تہذیب الاخلاق
علی گڑھ

جلد ۳ — پہلی جنوری سنہ ۱۹۸۴ء — شمارہ ۵-۱

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نور الحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مولانا محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، مولانا کی زبان برک کی زبان تھی اور اُن کا قلم میکالے کا قلم تھا۔ — ایچ۔ جی۔ ویلز

★ محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اس کے رفقا اور اس کے ہم عصر اس کے سامنے بَونے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا۔ وہ محبت و مروّت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جاں نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جانثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

مولانا محمد علی

★ محمد علی کی ذہانت و فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغِ اصیل تھی جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔ کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرامِ مصر سے ٹکرا رہی ہے لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے اس کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے "بنیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے" اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے بل کھاتے پہنچتے، جس کڑک، تڑپ، غرّاہٹ اور غلبے سے بولتے وہ میں نے دیکھا ہے۔ وہ بولنے میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے۔ وہ دنیا کے ہر حربے کا جواب اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔ محمد علی کی موت کا حال جب میں نے سنا تو تھوڑی دیر کے لیے یقین نہیں آیا۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا رہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طور پر کیا ہو گا۔ خود موت پر کیا گذری ہو گی۔

—— پروفیسر رشید احمد صدیقی

★ افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دُنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ بیقرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو ہو جاتا تھا اور اوروں کو بے تاب کر دیتا تھا دریغا کہ قیامت تک کے لیے ساکن ہو گیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے اُن کے ترانے اب ہمارے کان نہ سن سکیں گے۔ وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغِ برّاں بن کر چمکتی تھی اس کی تابش اب کسی معرکے میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئیگی، وہ پر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہائے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا، وہ پُر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گزاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا۔ آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو گا۔ الوداع محمد علی الوداع! والسلام الیٰ یوم القیام۔

وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا، لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشوونما پائی۔ مشرق کی مٹی سے اس کا جسم بنا لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا۔ اس کا دماغ مغربی، مگر دل مشرقی تھا، وہ مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا اور اس نے اس کا لوہا مانا۔ وہ مشرق کا آفتاب تھا۔ یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا وہ اسی لیے تھا کہ مشرق و مغرب کا متحد مرکز (بیت المقدس) اس کا مدفن بنے اے مشرق و مغرب کے مالک تو اپنی رضامندیوں کے پھولوں سے اس کا دامن بھر دے۔

مولانا سید سلیمان ندوی

ایک دیو پیکر رہنما

مولانا محمد علی

عقل کو ہم نے کیا نذرِ جنوں

مولانا محمد علی جوہر کا آزادی سے عشق، عشق سے بڑھ کر جنوں کی حد داخل ہوگیا تھا۔ وہ اپنے مقصد کے پیچھے دیوانے تھے اور اُن کی زندگی ہر لمحہ اسی فکر میں بسر ہوتا تھا کہ ملک کو کس طرح غلامی کے طوق سے رہائی حاصل ہو۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس ہونے والی تھی اور مولانا کی صحت اس میں شرکت کی اجازت نہ دیتی تھی۔ گٹھیا کی شکایت تھی۔ ذیابیطس کے حملے پے بہ پے ہو رہے تھے ایک آنکھ جاتی رہی تھی دوسری کی روشنی کم ہو چلی تھی۔ مولانا کے معالجوں نے آرام کی تاکید کی اور سفر سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ مگر یہ کس کی بات ماننے والے تھے۔ فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فریضہ ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں کے سلطان جابر اور رعایا دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آنکہ اس کام میں مرجاؤں" زندگی بھر بات کہنے کا یہی انداز رہا تھا۔ موت سے ذرا پہلے کیوں بدل جاتے۔ ان کے بارے میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا "اُن کے یہاں مصلحت کا گذر نہ تھا جو دل میں ہوتا وہی بے اختیار زبان پر آجاتا"۔ یہی اُن کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ یہی اُن کا سب سے بڑا عیب۔ عیب یوں کہ سیاست میں اس بیباکی اور مصلحت ناندیشی کا کیا کام۔

اقبال نے کہا تھا کہ "عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد" اقبال کے وہ بڑے قائل تھے اور اس کا اشارہ پاکے انھوں نے عصا سنبھال لیا تھا جس سے غیر اور اپنا کوئی بچتا نہ تھا۔ اسی لیے اپنے بھی ایک ایک کرکے بیگانے ہوتے چلے گئے۔ صاف گو تھے اور ایسے صاف گو کہ بات دل کے پار ہو جاتی تھی۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ "لوگ اس سے ایسے بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتے ہیں" ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ انگارے کی طرح دہکتا تھا کیونکہ اُن کی ہر بات میں خلوص کی آنچ ہوتی تھی۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ انھوں نے آرام کرنے سے صاف

عمر بھر میں یہی دانائی کی

انکار کردیا اور کہہ دیا کہ "ایک سپاہی کا یہ فرض ہے کہ جب اس کا مذہب اور ملک خطرے میں ہو تو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے فرض منصبی کو پورا کرے۔ میں اپنی ساری زندگی کام کے لیے زندہ رہا اور اس وقت آرام کی خاطر کام سے منہ موڑ لینا ایسا مجرمانہ فعل ہوگا جو صرف نامردوں اور بزدلوں کے لیے موزوں ہے" زندگی بھر کسی کے رعب میں نہ آئے تھے موت سے کیوں ڈر جاتے۔ مردِ مومن تھے اور موت اُن کے لیے بچوں کا کھیل۔ معالج تو کورا جواب پاکے خاموش ہو رہے مگر دوست کیسے چُپ ہو جاتے۔ مولانا عبدالماجد بدایونی نے جھُنجھلا کے کہا "ان بیماریوں کی گٹھری کے ساتھ زندہ لاش بنے ہوئے کیوں ولایت جاتے ہو؟" اُن کا مختصر جواب تھا "مرنے کے لیے"

انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اُنھوں نے اعلان کیا کہ "میں آزادیِ کامل کو اپنا مسلک قرار دے چکا ہوں اور آج جس مقصد کو لے کر یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اس حالت میں واپس جاؤں کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر لیکن آزاد ملک میں مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی" اور واقعی وہ لوٹ کر اس غلام ملک کی سرزمین پر قدم رکھنے کی شرمندگی سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ اُنھوں نے انگلستان میں انتقال کیا اور بیت المقدس کی مبارک مٹی میں دفن ہوئے۔ اُنھوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

ہے رشک اک جہان کو جوہر کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

یہ جاں نثار تو زخموں سے چور ہو کے میدانِ جنگ میں گرا اور اپنا کام ادھورا چھوڑ کے رخصت ہو گیا لیکن آزادی ملی تو دنیا اُسے بھول گئی۔

کتنی آنکھیں ہیں جو ہر سال ۴ جنوری کو اس کی موت کے غم میں نم جاتی ہوں؟ شاید دو چار بھی نہیں۔ غیروں کو کیا دوش دیں کہ ہم خود بھی اسے بھول چکے۔ شکریہ تہذیب الاخلاق کے اس حساس اور باشعور قاری کا جس نے ہمیں اس کی تاریخ وفات یاد دلا کے چونکا یا اور دو مختصر مگر اہم پُرانے مضامین ڈھونڈ نکالے اور ہمیں بھیج دیے۔ یہ مضامین پیش کیے جاتے ہیں۔

نورالحسن نقوی

★ مولانا مرحوم کی شخصیت ذہانت، قابلیت اور سیاسی شہرت نے انکو ہندوستان میں نمایاں ترین ہستیوں میں سے ایک ممتاز ہستی بنا دیا تھا اگرچہ مولانا لاہور کے ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے مگر ان کی ہمہ گیر قابلیت نے ان کے نام کو ہندوستان کے ہر کونے اور ہر گوشے میں روشن کر دیا تھا ابھی ملک اور قوم کو ان جیسی شخصیت کی اشد ضرورت تھی مگر صد حیف قضا کے بے پروا ہاتھ نے دونوں کو انکی عدیم المثال قوتوں سے محروم کر دیا اور آج محمد علی کا نام کہ جس نے ہندوستان کے خاموش دماغی سمندر میں برسوں طوفان اور تلاطم برپا رکھا افسانہ بن کر رہ گیا۔ غالب کا قول ہے ؎

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

دنیا میں ہمیشہ یہی ماتم درپیش رہا ہے۔ خاص خاص ہستیاں خاص خاص زمانے میں پیدا ہوتی ہیں مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے خوابوں سے تعبیر دیکھ سکیں کنج مزار میں جا سوتی ہیں اور اپنے مدح خوانوں کی جماعت کو نوحہ گراں کی جماعت سے بدل دیتی ہیں۔

مجھے وہ دن یاد ہے کہ جب محمد علی نے انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ نکالا اور اُس زمانے میں وہ انگریزی زباں داں اور ادب پر مبنی مضمون آفرینی کا مرقع گردانا جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ خود محمد علی مرحوم کہا کرتے تھے کہ جب وہ سرگانی فیلیٹ ڈ ڈونس سے پہلی مرتبہ ملے تو انھوں نے اپنی الماری میں سے جس میں عجوبۂ روزگار چیزیں جمع کر رکھی تھیں کامریڈ کا ایک پرچہ نکال کر دکھایا اور کہا کہ میں تمھارے اس اخبار کو بھی اس دور کا ایک عجوبہ سمجھتا ہوں۔

کامریڈ کا گھر گھر چرچا تھا اور ہر ادبی مذاق رکھنے والا شخص خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہوا سے ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ ادبیت سخن سنجی، نکتہ آفرینی اور ظرافت مولانا مرحوم کے رگ و پے میں خون کی طرح دورہ کرتے تھے اور ہر موقع و محل کے لیے اُن کی طبیعت نئی سے نئی تازگی پیدا کر دیتی تھی۔ جب اُنھوں نے سیاسیات میں قدم رکھا تو اس میں بھی طوفان نوح کی سی شان پیدا کر دی۔

مسئلۂ خلافت جو صدیوں سے مسلمانوں کے ذہنوں سے مفقود ہو چکا تھا اُسے ایک ایسے رنگ میں پیش کیا کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا بچہ بچہ بلکہ ہندوستان کی دوسری اقوام کے بھی سمجھدار اشخاص خلافت کی حمایت میں جزیرۃ العرب کی آزادی کے علمبردار بن گئے۔ ایک موقعے پر ایک انگریزی مضمون میں مجھے اس سلسلے میں کچھ کہنے کا موقع ملا تو میں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ صلیبی جنگوں کے سلسلے میں جو کام اٹلی کے ایک راہب نے ٹیم نے تمام یورپ کے بیدار کرنے میں کیا تھا اور جس کی گونج صدیوں تک یورپ اور ایشیا کے کانوں میں پہنچتی رہی اور جس کے نتائج سے یورپ اور ایشیا کی تاریخ کے کئی باب آج پُر نظر آرہے ہیں وہ کام علی برادران نے مسئلۂ خلافت کے سلسلے میں ہندوستان میں تنہا انجام دیا تھا۔

یہ دوسری بات ہے کہ بعد کے واقعات اور زمانے کی رفتار نے حالات کا رخ بدل دیا اور عوام کی ذہنیت نے ایک ایسی کروٹ لی وہ تعبیر جو علی برادران کے پیش نظر تھی اور جس کا محمد علی مرحوم نے ایک شاندار خواب دیکھا تھا وہ آج خود افسانہ ہو کر رہ گئی۔ مگر اس میں کیسے کلام ہو سکتا ہے کہ چند برسوں کے لیے محمد علی مرحوم اور شوکت علی صاحب کے اسمائے گرامی ایک ایسی تحریک سے وابستہ رہے ہیں کہ جس میں دنیا کے ایک بہت بڑے انقلاب کی امید کی لہر بلند سے بلند مقام تک پہونچ گئی۔ آج یہ کہنا آسان ہے کہ وہ ایک چراغ سحری کی بھڑک تھے لیکن اگر واقعات رُخ نہ بدلتے اور حالات مساعدت کرتے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ تحریک ایشیا اور افریقہ کے نقشے تک نہ بدل دیتی۔

۱۹۲۰ء میں علی برادران ہندوستان کی انقلابی ذہنیت کے تموج اور سر بفلک کشیدہ لہروں کی اونچی سے اونچی چوٹی پر نظر آتے تھے اور محمد علی کی حب الوطنی پر آل انڈیا کانگریس نے ۱۹۲۳ء میں انھیں صدر بنا کر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی مگر ہزار افسوس کہ ۱۹۲۳ء سے پہلے ہی ادھر تو تحریک خلافت کا

چڑھاؤ اتر چکا تھا اور اِدھر ہندوستان کی قومی آزادی کی انقلابی تحریک کا سمندر بھی آمار کے جھکولے لے رہا تھا۔ نہ صرف ہندو اور مسلمانوں میں بلکہ ہندو ہندو میں اور مسلمان مسلمان میں نفاق کے بادل چھا چکے تھے اور انتشار کی ہوا چل رہی تھی سینکڑوں تدبیریں اور ہزاروں منتر پڑھے مگر ملک اور قوم کا مزاج استقلال اور یک جہتی کی طرف رجوع نہ ہوا۔

ایک آخری کوشش نہرو کمیٹی نے معاملات کو سُلجھانے کی کی مگر بدقسمتی سے وہ ایک نئی الجھن کا باعث بن گئی اور اس وقت مولانا محمد علی مرحوم کے اختلافات کانگریسی طبقے سے نمایاں ہونے شروع ہوئے حتیٰ کہ گول میز کانفرنس کی کارروائی شروع ہوتے وقت تک اس قوم پرست طبقے کے خیالات کہ جس میں خود مولانا محمد علی کی نشو و نما ہوئی تھی اور جس کی نشو و نما میں خود ان کا بھی کافی ہاتھ تھا اور مولانا محمد علی کے خیالات میں کافی وسیع خلیج پیدا ہو گئی تھی مگر مولانا کی وہ تقاریر جو انھوں نے گول میز کانفرنس ہندوستان میں کیں اپنا آپ نمونہ تھیں اور حبّ الوطنی کے جن جذبات کا انھوں نے اظہار کیا اپنی گہرائی اور صداقت میں کسی بہتر سے بہتر محب وطن کے جذبات سے کم نہیں تھیں۔ بلکہ ان کا یہ فقرہ کہ "اگر میں آزاد ہندوستان میں واپس نہ جا سکا تو میں ہندوستان سے باہر مرنا پسند کروں گا" نہ صرف ان کی تمام زندگی کا خلاصہ تھا بلکہ قوم اور ملک کی بدقسمتی سے ایک پیشین گوئی ثابت ہوا۔

بیرسٹر آصف علی (روزنامہ خلافت بمبئی)

مرسلہ جناب ظہیر دارثی، کانپٹی

★ میرے رہنما سیاسی اُستاد اور محترم دوست مولانا محمد علی سے میرا تعارف ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ میں ایم اے کالجیٹ اسکول علی گڑھ میں پڑھتا تھا من الفرض کی جانب سے اُس زمانے میں ہر سال تقریروں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ مولانا مرحوم اس رسالے کے مقابلے میں جج بنائے گئے تھے میں نے بھی تقریر کی تھی۔ مولانا نے بعد اختتام مجھے بلایا بوسہ دیا اور نہایت خلوص اور محبت سے فرمایا کہ یہ بڑی نعمت ہے اس کی قدر کرنا اور مشق برابر جاری رکھنا اس وقت سے آخر تک باوجود بعض مرتبہ شدید اختلافات رائے کے مولانا کی محبت اور میری عقیدت میں فرق نہ آیا اور میری موجودہ زندگی بڑی حد تک مولانا کے فیضِ صحبت کے اثر سے مملو ہے۔ مولانا مرحوم کی ذات درحقیقت کمالات تھی۔ کبھی ایک ذات میں اتنے اوصافِ حمیدہ کا اجتماع مفقود

نہیں تو نادر ضرور ہے۔ چند اوصاف کی تو اتنی زیادتی تھی کہ بعض لوگوں کی نظر میں عجیب معلوم ہونے لگے تھے۔ مولانا بلا کے ذہین تھے حافظہ بے مثل تھا اور ان دونوں اوصاف کی حیرت انگیز قابلیت کا لازمی نتیجہ تھی ۲۰ سال کی عمر میں بی اے کی ڈگری اور باوجود اس کے کورس کی کتابیں بھی نہ خریدی تھیں اپنے صوبے میں اوّل نمبر رہے۔

زبان دانی کا اوائلِ عمر میں شوق تھا مادری زبان میں ان کے مضامین ان کی تقاریر اور ان کے اشعار ان کی اعلیٰ قابلیت کے مشاہد ہیں۔ انگریزی زبان میں ہزاروں سے خراجِ تحسین لیا۔ مشتے نمونہ از خروارے ایچ جی ویلس جیسے ادیب اُن کے متعلق فرماتے ہیں "ان کا قلم میکالے کا قلم اور ان کی زبان برک کی زبان تھی" ان کی شوخ نگاری کا سکہ تمام ملک پر بیٹھا ہوا تھا "چوائس آف ٹرکس" اس کا ایک نمونہ ہے۔ ان کی ظرافت اور بذلہ سنجی زبان زد ہیں دو ایک پھبتیاں جو میرے علم میں ہیں اُن کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ سر سیّد راس مسعود کی شادی کے موقع پر مولانا کو کہیں سے بہت سے شریفے ہاتھ آ گئے جس کوٹھی میں قیام تھا اس کی لان پر لیٹے ہوئے مع احباب شریفے کھائے جا رہے تھے ایک صاحب علی گڑھ کے باشندے جن سے مولانا کی کچھ ملاقات تھی تشریف لائے اور کہنے لگے کہ شریفے کھا کر بیج یہیں پھینک رہے ہو یہ اُگ آئے تو کیا ہوگا۔ مولانا نے چپکے سے فرمایا کہ بہت بہتر ہوگا علی گڑھ میں شریفوں کی بہت کمی ہے جملہ ایسا پھبا کہ معترض کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے فوراً تشریف لے گئے۔ جملہ کسنے میں مولانا کہیں باز نہ آتے تھے چنانچہ جب مولانا کے برادرِ بزرگ بھائی شوکت علی لنکا تشریف لے گئے تو وہاں سے تار دیا کہ میرا استقبال یہاں ایسا ہوا کہ شاید کسی کا ہوا ہوگا۔ مولانا نے بذریعہ تار جواب دیا کہ "غالباً راون کے بعد"

ایک دعوت کے موقع پر دہلی میں جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور نے تربوز بھی کھلائے ایک پنجاب کے بزرگ نے بیحد تعریف کی اور فرمایا کہ دہلی میں تربوز بہت اچھے ہوتے ہیں کسی صاحب نے اُن بزرگ سے پوچھا کہ پنجاب میں کیا چیز اچھی ہوتی ہے تو مولانا نے چپکے سے فرمایا "خربزہ" ہزاروں ان کے ایسے جملے ہوتے تھے جن کے ضبطِ تحریر کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔

مولانا مرحوم کے خاص اوصاف انکی آزادی رائے آزادی عمل اور

صاف گوئی تھے اور یہ خیال اُن میں اس درجہ تھیں کہ بعض لوگ اُن کو عجیب سمجھنے لگے تھے اُن کو اپنی رائے پر اتنا شغف تھا اور اس درجے اس پر مُصر تھے کہ ان کے یہاں اختلاف اور مخالفت میں بہت کم فرق رہ جاتا تھا۔ ہندوستان کی فضا اُن کے دورانِ عمل میں اُن اوصاف کی متحمل نہ تھی اور اسی وجہ سے بہت ساری غلط فہمیاں ہوگئیں جو چیز اُن کے ذہن میں آتی تھی اس کو بے دریغ کہہ ڈالتے تھے اور ان کو اس کی مطلق پرواہ نہ ہوتی تھی کہ اس کا کیا اثر ہوگا۔ چنانچہ گاندھی جی کے متعلق اُن کے اس جملے نے کہ "ایک فاسق فاجر مسلمان کو وہ گاندھی جی سے بہتر سمجھتے ہیں" سارے ہندوؤں کو اُن کی طرف سے بدظن کر دیا۔ اسی سلسلے میں ان کی حاضر جوابی کا قصّہ یاد آیا مہاتما جی کے متعلق جو انھوں نے جملہ فرمایا تھا اس کے متعلق ایک مرتبہ راقم الحروف سے گفتگو ہو رہی تھی بحث بڑھ گئی اور مذہبی نقطۂ نظر سامنے تھا۔ عرض کیا گیا کہ اگر آپ کی رائے مان لی جائے تو خدائے تعالیٰ فرقہ پرور ٹھہرا۔ جی ہاں "پھر بھی میرا فرقہ پرور خدا آپ کے بے حس خدا سے بہتر ہوگا۔"

ایک مرتبہ ایک انگریز جو ایک صوبہ کے گورنر تھے اور مولانا سے چند مرتبہ پہلے مل چکے تھے اور جب ملتے تھے غالباً از راہِ اغماض کہتے تھے کہ میں نے آپکو کہیں دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی کے قلعے میں مولانا اپنے ایک دوست کے ساتھ جو اس زمانے میں گورنر صاحب کے چیف سکریٹری تھے جا رہے تھے اتفاقاً گورنر صاحب سے سامنا ہو گیا مولانا کے دوست نے گورنر صاحب سے کہا کہ مولانا کو تو آپ جانتے ہیں گورنر صاحب نے حسبِ عادت جواب دیا دیکھا تو ہے مگر نام اور موقع یاد نہیں رہا۔ اور مولانا کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ مولانا کو کہاں تاب تھی جواب دیا کہ اس سے پہلے دو تین مواقع پر سوال کا جواب دے چکا ہوں مگر اب چاہے میرا حافظہ اس سوال کا سبب ہو یا بد دماغی اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا اور یہ کہہ کر دوسری طرف چل دیے۔

رنگیلا رسول کے مقدمے میں راجپال کے فیصلے کے متعلق جو شورش فیصلہ دینے والے جج جسٹس دلیپ سنگھ کے خلاف ہوئی اُس کی مخالفت نے بہت سے اُن کے دوستوں کو ان کا مخالف بنا دیا۔ قتلِ مرتد کے معاملہ میں بہت سے اُن سے جُدا ہو گئے۔ ابن سعود کی ابتدائی موافقت میں خود اُن کے پیر مولانا عبدالباری صاحب مرحوم و مغفور تک سے اختلاف واقع ہوا۔ مگر اُن کے نزدیک جو بات حق تھی اُس کی تائید سے باز نہ آئے۔ صاف گوئی حق پسندی اور آزادیٔ رائے کے اوصاف اُن میں ابتدا سے تھے اور لوگ اُن سے اس قدر خائف رہتے تھے کہ جہاں اُن کا ہاتھ کسی کام میں آتا تھا تو وہ اس ڈر سے اس کے پاس آنا گوارا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں جب ان کی پروفیسری کا معاملہ پیش ہوا تو کُل انگریز اور بعض ہندوستانی پروفیسروں نے اس کی سخت مخالفت کی اور ان کو پروفیسر ہونے دیا۔ مادرِ کالج سے ان کو از حد محبت تھی مگر دو طریقوں پر ایک تو ۱۹۰۷ء میں جب انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ کالج کو امپیریلیسٹ پالیسی کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے تو اسی وقت سے اس کے نظام کی انھوں نے سخت مخالفت کی اور اس وقت کے طلبا کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ کچھ زمانہ ایسا گذرا کہ یہ تعلیم گاہ سخت معرضِ خطر میں تھی بڑی زبردست دھمکیاں دی گئیں مگر وہ حق کی طرفداری سے باز نہ آئے۔

دوسرا معرکہ نان کو آپریشن کا حافظوں میں اب تک زندہ ہوگا۔ غرض کہ مولانا مرحوم کو اپنی زندگی میں جو مصائب برداشت کرنا پڑے وہ تقریباً سب کے سب اُن کی حق گوئی آزادی رائے اور آزادی عمل کا خمیازہ تھے۔

تصدق احمد خاں شیروانی (روزنامہ خلافت بمبئی)

جناب ظہیر وارثی کامٹی

★ مولانا محمد علی جوہرؔ آزادی کے متوالے اور قوم کے جانباز سپاہی تھے۔ کم مجاہدوں کو یہ رتبہ نصیب ہوتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں لڑتے لڑتے جان دیں۔ مولانا نے آزادی کی لڑائی لڑتے ہوئے جان دی۔ سچ ہے انھیں شہادت نصیب ہوئی۔

ابھی وہ صرف ڈیڑھ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ نے جنھیں آگے چل کر اہلِ ہند نے بی اماں کہہ کر پکارا، اپنے بیٹوں کی پرورش اس ناز و نعم سے کی کہ انھیں یتیمی کا احساس تک نہ ہو اور شاید یہی وجہ تھی کہ ساری زندگی مولانا محمد علی نے شاہانہ زندگی بسر کی اور کبھی روپے کو اہمیت نہ دی۔ اسی شاہ خرچی کے سبب ان پر اکثر جا و بے جا تنقید بھی ہوئی مگر انھوں نے پرواہ نہ کی۔

انگلستان سے واپسی کے بعد مولانا کی خواہش تھی کہ وہ اپنی خد

محمڈن کالج علی گڑھ کو پیش کریں اور وہ کم تنخواہ قبول کرنے کو بھی تیار تھے لیکن پرنسپل تھیوڈور مارلسین کی مخالفت کے سبب اس ملازمت سے محروم رہے۔ رام پور میں ان کا تقرر ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدے پر ہوا اور کچھ عرصے بعد وہ ریاست بڑودہ سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء میں مولانا نے کلکتے سے اپنا عہد ساز اخبار کامریڈ جاری کیا۔ اخبار جاری کرنے کے لیے بڑے سرمایے کی ضرورت تھی۔ مولانا اس وقت تقریباً تہی دست تھے لیکن یہ اخبار اتنا مقبول ہوا کہ ابتدا ہی میں ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہونے لگا۔ مولانا نے اپنے اخبار میں ترکوں کی حمایت کی جو انگریز سرکار کو ناگوار گزری۔ مولانا اور ان کے بھائی شوکت علی گرفتار ہوئے اور کئی برس چھندواڑہ میں قید رہے۔ یہاں دونوں بھائیوں نے داڑھیاں رکھ لیں اور بیشتر وقت کلام پاک کی تلاوت میں صرف کرنے لگے اور شاید یہیں سے دونوں بھائیوں کا نام ایک دوسرے کے نام سے ایسا چپکا کہ کبھی الگ نہ ہو سکا۔ اکثر اجنبی اور کم علم لوگ انھیں، محمد علی شوکت علی، کہا کرتے تھے۔ ایک بار کسی تانگے والے نے تانگے کا توازن ٹھیک کرنے کی غرض سے کہا "محمد علی صاحب ذرا ادھر ہو کر بیٹھیے" یہ بہت خوش ہوئے۔ بولے بھائی تم پہلے تانگے والے ہو جس نے میرا نام بلا شرکت غیرے لیا ہے۔

۱۹۱۹ء میں عالمی جنگ کے خاتمے پر مولانا رہا ہوئے۔ پھر میدان سیاست میں سرگرم عمل ہو گئے۔ ان کی دھواں دھار تقریروں نے خلافت تحریک کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی تو مولانا اس میں بھی پیش پیش تھے۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے کامریڈ دوبارہ جاری کیا۔ یہ انگریزی اخبار تھا اور انگریز بھی اس اخبار کی زبان کا لوہا مانتے تھے لیکن انھوں نے ایک اردو اخبار کی ضرورت بھی محسوس کی اور "ہمدرد" نام سے ایک اردو اخبار جاری

مولانا کے مزاج میں بلا کی ظرافت تھی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کے بڑے معترف تھے اور کہا کرتے تھے کہ اتنا اچھا مقرر ہونا ہے ایسا مقرر قوم کو کسی غلط راستے پر بھی ڈال سکتا ہے۔ مولانا بخاری کو "بخار اللہ شاہ عطائی" کہا کرتے تھے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ خود بھی کسی آتش فشاں سے کم نہ تھے اور اپنی تقریروں سے آگ سی لگا دیتے تھے۔

مولانا ایک سیاسی رہنما، ایک شعلہ بیان مقرر اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کی ذات میں بہت سی خوبیاں مجتمع ہو گئی تھیں۔ ملک اور قوم ان پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

اسعد بدایونی، (ریسرچ اسکالر)

سیف الدین طاہر ہائی اسکول علی گڑھ

لائف ممبرز

جناب لبیق احمد خاں صاحب	جناب نثار احمد خاں صاحب
" محمد سعید فاروق "	" عقیل احمد "
" ظہیر احمد "	" محمد ظہیر الدین "
" محمد صالح شمیم "	محترمہ سلمٰی رضوی صاحبہ
" خورشید الزماں ہاشمی "	جناب تقی حسن صدیقی صاحب
محترمہ آصفہ خاتون صاحبہ	" محمد وقیع "
" عابدہ منیر "	" محمد سلیم انصاری صاحب
" قدسیہ نثار "	" منظر جمیل "
" مسعودہ فرحت "	" عبد السمیع خاں "
" شگفتہ کریم "	" سعد انور حسن رضوی
" نسیم خاں صاحبہ	" ایس ایم اے کرمانی "
" سید قمر عباس نقوی صاحب	" محمد عزیز الدین "
" ایم۔ ایس۔ خان "	" وحید اشرف "
" صغیر الاسلام صدیقی "	" قیوم عطا "
" معراج احمد صاحب "	" محمد اکرام غزنوی "
محترمہ مسعودہ خاتون صاحبہ	" محمد وصی صاحب

(باقی آئندہ)

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

اپنی کارکردگی کا جائزہ

پیش رفت

گزشتہ تین سال کا یونیورسٹی کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر جہت میں بہتری کی طرف قدم اُٹھے ہیں۔ اگرچہ اسی دوران میں بعض عناصر کی شرپسندی کے باعث یونیورسٹی کو کافی مدت کے لیے بند رکھنا پڑا۔ لیکن بہتری کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی رفتار میں کمی نہیں آئی اور یہی وجہ ہے کہ اس مدت کی تلافی کر لی گئی اور طلباء کے قیمتی سال کو ضایع ہونے سے بچا لیا گیا۔

یونیورسٹی کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ طلباء کے لیے تعلیم کے بہترین مواقع فراہم کرے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ گزشتہ دو سال میں تدریس کی صورت بہت بہتر ہوئی ہے۔ ہر کلاس کو زیادہ تدریسی وقت دیا گیا تاکہ نصابات کو مکمل طور پر پڑھایا جا سکے اور طلباء یہاں آنے اور اپنی تعلیم کے مقصد کو پورا کر سکیں۔ نصاب کو مختصر کرنے یا نامکمل نصاب میں سے امتحان لینے کے طریقے کو ختم کر دیا گیا۔

حاضری کے قواعد کو سختی سے نافذ کیا گیا تاکہ طلباء کلاس آنے کی پابندی کریں اور حصولِ تعلیم کی کم سے کم شرائط کو پورا کریں۔ امتحانات کے پروگرام اس طرح بنائے گئے کہ دو تین سال میں تمام کام معمول کے مطابق آ جائیں۔ امتحان کے نتائج پھر نئے داخلے، تعلیمی سال کا آغاز و اختتام یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک میں گڑبڑ ہونے سے سارا نظام متاثر ہوتا ہے۔ اس بات کو سختی سے روکا گیا کہ معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے امتحان ملتوی کر دیا جائے۔ امتحان ملتوی ہونے کا اثر اندرونی نظم پر پڑنے کے علاوہ اس کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ یونیورسٹی کے بہت سے امتحانوں میں پرائیویٹ اُمیدواروں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے جو ملک کے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ملازم ہوتے ہیں۔ التوائے امتحان سے ان کو جو دشواریاں ہوتی تھیں وہ ظاہر ہیں پھر بار بار کے التوا سے اچھے طالب علموں کا بیحد نقصان ہوتا تھا، کسی کی ملازمت کے مواقع ختم ہوئے، کسی کا دوسری جگہوں پر داخلے کا وقت نکل گیا، کسی کے مقابلے کے امتحان میں شامل ہونے کا وقت ختم ہو گیا اور غیر یقینی حالت سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی تھی۔

ان اقدامات کے نتیجے میں طلباء بھی سنجیدگی سے اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کا ثبوت انھوں نے نہ صرف کلاس کی حاضری میں دیا لائبریری اور دارالمطالعوں سے بھی اس کا ثبوت بہم پہنچایا۔ اب سال کے بیشتر حصے میں یونیورسٹی لائبریری جو بیس گھنٹے کھلی رہتی ہے ا ہر وقت طلباء وہاں مصروفِ مطالعہ نظر آتے ہیں۔ ان کے ذوق او ضرورت کی تکمیل کے لیے نصابی اور دوسری کتابوں کی فراہمی کا بڑ پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ ہر ہال کے دارالمطالعے میں بڑی تعداد کتابیں مہیا کی گئیں۔ اُن سے بڑا استفادہ کیا جا رہا ہے

طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر نئے ہالوں کی ضرو محسوس کی جا رہی تھی۔ پھر یہ بھی کہ بعض وہ طالب علم اپنی تعلیم کر چکے تھے ہوسٹلوں میں قیام پر اصرار کرتے تھے اور موجودہ علموں کے رہنے کی گنجائش کم ہو رہی تھی ایک طرف ایسے سابق سے ہوسٹلوں کو خالی کرایا گیا دوسری طرف نئے ہالوں کی تعمیر کا

توجہ دی گئی۔ ابھی نئے ہال زیر تعمیر ہیں۔ تعمیر مکمل ہونے پر تقریباً ایک ہزار طلبا کے قیام کی مزید گنجایش پیدا ہو جائے گی لیکن اس سال بھی نئے داخل ہونے والے طالب علموں کو ہوسٹلوں میں جگہ مل چکی ہے۔ کئی سال بعد ایسا ہوا اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہو سکا کہ ناجائز قبضوں کو ختم کرایا گیا۔

تعلیم و تدریس کے ساتھ کھیلوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس دوران ان پر خصوصی توجہ دی گئی۔ طلبا کی ہمت افزائی کی گئی۔ کھیل کے میدانوں کو بہتر بنایا گیا۔ اس سلسلے کی کڑی حکومت ہند کی وہ منظوری ہے جو حال ہی میں گلائڈنگ کلب قائم کرنے کے لیے حاصل ہوئی ہے۔ یونیورسٹی کا رائڈنگ کلب (گھڑ سواری) کلب پہلے ہی اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ گلائڈنگ کلب سے طلباء کو اس سمت میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔

میڈیکل کالج میں ڈیڑھ سو مریضوں کے لیے نئی عمارت، نرسوں کے لیے ہوسٹل زیر تعمیر ہے۔ نیا مہمان خانہ، قانون اور کامرس کی فیکلٹیوں کی عمارت عنقریب شروع ہو جائے گی۔ عمارتوں میں اضافے کے علاوہ نئے شعبوں کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ کمپیوٹر کی تربیت کے لیے کورس شروع کیے گئے ہیں۔ ایسے ہی نرسوں کی تربیت کے لیے نیا کورس شروع کیا گیا۔ انجینئرنگ کالج میں کیمیکل انجینئرنگ کے شعبے کا اضافہ ہوا۔ شعبۂ اردو میں خطاطی کا دو سالہ کورس شروع کیا گیا۔ حال ہی میں ہوٹل مینیجمنٹ کا دو سالہ کورس شروع ہونے کی منظوری حاصل ہو گئی ہے۔ اور آئندہ سال یہ کورس بھی شروع کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال نئے شروع ہونے والے کورس میں ملٹری سائنس کا کورس بہت اہم ہے۔ اس کا الگ سے شعبہ قائم ہو کر تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ان سے ہمارے طلباء کے روزگار کے لیے کچھ اور راہیں کھل جائیں گی اور بھی بعض شعبوں کی توسیع زیر غور ہے۔

گزشتہ تین سال میں اگر ایک طرف یونیورسٹی کی ہمہ جہتی توسیع اور اس موجودہ صورت حال کو بہتر بنانے کا مشن انتظامیہ کے پیش نظر رہا تو دوسری ان قوتوں سے بھی برسر آزمائی کرنی پڑی جو نہ کاموں کو منظم دیکھنا چاہتی تھیں کہ بدنظمی ان کو راس آتی تھی نہ فرسودہ طریقوں کو ختم کیے جانا پسند کرتی تھیں نہ چھوٹے اور ذاتی مفادات سے دست بردار ہونے کو تیار تھیں۔ یہ قوتیں تعمیری کوششوں میں رکاوٹ بنتی رہیں۔ لیکن اس کے باوجود صورت حال بہتر ہوئی ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ کو یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو یقین ہے کہ تعمیر و ترقی کی راہ اور تیز ہو جائے گی اور یہاں علمی، تعلیمی اور تنظیمی ہر اعتبار سے وہ معیار قائم کیا جا سکے گا جس کی بجا طور پر اس یونیورسٹی سے توقع کی جاتی ہے۔

ایک زیر تعمیر ہال
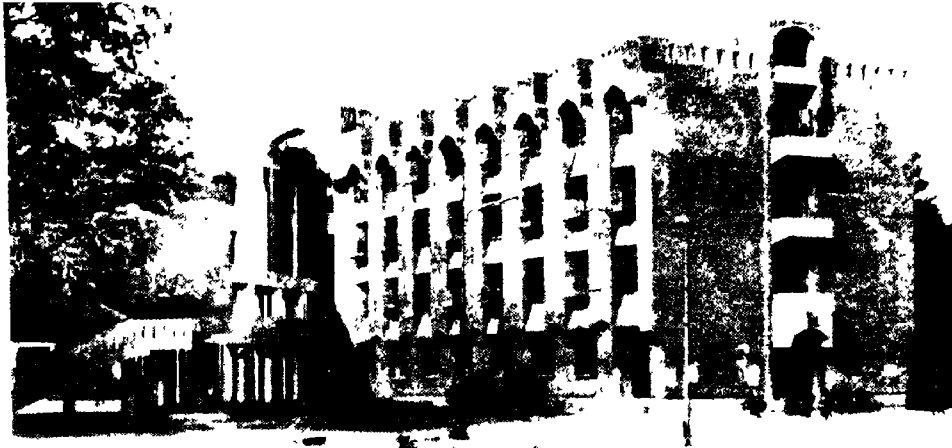
..یونیورسٹی دفاتر کی زیر تکمیل عمارت

طبیہ کالج (شعبۂ علم الادویہ) کی نئی عمارت
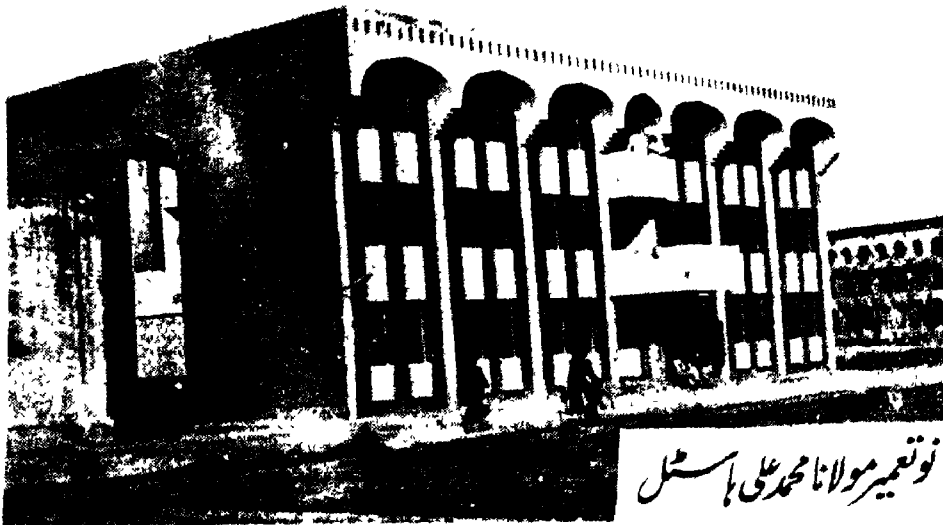
نوتعمیر مولانا محمد علی ہاسٹل

سید کاظم نقوی

انسانی فطرت اور ذاتِ خدا سے لگاؤ

علم الاجتماع (سماجیات) کے ماہرین کا فیصلہ ہے کہ خالق کائنات کی حیثیت سے کسی ایک ذات یا بہت سی ذاتوں کی پرستش انسان قدیم ترین زمانوں سے کرتا چلا آیا ہے۔ اس کی جڑیں وجود انسانی کی انتہائی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ گو یا خدا پرستی اور بالا تر موجودات سے انسان کی عقیدت اس کی گھٹی میں ملی ہوئی ہے انسان انھیں اپنے اوپر بلکہ پوری اس دنیا کے اوپر جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے، حاکم اور فرمانروا سمجھتا ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے، اس کا یہ عقیدہ اس کے ساتھ زندہ اور برقرار ہے۔ خدا پرستی کے میلان کی نوعیت ان باتوں سے جداگانہ ہے جن کا انسان کی عادت سے تعلق ہے۔ ان کا ہر معاشرے میں مخصوص روپ ہے۔ ہر خطۂ زمین میں الگ الگ رنگ ہے۔ یہ باتیں مستقل ثابت قدم نہیں ہیں۔ ان کی عمارت ایسے کھمبوں پر کھڑی ہے جو ہمیشہ ڈگمگا رہے ہیں۔

عادت اور فطرت

ایسا نہیں ہے کہ عادت اور فطرت کے درمیان فرق نہ کیا جاسکے۔ یہ نہ سمجھا جاسکے کہ کن باتوں کا سرچشمہ عادت ہے اور کن امور کی پیدائش فطرت کی رہین منت ہے۔ معیار یہ ہے کہ ہر وہ خیال اور عمل جس کی انتہا جغرافیائی یا اقتصادی یا سیاسی یا کسی شخص کے خصوصی حالات کے اوپر ہو اسے عادت کی پیداوار سمجھا جائے گا ان کا سرچشمہ یہی اسباب قرار پائیں گے۔ ان کا تعلق انسان کی فطرت سے نہیں ہوگا۔ مثلاً جو قومیں قطبِ شمالی یا قطب جنوبی کے پڑوس میں رہتی ہیں وہ جغرافیائی حالات کی بنا پر مجبور ہیں کہ موٹے اونی کپڑے پہنیں اس کے برخلاف جو لوگ خطِ استوا کے نزدیک زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھیں اپنے جغرافیائی حالات کی وجہ سے مہین اور باریک کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ ان میں سے کسی فعل کا سرچشمہ فطرت نہیں ہے۔ مختلف قوموں کا یہ مختلف عمل صرف اس ماحول کا نتیجہ ہے جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اسی طرح لباس کی شکل وصورت، اس کا رنگ، اس کی وضع قطع قوموں کے رسم اور فیشن سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی کوئی فطری بنیاد نہیں ہے۔ اگر پوشاک کی شکل اور وضع کا ربط انسانی فطرت سے ہوتا تو اسے ہر جگہ یکساں ہونا چاہیے تھا ملکوں اور قوموں کے لحاظ سے ان میں فرق نہ ہوتا۔

اس کے برخلاف ہر وہ خیال اور عمل جس کی بنیاد انسانی فطرت ہو جس میں جغرافیائی، اقتصادی اور سیاسی اسباب کا دخل نہ ہو وہ ہمیشہ مستقل اور ثابت قدم رہتا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، ملکوں اور قوموں کے اختلاف سے اس میں اختلاف نہیں پیدا ہوتا ہے۔

شہد کی مکھی کی تمام کارگزاریاں، پھولوں کا رس چوسنا، اپنے چھتے میں مسدس خانے بنانا، انڈے دینا، اپنے بچوں کی پرورش کرنا، یہ اور ان کے علاوہ تمام دوسرے کام فطری ہیں کیوں کہ ان کا ان اسباب اور امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، جنھیں پہلے بیان کیا گیا۔ اس کی یہ تمام کارگزاریاں عمومی اور آفاقی ہیں۔ شہد کی مکھی کہیں ہو ہمیشہ اس کے یہی کام ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کارگزاریاں اس کی ذات کا خاصّہ ہیں۔ یہی حال تمام جانداروں کے کاموں کا ہے۔

جانوروں کی طرح انسان کے اندر بھی کچھ فطری میلانات
موجود ہیں جو کسی بیرونی سبب کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہیں
ان میں عمومیت، ہمہ گیری اور آفاقیت ہے۔ مثلاً تمام لوگ
اپنی عمر کے مخصوص حصوں میں جنسی مسائل سے دلچسپی محسوس
کرتے ہیں، وہ حسن وجمال، مال و دولت، جاہ و منصب،
محبوبیت اور ہر دلعزیزی، اولاد اور سماجی انصاف چاہتے
اس کے برخلاف فقر وافلاس، معاشرتی بے انصافی سے نفرت کرتے ہیں۔
ایسا غیر شعوری طور پر ہوا کرتا ہے۔

شاید مہذب اور متمدن لوگوں سے زیادہ امانت اور شرافت کی
اہمیت ان وحشی قبائل کی نظر میں ہو۔ جن کی زندگی بالکل سادہ
اور بے آلائش ہے، جس میں کسی قسم کی بناوٹ موجود نہیں ہے۔ وہ
جو وعدہ کر لیتے ہیں، اس کو محترم سمجھتے ہیں۔ عام طور سے لوگ جو کام
مکاری اور بددیانتی کی بنا پر کیا کرتے ہیں وہ ان میں نظر نہیں
آتے ہیں۔

دو طرح کے خیالات اور کاموں کی جو مثالیں پیش کی گئیں،
انھیں پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجۂ ذیل علامتوں کے ذریعہ فطری
اور غیر فطری امور کے درمیان امتیاز اور فرق پیدا کیا
جا سکتا ہے۔

(الف) ہر وہ خیال اور کام جس کا سرچشمہ فطرت ہو وہ عمومی اور
ہمہ گیر ہوگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ویسا نہ کرے۔

(ب) فطری امور صرف عقل اور فطرت کی راہنمائی سے انجام پاتے ہیں۔
انھیں سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ج) ہر وہ خیال اور عمل جس کا سرچشمہ فطرت ہو وہ جغرافیائی
اقتصادی اور سیاسی اسباب کے حدود اقتدار سے باہر ہوگا۔

(د) مسلسل پروپیگنڈہ جب فطری امور کے خلاف ہوتا ہے تو
یہ ممکن ہے کہ ان کے پھلنے پھولنے کی رفتار سست ہو جائے، لیکن
وہ ان کی بالکل بیخ کنی نہیں کر سکتے۔

ان کے برخلاف جن باتوں کا عادت سے تعلق ہے، ان میں مذکورہ
خصوصیتوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتی ہے بلکہ اس کے برعکس
دکھائی دیتا ہے۔

اب ہمیں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ مذہب اور خدا پرستی
کے احساس میں یہ چاروں خصوصیات پائے جاتے ہیں یا نہیں؟

مختصر توجہ کے بعد ہمیں معلوم ہوگا کہ دین داری اور خدا پرستی
ان مذکورہ بالا چاروں خصوصیتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

خدا پرستی کا جذبہ عالمی ہے

خدا پرستی بلکہ غیر مادی امور سے لگاؤ زمان اور مکان کے
حدود سے بالاتر ہے۔ قدیم تاریخ گواہی دیتی ہے کہ تمام اقوام و
ملل خواہ مہذب اور متمدن ہوں اور خواہ غیر مہذب اور غیر متمدن
سب کے سب خدا کے وجود کا عقیدہ رکھتے اور یہ مانتے رہے ہیں کہ
اس عالم کا کوئی خالق ضرور ہے۔ آثار قدیمہ کی کھوج کرنے کے سلسلے
میں گذشتہ قوموں کے سوچنے کا طرز اور رہنے سہنے کا ڈھنگ، ان
کے تہذیب وتمدن کا درجہ معلوم کرنے کے لیے جو کھدائیاں کی گئی ہیں
ان میں بڑے بڑے اونچے ٹیلوں کے نیچے بتکدے نکلے، عبادتگاہیں
نظر آئی ہیں۔ ان آثار سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم ترین قومیں ان
مقامات کے اوپر بتوں کو معبود مان کر پوجا کرتی تھیں۔ یا انھیں
اپنے معبودوں کے حسین وجمیل اوصاف کا مظہر سمجھتی تھیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وجود خدا کا اعتقاد انسان کے ساتھ
ساتھ پیدا ہوا ہے۔ شاید انسان اور حیوان کے درمیان امتیاز
کا نشان یہی اعتقاد ہے۔

آج بھی متمدن قوموں کے درمیان مذہبی احساس ایک
فطری احساس کے رنگ میں نظر آتا ہے وہ دنیا کے ہر ہر گوشے
میں دکھائی دے رہا ہے۔ آج بھی کرۂ زمین کے بہت بڑے علاقے
پر شاندار مسجدیں، گرجے، گردوارے اور مندر پھیلے ہوئے
ہیں۔ آج بھی اللہ اکبر کی آواز مختلف اوقات میں مسجدوں،
صدائے ناقوس کلیسا کی فضاؤں سے کانوں میں آرہی ہے

انسان کے تمام باطنی احساسات کی طرح کسی بیرونی تعلیم اور راہنمائی کے بغیر خدا کی تلاش کا جذبہ خود بخود انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ اپنی عمر کے مخصوص حصّہ میں مال و دولت، اقتدار و منصب، عزت و احترام، حسن و جمال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان کی طرف خود بخود توجہ ہوتی ہے، نہ کوئی شخص تعلیم دیتا اور نہ کوئی راہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح خدا کی جستجو کا جذبہ انسان میں از خود نمایاں ہوتا ہے۔

خدا اور مذہب کی طرف بغیر تعلیم اور راہنمائی کے قلبِ انسانی کا متوجہ ہو جانا اس کی دلیل ہے کہ تلاشِ خدا کا جذبہ فطری ہے۔ یہ احساس اس کے دوسرے باطنی احساسات کے مانند اچانک مخصوص حالات اور شرائط کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے لیکن یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ اگر اس احساس کی صحیح طور سے دیکھ بھال نہ کی جائے تو بہت سے نامعقول انحرافات پیدا ہو سکتے ہیں

اگر یہ مذہبی احساس انبیاء و مرسلین، علماء اور فلاسفہ کی نگرانی میں پلے پھولے تو اس میں کبھی کسی قسم کا انحراف نہیں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان کی نگرانی سے محروم رہے تو انسان کو بت پرست بنا دیتا، اس کے سر کو مخلوقات کے سامنے جھکا دیتا ہے۔ انسان خالق کے بجائے مخلوق کو پوجنے لگتا ہے۔

ہم نے یہ جو کہا کہ فطری اور طبعی احساس کو کسی معلم کی راہنمائی اور تعلیم کی ضرورت نہیں ہے تو اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ وہ خود پیدا ہوتے ہیں، کسی معلم اور راہنما کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن ان احساسات سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانا، ہر طرح کی کجروی سے بچاتے ہوئے انھیں عملی جامہ پہنانا بغیر با بصیرت مربیوں کے ممکن نہیں ہے۔ حقیقتاً تمام زمینی اور آسمانی موجودات کی پرستش کا سرچشمہ یہی فطری دینی احساس ہے مگر ایسا احساسِ مذہبی جو کسی مادی سبب کی پیداوار نہیں ہے۔

یہ جو ہمیں نظر آتا ہے کہ احساس دینی کرۂ ارض کے تمام حصوں میں موجود رہا ہے اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فطرت کی آواز ہے۔ اس کا محرک فطرت کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دینی احساس جغرافیائی حالات یا کسی دوسرے سبب کا اگر نتیجہ ہوتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ اسے بس اسی سرزمین اور اسی طرح کے لوگوں کے درمیان پایا جانا چاہیے تھا جن کے اقتصادی، سیاسی اور جغرافیائی حالات یکساں تھے، حالاں کہ ہمیں بالکل اس کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ رہنا ضروری ہے کہ کسی احساس کے فطری ہونے کا یہ نتیجہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ جلوہ گر رہے۔ ہر قسم کے ماحول میں افراد انسانی اس کی جانب متوجہ رہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ مال و دولت، عزت و منصب، شہرت و محبوبیت، زندگی کی شر بھری سرگرمیاں اس کی نگاہوں کو بہت سے اخلاقی فضائل اور فطری امور کی طرف موڑ دیں۔ فطری امور صرف خدا کے جذبۂ تلاش میں محدود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انسان بہت سے ذاتی اور طبعی میلانات رکھتا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کسی خاص فطری تقاضے کی طرف انسان کا پورے طور پر متوجہ ہو جانا دوسرے فطری امور سے اسے روگرداں بنا دیتا ہے۔

آپ ملاحظہ فرمائیے کہ کائناتِ عالم کے اسرار و رموز کی کھوج ان باتوں میں سے ہے جو انسان کی فطرت میں راسخ ہیں، ہر شخص گوناگوں چیزوں کی بابت علمی تحقیق کو پسند کرتا ہے، لیکن یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ یہ باطنی شعور ہر جگہ، ہر ماحول میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اس کی کارفرمائی تمام حالات میں یکساں نہیں ہے یہ جذبۂ تحقیق علمی ماحول، سازگار حالات، مناسب مرکز، ہم خیال دوستوں کے درمیان خوب پھلتا پھولتا ہے، لیکن ناسازگار فضا میں اسی طرح آنکھیں موند کر سو جاتا ہے کہ گویا ایسی ہی فضا

طویل عرصہ تک باقی رہے تو خود اس [illegible] کا وجود خطرے میں
پڑجائے گا۔

یوں ہی کون انکار کرسکتا ہے کہ شادی بیاہ سے انسان
کا تعلقِ خاطر، جاہ و منصب حاصل کرنے سے اس کی محبت فطری
اور طبعی ہے، لیکن ان احساسات میں یہ کس بل نہیں ہے کہ
سازگار اور ناسازگار تمام حالات میں جلوہ آرا رہیں۔ کبھی
ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی ایک فطری جذبہ خوب سیر ہوتا رہتا
ہے تو انسان مگن رہتا اور بقیہ فطری تشنگیوں کو بھول
جاتا ہے۔

تلاشِ خدا کا احساس دوسرے احساسات سے نرالا
نہیں ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ مادہ پرستی، مادی سرگرمیوں،
دنیوی لذتوں میں غیرمعمولی انہماک انسان کو بہت سے ایسے امور
سے غافل بنادے جن کا اس کی فطرت سے لگاؤ ہے۔ انسان کبھی
ایسا بھوکا، ایسا پیاسا، جنسی خواہشوں میں ایسا اندھا ہوجاتا
ہے کہ اسے خود اپنی خبر نہیں ہوتی۔ یہ خود فراموشی کی کیفیت رہتی
ہے، یہاں تک کہ وہ اسباب برطرف ہوں جنھوں نے اس کی فطرت
کے اوپر پردۂ فراموشی ڈال دیا تھا۔ جب غفلت کے پردے ہٹتے
ہیں تو انسان اپنے آپے میں آتا ہے اور اس کی فطرت کا چہرہ
پھر دمکنے لگتا ہے۔

خدا کی ذات کی طرف توجہ، اصول اخلاقی پر عمل کرنے کا
تعلق معنوی امور سے ہے۔ اس کا نقطۂ مقابل ہے انسان کا
نفسانی میلانات میں غرق ہوجانا۔ ظاہر ہے کہ اگر نفسانی میلانات
کا پلّہ اتنا بھاری ہو، اتنا بھاری ہو کہ انسان کی روح کے تمام
اطراف وجوانب پر چھاجائے تو پھر دوسرے معنوی میلانات کے
بارآور ہونے کا موقع نہیں ہے۔

مصائب وآلام اس لحاظ سے عظیم نعمت ہیں کہ وہ غفلت زدہ
انسان کو جھنجھوڑ کر مادیت کی گہری نیند سے چونکا دیتے ہیں۔ وہ
صفحۂ دل سے ہر قسم کے زنگ کو دور کردیتے ہیں۔ وہ فطرت کو
جلوہ گری کا موقع دے دیتے انسان کے دل و دماغ کو مادیت
کی اندھیری فضاؤں سے نکال کر خدا کی طرف متوجہ کردیتے ہیں
اسی لیے غفلت زدہ انسان مصائب و شدائد کے مواقع پر خلوص
کے ساتھ خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ صرف مصائب و شدائد میں مبتلا
ہونے کے موقع پر خدا کو یاد کرتے ہیں، لیکن ان کے مقابلے
میں ایسے پارسا اشخاص بھی ہیں جن کے احساس مذہبی کے ظاہر
ہونے کا کوئی وقت معیّن نہیں ہے۔ گویا ان کے قلوب کی اہم
رگیں عالم ابدیت سے بندھی ہوئی ہیں جن لوگوں کے مذہبی احساسات
گوناگوں اسباب کی بنا پر کمزور ہوچکے ہیں اس مطلب کا ان کے
ذہن نشیں ہونا مشکل ہے۔

وہ شخص کہ جو خدا سے غافل ہے اور مادی لذتوں میں غوطہ
لگا رہا ہے، اس کھلاڑی لڑکے کے مانند ہے کہ جو ہمہ تن کھیل کود
میں مشغول ہے۔ وہ اپنے شفیق اور مہربان ماں اور باپ کی
طرف سے بے اعتنائی برتتا ہے جن کا جلوہ اس کے وجود کے ایک
ایک گوشے میں جھلک رہا ہے، لیکن جوں ہی وہ کسی سختی
سے دوچار ہوتا فوراً انھیں یاد کرتا اور ان سے امداد
چاہتا ہے۔

انسان جب سکون و اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگتا
ہے تو اس کی دنیوی سرگرمیاں اسے عالمِ ابدی کی طرف متوجہ
ہونے سے باز رکھتی ہیں، لیکن جوں ہی وہ کسی ایسے حادثہ سے
دوچار ہوتا ہے جو اس کی زندگی کو درہم وبرہم کردینے کی
طاقت رکھتا ہے، جس کے مقابلے میں وہ اپنے کو عاجز اور ناتواں
پاتا ہے تو اس موقع پر فوراً اس کی روح میں اس کے دل

دماغ میں ردّعمل کی ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ایک برتر عالم، ایک عظیم طاقت کی تلاش میں منہمک ہوجاتا ہے۔ جب مصائب و آلام ہر طرف سے ہجوم کرتے ہیں، جب سمندر میں طوفان آتا ہے، جب ہوائی جہاز کے گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے جب صحت اور تندرستی سے انسان بالکل مایوس ہوجاتا ہے تو ایسے اوقات میں تمام لوگ خواہ خدا کے وجود کے قائل ہوں اور خواہ اسے نہ مانتے ہوں یکزبان ہوکر اس کو یاد کرنے لگتے ہیں، اس سے امداد اور اعانت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ گویا مصائب و آلام ایسا سوہان ہیں جو دلوں کے زنگ کو دور کردیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جب درد دکھ قلوب کو اچھی طرح صیقل دے دیتا ہے تو ان میں یادِ خدا کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

پروپیگنڈہ اس کو نہیں مٹا سکتا۔

دنیا کے اقوام و ملل کے درمیان ایسے لوگ مل سکتے ہیں، جنھوں نے بڑی بڑی پُرمشقت ریاضتیں کرکے کسی فطری تقاضے کو پھلنے پھولنے سے روک دیا، مثلاً ہر شخص میں جنسی میلانات ایک باطنی اور فطری پکار کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن عیسائی تارک الدنیا اور ہمارے ہندوستان کے جوگی بڑی بڑی سختیاں جھیلنے کے بعد اس جنسی میلان کو اتنا کمزور بنادیتے ہیں کہ وہ بہت کم جنسی مسائل کے متعلق سوچتے ہیں، لیکن ان ہی اشخاص کا سابقہ اگر دوسرے قسم کے ماحول سے ہوتا تو جنسی احساسات ان میں دوبارہ ابھر آتے ہیں۔

کسی بات کے فطری ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام حالات میں وہ نمایاں رہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فطرت کی ہلکی اور سریلی آوازیں اسی وقت محسوس ہوتی ہیں جب کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

بے شک ہمارا دعویٰ ہے کہ مذہبی احساس اور تلاش خدا کا جذبہ فطری اور باطنی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسے کوئی چیز کمزور یا طاقتور نہیں بنا سکتی، مثلاً اس کے خلاف جتنا چاہے پروپیگنڈہ ہوتا رہے، لیکن وہ اپنی شدّت اور طاقت پر باقی رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے احساسات کی طرح اس احساس کا نمایاں ہونا بھی سازگار ماحول چاہتا ہے۔

یقیناً بہت سی اندرونی اور فطری آوازوں کو مخالف پروپیگنڈہ ہلکا اور مدھم بنا دیتا ہے، لیکن وہ انھیں سرے سے نیست و نابود نہیں کرسکتا۔ آج جب کہ دنیا کے ایک تہائی حصّہ پر کمیونزم کے افکار اور خیالات حکومت کررہے ہیں، مادّہ پرست راہنما پوری کوشش کررہے ہیں کہ جو قومیں اشتراکی سامراج کے شکنجے میں گرفتار ہوگئی ہیں، ان کے دلوں سے مذہبی احساسات کو بالکل کھرچ کر مٹادیں، لیکن وہ اب تک اپنی کوششوں میں بہت کم کامیاب ہوئے ہیں، ابھی تک لوگوں کے دلوں کو خدا کے تصوّر سے خالی نہیں کیا جاسکا ہے۔

آج کافی مدّت گزر چکی ہے کہ روس میں تخت حکومت کمیونزم کے قدموں کے نیچے ہے، لیکن اس کے باوجود اب بھی وہاں کے بہت سے لوگوں کے دلوں میں احساس دینی، مذہب دوستی اور روحانیات کی طرف توجہ پوری شدّت کے ساتھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہاں کے اربابِ بست وکشاد نے مجبور ہوکر مسلمانوں اور عیسائیوں کو کچھ نہ کچھ آزادی دے دی ہے کہ وہ مخصوص شرائط کے ساتھ اپنے مذہبی رسم کو ادا کرسکتے ہیں۔

(اقتباس از کتاب "آفریدگار جہان")

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون
۶۰۹
۱۹۹

شبیر احمد غوری

الجبرا کا آغاز

اعتذار: یہ کوئی تحقیقی مقالہ نہیں ہے کیوں کہ اس باب میں راقم السطور کو اپنی نارسائی کا پورا پورا احساس ہے۔ اربابِ تحقیق کے لیے یہ صرف ایک لمحۂ فکریہ ہے جن کی نظر سے علم الجبر والمقابلہ کے آغاز وارتقا کے سلسلہ میں مختلف مکاتبِ فکر کے مواقف گزرے ہوں گے۔ ان کے عظیم المرتبت اور فخیم الشان علم برداروں کے مقابلے میں ایک "پسماندہ قوم" کے استحقاق اولیت کی بات یقیناً

ایک بات لگرسی بزبان دکنی

معلوم ہوگی۔ پھر بھی یہ ایک نظریہ ہے اور "مالہ" کے ساتھ "ماعلیہ" کی کمزوری ہر نظریہ کا ازلی مقدر ہے۔ لہٰذا اگر اس نظریہ میں بھی جھول ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔ البتہ اس بات کا فیصلہ ماہرینِ فن کو ضرور کرنا ہے کہ یہ جھول کہاں تک قابلِ اصلاح ہیں یا بالکل ہی ناقابلِ اصلاح۔

اشتقاق: "الجبرا" عربی اصطلاح "الجبر والمقابلہ" کی ترخیم کی انگریزی شکل ہے۔ اس کی منطقی تعریف اور توضیح غیر ضروری ہے، کیونکہ اس کا مصداق ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہے۔ ویسے اس کے دائرہ اطلاق میں "مساواتوں" کے علاوہ اور بھی مباحث آتے ہیں۔ جیسے "مسئلہ ثنائی" "لوگارثمی مسئلہ" "اجتماع وترتیب" "تفریقی کسور" حتیٰ کہ نظریہ اعداد" بھی جو اپنے یونانی بانیوں کے یہاں علم الحساب یا "ارثماطیقی" کے مترادف تھا۔

مگر جب اس علم کے آغاز وارتقا پر گفتگو کی جاتی ہے تو اصولاً "مساواتوں" کے حل ہی سے بحث کی ابتدا ہوتی ہے۔

قدامت: اس قسم کے مسائل جنھیں ہم آج الجبرائی مساواتوں کے ذریعہ حل کرتے ہیں، اُن کی سادہ ابتدائی شکلیں اقوام قدیمہ کے یہاں بھی مل جاتی ہیں، چنانچہ مصرِ قدیم کے جو حصیری مخطوطات ملے ہیں، ان میں اس قسم کی مساواتیں مذکور ہیں۔ یونانیوں کے یہاں ان کا کچھ زیادہ منظم بیان ملتا ہے، بالخصوص ذیوفنطس کے یہاں۔ ہندوؤں کے یہاں بھی ایسی چیزیں ملتی ہیں لیکن کیوں کہ ایک دوسرے سے دور دراز فاصلوں پر بسنے والی قوموں کے درمیان واضح اور متعین علمی روابط نہیں ملتے، اس لیے یہ خیال حقیقت سے زیادہ بعید نہ ہوگا کہ ہر قوم اپنی تفکیری زندگی کی کسی نہ کسی منزل میں اس قسم کے حسابی مسائل کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کیا کرتی ہے۔

الجبر والمقابلہ کی ابتدا: شاید اسی قسم کی حسابی سرگرمیوں کے نتیجہ میں عربوں میں بھی ایک نئی "ورزشِ ذہنی" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت (۶۳۴ - ۶۴۴ء) ہی سے شروع ہوگئی تھی، جس کا محرک ان کا یہ ارشادِ گرامی تھا کہ

"اِذَا تحدثوا فتحدثوا بالفرائض"

(جب آپس میں گفتگو کیا کرو تو "فرائض" یعنی وراثت کے پیچیدہ مسائل کے بارے میں گفتگو کیا کرو)

پھر جب فقہائے کرام کی سرگرمیاں واقعی مسائلِ حیات سے زیادہ مفروضہ فقہی مسائل تک ممتد ہوئیں، تو پھر وراثت اور وصیت سے متعلق مسائل بھی اس تفکیری کاوش کا موضوع بن گئے۔ اس طرح ایک نئے علم کی ایجاد وترقی کے لیے ضروری مواد جمع ہونے لگا جیسے وہ "مساواتیں" (یا "معادلات") بنا کر حل کرتے تھے۔

وجہ تسمیہ: اس حل کے لیے وہ "مساوات" کے دونوں پلڑوں (طرفوں) کو آپس میں برابر رکھنے کے لیے کبھی ایک پلڑے میں کچھ اضافہ کرتے تھے اور کبھی دوسرے میں سے کچھ منہا کر دیتے تھے۔ ان دونوں عملوں کو وہ بالترتیب "جبر" اور "مقابلہ" کہتے تھے۔ اس طرح غیر شعوری طور پر ایک نئے علم کی داغ بیل پڑ رہی تھی، جو ان دونوں "عملوں" کی وجہ سے "علم الجبر والمقابلہ" کہلایا۔ یہی فن عہدِ حاضر میں "الجبرا"

کہ ۱۱

کا واضع و بانی:- تاریخ نے اس سوال کا جواب محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی کہ مسلمانوں میں اس فن کا بانی کون ہے۔ البتہ اتنا یقینی ہے کہ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی اس فن کا "بانی نہیں ہے" بلکہ وہ اس موضوع پر لکھنے والا پہلا مصنف بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے ایک ہم عصر (غالبًا متقدم ہم عصر) سند بن علی کی تصانیف میں مشہور ماہر کتابیات ابن ندیم اس موضوع پر ایک کتاب کا نام لیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں ہی (الخوارزمی اور سند بن علی) کسی پہلے سے چلی آرہی علمی تحریک کے خوشہ چیں تھے۔ خود جو کچھ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے اپنی "کتاب الجبر والمقابلہ" کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"قد شجعنی ما فضل اللہ بہ الامام المامون امیر المومنین مع الخلافۃ علیٰ ان الفت من حساب الجبر والمقابلہ کتابًا مختصرًا حاصرًا للطیف الحساب وجلیلہ لما یلزم الناس من الحاجۃ الیہ فی مواریثہم ووصایاھم ....

اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین المامون کو مرتبۂ خلافت کے ساتھ (جس علم و فضل نوازی کی نعمت سے) نوازا ہے، اس کی بنا پر انھوں نے میری تشجیع و ہمت افزائی کی کہ میں "حساب الجبر والمقابلہ" کے موضوع پر ایک مختصر کتاب تصنیف کروں جو فن حساب کے دقیق و لطیف اور واضح اور جلی جملہ مسائل پر حاوی ہو، جو وراثت و وصیت کے سلسلہ میں عوام کو پیش آتے ہیں۔

بالفاظ دیگر الخوارزمی کے زمانہ میں "الجبر والمقابلہ" ایک مشہور علم تھا۔ اس علم کی کتابیں بھی موجود تھیں، مگر یا تو وہ بہت زیادہ ضخیم تھیں یا جملہ مسائل پر حاوی نہیں تھیں۔ لہذا المامون کی فرمائش پر الخوارزمی نے ان کوتاہیوں کی تلافی کی ضخیم کتابوں کے مقابلوں میں ایک مختصر کتاب لکھی اور ناقص مواد کے مقابلہ میں اپنی تصنیف میں تمام ضروری مواد ودیعت کر دیا۔

زمی کا ماخذ: اس تفصیل سے اور خود الخوارزمی کی تصریح سے یہ بات واضح ہے کہ الخوارزمی اس باب میں صرف اپنے مسلمان متقدمین کا خوشہ چیں تھا۔ مگر مستشرقین جو مسلمانوں کو کسی بھی ایجاد یا دریافت کا شرف بخشنا نہیں چاہتے، الخوارزمی کو کبھی ہندوؤں کا اور کبھی یونانیوں کا خوشہ چیں بتاتے ہیں۔ لیکن جب ان مفروضوں کو تحقیق کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو پورے نہیں اترتے۔ لہذا جب تک الخوارزمی کا اور کوئی دوسرا ماخذ متحقق نہیں ہو جاتا، الجبرا کے اسلامی الاصل ہونے کے مفروضہ کو علمی دنیا میں اس کے جائز مقام پر فائز رہنا چاہیے۔ ★

(بقیہ ص ۲۰ سے آگے)

وئی کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، چغلی کھاتا ہے کسی کی غیبت
اہے اس کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کا جھوٹ پکڑا جائیگا
ں کو وہ چغلی یا غیبت کا نشانہ بنا رہا ہے اس نے پلٹ کے
کیا تو کیا ہوگا وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر یہ بیہودہ حرکتیں
اہے مگر ہر لحظہ خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ خوف سے نظامِ ہضم
اثر ہوتا ہے اور نتیجہ یہ کہ یہ عیوب اس کی خرابی صحت کے
ہدار بن جاتے ہیں۔

صحت کی بہتری کے لیے جس طرح اچھی غذا ضروری ہے
ی طرح پاکیزہ خیالات اور سوچنے کا اچھا انداز بھی ضروری
یا۔ ★

(بقیہ ص ۲۱ سے آگے)

بھی کم ہوگا۔

جو کام حکومت کے کرنے کا ہے وہ حکومت کرے گی لیکن آپ وہ کام تو کیجیے جو آپ کے کرنے کا ہے یعنی ہٹے کٹے بھکاریوں پر ترس کھانا اور بھیک دینا چھوڑ دیجیے۔

ہمارے گھروں میں دستور ہو گیا ہے کہ گداگر کو دھتکارنا تو کیا معنی اسے خالی ہاتھ لوٹانا بھی معیوب سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بہت عمدہ دستور ہے۔ اس سے رحم دلی، انسانیت اور فیاضی کا اظہار ہوتا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اسی سے گداگری کو فروغ ہو رہا ہے۔ اگر اس سماجی عیب کو دور کرنا ہے تو اس عادت کو بدلنا ہوگا۔ ممکن ہے ہمارے بزرگوں کو یہ بات پسند نہ آئے اور ہو سکتا ہے اس سے خود ہمارے دلوں کو ٹھیس لگے مگر اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی تو نہیں۔ ★

ڈاکٹر اطہر پرویز

صنعتی ترقی اور گرانی

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان نے صنعتی اور زراعتی میدانوں میں غیر معمولی ترقی کی ہے جہاں تک صنعت کا تعلق ہے اب دنیا کے ملکوں میں ہندوستان کا نمبر نواں ہے۔ زراعت میں بھی ہماری پیداوار اتنی بڑھ گئی ہے کہ اجناس کے معاملے میں ہم بڑی حد تک خود کفیل ہو گئے ہیں۔ اور یہ معمولی بات نہیں۔

لیکن اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے کہ ہماری اشیاء کی قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے جس نے ہمارے امیر طبقہ کو امیر تر اور غریب طبقے کو غریب تر کر دیا ہے۔ چوں کہ امیروں کی تعداد محدود ہے اور غریبوں کی تعداد لامحدود۔ اس لیے خوش حالی کم اور افلاس زیادہ نظر آتا ہے۔ قیمتوں کے بڑھنے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں گیہوں کی قیمت ایک روپیہ میں آٹھ سیر تھی اور اب دو روپیہ میں ایک کلو ملتا ہے۔ گویا یہ قیمت ۱۶ گنا ہے۔ کیا اس زمانے میں جس آدمی کی آمدنی سو روپیہ تھی، اب سولہ سو روپیہ ہو گئی ہے۔

یہ تو رہی غلے کی بات — اور اشیا کا حال اس سے بھی زیادہ خراب ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے اچھے سے اچھا اونی کپڑا تین روپیہ گز ملتا تھا، آج اس کی قیمت دو سو روپیہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے قیمتوں کا تعین پیداواری قیمت کے لحاظ سے ہوتا تھا اور اب ہمارے صنعت کار آنکھ بند کر کے جو دام مناسب سمجھتے ہیں رکھ دیتے ہیں۔ چوں کہ ہندوستان میں جب کوئی چیز کارخانوں میں بننے لگتی ہے تو اس کا فوری تحفظ صنعت کار اس طرح سے کر لیتا ہے کہ وہ حکومت سے اس کی درآمد پر پابندی لگواتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ اس کی فروخت پر 'کیو' لگ جاتے ہیں۔ وہ پیداوار کو کم کر کے اس کی مانگ کو بڑھا دیتا ہے اور پھر چور بازار جنم لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ برابر اس کی "کوالٹی" تو خراب تر ہوتی رہتی ہے۔ پھر عام آدمی غیر ملکی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔

جب کبھی گرانی کی بات کہی جاتی ہے تو مفاد پرست فوراً غیر ملکی بازار کا حوالہ دیتے ہیں کہ یہی قیمت تو وہاں بھی ہے۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں مزدوروں کی اجرت ہمارے یہاں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کے لوگوں کی آمدنی بھی ہم سے بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر بریف کیس کو لیجیے کیا اس چھوٹے سے بریف کیس پر اتنا خرچ آتا ہے کہ اس کی قیمت ڈھائی سو اور تین سو روپیہ ہو۔ ان کے غیر معمولی منافع کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ یہ فرمیں کرکٹ ٹسٹ کے دوران لاکھوں روپے کے انعامات کا اعلان کرتی ہیں۔ اور ان کے اشتہارات پر اتنا ہی خرچ ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ دراصل وہ اپنے منافع پر غیر معمولی انکم ٹیکس کی بچت کرتے ہیں۔ ابھی حکومت یہ اعلان کر دے کہ ان پر انکم ٹیکس کی رعایت نہ دی جائے گی پھر دیکھیے ان میں کتنے کھیل اور کھلاڑیوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ دراصل یہ عام لوگوں کی جیبوں سے بڑی رقم نکال کر ان میں سے بہت معمولی رقم خرچ کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ حکومت بھی اس طرف توجہ نہیں دے رہی ہے کہ وہ قیمتوں کے تعین پر نظر رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ جو ٹیلی وژن انگلستان میں چار ہزار روپیہ میں فروخت ہوتا ہے وہ ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ ڈھائی ہزار روپیہ میں مل سکتا ہے۔ کیوں کہ ہماری مزدوری سستی اور کوالٹی ان کے مقابلے میں پست ہوتی ہے۔

گرانی کا بوجھ خوش حال طبقہ بہر حال برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن یہ عام آدمی کی کمر توڑنے کے لیے کافی ہے۔

اگر ہمارے یہاں قیمتوں پر قابو پا لیا جائے تو سارا ملک خوشحالی کے راستے پر چل سکتا ہے۔ ★

سید محمد محمود

خیالات کا اثر صحت پر

عہدِ حاضر کے ایک مفکر نے سچ کہا تھا "میں ہوں اس لیے کہ میں سوچتا ہوں"، گویا سوچنے کی طاقت ہی انسان کی اصل شناخت ہے اور زندگی میں قدم قدم پر اسی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جسمِ انسانی ایک عظیم الشان، بے حد پیچیدہ اور بہت پُراسرار مشین ہے ایسی مکمل کہ اس سے بہتر مشین صرف وہی بنا سکتا ہے جس نے یہ بنائی ہے اس کے تمام کل پرزے آپس میں گہرا ربط رکھتے ہیں اور ایک بے مثال کمپیوٹر ان پُرزوں پر حکمراں ہے جسے آپ انسانی دماغ کہہ لیجیے۔ مطلب یہ کہ پوری مشین میں اسے کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے سوچنے کا انداز ہمارے جسم اور ہماری صحت پر اتنا اثر انداز ہوتا ہے جتنی کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ حد یہ ہے کہ دوا بھی نہیں۔ کسی مریض کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ میرا بچنا ممکن نہیں تو واقعی اس کا جینا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف کوئی مریض یہ یقین کرلے کہ میں جلد صحت مند ہو جاؤں گا تو اس سے مریض کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ اسی کو نفسیات کی اصطلاح میں قوتِ ارادی کہتے ہیں اور معالجین اس کی اثر انگیزی کے قائل ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ پچپن ساٹھ برس کی عمر میں ایک شخص کی مشغولی عمر کا خاتمہ ہوا اور ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ عقل کہتی ہے کہ اب اس کا ذمہ داریوں سے پیچھا چھوٹا اور آرام میسر آیا تو صحت میں کچھ بہتری ہو گی۔ مگر ہوتا اس کے برعکس ہے اور وہ تیزی سے بڑھاپے کی طرف دوڑتا ہے ایسا کیوں ہے؟ یوں کہ بابا، بڑے میاں بزرگوار، دادا نانا کے خطابات تو اسے پہلے ہی مل چکے ہوتے ہیں اور یہ سبکدوشی بڑھاپے کی سند پر مُہر لگا دیتی ہے۔ اب دل سے اُمنگ رخصت ہو جاتی ہے وہ سوچتا ہے میں بوڑھا ہو گیا اور واقعی چار ہی دن میں وہ بہت بوڑھا ہو جاتا ہے۔

وہم اور سہم کا بھی آپس میں گہرا تعلق ہے جس پر وہم کا تسلط ہو گیا اس کی قوت ارادی اور قوتِ مدافعت دونوں بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جس کے دل میں یہ وہم بیٹھ جاتا ہے کہ میں بیمار ہوں، ڈاکٹر جھوٹ موٹ کی دوا دے کر تو اسے صحتیاب کر سکتا ہے لیکن کسی دلیل سے وہمی کو قائل نہیں کر سکتا کہ وہ بیمار نہیں صحت مند ہے۔ لالچی حکیم اور ڈاکٹر اس انسانی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے علاج کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اور زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کی غرض سے مریض کو یہ باور کراتے ہیں کہ ان کا مرض مہلک ہے۔ یہ طریق کار نہ صرف اخلاقاً مذمت کے قابل ہے بلکہ پیشے اور کاروبار کے اصول کے بھی خلاف ہے۔ مریض کی ذہنی کیفیت پر بُرا اثر ڈالنا نہایت معیوب ہے۔

انسانی خیال کی یہ قوت جو صحت انسانی پر بے حد اثر انداز ہوتی ہے، قدیم انسان کے بھی علم میں تھی۔ وہ دواؤں کے بغیر محض خیالات کو متاثر کر کے بیماری کے ازالے میں یقین رکھتا تھا اور کسی نہ کسی درجے میں کامیاب تھا۔ تعویذ گنڈے، جنتر، منتر، ٹونے ٹوٹکے اسی کام کے لیے ایجاد ہوئے تھے۔ ظاہر ہے ان میں کوئی شفا بخش قوت موجود نہیں لیکن ان پر اعتقاد صحت کو متاثر کر سکتا ہے۔ اعتقاد یا خیال کی اس قوت کو ماہرینِ نفسیات نے بھی تسلیم کیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ خیالات کی پاکیزگی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے تو آپ ضرور کہیں گے کہ ہم غلط مبحث کر رہے ہیں اور روحانیت کے میدان میں قدم رکھ رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ کیا آپ کو کبھی تجربہ نہیں ہوا کہ کوئی پریشانی کی خبر سنی اور معدے کا فعل خراب ہوا۔ کسی کاروباری نے بھاری نقصان کی بات سنی۔ اور وہ لوٹا لے کے بیت الخلا کو دوڑا۔ چنانچہ جو شخص

ڈاکٹر ریاض الحسن قاسمی

گداگری کا علاج

گرمیوں کی سہانی شام تھی، دور تک سناٹا تھا اور اس وقت ہماری عمر چودہ پندرہ برس سے آگے نہ بڑھی تھی۔ ہم تنہائی میں اکتائے اکتائے سے ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے کہ دور سے کوئی شخص آتا نظر آیا صورت سے بھکاری معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے لمبی دوپہروں کے اس موسم میں کئی داستانیں پڑھ لیں تھیں اور اصلی دُنیا سے زیادہ خیالی دُنیا میں کھوئے رہتے تھے۔ جب تک وہ بھکاری نزدیک آئے ہم نے اپنے ذہن میں بہت سے سوال ترتیب دے لیے تھے۔ تمھارے والد بڑے تاجر تھے یا کسی دور دیس کے بادشاہ تھے یا کسی بادشاہ کے وزیر تھے؟ وہ کونسا انقلاب تھا جس نے تمھیں پھولوں کی سیج سے اُٹھا کر کانٹوں بھری زمین پر لا پٹکا؟ تم کسی شہزادی کے عشق میں مبتلا ہوئے کہ گھر بار چھوٹا اور یہ حالت بنی۔ ہمیں یقین تھا کہ جب تک یہ سب کچھ نہ ہو کوئی نوجوان یوں دربدر نہیں ہوتا۔ ہم نے اس اُمید میں کہ اب الف لیلہ کی کوئی نئی کہانی وجود میں آتی ہے ایک کے بعد ایک سوال کیا اور ہر جواب پر ایک نئی مایوسی سے دوچار ہوئے۔ اس نے کہا فقیر کیوں ہو گئے یہ کیا بات ہوئی۔ فقیر یوں ہیں کہ باپ دادا کا یہی پیشہ تھا۔ پوچھا وہ کیوں بھیک مانگتے تھے جواب ملا اس لیے کہ ان کے بڑے یہی کرتے آئے تھے۔ اس کم عمری میں اس بات نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ یہ بھی ایک خاندانی پیشہ ہے جو ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس پیشے کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ سُنا ہے خاندان کے کسی لڑکے نے بغاوت کر دی تھی وہ کوڑھی ہو کر مرا۔ ایک اور لڑکے کا یہ انجام ہوا کہ دونوں آنکھوں کو رو بیٹھا اس لیے کتنی ہی بڑی دولت کیوں نہ ہاتھ آ جائے بھکاری بھیک مانگیں گے ضرور چاہے سال چھ مہینے میں ایک بار ہی مانگیں کیونکہ کوڑھی ہو کر مرنا کون چاہے گا۔ تب ہمیں ایک داستان کی وہ بھکارن یاد آئی جو کسی بادشاہ کی نظرِ عنایت سے ملکہ بن بیٹھی مگر بھیک مانگنے کی عادت نہ گئی۔ روز طاق میں روٹی کا ٹکڑا رکھ دیتی اور سامنے کھڑے ہو کر کہتی "آلا آلا دے نوالا"، پھر ٹکڑا اٹھا کر کھا لیتی۔

یہ ہمیں ہو کیا گیا کہ داستان لمبی کیے جا رہے ہیں۔ اصل بات پر نہیں آتے۔ دراصل بات یہ ہے کہ بھکاری اس لیے بھیک نہیں مانگتے کہ ان کو روٹی میسّر نہیں بلکہ یوں مانگتے ہیں کہ یہی ان کا آبائی پیشہ ہے۔ پڑوسی ملک چین میں کبھی یہ بھی آرٹ تھا۔ یہ کم بخت بھیک مانگنے اور منگوانے کے لیے بچّوں کو اندھا لنگڑا، لولا کر دیا کرتے تھے مگر آج تو چین کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ ہمارے ملک میں بھک منگی البتہ روز افزوں ہے۔
ان بھکاریوں کا دل نہیں بدلا جا سکتا۔ ان بیچاروں کو کوڑھی ہونے کا ڈر ہے۔ انھیں روٹی کپڑا بھی نہیں چاہیے۔ انھیں نقد پیسے چاہئیں افیون کھانے اور چانڈو پینے کو! ملک میں بہت سے بچے اس لیے اغوا ہوتے ہیں کہ مجرموں کے گروہ ان سے بھیک مانگنے کا دھندا کراتے ہیں۔

بھک منگی کی روک تھام ضروری ہے۔ اس کے لیے حکومت کو سخت قوانین بنانے ہوں گے اور بھیک مانگنے کو جرم قرار دینا ہوگا آپ کہیں گے کہ بے روزگاروں کے اس ملک میں یہ کیسے ممکن ہے تو سنیے بے روزگاری تعلیم یافتہ لوگوں میں عام ہے ورنہ آج نوکر اور مزدور کسی طرح ہاتھ نہیں آتے۔ اپاہجوں کے لیے اپاہج خانے ہونے چاہئیں جن کو یا تو فلاحی ادارے چلائیں یا پھر حکومت اس کی ذمہ داری لے اور یہ مشکل ہو تو اپاہجوں کو بھیک مانگنے کا لائسنس دیا جائے۔ ان کے علاوہ جو بھیک مانگتا نظر آئے اسے گرفتار کر کے سخت سزا دی جائے۔ اس سے بچوں کا اغوا

(بقیہ ص ۱۸ پر)

ڈاکٹر جمال آرا نظامی

مسلم خواتین اور تعلیم و ملازمت

تاریخ عالم گواہ ہے کہ دنیا عورت کے ساتھ کبھی انصاف نہ کر سکی۔ بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے یوں بھی ہوا کہ عصائے شاہی عورت کے ہاتھ میں آیا مگر اس کی تقدیر پلٹ جائے یہ کبھی نہ ہو سکا۔ دنیا جوں جوں مہذب ہوتی گئی بظاہر عورت کا احترام بھی بڑھتا گیا مگر سچ بات یہ ہے کہ مرد کے برابر رتبہ اُسے کبھی نہ حاصل ہوا۔ اس کے اسباب ہیں۔ خاص طور پر معاشی اسباب جن کے آگے اچھے اچھے حوصلے والوں نے گھٹنے ٹیک دیے وہ جس نے اصلاحِ قوم کا بیڑا اٹھایا، سوتوں کو جگایا مسلمانوں کے تنِ مردہ میں جان ڈالی وہ بھی سرسری طور پر یہ کہہ کے آگے بڑھ گیا کہ پہلے مرد تعلیم یافتہ ہو لیں پھر وہ اپنی عورتوں کو خود تعلیم دلا لیں گے۔ پھر وہ جو امت کا حکیم کہلایا عورتوں کی مظلومی کا دکھ تو اُسے بھی بہت ہوا مگر اس کے ناخن سے بھی یہ گرہ نہ کھل سکی صرف اظہار ہمدردی کر کے رہ گیا۔

> میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
> نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

ہم نے ہوش سنبھالا تو یہ دیکھا کہ اوّل تو قوم کو تعلیم کی طرف رغبت نہیں اور ہے تو صرف بیٹوں کو تعلیم دلانا چاہتے ہیں اور بیٹیوں کی تعلیم سے ان کے خیال میں وقت سے پہلے قیامت آ جانے کا اندیشہ ہے۔ ماں باپ کو تو اگلے وقتوں کے لوگ سمجھ کے چپ ہو جائیں مگر اس کو کیا کرنے کہ ہماری نسل کے بھائی بھی جو خود تو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند تھے مگر بہنوں کی تعلیم معمولی اُردو اور قرآن شریف تک محدود رکھنے کے حق میں تھے۔

> خود تو گٹ پٹ کے لیے جان دیے دیتے ہیں
> ہم کو تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

(اکبر الہ آبادی)

جانے کتنوں کی زبانی یہ سُنا کہ لڑکیاں ذرا پڑھ جائیں تو رقعہ بازی کرنے لگتی ہیں۔ ان بیچاروں کو کون سمجھائے کہ جو بُرا ہے وہ لکھنا نہ جانتا ہو تو نہ جانے لیکن اس کے چشم و ابرو کو اشاروں سے کون باز رکھ سکے گا۔ خیر صاحب ان کو جیتے دیکھا جو ہمیشہ سے جیتے آئے ہیں اور ان بچیوں کو جن کے گڑیاں کھیلنے کے دن تھے پردے میں بیٹھتے دیکھا کہ صاحب یہ تو خدا اور رسول کا حکم ہے حالانکہ قرآن میں چہرہ چھپانے کا کہیں حکم نہیں۔

ہم نے اس مسئلے پر بہت سوچا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ جو ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے۔ مرد کو خدا نے جسمانی طور پر طاقت ور بنایا ہے۔ اسی طاقت کے سبب روزی روٹی کا ذمّہ دار وہ ہے، کنبے کا رکھوالا وہ ہے۔ گویا یہی فطرت کا تقاضا اور یہی خدا کی مصلحت ہے اس نے ایک کو حاکم دوسرے کو محکوم بنایا ہے تو اس میں کسی کا کیا دوش؟ عورت کے لیے یہی مناسب ہے کہ تھوڑا سا پڑھ لے تاکہ شام کو شوہر کو دن بھر کا حساب دے دے، دھوبی کے کپڑے لکھ لے اور میکے والوں کو اپنی خیریت لکھ بھیجا کرے۔ اس کا فرض ہے کہ پہلے ماں باپ پھر ساس سسر کی خدمت کرے۔ شوہر کی خوشنودی حاصل کرے بچے پیدا کرے، انھیں پالے اور آخر کار اپنے معبودِ حقیقی کے حضور پہنچ کے دنیا کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔

وطن کے گھٹے گھٹے ماحول سے نکل کر یونیورسٹی کی کھلی فضا میں قدم رکھّا تو آنکھیں ذرا چندھیائیں (اور ابھی یہ آخری منزل تو نہیں کہ علی گڑھ سے آگے دہلی اور دہلی سے آگے بمبئی اور سمندر پار کر لو تو آنکھیں خیرہ کرنے کو لندن، پیرس اور نیویارک موجود ہیں) بہرحال اب خیالات نے پھر ایک کروٹ لی۔ پچھلی عمارت ڈھیتی نظر آئی اور اندازہ ہوا کہ جو سیلاب اُمڈا چلا آتا ہے وہ روکے رُک نہیں سکتا اور ضرورت اس کے روکنے کی نہیں اس کا خیر مقدم کرنے کی ہے۔ دیوار پر جلی حرفوں میں لکھی اس عبارت کو بغور پڑھ لینا

چاہیے کہ مستقبل قریب میں زندگی ایسی ہوجائے گی کہ اس کا
بوجھ ایک آدمی سے نہ اُٹھے گا۔ یہ بوجھ میاں اور بیوی دونوں کو مل
کر اُٹھانا ہوگا۔ ہم خود کو اس کے لیے آمادہ نہ کرسکے تو زمانہ ہم کو پامال
کرتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔

خان عبدالغفار خاں ہندوستان آئے تھے تو انھوں نے
بہت سی اہم باتیں کہی تھیں۔ مسلمانوں کے ایک جلسے کو خطاب کرتے
ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ تمھارے دوسرے ہم وطن بھائیوں کی
حالت تو ٹھیک ہے ان کی گاڑی تو دونوں پہیوں پر چل رہی ہے۔
مگر تمھاری سائیکل کے ایک پہیئے میں پنکچر ہے تم منزل تک کیسے
پہنچوگے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم تنگی سے گذر کر
لیں گے مگر اپنا راستہ تو نہ بدلیں گے۔ لیکن اس جذباتی جواب سے
مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ذرا تصور کیجیے کہ آپ کے ہمسائے میں کوئی
ایسا کنبہ آباد ہے جس میں مرد عورت دونوں برسرِ روزگار ہیں۔
آپ سے دوگنی آمدنی ہے رہن سہن اعلیٰ ہے بچوں کو آپ کے
بچوں سے بہتر غذا ملتی ہے اس لیے صحت قابلِ رشک ہے۔ ان
کی تعلیم کا بھی معقول بندوبست ہے۔ گھر میں آسائش کا ہر سامان موجود
ہے۔ آپ جب ان سے مقابلہ کریں گے تو یقیناً احساسِ کمتری میں مبتلا
ہوں گے۔ ممکن ہے آپ یہ سب سہ جائیں مگر ناسمجھ بچوں کو کون سمجھائیگا۔
یہ سب دیکھ کر اُن کی ذہنی نشوونما پر بُرا اثر پڑے گا اور وہ ساری زندگی
کے لیے پسماندہ اور دل برداشتہ ہوکر رہ جائیں گے۔

بات کو مختصر کرتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ عورتیں اگر ملازمت
کرنا اور مرد ملازمت کرانا گوارا کرلیں تو اس سے مالی حالت میں خوشگوار
تبدیلی رونما ہوسکتی ہے اور اب مسلمان عورتیں اس طرف توجہ کرنے بھی
لگی ہیں لیکن صورتِ حال پوری طرح خوش کن نہیں ہے۔ پرسشِ احوال
مستحسن ہے بشرطیکہ مقصد نیک ہو لیکن کسی کے حالات کی جستجو معیوب
لیکن مجبوراً ہم نے یہ بھی کیا اور افسوس ہے کہ اکثر ملازمت پیشہ خواتین
زندگی تلخ پائی۔ ایک تو ان پر کام کا بوجھ بہت ہوتا ہے۔ ہمارے مرد
اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں کہ جب وہ ملازمت سے لوٹیں تو پھر ان کو
ہاتھ پاؤں نہ ہلانا پڑیں۔ گھر کی دیکھ بھال بیوی کرے، باورچی خانہ وہ
سنبھالے، بچوں کی نگہداشت وہ کرے، سودا سلف وہ لائے، تعلیم یافتہ
ہے تو بچوں کا ہوم ورک وہ کرائے۔ ان سب میں کوئی بُرائی نہیں۔
لیکن جب بیوی ملازمت بھی کرتی ہو تو ایسے گھروں میں میاں
بیوی دونوں کو مل کر گھر کا بوجھ بٹانا چاہیے۔

آجکل وہ زمانہ ہے کہ جسے ترجیح کا نہیں بلکہ برابری کا دور کہا جاتا
ہے۔ ہماری مراد آجکل کے مرد عورت کی "ہم دوئی" سے ہے۔

عورتوں نے کچھ عرصے قبل پاکستان میں ایک نعرہ بلند کیا تھا۔
آزادیٔ نسواں کا اور اسی میں ایک ذیلی نعرہ "برابری" یعنی مساوات
تھا۔ مساوات بھائیوں میں ہو تو بھائی چارہ کہلاتی ہے اگر میاں
بیوی میں ہو تو میاں "بے چارہ" کہلاتا ہے۔

ایک اور بات جو سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے یہ ہے کہ جہاں بیوی
باہر نکلتی ہے اور مردوں کے ساتھ کام کرتی ہے تو اکثر شکی طرح
شوہر اس کے چال وچلن کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور
اس میں عجب عجب طرح کی رکیک حرکتیں کرتے ہیں۔ اس کی ڈاک کو
سنسر کرتے ہیں، اس کی نقل وحرکت پر نظر رکھتے ہیں کسی مرد سے
گفتگو کر رہی ہو تو چھپ چھپ کے باتیں سنتے ہیں اور یہ بھول جاتے
ہیں کہ عقلِ سلیم کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے تو کوئی جاتی
اسے گمراہی سے باز نہیں رکھ سکتی اور ملازمت کرنے نہ کرنے سے اس
میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گھر کا ماحول خوشگوار اور گھر کے حالات
سازگار رکھنے ہیں تو ان مردوں کو بدلنا ہوگا، بیوی پر بھروسہ
کرنا ہوگا تاکہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس آزادی سے عورتوں کی لگامیں
ڈھیلی کی گئیں تو وہ ان کے مقابل آکھڑی ہوتی ہیں اور اب معاملہ
اپنی انتہا پر پہونچ گیا ہے جہاں "تصادم" ناگزیر ہے۔ کچھ کا خیال
ہے کہ کوئی تنازعہ (CONFLICT) پیدا نہیں ہوتا صرف کہنے کی
باتیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب صلاحیتوں میں عورت مرد کی برابری
نہیں بلکہ اس سے کچھ آگے ہی نکل گئی ہے۔

اور اب ہمارا روئے سخن بچیوں کے والدین کی طرف ہے۔ یہ
بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ لڑکیوں کو تعلیم دلانا انتہا

ہی ضروری ہے جتنا لڑکوں کو وہ دن دور نہیں جب میاں بیوی
دونوں کو ملازمت کے بغیر گھر کی گاڑی کھینچنی محال ہوگی ۔ اگر آپ
عورتوں کی ملازمت کے خلاف ہیں تو بھی یہ سوچ کر کہ آنے والے زمانے
کا حال کسے معلوم ہے ۔ ان کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائیے یاد رکھیے مرد
عورت دونوں کو تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ رسولِ اکرم کا
ارشاد ہے طَلَبُ العلم فریضۃٌ علیٰ کل مُسلم و مُسلِمۃ ۔ یعنی
علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے ۔

امریکہ کے یہودی سربلند ہو کے جینے کا گُر جانتے ہیں ۔ عالمی
جنگ کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم کے لیے میدان منتخب کر لیے
تھے اور فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کن پیشوں کو ترجیح دیں گے ۔ نتیجہ خاطر
خواہ نکلا اور آج وہ سارے امریکہ اور اس کے وسیلے سے ساری
دنیا پر چھائے ہوئے ہیں ۔ ہمیں کم سے کم اپنی لڑکیوں کے مشاغل کا انتخاب
کر لینا چاہیے ۔ ہمارا خیال ہے کہ خواتین کے لیے مدرسی سب سے بہتر، محفوظ
اور باعزت پیشہ ہے کہ دقیانوسی خیال کا شوہر بھی بیوی کو کسی گرلز اسکول
یا کالج میں ملازمت کرنے سے نہ روکے گا پھر یہ کہ ملازمت نہ ملے تو ٹیوشن
پڑھائے جا سکتے ہیں، گھر میں چھوٹا سا اسکول کھولا جا سکتا ہے ۔ یہ بھی
نہ ہو تو اپنے بچوں کی تعلیم کی نگرانی تو بہ آسانی کی ہی جا سکتی ہے دوسرا
پیشہ ہے طبابت یہ پہلے سے بہتر ہے کہ اس میں خدمتِ خلق کا اور زیادہ
موقع ہے ۔ ملازمت کسرِ شان ہو تو مفت علاج کرو ۔ طبابت سے مراد
صرف یہ نہیں کہ ایم بی ۔ بی ۔ ایس ہی کرایا جائے ۔ کسی طبیہ کالج سے طبابت
کا کورس بھی کرایا جا سکتا ہے اور علی گڑھ اس کے لیے بہترین جگہ ہے ۔ اگر
کسی کو اچھی اردو آتی ہے تو اس کے لیے داخلے کا نادر موقع ہے ۔ اردو کے
علاوہ فارسی یا عربی میں سے ایک زبان آتی ہو یا پھر اس نے انٹرمیجیٹ
تک سائنس پڑھی ہو تو وہ داخلے کا مستحق ہے جن کو یہ تعلیم بھی دشوار
معلوم ہوتی ہے وہ ہومیوپیتھی کی طرف توجہ کریں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے
ایک تقریر میں کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان باوقار زندگی گذارنا
چاہیں تو خدمتِ خلق کی طرف توجہ کریں ۔ مدرسی اور طبابت دونوں پیشے
اسی ذیل میں آتے ہیں ۔ جو لڑکیاں ٹکنیکل ایجوکیشن سے رغبت رکھتی ہیں ان
کے لیے میکنیکل انجینئرنگ اور الیکٹریکل انجینئرنگ بہترین ہوں گے کہ ان سے
بھی گھر بیٹھے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ لڑکیاں تعلیم یافتہ اور خود کفیل ہوں گی اور
کسی کی دستِ نگر نہ ہوں گی تو انشاء اللہ باعزت زندگی گذار سکیں گی ۔
اور مرد کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑی ہو سکیں گی ۔

کہا جاتا ہے کہ زبانوں میں جو صنف سب سے پہلے وجود میں
آئی وہ شاعری تھی اگر یہ بات صحیح ہے تو شعر کہنے والی پہلی شخصیت
عورت ہی رہی ہوگی ۔ اس لیے کہ بچے کو لوریاں دینے کے لیے پہلی بار
الفاظ گیت بن کر ہونٹوں تک آتے ہوں گے ۔

اسی بات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی نے
پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز کا تعلق بھی دکن سے
بتایا ہے ۔ افسانوی ادب میں لاتعداد عورتوں نے قلم اٹھایا ہے ۔
اس کی ابتدائی فہرست میں اکبری بیگم، نذر سجاد حیدر، اور حجاب
امتیاز علی وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں ۔

سارے کنبہ اور خاندان کا مرکز عورت ہی ہے ۔ مرد کسی حد تک
گھر چلانے اور خاندان کو پالنے میں ہاتھ ضرور بٹاتا ہے لیکن عورت
وہ محور ہے جس کے اردگرد ساری گرہستی گھومتی ہے ۔ اگر کوئی کنبہ
خوشحال ہے اس کو سماجی اور اقتصادی ترقی حاصل ہے تو سمجھ
لیجیے کہ خاتونِ خانہ ہنرمند ہے ۔

علی گڑھ کی عظمت

اب علی گڑھ کی عظمت دوچند بلکہ صدچند بڑھ گئی ہے ۔ اس لیے کہ
اس میں ایک بدنصیب قوم کے دو بیش بہا لعل مدفون ہیں ۔ ایک ان میں سے
باپ ہے جس نے کسان کی طرح شب و روز محنت کی اور خون پسینہ ایک کر کے
اپنی قوت اور کندھے کے زور سے اپنی قوم کو پستی سے نکال کر دنیا میں
اُبھارا ۔ دوسرا بیٹا ہے جو آسمانِ لیاقت پر شہابِ ثاقب کی طرح چمک کر
زمین میں غائب ہو گیا ۔ یہاں سیاح اور مسافر دور دور سے آئیں گے
اور دو آنسو بہا جائیں گے ۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

ڈاکٹر انجمن آرا بیگم

مذہب اور سائنس

یہ خیال کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے حریف ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ اس خیال کا باعث ان دونوں کے بارے میں معلومات کی کمی، ان کے دائرہ عمل اور حدود کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ مذہب کو صرف ایک واہمہ یا کور یقینی سے تعبیر کرنا اور سائنس کو عقلِ محض قرار دینا درست نہیں۔ اس کائنات کا مطالعہ نہ صرف کور یقینی کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے اور نہ عقلِ محض اس کے سارے اسرار کی پردہ کشائی کر سکتی ہے۔ دونوں کا گہرا مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں نہ کہ حریف۔

مذہب کی بنیاد ایمان و یقین پر ہے جب کہ سائنس کی کسوٹی تجربہ اور عقل ہے۔ مذہب عرفانِ ذاتِ الٰہی کا نام ہے۔ اپنی ذات کی پہچان، دُنیا کی پہچان اور اقدارِ حیات کی اساس کا علم مذہب سے حاصل ہوتا ہے۔ علم، عقل اور تجربے کے ذریعے فطرت کے پوشیدہ خزانوں اور نامعلوم گوشوں تک رسائی اور ان کی نقاب کشائی کرنا سائنس کا کام ہے۔ مذہب یہ بتاتا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ اچھے اور بُرے، نیکی اور بدی کا معیار کیا ہے؟ خیر و شر کا پیمانہ کیا ہے؟ انسان کا خدا سے اور انسان کا انسان سے کیا رشتہ ہے؟ اس کے فرائض و حقوق کیا ہیں؟ ایک صالح، پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی گزارنے کے لیے کن اصولوں اور قاعدوں کو اپنانا چاہیے۔

سائنس اور مذہب کے عمل کے ان مختلف دائروں کے بعد ان کے ربطِ باہمی پر نظر ڈالیے جہاں وہ تکمیل و اکمال کا کام انجام دیتے ہیں۔ خالقِ دو جہاں نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اسے عقلِ سلیم عطا کر کے پوری کائنات میں اسے برتری کا شرف بخشا ہے۔ دنیا کی تمام نعمتیں اور خزانے اس کی ضروریات پوری کرنے، اس کے فائدے، راحت اور آرام کے لیے ہیں۔ چاند، سورج، آسمان زمین، بحر و بر اور حیوانات و جمادات غرض کہ یہ تمام عالم انسان کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ انسان خالق کی عطا کردہ عقل کی بدولت اس کائنات کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنی معلومات، شعور اور تجربے کی مدد اور بنیاد پر حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کرتا ہے جو حیاتِ انسانی کے قافلے کو مادی ترقی کے راستے پر آگے بڑھانے میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔

دنیا میں ساری چیزیں آیاتِ الٰہی ہیں۔ یہ نشانیاں جو وجودِ باری تعالیٰ کا واضح ثبوت ہیں، انسان کو غور و فکر اور تدبّر کی دعوت دیتی ہیں۔ سائنس کا عمل یہ ہے کہ کائنات میں بکھرے ہوئے بیش بہا پوشیدہ خزانوں کے بارے میں معلومات فراہم کر کے ان کے استعمال کے ایسے راستے نکالے کہ انسان ایک کامیاب مادّی زندگی گزارنے کی سہولتیں حاصل کر سکے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ہوا میں پرواز کر رہا ہے۔ سمندروں کے سینے چیرتا ہوا اپنی منزل پر پہنچ رہا ہے۔ گھر بیٹھے بیٹھے کروڑوں میل کے فاصلے پر گفتگو کرتا ہے۔ چاند کی دنیا میں اتر کر اپنی بلند پروازی کا ثبوت دیتا ہے۔ غرض اس کارخانۂ قدرت میں جو خام مواد موجود ہے اسے اپنے ہاتھوں سے بنا اور سنوار کر نہ صرف حسین و دلاویز بناتا ہے بلکہ کارآمد بھی۔ سائنس کا علم پروردگارِ عالم کی حیرت انگیز تخلیقات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے نہ کہ اس کے وجود سے منحرف ہونے کی۔ اس عالمِ ناپیدا کنار کی ہر تخلیق یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کو نظم و ضبط کے ساتھ چلانے والی کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو سب سے زیادہ طاقتور، عالم اور ہر ایک کی ضرورت پوری کرنے والی ہے

اس طرح سائنس مذہب کی معاون طاقت ہے نہ کہ مخالف اور مذہب سائنس کی تکمیل کرتا ہے نہ کہ اس کی تخریب۔

تہذیب الاخلاق کی رکنیت

شہرِ بنارس میں

قارئین کو یقیناً اندازہ ہوگا کہ تہذیب الاخلاق کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی تعدادِ اشاعت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ ملک کے دور دراز علاقوں میں اس کی تقریباً تین درجن ایجنسیاں قائم ہو چکی ہیں، خریداروں کی تعداد روز افزوں ہے۔ بعض مقامات پر سنجیدہ کتابوں اور رسالوں کے مطالعے اور ان پر گفتگو کے لیے علمی مجالس اور سوسائٹیاں قائم ہوئی ہیں لیکن رسالے کے بہی خواہوں اور سرپرستوں کے دلوں میں یہ خدشہ بہرحال باقی ہے کہ اور بہت سے اردو رسائل کی طرح کہیں اس کی عمر بھی مختصر نہ ہو۔ رسالے عام طور پر اس لیے بند ہو جاتے ہیں کہ ان کم اشاعت رسالوں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تہذیب الاخلاق کا معاملہ برعکس ہے۔ اس پر نہ کسی کی تنخواہ کا بوجھ ہے، نہ کسی مکان کے کرائے کا۔ اس کی آمدنی صرف کاغذ، کتابت، طباعت، بائنڈنگ اور ڈاک جیسی ضروری چیزوں پر ہی صرف ہوتی ہے بلکہ حد یہ ہے کہ جو اصحاب اس کی اشاعت میں اضافے کے لیے خط و کتابت کرتے ہیں وہ ڈاک کا خرچ خود ہی اٹھاتے ہیں، جو اس مقصد کے لیے سفر کرتے ہیں وہ اپنے مصارف خود برداشت کرتے ہیں، تاجر اور صنعت کار اشتہارات دے کر اس کے خسارے کو پورا کرنے کی طرف متوجہ ہیں۔ دو مہینے پہلے لائف ممبرشپ کی ایک اسکیم بنائی گئی تھی وہ بے حد کامیاب ہوئی ہے۔ شاید دو مہینے بعد ہم آپ کو یہ خوشخبری سنا سکیں گے کہ لائف ممبرشپ کا جو نشانہ مقرر کیا گیا تھا ہم اس سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہر شہر اور ہر قصبے میں تہذیب الاخلاق سے دلچسپی رکھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا ہو اور اس مقصد کے لیے مختلف علاقوں کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ بنارس وہ پہلا شہر ہے جہاں ممبر سازی کے لیے تہذیب الاخلاق کے مدیر اور

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد ۱۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کو تشریف لے گئے۔ مدیر مسئول نورالحسن نقوی اور کامرس فیکلٹی کے ایک استاد جناب سمیع الدین بھی ہمراہ تھے۔

بنارس وہ خوبصورت تاریخی شہر ہے کہ فارسی کے نامور شاعر علی حزیں یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کا مشہور شعر ہے:۔

از بنارس نہ روم معبدِ عام است ایں جا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است ایں جا

یہاں کی خاک پر اورنگ زیب کے قدموں کے نشان ثبت ہیں۔ غالب نے بنارس جاتے ہوئے یہاں قیام کیا لیکن یہاں جو بات خاص طور پر بیان کرنے کی ہے وہ یہ کہ اس شہر میں سرسید کا دس برس قیام رہا، ان کے عظیم الشان منصوبے یہیں تیار ہوئے، مسلمانوں کی تعلیم کے پروگرام یہیں بنے، ولایت کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کرنے کے لیے وہ اسی سرزمین سے روانہ ہوئے۔ انگلستان سے رسالہ تہذیب الاخلاق کا خواب لے کر لوٹے تو اس کے لیے بہت سے مضامین یہیں بیٹھ کر لکھے گئے۔ سائنٹی فک سوسائٹی کے لیے انھوں نے چندے کی مہم چلائی تو سب سے زیادہ چندہ بنارس کے اہلِ ہمت نے دیا۔

وائس چانسلر صاحب کی بنارس تشریف آوری کے اس موقع پر اراکینِ سرسید سوسائٹی نے جشنِ سرسید کا اہتمام کیا تھا ۱۸ دسمبر کی صبح "سرسید تحریک اور عصرِ حاضر میں اس کی معنویت" سے متعلق تقاریر و مقالات کے لیے مخصوص تھی جو مقالات پیش کیے گئے ان میں بیشتر نہایت فکر انگیز تھے۔ پروفیسر حکم چند نیر نے اپنے مقالے میں یہ واضح کیا تھا کہ اسلام ترقی کا مانع نہیں ممد و معاون ہے اور یہ کہ ہم اپنی نادانی سے اصل اسلام کو تو بھلا بیٹھے اور چند رسموں کو ہم نے اسلام سمجھ لیا۔ جناب اشتیاق حسن قریشی نے مسلمانوں کی حق تلفی کا گلہ کیا چودھری محمد عارف صاحب نے اسلامک سنیٹر کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرایا۔ مسٹر رستم ستین نے اہلِ حرفہ کی ترقی و خوشحالی کے

پیش تعدد تجاویز پیش کیں۔ اِس سمینار میں حاضرین کی تعداد ایک
ہزار کے قریب تھی جن کے لیے سرسید سوسائٹی کی طرف سے ظہرانہ کے
بندوبست کیا گیا تھا۔ اِس سمینار کو ہر لحاظ سے بے حد کامیاب
قرار دیا جاسکتا ہے، ڈاکٹر اقبال احمد، ڈاکٹر عبدالرحیم، جناب طاہر علی
ایڈوکیٹ، جناب رمضان علی ایڈوکیٹ اس جشن کے اہتمام میں
پیش پیش تھے۔

تین بجے سہ پہر جب وائس چانسلر صاحب نے جلسے کو خطاب
کیا تو ہال بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے دورانِ تقریر مسٹر سکسینہ کی یہ
بات دہرائی کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا ہے کہ اقلیت نے اکثریت
کے برابر محنت کرنے سے انکار کر دیا ہے یعنی ہندوستانی مسلمان
اپنے دیگر ہم وطنوں کے برابر محنت نہیں کر رہے اسی لیے وہ زندگی کے
ہر میدان میں اُن سے پیچھے ہیں۔ ہمیں اگر جینا ہے تو سخت محنت
کرنی ہوگی اور ایک بات یہ کہ اکثریت سے اپنے تعلقات خوشگوار
رکھنے ہوں گے۔

اہلِ حرفہ کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا یہ خیال گمراہ کن
ہے کہ جو لوگ صنعت و تجارت میں مشغول اور ہر طرح آسودہ حال
ہیں اُن کی اولاد کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ذہن میں
رکھنی چاہیے کہ تعلیم ہر کام کو سلیقے سے کرنا سکھاتی ہے۔ تعلیم حاصل
کرنے کے بعد آپ کے بچے صنعت و تجارت میں زیادہ کامیاب
ہوں گے۔ یہ نہ بھی ہو تو صرف کمانا اور پیٹ بھر لینا کافی نہیں
یہ کام چرند پرند بھی کر لیتے ہیں۔ انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے
والی چیزیں ہیں علم اور عقل۔ آخری بات یہ کہ خدا اور رسول کا
ارشاد ہے کہ علم حاصل کرو قرآن و حدیث میں علم کی فضیلت
کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ جو لوگ اپنی
اولاد کو کاروبار میں لگاتے ہیں اور اس طرح انھیں علم سے محروم رکھتے
ہیں اُن میں سے بیشتر دیندار ہیں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ
بتائیں کہ حساب کے دن ان سے جب اِس کوتاہی کے لیے بازپرس
ہوگی تو وہ کیا جواب دیں گے۔ دو گھنٹے کی یہ تقریر بڑی توجہ کے ساتھ
سنی گئی اور اندازہ ہے کہ اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔

بنارس میں جن حضرات نے تہذیب الاخلاق کی رکنیت قبول
فرمائی اُن کے نام یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

جناب محمد صالح صاحب (اناج کارپوریشن)
" خلیل احمد صاحب (صراف) اینگلو اورینٹل مسلم ہائر سکنڈری اسکول
" محمد ظفر صاحب میسرز سائیکس ٹریڈنگ کمپنی (دال منڈی)
" ظفر عباس صاحب میسرز گلاس اینڈ پلائی ووڈ سینٹر
" مسز سائرہ خاتون (کلکتہ مائیکا کمپنی)
" ڈاکٹر حمایت اللہ صاحب (کینٹونمنٹ) حافظ عبداللہ صاحب
جناب حاجی محمد نور صاحب (موتی باغ)
" انور جمال صاحب (زیر گو) پرنسپل گلستان انگلش اسکول
" آغا جمیل احمد صاحب (ناریل بازار) " نورالحسن صاحب
" محمد خالد صاحب (نوادا اکسپورٹ) (زیر گولر)
" سلیمان آصف صاحب (نخاش) حاجی محمد طاہر صاحب
" شمیم احمد صاحب (سرائے ہراخاں) (اشفاق نگر)
" حاجی عبدالقدوس صاحب (بازار سدانند)
" محمد انعام صاحب (برنایل) حاجی عبدالقیوم صاحب
" حاجی انیس الرحمٰن صاحب (بنارس سلک کمپنی) (مالتی باغ)
ڈاکٹر حنیف احمد نقوی صاحب ، عبدالبصیر صاحب (مالتی باغ)
مسز بھارت گلاس اسٹور جناب وجاہت حسین صاحب
جناب محبوب عالم صاحب (کالی محل)" محمد سلیم صاحب (ریوڑی تالاب)
" عبدالصمد صاحب (جنگل ٹولہ) " احمد علی صاحب (ایڈوکیٹ)
ڈاکٹر اقبال احمد صاحب (اورنگ آباد) ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب
جناب محمد شاہد صاحب (ایڈوکیٹ) ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ انصاری صاحب
جناب حاجی عبدالمحیط صاحب (اشفاق نگر) انور کاظم صاحب
" امتیاز حسین صاحب (ریوڑی تالاب)

ممبر سازی کے سلسلے میں ڈاکٹر اقبال احمد صاحب۔ جناب
رمضان علی صاحب ایڈوکیٹ، جناب طاہر علی صاحب ایڈوکیٹ
جناب اقبال احمد صاحب (ایڈوکیٹ) اور جناب شاہد مسعود
صاحب سکریٹری عربی اسکول اور ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب نے بہت
معاونت فرمائی جس کے لیے ادارہ ان کا شکر گذار ہے۔ ★

★ تہذیب الاخلاق لباس نو میں مل رہا ہے۔ بلا شبہ اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے "طرز کلام اور" ہو جانے سے ذاتی طور پر مجھے بہت خوشی ہے۔ یہ تو مہینے دو مہینے سے مسلط تحریر کتنی جواب قلم بند ہو سکی ہے۔

مفتی محمد رضا انصاری، چیرمین اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ۔

★ تہذیب الاخلاق کا تازہ شمارہ اتفاق سے مل گیا اور اسی وقت پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ میں نے پچھلے خط میں اس نئی ذمہ داری پر آپ کو مبارکباد دی تھی تو اس وقت تک آپ کی ادارت میں نکلے ہوئے پرچے نظر سے نہ گزرے تھے۔ اب تازہ شمارے کے مراسلات پڑھ کر یقین ہو گیا کہ میرا ایمان بالغیب غلط نہیں تھا۔ سوائے ایک مراسلہ نگار کے سبھی نے رسالے کی تعریف کی ہے اور خلوص کے ساتھ کی ہے۔ جن مراسلے میں اعتراض کیا گیا ہے اور مشورہ دیا گیا ہے کہ سر سید مرحوم کی بعض تحریروں اور رایوں کو خود انہی کے رسالے میں ممنوع الاشاعت قرار دیا جائے میں اس پر تفصیل سے اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں مگر بعد میں طے کیا کہ ایک بھرپور مضمون لکھوں۔ کچھ اور عنوانات بھی ذہن میں ہیں۔

عبداللطیف اعظمی، جامعہ نگر، نئی دہلی

★ بک اسٹال سے تہذیب الاخلاق کا تازہ شمارہ خرید کر پڑھا، بخدا طبیعت باغ باغ ہو گئی، اس نئے روپ رنگ والا پورا سیٹ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ کاش کہ یہ خواہش پوری ہو۔ کمی اور عیب کہاں نہیں ہوتے ہیں مگر خوبیاں غالب ہیں، اسلوب، زبان، مواد اور موضوع کی بوقلمونی میں یہ پندرہ روزہ بے مثال ہے مگر یہ ڈاکٹر شریف خاں صاحب کون ہیں۔ ان سے کہیے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالیں، پیچیدہ موضوع ہے۔ عنوان غلط ہے، حدیث کی روشنی میں، ہونا چاہیے تھا بعض باتوں کی تکرار ہے۔ یہ سب آپ نے کیوں نہ دیکھا۔ یہاں ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ ناکام ہو گئے۔ ڈاکٹر سید محمد ہاشم صاحب کا وقار الملک پر جو مضمون ہے وہ بے نظیر ہے۔ اُن سے یہ کہا جائے کہ سیاست کے معمولی پہلوانوں کو رستم دستاں بنانا جاری رکھیں۔ وقار الملک پر ہمہ جہت مطالعے سے خود مصنف کی اپنی شخصیت بھی ابھرتی نظر ہے۔ بخدا بہت ہی اچھا مضمون ہے۔ یہاں بزم احباب میں بڑے قدر و اکرام سے پڑھا گیا۔ ڈاکٹر عالم حسین بے پناہ صلاحیتوں کے مالک لگتے ہیں۔ اُن سے لکھواتے رہیے۔ فزکس میں رہ کر عوام پسند ادیب بننا گدڑی کے لال سے کم نہیں۔ انگریزی اصطلاحوں کی وضاحت چاہیے۔ ستاروں کی زندگی پر سید حامد صاحب کا مضمون عمدہ ہے مگر تمہید اس سے میل نہیں کھاتی۔ اس موضوع پر اور مضامین چھاپیے۔ آپ کا اداریہ شروع میں ترقی پسند خیالات کا ترجمان ہے جسے پسند نہیں کیا جاتا ہے۔ آخر میں تلمیح ہو گیا ہے۔ اس میں آفاقیت کے بجائے ذاتیت نظر آتی ہے۔ معذرت کے ساتھ آپ اس خط کو جوں کا توں شایع کریں۔ آخری جملہ ناگوار ہو تو اسے روک سکتے ہیں۔ آپ تک رائے پہنچانی تھی وہ پہنچ گئی۔

شہاب الدین عظیم، ہاوڑہ اسٹریٹ کلکتہ۔

★ خوشی کی بات ہے کہ شمارہ وقت پر مل جاتا ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں خاص طور پر مسلمانوں کے حلقے میں پڑھنے اور علمی و ادبی گفتگو کا ماحول کم ملتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو یہ رسالہ پڑھنے کو دیا تو اس کی تعریف کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اس میں قوم کے نوجوانوں اور طالب علموں کے سلسلے میں نصیحت آمیز مضامین ہوں تو اور بہتر ہوگا۔

شیخ شاہد حسن (لائبریرین) کرلا۔ بمبئی۔

★ ویسے رسالے کے تمام مضامین اچھے ہیں مگر سید محمد ہاشم صاحب کا مضمون وقار الملک خاص طور سے پسند آیا۔ صفحات کی تعداد میں اضافہ کیجیے۔ ایم عرفان، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، بہار

★ کاشی میں تہذیب الاخلاق کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کی افادیت کو محسوس کیا گیا۔ اب ادھر کی چند اشاعتوں سے اس میں تزئین و آرائش اور بلحاظ مضامین نئے نئے عنوانات کا اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ سے قارئین کی دلچسپیوں میں بھی قرار واقعی اضافہ ہوا ہے۔ آپ یہ جان کر مسرور ہوں گے کہ یہاں کے علمی حلقے میں اس کی اشاعت کی منظم کوشش ہو رہی ہے اور تقسیم کے لیے ایک ایجنسی بھی قائم ہو گئی ہے۔ یادگار

شخصیتوں کا سلسلہ براہِ کرم جاری رکھیں۔ سید محمد ہاشم کا مضمون بہت اچھا ہے۔ جنوری میں مولانا محمد علی جوہر اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں پر مضامین شایع کیجیے۔

محمد ظہیر وارثی، کامٹی، ناگپور، (مہاراشٹر)

★ تہذیب الاخلاق کے دوبارہ اجرا پر مبارکباد۔ شاندار پرچہ مختصر مگر بہترین اور معلوماتی مضامین کے اِس گلدستے کو دُہرا ہنا ذوقی ہوگی۔ سیّد حسن عباس، بہار یونیورسٹی، مظفرپور

★ مبارکباد ہو آپکو کہ تہذیب اخلاق کے علاوہ ایسی گوناگوں باتیں بھردی ہیں کہ جن کو سُن کر بھی پیاس نہیں جاتی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ معلوماتی باتیں دیا کریں۔

بدرالدین بدھپوری، بدھپور، گھٹیر، گیا (بہار)

★ تہذیب الاخلاق کو نیا لباس مبارک۔ تصانیف سرسید سے کچھ اقتباس ضرور دیا کریں۔ دیکھو صفحہ فلاں دے کر مضمون کو منتشر کرنا مناسب نہیں۔ اشتہارات سے صفحات برباد ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر انور رئیس انڈین بیورو آف مائنز، ناگپور،

★ میرے مضمون کے عنوان میں آپ سے غلطی ہوگئی "طب یونانی اور ہومیوپیتھی" ہونا چاہیے تھا۔ صفحہ ۱۶ کی سطر ۱۱ کی اصل عبارت یوں تھی " یہ جزلا یتجزی بعد تحقیق و تدقیق جز یتجزی بن کر ایٹم کی تعریف میں آتا ہے۔ اسی صفحہ پر سطر ۵ میں "مرض" کے بجائے "اِس" اور سطر ۹ میں مجربات کے بجائے تجربات ہونا چاہیے۔

حکیم صیانت اللہ، قاضی زادہ امروہہ

اخلاق احمد

دوشنبہ

یوں تو تمام دن اللہ کے بنائے ہوئے ہیں لیکن اسلامی تاریخ میں متعدد اہم واقعات دوشنبہ کے روز پیش آئے جس کی وجہ سے اس کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ تقویمی حسابات کی پیچیدگی اور تاریخی اختلافات اپنی جگہ پر ہیں لیکن جس تاریخ اور دن پر عام طور پر اتفاق ہے اسے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ۱۲ ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی۔

۲۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے وحی دوشنبہ ۹ ربیع الاول مطابق ۱۲ فروری ۶۱۰ء کو نازل ہوئی۔

۳۔ معراج کا مشہور واقعہ نبوت کے دسویں سال (۶۲۱ء) ۲۷ رجب دوشنبہ کی شب میں پیش آیا۔

۴۔ معراج ہی کے موقع پر اس (دوشنبہ) رات میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔

۵۔ مدینہ ہجرت کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یکم ربیع الاول بروز دوشنبہ مطابق ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء کو غارِ ثور سے مدینے کے لیے روانہ ہوئے

۶۔ ۸ ربیع الاول دوشنبہ کے دن (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) آپ قبا میں تشریف فرما ہوئے۔

۷۔ جنگ بدر میں کامیابی کے بعد مسلمانوں کی مدینہ واپسی ۲۰ رمضان بروز دوشنبہ ۲ھ (مطابق ۱۶ مارچ ۶۲۴ء) کو ہوئی۔

۸۔ فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کا سب سے پہلا قافلہ حضرت ابوبکرؓ کی امارت میں ۹ ذی الحجہ ۹ھ (مطابق مارچ ۶۳۱ء) بروز دوشنبہ روانہ کیا۔

۹۔ دوشنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۸ جون ۶۳۲ء بوقت چاشت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم واصل بحق ہوئے۔

جملہ خط و کتابت کا پتہ:
نورالحسن نقوی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

روپیہ بھیجنے کا پتہ:
منظر عباس نقوی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قیمت فی شمارہ	ایک روپیہ
سالانہ	۲۰ روپے
تاحیات	دو سو روپے
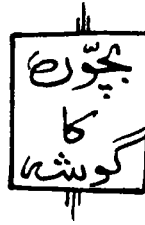
احمد رشید شیروانی

ایک طالب علم کا خط اور اُس کا جواب

ایک مسلم اسکول کے ایک ٹاپر صاحبزادے نے مجھے ایک بڑا پیارا خط لکھا " آپ کا ارسال کردہ انعام ملا۔ حوصلہ افزائی کا تہہ دل سے شکریہ۔ اس پُر آشوب دور میں جب کہ ایک طرف علمی کم مائیگی اور بے بضاعتی عام ہے اور دوسری طرف قحط الرجال ہے۔ اس دور میں آپ نے جس علم نوازی اور قوم پرستی کا عملی نمونہ پیش کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ خدا کرے آپ کے اس نیک نمونے کا دوسروں پر بھی اثر پڑے تاکہ وہ بھی ایسے ہی اقدامات اٹھا کر قوم پرستی کا نمونہ پیش کریں جس سے ہم طالب علموں کی ہمت افزائی ہو۔ اور ہم اس لائق بن سکیں کہ آگے چل کر قوم و ملک کے کام آسکیں"۔ چونکہ اس سے ملتے جلتے خط کافی آتے ہیں۔ اس لیے میں نے جو جواب لکھا وہ پیش ہے تاکہ ایسے جن بچوں کو میں فرداً فرداً جواب نہیں دے سکا وہ یہ جواب پڑھ لیں

آپ کا خط ملا۔ شکریہ۔ کوئی دور پُر آشوب نہیں ہوتا اور خاص کر یہ دور تو ہرگز ہرگز پُر آشوب نہیں۔ انسان نے جتنی ترقی اِس دور میں کرلی ہے پہلے کبھی نہ کی تھی۔ علم کو جتنا فروغ اس دور میں ہوا ہے۔ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس دور کو علمی کم مائیگی کا دور کہنا بالکل غلط ہے۔ نہ اس دور میں قحط الرجال ہے نہ علمی کم مائیگی۔

"علم نوازی" ایک نہایت غلط ترکیب ہے۔ علم کو کوئی کیسے نواز سکتا ہے؟ علم تو خود سب کو نوازتا ہے۔ "قوم پرستی" ایک اور غلط مجموعۂ الفاظ ہے۔ میں ہرگز ہرگز "قوم پرست" نہیں۔ میں خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش نہیں کرتا۔

آخری بات جو آپ نے لکھی ہے وہ بھی بالکل غلط ہے کہ دوسرے لوگ طالب علموں کی ہمت افزائی کریں تب طالب علم اس لائق بنیں گے کہ آگے چل کر قوم و ملک کے کام آسکیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی طالب علموں کی ہمت افزائی نہ کرے بلکہ بہت سے لوگ طالب علموں کی حوصلہ شکنی کریں تب بھی طالب علموں کو اپنے مقصد (یعنی حصولِ علم) میں خود کامیاب ہونا چاہیے اور آگے چل کر قوم و ملک کے کام آنا چاہیے۔

ایک لویہ کی کہانی آپ نے سُنی ہوگی۔ اگر سُنی بھی ہے تو پھر سُنیے۔ وہ ایک ہریجن لڑکا تھا۔ اسے تیر اندازی سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ وقت کے عظیم ترین ماہر گرو درون آچاریہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کے چرنوں کی دھول کو ہاتھ لگا کر اُس نے انھیں گرو مان لیا اور اُن سے التجا کی کہ تیر اندازی سکھا دیں۔ درون آچاریہ شہزادوں کے استاد تھے اور وہ کسی "نیچ" کو فن تیر اندازی سکھانا نہیں چاہتے تھے۔ خاص کر جبکہ انھیں صاف نظر آگیا کہ ایک لویہ میں سیکھنے کی صلاحیت بہت ہے تو انھوں نے ایک لویہ کو ٹال دیا۔

ایک لویہ واپس چلا آیا۔ مگر چونکہ وہ درون آچاریہ کو اپنا گرو مان چکا تھا اس لیے اس نے درون آچاریہ کی ایک مورتی بنائی اور روز صبح اس مورتی کو پرنام کر کے اس مورتی کی آگیا سے تیر کمان اُٹھاتا تھا اور مشق کرتا تھا۔ نتیجہ؟ جب ایک دن اتفاق سے درون آچاریہ شہزادوں کے ساتھ اِدھر آنکلے تو پتہ چلا کہ ایک لویہ تو ارجن کی ٹکر کا تیر انداز ہے جب کہ ارجن کی ہر طرح سے ہمت افزائی ہوئی تھی اور درون آچاریہ نے ارجن کو خوب جم کر یہ فن سکھایا تھا اور ایک لویہ ٹھکرایا ہوا، دھتکارا ہوا تھا۔

اور سنیئے۔ دورنؔ آچاریہ نے ایک لویّہ سے پوچھا کہ تجھے اتنی اچھی تیراندازی کس نے سکھائی؟ تیرا گرو کون ہے؟ تو ایک لویّہ نے کہا کہ میرے گرو آپ ہیں یہ سب میں نے آپ کے چرنوں میں سیکھا یعنی آپکی مورتی کے چرنوں میں۔

پھر دورنؔ آچاریہ نے کیا کیا؟ انھوں نے ایک لویّہ سے "گرو دکھشنا" مانگی۔ وہ بولا جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب آپ کا ہے۔ جو آپ کہیں میں پیش کروں۔ دورناچاریہ نے کہا۔ اچھا تو اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا مجھے دے دو۔ تیراندازی میں دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی بہت اہمیت ہوتی ہے کیونکہ اسی سے تیر کو دبائے رکھنا پڑتا ہے اور وقت پر چھوڑنا پڑتا ہے۔ ایک لویّہ نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا بھی کاٹ کر گرد کو دے دیا۔

پھر کیا ہوا؟ ایک لویّہ نے ان ہی دورنؔ آچاریہ کی مورتی کے چرن چھوکر پھر بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے تیر دبانے اور چھوڑنے کی مشق کی اور دوبارہ ارجن کی ٹکر کا تیرانداز بن گیا۔

ہمارے بچّوں کو اس کہانی سے سبق لینا چاہیے۔ اگر کوئی آپکی ہمت افزائی نہ کرے بلکہ لوگ آپکی حوصلہ شکنی کریں آپ کے راستے میں روڑے اٹکائیں، آپ کو علم حاصل کرنے سے روکنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کریں، آپکو ہر طرح سے محروم کریں تب بھی آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔

یہ بات آپ کی کہ "خدا کرے کہ لوگ ہم طالب علموں کی ہمت افزائی کریں تاکہ ہم لوگ علم حاصل کر سکیں" مجھے پسند نہیں آئی۔ میں کہتا ہوں کہ چاہے لوگ ہمارے بچّوں کو علم حاصل کرنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں ہمارے بچّوں کو پھر بھی علم حاصل کرنا ہے اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کرنی ہے۔

جن الفاظ کا استعمال کریں اُن کا مفہوم سمجھ لیا کریں۔ "پُرآشوب دور"، "نازک وقت"، "علمی کم مائیگی"، "بے بضاعتی"، "قحط الرجال"، "علم نوازی"، "قوم پرستی"، "ہمت افزائی"، یہ سب الفاظ بے معنی سے ہیں۔ پھر بھی لوگ انھیں دھڑا دھڑ استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کی رٹ لگائے رہتے ہیں۔ آپ اس سے بچیں۔

ہاں بس یہ دعا ہر وقت ہر دقت کیجیے "اے میرے رب میرے علم کو بڑھا" اور اس دُعا کے ساتھ پوری محنت کیجیے۔ لگ کر کوشش کیجیے ★★

بہن کی رکشا

نیلما پرویز

دھرم اور مذہب دو لفظ ہیں جن کا مطلب ایک ہی ہے۔ دونوں کی منزل ایک ہے لیکن ان پر چلنے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ گاندھی جی نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ "مذہب انسان کو علیحدگی نہیں سکھاتے بلکہ مل کر جینے، مل کر آگے بڑھنے کا راستہ دکھاتے ہیں"، مسلمانوں کے رہنما سر سیّد احمد خاں نے بھی ایک بار ایسی ہی بات کہی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ "ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گی تو ہماری دُلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گی تو وہ کانی بن جائیگی پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ چاہے اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہے کانا"

تاریخ کے اوراق اُلٹیے تو ایسے بہت سے واقعات نظر آئیں گے جنھوں نے دلوں کو جوڑنے کا بڑا کام کیا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ رانی کرماوتی کی راکھی کا ہے۔ جو اس نے ہمایوں کو بھیجی تھی۔ ہمایوں اپنی

بھی کبھی فوج اکٹھا کرکے شیر شاہ پر حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک پیغام بر آیا اور اُس نے راکھی لاکر سامنے رکھدی اور بولا۔" مہابلی! ہماری رانی نے آپ کو یہ راکھی بھیجی ہے۔"

ہمایوں نے کہا "اس کا مطلب؟"

پیغام بر نے کہا "رانی نے یہ راکھی بھیج کر آپ کو اپنا بھائی بنایا ہے۔ ہمارے یہاں یہ رسم ہے کہ بہن اپنے بھائی کی کلائی پر راکھی باندھتی ہے اور بھائی اُس کی رکشا کرتا ہے۔"

بادشاہ نے یہ تحفہ قبول کر لیا۔ معلوم ہوا کہ گجرات کے بادشاہ نے میواڑ کی سلطنت پر حملہ کر دیا ہے اور بہن کو اپنے منہ بولے بھائی کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس وقت رانی کے کچھ ہمدرد اس سے کہتے ہیں " ہمایوں مسلمان ہے اس سے ہم کیوں مدد مانگیں ؟ " رانی جواب دیتی ہے ۔" ہمایوں بہادر ہے۔ اسے بھائی بننا آتا ہے۔ ایک بہادر کی بہن بننا کیسے فخر کی بات ہے۔ مسلمان بھارت کے دشمن نہیں ہیں۔ ہندوستان کی اس لہلہاتی باڑی کو سینچنے میں اُن کا بھی خون پسینہ شامل ہے۔ ہماری طرح بھارت اُن کی جنم بھومی ہو چکی ہے۔ وہ ہمیں بہن سمجھیں اور ہم انھیں بھائی۔ یہی صحیح راستہ ہے۔"

اور اب ہمایوں کو راکھی کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔ جب ہمایوں کے ساتھی اس سے کہتے ہیں ۔"حضور! ابھی تو آپ کو اپنی لڑائی لڑنی ہے آپ کیوں دوسروں کی لڑائی جھگڑوں میں پڑتے ہیں۔ رانی کرماوتی کو اپنی لڑائی خود لڑنی چاہیے ہم کیوں دوسروں کے پھٹے میں پاؤں دیں" ہمایوں اس کا جواب دیتا ہے۔

" افسوس! تم اس راکھی کی قیمت کو نہیں سمجھتے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میواڑ کی بہادر رانی نے مجھے اپنا بھائی بنایا ہے اور میواڑ کی حفاظت کے لیے میری مدد چاہی ہے۔ ساری سلطنتوں سے بڑھ کر ایک سلطنت اور ہے وہ ہے انسانیت کی سلطنت، محبت کی سلطنت، سکندر نے اتنی بڑی سلطنت قائم کی، کیا ہوئی وہ سلطنت؛ لیکن جنھوں نے دلوں کو جیتا وہ آج تک زندہ ہیں اور لاکھوں کروڑوں دلوں پر راج کرتے ہیں۔"

ہمایوں نے حملہ آور بادشاہ کو ہرادیا اور میواڑ کی سلطنت کو آزاد کرادیا۔ لیکن اس معرکے میں وہ کرماوتی کو نہ بچا سکا۔ جس نے لڑتے ہوئے اپنی جان دے دی۔ ہمایوں رانی کرماوتی کی چتا پر گیا اور بڑی درد بھری آواز میں اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

" بہن مجھے معاف کرنا۔ میں تمھارا نالائق بھائی ہوں۔ بہت کوشش کرنے پر بھی تمھیں نہ بچا سکا۔ پر تمھارے میواڑ کو تمھارے دشمنوں سے چھین کر پھر میواڑیوں کو سونپ چلا ہوں۔ ہمایوں مصیبت سے ڈرتا نہیں، مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ بہن! تم نے جس طرح راجپوتوں کو مرنا سکھایا ہے مجھے بھی حق کے لیے جینا سکھا دو۔ جس طرح تم تپتی ہوئی آگ میں جل مریں۔ مجھے بھی تکلیفوں کی آگ میں جیتے رہ کر مسکرانا سکھادو۔ چاہے جتنی بھی مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹے، پر میں ہمت نہ ہاروں۔ محبت اور انسانیت کا دامن نہ چھوڑدوں"۔

ہمیں فخر ہے کہ ہماری تاریخ میں ایسے بہت سے قصے موجود ہیں۔

**

With
Best
Compliments
From :

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

جلد ۳ ؛ ۱۶ تا ۲۹ فروری ۱۹۸۴ء ؛ شمارہ ۴

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نور الحسن نقوی
استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات

(سرورق پر: شیر کشمیر شیخ عبد اللہ)

★

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتند: یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت: آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

— اقبال

آزاد ترجمہ:

★ کل رات
شیخ چراغ لیے
شہر کے گرد گھوم رہا تھا
کہتا تھا: میں درندوں اور مویشیوں سے
تنگ آچکا ہوں
مجھے انسان کی تلاش ہے
ان سست عناصر ہمراہیوں سے
میں عاجز ہوں
خواہش ہے کوئی شیر خدا ملے
کوئی رستم دستاں میسر آئے
لوگوں نے کہا: ایسا انسان تو ملتا نہیں
ہم بہت ڈھونڈ چکے
بولا: جو مل نہ سکے
اُسی کو پانے کی تو آرزو ہے۔

اداریہ

پروفیسر عبدالسلام نے اپنی کتاب "خواب اور حقیقت" کے ایک باب میں لکھا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسروں سے بہت پیچھے ہیں اور سائنس کی تعلیم میں تو صورت حال اور بھی افسوسناک ہے۔ کچھ دن پہلے یہی بات اقلیتی کمیشن کے سکریٹری مسٹر سکینہ کہہ چکے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جن ملکوں میں مسلمانوں کی حکومت ہے وہاں بھی عیسائی اور یہودی تعلیم میں اور خاص طور پر سائنس کی تعلیم میں مسلمانوں سے بہت آگے ہیں۔ ہندوستان میں ہماری حالت اور بھی خراب و خستہ ہے۔ احمد رشید شروانی صاحب نے اعداد و شمار پیش کرکے بار بار جتایا ہے کہ تعلیم میں سب سے "پھسڈی" ہم ہی ہیں۔ اس کے اسباب ایسے نہیں ہیں جن سے اہل نظر واقف نہ ہوں۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے کوئی بڑا منصوبہ، کوئی ماسٹر پلان تیار کریں۔ اور مزید وقت گنوائے بغیر اس کی تکمیل میں لگ جائیں اگر ہم اب بھی نہ جاگے تو جتنے پیچھے آج ہیں کل اس سے کہیں زیادہ پیچھے ہوں گے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ایک اعلان نے ہماری تشویش میں اضافہ کر دیا ہے۔ پروگرام یہ ہے کہ آئندہ یونیورسٹیوں کی تمام کلاسوں میں داخلے ایک امتحان کے ذریعے ہوا کریں گے۔ داخلے کے یہ امتحان سارے ملک میں ایک دن، ایک وقت اور غالباً کمیشن کے اپنے اہتمام میں ہوں گے۔ یونیورسٹی سے ملحقہ اسکولوں کے طلبا اور اولڈ بوائز یا یونیورسٹی ملازمین کے بچوں کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے گی۔ گویا کم صلاحیت اور کم لیاقت طلبا پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ عملاً آج بھی یہی صورت ہے۔ جن طالب علموں کی ابتدائی تعلیم ناقص ہوتی ہے وہ کسی منزل تک نہیں پہنچ پاتے اور کسی مقابلے کے امتحان میں کامیاب نہیں ہوتے۔ آج سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ابتدائی تعلیم کی طرف خاص توجہ کی جائے اور ہر جگہ ایسے پرائمری اسکول قایم کیے جائیں جن کا ضبط و نظم اعلیٰ اور معیار تعلیم بہتر ہو۔ سرکاری پرائمری اسکول ہر جگہ ہیں لیکن یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی حالت بہت ابتر ہے۔ اور ان کا سدھارنا سہل نہیں۔

بہتر یہ ہوگا کہ ہم جگہ جگہ اپنے اسکول قائم کریں اور ہو سکے تو اس کام میں غیر مسلموں کو بھی اپنے ساتھ شریک کریں۔ یہ پرائمری اسکول پبلک اسکولوں کے انداز پر قایم کیے جائیں۔ یعنی یہ چندے سے نہیں فیس کی آمدنی سے چلائے جائیں مگر یہ فیس نسبتاً کم ہونی چاہیے اور کمزور طبقے کے بچوں کی فیس میں رعایت کی جانی چاہیے۔ اس کے باوجود یہ اسکول تقریباً خود کفیل ہوں گے اور انھیں چلانے کے لیے روز کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے گا۔ ان اسکولوں کے نصاب، معیار تعلیم اور اساتذہ کی کارکردگی کی طرف خاص توجہ دینی ہوگی۔ انسپکشن کا خود ہی معقول بندوبست کرنا ہوگا۔ موجودہ زمانے کی ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ کام کی نگرانی نہ کی جائے تو سرے سے کام ہوتا ہی نہیں۔ غرض یہ اسکول ایسے ہونے چاہئیں کہ طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کر سکیں اور ان اسکولوں کے پڑھے ہوئے بچے زندگی میں کہیں مات نہ کھائیں۔

سو سال پہلے سر سید نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایک بڑا منصوبہ تیار کیا تھا اور اس مقصد کے لیے ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تھی۔ آج بھی جگہ جگہ تعلیمی کمیٹیاں بنانے کی ضرورت ہے۔ اپنے اس بزرگ محسن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ہم اس تعلیمی انجمن کو سرسید سوسائٹی کا نام دے سکتے ہیں۔ بعض جگہ اس طرح کی سوسائٹیاں قائم ہوئی ہیں اور کام کا آغاز ہوا ہے۔ خدا کرے یہ کام بڑھے اور پھیلے۔

نورالحسن نقوی

خوشتر حبیب

سبزے سے دُور رہیے

کچھ ہی دن پہلے "گارجین" میں اس سرخی کے ساتھ ایک آرٹیکل شایع ہوا تھا۔ یہ سرخی گھر کے چھوٹے سے یا پارک کے کشادہ لان سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اس کا تعلق اسکولوں میں کھیل کے میدانوں سے ہے۔ انگلستان میں چند سال ہوئے ایک قانون بنا تھا کہ جن اسکولوں میں زمین ضرورت سے زیادہ ہے وہ اسے فروخت کر سکتے ہیں۔

قانون کا بننا تھا کہ جوع الارض میں مبتلا افراد اور اداروں کی رال ٹپکنے لگی۔ اسکولوں کی فاضل زمین حاصل ہو جائے تو مکان بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔ طرح طرح سے زمین حاصل کی گئی۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ ان سبزہ پوش میدانوں پر ایک گھنٹے روز کھیل ہو سکتا ہے۔ یہ مفروضہ غلط ہے۔ سبزہ آرام چاہتا ہے۔ گھاس ہر روز روندی گئی تو سر نہ اٹھا سکے گی۔ اس افتاد پر مخملی لان صفاچٹ میدان میں تبدیل ہو جائے گا۔

برطانیہ کے کھیلوں کے وزیر نے ۹ لاکھ روپے کا ایک عطیہ اسکولوں میں کھیلوں کے میدانوں کے تحفظ، پرداخت اور توسیع کے لیے منظور کیا ہے لیکن اس عطیے سے کہیں زیادہ اہم کھیل کے میدانوں کی قومی انجمن کا قیام ہے۔ اسی انجمن نے میدانوں کے تحفّظ اور پرداخت کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس خطرناک رجحان کو روک دیا ہے کہ اسکول کے منتظمین کھیل کے لیے موقوف زمینوں کے "فاضل" اجزا کو بیچ ڈالیں۔

ایک نکتہ چیں نے کہا ہے کہ اسکولوں کی کھیل کی زاید زمینوں پر عمارتیں بنائی جائیں گی۔ ان میں بچے رہیں گے وہ بچے تفریح کے لیے کیا کریں۔ کھڑکیاں توڑیں۔

یہ تو انگلستان تھا کہ لوگ کھیل کے میدانوں کے تحفّظ کے لیے سامنے آگئے۔ ہندوستان میں بیشتر اسکولوں کے میدانوں پر یا کلاس روم بن گئے ہیں یا لبریٹریاں یا لائبریریاں یا ہوسٹل۔

بہت کم اسکول یا کالج ایسے ہیں جن کے پاس کھیلنے کے لیے میدان ضرورت کے مطابق ہوں۔ ہمارے یہاں کھیلوں اور کھلاڑیوں کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے لیکن وہ کھیلیں کہاں۔ اسپورٹس گراؤنڈ کے نہ ہونے یا ناکافی ہونے کی وجہ سے کھیل مرجھا رہے ہیں اور ان کا معیار گرتا جا رہا ہے اور لوگ حیران ہیں کہ اسپورٹس کے لیے رقوم خطیر منظور کی جا رہی ہیں نتائج کیوں نہیں نکلتے۔ گویا لپسٹک، پاؤڈر اور رُوج کے وافر صرف سے چہرے پر رونق تو آگئی، صحت بہتر کیوں نہ ہوئی۔ صحت کے لیے غذا (اور ورزش) درکار ہے۔ چہرے کے مُلمّع سے انسان تندرست نہیں ہوتا جب سے غازہ و گلگونہ کا استعمال بڑھا ہے، انگریزی محاورے میں سطحی اقدامات کو COSMETIC یا گلگونہ ساں کہا جاتا ہے یہ نمایشی اور زیبایشی ہوتے ہیں؛ جلد کے نیچے سرایت نہیں کرتے۔

شہری منصوبہ بندی یا ٹاؤن پلاننگ میں کھلے ہوئے قطعات آراضی کو اہم درجہ دیا گیا ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو آدمیوں کی کثرت سے دَم گھٹنے لگے۔ ان علاقوں کو GREEN BELT بھی کہا جاتا ہے جس کا مفہوم اُردو میں "سبز منطقہ" یا "ہری پٹی" کہہ دینے سے ادا ہو جائے گا۔ ان علاقوں میں سبزہ بھی ہوتا ہے، پیڑ بھی ہوتے ہیں۔ پیڑ انسان کے پھیپھڑوں سے واپس آنے والی کاربن ڈائی آکسائڈ سے بھری ہوئی ہوا کو جذب کر کے اسے صحت بخش آکسیجن میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایسے کشادہ قطعات زمین کو شہر کے جسم کے اندر پھیپھڑوں سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن پھیپھڑوں کو ورزش جب ہی ملے گی جب کھیل کے میدان بنیں گے جن میں لڑکے اور نوجوان دلکش ورزش سے دل بہلا سکیں گے تن سنوار سکیں گے مغربی ممالک نے گزشتہ تین سو سال میں جو فضیلت حاصل کی ہے اس میں بڑا دخل جسمانی ورزشوں اور کھیل کود کو ہے

ارے یہاں یہ عالم ہے کہ جہاں لڑکے نے کھیلوں سے دلبستگی کا اظہار کیا وہیں والدین کی امیدوں پر اوس پڑنی شروع ہو گئی کہ بیٹا کھلنڈرا ہو گیا، اب کسی کام کا نہ رہا۔ اور یہ مایوسی اس روایت کو دیکھتے ہوئے کوئی بے جا بھی نہیں ہے جس نے کھیلنے والوں اور پڑھنے والوں کو دو دنیاؤں میں بانٹ دیا ہے جن کی سرحدیں شاذ و نادر ہی کہیں ایک دوسرے کو چھو پاتی ہوں۔ جسمانی صحت سے دماغی صحت پھوٹتی ہے جیسے ٹہنیوں سے کونپلیں، مہم جوئی، طالع آزمائی، حوصلہ مندی، بلند نگاہی، سب تندرستی کی دین ہیں۔

عالمی مقابلوں میں کھیلوں کے معیار بڑھتے چلے جا رہے ہیں انسان کی لامحدود صلاحیتوں کے حیرت انگیز ثبوت یہ مقابلے فراہم کر رہے ہیں لیکن کھیلوں کی دنیا میں مقابلے نے اتنا زور پکڑ لیا ہے کہ شکست کو کشادہ دلی اور خوبصورتی کے ساتھ قبول کرنے کی وہ صلاحیت جسے اسپورٹسمین شپ کہتے تھے، اب رو بہ زوال ہے۔ کھیلوں اور دوڑوں میں پیشہ ورانہ مہارت نے ان کی تفریحی دلکشی اور تشکیلی اور تعمیری اوصاف اور کردار سازی اور استقامت آموزی کی صلاحیتوں کو گھایل کر دیا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسا بڑا نقصان نہیں۔ پیشہ ورانہ مہارت ہر کھیل اور ہر ملک میں چند افراد تک محدود ہے، ہر کھیل میں جن کی تعداد ہزار دو ہزار سے زیادہ نہ ہو گی۔ لیکن ان کھیلوں کے لاکھوں کھیلنے والے ایسے ہونگے جو انھیں صرف ان سے والہانہ وابستگی کی بنا پر کھیلتے ہیں۔ انھیں وہ کھیل پسند ہیں۔ جب وہ انھیں کھیلتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے دنیا و مافیہا کو بھول جاتے ہیں، کاروباری گرد و غبار اور افکار کے فشار کا ذکر ہی کیا۔ کھیل انھیں سرد و گرم، کامیابی اور ناکامی کو طمانیت سے قبول کرنے کا گر سکھاتا ہے۔ کھیل انھیں بتاتا ہے کہ خواہ جان پر بنی ہو، ماتھے پر شکن، اور زبان پر کوئی تلخ بات اور دل میں کدورت اور غبار کا گزر نہ ہونے پائے۔ کھیل یہ درس بھی دیتا ہے کہ جو لوگ روح کے درپے ہوتے ہیں یا دماغ کے تعاقب میں رہتے ہیں، وہ توازن اور ہوشمندی کا ثبوت نہیں دیتے۔ جسم کی پرداخت ذہن کی صیقل اور روح کی ریاضت سے کم اہم ہیں۔ جسم کی پرداخت کے معنی ہیں اس کا سڈول پن اور تناسب۔ یہاں بھی افراط و تفریط سے بچنا پڑتا ہے۔ نہ اتنی ورزش کر جسم سوکھ کر کانٹا ہو جائے کپڑے نہیں تو ایسا لگے کہ کھیت میں فصل کو جانوروں سے بچانے کے لیے کھپچی پر ہانڈی ٹانگ دی گئی ہے اور چیتھڑے پہنا دیے گئے ہیں۔ انگریزی میں اس ہیولیٰ کو اسکیر کرو (SCARECROW) (کووں کو ڈرانے والا) کہتے ہیں۔ ہمیں یاد نہیں آ رہا کہ اردو میں اس کے لیے کیا لفظ ہے۔ مگر اسے ہمارے یہاں گیدڑوں، نیل گایوں، ہرنوں، وغیرہ کو دور رکھنے کے لیے نصب کیا جاتا ہے۔ نہ اتنی خوش خوری کہ فربہی سامنے آ کر لبیک کہے۔ سعدی نے کہا تھا۔ اسپ لاغر میاں بکار آید + روز میدان نہ گاؤ پرواری مرد کو اگر گوشت لانا ہے تو شانوں، سینوں اور بازوؤں پر لائے۔ کمر اور پیٹ پر چربی چڑھ جائے تو وضع قطع میں گاؤ پرواری کی شکل

حساب بیباق

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات سے کچھ دن پہلے ارشاد فرمایا۔ حساب کر کے بتایا جائے کہ میں نے اب تک بیت المال سے کتنا وظیفہ حاصل کیا ہے۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ کل چھ ہزار دینار یعنی تقریبًا پانچ سو روپے انھوں نے وصول کیے ہیں۔ اسی وقت حکم ہوا کہ ان کی زمین فروخت کر کے یہ کل رقم بیت المال میں جمع کر دی جائے۔ فورًا اس پر عمل کیا گیا پھر ارشاد ہوا۔ تحقیق کیا جائے کہ خلافت قبول کرنے کے بعد سے اب تک میرے مال میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک حبشی غلام کا اضافہ ہوا ہے جو بچوں کو کھلاتا ہے اور مسلمانوں کی تلواریں صیقل کرتا ہے۔ دوسرا اضافہ ایک اونٹنی کا ہے جس پر پانی لاد کے لایا جاتا ہے اور تیسرا اضافہ ایک چادر ہے جس کی قیمت ایک سو روپے کے برابر ہے۔ حکم دیا کہ میرے مرنے کے بعد یہ تینوں چیزیں خلیفۂ وقت کے حوالے کر دی جائیں۔ وفات کے بعد جب یہ تینوں چیزیں حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں پیش کی گئیں تو وہ رو پڑے۔ فرمایا "ابوبکر! تم اپنے جانشینوں کا کام بڑا دشوار کر گئے۔"

سلطان رضیہ۔ سوداگر

تبادلۂ خیال

یہ ۱۹۵۵ء کے علی گڑھ کا واقعہ ہے جب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں یہاں کے وائس چانسلر تھے کہ دو گروہوں میں کسی بات پر ٹھن گئی۔ بارہا آزمائے ہوئے ہتھیاروں یعنی مچھردانی کے ڈنڈوں سے مسلح دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوگئے۔ یہ گتھم گتھا ہونے ہی کو تھے کہ ذاکر صاحب کو خبر مل گئی اور وہ بلا تاخیر جائے واردات پر آپہنچے ان کا غصہ بہت خراب تھا۔ اور اس وقت غصے سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا دونوں گروہ ایک ایک قدم پیچھے ہٹ آئے۔ سب کے سر جھک گئے اور ساتھ ہی ڈنڈے بھی۔ ذاکر صاحب نے بگڑ کر پوچھا۔

"آخر یہ کیا ہو رہا تھا؟"

"تبادلۂ خیال" کسی منچلے نے برجستہ جواب دیا۔

اس جواب پر ذاکر صاحب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کا مسکرانا تھا کہ چاروں طرف دبی دبی مسکراہٹوں کی بارش سی ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے مطلع صاف ہوگیا۔ ★★

جھلکنے لگتی ہے۔ جسم کی فربہی کشاں کشاں نفس اور عقل کی فربہی کی طرف لے جاتی ہے اور گور کی راہ کو بھی مختصر کر دیتی ہے۔ چاق و چوبند انسان کا بیماریاں پیچھا کریں بھی تو اُسے پکڑ نہیں پاتیں۔ موٹا انسان سُست روی کی بنا پر اُن سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ جلد اُن کی زد میں آجاتا ہے۔

ہم نے مغرب سے جو کچھ سیکھا ہے اس میں سے بیشتر کو بھلا دینا ہمارے حق میں ہوگا اور جو کچھ نہیں سیکھا ہے اس میں سے ایک حصے کو سیکھ لینا زندگی میں سرخروئی اور سرفرازی کی طرف لے جائے گا۔ سیکھنے کے لائق باتوں میں سے ایک بات کھیلوں کو اوّلین اہمیت دینا ہے۔ اور پڑھنے والے اور کھیلنے والے کی تفریق کو مٹانا ہے۔ ۷۰ کروڑ کی آبادی والے ملک میں اتنی سکت آتنا جا نگر بھی نہ ہو کہ کھیلوں میں رو ہال برابر ملکوں سے مقابلہ کر سکے عبرت کا مقام ہے گر ہم کھیلنا سیکھ گئے تو تضیع وقت سے بھی جو کہ اُمّ الخبائث ہے بچ جائیں گے پڑھنے اور کھیلنے کے بعد وقت ہی کہاں بچے گا کہ غیبت اور بہتان

اور الزام تراشی اور دروغ بافی کے دلکش مشاغل میں شریک ہوسکیں۔

جسمانی طاقت، صلابت، ریاضت اور جفاکشی کے بغیر کوئی قوم آج تک نہیں اُبھری کھیل اسے حاصل کرنے کا سہل اور مؤثر ذریعہ ہیں۔

جس خبر کی سرخی سے اس مضمون کا آغاز ہوا تھا اس میں کھیلوں کی اہمیت کے علاوہ ایک اور پتے کی بات مخفی ہے۔ یعنی بیدار اور سمجھدار رائے عامہ کی تشکیل۔ رائے عامہ برائی اور ظلم، بے حسی اور بے توجہی سے نمایاں ہے۔ رائے عامہ حقوق اور امکانات کا تحفظ کرتی ہے۔ انگلستان میں بلکہ ساری مغربی دنیا میں عوام کی رائے ارباب اختیار کی غفلت اور غلطی اور بے راہ روی میں سدِّ راہ ہوتی ہے۔ ہمارا یہ حال کہ عام فلاح کا خیال بھی دل میں نہ لائیں گے۔ اگر معاشرے کا نقصان ہو رہا ہے تو ہوا کرے ہم تو جب ہی جیتیں گے جب ہمارا سامنا فوری ذاتی نقصان سے ہوگا۔ آزادی سے پہلے نئی دہلی میں ہاکی کے بارہ اچھے میدان تھے۔ تصرّفات کے نتیجے میں صرف ایک رہ گیا تھا اتنے میدان نکل گئے کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس مضمون کی عمارت دو ستونوں پر کھڑی کی گئی ہے: (۱) رائے عامہ (۲) کھیل۔

اس وقت ہمارے سامنے دو اخبار ہیں۔ ایک سنڈے ایکسپریس اور دوسرا سنڈے ڈیلی ٹیلی گراف ایکسپریس کے ۲۸ صفحات میں سے پانچ کھیل کی خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ٹیلی گراف کے ۳۲ صفحات میں سے ½۳ کھیلوں کے لیے وقف ہیں۔ جب کہ ½۱۵ صفحات اشتہارات کی نذر کئے گئے ہیں۔ گویا ٹیلی گراف کے ½۱۷ پُر خبر صفحات میں سے ½۳ صفحات یعنی ۲۰ فیصد کھیلوں کے ذکرِ جمیل سے تاباں و درخشاں ہیں اور ایکسپریس کے ۲۸ صفحات میں سے ۱۸ صفحات اشتہارات پر مشتمل ہیں یعنی دس پُر خبر صفحات میں سے پانچ کھیلوں کے ذکر سے مزین ہیں اس سے ایک موٹا سا اندازہ ہو سکتا ہے مغرب میں کھیلوں کی بالادستی کا۔

آپ بھی جسم کو صحت مند رکھیے تاکہ صحت مند دماغ کو نشوونما کا موقع ملے۔ عوامی فلاح کی فکر کیجیے کہ آپ کی فلاح کے سوتے بھی اسی سے پھوٹیں گے۔ ★★

ابوالکلام قاسمی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شیرِ کشمیر ۔ مردِ مجاہد

ایک ایسا شخص جس نے دنیا میں آنکھیں کھولنے کے بعد اپنے اطراف وجوانب میں عوام کو جبر و استبداد کے شکنجوں میں جکڑا ہوا دیکھا ہو، ایک ایسا حسّاس بچّہ جسے اپنے ماحول سے مظالم کے جواب میں صبر و رضا اور اقتدار و آمریت کی طرف سے نافذ ہونے والے ہر پسندیدہ و ناپسندیدہ حکم پر سرِ تسلیم خم رکھنے کا سبق ملا ہو، ایسا طالب علم جس نے اپنی خاندانی آسودہ حالی کے سبب علم و دانش کی برکتوں کا ادراک تو ضرور کیا ہو مگر اس کے ہم وطنوں کو تعلیم، تہذیب اور روشن خیالی سے اس لیے محروم رکھا گیا ہو کہ ان کی پسماندگی اور جہالت ہی کو حاکمِ وقت اپنی آمریت کے تحفظ کے لیے ناگزیر تصور کرتا ہو ـــــ ایک ایسا نوجوان جس نے ہوش وحواس کی منزل میں آنے کے بعد سے اپنی قوم کو صرف عاقبت اندیشی کی وجہ کر مسلسل خاموش پایا ہو مگر اس کے باوجود اُسے قدرت سے جو حساس طبیعت اور جرأت و حمیت کی دولت، ودیعت ہوئی ہے اس کے طفیل اسے کسی طور خاموشی گوارہ نہ ہو ـــــ ظاہر ہے کہ ایسے کسی بھی آدمی کو پورے نظام کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرنے اور استبداد کی قوت سے نبرد آزما ہونے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ـــــ سو وادیِ کشمیر کے ایک مردِ مجاہد کو بھی اپنی عزتِ نفس، جرأت اور بغاوت کی کچھ ایسی ہی قیمت چکانی پڑی، عمرِ عزیز کے کم و بیش ۱۶ سال قید و بند کی صعوبتوں کی نذر کرنا پڑے، ملک دشمن، فرقہ پرست اور غیر ملکی ایجنٹ، جیسے الزامات برداشت کرنا پڑے اور اس طرح کردارکُشی کے سارے حربے اس درویش صفت شخص پر آزمائے جاتے رہے۔

سعدی شیرازی نے زمانہ سازی کا درس ؎ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز، کہہ کر دیا تھا، مگر علامہ اقبال کو سعدی کا یہ مشورہ پسند نہ آیا اور اقبال نے اس کا جواب یوں دیا تھا کہ ؎

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بہ ساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

شیخ عبداللہ جس افتادِ طبع کے آدمی تھے اور جس طرح کے حالات کا سامنا ان کے گرد و پیش کے لوگوں کو کئی نسلوں سے رہا تھا، اُس صورتِ حال میں سعدی شیرازی جیسے مصلحت اندیش اور زمانہ شناس مفکر، بھلا کہاں تک ان کا ساتھ دے پاتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے زیادہ مشکل اور صبر آزما راستہ منتخب کیا اور اس موقع پر ان کے ناقابلِ شکست حوصلے اور جرأت و عمل کے جذبے کو اقبال کی شاعری میں زبان ملی ـــــ کہتے ہیں کہ اگر شاعری زندگی کے لیے بہت زیادہ بھی بامصرف ثابت ہوتی ہے جب بھی اس کا مصرف سننے یا پڑھنے والے کے احساس اور جذبے کی شراکت سے بہت آگے نہیں بڑھ پاتا۔ مگر اِس مردِ مجاہد کے لیے شاعری کا معاملہ بالکل مختلف رہا۔ اقبال کی شاعری نے نہ صرف یہ کہ ان کے حوصلے بلند کیے بلکہ لاہور اور علی گڑھ میں حصولِ تعلیم کے دوران جس چیز نے ان کی شخصیت کے پروان چڑھانے میں سب سے زیادہ معاونت بہم پہنچائی وہ اقبال ہی کا پیغام تھا۔ خودی، اپنے مقصد سے عشق، بلند پروازی، حرکت و عمل اور نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو رہنے کا انداز انھوں نے اقبال سے ہی سیکھا تھا، جو کارگہ حیات کے سارے سفر میں ان کے لیے زادِ راہ ثابت ہوا۔

شیخ عبداللہ نے شیخ عبداللہ سے شیرِ کشمیر کے لقب سے نوازے جانے تک کا سفر کیسے طے کیا؟ اس کا اندازہ ہندوستان کی آزادی یا صرف تقسیم ہند کے بعد کے حالات کے پس منظر میں نہیں لگایا جا سکتا۔ ادھر دو تین دہائیوں میں شیخ کی شخصیت کے جن پہلوؤں کو ہمارا قومی پریس زیادہ نمایاں طور پر پیش کرتا رہا، اسے کسی سیاسی رہنما کی صحیح تصویر پیش کرنے کے بجائے سیاسی تصویر کشی سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں آزاد ہندوستان کے کئی مسلم سیاسی رہنماؤں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ عموماً ہمارے سیاسی رہنماؤں کی ساری سیاسی کاوشیں خود کو سیکولر اور قوم پرست ثابت کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ

پرانی دوستی

دوستی خواہ پچاس سال کی عمر میں کی جائے خواہ بیس سال کی عمر میں، ہوتی یکساں دلکش اور ولولہ انگیز ہے۔ پھر بھی روایت اور تسلسل کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ پرانی کہاوت کہ پرانے دوست سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔

پاسپورٹ ٹو ایڈونچر

اعتذار کا انداز بجائے خود ایک طرح کے اجتماعی احساس کمتری اور دوسرے
تے کے لوگوں کے سامنے خود کو جواب دِہ محسوس کرنے کا زائیدہ ہے۔
خ عبداللہ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی اس سلسلے میں
متثنیٰ ترین لوگوں میں قرار دیے جاسکتے ہیں کہ ان تینوں نے بنیادی طور
دو قومی نظریئے ہی سے اتفاق نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ
کے علاوہ بھی بہت سے مسلم رہنماؤں نے یہی رویّہ اپنایا تھا مگر ان
وں کے دامن پر غیر ضروری طور پر اپنی صفائی پیش کرنے یا اعتذار کا
ہ اپنانے کا کوئی داغ بہت مشکل سے دکھلایا جاسکتا ہے۔ مولانا آزاد
معاملہ اظہر من الشمس ہے۔ مولانا حسین احمد نے "قوم" کے لفظ کی تعبیر
سلسلے میں علامہ اقبال کا جو طنز برداشت کیا تھا اس سے بھی لوگ ناواقف
ہیں، البتہ شیخ عبداللہ کی تصویر اس سچائی کے باوجود کہ وہ دو قومی
ریے کے مخالف تھے ایک پاکستان نواز کی حیثیت سے بھی پیش کی گئی —
۔ کہ تقسیم کے بعد دہلی کے ایک جلسہ میں شیخ عبداللہ نے بہت واضح الفاظ
ں اپنے نقطۂ نظر کو اس طرح پیش کیا تھا۔

"۔ عام ہندو، مسلمان، سکھ نہیں جانتے کہ ملک کیوں تقسیم ہوا ہے، کچھ لوگ طاقت کے استعمال میں شرکت نہیں چاہتے تھے اور بلا شرکت غیرے طاقت استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ملک کو تقسیم کرنا پڑا۔ ملک کے تقسیم کے مطالبے کی مسلمانوں کی جماعتوں نے بڑی شدت سے مخالفت کی تھی۔ آج قوم پرستی اور وطن پرستی کا دعویٰ کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مسلمان رہنماؤں بالخصوص حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا آزاد نے تقسیم کی مخالفت کر کے کیا کیا مصیبتیں برداشت کیں۔ ہم لوگوں نے تقسیم کی مخالفت ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے نہیں کی تھی، بلکہ حق سمجھ کر کی تھی —"

شیخ عبداللہ نے اور بھی بہت سے موقعوں پر دو قومی نظریے کے خلاف باتیں کیں۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ

"مسلمانوں اور ہندوؤں کے مسائل الگ الگ ہو سکتے ہیں مگر ہندو اور مسلمان دو قومیں نہیں ہیں"۔

اس نوع کی وضاحت کے بعد کسی صفائی کے پیش کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی —— اب رہی بات سیاسی مصالح کی تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ریاستِ جموں و کشمیر کے معاملے میں شیخ عبداللہ کے خیالات ایسے یقیناً رہے جیسے ہندوستان کی مجموعی صورت حال میں قابلِ اعتراض قرار دیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ شیخ عبداللہ کا امتیاز اور ان کی انفرادیت سیاسی مصالح سے کہیں بلند رہی۔ انھوں نے ملک کے دوسرے سیاسی رہنماؤں کے برخلاف خود کو ایک مخصوص علاقے کے مسائل تک محدود رکھا۔ اگر علاقہ، زبان، مذہبی گروہ یا چند مخصوص مسائل تک اپنے آپ کو محدود رکھ کر لائحۂ عمل مرتب کرنا اور ایک طے شدہ دائرے میں اپنے کام کو سمیٹے رکھنا فرقہ پرستی ہے تو ایسی فرقہ پرستی کے اتہام کو بخوشی برداشت کرنا چاہیے۔ شیخ عبداللہ نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک، سولہ سال کے عرصے میں کشمیر کی سرسبز و شاداب سرزمین پر پرورش پانے والے ویران اور کھلے انسانی معاشرے کو اپنا خون دے کر سینچا تھا، اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ وہ آزادی کے بعد کی بدلی ہوئی صورت حال میں بھی اپنا دائرۂ کار اسی علاقے میں محدود رکھتے۔

شیخ عبداللہ خاندانی طور سے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اگر وہ چاہتے تو بڑے آرام کی زندگی گزار سکتے تھے۔ مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم ختم کرنے کے بعد سے وہ مسلسل اسی جدوجہد میں مصروف رہے کہ وادیٔ کشمیر کے عوام کو آزادی کی زندگی کا مفہوم سمجھا سکیں۔ انھوں نے درس و تدریس کا پیشہ اپنایا مگر عوامی مسائل میں دلچسپی لینے کے جرم میں ملازمت سے برطرف ہونا پڑا۔ اس وقت کشمیر میں مہاراجہ کے ظلم و جور اور آمرانہ استبداد کا وہ عالم تھا جو انیسویں صدی کے روس میں وہاں

ی افغان حاکموں کا رہا ہوگا۔ شیخ عبداللہ نے اپنی آنکھوں سے
مہاراجہ کے حکم پر بے قصور لوگوں کا قتل و خون اور ان پر روا
ے والی بربریت دیکھی تھی۔ مگر پھر بھی وہ محتاط انداز میں ہی
کی جدوجہد میں مصروف تھے کہ اچانک ایک ایسا واقعہ رونما ہوا
شیخ سے ساری احتیاط اور میانہ روی چھین لی۔ ۱۹۳۱ء میں
عوام پر لب کشائی کے جرم میں فائرنگ ہوئی، شیخ عبداللہ بھی
موجود تھے۔ وہ ایک زخمی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے
نے یہ کہتے ہوئے دم توڑ دیا کہ "عبداللہ ہم نے اپنا فرض پورا
اب دیکھنا ہے کہ آگے تم کیا کچھ کر سکوگے۔" اس واقعے نے شیخ
یں کھول دیں اور اس طرح وہ قومی غیرت و حمیت کے ایسے احساس
چار ہوئے کہ اس کے بعد وہ مرد مجاہد تھا اور آزمائش و ابتلا کے پے در
۔ سری نگر میں جب شیخ نے سیاسی صورت حال پر بحث و مباحثہ
سے 'اسٹڈی سرکل' قائم کیا تو ان پر باغی ہونے کا شبہ ظاہر کیا
۱۹۳۲ء میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس قائم کی تو ان کی تحریک کو
کوشش کی گئی۔ شیخ کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھی جانے لگی اور
بہانوں سے ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جاتے رہے اور
وقفہ وقفہ سے گرفتار یا سیاسی سازشوں کا شکار ہونا پڑا۔

شیر کشمیر نے ابتدا سے ہی جس نظام حکومت پر انگشت نمائی شروع کی
اس کے نمائندہ مہاراجہ ہری سنگھ تھے۔ ہری سنگھ نے اپنی زیر اقتدار
یا کے معاملے میں کئی موقعوں پر فرقہ پرستانہ انداز بھی اختیار کیا۔ ان کی ہمدردیاں
کشمیر میں بسنے والی اکثریت کے ساتھ بہر حال نہ تھیں۔ ایسے عالم میں
اکثریت میں جو بہر حال مسلمانوں کی تھی، فرقہ پرستی کے احساسات کا جنم
کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ مگر شیر کشمیر نے اس توازن کو ساری زندگی
رکھا کہ ان کی تحریک کو صرف مسلمانوں کے ساتھ وابستہ نہ تصور کیا
، چنانچہ انھوں نے اپنی پارٹی کے نام پر نظر ثانی کی اور اس کا نام ۱۹۳۸ء
یل کر کے نیشنل کانفرنس رکھ دیا۔ نیشنل کانفرنس کی کارکردگی
ے باہم کے درس کا نتیجہ تھا کہ تقسیم ہند کے موقع پر پورے ملک میں
رانہ عصبیت کی مشتعل آگ کی لپٹوں سے وادیٔ کشمیر محفوظ رہا ــــــ
یر کی انسان دوستی اور غیر فرقہ پرستانہ نقطہ نظر کا اندازہ اس بات
یا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۸ء میں رہائی کے بعد جب ایک رپورٹر نے

مقبول بندوں کی شان

اس کا دل قوم کی دردمندی سے لبریز تھا۔ عمر بھر اسی دھن میں لگا
رہا اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دلیرانہ وار کام کرتے کرتے دنیا سے چل بسا
اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا، نہ مرنے کو۔ جب مرا تو کفن کے لیے ایک پیسہ
نہ نکلا۔ غیروں نے اپنے خرچ سے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ یہ ہے مقبول
بندوں کی شان۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

ان سے دریافت کیا کہ "آپ کشمیر نیشنل کانفرنس کے صدر تھے پھر آپ
ریاستی عوامی کانفرنس میں کیسے شامل ہوگئے؟" تو انھوں نے اپنے جواب
میں یہ جملے کہے۔

"ایک مرتبہ کشمیر کا دورہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ
خیال پیدا ہوا کہ میں دوسری ریاستوں کا بھی دورہ
کروں، چنانچہ میں نے ریاست حیدرآباد کا دورہ کیا۔
حیدرآباد کا دورہ کرنے کے بعد میں نے پوری شدّت کے
ساتھ محسوس کیا کہ کشمیر کا راجہ ہندو ہے اور وہاں کی
اکثریتی رعایا انتہائی پریشان ہے۔ اسی طرح حیدرآباد کا
نظام مسلمان ہے اور وہاں کی اکثریتی ہندو رعایا پریشان
ہے۔ میں نے سوچا مرض ایک ہے، ـــــ سوال ہندو اور
مسلمان کا نہیں ہے، اس لیے علاج بھی ایک ہی ہونا چاہیے
یہی سبب تھا کہ میں ریاستی عوامی کانفرنس میں شامل ہوگیا
جو سارے ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں پھیلی
ہوئی تھی۔"

آزادی کے بعد بھی شیر کشمیر کا یہی انداز نظر برقرار رہا اور اس حقیقت
کے باوجود کہ ان کے استاد معنوی علامہ اقبال نے حضرت مولانا حسین احمد
مدنیؒ کو 'قوم و ملت' سے 'وطنیت' مراد لینے کی پاداش میں یہ کہہ کر
معتوب کیا تھا کہ:

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

اصل کام

ان قدروں کی شناخت جنھیں ہمیں راہنما بنانا ہے - ایک ہلکا سا ابتدائی کام ہے - حقیقی اور مہتم طلب کام یہ ہے کہ ان قدروں کو برتا جائے، ان میں عمل سے جان ڈالی جائے۔ قدروں کا جہاں تک تعلق ہے وہ جریدۂ عالم پر ثبت ہیں پتھروں پر کندہ اور زرّیں مخطوطات میں قلم بند ہیں ہمیں ان پر اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کانٹے کی بات یہ ہے کہ انسانوں کے افعال سے قدروں کو زندہ رکھا جائے

جان گارڈنر

پھر بھی شیخ عبداللہ نے مولانا مدنی کے ہی راستے کو اپنایا اور اقبال کی یہ مذہبی تعبیر ہمیشہ ان کو ناقابل قبول محسوس ہوئی ـــــ اس کا یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ شیخ صاحب اسلامی تعلیمات سے کما حقہ' واقف نہ تھے۔ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ کے پس منظر میں انھوں نے اسی رویّے کو ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کا رویّہ سمجھا تھا۔ شیخ نے اپنی پوری زندگی میں یہ کوشش برقرار رکھی کہ ذاتی یا اجتماعی معاملات میں ان کا کوئی قدم قرآنی تعلیمات کے خلاف نہ پڑنے پائے۔ وہ رسول کریم کے اسوۂ حسنہ سے اس حد تک متاثر تھے کہ بلراج مدھوک جیسے انتہا پسند اور جارحانہ بیانات دینے والے شخص پر اظہار خیال کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کم و بیش رسول کریم کے الفاظ میں اپنے دشمن کو دعا دی تھی۔ انھوں نے کہا کہ "میں مدھوک صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ جو باتیں کرتے ہیں، میں ان کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو سیدھے راستے پر لائے۔"

دیوبند میں منعقدہ جمیعۃ العلماء ہند کے جلسے میں شیخ عبداللہ نے جو باتیں کہی تھیں، ان سے قرآن اور سنت پر ان کے بے پناہ اعتماد و یقین کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ صاحب نے دوران تقریر کہا تھا کہ

"آپ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہونی چاہیے، جس سے آپ اُس مرکز سے ہٹ جائیں جس سے آپ وابستہ ہیں۔ وہ مرکز ہے قرآن اور سنتِ رسولؐ۔ وہی آپ کی زندگی کا مینار ہے۔ جس طرح طوفان خیز سمندر میں ڈوبنے والے جہاز کے لوگوں کی نگاہ مینارۂ نور کی طرف ہوتی ہے اور اگر اس روشنی سے نگاہ ہٹ گئی تو جہاز ڈوب گیا۔ آپ کے لیے روشنی کا مینار اسوۂ حسنہ ہے، قرآن کریم ہے۔ اگر آپ کی نگاہ اس روشنی سے ہٹ گئی تو آپ کی زندگی کا جہاز بچ نہیں سکتا ـــــ"

شیر کشمیر نے اسلامی تعلیمات کا جہاں نہایت غائر مطالعہ کیا تھا وہیں ان پر عمل پیرا ہونے پر بھی ساری زندگی زور دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنی یادداشت میں لکھا تھا کہ ان کے کسب فیض کا وسیلہ قرآن و سنت تو تھا ہی، مگر اسلامی تاریخ کے مدوجزر اور اقبال کی شاعری نے سیاسی اور سماجی معاملات میں بھی قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی ـــــ شیر کشمیر اقبال ہی کی طرح رہبانیت کو مذہب اسلام کی روح کے خلاف سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے سماجی و سیاسی معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں مذہبی احکامات پر عمل پیرا رہنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا آئیڈیل اقبال کا مرد مومن تھا، جسے اپنے مقصد سے غیر معمولی عشق ہوتا ہے اور جس کا کوئی نقش خون جگر کی آمیزش کے بغیر اور ہر نغمہ، آہنگ دل و جان کے ربط سے الگ نامکمل رہتا ہے ـــــ انھوں نے تادم حیات اسی ربط کی تلاش اور اس کی تکمیل کی کاوش برقرار رکھی۔ شیر کشمیر کی انفرادیت اور اُن کا امتیاز اپنے حدود کو پہچاننے اور ایک مخصوص دائرہ کار تک اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں مضمر ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا بحران رہنماؤں کی ہمہ جہتی اور غیر محدود مسائل کا پیدا کردہ ہے ـــــ جب جذباتی سیاست کی گرد بیٹھ جائے گی اور لمحاتی شورشوں کی بنا پر عظمت کا انحصار نہ ہوگا تب کہیں جا کر شیر کشمیر کی صحیح قدر و قیمت کا ادراک کیا جائے گا۔

شیخ صاحب ایک گنج گراں مایہ تھے اور ان کی تلافی شاید کسی اور سیاسی رہنما سے ممکن نہ ہو سکے گی۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

★★

الطاف حسین ندوی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سرسیّد اور مذہب

سرسیّد احمد خاں ابتدا ہی سے دین کے شیدائی اور مذہب کے پرستار تھے۔ انھیں بچپن ہی سے ایسا ماحول میسر آیا جس نے ان کے اسلامی شعور کو بیدار کیا اور ان کے دینی جذبات کو تقویت پہنچائی۔ دین کی تکریم و تعظیم انھیں ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے اسلام کی حقانیت اور اس کی صداقت کا یقین اپنے خاندان سے حاصل کیا تھا۔ سرسیّد کی والدہ ایک دین دار اور خدا ترس خاتون تھیں۔ وہ مذہب کے معاملے میں بڑی راسخ العقیدہ تھیں اور اوہام و خرافات پر بالکل یقین نہیں رکھتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شاہ غلام علیؒ جیسے پابندِ شرع بزرگ سے بیعت رکھتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے کبھی نہ کوئی منّت مانی اور نہ نذر و نیاز کی۔ انھیں ایام و اوقات کی سعادت و نحوست پر بھی کوئی اعتقاد نہ تھا۔ سرسیّد کے اوپر مذہب کے ان ابتدائی نقوش اور معتقدات کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے بڑے ہونے کے بعد اسلامی عقائد اور تصوّرات کے متعلق اپنی تحقیق و تنقیح سے جو خیالات قائم کیے تھے وہ ان کی والدہ کے خیالات سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ سرسیّد خود کہا کرتے تھے کہ میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک و بدعت کا اطلاق ہو سکے، نہیں پاتا۔ سرسیّد کے والد بھی ایک درویش صفت اور پرہیزگار انسان تھے۔ راست بازی اور بے نیازی ان کی طبیعت کا خاصہ تھیں۔ سرسیّد کے اندر یہ دونوں خصوصیات ان کے والد کے اثر ہی سے آئی تھیں۔

اس کے ساتھ ساتھ سرسیّد نے جس فضا میں پرورش پائی اور جس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی وہاں خالص دینی تصوّرات اور اسلامی افکار کے دو سرچشمے بھی جاری تھے۔ یہ دونوں سرچشمے اپنے اندر حقیقی اسلام کی پوری توانائی اور روانی رکھتے تھے اور ان سے دہلی اور بیرونِ دہلی کے بے شمار بندگانِ خدا فیض یاب ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک سرچشمہ تو شاہ غلام علیؒ کا تھا اور دوسرا شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کا۔ سرسیّد کا ددھیال شاہ غلام علیؒ کے چشمۂ رشد و ہدایت سے سیراب ہو رہا تھا اور ننھیال شاہ عبدالعزیزؒ کے چشمۂ صافی سے دین و شریعت کا علم و ایقان حاصل کر رہا تھا۔ سرسیّد کی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ بیک وقت ان دونوں سرچشموں سے سیراب ہوئے۔ آگے چل کر سرسیّد نے دین کو سمجھنے کی شعوری کوشش کی اور اس کا براہِ راست مطالعہ کرنے کی غرض سے انھوں نے مولوی نوازش علی دہلوی سے فقہ اور اصول فقہ کا درس لیا۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے قرآن فہمی کے لیے عربی ادب پڑھا اور مولانا مخصوص اللہ دہلوی سے جو شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدینؒ کے فرزند تھے، حدیث کا علم حاصل کیا اور قرآن کی سند لی۔ اس طرح والدین کی مذہبیت، تصوّف سے خاندانی نسبت، شاہ غلام علیؒ سے عقیدت اور شاہ ولی اللہؒ کی تجدید و احیائے دین کی کوششوں اور شعوری طور پر دینی علوم سے واقفیت کی بنا پر مذہب سے سرسیّد کی وابستگی بہت گہری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو خدا کا آخری اور مکمل دین سمجھتے تھے۔ انھیں سرورِ کائنات اور ان کے صحابۂ کرامؓ سے غایت درجہ کا عشق تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

خدا دارم، دل بریاں زِ عشقِ مصطفیٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر، ساز و سامانِ کہ من دارم

اسی جذبۂ محبت کے تحت انھوں نے فتح پور سیکری کے زمانۂ قیام ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۶ء میں "جلاء القلوب بذکر المحبوب" نامی رسالے کی تالیف کی۔ اس رسالہ میں سرسیّد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کا ذکر کیا ہے۔ اسی زمانے میں ایک رسالہ "تحفۂ حسن" بھی لکھا۔ ایک اور رسالہ ۱۸۴۹ء میں "کلمۃ الحق" کے نام سے مرتب کیا اور اس میں پیری و مریدی اور بیعت کے مروّجہ طریقوں کی مخالفت کی۔ ۱۸۵۰ء میں ایک دوسرا رسالہ "راہِ سنّت در ردِ بدعت" قلم بند کیا اور لوگوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ قرآن و سنت کی تعلیم اور زندگی میں دین کی پابندی کے ضمن میں

منشور

سرسید کی دی ہوئی اردو کا منشور تھا کہ —
"اب سے اردو کا دبستان جغرافیائی حدود یا صنائع و بدائع کا مینا بازار نہیں بلکہ زندگی، زمانہ اور علم و ادب کے تقاضوں اور تکملوں کا کھلا ہوا بازارِ مصر ہوگا۔

سرسید علمائے اسلام کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا کا کلام اور رسول کا کلام ہرگز خلافِ واقعہ نہیں ہو سکتا۔ وہ فرماتے ہیں

"قرآن مجید بلا شبہ کلام الٰہی ہے۔ کوئی حرف اس کا نہ خلافِ حقیقت ہے اور نہ خلاف واقعہ۔ قرآن مجید کی اگر کوئی آیت ہم کو بظاہر خلافِ واقعہ یا خلافِ حقیقت معلوم ہو تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس آیت کا مطلب سمجھنے میں ہم سے غلطی ہوئی یا جس کو ہم نے حقیقت اور واقعہ سمجھا ہے، اس میں غلطی کی ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وافعال میں بالکل سچائی ہے۔ مصلحتِ وقت کی نسبت رسول کی طرف کرنی سخت بے ادبی ہے جس میں خوفِ کفر ہے کوئی انسان سوائے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسا نہیں جس کا قول و فعل، بلا سندِ صحیح، دینیات میں قابلِ تسلیم ہو یا جس کے عدمِ تسلیم سے کفر لازم آتا ہو۔ اس کے برخلاف اعتقاد رکھنا شرک فی النبوت ہے۔"

ان اعتقادات اور نظریات کا پرتو ہمیں سرسید کی زندگی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ حتی الامکان ان پر کاربند رہے اور ان سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔

اسلام پر سرسید کا یقین بہت پختہ اور مضبوط تھا۔ وہ اس کی حقانیت اور صداقت پر غور و فکر کے بعد ایمان لائے تھے۔ چنانچہ جب کچھ مخالف لوگوں نے ان کے اسلام پر شبہ کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا اگر دینِ اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام ترک کر دیتا۔ وہ ایک خط میں سید مہدی علی خاں سے بھی یہی بات کہتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں۔ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقیناً مذہب کو چھوڑ دیتا۔"

اسلام پر ان کا یقین اپنی ذات کی حد تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ وہ اسے پوری قوم کے لیے بھی ناگزیر سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک تقریر میں فرمایا:

ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یاد رکھو جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تبھی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا اور جس پر تم کو مرنا ہے، اسے قائم رکھنے سے ہماری قوم، قوم ہے۔"

سرسید کے زمانہ میں اسلام کے استحکام، دین کی بقا اور اس کی حفاظت کو کئی محاذوں پر مقابلہ درپیش تھا اور مختلف قسم کی آزمائشیں اس کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھیں۔ اس آڑے وقت میں سرسید نے اپنی دینی فراست اور مومنانہ بصیرت کے ذریعہ اسلام کو ان خطرات سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی اور محاذ پر مخالفین کے حملوں کا سینہ سپر ہو کر جواب دیا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے بہترین اسباب و ذرائع سے کام لیا اور وہ اس میدان میں جدید ترین اسلحہ سے لیس ہو کر دشمن کے مقابلے میں آئے۔ اسباب و ذرائع کے اختیار کرنے اور انھیں اسلام کے حق میں کارگر سمجھنے کے سلسلے میں ان سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ لیکن اسلام کے معاملے میں ان کی نیت اور ان کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سچے دل سے اسلام کی برتری کے لیے لڑے اور پوری نیک نیتی سے اس کی بقا اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ ان کے دور میں اسلام کو جن مختلف محاذوں کی طرف سے خطرات لاحق تھے، ان میں سے تین بڑے محاذ یہ تھے۔

۱۔ **اسلام کے پیرو** :- سرسید کے عہد میں مذہب کا تصور محدود ہو چکا تھا اور مسلمانوں نے اسے چند اعمال اور کچھ فقہی مسائل کے اندر محصور کر دیا تھا۔ عام مسلمانوں کا ذہن تقلیدی تھا اور ان کے اندر مذہب کے نام پر بہت سی غیر مذہبی باتیں رائج تھیں۔ تقلید سے ان کے ذہن چونکہ جامد

ہو چکے تھے اس لیے تنگ نظری، تعصب اور باہمی اختلاف کا کافی زور تھا۔ شاہ ولی اللہؒ کی تحریک اور سید احمد شہید کی تحریک نے مسلمانوں کو جمود و تعطل سے باہر نکالا لیکن آہستہ آہستہ وہ پھر اسی کا شکار ہو گئے۔ سرسید نے محسوس کیا کہ مسلمان اپنے جمود اور تقلیدی ذہن کی بنا پر ہی مغربی علوم سائنس اور نئی تہذیب سے دور بھاگ رہے ہیں اور اپنے عمل سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ گویا اسلام ان چیزوں کا مخالف ہے۔ انہی خیالات کے پیش نظر سرسید نے اسلام کا ایک متحرک اور ترقی پسندانہ تصور پیش کیا اور یہ بتلایا کہ وہ سائنس اور ترقی کا مخالف نہیں ہے۔ سرسید نے یہ بھی ثابت کیا کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور وہ ہر زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا چیلنج قبول کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مذہب کے بہت سے عقائد کی عقلی تاویل کی اور انھیں فطرت کے عین مطابق ثابت کیا۔ انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کیا کہ جو عقائد فطرت کے مطابق ثابت نہ ہو سکے انھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ سرسید سے علماء کے شدید اختلاف کی اصل وجہ یہی انکار ہے۔ سرسید جمود کے سخت مخالف تھے۔ اس لیے انھوں نے تقلید اور تعصب کے خلاف بہت کچھ لکھا اور مسلمانوں کو اس سے بچانے کی سر توڑ کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ "جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا اور یہ اسلام کے حق میں سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔"

قرآن اور اس کی تعلیمات چونکہ ارتقاے انسانی کے ہر مرحلے پر چراغِ راہ ہیں اور قیامت تک انسان کی رہبری اس کی ذمہ داری ہے اس لیے قرآنی آیات کی توجیہ اور تفسیر میں عصری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کے مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماج کے بدلتے ہوئے حالات، علوم و فنون کے انکشافات اور نئے ذہنی رجحانات کو سامنے رکھے اور ان کی روشنی میں آیات کی ایسی تشریح پیش کرے جس سے دینی روح بھی برقرار رہ سکے اور موجودہ خدشات و شبہات کا ازالہ بھی ہو سکے۔ سرسید نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اسی اصول کے پیش نظر عصرِ جدید کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن فہمی کے لیے اس کی ایسی ہی توجیہ ہونی چاہیے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہؓ کے زمانہ میں تھی۔ روایتوں کے شوق، لطف بیان اور اعجوبہ پسندی کی خاطر تفسیر میں جو اضافے نظر آتے ہیں وہ سب بعد کی چیزیں ہیں اور ان کی بنیاد

کھو نہ جا....

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش
صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

— اقبال

بڑی حد تک محض قیاسات اور تاریخ نما افسانوں پر قائم ہے۔ علمائے اسلام نے ان تمام چیزوں کو اسرائیلیات کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ذہنوں کو متحیر کرنے نہیں بلکہ روشن کرنے آیا ہے۔ اس نے آفاق اور مظاہرِ کائنات میں ہمیشہ غور و فکر کی دعوت دی ہے اور اسباب سے مسبب کا پتہ لگانے کی تلقین کی ہے۔ قرآن کے نقطۂ نظر کے مطابق کلام بھی آیتِ الٰہی ہے اور مظاہرِ قدرت بھی آیتِ الٰہی ہیں۔ اس لیے قرآنی آیت کی توجیہ اور تفسیر میں سائنسی تحقیقات، جدید انکشافات اور انسانی تجسس کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید کے نزدیک فطرت فعلِ الٰہی ہے اور قرآن قولِ الٰہی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قول اور فعل میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے مظاہرِ قدرت کو دیکھ کر قادرِ مطلق تک پہنچنا ایک معروف طریقہ رہا ہے۔ صوفیائے حق کے یہاں معرفتِ الٰہی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔

سراپا ہیں اس کے نظر کر کے تم
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے

سرسید نے اپنی تفسیر میں ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھا ہے اور اس سلسلے میں کچھ اجتہادات بھی کیے ہیں۔ اجتہادات میں ان سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں جن سے خود سرسید کے رفقاء نے اختلاف کیا ہے۔

۲۔ **مسیحی حکومت**: ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان منافرت اور مغایرت کی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس ہنگامے میں انگریزوں نے مسلمانوں ہی سے اقتدار چھینا تھا اور ان کے ظلم و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمان ہی بنے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی مسیحی حکومت کے قیام کے بعد

> سرسید نے مذہب اور سائنس میں دائمی صلح کی بنیاد ڈالی۔
> —— حالی

سرسید نے مذہب کی راہ سے اس منافرت کو دور کرنے کی کوشش اور اس کی جگہ مفاہمت و مصالحت کی راہ اختیار کی۔ اس سلسلے میں سرسید نے اسلام اور مسیحیت میں مماثلت کی راہیں تلاش کیں اور ان اصولوں کو منظرِ عام پر لائے، جو اسلام اور مسیحیت میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح انھوں نے عیسائیوں کی اُن بدگمانیوں کو دور کیا جو اُن کے اندر قرآن و سنت کے بارے میں عام تھیں اور مسلمانوں کی ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جو ان کے ذہنوں میں بائیبل اور دینِ مسیح سے متعلق تھیں۔ سرسید نے اسی مقصد کی خاطر بائیبل کی ایک تفسیر بھی لکھی اور اُس کا نام "تبیین الکلام" رکھا۔ اس تفسیر کی تیاری کے سلسلے میں انھوں نے عہد نامۂ عتیق اور عہد نامہ جدید کا گہرا مطالعہ کیا اور قرآن و حدیث سے ان عہد ناموں کی تطبیق کر کے اسلام اور عیسائیت میں اتحاد کی بنیادیں استوار کیں۔ انھوں نے اپنی تحقیق کے ذریعے موجودہ عیسائیت کو کہ جس کی بنیاد عقیدۂ تثلیث، کفارہ اور تکذیب محمدؐ پر ہے بالکل غلط ٹھہرایا۔ یہ تفسیر مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے زیادہ پسندیدہ ثابت نہ ہوئی۔ اسی لیے یہ مکمل نہ ہو سکی۔ مگر اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مخاصمانہ مناظرہ کے بجائے افہام و تفہیم اور مصالحت کا طریقہ رائج ہوا۔ "تبیین الکلام" میں سرسید نے اس بات پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے کہ عیسائیت سے قریب ترین اگر کوئی مذہب ہے تو وہ اسلام ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام خوں ریزی، بربریت اور جنگ و جدال کا مذہب نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اخوت و مودت، امن و آشتی اور توافق للبقا کا علمبردار ہے۔

۳۔ **عیسائی مشنری:** سرسید کے زمانے میں اسلام کو ایک اور زبردست خطرہ عیسائی مبلغین سے تھا۔ ان مبلغین کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انھیں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اس لیے یہ پوری طاقت کے ساتھ رفاہی کاموں کے علاوہ اسلام دشمنی کا بھی منظم پروگرام چلا رہے تھے۔ وہ قرآن و حدیث نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دوسرے احکام مثلاً طلاق، تعدد ازواج اور غلامی وغیرہ پر رکیک حملے کر کے مسلم نوجوانوں اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو دین سے برگشتہ کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" چار جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں میور نے اسلام کی تعلیمات پر کاری ضرب لگانے کی پوری کوشش کی تھی۔ سرسید نے اپنی دینی حمیت اور اسلام کی محبت کی بنا پر اس کتاب کا بہت ہی مدلل، سائنٹفک اور بھرپور علمی جواب "خطباتِ احمدیہ" کی شکل میں دیا۔ یہ پوری کتاب عیسائی علماء اور پادریوں کے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ اس میں سرسید نے رسول کی انسانی حیثیت، ان کی خاندانی عظمت، رسول کی اعلیٰ دماغی بصیرت اور غیر معمولی فہم و فراست کو نہایت علمی اور تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں انھوں نے مختلف معاشرتی مسائل اور دوسرے دنیاوی معاملات میں اسلام کی رہنمائی اور ہدایت کو بھی بہ صراحت ظاہر کیا ہے۔ سرسید علیہ الرحمۃ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک اور اسلامی تعلیمات سے جو گہری محبت اور حد درجہ عقیدت تھی، اس کا اندازہ "خطباتِ احمدیہ" سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے جب ذاتِ اقدسؐ پر ناروا حملے دیکھے تو اس سے انھیں بے حد اضطراب ہوا اور وہ دنیا کی ہر تکلیف کو اس کے مقابلے میں ہیچ سمجھنے لگے۔ انھوں نے لندن سے نواب محسن الملک کو لکھا:۔

> اِن دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا۔ اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔"

سرسید اس کتاب کی تیاری کو سب سے بڑا دینی فریضہ خیال کرتے تھے چنانچہ اپنے ایک خط میں وہ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آناج کے برابر سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔ خطباتِ احمدیہ سرسید کے دینی جوش اور دینی جذبے کی صحیح عکاسی کرنے کے لیے کافی ہے۔ دین کی خدمت اور اسلام کی حمایت کا جذبہ اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے اور اس سے یہ ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے کہ مذہب کی محبت ان کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔

لعل پرویز

سماج میں بوڑھوں کی ضرورت

جارج برنارڈ شا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی نے ان سے کہا کہ موجودہ نسل، آپ کی نسل کے مقابلے میں زیادہ قدآور ہے" تو برنارڈ شا نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں ــــ ظاہر ہے کہ قدآور تو دکھائی دیں گے ہی کیوں کہ وہ ہمارے کندھوں پر کھڑے ہوئے ہیں۔"

اِس بیان میں بڑی صداقت ہے۔ تہذیبوں کی عظمت اور توانائی کا انحصار درختوں کی طرح ان کی جڑوں پر ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کی جھنڈی والی دوڑ ہے کہ ایک دوڑنے والا، اپنی منزل پر پہنچ کر وہ جھنڈی اگلے کے سپرد کرتا ہے، جو اس کو لے کر دوڑتا ہے اور وہ جھنڈی پھر اگلی منزل پر کسی دوسرے کو دے دیتا ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اسی لیے جب آگے والا آگے نکلتا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اس کے آگے نکلنے میں پہلے والے کا بھی احترام ہے۔ اور اسی لیے جب نئی نسل کوئی بڑا کام کرتی ہے تو اس میں پچھلی نسل کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ دنیا راکٹ کی منزل میں پہنچ گئی ہے لیکن جس آدمی نے پہیا ایجاد کیا تھا، اس کی حکمت بھی اس میں شامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں بوڑھوں کی بڑائی کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ تجربے اور دانائی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

مغرب میں بوڑھوں کو سماج سے علیحدہ کرنے کی کوشش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ہمارا سماج مغرب سے بہت مختلف ہے۔ مغرب میں جہاں فرد کی انفرادیت کا بڑا ڈھول پیٹا جاتا ہے، وہاں بوڑھے کو اس انفرادی آزادی سے محروم کرنے کا عمل کارفرما ہے۔ جیسے انسان بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھتا ہے وہ معاشرے سے بھی الگ ہوتا ہے۔ جن لوگوں سے ان کا خون کا رشتہ ہے وہ لوگ بھی ان سے اپنا ناتا توڑ لینا چاہتے ہیں۔ اب وہ چلتا پھرتا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ زندہ ہے۔ اس کی انفرادی آزادی محض اس حد تک رہ جاتی ہے کہ وہ چل پھر سکتا ہے لیکن معاشرے میں رہنے کے معنی محض چلنا پھرنا نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں حصّہ لینا ہوتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں بوڑھے کو ایک اہم سماجی حیثیت حاصل ہے۔ بیشتر کر خاندان میں اس کی حیثیت ایک سربراہ کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بال بچّوں کی زندگی کی سمت مقرر کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اس چھوٹے سے خاندان کا مشیر بھی ہوتا ہے اور ان کا ذمہ دار بھی۔

جب میں بوڑھے کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو اس سے مراد محض مرد نہیں بلکہ عورتیں بھی ہیں۔ اسی لیے کہ بوڑھی عورتیں گھر میں ایک مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ خاندانی روایات کی پاسبان ہوتی ہیں ــــ وہ بے لکھے خاندانی قانونوں کو عمل درآمد کرانے میں مددگار ہوتی ہیں ــــ وہ رشتوں کے اعتبار سے ہر ایک کے حقوق و فرائض سے نہ صرف واقف ہوتی ہیں بلکہ ان کی رہنمائی میں ان حقوق و فرائض پر عمل ہوتا ہے۔ معاشرتی قوانین اپنی جگہ پر ــــ لیکن ہمارے معاشرے میں روایات اور رسومات کو ان سے کم حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اور ان روایات اور رسومات نے ہندوستانی معاشرے کو بکھرنے سے بچا رکھا ہے۔

بڑے بوڑھے نہ صرف یہ کہ ان کی پاسبانی کرتے ہیں ــــ ان پر عمل کرواتے ہیں۔ وہ گھر کے اندر اور کبھی کبھی باہر بھی "عدالت" کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ گھر کے لڑائی جھگڑے، ان کے تصفیوں کے محتاج ہوتے ہیں اور گھر کا ہر فرد ان کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ وہ اپنے خاندان کا ڈکٹیٹر ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈکٹیٹر شپ ہندوستانی مزاج سے بعید ہے۔ ہندوستانی مزاج کبھی بھی ڈکٹیٹر شپ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی معاشی تکلیف برداشت کر لیتا ہے۔ موسموں سے لڑ جھگڑ لیتا ہے اور ان کے سامنے ہتھیار بھی ڈال دیتا ہے، چھوٹی موٹی زیادتی برداشت کر لیتا ہے لیکن وہ اپنی انفرادی آزادی کو کبھی کسی دوسرے کے سپرد نہیں کر سکتا۔ یہ انفرادی آزادی اسے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اپنی زبان بندی

گوارہ نہیں کرتا کہ اس کے بغیر اسے روحانی تسکین حاصل نہیں ہو سکتی۔
بوڑھے کی یہ حیثیت نہ صرف اپنے گھر میں ہوتی ہے، باہر بھی اس کو
عزت سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے پنچ کے بیچ پر بٹھایا جاتا ہے۔ سب لوگ اس
کے سامنے اپنی شکایتیں اور اپنے جھگڑے رکھتے ہیں۔ اس وقت اس کی
حیثیت پنچ پرمیشور کی ہوتی ہے۔ وہ حق اور انصاف کی روشنی میں اپنے
فیصلے کرتا ہے۔ وہ اس وقت انصاف کے ترازو کو ہاتھ میں لینے کے بعد
اپنے پرائے میں امتیاز نہیں کرتا۔ یہاں اس کی عمر کے تجربے اس کی رہنمائی
کرتے ہیں۔ ایک بڑی اور بامصرف زندگی گزار دینے کے بعد وہ خود غرضی
کی سطح سے اپنے آپ کو بلند کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارا گاؤں اس
کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔

ہندوستانی بوڑھا، علم عقل اور تجربے کا دوسرا نام ہے۔ وہ
ایک بڑی روایت کا حامل ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ آنے والی نسل کو
اپنا سب کچھ دے جو اس نے برسوں کی محنت، مشقت اور ریاضت کے بعد
حاصل کیا ہے۔ اور وہ ایسا کرتا بھی ہے لیکن کیا یہ عجیب نہیں کہ ہم اس کے
مالی ورثے کو بلا جھجک قبول کر لیں، لیکن اس کے تہذیبی ورثہ سے اپنے آپ
کو بے نیاز سمجھیں۔ کیا یہ خواہش بہت زیادہ نہیں کہ ہم از سر نو اپنے تجربے
سے ہی سب کچھ حاصل کریں۔ کیا یہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا
تھو تھو نہیں ہے۔ حالاں کہ جس کو کڑوا سمجھ کے تھوکا جا رہا ہے، وہ اتنا
کڑوا بھی نہیں ہے۔

شاید ہندوستانی معاشرے نے یہ بات روز اوّل سے ہی سمجھ
لی ہے کہ بوڑھے بھی سماج کا اٹوٹ انگ ہوتے ہیں۔ ان کو اگر توڑ
دیا جائے تو ہمارا معاشرہ لولا اور لنگڑا ہو جائے گا۔ اس لیے سماج
میں ان کا کردار مثبت حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سرکاری ملازمت سے
وہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر سبکدوش ہوتے ہیں، لیکن وہ معاشرے سے
سبکدوش نہیں ہوتے۔

یہ بوڑھا جسے لوگ غلطی سے از کار رفتہ بھی سمجھ لیتے ہیں، اس کا ذہن
ایک شاندار کمپیوٹر ہوتا ہے، جس میں زندگی کے تجربے، انسانی رشتوں کی
نزاکتیں، علم و عمل کی سرگرمیاں سب محفوظ ہو جاتے ہیں۔ رات میں بچہ اچانک
رونے لگتا ہے۔ نوجوان ماں اور باپ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان کے بھلے چنگے
بیٹے کو کیا ہوا۔ ماں تو اپنے ہوش و حواس کھونے لگتی ہے۔ اس وقت گھر کا
یہ بزرگ آگے بڑھ کر ان کو تسلی دیتا ہے۔ ان میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور
غور سے بچے کو دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے — "بہو ذرا بستر تو دیکھو۔ یہ کیا
چونٹیاں کاٹ رہی ہیں۔ بغلوں اور جانگوں میں چونٹیاں رینگ رہی ہیں
ماں کے بہلانے سے بچہ کیسے چپ ہو جاتا۔ وہ اپنی تکلیف کو بیان نہ
کر سکتا۔ اور بوڑھی دادی نے بروقت اپنے تجربے سے مدد لی۔ یہ ضرور
نہیں کہ بچے کے چونٹی ہی کاٹ رہی ہو۔ اس کے کان میں درد بھی ہو سکتا
ہے۔ اپنی تکلیف نہیں بیان کر سکتا۔ لیکن بوڑھی دادی غور سے دیکھنے کے
بعد یہ دریافت کر لیتی ہے کہ اس کے کان میں درد ہے۔ وہ سب کو مطمئن
کر دیتی ہے اور طاق میں سے کوئی تیل نکال کر ایک آدھ قطرہ کان میں
ٹپکا دیتی ہے اور ذرا سی دیر میں بچہ خاموش ہو کر سو جاتا ہے۔
گویا یہ بوڑھے اپنے ٹوٹکوں سے اس چھوٹے سے گھر کے بروقت
معالج بھی بن جاتے ہیں۔

بوڑھوں کی ہمہ جہتی حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بعض لوگوں
کا خیال ہے کہ جدید سوسائٹی بوڑھوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ خیال
خام ہے بلکہ میں تو اور آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ آج ان کی جتنی ضرورت
ہے۔ اتنی شاید اس سے پہلے نہیں تھی۔ اب جب کہ نوجوان میاں بیوی دونوں
گھر سے باہر بھی کام کرتے ہیں اُن کو کم از کم آٹھ گھنٹے تو ضرور اپنے منصبی
فرائض کی وجہ سے باہر رہنا پڑتا ہے تو اس وقت ان کے ننھے منے بچے ان
بوڑھوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ملازم ان کی دیکھ
بھال کر لیتے ہوں لیکن ان کو وہ محبت تو نہیں مل سکتی، جو ان کو دادی اور
دادا دے سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے بچوں کی پرورش کرنے میں ہی مد
د معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بلکہ ان بچوں کی ابتدائی تربیت میں بھی بڑا نمایاں
کردار ادا کر سکتے ہیں۔

یہ کہنا کہ حکومت چوں کہ ایک خاص عمر پر بلا وجہ تھوڑا ہی اپنے کارکنوں
کو سبکدوش کرتی ہے سچ ہے لیکن کلی حقیقت نہیں۔ وہ بڑوں کو اس
لیے سبکدوش کرتی ہے کہ نوجوانوں کو موقع فراہم کرے۔ لیکن یہ بھی دیکھا
گیا ہے اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دوسرے لوگ ان کی خدمات حاصل
کر لیتے ہیں اور ان کے علم اور تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیاست کے
میدان میں بڑے اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔ کاروبار کی دنیا میں وہ اپنی
کامیابی کے سکے گاڑتے ہیں۔ ان کے مشورے سے قدم بہ قدم

بیگم نسیم اقتدار علی

اقامتی زندگی کی کچھ جھلکیاں

یکّی بارک یعنی سر سیّد ہال کے کمرہ نمبر ۴۹ کے سامنے ایک نحیف الجثہ
رگ کھڑے ہوئے اس کمرے کو بڑی پُر شوق نگاہوں سے دیکھ رہے
ں۔ دیکھ کیا رہے ہیں گویا ماضی کی یادوں میں کھو کر حال سے بے خبر ہو گئے
ں۔ کمرے کا نوجوان مکین باہر نکل کر دریافت کرتا ہے "کہیے قبلہ کس کی
ں ہے"۔ یہ ذرا سا چونک کر جواب دیتے ہیں۔ "کچھ نہیں برخوردار!
ں کی تلاش نہیں۔ کچھ پرانی یادیں ہم کو یہاں کھینچ لائیں۔ ہم بھی کبھی تمہاری
یہاں رہے تھے۔ ایک دو نہیں پورے سات سال"۔

یہ واقعہ ۱۹۵۳ء کا ہے جب حبیب الرحمٰن خاں صاحب عرف بڑے
ں، جنھیں ہم لوگ میاں کہتے تھے اپنے بڑے صاحبزادے اور میرے والد
ر الرحمٰن خاں صاحب کے پاس اکثر علی گڑھ تشریف لاتے تھے۔ والد
ب اس زمانے میں علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ میاں جب بھی آتے
ی کی عجلت ہوتی۔ کبھی ہفتہ عشرہ سے زیادہ قیام نہیں فرمایا۔ حالاں کہ
وقت ان کے کچھ ساتھی اور دوست علی گڑھ میں موجود تھے۔ جن میں
الدین خاں مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ حمید الدین خاں بریلی کے رہنے
، روہیلہ پٹھان تھے۔ بڑی آن بان کے بزرگ تھے۔ یونیورسٹی میں
فارسی کے صدر اور پروفیسر رہے۔ رٹائرمنٹ کے بعد تار بنگلہ کے
اپنی کوٹھی میں رہتے تھے۔ میاں۔ ، ان کی بے تکلفی کی دوستی تھی۔
ذاکر حسین خاں مرحوم اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے
ں چانسلر تھے۔ حمید الدین خاں کسی بات پر ان سے ناخوش ہو گئے
ے نام ایک خط لکھا اور ایک دن میاں سے کہا "یہ خط تم دے آؤ"۔
انے فرمایا "ڈاک سے بھیج دو۔ میں کیوں تمہارا قاصد بنوں"۔ کہنے
"اگر ڈاک سے بھیجوں گا تو مراد (ذاکر صاحب مرحوم کے .P.A)
ب کر دیں گے"۔ میاں نے کہا "پتہ نہیں تم نے کیا اول جلول لکھا ہے۔ وہ
ے سمدھی ہیں۔ میں نہیں لے جاؤں گا۔ [ذاکر حسین صاحب کی چھوٹی

صاحبزادی کی شادی میاں کے بھتیجے یعنی فضل الرحمٰن خاں صاحب عرف چھوٹے
خاں کے صاحبزادے ڈاکٹر ظلّ الرحمٰن خاں سے ہوئی تھی] حمید الدین خاں
صاحب بگڑ گئے۔ "ہاں ہاں میں تم کو خوب جانتا ہوں۔ تم نے تو عمر بھر انگریزوں
کی غلامی کی ہے۔ بھلا تم کیوں لے جانے لگے"۔ [یہ میاں کی سرکاری ملازمت
پر چوٹ تھی۔ وہ ۱۹۴۶ء میں بہ حیثیت کلکٹر ہمیرپور سے رٹائر ہوئے تھے]
میاں ہنس دیے۔ بات ختم ہوئی۔ پتہ نہیں وہ خط ذاکر صاحب کو پہونچا یا
ان کو یونہی خبر لگی کہ خاں صاحب ناراض ہیں۔ وہ از خود ان کے گھر تشریف
لے گئے اور حمید الدین خاں کی ناراضگی یا غلط فہمی دور ہو گئی۔

اس وقت علی گڑھ میں شاہجہانپور کی ایک اور بزرگ شخصیت ڈپٹی
حبیب اللہ خاں صاحب بھی حیات تھے اور اپنی کوٹھی ولایت منزل میں رہتے
تھے۔ میاں کبھی کبھی ان کے پاس بھی تشریف لے جاتے۔

ان کے علاوہ ہسٹری کے مشہور زمانہ پروفیسر محمد حبیب صاحب
بھی میاں کے ساتھیوں میں تھے۔ بدرباغ میں ان کی کوٹھی میرے والد کے
جائے قیام رابعہ منزل سے بالکل قریب تھی۔ لیکن ان سے میاں کا ملنا کم ہوتا
تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پروفیسر حبیب ہمہ تن درس و تدریس
میں لگے رہتے۔ [ان دونوں بزرگوں کا ذکر تفصیل سے پھر پیش کیا جائے گا]

میاں خاندان میں سب سے بڑے تھے اور گھر کی ذمہ داری بہت کم سنی
میں ان پر آن پڑی تھی۔ کئی گاؤں کی زمینداری، فارم اور شہری جائداد
تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی خان بہادر فضل الرحمٰن خاں عرف چھوٹے خاں
مرحوم شروع ہی سے کچھ اس طرح سیاست، وکالت اور فلاحی کاموں میں
الجھے کہ گھر کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ مسلسل تیئیس ۲۳ سال شاہجہانپور
میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے۔ کئی مرتبہ ایم ایل اے رہے اور پھر شہر میں
ایک ڈگری کالج گاندھی فیض عام کے نام سے قائم کیا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے ایک قابل قدر فرزند تھے۔ جن کے حالات زندگی لکھنے کے لیے ایک دفتر

چاہیے ۔ میاں جب تک ملازمت میں رہے ہر پندرھویں دن شاہجہانپور سے منشی کارندے بہی کھاتے کر انھیں حساب کتاب دکھانے اور احکام لینے جاتے رہے ۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد مستقل طور سے گھر آگئے ۔ ہماری دادی مرحومہ کا انتقال بہت پہلے ہوچکا تھا ۔ میاں کی رہائش قلعہ نما مکان کے مردانے حصے میں تھی (سندی ہفت روزہ دھرم یوگ نے میاں کا جو انٹرویو شائع کیا تھا اس میں اس مکان کو حویلی لکھا ہے) لیکن کھانا ہمیشہ ہم لوگوں کے ساتھ زنانے مکان میں کھاتے تھے ۔ رات کے کھانے کے بعد دیر تک باتیں کرتے دلچسپ قصے سناتے ۔ فارسی اور اردو کے بیسیوں اشعار سناتے ۔ ہم لوگوں سے شعر سنتے اور جو پسند آتا اسے نوٹ کر لیتے ۔ ویسے حافظہ اس بلا کا تھا کہ فوراً یاد ہو جاتا ۔ لیجیے اب ان کی کہانی ان کی زبانی سنیے :

میاں کی کہانی ،
میاں کی زبانی

میرے مورثِ اعلیٰ میر داد خاں عرف دیوان میر خلیل صاحب افغانستان سے ہندوستان تشریف لائے اور سلطنتِ مغلیہ میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے ۔ ان کا مقبرہ ہمارے گھر کے سامنے والے وسیع باغ میں آج بھی عظمتِ پارینہ کی یاد دلاتا ہے ۔ میرے والد محمد عثمان خاں مرحوم کو شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے بڑی عقیدت تھی اور اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے ۔ ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا :

"خاں صاحب ! تم شادی کر لو"

عرض کیا "حضرت میرا سن تو اب ساٹھ سے تجاوز کر گیا ہے"

حضرت نے فرمایا : "تو کیا ہوا ! اور ہاں سنو ۔ جب اولاد نرینہ ہو تو بتانا ۔ نام میں رکھوں گا ۔"

والد صاحب مرحوم تین شادیاں کر چکے تھے ۔ اولادِ نرینہ کسی بیوی سے نہ تھی اور نہ کوئی بیوی اس وقت حیات تھیں ۔ تعمیلِ حکم میں چوتھی شادی کی اور میں پیدا ہوا ۔ حضرت کو اطلاع کی گئی اور انھوں نے حبیب الرحمٰن خاں نام رکھا ۔ دو سال بعد چھوٹے بھائی ہوئے حضرت نے فرمایا ۔ اس کو میں نے اپنا نام دیا ۔ ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق مکتب و مدرسہ سے شروع ہوئی ۔

ایثار

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مدینے کے گورنر بنائے گئے تو ان کا ذرو مال اتنا زیادہ تھا کہ اسے تیس اونٹوں پر لاد کر مدینے پہنچایا گیا ۔ خوش پوشاک ایسے تھے کہ لوگ ان کے بدن پر جس لباس کو ایک بار دیکھ لیتے ، اسے پھر نہ پہنتے تھے ۔ پسند ایسی تھی کہ قیمتی سے قیمتی کپڑا بھی بمشکل پسند آتا تھا ۔ مشک و عنبر کا ایسا شوق تھا کہ جس کوچے سے گزر جاتے وہ دیر تک مہکتا رہتا ۔ لیکن جس دن خلافت کی ذمہ داری قبول کی ، اسی دن سارا سازوسامان محلات ، لونڈی اور غلام ، سواریاں سب بیچ کے روپیہ بیت المال میں جمع کر دیا ۔

ان کے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا تھا ۔ جب وہ میلا ہو جاتا تو دھو کر پہن لیتے ۔ مرض الموت میں مبتلا تھے تو ان کے برادرِ نسبتی نے اپنی بہن اور ان کی بیوی فاطمہ سے کہا کہ قمیص میلی ہو گئی ہے ۔ لوگ برابر عیادت کو آرہے ہیں ۔ اسے بدل دو ۔ وہ چپ ہو رہیں ۔ انھوں نے پھر اپنی بات دہرائی تو جواب ملا ۔ ان کے پاس دوسری قمیص ہے کہاں کہ بدل دوں ۔ ایک بار بیٹی کے پاس لباس نہیں تھا ۔ فرمایا : ابھی میرے پاس گنجائش نہیں ہے ۔ فرش پھاڑ کر اس کا کرتہ بنا دیا جائے ۔

سلطان رفیع سوداگر ۔

والد صاحب قبلہ سرکار انگریزی میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے لیکن انگریز اور انگریزی سے سخت نفرت تھی ۔ ادھر سرسید احمد خاں کی تحریک زوروں پر تھی اور شاہجہاں پور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہونے والا تھا ۔ اس جلسہ کے دو روحِ رواں اور سرسید کے رفقاءِ کار حافظ محمد اسماعیل (سر محمد یعقوب کے والد) اور ڈپٹی برکت علی خاں ساکن شاہجہانپور و رئیس لاہور میرے والد کے عزیز دوستوں میں تھے ۔ ان دونوں حضرات نے والد صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنی نو تعمیر انگریزی وضع کی کوٹھی جو ہمارے آبائی مکان سے ملحق تھی ، سرسید اور سید محمود کے دو

روزہ قیام کےلیے دے دیں۔ والدصاحب نے برافروختہ ہوکر کہا۔ میں اِس نیچریے کو ہرگز اپنے گھر میں نہیں ٹھہراؤں گا۔ بالآخر دوستوں کے اصرار پر راضی ہوگئے لیکن س شرط کے ساتھ کہ سرسیّد ان سے ملنے نہ آئیں۔ یہ ۱۸۹۵ء کا واقعہ ہے۔ سرسیّد شریف لائے۔ ہمارے گھر میں قیام کیا اور پھر انھوں نے کہا کہ "میں صاحب خانہ سے ملنا چاہتا ہوں"۔ حافظ صاحب والد کے غصّے سے ڈرتے تھے۔ انھوں نے منع بھی کیا لیکن سرسیّد ایسے لوگوں کے عادی تھے۔ وہ ملنے پہنچ گئے۔ گھر ئے ہوئے مہمان سے بداخلاقی کیسے کرتے۔ والدصاحب نے انہیں پاس ٹھایا اور پھر ہم دونوں بھائیوں کو طلب کیا۔ ہم لوگ زنانے مکان میں الدہ صاحبہ کے پاس چھپے بیٹھے تھے۔ گھر کی خواتین میں مشہور تھا کہ یہ [سرا جادو بھی کر دیتا ہے (سرسید احمد خاں کے بڑے سر کی وجہ سے انھیں سرا کہا جاتا تھا)]۔ میری والدہ خوف زدہ تھیں اور ہمیں باہر بھیجتے ہوئے رتی تھیں۔ بہرحال ہم لوگ سرسیّد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہمارے سلام کے جواب میں انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنی کشادہ باہوں لے لیا اور کہا۔ "تم دونوں ہمارے کالج میں پڑھنے آنا۔ والدصاحب غصّے سے سرخ ہوتے ہوئے فرمایا۔" قسم خدا کی میری زندگی میں ایسا ہرگز ہوگا۔" سرسیّد نے مسکراکر کہا "خدا گواہ یہ دونوں میرے ہی کالج میں ھیں گے۔" اتفاق دیکھیے کہ ان دونوں بزرگوں کی قسمیں حرف بحرف ثابت ہوئیں۔

والدصاحب اب ضعیف اور کمزور ہوگئے تھے۔ انھیں میری شادی کا ارمان تھا۔ لہذا ۱۹۰۳ء میں جب کہ میری عمر صرف پندرہ سال تھی، میری شادی ہوگئی۔ والدصاحب کی لاعلمی میں میں نے انگریزی پڑھنا تو شروع کردی تھی لیکن باقاعدہ اسکول میں داخلہ لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی

شادی کے بعد ان سے پوشیدہ مشن اسکول میں نام لکھایا اور باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی اثنا میں والدصاحب کا انتقال ہوگیا۔ میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہاں پور سے دسواں درجہ پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے کا ارادہ کیا۔ والدہ صاحبہ کو اطلاع ہوئی سختی سے مخالفت کی۔ ادھر دو بچّے بھی ہوگئے تھے اور گھر میں سب سے بڑا میں ہی تھا لیکن سرسیّد کی آواز پر روح لبیک کہہ چکی تھی۔ ۸ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ پہنچ کر فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ بکلی بارک کا کمرہ نمبر ۴۹ رہنے کو ملا۔ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ تھے، جو ایک بڑی ہستی تھے۔ انتہائی مخلص اور ہمدرد۔ سرسیّد کے بے حد اصرار پر انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی کچھ عرصہ بعد مسٹر ٹول ان کی جگہ پرنسپل ہوکر آگئے اور آرچ بولڈ لندن واپس چلے گئے اور پھر وہاں ممبر پارلیمنٹ وغیرہ ہوکر سر کا خطاب پایا۔ ٹول صاحب کی خدمات بھی ایم۔ اے۔ او کالج کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ پرنسپل اور پروفیسروں کے انتخاب کے لیے سرسیّد خود لندن تشریف لے جاتے تھے اور ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بہتر سے بہتر آدمی کو کالج کے لیے لائیں اسی طرح ہندوستان میں بھی جامع صفات ہستیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر علی گڑھ لائے تھے۔
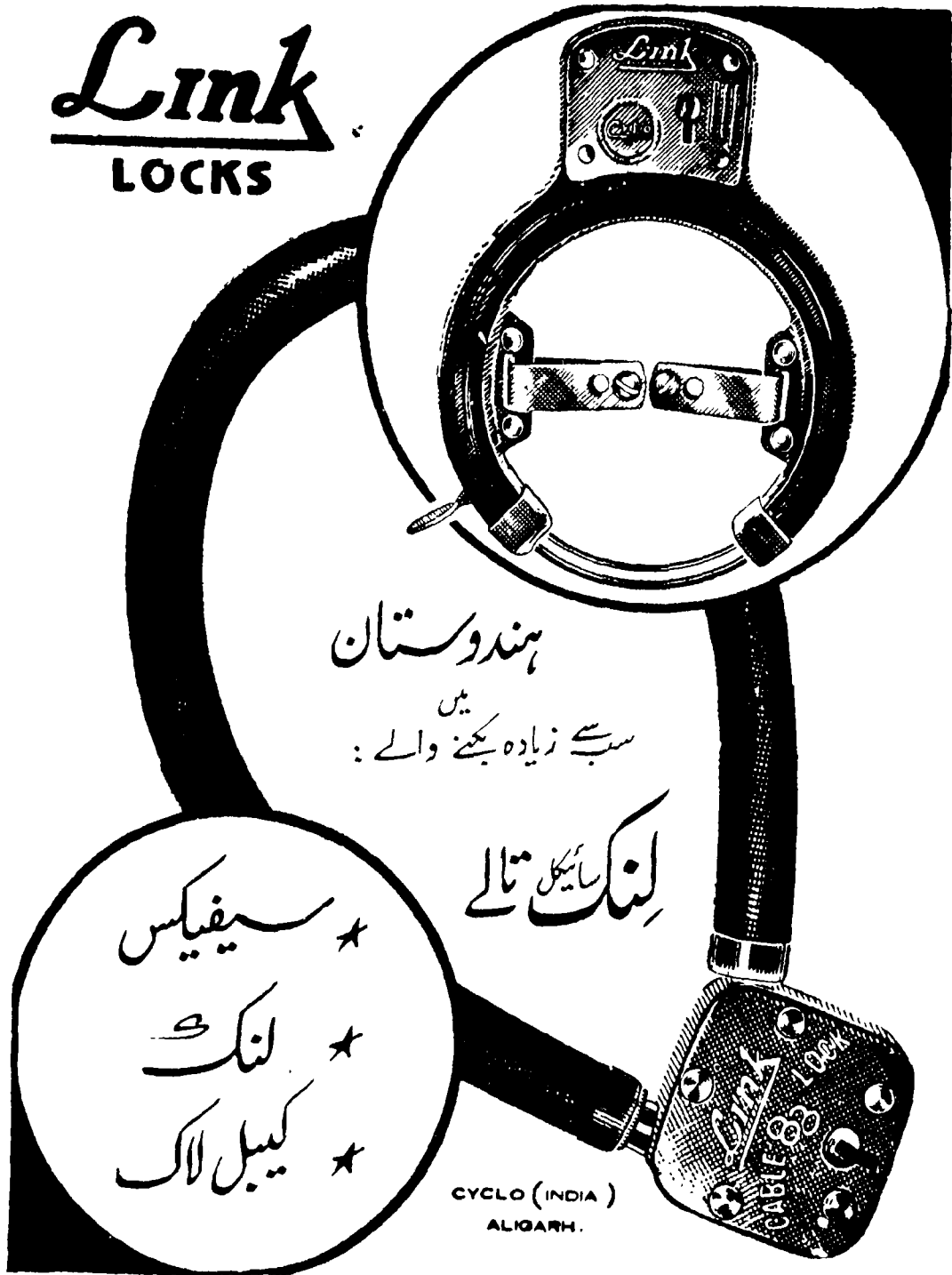
★★

پُرانا لباس

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات سے پہلے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ حضرت محمدؐ کو کتنے کپڑوں کا کفن دیا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا تین کپڑوں کا۔ ارشاد ہوا مجھے بھی تین کپڑوں کا کفن دیا جائے۔ دو تو یہی چادریں جو میرے بدن پر ہیں دھولی جائیں اور ایک نیا کپڑا بنا دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایسے مفلس بھی نہیں کہ نیا کفن نہ خرید سکیں۔ جواب ملا کہ نئے کپڑوں کی مُردوں کی بہ نسبت زندوں کو زیادہ ضرورت ہے۔ میرے لیے یہ پھٹا پرانا لباس ٹھیک ہے۔

سلطان رفیع سوداگر۔

دسعود عالم القاسمی
ن وَالی کوٹھی، علی گڑھ

صدرِ اسلام کی خواتین

ظہورِ اسلام سے پہلے دنیا بالعموم ظلم، جاہلیت، تشدد، انارکی، اخلاق باختگی اور بے یقینی کا شکار تھی، خاص طور پر جزیرہ نمائے عرب ان حالات سے زیادہ متاثر تھا، انسانوں کا کوئی بھی طبقہ ان حادثات کے تھپیڑوں سے محفوظ نہ تھا، اور صنفِ عورت تو بس یوں سمجھیے کہ بس کر رہ گئی تھی، اِسلام جب نمودار ہوا تو رفتہ رفتہ حالات تبدیل ہوگئے، ظلم و جاہلیت کے بادل چھٹ گئے اور ان کی جگہ علم و انصاف نے لے لی۔ بداخلاقی اور بے یقینی کی مسموم فضا ختم ہوگئی اور اخلاق و اعتماد کی فضا بحال ہوگئی۔ نظامِ حیات کی تبدیلی کا اثر عورت پر بھی پڑا اور اس کے دن بھی پھر گئے۔ اسلام نے اس کے چھینے ہوئے حقوق واپس دلا دیے اور وہ اسلام کے دامنِ رحمت میں آکر تعمیرِ انسانیت کا بنیادی پتھر تسلیم کر لی گئی۔ پھر اس نے ایک صالح معاشرے کے قیام میں جو کردار ادا کیا وہ یقیناً رہتی دنیا تک کے لیے معیار اور نمونہ رہے گا، مگر جب مسلمان اسلام کی حقیقی تعلیمات سے دور ہوئے اور اسلامی معاشرے پر زوال آیا تو اس کی زد میں عورت بھی آئی، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آج کے مسلم معاشرے میں عورت جو کچھ بن کر رہ گئی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ...وانی تہذیبوں کے علمبرداروں نے بھی "چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق" اس موضوع سخن بنالیا۔ جی چاہتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کی خواتین کے واقعات حدیث اور تاریخ کی معتبر کتابوں کی مدد سے بیان کروں تاکہ ...ری مسلم خواتین کے دلوں میں بھی ایسی صفات پیدا کرنے کا جذبہ جاگے اور ماضی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر ہوسکے۔

عورتیں تعلیمی میدان میں:۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ علم حاصل کرنا ...د اور عورت دونوں پر فرض ہے۔ چنانچہ صدرِ اسلام میں مردوں کی طرح ...تین کے اندر بھی علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ گوکہ حصولِ علم کے مواقع مردوں ...رح ان کو حاصل نہ تھے مگر وہ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں ...ں میں وہ اپنی تعلیمی ضروریات پوری کرسکیں، بلکہ بسا اوقات وہ مواقع نہ ملنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت بھی کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہؐ! یہ مرد حضرات تو ہم سے آگے بڑھ گئے تو آپ ہمیں بھی اپنی طرف سے ایک دن متعین کردیں تاکہ ہم آپؐ سے علم دین حاصل کریں۔ آپؐ نے وعدہ فرمایا اور آپ کا معمول یہ ٹھہرا کہ آپؐ ایک دن ان سے ملاقات کرتے اور ان کو تعلیم دیتے، نصیحت کرتے اور احکام دیتے" (بخاری: کتاب العلم)

علم حاصل کرنے میں ان کو کوئی عار نہ ہوتا تھا اور نہ اس میں شرم کی کوئی بات تھی، بلکہ وہ بلاجھجک آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی تشنگیٔ علم بجھاتی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بہترین عورتیں انصار کی عورتیں ہیں جن کو دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے میں حیاء رکاوٹ نہیں بنتی۔ (بخاری: کتاب العلم)۔ چنانچہ وہ علم بھی حاصل کرتیں اور اس کی اشاعت بھی کرتیں۔

خدا اور رسولؐ کی اطاعت میں:۔

صدرِ اسلام کی خواتین میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ اِسلام پر سختی سے عمل کرتی تھیں۔ اپنے معاملات میں صرف خدا اور رسولؐ کو حکم مانتی تھیں، اور ان کی ناراضگی مول لینا کبھی گوارا نہ کرتی تھیں۔ قرآن کریم کی سورۃ "مجادلۃ" کا شانِ نزول ہی یہ ہے کہ خولہ بنت ثعلبہ اپنے شوہر اوس بن صامت کا معاملہ حضورؐ کی خدمت میں لے کر آئیں۔ وہ اپنا قصہ یوں بیان کرتی ہیں:۔

"میں اوس کی زوجیت میں تھی اور وہ بوڑھے ہوچکے تھے، بڑھاپے کی وجہ سے ان کا اخلاق بگڑ گیا تھا، ایک دن وہ میرے پاس حقِ زوجیت وصول کرنے آئے تو میں نے کسی وجہ سے ان کو ٹال دیا۔ وہ خفا ہوگئے اور غصّہ میں بولے۔ تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو (یہ طلاق کی ایک قسم ہے) پھر نکل گئے اور تھوڑی دیر کو لوگوں کے ساتھ جا بیٹھے اور پھر میرے پاس آئے اور مجھ کو وظیفہ زوجیت ادا کرنے پر اکسانے لگے۔

میں نے کہا خدا کی قسم! آپ ہرگز میرے پاس نہ آئیں۔ ابھی آپ یہ سب کچھ
کہہ چکے ہیں۔ جب تک کہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہمارے بارے میں
نہ ہو جائے۔ تب وہ جذبات سے مغلوب ہو کر مجھ پر جھپٹے۔ تب میں نے ان کو پرے
ہٹایا کیوں کہ میں ان کی نسبت جوان تھی خولہ کہتی ہیں کہ پھر میں گھر سے نکلی اور
سیدھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی، میں ان کے سامنے بیٹھی اور
سارا ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان کی شکایت
اس طرح تھی:-

" یارسول اللہ! اوس نے میرا مال کھایا، میری جوانی کو چاٹ
گیا، میں نے اس کے لیے اپنا پیٹ پھیلا دیا اور جب میں عمر رسیدہ ہونے
کو آئی اور میرے بچے جدا ہو گئے تو مجھ سے ظہار کر لیا [طلاق دیدی] -
آنحضور نے فرمایا۔ اے خولہ! تمہارا شوہر بوڑھا ہے۔ تم اس کے حق میں
اللہ سے ڈرو۔ وہ کہتی ہیں۔ پھر اللہ نے میرے بارے میں یہ سورۃ نازل
کی۔" اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے بارے میں آپ
سے تکرار کر رہی ہے۔ اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں
کی گفتگو سن رہا ہے، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے" [تفسیر ابن کثیر]

حق گوئی اور بے باکی:

ایک مرتبہ خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطابؓ خطاب فرمارہے تھے۔
حاضرین میں مرد و عورتیں سبھی تھے۔ دوران تقریر آپؓ نے فرمایا کہ
لوگوں نے اپنی عورتوں کے مہر زیادہ رکھنا شروع کر دیے ہیں اور یہ کوئی
ثواب کا کام نہیں ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مہر کی رقم کم مقرر کیا کریں
اتنا سن کر حاضرین میں سے ایک خاتون اٹھیں اور حضرت عمرؓ کو مخاطب
کرکے بولیں۔ 'اے عمرؓ! آپ کو یہ اختیار کس نے دیا کہ جو حق اللہ نے ہمیں
دیا ہے، اس میں آپ کمی کریں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا۔ کیا مطلب؟" تو
خاتون نے قرآن کی یہ آیت پڑھی۔ "اور خواہ تم نے ان [عورتوں] میں کسی
کو ڈھیر سامان بھی دے دیا ہو، تو اس میں سے کچھ نہ لو" [النساء ۲۰]-
اتنا سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ عورت نے سچ کہا۔ اور مرد غلطی پر تھا [مسلم]
اندازہ کیا جائے کہ خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
کے اجتہاد کو خاتون نے چیلنج کر دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔
اس میں ایک تو خاتون کا علم نظر آتا ہے اور دوسرے ان کی بے باکی کا ثبوت
ملتا ہے۔ انھوں نے اس کا قطعاً خیال نہ کیا کہ کون بول رہا ہے۔ بلکہ صرف
یہ دیکھا کہ کیا بول رہا ہے۔

میدان عمل میں

سہل بن سعدؓ ایک خاتون کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کی اپنی کھیتی باڑی
تھی، اور وہ پانی کی نالیوں کے اطراف میں چقندر کی کاشت کیا کرتی
تھیں۔ جمعہ کے دن سہل بن سعدؓ اور بعض دیگر صحابہؓ ان سے ملاقات کے لیے
جاتے تو وہ چقندر اور آٹے سے تیار کیا ہوا حلوا ان حضرات کو کھلاتیں۔
[بخاری، کتاب الجمعہ]

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کہتی ہیں کہ زبیرؓ سے میرا نکاح ہو چکا
تھا، مگر پانی لادنے والے اونٹ اور ایک گھوڑے کے علاوہ ان کے
پاس نہ کوئی مال تھا اور نہ خادم وغیرہ۔ میں خود ہی ان کے گھوڑے کو
چارہ دیتی، پانی پلاتی، اور اس کا ڈول بھرتی۔ مجھے ہی آٹا گوندھنا پڑتا
روٹی پکانی پڑتی۔ میں روٹی اچھی نہیں پکا سکتی تھی۔ پڑوس کی انصار
عورتیں مخلص ثابت ہوئیں۔ وہ میری روٹی پکا دیا کرتیں۔ آنحضورؐ نے
زبیرؓ کو دو میل کے فاصلہ پر ایک زمین فائدہ اٹھانے کو دے رکھی تھی
میں وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں لایا کرتی۔ ایک دن میں اپنے سر پر گٹھلیوں
کی ٹوکری لیے آرہی تھی کہ راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
ملاقات ہو گئی، آپ نے مجھے بلایا تاکہ اپنی سواری کے پیچھے بٹھالیں [آنحضورؐ
اسماءؓ کے بہنوئی تھے] لیکن چوں کہ بعض انصار بھی آپؐ کے ساتھ تھے اس
لیے مجھے مردوں کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوئی، اور زبیرؓ کی غیرت
بھی یاد آگئی جو اس چیز کو پسند نہیں کر سکتے۔ چنانچہ میں پس و پیش کرنے
لگی۔ حضورؐ بات سمجھ گئے" اور آگے بڑھ گئے" [بخاری: کتاب النکاح]

مشہور صحابی عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی نے ایک مرتبہ حضورؐ سے
عرض کیا " میں ایک کاریگر عورت ہوں۔ مال تیار کر کے فروخت کرتی
ہوں۔ اس طرح میں تو کما سکتی ہوں لیکن میرے شوہر اور بچوں کا کوئی
ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ اور پوچھا کیا میں اُن پر خرچ کر سکتی ہوں" آپؐ
نے فرمایا۔" ہاں! تم کو اس کا اجر ملے گا۔ [بحوالہ عورت اسلامی معاشرہ میں۔
مولانا جلال الدین عمری]

اسلام کی حفاظت میں:

صدر اسلام کی خواتین نہ صرف کسب معاش کے سلسلے میں جدوجہد
کرتی تھیں بلکہ اسلام کی حفاظت میں دشمنوں کا مقابلہ بھی کرتی تھیں

ر جنگی محاذ پر اپنی خدمات بھی انجام دیتی تھیں۔ ایک خاتون ام عمارہؓ نے
جنگِ احد میں عظیم کارنامہ انجام دیا۔ اس کے متعلق جب امّ سعدؓ نے ان
ے سوال کیا تو انھوں نے بتایا کہ " میں صبح سویرے مجاہدین کی خدمت کے لیے
یدان جنگ میں پہنچ گئی تھی، ابتدا میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا۔ لیکن بعد
ں جب فتح اور نصرت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو ان میں افراتفری مچ گئی
ں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر آپؐ کے دفاع میں
ر اور تلوار چلانے لگی۔ یہاں تک کہ دشمن کی ضرب مجھ پر آپڑی۔ ام سعدؓ
ہتی ہیں کہ میں نے ان کے کندھے پر بہت ہی گہرے زخم کا نشان دیکھا۔ اور
چھا، اتنا سخت حملہ کس نے کیا تھا؟ انھوں نے جواب دیا۔ ابن قمئہ نے،
لّٰہ اسے غارت کرے۔ جب مسلمان شکست کھا کر حضورؐ کے پاس سے
ھاگ کھڑے ہوئے تو یہ چلّاتا ہوا آیا۔ بتاؤ محمدؐ کہاں ہے؟ اگر آج
ہ بچ گیا تو میری نجات نہیں۔ یہ سن کر میں، مصعب بن عمیر اور چند دوسرے
حاب نے جو آپؐ کے ساتھ جمے ہوئے تھے، اس کا سامنا کیا۔ اس مقابلہ
ں اس نے مجھ پر وار کیا۔ جس کا نشان تم دیکھ رہی ہو۔ میں نے بھی تلوار
ے کئی حملے کیے مگر دشمن خدا دو دو زرہیں پہنے ہوئے تھا [ابن ہشام]

مجاہدین کی تربیت میں :

حضرت خنساءؓ جو بڑی مشہور شاعرہ تھیں، جنگ قادسیہ میں اپنے
ر نوجوان بیٹوں کے ساتھ شریک ہوئیں اور جنگ سے پہلے رات میں اُن چاروں
جمع کرکے خطاب کیا۔ " میرے بیٹو! تم نے خوشی سے اسلام قبول کیا ہے
ر اپنی مرضی سے ہجرت کی ہے، ورنہ تم اپنے ملک کو بھاری نہ تھے۔ جس
رح تمہاری ماں ایک ہے، تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ تمہاری ماں نے تمہارے
پ کے ساتھ خیانت نہیں کی اور نہ تمہارے ننھیال کو رسوا کیا۔
ہیں معلوم ہے کہ خدا نے کفار سے جہاد کے بدلے میں کس قدر ثواب عطا کیا ہے
وب سمجھ لو اس فانی دنیا سے آخرت بہتر ہے۔ کیوں کہ خدا کا فرمان ہے۔
" اے ایمان والو! ثابت قدم رہو اور ثابت قدم رہنے میں ایک دوسرے
کا مقابلہ کرو۔ حق کی راہ میں جمے رہو، اور اللہ سے ڈرو۔ شاید تم کامیاب
ہو۔ [آل عمران]۔ اگر تم صبح تک سلامت رہے تو اللہ سے مدد مانگتے
ہوئے دشمنوں کے مقابلے پر نکل جاؤ اور جنگ کے شعلے جب بھڑک اُٹھیں
تم اس کی بھٹی میں کود پڑو۔ جب دشمنوں کا لشکر بے جگری سے برسرپیکار
تو تم اس کے سردار پر حملہ کرو۔" ماں کی ولولہ انگیز تقریر سنی اور چاروں

جرأت مند ماں کی گود میں پرورش پانے والا جری کیسے نہ ہو (ڈاکٹر ذاکر حسین)

نوجوان اشعار پڑھتے ہوئے رن میں آنکلے، اور پورے جوش کے ساتھ لڑتے
رہے، جب مسلمانوں نے میدان جنگ فتح کر لیا تو چاروں شہیدوں کی مبارک
لاشیں ناظرین سے خراج شجاعت وصول کر رہی تھیں، نوجوان بیٹوں کی شہادت
دیکھ کر حضرت خنساءؓ کی آنکھ نے آنسو نہیں بہائے بلکہ انھوں نے چار شہدائے
اسلام کی ماں ہونے پر فخر کیا۔ ان کا چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ [اسد الغابۃ
فی تمیز الصحابہ]۔

راہ عزیمت اور شہادت میں :

اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں مسلمانوں کی تلوار نہیں، ان کے کردار،
ان کے خلوص، ان کی قربانی اور ان کی استقامت وعزیمت کارفرما رہی ہے
جب اسلام کا آوازہ بلند ہوا تو مشرکین مکہ نے اسلام کے داعیوں پر جو سنگین
مظالم ڈھائے اور اسلام کے شیدائیوں نے بھی جس استقلال وتحمل کے
ساتھ ان کا مقابلہ کیا وہ شاید ان کا ہی حصّہ تھا۔ یہ قربانیاں صرف مردوں
ہی نے نہیں دیں بلکہ پاک نفوس خواتین نے بھی دیں۔ ان ہی خواتین میں ایک
مقدّس نام حضرت سمیہ بنت خباط کا بھی ہے۔ جب اسلام کی دعوت عام
ہوئی تو سمیہؓ نے بڑھ کر اسے قبول کیا اور پھر ان مصائب کو جھیلنے پر آمادہ
ہوئیں جو اس راہ میں آتے تھے۔ کفار قریش ان کو چلچلاتی دھوپ میں
تپتی ہوئی ریت پر لوہے کی زرہیں پہنا کر ناقابل برداشت اذیت دیتے
تاکہ وہ اسلام سے پھر جائیں۔ مگر وہ سب کچھ سہتیں۔ ایک رات ایسا ہوا کہ
ابوجہل نے ان کو فحش قسم کی گالیاں دیں اور اس زور کا نیزہ مارا جو آپؓ
کے ناف پر لگا اور آپؓ اسی ضرب میں اللہ کو پیاری ہو گئیں [خدا رحمت کند
ایں عاشقان پاک طینت را] [الاستیعاب]

اسلامی تاریخ کا یہ سنہرا باب ہے کہ اسلام کی راہ میں پہلی مظلومانہ
شہادت بھی ایک خاتون ہی کے حصّہ میں آئی۔ یہ اور اس طرح کے اور
بہت سے روشن واقعات ہیں جو صدرِ اسلام کی خواتین کی عظمت کا نشان
ہیں۔ کاش آج کی خواتین میں بھی یہی جوش، یہی غیرت، یہی استقامت
اور جوانمردی پیدا ہو جائے اور پھر مسلم معاشرہ میں اپنی عظمت رفتہ کی
بازیابی میں کامیاب ہو جائے [آمین]

★ ★

مذہب اور سیاست

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

علامہ اقبال کا یہ شعر اس مضمون کا محرک ہے۔ آج کل عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ سیاست و مذہب دو جداگانہ عنصر ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جیسے آگ اور پانی اور ان کا یکجا ہونا معاشرے کے لیے ایک خطرناک امر ہے۔ آج کل اکثر و بیشتر سیاستداں یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ مذہب کو سیاست میں شامل کرنے ہی سے تمام معاشرتی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور یہی اشتراک فرقہ وارانہ فسادات کی جڑ ہے۔

مندرجہ بالا نظریہ مذہب اور سیاست کے اصل مفہوم کی ناسمجھی کا نتیجہ ہے مذہب ایک ازلی اور فطری قانون ہے جس کا معاشرے کو صحت مند رکھنے میں ایک اہم رول ہے۔ مذہب اخلاقی اقدار کو فروغ دیتا ہے اور معاشرے کے ہر شعبہ کو صحیح رخ پر ڈھالتا ہے۔ مذہب ہی اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی خدائے واحد کی مخلوق ہے اور تمام دنیا ایک وسیع خاندان ہے اور اس خاندان میں انسانوں کے مابین کسی کو کسی پر رنگ و نسل، مذہب و مذہب کی بنا پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب انسانوں کے مابین نفرت نہیں سکھاتا۔

مذہب کا کام محض عبادت الٰہی اور پوجا پارٹ ہی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ مذہب ایک مکمل نظام حیات کی نشان دہی کرتا اور یہ بتاتا ہے کہ ایک انسان کا رشتہ اس کے خالق سے کیا ہے اور دوسرے انسانوں سے کیا ہے اور کس طریقہ سے ان رشتوں کو استوار رکھا جا سکتا ہے جس سے کہ معاشرے کی تشکیل باہمی محبت و یگانگت کی بنیاد پر ہو۔

ایک مہذب معاشرے میں جنگ و جدال اور آپسی تنازعات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فسادات کے بانی وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے ذہن و دماغ میں مذہب کا محدود یا غلط تصور ہوتا ہے۔ اگر ان کو مذہب کی صحیح تعلیم سے بہرہ ور کیا جائے تو وہ کوئی غلط راستہ اختیار نہ کریں۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے موجودہ مذہبی رہنما جو خود روحِ مذہب سے ناواقف ہوتے ہیں اور جن کا مقصدِ حیات ذاتی اقدار و مفاد کا حصول ہوتا ہے، اپنے پیروؤں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام الناس کے سامنے ابتدا ہی سے مذہب کا صحیح تصور پیش کیا جائے تاکہ وہ ان نام نہاد مذہبی رہنماؤں کے غلط پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوں۔

فی زمانہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ان کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے غیر اخلاقی ذرائع استعمال کرنے کو قطعاً برا نہیں سمجھا جاتا۔ رنگ و نسل ذات پات اور ملک و قوم کے اختلافات کو فروغ دینے سے جو کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ دیرپا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنی طاقت کو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جس سے معاشرے میں طرح طرح کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مذہب کو سیاست سے جدا رکھنے کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں امن نہیں ہے۔ روس اور امریکہ کی نیوکلیائی تیاریوں کے باعث دنیا تباہی کے غار پر کھڑی ہے۔ عرب اسرائیل جنگ نے اس خطے کے لوگوں کی زندگیوں کو جہنم زار بنا دیا ہے۔ ایران و عراق کی جنگ نے لاکھوں خاندانوں کو خانماں برباد کر دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عیسائی ملکوں اور قوموں نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کو یکسر بھلا دیا ہے۔ یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ کی تعلیم سے منہ موڑ لیا ہے۔ اسلامی ممالک نے رسول کریمؐ کی تعلیم کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور مہاتما بدھ کے نام لینے والوں نے ان کی تعلیم کو بازیچۂ اطفال بنا دیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ مذہبی تعلیمات کے ذریعہ دنیا کو پھر محبت، یگانگت اور صلح و آشتی کا سبق سکھایا جائے تاکہ یہ خونی ڈرامہ جو اس وقت دنیا کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے، ختم ہو۔ جو اربوں اور کھربوں روپیہ آلاتِ حرب بنانے اور خریدنے میں صرف ہو رہا ہے، اس کو انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگایا جائے جس سے جہالت، غربت اور بیماریوں کا استعمال ہو۔

مناسب ہے کہ اس مضمون کا اختتام بھی علامہ اقبال ہی کے مصرعہ سے کیا جائے: مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ★★

کوہِ نور

"آنکھ کے اندھے نام نین سکھ" یہ کہاوت آپ نے ضرور
ہوگی۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ کہاوت وہ لباس ہے
ہمارے بدن پر بالکل صحیح بیٹھتا ہے۔ یعنی یہ کہاوت
ں ہماری حالت کے مطابق ہے ــــ نام کوہ نور یعنی روشنی
ہاڑ اور واقعی صورت بھی ایسی کہ چاند سورج کو شرمائے
آنکھوں کو چندھیائے مگر قسمت پر نظر ڈالیے تو کالی
، کی طرح تاریک۔

نام تو آپ نے سن لیا۔ آپ پوچھیں گے ذات؟ تو
کا مختصر جواب یہ ہے کہ "ہیرا"۔ باپ دادا کو لوگ "کاربن"
نام سے یاد کرتے ہیں۔ کاجل اور پتھر کا کوئلہ بھی ہمارے
خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پنسل کے مونگے سے بھی
ی دور کی رشتہ داری ہے۔

ہمارے حقیقی بھائی بند ہندوستان، جنوبی افریقہ، برازیل
آسٹریلیا میں آباد ہیں۔ ہم اور ہمارے یہ بھائی بند
ز فضا میں سانس لیتے تھے کہ قدرت کے ان دیکھے ہاتھوں
ہم کو گرفتار کیا اور اتنا تپایا کہ ہمارا جسم پگھل کر رقیق
گیا اور پھر چٹانوں کے نیچے دبا دیا گیا۔ جہاں ہزاروں
ں دبے پڑے رہے۔ تکلیف تو بہت ہوئی مگر کچھ
ر چارہ کار بھی نہیں تھا ــــ اس طرح کی تکلیفوں سے
رنے نے ہمیں نہایت سخت جان بنا دیا۔ ایسے سخت جان
دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری چیز سختی میں ہماری
بری کر سکے۔ یہاں تک کہ شیشوں اور سخت پتھروں کو
ٹنے اور چٹانوں کا سینہ چیرنے کے لیے ہمیں استعمال
جاتا ہے۔

یہ حضرت انسان بھی خوب ہیں۔ قدرت کے خزانوں میں
سے طرح طرح کی چیزیں ڈھونڈ نکالتے ہیں اور پھر ان کی
پوشیدہ قوتوں کو آشکار کرتے ہیں اور اپنی کاریگری
سے ان کو خوبصورت بھی بنا دیتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ
جو اُن کے ہاتھ لگے تو انسان نے ہمیں بھی اپنا تختۂ مشق
بنا ڈالا۔ یہ نہ خیال کیا کہ ہم پہلے ہی کتنے ستم رسیدہ ہیں
ہمیں کاٹا، تراشا، رگڑا ــــ مگر اب ہماری چمک دیکھ کر ان
کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ شاید اسی لیے ہمارا نام "ہیرا"
رکھ دیا گیا۔ ہماری اس تابناکی نے انسان کو ایسا فریفتہ
کیا کہ ہمارے حاصل کرنے کی خواہش بڑے بڑے بادشاہوں
کو تڑپانے لگی۔ شہنشاہوں نے ہمیں عزت سے سر پر
جگہ دی۔ ہمیں اپنے خزانوں میں حفاظت سے رکھا۔ مگر ان
کی یہ چاہت ہمارے لیے بلائے جان بن گئی۔ ہم ان کی
ہوس کا شکار ہوتے رہے اور آزادی کو ترستے رہے۔
آپ میری کہانی کو سن کر ہمارے خاندان کے دوسرے
لوگوں کی زندگی کا اندازہ لگائیے۔

میرا نام کوہ نور ہے۔ قدرت کی سختیوں سے گزرنے
کے بعد میں حیدرآباد کے قریب گولکنڈہ کی پہاڑیوں میں
پڑا آرام سے زندگی گزار رہا تھا۔ میں وہاں سے ایک
ایرانی جنگجو میرجملہ کے ہاتھ لگ گیا۔ میرجملہ عبداللہ قطب
شاہ کے عہد میں وزیر اعظم بن گیا تھا۔ پھر اس نے
غدّاری کی اور مغل شہنشاہ شاہجہاں کے زیر سایہ اپنی
ریاست قایم کی۔ اس نے شاہجہاں سے وفاداری کا اظہار
کرنے کے لیے مجھ کو بطور ہدیہ پیش کیا۔ شاہجہاں مجھے
اپنے تاج کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ میری خراش تراش ہوئی
تو جان ضیق میں آگئی۔ میرے دو تہائی جسم کو کاٹ کر
پھینک دیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو میرے
جسم کو کاٹا جا رہا تھا اور میں تکلیف سے کراہ رہا تھا
اور دوسری طرف میری خوب صورتی اور چمک بڑھتی جا رہی
تھی اور آخر کار میں عظیم مغل شہنشاہ کے تاج کی زینت

بن گیا۔ یہ تاج ایک بعد دوسرے شہنشاہ کو منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ باون سال کے بعد محمد شاہ کو مل گیا۔ اس بادشاہ کی رنگ رلیوں کو دیکھ کر میں کڑھتا تھا۔ حکومت کمزور ہوئی تو ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے حملہ کر دیا اور اس تاج کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ میری چمک نے اس کو مبہوت کر دیا۔ اسی نے پہلی مرتبہ مجھے کوہ نور کے نام سے یاد کیا۔ اس فاتح نے مجھے عزت تو بخشی مگر مجھ سے میرا وطن چھوٹ گیا۔ پینتیس۳۵ سال بعد نادر شاہ کا قتل ہوا تو میں اس کے پوتے شاہ رُخ کی ملکیت بن گیا۔ ابھی محض چار سال کا ہی عرصہ گزرا تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے مجھے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ۶۳ سال اس خاندان میں گزرے۔ یہ مدّت کچھ کم نہیں ہوتی۔ اس عرصہ میں مجھے ابدالی خاندان سے محبت ہوگئی تھی اور میں ایک سکون کی سی حالت محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ایک بار پھر میرا سکون ٹوٹا۔ جب شاہ شجاع ابدالی نے ۱۸۱۳ء میں مجبور ہو کر مجھے بطور تحفہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دے دیا۔ اس طرح ایک بار پھر میں نے اپنے وطن کی فضا میں سانس لیا۔ مہاراجہ مجھ سے بے پناہ محبت کرنے لگے تھے کبھی مجھ کو اپنی دستار میں سجاتے اور کبھی اپنے گلے کی مالا میں۔ مہاراجہ مجھ سے اتنی محبت کرتے کہ بے پناہ دولت کا لالچ دیے جانے پر بھی انھوں نے مجھے اپنے سے جدا نہیں کیا۔ رنجیت سنگھ کے بعد میں اُن کی اولاد کے قبضہ میں رہا۔

۱۸۴۹ء میں میری زندگی کا سب سے درد ناک واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ میرے دوستوں سے مجھے جدا کر دیا گیا۔ رنجیت سنگھ کی اولاد نے مجھے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے میرے وطن سے جدا کر کے ایک اجنبی وطن بھیج دیا۔ مجھے کس طرح اور کب میرے وطن سے جدا کیا گیا۔ اس کی کہانی میں آپ کو سنائے دیتا ہوں ۶؍اپریل ۱۸۵۰ء کو بمبئی کے بندرگاہ سے مجھے سندیا نام کے ایک جہاز سے لندن کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ یہ کام بڑے خفیہ طریقے پر ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی مجھ کو لاہور سے بمبئی لے گیا۔ لاہور سے بمبئی تک کے سفر کے دوران اس نے مجھ کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے سے علیحدہ نہیں کیا۔ جولائی ۱۸۵۰ء کو میں لندن پہنچ گیا۔ اس وقت میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ انسانی ہاتھوں میں پڑنے سے پہلے میرا وزن ۷۵۶ کیرٹ تھا وہ محض ۱۸۶ کیرٹ رہ گیا۔ لیکن اب جو میرا رنگ نکھرا تو میرے مالکان بھی دنگ رہ گئے۔ ۱۸۵۲ء میں لندن کی ایک عظیم الشان نمائش میں میری نمائش کی گئی پھر کسی ظالم کو سوجھا اور مزید تراش خراش کے عمل سے گزار کر میرے جسم کو سڈول بنایا گیا اور آخر میں مجھے تاج برطانیہ کی زینت بنا دیا گیا۔ یہ وہی تاج ہے جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اور بس اس وقت سے دنیا کی نظروں میں میں جگمگا رہا ہوں۔ مگر آہ! میں خود کو قیدی محسوس کر رہا ہوں۔ وطن سے دور، غیروں کے ہاتھوں میں محصور! دِل جلتا ہے تڑپتا ہے وطن کے لیے اور علامہ اقبال کی زبان میں:-

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا

مگر میرے اہلِ وطن کو بھی میرا کچھ خیال ہے؟ اس کا جواب میں کیا دوں!

غرض قدرت نے ہمیں چمک دمک دے کر اور بعض دوسری بے مثال خوبیاں عطا کر کے ہماری قدر و قیمت بڑھائی لیکن ہماری یہ قدر و قیمت ہی ہمارے لیے مصیبت کا باعث بن گئی کہ انسان کے ہاتھوں ہم کیسے کیسے ظلم سہتے ہیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ ہر مشکل سے گزرنے کے بعد ہماری قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور خود انسان ہی ہمارے لیے بے تاب ہو اُٹھتا ہے۔

حسان عتیق صدیقی
سرسید نگر، علی گڑھ

کاغذ کی اہمیت

یوں تو کاغذ دیکھنے میں ایک معمولی چیز ہے لیکن وہ
بہت کام کی چیز ہے۔ ہاں بھئی لیکن اس کی اہمیت
، سمجھتا ہے۔ لوگ اسے نالیوں میں ڈال دیتے ہیں۔
کے باوجود وہ ذرا بھی شکوہ نہیں کرتا۔ اگرچہ ہم
ے ہی علم حاصل کرتے ہیں۔

ایک دن میری سہیلی راشدہ اپنی کرسی پر بیٹھی
ر کاغذوں کو کوس کوس کر پھینک رہی تھی۔ تب
اس کا بھائی راشد آگیا۔ اس نے جب ایسا منظر دیکھا
ہا یہ کیا کر رہی ہو۔ راشدہ تمہیں معلوم ہے جب
تمہیں ترقی ہوگی انہی کاغذوں کی بدولت۔ اس
اغذ ہنسا۔ اور کہا بھائی ہمارا کام تو ظلم سہنا ہے
ہم سہہ رہے ہیں۔ جہاں کام نکلا ہم کو نالیوں اور
ے میں پھینک دیا جاتا ہے۔

ایک دور یہ تھا کہ لوگ ہماری عزّت کیا کرتے تھے
، نہیں تھی کہ ہم کو گندگی میں ڈالا جائے۔ کیوں کہ
جانتے تھے کہ ہم پر ہی اللہ کا کلام لکھا جاتا
۔ گیتا اور مقدّس کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ علم کی
ہمارے ہی سینے پر روشن ہے۔

مگر راشدہ تو مغرور تھی۔ وہ منہ بنا کر یہ کہتی
ہوئی چلی گئی۔ اس معمولی چیز کی حقیقت کیا ہے۔
جب انجینیرنگ کے آخری سال کا امتحان شروع ہوا تو کاغذ
بنانے والوں نے ہڑتال کردی۔ راشدہ سخت پریشان
تھی۔ جس سے بھی وہ کاغذ مانگتی سب کہتے ہمارے پاس
جو بھی کاغذ ہے ہمارے کام کا ہے۔ راشدہ سخت پریشان
تھی کہ اللہ کیا کرے۔ اسی پریشانی کے عالم میں اس
کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب دیکھا کہ وہ اپنی کرسی پر
بیٹھی پڑھ رہی ہے۔ اُس کے چاروں طرف کاغذ بکھرے
پڑے ہیں۔ اور ہر ٹکڑے سے قہقہے کی آواز آرہی ہے
کہو جی معمولی چیز کی حقیقت کیا ہے۔ ہماری عزت کیوں
کی جائے۔ ہا ہا ہا!! راشدہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔
اور چیخنے لگی۔ یا اللہ! مجھے معاف کردے — میں علم حاصل
کرنے سے پہلے اس کی عزت کر سکوں۔ کوئی بھی چیز دنیا
میں حقیر نہیں ہے۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی تو دیکھا
ریڈیو پر خبریں آرہی تھیں کہ کاغذ بنانے والوں نے
ہڑتال ختم کردی ہے۔ یہ سن کر راشدہ خوشی سے جھوم
اٹھی۔

سیّدہ فاطمہ ہاشمی
کانفرنس کمپاؤنڈ، علی گڑھ

خوشامد تین نفرت انگیز برائیوں کا مجموعہ ہے جھوٹ، غلامی
اور فریب کاری کا۔ — کارلائل

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے
— اقبال

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۳۳
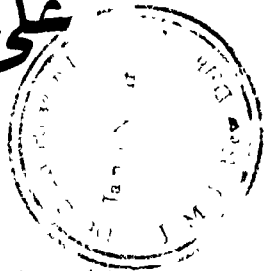
مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو امیدوار ایک سے زائد پوسٹوں کے لیے امیدوار ہوں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر پوسٹ کے لیے الگ الگ درخواست دیں۔

ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچرس (۱۵ اسامیاں)۔ (مستقل)

شرح تنخواہ:- ۴۴۰-۲۰-۵۰۰-ای بی-۲۵-۷۰۰-ای بی ۲۵-۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

(الف) ٹیچرس آف فزکس (۲ جگہیں خواتین کے لیے) ۵ پوسٹیں۔

ٹیچر آف کیمسٹری (صرف خواتین کے لیے) ایک پوسٹ۔

استعداد:- لازمی:- اس مضمون میں گریجویٹ اور تعلیمات میں تسلیم شدہ ڈگری یا ڈپلوما

یا

این سی ای آر ٹی کے ریجنل کالج آف ایجوکیشن سے بی۔ ایس سی اور بی ایڈ پاس شدہ۔

یا

این سی ای آر ٹی کے ریجنل کالج آف ایجوکیشن سے بی ٹیک اور بی ایڈ پاس شدہ (صرف فزکس کے لیے)

(ب) ٹیچرس آف میتھمیٹکس (چار جگہیں صرف خواتین کے لیے) سات اسامیاں۔

استعداد:- (لازمی):- اس مضمون میں گریجویٹ اور تعلیمات میں تسلیم شدہ ڈگری یا ڈپلوما۔

(ج) ٹیچرس آف لائف سائنس (صرف خواتین کے لیے) ۲ پوسٹیں۔

استعداد:- لازمی:- باٹنی یا زوولوجی میں بی ایس سی اور بی ایڈ۔

یا

دہلی یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی (ہوم سائنس) اور بی ایڈ۔

یا

این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے ریجنل کالج آف انجینرنگ سے بی۔ ایس سی اور بی۔ ایڈ۔

پسندیدہ:- تمام اسامیوں کے لیے

کسی کالج یا ہائر/ہایر سکنڈری اسکول میں اس مضمون کی تدریس کا مناسب تجربہ۔

نوٹ :- جن امیدواروں نے اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۸ اور ۸۴-۸۳/۱۵ کے تحت درخواست دی ہے اور ان کو ازسرنو درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔

ٹرینڈ گریجویٹ (جنرل)۔ (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) گرلس ہائی اسکول

شرح تنخواہ :- ۴۴۰- ۲۰- ۵۰۰- ای بی- ۲۵-۷۰۰- ای بی- ۲۵- ۵۰ ۷، روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد :- (ا) لازمی :- (ا) انگریزی اور تاریخ کے مضامین کے ساتھ گریجویٹ۔

(اا) تعلیمات میں ڈگری/ڈپلومہ

(ا) پسندیدہ تدریس کا مناسب تجربہ

نوٹ :- انگریزی کے ذریعہ تعلیم دینے والی امیدوار ہی درخواست دیں۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربے کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔
طلبیدہ امیدواروں کو ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ بطور ٹی اے دیا جائے گا۔
درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار سلیکشن کمیٹی کے دفتر سے پانچ روپیہ نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کی جا سکتی ہیں۔
ڈاک سے منگوانے کی صورت میں ۱۰×۲۲ سم کا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیجنا ضروری ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۶ مارچ ۱۹۸۴ء شام ۴ بجے تک ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں
(رجسٹرار)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۳۲

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ ڈپٹی فائننس آفیسر (مستقل) سینٹرل اکاؤنٹس آفس۔

شرحِ تنخواہ:- ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:- کم از کم گریجویٹ، اکاؤنٹس کا پری۔ آڈٹ اور فائننس کے کام سمیت کم از کم دس سالہ تجربہ جس میں اکاؤنٹنٹ یا سپرنٹنڈنٹ یا سیکشن آفیسر (اکاؤنٹس) کسی بھی حیثیت سے دفتری کام کا ۲ سالہ تجربہ بھی شامل ہے۔

پسندیدہ:- چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ

۲۔ اسسٹنٹ فائننس آفیسر (دو اسامیاں) (مستقل) - سینٹرل اکاؤنٹس آفس۔

شرحِ تنخواہ:- ۷۰۰ - ۴۰ - ۹۰۰ - ای بی - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:- (۱) لازمی۔ امیدوار کے لیے کسی تسلیم شدہ ہندوستانی یا غیر ملکی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اکاؤنٹس کا پری۔ آڈٹ اور فائننس کے کام سمیت سات سالہ تجربہ۔ جس میں سے کسی سرکاری، نیم سرکاری ادارہ، کسی یونیورسٹی پبلک یا اہمیت کے حامل کسی پرائیویٹ ادارہ یا چارڈ اکاؤنٹنٹ کی کسی فرم میں سپروائزر (حیثیت میں کم از کم پانچ سالہ تجربہ

(۲) پسندیدہ: چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ۔

۳۔ انسٹرکٹر (ٹینس) - (مستقل) گیمس کمیٹی۔

شرحِ تنخواہ:- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ مع الاؤنس۔

استعداد:- امیدوار کے لیے کم از کم استعداد فزیکل ایجوکیشن میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ یا سرٹیفکیٹ یا ڈگری ہے

پسندیدہ:- ٹینس میں کوچنگ کے تجربے کے علاوہ ٹینس گراؤنڈ کی دیکھ بھال اور اسپورٹس کے سلسلے میں طلبار کو میسر آسانیوں اور ساز و سامان (EQUIPMENTS) کی دیکھ بھال

۴۔ سپروائزر (بوٹانیکل گارڈن) - ڈپارٹمنٹ آف باٹنی

شرحِ تنخواہ:- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۶۰ - ای بی - ۲۰ - ۷۰۰ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔ بی ایس سی (ایگریکلچر) جس میں ہارٹیکلچر بحیثیت مضمون لیا ہو۔
پسندیدہ:۔ پودوں کے عمل نقل اور کھاد کے متعلق مزدوری تجربہ
نوٹ:۔ غیر معمولی طور پر سند یافتہ اور تجربہ کار ملازمین کے سلسلہ میں استعداد میں چھوٹ دی جائے گی

امام۔ جامع مسجد۔ (مستقل)

شرح تنخواہ:۔ ۴۲۵ ۔ ۱۵ ۔ ۵۲۰ ۔ ای بی ۔ ۲۰ ۔ ۶۴۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:۔ (۱) لازمی: کسی مستند ادارہ سے عالم اور قاری، حافظ قرآن۔
(۲) پسندیدہ:۔ تقریر اور وعظ دینے کی اہلیت۔

سینیر لیباریٹری اسسٹنٹ (چھٹی کی بنا پر خالی جگہ) ڈیپارٹمنٹ آف پیتھالوجی
شرح تنخواہ:۔ ۳۸۰ ۔ ۱۲ ۔ ۵۰۰ ۔ ای بی ۔ ۱۵ ۔ ۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔
استعداد:۔ ہائر سکنڈری / سائنس کے مضمون سے کر یری یونیورسٹی۔
(۲) پسندیدہ:۔ میڈیکل کالج سے وابستہ ہسپتال میں کام کا تجربہ۔

ڈرائیور (مستقل)
شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰ ۔ ۶ ۔ ۲۹۰ ۔ ای بی ۔ ۶ ۔ ۳۲۶ ۔ ۸ ۔ ۳۶۶ ۔ ای بی ۸ ۔ ۱۰ ۔ ۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد (۱) لازمی: تعلیم یافتہ
ہلکی / بھاری گاڑیاں چلانے کا لائسنس۔
ڈرائیونگ کا چار سالہ تجربہ۔
(۲) پسندیدہ :۔ اردو اور ہندی کی کام چلاؤ معلومات
موٹر میکینک کا تجربہ

پیش نماز (شیعہ) ۔ (مستقل)
شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰ ۔ ۶ ۔ ۲۹۰ ۔ ای بی ۔ ۶ ۔ ۳۲۶ ۔ ۸ ۔ ۳۶۶ ۔ ای بی ۸ ۔ ۳۹۰ ۔ ۱۰ ۔ ۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔
استعداد:۔ کسی معتبر دینی مدرسہ کی سند جیسے فاضل، سند الافاضل یا اس کے برابر کوئی دوسری دینی سند نیز اس کے ساتھ کسی معتبر عالم دین کا اجازۂ پیش نمازی اور احکام شرعیہ کی ایسی پابندی جس سے عدالت کا پتہ چلے۔

اسسٹنٹ وائرمین (چھٹی کی بنا پر خالی جگہ) الیکٹریسٹی ڈیپارٹمنٹ
شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰ ۔ ۶ ۔ ۲۹۰ ۔ ای بی ۔ ۶ ۔ ۳۲۶ ۔ ۸ ۔ ۳۶۶ ۔ ۸ ۔ ۳۹۰ ۔ ۱۰ ۔ ۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔ وائرمین کا لائسنس

یا

آئی۔ ٹی۔ آئی کا الیکٹریشن سرٹیفکیٹ۔

۱۰۔ نرسنگ اسسٹنٹ [چھٹی کی وجہ سے خالی جگہ] یونیورسٹی ہیلتھ سروس۔

شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰-۶-۳۲۶-ای بی ۸-۳۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد: (۱) لازمی [الف] ہائی اسکول پاس شدہ۔

[ب] معاون و مددگار نرس اور قابلہ کا ڈپلومہ

[ج] رجسٹریشن۔

پسندیدہ:۔ کسی ہسپتال میں کام کا تین سالہ تجربہ۔

غیر معمولی تجربہ اور قابلیت کے حامل امیدوار کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا، انھیں بطور ٹی۔ اے ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سیلکشن کمیٹی] رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے یکشت پانچ روپیہ [اسامی ۱-۲-۳ کے لیے] اور باقی ماندہ کے لیے ۳ روپیہ نقد ادائیگی [مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ] یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۲۳×۱۰ سنٹی میٹر سائز کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے جس پر خود کا پتہ تحریر ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۵ مارچ ۱۹۸۴ء ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

پرنٹر، پبلشر: ابوالحسن نقوی۔ مطبع: [illegible] مقام اشاعت: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟

اپنی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا
اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا
ٹھیک اور طاقتور ہے۔
سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں
طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی
اجزاء کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا،
دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ ۱۴ جڑی
بوٹیاں شامل ہیں۔ اِس مرکب سے آپ کے
نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن
اس کی مدد سے آپ کی روزمرّہ خوراک سے
صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔
سنکارا
ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک
ہمدرد
cinkara

تہذیب الاخلاق
علی گڑھ

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نورالحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

جلد ۳ (یکم تا ۱۵ مارچ ۸۴ء) شمارہ ۵

مندرجات:

بیداری کے آثار

آج اگر ہم اپنی قسمت پر فخر کریں تو بھی بجا ہے اور اگر اپنی قوم کے اقبال کی فصل بہار کی آمد آمد کی خوشیاں منائیں تو بھی زیبا ہے..... کیا ایسے قلیل زمانے میں اس کے ہونے کی ہم کو توقع تھی ؟ — توبہ توبہ۔ کیا ہم کو ایسا جلد ان ناچیز پرچوں سے اپنی قوم کے جگانے اور اٹھانے کی جو مدّتِ دراز سے غفلت کے تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی بے خبر سو رہی تھی توقع تھی ! ہماری قوم کی جو کچھ بدا قبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کے دار و بے ہوشی نے ان کے کانوں کو بہرہ کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا۔ دل بھی ہو گئے تھے۔ دماغ قابو میں نہیں رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سست ہو گئے تھے۔ زندہ تھے پر مُردوں سے بدتر تھے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تھے پر کچھ نہ کرتے تھے۔ اسی تھوڑے عرصے میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی۔ کچھ لوگ بخوبی ہشیار ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے۔

کچھ لوگ ہشیار ہوئے پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں۔ بہت سونے اور پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیپڑ جما ہوا ہے۔ کچھ کھلتی ہیں مگر روشنی سے چندھیا جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں۔ کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ ہشیار ہوئے ہیں مگر بدمزاجی اور تند خوئی سے ضد میں آ کر کمل تانے پڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نہیں اٹھنے کے تمہارا کیا اجارہ ہے۔ ہم یوں ہی پڑے رہیں گے۔ بعضے ان میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی پڑے رہو مت اٹھو۔ سید احمد کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے۔ ہم اسی بات کو سن کر خوش ہوتے ہیں اور دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں کہ وہ اٹھے وہ کلبلائے۔ خدا نے چاہا تو اب سمجھ دار بھی ہو جاویں گے۔ یہی رست و خیز ہماری قوم کے اقبال کی نشانی ہے۔ پتھر پسیجا تو سہی۔ اب کسی نہ کسی طرف یہ نکلے گا۔ لوہا پگھلا تو سہی۔ اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہے گا۔ بند پانی کے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا پانی کو بہنا چاہیے۔ پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنالے گا۔ اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت کچھ اچھی نہیں۔ قوم کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں جان نہیں ڈال دیتی ہے ؟

——— سرسید

برخیز !

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز

کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ است ہنوز

از سرِ تیشہ گزشتن ز خرد مندی نیست

اے بسا لعل کہ اندر دلِ سنگ است ہنوز

— علامہ اقبال

ترجمہ :

یہ کیا کہ تو کنارِ دریا مزے سے لیٹ گیا

اُٹھ — تجھے خبر نہیں

کہ ابھی تجھے طوفان کا مقابلہ کرنا ہے

نہنگ سے نبرد آزما ہونا ہے

تو نے تیشہ اٹھا کے رکھ دیا

یہ دانائی نہیں

تجھے خبر بھی ہے

کہ چٹانوں کے سینے میں

ابھی نہ جانے کتنے لعل و گہر پوشیدہ ہیں

(فیضان لغوی / مظفر نور)

کرانے کے لیے حال ہی میں بہار اور مشرقی یوپی کا دورہ کیا۔ ۶ فروری کو انھوں نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے کرزن ہال میں سرسید اور علی گڑھ تحریک پر ایک توسیعی خطبہ پیش کیا۔ ڈاکٹر اے۔ آر۔ قدوائی گورنر بہار نے اس تقریب کی صدارت فرمائی۔ خطبے سے پہلے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے سرسید تحریک کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور مختصراً سید حامد صاحب کی خدمات کا ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ سید صاحب کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کے ذوق کو عام کرنے کے لیے سرسید تحریک کو از سرِ نو زندہ کیا اور اس تحریک کے ترجمان تہذیب الاخلاق کو دوبارہ جاری کیا جو اس تحریک کے فروغ میں قابل قدر خدمت انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے راقم (مدیر مسؤل) کو تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد مختصراً پیش کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ سید حامد صاحب نے علی گڑھ تحریک کی افادیت و اہمیت کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ آج اس تحریک کو پھر سے زندہ کرنے اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر بھرپور توجہ دینے کی بے حد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں علی گڑھ کی خدمات اور ملک و قوم کو درپیش مسائل پر اظہار خیال کیا۔ یہ جلسہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ سامعین کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ جتنے لوگ ہال کے اندر تھے کم سے کم اتنے ہی باہر بھی تھے۔ ڈاکٹر قدوائی گورنر بہار نے راج بھون میں وائس چانسلر سید حامد صاحب کے اعزاز میں لنچ کا اہتمام کیا تھا جس میں عمائدین شہر مدعو تھے۔ مسرّت کا مقام ہے کہ شرکا میں اردو جاننے والے تمام حضرات تہذیب الاخلاق کی خدمات کے معترف تھے۔ انھوں نے تعاون کا یقین دلایا اور اکثر نے لائف ممبرشپ قبول فرمائی۔ پٹنہ میں رسالے کی ممبر سازی کی مہم میں ڈاکٹر خواجہ افضل امام اور اعجاز مقبول صاحب نے مدد کی۔

۸ فروری کو سید حامد صاحب نے رانچی میں مختلف اداروں کے منتظمین اور سوشل ورکرز سے اور جمشید پور میں کریمیہ ٹرسٹ کے اراکین اور اہل جمشید پور سے خطاب کیا اور تعمیری کاموں سے متعلق ان کی سرگرمیوں پر انھیں مبارکباد دی۔ کریمیہ ٹرسٹ اسکول، کالج، ٹریننگ کالج اور ہسپتال جیسے گیارہ ادارے نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے۔ اس کے منتظمین بڑی تندہی کے ساتھ عوام کی خدمت میں مصروف ہیں۔

۹ فروری کو پھلواری شریف میں امارت شرعیہ کے اراکین اور معاونین نے سید حامد صاحب کا خیر مقدم کیا۔ جناب قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے ادارے کا مختصر تعارف کرانے کے بعد علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کی خدمات کو سراہا۔ انھوں نے سید صاحب کی لگن، مستقل مزاجی اور خلوص کی تعریف کی اور اپنے تعلیمی و تعمیری منصوبوں میں مسلم یونیورسٹی سے تعاون کی اپیل کی۔ سید حامد صاحب نے امارت شرعیہ کے اراکین کو مبارکباد دی کہ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ جابجا شرعی عدالتیں قایم کر کے انھوں نے ایک اچھی مثال قایم کی ہے اور مسلمانوں کو تکلیف دہ مقدمہ بازی سے نجات دلائی ہے۔ ان کے نئے منصوبے (پالی ٹکنیک، پرائمری اسکول اور ہسپتال کا قیام) نہایت قابل قدر ہیں اور ان کی سعیٔ مسلسل اور جذبۂ ایثار کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ یہ منصوبے جلد تکمیل کو پہنچیں گے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آج آپ علما کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ مسلمان آپ کا احترام کرتے ہیں۔ اگر آپ انھیں مشورہ دیں کہ وہ اپنے عقائد پر مضبوطی سے قایم رہتے ہوئے جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہوں تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔ آخر میں جناب مولانا نظام الدین صاحب (ناظم امارت شرعیہ) نے شکریہ ادا کرتے ہوئے یقین دلایا کہ آپ کی تعلیمی مہم کو ہماری مکمل تائید حاصل ہے۔

۹ فروری کو وائس چانسلرز کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد ۱۰ فروری کو حلیم انٹر کالج میں شبلی لائبریری کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے سید صاحب کانپور تشریف لے گئے۔ کانپور میں حلیم ٹرسٹ کے تحت متعدد تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ مجلس انتظامیہ کی کوششوں سے ٹرسٹ کی مالی حالت بہت بہتر ہوئی ہے جس سے آئندہ ترقی میں مدد ملے گی۔ جناب مظفر الحق ندوی (علیگ) اور ان کے رفقا نے اہل کانپور کی تعلیمی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ جلد تکمیل کو پہنچے گا۔ انشاء اللہ۔ کالج کے کچھ طلبا لائبریری کے نام میں تبدیلی کے لیے مظاہرہ کر رہے تھے لیکن آخر کار وہ جلسے میں شریک ہوئے اور انھوں نے آخر تک نہایت انہماک کے ساتھ اپنے مہمان کی تقریر کو سنا اور ان کے نمائندوں نے اسٹیج پر آ کر یقین دلایا کہ آئندہ وہ بہترین ضبط و نظم کا مظاہرہ کریں گے اور تعلیم کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوں گے۔

اشتیاق حسین قریشی صاحب کانپور کے ان تینوں جلسوں میں شرکت کے لیے لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر ایک ہایت پر اثر تقریر
کی جس کا خلاصہ الگ دیا گیا ہے۔ اس جلسے میں سید صاحب نے تعلیم کی اہمیت پر تقریر فرمائی۔ انھوں نے اہل کانپور سے اپیل کی کہ وہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوں، اپنے موجودہ تعلیمی اداروں کو بہتر بنائیں اور نئے تعلیمی ادارے قائم کریں۔ مدیر مسئول نے تہذیب الاخلاق کا مختصر تعارف کرایا۔ اور جلسے کے اختتام پر شرکا نے بڑے پیمانے پر رسالے کی لائف ممبر شپ قبول فرمائی۔ ۱۲ر فروری کو سید حامد صاحب نے گورکھ پور کے جارج اسلامیہ کالج کی ایک تقریب میں شرکت فرمائی اور طلبا، اساتذہ اور معززین شہر کے ایک ملے جلے مجمعے کو خطاب کیا۔

یقین ہے کہ سید صاحب کا یہ طویل سفر مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور انھیں اپنے تعلیمی اداروں کی طرف متوجہ کرنے نیز نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے میں معاون ہوگا اور بہت جلد اس کے مثبت نتائج ظاہر ہوں گے۔ سید صاحب نے اپنی ہر تقریر میں تہذیب الاخلاق کی اہمیت واضح کی اور لوگوں کو اس کی رکنیت قبول کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیمی اداروں کے مقابلے میں اس رسالے کی اہمیت ثانوی ہے۔ یہ مقصد نہیں ذریعہ ہے لیکن اس کی اہمیت مسلم ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے اور خود سرسید کے زمانے میں یہی تجربہ ہوا کہ جب بھی کسی مہم کا آغاز ہوا تو بیداری کے آثار نمایاں ہوئے، کامیاب جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں لیکن پھر خاموشی چھا گئی جیسے کوئی نیند کا ماتا کلبلائے اور پھر گہری نیند سو جائے اس لیے ضرورت ہے کہ کوئی بار بار اسے جھنجھوڑے اور سونے نہ دے۔ تہذیب الاخلاق یہی خدمت انجام دینا چاہتا ہے۔ اس کے اجرا کا یہی مقصد ہے۔ یہ ہر پندرھویں دن ہماری کنڈی ہلاتا اور ہمارے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ ہمارے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہے، تعلیم کے میدان میں جو پیش رفت ہو رہی ہے اس سے ہمیں با خبر رکھتا ہے۔ ہمارے بچوں کی ترقی کے جو راستے کھل رہے ہیں ان سے ہمیں مطلع کرتا ہے۔ رسالے کی خامیوں اور کوتاہیوں سے ہم بے خبر نہیں ہیں اسے زیادہ بامعنی اور زیادہ بامقصد بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس کے قارئین کا حلقہ وسیع ہو اور ہمارے ہر گھر میں اس کی رسائی ہو۔

تہذیب الاخلاق کے آپ تک پہنچنے کی تین صورتیں ہیں۔ ہر پندرھویں دن آپ اسے اپنے اخبار فروش یا کسی نزدیکی بک اسٹال سے خرید سکتے ہیں کہ ملک میں اس کی تقریبًا پچاس ایجنسیاں ہیں لیکن ضروری نہیں کہ آپ کے شہر میں ایجنسی موجود ہو یا یہ کہ جب آپ رسالہ خریدنے کا ارادہ کریں تو اسٹال پر دستیاب بھی ہو۔ دوسری صورت سالانہ خریداری کی ہے مگر اس کی اپنی دشواریاں ہیں۔ مدت خریداری ختم ہونے پر ہمارے لیے مشکل ہے کہ بار بار آپ کو ادھر متوجہ کریں اور اس مصروفیت کے زمانے میں آپ کے لیے دشوار ہے کہ قطار میں کھڑے ہو کر منی آرڈر فارم حاصل کریں، خانہ پُری کریں اور دوبارہ قطار میں کھڑے ہونے کی صعوبت برداشت کریں۔ ایک بار تساہل ہوا اور ہمارا آپ کا رشتہ ٹوٹا تو بس ٹوٹ ہی گیا۔ اس لیے لائف ممبر شپ کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا کہ صرف ایک بار دو سو روپے (یکمشت یا دو تین ماہانہ قسطوں میں) ادا کر دیجیے۔ پھر آپ بھی ساری زحمتوں سے محفوظ اور دفتر بھی۔ نہ آپ کو آئندہ کوئی چندہ بھیجنے کی زحمت نہ دفتر کو کسی یاد دہانی کی ضرورت۔

پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ پانچ سو لائف ممبر بنائے جائیں اور حاصل شدہ رقم سرمایۂ محفوظ کے طور پر بنک میں جمع رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ منصوبہ کامیاب ہوا اور اب تک ہمارے بیشتر اہل قلم، تاجر، صنعت کار، معلم، طبیب، ڈاکٹر، وکیل، انجینیر، دانش ور، تہذیب الاخلاق کی رکنیت قبول فرما چکے ہیں۔ اس وقت لائف ممبروں کی تعداد چار سو کے قریب ہے۔ مناسب ہوگا کہ یہ تعداد پانچ سو سے آگے نہ بڑھے۔
گرانی اور خاص طور پر کاغذ کی گرانی میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس سے یہ اندیشہ ہے کہ ہزار نہ چاہنے کے باوجود رسالے کی قیمت بڑھانی ہوگی۔ بار بار بڑھانی ہوگی اور شاید یہ افسوسناک سلسلہ جاری رہے لیکن ہماری یہ خواہش ہے کہ قیمت بڑھے تو لائف ممبر اس سے متاثر نہ ہوں کیوں کہ انھوں نے دائمی رکنیت قبول کرکے رسالے کی بنیاد مستحکم کی اور خطرے کے نشان سے باہر آنے میں اس کی مدد کی۔ لیکن لائف ممبروں کو لاگت سے کم قیمت پر رسالہ مہیا کرنے کا مطلب ہوگا مسلسل نقصان اور لائف ممبروں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی نقصان بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اس لیے تعداد پانچ سو ہو جانے پر اسے روک دینے کا ارادہ ہے۔ بہر حال ہماری خواہش ہے کہ تہذیب الاخلاق کو آپ کا ہر ممکن تعاون حاصل رہے۔

سید حامد

ایک تقریر

سید حامد صاحب، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے مقصد سے حال ہی میں اتر پردیش اور بہار کے چند اضلاع کا دورہ کیا۔ مختلف مقامات پر انہوں نے جو تقریریں کیں اُن کے جستہ جستہ اقتباسات کو یکجا کر کے ہم نے یہ تقریر تیار کی ہے جس سے اُن کے پیغام کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

حاضرین کرام۔

سب سے پہلے میں اس جلسے کے منتظمین کا شکریہ ادا کردوں۔ شکریہ اس کا نہیں کہ آپ نے اتنی محبت سے پذیرائی کی، ایسے اعلیٰ پیمانے پر جلسے کا اہتمام کیا، ایسی فیاضی اور دریا دلی کا ثبوت دیا۔ شکریہ تو یقیناً اس کا بھی واجب ہے لیکن میں کسی استقبال کی امید، کسی اعزاز کی تلاش میں نہیں نکلا ہوں۔ مجھے تلاش ہے ایسے مواقع کی کہ میں اپنے بھائیوں سے، دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے دوستوں سے گفتگو کر سکوں۔ اپنے دل کی بات ان تک پہنچا سکوں۔ تو اصل شکریہ اس کا کہ آپ نے ایسا موقع فراہم کیا۔

حضرات! میں آپ سے جو گفتگو کرنے والا ہوں۔ اس میں آپ کو زبان کا چٹخارہ نہیں ملے گا، جو تصویر میں آپ کے سامنے پیش کرنے والا ہوں، وہ کوئی دلکش و دلآویز تصویر نہیں، جو کچھ میں عرض کرنے والا ہوں، اس سے آپ کو سرور و انبساط کے بجائے ذہنی کرب حاصل ہوگا، آپ کے دل کو بے چینی محسوس ہوگی، مگر میں کیا کروں۔ مجھے احساس ہوا کہ قوم کو ایک سخت مرحلہ درپیش ہے اور یہ گھڑی امتحان کی گھڑی ہے۔ اس احساس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں علی گڑھ سے قدم نکالوں اور دیوانہ وار سارے ملک کا دورہ کروں، اپنے درد میں آپ کو شریک کروں۔ ممکن ہے اس سے قوم کی بہتری کی کوئی سبیل نکل آئے اور اس دشوار مرحلے سے گزر جانے کا کوئی راستہ نکلے۔

دوستو! اس وقت صورت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہر جگہ اور ہر معاملے میں دوسروں سے بہت پیچھے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ بہتوں کو تو اس پسماندگی کا احساس تک نہیں اور جنھیں احساس ہے بھی، ان پر ایسی بے حسی طاری ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اقلیتی کمیشن کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر سکسینہ نے دردمندی کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے دو ایسی باتیں کہی ہیں جو ساری قوم کو بے چین کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انڈونیشیا سے لے کر مصر تک جن ملکوں میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ آباد ہیں وہاں وہ تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی میں اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے ہیں۔ دوسری بات اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اقلیت کو زندہ رہنے کے لیے اکثریت سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا ہے لیکن تاریخ میں پہلی بار اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اکثریت سے زیادہ تو کیا، اس کے برابر محنت کرنے کو بھی آمادہ نہیں ہیں۔

دُرست فیصلہ

سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو تعلیم جدید سے آراستہ کرنے پر صرف کردینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ میرا خیال ہے کہ بغیر اس تعلیم کے مسلمان طرزِ جدید کی قومیت کی تعمیر میں کوئی قابلِ قدر حصہ نہ لے سکتے تھے بلکہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط۔ —— جواہر لال نہرو

اِس بے حسی اور بے عملی کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان جدید تعلیم سے محروم ہیں اور ملال اس کا ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس کے دین میں علم حاصل کرنے کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ پیدائش سے موت تک برابر علم حاصل کرو؛ اے ایمان لانے والے مردو اور عورتو! علم حاصل کرو۔ جن اصحاب نے اس نظر سے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا ہے ان کا بیان ہے کہ جن آیتوں میں کائنات کا مشاہدہ کرنے اور اس پر

* کارخانۂ قدرت پر غور کرنا بھی عبادت ہے۔ (حضرت علیؓ)

غور و فکر کرنے کے بعد نتائج تک پہنچنے اور علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اُن آیتوں سے گنتی میں کہیں زیادہ ہیں جو عبادات سے تعلق ہیں یہ بات بھی توجہ کی طالب ہے کہ آج عربی میں سائنس کا ترجمہ علم ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک یعنی چار سو سال مسلمان خدا اور اس کے رسولؐ کے اس حکم پر کاربند رہے۔ سائنس کے مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ اُس زمانے میں دنیا کا کوئی علم ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کا شرمندۂ احسان نہ ہو۔ علوم میں کوئی اضافہ ایسا نہیں ہوا جس کا سہرا اس دور کے مسلمانوں یا عربوں کے سر نہ رہا ہو۔ اس کے بعد چار سو سال ایسے گزرے جنھیں ڈھلان کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کے بعد مکمل تاریکی ہے۔ جہالت، زوال، بے حسی کی تاریکی۔ آج کا مسلمان علم سائنس اور ٹکنالوجی سے کوسوں دور ہے اور ان تینوں چیزوں پر غیر مسلموں کی حکمرانی ہے۔

یہ صورتِ حال تشویش ناک ہے۔ ہم سب کو مل کر اس طرف توجہ کرنی چاہیے اور علم کی دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہم میں جو لوگ تجارت کر رہے ہیں یا جنھوں نے کوئی صنعت قائم کرلی ہے یا کسی دستکاری میں مہارت حاصل کرلی ہے وہ اپنی ظاہری آسودہ حالی سے مطمئن ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کوئی اہمیت نہیں رکھتی وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلانا وقت اور پیسے دونوں کا زیاں سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ تعلیم حاصل کرکے وہ ان کے کام کے نہ رہیں گے اور اتنا نہ کما سکیں گے، جتنا بغیر تعلیم کے کما سکتے ہیں۔ وہ اس قدر صبر اور اتنا انتظار نہیں کرسکتے کہ ان کے لڑکے تعلیم مکمل کرلیں۔ ان ننھے ہاتھوں اور ناپختہ ذہنوں کو اپنی آمدنی میں اضافے اور اپنی آسایش کے لیے استعمال کرتے ہیں اور خدا سے نہیں ڈرتے۔ وہ اپنی ذرا سی آسایش اور آمدنی میں معمولی سے اضافے کی خاطر بچوں کو اپنے ساتھ لگا لیتے ہیں اور انھیں تعلیم سے محروم کردیتے ہیں۔ یہ بڑی نادانی ہے، بڑی خام خیالی ہے۔ یہ بچے تعلیم یافتہ ہوں گے تو کل آپ کے کاروبار کو بہت آگے بڑھا سکیں گے۔

سوچیے کیا بات ہے کہ مال ہم اپنے کارخانوں میں تیار کرتے ہیں۔ اسے ملک سے باہر بھیج کر لاکھوں روپے دوسرے کماتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ تعلیم یافتہ ہیں۔ درآمد برآمد کا فن بڑا پیچیدہ ہے۔ وہ لوگ اس فن سے واقف ہیں۔ درآمد برآمد کی بات بھی جانے دیجیے — سائنس اور ٹکنالوجی بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ آج کل دنیا کا مجموعی علم ہر دس سال میں دوگنا ہو جاتا ہے زمانہ کی تیز رفتاری کا اندازہ اس سے لگائیے۔ آنے والا زمانہ، ہمارے بچوں کا زمانہ اور بھی تیز رفتار ہوگا۔ صنعت میں، دستکاری میں عجب عجب تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی ایجادات ہوں گی۔ کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ذریعے ان کا علم عام ہوگا۔ بے علم لوگوں کی رسائی ان سب چیزوں تک کیسے ہوگی۔ تو جناب! یقین کرلیجیے کہ علم حاصل کیے بغیر ہمارے بچے ہمارے کام کو، ہمارے کاروبار کو ہرگز فروغ نہیں دے سکیں گے۔ نہ ان کی شخصیت کی تعمیر ہوسکے گی، نہ اُن کا کاروبار بڑھ پائے گا۔

اگر آپ میری اس رائے سے اتفاق نہ بھی کرتے ہوں تو ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ کما کر پیٹ بھر لینے میں کوئی کمال نہیں۔ یہ کام تو چرند

سب ہی کر لیتے ہیں۔ لیکن جو چیز انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے
ہے علم اور عقل۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے کہ علم کے بغیر
کو جلا نہیں ہوتی، اس میں چمک نہیں آتی۔ کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ
ے بچے کما کر پیٹ تو بھر لیں، لیکن علم سے محروم رہیں۔ ان میں اور
نوں میں کوئی فرق نہ ہو۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ انسان کا نشانِ امتیاز
ہے کہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر کسے، علم کی روشنی میں پرکھے۔

آخری بات یہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہمیں علم حاصل کرنے
کید فرمائی ہے اور خدا نے ان بچوں کو ہماری تحویل میں دیا ہے۔
ان کا سرپرست مقرر فرمایا ہے۔ بہتر سے بہتر انداز پر ان کی پرورش
ہمارا فرض ہے۔ خدا کے بتائے ہوئے راستے پر ان کو چلانا ہماری
واری ہے۔ بچپن سے انھیں کاروبار میں لگا کے اور انھیں علم سے
کرکے ہم خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ
ے صنعت کار، تاجر اور اہلِ حرفہ بیشتر دین دار لوگ ہیں لیکن
ایک اہم حکم ماننے سے وہ انکار کردیں تو ان کی دین داری کس
ی۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ حشر کے دن جب سوال ہوگا کہ
معصوموں کو تمہاری تحویل میں دیا گیا تھا تم نے اپنی ذرا سی آسائش کی
انھیں ایک اہم حکم کی تعمیل سے روک دیا۔ ان کی شخصیت کے سنورنے
وانا ہونے کے امکانات کو ختم کر دیا، انھیں علم حاصل نہیں کرنے دیا
ستو بتاؤ تمہارے پاس کیا جواب ہوگا؟

خدا تعالےٰ تمہارے کاروبار میں ترقی دے۔ تمہاری دولت میں
ہو۔ اللہ تمہیں اور زیادہ نعمتوں سے نوازے۔ مگر خدارا تم
ں کو اللہ کی ایک اہم نعمت سے محروم تو نہ کرو۔

ہمارے کچھ بھائی ایسے بھی ہیں جنھوں نے ماشاء اللہ تعلیم حاصل
ور کسی بلند منصب پر فائز ہو گئے۔ اب وہ خوش اور مطمئن ہیں کہ
دولتِ دنیا حاصل ہو گئی۔ ان کے بچے بھی ملک کے بہترین اسکولوں
پا رہے ہیں۔ ان بچوں کا مستقبل محفوظ ہے اور ان کے لیے ترقی
ستے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن انھیں قوم کے باقی افراد کا خیال نہیں
ن بھائیوں کا خیال نہیں آتا جو زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں
تہ لوگوں پر ان بھائیوں کا بڑا حق ہے۔ علم کی دولت پس انداز
ے لیے نہیں، بانٹنے کے لیے ہے۔ یہ لوگ جو پسماندہ ہیں یہ بھی تو قوم کا

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

درخت میں ہر ڈالی اور پتی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے لیکن ڈالی
یا پتی کے ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا، درخت سے الگ
ہو کر ڈالی اور پتی کے لیے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔

——— ڈاکٹر ذاکر حسین

ایک حصہ بلکہ بڑا حصہ ہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ ہم ان سے علیحدہ ہیں دانشمندی
نہیں۔ ہم سب ایک ہی شجر کی شاخیں ہیں۔ ٹہنی اس وقت تک ہری بھری
اور سرسبز و شاداب رہتی ہے، جب تک وہ شجر سے جڑی رہے، علیحدہ ہو جانے
کے بعد وہ مرجھا جاتی ہے کمھلا جاتی ہے پتے منتشر ہو کر پامال ہو جاتے
ہیں اور ٹہنی سوکھ کر آگ کی خوراک بنتی ہے اور آخر راکھ ہو جاتی ہے —
ہمارے شاعر نے کہا تھا ؎

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

یہی تعلق فرد و ملت کا ہے۔ فرد ملت سے کٹ کے اپنی حیثیت کھو
بیٹھتا ہے۔

فرد قایم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

قوم سے ہمارا تعلق استوار رہنا چاہیے کہ اسی میں ہماری بقا ہے۔

ساری خرابی دراصل یہ ہے کہ: کارواں کے دل سے احساسِ
زیاں جاتا رہا۔ جو لوگ احساس کی دولت سے محروم ہیں، جنھیں زیاں کا
کوئی احساس نہیں انھیں کچھ کہنا فضول ہے۔ یہ لوگ اس معنی میں خوش نصیب
ہیں کہ نہ یہ کچھ سوچنے کی زحمت کرتے ہیں، نہ انھیں قوم کی بدحالی کا خیال
آتا ہے۔ اس لیے وہ ہر طرح کے ذہنی کرب سے محفوظ رہتے ہیں۔ مگر ایک
جماعت وہ بھی ہے جسے اس زیاں کا احساس ہے۔ اس نقصان کا غم ہے۔
قوم کی زبوں حالی کا صدمہ ہے۔ وہ دکھ جس کا اظہار نہ ہو، آخر کار کینسر
بن جاتا ہے اور جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو حرفِ شکایت

ہائی ایجوکیشن

اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دیے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہے تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعًا و کرہًا ہم کو دلا دے گی۔ —— سرسید

زبان پر لاتے نہیں تھکتے۔ حکومت کی شکایت، افسران کی شکایت، نامساعد حالات کی شکایت۔ یہ عادت فضول بھی ہے اور مضر بھی۔ شکایت کر کے انسان سُبک ہوتا ہے اور اپنا وزن اور وقار کھو بیٹھتا ہے۔ کچھ کو فلک ناہنجار سے گلہ رہتا ہے۔ کیوں کہ ہر مصیبت اوپر ہی سے تو نازل ہوتی ہے۔ قوم کے کھوئے ہوئے اقبال کا یہ بے مصرف ماتم اور بھی مہلک ہے۔ اس سے قوتِ عمل مجروح ہوتی ہے۔ کام کرنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ دل سے ولولہ اور امنگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ شکوہ و ماتم سے بچنا اور سرگرمِ عمل ہو جانا وقت کا تقاضا ہے۔ نالہ و فریاد کرنے والے عمل کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک لمحہ برباد کیے بغیر اُٹھ کھڑے ہوں اور کچھ کر گزریں۔ اگر ہم اس خام خیالی میں رہے کہ آسمان سے کوئی مسیحا اُتر کے ہمارے درد کا درماں کرے گا، کسی "مردے از غیب" کا ظہور ہوگا جو ہمارے بگڑے کام بنا دے گا تو یہ خود فریبی ہوگی۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ اپنا کام آپ کیے سے ہوتا ہے۔ جو لوگ ہم خیال اور ہمدرد ہیں، جنھیں مسلمانوں کی زبوں حالی بے چین کیے ہوئے ہے، وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں ملیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے جوار اپنے حلقہ میں سب سرگرمِ عمل ہو جائیں۔ ان کے عمل کی مجموعی طاقت نتیجہ خیز اور بارآور ثابت ہوگی۔ کوئی ہمسایہ مدد کو نہیں آتا۔ ہمیں خود اُٹھنا ہوگا اپنی تقدیر آپ بنانی ہوگی۔

ہمارے ہم وطن ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے۔ ہم اب تک چونکے بھی نہیں۔ کل تک ہم کارواں سالار تھے، آج گردِ کارواں ہیں اور گردِ کارواں ہی رہے تو کل پیروں تلے روندے جائیں گے۔ یاد رکھیے زمانہ بڑا بے رحم ہے۔ جو اپنا خیال آپ نہ کرے، زمانہ اس کا خیال نہیں کرتا۔ پیچھے رہ جانے والوں کو وہ مڑ کر دیکھتا تک نہیں۔ زندگی کا کارواں بڑا تیز رفتار ہے۔ ہمیں سبک خرامی اور سست روی کو ترک کرنا ہوگا اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے دوسروں سے تیز دوڑنا ہوگا کہ آگے نکل جانے والوں کو پکڑ سکیں۔ اس دوڑ میں کمزور مارے جاتے ہیں۔ اور مارے جانا ان کی قسمت ہے۔ ہمارے شاعر نے کہا تھا ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

قدرت کا یہ قانون اٹل ہے کہ کمزور کو اس دنیا میں جینے کا حق نہیں۔ یہاں ضعیفی سے جسمانی کمزوری مراد نہیں، مراد ہے علمی، اقتصادی اور تکنیکی پسماندگی۔ جب ہی تو آپ نے دیکھا کہ تندرست و توانا عربوں کو یہودیوں نے جب اور جس طرح چاہا، مات دی۔ یوں کہ یہ قوم بیدار ہے، منظم ہے، تعلیم یافتہ ہے، سائنس اور ٹکنالوجی پر مکمل گرفت رکھتی ہے۔ ہمیں اس پسماندگی سے نجات پانی ہوگی، جرمِ ضعیفی کے ارتکاب سے بچنا ہوگا۔ ورنہ وہ دن دور نہیں، اور میں اس دن کے تصوّر سے کانپتا ہوں، جب ہم صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔

ہم اگر پسماندہ ہیں تو جس ملک میں رہیں اس کی دھرتی پر بوجھ بنیں گے اور بے آبرو ہوں گے۔ اگر ہم اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے اور ملک کی ترقی میں کوئی رول ادا کر سکے تو آنکھوں پر بٹھائے جائیں گے

آپ حضرات جو اس جلسہ گاہ میں جمع ہیں اور جنھیں خدا نے علم کی دولت اور مادّی وسائل سے نوازا ہے اور جو میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجّہ کرنے کی کوشش کریں، ان میں تعلیمی بیداری پیدا کریں اور کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ جا بجا تعلیمی ادارے قائم کریں۔ اور کسی مسلمان بچے کو ان پڑھ نہ رہنے دیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس ضمن میں میرے فرائض آپ سے زیادہ ہیں، میری ذمہ داریاں آپ سے بڑھ کر ہیں۔ اس لیے کہ میں اس ادارے سے منسلک ہوں جو ہمارے آپ کے بہت بڑے محسن سرسیّد علیہ الرحمۃ کے تعلیمی اور اصلاحی مشن کا ایک حصّہ ہے۔ سرسیّد ہمارے کارواں

ہ سالار تھے جن کا ہاتھ قوم کی نبض پر اور نظر مستقبل پر تھی۔
کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے اعتماد کی بازیابی کی،
کی یاس کو آس میں بدلا، ان کو اپنی روایات پر قایم رہنے کی
یب دی۔ ہمارے رہنما جذبات سے کھیلتے آئے ہیں۔ ان کی اپیل
بات سے ہوتی رہی ہے۔ ایک سرسیّد ہی ایسے تھے جنھوں نے
دوستانی مسلمانوں کو عقل سے کام لینے کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک
مانوں کو پستی سے نکالنے کا واحد ذریعہ تعلیم تھی۔ اس لیے انھوں
سلمانوں کی تعلیم کا ایک وسیع منصوبہ تیار کیا۔ علی گڑھ میں مدرسۃ
رم کی بنیاد ڈالی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اتنے بڑے ملک میں صرف
کالج مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔ انھوں نے مسلم
وکیشنل کانفرنس قایم کی جس کا مقصد سارے ملک میں جگہ جگہ تعلیمی
ارے قایم کرنا تھا۔ انھوں نے مختلف مقامات پر اس کانفرنس
سالانہ اجلاس منعقد کیے اور جدید تعلیم کا ذوق عام کرنے کی کوشش
۔ انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن ان کی چلائی ہوئی تعلیمی
ریک پچاس سال تک کامیابی کے ساتھ چلنے کے بعد مضمحل سی ہوگئی
اس تحریک کو پھر منظّم طور پر زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سرسیّد کو احساس تھا کہ کانفرنس کا اجلاس تو سال میں ایک
ہوتا ہے۔ یاددہانی نہ کرائی جائے تو لوگ اس کی تجویزوں اور
ارشوں کو بہت جلد بھلا دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں بیداری پیدا
، ان کی سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے تہذیب الاخلاق
۔ انھوں نے اس رسالے سے یہ کام بھی لیا کہ کبھی مہینے میں ایک بار
دوبار گھر گھر پہنچ کر لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلایا کرے
کے اصلاحی اور تعلیمی مشن کا ترجمان تھا اور مسلمان قوم کو بیدار
نے میں اس کا جو حصّہ ہے، اس سے آپ سب واقف ہیں۔ محسوس
لسے ازسرِنو جاری کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ فروری ۱۹۸۲ء
سے دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ جناب محمد ہدایت اللہ صاحب نائب
ہوریہ نے اس کا اجرا کیا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اچھے نتائج
ہے ہیں۔ یہ باقاعدگی سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت
فزوں ہے اور یہ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ رہا ہے۔ یہ
سراسر تعلیمی اور اصلاحی رسالہ ہے۔

سرسید کے تہذیب الاخلاق کا

کرشمہ

یہ تہذیب الاخلاق کا ہی کرشمہ تھا —

کہ الفاظ قومی ہمدردی، قومی خیرخواہی ہمارے روزمرہ میں داخل ہوگئے۔

کہ مسلمان آپ اپنی عزت کرنے لگے۔

کہ اردو لٹریچر لفاظی، جھوٹ، مبالغہ، خوشامد اور ابتذال سے پاک ہوگیا۔

کہ علوم کی قدر ہونے لگی۔

کہ لوگوں کو اپنے خیالات آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کی جرأت ہوئی۔

کہ لوگوں میں تحقیقِ حق کا شوق پیدا ہوا۔

کہ مسلمانوں میں قوتِ اجتماعی کی تحریک پیدا ہوئی۔ (مولوی نذیر احمد)

اس ملک میں ہم اقلیت میں ہیں اور اقلیت کو جانبر ہونے اور باعزت زندگی گزارنے کے لیے میرے خیال میں تین شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے دینی مسلک اور اپنی صالح تمدنی روایات پر ثابت قدم رہے۔ جو اپنے عقائد سے وفاداری نہیں برتتے ان کے بارے میں یہ خیال ہوتا ہے اور درست ہوتا ہے کہ یہ اپنے مذہب کے وفادار نہیں تو ملک کے وفادار کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور جس میں یہ صفت نہ ہو وہ عزت کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اقلیت کو اکثریت سے زیادہ محنت و جانفشانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ پہلی شرط کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اکثریت سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے چاہئیں۔ اس لیے کہ تعلقات خوشگوار اور شگفتہ رکھنے میں دونوں کا بھلا ہے اور اس لیے بھی کہ ہمارے آئین اور حکومتوں نے مختلف فرقوں کے درمیان جس برابری اور عدمِ امتیاز کا اعلان کیا ہے ان کا نفاذ اکثریت کے ان افراد کے ہاتھ میں ہے جو مختلف شعبوں اور اداروں میں برسرِاختیار ہیں۔

اسناد کی اہمیت

تعلیم و تربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور ایک قاعدہ داں کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے کبھی نہیں پکتے۔ پھر اگر تم چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکالو، وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ —— سرسید

میں جہاں کہیں جاتا ہوں مجھ سے مسلم یونیورسٹی کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ آپ بھی یقیناً اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس ادارے سے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک جذباتی لگاؤ ہے۔ شکاگو میں علی گڑھ کے ایک پرستار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گھنٹوں یہاں کے چپے چپے کا اس تفصیل سے ذکر کیا جیسے برسوں یہاں رہے ہوں۔ بعد میں یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے کبھی علی گڑھ کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا۔

طلباء میں بدنظمی ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی علی گڑھ میں ضبط و نظم کی بہتر فضا ہے۔ ریڈنگ روم صبح آٹھ بجے سے رات کے دو دو بجے تک کھلے رہتے ہیں اور پڑھنے والوں کی وہ کثرت ہے کہ بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ اساتذہ کی مستعدی اور طلباء کی محنت سے ہم نے اپنے نقصان کی تلافی کرلی ہے۔ ایک سال برباد ہوجانے کا جو اندیشہ لاحق ہوگیا تھا وہ الحمدللہ دور ہوگیا۔ داخلے صلاحیت کی بنا پر کیے جارہے ہیں۔ سال بہ سال داخلوں کی شرائط کو سخت اور معیار کو بلند کیا جارہا ہے۔ داخلے اور امتحانات پروگرام کے مطابق ہورہے ہیں۔ اقامتی زندگی کو چیرہ دستوں، تخریب کاروں اور استعمال آزماؤں سے پاک کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی میں بہت سے نئے شعبے قائم ہوئے۔ کیمیکل انجینئرنگ کی شروعات پہلے ہوچکی تھی۔ اب اس میں باقاعدہ تعلیم ہورہی ہے۔ نرسنگ کا کورس شروع کیا گیا ہے۔ ہوٹل مینیجمنٹ کی دنیا میں بہت مانگ ہے یہ کارآمد کورس بھی ہمارے یہاں اگلے سال سے شروع ہو رہا ہے فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے۔

یونیورسٹی میں عمارات کی کمی تھی۔ اسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میڈیکل کالج میں ایک سو پچاس بستروں کا ایک نیا وارڈ زیرتعمیر ہے، ایک بہت بڑے سہ منزلہ ہوسٹل کی تعمیر مکمل ہونے والی ہے۔ اس میں پانچ سو طلبہ رہ سکیں گے۔ ایک اور اقامت گاہ نیو ہال میں کمروں کا اضافہ ہوا ہے۔ انتظامیہ عملہ کی عمارت تقریباً مکمل ہوچکی ہے۔ سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک میں نصاب اور داخلوں میں غیرمعمولی اضافہ آئندہ سال سے کیا جائے گا۔ لڑکیوں کے کالج میں ۲۰۰ لڑکیوں کے لیے ایک ہوسٹل کی منظوری حاصل کرلی گئی ہے۔ الغرض یونیورسٹی میں سنجیدہ تعلیمی اور تحقیقی فضا کو بحال کر دیا گیا ہے۔ اب نصابوں کی تجدید کی باری ہے۔ جس کے لیے یہ لمحہ موزوں ہے۔ کیوں کہ یونیورسٹی نے ۱۰+۲+۳ وضع تعلیم کو قبول کرلیا ہے۔

اڑان کے لیے ضروری ساز و سامان فراہم ہے۔ اساتذہ سے طلبہ کی توقعات بڑھ رہی ہیں۔ بے حد ضروری ہے کہ یہ توقعات پوری کی جائیں۔ اور ہمارا قافلہ ولولے اور عزم کے ساتھ مقابلہ کی رزمگاہ اور معیار کی منزل کی طرف روانہ ہوجائے۔

سامعین کے اس مجمع میں اہلِ علم ہیں، دانشور ہیں، فضلا ہیں، صنعت کار اور اہلِ حرفہ ہیں، نوجوان اور طالب علم بھی ہیں۔ ان سب نے میری اس طویل تقریر کو انہماک اور تحمل سے سنا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں عرض کی گئیں، انھیں وہ قابلِ توجہ خیال کرتے ہیں اور یہ بیداری کے آثار ہیں۔ دکن کے مسلمان ہم سے پہلے جاگ چکے ہیں اور تعمیری کاموں میں معروف ہیں۔ ہمیں ان کی پیروی کرنی چاہیے اور خود انھیں بھی کام کی رفتار کو تیز کرنا ہوگا کہ وہ بھی دوسری قوموں سے ابھی پیچھے ہیں۔ ہمیں اپنے پرانے اداروں کو مستحکم کرنا چاہیے، نئے ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر آپ سب نے توجہ کی تو جلد شمالی ہند میں بھی ہمارے اداروں کا جال پھیل جائے گا۔ انشاءاللہ۔ لیکن ہمیں نہ صرف ایسے اداروں میں اضافہ کرنا ہے بلکہ عام اداروں میں منظم کوشش کے تحت بڑی تعداد میں داخل ہونا ہے۔ اس کے لیے ہمیں سرجوڑ کر کوشش کرنی چاہیے۔

★★

اشتیاق حسین قریشی

تعلیم کے پانچ محاذ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سیّد حامد صاحب فروری [illegible]ے ہفتے میں کانپور تشریف لے گئے تھے۔ کانپور کے شہریوں نے [illegible]یک استقبالیہ دیا جس میں معززینِ شہر نے شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر ا[illegible]ق حسین قریشی صاحب نے جو دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے [illegible] کی ایک اہم خدمت انجام دے رہے ہیں، اِس موقعے پر ایک نہا[illegible]کرانگیز اور پُراثر تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر کے آغاز میں ایک [illegible] کا قول دہرایا کہ ذہنی و فکری اور تعلیمی و تہذیبی غلامی، سیا[illegible]لامی سے کہیں زیادہ گہری اور کہیں زیادہ مہلک ہوتی ہے اور [illegible]لامی قوم کو اندر ہی اندر اس طرح برباد کر دیتی ہے کہ اس بر[illegible] کا لوگوں کو احساس کبھی نہیں ہو پاتا۔ سر سیّد کا ہماری قوم پر [illegible]حسان ہے کہ انھوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا اور اپنی ساری کوش[illegible] مسلمانوں کو اس غلامی سے آزاد کرانے میں صرف کر دیں۔ آج [illegible] اس تحریک کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے، اپنے آزاد تعلیمی دا[illegible] قایم کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔

[illegible]اکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہمیں تعلیم کے پانچ محاذوں پر کام کرنا ہے۔ [illegible] محاذ اعلیٰ تعلیم کا ہے۔ اس محاذ کا درست رکھنا بہت ز[illegible] ہے۔ اس سطح پر کام کرنے والا ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ [illegible]ی آرزو ہے کہ یہ ادارہ ہم سب کی امیدوں پر پورا اترے [illegible] فرائض سے عہدہ برآ ہو۔ دوسرا محاذ دینی تعلیم کا ہے۔ [illegible] دیوبند جیسے ادارے اس محاذ پر کام کر رہے ہیں۔ اس محاذ [illegible] صفوں کو مزید منضبط اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ [illegible] نیچے کی سطح پر بھی مضبوط کرنا اور دور دور تک پھیلانا ضروری [illegible] کرشنن جیسے مفکر کا قول ہے کہ جدید تعلیم مذہبی تعلیم سے [illegible]نسان نہیں شیطان پیدا کرتی ہے۔ تیسرے نمبر پر ابتدائی [illegible]م ہے۔ تعلیمی نظام میں اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ اگر اس سطح پر ہم نے تعلیم کو بہتر بنا لیا تو گویا تعلیمی عمارت کی پہلی اینٹ سلیقے سے رکھ دی۔ اور ایسا کرنے کے بعد ہم بہتر نتائج کی توقع کر سکتے ہیں تعلیمی پسماندگی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری قوم کے بہت سے بچّے بہت سے نوجوان مجبوراً روزی کمانے میں مصروف اور تعلیم سے محروم ہیں۔ ان کی تعلیم کا بہت بڑا فرض ہم پر عاید ہوتا ہے۔ یہ کام زیادہ دشوار بھی نہیں۔ ان کے لیے ہمیں جز وقتی تعلیمی ادارے قایم کرنے ہوں گے جن کے لیے نہ بڑی رقمیں درکار ہیں نہ وسیع عمارتیں، نہ بہت لایق کل وقتی استاد۔ ان کے لیے شبینہ مدارس کی ضرورت ہے جن میں تعلیم کے ساتھ ایسی معلومات بھی فراہم کی جائے جو اُن کے پیشوں میں معاون ہو اور انھیں آگے بڑھنے میں مدد دے۔ تعلیم کا پانچواں محاذ ہے خواتین کی تعلیم۔ افسوس ہے کہ اس طرف اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اس کو اب نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اعداد و شمار صاف بتا رہے ہیں کہ ہم دوسروں سے پیچھے رہ گئے بلکہ روز بروز اور پیچھے ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے بچّوں کے لیے مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مسدود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مہاراشٹر میں مسلمان کل چھ فیصد ہیں اور وہاں ۲۴۰ اردو میڈیم اسکول ہیں۔ یوپی میں صورتِ حال سخت افسوس ناک ہے جب کہ یہاں ہماری تعداد پچیس فی صد تک بتائی جاتی ہے۔

آخر میں انھوں نے فرمایا کہ سیّد صاحب کی یہ کوشش قابلِ ستایش ہے کہ وہ سر سیّد کے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے سرگرداں ہیں۔ علی گڑھ میں انھیں سخت دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ کبھی کبھی وہ تنِ تنہا نظر آئے مگر ان کی استقامت میں کمی نہیں آئی۔ انھوں نے خلوص و ایثار سے کام لیا، فرض شناسی کا ثبوت دیا، ملّت کے مفاد کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔

★★

خوشہ چیں

ام الخبائث

شراب کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ برائیوں کی ماں ہے۔ اس نے انسانی
معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہر چند کہ مسلمانوں میں اس کا رواج
عام نہیں ہوا تاہم ان پر اس کا وار اس لحاظ سے بہت کاری ہوا ہے کہ اس
کی کشش نے انھیں دیدہ دلیری کے ساتھ دوسرے نواہی اختیار کرنے کی
جسارت دے دی۔ چنانچہ بعض مسلمان، خصوصاً وہ مسلمان جو بہت خوشحال
ہیں اور سماج کے اوپری حصے سے تعلق رکھتے ہیں، اور جنھوں نے جدید تہذیب
کی قبا پہن رکھی ہے، شراب کو شیرِ مادر کی طرح پینے لگے ہیں۔ ایک ممنوعہ فعل
شروع کر دیجیے تو ساری ممنوعات کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔ یہ ظالم پیتے
ہیں اور پینے کے لیے جواز بھی فراہم کرتے ہیں۔ وہ جواز "یک گونہ بے خودی"
نہیں بلکہ بے خودی سے پہلے خود کو روک لینا اور دَور کو بند کر دینا ہے۔
تاویل کرتے ہیں کہ ممانعت نشہ کی ہے، پینے کی نہیں۔ اس طرح تو حرام کاری کو
بھی جائز قرار دیا جا سکتا ہے، اگر بات وضعِ حمل تک نہ پہونچے۔
ایک کانفرنس میں یہ دیکھ کر عبرت ہوئی کہ ہمارے پورپی پڑوس
کے بعض نمائندے بے محابا شراب پی رہے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں
مسلمانوں کی ضیافت کے لیے شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔
۱۴ اگست کے سنڈے ٹیلی گراف نے تفصیل اور تکلیف کے ساتھ
برطانیہ کے ان نوجوانوں کا تذکرہ کیا ہے جو اسپین چھٹی منانے کے لیے جاتے
ہیں اور اپنے ملک کو بدنام اور دوسروں کو بدحظ کرتے ہیں۔ یہیں ہے
ان کی تفریح گاہ بینی ڈورم [Beni Dorum]۔ گرمیوں میں ہر
ہفتہ پچاس ہزار تفریح طلب انگریز بینی ڈورم پہنچتے ہیں۔ ان کا سابقہ اپنے
ساتھیوں سے کچھ کی بدمستی، اوباشی اور بداطواری سے پڑتا ہے جنھیں مستیِ
شراب کشاں کشاں اسپین لے جاتی ہے اور وہاں جاکر وہ بالکل بے عناں
ہو جاتے ہیں اس بھیڑ سے بھی زیادہ عناں گستہ جو فٹ بال میچ دیکھنے
جاتی ہے اور آسمان کو سر پر اٹھا لیتی ہے۔ "پب" اور "ڈسکو" سے
کک حاصل کرکے وہ ہنگامہ برپا کرتے ہوئے بے مہار گھومتے ہیں۔ گروہوں میں
باہم لڑائیاں ہوتی ہیں۔ شہ نشینوں سے کرسیاں نیچے پھینکی جاتی ہیں کاروں
پر دھار جاکر شباب کیا جاتا ہے۔ شیشے توڑ کر ان کے ٹکڑے سوئمنگ
میں پھینکے جاتے ہیں۔ جا بجا قے کرنے کا تو کوئی شمار نہیں۔ غالب۔

مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

غالب اپنی مے نوشی میں یک گونہ بے خودی سے آگے نہیں بڑھے۔ ا
شاید پرستانِ قدح کو قے کرتے نہیں دیکھا تھا۔ مگس کی قے کو ا
کی قے پر کون نہ ترجیح دے گا۔ جس طرح میکش پی کر بہکتے ہیں
طرح ان کی شخصیت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے، اس کا سماں عبرت
ہے۔ اچھا خاصہ آدمی مہمل، بے جان، مجہول، احمق، کم ظرف، کم د
بے تہ، بے لگام، بے ریڑھ نظر آنے لگتا ہے۔ اُسے دیکھ کر اتنی
کراہت ہوتی ہے جتنی اس قے کو دیکھ کر جس کا متعفن چھڑکاؤ اس
میز کرسی اور فرش پر کیا ہے۔ یا ان ٹوٹے پھوٹے مہمل، منمناتے ہو
جملوں کو سن کر جو خرمستی کی حالت میں اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں
بینی ڈورم کی تفریح گاہ میں یہ ہوش باختہ بدحرکتی نیم شب
ہوتی ہے اور صبح ۵ بجے تک جاری رہتی ہے۔ یہ فرزند برطانیہ دن کو
شرابوں اور دہشت انگیز ویڈیو فلموں پر گزر کرتے ہیں، یک گونہ اعتد
میانہ روی کے ساتھ۔ شام کے آٹھ بجے اور بلا نوشی کا دور شروع ہو
گیت فضا کو مکدّر کرنے لگے۔ ہالینڈ کے ایک باشندے نے تبصرہ کیا۔"
کتنے جنگلی ہو گئے ہیں۔ کسی نے ان کو سکھایا ہی نہیں کہ دوسروں کے ساتھ
برتاؤ کیا جاتا ہے۔"

اب ۱۸ اگست کے گارجین کی یہ سرخی دیکھیے۔

"روس شرابیوں اور کام چوروں کو سزا دے گا۔"

کمیونسٹ پارٹی نے کام چوروں اور شرابیوں کے لیے جرمانہ کی سزا او
ورکروں کے لیے انعام تجویز کیا ہے۔

یہ بات تسلیم کی جا رہی ہے کہ اقتصادی ترقی کی راہ میں کام چو
حائل ہیں۔ مسٹر اینڈروپو نے ان مزدوروں کو بڑے پیمانے پر برطرف
کا اعلان کیا تھا جو کام چھوڑ کر خریداری اور مے نوشی کے لیے نکل جاتے
انھوں نے "ملیشیا" بھیج کر شراب خانوں سے ایسے ورکروں کو گرفتا
کرایا تھا۔

خواہ سرمایہ دار برطانیہ ہو خواہ اشتراکی روس، مے نوشی کے
سب ننگے ہیں۔ ام الخبائث کے دام میں سب اسیر ہیں۔

محسن

کاغذ کی ڈھال

ل یہ تھا کہ عائلی قوانین کے اس دور میں جبکہ بیویوں کو کھٹکا نہ
ا کا سوکن کا تصور بالکل ختم ہو جائے گا لیکن بُرا ہو خواتین کے
ازاری کا کہ ایسا نہ ہو سکا اور حوا کی بیٹیوں نے ہم بیچارے آدم کے
بعض عادتوں یا مصروفیتوں یہاں تک کہ مجبوریوں کو بھی رقیبا نہ
ے دیکھ دیکھ کر انھیں سوکن کا درجہ دے دیا۔

ب اس ہستی کو ہی لیجیے جس کا ہمیں نصف کمتر ہونے کا شرف
ہے۔ انھیں ہمارے اخبار پڑھنے پر شدید اعتراض ہے۔ ہم نے
ہا سمجھایا کہ اے نیک بخت! اس زمانے میں جب تک کسی کو
ہو کہ کل تج ہی صبح برازیل کے صدر کو کتنی چھینکیں آئی تھیں
انگا مانگا سے ساہیوال جانے والی بس اور ایک مست خرام
ٹکر میں کتنے مسافروں کو کہاں کہاں خراشیں آئیں، اسے پڑھے
ی کی مجلس میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن نہ ہماری اِن
ان پر کوئی اثر ہوا اور نہ اخبار سے ان کا جلا پا کم ہوا۔

مر صاحب ہم بھی ایک ہی چکنے گھڑے واقع ہوئے ہیں۔ وہ لاکھ
ل بیلی کریں، دانت پیسیں، ہونٹ چبائیں، ہم گھر پہنچتے ہی
ھال لیتے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ لقمہ ہاتھ میں ہے اور آنکھیں
ہولناک قحط کی خبر پر، پانی کا گلاس لبوں پر ہے اور
سے نیو کراچی میں نلکوں کے خشک ہو جانے پر خصوصی رپورٹ
ے ہیں۔

ور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی دانست میں کوئی بہت ہی
رہی ہوتی ہیں۔ اور ہم ہیں کہ اخبار میں گم۔ اس کے بعد اخبار
ے ساتھ ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا پڑتا ہے اور
واز آتی ہے، "پھر وہی اخبار"۔

کھسیانی سی مسکراہٹ چہرے پر طاری کرتے ہوئے اُن سے
پوچھتے ہیں "ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں آپ ــــــ ؟"

"خاک کہہ رہی تھی۔ آپ کو اخبار سے کبھی فرصت بھی تو ہو۔"

ان کے پارے کو نارمل تک پہنچنے میں کچھ وقت لگتا ہے اور جب
وہ اپنے اصل موضوع پر واپس پہنچتی ہیں، یا تو ہم میٹھی نیند کے مزے
لے رہے ہوتے ہیں یا پھر اخبار میں غرق ہو چکے ہوتے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ہمیں 'باوثوق ذرائع' سے یہ بھی معلوم ہوا
ہے کہ جب ہم دفتر میں ہوتے ہیں تو ہماری غیر حاضری میں یا یوں کہہ لیجیے
کہ ہماری نظر بچا کر وہ خود بڑے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ اخبار کا مطالعہ
فرماتی ہیں۔ ایک دن ہمت کر کے ہم نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ جب آپ اپنے
لیے اخبار پڑھنا مضرِ صحت نہیں سمجھتیں تو ہمارے لیے اس شغل پر پابندی
کیوں؟ جواب ملا۔ "ہم کوئی آپ کی موجودگی میں تھوڑا ہی پڑھتے
ہیں۔ لیکن آپ ــ ؟ آپ تو ٹھیک اسی وقت اخبار لے کر بیٹھتے ہیں
جب ہمیں فرصت ہوتی ہے اور ہم آپ سے دو چار باتیں کرنے آتے ہیں۔"

کہتی تو ٹھیک ہی ہیں وہ، اس لیے اب آپ ہمارا 'وضاحتی بیان'
بھی پڑھ لیجیے۔ قصہ اصل میں یہ ہے کہ جب بھی ہمارے اور ان کے درمیان
بقول ان کے دو چار باتیں ہوتی ہیں تو موضوعِ گفتگو ابتدا میں خواہ
کتنا ہی بے ضرر سا کیوں نہ ہو، گھوم گھما کر بات قطع میں جا پڑتی ہے
اور ان مسائل کا ذکر چھڑ جاتا ہے جن کے تذکرے سے ہم اس لیے کتراتے
ہیں کہ مقصود ان سے قطع محبت نہیں ہیں۔

کل ہی کی بات ہے۔ ہم نے جی کڑا کر کے اخبار ایک طرف رکھ دیا تھا
اور ہم دونوں ننھے میاں کی معصوم حرکتوں کا تذکرہ کر کے خوش ہو رہے
تھے۔ اخبار کے رپورٹر کی زبان میں 'بات چیت' بڑے ہی 'خوشگوار
ماحول' میں ہو رہی تھی۔ اچانک ان کے چہرے پر افسردگی کے آثار پیدا
ہوئے۔ ہم چونکنے ہو گئے۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر

کہا گیا۔ "ہائے بچارے نانا نانی تو دیکھنے کو ہی ترس گئے اور نہ جانے کب تک ترسیں گے۔"

لیجیے 'خوش گوار ماحول' آن کی آن میں 'کشیدگی کے عالم' میں تبدیل ہو گیا۔ ویسے آپ سے کیا چھپانا۔ دو سال بھی تو نہیں ہوئے ہم انھیں ان کے میکے لے گئے تھے۔ یقین کیجیے اس سفر پر ہماری گھریلو معاشیات کو جو دھکا لگا تھا اس کے نتیجے میں ہمارا بجٹ عرصے تک خسارے میں چلتا رہا۔ چوں کہ ہم ابھی ایک بار پھر ایسے کٹھن دور سے گزرنے کی سکت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ اس لیے بوجہ شرمساری منھ چھپاتے پھرتے ہیں۔ اور منھ چھپانے کے لیے اخبار کے صفحات سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔

ہم خود ستائی تو نہیں کرتے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم نے طبیعت بڑی جمہوریت پسند پائی ہے۔ اس لیے ہم نے انھیں داخلی امور میں مکمل خود مختاری دے رکھی ہے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتے ہی کمال سعادت مندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں خرچ کریں بس ہمیں دال روٹی ملتی رہے۔

لیکن بد قسمتی سے انھوں نے ہمارے اس جمہوری اندازِ فکر کی کبھی قدر نہیں کی۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ جو چیز آسانی سے حاصل ہو جائے اس کی اہمیت نظروں میں کم ہو جاتی ہے۔ اب اگر انھوں نے بھی اس داخلی خود مختاری کے لیے کبھی ہاتھ پاؤں مارے ہوتے، بھوک ہڑتال کی ہوتی یا آنسو بہائے ہوتے (اشک آور گیس کے استعمال کے بغیر ہی سہی!) تو ہوتی اس کی کچھ قدر و قیمت۔ ویسے ان کا کہنا یہ ہے کہ ہماری اس فراخدلی کا جمہوریت پسندی سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ دراصل ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش ہے۔ لیجیے ، یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں۔

لیکن چپکے سے سن لیجیے کہ وہ کچھ غلط بھی نہیں کہتیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم دفتر میں سارا دن "زیر غور، مسودہ برائے منظوری، 'اشد ضروری'" کی رنگ برنگی جھنڈیوں سے مرصع فائیلوں سے مغز پچی کرتے ہیں اور پھر جب نڈھال ہو کر گھر پہنچتے ہیں تو وہ ہم سے ان معاملات میں مشورہ طلب کرتی ہیں جن کا ہم انھیں اختیار کلی دے چکے ہیں۔ یہاں تک بھی غنیمت ہے۔ لیکن بعض اوقات تو وہ غضب ہی ڈھاتی ہیں یعنی یہ کہ ہم سے ان مسائل کو حل کرنے میں عملی تعاون کا مطالبہ کرتی ہیں۔

اکثر گھر پہنچنے پر ہمارا استقبال کچھ اس قسم کے شکووں سے ہوتا ہے کہ دھوبی کپڑے بہت گمانے لگا ہے۔ ملازم سودا لانے میں پیسے مارنے لگا ہے وغیرہ اور پھر ساتھ ہی یہ فرمائش بھی ہوتی ہے کہ دوسرا دھوبی ڈھونڈیے ایماندار نوکر اس دور میں تلاش کیجیے۔ آپ ہی بتائیے کہ دن بھر کی مزدوری کے بعد ہم اتنا دم خم کہاں سے لائیں کہ اس قسم کی مہمات کامیابی کے ساتھ سر کر سکیں۔ آسان نسخہ یہ ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

چنانچہ ہم اپنا اخبار پھیلا لیتے ہیں۔ وہ بولتی جاتی ہیں اور ہم ہوں ہاں کرتے جاتے ہیں۔ عموماً ہمارا یہ نسخہ کارگر ثابت ہوتا ہے اور بات ٹل جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں اخبار دیکھتے ہی وہ جلال میں آجاتی ہیں اور معاملہ سنگین رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ گھر کے معاملات سے ہماری بے توجہی یہاں تک کہ خود اُن کی ذات سے عدم دلچسپی کے طعنے دیتی ہیں اور پھر سارے فساد کی جڑ اخبار سے ہماری غیر معمولی دلچسپی کو ٹھہراتی ہیں۔ اب ہم انھیں کیا بتائیں کہ ہمارے اخبار میں غرق رہنے کا اصل راز کیا ہے۔

اگلے وقتوں میں لوگ اک گونہ بے خودی کے لیے مے پیا کرتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ اس سے غرض نشاط ہرگز نہیں۔ آج کے زمانے میں شاید بیخودی کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مے کے لیے نہ صرف زرِ نقد، بلکہ زرِ مبادلہ بھی چاہیے کہ اسکاٹ لینڈ یا فرانس سے درآمد ہوتی ہے۔ اس لیے ہم جیسے خالی جیب جدّ و جہد زندگی کے مارے ہوئے بے خودی کے طلبگاروں یا فراریت پسندوں کے لیے مے کی جگہ اخبار نے لے لی ہے۔ اور لاکھ کوئی کچھ کہے، چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

تکلف برطرف ہمارے نزدیک اخبار کے مطالعے کا اصل مقصد دنیا کے حالات سے باخبر ہونا نہیں بلکہ اپنی حالت سے بے خبر ہونا ہو جاتا ہے۔ اس کے صفحات میں کھو کر ہم اپنے ذاتی مسائل، ناکامیوں، اور محرومیوں کو بھول جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے ہی۔

خیر چھوڑیے اِن باتوں کو آئیے اخبار پڑھیں۔

★ ★ ★

فرخ جلالی

مولانا اسماعیل
سرسید کے ایک نامور رفیق

سرسید کے ذہن اور ذکاوت کا اندازہ ان کے رفقاء کے ناموں اور کاموں سے ہو سکتا ہے۔ سرسید کو اپنی حیات میں مخالفت اور مخاصمت کا سخت سامنا کرنا پڑا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ تحریک اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے انتظام اور انصرام میں ایسے حضرات بھی شریک ہو گئے جو سرسید سے یا تو اختلاف رکھتے تھے یا سرسید کے شدید مخالف تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرسید کے سچے ہمدردوں اور ساتھیوں کے ناموں کو علی گڑھ تحریک کی تاریخ سے مٹا دیا گیا۔ جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض علماء نے سرسید سے اختلاف کیا اور سختی سے مخالفت بھی کی مگر نامور علماء نے سرسید کی تردید میں بہت کم لکھا۔

کچھ عالموں نے سرسید کے ساتھ علمی اور عملی تعاون کیا۔ لہذا ان کے ناموں کو بھی محو کر دیا گیا۔

مولانا محمد اسماعیل بن عبدالجلیل علی گڑھی ان نامور علماء میں سے ہیں جنھوں نے سرسید کے ساتھ کام کیا اور سرسید کے ساتھ بڑے کام کیے۔ ان کے امتیاز کے لیے یہ شاید کم نہیں کہ مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی (جو مدرسہ دیوبند کے بانیوں میں سے تھے) مولانا محمد اسماعیل کو پڑھانے کے لیے علی گڑھ آئے۔[1] مولانا محمد اسماعیل کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کے والد مولانا عبدالجلیل نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصہ لیا اور شہید ہوئے اور اس سلسلہ میں سرسید کی جرات بھی ملاحظہ کیجیے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب باغیوں کی اولاد سے رابطہ رکھنا بھی جرم تھا، سرسید نے مولانا محمد اسماعیل کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا ایڈیٹر مقرر کیا اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی "کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت" کا ممبر مقرر کیا۔

مولانا محمد اسماعیل ۱۲۶۴ھ علی گڑھ[2] میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا عبدالجلیل بن سیاف الدین سے پائی۔ مولانا عبدالجلیل مولانا بزرگ علی مارہروی کے شاگرد تھے۔ علی گڑھ شہر کی جامع مسجد کے امام اور خطیب بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بغاوت میں حصہ لیا اور شہید ہوئے۔ مولانا عبدالجلیل کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے لیکن محتاج تعارف بنا دی گئی ہے۔

مولانا محمد قاسم کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کو خواب میں حضور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حکم ہوا کہ "ہمارے دوست عبدالجلیل کے بیٹے اسماعیل کو حدیث پڑھاؤ"۔[3]

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے۔

> " اسی علی گڑھ میں جب وہ کول کے نام سے مشہور تھا ایک رئیس مولوی محمد اسماعیل صاحب نامی تھے جن کو حدیث پڑھنے کا شوق ہوا لیکن ریاست کے کاروبار کی مشغولیت اس کا موقع نہیں دیتی تھی کہ گھر سے باہر نکل کر اپنے شوق کو پورا کریں۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کو مولوی محمد اسماعیل کے حالات بتائے نہیں گئے۔ اسی لیے ان کو علی گڑھ کا رئیس بنا دیا۔ طلب علم

---

[1] مولانا محمد قاسم کی وفات پر انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید نے دلی رنج کا اظہار کیا اور بعد میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں مولانا محمد قاسم کے داماد مولانا عبداللہ انصاری کو ناظم دینیات مقرر کیا۔

[2] ۔ نزھۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر کے مصنف مولانا عبدالحی رائے بریلوی نے مولانا محمد اسماعیل کا سن ولادت ۱۲۶۳ھ لکھا ہے۔ مولانا عبدالحی رائے بریلوی سرسید سے خوش نہ تھے لہذا نزھۃ الخواطر میں سرسید کو "قلیل العلم" لکھا ہے۔ مولانا محمد اسماعیل کے حالات لکھتے ہوئے سرسید سے تعلق کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ مولانا عبدالحی نے مولانا محمد اسماعیل کے مسلک کو پسند فرمایا۔ مولانا عبدالحی کے فرزند مولانا ابوالحسن علی ندوی کو بھی شاید اس تعلق کا علم نہیں ہو سکا۔

[3] ابو یحییٰ امام خاں۔ تراجم علمائے اہل حدیث ہند۔ دہلی ۱۹۳۸ء ص ۲۲۴

میں روپیہ خرچ کرنا علماء کے خاندانوں کا عام دستور رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے مولانا محمد اسماعیل کا علی گڑھ کے خاندان بنی اسرائیل سے تعلق تھا۔ اس خاندان میں پڑھنے اور پڑھانے کی روایت کئی صدی تک رہی ہے۔

ابو یحیٰ امام خاں نے مولانا محمد اسماعیل کی مالی حالت کے متعلق بیان کیا ہے۔

"۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا۔ جس میں شاہ صاحب (مولانا عبدالجلیل) نے جام شہادت پیا۔ آپ (مولوی محمد اسماعیل) معہ والدہ اور بھائیوں کے تین برس تک چھپے پھرے"

ظاہر ہے کہ رئیس ہونے کا اب کیا سوال ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا محمد قاسم کے علی گڑھ آنے کا ایک اور سبب بھی بتایا ہے۔

"سننے میں آیا ہے کہ مولوی محمد اسماعیل پر غیر مقلدیت کا غیر معمولی اثر تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی طرف بعض ناگفتہ باتیں بھی منسوب ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے اسی مرض نے طبیب کے دل کو تڑپایا ہو۔"

پھر فرماتے ہیں۔

"افسوس اس قصہ کا تفصیلی تذکرہ حضرت والا (مولانا محمد قاسم) کے حالات بیان کرنے والوں کی روایتوں میں نہیں ملا۔"

مولوی محمد اسماعیل نے مولانا محمد قاسم کے علاوہ مولانا سید احمد حسن (مولانا سید صدیق حسن کے بھائی) اور سرسید کے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے بھی پڑھا۔

۱۸۶۰ء میں ان کا تقرر بہ حیثیت ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ہوا۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی کی ادارت کے بارے میں الطاف حسین حالی نے لکھا ہے۔

"اس اخبار کا ایڈیٹوریل کا اہتمام ابتدا سے اخیر تک سوائے ان ایام کے جب سرسید علی گڑھ میں نہیں رہے، انھیں کے ہاتھ میں رہا۔"

حیات جاوید صفحہ ۱۲۹۔ دہلی ۱۹۷۹ء

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں سرسید بنارس میں رہے اخبار کی ادارت کی ذمہ داری مولوی محمد اسماعیل کے ذمہ رہی جس کو انھوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے پورا کیا۔ جیسا کہ اصغر عباس صاحب نے اپنی کتاب "سرسید کی صحافت" میں لکھا ہے۔

"نومبر ۱۸۶۰ء کے اوائل میں مولوی محمد اسماعیل گزٹ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپریل ۱۸۷۷ء کے اواخر تک اس فرض کو انجام دیتے رہے۔"

اس کتاب میں راجہ جے کشن داس سکریٹری سائنٹیفک سوسائٹی کی رائے مولوی محمد اسماعیل کے بارے میں نقل کی گئی ہے۔

"ان (مولوی محمد اسماعیل) کی وجہ سے اخبار کو نہایت رونق ہوئی اور تمام عالم میں اس کو شہرت ہوئی۔ تمام اخبار نویس سوسائٹی کے اخبار کو اول درجہ کا خیال کرتے ہیں اور شائقین اس کو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ کوئی مضمون مفید ایسا نہیں ہے جس پر مولوی محمد اسماعیل صاحب نے کوئی آرٹیکل نہ لکھا ہو۔"

راجہ جے کشن داس سرسید کے بہت مخلص دوست تھے۔ ان کی شہادت بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔ راجہ جے کشن داس کی رائے کے بموجب سرسید کی غیر حاضری میں مولوی محمد اسماعیل برابر آرٹیکل لکھتے رہے۔ لہٰذا اس دور کے مضامین اور اخبار کی ترتیب میں مولوی محمد اسماعیل کا بڑا حصہ ہے۔ اس دس برس کے سب مضامین جو گزٹ میں شائع ہوئے ہیں سرسید کے سپرد نہیں کیے جا سکتے جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے۔

جناب اصغر عباس صاحب کو مولوی محمد اسماعیلؒ کے حالات بالکل دستیاب نہیں ہو سکے۔ مولوی محمد اسماعیل مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے جس کی طرف مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اشارہ کیا ہے۔

مولانا عبدالحی رائے بریلوی نے ان کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ القول الصریح فی تکذیب مثیل المسیح۔

۲۔ القول الصواب فی المولد والقیام۔

مولانا امام خاں نوشہروی نے پہلی کتاب کے علاوہ

۳۔ اثبات الجہر بالتامین عن الاحناف المحققین۔

۴۔ الکلام الرزین فی الرد علی القول المتین۔

کا ذکر کیا ہے۔

اس کے علاوہ کتاب "رفع الالتباس عن بعض الناس" کو بھی مولوی محمد اسماعیل سے منسوب کیا گیا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل نے سید خیرالدین وزیر تونس کی عربی کتاب "اقوام المسالک فی معرفۃ احوال الممالک" کا ترجمہ "نظم الممالک" کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ خلیفہ سیّد محمد حسن وزیراعظم ریاست پٹیالہ کے فرمان کے بموجب اور سرسیّد کی فرمائش پر کیا گیا۔ اور اس کتاب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ سرسیّد نے اس کتاب پر مختصر حاشیے بھی لکھے ہیں جو بہت اہم ہیں۔

اصغر عباس صاحب نے "سرسیّد کی صحافت" میں گزٹ میں مشمولہ کتاب پر تبصروں کی ایک فہرست دی ہے۔ لہذا نمبر ۲ پر اس کتاب "نظم الممالک" نام دیا گیا ہے۔ مگر سہواً مصنف اور مترجم کا نام رہ گیا ہے۔ بقیہ کتب کے مصنفین یا مترجمین کے نام شامل ہیں۔ "نظم الممالک" کا حق اشاعت خلیفہ سیّد محمد حسن نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی کمیٹی کو افتتاح سے قبل دے دیا تھا — نظم الممالک مارچ ۱۸۷۵ء میں نول کشور کے مطبع سے چھپی اور کالج کا افتتاح ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ اس کتاب میں مغربی ممالک کی ایجادات، انتظامی اور سماجی اور سیاسی حالات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ حاشیہ میں سرسیّد نے جدید مغربی نظام کے مختلف پہلوؤں پر جو رائیں دی ہیں اس سے ابھی تک استفادہ نہیں ہو سکا ہے۔

خیرالدین نے لکھا ہے۔

جو لوگ اپنی سیاست میں آزادی کی بنا ڈالنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اول اپنی رعایا کی لیاقت دیکھیں اور اس بات کا لحاظ رکھیں کہ کہاں تک آزادی چاہیے اور کہاں تک نہ چاہیے۔"

نظم الممالک صفحہ ۱۳۰

سرسیّد نے حاشیے پر لکھا۔

"ہندوستان کی رعایا کو اس لائق مسلمان وزیر کی رائے پر غور کرنا چاہیے کہ جب تک خود رعایا تربیت پاکر لائق نہ ہوں اس وقت تک وہ تمام حقوق جو آزاد رعایا کے ہیں درحقیقت پانے کے مستحق نہیں ہوتے۔"

خیرالدین نے مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے فائدے گناتے ہوئے بتایا کہ:

"یہ بات ظاہر ہے کہ قوت جماعت کی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں سرسیّد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

ہمارے ہندوستان کے رہنے والوں کو ان مضامین پر بخوبی غور کرنا چاہیے کہ جب تک وہ لوگ بھی باہم متفق ہو کر کام نہ کریں گے اور ہر کام کے لیے کمیٹیاں نہ بنائیں گے کبھی ان کے ملک کو ترقی نہ ہوگی۔ بالفعل یہ حال ہو رہا ہے کہ بقول مشہور "ساجھے کی ہنڈیا چوراہے میں" نہ ہوگی شراکت میں کیا جاتا ہے اوس میں چوری اور دغابازی ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی شریک مال مار بیٹھتا ہے۔ اوس کے دو سبب ہیں۔ ایک بے علمی جو بغیر ایک قومی مدرسۃ العلوم قائم ہوئے رفع نہیں ہو سکتی۔ دوسری تجارت کے کاروبار اور شراکت کے اصول اور طریقہ اور حساب کتاب سے ناواقفیت"۔

اسی طرح اور مقامات پر سرسیّد نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

مولوی محمد اسماعیل مدتوں مدرسہ کی دینیات کی کمیٹی کے ممبر رہے مولوی محمد اسماعیل کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق اسکول کے ~~[illegible]~~ میں مدرس فارسی رہے۔ ان کا ۶ مارچ ۱۸۷۶ء کو اسکول میں تقرر ہوا تھا۔ عرشی تخلص تھا۔ ۱۸۹۰ء مطابق ۱۳۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

مولوی محمد اسماعیل کے صاحب زادے مولانا محمد عثمان بھی عالم تھے مولانا محمد اسماعیل کا ۴ مئی ۱۸۸۴ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ حکیم عبدالمجید خاں کے علاج کے لیے لے جائے گئے تھے وہیں انتقال ہوا۔ جنازہ علی گڑھ لایا گیا۔ عیدگاہ میں سیکڑوں آدمیوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

۸ مئی ۱۸۹۴ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں لکھا گیا کہ

"ان کی وفات سے علی گڑھ علم سے خالی ہو گیا" علی گڑھ کے مشہور شاعر عنایت اللہ قیس نے اردو میں قطعہ تاریخ کہا اور فارسی میں محمد عبدالسلام عالی کا قطعہ تاریخ چھپا۔

نوٹ:۔ سرسیّد کے رفقا میں دو اور اسماعیل نام کے اصحاب تھے۔ ایک سرسیّد کے عاشق اور رفیق خاص حاجی محمد اسماعیل خاں رئیس دتاولی جو کمیٹی منتظم کالج کے وائس پریسیڈنٹ تھے۔ سرسید کا انتقال ان ہی کی کوٹھی پر ہوا۔

دوسرے خواجہ محمد اسماعیل جو کمیٹی منتظم کالج کے ممبر تھے اور علی گڑھ کے رہنے والے تھے۔

★ ★

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
Link
CABLE 83 LOCK

اطہر پرویز

ایک عظیم یونانی شاہکار — اوڈیسی

یونانی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ہے۔ انسانی تہذیب
ںا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کتنے علوم ہیں جن کی ابتدا یونان سے ہوئی ہے
۔ جیسے تو یورپ کی ذہنی زندگی کی ترتیب و تصنیف یونان ہی سے ہوئی
اس نے ہمیں سوچنے اور عمل کرنے کے راستوں پر ڈالا ہے۔ ذہنی اور
نود نما کے آداب سکھائے ہیں۔ یونان کے بغیر ہماری تہذیب نامکمل ہی
ہے گی بلکہ اس کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی۔ فلسفہ، سائنس، ادبیات
ن لطیفہ کے ابتدائی نقوش یونان کے افق سے ابھرے ہیں اور آج بھی
ب و تاب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ —— ہومر، سفوکلیز، ہیروڈوٹس،
ں، یورپڈیز، سقراط، افلاطون، ارسطو، ہپوکریٹیز، تھیوکریٹس وغیرہ
لوم کی مختلف شاخوں کا مطالعہ نامکمل رہے گا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے
نے میدانوں میں علوم کو اس کی ابتدا ہی میں اتنا آگے بڑھا دیا تھا کہ آج
ے مطالعے کے بغیر ان تمام علوم کا مطالعہ نامکمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا
ونانی کتنے غیر معمولی انسان تھے اور انسانی تہذیب ان کی وجہ سے کتنی
بنیادوں پر ہے۔ علوم کے کتنے میدان ہیں جن میں پہلا اور مضبوط قدم
ںانے ہی اُٹھایا ہے۔

جہاں تک ادب کا تعلق ہے، یونانی ادب کی دو بڑی خصوصیات ہیں
— سچائی اور سادگی —— ایسا نہیں ہے کہ یونانیوں نے دنیا کے
ے لوگوں کے مقابلے میں کم اصنام تراشے ہیں — کم جھوٹ بولا ہے —
یداوروں سے زیادہ ہی — لیکن چوں کہ سخن کے خوگر تھے اس لیے ان
نام میں — ان کے جھوٹ میں —— زندگی کی بڑی بڑی سچائیاں ہیں —
ں نے دنیا کو اس طرح سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جیسی کہ وہ ہے۔
ں ان کے فلسفے اور سائنس دونوں نے مدد کی۔ ان کے شاعروں نے
ھی اور انسانوں کو سمجھا اور برتا۔ کیوں کہ وہ انسانی زندگی کو اس کے
اظر میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے یہاں بچوں کی سی اثر پذیری ہے لیکن
ان کے ذہن کے دریچے بڑوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔

آیئے **ہومر** کی ایک کتاب "اوڈیسی" کو ذرا قریب سے دیکھیں۔ یہ اوڈیسس کا سفرنامہ ہے جسے ہومر نے لکھا ہے۔ اس کے نام سے دو رزمیہ منسوب ہیں —"ایلیڈ" اور "اوڈیسی"۔

یونان کا ادب ہومر سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن ہومر کون تھا؟ کیا یہ دونوں کتابیں ہومر نے لکھی ہیں۔ یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ سوال تاریخ سے بھی پہلے کے دھندلکوں میں کھویا ہوا ہے۔ کیا یہ دونوں رزمیہ ایک آدمی کی تصنیف ہیں۔ یا ایک سے زیادہ کی۔ یہ سوال نہیں ایک عقدہ ہے جس کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بہت سے لوگوں نے مختلف تاریخوں میں لکھا ہے اور پھر کسی بڑے شاعر نے اس کو آخری شکل دی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ایسا ہے جس کو بہتر ہے کہ ہم یوں ہی چھوڑ دیں اور "اوڈیسی" کے بارے میں بات کریں۔

"اوڈیسی" کے مطالعے کے لیے اچھا ہوگا اگر ہم یونانی معاشرے کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہومر کا سماج بنیادی طور پر امرا اور شرفا کا سماج ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہاں عام آدمی نہیں ہیں یا اُن عامیوں میں وہ خوبیاں نہیں ہیں جو دور سے دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ امرا و شرفا کا قد بہت اونچا ہے۔ عام آدمی ان کی طرف ہر اعتبار سے حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان میں علم بھی ہے عقل بھی — جرأت مندی بھی ہے اور بہادری اور حوصلہ مندی بھی۔ وہ ایسے بادشاہ نہیں جو محض فرماں روائی کرتے ہیں بلکہ وہ میدان جنگ میں بھی آگے آگے ہوتے ہیں۔ وہ جینے کے لیے مرنے سے نہیں ڈرتے۔ اُن کا ہیرو صحیح معنیٰ میں ہیرو ہے۔ انسان کو اس دنیا میں کیسے رہنا چاہیے وہ دنیا جو بہت سخت ہے، جہاں جینے کے لیے خطرات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور دیوتا بھی جرات اور ہمّت کا ساتھ دیتے ہیں۔ دیوتا مدد ضرور کرتے ہیں لیکن عمل خود اس کا کام ہے۔ ان کے بہادر

اور جیاے مافوق الفطرت سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ لیکن جرأت مندانہ اقدام
خود ان کو ہی کرنا پڑتا ہے ـــــ اوڈیسس کی واپسی اس کی ایک شاندار مثال
ہے۔ کس طرح وہ خطرات سے مقابلہ کرتا ہوا، سمندر کے تھپیڑے کھاتا ہوا
بیس سال بعد اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے جہاں اس کا استقبال
ہونے کے بجائے اس کا سامنا ایسے امرا سے ہوتا ہے جو اس کی پیٹھ کے پیچھے اس
کی دولت کو کھا رہے ہیں اور اس کی بیوی سے زبردستی شادی کرنا چاہتے
ہیں۔ پھر وہ سب کو تہ تیغ کرتا ہے اور اپنے باپ، بیوی اور بیٹے کے پاس پہنچتا
ہے۔ اس رزمیہ کا موضوع جنگ نہیں ہے۔ یہ سفرنامہ ہے لیکن اس سفر میں
اس کا مقابلہ کہیں انسانوں سے ہوتا ہے، کہیں فطرت سے اور کہیں مافوق الفطرت
سے اور وہ ان سب سے عہدہ برا ہوتا ہے۔ اوڈیسس کی کہانی انسان کی کہانی
ہے جو اس بڑی دنیا میں جدوجہد کر رہا ہے اپنی بقا کے لیے ـــــ اپنی زندگی
کو آگے بڑھانے کے لیے ـــــ اوڈیسس انسانی زندگی کو گزارنے کے لیے دیوتاؤں
کی غیر فانی زندگی سے انکار کرتا ہے۔ شاید اس لیے کہ خطرات میں جینا اصل جینا
ہوتا ہے۔ اپنی دنیا آپ پیدا کرنا اصل زندگی ہے۔

اوڈیسس عام انسان ہے، دیوتا نہیں ہے۔ اس کے اندر عقل، جرأت،
عمل اور اس کی عظمت و ناموری سب انسانوں کی سی ہے۔ اس کی شخصیت
میں مافوق الفطرت کا کوئی بھی عنصر نہیں ہے۔ اس کے یہاں غیر معمولی قوت
برداشت ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اتنا ہی تدبر بھی ہے۔ وہ دنیا کا پہلا
سیاح ہے جو ہر مشکل، ہر سختی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔
اس کی عقل تجربات سے نشو و نما پاتی ہے۔ اس لیے وہ کشادہ ذہنی کے ساتھ
تجربات کو قبول کرتا ہے۔ کیوں کہ اس سفر کے دوران اس نے ہر طرح کے
لوگوں کے ساتھ رہنا سیکھا ہے۔ وہ باتیں کرنا جانتا ہے۔ اُس کا ذہن بڑا
زرخیز ہے۔ وہ ذرا سی دیر میں ضرورت پڑنے پر ایک فرضی قصہ گڑھ لیتا ہے
زندگی کی سختیوں نے اسے چڑچڑا نہیں بنایا۔ وہ بیس سال کی مصیبتوں
کے باوجود کبھی تھکن کا شکار نظر نہیں آتا۔ بلکہ ہر دم تازہ دم رہتا ہے۔ وہ
دیوتاؤں کا نہیں انسانوں کا عاشق ہے۔ وہ دیوی کلیپو کے ساتھ رہ کر امر
ہو سکتا ہے۔ لیکن اُسے اپنی بیوی پینی لوپ کے ساتھ مرنے ہی میں زندگی
نظر آتی ہے۔ میاں بیوی کے رشتے میں جس حسن کا اظہار ہے وہ شاید ہی کہیں
اور ملتا ہے۔ اوڈیسس، ناسیکا سے کہتا ہے ـــــ "اس سے زیادہ
شاندار اور بلند چیز کیا ہو سکتی ہے، جب شوہر اور بیوی، ایک مکان میں
مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں۔ یہ دشمنوں کے لیے غم اور دوستوں کے لیے خوشی
ہوتی ہے اور ان کے اپنے دل اس کو سب سے زیادہ سمجھتے اور محسوس کرتے
ہیں۔"

ہومر کے یونان میں سرائے اور ہوٹل نہیں ہیں کیوں کہ مہمان اللہ کی
دین ہوتے ہیں۔ ہر ایک مہمان کا استقبال کرتا ہے۔ فقیروں، پناہ گزینوں
اور جلاوطنوں کے لیے ٹھکانہ ملتا ہے۔ ہومر کے عہد میں زندگی پیچیدہ نہیں
ہے، صاف ستھری اور سادہ ہے۔ اس لیے ہمیں اس کے سمجھنے میں ذرا بھی
دقت نہیں ہوتی۔

اس رزمیہ میں بلا کی سادگی ہے۔ اس کا مصنف زندگی کو پیش کرتا
ہے۔ ہمیں اس کی شخصیت کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی ذات میں کھویا ہوا نہیں
ہے بلکہ اس نے زندگی کے اس رزمیہ میں اپنی ذات کو کھو دیا ہے۔

"اوڈیسی" نہ صرف یونانی ادب میں بلکہ دنیا کے ادب میں ایک بلند
مقام رکھتی ہے۔ یہ اُن اولین اینٹوں میں سے ہے جس پر عالمی ادب کی عمارت
کھڑی ہے۔ یہ مقام مسرت ہے کہ یہ اینٹ اتنی مضبوط ہے کہ ماہ و سال،
سرد و گرم بھی عمارت کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا سکے۔ ★ ۲

ملازمتوں کے مواقع:

★ انڈین فارسٹ سروس
قابلیت: بی، ایس، سی۔ کل جگہیں ۲۰۰
آخری تاریخ: ۲ر اپریل ۱۹۸۴ء

★ ریجنل ریکروٹمنٹ بورڈ (اسٹیٹ بنک گروپ I۔ نئی دہلی)
ملازمتیں: کلرک، کیشیئر، کلرک ٹائپسٹ انگریزی، کلرک ٹائپسٹ
ٹیلی فون آپریٹر وغیرہ
کل جگہیں ۱۴۰۵؛ قابلیت: ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ، پری یونی
ایس ایس سی وغیرہ۔
درخواست کی آخری تاریخ: ۹۔ مارچ ۱۹۸۴ء
امتحان کی تاریخ: ۳ر جون ۸۴ء (دہلی) ۲۴ر جون ۸۴ء (دیگر)

★ سینٹرل ریکروٹمنٹ بورڈ (اسٹیٹ بنک گروپ I نئی دہلی)
پروبیشنری آفیسرز۔ کل جگہیں ۳۱۸
قابلیت: گریجویشن، آخری تاریخ: ۱۸ر مارچ ۸۴ء
(تفصیل کے لیے قریبی ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے رجوع کریں) - ایم۔ ایم۔

بہ محمد مختار اصلاحی

ایک صاحبِ کردار طبیب

کشمیر پر جب درّانیوں نے قبضہ کرکے لوٹ مار شروع کی تو اس
نت بے شمار خاندان کشمیر چھوڑ کر دوسرے ممالک میں منتقل ہوگئے۔ انھیں
ں ایک مولوی عبدالصمد صاحب بھی تھے جو اپنے بیٹے مولوی غلام نبی کو لے کر دلی
گئے۔ پھر عہد نواب آصف الدّولہ دلی سے لکھنؤ تشریف لے آئے اور
ہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ مولوی غلام نبی کے بڑے صاحبزادے
لوی حکیم محمد یعقوب صاحب ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے۔ بیاسی
ال کی عمر پائی۔ حکیم محمد یعقوب صاحب ایک جیّد عالم اور بڑے حاذق طبیب
ے۔ انھوں نے نواب سعادت علی خاں کا زمانہ دیکھا۔ پانچ بادشاہوں:
ازی الدّین حیدر، نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ
ور واجد علی شاہ کے عہد کی بہاریں دیکھیں اور آخری دورِ خزاں
ی، ملکہ وکٹوریہ کے عہدِ حکومت میں عالمِ جاودانی کی راہ لی۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کا زمانہ ہے۔ حاذق الملک حکیم سیّد
رتعش کا انتقال ہوچکا ہے، ان کے جانشیں کی حیثیت سے جھوائی ٹولہ
ھنؤ کے ایک چھوٹے سے مکان میں حکیم محمد یعقوب صاحب خلقِ خدا کی خدمت
یں مصروف ہیں۔

ایک دن نواب قدسیہ محل کی ایک مغلانی کا بچّہ سخت علیل ہوا۔ شاہی
لبیوں کے علاج سے فائدہ نہ ہوا تو حکیم یعقوب صاحب کے یہاں لے گئے
ور بچّہ صحت یاب ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد ولی عہد بہادر بخار میں مبتلا ہوئے
اطبّاءِ شاہی کی ہر ممکن کوشش کے باوجود نہ بخار دور ہوا اور نہ بے چینی میں
کمی آئی۔ نواب قدسیہ محل کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ بالآخر بادشاہ نے
چوب دار کو بھیجا کہ حکیم صاحب کو دربار میں لے آئیں اور ولی عہد کو
دکھلادیں۔ حکیم صاحب نے چوب دار سے کہا کہ میں ایک معمولی فقیر آدمی ہوں۔
شاہی دربار کے کچھ آداب و رسوم ہیں۔ میں ان سب کو پورا کرنے کے
لیے اپنے کو اہل نہیں پاتا۔ اقبال نے کتنی اچھی ترجمانی کی ہے اس موقف کی[۵]

خوددار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری

چوب دار نے جب بادشاہ سے یہ قول دہرایا تو انھوں نے فرمایا کہ جاؤ حکیم
صاحب سے کہہ دو کہ ان کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ جس طرح اور جس حال
میں بھی ہوں تشریف لے آئیں۔ حکیم صاحب معمولی سادہ لباس میں ملبوس
کندھے پر ایک ہلکی سی چادر ڈالے ہوئے دربار میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ تین دن
سے ولیعہد کی بے چینی اور بخار میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ شاہی اطبّاء حُقنہ
(ENEMA) دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ آپ نے ولیعہد کو غور سے دیکھا۔
نبض پر ہاتھ رکھا، چہرہ اور آنکھوں پر نظر ڈالی اور پوری کیفیت کا جائزہ
لیا۔ پھر انتہائی اعتماد اور وثوق کے ساتھ فرمایا۔ آپ سب فکر نہ کریں، یہ
تپ جدری یعنی چیچک کا بخار ہے۔ انشاءاللہ اب دانے صبح تک نمودار ہو جائیں
گے۔ بادشاہ اور شاہی طبیب یہ سن کر دیر تک سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بادشاہ
نے فرمایا۔ کہ براہ کرم دو دن شاہی محل میں قیام کریں تاکہ مریض کے حالات
سے ہر وقت باخبر رہیں۔ حکیم صاحب نے دربار کے ایک کمرے میں اپنا مصلّٰی
بچھا دیا اور حسبِ معمول ذکرِ الٰہی میں لگ گئے۔ صبح سویرے ہی مغلانی نے اطلاع
دی کہ آپ کی تشخیص بالکل صحیح نکلی۔ ولی عہد کے دانے نمودار ہوگئے۔ پھر حکیم
صاحب نے گلِ بنفشہ ۶ ماشہ، عناب ۵ دانہ، مویز منقّی ۹ دانہ، انجیر زرد ۲ عدد
خاکسی ۴ ماشہ، پانی میں جوش دے کر مصری ملا کر صبح و شام پینے کی ہدایت
فرمائی، اور جوشاندہ سے پہلے زہر مہرہ ۲ سرخ و مروارید ۲ سرخ کا سفوف
کھلانے کے لیے بتلایا۔ دانے وقت پر ڈھل گئے اور کچھ دنوں کے بعد ولی عہد
نے غسلِ صحت فرمایا۔

حکیم صاحب نے احتیاط و پرہیز اور مناسب غذائیں بتا کر رخصت
چاہی۔ بادشاہ نے اس علاج و تدبیر سے بہت خوش و مطمئن تھا۔ غسلِ صحت
کے دن حکیم صاحب کو کشتی میں پندرہ سو اشرفیاں اور خلعت عطا ہوئے۔

پھر نواب قدسیہ محل کی سفارش سے ایک معافی کی جاگیر بھی بخش دی گئی، لیکن حکیم صاحب نے شکریہ کے ساتھ اس جاگیر سے معذرت چاہی اور فرمایا کہ اللہ کا دیا ہوا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ یہ گراں قدر جاگیر میری اولاد کو ترقی کی راہوں سے ہٹا کر عیش و آرام میں مبتلا کر دے گی اور پھر وہ کسب کمال سے دور ہو جائے گی۔ حکیم صاحب نے جب جاگیر قبول نہ فرمائی تو نواب قدسیہ محل نے چار سو روپیہ ماہوار ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا جو حکیم صاحب کو ان کی زندگی تک ملتا رہا۔

یہ تھا کردار و استغناء اس وقت کے ایک صاحبِ کمال طبیب کا جس نے شاہ وقت کی دعوت پر بھی اپنی شانِ قلندری اور علمی وقار کو مجروح نہ ہونے دیا اور جب گراں قدر زرین جاگیر ملی تو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ

اے طائر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

آیئے! اب ہم ذرا موازنہ و مقابلہ کریں اس دور کے اعلیٰ کردار کا آج کے اپنے کردار سے۔ حصول فن اور کسب کمال سے غافل و بے پرواہ ہو کر پڑھنے اور سیکھنے کے زمانہ میں ہم زیادہ تر غلط خواہشوں اور منصوبوں، بے کار فروعی مسائل اور ہر طرح کے لہو و لعب میں مبتلا رہتے ہیں اور پھر اسی کے نتیجے کے طور پر اپنی عملی زندگی میں ہر قدم اور ہر موڑ پر احساس کمتری کا شکار ہو کر وقتی منفعت، سستی شہرت، اور جھوٹی عزت کی خاطر ہم اپنی ہر متاعِ عزیز کو قربان کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے فن اور اپنے نام سے عار ہے۔ ہم جس فن کے صحیح نمائندے ہیں اس کو سیکھتے نہیں اور جس فن کو ہم جانتے نہیں اس کی علمبرداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس پر شکایت ہے کہ لوگ پہلے کی طرح ہماری طرف متوجہ نہیں اور حکیم علوی خاں و حکیم اجمل خاں جیسی شہرت و عزت کے لوگ اب پیدا نہیں ہوتے۔ حالاں کہ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ جو اپنے آپ کو خود تیار نہیں کرتا اور اپنی قدر و منزلت کو نہیں پہچانتا، زمانہ کبھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔

کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی!

مُلکِ خُدا تنگ نہیں ہے

ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا
پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نمو کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہِ عمل بند
مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا
جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا مُلکِ خدا تنگ نہیں ہے

— (علامہ اقبال)

خالق کا وجود

زندگی کے زبردست ڈیزائن پر غور کیجیے۔ حیرت کی ایک شبیہ کو حیرت کی دوسری شبیہ کے آئینہ میں دیکھیے۔ سبزہ اور پیروں کے نقوش کی بازگشت دریچہ کے شیشہ پر پڑے ہوئے پالے میں نظر آئے گی۔ کیا یہ ساری شکلیں ایک اندھی بے شعور تخلیق ہیں؟ ان کے ہوتے ہوئے میں خالق کے وجود کی بابت شک و شبہ میں ہی نہیں پڑ سکتی

ایڈتھ سٹویل

ر- ضیا نقوی

ہماری صحافت

اُردو صحافت کی تاریخ تقریبًا پونے دو سو سال پرانی ہے۔ کلکتہ کا
ار " جامِ جہاں نما " فارسی کا پہلا اخبار ہے جس نے ۱۹۔ویں صدی
اوائل میں اردو کا ضمیمہ شایع کرنا شروع کیا اس کے بعد اسی شہر کا " شمس
خبار " بھی اردو ضمیمہ شایع کرنے لگا۔ البتہ شمالی ہند میں اردو صحافت کا
ز ۱۸۳۶ء میں دہلی اردو اخبار کی اشاعت کے ساتھ ہوا۔ بعد ازاں
ٰ ہی سے " سراج الاخبار " اور " سیدالاخبار " شایع ہونا شروع ہوئے۔
ں وقت سے آج تک اردو اخبارات و رسایل کی تعداد بڑھتی ہی چلی جارہی
، اور اب اردو صحافت کا دائرہ برِّصغیر ہند و پاک تک ہی محدود نہیں بلکہ
انیہ، کناڈا، شمالی امریکہ اور خلیجی ممالک تک پھیل چکا ہے۔ نہ صرف یہ
پاکستان میں اردو اخبارات تعداد اور سرکولیشن کے معاملے میں دوسری
ب زبانوں سے آگے ہیں بلکہ لندن کا اردو روزنامہ " جنگ " اور
ہنامے " شفق " اور " سفیر " کناڈا کا اردو رسالہ پاکیزہ
ٹرنیشنل بھی بڑی تعداد میں شایع ہو رہے ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو صحافت کو سخت دور کا
منا کرنا پڑا۔ مگر اب حالات دھیرے دھیرے سازگار ہو رہے ہیں۔ ہرچند
بھی اردو صحافت کو ملک کی دیگر اہم زبانوں کی صحافت کے دوش بدوش
نے کے لیے زبردست کوششیں درکار ہیں۔ رجسٹرار آف نیوز پیپر کی تازہ ترین
رٹ کے مطابق ۱۹۸۱ء میں اردو اخبار ملک کی کل تعداد ۱۲۹۹ ہوگئی۔
ب کہ گذشتہ ۱۹۸۰ء میں ۱۲۳۴ تھی۔ اسی طرح اس ایک سال میں سرکولیشن بھی
لاکھ ۰، ہزار سے بڑھ کر ۲۲ لاکھ ۵۴ ہزار ہوگئی۔ اب ہمارے پاس ۱۲۸
زنامے، سہ روزہ، ۶۳۷ ہفت روزہ اخبارات ہیں۔

اگر بحیثیت مجموعی رجسٹرار کی اس رپورٹ پر غور کیا جائے تو پتہ
لتا ہے کہ اردو اخبارات کل تعداد کے لحاظ سے تو ہندی، انگریزی
ر بنگالی کے بعد چوتھے نمبر پر ہیں لیکن سرکولیشن کے لحاظ سے دیکھا جائے
تو اردو کا نمبر بہت بعد میں آتا ہے۔ ہندی اور انگریزی دونوں ہی کے اخبارات
کی سرکولیشن ایک ایک کروڑ سے کچھ زائد ہے اور اردو تو اس معاملے میں نہ
صرف ہندی و انگریزی بلکہ بنگالی، تامل اور ملیالم وغیرہ سے بھی بہت پیچھے
ہے۔ ظاہر ہے کہ بہت سے اخبارات شایع ہونے سے کہیں اہم بات ان کا
سرکولیشن ہے۔ اردو اخبارات میں بڑی تعداد غیر معیاری اور بہت کم
تعداد میں چھپنے والے مقامی اخباروں کی ہے جو صرف برائے نام ہی اخبارات
ہیں اور معقول اسٹاف، ٹیلی پرنٹر اور آفسیٹ پریس جیسی سہولیات سے
یکسر محروم ہیں۔ ایک اور عیب ہماری صحافت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا
ہے، وہ ہے سنسنی خیزی۔ پڑھنے والوں کے جذبات سے کھیلنا، ان کے خون
کو گرمانا۔ بعض اخبار رہنمائی کا فرض انجام دینے کے بجائے جھوٹی خبریں
چھاپ کر، چٹپٹے اداریے لکھ کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

پچھلے چند برسوں میں بعض روزناموں کے معیار اور سرکولیشن
میں زبردست اضافہ ہوا ہے ساتھ ہی اس دوران چند بہت اچھے اور
معیاری نئے روزنامے بھی منظرِ عام پر آئے ہیں جنہوں نے جلد ہی اپنی
غیر معمولی مقبولیت کے سبب اچھا سرکولیشن بنا لیا ہے۔

لیکن اردو رسائل کے منظر نامے پر نظر ڈالیے تو حالات بہت
غیر اطمینان بخش نظر آتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی بھی ایسا رسالہ نہیں جو
پڑھے لکھے عام آدمی کے لیے دلچسپی کا مواد فراہم کر سکے۔ جس کے موضوعات
کا دائرہ وسیع ہو اور جس میں سیاست، سماجی زندگی، تہذیب و
ثقافت، مذہب، ادب، آرٹ، صنعت و تجارت، ذرائع ابلاغ،
فلموں اور کھیل کود وغیرہ پر فیچرز، رپورٹیں، مضامین اور انٹرویوز
ہوں اور جسے ہم السٹریٹڈ ویکلی اور انڈیا ٹوڈے جیسے رسایل کے
سامنے رکھ سکیں۔ صحافت میں اب کسی حد تک سنجیدگی آچلی ہے۔ ممکن
ہے جلد ہی یہ کمی بھی دور ہو جائے۔

اردو میں فلمی رسالے کثیر الاشاعت ہیں اور دلی سے شایع ہونے
ے ایک فلمی رسالے کی اشاعت ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے جو کہ واقعی
ی ریکارڈ ہے۔ باقی رسایل کے موضوعات کا دائرہ بھی محدود ہے۔ جیسے
رب، ادبی تنقید اور تحقیق وغیرہ۔ ان میں سے بعض رسایل نے اچھا معیار
ایم کیا ہے لیکن ان سے ایک خاص طبقہ ہی مستفیض ہو سکتا ہے۔ باقی
یادہ تر رسالوں میں افسانوں اور غزلوں کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ بجائے
س کے کہ تمام عصری موضوعات کو شریک کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی
نتخب افسانے غزلیں اور ادبی کالم بھی شایع کیے جائیں، رسایل کو صرف
فسانوں اور غزلوں سے (وہ بھی ہر کس و ناکس کے) بھر دیا جاتا ہے
جس سے عام قارئین کو اکتاہٹ اور بیزاری ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں
یسا لگتا ہے جیسے ہمارے پاس اس کے سوا کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔

بہت سے لوگ سوچتے ہیں کہ جب اردو بولنے والے اقلیت میں ہیں
و ہمارے اخبارات و رسایل بڑی تعداد میں کیسے شایع ہو سکتے ہیں۔ لیکن
گر اردو بولنے والے خرید کر اخبارات و رسایل پڑھنے کی عادت ڈالیں،
ور پڑھا لکھا طبقہ صرف انگریزی اخبارات پہ اکتفا کرنا چھوڑ کر اردو اخبارات
ی بھی سرپرستی شروع کر دے تو ہمارے اخبارات کی تعدادِ اشاعت لاکھوں
روڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کی زندہ مثال کلکتہ سے شایع ہونے والا
نگالی روزنامہ "امرتے بازار پتریکا" ہے جس نے سرکولیشن کے معاملے
یں ہندوستان کی تمام زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح ملیالم
زبان کا ماہنامہ "ملیالم منورما" ملک کی تمام زبانوں کے رسالوں
میں سب سے زیادہ بکتا ہے۔ جبکہ بنگالی اور ملیالم بولنے والے اردو
بولنے والوں سے بھی کم ہیں۔

ہندوستان میں اردو صحافت کی ترقی کے لیے دو طرفہ کوششیں
درکار ہیں۔ اردو بولنے والوں کو اردو اخبارات و رسائل کی سرپرستی
کرنی چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ان اخبارات اور رسائل کے مالکان
و مدیران کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ذاتی پسند اور ناپسند اور اپنے
تعصبات سے بالاتر ہو کر غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل کریں اور معیار
میں ہمہ گیر بہتری اور موضوعات میں تنوع کی طرف توجہ دیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک "گریٹ بک کلب" قایم ہے
اس کی طرف سے ایک وفد حال ہی میں تعلیمی و تہذیبی دورے پر دہلی بھیجا
گیا تھا (کلب کے سکریٹری جاوید عابدی نے اس وفد کی قیادت کی)۔ اراکین
وفد نے دہلی میں صدر جمہوریہ ہند جناب گیانی ذیل سنگھ، نائب صدر
جمہوریہ جسٹس محمد ہدایت اللہ، سابق وائس چانسلر علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی پروفیسر علی محمد خسرو، ڈاکٹر ظہور قاسم،
اور جناب محمد فضل سے ملاقاتیں کیں۔

پروفیسر خسرو نے ملاقات کے دوران اراکین وفد کو موجودہ
عالمی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور خاص طور پر ان خطرات کا ذکر کیا
جو ہتھیاروں کی دوڑ کے سبب دنیا کو در پیش ہیں۔ ڈاکٹر ظہور قاسم
نے انٹارکٹکا کی مہم دلچسپ انداز میں بیان کی اور اس پر فخر کا اظہار
کیا کہ ہمارا ملک اب سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بہت آگے بڑھ
چکا ہے اور اس کا ثبوت یہ کہ اتنی عظیم الشان مہم ہم نے بغیر کسی بیرونی
امداد کے سر کی۔ محمد فضل صاحب نے طلبا کو مشورہ دیا کہ کسی قسم کے
احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں اور برابر آگے بڑھیں۔ صدر جمہوریہ
اور نائب صدر جمہوریہ نے اراکین وفد کے توسط سے مسلم یونیورسٹی
کے طلبا کو اپنی نیک خواہشات سے نوازا۔ ★★

تہذیب الاخلاق کی اہم ایجنسیاں

بھیونڈی میں :- مکتبہ معارف الاسلام، نظام الدین
گیا میں :- سلطان بک ڈپو، ماڈل اسکول، جی، جی، روڈ
ٹیٹاگڑھ میں :- پرویز اقبال، دوست محمد پرائمری اسکول، بانس بگان
کامٹی میں :- صدیق اختر انصاری، دراس پورہ
گوونڈی میں :- قیصر قدوس جان، بھنڈار ایریا
دربھنگہ میں :- نسیم بک ڈپو، ٹاور چوک (سول ایجنٹ)
دھنباد میں :- محمد حسین (بک سیلر) اسٹیشن روڈ
مظفر پور میں :- بہار بک اسٹور، بکی سرائے روڈ
بریلی میں :- اعظم خاں، تھریا نجابت خاں
پٹنہ میں :- بک امپوریم، سبزی باغ
گل مہر بک ہاؤس، نزد پٹنہ لاجنگ
فرمیگزین، داتا مارکیٹ

ایم۔اے۔ایم۔الٰہی

ترقی کی نئی راہیں

بنک کی ملازمتیں

ملک کی معیشت میں بینکوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور بینکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دیہی علاقوں میں شاخیں کھولی جا رہی ہیں اور ان کے دائرہ کار میں توسیع بھی ہو رہی ہے بیروزگاروں/غریبوں کو سرکاری اسکیم کے تحت بینکوں کے ذریعے قرضوں کی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ تاکہ چھوٹے موٹے دھندے شروع کرکے بیکاروں کو راحت مل سکے اور بیروزگاری کا مسئلہ حل ہو سکے۔

جون ۱۹۶۹ء میں کامرشیل بنک کے دفاتر کی تعداد ۸۲۶۲ تھی۔ جون ۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۳۵۳۰۷ اور نومبر ۱۹۸۱ء میں ۳۷۰۱۱ تک پہنچ گئی۔

بینکوں میں بھرتی کے لیے ایک الگ نظام ہے۔ Banking Service Recruitment Board کی نگرانی میں اسٹاف کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ سہولت کے لیے بورڈ کو مختلف منطقوں [Zones] میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ وقتاً فوقتاً ان کے ذریعے اخبارات میں اشتہار نکلتے رہتے ہیں اور بڑی تعداد میں جگہیں نکلتی ہیں۔ بینک کلرک/کیشئر/گودام کلرک/گودام کیپر/کلرک ٹائپسٹ/ ایگریکلچر کلرک/اسسٹنٹ وغیرہ کی جگہوں کے لیے امیدواروں کی تعلیمی لیاقت اور عمر کا معیار حسب ذیل ہوتا ہے۔

گریجویٹ یا سیکنڈ ڈویژن پاس ہائر سیکنڈری و ۱۰+۲ یا ۱۰+۲+۳، انٹرمیڈیٹ یا پری یونیورسٹی، یا فرسٹ ڈویژن سے میٹرک کولیشن/ایس ایس سی وغیرہ

عمر کی حد:۔ کم سے کم ۱۸ سال اور زیادہ سے زیادہ ۲۵ سال مندرجہ فہرست ذاتوں/قبائل کے امیدواروں کے لیے ۵ تا ۱۰ سال کی رعایت ہے۔ اس کے علاوہ جسمانی طور پر معذور امیدواروں کے لیے نیز سابق فوجیوں کے لیے بھی عمر میں رعایت کا اعلان ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا امیدواروں کے لیے ایک خاص تناسب سے جگہیں مخصوص بھی ہوتی ہیں

فیس:۔ ایک جگہ کے لیے عموماً امتحان فیس -/۱۰ دس روپیہ اور ایک سے زائد کے لیے -/۲۰ روپیہ ہوتی ہے [مندرجہ فہرست ذاتوں/قبائل کے امیدواروں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی]۔ فیس بنک ڈرافٹ یا پوسٹل آڈر کے ذریعہ قابل ادائیگی ہوتی ہے

منطقہ Zones کے مختلف شہروں کے مراکز پر امتحان کا انتظام کیا جاتا ہے اور صرف ایک دن میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔

تنخواہ:۔ مہنگائی بھتہ ملا کر آٹھ سو روپے

طریقۂ امتحان اور مضامین

امتحان Objective اور Description دونوں طریقوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

A- Objective Type کے سوالات مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں۔

1- Test of Reasoning
2- Clerical Aptitude Test
3- Numerical Ability
4- English Comprehension

B- DESCRIPTIVE TYPE

1- English Essay
2- Letter and/اور Precis writing

ٹائپسٹ کے لیے ہندی میں ٹائپ کرنے کی رفتار پچیس الفاظ اور انگریزی میں تیس الفاظ فی منٹ ہونا چاہیے۔

متعلقہ دفتر میں درخواست پہنچنے کی بعد ایک ہدایتی کتابچہ امیدوار

کو بھیجا جاتا ہے۔ اس میں سوالات کو حل کرنے کی ترکیب اور ہدایتیں تفصیل سے درج ہوتی ہیں۔

امیدواروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اس لیے Objective Type کے سوالات جانچنے کا کام کمپوٹر کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے کم وقت میں صحیح ترین کام ہو جاتا ہے۔

امتحان کی تاریخ کا اعلان اشتہار کے ساتھ ہی کر دیا جاتا ہے اس سے امیدوار کو امتحان کی تیاری کرنے میں مدد ملتی ہے اور اسے یہ پتہ رہتا ہے کہ تیاری کے لیے اس کے پاس کتنا وقت ہے۔

صرف تحریری امتحان میں کامیاب شدہ امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے۔

ھدایات :

جو امیدوار بنکوں میں نوکری کے لیے امتحان میں شریک ہونا چاہتے ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ ہفتہ وار اخبار امپلائمنٹ نیوز (جو انگریزی، ہندی اور اردو زبانوں کے علاوہ ملک کی کئی زبانوں میں شایع ہوتا ہے) کا مطالعہ کریں۔ اس میں اشتہاروں کے علاوہ مفید مضامین اور معلومات عامّہ کا مواد بھی شایع ہوتا ہے۔ بنکوں میں خالی اسامیوں کے اشتہارات اس اخبار میں باالتزام شایع ہوتے ہیں

اس کے علاوہ ہندوستان ٹائمز، ٹائمس آف انڈیا، امراجالا اور دوسرے مشہور قومی اخبارات میں بھی اشتہارات نکلتے رہتے ہیں۔

اترپردیش کے امیدواروں کے لیے خصوصًا مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ پندرہ روزہ روزگار ڈائجسٹ (ہندی) جو مراد آباد سے نکلتا ہے، برابر خریدیں۔ یہ اخبار اسٹیشنوں اور بک اسٹالوں پر آسانی کے ساتھ دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ ہے کہ سرکاری نیم سرکاری اداروں کے علاوہ خصوصی طور پر اترپردیش میں نکلنے والی تمام اسامیوں کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ اور روزگار کے متلاشی امیدواروں کے لیے بہت اہم اخبار ہے

نوکریوں کے اشتہارات کے علاوہ معلومات عامہ اور مفید مضامین بھی شایع ہوتے ہیں۔

درخواست کا فارم جو اشتہار کے ساتھ دیا رہتا ہے عمومًا شہر کے چھوٹے بک اسٹالوں پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ کچہریوں میں ٹائپسٹوں کے پاس مل جاتا ہے۔ کہیں دستیاب نہ ہونے کی صورت سادے کاغذ پر ہاتھ سے صاف ستھرے طریقہ پر نقل کر کے پُر کیا جا سکتا ہے اور قابل قبول ہوتا ہے۔

بینک کے امتحانات کے پرچے کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے امیدواروں کو چاہیے کہ وہ 'بنک گائڈز'، جو بک سیلرز کے یہاں مل جاتی ہیں، خریدیں۔ ان میں سوالات کے مکمل نمونے اور حل دیے رہتے ہیں۔

امیدواروں کو معلومات عامہ، حساب (ہائی اسکول کی سطح تک کا) اور جنرل انگلش کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہوگی Competitive Master یا Competitive — Current Topics یا — Success Review وغیرہ رسالوں کا جو مقابلہ کے امتحانات کے لیے ناگزیر ہیں، کسی ایک رسالہ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

ہندی کا ایک رسالہ 'پرت یوگیتا منجوشکا' [illegible] بھی جو ہندی کا ماہنامہ ہے، بہت مفید ہے اور جو امیدوار انگریزی میں کم استعداد رکھتے ہیں، اُن کے لیے بہت موزوں ہے۔

اگر بنک میں نوکری کے متلاشی امیدوار ہندی یا انگریزی میں ٹائپ کرنا سیکھ لیں اور تیز اور صحیح طریقہ پر ٹائپ کرنے کی مشق کریں تو اُن کی کامیابی یقینی ہے۔ اچھے ٹائپسٹوں کی بہت کمی رہتی ہے اور ان کے لیے بنکوں کے علاوہ بھی دوسرے اداروں میں بہت مانگ ہے۔

[یقین ہے کہ جناب ایم۔ایم الٰہی یہ مفید سلسلہ جاری رکھیں گے اور آئندہ اسٹاف سیلکشن ریلوے سروس کمیشن وغیرہ کے امتحانات کے بارے میں تہذیب الاخلاق کے صفحات میں مفید معلومات فراہم کرتے رہیں گے۔ مسلم یونیورسٹی گائڈنس سینٹر سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ تہذیب الاخلاق بھی ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہے۔ مشورہ و معلومات کی ضرورت ہو تو خط لکھ کر ہم سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں — ادارہ]

★ ★ ★

فائزہ طارق
امیر نشاں، علی گڑھ

ایک چینی افسانہ

پرانے زمانے میں، ندی کنارے ایک بڑھیا اور اس کا ایک نوجوان بیٹا رہا کرتے تھے۔ دونوں کھیتی باڑی کرکے زندگی گزارتے تھے۔ رات دن کی محنت کے باوجود انھیں دو وقت کی روٹی مشکل سے مل پاتی تھی۔

نوجوان ہمیشہ سوچا کرتا۔ آخر کیا بات ہے کہ ہم دن رات محنت کرنے کے باوجود غریب اور نادار ہیں۔ اس نے طے کیا کہ بڑے کاہن کے پاس جا کر اس سے اپنی مشکل بیان کی جائے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بڑا کاہن ہر مشکل کو حل کر دیتا ہے۔ لہٰذا فوراً وہ ماں سے اجازت لے کر روانہ ہوگیا۔

سات ہفتے کے سفر کے بعد وہ ایک جگہ پہنچا جہاں ایک بڑھیا کی کٹیا تھی۔ بڑھیا باہر نکلی اور لڑکے سے بولی: بیٹے اتنی جلدی میں تم کہاں جا رہے ہو؟

میں بڑے کاہن کے پاس جا رہا ہوں تاکہ اس سے معلوم کروں کہ ہم لوگ رات دن کام کرنے کے باوجود غریب کیوں ہیں؟

بڑھیا نے کہا: بیٹا! کیا تم میرا بھی ایک کام کر دوگے؟

لڑکے نے کہا: فرمائیے، آپ کی کیا مشکل ہے؟

بڑھیا نے بتایا: میری مشکل یہ ہے کہ میری ایک لڑکی ہے، بہت خوبصورت نہایت حسین، سترہ سال اس کی عمر ہے۔ لیکن اب تک وہ بولتی نہیں ہے۔ بڑے کاہن سے دریافت کرنا کہ میری بیٹی کب تک بولے گی؟

لڑکے نے کہا: بہت اچھا، ضرور معلوم کرلوں گا۔ یہ کہہ کر وہ منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

چلتے چلتے وہ ایک جگہ پہنچا۔ وہاں ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا۔ نوجوان کو اس حال میں دیکھا تو دریافت کیا

بچے! اتنی تیزی سے تم کہاں جا رہے ہو؟

نوجوان نے مقصدِ سفر بیان کیا

بوڑھے نے کہا: تب تو میری بھی اک خواہش ہے۔

لڑکے نے پوچھا: وہ کیا؟

بوڑھے نے جواب دیا: وہ یہ کہ میرے گھر میں سنتروں کا ایک بڑا گھنیرا پیڑ ہے۔ لیکن اس میں پھل نہیں آتے۔ بڑے کاہن سے پوچھنا کہ وہ کب پھلیگا؟

لڑکے نے وعدہ کرلیا اور آگے چلا۔

چلتے چلتے وہ ایک ندی کے کنارے پہنچا۔ ہر طرف شور مچاتا پانی بہ رہا تھا۔ آگے جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ نہ ندی پار کرنے کا کوئی ذریعہ۔

نوجوان ایک پتھر پر بیٹھ گیا تاکہ تھکن دور ہو اور آگے جانے کی کوئی تدبیر کی جائے۔

اچانک زوردار ہوا چلنے لگی۔ ندی کا پانی اوپر اچھلنے لگا۔ موجوں کے طوفان میں ایک بڑے سے اژدہے نے گردن پانی سے باہر نکالی۔ اژدھے کی آنکھیں نہایت پرکشش اور خوفناک تھیں۔ لیکن اس کی گردن کی جلد بہت خوش رنگ اور خوبصورت تھی۔ دونوں آنکھوں کے بیچ پیشانی پر ایک چمکدار موتی جڑا ہوا تھا۔ اس موتی سے سورج کی مانند روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ لڑکا اچانک اژدہے کو اتنے قریب دیکھ کر گھبرا گیا۔

لیکن یہ کیا ____ اژدہا تو بول رہا تھا ____ وہ اسی سے مخاطب تھا۔

اژدہا کہہ رہا تھا: نوجوان خوف زدہ مت ہو۔ یہ بتاؤ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟

نوجوان کے ہوش کچھ کچھ ٹھکانے آئے۔ اس نے ہمت کرکے تمام ماجرا بیان کیا اور کہا:

میں بڑے کاہن کے پاس جا رہا ہوں۔ تاکہ وہ میری مشکل حل کردے لیکن ندی سے پار اترنے کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں ہے۔

اژدہے نے کہا، اس کی فکر نہ کرو۔ اگر تم ایک خواہش میری بھی بڑے کاہن تک پہنچا دو تو میں تمہیں ندی پار کرا دوں گا۔

لڑکے نے خوش ہو کر معلوم کیا: وہ خواہش کیا ہے؟
اژدہے نے کہا: میری خواہش یہ ہے کہ بڑے کاہن سے اتنا کہہ دینا کہ میں برسوں سے دور دراز کی اس ندی میں زندگی گزار رہا ہوں۔ میں نے آج تک کسی کو کوئی تکلیف بھی نہیں دی ہے۔ بس اب میری تمنا یہ ہے کہ میں آسمان پر چلا جاؤں۔

جوان نے وعدہ کر لیا کہ وہ اژدہے کی خواہش بڑے کاہن تک پہنچا دے گا اژدہے نے نوجوان کو اپنی پیٹھ پر سوار کیا اور ندی کے اس پار پہنچا دیا۔ دوسرے کنارے پہنچ کر جوان نے پھر سفر شروع کر دیا۔

وہ چلتا رہا، چلتا رہا یہاں تک کہ ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر بڑے کاہن کی خانقاہ تک جا پہنچا۔ اس نے دیکھا۔ ایک بزرگ انسان ایک پرانے درخت کے نیچے غور و فکر میں کھوئے ہوئے ہیں۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

بزرگ نے بڑے پیار اور ہمدردی سے سلام کا جواب دیا اور پوچھا:

بیٹا! تم کہاں سے آ رہے ہو اور کیا حاجت لے کر آئے ہو؟

نوجوان سمجھ گیا بڑے کاہن یہی ہیں۔ اس نے تمام حالات ان کے سامنے رکھے اور چاروں درخواستیں ان کے سامنے پیش کیں۔

بڑے کاہن نے نوجوان کی تمام باتوں کو غور سے سنا۔ پھر آہستگی کے ساتھ کہنے لگے:

میرا اصول یہ ہے کہ مجھ سے ایک بات معلوم کی جا سکتی ہے' دو نہیں۔
مجھ سے تین سوال دریافت کیے جا سکتے ہیں لیکن چار نہیں۔
مجھ سے تم پانچ مشکلات حل کرا سکتے ہو لیکن چھ نہیں۔
تمہارا معاملہ یہ ہے کہ تمہاری ضرورتیں چار ہیں جو میں اس اصول کے تحت پوری نہیں کر سکتا۔ لڑکے نے فکرمندانہ لہجے میں معلوم کیا: پھر کیا کیا جائے۔

بڑے کاہن نے اطمینان سے جواب دیا: تم یہ کر سکتے ہو کہ ایک خواہش کو بھول جاؤ، کسی ایک شخص کی مشکل سے چشم پوشی کر لو۔ باقی تین باتیں مجھ سے دریافت کر لو۔ میں اُن کا حل تم کو بتائے دیتا ہوں۔

کیا اس کے علاوہ ......؟

—— نہیں نوجوان اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔

اب نوجوان فکر میں پڑ گیا۔ کس کی ضرورت سے چشم پوشی کرے، کس کی خواہش کاہن کے سامنے پیش نہ کرے۔ اپنی ضرورت ترک نہیں کی جا سکتی اسی کے لیے تو یہ پاپڑ بیلے ہیں —— بڑھیا کی مشکل —— کیسے چھوڑ دے بے چاری کی امیدوں کا تنہا مرکز ایک لڑکی ہے۔ بڑھیا آج مری کل دوسرا دن۔ پھر اس گونگی لڑکی کو کون پوچھے گا؟ —— اچھا بوڑھے کا مسئلہ؟ ہاں وہ اتنا اہم نہیں، نہ سہی، لیکن وعدہ تو اس سے بھی کیا ہے' اسے کیا جواب دوں گا؟ رہی اژدہے کی بات —— اس نے تو مجھ پر احسان بھی کیا ہے۔ کوئی تکلیف مجھے نہیں دی۔ دریا پار کرایا۔ ورنہ اس منزل تک پہنچنا ہی ممکن نہ تھا۔ اس کی حاجت نہ پیش کروں تو کیا کہے گا۔

وہ سوچتا رہا —— ہر شخص کی ضرورت اپنی جگہ اہم تھی۔ اس کی مشکل اہم تر تھی۔ لیکن وعدہ کا بھرم بھی تو کوئی چیز ہے۔

آخر اس نے مناسب یہی سمجھا کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھا جائے اور اپنی حاجت بیان نہ کی جائے —— اس نے ایسا ہی کیا —— بڑھیا اور بوڑھے اور اژدہے تینوں کی درخواستیں اس نے بڑے کاہن کے سامنے پیش کر دیں۔ بڑے کاہن نے تینوں کا حل اس کو بتا دیا —— وہ کاہن سے رخصت ہوا اور گھر کی جانب واپس چلا۔

جیسے ہی ندی کے کنارے پہنچا تو اژدہے کو منتظر پایا۔

—— فرمائیے! میری درخواست کا کیا جواب ملا۔

نوجوان نے کہا: بڑے کاہن نے فرمایا ہے کہ تم مجھے ندی کے اس پار پہنچا دو۔

اژدہے نے فوراً اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ندی کے اس پار پہنچا دیا۔

جیسے ہی وہ دونوں ندی کے کنارے پہنچے، اژدہا آسمان کی طرف کھنچنے لگا۔

اژدہے نے خوش ہو کر وہ موتی جو اس کی پیشانی میں جڑا ہوا تھا' نیچے پھینک دیا اور بولا:

تم نے جو زحمت میرے لیے برداشت کی ہے یہ اس کا بدلہ ہے۔

نوجوان نے موتی اُٹھا لیا اور خوشی کے ساتھ بوڑھے آدمی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بوڑھا جیسے اس کا منتظر تھا دیکھتے ہی بولا: کہو بیٹا! کیا تم نے اپنا وعدہ پورا کیا؟

نوجوان نے کہا: جی ہاں، بڑے کاہن نے فرمایا ہے کہ تمہارے صحن میں جو حوض ہے اس کے نیچے نو پیالے سونے اور نو پیالے چاندی سے بھرے ہوئے دفن ہیں ان پیالوں کو زمین سے کھود کر نکال لو اور پھر حوض کے پانی سے درخت کو

سیراب کرو تو اسی وقت سنترے آنے لگیں گے۔

بوڑھے نے نوجوان کی مدد سے سونے چاندی کے پیالے زمین سے کھود کر نکال لیے۔ فوراً حوض صاف و شفاف پانی سے بھر گیا۔ بوڑھے نے حوض کا پانی درخت کی جڑیں ڈالا۔ جیسے ہی درخت سیراب ہوا، اسی وقت سنہری سنتروں سے پیڑ بھر گیا۔ بوڑھا بہت خوش ہوا۔ روپیہ پیسہ اس کے پاس پہلے ہی کم نہ تھا اس نے یہ تمام سونا چاندی نوجوان کو دے دیا۔

نوجوان موتی اور سونا چاندی ساتھ لیے بڑھیا کی کٹیا کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہاں پہنچا تو بڑھیا نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا: بیٹے! تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟

نوجوان نے کہا: ہاں ہاں اماں! بڑے کاہن نے کہا ہے جلدی ہی تمہاری لڑکی بولنے لگے گی۔ ابھی نوجوان کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور ماں سے پوچھنے لگی ماں! یہ کون صاحب ہیں؟

بڑھیا خوشی کے مارے پھولے نہ سمائی۔ اس نے بیٹی کو کلیجے سے لگایا اور بولی: کیا مبارک گھڑی ہے! بیٹی یہ نوجوان تیری خوش نصیبی کا سبب ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ اس نیک لڑکے سے تیری شادی ہو۔

نوجوان ایک حسین بیوی کو ساتھ لیے سونے چاندی سے لدا پھندا، قیمتی موتی جیب میں لیے خوش خوش اپنے گھر واپس آیا۔ جہاں بوڑھی ماں کی پُر امید نگاہیں اس کی راہ تک رہی تھیں۔

★ ★

حضرت علی کا انصاف

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو عرب کہیں بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے ایک کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس تین۔ اتنے میں ایک اور شخص وہاں آپہنچا۔ ان دونوں نے اُسے بھی کھانے میں شریک کر لیا وہ کھانا کھا کر جانے لگا تو اس نے اپنی جیب سے آٹھ درہم نکال کر دیے اور کہا کہ تم دونوں یہ آپس میں تقسیم کر لینا۔ وہ تو چلا گیا لیکن یہ دونوں جھگڑنے لگے۔ پانچ روٹیوں والا تین روٹیوں والے سے کہتا تھا کہ پانچ درہم مجھے دو اور تین تم لو۔ اس کا جواب تھا کہ مہمان نے دونوں کا کھانا کھایا۔ دونوں کو چار چار درہم ملنے چاہئیں۔ آخر کسی طرح فیصلہ نہ ہو سکا۔

یہ دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ ہی ہمارا جھگڑا چکا دیجیے۔ وہ بہت نیک اور منصف مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین اور بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے دونوں کی بات سنی اور تین روٹیوں والے سے فرمایا کہ تم تین درہم پر راضی ہو جاؤ مگر وہ کسی طرح نہ مانا اور بولا کہ مجھے قائل کر دیجیے۔ میں انصاف کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ انھوں نے فرمایا انصاف تو یہ ہے کہ تمھیں صرف ایک درہم۔ یہ سن کر وہ بہت جھنجھلایا اور پوچھا: یہ کیسے

حضرت علیؓ نے فرمایا: تو سنو۔ پانچ اور تین آٹھ روٹیاں تھیں۔ اور کھانے والے تین۔ یہ فرض کرنا پڑے گا کہ تینوں نے برابر برابر ہی کھایا ہوگا۔ آٹھ روٹیاں تین حصوں میں بٹ نہیں سکتیں تو یوں مان لو کہ ہم نے ایک ایک روٹی کے تین تین ٹکڑے کر لیے۔ اس طرح آٹھ روٹیوں کے آٹھ تیا چوبیس ٹکڑے ہوئے۔ انھیں تین پر برابر برابر بانٹا تو ہر ایک کے حصے میں آٹھ ٹکڑے آئے تین روٹیوں کے مالک نے اپنے نو ٹکڑوں میں سے آٹھ خود کھائے۔ ایک مہمان کے حصے میں آیا۔ پانچ روٹیوں والے کے پندرہ ٹکڑوں میں سے آٹھ خود اس نے کھائے اور سات مہمان کے حصے میں آئے۔ اس نے آٹھ درہم دیے گویا ہر ٹکڑے کے بدلے ایک درہم۔ سات درہم پندرہ ٹکڑوں کے مالک کو ملنے چاہئیں اور نو ٹکڑوں کے مالک کو صرف ایک۔ بات درست تھی۔ تین روٹیوں والا جو چار درہم سے کم لینے پر راضی نہ ہوتا تھا وہ ایک درہم لے کر مطمئن ہو گیا اور خوش خوش چلا گیا۔ ★

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

[بلڈنگ ڈپارٹمنٹ]

ٹینڈر نوٹس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، سی پی - ڈبلو - ڈی ؛ پی ڈبلیو - ڈی ؛ ایم - ای - ایس ریلوے کے اے کلاس / کلاس ون ٹھیکیداروں اور واٹر سپلائی / سیور ڈالنے کے بڑے کاموں کا تجربہ رکھنے والی مشہور تنظیموں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آئٹم ریٹ کی بنیاد پر سربند ٹینڈر مطلوب ہیں - ٹینڈر کے ساتھ یہ ثبوت مہیا کرنا ضروری ہے کہ امیدوار کو اس نوعیت کا کام کرنے کا تجربہ حاصل ہے - اس تجربے کی تفصیل مہیا کرنی بھی ضروری ہے - ہفتہ میں جو کام کے دن مقرر ہیں ان میں دفتری اوقات کے دوران یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے ٹینڈر سے متعلق فارم و کاغذات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر موصول ہونے کی آخری تاریخ سے دو روز قبل ٹینڈر فارموں کی فروخت بند کر دی جائے گی۔

ٹینڈر ۱۰ / مارچ ۱۹۸۴ء کو سہ پہر تین بج کر تیس منٹ پر کھولے جائیں گے اور اسی دن ایک بجے تک ٹینڈر وصول کیے جائینگے ۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	سیور اور واٹر سپلائی ... ۵ طلبا کے ہاسٹل کی عمارت علی گڑھ	6,61,557/-		15/-	چار ماہ
۲	انڈر گراونڈ واٹر ٹینک ... ۵ طلبا کے ہاسٹل کی عمارت ، علی گڑھ	51,706/-	17,840/-		
	کل	7,13,263/-			

لفٹیننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۳۴/۸۳-۸۴

مندرجہ ذیل اسامی کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں
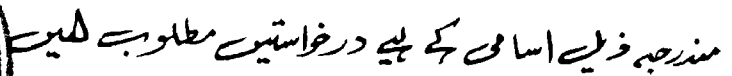
منیجر۔ ڈپارٹمنٹ آف لینڈ اینڈ گارڈینس۔

شرح تنخواہ:- ۶۵۰-۳۰-۷۴۰-۳۵-۸۱۰-ای بی-۳۵-۸۸۰-۴۰-۱۰۰۰-ای بی-۴۰-۱۲۰۰
اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:- گریجویٹ اور کسی سرکاری زمرے کے تحت آنے والے باغ یا فارم میں انتظامی حیثیت سے کام کرنے کا کم از کم دس سالہ تجربہ۔

نوٹ:- پارٹی کلچر بحیثیت ایک مضمون لے کر اگریکلچر کے گریجویٹ کو ترجیح دی جائے گی۔

غیر معمولی تجربہ اور قابلیت کے حامل امیدوار کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور ٹی۔اے ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا ایک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔
درخواست کے فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے ۵ روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فائننس آفیسر کے نام واجب الادا اسی قیمت کے انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک طلب کرنے والوں کو 23 x 10 سم سائز کا ٹکٹ چسپاں لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو، بھیجنا ضروری ہوگا۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ مارچ ۱۹۸۴ء ۴ بجے سہ پہر تک ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

تہذیب الاخلاق
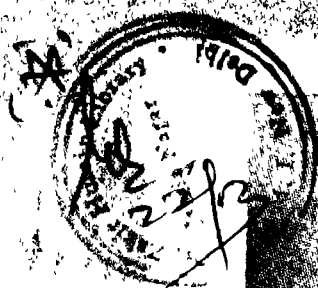
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کی خاص خاص مطبوعات

جلد ۳ ۱۶ تا ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۸۴ء شمارہ ۶

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نور الحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات:

(سرورق پر: وقار الملک کی تصویر)

بغیر اس کے کہ میں مسلمانوں کے گزشتہ عروج کے قومی کارناموں اور ان کے زوال اور اسباب زوال بیان کرکر کہیں آپ کو ہنساؤں اور کہیں آپ کو رلاؤں اور اس طرح مسلّمہ امور پر جن کی نسبت بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے آپ کا کچھ اور وقت لوں، میں آپ کی توجہ زیادہ تر اس امر کی نسبت چاہتا ہوں کہ اب واقعات کی حالت کیا ہے اور اس لحاظ سے آیندہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ میں ماضی کو چھوڑتا ہوں اور حال و مستقبل سے بحث کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

جس تحریک کو علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جو کچھ بھی ہو علی گڑھ کی ہی زمین اور علی گڑھ کے اینٹ پتھر اور چونے کی بنی ہوئی عمارتوں کے اندر اور علی گڑھ کی آب و ہوا میں ہو، بلکہ علی گڑھ کی تحریک میں ہر ایک وہ کام شامل ہے جو حقیقی و کامل و اکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں مفید ہو، خواہ کسی صوبے کے مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہو۔ اس قسم کے کالجوں کا، اسکولوں کا ہر ایک صوبے میں اور ہر جگہ قایم ہوجانا ہم مسلمانوں کے واسطے بہت زیادہ فائدہ بخش ہے۔ ایک علی گڑھ کالج یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے درد کی دوا نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا تعلیمی ذرائع جس قدر زیادہ ملک میں وسعت اختیار کریں اور مسلمان ان سے متمتع ہونے کے اسباب مہیا کریں اسی قدر مسلمانوں کے حق میں مفید ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر علاقے سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے غول کے غول پیدا ہوں اور اس میں اب دیر لگانے کا وقت نہیں ہے۔

(وقار الملک)

ماضی کا نقشہ چھوڑ جو ہونا تھا ہو چکا
اب روز نئے گل کھلا، عالم ستائے دیکھ
(عتیق انصاری)

[illegible]

اداریہ

پہلی فروری کے شمارے کے ساتھ "تہذیب الاخلاق" نے اپنی نئی زندگی کے دو سال پورے کر لیے۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ایک پرچہ بھی ناغہ نہ ہوا؛ نہ
مون ایسا چھپا جو اخلاقی اور اصلاحی مقصدیت سے ہٹا ہوا ہو۔

گزشتہ چار ماہ کے اندر "تہذیب الاخلاق" کی تعداد اشاعت میں قابلِ لحاظ تبدیلی ہوئی ہے۔ اب یہ ہر ماہ تین ہزار کی تعداد میں چھپ رہا ہے
کثر ایسا ہوتا ہے کہ ایجنسیوں (جن کی تعداد چالیس سے متجاوز ہو گئی ہے اور جو ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی ہیں) کی مانگ ہم پوری کر نہیں پاتے۔ تعدادِ اشاعت
ب مزید اضافہ کرنا پڑے گا۔ ابھی تک ایجنسیاں جموں و کشمیر، یو۔پی۔ بہار۔ بنگال، کرناٹکا، آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور راجستھان تک
د ہیں۔ پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش، مدھیہ پردیش، اڑیسہ میں ایجنسیاں کھلنا باقی ہیں۔ قارئین اور کتب فروش حضرات کی توجہ درکار ہے

ایک علمی اور اصلاحی، مقصدی اور غیر رومانی اور خالص نثری پرچے کی اشاعت کا اس عنوان بڑھنا حیرت انگیز امید افزا اور طمانیت خیز ہے

چونکہ رسالہ نئی زندگی کے تیسرے سال میں قدم رکھ رہا ہے، ہم اس موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں مشورہ دیں
ذیب الاخلاق کو خوب سے خوب تر کس طرح بنایا جائے، ہم کن عناوین اور ابواب کا اضافہ کریں، کون سے عنوانات اور موضوعات کو ترک کر دیں۔ قارئین
لہ بھی کریں کہ آیا یہ رسالہ اُس مقصد کو پورا کر رہا ہے جس کے حصول کے لیے سرسید علیہ الرحمۃ نے اس کی بنا ڈالی تھی اور جس کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے
ں نے مختلف وقفوں سے تین بار اسے جاری کیا۔ اور جو ضرورت اب اور زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ اخلاق و اطوار کی اصلاح کے علاوہ، اس رسالے کا ایک
د یہ بھی ہے کہ انسانی، قومی اور ملی مسائل سے قارئین کو آگاہ کرے۔ یہ رسالہ علی گڑھ تحریک کی ترجمانی کرتا ہے۔ قارئین اس بات پر بھی توجہ کریں کہ رسالے
یادہ دلچسپ اور کارآمد کیوں کر بنایا جا سکتا ہے۔ ہم قارئین کی تجاویز کا انتظار کریں گے۔

ادارہ وقتاً فوقتاً مختلف ہاتھوں میں جاتا رہے گا۔ اسے سنجیدگی، آئینہ داری، مصلحی، اور باخبری کی راہ پر چلانے کی ذمہ داری بیدار اور مواظب
ین کے ذوقِ سلیم پر رہے گی۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ یہ رسالہ خسارے پر چل رہا ہے۔ اشتہار مل جاتے ہیں تو خسارے میں کمی آجاتی ہے۔ تعدادِ اشاعت بڑھے گی تو ٹوٹا کم ہو گا۔
ارئین کو اِس رسالہ کی افادیت کا احساس ہے، ہمیں امید ہے کہ وہ اس کی اشاعت بڑھانے میں ہماری مدد کریں گے۔ سالانہ خریدار بنانے کے علاوہ
پ لائف ممبر بنانے کی کوشش کریں تو تہذیب الاخلاق کو استحکام حاصل ہو گا۔ ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ اس رسالے کو نکالنے میں جن مشکلات
امنا کرنا پڑتا ہے، ان کے تذکرے سے آپ کی طبیعت کو مکدر کریں۔ ہمارا مقصد قارئین کے لیے انشراحِ صدر اور تہذیبِ نفس اور توسیعِ افق کے
ان فراہم کرنا ہے۔

ایک آخری گزارش: تہذیب الاخلاق کے پیغام کو عام کرنے کے لیے آپ اسے اپنے احباب کو پڑھنے کے لیے دیجیے اور اپنے شہر کے کتب خانوں
اس کو منگوانے کا انتظام کیجیے۔ جس رسالے کا مقصد تجارت اور منافع سے ماورا ہو اس کو صرف ادارہ نہیں چلاتا۔ اس کو ادارہ اور قارئین مل کر
لے ہیں۔ یعنی قارئین اس پر نگاہ رکھتے ہیں اور اس کی پالیسی اور معیار اور اسلوب کو ترمیم اصلاح اور ترقی سے دوچار کرتے ہیں۔ آپ کی دلچسپی اور تنقید میں
سالہ کی فلاح ہے۔ قلمی معاونین کا دائرہ اور وسیع ہونا چاہیے۔ یہ رسالہ اسی قدر اچھا ہو گا جس قدر قارئین چاہیں گے۔

سید حامد

محمد شریف خان
ریڈر شعبۂ تعلیم مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اسلام سے متعلق کچھ معلومات

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بہت عرصہ سے پیرس میں مقیم ہیں۔ آج کل وہ نجی طور پر اسلامی تحقیق و تبلیغ کے مشن کا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے مارچ ۱۹۸۰ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور میں بارہ لکچر دیے جن میں اسلام سے متعلق غیر معمولی معلومات فراہم کیں۔ انھیں معلومات میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

کچھ انسان ایسے ہیں جن کو صراحت کے ساتھ نبی تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا مگر ان کی نبوت کے امکان کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک شخصیت "زرتشت" کی ہے جو مجوسیوں کے لیے "اوستا" کتاب لائے تھے۔ یہ "ژند" زبان میں تھی۔ آج کل اس کتاب کا صرف دسواں حصہ موجود ہے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین دینی کتاب ہے۔ اس میں زرتشت کا یہ بیان ملتا ہے۔

> "میں نے دین کو مکمل نہیں کیا۔ میرے بعد ایک اور نبی آئے گا جو اس کی تکمیل کرے گا اور اس کا نام رحمۃ للعالمین ہوگا۔"

ہندوستان میں کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک "پران" ہے۔ دس پران ہیں۔ ان ہی سے ایک میں یہ ذکر آیا ہے۔

> "آخری زمانے میں ایک شخص ریگستان کے علاقے میں پیدا ہوگا۔ اس کی ماں کا نام "قابل اعتماد" اور باپ کا نام "اللہ کا غلام" ہوگا۔ وہ اپنے وطن کو دس ہزار آدمیوں کی مدد سے فتح کرے گا۔ جنگ میں اس کی رتھ کو اونٹ کھینچیں گے اور وہ اونٹ اس قدر تیز رفتار ہوں گے کہ آسمان تک پہنچ جائیں گے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشارہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے مہینہ میں دن کے وقت قرآن مجید کو جتنا اس سال تک نازل ہوا تھا با آواز بلند دہرایا کرتے تھے اور پڑھے لکھے صحابہ اپنے ذاتی نسخوں کا موازنہ کرتے جاتے تاکہ کوئی غلطی ہو تو درست کریں۔ آخری سال وفات سے پہلے جب رمضان کا مہینہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا قرآن مجید لوگوں کو دو مرتبہ سنایا اور یہ بھی کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ میری وفات قریب آگئی ہے لہذا جبرئیل علیہ السلام نے مجھے حکم دیا کہ میں دو مرتبہ پڑھ کر سناؤں۔ تاکہ اگر کسی سے غلطیاں ہوئی ہیں تو وہ باقی نہ رہیں۔

قرآن مجید کی تدوین حضرت عمرؓ کی تجویز پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ کے ذمہ کی۔ شہر مدینہ میں جس شخص کے پاس جتنا تحریری حصّہ تھا وہ لاتا اور سناتا اور وہ آیت ہی قبول کی جاتی جو کم سے کم دو تحریری نسخوں میں موجود تھی۔ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت کم از کم پچیس حافظ موجود تھے حضرت زید خود بھی حافظ تھے۔ حضرت زید کہتے ہیں کہ جب پورا قرآن جمع ہو چکا تو ان کو ایک آیت کم نظر آئی جو ان کے حافظے میں موجود تھی۔ مگر اس تحریری نسخہ میں شامل نہیں تھی۔ انھوں نے مہاجرین اور انصار کے گھروں میں چکر لگائے۔ تب ایک شخص کے پاس ایک نسخہ ملا جس میں وہ تحریر تھی۔ مگر حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت تھی کہ جب تک آیت کم از کم دو نسخوں میں نہ ملے، اس کو قرآن میں شامل نہ کیا جائے۔ مگر مشیت خداوندی نے اپنا اثر دکھایا۔ کیوں کہ یہ آیت قرآن اس شخص سے ملی تھی جس کے متعلق رسول اللہؐ نے کسی کام پر خوش ہو کر کہا تھا کہ تمہاری شہادت دو شہادتوں کے برابر سمجھی جائے گی۔ اس طرح وہ آیت قرآن میں شامل ہوئی۔

قدیم ترین انجیل یونانی زبان میں ہے کیوں کہ آرامی زبان کی انجیل اب موجود نہیں۔ یونانی زبان کے جتنے مخطوطات ہیں۔ ان کو جمع کیا گیا اور عیسائی پادریوں نے جرمنی میں ان کا موازنہ کیا تو پتہ چلا "کوئی دو لاکھ

اختلافی روایات ملتی ہیں۔" اس کے بعد حسد میں قرآن کے موازنہ کا کام بھی میونخ یونیورسٹی میں ہوا اور ۱۹۳۳ء میں بیالیس ہزار نسخوں کے فوٹو اسٹیٹ جمع کیے گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے کی عمارت پر بم گرا جس میں یہ نسخے موجود تھے۔ مگر اس سے قبل جو رپورٹ شائع ہوئی اس میں تحریر ہے "قرآن مجید کے نسخوں میں مقابلے کا جو کام ہم نے شروع کیا تھا، وہ ابھی مکمل تو نہیں ہوا لیکن اب تک جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نسخوں میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن اختلافاتِ روایت ایک بھی نہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جب قرآن کی تحریراً تدوین ہوئی تو یہ نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ان کی وفات پر یہ حضرت عمرؓ کے پاس چلا گیا۔ جب ان کی شہادت ہوئی تو وہ نسخہ ان کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس چلا گیا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ وہ حضرت حفصہؓ کے پاس سے اس کو لے لیں۔ لیکن جب آیتوں کی قرات کے بارے میں ایک بار اختلاف ہوا تو انھوں نے حضرت حفصہؓ سے اس کو مستعار لیا۔ اس کی نقلیں تیار کرائیں۔ املا میں کہیں کہیں ترمیم کی گئی، لفظ کی آواز کو نہیں بدلا گیا۔ اس کے چار نسخے تیار کیے گئے۔ ان کو مسجد نبوی میں بآواز بلند شروع سے آخر تک پڑھا گیا۔ جب سب کو اس کے صحیح ہونے میں اطمینان ہو گیا تو مختلف صوبوں کے صدر مقاموں پر وہ نسخے بھیج دیے گئے اور حکم دے دیا گیا کہ آئندہ انہیں نسخوں سے نقلیں کی جایا کریں۔ ان نسخوں میں سے ایک آج کل روس کے شہر تاشقند میں ہے۔ دوسرا نسخہ استنبول میں ہے جس میں سورہ بقرہ کی آیت پر حضرت عثمانؓ کا خون ہے۔ کیوں کہ ان کو تلاوت کے دوران شہید کیا گیا تھا۔ تیسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔

رسول اللہؐ نے مدینے میں ہر قبیلے میں ایک انشورنس یونٹ قایم فرمایا اور یہ کہا کہ تمہارے قبیلے کے کسی آدمی کو قتل یا گرفتاری کے سلسلے میں رقم ادا کرنی ہو اور وہ شخص ادا نہ کر سکے تو یہ انشورنس یونٹ ادا کرے گی اور اگر کسی یونٹ کے پاس اتنی گنجائش نہ ہو تو حکم تھا کہ اس کے قریبی محلہ کی جو انشورنس یونٹ ہے وہ اس کے ساتھ تعاون کر کے رقم ادا کرے اور اگر اس کے پاس بھی نہ ہو تو دوسری یونٹ سے انتظام کیا جائے۔ جب ساری آبادی کی انشورنس یونٹیں بھی بار نہ اٹھا سکیں تو ایسی صورت میں حکومت بھی مدد کرے گی۔ زمانۂ حال میں دو طرح کی انشورنس ہے۔ ایک سرمایہ دارانہ انشورنس اور دوسری باہمی انشورنس۔ سرمایہ دارانہ انشورنس میں تمام نفع سرمایہ دار کو ملتا ہے اور باہمی انشورنس میں انشورنس کرانے والے آدمی منفعت میں شریک ہوتے ہیں۔ عہدِ نبوی میں جو انشورنس کا نظام تھا وہ باہمی انشورنس سے کچھ قریبی مشابہت رکھتا ہے۔

محققین اور مورخین کا خیال ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی قانون ساز قوم رومیوں کی گزری ہے اور ان کے برابر کسی نے قانون کی خدمت نہیں کی۔ یورپ کی حد تک تو یہ صحیح ہے۔

رومی قانون کا مشہور مورخ کولی لکھتا ہے کہ رومی قانون بالکل ابتدائی قسم کا تھا اور جب رومیوں کی سلطنت توسیع پا کر ایشیا میں پہنچی تو اس وقت وہاں کے قانون سے متاثر ہو کر رومیوں نے اپنے قانون میں اصلاحیں کیں۔ رسول اللہؐ کی ولادت سے چار پانچ سے فوت ہونے والے حکمراں جسٹینین نے اس قانون کو مدون کرنے کی کوشش کی اس کے مجموعے کا فتاوائے عالمگیری سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قانون میں کافی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ کیوں کہ وہ انسان کا بنایا ہوا قانون تھا۔ لیکن ہمارے رسولؐ نے جو قانون دیا وہ خدائی قانون کی بنیاد پر تھا۔ اس لیے اس میں استحکام، استقامت اور پائیداری ہے۔ اگر کوئی غیر جانبداری سے رومی قانون اور اسلامی قانون کا موازنہ کرے تو وہ اسلامی قانون کو بہتر پائے گا۔ اس میں دینی امور اور عبادات کا ذکر بھی ہے جو کہ رومی قانون میں نہیں ہے۔

خلفائے راشدین کا معمول تھا کہ جب کسی مسئلے میں قرآن و حدیث میں قانون نہ ملتا تو اجتماع عام کیا جاتا۔ اذان ہوتی لوگ دوڑتے ہوئے مسجد کی طرف آتے اور خلیفہ ان سے پوچھتا کہ اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ مرد اور عورت سب ہی اس میں شریک ہوتے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ بیٹی کا نکاح کرنے سے قبل بڑا مہر مانگنے لگے تھے جس کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں شوہر نہ حاصل کر پاتیں۔ اس لیے انھوں نے حکم جاری کر دیا کہ اتنی رقم سے زیادہ مہر نہ باندھا جائے۔ اس اعلان پر مسجد میں ایک عورت اٹھی اور کہا یہ قانون نامناسب ہے۔ کیوں کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ تم عورت کو مہر میں ایک قنطار دے چکے ہو تو بھی طلاق کی صورت میں اسے واپس

لینا۔ جب خدا نے ایک قنطار مہر کی اجازت دی ہے تو عمرؓ اس قانون کو کس
طرح منسوخ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے فوراً حکم واپس لے لیا۔

زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت بڑے فقیہہ تھے ان کی کتاب
"المجموع فی الفقہ" اسلامی قانون کی قدیم ترین کتاب ہے جو اب چھپ
گئی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فقہی معاملات میں ان سے استفادہ کیا تھا۔
امام ابو حنیفہؒ نے اپنے بہت سے شاگردوں میں سے چالیس ماہرین کو منتخب
کر کے ایک اکیڈمی قائم کی تاکہ اسلامی قانون کی تدوین ہو۔ اس کا طریقہ کار
یہ تھا کہ ایک فرضی سوال پیش کیا جاتا۔ اس پر ایک ایک ماہ تک بحث ہوتی۔
اور نتیجہ کو اکیڈمی کے سکریٹری امام ابو یوسف لکھ لیا کرتے۔ ایسی تحریریں
آج کل دستیاب ہیں۔

اسلام میں عورت کو پردے کا حکم ہے۔ اس کو مردوں کے ساتھ
مخلوط ہونے کی اجازت نہیں۔ لہذا قدرتی طور پر عورت کو وہ معلومات حاصل
نہیں ہو سکتی جو کہ مرد کو ہو سکتی ہیں۔ اس کے فرائض منصبی بھی ایسے ہیں
کہ اس کو گھر کے اندر رہنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ عورت کی
شہادت قبول ہی نہ کی جاتی۔ مگر اسلام نے اس کی شہادت قبول کی۔ مگر
حالات کے مطابق ایک کی جگہ دو عورتوں کی شہادت کی شرط رکھی۔

اسلام میں غلام بنانا واجب نہیں ہے صرف جائز ہے۔ کیوں کہ
اسلام سے قبل جب لوگ لڑتے تھے اور کسی انسان کو مغلوب کر لیتے تھے تو
اس کو قتل کر کے کھا جاتے تھے۔ اس کے بعد لوگوں نے سوچا کہ ان کو مار کھانے
کی بجائے اُن سے خدمت لی جائے۔ اسلام نے حکم دیا ہے کہ غلاموں کو آزاد
کرنا ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی غلام مطالبہ کرے کہ
مالیت کو لے کر اس کو آزاد کر دیا جائے تو آقا انکار نہیں کر سکتا۔ غلامی
انسانیت کے لیے "ناسور" ہے تو کم از کم "اسلامی غلامی" انسانیت کے
اس ناسور کا علاج ہے۔

تحریری قانون جو قدیم ترین ملتا ہے وہ عراق کے بادشاہ حمورابی
کا ہے۔ یہ قانون ایک سیاہ رنگ کے پتھر پر میخی رسم الخط میں کندہ کیا گیا
ہے۔ اس کے ترجمے اکثر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مصر میں ہیروغلیفی کے
کتبے ملے ہیں۔ ان میں بھی قوانین ہیں۔ رومی قانون بھی ہے اور یونانی قانون
بھی ہے لیکن یہ سب نامکمل تھے۔ ایک مکمل قانون پہلی مرتبہ مسلمانوں نے پیش
کیا ہے۔ اس کو اصولِ فقہ کا نام دیا ہے۔ یہ ان سوالات کا جواب دیتا
ہے۔ قانون کا کیا مطلب ہے؟ وہ کیسے بنتا ہے؟ اس کو کون بناتا ہے؟
وہ کب بنتا ہے؟ اس کو تبدیل کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ اس کو منسوخ
کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ اس میں اضافہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کو
کس اساس پر بنایا جاتا ہے۔

اصول فقہ پر پہلی کتاب امام ابو حنیفہ کی "کتاب الرائے" تھی
دوسری کتاب ان کے شاگرد امام ابو یوسف کی کتاب "کتاب الاصول"
تھی جو شاید "کتاب الرائے" کی شرح تھی۔ مگر یہ دونوں کتابیں دستیاب
نہیں ہیں۔ ایک دوسرے شاگرد امام محمد شیبانی ہیں انھوں نے بھی "کتاب
الاصول" کے نام سے ایک کتاب لکھی مگر وہ بھی دستیاب نہیں ہے۔ معتزلی
فرقہ کی ایک کتاب امام ابو الحسن بصری کی بھی ہے جس کا نام "اصول الفقہ"
ہے۔ مگر اس کے بھی تین نسخے دستیاب ہیں۔ ایک استنبول میں، دوسرا
یمن میں اور تیسرا مصر میں ہے۔ امام شافعی امام شیبانی کے شاگرد ہیں
ان کے زمانے میں اہل الرائے اور اہل حدیث میں بہت اختلاف تھا۔ کیوں کہ
اہل الرائے کو حدیث سے کم واقفیت تھی۔ اس لیے جس مسئلے کی حدیث ان کو
معلوم نہ ہوتی، اس پر وہ قیاس کے ذریعے احکام دے دیا کرتے تھے۔
اگر وہ حدیث کے خلاف ہوتا تو اہل حدیث ان کو کافر سمجھتے۔ مگر امام شافعی
نے دونوں فرقوں سے تعلیم پائی تھی۔ اس لیے وہ دونوں کو متحد کر دیتے
امام شافعی نے ایک "کتاب الرسالہ" لکھی جو دستیاب ہے۔ اس طرح اصول
فقہ کی وہ قدیم ترین کتاب ہے جو دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اسی پر ایک ضخیم
کتاب ابو الحسن بصری نے لکھی جو دو جلدوں میں ڈیڑھ ہزار صفحوں پر چھپی
ہے۔ اس کتاب کا خلاصہ بیس صفحوں میں امام بیضاوی نے لکھا ہے۔ زمانہ
حال میں سر عبد الرحیم نے ایک کتاب لکھی جو محمڈن جیورسپروڈنس کے نام
سے مشہور ہے۔

اصولِ فقہ میں قرآن اور حدیث کی خاموشی کی صورت میں "اجتہاد"
کی گنجائش ہے جو "قیاس" "استدلال" "استطباق" اور "استحسان"
کے نام سے پکارے جاتے ہیں

ہمارے پاس قدیم ترین فقہ کی کتاب "المجموع فی الفقہ" ہے۔ جو
امام زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب
میں ایک باب قانون بین الممالک ہے جس کو کتاب السیر کا نام دیا گیا ہے
ایک دوسری کتاب اس پر امام ابو حنیفہ نے تصنیف کی مگر وہ بھی دستیاب

نہیں ہے

امام ابو حنیفہ رح کے شاگردوں کی کتابیں دستیاب ہیں جو شاید امام ابو حنیفہ کے لکچروں سے تصنیف کی گئی ہیں۔ ان میں امام الفرازی کی کتاب مخطوطے کی صورت میں مراکش میں موجود ہے لیکن یہ کوئی خط میں ہے۔ دو کتابیں ان کے ایک اور شاگرد امام محمد شیبانی کی ہیں جو کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر ہیں۔ پانچویں صدی ہجری میں ایک مشہور حنفی امام سرخسی گزرے ہیں۔ ان کو حاکم وقت نے ایک فتویٰ کی بنا پر قید کرکے ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا تھا۔ قید چودہ سال کی تھی۔ اس میں یہ اجازت مل گئی تھی کہ شاگرد کنویں کی مینڈ پر آکر بیٹھیں اور استاد کے ارشادات کو نوٹ کریں۔ امام سرخسی نے کنویں کے اندر سے باواز بلند جو کتابیں تصنیف کیں، ان میں ایک کتاب المبسوط تیس جلدوں میں چھپی ہے اور شرح السیر الکبیر چار جلدوں کی ضخیم کتاب ہے اور اس کے علاوہ کوئی درجن بھر اور شرحیں ہیں۔ کتاب المبسوط کا مخطوطہ استنبول میں ہے۔ امام مالک نے ایک کتاب کتاب السیر کے نام سے لکھی مگر وہ بھی ناپید ہے۔ اسی زمانہ میں مشہور مورخ واقدی نے بھی کتاب السیر لکھی مگر وہ بھی ناپید ہے۔

ڈارون کے بارے میں ایک غلط فہمی ہے کہ وہ ملحد تھا۔ مگر اس کی سوانح عمری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا قایل تھا۔ اس نے کیمبرج میں عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں پر اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اس نے عربی زبان بھی پڑھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت شہر مکہ ایک شہری مملکت تھی جس کا رقبہ تقریباً ایک سو تیس مربع میل تھا۔ وہاں پر بادشاہت کی جگہ ایک طرح کی سیلف گورنمنٹ تھی۔ ایک مجلس وزراء اس کے انتظام کی ذمہ دار تھی۔ ہر اہم کام کے لیے وزیر تھے۔ ایک اور ادارہ تھا جس کو دار الندوۃ کہنا چاہیے۔ ہر مشکل مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اس میں ہر وہ شخص شامل تھا جس کی عمر کم از کم چالیس سال تھی۔ صرف دو آدمی اس شرط سے مستثنیٰ تھے۔ ان میں سے ایک ابو جہل تھا۔ کیوں کہ اس کی فراست اور عقل مندی کا بڑا چرچا تھا۔ اس لیے نوجوانی ہی میں وہ اس مجلس مشاورت میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کے برخلاف مدینہ میں کسی شہری مملکت کا وجود نہیں تھا جس کو رسول اللہ نے "اوس" اور "خزرج" قبیلوں کے درمیان صلح کرانے کے بعد قایم کیا۔ جس کو دو چار اوسی اشخاص کے علاوہ سب نے قبول کیا۔ اس مملکت کا ایک دستور تحریری طور سے مرتب کیا گیا۔ یہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور "امیّ" شخص کے ہاتھوں وجود میں آیا۔ اس میں مستقل اور خود مختار مملکت قایم کی گئی اور اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے دین کی پوری آزادی ہوگی۔ دستور کی ایک دفعہ کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

"مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا دین اور یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے۔"

اس دستور میں صراحت ہے کہ امن اور جنگ ناقابل تقسیم چیز ہوگی یعنی اگر امن ہو تو سلطنت کے سارے باشندوں کے لیے ہوگا اور جنگ ہوگی تو سارے باشندوں کے لیے۔ اگر جنگ کے لیے باہر جانے کی ضرورت ہو تو حکومت کے صدر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ کریں گے۔ گویا کہ صدر کے ساتھ کمانڈر انچیف بھی وہی تھے۔ دستور میں عدل گستری کا بھی ذکر ہے۔ ابتدائی عدالت قبیلہ وار رکھی گئی۔ اگر فریقین دو قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے تو فیصلہ کے لیے رسولِ خدا کے پاس جانا ہوتا تھا۔ دونوں فریق مل کر کسی اور کو بھی حکم بنا سکتے تھے۔ مگر آخری حاکم عدالت رسولِ خدا ہی تھے۔ مسلمانوں کے لیے قانون سازی کا اختیار رسول اللہ کو تھا۔ السیر الکبیر میں لکھا ہے کہ عہدِ نبوی میں ایک کاتب کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ ان بالغ لوگوں کی فہرست مرتب کرے جو نہ صرف جنگ کے قابل ہیں بلکہ اس پر آمادہ ہیں کہ جب انھیں بلایا جائے فوراً فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔ مدینے کی مسجد کا ایک حصہ صُفّہ کہلاتا تھا جو دن کے وقت تعلیم گاہ کا کام دیتا تھا اور رات کے وقت بے خانماں لوگوں کے لیے سونے کی جگہ بنتا۔ یہ پہلی اقامتی یونیورسٹی تھی۔

ایک حدیث ہے علم سیکھو چاہے وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس کی صحت میں کچھ لوگوں کو شبہ ہے۔ کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کو چین کے علوم و فنون کا کس طرح پتہ چلا۔ اس اعتراض کے جواب میں مندرجہ ذیل ثبوت ہیں۔

(۱) مسعودی کی مشہور کتاب "مروج الذھب" میں نقل ہے۔ اسلام سے پہلے چینی بصرہ تک آئے تھے بلکہ عمان تک بھی پہنچے تھے۔

(۲) محمد بن حبیب البغدادی نے اپنی کتاب المحبر میں لکھا ہے

"ہر سال فلاں مہینہ میں دباء نامی مقام پر میلہ لگتا تھا جس میں شرکت کے لیے سمندر پار سے بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں

ایرانی بھی ہوتے تھے، چینی بھی ہوتے تھے، ہندی اور سندھی بھی ہوتے تھے مشرقی لوگ بھی ہوتے تھے، مغربی لوگ بھی ہوتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے۔

قبیلہ عبدالقیس کے لوگ جو عمان اور بحرین میں رہتے تھے، مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا (اس سے مراد وہ بحرین نہیں ہے جسے ہم آج کل بحرین کہتے ہیں) اس زمانے میں اس جزیرہ کا نام "سماء اوال" تھا اور بحرین کا لفظ اس علاقہ کو ظاہر کرتا تھا جسے آج کل ہم "الدمام" اور "القطیف" کے نام سے یاد کرتے ہیں)۔ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے کچھ سوالات کیے۔ فلاں شخص ابھی زندہ ہے؟ یا کیا فلاں سردار زندہ ہے؟ فلاں مقام کا کیا حال ہے؟ آپؐ کے ان سوالات کو سن کر وہ لوگ حیرت سے پوچھتے ہیں۔ یا رسول اللہ ﷺ! آپ تو ہم سے بھی زیادہ ہمارے ملک کے شہروں اور باشندوں سے واقف ہیں۔ یہ کیسے ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاؤں تمہارے ملک کو بہت عرصے تک روندتے رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مَیں وہاں بہت دن تک مقیم رہا ہوں۔

قرآن مجید میں بے شمار بادشاہوں، نبیوں اور قوموں کے قصّے بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں ایک ایسے پیغمبر کا بھی ذکر آیا ہے جسے ہم ہندوستان سے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہ پیغمبر حضرت ذوالکفل ہیں۔ ان کے متعلق قرآن اور حدیث میں تفصیلی صراحت موجود نہیں ہے۔ بعض محدثین و مفسرین نے اس سلسلے میں اگرچہ لکھا ہے لیکن وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کہتے تھے کہ غالباً اس سے مراد گوتم بدھ ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتلاتے تھے کہ ذوالکفل کے لفظی معنیٰ کفل والے کے ہیں۔ "کپل وستو" کی معرب شکل ہے یہ بنارس کے قریب ایک شہر ہے جس میں گوتم بدھ پیدا ہوئے تھے۔ اس کی مزید تائید کے لیے وہ سورۃ "والتین" کی طرف اشارہ فرماتے تھے کہ "والتین" کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بعض نے اس سے کسی اور نبی کی طرف اشارہ مراد لیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی زندگیوں میں انجیر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ جب کہ گوتم بدھ کو ان کے ماننے والوں کے مطابق جنگلی انجیر کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔

اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ اس سے پہلے کے مذہبوں میں سرکاری آمدنی کے ذرائع یعنی کن کن چیزوں پر ٹیکس لیا جائے اس کی تفصیل توہیں ملتی ہے۔ مثلاً توریت وغیرہ میں۔ لیکن کن کن مدّات میں انھیں خرچ کیا جائے اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ قرآن کریم پہلی دینی کتاب ہے جس میں آمدنی کے وسائل کے متعلق بہت کم تفصیلیں ملتی ہیں لیکن خرچ کے متعلق انتہائی تفصیل سے بتایا جاتا ہے کہ کس کو کتنی رقم دی جائے۔ اسلام نے حکومت کی بجٹ کی پالیسی متعین کر دی کہ زکوٰۃ کی آمدنی آٹھ مدّات میں خرچ کی جائے۔ وہ آٹھ مدّات یہ ہیں۔ فقراء، مساکین، عاملین علیہا مولفۃ القلوب، الرقاب، غارمین، فی سبیل اللہ اور ابن السبیل امام شافعی کا بیان ہے کہ چوں کہ آٹھ مدات میں خرچ کرنے کا حکم ہے لہٰذا ہر ایک مد پر ⅛ حصّہ خرچ کیا جائے۔ دوسرے ائمہ کی رائے یہ نہیں ہے ابتدائی دو نام فقراء اور مساکین مترادف لفظ ہیں۔ امام شافعی نے کہا چوں کہ اللہ نے غریبوں کو دگنا حصّہ دلانا چاہا، اس لیے دو نام استعمال کیے۔ اس لیے غریبوں پر ¼ حصّہ خرچ کیا جائے۔

آج کل فقہ کی کتابوں میں ملتا ہے کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کو دی جاسکتی ہے، غیر مسلموں کو نہیں دی جاسکتی۔ مگر امام ابو یوسف کی کتاب "کتاب الخراج" میں ملتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں زکوٰۃ کی آمدنی سے یہودیوں اور عیسائیوں کی بھی مدد کی ہے۔

رسولِ خدا کے مکتوبات میں نجاشی کے نام ایک مکتوب ملتا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ میں اپنے چچازاد بھائی جعفر کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں جب وہ پہنچے تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا استقبال کر، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور اس بارے میں ایسی ہٹ دھرمی اختیار نہ کر جو تیرے شایانِ شان نہ ہو۔ طبری میں یہ خط موجود ہے مگر اس میں یہ تفصیل نہیں ملتی کہ خط کب بھیجا گیا۔ سیاق و سباق سے وہ ۲۔ ہجری سے پہلے کا ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے کی ایک معتبر شہادت موجود ہے جس کی اصل دستاویز بھی آج تک محفوظ ہے۔ ایک عیسائی اپنے ہم مذہبوں کو جو دوسرے شہر کے تھے یہ خوش خبری پہنچاتا ہے کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے لیکن وہ ہم پر ظلم نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف وہ ہمارے گرجاؤں اور ہماری خانقاہوں کی مدد کرتی ہے۔

خودکشی کے طریقے

دنیاوادیٔ حرماں ہے ۔جس کو دیکھیے پریشان ہے، فریاد کررہا
ہے، کفِ افسوس مل رہاہے۔ " خوشہ چیں " نے سوچا کہ وہ طریقے ڈھونڈھیے
ن سے یہ دلدّر دور ہوں اس عذاب کو جسے زندگی کہتے ہیں ختم کرنے کی ترکیبیں
اش کیجیے۔ تلاش کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی عقل نے آئے دن کی مصیبتوں
ے دائمی نجات حاصل کرنے کے لیے جو ڈھنگ نکالے ہیں ان کی تفتیش کیجیے۔ غم،
سرت، گلہ اور اضطراب دل کی بانسری سے یہی سُر نکل رہے ہیں ۔ بانسری
بنا بند کیسے ہو ؟ اس کا طریقہ صرف ایک ہے ۔ وجود کے بانس سے چھٹکارا
اصل کرلیا جائے ۔ ایسا کرنے کے ڈھنگ کیا کیا ہیں ۔ بے چارہ خوشہ چیں
ہوں اسی جستجو میں سرگرداں رہا ۔خودکشی کے آرزومندوں سے بات چیت
۔ ایک حسرت زدہ جو قبر میں اُترنا چاہتے تھے ۔ بولے " آسان طریقہ ہے
طمنچہ کنپٹی پر رکھ کر داغ دیا جائے " خوشہ چیں نے کہا ۔" اس میں
حن یہ ہے کہ طمنچہ خوشحالوں کو ہی نصیب ہوتا ہے ۔ پستول کا لائسنس
سانی سے نہیں ملتا ۔ بغیر لائسنس کے پستول حاصل کرنا پُرخطر ہے اور ساتھ
ھنا اور زیادہ مخدوش ۔ چلے تھے زندگی کی قید سے رہائی حاصل کرنے
ر ہوا یہ کہ ناجائز اسلحہ رکھنے پر پولس کی گرفت میں آگئے اور قید خانے
ں ڈال دیے گئے ۔ اور اگر یہ مراحل کامیابی کے ساتھ طے کر بھی لیے
اس کی کیا ضمانت کہ اپنی جان لیتے وقت ہاتھ ہل نہ جائے گا ۔ ہاتھ ہل
اور کنپٹی کے بجائے کان اُڑ گیا تو عمر بھر ایک کان لیے گھومیں گے ،
دونوں آنکھیں ہوتے ہوئے بھی بجا طور پر کانے کہلائیں گے ۔ جگ ہنسائی
ہو گی " کتنا اچھا نشانہ ہے ، کان کو اس طرح اڑا دیا کہ سر پر آنچ
آئی " ۔ اور اگر نشانہ نہ چوکا تو بھیجے کی سفیدی اور خون کی لالی سے
دیوار پر جو بھی کاری ہو گی اس کا ذمہ دار کون ٹھہرے گا ۔ اور خود
جنازہ کا جو نقشہ ہو گا ، اس کا بھیانک پن آن جہانی کی بابت ہولناک
ہو جائے گا "۔

۲ ۔ زندگی سے دل برداشتہ ایک دوسرے صاحب نے ارادہ ظاہر کیا
کہ ندی یا تالاب کے کنارے یا پُل پر سے کھڑے ہو کر، آنکھ بند کرکے چھلانگ
لگا دیں گے ۔ عزائم پر فخر کرتے ہوئے بولے : " غالب تو ڈوب کر مرنے کی
حسرت اپنے ساتھ لے کر چلے گئے " :

ہوئے تم جو مر کے رسوا ، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کوئی جنازہ اُٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

مجھے دیکھیے دھڑلّے کے ساتھ ڈوبنے جا رہا ہوں ۔ کوئی ہے جو مجھے روک
سکے ۔ مسلمان کے لیے بالخصوص اس طرزِ خودکشی میں بڑی عافیت یہ ہے
کہ نعش بہہ جاتی ہے اور وہ اس رسوائی سے بچ جاتا ہے کہ امام صاحب
حرام موت سمجھ کر جنازہ کی نماز پڑھانے سے انکار کر دیں "۔

خوشہ چیں نے انھیں اس عزم بالجزم اور آبی سفر پر مبارکباد دی
لیکن اس جملۂ معترضہ سے ان کے ارادہ کو ڈگمگا دیا :

" بھائی صاحب ! قدرت کا نظام کچھ ایسا ہے کہ اچھائی کے ساتھ برائی
اکثر لپٹی ہوئی نظر آتی ہے ۔ مرگِ آبی میں ایک چھوڑ دو دو خطرات ہیں ۔ پہلا تو
یہ کہ عجب نہیں پانی تک پہنچتے پہنچتے آپ کی نیت بدل جائے اور آپ بکمال زیانی
یہ سوچنے لگیں کہ کیوں نہ ایک اور موقع زندگی کو دے دیا جائے ۔ آپ
کو منانے کا اور یہ ثابت کرنے کا کہ وہ اتنی بُری نہیں جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے
اگر ایسا ہوا تو یہ کیسی بے بسی کا عالم ہو گا ۔ آپ جب مرنا چاہتے تھے تو موت
نہ آئی ۔ اب جینے کی ٹھانی تو موت دامن نہیں چھوڑ رہی ہے ۔ گومگو کے عالم
میں دنیا کو چھوڑیے گا تو سدا عالمِ برزخ میں قیام کرنا پڑے گا ۔ تلوار کی
دھار والے اعراف سے پاؤں لہولہان ہو جائیں گے ۔ نہ جنت ملے گی ، نہ
جہنم ۔ کرب کا نیزہ آپ کو چھید ڈالے گا ۔ زندگی میں جو صعوبتیں آپ نے
برداشت کیں اور جو بالآخر برداشت سے باہر ہو گئیں ، وہ اس کرب
پشیمانی اور بے بسی کے مقابلے میں ہیچ ہیں ۔ موت اگر اسی کا نام

تباہی کی نشانیاں

ہم نے ایک نواب زادے کو جو غدر میں تباہ ہوگیا تھا دیکھا تو ہم کو شبہ ہوا کہ شاید یہ کوئی تمباکو فروش ہے۔ ہم نے انشاء اللہ خاں کے پوتے کو بھی دیکھا ہے۔ اور ہم کو ان کی حالت اور صورت سے ہرگز اس بات کا یقین نہ ہوتا تھا کہ ایسے نامور کی نسل میں ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے بادشاہ زادے بھی دیکھے ہیں جو گولا کبوتر کو سیٹی پر لگانے اور طوطوں کو پنجروں پر اڑانے اور بٹیروں کو لڑانے کے سوائے اور کوئی نشان شاہزادگی کا نہ رکھتے تھے اور جب ہم نظر کرتے تھے تو ہم کو خود اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ بلاشبہ یہ قوم ضرور تباہ ہونے کے لائق تھی۔ (سرسید)

موت کو ہزار سلام۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ جس وقت آپ نے جست لگائی۔ قضارا اسی وقت ایک تیراک کا اس طرف سے گزر ہوا۔ وہ آپ کے پیچھے سر کے بل گیا۔ اور جتن کر کے آپ کو نکال لایا اور اس کوشش میں خود ڈوبتے ڈوبتے بچا۔

خودکشی کی شانِ امتیاز یہ ہے کہ اسے کر ڈالیے تو کوئی حرج نہیں لیکن ارادہ کر کے آدھے راستہ میں رہ جائیے تو سرکار پر آپ کے نان و نفقہ کی ذمہ داری براہِ راست عاید ہو جاتی ہے۔ تعزیراتِ ہند میں جرائم کی جتنی دفعات ہیں، ان میں سب سے یگانہ اور بانکی دفعہ اقدام خودکشی کی ہے

۳۔ ایک روز ایک اور حرماں زدہ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ چلتی ٹرین کے سامنے لیٹ جائیں گے۔ خوشہ چیں نے ان کی پیٹھ ٹھونکی: مرحبا، جزاک اللہ" لیکن چلتے چلتے کہہ گئے کہ "اس میں تشہیر اور ہنگامہ آرائی دوسری صورتوں سے کچھ اور زیادہ ہوتی ہے۔ پھر خطرہ یہ کہ اگر دل مضبوط نہیں ہے (اگر دل مضبوط ہوتا تو خودکشی کرنے کیوں نکلتے) تو قریب آتی ہوئی ٹرین کی گڑگڑاہٹ سن کر بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ یا کوئی ایسا حصہ زد میں آجائے جو زندہ رکھے لیکن زندگی بھر کے لیے اپاہج بنا کر اور اگر گردن زد میں آئی اور سر دھڑ سے الگ ہوگیا تو لوگ کہیں گے "زندگی میں تو سالم تھے، مر کر دو نیم ہوگئے"۔ اور اس سے پہلے یہ خطرہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں مشتبہ حالات میں ریلوے لائن کے قریب کسی پہرہ دار نے دیکھ لیا تو تخریب کار، نکسلی یا اکالی سمجھ کر دھر لے گا۔ پھر وہی عدالتی ہوا خوری اور سرکاری مہمانی۔

۴۔ خوشہ چیں ہنوز شش و پنج میں تھا کہ زندگی سے بیزاروں کو کیا رائے دے اور خود ساختہ رحلت کا کون سا مجرب اور بے ضرر نسخہ بتائے، ایک دل گرفتہ نے گتھی سلجھا دی "زہر کھا کر کیوں نہ مر جائیے"۔

خوشہ چیں نے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا "اس طریقہ میں بھی ذرا سا خطرہ ہے۔ زہر خریدنے جائیے تو لوگوں کو شبہ جو ہو جائے" یہ کہہ کر خوشہ چیں گہری فکر میں ڈوب گئے۔ لیکن غوطہ لگا کر جب نکلے گوہرِ مقصود ہاتھ میں تھا:

"آپ جانتے ہیں جدید زمانہ کے فشار نے نیندیں اُڑا دی ہیں۔ نیند کی گولیاں لوگ دیوانِ غالب کی طرح سرہانے رکھ کر سوتے ہیں گولیوں کی ایک شیشی لے آئیے اور مارلین منرو کی طرح ایک رات شیشی خالی کر دیجیے اور اسی کی طرح

د برہنہ آیا تھا یاں عدم سے
برہنہ یاں سے چلا عدم کو

خوابوں کی دنیا میں پہنچ جائیے اور واپس آنے کا نام نہ لیجیے

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رُو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت[1]

مرگ طلب سایل نے اعتراض کیا۔" میں تو گہری نیند سوتا ہوں" خوشہ چیں نے کہا۔ "گہری نیند سوتے ہو تو مرنے کے لیے بے تاب ہو۔ اور اگر جانا ہی چاہتے ہو تو نیند کو ذرا اور گہرا کر دو"

---

[1] دنیا دوبارہ دیکھنے کے لائق نہیں ہے۔ یہاں سے جو گیا، اس نے دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا۔

کی نیند کے لذت آشنا بن جاؤ۔ یا نیند کی گولیاں حاصل کرنے کے لیے پہلے
نیند اچاٹنے کی ترکیبیں کرو۔ پھر دو چار مہینے خواب آور گولیاں کھانے کی
مشق کرو اور پھر ..... ایک رات مہلک خوراک لے کر سو جاؤ۔ مشورہ
لینے والا، جسے مرنے کی جلدی تھی، اتنی تاخیر کہاں برداشت کر سکتا تھا
خوشہ چیں کو سخت سست کہہ کر رخصت ہو گیا۔ لیکن جب ایک نسخہ
خوشہ چیں کے ہاتھ آگیا تھا تو اسے آزمانا لازم تھا۔ ایک دوسرے سوالی
کو خوشہ چیں نے خود زہر کا نسخہ بتایا اور پوچھا۔ "کسی ڈاکٹر سے
یاد اللہ ہے ؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر ان سے اپنے کسی ایسے مرض کا علاج کراؤ جس سے شفا کے
لیے زہر تریاق کا حکم رکھتا ہو۔ سارا نسخہ نہیں، نسخے کا صرف ایک جزو۔
ڈاکٹر صاحب جنھوں نے حصولِ زر کی خاطر خود کو خدمتِ خلق کے لیے وقف
کر دیا ہے، ضرور اس خدمت سے حذر نہ کریں گے۔ جب زہر مناسب
مقدار میں اکٹھا ہو جائے تو اسے اور خود کو ٹھکانے لگا دو۔"

سائل خوشہ چیں کے جواب سے مطمئن ہو گیا۔ اس غریب کو کیا معلوم
کہ زہر کھا کر موت کی جانکنی کا ایک لمحہ زندگی بھر کی تکلیفوں پر بھاری ہے
آنتیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں گی۔ تن بدن میں برچھیاں اور بھالے
چبھنے لگیں گے اور اپنی جان لینے والا گھنٹوں تڑپ تڑپ کر چلّا چلّا کر
جان دے دے گا۔ اسے کب یہ اندازہ تھا کہ شاعر اور عاشق جس آسانی
سے زہر کھا کر مر جانے کا ذکر کرتے ہیں، دراصل اتنی ہی دشواری زہر
کھا کر نزع کا سفر طے کرنے میں ہوتی ہے۔

خلافِ وضع ہے اے دل ادھر جانا، اُدھر جانا
ہیں کچھ کھا کے سو رہنا، اسی چوکھٹ پہ مر جانا

وہ اُدھیڑ بن میں پڑ گیا

خوشہ چیں قیافہ شناس تھا، سائل کے تردد کو پہچان گیا۔ کہنے
لگا "اگر کچھ کھا کے سو رہنے کی تمنا ہے، اگر زہر کے زیرِ اثر سکون
کی موت مرنا چاہتے ہو تو مصر کی ملکہ قلوپطرہ کا طریقہ اپناؤ۔ اس
نے ایک ننھے منے بس بھرے سانپ کو بڑے ارمانوں کے ساتھ
سینے سے لگا لیا تھا۔ اس چاؤ سے تو اس نے انٹونی یا قیصر
کو اپنے پہلو میں جگہ نہ دی ہوگی۔ آن کی آن میں قلوپطرہ پر

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

لوگ ہمیشہ اسی کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے
کاموں کے لیے کام میں لائیں لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے
بڑا کام خود زندگی ہوئی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔
یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مرجائیے اور اس سے
زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی،
اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔

——— مولانا ابو الکلام آزاد

غنودگی طاری ہوئی اور وہ سدا کے لیے خوابوں، رنگیں خوابوں،
کی دنیا میں چلی گئی۔"

موت کا جویا چلّا اٹھا "ہم غریبوں کی دسترس ملکہ کو
سلانے والے سانپ تک کہاں"۔

۶۔ خوشہ چیں نے کسی قدر ترش روی سے کہا۔ "تو پھر چھت سے لٹک
جائیے اور گردن کو رسی کے حلقے کی آغوش میں دے دیجیے۔"

جواب ملا۔ "آنکھیں باہر نکل آئیں گی، چہرہ بھیانک ہو جائے گا
اور تعزیت کرنے والے بجائے تعریف کے مذمت کریں گے۔ "مرے
ہمدردی کی تمنا میں اور حاصل ہوئی جگ ہنسائی"۔ باز آئے
ہم ایسی موت سے۔ رقص کرنا بجا، مگر یہ بھی کیا رقص ہے کہ ہوا میں
جھول رہے ہیں۔ ساون کے مہینے کا بھی انتظار نہ کیا۔ سر مقیّد اور
دھڑ آزاد۔ زندگی میں تو بیشتر انسانوں کا یہ حال ہوتا ہے، لیکن
مرنے کے بعد بھی یہی حال رہا تو ستم ہو جائے گا۔"

خوشہ چیں، خُردہ گیروں اور نکتہ چینوں سے تنگ آگیا تھا۔
کہنے لگا "تمھیں کوئی طریقہ مرگِ خود اختیاری کا پسند نہیں آتا تو جاؤ
بھاڑ میں۔" بھاڑ کے لفظ نے اس کے ذہن کو آگ کی طرف منتقل کر دیا
قارئین فخر کی اس طغیانی سے ناواقف نہیں ہوں گے جو یونانی سائنسداں
آرشمیدس نے بے ساختہ محسوس کی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ
اس وقت وہ پانی کے ٹب میں بیٹھا نہا رہا تھا۔ انھوں نے یہ بھی پڑھا

سید صاحب کی شخصیت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ جو ان کے نزدیک آیا ان کا گرویدہ ہو کے رہ گیا۔ عبدالحق تو سید صاحب کے بہت نزدیک تھے۔ اگر وہ ان کے حلقہ بگوش ہو گئے، اور ساری زندگی ان کے نظریات کو متاع عزیز کی طرح سینے سے لگائے رہے، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! کبھی کبھی سرسید پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بری طرح پرنسپل بیک کے اثر میں آ گئے تھے۔ شبلی نے جب یہ کہا تھا " ان کی ہر بات میں آورد تھی، آمد نہ تھی"، تو روئے سخن بیک صاحب ہی کی طرف تھا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ الزام بے بنیاد تھا۔

سید صاحب کے سامنے اچھے اچھوں کی زبان ہکلانے لگتی تھی۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحق کو سید صاحب کے خواب کتنے عزیز تھے۔

کفرانِ نعمت

" میرا عقیدہ یہ ہے کہ سب انسان نیک ہیں، سوائے کاہل کے، کاہلی جرم ہے، گناہ ہے عطیۂ الٰہی سے انحراف اور کفرانِ نعمت ہے۔ یاد رکھیے کہ جو اقوام یا افراد کام کرنے سے ہچکچاتے اور محنت سے جی چراتے ہیں انھیں کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی۔ کام سے انسانیت آتی ہے، سیرت اور اخلاق بنتے ہیں، ظاہر و باطن کی اصلاح ہوتی ہے۔ ہم جان دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، مگر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس میں پتا مارنا پڑتا ہے، عزیز اشغال اور محبوب عادتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔"

—— مولوی عبدالحق

دو شاہکار

از ثاقب امروہوی

وہ ایک تاج محل خوابِ شاہ کی تعبیر
مرے تخیل میں آئے ہیں یہ جو دو شہکار

وہ ایک جانِ علی گڑھ کہ قوم کی تقدیر
زمانہ چاہے مگر کر سکے نہ پھر تعمیر

یہ مانا تاج مشہورِ زمانہ ہو تو گیا
وہ ایک مُردہ، کفن پوش مرمریں پتھر

مگر وہ قوم کی تقدیر کو بدل نہ سکا
مثالِ بت ہی رہا جسم و جاں میں ڈھل نہ سکا

مگر وہ جانِ علی گڑھ وہ روحِ سرسید
کہ جس کے نور سے ذرّوں نے روشنی پائی

ہوئی ادارۂ قومی میں ڈھل کے تابندہ
کہ جس نے ملّتِ مردہ کو کر دیا زندہ

مذاقِ مردہ پرستی سے تجھ کو کیا حاصل
جو دیکھنا ہو تجھے کارِ ہمتِ انساں

وہ تاج ہو کہ کوئی اور مقبرہ اے دوست
تو مان لے تو مرا ایک مشورہ اے دوست

تو جا کے دیکھ ذرا درس گاہ علی گڑھ کی
یہ التجا ہے گزرنا بہت ہی دھیرے سے

کہ چپّہ چپّہ ہے اک زندہ شاہکار اس کا
کہ سو رہا ہے وہاں تھک کے معمار اس کا

ڈاکٹر ضیاءُ الدّین انصاری
مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مُسلم ایجُوکیشنل کانفرنس

سر سید بڑے دور اندیش اور دور بین انسان تھے۔ قوم کا درد ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسلم قوم کی اصلاح اور اس کی ترقی کی فکر میں صرف ہوا۔ ان کی زندگی سعیِ پیہم، جہد مسلسل اور یقین محکم کی ملی تصویر تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیے۔ یہ بات تو اب مسلّم ہو چکی ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم کو وہ مسلمانوں کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے مسلمانوں میں مغربی طرز تعلیم کے نظام کو عام کیا۔ اپنی اس اسکیم کو مقبولِ عام بنانے کے لیے انھوں نے مختلف ذرائع اختیار کیے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی کام تو مدرسۃ العلوم مسلمانان کے قیام کا تھا جو ترقی کی منازل طے کر کے آج ہمارے سامنے "مسلم یونیورسٹی" کی شکل میں موجود ہے اور ملک و بیرون ملک کے تشنگانِ علم کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں سر سید کو جس شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ لیکن سر سید پختہ عزم اور کوہ ہمالہ کی طرح بلند حوصلہ انسان تھے۔ حالات کے سامنے سپر انداز ہو جانا، یا ہمت ہار بیٹھنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ عوام کی رائے ہموار کرنے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے ایسے ذرائع اختیار کرتے کہ ان کے مخالف بھی ان کی صداقت اور خلوص اور ان کے منصوبوں کی افادیت کے قایل ہو جاتے۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ اُن کی مغربی تعلیم کی اسکیم کی مخالفت کی جا رہی ہے، تو انھوں نے اس تحریک کو مقبول بنانے کے لیے کئی ترکیبیں اپنائیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو ۱۸۶۳ء میں انھوں نے سائن ٹیفک سوسائٹی [Scientific Society] قایم کی جس کا بنیادی مقصد مغربی زبانوں کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ شایع کرنا تھا۔ اسی سلسلہ میں ۱۸۶۶ء میں انھوں نے "اخبار سائن ٹیفک سوسیٹی" جاری کیا۔ پھر ۱۸۷۰ء میں اپنا مشہور زمانہ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' نکالا جس میں تعلیمی، مذہبی، معاشرتی اور ادبی مضامین شایع ہوتے۔ اس کو غیر معمولی قبول عام نصیب ہوا اور سر سید کے مشن کو غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی۔ لیکن سر سید نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ انھوں نے ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت کو بھی محسوس کیا جس میں ملک کے دانشور، عالم، ماہرینِ تعلیم اور دردمندان قوم یکجا ہو کر مسلمانوں کی تعلیمی حالات کا جائزہ لیں اور ان میں تعلیم عام کرنے کے ذرایع تجویز کریں۔ اس کے لیے انھوں نے ۱۸۸۶ء میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" قایم کی۔ مختلف اوقات میں اس کے نام میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ شروع میں اس کا نام "محمدن ایجوکیشنل کانگریس" رکھا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں اس کا نام محمدن ایجوکیشنل کانفرنس، کر دیا گیا۔ پانچ سال بعد ۱۸۹۵ء میں ایک بار پھر نام میں تبدیلی کی گئی۔ اب اس کا نام 'محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس' کر دیا گیا۔ بعد ازاں چھتیسویں سالانہ اجلاس [۱۹۲۳ء] میں صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی تحریک پر لفظ محمدن کو "مسلم" سے بدل دیا گیا اور اس طرح اس کا نام "مسلم اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس" ہو گیا۔ آج کل یہ 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' کے نام سے معروف ہے۔

کانفرنس کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے "حیات جاوید" میں مولانا حالی رقم طراز ہیں:

> محمدن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہو گئی تو سر سید کو یہ خیال ہوا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہو گیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصّوں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔ ہر حصۂ ملک کے مسلمانوں کی

ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہوا اور مسلمان جو باجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں ان میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اس بنا پر جیسا کہ سرسید نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا، یہ کانفرنس قایم کی گئی اور اس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج منعقد ہوا۔"

اس طرح آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود عمل میں آیا۔ اس کانفرنس نے مختلف مراحل پر قوم کی بھرپور خدمت کی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے میں اس کی مدد کی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی کارکردگی میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور اس کے اغراض و مقاصد میں تنوع آتا گیا لیکن ابتداء میں جو اساسی مقاصد طے پائے تھے، وہ حسب ذیل تھے:

۱۔ "مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں، ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۳۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جا بجا طور پر خود دیتے ہیں، اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قایم و جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

۴۔ جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے، اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔

۵۔ قرآن خوانی اور حفظِ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے، ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قایم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔"

ان مقاصد کی تکمیل ہمیشہ اس کانفرنس کے پیش نظر رہی۔ یہ مقاصد چوں کہ نیک اور خلوص نیت پر مبنی تھے، اس لیے جلد ہی کانفرنس کو مقبولیت حاصل ہو گئی اور مختصر سی مدّت میں اس نے ملک گیر تحریک کی شکل اختیار کر لی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ابتدا میں اس کے خلاف آوازیں اٹھیں۔ دراصل مخالفت سرسید کا مقدر بن چکی تھی۔ ان کا مغربی تعلیم کا تصوّر پہلے ہی شدید مخالفت کا موضوع بن چکا تھا۔ اس لیے ہر وہ عمل، اور ہر وہ اسکیم جس کا مقصد اُس طرزِ تعلیم کو فروغ دینا ہو، اس کی مخالفت فطری اور بدیہی تھی۔ چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی مخالفت ہوئی اور اسی زور و شور سے ہوئی جس سے کالج کو ہدف مخالفت بنایا جا رہا تھا۔ اس کا بڑا مدلّل، واضح اور پُر ہنر جواب نواب محسن الملک نے ۱۸۹۳ء میں کانفرنس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں ان الفاظ میں دیا:

" مانا کہ ہم نے مغربی علم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا، مانا کہ ہم نے کانفرنس قایم کر کے مسلمانوں کو بہکایا مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لیے یہ بتا دیں کہ انھوں نے اپنی قوم کے لیے کیا کیا؟ اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے لیے دیر و کنشت بنایا، مگر یہ بتائیے کہ ان کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں؟ اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قایم کی، ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا۔ مگر ہمارے دوست براہِ مہربانی یہ فرما دیں کہ انھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے کے لیے کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟ ہم اگر مضر یا بے سود کام کرنے کے گنہ گار ہیں تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمّہ دار کون ہے؟"

اس تحریک کو مقبول اور کامیاب بنانے کے لیے سرسید اور ان کے ر[فقا] نے بہت سے اقدامات کیے جو بڑے کارگر ثابت ہوئے۔ اُن سے کانفرنس [کی] ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوا اور اس کی افادیت مسلّم ہوتی ہوئی۔ ان [میں] سے ایک تدبیر تو یہ اختیار کی گئی کہ اگرچہ کہ اس کا صدر دفتر علی گڑھ میں [تھا] اس کے سالانہ جلسے ملک کے مختلف مقامات پر بھی کیے جاتے اور اس طرح [دور] دراز کے علاقوں تک اس کی آواز پہنچائی جاتی۔ ہر سال نئے شہر کا انتخاب [ہوتا] اور وہاں جلسہ ہوتا۔ چنانچہ علی گڑھ کے علاوہ رنگون، ڈھاکہ، پشا[ور]، لاہور، امرتسر، سورت، بمبئی، کلکتہ، مدراس، پونا، جب[ل پور]، ناگپور، پٹنہ، اجمیر، الہ آباد، آگرہ، دہلی، میرٹھ، شاہ[جہاں پور] وغیرہ جیسے دور دراز شہروں میں اس کے اجلاس منعقد کیے گئے [ج]ن سے ملک کے کونے کونے میں اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

دوسری اہم اور کارگر ترکیب یہ اختیار کی جاتی کہ ان اجلاسوں کی صدارت کے لیے ملک و قوم کی نامور اور با اثر شخصیات کا انتخاب کیا جاتا جس سے کانفرنس کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا اور اس کے وقار میں چار چاند لگ جاتے۔ چنانچہ جن حضرات نے منصبِ صدارت کو اعزاز بخشا اُن میں مولوی سمیع اللہ، نواب اسحاق خاں، محسن الملک، عماد الملک، جسٹس شاہ دین ہمایوں، سر آغا خاں، بدر الدین طیب جی، سر تھیوڈر ماریسن، مولانا حالی، مہاراجہ محمود آباد، عبداللہ یوسف علی، میاں محمد شفیع، ابراہیم رحمت اللہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر عبدالقادر، سر راس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، نواب زادہ لیاقت علی خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ جیسی نادر روزگار شخصیات کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ کسی بھی تحریک سے ان حضرات کی وابستگی اُس کی کامیابی کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ ان اجلاسوں کا اہتمام بڑے پیمانے پر کیا جاتا۔ خود سر سید کا یہ عالم تھا کہ جس شہر میں اجلاس منعقد ہوتا، وہ کافی پہلے سے وہاں پہنچ جاتے اور تمام انتظامات کی نگرانی خود کرتے۔

کانفرنس میں جو صدارتی خطبے پڑھے جاتے، وہ بھی کئی حیثیتوں سے اہم ہوتے۔ ان میں صاحبِ خطبہ کی مکمل شخصیت ابھر کر سامنے آتی۔ وہ اس کے خیالات، نظریات اور جذبات کا آئینہ دار ہوتا۔ یہ خیالات قوم کے کاموں میں اُس کی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ ہوتے۔ جن سے قوم کو صحیح سمت رہنمائی ہوتی۔ ان کے علاوہ دیگر عمائدِ ملک بھی ان اجلاسوں میں شرکت کرتے، کارروائیوں میں حصّہ لیتے، مقالے پیش کرتے، نظمیں پڑھتے اور اس طرح اپنے خیالات سے دوسروں کو مستفید کرتے۔ ان کی معرفت تعلیمی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت کے علاوہ ان اجلاسوں کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہو گئی۔ ان کی افادیت واضح کرتے ہوئے نجم الہند سردار محمد حیات خاں نے پانچویں اجلاس [۱۸۹۰ء] منعقدہ الہ آباد میں اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا:

"صاحبان! ہم کو آپ کو اس تعلیمی کانفرنس سے جن برکتوں کی توقع ہے، اور جو مفاد ہم کو حاصل ہوتے ہیں، ان میں سے یہ فائدہ کچھ کم قابلِ قدر نہیں جو ہر سال ہماری قوم کے علماء اور فضلا کے قیمتی لکچروں اور قومی مضامین کی تحریروں سے حاصل ہوتا ہے، جو اس میٹنگ میں پڑھے جاتے ہیں۔ پچھلے سالوں میں ہمارے لائق پروفیسر مولوی محمد شبلی صاحب اور مولوی نذیر احمد صاحب اور مولوی الطاف حسین صاحب حالی کی بیش بہا تحریروں سے قوم متمتع ہوئی ہے اور اس سال کے اجلاس میں جو بات نہایت خوشی اور بے انتہا مسرت بخشنے والی ہے وہ ہمارے جلیل القدر اور فاضل بے بدل نواب محسن الملک، محسن الدولہ منیر نواز جنگ بہادر مولوی سید مہدی علی صاحب کی شمولیت ہے [جو ہر ایک مسلمان کا فرض ہے] اور اپنے بے نظیر علم و فضل سے قوم کو فائدہ بخشنے کے لیے تیار ہیں۔ نواب صاحب کی کوئی تحریر یا تقریر سننے کے لیے قوم کے اشتیاق کی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی۔"

ابتدا میں کانفرنس کا دائرۂ عمل محدود تھا۔ اس کے اجلاسوں واحد موضوع مسلمانوں میں جدید تعلیم کی تبلیغ کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ ان میں مقالے پیش کیے جاتے یا تقریریں کی جاتیں ان کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کو واضح کرنا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہوتا۔ لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اور حالات بدلتے گئے، اسی کے ساتھ مسلم قوم کے مسائل بھی مختلف النوع ہوتے گئے۔ اسی کے لحاظ سے کانفرنس کا دائرہ عمل بھی وسیع ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر جو چار روزہ اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا، اس کو بارہ مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر شعبہ کا صدر اور سکریٹری علیحدہ مقرر ہوا تھا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے:

	شعبہ	عہدہ	نام
۱۔	شعبۂ ابتدائی تعلیم و مدارسِ اردو	صدر	سید آل علی نقوی۔ انسپکٹر مدارسِ اسلامی صوبجات متحدہ
		سکریٹری	سید اسد اللہ۔ اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز۔
۲	شعبۂ ثانوی تعلیم	صدر	ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
		سکریٹری	خواجہ غلام السیدین
۳۔	شعبۂ اعلیٰ تعلیم	صدر	عبداللہ یوسف علی۔
		سکریٹری	پروفیسر محمد حبیب
۴	شعبۂ تعلیم نسواں	صدر	شیخ عبداللہ ربانی ویمنس کالج علی گڑھ

سکریٹری۔ سید ہادی حسن

شعبۂ مدارسِ اسلامی — صدر: مولانا حسین احمد مدنی
سکریٹری: ابوبکر محمد شیث

شعبۂ لٹریسی و تعلیم بالغان — صدر: طفیل احمد منگلوری۔
سکریٹری: تجمل حسین

شعبۂ معاشیات و اصلاح معاشرت — صدر: محمد الیاس برنی
سکریٹری: شیخ عطاء اللہ

شعبۂ اردو یا اردو کانفرنس — صدر: مولوی عبدالحق
سکریٹری: رشید احمد صدیقی۔

شعبۂ پریس کانفرنس — صدر: (۱) مولوی بشیر الدین و ایڈیٹر البشیر اٹاوہ]
(۲) منشی دیانرائن نگم و ایڈیٹر زمانہ کانپور]
سکریٹری: (۱) محمد اکرام اللہ خاں ندوی
(۲) نظام الدین نظامی (ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں]

۱۰ شعبۂ ٹیکنیکل تعلیم — صدر: ڈاکٹر اے۔جی۔خان۔ ڈپٹی ڈائرکٹر اسٹورز۔ دہلی۔
سکریٹری: (۱) ڈاکٹر رفیق احمد
(۲) عبیداللہ درانی

۱۱ شعبۂ اسلامی علوم و فنون — صدر: سید سلیمان ندوی
سکریٹری: امیر حسن صدیقی

۱۲ شعبۂ تعلیمی نمائش — صدر: کرنل آر۔ایس ویبر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم۔ صوبجات متحدہ
سکریٹری: ڈاکٹر عبدالرحمٰن

اس طرح کانفرنس نے محض تعلیمی مسائل سے گزر کر زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانانِ ہند کی قیادت کا بار سنبھالا۔ خصوصاً اصلاح معاشرہ اور اردو زبان کے تحفظ کے سلسلہ میں اس کی سرگرمیاں وسیع پیمانے پر ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ مسلم ثقافت کی بازیافت اور اس کی بہترین روایات کی تجدید بھی اکابر کانفرنس کی توجہ کے مرکز بنے رہے۔ اردو زبان و ادب کی خدمات کے سلسلہ میں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انجمن ترقی اردو، جس نے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں سرگرم اور فعال ہے، اسی کانفرنس کے بطن سے پیدا ہوئی۔

اگرچہ آج کل یہ کانفرنس اتنی فعال اور سرگرم نہیں ہے جتنی ۱۹۴۰ء سے قبل تھی۔ تاہم اس کی اہمیت کو آج بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آزادی سے قبل ملک و قوم کے لیے اس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس کا سب سے بڑا اور اہم کام سرسید کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھانا تھا۔ اس میں بڑی حد تک اس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے مسلمانوں پر جدید تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا اور ان کے دلوں سے تمام شکوک و شبہات کو نہ صرف رفع کیا بلکہ ان کے دلوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے کا شوق بھی پیدا کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے قدیم اور جدید دونوں مکاتبِ فکر کے اکابر و عمائد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ چنانچہ اس کے پلیٹ فارم پر جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، علامہ سید سلیمان ندوی، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابوبکر شیث اور مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے علماء و مشایخ نظر آتے ہیں، وہیں سرسید اور ان کے رفقاء کے علاوہ سر آغا خاں، بدرالدین طیب جی، مہاراجہ محمود آباد، میاں محمد شفیع، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر راس مسعود، سر عبدالقادر، ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے رہنمایانِ قوم بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کانفرنس کو غیر معمولی کامیابی اس لیے نصیب ہوئی کہ اس کو دونوں مکاتبِ فکر کے اکابر کا تعاون حاصل رہا۔ یہ اجتماعِ ضدین حقیقت میں قران سعدین ثابت ہوا جو دلچسپ بھی تھا اور فال نیک بھی۔

کانفرنس نے بہت سے ٹھوس اور عملی اقدامات کیے جس سے نونہالانِ وطن کو بہت فائدہ ہوا۔ اس نے بہت سے نادار اور ضرورت مند طلباء کو وظیفے دیے۔ اس مد میں اس نے لاکھوں روپے صرف کیے اور ہزاروں طلباء کی مالی اعانت کرکے ان کی مشکلات دور کیں۔ وظائف کے علاوہ زیادہ مستحق طلبا کو درسی کتب بھی فراہم کیں۔ لیکن اس نے صرف طلباء کی امداد پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ مدارس اور مکاتب تک اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کیا اور ایسے بہت سے مدرسوں کی خدمت کی جو معاشی مشکلات سے دوچار ہو رہے تھے۔

کانفرنس نے پیشہ ورانہ تعلیم پر بھی توجہ دی اور طلبہ کو ایسی تعلیم کی طرف رغبت دلائی جس کو حاصل کرکے وہ اپنی روزی کا انتظام خود کرسکیں، محض ملازمت پر ہی انحصار نہ کریں بلکہ اپنا نجی کام کرنے کے قابل ہوجائیں۔ اس طرح اس

بڑی خوش اسلوبی سے اس تنقید کا جواب دیا کہ مُسلم یونیورسٹی کا کام صرف
[illegible]تری کلرک پیدا کرنا ہے۔

کانفرنس نے ہر مرحلہ پر مذہبی اقدار کو برقرار رکھنے اور اخلاقیات کو
[illegible]م رکھنے پر زور دیا۔ اس نے اس ہی قسم کی تعلیم کی تبلیغ کی جس کو حاصل کرکے
[illegible]ہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے روشناس ہوں۔ یہی وہ راہِ عمل تھی جس کو
[illegible]فرنس نے روزِ اوّل سے ہی اختیار کرلیا تھا اور جس کی وضاحت نواب
[illegible]ن الملک نے اس کے دسویں اجلاس [۱۸۹۵ء] منعقدہ شاہجہاں پور
[illegible]ں اپنے مخصوص پُرزور اور پُراثر انداز میں اس طرح کی تھی:

" صاحبو! ہمارا ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ ہم انگریزوں کی
کورانہ تقلید کریں، اپنے بچّوں کو صرف وہ تعلیم دلائیں جو
فقط دنیا کے لیے مفید ہو اور جس سے وہ صرف گورنمنٹ
کی ملازمت کے لایق ہوجائیں بلکہ ہمارا مقصد اس سے ارفع
و اعلیٰ ہے۔ ہم اِس قسم کی تعلیم کو ہرگز تعلیم بھی نہیں کہہ
سکتے۔ ہمارے نزدیک تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ اس
سے چند پیشوں کے کام کرنے کی لیاقت حاصل ہو، بلکہ تعلیم
کا مقصود یہ ہے کہ تمام قوتیں جو خدا نے انسان میں رکھی ہیں
وہ نمو پائیں اور نہ صرف انھیں قوتوں کو نمو دیا جائے، جو
ہماری جسمانی آسائش کے کام آئیں بلکہ روحانی قوتوں
کا کام میں لانا، اور دماغ کو غذا پہنچانا تعلیم کا اصلی مقصود
ہے۔ بلاشبہ اس قسم کی تعلیم جس سے ہم معاش پیدا کرنے
کے لایق ہوں، ضروری ہے اور ہماری دنیاوی لذت دور
ہونے کے لیے اس کا سیکھنا بھی لازم ہے۔ لیکن اس کے
علاوہ ہم وہ تعلیم بھی چاہتے ہیں کہ جس سے ان کے دل و دماغ
روشن ہوں اور علم کو علم کے لیے حاصل کریں اور علاوہ
جسمانی آسائش کے، جو فنا ہونے والی ہے، ان چیزوں کو
بھی حاصل کریں جو ان کی روحانی راحت کے لیے، جو کہ
ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، کام آوے۔ ان میں سچی ہمدردی
اور کامل انسانیت پیدا ہو۔ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ
اعلیٰ اور زیادہ پاک ہو اور جس طرح ہمارے بزرگوں نے
علم کو علم کے لیے حاصل کیا اور ہمارے لیے وہ اپنے دل و
دماغ کو ترکہ چھوڑ گئے، اسی طرح ہم بھی علم کو علم کے لیے حاصل
کریں اور اپنے بزرگوں کے ترکہ میں جو کچھ بڑھا کر آئندہ آنے
والی نسلوں کے لیے چھوڑ جائیں، اس کے لیے ہم چاہتے ہیں کہ
ہمارے بچّے دینی علوم بھی سیکھیں اور عقلی علوم کی بھی
تحصیل کریں۔"

کانفرنس کی ہمہ جہتی خدمات کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے تصنیف
و تالیف اور نشر و اشاعت کی طرف بھی خصوصی توجہ دی اور مختلف موضوعات
پر متعدد مفید کتابیں شایع کیں۔ ان میں سوانح، معاشیات، اسلامیات،
سماجیات، لسانیات اور تاریخ و ادب جیسے اہم موضوعات پر کتابیں شامل
ہیں۔ ان مطبوعات کی فہرست کافی طویل ہے۔ جن میں سے چند اہم درجِ ذیل
کی جاتی ہیں:

۱۔ یادِ ایام از حکیم سید عبدالحی [۱۹۱۹ء]
۲۔ وقارِ حیات از اکرام اللہ ندوی [۱۹۲۵ء]
۳۔ گنجِ سلیمانی از مظفر حسین خاں سُلیمانی [۱۹۲۷ء]
۴۔ ذکرِ مبارک از بیگم بھوپال [۱۹۲۷ء]
۵۔ خطباتِ عالیہ [۳ حصے] مرتبہ انوار احمد زبیری [۲۸-۱۹۲۷ء]
۶۔ صولتِ شیر شاہی از سیّد احمد مرتضیٰ نظر قبعی [۱۹۳۴ء]
۷۔ حیاتِ محسن از محمد امین زبیری [۱۹۳۴ء]
۸۔ مرقعِ کانفرنس از انوار احمد زبیری [۱۹۳۵ء]
۹۔ ھمایوں نامہ؛ مترجمہ عثمان حیدر مرزا و وحید مرزا [۱۹۳۵ء]
۱۰۔ خطباتِ صدارت پنجاہ سالہ جوبلی [۱۹۳۸ء]
۱۱۔ اللغۃ والامثال مولفہ محمد فضل قدیر ظفر ندوی [۱۹۴۰ء]
۱۲۔ التربیت والتعلیم [عربی متن مع اردو ترجمہ] از علامہ رشید رضا [ب ت]
۱۳۔ اِسلامی عقائد از مولانا سعید احمد اکبرآبادی [۱۹۶۱ء]

★ ★ ★

جس طرح ایک چھوٹے سے دیے کی روشنی بہت دور تک
پھیلتی ہے اسی طرح اس بری دنیا میں بھلائی دور تک چمکتی ہے۔
—— شیکسپیر

صبیح محسن

تقریبِ رُونمائی

ایک زمانہ تھا کہ کتابیں دوسروں کی فرمائش پر لکھی جاتی تھیں عموماً ناشر کی فرمائش پر۔ ہم نے بچپن میں جو کتابیں پڑھی تھیں ان میں سے اکثر کے سرورق پر کچھ اس طرح کی عبارت ضرور لکھی ہوتی تھی: حسبِ فرمائش منشی نول کشور مالک مطبع ہٰذا، اور کہیں کہیں تو 'حسب الفرمائش' بھی لکھا ہوتا تھا۔ اس سے غالباً فرمائش کی شدت کا اظہار مقصود ہوتا ہوگا۔

معلوم نہیں اب ایسے باذوق اور ادب پرور ناشر کہاں گئے؟

ناشروں کی بات تو خیر چھوڑیے کہ ان بے چاروں کو تو فرمائش کرکے پھر بھگتنا بھی پڑتا تھا۔ یعنی اس سستے دور میں بھی ہزار دو ہزار کا جوا کھیل جانا پڑتا تھا۔ اب تو وہ یارانِ طریقت بھی عنقا ہوگئے ہیں جو اپنے اہلِ قلم دوستوں سے فرمائش اور اصرار پر اصرار کرکے 'رضیہ کی آپ بیتی عرف جلتی جوانی' جیسے معرکۃ الآرا ناول لکھوایا کرتے تھے۔

اُس دور کی کتابیں اُٹھا کر دیکھیے تو ایسا لگتا ہے کہ جس طرح مشاعروں میں شاعر داد کے بغیر شعر نہیں سنا سکتا، اسی طرح مصنف اپنے کسی مربی، دوست یا پبلشر کی فرمائش کے بغیر قلم نہیں اُٹھا سکتا۔ ادبی تحقیق کی طرف تو ہم نے کبھی رخ ہی نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ میدان ہمارے مشفق دیرینہ جناب مشفق خواجہ کا ہے، لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ایک مدت سے جو ہم یہ نعرہ مسلسل سنتے چلے آئے ہیں کہ ادب جمود کا شکار ہے تو اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ اچھے افسانہ نگار، ناول نویس اور شاعر پیدا ہی نہیں ہو رہے تھے اور خدانخواستہ یہ بھی نہیں تھا کہ بڑے ادب کی تخلیق کے راستے میں کسی طرح کی کوئی اور رکاوٹ حائل ہوگئی تھی۔ بس فرمائش کرکے لکھوانے والے ناشر اور زور دے کر چھپوانے والے دوست یا سرپرست باقی نہیں رہے تھے۔

نام نہاد ادبی جمود یا یوں کہیے کہ ناقدری کے اُس دور میں ہم نے کتنے ہی نثر گو شعراء کو دیکھا کہ انھوں نے بڑی محنت سے اپنا دیوان ترتیب دیا۔ پھر اس کو برسوں سرہانے رکھ کر سوتے رہے۔ لیکن افسوس کہ کوئی صاحبِ بصیرت ناشر نہ مل سکا۔ جو ان کے کلام کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگاتا اور پھر اس کو زیورِ طبع سے آراستہ کرتا۔ مزید افسوس یہ کہ ان کے مسودے بھی باقی نہ رہے۔ ان کو ردّی کاغذ سمجھ کر یا تو بچوں نے ناؤ بنا بنا کر پانی میں بہا دیا یا بیگم صاحب نے ردّی پیپر والے کے حوالے کر دیا کہ وہ ناسمجھ تھے تو یہ ناقص العقل۔ اگر کسی طرح یہ مسودے ہی محفوظ رہ جاتے تو بھی کم از کم یہ امید تو کی جا سکتی تھی کہ ان شعرائے باکمال کے انتقالِ پُر ملال کے سو پچاس برس بعد شاید کوئی محقق یا پی ایچ ڈی کی ڈگری کا خواہش مند انھیں ڈھونڈ نکالتا اور پھر حضرت معصوم تمنائی کے دیوان کا نسخہ' لالوکھیت' یا 'دیوانِ کلیجہ کا نسخہ' اورنگی ٹاؤن' کے عنوان سے ان پر مقالے لکھتا جن میں موصوف کے کلام کے شعری محاسن گنوائے جاتے، ان کے سماجی شعور کا تذکرہ ہوتا، روایت سے ان کی بغاوت کو سراہا جاتا اور آخر میں میر و غالب کے کلام سے ان کے کلام کا موازنہ کیا جاتا۔

لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب نہ شاعروں کو اپنے دیوان کا مسودہ سرہانے رکھ کر سونے کی ضرورت ہے اور نہ افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کو اپنے شاہکار قلمی نسخوں کی شکل میں سینے سے لگائے پھرنے کی۔ ادب کے فروغ اور کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک نیا راستہ نکل آیا ہے۔ کوئی اسے تقریبِ رونمائی یا چہرہ نمائی کہتا ہے تو کوئی تعارفی تقریب۔ لیکن اسے جس نام سے بھی پکاریں اس تقریب کا لازمی جزو ایک کتابچہ ہوتا ہے جسے ادب واحترام کی خاطر اس کے انگریزی نام 'سووینیر' سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کتابچے میں صاحبِ کتاب کے بارے میں نقادانِ ادب کی گرانقدر آراء کے ساتھ ساتھ تجارتی اداروں کے اشتہارات

ہوتے ہیں۔" اگر اوّل الذکر مصنف کی کاوش کو ادب عالیہ میں جگہ دلوانے کی
ضامن ہوتی ہیں تو موخر الذکر اس کی اس کوشش کو کتابی صورت دلانے کے
ذمہ دار۔

تقریبات رونمائی بلکہ سچ پوچھیے تو اس اشتہاری کتابچے کی
بدولت گلستانِ ادب کی گئی ہوئی بہار پھر لوٹ آئی ہے۔ کوئی دن ایسا
نہیں جاتا کہ جب کسی نئے شعری مجموعے یا نثری شاہکار کی اشاعت کا مژدہ
سننے میں نہ آتا ہو۔ اور شاید ہی کوئی ایسی شام گزرتی ہو جس میں کسی کتاب
کی رونمائی کی تقریب کا اہتمام نہ ہوتا ہو۔ ادب میں جمود ختم ہو چکا ہے
ہمیں تو پورا یقین ہے کہ ادب کی تاریخ میں یہ زمانہ سنہرے دور کے
سے یاد کیا جائے گا۔

لیکن اعتراض کرنے والے کہاں نہیں ہوتے؟ کچھ لوگ تقریبات
رونمائی جیسی ادب پرور سرگرمی پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔ خصوصاً
اشتہاری کتابچے پر۔ ایک بہت بڑے ادیب بلکہ ادیب گر تو رونمائی
ان تقریبات میں شرکت ہی نہیں کرتے جن میں اشتہاری کتابچے تقسیم
ہوتے ہوں۔ ہم یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اعتراض کی اصل وجہ کیا ہے
گمانِ غالب یہی ہے کہ کسی اہل قلم کے لیے اشتہارات کی خاطر دربدر پھرنا
معترضین کے نزدیک باعثِ ننگ ٹھہرتا ہے۔

اگر بات یہی ہے تو کچھ ایسی غلطیاں نہیں کہ ہمیں خود صاحبانِ قلم کا
صاحبانِ ثروت کے آگے یوں دامن پھیلانا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اس کو کیا
کریں کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے۔ یہ روایت تو ادب کی قدیم ترین روایتوں
میں سے ایک ہے۔ آخر گئے وقتوں میں بھی تو استادانِ سخن بادشاہوں
ان کے درباروں اور امراء و رؤسا کی بیٹھکوں میں حاضری دے کر
ان کی شان میں قصیدے کہہ کر خلعتیں، وظیفے اور انعامات و اکرامات
پاتے رہے ہیں۔ آج کے دور میں نہ بادشاہ رہے اور نہ نواب۔ حد یہ ہے کہ
تصنیف کر کے لکھوانے والے ناشر تو کجا، خوشامد کروا کر چھاپنے والے
بھی نصیب والوں ہی کے ہاتھ آتے ہیں۔ تو پھر اس دور کے قلم کار کے
لیے تجارتی اداروں کے شعبۂ اشتہارات اور اشتہاری ایجنسیوں کی ڈیوڑھیوں
کے سوا اور کون سے دَر کھلے رہ گئے ہیں۔

ویسے ان آستانوں پر حاضری دینا اور اپنی حاجت روائی کروا لینا
کوئی آسان مرحلہ نہیں ہوتا۔ تجارتی اداروں اور اشتہاری ایجنسیوں
میں نہ تو شاہی درباروں کی داد و دہش والا سماں ہوتا ہے اور نہ پشتینی
رئیسوں جیسی وضعداری کہ چاہے حال اندر سے کتنا پتلا ہی کیوں نہ ہو
دستِ سوال دراز کرنے والے کو بھی مایوس نہ لوٹاتے تھے۔ یہ ادارے
بہرحال تجارتی ادارے ہیں اور ادب کی سرپرستی کرتے ہوئے بھی تجارت
کے اصولوں کو یکسر نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ان سے کسی قسم کی مالی اعانت
حاصل کرنا دل گردے کا کام ہے۔ یا دورِ حاضر کی اصطلاح میں یوں کہیے
کہ وسیع اور موثر پی۔ آر اور رکھنے والوں کا ہی کام ہے۔

لیکن آج کل کے شاعر و افسانہ نگار بھی میر تقی میرؔ تو ہیں نہیں کہ
برس دن گزر جائیں اور کمرے کی کھڑکی کھول کر یہ دیکھنے کی زحمت بھی
گوارا نہ کریں کہ باہر کی طرف ہے کیا۔ طبیعتوں میں فرق تو ہوتا ہے مگر ہم
نے بیشتر شعراء اور ادباء کو دیکھا ہے کہ بے خودی اور سرشاری اپنی جگہ لیکن
دیوانہ بکار خویش فرزانوں سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے ہمیں ایک ایسے شاعر سے نیاز حاصل ہوا جن کا
نام آج کی شاعری میں بڑا معتبر سمجھا جاتا ہے۔ موصوف پر ایک عجیب مدہوشی
اور بے خبری کی کیفیت دیکھی۔ بات کرو کھیت کی تو جواب ملے کھلیان کا۔
ذکر کرو ایران کا تو وہ سمجھیں توران کا۔ ہم نے دل میں سوچا کہ ان کے اہل خانہ
کا تو خدا ہی حافظ ہو گا۔ لیکن دو چار ملاقاتوں میں جب وہ کھلے تو پتہ چلا کہ
یہ سرمستی تو ضرورتِ شعری کے تحت تھی۔ ورنہ ان سے بڑھ کر زمانہ شناس
اور دور اندیش کون ہو گا کہ اپنی شاعرانہ حیثیت کے ناطے سے صاحبانِ اقتدار
کے ساتھ راہ و رسم بڑھا کر گلشن میں ہزار گز کا قطعۂ زمین الاٹ کروا یا۔ پھر
ایک رقمِ خطیر بطور قرضہ حاصل کر کے مکان بنوایا۔ جس کے ایک حصے میں خود
رہتے ہیں اور دوسرا کرائے پر اُٹھا رکھا ہے صرف یہی نہیں بلکہ کارپوریشن
سے ایک موقعے کی دکان بھی الاٹ کروا لی ہے جس پر ان کا فرزند دلبند بیٹھتا
ہے۔ ہم نے ان کے گھر میں وہ سارا ساز و سامان دیکھا جو انسان نے اپنی
آسائش کے لیے بنایا ہے۔ اور وہ ساری نعمتیں بھی جو اللہ تعالٰی نے انسان
کے لیے پیدا کی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خود موصوف کو اب بھی اپنے اشعار
میں گھر دیکھ کر دشت یاد آتا ہے۔

نوجوان شعراء بھی اس معاملے میں کچھ کم نہیں۔ ہمارے ایک عزیز ہیں
انھیں اپنی دختر نیک اختر کے لیے ایک اچھے سے رشتے کی تلاش تھی۔ ایک
صاحب نے ایک صاحبزادے کا تذکرہ کیا کہ بڑا ہی نیک طینت و نیک صورت

ہے۔ لیکن آج کل تو ان تمام نیکیوں سے زیادہ اہمیت کسی اور چیز کی ہوتی
ہے۔ چنانچہ لڑکی کے والدِ ماجد نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "آمدنی کتنی ہے؟"

"اچھی خاصی آمدنی ہے"۔ رشتہ بنانے والے صاحب بولے۔

اب قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔ کسٹم میں کام کرتا ہوگا؟ بینک
میں ملازم ہوگا؟ نہیں؟ تو پھر دبئی یا مسقط میں رہتا ہوگا۔

لیکن رشتہ بتلانے والے صاحب ہر بات کا جواب نفی میں دیتے رہے
آخر جب سسپنس خاصہ طول کھینچ گیا تو وہ صاحب مسکرا کر بولے:

"شاعر ہے!"

لڑکی کے والدِ بزرگوار نے ان صاحب کو گھور کر دیکھا۔ پھر لڑکی کی
والدہ ماجدہ شکست خوردہ لہجے میں بولیں "کیوں مذاق کرتے ہو میاں"
شاعری کرتا ہے تو بیوی بچوں کو کھلائے گا کہاں سے؟"

لیکن ان صاحب کا بیان تھا کہ لڑکے کی آمدنی تقریباً پچاس ہزار
سالانہ یعنی کوئی چار ہزار ماہانہ ہے۔ یہ آمدنی بُری تو نہیں۔

"تو کیا فلموں کے لیے گیت لکھتا ہے"۔ لڑکی کے والد نے پوچھا

"جی نہیں۔ ٹھیٹھ ادبی شاعری کرتا ہے"۔

"ٹیلی ویژن کے لیے ترانے لکھتا ہوگا"۔

"کبھی کبھی"۔

"شاعری کے ساتھ کوئی اور ملازمت بھی کرتا ہوگا"۔

"جی نہیں۔ کل وقتی شاعر ہے"۔

سسپنس دوبارہ طول کھینچتا نظر آرہا تھا اس لیے ان صاحب
نے بات کو مختصر کرتے ہوئے بتایا کہ ہر سال اس کا ایک مجموعۂ کلام شایع
ہوتا ہے۔ پھر اس مجموعۂ کلام کی تقریبِ رونمائی ہوتی ہے۔ اس موقع
پر ایک کتابچہ بھی جاری کیا جاتا ہے۔ لڑکا چونکہ شاعر ہونے کے ساتھ
ساتھ ہشیار بھی ہے۔ اس لیے کتابچے کے لیے پچاس ہزار سے زیادہ کے
ہی اشتہارات مل جاتے ہیں۔

ویسے ہم تو یہ کہیں گے کہ پچاس ہزار کیا ایک پیسے کی آمدنی بھی نہ
ہو تو بھی ایک کتاب کی تقریبِ رونمائی میں صاحبِ کتاب کی جو ڈھیروں
تعریف و توصیف ہوتی ہے وہ خود اس کو تو سال بھر تک بغیر کھائے پیے بھی
زندہ و سلامت رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ البتہ اس کے اہل و عیال کے
بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ہمارا دور اسپیشلائزیشن کا دور ہے جب تقریبِ رونمائی کا چلن عام ہوا
اور اس کے لوازمات کی مانگ بڑھنے لگی تو لوگوں نے ان میں بھی اسپیشلائز کرنا
شروع کردیا۔ ہمارے شہر میں اس قسم کی تقریبات کی صدارت کے کئی اسپیشلسٹ
ہیں۔ ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ سب خاصے کہن سال ہیں۔ ان میں
سے کچھ کا تعلق تدریس کے شعبے سے رہا ہے اور کچھ اپنے زمانے کے معروف
تنقید نگار ہیں۔ ویسے تو مسندِ صدارت پر ان بزرگوں کی اجارہ داری ایک
امرِ مسلّمہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی جب شہر میں کسی اہم کرسی پر کوئی ایسا اعلیٰ سرکاری
افسر متمکن ہوجاتا ہے جس کے بارے میں یہ خبر اُڑ جاتی ہے یا بعض اوقات
جس پر یہ تہمت لگادی جاتی ہے کہ حضورِ پرنور بھی ادب سے کسی نہ کسی نوع
کا علاقہ رکھتے ہیں تو پھر ان بیچارے اسپیشلسٹوں کی کرسیِ صدارت خطرے
میں پڑ جاتی ہے کہ سرکاری افسر کے مقابلے میں بڑے بڑے نکتہ شناسِ سخن اور
غواصِ معنیٰ کی صدارت ہیچ سمجھی جاتی ہے۔

تقریبِ رونمائی میں تقریر کرنا بھی اپنی جگہ ایک الگ فن ہے۔ ہمارے
شہر میں اس طرح کے اسپیشلسٹوں کی تعداد مشکل سے نصف درجن ہوگی۔ رونمائی
شعری مجموعے کی ہو، افسانوں کی کتاب کی ہو یا ناول کی، مقررین کی فہرست
میں آپ کو ان ہی ماہرین کے اسمائے گرامی ملیں گے۔ ان میں شعبے البتہ
بٹے ہوئے ہیں۔ کچھ تو صاحبِ کتاب کی تحریروں پر ادبی نقطۂ نظر سے ایک نظر
ڈالنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اور کچھ مصنف کی شخصیت اور اس سے اپنے ذاتی
مراسم کو شگفتہ انداز میں بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ جس طرح تھیٹر کے
کھیلوں میں یا فلموں میں عموماً دو چار سنجیدہ مناظر کے بوجھل پن کو کم کرنے
کے لیے ایک مزاحیہ سین ضرور رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح تقریبِ رونمائی میں بھی
اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے کہ جب حاضرین صاحبِ کتاب کے ادبی
کارناموں کا ذکر سن سن کر جماہیاں لینی شروع کردیں تو شگفتہ بیان مقرر
زبان و بیان کی پھلجھڑیاں چھوڑ کر فضا کو بوجھل بننے سے بچالے۔

آج کل تقریباً سارے اخبارات میں ادبی صفحہ نہیں تو کم از کم ایک ادبی
کالم ضرور چھپتا ہے۔ اس ادبی صفحے یا کالم کا بیشتر حصہ تقریباتِ رونمائی کا
مرہونِ منت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ان ہی کی روئیداد اور تصویروں پر
مشتمل ہوتا ہے۔ صاحبِ کتاب ان کالموں کے تراشے بہت سنبھال سنبھال کر
رکھتا ہے کہ یہی اس کی ادبی زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ تقریبِ رونمائی سے بہتوں کا بھلا ہوتا ہے۔ مصنف کی کتاب

چھپ جاتی ہے۔ مقررین کو اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے اور آئے دن اخبارات کے کالموں میں جگہ پانے کا زریں موقع فراہم ہو جاتا ہے اور ادبی کالم نویسوں کو اپنے کالموں کے لیے خوب خوب مواد مل جاتا ہے۔

نقصان اگر کسی کا ہوا ہے تو وہ ہیں قارئینِ کرام۔ جب سے تقریبِ رونمائی کا نسخہ ہاتھ لگا ہے تب سے ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کر ڈالی ہے۔ وہ بھی جن کا املا تک درست نہیں تھوڑی سی ہمت کر کے صاحبِ کتاب بن گئے ہیں۔ جہاں کچھ اچھی کتابیں چھپی ہیں وہاں ایک دفترِ بے معنیٰ کا انبار بھی لگ گیا ہے اور بیچارہ قاری حیران و پریشان ہے کہ کیا پڑھے اور کیا نہ پڑھے۔

تقریبِ رونمائی کے اس نسخۂ لاجواب و بے تمثال کو یوں بکثرت استعمال ہوتا دیکھ کر ہم نے بھی جی میں یہ ٹھانی ہے کہ اپنی ان تحریروں کو جو گزشتہ ربع صدی کے دوران ہم نے اپنی بساط کے مطابق بڑی خوش سلیقگی سے جگر خوں کر کر کے تخلیق کی ہیں، یکجا کریں اور کتابی صورت میں شایع کریں۔ ہم بھی اس مقصد کے لیے یہی نسخہ آزمائیں گے۔ گزارش ہے کہ اس کی تقریبِ رونمائی میں شرکت کر کے ہمیں شکریے کا موقع ضرور دیجیے۔ ★★

کالج کا قومی لباس

مولوی عبدالحق بہت کم گو انسان تھے۔ خود نمائی تو انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک واقعہ سپردِ قلم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بات ہی ایسی ہے کہ اس پر وہ جتنا ناز کرتے، کم تھا۔ قیامِ کالج کے بعد ہی سے سر سید کو یہ خیال تھا کہ کالج کا قومی لباس ہونا ضروری ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ ترکی ٹوپی، ترکی وضع کا کوٹ، پتلون اور پمپ شو کالج کا یونی فارم ہو۔ انھوں نے کانپور کی کسی کمپنی سے گہرے نیلے رنگ کی سرج کا ایک تھان منگایا اور اس کے تین کوٹ سلوائے۔ ایک اپنے لیے، ایک اپنے چھوٹے پوتے راس مسعود کے لیے اور ایک عبدالحق کے لیے۔ سید محمود نے شکایت کی کہ "آپ ہمیں بھول گئے"، تو انھوں نے جواب دیا کہ "چوتھے کوٹ کی گنجایش نہ تھی"!

کالے کپڑے کے ٹکڑوں پر کلابتوں سے "مدرسۃ العلوم" وہ دہلی سے کڑھوا کر لائے تھے۔ بند گلے کے کوٹ پر یہ اس طرح ٹانکا گیا تھا کہ "مدرسۃ" ایک کالر پر اور "العلوم" دوسرے کالر پر تھا۔ کالر کا ہک لگتے ہی "مدرسۃ العلوم" پیش نظر ہو جاتا تھا۔ جب کوٹ تیار ہو کے آیا تو عبدالحق اس وقت سید محمود کے کمرے میں تھے۔ انھیں بلایا گیا۔ درزی انھیں کوٹ پہنا چکا، تو سید صاحب جھٹ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے، عبدالحق کو سلام کیا اور بولے "تم میری ہو"۔ جس کے نصیب ایسے ہوں، وہ اس پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے۔ یہ سلام دراصل کالج کے یونی فارم کو تھا۔ عبدالحق صاحب کا کوٹ خواہ مخواہ نہیں تیار ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ لباس پہن کر کالج کے طالب علموں کو دکھائیں اور پوچھیں کہ کالج کے لیے یہ قومی لباس انھیں پسند ہے کہ نہیں! دو کے سوا کالج کے سب ہی طالب علموں نے اسے پسند کیا اور آخر کار یہ کالج کا یونی فارم طے پا گیا۔ ★★ (پروفیسر مختار الدین احمد)

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

مندرجہ ذیل کام کے لیے سربمہر ٹینڈر شرح فی صد کی بنیاد پر ۵ اپریل ۸۴ء کو دوپہر ایک بجے تک مطلوب ہیں۔ ٹینڈر اسی دن سہ پہر ساڑھے تین بجے کھولے جائیں گے۔ ٹینڈر سے متعلق جملہ کاغذات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے کسی بھی دن دفتری اوقات میں حاصل کیے جا سکتے ہیں

ٹینڈر موصول ہونے کی آخری تاریخ سے ۲۴ گھنٹہ قبل ٹینڈر کی فروختگی بند ہو جائے گی۔

کام کی نوعیت	ٹینڈر کے لیے مختص رقم	زرضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
طبیہ کالج دواخانہ کی عمارت میں منیجر دواخانہ کے دفتر کی پشت پر کھلے صحن میں چھت پڑنا اور برآمدہ کی تعمیر	26720/-	670	پانچ روپے	چار ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

(یونیورسٹی انجینئر)

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈر شرح فیصد کی بنیاد پر ۵ اپریل ۱۹۸۴ء دوپہر ایک بجے تک مطلوب ہیں۔
ٹینڈر اسی تاریخ کو سہ پہر ساڑھے تین بجے کھولے جائیں گے۔ ٹینڈر سے متعلق فارم و کاغذات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے دفتری اوقات کے دوران حاصل کیے جا سکتے ہیں۔
ٹینڈر موصول ہونے کی آخری تاریخ سے ۲۴ گھنٹہ قبل ٹینڈر فارموں کی فروخت بند کر دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
	یونیورسٹی قبرستان میں گڑھوں کی بھروائی اور روشوں کا بنانا	۳۲۶۹۰-۰۰	۸۲۰ روپے	۵ روپے	۳ ماہ

[دستخط] لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینئر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳ / ۳۵

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ پروفیسر آف جیالوجی :۔ ڈپارٹمنٹ آف جیالوجی۔

شرح تنخواہ :۔ ۱۵۰۰ — ۶۰ — ۱۸۰۰ — ۱۰۰ — ۲۰۰۰ — ۲/۱۲۵ — ۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :- (ا) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس ماسٹر ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد۔

(ب) ڈاکٹریٹ معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام

(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا دس سالہ تجربہ اور ریسرچ کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

۲۔ ریڈر ان جنرل ایجوکیشن ۔ جنرل ایجوکیشن سینٹر۔

۳۔ ریڈر ان فلاسفی۔ ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی

شرح تنخواہ :۔ ۱۲۰۰ — ۵۰ — ۱۳۰۰ — ۶۰ — ۱۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد (ا) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں فرسٹ کلاس یا ہائی سیکنڈ کلاس ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد

(ب) ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام

(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا پانچ سالہ تجربہ اور ریسرچ کی رہنمائی کا قدرے تجربہ۔

پسندیدہ : جنرل ایجوکیشن سینٹر میں ریڈر ان جنرل ایجوکیشن کے لیے ۔ جنرل ایجوکیشن سے متعلق کورسیز کی تدریس کا کم ازکم پانچ سالہ تجربہ

ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی میں ریڈر کی پوسٹ کے لیے مسلم فلاسفی/ ہم عصر مغربی اخلاقیات اور مذہب/

سمبالک لاجک میں تخصص یا اچھی ٹھوس معلومات

۴- لکچررس ان فلاسفی (۲ اسامیاں) (ایک مستقل اور ایک عارضی) ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی

۵- لکچرر ان پولیٹیکل سائنس (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس

۶- لکچرر ان بنگالی۔ ڈپارٹمنٹ آف ہندی
شرح تنخواہ:- ۷۰۰- ۴۰- ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد :- (۱) لازمی
(ا)۔ ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام
فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس کے ساتھ مسلسل اچھا تعلیمی ریکارڈ (سیون پوائنٹ اسکیل میں B) اور
(ب) متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری یا کوئی مساوی غیر ملکی استعداد
ترقی پذیر بین الموضوعاتی پروگراموں کو مدنظر رکھتے ہوئے (۱) اور (ب) کے تحت متعلقہ مضامین میں ڈگری۔
اگر سیلیکشن کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کے تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے بہت اعلیٰ پایہ کا ہے تو (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں کمی کر سکتی ہے۔
مزید آنکہ ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام کا حامل کوئی امیدوار اگر دستیاب نہ ہو یا اہل قرار نہ پائے تو اس صورت میں مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (ایم.فل یا متبادل ڈگری یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کو اہمیت دی جائے گی) کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس نے دو سال تک تحقیق کی ہو یا کسی ریسرچ لیباریٹری/ آرگنائزیشن عملی تجربہ حاصل کیا ہو۔ اور اگر اس کا تقرر اس جگہ پر کر دیا جائے تو اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کرے یا اس کے معیار کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ ناکامی کی صورت میں وہ مستقبل میں اس وقت تک سالانہ انکریمنٹ کا مستحق قرار نہ پائے گا، جب تک وہ ان شرائط کو پورا نہ کرے۔

(۲) پسندیدہ: شمار نمبر ۴ کے تحت فلاسفی میں لکچرر کے لیے
پہلی اسامی کے لیے مسلم فلاسفی میں تخصص
دوسری اسامی کے لیے تجزیاتی مغربی فلاسفی میں تخصص

شمار نمبر ۶ کے تحت بنگالی لکچرر کے لیے
ہندی کی معلومات اور تدریسی/تحقیقی تجربہ

غیر معمولی تجربہ اور قابلیت کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے
انٹرویو کے لیے طلبیدہ امیدواروں کو بطور T.A. ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔
درخواست کے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس کے دفتر سے پانچ روپیہ یکمشت ادائیگی کے بعد (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جاسکتے ہیں۔
ڈاک سے منگوانے کی صورت میں ۲۳x۱۰ سم سائز کا ٹکٹ چسپاں اور خود کا پتہ تحریر شدہ لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۹ مارچ ۸۴ ۱۹ء ۴ بجے سہ پہر تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا
نوٹ :۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں خالی ہونے والی اسامیوں پر تقرر کے لیے بنائے جانے والے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں
(رجسٹرار)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۳۶

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ سینیئر ٹیکنکل اسسٹنٹ (ویٹرنیری)۔ (مستقل)۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری

شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :۔

ا۔ لازمی۔ کسی مستند یونیورسٹی سے ویٹرنیری سائنس میں گریجویٹ

اا۔ پسندیدہ:۔ چھوٹے بڑے جانوروں کی دیکھ ریکھ کا تجربہ۔ کسی تجرباتی سرجیکل لیبارٹری میں کام کرنے اور انیستھیا دینے کا تجربہ

۲۔ فزیوتھریپسٹ (دو اسامیاں)۔ (مستقل) جے این میڈیکل کالج ہسپتال۔

شرح تنخواہ:۔ ۴۵۵ - ۱۵ - ۵۶۰ - ای بی - ۲۰ - ۷۰۰ - روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد ہائی اسکول یا اس کے مساوی۔ کسی تسلیم شدہ طبی ادارہ سے فزیاتھروپی میں ڈپلومہ۔ اس مضمون میں تین سالہ تجربہ۔ آبادکاری و بحالی کے کام کا ایک سالہ تجربہ

نوٹ:۔ جو امیدوار اشتہار نمبر ۸۴ - ۸۳/۲۸ مورخہ ۳۰ دسمبر ۸۳ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں، ان کو از سرِ نو درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ ان کی سابقہ درخواست پر ہی غور کرلیا جائے گا

۳۔ اوورسیر:۔ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ:۔ ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ - ۲۰ - ۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ کسی تسلیم شدہ ادارہ سے سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ۔ عمارتوں کی دیکھ بھال اور تعمیر کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ۔

- پروجیکشنسٹ : مستقل ۲ - ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی

شرح تنخواہ :- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۶۰ - ای بی - ۲۰ - ۶۴۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :-

۱- لازمی (۱) ہائی اسکول

(۲) ۳۵ ایم ایم / ۱۶ ایم ایم کے پروجیکٹر چلانے کا سرٹیفکیٹ / لائسنس - اسی قبیل کے پروجیکٹر چلانے کا کم از کم تین سالہ تجربہ

(۳) بجلی کے دوسرے آلات جیسے آپٹکل اکوپمنٹ ، ایر کنڈیشنر ، ریفریجریٹرس ، اور ایر کولرس کی مرمت اور دیکھ ریکھ کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ :- ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جو پبلک ایڈریس سسٹم اور لے۔ وی سسٹم میں کام آنے والے آلات کے استعمال اور دیکھ ریکھ کا تجربہ رکھتے ہوں۔

- سینیر لیباریٹری اسسٹنٹ مستقل ۲ - شعبہ علم الادویہ - اجمل خاں طبیہ کالج ۔

شرح تنخواہ :- ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی ۱۵ - ۵۶۰ - روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :-

۱ لازمی :- فارماکالوجیکل لیباریٹری میں کام کرنے کا تجربے کے علاوہ سائنس کے مضامین میں ہائرسکنڈری۔

۲ پسندیدہ اردو کا علم

مولڈر مستقل ۱ یونیورسٹی پولی ٹکنیک ۔

شرح تنخواہ :- ۲۶۰ - ۶ - ۲۹۰ - ای بی ۶ - ۳۲۶ - ۸ - ۳۶۶ - ای بی ۸ - ۳۹۰ - ۱۰ - ۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس ۔

استعداد :- مولڈر کے سرٹیفکیٹ کے علاوہ کام کرنے کا پانچ سالہ تجربہ

یا

خواندگی کے علاوہ فاؤنڈری کے کام کا دس سالہ تجربہ

امام (سنی دینیات ۱) دواسامیاں - نظامت سنی دینیات

شرح تنخواہ :- ۲۶۰ - ۶ - ۲۹۰ - ای بی - ۶ - ۳۲۶ - ۸ - ۳۶۶ - ای بی - ۸ - ۳۹۰ - ۱۰ - ۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس ۔

استعداد : ۱- لازمی - ۱- مستند عالم

۲۔ مستند قاری۔

لا اسپنیڈ :۔ حافظ قرآن

غیر معمولی تجربہ اور قابلیت کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جا سکتی ہے۔

انٹرویو کے لیے طلبیدہ امیدواروں کو بطور ۲۸ ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواستوں کے فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سیلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے تین روپیہ نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاک سے منگوانے کی صورت میں ۲۳×۱۰ سمہ سائز کا ٹکٹ چسپاں لفافہ جس پر خود کا پتہ بھی تحریر ہو، بھیجنا ضروری ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۴ اپریل ۱۹۸۴ء ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

Tahzibul Akhlaq Fortnightly 16tn. to 31st March 84. Regd. No. L/ALG. 247

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

جلد ۳ — یکم تا ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۸۴ء — شمارہ ۷

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نور الحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات

سرورق پر: ڈاکٹر اطہر پرویز

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے — غالب

تعزیتی تقریر

...... مجھے پرویز صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ یونیورسٹی کے انتظامی امور سے بھی متعلق رہے۔ پہلے ڈپٹی پراکٹر اور پھر پرووسٹ رہے۔ انھوں نے بڑی استقامت اور بہت ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے اور بڑی جرأت کے ساتھ شرپسند عناصر سے یونیورسٹی کو نجات دلائی۔

رات حالی ہوسٹل میں ایک جلسہ تھا۔ مرحوم کی ناگہانی موت پر پہلی تعزیتی قرارداد یہیں منظور ہوئی۔ یہ بھی اک عجب اتفاق ہے۔ کیونکہ مولانا حالی اور اطہر پرویز صاحب میں ایک مناسبت ہے۔ پرویز صاحب کے سادہ، واضح اور توانا اسلوب پر مولانا کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ پرویز صاحب کو تصنیف و تالیف سے گہرا شغف تھا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ علی گڑھ میں سب سے زرخیز قلم شاید انہی کا تھا۔ تحقیقی اور تنقیدی کاموں سے قطع نظر انھوں نے صرف بچوں کے لیے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں۔ وفات سے ایک روز قبل وہ مجھ سے ملے تو 'الفاظ' کے تازہ شمارے کے ساتھ انھوں نے اپنی ایک اور کتاب بھی عنایت کی۔ یہ ایلیڈ کا اردو ترجمہ تھا۔ تہذیب الاخلاق کے وہ صرف قلمی معاون نہ تھے بلکہ اس رسالے کو ان کا ہر طرح کا تعاون حاصل تھا۔ تصنیفی کاموں سے انھیں ایسی دلچسپی تھی کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے صرف قلمی نام یاد رہ گیا۔ ایک بار کرنل بشیر حسین زیدی نے ان کا ذکر کسی اور نام سے کیا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا یہ وہی صاحب ہیں جنھیں آپ اطہر پرویز کے نام سے جانتے ہیں۔ لطف یہ کہ میں اس کے بعد بھی ان کا اصل نام یاد نہ رکھ سکا۔

اطہر پرویز صاحب بہت محنتی اور بڑی لگن کے آدمی تھے۔ جس کام کو کرنے کا بیڑا اٹھا لیتے اسے کر دکھاتے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے کہ جس کام کو اٹھاتے اسے اپنے کندھوں پر لے کر چلتے۔ مجھے معلوم تھا کہ انھوں نے کسی زمانے میں سیاست میں حصہ لیا تھا، کبھی مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ ان کے علمی کاموں اور تعلیمی کارناموں سے میں بڑی حد تک واقف تھا لیکن آج صبح ایک اور بات معلوم ہوئی۔ اس کا راوی چونکہ بہت ثقہ ہے اس لیے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک بے حد اچھے استاد تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا کہ وہ جتنے اچھے انسان تھے اتنے ہی اچھے استاد بھی تھے ان کا یہ وصف قابلِ تقلید ہے۔

کسی شخص کی دنیا نے کتنی قدر کی اس سے کسی کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ دنیا اپنے محسنوں کو بہت جلد فراموش کر دیتی ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پرویز صاحب ایک حوصلہ مند انسان تھے۔ قومی ترقی کے لیے انھوں نے جان کی بازی لگادی تھی۔ آپ نے ابھی آیۂ کریمہ سنی۔ ارشاد ہوا کہ "جو لوگ ہماری راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ کہو۔ وہ مرے نہیں زندہ ہیں"۔ جو خدا کے بندوں کی خدمت اور ان کی ترقی کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور اسی میں جان دے دیتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں مرتا ہے۔ اطہر پرویز صاحب آخر وقت تک انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔ اس لیے وہ مرے نہیں زندہ ہیں، ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اب میں اپنی بات کو دو شعروں پر ختم کرتا ہوں ـــ

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور ـــ سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

سید حامد

۳

ہم سے اک یار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا

سرسید کی وفات کے بعد مولوی نذیر احمد نے قومی جلسوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ کہا کرتے تھے کسی جلسے میں جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو اس کی صورت سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ اس کی یاد آئی اور جی بے قابو ہوا کیونکہ قومی کاموں کا یہ سب چرچا اسی کے دم سے تھا۔ مولوی صاحب نے اپنے ان جذبات کو شعروں کا روپ بھی دیا تھا جن میں سے ایک مصرع اس تحریر کا عنوان ہے کہ یہ آج ہمارے بھی حسبِ حال ہے۔ نہ وہ سرسید کے ہم رتبہ تھے نہ ان کے احباب رفقائے سرسید کے ہم پلہ پھر بھی اپنے رفیقوں میں وہ سب سے دراز قامت تھے۔

وہ "دھن کے پکے، قول کے سچے اور دل کے کھرے تھے۔ کام کا شوق زندگی کی مسافت میں ان کا رفیقِ سفر رہا۔ انھوں نے جو کام بھی کیا بڑے سلیقے سے کیا۔ اپنے مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ قول ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہا کہ "جو کام کرنے کے لائق ہے وہ یقیناً اس لائق بھی ہے کہ اسے سلیقے سے کیا جائے"۔ دل ایسا پایا تھا جس میں حسد، عداوت، نفرت اور انتقام کا گزر نہ تھا۔ دوستوں کے عیبوں سے چشم پوشی کرتے، برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے، بڑی سے بڑی زیادتی اور ناانصافی کو ذرا دیر میں بھلا دیتے بلکہ دریا دلی سے معاف کر دیتے۔ دوستوں کے ایسے جاں نثار کہ ممکن نہ تھا کوئی ان کے آگے کسی دوست کے خلاف لب کشائی کرے اور اپنا گریبان سلامت لے جائے۔

انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کمیونسٹ پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس میں طرح طرح کے مصائب و مظالم سہنے پڑے۔ یہیں انھوں نے جفاکشی کا پہلا سبق پڑھا۔ ٹریڈ یونینوں کی رہنمائی نے انھیں استقامت، ایثار اور بے غرضی کی دولت عطا کی۔ پارٹی سے کنارہ کر کے جامعہ ملیہ سے منسلک ہوئے تو ذاکر صاحب کی رفاقت میسر آئی۔ اس پارس سے چھو کر تو وہ بالکل ہی کندن ہو گئے۔ بات کہنے کا دل نشیں انداز اور دقیق سے دقیق نکتے کو سادہ دپراثر زبان میں بیان کر دینے کا گر شاید انھوں نے ذاکر صاحب ہی سے سیکھا اور اس فن سے ایسا کام لیا کہ بچوں کے لیے ایک لافانی ذخیرہ چھوڑ گئے۔ ذاکر صاحب بھی ان کے ایسے قدرداں تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے جب ایک قابلِ اعتماد، دیانت دار اور جفاکش کارکن کی ضرورت کا اظہار کیا تو انھیں اطہر پرویز کے سوا کسی کا نام یاد نہ آیا۔ علی گڑھ آنے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلیمی مشن صرف کلاس روم تک محدود نہ تھا، ذاکر حسین اسکول بھی ان کی عرق ریزی کا گواہ ہے۔

سنا ہے کسی زمانے میں وہ مذہب سے برگشتہ تھے لیکن ہم نے تو بتدریج انھیں مذہب کی طرف بڑھتے ہی دیکھا۔ کئی برس سے اس پر زور تھا کہ درسی کتابوں کی اساس مذہب پر ہونی چاہیے۔ رفیق محترم ڈاکٹر نادر علی خاں نے بتایا کہ ایک دن دیر تک ان کے پاس بیٹھے روتے اور اس خواہش کا اظہار کرتے رہے کہ کسی طرح مدینہ منورہ میں حاضری ہو تو روضے کی جالی پکڑ کے پوچھوں کہ کس قصور کی سزا ہے جو میں اتنے مصائب میں گھرا ہوا ہوں۔

ایک عرصے سے دل کے عارضے میں مبتلا تھے مگر آخر تک ہنستے بولتے بلکہ مسلسل کام کرتے رہے۔ کئی بار مزے لے کر ایک ان پڑھ عورت کا نقرہ سنایا جو کبیر لال کی ہمسایہ تھی۔ اس کا چڑچڑا شوہر دن میں دس دس بار کہتا جا میں تجھے طلاق دیتا ہوں مگر اس کا صرف ایک جواب تھا میں نہ لیتی طلاق۔ کہا کرتے تھے میرا اور بیماری کا معاملہ اس عورت اور طلاق کا سا ہے۔ یہ لاکھ اپنے وجود کو منوانا چاہے مگر میں مان کر نہ دوں گا۔ مرنے سے دس منٹ پہلے تک وہ اپنی موت کا مذاق اڑا کے ہنستے ہنساتے رہے۔ وہ تو کیا مگر ہم دوستوں میں سے بھی کوئی نہ دیکھ سکا کہ قضا ان کے سر پہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مرتے دم تک وہ ایک اہم قومی کام میں مصروف اور ایک گتھی کو سلجھانے میں سرگرداں رہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں موت ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ وہ مرے نہیں شہید ہوئے۔

[illegible]

● زندگی کا لازمی انجام اور زندگی کی اصل حقیقت موت ہے۔ اور حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز کی موت بھی ایک ایسی ہی تلخ حقیقت ہے کہ جس کو نہ تو برداشت کرنا آسان نہ جس سے انکار ممکن۔ یہ ایک بہت سخت سانحہ ہے۔ آپ دوستوں نے تو رو کر اپنا دل ہلکا کر لیا لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ میری آنکھ سے آنسو نہیں نکلتا اور غم کا بوجھ اور بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ عرفی کی زبان میں —

آں نوحہ کہ راہِ لب ندارند، داریم
وآں گریہ کہ دل بدیدہ نگذارد ہست

ڈاکٹر پرویز آج ہم میں نہیں۔ ان کی کتنی اہمیت تھی وہ کیا تھے اور کیا نہیں تھے اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی لیکن اتنا میں ضرور کہوں گا کہ وہ اس اسکول کے تنہا معمار تھے۔ دوستوں نے ان کی مدد کی لیکن اصل کام کیا اسی خدا کے بندے نے۔ لوگ کہتے ہیں اسکول کو زمین دے کر اصل کام میں نے کیا۔ میں نے بارہا کہا ہے اور آج پھر دہراتا ہوں کہ میں نے نہیں اس شخص نے سب کچھ کیا۔ یہ شہر جس میں آپ اور ہم مل کر قومی کام کر رہے ہیں بڑا بے درد ہے۔ یہ حاسدوں کی بستی ہے۔ قوم کے خادموں کے نام یہاں یاد نہیں رکھے جاتے۔ یہاں تنقید کرنے والے، عیب نکالنے والے بہت ملتے ہیں کام کرنے والے نہیں ملتے۔ اس شہر میں طرح طرح کے لوگ ملیں گے لیکن اطہر پرویز جیسا ایک بھی نہ ملے گا۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ بھاری سے بھاری بوجھ اٹھا کر بھی اس تیز رفتاری سے چلتے تھے کہ لوگ ان کی گردِ سفر کو بھی نہ پا سکتے تھے۔

دعا کیجیے کہ ہم ان کے لگائے ہوئے اس پودے کو مل کر متحد ہو کر ساری زندگی سیراب کرتے رہیں۔ خدا ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان کے آئیڈیل کو پورا کر سکیں جس ادارے کو انھوں نے جاں فشانی سے، لگن سے، جدوجہد سے اس منزل تک پہنچایا اگر وہ برابر ترقی کرتا رہا اور کسی دن صحیح معنی میں ماڈل بن سکا تو اس سے ان کی روح کو عین راحت ہوگی۔ اتنا اور عرض کرنا چاہوں گا کہ اطہر پرویز صاحب سے اختلاف کرنا ممکن تھا لیکن ان میں کوئی بات ایسی نہ تھی کہ ان کی ذات سے ان کی شخصیت سے نفرت کی جا سکے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے۔ ان کے پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا کرے اور ہم دوستوں کو حوصلہ دے کہ ہم اس غم کو برداشت کر سکیں۔

— نواب رحمت اللہ خاں شروانی

● اطہر پرویز صاحب کو مرحوم کہنے کو دل کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ ہم سے بچھڑ گئے۔ جس شام ان کا انتقال ہوا اسی دن ڈھائی بجے تک وہ شعبے میں ہمارے ساتھ تھے اور کاموں میں مصروف تھے۔ کون جانتا تھا کہ وہ اتنی جلدی ہمارا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

آج ان کی خوبیاں ایک ایک کر کے یاد آ رہی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ جس کام کو کرتے اس انہماک اور توجہ سے کرتے جیسے کوئی خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کرتا ہے۔ وہ کسی کام کو اپنے رتبے سے فروتر نہیں سمجھتے تھے۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا جب اس کی ذمہ داری قبول کر لیتے تو اسے بحسن و خوبی تکمیل تک پہنچانے اور اس کام کو اس تندہی سے انجام دیتے کہ باقی سب کچھ بھول جاتے۔

ان کے سینے میں ایک معصوم دل تھا۔ دوستوں سے اختلاف کرتے، کبھی کبھی لڑتے جھگڑتے بھی مگر ذرا دیر میں سب کچھ بھول جاتے ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اپنے دوستوں کو بے حد عزیز رکھتے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص ان کے سامنے ان کے کسی دوست کے خلاف لب کشائی کی جرأت کر سکے۔ علی گڑھ کے ماحول میں یہ بات کچھ غیر معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔

بچوں سے انھیں بے حد پیار تھا۔ وہ زندگی بھر بچوں کے لیے لکھتے رہے۔ بچوں کے لیے انھوں نے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ افسوس ہے کہ ان کی اس خدمت کو ابھی تک سراہا نہیں گیا۔ بلکہ اس کام کے سلسلے میں تحقیر کا رویہ اختیار کیا گیا اور اس کام سے انھیں نقصان بھی پہنچا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن پرویز صاحب کے اس کام کی بہت قدر ہوگی۔ بچوں کے لیے لکھتے لکھتے انھیں مشکل بات کو آسان بنا کے پیش کرنے کا سلیقہ آ گیا تھا اور اسی لیے وہ ایک کامیاب استاد بھی تھے۔ علی گڑھ شہر پر ان کا ایک اور احسان ہے۔ انھوں نے ذاکر حسین ماڈل ہائر سکنڈری اسکول قایم کر کے علی گڑھ کو ایک معیاری اسکول مہیا کر دیا۔

میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

— پروفیسر عتیق احمد صدیقی

خوشہ چیں

اِجتماعی خودکُشی کے طَریقے

خوشہ چیں کو جستجو کشاں کشاں ایک بزم میں لے گئی۔ حاشیے میں وہ ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے وہ سب کو دیکھتا اور سُنتا رہے اور خود اس پر کم لوگوں کی نگاہیں پڑیں۔ محفل گرمی پر آ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں گھوم پھر کر خوباں کے چہروں پر پڑ رہی تھیں جو فروغِ مے سے گلستاں بنے ہوئے تھے۔ مشتاق نگاہوں کی گرمی اس پر مستزاد

اُن کو مشتاق نگاہوں کی ملی ہے آہٹ

اب وہ دو گام بھی چلتے ہیں تو پندار کے ساتھ

مرد وہ باتیں کر رہے تھے جنھیں انگریزی محاورے میں "چھوٹی گفتگو" کہتے ہیں۔ عورتیں کپڑوں کی قیمت اور تراش کے علاوہ دوسری عورتوں کی "خراش" پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ اُن کے معاملات اور تعلقات اور تسخیراتِ دُوسرِ دیگراں کا ذکر مزے لے لے کر کیا جا رہا تھا۔ خوشہ چیں سوچنے لگا اس عیب جوئی اس یاوہ گوئی سے کیا حاصل۔ نفرت اور غیبت کا یہ دھواں کیا ان کے دلوں کو توے کی طرح سیاہ کر کے نہ چھوڑے گا۔ پھر چہرے صہبا، گلگونہ اور پندار سے گلنار ہو گئے تو کیا حاصل۔ اور پھر اس کا ذہن اس ناانصافی کی طرف گیا جس کے تحت یہ نکمّی عورتیں عیش و عشرت میں زندگی گزار رہی ہیں اُن کے لیے کسی چیز کی کمی نہیں اور اس مکان سے تھوڑی ہی دُور پردہ عورتیں نظر آئیں گی، جگر دوز محنت اور صبر آزما فاقے جن کے مقدر میں لکھے گئے ہیں وہ اسی سوچ میں تھا کہ کسی نے آکر اس کا شانہ جھنجھوڑا۔

" میاں خوشہ چیں خیر تو ہے آپ بھی اس بزم میں آنکھیں سینکنے آ گئے۔ یہ تو بتائیے آپ کا وعدہ کیا ہوا۔ آپ نے ایک پورا مضمون خودکشی کے طریقوں پر لکھ ڈالا تھا اور کیوں نہ لکھتے یہ اختصاص کا زمانہ ہے۔ یونیورسٹیوں میں یہ شرط ہے کہ استادی کے منصب پر اُسی کو فائز کیا جائے گا جس نے تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے۔ آپ بھی شاید اسی چکر میں ہوں گے۔"

خوشہ چیں بات کاٹتے ہوئے بولا "حضرت جویا آپ جانتے ہی ہیں کہ خود جس کے سر میں چکر ہو وہ ان چکروں میں نہیں پڑتا۔"

جویا: "مان لیا کہ آپ کو نہ اُستادی کی تمنّا ہے نہ صلے کی پروا۔ اس کا جواب دیجیے کہ پھر آخر آپ نے تحقیق پر کیوں کمر باندھ لی اور موضوع بھی ایسا چُنا جو کوئی تعمیری پہلو نہیں رکھتا۔ انسان خود کو فنا کے گھاٹ کس طور اتارے۔ یعنی چہ۔ آپ اچھے بھلے انسانوں کو گمراہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لوگ زندگی کو کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیتے ہیں۔ مُصیبتوں کو برداشت کر لیتے ہیں۔ زہر کو نگل جاتے ہیں اور جب چار آدمیوں کے کندھوں پر جاتے ہیں تو کسی کو گُمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ غریب کتنے عرصے تک کتنی تلخیاں سہتا رہا ہے ان کا شیوہ یہ ہوتا ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے

اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

ایک آپ ہیں کہ انھیں بھڑکا رہے ہیں، انھیں سمجھا رہے ہیں کہ اپنی خوشی نہ آئے، کوئی حرج نہیں، لیکن اپنی خوشی جانے کے جتن ضرور کرو کہ یہ تمھارے اختیار میں ہے۔"

خوشہ چیں "بھائی جویا، جسے آپ خوشی سے جانا سمجھ رہے ہیں وہ در اصل ناخوشی کا جانا ہے۔ اگر آپ کا اعتراض نفسِ مضمون پر نہیں، موضوعِ تحقیق پر ہے تو میرا موضوع کوئی ایسا بُرا نہیں۔ میں آپ کو چنوتی دیتا ہوں۔ ملک کی ایک سو تیس یونیورسٹیوں سے ہر سال ہزاروں طالب علم ڈاکٹریٹ لے کر نکلتے ہیں اُن کی تحقیقات پر غور کیجیے۔ کوئی موضوعِ تحقیق میرے موضوعِ تحقیق سے زیادہ معنی خیز اور کار آمد نہیں نکلے گا۔ مثال کے طور پر ان موضوعات کو لے لیجیے۔

۱۔ پیاز کی گرہ کو پرت پرت کرکے کھول دیکھیے اور اتاری ہوئی پرتوں کو دوبارہ پیاز کی شکل دینے کے ڈھنگ تلاش کیجیے۔

۲۔ دھوبی کو کتنے کپڑے اور کتنے سال درکار ہوں گے گھاٹ کے تختے کو توڑنے کے لیے۔ تحقیق کو شمالی جنوبی مشرقی اور مغربی ہندوستان کے تجربات پر مبنی کیجیے۔

۳۔ بچہ روتا ہوا دُنیا میں آتا ہے، یہ بات تو سمجھ میں آئی۔ کھوج اس بات کی کیجیے کہ وہ منہ بسورتا ہوا یہاں سے کیوں جاتا ہے۔ کیا یہ اس لیے کہ عمر رسیدہ کے لیے بلک بلک کر رونا مناسب نہیں سمجھا جائے گا یا اس لیے کہ رونے اور بسورنے کے سرے دائرہ وار مل گئے اور بیچ میں جو وقت گزرا وہ بے معنی ہے۔

ان میں سے ہر موضوع پر ادنیٰ ترمیم اور اعلیٰ تحریف کے ساتھ بیشمار تھیسس تیار ہو گئے۔ آپ ہی بتائیے اُن کے مفید یا طبعزاد ہونے پر کون ایمان لائے گا۔ پیاز کے بجائے اگر کسی نے کرم کلّے کو موضوع بنا لیا تو کون سی بڑی تبدیلی ہو گئی۔

جویا میاں، اب تو آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یونیورسٹیوں میں فی زمانہ جو تحقیق ہو رہی ہے وہ بیشتر دور از کار ہے اور اکثر اس کی شانِ امتیاز تکرار، تصرف اور پیوندکاری ہے۔ میں نے تو پھر بھی ایسا موضوع ڈھونڈا جو ہمیشہ کے لیے نجات دلانے والا ہے جیسے جیسے نسلیں بڑھیں گی میرے تھیسس کی افادیت بڑھتی جائے گی، میری شہرت اور عظمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔"

جویا: "کیوں نہیں حضرت خوشہ چیں، آپ ہزاروں کو موت کے گھاٹ قبل از وقت اُتار دیں گے اور اپنے لیے پروانۂ دوام حاصل کر لیں گے اپنی خوشی سے مرنے والے جب مریں گے آپ کا نام ان کی زبان پر ہو گا۔ مرگِ انبوہ آپ کے لیے جشن بن جائے گی"۔

خوشہ چیں: "جی نہیں حضرت آپ بھول گئے۔ میری پہلی ڈاکٹریٹ تو افراد کی خودکشی کے طریقے پر ہے۔ ڈی لٹ کے لیے میں نے اس موضوع کو قدرے پھیلا دیا ہے، قوموں، ملتوں، طبقوں اور جماعتوں کے لیے خودکشی کے طریقے جداگانہ ہیں۔ وہاں ایک فرد سے دنیا ہاتھ دھوتی ہے یہاں لاکھوں کروڑوں کو بہ یک وقت خیرباد کہتی ہے۔ کام کتنا آسان ہو گیا۔ ایک خلقت کے دکھوں کا نوارن[1] ایک ساتھ"۔

[1] निवारण

جویا: یہ تو واقعی بڑا کارِ خیر ہے جو آپ کے معجز رقم قلم کے ذریعے انجام پائے گا۔ ایک بات البتہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک ہی موضوع یعنی خودکُشی کے طریقوں پر آپ کو دو ڈاکٹریٹ مل گئیں: ایک پی ایچ۔ڈی دوسری ڈی لٹ۔ یہ کیوں کر ممکن ہوا۔

خوشہ چیں: "سخن شناس نہ ای دلبرا، خطا اینجاست۔ اسے آپکی کم فہمی کہوں کہ لاعلمی۔ بھائی فی زمانہ تحقیق کا دستور یہی ہے۔ ایک ایسا موضوع لے لیجیے جس کی ساری نوکیں کثرتِ استعمال سے گھس چکی ہوں پہلے اس پر ایم فل کا مقالہ (ڈزرٹیشن۔DISSERTATION) لکھیے پھر اسے اور ذرا کاتیے۔ اُسی بات کو ذرا پھیلا کر کہیے، لیجیے آپ کا تھیسس تیار ہو گیا۔ تاگے کو اتنا باریک کر دیجیے کہ اس سے ڈھاکے کی ململ تیار ہو سکے۔ خدا آپ کو وقت، فرصت اور توفیق دے تو اس پر تھوڑی سی صیقل اور اس کی قدرے توسیع کر دیجیے۔ لیجیے آپ نے خود کو ڈی لٹ کے حدود میں داخل کر دیا"۔

جویا: "بجا ارشاد ہوا۔ اپنی جہالت اور جسارت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ روئی کو لے لیجیے اس سے موٹا دھاگا کاتا جا سکتا ہے اور باریک اور اور زیادہ مہین بھی۔ اتنی سی بات تھی جو میں اس وقت نہ سمجھ سکا۔ حضرت، ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح فروعی باتوں میں اس طرح اُلجھ گئے کہ اصل کا دُور دور سُراغ نہیں ملتا۔ آپ نے یہ ہنوز بتایا ہی نہیں کہ اجتماعی خودکشی کے طریقے کیا کیا ہیں"۔

خوشہ چیں: "لیجیے سنیے، پہلا طریقہ جسے تیر بہدف سمجھیے پیچھے کی طرف دیکھنا ہے۔ نہ دنیا ساکت ہے نہ زندگی ٹھہری ہوئی۔ لہٰذا انسان کے لیے حرکت میں رہنا ضروری ہے۔ جو پیچھے کی طرف رُخ کرے گا وہ پیچھے جائے گا، جس کا رُخ آگے کی طرف ہو گا وہ آگے بڑھے گا جو پیچھے جائے گا وہ بالآخر عدم تک پہونچ جائے گا جس سے وہ کبھی وجود میں آیا تھا۔ عدم کا لامتناہی سکون حاصل کرنا ہے تو ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھیے۔ حال اور مُستقبل سے کنارہ کش ہو جائیے۔ ماضی میں زندگی بسر کیجیے اور بالآخر عدم تک کا سفر طے کر لیجیے۔ جہاں سے آئے تھے وہیں پہونچ جائیے۔ جن قوموں کو آگے بڑھنے کا ولولہ نہیں رہتا جو زمین کے سینے پر بوجھ بن جاتی ہیں وہ ہمیشہ ماضی کی بات کہا کرتی ہیں اور اس ماضی کی طرح جو ختم ہو گیا ہے خود بھی

ختم ہو جاتی ہیں۔ جو پیچھے کی طرف رُخ کرکے آگے بڑھنے کی کوشش
کرے گا وہ لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ زندگی نام ہے حرکت کا جستجو کا اور
پیش رفت کا۔ ان تینوں مصیبتوں کا علاج صرف ایک جگہ ملے گا۔ پوچھو
کہاں" "موت کی آغوش میں"، جویا بول اُٹھا "شاباش میرے
دوست" خوشہ چیں نے سلسلۂ سخن جاری رکھتے ہوئے کہا "اجتماعی
خودکشی کے لیے ایک سبیل اور نکلی ہے یعنی وقت ناوقت فریاد کرنا،
آہ بھرنا، حرفِ شکایت زباں پر لانا اور اپنے حالِ زار پر پیہم
ترس کھانا۔ جو لوگ فریاد کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بے داد کرتے
ہیں۔ شکوہ و شکایت کرنے والا پہلے غیرت سے ہاتھ دھوتا ہے
خود پر ترس کھانے والا ایک گھن لگا دینے والے اخلاقی مرض میں
گرفتار ہو جاتا ہے جو قوم گلہ مندی کی خوگر ہو جاتی ہے حوصلے کی
راہیں اُس پر بند ہو جاتی ہیں، ولولہ اس سے کترا کر نکل جاتا ہے
اس کے یہاں عمل کی طاقت شل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی تکلیفِ حقیقی
یا خیالی کو بڑھا چڑھا کر اپنے وجود پر حاوی کر دیتی ہے۔ اپنی خام
خیالی اور مبالغہ آرائی سے خود کو بے بس بنا دیتی ہے اس میں جینے کی
لگن باقی نہیں رہتی اور وہ سسک سسک کر مر جاتی ہے۔ شکایت
کو جس جماعت نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اس نے فنا کو گلے لگایا۔
شکایت کرنے والے کام نہیں کر سکتے۔"

"یہ خوب رہی"، میاں جویا بول اُٹھے "ظلم بھی کیجیے اور شکایت
بھی نہ کرنے دیجیے آہ بھی نہ بھرنے دیجیے۔"

"گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے"

"اگر صاف گوئی کی تاب نہیں لاسکتے تو خوشہ چیں کو چھیڑنا کیا ضرور تھا"
میاں خوشہ چیں نے اس دخل در معقولات پر برہم ہو کر کسی قدر
تُرشی کے ساتھ کہا۔ جویا نے دم سادھ لیا۔

"ایک شکایت ہی کیا، گفتار کی کثرت بھی اکثر اجتماعی زندگی
کی مشکلات کو آسان کر دیتی ہے۔ گفتار کے غازیوں کا کردار
کھوکھلا ہو جاتا ہے اور اس بوڑھے پیڑ کی طرح جو کھوکھلا ہو
چکا ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا اُسے وجود سے عدم کی طرف لیجاتا
ہے۔ جو قوم زبان کے چٹخارے پر جان دینے لگی وہ دراصل
جان گنوا بیٹھتی ہے۔ زبان کا چلنا زندگی کی ایک علامت ہے مگر زندگی سے
عبارت نہیں۔ جو لوگ باتیں بنانے کے عادی ہو جاتے ہیں کام کرنے کی صلاحیت ان میں
باقی نہیں رہتی۔ باتیں بنانے سے کام بگڑتے ہیں۔ زیادہ باتیں کرنے
والے لوگ بہت سی باتیں غلط کہہ جاتے ہیں۔ اپنی بات کا پاس نہیں
رکھتے، اپنے عہد کو پورا نہیں کرتے اس عادت میں جب وہ راسخ ہو جاتے
ہیں تو قول کو فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی شخصیت مجروح
ہو جاتی ہے، جوانمردی کا اُن میں شائبہ باقی نہیں رہتا۔ عزتِ نفس کا
احساس ان کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ یہ لوگ حقیقت کے بجائے
داستانوں کی دنیا میں رہتے ہیں اور داستان کہتے کہتے سو جاتے ہیں
اس طرح سے کہ ان کی داستان تک بھی داستانوں میں باقی نہیں رہتی
یہ لوگ خیالی پَون چکیوں پر وار کرتے رہتے ہیں اور بالآخر خود اُس
وار کے ہدف بن جاتے ہیں جو دستِ قضا سے سرزد ہوتا ہے۔"

جویا جو غور سے سُن رہا تھا، اچانک بول اُٹھا "پہیلی کیوں
بھجواتے ہو، داستان کو پہلے بُرا کہتے ہو، پھر یہ سوچ کر پچھتاتے ہو
کہ داستان باقی نہیں رہی۔ آگے چلتے ہو تو "پَون چکی" کا چرچا
کرتے ہو۔ ہم نے بچپن سے "پن چکی" سنا تھا، تم پَون چکی کہاں سے
لے آئے۔ کیا یہ وہی پن چکی ہے جس کے دو پاٹن کے بیچ میں آتا بت
بچا نہ کوئے" "مورکھ"، خوشہ چیں نے حقارت کے ساتھ کہا۔
"پن چکی پانی سے چلتی ہے، پَون چکی ہوا سے۔ آجکل بڑا چرچا ہے
توانائی کے قدرتی وسائل تلاش کرنے کا۔ پانی اور ہوا کے علاوہ
دھوپ کو بھی انسان نے تسخیر کر لیا ہے۔ تمہیں آگاہ کیے دیتا ہوں
میاں جویا کہ آئندہ بیچ میں ٹانگ نہ اڑانا" "بہت اچھا"، جویا نے
انتہائی سعادت مندی کے ساتھ حامی بھری۔ حالانکہ اس وقت اس
کا دھیان نغمہ بیں عطروں اور نغمہ بار کھلاہٹوں کی طرف جا رہا
تھا جو جنتِ مشام اور فردوسِ گوش بنی ہوئی تھیں۔

"قومیں خود کو معدوم کرنے کے لیے ایک اور طریقہ بھی اختیار
کرتی ہیں" خوشہ چیں نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا "علم سے
اپنا ناتہ توڑ لیتی ہیں اور جہالت کے حصار میں جا بیٹھتی ہیں اس
شبستان میں انھیں بڑا سکون ملتا ہے۔ وہاں علم کی شعاعیں
آنکھوں کو ستاتی نہیں۔ گہری نیند سے جگاتی نہیں۔ ہر سمت اندھیرا
ہر طرف سکون، نہ آگہی کی روشنی نہ جستجو کی تڑپ، نہ پیش رفت

کا ولولہ۔ انسان نے دنیا میں جو کچھ ترقی کی ہے علم کی بدولت کی ہے۔
علاوہ بریں دنیا کے وسائل محدود ہیں۔ ان وسائل کو حاصل اور استعمال
کرنے کے لیے دنیا کی اقوام میں سخت مقابلہ ہو رہا ہے۔ جن قوموں کے
پاس علم ہے عالم کی زمام ان کے ہاتھ میں ہے۔ علم طاقت ہے زندگی
ہے جہالت کمزوری ہے، فنا ہے۔ فنا ہونے کا آسان طریقہ ہے جہالت
کی قبر میں اُتر جانا۔ زندہ درگور ہو جانا اور پھر ابدی نیند سو جانا۔ انسان
کی تسخیرات اور قدرت پر اس کی بالادستی علم اور عقل کی بدولت ہے
علم ہی عقل پر سان رکھتا ہے۔"

جویا گویا ہوئے "تم نے پہلے کیوں نہ بتا دیا خوشہ چیں، ہم نے جو
اتنے عرصے پڑھائی میں پاپڑ بیلے۔ فنا کی منزل تک پہنچنے کے لیے جہالت کی
افادیت کا بروقت ادراک ہو جاتا تو ہم اس محنتِ رائیگاں سے بچ جاتے
کیسے کیسے خشک لیکچر اور بے کیف سبق ہمیں برداشت کرنا پڑے۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ علم کی تکلیف دہ دھوپ سے ہماری آنکھوں کو بچانے کے
لیے اُستادوں نے یہ ٹھان رکھی ہے کہ جو مضمون بھی پڑھائیں گے اس
میں طلبہ کی دلچسپی پیدا نہ ہونے دیں گے۔ اگر خدانخواستہ دلچسپی پیدا
ہو گئی تو مرگِ مفاجات کے بجائے حیاتِ دوام کا ذکر چھڑ جائے گا۔
مرنے کے لالے پڑ جائیں گے۔ قیدِ حیات سے چھٹکارا ناممکن ہو جائیگا۔
ہم سے تو ہمارے بیشتر ہم مذہب بہتر نکلے۔ مرنے کی آرزو بھی، جہالت کو
وسیلہ بنا لیا۔"

خوشہ چیں نے بغیر جویا کو چھیڑے ہوئے اپنی بات اس طرح
شروع کر دی "تم اتنا تو جانتے ہی ہو گے کہ قوم افراد سے بنتی ہے۔ افراد
متحد ہوتے ہیں تو جماعت مضبوط ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنے مفاد کا اسیر ہو جائے
تو جماعت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اینٹوں کو مسالے سے نہ جوڑیے، یوں
ہی اوپر تلے رکھ دیکھیے تو مکان بن چکا۔ افراد کو ربط باہم اور خلوص و
ایثار سے جوڑا جاتا ہے مشترک مقاصد اور مشترک عزائم و عقاید ہی
جماعت کو توانا بناتے ہیں۔ اگر خلوص ربط باہم اور اشتراک مقاصد
کی جگہ خود غرضی نے لے لی تو یوں سمجھیے کہ قوم فنا کے راستے کی بہت سی
مشکلات سے نجات پا گئی۔ جو قومیں پکے ہوئے پھل کی طرح ٹپکنے کے
لیے تیار رہیں ٹٹولیے تو وہ افراد کی خود غرضی کی مرہونِ احسان ہیں اسی
کی بدولت اس جہالت کو پہنچی ہیں کسی قوم کے متعلق اگر یہ فیصلہ کرنا ہو
کہ وہ باقی رہے گی یا فنا ہو جائے گی تو یہ دیکھیے کہ اس کے افراد اپنے ذاتی مفاد
کو ترجیح دیتے ہیں یا اجتماعی مقاصد کو۔ اجتماعی موت کو حاصل کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ افراد
کے کانوں میں خود غرضی کا سبق پھونک دیا جائے۔ افراد مختلف سمتوں میں
جائیں گے تو جماعت منزلِ مقصود تک پہونچ چکی۔ تمہیں بتاؤ جویا، ہمارے
ہندوستان میں کون سی قوم ایسی ہے جس کے افراد اپنے چھوٹے سے
چھوٹے فائدے کے لیے قوم کا بڑا سے بڑا نقصان کرنے کو تیار نہیں"
جویا نے دردآمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "عیاں را چہ بیاں"
خوشہ چیں آگے بڑھا "خود غرضی کے جلو میں تکبر، انا اور نخوت آتے
ہیں۔ ان سب کی پرچھائیں عقل و شعور پر پڑتی ہے۔ نخوت کے نشے
میں انسان اجتماعی فلاح کو فراموش کر دیتا ہے۔ نخوت جدھر جاتی ہے
عداوت اور نفاق کے بیج چھڑکتی ہوئی جاتی ہے۔ نخوت جہالت کی
بہن ہے اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے۔ کسی قوم میں نفاق
اور انتشار برپا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے کانوں میں تکبر
کا منتر پھونک دو۔ پھر ایسی پھوٹ پڑے گی جس کا مٹنا قسم ہے۔
انا گزیدہ لوگ پھنکارتے اور ڈستے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کاٹے کا علاج
نہیں۔ ان کا کاٹا سوتا ہے۔"
جویا پھر گویا ہوئے "خود غرضی اور غرور کا تو ذکر کر دیا، بھائی
صاحب، آپ حسد کو کیوں بھولے جاتے، وہ تو ہماری قوم کا طرۂ امتیاز
ہے، کیا اس کی وجہ سے شیرازہ نہیں بکھرتا؟"
"اس کی وجہ سے تو سب سے زیادہ بکھرتا ہے۔ بظاہر حسد خود غرضی
کے برعکس ہے۔ جو زیادہ قریب ہوتا ہے، وہی اس کا ہدف زیادہ
بنتا ہے جن سے کوئی تعلق نہیں، وہ پھلیں پھولیں ترقی کریں۔ کسی پر
گراں نہیں گزرتا۔ اپنے عزیز، ہمسائے اور احباب اگر کامیاب ہوتے
ہیں، ترقی کرتے ہیں تو لوگ آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔
اغیار اگر پنپتے ہیں ترقی کرتے ہیں تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گویا
قدرت کی طرف سے ایک مضبوط انتظام اس بات کا ہو گیا کہ یہ قوم
کبھی مل کر نہ رہ سکے۔ ہمیشہ جوتی میں دال بٹتی رہے لہٰذا حسد کو
راہنما بنا لیا جائے تو قوم کے فنا ہونے کی منزل آسان ہو جاتی ہے۔ حسد
اچھائی کو پنپنے نہ دے گا، برائی کو شہ دے گا۔ اچھائی بقا کی ضامن
ہوتی ہے۔ برائی موت کا باعث۔ حسد محبت کی قبا کو پارہ پارہ

رتیاہے۔ اتحاد کی دیوار میں دراڑ ڈال دیتا ہے۔" کپڑے پھٹ گئے،
ار تڑخ گئی تو کیا ہوا"، جویا بولے "رفو ہو جائیں گے، جوڑ دی
ے گی۔ خوشہ چیں تم نے یہ کیا ڈھنگ اپنائے ہیں۔ جو چال
وگے نرالی۔ گویا عام روش سے انحراف تمھارا شیوہ ہے۔ جانتے
اچھی طرح کہ دنیا بُری ہے تو پھر اس بُری دنیا کو چھوڑنے کے
، اتنی بہت سی برائیوں کا سہارا کیوں لیتے ہو۔

دلم بہ سوخت زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است "

شہ چیں نے کہا "جویا بھائی تم پھر بولے بغیر بولے تمھیں چین نہیں
تا۔ بُری جگہ سے نکلنے کے لیے برائیوں کو منتخب کرنا اور ذریعہ
ا کیا بُرا ہے۔ لوہے کو لوہا ہی تو کاٹتا ہے۔"

اتنے میں چیخنے چلانے کی آواز آئی جویا خبر لائے کہ دُخت رز یا دُختِ
م کے دو پرستاروں میں آویزش ہو گئی مشکل سے بیچ بچاؤ کیا گیا۔
خوشہ چیں کو دوسرا نشہ تھا۔ اپنے تجربہ سے یہ حضرت اس طرح
تے جیسے راگ سے باجہ۔

ک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے" قوموں کے عُروج و زوال
اور فنا اور ان کے اسباب و علل پر وہ اس انداز سے محاکمہ کر رہے
کہ ابن خلدون، گبن اور ٹوائن بی کو رشک آئے، محاکمہ کا
مد صرف ایک تھا: اس ناہنجار دنیا سے من حیث القوم اخراج
کہ ممکن ہے کسی جماعت کا شیرازہ بکھرنے لگے تو امید بندھتی
جلد ہی زندگی کے مصائب سے نجات مل جائے گی، موت اُسے
آغوش میں سمیٹ لے گی۔ دہر میں نفسی نفسی کے کلمہ گو موت کی راہ
شہ کے میدان تک پہونچ جائیں گے۔ وہاں جو ہوگا دیکھا جائے گا
یہاں کے نت نئے بکھیڑوں سے تو رُستگاری ملے گی۔ ساتھ ہی
بھی یہ اندیشہ ہوتا ہے، جیسا کہ اقوام و ملل کی تاریخ میں بار ہا ہوا
کہ اُن ہی میں سے کوئی فرد ایسا اُٹھے جو زوال آمادہ قوم کو سنبھال
اس کی رگِ غیرت کو جوش میں لے آئے۔ اس کی قیادت اور شیرازہ بندی
عنوان کرے کہ بقا فنا کی جگہ لے لے، پیش رفت پسپائی کی۔ لہٰذا اس
یا جماعت پر جس نے دنیا سے منھ موڑ لیا ہے اور فنا ہو جانے کی
ان لی ہے، لازم آتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے کسی فرد میں خلوص
رہبری کو اکٹھا نہ ہونے دے اور اگر وہ جمع ہو جائیں تو ایسے

راہنما کی وہ تُکا فضیحتی کرے، اس کی تذلیل اور تحقیر کے اتنے اسباب
فراہم کردے کہ خود اس کی جان پر بن جائے۔ یا تو اصلاح کا سودا
اس کے سر سے نکل جائے یا جان تن سے۔ اس کی نیت پر شبہ کرے
اور الزاموں کی بوچھار سے اس کی طمانیت کو برہم اُس کے عزائم کو
متزلزل، اس کے جذبۂ اصلاح کو مجروح کر دے۔ جو قوم صالح قیادت کو
پنپنے نہیں دیتی اس کے لیے موت بغایت آسان ہو جاتی ہے۔"

"یہ نسخہ تو واقعی بہت کارگر ہے" جویا نے کہا "بیمار کے پاس چارہ گر
کو پھٹکنے نہ دیجیے۔ یا ہار دیجیے تو ایسے نام نہاد معالجوں کو جو دوا کے نام
پر زہر دیتے ہوں۔ یعنی قصہ پاک ہوا۔ پاپ کٹ گیا۔" لیکن خوشہ چیں
نے جویا کا یہ قولِ فیصل سنا ہی نہیں۔ وہ بڑے غور سے تین چہروں کو بہ یک
وقت دیکھ رہے تھے۔ دو چہرے جن میں بہ فیضِ رقص کوئی فاصلہ نہیں
رہا تھا، ہوس اور صہبا سے جو دمک اُٹھے تھے جہاں آنکھوں ہی آنکھوں
میں طرح طرح کے پیمان ہو رہے تھے، جنھیں دونوں چپیاں جسموں کے اعضا
ہر بُن مُو سے دہرا رہے تھے۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو خوشہ چیں اس
منظر کو ایک اچٹتی ہوئی نگاہ کا خراج دے کر گزر جاتے کیونکہ جدید
محفلوں میں ایسے مناظر بارہا ان کی نظر سے گزرے تھے لیکن انھوں نے
ان چہروں سے کچھ فاصلے پر ایک اور چہرہ پر فکر، کرب اور اضطراب
کی عبارت پڑھ لی تھی۔ یہ بات نئی تھی کہ شوہر اپنی بیوی کو کسی دوسرے
مرد کے ساتھ رقص کرتے اور پینگ بڑھاتے ہوئے دیکھ کر تکلیف اور
تشویش میں مبتلا ہو جائے۔" نو آموز اور ناتراشیدہ لگتا ہے بے چارہ"، خوشہ چیں
نے دل ہی دل میں کہا" ورنہ فکر کے بجائے فخر کرتا کہ اس کی شریک حیات
پر لوگ جان دینے لگے ہیں، دورانِ رقص ہی کیوں نہ ہو۔" میاں جویا
سے نہ رہا گیا وہ دیکھنے والے کی نظر دیکھ رہے تھے اور خود بھی حظ
اندوز ہونے لگے تھے "آفریں ہے یار تم پر خودکشی کا سبق دیتے دیتے
رقص و رومان میں محو ہو گئے" جھینپتے ہوئے خوشہ چیں بولے "اجتماعی
خودکشی سے بچنے کا ایک راستہ اور ہے، چلو اسے بھی بند کرتے چلیں
وہ ہے اداروں کو چلانے کی صلاحیت۔ جب تک کوئی قوم اداروں
کو ڈھنگ سے چلا سکتی ہے وہ مر نہیں سکتی۔ ادارے انفرادی برائیوں
کی روک تھام کرتے ہیں اور اجتماعی ترقی کا انصرام۔ خدا جس قوم
کو فنا کرنا چاہتا ہے اس سے صحتمند قیادت کے علاوہ اداروں کو چلانے کی

صلاحیت بھی چھین لیتا ہے۔ خدا کے بندے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔"
جوہا نے اثبات میں سر ہلایا "دُور کی کوڑی لائے ہو، استاد ہمارے
یہاں دستور ہے کہ جو ادارہ چلائے گا، گالیاں کھائے گا، تہمت اٹھائے گا۔
اس کی نیت شجرہ اور نجی زندگی اور دیانت پر تابڑ توڑ اتنے حملے کیے جائیں گے
کہ اس غریب کے لیے سر چھپانا دشوار ہو جائے گا۔" "لیکن ایک اور مشکل راہ میں
حائل ہے" خوشہ چیں نے قدرے پریشانی کے ساتھ کہا "وہ ہے انسان کی عقل
اس کے سوچنے کی طاقت۔ عقل سوچنے اور غور کرنے سے باز نہیں آتی۔ غور
کرے گی تو بھلے بُرے کو سمجھنے لگے گی اور کبھی نہ کبھی راہ پر پڑ جائے گی۔"
اس بار جوہا نے عقدہ کشائی کی "ناحق پریشان ہوتے ہو میاں۔ ہم نے
مانا کہ عقل کو طاق پر نہیں بٹھا سکتے، اسے معطل نہیں کر سکتے لیکن اسے
غیر ضروری باتوں میں اُلجھا تو سکتے ہو۔ اسے اصول سے ہٹا کر فروعات کے دلدل
میں ڈال دو۔ لاکھ جتن کرے اس میں سے نکل نہ پائے گی پھنستی چلی
جائے گی۔ فضولیات، توہمات اور خرافات کی گرفت میں ایک بار عقل آگئی
تو ادراک اور بصیرت سے محروم ہو جائے گی۔ اُسے اس کا یارا ہی نہ رہے گا
کہ قوم کو فنا سے بچائے۔ مثلاً جب دو انسان ملتے ہیں تو جوش اور خوشی
کے ساتھ ایک دوسرے کی پذیرائی کرتے ہیں۔ کوئی آداب عرض کہتا ہے
کوئی سلام علیکم کہہ کر خیر مقدم اور خیر سگالی کرتا ہے۔ سلام کا مقصد ہے دلوں
کو ملانا، افراد کو جوڑنا۔ اس کا رُخ موڑ دو تو یہ دلوں میں بیر ڈال دے گا۔
افراد کو ایک دوسرے سے توڑ دے گا۔ افراد کو اس بحث میں اُلجھا دو کہ سلام
ہاتھ اُٹھا کر کیا جائے کہ ہاتھ چھوڑ کر یا یہ کہ سلام بآواز بلند کیا جائے یا ہاتھ کے
اشارے سے۔ اس بحث کو تیز و تند کر دو ـــ ـــ ـــ اس
قدر تیز کہ مسلسل جاری کہ قرار ہوتے ہی بنے اور افراد کشت و خون پر تل جائیں
اور صدیوں تک اپنا وقت اور صلاحیتیں اس مباحثے کی نذر کرتے رہیں اور
سبھی باتیں زندگی، ترقی بقا اور پیش رفت کے لیے ضروری ہیں انھیں بھول
جائیں۔ دیکھا آپ نے سلام کا مقصد فوت ہو گیا بلکہ اُلٹ گیا۔ کسی قوم کو
اصول سے ہٹا کر فروع میں اُلجھا دیجیے وہ ہمیشہ اپنے لیے مشکلات پیدا کرتی
رہے گی جن سے نجات دوسرے کے ہی ہاتھوں ملے تو ملے۔ ایسے لوگ پیڑ گنتے
ہیں اور جنگل اُن کی نگاہوں کی گرفت میں آتا ہی نہیں۔ یہ جزو کو کل پر اور نقطے
کو متن پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ فروع آشنا اصول سے منحرف رہتے ہیں۔ تناسب
اور تناظر سے محروم ہو جاتے ہیں نیک و بد کا انھیں شعور نہیں رہتا۔"

"بظاہر بہت سیدھے بنتے ہو اور بات اتنے پتے کی کہی،" خوشہ چیں نے زہر
کیا۔ "ایک خطرے سے تمھیں اور آگاہ کیے دیتا ہوں۔ قوم کی مجموعی حالت
بھی ہو خواہ کتنی ہی مفلس، جاہل، جھگڑالو، سطحی اور بے وقار کیوں نہ ہو اس
سے اُبھر کے کچھ لوگ ایسے ضرور نکلتے ہیں جو خوشحال پڑھے لکھے سنجیدہ سمجھدار
اور بااثر ہوتے ہیں۔ ہمیں کھٹکا ہے کہ یہ لوگ قوم کو سیدھی راہ نہ دکھا دیں
اسے مرنے اور مٹنے سے نہ بچا لیں یا مرض الموت کو طول نہ دے دیں۔" جوہا
پھر دستگیری کی "خوشہ چیں بھیا تم نہ گھبراؤ اگر قوم پسماندہ ہے تو یہ ترقی یافتہ
طبقہ اس کی اصلاح کے بجائے اس کے استحصال پر کمربستہ ہو جائے گا۔ اس
نعش پر کھڑا ہو کر اپنے قد کو اونچا کرے گا۔ اس کا نمائندہ بن کر اسے دھوکہ
دے گا اور حکومت وقت کا قرب حاصل کرے گا حکومت کو اطمینان دلائے گا
کہ جس جماعت سے اس کا تعلق ہے وہ خوشحال اور شاد ماں ہے اور
حکومت کے اقبال اور انصاف کے گن گا رہی ہے۔ یہ طبقہ گورکن کا درجہ
رکھتا ہے۔ قوم کی بالاقساط تدفین کرنا اس کا مشغلہ اور پیشہ ہے۔ اس طبقہ
سے بڑا یاور تمھیں اس مہم میں کوئی نہیں ملے گا۔ میرا کہا مانو تو اس سے
سازباز کر لو۔ یہ قوم کی جڑ کاٹنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ ہے۔ یہ وہ جنس گراں
ہے جو مصر کے بازار میں بکنے کے لیے سدا تیار ہے اور اس کی قیمت بھی کوئی ایسی
زیادہ نہیں چند ٹکڑے چاندی کے یا روٹی کے۔ یہ طبقہ بڑے کام کا ہے اس کی امداد
شریک حال رہی تو قوم کل کی مرتی آج مر جائے گی۔"
خوشہ چیں نے ستائش آمیز حیرت کے ساتھ جوہا پر نظر ڈالی اور کہا "اس
سلسلے کی ایک کڑی اب بھی رہ گئی ہے جس قوم کو ابدی نیند سُلانا ہے اس کو
آہستہ آہستہ حرکت اور محنت سے دُور لے جانا ہو گا۔ حرکت میں برکت ہے۔
محنت بار آور ہو کر رہتی ہے۔ جفاکشی میں توانائی چھپی ہوئی ہے۔ جو قومیں منزل
فنا کے لیے رخت سفر باندھ لیتی ہیں وہ محنت، حرکت، جدوجہد سے جی چراتی
ہیں، کاہلی، تن آسانی اور عیش و عشرت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہیں۔
بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ جس قوم نے اپنے عروج کے زمانے میں ایک
عالم کو تہ و بالا کر ڈالا، جس نے چشم زدن میں دنیا کو تسخیر کر لیا، علم و عمل دونوں
سے، وہی زوال کے زمانے میں خانہ نشیں ہو گئی، اپاہج ہو کر گھر میں بیٹھ رہی
اس طرح منجمد ہو کر گویا کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ جسے خود حرکت سے گریز ہو
اس کا لہو کب تک گردش میں رہے گا۔ ایسی قوم کے افراد سلامتی اور آرام
کا کلمہ پڑھتے ہیں، جستجو اُن کے دامنِ دل کو چھوتی نہیں، مہم جوئی سے

ابھی گریز ہوتا ہے ملک خدا اُن کے لیے تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ معذور ہو کر گھر میں بیٹھ جاتے ہیں اور اسی طرح ایک دن قبر میں اُتر جاتے ہیں، تن آسانی خانہ نشینی، عیش طلبی کا بھلا ہو۔ جانکنی کی مدت مختصر ہو جاتی ہے۔" اب جویا کی باری تھی۔

"ایک شاعر نے جسے مدتوں زعم رہا کہ وہ زوال کے سیلاب کو بند باندھ کر روک سکتا ہے، کہا تھا۔

یقین محکم، عمل پیہم محبّت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

سچ ہے جو قوم یقین کی دولت کھو بیٹھتی ہے وہ اپنی شخصیت کو محفوظ نہیں رکھ پاتی فنا ہو جاتی ہے۔ یقین سے ہی عمل کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ گماں کے صحرا میں قدم رکھا تو بھٹکنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کسی قوم کے یقین کو مجروح کر دو، اس میں نہ ولولہ باقی رہتا ہے نہ زندگی، نہ عمل کا جذبہ نہ آگے بڑھنے کی تمنا۔ شاعر نے بہت شور مچایا، زوال آمادہ، فنا بستہ قوم گُنگُنائی پھر سوگئی۔ بڑی رعایت کی اس کے اشعار گنگنانے لگی۔ اس سے بڑا طنز کیا ہوگا کہ جن اشعار میں عمل کی تلقین کی گئی ان اشعار کو ہی عمل کا بدلہ بنا لیا گیا۔ دھرے رہ گئے شاعر کے سارے عزائم۔ انقلاب برپا ضرور ہوا۔ لیکن زبانوں تک رہ گیا، حلق کے نیچے نہیں اُترا جس یقین کو بیابان کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی بننا تھا اس کی لو دھیمی ہوتی چلی گئی وہ بجھ گیا۔ حرکت اور جدوجہد کا جو صُور شاعر نے امنگ اور آرزو اور اعتماد کے ساتھ پھونکا تھا اسے سُن کر قوم نے کروٹ لی پھر اس طرح سوگئی کہ جاگنا حشر تک قسم ہے۔"

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ محفل میں کچھ شور بپا ہوا۔ ایک صاحب نے ضرورت سے زیادہ پی گئے تھے، قے کرنا شروع کی۔ شراب کے بھبکے پھر ان کی بدبو، تعفّن نے محفل آرائی کا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ عطر اور پرفیوم کی خوشبوئیں کافور ہو گئیں۔ ہمنشینوں کی شفاف اور جورجیٹ کی ساریاں داغ دار ہو گئیں۔ شاعر نے شہد کی تحقیر کی تھی، اُسے مگس کی قے کہہ کر اس کی قے کا موازنہ اشرف المخلوقات کی قے سے کیجیے تو انسان کی قلعی کھل جائے اور فضیلت کا دعویٰ خاک میں مل جائے۔ وہ بھی جس کے دامِ خیال میں سارا عالم آگیا تھا یہاں چوک گیا۔ گُن گاتے ہوئے وہ بھول گیا کہ قے آوردہ مے ہے۔

محفل اتنی بدمزہ ہوئی کہ دونوں دوست کنکھیوں سے محفل کے ارباب و اصنام کو دیکھنا بھول گئے۔ پایان کار جویا نے حیرت اور ستائش کے ساتھ خوشہ چیں سے کہا "آفریں ہے بھائی صاحب آپ کی فراست اور طبّاعی پر۔ اجتماعی خودکشی کے پے در پے اتنے بہت سے طریقے آپ کے ذہن رسا نے ڈھونڈھ نکالے۔" خوشہ چیں نے برائت کے طور پر کانوں پر ہاتھ رکھے اور کہا "حاشا و کلّا، حالیہ تحقیقوں کی طرح جن کا ذکر آگے گزرا ان میں سے ایک نکتہ، ایک طریقہ ایک بات بھی طبعزاد نہیں ہے۔ تحقیق کے مقالوں کی طرح میں بھی یہ اوراق اٹھا لایا ہوں۔ اب چاہے تم سے سرقہ کہو چاہے نقل، چاہے دیدہ دلیری۔" "پہیلیاں کیوں بجھواتے ہو" جویا بولا "یا شاید انکسار اس لیے کر رہے ہو کہ تعریف سے دل نہیں بھرا۔ ہم نے تو کسی کتاب یا رسالے میں اجتماعی خودکشی درکنار انفرادی خودکشی کے طریقوں پر مضامین نہیں دیکھے۔"

خوشہ چیں نے کہا "بھائی میرا نام ہی اس کی ضمانت ہے کہ میری کوئی بات طبعزاد نہیں ہوگی۔ جو کچھ میں لکھوں گا خوشہ چینی کرکے لکھوں گا لیکن نقل کے لیے عقل درکار ہے شاید تھوڑی سی میری گرہ میں ہو۔ میں کتابوں سے نہیں قدرت سے نقل کرتا ہوں مطالعہ کرکے اوراق نہیں بھرتا۔ مشاہدہ اور تجربے کو صفحات پر منتقل کر دیتا ہوں تم سے کیا چھپانا، اپنے مضمون کا ماخذ بتائے دیتا ہوں۔ بھائی میرے، میرے ہاتھ میں نہ قلم ہے نہ موقلم۔ ایک آئینہ ہے جسے میں نے بظاہر ایک جیتی جاگتی قوم کے سامنے رکھ دیا ہے۔ جو کچھ تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے، جو کچھ میں قلمبند کروں گا وہ عکس ہے ایک ایسی قوم کا جو مٹنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ ہر وہ ڈھنگ اختیار کر رہی ہے جو اسے فنا کی منزل تک پہنچا دے۔ دنیا کی تاریخ میں کب کسی قوم نے مرنے کے لیے اتنے سامان فراہم کیے ہونگے۔ رہتی دنیا تک خودکشی کرنے والی اقوام خودکشی کے ان طریقوں پر کوئی اضافہ نہ کر سکیں گی۔ خدا گواہ ہے میں نے اس فنا آمادہ قوم کے سامنے آئینہ اس لیے رکھا کہ اس کی تصویر بلا کم و کاست سامنے آجائے۔ نکتہ چینوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں نے آئینہ چہرے کے سامنے یہ دیکھنے کے لیے رکھا کہ سانس آرہی ہے یا مریض دم توڑ چکا"، نکتہ چینوں سے کسی کو مفر نہیں۔ خوشہ چینوں کو بھی۔" جویا نے حسرت بھرے انداز میں کہا اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہوا چلا گیا۔ ٭

علام سیر ای

چاسر اور کینٹربری ٹیلس

(ایک مختصر تعارف)

جیوفرے چاسر

ولادت:۔ ۱۳۴۰ مقام : لندن

زمانہ: شاہ ایڈورڈ سوم

وفات : ۱۴۰۰ مدفن: ویسٹ منسٹر ایبی

زمانہ:۔ شاہ ہنری چہارم

جیوفرے چاسر کے والد لندن میں شراب کے تاجر تھے۔ ان کی رسائی شاہی خاندان میں بھی تھی۔ اسی وجہ سے جیوفرے چاسر سترہ سال کی عمر میں پیج[1] ہی حیثیت سے شاہی خاندان میں شاہ ایڈورڈ سوم کی بہو کے یہاں ملازم ہو گئے۔ بعدازاں فوج کے سپاہی، سفارت خانہ کے کارکن، ممبر پارلیمنٹ، کسٹم کے افسرِ اعلیٰ اور درباری شاعر کی حیثیت سے وہ شاہی خدمات انجام دیتے رہے۔ شاہی خدمات کے ہی سلسلہ میں انھوں نے فرانس اور اٹلی کا دورہ بھی کیا۔ جس طرح ان کی اوائل عمری اور تحصیل علم کا حال دھندھلکوں میں غائب ہے، اسی طرح ان کی بیوی فلپّا روئٹ کے بارے میں بھی معلومات کا فقدان ہے کہا جاتا ہے کہ فلپّا روئٹ چاسر کی معاون جان آف گانٹ کی تیسری بیوی کی بہن تھی۔ جس کو ملکہ کی جانب سے شادی کے موقع پر شاہی پنیشن بھی عطا کی گئی تھی۔ جان آف گانٹ کا لڑکا ہنری چہارم جب تخت نشیں ہوا تو اس نے بھی چاسر کے لیے پنشن منظور کی تھی۔ چاسر کی زندگی کے آخری دور میں وقتی دشواریاں پیدا ہوئی تھیں۔ باقی ساری زندگی خوشحالی میں بسر ہوئی۔

چاسر کو انگریزی ادب میں "بابائے شاعری" کہا جاتا ہے اور اُن کے ہم عصر جان وکلف کو "بابائے نثر" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

وکلف نے انجیل کے ترجمہ اور مذہبی اصلاحی اشتہارات کے ذریعہ انگریزی زبان کی صلاحیتوں کو اس وقت اُجاگر کیا جب کہ عام طور سے مذہبی معاملات کے اظہارِ خیال میں اطالوی زبان کا تسلط تھا۔ ترجمہ کے سلسلے میں سر جان مانڈیوائیل کا نام بھی صفِ اوّل میں آتا ہے۔ چاسر کے ہم عصروں میں جان گاور اور ولیم لینگ لینڈ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ جان گاور اور چاسر ہم عصر اور درباری شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی تھے جو کچھ عرصے بعد بدظنی کا شکار ہو گئے تھے۔ گاور کی دو طویل نظمیں فرانسیسی اور لاطینی زبان میں ہیں۔ تیسری نظم کنفیشیو امانٹیس انگریزی زبان میں ہے مگر وہ چاسر کی دلکشی، چاشنی اور شگفتہ بیانی کے مقابلے میں بے رنگ، بے رس اور بے لطف ہے۔ لینگ لینڈ بھی چاسر کی طرح ایک عوامی شاعر تھا۔ اس کی طویل تمثیلی نظم "The Vision of William Concerning Piers The Plowman" تقریباً پندرہ ہزار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اپنی عظمت کے باوجود یہ نظم چاسر کے کلام کینٹربری ٹیلس کی ہم سری نہیں کر سکتی۔ دونوں شعراء کے یہاں چودھویں صدی کی حقیقی تصویر کشی ہے۔ مگر لینگ لینڈ مذہبی اِصلاح 'تازیانہ' کے ضرب سے کرتا ہے۔ جب چاسر محبت سے طنز کے نشتر لگاتا ہے۔ لینگ لینڈ کی یہ نظم 'خواب' سے شروع ہوتی ہے اور 'خواب' ہی کی طرح بے ربط، موہوم اور خیالی ہے۔ اس کے پڑھنے سے حقیقت بیانی اور سوز و گداز کی تاثیر کے ساتھ ساتھ موہومیت اور مافوقیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس کی شدید اخلاقی اور اصلاحی ہم آہنگی اس کی کمیوں کی تلافی کر دیتی ہے۔ پھر بھی زبان اور اسلوب بیان چاسر سے کہیں زیادہ فرسودہ، ناتراشیدہ اور ابتدائی ہیں۔ تلفظ اور الفاظ

---

[1] Page پیج شاہی خاندان کا امراء کا نو عمر خدمتگار عموماً وردی پوش۔ جس کے سپرد چھوٹے موٹے کام ہوتے ہیں۔

ساخت میں جنوبی اور وسطی علاقائی انگریزی کا رنگ نمایاں ہے —
نگلوسیکسن اصول تجنیس نفظی کے تحت کہی گئی یہ اپنے زمانے کی آخری
یم نظم ہے۔

نشاۃ ثانیہ جو سولہویں صدی کا طرۂ امتیاز ہے اٹلی اور فرانس
گزرتا ہوا انگلینڈ پہنچا تھا۔ اس کی بنیاد تقریباً دو سو سال پیشتر چاسر
رکھی تھی۔ اٹلی اور فرانس میں نشاۃ ثانیہ کا قدم جم چکا تھا اور ایک
زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس وقت چاسر وہاں پہنچے اور وہاں کے
ی از ادبی کارناموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی سے چاسر
جدید کا پہلا آدمی "کہا گیا ہے۔ چاسر نے روایتی اور قرونِ
طی کے مروج نہج کو ترک کر کے "مافوقیت" کی جگہ "انسانیت اور
ریت" کو دی اور "مقامی" کی جگہ "آفاقی" اور "عالمگیری"
پیدا کر دیا۔ زبان کو شستہ، صاف، واضح، مدلل، تراشیدہ
آسان پیرایہ میں ڈھال کر الفاظ میں نکھار پیدا کیا اور تلفظ میں
سیقیت کی بنا ڈالی۔ شمالی، جنوبی اور مغربی علاقائی انگریزی کو
باد کہہ کر مشرق وسطی کی علاقائی انگریزی کو اپنایا۔ اس کا سلسلہ
ب اینگلوسیکسن زبان سے ملتا ہے۔ بعد ازاں یہ زبان مختلف
رج طے کرتی ہوئی دورِ حاضر تک پہنچی۔ اور ٹی۔ ایس ایلیٹ
ے مسلمہ زبان کے استعمال میں ہے۔ چاسر نے قدیم یونانی دیوی،
ماؤں، پریوں دیووں اور سورماؤں کی دنیا کو اپنے کلام کا
موضوع بنایا۔ حقیقی کردار نگاری یقیناً چاسر کی ایک ایسی دین ہے
مد میں انگریزی ادب کی امتیازی خوبی بن کر ڈرامہ اور ناول میں
ہوئی۔

چاسر کے اسلوب بیان میں حکایتی، مکالماتی اور جدت پسندی
ل نمایاں ہے۔ وہ "مخالف میں یگانگت" کا رنگ ایک مصور کی
بھر کر حقیقی مرقع پیش کرتے ہیں۔ سیدھے سادھے الفاظ میں جو
دیکھتے ہیں جس حالت میں دیکھتے ہیں، اسی طرح قلم بند کر دیتے ہیں
بری ٹیلس میں چودھویں صدی کی عکاسی کے لیے انھوں نے
دبی صنعتوں اور ترکیبوں کا استعمال کیا ہے۔ مماثلت اور معکوسیت

رہنما مینار

"اب ایک صورت ہے کہ ان بزرگ اور اولو العزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے، پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں جھیلیں اور دکھ سہے، اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت اور رہنمائی کا کام دیں گے۔ ان کی قربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے"! — مولوی عبدالحق

کے لیے وہ سکۂ رائج الوقت کے دونوں رُخ، ایک وجود کی دو شکلیں
ایک ساتھ پیش کرتے ہیں۔ پس منظر میں "کیا ہونا چاہیے" اور منظر
در پیش "کیا ہے" کی نمائش اس طرح کرتے ہیں کہ اس زمانے کی سچی
تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ اس فنی ترکیب کا استعمال
وہ شروع ہی سے کرتے ہیں۔ موسم کے لیے بہار اور خزاں، مہینہ کے
لیے اپریل اور مئی، زمانہ کے لیے باپ اور بیٹے کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر
اچھے کردار نائٹ، پلاؤمین اور کلرک[1] کے مقابلے میں باقی سارے
کرداروں کی تشریح کرتے ہیں۔ ایک اور نکتہ۔ قافلۂ زائرین کا ہے
جو سینٹ تھامس ایبک کی درگاہ کی زیارت کرنے کے لیے کینٹربری
جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ زائرین کا مقصد مقدس ہے مگر عملاً بیشتر زائرین
فاسق اور فاجر نظر آتے ہیں۔ اپنے بیان میں صداقت، وضاحت اور
اثر پیدا کرنے کے لیے چاسر تشبیہ و استعارہ، مماثلت اور موازنہ،
طنز و تعریض، اشارہ و کنایہ، ظرافت اور بذلہ سنجی کا استعمال ایک
ماہرِ فن کی طرح کرتے ہیں۔ اکثر بظاہر الٹی مگر درحقیقت صحیح بات کہہ
کر بیان میں مزاح اور زور پیدا کرتے ہیں۔

---

[1] Clerk کلرک۔ نائب پادری یا وہ اسکالر جو پادری بننے کے لیے مذہبی تعلیم حاصل کرتا ہے۔

زندہ زبان کی پہچان

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانے میں اردو لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں مگر ان کو غور کرنا چاہیے کہ زندہ زباں میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے مردہ کہلاتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہل زبان کا کام ہے مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہل زبان غیر زبان کے الفاظ کو ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضے میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچی کاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہل زبان کے سوا دوسرے سے نہیں ہو سکتی اور نہ سب اہل زبان سے بلکہ صرف اس سے جسے خدا نے یہ ملکہ دیا ہو۔ (سرسید)

چودھویں صدی کا یہ 'جہاں دیدہ' درباری شاعر ایک ایسی تخلیق میں فکر میں ہمیشہ رہا جو 'جہاں نما' ہوا اور اپنی مثال آپ ہو۔ چاسر کی ادبی زندگی تین زمانوں میں منقسم ہے۔ فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی۔ ان زمانوں پر مشتمل تخلیقات کی حیثیت "مقتدی" کی سی ہے۔ کینٹربری ٹیلس چاسر کے کارناموں میں آخری ہے اور "امام" کی حیثیت رکھتا ہے۔ داستان گوئی کا رواج اس زمانہ میں کم نہ تھا مگر کینٹربری ٹیلس کا انداز بیان اور اس کے پلاٹ کی ہم آہنگی کا مقابلہ شیکسپیر ہی کر سکتا ہے۔ گاور کی کہانیوں کا مجموعہ کنفشیو امانٹس ایک شخص کی بیان کردہ ہیں۔ بوکاشیو کے داستان گو، گو کئی ہیں مگر سب میں عصری اور طبقاتی یکسانیت ہے۔ چاسر کا یہ واحد کارنامہ ہے جس میں سماج کے تقریباً ہر طبقہ کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اُن کے فن کا یہ کمال ہے کہ وہ اس مجموعہ کلام میں کہیں بھی ناصح یا نقاد کی حیثیت سے نظر نہیں آتے۔ حالاں کہ اُن کا جائزہ تنقیدی اور نصیحت آمیز ہے۔ لینگ لینڈ کی طرح ترش، رہبرانہ اور خطابی نہیں ہے۔ چاسر کے یہاں پردہ داری میں پردہ دری ہے۔

کینٹربری ٹیلس کا ڈھانچا بناتے وقت چاسر کے ذہن میں ایک سو بیس داستانیں تھیں جنھیں تیس زائرین لندن سے کینٹربری تک سفر کے دوران کہتے۔ ہر زائر دو کہانیاں جاتے وقت اور دو کہانیاں سفر سے واپسی میں کہتا۔ اسی منصوبے کے تحت چاسر اٹھائیس زائرین کی انجمن "ٹیبرڈ اِن" (ایک سرائے) میں آراستہ کرتے ہیں۔ زائرین کی زمرہ میں سرائے کا مالک بھی شریک ہو جاتا ہے۔ سفر کے دوران ایک مسافر اور مل جاتا ہے اس طرح تیس زائرین پر مشتمل یہ قافلہ زیارت گاہ کی جانب کینٹربری روانہ ہوتا ہے۔ لیکن "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ" کے مصداق چاسر کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اپنا یہ شاہکار نامکمل چھوڑ گئے۔ صرف چوبیس کہانیوں کا یہ مجموعہ ہے جس میں دو ادھوری ہیں۔

زائرین کے زمرہ میں دو سماجی طبقے — اعلیٰ ترین امراء کا اور کمترین مزدور کا، قصداً شریک نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ ان طبقوں کے لوگ اِس طرح سفر نہیں کرتے تھے۔ نائٹ، تعلیم یافتہ پیشہ کے لوگ، زمیندار، قرونِ وسطیٰ کے جاگیردار، کسان، ترقی پذیر درمیانی درجہ کے لوگ، تاجر، باورچی وغیرہ کے علاوہ کلیسائی نظام اور رہبانی زندگی کے نمونے روشن میناروں کی طرح اس نگار خانہ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

کلیسائی اور خانقاہی زندگی کے رگ و ریشہ میں روپوش خباثت کا پردہ چاک کرنے کے لیے چاسر نے اس انداز میں سیرت نگاری کی ہے کہ سارے کردار اپنی مطابقت، انفرادیت اور نمائندگی کی بنا پر شیکسپیر کے کرداروں کی طرح ہمیشہ، ہر زمانے میں اور ہر ملک میں زندہ رہیں گے۔ کلیسا اور اس کے خدّامِ صالح، کے زمرے میں آتے ہیں۔ مگر حقیقتاً پورا ڈھانچا بدچلنی کی غلاظت میں ڈوبا ہوا ہے۔ ظاہر اور باطن کا موازنہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے حقیقی تصویر چلتی پھرتی، بولتی چالتی، آپس میں جھگڑتی کرتی نظر آتی ہے۔ دھوکے کی دیوار خود بخود گرنے لگتی ہے۔ خواب بکھرنے

لگتے ہیں طلسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے پردہ اُٹھنے لگتا ہے
اور حقیقت ٹھوس بن کر ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اسی قسم کا ایک کردار
چاسر کینٹربری ٹیلس میں پارڈنر[1] کا پیش کیا ہے۔ خادم کلیسا عابد
زاہد اور راہب ہونے کی بجائے 'کیا ہے؟'۔ اس سلسلے میں پارڈنر
لنے کے جھونک میں اپنے 'چور راستوں' کا تذکرہ خود کر دیتا ہے اور
سمجھتا ہے کہ وہ اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے۔ اس جگہ چاسر ایک مصوّر
کی طرح سفید کینوس پر کالے کالے کارناموں کی نقاشی اس خوبی سے
کرتے ہیں کہ نقش و نگار از خود قابل تضحیک نظر آنے لگتے ہیں۔ پارڈنر
اپنا کچا چٹھا کہہ لینے کے بعد انھیں زائرین سے روپے اینٹھنے کی کوشش
کرتا ہے۔ نتیجہ میں اسے ہتک آمیز باتیں سننی پڑتی ہیں اور چاسر کا کلام
ہجو ملیح سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

پارڈنر کی کہانی کا ماحصل ہے کہ "محبتِ زر برائی کی جڑ ہے"
مگر پارڈنر دوسروں کے دل میں ایمان کی گرمی پیدا کر کے اپنی حرص
طمع کا پیٹ بھرنے کے لیے یہ داستان کہتا ہے۔ اس داستان میں
روحانی بے بصری اور روحانی موت کا پہلو نمایاں ہے۔ 'موت' کا تصوّر
نٹربری ٹیلس میں ابتدا ہی سے کارفرما ہے۔ 'سرائے' 'قافلہ'
سفر، کہانی، آپ بیتی یا حساب زندگی، سب چند روزہ زندگی
ے موت کی طرف، وقتی سے ابدی مرکز درس گاہ شاہ تھامس
ٹ کی جانب رواں ہیں۔ پارڈنر کی کہانی میں 'موت کی تلاش'
معنی ہے۔ نزول آدم اپنے ساتھ روحانی اور جسمانی موت بھی لایا
ن انسان اپنے عمل سے پیغمبروں، شہیدوں، ولیوں اور
بدالوں کی طرح غیر فانی بھی ہو سکتا ہے۔ کہانی کے تین اوباش
نوجوان' دراصل روحانی نوجوان نہیں ہیں۔ وہ مادہ پرست
جوان ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات دل کھول کر پوری کرتے
ں۔ شراب نوشی کے دوران روحانی موت کی فضا میں جنازہ کے
ساتھ بجتی ہوئی گھنٹی کی آواز پہلی مرتبہ ان کے سامنے جسمانی موت کی
بھیانک شکل لا کر کھڑی کر دیتی ہے۔ 'سونا' روحانی موت کی علامت
ہے۔ کہتے ہیں کہ جنت میں سانپ کا رنگ بھی سنہرا تھا۔ کہانی میں
بوڑھا آدمی ان نوجوانوں کو 'سیدھے' کے بجائے 'ٹیڑھے' راستے
پر ڈال دیتا ہے جو انھیں شاہ بلوط کے درخت کے پاس لے جاتا
ہے۔ شاہ بلوط کا درخت بہشتی شجرِ ممنوعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے
جس کے نیچے آدمؑ اور حوّاؑ دونوں روحانی بے بصری کے شکار ہو گئے
تھے۔ اور ضمنی طور پر انھیں روحانی اور جسمانی موت ملی تھی۔ اس
طرح شاہ بلوط کا درخت بھی موت یا بُرائی کا درخت ہے جس کی
جڑ میں ان اوباشوں کو خزانہ ملتا ہے۔

بہر حال پارڈنر کی کہی ہوئی کہانی کینٹربری ٹیلس موضوع
کے اعتبار سے بہترین ہے۔ چاسر 'مفقود' کو 'موجود' اور
'غیر حاضر' کو حاضر کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کا کھوکھلا سماج اخلاقی
قدروں سے سنور جائے۔ یہی ان کی قومیت کا جذبہ ہے۔

لکھنے کا مقصد

"ہم کیوں لکھتے ہیں؟ اسی لیے کہ ہمارے خیالات دوسروں تک
پہنچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں۔ تو جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں
لوگ ہماری تحریر کو پڑھیں گے۔ اسی نسبت سے اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوگا۔
اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ تحریر آسان زبان میں ہو
اور ایسے پیرایے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ اسے شوق سے پڑھ سکیں۔ اگر مشکل
زبان میں ہوئی، تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، اور اسے مقبولیت
حاصل نہ ہو گی۔ اگر آپ دنیا کے ایسے ادیبوں کی فہرست بنائیں جنھیں
قبولِ عام حاصل ہے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں یہ عزّت انہی مصنّفوں
کو ملی ہے جنھوں نے اپنے خیالات آسان زبان میں ادا کیے ہیں۔

—— مولوی عبدالحق

[1] Pardoner۔ پارڈنر۔ کلیسا کی جانب سے مقرر کیا ہوا وہ شخص جس کو اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں سے روپیہ لے کر اُن کے گناہوں کو معاف کر دے۔

ظہیر الدین احمد
معلم دینیات، ایس ٹی ایس ٹی ہائی اسکول،
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انسان کی حقیقت

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات بے نیاز اور خالقِ کائناتِ کل ہے۔ عرش سے فرش تک کی جملہ مخلوقات کی کنہہ وحقیقت سے واقف ہے۔ توجو ذات ی جامع صفات والی ہو تو اس کا ہر حکم اور ہر بات حقیقت اور حکمت سے پُر ہوگی۔ اب ملاحظہ فرمائیں قرآن حکیم کی ان آیتوں کو جو سورہ دہر کی سب سے پہلی اور دوسری آیت ہے اس میں اللہ تعالیٰ کس طرح سے انسان کی ابتدائی اور انتہائی حالت کی حقیقت واضح فرما رہا ہے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ٥ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ٥

[کیا انسان پر ایک ایسا زمانہ نہیں گزرا۔ جب کہ وہ قابلِ تذکرہ بھی نہ تھا۔ پھر کتنے ہی درطے کرکے نطفہ کی شکل میں آیا۔ وہ حالت بھی اس کی موجودہ شرافت وکرامت کو دیکھتے ہوئے اس قابل نہیں کہ زبان پر لائی جاتی! بیشک ہم نے انسان کو ایک دو رنگی بوند سے پیدا کیا ہے۔ یعنی نطفہ سے جما ہوا خون، پھر اس سے گوشت کا لوتھڑا بنایا۔ اسی طرح کئی طرح کے الٹ پھیر کرنے کے بعد اس درجہ میں پہنچا دیا کہ اب وہ کانوں سے سنتا اور آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور اُن قوتوں سے وہ کام لیتا ہے جو کوئی دوسرا حیوان نہیں لے سکتا ایک نطفۂ بے جان سے انسان عاقل بن گیا۔]

یہ تو ہے ہمارے وجود کی حقیقت کہ کس ناپاک نطفہ سے پیدا ہوکر اشرف المخلوقات بن گئے۔ تو اب قابل غور یہ ہے کہ ہم سب کو اشرف المخلوقات ہونا تو برابر پیشِ نظر ہے مگر انجس المخلو[قات] سے زیادہ ناپاک ہونا پیش نظر نہیں۔ اسی حقیقت سے ہم ناآ[شنا ہیں] جس کی معرفت اللہ تعالیٰ نے کرائی ہے کہ اے انسانو! پہلے [اپنی] معرفت حاصل کرلو۔ تب ہی تم مجھ کو پہچان سکوگے۔ جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ سے ہمیں معرفت [کرائی] مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی جو شخص اپ[نی ذات] کا عارف ہوگیا تو یقیناً وہ اپنے رب کا بھی عارف ہوگیا۔ اِ[س] سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خدا کا عارف بننے کے لیے اپ[نا عارف] بننا ہوگا۔ یعنی اپنی حقیقت پیش نظر رکھنی ہوگی۔ جیسے علت سے معلول کا وجود۔ سبب کے وجود سے مسبّب کا وجود لازم [ہے ویسے ہی نعمت] کی معرفت سے منعم کی بھی معرفت لازم ہے۔ انسان جب اپنی حقی[قت پر] غور کرے گا اور اس کو اپنی محتاجی اور کمزوری اور ناپاکی کی [معرفت] ہوگی۔ پھر ان سب احتیاج وکمزوری اور ناپاکی کے باوجود اپنی اس[تعداد] وصلاحیت کے گوناگوں صفات سے متصف ہونے کی جب دوسری [معرفت] ہوگی تو لازماً ان سب کے خالق کامل کی بھی معرفت اور قدر ہو[گی۔ اسی] وجہ سے معلم انسانیت نے یہ جملہ فرمایا کہ

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

اسی انسان کی حقیقت کو اور واضح کرنے کے لیے ایک ناصح بزر[گ کا] واقعہ سناتا ہوں جس کو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے موا[عظ میں] لکھا ہے کہ ان بزرگ نے ایک جوان کو دیکھا کہ اکڑ کر چل رہا ہے [تو انہوں] نے اس کو ٹوکا کہ ذرا سنبھل کر چلو۔ وہ کہنے لگا تم جانتے نہیں [میں] کون ہوں۔ فرمایا۔ ہاں میں خوب جانتا ہوں۔ کہنے لگا بتلاؤ کہ [میں کون] ہوں۔ آپ نے فرمایا۔

اَوَّلُكَ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَاٰخِرُكَ جِيْفَةٌ قَذِرَةٌ وَاَنْتَ

ذالک تحمل العذرۃ ۔ یعنی تمہاری ابتدا تو ایک ناپاک نطفہ ہے
اور تمہاری انتہا ایک سڑی ہوئی لاش ہے کہ مرنے کے بعد تمہارے اندر
ہزاروں کیڑے پڑ جائیں گے اور مردہ لاش میں ایسی بدبو آئے گی کہ
کوئی پاس بھی نہ پھٹک سکے گا۔ اس لیے شریعت نے حکم دیا ہے کہ
مر جانے کے بعد دفن میں جلدی کرو۔ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ
مسلمان مردہ کو ایسی حالت میں اپنے سے جدا کیا جائے کہ کوئی بات
موجب نفرت اس کے اندر نہ پیدا ہو۔ دیر کرنے میں اندیشہ ہے کہ
لاش پھول جائے، اس میں سے بدبو آنے لگے اور اس حالت کو دیکھ کر
لوگ اس کو حقارت سے دیکھیں۔ جو اکرام میّت کے منافی ہے۔ غرض یہ
تمہاری انتہائی حالت ہے جس میں بڑے سے بڑا عاشق بھی لاش کو
جلدی دفن کر دینا ہی چاہے گا۔

اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تم ہر وقت پاخانے کا ٹوکرا
ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہو۔ کیوں کہ تمہاری آنتوں کے اندر نہ معلوم
کتنے سیر پاخانہ بھرا ہوا ہے۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اُس نے آنتوں
کو ڈھکا بنا دیا ہے کہ اس میں پاخانہ بھرا ہوا ہے مگر پاس بیٹھنے
والوں کو کچھ بھی خبر نہیں ہوتی۔ واقعی اگر آنتوں میں قوّت ماسکہ
(رکنے کی قوّت) نہ ہوتی جس کی وجہ سے پاخانہ کو روکے رکھتی ہے
اور ایک معیّن وقت میں سارے کو باہر نکال دیتی ہے تو ہماری کیسی
ی گت بنتی۔ بس ہر وقت موری سے پاخانہ بہا کرتا۔ چنانچہ جب
سی مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے یہ قوت ماسکہ کمزور ہو جاتی ہے تو
س شخص کے تیماردار بھی گھبرا جاتے ہیں اور سارا گھر بدبو سے سڑ جاتا
۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نے قوّت ماسکہ رکھ
ی۔ ورنہ ہر وقت نجاست بہا کرتی۔ پھر دیکھو انسان کے بدن میں
وں مسامات ہیں جن سے پسینہ نکلتا ہے۔ یہ خدا کی کتنی بڑی
ت ہے کہ ان مسامات سے پاخانہ کا عرق بھی باہر نہیں آتا۔ اگر مسامات
پاخانہ نکلا کرتا تو زندگی موت ہو جاتی۔ تو یہ محض خدا کی رحمت کی وجہ
، آپ بنے ٹھنے پھرتے ہیں۔ ورنہ آپ کے اندر اتنی غلاظت بھری ہوئی
کہ اگر برابر نکلنے لگے تو اس وقت اس زینت و آرائش کی ساری مٹی
ہو جائے۔ غرض ان بزرگ نے خوب ہی جواب دیا کہ میں جانتا
ں کہ تو کون ہے۔ بس تیری حقیقت تو یہ ہے کہ آگے خدا کی ستّاری

ہے کہ اُس نے تیرے پیٹ کو ڈھکا ڈھول بنا دیا ہے۔ تو کیا اس
کا یہی شکر ہے کہ تو فرعون کی طرح اکڑ کر چلے۔ اسی وجہ سے اللہ تعا
نے اپنی کتاب قرآن مجید میں بندوں کو نصیحت کی کہ
لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا۔ یعنی تم زمین پر اکڑ کر نہ
چلو۔

دیکھا آپ نے اس متکبّر شخص کو ان بزرگ نے انسان کی معرفت
کس طرح کرائی۔ ایسے تو دنیا کی تمام چیزیں معرفت کے قابل ہیں۔ بلکہ
انسان تو انسان درختوں اور اس کے پتوں میں بھی خدا کی معرفت کا
ایک ایک دفتر موجود ہے۔ اسی کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شعر
میں اس طرح کہا ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

(یعنی سبز درختوں کا ہر پتہ عارف کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی
معرفت کا ایک دفتر ہے)۔

تو شیخ سعدیؒ جو درختان سبز کو معرفت کردگار فرما رہے ہیں
اس میں 'نظر ہوشیار' کی قید بھی تو لگی ہوئی ہے اور ہوشیار کی نظر اس
وقت ان معارف کی طرف جاتی ہے جب کہ وہ خود اپنے نفس وحقیقت کا
عارف ہو جاتا ہے۔ پھر تو وہ خود اپنے اندر بحر روح اور بحر نفس کے دو
سمندر دیکھتا ہے۔ جب بحرِ روح میں طغیانی آتی ہے تو 'انا الحق' کی آواز
نکلنے لگتی ہے اور جب بحرِ نفس میں طغیانی آتی ہے تو انا ربکم الاعلیٰ
کا دم بھرنا شروع کر دیتا ہے اور جب دونوں بحروں میں اعتدال
ہوتا ہے تو 'مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان'
کی کرامت ظاہر ہوتی ہے جو سب سے بہتر حالت سمجھی جاتی ہے۔

الغرض انسان جب بھی اپنی حقیقت پر نظر رکھے گا تو اسے ایک اعتدال
کی دولت نصیب ہوگی جو اسے افراط و تفریط سے محفوظ رکھے گی اور
وہ دنیا میں صحیح معنوں میں انسان کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ
عبدیت کا بھی حق کامل طور پر بجا لائے گا۔ جس سے بندہ دنیا و
آخرت دونوں جگہ سرخرو کہلائے گا اور اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب
ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو معرفتِ نفس عطا فرمائے

وما علینا الا البلاغ

صطفیٰ شروانی
۳-۶، حمایت نگر، حیدرآباد

سر سیّد کا سفرِ پنجاب

تہذیب الاخلاق میں جناب سیّد حامد کے بامقصد سفر کا حال پڑھا تو
مرحوم کے وہ سفر یاد آئے جو قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے کیے گئے ان
ایک اہم سفر، سفرِ پنجاب بھی تھا۔

سرسیّد احمد خاں مرحوم نے ۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء تا ۱۰ فروری
۱۸۸۴ء ہجری سنہ کے مطابق ایک سو چار سال قبل ۱۳۰۱ھ میں کیا
ں کی بڑے دلچسپ پیرایہ میں مولوی سیّد اقبال علی صاحب قائم مقام
ج بارہ بنکی اودھ نے "سرسید کا سفرنامۂ پنجاب" کے عنوان سے اپنی
صنیف میں تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ اس سفرنامے کی اہمیت دوبالا
تی ہے جب پہلے ہی نسخے پر مطبع کا نام " علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس"
بع و ناشر کا نام "لالہ گلاب رائے" نظر آتا ہے۔ دیباچہ زبانِ
میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا ہے جس میں سفر اور سفرنامے کی غایت
انا شبلی نے یوں روشنی ڈالی ہے۔

"این سفرنامہ احمدی کہ مولوی سیّد اقبال علی صاحب بہ
تسوید او ہمت گماشتہ شک نہ تواں کرد کہ در نوردِ این
فرآنچہ از حالات و واقعات پیش آمدہ است مردِ ہوشمند
ہمین نتیجہا از و تواند گرفت و کسے را کہ درد اسلام داشتہ
بر نصرت و یاوری اسلامیان تواند انگیخت ۔"

سرسیّد کے اس تاریخی سفرِ پنجاب کے متعلق مولف سفرنامہ سیّد
لی صاحب اپنے پیشِ لفظ میں لکھتے ہیں۔

" یہ سچ ہے کہ کوئی محبِ قوم اور کوئی ریفارمر کسی زمانہ میں
ایسا نہیں گزرا کہ جس کے ساتھ اس زمانہ کے لوگوں نے
بدسلوکی نہ کی ہو اور اس کو لعنت و ملامت کا نشانہ نہ بنایا
ہو۔ مگر اس زمانہ میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اُن کی
نہایت قدر کرتے تھے اور ان کی کوششوں میں شریک
ہوتے تھے ــــ پنجاب کے لوگوں نے ثابت کر دیا کہ وہ
قومی بھلائی میں کوشش کرنے والے، قومی ہمدردی کرنے
والے، قوم کی ترقی چاہنے والے اپنے زمانہ کے ریفارمر
کی کیسی قدر کرتے ہیں۔"

پنجاب کے اس تاریخی سفر میں سرسیّد علیہ الرحمۃ کے ہمراہ حاجی اسمٰعیل
خاں شروانی رئیس دتاولی، سیّد اقبال علی صاحب منصف بارہ بنکی [مصنف
سفرنامۂ پنجاب] سید محمد علی اور دہلی کے ایک رئیس محمد اکرام اللہ ہمرکاب
تھے۔ ۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو یہ مختصر مگر قوم کا نقیب قافلہ علی گڑھ سے
روانہ ہوا اور ۲۳ جنوری ۱۸۸۴ء کو لدھیانہ پہنچا۔ سرسیّد نے اپنے
دورانِ سفرِ پنجاب جو تقاریر کیں ان کے بارے میں صاحب سفرنامہ پنجاب
لکھتے ہیں:۔

" ان کا [سرسید علیہ الرحمۃ] کا ارادہ تھا کہ پنجاب میں سب
لکچر تحریری ہوں تاکہ لوگوں کو اور خصوصاً ان لوگوں کو جو
ان کی مخالفت کرتے ہیں اور سیّد صاحب کی تحریر و تقریر
کو غلط طور پر بیان کرتے ہیں، ایسا کرنے کا موقع نہ رہے
مگر وہ [سیّد صاحب] ایسا نہیں کر سکے اور پنجاب
میں تمام لکچر زبانی ہوئے۔"

لدھیانہ میں سرسیّد علیہ الرحمۃ نے اپنی پہلی ہی تقریر میں اسلام کی
بین الاقوامی یکجہتی کا یوں تجزیہ کیا:۔

"اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجک۔ وہ
افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا، وہ چین کا باشندہ
ہے یا ماچین کا۔ وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا
بلکہ جس نے اس عروۃ الوثقیٰ کلمۂ توحید کو مستحکم پکڑا
وہ ایک قوم ہو گیا۔"

انجمن مفید عام لدھیانہ نے ۲۳ر جنوری ۱۸۸۴ء کو سرسید کی خدمت
یں سپاسنامہ پیش کیا تھا۔ جس کے جواب میں سید احمد خاں نے کہا:

" ایڈریس میں جو الفاظ میری نسبت بیان کیے ہیں، میں اپنے
تئیں ان الفاظ کا مستحق نہیں سمجھتا۔ مگر اس وجہ سے کہ گو
وہ شخص جس کے واسطے یہ ایڈریس پیش کیا گیا ہے،
اس کا مستحق نہ ہو مگر آئندہ اس کی امید پڑی ہے کہ
ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو الفاظ اس
وقت جوش ہمدردی سے میری نسبت بیان کیے وہ اس
کے مستحق ہوں گے۔"

اسی جلسہ میں ڈاکٹر عثمان صاحب غنی نے استقبالیہ نظم پڑھی جس کا
مطلع ہے:-

ادائے شکر ہے تشریف کا لانا مبارک ہو
غریبوں پر ہمیشہ لطف فرمانا مبارک ہو

لدھیانہ سے ۲۴ر جنوری ۱۸۸۴ء کو سید احمد خاںؒ کا قافلہ جالندھر
ہنچا، جہاں ٹاؤن ہال میں انجمن اسلام نے ایڈریس پیش کیا اور گورنمنٹ
سکول کے طلبہ نے سپاسنامہ پیش کیا۔ ۲۵ر جنوری ۱۸۸۴ء کو امرتسر
ں مدرسہ اسلامیہ امرتسر کی طرف سے پیش کیے ہوئے ایڈریس کے
اب میں سرسید نے کہا تھا:-

" جس نے جامۂ انسانیت پہنا ہے، اس کی یہ خواہش ہوگی
کہ ہندوستان میں دونوں قومیں برابر ترقی کریں۔ ہندو
ہوں یا مسلمان یا ہندوستان کی کوئی قوم ہو، ملک کی
بہتری کے لیے سب کو ایک ہونا چاہیے۔"

۲۷ر جنوری ۱۸۸۴ء کو سرسید اپنے رفقاء کے ساتھ گورداسپور
ئے۔ وہاں کی اہلیانِ گورداسپور نے سپاسنامہ پیش کیا۔ نجم الہند سردار
مد حیات خاں نے خواتین پنجاب کا ایڈریس سرسید کی خدمت میں
ش کیا۔ جس کے جواب میں سید احمد خاں نے کہا تھا۔

"اے میری بہنو! آج کی رات میرے لیے شب قدر سے کچھ
کم نہیں۔ جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی وہ میرے
لیے ایک ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو
نصیب نہیں ہوئی۔ میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکرگزار ہوں"

امرتسر واپسی پر سرسید علیہ الرحمہ نے مختلف مکاتبِ خیال افراد
اور انجمنوں کو مخاطب کیا اور ہندوستان کی تجارت کو فروغ دینے کا مشورہ
دیا۔ پھر لاہور میں خیر مقدمی تقریبات کے علاوہ اخبارات میں سرسید کے
مدرسۃ العلوم قایم کرنے کا پرزور الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔ ۲ر فروری ۱۸۸۴ء
کے "پنجابی اخبار لاہور" میں ایک جلسہ کی رپورٹ میں لکھا ہے:- "لالہ
سنگم لال نے مدرسۃ العلوم قایم کرنے اور اس کے بے تعصبانہ اصول کی
طرف جس پر مدرسہ قایم ہوا ہے اور جس کی وجہ سے ہر ملت و مذہب
کے طالب علم اس میں داخل ہو سکتے ہیں اشارہ کیا" لاہور کے ایک جلسہ
میں مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی نظم سنائی تھی جو دراصل انگریزی
نظم "اکسیلسر" کا ترجمہ ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی نظم سنائی
تھی

"آہستہ سر اُٹھا کے کہا ہاں بڑھے چلو"

واپسی میں جالندھر، پٹیالہ، اور مظفر نگر ہوتے ہوئے سرسید
رحمۃ اللہ علیہ اپنے رفقا کے ساتھ ۷ر فروری ۱۸۸۴ء کو علی گڑھ پہنچے
تھے وہ علی گڑھ جہاں تنکا تنکا جوڑ کر سرسید نے قوم کے لیے ایک علمی
نشیمن کی تعمیر کی اور علامہ اقبال کی زبان سے کہا تھا۔

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

★ ★ ★

قیمت فی شمارہ :- ایک روپیہ
سالانہ :- بیس روپے
لائف ممبر شپ :- دو سو روپے

عجائباتِ ترکیہ

ڈاکٹر اکمل ایوبی

★ یورپ اور ایشیا کا سنگم ترکی ہے اور دونوں براعظموں کو آبنائے باسفورس ملاتی ہے۔ ترکی کا مشہور شہر استنبول یعنی قسطنطنیہ یورپ اور ایشیا دونوں براعظموں میں آباد ہے۔ دنیا کا سب سے سستا بین الاعظمی بحری سفر ترکی میں ہوتا ہے جہاں معمولی کشتیوں سے بھی آبنائے باسفورس عبور کر کے ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم جایا جاتا ہے۔

★ مشہور پیغمبر حضرت نوحؑ کی کشتی ترکی کے کوہِ ارارات پر آکر ٹھہری تھی اور اب ترکی کے آثارِ قدیمہ کے ماہر اس کو تلاش کر رہے ہیں۔

★ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ مریمؑ کی آخری قیام گاہ ترکی کے "ایفیس" نامی شہر میں ہے۔ قلوپطرہ اور مارک انطونی کی پہلی ملاقات "طارس" میں ہوئی تھی، جو ترکی کا ایک شہر ہے۔ ★ ہنی بال نے ترکی کے 'بورسہ' شہر میں خودکشی کی تھی۔

★ عیسائیوں کے بابو اور ان کے بچوں کے بابا سانٹا کلاز ترکی کے 'دمیرا' شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کا نام سینٹ نکولاز تھا۔

★ دنیا کا پہلا مقابلۂ حسن ترکی کے 'ٹرائے' میں ہوا تھا جس میں زہرہ نامی عورت کو ایک طلائی سیب اوّل قرار پانے پر انعام کے طور پر دیا گیا تھا۔

★ انسانوں کے زیرِ استعمال دنیا کی سب سے قدیم عمارت ترکی کے استنبول شہر میں ہے جو آیا صوفیہ کہلاتی ہے۔ یہ عمارت ۱۵۰۰ سال سے بھی زیادہ پُرانی ہے۔

★ دنیا میں سب سے پہلے ٹیکہ سترھویں صدی میں ترکی میں ایجاد ہوا تھا جو چیچک کا ٹیکہ تھا۔

★ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی مزار ترکی کے استنبول کے ایک محلے ایوب نامی میں ہے۔

★ دنیا کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد سلیمانیہ ہے جو ترکی کے شہر میں استنبول میں ہے۔

★ استنبول ہی میں دنیا کی وہ واحد مسجد بھی ہے جس کی چھ مینار یں ہیں۔ یہ مسجدِ سلطان احمد ہے لیکن اس کو 'نیلی مسجد' بھی کہتے ہیں۔

★ استنبول کو "مسجدوں کا شہر" کہا جاتا ہے۔ مگر وہاں کتب خانوں اور میوزیم کی تعداد مسجدوں سے بھی زیادہ ہے۔

★ مولانا جلال الدین رومی فارسی کی شہرۂ آفاق مثنوی کے خالق ہیں اور تصوّف کے مولویہ سلسلے کے بانی ہیں۔ ان کا مزار اور مقبرہ قونیہ (کونیہ) میں ہے جو ترکی کا خاص شہر ہے۔ ★ ترکی کا شہر انقرہ (انکرا) دو ہزار سال قبل مسیح آباد ہوا تھا۔

★ ترکی میں کوئی شخص ترکی ٹوپی نہیں پہن سکتا۔ کیوں کہ یہ خلافِ قانون قرار دی جا چکی ہے۔

★ ترکی کے ترکوں کی مادری زبان کا لفظ "اردو" اس حد تک مقبول ہوا ہے کہ ہماری مادری زبان کا بھی نام 'اردو' ہو گیا ہے۔

★ ترکی کے مشرقی و شمالی حصّے میں کوہِ قاف ہے۔ اسی مناسبت سے وہاں کی صنفِ نازک کو 'کوہ قاف کی پری' کہا گیا ہے۔ یہ پریاں آج بھی ترکی کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں نظر آتی ہیں۔ ★ ترکی کے قیصری (کیسری) شہر کو مقبروں کا شہر کہتے ہیں۔

★ ترکی کی نامور حریت پسند ادیبہ خالدہ ادیب خانم کا مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین نے ۱۹۳۵ء میں اپنی مخصوص طرز سے گل پوشی کر کے خیر مقدم کیا تھا۔ اور ان کو یونین کا 'لائف ممبر' بنایا تھا۔ اس موقع پر "علی گڑھ ترانہ" کے خالق مجاز لکھنوی نے ایک نظم "نذرِ خالدہ" پیش کی تھی جس میں نطق گوہر بار اور فطرتِ احرار کا ذکر تھا۔ آزادی کے راز پوچھے گئے تھے اور بیداری کے ساز چھیڑنے کی فرمائش کی گئی تھی۔

★ ترکی کے ترکوں کی مادری زبان کے بہت سے الفاظ یوروپ اور ایشیا کی متعدد زبانوں میں آج بھی رائج ہیں۔ ہماری ہندوستانی زبانوں میں بھی خاص کر ہندی اور اردو میں ترکی الفاظ کی کثرت ہے۔ ★ ترکی میں انگور اور سیب ترکاریوں سے ارزاں ہیں۔

★ اسی ترکی کے ترکوں نے اسلام کا پیغام پہاڑوں کی بلندیوں، سمندر کی گہرائیوں اور زمین کی وسعتوں میں پہنچایا اور صدیوں تک اسلام کا جھنڈا بلند رکھا، خانۂ کعبہ کے پاسبان بنے۔ اسلامی سطوت کا نشان رہے۔ اور شوکتِ اسلامی کے نقیب کے فرائض انجام دیے۔ ★

نقیب الاسلام شرر اعظمی

کام کی باتیں

۱۔ **جوڑوں کا درد:** اس درد میں دھتورہ کا پھل اور سرسوں کا تیل حسبِ ضرورت لے کر پھل کو خوب تیل میں جلا دیں اور چھان کر محفوظ کر لیں اور وقتِ ضرورت ہلکے گرم تیل کی مالش کریں

۲۔ **عرق النساء** (لنگڑی کا درد) [?] چوب چینی کو کچل کر ۲۵ ملی لیٹر پانی میں آدھے دن بھگو کر پھر جوش دے کر آدھا کریں اور چھان کر صبح کے وقت استعمال کریں۔

۴۔ **لُو لگنا۔** اس میں ایک کچا آم لے کر گرم راکھ میں رکھ دیں پھر چھلکا اُتار کر اس کو نچوڑ لیں۔ ۲۰ ملی لیٹر پانی میں ملا کر شکر سے میٹھا کر لیں اور برف سے ٹھنڈا کر لیں اور صبح شام استعمال کریں۔ اسی طرح چنے کا ساگ (سوکھا ہوا) بھی پانی میں پیس کر شکر ملا کر استعمال کریں

۱) **پتّی اچھلنا:** گائے کا دودھ ½ لیٹر لے کر دودھ کو جوش دے کر چند قطرے لیمو کا رس ملا دیں۔ تاکہ وہ پھٹ جائے۔ پھر چھان کر پانی الگ کر لیں اور صبح کو یہ پانی استعمال کریں۔

دوسرے نسخے میں کچے شہتوت سرکہ میں پیس کر پتّی کی جگہ پر لگائیں

۔ **جل جانا۔** انڈے کی سفیدی کو جلے حصّے پر لگائیں۔

شکر کو پانی میں جوش دے کر شیرہ بنا لیں اور ٹھنڈا کر کے جلے ہوئے حصّہ پر لگائیں۔

انار کے پتّے پانی میں پیس کر جلے ہوئے حصے پر لیپ کریں۔

زخم:۔ برگد کے پتّے کو زخم پر باندھیں

زخم حیات کے پتّے کو کچل کر زخم پر باندھیں۔

چوٹ لگنا ارنڈ کے پتّے پانی میں جوش دے کر چھان لیں اور چوٹ کی جگہ پر دھاریں۔

اگر اندر چوٹ ہے تو ۵۰۰ ملی گرام پھٹکری کا سفوف دودھ میں ملا کر پلائیں۔

۸ **سانپ کا کاٹنا:** ایک یا دو لہسن کے جوے ۱۲۵ ملی گرام شراب میں کھلائیں پیاز کافی مقدار میں خالص گھی کے ہمراہ کھلائیں۔

لیموں کے بیج ایک گرام، تھوڑے پانی میں پیس کر لگائیں

۹ **بچھو کا کاٹنا:** ریٹھے کا چھلکا پانی میں پیس کر لیپ بنا کر کاٹے کی جگہ کے چاروں طرف لگائیں۔

پھٹکری تھوڑی سی لے کر پانی میں گھول لیں اور جس طرف بچھو نے کاٹا ہے اُس طرف کی آنکھ میں یہ پانی چند قطرے ٹپکائیں اور ایک کپڑا اسی پانی میں بھگو کر بچھو کے کاٹے کی جگہ پر بھی رکھیں۔

۱۰۔ **کیڑوں کا کاٹنا:** مٹی کا تیل کیڑے کے کاٹے ہوئے حصے پر لگائیں

گل ارمنی ہمراہ کافور سرکہ میں پیس کر لیپ بنا لیں اور کاٹے کی جگہ لگائیں

۱۱ **موٹاپا۔** ایک لیموں کا عرق پانی میں ملا کر صبح خالی پیٹ پئیں۔

لک مغسول (لاکھ صاف کیا ہوا) ۱ گرام لے کر پانی کے ساتھ لیں۔

۱۲ **بالوں کا گرنا۔** ریٹھا برگد ایک لیٹر ناریل کا تیل دو تین روز تک سایہ میں خشک کریں اور کچل کر ناریل کے تیل میں ۱۵ دن تک ڈالے رکھیں اس کے بعد چھان کر بوتل میں رکھ لیں اور سوتے وقت سر پر ملیں۔

۱۳۔ **گنج** (مجرب) ۲۰ لیموں کا عرق ۲۰ کوڑیوں (سمندر گھونگا) لیموں کے عرق میں کوڑیاں ڈال دیں۔ کوڑیاں گھل جائیں گی اور پھر ایک ہفتہ بعد برائے نام گنج کی جگہ پر سوتے وقت ملیں۔ مگر ایک بات یاد رہے کہ اس کو تیل کی طرح زیادہ نہیں لگانا ہے۔ ورنہ تکلیف ہوگی۔

۱۴۔ **انگل ہڑا یعنی انگلی کے ناخن کا پھوڑا۔** اسپغول کو سرکہ میں آدھ گھنٹہ بھگوئیں اور اس کو انگلی پر لگا کر پٹی باندھ دیں۔ دو تین بار دن میں ٹھنڈے پانی میں انگلی ڈبوئیں۔ ۲ دو دن کے بعد سوجن ایک جگہ ہو کر پھوڑا پھوٹ جائے گا۔

۱۵۔ **داد:** تلسی کے پتّے پانی میں پیس کر خارش کی جگہ لگائیں

مہندی کے تازہ پتّے ہمراہ گندھک ہموزن پانی میں پیس کر خارش کی جگہ لیپ کریں

فوزان صدیقی

آپ کا امتحان

(اگر آپ اپنی معلوماتِ عامہ کا امتحان لینا چاہیں تو مندرجہ ذیل سوالوں کے سامنے جواب لکھیے۔ پھر نیچے دیے ہوئے حل سے مقابلہ کر کے ان پر صحیح / غلط کا نشان لگائیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ آپ کامیاب ہیں یا ناکام۔ اگر مفید پایا گیا تو اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے گا)۔

۱- ہندوستان کے موجودہ آئین کا نفاذ کب ہوا؟ مجلسِ آئین ساز کا چیرمین کون تھا؟
۲- دل تک خون پہنچانے والی رگیں کیا کہلاتی ہیں؟
۳- صدر جمہوریہ ہند کا انتخاب کون کرتا ہے؟
۴- مٹی کے برتنوں میں رکھا ہوا پانی دھات کے برتن کی بہ نسبت کیوں ٹھنڈا ہوتا ہے؟
۵- مہاتما گاندھی نے عدم تعاون تحریک کس سال شروع کی تھی؟
۶- "ڈاکٹر زواگو" لکھنے پر کس روسی مصنف کو نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا؟
۷- اس وقت دنیا کا سب سے لمبا آدمی کون ہے؟
۸- ہائی کورٹ کے ججوں کا تقرر کون کرتا ہے؟
۹- نائٹروجن، آکسیجن، ہائیڈروجن اور ہیلیم میں سب سے ہلکی گیس کون سی ہے؟
۱۰- راجیہ سبھا کا چیرمین کون ہوتا ہے؟
۱۱- وٹامن "کے" کی کمی سے کیا بیماری پیدا ہوتی ہے؟
۱۲- ہندوستان نے پہلا ایٹمی تجربہ کب اور کہاں کیا تھا؟
۱۳- صدر اندرپوف کے انتقال کے بعد کون اُن کا جانشین مقرر ہوا؟
۱۴- رنگا سوامی کپ کس کھیل کے لیے دیا جاتا ہے؟ اس سال یہ کپ کس نے جیتا؟
۱۵- ہندوستان کی کس ریاست میں ہریجنوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے؟
۱۶- دروز مسلم ملیشیا کس سے برسرِ پیکار ہے؟
۱۷- دنیا میں سب سے زیادہ سونا کہاں نکلتا ہے؟
۱۸- ایم سی سی کی اعزازی ممبرشپ کس کھلاڑی کو عطا کی گئی؟

صحیح جوابات:- ۱- ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء، بی۔ آر۔ امبیدکر۔ ۲- کانری شریانیں۔ ۳- ایک الکٹورل کالج جو دونوں مرکزی ایوانوں اور ریاستی اسمبلیوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ۴- مٹی کے برتن میں مسام ہوتے ہیں جن کے ذریعے حرارت خارج ہوتی رہتی ہے۔ ۵- رولٹ ایکٹ کے نفاذ اور جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کے بعد۔ ۶- بورس پاسترنک۔ ۷- ایک پاکستانی محمد عالم چینا، ۸ فٹ ۳ انچ۔ ۸- صدر جمہوریہ ہندوستان کے چیف جسٹس و سپریم کورٹ اور متعلقہ ریاست کے گورنر سے مشورہ کرنے کے بعد۔ ۹- نائٹروجن۔ ۱۰- نائب صدر جمہوریہ ہند۔ ۱۱- جریانِ خون۔ ۱۲- ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو پوکھاران راجستھان میں۔ ۱۳- کانسٹن چرننکو۔ ۱۴- ہاکی، انڈین ایرلائنز۔ ۱۵- اتر پردیش میں۔ ۱۶- حکومت لبنان سے۔ ۱۷- جنوبی افریقہ میں۔ ۱۸- دلیپ سرڈیسائی۔

کُل ہند سیمینار

گجرال کمیٹی کی سفارشات اور اردو کی موجودہ صورتِ حال

رپورٹ : راحت ابرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے زیر اہتمام کینڈی ہال میں مورخہ ۴ر مارچ ۸۴ء کو گجرال کمیٹی کی سفارشات اور اردو کی موجودہ صورتِ حال کے موضوع پر کل ہند سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر جناب سیّد حامد نے کہا کہ علی گڑھ تحریک اور اردو زبان کی تحریک کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس ادارے کے بانی سر سیّد احمد خاں خود اردو نثر کے معمار تھے اور وہ اردو ادب کے ستون کہے جاتے ہیں۔ سر سیّد نے جدید زبانوں سے ہم آہنگ کرنے کی اپیل کی۔ اردو زبان سے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیے اور جذباتی انداز سے نہیں بلکہ عقل کی کسوٹی پر ہر مسئلہ کو پرکھا جانا چاہیے۔

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے گجرال کمیٹی کی تشکیل اور اس کی سفارشات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ۵ر مئی ۷۲ء کو مسٹر اندر کمار گجرال کی نگرانی میں پارلیمنٹ کے ذریعے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ مئی ۷۵ء میں اس کمیٹی نے ۳۱۷ سفارشات پر مبنی اپنی رپورٹ حکومتِ ہند کو پیش کی جس میں سے صرف تیرہ سفارشات کو اب تک تسلیم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے گجرال کمیٹی کی اس سفارش کے بارے میں بھی بتایا جس کے تحت اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے دو تحقیقی ادارے قایم کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کام علی گڑھ والے بہ آسانی کرسکتے ہیں۔

نامور صحافی مسٹر کلدیپ نیّر نے اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کے ہندوؤں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی یہ زبان پاکستان چلی گئی اور اب یہاں کی اکثریت اردو کو اپنی زبان تسلیم نہیں کرتی۔ ملک کی تقسیم کے بعد یہ زبان سیاست کا شکار ہوگئی اور سیاست داں اس کو ووٹ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ خو مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا نے بھی اپنی چیف منسٹر شپ کے دورا اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں دلایا۔

مسٹر کلدیپ نیر نے کہا کہ جب تک اردو کو روٹی اور روزی سے نہیں جوڑا جائے گا، اس وقت تک اردو کا کوئی مستقب نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس زبان کو سیاست الگ کرکے روزی سے جوڑا جائے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اپنی صحافت اردو زبان سے شروع کی۔ میں نے اردو صحافت صرف اس لیے چھوڑی کہ میں نے دیکھا کہ یہ زبان معاشی استحکام کا ذریعہ نہیں ہے۔

اردو کے نامور ادیب و ممبر پارلیمنٹ جناب حیات اللہ انصاری نے کہا کہ اردو کی لڑائی ہم ہارے نہیں ہیں۔ بلکہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اردو کی یہ لڑائی صرف اتر پردیش ہی میں لڑیں گے۔ مگر اس جدّوجہد میں بڑے کالجوں کے اساتذہ شریک نہیں ہیں۔ ہمیں اس تلخی کا مقابلہ کرنا ہے۔ انھوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ اتر پردیش میں سات ہزار اردو اساتذہ کی تقرری کے بعد اردو کی حالت بدلی نہیں ہے۔

دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کہا کہ گجرال کمیٹی ہمارے خوابوں کی تعبیر نہیں ہے۔ اس کا بیشتر حصّہ بنیادی چیزوں کے علاوہ فروعی چیزوں میں الجھ گیا ہے۔ اردو کو اگر دوسری سرکاری زبان تسلیم کرلیا گیا تو ہمارے بہت سے مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔ انھوں نے اردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کے علاوہ اردو، عوام اور حکومت کے درمیان تال میل قایم کرنے کے لیے ایک سیل کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبۂ اردو کے پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے کہا کہ جنتا حکومت نے کانگریس سے انتقامی جذبے کے تحت یہ رپورٹ شایع کی۔ گجرال کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ لینے کے لیے ۱۹۷۹ء میں پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور پروفیسر سرور کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ مرکزی سرکار کو پیش کردی ہے۔ مگر ابھی تک کوئی خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے گئے۔ اردو کا حق تسلیم کرانے کے لیے ہم نے قانون کا سہارا لیا اور ہر دفعہ اردو کا دفاع کرنے میں ناکام ہوگئی ہے۔

انھوں نے کہا کہ وقتاً فوقتاً کبھی سیاسی وجوہات کی بنا پر اردو کی مراعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ پرائمری اور ثانوی سطح پر مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

انجمن ترقی اردو ہند کی ریاستی صدر محترمہ سلطانہ حیات نے کہا کہ گجرال کمیٹی کی کوئی بھی سفارش ایسی نہیں ہے جو اردو کے قافلے کو آگے لے جائے۔ جب تک اردو والے ہر اسکول میں جاکر اردو تعلیم کا انتظام نہیں دیکھیں گے۔ اردو کا مستقبل مشاعرے، مذاکرے اور کانفرنس تک ہی وابستہ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ گجرال کمیٹی نے درجہ پانچ تک اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سفارش کی ہے۔ ثانوی سطح پر ذریعۂ تعلیم اردو کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جبکہ انجمن ترقی اردو نے اترپردیش میں درجہ ۸ تک ذریعہ تعلیم اردو بنوا دیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ماضی کی روشنی میں اردو کا حق مانگنا چاہیں ہمارا مقدمہ بہت کمزور ہے۔ ماضی کی کمائی ہمیشہ نہیں کھا سکتے۔ اردو کے مستقبل کو جو خطرات ہیں وہ جنوبی ہندوستان میں ہیں۔

انھوں نے کہا کہ ہر بچے کو یہ آئینی حق حاصل ہے کہ اس کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہو۔ ہم اپنے اتحاد اور رائے عامہ کو ہموار کرکے دس فیصد اردو بولنے والی آبادی میں وہاں دستور کی دفعہ ۳۴۵ کے تحت لنگویج ایکٹ میں ترمیم کرائیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ اب ایسی لسانی اقلیتوں کا سوال ہے اور اپنی علاقائی ثقافت پہچان اور تہذیب کا چہرہ زبان ہوتی ہے۔

پروفیسر نارنگ نے مشورہ دیا کہ انجمن ترقی اردو اور مسلم یونیورسٹی کے اشتراک سے ایک پلیٹ فارم تیار کیا جائے تاکہ اردو کو اس کا جائز مقام دلایا جاسکے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر اور ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں نے کہا کہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اردو نظامِ تعلیم کے بارے میں زیادہ تر سفارشات تشنہ ہیں اور اردو کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ہندی حلقہ کو یہ بتانا چاہیے کہ اردو ہندی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لسانی اقلیت اور لسانی اکثریت کی بنیاد ایک ہے۔ ہمیں دوسروں کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے تاکہ اردو کا قافلہ آگے بڑھ سکے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے عبرانی زبان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مردہ زبانیں بھی زندہ بنائی جا سکتی ہیں، اگر قوتِ ارادی ہو۔ اردو گھرانوں میں یہ خلیج پیدا ہوگئی ہے اور ہماری لکھی ہوئی چیزوں کو ہمارے بچے نہیں پڑھ سکتے۔ یہ خلیج مسلم یونیورسٹی احاطے میں سب سے زیادہ ہے

انھوں نے کہا کہ زبان کا مسئلہ اجتماعی زندگی کا مسئلہ ہے اس لیے اردو کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خود اردو والے بھی ایسے ہیں جو اردو کو ہی ہندوستان کی واحد زبان سمجھتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ اعتماد ایک جذباتی رویہ ہے جس سے ہمیں پرہیز کرنا چاہیے۔ اردو بغیر ادب کے آپ کی زندگی میں جاری وساری نہیں ہوگی۔

سیمنار کے اختتام پر مرکزی سرکار و ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ گجرال کمیٹی کی جملہ سفارشات کو بلا تاخیر نافذ کیا جائے اس کے ساتھ ہی حکومت اترپردیش سے مطالبہ کیا گیا کہ ریاست میں حسبِ وعدہ اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دینے کے لیے اسمبلی کے حالیہ اجلاس میں بل لاکر اسے قانونی شکل دی جائے۔

مرکزی سرکار ایک ایسا سیل قایم کرے جو ان سفارشات کے نفاذ کی عملی صورت کی نگرانی کرے اور عدمِ نفاذ کی صورت میں نہ صرف حکومت کو مطلع کرے بلکہ اس کے تدارک کی صورت بھی پیدا کرے۔ ★

تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ

فون :
۳۶۰۹
۴۱۹۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳ / ۳۷

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں

ریڈرس

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ مع دیگر الاؤنس

۱- ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز [جغرافیہ] سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز
۲- ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز [اکونامکس] " "
۳- ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز [پولیٹکل سائنس] " "

قابلیت:

۱- لازمی الف: متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد

[ب] ڈاکٹریٹ معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام

[ج] پوسٹ گریجویٹ کلاسنر کی تدریس کا پانچ سالہ تجربہ اور تحقیق کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

۲- پسندیدہ: شمار نمبر ۱ و ۲- ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز [جغرافیہ/معاشیات] سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے لیے

موجودہ ویسٹ ایشین جغرافیہ/اکونامکس کا مکمل علم۔ نیز عربی یا کسی دوسری ویسٹ ایشین زبان میں کام کرنے کی مکمل صلاحیت

شمار نمبر ۳ ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز [پولیٹکل سائنس] سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے لیے

ویسٹ ایشیا کے سیاسی حالات کی مکمل ترین معلومات۔ نیز کسی ویسٹ ایشین زبان میں کام کرنے کی صلاحیت یا کسی جدید یورپین زبان میں کام کرنے کی قابلیت۔

لکچررز

شرح تنخواہ - ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ مع دیگر الاؤنس

۱- لکچرر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز (اکونامکس) - سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز

۲ " " " (سوشیالوجی) " " "

۳- " " " (عربک) " " "

قابلیت

(۱) لازمی (الف) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام

(ب) فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس کے ساتھ مسلسل بہترین تعلیمی ریکارڈ (B. سیون پوائنٹ اسکیل میں) متعلقہ مضمون میں ماسٹر ڈگری یا غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الموضوعی ترقیاتی پروگرام کے لیے مذکورہ بالا الف و ب کے متعلقہ موضوع میں ڈگری۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس سے ظاہر ہے، یا اس کا مطبوعہ کام انتہائی اعلیٰ پایہ کا ہے تو وہ (ب) کے تحت دی ہوئی مطلوبہ استعداد کو ختم کر سکتی ہے۔

اور اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل کوئی امیدوار میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں نہ ہو تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (جو اس صورت میں ایم فل ڈگری یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام کو وزن دیا جائے گا) کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیبارٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری سے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی جب تک کہ وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرے۔

آاپسندیدہ - عربی یا کسی دوسری ویسٹ ایشین زبان میں کام کرنے کی صلاحیت۔

غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے ابتدادی جا سکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور T.A ریلوے کے

سکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا جائے گا (صرف ایک طرف کا)
مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپیہ نقد مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا .... 23x10 کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو، بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔
درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۱ اپریل ۱۹۸۴ء (شام چار بجے تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔
نوٹ:- موزوں امیدواروں کو مستقبل میں خالی ہونے والی جگہوں پر تقرری کے لیے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تصحیح

جینیر لیبارٹری اسسٹنٹ (مستقل) شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج کی اسامی کے لیے اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۳۶ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۸۴ء کے حوالے سے اطلاع دی جاتی ہے کہ لازمی تعلیمی لیاقت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تبدیلی نوٹ کر لی جائے۔
سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری اور فارماکوگنوسی لیبارٹری [Pharmacognosy Lab] میں کام کرنے کا تجربہ (بجائے فارماکولوجیکل لیبارٹری کے)

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۸۵-۱۹۸۴ء کے تعلیمی میقات میں داخلہ کا امکانی شیڈول

نمبر شمار	کورسیز	درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ	ٹیسٹ کی تاریخ
۱	کلاس XI / 10+2	۶ر جولائی ۸۴ء	—
۲	ڈپلومہ ویمنس پالیٹکنک	۶ر جولائی ۸۴ء	—
۳	سرٹیفکٹ ان ڈرافٹمینشپ	۶ر جولائی ۸۴ء	—
۴	ڈپلومہ ان ٹیچنگ اردو	۶ر جولائی ۸۴ء	—
۵	ڈپلومہ ان ڈرافٹنگ اینڈ ڈیزائنگ	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	اردو خطاطی کا ڈپلومہ	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	ڈپلومہ اسٹینو ٹائپنگ	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	بی-اے/بی-ایس سی/بی کام I	۲۲ر جون ۸۴ء	—
	ایم-اے/ ایم-ایس سی/ ایم کام-ایل-ایل-بی/ بی-ٹی ایچ/ ڈی-بی-اے ڈی-ایس-ڈبلو/ ڈپلوما ان پروفیشنل کورسیز	۱۶ر اگست ۱۹۸۴ء	— —
	ایل-ایل-ایم	۱۶ر اگست ۸۴ء	—
	ایم ٹی-ایچ	۱۶ر اگست ۸۴ء	—
	ڈپلومہ ان جنرل نرسنگ	۱۵ر جون ۸۴ء	۴ر جولائی ۸۴ء
	ڈپلومہ ان انجینیرنگ	۵ر جون ۸۴ء	۶ر جولائی ۸۴ء
	بی-ایس سی انجینیرنگ	۱۰ر جولائی ۸۴ء	۱۲ تا ۱۶ر اگست ۸۴ء

نمبر شمار	کورسیز	درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ	ٹیسٹ کی تاریخ
۱۵	بی ای انجینئرنگ (شام کا)	۱۶ر جون ۸۴ء	--
۱۶	ایم ایس سی انجینئرنگ	۱۱ر جون ۸۴ء	—
۱۷	بی یو ایم ایس (یری طب)	۱۲ر جولائی ۸۴ء	۱۷ و ۱۸ر اگست ۸۴ء
۱۸	ایم بی بی ایس	۱۶ر جولائی ۸۴ء	۲۰ تا ۲۲ر اگست ۸۴ء
۱۹	ایم ڈی (یونانی)	۲۵ر جولائی ۸۴ء	۸ر اگست ۸۴ء
۲۰	بی لب سائنس	۲۵ر جولائی ۸۴ء	۲۷ و ۲۸ر اگست ۸۴ء
۲۱	ایم لب سائنس	۲۵ر جولائی ۸۴ء	۲۷ر اگست ۸۴ء
۲۲	ایم بی اے	۲۰ر جولائی ۸۴ء	۸ تا ۱۰ر اگست ۸۴ء
۲۳	بی ایڈ	۲۳ر جولائی ۸۴ء	۲۵ و ۲۶ر اگست ۸۴ء
۲۴	ایم ایڈ	۲۳ر جولائی ۸۴ء	۲۵ر اگست ۸۴ء
۲۵	ڈپلومہ ان کمپیوٹر پروگرامنگ	۲۶ر جولائی ۸۴ء	۳۰ر اگست ۸۴ء
۲۶	ماسٹر ان کمپیوٹر سائنس / کمپیوٹر سائنس میں پوسٹ بی ایس سی ڈپلومہ	۲۶ر جولائی ۸۴ء	۲۹ر اگست ۸۴ء
۲۷	ہائیڈرو جیالوجی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ	۲۶ر جولائی ۸۴ء	۱۷ر اگست ۸۴ء
۲۸	ایم ڈی / ایم ایس / ڈپلومہ (میڈیسن)	۱۵ر مئی ۸۴ء	۲۵ر مئی ۸۴ء
۲۹	پٹرولیم پروسیسنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ	۱۵ر جون ۸۴ء	—

این موئیدین

کنٹرولر آف اگزامینیشن اینڈ ایڈمیشن

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آئٹم ریٹ کی بنیاد پر مندرجہ ذیل کاموں کے لیے سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ وہ ٹھیکیدار جو ڈپارٹمنٹ میں کلاس ون ٹھیکیداروں کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہیں یا سی۔ پی۔ ڈبلو۔ ڈی، ایم۔ ای۔ ایس، پی۔ ڈبلو۔ ڈی۔ کسی سرکاری ادارے یا کسی دوسری تنظیم میں مساوی درجہ رکھتے ہیں اور جنھوں نے کم سے کم پچیس لاکھ روپے کی مالیت کا سیول میں کام کیا ہے، یہ ٹینڈر داخل کرنے کے مجاز ہیں۔ ضروری ہے کہ ٹینڈر کے ساتھ اس نوعیت کا کام کرنے کا ثبوت، کاموں کی فہرست، کارگردگی کی سند و دیگر ضروری سرٹیفکٹ بھی پیش کیے جائیں۔

مالی حیثیت کے تعین کا ثبوت بھی درکار ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ٹھیکیدار صاحبان کسی منظور شدہ بنک کا یہ سرٹیفکٹ کہ وہ کتنی رقم حاصل کر سکتے ہیں

Credit worthiness Certificate in The form of Solvency Certificate

اِس سرٹیفکٹ پر بذاتِ خود منیجر کے دستخط ہونے چاہیں۔

ٹینڈر کے کاغذات کے ساتھ اپنی تنظیم کی تفصیل، ٹکنیکل اسٹاف اور پلانٹ وغیرہ کی تفصیل بھی پیش کریں۔

ان ٹھیکیداروں کو ترجیح دی جائے گی جنھوں نے اسی نوعیت کی ایسی عمارتوں کا کام کیا ہو جن میں مندرجہ ذیل چیزیں بھی شامل ہوں۔

★ Central Air Conditioning   سینٹرل ایرکنڈیشنگ ۔

★ Dust proof atmosphere   ڈسٹ پروف ایٹماسفیر ۔

★ Fire - fighting   فایر فائٹنگ ۔

ٹینڈرس کے فارم یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے چھٹی کے علاوہ باقی دنوں میں دفتری اوقات میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ٹینڈر فارموں کی فروخت ٹینڈر موصول ہونے کی تاریخ سے دو روز پہلے روک دی جائے گی
ٹینڈر کھلنے کے دن ٹینڈر ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کے لیے مختص رقم
ا۔	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی احاطے کے اندر کمپیوٹر سینٹر کی عمارت کی تعمیر	
	i تعمیراتی کام	9,85,075-00
	ii اندرونی واٹر سپلائی اور سینیٹری فٹنگ، نالیاں وغیرہ	41,409-00
	iii اندرونی کام کا تخمینہ	2,35,363-00
۲۔	زر ضمانت	20,000-00
۳۔	ٹینڈر کی قیمت	15-00
۴	کام کی تکمیل کی مدت	بارہ ماہ
۵	ٹینڈر کھلنے کی تاریخ	۱۰ر اپریل ۱۹۸۴ء [۳ بجکر ۳۰ منٹ شام]

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

شربت
نزلہ
کھانسی
زکام، نزلہ کے لئے
خون صفا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں

تہذیب الاخلاق
پندرہ روزہ
علی گڑھ

نورالحسن نقوی

سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کی خاص خاص مطبوعات

جلد ۳ — ۱۶ تا ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۸۴ء — شمارہ ۸

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسؤل:
نورالحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات:

ہمارے اساتذہ کی ذمہ داریاں

اس شمارے میں ایک مختصر مضمون شامل ہے جس میں عہد حاضر کے اساتذہ کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت میں ہمیں کچھ تامل تھا کیونکہ کہیں کہیں مصنف کا لہجہ ذرا سخت ہوگیا ہے۔ ہم نے چاہا بھی کہ بعض جملوں کو قلم زد کردیں مگر صاحب مضمون کا اصرار تھا کہ اسے اشاعت کے لیے منتخب کیا جائے تو اس میں کتر بیونت نہ کی جائے۔ مصنف ایک فرض شناس استاد ہیں اور فرض شناسی کے اسی جذبے نے انھیں یہ مضمون سپرد قلم کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس لیے یہ مضمون بے کم و کاست شائع کیا جارہا ہے۔ ممکن ہے اس آئینے میں ہمیں کہیں اپنا چہرہ نظر آجائے اور ناگواری کا احساس ہو لیکن یہ تلخ ترش باتیں کہنے، سننے اور اس سے بھی زیادہ غور کرنے کی ہیں۔ یہ بات بار بار دہرانے کی نہیں ہے کہ ہماری قوم میں تعلیم کی کمی ہے۔ بہت سے بچوں کو تو اسکولوں میں داخلہ لینا نصیب ہی نہیں ہوتا لیکن ان بچوں کی تعداد بھی کم نہیں جو سال دو سال میں اسکول چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے ہیں یا کارخانے آباد کرتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اقتصادی بدحالی اس کی ذمہ دار ہے۔ یہ خیال سو فی صدی درست نہیں۔ اب ہر طبقے میں تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ اگر بچہ پڑھنے کا شوقین ہے تو بیشتر غریب ماں باپ اس کے لیے ہر ممکن قربانی دینے کو آمادہ نظر آتے ہیں۔ بہت سے بچوں کا دل تعلیم سے اس لیے اچاٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے استاد ان کے دل میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے میں ناکام رہتے ہیں بلکہ بعض استادوں کی نامہربانی بچوں کو اسکول سے خوف زدہ کردیتی ہے۔ ہمارے بعض استاد جس ڈنڈے کے زور سے بچوں کے ذہنوں میں علوم کے ذخیرے اتارنا چاہتے ہیں وہ دنیا میں کبھی کا متروک ہو چکا اور آج اس کی جگہ عجائب گھر کے سوا کہیں اور نہیں۔ ڈنڈے کا استعمال استاد کا عجز اور اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ پڑھانے کے فن سے قطعاً ناآشنا ہے۔ والدین ہوں یا استاد، اکثر وہ بچے کو کچھ سکھانے کے لیے نہیں بلکہ اپنا غصہ اتارنے کے لیے سزا دیتے ہیں۔ کتنا عام تجربہ ہے کہ تھپڑ مارنا چاہا بچے کے گال پر مگر ہاتھ جا ٹکرایا دیوار یا ڈیسک سے۔ اب تو بچے کی شامت ہی آگئی۔ بات ذرا لمبی ہوگئی کہنا یہی صرف یہ تھا کہ والدین ایک بار جب بچے کا ہاتھ استاد کے ہاتھ میں دیدیں تو وہ اپنے مشفقانہ برتاؤ سے، پڑھانے کے دلچسپ انداز سے اسے ایسا موہ لے کہ یہ رشتہ ٹوٹ نہ سکے۔

معلمی کا پیشہ بڑا نازک اور معلم کا کام دوسرے پیشوں سے بڑا مختلف ہے۔ عام طور پر اس کے حصے میں خزف ریزے آتے ہیں مگر ایسے خزف ریزے جنھیں سلیقے سے تراش دیا جائے تو ان کی آب و تاب کے آگے سچے ہیرے ماند پڑ جاتے ہیں لیکن یہ کام آسان نہیں اس کے لیے کچھ تو خداداد صلاحیتیں درکار ہیں اور کچھ ایسے اوصاف اور ایسے ہنر جن کا اکتساب ممکن تو ہے مگر بڑی محنت اور بہت مشق سے۔ معلمی کے پیشے سے ذہنی مناسبت، شاگردوں کے لیے دل میں بے پناہ شفقت، دل آویز شخصیت، بلند اور واضح آواز کہ ایک ایک حرف صاف سنا جائے حسب ضرورت آواز کا اتار چڑھاؤ اور بات کرنے کا وہ انداز کہ ادھر زبان سے کچھ نکلا اور ادھر سننے والے کے دل میں اتر گیا۔ یہ سب وہ خوبیاں ہیں کہ خدا ہی دے تو میسر آئیں لیکن کسی درجے میں یہ موجود ہوں تو کوشش سے انھیں نکھارا ضرور جا سکتا ہے۔

استاد کی شخصیت طلبا کو متاثر کرنے میں بہت کارگر ہوتی ہے لیکن شخصیت صرف قد و قامت اور چہرے مہرے کا نام نہیں۔ بلاشبہ ان چیزوں کی بھی اہمیت ہے مگر صرف یہی سب کچھ نہیں۔ تاریخ عالم کی ورق گردانی کی جائے تو ایسی عظیم ہستیاں ان گنت نظر آئیں گی جن کے ساتھ قدرت نے اس معاملے میں فیاضی کا سلوک نہیں کیا لیکن اس کمی کو انھوں نے کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی لیا۔ یہی معاملہ

آواز کا ہے۔ معلمی کے پیشے میں صاف، بلند اور خوشگوار آواز
کی خاص اہمیت ہے لیکن جسے یہ دولت نہ ملی ہو مایوس اسے بھی
نہ ہونا چاہیے۔ اول تو مشق سے آواز یا آواز نہیں تو کم سے کم
بات کرنے کے انداز کو بہتر بنایا جا سکتا ہے لیکن جہاں معاملہ
لاعلاج ہو تلافی وہاں بھی ممکن ہے۔ برطانوی دارالعوام میں تین بار ہکلانے
کے بعد بھی ڈزرائیلی اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا تو ایک خاتون رکن نے ایک نہایت
ننگا فقرہ چست کیا اور سارے اراکین کھکھلا پڑے۔ ڈزرائیلی نے دل
میں قسم کھائی کہ ایسا موقع زندگی میں پھر نہ آنے دے گا۔ دنیا نے دیکھا
کہ انگلستان کا یہ ہکلا وزیر اعظم تین تین گھنٹے تقریر کرتا تھا۔ ہکلاتا
بھی تھا لیکن باتیں اتنی اہم ہوتی تھیں کہ لوگ سراپا توجہ بنے رہتے
تھے۔ خود ہم نے نمبودری پد کو ہزاروں کے مجمعے میں تقریر کرتے اور
ہکلاتے دیکھا مگر مجال تھی کہ سکوت ایک لمحے کو بھی ٹوٹ جائے۔

تقریر اور گفتگو دونوں ہی فن ہیں اور سخت ریاض کا تقاضا
کرتے ہیں۔ اس فن کی بدولت جنھوں نے حیاتِ دوام پائی انھوں نے
گھنٹوں آئینے کے مقابل کھڑے ہو کے ریہرسل کی، چشم و ابرو کے
اشارے اور ہاتھ کی ایک ایک جنبش پر توجہ کی تب کہیں سامعین
کی داد و تحسین کے مستحق ٹھہرے۔ پروفیسر ہادی حسن کی جادو بیانی دنیا
نے دیکھی مگر کم لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ وہ تنہائی میں پہروں ریہرسل کرتے تھے۔

ایک اور ضروری بات یہ کہ تعلیم کو اہرام مصر کی طرح ہونا چاہیے کہ
بنیاد وسیع اور مستحکم ہو، جوں جوں اوپر کی طرف بڑھے اس کا حجم کم ہوتا جائے۔
یہاں تک کہ اس کی تکمیل ایک نقطے پر ہو۔ تخصص Specialisation
کا یہی مفہوم ہے۔ تعلیم کا وسیع بنیاد (BROAD-BASED) ہونا استاد
کے لیے اور بھی ضروری ہے کیونکہ اسے ایک علم کی تدریس میں دس علوم کا
سہارا لینا پڑتا ہے۔ اگر اس کی معلومات وسیع ہے تو وہ موقع بہ موقع
اپنے شاگردوں کو ایک جہان کی سیر کرا دیتا ہے مگر اس طرح جیسے پرواز
میں بھی طائر کی آنکھ نشیمن پر رہتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اچھا استاد
جہاں سے چلتا ہے ذرا دیر میں وہاں لوٹ آتا ہے، یہ نہیں کہ بھٹک کے
کہیں کا کہیں جا پہنچے اور واپسی کا راستہ ہی بھول جائے۔

استاد کا علم وسیع ہونا چاہیے اور ضروری ہے کہ اپنے مضمون
و موضوع پر اسے مکمل عبور حاصل ہو لیکن اس سے بھی ضروری بات
یہ ہے کہ استاد کو کلاس میں جو کچھ پڑھانا ہے، کلاس میں قدم رکھنے سے
پہلے اس کی بھرپور تیاری کرے بلکہ جو کچھ پڑھا رہا ہے اس کے ساتھ
جینے کا ہنر سیکھ لے یعنی پہروں اسی میں کھویا رہے۔ یاد نہیں آتا کہ
عربی کے کسی مشہور معلم کا یہ واقعہ کہاں پڑھا ہے کہ رات کو دوستوں
کی محفل سے یہ کہہ کر رخصت ہونے لگے کہ صبح کے سبق کی تیاری
کرنی ہے تو کسی نے پوچھا کوئی نئی کتاب داخل نصاب ہوئی ہے
جس کی تیاری ضروری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ چودہ برس سے ایک
ہی کتاب پڑھا رہے ہیں لیکن ہر بار اسی اہتمام سے تیاری کرتے ہیں
اور ہر بار نئے نکتے ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن تیاری کی بھی مختلف
نوعیتیں ہیں۔ بعض استاد نوٹس تیار کر لاتے ہیں، کلاس میں سر
جھکائے انھیں پڑھتے جاتے ہیں اور شاگرد انھیں حرف بہ حرف
لکھ لیتے ہیں۔ تدریس کا سب سے ناقص طریقہ یہی ہے۔ اس سے وقت
کی بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ نوٹس نقل کرنے کا کام تو کلاس سے
باہر بھی کیا جا سکتا ہے اور بازار میں ملنے والی امدادی کتابیں اس کام کے
لیے کیا بری ہیں۔ کچھ استاد تو یہ ستم کرتے ہیں کہ ایک بار جو نوٹس تیار
کر لیے پھر ان میں اضافہ و تبدیلی قسم ہے۔ ایک استاد اپنے نوٹس املا
کرا رہے تھے۔ کلاس میں ایک طالب علم ایسا بھی تھا کہ جس کے ہاتھ
میں قلم تھا نہ سامنے نوٹ بک۔ سرزنش ہوئی تو اس معصوم نے بتایا کہ
اس کے والد انہی محترم کے شاگرد رہ چکے ہیں اور ان کے نوٹس اسے
ورثے میں ملے ہیں۔ استاد محترم نے اس اطلاع کو خراج سمجھ کر قبول
فرمایا۔ ایک اور صاحب نے نوٹس لکھانے کے بعد فرمایا کہ جہاں جہاں
آنہ پائی لکھا گیا ہے اسے پیسوں میں تبدیل کر لیا جائے۔ کوئی مشاہد،
کوئی مبصر، کوئی خوشہ چیں یہ دل خراش منظر دیکھ لیتا تو غش کھا جاتا
مگر یقین کیجیے ایسی باتیں چھپتی نہیں۔ ان کے چرچے دور پہنچتے ہیں۔

اچھے استاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا ذہن کھلا
رکھے، شاگردوں کے سوالوں کو تحمل سے سنے اور محبت سے ان کے جواب
دے۔ شاگرد کہیں اختلاف کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ یہ ممکن
ہے کہ کسی ہونہار طالب علم کی نظر کسی ایسے نکتے تک پہنچ جائے جس تک
اتفاق سے استاد نہ پہنچ سکا۔ "شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل"

مفہوم واضح کرتے ہوئے کسی استاد نے شام کے صحرا کا مطلب یہ
کہ جھٹپٹے کے وقت صحرا میں درختوں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔
لاف کرتے ہوئے کسی طالب علم نے کہا کہ شاید یہاں ملک شام مراد
کہ وہاں کھجوروں کے بے شمار درخت ہوں گے۔ کچھ طلبا نے اس رائے
اتفاق کیا مگر استاد اپنی بات پر اڑے رہے۔ ایک صاحب نے
ن تھا تیرا بہت عالم فریب :: خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا" کی
شریح کرتے ہوئے خط کا مطلب مکتوب بتایا۔ رہی بات مفہوم کی تو
طلب شعر کے اندر سے نہ نکالا جا سکے تو بعض کاریگر قسم کے استاد اوپر
سے مطلب ڈالنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

بعض استاد بہت تیاری کر کے کلاس میں آتے ہیں۔ ضروری
بات کو وہ یادداشتوں کی شکل میں لکھ لاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ
ترین طریقہ ہے۔ خاص طور پر اعلیٰ جماعتوں میں اس سے مفر نہیں
راس کو کیا کریں کہ طلبا اس طریقے سے مرعوب نہیں ہوتے اور یہ بات
م ہوا میں نہیں رائے شماری کی بنیاد پر عرض کر رہے ہیں۔ ان کا آئیڈیل
ر ان کا مثالی استاد وہ ہے جسے سارے نکات ازبر ہوں! اقتباس
رحوالے کی بات الگ ہے۔ مطلب یہ کہ ٹیچر تیاری تو خوب کر کے آئے
ن اس کے شاگرد یہ سمجھیں کہ یہ تو دن رات مطالعے میں منہمک رہتے
ں، سارا علم نوک زبان ہے، انھیں بطور خاص تیاری کر کے آنے
ضرورت ہی کیا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں معاشیات کے ایک استاد
، ہم لوگ بے حد قائل تھے۔ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے کلاس میں آتے اور
فی علم کا دریا بہا جاتے۔ جس دن وہ آخری کلاس لینے آئے اس دن
ہوں نے عجیب انکشاف کیا۔ کہنے لگے: تم میں سے بہتوں نے میری
نت اور میرے حافظے کی اکثر تعریف کی ہے اور میں نے عموماً مسکرا مسکرا کے
ے قبول بھی کیا ہے مگر سنو میں اپنی جماعت کا سب سے غبی طالب علم
ا اور مجھ سے کمزور حافظہ کسی کا نہ تھا۔ میں نے محنت سے اور تدبیروں
ے اس کمی کو پورا کیا۔ یہ بات اس لیے کہتا ہوں کہ شاید تم میں کئی میری
ح اوسط درجے کے ہوں اور مجھ سے اپنی دشواری کا کوئی حل سیکھ
سکیں۔ آخر میں تمھارا استاد ہوں اور تمھیں سکھانا ہی تو میرا کام ہے
سنو، میں نے چیزوں کو یاد رکھنے کے فارمولے بنا کر رٹ لیے ہیں مثلاً
مجھے "سکّے کی خصوصیات" پر لیکچر دینا ہے۔ اس کے لیے میں نے ایک لفظ
بنا کے رٹ لیا۔ DISHCUP+M ان آٹھوں حرفوں میں ایک
ایک خصوصیت پوشیدہ ہے مثلاً D سے سکّے کی ایک صفت
DIVISIBILITY مراد ہے۔ I سے بنتا ہے INTRINSIC
VALUE ـ وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے میں بے تکان بولتا چلا جاتا ہوں
ایک صاحب کو شعر یاد نہیں رہتے تھے۔ ہاں پہلا لفظ بتا دو تو پورا شعر
یاد آ جاتا تھا۔ کہتے تھے کلاس میں شعر لکھ کر لے جاتے ہوئے شرم آتی
ہے۔ جن شعروں کی ضرورت پیش آنے والی ہے ان کے پہلے لفظ ہتھیلی
یا ناخنوں پر لکھ کر لے جاتا ہوں اور کسی طرح ان پر دزدیدہ نگاہ ڈال
لیتا ہوں۔ پھر کبھی سر کھجاؤں گا، کبھی چھت پر نظریں جماؤں گا گو
حافظے پر زور ڈال رہا ہوں اور آخر کار شعر سنا دوں گا۔ واقعی استا
کو کبھی کبھی تھیٹر کی سی اداکاری بھی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اداکاری
کا یہ مسلّمہ قاعدہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ناظرین کو اداکاری کا
شبہ تک نہ ہو ورنہ اداکار کی ساری محنت خاک میں مل جاتی ہے۔

> کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ
> تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔ (سر سیّد)

لیکن یہ اداکاری کارگر اسی وقت ہو سکتی ہے جب استاد
پوری تیاری کے ساتھ کلاس میں داخل ہو۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ شاگردوں
کی نظر میں اپنا وقار کھو بیٹھتا ہے۔ اس سلسلے کے بہت سے لطیفے تو
آپ نے سنے ہی ہوں گے لیکن بہت سے سچے واقعات بھی شنیدنی ہیں۔
ہمارے ایک دوست ابھی ایم۔ اے۔ کے طالب علم ہی تھے کہ ادیب کامل
کو پڑھانے کی اعزازی خدمت تفویض ہوئی۔ آدمی فرض شناس
تھے۔ تیاری کر کے جاتے اور محنت سے پڑھاتے۔ ایک دن اقبال
کی نظم پڑھاتے پڑھاتے اس شعر پر پہنچے:

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

تو مطلب بیان کیا: شاعر کہتا ہے اے خدا غریب کا بیڑا تیری ہی مدد سے پار لگتا ہے، جان جو سب کو عزیز ہے اور جسے پاک کہنا بجا ہے اس کا نگہبان تو ہے۔ مجاز مرسل سے آپ واقف ہوں گے کہ کبھی کبھی شاعر جُز کہہ کر کُل مراد لیتا ہے جیسے یہاں دیوار سے مراد مکان ہے۔ کہتا ہے اے اللہ یتیم کے گھر کا رکھوالا بھی تو ہی ہے۔ یہاں تک پہنچے تھے کہ ایک ہونہار طالب علم بے تاب ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا، ماسٹر صاحب ہم تو سمجھتے تھے اس شعر میں وہ تاریخی واقعہ بیان ہوا ہے جب حضرت موسیٰ اور حضرت خضر ہم سفر تھے۔ جس کشتی میں دونوں نے سفر کیا حضرت خضر نے اسے توڑ دیا بعد کو پتہ چلا کہ نہ توڑتے تو وہاں کا ظالم بادشاہ کشتی کو چھین لیتا۔ ایک بچے کو بچپن کے مار ڈالا وہ بڑا ہو کے نافرمانی کرتا۔ ایک گرتی دیوار کو درست کر دیا کہ اس کے نیچے کم عمر یتیموں کا مال دفن تھا۔ لڑکا درست کہہ رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کے پسینے چھوٹ گئے لیکن مومن تو ایک سوراخ سے صرف ایک ہی بار ڈسا جاتا ہے۔ اسی دن سے انھوں نے غالب و اقبال کے کلام کا مطالعہ شرحوں کی مدد سے شروع کر دیا اور قصائد اساتذہ سے پڑھے۔ چنانچہ آج ان کا شمار اردو کے نامور استادوں میں ہے۔ ایسے صدہا واقعات ہیں جن میں کچھ جگ بیتیاں ہیں کچھ آپ بیتیاں جو مزیدار بھی ہیں مگر چند صفحوں کے اس مضمون میں ان کا سمانا ممکن نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ مناسب تیاری کے بغیر کلاس میں جانا خطرے کو دعوت دینا ہے اور ایک بار استاد کا بھرم ٹوٹا تو سدا کے لیے ٹوٹ گیا۔

ذاکر صاحب نے کہا ہے کہ استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر لفظ محبت لکھا ہوتا ہے۔ واقعی جس دل میں طلبا کے لیے محبت نہ ہو وہ کسی استاد کا دل تو ہو نہیں سکتا۔ اچھا استاد تو وہ ہے جو اپنے شاگردوں کا دل سے بھلا چاہتا ہو۔ آج کے دور میں یہ بات عام طور پر سننے میں آتی ہے کہ طالب علم استاد سے کسی لفظ کے معنی پوچھنا چاہے تو وہ بتانے سے پہلے ٹیوشن فیس طے کر لینا بلکہ وصول کر لینا چاہتا ہے لیکن علی گڑھ میں ہمیں اس تصویر کا دوسرا خوشگوار رخ دیکھنے کے مواقع زیادہ ملے۔ یہاں اپنی آنکھوں سے کم سے کم دس ایسے ڈرائنگ روم دیکھے جو کلاس روم لگتے تھے کہ باقاعدہ بلیک بورڈ بھی لٹکا ہوا ہے۔ یہ ان اساتذہ کے ڈرائنگ روم ہیں جو خواہش مند طلبا کی مدد کو ہمہ وقت مستعد نظر آئیں گے اور معاوضہ تو کجا طلبا کی خاطر مدارات الگ کریں گے۔ یہاں بیسیوں استادوں کو طلبا کے واجبات چپکے چپکے اپنی جیب سے ادا کرتے دیکھا۔ ہمارے کرم فرما عبید الرحمٰن خاں شروانی صاحب کسی زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے ٹریزرار تھے اور اس راز سے واقف تھے کہ بہت سے استادوں کی تنخواہ سے طلبا کے واجبات مسلسل وضع ہوتے ہیں۔ شروانی صاحب ایک روز بتا رہے تھے کہ یہ اساتذہ ان کی خوشامد کرتے رہتے تھے کہ یہ راز ان کے گھر تک نہ پہنچے ورنہ خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہوگی۔ ایسے واقعات سنتے ہیں تو فخر سے سر بلند ہو جاتا ہے کہ ہم اس ادارے سے وابستہ ہیں جہاں ایثار کرنے والے اساتذہ کل بھی تھے، آج بھی ہیں۔

اچھے استاد کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ اس کا کوئی شاگرد کلاس روم میں یا کلاس روم کے باہر اس سے مل کر لوٹے تو اسے یہ احساس ہو کہ یہاں آنے سے پہلے وہ جو کچھ جانتا تھا واپس جاتے ہوئے یقیناً اس سے زیادہ جانتا ہے یعنی ہر ملاقات میں اپنے شاگرد کو وہ کچھ نہ کچھ ضرور دیتا ہے وہ امتحان کا پرچہ بھی اس طرح بناتا ہے کہ سیکھنے والا اس سے بھی بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔ اچھے استاد کی زندگی خود ایک سبق ہوتی ہے اور شاگرد اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سخت سردی میں ایک استاد رنگ برنگے دستانے پہن کر اسکول آ گئے اور کچھ شرمندہ تھے کہ کیا کروں اس وقت یہی موجود تھے۔ انٹرول کے بعد کم سے کم دس طالب علم اسی طرح کے دستانے پہنے ہوئے تھے۔ یہ طالب علم نویں اور دسویں جماعت کے تھے۔ چھوٹا بچہ اپنے والدین سے متاثر ہوتا ہے لیکن جب وہ بڑا ہوتا ہے تو یہ جگہ استاد لے لیتا ہے۔ طالب علم کے لیے استاد ایک مثالی انسان کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا جو نقش طالب علم کے ذہن پر مرتسم ہوتا ہے وہ زیادہ دیرپا ہوتا ہے استاد کو طالب علم کی اس اثر پذیری سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اگر ہمارے تمام اساتذہ کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہو جائے اور وہ اسے پورا کرنے پر کمربستہ ہو جائیں تو ہم تعلیم کے میدان میں یقیناً دوسروں سے آگے نظر آئیں گے۔

نور الحسن نقوی

عیاذ انصاری قاضی

پرا کٹر اور اُستاد

سیّد عبدالجلیل

رشید صاحب (مرحوم) کے قلم کی موشگافیوں نے گنجہائے گرانمایہ اور ہم نفسانِ سلف کے مرقعوں میں جہاں اُردو ادب کی اس صنف کو معتبر بنا دیا ہے برصغیر میں مُسلم اقلیت کے اداروں، تحریکوں اور جماعتوں میں دہاں علی گڑھ سرفرازی بھی ان مرقعوں میں ایک مضبوط دلیل بن کر ابھری ہے۔

رشید صاحب کے فن کا جائزہ نہ میرا مقصد۔ نہ منصب لیکن اُنکے نام لیوا کے ناطے، اِس حقیقت سے روگرداں بھی گذرنا نہیں چاہتا کہ ان کے طنز و مزاح کے تانے بانے میں، ان کی نجی محفلوں کی اہمیت نمایاں رہتی ہے، ان کے حواریوں میں خانصاحب حمید الدّین، حاذق صاحب، عظمت الٰہی زبیری اصغر صاحب اور ایوب صاحب وغیرہم کے ساتھ جلیل صاحب برابر کے شریک تھے، ان محفلوں کے داد نما قہقہوں اور مُسکراہٹوں ہی میں رشید صاحب کا فن پروان چڑھا ہے، حاذق صاحب بلند بانگ، شگفتہ مزاج، نطق و گویائی کے اداشناس بڑے قہقہہ انداز تھے تو جلیل صاحب دبی دبی مُسکراہٹوں کا ان محفلوں میں تبسّمی کردار ادا کرتے تھے۔ قہقہوں کی بسط و کُشاد میں مسکراہٹوں کا ضبط و انقباض، دو الگ الگ مزاج ہیں جلیل صاحب نے مزاج سے زیادہ، اِس انداز کو بہ سعی لبیار اپنی زندگی کی عادت بنا لیا تھا۔

علی گڑھ کی آمد سے پہلے کے جلیل صاحب کا مجھے کوئی علم نہیں لیکن یہاں کسی نے انھیں کھل کر ہنسنے یا پھر اونچے سُروں میں تیز تیز لے کے ساتھ کسی پر برستے نہیں دیکھا،

انسانی ذہن ہمہ وقت اور ہر حادثے پر سنبھل سنبھل کر چلنے کی کوشش کرتا رہے تو انسانی سیرت کا یہ گھٹل پن بھی ہو سکتا ہے لیکن نفس پر قابو پانے اور جذبات کو عقل کی گرفت سے باہر نہ ہونے دینے والے انسان کا عمل مجاہدہ اور یوگ بھی ہے اور یہ بڑے دل گردے والے کا کام ہے صوفیا اور یوگیوں نے بڑی بڑی ریاضتوں سے اس راہ کو ہموار کیا۔

جلیل صاحب کا تعلق بلا شُبہ نہ یوگ کے کسی مٹھ سے تھا اور نہ ہی وہ کسی صوفی صاف دل بزرگ کے خانوادے اور مرشد زادے تھے۔

ایک اچھّے اُستاد کے باوصف وہ علی گڑھ سے متعلق نہ بھی ہوتے تو اس دور کی محدود سائنس کے اساتذہ میں اُن کی حیثیت ڈاکٹر ولی محمد اور ڈاکٹر منصوری جیسی منفرد ضرور ہوتی، لیکن انھیں علی گڑھ سے متعلق ہونا اور اس ہجوم میں شامل ہونا مقدّر تھا جسے فوجِ طفلاں بھی کہا جاتا رہا ہے اس ہجوم میں رہ کر ہی اُن کی حیثیت سے زیادہ اُن کی شخصیت کی صبر آزمائی کا مظاہرہ ہونا باقی تھا۔ حیثیت سے شخصیت جدا بھی ہے، اور برتر بھی کہ انسانی حیثیت کا تعیّن اس کی اپنی طبعی زندگی کے حفظ و بقا کی جدوجہد سے ہے کہ اس نے زندگی کے سنگِ گراں کو کسی حد تک ہٹا کر خود کو سبک رو بنایا ہے، اقتصاد اور وجاہت، دونوں کے لیے خارجی قوتوں کو مسخر کرنا ضروری تھا اور جس حد تک یہ تسخیر ممکن ہوئی اس حد تک انسان کی طبعی زندگی کا تعین ہو گیا۔ وہ پروفیسر کہ ڈاکٹر کہ وکیل، صنّاعی و مزدکی اور افسری اور ماتحتی سب کی حیثیتوں کا تعین اضافی ہے کسبی ہے اور خارجی احوال کی قوتوں سے تصادم و تزاحم اس کا میدانِ کارزار ہے۔ لیکن اس سے آگے پھر جب انسان اپنی داخلی زندگی کی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے تو یہ تصادم اور یہ تزاحم خود اس کی اپنی ذات سے متعلق ہو جاتا ہے، جہاں اس کی سادہ فطرت کا تقاضا کچھ اور تھا اور مصلحتوں کا تقاضا کچھ اور ہو گیا۔ ایک ہی انسان کے اندر یہ دو ایسے دشمن موجود ہیں جو ایک دوسرے سے مبارز طلب، نہ ایک

دوسرے سے وہ صلح کرتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے الگ رہ سکتے ہیں۔ جلیل صاحب کی زندگی کے یہ دونوں زاویے، ان کی حیثیت اور شخصیت، بہت مختصر مگر بہ یک وقت اور ساتھ ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اُن کی زندگی ان کی حیثیت کی طرفگی اور شخصیت کی صبر آزمائی اور شکستگی محض برسبیل تذکرہ نہیں ہے، ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ موصوف ایف ایس سی کے میرے فزکس کے اُستاد بھی تھے اور طالب علم کی حیثیت سے متعدد بار میں پراکٹر جلیل صاحب کے حضور ایک مُلزم کی طرح کھڑے ہونے کی افتاد سے بھی گذر رہا ہوں۔ ان کی علمی برگزیدگی کے باوصف کیا میری کم بصیرتی ہی ہے کہ استاد کی حیثیت سے زیادہ سرعت کے ساتھ میرے ذہن پر ان کی شخصیت ایک برتر مقتدر اور مُربی پراکٹر کی طرح محفوظ رہی ہے۔

استاد شاگرد کے رشتے کی صحتمندی پر استاد کے روایتی اولیٰ اور پراکٹر کے معمولاً اخریٰ کی صغریٰ و کبریٰ پوری طرح منطبق نہیں ہوتی، اور بہ ظاہر یہ دعویٰ بلا دلیل ہی ہے کہ جلیل صاحب استاد سے زیادہ اس دور کے طلباء کے ذہن پر پراکٹر کی شخصی چھاپ چھوڑ گئے ہیں۔ علی گڑھ کو یہی چھاپ چھوڑنے والی الطباعی سیرت زیادہ عزیز رہی ہے غیر علی گڑھ والوں کی اس متاعِ عزیز کو علی گڑھ پرستی سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ محمد علی (مولانا) کہ مُرشد (ذاکر حسین خاں) ڈاکٹر ضیاء الدین، اور ایوب، علی گڑھ سرفرازی کی یہی الطباعی وحدۃ ان سب میں مشترک ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ علی گڑھ کی محدود دنیا کے سوا رشید کی جھولی میں اور ہے بھی کیا؟ پطرس (مرحوم) سے ہرگز ہرگز مقابلہ مقصود نہیں ہے لیکن برسبیلِ تذکرہ، اُردو زبان کے اس "جیروم۔ کے۔ ریوم" کے قلم کی گلکاریوں میں مقصد اور ذریعے کی ہم آہنگی قائم نہیں رہتی۔ شب برات کی پھلجھڑیوں سے زندگی کی تاریکیوں کو روشنی ملتی رہتی تو مقصد اور ذریعے کی صغریٰ و کبریٰ کی تلاش ہی بے سود ہے۔ پطرس (مرحوم) کے فن میں جہاں ذریعے کی گیرائی کی فراوانی ہے مقصد کی گہرائی کا اتنا ہی فقدان بھی ہے ان کے مزاج کی صوتی لہریں اوپری سطح پر علامت بننے سے پہلے سماعت سے ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں جیسے کوئی پوری طاقت سے قہقہہ لگا کر، خود ہی شرمساری کی تہکاوٹ محسوس کرتا ہو، قلب کی گہرائیوں تک مداری کی بلند و بانگ آواز کی رسائی کبھی ممکن نہیں ہوئی "جیروم۔ کے ریوم" کے غریب رشتے دار" کی الطباعی افادیت سے مضامین پطرس خالی ہے۔

رشید صاحب کے مرقعوں کی تحدید کرنے والوں نے علی گڑھ کی علامتی حیثیت کا اندازہ بھی نہیں کیا اور یہ نہ سمجھا کہ رشید صاحب سماعت سے زیادہ آخر قلب کو کیوں جھنجھوڑتے ہیں، اپنے ذکر و فکر میں اسی کسک کو کیوں بیدار رکھتے ہیں وہ اسی خلش کو کیوں اُبھارتے ہیں، برصغیر کی مسلم اقلیت جس کرب کو دو صدیوں سے زائد سینے سے لگائے، اپنے وطن میں مسکینی و محرومی کی زندگی گذارتے پر مجبور رہی ہے۔ یہی غم پنہاں رشید صاحب کا محور و مرکز ہے، اور غم پنہاں، وہ غم ہے جو بے گفتن عیاں ہو۔ اور اس شرط کی جزا بھر مصرعۂ ثانی خود رشید صاحب ہیں "چو آید بر زبان یک داستان است"، علی گڑھ کو علامت بنا کر انھوں نے اس غم کی ہزار داستانی کی ہے ؎ غم پنہاں کہ بے گفتن عیاں است۔ چو آید بر زباں یک داستاں است

۵۷ء کے بعد اقلیت سماج میں خارجی احوال کے مصائب کی داستان زائد از شمار ہے باز بجواں کی ہدایت سے منحرف اگر ۵۷ء کے حادثے کو قصہ پارینہ سمجھ کر بھولنے کی کوششیں بھی کیجیے تو اسے کیا کہیے کہ عبوری دور کی پوری یہ ایک صدی محرومیوں اور ناکامیوں کی ہزار داستان بن بن کر ہمارے سامنے آتی رہی ہے، ترک موالات ہی کو لیجیے کہ ملت و قومیت کی ہم آہنگی کا جو طلسم ہم نے اقلیت و اکثریت اتحاد سے قائم کیا تھا، وہ بے بود ہی ثابت ہوا، مشرق و مغرب کی کشمکش کا زور گھٹا نہ معاش و معاد میں عدل و وسط قائم رہ سکا، خلافت کی ہاری ہوئی بازی سے قومی تحریک کے تنِ مردہ میں ہم نے زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ وہ روح مرشد کی نمناک آنکھوں میں جس کی دمک رشید صاحب نے دیکھی تھی۔ ہندو مُسلم اتحاد کا وہ روح پرور عمل دنیا کے سامنے ایک نئے سماج کا تصوّر بنتا آرہا تھا، وہ سماج جو جامعہ کے یومِ تاسیس کے دن، پہلی بار اُن کے ذہن میں شرارہ بن کر چمکا تھا۔ یورپ کے مفاد پرست۔ ذہن سے الگ اس نظامِ زندگی میں نہ تغلب تھا، نہ تسلط تھا، سرمایہ کی اجتماعی فتنہ پروری تھی نہ اشتراکیت کی انفرادی تہی دستی، ایوب مرحوم کی صاف و سادہ سیرت میں انھوں نے انسان کی فطرت صحیحہ کی علامت کو روشن دیکھا تھا کہ عوامی فلاح کی بنیادی قدروں پر یہ ایک ملک کی مشترک زندگی کا ایک نیا اقتصاد بھی تھا اور نئی

سیاست بھی۔ اور یہی اس دنیا کی وہ تمنا تھی جو آج کی متصادم قوتوں کے
درمیان عدل و وسط کے راستے کی نشاندہی کے لیے ٹھیک رہی ہے
انسانیت کو جنگ کی ہولناکیوں سے امن و شانتی، خوشحالی و خود کفالی
کی سمت موڑ لانے کا یہ راستہ مگر کھوٹا پڑ گیا اور آزادیٔ ہند کا ترک
موالاتی قافلہ زندگی کی پرپیچ راہوں سے گزرتا، بے شمار تلخیاں اپنے
ساتھ لیے اور المناک داستانیں پیچھے چھوڑتا، راہ زن راستوں کی
طرف موڑ کھا گیا ؎

تری محفل ہے ہم آئے مگر باحالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

تمنا کا المیہ ہی یہ ہے کہ وہ تماشا بن کر رہ جائے۔ دین اور عقیدے کی
مضبوطی کے ساتھ اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی استواری کی خاطر،
معاش و معاد کے وسط و اعتدال کے لیے اپنے مسلک کی رواداری اور
نظامِ اخلاق کی مضبوطی کے اعتماد کے ساتھ ہم نے ترکِ موالات میں مشترک
قومیت کا جواز ڈھونڈا تھا اور پوری پوری دیانت اور بھرپور شجاعت
کے ساتھ، علی گڑھ ہی نے ترک موالات کو اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ
بنادیا۔ اس ملک کی غیر اسلامی اکثریت کے اندر رہ کر اپنی عددی قلت
کے ساتھ اتحادِ عمل کے لیے، خود زندہ رہنے اور دوسروں کو زندہ رہنے
کے حق پر یقین کے ساتھ، برصغیر میں مشترک زندگی گذارنے کا چودہ سو
سالہ اسلامی تاریخ کا یہ پہلا اور منفرد واقعہ تھا مسلمان جہاں بھی
پہنچے وہ فاتح اور بااختیار حیثیت لے کر گئے اقتدارِ زمانہ سے جہاں انھیں
ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا انھوں نے مقامی آقاؤں کے ساتھ اشتراک
سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ اپنی کھوئی ہوئی آزادی بحال کرکے وہ دوبارہ
بااختیار ہوئے یا پھر تاریخ کا ایک منجمد صفحہ، وہ راستے ہی سے الگ
ہو گئے۔ علی گڑھ کے احرار کی قوتِ عمل نے، اس ملک میں مشترک قومیت
میں حفظ قوت کے امکان کو مضبوط بنا کر، حفظ ناموس کا راستہ روشن
کیا تھا۔ قاسمؒ اور سرسیّد کے خواب کی یہی تعبیر تھی کہ دونوں رہبر
قافلہ ۱۸۵۷ء کے بعد چل پڑے تھے، ایک ہی مقصد لے کر، راستے
ان کے جدا جدا تھے، ذرائع مختلف تھے اب ذرائع کا ارتکاز ہوا تو
مقصد کی یکتائی اُبھر کر سامنے آئے گی۔ فاتح برطانیہ کا قصرِ اقتدار کو
محمود و محمد علی کے مضبوط ہاتھوں نے متزلزل کر دیا تھا، انگریز نے
گھٹنے ٹیک دیے تھے کہ دفعتاً بساطِ سیاست ہی اُلٹ گئی، محاذِ جنگ ہی
چھوٹ گیا زمین پاؤں تلے سے نکل گئی آسمان پھٹ پڑا اور جیتی
ہوئی بازی ترک موالات کی ناکامی کی شرمساری میں بدل گئی۔ تاریخ
کا وہ عظیم کارنامہ وقت کی تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

علی گڑھ پر اس ناکامی کا ردِّ عمل صاف تھا، شکست قبول،
ٹوٹے دل، سیاسی بازی گری کے فریب خوردہ، ذہنی انتشار کے مارے
سیاسی بے بو کے زخم کا نشان بازو پر کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال (غازی) نے
خلافت ہی کو معزول کر دیا تھا، وہ خلافت جس کی حفظ و بقا کے لیے
ہم نے اس ملک کی اکثریت کو قومیت کا دھن دیا تھا۔ انگریز کا جذبہ
منتقمانہ تھا تو ہم سفروں کی شماتت تھی، اقتصادی بے مقامی کی سمت
دھکیل کر اکثریت نے ہمیں حفظ قوت کے اتحاد سے محروم کر دیا تھا۔ اس
تمام عرصے یونیورسٹی کی تخلیقی قوتیں، مفلوج اور معطل رہیں۔

سر رحمت اللہ کمیشن کا ذکر نہ بھی کیجیے کہ علی گڑھ پر ترک
موالات کی ناکامی کی افتاد پر یہ کمیشن مزید بر آں، وبیش باد تھا،
بھوپال کی حکمراں خاتون کے واسطے سے کہ وہ یونیورسٹی کی چانسلر تھی
انگریز نے علی گڑھ سے ترک موالات کا انتقام تو لیا ہی تھا، مگر برطانوی
فراست کے لیے اس سازش کی پردہ پوشی بھی ضروری تھی کہ ہندوستان
کی صنعتی ترقی کی کنجی اُس نے اقلیت سے پسِ پردہ، اکثریت کے
حوالے کر کے، قومی تحریک کو خریدنے کی قیمت ادا کی تھی۔ اقلیت کو
اور اسی دور کی اقلیت صرف مسلم اقلیت تھی، اس دھرتی کے آخذہ
کی پیداواری قوت سے محروم کر کے انگریز اور اس کی حلیف
اکثریت نے پیداواری قوت کے باہمی رشتے کی سماجی ترقی کی راہ ہی کو
مسدود کر دیا تھا۔ مشترک قومیت کے نونہال پودے کی آبیاری کے
لیے پیداواری قوت کی مساوات کی ضرورت ہی قومیت کی بنیاد
ہے کہ سماج کی پیداواری قوت کے رشتوں میں منسلک ہو۔ مشترک
قومیت کی دوسری تمام شرائط فروعی ہیں۔ پتوں کی آبیاری سے
جڑ کی مضبوطی ممکن نہیں۔ بہر حال ذکر اس نامبارک کمیشن کا تھا جس کو
یونیورسٹی کے نظم و اہتمام میں جب کوئی رخنہ نہ ملا تو اسکول کی چند
انفرادی بدکاریوں کا کیچڑ اچھال کر اسی کو حاصل کمیشن قرار دے

یا گیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو یونیورسٹی کی سربراہی سے الگ کر دیا
گیا۔

جلیل صاحب کی حیثیت اور شخصیت کا ابھار، نکھار اور وقار اسی دورِ مختصر میں نگاہوں کے سامنے آیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے دست راست جلیل صاحب کمیشن کے احتساب سے کیونکر بچ نکلتے وہ بھی یونیورسٹی سے الگ کر دیئے گئے۔

میں اس کا چشم دید گواہ ہوں کہ کتنی بڑی وہ آفت تھی جو اس دور کے طلباء اور اساتذہ کے سر سے گذر گئی۔ اور کتنا بھاری وہ طوفان تھا علی گڑھ جس کی لپیٹ میں تھا۔ ترک موالات کی ناکامیوں اور محرومیوں کے عبوری دور میں جلیل صاحب کی کارکردگی نے نوجوانوں کی جھنجھلاہٹوں اور بے زاریوں معتدل رکھا۔ یونیورسٹی میں نہ کوئی بم پھٹا نہ چاقو زنی کے واردات ہوئے ٹکراؤ اور پتھراؤ اس دور کے طالب علم کا مزاج ہی نہیں تھا۔

استاد و شاگرد کے رشتے سے زیادہ جلیل صاحب طلباء کے ہجوم کی نگہبانی کی خدمت پر مامور رہے، دنیا کی تقریباً تمام درسگاہوں میں پراکٹر کی خدمات میں یونیورسٹی قوانین کا نفاذ، اور طلباء کے اخلاق و عادات کی دیکھ بھال شامل ہے۔ جلیل صاحب نے اس میں شک نہیں، اپنے دور کی اس خدمت کو ریاضت کا بدل دے کر، خدمت سے زیادہ عبادت بنا لیا تھا، ان سے پہلے یونیورسٹی پراکٹر مرحوم ولایت حسین تھے۔ علی گڑھ سے ان کا خلوص ضرب المثل ہے۔ ڈپٹی حبیب اللہ (مرحوم) میر ولایت حسین اور مولانا طفیل احمد علی گڑھ کے قدیم کے یہ تین نام ہمیشہ عقیدت کے ساتھ لئے جاتے رہے ہیں۔ ترک موالات کے بعد یونیورسٹی کی زندگی میں، ترک موالات سے پہلے ایم اے او کالج جیسی سکون و عافیت تو رہ نہ سکی کہ بزرگی و خوردی کے تعلق سے میر صاحب مرحوم طلباء کے مزاج کو متوازن رکھتے ترک موالات کے عام تصورات کے خلاف جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے احرار کے بالمقابل زور لگائی کی اور یونیورسٹی کو بے مقام ہو جانے سے محفوظ رکھنے کی آواز بلند کی تو انھیں ضبط و نظم کی خاطر نوجوانوں خون کی ضرورت تھی انھوں نے کالج کے نووارد، الڑھ ہجوم کو پرنسپل عبدالمجید قریشی (مرحوم) کے سپرد کیا، نظم و اہتمام کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر، جلیل صاحب بار کی اقامتی زندگی میں عافیت قائم رکھنے کی ذمہ داری سونپ دی یونیورسٹی کا پراکٹر بنا دیا۔ جلیل صاحب نے ایم۔اے۔او کالج کی سلور

جوبلی کی کامیابی کی خاطر، اپنے انتظام کی کڑیوں کو مضبوط رکھنے کے لیے یونیورسٹی میں پہلی بار، سینئر طلباء میں سے ایک سینئر پراکٹوریل اور ان کی نگرانی میں مختلف اقامتوں کے نمائندے پراکٹوریل مانیٹروں کا ایک پورا دستہ قائم کرایا۔ جلیل صاحب کی اس نئی وزارتی قسم کی ٹیم نے چار ہزار طلبا کے ہجوم کو گھیرے میں لے لیا، جوبلی کے انتظامات کا زور بڑھ رہا تھا، طلباء میں ترک موالات کی ناکامی کا احساس گھٹ رہا تھا۔ ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو رہا تھا، ڈاکٹر ضیاء الدین کے حسابی ذہن نے 'ایم اے' او کالج جوبلی کے انعقاد کے اعلان سے اس خلش کو دور کر دیا تھا۔ جو ابنائے قدیم و جدید میں علی گڑھ ناکامی کی احساس کمتری بنتا جا رہا تھا۔ اب یونیورسٹی کی زندگی میں تابندگی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے ذہن میں جوبلی کے سہانی یادوں میں اسٹریچی ہال کا آل انڈیا مشاعرہ، جوبلی کے کھلے اجلاس کا عظیم پنڈال، خاص اس جگہ جہاں آج کینیڈی ہال کی عظیم عمارت کھڑی ہے، عجب منظر تھا، ہزاروں ابنائے قدیم و جدید، سیاہ شیروانیاں، اور سرخ ٹوپیاں لگائے، خواجہ دل محمد کی وہ نظم سن رہے تھے جو انھوں نے خاص سلور جوبلی کے لیے کہی تھی، پوری نظم تو ذہن سے نکل گئی اور پھر تلاش بسیار کے بعد بھی میسر نہ ہو سکی مگر اس کے چند مصرعے میرے ذہن میں جم کر رہ گئے ہیں، ساٹھ سال پرانی وہ آواز آج بھی کانوں میں گونج جاتی ہے ؎

تیرا خدا موجود ہے۔ تیرا قرآں موجود ہے
لا تقنطو پر رکھ یقیں، اے وارثِ دنیا و دیں

ایم اے او کالج کی سلور جوبلی کے صحت مند تاثر کو آگے بڑھانے کا موقع ملتا تو اساتذہ اور طلباء کے باہمی رشتے میں شگفتگی کا پیدا ہو جانا ضروری تھا، ترک موالات سے علی گڑھ تحریک میں جو اضمحلال اور ہزال ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی قیادت سے تحریک کی قوت کی بازآفرینی کے امکانات میں روشن تھے۔ لیکن سر رحمت اللہ کمیشن کی ناعاقبت اندیشانہ سفارشوں نے یونیورسٹی کی دوبارہ بنی ساکھ کو مجروح کر دیا، ان کی علیحدگی سے سلجھاؤ کی بجائے مسایل اور زیادہ الجھ گئے اور پانچ سات برس انقلابی دور کے علی گڑھ کارکردگی کے لیے ضایع اور رائگاں ہو گئے، اس قلیل عرصے میں بڑے نام آور وائس چانسلروں کی یکے بعد دیگرے تبدیلی سے نہ نظم میں کوئی سدھار ہوا، نہ تعلیمی کارکردگی بڑھی نہ طلبا اور اساتذہ کے باہمی تعلق میں کوئی شگفتگی پیدا ہوئی، جمود اور تعطل کو

اس دور کا کوئی وائس چانسلر دور نہ کر سکا، علی گڑھ کی ہر کوشش بقول روتی، کوشش بے سود بہ از خفتگی سے آگے نہ بڑھ سکی، سر راس مسعود (مرحوم) کا انتخاب اس میں ذرا شک نہیں وقت کے بڑے نازک دور میں علی گڑھ کے لیے مفید مقصد تھا۔ اور انھوں نے پہلی ہی فرصت میں اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر علی گڑھ کے لیے سائنس کی بہترین لیبارٹری اور کام کرنے والے بین اقوامی شہرت کے اساتذہ کا انتظام بھی کر دیا۔

لیکن سر سید کے پوتے نے دادا کی بصیرت افروزی کا ثبوت نہ دیا۔ سائنس کی کارکردگی کے معیار کو اونچا اٹھانے اور ہمعصر یونیورسٹیوں میں علی گڑھ کی سائنسی پیداوار کو بلند کرنے کا جذبہ اس میں شک نہیں بہت مبارک تھا اور سر راس نے بڑے حوصلے اور ہمت سے کام لے کر، پرنس آف ویلز لیبارٹریز، بہترین معمل بنا دیا لیکن وہ اس راز سے بے خبر اس عظیم کام میں مصروف عمل ہے کہ سائنس کی تعلیمی کارکردگی کو لیبارٹریز سے باہر صنعتی ترقی کے میدان کارزار کی ضرورت تھی کہ وہ ہمعصر یونیورسٹیوں میں اپنے مقام کو حاصل کرتی۔ پرنس آف ویلز لیبارٹریز، اور اس کے کارگزار اساتذہ اپنی اپنی جگہ مصروف کار رہے بھی تو کیا۔ سبب اور مُسبب کی منطق میں اسباب کی فراوانی مُسبب کی ساتھ مربوط نہ رہ سکتی تھی۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلباء سائنس کے سامنے کوئی لائحہ عمل کوئی منصوبہ نہیں تھا جس کے حصول کے لیے وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا نے اس کی ڈگریاں بازار میں کھوٹے پیسے کی طرح ناقابل قبول ہی رہی۔ اور حمید الدین خاں صاحب کی مشہور پھبتی سفید ہاتھی ہمارے سائنس کالج کی کارکردگی پر پوری طرح صادق تھی۔ میری ملازمت کی خبر سنتے ہی خاں صاحب مرحوم نے بڑی بے ساختگی سے کہا تھا، 'پڑھی فارسی اور بیچا تیل' سائنس کے طالب علم اور گانے بجانے والوں میں بیٹھ کر روزی کی تلاش وائے بوالعجبی!

———— خانصاحب کی اس پھبتی کا جواب تو ممکن نہیں تھا کہ ذریعہ اور مقصد کی اس بے ربطی کے شکار وہ طالب علم ہو رہے تھے جنھوں نے اونچی سطح کی صلاحیتوں کے ریکارڈ توڑے تھے مگر نتیجے میں وہ بھی ناکام و نامراد ہی پھرے۔ محمد احسان (فلم اسٹار سائرہ بانو کے باپ) میرے ہم جماعت بی ایس سی کے سرفہرست کامیاب طالب علم تھے۔ اُن کی صلاحیتوں کے لیے میدان کارزار کی مطابقت ہوتی تو ہندوستان کے آخذہ کی قوت پیداوار کے وہ ایک موثر حقدار ثابت ہوتے، لیکن اس غریب کی زندگی میں پری چہرہ نسیم کی ذہنی طمانیت کے سوا، اس کی تعلیمی کارکردگی کا کوئی ثمرہ نہ ملا۔ بمبئی میں تاج فلم کمپنی میں باپ کی گاڑھی کمائی ڈبو کر لڑائی کے زمانے میں جوہو کی امریکن کینٹین کی ٹھیکیداری کی انتہائی نا آسودہ زندگی بسر کرتے رہے 'پڑھی فارسی اور بیچا تیل' کی پھبتی کے وہ بھی مصداق رہے۔

———— اس دور کی علی گڑھ کارکردگی میں خواجہ السیدین (مرحوم) کا ٹریننگ کالج اور مولانا عبد الخالق کا قانون کا شعبہ یہی دو ایسے ادارے تھے جس کے فارغ التحصیل طلباء کو اسلامیہ کالجوں اور اسکولوں میں ٹیچری اور ضلع دار عدالتوں میں وکالت کا موقعہ میسر ہو جاتا تھا، اور پورا ہجوم ایک ہی کشتی میں سوار تھا، کس نمی پُرسد کہ بھیا کیستی۔ کا دور دورہ تھا۔

ترک موالات کی ناکامی کا جو ردّ عمل علی گڑھ پر ہوا اس کی نشاندہی باہر کی زندگی میں بڑی واضح اور صاف تھی، جس ہندوستان کا خاکہ ابھر کر سامنے آرہا تھا، اس میں اقلیت بے سروسامانی، پریشانی وحیرانی کی صاف نشاندہی ہو رہی تھی۔ مشترک قومیت میں حفظ قوت کا جو امکان ابھر کر قائم ہو رہا تھا اکثریت نے خلافت کانگریس اتحاد کو توڑ کر ہمیں اس قوت سے محروم کر دیا تھا، اس کی باز آفرینی کے ہر منصوبے پر انکار لازم آتا جا رہا تھا! خاکساروں کی تنظیم سے وابستہ احراریوں کی سرفروشی کی وہ ہمنوا بیلچے کندھوں پر سادھے، سبز پھریرے ہوا میں اڑاتے، بازاروں میں پریڈ کرتے، ہاتھوں میں کلہاڑے لیے نیلی پوشش وہی تھے، وہی سبز پوشش اور سرخ پوشش تھے۔ خلافت کانگریس اتحاد کے علمبرداروں کی حیثیت علی گڑھ کے سائنس کالج کے ڈگری داروں کی طرح ہندوستان کی سیاست میں، غیر معتبر تھی ڈاکٹر ضیاء الدین کی علیحدگی اور پھر ان کی دوبارہ واپسی کے عبوری دور میں زندگی نے جو کروٹیں بدلی اور برصغیر کی اقلیت جن انتشاری رجحانات کا شکار رہی، اس کے متوازی اکثریت نے جس جس طرح بلاشرکت اقلیت ہندوستان کی زندگی میں، اپنی اقتصادی زندگی کو اپنی سیاسی کارکردگی سے الگ مضبوط بنایا ہے۔ اس کی تصویر اب مکمل ہو چکی تھی۔

ہندوستان کی قوتِ آخذہ کھل کھل کر سامنے آرہی تھی سرمایہ کاری

کے بے پایاں امکان تھے۔ بنارس یونیورسٹی کے فارغ التحصیل خورسند تھے وہی سرمایہ کار اور حکومت کے نوکرشاہی بن بن کر نکل رہے تھے۔ وہی سرمایہ داری نظام کی کڑیوں کی بلا شرکت اقلیت اور علی گڑھ سے بے تعلق اور بے نیاز ہندوستان کی زندگی میں مضبوط کر رہے تھے۔ نئی نئی بنکوں کے مالک اور مینیجر وہی تمام نہاد انجینئر، انشورنس پر ان کا قبضہ، پریس ان کے ہاتھوں میں، صابن، تیل، کوئلہ، لوہا، دوائیں اور شکر اور سوت کی تمام مصنوعات پر وہی قابض تھے، رحمت اللہ کمیشن گزیدہ علی گڑھ کے طالب علم اس تمام عرصے یونیورسٹی کی چہار دیواری میں محبوس زندگی گزار رہے تھے۔ ۳۰ء کے ادھر ادھر جب میں بی ایس سی کا طالب علم تھا، جلیل صاحب کو میں نے فتحپوری کے ایک بالاخانے کے دفتر میں دیکھا، انشورنس کے ساتھ، وہ سائنس کے آلات کی سپلائی کی کشمکش سے گزر رہے تھے اور بہ خیال خود اب تجارت کرنے پر مائل وہ استاد کی حیثیت سے الگ اور پراکٹر کی وجاہت سے دور ایک نئی زندگی اختیار کرتے جا رہے تھے۔ رشید صاحب اور حاذق صاحب کے تعلق سے میرا رشتہ اُن سے خُوردی و بُزرگی کا تھا۔ انھوں نے اپنے انداز خاص کی مسکراہٹ سے میری پذیرائی کی اور پوچھا شاہجہانپوری کی دوکان سے قورمہ بھی کھایا، دلی کی سیر اس قورمہ بغیر نامکمل ہے۔ میں نے کہا آپ نے تو علی گڑھ کو خیرباد ہی کہدیا۔ فرمانے لگے تم علی گڑھ کی خیر مناؤ میری فکر نہ کرو۔ میں نے کہا سر راس مسعود نے پرنس آف ویلز لیبارٹریز بنوا دی ہیں بی ایس کا ہمارا پہلا طائفہ اس میں کام کر رہا ہے وہ مسکراتے رہے اور فرماتے رہے، رشید، حاذق اور خاں صاحب کی خیریت سناؤ، سائنس کالج کا ذکر فضول نہ کرو، میں حیران رہ گیا کہ یہ وہی جلیل صاحب ہیں سائنس کے میرے استاد اور بھاری بھر کم علی گڑھ یونیورسٹی کے وہ پراکٹر۔ وہ مجھے شاہجہانپوری کی دوکان پر لے آئے اور میرے لیے قورمہ روٹی کا آرڈر کر کے میرے سامنے بیٹھ گئے، جلیل صاحب مسکراتے رہے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر کچھ دنوں کے بعد جب ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم کی علی گڑھ میں بہ انداز دیگر دوبارہ واپسی ہوئی ایک روز میں نے انھیں یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس میں بیٹھے کاغذات میں اُلجھے امتحانات کے شعبہ کے محمد علی مرحوم کے ساتھ کام کرتے دیکھا ان کی حیثیت اور شخصیت پر اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ہے وہ نہ اُستاد تھے نہ پراکٹر جلیل صاحب حمیدالدین خاں صاحب نے اپنے گھر کا زائد حصّہ اُن کی رہائش کے لیے دے دیا تھا، وہ ہر روز شام کو دوستوں میں بیٹھ کر مسکراتے ضرور تھے، لیکن غالب نے شاید ایسی ہی کسی شخصیت کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اسد میں تبسّم ہوں پژمردگان کا"

بقیہ: فرانسیسی فلسفی........

حقیقتِ واقعی یہ ہے کہ "دورانِ خالص" اور "پیمائشی" یا "تسلسلی زمان" کے درمیان برگساں کی تدقیق متاخر نو فلاطونی فلاسفہ سے ماخوذ ہے جو اپنی نوبت میں ایرانِ قدیم کی "زروانیت جدیدہ" سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ "زروانیت جدیدہ" ساسانی عہد کے آخر میں ایران کی مذہبی فکر میں سر اٹھا رہی تھی۔ مگر برگساں نے "دورانِ خالص" [Dubee Reels] کی بازیافت کے بعد اپنی تخیّل کے سمند بادپیما کی لگام کھینچ لی۔ اور یہی علاّمہ کی نظر میں برگساں کی غلطی تھی، جس کی نشاندہی کے لیے فرماتے ہیں:

"میں یہ خیال کرنے کی جراَت کرتا ہوں کہ برگساں کی غلطی
زمانِ خالص کو خودی پر مقدّم سمجھنے میں مضمر ہے، کیونکہ
صرف اسی کے لیے دورانِ خالص ممکن ہو سکتا ہے"۔

[اقبال: خطبات ستہ صفحہ نمبر ۵۰]

اِس لیے ان کے شوقِ فضول نے اس "سمند بادپیما" کو "بادپیمائی" کے لیے مطلق العنان چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس اعتنائے مفرط نے انجام کار انھیں بھی اسی راہ پر ڈال دیا جس پر قبل ساسانی دور کے مفکرین کو ڈال دیا تھا۔ مزید تفصیل آئندہ۔

★ ★

سید کاظم نقوی
ریڈر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فکرِ انسانی کی نئی تشکیل

عقلِ عمومی کا یقینی منصفانہ فیصلہ

وجودِ خدا کی طرف اِنسانی فطرت بھی راہنمائی کرتی ہے اور عقلِ عمومی بھی۔ یقیناً اگر فطرت کو طرح طرح کے مخصوص اسباب اس کے راستے سے روگردان نہ بنا دیں تو وہ وجودِ خدا کے متعلق اِنسان کے دل کو مطمئن بنا دیتی ہے۔ فطرت اس عقیدے کی دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ عقل کو دِل سے نہیں، دماغ سے سروکار ہے۔ وہ اِنسان کے دماغ کو خدا کے ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ اس سلسلے میں عقل اور فطرت کے درمیان اس لحاظ سے بھی فرق ہے کہ فطرت کی راہنمائی کا دائرہ ہر شخص کی ذات سے محدود ہے۔ مصائب و آلام کے بادل جب کسی انسان کے سر پہ گرجتے ہیں۔ جب ظاہری اسباب و ذرایع کے بندھن ایک ایک کرکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ جب اِنسان اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتا ہے تو اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ ہر طرف سے اس کے سامنے مایوسی ہی مایوسی آتی ہے۔ نجات کی کوئی راہ اور امید کی کوئی کرن دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ یکایک اس کی فطرت اس کے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے کہ اے اِنسان! نا امید نہ ہو، اِس عالمِ بے سروسامانی میں کوئی با اقتدار ذات ہے جو تجھے نجات دے سکتی ہے۔ ذاتِ الٰہی کی جانب اس فطری کشش کو صرف اس شخص کا دل محسوس کرتا ہے جسے نا امیدیاں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ ہرگز اس پر قادر نہیں ہے کہ اپنی وارداتِ قلبی کو دوسرے کے دل میں ڈال دے۔ قلبی کیفیات سے دوسرے کو آگاہ کیا جا سکتا ہے لیکن انھیں دوسروں کے دلوں میں پیدا نہیں کیا جا سکتا، وہ کیفیتیں وجود میں نہیں لائی جا سکتیں۔ خود بخود مخصوص حالات میں وجود میں آتی ہیں۔

عقلی راہنمائی کی نوعیت اس فطری راہنمائی سے مختلف ہے جس شخص کا دماغ کسی دلیل سے وجودِ خدا کا قائل ہوا ہے، اس کا یہ عقیدہ اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ وہ اسی دلیل کے ذریعے اس بارے میں دوسرے کے ذہن کو مطمئن بنا سکتا ہے۔ وہ جس طرح خود وجودِ خدا کا معتقد ہے اسی طرح دوسروں کو بھی قائل کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف قسم کے ادلّہ وجودِ خدا تک انسانی عقل کو پہنچاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا سرچشمہ ایسے علوم ہیں جن کا احساس اور تجربے سے تعلق ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا سرچشمہ خالص فلسفہ ہے۔ اِنسانی تاریخ زندگی بہت پرانی اور لمبی ہے۔ ہر شخص ایک مخصوص دماغی صلاحیت رکھتا ہے ہر ایک کے پاس معلومات کا ایک مخصوص ذخیرہ ہے، وہ اپنے فہم و علم کے مطابق خدا کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ علمی اور فلسفی ادلّہ کی مدد سے اس کے متعلق طرح طرح کے فیصلے کرتا ہے۔

یہ تصور غلط ہے کہ خدا کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ اتفاق سے وہ آسان اور بہت آسان ہے۔ یہ عالمِ کائنات درہم وبرہم اور غیر منظم نہیں ہے۔ اس کا نظام وجودِ خدا کی انتہائی مضبوط دلیل ہے جو مجموعی طور پر ہر ایک کو مطمئن بنانے کے لیے کافی ہے۔ درحقیقت موجوداتِ عالم ایک ایسی کتاب کے مانند ہیں جس کا ہر ہر صفحہ بلکہ ہر ہر سطر اس کے مرتب اور منظم ہونے کو بتاتی ہے۔ قرآن مجید اور عظیم المرتبت راہنمایانِ اسلام نے صاحبانِ عقل کو بڑے پرزور انداز سے اس کتاب کے غور سے پڑھنے کی ہدایت کی ہے، اتنا ہی نہیں انھوں نے موجوداتِ عالم کے حیرت انگیز نظم و ترتیب کے کچھ نمونے بھی پیش کر دیے ہیں تاکہ نکتہ رس اشخاص کتابِ خلقت کو پڑھنے اور اس کے دل میں چھپے ہوئے اسرار و رموز کی چھان بین کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ ارشادِ قرآنی ہے۔

قل انظروا ماذا فی السموٰت والارض	"اے رسول! تم ہمارا یہ حکم لوگوں کو سنا دو کہ ان کا فرض ہے کہ وہ غور کریں کہ ان آسمانی کروں اور خود کرۂ زمین
یونس ۔ ۱۰۱۔	

ہیں کون سی چیزیں اور ان کے وجود میں کیسے کیسے اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔"

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

"یقیناً زمین اور دوسرے آسمانی کروں کی پیدائش میں، دن اور رات کے یکے بعد دیگرے آنے جانے میں، اُن کشتیوں میں جو سمندروں کی سطح پر لوگوں کے لیے مفید اشیاء لے کر چلتی ہیں، ان بارشوں میں جو بلندیوں سے زمین پر ہوتی ہیں، جن سے خدا مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے۔ جن کے آغوش میں مختلف قسم کے چوپائے پھیلادیے ہیں ان بادلوں میں جو زمین اور آسمان کے درمیان حکم خدا کے فرماں بردار ہیں، اس کی قدرت، حکمت اور عظمت کی نشانیاں ہیں صاحبانِ عقل کے واسطے۔"

عربی زبان میں "رویت" اور نظر کے معنی میں فرق ہے۔ "رویت" کے معنی ہیں آنکھ سے دیکھنا، لیکن "نظر" علمی نگاہ کو کہتے ہیں، یعنی غور و خوض کرنا۔

قرآن اور تعلیماتِ قرآنیہ کے علمبرداروں نے کائناتِ عالم کے متعلق لوگوں کو غور و خوض کرنے کی دعوت کیوں دی؟ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی ذہانت کے مطابق ان موجودات میں جو نظم و ضبط کے چمکتے ہوئے نمونے موجود ہیں انھیں دیکھ سکے۔ وہ اس حیرت انگیز نظم کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرے کہ وہ بغیر کسی صاحبِ عقل و شعور طاقت کے پیدا کیے وجود میں نہیں آسکتا ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ اندھا، بہرا، گونگا، بے حس، بے زبان، بے شعور، مادہ خود اپنے کو اس طرح منظم اور مرتب کرلے

نیچرل سائنس کے گوناگوں شعبے ہیں۔ اس کی ہر شاخ درحقیقت اس عالمِ وجود کے کسی ایک گوشے کے نظم و ترتیب کو نمایاں کرتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انسان نے ان موجودات کے بہت سے سربستہ رازوں کا پتہ چلالیا ہے۔ اگرچہ اس کے مجہولات کوہِ ہمالیہ کے مانند ہیں، لیکن اس نے اس کی بہت سی اونچی اونچی چوٹیاں فتح کرلی ہیں۔ اس کی حیرت انگیز علمی کامیابیوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ اس نے اس دنیا کے تعجب انگیز اور بال سے زیادہ باریک نظم و ترتیب معلوم کرنے کے لیے غیر معمولی انتھک کوششیں کی ہیں، مگر اس کے باوجود انسان کا علم اس کی جہالت کی بہ نسبت کم اور بہت کم ہے۔

یہ علومِ طبیعیہ صاف صاف ہمیں دو باتیں بتلاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کائنات کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ذرہ یہاں تک کہ وہ جسے سائنسدانوں کی زبان میں ایٹم کہا جاتا ہے انتہائی منظم و مرتب ہے، ہر چیز ایسے اصول و ضوابط کی پابند ہے جن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عالمِ وجود کا یہ عجیب و غریب نظم و ضبط پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ کسی صاحبِ عقل و شعور طاقت کی کرشمہ سازی ہے۔ وہ ہرگز خود بخود وجود میں نہیں آگیا ہے۔

اس دلیل کی عمارت مندرجۂ ذیل ستونوں پر قائم ہے۔

الف۔ کوئی چیز از خود پیدا نہیں ہوسکتی۔

ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئے۔ پہلے معدوم اور پھر موجود ہو، اس کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔ علت اور معلول کا اصول ہمہ گیر ہے۔ غالباً یہ اصول بدیہی ہے۔ ہر شخص بغیر غور و خوض کیے اس کی تصدیق کرنے کے لیے تیار ہے۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ جو چیز کسی وقت میں نہ ہو۔ وہ بعد میں خود بخود بغیر کسی علت و سبب کے وجود میں آجائے۔ ہم دیکھتے ہیں تین تین چار چار برس کے بچے گویا سوال اور پوچھ گچھ کا پتلا ہوتے ہیں۔ وہ کسی آواز کو سن کر فوراً اپنے بزرگوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ کس کی ہے اور کہاں سے آرہی ہے؟ جب کوئی درخت ان کے سامنے گرپڑتا ہے، کوئی مکان ڈھا جاتا ہے تو وہ فوراً دریافت کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے دماغوں میں یہ بات پیوست ہے کہ کوئی چیز جو پہلے نہ ہو، وہ بعد میں بغیر کسی علت اور سبب کے موجود نہیں ہوتی ہے۔

ب۔ کسی شئے پر سرسری طور سے نگاہ نہ کیجیے۔

انسانی عقل نے ناقص اور کمزور ہونے کے باوجود اس دنیائے کائنات کی اکثر و بیشتر چیزوں کو انتہائی منظم اور مرتب پایا

ہے۔ تجربہ گاہوں، رصد خانوں اور علمی مرکزوں میں جو کوششیں
ہو رہی ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس نظام کا پتہ چلائے جس
کے تمام موجودات پابند ہیں، ان اسرار و رموز کو معلوم کرے جو ان
کے دل میں چھپے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عالم خلقت کے راز
ایک ناپیداکنار دریا کے مانند ہیں۔ انسان اپنی حیرت انگیز ریسرچ کے
ذریعے اس میں تیر کر صرف چند گز طے کر سکا ہے۔ اسے نیچرل سائنس
کی صرف الف۔ بے آئی ہے۔ علم و دانش کے میدان میں انسان جتنا
جتنا آگے بڑھ رہا ہے، اس عالم خلقت کے متعلق اس کی حیرانی میں برابر
زیادتی ہو رہی ہے۔ اسے اپنی جہالت اور ناواقفیت کا زیادہ سے
زیادہ اندازہ ہو رہا ہے۔ بلاشبہ اس کے مطالعے کا دائرہ بہت وسیع
ہو گیا ہے۔ آج چھوٹے سے چھوٹے ذرّے سے لے کر کہکشاں تک، ایک
حقیر جرثومے سے لے کر انسان تک اس کی نظر میں ہے، لیکن اس کے باوجود
اسے اقرار ہے کہ وہ بہت سی باتیں نہیں جانتا ہے۔ سائنس داں کبھی کوشش
کرتے رہتے ہیں کہ اپنے مفروضات کو واقعیت اور حقیقت کا جامہ پہنائیں
لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوں جوں وہ حقایق کے نزدیک ہوتے
ہیں، حقیقتیں ان سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ سائنس دانوں کے ایسے
اقوال کثرت سے موجود ہیں جن میں اپنے معلومات کے انتہائی محدود
ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے۔ گویا علم ایک سیڑھی کی شکل ہے جس کی
صرف چند سیڑھیاں انسان نے طے کی ہیں۔ اسی لیے جب ریاضیات کے
مشہور و معروف ماہر آئن اسٹائن سے اس عالم میں جب کہ وہ اپنے
کتب خانے کی سیڑھی کے پاس کھڑے ہوئے تھے پوچھا گیا کہ آپ کے معلومات
کی آپ کے مجہولات سے کیا نسبت ہے تو انھوں نے اس سوال کے جواب
میں کہا کہ ان دونوں کے درمیان وہی تناسب ہے جو اس چھوٹی سی
سیڑھی اور آسمانوں کی غیر محدود فضا کے درمیان ہے۔ میں نے ابھی
علم کی چند سیڑھیاں طے کی ہیں۔

انسانی معلومات انتہائی کم اور ناقص ہونے کے باوجود
ان کا بہت مختصر سا حصہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ دنیا کا یہ
موجودہ پیچیدہ نظم و ضبط بغیر کسی صاحب عقل و علم طاقت کے پیدا کیے
وجود میں نہیں آ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ دلیل اسی وقت مکمل
ہوتی ہے جب ان موجوداتِ عالم کے حیرت انگیز نظام و ترتیب کے کچھ
نمونے بھی پیش کر دیے جائیں۔

درحقیقت معرفت خدا کی کنجی یہ ہے کہ کوئی چیز ہمارے نزدیک چاہے
کتنی ہی معمولی ہو اسے ہم سرسری طور سے نہ دیکھیں، کیوں کہ یہی حقیر
موجودات اور معمولی معمولی واقعات ہیں جو بڑے بڑے عظیم علوم و فنون
کا سرچشمہ قرار پائے ہیں۔ عام طور سے بلند پایہ مفکرین کی یہ خصوصیت
ہے کہ وہ کسی چیز کو سرسری طور سے نہیں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے انتہائی
حقیر اور معمولی واقعات سے بڑے بڑے اہم نتائج نکالے ہیں۔

نیوٹن نے درخت سے ایک عدد سیب کے گرنے سے ہمہ گیر اصول
جذب و کشش کا انکشاف کیا، گیلیلیو GALILEO نے ایک
مذہبی تقریب میں دیکھا کہ ایک جھاڑ ان کے سر پر ہل رہا ہے۔ اسی کو
دیکھ کر انھوں نے "سقوطِ اجسام" کا اصول ایجاد کیا۔

بہت سے لوگوں کے سامنے درختوں سے پھل گرتے ہیں، وہ
چھتوں میں لٹکے ہوئے جھاڑوں کو ہوا چلنے کی وجہ سے متحرک دیکھتے
ہیں، لیکن وہ ان واقعات سے ان نتائج تک نہیں پہنچتے جن نتائج تک
نیوٹن اور گیلیلیو پہنچے۔ اسی لیے قرآن مجید ان لوگوں کو خدا کا حقیقی
بندہ سمجھتا اور کہتا ہے کہ جو اس عالم خلقت کے متعلق غور و خوض
کریں اور اسے سرسری طور سے نہ دیکھیں۔ ذکر شدہ آیت کو
دوبارہ پڑھیے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ
وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ
اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا
بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ [آل عمران ۱۹۰-۱۹۱]

ج۔ نظم و ترتیب - یعنی چہ؟

موجوداتِ عالم کا منظم اور مرتب ہونا اگرچہ کوئی ایسی بات نہیں
ہے جو ڈھکی چھپی ہو، لیکن مندرجۂ ذیل امور کی طرف متوجہ ہونے کے
بعد کائنات کا منظم اور مرتب ہونا بہت نمایاں طور سے سامنے آجاتا
ہے۔

۱۔ ہر جاندار کے وجود میں آنے اور باقی رہنے کے واسطے کچھ
خاص شرطوں کا ہونا ضروری ہے، مثلاً ایک سبز و شاداب درخت کے

ڈاکٹر اکمل ایوبی

ترکی زبان ۔ ایک مطالعہ

ترکی ایشیا اور یورپ کے ترکوں کی مادری زبان ہے۔ اس کا شمار دنیا کی قدیم زبانوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی لیکن بامحاورہ اور زرخیز زبان ہے اور دنیا کی شیریں زبانوں میں اس کا ایک مقام ہے اس کا لسانیاتی تعلق نہ تو عبرانی اور عربی جیسی سامی زبانوں سے ہے اور نہ ہی سنسکرت اور فارسی جیسی آریائی زبانوں سے ہے۔ یہ بذات خود ایک مستقل زبان ہے اور یورال التائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کو تورانی خاندان بھی کہتے ہیں۔ اس وقت ترکی زبان کے مختلف لہجے تقریباً پچیس علاقوں میں بولے جاتے ہیں اور دس ملکوں میں انھیں قومی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بھی تقریباً بارہ کروڑ ہے جو ولاڈی واسٹک سے لے کر بلگریڈ تک پھیلے ہوئے ہیں جن میں ترکی جمہوریہ کے علاوہ سین کیانگ (چینی ترکستان) ازبکستان، قرغزستان، قازاقستان، ترکمانستان، آذربائیجان اہم خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ یونان، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، رومانیہ، افغانستان، عراق، شام، قبرص کے بھی متعدد علاقوں میں اسی زبان کا بول بالا ہے۔

ترکی زبان کو خود ترک "تورک دلی" کہتے ہیں۔ لیکن ترکی جمہوریہ کی زبان "تورکچہ" کہلاتی ہے۔ یہ ہماری اردو زبان سے بھی زیادہ جامع زبان ہے اور اس کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب عموماً اردو جیسی ہوتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے کہ اگر ایک زبان کی عبارت کا ترجمہ دوسری زبان میں لفظاً بلفظاً کردیا جائے تو وہ خود بخود بامحاورہ ترجمہ ہوجاتا ہے۔ تاہم ترکی زبان میں تذکیر و تانیث کا وجود نہیں ہے۔ اس میں کسی ایک نحوی عبارت یا مجموعۂ عبارات کے عوامل نحوی اپنے معمولات کے بعد آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جملے کا اہم ترین حصہ عموماً جملے کے آخر میں رکھا جاتا ہے اور اس طرح روابط فاعلی کے بعد آتے ہیں۔ اور اجزائے موصوفہ اپنی صفت کے بعد رکھے جاتے ہیں اور دائمی و اہم بیانات عارضی بیانات کے بعد آتے ہیں۔ ترکی زبان میں ایک ہی ماخذ سے بہت سے الفاظ بنانے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے جس سے ہندی اور اردو زبانیں کسی حد تک محروم ہیں۔ یہ اصلیت ہے کہ ہندی اور اردو دونوں میں ہر زبان کے الفاظ کو اپنے میں جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن کافی تعداد میں الفاظ وضع کرنے کی خصوصیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہندی داں حضرات نے سنسکرت کا رُخ کیا ہے اور اردو والوں نے عربی اور فارسی زبانوں سے اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا ہے۔

ترکی بہت ہی بامحاورہ اور زرخیز زبان ہے۔ اس میں حروف علت کی تعداد آٹھ ہے۔ لیکن ان میں ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کی رو سے حرکاتِ لاحقہ کے بعد حرکات لاحقہ ہی آتے ہیں اور حرکات سابقہ کے بعد حرکاتِ سابقہ ہی آتے ہیں۔ اسی طرح حروف صحیح کی مماثلت پر بھی بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس زبان میں لاحقہ کا بھی استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ جمع کا لاحقہ اسم اور فعل دونوں کے ساتھ یکساں استعمال کیا جاتا ہے۔ ترکی زبان میں ایک صیغہ ایسا بھی رائج ہے جو زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔ یہ صیغہ نہ حال ہے، نہ ماضی اور نہ ہی مستقبل۔ اس میں صرف ان باتوں کو بیان کیا جاتا ہے جن کا تعلق کسی ایک مخصوص زمانے سے نہیں ہے بلکہ ہر زمانے سے ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترکوں کا ابتدائی مسلک آسمان پرستی اور آتش پرستی تھا۔ ان کے بعض قبائل نے مختلف اوقات میں شامانیت، بدھ مت، یہودیت مسیحیت اختیار کیا تھا اور آخر میں زیادہ تر ترک مذہب اسلام کے پیرو بن گئے اور مسلمان ترکوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ آج بھی غیر مسلم ترک موجود ہیں جن میں زیادہ تر بت پرست، بدھ، یہودی اور عیسائی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی زبان کے اصل ذخیرے میں یونان کے خانہ بدوشوں کی بولیوں سے لے کر چین کے شمالی علاقوں کے الفاظ شامل تھے

لیکن اسلام کے حلقہ بگوش ہونے اور مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اور انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں کے صرف الفاظ ہی بکثرت اپنی مادری زبان میں شامل نہیں کر لیے بلکہ عربی اور فارسی رسم الخط بھی اپنا لیا۔ یہ ترکوں کے لیے کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ انھوں نے اپنی زبان کا رسم الخط متعدد بار پہلے بھی تبدیل کیا تھا۔ ترکوں کا قدیم ترین رسم الخط "اورخون" نامی ہے۔ جو ترکستان اور منگولیا کے علاقوں میں پانچویں صدی سے قبل رائج تھا۔ اس میں کل اڑتیس ۳۸ حروف اور علامتیں ہیں۔ آٹھویں صدی سے منگولیا اور ترکستان کے ترکوں میں "اویغور" رسم الخط کا رواج ہو گیا جس میں تیئس ۲۳ حروف اور ترپن ۵۳ علامتیں ہیں۔ یہ خط کسی نہ کسی طرح پندرھویں صدی تک استعمال ہوتا رہا۔ لیکن ترکوں کے بعض قبائل نے آٹھویں صدی میں "چینی" رسم الخط بھی اختیار کر لیا تھا۔ جو تقریباً بیس ہزار تعداد پر ہے — اس کے برخلاف بعض ترکوں نے "صغدی" رسم الخط پسند کیا جس میں کل بائیس ۲۲ حروف ہیں اور جو ترکوں میں آٹھویں تا گیارھویں صدی رائج رہا۔ اسی طرح چند ترکی قبیلوں نے اپنی مادری ترکی زبان کے لیے "تبتی" رسم الخط کو پسند کیا جو ساتویں صدی سے دسویں صدی تک استعمال ہوتا رہا اور جس میں پینتیس ۳۵ حروف اور ستانوے ۹۷ علامتیں ہیں۔ لیکن عیسائی اویغوروں میں "نسطوری سریانی" رسم الخط آٹھویں تا گیارھویں صدی استعمال ہوتا رہا جس میں کل بائیس ۲۲ حروف ہیں۔ آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی کے دوران بعض ترکی قبیلوں میں "مانی" رسم الخط بھی رائج رہا۔ جو چھتیس ۳۶ حروف پر ہے۔ ترکوں کے بیشتر قبیلوں نے بدھ مت بھی اختیار کیا تھا اور وہ "برھمی" رسم الخط استعمال کرنے لگے تھے جو ایک طرح سے سنسکرت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ خط ترکستان کے بعض علاقوں میں آٹھویں سے گیارھویں صدی تک مستعمل رہا۔ اس میں تیرہ حروف علت، تینتالیس ۴۳ حروف صحیح اور چودہ ماترائیں ہیں۔ ان کے علاوہ ترکوں نے یاسایا، پیمینگ، تورانی، یونانی، ارمنی، سلاوی یا صلاتی جیسے رسم الخط بھی متعدد ادوار میں استعمال کیے ہیں۔ اب کرائم نامی یہودی ترک "عبرانی" رسم الخط استعمال کر رہے ہیں۔ سوویت یونین کے ترکوں میں "روسی" رسم الخط نافذ ہے۔ ایران اور افغانستان کے ترک "فارسی" خط اپنائے ہوئے ہیں۔ جبکہ ترکی جمہوریہ کے ترکوں نے ۱۹۲۸ء سے عربی و فارسی کے بجائے "لاطینی" رسم الخط اختیار کر لیا ہے۔ اس طرح ترکی زبان کے لیے اب تک اٹھارہ رسم الخط استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترکوں کو کبھی بھی کسی ایک رسم الخط سے قلبی لگاؤ نہیں رہا ہے اور اب بھی اس کا امکان ہے کہ مستقبل میں کوئی اور رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔ ★★

کوئی استاد کلاس میں غزل پڑھا رہے تھے۔ جب اس مصرع پر پہنچے کہ — پنجۂ سل سے کھلیں گے عقدۂ گیسوے دوست

تو ارشاد ہوا: پنجۂ سل کا مطلب ہے پنجۂ سِل — سِل کا پنجہ، کھلیں گے یعنی وا ہو جائیں گے مطلب یہ کہ کھل جائیں گے، عقدہ یعنی گرہ؛ گیسوے دوست یعنی محبوب کے گیسو — مطلب یہ کہ محبوب کے گیسو پنجۂ سل سے کھل جائیں گے —!!

ہر کلاس میں دو ایک طالب علم تو غیر معمولی ہوتے ہی ہیں۔ ایک لڑکا کھڑا ہوا، بولا: سر، شاید یہ طباعت کی غلطی ہے یہ پنجۂ سل نہیں پنجۂ شل ہے اور شل کے معنی ہیں بے جان۔ مشابہت کے سبب کنگھے کو پنجہ کہا اور وہ بے جان ہوتا ہے اس لیے پنجۂ شل کہا۔ شاعر اس پر افسوس کر رہا ہے کہ ہماری جاندار انگلیاں تو محبوب کی زلف سنوار نہ سکیں اور کنگھا جس کی انگلیاں بے جان ہیں اس کی خوش قسمتی ملاحظہ ہو اس نے زلف محبوب کے بل کھول دیے وہ بھلا کب ہار ماننے والے تھے، بولے درست درست پنجۂ سل اور پنجۂ شل ایک ہی بات ہے۔

شبیر احمد خان غوری

فرانسیسی فلسفی
برگساں اور اس کے اثرات

اقبال مختلف مفکرینِ مغرب سے متاثر ہوئے ہیں، جن میں سے اکثر کے ناموں کی انھوں نے صراحت کی ہے، نہ صرف نام کی بلکہ اُن کے افکار اور تصوّرات کی بھی جنھیں ردّاً یا قبولاً انھوں نے درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔

مگر سب سے زیادہ وہ فرانسیسی فلسفی برگساں سے متاثر ہیں جس کا ذکر انھوں نے بڑی عقیدت مندی سے کیا ہے:۔

"معاصر فکر کے نمائندوں میں برگساں تنہا مفکر ہے جس نے زمانے کے باب میں دورانِ خالص کا بڑا عمیق مطالعہ کیا تھا۔"

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اقبال کا "تصوّرِ زمان" بڑی حد تک برگساں ہی سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس کے مخصوص تصوّرِ زمان پر اضافہ و اصلاح کی بھی کوشش کی ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے، یہ سنّتِ دیرینۂ روزگار ہے۔ برگساں کا تصوّر "زمانِ خالص" عہدِ حاضر کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ مگر یہ بھی اس قدیم کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بعد میں اسے اقبال نے برگساں سے لے کر خود کو

سرآمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

کا مصداق بنالیا۔

اس سلسلے میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں:۔

۱۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اقبال نے "تصوّرِ زمان" کے سلسلے میں برگساں ہی کی خوشہ چینی کیوں کی، حالاں کہ نفسیاتی طور پر انھیں اپنے استاد میک ٹیگرٹ کا اتباع کرنا چاہیے تھا

۲۔ دوسرا سوال جو اتنا اہم تو نہیں ہے، پھر بھی اگلے سوال سے یک گونہ تعلق کی بنا پر خصوصی کاوش کا مستحق ہے، یہ ہے کہ خود برگساں کا تصوّر "زمانِ خالص" کوئی الہامِ غیبی تھا۔ جس کا اس پر القا ہوا تھا یا وہ اس کے لیے افکارِ قدیم کی خوشہ چینی کا رہینِ منت ہے۔

۳۔ اقبال کی اس "اپچ" کا تاریخِ فکرِ انسانی میں کیا مقام ہے؟ اور

۴۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ اقبال کا یہ "تصورِ زمان" کہاں تک اسلامی ہے۔ اس سوال کے قایم کرنے کی ضرورت یوں لاحق ہوئی کہ صرف عقیدت مندانِ اقبال ہی انھیں "شارحِ رموزِ دینِ متین" نہیں سمجھتے۔ وہ خود بھی اس تصور کو اسلامی الاصل قرار دیتے تھے۔

اقبال اور برگساں کی خوشہ چینی

اقبال کی سب سے بڑی صلاحیت ان کی فلسفہ دانی تھی، جسے انھوں نے ایک عظیم مقصد کے لیے وقف کردیا۔ یہ عظیم مقصد ایک زوال آمادہ قوم میں جو "محکومی و مجبوری و نومیدیِ جاوید" کا مصداق بنی ہوئی تھی، حیاتِ تازہ کی روح پھونکنا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ دنیائے جدید وقدیم کی تمام پسماندہ قوموں کی طرح ان کی قوم میں بھی جذبۂ عمل کوشی و بلند حوصلگی کا فقدان ہے اس لیے انھوں نے اس کی خودی کو ابھارنے کے لیے اپنی شاعری اور فلسفہ کو وقف کردیا۔ ایک نقیبِ ملّت کی حیثیت سے وہ کہہ سکتے تھے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

وہ قناعت پسندوں اور تقدیر پرستوں سے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ سعیِ پیہم سے جہانِ نو پیدا کرنا انسان کی تقدیر ہے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

یہ شاعرانہ رجز بلیغ ہنگامی طور پر پست ہمت شکستہ افراد کو عمل کوشی کے لیے برانگیختہ کرسکتا ہے۔ مگر یہ مسئلہ کا جزوی حل ہے۔ ایک دیرپا اثر کے لیے قوم کے مزاج اور اندازِ فکر میں انقلابی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ اجتماعی

نفسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ "مسئلہ جبر و اختیار" کی حقیقت جو کچھ بھی ہو، لیکن قومیں عملاً اپنے دورِ عروج میں "اختیار" کی اور عہدِ زوال میں "جبر" کی قایل ہوا کرتی ہیں۔ اس لیے ایک حقیقت پسند مفکر اور دور اندیش مصلح و نقیب کی حیثیت سے علامہ اقبال نے بھی اپنے پیغامِ عمل کو فلسفۂ "اختیار" کی اساس پر استوار کرنا چاہا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اگر مشرق "مقدر پرستی" کے واہمہ میں گرفتار تھا تو مغرب سائنس کی تابحدِ ثریا پہنچی ہوئی ترقی کے پیشِ نظر میکانکی جبر ولزوم میں مبتلا تھا۔ انیسویں صدی کا نصفِ آخر سائنس بالخصوص میکانکیت کی ادعائیت کا نقطۂ عروج ہے۔ طبیعاتی علوم خصوصیت سے اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے قوانینِ فطرت کو دریافت کر لیا ہے اور وہ دیے ہوئے معطیات سے مستقبل کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کائنات ایک بندھے ٹکے نظام کا نام تھی جو علت و معلول کے ناقابلِ شکست جال میں جکڑا ہوا تھا۔

پھر ڈارون کی "اصل الانواع" کی اشاعت کے ساتھ یہ خوش فہمی طبیعاتی علوم سے بڑھ کر حیاتیاتی علوم میں اور بعد ازاں نفسیاتی علوم کے دائرے میں بھی سرایت کر گئی۔ اس خوش فہمی کا نتیجہ ایک شدید قسم کے جبر ولزوم کی شکل میں نکلا جہاں آزادیِ انتخاب اور حریتِ عمل بے معنیٰ لفظ بن کر رہ گئے۔

مگر کچھ عرصے بعد جب ماہرینِ طبیعیات کی حسابی پیشین گوئیاں غلط ثابت ہونا شروع ہوئیں اور اس تغلیطِ پیہم کے نتیجے میں قدیم ادعائیت کے خلاف اربابِ نظر میں بے اطمینانی بڑھنے لگی تو پھر طبیعیات کو اپنی تحکیمیت میں تعدیل کرنا پڑی مگر حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم کے دائروں میں یہ ادعائیت جو طبیعیات سے مستعار تھی، برقرار رہی اور ان علوم کے ماہرین اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے۔

اس صورتِ حال نے "حریتِ عمل" اور ارادۂ مختار" کو

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنیٰ نہ ہوا

بنا دیا۔ مگر یہ کوئی پسندیدہ صورتِ حال نہ تھی۔ اس لیے سنجیدہ مفکرین روزگار نے اس کی اصلاح کی کوشش کی۔ ان میں دو نام نمایاں ہیں:۔ کانٹ اور برگساں۔ لیکن کانٹ نے "اختیار" کو "اشیاء بالنفسہا" (Things-in-Themselves) کے حریم مقدس میں جا بٹھایا، جس کے متعلق برگساں کہتا ہے کہ اس کے پُراسرار آستانہ تک تمہارے شعور کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

برگساں نے جو "اختیار و حریتِ عمل" کے مقدس تصور کو دنیائے آب و گل ہی تک محدود رکھنا چاہتا تھا، اس گتھی کو "زمانِ حقیقی" یا "دورانِ خالص" [Duree Reele] اور پیمائشی زمان [Serial Time] کی تدقیق کے ذریعے سلجھایا اور اس بحث پر ایک مستقل کتاب "Essai Sur les Donnees Immediates de la Conscience" یا "شعور کی قریبی معطیات" کے عنوان سے لکھی۔ چنانچہ وہ اس کے مقدمے میں لکھتا ہے:۔

> جو مسئلہ میں نے بحث و تمحیص کے لیے منتخب کیا ہے وہ .... "ارادۂ مختار" کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ میں ثابت کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ قائلینِ جبر و لزوم اور ان کے مخالفین کے مابین جو بحث و نزاع ہے اس کے اندر مدّت اور امتداد تعاقب و تداول اور سہم و قتی نیز کمیت اور کیفیت کے درمیان ایک سابق کا خلطِ مبحث مضمر ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ خلطِ مبحث رفع ہو جائے تو پھر ہم دیکھ سکیں گے کہ وہ تمام اعتراضات بھی غائب ہو جاتے ہیں جو ارادۂ مختار اس کی حدود و تعریفات، نیز خود مسئلہ جبر و اختیار کے خلاف وارد کیے جاتے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب کے تیسرے حصے کا مقصد اسی بات کو ثابت کرنا ہے۔

اسی طرح جب Father de Tonquedec نے اپنے مقالے "Bergson est-il Moniste ?" میں اس پر لامذہبیت اور بیدینی کا الزام لگایا تو برگساں نے اپنی تصانیف کی مدد سے اپنی دینداری کا ثبوت دیا اور لکھا

> "اب وہ ملفوظات جو میری کتاب "Essai Sur les Donnees Immediates de la Conscience" میں قلم بند ہوئے ہیں، وہ "اختیار" کی حقیقت کو منصۂ شہود پر لانے میں منتج ہوتے ہیں۔"

برگساں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز اسی کتاب "زمانہ اور ارادۂ مختار" سے کیا تھا جسے اس نے ۱۸۸۹ء میں شایع کیا تھا۔ اس کے بعد اور کتابیں لکھیں۔ مگر جب ۱۹۰۷ء میں اس کی "تخلیقی ارتقا" شایع ہوئی تو اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہونے لگی اور وہ جلد ہی ایک آفاقی مفکر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ تین چار سال کے عرصے میں اس کے فکری شاہکار

یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمے ہوگئے۔ انھیں میں اس کا شاہکار "Essai sur les Donnees Immediates de la Conscience" تھا جسے ایف ایل پوگسن نے ۱۹۱۰ء میں انگریزی میں "Time and Free Will" کے نام سے ترجمہ کیا۔

یہ ترجمہ علامہ اقبال کی نظر سے بھی گزرا۔ چوں کہ اس کا مرکزی خیال "آزادیٔ انتخاب" اور ارادۂ مختار" کا اثبات تھا اور علامہ بھی اسی کی تلاش میں تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس "فلسفۂ عمل" سے استفادہ کرنے میں دیر نہیں کی۔

علمِ کلام کے اندر "جبر و اختیار" کے مسئلہ کی جو بھی اہمیت ہو اسلام کی سماجی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی قومی انحطاط رونما ہوا، مصلحینِ امّت نے عقیدۂ اختیار ہی کا صورِ اسرافیل بلند آہنگی سے پھونکا اور اس "تیز نوائی" میں اُن کلامی موشگافیوں کی کوئی پروا نہ کی، جنھوں نے "جبر و اختیار" کی حدبندی کر رکھی تھی: اموی مظالم کے عہد میں معبد جہنی و غیلان دمشقی و بلکہ بقولِ بعض حسن بصریؒ کی "قدریت" اور یورشِ تاتار کے زمانے میں مولانا روم کی "حریت و اختیار" کی ترجمانی اسی تاریخی اصول کا نتیجہ تھیں۔ لہٰذا بیسویں صدی مسیحی کے آغاز میں مائل بزوال ملّتِ اسلامیہ کے تنبّہ اور بیداری کے لیے بھی اس تاریخی اُصول کا عمل میں آنا ناگزیر تھا۔ چھ سو سال پہلے مولانا رومؔ نے جو کام شاعری سے لیا تھا، علامہ اقبالؒ نے اسے فلسفہ کی مدد سے انجام دیا۔

اس طرح برگسان کے اندازِ فکر سے اقبال خصوصیت سے متاثر ہوئے جس کا انھوں نے "خطبات" میں اعتراف کیا ہے۔

"معاصرِ فکر کے نمائندوں میں برگسان تنہا مفکر ہے، جس نے زمانہ کے باب میں "دورانِ خالص" کا بڑا عمیق مطالعہ کیا ہے۔"

علامہ نے بھی زمانے کے اس برگسانی تصوّر کو اپنی تفکیری سرگرمیوں کا سنگِ بنیاد بنا دیا۔ چنانچہ پروفیسر ایم۔ایم شریف فرماتے ہیں:۔

اقبال بھی دورانِ خالص اور تسلسلی زمان کے درمیان اسی طرح فرق کرتے ہیں، جس طرح برگسان نے کیا ہے اور وجوہ بھی یکساں ہیں۔

علامہ نے سب سے پہلے اس مسئلہ کو "اسرارِ خودی" میں پیش کیا جسے ۱۹۱۳ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر غالباً وہ اپنے اوپر "افرنگ زدگی" طعنہ سننا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے زمانہ کے اس نئے برگسانی تصور کو جو "حریت عمل" کے جدید فلسفیانہ تخیل کی کلید تھا، اسلامی الاصل بنانے کے لیے امام شافعیؒ کی طرف منسوب مقولہ "الوقتُ سَیفٌ قاطِعٌ" سے مستزج کرنے کی کوشش کی۔

سبز بادا خاکِ پاکِ شافعی
عالمِ سرخوش ز تاکِ شافعی
فکرِ او کوکب ز گردوں چیدہ است
سیفِ بُرّاں وقت را نامیدہ است

یہی نہیں بلکہ اس فلسفیانہ توضیح پر ایمان و ایقان کو حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کا اسوہ بتایا۔

من چہ گویم سرِّ ایں شمشیر چیست
آب او سرمایہ دار از زندگی است
پنجۂ حیدر کہ خیبر گیر بود
قوت او از ہمیں شمشیر بود

"اسرارِ خودی" سے پہلے علامہ نے مسئلہ زمان کے ساتھ کہیں بھی تعرض نہیں کیا، نہ اپنے منظوم افادات میں اور نہ "فلسفۂ عجم" میں۔ مگر "اسرارِ خودی" میں وہ یکایک اس تصوّر کے ساتھ اتنے تشدد سے اعتنا فرماتے نظر آتے ہیں کہ زمانہ کے عام مفہوم "دگاہ شماری اور وقت پیمائی" کو کافرانہ اندازِ فکر "زنار بردوشی" و "باطل فروشی" قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اے اسیرِ دوش و فردا در نگر
در دلِ خود عالمِ دیگر نگر
در گِلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی
وقت را مثلِ خطے پنداشتی
باز با پیمانۂ لیل و نہار
فکرِ تو پیمود طولِ روزگار
ساختی ایں رشتہ از زنار دوش
گشتۂ مثلِ بتاں باطل فروش

بعد میں علامہ کا یہ تشدد و مبالغہ و غلو کی حدود کو بھی پار کر گیا جس کی تفصیل ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے۔ (باقی صـ۱۱)

سید محمد رضوی

مسلمان کو مسلمان تو ہو لینے دو

اِس سرخی کے میری نظر میں دو جز ہیں: 'مسلمان' اور 'مسلمان تو ہو لینے دو'۔ اوّل الذکر بہت آسان منزل سمجھی جاتی ہے یعنی مسلمان ماں باپ کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔ لہٰذا نسلی اور خاندانی سلسلہ سے مسلمان ہوئے۔ مذہب کو اپنے باپ دادا کے عقاید و رسوم کی تقلید سمجھا۔ چوں کہ یہ تصوّر خلافِ حقیقت ہے۔ اسی لیے دوسرے جُز کے اضافے کی ضرورت ہوئی۔ یقیناً یہ دوسری منزل کٹھن ہے ایسے مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں جو واقعی مسلمان ہوں۔ اسی لیے اپنی کوتاہیوں کا شمار کم دوسروں کی نظر اندازی کا گلہ زیادہ ہے۔ بیشک کچھ افرادِ قوم جو مسلمان ہونے میں بدرجہ اتم کامیاب ہوئے ہماری بے مائیگی اور بدقسمتی پر آنسو بہا رہے ہیں اور کوشاں ہیں کہ خوابِ غفلت سے اب بھی ہم آنکھیں کھولیں۔ مگر کیا کیجیے ہمارے اندازِ تغافل کو اور کہاں تک کھٹکھٹایئے گا جب ہم اس پر تلے ہوں کہ ذرا سا آرام میں خلل آیا اور ہم نے 'اِسلام خطرے میں ہے' کا نعرہ بلند کیا۔ یہ شامیانہ بھی اتنا کشادہ ہے کہ ہر کس و ناکس بغیر غور و فکر ہم کو ہمدردانہ سہارے سے نوازتا ہے۔ تاکہ ہم دوبارہ تاریکیوں میں کھو جائیں۔

سوال یہ اُٹھتا ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے ضروری اور لازمی اجزا کیا ہیں اور نظامِ اسلام کے پیرو کب مسلمان کہلائیں گے مذہب کا ماننا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ جس طرح جسمانی امراض کے علاج کا ذریعہ طبِ جسمانی ہے، اُسی طرح انسان کی علمی، عقلی، اخلاقی و روحانی زندگی اور صحت کو قایم رکھنے کے لیے روحانی طب یعنی مذہب ضروری ہے۔ مذہب سے وہ قانون مراد ہے جس پر انسان اپنے فطری تقاضے سے عمل کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ مذہبِ اسلام کے پیرو کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مسلمان ہونے سے پہلے یہ جاننا لازمی ہوگا کہ کہیں اِسلام نے مسلمانوں کو مکمل تحفظ عطا کیا ہو اور گارنٹی دی ہو کہ اِسلام کے آئین کے عامل کو مکمل بقا، ترقی و تحفظ حاصل ہے تو سورۃ البقرہ کی ع ۶۲ نے صاف صاف بتایا کہ کسی کو خصوصیت نہیں بلکہ "بیشک مسلمانوں، یہودیوں، نصرانیوں اور پیروانِ حضرت یحییٰ میں سے جو شخص خدا اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتا رہے، اس کے لیے اجر و ثواب اُس کے خدا کے پاس ہے اور نہ قیامت میں اس پر کسی طرح کا خوف ہوگا، اور نہ وہ رنجیدہ دل ہوگا۔"

پیروانِ اِسلام یعنی مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی قسم کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اور 'جیسا کروگے ویسا پاؤگے' کے اصول کے تحت خدا اور روزِ آخرت پر ایمان کے ساتھ اچھے اچھے کام بھی کرنا ہیں۔ اچھے اچھے کام کے ذیل میں عبادت و مراقبہ، برائیوں سے پرہیز، ذاتی بچاؤ اور انفرادی تقدس حاصل کرنے والے کو مکمل اِسلامی اِنسان نہ کہا جاسکے گا۔ کیوں کہ انسانِ کامل کہلانے کا وہی مستحق ہوتا ہے جس کے تمام طبعی جذبات عقلِ سلیم کے تقاضے کے مطابق ظہور میں آئیں اور ان جذبات کی عملی صورت ہر طرح سے معقول اور مکمل ہو۔

اِسلام دراصل انسان کے تہذیبی معاشرے، سیاست و فلسفۂ حیات اور علمی ترقیوں کی ارتقار کی فیصلہ کن منزل ہے۔ سکونِ روحانی نہیں بلکہ عملِ پیہم اور حرکت جاودانی کے پیغام کو اسلام کہا گیا ہے۔ اِسلام نے بنیادی اصول کے حدود متعین کر دیے اور فکر و عمل کے لطیف سنگم تک پہنچنے کو زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ روحانی زندگی کو مادّی زندگی کا ماحصل کہا۔ (سورۃ الاعراف ع ۳۲)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط" کہدو کہ کس نے اللہ کی پیدا کی ہوئی زینتوں کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے عمدہ چیزوں میں سے

نکالی ہیں۔ اسلام نے زندگی کو طوقِ لعنت کی گردان سے ہٹا کر ایک عزم عظیم
قرار دیا اور یہ بتایا کہ وہی معاشرہ اسلامی ہوگا جس میں اسلامی تعلقات میں
ہم آہنگی ہو، سیاسی، معاشی اور مذہبی طبقاتیت کی بھرمار نہ ہو بلکہ بدرجۂ اتم
جذبات کا احترام کار فرما ہو۔ اسلام نے اصولی طور سے واضح کر دیا کہ خدمتِ
خلق، ملک و قوم کی ترقی میں خلوص جذبے سے منہمک ہونا، علمی و عقلی اور عملی
سعی سے بنی نوعِ انسان کا بلند تر اور ارفع سطح پر پہنچانا ہی مسلمان ہونا ہے
اسلام نے جہاد کو تمام عبادتوں میں اعلیٰ اور افضل مقام دیا (سورۃ
الحج ع ۱۰) "وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ" اور جو حق جہاد
کرنے کا ہے، خدا کی راہ میں جہاد کرو"۔ مگر وائے برحال ما کہ ہم صرف کافروں
اور غیر مسلموں پر تلوار لے دوڑنے کو ہی جہاد سمجھتے ہیں۔ کاش اس کو
پیغامِ عمل یعنی جہاد بالنفس سے تعبیر کرتے تاکہ دوسروں کا شکوہ نہ کرکے
ان کے دوش بدوش بلکہ چند گام آگے بڑھ کر دنیاوی ترقی کی تحقیقات
میں حصہ لیتے۔ اپنی اصلاح کرتے دوسروں کو بھی عملی دعوت دیتے کہ صرف
تقدیر کے سہارے نہیں بلکہ زورِ بازو اور حکمتِ عملی سے تقدیریں بدل
سکتے ہیں۔ خود مجاہد و سپاہی بنتے۔ تجرباتی طریق کار کا پرچم بلند کرتے۔

ہم نے تو عبادت پر قناعت کا نام اسلام رکھ لیا۔ جب کہ اسلام کے
نزدیک ہماری عبادت کا مفہوم معاشرت اور تمدن کے مشاغل میں پوری
طرح مصروف ہو کر شاہراہِ عمل میں نمایاں ہونا ہے۔ ہم نے صرف برائیوں
سے پرہیز کرنا تو سیکھا مگر معاشرے سے برائیاں دور کرنے کا طریقہ نہ
اپنایا۔ ہم نے ذاتی بچاؤ اور خودغرضی کو اپنی زندگی میں اس طرح نمایاں
کر دیا کہ دنیا اسے ہی اسلام سمجھ بیٹھی۔ جب کہ اسلام خود اس کو بزدلی
بہانگ دُہل پکار رہا ہے۔ ہم نے انفرادی تقدس کو اسلام کا پیکر سمجھا
اور اسلام نے اجتماعی تقدّس کو روحِ اسلام کہا۔ اسلام نے کہا کہ اچھے
اور پاکیزہ افراد ہی کافی نہ ہوں گے بلکہ پورے معاشرے اور تمدن کو
پاک اور صاف ستھرا بناؤ تب ہی معاشرہ روحانی حیثیت سے زیادہ نمایاں
اور ترقی یافتہ ہوگا اور تب ہم صحیح معنیٰ میں مسلمان کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

قرآن حکیم نے گذشتہ اقوام کی تباہی کے وجوہ بدکرداری، ظلم،
معاشی عدم مساوات اور سیاسی استبداد بتائے ہیں اور بدقسمتی سے ہم
مسلمان بھی رفتہ رفتہ انکا شکار ہو رہے ہیں اور یہ بھول گئے کہ اُس
آئینِ محکم نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ خدا کسی قوم یا فرد کو خصوصیت کی
بنا پر قانون کی زد سے محفوظ نہیں رکھے گا۔ نتیجتہً اب ہم بھی پستی اور
زوال کی طرف مائل ہیں۔ لہٰذا واجب ہوتا ہے کہ ہم اس تنزلی کے اسباب
و علل پر غور و فکر شروع کریں اور اسلام کے عملی نظام پر کاربند
ہونے کی جدّ و جہد کریں۔ تعلیم و ریسرچ میں انہماک انڈسٹری اور
تجارت میں لگن سے مشغول ہوں۔ تاکہ نمایاں کامیابی حاصل کرکے
اپنی کاہلی کے معترض حضرات کا منہ بند کریں۔ مسلمان بننے کے لیے یہ
بھی ضروری ہے کہ قوانین حیات کا علم حاصل کریں تاکہ موجودہ قومی
زندگی کے ترقی یافتہ حالات سے مطابقت پیدا ہو اور ایک مکمل کامیاب
معاشرہ کی تشکیل ہو سکے۔ جیسے جیسے کاوش بڑھے گی علمی مدارج کا
دائرہ وسیع ہوگا۔ خود بخود خرابیاں، ناکامیاں اور محرومیاں دامن
سمیٹنے لگیں گی اور خوش بختی کا خوش امید سورج ہماری زندگی کے
افق پر طلوع ہوگا۔ ہم معاشی اور سیاسی انتشار و زوال سے محفوظ
رہیں گے۔ نافہمی اور جہالت دور ہوگی۔ قومی اور اجتماعی زندگی کا
جائزہ لینا ہے۔ تاکہ عدل و انصاف و مساوات اور عملی زندگی میں جو
بے راہ روی آگئی ہے اس کا تدارک ممکن ہو سکے اور ہم عقل و بصیرت اور
عمل و اخلاق کے امتحان کی کامیابی میں سبقت حاصل کریں تاکہ دنیا
جان لے کہ اسلام تقدیری نہیں بلکہ قوتِ عملی کا نام ہے۔

خداوندِ عالم ایک بار ہم کو ہمت دے کہ ہم کارخانۂ حیات کے
تجربہ گاہ میں عزم و حوصلہ کے سہارے نمایاں ہوں اور معیارِ مسلمان
تک کامیابی حاصل کرکے مسلمان کہلانے کے مستحق ہوں۔

★ ★ ★

ٹر امام مُرتضیٰ نقوی
المدارس انٹر کالج۔ امروہہ۔

عہدِ حاضر کے اساتذہ

اجاتا ہے کہ معلمی کا پیشہ بڑا مقدس اور بڑا سنجیدہ ہوتا ہے۔ معلّم کے فرائض
ہت اہم ہیں۔ وہ درسی کتابوں کی ہی تعلیم نہیں دیتا بلکہ اخلاق کا معلّم
بھی ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے اخلاق و کردار کو تہذیب و شائستگی سے
راستہ کرتا ہے۔ وہ معاشرے کا معمار ہے۔ اس کو ایک آئیڈیل ہونا
اہیے تاکہ نوجوان اس کے کردار کا اتباع کریں اور زیورِ انسانیت سے
زیّن ہو سکیں۔ یہ نقطۂ نظر یقیناً مستحسن ہے مگر جہاں آج کی سوسائٹی
یں ہمارے خیالات بدلے، ہماری تہذیبی قدریں بدلیں، ہمارا رہن سہن
بدلا، ہماری معاشرت بدلی، وہیں معلمی کا یہ نقطۂ نظر چاہے کاغذی اور
.بانی طور پر نہ بدلا ہو لیکن عملی طور پر تو بالکل بدل گیا ہے۔

ہمارے ہندوستان میں گرو کو بڑی قدر و منزلت حاصل
ھی، اس کے پیر چھوئے جاتے تھے اُس کی سیوا کی جاتی تھی۔ یہ
تیں سنتے چلے آئے ہیں۔ مگر اب تو صرف داستانیں رہ گئی
یں۔ نہ وہ گرو رہے اور نہ وہ چیلے اور کسی نہ کسی طرح
لوی صاحب گلستاں و بوستاں پڑھایا کرتے تھے تو اُن کا مقصد یہ ہوتا
ھا کہ طالب علم میں علمی ذوق اور ٹھوس لیاقت پیدا ہو اور کسی طرح
ن کے دل و دماغ میں بات اترتی چلی جائے چاہے تنبیہ الغافلین سے
ی کام لیا جائے۔ یہ علمی ذوق اور ٹھوس لیاقت پیدا کرنے والی بات
ب افسانۂ پارینہ بن گئی ہے۔

جب انگریزی اسکول اور کالج قایم ہوئے تو عموماً مدرسی کا پیشہ
ہی لوگ اختیار کرتے تھے جن کا خاص طور سے اس طرف رجحان ہوتا
ھا۔ نہایت ثقہ، مہذب لوگ اس پیشے میں داخل ہوتے تھے۔ جن کی
سوسائٹی میں بڑی عزت تھی۔ وہ خود رکھ رکھاؤ کا بڑا خیال رکھتے تھے
ان کی گفتگو ثقاہت سے لبریز ہوتی تھی۔ وہ علمِ مجلسی سے واقف تھے
ان کا عمل ابتذال سے پاک ہوتا تھا۔ وہ طالب علم کو صرف شاگرد ہی
نہیں بلکہ اپنی اولاد سمجھتے تھے اور اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کرتے
تھے۔ وہ شاگرد کے سچے ہمدرد تھے۔ وہ اس کو کتابی علم کے علاوہ اخلاقی
تعلیم بھی دیتے تھے خلوص میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ طالب علم بھی جانتا تھا کہ
ماسٹر صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ میری بھلائی میں کہہ رہے ہیں۔
نتیجہ یہ کہ استاد بھی مطمئن کہ شاگرد میرا فرمانبردار ہے اور طالب علم بھی
خوش کہ ماسٹر صاحب میرے شفیق ہیں۔ یہ روحانی رشتہ عرصہ دراز
تک پروان چڑھتا رہا۔

اب تعلیم عام ہوئی۔ گویا ماحول کی کایا پلٹ ہوگئی۔ وہ گھرانے
جہاں تعلیم کا کوئی تصور نہ تھا، زبردستی اور کھینچ تان کر کے اسکول کی
چہار دیواری تک لائے گئے۔ گھر کا ماحول گالی گلوج کا تھا۔ اسکول کی
تعلیمی فضا میں آکر ان کا دم گھٹنے تو ضرور لگا، لیکن کسی نہ کسی طرح وہ
اس قابل بن گئے کہ تھوڑی بہت لکھنے پڑھنے کی سوجھ بوجھ ہو جائے۔
کچھ نے قدم اور آگے بڑھائے اور کالج کی تعلیم ختم کر لی۔ مگر اب کیا کریں؟
یہ بھی ایک مسئلہ تھا۔ خاندانی پیشہ تعلیم کی وجہ سے ختم کرنا پڑا۔ باپ دادا کی
جمی جمائی دوکان پر بیٹھنا کسرِ شان ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ہر قوم کی توجہ تعلیم
کی طرف ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے لاکھوں نوجوان گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ
نظر آنے لگے۔ چاہے اپنی ذاتی قابلیت کی وجہ سے ہوئے ہوں یا نقل کر کے
ڈگری حاصل کی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ملک میں صنعتی ترقی نے انقلابِ
عظیم پیدا کر دیا۔ روزگار کے نئے نئے وسائل پیدا ہو گئے۔ مگر یہ روزگار
عموماً ان ہی نوجوانوں کو مل سکا جنھوں نے ٹکنیکل تعلیم حاصل کی تھی۔ اب
رہا وہ تعلیم یافتہ طبقہ جس نے سماجی علوم یا ادب میں ڈگریاں لی تھیں ان
کو روزگار کا ملنا یقیناً ایک مسئلہ بن گیا۔ جب انھیں کچھ نظر نہ آیا تو مدرسی
کا پیشہ اختیار کر لیا۔ یہی ایک راہ نجات تھی اور یہی ایک سستا نسخہ۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اس پیشے میں داخل ہوتے ہیں وہ

صرف بے روزگاری کی بنا پر داخل ہوئے ہیں۔ عموماً اسکولوں اور انٹر کالجوں
میں ہمیں ایسے ہی اساتذہ نظر آتے ہیں جن کا رجحان اور میلانِ طبع اس پیشے
کی طرف بالکل نہیں۔ لیکن مجبوراً ان کو یہ پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ جب کسی پیشے
سے فطری لگاؤ نہ ہوگا تو اس کی کارکردگی کیسی ہوگی۔ یہ آپ خود اندازہ
لگا سکتے ہیں۔

آج کل کالج اور اسکولوں میں ایک اور رواج چل پڑی ہے۔ یعنی یہ
کہ جس کا تقرر کیا جاتا ہے۔ اس سے معقول عطیہ بھی لیا جاتا ہے۔ اس میں
ہر امیدوار زیادہ سے زیادہ رقم کی پیش کش کرتا ہے اور کالج کے ارباب
حل و عقد اس شخص کا تقرر کر دیتے ہیں جس کی بولی سب سے اونچی رہی ہو
چاہے وہ کتنا ہی ناکارہ اور نالایق کیوں نہ ہو۔ گویا اب تقرر کا معیار
لیاقت نہیں بلکہ نوٹوں کی تعداد پر رہ گیا ہے۔ تقرر کے بعد اگر ایسے
ٹیچر سے اس کی نااہلی پر کوئی باز پرس کی جاتی ہے تو وہ فوراً کہہ دیتا ہے
کہ میں نے تو پانچ ہزار میں یہ جگہ خریدی ہے۔ اب اس کا کوئی کیا بگاڑ
سکتا ہے۔ پرنسپل بھی مجبور ہے اور منیجنگ کمیٹی بھی لاچار ہے کیوں کہ
یہ بھاؤ تاؤ اُن ہی کے ذریعے ہوا ہے۔

اسکولوں اور کالجوں میں جا کر دیکھیے تو کلاسوں میں پڑھائی بہت
کم نظر آتی ہے۔ ٹیچروں نے اپنے گھر پر ٹیوشن کے اسکول قایم کر رکھے ہیں۔
طلبا کو دھمکی دیتے ہیں کہ اگر ہمارا ٹیوشن نہ کیا تو ہم فیل کر دیں گے۔ ان پر
جا و بیجا دباؤ ڈالتے ہیں۔ کلاس میں پڑھانے کی طرف کوئی توجہ اس لیے
نہیں کرتے کہ یہ کمزور رہیں گے تو خود بخود ہمارے پاس پڑھنے کے لیے
آئیں گے۔ تنخواہ سے زیادہ ٹیوشن کی آمدنی کی طرف خیال رہتا ہے۔ یہ
بات اسکولوں اور انٹر کالجوں میں تو دیکھنے میں آتی ہی ہے مگر اب تو
ڈگری کالجوں اور یونیورسٹی کے لکچرر بھی ان سے پیچھے نہیں۔ پہلے ڈگری
کالج یا یونیورسٹی کے لکچرر کے لیے یہ کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ
وہ ٹیوشن کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ اُن کے لیے معیوب خیال کیا جاتا تھا۔
مگر ہم اب یہ حالت دیکھ رہے ہیں کہ لکچرر تو کجا ریڈر بھی ٹیوشن کر رہے
ہیں۔ حالاں کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کو زیادہ وقت اپنے مطالعے میں صرف
کرنا چاہیے۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اچھے اسکالر ہوں۔ مگر اس
طرف کوئی توجہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ
کوئی اچھا شگون نہیں۔

اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کو تو مزید مطالعہ کی ضرورت نہیں
وہ جو کچھ بی۔ اے۔ ایم۔ اے تک پڑھ آئے وہی کافی سمجھتے ہیں۔ وہی
گھسی پٹی کتاب جو برسوں سے چل رہی ہے اس کو ہی پڑھاتے کوئی
نئی چیز سامنے آئے تو پڑھیں۔ اپنے نوٹس تیار کریے اور طلبا کو لکھوا دیے
ایک صاحب نے اپنی ملازمت کے ابتدائی دور میں نوٹس تیار کیے تھے۔ ساری
عمر اسی کو لکھواتے رہے۔ ریٹائر ہو گئے تو اُن کے صاحبزادے اس
میں ملازم ہو گئے۔ والد بزرگوار نے وہ نوٹس کی کاپی اپنے صاحبزادے
کو اس طرح سپرد کی جیسے جائیداد کے کاغذات ہوں۔ اب اُن کے صاحبزادے
وہی نوٹس لڑکوں کو لکھواتے ہیں اور دھوکا دیتے ہیں

اسکولوں اور کالجوں میں علمی ماحول ناپید ہو چکا ہے۔ کوئی ٹیچر
یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ میں اپنے مضمون سے متعلق نئی نئی کتابیں یا
آرٹیکل ــــ ہے۔ روز بروز تازہ لٹریچر ہر مضمون پر آ رہا ہے۔ مگر ہمارے
اساتذہ اس کی کیوں زحمت کریں اور اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔
وہ وہی اپنے دقیانوسی علم پر توکل کیے ہوئے ہیں۔ اسٹاف روم میں
جائیے تو وہاں کسی قسم کی ادبی یا علمی گفتگو نہیں سن سکتے۔ کیوں کہ وہ ذہنی
طور پر کنگال ہیں۔ ان کی گفتگو کا بہترین موضوع یا تو جنسیات ہوگا یا
فلم۔ اور ہر شخص اس مذاکرے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا۔ آج گھر گھر
ٹی۔ وی لگ گئے ہیں۔ جن پر ہفتے میں دو مرتبہ پکچر آتی ہے اس نے معاشرے
کو اور بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ٹی۔ وی پر فلم دیکھ کر اسٹاف روم میں
باقاعدہ اس پر تنقید و تبصرہ ہوتا ہے۔ اگر اس میں ہی ہو تو غنیمت
ہے مگر کچھ منچلے تو کلاس میں طلبا سے رائے معلوم کرتے ہیں اور باقاعدہ
طور پر کلاس میں بجائے کتابی سبق کے فلم کا سبق پڑھایا جانے لگتا ہے

تعلیمی ادارے کی چہار دیواری میں بیڑی سگریٹ پینا ویسے ہی
معیوب ہے۔ مگر اب حالت یہ پہنچ گئی ہے کہ اساتذہ کلاسوں کے آگے
کھڑے ہو کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے ہیں اور کبھی کبھی تو کلاسوں
کے دروازوں پر کھڑے ہو کر بڑے مزے کے ساتھ بیڑیاں پیتے ہیں۔
ایک امتحان میں جب زیادہ لڑکے پرچہ ختم کر کے چلے گئے اور چند لڑکے
رہ گئے تو ماسٹر صاحب نے سگریٹ سلگایا اور پینے لگے۔ اتنے میں ایک
چپراسی کوئی کاغذ لے کر اندر آیا تو اس نے ماسٹر صاحب کی اس حرکت
پر ٹوک دیا۔ بڑے شرمندہ ہوئے اور سگریٹ بجھا لیا۔ جب اساتذہ

آزمائش

معلمی جتنا بڑا اشرف ہے اتنی ہی بڑی آزمائش بھی ہے۔ ہر عہد خصوصاً جدید عہد میں جس طرح علوم کی مسلسل توسیع و ترقی عمل میں آرہی ہے اس کے پیش نظر معلم کے فرائض میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کی ذمہ داری کے حدود وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑے عالم کو ہر لمحے اور ہر قدم پر اس کا احساس ہوتا ہے اور اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ نت نئے چیلنجوں کا معاملہ در پیش رہتا ہے جو اسے اپنی ساری صلاحیتوں کو بر سر کار لانے اور امتحان دیتے رہنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ معلم کی تقدیر لامتناہی آزمائشوں سے گزرتے رہنا ہے۔ اور اس کا شرف یہ ہے کہ وہ اپنی خدمت اور ریاضت سے نوخیز نسلوں کو تعلیم و تہذیب نفس کے جملہ مدارج سے بخیر و خوبی گزرنے میں مدد دے جو ان کو نہ صرف کاروانِ علم و فن سے ہم عناں رکھنے میں معین ہو بلکہ اس کی رہنمائی کرنے کے قابل بنائے۔ طالب علموں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کا دوسرا مفہوم خود معلم کی تعلیم و تربیت اور اصلاح ہے۔ عام طور پر معلم اور طالب علم کے رشتے کو چھوٹے اور بڑے کے رشتے سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن دراصل یہ رشتہ باہمی عزت، رفاقت و مساوات کا رشتہ ہے۔ اس رشتے کو استواری اسی وقت حاصل ہو گی جب ہم ہر لمحہ ہر جگہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہیں گے۔ زیادہ دل سوزی، تندہی اور پابندی سے کام کریں گے۔ ہماری تہذیبی ریاست میں سب سے بڑا درجہ اس کا ہونا چاہیے جو متعلقہ فرائض اور ذمہ داریوں کی بجا آوری میں سب سے زیادہ وقت اور محنت صرف کرے اور جان کھپائے۔

رشید احمد صدیقی ★★

کی یہ حالت ہو گی تو طلبا کے کردار پر اس کا اثر کیوں نہ پڑے گا۔ کیوں کہ ناپختہ ذہن بُری باتوں کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔

لباس کا خیالات پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ پہلے زمانے میں اساتذہ ایسا لباس پہنتے تھے جس پر کوئی انگشت نمائی نہ کر سکے۔ آج فلم کی [ترق]ی کے ساتھ فیشن بھی روز بروز بدل رہا ہے۔ کسی نئے فیشن کو ایکدم [اپ]نانا ایک عام آدمی کے لیے تو مناسب ہے لیکن ایک ٹیچر کے لیے یہ کسی [ط]رح مناسب نہیں کہ وہ اس لباس کو پہن کر کالج آئے جو رات اس نے فلم میں کسی ہیرو کو پہنے دیکھا تھا۔ یہ بات بھی آج کل عام طور پر نظر آتی ہے کہ اساتذہ اپنی شایانِ شان لباس نہیں پہنتے۔ جب اساتذہ یہ طریقۂ کار اختیار کریں گے تو طلبا ان سے آگے قدم ماریں گے اور نتیجہ یہ ہو گا کہ پورا معاشرہ گمراہ ہو جائے گا۔ اور آج ہم اس گمراہی کی وہ تمام علامات دیکھ رہے ہیں۔ اگر ہمارے اساتذہ نے اپنی روش نہیں بدلی تو اس سماج کا اللہ ہی حافظ ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

★ ★ ★

اخلاق احمد

مسلمانوں کی ایجاد

یورپی غسل خانے

اسلام کے اندر روح کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ جسم کی طہارت بھی ضروری قرار پائی۔ طلوعِ اسلام کی سرزمین بے آب و گیاہ، خشک اور بنجر تھی۔ ناپاکی دور کرنے کے لیے غسل اور نماز کے لیے وضو ضروری تھا۔ خاص طور سے جہاں پانی نایاب ہو وہاں ناپاکی دور کرنے کے لیے کچھ اور ذرائع ہوتے تو آسان ہوتا۔ لیکن اس کے علاوہ دوسری شکل میں ناپاکی کا دور ہونا تو درکنار روح کی بالیدگی مزید مجروح ہو جاتی۔

اسلام سے پہلے عرب میں پانی کی بڑی اہمیت تھی۔ پانی کے ایک ایک قطرے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ قبائلی جنگیں عام تھیں۔ پانی کے چشموں کی ناکہ بندی سے بڑی بڑی جنگیں جیتی جاتی تھیں۔ جہاں پینے کو پانی نہ مل سکے وہاں نہانے کا کیا کام۔ ایسی حالت میں غسلخانے کا تصور کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ عرب جب دوسری سرزمینوں میں داخل ہوئے تو اپنے یہاں کے مقابلے میں ان کو ہر جگہ پانی کی افراط نظر آئی۔ ترسے ہوئے لوگوں نے پانی کی بڑی قدر کی اور اس کو مختلف طریقوں سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جو وہاں کے لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یورپ کی سرد اور منجمد آب و ہوا میں پانی سے قربت کے بجائے دوری بہتر خیال کی جاتی تھی۔ نہانا خطرناک حد تک سوچا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عیسائیت کے لحاظ سے بھی نہانا روا نہیں تھا۔ سسلی کے بادشاہ فریڈرک دوم کے خلاف عیسائیوں نے یہ الزام لگایا کہ مسلمانوں کی طرح روزانہ غسل کرتا ہے۔

تیرھویں صدی تک اسپین کے مختلف حصوں میں حمام پائے جاتے تھے جو بعد میں اخلاقی اور مذہبی وجوہات کی بنا پر بند کر دیے گئے۔ صقلیہ اور اندلس کے تہذیبی اثرات یورپ والوں کی معاشرت پر بھی ہوئے، جہاں مکانوں کو صاف ستھرا رکھنا، ان میں پائیں باغ لگوانا، یورپ والوں نے سیکھا۔ وہاں روزانہ نہانے کی عادت بھی پڑی اور غسلخانے کا رواج عام ہوا۔ شروع شروع میں حمام کا رواج عام نہیں تھا۔ لیکن عباسی دور میں حمام معاشرتی زندگی کے جز بن گئے۔ حمام استعمال کرنے کے لیے مردوں اور عورتوں کے دن مقرر تھے۔ حمام کے اندر مختلف کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کی دیواریں سنگِ مرمر کی ہوتی تھیں۔ رنگ، میناکاری اور چوکوں کے چکنے فرش ہوتے تھے۔ درمیان میں ایک بڑا ایوان ہوتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے روشنی آتی تھی۔ بیچ میں پانی کا حوض گرم کیا جاتا تھا اور اسی کی گرمی اور بھاپ سے حمام گرم رہتا تھا۔ اس سے ملحق دوسرے کمروں میں نشست کا انتظام ہوتا جہاں کھانے پینے کا مشغلہ جاری رہتا۔ جس طرح آج چائے خانے سماجی زندگی کے خاص مرکز بنے ہوئے ہیں اسی طرح اس وقت کی معاشرتی زندگی میں حمام اجتماعی مقامات تھے۔ عورتوں کا حمام میں جانا کچھ عجیب سی بات نظر آتی ہے۔ شاید انھیں سماجی زندگی میں شامل کرنے کا حمام ایک بہترین ذریعہ تھا ورنہ مکانوں کے اندر اس کا انتظام آسانی سے ہو سکتا تھا۔ یا اس وقت کی سماجی کمزوری تھی کہ عورت حمام میں نہانے جائے۔

یورپ کے عہدِ تاریک میں نہانے اور غسل خانے کی طرف کم توجہ دی جاتی تھی۔ کیوں کہ انحطاطی دور میں جب معاشی حالت خراب ہو جاتی ہے تو صفائی اور تندرستی کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ عہدِ رومی میں یورپ کے اندر نہانے اور غسلخانے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس وقت کام کرنے کے بعد تفریح کی جگہ حمام ہوتی تھی۔ حمام کی خوبصورت عمارت محل جیسی ہوتی تھی۔ سنگِ مرمر کی سیلیں و بیسن، گرم اور ٹھنڈے پانی کے علاوہ کسرت کے کمرے، لائبریری، خوبصورت ستونوں کے برآمدے اور نشست گاہیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ جہاں جوئے کھیلے جا سکتے تھے۔ یہ حمام بادشاہوں کی جانب سے بنوا دیے جاتے تھے۔ ان میں داخلے کی فیس پھوٹی کوڑی کے برابر تھی۔ اناطولیہ کے غسلخانے میں اتنی گنجائش ہوا کرتی تھی کہ ایک وقت میں تقریباً سولہ سو لوگ نہا سکتے تھے۔ کام کرنے والے عموماً بغیر کسی خرچ کے تفریح کرتے

تھے۔ اس کا انتظام بادشاہ یا میونسپلٹی یا صاحب ثروت کی طرف سے ہوتا تھا تاکہ عوام کی حمایت حاصل ہو سکے۔ رومی حکومت میں یورپ، افریقہ ایشیاء کے زرخیز اور مردم خیز خطّے شامل تھے۔ لیکن ان حصّوں میں مشرق وسطیٰ کی زیادہ اہمیت تھی۔ اس حصّے کی ثقافت سے یورپ عہد قدیم سے متاثر ہوتا رہا کیونکہ اس حصے کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی تھی۔ مغرب، مشرق وسطیٰ سے مختلف چیزیں لیتا رہا۔ مثلاً کھیتی، جانوروں کا پالنا، کھانے کی چیزیں، لباس، نقل و حمل، کتائی بنائی، عمارت، نالیاں اور سینچائی، سڑک اور سواری، دھات کا کام، ہتھیار اوزار اور مختلف قسم کے ہتھیار، جہاز کا چلنا، علم نجوم کا مشاہدہ اور نظام تقویم، دستاویز کا لکھنا اور محفوظ رکھنا، قانون اور شہری زندگی، سکّے، نظری خیال اور ریاضیات، بہت سے مذہبی خیالات اور Symbols مختلف ادوار میں یہ چیزیں مشرق سے مغرب میں داخل ہوئیں۔ خاص طور سے ایک ہزار قبل مسیح سے لے کر پانچ سو عیسوی تک قبل اسلام تہذیب کی سطح پر جب اس پیمانے پر لین دین جاری تھا تو جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کے لحاظ سے حمام مغرب کی ایجاد قرار نہیں پاتی۔ طلوعِ اسلام کی سرزمین بھی جب یہی مشرق کی سرزمین رہی تو مسلمانوں کی ثقافتی معراج عین ممکن ثابت ہوتی ہے۔ یورپ اپنا عہدِ رومی بھول چکا تھا۔ عہدِ تاریک کی سیاہی اس پر پھیر جا چکی تھی۔ مشرق سے اس کو پھر روشنی نظر آرہی تھی اور دھیرے دھیرے یہ اجالا اس کے گھروں میں پھیل گیا۔ اس اجالے میں اس کو بہت سی نئی چیزیں نظر آنے لگیں۔ مثلاً مسلمان عمارتوں کے اندر پانی کا استعمال نہروں، نابدوں، حمام، فواروں وغیرہ کے ذریعے کثرت سے کرتے تھے۔ الحمراء کے اندر شیروں کے صحن خانے میں یا محل کے دوسرے دور دراز حصوں میں روانی کے ساتھ پورا پانی پہنچاتے تھے۔ پائیں باغ کے اندر چوڑی پتلی پانی سے بھری بل کھاتی نالیاں پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے ترو تازگی، شادابی اور خنکی برقرار رہتی تھی۔ پانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے اور بلندی پر چڑھانے کے مختلف طریقے استعمال ہوتے تھے۔ اس کے لیے نئے نئے آلات تیار کیے جاتے تھے۔ صقلیہ کے اندر کثرت سے دریا، جھیل اور چشمے پائے جاتے تھے اسی لحاظ سے پانی کے کارخانے قائم تھے اور ہر جگہ بے شمار پن چکیاں نصب تھیں۔ پانی کی مدد سے ایک آبی گھڑی بھی تیار کی گئی تھی جو ایک چشمے میں لگی ہوئی تھی جس سے نمازوں کے اوقات معلوم ہوتے تھے۔ ★★

بقیہ : عقل عمومی .....

لگنے اور اس کے پھلدار ہونے کے لیے لازم ہے کہ بیج کسی ایسے مقام پر بو یا جائے جہاں کی زمین، ہوا اور گرمی کا درجہ اس کے مناسب ہو۔ بغیر اس کے نہ وہ ہمہ وقت صحیح غذا حاصل کر سکتا اور نہ سانس لے سکتا ہے۔ اگر مخصوص حالات اور شرائط نہ موجود ہوں تو وہ دانہ ہرگز روییدہ نہ ہوگا، بیج نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس میں اکھوا نہیں پھوٹے گا کسی پودے کی زندگی کچھ تکوینی اصولوں کے سایہ میں ہوا کرتی ہے جن کے دائرے میں اس کی جڑ سے لے کر تنے تک، شاخوں سے لے کر پتیوں اور پھلوں تک سب چیزیں داخل ہوتی ہیں۔ ہر طرح کے حالات اور شرائط میں کسی بیج کا درخت کی صورت اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔

٢- ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہر چیز کا ایک اثر اور اس کی ایک خاصیت ہے جسے اس سے اگر الگ کر لیا جائے تو وہ نیست و نابود ہو جائے گی نمونے کے طور پر انسان کے بدن کو لے لیجیے۔ حضرت علی بن طالب (ع) کے بقول وہ خود ایک عظیم الشان عالم ہے۔ یہ انسان جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضاء دانستہ یا نادانستہ طور سے اس کے ساتھ ہم آہنگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر اس جسم میں معمولی سی خراش لگ جاتی ہے تو فوراً خون کے سفید جرثومے ایک منظم، وفادار، چوکنّی فوج کی طرح دشمن کے مقابلے کی غرض سے اسی جگہ اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

٣- اس دنیائے رنگ و بو، اس عالم کائنات پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ کسی ایک جاندار کے اجزا کے درمیان تعاون اور باہمی امداد کارفرما ہو، بلکہ یہ ہم آہنگی پورے کرۂ زمین کے موجودات بلکہ اس سے بڑھ کر مختلف آسمانی کروں کے درمیان پائی جاتی ہے، سورج چمکتا ہے، پانی بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے، ہوا بادلوں کو ادھر اُدھر حرکت دیتی ہے، کہیں موسلا دھار یا ہلکی بارشیں ہوتی ہیں، کہیں روئی کے گالوں کی طرح برف گرتی ہے، تب جا کے درختوں اور پودوں میں زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔

مذکورہ چاروں باتوں کے ذہن نشیں ہو جانے کے بعد یقیناً یہ سمجھ میں آجانا چاہیے کہ کسی چیز کے منظّم اور مرتّب ہونے سے کیا مراد ہے ؟ ★★

شجاع الدین فاروقی

آثار الصنادید۔ ایک مطالعہ

سرسید کی ابتدائی تصانیف میں آثار الصنادید ایک خاص اہمیت
کی حامل ہے۔ بقول حامد حسین قادری "یہ کتاب سرسید کا نہایت عجیب
ونادر کارنامہ و یادگار ہے اور اردو میں اپنی نوع کی پہلی چیز"
(داستان تاریخ اردو)

سرسید کو شروع سے ہی تاریخ سے بہت شغف تھا۔ اسی
شغف نے ان سے "جام جم" 'سلسلۃ الملوک' تاریخ ضلع
بجنور' تاریخ سرکشی بجنور' وغیرہ کی تصنیف اور فیروز شاہی
آئین اکبری اور تزک جہاں گیری کی ترتیب نو کرائی۔ آثار الصنادید
بھی ان کے اسی تاریخی ذوق وشوق کا پتہ دیتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گبن کو تاریخ سے دلچسپی روم کے کھنڈرات
دیکھنے کے بعد پیدا ہوئی تھی اور اس کے بعد ہی اس نے تاریخ کی عظیم کتاب
زوال سلطنتِ روم" تصنیف کی اور عظیم مورخوں میں بلند مقام پایا۔ سرسید
کو بھی تاریخ سے دلچسپی قلعہ دہلی سے تعلق اور دہلی کی قدیم عمارتوں
کو دیکھنے کے بعد ہی پیدا ہوئی تھی۔ انھیں گبن سے بھی غیر معمولی دلچسپی
تھی۔ انھوں نے گبن کی تاریخ کا ترجمہ کثیر رقم خرچ کر کے خاص اپنے
لیے کرایا تھا۔ ان کا ذہن اور صلاحیتیں بھی تاریخ کے لیے بہت موزوں
تھیں اور شاید انھیں اردو کا اور ہندوستان کا گبن بننے کی خواہش بھی
تھی۔ مگر بقول ڈاکٹر سید عبداللہ، "اگر وہ بہت بڑے مورخ
نہ بن سکے تو اس کا سبب یہ ہے کہ حالات و واقعات نے انھیں دوسرے
مشاغل کی طرف متوجہ کر دیا۔" (سرسید اور ان کے نامور رفقاء)

سرسید کے دور میں تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی بھی بہت بڑھ
گئی تھی۔ آگرہ کالج کے چند لائق لوگوں نے آگرہ کی عمارتوں پر مفید
معلوماتی رسالے فارسی میں مرتب کیے۔ مثلاً "تفریح العمارات" یا
"حالات مستقر الخلافت" وغیرہ۔ لزلی اسٹیفین اور کننگھم نے دہلی کی
عمارتوں پر انگریزی میں کتابیں لکھیں۔

سرسید بھی اس علمی تحریک سے متاثر ہوئے۔ انھیں دہلی کی منصفی
کے زمانہ میں قدیم عمارتوں اور شہر و نواحِ شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا۔
انھوں نے دہلی کی ایک ایک عمارت کے بارے میں بڑی گہرائی اور محنت
سے معلومات حاصل کیں۔ وہ چھٹیوں میں نواح دہلی کی عمارات کی تحقیق
کے لیے جاتے تھے اور کئی کئی دن وہاں رہتے تھے۔ اکثر قدیم عمارتیں شکستہ
اور بوسیدہ تھیں اور ان کے کتبے پڑھنے مشکل تھے۔ بہت سے کتبوں
سے مکمل معلومات حاصل نہ ہوتی تھیں اور بعض ایسے خطوں میں تھے جن
سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض عمارتوں کی حالت اس قدر بدل گئی تھی
کہ یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ ان کی تعمیر کا مقصد کیا تھا۔ کتبوں میں جس بانیِ
عمارت کا نام کندہ تھا، اس کے حالات کے لیے تاریخی کتب سے رجوع کرنا
ضروری تھا۔ لیکن سرسید نے ان تمام مشکلات کا خندہ پیشانی سے
مقابلہ کیا اور تمام ممکن مواد فراہم کر لیا۔

انھوں نے ہر عمارت کے طول و عرض کی پیمائش کی اور اس کے حالات
قلم بند کیے۔ کتبوں کے چربے اُتارے اور ہر ایک کتبے کو اس کے اصلی خط
میں پیش کیا۔ ہر عمارت کا نقشہ مصوّر سے بنوایا اور اس طرح سوا سو
عمارتوں کی مکمل تحقیقات پیش کیں۔

سرسید نے قطب مینار کے اونچے کتبوں کو پڑھنے کے لیے دو
بلیاں لگوا کر ان میں چھینکے لٹکوائے اور خود ان میں بیٹھ کر ان کتبوں
کی نقل لی۔ ظاہر ہے یہ بہت خطرے کا کام تھا۔ لیکن انھوں نے ذرا
پروا نہ کی اور تحقیق کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ بقول مولانا حالی ــــ
سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت
بالکل ابو تمام کے اس شعر کے مصداق تھی۔

وَتَصعِیدٌ حَتّٰی یَظُنُّ الوَرٰی   بِاَنَّ لَہٗ حَاجَۃٌ فِی السَّمَاءِ

"وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ
اس کو آسمان پر کچھ کام ہے"۔ حیاتِ جاوید

یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں شایع ہوئی۔ اس میں چار باب تھے۔ پہلا باب بیرونِ شہر کی عمارتوں کے بارے میں تھا۔ اس میں سرسیّد نے تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا حال لکھا۔ جن میں ہندو اور مسلم دونوں ہی عہد کی عمارتیں ہیں۔ ان میں سے چند کے علاوہ ہر عمارت کا نقشہ اور کتبہ بھی دیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں لال قلعہ اور اس کی ۳۲ عمارتوں کا حال معہ نقشوں اور کتبوں کے ہے۔

تیسرے باب میں خاص شہر شاہجہاں آباد کی ۰، حویلیوں مسجدوں مندروں، بازاروں، باولیوں اور کنوؤں کا حال ہے۔

چوتھے باب میں ان شہروں، قلعوں اور محلوں کا حال درج ہے جو سمبت ۲۰۴ دکرمی سے مغل عہدِ حکومت تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین پر آباد ہوئے۔ اس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبان اردو کا ذکر ہے۔ اور پھر ۱۲۰ مشاہیر اہلِ دہلی کا تذکرہ ہے جن میں علماء، ومشایخ شعراء، وادباء، فقراء، وقراء، اطباء، خوش نویس، مصور و موسیقار وغیرہ سبھی ماہرینِ علم و فن شامل ہیں۔

آثار الصنادید کی تالیف میں سرسیّد کے دوست اور اردو فارسی کے زبردست عالم و انشاء پرداز مولانا امام بخش صہبائی نے بھرپور تعاون کیا تھا اور مولانا حالیؔ کے مطابق اس کے پہلے ایڈیشن کی مقفیٰ و مسجع اور رنگین و مبالغہ آمیز عبارت مولانا صہبائی ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

سرسیّد کی اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اہلِ علم نے اس کی بڑی قدر کی۔ فرانس کے مشہور اردو عالم گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں شاندار الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا۔ اور ۱۸۶۱ء میں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی ترجمہ کی بنیاد پر انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی اعزازی ممبری حاصل ہوئی۔ یہ وہ علمی اور ادبی سوسائٹی تھی جس کی ممبری کے لیے بڑے بڑے عالم آرزومند رہتے تھے اور درخواست دینے کے بعد برسوں انتظار کرتے تھے۔

انھیں دنوں مسٹر رابرٹس، جو دہلی کے کلکٹر و مجسٹریٹ تھے اس کی ایک کاپی اپنے ساتھ انگلستان لے گئے۔ وہاں کورٹ آف ڈائرکٹرز کے ممبران نے اُن سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ رابرٹس نے ہندوستان واپس آکر سرسید کی مدد سے اس کا ترجمہ کیا۔ لیکن سرسیّد نے ترجمہ سے پہلے اس کی بعض غلطیوں کو درست کیا اس پر مکمل نظرِ ثانی کی۔ اس بار عبارت بھی سادہ و سلیس کر دی گئی ا اسلوب بیان کو بالکل تبدیل کر دیا گیا۔ اس طرح مکمل اصلاح و تر نو کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں شایع ہوا۔

اگرچہ موجودہ دور میں قدیم عمارتوں اور آثارِ قدیمہ و فن تعمیر سے متعلق بہت سی بلند پایہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں فن تعمیر باریکیوں اور نزاکتوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ جبکہ آثا الصنادید میں فن تعمیر کا بہت ہی کم تذکرہ ہے۔ اس کے بہت نظریات بھی جدید تحقیق کی روشنی میں غلط ثابت ہو گئے ہیں۔ مثلاً زیب النسا کی قبر کا مسئلہ، قطب مینار کے فن تعمیر میں ہندو اثرات کی موجودگی لیکن اس کے باوجود یہ ایک قیمتی دستاویز ہے اور اس میں وہ تمام خ اور خامیاں پائی جاتی ہیں جو کسی موضوع کی اولین کتابوں میں ہوتی اور بہرحال سرسیّد کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ بقول پروفیسر خلیق نظامی "ہندوستان میں آثارِ قدیمہ کی اوّلیت کو سب سے پہ سرسیّد نے محسوس کیا اور اس پر باقاعدہ کام کی بنیاد ڈالی تاریخ اور تمدن کے اس ماخذ کی طرف ان کی نظر لارڈ کرزن سے بہ پہلے گئی تھی ــــ انھوں نے جس ذوق، انہماک اور تاریخی بصیرت ساتھ اس کا مواد جمع کیا وہ حیرت انگیز ہے"
(مقدمہ سرسیّد اور ہندوستانی مسلمان)

عتیق صدیقی نے بجا طور پر لکھا ہے "سرسید کی تصانیف میں آثا الصنادید کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ا ان کی علمی شہرت کو پر لگا دیے اور ہندوستان سے انگلستان تک پہنچا دیا۔ آج بھی اس کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے"۔ (احمد خاں: ایک سیاسی مطالعہ)۔

بلاشبہ اس موضوع پر یہ انیسویں صدی کی بہترین کتاب ہے۔ اسی اس دور میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ کیوں کہ یہ ایسی معلومات پُر تھی جو نئی بھی تھیں اور مفید بھی۔

★★★

نقیب الاسلام
بی۔یو۔ایم۔ایس۔

ہِسٹیریا

ہسٹیریا ایک یونانی لفظ ہسٹرا (HUSTERA) سے مشتق ہے جس کا مفہوم ہے: بچہ دانی چونکہ یہ ایک ایسا مرض ہے جو کہ بچہ دانی سے متعلق ہے اس لیے اس کو ہسٹریا کہتے ہیں۔

طب یونانی میں اس کو اختناق الرحم کہتے ہیں جس کے معنی رحم یا بچہ دانی کے گلا گھوٹنے کے ہیں چونکہ اس مرض میں مریضہ کا دم گھٹنے لگتا ہے اور یہ مرض رحم کی خرابی کی وجہ سے ہوتا ہے اس لیے حکما۔ اطبا نے اس کو اختناق الرحم کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اس کو عرفِ عام میں باؤ گولہ کہا جاتا ہے کیونکہ دورۂ مرض کے وقت مریضہ کے پیٹ میں سے ایک گولہ سا اوپر کو اُٹھتا محسوس ہوتا ہے اور گلے میں جا اٹکتا ہے جس کی وجہ سے دم سا گھٹنے لگتا ہے۔ چنانچہ عام لوگ اُسے باؤ گولہ کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک آسیبی بیماری ہے اور یہ مرض موجودہ زمانے میں جن اور بھوتوں کے سائے پڑ جانے سے پیدا ہوا ہے چنانچہ اس مرض میں مبتلا مریضوں کا صحیح علاج کرانے کے بجائے غلط تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

ہسٹریا ایک ایسا مرض ہے جو مرگی اور غشی دونوں سے مُشابہ ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مرگی والے پر دورے کی حالت میں۔ جو کیفیت گزرتی ہے وہ احساس وشعور کے بالکل زوال پذیر ہو جانے کی وجہ سے معلوم نہیں ہوتی اور وہ دورے جاتے رہنے پر بیان نہیں کر سکتی لیکن اس بیماری کی مریضہ وہ کیفیت من وعن پوری طرح بیان کر سکتی ہے۔ علاوہ ازیں مرگی میں مریضہ کے منہ سے جھاگ نکلتے ہیں جبکہ اس میں جھاگ بالکل نہیں نکلتے۔

اسباب:۔ قدیم یونانی اطبا کے علاوہ جدید طب کے حاملین بھی اسے رحم ہی کا مرض تصور کرتے ہیں لیکن عصری تحقیقات کی روشنی میں عصبی الاصل مرض ہے جس میں نہ صرف عورتیں بلکہ مرد اور بچے بھی مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یہ مرض زیادہ تر عیش پسند، نازک مزاج اور شہری امیرزادیوں اور نازک طبع و نازک اندام عورتوں کو لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ تحقیقات سے حکیم رازی اور جالینوس کے خیال کی تائید ہوتی ہے یہ لوگ اختناق الرحم کا مبدا اگرچہ رحم کو تسلیم کرتے ہیں تاہم دیگر معاون اسباب میں کثرت منی اور اوعیہ منی میں اس کا احتباس بتاتے ہیں جس کے استحالے سے رحم میں سمی و تشنجی کیفیت پیدا ہوتی ہے قوی عصبی مشارکت کے سبب حجاب حاجز شرائین وا وردہ کے علاوہ دل و دماغ پر بھی اس کا بھرپور سمی اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے یہ مرض شادی شدہ عورتوں کی بہ نسبت ناکتخدا اور باکرہ عورتوں میں زیادہ دیکھنے میں آتا ہے۔ جس کا سبب سب سے خاص منی کا بند یا احتباس ہوتا ہے۔

لبا اوقات خلط بلغم، صفرا یا سودا کی زیادتی سے بھی یہ مرض ہوتا ہے۔ یہ مرض عموماً عورتوں میں ۱۴ تا ۴۰ سالہ تولیدی عمروں میں لاحق ہوتا ہے کبھی کبھار بعض لڑکیوں میں چند محرکات کے ذریعے ان کے اعضاءِ تولید و تناسل قبل از وقت اپنا کام شروع کر دیتے ہیں نیز کچی پکی منی بنانے لگتے ہیں علاوہ بریں مردوں میں اعلام۔ جلق، دماغی محنت کی کثرت اور بے خوابی بھی اس کے اسباب ہوا کرتے ہیں۔

یہ مرض موروثی طور پر ان عورتوں کو لاحق ہوتا ہے جن کی مائیں اختناق الرحم، صرع یا سکتے میں مبتلا رہی ہیں یشرابی، آتشکی اور خنازیری والدین کی اولاد میں بھی اس مرض کی کثرت ہوتی ہے۔

عیش وعشرت کی زندگی گذارنا شہوانی اور نفسانی خواہشات کا غلبہ عشقیہ ناولوں، افسانوں کو پڑھنا یا ایسی فلموں یا ڈراموں کو دیکھنا بھی اس کے اسباب ہو سکتے ہیں کیونکہ اختناق الرحم کی مریضہ کا جذباتی رجحان زیادہ تر جنسی عوامل سے متاثر ہوتا ہے جنسی اشتعال یا محرومی

کے نتیجے میں دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ پرانے قبض، نفخ، خوف و ناامیدی۔ فکر و تردد رنج و غم محبت یا کسی دوسرے سلسلے میں احساس ناکامی، جان و مال کے نقصان کا صدمہ بھی اس کا سبب ہو سکتے ہیں۔ اکثر اوقات ایک لمبے عرصے تک قاطع و مانع حمل ادویا کے استعمال سے جو عورتیں حاملہ نہیں ہو پاتی ہیں ایسی حالت میں بھی آلات منی یا طمثی عروق میں تضرر واقع ہونے کی وجہ سے اختناق الرحم لاحق ہو جاتا ہے۔ بقول بقراط حاملہ عورتوں میں اختناق الرحم (ہسٹیریا) نہیں واقع ہوتا ہے۔

علامات: یہ مرض دورے کے ساتھ ہوتا ہے۔ دورہ کسی کو چند منٹ کسی کو چند گھنٹے اور بعض کو دو، چار دن تک بھی رہتا ہے اور دورہ اکثر حیض کے ایام میں پڑتا ہے۔ پہلے مریضہ کے کولھوں میں کچھ درد ہوتا ہے۔ آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔ سر میں درد ہوتا ہے۔ طبیعت نڈھال ہوتی ہے سستی اور ضعف کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ تاریکی چشم کی شکایت ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد شکم میں ایک گولہ سا اٹھ کر اوپر جا کر گلے میں اٹک جاتا ہے جس کو مریضہ بار بار نگلنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کا دم گھٹنے لگتا ہے یا قہقہہ مار کر ہنستی ہے اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتی ہے۔ آواز بیٹھ جاتی ہے۔ بولا نہیں جاتا۔ چھاتی کوٹنے لگتی ہے۔ ہاتھ پاؤں مارنے لگتی ہے۔ جسم میں بل پیدا کرتی ہے کبھی اٹھتی ہے اور کبھی بیٹھتی ہے۔ ہاتھ پاؤں میں تشنج ہو جاتا ہے سانس کی رفتار بڑھ جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے ہیں۔ کبھی مریضہ سر کے بال نوچتی ہے اور کبھی دیوار سے سر ٹکراتی ہے اور بار بار اپنے گلے کی طرف انگلی لے جاتی ہے۔ گویا گلے میں کسی شے کی رکاوٹ کا اشارہ کرتی ہے۔ جب مرض کا دورہ کم ہو جاتا ہے تو مریضہ ہانپنے اور کانپنے لگتی ہے چھونے سے چونکتی ہے اور کبھی چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ آخر میں کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے اور مرض کا دورہ رفع ہو جاتا ہے اور پیشاب بکثرت آتا ہے بعض کو ہذیان کی شکایت ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے دورے کی حالت میں مریضہ بہکتی اور فضول باتیں کرتی ہے۔

دورے کے بعد مریضہ بالکل مضمحل ہو جاتی ہے۔ صورت مسکین کی سی بنالیتی ہے اور ہمدردی کی طلب گار ہوتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

علاج و تدابیر: اگر مریضہ باکرہ ہے تو اکثر اوقات شادی کر دینے سے یہ شکایت خود بخود رفع ہو جاتی ہے۔

۲۔ نوجوان عورتوں میں یہ شکایت ہو تو عمر بڑھنے پر رفتہ رفتہ کم ہو جاتی ہے

۳۔ اگر مریضہ کو غشی ہو تو فوراً اسے ہوادار کمرے میں لٹا دیں۔ گریبان ڈھیلا کر دیں اور سر قدرے اونچا کر دیں۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی چھینٹا ماریں، مریضہ کو زور سے چلا کر بلائیں اور قوی محرکات سونگھائیں۔

چونکہ بے ہوشی مکمل طور پر طاری نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی دہکتا ہوا کوئلہ یا گرم لوہا اس کے پاس لے جا کر جسم پر رکھنے کی بات کہی جائے چنانچہ اکثر یکلخت ساری بے ہوشی دور ہو جاتی ہے۔ دورہ ختم ہونے پر مناسب علاج کیا جائے۔

۴۔ شدید دورے میں پاؤں ہاتھوں اور تمام جسم پر خوب مالش کریں۔ ناف کے نیچے اور پنڈلیوں پر خالی سینگیاں کھچوائیں۔ اگر قبض ہو تو حقنہ کے ذریعہ دور کریں۔ اور رحم کے اندر روغن گل اور روغن صندل روئی میں تر کر کے رکھیں۔

۵۔ مناسب تدابیر سے ماہواری کی درستگی کو بہتر بنائیں اور دوسری وجوہات اور اسباب کو دور کریں۔

جدید علاج: جدید تدابیر میں عوارضات کے لحاظ سے درد ختم کرنے کے لیے: اوجین، مالکرو یا بیرین یا کوڈر پائرین وغیرہ دیں۔

(۱) زود حساسیت کو کم کرنے کے لیے سوڈیم گارڈینال وغیرہ دیں۔

(۲) اگر جسم کے کسی حصے پر بے حسی ہو تو الیکٹرک شاک لگوائیں۔

(۳) کثرت شہوت کی حالت میں لیوٹو سائیکلین (۲۵ ملی گرام) ہفتہ میں دو بار دینے سے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۴) بخار وغیرہ کی حالت میں سوڈیم سیلی سلیٹ سے آرام ہو جاتا ہے۔

پرہیز اور غذا: بادی ثقیل اور دیر ہضم غذاؤں غم و غصے سے اور عشقیہ افسانے اور ناول کے پڑھنے سے پرہیز کرائیں۔ غذا میں زود ہضم غذائیں دیں حسب ضرورت بکرے کے گوشت کا شوربہ کم مرچ کا چپاتی کے ساتھ دیں۔ کدو پالک ترئی وغیرہ دیں۔ انگور اور امرود حسب عادت دیں۔

★

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۳۸ / ۸۳-۸۴

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں -

فیکلٹی آف میڈیسن :

۱- ریڈر ان ریڈیالوجی : ڈپارٹمنٹ آف ریڈیالوجی -
شرح تنخواہ :- ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ معہ دیگر الاؤنس -
استعداد :- ایم. ڈی / ایم. ایس (ریڈیالوجی)
تعلیمی / تحقیقی تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان ریڈیالوجی پانچ سالہ تجربہ

۲- لکچرر ان ریڈیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف ریڈیالوجی -
شرح تنخواہ :- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ معہ دیگر الاؤنس
استعداد :- ایم. ڈی / ایم. ایس (ریڈیالوجی)

۳- لکچرر ان فزیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی
شرح تنخواہ :- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ - معہ دیگر الاؤنس -
استعداد :-

۱- لازمی - ایم. ڈی (فزیالوجی)
ایم. بی. بی. ایس معہ ایم. ایس سی (فزیالوجی)
پی. ایچ. ڈی (میڈیکل فزیالوجی)
ڈی. ایس سی (میڈیکل فزیالوجی)

پسندیدہ:- ہندوستانی یا غیرملکی رسائل میں اعلیٰ درجے کا تحقیقی معیار کا مطبوعہ کام۔

۴- لکچرار ان بائیوکیمسٹری - ڈپارٹمنٹ آف بائیوکیمسٹری۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنس

استعداد:- ایم۔ڈی (بائیوکیمسٹری)
ایم۔بی۔بی۔ایس معہ
ایم۔ایس۔سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)
پی۔ایچ۔ڈی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)
ڈی۔ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

نوٹ:- منتخب شدہ امیدواروں کو کلینکل بائیوکیمسٹری سیکشن کی تنظیم اور ایم بی بی ایس و ایم ڈی درجات کے لیے میڈیکل بائیوکیمسٹری کے نصابات کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔

۵ لکچرار ان اناٹومی - (ہسٹالوجی) ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ - معہ دیگر الاؤنس

استعداد

(۱) لازمی:- ایم ایس (اناٹومی)
ایم۔بی بی ایس معہ ایم۔ایس سی (اناٹومی)
پی۔ایچ۔ڈی (میڈیکل اناٹومی)
ڈی۔ایس سی (میڈیکل اناٹومی)

(۲) پسندیدہ:- مطبوعہ کام / ہسٹالوجی کے میدان تحقیقی تجربہ۔

۶ لکچرار ان مائیکرو بیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف مائیکرو بیالوجی۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ معہ دیگر الاؤنس۔

استعداد۔(۱) لازمی۔ ایم ڈی (بکٹریالوجی) / ایم ڈی (مائیکرو بیالوجی)
ایم ڈی (بکٹریالوجی معہ پیتھالوجی)
ایم ڈی (پیتھالوجی اور بکٹریالوجی)
ایم۔بی۔بی۔ایس معہ
ایم۔ایس سی میڈیکل بکٹریالوجی / ایم ایس۔سی (مائیکرو بیالوجی)

پی۔ ایچ ڈی۔ و میڈیکل بکٹریالوجی / پی۔ ایچ ڈی میڈیکل مائکروبیالوجی یا
ڈی۔ ایس سی۔ و میڈیکل بکٹریالوجی / ڈی۔ ایس سی و میڈیکل مائکروبیالوجی
آ پسندیدہ۔ مائیکرو بیالوجی میں تعلیم دینے کا تجربہ

۷۔ لکچرر ان نیرو سائیچٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن
شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ معہ دیگر الاؤنس
استعداد:۔ ایم۔ ڈی دسائیچیٹری یا
ایم ڈی دسائیکالوجیکل میڈیسن یا
ایم۔ ڈی ان میڈیسن معہ ڈپلومہ ان سائیکالوجیکل میڈیسن

فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی

۸۔ ریڈر ان سول انجینئرنگ۔ سول انجینئرنگ سیکشن۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔
۹ ریڈر ان میکینکل انجینئرنگ۔ میڈیکل انجینئرنگ سیکشن یونیورسٹی پالی ٹکنیک۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ معہ دیگر الاؤنس۔
استعداد:۔ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ مع متعلقہ موضوع میں ڈاکٹریٹ۔ تدریس کا کم وبیش پانچ سال کا تجربہ۔
اُن امیدواروں کی درخواست پر بھی غور کیا جا سکتا ہے جن کے پاس اگرچہ کہ ڈاکٹریٹ کی سند نہیں ہے، لیکن اُس کے معیار کا مطبوعہ کام ہے۔ یا اعلیٰ معیار کا کسی ادارے یا صنعت میں ترقیاتی کام ہو۔

یا

ایسے اشخاص کی صورت میں جنھیں کسی صنعت یا پیشہ ورانہ میدان سے بھرتی کیا جائے گا، ان کے لیے ضرور ہوگا کہ امیدوار کے پاس اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ ہو اور تقریباً سات سال کا مستند پیشہ وارانہ کام کا تجربہ رکھتے ہوں جس میں ایجادات / تحقیقات اور ترقیات بھی شامل ہوں۔

۱۰ لکچرر ان سول انجینئرنگ۔ سول انجینئرنگ سیکشن۔ یونیورسٹی پالی ٹکنک۔
شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ معہ دیگر الاؤنس۔

استعداد

(الف) انجینئرنگ یا ٹکنالوجی کے متعلقہ میدان میں ماسٹرس ڈگری۔

(ب) اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ مع انجینئرنگ یا ٹکنالوجی میں بیچلرس ڈگری۔ بیچلرس ڈگری/ ماسٹرس ڈگری کے معیار کی ڈگری میں فرسٹ ڈویژن

(ج) تعلیمی/ تحقیقی ادارے کے علاوہ ایک سال کا پیشہ وارانہ تجربہ۔

انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کے موضوعات میں نامیاتی بین الموضوعی پروگراموں میں ملازمتوں کے لیے دیگر حیثیتوں سے اعلیٰ صلاحیت کے حامل امیدواروں کے حق میں انجینئرنگ اور ٹکنالوجی میں ڈگریوں کی شرائط کو نرم کیا جا سکتا ہے۔

ایسے امیدوار کے لیے جو پیشہ ورانہ تجربہ رکھتا ہو یا ایسے مناسب امیدوار کے نہ ملنے کی صورت میں جس شخص کا تقرر کیا جائے گا، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر مطلوبہ پیشہ وارانہ تجربہ حاصل کرلے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کر دے۔

اگر ماسٹر ان ٹکنالوجی یا ماسٹر ان انجینئرنگ کی ڈگری کے حامل امیدوار دستیاب نہ ہوں یا تقرر کے لیے مناسب تصور نہ کیے جائیں تو اس صورت میں تعلیمی صلاحیت کی شرائط کو نرم کیا جا سکتا ہے اور فرسٹ ڈویژن میں پاس شدہ انجینئرنگ گریجویٹ کا تقرر اس شرط پر کیا جا سکتا ہے کہ امیدوار تقرر کے بعد پانچ سال کی میعاد میں ماسٹر ان ٹکنالوجی یا ماسٹر ان انجینئرنگ کی سند حاصل کرلے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کر دے۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربے کے حامل امیدواروں کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔

طلبیدہ امیدواروں کو ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ بطور ٹی۔ اے [A.T] دیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار سلیکشن کمیٹی کے دفتر سے پانچ روپیہ نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا

فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں 23 × 10 cm سائز کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۸۴ء (شام ۴ بجے تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائیگا

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

اطلاع

ہماری طرف سے ایک ٹینڈر نوٹس پہلے شائع ہوا تھا۔ مینیجر دوا خانہ طبیہ کالج کے کمرے اور برآمدے کے پچھلے حصے پر ٹائیلنگ و Roofing کے لیے جو ٹینڈر طلب کیا گیا تھا، اس کو منسوخ کیا جاتا ہے۔

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

تصحیح

ٹینڈر نوٹس برائے تعمیر کمپیوٹر سینٹر بلڈنگ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مندرجہ بالا کام کے لیے جو ٹینڈر طلب کیے گئے تھے اس کی تاریخ ۱۰ ر اپریل ۱۹۸۴ء مقرر کی گئی تھی۔

اس تاریخ میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ اب ٹینڈر وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۷ ر اپریل ۱۹۸۴ء مقرر کی گئی ہے۔

باقی تمام چیزیں بدستور ہیں۔

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

ریٹ آئٹم کی بنیاد پر ٹینڈر مطلوب ہیں جو ۳ رمئی ۱۹۸۴ء کو ایک بجے تک وصول ہو جانے چاہئیں۔ یہ ٹینڈر اسی تاریخ کو ساڑھے تین بجے کھولے جائیں گے ٹینڈر کے فارم و کاغذات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے چھٹی کے علاوہ کسی بھی دن کارکردگی کے اوقات میں حاصل کیے جا سکتے ہیں — ٹینڈر وصول ہونے کے مقررہ وقت سے ۲۴ گھنٹے پہلے ٹینڈر فارموں کی فروخت بند کر دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کی رقم	زرضمانت	ٹینڈر کی قیمت	مدت تکمیل
۱	راس مسعود ہال کے ریڈنگ روم کی توسیع	-/57,560 روپے ۱۹۸۱ء کے DSR کی بنیاد پر	-/1,440	پانچ روپے	پانچ مہینے

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۸۵-۱۹۸۴ء کے تعلیمی میقات میں داخلہ کا امکانی شیڈول

نمبر شمار	کورسیز	درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ	ٹیسٹ کی تاریخ
	کلاس XI / 10+2	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	ڈپلومہ وینس پالیٹکنک	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	سرٹیفکٹ ان ڈرافٹمینشپ	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	ڈپلومہ ان ٹیچنگ اردو	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	ڈپلومہ ان ڈرافٹنگ اینڈ ڈیزائننگ	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	اردو خطاطی کا ڈپلومہ	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	ڈپلومہ اسٹینو ٹائپنگ	۶ر جولائی ۸۴ء	—
	بی۔اے/بی۔ایس سی/بی کام I	۲۲ر جون ۸۴ء	—
	ایم۔اے/ ایم۔ایس سی/ ایم کام۔ ایل۔ایل۔بی/ بی۔ٹی ایچ/ ڈی۔بی۔ٹی ڈی۔ایس۔ڈبلو/ ڈپلوما ان پروفیشنل کورسیز	۱۶ر اگست ۱۹۸۴ء	—
	ایل۔ایل۔ایم	۱۶ر اگست ۸۴ء	—
	ایم ٹی۔ ایچ	۱۶ر اگست ۸۴ء	—
	ڈپلومہ ان جنرل نرسنگ	۱۵ر جون ۸۴ء	۴ر جولائی ۸۴ء
	ڈپلومہ ان انجینیرنگ	۱۵ر جون ۸۴ء	۶ر جولائی ۸۴ء
	بی۔ایس سی انجینیرنگ	۱۰ر جولائی ۸۴ء	۱۲ تا ۱۶ر اگست ۸۴ء

۱۵ نمبر شمار	کورسیز	درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ	ٹیسٹ کی تاریخ
۱۵	بی ای انجینئرنگ (شام کا)	۱۶ جون ۸۴ء	--
۱۶	ایم ایس سی انجینئرنگ	۱۱ جون ۸۴ء	—
۱۷	بی یو ایم ایس (دیسی طب)	۱۲ جولائی ۸۴ء	۱۷ و ۱۸ اگست ۸۴ء
۱۸	ایم بی بی ایس	۱۶ جولائی ۸۴ء	۲۰ تا ۲۴ اگست ۸۴ء
۱۹	ایم ڈی (یونانی)	۲۵ جولائی ۸۴ء	۸ اگست ۸۴ء
۲۰	بی لب سائنس	۲۵ جولائی ۸۴ء	۲۷ و ۲۸ اگست ۸۴ء
۲۱	ایم لب سائنس	۲۵ جولائی ۸۴ء	۲۷ اگست ۸۴ء
۲۲	ایم بی اے	۲۰ جولائی ۸۴ء	۸ تا ۱۰ اگست ۸۴ء
۲۳	بی ایڈ	۲۳ جولائی ۸۴ء	۲۵ و ۲۶ اگست ۸۴ء
۲۴	ایم ایڈ	۲۳ جولائی ۸۴ء	۲۵ اگست ۸۴ء
۲۵	ڈپلومہ ان کمپیوٹر پروگرامنگ	۲۶ جولائی ۸۴ء	۳۰ اگست ۸۴ء
۲۶	ماسٹر ان کمپیوٹر سائنس / کمپیوٹر سائنس میں پوسٹ بی ایس سی ڈپلومہ	۲۶ جولائی ۸۴ء	۲۹ اگست ۸۴ء
۲۷	ہائیڈروجیالوجی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ	۲۶ جولائی ۸۴ء	۷ اگست ۸۴ء
۲۸	ایم ڈی سی / ایم ایس / ڈپلومہ (میڈیسن)	۱۵ مئی ۸۴ء	۲۵ مئی ۸۴ء
۲۹	پٹرولیم پروسیسنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ	۱۵ جون ۸۴ء	

این۔ موئیدین

کنٹرولر آف اگزامینیشن اینڈ ایڈمیشن

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ

علی گڑھ

مدیر
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول
نور الحسن نقوی
استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کی خاص خاص مطبوعات

کلیات اقبال اردو

جلد ۳ — یکم تا ۱۵ مئی ۱۹۸۴ء — شمارہ ۹

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نور الحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات

سرورق کی تصویر : چاند پر انسانی قدموں کے نشان

" قمر، ہمارے خوابوں اور ولولوں کا محور قمر، خود انسان کی قدم بوسی کر رہا ہے۔" خوشہ چیں

صدر جمہوریہ کی تقریر

پیارے بھائیو اور پیاری بہنو!

آج مجھے اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بڑی مسرت ہورہی ہے۔ اس کانفرنس کے لیے جو موضوع آپ نے چنا ہے اس کے لیے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ جو معلم اور دانش ور اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے ان کا میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ کانفرنس مسلم یونیورسٹی میں ہو رہی ہے۔ اس بات کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے۔ یہ یونیورسٹی ہمارے دیش کی تمام یونیورسٹیوں میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید احمد خاں نے یہ تعلیمی ادارہ قائم کرکے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ پھر ان کے جانشینوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ جنھوں نے یہاں تعلیم پائی وہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب ہوئے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی اور تسلی ہوتی ہے۔

قرآن شریف پڑھ کر اس کانفرنس کا ادگھاٹن کیا گیا ہے۔ قرآن شریف علم حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں خداوندکریم ان کی حفاظت کے لیے دو فرشتے مقرر فرما دیتا ہے۔ طالب علموں سے ہماری بڑی امیدیں وابستہ ہیں یہ مستقبل کے معمار اور آنے والے بھارت کے معمار ہیں۔ طلبا کو سیاست داں گمراہ کرتے ہیں۔ ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ آپ طالب علم دانش وروں سے رشتہ جوڑیں۔ سیاست دانوں کا تو یہ حال ہے کہ —

نہ پتہ ہے راستوں کا نہ خبر ہے منزلوں کی   مگر اس پہ یہ گماں ہے کہ ہیں رہنما تو ہم ہیں

یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی تھی۔ اب اس کا اقلیتی کردار بھی تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہاں مسلمان ہی پڑھیں گے۔ اس کے بانی نے اس کے دروازے ہر ایک پر کھلے رکھے تھے۔ مسلمان خدا کو رب العالمین مانتے ہیں۔ حضرت محمدؐ ساری دنیا کے لیے محبت و رحمت بن کر آئے تھے۔ تو ہمارے دلوں میں بھی ایک دوسرے کے لیے محبت ہونی چاہیے۔ طالب علموں کو سیاست دانوں سے دامن چھڑائیں، اپنے استادوں کا دامن تھامیں، ان کا ادب احترام کریں۔ استاد ان سے پیار کریں، انھیں اپنی اولاد جانیں۔ ہمارے بچے بہت غلطیاں کرتے ہیں، شرارتیں کرتے ہیں مگر ہم انھیں گھر سے نکال نہیں دیتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکے اس سے غلط فائدہ اٹھانے لگیں۔

اس یونیورسٹی میں اردو کی طرف خاص دھیان دیا جاتا ہے۔ یہ عمدہ بات ہے۔ اردو سب کے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔ جبھی تو یہ ہوا کہ راکیش شرما سے ہماری وزیر اعظم نے پوچھا کہ اتنی اونچائی سے ہندوستان کیسا لگتا ہے تو اس کے منہ سے فوراً نکلا "سارے جہاں سے اچھا" اردو اور ہندی کی بات یہ ہے کہ اردو کو ہندی لپی میں اور ہندی کو اردو خط میں لکھا جا سکتا ہے مگر دلوں میں پیار تو ہو —

بجھ رہے ہیں چراغِ دیر و حرم   دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

آخری بات یہ کہ خدا نے تو ہمیں انسان بنا کے بھیجا ہے ہندو مسلمان سکھ عیسائی نہیں بنایا۔ وہ ہم خود بنے۔ ہمیں انسان رہنا چاہیے —

تم کو خدا کہوں کہ خدا کو خدا کہوں

ایک اہم مسئلہ : ذریعۂ تعلیم

خدا خدا کرکے برف پگھلی اور ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کے کچھ آثار نمودار ہوئے۔ ملک کے مختلف حصوں سے اب یہ حوصلہ افزا اطلاعات مل رہی ہیں کہ مسلمان جا بجا اپنے تعلیمی مراکز قائم کر رہے ہیں اور ابتدائی تعلیم کی طرف خاص طور پر متوجہ ہیں۔ اگر ہم نے صرف اس محاذ پر مکمل فتح پالی، ابتدائی تعلیم کے معیاری اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اس طرح اپنے بچوں کو مضبوط تعلیمی بنیاد فراہم کرسکے تو آگے کی منزلیں آپ سے آپ سر ہوجائیں گی اور پھر کوئی چیز ان کی ترقی کے راستے میں مزاحم نہ ہوسکے گی۔ اب کام کا آغاز ہوا ہے تو کچھ مسائل نے بھی سر اٹھایا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیے کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا مگر جوں ہی آپ نے میدان عمل میں قدم رکھا بے شمار گتھیاں آپ کے ناخن تدبیر کا منہ تکنے لگیں گی۔

اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے نئے اسکول کس زبان کو تعلیم کا ذریعہ بنائیں۔ ہم نے یہ سوچ کر اس مسئلے پر قلم نہیں اٹھایا تھا کہ ہر جگہ کے حالات آپ بتادیں گے کہ کہاں کیا ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں تبادلۂ خیال ضروری ہے۔ تہذیب الاخلاق میں اس بحث کا آغاز اسی ضرورت کے پیش نظر کیا جارہا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس مسئلے پر غور کریں اور اپنی رائے اشاعت کے لیے ہمیں مرحمت فرمائیں۔

اس وقت ملک میں عام رجحان انگلش میڈیم کی طرف ہے اس لیے ضروری ہے کہ پہلے اسی کی خوبیوں اور خرابیوں پر غور کیا جائے۔ اسکول میں چاہے جتنی زبانیں سکھائی جاتی ہوں لیکن ایک زبان ضرور ایسی ہونی چاہیے جس پر بچے کو پورا قابو ہو، جو پوری طرح اس کی گرفت میں ہو اور یہی وہ زبان ہو جس کے ذریعے وہ تمام علوم حاصل کرے۔ اسی لیے کوشش کی جاتی ہے کہ بچہ اسکول کے احاطے میں وہی زبان بولے جو وہاں ذریعۂ تعلیم ہے۔ چنانچہ انگلش میڈیم اسکولوں میں یہ دستور رہا ہے کہ طالب علم کے منہ سے کسی اور زبان کا لفظ نکلا اور اس کے سر پر "احمق کی ٹوپی" منڈھی گئی۔ مراد یہ ہے کہ اس زبان پر اسے مکمل دسترس حاصل ہوجائے اور اس زبان میں اسے جو کچھ بتایا جائے اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ اس کے گھر میں بھی یہی زبان بولی جاتی ہوگی۔

اصل موضوع پر آنے سے پہلے یہ بات اور واضح ہوجانی چاہیے کہ اب تعلیم کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اس لیے ہر ملک میں پرائمری سے پہلے دو درجوں نرسری اور کے جی کا اضافہ کردیا گیا ہے اور یہ تجربہ کامیاب ہے۔ یعنی تعلیم پانچ برس کی عمر کے بجائے اب تین برس کی عمر میں شروع ہوجاتی ہے۔ اس نظام کو اپنایا تو ہم نے بھی مگر اس کی صورت بگاڑ کر یعنی جوں ہی بچے نے نرسری کلاس میں قدم رکھا ہم نے فوراً اس کے ہاتھ میں قلم تھمادیا اور اس سے لکھنے اور پڑھنے کی توقع کرنے لگے۔ نرسر
کلاس کا یہ مقصد ہرگز نہیں۔ تین برس کے بچے کو اسکول بھیجنے کا مقصد یہ
وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کھیلنا اور مل جل کر رہنا سیکھے، اٹھنے
کے طور طریقے جان جائے۔ گھر میں وہ بڑوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے، ا
میں وہ کسی حد تک اپنے کام آپ کرنے لگے۔ یہ ساری چیزیں بھی تعلیم ہی کا ایک ح
ہیں لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ وہ اسکول کے اس پہلے سال میں تعلیم بھی حاصل کرتا
مگر یہ تعلیم زبانی ہوتی ہے۔ اگر نرسری کا استاد یہ جانتا ہے کہ اسے ان ننھے بچ
کو کیا اور کس طرح سکھانا ہے تو وہ عمر کی اس منزل میں اور تعلیم کی اس سطح پر ب
کچھ سیکھ سکتا ہے مگر کتابیں پڑھا کر نہیں۔ قلم اور کتاب کا نرسری کلاس
کوئی کام نہیں۔ یہاں بچہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ باتوں سے، کہانیوں سے، کھ
سے۔ اس عمر کا بچہ اپنے گرد و پیش کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا
اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان سو
کے مناسب جواب دیے جائیں۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ خود بچے سے بھی
طرح کے سوال کیے جائیں تاکہ اس کی سوچنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو۔ ا
بات کرنے کا سلیقہ آجائے اور زبان پر اس کی گرفت رفتہ رفتہ بڑھتی جائے۔ غ
یہ کہ تعلیم کے اس پہلے سال میں گفتگو کے ذریعے بچے کو اتنا سکھایا جا سکتا ہے
کتابوں کے ذریعے کئی سال میں سکھانا ممکن نہیں۔ اس عمر میں بچہ جو کچھ سیکھ
ہے اسے وہ کوشش کرے تو بھی ساری عمر بھلا نہیں سکتا۔ گویا نرسری ک
آئندہ تعلیم کی پہلی اینٹ ہے اور اسے بہت سلیقے سے رکھا جانا چاہیے۔

گویا تعلیم کی پہلی اور سب سے اہم منزل ہے زبانی تعلیم اور یہ نہ ہو تو بچے کی
نشو و نما رک جائے اور اس کا آغاز بلا تاخیر اسی لمحے ہو جانا چاہیے جب بچہ
بولنے اور کچھ سمجھنے کے لائق ہو جائے۔ ماہرین نے یہ عمر ڈھائی تین برس متعین
ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ نرسری کا طالب علم یعنی ڈھائی تین برس کا بچہ سو
پوچھے گا تو وہ کس زبان میں اور جواب سمجھے گا تو وہ کس زبان میں؟ انگریزی م
بے شک، اگر آنکھ کھلتے ہی اس نے گھر میں انگریزی کا ماحول دیکھا، اگر اس
کان میں پڑنے والا پہلا لفظ انگریزی کا ہی تھا۔ تو بھی زبان اس کے لیے منا
ہوگی۔ آپ مجبور ہیں کہ بچے سے بات کریں تو وہ زبان استعمال کریں جس کو وہ
ہے۔ اگر آپ یہ نہ کریں تو بچے کے ذہن و دل کے نزدیک نہیں پہنچ سکتے اور د
تک رسائی نہ ہو تو اسے کچھ سکھانے، کچھ بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حیرت ہے اور حیرت سے زیادہ افسوس ہے کہ تعلیم یافتہ والدین اپنے چھ
چھوٹے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں داخل کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں کہ وہ

گئے اور یہ نہیں دیکھتے کہ انھوں نے ان معصوموں کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر دیا۔ آج
تنے گھرانے ہیں جہاں بے تکلف انگریزی بولی جاتی ہو! نتیجہ یہ کہ بچہ انگریزی سمجھ
ں سکتا اور جو زبان بول سکتا اور سمجھ سکتا ہے اس کا یہاں چلن نہیں۔ چنانچہ اس
تعلیم کا سلسلہ اس وقت تک شروع نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس بدیسی زبان
چھوٹے چھوٹے جملے سمجھنے اور بولنے کے لائق نہ ہو جائے۔ اس کام کے لیے پانچ چھ
ل کی مدت درکار ہے۔ انگلش میڈیم اسکولوں میں پانچ چھ سال کی یہ مدت
طرح گزرتی ہے؟ انگریزی حروف و اعداد لکھنے اور رٹنے میں، ڈرل میں
سمجھے بغیر، آہنگ سے لطف لیے بغیر انگریزی گیت گانے میں۔ یہ اسکول ایسا
نے پر مجبور ہیں یوں کہ ہمارے آپ کے بچے ہی نہیں بلکہ تمام بچے ایسے گھرانوں سے
ے ہیں جہاں انگریزی بولنے کا رواج نہیں۔ یہ نام نہاد انگلش میڈیم اسکول جو
دل کم اور روپیہ بٹورنے کی چمکتی دمکتی دکانیں زیادہ ہیں انھیں اپنی فیس سے
ن ہے ہمارے بچوں کے مستقبل سے کیا سروکار!

نتیجہ صرف یہ نہیں کہ ہمارے بچے کی زندگی کے کم سے کم چار پانچ برس برباد ہو جاتے
بلکہ زیادہ غم اس بات کا ہے کہ یہ چار پانچ برس اس کی ذہنی صلاحیتوں کو پامال
نے میں صرف ہوتے ہیں۔ بچہ کسی اجنبی زبان میں اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتا
مل کر نہیں کہہ سکتا یا پوری وضاحت سے نہیں کہہ سکتا تو وہ چپ رہنے کو
یح دیتا ہے۔ ذہن میں پیدا ہونے والے سوال جب پیش نہ کیے جا سکیں جب
ب نہ پا سکیں تو آخر کار ذہن سوچنے کا عمل ترک کر دیتا ہے۔ تجربے نے بتا دیا
سائنس نے ثابت کر دیا کہ جس جز سے کام نہ لیا جائے وہ مرجھاتے مرجھاتے
مردہ ہو جاتی ہے۔ جس ذہن سے پانچ برس کام نہ لیا جائے پھر دس برس محنت
یجیے تو بھی وہ کام کا نہیں ہو سکتا۔

سرسید نے آج سے ایک صدی پیشتر کہا تھا کہ علوم کسی بدیسی زبان کے
یے سیکھے جائیں تو اس کے لیے دوگنا وقت اور دوگنی محنت درکار ہے۔ یعنی
پہ تاریخ کا سبق کسی بدیسی زبان میں پڑھ رہا ہے اسے اصل مضمون سے زیادہ
اس بدیسی زبان پر کرنی ہوگی۔ نتیجہ یہ کہ ایک سال کی مقررہ مدت میں اسے
اسفر طے کرنا چاہیے بمشکل اس سے آدھا طے کر پائے گا۔ کسی انگریز نے ایک
ل کا معائنہ کرنے کے بعد مولوی عبدالحق سے کہا کہ اگر میں اپنے ملک جا کے یہ
رہ دوں کہ انگریز بچوں کو اردو زبان یا چینی زبان میں تعلیم دو تو اسی وقت
پاگل خانے بھیج دیا جائے گا مگر آپ کے دیس میں بچوں کو ایک بدیسی زبان
ریعے تعلیم دی جاتی ہے اور کوئی اس پر غور نہیں کرتا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

انگریزی کی حمایت میں تین باتیں خاص طور پر کہی جاتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ انگریزی
عالم گیر زبان ہے۔ اس سے واقف نہ ہوں تو باقی دنیا سے ہمارا رشتہ منقطع
ئے۔ دوسری یہ کہ کتابوں کا جتنا ذخیرہ انگریزی زبان میں ہے، خاص طور پر
ں علوم کا، وہ کسی اور زبان میں موجود نہیں اور تیسرے یہ کہ کچھ تو بات ہے
یدان میں انگریزی اسکولوں سے نکلے ہوئے بچے ہی آگے نظر آتے ہیں۔

یہ محض غلط فہمی ہے کہ انگریزی سے ناواقف ہوں تو دنیا سے ہمارا رابطہ ٹوٹ جائے گا۔
سائنس اور ٹکنالوجی میں جو ترقی ہو رہی ہے اس سے ہم بے خبر رہ جائیں گے۔ جاپان میں
انگریزی جاننے والے نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن صنعت میں اس نے بڑے بڑے ملکوں
کو پچھاڑ دیا ہے۔ مزائیل تو دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ اس سے بہت پہلے جرمنی نے
وی۔ ون اور وی۔ ٹو کے نام سے ایسے 'اڑن بم' بنائے تھے جو امریکی اور برطانوی
نوجوں کو جادو کا تماشا معلوم ہوتے تھے۔ جرمن سائنس دانوں نے کس اسکول میں انگریزی
کی تعلیم پائی تھی؟ تجزیہ کر کے دیکھ لیجیے آج وہی ملک سائنس، ٹکنالوجی اور باقی تمام
علوم میں آگے ہیں جہاں جملہ تعلیم اپنی زبان میں دی جاتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں جو
ریسرچ ہو رہی ہے ان کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لیے بیشتر ممالک نے دفاتر
قائم کر رکھے ہیں۔ یہ کام ان ملکوں نے بھی کر لیا ہے جو بہت چھوٹے ہیں اور جن کے وسائل
محدود ہیں۔ ہمارا ملک تو بہت بڑا ہے۔ یہ کام ہم کیوں نہیں کر سکتے۔

ہم تو سرے سے انگریزی زبان کی تعلیم ہی کے مخالف ہیں اور یہ رائے رکھتے
ہیں کہ جتنی محنت کر کے بچہ ایک بدیسی زبان سیکھے اتنی محنت سے وہ دو جدید علوم
میں مہارت حاصل کر سکتا ہے لیکن اسے آپ انتہا پسندی خیال فرمائیں تو ہم کہیں گے
کہ انگریزی کو ایک زبان کی حیثیت سے بے شک پڑھ لیا جائے تاکہ انگریزی ذخیرے
تک رسائی ممکن ہو لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے اور
اس طرح بچے کے کئی ابتدائی سال بھی برباد کیے جائیں اور اس کے بوجھ میں بھی
اضافہ کر دیا جائے کہ وہ جو کچھ پڑھے اس کا سمجھنا اور یاد رکھنا دشوار ہو۔

انگریزی میں کتابوں کا ذخیرہ بلاشبہ زیادہ ہے۔ ہم اردو والے تو خیر
سوتے ہی رہتے ہیں لیکن خود ہمارے ملک میں جو زبانیں کسی چھوٹے سے علاقے
میں بولی جاتی ہیں انھوں نے بھی کتابیں لکھوا کر، ضروری کتابوں کا ترجمہ کرا کے
اپنی ضرورت کو پورا کر لیا ہے۔ اس وقت یہاں گفتگو صرف ابتدائی تعلیم کے مسئلے پر
ہو رہی ہے اور اس سطح کے لیے بہت زیادہ کتابوں کی ضرورت نہیں۔ درسی اور نصابی
کتابوں کے علاوہ نرسری سے پانچویں جماعت تک جن امدادی کتابوں کی ضرورت ہے ان کی
تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اگر ۲۴ تا ۳۲ صفحات کی سو کتابیں منصوبہ بند
طریقے سے تیار ہو جائیں تو وہ تمام ضروری موضوعات کا احاطہ کر لیں گی۔ کوئی ادارہ ہمت
کرے تو یہ کام دشوار نہیں۔ اترپردیش اردو اکیڈمی نے اس کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا تھا
ہے اور امید ہے یہ کام جلد مکمل ہو جائے گا۔ بہرحال سردست یہ تو طے ہے کہ انگریزی
میں زیادہ کتابیں موجود ہیں لیکن وہ کتابیں جن سے، ہمارے بچے پورا فائدہ نہ اٹھا سکیں،
جن کے اسباق کو رٹنے پر وہ اپنی ساری قوت صرف کر دیں اور جن معلومات کو وہ اپنے
ذہن کا جز نہ بنا سکیں ان کے موجود ہونے سے فائدہ؟ بالفرض یہ معلوم ہو جائے کہ
کسی اہم موضوع پر لاطینی زبان میں بے حساب ذخیرہ موجود ہے تو — ہم اسے اپنی زبان
میں منتقل کرنے کی تدبیریں کریں گے یا اس زبان کو اپنے بچوں کا ذریعۂ تعلیم قرار دے دیں گے؟

انگریزی کی حمایت میں آخری اور سب سے مضبوط دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ انگریزی
اسکولوں کے بچے ترقی کی دوڑ میں سب کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ مقابلے کے امتحانوں

ہیں یہ سب سے آگے نظر آتے ہیں اور اعلیٰ مناصب پر یہ فائز ہوتے ہیں۔ یہاں انگریزی اسکولوں سے مراد ہیں پبلک اسکول اور ان کی کارکردگی واقعی قابل رشک ہے۔ سرکاری اسکولوں کی حالت تو ایسی خراب وخستہ اور اتنی مایوس کن ہے کہ ان کے بارے میں گفتگو کرنا بھی تضیعِ اوقات معلوم ہوتا ہے۔ ملک کی تعلیمی ترقی کی کچھ آس بندھتی ہے تو ان ہی پبلک اسکولوں سے۔

پبلک اسکولوں کی کامیابی کا راز یہ نہیں کہ ان کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے بلکہ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ یہ اسکول سرکاری امداد سے نہیں فیس کی آمدنی سے چلائے جاتے ہیں۔ اس کے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ غریب بچوں کو ان اسکولوں میں داخلہ نہیں مل پاتا۔ یہاں صرف خوش حال گھرانوں کے بچے داخل ہوتے ہیں۔ ان کے والدین تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح واقف۔ ان بچوں کو گھروں پر تمام سہولتیں میسر ہوتی ہیں اور مدد ورہنمائی کے لیے کئی کئی ٹیوٹر موجود ہوتے ہیں۔ اگر اسکول ان بچوں کی تعلیم پر ذرّہ برابر توجہ نہ دے تب بھی یہ آگے نظر آئیں گے۔ دوسرا یہ کہ جو لوگ اپنے بچوں کی بھاری فیس ادا کرتے ہیں وہ یہ کیسے گوارا کرلیں کہ اسکول میں ان بچوں کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہ کی جائے۔ دوسری طرف زیادہ فیس لینے والے اسکول بھی تندہی سے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ انھیں ہر ایک استاد کے کام کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ کہیں کوتاہی نظر آئے تو اس کا علاج کرنا پڑتا ہے، کوئی استاد کام چور یا نالائق ہو تو اس کو رخصت کرنا پڑتا ہے۔ ایک اسکول کے پرنسپل نے بتایا کہ "کسی طالب علم کی غلطی استاد کی نظر سے بچ جائے تو اس کے باپ کے لیے کیا دشوار ہے کہ دفتر یا فیکٹری جاتے ہوئے اپنی کار اسکول کے سامنے سے نکال لے اور کاپی ہمارے منہ پر پٹک دے۔ اس کا وقت نہ ملے تو دفتر میں صاحب کے بائیں ہاتھ اور ٹیلی فون کے درمیان صرف دو بالشت کا فاصلہ ہوتا ہے۔ گویا ٹیلی فون پر تنبیہہ کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس لیے ہم نکمّے استاد سے فوراً نجات پالینے پر مجبور ہیں" سرکاری اسکول کا استاد پندرہ دن بغیر درخواست کے اسکول نہ جائے تو خیر اس کا کوئی بگاڑ کیا لے گا، اسکول بڑا ہے اور اس کے دوستوں کا حلقہ وسیع تو اس کی غیر حاضری کا پتہ بھی نہ چلے گا۔

پبلک اسکولوں کو ایک طرح کی داخلی خود مختاری حاصل ہوتی ہے اس لیے ان اساتذہ کے کام کی سختی سے نگرانی ہوتی ہے، استاد پڑھانے اور شاگرد پڑھنے کے لیے مجبور ہیں، اسکول میں وہ تمام ساز وسامان موجود ہوتا ہے جو تعلیم کے لیے ضروری ہے، ضبط ونظم بھی بہتر ہوتا ہے اور یہاں کے طالب علموں کو اپنے گھروں پر بھی رہنمائی کی سہولت میسر ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں ان اسکولوں کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ ذریعۂ تعلیم کا ان کی کامیابی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ درست ہے کہ سنٹرل بورڈ نے صرف انگریزی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کیا تھا لیکن اب اس میں تبدیلی ہوتی جارہی ہے۔ بعض مضامین میں زبان کا زیادہ استعمال ہے جیسے تاریخ، جغرافیہ، معاشیات وغیرہ۔ اب طلبا کو اجازت دی جانے لگی ہے کہ ان مضامین کے جوابات مادری زبان میں دے دیے جائیں۔ وہ دن دور نہیں جب تمام مضامین کے لیے یہی آزادی ہوگی اور جس دن ایسا ہوگیا اس دن یہ اسکول قوم کی بہتر خدمت کرسکیں گے۔

جو لوگ نئے اسکول قائم کررہے ہیں انھیں ایک ناخوشگوار تجربہ ضرور ہوا ہوگا۔ ایک صاحب اپنے لخت جگر کو اسکول میں داخل کرانے لاتے ہیں۔ دوران گفتگو انھیں اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ انگلش میڈیم اسکول نہیں تو وہ اگلے دن تشریف لانے کا وعدہ کرکے رخصت ہوجاتے ہیں اور اگلی صبح ان کا بچہ کسی کونونٹ یا کسی سینٹ تھامپسن اسکول میں داخلہ لے لیتا ہے۔ آپ کے حصے میں صرف وہ غریب بچے آتے ہیں جن کے والدین نہ تعلیم یافتہ ہیں نہ تعلیم کی اہمیت سے آشنا — کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟ ہے تو سہی مگر ہم میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ ڈنکے کی چوٹ بتا سکیں۔

انگریزی زبان میں تعلیم دینے سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کا اندازہ ایک دن ہوگا تو ضرور مگر اس وقت تک ہم بہت کچھ گنوا چکے ہوں گے۔ کیسی حیرت کی بات ہے کہ انگریزی نہ تو اب ہمارے حکمرانوں کی زبان ہے، نہ دنیا کے نقشے پر اس کی پہلی سی اہمیت باقی ہے لیکن نہ جانے کیوں ہم اس کے فریب سے نکل نہیں پارہے، ستم یہ ہے کہ جب اس زبان کو اپنانے کا وقت تھا اس وقت ہم اسے ٹھکراتے رہے، آج اس سے نجات پالینے میں بھلائی ہے تو ہم اسے سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں اگر اسے چمٹائے رکھنے کی معقول دلیلیں آپ کے پاس ہیں تو تہذیب الاخلاق کے صفحات ان کی اشاعت کے لیے حاضر ہیں۔

نورالحسن نقوی

بھلے کی بات

جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک ان ہی کی زبان میں ان کو دیے جاویں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھود دی جاوے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو انھی کی زبان میں نہ دیے جاویں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی کا درجہ نصیب نہ ہوگا۔ سرسید

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں

صدرِ جمہوریۂ ہند کی تشریف آوری

کسی قوم و ملک۔ ادارہ اور کسی جماعت کا وہ سربراہ بڑا کامیاب اور دانشور سمجھا جاتا ہے جو وقت، ماحول اور حالات کے مطابق اپنی قوم اور اپنے ادارے کی ترجمانی کرے۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۸۴ء کو جب جمہوریہ ہند کے سربراہ عالی جناب سردار گیانی ذیل سنگھ صاحب نویں انڈین سوشل سائنس کانگریس کے اجلاس کا افتتاح کرنے علی گڑھ تشریف لائے تو اس موقع پر مسلم یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر جناب سیّد حامد نے آپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی، اردو زبان اور مسلمانانِ ہند کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا۔

"عالی جناب صدر جمہوریہ ہند۔ جناب والا میں آپ کے خیر مقدم کے لیے اپنے دل میں خوشی، فخر، اطمینان اور امید کی ملی جلی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ خوشی آپ کی تشریف آوری پر۔ فخر اس بنا پر کہ ہمیں اپنے وزیٹر کی زیارت کا موقع مل رہا ہے۔ اطمینان اِس لیے کہ آپ کا وسیع قلب اور کشادہ شانے اس عظیم ملک کی ذمہ داریوں سے غیر جانب داری اور انصاف کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اُمید اس بات کی کہ آپ کے قدم مسلم یونیورسٹی کے استحکام، توسیع اور ترقی کے لیے نئی راہیں کھولیں گے۔

محترم! ایک سو آٹھ سال قبل سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنا ڈالی تھی جو ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کے مرتبے پر پہنچ گیا۔

سر سید احمد خاں کا شمار جدید ہندوستان کے بانیوں میں ہے۔ انھوں نے اس قوم کو جو حکومت کر چکی تھی جو زندگی سے بیزار اور انصاف سے مایوس اور امید سے محروم ہو چکی تھی، پھر سے زندہ کیا، اسے جینے کے گُر سکھائے اور نئے علوم حاصل کرنے کے لیے اسے تیار کیا۔ سر سید نے وہ طریقہ اختیار کیا جو ملک و ملت دونوں کے لیے یکساں سود مند تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے سے ملک کی ترقی کی رفتار خود بخود تیز ہو جائے گی۔

سر سید احمد خاں نے مسلم یونیورسٹی کی بنیاد وطن دوستی، انسانیت نوازی اور غیرتِ ملّی پر رکھی۔ انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج کا مطمح نظر فراخدلانہ رواداری اور آزاد تحقیق و جستجو کو بنایا تھا اور یہی ان کا مسلک رہا ہے۔ ان کے تعلقات برادرانِ وطن کے ساتھ نہایت شگفتہ تھے اور انھوں نے کالج کے دروازے اُس حسین دُلھن کی دلربا آنکھوں کی طرح جس کا نام ہندوستان ہے اور جس کی ایک آنکھ ہندو ہے دوسری مسلمان، ہر مذہب و ملّت کے لیے کھلے رکھے۔

ابھی چند روز ہوئے پروفیسر اقبال نرائن وائس چانسلر بنارس ہندو یونیورسٹی اپنی فٹ بال ٹیم لے کر علی گڑھ تشریف لائے تھے، انھوں نے یہاں سے جا کر مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی شائستگی، انہاک اور خوش دلی کو خراجِ تحسین ادا کیا اور اس بات پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیا کہ یہاں لائبریری صبح آٹھ بجے سے رات کے دو بجے تک کھلتی ہے اور کھچا کھچ بھری رہتی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دراصل ہندوستان کی ملی جلی نمائندگی ملک کی دوسری یونیورسٹیوں سے بہتر کرتی ہے۔ یہاں کی فضا فرقہ واریت، ذاتیت اور علاقائیت کے زہر سے محفوظ ہے۔ اس کے فرزندوں کی فہرست طویل اور درخشاں ہے۔ اس میں ایک سرے پر ظفر اقبال ہیں جو ہندوستان کی مایہ ناز ٹیم کے کپتان ہیں اور دوسرے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہیں جنھوں نے ملک کے جہاز کی کپتانی اپنی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر وقار کے ساتھ کی جیسا کہ فی زمانہ جناب والا کر رہے ہیں۔

سر سید نے علی گڑھ کو جس تعلیمی تحریک کا مرکز بنایا تھا اس کو اردو سے اور اردو زبان و ادب کو اس تحریک سے بڑا فروغ ملا۔ علی گڑھ کا شمار اردو زبان و ادب کے اہم مرکزوں میں ہے۔ اردو زبان ہندوستان اور ایشیائی زبانوں کا اِک دلنواز سنگم ہے۔

ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے جو لڑائی لڑی گئی اسی زبان کے نعروں اور نظموں کی دھنوں میں لڑی

سی۔ اقبال کا "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور رام پرشاد بسمل کی غزل کا مطلع ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

آج تک وطنِ عزیز کی فضا میں گونج رہا ہے۔ اور ہندوستانیوں کے اندر متحدہ قومیت کا تصور پیدا کرنے میں اردو زبان کا کردار عہد آفریں رہا ہے۔ یہ ہندوستان کا سب سے بڑا لسانی سرمایہ ہے۔ اردو زبان تاج محل سے زیادہ حسین، ہوش ربا اور معنی خیز ہے۔ مجھے امید ہے کہ رواداری کی روایت اور قومی شعور بیدار ہوگا اور یہ مشترک میراث بالآخر مسندِ اعتبار واختیار پر بٹھائی جائے گی۔

سرسید احمد خاں نے اس یونیورسٹی کو اپنی عدیم المثال بصیرت کی روشنی میں تحصیل کمال علم کے لیے وقف کیا تھا اور آزادی کے بعد ہمارے ماہرین ومنتظمین تعلیم نے اس مسلک پر مُہر لگادی۔ چنانچہ اب اس کا شمار ان قومی یونیورسٹیوں میں ہے جو تعلیم کے قافلے کے کارواں سالار ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ تقسیم کی لائی ہوئی دشواریوں اور سراسیمگی اور اس کے بعد خودمختاری اور کردار کی بازیابی کی مہم اور اس کے بعد داخلی انضباط کے خلاف ایجی ٹیشن کے دور اب ختم ہو چکے ہیں۔ آپ کی حکومت نے ۱۹۸۱ء میں اسے خودمختاری اور اس کا اقلیتی کردار واپس دے دیا ہے۔ اب علی گڑھ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ یہ دور سنجیدگی، ریاضت، انضباط اور انہماک کا دور ہے۔ گویا طیارہ اب پرواز کے لیے پر تول رہا ہے۔ محترم وزیر سے میری گذارش ہے کہ اپنی خصوصی توجہ سے ہمارے عزمِ پرواز کو محکم بنادیں۔ ہمیں اس وقت بھرپور امداد کی ضرورت ہے۔ اداروں کی زندگی میں بعض لمحات غیر معمولی توجہ کے طالب ہوتے ہیں۔ ہم اپنے معزز ومحترم وزیر کو اپنے مطالبات سے گراں بار نہ کرنا چاہیں گے۔ ہم اُن کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے یونیورسٹی کے وقار کو بحال کیا اور اساتذہ کو میرٹ پروموشن اسکیم کے ذریعے آگے بڑھنے کا موقع دیا۔"

اس موقع پر صدر جمہوریۂ ہند کو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

" عالی جناب! اس یونیورسٹی کا اک فریضہ یہ بھی رہا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر غور وخوض کرے اور ان سے ملک کو روشناس کرائے۔ ہمیں اس بات کا دردناک احساس ہے کہ ہندوستانی مسلمان پیچھے کی طرف جارہے ہیں۔ ملازمتوں اور روزگار میں ان کا تناسب تیزی کے ساتھ گھٹ رہا ہے۔ ان کی تعلیمی حالت زبوں ہے۔ اس میں قصور ایک حد تک ان کا بھی ہے۔ کیا ہمارا ملک انھیں ان کی حالت پر چھوڑ کر مطمئن ہوسکتا ہے؟ یا آگے بڑھ سکتا ہے؟"

خواجہ سید حامد نے ملک کے اندر لاقانونیت اور فرقہ واریت وعلیحدگی پسندانہ ماحول پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں کہا:

" جنابِ والا! اس وقت ملک میں انضباط شکنی، تشدد اور فرقہ واریت کی فضا روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ بات انتہائی تشویشناک ہے کہ خونریزی کا جواز مذہب میں تلاش کیا جارہا ہے حالانکہ ؎ "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" اس وقت جو ہمارے ملک میں انتشار اور علیحدگی پسندانہ ماحول پیدا کر رہے ہیں، ان کے خلاف ایک محاذ بنانا ہوگا اور اس کے لیے ہماری یونیورسٹی کے طالب علم جو اعتماد، محبت اور رواداری کے لیے معروف ہیں، اس ضمن میں ملک صالح عناصر کے ساتھ حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

کاش کہ ہم علم کے ساتھ تحقیقی اور سائنسی مزاج بھی پیدا کرسکیں۔ تاکہ ہم مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا سیکھ جائیں"

ڈاکٹر فوق کریمی

ایڈیٹر ہفت روزہ ترجمان علی گڑھ

ہوسپیں

پیکیجنگ

PACKAGING

سائنس اور ٹکنولوجی کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیے تو پیکیجنگ کو دورِ جدید کی علامت ٹھہرائیے گا۔ چھوٹی صنعت اور بڑی تجارت اِس کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتی خریدار کو اس سے کوئی خاص غرض نہیں کہ مظروف کیا ہے اور کیسا ہے اصرار صرف اس پر ہے کہ ظرف دیدہ زیب اور باصرہ نواز ہو۔ ہر شے کا ظرف بدلتا رہتا ہے۔ نت نئے ڈیزائن وضع ہوتے ہیں۔ طبیعتیں ایک شکل کے ڈبے، ریپر[1] شیشی یا بوتل سے بہت جلد اُکتا جاتی ہیں۔ اسی لیے خورد و نوش، ادویہ، سامانِ آرائش، غرضیکہ جملہ اشیائے صرف کے پیرہن جلد جلد بدلے جاتے ہیں۔ اُن کے ظروف کو کجکلاہی کا سا انداز ملتا ہے۔ زاویے اور شکلیں اور اسالیب بڑے حسن اور سلیقہ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر تین باتیں حائل نہ ہوتیں تو پیکنگ روز اسی طرح بدلتی جیسے خوشحال خواتین کے لباس اور اُن کے ڈیزائن۔

۱۔ مالی اور اختراعی وسائل بہرحال محدود ہیں۔

۲۔ مال کے پیک ہونے اور گاہک تک پہنچنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ کنوے یر بلیٹ[2] کے ایک سرے پر ایک ہی مال ایک لباس میں نظر آئے اور دوسرے پر وہی مال کسی دُوسری پوشاک میں۔

۳۔ بنانے اور بیچنے والے جہاں انسان کے فطری تلوّن سے واقف ہیں وہیں یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان کی نفسیات میں گھر اور جانی بُوجھی چیز کی طرف لوٹنے کا رجحان بھی ہے۔ حافظے کی طرح پسند، رجحان اور میلان پر بھی عادت اور اعادہ اور تکرار کا اثر پڑتا ہے اس لیے وہ اس کا انتظام کرتے ہیں کہ صارفین کو اپنی مصنوعات اور اُن کے حالیہ لباس کا عادی بنادیں۔ اس کے بعد کسی صبح کو اچانک اُسے نئی سج دھج کے ساتھ مصر کے بازار میں لے آئیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گھر سے فراواں وابستگی کے باوجود بلکہ اسی کی بنا پر بہت سے لوگ گھر میں سامانِ خانہ داری کی ترتیب کو وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں۔ گھر تو انھیں بہرحال یاد رہتا ہے۔ ترتیب میں ترمیم اس کی کشش کو بڑھا دیتی ہے۔ بہرکیف تبدیلی قانونِ قدرت ہے۔ اہلِ فروخت اسی قانون کی پیروی کرتے ہیں اور اس دوسرے قانون کی بھی کہ انسان جس چیز کا عادی ہوتا ہے، جسمانی اور ذہنی طور پر بار بار اس کی طرف لوٹتا ہے۔ وفا اور وابستگی ایک طرف، تغیر اور تلوّن دوسری طرف۔ ان دونوں سروں کے بیچ کی مسافت انسان کی طبیعت طے کرتی رہتی ہے۔ اہلِ تجارت اور اربابِ اشتہار کو انسانی نفسیات پر گہرا عبور ہوتا ہے۔ وہ پُرانی شراب کو نت نئی بوتلوں میں پیش کرتے ہیں۔ نشہ میں فرق نہیں آتا، عفونت میں کمی نہیں ہوتی لیکن ظاہری کشش دوچند ہوجاتی ہے۔

ہمیں پیکنگ کی دیدہ زیبی اور دلپذیری سے انکار نہیں، اتنا گلہ ضرور ہے کہ بسا اوقات اس کی وجہ سے صانع اور صارف دونوں کی توجہ اس شے کو بہتر بنانے کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور بیشتر دھیان اس طرف جاتا ہے کہ اِس کی ظاہری وضع اور پوشاک میں کہربائی تاثیر کیوں کر پیدا کی جائے یعنی باطن پر ظاہر کو ترجیح دی جاتی ہے، کھلی ہوئی ترجیح۔ تاثیر تزئین کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ فائدہ سج دھج کی نذر ہوجاتا ہے۔ لباس کو جسم پر فوقیت ملتی ہے۔

یہ تو کوئی نہیں کہے گا کہ انسان چیتھڑے لگا کر گھومے یا بے ہنگم کپڑے پہنے یا جسم کی کھونٹی پر پوشاک ٹانگ کر چلے کہ نگاہیں گدڑی میں لعل ڈھونڈتی رہ جائیں یا جیبں کی شکنوں کو جامہ میں اُتار دے، یا لباس کو بدن سے اس طرح چپکا لے کہ جلد کی دو پرتوں کے اوپر ایک تیسری جلد کا گمان ہو۔ خوش لباسی کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ کپڑوں سے شخصیت جھلکتی ہے۔ کپڑے اخفا کے ساتھ اظہار کے کام بھی آتے ہیں قد و قامت کی دلنوازی میں ان سے اضافہ ہوتا ہے لیکن جامہ زیبی لباس کی باصرہ نوازی کو ہی نہیں کہتے۔ جامہ زیبی کو قد و قامت کا تناسب درکار ہوتا ہے اس میں جامہ سے کہیں زیادہ اہمیت جسم کو حاصل ہے۔ بدن صحتمند اور سڈول ہو تو اُس پر بُرے کپڑے بھی بھلے لگتے ہیں۔ پہلے تو یہ دستور تھا کہ انسان اپنی بیلنگ کرنے سے پہلے اپنے جسم کا خیال رکھتا تھا، اُسے لاغری، فربہی، کجی اور ڈھلملا پن سے بچاتا تھا۔ کسرت کرتا تھا کہ زاویوں کی کجی اور گڑھے نکل جائیں جو اِن رعنائی ترکیب میں جامہ کی خوش تراشی سے زیادہ جسم کے حسنِ تناسب کو دخل ہوتا تھا۔ جسم پر لباس کی پھبن کو جامہ زیبی کہتے تھے، کپڑوں سے جسم کی زینت کو نہیں۔ شیروانی کے لیے مشہور تھا کہ اُسے پہننے کے لیے خوبصورت کسرتی جسم درکار ہے۔ ایک رائج ترکیب کو دوسرے مفہوم میں استعمال کرلیجیے تو ہشت پہلو یا ہشت پیکر یا ہشت نما جسم ہشت سے مراد یہاں انگریزی عدد 8 سے ہے۔ شانے اور سینہ فراخ اور کمر پتلی جیسے شیرِ ببر۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ جسم کی ورزش اور مالش اور پرداخت کا تصوّر بالکل اُٹھ گیا۔ ایک لحاظ سے تو عالمی سطح پر یہ بڑھا ہے۔ مہم جُوئی کی خو بو بھی زوروں پر ہے جسمانی مقابلے مختلف عنوانات سے ہوتے ہیں کھیلوں کی ریل پیل ہے انسان خود کو جوکھم میں ڈال کر ایورسٹ کی چوٹی سے لے کر سطحِ سمندر تک اُتر گیا ہے قطبِ شمالی سے لے کر انٹارکٹکا تک اُس کے زیرِ قدم ہیں۔ قمر، ہمارے خوابوں اور ولولوں کا محور، قمر خود انسان کی قدم بوسی کر رہا ہے اب کلبے جان لیکن عکاس اور پیغام رساں قاصد نظامِ شمسی کی کشش کے بندھنوں کو توڑ کر خلائے بالا میں داخل ہوچکا ہے، آخری سیّارے نیپچیون کو لاکھوں میل پیچھے چھوڑتا ہوا۔ انسان کی مہم جوئی میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ اُس کے لیے نئے اور بے کراں میدان اور بے پناہ مسائل ہاتھ آگئے ہیں اور ان کا پہلا تقاضا ہے تن دُرستی، توانائی، برداشت، لیکن مہم جوئی کی پرداخت کے اوصاف کو تخصیص کے شکنجہ نے کس لیا ہے، ایک طبقہ تک محدود کردیا ہے اور باقی دنیا اس سے محروم ہوگئی ہے۔ جن اوصاف کو زاویۂ نگاہ اور قدر قبول بنا تھا وہ سمٹ کر ایک خطہ اور ایک طبقہ کی بن گئے ہیں۔ خطۂ یورپ، شمالی امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ یعنی دنیا

[2] conveyer belt

خوشحال ممالک۔ طبقہ جسمانی صحت وصلاحیت کے پیشہ ور ترجمان جو کھیلوں
خطروں اور مہمات میں دن رات اپنے جوہر دکھاتے رہتے ہیں اور جن کے
کارناموں نے نوعِ انسان کو انگشت بدنداں کر دیا ہے۔
اس خطے اور اس طبقے کو چھوڑ دیجیے تو سناٹا نظر آئے گا۔ غریب
ملکوں نے ریس میں مغربی ممالک سے خوش پوشی کے اسالیب تو سیکھ لیے
لیکن جسم کو جس کے لیے یہ سب اہتمام ہے، نظر انداز کر دیا۔ غریب گھروں کے
وسائل بہت محدود تھے، فیصلہ کرنا تھا کہ ان کا زیادہ حصہ جسم اور صحت کی
نشوونما پر صرف ہو یا جسم کو ڈھانکنے والے کپڑوں کی دیدہ زیبی پر "پچھوا"
(مغربی ممالک سے چلنے والی) ہوا نے غریب پوربیوں (اہلِ مشرق) کو اس پر
آمادہ کر دیا کہ لباس کو دیدہ زیب بنایا جائے تن تو چھپ جائے گا ہی۔ کیسے کپڑے
پہنے ہیں یہ ساری دنیا دیکھے گی۔ کیا کھا کر گھر سے نکلے ہو یہ کون جانے گا۔ باطن
پر ظاہر، صحت پر زینت، ورزش پر نمائش توانائی پر خود نمائی کو ترجیح دی گئی۔
ظرف کو چمکا دیا۔ مظروف محروم رہ گیا۔ وسائل کی یہ تقسیم سطحی اور ناقص ہے۔ اس
طرح صحتیں بگڑتی رہیں گی۔ جسم نشوونما کے لیے "غذا، غذا" چلاتا رہے گا۔ اس
کی ایک نہ سنی جائے گی۔ ترکیبیں صرف افلاس کو چھپانے اور خود کو خوشحال اور
خوش لباس دکھلانے کی کی جائیں گی۔
دیکھ لی آپ نے یہاں بھی پیکیجنگ کے عمل کی بالادستی۔ کوئی سوال
کرسکتا ہے کہ لباس پرستی کا یہ جنون کیا اس وقت سو گیا تھا جب فلک شگاف
برق رفتار پاینیر دہم کے اندر نہ پگھلنے والی دھات پر مرد اور عورت کے پیکر
بنا کر رکھے گئے تھے۔ صرف یہ خیال درپیش تھا کہ اگر کائنات میں کہیں اور ذی
روح بستے ہوں اور ان کی نگاہ ان پیکروں پر پڑے تو وہ اس دنیا اور اس
میں بسنے والی اشرف المخلوقات کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں۔ خوش قطع
لباس کے ابہام و التباس سے ان دو پیکروں کو بچایا گیا اور انھیں اسی لباس میں
دکھایا گیا جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔
ہمارا تجربہ ہے کہ عملی زندگی میں گفتگو کسی موضوع پر ہو قولِ فیصل بسا
اوقات سعدی شیرازی کے ہاتھ رہتا ہے۔ حکایت ہے کہ وہ ایک دعوت میں پہنچے
دربان نے ان کی پوشاک سے خستہ حالی کا اندازہ لگایا اور انھیں کھڑے
کھڑے لوٹا دیا۔ دوبارہ عبا قبا پہن کر آئے۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی کھانا
شروع ہوا تو شوربہ کا پیالہ عبا پر انڈیل دیا۔ لوگوں نے پوچھا حضرت یہ کیا۔ فرمایا
دعوت اسی کی تھی اس تک پہنچ گئی۔ اس سے یہ عقدہ کھلا کہ انسان کی
نگاہ ظاہر بیں ہمیشہ رہی ہے۔ سطح سے نیچے دیکھنے کی زحمت وہ شاذ ہی کرتی ہے
پیکنگ سے وہ ہمیشہ متاثر اور مرعوب ہوتی ہے لیکن کبھی اتنی نہیں جتنی کہ فی زمانہ
اور نہ اس پیمانے پر۔
اور ایک پیکجنگ خود قدرت کی جانب سے ہوتی ہے۔ روح کو جسم کا قالب
جاتا ہے۔ کم لوگ ایسے ہیں جو روح کو دیکھتے ہیں یا دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔
اس ڈبے اس کاسکٹ پر جا کر ٹھہر جاتی ہے روح جس میں قید ہے۔
ڈھال، قد و قامت، رنگ اور ڈھنگ سے آگے کون بڑھتا ہے۔ سب شکل دیکھ
رائے قائم کرتے ہیں انھیں گمان بھی نہیں ہوتا کہ خوبصورت ڈبے یا پٹاری میں سانپ
اور بچھو بند کیے جا سکتے ہیں۔ نفس کی خباثت پر بعض اوقات جسم کی کشش
اور خال و خد کے حسن کی دلفریب نقاب پڑی رہتی ہے۔ لڑکے شریکِ حیات ڈھونڈ
نکلتے ہیں تو سارا زور حسنِ صورت پر ہوتا ہے۔ سیرت کی طرف دھیان کم ہی جاتا
ہے۔ وہ بھی صرف اس عنوان کہ چال چلن تو خراب نہیں۔ جو نکھی لڑنے کی خو تو نہیں
اگر ایسا نہیں ہے تو پھر فکر کاہے کی۔ گویا حیاتِ باہمی کے لیے رختِ سفر یا تو صوری ہے
یا منفی۔ بیچاروں کو نہ اندازہ ہوتا ہے نہ اندیشہ کہ وہ جہنم فردوس نما کو عقدِ نکاح میں
لا رہے ہیں، زندگی جس کی وجہ سے اجیرن ہو جائے گی اس کی بدمزاجی ہر گام پہ
ستائے گی۔ قدرداں نگاہوں کی لائی ہوئی الجھنیں اس پر مستزاد۔ حور اور
پری کی تلاش میں ٹوٹا ہی ٹوٹا ہے۔ نہ ملی تو وحشت اور جنون، مل گئی تو حالت زبوں
شمع انجمن سے چراغ خانہ بہتر، ہزار بار بہتر۔ بہرکیف توازن کا تقاضا ہے اور اعتدال
کا اصرار کہ ظرف کے حسن سے اثر لیجیے مگر ظرف کے اندر کیا ہے اسے نہ بھولیے۔ ڈبے
تو پھینک دیے جاتے ہیں۔ قیمت دراصل اس شے کی ہے جو ڈبے کے اندر ہے۔ پلاسٹک
کے کنٹینر (container) جو اتنے شکیل اور حسین ہوتے ہیں ایک مسئلہ
بن گئے ہیں۔ ان کے انبار خوشحال ممالک میں زمین کے سینے پر بار بن گئے ہیں
مضمون طویل ہو گیا۔ اب ہم اس کے ایک اور پہلو کا ذکر کر کے دم لیں گے۔ ہم اپنے
خیالات، احساسات اور جذبات کو برہنہ پیش نہیں کرتے۔ ایسا کرنے لگیں تو سماج
درہم برہم ہو جائے۔ ہم انھیں مصلحت اور تہذیب کا پیرہن عطا کرتے ہیں۔ بہت سی
باتیں نوکِ زبان تک آتی ہیں اور ناگفتہ واپس چلی جاتی ہیں۔ ہم کس حد تک مہذب
ہیں اس کا اندازہ اس زبان سے ہوتا ہے جو ہم اپنے جذبات و خیالات کو دیتے
ہیں لیکن یہاں بھی کسوٹی صداقت ہی ٹھہرے گی۔ اگر ہماری زبان کی صداقت کو
حقیقت سے کوئی واسطہ نہ رہا تو لوگ اسے صرف ملمع سمجھیں گے جو کھرچنے پر اتر جائے گا۔
تکلف برحق بشرطیکہ وہ سچ کے ساتھ ناتہ نہ توڑے، جھوٹ اور فریب کے ساتھ
رشتہ نہ جوڑے۔ جہاں تک ممکن ہو ایسی بات نہ کہیے جس سے جراحت پہنچتی ہو لیکن
مخاطب کو دھوکے میں کبھی نہ رکھیے۔ وہ تکلف بجا جس سے خود کو تکلیف ہو پہنچے اور
اور جس کی طرف ذوق نے اشارہ کیا تھا، وہ تکلف سخت ناروا جس سے دوسروں
کو گزند پہنچے۔ کھری بات اور کھری شخصیت کھوٹی بات اور کھوٹی شخصیت
سے ہمیشہ بہتر ہوتی ہے۔ تکلف برتیے لیکن اسے تصنع کی سرحدوں میں داخل ہونے سے پہلے روک لیجیے۔
تصنع، تملق، ملمع کاری اور دروغ سے احتراز اولی۔ برہنگی ناروا لیکن جھوٹ کا لباس
اس سے ناروا۔ ڈبہ بہت خوبصورت بہت خوشنما لیکن اس کے اندر کچھ نہ
تو وہ باتیں جن میں لفاظی ہی لفاظی ہو کتنی کھوکھلی ہوتی ہیں۔ کانفرنسوں خصوصاً
بین الاقوامی کانفرنسوں میں بلند بانگ قراردادیں پاس ہوتی ہیں، طویل تقریریں
کی جاتی ہیں جس میں نہ مفہوم ہوتا ہے نہ مقصود۔ لفظوں کا ہیر پھیر ہوتا ہے اور بس
مختصر یہ کہ انسان نے خود کو پیکیجنگ کے جنگل میں دے دیا ہے۔ اس کا
زاویۂ نگاہ، اس کا طرزِ گفتگو اس کا اسلوبِ حیات سب متاثر ہوئے ہیں۔ طولِ
کلام اور طولِ امل اور دل خوش کن فریب کا باب بھی یہیں سے کھلتا ہے۔ پیکیجنگ
آٹے میں نمک کے برابر ہونا چاہیے تھی۔ اس نے اب نمک میں آٹے کا سا حجم اختیار
کر لیا ہے اور یہیں سے نوعِ انسان کے لیے خطرہ شروع ہوتا ہے۔ ★

ڈاکٹر عالم حسین
شعبۂ طبیعیات
انجینئرنگ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خلائی سفر

الٹی گنتی ختم۔ تین - دو - ایک - اور جوشِ مسرت
دل بلیّوں اچھلنے لگا جب ہم نے سولہ منزلہ سویوز ٹی 11 T-11
راکٹ کو فضا کے سینے کو چیرتے ہوئے آسمان کی بلندیوں کی طرف بلند
دیکھا۔ نیچے کی طرف آگ اور دھویں کا غضبناک آبشار اور اوپر کی
میں پہلی بار ایک ہندوستانی باشندہ خلائی سفر پر روانہ ہو رہا ت
طرح خلائی سفر کا ایک نیا باب ہمارے لیے کھلا۔ ترقی کی رفتار اسی
رہی تو انشاء اللہ وہ دن اب بہت دور نہیں کہ جب خلائی مسافر
میں ڈوبی ہوئی کائنات میں طویل ترین فاصلوں پر موجود مقاما
آمد و رفت کر سکیں گے۔ یہ باتیں اب شیخ چلی کی کہانیوں کی کتا
اوراق سے نکل کر ٹھوس حقیقت بن چکی ہیں۔ آپ واقف ہیں کہ ہما
زمین کے بہ وردہ راکیش شرما مع اپنے دو روسی ساتھیوں ک
میں خلائی سفر میں آٹھ دن گذار کر واپس آئے ہیں۔ ان کی خلائی
سویوز ٹی 11 خلا میں تین اپریل ۸۴ء کو گئی اور دو دن بعد د
کے چاروں طرف تین سو کلو میٹر قطر کے مدار میں پہلے سے گھومت
مصنوعی سیارے سیلیوٹ ۔ 7 (Salyut - 7) سے
ہو گئی - سیلیوٹ ، میں ان تینوں مہمانوں کا خیر مقدم وہاں پہلے سے
تین روسی خلا بازوں نے کیا۔ اس خلائی اسٹیشن یا خلائی تجربہ گا
جانباز خلا بازوں نے سات دن رہ کر بہت اہم تجربات کیے۔ خلائی
پر خلا بازوں کے 'دن رات' کیسے کٹے ، یہ بھی ہماری آنکھوں کے سا
ان کے تجربات اور صفر مادّی کشش میں تیرتی ہوئی اشیاء کا نظ
میں گدگدی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے
تماشا ہو رہا ہو۔ صرف ایک نسل پہلے جو نظریات صرف تصوّر اور خ
محدود تھے وہ آج نگاہوں کے سامنے ہیں۔ سائنس اور کمپیوٹر کے ک
لیس ہو کر آج کا انسان کھوج کی ایک انقلابی مہم پر نکلا ہے اور
یہ ہے کہ اس مشن میں اب ہمارا 'پچھڑا ہوا' دیس بھی 'ترقی یافتہ'
بہت پیچھے نہیں۔

خلائی سفر کی گاڑیاں: آسمانوں کی طرف سفر کرنے ک
طرح کی گاڑی کی ضرورت ہوگی؟ یہ گاڑی مکمل طور پر سیل بند ہو
کیوں کہ زمین کے گرد ہوا کا دائرہ مختصر ہے۔ زمین سے تین ہزار ک

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

— اقبال

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

— اقبال

ا پر ہوا نہ ہونے کے برابر ہے۔ خلائی گاڑی میں ہوا بازوں کے
ا اور پانی کا معقول انتظام ہونا ضروری ہے۔ اطلاعات وتحقیق و
ئی کے لیے ضروری آلات سے یہ گاڑی لیس تو ہوگی ہی۔ جب یہ
تیار ہوگئی تو پرواز کیسے کرے گی؟ اس بات کو سمجھنا زیادہ
ا نہیں۔ ہوا بھرے ہوئے ایک غبارے کا منہ نیچے کی طرف کرکے کھول
۔ ہوا تیزی سے نیچے کی طرف نکلے گی اور غبارہ اوپر کی طرف بھاگے
وٹن کے تین قوانین میں سے دوسرے قانون کا مظہر اس غبارے
ے میں آپ نے دیکھا اور یہی سادہ سا اصول راکٹ کو اڑانے میں
م آتا ہے۔ اس اصول کے مطابق حرکت کا معیار [Momentum]
یعنی برقرار رہتا ہے۔ حرکت کے معیار کا مطلب ہوتا ہے مقدار
ضرب رفتار۔ شروع میں راکٹ ساکن ہے اور معیارِ حرکت صفر
یکن جب راکٹ داغا جاتا ہے تو ایندھن جلتا ہے اور بہت سی گیس
ے نیچے کی طرف نکلتی ہے۔ شروع کی طرح اب بھی معیارِ حرکت کو صفر
کے لیے یہ لازم ہوجاتا ہے کہ راکٹ مخالف سمت میں تیز رفتار سے پرواز
۔ اس بات کو مزید سمجھنا چاہیں تو اس طرح سمجھیے کہ جب بندوق سے
ہر جاتی ہے تو بندوق پیچھے کی طرف زور سے ہٹتی ہے بندوق کا وزن
، مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس لیے اس کے پیچھے ہٹنے کی رفتار بہت
ا ہے۔ گولی اور بندوق دونوں کا معیارِ حرکت برابر مگر مخالف ہوتا
ں کل معیارِ حرکت شروع اور آخر میں برابر یعنی صفر رہتا ہے۔ راکٹ
یندھن جلتا ہے، گیس تیزی سے خارج ہوتی ہے اور راکٹ اُڑان
ہے۔ یہاں پر ایک بات صاف ہوجانی چاہیے کہ اصل بات ایندھن کا
یں بلکہ گیس کا تیزی سے راکٹ کے باہر نکلنا ہے۔ اسی لیے راکٹ کو
ا پھینکنے کے لیے کیمیائی ایندھن کے بدل کی تلاش ہے اور یہ موضوع
ی تحقیق کے منازل میں ہے۔

خلا میں کیوں جائیں؟

خلابازی کے بارے میں لوگوں کے تاثرات بہت طرح کے ملتے
تہا پسند عناصر تو یہ کہتے ہیں کہ خلابازی کی عیاشی ہرگز نہیں کرنا
۔ ان کے خیالات تو یہاں تک ہیں کہ خلابازی خدا کی مرضی کے خلاف
س کے برعکس کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو خلا میں صرف اس لیے جانا چاہیے
کہ زمین کی فضا کے باہر خلا موجود ہے اور وہاں جایا جا سکتا ہے۔ ان
س کے برخلاف خلابازی کے پروگرام کے حق میں چند جامع رُخ ہیں۔

فوجی اہمیت: خلا میں بھیجے گئے مصنوعی سیارے - [Artifi-
cial Satellite] جاسوسی کا بہترین کام کرتے ہیں۔ سو
ین سو میل دور مدار میں رقصاں یہ آسمانی جاسوس، زمین پر فوجوں
ل و حرکت کی پوری تفصیل فراہم کرسکتے ہیں۔ کہاں میزائل نصب ہیں

بے عملی

سوچنا اور غور کرنا، بے شک ایک مبارک فعل ہے، اور اہلِ دانش کا شیوہ ہے
لیکن سوچتے ہی رہ جانا اور عمل کی طرف قدم نہ اٹھانا کاہلوں اور شیخ چلیوں کا کام ہے۔ شیخ
چلی کوئی بُرا آدمی نہ تھا۔ اس میں تخیل بھی تھا اور سُوجھ بُوجھ بھی۔ اس کے منصوبوں میں کہیں
منطقی ضعف نہیں پایا جاتا۔ صرف ایک کسر تھی کہ بے عمل تھا۔ اسی لیے ناکام رہا اور
بدنام ہوا۔ مولوی عبدالحق

کہاں سے راکٹ داغے جا سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ فوجی اہمیت کے سوالوں
کے جواب مصنوعی سیاروں کے ذریعے آسانی سے مل سکتے ہیں۔ بغیر زمینی
مزاحمت کے خفیہ خبر رسانی کا کام بھی یہ آسمانی جاسوس بہ آسانی کرسکتے ہیں

۲ عام افادیت: مصنوعی سیارے عام خبر رسانی یا ترسیل
[Communication] کے کام کے لیے بہت بڑی نعمت بن گئے ہیں۔
زمین کے گلوب کے دور ترین مقامات کے درمیان ترسیل کا کام بڑی
خوبی سے ان سیاروں سے لیا جاتا ہے۔ آج آپ ٹی۔وی [T.V] کے
پردے پر دنیا میں کسی بھی جگہ واقع ہو رہی واردات کو اسی وقت دیکھ
سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ موسم کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے
کا ذریعہ بھی یہ مصنوعی سیارے ہیں۔ یہ ہم کو طوفان کی آمد کی پیشگی
اطلاع دے کر بہت بڑے خساروں سے بچاتے ہیں۔ ان سیاروں
میں نصب حسّاس آلات [Sensors] کی مدد سے زمین کی سطح
کا درجۂ حرارت ہر جگہ پر مل سکتا ہے جس کی بنا پر کسانوں کو فصل بونے
کے ٹھیک ٹھیک اوقات سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ زمین کے اندر کون
کون سے معدنیات کہاں پر مل سکتے ہیں، اس بارے میں بھی مصنوعی
سیارے میں موجود حساس آلات اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔

۳۔ سائنس اور تکنیکی فوائد: سائنس میں مصنوعی سیاروں
کی اہمیت تحقیق طرز کی ہے۔ ان سیاروں کے عروج کے بعد ہی ہم کو زمین
کی اصلی شکل معلوم ہوئی۔ پتہ لگا کہ جگہ جگہ سطح پر اُٹھان یا اُبھار ہیں۔
پہلے دور دراز مقامات کے مابین فاصلہ ٹھیک ٹھیک ناپنا مشکل تھا، لیکن اب
ایسا نہیں۔ پہلے براعظموں کی حرکت کے بارے میں جن سوالوں کے جوابات
دینا مشکل تھے، آج مصنوعی سیاروں سے حاصل کی گئی اطلاعات کی بنا
پر ان کے جوابات دیے جا سکتے ہیں۔ زمین کے گرد پھیلی ہوئی فضا کا
ایک کام یہ ہے کہ وہ دور خلا سے آنے والی الٹرا وائلٹ [Ultra-
violet] اور انفرا ریڈ [INFRARED] شعاعوں کو جذب
کر لیتی ہے۔ اس بات سے جہاں فوائد ہیں۔ وہاں ایک نقصان بھی
ہے۔ وہ یہ کہ یہ شعاعیں دور خلا سے جو اطلاعات اپنے ساتھ لاتی ہیں
وہ ہم تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اس مسئلے کا حل یہ سوچا گیا کہ خلا میں مصنوعی
سیاروں پر ٹیلی اسکوپ [TELESCOPES] نصب کیے جائیں یعنی

۴۔ جرأت مندانہ رخ: انسان کا خلا میں جانے کا عمل بذاتِ خود عظیم ترین جرأت مندانہ قدم ہے۔ خلاباز معمولی انسان نہیں بلکہ یہ اصلی جانباز ہیں۔ کھوج کے انقلابی خلائی مشن میں کیا حاصل ہوگا، پہلے سے اس کی یقین گوئی کس طرح کی جا سکتی ہے۔ ارضی بندھنوں کو توڑ کر ستاروں کی طرف خلا میں دندناتے ہوئے کوچ کر جانا کیسی جواں مردی کا کام ہے۔

جب پہلا انسان چاند پر پہنچا تو انسان کے بلند حوصلوں کو سہارا ملا۔ اپولو (Apollo) خلائی گاڑیاں جب چاند پر اتریں تو اُن میں نصب آلات نے بتایا کہ چاند کی سطح بہت دیر تک تھرتھراتی رہی اور گھنٹیوں کی سی زوردار گونج پیدا ہوتی رہی۔ سائنس کے نظریے سے ہٹ کر میں اس حقیقت کو یوں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ خود چاند نے گھنٹیوں کی سی گونج کی آواز پیدا کر کے اپولو اور اس کے ارضی مہمانوں کا زوردار خیر مقدم کیا تھا۔ اس بات کو برس بیت گئے۔ دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھ رہے ہیں، چاند سے آگے اب انسان کی نظر سیاروں اور بلکہ سیاروں سے بھی آگے دور ستاروں پر ہے۔

خلائی سفر کہاں تک؟ راکٹ میں جتنی تیز رفتار سے ایندھن جلے گا، اتنی ہی زیادہ رفتار راکٹ کو ملے گی۔ راکٹ کا ایندھن مختلف منازل میں بٹا ہوتا ہے۔ ایک ایک کر کے ایندھن کی یہ منازل خرچ ہوتی ہیں۔ کیمیائی ایندھن سے ۲۵ ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار راکٹ کو مل سکتی ہے۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ آئندہ سو ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار ممکن ہو جائے گی تب ہم اس رفتار سے خلا میں کتنی دور تک جا سکیں گے؟ ہم سے قریب ترین ستارہ پراکسیما سینٹوری (Proxima Centauri) تقریباً چار لائٹ ایر (4 light years) کے فاصلے پر ہے۔ سو ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے یہ فاصلہ ۲۵ ہزار سال میں طے ہوگا! کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم قریب ترین ستارے کے آس پاس تک بھی خلا میں نہیں پہنچ پائیں گے؟ جواب ہاں میں دینے کو جی نہیں چاہتا۔ کیوں کہ اس مشکل کے کچھ حل ممکن ہو سکتے ہیں۔ ان ممکنات میں سے ایک قرین از قیاس حل یہ ہے کہ کیمیائی ایندھن کے بجائے نیوکلیر ایندھن کا استعمال کیا جائے۔ نیوکلیر فشن اور فیوژن (Nuclear Fission and Fusion) دونوں پر مبنی اس صدی کے خوفناک ترین حربے ہائیڈروجن بم کو تعمیری مقصد کے لیے کام میں لایا جائے۔ فشن کے ذریعے ایک کروڑ ڈگری درجۂ حرارت پر فیوژن ہو یعنی ہائیڈروجن بم پھٹے، آگ کا سمندر نیچے کی طرف طوفان برپا کرے اور جدید راکٹ فضا کو چیرتا ہوا روشنی کے جھپاکے کی طرح نظروں سے غائب ہو جائے۔ اس طرح سے مانے گئے راکٹ کی رفتار تقریباً بیس لاکھ میل فی گھنٹہ ہوگی
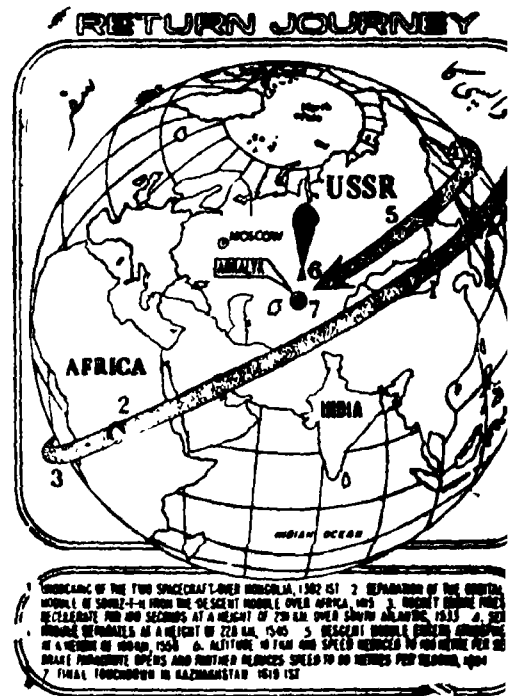
ر بہ گاہیں قائم کی جائیں۔ اس طرح کی تجربہ گاہ میں نصب شدہ
وب سے کائنات کے بارے میں جو اطلاعات حاصل ہوتی ہیں وہ
۔تجربہ گاہ کی بہترین ٹیلی اسکوپ سے بھی ملنا ممکن نہیں۔ اس کے
ائی تجربہ گاہوں میں جس طرح کے انوکھے تجربات کیے جا سکتے ہیں
مین پر دہرایا جانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مثلاً زمین پر
شش ہوتی ہے اور خلائی تجربہ گاہ میں یہ کشش صفر ہو جاتی ہے،
ہت اعلیٰ اور ادنیٰ درجۂ حرارت کا پیدا کرنا آسان ہے۔ صفر
شش میں جو دھات اور دوسرے مادّی نمونے تیار کیے جاتے
ں کی بناوٹ نقص سے پاک اور اصلی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔
ں کے مشن کے فوائد کی فہرست بہت طویل ہے۔ آدمی خلائی سفر پر
ئے یا مشینوں اور روبوز کو بھیجے، اس بارے میں ہم یہ کہیں
دمی کو خود بھی جانا چاہیے۔ آدمی سوچ اور سمجھ کا مالک ہے،
برخلاف مشین خود سے فیصلے کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے
ے طور پر اگر آدمی مریخ (Mars) پر جائے تو وہ دیکھ
ھ کر سکتا ہے کہ تحقیق کے کام کے لیے وہاں سے زمین پر لانے کے
ن سا پتھر چنا جائے۔ لیکن کہنا آسان اور کرنا مشکل۔ جان جوکھم
ال کر مریخ پر کون جائے گا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ رفتار تو بہت زیادہ ہے۔ اس سے پرواز کر کے بہت دور کائنات کی پرتوں کو چھیدنا ممکن ہوگا، جناب عالی تصور سے باہر اس رفتار سے چلنے کے باوجود قریب ترین ستارے تک کا چار لائٹ ایر کا فاصلہ طے کرنے میں ایک ہزار سال لگیں گے !

تصورات کی دنیا:

یہ مشکل تو بہت پیچیدہ آگئی۔ اس مشکل کا حل کیا ہو ؟ حل تلاش کرنے میں بہت دلچسپ دو ممکنات سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دو یا تین خلا بازوں کے بجائے خلا بازوں کی پوری کالونیاں آسمانی منازل کی طرف کوچ کریں۔ یہ لوگ بذاتِ خود اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے اور نہ ہی ان خلابازوں کے زندہ واپس آنے کی کوئی امید کی جاسکتی ہے، کیوں کہ کون ایک ہزار سال جی سکے گا۔ ہاں اِس لامتناہی سفر میں ان کی نسلیں جنم لیں گی جو کوئی منزل پا سکیں گی، اگر وہاں زندہ رہنے کے لائق آب و ہوا ہوئی تو یہ لوگ اپنے ماضی سے بے پرواہ ہوکر وہاں نئی دنیا بھی بسا سکیں گے اور ممکن ہوا تو بعد کی کبھی نسل کے کچھ افراد شاید یہاں واپس بھی آسکیں (مجھے تو شبہ ہوتا ہے کہ اربوں سال پہلے کسی دوسری کائناتی منزل سے خلائی سفر میں کوئی خلاباز کالونی سفر پر نکلی اور اس کے سفر کا اختتام ہماری زمین پر ہوا اور اس طرح خالی دنیا آباد ہو گئی ہے)۔

ایک دوسرا خوشنما تصور یہ ہے کہ خلائی سفر پر جانے والے خلابازوں کی زندگی بڑھائی جاسکے۔ یہ بات دو طرح سوچی جاسکتی ہے۔ ایک حل تو نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) کے مطابق ہے کہ جب روشنی کی رفتار کے قریب رفتار سے سفر ہوگا تو وقت تھمنے لگے گا۔ مگر جناب نور کی رفتار ہم اور آپ کو کہاں میسر! (سائنس کا یہ اہم اصول ہے کہ خلا میں مادی اشیا کی رفتار نور کی رفتار کے برابر کبھی نہیں ہوسکتی) یعنی یہ ایک خصوصی حل ہے جو ہم خاک کے پتلوں کے لیے نہیں ہے۔ تب پھر کیا کیا جائے ؟ ایک اور راستہ یہ ہے کہ کسی طرح زندگی کو مرضی کے مطابق عارضی طور پر روکا جاسکے اور جب چاہیں زندگی واپس لائی جاسکے، اس بات کا تصور اس طرح ممکن ہے کہ اگر خلائی گاڑی میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے تقریباً ۲۷۳ ڈگری نیچے برقرار رکھا جاسکے اور اس طرح زندگی کو جہاں کا تہاں روکا جاسکے اور بعد میں وقتِ ضرورت زندگی کو واپس لایا جاسکے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ یہ تصور تحقیق کے میدان میں ابھی بالکل ہی ابتدائی دور میں ہے اور اس پر مزید کچھ کہنا مشکل ہے۔ ان مراحل کے پیشِ نظر فی الحال اپنے شمسی نظام کے نو سیاروں (Nine Planets) کے درمیان ہی خلائی پروازیں کی جائیں تو نظریاتی

ہندوستان کا مایۂ ناز فرزند : راکیش شرما

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال

مشکلات کافی کم اور زیادہ حصول کی امید کی جاسکتی ہے۔ ان سیاروں کے بارے میں اطلاعات کا ذخیرہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اس کے باوجود اُن کی شکل اور بناوٹ کے بارے میں ابھی بہت کچھ معلوم کرنا باقی ہے۔ ان پر زندگی کی کوئی شکل پائی جاتی ہے کہ نہیں، ابھی تک معلوم نہیں۔ یہ سب اگر معلوم ہو جائے تو ہم اس کی روشنی میں اپنی زمین اور اپنی زندگی کے بارے میں بہتر رائے قائم کرسکیں گے۔ ★★

قابلِ تقلید!

کچھ عرصہ قبل جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ تعزیتی خطوط کا جواب دیتے ہوئے حکیم صاحب محترم نے تحریر فرمایا:

"بے شبہ بیگم مرحومہ سے ۵۲ سالہ رفاقت کا یہ خاتمہ میرے لیے عمر کے اس نازک موڑ پر، جب کہ زندگی کے ہر دور سے زیادہ مجھے ان کی ہم راہی اور دم سازی کی ضرورت تھی، بڑا دردناک اور صبر آزما ہے۔ انھوں نے جہادِ زندگی اور خدمتِ خلق میں پوری خلوص کے ساتھ میری رفاقت کی ہے۔ انھوں نے جو احسانات مجھ پر کیے ہیں اُن کا شمار بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ ان کا سب سے بڑا احسان بلکہ دین تو یہ ہے کہ انھوں نے آدمی انسانیت کا احترام، توقیر اور محبت مجھے ایسی عطا کی ہے کہ ان کی صنف کی کسی بھی فرد کی بے حرمتی تو کیا، مجھے اس وقت یہ بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ میں نے کسی خاتون یا کسی بچی سے کبھی ترش روئی اور ناگواری سے بھی بات کی ہو۔"

مرحومہ کا یہ وصف کہ انھوں نے حکیم صاحب کے قومی و ملی کاموں اور خدمتِ خلق کے کارناموں میں پوری طرح حقِ رفاقت ادا کیا، قوم کی خواتین کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ اس سے زیادہ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عمل اور ایثار سے اپنے رفیقِ زندگی کے دل میں صنفِ نسواں کا احترام پیدا کر دیا۔ خدا تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور ہماری بچیوں کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

ہماری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ جناب حکیم عبدالحمید صاحب، جناب عبدالمعید صاحب، جناب حماد احمد صاحب، محترمہ فریدہ اعجاز، محترمہ مسعودہ معید، محترمہ فریدہ حماد اور دیگر اعزا و متعلقین کو ہمت دے کہ وہ اس جانکاہ حادثے کو استقامت کے ساتھ برداشت کرسکیں۔

—ادارہ—

ابوالکلام قاسمی
شعبۂ اردو
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۹۸۴ اور عالمی صورتِ حال

۱۹۸۴ء کے آغاز کے ساتھ ساری دنیا میں جارج آرول (George Orwell) کے ناول '۱۹۸۴ء' کے بارے میں نئے سرے سے غور و خوض اور اظہارِ خیال کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ ناول مستقبلیت کے موضوع پر لکھا گیا تھا۔ چند سال پہلے تک اِس ناول کو صرف ایک سیاسی اور سماجی تمثیل سمجھا جاتا رہا کہ ۱۹۴۸ء میں مکمل ہونے والے اس ناول کی وجہ تسمیہ ۴۸ کے اعداد کی تبدیلی (۸۴) اور اس الٹ پھیر سے مترشح ہونے والی مستقبلیت کے سوا اور کچھ نہ تھی مگر حقیقی معنوں میں ۱۹۸۴ء کی آمد نے نہ صرف یہ کہ جارج آرول کے زیرِ بحث ناول کی تمثیلیت کو برقرار رکھا ہے بلکہ آج کی عالمی صورتِ حال اور اس صورتِ حال سے آرول کی عاقبت اندیشی کی توثیق نے اِس ناول پر از سرِ نو غور و فکر کے لیے نئی جہات اور نئے امکانات پیدا کر دیے ہیں۔ جارج آرول کے اِس ناول پر اب تک ادبی اظہار اور سماجی صورتِ حال کے پس منظر میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کسی نے آرول کی سیاسی سوجھ بوجھ کی داد دی ہے تو کسی نے اس ناول کو سوشلسٹ روس سے ملک بدر ناول نگار زمیاتن (ZAMYATIN) کے ناول 'We' کا چربہ بتلایا ہے، کوئی '۱۹۸۴ء' کو صرف ایک طنز سے تعبیر کرتا ہے تو کوئی اسے ادبی اور سیاسی ہجوِ ملیح کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ مگر یہ اور ان جیسے خیالات کی بھیڑ میں یہ بازگشت ہر جگہ سنائی دیتی ہے کہ '۱۹۸۴ء' اپنی ادبی ہئیت اور سیاسی اور سماجی بصیرت کی بنیاد پر ایک اہم اور قابلِ لحاظ ناول ہے، جو فکشن کی تاریخ میں تازہ کاری اور انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کا اعلامیہ بھی ہے۔

'آرول' کے بارے میں شاید یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ وہ ہندوستان ہی میں، نیپال کی سرحد کے قریب ایک چھوٹے سے شہر 'موتیہاری' میں پیدا ہوا تھا، جہاں اس کے والد برٹش انڈیا کے ملازم تھے۔ سوائے ابتدائی چند برسوں کے آرول کی ساری زندگی یورپ میں گزری مگر ہندوستان کے وطن مولود ہونے کا سیاق و سباق اس کی شخصیت میں کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر ہمیشہ برقرار رہا۔ ایک انسان دوست اور جمہوریت پسند ادیب اور صحافی ہونے کے ناطے ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی کے ساتھ اس کی ہمدردیاں ہر شخص پر عیاں تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں

ہندوستان کی آزادی پر اس نے بعض مضامین میں کھل کر اور [illegible]
میں سربستہ انداز میں اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ آرول کی یہ مسر[illegible]
افتادِ طبع کا حصہ تھی کہ ہندوستان کے علاوہ بھی اس نے بارہا د[illegible]
مظلوم اور غلام ملکوں کے سلسلے میں اسی قسم کے خیالات کا اظ[illegible]
وہ چونکہ نرا ادیب یا فکشن نگار نہ تھا بلکہ اپنے عہد کے کئی دو[illegible]
اور دانش وروں (مثلاً کامیو، سارتر اور آرتھر کوئسلر) کی طرح
میں کھلے عام یا درپردہ ایک شریک کار کی حیثیت بھی رکھتا تھا اس
کے اواخر میں اسپین کے جمہوریت پسندوں کے لیے اور اُن کے [illegible]
لڑا اور زخمی ہوا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے سلسلے میں اس کی تر[illegible]
واضح اور سب پر عیاں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے کسی دانشور کے لیے
یا سماجی معاملات صرف نظریاتی وابستگی یا ناوابستگی تک محدود نہی[illegible]
بہت سے ادبی نظریہ سازوں اور سیاسی نظریہ بازوں کے مقا[illegible]
سیاسی اور سماجی صورتِ حال اس کے اپنے وجود کا حصہ تھی اور [illegible]
کے اظہار کا وسیلہ۔

جارج آرول اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بڑی شد[illegible]
بات محسوس کرتا تھا کہ انگریزی ادب میں Totalitarianism
پر کوئی اچھی کتاب نہیں لکھی گئی۔ جبکہ آرول کا خیال یہ تھا کہ [illegible]
مختلف نظام ہائے سلطنت کے نام سے دراصل آمریت اور ڈکٹ[illegible]
کو ہی فروغ حاصل ہوتا رہے گا۔ انھیں دنوں آرول نے ۴۳
لکھنے کا آغاز کیا اور اس ناول کے لکھنے کے دوران جب ۴۶
اسے زمیاتن کی نئی کتاب 'وی' پڑھنے کو ملی تو اس نے زمیات[illegible]
ناول کو اپنے خیالات کی بازگشت جانا اور اس پر تبصرہ کرتے ہو[illegible]
پسندیدگی کا اظہار کیا۔ شاید یہی سبب ہے کہ '۱۹۸۴ء' اور [illegible]
بہت سی باتیں مشترک ملتی ہیں۔

آرول نے اپنے ناول ۱۹۸۴ء کی اشاعت سے بہت پہل[illegible]
میں آرتھر کوئسلر سے کہا تھا کہ "تاریخ اپنے انجام کو ۱۹۳۶ء میں [illegible]
اس لیے اب تاریخ سے سچائی کی توقع رکھنا ایک فضول بات ہے"۔ ج[illegible]
لعنتوں کا جو شدید احساس آرول کو تا دمِ حیات رہا ان میں 'ص[illegible]
کی صداقت اور عدمِ صداقت کا مسئلہ شاید سب سے اہم تھا۔ اس [illegible]

نیل میں دنیا کی سیاسی حکمرانی کرنے والے نہ صرف یہ کہ حال اور مستقبل کو
ں کریں گے، بلکہ ماضی کو بھی کنٹرول کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کو
تجربات اور سیاسی حالات سے اس کا یقین ہو چلا تھا کہ سچائی اور تاریخ
نے لوگوں کا رویہ روز بروز مشروط ہوتا جارہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم
وں اور قوموں اور ان سے کہیں زیادہ انسانی قدروں کی جو گت بنائی
رول کا خیال تھا کہ مستقبل میں اس سے بھی کہیں زیادہ ہیبت ناک معاشرہ
میں آئے گا۔ ایسا معاشرہ جس میں 'صلح'، 'امن'، 'دوستی' اور اس کے
رف الفاظ صرف سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔ اس کا خیال
۔ "آج کے عہد کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ سیاست نے الفاظ کے معنیٰ
ں کر دیے ہیں۔ ممکن ہے آئندہ بھی کچھ ایسے ہی الفاظ استعمال کیے جائیں
فی میں کیے جاتے رہے۔ حکمران کے مفاہیم کا تعین سیاسی مصالح کی
بر ہوگا نہ کہ لغوی معنی پر۔ اگر حکمراں کہے گا کہ فلاں فلاں واقعات
ں وجود میں نہ آئے تو وہ واقعات یقیناً وجود میں نہ آئے ہوں گے
نر وہ کہے گا کہ دو اور دو کے ملانے کے بعد حاصل جمع پانچ ہوتا ہے
یسا ہی ہوگا اور انفرادی اور اقداری فیصلے لغو اور مہمل ہو کر رہ
ں گے۔"

اس موقع پر انگریزی کے ایک ہندوستانی نژاد نوجوان ناول
سلمان رشدی کا ذکر بے محل نہ ہوگا جسے اس کے دو تازہ ناولوں
'Midnight's Children' اور 'Shame' کے سبب غیر معمولی
ت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ یوں تو سلمان رشدی نے ان ناولوں
لے بھی ایک ناول لکھا تھا مگر 'مڈ نائٹس چلڈرن' کی اشاعت کے ساتھ
ی ناول نگاری، ادب کے ساتھ سیاست کے تناظر میں بھی موضوع
۔ بن گئی ہے۔ اس اثنا میں "دی شیم" کے نام سے جو ناول شائع
آیا ہے، وہ بھی اول الذکر ناول کی طرح برصغیر کی سیاسی اور سماجی
ت حال پر لکھا گیا ہے ـــــ یوں تو سیاست کے پس منظر میں دنیا
ہت سی زبانوں میں فکشن لکھا جاتا رہا ہے مگر سلمان رشدی کا سلسلہ
نہ کسی طور جارج آرول سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی چند روز قبل دہلی
یں کلب میں 'سیاست اور ناول نگاری' کے موضوع پر لکچر دیتے ہوئے
رشدی نے جارج آرول کے حوالے سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تو راقم الحروف
وس ہوا کہ گویا اسے اس سلسلے کی ایک گمشدہ کڑی مل گئی ہے۔ رشدی
اخبارات کی اطلاع کی بموجب) آرول کے ایک مضمون اور ناولوں کا ذکر
، ہوئے بتلایا کہ "گو ہم لکھنے والے بسم اللہ کے گنبد میں بند ہیں مگر گرد و پیش
مصائب شکن معاشرتی صورت حال سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ ممکن ہے کہ
ں ناپسندیدہ صورت حال کا مقابلہ نہ کر سکیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس
ارک کی کوئی صورت نہ نکال سکیں۔ مگر ہم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنے
حسب بے جا پر صدائے احتجاج بلند کریں یا کم از کم اس کیفیت کو لفظوں میں
محفوظ ہی کر لیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ 'آرول' نے مستقبل کے جن اندیشوں
کی بات اپنے ناول میں کی تھی 'رشدی یا اس جیسے دوسرے فکشن نگار اپنے
عہد کے تجزیے کے ذریعے ان اندیشوں کی صداقت کا ثبوت فراہم کر رہے
ہیں۔

'جارج آرول' کا ناول ۱۹۸۴ء ایک ایسے معاشرے کو پیش کرتا
ہے جہاں اقتدار اور سیاسی طاقت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس
معاشرے میں تمام شعبہ ہائے زندگی پر اس اقتدار اور سیاسی قوت کی
بالادستی قائم ہے۔ اس معاشرے میں عوام کی رہنمائی ایک مخصوص جہت میں
کی جارہی ہے۔ اس جہت میں جہاں گورنمنٹ اور حکمراں پارٹی کے درمیان
کوئی حدِ فاصل نہیں ہے اور عملی طور پر دونوں لفظ مترادف ہو گئے ہیں۔
آرول کا ایک کردار کہتا ہے کہ "پارٹی صرف اپنے تحفظ کے لیے اقتدار
حاصل کرتی ہے۔ ہمیں دوسروں کی بھلائی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم
صرف اقتدار کے طالب ہیں، ہم دولت، عیش و عشرت، طویل زندگی یا
مسرت و شادمانی کے طلب گار نہیں۔ ہمیں تو بس قوت چاہیے مطلق العنان
قوت۔ قوت ہمارے لیے وسیلہ نہیں منزل ہے۔ ہم لوگ صرف اور صرف
اقتدار کے پجاری ہیں۔" اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر یہ بیان ایک
طنزیہ بیان معلوم ہوتا ہے مگر آرول نے اپنے ناول میں جو طلسم پیدا کیا ہے
اس کے سبب یہ سارا کاروبار حقیقی اور سچا روپ بن کر سامنے آتا ہے۔
۱۹۸۴ء کے پڑھنے والے کو اس میں پیش کیا گیا معاشرہ آج کے معاشرے
سے ملتا جلتا معاشرہ دکھائی دیتا ہے۔ کیا آج دنیا کے سارے بڑے ممالک
میں ہم اس سے کوئی مختلف صورت حال دیکھ رہے ہیں؟ ریاست ہائے
متحدہ امریکہ میں ڈیموکریٹک اور ریپبلکن پارٹیوں کی رسہ کشی ہو یا سوشلسٹ
روس میں پولیٹ بیورو کا اقتدار اعلیٰ، معاملہ اگر بالکل یہ نہیں تو اس
سے ملتا جلتا ضرور ہے ـــــ ۱۹۸۴ء کی جزئیات پر تفصیلی گفتگو کا بوجھ
یہ چھوٹا سا مضمون تو نہیں اٹھا سکتا، مگر ان کی طرف اشارے ضرور کیے
جا سکتے ہیں۔

آرول نے اپنے ناول میں برادر بزرگ (Big-Brother)
کا مرکزی کردار پیش کیا ہے جو اس کے بیان کردہ تفصیلات کی روشنی
میں اسٹالن پر منطبق ہوتا ہے کہ آرول کے لیے برادر بزرگ کا کردار
اسٹالن ہی ادا کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مگر آج اس کی شکلیں مختلف ہیں۔
آرول کے پیش کردہ معاشرے میں برادر بزرگ کا وجود ہر جگہ ہے اور
وہ ہر شخص کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے۔ اگر ہم آج کی دنیا کی
تینوں بلاک میں برادران بزرگ کی تلاش کریں تو ان کی نشاندہی کوئی
مشکل نہیں رہ جاتی۔ دو بلاک تو بہت واضح ہیں، تیسرے بلاک سے

ی مراد ناوابستہ ممالک کی تنظیم سے ہے جس میں شامل ملک نہ تو
وابستہ ہیں اور نہ اس کے قائد، برادرِ بزرگ بننے کی جدوجہد
، غافل ہیں ـــــ ۱۹۸۴ء کے معاشرے میں ساری زندگی
کنٹرول جماعت اور پارٹی کے ہاتھ میں ہے جو اپنے اقتدار
لی کو چار وزارتوں میں تقسیم کرکے عوام کے ظاہر و باطن
ان وزارتوں کے ذریعے اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔
چار وزارتیں منسٹری آف ٹروتھ [TRUTH] منسٹری آف
- LOVE [ ] منسٹری آف پیس [PEACE] اور منسٹری آف
ٹی [PLENTY] ہیں ـــــ یہ وزارتیں اپنے
ے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے تمام شعبہ ہائے زندگی کا احاطہ
تی ہیں۔ معاشرتی زندگی کی گوناگوں سرگرمیوں اور مسائل
رف چار بڑی سرخیوں سے احاطہ کر لینا بھی عوام کو آسانی
قابو میں رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ منسٹری آف پیس، کا
ں جنگ اور آپسی مخاصمت سے ہے۔ وزارت لو کا تعلق نظم
، کے سنبھالنے سے اور وزارت پلینٹی کا تعلق اقتصادی معاملا
ذمہ داری سے۔ جہاں تک منسٹری آف ٹروتھ، کی ذمہ داریوں
وال ہے تو اس کا دائرہ کار نہایت وسیع اور ہمہ جہت ہے
کے دائرے میں خبریں، سیر و تفریح، تعلیم اور فنونِ لطیفہ
سی چیزیں شامل ہیں۔ زبان کا غلط استعمال اور لفظوں
رگی کے طور پر استعمال کرنے کے رجحان کو عام کرنا اُس
رت کی اہم ذمہ داری ہے۔ اس وزارت کا یہ فرض بھی ہے
روں کی پیش کش اور زبان کے عیارانہ استعمال سے ذرائع ابلاغ
ل میں ایک ایسا "NEWSPEAK" تخلیق کرے جس میں جھوٹ،
ی، دھوکہ، فراڈ، مفہوم کو مسخ کرکے پیش کرنا اور نقل
ریعے اصل کا فریب پیدا کرنا، بنیادی کام تصور کیے جائیں۔
ل کا ایک کردار "نیوز پیک" کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے
ے کہتا ہے کہ "نیوز پیک کا اصل مقصد دائرۂ فکر کو محدود کرنا
اس کے لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم الفاظ کو اُن کے تخلیقی
تعمال اور معنوی امکانات سے محروم کردیں، تاکہ ناپسندیدہ
یب اظہار کو خارج از امکانات قرار دیا جاسکے۔ ظاہر ہے کہ
ساری کوششوں کے پس پشت ہمارے سیاسی مقاصد کارفرما
۔ کرداروں کے مابین گفتگو اور ان کے عمل کے بیان کے ساتھ
تھ مصنف بڑی چابکدستی سے راوی کا تبصرہ بھی پیش کرتا ہے
ہتا ہے کہ یہ زبان دنیا کی واحد زبان ہوگی جس کی ووکیبولری
سال کم ہوتی چلی جائے گی ـــ چونکہ جارج آرول ادیب کے ساتھ
ایک صحافی بھی تھا، اس لیے خبروں کو کسی خاص پالیسی کا ترجمان
بنا کر پیش کرنے اور حقیقی صورتِ حال سے زیادہ ذرائع ابلاغ سے
سامنے لائی جانے والی صورتِ حال کی صداقت کے کھیل سے اُسے پوری
واقفیت تھی۔ آرول نے صحافت کے علاوہ بی۔بی سی میں بھی ملازمت
کی تھی، اس طرح ذرائع ابلاغ کے طریقۂ کار اور زبان کے
Manipulations کا راز بھی اسے معلوم تھا۔ اس نے ترسیل و
ابلاغ کے ان وسیلوں پر بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں جن میں
اس کا لہجہ خاصا تلخ ہے اور زبان نہایت تنقیدی استعمال ہوئی ہے۔

آئیڈیل نیوز پیک کی جو فضا ۱۹۸۴ء میں تخلیق کی گئی
ہے اس میں عزت، انصاف، اخلاق، جمہوریت، بین الاقوامیت
سائنس، مذہب، عقلیت اور معروضیت جیسے الفاظ کا کوئی وجود ہی
نہیں ہے ـــ ان سارے الفاظ کا احاطہ 'رجعت پسندی' کے
الفاظ سے کیا گیا ہے۔ ناول میں 'رجعت پسندی' کے لیے 'Old
Think' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو مذکورہ الفاظ اور ان کے
مفاہیم کو از کار رفتہ ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح آزادی، مساوات،
انسانی حقوق اور حصولِ مسرت جیسے الفاظ کو 'Crime Think'
کے خانے میں رکھا گیا ہے ــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ
آج ۱۹۸۴ء کی دُنیا من و عن آرول کی فینٹسی جیسی نہیں ہے
اور نہ کسی فینٹسی سے بلا کم و کاست حقیقت کی مماثلت ممکن ہے۔
مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اگر بعینہٖ
یہ نہیں تو اس نوع کے ذرائع ابلاغ اپنا غیر معمولی اثر ضرور رکھتے
ہیں۔ مغربی نیوز ایجنسیاں ہوں یا مشرقی، ان سب کی پالیسیاں
سیاسی مقاصد سے منسلک ہوتی ہیں۔ روائٹر، طاس، اور یونائیٹڈ
پریس آف امریکہ کو تو جانے دیجیے کہ ہم ان بڑی نیوز ایجنسیوں
کا مقابلہ کہاں کرسکتے ہیں۔ مگر خود ہمارے ملک میں کوئی اہم
اطلاع نیوز ایجنسی کی چھلنی میں چھنے بغیر ہم تک نہیں پہنچ پاتی۔ البتہ
یہ ضرور ہوتا ہے کہ جو کمی نیوز ایجنسیوں سے پوری نہیں ہو پاتی
ہے، اس کو نیشنل پریس اپنی پالیسی کے قالب میں ڈھال کر پورا کردیتا ہے۔
نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام تک پہنچتے پہنچتے اطلاعات کی صحیح شناخت
بھی ممکن نہیں رہ جاتی۔

آرول کی مستقبلیت اگلے زمانوں میں تاریخ نویسی
کے رول کو بہت مشتبہ مگر اہم گردانتی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں تاریخ نویسی
کی سرپرستی بھی وزارتِ صدق کے سپرد ہے۔ یہ وزارت جیسا
کہ پہلے ذکر آچکا ہے، تاریخ نویسی کا ایسا رجحان عام کرنے میں
مصروف ہے جس کے زیرِ اثر تاریخ سے نہ صرف زمانۂ حال اور

> لوگ اپنی حالت کے لئے اپنے حالات کو الزام دیتے رہتے ہیں۔ میں حالات کو مانتا ہی نہیں۔ اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اٹھ کر اُن حالات کو ڈھونڈتے ہیں جن کی انہیں طلب ہوتی ہے اور اگر وہ حالات نہیں ملتے تو یہ لوگ خود اُن حالات کو وجود میں لے آتے ہیں۔
>
> — انگریز فلسفی برٹرنڈ رسل

ستقبال کو ریکارڈ کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ بلکہ زمانۂ ماضی کے اقعات کی تشکیلِ نو بھی اس کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ اس کا طلب یہ ہوا کہ تاریخی حقائق پر پردہ ڈالنا یا اگلی نسلوں کے لیے ماضی کا وہ تصور پیش کرنے کی کوشش کرنا جو سیاسی بازی گروں لو مفید مطلب معلوم ہوتی ہے۔ آرول کے اُن اندیشہ ہائے دور و دراز میں سے ایک تھا جن کا سامنا آج کی دنیا کو کرنا پڑ رہا ہے۔ کم از کم آج اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے عہد کے سیاست کار اور نظریہ ساز مورخین ساری دنیا میں قوموں کے تاریخی حافظے کے ساتھ کھلواڑ کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ تاریخ نویسی اور مورخین کے بارے میں مشہور مورخ 'بپن چندر' نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں آرول کے حوالے سے بعض عبرت انگیز حقائق کا انکشاف کیا ہے۔ پروفیسر بپن چندر تاریخ کی فرقہ وارانہ تعبیروں پر اپنی برافروختگی کا اظہار کرتے ہوئے ۱۹۷۷ء میں جنتا حکومت کے زیر نگرانی انڈین ہسٹری کانگریس کے مقابلے میں انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ' کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اس زمانے میں اس تنظیم نے پرانی تاریخ کو منصوبہ بند طریقے پر اکثریتی فرقے کی پسند و ناپسند کا تابع بناکر کیوں کر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ پروفیسر موصوف نے اس سلسلے میں دو مثالیں دی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی قسم کی فرقہ وارانہ تاریخی تعبیروں کا نتیجہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے مراٹھا حملوں اور ظلم و تشدد کے سلسلے میں بنگالیوں کا جو تاریخی حافظہ تھا اسے مسلمانوں کے ظلم و جور کے تاثر میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے تاریخی واقعات کے سلسلے میں ہماچل پردیش کے علاقے میں سکھوں سے جو شکایت چلی آرہی تھی، اسے بیسویں صدی کی سکھ اور ہندو فرقہ پرستی نے مسلمانوں سے شکایت اور غلط فہمیوں کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ ٹوائن بی نے بھی اپنی تحریروں میں عالمی تاریخ کے بارے میں اس نوع کی ان گنت بدعنوانیوں کی نشاندہی کی تھی۔ ماضیٔ قریب کے ویٹ نام اور چلی یا اسرائیل اور فلسطین کی تاریخ، دنیا کے دو بڑے بلاک میں دو مختلف طریقوں بلکہ بعض اوقات متضاد طریقوں سے لکھی گئی اور لکھی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں بلاکس سے وابستہ مورخین اگر آج کے شمالی اور جنوبی کوریا، مرکزی امریکہ 'گرینیڈا'، ایران، افغانستان، پولینڈ اور بنگلہ دیش، کی تاریخ بالکل مختلف اور متضاد انداز میں لکھیں تو ہمیں تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

آج ۱۹۸۴ء تک آتے آتے ساری دنیا اخلاقی اور انسانی اقدار کی بجائے سیاست کی بالادستی کو تسلیم کر چکی ہے اور اسے اپنا مقدر جانتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ امن، انسانیت اور بقائے باہم کی گفتگو کرنے والے ممالک کبھی اسرائیل کی سرپرستی کرکے بیروت میں شطیلہ اور صابرہ کیمپوں میں روا رکھی جانے والی بربریت کا جواز فراہم کرتے ہیں اور کبھی سیاسی بہانوں سے جنوبی کوریا کے مسافر بردار جہاز کو اس طرح مار گراتے ہیں گو اس جہاز میں سوار مسافر انسان نہ ہوں بلکہ شکار کیے جانے والے پرندے ہوں۔ آج جس طرح دنیا دو فریقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے اس کا انجام سوائے تیسری عالمگیر جنگ کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ ابھی دونوں فریق براہ راست مقابلہ کرنے کے بجائے مشرق وسطیٰ، خلیج فارس، سینٹرل امریکہ اور گرینیڈا میں بالواسطہ طور پر جنگ لڑنے میں مصروف ہے۔ ایک فریق صدائے احتجاج بلند کرنے والے کو غدار قرار دیتا ہے تو دوسرا اسے امن کا نوبل انعام دلوانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ایک فریق یاسر عرفات کی تنظیم اور خود اس مجاہد کی پشت پناہی کرتا ہے تو دوسرا اس کے مقابلے میں پی۔ ایل۔ او کا کوئی نیا قائد لاکھڑا کرتا ہے۔ ایک شخص آزادی کا نعرہ بلند کرکے اس کا رشتہ ایک مخصوص قسم کی جمہوریت سے جوڑتا ہے تو دوسرا اشتراکیت اور اشتمالیت کے نام پر پارٹی کو مطلق العنان بنانے پر مُصر ہے۔ اسی صورت حال کو جارج آرول نے اپنے ناول میں کنسنٹریشن کیمپ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ کنسنٹریشن کیمپ آرول کی نظر میں اس لیے منظم کیا گیا ہے تاکہ اس کے شہریوں کو ذہنی اور علمی اعتبار سے تباہ و برباد کیا جا سکے۔ اس طرح کے معاشرے

ہیں جو لوگ بغیر کسی بغاوت کے اور احتجاج کے خوش رہ سکتے ہیں وہ بجائے خود مُردوں کی طرح ہیں جن سے مطلق العنانیت کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس کیمپ کے علاوہ زیرِ بحث ناول میں ایک اور قابلِ ذکر معاشرہ بھی ہے جسے Oceana کا نام دیا گیا ہے۔ جو لوگ قوت اور مجبوری، سیاسی نفسیات اور اخلاقی اقدار کے تصادم کو برداشت کر رہے ہیں وہ Oceana میں دکھلائے گئے ہیں۔ مگر اس معاشرے کو بھی ایک خاص مقصد سے قائم کیا گیا ہے تاکہ ایسے تمام لوگوں کو مناسب ترین وقت اور مناسب ترین طریقے سے موت کے گھاٹ اُتارا جا سکے۔

آرول اپنے ناول میں نینٹشی تخلیق کرنے کے فنی لوازم کا خیال رکھتے ہوئے بہت وضاحت سے کچھ نہیں کہتا۔ مگر Manipulated اور Brutalised انسانیت کے لیے اس کی بصیرت آج بھی بڑی حد تک معنیٰ خیز ہے۔ بلکہ اسے یوں کہنا چاہیے کہ آرول کی بصیرت آج ہی سب سے زیادہ معنیٰ خیز معلوم ہوتی ہے۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مذکورہ ماحول اور فضا کی پیش کش کا مفہومِ مخالف کیا ہے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ آرول کی ترجیحات اُن اقدار کی بقاء میں مضمر ہیں جن کا فقدان ۱۹۸۴ء کی صورتِ حال کے پیدا ہونے کا سبب بنا ہے؟ اس کا بدیہی جواب اثبات میں ہی دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ طنزیہ تخلیقات دراصل مفہومِ مخالف کے طور پر ابھرنے والی اقدار کا اثبات کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ آج دنیا میں انسانی اقدار سے لاتعلقی اور زندگی کے تمام مظاہر میں جدّت کے نام سے بے جہت ترقی، خود غرضی مادّیت اور نفسی نفسی کی جو کیفیت ہے اس میں آرول کے بیان کردہ خدشات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس لیے اگر ایسی صورتِ حال میں جدید انسان مذہبی اقدار کا متلاشی ہے اور روحانی سکون کی جستجو میں مختلف مذاہب اور نظام ہائے اقدار میں اپنے درد کا درماں ڈھونڈھ رہا ہے تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں کہ کائنات کا ڈھانچہ کچھ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ ہر زمانے میں انسان کو اپنی بے بسی اور نارسائی کا احساس ضرور ہوتا رہتا ہے۔ آج کا انسان اپنی نارسائی اور بے بسی سے نبرد آزما بھی ہے مگر عموماً اس جنگ میں شکست کھا کر اسے کسی روحانی سہارے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔

جارج آرول کے زیرِ بحث ناول میں معاشرتی ابتری اور ہمہ جہت تباہی اور بربادی (Holocaust) کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس میں صرف تین نعروں کی گونج سنائی دیتی ہے

ایک وقت میں انسان کو ایک ہی چیز کی طلب ہونی چاہیے تب تو وہ اُسے مل کر رہے گی لیکن میرا یہ حال ہے کہ میں ہر چیز چاہتا ہوں لہٰذا مجھے کوئی چیز بھی نہیں ملتی۔ بارہا مجھے پتہ چلا کہ جب میں دوسری چیز کا تعاقب کر رہا تھا تو پہلی چیز میرے پاس آکر گزر گئی اور اب وہ میری دسترس سے باہر ہے

— فرانسیسی مصنف آندرے ژید

جنگ ہی امن ہے، آزادی ہی غلامی ہے اور ناواقفیت اور غفلت میں ہی طاقت چھپی ہوئی ہے ——— مگر ان نعروں کے بارے میں بھی آرول کا ایک کردار کہتا ہے کہ ایک مرحلے پر یہ نعرے بھی بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ جب آزادی اور امن کا کوئی تصور ہی باقی نہ رہ جائے گا تو اُن نعروں کو لے کر ہم کیا کریں گے۔ آرول نے اپنے زیرِ بحث ناول کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "صداقت کے دشمن نہ صرف وزارتِ صداقت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں بلکہ عوام میں بھی ہیں جو ۱۹۸۴ء کو پڑھ کر مصنف کی بصیرت کو غیر حقیقی، مریضانہ اور میلو ڈرامائی سمجھتے ہیں اور ان خیالات کو مشتہر کرتے ہیں" ——— آرول کا یہ اندیشہ اُس وقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مثبت اقدار پر اصرار کو آج بآسانی رجعت پسندی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اگر رجعت پسندی یہی ہے تو آرول بھی رجعت پسند تھا اور اقبال بھی، جس نے مطلق العنانیت کے مختلف روپ کی نشاندہی اس طرح کی تھی ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مگر ان حقیقت پسندانہ باتوں کو رجعت پسندی کہنے سے پہلے ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آزادی، امن، مساوات اور مثبت سماجی اقدار کے ماننے والے سارے باضمیر لوگ رجعت پسند ہیں۔ مگر چونکہ یہ بات اعتراف کم اور احتساب زیادہ ہے اس لیے ہمیں اپنے سارے رویّوں پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے جو سیاست اور سیاسی طریقہ کار کی دین ہے

آپ کے نونہالوں کو آپ کا پیار چاہیے

اور یہ کتابیں بھی

چارلس ڈارون

★ ——— ڈاکٹر اطہر پرویز

دنیا کا عظیم سائنس داں جس کے کارناموں نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اور جس کی شہرہ آفاق تصنیف ORIGIN OF SPECIES نے دنیا کے سوچنے کا طریقہ بدل ڈالا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو جانے بغیر آپ کے بچے کا علم مکمل ہو سکے؟

سورج کا انوکھا روپ

★ ——— ڈاکٹر مسز شہناز خاں

اس سے پہلے کہ توانائی کے ذخیرے ختم ہو کر زندگی کو ناممکن بنا دیں، سائنس نے سورج میں توانائی کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تلاش کر لیا۔ یہ کیا ہے اور کیسے کام میں لایا جائے گا، آج کی دنیا میں ہمارے بچوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے۔

دنیا کی بہترین کہانیاں

★ ——— ڈاکٹر شہریار

عالمی ادب کی چند منتخب اور دلچسپ کہانیاں جنھوں بچوں کی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعے سے عالمی ادب کا پہلا بھرپور تعارف حاصل ہو جاتا ہے اور دنیا کا ادب پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔

سرسید کا خواب

★ ——— ڈاکٹر نورالحسن نقوی

خواب میں سرسید سے ملاقات جس میں سرسید اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے کیا خواب دیکھا اور کس طرح وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ یہ کتاب محسنِ قوم سرسید کے کارناموں کی پُراثر داستان ہے۔

تاریخ عالم کی کہانیاں

★ ——— حفیظ عباسی

تاریخ عالم کے وہ قصے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ سبق آموز بھی ہیں اور پڑھنے والوں کا حوصلہ بھی بڑھاتے ہیں۔ دنیا کے ان اہم واقعات سے واقفیت بچوں کو دنیا کی تاریخ سے روشناس کراتی ہے اور اُن کے ذہنوں کو وسعت دیتی ہے۔

★ بچوں کے لیے نہایت مفید کتابوں کا یہ سیٹ مجلس اشاعتِ ادب۔ دھلی نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ دہلی کے تعاون سے شائع کیا ہے

★ فوٹو آفسٹ سے باتصویر طباعت

★ خوبصورت سرورق

★ فی کتاب : پانچ روپے

★ پانچ کتابوں کا مکمل سیٹ : بیس روپے

★ محصول خریدار کے ذمے

★ تاجروں کو ۳۳ فی صدی کمیشن

قیمت پیشگی وصول ہونے پر کتابیں رجسٹرڈ پارسل سے بھیجی جا سکتی ہیں

اگر آپ کے بچے نے ابھی پڑھنا نہیں سیکھا یا وہ اردو نہیں جانتا تو اسے یہ کتابیں پڑھ کر سنائیے

BOOKS-N-BOOKS

4/268, Civil Lines, Aligarh-202001

میناطور تصویریں

MINIATURE PAINTING

سیما
لکچرر فائن آرٹ
ویمنز کالج مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

تصویریں بنانے کا فن دنیا میں ہزاروں برس سے چلا آرہا ہے کیوں کہ تصویریں بنانا انسان کی فطرت میں ہے۔ آپ کسی بچے کو کوئلہ یا چاک کے ٹکڑے دے دیجیے وہ فوراً اس سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچے گا۔ کچھ شکلیں بنانے کی کوشش کرے گا۔ انسان نے اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے تصویریں بنائیں۔ جب انسان غاروں میں رہتا تھا تو وہ پڑھنا لکھنا تو جانتا نہیں تھا۔ اس لیے بہت سی چیزوں کو یاد رکھنے کے لیے بھی اُس نے تصویریں بنائیں۔ اُس نے کسی سے کوئی چیز اُدھار لی تو اس کو یاد رکھنے کے لیے اس نے اس چیز کی شکل بنالی۔ اس طرح آرٹ کی شروعات ہوگئی۔ اُس میں خواہش کے ساتھ ساتھ انسانی ضرورتوں کا بھی ہاتھ تھا۔ اس طرح اس نے اپنی خواہش کو بھی پورا کیا اور ضروریات کو بھی۔

آگے چل کر اس نے غاروں میں اچھی اچھی تصویریں بنائیں۔ ہندوستان میں اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں ہم کو شاندار تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ تصویریں گوتم بدھ کی زندگی کے بارے میں ہیں۔ یہاں انسان نے مذہبی تصورات کو تصویروں کی شکل میں پیش کیا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں جو تصویریں نظر آتی ہیں وہ مذہبی تصوّرات پر مبنی تھیں۔ غاروں کے بعد لوگوں نے بڑی بڑی دیواروں پر تصویریں بنائیں۔ ہندوستان میں غاروں اور دیواروں پر جو تصویریں بنائی گئیں اس کے بعد لوگوں نے تاڑ کے پتوں پر تصویریں بنانا شروع کیں۔ ظاہر ہے تاڑ کے پتّوں پر جو تصویریں بنائی گئیں وہ بہت چھوٹی تھیں۔ اس وقت تک کاغذ کی ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ فن کاروں کو تصویریں تو بنانی ہی تھیں۔ انھوں نے پتّوں پر تصویریں بنانا شروع کردیں۔ البتہ دیواروں پر جو تصویریں بنائی جارہی تھیں، وہ بہت بڑی تھیں۔ اتنی بڑی تصویریں بنانے کے بعد اتنی چھوٹی تصویریں بنانا آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے یہ ابتدائی تصویریں بہت معمولی ہیں ٹکنک کے اعتبار سے بھی ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھونڈی ہیں۔ مگر ایک نئے فن کی بہرحال شروعات ہوگئی تھی۔ جسے آج کل ——— MINIATURE PAINTING — یعنی میناتور مصوّری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ "میناتور" مصوری کو سب سے زیادہ ترقی مغل بادشاہوں کے دور میں ہوئی۔ جب کہ بارھویں صدی عیسوی میں بہار اور بنگال میں پال راجاؤں کے زمانے میں بھی میناتور تصویریں بنیں۔ یہ راجا بدھ مذہب کے ماننے والے تھے۔ گجرات اور راجستھان میں بڑی خوبصورت میناتور تصویریں بنیں۔ مگر مغل بادشاہوں نے اس فن کو کہیں سے کہیں پہنچادیا۔ مغل بادشاہ سولھویں صدی میں وسطِ ایشیا سے آئے۔ یہ وسطِ ایشیا کی تہذیبی روایات بھی اپنے ساتھ لائے۔ اُس وقت ایران میں اس قسم کی تصویریں بن رہی تھیں۔ جب مغلوں نے اس میں دلچسپی لی تو اس فن نے باقاعدہ ایک اِسکول کی شکل اختیار کرلی۔ اب کاغذ پر تصویریں بنانے کا رواج بھی عام ہوگیا تھا۔ یہ زمانہ تھا جب کاغذ بھی رائج ہوگیا تھا۔ مغل اپنے ساتھ جو فن کار لائے تھے وہ اُن کے دربار سے وابستہ ہوگئے تھے۔ پھر مغلوں نے ہندوستانی فن کاروں کو بھی اکٹھا کیا۔ ان سب نے مل کر کام کرنا شروع کردیا اور بہت جلد اس کو بامِ ترقی پر پہنچادیا۔ ان کے یہاں ایک تبدیلی اور آئی۔ تبدیلی کا سبب یہ تھا کہ ساری دنیا میں مذہبی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ اِسلام میں تصویریں بنانا ممنوع تھا۔ اس لیے یہ لوگ مذہب سے متعلق تصویریں نہیں بناسکتے تھے۔ اسی لیے مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ Architecture یعنی فن تعمیر پر زور دیا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا کہ فن انسانی فطرت میں ہے اور وہ کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ میناتور مصوّری کے اِس اسکول نے مذہب کے موضوعات کو بالکل نہیں اپنایا۔ انھوں نے بادشاہوں کے دربار کی تصویرکشی کی۔ بادشاہوں کو شکار کھیلتے دکھایا۔ بادشاہوں کو مے نوشی کرتے بنایا۔ غرض اِس قسم کی تصویریں بنائیں۔ مغل میناتور مصوری کا خاص موضوع Court Art یا درباری آرٹ تھا۔

مغل بادشاہوں میں اکبر اور جہانگیر نے اس میں بہت دلچسپی لی، ان لوگوں نے ہی اس اسکول کو بڑھانے کا کام کیا۔ بہترین فن کاروں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جن میں ہندوستان کے ہندو آرٹسٹ بھی تھے۔

بابر پہلا مغل بادشاہ تھا جو ہندوستان آیا تھا۔ اس کی ساری زندگی خیموں میں گزری۔ لڑائیوں ہی نے اس کو موقع نہ دیا کہ وہ کسی اور طرف توجہ دیتا۔ اس کا بیٹا ہمایوں علم و ادب اور آرٹ کا بڑا قدردان تھا۔ مگر مسلسل شکستوں کے بعد اس کے ہاتھ سے ہندوستان کی حکومت

نکل گئی۔ پھر سے اقتدار واپس لانے میں اس کو پندرہ سال کا وقفہ لگا۔ یہ پندرہ سال ہمایوں نے برباد نہیں کیے۔ ایران گیا وہاں خوب گھوما پھرا۔ شاعروں اور فن کاروں سے ملا اور جب اس نے دوبارہ حکومت حاصل کی تو تبریز کے مشہور فن کار میر سید علی اور شیراز کے فن کار عبدالصمد کو اپنے دربار میں بلایا۔ ان فن کاروں نے ہندوستان کے فن کاروں کے ساتھ مل کر داستان امیر حمزہ کی تصویریں بنائیں۔ اس لحاظ سے یہ تصویریں بہت اہمیت رکھتی ہیں کہ ان میں ایرانی طرز کے باوجود یہ ہندوستانی لگتی ہیں۔

اکبر کے زمانے میں بھی مینا تور تصویروں کے فن کار کو بڑی ترقی ہوئی۔ اُس نے اپنے باپ کے اس کام کو اور آگے بڑھایا اور ہندوستان کے کونے کونے سے اچھے اچھے آرٹسٹوں کو اکٹھا کیا۔ اکبر ہندوستان سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے ہندوستان کی پرانی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کروائے اور ان کتابوں میں تصویریں بھی بنوائیں "رزم نامہ" مہابھارت کا با تصویر ترجمہ ہے۔ اکبر کے زمانے کے مشہور ہندوستانی آرٹسٹ دسونت، بساون اور لال تھے۔ ١٦٠٥ء میں اکبر کی موت کے بعد ایرانی اور ہندوستانی طرز الگ الگ ہوگیا۔ شاہجہاں کو عمارتیں بنوانے کا شوق تھا۔ اس کو مصوری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ پھر اورنگ زیب کٹر مذہبی آدمی تھا۔ اس لیے اس کے زمانے میں مصوری کے فن کا چلنا ناممکن تھا۔

مغلوں کے زمانے میں Portrait Painting یعنی شبیہ نگاری اور Book Illustration یعنی کتابوں کو مصور کرنے کے آرٹ میں بڑی ترقی ہوئی۔ آج کل جب کہیں گھومنے جاتے ہیں تو اپنے ساتھ کیمرہ لے جاتے ہیں اور خوبصورت جگہوں پر اپنی تصویریں کھنچواتے ہیں اور خوبصورت مناظر کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ اس زمانے میں کیمرے کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ مغل بادشاہ جب کہیں جاتے تھے تو اپنے ساتھ آرٹسٹوں کو لے جاتے تھے اور تصویریں بنواتے تھے۔

مغلوں کے یہاں کام کرنے کا خاص ڈھنگ یہ تھا کہ ایک تصویر ایک آدمی نہیں بناتا تھا بلکہ اس کو بنانے میں کئی آرٹسٹ مل کر کام کرتے تھے۔ خاکہ کوئی بناتا تو رنگ کوئی اور بھرتا تھا چہرہ کوئی اور بناتا تھا تو کپڑے دوسرا فنکار بناتا تھا جو جس فن کا ماہر ہوتا تھا وہ اس کام کو کرتا تھا۔ یہ طریقہ ایران سے ہندوستان آیا تھا۔

مغل مینا تور تصویروں میں تصویروں کے ساتھ لکھائی بھی کچھ تصویروں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں فارسی درباری زبان تھی۔ ان تصویروں پر فارسی میں اشعار لکھے ہوئے ہیں ان شعروں کا تصویر کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہو تھا۔ ایک خاص بات اور مغل آرٹ کی تھی وہ یہ کہ یہ مردانہ آرٹ تھا۔ اُن کے یہاں زیادہ تر جو تصویریں ہیں وہ مردوں کی ہیں کیوں کہ مغل اسکول 'درباری آرٹ' تھا اور عورتیں پردے میں رہتی تھیں۔

اب اس مغل اسکول کے ساتھ ساتھ جو کہ اسلامی طرز کا تھا ایک اور اسکول کی شروعات ہوگئی جو راجپوت اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اصل میں اس اسکول کی شروعات تو مغل اسکول سے پہلے ہی نویں صدی میں ہوگئی تھی ان چھوٹی چھوٹی تصویروں میں اجنتا کے فریسکو کے اثرات نظر آتے ہیں اجنتا میں گوتم بدھ کی زندگی کو تصویروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ بودھ مذہب کے خاتمے کے بعد ہندومت کا پھر سے زور ہوا، تو فن نے بھی نئی شکل اختیار کرلی۔ اب دیومالائی ادب میں لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ مندروں کے جلوسوں کی شان و شوکت، ہتھیاروں کی رونق، مذہبی رسومات کے تقدس نے لوگوں کے دلوں میں امنگیں پیدا کردیں مندروں کی سجاوٹ اور پوجا کے لیے بتوں کی ضرورت ہوئی۔ اب مجسمہ سازی کے فن کا زور ہوا مگر ہمارا دیش روایت پسند ہے۔ اس لیے اس نے مصوری کو نہیں چھوڑا۔ اور اس زمانے میں جو تصویریں بنیں وہ راجستھانی اسٹائل کی تھیں۔ یہ طرز دراصل جے پور سے پھلا پھولا۔ جب مغلوں کا زمانہ آیا تو جے پور اور دوسرے شہروں کے فنکار مغلوں کے دربار میں پہنچے۔ اور ان لوگوں نے ایرانی آرٹسٹوں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کردیا۔ کچھ تصویریں ان کے ساتھ مل کر ایرانی طرز پر بنائیں یا مغل تصویروں کے جو موضوع تھے، ان پر کام کیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ خالص ہندوستانی طرز سے کام کرتے رہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں جب مصوری ختم ہوگئی تو یہ ہندوستانی فن کار ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بکھر گئے۔ خاص طور سے پنجاب اور ہمالہ کے مختلف علاقوں میں جا کر رہنے لگے تھے۔ یہاں ایک خاص قسم کا طرز نظر آتا ہے جس کو کانگڑہ قلم کہتے ہیں اب لوگ اس کو "پہاڑی" بھی کہنے لگے ہیں۔ کیوں کہ یہ مصور پہاڑی علاقوں میں جا کر بس گئے تھے جیسے نورپور، بسوہلی، چمبا، جموں کانگڑہ کے اطراف میں ـــ یہاں ان فن کاروں نے غیر معمولی کام کیا

بہ سترھویں صدی کے وسط کے زمانے کے ہیں۔

مغل اسکول میں اسلامی طرز پر کام ہوا۔ ان کے رہن سہن لباس سب کا تعلق مغل بادشاہوں کے درباروں جیسا تھا اور راجپوت اسکول میں ہندو آرٹسٹوں نے اپنی مذہبی کہانیوں دیومالاؤں اور راگ راگنیوں اور عام لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کو بنایا۔ انھوں نے روزمرہ کی زندگی کے عام موضوعات کو لے کر تصویریں بنائیں۔ ان میں اجنتا فریسکو کا ایک مذہبی رنگ شامل ہے۔ لیکن یہ ہندوستانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اور ہندوستان کے عوامی سنگیت میں اس کی جڑیں ملتی ہیں۔ یہ دیہات کے عام انسان کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس طرح اس آرٹ کے دو رُخ ہیں۔ ایک اس کی اپنی زندگی اور دوسری اس کی مذہبی دنیا — انھوں نے روشنی کا تاثر سونے سے دیا ہے۔ پہلے سونے کے پانی سے کاغذ کو رنگ لیتے تھے۔ پھر تصویریں بناتے تھے۔ اس طرح یہ فن کار روشنی کو پینٹ کرتے اور اس کا مقابلہ کوئی نہ کر سکتا تھا۔ جاپانیوں کے یہاں بھی یہ طریقہ تھا مگر راجپوتوں نے اس فن کو کمال پر پہنچا دیا۔

یہ آرٹسٹ چپ چاپ تنہائی میں کام کرتے رہے۔ کسی کو ان کے کام کے بارے میں معلوم بھی نہیں تھا۔ ان کے کام کا اس وقت اچانک پتہ چلا جب یہ فن آخری سانس لے رہا تھا۔ جب سڑکوں اور ریل گاڑیوں سے ان تک رسائی ہوئی، تب لوگوں کے سامنے اُن کا کام آیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس کا زوال ہوا۔ لیکن کانگڑہ

راجستھانی آرٹ کا ایک

اسکول کو سب سے بڑی چوٹ تو ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو پہنچی۔ جب "دھرم شالہ" میں زبردست زلزلہ آیا جس نے کانگڑہ کے خوشحال شہر کو برباد کر دیا اور بھرا پُرا شہر مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا اس میں نہ صرف یہ کہ فن کاروں کا خاتمہ ہوا، بلکہ ان کی بنائی ہوئی بیشتر تصاویر بھی خاک ہوگئیں اور یہ تھا انجام راجپوت اسکول کا۔ جو صحیح معنوں میں ہندوستان کا اصل فن تھا★

کام کی باتیں

نقیب الاسلام ثمر اعظمی

★ مہاسے۔ سنترہ کا چھلکا (سوکھا ہوا)۔ انڈے کا چھلکا۔ کتیرا۔ جو۔ چنا سور۔ گیہوں کا نشاستہ۔ بادام کی گری۔ خربوزہ کے بیج گری ہر ایک ۱۲ گرام لے کر سفوف بنالیں اور بقدر ضرورت پانی میں لیپ بنا کر چہرے پر سوتے وقت لگائیں۔ صبح کو ہلکے گرم پانی سے دھوئیں اور چنبیلی کا تیل لگائیں۔ اس سے جھائیاں بھی دور ہوں گی اور چہرے کی خوبصورتی بھی بڑھے گی۔

★ خشک و تر خارش:۔ مہندی کے پتے خشک کر کے سفوف بنا کر گھی میں ملا کر خارش کی جگہ لیپ کریں

★ پھوڑے پھنسیاں۔ السی پانی میں پیس کر لیپ کریں اور پھوڑوں پر لگائیں۔ پھوڑا دھیرے دھیرے خود بخود پھٹنے لگے گا۔

ان بجھا چونا چربی میں اچھی طرح ملا کر لگائیں۔ پھوڑا آسانی سے پھٹ جائے گا۔

ترقی کا راز

انگریز قوم نے جو اس قدر ترقی کی ہے وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ تمام علوم و فنون اُسی زبان میں ہیں جو وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر انگریزی زبان میں تمام علوم و فنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن یا گریک میں یا عربی فارسی میں ہوتے تو تمام انگریز اب تک ایسے ہی جاہل اور بے علم اور ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں اور آئندہ کبھی جب تک کہ تمام علوم و فنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے ہم جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی — سرسید

روبی شمپو پاؤڈر
سے
بال سیاہ ، گھنے ، لمبے اور چمکیلے ہوجاتے ہیں
آپ بھی اپنی شخصیت کو
جاذب نظر بنانے کے لیے
روبی
شمپو پاؤڈر
کا استعمال کریں
روبی شمپو پاؤڈر بالوں کو
سیاہ ، گھنا ، لمبا اور
چمکیلا ہی نہیں بناتا بلکہ بالوں
کی دوسری بیماریوں، جیسے
بالوں کا وقت سے پہلے سفید
ہونا، کمزور ہوکر گرنا، بالوں
میں خشکی اور خارش کو
ختم کر دیتا ہے
آج ہی اپنے
قریبی اسٹور
سے طلب
فرمائیں۔

اکسیر شباب

ہاضمی

ڈاکٹر انیس احمد انصاری (ایم.ڈی)
اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ابن النفیس - ریوی دورانِ خون کا محقق

بعض مغربی مورخین نے عرب مسلم اطباء کے تحقیقی کارناموں کو نظر انداز کر کے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ عرب اطباء نے طب کی ارتقاء کے دوران کوئی قابل قدر تحقیقی کارنامے انجام نہیں دیے۔ مثلاً ایک مشہور مورخ پروفیسر ای۔جی۔ براؤن اپنی کتاب "عریبین میڈیسن" میں لکھتا ہے کہ

"یہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ مسلم عرب اطباء محض ایمانداری کے ساتھ یونانی علوم وطب کو (یورپ) منتقل کرنے والے تھے اور وہ کسی نئے فن کے موجد نہیں تھے۔"

حالاں کہ طب کی تاریخ کا اگر غیر جانبداری اور بنظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ منکشف ہوتا ہے کہ عرب اطباء نے یونانی طب کو من وعن تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے یونانی اطباء کی اندھی تقلید کی۔ مزید برآں انھوں نے صرف یونانی طبی کتابوں کے محض عربی زبان میں تراجم ہی نہیں کیے بلکہ عرب اطباء نے بیشتر مقامات پر یونانی اطباء سے اختلاف کیا۔ نیز اپنے ذاتی تجربوں و مشاہدات کی بنیادوں پر نئے نئے نظریات طب میں ایجاد کیے اور وہ طب جو عرب اطباء کو یونانیوں سے ملی تھی اس میں اس قدر ایجادات واضافات کیے کہ آج کے بہت سے مورخین طب یونانی کو اب "طب العرب" یا "طب الاسلامی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اُن عرب اطباء میں جنھوں نے اپنے تحقیقی وعلمی کارناموں کے ذریعہ طب کو ایک نئی جہت وسمت عطا کی ایک بلند پایہ طبیب علاء الدین ابی الاعلی' علی بن الحزم القرشی الدمشقی (۱۲۱۰-۱۲۸۸ء) ہے جو ابن النفیس کے نام سے دنیائے طب میں زیادہ معروف ہے اس نے ریوی دوران خون (Pulmonary Blood Circulation) کی وضاحت ودریافت سرویٹس سے تین سو سال قبل ہی کر دی تھی۔ ابن النفیس کی اس عظیم دریافت کی بنا پر آج اس کا نام آسمان طب پر روشن ستارے کی طرح درخشاں ہے۔

ابن النفیس دمشق کے قریب القرشیہ گاؤں میں پیدا ہوا۔ طب کی تعلیم اس نے وہاں کے مشہور طبیب الدقوان (۱۲۳۹ء ف) سے حاصل کی۔ ساتھ ہی اس نے علم نحو، فلسفہ ودینیات کے علوم میں بھی کمال حاصل کیا۔ کچھ عرصے بعد ابن النفیس قاہرہ گیا جہاں وہ اپنی ذاتی قابلیت اور معالجانہ حذاقت کی وجہ سے مصر کے سرکاری ہسپتال (منصوری ہسپتال) کا طبیب اعلیٰ مقرر ہوا۔ علاوہ ازیں اس نے بادشاہ وقت کے طبیب خاص کا اعزاز بھی پایا۔ اور ۸۰ سال کی عمر میں قاہرہ میں ہی وفات پائی۔

ایک عربی مورخ ابن النفیس کی معالجانہ صلاحیتوں کا یوں معترف ہے کہ

"وہ اس راستے سے نہیں ہٹا جس کی اس نے تعلیم پائی۔ اور وہ اس وقت تک کوئی دوا نہیں لکھتا تھا، جب تک کہ وہ پہلے غذا نہ تجویز کر دے (یعنی وہ علاج بالغذا پر زیادہ زور دیتا تھا اس سے ناکامی کی صورت میں وہ دوا سے علاج کی طرف راغب ہوتا تھا۔ چنانچہ اچھے طبیب آج بھی علاج بالغذاء کو علاج بالدوا پر اولیت دیتے ہیں) اور وہ مرکب دوا استعمال نہیں کرتا تھا جب تک کہ مفرد دواؤں سے علاج نہ کر لے (آج بھی طب کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ پہلے مفرد دواؤں کے ذریعہ علاج کرنا چاہیے ان سے ناکامی کی صورت میں مرکب ادویات کی طرف رجوع کرنا چاہیے)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن النفیس نے نتائج اخذ کرنے میں اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کو ہی بنیاد بنایا اور اپنے سے سابق اطباء کے تجربات اور بیانات پر اکتفا نہیں کیا۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور کتاب "شرح تشریح القانون" کے تعارف میں رقمطراز ہے کہ

"میں نے اعضاء کے تشریحی بیان میں اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کو اولیت دی ہے۔ بلا اس خیال کے کہ میرے یہ نتائج سابقہ اطباء کے بیان کے مطابق ہیں یا مخالف۔"

یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابن النفیس ایک محققانہ ذہن کا مالک تھا۔ ابن النفیس ریوی دوران خون کی دریافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "

"قلب کے دونوں جوف (ventricles) کے درمیان کوئی راستہ نہیں ہے۔ جس سے خون گزر سکے آنے والا یا نظر نہ آنے والا راستہ نہیں ہے جس سے خون گزر سکے جیسا کہ جالینوس(۲۰۱ء) کا خیال ہے بلکہ اس مقام پر قلب کے مسامات مسدود ہوتے اور یہ حصہ موٹا ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب خون ہلکا ہو جاتا ہے تو یہ شریان ریوی (Vena Artreosa) کے ذریعے پھیپھڑوں میں چلا جاتا ہے جہاں یہ ہوا، نسیم (ozo) سے ملاقی ہوتا ہے اور صاف ہوتا ہے تب ورید شریانی (Arteria-Venosa)-کے ذریعہ قلب کے بائیں جوف میں چلا جاتا ہے۔"

ابن النفیس کے دور میں مذہبی رکاوٹوں کی وجہ سے انسانی لاشوں کا اشراح (ڈائسیکشن) بہت مشکل امر تھا اور اطبار چھپ چھپ کر انسانی لاشوں کا اشراح کرتے تھے۔ تاہم ابن النفیس کے لیے یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس نے قلب کا اشراح کافی تفصیل سے کیا ہوگا۔ ورنہ یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ جالینوس(۲۱۳ء) اور ابن سینا(۱۰۰۹ء) کے نظریات کو یکسر مسترد کر کے ریوی دوران خون کا ایک نیا نظریہ پیش کرنے کی جسارت کرتا۔ لیکن وقت کی ستم ظریفی کہ ابن النفیس کے ہم عصر اور بعد کے عرب طبیبوں نے بھی اس کی اس عظیم دریافت کو جائز مقام نہیں دیا اور یکسر فراموش کر دیا۔ اور قریب دو سو سال بعد ایک مغربی محقق مائیکل سروٹیس (۱۵۱۱ء - ۱۵۵۳ء) نے اس کی کتاب "شلسام تشریح القانون" سے اس نظریے کو بے کر بغیر اس کا ماخذ بتاتے ہوئے اپنے نام سے دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور وہ برسوں تک ریوی دوران خون کی تحقیق کے لیے خراج تحسین وصول کرتا رہا۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں محی الدین الططاوی نے فریس برگ جرمنی کی میڈیکل فیکلٹی میں اپنی ایک تھیسس "Der Lungenkreis-lauf nach al-Koraschi" کے ذریعہ ریوی دوران خون کی تحقیق کا تاج سروٹیس کے سر سے اُتار لیا اور اس کے اصل حقدار ابن النفیس کو پہنا دیا۔ لیکن مغربی سائنس دانوں نے ابن النفیس کی اس دریافت کو آسانی سے تسلیم نہیں کیا اور ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اوائل تک فرانس اور جرمنی میں علمی مباحث جاری رہے۔ حتیٰ کہ ۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو عبدالکریم نے ایک اور تھیسس بعنوان "Ibn al Nafis - et la Decoverte de la circulation Pulmonaire" اکیڈمی فرانس میں پیش کر کے ابن النفیس کو خراج تحسین پیش کیا۔ بعدازاں ۲۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ایل بنٹ اور اے ہرین نے اکیڈمی آف میڈیسن میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں طویل بحث و مباحث کے بعد بالآخر ابن النفیس کو ریوی دوران خون کا محقق مان لیا گیا۔

* شوق وہی مانگتا ہے جو مشکل ہو۔
* عہد انسانوں سے بہت پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔
* خواہش بھی آندھی کی طرح ہر دم نئی بستیاں بسانی ہے۔
* تجربے کی تلخی وقت کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے اور فاصلہ اس میں رنگ بھرتا ہے
* انسان نے اپنے تاریخی سفر میں بہت سی منزلیں صرف اس صورت میں سر کی ہیں کہ فرار کا راستہ بند ہو چکا تھا۔
* اونچا بولنا قوت کا اور بے مصرف بولنا مہلت کا غلط استعمال ہے۔

— مختار مسعود

اسلام کی اشاعت اور عورتوں کی خدمات کی اہمیت

اسلام کی اشاعت اور حفاظت بظاہر ان قربانیوں اور عزیمتوں کی رہین منت ہے جو مومنوں نے اس راہ میں دی ہیں۔ اسلام کے اس تناور درخت کی آبیاری انہی پاک نفس مسلمانوں کے خونِ دل سے ہوئی ہے جنہوں نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان و مال عزت و اقتدار سب کچھ کا سودا کر لیا، اس میں مرد عورت دونوں نے یکساں طور پر حصہ لیا ہے اسلامی تاریخ کے اس حصے پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جو عورتوں کی خدمات سے متعلق ہے۔

پہلی مسلمان عورت: اللہ تعالیٰ نے اپنی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کا شرف ایک عورت ہی کو عطا کیا۔ محدثین اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو سب سے پہلے جس ذات نے قبول کیا وہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تھیں۔ وہ نبی پاکؐ کی پہلی شریکِ حیات تھیں اور سب سے پہلے وصال کر گئیں۔ ان کے وصال پر آنحضورؐ غیر معمولی غمزدہ ہوئے تھے، اور آپؐ کا یہ غم محض اس وجہ سے نہ تھا کہ آپؐ کی زوجۂ مطہرہ وفات پا گئی تھیں، بلکہ ایک ایسی رفیقہ کے جدا ہونے کا غم تھا جو آپؐ کی ہمراز، دمساز، غم خوار، مشیر کار اور مخلص وہمدرد تھیں، وہ آپؐ کو صبر کی تلقین کرتی تھیں، ہمت بڑھاتی تھیں اور عملاً آپؐ کا دکھ درد بانٹنے والی خاتون تھیں۔ بخاری شریف کے بالکل شروع میں یہ روایت آتی ہے کہ جب غارِ حرا میں آنحضورؐ پر پہلی وحی کا نزول ہوا تو آپ گھبرائے ہوئے حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا مجھے چادر اڑھا دو۔ میری جان کو خطرہ لاحق ہے۔ تو حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو ڈھارس بندھائی اور کہا، ہرگز نہیں! خدا کی قسم اللہ آپؐ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ کیوں کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور حق کی خاطر مشکلات برداشت کرتے ہیں۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکّہ

کے ابتدائی ا... راحت و آرام، امن و سکون، ملک و
...ہین لیے گئے ہیں۔ ان سب کا واحد سبب
پڑھتی تھیں ...ر نا ہے۔ بادشاہ سمجھتا ہے کہ رعایا صرف
رسولِ اکرمؐ ...م اس کی رعایت کرنے کو تیار نہیں۔ اسی
نظر بند ہونا پڑا ...نے سے ہم اخلاقی حیثیت سے اتنا گر چکے
کفارِ مکہ نے ...ہوءِ معاشرت کے اس مقام پر پہنچ چکے
دیں ...دی مسکرا مسکرا کر ہمارا استقبال کر رہی
کو غالب کر... ری غفلت کی آنکھیں بند ہیں اور ہم اور
اس دین کو ...خر گوش میں ہیں۔ اس لیے کہ ہماری قوم
اسی دین کی ...کا رہے، اس کا واحد سبب جہالت ہے۔
کوئی مخصوص ...غفلت اور کاہلی ہے۔ یعنی علم دین سے غافل
اور باقی مسل... غفلت اور کاہلی نے ہمیں دین اور دنیا
داعی تھا اور ...کر رکھا ہے۔ نہ ہمارے پاس علوم ہی ہیں
مرد و عورت ...ے ہم شیدائی ہیں۔ یہ ہیں کرشمے ہماری
عورتوں نے ...رات ظاہرا علوم سے متصف ہیں وہ اپنے
تو اسلام کی ...تنا سمجھتے ہیں حالاں کہ وہ خود بھی جہل مرکب
سیدنا عمرؓ ...ہوں نے فنون کو علوم سمجھ رکھا ہے۔ حقیقت
کی بہن فاطمہؓ ...ر کے ذریعے خالق ومخلوق کی معرفت، بندہ
اس طرح ...ر کے نقص کی معرفت اور دنیا و آخرت کی
ام حکیمؓ کے ...ہے۔ جن فنون کو ہم علوم سمجھتے ہیں، وہ
عورتوں کو ا... یں۔ کیوں کہ ان فنون سے ہماری معاشرت
نے دعوت و... نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے
رول ادا کیا ...سکتے ہیں۔ جس کو اکبر الہ آبادی نے انھیں
اسلا... ...کے تین بڑے بڑے اداروں کا ذکر کرکے
جڑ پکڑ رہی ...ری ہے کہ کس علم سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے
اس دعوت ...
کھلنے کے لیے
مسلمانوں کو ...یوبند + اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند
ڈھاتے تھے ...بیہ لو + ایک معزز پیٹ اسکو مان لو
کا فیصلہ کرنا ...ری نے اس علی گڑھ کے ادارے کو جس کو

ہم علم کا مخزن کہتے ہیں، یہاں کے حصول علم کا نتیجہ صرف پیٹ کو معزز کرنا بتایا ہے۔ لہٰذا ہم ایسے علوم کو علوم نہیں کہہ سکتے جس کے ذریعے ہماری صحیح رہبری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسی زمانے کے ایک بہت بڑے سائنس داں کا مقولہ ہے جس نے تمام انسانوں کو مخاطب کرکے یہ کہا ہے کہ

"اے انسانو! تم اپنی عقل اور سائنس کے ذریعے
ترقی کے اس مقام پر پہنچ گئے ہو کہ ہوا پر اُڑتے
ہو اور سمندر کی تہہ میں غوطہ لگاتے ہو۔ یہ تو ہے
تمہاری ترقی کا عالم۔ مگر تم کو ابھی تک انسانوں
کی طرح زمین پر چلنا نہیں آیا۔"

دیکھا آپ نے آپ ہی کے سائنس داں ایسی باتیں فرما رہے ہیں کہ آپ ترقی کی معراج تک تو پہنچ گئے مگر انسانیت کے راز سے محروم ہیں۔ اسی وجہ سے یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری قوم جس حالت سے دوچار ہے وہ علم انسانیت ہے، حیوانیت نہیں۔ ہماری قوم جو تمام اقوام سے اعلیٰ اور افضل ہے، اس کی علت حقیقی سراپا علم روحانیت ہے جس سے انسانیت نشو و نما پاتی ہے جس کی دلیل علامہ اقبالؒ کا یہ شعر ہے

قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم
صوم ہے ایمان سے ایمان رخصت صوم گم

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن سراپا روحانیت سے متصف ہے۔ جب قوم سے علوم قرآن مفقود ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ یہ روحانیت سے محروم ہو جائے گی اور اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے مادیت کو اپنائے گی۔ جیسا کہ فی زمانہ مشاہد ہے۔ پھر تو اس مادیت کے جو بھی اثراتِ بد مرتب ہو سکتے ہیں وہ بدستور خوب ہی اثر پذیر ہوتے رہیں گے۔ جیسے خالق کا انکار، مخلوق کے حقوق کی ادائیگی سے انحراف، افراط و تفریط میں ابتلا، اعتدال سے محروم اور سب سے بڑی چیز جس سے دنیا کا نظام اور آخرت کی ترقی جس پر موقوف ہے وہ ہے مساوات جو بالکل مفقود ہے جس کی طرف ہم شروع ہی میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے جس چیز کی بنیاد ہی غلط اور ٹیڑھی پڑے گی تو اس عمارت کی ہر دیوار خواہ وہ ثریا تک پہنچ جائے ٹیڑھی اور کمزور ہی رہے گی۔ جیسا کہ شیخ سعدیؒ نے اس کو بہت ہی عمدہ طریقے سے اپنے شعر میں سمجھایا ہے ؎ فرماتے ہیں ؎

خشتِ اول گر نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یعنی معمار اگر پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دے گا تو وہ دیوار ثریا کی بلندی تک ٹیڑھی ہوتی چلی جائے گی۔"

اِس شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ جس چیز کی غلط سے کی جائے گی اس کی انتہا بھی غلط ہی پر ہوگی۔ لہٰذا اس کے نام نہاد عقلاء مساوات کے معنیٰ اور مطلب کو جس طرح سے کر رہے ہیں، اس سے سوائے تخریب کے کچھ اور حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا نتیجہ انتہائی مہلک اور بھیانک شکل میں رونما یوں تو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اور اس کی ہر شا مساوات کی ضرورت بھی جاتی ہے۔ مگر اس پر عمل مثل کالعدم اس لیے ہم صرف مساوات کو تمثیل کے طور پر مرد اور عورت بیان کرتے ہیں کیوں کہ انہیں دونوں کے درمیان عدم میں ابتلا عام ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان مساوا

مرد اور عورت کے درمیان ہم جو مساوات کے قایل وہ مراتب میں ہیں، حقوق میں نہیں۔ اور حقیقت میں یہ مسا نہیں، بلکہ فسادات ہیں۔ ہم سے غلطی یہیں سے شروع ہوتی کہ بجائے حقوق میں مساوات برتنے کے مراتب میں مساوات رہے ہیں اور یہ ایسا کرنا خدا کی قدرت سے مقابلہ کرنا ہے کہ جب ہمارے خالق نے مرد اور عورت کی معرفت کرادی اور ا مراتب اور حقوق کو الگ الگ بیان کر دیا تو کبھی بھی ان دونو غلط ملط نہیں کر سکتے۔

مرد جس میدان کا مجاہد ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُ جس ساخت کا بنایا ہے، جتنی صفتیں اور صلاحیتیں اس کو عطا وہ صفات اور صلاحیتیں عورت میں نہیں مل سکتی ہیں۔ اِس با سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ عورت کسی قابل ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو دوسری عظیم صلاحیتوں کا مالک بن ان کی ساخت میں جو نازک پن ہے اس کی مناسبت سے ان میدانِ جہاد الگ ہی بنا رکھا ہے۔ یہ بھی اپنے میدان کی مجا اِس میدان میں مرد کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور نہ اُس می میں عورت کبھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ مثلاً مرد کو اللہ تعالیٰ حکومت اور سیاست کی کامل صلاحیت دے رکھی ہے اور اس جتنے لوازمات ہیں ان کی تمام صفات سے مرد کو متصف کیا ہے یہی اس میدان میں اپنا صحیح کردار ادا کر سکتا ہے۔ بخلاف عو کے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے کامل انتظام امور خانہ داری اور کی تربیت اور پرورش کے گوناگوں صلاحیتوں سے معمور کر

ہے۔ اس میدان میں ایک عورت ہی کامیاب ہوسکتی ہے۔ اس اعتبار
ے مرد کو وزیر خارجہ اور عورت کو وزیر داخلہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا
ی مساوات کو برقرار رکھنے کے لیے ہماری شریعت مقدسہ نے مردوں
ر عورتوں کے حقوق مفصل فرداً فرداً بیان کر دیے ہیں جو اسلامی
بوں میں موجود ہیں ۔

مساوات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بادشاہ جس تخت پر جانشیں
و اسی پر رعایا کو بھی بٹھا دیا جائے، اس طرح حاکم جس کرسی پر ہو،
کوم کو بھی وہی کرسی دے دی جائے۔ یا باپ جس مقام پر فائز ہے
ے کو بھی وہی مقام دے دیا جائے اور شوہر جن چیزوں کا اہل ہے
ی کو بھی ان ہی چیزوں کا اہل بنا دیا جائے۔ بلکہ مساوات کا مطلب
ہے کہ بادشاہ اپنی رعایا کا حق ادا کرے اور رعایا اپنے بادشاہ کا
ق ادا کرے۔ اسی طرح سے حاکم، والد، استاد، شوہر اپنا اپنا حق
دا کریں، اور محکوم، اولاد، شاگرد اور بیوی اپنا اپنا حق ادا کریں
پس میں برابر حقوق کی ادائیگی کا نام ہی مساوات ہے۔

ہماری باتوں سے شاید آپ کو اشکال ہو سکتا ہے کہ اس
انے میں ہم زیادہ تر عورتوں کو ہی مردوں کی جگہ بڑے بڑے
راتب پر فائز دیکھتے ہیں اور ہماری نظروں میں وہ کامیاب نظر
تی ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شئے کی کامیابی کی ایک صورت
تی ہے اور ایک حقیقت ہوتی ہے۔ محض صورت کو ظاہراً کامیاب
صحت مند دیکھ کر حقیقت کا حکم نہیں لگا سکتے۔ اس کی مثال ایسی
ہے جیسے ایک جگر کا مریض ہو جس کا سارا جسم جگر کی خرابی کی
ہے خوب پھول کر موٹا ہو گیا ہو تو کیا کوئی طبیب اس کو صحتمند
سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ حالاں کہ ظاہراً اس کا جسم، چہرہ، ہاتھ و
خوب سڈول اور خوب پھولا ہوا ہے۔ کہیں سے کمزور دکھائی
یں دیتا۔ بلکہ وہ مریض کھانا بھی پہلے سے زیادہ کھاتا ہے اور
ہ اس موٹے پن سے خوب خوش بھی ہے اور دوسرے غیر طبیب
رات بھی اسے صحت مند نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر طبیب حاذق
مریض کو دیکھ کر بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ اس موٹے اور پھولے
ئے جسم کو صحت مند ہرگز مت سمجھو یہ محض عارضی اور وقتی ہے۔
ار کبھی یہ مرض اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا تو تم کو ہلاک ہی
کے چھوڑے گا۔ لہٰذا یہ اصلاح بدن نہیں ہو رہا ہے بلکہ فساد بدن
رہا ہے۔

اسی وجہ سے یہ اہلِ حقیقت اس قسم کی مساوات
نے والوں کو ہلاکت کے غار میں دیکھ رہے ہیں جس کی تفصیل لکھنے
لیے ایک باب چاہیے۔ الغرض کسی کی ظاہری چمک دمک کو دیکھ کر
باطن کی اچھائی پر حکم نہیں لگا سکتے۔ البتہ وہ حضرات ضرور لگا سکتے ہیں جو
اہلِ باطن ہیں جن کو ہم اس سے پہلے اہلِ حقیقت کا نام دے چکے ہیں۔ کیوں
کہ ان حضرات کی نظر ابتداء سے زیادہ انتہا پر ہوتی ہے۔ لہٰذا جو مساواتِ
شرعی بیان کیے گئے ہیں اگر ان کا لحاظ نہ رکھا جائے گا اور مرد و عورت
کے حقوق کو ایسے ہی خلط ملط کرتے رہیں گے تو ان دونوں کا نتیجہ بالکل
ایسے ہی ظاہر ہوگا جیسے دو برقی تار اگر آپس میں خلط ملط ہو جائیں تو
فیوز ہو جاتے ہیں اور روشنی ظلمت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی اس
طرح ہمارا معاشرہ بھی تاریکی وظلمت سے بھر جائے گا۔ اس خلط ملط کی ایک
اور مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک جہاد کا میدان ہے اور ایک کاشت کا میدان
ہے یا ایک کھیل کا میدان ہے اور تینوں میدانوں کے مرد جدا جدا ہیں۔
مگر تینوں کو میدان ہی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم مساوات کا یہ مطلب لیں
کہ مجاہد کو کھیل کے میدان میں اور کاشتکار کو میدان جہاد میں رکھ دیں
تو آپ ہی بتلائیے کہ اس میدانِ جہاد اور اس میدان کاشت کا کیا عالم ہوگا
اور وہاں پر کیا کامیابی اور ترقی ہوگی۔

اس طرح حاکم و محکوم، امیر و غریب کے درمیان جو بھی مساوات
ہم اختیار کریں گے وہ ان چاروں کے حقوق میں ہوں گے مراتب میں
نہیں جیسا کہ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مساوات کی حقیقت
اور اس کے علم سے ہم جب تک واقف نہیں ہوں گے اس وقت تک ہمارا
ملک ہماری قوم ہماری معاشرت کامیابی اور ترقی کی راہ پر گامزن نہیں
ہو سکتی۔

اللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا
الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ

اے اللہ ہم سب کو حق کی باتیں صورت حق ہی میں
دکھلائے اور اس کی اتباع کی توفیق عنایت فرمائے
اور باطل کو باطل ہی دکھلائے اور ہم سب کو اس سے
بچنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین)
وما علینا الا البلاغ

السید افتخار احمد نقوی
علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج،
علی گڑھ

حارث بن کلدہ ثقفی

ظہورِ اسلام کے بعد تین سو سال تک کوئی قابلِ ذکر صاحبِ تصنیف مسلمان طبیب نہیں ہوا۔ پہلا مسلم صاحب تصنیف طبیب یعقوب بن اسحاق الکندی تھا۔ اسی طرح اگر تاریخ عرب پر ایک محققانہ نظر ڈالی جائے تو ہمیں عرب کی سرزمین پر طب یونانی کے پہلے نمائندے کی حیثیت سے جس کا نام نظر آتا ہے، اسے طبی دنیا حارث بن کلدہ ثقفی کے نام سے جانتی ہے۔

حارث بن کلدہ ثقفی عرب میں طب یونانی کا پہلا نقیب اور طب کا باقاعدہ تعلیم یافتہ تھا۔ جزیرۃ العرب کے باشندے اگرچہ صدیوں سے اپنی ایک مستقل طب کے وارث تھے۔ تاریخ ادب اور لغت کا مطالعہ بھی اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ عربوں میں علم العقاقیر صدیوں سے رائج تھا۔

ساتویں صدی عیسوی میں آفتاب رسالتؐ طلوع ہوا۔ جنھوں نے اپنی تعلیمات سے نہ صرف روح کی بیماریاں دور کیں بلکہ جسم کی طہارت اور شفا کے بہترین اصول بھی دنیا کو بتائے۔ جزیرۃ العرب میں عہدِ رسالتؐ میں متعدد اطباء کے نام ملتے ہیں۔ ان میں طائف کے باشندے حارث بن کلدہ ثقفی کا نام سرفہرست ہے۔

حارث کو دنیا کے متمدن ممالک کی سیر و سیاحت کا موقع ملا تھا اس نے ایران پہنچ کر طب کی تعلیم جندی شاپور کے مشہور طبی مدرسے سے حاصل کی تھی جو اس زمانے میں طبی تعلیم کا اعلیٰ مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس نے امراض کی تشخیص اور دواؤں کے فوائد کا تجربہ بھی کیا۔ طب کی تعلیم مکمل کر کے اس نے یمن آکر وہاں کے اس دور کے اطبّاء سے استفادہ کیا۔ تاریخ کا کوئی بھی ورق ان اطبّاء کا نام ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ حارث کو فنِ موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ عود و ستار ؟ بجانے میں اس کو ید طولیٰ تھا۔ اس نے اس فن کی تعلیم بھی ایران میں حاصل کی تھی۔

حارث بن کلدہ ثقفی عہدِ رسالت سے لے کر خلافتِ راشدہ اور پہلے اموی خلیفہ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد تک زندہ رہا۔ حارث طبیب العرب کہلاتا تھا۔ علاج معالجے میں اسے غیر معمولی شہرت حاصل تھی مشہور صحابی سعد بن ابی وقاصؓ جب مکہ میں علیل ہوئے، مرسلِ اعظمؐ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ آپؐ نے حارث بن کلدہ ثقفی کو بلوانے کی ہدایت فرمائی تاکہ وہ سعدؓ بن ابی وقاص کے لیے کوئی دوا تجویز کرے۔ حارث نے سعدؓ کو دیکھنے کے بعد بتایا۔ حلبہ او[ر] کھجوروں کا جوشاندہ بنا کر ان کو پلایا جائے۔ چنانچہ یہ د[وا] کرائی گئی اور سعدؓ بن ابی وقاص کو صحت نصیب ہوئی۔

حارث بن کلدہ ثقفی اسی طریقے پر اہلِ عرب کے حسبِ [...] ان کا علاج تجویز کرتا تھا اور لوگ شفایاب ہوتے تھے۔ ا[...] اہلِ عرب کے مزاج اور اُن کی عادات کا بڑی محنت سے [...] کیا تھا اور وہ ان کے واسطے نسخوں کی تجویز میں کمال رکھتا [تھا]۔ ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہؓ نے اس سے دریافت کیا۔ "حا[رث] طب کس چیز کا نام ہے؟" حارث نے جواب دیا۔ "پر[ہیز]" حارث بن کلدہ ثقفی سرزمینِ عرب کا وہ طبیب ہے جس کو [...] کے مشہور بادشاہ نوشیرواں سے بھی شرفِ کلام حاصل ہے حارث بن کلدہ نے صحت کے لیے چند اصول مرتب کیے تھے جو د[رج] ذیل ہیں۔

(۱) جوان عورت کے علاوہ دوسری عورت سے شادی نہ کرنا۔
(۲) میوے اور پھل خوب پکے ہوئے کھانا۔
(۳) جب تک بدن بیماری کو برداشت کر سکے اس وقت تک علاج نہ کرنا۔
(۴) دن کا کھانا کھاتے ہی ذرا لیٹ رہنا اور رات کا کھانا کھا کر چہل قدمی کرنا۔
(۵) دوا کے استعمال سے حتی الامکان بچتے رہنا۔ اگر ضرورت [...] ہو کر دوا استعمال کرنا پڑے تو اس وقت تک استعمال کرنا [جب] تک ضرورت ہو۔
(۶) بلا ضرورت دوا کا استعمال موجب مرض ہوتا ہے۔

تصانیف: حارث بن کلدہ ثقفی نے کوئی قابلِ ذکر تصـ[نیف] نہیں چھوڑی ہے۔ صرف اس کا ایک مناظرہ ہے جو اس کے ا[ور] نوشیرواں (مشہور ایرانی بادشاہ) کے درمیان ہوا۔ یہ [...] مکالمہ ابن ابی اصیبعہ کی کتاب طبقات الاطباء میں محفوظ [ہے]۔

★ ★

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

پرسنٹیج کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ ٹینڈرز ۱۵ رمئی ۱۹۸۴ء کو ایک بجے دوپہر تک دفتر پہنچ جانے چاہیں جو کہ اسی روز ۳-۳۰ منٹ پر کھول دیے جائیں گے۔

ہفتہ میں جو کام کے دن مقرر ہیں، ان میں دفتری اوقات کے دوران یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے متعلقہ فارم اور کاغذات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر موصول ہونے کی آخری تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل ٹینڈر فارموں کی فروخت بند کردی جائے گی۔

نمبرشمار	کام کی نوعیت	رقم	زرضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	یونیورسٹی قبرستان میں زمین کی بھرائی اور راستوں کی بنائی	32,690/- روپے	820/- روپے	5/- روپے	تین ماہ
	سی پی ڈبلیو ڈی کے شیڈولڈ کے مطابق				

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس ۔

آئٹم ریٹ کی بنیاد پر ۸ رمئی ۱۹۸۴ء بوقت ایک بجے دوپہر تک سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ ٹینڈر اسی روز تین بجکر تیس منٹ پر کھول دیے جائیں گے ۔ ٹینڈر کے جملہ کاغذات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے کسی بھی دن علاوہ تعطیل کے دفتری اوقات کے دوران حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ٹینڈر فارموں کی فروخت ٹینڈر وصولیابی کی تاریخ سے ۲۴ گھنٹے پہلے بند کردی جائے گی۔

نمبرشمار	کام کی نوعیت	کام کے لیے تخمینی رقم	زرضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	اے/آر ٹو الاٹمنٹ ریذیڈنشیل بلڈنگ	33,900/- روپے	850/-	5/-	۱۵ رمارچ ۱۹۸۵ء

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

ایٹم ریٹ کی بنیاد پر مندرجہ ذیل کاموں کے لیے سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ ٹینڈر سے متعلق کاغذات چھٹی کے علاوہ کارکردگی کے اوقات میں یونیورسٹی انجینئر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ٹینڈر ۱۴ رمئی ۱۹۸۴ء کو دوپہر دو بجے تک وصول کیے جائیں گے۔ اور اسی دن تین بجے سہ پہر کھولے جائیں گے

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کی رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	لڑکوں کی پالی ٹکنیک لائبریری کی تعمیر و توسیع	۱,۳۱,۸۱۳/- روپے	۳۲۹۵/- روپے	۵/- روپے	چار ماہ
۲ (الف)	یونیورسٹی پالی ٹکنیک (لڑکوں کے لیے) میں ورک شاپ، سپرنٹنڈنٹ آفس کی تعمیر اور ورک شاپ میں پیشاب خانوں اور بیت الخلا وغیرہ کی تعمیر	۴۶۹۷۰/- روپے	۱۷۲۸/- روپے	۱۰/- روپے	چار ماہ
(ب)	یونیورسٹی پالی ٹکنیک (لڑکوں کے لیے) کی ورک شاپ سپرنٹنڈنٹ آفس، بیت الخلا، پیشاب خانوں میں سینٹری اور واٹر سپلائی کی فٹنگ کا کام۔	۲۲۲۳۰/- روپے			
		۶۹۱۰۰/- روپے			

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۱۱ [جولائی ۱۹۸۴ء]

فیکلٹی آف میڈیسن میں ایم ڈی/ایم ایس اور مندرجہ ذیل مضامین کے ڈپلومہ کورسیز کے لیے داخلے کے مجاز امیدواروں کی درخواستیں مطلوب ہیں۔

کورس		ممکنہ سیٹیں۔
ایم۔ڈی	۱۔ بائیوکیمسٹری	۱
	۲۔ جنرل میڈیسن	۷
	۳۔ ادبسٹ اینڈ گائنا کالوجی	۳
	۴۔ مائیکروبیالوجی	۳
	۵۔ پیڈیاٹرکس	۳
	۶۔ پتھالوجی	۴
	۷۔ فارماکالوجی	۵
	۸۔ فزیالوجی	۴
	۹۔ پریوینٹو اینڈ سوشل میڈیسن	۳
	۱۰۔ ریڈیو ڈائیگونوسس	۱
	۱۱۔ ریڈیو تھراپی	۱
ایم۔ایس	۱۔ انستھیسیالوجی	۳
	۲۔ اناٹومی	۲
	۳۔ ای۔این۔ٹی	۲
	۴۔ جنرل سرجری	۷
	۵۔ اوپتھلمالوجی	۷
	۶۔ اُورتھوپیڈک سرجری	۲
پی جی ڈپلومہ کورسیز		
	انستھیسیالوجی (ڈی۔اے)	۶
	چائلڈ ہیلتھ (ڈی۔سی۔ایچ)	۶
	اوبسٹ اینڈ گائناکالوجی (ڈی۔جی۔او)	۶
	۴۔ لارین گولوجی اینڈ اوٹولوجی (ڈی۔ایل۔او)	۴
	میڈیکل ریڈیو ڈائیگونوسس (ڈی ایم آر ڈی)	۲
	میڈیکل ریڈیو تھراپی۔ (ڈی ایم آر ٹی)	۲
	آپتھلمالوجی (ڈی او)	۱۲

آرتھوپیڈکس (ڈی۔ اورتھ)

درخواست دینے کے لیے ضروری لیاقت

۱۔ اِس یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا ہو۔ یا کسی اور یونیورسٹی سے وہ امتحان پاس کیا ہو جسے یہ یونیورسٹی ایم۔بی۔بی۔ایس کے مساوی تسلیم کرتی ہو۔

(ل) برائے کلینکل اور پیرا کلینکل مضامین

جن لوگوں کو ایم بی بی ایس کے امتحان میں دو سے زیادہ بار سپلیمنٹری امتحان دینا پڑا ہو وہ اس کے لیے مجاز نہیں ہیں جو امیدوار جب کسی مضمون میں ایک سے زیادہ بار ناکام رہے ہوں وہ اس کے لیے مجاز نہیں ہیں کہ وہ اس مضمون کے پوسٹ گریجویٹ کورس میں داخلہ لے سکیں۔

(ب) برائے نان کلینکل مضامین

نان کلینکل مضامین کے پوسٹ گریجویٹ کورس میں وہ امیدوار داخلے کے مجاز نہیں جنھیں تین سے زیادہ بار سپلمنٹری امتحان میں شریک ہونا پڑا ہو

۲۔ ایم۔بی۔بی۔ایس کا آخری امتحان پاس کرنے کے بعد ایک سال روٹیٹنگ انٹرن شپ کی مدت اطمینان بخش طور پر مکمل کی ہو اور اسٹیٹ میڈیکل کونسل میں اس کا رجسٹریشن مکمل ہو۔

۳۔ ہاؤس فیزیشن یا ہاؤس سرجن کی حیثیت سے ایک سال کام کیا ہو۔ اس مدت میں سے کم چھ ماہ اس شعبے میں کام کیا ہو۔ جو اسی کے تخصص [illegible] کا میدان ہے۔ یا اس کے مساوی متبادل تجربہ ہو جو ایم۔سی۔آئی کا منظور شدہ ہو۔ تجربے کی مطلوبہ مدت درخواست دینے کی جو آخری تاریخ مقرر ہے، اس دن تک مکمل ہو جانی چاہیے۔

تمام وہ امیدوار جن کی ایک سال ہاؤس جاب کی مدّت ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ء کو مکمل ہو رہی ہو، وہ اگر کسی ایسی جگہ کے لیے امیدوار ہونا چاہیں جو جنوری ۱۹۸۵ء میں خالی ہو تو وہ ٹیسٹ کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ جنوری ۱۹۸۵ء میں فارغ ہونے والی جماعت کے امیدواروں کے انتخاب کے لیے کوئی الگ ٹیسٹ یا انٹرویو نہیں ہوگا

جولائی ۱۹۸۴ء اور جنوری ۱۹۸۵ء کے تعلیمی سالوں کے لیے ایم ڈی/ ایم ایس میں اور ڈپلومہ کورسز میں داخلے کے تمام امیدواروں کا ایک مشترکہ امتحانِ داخلہ ہوگا۔ تحریری امتحان اور زبانی امتحان کی کارکردگی کی بنیاد پر امیدواروں کے انتخاب کا فیصلہ ہوگا۔

تحریری امتحان ۱۳ مئی ۱۹۸۴ء کو ہوگا۔ امتحان میں شریک ہونے کے لیے امیدواروں کو الگ سے کوئی اطلاع نہیں دی جائے گی۔ جو امیدوار داخلے کے مجاز ہیں اور انھوں مقررہ وقت کے اندر فارم داخلہ جمع کر دیے ہیں ان سے درخواست ہے کہ یونیورسٹی کے دفترِ امتحان سے داخلہ ٹیسٹ کا کارڈ ایک روز پہلے حاصل کرلیں۔ جس امیدوار کو داخلے کا مجاز نہیں پایا جائے گا، اس کو داخلہ ٹیسٹ کا یہ کارڈ نہیں دیا جائے گا

فارم داخلہ اور اطلاعاتی کتابچہ اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۲۷ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دستی حاصل کیا جا سکتا ہے، یا ڈاک سے منگایا جا سکتا ہے۔ اس کی فیس تین روپے ہے جو پوسٹل آرڈر کے ذریعے ادا کی جانی چاہیے۔ یہ پوسٹل آرڈر فائننس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو واجب الادا ہونا چاہیے — ۲۵ × ۵ اسینٹی میٹر کا ایک لفافہ جس پر اپنا پتہ تحریر ہو، ہمراہ آنا چاہیے۔ جو لوگ فارم

معمولی ڈاک سے طلب کریں وہ اس پر ایک روپیہ نوے پیسے کے اور جو رجسٹرڈ ڈاک سے منگانا چاہیں وہ چار روپے پچاس پیسے کے ٹکٹ چسپاں کریں۔

فارم داخلہ مع ۳۵ روپے کے پوسٹل آرڈر کے جو فائنس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو واجب الادا ہو، رجسٹرڈ ڈاک سے اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۲ کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اس طرح بھیجا جائے کہ ۲۱ مئی ۱۹۸۴ء شام ۵ بجے تک موصول ہو جائے۔

نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

این موئیدین

کنٹرولر آف اگزامینشنز اینڈ اڈمیشنز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱/۸۴ - ۸۵

مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے منظور شدہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ ریڈر ان فزیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی۔

تنخواہ کا اسکیل۔ ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ مع دیگر الاؤنس

تعلیمی لیاقت

لازمی۔ ایم ڈی (فزیالوجی) یا

ایم بی بی ایس مع ایم-ایس سی (فزیالوجی) یا

پی-ایچ ڈی (میڈیکل فزیالوجی) یا

ڈی ایس سی (میڈیکل فزیالوجی) یا

تدریس و تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں پانچ سال کی مدت تک فزیالوجی کے لکچرر کی حیثیت سے کام کیا ہو۔

ii۔ پسندیدہ:۔ تحقیقی مضامین جو اس تخصص اور [illegible] سے تعلق رکھتے ہوں اور ہندوستان یا بیرونی ممالک کے رسائل میں شائع ہوئے ہوں۔

۔ اسسٹنٹ رجسٹرار (پوسٹ مارٹم پروگرام) ڈپارٹمنٹ آف آبسٹیٹرکس وگائنا کولوجی

تنخواہ کا گریڈ ۷۰۰ - ۴۰ - ۹۰۰ ای بی ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ مع دیگر الاؤنس۔

تعلیمی لیاقت

ا۔ لازمی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس اور دو سال کا انیستھیا کے کام کا تجربہ

ii پسندیدہ ڈی۔ اے / ایم۔ ڈی۔

٣۔ لکچرر سائیکالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف سائیکالوجی

٤ لکچرر سائیکالوجی، ویمنز کالج۔

٥ لکچرر اسٹیٹسٹکس۔ ڈپارٹمنٹ آف اسٹیٹسٹکس

تنخواہ کا اسکیل:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ مع دیگر الاؤنس

تعلیمی لیاقت: (ا) ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے معیار کا تحقیقی کام

(ب) تعلیم کا عمدہ مسلسل ریکارڈ۔ فرسٹ کلاس یا اچھے نمبروں سے سکنڈ کلاس (یعنی بی سیون پوائنٹ اسکیل میں) متعلقہ مضمون میں ایم۔ اے / ایم ایس سی کی ڈگری یا اس کے مساوی کسی بیرونی ملک کی یونیورسٹی کی ڈگری۔

چونکہ انٹر ڈسپلنری پروگراموں کے فروغ کی ضرورت کا احساس کیا جا رہا ہے، اس لیے مندرجہ بالا (ا) اور (ب) میں بیان شدہ ڈگریاں باہم تعلق رکھنے والے مضامین میں ہو سکتی ہیں۔ اگر سیلیکشن کمیٹی کی رائے میں کسی امیدوار کا تحقیقی کام (خواہ وہ اس کا تحقیقی مقالہ ہو یا مطبوعہ مضامین مقالات) بہت اعلیٰ معیار کا ہے تو مندرجہ بالا (ب) میں مذکورہ تعلیمی لیاقت کی شرائط میں کمی کی جا سکتی ہے۔

مزید یہ کہ اگر ڈاکٹوریٹ کی ڈگری یا مساوی تعلیمی استعداد رکھنے والا کوئی امیدوار نہ مل سکے یا ایسے امیدوار کو اس جگہ کے لیے مناسب خیال نہ کرے تو کسی ایسے امیدوار کا تقرر کیا جا سکتا ہے جو مسلسل عمدہ تعلیمی ریکارڈ رکھتا ہو (ایم۔ فل یا اس کے برابر کسی ڈگری یا اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام زیادہ اہمیت دی جائے گی) بشرطیکہ اس امیدوار کو کم سے کم دو سال کا تحقیقی کام کا تجربہ ہو یا کسی ریسرچ لیبارٹیری یا ریسرچ کے ادارے میں عملی کام کا تجربہ ہو۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ منتخب امیدوار تقرر کے پانچ سال کے اندر ڈاکٹوریٹ کی ڈگری حاصل کرے یا اس کے معیار کا تحقیقی کام کرنے کا ثبوت فراہم کرے
بصورت دیگر اس کی سالانہ ترقی اس وقت تک کے لیے روک دی جائے گی جب تک وہ اس شرط کو پورا نہ کرے۔

غیر معمولی لیاقت یا تجربہ رکھنے والے امیدواروں کی ملازمت زیادہ تنخواہ سے شروع ہو سکتی ہے۔

انٹرویو کے لیے بلائے جانے والے امیدواروں کو سکنڈ کلاس ریلوے کا ایک طرف کا کرایہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

درخواستوں کے مقررہ فارم وہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار وسلیکشن کمیٹی ، رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پانچ روپے نقد یا فائنس آفس کے کیش سیکشن میں رقم جمع کرکے رسید پیش کریں

یا

انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے جو فائننس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو ، حاصل کیا جاسکتا ہے۔

۱۰ × ۲۳ سینٹی میٹر کا لفافہ جس پر اپنا پتہ تحریر ہو ، آنا ضروری ہے۔
فارم دستی حاصل کیا جاسکتا ہے یا ڈاک سے منگایا جاسکتا ہے۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۰ رمئی ۱۹۸۴ء (شام ۴ بجے تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

مناسب امیدواروں کے نام کو آئندہ تقرر کے لیے پینل میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

پرنٹر پبلشر: نور الحسن نقوی۔ مطبع: شیروانی آفسیٹ پریس دہلی۔ مقام اشاعت: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بہار نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت پہنچاتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے پھنسی خارش اور داد وغیرہ کی
دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یو۔پی

THE
MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تهذیب الاخلاق

جلد ۳ — ۱۶ تا ۳۱ مئی ۱۹۸۴ء — شمارہ ۱۰

مندرجات

ادبار کی نشانیاں

جس قوم کے افراد کی تلواریں آپس ہی میں ٹکرانے لگیں
شکست اس قوم کا مقدر ہوتی ہے
اور
جس قوم میں غدّار پیدا ہونے لگیں
اس قوم کے مضبوط قلعے گھروندے معلوم ہوتے ہیں

— شہید سلطان ٹیپو

The trouble-spot at [illegible]. The two graves in the front are to be shifted to a corner in the south. *The camp is pitched by the PAC* to keep a watch. Behind that is the Shia [illegible], where Muharram is observed by the Shias.

اے گرفتارِ ابوبکر و علی ہشیار باش

ہندوستان کا خوبصورت تاریخی شہر بنارس ہم ہندوستانی مسلمانوں کو بے حد عزیز ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے اکثر منصوبے اسی قیام کے دوران بنائے۔ ان میں ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا تو اس کی پالیسی یہیں مرتب ہوئی۔ ان کے لیے مغربی طرز کی درس قائم کرنے کا خواب یہیں دیکھا اور جب اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کا وقت آیا تو اس کے لیے بھرپور عملی تعاون کا ہاتھ بھی سب سے پہلے یہیں کے حوصلہ مندوں نے پچھلے سال نیند کے ماتوں نے ذرا کروٹ لی اور تعلیمی بیداری کا آغاز ہوا تو امید کی پہلی کرن بھی اسی سرزمین سے پھوٹی۔ اس لیے قوم نے ہمیشہ اس شہر کو فخر اور راحت نظر سے دیکھا۔ آج بھی سارے ملک کی آنکھیں اسی شہر پر لگی ہوئی ہیں۔ مگر بڑی تشویش کے ساتھ، اور ہر لمحہ یہ اندیشہ ہے کہ خدا جانے کب کیا قیامت گزر جائے۔

بنارس کے محلہ دوشی پورہ میں شیعوں کا ایک قدیم قبرستان ہے جس میں سنیوں کی دو قبریں بھی ہیں۔ ان قبروں پر سنی ہر سال چادریں چڑھاتے فاتحہ خوانی کرتے ہیں جس پر شیعوں کو اعتراض ہے۔ معاملہ غالباً صرف اتنا ہی نہیں بلکہ قبرستان سے متعلق آراضی کی ملکیت کا بھی ہے۔ یہ مقدمہ عدالت میں آج سے ایک سو تیس برس سے زیر سماعت ہے۔ پچھلے مہینے عدالت نے فیصلہ کر دیا کہ یہ دونوں قبریں وہاں سے ہٹا دی جائیں۔ سنیوں کو یہ فیصلہ شاق گزرا اور شیعوں کو ہے کہ عدالت کے فیصلے پر جلد عمل درآمد ہونا چاہیے۔ مردہ بدست زندہ ان دو مردوں کو وہاں سے اٹھا کر کہیں اور لٹا دیا گیا تو اس سے ان کے آرام میں خلل پڑے گا مگر ملک میں ضرور ایک نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا اور ایک ہی قوم کے دو فرقوں کے درمیان شگاف پڑ جائے گا۔ قبروں کا ہٹایا جانا۔ تو کوئی نئی بات ہے نہ ایسی پریشان کن بشرطیکہ یہ کسی اہم ضرورت کے تحت ہو عدالت کے فیصلے سے نہیں۔ عدالت کا یہ رخ دیکھ کر اگر بنارس کے شیعہ خود اپنے مطالبے کو واپس لے تو دونوں فرقوں میں دوستی کی مستحکم بنیاد قائم ہو جاتی لیکن آپسی اختلاف میں ہم اکثر ان جماعتوں کا آلۂ کار بھی بنے ہیں جنھوں نے ہماری بیخ کنی میں کبھی کو کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بہرحال یہ بات کچھ کم خوش آئند نہیں کہ ایک شیعہ رہنما اس فتنے کو فرو کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ رہنما ہیں پرنس انجم قدر جو شیعہ پولٹیکل کے علاوہ انجمن اتحاد المسلمین کے بھی صدر ہیں۔

پرنس انجم قدر صاحب نے بار بار کہا ہے کہ قبریں اکھاڑنے کے بھیانک نتائج برآمد ہوں گے۔ کیوں کہ سارے ملک میں شیعوں کے قبرستان ہونے کے برابر ہیں اور شیعہ مردے سنیوں کے قبرستانوں ہی میں دفن کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے سوال کیا کہ جب ان مردوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تو ہمارے دلوں کی کیا حالت ہوگی۔ دوسری طرف سے یہ مطالبہ ہونے بھی لگا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض جگہ مندروں کے قریب جو مسجدیں اور قبرستان ہیں کی نظروں میں وہ کھٹکنے لگے ہیں۔ بنارس ہی کے ایک ہندی اخبار نے لکھا ہے کہ وشوناتھ مندر کے علاقے سے مسجد اور قبریں ہٹا دی جائیں تو مندر کا راستہ اتنا کشادہ ہو جائے گا کہ موٹریں مسجد کے دروازے تک پہنچ سکیں۔ یہ تو شروعات ہے دیکھیے آئندہ کیا ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ پرنس انجم قدر صاحب کی کوششیں بارآور ہوں اور بنارس کے شیعہ سنی فرقوں کے درمیان جو خلیج پیدا ہو گئی ہے وہ مٹ جائے۔

بنارس سے ایک اور تکلیف دہ خبر موصول ہوئی ہے۔ پچھلے سال تعلیم یافتہ مسلمانوں نے وہاں متعدد تعلیمی ادارے قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بڑے جوش و خروش سے اس تعلیمی مہم کا آغاز ہوا، پروگرام بنے، زبردست تیاریاں ہوئیں اور پچھلے مہینے جب سرسید اسکول کا سنگ بنیاد رکھنے کی مبارک ساعت آئی تو خود اپنے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ ان دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ جو لوگ ان اداروں کے قیام کے لیے سرگرداں ہیں الحمدللہ وہ سب بے غرض اور بلند حوصلہ ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی مخالفت ان کے ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتی اور جو اہم کام کرنے کا بیڑا انھوں نے اٹھایا ہے وہ اسے کر کے دم لیں گے (انشاء اللہ)۔ جو دوست کسی غلط فہمی کے سبب مخالفت پر آمادہ ہیں ان سے گزارش ہے کہ سارے اختلافات کو بھلا کر اس اہم کام میں خلوص دل سے شریک ہوں اور مسلمانان بنارس کے وقار کو خاک میں نہ ملنے دیں۔

نورالحسن نقوی

نہ چیں

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار

ہماری نیت بھی آج آپ کو مصر کا بازار دکھانے کی ہے۔ لیکن آپ
جنسِ گراں ہونے کے بارے میں شبہ ہے تو گھبرائیے نہیں۔ آپ کو
ستے ہم بیچنے نہیں لے جا رہے ہیں۔ گو اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ
مصر کے بازار میں بک گئے ہیں۔ آپ ہی سوچیے جنس گراں ہوتے
اکر بکتے۔

وہ غلطی جو سیاحوں کا خاصہ ہے ہم سے بھی سرزد ہو رہی ہے۔ یعنی
ز کے لیے سب سے بڑا شہر دیکھ لیا اور سارے ملک کے متعلق رائے
،۔ رائے اتنی جلدی قائم کرنا حماقت ہے۔ لیکن پورا ملک دیکھنے
نہ ملے تو کیا رائے قائم کرنے کا حق بھی نہ رہا۔ ہر وہ شخص جو
ت کے لیے نکلتا ہے رائے ظاہر کرنے کے لیے اسی قدر بے تاب رہتا
ے غزل کا شاعر کلام سنانے کے لیے، یا ہمراز راز کو افشا کرنے یا ٹوہی
، کی کمزوریوں کو الم نشرح کرنے کے لیے۔ اس سب کی کیفیت بے تابی
ِ اضطراب وضعِ حمل سے قبل کی سی ہوتی ہے۔

مصر نے ہمارے من کو موہ کیوں لیا، اس کی تفصیل میں ہم نہ جائیں
ن دو باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جن میں ربطِ باہم کی تلاش بے سود
ب سے پہلی چیز تو مصریوں کی گرم جوشی اور فراخ دلی اور خوش آشتی
فکری ہے۔ اپنے وطن پر افتخار کے باوجود ان کے دلوں کے دروازے
ں کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اجنبی نہیں،
ں، خلوص اور جوش سے وہ ملتے ہیں وہ دلوں کو جیت لیتا ہے۔ ہمیں
یں کے عقب یا تہ میں نہ جانا چاہیے۔ یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے پذیرائی
، ساتھ کی۔ آپ کو محسوس کرا دیا کہ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے اور عالم
دجود سے بیزار نہیں ہے۔ زمین کی تنگی کا احساس اور گھٹن وہیں
، جہاں حریق پذیرائی پکار پکار کر دلوں کی تنگی کا اعلان کرتا ہے۔
ناح کی حیثیت سے آئے ہیں۔ آپ کو کسی سے کچھ نہ لینا ہے نہ دینا۔ کسی
سے دو بول بول دیے، ساری دنیا آپ کی نگاہوں میں روشن ہو گئی
ل کلی کی طرح کھل گیا اور آپ کا جی چاہنے لگا کہ جو سامنے آئے اسے بڑھ
لگا لیں یا کم سے کم اپنی خوشی اور بالیدگی میں اسے شریک کریں۔ یہ بات
، کی ضمن میں زبان پر آگئی۔ ورنہ اس کا اطلاق لا محدود ہے۔ بات تو
، جہاں جائیے، خوشیاں بکھیرتے ہوئے جائیے، افسردگیوں، کدورتوں

اور تلخیوں کے بیج نہ بوئیے۔ مانا کہ آج دنیا نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا
اور فکر مند ہیں جھنجھلا رہے ہیں پریشان ہیں۔ آپ کو اپنی یہ حالت پسند
نہیں۔ پھر کیوں چاہتے ہیں کہ جو آپ کی راہ میں آئے اس کی حالت بھی ایسی
ہو جائے۔ غم اور فکر اور غصہ اور کڑواہٹ کو کیوں پھیلاتے ہیں، کیوں
بانٹتے ہیں۔ خوش دلی بکھیریے، روشنی بانٹیے، خوشبوئیں تقسیم کیجیے۔ عادت
ڈالیے کہ دوسروں کو مکدر نہیں کریں گے۔ خود آپ کی کدورت دور ہو جائے
گی۔ انقباض کے بجائے انشراح آپ کا شریک ہوگا۔ مسکرا کر پذیرائی کرنے،
مسکراتے ہوئے گزر جانے، نرمی کے ساتھ بات کر لینے سے آپ کا کچھ نہیں
جاتا۔ دوسروں کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔

مصر والوں کے دِل بڑے ہیں ان کے دل تنگ ہو بھی نہیں سکتے
ان کی طویل تاریخ اور ان کے ملک کا محلِ وقوع اس کا ضامن ہے کہ وہ
اپنے دروازے اور اپنا ذہنی افق دوسروں کے لیے کھلے رکھیں۔ ان کی رگوں
میں بہت سی نسلوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ عصبیت اور علیحدگی پسندی اور
تحقیر آمیز تفاخر اور جارحانہ حبِ وطن کا ان کے دل میں گزر ہو ہی نہیں
سکتا۔ اس کے علاوہ انھوں نے دریائے نیل کے طور طریقے صدہا صدیوں
میں جذب کر لیے ہیں۔ ان کا نیل انھیں اس بے آب و گیاہ ریگستان کے
شدائد سے بچاتا ہے جس کا نام ہی صحرائے صحارا پڑ گیا ہے جو دنیا کا سب
سے بڑا اور سب سے بے نم اور بے درد ریگستان ہے۔ وہ نیل جو ریگ
زار میں سے جہاں سے گزرتا ہے، اسے چمن بناتا ہوا نکل جاتا ہے۔ زندگی
کے ریگ زار سے ہم سب کا سابقہ ہے۔ طرح طرح کی دشواریاں، بے شمار
مظالم، رنگ برنگ کی بے مہریاں، بے تعلقیاں، آفاتِ ارضی وسماوی، یہ
ریگستان نہیں تو کیا ہیں۔ اس ریگستان میں میٹھے بول، اچھی پذیرائی، دلنواز
تبسم، ہمدردی یا انسیت کا ایک حرف دریائے نیل کی طرح بے گیاہ زمینوں
بنجر دلوں میں چمن کھلا دیتا ہے۔ مرجھائے ہوئے پودے لہلہانے لگتے ہیں۔
دریائے نیل گرمجوشی پر آتا ہے تو اپنی حدود سے نکل کر دونوں طرف میلوں
تک زمین سے بغل گیر ہو جاتا ہے اور زرخیز مٹی زمین کی نذر کرتا ہے۔ نیل
اگر یہ مٹی نہ لائے تو مصر کے لوگ بھوکوں مر جائیں۔ ہزاروں میل دور سے
چٹانوں کو توڑ کر سفوف بنا کر بہاتا ہوا یہ دریا اپنے ساحلوں کے ارد گرد
زرخیز کشت زاروں کو بالیدگی دیتا ہوا سمندر سے جا ملتا ہے۔

مصر کا دریا دنیا کا سب سے طویل دریا ہے۔ مصر کی تاریخ دنیا کے سارے ملکوں کی تاریخ سے زیادہ قدیم ہے۔ اسی لیے معصوم اور بے ضرر تفاخر کے ساتھ اہل مصر اپنے ملک کو مادر گیتی گردانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مصر ہی تہذیب کا گہوارہ ہے اور یہ بھی کہ سارے الہامی مذاہب اس کے محور پر گردش کرتے رہے ہیں۔ مصری تہذیب کم از کم سات ہزار سال پرانی ہے۔ بعض مورخین اسے سولہ ہزار سال تک پیچھے لے جاتے ہیں۔ جنوبی مصر کے "اسنا" اور "ادیفو" مقامات کی کھدائیوں میں فصل کاٹنے اور غلہ پیسنے کے جو پتھری اوزار ملے ہیں وہ اس تہذیب کا تاریخی ناتہ ۱۴۰۰۰ قبل مسیح سے جوڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ جدید حجری دور کا ایک گاؤں ابھایا تمام و کمال برآمد ہوا ہے۔ اس کا زمانہ ۶۰۰۰ سے ۸۰۰۰ قبل مسیح کے درمیان ہے مصری مصنف محی السمری فخر کے ساتھ لکھتا ہے کہ مصر میں ایک انچ زمین بھی ایسی نہ ہوگی جس میں اس کی قدیم تہذیب کے نشانات نہ ملتے ہوں۔ سارا ملک ایک بڑا عجائب گھر ہے جس میں انسانی تہذیب کی تاریخ اور انسان کے ارتقا کے سربستہ راز چھپے ہوئے ہیں۔

نیل کی ہمہ گیر اور روزی رساں اہمیت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۰ لاکھ مربع کیلو میٹر وسیع اس ملک میں ۹ لاکھ ۳ ہزار مربع کیلو میٹر پر ریت بچھی ہوئی ہے۔ دو ریگستان ہیں، مغرب کی طرف بڑا اور مشرق کی طرف نسبتاً چھوٹا۔ جن کو دریائے نیل ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ نیلگوں پانی کے دونوں طرف ایک ہرا فیتہ ہے جس پر چار کروڑ انسانوں اور بے شمار جانوروں کی خوراک کا انحصار ہے۔ مصر کے قحط کا ذکر کلام پاک میں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایام نیل میں سیلاب کے بغیر گزرے ہوں گے۔ زمین زرخیز پرت اور نمی کے انتظار میں سوکھ گئی اور انسان بھوک اور پیاس سے تلملا اٹھا۔

شاد باید زیستن.....

عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتی اور مرجھاتی رہتی ہیں لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوتی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے جہاں کہیں اپنے پر کھول دے گا ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چیز کا عکس بیک وقت سیکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر بھی غبار آ جائے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر ایک فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں، اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔

ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاش فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آب رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دمکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

اردو کی تہذیبی اہمیت

(توسیعی خطبہ جو جمعیۃ الاصلاح، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں پڑھا گیا)

تعارف از حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی،

ناظم ندوۃ العلما، لکھنؤ

دار العلوم ندوۃ العلماء کی انجمن الاصلاح (جس کی حیثیت وہ ہے
درسٹیوں میں یونین کی ہوتی ہے) طلباء کے علمی ذوق وشوق کا میدان
صلاحیتوں کی تجربہ گاہ، ان کی خود اعتمادی اور خود شناسی کا مظہر اور
طابتی و تحریری سرگرمیوں کا مرکز ہے، شعبۂ خطابت وصحافت اور ایک
تابی ذخیرہ کے ماسوا، جس میں اردو لٹریچر، علمی رسائل و اخبارات کے
اور ادبی و تاریخی کتابوں کا ایسا ذخیرہ ہے جو کم سے کم نصف صدی
ذوق و جستجو اور علمی ذوق کا آئینہ دار ہے، طلباء کے معلومات میں اضافہ
کے مطالعہ میں نظم و ربط پیدا کرنے کے لئے چند سال سے
خطبات (EXTENSIVE LECTURES) کا انتظام کیا گیا ہے
کے لئے ملک کے ممتاز فضلا اور صاحب علم و صاحب نظر اساتذہ کو دعوت
تا ہے اور وہ اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مطالعہ اور فکر و نظر کا عطر
کے سامنے رکھتے ہیں، ان خطبات کا تعلق ابھی تک زیادہ تر شریعت اسلامی
سلاح و تجدید، اور ہندوستانی مسلمانوں کے دینی و علمی خدمات اور علوم اسلامیہ
... (CONTRIBUTION) سے رہا ہے

... ندوۃ العلماء کے بانیوں اور فضلاء کا اردو زبان و ادب سے گہرا
... نہ صرف یہ کہ وہ زبان و ادب کے رواں دواں قافلہ سے بچھڑنے
... انھوں نے اردو ادب و انشاء کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا
... کی "الفاروق"، مولانا حکیم سید عبد الحیؒ صاحب ناظم ندوۃ العلماء
... ایامؒ"، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ کی
... "الصدیق"، مولانا سید سلیمانؒ ندوی کی "خطبات مدراس"
اور پروقار مؤثر اور دلآویز انشاء پردازی کا نمونہ ہیں جن میں وقار و متانت
... زبان کا بانکپن اور ادب کی چاشنی بھی ہے اور ابھی تک کم سے کم علمی
... دینی مطالب و مضامین کے لئے اردو میں ان سے بہتر زبان و طرز ادا
پیش نہیں کیا جاسکا۔ ان کتابوں کے علاوہ، جن کا موضوع تاریخی اور مذہبی
... میں سے متعدد حضرات نے اردو زبان کی تاریخ اور شعر و ادب کے
... پر بھی وقیع ... میں لکھی ہیں، مولانا حکیم سید عبد الحی کی "گل رعنا"
... السلام ... کی "شعر الهند"، نواب صدر یار جنگ کے انجمن
... اردو کے خطبات، اور شعراء کے بعض دیوانوں اور ادبی کتابوں پر مقدمات
... سید سلیمان ندوی کی "نقوش سلیمانی" اس کا نمونہ ہیں۔

ندوۃ العلماء کے اسی امتیاز کے پیش نظر، اور طلباء میں صحیح علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے، اور ان میں اپنے ملک کی زبان و ادب کی خدمت کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے خالص ادبی و لسانی موضوعات پر بھی خطبات کا انتظام کیا جاتا ہے اسی مقصد کے لئے گزشتہ سال ۱۹۸۲ء میں، ان توسیعی خطبات کے سلسلہ میں پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کو تکلیف دی گئی، خواجہ صاحب کا اردو کے صاحب نظر اور محقق ادیبوں اور ناقدین میں شمار ہے، وہ عرصہ تک دہلی یونیورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر ہیڈ اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین،
BOARD OF RESEARCH STUDIES FOR HUMANITIES
دہلی یونیورسٹی کے چیئرمین اور راک فیلر ریسرچ اسکالر اور یورپ و امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں کے "استاد زائر" VISITING PROFESSER رہ چکے ہیں۔

ان اضافی اور خارجی امتیازات و اعزازات سے بڑھ کر یہ بات ہے، کہ انھوں نے اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں اور موضوعات پر گراں قدر تحقیقی کام کیا ہے جس میں ان کی کتاب "میر تقی میر" کو سب سے زیادہ شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ خواجہ صاحب نے لکھنؤ میں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی، ان کے جد امجد مفتی محمد نور اللہ صاحب مناظر جنگ، اور ان کے پردادا مولوی مظہر اللہ صاحب اور کئی بزرگ اسی خاک میں آسودۂ خواب ہیں، اس لئے بھی ان کے لکھنؤ سے قدیم و عزیز روابط ہیں۔

یہ خطبہ جس کا عنوان انھوں نے "اردو کی تہذیبی اہمیت" رکھا ہے، ۱۰ اپریل ۱۹۸۳ء کو، انجمن الاصلاح دار العلوم ندوۃ العلماء میں پڑھا گیا، انھوں نے اپنے اسی تعلق و ارتباط کی بنا پر، ندوۃ العلماء اور اس کے ناظم اور لکھنؤ کو مخلصانہ اور کسی حد تک شاعرانہ خراج عقیدت و تحسین پیش کیا، خطبہ کی زبان بڑی ادیبانہ اور فلسفیانہ کی زبان ہے، جس کے سایہ میں خواجہ صاحب نے بر سبیل میر و غالب کے کلام کا درس دیا، مقالہ میں بڑے آبدار فارسی شعر برمحل لائے گئے ہیں ان کا مرکزی نقطۂ خیال یہ ہے کہ مادری زبان کا بحیثیت تہذیبی قدر اور بحیثیت ذریعہ تعلیم کے جاننا اور پڑھنا ضروری ہے، انھوں نے کارڈنل نیومن کا یہ مقولہ خوب نقل کیا ہے (جس میں ایک پوری کتاب کا مضمون آگیا ہے) کہ "انسانی افکار خیالات و احساسات کا اظہار صحیح زبان اور مناسب الفاظ کے ذریعہ ہی در اصل ہوسکتا ہے"۔ خواجہ صاحب نے مادری زبان کی ضرورت و اہمیت، اور اس کے ایک فطری تقاضا ہونے پر نفسیاتی، ادبی و علمی زاویۂ نظر سے بحث کی ہے اور

اس کے لئے تاریخ و ادب سے ناقابل انکار شہادتیں پیش کی ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کی وسعت اور اس کی عالمگیری کو اعداد و شمار کی زبان سے بھی ثابت کیا ہے، اور واقعات اور ملکوں کی سیاست کے حوالہ سے بھی، اردو نے آزادی کی تحریک، معاشرہ کی اصلاح، قلب و نظر میں وسعت، زندگی میں جمال و تنوع پیدا کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اس کو بھی انھوں نے دلکش انداز میں پیش کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کی فراخ دامانی، کشادہ دلی، علوم و افکار اور زمانہ کے تغیرات کا ساتھ دینے کی صلاحیت کو بھی ثابت کیا ہے۔

ان کے اس مقالہ میں ادیب کی جمالی حس، شاعر کی وجدانی کیفیت مورخ کی حقیقت پسندی اور (خواہ کسی کو برا لگے) مسلمان کی خودداری، اور ایک خاندانی آدمی کی بلند نظری نظر آتی ہے

واجد صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ایک ملک میں مختلف بولوں رسم الخط، اور تہذیبوں کی موجودگی کسی طرح کا عیب، کمزوری اور ترقی سے مانع نہیں یہ محض ایک مفروضہ ہے، جس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں انھوں نے زبان کے اقتصادی پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اور بتایا ہے کہ روحانی قدریں ذاتی تقاضے اور تہذیبی مطالبے ان سے زیادہ اہم ہیں۔ اپنی مادری زبان کے قائم رکھنے میں بعض مفتوح قوموں کے افراد نے جو قربانیاں دیں، اور اس کی جو قیمت ادا کی، اس کا بھی ذکر کر کے، انھوں نے اردو والوں کی غیرت پر اگر تازیانے نہیں لگائے تو چٹکیاں ضرور لی ہیں۔ اور یہی اس خطبہ کی روح اور اس کا پیغام ہے۔ اور اسی وجہ سے اس خطبہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت اور افادیت ہے۔

سید ابوالحسن علی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اردو کی تہذیبی اہمیت

صدرِ محترم قبلۂ دیدہ و دل حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی گرامی مرتبت اساتذہ دار العلوم ندوۃ العلماء، اراکین جمعیۃ الاصلاح، مہمانانِ خصوصی، بزرگو، عزیزو اور دوستو!

میرے لئے اس سے بڑا شرف اور اس سے بڑا اعزاز اور کوئی نہیں ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں حاضر ہو کر آپ کی یونین کو مخاطب کروں۔

دریا، گہر کو اور کوثر و تسنیم ایک تشنہ لب کو طلب فرمائیں، اس سے زیادہ عزت اور افتخار کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ جس طرح شبنم، چمنستان کو اور نسیمِ سحر پھولوں کو شگفتہ اور شاداب کر دیتی ہے، اسی طرح آپ کے دعوت نامہ نے مجھے ممنون و مسرور فرمایا۔ اس وقت جذبات کی فراوانی مجھ سے صرف طلبگارِ سکوت ہے اور میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں کہ احساس کے مطابق اظہارِ تشکر کر سکوں؛

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

ندوہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ یہاں بصیرت افزائی اور دانش افروزی کا جو سامان مہیا ہے، جذبات اور احساسات کی جو تہذیب یہاں ممکن ہے، اور جو ذہنی تربیت اس اقامتی ادارے میں کی جارہی ہے جس سے مجلسی اور اجتماعی امور میں شائستگی، سلیقہ اور توازن پیدا ہو، وہ مجھے انگریزی تعلیم کی انیس[19] برس دشت نوردی کرنے کے بعد بھی میسر نہیں آئی۔

اسی طرح لکھنؤ مجھے بے حد عزیز ہے، یہاں کوئی میرا عزیز ہے، کوئی دوست، کوئی بزرگ، کوئی ہادی و مرشد۔ نظام شمسی میں ایک محور ضروری ہے اسی طرح حضرت پیر و مرشد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ذاتِ گرامی میرے لئے مرکز و محور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب لکھنؤ کا کوئی تصور بغیر حضرت مولانا مدظلہ العالی کے ممکن ہی نہیں ہے ؎

حافظ جناب پیر مغاں مامنِ وفاست
من ترکِ خاکبوسیِ این در نمی کنم

لکھنؤ آکر عمرِ رفتہ کی آواز سننے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں میں نے لکھنا پڑھنا، اٹھنا بیٹھنا، ادب اور تمیز سیکھی۔ ہائی اسکول تک اسی علاقہ میں تعلیم حاصل کی، اور جوبلی کالج میں آکر امتحان دیا۔ جی نہیں چاہتا کہ ان محفلوں کو، چاہے وہ عالمِ خیال ہی میں کیوں نہ ہوں، ایک دفعہ پھر آراستہ کروں، اور ان دلکش واقعات اور حسین یادوں کا ایک مینا بازار سا لگا دوں۔ اسی لکھنؤ کی خاکِ پاک میں میرے جدِ امجد زبدۃ الموحدین مفتی محمد نور اللہ مناظر جنگ میرے پردادا مولوی مظہر اللہ مشیر قانونی ریاست رام پور اور معاصر سرسید اور میرے چچا مولانا فضل محمد رحمانی عاشق رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وسلم آسودۂ خواب ہیں۔

حضرت نیاز فتحپوری مذاق میں کہا کرتے تھے "فاروقی صاحب! مجھے آپ کی طرف سے بڑا اندیشہ ہے۔ آپ پایانِ عمر میں اسی لکھنؤ میں آکر زاویہ نشین ہو جائیں گے" پہلے پہلے تو یہ بات مجھے بہت بری لگی لیکن اب وہی میری تمنا ہے۔"

دہلی میں میں نے عمرِ عزیز کے ۳۷ سال گذارے ہیں اور بخت و روزگار نے بھی مساعدت کی ہے، اور یونیورسٹی کے دائرہ میں جتنے مناصب اور مراتب ہو سکتے تھے وہ سب بحمدہٖ تعالیٰ حاصل ہوئے ہیں لیکن ارضِ لکھنؤ کی یاد کسی طرح دل سے نہیں نکلتی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں حضرت شیخ حمید الدین ناگوری کا نام سرفہرست ہے، ان کے پوتے کو سلطان محمد تغلق نے ناگور سے دہلی بلایا اور بڑی عزت اور تکرم سے رکھا، مگر انھوں نے کچھ دن کے بعد سلطان کو یہ اشعار بطورِ معذرت کے لکھ بھیجے، اور وہ دہلی کو چھوڑ کر ناگور آگئے

دِلی کہ مرا بجائے ناگور نہ شد
غمگیں دلِ من ہرگز مسرور نہ شد
ہرچند نگار خانہ دادند مرا
آں چھپّر و بوریا ز دل دُور نہ شد

حضرات! میری گفتگو کا موضوع ہے، "اُردو کی تہذیبی اہمیت"۔ سب سے
پہلے میں مادری زبان کے متعلق چند معروضات پیش کروں گا۔ اُردو ہماری مادری
زبان ہے، اس کو ہم نے ماں کی گود میں سیکھا ہے، اس کے ذریعہ ہم نے اپنے دِلی
جذبات کا اظہار کیا ہے، دل دیا بھی ہے اور لیا بھی ہے، ہنسا ہنسا کر انکسار کیا ہے
اور دشتی کی نمناکی ہے، آزادی کے گیت گائے ہیں، لوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا ہے
اور تہذیب اور انسانیت سیکھی ہے۔ مادری زبان کو بہ حیثیت تہذیبی قدر کے
بہ حیثیت ذریعۂ تعلیم کے جاننا ہی چاہیئے، یہ اتنا سیدھا سادہ اور فطری اصول
ہے کہ اس کے سمجھانے کی مطلق ضرورت نہیں، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے
یہ مت کہیں کہ پاؤں سے چلنا چاہیئے اور آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے لیکن ہمارے
دیس میں جہاں انگریزوں کا دیا ہوا غلط طریقۂ تعلیم آج بھی رائج ہے اور جہاں
الٹی گنگا بہائی جاتی ہے، اتنی واضح اور بدیہی بات کے لئے بھی دلیلیں لانا
ضروری ہیں۔

۱۹۵ء میں بی بی سی نے لندن سے ایک پروگرام نشر کیا تھا، عنوان تھا،
زبان اور تعلیم ۔۔۔ اس میں سر والٹر موبرلے اور پروفیسر بلیکٹ جیسے دانشور
شامل تھے، ان سب نے اس بات پر زور دیا کہ یونی ورسٹی، گفتگو کا مرکز ہے، یہ
گفتگو استاد اور استاد کے درمیان، استاد اور طالب علم کے درمیان اور طالب علم
اور طالب علم کے درمیان ہونا چاہیئے اور یہ مقصد صرف زبان کی تعلیم ہی سے پورا
ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی تعلیم کا بڑا نصب العین یہ رہا ہے کہ زبان پر اتنی
قدرت حاصل ہو جائے کہ ہر قسم کے مضامین کو کامیابی سے ظاہر کیا جا سکے۔
قدیم کتابوں میں کیمیا۔ علم جفر۔ رمل۔ قصص و اخبار کو بھی فنون میں
شامل کیا گیا ہے۔ ان سب فنون کو سیکھنا اور سکھانا، علم ادب کے وسیع دائرہ
میں شامل ہے۔ مغربی علماء نے بھی اس خیال سے اختلاف نہیں کیا۔ کارڈنل
نیومن کہتا ہے۔ انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا اظہار صحیح زبان
اور مناسب الفاظ کے ذریعے، یہی دراصل ادب ہے۔ لیکن ہماری یونیورسٹیوں
کے طلباء اپنا مافی الضمیر نہ اُردو میں ادا کر سکتے ہیں، نہ انگریزی میں، نہ ہندی میں،
ان طالب علموں میں جو انتشار اور بے چینی نظر آتی ہے اس کا بھی ایک بڑا
سبب زبان کی شدید ناواقفیت ہے، ان کا حال ہندوستانی قصّہ کے گونگے
شہزادوں کا سا ہے جو اظہار کے لئے اندر ہی اندر گھلتے رہتے ہیں۔
مادری زبان کی تحصیل سب سے آسان ہے اس لئے کہ وہ ہمارے
لاشعور میں بسی ہوئی ہے اور تمام بھولی بسری یادیں اُسی میں مرکوز ہیں۔ ہم
ہر چیز کو بھول سکتے ہیں لیکن وہ زبان اور محاورے نہیں بھول سکتے جو ہم نے
ماں کی گود میں سیکھے ہیں اور جس میں ہم نے اپنے دل کے جذبات کا اظہار
کیا ہے۔

ایک مرض ہے جس کا نام ہے، اَم نی سیا AMNESIA اس میں آدمی
ہر چیز بھول جاتا ہے لیکن مادری زبان نہیں بھول سکتا، اس لئے اس کے بھلانے
کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہیئے۔

جوزف کان راد کی ایک کہانی ہے کہ ایک پولش نوجوان اپنے وطن کی
مصیبتوں سے تنگ آکر ہجرت کرتا ہے اور انگلستان کے ایک گاؤں میں رہنے
لگتا ہے، وہ انگریزی زبان سے ناآشنا ہے اور انگریزوں کے طور طریق اور تہذیبی
مزاج سے بھی قطعی ناواقف ہے۔ ایک انگریز لڑکی جو اس کی ہم عمر ہے، اس کے
حال پر رحم کھاتی ہے اور کبھی کبھی اُسے کچھ کھانے پینے کو دے دیتی ہے۔ اور کچھ
اشاروں اشاروں میں باتیں بھی کرتی ہے۔ چند سال بعد دونوں کی شادی ہو جاتی
ہے اور ایک بچّہ بھی ہو جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں پولش نوجوان کو تیز بخار چڑھتا ہے
اور سرسامی کیفیت ہو جاتی ہے اور وہ پولش زبان میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا
ہے وہ انگریز لڑکی اس نوجوان اور اس بچہ کو اچھی طرح کمبل اوڑھا کر اور خوب
گھرس کر، گھر سے نکل جاتی ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آتی ۔۔۔ اس لڑکی نے پہلی
دفعہ یہ محسوس کیا کہ اس میں اور اس کے شوہر میں، صرف جنس اور جسم کا تعلق ہے
رُوح اور دل کا وہ تعلق نہیں جو زبان و لسان اور افہام و تفہیم کی بنیاد پر قائم
ہوتا ہے۔

بزرگو، عزیزو، اور دوستو! اُردو، دنیا کی اہم زبانوں میں سے ہے اور اس
کے بولنے والوں کی تعداد شمالی چینی اور انگریزی کو چھوڑ کر، دُنیا میں سب سے
زیادہ ہے۔ جرمن رسالہ AUSSEN POLITIK کے تازہ شمارہ میں اردو
کے ہندوستانی روپ کے بولنے والوں کی تعداد ۲۲۰ ملین بتائی گئی ہے اور یونسکو
کوریئر کی اطلاع کے مطابق ان کی تعداد ۱۶۰ ملین ہے۔ عددی اعتبار سے روسی
ہسپانوی۔ جرمن اور جاپانی کا نام اُردو کے بعد آتا ہے۔ اردو کے بولنے والوں
کی آبادیاں فیجی، قدیم برٹش گیانا ٹری نی ڈاڈ، جنوبی اور مشرقی افریقہ۔ انگلستان
کناڈا، امریکہ، ازبکستان، افغانستان۔ عدن۔ پاکستان۔ ایران۔ عراق۔ سعودی
عربستان۔ خلیجی ممالک ماریشس۔ برما۔ ملیشیا۔ سری نام۔ سنگاپور۔ سری لنکا
اور انڈونیشیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اردو کے ذریعہ ہندوستان کا رشتہ، ان تمام
ملکوں سے استوار ہوتا ہے۔ اردو کے پروگرام دنیا کی تمام بڑی بڑی راجدھانیوں
سے نشر کئے جاتے ہیں۔ اردو کے اخبار اور رسالے برصغیر کے علاوہ انگلستان
جاپان سنگاپور اور افریقہ سے شائع ہوتے ہیں اور اُردو کی تعلیم اور تحقیق کی
سہولتیں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ۔ روس انگلستان۔ جرمنی اور اٹلی
کی اہم یونیورسٹیوں میں بھی موجود ہیں۔ اس کے فلم روس۔ ہنگری۔ پولینڈ۔ ٹیونس
الجیریا۔ مصر۔ افغانستان۔ انگلستان۔ ایران۔ عراق افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بے حد
مقبول ہیں اور اس کے علمی خزانے جن سے ٹیپو سلطان کی شہادت (۱۷۹۹ء)
انتزاعِ سلطنت اودھ (۱۸۵۶) اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد (۱۸۵۷ء)
یورپ کی آنکھیں روشن ہوئیں۔ آج دُنیا کی مشہور لائبریریوں کی زینت ہیں، اور
جن کی مدد کے بغیر اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی کی ہندوستان کی
تاریخ مرتب ہی نہیں ہو سکتی۔

اردو، ہندوستان میں پیدا ہوئی، یہیں پلی اور بڑھی اور یہیں سے مختلف
ملکوں میں پھیلی۔ پچھلی مردم شماری کی رُو سے ہندوستان میں اردو کے بولنے
والوں کی تعداد ۲۹ ملین ہے لیکن درحقیقت اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ تاہم
ن میں شمس الامرا امیر کبیر ثانی، قدیم دلی کالج، آگرہ کالج، سائنٹفک سوسائٹی
ورناکلر سوسائٹی، جامعہ عثمانیہ، دارالترجمہ، حیدر آباد اور انجمن ترقی اردو ہند
خدمات بھی کسی طرح فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ یہاں ایک زبان کا دوسری
ن سے مقابلہ کرنا مقصود نہیں لیکن ڈاکٹر تراپاٹھی کے اس قول کے نقل کرنے
مضائقہ نہیں کہ ہند و پاک کی کسی دوسری زبان کا ادب وسعت اور توانائی میں
د کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہمارے کم نظر اور مغرب زدہ نقاد، برابر اس بات کے شاکی ہیں کہ اردو میں
ایک ورڈز ورتھ پیدا ہوا اور نہ کیٹس۔ میں یہ عرض کروں گا کہ انگریزی میں بھی
ب میر اور ایک غالب پیدا نہیں ہوا، اور نہ ہو سکتا تھا، اکبر الٰہ آبادی نے
شاعری اس وقت شروع کی تھی جب تا حدِ نظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا
تھا اور ہم شدید قسم کے احساسِ کمتری میں گرفتار تھے۔ ان کا شعر ہے ؎

چیز وہ ہے، بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

ہم اس احساسِ کمتری سے ابھی تک باہر نہیں نکلے ہیں۔ ایک صاحب
پر فرما رہے تھے کہ میرے یہاں روسی اور امریکی دونوں نقطہ ہائے نظر کی
ائش ہے اور میں بیک وقت روسی بھی ہوں اور امریکی بھی۔ میں نے
ض کیا کہ "میں دُنیا کی سب سے چھوٹی اقلیت سے تعلق رکھتا ہوں یعنی
ہندوستانی ہوں اور اردو کو جو سرتاسر ہندوستانی زبان ہے، ہندوستان کے
قع میں سجانا چاہتا ہوں۔" بلنسکی نے ایک مرتبہ روسی ادیبوں سے کہا تھا
ب تک تم اپنے ادیبوں کو شیکسپیر اور گوئٹے کے پیمانے سے ناپتے رہو گے
وقت تک تمہارے پشکن اور گوگول دوسرے درجہ کے مصنف سمجھے
ئیں گے۔ تم کو تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کوئی مصنف تمہارے ملک کی زندگی
ن میں شمس الامرا امیر کبیر ثانی، قدیم دلی کالج، آگرہ کالج، سائنٹفک سوسائٹی
ورناکلر سوسائٹی، جامعہ عثمانیہ، دارالترجمہ، حیدر آباد اور انجمن ترقی اردو ہند
خدمات بھی کسی طرح فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ یہاں ایک زبان کا دوسری
ن سے مقابلہ کرنا مقصود نہیں لیکن ڈاکٹر تراپاٹھی کے اس قول کے نقل کرنے
مضائقہ نہیں کہ ہند و پاک کی کسی دوسری زبان کا ادب وسعت اور توانائی میں
د کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
ہمارے کم نظر اور مغرب زدہ نقاد، برابر اس بات کے شاکی ہیں کہ اردو میں
ایک ورڈز ورتھ پیدا ہوا اور نہ کیٹس۔ میں یہ عرض کروں گا کہ انگریزی میں بھی
ب میر اور ایک غالب پیدا نہیں ہوا، اور نہ ہو سکتا تھا، اکبر الٰہ آبادی نے
شاعری اس وقت شروع کی تھی جب تا حدِ نظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا
تھا اور ہم شدید قسم کے احساسِ کمتری میں گرفتار تھے۔ ان کا شعر ہے ؎
یز وہ ہے، بنے جو یورپ میں بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

ہم اس احساسِ کمتری سے ابھی تک باہر نہیں نکلے ہیں۔ ایک صاحب
تقریر فرما رہے تھے کہ میرے یہاں روسی اور امریکی دونوں نقطہ ہائے نظر کی
گنجائش ہے اور میں بیک وقت روسی بھی ہوں اور امریکی بھی۔ میں نے
عرض کیا کہ "میں دُنیا کی سب سے چھوٹی اقلیت سے تعلق رکھتا ہوں یعنی
ہندوستانی ہوں اور اردو کو جو سرتاسر ہندوستانی زبان ہے، ہندوستان کے
مرقع میں سجانا چاہتا ہوں۔" بلنسکی نے ایک مرتبہ روسی ادیبوں سے کہا تھا
"جب تک تم اپنے ادیبوں کو شیکسپیر اور گوئٹے کے پیمانے سے ناپتے رہو گے
اس وقت تک تمہارے پشکن اور گوگول دوسرے درجہ کے مصنف سمجھے
جائیں گے۔ تم کو تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کوئی مصنف تمہارے ملک کی زندگی
کی ترجمانی کس طرح کرتا ہے اور ادب کے مستقل اصولوں کے تحت اس کے
ادب کی کیا حیثیت ہے۔"

بڑا افسوس ہے کہ ایسی خوب صورت زبان کو جس میں قدرِ اوّل کا ادب موجود
ہے اور جس نے میر و غالب، انیس و اقبال، شبلی اور ابوالکلام آزاد کو پیدا کیا
ابھی تک اس کا جائز مقام نہیں مل سکا اور اس کی ۲۹ ملین آبادی کو طفل تسلیوں
سے بہلایا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کو، جو ہرگز ہمارے درد کا
پورا علاج نہیں ہے، طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا گیا ہے ع

کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

اور یوپی میں، جو اس کا سب سے بڑا گہوارہ اور مرکز و محور ہے اُس کی حیثیت اُس
ملکہ کی سی ہو گئی ہے جو چھت پر بیٹھ کر کوّے اُڑایا کرتی تھی۔ اس کے پیچھے
جو ذہنیت کارفرما ہے وہ بہت ہی پست، مریضانہ اور افسوسناک ہے۔ اکثر
یہ کہا جاتا ہے کہ اردو کے بولنے والے تعداد میں کم ہیں اور اسی وجہ سے اب تک
اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا۔ سوئزرلینڈ چھوٹا سا ملک ہے۔ یوپی میں
دو سوئزرلینڈ سما سکتے ہیں، لیکن وہاں چار سرکاری زبانیں ہیں۔ جرمن، فرانسیسی
اطالوی اور رومانش۔ رومانش کے بولنے والے ایک فی صد سے بھی کم ہیں
دیا سلائی خریدیئے تو اس پر چار زبانوں میں لکھا ہوا ملے گا، دلداری اور فراخدلی
اسے کہتے ہیں اور سچ بھی یہ ہے کہ مہتمم بالشان تہذیبی مسائل سروں کو گن کر طے نہیں کئے
جاتے اسلئے اور بھی کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید۔

اردو کے مضبوط قلعے پر حملہ کرنے کی واحد صورت یہ تھی کہ اس مشترکہ
تہذیب کی علامت اور خوب صورت زبان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی جائیں
اور بقول ہٹلر، پروپیگنڈے کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر بار بار یہ کہتے رہیئے کہ دوزخ
جنت ہے اور جنت دوزخ تو کچھ لوگ ضرور یقین لے آئیں گے۔ سب سے
پہلے ہندوستانی تہذیب کے دشمنوں نے یہ کہا کہ اُردو کوئی زبان ہی نہیں ہے۔ ہلوب
یا شیلی ہے۔

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یہ بات پاؤں نہ چلی تو یہ کہا گیا کہ اُردو زبان تو ہے لیکن غیر ملکی ہے اور ہندوستان
کی سرزمین سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس کا جواب بھی علمی سطح پر دیا گیا اور بتایا
گیا کہ اردو میں ۸۵ فی صد الفاظ سنسکرت کے ہیں اور صرف ۱۵ فی صد ایسے

بذ انگریزی، پرتگالی، عربی، فارسی اور ترکی سے لئے گئے ہیں۔ انگریزی میں
بت حال برعکس ہے اس میں ملکی الفاظ یعنی ANGLO SAXON
ہ فی صد سے بھی کم ہیں اور ۸۵ فی صد لاطینی، عربی، اردو، یونانی اور نارمن
وغیرہ ہیں لیکن اس کے باوجود کسی نے اسے یہ طعنہ نہیں دیا کہ یہ زبان انگلستان
زمین سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یہی حال ہنگیرین زبان کا ہے۔ اس کے
زرزاعتی الفاظ، سلاو زبانوں سے مستعار ہیں۔ جانوروں سے متعلق زیادہ تر
ظ ترکی ہیں۔ تجارت سے متعلق اکثر الفاظ قدیم ایران سے تعلق کو ظاہر
تے ہیں لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں کہا کہ یہ زبان غیر ملکی ہے اور ناقابلِ
سنا ہے۔

آج کل سب سے زیادہ زور اس بات پر ہے کہ اردو کا رسم خط صوتیاتی
ا ہیں، ہم بولتے کچھ اور لکھتے کچھ ہیں۔ لیکن ان معترضوں کو یہ نہیں معلوم
PHONETICIANS اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کا کوئی رسم خط
تیاتی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ایک زبان کی آوازوں کو اس کی معتبرہ
متوں کے علاوہ دوسری علامتوں کے ذریعہ ادا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جو انگریزی
ہجے اور املا دونوں حد سے زیادہ ناقص ہیں۔ برنارڈشا کہا کرتا تھا کہ ہم
FISH کو GHOTI بھی لکھ سکتے ہیں، اس طرح کہ ENOUGH
G لے لیں وہ برابر ہے F کے اور WOMEN کا O لے لیں وہ برابر
I کے اور NATION کی TI لے لیں وہ برابر ہے ش یا SH کے لیکن
یں آپ تبدیلی نہیں کر سکتے۔ رزوولٹ نے اس طرح کی کوشش کی تھی اور
ہیں وہ الیکشن ہار دیا تھا۔

رہی یک جہتی کی بات۔ وہ حضور والا، ایک رسم خط سے نہیں پیدا ہوتی
ون کو توڑنے سے نہیں، جوڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت محبوب الٰہی
نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے قینچی پیش کی۔ آپ نے فرمایا
سوئی دو۔ میں کاٹتا نہیں، جوڑتا ہوں"۔ یک جہتی تہذیبی رنگا رنگی کو
سے تسلیم کرنے اور اس کا احترام کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

یورپ میں روس کو چھوڑ کر سارے برّ اعظم کا ایک رسم خط ہے لیکن
میں سو سو برس تک لڑائیاں ہوئی ہیں اور آخری دو لڑائیاں تو ایسی ہوئی
کہ ان کی خوں آشامی کی مثال ہی نہیں اور یہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ اٹلی
رمنی اور فرانس اور انگلستان کا رسم خط ایک ہے۔

اردو کا ہیرا تراش رسم خط، فنونِ لطیفہ میں شامل ہے اور یہ شرف کسی اور زبان
رسم خط کو حاصل نہیں۔ جو لوگ اس کے بدلنے پر اصرار کرتے ہیں، ان کا حال اس
ری کا سا ہے جس کی دم ایک جھاڑی میں پھنس کر کٹ گئی تھی، اس نے تمام
ڑیوں کی دعوت کی اور ایک اثر انگیز تقریر کی جس میں دم کا بے کار ہونا نقصان
ساں ہونا اور کھونڈا ہونا ثابت کیا اور کہا کہ سب اپنی اپنی دم کٹوا ڈالیں۔

جناب صدر! یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ ۱۹۴۶ء میں جنرل
یک آرتھر اور امریکی مشن نے جاپان سے پرزور سفارش کی کہ وہ رومن رسم خط
ختیار کر لیں اور جاپانی رسم خط کو جو مشکل اور دشوار ہے، چھوڑ دیں لیکن جاپان

کی مغلوب اور محکوم حکومت نے اس وقت بھی جب وہ جنگِ عظیم دوم کے زخم
چور چور تھی، فاتح امریکہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "یہ ہمارا تہذیبی معا
ہے اور ہم اس میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔ رومن رسم خط کو قبو
کرنے کے معنی درحاصل یہ ہوں گے کہ ہم کو زبان میں بنیادی تبدیلی ہی نہیں کر
ہوگی، بلکہ ایک نئی زبان بنانا ہوگی۔"

جاپان کو اپنا تہذیبی سرمایہ عزیز ہے اسی لئے اس کی ترقی کی سمت او
سطح بھی لائقِ رشک ہے، باوجود لڑائی میں ہار جانے کے ایشیا کی صنعتی اما
پھر اس کے ہاتھ میں آ گئی ہے اس کا IQ ذہانت کی سطح دنیا میں سب سے زیادہ بل
ہے بچوں کے قد اور ان کے وزن بڑھ گئے ہیں اور ملک کی خواندگی ۹۹ فی
کے قریب پہنچ گئی ہے اور وہ سب اسی رسم خط کے ذریعے جس میں ہزار
ہزار شکلیں ہیں اور جو پیچیدگی اور دشواری میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ فرمایا تھا:

> "رسم خط کی تبدیلی ایک خزینہ دار زبان کے معاملہ میں مہلک ثابت ہو سکتی ہے، اس لئے کہ رسم خط اور زبان و ادب میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رسم خط کے بدلتے ہی نئی لفظی تصویریں، نئی آوازیں، اور نئے خیالات ابھرنے لگتے ہیں، یہی نہیں بلکہ قدیم و جدید لٹریچر کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے، اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے"

برٹش میوزیم میں ایک ترکی خاتون سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا، آپ کا اسمِ گرامی کیا ہے؟ کہنے لگیں حالے دِہ۔ بڑی دیر کے بعد سمجھ میں آیا کہ یہ خالدہ کی ریڑھ لگائی ہے۔ ٹوئن بی نے لکھا ہے کہ اتاترک نے اپنے ہم وطنوں کا رشتہ ماضی سے کاٹنے اور ان کو ایرانی اسلامی تمدن سے آزاد کرانے کے لئے کتب خانے جلانے کے بجائے حروفِ تہجی کو بدل کر لاطینی کر دیا۔ اس طرح فارسی، عربی اور ترکی لٹریچر کے کلاسیکی ذخائر نئی نسلوں کی دسترس سے باہر ہو گئے۔ اب کتابوں کے جلانے کی ضرورت نہیں رہی جیسا کہ اس سے قبل جولیس سیزر یا ہٹلر نے کیا تھا اس لئے کہ وہ حروفِ تہجی جو ان کی کنجی تھے، وہی منسوخ کر دیئے گئے۔[1]

میں یہ بھی عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اردو رسم خط، دوسرے رسومِ خط کے مقابلہ میں زیادہ ہمہ گیر ہے۔ سندھی۔ نائطی (جو کوکنی کی ایک شکل ہے) عرب تامل اور عرب ملیالم کے تمام ذخیرے صرف اردو رسم خط میں ملیں گے۔ حد یہ ہے کہ تلسی داس جی کی رامائن کا قدیم ترین نسخہ جو مصنف کی زندگی کا ہے اور جائسی کی پدماوت کا اوّلین نسخہ اردو رسم خط میں ہے۔ انیسویں صدی تک اس میں کشمیری، پنجابی، ڈوگری، بنگالی آسامی، اودھی، تامل، ملایالم اور گجراتی یہ سب زبانیں لکھی گئی ہیں، اس کے بعد بقول آرنلڈ ٹوئن بی عیسائی مشنریوں اور انگریز حاکموں نے شعوری طور

بان اور رسم خط کا جھگڑا شروع کیا اور ہم اپنی بیوقوفی سے آج تک اس جال
ں پھنسے ہوئے ہیں ؎

نماند فاعدۂ مہر کوہ کن بہ جہاں
دلے عداوتِ پرویز واکوہ کن باقی ہست

عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ اردو پڑھنے کے بعد ہمارے
یہ روزگار کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ حضور والا، بے روزگاری
مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے، جتنا ہم نے سمجھ لیا ہے یہ کسی زبان کے پڑھنے یا نہ
ھنے سے طے نہیں ہو سکتا، یہ اس سے کہیں بڑا مسئلہ ہے، یہ سارے ملک کی
اشی تنظیم کا مسئلہ ہے، پیداوار کی اور دولت کی مناسب تنظیم اور بہتر تقسیم
مسئلہ ہے۔

اس وقت اردو پر دو طرف سے حملہ ہے جیسا کہ منگول یا جدید زمانے میں
تی قینچی کے دو حصوں میں دبا کر مار ڈالتے تھے، ایک تو گھر والوں کی مخالفت
ے دوسرے حکومت کی سرد مہری ہے، روزگار کی عام دقتیں ہیں اور مشترکہ
ہذیب کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ہیں ؎

کس قیامت کی بے کسی ہے، نہ میں ہی اپنا نہ یار میرا
نہ خاطرِ بے قرار میری، نہ دیدۂ اشکبار میرا

یہ مشکلات اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہیں کہ ہمیں ابھی تک یہ یقین نہیں
ہندوستان میں ایک جمہوری نظام قائم ہو چکا ہے اور وہ یونی ورسل سفرج
کے ذریعہ ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے جس میں عوام برابر کے
ریک ہوں۔ یہ جمہوری حکومت اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی، جب تک
ن کی پندرہ زبانوں کے ذریعہ شہریوں کی تربیت نہ ہو، اور ان کو اظہار کا
احق نہ دیا جائے۔ لارڈ ویلزلی نے صاحبانِ نو آموز کو پڑھانے کے لئے
رٹ ولیم کالج قائم کرتے وقت کہا تھا کہ "حکومت کرنے کے لئے رعایا
ے گفتگو ضروری ہے اور گفتگو کے لئے زبان کا جاننا ضروری ہے"۔ کوئی
ہ دار حکومت ۲۹ ملین اردو بولنے والوں کی فلاح و بہبود، تعلیم و تربیت
روزگار و معیشت سے بے تعلق نہیں ہو سکتی، اس لئے خوب سمجھ لیجئے
ردو بھیک نہیں ہے۔ آپ کا حق ہے۔

انگریز نے اپنا آشیانہ اس ملک کے عوام سے دور بنایا تھا، اس کی محفلوں
، ہمارا گزر نہیں تھا۔ ہماری قسمت اور معیشت کا فیصلہ ہمارے اختیار
ں نہیں تھا، ہمارے حصہ میں بس دور کا جلوہ تھا ؎

محفل ان کی، ساقی ان کا   آنکھیں میری، باقی ان کا

اب یہ صورت نہیں ہے، جمہوری نظام میں یہ صورت ہو بھی نہیں سکتی
ـ حکومت ہیں، اصلی طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے، جس حکومت کو ۲۹ ملین
م پسند کریں گے اس کی کامیابی یقینی ہے اور جس حکومت کو ۲۹ ملین عوام
ند کریں گے وہ ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔

حضرات! اردو کے مطالعہ سے ادراک کی بند آنکھیں کھل جاتی ہیں،
ں اور ذکاوت پر جلا ہو جاتی ہے اور ہم سب کے دل ایک ہی آہنگ پر

دھڑکنے لگتے ہیں۔ ہندوستان کی تہذیب بڑی دلفریب ہے اور اردو نے
اس میں ایرانی اور وسطِ ایشیائی عناصر شامل کر کے اسے وسیع تر اور حسین تر
بنا دیا ہے اگر اس زبان کے ساتھ بے رخی یا بے وفائی برتی گئی تو اس میں پورے
ملک کا نقصان ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے اپنے انتقال سے چند روز پہلے
وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط لکھا تھا اور یہ خط پنڈت جی کے
مرتب کئے ہوئے پرانے خطوں میں موجود ہے۔ اس میں انھوں نے یوپی میں
اردو کے ساتھ جو ظلم اور زیادتی ہوئی تھی، اس پر گہرے رنج کا اظہار فرمایا تھا
اور لکھا تھا کہ اردو اتحاد اور شیرازہ بندی کی زندہ علامت ہے اس کے نقصان
میں پورے ملک کا نقصان پوشیدہ ہے۔

گلستاں بیرد اگر میرد یم ما

اردو کی تعلیم و تدریس جمہوریت کا تقاضا ہی نہیں ہے، تہذیبی ضرورت
بھی ہے وہ تعلیم یکسر ناقص ہے جو مادری زبان میں نہ دی جائے اور دنیا کا کوئی
ماہرِ تعلیم ایسا نہیں ہے جس نے یہ کہا ہو کہ بغیر مادری زبان میں تعلیم حاصل کئے
صحیح شخصیت اور صحیح کردار کی نشو و نما ہو سکتی ہے اور سوائے افریقہ کے ان علاقوں
کے جن کی بولیاں بہت پس ماندہ ہیں، کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں تعلیم
مادری زبان میں نہ دی جاتی ہو۔ یا جہاں ۲۹ ملین آبادی کو اس کی ترسیل اور
ترقی یافتہ مادری زبان سے محروم کر دیا گیا ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے گاندھی
جی کے حوالے سے کہا تھا کہ "جو تعلیم مادری زبان میں نہ دی جائے میرا بس
چلے تو میں اُسے یک قلم مسترد کر دوں اور ان تمام اساتذہ کو فوراً برطرف کر دوں
جو اجنبی زبان میں تعلیم دیتے ہیں، جو نقصان پوری پوری نسلوں کا ہوا اس کا علاج
اسی سختی سے ممکن ہے۔"

حضرات! اگر آپ اس خیال میں ہیں کہ اس ملک میں صرف ایک زبان
ایک رسم خط اور ایک تہذیب کی حکمرانی ہوگی تو آپ بہت بڑی غلط فہمی
میں گرفتار ہیں، ایسا اس ملک میں نہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، ہمارا ملک
روس کو چھوڑ کر یورپ کے برابر ہے اور اس کا مقدر یہ ہے کہ وہ تمام قومی
زبانوں کو تسلیم کر کے آگے بڑھے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ تہذیبی
قدروں کا اعلان و اظہار صرف زبان ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

آپ سے زیادہ اس بات کا محرم اور کون ہوگا کہ حکومت کی بنیاد
تیغ و تفنگ پر نہیں، افکارِ تازہ پر ہوتی ہے۔ جو قوم خوب سے خوب تر کی
جستجو میں رہتی ہے، وہی آگے بڑھتی ہے۔ اسی طرح کسی ملک کی ترقی کا انحصار
بھی صرف تعلیم پر ہے اور ماہرین اس پر متفق ہیں کہ طالب علم کی زبان اور
تعلیم کی زبان میں فرق نہیں ہونا چاہیئے اور وہ تعلیم یکسر بے وقعت اور غیر تخلیقی ہے
جو مادری زبان میں نہ دی جائے یا جو اپنی تمدنی بنیادوں سے ناآشنا ہو۔

خدا کی رحمت ہو ندوہ کے دیدہ ور بانیوں پر جنھوں نے اس نکتہ کو سمجھا
اور اردو کی سرپرستی کی اور ندوہ کے مصنفین نے اس کے دامن کو اتنا وسیع کیا کہ آج
اس میں اسلامی لٹریچر ترکی اور انڈونیشی سے زیادہ ہے اور اپنی میزانِ قدر میں
شخصیت کی تعمیر اور جذبات کی تہذیب کو سب سے اونچا مقام دیا۔ یہ مقاصد

> کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ
> کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھودے۔
>
> ——— سرسید

میں پھر عرض کروں گا، اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم اردو کی تہذیبی قدر سمجھیں اور تعلیم کے شعبہ میں اردو کی اہمیت کو پہچانیں۔

عزیزانِ ندوہ! بڑا افسوس ہے کہ ہم ہر چیز کو پیسے کی ترازو میں تولنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اس CASH NEXUS کی وجہ سے جدھر پلّہ جھکتا ہے اُدھر خود بھی جھک جاتے ہیں۔ زبان و ادب کی تعلیم سے ہم اس لئے بے تعلق ہوتے جاتے ہیں کہ ان سے ہماری اقتصادی مشکلات حل نہیں ہوتیں۔ درحقیقت یہ زر دوستی کی گمراہ کن ذہنیت ہے جو انسان دوستی، رواداری، محبت، مذہب، انسانی قدروں اور عقیدوں کو بھی اسی طرح خوانچہ والوں کی ترازو میں تلوانے لگی۔ یہ نقد سودے کا اصول اگر زندگی پر حاوی ہو گیا تو پھر ہم سارے تہذیبی کام بند کر دیں گے۔

برادرانِ عزیز اور دوستو! میں روٹی کی اہمیت کو مانتا ہوں لیکن اس فرض کے پورا کرنے میں ذہنی صلاحیتوں اور تہذیبی مطالبوں سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا

MAN DOES NOT LIVE BY BREAD ALONE

بلکہ بقول ایک شاعر کے زندہ رہتا ہے۔ صداقت اور نیکی سے۔ حسن اور ہم آہنگی سے، محبت اور دوستی سے، آرزو کی خلش اور عبادت کے شوق سے۔ صرف روٹی سے نہیں، بلکہ گلاب کی عطر بیزی سے، نارنگی کے شگوفوں کی مہک سے، تازہ کٹی ہوئی گھاس کی بھینی بھینی خوشبو سے، دوست کے مصافحہ کی گرمی اور ماں کے محبت بھرے پیار کے گداز سے۔ صرف روٹی سے نہیں بلکہ شاعروں کے تغزّل سے، حکماء کی حکمت سے، اولیاء کے تقدس سے اور بلند ہستیوں کی داستانِ حیات سے۔ صرف روٹی سے نہیں بلکہ رفاقت اور اولوالعزمی سے، ڈھونڈنے اور پانے سے، سیوا اور مِل بانٹ کر کھانے سے چاہنے اور چاہے جانے سے۔

دوستو اور عزیزو! اگر ہمیں اردو کو بچانا اور اس کو ترقی دینا ہے تو زبان و ادب کو دولت سے اونچا مقام دینا ہوگا اور زبان و تہذیب کے لئے وہ سارے کام کرنے ہوں گے جو پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ میں ہو چکے ہیں۔

دہلی اور یوپی جو اردو کا خاص گہوارہ اور آستانہ رہے ہیں اور جہاں اس کے تمام لفظیات و اسالیب وجود میں آئے ہیں آزادی کے بعد وہاں کے اسکولوں بالخاص کر پرائمری اسکولوں سے اردو کو خارج کر دیا گیا جو آئین و دستور کی صریح خلاف ورزی تھی اور اس کے کتب خانے ورق ورق ہو کر اُڑ گئے اور اس کا ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہماری بے حسی واقعی تیمارداروں کو شرماتی ہے، مجھے اس پر ایک قصہ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ شیطان بہت سخت بیمار ہوا۔ لینے کے دینے پڑ گئے شیاطین میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ مختلف اطباء اور ڈاکٹر بلائے گئے۔ کسی نے کہا اسے کسی بڑے قاتل کا خون دینا چاہیئے، خون پہنچایا گیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ ہذیان کی کیفیت بڑھ گئی۔ پھر طبی کانفرنس ہوئی اور یہ تجویز ہوئی کہ اسے کسی بڑے کذّاب کی بوٹیوں کا شوربا دینا چاہیئے۔ اس سے بھی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر میں ایک بوڑھے طبیب نے تجویز کیا کہ اسے کسی بڑے بے حس کی کھیجی کا پانی نتھار کر دینا چاہیئے۔ خدا کی قدرت اس نے ایک ہی خوراک پی تھی کہ آنکھیں کھول دیں۔

بے حسی سب سے بڑا شیطانی زہر ہے جو ہماری رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور اس نے احساسِ زیاں کو مٹا دیا ہے۔ یہ بوالعجبی بھی ملاحظہ ہو کہ ہم اردو کی اکادمیوں اور انجمن کی شاخوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اردو کے لئے جائز حقوق فراہم کریں گی، حالانکہ وہ بقول اکبر "مدخولۂ گورنمنٹ" ہیں اور ان کی زیست سرتاسر حکومت کے لطف و کرم پر منحصر ہے ؎

چلی ہے مصلحتِ وقت کے قدم چھو کر
ہوائے دامنِ ساحل کی آبرو کیا ہے

اس بات کے دہرانے میں مضائقہ نہیں کہ اردو کو ہندوستانی زبانوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اتفاقی نہیں ہے بلکہ صدہا سال کی تمدّنی ضروریات اور تحریکات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہمیں ذہن کے جالے صاف کر کے اور دل کی نامحکمی کو چھوڑ کر اردو کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو جانا چاہیئے اس لئے کہ اردو کی خدمت سیکولر اور جمہوری سماج کی خدمت ہے۔ اردو کی خدمت زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں کی خدمت ہے۔ اگر اردو کے کارناموں کی پرچھائیاں ہمیں نئے تمدن میں حرکت کرتی ہوئی معلوم نہ ہوئیں تو اس سے نہ صرف اردو کو نقصان پہنچے گا بلکہ پورے ملک کو، گنگا جمنی تہذیب کو اور سیکولر جمہوریت کو نقصان پہنچے گا جمہوری نظام کو فرشتے نہیں چلاتے مشینیں نہیں چلاتیں، انسان چلاتے ہیں، ہم اور آپ چلاتے ہیں۔ اردو اپنی فراخدلی، ملنساری، عوام دوستی، وفا کیشی، دردمندی اور اولوالعزمی سے ہمارے اندر وہ صفات پیدا کرتی ہے جو مستقبل کے شہریوں کے لئے ضروری ہیں اور جن کے ذریعہ ہم اپنی آئندہ کی ذمہ داریوں کو پورے اعتماد کے ساتھ اٹھا سکتے ہیں۔

میں رُخِ گردش کے آگے شمع رکھنا نہیں چاہتا اور نہ ایک زبان کا دوسری زبان سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن آخر میں بڑے ادب سے اتنی بات ضرور پوچھوں گا اور اجازت چاہوں گا ؎

کوئی انساں بھی دیکھا؟ کوئی عاشق بھی مِلا؟
یوں تو آنے کو تری بزم میں دنیا آئی

———

بیگم نسیم اقتدار علی

میاں جی کی کہانی — اُن کی اپنی زبانی

کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں کے انتخاب کے لیے سرسیّد خود انگلینڈ تشریف لے جاتے تھے اور وہاں سے قابل اور مخلص لوگوں کو منتخب کرکے لاتے۔ ج یہ درست نہیں ہے — ادارہ ع اس کے علاوہ بھی ہندوستان کے کونے کونے سے قابل اساتذہ کو علی گڑھ میں لاکر جمع کیا تھا۔ میرے زمانے میں ایک بنگالی پروفیسر انعام اللہ خاں شیکسپیئر پڑھانے میں کمال رکھتے تھے۔ اگر کسی طالب علم کو سمجھنے میں دقت ہوتی تو بلامعاوضہ اسے الگ سے پڑھا دیتے تھے۔ یہ دیکھ کر بہت سے لڑکے پڑھنے لگے، جب تعداد زیادہ بڑھی تو فرداً فرداً پڑھانا مشکل ہوگیا تو ایک فاضل کلاس لینا شروع کردیا۔ عجیب حلیہ تھا ان کا شیروانی ٹوپی پہنتے تھے۔ لیکن شیروانی حد سے لمبی ہوتی۔ بس گٹنوں سے ذرا اوپر تک رہتی تھی۔ وہ فنافی الشکسپیر تھے۔

ایک اور بنگالی پروفیسر چکرورتی سرسیّد کے لائے ہوئے میرے زمانے میں تھے۔ سادہ وضع سادہ لباس لیکن انتہائی قابل۔ چلم پیتے تھے اور دھوئیں کی کثرت سے داڑھی اور مونچھوں کے بال لبوں کے اطراف پیلے ہو گئے تھے۔ علم ہندسہ پر انہیں کی مشہور کتاب چکرورتی کے نام سے برسوں ہائی اسکول کے کورس میں شامل رہی۔

ان کے علاوہ دو مولوی صاحبان جو اپنے اپنے مسلک کے جیّد علم تھے، اکثر یاد آتے ہیں۔ مولوی خلیل احمد صاحب سنی اور مولوی عباس صاحب شیعہ تھے۔ دونوں محبت اور مروت کے پیکر تھے اور اپنے ہم مذہب اساتذہ اور طلباء پر ان کا بڑا اثر تھا۔ سرسیّد ان دونوں کو اسی لیے لائے تھے کہ شیعوں اور سنیوں میں باہم میل و محبت رہے۔ چنانچہ دونوں فرقوں کے لوگ یونیورسٹی کی مسجد میں ایک ساتھ نماز ادا کرتے۔ اور وہ اس طرح کہ اِدھر اِن کی جماعت ہو رہی ہے اور اُدھر اُن کی۔

وقار الملک نواب مشتاق حسین خاں اس وقت کالج کے سکریٹری تھے۔ ان کی وضع قطع مولویانہ تھی اور صوم و صلوٰۃ نیز جملہ اصول شریعت کے پابند تھے۔ ہوسٹل کے لڑکوں پر بڑی سختی رکھتے۔ رات کو نو بجے کے بعد کوئی لڑکا ہوسٹل سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ علاوہ ازیں ہوسٹل کے اندر بھی لہو و لعب کی اجازت نہ تھی۔ ایک مرتبہ رات میں لڑکے ہوسٹل کے اندر ایک ہال میں اندر سبھا کا ڈرامہ کھیل رہے تھے۔ کسی نے جاکر مخبری کردی۔

نواب صاحب چھڑی لیے غصّے میں بھرے فوراً آئے اور سب لڑکے تو بھاگ گئے۔ لیکن آغا مرزا راجہ اندر بنے تخت پر بیٹھے تھے۔ وہ بھاگ نہیں سکے، و ہی بیٹھے رہے۔ وقار الملک نے ڈپٹ کر پوچھا "تو کون" آغا مرزا انتہا ئی مسخرے تھے۔ ہیک کر اپنا پارٹ سنانے لگے۔ "راجہ ہوں میں قوم کا اور میرا نام" نواب صاحب مرحوم لاحول پڑھتے ہوئے چلے گئے۔

ہم لوگوں کو فارسی ایک ایرانی استاد پڑھاتے تھے اور وہ ہم لوگوں سے گفتگو بھی فارسی ہی میں کرتے تھے۔ بڑی شفقت و محبت فرماتے میرے فارغ العلم ہونے کے بعد بہت عرصے تک یعنی جب تک وہ ہندوستان میں رہے انھوں نے وہ ربط و تعلق قایم رکھا۔ حیدرآباد کے راجہ جے کشن پرشاد کالج کے بڑے دل دادہ اور سرسیّد کے خاص ہمدردوں میں تھے۔ اسٹاف میں تو نہیں تھے لیکن کالج کے بڑے مہربانوں میں تھے۔

ہم سبق ساتھیوں میں پروفیسر حمید الدین خاں، پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر عبد الحمید وغیرہ کے علاوہ صاحبزادہ حمید اللہ خاں والی بھوپال سے خصوصیت کی ملاقات تھی — اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم دونوں کا پولو کھیلنے کا شوق قدر مشترک تھا۔ حمید اللہ خاں بھی اسی سال علی گڑھ آئے تھے۔ ایک شاندار کوٹھی قیام کے لیے کرایے پر لی تھی اور ریطور ڈے کالج میں داخل ہوئے۔ دو گھوڑے رکھتے تھے اور ایک پرائیویٹ ٹیوٹر تھے۔ کی طرف ان کی توجہ کم تھی، کھیل کود کے زیادہ شوقین تھے۔ میری اُن کی ملاقات کا سلسلہ بعد تک قائم رہا۔ لیکن ایک مرتبہ میری ناراضگی کی وجہ سے یہ سلسلہ کچھ عرصے کے لیے منقطع ہوگیا تھا۔ ہوا یہ کہ میرے خط کا جواب بجائے حمید اللہ خاں کے ان کے پرائیویٹ سکریٹری نے دیا۔ میں نے دوبارہ خط لکھا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ میری ملاقات علی گڑھ کے پُرانے ساتھی حمید اللہ خاں سے ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ ان کی جگہ ہز ہائی نس نے لے لی ہے۔ لہذا آج دوستی کا یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میری تعیناتی بہ طور ڈپٹی کلکٹر بریلی میں تھی۔ وہ نینی تال جا رہے تھے۔ اپنی آمد کا اظہار کیے بغیر بہانے سے بریلی اسٹیشن بلوایا۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے اور زبردستی اپنے سیلون میں بٹھا لیا۔ ریل چل دی۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن ایک نہ سنی بڑے قد آور اور وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ دو چار اسٹیشن بعد ہدایت تھی کہ موٹر پہنچ جائے اور موٹر سے مجھے بریلی پہنچوایا۔ اکثر بھوپال بلا

تھے لیکن میں صرف ایک مرتبہ ہی جا سکا اور وہ بھی طالب علمی کے زمانے میں۔
ہمارے ایک اور ساتھی آگرہ کے اختر عادل جو بعد میں پاکستان میں کسی بڑے عہدے سے رٹائر ہوئے تھے اور اب آگرہ ہی میں مدفون ہیں، اس سفر میں میرے ساتھ تھے۔ حمید اللہ خاں کی والدہ محترمہ ہر ہائی نس بیگم بھوپال نے ہم دونوں کو طلب کیا اور پردے میں سے مخاطب ہوئیں۔ ہماری خیر و عافیت دریافت کی اور دورانِ گفتگو فرمایا کہ "یوں تو میں حمید اللہ کو تعلیم کے لیے لندن بھی بھیج سکتی تھی، لیکن علی گڑھ محض اس وجہ سے بھیجا کہ اس کے دل میں قوم کا درد پیدا ہو۔" ان کا یہ جملہ مجھے اکثر یاد آتا ہے۔

ہمارے ایک اور قابلِ ذکر ساتھی عبداللہ خاں بلوچ تھے۔ کیا حیرت انگیز ہستی تھے۔ بلوچستان سے علی گڑھ آئے۔ ایک پیسہ پاس نہ تھا۔ اسٹیشن سے بکس اور بستر پیٹھ پر لاد کر پوچھتے پوچھتے وکٹوریہ گیٹ پہنچ گئے۔ لمبے چوڑے پہلوان آدمی تھے۔ سیدھے ہیڈ اسسٹنٹ کے پاس جا کر کہا۔ "ہم داخل ہونے آیا ہے۔" شاہجہاں پور کے رہنے والے بابو رفیع اللہ خاں اس وقت ہیڈ اسسٹنٹ تھے۔ انھوں نے برسر کے پاس بھیج دیا۔ برسر عبدالباقی میاں بھی شاہجہاں پور ہی کے تھے۔ کام سے کام رکھنے والے خشک مزاج آدمی تھے۔ انھوں نے فیس کا پرچہ بنایا اور بغیر نظر اٹھائے کہا کہ "چودہ روپے فیس جمع کرو۔" عبداللہ خاں بولے "تم ہوش میں ہو، ہمارے پاس تو چودہ پیسہ بھی نہیں ہے۔" "پھر داخلہ کیسے ہوگا" باقی میاں نے کہا۔ عبداللہ خاں نے جیب سے ایک اردو اخبار نکال کر دکھایا جس میں نادار اور ہونہار طلبہ کے لیے فیس کی معافی کا اعلان تھا اور کہا کہ "ہم تو اسے پڑھ کر آئے ہیں۔" خیر داخلہ ہو گیا اور یہ اسی بکس بستر کلاس میں پہنچ گئے۔ تاکہ ایک دن بھی ضائع نہ ہو۔ لڑکوں نے ان کی ہیئت دیکھ کر ہنسنا اور مذاق کرنا شروع کیا۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رہنے کے لیے بابو رفیع اللہ خاں نے سر سید ہال کے پاس بیت بیلے کے پیچھے برآمدے میں جہاں ان کی بکریاں بندھتی تھیں، جگہ دے دی۔ عبداللہ خاں نے ہمیشہ سڑک کی روشنی میں پڑھا اور کبھی کتاب نہیں خریدی۔ دوستوں سے مانگ کر لے جاتے تھے اور رات بھر میں پوری کتاب نقل کر لیتے۔ ٹیوشن سے گزر بسر کرنے لگے۔ ظہور وارڈ میں ایک ٹیوشن کیا تھا لیکن ایسی محنت سے پڑھایا کہ اس کی کالج بھر میں شہرت ہو گئی۔ ٹیوشن پڑھنے والے بہت سے امیدوار ہو گئے۔ لیکن سب کو یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ایک سے زیادہ کو پڑھا سکوں۔ اس کے کھانے کا یہ انتظام تھا کہ ایک بڑی سی مٹی کی ہانڈی خرید لی تھی، اس میں دنیا بھر کی چیزیں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیتے تھے اور پھر اس میں سے کھا کر باقی چھینکے پر ٹانگ دیتے تھے۔ کالج سے بی۔ ایس سی کرنے کے بعد بمبئی چلے گئے اور بحری جہاز میں کوئلہ جھونکنے پر ملازمت کر لی۔ جہاز امریکہ گیا یہ وہاں جہاز سے اتر کر شہر میں پہنچ گئے۔ بغیر کاغذات و پاسپورٹ گھومتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ جیل میں امریکہ کا قانون پڑھا اور مقدمہ میں یہ نکتہ پیش کیا کہ ملکی قانون کی رو سے کوئی غیر ملکی بغیر پاسپورٹ ملک میں داخل نہیں ہو سکتا۔ میں تو داخل ہو گیا ہوں۔ لہٰذا یہ دفعہ مجھ پر عائد نہیں ہو سکتی۔ نیز حصولِ تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا۔ فاضل جج نے بری کر دیا۔ اور ملک میں رہنے کی اجازت دی۔ وہاں سے انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ علی گڑھ سے بلاوا گیا، لیکن یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "میرا وطن بلوچستان میری خدمات کا طالب ہے۔" کیسی کیسی ہستیاں تھیں ع زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔

مشہور معالج ڈاکٹر عبدالحمید مرحوم بھی ہمارے ہم سبق ساتھیوں میں تھے۔ یہ نماز کے مانیٹر تھے۔ مسجد کے باہر نماز کا رجسٹر لیے پانچوں وقت موجود رہتے۔ اکثر لڑکے بغیر نماز پڑھے کہہ سن کر اپنی حاضری لگوا لیتے تھے۔ ان سے ملاقات کا سلسلہ بعد تک قائم رہا۔

پروفیسر محمد حبیب طالب علمی کے زمانے میں بڑے شکیل، دبلے پتلے شرمیلے سے کم آمیز نوجوان تھے۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ اذان سنتے ہی مسجد کا رخ کرتے۔ لباس کے معاملے میں ہمیشہ لاپروا رہے۔ یعنی آستینوں کے بٹن کھلے ہی رہتے تھے۔ بعد میں ایک عرصے تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں تجدید ملاقات کا یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ اسی محبت سے ملے۔ لیکن اُن میں ہونے والی تبدیلی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ حبیب بھی بارک کے کمرہ نمبر ۴۸ میں رہتے تھے جب کہ میں ۴۹ میں تھا۔

صاحب زادہ لیاقت علی خاں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بھی اسی زمانے میں کالج میں تھے۔ لیکن مجھ سے جونیئر تھے اور زیادہ عرصے نہیں رہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اسکول میں داخل ہوئے تھے اور میکڈانلڈ ہوسٹل میں رہتے تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یونین جو سٹوڈنٹس کلب کے نام سے مشہور تھی، اقامتی یونیورسٹیوں میں شاید پہلی یونین تھی۔ اس کا پریسیڈنٹ اس زمانے میں بڑی اہمیت کا حامل ہوتا تھا اور لڑکے اس کی بڑی عزت و وقعت کرتے تھے۔ ہمارے زمانے میں ایم۔ اے۔ او کالج میں کھیل کی سرگرمیاں بہت زوروں پر تھیں۔ پولو، ٹینس، ہاکی، فٹ بال وغیرہ سب ہی کھیلوں کا انتظام تھا۔ میں پولو اور ٹینس کا کیپٹن رہا۔ اپنا گھوڑا رکھتا تھا اور رائڈنگ کلب کا کیپٹن بھی تھا۔ بلکہ رائڈنگ کلب کا کیپٹن تو متواتر دو ٹرم رہا۔ یہ بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت تک کسی دوسری یونیورسٹی میں رائڈنگ کلب نہ تھا۔ جب کوئی معزز مہمان آتا تو ہم لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر اسے لینے اسٹیشن جاتے۔ سیاہ رنگ کے ٹرکش کوٹ اور ہاف پینٹ ہماری وردی تھی۔ ویسے روزانہ شام کو رائڈنگ کلب کے دس پندرہ ممبر گھوڑ سواری کی مشق کرتے۔
پرانے طالب علم اس زمانے میں بھی نئے لڑکوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے

لیکن تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے۔ فاختہ اڑانا ایک خاص شرارت
یعنی کوئی لڑکا سو رہا ہے دوسرے لڑکے آئے اور چپکے سے اس کے ہاتھ
پر روئی رکھ کر ماچس لگا دی۔ وہ چیخ کر اچھل پڑا۔ اور یہاں قہقہے لگ
رہے ہیں کہ فاختہ اُڑ گئی۔ برسات میں Mud Throwing یعنی کیچڑ
اچھالنا بھی سب لڑکوں کا محبوب کھیل تھا۔

کالج میں ایک اور قاعدہ تھا کہ ہر پندرھویں دن انگلش ڈنر
ہوتا تھا۔ اس میں جو طالب علم شریک ہونا چاہے، اس کو اس روز ڈائننگ
ہال سے کھانا نہیں ملتا تھا۔ اس کے علاوہ مزید آٹھ آنے دینا ہوتے تھے۔
ٹیبل پر سٹر لوگ کھانے میں شریک ہوتے تھے اور لڑکوں کو انگریزی طریقے
سے کھانا سکھاتے تھے۔ جب پڈنگ آتی تو آغا مرزا بہت سی لینے کی کوشش کرتے
اور صاحب ڈانٹ لگاتے "آغا مرزا Think others"

میرے زمانے میں ڈاکٹر ضیاءُ الدین وائس چانسلر ہو گئے تھے
مجھ پر ان کی خاص عنایت رہتی تھی۔ میں ایم۔ اے پریویس میں تھا کہ
انھوں نے مجھے اسسٹنٹ ٹیوٹر مقرر کر دیا۔ اسسٹنٹ ٹیوٹر اس وقت
اسسٹنٹ وارڈن کو کہتے تھے۔ مسٹر یونی کلف وارڈن تھے۔ یہ سائنس
کے استاد تھے۔ غالباً فزکس یا کیمسٹری پڑھاتے تھے۔ ان سے اکثر ملنا ہوتا
ایک روز یونہی بغرض تفریح میں نے دہلی جانے کا ارادہ کیا۔ مسٹر یونی کلف
سے اجازت طلب کی۔ انھوں نے ایک خط دیا کہ یہ دہلی میں ان کے ایک دوست
Hon'ble Mr. Bl[illegible] کو پہنچا دوں۔ انھوں نے خط دیکھتے ہی مجھے
بلا لیا۔ اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد کہا کہ مسٹر یونی کلف نے تمہاری
بہت تعریف لکھی ہے۔ ہم تمہیں دہلی سکریٹریٹ میں ملازم رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنا
اپائنٹمنٹ لیٹر آج ہی لیتے جاؤ۔ میں ذرا گھبرایا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ مسٹر بلونٹ
گورنمنٹ آف انڈیا میں اپوائنٹمنٹ سکریٹری تھے اور انھوں نے یونی کلف
صاحب سے کہا تھا کہ "میں چاہتا ہوں کہ علی گڑھ کے کچھ اچھے لڑکے ہم کو
دو۔ خاص طور سے وہ جن کا تعلق یو پی کے اچھے خاندانوں سے ہو۔" اس
زمانے میں مرکزی حکومت کی سکریٹریٹ پر بنگالیوں کا بہت اچھا اثر تھا اور
زیادہ تر بنگالی ہی تھے۔ اس لیے مسٹر بلونٹ دوسرے صوبوں سے اچھے لوگ مرکز
میں لانا چاہتے تھے۔

میں تقرر نامہ لے کر علی گڑھ واپس آیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مجھے جانے
نہیں دیتے تھے۔ چند ماہ ٹالے رکھا۔ پھر بڑی مشکل سے لے جانے کی اجازت دی
میں نے ملازمت تو کر لی لیکن دہلی اور شملہ میں جی نہ لگا اور جلد ہی علی گڑھ
واپس آگیا۔ ایم۔ اے فائنل کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے وہیں لکچرر شپ کے لیے
بہت زور دیا۔ لیکن میں ڈپٹی کلکٹری کے لیے درخواست دے چکا تھا۔ وہ
منظور ہوئی اور پندرہ مارچ ۱۹۱۵ء کو بریلی سے میری ملازمت کا آغاز
ہوا اور جنوری ۱۹[illegible]ء میں ہیں یو پی سے ریٹائر ہوا۔

اِس عرصے میں یو۔ پی کے کئی اضلاع میں رہنا ہوا اور مختلف لوگوں
کا ساتھ رہا جن میں بیشتر انگریز افسران تھے۔ ان کے ساتھ اکثر دلچسپ اور بعض اوقات
سبق آموز واقعات پیش آئے۔ جن کے بیان کے لیے ایک پوری کتاب چاہیے۔

انگریزی دورِ حکومت میں بے باکی خودداری اور عزت نفس کے
ساتھ کام کرنا جن چند بزرگوں کا حصہ تھا، ان میں میاں مرحوم بھی تھے جس زمین
پر رہے، ہمیشہ آسمان رہے۔ لیکن کبھی غرور و تکبر کا شائبہ پاس سے نہ گزرا۔
مزاج متوازن تھا لیکن کبھی کبھی دیدہ و دانستہ دروغ گوئی یا احمقانہ بحث پر
طیش میں آجاتے اور اس وقت ہر شخص اپنی جگہ پر دم بخود ہو جاتا تھا۔ میاں
کی زندگی بڑی پروقار، بااصول اور سادہ تھی۔ دورانِ ملازمت ہمیشہ
تین چار ذاتی ملازم رکھے اور بعد میں گھر پر تو بے گنتی ملازم تھے۔ لیکن اپنے
کام کے لیے کبھی کسی کو آواز نہیں دی۔ حتیٰ کہ وضو کا گرم پانی بھی خود ہی
لے لیتے۔ کھانے کے وقت اگر کوئی پاس کھڑے خدمت گار سے پانی مانگتا
تو ناخوش ہوتے۔ ہمیشہ اپنا کام خود کیا اور یہی نصیحت ہم لوگوں کو کرتے تھے۔
اور میں نے تو گویا ان کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ان کی تربیت میں
ہوش سنبھالا۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے والد بی ایس سی کرنے کے بعد
ایل ایل بی کر رہے تھے۔ بچوں کی اولادوں میں سب سے بڑی میں ہوں اور
انھیں چھوٹے بچے بہت پسند تھے۔ مجھ سے انتہائی محبت کرتے۔ لیکن بے جا لاڈ
کبھی نہیں کیا۔ میاں کی عظمت کا نقش تو بچپن ہی سے میرے دل پر ثبت ہے۔ میں
نے اُن کو کبھی غلط بیانی کرتے یا پس پشت کسی کو بُرا کہتے نہیں سنا۔ صاف گوئی
اور راست بازی ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز رہا۔ کبھی کبھی ان کی یہ صاف گوئی
لوگوں کو بُری لگ جاتی لیکن انھوں نے کسی سے بدلہ لینے یا نیچا دکھانے کی
کوشش نہیں کی وہ ان سب چیزوں سے ارفع اور بلند تھے۔ دور اور قریب
کے سب ہی رشتہ داروں کا خیال رکھتے اور اگر کوئی چند روز نہ آتا تو اس کی
خیریت دریافت کرنے یا تو خود تشریف لے جاتے یا کسی کو بھیجتے تھے۔ صلح کل اور
انصاف پسند طبیعت تھی۔ اعزا کے درمیان جائداد وغیرہ پر ہونے والے جھگڑوں
کو اس حسن و خوبی سے طے کرتے کہ دونوں فریق خوش رہتے۔ ایک مرتبہ ایک
بہت الجھا ہوا مقدمہ جو برسوں چلتا، میاں کے کہنے سے فریقین نے کچہری
سے اُٹھا لیا اور انھوں نے چند روز میں اس کا فیصلہ کر دیا۔

معلومات غضب کی تھیں۔ ہر فرد سے اس کے مذاق کے مطابق گفتگو
کرتے۔ موضوع شکار ہو یا سیاست، ادب ہو یا شاعری۔ وہ بے تکلفی سے
بات کرنے اور سننے والا متحیر ہو جاتا۔ عالمی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی اور
اخبار بینی تو گویا عادت تھی۔ جب تک نگاہ نے ساتھ دیا، اخبار پڑھتے رہے
پھر پڑھوا کر سننے لگے۔ انتقال سے ایک مہینہ پہلے اخبار سننا از خود بند کر دیا
تھا۔ خطوں کے جواب بہت پابندی سے دیتے اور بڑے دلچسپ خط لکھتے تھے۔

میاں نام و نمود سے ہمیشہ دور رہے اور نمائشی تقریبات سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ کبھی کسی بچے کی سالگرہ یا دھوم دھام سے بسم اللہ یا دیگر اس قسم کی تقریبات کرنے کی اجازت نہ دی۔ اسے اسراف بے جا میں شمار کرتے تھے۔ سینما کو حد درجے مخرب اخلاق سمجھتے تھے۔ اور ہم لوگوں کے سینما دیکھنے پر پابندی تھی۔ کورس کی کتابوں کے علاوہ ہم لوگ کس قسم کی کتابیں پڑھ رہے ہیں، اس پر بھی میاں بڑی کڑی نظر رکھتے۔ طالب علمی اور ملازمت کے ایام میں بقول اُن کے وہ ماڈرن رہے۔ رٹائرمنٹ کے بعد فریضۂ حج ادا کیا اور مذہب کی طرف زیادہ مائل ہوگئے۔ شاہجہاں پور میں ایک یتیم خانہ اور مدرسہ قائم کرنے کی بڑی خواہش تھی۔ انتقال سے چند سال قبل اس کی داغ بیل ڈالی لیکن کام زیادہ نہ بڑھ سکا۔

گھر کے سب ہی نوجوان تلاشِ معاش میں اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے اور لڑکیوں کی شادیاں ہوجانے کی وجہ سے گھر سونا ہوگیا تھا۔ خالی خالی گھر دیکھ کر اکثر یہ شعر پڑھتے۔

به وقت لقمہ خوردن اے تجمل گفت لب ہائم
کہ روزی می کند از ہم جدا یاران ہمدم را

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم سب جمع ہوتے تو بقول اُن کے گھر پر بہار آجاتی۔ لیکن اس بہار کا مرکز اور سب کی محبت کا محور ان کی ذات ہوتی۔ اپنی پوتی کے نواسی نواسہ کو بڑی شفقت اور محبت سے گود میں لے کر پیار کرتے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ رخصت کی گھڑی آتی تو ہمیشہ آبدیدہ ہوجاتے اور یہ شعر پڑھتے۔

میاں جی

دیدہ و دل سعدیا ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

آج بھی مجھے لگتا ہے جیسے ان کی آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہیں اور شفقت بھرا دلِ زیر زمین ہمارے لیے دھڑک رہا ہے۔ لیکن اُن کا خالی گرد آلود بیز کرسی، ویران الماریوں میں قرینے سے رکھی ہوئی ان کی [illegible] اس بے طرح ان کی یاد دلاتی ہیں کہ دل پکار اُٹھتا ہے ۔

ابا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے۔

★ ★ ★

کم فرصتی

وقت کم اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں۔ — سرسید

★ جس کے ہاتھ تلوار نہیں اٹھا سکتے وہ کبھی عزت کی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ (صلاح الدین ایوبی)

★ بڑے گھروں میں عموماً چھوٹے اور چھوٹے گھروں میں عموماً بڑے لوگ رہتے ہیں۔ — رازی

★ مشکل کام شروع کرنے سے پہلے مشکل ہوتا ہے۔

★ دشمن سے ہمیشہ اور دوست سے اس وقت بچو جب وہ تعریف کرنے لگے۔

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیاس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون :
۳۶۰۹
۴۱۹۹

مختار احمد مکی
صدر شعبۂ سیاسیات، کریم سٹی کالج،
جمشید پور

سرسید، اقبال اور علی گڑھ

ترکی کے مدحت پاشا، ایران کے حجۃ الاسلام شیخ ہادی نجم آبادی، مصر کے مصطفےٰ کمال، الجیریا کے امیر عبدالقادر، نجد کے مولانا محمد بن عبدالوہاب، حلقۂ فکر کے اکابر، افغانستان کے سید جمال الدین افغانی اور ہندوستان کے سید احمد شہید اور سرسید احمد خاں وہ مایہ ناز فرزندان اسلام ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی اصلاحِ معاشرہ تجدیدِ فکر اور احیائے ملی کے لیے انیسویں صدی میں مسلسل اور پُرخلوص جدوجہد کی۔ ان لوگوں کا نقطۂ نظر ایک تھا۔ گو طریقۂ کار مختلف۔ ان میں سے بعض نے سیاسی اقتدار کی بازیافت پر اپنی کوششیں صرف کیں۔ بعض کو احیائے دین میں عز و اقبال کا نشان نظر آیا۔ اور کچھ فکر و نظر کے پُرانے ساغر توڑ کر مغربی علوم و فنون کا سہارا لے کر تجدید و احیا کی راہ تلاش کی۔ سرسید احمد خاں کا شمار ہم انہیں لوگوں میں کر سکتے ہیں جن کا نقطۂ نظر تھا کہ علم و ہنر سماج و سیاست کے ان تمام قدیم نظریات سے سبکدوشی حاصل کی جائے جو آزادی کی راہ میں سنگِ گراں کی طرح حائل تھے۔ سید احمد شہید کے برعکس سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو تاریکی و ظلمت کی گہرائی سے نکالنے کے لیے انگریزوں کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کرنے اور معتقد مجاہدوں کے ساتھ سرحد پر انگریزوں سے برسرِ پیکار ہونے کے برخلاف مثبت اور پُرامن طریقہ اختیار کیا گو آزادی کی خلش اور تڑپ سرسید احمد کے پیشِ نظر بھی تھی۔ بقول مولانا محمد علی جوہرؔ

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی ابتدا تم تھے تو اس کی انتہا ہم ہیں

سرسید احمد خاں نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کی تحریک اور جنگ بالاکوٹ اور مولانا سید احمد شہیدؒ کی عملی تحریک کا مطالعہ بڑی گہری نظروں سے کیا تھا۔ لیکن تحریک کی ناکامی نے اُن کا دل توڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی پہلی جنگِ آزادی میں حریت پسندوں کی ناکامی کے باعث حریتِ آزادی کے لیے ان کی رہی سہی امیدیں بھی ختم ہو گئیں اور اُن کے سامنے پُرامن جدوجہد کا ایک ایسا راستہ رہ گیا جس پر گامزن ہو کر وہ اپنی قوم کو ترقی سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ کیوں کہ مسلمان اس وقت محض مجاہدانہ نعروں اور کشت و خون کے ذریعے اپنا مقصد کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں قانونی اور فکری تربیت کی ضرورت تھی تاکہ انگریزوں کی عیار سیاست کا انھیں کے ہتھیاروں سے قلع قمع کر سکیں۔ انھیں شدید طور پر یہ احساس تھا کہ عہد وسطیٰ کی مسلم سیاسی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور معاشی نظام دورِ حاضر میں نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے اور بدلے ہوئے نظام سے نبرد آزما ہونے کے لیے مسلمانوں کو اپنے پُرانے طریقۂ تعلیم کو خیرآباد کہہ کر نئے علوم کو اپنانا چاہیے جس سے اُن کے اندر ایک انقلاب انگیز نقطۂ نظر پیدا ہو اور اس کے بعد ہی وہ ترقی کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے خیال میں

"اگر حکومت نے ہمارے کچھ حقوق ابھی تک نہیں دیے ہیں
اور جس کی ہمیں شکایت ہے تو اعلیٰ تعلیم وہ چیز ہے جس
کے ذریعے یہ اختیارات خود بخود ہم مل جائیں گے۔ مگر
جو مانگتے ہو، اس کے مستحق تو بنو۔"

علامہ اقبال کا تعلق مسلمانوں کے متوسط طبقے سے تھا اور وہ اعلیٰ تعلیم کی اس دولت سے بھی مالا مال تھے جس طرح کی تعلیم سرسید احمد خاں مسلم نوجوانوں کو دینا چاہتے تھے۔ وہ ایک حساس مسلم نوجوان کی طرح اپنے دور کی کشیدگی، محرومی اور مسلمانوں کی زبوں حالی سے بھی واقف تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے مسلم قوم کو تصویرِ درد اور نالۂ یتیم سے تعبیر کیا ہے۔

بقول مولانا ابو الکلام آزاد

"مرحوم سرسید احمد خاں اور اُن کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں
صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور
ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ بیدار کر دیا تھا
جس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ اس
عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی
حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو، جدید ہندوستان
کے بہترین مصنف اسی حلقے کے زیرِ اثر پیدا ہوئے اور یہیں
نئی قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی
گئیں۔"

اس طرح محمڈن اینگلو اورینٹل کالج صرف ایک کالج نہ تھا جہاں نوخیز ذہنوں کو نئے سانچوں میں ڈھالا جاتا تھا۔ بلکہ یہ ایک تحریک تھی جس نے بالواسطہ سے زیادہ بلاواسطہ لوگوں کو متاثر کیا اور نیم مردہ ذہنوں میں بیداری کی ایک روح پھونک دی اور ہندوستانی مسلمان جذباتی و ذہنی طور پر اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ علامہ اقبال بھی اس تحریک کے پسندیدہ تھے۔

ون نے جس فضا میں سانس لی وہاں اس تحریک کی روح رچی بسی تھی۔ یہ وہ زمانہ
اجب سرسید اور ان کی تحریک کا پنجاب میں بڑا پُرجوش خیر مقدم ہوا تھا اور بقول
لی " جب بھی سرسید وہاں جایا کرتے تھے تو ریاست پنجاب میں ایک بجلی
، دوڑ جایا کرتی تھی۔" اسی تحریک کی گود میں علامہ اقبال کی پرورش ہوئی۔
ن قسمتی سے انھیں ابتدائی دور میں مولانا سید میر حسن جیسا روشن ضمیر اور
شن دل استاد ملا جو سرسید کے نہ صرف مداح تھے بلکہ پرجوش عقیدت مندوں
ںسے ایک تھے اور اس تحریک کی ہی دین ہے کہ وہ علامہ اقبال اور حکیم ملت بنے
نہ اپنی تعلیم کے حصول کے بعد کہیں ملا ہو جاتے یا خاندانی پیشے سے وابستہ ہو کر
امی کی زندگی میں فوت ہو جاتے۔ یہ وہی مولانا سید میر حسن ہیں جب کہ
مہ اقبال کو سر کا خطاب حکومت برطانیہ کی جانب سے دیا جانے والا تھا
س کو لینے سے اس وقت تک آپ نے انکار کیا جب تک سید میر حسن کو شمس
لماء کا خطاب نہ دیا جائے۔ اس پر گورنر پنجاب نے بڑی حیرت سے اُن کا
سنا اور پوچھا کہ " شاہ صاحب کی کوئی تصنیف بھی ہے " تو
امہ کا جواب برجستہ تھا کہ " ان کی زندہ تصنیف تو میں خود
ے ھوں "

مولانا سید میر حسن سے علامہ کی گہری عقیدت کا اظہار اس
قت بھی ملتا ہے جب کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ جاتے ہوئے حضرت خواجہ
نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر جو نظم آپ نے پڑھی تھی، اس میں اپنے
لدین اور بڑے بھائی کے تذکرے کے ساتھ شاہ صاحب کا بھی ذکر تھا۔

وہ شمع بارگہہ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کی کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

خود شاہ صاحب کا تعلق سرسید احمد خاں سے اس قدر گہرا تھا کہ سرسید
پنجاب کے جن دو چار بزرگوں پر اعتماد تھا اور جن کا وہ بے حد احترام کرتے
ے، ان میں شاہ صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے
لاس میں وہ باقاعدہ شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں جب کالج کا سنگ بنیاد
ئسرائے ہند کے ہاتھوں رکھا جانے والا تھا تو اس تقریب میں شاہ صاحب
ی شریک تھے۔ وائسرائے کے اعزاز میں دیے جانے والے شاندار ڈنر
ں شرکت سے انھوں نے معذرت کی کہ وہ ایسی دعوتوں میں شریک نہیں
ر سکتے۔ چنانچہ سرسید نے اپنے فرزند جسٹس محمود کے ہاتھوں ان کا کھانا اس
ید کے ساتھ بھیجا کہ "جب تک شاہ صاحب کھانا قبول نہ کریں، اُس وقت تک
، کی خدمت میں حاضر رہنا اور اُن کی باتیں سنتے رہنا۔"

مولانا سید میر حسن کے بعد جس شخص سے علامہ اقبال اپنے دوران
لیم بہت زیادہ متاثر ہوئے وہ ڈاکٹر ٹامس آرنلڈ ہیں۔ ڈاکٹر آرنلڈ
کالج کے بانیوں میں سے ہیں اور بہت دنوں تک سرسید کے دستِ راست
رہے اور سرسید کی زندگی تک وہاں فلسفہ کے پروفیسر رہے۔ لیکن ان
کے انتقال کے بعد علی گڑھ سے قطع تعلق کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے
کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ سرسید کے انتقال کا انھیں بہت صدمہ تھا،
اور ایک تعزیتی جلسے میں اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے انھوں نے کہا
تھا۔

" ہمیں ایسے شخص کی مثال ہندوستان میں کہاں مل سکتی
ہے جس کے پاس نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی اس
کے باوجود وہ ہندوستانی مسلمانوں کا سردار بن کر ظاہر
ہوا۔ میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہوں جس نے
سرسید سے زیادہ شریف زندگی بسر کی ہو۔ یہ ایک
شخص تھا اس قدر مفلس کہ اس کے پاس نہ رہنے
کو گھر تھا اور نہ مرنے کو۔ پھر بھی اس نے آپ کے لیے
ایک دولت چھوڑی ہے۔ اگر اس کی پیروی آپ کریں
تو آپ اور آپ کی اولاد کے قبضے میں سب سے بڑی
دولت ہوگی "

علامہ اقبال کو گورنمنٹ کالج لاہور میں اُن سے فیضیاب ہونے
کا موقع ملا اور آپ کی خداداد صلاحیت کے باعث ڈاکٹر آرنلڈ شاگرد سے
زیادہ دوست کا سلوک کرتے تھے ۱۹۰۴ء میں جب پروفیسر آرنلڈ
ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان چلے گئے تو اُن کی روانگی سے
حد درجے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے اپنی ابتدائی دور کی ایک مشہور
نظم " نالۂ فراق" لکھی جس میں استاد کی عظمت اپنی تشنگیٔ علم اور
عزم انگلستان کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

ان بزرگوں کے علاوہ علامہ اقبال ایک حد تک مولانا حالی سے بھی
متاثر تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے سب سے پہلے سرسید احمد خاں کی
ایماء و تحریک پر شاعری کو تفریحی مشغلہ اور تضیع اوقات سمجھ کر نہیں بلکہ
ایک تعمیری وظیفہ جان کر استعمال و اختیار کیا۔ اور دوسروں کو بھی اس کا
مشورہ دیا۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد
سید دگرا دراز نمی ازاشک سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

بہرکیف یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے علامہ اقبال کی تعلیمی آبیاری

میں حد درجے محنت کی اور اُن کے نظریات و خیالات کا اثر ہمیں علامہ کی شاعری
اور نثری افکار میں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے انہیں حضرات کی بدولت وہ نہ صرف
سرسید احمد خاں کی تحریک، علی گڑھ کے قیام اور اس کی روح سے واقف
ہوئے بلکہ علی گڑھ سے ایک قلبی تعلق اور سرسید احمد خاں سے ایک گہری عقیدت
پیدا ہوئی جس کا اظہار جگہ بہ جگہ انھوں نے اپنی نثر و نظم میں کیا ہے۔ بقول
رشید احمد صدیقی۔

سرسید مسلمانوں کو ملاؤں کی گرفت سے نکالنا چاہتے تھے
یہی مہم اقبال کے پیش نظر بھی تھی۔ گو دونوں کا زمانہ اور
طریقۂ کار مختلف تھا۔"

علامہ اقبال اپنے مشہور خطبۂ مدراس "اسلام میں مذہبی نظریات کی
تشکیل جدید" میں ہندوستان میں مسلمانوں کی احیائے ملی اور نشاط ثانیہ
کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"غالباً سرسید احمد خاں دورِ جدید کے پہلے مسلمان ہیں جنہوں
نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی جھلک دیکھ لی تھی۔
اور اپنی جدوجہد کا رخ اسلام کی نئی تفسیر اور تعبیر کی طرف
کر دیا تھا...... لیکن ان کی حقیقی عظمت اس میں ہے
کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جس نے اسلام کی
نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لیے سعی
کی۔"

علامہ اقبال کی سرسید احمد خاں سے کبھی ملاقات بھی ہوئی تھی؟ یا
کبھی انھوں نے دیکھا بھی تھا اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن 'ذکر
اقبال' کے مصنف مولانا عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں کہ قیام لاہور
کے زمانے میں ایک دفعہ اقبال تعطیلات کی وجہ سے سیالکوٹ گئے ہوئے تھے
کہ سرسید احمد خاں کے انتقال کی خبر آئی۔ مولانا میر حسن سے سرسید احمد خاں کے
تعلقات بہت گہرے تھے انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ وہ کالج جا رہے تھے راستے
میں اقبال مل گئے۔ آپ نے فرمایا۔ سرسید فوت ہو گئے۔ ذرا تاریخ وفات
کی فکر کرنا۔ اقبال ایک شناسا کی دُکان پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر فکر کرنے
کے بعد سید ذکی شاہ سے کہنے لگے۔ تاریخ وفات ہو گئی۔ جاؤ ابھی شاہ صاحب
کو سنا دو۔ تاریخ تھی۔ "اِنّی متوفیک و رافعک الیّ و مطھرک"
(قرآن شریف کی اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی طرف خطاب ہے کہ اے عیسیٰ
میں تجھ کو موت دینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھالینے والا ہوں اور
تجھ کو کافروں کے اتہام سے پاک کرنے والا ہوں۔) ذکی شاہ نے جب یہ تاریخ
تاریخ مولانا میر حسن کو سنائی تو انھوں نے فرمایا "بہت خوب ہے۔ میں
نے بھی ایک تاریخ نکالی ہے۔ "غفرلہٗ""

علامہ اقبال غالباً پہلی بار ۹ جنوری ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ آئے
جہاں اُن کا بہت ہی پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ اِس موقع پر انھوں نے ا
ہال میں انگریزی میں ایک مضمون ... a Social & Political ...
Muslim پڑھا جس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے "ملت بیضا پر
ایک عمرانی نظریہ" کے عنوان سے کیا ہے۔ اسی موقع پر انھوں نے
ایک مشہور نظم "ترانۂ ملت" بھی سنائی۔ یہ وہ زمانہ تھا
کہ مسلم اکابرین مثلاً وقار الملک، ہز ہائی نس آغا خاں اور
ضیاء الدین وغیرہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی جد
میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے
ایک تقریر "اسلامی یونیورسٹی کے خدوخال" کے نام سے ۱۹ فروری
کو محمڈن ہال لاہور میں کی۔ جس میں انھوں نے بتایا کہ مسلمانوں کا
کوئی بھی مسئلہ ہو وہ مذہبی مسئلہ ہوتا ہے اور صرف قومیت
اور نسل کی بنیاد پر یونیورسٹی کا قیام لاحاصل ہے۔ مسلمانوں کی قومیت مذ
کے ساتھ رہتی ہے۔ ایک شخص اس وقت مسلمان کہا جا سکتا ہے جب قوم
میں اس نے نشو و نما حاصل کی ہو اور اسی کام کی تکمیل کے لیے ہم یونیو
قایم کرنے والے ہیں۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

مسلم یونیورسٹی کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کی غرض سے ایک و
میں آغا خاں کی زیر قیادت لاہور پہنچا تو وفد کا استقبال کرنے والوں
صرف علامہ اقبال پیش پیش تھے بلکہ انھوں نے ہر ممکن مدد بھی کی۔

۱۹۱۴ء میں ہی جب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے
شوکت علی نے علامہ اقبال کو شرکت کی دعوت دی تو اس کے جواب میں ا
نے لکھا:

بھائی شوکت! اقبال عزلت گزیں ہے اور اس طوفان
بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چہار دیواری کو کشتی نوح
سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت
تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے
کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصے
سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی
عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا
سلام کہیے۔ مجھے اُن سے غائبانہ محبت ہے اس قدر
کہ ملاقات ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا
امکان بہت کم ہے۔ یہ چند اشعار میری جانب سے
ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے۔"

ان کی نظم یہ تھی۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

نواب وقار الملک کے انتقال پر فروری ۱۹۱۷ء میں علامہ اقبال
نے درجہ ذیل تاریخ وفات کہی۔

نواب وقار الملک و ملت — افشاند سوے جناں رکابش
برلوحِ مزار او نوشتم — انجام خیر باخطابش

وقار الملک انجام بخیر
۱ ۳ ۳ ۵

خاں نیاز الدین خاں بستی دانشمندان جالندھر کے نام ایک
یں ۶ دسمبر ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔

"افسوس اس بار علی گڑھ نہ جا سکوں گا۔ سردی کا
موسم ہے اور مجھے اس موسم میں احتیاط کی خاص ضرورت
ہے۔ علی گڑھ کانفرنس ایک مدت سے مردہ ہو چکی ہے
اور حبیب الرحمٰن خاں شروانی ایک مدت سے اسے
زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں
پئے نافہ ہائے رمیدہ بو بپسند زحمتِ جستجو
بخیالِ حلقۂ زلف او گرہے خورد بختن درآ"

ایک دوسرے خط میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۴ء کو خاں نیاز الدین خاں
لکھتے ہیں کہ علی گڑھ جانے کا قصد تو تھا مگر سردی اور
بارش سے کمر میں درد ہونے لگا اس وجہ سے وہاں
سے معذور رہے۔

۹ فروری ۱۹۲۹ء کو جب راس مسعود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے
چانسلر مقرر ہوئے تو اقبال کا تعلق یونیورسٹی سے بہت زیادہ
یا۔ اس دوران مختلف بار وہ علی گڑھ گئے۔ ۵ جنوری ۱۹۳۰ء
ب خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں

"میں ابھی ایک ہفتے کے لیے علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ وہاں
ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سید راس مسعود
بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے
کہ ان کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک
خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گی۔ آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا
کریں اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو کیا کریں
تو نتائج بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت سی مخالف
قوتوں کے جو ہندوستان میں مذاہب کے خلاف اور
بالخصوص اسلام کے خلاف اس وقت عمل کر رہی ہیں
مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کے لیے تڑپ ہے
لیکن افسوس کہ کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی زندگی
قلوب پر موثر ہو۔"

حکومت افغانستان کی دعوت پر علامہ اقبال، سید راس مسعود اور
مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جب افغانستان کا تعلیمی دورہ ساتھ کیا
تو علامہ کے تعلقات سید راس مسعود سے اور بھی گہرے ہو گئے جو راس مسعود
کے انتقال تک برقرار رہے۔ وہ جب ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کی وائس چانسلری سے
مستعفی ہو کر نواب بھوپال کی دعوت پر وزیر تعلیم مقرر ہوئے تو انھیں کی
کوشش سے علامہ اقبال کا وظیفہ مقرر ہوا۔ قیام بھوپال کے زمانے میں علامہ
اقبال نے بڑے اصرار سے ایک خوش الحان قاری کو مقرر کر رکھا تھا جو ہر صبح
آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی
موصوفہ کی دوسری بچی نادرہ کی پیدائش ہونے والی تھی۔ علامہ کا خیال تھا کہ
ایامِ حمل میں کسی خوش الحان قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچہ
پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ غالباً اسی خیال سے ارمغان حجاز میں
دخترانِ ملت کو خطاب کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں

ز شامِ ما برون آور سحر را
بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قرأت تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

راس مسعود کے پہلے بچے کے شیر خوارگی میں وفات پا جانے پر رنجور
ماں کو تسکین و تشفی کا خط لکھتے ہوئے آخر میں یہ شعر بھی لکھتے ہیں ؎

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود
آہ ازاں غنچہ کہ بادِ سحر اوراکشود

علامہ اقبال اپنی فارسی مثنوی کے ایک مجموعے "پس چہ باید کرد
اے اقوام مشرق" کے محرک کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں ۱۹۳۶ء
کے بھوپال کے زمانۂ قیام میں ایک خواب کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

"۳ اپریل ۱۹۳۶ء کی رات ۳ بجے کے قریب میں نے
سرسید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں کب سے
بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گزر
گئی۔ فرمایا۔ حضور رسالتمآب ﷺ کی خدمت میں عرض کرو
میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرضداشت کے
چند شعر، جو اب طویل ہو گئی ہے، میری زبان پر جاری
ہو گئے۔ انشاء اللہ مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے

اقوام مشرق، نام کے ساتھ جلد ہی یہ عرضداشت شائع
ہوگی - ۴ر اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی
شروع ہوئی - اب پہلے کی بہ نسبت آواز صاف ہے
اور اس کا وہ ring عود کر رہا ہے جو
انسانی آواز کا خاصہ ہے - گو اس ترقی کی رفتار
بہت سست ہے ۔"

جون ۳۶ ۱۹ء میں علامہ اپنے ایک خط میں سر راس مسعود کو لکھتے ہیں
کہ

"میں چاہتا ہوں کہ شیخ عبدالغنی مرحوم کی جگہ تم کو اپنے
بچوں کا چوتھا ولی مقرر کر دوں"

اس کے جواب میں سر راس مسعود نے تحریر کیا -

"ولی تو کم از کم ایسے آدمی کو مقرر کرو جو پنجاب میں
مقیم ہو - البتہ اپنی وصیت میں یہ ضرور لکھو کہ گارجینس
کو اگر کسی معاملے میں جہاں تک منیزہ سلمہا اور جاوید
سلمہٗ کی تعلیم کا تعلق ہے، کوئی مالی دقت پیش آئے
تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں - یہ خود ایک بڑی ذمہ داری
میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں
جو مجھے تم سے ہے ۔"

۳۰ر جنوری ۱۹۳۰ء کو راس مسعود کے ناگہانی انتقال کا علامہ
اقبال کو بہت صدمہ ہوا - لیڈی مسعود کو تعزیتی خط میں لکھتے ہیں کہ
"میں آپ کو صبر کی تلقین کیوں کر کروں، جب کہ میرا
دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے۔"
یہ جملہ اس شخص کا لکھا ہوا ہے جس نے ہمیشہ دنیا کو ضبط، تحمل اور
استقلال کا درس دیا تھا -

ایک دوسرے خط میں ممنون حسن خاں و سر راس مسعود کے
پرائیویٹ سکریٹری تھے کو لکھتے ہیں کہ "میرے لیے یہ صدمہ ناقابل
برداشت ہے راس مسعود کا غم باقی رہے گا جب تک میں باقی
ہوں ۔" علامہ نے ایک رباعی جو اپنے مزار کے کتبے کے لیے لکھ رکھی تھی
راس مسعود کے مزار کے لیے ممنون حسن خاں کو روانہ کی - اس خط کے ساتھ
کہ "اس رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ ان کی زندگی اور
موت پر صادق آتا ہے۔"

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
ز بند این و آں آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمے چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

۱۳ر جنوری ۱۹۳۰ء کو جنرل کونسل حمایت اسلام کے نام ایک
میں علامہ نے لکھا کہ

"مرحوم نے دادا کی طرح ملک و ملت کی بہت زیادہ
خدمت کی ہے - مرحوم کی موت سے مسلمانانِ ہند کو بہت
نقصان پہنچا ہے - لہٰذا تعزیت کا ریزولوشن پاس کیا
جائے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے - نیز
ریزولوشن کی کاپی بیگم مسعود صاحبہ ریاض منزل بھوپال
اور مرحوم کی والدہ ماجدہ کی خدمت میں علی گڑھ ارسال
کی جائے ۔"

ارمغان حجاز کی ایک مشہور نظم مسعود مرحوم میں بھی انھوں نے
اس گہرے تعلق کا اظہار کیا ہے -

وہ یادگار کمالات احمد و محمود
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاع گراں بہا مسعود
مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بیدردی

ان تعلقات کے علاوہ "سید کے لوح تربت پر" میں علامہ اقب
کے جذبات، عقیدت و ارادت کا ایک دریا موجزن نظر آتا ہے - اس میں ا
نے سرسید کے پیغام ان کے مقصد حیات اور فکر کی بنیادی پہلوؤں پر
موثر انداز میں روشنی ڈالی ہے -

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
سنگ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشم باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ
بندۂ مومن کا دل بیم ورجا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

"طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" اُن کا جو پیغام ہے وہ بھی در
گہرائی لیے ہوئے ہے

اس گہرے تعلق کے باوجود ایک بات عام طور پر کھٹکتی ہے وہ
ہے کہ ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ نے انہیں فلسفہ میں پروفیسر شپ کے عہدے
پیش کش کی تو اس کو انھوں نے ٹھکرا دیا - اس کی وجہ بتاتے ہوئے اپر
۱۹۰۹ء میں وہ عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں

"وجہ صرف معمولی ہے کہ میں نوکری نہیں
کرنا چاہتا اور اس سے قبل لاہور یونیورسٹی
میں تاریخ میں پروفیسر شپ کے عہدے کو
بھی ٹھکرا چکا ہوں ۔"

★

جہیز کی آگ

ڈاکٹر فوق کریمی
ایڈیٹر ہفت روزہ ترجمان
علی گڑھ

۲ر مئی ۱۹۸۴ء کو راجیہ سبھا میں وزیر قانون شریمتی رام دلاری سنہا نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ جہیز کی قربان گاہوں پر لڑکیوں کو بھینٹ چڑھانے کی رسم صرف دہلی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی جہیز کم لانے کی بنا پر لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، یا خودکشی کر لیتی ہیں اس سلسلے میں وزیر صاحبہ نے تین سال کے درمیان کس کس صوبے میں کتنی لڑکیوں نے خودکشی کی یا اُن کو جہیز کی قربان گاہ پر چڑھا دیا گیا۔ اس کے اعداد و شمار کا ایک چارٹ بھی راجیہ سبھا میں پیش کیا گیا ہے جس کو ہم ذیل میں دے رہے ہیں۔

نمبر سلسلہ	نام صوبہ	۱۹۸۱	۱۹۸۲	۱۹۸۳	میزان
۱	اترپردیش	۳۰	۱۵۱	۱۶۰	۳۴۱
۲	ہریانہ	۲۸	۴۲	۷۲	۱۴۲
۳	پنجاب	۳۵	۴۰	۴۰	۱۱۵
۴	دہلی	۲۴	۴۰	۴۲	۱۰۶
۵	مہاراشٹرا	۱۹	۲۵	۳۵	۷۹
۶	مدھیہ پردیش	۷	۲۶	۳۵	۶۸
۷	کرناٹک	۷	۸	۳۱	۴۶
۸	بہار	۹	۱۲	۱۵	۳۶
۹	تامل ناڈو	۲	۵	۵	۱۲
۱۰	آندھرا	۲	۴	۴	۱۰
۱۱	اڑیسہ	۱	۴	۵	۱۰
۱۲	ہماچل پردیش	۱	۳	۲	۶
۱۳	گجرات	۲	۱	۲	۵
۱۴	چنڈی گڑھ	-	۲	۲	۴
۱۵	آسام	۲	-	-	۲

جہیز کم لانے یا لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کی برابر مانگ اور مختلف قسم کی فرمائشوں کے پورا نہ ہونے پر لڑکیاں جلادی جاتی ہیں یا وہ خودکشی کر لیتی ہیں۔ مذکورہ اعداد و شمار سرکاری ہیں لیکن یہ اعداد و شمار اس لیے صحیح نہیں ہو سکتے کہ سیکڑوں لڑکیوں کی مرنے کی رپورٹیں پولیس میں اندراج تک نہیں ہوتیں۔ کچھ تو اس لیے کہ لڑکی والے پولس میں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی بات الٹی نہ ہو جائے۔ دوسرے ہزارہا واقعات شہروں کے مضافات میں ہوتے ہیں اور غریب باپ اپنی بیٹی کی موت پر آنسو بہا کر رہ جاتا ہے۔ اگر وہ یا اُس کے متعلقین کچھ شور و غل بھی کرتے ہیں تو دوسری پارٹی کے پاس ذرائع ہوتے ہیں۔ وہ بہت جلد پولس کو اپنے اثرات سے اپنا ہمنوا بنا لیتی ہے۔ دوسرے اس نقشے میں ہندوستان کے سارے علاقوں کے اعداد و شمار نہیں ہیں اور جن علاقوں کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں وہ اس لیے بھی کم معلوم ہوتے ہیں کہ بعض جگہ جہیز دینے کی رسم اتنی ضروری بن گئی ہے جیسے انسان کے زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور غذا بھی معمولی نہیں بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہونی چاہیے۔ جیسے آندھرا پردیش جہاں کوئی لڑکی شاید ہی بغیر جہیز کے بیاہی جاتی ہو۔ مذکورہ نقشے میں آندھرا پردیش میں تین سال کے اندر صرف دس لڑکیوں کی موت بتائی جاتی ہے۔ جب کہ آندھرا پردیش میں غربت بھی بہت زیادہ ہے۔ مذکورہ نقشے کے اعداد و شمار سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ ہر صوبے میں جہیز کی بھینٹ چڑھنے والی لڑکیوں میں کسی سال کمی نہیں پائی گئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ ہر روز اخبار میں لڑکیوں میں خودکشی ہونے والے واقعات ہندو سماج میں ہوتے ہیں اور اخبارات میں بھی وہی واقعات آتے ہیں جن کا اندراج پولس کے ریکارڈ میں آجاتا ہے۔ ورنہ سیکڑوں واقعات دہلی اور بڑے بڑے شہروں کے مضافات میں ایسے ہو جاتے ہیں اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوتی اور لڑکیاں و عورتیں خاموشی سے موت کی نیند سو جاتی ہیں۔

جہیز کے نام پر جو خودکشیاں ہوتی ہیں ان کو ہم صرف جہیز کم لانے کی وجہ ہی قرار نہیں دے سکتے، ان کا تعلق نوجوانوں کی نفسیات و جذبات سے بھی بڑی حد تک دیکھا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات ۹۹ فیصدی ہندوؤں میں ہی پائے جاتے ہیں۔ اس کے لیے حکومت نے مختلف ذرائع اپنائے کہ یہ بُرے واقعات پیش نہ آئیں۔ اس کے لیے قانون بھی بنائے گئے کہ جہیز دینے پر بندش لگا دی گئی۔ مگر اس بندش کے بعد جہیز کی مانگ اور بڑھ گئی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ پہلے لڑکے والوں کو ان کی مانگ پر روپیہ دے دیا جاتا تھا اور وہ لوگوں کی اور برادری والوں کی نظر میں آجاتا تھا۔ لیکن اب تو پہلے سے زیادہ مانگ بڑھ گئی ہے اور ہندو سماج کی مارکیٹ میں لڑکے کی تعلیم و ملازمت کو سامنے رکھ کر سودا ہوتا ہے اگر ایک لڑکا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہے تو اس کی قیمت ایک لاکھ روپے مقرر ہے۔ اگر

کوئی لڑکا انجینئر ہے اور اس کی تنخواہ ہزار بارہ سو ہے لیکن باقی دوسری آمدنی کو سامنے رکھ کر لڑکے کی قیمت دو لاکھ تین لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر کوئی لڑکا اور سیر ہے تو اس کی قیمت پچاس ساٹھ ہزار لگتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی لڑکا بنک میں ملازم ہے یا کسی ایسی جگہ پر ہے جس کی آمدنی ٹھوس ہے تو اس کی قیمت ہزاروں سے بڑھ کر لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ حالاں کہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اگر کوئی لڑکا ڈاکٹر، انجینئر یا ڈپٹی کلکٹر ہے تو اس کو دولت کے مقابلے تعلیم یافتہ اور شریف و باعزت گھرانے کی لڑکی کے ساتھ بغیر دولت کے شادی کر لینی چاہیے اور اپنی طرف سے لڑکی والوں کو تمغے تحائف دینے چاہیں۔ مگر ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ ہندو سماج میں جہیز دینا اور لڑکے کو زیادہ سے زیادہ بولی بول کر حاصل کرنا آج کی بات نہیں ہے، ہزارہا سال کی رسم ہے اور اب یہ رسم مسلم سماج میں بھی آنکھ کھول رہی ہے۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ مسلم لڑکیوں میں خود سوزی اور خودکشی کے واقعات ہزار میں شاید دو چار ہی ملیں گے لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ مسلمان دولت نہیں چاہتے رہے ہیں۔ مگر ان کے سماج میں ان کی مذہبیت غالب ہے اور اسلام میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اسلامی قانون میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ خودکشی کرنے والوں کی بخشش نہیں ہوگی اور مسلم گھرانوں میں پیدائشی طور پر خودکشی کو بزدلی بھی بتایا ہے لیکن اب ہمیں یہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں بھی جدید تقاضوں اور موجودہ اسلام کش روایات کو اپنے یہاں جگہ دینی شروع کر دی ہے۔ ان کے یہاں بھی برادری، ذات کی تقسیم اور معیار نے طبیعتوں کو لالچی بنا دیا ہے حالاں کہ اسلام نے عورت کو برابری کا درجہ دیا ہے۔ اسے ایک طرف باپ کی وراثت میں پڑا کا حقدار بنایا تو شوہر پر پہلے مہر کی ادائیگی کو ایک ضابطہ قرار دیا۔ لیکن آج اسلامی زندگی میں تیزی کے ساتھ غیر اسلامی طور طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو مسلم سماج میں بھی لڑکیاں خود سوزی اور خودکشی کی آئے دن شکار ہو جائیں گی۔

جہیز کی لعنت قانون کے ذریعے نہیں ختم ہو سکتی بلکہ اس کو سماج سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہے جس طرح مذہب اسلام کے ہادی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی پر ایک مشکیزہ، ایک چکی اور چند برتن دے کر جہیز کی شکل دی آج اسی طرح کی زندگی اپنانے کی ضرورت ہے جس نے عورت کو سوسائٹی اور سماج میں ایک باوقار درجہ عطا کر دیا۔

★ ★

ایک فاسد مگر دل فریب تصورِ زندگی مدتوں تک زندگی کے چشموں کو مسموم کر سکتا ہے۔

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

موسیقی منجمد ہو جائے تو وہ فنِ تعمیر کہلاتی ہے

— جرمن شاعر گوئٹے

خوشی بونے سے آتی ہے کاٹنے سے نہیں

— البرٹ شوائٹزر

جو آدمی کشتی کو کھیتا ہے اس کے پاس اسے ہلانے اور جھکولے دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔

[illegible]

جو شخص ٹھوکر مارتا ہے وہ ایک [illegible] ہوتا ہے۔

فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو

ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔

———— ڈاکٹر ذاکر حسین

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

— اقبال

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

— اقبال

نقیب الاسلام نشرہ اعظمی
بی۔یو۔ایم۔ایس۔

ذیابیطس ۔ ایک تکلیف دہ مرض

ذیابیطس کو دولاب، برکاریہ، معطشہ، زلق الکلیہ اور استسقاء انس کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کو ڈایابٹیز (Diabetes) اور سنسکرت میں مدھو پرمیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ماہیت (Pathology)۔ ذیابیطس ایک نہایت خطرناک مرض ہے اور تکلیف دہ بھی جس میں بحالت شدت مرض مریض کو بار بار پیشاب کرنا پڑتا ہے اس کے ساتھ ہی پیاس بھی شدید لگتی ہے۔ مریض پیاس کو تسکین دینے کے لیے بار بار پانی پیتا ہے اور یہ پانی تھوڑی دیر میں پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ :۔ ذیابیطس یونانی لفظ کا معرب ہے اور اسی یونانی لفظ کو خفیف تغیر کے بعد انگریزی میں ڈایابٹیز کہا جانے لگا ہے

ذیابیطس کے معنی یونانی میں دولاب (رہٹ) کے ہیں اس مرض میں گردے نہایت شدت کے ساتھ خون سے پانی کو جذب کرکے خارج کرنے لگتے ہیں اور جب اس جذب کی زیادتی سے خون میں پانی کی کمی واقع ہوجاتی ہے تو معدے میں پانی کی مانگ بڑھ جاتی ہے جس کی علامت پیاس کی شدت ہے۔ اس پیاس کو رفع کرنے کے لیے مریض پانی پیتا ہے جس کو گردے فوراً ہی جذب کرکے خارج کر دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ یعنی ادھر مریض پانی پیتا ہے، ادھر گردے اس کو نکال باہر کرتے ہیں۔ اس جذب و اخراج کی مثال رہٹ سے دی جاسکتی ہے جس میں کنویں سے ڈول بھر بھر کر آتے ہیں اور اُن کا پانی باہر آکر گرتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی مشابہت سے اس مرض کو ذیابیطس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

"برکاریہ" لفظ 'برکار' سے بنا ہے جو کہ 'برکار' سے منسوب ہے جس طرح برکار ایک نقطے سے گھوم کر پھر اسی نقطے پر آموجود ہوتا ہے اسی طرح مرض ذیابیطس میں پانی جس طرح باہر سے اندر گیا تھا اسی طرح باہر آجاتا ہے۔ لہٰذا وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

معطشہ کے معنی پیاس کے ہیں بلکہ "پیاس لگانے والا" چونکہ اس مرض میں پیاس بہت شدید ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو بعض اطباء نے "معطشہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

زلق الکلیہ کے معنی ہیں 'گردوں کی پھسلن' اس مرض میں جب پانی گردوں میں پہنچتا ہے تو وہاں سے فوراً ہی واپس پھسل کر نکل جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام 'زلق الکلیہ' بھی رکھ دیا گیا ہے۔

استسقائے انس کے معنی ہیں مثانے کا استسقاء" اس مرض میں چونکہ مثانہ کسی وقت بھی پیشاب سے خالی نہیں رہتا ہے تھوڑا بہت ہر وقت اس میں جمع رہتا ہے۔ لہٰذا اس کو استسقائے انس بھی کہتے ہیں۔

مدھو پرمیہ کے معنی 'میٹھا جریان' کے ہیں۔ چونکہ اس مرض میں پیشاب کے ساتھ شکر بھی خارج ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو سنسکرت میں مدھو پرمیہ کہتے ہیں۔

ذیابیطس کی تاریخ :۔ ذیابیطس کوئی نیا مرض نہیں ہے قدیم یونانی اطباء اس سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اس پر کافی بحث کی اور اس کا علاج تجویز کیا۔ آیورویدک میں بھی 'مدھو پرمیہ' کے نام سے اس کا ذکر اور علاج ملتا ہے۔ انگریزی اطبا نے اٹھارہویں صدی سے اس مرض کے متعلق تحقیق شروع کردی اور جدید معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں یورپ کے کئی مشہور ڈاکٹروں نے اس مرض کی دوا 'انسولین' (INSULIN) دریافت کی۔

ذیابیطس کی قسمیں (TYPES)

ذیابیطس کی دو قسمیں ہیں

۱۔ ذیابیطس شکری (Diabetes Mellitus)

۲ ذیابیطس سادہ (Diabetes Insipidus)

۱۔ ذیابیطس شکری (Diabetes Mellitus)۔ اس قسم میں مریض کو بہت زیادہ پیاس لگتی ہے اور بار بار پیشاب آتا ہے اور اس پیشاب میں شکر خارج ہوا کرتی ہے۔ درحقیقت ذیابیطس یہی ہے اور اس کا بیان ہی ہمارا موضوع ہے۔

۲۔ ذیابیطس سادہ (Diabetes Insipidus)۔ اس میں مریض کو پیاس بھی زیادہ لگتی ہے اور پیشاب بھی زیادہ آتا ہے لیکن اس میں پیشاب میں شکر خارج نہیں ہوتی ہے۔

ذیابیطس شکری [DIABETIS MELLIUS]

ذیابیطس شکری ہی درحقیقت ذیابیطس ہے۔ یہ نہایت تکلیف دہ اور مشکل سے اچھا ہونے والا مرض ہے۔ اس میں پیشاب زیادہ آتا ہے اور اس کے ساتھ شکر ملی ہوئی ہوتی ہے۔ شکر کے اخراج سے تمام جسم کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے عضلات تحلیل ہو کر پتلے پڑ جاتے ہیں اور ساتھ ہی عام صحتِ جسمانی بھی خراب ہو جاتی ہے۔ ذیابیطس شکری ایک خفیف یا عارضی قسم بھی پیدا کرتی ہے جس کو بولِ شکری [GLYCOSURIA] کہتے ہیں۔ یہ قسم عموماً مٹھائیاں کھانے کالی کھانسی، دمہ اور مرگی یا کلوروفارم سنگھانے کے بعد ہوتی ہے۔ اس کی تین صورتیں ہوا کرتی ہیں۔

(۱) پیشاب میں ہمیشہ شکر آتی ہے اور اس کا وزن تناسبہ ـــــ یعنی [Specific gravity] ۱.۰۳۰ سے ۱.۰۴۵ تک ہوتا ہے۔ پیشاب کی مقدار میں تھوڑا ہی اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں نہ تو پیاس زیادہ لگتی ہے اور نہ بھوک ستاتی ہے اور نہ مریض زیادہ لاغر ہوتا ہے جب تک مرض قایم رہتا ہے، مریض کی حالت میں کوئی غیر معمولی فرق واقع نہیں ہوتا ہے۔

(۲) بولِ شکری کی دوسری صورت میں شکر چند روز آتی ہے اور پھر موقوف ہو جاتی ہے۔ پیشاب کی مقدار عموماً تو تندرستی کے مطابق ہوتی ہے لیکن کبھی اس سے بڑھ جاتی ہے۔ یہ حالت زیادہ تر فکر و تردد یا سر اور پشت پر چوٹ لگنے سے پیش آتی ہے اور اس میں مریض کسی قدر لاغر اور کمزور بھی ہو جایا کرتا ہے۔

(۳) بولِ شکری کی تیسری صورت میں پیشاب متوسط مقدار میں ہوتا ہے یعنی نہ تو وہ بہت زیادہ اور نہ کم۔ اس میں شکر کی مقدار بھی زیادہ خارج نہیں ہوتی ہے۔ پیشاب میں حامض بولی [Uric Acid] کے ذرات بھی شامل ہوا کرتے ہیں اور جن لوگوں کو اس تیسری صورت سے واسطہ پڑتا ہے وہ اکثر مرض نقرس [گاوٹ] میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مریض عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جو متوسط درجے کے موٹے تازے ہوتے ہیں اور جن کی عمر چالیس برس یا اس سے تجاوز کر چکی ہے۔

بدنِ انسان میں شکر کی پیدائش

ہم روزمرہ جس قدر نشاستہ آٹے دالوں وغیرہ کی شکل میں کھاتے ہیں وہ معدہ اور آنتوں میں ہضم ہو کر شکر انگوری [گلوکوز] بن جاتا ہے اور یہ شکر یہاں سے جذب ہو کر بابُ الکبد [Hepatic Portal Vein] کے راستے جگر میں پہنچتی ہے اور وہاں پر پھر اس میں ایک کیمیاوی تبدیلی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ شکر انگوری جگر میں پہنچنے کے بعد ایک خاص قسم کے مادے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ مادہ شکر کبدی یا گلائیکوجن [Glycogen] کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب یہ شکر کبدی خون میں شامل ہوتی ہے تو وہاں اس کو ایک خاص قسم کے خمیرے واسطہ پڑتا ہے جو اس کو اپنے کیمیاوی اثر سے پھر شکر انگوری [گلوکوز] بنا دیتا ہے۔ غرض کہ یہ شکر خون میں شامل ہو کر دوران کرتی ہوئی تمام بدن میں پھیل جاتی ہے اور عضلاتِ جسم میں داخل ہو کر ان کی پرورش کرتی ہے۔ نیز اس میں طاقت اور گرمی پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے غذاؤں کے نشاستہ دار اور شکریلے اجزاء میں یہ تبدیلیاں نہ ہوں اور یہ عضلات تک نہ پہنچیں تو یہ شکریلے اجزاء پیشاب کے ساتھ خارج ہونے لگتے ہیں اور مرض ذیابیطس لاحق ہو جایا کرتا ہے۔

اسباب: [CAUSES OF DIABETES]

بعض مریضوں میں تمام تحقیق و جستجو کے بعد بھی ذیابیطس کا کوئی سبب نہیں پایا جاتا ہے۔ لیکن بعض مریضوں میں اس کا سبب محرک صرف سردی لگنا یا بارش میں بھیگ جانا ہوا کرتا ہے۔ بعض مریض ایسے بھی پائے گئے ہیں جن کے حالات سننے سے معلوم ہوا کہ وہ سخت محنت و مشقت یا ورزش کرنے یا سفر کرنے کے بعد بدن کے حالتِ اعتدال میں آنے سے پہلے پانی پی لیتے تھے۔ بعض مریضوں میں شیریں اور نشاستہ دار غذاؤں کا کثرتِ استعمال سست اور بیکار رہنا، عیش و آرام کی زندگی بسر کرنا بھی اس مرض کا سبب معلوم ہوا ہے۔ بعض میں شراب نوشی کی کثرت سے بھی یہ مرض ہوتا ہوا دیکھا گیا ہے۔

علاوہ اس کے کثرتِ مباشرت، رنج و غم کی زیادتی، دماغ و نخاع [حرام مغز] یا جگر یا گلاہ گردہ یا آنتوں پر چوٹ لگنے سے بھی یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے اور کبھی ہائپر تھائیرائڈزم [Hyperthyroidism] بھی اس کا سبب بن جاتا ہے۔ اکثر دماغی محنت کرنے والے بھی اس مرض میں مبتلا دیکھے گئے ہیں۔ کبھی دماغ کے بطن یا مؤخر یا اس کے قرب و جوار میں رسولی [Tumours] پیدا ہو جانے سے یہ مرض لاحق ہوتا ہے اور کبھی کسی مرض کی سمیت کے اثر سے جگر اور نظام عصبی [Nervous System] میں فتور پڑ جانے سے بھی یہ مرض ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں میں ملیریا اور دیگر متعدی بخاروں نیز آتشک و نقرس کے بعد ان کی سمیت سے ذیابیطس کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض یونانی اطباء کے نزدیک ذیابیطس کا سبب گردوں کا سوءِ مزاج گرم ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا اسباب وہ اسبابِ محرکہ ہیں جو اس مرض کو تحریک میں لاتے ہیں ان کے علاوہ جنسیت [Sex]، عمر، وراثت [Familial] اور رنگت بھی اس مرض کے پیدا کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ چنانچہ عورتوں کی بہ نسبت مردوں میں اس مرض

کے پیدا ہونے کی استعداد زیادہ ہے۔ بچوں میں یہ مرض نہیں ہوتا ہے۔
مردوں میں زیادہ تر ۴۵ سے ۶۵ سال کی عمر تک دیکھا جاتا ہے۔ تقریباً
۴۸ فی صدی مریض ۴۰ سے ۶۰ سال کی عمر کے، ۰، فی صدی ۲۰ سے ۴۰ سال
کی عمر کے، فی صدی ۲۰ سے ۴۰ سال کی عمر کے اور صرف ۴ فی صدی ۲۰
سال کی عمر کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ جوانی میں عورتیں بھی اس میں مبتلا دیکھی
گئی ہیں۔ دیہاتوں کے مقابلے میں یہ مرض شہریوں میں خصوصاً امیر
شہریوں میں ہوتا ہے۔ جو خوب کھاتے پیتے اور عیش و آرام کی زندگی بسر
کرتے ہیں۔ دُبلے لوگوں کی نسبت زیادہ تر موٹے لوگوں کو ہوتا ہے۔

یہ مرض اگرچہ تمام روئے زمین پر پایا جاتا ہے، لیکن ہندوستان
لنکا اور اٹلی میں اس کے مریض زیادہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ تمام قومیں اس
میں مبتلا ہوتی ہیں مگر یہودیوں کو یہ مرض زیادہ ہوتا ہے اور گورے
لوگ سیاہ فام لوگوں کے مقابلے میں اس مرض میں زیادہ مبتلا ہوتے
ہیں۔ کبھی یہ مرض موروثی بھی ہوتا ہے اور کبھی ایک ہی خاندان کے کئی افراد
اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ذیابیطس کی علامتیں [Symptoms of Diabetes]

جب کسی شخص میں اس مرض کی ابتدا ہوتی ہے تو طبیعت سست
رہنے لگتی ہے۔ پیشاب معمول سے کسی قدر زیادہ آنے لگتا ہے ——
اور پیاس بھی زیادہ لگنے لگتی ہے لیکن بھوک اپنے معمول کے مطابق رہتی
ہے۔ یہ علامتیں اس قدر خفیف ہوتی ہیں کہ مریض ان کو اہمیت نہیں
دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت مرض خفیہ طور پر آہستہ آہستہ اپنا کام شروع
کر دیتا ہے۔ اور مریض اپنے آپ کو اس وقت دشمن جاں مرض میں
پھنسا ہوا دیکھتا ہے جب پیاس بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور پیشاب
زیادتی سے بار بار خارج ہونے لگتا ہے اور جسم روز بروز لاغر اور کمزور
ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

پیشاب عموماً رات کو زیادہ آتا ہے اور دن اور رات میں
اس کی مقدار تقریباً ، لیٹر تک ہو جایا کرتی ہے۔ یہ پیشاب ہلکا شربتی رنگ
کا ہوتا ہے اور اس میں شکر کی آمیزش ہوتی ہے۔ جس کے باعث اس کا مزہ
میٹھا ہوتا ہے اور بو میں بھی مٹھاس کا احساس ہوتا ہے۔ مریض جس جگہ
پیشاب کرتا ہے اس پر مکھیاں اور چونٹیاں جمع ہونے لگتی ہیں۔ پیشاب میں شکر
کی آمیزش سے اس کا وزن مخصوص بڑھ جاتا ہے۔

پیشاب میں شکر کے علاوہ یوریا اور فاسفیٹ Urea and
Phosphates] — بھی زیادہ خارج ہونے لگتے ہیں۔ پیشاب میں شکر
کے برابر نکلتے رہنے سے پیشاب کی نالی Urinary Tubules میں خراش
پیدا ہو جاتی ہے جس کے باعث پیشاب کرتے وقت جلن ہونے لگتی ہے اور
گردوں میں دکھن ہوا کرتی ہے۔

جب یہ مرض بہت شدید ہوتا ہے تو علامتیں بھی شدید
ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مریض کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگتا ہے۔ پیاس اس قدر
زیادہ لگتی ہے کہ جلد جلد بار بار پانی پینے کے باوجود بھی تسکین نہیں ہوتی،
ادھر پانی پیا، ادھر پیشاب کے راستے فوراً ہی خارج ہو گیا۔ بھوک شدید طور
پر بڑھ جاتی ہے۔ اور بار بار لگتی ہے۔ عام طور پر قبض رہتا ہے، منہ
خشک اور چپکا ہوا رہتا ہے۔ پیاس کی زیادتی کے باعث خون سے پانی جذب
ہو کر زیادہ مقدار میں نکل جاتا ہے۔ لہٰذا جسم کی رونق اور تازگی جاتی رہتی
ہے اور جسم کی جلد کھردری اور خشک ہو جاتی ہے اور اس سے بھوسی
سی جھڑنے لگتی ہے۔

بعض مریضوں کی جلد پر داغ اور جھائیاں پیدا ہو جاتی ہیں
اور بعض کو چھاجن ہو جاتی ہے۔ مریض روز بروز لاغر اور کمزور ہو جاتا
ہے۔ یہاں تک کہ اس کے عضلات سوکھ جاتے ہیں، اس کی قوتِ باہ زائل
ہو جاتی ہے۔ عورتوں میں حیض بند ہو جاتا ہے اور اس کمزوری کی
حالت میں بدن کی حرارت بھی کم ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں سرد ہونے
لگتے ہیں، لیکن ہاتھ کی ہتھیلی اور پاؤں کے تلوں میں گرمی اور جلن معلوم
ہوا کرتی ہے۔

شروع میں قلب اور نبض کی رفتار میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے
لیکن جب مریض اس مرض کی مخصوص بے ہوشی [Diabetic Coma]
میں مبتلا ہوتا ہے تو نبض کی رفتار سست ہو جایا کرتی ہے اور عضلات
کے سوکھ جانے سے جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے لگتا ہے۔ مریض کے جسم
اور سانس سے میٹھی بو آنے لگتی ہے۔ ہر وقت درد سر رہنے لگتا ہے
اُٹھتے بیٹھتے چکر آنے لگتے ہیں۔ زبان اکثر خشک اور کبھی اور سرخ معلوم
ہوتی ہے اور کبھی اس پر میل سا جما ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مسوڑے سوج
کر موٹے ہو جاتے ہیں جن میں دبانے سے درد ہوا کرتا ہے اور
دانت گلنے سڑنے لگتے ہیں۔ ان علامتوں کے علاوہ مریض کا مزاج چڑچڑا
ہو جاتا ہے۔ غصہ بہت جلد آتا ہے اور طبیعت پر خوف و ہراس کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

آخر میں مرض کی شدت کی وجہ سے بعض اوقات علامات میں
تبدیلیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً پیشاب کم آنے لگتا ہے۔ اس میں شکر
بھی گھٹ جاتی ہے اور رطوبت سفید [Albumin] آنے لگتی ہے
پہلے بھوک کا ہوکا آتا تھا اور اب غذا سے نفرت ہو جاتی ہے۔ قے کی
مقدار بڑھ جاتی ہے اور تعداد بھی۔ بعض مریضوں کو موتیا بند
cataract ہو جاتا ہے اور بینائی جاتی رہتی ہے۔

آخرکار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ مریض بہت زیادہ کمزور
ہونے کے باعث ہلاک ہو جاتا ہے، یا خون میں سمیت [Toxin] پیدا
ہو جانے کے سبب اس پر قوما ئے ذیابیطسی [Diabetic Coma]

کے دورے پڑنے لگتے ہیں یا تشنج ہونے لگتا ہے اور ان سے موت واقع ہوجاتی ہے اور گاہے مریض سل (دق) یا ذات الریہ میں مبتلا ہوکر یا دست کی زیادتی سے کمزور ہوکر ہلاک ہوجاتا ہے۔

ذیابیطس کی مخصوص علامتیں [Cardinal Symptoms]

۱۔ پیشاب کا زیادہ آنا۔
۲۔ شکر کا آنا۔
۳۔ پیاس کی شدت۔
۴۔ بھوک کی زیادتی۔
۵۔ جسم کی لاغری اور کمزوری

ذیابیطس کی تشخیص [DIAGNOSIS of DIABETES]

اگرچہ مذکورہ بالا پانچ علامتوں کی موجودگی میں ذیابیطس کی تشخیص آسانی سے ہوسکتی ہے۔ لیکن بعض اوقات معالج کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ مریض ذیابیطس سادہ Diabetes Insipidus میں مبتلا ہے یا ذیابیطس شکری Diabetes Mellitus میں۔

اگر قارورے [Urine Specimen] کو لے کر آگ پر خوب گرم کریں اور ٹھنڈا کریں تو اس میں البیومین [albumin] انڈے کی سفیدی کی مانند جم جائے گی اگر البیومین موجود ہے۔ اب قارورے کو چھان کر سیال مادہ الگ کریں اور اس میں تیزاب گندھک [Acid Sulphuric] ملائیں۔ اگر قارورے میں شکر موجود ہے تو وہ تیزاب سے جل کر سیاہ اجزاء کی شکل اختیار کرے گی اور تہہ نشین ہوجائے گی۔ پیشاب یا قارورے کی جانچ گھر پر بھی باآسانی کی جاسکتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ جانچ ممکن نہیں ہوپا رہی ہے تو مذکورہ پانچ علامات ہی تشخیص کے لیے کافی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ذیابیطس سادہ (کثرت بول) میں شکر کے عدم اخراج کے علاوہ مریض میں کوئی غیر معمولی لاغری اور کمزوری لاحق نہیں ہوتی ہے اور نہ دوسرے عوارض شدید ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بول شکری میں جو شکر خارج ہوتی ہے وہ محض عارضی ہوتی ہے اور اکثر مریضوں میں سبب دور کرنے سے اور غذاؤں کے کھانے پینے کی وجہ سے اس کا اخراج رک جاتا ہے۔

عوارضات:- [COMPLICATIONS]

ذیابیطس بذات خود ایک خطرناک مرض ہے اور اکثر ہلاکت کا سبب ہوا کرتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ دوسرے عوارضات کی طرف بھی منتقل ہوجاتا ہے اور وہ عوارضات بھی مہلک ہوا کرتے ہیں۔
مندرجہ ذیل عوارضات ذیابیطس کی وجہ سے ہوتے ہیں:

۱۔ سل یعنی دق جو خود ایک مہلک مرض ہے
۲۔ پھیپھڑوں کی ہوائی نالیوں میں ورم جس کی وجہ سے شدید کھانسی ہوتی ہے۔
۳۔ ذات الجنب یعنی Pleurisy اور ذات الریہ Tracheitis
۴۔ ورم گردہ یعنی Nephritis
۵۔ پھوڑے، پھنسی، چھاجن وغیرہ
۶۔ موتیا بند [cataract] اور طبقہ شبکیہ [Retina] میں لاغری اور خشکی ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے بینائی جاتی رہتی ہے۔

تدابیر و علاج [Management and Treatment]

۱۔ غذائیں [Diets] چونکہ مریض کی شکر کے ہضم و تحلیل میں خلل واقع ہوتا ہے، اس لیے مریض کو ہر قسم کی شیریں چیزوں سے سختی سے پرہیز کرایا جاتا ہے اور نشاستہ دار [Carbohydrates] چیزیں نہیں دی جاتی ہیں۔ کیوں کہ ان چیزوں کے نتیجے میں شکر پیدا ہوتی ہے۔ کھانے میں عام طور پر گیہوں کا آٹا یعنی اس کی روٹی یا چاول لیے جائیں۔ جہاں تک ممکن ہو آٹے کا نشاستہ الگ کرکے روٹی بنالیں۔ چاہیں تو آدھی بھوسی اور آدھا آٹا ملا کر روٹی بنالیں۔

حیوانی غذاؤں میں ان کا گوشت اور ان کا دودھ گھی وغیرہ کھائیں۔ مگر بڑے جانوروں کے گوشت سے گریز کریں۔ مرغ، بٹیر، تیتر اور دوسرے پرندوں کا گوشت مناسب ہے۔ بکرے کا گوشت بھی کھا سکتے ہیں۔ انڈے، مکھن، ملائی، گھی استعمال کرسکتے ہیں۔ دہی کا استعمال کرنا بھی مفید ہے۔ لوکی، ٹنڈا، توری، پرول، ککڑی، ٹماٹر اور گوبھی کھانے کی اجازت ہے۔ آلو، چقندر، شلجم، گاجر نہیں کھا سکتے۔

۲۔ دوائیں ذیابیطس کے علاج میں ہم چند گھریلو مگر مجرب نسخے تحریر کر رہے ہیں جو بے حد فائدے مند ہیں۔

نسخہ ۱۔ جامن کی گٹھلی کی گری ۶۰ گرام خشک کرکے باریک سفوف بنالیں اور ۳ گرام سفوف پانی کے ہمراہ دن میں دو بار لیں۔
نسخہ ۲۔ بنولہ (کپاس کے بیج) کی گری ۲ گرام لے کر ۸۰۰ ملی لیٹر پانی میں اتنا جوش دیں کہ ۲۰۰ ملی لیٹر رہ جائے۔ پھر چھان لیں اور دن میں دو بار لیں۔
نسخہ ۳۔ کریلہ بقدر ضرورت لے کر کچل کر اس کا رس نچوڑ لیں اور ۲۵ ملی لیٹر دس دن تک دو بار لیں۔
نسخہ ۴۔ بیل کے پتے ۱۲ گرام لے کر ۶۰ ملی لیٹر پانی میں پیس کر چھان لیں اور روزانہ صبح لیں۔
نسخہ ۵ (بے حد مجرب ہے)۔ مہندی کی پتیاں روزانہ صبح کو دودھ میں

بینٹ دنوں تک پیتے ہیں۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے روز صرف ایک پتی رات کو دودھ میں اُبال لیں اور صبح کو پتی کے ساتھ دودھ پی لیں۔ دوسرے روز دو پتیاں، تیسرے روز تین اور یکے بعد دیگرے پتیوں کی تعداد بڑھاتے جائیں اور دسویں روز ۱۰ پتیاں دودھ میں اُبال کر پئیں گے۔ گیارھویں روز اب تعداد پتیوں کی دس رکھیں گے۔ بارھویں روز نو پتیاں استعمال کریں اور یکے بعد دیگرے کم کرتے جائیں گے اور آخر میں بیسویں روز صبح کو صرف ایک پتی اُبال کر دودھ میں پئیں گے۔ مگر یاد رہے کہ پتیوں کی جو ترتیب بنائی گئی ہے اس میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دوا استعمال کرنے سے پہلے اور آخر میں پیشاب کی شکر کی مقدار معلوم کر لیا کریں تاکہ خاطر خواہ فائدے کا اندازہ ہو سکے۔

بظاہر یہ ترکیب اور ترتیب ایک حماقت لگتی ہوگی، مگر ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کو اسی میں صحتِ کلی دینا مقصود ہو۔ لہٰذا ایک دفعہ یہ تدبیر اختیار کر کے دیکھ لیں۔ اگر فائدہ نہ ہو تو پھر اسی ترتیب سے دوبارہ علاج کریں اور اوّل و آخر پیشاب کی شکر جانچ کرائیں انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

اس کے علاوہ تیار شدہ دواؤں میں قرص ذیابیطس ایک قرص ہمراہ پانی دن میں دو بار لیں۔ کشتۂ بیضۂ مرغ ۲۵ ملی گرام پانی کے ہمراہ صبح لیں۔ جوارش جالینوس ۶ گرام دن میں دو بار لیں۔

جدید علاج :- جدید علاج میں مرض کی شدت و کمی کے لحاظ سے دوائیں لیتے رہیں۔ شروع میں Tab Chlorpropamide جو کہ 100mg کی ٹکیہ آتی ہے دن میں ۵ ٹکیاں کھلاتے ہیں اور جب کمی واقع ہوتی ہے اور مرض کی شدت کم ہونے لگتی ہے تو پھر یہ ٹکیہ صرف دن بھر میں ایک عدد دیتے ہیں جو کافی لمبے عرصے تک لینا پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ Tab Daonil یا — Tab
Euglucon کی 5mg دن میں ایک دفعہ دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ اگر ضرورت پڑتی ہے تو "انسولین" [Insulin] کے انجکشن بھی استعمال کراتے ہیں۔ تاکہ انسولین کی مقدار خون میں مناسب موجود رہے۔ کیوں کہ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ انسولین کی کمی کی وجہ سے شکر کا انجذاب نہیں ہو پاتا ہے اور براہ بول [Urine] خارج ہوتی ہے۔

Insulin Plain

20, 40, 80, I.U./ml of body weight

Isophane 40, 80 I.U./ml of body weight

یہ دونوں استعمال کرا سکتے ہیں۔

اگر انسولین کے استعمال سے دل دھڑکنے لگے یا آنکھوں میں اندھیرا چھا جائے تو فوراً گلوکوز [Glucose] یا ایک اونس یا چینی کا شربت پلائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسولین کے استعمال سے ذیابیطس میں کمی ہوتی ہے اور شکر عارضی طور پر رُک جاتی ہے۔ مگر چند گھنٹے بعد میں اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس اثر کو قائم رکھنے کے لیے بار بار انسولین دینا پڑتا ہے حتیٰ کہ تمام عمر اس کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے انسولین کو ذیابیطس کی کامیاب دوا نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس کے متواتر استعمال سے نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اس کی زیادتی سے مریض کی بھوک دفعتہ غیر معمولی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ بے چینی اور غیر معمولی تکان محسوس ہوتی ہے۔ چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ نبض تیز ہونے لگتی ہے۔ فوراً تدارک نہ کرنے کی صورت میں مریض کو پسینہ آنے لگتا ہے۔ جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے اور شدید ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو کر مریض بے ہوش ہو جاتا ہے۔

چنانچہ کوشش یہ کرتے ہیں کہ انسولین کے ساتھ ساتھ بانقراس [Pancreas] اور جگر اور معدہ کی پیدا شدہ گڑبڑی کو دور کریں اور مناسب غذائیں دیں۔ اسی طریقے سے اس مرض کو دور کیا جا سکتا ہے اور عوارضات [Complications] سے نجات مل سکتی ہے۔

انجام [Prognosis]

ذیابیطس ایک مرض مزمن [Chronic Disease] ہے اور عام طور پر ایک سال سے تین سال تک رہتا ہے۔ لیکن بعض مریضوں میں حاد [Acute] بھی ہوا کرتا ہے اور چند مہینوں یا ہفتوں کے اندر ہی مریض کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مریض ہفتہ عشرہ کے اندر مرتے دیکھے گئے ہیں۔

بہرحال اس مرض کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہے۔ اس سے مریض بہت کم ہی شفایاب ہوتا ہے۔ خصوصاً یہ مرض جب کہ نوجوانوں میں ہوتا ہے تو وہ اکثر ہلاک ہی ہو جاتے ہیں۔ البتہ چالیس سال کی عمر کے بعد مناسب علاج اور پرہیز سے بعض مریض اچھے ہو جاتے ہیں۔

اکثر اوقات پیشاب میں شکر آنا یک دم رک جاتی ہے تو مریض قومائے ذیابیطس [Diabetes Coma] میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاتا ہے اور اگر مریض کو دست آنے لگیں اور روز بروز لاغری اور کمزوری بڑھتی جائے اور اس کے ساتھ ہی کچھ دماغی علامتیں بھی پیدا ہو جائیں تو ان حالات میں مریض دفعتاً انتقال کر جاتا ہے۔

[اللہ شافی]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

داخلہ نوٹس

سیشن ۸۵-۱۹۸۴ء

سینئر سیکنڈری اسکول سرٹیفکٹ کورس (۱۰+۲ اسکیم کے تحت گیارھویں جماعت) برائے تعلیمی سال ۸۵-۱۹۸۴ء کے داخلے کے لیے، داخلے کے مجاز امیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں ۔

سینئر سیکنڈری کورس کی سطح +۲ سے متعلق تفصیلات، داخلے کی شرائط اور اسی کے لیے کم سے کم مطلوبہ تعلیم، داخلے کے متعلق قواعد مئی ۸۴ء کے پہلے ہفتے میں اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر 52 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ یا یونیورسٹی اسکولوں کے پرنسپل صاحبان یا سپرنٹنڈنٹ، پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں ۔

فارم داخلہ (قواعد داخلہ کی قیمت بارہ روپے ہے ۔ جو نقد ادا کیے جا سکتے ہیں ۔ یا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر فنانس او فیسر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو واجب الادا ہونے چاہیں ۔

جو امیدوار فارم داخلہ ڈاک کے ذریعے منگوانا چاہیں وہ اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ (۲۰ × ۲۸ سینٹی میٹر کا) روانہ کریں ۔ جس پر ایک فارم کے لیے ایک روپیہ نوّے پیسے (Rs 1-90) کے ٹکٹ لگائے گئے ہوں ۔

جو لوگ رجسٹری سے فارم منگانا چاہیں وہ چار روپے پچاسی پیسے (Rs 4-85) کے ٹکٹ چسپاں کریں ۔ مذکورہ بالا لفافے پر اپنا پتہ درج کریں ۔

ایک سے زیادہ فارم منگانے کے لیے الگ الگ لفافے روانہ کیے جائیں جس پر ٹکٹ چسپاں ہوں ۔

داخلے کے فارم ہر لحاظ سے مکمل ہونے چاہیں اور ان کے لیے دو مجموعۂ مضامین Combinations کے علاوہ ہر مزید پسندیدہ (choice) کے لیے پانچ پانچ روپے (ناقابلِ واپسی) فیس انڈین پوسٹل آرڈر کی شکل میں منسلک ہونی چاہیے ۔ یہ پوسٹل آرڈر کراسڈ ہوں اور فنانس او فیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو واجب الادا ہوں

یہ فارم اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ کو ۶ر جولائی ۸۴ء کی شام ۵ بجے تک وصول ہو جانے چاہیں

تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی ۔

این ۔ موئیدین

کنٹرولر اگزامینشن اینڈ ایڈمیشن

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار داخلہ نمبر ۴ .

سیشن ۔ ۸۵-۱۹۸۴ ء

داخلے کی مجاز خواتین امیدواروں کی درخواستیں برائے داخلہ "ڈپلومہ اِن جنرل نرسنگ اینڈ مڈوائفری" (تین سال برائے جنرل نرسنگ و چھ ماہ برائے مڈوائفری) کورس جواہر لال نہرو میڈیکل کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے مطلوب ہیں۔

کم سے کم تعلیمی لیاقت:۔ کل نمبروں کے کم سے کم ۴۵ فی صدی کے ساتھ انٹرمیڈیٹ امتحان یا اس کے مساوی کوئی امتحان۔

زیادہ تعلیمی لیاقت رکھنے والی امیدوار، جنھوں نے سائنس اور انگریزی کے ساتھ امتحان پاس کیے ہوں، ترجیح کے مستحق ہوں گے۔

امیدوار کی عمر درخواست وصول ہونے کی مقررہ تاریخ کو کم سے کم ۱۷ برس اور زیادہ سے زیادہ ۲۵ برس ہونی چاہیئے۔

امیدواروں کا انتخاب تحریری امتحان اور انٹرویو کی بنیاد پر کیا جائے گا جن کی تاریخیں درج ذیل ہیں۔

داخلے کا امتحان ۵-۷-۸۴ء صبح ۱۰ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک

انٹرویو:۔ ۶-۷-۸۴ء صبح ۹ بجے سے ۱ بجے دوپہر تک

تحریری امتحان (۱) انگریزی (۲) ابتدائی ریاضی اور (۳) معلومات عامہ کا ہوگا۔

امیدواروں کو داخلے کے امتحان اور انٹرویو کے لیے علیحدہ سے کوئی اطلاع نہیں بھیجی جائے گی۔ داخلے کے مجاز امیدوار جنھوں نے اپنی درخواستیں مقررہ مدّت کے اندر بھیجی ہوں، انھیں چاہیے کہ امتحان سے ایک دن پہلے داخلہ امتحان کا کارڈ ایڈمیشن سیکشن سے وصول کریں۔

درخواست فارم اور قواعد اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ - علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تین روپے نقد یا اس قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر (کراسڈ) بنام فنانس افیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

وہ امیدوار جو درخواست فارم بذریعہ ڈاک منگانا چاہتے ہوں، ان کو چاہیے کہ ایک ۱۲ × ۲۸ سینٹی میٹر کا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو روانہ کریں۔ لفافہ پر ایک روپیہ نوّے پیسے (۱-۹۵) کے ڈاک ٹکٹ بھی چسپاں ہونا ضروری ہیں۔ یہ ۹۵-۱ پیسے کے ٹکٹ صرف ایک درخواست فارم کے لیے لگانے ہیں۔

اگر کوئی امیدوار یہ چاہتا ہو کہ وہ درخواست فارم بذریعے رجسٹرڈ ڈاک منگائے تو اِس صورت میں ضروری

ہے کہ ایک ۱۲×۲۸ سینٹی میٹر کا لفافہ جس پر ۸۵-۴ کے ٹکٹ چسپاں ہوں اور خود کا پتہ بھی تحریر ہو بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اگر کوئی امیدوار ایک سے زیادہ درخواست منگانے کا خواہش مند ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر درخواست فارم کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹکٹ چسپاں شدہ لفافے بھیج کر حاصل کر سکتا ہے۔

ہر طرح سے مکمل درخواست فارم جس کے ساتھ تین پاسپورٹ سائز کے فوٹوز جو کہ تصدیق شدہ ہوں اور انڈین پوسٹل آرڈر (کراسڈ) جو کہ ۲۵ روپے کی قیمت کا ہو اور فنانس افیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بھیجے جانے چاہئیں (یہ ۲۵ روپے کا پوسٹل آرڈر رجسٹریشن اور ٹیسٹ فیس کے لیے ہے اور ناقابل واپسی ہے)

درخواست فارم مع انڈین پوسٹل آرڈر اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر 2 ڈ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یہاں ۱۵ر جون ۱۹۸۴ء شام پانچ بجے تک پہنچ جانی چاہیں۔

نامکمل یا مقررہ مدت کے بعد موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول متصور ہوں گی

این۔ موئیدین

(کنٹرولر اگزامینشنز اینڈ ایڈمیشنز)

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

ایٹم ریٹ کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ ٹینڈر کے فارم اور کاغذات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے چھٹی کے علاوہ کسی بھی دن کارکردگی کے اوقات میں ۲۵ر مئی ۱۹۸۴ء تک حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ٹینڈر ۲۶ر مئی ۸۴ء کو گیارہ بجے صبح تک وصول کیے جائیں گے اور اسی روز ۱۲-۳۰ پر ٹھیکیداروں کی موجودگی میں کھول دیے جائیں گے۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱۔	برائے تعمیر جانور خانہ (ANIMAL HOUSE) علم الادویہ	۴۹,۵۵۰.۰۰ DSR 77 کی بنیاد پر	۱۲۳۹/-	۱۰/- روپے	چھ ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

(یونیورسٹی انجینئر)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۵-۸۴/۲

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ ڈائرکٹر فزیکل انسٹرکشن۔ (مستقل)۔ (ایک)۔ یونیورسٹی گیمس کمیٹی۔

۲۔ ڈائرکٹر فزیکل انسٹرکشن (ٹینس)۔ (مستقل)۔(ایک اسامی) یونیورسٹی گیمس کمیٹی۔

۳۔ ڈائرکٹر فزیکل انسٹرکشن (ہاکی)۔(مستقل)۔ ایک اسامی)۔ یونیورسٹی گیمس کمیٹی۔

شرح تنخواہ۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ معہ دیگر الاونس۔

تعلیمی لیاقت:۔ لازمی:

لازمی (i) کھیلوں میں ایم۔ اے کی ڈگری اور نیشنل/اسٹیٹ/انٹر یونیورسٹی یا اس کے مساوی مقابلے کے لیے ٹیم کو کھیل کی مشق کرانے (Coaches) کا تین سال کا تجربہ

کسی منظور شدہ اسپورٹس انسٹی ٹیوٹ سے کھیلوں میں ایک سال کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اور ٹیم کو نیشنل/اسٹیٹ/انٹر یونیورسٹی یا اس کے مساوی مقابلے کے لیے کھیل کی مشق کرانے کا پانچ سالہ تجربہ یا

گریجویٹ اور کسی منظور شدہ کوچنگ انسٹی ٹیوٹ سے ایک سال کا کوچنگ ڈپلوما اور ٹیم کو نیشنل/اسٹیٹ/انٹر یونیورسٹی یا اس کے مساوی مقابلے کے لیے کھیل کی مشق کرانے کا آٹھ سالہ تجربہ۔

نوٹ :۔ (i) کھیلوں کی تیاری کرانے (کوچنگ) کا تجربہ تخصص کے میدان میں (Area of Speciality) میں ہی ہونا چاہیے۔

(ii) تعلیمی لیاقت اور تجربے کی مقررہ شرطوں میں یونیورسٹی کو رعایت کرنے کا اختیار ہے بشرطیکہ امیدوار نے نیشنل/اسٹیٹ یا اس کے مساوی سطح پر ٹیموں کو تیار کرانے میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔

پسندیدہ :۔ کھیلوں کے میدان کی نگہداشت/کھیلوں کی سہولیات مہیا کرنے اور کھیلوں کے سامان کی نگہداشت کرنے کا تجربہ۔

کام کی نوعیت: (۱) ٹیموں کو اور دیگر کھلاڑیوں کو کھیل کی مشق (کوچنگ) کرانا۔

(۲) کھیلوں کی سہولیات کا انتظام۔

۔۲۔

۴۔ انتظامی امور اور دیگر فرائض جو تفویض کیے جائیں۔

غیر معمولی تعلیمی لیاقت و تجربہ رکھنے والے امیدواروں کو زیادہ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔

طلبیدہ امیدواروں کو ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ بطور ٹی۔ اے۔ ڈی۔ اے۔ دیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فنانس افسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں 23×10 سمی سائز کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے، جس پر خود کا پتہ تحریر ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۹ مئی ۱۹۸۴ء شام چار بجے تک ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ

اشتہار نمبر ۴/ ۸۴ — ۸۵

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ لکچرر سائیکالوجی (دو جگہیں) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف سائیکالوجی

۲ لکچرر سائیکالوجی (ایک اسامی) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید ہے) ویمنس کالج

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ — ۴۰ — ۱۱۰۰ — ۵۰ — ۱۶۰۰ — مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت

لازمی (۱) ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام یا اس کے مساوی کوئی اعلیٰ استعداد۔
(۲) اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس (بی سیون پوائنٹ اسکیل میں) کے ساتھ متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے ماسٹر ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

پسندیدہ۔ اسامی نمبر ۱ (لکچرار سائیکالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف سائیکالوجی) کے لیے
(۱) تدریس کا قدرے تجربہ اور تحقیق کی رہنمائی کا تجربہ۔ کلینکل سائیکالوجی (در پیمائشی، تقابلی اور عضویاتی سائیکالوجی کی بنا پر قابل ترجیح ہوں گے۔ (اسامی نمبر ایک کے لیے)
(۲) سماجی، صنعتی اور تجرباتی سائیکالوجی میں (دوسری اسامی کے لیے) قابل ترجیح شمار کیے جائیں گے

پوسٹ نمبر ۲ کے لیے (لکچرر سائیکالوجی ومینس کالج)
(۱) تدریس کا قدرے تجربہ اور تحقیق کی رہنمائی کا بھی قدرے تجربہ

اگر سیلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے اعلیٰ پیمانے کا ہے، تو اس صورت میں (ب ۲) کے تحت مطلوبہ استعداد میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔

اگر ایسے امیدوار میسر نہ آئیں جن کے پاس ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام کی ڈگری ہو یا بصورت دیگر تقرر کے لیے مناسب تصور نہ کیے جائیں تو اس صورت میں ایسے امیدوار جو اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل ہوں اور ایم فل یا مساوی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام رکھتے ہوں) اُن کا تقرر کیا جا سکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ یہ ثابت کریں کہ انھوں نے کم از کم دو سال تک تحقیقی کام کیا ہے یا اُن کو کسی ریسرچ لیبارٹری میں عملی تجربہ تقریباً دو سال تک حاصل کیا ہے
اور اُن کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ ڈگری یا تحقیقی کام جو اعلیٰ معیار کا ہو اور ڈاکٹریٹ ڈگری کے مساوی ہو، حاصل کریں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان کو مزید انکریمنٹ سے محروم کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس شرط کو پورا نہ کریں۔

وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱/۸۴ — ۸۵ مورخہ ۵ اپریل ۸۴ء کے جواب میں درخواست دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر ہی امیدوار متصور کیا جائے گا۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربے کے حامل امیدواروں کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔
انٹرویو کے لیے طلبیدہ امیدواروں کو ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ بطور ٹی اے

(7.8.7) دیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں 23X10 cm سائز کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے جس پر ٹکٹ چسپاں ہوں اور خود کا پتہ تحریر ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ مئی ۱۹۸۴ء (شام چار بجے تک) ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

(رجسٹرار)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۳ / ۸۴ - ۸۵

درج ذیل اسامیوں کے لیے مجوزہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ ڈائی ٹیشن۔ (مستقل) جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل (ایک اسامی)

تنخواہ کا اسکیل: ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ع۵ - ۳۰ - ۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنس

تعلیمی لیاقت:

لازمی۔ ڈائی ٹکس میں ڈپلوما کے ساتھ بی ایس سی یا نیوٹریشن خاص مضمون کے ساتھ ہوم سائنس (Home-Economics) میں گریجویٹ۔

"پسندیدہ:۔ اسپتال میں بحیثیت ڈائی ٹیشن کام کرنے کا ۳ سال کا عملی تجربہ

۲۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ بلڈ بنک (Leave Vacancy) جے این میڈیکل کالج ہسپتال (ایک)

اسکیل :- ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی- ۳۰- ۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنس۔

تعلیمی قابلیت۔

لازمی :- لیبارٹری ٹیکنکس میں ٹریننگ کے تجربے کے ساتھ بی ایس سی پاس۔

پسندیدہ :- کلینکل پیتھالوجی میں سرٹیفکٹ یا بلڈ ٹرانسفیوزن سروس۔ بلڈ بنک میں کام کرنے کا عملی تجربہ

نوٹ :- تاریخ ۲ جنوری ۱۹۸۴ء کو شایع اشتہار نمبر ۳۰/ ۸۳ — ۸۴ کے جواب میں جنہوں نے پہلے درخواستیں روانہ کی ہیں وہ مزید درخواست نہ بھیجیں۔

۳- سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ویٹرنٹی) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (ایک)

اسکیل :- ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی- ۳۰- ۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنس۔

تعلیمی قابلیت۔

لازمی :- کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے ویٹرنٹی سائنس میں گریجویٹ۔

پسندیدہ :- چھوٹے بڑے جانوروں کو سنبھالنے کا تجربہ۔ تجرباتی سرجیکل لیبارٹری میں کام کرنے اور انیستھیسیا دینے کا تجربہ۔

۴- پرنسپل یونیورسٹی پالی ٹیکنک کا پی-اے (مستقل) -(ایک)

اسکیل :- ۴۲۵- ۱۵- ۵۰۰- ای بی ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ۷۰۰ روپے اور دیگر الاؤنس

تعلیمی قابلیت :

آرٹس، سائنس یا کامرس میں گریجویٹ ہونے کے ساتھ کسی کالج یا یونیورسٹی آفس میں پرسنل اسسٹنٹ یا اسٹینوگرافر یا اس کے مساوی حیثیت سے تین سال کا تجربہ۔ شارٹ ہینڈ یا انگلش ٹائپنگ کی بہتر جانکاری۔

۵- اسسٹنٹ حکیم (مستقل) اے کے طبیہ کالج ہاسپٹل (ایک)

تنخواہ کا اسکیل :- ۳۳۰- ۱۰- ۳۸۰- ای بی- ۱۲- ۵۰۰ ای بی ۱۵- ۵۶۰ روپے اور دیگر الاونس۔

تعلیمی قابلیت

لازمی (۱) بی-یو-ایم-ایس کی فرسٹ کلاس ڈگری یا اس کے مساوی۔
(۲) یونانی پریکٹس میں کم سے کم ۶ ماہ کا تجربہ
(۳) عربی، فارسی اور انگلش سے واقفیت۔

پسندیدہ :- (۱) اسپتال کے انتظام کا تجربہ۔
(۲) پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری۔

۶- نرسنگ اسسٹنٹ (Leave Vacancy) یونیورسٹی ہیلتھ سروس (ایک)

تنخواہ کا اسکیل :- ۲۶۰- ۶- ۳۲۶- ای بی- ۸- ۳۵۰ روپے اور دیگر الاؤنس

تعلیمی قابلیت :-

لازمی :- (۱) ہائی اسکول پاس۔

(۵) آگزلیری نرس اور مڈ وائفری میں ڈپلومہ
(۶) رجسٹریشن۔

پسندیدہ:۔ کسی اسپتال میں کام کرنے کا تین سالہ تجربہ
نوٹ:۔ تاریخ ۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء کے اشتہار نمبر ۳۲/۸۳ — ۸۴ کے جواب میں جنہوں نے
درخواستیں روانہ کی ہیں وہ مزید درخواستیں نہ بھیجیں۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتداء سے ہی اعلیٰ تنخواہ
سے شروعات دی جا سکتی ہے۔

جو امیدوار انٹرویو کے لیے طلب کیے جائیں گے اُن کو ریلوے کے سکنڈ کلاس
کا یک طرفہ کرایہ بطور ٹی اے (T.A) دیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار سلیکشن کمیٹی کے دفتر سے
تین روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا
فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین
پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں 23×10 cm سائز کا ایسا
لفافہ بھیجنا ضروری ہے جس پر خود کا پتہ تحریر ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۸ مئی ۱۹۸۴ء
(شام چار بجے تک) ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں
پر غور نہیں کیا جائے گا

ضمیر احمد خاں
(رجسٹرار)

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈرس ایم ریٹ کی بنیاد پر مطلوب ہیں۔ یہ ٹینڈرس ۶ر جون ۱۹۸۴ء بوقت ۱۱ بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈرس اسی روز ۶ر جون ۱۹۸۴ء کو بوقت ساڑھے بارہ بجے کھولے جائیں گے

ٹینڈرس فارم اور دیگر کاغذات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے چھٹی کے علاوہ کسی بھی دن کارکردگی کے اوقات میں حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر وصول ہونے کے مقررہ وقت سے ۲۴ گھنٹے قبل ٹینڈر فارموں کی فروخت بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	کام کے لیے متعین رقم	زر ضمانت	ٹینڈر فارم کی قیمت	کام کی مدت تکمیل
۱	انجینیرنگ کالج ورکشاپ میں برائے ورکشاپ کے اندر اضافہ اور تبدیلی کا کام	23,48,500/-	8,800 روپے	15/- روپے	نو ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر

پرنٹر پبلشر: نورالحسن نقوی۔ مطبع شیروانی آرٹ پریس، مٹیا محل۔ دہلی۔ مقام اشاعت: شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟
سنکارا
ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک
ہمدرد

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ علی گڑھ

مدیر
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول
نور الحسن نقوی
استاد شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نور الحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

جلد نمبر ۳ — یکم تا ۱۵ جون ۱۹۸۴ء — شمارہ ۱۱

مندرجات

زادِ راہ اور راہنما

[دوسری اور آخری قسط]

مختصر یہ ہے کہ سر سید کی بات کو مسلمانوں نے یہاں تک سنا کہ دنیا سے کنارہ کشی کی مذموم رسم کو ترک کر دیا اور یاس کے لبادہ کو اُتار پھینکا اور حکومت وقت سے بے تعلقی اور اس کے خلاف سلگنے کی بے مصرف روش سے باز آگئے اور انگریزی تعلیم کو با دل ناخواستہ قبول کر لیا۔ لیکن جدید تعلیم کی اشاعت اس تیزی کے ساتھ نہ ہو پائی، حالات جس کا تقاضا کر رہے تھے۔ سر سید کی رحلت کے پچاس سال بعد جدید تعلیم کی تحریک کا زور ٹوٹنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کے نوّے سال بعد مسلمانان ہند کو ایک دوسرے پُرآشوب دور کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ملک کی تقسیم اور اس سے متعلق ہنگاموں نے ان مسلمانوں کے حوصلے کو جو ہندوستان میں رہ گئے تھے توڑ دیا اور وہ غصہ مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ایک بار پھر خول کے اندر سرک گئے، گرد و پیش سے بے تعلق اور بے حس اور ملک کی ترقی اور خوشحالی سے بے نیاز اور بے بہرہ ہو کر۔ تعلیمی پسماندگی نے ہر قدم پر اُن کا راستہ روکا۔ کچلے ہوئے جذبات کو انھوں نے حرزِ جاں بنایا۔ کڑھتے رہے، سلگتے رہے۔ اُن کا ردِ عمل سر بسر جذبات پر مبنی تھا۔ انھوں نے اس زبوں حالی میں بھی عقل کی رہبری قبول نہ کی۔ جذبات کی رَو میں بہتے رہے اور ہر طرح کے نقصان سہتے رہے۔ عقل کو منھ نہ لگایا، اس لیے پے در پے مات کھائی۔ علی گڑھ ہندوستانی مسلمانوں کا دل اور ان کے طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی نے، بجائے اس کے کہ وہ ان مسائل پر، جو مسلمانوں کو آزادی در تقسیم کے بعد لاحق ہوئے تھے، غور و فکر کرتی، ۱۹۶۵ء کے سانحے کے بعد ساری توجہ اقلیتی کردار کی بازیابی پر مامور کر دی۔ ہمیں اس کردار کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اعتراض ہے اس ابہام اور نا عاقبت اندیشی اور سادہ لوحی پر جس نے سارے حقایق کا بدل ایک نعرہ کو سمجھ لیا۔ ذرا دیر کے لیے بھی ہم نے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا۔ اگر پہلوؤں اور مضمرات کو فکر کے احاطے میں لے آیا گیا ہوتا تو یہ دردانگیز انکشافات نہ ہوتے جو ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ کو برتتے پر ہوئے۔ اقلیتی کردار کے مبہم مطالبہ اور یونیورسٹی کی تعریف اور درٹ کی تشکیل پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانے کے بجائے ٹھوس بنیادی امور کو ایکٹ کی گرفت میں لائے ہوتے۔ جذبات ساری تحریک پر چھا گئے اور عقل کو نفع و نقصان کے پرکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ یہ مسئلہ سر سید کی زندگی میں اُٹھا ہوتا تو وہ اس کے حل کے لیے کسی تحریک کی ضرورت سرے سے سمجھتے ہی نہیں۔ حکومت کو استدلال سے قائل کرتے۔ ان کا ہدف مبہم اقلیتی کردار نہ ہوتا بلکہ وہ چند ایسی ٹھوس باتیں منوا لیتے جن کے نتائج خاطر خواہ ہمہ گیر، نفاذ پذیر اور دوررس ہوتے۔ اگر ان کے دلائل اور مطالبے کو حکومت رد کر دیتی تب کہیں تحریک کی نوبت آتی جس کی بنیاد ابہام پر نہیں تصریحات پر ہوتی۔ وہ دانا اور بینا انسان کبھی سراب کے تعاقب پر راضی نہ ہوتا۔ اس کی حکمتِ عملی موانع اور مخالفت سے عہدہ برآ ہوتی۔

سیّد والا گہر کی رحلت کو چوتھائی صدی بھی نہ گزری تھی کہ علی گڑھ اور مسلمانانِ ہند نے ہوش و گوش اور سوجھ بوجھ اور عقل و دانش کے اس سبق کو بھلا دیا جو انھوں نے دیا تھا۔ چنانچہ ان کے شاگرد علی برادران خلافت کی تحریک کو لے کر اُٹھے۔ مسلمانانِ ہند نے اُن کی آواز پر لبیک کہا اور قریب تھا کہ ان کے سب سے قیمتی سرمایہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی اس تحریک پر قربان کر دیا جائے۔ ہر طرف جذبات کا بول بالا تھا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ہندوستان کے مسلمان خلافت کے جسدِ بے جان میں روح کیوں کر پھونک سکتے ہیں اور اگر بفرضِ محال پھونک بھی دی تو خود اُن کو اس سے کیا حاصل ہوگا اور دنیائے اسلام کو کرم خوردہ خلافت سے کیا ملے گا۔

یہاں تک ذکر تھا رہنما عقل کا جسے ہم نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ عقل سے ہم نے سر سید کے جاتے ہی ناتہ توڑ لیا۔ اب تذکرہ ہوگا زادِ راہ یعنی اخلاص کا۔ سر سید نے فکر اور نظر میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ ایسا کرنے کے لیے انھیں کون سے جتن تھے جو نہ کرنے پڑے، کون سی قربانی تھی جو نہ دینی پڑی۔ ساری صعوبتیں، خصومتیں اور تکلیفیں انھوں نے اخلاص کے سہارے برداشت کیں۔ ان کے اخلاص کا نتیجہ ہے کہ علی گڑھ تحریک ہندوستان بھر میں تعلیم و روشنی کے برگ و بار لائی۔ علی گڑھ کے طلبا ایک لڑی میں پرو دیے گئے۔ بانی کے حسنِ نیت کی بدولت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پُرآشوب ادوار سے جانبر

ہوئی اور آج بھی پھل پھول رہی ہے۔

ماتم اِس بات کا ہے کہ اخلاص کی روایت بھی یونیورسٹی سے فنا ہوگئی۔ اب جسے دیکھیے نفسی نفسی میں گرفتار ہے۔ کم ہیں ایسے لوگ جو اپنے چھوٹے سے فائدے کے لیے یونیورسٹی کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اخلاص نام کی کوئی شے یہاں دور دور نظر نہیں آتی خودغرضی کا دَور دَورہ ہے۔ آرزو صرف یہ ہے کہ یونیورسٹی سے جو کچھ مل سکے لے لیا جائے اور اس کے عوض اسے کچھ دیا نہ جائے۔ عمارت کے لیے اخلاص مسالے کا کام کرتا ہے۔ اس کے بغیر اینٹیں الگ الگ رہتی ہ نہیں پاتیں۔ ہوا ذرا سی تیز ہوئی اور دیوار اڑا اڑا دھم' زمین پر خودغرضی جب رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو افراد بنپ جا تو بِپ جائیں' جماعت کا شیرازہ بکھرا رہتا ہے۔ یہی حال اس ا یونیورسٹی کا اور ہندوستانی مسلمانوں کا ہے۔ اُن کے لیے ترقی ا اور پیش رفت کے منازل طے کرنا محال ہوگیا ہے۔ سفر کریں تو ک زادِ راہ ہی نہیں۔ نہ زادِ راہ نہ رہنما۔ نہ اخلاص' نہ عقل

رمضان شریف

لیجیے خیر و برکت کا مہینہ آ گیا۔ ریاضت' جفاکشی' اور ضبطِ نفس کا مہینہ تہذیبِ اخلاق کا مہینہ۔ جون کے مہینے کی پتّہ پانی کر دینے والی گرمی' عام حالات میں بھی نڈھال کر دینے والی گرمی' روزے داروں کے ایمان اور استقامت کا امتحان لینے آ گئی۔ سخت امتحان' کڑی آزمائش۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں آدمی روزہ رکھیں گے۔ کھانے کا سامان ہوتے ہوئے دن بھر بھوکے رہیں گے' حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ جائیں گے لیکن پانی کا نام بھی نہ لیں گے۔ یہ مہینہ آزمائش کا مہینہ کا ہے' روح کی تربیت کا مہینہ ہے۔ روزے ہمیں بتاتے ہیں کہ نفس کو کس طرح مارا جاتا ہے' خواہشوں کو کیسے دبایا جاتا ہے' اپنے اوپر قابو کیوں کر پایا جاتا ہے۔ جذبات' خواہشات' بھوک اور پیاس کی رَو میں بہ جانے کے بجائے ان کو زیر کس طرح کیا جائے یہ تربیت ہمیں ہر سال رمضان شریف کی بدولت ملتی ہے۔ غور کیجیے تو انسان اور حیوان میں ایک بڑا فرق یہی ہے کہ حیوان اپنے اوپر روک نہیں لگا سکتا' انسان لگا سکتا ہے۔ جو اپنی روک تھام کر سکے' جو غصّہ' لالچ اور اشتہا پر قابو پا سکے مرد وہی ہے۔ جو بغیر کسی غرض کے صعوبت اور تکلیف برداشت کر سکے عالی ظرف وہی ہے۔ غرض تکلیف اُٹھانے والے ہر گلی کوچے میں مل جائیں گے۔ بات تو جب ہے کہ اپنے پروردگار کی رضا کے لیے جان بوجھ کر تکلیفیں جھیلی جائیں۔

روزے کی حیثیت ان غریبوں سے پوچھیے جو دن بھر لُو اور دھوپ میں محنت کرتے ہیں' حال یہ ہے کہ پسینہ بہ رہا ہے' قدم لڑکھڑا رہے ہیں کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ قرائن یہ کہ اب لو لگی' اب نڈھال ہو کر گرے' لیکن وہ سارے خطرات سے بے نیاز ہو کر اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے کھانے اور پینے کو اپنے اوپر حرام کیے ہوئے ہیں۔

اِس جگہ دو رز ریاضت کا تقاضا یہ ہے کہ رمضان کے دوران را دن کے برعکس نہ ہو۔ دن تو دن' راتیں بھی اِس طرح گزریں کہ ضبطِ نفس تہذیبِ اخلاق کے نقوش گہرے ہوتے چلے جائیں۔ روزہ کھولنے کے بع اس ریاضت اور نفس کشی کے آثار اور انداز باقی رہیں جو صبح سے شام رفیقِ راہ بنی رہی۔ روزہ کے بعد بھی کھانے میں احتیاط اور اختصار سے لیا جائے اور خیال اور زبان کی پاکیزگی اور اطوار کی متانت جو روزے دین ہیں' افطار کے بعد روزہ دار کو چھوڑ کر الگ نہ ہو جائیں کہ یہ یہ مجاہدہ' یہ تربیت' یہ نصاب پندرہ گھنٹے کا نہیں متواتر تیس دن

روزہ صرف شکم کا روزہ نہیں ہے۔ روزہ فکر' نظر' ا احساس اور زبان کا روزہ ہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے کی نہیں کہ اللہ کے لیے روزہ رکھا جائے اور اس کی مخلوق کو بھلا دیا جائے۔ اللہ کی خ حاصل کرنی ہے تو اس کی مخلوق کے ساتھ احسان کرنا ہوگا۔ نفس مار کے معنی یہ ہیں کہ لاکھ جی چاہے' لاکھ اشتعال ہو' ترغیب ہو کوئی بات ا نہ سوچیں' نہ کہیں نہ کریں جس سے دوسرے انسانوں کو تکلیف یا جراحت یا روزے کی پاکیزگی پر آنچ آئے یا ضبطِ نفس کا سلسلہ درہم برہم ہو رمضان روح کی پاکیزگی اور اخلاق کی تہذیب کا وہ نصاب ہے جو ہر دہرایا جاتا ہے' تاکہ آئندہ گیارہ ماہ تک انسان اپنے افکار اور اقوال وا کو اسی کے مطابق ڈھالتا رہے۔ عیدِ رمضان کے اتمام کے لیے آتی ہے اس سبق کے استمرار کے لیے جو رمضان کی ریاضت اور روحانی ورزش اور اخلاقی پامردی نے ہمیں سکھایا ہے۔

رمضان خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ یہ خیر و برکت عام اور لازم ہونا چاہیے۔ روزہ شخصیت کو توانا کرنے' قوّتِ ارادی کو مضبوط کر

۴ لائبریری انچارج ۔ بشیر صاحب
۵ شعبۂ فلسفہ پروفیسر ظفر الحسن صاحب
۶۔ شعبۂ اردو پروفیسر رشید احمد صدیقی اور
آل احمد سرور صاحبان
۷۔ شعبۂ اقتصادیات پروفیسر لودھی کریم حیدر و مجیب صاحبان
۸ شعبۂ فارسی پروفیسر ہادی حسن و ضیاء احمد بدایونی صاحبان
۹ شعبہ عربی پروفیسر عبدالعزیز میمن صاحب
۱۰ شعبۂ ارضیات پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب
۱۱ شعبۂ جغرافیہ پروفیسر طاہر رضوی اور
ڈاکٹر مظفر صاحبان
۱۲ شعبۂ انگریزی پروفیسر ایف۔ جے۔ فیلڈن اور
خواجہ منظور صاحبان

ان کے علاوہ ٹریننگ کالج میں حبیب الرحمٰن صاحب سائنس کے مختلف شعبوں میں پروفیسر بابر مرزا و کرنل حیدر وغیرہ۔
وائس چانسلر یگانۂ زمانہ ریاضی داں ڈاکٹر سر ضیاء الدین تھے۔

آزاد ماحول سے قید و بند کی زندگی زیادہ راس آئی۔ ہاسٹل کی زندگی تو اصول و ضوابط کی ایک مسلسل کڑی تھی۔ ہر طالب علم کو خواہ وہ شہر کا ہو، نیم بارڈر رہو یا ہاسٹلر ہو بنیادی اصولوں کی پابندی ضروری تھی۔ سر پر ترکی ٹوپی، سردیوں میں کالی شیروانی دیگر موسم میں شیروانی کے رنگ کی قید نہیں تھی۔ شیروانی کے پورے بٹن لگانا، پاؤں میں موزہ اور شو بھی ضروری تھے۔ ہاسٹل کے اندر یا رہائش گاہوں کے اندر ضوابط کچھ نرم تھے۔

رات نو بجنے کے بعد کسی طالب علم کا ہاسٹل یا گھر کے باہر رہنا یونیورسٹی ضوابط کے تحت جرم تھا۔ نماز مغرب کے بعد شہر یا اسٹیشن جانے کے لیے اجازت نامہ ضروری تھا۔ یہ اجازت نامہ نو کے بعد خود بخود منسوخ ہو جاتا تھا۔ راستے میں کھانا، سائیکل پر دو سوار ہاں یا رات کو بغیر روشنی کے سائیکل چلانا قابل دست اندازی پراکٹر جرم کی فہرست میں شامل تھے۔ یونیورسٹی کا پراکٹوریل اسٹاف اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں ہر وقت چوکنا و ہوشیار رہتا تھا اور طالب علم کی ذراسی کوتاہی جرمانے کا سبب بن جاتی تھی۔ پولس سے زیادہ پراکٹر کا ڈر رہتا تھا۔ یونیورسٹی کے طالب علم کی چیکنگ صرف پراکٹوریل اسٹاف ہی کرتا تھا۔ سینما میں ہمارے لیے علیحدہ کلاس ہوتا تھا۔ اس کے لیے پہلے ہاسٹل وارڈن سے اجازت نامہ لینا ہوتا تھا اور صرف پہلا شو دیکھا جا سکتا تھا۔ ہر ہاسٹل کی مسجد میں نماز کے وقت حاضری ہوتی تھی جس کا انچارج پریر مانیٹر [Prayer Monitor] تھا

ان تمام قیود نے ایک صاف ستھری مسلم تہذیب کو جنم دیا تھا جو اپنی انھیں انفرادی خصوصیات کی وجہ سے بہت ممتاز تھی۔

ہمیں پڑھنے لکھنے کا خوب موقع ملتا تھا اور سچ پوچھیے تو عزیزوں کو چھوڑ کر اتنی دور علم حاصل کرنے گیا تھا۔ علم کے وسیع سمندر سے سیرابی کا تو سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ہاں چند قطرے مل جائیں تو یہ بھی بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ اور تہذیب دونوں کے حصول کے لیے ہوتا تھا۔

ہم کبھی شہر یا نمائش میں اگر سائرن کی آواز سنتے تو یہی احساس ہوتا کہ ہمیں بلا رہا ہے اور ہم جلد از جلد نو بجے کے اندر ہاسٹل پہنچ جاتے تھے۔ سائرن ۱۵ منٹ پہلے پونے نو بجے آواز دیتا تھا۔ کبھی شومئی نصیب سے اگر دیر ہو گئی تو گیٹ پر رکھے رجسٹر میں وجہ تاخیر درج کرنا ہوتی۔ پھر جوابدہی۔ جوابدہی قابل قبول نہ ہوئی تو جرمانہ۔ ایسی حالت میں کبھی کبھی ہم ایسے اشعار گنگناتے تھے۔

کیا کروں جان نہ پہچان بڑی مشکل ہے
کیسا رکھا ہے یہ دربان بڑی مشکل ہے
آج انجمؔ جو نمائش میں ذرا دیر ہوئی
ہو گیا بس مرا چالان بڑی مشکل ہے

وغیرہ وغیرہ۔

مگر اوقات کی پابندی نے پوری زندگی پر کچھ ایسی چھاپ چھوڑی کہ آج بھی اس کا خصوصی اہتمام رہتا ہے۔ اگر دیر ہو گئی تو ذہنی کرب رہتا ہے۔ ایسے سب ہی حضرات پر سخت افسوس ہوتا ہے جو اپنی تاخیر پسندی کو ہندوستانی اوقات سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس جگہ اگر ایک واقعہ کا ذکر نہ کروں تو واقعاتی بے ایمانی ہو گی۔
مگر یہ یاد نہیں ہے کہ یہ واقعہ کس سن کا ہے اور میں اس وقت باہر رہتا تھا یا ہاسٹل میں۔ واقعہ یوں ہے کہ شہر کے کسی سینما ہال میں (اُن دنوں یونیورسٹی میں کوئی سینما ہال نہیں تھا) فلم "ڈھنڈھورا" لگی ہوئی تھی۔ اس فلم میں مشہور مزاحیہ اداکار نور محمد چارلی کا دوہرا کردار تھا۔ میرے طبیہ کالج کے دوستوں نے اسے دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اب مسئلہ ہاسٹل کے اجازت نامے کا تھا۔ یہ مشکل ان لوگوں نے یوں حل کی کہ کہیں سے پانچ آدمیوں کا اجازت نامہ لائے جو کسی گذشتہ تاریخ کا تھا۔ اس کی تاریخ درست کی گئی۔ ہم پانچ آدمیوں نے ان میں مندرج ناموں میں سے ایک ایک نام اپنے لیے چن لیا اور سینما ہال میں جا بیٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد پراکٹوریل اسٹاف چیک کرتا ہوا آ گیا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے اصلیت جان لی اور دوسرے دن ہمیں اپنے حضور پیش ہونے کا حکم دیا۔ ہم سب وقت پر حاضر ہو گئے۔ سخت زجر و توبیخ کے بعد آئندہ ایسا نہ کرنے و معافی مانگنے کے بعد نجات حاصل ہوئی۔ راستے میں ہم میں سے ایک صاحب نے فرمایا ؎

مارا دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور
رکھ لی مگر خدا نے سبھی بیکسوں کی شرم
"ہائے رے ڈھنڈھورہ، کیسا ڈھنڈھورہ پیٹا"
وغیرہ وغیرہ

ئندہ پھر کبھی ایسی غلطی نہیں ہوئی۔

ان تمام اصول وضوابط کا سرچشمہ ونگہبان ابّا حلیم تھے۔ پہلے وہ خود عمل کرتے تھے پھر طلبا سے عمل کراتے تھے۔ اسی لیے کسی کو بھی کبھی شکایت نہ ہوئی۔ بعض خصوصی ذمہ داریوں کی وجہ سے ان پر ہر اصول کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ اکثر دیکھا گیا کہ انھوں نے کسی طالب علم کو خلاف ورزی میں پکڑا تو اسی سے کاغذ قلم لے کر اس کا نام و پتہ درج کر کے اس کے حوالے کر دیا کہ جا کر آفس میں دے دے۔ چوں کہ ضمیر زندہ تھا۔ جرم کا احساس تھا، اس لیے بلا پس وپیش وہ اسے آفس میں دے کر خاموشی سے جرمانہ ادا کر دیتا تھا۔ سینئر طلبا ان اصولوں کے محافظ تھے۔ خود عمل کرتے اور دوسروں سے کراتے۔ انھیں میں سے پراکٹورِیل اسٹاف کا انتخاب ہوتا تھا۔

یہیں ایک واقعہ اور یاد آگیا۔ یہ میرے علی گڑھ کے ابتدائی ایام کا ہے۔ شہر میں اسٹیشن روڈ پر ایک نئی عمارت تھی جس میں ایک دوکان بھی تھی نہ مالک مکان کا نام یاد ہے نہ صاحب دوکان کا۔ مگر یہ دوکان ایک غیر مسلم کی تھی۔ اس کی شہرت بہت تھی۔ مجھے بھی کسی کام سے وہاں جانا پڑا۔ دیکھا کہ یونیورسٹی کے کئی طلبا آئے۔ سامان کی قیمت دریافت کی اور سامان لے کر چلے گئے۔ میں نے دریافت کیا۔ "انھوں نے قیمت نہیں دی اور چلے گئے۔ کیا آپ بھول گئے۔ یا آپ انھیں جانتے ہیں۔"

جواب ملا۔ "ان کو نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ یونیورسٹی کا کوئی طالب علم آج تک مجھے ایسا نہیں ملا جس نے از خود آ کر قیمت نہ دی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار بھی ایسا ہی ہوگا۔"

اس جواب سے مجھے بھی کچھ فخر کا احساس ہوا۔ کیوں کہ میں بھی اس دارالعلوم کا ایک طالب علم تھا۔

سالِ اول ہی سے میرے دو خصوصی مضامین تھے۔ "اردو" جس سے مجھے عشق تھا اور ہے اور یہ بھی فخر ہے کہ رشید احمد صدیقی مرحوم و آل احمد سرور جیسے اساتذہ سے درس لیا ہے۔ دوسرا "تاریخ اسلام" جس سے روحانی تعلق ہے۔ انٹر و بی۔ اے میں دونوں ہی مضامین ساتھ تھے۔ مگر جب ایم۔ اے کے دوراہے پر پہنچا تو سوچ میں پڑ گیا کہ کس کو منتخب کروں۔ قرعۂ فال بحق تاریخ اسلام نکلا جو مستقبل میں میرے لیے فال بد ثابت ہوا۔ یہ مضمون تو بغیر درسی نصاب کے بھی پڑھا جا سکتا تھا۔

شعبۂ تاریخ میں جولائی ۱۹۴۵ء میں اس نصاب میں شامل ہوا۔ ابّا حلیم تاریخ عہد ٹیوڈر کا کلاس لیتے تھے۔ جتنی جاذبِ نظر اُن کی شخصیت تھی، اس سے زیادہ پرکشش، دلچسپ اور معلومات کا وسیع خزانہ ان کا درس ہوتا تھا۔ گویا علم کا سمندر لہریں مار رہا ہو، مگر تحریر بالکل برعکس تھی۔ سامنے ٹیبل پر وہ اپنی چھڑی اور ٹوپی رکھ دیتے۔ کبھی ٹوپی آگے اور چھڑی پیچھے اور کبھی چھڑی آگے اور ٹوپی پیچھے رکھتے۔ درس جاری رہتا۔ یہ اُن کا ایک غیر اضطراری فعل تھا۔ وہ جو بھی عنوان لیتے اس کا درس اس موضوع کی ساری کتابوں کا احاطہ کر لیتا تھا۔ جس نے ان کے لکچرس نوٹ کیے، اس کو پھر کسی کتاب کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔ میں ہمیشہ ہی موصوف کے سامنے اگلی صف میں بیٹھتا تھا، مگر اس روز ایسا ہوا کہ یکایک انھوں نے اپنے لکچر کو بریک لگائی اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "آپ کو ہاسٹل میں جگہ ملی یا نہیں۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ان دنوں میں مارلین کورٹ کے کمرہ نمبر ۱۶ میں رہتا تھا۔ یہ کوئی بہت اہم سوال یا مسئلہ نہ تھا مگر اس عظیم منتظم، اس کامیاب وشفیق استاد کی یادداشت پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ بلکہ ناطقہ سر بہ گریباں کہ انھیں کیا کہیے۔ چار سال قبل سیکڑوں امیدواروں میں میں بھی چند لمحوں کے لیے ان کے روبرو گیا تھا۔ یہ ایک عبقری ذہن و دماغ کا کام تھا اور ابّا حلیم ایسے ہی ذہن و دماغ کے مالک تھے جو انھیں یہ بات اب تک یاد تھی۔

صبح آزادی سے قبل کانگریس اور مسلم لیگ نے مرکزی انتخابات کے لیے امیدوار کھڑے کیے۔ انتخابات تقسیم ملک کی خونیں داستان کی تمہید تھے۔ ابّا حلیم لیگ کے ٹکٹ پر علی گڑھ سے ایم۔ ایم۔ بشیر کے مقابلے میں امیدوار تھے۔ راقم الحروف، اس کے دوستوں۔ نثار اللہ جابری و اللہ نور چودھری کو ہاتھرس کے الیکشن کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ شام کو روانگی تھی۔ شعبۂ قانون کے شفیق استاد محمد اسماعیل مرحوم کے ساتھ جانا تھا جو ہاتھرس کے رہنے والے تھے۔ ابّا حلیم نے فرمایا اس وقت تو رات ہو جائے گی۔ اس لیے اسماعیل صاحب کے یہاں مہمان رہیے گا۔ مگر صبح ہر حال میں انتظام کر لیجیے گا اور ہم لوگوں نے اسی پر عمل کیا۔ ابّا حلیم نے انتخابات شاندار کامیابی حاصل کی۔

میں جون ۱۹۴۷ء میں ایم۔ اے۔ کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دے کر وطن واپس چلا آیا۔ اس وقت دہلی میں عبوری حکومت تھی۔ تقسیم کے خطوط واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ معلوم ہوا تقسیم ملک کے بعد ابّا حلیم سرحد کے اس پار چلے گئے۔ کافی دنوں تک کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور وہیں سپرد خاک ہوئے "پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔" اللہ انھیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ وارفع اصولوں کے پیکر و پاسبان تھے اور مسلم یونیورسٹی کے معماروں میں سے ایک تھے۔ علی گڑھ جس تحریک کا نام ہے اس کے سرخیلِ کارواں تھے۔

کیا بہار کی سرزمین سے پھر کوئی ابّا حلیم جنم لے گا؟
"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔"

*

ٹلیرڈ
ترجمہ نجمہ شہریار
ویمنز کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اساتذہ اور تحقیق

کچھ برس پیشتر کے بعد میں نے کناڈا کی ہومینٹیز ریسرچ کاونسل ‌طرف سے دیے گئے دعوت نامے کو قبول کر لیا جس کے مطابق مجھ کو تحقیق کے وسع بر کناڈا کی مختلف یونیورسٹیوں میں بولنا تھا۔ میرا خود اپنے بارے میں ‌بال ہے کہ میں علمی تنقید کی فقط مشق کر رہا ہوں باقاعدہ محقق نہیں ہوں۔ ‌خیال ہے کہ انڈر گریجویٹ درجات کی تدریس پوسٹ گریجویٹ درجات ‌تدریس کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ ساتھ ہی میں تحقیق میں کچھ حالیہ رجحانات ‌ں معترض ہوں اور اُن پر حملہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان ہی وجوہات کی ‌پر بظاہر میں ان ہی چیزوں کی مخالفت کر رہا تھا اور اسی چیز کے سلسلے میں ‌بت انگیزی کا خطرہ مول لے رہا تھا۔ جس کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں مجھے ‌کرنی تھی۔ یوں میں اپنی بات کو اس طرح شروع کرتا ہوں کہ تقائص کے ‌بود تحقیق کے عمل کی بنیاد کچھ مستقل انسانی جبلتوں پر ہے

ان جبلتوں میں سب سے سادہ جبلت تجسس ہے، جستجو ہے، سیکھنے ‌خواہش جس کے بارے میں ارسطو نے کہا تھا کہ یہ انسانی فطرت کی تہوں میں ‌بود ہے۔ کوئی بھی انسان جس میں یہ دھندلی یا خوابیدہ ہے وہ نامکمل ہے ملٹن ‌"فردوس گمشدہ" میں اس تجسس کو بہت واضح صورت میں پیش کیا ‌۔ آدم علم کے لیے بے چین ہیں۔ یہ چیز ان میں تجسس پیدا کر لی ہے۔ اس کی ‌نیس علیحدگی میں ناممکن ہے۔ تحقیق کا تعلق زندگی کی ان سچائیوں سے ‌جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہوں۔ اس کی صحت کا انحصار انسان ‌بھلائی پر ہے۔

حق اور صداقت کی اس لامتناہی توسیع سے کیا فائدہ جو انسان ‌نسانیت فراموش کر دینے پر مجبور کر دے۔ وہ سچائیاں اور صداقتیں ‌نسان کی بھلائی کے کام آ سکیں، انھیں انسانی تحقیق کا موضوع ہونا چاہیے۔
حالاں کہ تجسس اپنے آپ میں بڑی قابل تحسین چیز ہے۔ لیکن اسے ‌مگی میں شناخت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زندگی کی زبردست خدمت کر سکتا ‌۔ لیکن جب یہ آقا بن بیٹھے تو انسانی توازن کے لیے خطرہ پیدا کرتا ہے۔ آدم حالانکہ ‌میں بے انتہا تجسس موجود ہے، اس جذبے کو خدا کی عظمت و شوکت کے ماتحت ‌تے ہیں۔ وہ خدائی کے راز جاننے سے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ منفی صورت ‌میں تجسس گناہ بے لذت ہے جس میں کہ انسان خود کو سارے عمل سے الگ کر لیتا ہے اور بہت بے کسی اور بے چارگی کا شکار ہو جاتا ہے، وہ شخص اس خدمت کا اہل نہیں رہتا جو عام انسان چاہتے ہیں۔ ملٹن اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ علم کو انسان کی بھلائی کے کام آنا چاہیے۔ اس کا مقصود ذاتِ خداوندی کا علم ہے جو کہ حقائق کے محض جمع کرنے کے عمل سے مختلف ہے جو علم انسان کو کتابی علم کے بجائے متوازن قوّتِ فیصلہ، عقلِ سلیم، تنقید و بصیرت کا اہل بناتا ہے۔ ملٹن کے خیال کے مطابق ریسرچ کی صحت کا انحصار نوعِ انسانی کی بہبود اور بھلائی پر ہونا چاہیے۔

یہ بہت ہی بحث طلب اور نزاعی بیان ہے یوں کہ یہ بیشتر سائنسی تحقیق کے عقائد اور مسلک کے خلاف جاتا ہے کہ ایسی کسی دیوی کا وجود ہے جسے حق کی دیوی کہتے ہیں اور اس کی سلطنت کی توسیع بذاتِ خود اہم اور قابلِ قدر ہے۔ سارے انسانی پاس و لحاظ سے قطع نظر۔ لیکن یہ دیوانگی ہوگی اگر ہم وقت کے اُڑتے ہوئے رتھ کی آواز اپنی پشت پر نہ سنیں۔ حق کی اس لامتناہی توسیع سے کیا فائدہ جو انسان کو اپنی انسانیت فراموش کر دینے پر مجبور کرے۔

حق کو یوں دیوی کا روپ دینے کا غلط رویّہ دراصل مختلف نظریات، عقاید اور اصولوں کے گڈمڈ ہونے کا ثبوت ہے۔ سائنسی سچائی کا صحیح اصول محض حقایق سے چپٹے رہنا نہیں ہے۔ حقائق نہیں بلکہ وہ سچائیاں جو انسان کی بھلائی کے لیے ہوں انھیں کریم النفس اور شائستہ انسانی تحقیق کا موضوع ہونا چاہیے۔ روایتی محقق عموماً انسانوں کی قربانی دے کر اپنی تصنیفات منظرِ عام پر لاتا ہے۔ یہ اشاعت برائے اشاعت، تحقیق برائے تحقیق ترقی یا پروموشن کے لیے تشویش ناک صورتِ حال ہے۔ یہ علم کو رسوا اور بدنام کرنا ہے۔ بے روح میکانکی تحقیق کا کوئی حاصل نہیں۔ اکیڈمک ترقی کے لیے سوائے بہ حیثیت استاد برتری اور فوقیت کے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ جن کے پاس ریسرچ تجسس نہیں اور جو اچھے، معتبر استاد ہیں، ان کی ترقی رکنا نہیں چاہیے۔

میرے ذہن میں کچھ تدابیر ہیں جن کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں انتخابی اور مدیرانہ۔ پہلی قسم میں میرا خیال ہے کہ ترقی کے لیے استاد کی حیثیت سے نمایاں ہونے کے علاوہ کوئی خوبی درکار نہیں۔ نمایاں اور اہل اساتذہ کچھ تحریر بھی کرنا چاہیں گے اور تحریری شایع شدہ نمونے نہ ہونے کی صورت میں نقصان میں رہیں گے۔ لیکن کچھ اساتذہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بہ حیثیت استاد کوئی کمی نہیں ہوتی جن کے پاس شایع شدہ تحریریں موجود نہیں ہوتیں ان کی نہ تو ترقی رکنی چاہیے، نہ ہی زبردستی ان سے تحقیق کروائی جانی چاہیے شایع شدہ کام پر زور دینا چاہیے۔

اردنگسبے بٹ کے مطابق اسکالر دو طرح کے ہوتے ہیں پُرنویس پُرگو اسکالر اور قابل و تاثر پذیر اسکالر۔ دوسری قسم کے وہ عالم ہیں جو جوافذیت رکھنے والے، ترتیب دینے والے منظم کرنے والے ہوتے ہیں (تنظیم مربوط کن عمل ہے) جو علم کو خود میں جذب کرتے ہیں، سموتے ہیں، اسے اپنے وجود کا حصہ بناتے ہیں، علم کا خیر مقدم کرتے ہیں جو علم کے امین اور محافظ ہیں۔ پہلی قسم کے اسکالر علم کو دریافت کرتے ہیں، انکشاف کرتے ہیں، اظہار کرتے ہیں، پیش کرتے ہیں ـــــ دوسری طرح کے اسکالر علم کو حاصل کرکے اسے تفہیم کرتے ہیں۔ تہذیب میں اس کی قلب ماہیت کرنے کی بات کرتے ہیں

ایک استاد جو سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے، منظم کام کو پورا کرتا ہے، علم کے مختلف عناصر کو یکجا کرتا ہے۔ حالاں کہ کچھ بھی شایع نہیں کرواتا ہے یا علم کی نمائش کا قایل نہیں، خود نمائی کو پسند نہیں کرتا کہیں زیادہ اہل ہے کسی اہم تدریسی عہدے کے بہ نسبت اُس استاد کے جس نے سیکڑوں غیر متفکرانہ، غیر سنجیدہ، بے روح چیزیں لکھی ہیں، ایپکٹیٹس (Epictetus) کی مثال لے لیجیے وہ زمانۂ قدیم میں فلسفے کا پروفیسر تھا جو فقط لکچر دیتا تھا، درس دیتا تھا، لیکن اس نے کبھی بھی کچھ شایع نہیں کروایا۔ اس کے شاگرد جو لکچر نوٹس لیتے تھے وہی اس کی تصانیف کی صورت میں سامنے آئے۔ یہ بڑا محتاط، ہوشمند اور معتدل خیال ہے کہ وہ آج کے دور میں یقیناً کسی بھی یونیورسٹی میں اپنا عہدہ اور منصب کھو دیتا۔

حق انتخاب رکھنے والوں کو جب وہ امیدوار کے شایع شدہ کام کا جائزہ لیں تو اُن کو مقدار کثیر کے بجائے عمدگی، قابلیت، کمال، ذہنی اور اخلاقی وصف پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، ان کو یہ چیز خلجان میں ڈال دیتی ہے کہ الف جس نے زیادہ چیزیں تو شایع نہیں کروائی ہیں زیادہ لائق ہے لیکن اس کا کام دوبارہ مطالعہ مانگتا ہے، سمٹا ہوا اور مجتمع ہے، بحث و مباحثہ اور غور و فکر چاہتا ہے، زیادہ توجہ طلب ہے، اس میں ارتکاز ہے جو زیادہ ذہنی قوت کا مظہر ہے اور پھر وہ کچھ غیر یقینی کی کیفیت سے بھی دوچار ہوتے ہیں کہ وہ واقعی اہل ہے کہ نہیں ـــــ ب اور ج نے زیادہ تصنیفات پیش کی ہیں، ان کا کام غیر پیچیدہ، سلجھا سلجھا سا، سیر حاصل معلوم ہوتا ہے۔ ان کے مصنف زیادہ زرخیز معلوم ہوتے ہیں، کام بہت ہے تو جناب وہ منصب ب یا ج کو جائے گا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی الف باقی دونوں کے مقابلے میں ہزار گنا لایق ہو، لیکن عہدہ اسے نہیں ملے گا۔ ایسا امکان ہے اور اس خلا پذیر دنیا میں اکثر ایسا ہو گا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ایسا کم سے کم ہو تو اس کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں کہ متفکرانہ تحقیق وجود میں آئے کریم النفس اور عظیم تحقیق جنم لے بجائے میکانکی تحقیق کے جس میں مقدار کثیر کے بجائے لیاقت پر زیادہ زور ہو، لیاقت جو محض صفحۂ کاغذ سے نہ ناپی جائے ـــــ

اب ہم اپنی پیش کردہ تدابیر اور چارۂ کار کی دوسری قسم یعنی مدیرانہ تدابیر کی طرف آئیں۔ اور اس سے میری مراد ہے کوئی بھی وہ تنقید جس کے ذریعے مدیر، تبصرہ نگار یا قارئین شائع شدہ تحقیقی کام کی نوعیت پر اثر انداز ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ ان کو مالی نقصان پہنچ جائے یا نکتہ چینیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ حقیقت ہے کہ بیشتر مضامین طویل ہوتے ہیں جو کہ مضامین کے بجائے ایسے ضخیم نوٹس ہوتے ہیں جو ثقیل الفاظ سے پُر ہوں۔ اسی صورت کچھ کتابیں بھی محض ضخیم نوٹس ہوتی ہیں۔ تحقیق کی ضخامت کم کی جائے اور اس کی اثر پذیری اور افضلیت میں اضافہ کیا جائے جس کو مدیرانہ سختی سے کیا جا سکتا ہے۔ اشاعت کی قبولیت کا معیار بڑھایا جائے۔

یہ تدابیر ہیں جن کو سامنے رکھنا آسان ہے لیکن جن پر عمل مشکل ہے۔ اس کی وجہ فقط موجودہ تحقیق کے مخصوص نقائص کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر مدیرانہ سختی ہو تو حسن و دلربائی سے عاری، بے روح اور مبہم تحقیقات کی پیداوار رک جائے گی اور تب ہی کھرے کھوٹے اور اصل و نقل کا فرق محسوس ہو گا۔

حال ہی میں مَیں نے ایک کتاب دیکھی، بیشتر جملوں کو سمجھنے میں تین یا چار بار پڑھنے کی ضرورت پیش آئی۔ چار سو چھبیس صفحات پر مشتمل وہ کتاب جسے پڑھنے کے لیے تقریباً تین ماہ کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ یقیناً میں اس کے مطالعے کے بعد کافی عقلمند ہو جاؤں گا۔ لیکن ان دوسری کتابوں کا کیا ہو گا جو منفرد اور کہیں زیادہ تاباں، روشن اور واضح ہیں۔ یہ کتاب ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جو قاری کی ضرورت کو مدّنظر رکھ کر نہیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ مجھے بڑی بھیانک بات لگتی ہے کہ تحقیق کا کام جو کہ کریم النفس، شفیق، ہمدرد، تہذیب و شائستگی سکھانے والی ہونے کا منشا رکھتی ہے اور تہذیب کے معاملات سے بحث کرتی ہے، اپنے طرز نگارش سے اسی مقصد کو مجروح کرے۔

اتنا تو ہوا عملی تدارک اور اصلاح کے بارے میں جو کہ موجودہ تحقیق کے نقائص کے سلسلے میں ہیں، اب میں تحقیق کو صحت مند رکھنے کے عمومی اصول پر غور کروں گا۔ لیکن ان کو میں صرف اس تحقیق پر لاگو کروں گا جن کا تعلق تخلیقی فن پاروں سے ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ ایسی تحقیق کا جواز تبھی نکلتا

ہے جب یہ جمالیاتی تنقیدی قابلیت اور صلاحیت کی بنیادی اور اساسی ریاضت
مشق اور عمل درآمد کو متعین کرے جو وسیع تناظر میں اس نظریہ کی حامل ہے کہ
علم کو عام انسانی بھلائی کے لیے استعمال کیا جائے۔

یاد رکھیے کہ اب میں بات کر رہا ہوں ان چیزوں کے بارے میں جن کا
تعلق تخیلی تحریروں سے ہے علم سلف اور قدامت شناسی سے نہیں۔ تنقید
کا بنیادی مقصد کسی فن پارے کے بارے میں معلومات بہم پہنچا کر اس کی تشریح
کرنا ہوتا ہے یوں کہ قاری محظوظ ہو اور اس کی تدریس ہوا اور یہی وہ مقصد
ہے جو بڑے فن کاروں پر تنقید، جس میں تحقیق بھی شامل ہے، کرتے وقت
ذہن میں ہونا چاہیے اگر اسے صحت مند رہنا ہے۔

اب اگرچہ کہ علمی اور منطقی نقاد سب سے زیادہ اہل ہے کہ وہ بڑے
ادیبوں کو ان کے دور کے تناظر میں رکھ کر دیکھ سکے تو یا تو اس کو یہ پہچان
ہونا چاہیے کہ وہ اپنے کام کو ناکافی اور غیر مکمل سمجھے اور تکمیل کے لیے اسے
دوسرے کے سپرد کرے یا پھر خود اسے مکمل کرے۔ یہاں پر میں ایک مثال
دوں گا۔ للی کیمپ بیل شیکسپیئر کے تاریخی ڈراموں پر اپنی تصنیف مارک
وین ڈارین پر حملے کی صورت شروع کرتی ہے کہ وہ غیر تاریخی اور ذاتی
نقاد ہیں۔ کیمپ بیل کی کتاب عالمانہ ہے جو تنقید میں ایک قابل قدر اضافہ
ہے۔ لیکن ایک نقاد کی حیثیت سے ہم اسے نمایاں نہیں کہہ سکتے۔ وین ڈارین
عمدہ نقاد ہیں گو کہ ذرا غیر مستقل اور ڈانواں ڈول ہیں اگر ان کے نکالے ہوئے
نتائج کیمپ بیل کے نتائج سے میل نہیں کھاتے تو ان کی تنقید مشتبہ ہو جاتی ہے
کیونکہ یہی آپسی مخالفت نامناسب ہے۔ دو کو لڑنا نہیں چاہیے بلکہ ایک دوسرے
کے کام کو مکمل کرنا چاہیے، جذب کرنا چاہیے۔ ٹلیرڈ اپنے ایک دوسرے مضمون میں
لکھتے ہیں۔

we agree to disagree in our search after truth.

مثال کے طور پر مورس کیلی ملٹن پر اپنی کتاب میں میرے ادب پہ
حملہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق شاعر کو اپنے عہد کی روشنی میں دیکھنا جس طرح کہ
اس کے معاصرین نے دیکھا ہو منطقی تنقید کا آخری مقصد ہے اور یوں بظاہر
یہ تنقید وجدان کی اہمیت سے انکاری ہے جس پر انحصار کرنے کی وجہ سے وہ
مجھ پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ مارس کیلی نے نہایت عمدہ کتاب لکھی ہے ایک انتہائی
بردبار اور درست و محتاط تحقیق ہے ملٹن کی "فردوس گمشدہ" پر۔ اور
نقاد کو ضرور اسے مد نظر رکھنا چاہیے جب وہ یہ بتلائے کہ "فردوس گمشدہ"
اس کے لیے کیا معنیٰ رکھتی ہے —— ان سب چیزوں سے قطع نظر قاری
کا ردّ عمل سب سے اہم چیز ہے۔ وہ ردّ عمل خطا پذیر اور غیر اطمینان بخش
ہو سکتا ہے تاہم غیر معمولی اور خاص ہے۔

کبھی نہ بھولیں کہ تنقید کا واحد مقصد فن پارے کی طرف آپ کے
پورے وجود کا ردّ عمل ہے۔ یہی تنقید کا بنیادی مقصد ہے اور نقاد کی
پرکھ کا واحد معیار۔ تحقیق اور تنقید کا رشتہ آسان نہیں بلکہ عجیب و غریب
معاملہ ہے اور مجھے جنگ کی ظاہری ساخت کی یاد دلاتا ہے۔ کون ہے ایسا
جو موجودہ جنگ و جدل میں عدم تناسب پر نہ چونکے وہ عدم تناسب جو
مستعدی، آمادگی، ساز و سامان اور تعمیل، کارروائی اور نفاذ کے مابین
ہوتا ہے جو کہ سارے واقعات کی خاکہ کشی، نقشہ کشی اور شکوہ و طمطراقیتوں
کے مابین ہوتا ہے۔ وہ سارے واقعات جو میدانِ کارزار کے پس منظر میں
ہوتے ہیں —— اور اس کے علاوہ بذاتِ خود جنگ کے اتفاقات، ابتری،
پراگندگی، انتشار اور سفلہ کشمکش و جد و جہد —— اپنے شکوہ میں
جدید تحقیق ان آمادگیوں اور ساز و سامان سے مشابہ ہے۔ تنقید ایک جنگ
کی مانند ہے، اتفاقیہ ہے، منتشر اور گڈمڈ ہے اپنے بہت سے اظہارات
میں یہ عمل کی واحد صورت ہے جس کی طرف تحقیق کی پر شکوہ سخت گیریاں
لے جا سکتی ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میرا مقصد تحقیق کی مخالفت کرنا ہے
ہرگز نہیں۔ میں تو فقط صحیح تحقیق کو عمل میں لانے کی وکالت کر رہا ہوں اور غلط
تحقیق سے احتراز کی تلقین۔ وینیور کی مارلے ڈ آرتھر پر تحقیق توجہ طلب اور
قابلِ قدر رہے۔ اس سے پہلے میلوری کا مطالعہ غلط بنیادوں پر کیا جاتا تھا۔
وینیور نے نیا نقطۂ نظر پیش کیا۔ شیکسپیئر کے تاریخی ڈراموں پر ڈبلو لارینس
کی کتاب بیش بہا ہے۔ جس کا لبِّ لباب یہ ہے کہ بہت سے واقعات طربیوں
اور لوک کہانیوں میں مشابہ ہیں۔ یہ علم واقعتاً مددگار ثابت ہوا۔ اب آج کے قارئین
ان ڈراموں کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ گرین لا نے سڈنی کی آرکیڈیا
پر ایک مضمون پیش کیا جس کے مطابق یہ تصنیف سنجیدہ سیاسی موضوع پر مبنی
ہے۔ یہ تنقید اور تحقیق کے میدان میں ایک بہت بڑی خدمت اور ایک بیش بہا
اضافہ ہے۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نقائص اور عیوب کی وجہ سے تحقیق سے
متنفر نہ ہوں بلکہ اسے صحیح اور بہترین طریقے سے استعمال کریں۔ یہ کہا جاتا ہے،
کہ کنا ڈا کا مقصد برطانیہ اور امریکہ کے مابین مفاہمت پیدا کرنا ہے۔ تو اس
کے لیے یہ کہوں گا کہ انگریزی تنقید کی خصوصیات ہیں غور و فکر کی پختہ قوت و
صلاحیت اور زود حسی۔ اور اس کے عیوب ہیں ناتجربہ کاری، مغروریت،
ناکافی صلاحیت۔ (میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ سارے ہی برطانوی نقادوں میں
یہ عیوب ہیں۔ امریکی تنقید کے اوصاف ہیں سرگرمی، توانائی، زور، جستجو
اور تکمیلیت و اعلیٰ ظرفی۔ اور اس کے عیوب ہیں ناکافی غور و فکر، خیال
اور رائے اور نتائج نکالنے کی صلاحیت کی کمی اور میرا آخری مشورہ یہ ہے کہ
وہ جو تحقیق کے میدان میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا چاہتے ہیں وہ دونوں
ملکوں کی تنقید کے بہترین اوصاف کو سامنے رکھیں، اور تب اپنی جستجو کی منزل
بہ قدم بڑھائیں۔

اخلاق احمد

ایک حسین تصویر

یہ تصویر دیکھی ہوئی نہیں ہے، لیکن پہچانی جاسکتی ہے۔ رنگ و روغن سے بے نیاز، دیدۂ تر میں لہراتی ہے۔ تصویر سے بات کی جاتی ہے۔ لیکن تصویر خاموش رہتی ہے۔ یہ تصویر آپ سے بات کرتی ہے، مشورے دیتی ہے، حکم دیتی ہے، بُرائی بھلائی سے آگاہ کرتی ہے، نیکی کی دعوت دیتی ہے، بُرائی سے ڈراتی ہے، خفا ہوتی ہے، محبت کرتی ہے اور مسکراتی ہے۔ زندگی کی سخت گھڑی میں اپنی مثال پیش کر کے سکون اور اطمینان بخشتی ہے۔ اس بات کا سبق دیتی ہے کہ زندگی سکون یا آرام و عشرت کا نام نہیں ہے بلکہ جدوجہد اور جفاکشی کا نام ہے۔ یہ زندگی سیم و زر جمع کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ سیم و زر انسانوں کے درمیان بکھیرنے کا نام ہے۔ انسانوں پر ظلم و ستم ڈھا کر قابو میں نہیں لایا جاسکتا ہے بلکہ محبت سے ان کے دلوں کو جیتنے کے بعد ان کو صحیح راہوں پر لایا جاسکتا ہے۔ اس تصویر کو نہ پھاڑا جاسکتا ہے، نہ جلایا جاسکتا ہے، نہ برباد کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو مسکراتی رہتی ہے۔ چاہے دیکھنے والا اپنی آنکھیں بند کرلے یا کھولے رکھے۔ نہ اُس کی پوجا کی جاسکتی ہے، نہ فریم میں لگا کر دیوار پر لٹکائی جاسکتی ہے۔ مگر دل کے آئینے میں ہر وقت چمکتی رہتی ہے اور سانس کی طرح ہر دم اندر باہر آتی جاتی ہے۔ اس تصویر کا ہر پہلو ہر وقت نظر آتا ہے۔ دوری اور نزدیکی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تصویر جب گامزن ہوتی ہے تو خرام کے بجائے تیز رفتاری پسند کرتی ہے۔ تصویر کشی سے پہلے آرائشی تقاضے پورے کیے جاتے ہیں، لیکن یہ تصویر آرائشوں سے بے نیاز نظر آتی ہے۔ یہ تصویر مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے لی گئی لیکن ہر پہلو سادہ ترین نظر آتا ہے۔ گروپ میں اس کی جگہ بدلتی نظر آتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ درمیانی جگہ پر نظر آئے۔ کبھی دائیں کبھی بائیں، کبھی پیچھے، کبھی آگے نظر آتی ہے۔ شاہراہوں پر عام طریقے سے چلتی پھرتی نظر آتی ہے، بازار میں گھومتی نظر آتی ہے۔ اپنے کاروبار میں مشغول نظر آتی ہے۔ گھریلو کام میں دلچسپی لیتی ہے، نہ عارفانہ افتخار نہ شور نہ ہنگامہ، بچوں سے پیار بڑوں سے محبت۔

رخ شگفتہ کی تازہ دمی اور شادابی میں چاند سا چہرہ فروزاں اور تاباں ہے جیسے چودھویں رات کا چاند، چمکتا ہوا آفتاب، چہرہ بدر کی گولائی لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ کھلی ہوئی پیشانی، ابرو کی دو جدا جدا کمانیں لچکدار دکھائی پڑتی ہیں۔ دونوں جیسے کاجل کی باریک لکیریں ہوں۔ لیکن بال گنجان ہیں جلالی شان کے وقت دونوں کمانوں کے درمیان ایک رگ ایسی پھڑک جاتی ہے جیسے دونوں کمانوں کے درمیان ریشمی گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ پیشانی کے اوپر جمالیاتی لہریں موج زن نظر آتی ہیں۔ مسرت سے بھرا ہوا پیالہ جیسے چھلکنے کے لیے بے تاب ہو۔ چاندی سا بدن، جہاں چاندنی کے پیر پھسلتے ہیں۔ یہ طے کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ سفیدی میں سرخی ہے یا سرخی میں سفیدی۔ لیکن چہرہ ملیح اور طرح دار ہے۔

سیاہ آنکھیں، دراز پلکیں، سرمگیں کناروں والی جھیل کے صاف صاف پانی میں جیسے پتلی کو پکڑنے کے لیے سرخ ڈوروں کا جال پڑا ہو، نگاہیں نیچی دیکھنے کا انداز — پردہ نشیں کنواری لڑکیوں سے بڑھ کر شرم و حیا، ناک کی بلندی کمان کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لیکن خوبصورتی کا دامن یہاں بھی نہیں چھوٹتا ہے۔ رخسار نہ پھولے ہوئے ہیں نہ پچکے ہوئے بلکہ ہموار نظر آتے ہیں ان پر گوشت ذرا سا لیے ڈھکے ہوئے اور ڈھلکے ہوئے جیسے شہد کے دو قطرے ٹپکنے کی تیاری میں ہوں۔ فراخ دہن ہے۔ گل سے لبوں کا کیا کہنا، جیسے کہ گلابی نیلنے والی ہو۔ یہ تصویر جب بات کرتی ہے تو منہ سے آواز کیا نکلتی ہے گویا روشنی پھوٹتی ہے۔ کیوں کہ دانتوں کی چمک آواز پر غالب نظر آتی ہے۔ گھنیری داڑھی کے سائے میں فرشتے دم لیتے ہیں۔ اعتدال کے ساتھ بڑا سر نظر آتا ہے۔ گنجان گھونگھروں والے بال لیکن زیادہ خمدار نہیں۔ شانوں پر لہرائے ہوئے۔ درمیان میں مانگ جیسے چاندی کی لکیر۔ خوبصورت سا چہرہ جیسے ساون کی اندھیری رات میں چاند نظر آجائے۔ چہرہ کی یہ خوشنما آرائش تراشتی ہوئی اجلی، پتلی اور لمبی گردن پر نظر آتی ہے۔ کسا کسا گٹھیلا بدن، نہ موٹا نہ پتلا میانہ قد مگر دوسروں سے عموماً نکلتا ہوا۔ پیٹ سپاٹ، سینہ کشادہ، سینے سے ناف تک بالوں کی ہلکی سی لکیر بازوؤں اور کندھوں کے بالائی حصے پر بالوں کے گچھے کندھوں اور گردن کا درمیانی حصہ گوشت سے بھرا ہوا۔ چوڑی کلائی، پھیلی ہوئی ہتھیلی جس پر گلستان جہاں مہکتا ہے۔ لمبی انگلیاں۔ ایک بھی اشارہ کریں تو چاند کے دو ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ پنڈلیاں اور ایڑیاں گوشت سے لدی ہوئی نہیں بلکہ ستی ہوئی، قدم گوشت سے بھرے ہوئے۔

ایسی باوقار تصویر جس کو نگاہیں چھو نہیں سکتیں۔ مگر دل کی آنکھیں سیراب ہوسکتی ہیں۔ مصور نے بے شمار تصویریں بنائیں لیکن اس تصویر کو بنانے کے بعد خود اس پر فریفتہ ہوگیا اور اس تصویر کو دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپا کر رکھ لیا اب نہ وہ خود ایسی تصویر بناتا ہے، نہ دنیا والے اس کی نقل اتار پاتے ہیں۔ فن کاروں کے فن تڑپ رہے ہیں لیکن ایسی تصویر نہیں بن پا رہی ہے۔ شاہکار کی نقل کہاں ممکن ہوسکتی ہے۔

نوری تن کمبل میں چھپائے بادل میں بجلی لہرائے
نور کا مینہ برسائے جھم جھم صلی اللہ علیہ وسلم

سرفراز احمد

رفائل

Raphael

یورپ کے عظیم ترین مصوروں میں رفائل کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔ وہ ان معدودے چند مصوروں میں سے ایک ہے جن کی تخلیقات صدیوں پر محیط طویل دور میں بدلتے ہوئے فیشن اور ذوق کے باوجود مصوری کے شائقین سے داد تحسین حاصل کرتی کرتی رہی ہیں۔

اوائل عمر ہی میں رفائل کی ذہانت نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ درحقیقت اس کی خلاقی اور فطانت اُن توقعات سے کہیں زیادہ تھی جو لوگوں نے اس سے وابستہ کی تھیں۔ رفائل میں کسی بھی طرز مصوری کو بہت جلد سیکھنے اور پھر اپنے ذہنی عمل کے ذریعے ایک منفرد اسلوب میں پیش کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ اس کی تمام تخلیقات اپنی نزاکت، رعنائی اور اشاریت میں بے مثال ہیں۔ خواہ وہ اس زمانے کی ہوں جب وہ وسطی اٹلی کا ایک ابھرتا ہوا نوعمر فنکار تھا یا اس فلورنسی دور (Florentine Period) کی ہوں جب وہ لیونارڈو اور مائیکل اینجلو کے فن پاروں سے متعارف ہوا یا پھر اُن کا تعلق اس کی زندگی کے اُن آخری سالوں سے ہو جب وہ روم میں نشاۃ ثانیہ کے افق پر سورج کی مانند پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ اُن میں ایسا توازن ہے گویا حرکت اور جمود کو یکجا کر دیا گیا ہو۔ ایسے جذبوں کی عکاسی ہے جو شدید ہوتے ہوئے بھی نزاکت اور شائستگی کے پیکر میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ حسن کے بارے میں رفائل کا اپنا ایک آئیڈیل تھا جس کی نشاندہی اس کی بالکل ابتدائی تخلیقات میں بھی کی جا سکتی ہے۔

۱۴۹۹ء میں اس نے اپنی خود کی پورٹریٹ میں ایک پُروقار لڑکپن کی تصویر کشی کی ہے۔ اشمولین کے عجائب گھر میں اس کے چند دوسرے بیش قیمت فن پاروں کے ساتھ یہ پورٹریٹ بھی محفوظ ہے۔

پوپ جولیس ثانی اور پوپ لیو دہم رفائل کے بااثر سرپرستوں میں تھے۔ پوپ جولیس ثانی کے درباری مصور کی حیثیت سے رفائل نے ویٹیکن کے مشہور ترین کمرے (Apartment) کی اس طرح آرائش کی جس طرح مائیکل اینجلو نے Sistine Chapel کی تزئین کاری کی تھی۔ اسی زمانے میں لیونارڈو بھی روم پہنچ گیا تھا۔ اس طرح ایک مختصر عرصے کے لیے نشاۃ ثانیہ کے دور کے تین عظیم ترین مصور روم میں یکجا ہو گئے تھے۔

رفائل کے تکمیل فن کی تلاش، اس کا تصور حسن اور اس کی حیرت انگیز حد تک باریک بین نظر کا احساس اس کی ہر تخلیق سے ہوتا ہے خواہ وہ ابتدائی زمانے کی اپنی پورٹریٹ ہو یا ویٹیکن کی حسن کاری ہو یا دوسرے خاکے اور تصویریں۔

RAPHAEL

1483 - 1520

SELF PORTRAIT

Ashmolean Museum, Oxford

Plate 22

RAPHAEL
1483 - 1520
MADONNA WITH POMEGRANATE
[illegible]rtina, Vi[illegible].

St. George and The Dragon اس کے بنائے
ئے شاہکار خاکوں میں سے ایک ہے۔ ۱۵۰۲ء اور ۱۵۰۵ء کے درمیان
ئے گئے اس خاکے میں قلم اور کتھئی روشنائی سے کام لیا گیا ہے فی الحقیقت
ایک پینٹنگ کے لیے ابتدائی خاکے کے طور پر بنایا گیا تھا۔ لیکن اس میں تکمیل
دہ تصویر کا سا حسن اور رعنائی جھلکتی ہے۔ نیشنل گیلری واشنگٹن
ں اسی موضوع پر بنائی گئی رفائیل کی ایک اور تصویر ہے جس کا شمار اس
اعلیٰ ترین فن پاروں میں کیا جاتا ہے۔

البرٹینا، ویانا میں رفائیل کا ۱۵۰۴ء میں چاک سے بنایا
ایک خاکہ ہے جس کا عنوان ہے "Madonna with Pomegranate"
نار کے ساتھ مقدس کنواری) نشاۃ ثانیہ کے دور میں میڈونا کا جو
یڈیل تھا، وہ اس خاکے میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔
ویر کے کئی اجزا ہیں۔ ماں، بچہ، انار اور پھر کتاب۔ لیکن پوری
ویر میں معصومیت اور پاکیزگی کی جو فضا ہے، وہ اُن اجزا میں ایک
با حیرت انگیز توازن اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے کہ یہ تصویر مختلف اجزا
مجموعہ ہونے کے بجائے ایک وحدت ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

مصوری کی دُنیا میں یہ عام روایت رہی ہے کہ کسی تصویری
ے کا مطالعہ کرتے ہوئے دیگر مشاہیر کی تخلیقات سے اس کا موازنہ
تے ہیں۔ اس سے کسی بھی فن پارہ کی نمایاں اور امتیازی خصوصیات
سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ہم Botticelli
ں 'Abundance' کا رفائیل کے زیرِ تذکرہ خاکے سے
قابلہ کریں تو Botticelli کے یہاں ہمیں حقیقت اور آئیڈیل

کا امتزاج ملتا ہے۔ ایک غیر مرئی، ماورائی، روحانی کیفیت کا احساس ہوتا
ہے۔ اس کے برخلاف رفائیل کی تخلیق تمام تر نزاکت کے باوجود اپنے وزن
اور اپنی بناوٹ کا احساس دلاتی ہے۔ گویا رفائیل کے یہاں روحانی اور
جسمانی حسن کے درمیان ایک متوازن ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

نشاۃ ثانیہ کے دور کے اطالوی خاکوں کی ایک اور خصوصیت
بھی رفائیل کے فن میں نمایاں ہے۔ اس دور میں کسی ڈیزائن کے مجموعی تاثر
کے پیشِ نظر جسم کے خطوط کو نمایاں اور واضح طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن
دیگر تفصیلات کو غیر واضح رہنے دیا جاتا ہے۔ یہ غالباً اس دور میں فنِ مجسمہ
سازی کی غیر معمولی مقبولیت کا اثر ہے رفائیل کی Madanna and Child
کا اگر ہم اسی موضوع پر بنائے گئے Schongauer کے خاکے سے
موازنہ کریں تو رفائیل کی یہ خصوصیت بالکل واضح ہو جاتی ہے Schongauer
کے خاکے میں جسم لباس ہی کا ایک حصّہ معلوم ہوتا ہے۔ اس خاکے میں جسم کی
بناوٹ سے زیادہ آرائشی خطوط کے ذریعے تفصیلات پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی
Schongauer کے یہاں آرائشی خطوط بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں
لیکن رفائیل کے یہاں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

واقعات میں خیالات کی تونگری کہاں
اور شعور کی ثروت کہاں۔ واقعہ یک زمانی ہوتا
ہے، سو رات گئی بات گئی۔ خیال پر کوئی ایسی
بندش نہیں۔ جب چاہا اور جہاں چاہا بات دہرائی
قندِ مکرر کا مزہ لیا اور رات پھر سے سجالی۔

مختار مسعود

ڈاکٹر جمال آرا نظامی
ویمنز کالج مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

ہندوستانی مسلمانوں میں
تعلیم نسواں کی تحریک

ہندوستان میں مسلمان بچیوں کی تعلیم کے سلسلے میں دو محسنین قوم شیخ عبداللہ اور کرامت حسین نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں اور جو کام لڑکوں کی تعلیم کے سلسلے میں سرسید نے انجام دیا، اسی نوعیت کا بلکہ اس سے مشکل تر کام ان اصحاب نے لڑکیوں کی تعلیم کے ضمن میں انجام دیا۔

سرسید کے سلسلے میں آج تک طرح طرح کی غلط فہمیاں موجود ہیں۔ مثلاً یہ خیال بہت عام ہے کہ وہ در پردہ لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ خود شیخ عبداللہ نے لکھا ہے کہ سرسید لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنے کے خلاف تھے۔ اس لیے یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ "جب لڑکے تعلیم پا چکیں گے تو وہ اپنی قوم کی لڑکیوں کو خود ہی تعلیم دے لیں گے۔" یہ بات قابلِ غور ہے کہ سرسید تعلیم نسواں کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شعبۂ نسواں قائم ہی کیوں ہوتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ کم لوگوں کو ایسی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جیسی مخالفت سے سرسید دوچار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنے مذہبی افکار کے اظہار سے باز رہنا پڑا۔ تہذیب الاخلاق کو کئی بار بند کرنا پڑا۔ ان کے زمانے میں جتنی مخالفت لڑکوں کی تعلیم کی ہو رہی تھی، اس سے کئی گنا زیادہ مخالفت تعلیم نسواں کی ہوئی۔ اس زمانے میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ لڑکیاں مدرسوں میں جا کر تعلیم پائیں۔ اگر سرسید بھڑوں کے اس چھتے میں ہاتھ ڈال دیتے تو ان کے خلاف ایسا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا جس کا روکنا ان کے بس سے باہر ہوتا۔ اسی طوفان میں ان کی ساری کمائی یعنی محمڈن کالج بھی بہہ جاتا۔ اسی لیے وہ چپ ہو رہے۔ اس زمانے کے حالات اور مسلمانوں کے عام خیالات کا مطالعہ کرنا ہو تو ان مشکلات پر نظر کرنی چاہیے جو سرسید کی وفات کے کافی بعد اس وقت پیش آئیں جب شیخ عبداللہ نے علی گڑھ میں لڑکیوں کے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی۔

شیخ عبداللہ نے "سوانح عمری عبداللہ بیگم" کے نام سے اپنی اہلیہ کی جو تعلیم نسواں کی تحریک میں ان کی واحد رفیق تھیں، زندگی کے حالات قلم بند کیے ہیں یہ کتاب اب کمیاب ہے ہم اس کتاب کے صرف وہ حصے پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے ان دشواریوں کا اندازہ ہو سکے جو شیخ عبداللہ کو تعلیم نسواں کی تحریک کے سلسلے میں پیش آئیں۔ یہ خلاصہ ہم اپنی زبان میں پیش کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں جا بجا خود شیخ صاحب کے الفاظ بجنسہٖ نقل کیے گئے ہیں۔ تاکہ ان کے احساسات و جذبات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

خواتین سے ہمدردی:۔ شیخ عبداللہ کو زمانۂ طالب علمی سے اس

"سوانح عمری عبداللہ بیگم" کی تلخیص

پاپا میاں اور اعلیٰ بی
Papa Mian & Ala Bi

لائبریری

آرٹ روم

آرٹ کا کمرہ
Art Room
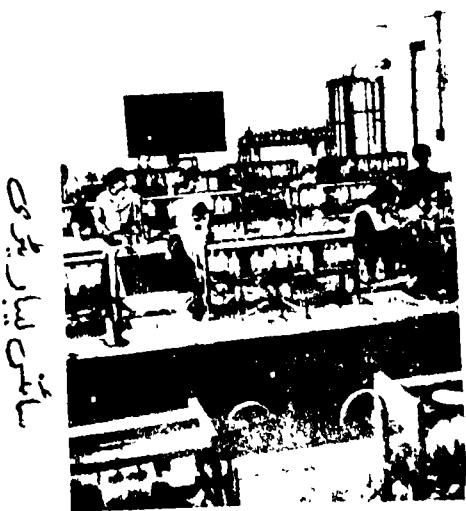
سائنس لیبارٹری

بات کا احساس تھا کہ عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ انھوں نے ایک بہت بوڑھی عورت سے جو مہارانیگان جموں کے شاہی محلات میں ایک عرصے تک ملازم رہ چکی تھی، سنا تھا کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے چھوٹے بھائی مہاراجہ سچیت سنگھ جب اس دنیا سے سدھارے تو ان کی چتا پر "بائیس" رانیاں ستی ہوئیں۔ یہ سب کی سب کم سن اور خوب رو تھیں۔ انھوں نے ایک ڈوگرا سپاہی کو ایک مسلمان حاملہ عورت پر ظلم کرتے دیکھا تھا۔ لاہور کے جس بورڈنگ ہاؤس میں ان کا قیام تھا، اس کے نزدیک ہی ایک نواب صاحب کا مکان تھا۔ ان کی چار بیویاں تھیں۔ نواب صاحب کا معمول تھا کہ دن چھپا اور انھوں نے باری باری سب کی پٹائی شروع کر دی۔ یہ پروگرام اس پابندی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا کہ بورڈنگ ہاؤس کے لڑکے بیویوں کی آواز پہچاننے لگے تھے اور آپس میں کہا کرتے تھے کہ اب چھوٹی پٹ رہی ہے۔ اب بڑی کا نمبر ہے۔ اب منجھلی کی باری ہے۔

شیخ صاحب نے ایک سید صاحب کا واقعہ بھی لکھا ہے جنھوں نے اپنی دو جوان بیٹیوں کو اس وقت تک بٹھائے رکھا جب تک کہ ایک مستند سید کے گھر سے رشتہ نہ آیا۔ یہ لڑکا بڑا ظالم نکلا۔ شوہر کی عدم موجودگی میں لڑکی اپنی پھوپی کے مرنے میں بلا اجازت چلی گئی۔ لوٹی تو اس سنگدل نے اتنا پیٹا کہ وہ مر گئی۔ باپ کو بڑا صدمہ ہوا۔ بہت رویا۔ لیکن آخر یہ کہہ کر مطمئن ہو گیا کہ چلو خوش نصیب تھی کہ سید کے ہاتھوں مری اور پھر اسی کو اپنی دوسری بیٹی بیاہ دی۔

اس طرح کے بہت سے واقعات انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے جس کے سبب انھیں تعلیم نسواں سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اور یقین ہو گیا تھا کہ جب تک ہماری بچیاں تعلیم یافتہ نہ ہوں گی وہ عزت کی زندگی نہیں گزار سکیں گی۔

کام کا آغاز:- شیخ صاحب ایک عملی آدمی تھے۔ انھیں خوب احساس تھا کہ کام تو اپنے کیے سے ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں دہلی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو ایک روز شام کے وقت شیخ صاحب نے اپنے دوستوں کو ایک جگہ جمع کیا۔ ان میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب سلطان احمد خاں، سید سجاد حیدر اور محمڈن کالج کے بہت سے قدیم طالب علم تھے، شیخ صاحب نے ان سے کہا کہ کانفرنس کے شعبۂ نسواں کو زندہ کرنا ضروری ہے

ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ اس خدمت کو میں انجام دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے آپ لوگ سکریٹری کی حیثیت سے مجھے منتخب کر دیجیے۔ اس وقت اس کام میں ہاتھ ڈالنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ اس لیے یہ باتفاق رائے سکریٹری منتخب ہو گئے۔

اس وقت شیخ صاحب کی شادی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنی بیگم سے تعلیم نسواں کے بارے میں اپنے خیالات بیان کیے۔ وہ بھی جی جان سے اس کام میں شریک ہو گئیں۔ اپنے شوہر کی رہنمائی میں انھوں نے کئی زنانہ جلسے کیے اور خواتین کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی (اس وقت تک شیخ صاحب محلہ رسل گنج میں سکونت پذیر تھے) اس محلے میں چرچے ہونے شروع ہوئے کہ اب تو فرنگیوں کے طریقے اختیار کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ لڑکیوں کے اسکول کھلیں گے۔ لڑکیاں کھلے منھ اسکول جایا کریں گی۔

اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دسمبر ۱۹۰۲ء میں جس کو اب بیاسی سال کے قریب ہو چکے ہیں لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے کیا خیالات تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جلسے کی وجہ سے عبداللہ بیگم کو لڑکیوں کی تعلیم سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ۱۹۰۳ء کا پورا سال بحث و مباحثے میں گزرا۔ شیخ صاحب نے اخبارات میں مضامین لکھے اور لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ کچھ لوگوں نے اس کی موافقت بھی کی لیکن مخالفت میں لکھے گئے مضامین کی تعداد زیادہ تھی۔

مخالفت:۔ بحث مباحثے کا حاصل یہ تھا کہ آج تک اسلام میں کبھی لڑکیوں کے لیے اسکول نہیں قائم کیے گئے۔ اس لیے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور شرافت ان اسکولوں میں لڑکیوں کے تعلیم دلانے کی متحمل ہو سکے گی یا نہیں۔ اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اسلام میں یہ ایک سخت بدعت ہے کہ لڑکیوں کو اسکول بھیجا جائے جہاں ادنا اور اعلا سب قسم کی لڑکیاں جمع ہوں جن میں بعض لڑکیوں کے اخلاق اس قابل نہ ہوں کہ ان سے شریف لڑکیاں ملیں اور یہ باتیں ان کے اخلاق پر اثر انداز ہوں اور اگر اسکول ہوگا تو مجبوراً ان کو آپس میں ملنا ہی ہوگا۔ ان وجوہات کی بنا پر ان کا خیال تھا کہ "لڑکیوں کے مدارس ہماری عورتوں کے اخلاق کی تخریب کا موجب ہوں گے"۔ اور سب سے بڑی بات پردے کی تھی جس میں صرف مرد ہی نہیں پرانے خیالات کی خواتین بھی شامل تھیں۔

عورتوں کی شرکت کا پہلا موقع۔

دسمبر ۱۹۰۳ء میں بمبئی میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں پہلی مرتبہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر عورتوں کو تقریریں سننے کا موقع دیا گیا۔ اس جلسے کے سلسلے میں شیخ صاحب نے ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے۔ "عورتوں کے لیے چلمنیں ڈال دی گئی تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بعض متجسس نگاہیں ان چلمنوں پر لگی ہوئی تھیں، کیوں کہ ایک اردو کے اخبار نے لکھا کہ کچھ عورتیں چلمنوں میں سے انگلیاں ڈال ڈال کر اپنے دیکھنے کے لیے جگہ بنا رہی تھیں۔ لوگوں نے ان کی جھکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا"۔ شیخ صاحب نے جواب دیا۔ "جو لوگوں نے قصداً ان روزنوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی، انھوں نے شرع کی سخت خلاف ورزی کی۔ کیوں کہ شرع میں آیا ہے کہ جب کوئی عورت تمہارے سامنے آجائے تو اپنی آنکھیں نیچی کر لو۔ لیکن جن لوگوں نے اس طرح دیکھا انھوں نے خدا اور رسولؐ کے حکم کی کچھ قدر نہیں کی۔ اور الٹا دوسروں کے سر الزام رکھ دیا۔ اس جلسے میں زہرہ فیضی، عطیہ فیضی دونوں بہنوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔ اور ان کے خاندان کی دوسری خواتین بھی علی گڑھ تحریک تعلیم نسواں کی معاون رہیں۔ اس جلسے میں بیگم عبداللہ نہ جا سکی تھیں۔ بمبئی کے اس جلسے میں ایک ریزولوشن پاس ہوا تھا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک اسکول بطور نارمل اسکول کے شروع کریں، اس میں لڑکیوں کو پڑھانے کی تربیت دی جائے۔ یہ بات جب شیخ صاحب نے عبداللہ بیگم کو بتائی تو وہ بہت خوش ہوئیں اور کہا کہ ہمارے یہاں تو استانیاں باوجود تلاش کے نہیں ملتیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو لڑکیوں کی تعلیم میں آسانی ہو جائے گی۔ لیکن اس بارے میں شیخ صاحب نے علی گڑھ واپسی کے بعد شمس العلما ممتاز علی صاحب (لاہوری ایڈیٹر تہذیب نسواں) اور مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار (جو بمبئی کے جلسے میں موجود تھے) سے خط و کتابت شروع کی کہ وہ لاہور میں کوئی اسکول جاری کریں۔ کیوں کہ علی گڑھ میں ایک لڑکوں کا اسکول ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کے اسکول کے مخالف ہیں، لیکن دونوں صاحبان نے کئی ماہ بعد صاف جواب دے دیا کہ ایسا نہ ہو سکے گا۔ جب دوسری جگہ سے بھی مایوسی کے خط آگئے تو شیخ صاحب نے عبداللہ بیگم سے مشورہ کیا کہ اگر علی گڑھ میں اسکول کھول لیں تو لوگ مخالفت تو نہ کریں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ دونوں طرح کے لوگ ہیں لیکن مخالف گروپ کے لوگوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اگر یہاں کوئی اسکول کھلتا ہے تو میں ضرور کام کروں گی۔ شیخ عبداللہ نے اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود (یہ ۱۹۰۴ء کا زمانہ تھا) کیوں کہ ان کا پیشہ وکالت انتہائی عروج پر تھا۔ لیکن اس کے باوجود "سر سید میموریل فنڈ" "ڈرتے روپے فنڈ" کا کام بہت بڑھ گیا تھا اور انھیں ایجنٹوں کی نگرانی کے لیے باہر جانا پڑتا تھا اور مختلف مقامات پر جلسوں کا انتظام کرنا بھی ہوتا تھا۔ عبداللہ بیگم یہ ضرور کہا کرتی تھیں کہ ادھر اُدھر جانے میں وکالت پر اثر پڑے گا، لیکن مخالفت نہیں کرتی تھیں۔

رسالہ "خاتون" کا اجرا

۱۹۰۴ء کے وسط میں شیخ صاحب نے رسالہ "خاتون" جاری کرنے کا ارادہ کیا کہ تعلیم نسواں کی تحریک میں جان پڑ جائے۔ سید سجاد حیدر صاحب، خان بہادر ابو محمد صاحب، مولوی احتشام الدین صاحب اور مولوی انعام الحق صاحب مرحوم نے شیخ صاحب کی رائے سے اتفاق کیا لہٰذا جولائی ۱۹۰۴ء میں شیخ صاحب کی ایڈیٹری میں رسالہ "خاتون" شائع

ہونا شروع ہوا، اس کا نام خاتون سیّد سجاد حیدر یلدرم یا خان بہادر ابوجعفر صاحب نے تجویز کیا تھا۔ اس رسالے کی تمہید کے آخر کی چند سطریں پیش کی جاتی ہیں جو دلچسپ ہیں :۔ "اس وقت مسلمان مردوں کی اصلاح و ترقی کے لیے تھوڑا بہت سامان موجود ہے۔ مگر مسلمان عورتوں کے لیے کوئی مستقل اور قابل وقعت انتظام نہیں ہے۔ بحیثیت انسان وہ ہماری توجہ اور غور کی مستحق ہیں۔ بحیثیت مسلمان وہ ہماری ہمدردی کی حق دار ہیں وہ بحیثیت عورتوں کے ہماری شریک حال اور بوجہ چولی دامن کا ساتھ ہونے کے ان کا اور ہمارا معاملہ ایک ہے، کچھ جدا نہیں جس قدر مردوں کی حالت پر توجہ کی ضرورت ہے اسی قدر عورتوں کی حالت پر بھی توجہ کی ضرورت ہے اور ہم نے اس ضرورت کا لحاظ رکھنا اپنا فرض سمجھا ہے اور اس فرض کے ادا کرنے کی صورت میں "خاتون" کو جاری کرنا قرار دیا ہے۔ خاتون ایک ماہوار رسالہ ہوگا جس میں صرف عورتوں کے متعلق مضامین ہوا کریں گے۔ تعلیم نسوان کی ضرورت مختلف پیرایوں سے ثابت کرنے کے علاوہ ہماری کوشش یہ بھی ہوگی کہ عورتوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات جو اُن کی ذات اور حالت کے مناسب ہوں گے، شایع کریں۔ ان میں صحیح مذاق پیدا کریں۔ ان میں ان نفیس اور اعلیٰ قوتوں کو ترقی دیں جو ان کے لیے مخصوص ہیں اور دنیا کے لیے نعمت ہے اور ہماری قومی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کی کامیابی اس وقت ممکن ہے کہ ہماری کوشش کے ساتھ پبلک کو ہمدردی ہو۔ محض زبانی ہمدردی ہی نہیں بلکہ ہمدردی اور خلوص کے ساتھ اس کا عملی ثبوت بھی میسّر ہو۔"

بقول شیخ صاحب اس وقت جو کچھ لکھا جاتا تھا ہاتھ پاؤں بچا کر لکھا جاتا تھا، پھونک پھونک کر قدم رکھے جاتے تھے۔ راستے میں کانٹے بہت تھے، غار تھے، ناہموار پتھریلی زمین تھی اور منزلیں سخت دشوار تھیں۔

مخالفت :۔ "خاتون" جاری ہوتے ہی اخبارات اور رسالوں نے مخالفت شروع کر دی۔ کوئی کہتا کہ یہ رسالہ نیچری رسالہ ہے اور پردے کی مخالفت کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ علی گڑھ سے جو رسالہ یا اخبار نکلے گا وہ مذہبی اعتقادات کا مخالف ثابت ہوگا۔ سر سیّد احمد خاں نے تو بذریعہ مردوں کے اسلام کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا تھا اب اس کا ایک شاگرد بذریعہ عورتوں کے اسلام کو مٹانے کی فکر میں ہے ۔

اِس مخالفت کا نواب محسن الملک پر بھی اثر ہوا اور انھوں نے مشورہ دیا کہ اس رسالے سے کہیں علی گڑھ تحریک کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس لیے اگر مناسب ہو تو بند کر دیا جائے۔ شیخ صاحب نے اس کا جواب دیا کہ علی گڑھ تحریک موم کی ناک نہیں ہے کہ چھونے سے ٹیڑھی ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو خدا ہی اس کا حافظ ہے۔ اب زمانہ لوگوں کی اِس قسم کی باتوں کی طرف توجہ کرنے کا نہیں ہے۔ پُرانے اور نئے خیالات میں ایک طرح کا تصادم ہو رہا ہے۔ آخر کو جیت نئے خیالات کی ہی ہوگی۔ اس لیے بجائے ہم کو جدید خیالات کی مخالفت کرنے کے اس کو رفتہ رفتہ اپنی اپنی سوسائٹی میں آنے کی اجازت دینی چاہیے۔ لڑکیوں کی تعلیم تو ایسی چیز ہے کہ اس کی مخالفت تھوڑے دنوں کے بعد بمنزلہ قومی خودکشی کے سمجھی جانے لگے گی۔ اس لیے اس کی مخالفت مناسب نہیں۔ نواب محسن الملک خود بہت روشن خیال تھے اس کے بعد انھوں نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ اس میں اپنا ایک مضمون بھی شائع کرنے کو لکھ کر دیا۔

"خاتون" رسالہ ۱۹۱۴ء تک جاری رہا اور اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے جد و جہد کرتا رہا۔ اسی دوران میں عورتوں مردوں کے حلقے میں خاتون رسالے نے اچھا اثر پیدا کر لیا۔ شیخ صاحب کی خوشی تھی کہ یہ رسالہ ایسے وقت میں بند ہوا کہ جب ملک میں اور بھی اخبارات اور رسالے تعلیم نسواں کی حمایت کے لیے جاری ہو گئے تھے۔ گویا شیخ صاحب کا مقصد پورا ہو گیا تھا

مدرسۂ نسواں کے ابتدائی مراحل :۔ بقول شیخ صاحب ۱۹۰۴ء کا سال مدرسہ نسواں کے قایم کرنے کے لیے ایک اہم سال تھا۔ وہ نہایت خاموشی سے اسی فکر میں لگے رہتے تھے کہ کس طرح سے علی گڑھ میں مدرسہ قایم کرنے کا کوئی ذریعہ نکل آئے۔ اسی سال دسمبر میں لکھنؤ میں کانفرنس ہونے والی تھی، اسی کے ساتھ زنانہ دست کاری و مصنوعات کی نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا لیکن اصلی مقصد یعنی اسکول قایم کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن شیخ صاحب کے استقلال میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا تھا۔ اسی سال قریب آخر نومبر یا دسمبر کے شروع میں ان کے ذہن میں ایک بات آئی کہ کہیں کسی روشن خیال والیٔ ملک سے اسکول شروع کرنے کے لیے مالی امداد کی درخواست کرنی چاہیے۔ ممکن ہے کہ کامیابی ہو جائے۔

اسی زمانے میں نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ بھوپال میں لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کر رہی ہیں۔ یہ معلوم ہوتے ہی شیخ صاحب نے ایک درخواست ان کی خدمت میں بھیجی۔ اس میں لکھا کہ اِس وقت کل روئے زمین کی مسلمان عورتوں میں علیا حضرت ہی ایسی خاتون ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے حکمرانی کا مرتبہ عطا فرمایا ہے۔ اگر اس وقت بھی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ ہوئی تو آئندہ ان غریبوں کی کہیں پرسش نہ ہوگی۔ اگر آپ کی سرپرستی سے کسی صدر مقام پر کوئی اسکول کھل جائے تو کل ہندوستان کے لیے ایک مثال اور نمونے کا کام دے گا۔ ہم علی گڑھ میں ایک اسکول قائم کرنے کی فکر میں ہیں، لیکن تہی دست ہیں، چاروں طرف سے مخالفت کا اندیشہ ہے۔ اگر آپ کی مالی اور اخلاقی سرپرستی شامل حال رہے گی تو ہم اس مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے۔ شیخ صاحب نے اس سلسلے میں نہ کسی سے مشورہ کیا یہاں تک کہ عبداللہ بیگم سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ اچانک ۲۰ر دسمبر کو بھوپال کا ایک لفافہ آیا جس کو دیکھ کر خیال آیا کہ نامنظوری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن پڑھنے پر معلوم ہوا کہ اس کے ایک ایک لفظ سے امید کی شعاعیں نکل کر مسرت پہنچانے لگیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے تحریر فرمایا کہ علی گڑھ میں کوئی اِسکول کھولو تو ریاست سے سَو روپیے ماہوار کی مستقل امداد ملا کرے گی۔ شیخ صاحب نے فوراً یہ خبر جا کے عبداللہ بیگم کو سنائی انھوں نے سن کر سب سے پہلے

...پر کانووکیشن ایڈریس پڑھتے ہوئے ذاکرحسین نے کہا:

اِس سلسلے میں شیخ صاحب کے ایک دوست مولوی نظام الدین حسن ...م اس وقت علیا حضرت کے وزرائے خاص میں تھے اور علیا حضرت نے ...سے پہلے انھیں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے پرزور حمایت کی کہ امداد ملنی چاہیے۔

نواب محسن الملک کی مخالفت

شیخ صاحب نے علی گڑھ میں اس عطیہ کا صرف صاحبزادہ آفتاب ...خاں سے ذکر کیا اور کسی سے اس لیے نہیں کہا کہ لوگ ویسے ہی زندہ نہیں ...نے دیتے اگر اس اسکول کا معلوم ہو جاتا تو نہ جانے کیا حشر کرتے۔ خیال ...کہ نواب محسن الملک ضرور خوش ہوں گے۔ عطیہ نامہ اپنے ساتھ لے کر گئے ...ب صاحب سے راجہ تصدق رسول خاں کی کوٹھی پر ملے۔ اس وقت نواب ...حب کسی بات پر ناخوش بیٹھے تھے اور بہت سے احباب ان کے پاس جمع تھے ...ب ان سے اسکول قائم کرنے کا ذکر آیا اور عطیہ نامے کے بارے میں بتایا ...بقول شیخ صاحب انھوں نے غیض و غضب کا جس طور پر اظہار کیا وہ یہ تھا کہ ...کول کھلنے کی خبر سنتے ہی اپنی ترکی ٹوپی سر سے اتار کر چبوترے پر دے ...ری اور کہا کہ اب میرا علی گڑھ میں رہنا دشوار ہے۔ لوگ یوں ہی کالج ...پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اب نہ معلوم کیا کیا کہیں گے۔ راجہ صاحب نے ...شیخ صاحب کو سمجھایا کہ آپ نوجوانوں کو مناسب نہیں کہ بڑوں کی مرضی کے ...اف کوئی کام کریں۔ آپ کو پہلے نواب صاحب سے مشورہ لینا چاہیے تھا۔ شیخ ...احب کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر چبوترے پر سے ٹوپی اُٹھا کر میز ...لا کر رکھ دی۔ اور نواب محسن الملک صاحب اُٹھ کر گاڑی سے جانے لگے۔ شیخ ...احب بھی ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے اور اُن سے کہا کہ پُرانے خیال کے ...ل لڑکیوں کا اسکول کھولنے کے مخالف ہیں، لیکن جدید نسل کے خیالات کا آپ ...کوئی لحاظ نہیں کیا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ آپ دل سے تعلیم نسواں کے حامی ...ں۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس حمایت کا ظاہری طور پر بھی آپ کوئی ثبوت ...ں۔ یہ بات سن کر وہ مسکرانے لگے اور کہا جو کچھ میں نے کیا وہ بھی ٹھیک ...ا اور جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ۔

شیخ صاحب نے نواب محسن الملک سے کہا کہ اسی جلسے میں ریزولوشن ...ں ہو جانا چاہیے۔ لیکن نواب صاحب کی مرضی نہیں تھی۔ انھوں نے کہا کہ لتنے ...ے جلسے میں یہ ہرگز پیش نہیں ہونا چاہیے۔ اس صیغے کا ایک الگ جلسہ کر کے ...ریزولوشن پاس کرا لو۔ اس سے ان کے دل کو تکلیف تو ہوئی لیکن مجبوری ...ی۔ شیخ صاحب نے بھاگ دوڑ کر کے دوستوں کی کافی تعداد اپنے ہم خیال ...لی۔ دوسرے دن سب کو جمع کر کے قیصر باغ کی بارہ دری کے پاس ایک چھوٹا ...ا مکان ہے جس میں نمائش کی گئی تھی، جسٹس شاہ دین صاحب کی صدارت ...ں ایک جلسہ کیا اور علی گڑھ میں اسکول کھولنے کا ایک ریزولوشن پاس کرایا۔ ...ر اس میں علیا حضرت کے عطیے کے تشکریے کا ووٹ بھی پاس کرایا۔ لکھنؤ سے

واپسی کے بعد یہ فکر درپیش ہوئی کہ جلد ہی علی گڑھ میں اسکول قائم کر دیا جائے۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ کوئی استانی نہیں ملتی تھی۔ جہاں کوئی پتہ دیتا اور وہاں خط لکھا جاتا تو کوئی بھی غیر شہر میں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔

نمایش زنانہ مصنوعات

دسمبر ۱۹۰۵ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ علی گڑھ میں ہونے والا تھا۔ شیخ صاحب نے زنانہ مصنوعات کی نمایش کا ایک بڑے پیمانے پر اہتمام کیا اور اس کے ساتھ ایک زنانہ کانفرنس کے جلسے کی تجویز بھی خاتون کے ذریعے سے ملک کی خواتین کے سامنے پیش کی۔ بہت سی تعلیم یافتہ خواتین نے بہت زور شور سے اس کا خیر مقدم کیا۔ بمبئی میں بھی اس میں دو معزز خاندان کی خواتین سے آنے کی درخواست کی۔ اُن میں سے ایک توفیضی خاندان تھا دوسرا طیب جی خاندان تھا۔ عطیہ بی بی اور زہرہ بی بی نے آنے کی درخواست منظور کر لی اور یہ بھی وعدہ کیا کہ طیب جی خاندان کی خواتین کو ساتھ لانے کی کوشش کریں گی۔ رسالہ خاتون نے نمائش و جلسے کی کامیابی میں بہت مدد دی۔ نمایش کے لیے سیکڑوں قسم کے اعلا سے اعلا نمونے کشیدہ کاری و سوزن کاری کے آنے شروع ہوئے۔ لاہور، دلی، آگرہ، میرٹھ اور مرادآباد سے خواتین نے شریک جلسہ ہونے کا اظہار کیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی خاص شاہانہ دلچسپی کا اس نمایش کی کامیابی کے لیے جو عملی ثبوت دیا وہ قابلِ ستائش ہے۔ انھوں نے نمائش کے لیے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزیں یعنی آئل پینٹنگ اور کچھ کشیدہ کاری بھی روانہ فرمائیں۔ علیا حضرت کی اس دلچسپی سے شیخ صاحب کو بہت تقویت ہوئی اور عام طور پر بھی اِس نمایش میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔

بعض لوگ اِس نمایش کے بھی مخالف تھے اور کہتے تھے کہ شریف مستورات کے ہاتھ کی بنائی چیزیں عوام کے سامنے رکھی جائیں گی اور ان کی نمایش کی جائے گی؟ ایک صاحب نے ایک پرائیویٹ خط میں لکھا کہ اب علی گڑھ میں نئی سے نئی بدعت ہونے لگی ہے۔ شریف بہو بیٹیوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمایش کی جاتی ہے، کل خود اُن کی نمایش کی جائے گی۔ شیخ صاحب نے اس کا جواب یوں دیا کہ ایک کاغذ کے پرزے پر 'جہالت' 'جہالت' 'جہالت' لکھ کر لفافے میں بند کر کے ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ بس یہی اس بات کا جواب تھا۔

تصویر کا دوسرا رُخ

اس سال اکتوبر کے رسالے 'خاتون' میں مسز علی اکبر کا فوٹو شایع ہوا۔ یہ عطیہ فیضی کے برادرِ حقیقی کی بیگم تھیں۔ انھوں نے کچھ عرصہ قبل پردہ چھوڑ دیا تھا۔ فوٹو کیا شایع ہوا، بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دے دیا۔ چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی۔ اخبارات نے اس موقع پر نہایت گندی اور عامیانہ باتیں لکھیں اور بجائے مسز اکبر کو بُرا کہنے

کے شیخ صاحب کو نشانہ بنایا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب ان اعتراضات پر توجہ نہ دی گئی تو خود ہی لکھتے لکھتے تھک کر بیٹھ گئے۔

دسمبر کا مہینہ شروع ہوا تو نمائش کے لیے کالج کے ارباب حل و عقد نے شیخ صاحب کو نظام میوزیم عطا کیا اور لیڈیز کانفرنس کے لیے سوسائٹی کا مکان دیا۔ نوجوان طالب علم دن رات محنت کرتے ان میں مولوی احتشام الدین صاحب اور عبدالرحمٰن صاحب صدیقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اہتمام ہو ہی رہا تھا کہ سکریٹری نواب محسن الملک کو کسی نے کیا پٹی پڑھائی کہ انھوں نے شیخ صاحب کو لکھا کہ لوگ مخالفت کرتے ہیں کہتے ہیں کہ کالج کے کسی مکان میں عورتوں کا کوئی اجتماع نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے دوسرا مکان تلاش کیجیے۔ سوسائٹی کا مکان نہیں دیا جائے گا۔ شیخ صاحب کو سخت پریشانی کا سامنا ہوا۔ اس بات سے عبداللہ بیگم بھی بہت مغموم تھیں کہ مہمان خواتین آجائیں گی اور کیا انتظام ہوگا۔ شیخ صاحب نے انھیں اطمینان دلایا اور مکان کی تلاش میں نکلے۔ ایک پارسی دوست کے یہاں گئے جن کے پاس اس وقت شاہ پورجی پارسی کی وہ کوٹھی تھی جس میں اب ڈاکٹر موہن لال نے ہسپتال کھول رکھا ہے (یہ کوٹھی بازار رسل گنج میں ہے ڈاکٹر موہن لال نے پہلے اسی میں اپنا ہسپتال کھولا تھا) اور نواب چھتاری صاحب کی ملکیت ہے۔ شاہ پورجی کا دیوالہ نکل گیا تھا۔ ان کے کوئی عزیز پارسی اس پر قابض تھے۔ ان کو ضرریات بتاکر درخواست کی۔ وہ راضی ہو گئے اور لیڈیز کانفرنس کے لیے اس کی چابیاں چند روز کے لیے شیخ صاحب کے حوالے کر دیں۔ عبداللہ بیگم بہت خوش ہوئیں۔ ملازموں کو لے جاکر صفائی وغیرہ کرا دی گئی۔

۲۰ر دسمبر کو زھرہ فیضی کی صدارت میں لیڈیز کا جلسہ ہوا اور علی گڑھ میں اسکول جاری کرنے کی تجویز کا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا گیا اور بہت سے ریزولوشن پاس ہوئے۔

اس سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت خلیفہ محمد حسن صاحب مرحوم وزیر پٹیالہ نے فرمائی اور خود نواب محسن الملک بھی نمایش میں تشریف لائے اور اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔

۲۹ر دسمبر کو شعبہ تعلیم نسواں کا ایک بڑا جلسہ اسٹریچی ہال میں ہوا اور خود خلیفہ محمد حسن صدر کانفرنس نے اس کی صدارت فرمائی۔ شیخ صاحب نے نمایش کی کامیابی صیغہ تعلیم نسواں کے کام اور ترقی کی رپورٹ جلسے کے سامنے پڑھ کر سنائی۔ اولڈ بوائز میں سے ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ سرسید میموریل فنڈ و درنے روپی فنڈ کا کام جو سب سے ضروری ہے، اس کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے اور شیخ صاحب اِدھر اُدھر کے کاموں میں اپنا وقت ضایع کر رہے ہیں۔ انھیں یہ کام کسی دوسرے کے سپرد کر دینا چاہیے۔ اس پر نواب محسن الملک کھڑے ہوئے اور کہا کہ "میں سرسید میموریل فنڈ کا پریزیڈنٹ ہوں اور مجھ کو معلوم ہے کہ اس کام میں کوئی ڈھیل یا غفلت نہیں ہوتی ہے۔ کام اسی مستعدی سے ہو رہا ہے جیسے پہلے ہو رہا تھا، اس لیے یہ الزام ٹھیک نہیں ہے"۔ اس کے بعد خلیفہ محمد حسن صاحب نے ایک پُر زور تقریر فرمائی اور حاضرین سے خواہش ظاہر کی کہ وہ شیخ صاحب کا شکریہ ادا کریں وہ ایسے کام میں کامیابی حاصل کر رہے ہیں جس کی طرف سے قوم اب تک غافل رہی ہے اور جس کی ترقی سے آئندہ بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

ایسی باتیں بعض اولڈ بوائز کو ناگوار گزریں۔ اسی دوران ایک دن شیخ صاحب اسٹریچی ہال سے باہر نکلے تو ایک اولڈ بوائے مولانا شوکت علی نے پہلے تو انھیں گالیاں دیں۔ پھر ان پر حملہ کر دیا۔ اس مجمعے میں دو ہزار کے قریب آدمی تھے۔ بلبلی پڑ گئی۔ بیچ بچاؤ کرا دیا گیا۔ مصالحت کے باوجود آخر وقت تک مخالفت کرتے رہے۔

چندے:- ۱۹۰۶ء کا سال بہت اہم سال تھا۔ کیوں کہ اسی سال کے واقعات علی گڑھ شہر میں مدرسہ قائم کرنے کے باعث ہوئے۔ علی گڑھ کے بعض طلبا عبدالرحمٰن صدیقی، خان بہادر سید بشارت حسین، ظہور احمد، آنریبل مسٹر محمود صاحب نے خاص طور پر کاٹھیاواڑ، بمبئی، حیدرآباد وغیرہ علاقوں میں سالانہ دورے کیے اور چندے جمع کیے۔ مسز نیاز احمد جو میرٹھ کے ایک خاندان کی لڑکی تھیں، انھوں نے اپنی کوشش سے معقول رقم جمع کرکے بھیجی اور عطیہ فیضی اور زہرہ فیضی صاحبہ نے بھی معقول رقمیں بمبئی میں جمع کیں۔

اس وقت تک سوائے ان چھوٹے چندوں کے اور بھوپال کے عطیے کوئی رقم اسکول کی امداد کے لیے نہیں ملی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں شیخ صاحب کو خیال آیا کہ صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کے سامنے کوئی درخواست مالی امداد کے لیے پیش کرنی چاہیے۔ لہٰذا گورنر کے پاس درخواست بھیجی گئی کہ مسلمانوں کی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں ہوئی ہے۔ اب ہم علی گڑھ میں ایک اسکول قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور گورنمنٹ سے مالی امداد چاہتے ہیں۔ درخواست بھی قریب قریب اسی قسم کی تھی جیسی بھوپال بھیجی گئی تھی۔ شروع جولائی میں گورنر سر جیمس لاٹوش کا خط آیا۔ اس خط سے بھی شیخ صاحب کو خیال گزرا کہ جواب انکار میں نہ ہو۔ لیکن خلاف توقع بہت امید افزا جواب تھا کہ کون کون لوگ ڈیپوٹیشن میں آنا چاہتے ہیں۔ ہم خوشی سے اجازت دیتے ہیں۔ اور ۲ر اگست ۱۹۰۶ء تاریخ مقرر کر دی۔ چنانچہ مندرجہ ذیل لوگوں کی خدمت میں اس خط کی نقل بھیجی گئی:-

نواب محسن الملک سکریٹری کالج، سر نواب محمد فیاض علی خاں، مہاراجہ صاحب محمود آباد، سر راجہ تصدق رسول خاں، نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، راجہ نوشاد علی خاں، مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ، خواجہ غلام الثقلین صاحب۔ ان سب کے جوابی خطوط آ گئے کہ جانے کے لیے تیار ہیں۔ عرضداشت تیار ہو گئی۔ اور ان سب صاحبان کے نام گورنر بہادر کو بھیج دیے گئے۔ جب وقت قریب آگیا تو یکایک مذکورہ بالا حضرات کے تار اور خطوط آنے شروع ہو گئے کہ اس میں ہم شریک

وہ درخت جس کے نیچے شیخ صاحب نے کالج کا خواب دیکھا

گھوڑا گاڑی۔ ایسی گاڑیوں میں لڑکیاں علی گڑھ کے سارے
اطراف سے پڑھنے آتی تھی۔ گھوڑا گاڑیوں سے پہلے ڈولیوں اور
بیل گاڑیوں میں اسکول لائی جاتی تھیں۔

The school was started at first in 1906 in this building

نہیں ہو سکتے۔ سب نے الگ الگ عذر پیش کر دیے۔ اب صرف تین صاحب باقی رہ گئے

۱۔ راجہ نوشاد علی خاں ۲۔ مولوی محمد نسیم صاحب ۳۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب

جو اپنے وعدے پر قایم رہے۔ حالاں کہ ان حالات سے شیخ صاحب کے ارادے میں فرق نہیں آیا۔ لیکن یہ خیال ضرور آیا کہ گورنر بہادر کیا سوچیں گے کہ ان بڑے آدمیوں کے نام ڈیپوٹیشن کی فہرست میں کیوں کر دیے تھے جبکہ ان کو آنا نہیں تھا۔ عبداللہ بیگم نمازیں پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگتی تھیں کہ بدنامی کا منھ دیکھنا نہ پڑے۔

بہرحال ۲۹ر جولائی کو شیخ صاحب لکھنؤ پہنچے۔ راجہ نوشاد علی خاں کے یہاں قیام کیا۔ ۲ر اگست کو ٹھیک وقت پر گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ جب گورنر صاحب کے پاس حاضر ہوئے تو پرائیویٹ سکریٹری نے تعارف کرایا۔ انھوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ جن صاحبان کے بارے میں لکھا تھا وہ کیوں نہیں آئے — شیخ صاحب نے کہا کہ اس کی وجہ صاف ہے کہ اس وقت تک گورنمنٹ کی توجہ مسلمان لڑکیوں کی طرف نہیں ہے۔ اس لیے مسلمان زمیندار اور دولت مند آدمی بھی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ جب تک گورنمنٹ نے اس کی دستگیری نہیں کی تھی، مسلمانوں نے بھی اس کا کچھ خیال نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی عرضداشت گورنر کے سامنے رکھی۔ علی گڑھ میں لڑکیوں کے اسکول قایم کرنے کی تجویز کے حالات بیان کیے اور بیگم صاحبہ بھوپال کے عطیے کا بھی ذکر کیا۔ گورنر یہ حالات سن کر خوش ہوئے اور کہا کہ اگر مسلمان خود نہ چاہتے ہوں کہ اُن کی لڑکیوں کو تعلیم دی جائے تو گورنمنٹ تو زبردستی نہیں کر سکتی۔ اس میں لوگوں کے دلوں میں بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن لوگ چندہ دے رہے ہیں اور بیگم صاحبہ بھوپال بھی راضی ہیں تو پھر گورنمنٹ بھی مدد کے لیے تیار ہو جائے گی۔ یہ بھی سوال کیا گیا کہ ابھی اسکول کھولا جائے یا نہیں۔ شیخ صاحب نے کہا کہ گورنمنٹ کی امداد ملتے ہی اسکول کھل جائے گا۔ گورنر نے کہا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ پہلے اِسکول کھلنا چاہیے۔ پھر امداد کی درخواست کرنی چاہیے اور خود ہی کہا کہ آپ جاکر پہلے اسکول کھولیے۔ پھر امداد کی درخواست کی رپورٹ دیجیے۔ ہم کسی انسپکٹر کو معاینے کے لیے بھیجیں گے۔ اگر اس کی رپورٹ آپ کے موافق ہوگی تو ہم ضرور گرانٹ دیں گے۔

اس گفتگو کے بعد جب شیخ صاحب علی گڑھ واپس آئے تو انھوں نے استانی کی تلاش شروع کی۔ عبداللہ بیگم نے سب حالات سن کر کہا کہ استانی نہ بھی ملے تو ہم خود پڑھانا شروع کر دیں گے۔ میں ہوں اور دو بہنیں ہیں۔ ہم مل کر کم سے کم پرائمری تک تو پڑھا ہی دیں گے۔ شیخ صاحب کی رائے تھی کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ گھر کے آدمی پڑھا دیں گے تو پھر روپے کی کیا ضرورت۔ ایک استانی ضرور ہونی چاہیے۔ اخبار میں اشتہار دیا گیا، دوستوں کو خط لکھے گئے۔ آخر کو دہلی میں ایک استانی کا پتہ چلا۔ شیخ صاحب اور بیگم عبداللہ دونوں

دہلی گئے۔ اس نے جو شرطیں لگائیں سب منظور کیں۔ لہٰذا استانی، اس شوہر، ماں اور بیٹی کو علی گڑھ لے آئے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہ اسکول کھلنے سے قبل کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

مدرسے کا قایم ہونا۔

دہلی سے استانی کے آنے کے بعد علی گڑھ شہر کے محلہ با قلعہ میں ایک چھوٹا سا مکان لیا گیا۔ گو وہ مکان پہلے ہی سے چاروں سے بند تھا۔ مزید احتیاط کے لیے اور زیادہ پردے کا انتظام کیا گیا ڈولیاں اور چھ کہار نوکر رکھے گئے۔ آخر سال ۱۹۰۶ء میں بسم اللہ اسکول کھول دیا گیا۔ شیخ صاحب کا مکان محلہ رسل گنج میں تھا۔ عبداللہ اور اُن کی دو بہنیں، جو ساتھ رہتی تھیں، باری باری اسکول جاتی تھ اور خود بچیوں کو قرآن شریف اور اردو پڑھاتی تھیں اور لکھنا سکھاتی عبداللہ بیگم کا خط نہایت عمدہ تھا، اسی وجہ سے اس زمانے کی لڑ کا، جو اُن سے پڑھتی تھیں، اردو خط بہت اچھا ہو گیا۔ شروع شرو میں بڑی دشواریاں تھیں۔ کچھ لڑکیوں کے ماں باپ کہتے کہ صرف قرآ شریف پڑھانا اور کچھ نہ پڑھانا۔ قریب ہی جگہوں میں گھر ہوتا۔ لیکن اس آنے میں پردے لگتے۔ ویسے چاہے دن بھر کھیلتی پھرتی تھیں۔ عبداللہ نے رفتہ رفتہ لڑکیوں کی ماؤں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ ان کو ڈ میں اپنے گھر بلاتیں، انھیں ترغیب دیتیں۔ گھر آنے پر اکثر شیخ صاحب پژمردگی کا سبب پوچھتے تو وہ کہتیں کہ جب ذمہ داری لی ہے تو نبھ ہے۔ ان دنوں برابر کوئی نہ کوئی شکایت شیخ صاحب کے پاس آتی۔ ک کسی شخص نے کہاروں کو مارا۔ کسی نے اسکول کی بُرائی کی لڑکی کو پڑ سے بٹھا لیا۔ اس کے علاوہ محلّے کے نالائق لڑکوں کو شہ دے کر ڈولیوں سے راستے میں پردہ اچھالنے کے لیے تیار کیا۔ غرض روزانہ یہ جھگڑے ا کو چکانا پڑتے تھے۔

ایک دن شیخ صاحب چھپ کر کھڑے ہو گئے، جب لڑکوں نے ی حرکت کی تو ہاتھوں پر قمچیاں برسائیں۔ پھر کبھی لڑکوں نے ایسی حرکت نہ کی۔ ان لوگوں کے نام بھی معلوم ہو گئے جن لوگوں نے ان باتوں پر اکس تھا۔ ان سے بھی کہلوا دیا گیا کہ اب ایسی حرکت کروائی تو عدالت کے سا کھڑا ہونا پڑے گا۔

ایک قصہ قابل ذکر ہے ایک مسلمان تحصیلدار پرانے کٹر خیال کے آدمی تھے۔ لوگوں سے منع کرتے تھے کہ لڑکیوں کو پڑھنے نہ بھیجو۔ انھوں نے ایک عجیب قصہ گھڑا کہ میں نے آنکھ سے دیکھا۔ ایک لڑکی یکّ میں آئی اور میرے مکان کے سامنے یکّہ کھڑا ہو گیا اور یکّے والا پردے کے اندر گھس گیا اور کچھ دیر بعد وہاں سے نکلا اور لڑکی کو مدرسے پہنچا آیا۔ جب شیخ صاحب کو یہ معلوم ہوا تو جن دو لوگوں سے تحصیلدار صاح

ا سعا' انھیں ساتھ لے کر ُن صاحب کے پاس گئے' وہ گھبرا گئے۔ قسمیں کھائیں ماحب نے کہا کہ میں تو کلکٹر صاحب سے شکایت کرتا ہوں۔ یہ سن کر وہ ے اور کہا میں تو تعلیم کا بہت حامی ہوں۔ ان حالات سے اندازہ لگایا ا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے خیالات کیسے تھے۔ انھیں خیالات کی وجہ م نسواں کے راستے میں کتنی دشواریاں تھیں۔

ترقی کا آغاز:-

رفتہ رفتہ دن رات کی محنت کا نتیجہ نکلنے لگا۔ تین مہینے کے اندر س لڑکیاں اسکول میں آنے لگیں۔ تو گورنر صاحب کو مطلع کیا گیا لہذا ے انسپکٹریس کو معائنے کے لیے بھیجا۔ انسپکٹریس نے عبداللہ بیگم کی ا اپنی آنکھ سے دیکھیں اور ان کی دونوں بہنوں کو بھی کام کرتے ر کہا کہ یہ لوگ تو وہ کام کر رہی ہیں جو نسنری لیڈیاں کرتی ہیں — نے رپورٹ میں لکھا کہ اس مدرسے کی جڑ ابھی سے پختہ دکھائی دیتی بانیٔ مدرسہ تو دن رات اسی میں لگے رہتے ہیں اور ان کی اہلیہ اور بہنیں اسکول کے کامیاب بنانے میں حصّہ لے رہی ہیں۔ اور آخر لہ جب کل خاندان کی توجہ اس کی کامیابی پر لگی ہوئی ہے، خلوص و ے کام ہو رہا ہے تو پھر اس کی کامیابی میں شبہ کی گنجائش نہیں"۔

مس گانجا کی رپورٹ پہنچنے کے ایک ماہ کے اندر ہی ڈھائی سو ہانہ اور سترہ ہزار روپے نقد عمارت کے لیے منظور ہی آگئی۔ نواب لک حیات تھے۔ انھوں نے شیخ صاحب کو گلے لگا لیا۔ صاحبزادہ حمد خاں کو بھی بہت خوشی ہوئی۔ گورنمنٹ کی اس امداد نے شیخ صاحب للہ بیگم کی ہمت میں جان ڈال دی اور انھوں نے کہا کہ اب یہ ایک ل بن سکتا ہے۔ زندگی رہی تو بورڈنگ ہاؤس بھی بن جائے گا رفتہ یہ چھوٹا سا اسکول کالج تک پہنچے گا۔

گورنمنٹ گرانٹ کی خبر پاتے ہی لوگوں نے مخالفت میں اخبار ا مین لکھنے شروع کیے کہ اتنا روپیہ آ رہا ہے خزانچی کون ہے شیخ صاحب ہی سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے خزانے میں امانتاً روپیہ جمع کرانا ر دیا تھا۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا تو شاید اعتراض نہ کرتے ، اعلان کر دیا گیا۔ پھر مخالفت نہیں ہوئی۔ گرلس کالج کے لیے یہ طریقہ ش ثابت ہوا۔

ے عمارت کا منصوبہ اور مارِیس روڈ:- ۱۹۰۸ء میں ں تعداد بہت بڑھ گئی تو شہر سے باہر اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کا ارادہ کر لیا۔ ایک زمین شیخ صاحب نے اپنی کوٹھی کے لیے خریدی بنے کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ ایک روز شام کو شیخ صاحب ہوا یے نکلے۔ ایک باغ میں پہنچے جو نہایت گنجان تھا۔ دور دور تک کوئی در مکان نہ تھا۔ وہاں سے پون میل کے فاصلے پر دودھ پور سا گاؤں

تھا اور قریب سے قریب کنکر والی کوٹھی تھی۔ وہ باغ میں درخت کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ نہایت گنجان تھا۔ سورج کی ایک شعاع بھی چھن کر نہیں آ سکتی تھی۔ دل میں خیال کیا اگر یہ زمین مل جائے تو مکان تعمیر کروں اور اس درخت کے نیچے چھوٹے چھوٹے بچے کھیلا کریں اور خوش ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے شہر واپس چلے گئے۔ دوسرے روز لالہ لانتا پرشاد کالیتھ جو شیخ صاحب کے موکل تھے، آئے۔ باتوں ہی باتوں میں یہ ذکر آ گیا۔ آپ زمیں دار ہیں مکان بنانے کو زمین دلوا دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میرا ایک باغ ہے جس کو نانک رائے کا باغ کہتے ہیں۔ وہ شہر سے ذرا فاصلے پر ہے آپ لینا چاہیں تو حاضر ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی باغ ہے جہاں ایک مرتبہ کھڑے ہو کر شیخ صاحب نے سوچا تھا۔ لہذا یہ باغ ان سے خرید لیا گیا۔ پختہ باغ مع لکڑی کے انیس سو روپیہ میں بیع کر دیا گیا۔ شیخ صاحب نے اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کا خیال آتے ہی یہ زمین بھی اسکول کے نام کر دی اور اس کے علاوہ چھ بیعناموں کے ذریعے سے اور زمین خریدی۔ اس کی لکڑی ہی پانچ ہزار ایک سو روپے میں فروخت ہوئی۔ جس سے گرلز کالج کے لیے اور زمین خریدی گئی۔

جب لوگوں نے ترقی کی یہ رفتار دیکھی تو پھر مخالفت میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ جگہ لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج وہاں سے قریب ہے۔ گرلز کالج ایسے مقام پر کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ لوگوں نے جا کر وقار الملک کے کان بھرے۔ شیخ صاحب سے وقار الملک نے کہا کہ یہ تجویز مناسب نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ ایک دن سب کو آپ اپنے یہاں بلا لیں تو بات ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے پہلے پرنسپل آرچ بولڈ بولے کہ مدرسہ اس جگہ بنا تو میں استعفا دے دوں گا۔ مسلمان لڑکیوں کا اسکول لڑکوں کے مدرسے کے قریب قائم کرنا دونوں کی تباہی کا باعث ہے۔

شیخ صاحب کو مسٹر آرچ بولڈ کا بیان بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے کہا کہ آپ بلا وجہ ہمارے قومی معاملے میں دخل دے رہے ہیں۔ آپ سے اس معاملے میں کوئی تعلق نہیں۔ اگر استعفا بھی دے دیں گے تو ہمارے کالج پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اس جگہ کا فاصلہ لڑکوں کے کالج سے سوا سو میل ہے۔ میں نے یہ جگہ تجویز کر لی ہے، یہیں بنے گا۔ کسی صاحب نے کُل علی گڑھ کا اجارہ نہیں لے رکھا ہے کہ صرف لڑکوں کا ہی مدرسہ رہے گا۔ نواب صاحب نے سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا ہمارے پاس کوئی ایسی قوت نہیں ہے کہ مدرسے کو بنانے سے روکیں۔

۱۹۱۰ء سے قبل شیخ صاحب علی گڑھ میونسپلٹی کے ممبر تھے۔ انھوں نے بہت سے لوگوں سے مشورہ کیا کہ ریلوے اسٹیشن سے دودھ پور تک ایک پکی سڑک بن جائے۔ پھر بہت سے لوگ شہر سے نکل کر وہاں مکان

بنانے کی کوشش کریں گے۔ یہ معاملہ چیرمین نے کلکٹر کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس سے ایک یا دو سال بعد مسٹر ڈبلیو میرس کلکٹر ہوکر علی گڑھ آئے۔ اور علی گڑھ میونسپلٹی کے چیرمین بھی ہوئے۔ شیخ صاحب نے اس مسئلے کو پھر اٹھایا۔ انھوں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اب دودھپور گاؤں کے رقبے میں سیکڑوں کوٹھیاں بن گئیں اور اس وقت کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا جو ۱۹۰۵ء میں تھا۔

جب شیخ صاحب نے نانک رائے کا باغ خریدا تھا اس وقت اس علاقے کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں پر رات کو چور ڈاکو جمع ہوتے ہیں اور یہاں سے جاکر شہر میں اور آس پاس کے گاؤں میں وارداتیں کرتے ہیں۔ لوگ چراغ جلے ادھر کا رخ بھی نہیں کرتے تھے۔ آج خدا کے فضل سے وہی جنگل سب سے خوش حال بستی کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس سڑک کا نام مسٹر میرس کی وجہ سے میرس روڈ رکھا گیا۔ اس وقت گرلز کالج کی کل زمین چالیس ایکڑ ہے۔

گرلز کالج کے ہوسٹل کی بنیاد ۶ر نومبر ۱۹۱۱ء کو رکھی گئی۔ کالج کے ڈائننگ ہال میں سنگ مرمر کی سل پر اس کی تاریخ کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ جب نقشہ وقار الملک اور دیگر احباب کے سامنے پیش ہوا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ دیواروں پر سے لوگ پتھر لکھ لکھ کر پھینکیں گے۔ کسی نے کہا کہ کمرے کے روشن دان باہر نہیں ہونا چاہئیں۔

۱۹۱۳ء میں یہ عمارت مکمل ہوگئی تو یہ رائے قرار پائی کہ بیگم بھوپال سے اس کا افتتاح کرایا جائے۔ ان سے درخواست کی گئی۔ انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ ۲۵ر فروری ۱۹۱۴ء کو نواب سلطان جہاں بیگم تشریف لائیں۔ سر ذاکر علی خاں کے یہاں قیام کیا۔ عبداللہ بیگم نے جس جانفشانی سے سب کام کیے تھے۔ اس کا اعتراف خود نواب سلطان جہاں بیگم نے کیا۔ ۱۹۲۲ء کو میرس روڈ پر شیخ صاحب نے اپنا مکان عبداللہ لاج تعمیر کرا لیا۔ اور شہر کے مکان سے اس میں چلے آئے۔ مکان اسکول سے قریب دو سو قدم پر تھا۔ اور اس مکان میں شفٹ ہونے کا مقصد یہی تھا کہ کالج قریب رہے۔

وحید جہاں عبداللہ بیگم اعلی بی نے ۲ر رجب المرجب ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۸ر اگست ۱۹۳۹ء بروز جمعہ ۵۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ سر سید کی طرح وہ بھی دہلی کی خاک سے اٹھیں اور انہی کی طرح مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے علی گڑھ کی ہوکر رہ گئیں۔ اور یہیں سپرد خاک ہوئیں۔ انھوں نے قربانیاں دیں اور اپنے شوہر کے خواب کو پورا کر دکھایا۔ ؎

زبان بے زبانی سے کریں گے یاد بام و در
رہے گا گرلس کالج حشر تک افسانہ خواں باقی

★ ★ ★

میرس روڈ پر شیخ عبداللہ کی کوٹھی جو انھوں نے کالج کو دیدی

پروفیسر مہدی حسن ڈی۔ ایس سی۔
جواہر لال نہرو میڈیکل کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شراب پینا کیوں مضر ہے

میڈیکل سائنس کی روشنی میں چند دلائل

کھانے پینے اور پارٹی دینے کے جدید طریقوں نے رفتہ رفتہ معاشرہ میں شراب کے استعمال میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اس طریقے نے تیزی کے ساتھ شراب پینے والوں کی تعداد میں اضافہ کرکے مسئلے کو اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔

شراب استعمال کرنے والوں میں اکثر اس بات سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں کہ وہ شراب کیوں پیتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اعصاب کو درست رکھنے کی خاطر شراب استعمال کرتے ہیں جب کہ دوسرے لوگوں کے نزدیک شراب جسمانی سستی دور کرنے میں مدد دیتی ہے۔ بعض لوگ اپنی شراب نوشی کی دوسری وجوہات بیان کرتے ہیں۔ فی الواقعہ شراب نوشی کے سلسلے میں کوئی ٹھوس دلیل نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ ایک قسم کی لت اور عادت ہے اور جب یہ عادت پڑ جاتی ہے تو پھر بادہ کش اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر طرح طرح کے بہانے تراشنے لگتے ہیں۔

وہسکی [WHISKEY] جو شراب نوشوں کی اکثریت کی محبوب شراب ہے، بہت تلخ ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود شراب نوش اسے بڑی رغبت سے پیتے ہیں جب کہ وہی لوگ کونین کی گولی کھاتے وقت منہ کو ہزار زاویوں سے بناتے اور بسورتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شراب نوشی محض ایک عادت ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ماہرین کی رائے میں تقریباً پچاس فیصد شرابی، شراب نوشی کی عادت سے پیشتر ذہنی انتشار کا شکار رہتے ہیں۔ علم نفسیات کی رُو سے بھی شراب نوشی اِس بات کی علامت ہے کہ شراب نوشوں کے اندر بذاتِ خود کوئی نہ کوئی کمی، خامی یا کمزوری ضرور ہوتی ہے، جس کی بنا پر وہ اُس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ الغرض یہ کہنا کہ شراب اعضا اور اعصاب کے لیے مقوی ہوتی ہے، بالکل غلط ہے۔

شراب خواہ کتنی ہی کم مقدار میں کیوں نہ پی جائے، مرکزی نظامِ عصبی کو ضرور متاثر کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے شراب پینے والوں میں سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ درحقیقت شراب کے ابتدائی اثرات محرک دماغ ہوتے ہیں۔ شاید ایسا اِس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ دماغ کے کچھ حصوں کے اثرات کو زائل کر دیتی ہے، جو نظامِ جسمانی کو درست رکھتے ہیں۔ بظاہر ابتدائی حالت میں نظامِ عصبی و نظامِ جسمانی کمزور پڑ جاتا ہے جیسا کہ ان تمام باتوں سے واضح ہے۔ مثلاً بے ڈھنگی باتیں کرنا، معمولی سی بات پر خوب ہنسنا، مبالغہ آمیز باتیں کرنا، دلی جذبات و خیالات کو بے تکلفی سے بیان کر دینا، جسم کا توازن ٹھیک نہ ہونا، وغیرہ وغیرہ

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ شراب پینے والے حضرات اکثر جسمانی اور بالخصوص دماغی کام بخوبی انجام نہیں دے پاتے۔ ان کے مزاج میں چڑچڑا پن آ جاتا ہے۔ تدبّر اور تفکر کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔

ڈاج اور بنیڈکٹ [DODGE & BENIDICT] نے ۱۹۶۵ء میں مختلف پہلوؤں سے شراب نوشی کے نتیجے میں جسمِ انسانی پر مرتب ہونے والے اثرات کا مطالعہ کیا۔ لیکن کوئی ایسا ثبوت فراہم نہ ہو سکا جو شراب کے مقویِ دماغ ہونے کی ضمانت دیتا۔ شراب کا مقوی دماغ نہ ہونا اِس بات سے بھی ثابت ہے کہ اگر کسی شخص کو شراب پلانے کے بعد تاریک اور پُرسکون کمرے میں چھوڑ دیا جائے تو اس پر سستی اور نیند کا غلبہ فوراً ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس سے بھی دو قدم آگے نکل جاتے ہیں اور ان پر شراب پیتے ہی، خواہ کتنا ہی شور و غل کیوں نہ ہو، نیند کا غلبہ طاری ہو جاتا ہے۔

زیتیر ہینرکسن [Zeiner Henriksen] کے مطابق شراب کے استعمال سے مختلف رنگوں کو شناخت کرنے کی قوت و صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ خواہ شراب اس قدر کم مقدار میں کیوں نہ استعمال کی جائے کہ جسم کے لیے واضح طور پر نقصان دہ اور مضرت رساں ثابت نہ ہو شراب نوشی باریک اور دماغی کام کرنے والوں کے لیے بہت مضر ہے اس سے ان کے کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ٹائپ کرنے والوں کی رفتار کا کم ہو جانا، وغیرہ

ڈیورگ [DURIG] نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ کوہ پیمائی کے دوران تقریباً ۲۵ ملی لیٹر شراب کے استعمال سے ۱۲ تا ۱۴ فیصد چڑھائی سست ہو جاتی ہے۔ اس سے کام کرنے کی رفتار میں کمی کی طرف اِشارہ ملتا ہے۔

ویلینس [WALLANCE] نے اِس بات کا انکشاف کیا ہے کہ

شراب در حقیقت جسم کے واسطے مقوی نہیں ہے۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ فوجی بغیر شراب کے بہتر طریقے سے آگے بڑھتے ہیں اور بہت زیادہ طاقت محسوس کرتے ہیں۔

شراب کو زیادہ مقدار ایک ہی بار استعمال کرلینے سے یکایک دماغ میں پستی آجاتی ہے۔ جسم کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ پھر بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے۔ جسم کا توازن ابتدا ہی میں خراب ہوجاتا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حرام مغز شروع ہی میں سست پڑجاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شراب کی تھوڑی مقدار قلب کو قوت بخشتی ہے اور زیادہ مقدار سستی پیدا کرتی ہے۔

جدید ترین تحقیقات نے یہ بات بالکل واضح کردی ہے کہ شراب کا قلب پر کوئی ایسا اثر نہیں ہوتا کہ قلب سے باہر آنے والے خون کی مقدار میں اضافہ ہو بلکہ اس کے برعکس عضلاتِ قلب کی قوتِ انقباض کم ہوجاتی ہے۔

سلزر [SULZER] نے ۱۹۶۶ء میں اس بات کا اعلان کیا کہ شراب کے استعمال سے قلب سست ہوجاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وریدوں [یعنی وہ نسیں جو قلب کی طرف خون واپس لے جاتی ہیں] خون کا دباؤ بھی بڑھ جاتا ہے اور شریان اکلیلی کے ذریعے خود قلب کو جانے والے خون کی مقدار اچھی خاصی کم ہوجاتی ہے۔

شراب پینے کے بعد رفتارِ قلب بڑھ جاتی ہے اور زیادہ مقدار میں پینے سے رفتارِ نبض بھی بڑھ جاتی ہے۔ شاید ایسا کرتے ہوئے ضغط الدم یعنی خون کے دباؤ کو قائم رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ شراب کے استعمال کے بعد گرمی کے احساس کے ساتھ آنکھیں اور چہرہ لال ہوجاتا ہے۔ دورانِ خون بڑھ جاتا ہے۔ کیوں کہ عروقِ دموی [جن نسوں میں خون بہتا ہے] پھیل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دماغ کے دوران خون میں بھی بدنظمی پیدا ہوجاتی ہے۔

پاؤشیٹ [POUCHET] کا قول ہے کہ تھوڑی مقدار میں لیکن مستقل شراب پینے سے خون میں رفتہ رفتہ چربی کی مقدار بڑھتی رہتی ہے۔ چربی کی مقدار میں اضافہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو چربی غذا کے ساتھ روغن کی شکل میں خون میں پہنچتی ہے وہ جسم کے ذریعے مکمل طور پر جذب نہیں ہو پاتی۔ جیسا کہ عام اور طبعی حالات میں ہوتا ہے۔ خون کا کھارہ پن کم ہوجاتا ہے۔ خون کی صلاحیتِ انجماد بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ سب باتیں قلب کے دورے کو زیادہ مواقع فراہم کرتی ہیں۔

تحقیقات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ شراب کے استعمال سے حرارت جسمانی میں تقریباً چوتھائی تا ایک درجہ سینٹی گریڈ کی کمی واقع ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سطحی عروقِ دموی [خون کی نسیں] پھیل جاتی ہیں اور خون کی زیادہ مقدار پر فضا کی ٹھنڈک اثر انداز ہوتی ہے۔ اس امر کا بھی انکشاف ہوچکا ہے کہ عرصۂ دراز تک شراب نوشی میں مبتلا رہنے سے بدن کی قوتِ مدافعت کم ہوجاتی ہے، جس سے مختلف قسم کے امراض میں مبتلا ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہوجاتے ہیں۔

مندرجہ بالا سائنسی تحقیقات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ عام طور پر شراب نوشی کے سلسلے میں جو نظریات اور دلائل شراب نوش حضرات کی جانب سے پیش کیے جاتے ہیں وہ سراسر غلط اور بالکل بے بنیاد ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

اس لیے کوئی حیرت و تعجب کا مقام نہیں کہ شراب نوشی کے تمام ضرر رساں اثرات سے واقفیت رکھتے ہوئے، مخبر صادق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پیشتر ہی اپنے پیروکاروں کو شراب پینے سے منع فرمادیا تھا۔ کیوں کہ پیغمبر اسلام کی دور رس نگاہیں شراب نوشی کی تمام تر خرابیوں اور اس کے بُرے اثرات کو دیکھ رہی تھیں، جن میں سے صرف چند چودہ سو سال بعد موجودہ سائنس کی جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں ہمارے سامنے آسکی ہیں۔

[ترجمہ: ڈاکٹر بیت اللہ انصاری۔ ڈپارٹمنٹ آف انستھیالوجی]

اتر پردیش پبلک سروس کمیشن

Combined State Service examination 1984 —

کل اسامیوں کی تعداد: 297 ڈپٹی کلکٹر۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولس۔ ٹریژری آفیسرز، سیلس ٹیکس آفیسر۔ جیل سپرنٹنڈنٹ، وغیرہ]

تعلیمی صلاحیت: گریجوئیشن

عمر کی حد: ۲۱ تا ۳۰ [مندرجہ فہرست ذاتوں قبائل، جسمانی معذور افراد و صوبۂ یوپی کے لیے عمر میں ۵ سال کی چھوٹ]

فیس: عام امیدواروں سے ۔/۱۲ روپے

آخری تاریخ: اتر پردیش پبلک سروس کمیشن الہ آباد کے دفتر ۳ جولائی ۸۴ء تک۔

امتحانات: ستمبر/اکتوبر ۸۴ء میں الہ آباد۔ لکھنؤ۔ میرٹھ۔ گورکھپور۔ نینی تال و دہرہ دون میں منعقد ہوں گے

مضامین وجملہ تفصیل کے لیے انڈین ایکسپریس ۱۹ اپریل ۸۴ء دیکھیے امتحان فارم کا نمونہ اشتہار کے ساتھ دیا گیا ہے۔ کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہوسکتا ہے۔ کمیشن کے دفتر سے نہیں ملتا۔

ایس۔ ایچ۔ ھال
اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

توہم پرستی

خداتعالیٰ کی پیدا کردہ اس وسیع و عریض کائنات میں انسان ایک بلند مقام کا حامل ہے۔ ساتھ ہی تمام مخلوقات پر اشرف و افضل ہونے کے سبب اشرف المخلوقات کا شرف بھی اسے ہی حاصل ہے۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جسے خدائے برتر نے عقل و شعور عطا کیا۔ جہاں اسے خوشیوں سے ہمکنار کیا ہے وہیں اس کے لیے مصائب کے دروازے بھی وا کیے ہیں تاکہ وہ اپنے عقل و شعور کا سہارا لے کر اپنے وجود کو مصائب سے بچا سکے اور اپنے لیے ترقی کی راہیں متعین کر سکے۔ یہ احساسات و جذبات انسان کو اپنی حیاتِ اجتماعی کے ابتدائی دور سے ہی حاصل تھے جب وہ جانوروں کے درمیان زندگی بسر کرتا تھا اور خود اس کی اپنی زندگی بھی بڑی حد تک جانوروں کی زندگی سے مشابہ تھی، ساتھ ہی اس کی زندگی میں توہمات کو بڑا دخل حاصل تھا۔ عرصۂ دراز تک وہ توہمات کی ان وادیوں میں بھٹکتا رہا، جہاں بارش نہ ہونے پر اسے اپنے ہی ساتھیوں کو قربان گاہوں کی نذر کرنا پڑتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی زندگی میں انقلاب آنا شروع ہوا۔ اس کی عقل و شعور کے بند دریچے وا ہونے لگے اور زندگی کی یکسانیت سے اُوب کر اُس نے ترقی کی طرف قدم بڑھائے۔ اب اسے اپنے جسم کو چھپانے کے لیے پہلے درختوں کے پتّوں اور پھر کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اُس کی ضروریاتِ زندگی بھوک کے دائرے سے نکل کر وسیع تر ہوتی گئیں۔ آہستہ آہستہ ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا انسان آسمان کی وسعتوں تک پہنچ گیا۔ اس کے قدم چاند کی زمین کو چھونے لگے۔ اس نے ایورسٹ کی بلند و بالا چوٹیوں پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دیے۔ وہ ترقی کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر اسے چند لمحوں تک اس بات کا یقین نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی انسان ہے جسے صرف اپنی بھوک کی تشنگی دور کرنے کے لیے برہنہ حالت میں جنگلوں کی خاک چھاننی پڑتی تھی۔ وہ اپنی پچھلی زندگی اور روایات سے بڑی حد تک ناطہ توڑ چکا ہے۔ اس کے باوجود ایک شئے ابتدائی دور سے لے کر آج تک، جب کہ اُس نے مشینی دَور میں قدم بڑھا لیے ہیں، مسلسل اس سے وابستہ ہے اور وہ ہے توہم پرستی۔ وہ نہ تو اس سے ناطہ توڑ سکا ہے اور نہ اُس پر فتح حاصل کر سکا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی صبح سے شام تک نہ جانے کتنے وہم ہمارے دلوں میں گھر کرتے رہتے ہیں اور ان سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ کیوں کہ وہ ہماری زندگی کا ایک لازمی جز و بن کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً ہم امتحان کی تیاری میں مشغول ہیں کہ کہیں سے گدھے کی آواز آئی اور ہمیں یہ یقین واثق ہو گیا کہ یہ سوال پرچے میں آنا لازمی ہے۔ اب تمام سوالات ترک کر کے وہی سوالات تیار کیے جائیں گے جن پر گدھے کی آواز آئی تھی۔ اتفاقاً اگر وہ سوالات پرچے میں آ گئے تو پھر پوچھنا ہی کیا۔ ہمارا یقین اور مستحکم ہو جائے گا۔ اور اگر کہیں پرچہ اٹھاتے ہی پتہ چلا کہ وہ تمام سوالات تو سرے سے غائب ہیں، جن کے آنے کی تصدیق گدھے نے کی تھی، پھر کیا سارا قصور اپنی نااہلی اور توہم پرستی پر نہ ہو کر بلّی کے راستہ کاٹنے، کسی یک چشم پر نظر پڑنے، یا کسی کے چھینکنے کو قرار دیا جائے گا۔ گویا ہمارا پورا سال گدھے اور بلّی کی نذر ہو گیا۔

یہ خیالات اور وسوسے اس بُری طرح ہمارے ذہن سے چپک کر رہ گئے ہیں کہ کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں مثلاً کوّے کی آواز کان میں پڑتے ہی بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ آج کوئی آئے گا۔ گویا کوّا نہ ہوا ٹیلی گرام ہو گیا۔ کبھی صبح اور چراغ جلے قرض دینے سے منع کیا جاتا ہے تو کبھی غروبِ آفتاب کے وقت کنگھا کرنے سے، کوئی منگل کے دن شیو کرنے سے منع کرتا ہے تو کوئی سنیچر کے دِن نہانے سے۔ یعنی ہماری زندگی کی خود اعتمادی تو ہوئی بالائے طاق اور ہم ان وسوسوں کا شکار بن کر رہ گئے۔ اسی طرح سفر کی ضرورت درپیش ہوئی نہیں کہ ذہن نے الجھنا شروع کیا کہ سفر کے لیے منگل منحوس ہے تو بدھ خطرناک جمعرات نامناسب ہے، تو سنیچر نحس نہ جانے سرکار ان دنوں میں گاڑیاں کیوں چلاتی ہے۔

ان توہمات کے علاوہ ایک بات جسے ہماری زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ ہے شبھ لگن۔ کوئی بھی اہم کام کرنا ہوا اور شبھ لگن کی فکر سوار ہوئی۔ خواہ اس شبھ لگن کے انتظار میں کتنا ہی قیمتی وقت برباد ہو جائے۔ ایک بادشاہ کی پوری فوج اسی انتظار میں برباد ہو گی کہ نیک ساعت نکلے تو حملہ شروع ہو۔ مبارک ساعت تو نہ نکلی مگر زرہ بکتر پہن کر تیز دھوپ میں کھڑے ہونے کی وجہ سے فوج اس قابل ہی نہیں

رہی کہ کسی کا مقابلہ کر سکے ۔ سعد و نحس کے اس چکر سے ہٹلر اور چرچل جیسے فاتح اور علی انسان بھی اپنے آپ کو نہ بچا سکے اور اپنی توہم پرستیوں اور جوتشیوں پر اندھے اعتقاد کی وجہ سے انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہمارے ملک کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔ بڑے بڑے وزیر اور اعلیٰ طبقے کے افراد نجومیوں کا اشارہ پائے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکالتے ۔ ایک بار ایسے ہی کسی وزیر نے پنڈت نہرو کے پاس لکھ بھیجا کہ فلاں دن آپ کے لیے نحس ہے اور اس دن آپ کی جان کو خطرہ ہے ۔ لہٰذا اس دن باہر نکلنے سے گریز کریں ۔ پنڈت نہرو بہت ہی روشن خیال انسان تھے ۔ وہ توہمات پر یقین نہیں رکھتے تھے ۔ انھوں نے وزیر موصوف کا خوب مذاق اڑایا اور اس دن اپنے سارے کام پروگرام کے مطابق کیے اور ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

اکثر ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو زبان سے تو ہمیشہ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ یہ تمام باتیں فضول ہیں ۔ مگر جہاں کوئی کام در پیش ہوا اور اُن کے دل میں وسوسوں نے ہلچل مچانی شروع کی ۔ ایسے وقت میں ہمیشہ ان کی زبان پر یہ جملہ ہوتا ہے کہ "ہم تو ان باتوں کو نہیں مانتے مگر چونکہ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں ۔ اس لیے انھیں فراموش بھی نہیں کر سکتے وہ اپنے بزرگوں کی کتنی اہم وصیتوں کو فراموش کر چکے ہوں ، مگر ان توہمات سے کنارہ کشی اختیار کرنا گناہ سمجھتے ہیں ۔ بعض لوگ طرح طرح سے اپنی بدشگونی کا ازالہ بھی کر لیتے ہیں ۔ مثلاً ایک صاحب گھر سے نکلے ہی تھے کہ بلی راستہ کاٹ گئی وہ فوراً لوٹے اور جوتا بدل کر اس کا ازالہ کیا ، یا کسی یک چشم پر نظر پڑتے ہی فوراً واپس آکر پان کھایا ۔ تین بار پیک تھوکی اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے ۔

علی گڑھ میں ایک صاحب کو ایسا منحوس قرار دیا گیا کہ راستہ میں ان کی صورت نظر آئی اور وہیں لوگوں کو اپنی ناکامی کا پختہ یقین ہو گیا ۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگوں نے اس کا علاج بھی دریافت کر لیا تھا یعنی یہ کہ انھیں بہ آواز بلند سلام کرو ۔ اگر وہ جواب دے دیں تو سمجھو کہ نحوست ٹل گئی ۔ مرحوم کو خود اس بات کا علم ہو گیا تھا ، اِس لیے سلام کرنے پر اکثر چڑ جاتے تھے ۔

یہ خیالات و توہمات انسان کے لیے نہایت مُضر ہیں ۔ یہ نہ صرف ہماری خود اعتمادی اور قوت فیصلہ کو مجروح کرتے ہیں بلکہ زندگی کے اہم معاملات میں دخل انداز ہو کر ہمارے مستقبل کو مصائب سے ہمکنار بھی کر دیتے ہیں ۔ ہم اگر چاہیں تو بہت آسانی سے اِن خیالات سے کنارہ کشی ہو سکتے ہیں ۔ اس کے لیے ہمیں اس حقیقت پر ایمان رکھنے کی ضرورت پر ایمان رکھنے کی ضرورت ہے کہ مستقبل کا حال جاننے والی واحد خدا کی ذات ہے اس کے علاوہ نہ تو کوئی ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع ۔ نجومی جن ستاروں کی گردش سے ہماری قسمت کا رشتہ جوڑتے ہیں ، ان کو گردش میں ڈالنے والی بھی یہی ذات پاک ہے ۔ غور کریں اور گردش ہی جس چیز کا مقدر ہوں وہ کسی کا کاتبِ تقدیر کیسے بن سکتا ہے ۔ بقول اقبال ؎

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

اِنسان خود اپنی تقدیر کا معمار ہے ۔ خدا تعالےٰ نے اسے عقل و شعور اس لیے عطا کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرے نہ کہ اپنے لیے مسائل پیدا کرے ۔ ہماری زندگی کا ہر دن یکساں اہمیت رکھتا ہے ۔ نہ تو کوئی دن مبارک ہوتا ہے اور نہ ہی نحس ۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے مستقبل کے فیصلوں کی بنیاد یقین و عمل پر رکھے نہ کہ توہمات پر ★ ★

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون :
۳۶۰۹
۴۱۹۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۵/۸۴-۸۵

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں —

۱- پروفیسر آف سیول انجینرنگ - ڈپارٹمنٹ آف سول انجینرنگ -

۲- پروفیسر آف سول انجینرنگ (ہائیڈرالکس) - ڈپارٹمنٹ آف سول انجینرنگ -

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰- ۶۰- ۱۸۰۰- ۱۰۰- ۲۰۰۰- ۱۲۵/۲- ۲۵۰۰- مع دیگر الاؤنس

قابلیت:- معروف اسکالر جس کی اعلیٰ معیاری مطبوعات بھی ہوں اور وہ تحقیقی کام میں مشغول ہو۔ درس و تدریس اور یا تحقیق کا دس سال کا تجربہ ہو۔ ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی تجربہ -

یا

غیر معمولی صلاحیت کا انجینر یا ٹیکنیکل کے کام کا ماہر — جس نے انجینرنگ کے علم میں قابلِ ذکر اضافہ کیا ہو۔

۳- ریڈر ان سول انجینرنگ - ڈپارٹمنٹ آف سول انجینرنگ

۴- ریڈر ان سول انجینرنگ (ہائیڈرالکس) ڈپارٹمنٹ آف سول انجینرنگ -

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰- ۵۰- ۱۳۰۰- ۶۰- ۱۹۰۰ مع دیگر الاونس -

قابلیت:- اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ درس و تدریس/یا تحقیق اور ترقیات کے میدان میں پانچ سال کا تجربہ -

ان امیدواروں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جا سکتا ہے، جن کے پاس اگرچہ کے ڈاکٹریٹ کی سند نہیں ہے لیکن اس ڈاکٹریٹ کی سند کے معیار کا مطبوعہ کام ہے یا انتہائی اعلا معیار کا کسی تعلیمی ادارے یا انڈسٹری میں ترقیاتی کام ہو۔

یا

ایسے اشخاص کی صورت میں جنھیں کسی صنعت یا پیشہ ورانہ میدان سے بھرتی کیا جائے گا۔ ان کے لیے ضروری ہوگا کہ امیدوار کے پاس اعلا تعلیمی ریکارڈ ہو اور تقریباً سات سال کا پیشہ ورانہ تجربہ رکھتے ہوں۔ جس میں نئی ایجادات تحقیقات اور ترقیات بھی شامل ہوں -

۵- لکچرر ان الیکٹریکل انجینرنگ - ڈپارٹمنٹ آف الیکٹریکل انجینرنگ -

۶۔ لکچرر ان الیکٹریکل انجینرنگ۔ الیکٹریکل انجینرنگ سیکشن۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ معہ دیگر الاونس

قابلیت:۔ (ا) انجینرنگ یا ٹیکنالوجی کے میدان میں ماسٹر ڈگری

(ب) اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ معہ انجینرنگ یا ٹیکنالوجی میں بیچلرس ڈگری ہونا چاہیے۔ بیچلرس ڈگری/ ماسٹرس ڈگری میں فرسٹ ڈویژن ہو۔

(ج) تعلیمی/ تحقیقی ادارے کے علاوہ ایک سال کا پیشہ وارانہ تجربہ۔

- انجینرنگ اور ٹیکنالوجی کے موضوعات میں نامیاتی بین الموضوعی پروگراموں میں ملازمتوں کے لیے دیگر حیثیتوں سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل امیدواروں کے حق میں انجینرنگ اور ٹیکنالوجی میں ڈگریوں کی شرائط کو نرم کیا جاسکتا ہے
- ایسے امیدوار کے لیے جو پیشہ ورانہ تجربہ نہیں رکھتا ہو یا ایسا امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربے کا حامل ہو لیکن وہ تقرر کے لیے موزوں متصور نہ کیا جائے تو اس صورت میں جس شخص کا تقرر کیا جائے گا اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر مطلوبہ پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کرے۔
- اگر ماسٹر ان ٹیکنالوجی یا ماسٹر ان انجینرنگ کی ڈگری کے حامل امیدوار دستیاب نہ ہوں یا تقرر کے لیے مناسب متصور نہ کیے جائیں تو اس صورت میں تعلیمی صلاحیت کی شرائط کو نرم کیا جا سکتا ہے اور فرسٹ ڈویژن میں پاس شدہ انجینرنگ گریجویٹ کا تقرر اس شرط پر کیا جاسکتا ہے کہ امیدوار تقرر کے بعد پانچ سال کی مدت میں ماسٹر ان ٹیکنالوجی یا ماسٹر ان انجینرنگ کی سند حاصل کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کر دے۔

۷۔ ریڈر ان بزنس مینیجمنٹ (دو جگہیں) ڈپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن۔

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ - روپے معہ دیگر الاؤنس۔

قابلیت (۱) متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے ہونا ضروری ہے یا پھر اس جیسی کوئی غیر ملکی ڈگری ہونا چاہیے۔

(۲) ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری ہو یا اعلیٰ معیار کا مطبوعہ کام ہو

اور مزید

(۳) پوسٹ گریجویٹ کلاسس کی تدریس کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ ہو اور کچھ تجربہ تحقیق کی رہنمائی کا بھی ہونا ضروری ہے۔

۸۔ لکچرر ان فائن آرٹس (عارضی) ویمنس پالی ٹیکنک۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے معہ دیگر الاؤنس۔

قابلیت:۔ (۱) اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ (بی۔ سیون پوائنٹ اسکیل میں) فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا یونیورسٹی سے منظور شدہ متعلقہ مضمون میں کوئی

(۲) ڈپلوما۔ اور

(۳) دو سال کا تحقیقی یا پیشہ ورانہ کام کا تجربہ یا مخصوص دلچسپی کے موضوع میں غیر معمولی صداقت نامہ یا تین سال کا اپنے موضوع میں غیر معمولی صلاحیت کی تحقیق یا پیشہ ورانہ تجربہ۔

روایتی/پیشہ ورانہ فن کار مع انتہائی اعلیٰ فن کار کی حیثیت سے اپنے مخصوص موضوع میں قابلِ ذکر کارنامہ
خاتون امیدوار کو ترجیح دی جائے گی۔

۹ لیکچرر ان فزکس ، فزکس سیکشن، انجینئرنگ کالج
۱۰ لیکچرر ان انگلش (عارضی) ویمنس پالی ٹیکنک۔
۱۱ لیکچرر ان سنسکرت - ڈپارٹمنٹ آف سنسکرت
۱۲ لیکچرر ان پرشین - ڈپارٹمنٹ آف پرشین
۱۳ لیکچرر ان پرشین ویمنس کالج۔

شرح تنخواہ- ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاونس

قابلیت- (۱) لازمی (الف) - ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام

(ب) متعلقہ مضمون میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ (یا سیون پوائنٹ اسکیل میں) فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی غیر ملکی یونیورسٹی سے کوئی اعلیٰ ڈگری۔

(ج) سنسکرت قواعد اور ادب و زبان کی اچھی معلومات اور اس کے ساتھ سنسکرت گرامر اور لٹریچر کی اعلیٰ معلومات (صرف پوسٹ نمبر ۱۱ کے لیے) لیکچرر ان سنسکرت ڈپارٹمنٹ آف سنسکرت کے واسطے

پسندیدہ:- پوسٹ نمبر ۱۰. لیکچرر ان انگلش ویمنس پالی ٹیکنک کے لیے
درس و تدریس کا کچھ تجربہ۔

پوسٹ نمبر ۱۱- لیکچرر ان سنسکرت ڈپارٹمنٹ آف سنسکرت کے لیے
(۱) پوسٹ گریجویٹ کلاسز کی درس و تدریس کا تجربہ۔
(۲) پراکرت زبان و ادب کا علم

پوسٹ نمبر ۱۲ و ۱۳- لیکچرر ان پرشین - ڈپارٹمنٹ آف پرشین و ویمنس کالج کے لیے
درس و تدریس اور/یا تحقیق کا تجربہ۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس سے یا اس کے مطبوعہ کام سے ظاہر ہے کہ وہ انتہائی اعلیٰ درجے کا ہے تو اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے۔

اگر کوئی ایسا امیدوار جس کے پاس ریسرچ ڈگری ہو یا اس کے معیار کا تحقیقی کام ہو، دستیاب نہ ہو یا دستیاب تو ہو لیکن اس کو تقرر کے لیے مناسب متصور نہ کیا جاسکے تو ایسے امیدوار کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جو ایم.فل ہو یا ایم.فل کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا تعلیمی ریکارڈ اچھا رہا ہو اور یہ ثابت کرے کہ اس نے کم از کم دو سال تک تحقیقی کام کسی ادارے یا تحقیقی لیباریٹری میں کیا ہے۔ مزید یہ کہ وہ آئندہ پانچ سال میں ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کرے گا یا اعلیٰ معیار کا ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے مساوی (تحقیقی کام) پیش کرے گا۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے محروم کردیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس

شرط کو پورا نہ کر دے۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربے کے حامل امیدواروں کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔

جو امیدوار انٹرویو کے لیے طلب کیے جائیں گے ان کو ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ بطور ٹی۔ اے (T.A) دیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار سلیکشن کمیٹی کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۱۰×۲۲ سم کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے جس پر خود کا پتہ تحریر ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۶ر جون ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

استہار داخلہ نمبر ۶

سیشن۔ ۸۵ - ۱۹۸۴

داخلے کے لیے موزوں اور اہل امیدواروں سے سیشن ۸۵-۱۹۸۴ء کے لیے مقابلہ جاتی ٹیسٹ/ٹیسٹ اور انٹرویو کی بنیاد پر مندرجہ ذیل کورسیز کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ ہر کورس کے سامنے داخلے کے واسطے کم سے کم تعلیمی لیاقت، مدت، فارم جمع کیے جانے کی آخری تاریخ اور داخلے کے لیے مقابلے کا امتحان کی تاریخ دی گئی ہے۔

نمبر شمار	کورس مع مدت	کم سے کم تعلیمی لیاقت برائے داخلہ	درخواست کی آخری تاریخ	ٹیسٹ کی تاریخ
۱	ڈپلوما ان انجینئرنگ۔ سول/ الیکٹریکل/ مکینکل۔	ہائی اسکول/ سیکنڈری اسکول سرٹیفکٹ یا اس کے مساوی کوئی امتحان جس میں انگریزی، ہائر میتھ اور ہائر سائنس (فزکس اور کیمسٹری) خاص تین مضامین کے ساتھ۔	۱۵ر جون ۱۹۸۴ء	۶ر جولائی ۱۹۸۴ء

	یا اس اعلیٰ امتحان پاس شدہ امیدوار جس کے پاس انگلش، فزکس، کیمسٹری اور میتھ چاروں مضامین رہے ہوں اور ہائی اسکول میں میتھ، سائنس اور انگریزی میں مجموعی طور پر ۴۵٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ یا فزکس، کیمسٹری، میتھ اور انگریزی میں بایر امتحان میں		
۲ بی ایس سی انجینیرنگ (سول۔ الیکٹریکل، کیمیکل، میکینیکل ۔ ع) ۴ سالہ کورس	مسلم یونیورسٹی سے فرسٹ ایر بی ایس سی پاس شدہ اور کم سے کم ۴۵٪ فیصد مجموعی طور پر انگریزی میتھ، فزکس اور کیمسٹری میں حاصل شدہ نمبر ہوں یا کم از کم سینیئر سیکنڈری اسکول سرٹیفکٹ میں سیکنڈ ڈویژن یا پھر انٹرمیڈیٹ یا ان کے مساوی کوئی امتحان (جس میں انگریزی، فزکس، کیمسٹری اور میتھ شامل ہوں) یا اس یونیورسٹی سے کم سے کم سیکنڈ ڈویژن میں یا ڈپلوما ان انجینیرنگ مع پی۔یو۔سی / انٹرمیڈیٹ پاس شدہ امیدوار داخلے کے مجاز شمار کیے جائیں گے۔	۱۰ر جولائی ۱۹۸۴ء	۱۲ تا ۱۶ اگست ۱۹۸۴ء

(ل) فیکلٹی آف میڈیسن

۳) ایم۔بی۔بی۔ایس ۴½ سالہ کورس	پری میڈیکل امتحان سائنس میں ۵۰٪ فیصد نمبر کے ساتھ اس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو۔ یا انٹرمیڈیٹ یا سینیئر سیکنڈری اسکول سرٹیفکٹ کا امتحان مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد نمبروں سے فزکس، کیمسٹری، اور بائیولوجی سے پاس کیا ہو اور جس میں انگریزی بطور ایک مضمون کے اس میں شامل ہو۔ یا اس کے مساوی کوئی امتحان جو اس یونیورسٹی سے منظور شدہ ہو۔ یا بی۔ایس سی (آنرز) مع مسلم یونیورسٹی سے پاس شدہ امیدوار یا اس کے مساوی کوئی امتحان کیمسٹری زولوجی اور بوٹنی کے مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد حاصل شدہ نمبروں کے ساتھ پاس کیا ہو۔ یا کسی امیدوار نے بی ایم سی کے معیار کا امتحان فزکس میں پاس کیا ہو۔ یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو۔	۱۶ر جولائی ۸۴ء	۲۰ تا ۲۴ اگست ۱۹۸۴ء

نمبر	کورس	اہلیت	تاریخ	تاریخ
۴	کامل طب و جراحت (۶ ۱/۲ سالہ کورس) پری طب: ایک سال؛ مین کورس: ۵ سال؛ انٹرشپ: ۶ ماہ	(۱) پری یونیورسٹی امتحان یا کوئی مساوی امتحان جو یونیورسٹی سے منظور شدہ ہو اور اس میں انگریزی بطور ایک مضمون شامل ہو۔ یا عالیات وجامعہ السلفیہ۔ بنارس (عالم وعربک (کامل وفارسی (ادیب کامل وجامعہ اردو) یا اس کے مساوی کوئی امتحان کسی بورڈ / یونیورسٹی یا کسی ادارے یا صوبائی ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن کا ہو اور مسلم یونیورسٹی اسے تسلیم کرتی ہو پاس شدہ امیدوار اور (ب) اردو کی کافی اچھی جانکاری۔	۱۲ر جولائی ۱۹۸۴ء	۷ تا ۱۸ اگست ۸۴
۵	ایم ڈی (علم الادویہ) ۳ سالہ کورس	(۱) اس یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس پاس شدہ امیدوار۔ یا ایسا کوئی امتحان جس کو یونیورسٹی اپنے بی یو ایم ایس کے امتحان کے مساوی تسلیم کرتی ہو۔ (فرسٹ ڈویژن میں پاس شدہ) (۲) ہاؤس جاب / انٹرشپ کا کم از کم چھ ماہ کا تجربہ ہونا ضروری ہے یا کم سے کم دو سال کا پریکٹس کا تجربہ بی یو ایم ایس کے فائنل امتحان پاس کرنے کے بعد۔ یا اس کے مساوی امتحان پاس کرنے کے دو سال بعد تک پریکٹس کا تجربہ۔	۲۵ر جولائی ۱۹۸۴ء	۸ر اگست ۸۴ء

(۱۱) فیکلٹی آف کامرس

نمبر	کورس	اہلیت	تاریخ	تاریخ
۶	ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن (ایم۔ بی۔ اے) ۲ سالہ کورس	بی۔ اے / بی۔ ایس سی / بی۔ کام / بی ایس سی انجینئرنگ / بی ایس سی (ایگریکلچر) یا ان کے مساوی کوئی امتحان جن میں کم از کم ۵۰٪ فیصد نمبر مجموعی طور پر حاصل کیے ہوں۔	۲۰ر جولائی ۱۹۸۴ء	۸ تا ۱۰ر اگست ۸۴

(۱۷) فیکلٹی آف سائنس

نمبر	کورس	اہلیت	تاریخ	تاریخ
۷	ماسٹر آف کمپیوٹر سائنس اور ایپلیکیشن (ایم سی۔ اے) ۳ سالہ کورس	۶۰ فیصد نمبروں کے ساتھ بی ایس سی کی ڈگری جس میں فزکس اور میتھ / اسٹیٹسٹکس بحیثیت خاص مضامین کے یا سبسیڈری مضامین کی حیثیت سے شامل ہوں۔	۲۶ر جولائی ۱۹۸۴ء	۲۹ر اگست ۸۴
۸	پوسٹ آف بی ایس سی ڈپلوما ان کمپیوٹر سائنس اور ایپلیکیشن (پی۔ ڈی سی اے) ایک سالہ کورس	۶۰٪ فیصد نمبروں کے ساتھ بی ایس سی ڈگری جس میں فزکس اور میتھ / اسٹیٹسٹکس بحیثیت خاص مضامین یا سبسیڈری مضامین کے ہوں۔	۲۶ر جولائی ۱۹۸۴ء	۲۹ر اگست ۸۴

۱۔ ڈپلوما ان کمپیوٹر پروگرامنگ ایک سالہ	بیچلرس ڈگری کم از کم ۵۰٪ فیصد مجموعی نمبروں کے ساتھ یا ایسی کوئی مساوی ڈگری جو یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو۔	۲۶ر جولائی ۱۹۸۴ء	۳۰ر اگست ۱۹۸۴ء
پی۔جی ڈپلوما ان ہائیڈرو جیالوجی ایک سالہ کورس	ایم۔ایس سی یا ماسٹر آف ٹیکنالوجی ان جیولوجی یا جیوفزکس میں ایم۔ایس سی یا ایم ٹیک۔ مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد نمبروں کے ساتھ یا بی۔ایس سی سول انجینئرنگ میں مجموعی طور پر کم از کم ۶۵٪ فیصد نمبروں کے ساتھ	۲۶ر جولائی ۱۹۸۴ء	۱۷ر اگست ۱۹۸۴ء

۷ فیکلٹی آف سوشل سائنس

۱۱ بی۔ایڈ ایک سالہ کورس	(۱) بی۔اے/بی۔ایس سی/بی۔کام یا اس کے مساوی کوئی امتحان۔ کم از کم مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد نمبروں کے ساتھ اور معہ دو اسکول مضامین کے یعنی انگریزی/اردو/ہندی تاریخ/جغرافیہ/سیوکس/اکنومکس/فزیکل سائنس/بیالوجیکل سائنس/میتھمیٹکس/کامرس کے (۲) ماسٹر ڈگری اسکول کے کسی بھی مضمون میں سیکنڈ ڈویژن پاس اگر مجموعی پرسنٹیج گریجویشن میں ۵۰٪ فیصد سے کم ہو۔	۲۳ر جولائی ۱۹۸۴ء	۲۵ تا ۲۶ر اگست ۱۹۸۴ء
۱۱ ایم۔ایڈ ایک سالہ کورس	بی۔ایڈ یا اس کے مساوی کوئی امتحان۔ مجموعی طور پر کم از کم ۵۰٪ فیصد نمبر بی ایڈ یا اس کے مساوی کسی امتحان کے تھیوری کے پرچوں میں حاصل شدہ نمبر۔	۲۳ر جولائی ۱۹۸۴ء	۲۵ر اگست ۱۹۸۴ء
۱۱ بی۔لب سائنس ایک سالہ کورس	بی۔اے/بی۔ایس سی/بی۔کام مسلم یونیورسٹی سے پاس شدہ یا اس کے مساوی کوئی امتحان — ۴۸٪ فیصد نمبر کم از کم پاس شدہ۔	۲۵ر جولائی ۱۹۸۴ء	۲۷۔تا۔۲۸ر اگست ۱۹۸۴ء
۱۱ ایم لب سائنس ایک سالہ کورس	(۱) بی لب سائنس یا اس کے مساوی امتحان کم از کم ۴۸٪ فیصد نمبروں کے ساتھ (۲) کسی منظور شدہ ادارے میں کسی ذمہ دارانہ جگہ پر بحیثیت لائبریرین کام کر رہے ہوں ایسے امیدوار جنھوں نے بی لب سائنس کی ڈگری سیکنڈ ڈویژن میں حاصل کی ہو وہ امیدوار بھی داخلے کے امتحان اور انٹرویو کے لیے موزوں متصور کیے جائیں گے۔	۲۵ر جولائی ۱۹۸۴ء	۲۷ر اگست ۱۹۸۴ء

شمار نمبر ۲، ۳، ۴ اور ۱۳ کے کورسوں میں داخلے مقابلے کے تحریری امتحان کی بنیاد پر ہوں گے ہوگا۔ اور شمار نمبر ۱، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور ۱۴ کے کورسوں میں، داخلے مقابلے کے تحریری امتحان اور انٹرویو کی بنیاد پر ہوں گے

مکمل معلومات کورس، فیس کی ادائیگی، درخواست بھیجنے کے قواعد وغیرہ ایڈمیشن ٹیسٹ گائڈ میں دیے گئے ہیں۔ داخلہ فارم اور گائڈ ٹو ایڈمیشن ٹیسٹ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ اے ایم یو۔ علی گڑھ سے تین روپے نقد ادائیگی یا بذریعہ ڈاک کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں

درخواست فارم کے حصول کی درخواست میں واضح طور پر اس کورس کا نام درج ہونا چاہیے جس کے لیے فارم مطلوب ہے

مسلم یونیورسٹی کے طلباء اپنے ہال کے متعلقہ پرووسٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ امیدوار جو درخواست فارم بذریعہ ڈاک حاصل کرنا چاہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ جس پر ۵۰-۲ کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں (لفافہ کا سائز 6"×9" ہونا چاہیے) بھیج کر حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی امیدوار یہ چاہے کہ اس کو درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجا جائے اس کو چاہیے کہ ۵/۲۵ کی قیمت کا ٹکٹ خود کے لکھے ہوئے پتے کا لفافہ بھیج کر حاصل کرے۔

درخواست فارم بیرونی امیدوار ہر طرح سے مکمل کر کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر ۲۵/- روپے یا ۳۵/- روپے کی قیمت کا رجسٹریشن اور ایڈمیشن ٹیسٹ فیس (ناقابل واپسی) جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو متعلقہ کورس کے سامنے دی گئی تاریخ کے مطابق شام ۵ بجے سے پہلے اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے یہاں پہنچ جانا چاہیے۔

انٹرنل اسٹوڈنٹس اپنی داخلے کی درخواستیں ہر طرح سے مکمل کر کے مطلوبہ فیس اور ضروری کاغذات کے ساتھ اپنے متعلقہ پرووسٹ کے یہاں آخری تاریخ سے ۲ روز پہلے جمع کر دیں۔

نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں نہ تو قبول کی جائیں گی نہ اُن کے بارے میں مزید کوئی خط و کتابت کی جائے گی۔

این موئیدین

کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار داخلہ نمبر ـــــ ۷

سیشن ۸۵ - ۱۹۸۴

کورسوں اور اہل امیدواروں سے مندرجہ ذیل کورسز میں داخلے کے لیے مقررہ فارموں پر سیشن ۸۵-۱۹۸۴ کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

ہر کورس کے سامنے داخلے کے واسطے کم سے کم تعلیمی قابلیت، مدت تعلیم وغیرہ لکھ دیے

گئے ہیں۔

نمبر شمار	کورس کا نام اور مدت	داخلے کے واسطے کم سے کم تعلیمی لیاقت
۱	ایم۔ایس سی انجینئرنگ (سول، الیکٹریکل، مکینکل) ۱½ سال (۳ سمسٹر)	بی۔ایس سی انجینئرنگ یا اس کے مساوی کوئی امتحان متعلقہ برانچ میں جس میں مجموعی طور ۶۰٪ فی صد سے کم نمبر نہ ہونے چاہیں۔ یا اس کے مساوی گریڈ میں (این۔اے۔جی)
۲	پی۔جی ڈپلوما ان پٹرولیم پروسسنگ ۱ سال	بی۔ایس سی انجینئرنگ (کیمیکل) یا اس کے مساوی کوئی ڈگری جس میں مجموعی طور پر ۶۰٪ فی صد سے کم نمبر نہ ہونے چاہیں یا اس کے مساوی گریڈ میں (این۔اے۔جی)
۳	بی۔ای۔ ڈگری (شام کا کورس) (سول/ الیکٹریکل / مکینکل) ۳½ سالہ کورس	(۱) سول انجینئرنگ میں ڈپلوما (تین سال کی مدت کا) کسی منظور شدہ ادارے سے متعلقہ برانچ میں ہونا ضروری ہے (۲) اور کم از کم دو سال کا تجربہ بھی امتحان پاس کرنے کا بعد ہونا چاہیئے۔

تین روپیہ نقد یا اسی قیمت کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر اے ایم یو کے نام واجب الادا ہو اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے نام بھیج کر درخواست کے فارم اور ہدایات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ (تین روپے نقد یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع ہونا چاہئیں)۔

وہ امیدوار جو درخواست فارم بذریعے ڈاک حاصل کرنا چاہیں ان کو چاہیے کہ ایک فارم منگوانے لیے ۲۸×۱۲ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر ان کا اپنا پتہ تحریر ہو اور ایک روپیہ کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر امیدوار درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک سے حاصل کرنا چاہیں تو اُن کو چاہیے کہ لفافے پر اپنا پتہ تحریر کرکے ۳-۸۵ (تین روپے پچاسی پیسے) کے ڈاک ٹکٹ لفافے پر چسپاں کرکے روانہ کریں۔ اگر درخواست فارم ایک سے زیادہ حاصل کرنا چاہیں تو ہر درخواست فارم کے لیے ٹکٹ لگا لفافہ الگ الگ بھیجیں۔

ہر طرح سے مکمل درخواست فارم مع ۵/- روپے رجسٹریشن فیس (ناقابل واپسی) بذریعہ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر اے ایم یو کے نام واجب الادا ہو' اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یہاں ۱۸ رجون ۱۹۸۴ء شام پانچ بجے سے پہلے پہنچ جانا ضروری ہے۔

نامکمل درخواستیں یا مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول تصور کی جائیں گی اور ان کے سلسلے کوئی خط وکتابت بھی نہیں کی جائے گی۔

این۔ موئیدین

کنٹرولر۔ امتحانات اور داخلہ

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ۔

ایٹم ریٹ کی بنیاد پر ۱۲؍جون ۱۹۸۴ء بوقت ۱۱ بجے دوپہر تک منظور شدہ سپلائی کرنے والے ڈیلرس اور رجسٹرڈ ٹھیکیداروں سے جو سی۔پی۔ڈبلیو۔ڈی۔ اور ریاستی پی۔ڈبلیو۔ڈی سے رجسٹرڈ ہوں مندرجہ ذیل چیزوں کی سپلائی کے اسلئے سربمہر ٹینڈر طلب کیے جاتے ہیں۔

سپلائی کی جانے والی چیزوں کے نام	کام کے لیے مختص رقم	ٹینڈر کی قیمت	زر ضمانت
گروپ 'اے'			
جی۔آئی۔ پائپس اور جی۔آئی فٹنگ	۱۷۳۹۵/-	۵/-	۴۲۰/-
گروپ 'بی'			
سینیٹری واٹر سپلائی اور ایکسیسریز اور سے روڈ وغیرہ کے	۱۹۴۷۵/-	۵/-	۴۹۰/-
گروپ 'سی'			
سیور اور ہینڈ پمپ فٹنگ، واٹر سپلائی اور سینیٹری فٹنگ وغیرہ	۱۸۸۱۵/-	۵/	۴۷۰/
گروپ 'ڈی'			
آئرن ہب کوکس، اسٹاپ کوکس وغیرہ	۱۸۴۵۵/-	۵/	۴۶۰/-
گروپ 'ای'			
لکڑی کے سیلپر، دوڈن اسکیٹنگ	۱۹۸۲۵/-	۵/-	Rs ۵۰۰/-
گروپ ایف۔			
ڈور فٹنگ، ویلڈیڈ فیبرک، وایر سویز، ایکسپینڈیڈ میٹل وغیرہ	۱۰۵۲۰/	۵/	Rs ۴۴۰/-
گروپ جی۔			
پینٹس، وانشنز، لائنسڈ آئیل، چاک پاؤڈر، اسٹیل پٹی وغیرہ	۱۹۵۸۰/-	۵/-	Rs ۴۹۰/-
گروپ 'ایچ'			
کول، فائن سینڈ، کورس سینڈ، ایگریگیٹ اسٹون اور برکس وغیرہ	۱۷۶۸۵/-	۵/-	Rs ۴۴۰/-
گروپ 'آئی'			
گلاس شیٹ اور گلاس پٹی	۱۵۹۰۰/	۵/-	۴۰۰/-
گروپ 'جے'			
ایم۔ایس شیٹس ۔ اے۔سی شیٹس۔ ایم۔ایس بارس	۱۹۸۷۵/	۵/-	۵۰۰/-
گروپ 'کے'			
ڈیزل آئیل، موبل آئیل اور گریس	۷۲۰۰/-	۲/-	۱۸۰/
گروپ 'ایل'			
فل وے والوز اور بال بیرنگس۔	۱۸۶۵۰/-	۵/-	۴۶۵/-

گروپ ایم

سامان برائے پینٹنگ سیٹس نلنگس ایپلیس، ہینڈ ٹولس، بلیچنگ پاوڈر وغیرہ ۱۲۲۶۴/- ۵/- ۳۱۰/-

گروپ این

الیکٹرکس بلبس، ٹیوبس۔ پی۔وی۔سی۔وایر، فیوز وایر، انسولیٹنگ ٹیپس وغیرہ ۵۳۴۸/- ۲/- ۱۳۵/-

ٹوٹل ۲،۲۶،۸۹۷/- ۶۴/- ۵۸۱۰/-

۲۔ ٹینڈر اسی روز ۳۰-۱۲ بجے ٹھیکیداروں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔

۳۔ جو چیزیں ڈپارٹمنٹ دے گا ان کے نرخ مع مقدار کے ٹینڈر کے کاغذات کے ساتھ دیے جانے چاہییں۔ جیسا کہ منسلکہ کاغذ میں مذکور ہے۔ ادائیگی نقد ہونی چاہیئے۔ کام کے ہر گروپ کے سامنے تحریر ہے۔

۴۔ پیشگی رقم ہر ٹینڈر کے ہمراہ نقد یا فکسڈ ڈپازٹ رسیدس کی شکل میں یونیورسٹی کے فنانس آفیسر کے پاس جمع ہونا چاہیے پہلے پیراگراف میں ہر طرح کے کام کی پیشگی رقم تحریر ہے۔ پیشگی رقم کے بغیر کوئی ٹینڈر نہیں لیا جائے گا

۵۔ راقم الحروف کو بنا سبب بتائے ہوئے کسی بھی ٹینڈر کو مسترد کرنے یا منظور کرنے کا اختیار ہوگا۔ خواہ ٹینڈر سب سے کم ریٹ کا ہی کیوں نہ ہو۔ مزید یہ کہ شرط لگائے گئے ٹینڈر بھی مسترد کر دیے جائیں گے

۶۔ (الف) جو نرخ ٹینڈر میں دیے جائیں گے وہ اس مفاہمت کے ساتھ ہونے چاہییں کہ ٹینڈر داخل کرنے کے نو ماہ تک قابل عمل رہیں گے اور اس محکمے کو ٹینڈر موصول ہونے کے نو مہینے تک ٹھیکے کے مروجہ نرخ کے برابر مانی جائینگے

(ب) تمام سپلائیر محکمے کے اسٹور میں کی جائیں گی۔ اس لیے جو نرخ لکھے جائیں، ان میں ڈھلائی اور پیکنگ کے مصارف بھی شامل ہونے چاہییں۔

۷۔ مروجہ معاہدوں کے پیش نظر تمام سامان کی ادائیگی کی جائے گی اور یہ ادائیگی مروجہ ٹھیکے کے نرخ کو سامنے رکھ کر اور ٹینڈر میں لکھے ہوئے نرخوں کے حساب سے کی جائے گی جو نو ماہ تک قابل عمل سمجھے جائیں گے۔ اشیاء کے بلوں میں جو قیمت درج ہوگی، اسی کے حساب سے ادائیگی کی جائے گی اور یہ محکمہ کوئی ٹیکس ادا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

معیار سے گری ہوئی اشیا یہ محکمہ قبول نہیں کرے گا اور سپلائی کرنے والا اسے اپنے خرچے سے اٹھائے گا

۸۔ جو مختلف قسم کی چیزیں بلوں میں مذکور ہیں وہ عارضی سمجھی جائیں گی۔ مزید یہ کہ ڈپارٹمنٹ کے آرڈر دینے کے دس دن کے اندر اندر سپلائی کر دینی چاہییں۔

۹۔ ٹینڈر موصول ہونے کے تین ماہ کے اندر ٹینڈر داخل کرنے والوں کو ان کے ٹینڈر کے منظور ہونے یا مسترد کیے جانے کی تحریری طور پر اطلاع دی جائے گی

۱۰۔ اس معاہدے کے سلسلے میں کوئی تنازعہ وائس چانسلر یا اس کا نامزد کیا ہوا شخص طے کرے گا جو ٹھیکیدار یا سپلائیر کو ماننا پڑے گا۔

۱۱ ورک آرڈر کے موصول ہونے کے پندرہ دن کے اندر اندر سامان مہیا ہو جانا چاہیے۔ نہیں تو تاخیر کی صورت میں ایک فیصدی جرمانہ کیا جائے گا۔ جو دس فیصد تک بڑھایا جا سکتا ہے۔

۱۲ پندرہ دن کے اندر اندر یا توسیع شدہ مدت کے اندر سامان سپلائی کر دینے کی صورت میں کوئی جرمانہ نہیں عاید کیا جائے گا۔

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر

پرنٹر پبلشر نورالحسن نقوی۔ مطبع شیروانی آرٹ پریس مینامحل دہلی۔ مقام اشاعت۔ شعبۂ اردو۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

بہارِ نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یو۔پی

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

1

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ

علی گڑھ

مدیر
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول
نور الحسن نقوی
استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

جلد ۳ ۱۶ تا ۳۰ جون ۱۹۸۷ء شمارہ ۱۲

مندرجات

"غرضکہ سارا قرآن اور ساری تعلیم ہمارے ہادی کی یہی ہے کہ وہ استعداد جو بدفطرت میں خدا نے رکھی ہے، کام میں لائی جاوے۔ اور دنیا و دین کی ساری نعمتیں حاصل کی جاویں۔ قرآن سر ولیم میور کی سمجھی ہوئی وہ زنجیر نہیں ہے جس میں ہم دنیاوی ترقیات کے لیے جکڑے ہوئے ہیں۔ برخلاف اس کے وہ بندوں کو توڑنے والے ہیں جو عیسائیت نے یا عیسائیوں نے انسانوں پر اس سے روکنے کے لیے لگائے تھے۔ غور کرو خدا کی اس جھڑکی پر جو رہبانیت اور جوگی بننے کے لیے ہے۔ من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہٖ (کسی نے خدا کی وہ نعمت حرام کی جو خدا نے بندوں کے لیے پیدا کی) پڑھو خدا کی یہ آیت جو دنیاوی لذتوں سے متمتع ہونے کے لیے ہے کلو من طیبات ما رزقنکم واعملوا صالحاً (اچھی چیزیں جو ہم نے روزی کی ہیں کھاؤ اور نیک کام کرتے رہو)..... دیکھو کیسا عام اجازت نامہ ہے خدا کا، دنیا کمانے کے لیے۔ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (زمین پر پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو) پھر خدا اپنے اچھے بندوں کو کیا دعا سکھاتا ہے۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ (اے ہمارے رب! تو ہم کو دنیا و آخرت دونوں جگہ کی بھلائی دے) یعنی دنیا اور دین دونوں کی بھلائی جبکہ قرآن کے یہ احکام ہوں اور طلب معیشت اور تجارت اور کسب حلال کے لیے صاف صاف ترغیبیں اور بشارتیں، جیسا کہ ہمارے ہادی نے طلب معیشت کے لیے فرمایا ہو۔ ان من الذنوب ذنوبا لا یکفرہا الا الہم فی طلب المعیشۃ (یعنی ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف یہ ہے کہ معاش کی فکر میں رنج اٹھایا جاوے) اور تجارت کے لیے ارشاد کیا ہو کہ التاجر الصدوق یحشر یوم القیامۃ مع الصدیقین والشہداء (سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اٹھے گا) اور طلب دنیا کے لیے صاف صاف لفظوں میں یہ خوشخبری سنائی ہو کہ "جو شخص دنیا کو حلال طریقوں سے تلاش کرتا ہے اور جس کا مقصد سوال سے بچنا اور آل و اولاد کے لیے کوشش اور ہمسایہ پر مہربانی کرنا ہوتا ہے اس کا منہ خدا کی ملاقات کے وقت چودھویں رات کے چاند سا ہوگا" تو کیا ایسا مذہب دنیاوی خوشیوں کے حاصل کرنے کے لیے انسان کے پاؤں کی زنجیر ہے، ہرگز نہیں، بلکہ وہ ان کے لیے خطِ آزادی ہے۔"

محسن الملک

پروفیسر محمد محسن

سیرت پاک کی اہمیت

رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کی ذات بابرکات ہمارے لیے دو حیثیتوں سے اہمیت کی
حامل ہے۔ ایک تو یہ کہ خدا کا پیغام ہمارے پاس آپ کی وساطت
سے ہی پہنچا اور آپ کی ہی بدولت ہمیں خیر امت کہے جانے
کا شرف حاصل ہوا۔ دوسری یہ کہ آپ کی ذات ہمارے
لیے انسانِ کامل کا ایک زندہ جاوید مرقع ہے۔ یہ ایسا
ایسا نمونہ ہے جس کی مثال اس دنیا کی تاریخ میں
نہیں ملتی۔ ہم اپنے کو اس نمونے پر ڈھال کر فلاح دارین
حاصل کرسکتے ہیں۔ آپ کا نقشِ قدم ہمارے لیے مشعلِ
راہ ہے۔ حقیقت میں آپ کی سیرتِ پاک اور قرآن حکیم
کی تعلیمات ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اللہ جل
شانہٗ کا آنحضرتؐ کو ارشاد ہے۔ لَقَدْ آتَيْنَاكَ
سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (الحجر)
(ہم نے دی ہیں تمہیں سات آیتیں اور قرآن عظمت والا)
یہ سات آیتیں سورۃ فاتحہ کی ہیں جو ہر نماز کی ہر رکعت
میں دہرائی جاتی ہیں اور بطور وظیفہ بار بار پڑھی جاتی
ہیں۔ خدا مسلمانوں کو خطاب کرتا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ
فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو
اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (الاحزاب)
جو لوگ اللہ سے ملنے اور آخرت کا ثواب حاصل کرنے
کی امید رکھتے ہیں اور کثرت سے خدا کو یاد کرتے ہیں
ان کے لیے خدا کی ذات بہترین نمونہ ہے۔
باری تعالےٰ نے انسان کے اندر اپنی روح
پھونکی ہے۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ
بَشَرًا مِّن طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ
مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (سورۃ ص)
جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے میں تخلیق کرنے
جا رہا ہوں انسان کو مٹی سے جب ٹھیک بنا چکوں
اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم گر پڑو
سجدے میں۔" خدائے برتر نے انسان کی فطرت
کی تخلیق اپنی فطرت کے مطابق کی۔ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي
فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم) (وہی تراش ہے اللہ
کی جس پر تراشا انسانوں کو) ان آیتوں سے مراد
یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اس کی صلاحیت بخشی
ہے کہ وہ صفاتِ باری تعالےٰ سے اپنے کو مزین کرسکے
وہ اپنے کو موصوف بصفات بنا سکے۔ کسی دوسری مخلوق
کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہے۔ باری تعالےٰ نے ہمیں
اس کائنات میں اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ اِذْ قَالَ
رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرۃ)
جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے میں بنا رہا ہوں
(؟) زمین پر ایک نائب۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ
الْأَرْضِ (الاعراف) (اسی نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں

نائب وہی ہو سکتا ہے جو بنانے والے کے اوصاف سے
بہرہ ور ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اللہ تعالےٰ نے
مومنوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے۔ صبغۃ اللہ
ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عٰبدون
(البقرہ ع) کہو ہم نے خدا کا رنگ قبول کیا اور کس کا
رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے۔" ہم اسی کی بندگی
کرتے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ صفات باری تعالےٰ سے
زیادہ حمیدہ کون اوصاف ہو سکتے ہیں۔ رسول خدا
حضرت محمدؐ نے اپنی سیرت میں اللہ کے رنگ کی آئینہ
داری کا عدیم المثال نمونہ ہمارے سامنے پیش کر دیا
ہے۔ آپؐ کے اسوۂ حسنہ میں صفات باری تعالےٰ
کی جلوہ کاری کا مکمل نقش ہمیں ملتا ہے۔ آپ کی سیرت
ہمارے اندر مذکورہ صفت بننے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔
ہمارے خمیر میں وہ جوہر صفات باری تعالےٰ سے متصف
ہونے کے ودیعت کیے گئے ہیں، باوجود اپنی بشری
کمزوریوں کے ہم ان کی آبیاری کر کے انھیں پروان
چڑھا سکتے ہیں۔ اس بات کا سبق ہمیں آنحضرت کی
سیرت سے ہی مل سکتا ہے۔

آنحضرت کو اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ قل
سبحٰن ربی ہل کنت الا بشرا رسولا۔ کہدو
سبحان اللہ۔ میں کون ہوں مگر ایک آدمی ہوں بھیجا
ہوا (بنی اسرائیل ۱) قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ
الی انما الٰہکم الٰہ واحد (حم سجدہ ۱) کہو! میں بھی
آدمی ہوں جیسے تم۔ مجھ پر حکم ہوا ہے کہ تم پر بندگی ایک
حکم کی ہے"۔ قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا
الا ماشاء اللہ۔ (یونس ۵) کہدو! میں اپنے برے
بھلے کا مالک نہیں ہوں مگر جو چاہے اللہ آپ کی

بشریت کے طفیل میں ہی آپ کی سیرت ہمارے لیے مشعل
راہ بن سکتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے صرف آپ کی بشریت
نہیں بلکہ سارے دوسرے پیغمبروں کی بشریت کی تصدیق
کی ہے۔ وما ارسلنا قبلک الا رجالا۔ ما جعلنٰھم
جسدا لا یاکلون الطعام وما کانوا خالدین (انبیاء)
ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے رسول جو بشر نہیں تھے اور
ہم نے ان کے اعضا ایسے نہیں بنائے کہ وہ کھانا نہ
کھائیں اور نہ تھے وہ ہمیشہ رہنے والے۔ ولقد ارسلنا
رسلا من قبلک وجعلنا لھم ازواجا وذریۃ (الرعد)
اور بھیج چکے ہم کتنے رسول تم سے پہلے اور ہم نے دی تھیں
ان کو بیویاں اور اولاد" اسی طرح سورہ ابراہیم
میں بہت سارے پیغمبروں کا ذکر ہے جنھوں نے اپنی
قوم سے کہا ہم تو تمہارے ہی جیسے انسان ہیں۔ قالت
لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم (سورۃ
فرقان میں بھی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وما ارسلنا
قبلک من المرسلین الا انھم لیاکلون الطعام
ویمشون فی الاسواق اور نہیں بھیجے ہم نے تم
سے پہلے رسول مگر جو کھاتے تھے کھانا اور بازاروں
میں گھومتے تھے"۔

یہ ساری آیتیں پیغمبروں کی بشریت پر دلالت
کرتی ہیں۔ حقیقت میں اگر پیغمبر بشر نہ ہوتے تو انسان
اپنی بشری کمزوریوں کے ساتھ ان کی سیرت کو
اپنے لیے نمونۂ عمل کیسے بنا سکتا تھا؟

آنحضرت کی سیرت کی اہمیت کو نظر انداز
کرنے کے لیے ہم نے آپ کی ذات سے بہت سارے
معجزے منسوب کر دیے ہیں اور ان کے بیان میں
نہایت مبالغہ آمیز خیال آرائیاں کی ہیں۔ اس سے

تحت شعوری مقصد یہی ہے کہ آپؐ کی ذات کو دائرۂ
بشریت سے خارج کر کے ہم بہ آسانی اپنے کو اس
فریب میں مبتلا کریں کہ ہم اپنی بشری کمزوریوں کے
ساتھ آپؐ کے نقش قدم کو چراغ راہ کس طرح بنا سکتے
ہیں۔ چنانچہ سورۂ الم نشرح میں الم نشرح لک
صدرک کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ فرشتوں نے
آپؐ کا سینہ چاک کیا اور آپؐ کے قلب کو شستہ اور
صاف کر کے پھر آپؐ کے سینے میں پیوست کر دیا یعنی
اس طرح آپؐ کے قلب سے بشریت کے سارے نقش
معدوم کر دیے گئے۔ شرح صدر کا استعمال قرآن
میں اور بھی چند مقامات پر پایا جاتا ہے جہاں اس
کا مفہوم سینہ چاک کرنا نہیں ہے۔ مثلاً فمن یرد اللہ
ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام (سورۂ انعام)
"اللہ جس کو ہدایت کرتا ہے، اس کا سینہ کھول دیتا ہے
اسلام کے لیے۔" اسی طرح حضرت موسیٰؑ نے باری تعالیٰ
سے التماس کیا۔ "رب اشرح لی صدری (طٰہٰ)
اے رب! کھول دے میرا سینہ"۔ حقیقت میں معجزہ
سے پیغمبر کی عظمت کے بجائے باری تعالیٰ کی قدرت کاملہ
کی تصدیق ہوتی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے اس
کائنات کو ایک قانون کے تابع کیا ہے اور بالعموم
تمام واقعات اسی قانون کے تحت ظہور پذیر ہوتے
ہوتے ہیں۔ لیکن چوں کہ باری تعالیٰ قادر مطلق ہے
وہ اپنے بنائے ہوئے قانون کا تابع نہیں ہے۔ اس کے
اذن سے قانون قدرت کے خلاف بھی واقعات رونما
ہو سکتے ہیں۔ معجزہ ایسے ہی واقعات کا نام ہے۔ کسی
پیغمبر کا معجزہ اس پیغمبر کے خرق عادت [illegible]
پیش نہیں کرتا ہے اس سے کسی [illegible]

نہیں ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ نے بہت سارے
معجزوں سے نوازا تھا۔ لیکن ان کا کوئی معجزہ ان کی
ذات کی مافوق البشری کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا
قرآن مجید میں جہاں ان کے معجزوں کا ذکر آتا ہے
تو اسی کے ساتھ باذنی یعنی "میرے حکم سے" شامل
ہے "واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی
فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذنی وتبرئ الاکمہ
والابرص باذنی واذ تخرج الموتی باذنی
(المائدہ) "جب تم نے بنایا مٹی سے پرندہ کی صورت
میرے حکم سے پھر پھونکا اس کو تو ہو گیا اڑنے والا
میرے حکم سے اور اچھا کیا مادر زاد اندھے اور کوڑھی
کو میرے حکم سے اور نکال کھڑا کیا مردوں کو میرے
حکم سے۔" یعنی یہ ساری کرامات حضرت عیسیٰؑ کی اپنی
ذاتی نہیں [illegible] یہ سارے معجزے اللہ تعالیٰ کی قدرت
[illegible] اس کے اذن سے ہر اس بات کا جو بظاہر ناممکن
ہو ممکن ہو جانا ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح جب غزوۂ
بدر میں آنحضرتؐ نے مٹھی بھر کنکریاں ہوا میں پھینک
دیں اور وہ دشمنوں کی آنکھوں میں چلی گئیں اور
اس طرح کفار کا لشکر پسپا ہونے لگا تو یہ محض اللہ
کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ "وما رمیت اذ رمیت ولکن
اللہ رمی (الانفال) "تم نے نہیں پھینکی جس وقت پھینکی
بلکہ اللہ نے پھینکی۔" یعنی کنکریوں کا کفار کی آنکھ میں پہنچ
جانا اور اس طرح مٹھی بھر سنگ ریزوں سے فوجوں کا
منہ پھیر دینا یہ حضور اکرمؐ کی اپنی خارق عادت
کی دلیل نہیں تھی۔

آپ [illegible]
[illegible]

جماعت کو آپ نے چاند کی طرف دیکھنے کو کہا اور چاند کے
دو ٹکڑے ہو گئے۔ سورہ فتح کی جس آیت سے اس معجزے
کی سند حاصل کی جاتی ہے وہ بس اس قدر ہے ۔
"اقتربت الساعۃ وانشق القمر" (آ گئی
قیامت اور پھٹ گیا چاند)" اس آیت کا یہ بھی مفہوم
ہو سکتا ہے کہ قیامت کے آتے ہی چاند دو ٹکڑے ہو جائے
گا۔ قیامت کے ورود پر نظام کائنات کے درہم برہم
ہو جانے کے تفصیلی بیانات قرآن مجید کے اندر بکثرت
موجود ہیں۔ اس میں چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا بھی شامل
ہے۔ ہمیں اس کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں
ہو سکتا کہ آپ نے کفار کو چاند کی طرف دیکھنے کو کہا
اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جس طرح آپ نے غزوہ
بدر میں مٹھی بھر کنکر دے پھینکی اور اس کا ایک ایک ریزہ
لشکر کی آنکھ پہنچ گیا تو اس کے پیچھے اللہ کا ہاتھ تھا۔
یعنی یہ اس کی قدرت کاملہ کا کرشمہ تھا۔ اسی طرح چاند
کے دو ٹکڑے ہو جانا بھی باری تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر
دلالت کرتا ہے۔ جس خدا نے کن فیکون کہہ کر دنیا
کی تخلیق کی تو کیا اسی طرح اس کے اذن سے چاند دو
ٹکڑے ہو کر پھر سالم نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح واقعہ
معراج کا بیان بھی قرآن میں مجملاً ہی ہوا ہے لیکن اس
کی تفصیلات میں جانے کتنے دفتر سیاہ کر دیے گئے ہیں
اور کیسی کیسی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ معراج کے جسمانی یا
روحانی ہونے پر بھی طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ لیکن ان
ساری بحثوں کا آپ کی سیرت سے کوئی تعلق نہیں ہے
... آپ کی سیرت کو اپنے لیے مشعل راہ بنانے کی
[illegible] ترغیب ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد
ہے "ھو الذی انزل علیک الکتاب منه آیات

محکمٰت ھن ام الکتاب واخر متشٰبھٰت فاما الذین
فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء
الفتنة وابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الا
اللّٰہ- والراسخون فی العلم یقولون امنا به کل
من عند ربنا" (آل عمران) وہی ہے جس نے
اتاری تم پر کتاب اس میں بعض آیتیں محکم ہیں یعنی
ان کے معنی واضح ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں - اور دوسری
متشابہ یعنی جن کے معنی معلوم یا متعین نہیں۔ جن کے
دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں
فتنہ پیدا کرنے کی غرض سے اور اس کی تاویلات کرتے
ہیں۔ حالانکہ سوائے اللہ کے کوئی ان کا مطلب نہیں
جانتا۔ جن کا علم پختہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کو
تسلیم کر لیا وہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے ۔
متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کے مفہوم کو سمجھنے
میں کچھ اشتباہ یا التباس کے واقع ہونے کا احتمال
ہے ۔ قرآن پاک کی ساری تعلیمات کی جڑ یہی آیتیں ہیں
جنھیں محکمات کہا گیا ہے۔ حضرت محمدؐ کی سیرت ہمیں ان
محکمات پر عمل پیرا ہونے کا ایک مثالی خاکہ پیش کرتی ہے اور
یہی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ باقی باتیں جو متنازع فیہ
ہو سکتی ہیں ان پر بھی اسی طرح مان لینا چاہیے جس طرح
قرآن حکیم میں ان کا بیان ہوا ہے۔ ان کی بحث میں
پڑنے کا کوئی حاصل نہیں ہے۔

حضرت محمد صلعم سے قیامت کے متعلق بہت ساری
پیشن گوئیاں منسوب کی گئی ہیں۔ یہ آپ کے خوارق
عادات کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔ حالاں کہ
قرآن حکیم کی اکثر آیتیں ان کے بطلان پر دلالت کرتی
ہیں۔ یسئلک الناس عن الساعة۔ قل انما علمها

عند اللہ - "تم سے لوگ قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں
کہہ دو اس کا علم اللہ کو ہے"۔ الیہ یرد علم الساعتہ
قیامت کا علم صرف اسی کو ہے" قل لا یعلم من السموات
والارض الغیب الا اللہ۔ "کہہ دو میں نہیں جانتا جو
کچھ آسمان اور زمین میں چھپا ہوا ہے سوائے اللہ کے
(انمل) ۔ آنحضرت کو ارشاد ہے کہ کہیں (ولو کنت اعلم
الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء
اگر میں جان لیا کرتا غیب کی باتیں تو بہت کچھ بھلائیاں
حاصل کر لیں ہوتیں اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی ۔
اسی طرح لوگوں نے آپ سے روح کے بارے میں پوچھا
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ ویسئلونک عن الروح قل
الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا
تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دو روح ہے
میرے رب کی طرف سے اور ہم نے جو تم کو علم دیا ہے وہ
قلیل ہے ۔ اس کے بعد ارشاد ہے ولئن شئنا
لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک
بہ علینا وکیلا ۔ اگر ہم چاہیں تو لے جائیں اس
کو جس کی ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے خبر دی ہے ۔
پھر تم اسے واپس کر دینے کے لیے ہم کو ذمہ دار
نہ پاؤ گے ۔

قرآن حکیم ہمیں دین اسلام کے مکمل ہونے کی
بشارت دیتا ہے ۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت
علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (مائدہ)
آج میں پورا کر چکا تمہارے لیے دین تمہارا اور پورا
کیا تم پر اپنا احسان اور پسند کیا تمہارے واسطے دین
اسلام ۔ اسلام کی تکمیل کے بعد معجزے کی کوئی اہمیت
باقی نہیں رہی ۔ کفار حضور صلعم سے کہا کرتے ہم تمہاری
بات نہ مانیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین سے چشمہ
نہ جاری کر دو۔ یا تمہارے پاس ایک باغ ہو انگور
اور کھجور کا اور تم اس کے بیچ میں ایک نہر نکالو۔
یا تم آسمان کے ٹکڑے ہم پر گرا دو یا اللہ اور
فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ۔ یا تمہارا ایک سنہرا
گھر ہو یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ایک
کتاب لے آؤ جسے ہم پڑھ سکیں (بنی اسرائیل)
یعنی کفار آپ سے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ خدا
آپ سے کہتا ہے کہ کہہ دو سبحان اللہ! میں تو
ایک بشر ہوں بھیجا ہوا" اللہ تعالیٰ یہ کہہ کر آپ
کی خاطر جمع رکھتا ہے۔ لقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات
فسئل بنی اسرائیل اذ جاءھم فقال لہ فرعون
انی لاظنک یا موسیٰ مسحورا (بنی اسرائیل) ہم
نے موسیٰ کو نو نشانیاں دیں کھلی ہوئی۔ پھر پوچھ بنی اسرائیل
سے جب وہ آئے اس کے پاس تو فرعون نے کہا میرے خیال
میں موسیٰ تجھ پر جادو ہوا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ کے معجزات
کسی طرح کام نہ آئے

ہم نے آنحضرت کی سیرت کو وہ اہمیت نہیں دی جو
اس کا حق ہے ہم نے دوسری باتوں کی تفصیلات میں اپنے کو
الجھا دیا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔ خدا
بار بار کہتا ہے کہ اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ اس میں
کوئی الجھاؤ نہیں ہے احکام خداوندی جنہیں قرآن حکیم نے
محکمات کہا ہے وہ کسی فلسفیانہ موشگافی کی محتاج نہیں
ہیں۔ ان کا عملی نمونہ حضرت محمد کی سیرت میں ہمارے
سامنے ہے آپ کی زندگی کسی فوق البشر کی زندگی
نہیں تھی۔ آپ کی سیرت ہمارے لیے صحرائے حیات میں
نقش قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر سید محمد ہاشم

محسن الملک

جب سرسید کی کتاب "تبیین الکلام" شائع ہوئی تو اس کے بعض مختلف فیہ مسائل سے محسن الملک نے شدید اختلاف کیا اور اس وجہ سے وہ سرسید کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ خط و کتابت شروع ہوئی اور سرسید نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی [illegible] نہ ہوئے۔ تب افہام و تفہیم کے لیے [illegible] محسن الملک کو بنارس آنے کی دعوت [illegible] کوششوں کے بعد وہ وہاں گئے اور [illegible] یہاں قیام پذیر رہے۔ بہت بحث و مباحثہ [illegible] لیکن بے اثر رہا۔ رات میں سو رہے تھے کہ اچانک کسی کے رونے کی آواز سے آنکھ کھلی۔ غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ سرسید بے تحاشا رو رہے ہیں۔ محسن الملک کو تشویش ہوئی اور انھوں نے جاکر معلوم کیا کہ کیا خدانخواستہ گھر سے کوئی تار آیا ہے۔ سرسید نے جھلا کر جواب دیا کہ پوری قوم تباہ ہو گئی اور تم یہ پوچھتے ہو کہ گھر سے کوئی تار آیا [illegible]

پھر کیا تھا، محسن الملک نے تمام مخالفتیں بالائے طاق رکھ دیں اور اس وقت سے آخر دم تک سرسید جیسے محسن القوم کے ہر وقت کے رفیق و دمساز بن کر رہ گئے۔ اگرچہ مذہبی امور میں ان سے اختلاف بھی رہا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ انھی کے دست راست اور ترجمان کے طور پر اپنا تشخص اور اپنی شناخت قائم کر گئے اور بقول مولوی بشیر الدین "نواب محسن الملک کی ذات میں سرسید کو ایک سچا دوست، علی گڑھ تحریک کو ایک انتھک اور پُرجوش مبلغ اور ایم۔ اے۔ او کالج کو ایک فیاض طبیعت مربی و محسن مل گیا تھا۔ میں نے محسن الملک کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق بھی ہوا ہے، وہ بڑے زندہ دل، فراخ مشرب خوش مزاج آدمی تھے۔ جیسے اپنی بات کے دھنی تھے ویسے ہی کام کے بھی دھنی تھے۔ انھوں نے جس خلوص اور انہماک اور جوش و مستعدی سے سرسید کے کاموں میں ہاتھ بٹایا اس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔"

محسن الملک بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ قومی خدمت کے سلسلے میں عہد حاضر کی دیو قامت شخصیات میں سے بیشتر ان کے مقابلے میں بونے معلوم ہوں گے۔ ان کا فیضان صرف علی گڑھ پر ہی عام نہیں رہا بلکہ زندگی کا بہترین حصہ سرکاری ملازمت اور اس کے بعد مملکت آصفیہ کی خدمت میں گزارا اور وہاں انقلاب انگیز کارنامے انجام دیے اول اول بہت ہی معمولی درجے کی سرکاری ملازمت

کی۔ ان کی ذمہ دارانہ زندگی کا آغاز سترہ اٹھارہ برس
کی عمر میں دس روپے کی محرری اور اہلکاری سے ہوا۔
پھر پیشکار، سررشتہ دار، تحصیلدار اور بالآخر ڈپٹی
کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ اس کے بعد حیدرآباد میں
ناظم بندوبست سے ترقی کرتے کرتے ریاست کے خزانے
اور مال جیسے محکموں کے سکریٹری بنائے گئے، جاہ و
ثروت اور مناصب کے لحاظ سے اجلّہ روزگار بن گئے۔
ریاست کے حکمرانوں اور انگریزی افسروں کے ساتھ
رہنے کی وجہ سے معیارِ زندگی بہت بلند ہوگیا بالخصوص
انگریزی طرزِ معاشرت کے اتنے دلدادہ ہوگئے کہ جب
مکان بنوایا تو اس کے لیے اس زمانے کے ستر ہزار روپے
کا فرنیچر انگلستان سے منگوایا، ظاہر ہے ابتدائی حالات
کی روشنی میں اس قدر عظمت کا تصور بھی مشکل تھا۔
وہ ۹ر دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ (یوپی) کے
ایک معزز و ممتاز شہری میر ضامن علی کے یہاں پیدا
ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب سادات بارہہ سے جاملتا
ہے۔ محسن الملک مولوی مہدی علی کے نانا مولوی محمود
علی مناصب جلیلہ پر فائز رہے تھے۔ پہلے وہ صدر الصدور
تھے پھر ریاست ٹونک میں وزیر ہوئے۔ یہ سب کچھ تھا
مگر ابتدائی تعلیم خانگی مکتب تک محدود رہی جسے اپنی
ذاتی کوشش و کاوش اور فطری ذوق سے انھوں
نے جلا بخشی اور چند ہی برس میں علمائے کبار کے
درس میں شریک ہوکر تکمیل تعلیم کی۔ طالبعلمانہ ذوق
اتنا بلند تھا کہ حدیث، تفسیر اور ادب کی کتابیں
ہر وقت مطالعے میں رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ کلاسیکی
شعراء کے دواوین سے خصوصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ سیکڑوں
عربی، فارسی اور اردو کے اشعار زباں زد رہتے

تھے۔
وہ شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ مطالعہ و مشاہدہ
کی بیکراں دولت سے مالا مال تھے۔ نوجوانی کے زمانے
میں ہی انھوں نے سنّی مسلک اختیار کرلیا۔ نیز اپنے
سابقہ مسلک کے پیرودں کی طرف سے کیے جانے والے
اعتراضات کا احاطہ کرکے اس کے جواب میں "آیات
بیّنات" کے نام سے ۱۸۷۰ء میں ایک کتاب بھی لکھ
کر شائع کی۔ انھوں نے اس کی تین جلدیں لکھیں
اس کا مدلل انداز بیان ان کے اس مخصوص رنگ طبیعت
کا آئینہ دار ہے اور اس سے بھی بہت پہلے وہ میلاد
اور وعظ کی محفلوں میں شریک ہوکر مذہبی تقریریں
کیا کرتے تھے جس نے ان کے جوہر تقریر کو نکھارنے
میں نمایاں کردار ادا کیا۔ غرض کہ ان کی بنیاد مذہبی
تھی، حالات اور زمانہ نے اس کے صیقل کا کام دیا
اب لاکھ حالات بدل جائیں، وہ حیدرآباد رہیں یا
سرسید کے مشن کے مبلغ ہوں، کسی عہدے اور منصب
پر پہنچ جائیں، ہر جگہ ایک فصیح البیان مذہبی مقرر کی
حیثیت سے ظاہر ہوئے۔ تبدیلی مسلک کا عمومی ردّ عمل
اس شخص کے نئے مسلک میں مزید پختگی اور استحکام
و استقامت کا سبب ہوتا ہے۔ اسی ذہن کے ساتھ ان
کی زندگی کا قدم آگے بڑھتا رہا۔
اس کے علاوہ ان کی شخصیت میں دو جوہر
اور قابل ذکر ہیں۔ ان کی شخصیت کی کشش و جاذبیت
جس سے بات کرلیتے، مسحور ہو جاتا۔ بہت ذہین،
طبّاع، خوش بیان، لفظوں کا جادو جگانے والے، لفظ
کے استعمال میں انتہائی محتاط، لیکن روانی کا دامن
ہاتھ سے نہیں جاتا تھا۔ گفتگو بہت دلچسپ اور شیریں

ظرافت اور اس میں وقار۔ اور وقار میں ظرافت۔ لہجے
میں سنجیدگی اور متانت کا عمل دخل۔ نجی محفلوں میں باغ
وبہار اور نکھری ہوئی شخصیت کے مالک، سرکاری
اور مشاورتی مجلسوں میں علمیت کے ساتھ ساتھ سلجھا ہوا
واضح اور موثر انداز تکلم۔ اس فن میں وہ کمال حاصل تھا
کہ مخالفین بھی اس کی دست رس سے محفوظ نہ تھے۔ چنانچہ
کتنے ہی واقعات اس کی شہادت میں پیش کیے جا سکتے ہیں
بدرالدین طیب جی (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نہیں،
بلکہ ان کے دادا سرسید کے ہمعصر، بمبئی کی ایک سربرآوردہ
شخصیت) سرسید اور ان کے مشن کے بڑے مخالفین
میں سے تھے، ایک بار نواب صاحب نے ان تک رسائی
حاصل کر لی اور ان کے ساتھ اپنی شگفتہ بیانی، زورِ
استدلال اور اثر آفریں گفتگو کے اختتام تک کچھ اس
انداز سے پہنچے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور پھر تو
طیب جی نہ صرف سرسید تحریک کے حامی ہو گئے بلکہ
ایک خطیر رقم کانفرنس کو عطا کی اور آئندہ سال کانفرنس
کے اجلاس کی صدارت بھی کی۔

دوسری خصوصیت تھی انتھک محنت
اور لگن نیز بہت ہی تدبر کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ
یوں تو یہ بات بہت سے لوگوں میں مل جاتی ہے لیکن
کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو یہ ملکہ کچھ سوا ہی
عطا ہوا تھا۔ ان کا ذہن بڑا مرتب تھا اور بہت منضبط
بند طریقے پر کام کرتا تھا، ۱۸۶۱ء میں وہ تحصیلدار
ہوئے۔ اس زمانے میں شہر میں عمدہ عمدہ عمارتیں
بنوائیں، سیدھی اور چوڑی سڑکیں نکلوائیں اور
کوچہ و بازار کو پر رونق بنایا۔ ۱۸۶۷ء میں وہ
ڈپٹی کلکٹر مرزا پور ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں انھیں قحط
کا انتظام سنبھالنے کی ذمہ داری دی گئی تھی جسے
انھوں نے بہت تندہی، محنت، لگن اور جانفشانی
سے انجام دیا۔ ان کے افسر انگریز کلکٹر کا اس پر
اظہار خیال تمام انسلاکات کے ساتھ ذہن پر ایک
لافانی نقش چھوڑتا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ "میں
دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مہدی علی سے زیادہ
ذہین و مستعد اور ایماندار ملازم صوبہ ممالک مغربی
وشمالی میں نہیں ہے۔"

سرسید کی یہ عجیب و غریب خوبی تھی کہ
انھیں جو بھی جوہر قابل نظر آتا، اسے ریاست
حیدرآباد میں اعلیٰ عہدوں پر ملازمت دلواد یا کرتے
تھے۔ مولوی چراغ علی اور وقار الملک اس کی زندہ
مثال ہیں۔ لیکن ان دونوں سے پہلے محسن الملک
(جو ابھی صرف مولوی مہدی علی ہی تھے) کے لیے سرسید
نے سفارش کی اور ۱۸۷۴ء میں سرکاری ملازمت
سے استعفا دے کر آٹھ سو روپے ماہانہ پر مملکت
آصفیہ سے منسلک ہو گئے۔ ان کی مسلسل جدوجہد
اور قدم قدم پر کامیابیوں کے سبب تنخواہ اور
مناصب میں ترقی ہی ہوتی رہی۔ چنانچہ پہلے وہ ناظم
بندوبست اور انسپکٹر جنرل مال مقرر ہوئے، پھر
کمشنر بندوبست ہو گئے، پھر ریونیو سکریٹری ہوئے
(جو اس محکمے کا بلند ترین عہدہ تھا) اور بالآخر تین ہزار
روپے کے مشاہرے پر فائنشل اور پولیٹکل سکریٹری
(معتمد خزانہ وسیاسیات) کے عہدوں تک
پرواز کی۔

اعلیٰ درجے کے دوسرے افسروں کی طرح
محسن الملک کی ذمہ داریاں بھی منتخب اور پیچیدہ تر

تھیں اور اُن کو انھوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔
لیکن دو چیزیں یادگار ہو کر رہ گئیں۔ ریاست حیدرآباد
بہت امیر ریاست تھی لیکن بندوبست، مالگزاری،
حساب کتاب اور بجٹ کے سلسلے میں وہاں کوئی نظم
اور ضابطہ نہیں تھا۔ محسن الملک نے مصر کے مشہور
عام بجٹ کے طرز پر پہلی بار ریاست کا بجٹ تیار کیا
اور ایسی بجٹ رپورٹ پیش کی جس پر ہر جگہ حیرت کا
اظہار کیا گیا۔ بالخصوص بنگال کے گورنر نے 'جہاں کے
بجٹ کا بڑا شہرہ تھا' اس رپورٹ کو ہر لحاظ سے
عمدہ بتاتے ہوئے بنگال کے بجٹ سے بھی بہتر قرار دیا
مولوی ذکاء اللہ جو تاریخ ہند کے امام اعظم ہیں'
انھوں نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے
لکھا تھا کہ

"محسن الملک نے دکن میں وہ کام کیا جو
شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہندوستان کے
اندر ٹوڈرمل نے اور ممالک مغربی و شمالی
میں ٹامسن صاحب لفٹننٹ گورنر نے اور
مدراس میں منرو صاحب گورنر مدراس
نے اور بمبئی میں کپتان ونگیٹ نے کیا تھا
کہ ان کے بندوبست سے گورنمنٹ مالامال
اور رعایا نہال و خوش حال ہو گئی۔"

یہ کسی وقتی تاثر کا اظہار نہیں بلکہ ایک
بڑے مورخ کے اس مقابلے کا نتیجہ ہے جو اس کے
ذہن اور علم میں صدیوں کو محیط جیدہ کارناموں پر
مشتمل و مستنبط ہوتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ
مولوی ذکاء اللہ کے علاوہ ممالک متحدہ کے لفٹننٹ
گورنر بنگال اور خود وائسرائے لارڈ ڈفرن نے
سر اسٹوارٹ بیلی لفٹننٹ گورنر بنگال اور خود وائسرائے
لارڈ ڈفرن نے بہت کھل کر اظہار تحسین کیا۔ بالکل اسی
طرح کی داد تحسین انھوں نے ۱۸۷۷ء میں دکن اور
مغربی کرناٹک کے قحط زدہ علاقوں کی ذمہ داری سنبھال
کر حاصل کی تھی۔

دوسرا قابل ذکر کارنامہ یہ ہے معدنیات
کے ٹھیکے سے متعلق ریاست کے بعض حکام اور اعلیٰ انگریزی
افسروں نے مل کر ایک زبردست سازش تیار کی تھی
جس میں ریاست کروروں روپے کے نقصان میں
مبتلا ہو جاتی۔ موصوف نے اپنی حکمت اور تدبیر سے
بڑے پُراسرار طریقے پر اس راز کا انکشاف کر دیا
اور ریاست کی حمایت و وکالت کے لیے اس کیس میں
انھیں انگلستان تک جانا پڑا۔ وہاں بھی بڑے تدبر
اور فراست سے کام لیا، کامیاب ہوئے اور سرخ رو
ہو کر اس طرح واپس لوٹے کہ مسٹر گلیڈاسٹن (وزیر
اعظم برطانیہ) سے تعلقات قایم ہو گئے اور آخر وقت
تک مراسلت جاری رہی۔

ظاہر ہے یہ ایسی خدمات تھیں جن کے
صلے میں انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب دیا جا سکتا تھا۔
چنانچہ ۱۸۸۴ء میں انھیں "منیر نواز جنگ" کا خطاب
عطا ہوا اور ۱۸۸۷ء میں محسن الدولہ محسن الملک
کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ریاست
نے کوشش کر کے حکومتِ برطانیہ سے بھی منظور کرا لیا
ورنہ اس طرح کے خطابات ریاستی سطح کے ہوتے تھے
اور حکومت سے منظوری منوا بڑا اہم کام ہوتا تھا۔
فکر و تدبر کے یہ نمونے صرف منصبی ذمہ
داریوں تک ہی محدود نہ تھے بلکہ ایسی جگہ بھی ان کا

ذہن رسا تھا جہاں بڑے بڑے مدبر اور عہدیدار
سبھی ناکام رہے۔ ان کے زمانے میں اعلیٰ حضرت
آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں نظام الملک جو
والیٔ ریاست تھے، ان کے تعلقات ان کے وزیر عماد
السلطنت سالار جنگ ثانی سے ذرا کشیدہ ہو گئے
جس کے سیاسی اسباب تھے۔ ریذیڈنٹ جو عملی اعتبار
سے اعلیٰ حضرت کا نگراں ہی تھا، اس کی شہ پر عماد
الملک کے حوصلے بلند ہوئے تھے اور جب اعلیٰ حضرت
نے انھیں وزارت سے برطرف کرنا چاہا تو ریذیڈنسی
نے کھل کر عماد السلطنت کی حمایت کا اعلان کر دیا۔
یہ باور کرنا مشکل نہیں کہ یہ کشمکش کتنی پیچیدگی اختیار
کر گئی ہوگی اور نواب محسن الملک تو دونوں کے ہی
ملازم تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک کی حمایت ان
کے لیے ناگزیر تھی اور دوسری طرف سے یہی بات ان
کی ملازمت کے لیے خطرہ بھی تھی۔ بات اتنی بڑھ گئی
کہ خود وائسرائے لارڈ ڈفرن کو حیدرآباد آنا پڑا
وہ کئی روز رہے اور مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوا۔ لیکن
یہ دیکھ کر سبھی دنگ رہ گئے کہ ایک روز موقع پاکر
چند لمحوں میں ہی محسن الملک نے ان دونوں فریقوں
کے درمیان مفاہمت کرا کے جھگڑا ختم کرا دیا۔

اس واقعے کے سلسلے میں ان کے حریف
نواب سرور یار جنگ، جنھوں نے محسن الملک کی مخالفت
میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، ان کی مدبرانہ صلاحیتوں
کا اعتراف ان الفاظ میں کرنے پر مجبور ہوئے:

"مولوی مہدی علی نے اپنی سیاسی
قابلیت اور دقیق النظری سے کام لے کر
عرصۂ دراز کی کوششوں کو ایک پلک
جھپکنے ہی میں ختم کر دیا۔ خدا نے ان کو اس
قسم کا دل و دماغ دیا ہے کہ اگر وہ
یورپ میں پیدا ہوتے تو بسمارک اور
ڈزریلی کے ہم پلہ ہوتے۔"

اسی کے ساتھ ایک اور اہم کارنامہ بھی ناقابلِ
فراموش ان کی یادگار میں سے ہے۔

جب سالار جنگ اول کا انتقال ہوا تھا
تو اُن پر اکتیس لاکھ روپیہ قرض تھا۔ سالار جنگ کی
ذاتی ذرائع آمدنی کے پیشِ نظر یہ تو صحیح ہے کہ یہ
روپیہ ان کے ذاتی استعمال میں نہیں آیا ہوگا، بلکہ
قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روپیہ انھوں نے
ریاست کی ایسی اغراض کے لیے لیا تھا جن کو انگریز
گورنمنٹ پر ظاہر کرنا مناسب نہ ہوگا لیکن اب تو
بہر حال اس قرض کا بارِ عظیم ان کے ورثاء اور بیٹیوں
کو ہی اُٹھانا تھا۔ اس زمانے کی یہ زبردست رقم
ادا کرتے کرتے شاید ان کے ورثا دیوالیہ ہو جاتے
محسن الملک نے دریائے تدبر کی غواصی شروع کی
اگرچہ عماد السلطنت یعنی سالار جنگ کے بیٹے ہی سے
وزارت کے مذکورہ معاملے میں اعلیٰ حضرت کی
شکر رنجی ہو چکی تھی اور اس ضمن میں ان کی طرف
سے کوئی بھی رعایت بڑا مشکل کام تھا لیکن محسن
الملک نے انھیں بمشکل تمام اس بات پر آمادہ کر لیا
کہ اس قرض کو وہ اپنی حکومت کی طرف منتقل کر لیں
اور اس کی ادائیگی کی ذمہ داری ان کی حکومت لے
لے۔ چنانچہ یہ گوہرِ مراد ہاتھ آیا۔ بظاہر ناممکن کام
محسن الملک کی ان مخلصانہ کوششوں کی بدولت بخیر
انجام کو پہنچا ——— عماد السلطنت اور

دوسرے درناپیرا اس کا کتنا اثر ہوگا۔

حیدر آباد میں اس شان کے ساتھ بیس برس گزارنے کے بعد جب ۱۸۹۳ء میں وہ پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڑھ آگئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محسن الملک شاید پیدا ہی علی گڑھ کے لیے کیے گئے۔ سرسید کی سرپرستی، علی گڑھ کالج اور نیشنل کانفرنس کے توسط سے قومی خدمت کے جو نادر نمونے انھوں نے پیش کیے وہ رہتے دم تک غازی اور پس از مرگ شہیدوں کی یاد دلاتے ہیں۔ بقول خود محسن الملک سرسید سے ان کے تعلقات ۱۸۶۴ء میں اس وقت قایم ہوئے جب وہ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر بنے۔ اس وقت سے آخر وقت تک محبت اور عقیدت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اور "لحمک لحمی" اور "انا احمد و احمد انا" کا رشتہ قایم ہوگیا۔ مذہبی معاملات میں بحث و تکرار بھی ہوتی لیکن سرسید کی عقلیت اور نیچر کے صحیح ترجمان اور اصل شارح اور سرسید مشن کے اصلی نمائندہ کی حیثیت سے محسن الملک ہمیشہ ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نیچر کی تعریف و توضیح میں انھوں نے سرسید کی فکر نیچر کا سلسلۂ نسب ابن خلدون کے اجتماع انسانی اور نیچر کے روابط، تمدن اور نیچر کا اثر معیشت اجتماعی پر غور و فکر کی اہمیت وغیرہ سے جا ملایا ہے۔ نیز سرسید کی تحریروں سے جو مغالطے اور ابہامات پیدا ہوگئے تھے محسن الملک نے اپنے واضح نقطہ نظر اور صاف ستھرے، شگفتہ و دلنشیں طرز تحریر سے انھیں دور کرنے کی بھرپور کوشش کی اور سرسید کے انداز فکر سے معمولی سا اختلاف کر کے روایت سے بالکل بغاوت کے بجائے اسلاف کی صالح روایات کو قابل قبول سمجھنے کا رجحان پیش کیا ہے اور بہت سی وجوہ میں سے شاید اہم ترین وجہ یہی ہے کہ نیچر کے سلسلے میں سرسید کے خلاف جو شدید ردعمل شروع ہوا تھا، سرسید کے آخری دور میں وہ بہت کم ہوگیا اور محسن الملک کی تحریروں کی بدولت سرسید کا نظریہ عقلیت توازن کی شاہراہ سے گزر کر قوم کے پاس پہنچتا رہا۔

ان دونوں بزرگوں کے درمیان تعلقات کی سطح کا اندازہ سرسید کے قیام انگلستان کے زمانے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ انگلستان [illegible] بیٹھ کر 'خطبات احمدیہ' کے بارے [illegible] وقت سرسید کو جن اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، محسن الملک ہی کی بدولت ان پر کبھی قابو پایا جا سکا۔ سرسید محسن الملک کو خط لکھ دیتے اور محسن الملک کبھی تو چندہ کر کے اور کبھی کوئی چیز فروخت کر کے انھیں روپیہ بھیج دیتے۔ کبھی اپنی پوری تنخواہ ہی انگلستان بھیج دی اور سرسید کی ان مشکلات کو حل کر کے انھیں فارغ البال رکھا۔ مکتوب الیہ کی حیثیت سے محسن الملک کے نام چند خطوط کے اقتباس سے اس جذبے و اعتماد کا اندازہ لگانا آسان ہوگا۔

۱۔ "میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہوجائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں تو بلا سے ...."

۲۔ شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، آنا جانا، ملنا جلنا سب بند ہے

کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپے قرض لے لیجیے، سود اور روپیہ میں ادا کر دوں گا۔ ہزار روپے بھیجنے کے لیے دہلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپے بھیجدو۔ کیا کہیے، اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے۔"

۳۔ "اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا۔"

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام میں انتھک کوشش کرنے والوں میں محسن الملک سرفہرست ہیں۔ حیدرآباد میں وہ اسی تگ و دو میں لگے رہتے تھے۔ جب سرسید نے لکھا کہ تم نے وہاں بہت دن ملازمت کرلی، اب نوکری چھوڑ کر یہاں چلے آؤ۔ چنانچہ وہ یہاں آکر پوری توجہ اور انہماک سے سرسید کے مشن کی تکمیل میں لگ گئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں سرسید کو محسن الملک سے صرف اقتصادی تعاون ہی حاصل تھا، بلکہ وہ تہذیب الاخلاق کے اجرا کے وقت سے ہی اس میں مستقل مضامین لکھ رہے ہیں اور سرسید کے بعد سب سے زیادہ مضامین شاید موصوف نے ہی لکھے۔ اگرچہ انھوں نے کوئی مستقل تصنیف یادگار نہیں چھوڑی تاہم سرسید نے جس فکر و اسلوب کو رواج دیا تھا محسن الملک نے اسے فروغ بخشا اور ان تمام موضوعات پر سیکڑوں اعلیٰ معیار کے مقالے لکھے جو کسی نہ کسی اعتبار سے سرسید کے موضوعات سے مماثلت رکھتے تھے۔ البتہ ان کا اسلوب سرسید سے معمولی سے مختلف تھا۔ منطقی طرز استدلال اور ترغیب و ترتیب کا عنصر دونوں کے یہاں مشترک ہے لیکن محسن الملک کے یہاں سرسید کی سی کرختگی اور شدت نہیں بلکہ دھیما پن اور شیریں طرز تخاطب ہے۔ حصول مقصد کے لیے تمثیل کا سہارا دونوں نے لیا ہے۔ امام غزالی سے دونوں متاثر ہوئے لیکن جلد ہی فرار بھی اختیار کر لیا اور محسن الملک نے ابن خلدون کے دامن میں پناہ لے کر اس کے مقدمے پر دو تبصرے لکھے جن میں عقل و حکمت اور نیچر سے متعلق اپنے افکار کے لیے تصدیق اور سند ابن خلدون کے یہاں سے حاصل کی۔ سرسید کے افکار کی توضیح میں مقدمہ ابن خلدون کے بعض حصوں سے محسن الملک کو بڑی مدد ملی۔ جب کہ روحانی اور متصوفانہ حصے کو موصوف نے افسوس ناک حد تک نظر انداز کیا ہے۔ بہر حال ان مقالات کے ذریعے محسن الملک سرسید پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات دیتے رہے اور الہامات کی مدلل موثر و دلنشیں وضاحت کرتے رہے۔ اسی لیے مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے:

> "نواب محسن الملک جو کچھ لکھتے تھے اس میں ایسی لطافت ہوتی تھی کہ لوگ ان کے مضامین کو پڑھ کر سر دھنتے تھے۔ سرسید پر جو لوگ نکتہ چینی کرتے تھے اس کا جواب وہ ایسی دل ربا ظرافت اور وضاحت سے دیتے تھے کہ سرسید کے حریف دنگ رہ جاتے تھے اور ان سے کوئی معقول جواب نہیں بن پڑتا تھا۔"

محسن الملک کی تصانیف میں زمانۂ تحصیلداری

کے دو کتابچے "قانون مال" اور "قانون فوجداری"
ہیں۔ ایک ابتدائی دور کی تصنیف "میلاد نامہ" ہے
اس کے علاوہ تقلید بالحدیث، کتاب المحبت والشوق
د غزالی، مسلمانوں کی تہذیب، آیات بینات، مضامین
تہذیب الاخلاق، مکمل مجموعہ لکچرز اور مکاتیب ان
کی باقیات الصالحات ہیں۔

ان کی تقاریر مخصوص امتیاز اور اختصاص
کی حامل ہیں۔ خطابت کا جوش ادبی نیرنگیوں کی
شان کمال کے ساتھ سامعہ و باصرہ کو بیک وقت معطر
کرتا تھا، کوئی دلخراش موضوع زیر بحث آجاتا تو موجیں
مارتے ہوئے دریا اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر
کی طرح تلاطم خیزی آجاتی تھی۔ مثلاً رنگون میں بہادر
شاہ ظفر کی قبر کی زیارت کے بعد جو ولولہ انگیز تقریر
کی اس کا اندازہ صرف اس جملے سے ہو سکتا ہے کہ

"سلطنت کا آفتاب ہندوستان سے طلوع
ہوا اور رنگون میں آکر غروب ہوا" اب
علم کا آفتاب رنگون سے اٹھے گا اور اس
کی کرنیں چار دانگ ہند کو منور کر دیں گی"

ممکن نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی تاریخ کسی کے ذہن میں
ہو، بہادر شاہ کا حشر اسے معلوم ہو اور یہ تقریر
سن کر اس پر لرزہ نہ طاری ہو جائے۔

دوسرے لکچرز کے علاوہ کانفرنس کے صدر کی
حیثیت سے اس کے سالانہ اجلاس میں دیے جانے
والے دونوں خطبوں میں بھی ان کے مخصوص و مدلل
انداز اور رنگ طبیعت اور سر سیدیت کا بھرپور اثر
نمایاں ہے۔ کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور یہ
کامیابی کی روداد بیان کرتے ہوئے طنز و ظرافت
کی خفیف سی آمیزش سے وہ بات کو زیادہ سے
زیادہ موثر بنا دیتے تھے مثلاً ایک موقع پر عقل و
علم کے استعمال کی بالواسطہ ترغیب دی ہے۔

"بھائیو! عقل، علم اور انسانیت۔ یہ
خود مصیبت کے اسباب ہیں اور ہر شخص کو
دنیا میں اسی قدر مصیبت اٹھانی ہے جس
قدر اس میں عقل اور علم ہے۔ کاش ہم
انسان نہ ہوتے تو ان مصیبتوں میں سے
ایک بھی نہ اٹھانی پڑتی، یہ وہ خدا کی امانت
ہے جسے نہ آسمان اٹھا سکا نہ زمین، نہ
پہاڑ۔ ہم نے نادانی سے اٹھا لیا اور
ظالم و جاہل ٹھہرے۔ انا عرضنا الامانۃ الخ
آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"

اس طرح کاہلی سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انھوں
نے جو پیغام دیا تھا، وہ آج بھی ہمارے لیے اس وقت
سے زیادہ قابل عمل ہے۔

"یہ کمبخت کاہلی ہم کو وہ کام بھی نہیں کرنے
دیتی جو ہم کر سکتے ہیں ..... اس کاہلی پر
بوالہوسی اور خیال کی بلند پروازی اس
قدر ہے کہ جو کام ہم کر سکتے ہیں اسے
تو کرتے نہیں کہ ہمیشہ کسی بڑی چیز کا خیال
قایم کرتے اور اپنے ذہن میں بڑا بلند
نمونہ ٹھہرا لیتے ہیں۔ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی
پر چڑھنے کو منتہائے خیال بنا رکھا ہے
اور زمین پر دو قدم چلنے کا ارادہ تک
نہیں کرتے۔ حالاں کہ ہم اپنے کو اگر بکار آمد

بنانا چاہتے ہیں تو سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم سے ہو سکے، اسے کریں، بڑے کاموں کے انتظار میں نہ بیٹھے رہیں اور بڑے کاموں کی وجہ سے چھوٹے کام کرنے سے بھی باز نہ رہیں، جو کچھ بن پڑے اسے کرنا چاہیے تاکہ ہمارا جوش بیکار نہ جائے۔"

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی وسعت و فروغ کے لیے محسن الملک کی کوششیں اس وقت اور زیادہ تیز تر ہو گئیں جب سر سیّد کے آخری زمانے میں اس کا دائرۂ عمل محدود ہوتا نظر آیا۔ اس کے بعد تو کانفرنس کی ملک گیری کے لیے بہت دورے کیے اور تقریر کا جادو جگایا۔ [illegible] مقبول بنایا مضامین کے ذریعے لوگ موصوف سے پہلے ہی سے واقف تھے۔ دوسرے یہ کہ سر سید کی اصلاحات کا اثر بھی خاصا ہو چکا تھا۔ اس پر ملک کے ہر حصے میں محسن الملک کا بہ نفسِ نفیس پہنچنا اور فصیح و بلیغ اور دلنشین تقریریں کرنا بڑا ہی مفید ثابت ہوا۔ ملک کے طول و عرض میں اس کو وسعت حاصل ہو گئی۔ اس کے سالانہ اجلاس چاروں طرف ہونے لگے اور یہی جذبہ ترقی کرتے کرتے اس حد کو پہنچ گیا کہ مسلم یونیورسٹی کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جا سکا۔

سر سیّد کے انتقال کے بعد محسن الملک کی سرپرستی ختم ہو گئی تھی یوں تو انفرادی طور پر اس وقت تک انھوں نے ہزاروں کام کیے تھے لیکن سر سید کی مرکزیت کا خیال ہر وقت دل میں جاگزیں رہتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد بھی انجمن میں تھے لیکن خود کو تنہا محسوس کرتے تھے۔ سکریٹری کی حیثیت سے سر سیّد کی جانشینی تو سیّد محمود نے کی لیکن چند ماہ بعد ہی یہ ذمہ داری محسن الملک کے سر آ گئی۔ انھوں نے ہمت ہارنے کے بجائے نئے عزم اور حوصلے سے کام کیا۔

سر سیّد کا آخری زمانہ کالج کے لیے بڑا صبر آزما اور نازک زمانہ تھا۔ ایک مہاجن کے ہاتھوں ایک لاکھ روپے سے زیادہ کا غبن سر سیّد کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور جس وقت محسن الملک نے چارج لیا اس وقت بھی کالج پر ایک لاکھ روپے کا قرض اور قوم کا عدمِ اعتماد تھا۔ ایسے حالات میں اس زمانے کی یہ رقم اور کالج کے لیے اس کی ادائیگی کا مسئلہ، کالج کا سانس یقیناً رکنے لگا ہوگا۔ لیکن محسن الملک نے ذمہ داروں کے تعاون سے سر سیّد میموریل فنڈ کھولا، دورے اور تقریریں کر کے ہزار ہا روپیہ کا چندہ لے آئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں کالج کو قرضے سے نجات دلائی۔ زندگی اور سکریٹری شپ کے ان آخری آٹھ برسوں میں جواں حوصلہ اور عزم کے ساتھ جس انتھک محنت، لگن اور جگر کاوی کا مظاہرہ کیا وہ سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ ان کے زمانہ میں طلبا کی تعداد، تعلیم کا معیار اور بجٹ کی ترتیب میں ہر لحاظ سے کالج نے خاطر خواہ ترقی کی۔ انھیں کی جد و جہد سے کانفرنس میں جان پڑی، کالج ہی کے سلسلے میں وہ شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ ملاقات اور گفتگو کے دوسرے روز ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کے وطن اٹاوہ میں ہی دفن کیا جائے اور اسی لیے نعش کو وہاں جانا تھا لیکن نواب وقار الملک نے یہ کہہ کر کہ سر سیّد سے زیادہ

ق ان کا کہیں نہیں ہیں، ان کی نعش کو بہ اعزاز علی گڑھ
اتار لیا اور کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ ایک خاص مصلحت کے
تحت انھوں نے یہ وصیت کی تھی اب وہ مصلحت ختم ہو چکی
ہے، اس لیے انھیں یہیں دفن کیا جائے گا۔ چنانچہ
ہزاروں ماتم گساروں نے اسٹیشن پر اُن کے تابوت کو
اتارا اور جامع مسجد میں سرسید کی داہنی جانب دفن
کیا، ظاہر ہے

عاشق کا جنازہ تھا بڑے دھوم سے اٹھا

سرسید نے انھیں کے زمانے میں ان کی یادگار میں
باب اسحٰق کے بالکل سامنے اسٹریچی ہال کی لائن میں "مہدی
منزل" تعمیر کرائی تھی جو لٹن لائبریری کی عمارت کے قریب
آخری کمرہ ہے۔ ادھر کچھ عرصہ وہ ہال کینٹین رہی، فی الحال
اس کا کوئی اور نام اور قابلِ ذکر مصرف نہیں ہے۔

غرض سرسید مشن کا جو بوجھ ان کے کندھوں
پر تھا۔ کانفرنس کے توسط سے آگے بڑھتا رہا۔ کالج کو
یونیورسٹی بنانے والے بہت سے محسن ملتے رہے، لیکن
مولوی مہدی علی والی بات کہاں۔

۱۸۹۲ء میں کانفرنس کے سالانہ اجلاس
علی گڑھ کے موقع پر سرسید نے گفتگو کے لیے ایک عنوان
دیا تھا کہ "مسلمان من حیث القوم مردہ ہیں یا زندہ"
سرسید اپنی کوششوں کے صلے میں قوم کی طرف سے
کوئی جواب نہ ملنے پر مایوس تھے اور وہ قوم کو
مردہ سمجھتے تھے، اس کے برخلاف محسن الملک کا
خیال تھا کہ قوم زندہ ہے۔ اس کی حمایت میں انھوں نے
ایسی زبردست تقریر کی کہ برسوں اس کا چرچا رہا۔ انھوں
نے بتایا تھا کہ قوم زندہ ہے، وہ سرسید کے منصوبوں کی
قدر کرتی ہے، اسے اپنے تنزل کا احساس ہے اور اسی
احساس کے ساتھ وہ ترقی کی طرف گامزن ہے نیز مدرسۃ
العلوم جو تکمیل مقصد کا بڑا ذریعہ ہے، وہ اس کی تعمیر میں
مصروف ہے"۔ لیکن یہی محسن الملک اپنی عمر کی آخری منزل
تک پہنچتے پہنچتے سرسید کے خیال سے متفق ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء
کے اجلاس میں ان کی آخری تقریر کے چند جملے درج ذیل ہیں۔

"حضرات! کانفرنس کے اب تک کامیاب نہ ہونے کا
اصل سبب یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔ رہی قوم کی
حالت اس میں بھی کسی قسم کی ترقی نظر نہیں آتی، نہ
ان کی اصلاح و فلاح کے آثار معلوم ہوتے ہیں بلکہ
روز بروز ان کا افلاس بڑھتا جاتا ہے اور ان کی
قومیں دن بدن منتشر اور ضایع ہوتی جاتی ہیں....
جبکہ ہادیانِ طریقت کا یہ حال ہو اور وہ خود سیدھی
راہ سے بہکے ہوئے ہوں تو قوم اور امت کیوں کر
منزلِ مقصود پر پہنچ سکتی ہے"۔

اس کا راز کیا ہے اور کیا یہ سوال قوم کے ان
خدمت گزاروں کے سامنے آج بھی منہ پھاڑے کھڑا ہے جو
مسلسل جد و جہد کے بعد اب عمر کی آخری منزلوں تک پہنچ
چکے ہیں۔ دوسرا سوال انفرادی نوعیت کا ہے اگر محسن
الملک پیدا نہ ہوئے ہوتے تو کیا حیدر آباد کے مذکورہ
چار واقعات (بجٹ، ٹھیکہ معدنیات، اعلیٰ حضرت اور مدار
السلطنت کا جھگڑا اور ستائیس لاکھ روپے کا قرض) کا رُخ یہی
ہوتا۔ کیا سرسید اپنی شدت اور نیچر میں کرختگی کے باوجود اتنے
مقبول ہوتے، کیا سرسید کی نیچریت اتنی متوازن ہو جاتی، کیا کانفرنس اتنی
ہی قوی ہوتی جتنی آگے چل کر یونیورسٹی بنوائی، کیا سید محمود کی جانشینی
کے یہی اثرات مرتب ہوتے اور کیا ہمن اسکنڈل کے بعد کالج اسی طرح
مستحکم کھڑا رہتا؟ محسن الملک بس یہی سب کچھ نہیں تھے بلکہ یہ تو ان
شخصیت کے چند اہم ستون ہیں۔ کیا ان سوالوں اور نقطوں کے درمیان
آج بھی محسن الملک کی معنویت تلاش کی جا سکتی ہے!

Link
Locks
Link
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
Link
CABLE 88 Lock
Cyclo [INDIA]
Aligarh -
تیار کردہ: سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون نمبر ۳۶۰۹
۴۱۹۹

خوشہ چیں

انتظار کی گھڑیاں

انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں۔ ہاں، انتظار کرنے والے کو کاٹتی رہتی ہیں، نوچتی کھسوٹتی، جھنجھوڑتی رہتی ہیں۔ غریب انتظار کرنے والے کو جراحت کتنی پہنچتی ہے، یہ ایک حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ انتظار کس کا کیا جا رہا ہے۔ حبیب، رفیق، دوست یا عزیز کا یا بس، ٹرین، طیارہ کا یا ٹکٹ ملنے یا ملاقات کے لیے نمبر آنے کا۔ انتظارِ حبیب کی داستان کسی عاشق یا شاعر سے پوچھیے۔ ہم عاشق کے دل یا محبوب کے کوچے میں جھانکنے کو بے جا مداخلت یا ناروا جستجو سمجھتے ہیں لہٰذا محبت بدامن اور حشر بدوش انتظار سے کتراتے ہوئے نکل جانا ہی ہمارے لیے قرینِ احتیاط اور قارئین کے لیے قرینِ عافیت ہے۔ لیکن انتظار، انتظار محض انتظار مطلق کا دامن ہم ہاتھ سے نہ جانے دیں گے جو دل گرفتہ اپنے محبوب کا انتظار کرتا ہے وہ خواہ فردائے قیامت کا ہی کیوں نہ انتظار کرتا ہو، پھر بھی اس کے انتظار میں ایک لطف ہے، ایک حظ ہے، ایک کیفیت ہے، ایک بے تابی ہے، ایک میٹھا میٹھا درد ہے۔ خود آزاری کی اس میں لذت خویشتن زنی کا اس میں مزا ہے۔ اس میں کرب ہے لیکن نشاط آمیز۔

ہم تو اس وقت عاشق اور شاعر سے دامن بچاتے ہوئے اس پُرآشوب انتظار کا تذکرہ کریں گے جو پتّے کو پانی کر دیتا ہے، سکون کو برہم اور مزاج کو چڑچڑا کر دیتا ہے۔ جب ہر گزرنے والا ہر لمحہ جگر پر آری چلاتا ہے اور جب ہر گھڑی پہاڑ ہو جاتی ہے۔ جب انتظار کا اضطراب اشتیاق کی لذت سے محروم رہتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیا یاوہ گوئی ہے، مثال سامنے لائیے تو کچھ بات کھلے، کچھ بات بنے۔ سنیے حضرت:

آپ نے نصیبِ دشمناں سفر کی ٹھان لی۔ سفر کو آپ زحمت سمجھتے ہیں۔ بہت خوب۔ ہماری بات مانیے دونوں پر ایک نقطہ کے بجائے دو نقطے لگا دیجیے۔ یعنی تکلیف اور وہ بھی جہنم کی۔ چنانچہ آپ ٹرین میں لیٹنے یا بیٹھنے کی جگہ کا ریزرویشن کرانے اسٹیشن پہنچے۔ پہلے یہ عالم تھا کہ قلم برداشتہ یا قدم برداشتہ سفر پر نکل گئے۔ اب تو ہفتوں پہلے سے تیاری کرنا پڑتی ہے۔ اقتصادیات کا اصول بھی تو یہی ہے کہ پاپا نگر، کی ضرورت جب پڑتی ہے جب وسائل ضروریات سے کم ہوں۔ چنانچہ آپ سو کام چھوڑ کر اور عدیم الفرصتی کا لبادہ عارضی طور پر اتار

کر ریزرویشن آفس کی ایک کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ لائن میں آپ کا نمبر چالیسواں ہے۔ گھنٹہ بھر کھڑے رہنے کے بعد جب آپ ریزرویشن کلرک کے روبرو ہوئے تو جواب ملا کہ بھائی صاحب یہ تو امرتسر کی لائن تھی۔ کانپور کا ونڈو وہ سامنے ہے۔ اس لائن میں لگیے۔ کسی طرح دانت پیس پیس کر اور غیر ملفوظ گالیاں دے دے کر آپ نے ایک گھنٹہ ضائع کیا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ کانپور کی لائن امرتسر کی کیو کے ڈیڑھ گنی ہے، آپ کا پارہ چڑھ جاتا ہے، کھسیانہ پن کی شدت اپنی غلطی کے احساس سے اور بڑھ جاتی ہے۔ انسان کو جب اپنی غلطی یا حماقت کا احساس ہوتا ہے، اس عام انسان کو جو وسعتِ نظر اور احساسِ ظرافت سے محروم ہے، تو وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ دانت کاٹتا ہے، جھنجھلاتا ہے، کاٹنے کو دوڑنا چاہتا ہے لیکن بالآخر درویش کے طیش کو درویش کی جان پر اُتار دیتا ہے۔ کڑھ کر رہ جاتا ہے۔ بیچارے کے خون کا فشار نہ معلوم اس اثنا میں کتنے مدارج طے کر لیتا ہے۔ یہ خیال کہ گھر پر اتنے کام کرنے کے تھے، اتنے مضمون تکمیل کو ترس رہے تھے جواب طلب خطوط اور فیصلہ طلب فیصلوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اخبار پڑھنے کو تو وقت ہی نہیں ملا۔ ان تیرہ بختوں نے گھنٹوں کی بربادی کا سامان کر دیا۔ اگر لائن غلط تھی تو شروع میں کیوں نہ بتا دیا، بورڈ کیوں نہ لگوایا۔ تاکہ یہ ہفت خواں تو طے کرنا نہ پڑتا۔ بتاتے کیسے۔ پوچھا کیوں نہیں؟ پوچھتے کیسے جو لوگ غلط لائن میں کھڑے کھڑے پہلے ہی سے چڑچڑے ہو چلے تھے، آگے کیوں جانے دیتے۔

غرض کہ الجھن، بے آبروئی اور وقت کی بربادی کے احساس نے ہر ایک قطار آزما کو شمشیر برہنہ کر دیا ہے۔ ایک کی بدمزاجی دوسرے کی شعلہ آشامی کو شہ دیتی ہے۔ ایک ذرا چھیڑ دیجیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

یہ تو صرف ایک مثال دی گئی۔ ہمارا سابقہ روزانہ اس قسم کے وقت سوز اور صبر آشام اجتماعی انتظار سے ہوتا ہے۔ اسکول، یونیورسٹی، دفتر جانے کے لیے بس کا انتظار، بجلی یا پانی کا بل جمع کرنے کے لیے سانپ کی آنت جیسی کیو میں کھڑے رہنے کا جگر دوز تجربہ۔ اوپر یا نیچے جانے کے لیے لفٹ کا انتظار۔ ٹرین یا بس کی بے تابانہ راہ دیکھیے اور ٹرین یا بس ہے کہ آنے کا نام نہیں لیتی۔ جتنی دیر ہوتی ہے اتنی ہی الجھن بڑھتی ہے۔

ان میں سے بہت سی الجھنیں ایسی ہیں جنھیں ذرا سی توجہ سے ہم دور کر سکتے ہیں۔ زندگی میں کامیاب ہونے اور خوش رہنے کا ایک بڑا گر یہ ہے کہ انسان منفی کو مثبت میں، نقصان کو نفع میں زیاں کو سود میں، افسردگی کو شگفتگی میں متواتر بدلتا رہے۔ لائن لمبی ہے اور کوئی کام کرنے کو نہیں تو وقت فردائے قیامت کی طرح طویل اور سکون بتاشے کی طرح ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ سکون کو بچانے اور وقت کو سلیقہ اور شگفتگی کے ساتھ صرف کرنے کی بہت سی ترکیبیں ہیں مثلاً:

۱۔ جی کڑا کر لیجیے، الجھن کو چپکے سے طاقِ نسیاں میں بٹھا دیجیے اور کھڑے کھڑے کسی اہم مسئلے پر غور کیجیے وقت کٹ جائے گا اور آپ کو

پتہ بھی نہ چلے گا۔

۲۔ جس موضوع کے متعلق منزل مقصود پر گفتگو کرنی ہے اس کو کھڑے کھڑے دماغ کی بھٹی میں اچھی طرح جوش دے دیجیے تاکہ اس کے اہم پہلو کھل کر سامنے آجائیں۔ پہلے سے یہ ذہنی تیاری دم گفتگو آپ کو سرخرو کرے گی۔ یہ ہدایت عام انسانوں کے لیے ہے ورنہ جو لوگ تخلیقی کام کرتے ہیں وہ تو خود سے اس طرح مشورہ کرتے ہی ہیں

جس طرح آشنا سے کرے آشنا اصلاح

یوں بھی جب عمر بڑھ جاتی ہے اور دستور خودکلامی پُرصدا ہونے لگتا ہے تو بے درد زمانہ اس کا انتساب کہولت کی طرف کر بیٹھتا ہے۔ کہتا ہے کہ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں۔

۳۔ انتظار کے ان لمحات کو جو جدید زندگی میں عام شہری کے لیے ناگزیر ہو گئے ہیں، خود کو خوب سے خوب تر بنانے میں صرف کرنا چاہیے۔ اچھا لکھنے اور بولنے کے لیے اچھے لکھنے بولنے والوں کی خوشہ چینی کرنا پڑتی ہے۔ خوشہ چینی کیوں گل چینی کہیے۔ بات کو نوک پلک کے ساتھ کہنے کے اسالیب اہل طرز مصنفوں کی تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں ان ہی کے یہاں کیوں؟ اچھے اخباروں کے اداریوں اور خصوصی مضامین میں بھی۔ ان پھولوں کو چن لیجیے اور اپنی جیبی ڈائری کو ان سے سجا لیجیے۔ محاورے اقوال، اسالیب بیان، تجربات، اشعار۔ ان خزائن کو اسی چھوٹی سی ڈائری میں قلم بند کیجیے۔ چھوٹی ڈائری سے بیاض کا کام لیجیے۔ سفر حضر میں جہاں آپ انتظار روح فرسا انتظار سے دوچار ہوں ڈائری نکالیے اور اس کے خیابانوں میں گم ہو جائیے۔ ایک ایک پھول کو عقیدت اور احتیاط سے اٹھائیے اور اس کی بوقلمونی، نازکی، کج کلاہی اور خوشبو سے باصرہ، لامسہ اور شامہ کو سیراب کر دیجیے۔ اس طرح کہ آپ جب چاہیں حافظے کا موکل ان پھولوں کو آپ کے سامنے لا کھڑا کرے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ہر حس کی قبا حافظے کا استر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اگر آپ کو اکثر انتظار کرنا پڑا اور خدا کرے کہ ایسا ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایک مدت کے بعد بلا ارادہ وہی پھول آپ کے منھ اور نوک قلم سے جھڑنے لگیں گے۔ آپ کی تحریر و تقریر میں بانکپن اور تاثیر آجائے گی۔

الفاظ فقروں، محاوروں، ترکیبوں اور اسالیب ہی پر اکتفا کیوں کیا جائے۔ انتظار کی گھڑیوں سے ذہنی تربیت اور استدلالی وضاحت کا کام لینا بھی کوئی دشوار نہیں۔ اس کے بجائے کہ خیالوں کو بھٹکنے دیا جائے وہ خیال بھٹکنے لگتے ہیں تو وسوسے کہلاتے ہیں اور ذہنی انتشار کی خبر لاتے ہیں۔ ان کو منطق یا تسلسل کی لڑی میں پرو دیجیے تو ان میں لطافت، ربط اور توانائی آجاتی ہے۔ یہ کام کرنے کا ہے۔ لیجیے آم کے آم ہاتھ آگئے اور گٹھلیوں کے بھی دام لگ گئے۔ کرب انتظار کے آتشکدہ کو آپ کی فکر رسانے چشم زدن میں چمن بنا دیا۔ انسان کو خالق نے غیر معمولی صلاحیتیں اور امکانات عطا کیے ہیں۔ وہ ان کی ایک انتہائی مختصر کسر کو بروئے کار لاتا ہے اسے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ ہوتا تو

وقت کیوں ضایع کرتا، ان پر زنگ کیوں لگنے دیتا۔ کرب
کو طرب میں بدلنا اُن لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔
جو خود پر قابو رکھتے ہیں۔ جن کا مزاج اتنا مرتب ہے کہ
جب چاہا ایک کیفیت، احساس، تاثر یا رخ کو ختم کر دیا
اور دوسری کیفیت، احساس، رخ یا تاثر کو بروئے
کار لے آئے۔

۴۔ بعض نازک مزاج اشخاص اگر ذرا سی
بات طبیعت کے خلاف ہو جائے، تو طمانیت اور سکون
کھو بیٹھتے ہیں۔ اگر ماحول اور گھڑی سازگار اور حسب مذاق
نہ ہو تو وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ان کا مزاج مہورت
کا طالب ہوتا ہے۔ دنیا میں جینا، پنپنا اور خوش رہنا
ہے تو چھوئی موئی بننے سے کام نہیں چلے گا۔ شاعر نے
دعا مانگی تھی ؎

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

اس کے علاوہ یہ دعا بھی مانگنی ہوگی، اور اس کے حصول
کے لیے محنت کرنی ہوگی کہ بظاہر نامساعد حالات میں بھی
انسان دماغ کو یکسو اور سرگرم عمل کر سکے۔ ورنہ
اس مختصر زندگی میں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ یوں ہی عمر کا
ایک بڑا حصّہ سونے کھانے اور حوائج کی نذر ہو جاتا
ہے۔ اس کے بعد اگر سازگار ماحول اور موزوں موقع
کا انتظار رہا تو پھر کام کی گھڑیاں اور کم ہو جائیں گی
فرصت جہاں بھی ملے، جتنی بھی ملے، اُسے کام میں لے آنا
چاہیے۔ جدید زندگی میں ہر قدم پر انتظار سے دوچار
ہونا پڑتا ہے۔ جہاں دیکھیے افراد انتظار میں قطار
در قطار کھڑے نظر آتے ہیں۔ جس کسی نے انتظار
کی گھڑیوں کو کارآمد بنا لیا، اس نے گویا زندگی کی
بازی جیت لی۔ ایک پنتھ دو کاج۔ ایک طرف الجھن سے
چھٹکارا حاصل کیا، دوسری طرف وقتِ عزیز کی قیمت
وصول کر لی۔

۵۔ ہم نے ابھی تک انتظار کی گھڑیوں کو ذہن
کی ترتیب، مسائل کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض
گفتگو اور تحریر کو موثر اور دلنواز بنانے کے لیے استعمال
کرنے کی بات کی ہے۔ اسی ذہنی ریاضت سے زیادہ
آسان ان لمحات میں جسمانی ورزش ہے۔ ریڈرس
ڈائجسٹ کے حالیہ شمارے میں ایک مضمون دورانِ
انتظار اس نوع کی ورزش پر شایع ہوا ہے۔ آپ
سینما کے سامنے قطار میں کھڑے ہیں۔ وقت کیوں ضایع کیجیے
وہیں یہ ورزش شروع کر دیجیے:

مٹھی بند کیجیے، اور پھر پوری کشادگی کے ساتھ کھول
دیجیے۔ کلائی کو دونوں سمتوں میں گھمائیے۔ کلائی کو
نیچے اوپر موڑیے۔ اپنے ہاتھوں کو جھٹک دیجیے۔
یہ ورزش دورانِ خون کو تیز کر دیتی ہے۔
ہاتھوں اور کلائیوں کو لچک اور طاقت بخشتی ہے۔
کرکٹ، گولف اور اُن کھیلوں کے لیے جو بلّے سے
کھیلے جاتے ہیں، بالخصوص مفید ہے۔

ٹیلی وژن کا پروگرام دیکھ رہے ہیں۔ بے حد
غیر دلچسپ پروگرام۔ موقع کو غنیمت جانیے، ورزش
شروع کر دیجیے۔ کرسی پر اس طرح بیٹھیے کہ ریڑھ
کی ہڈی کے نیچے کا حصّہ کرسی کی پشت کو دبا رہا ہو۔
گردن کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیجیے۔
اپنا داہنا گھٹنا اُٹھائیے اور اسے اپنی بائیں
کہنی سے چھونے دیجیے اور پھر اس کے بالعکس دہرائیے۔
اس ورزش سے پیٹ مضبوط اور سپاٹ ہو جاتا ہے

اگر دھڑکتے ہوئے دل سے آپ کسی کا انتظار کر رہے ہیں تو کمر سے جھکیے اور اپنے جسم کو فرش کی طرف ڈھیلا کرکے لے جائیے اور اسی وضع میں چند گھڑیوں تک رہیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُٹھیے، ایک ایک پسلی کو کھولتے ہوئے۔ اس کے نتیجے میں چہرہ پر صحت کی سرخی آجائے گی۔ اور زیریں پیٹھ پر دباؤ کم ہو جائے گا۔

ٹیلی فون اکثر کرنا پڑتا ہو تو ایک کلو کا باٹ یا اور کوئی بھاری چیز قریب رکھ لیجیے اور اس کو ہاتھ سے اُٹھائیے اور دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے چکّر دیجیے اس سے جسم کے اوپری حصّے کو چستی اور توانائی ملے گی۔ فون کرتے ہوئے پیروں کی ورزش بھی کر سکتے ہیں۔ ننگے پاؤں سے مشروبات کی ابھری ہوئی دھاریوں والی بوتل دیا اس طرح کی کسی اور غیر ہموار شئے کو آگے پیچھے حرکت دیجیے پیروں کو راحت ملے گی اور اُن میں دوران خون بڑھ جائے گا۔ آپ انتظار کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں ۔ ڈاکٹر کے یہاں یا کسی سرکاری دفتر میں بے کار کیوں بیٹھیے۔ جسم کے ایک ایک عضو کو باری باری تانیے اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیجیے۔ ڈھیلا چھوڑتے ہوئے سکون اور استراحت کے احساس کو اچھی طرح ذہن نشیں کر لیجیے۔ اس طرح درد کم ہو جاتا ہے۔ توانائی محفوظ رہتی ہے اور ذہن صاف۔

ٹیلی فون کال کے انتظار میں چہرے کی ہلکی پھلکی ورزشیں بخوبی کی جا سکتی ہیں۔ اپنے منہ کو سختی سے بند کیجیے۔ اپنے ہونٹوں سے دانتوں کو بند کیجیے۔ آنکھیں بند کیجیے اور بھوؤں کو اُٹھائیے۔ منہ کو تنا ہوا رکھتے ہوئے دہن کے گوشوں کو کھینچ کر مسکراہٹ کی شکل دیجیے۔ پھر آہستہ آہستہ چھوڑ دیجیے۔ اپنے گالوں کو غبارے کی طرح پھلانے کی کوشش کیجیے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈھیلا کیجیے۔

یہ ورزش منہ کے آس پاس اور چہرے کے نچلے حصّے میں جھریاں نہیں پڑنے دیتی اور چہرے پر رونق لاتی ہے۔

آپ نے لنچ پر دوستوں کو بلایا ہے ان کے انتظار کی گھڑیوں سے فائدہ اُٹھائیے۔ میز سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑے ہو جائیے۔ میز کی طرف جھکیے اور اس کے کنارے پر ہاتھ ٹیک دیجیے ہاتھوں میں شانوں کے برابر فاصلہ رکھیے۔ جسم کو سیدھا کر لیجیے۔ گہری سانس لیجیے اور اپنے بازوؤں کو موڑ کر جسم کو یک لخت نیچے کی طرف لے جایئے اب اپنے بازوؤں کو سیدھا کرتے ہوئے، سانس نکالتے ہوئے خود کو پیچھے لے جائیے۔ یہ ورزش بازوؤں کے عضلات اور جسم کے اوپری حصّے کو توانا کرتی ہے۔

آپ ایک لمبی قطار میں وقف انتظار ہیں۔ گھٹنوں کو موڑتے ہوئے، اپنی پیٹھ کو پانچ سے دس سنٹی میٹر تک پیچھے کی طرف لے جائیے۔ اپنے سر اور دھڑ کو ایک سیدھ میں رکھیے۔

اپنے کندھوں کو پیچھے کی طرف کھینچیے۔ گویا آپ اپنے شانوں کو ملا رہے ہیں۔ اس پوزیشن میں ایک لمحہ رُکیے اور اس کے بعد اصلی حالت پر واپس آجائیے۔

گہری سانس لیجیے، سانس نکالتے وقت اپنے

پیٹ کے عضلات کو تان لیجیے اور کئی سکنڈ تک اسی
حالت میں رکھیے۔

اس ورزش سے آپ کا طرزِ نشست
و برخاست بہتر ہو جائے گا۔ آپ کار میں جا رہے
ہیں۔ بھیڑ یا لال بتی کی وجہ سے آپ کو رکنا پڑ رہا
ہے۔ اپنے پیٹ کو اندر کی طرف لے جائیے اور جب
تک کہ بتی ہری نہیں ہوتی یا ٹریفک حرکت میں نہیں
آتی، اسی طرح تانے رہیے۔ اس سے پیٹ سپاٹ
ہوتا ہے۔

اس طرح کی نہ معلوم کتنی چھوٹی چھوٹی کسرتیں ہیں
جن سے آپ انتظار کے لمحات کو گوارا اور مفید بنا سکتے
ہیں۔

دماغ اور جسم کی بات تو ہو گئی، روح کا ذکر
بھی نہیں آیا۔ قطار میں کھڑے کھڑے یا انتظار میں
بیٹھے ہوئے سوچیے کہ آپ صبح سے شام تک کوئی کام
دوسروں کی بھلائی کا بھی کرتے ہیں۔ جواب طمانیت
کو برہم کرنے والا ملے گا۔ اس برہمی کو تلافیٔ مافات
کا رُخ دیجیے۔ اسے فلاح کا نقطۂ آغاز بنا لیجیے۔ وہیں
کھڑے کھڑے طے کر لیجیے کہ آپ خدمتِ خلق کی کون
سی راہ پسند کریں گے۔ اس کے بعد اگر آپ نے اس
کارِ خیر کو شروع کرنے میں دیر کی تو جب کبھی آپ قطار
میں کھڑے ہوں گے آپ کا عہد آپ کو یاد آئے گا،
آپ کا ضمیر آپ کو ستائے گا۔ حالتِ انتظار میں
اور بھی اچھی اچھی باتیں سوچیے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر
ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو نعمتیں عطا کی ہیں اور
ہزاروں مصیبتوں اور بلاؤں سے آپ کو محفوظ
رکھا ہے۔ طبیعت کسی حالیہ ہزیمت، فکر یا خلش یا
اندیشے سے مکدّر ہے تو غم اور فکر کو تھوک دیجیے
کائنات کی وسعت اور اپنی بے بضاعتی پر غور کیجیے
یا پھر اس خیال سے طاقت اخذ کیجیے کہ پروردگار
نگہبان اور مہربان ہے۔ اس نے ہر نازک موڑ پر
آپ کی مدد کی ہے اور وہ پھر مدد کرے گا۔
اپنی زندگی کے کامیاب لمحات کو حافظے کے اشارے
سے واپس بلا لیجیے۔ ساری کدورت دور ہو جائے گی
یاس کافور ہو جائے گی۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
خیال کو تر و تازہ اور شگفتہ و بالیدہ رکھیے۔ خوشیاں
آپ کے قدم چومیں گی۔ اس وقت جب کہ آپ کو خلق
کا ازدحام دھکے دے رہا ہے خوشی آپ کی پذیرائی
کو آگے آئے گی، امید آپ کا خیر مقدم کرے گی، اعتماد
آپ کی راہ میں پھول بچھائے گا

انتظار کی گھڑیاں اعتماد، سکون، انبساط
اور افتخار کی بازیابی کی گھڑیاں بن سکتی ہیں۔ یہ
آپ کی ذہنی صلاحیتوں پر جلا کر سکتی ہیں۔ آپ کے
ذخیرۂ الفاظ اور تاثیرِ گفتار میں انقلاب برپا کر سکتی
ہیں۔ آپ کو صحت، شادابی اور وجاہت سے سرفراز
کر سکتی ہیں۔

کھڑے کھڑے جھنجھلانے، کڑھنے، غصہ
کرنے اور افسوس ملنے کے بجائے اپنے رب کی
حمد کیجیے اور اس کے رسولؐ پر درود بھیجیے اور
اس کی مخلوق کی خدمت کے لیے خود کو آمادہ کیجیے
کہ نجات اور کامیابی اور سکون کی لازوال راہ یہی
ہے۔

ام ہانی
اقبال منزل۔ لکھنؤ

کاش کہ مسلمان اب بھی بیدار ہو جائیں۔!

نقشہ اٹھا کر دیکھیے عالم اسلام کے حدود خون کی تحریر سے کھنچے نظر آئیں گے۔ نظام مصطفوی کے احیا کے پردے میں اسلام کے اندرونی دشمن اور منافق خود اپنے ہی گھر کو آگ لگانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اخبارات کی خبریں پڑھیے، دنیا کے مختلف ممالک میں بڑی بڑی کانفرنسوں کے متعلق سنیے، خود کبھی اتفاق ہو تو مسلم ممالک میں جا کر دیکھیے، ہر جگہ مسلمانوں کی خونریزی کا چرچا ہے۔ مسلمان خود مسلمان کے درپئے آزار ہے۔

آج مسلمانوں کی تعداد میں جو اضافہ ہو رہا ہے، اس کا کس قدر بڑھا چڑھا کر ذکر کیا جا رہا ہے۔ کہیں ایران کی مسلمات کی جرأت مندی و قربانیوں کے قصے ہیں تو کہیں امریکہ میں تیزی سے بڑھتی ہوئی اسلام کی نشر و اشاعت کی روداد کا ذکر ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ کیا اس پر مسلمانوں کی توجہ مبذول نہیں ہوتی کہ خود دو بڑے مسلم ممالک ایران و عراق بر سر پیکار ہیں، افغانستان میں خود مسلمان حکمراں مسلمان عوام کو زد و کوب کروا رہے ہیں، عرب کے شیخ اپنی عیش پرستی میں اسلامی شرم و حیا اور شریعت کے مدبرانہ اخلاقی اصولوں کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ پاکستان میں مسلم لڑکیاں کراچی میں خواتین کی الگ یونیورسٹی تعمیر کرنے کے خلاف نعرہ بازی کرتی گھروں سے بے حجاب نکل پڑی ہیں۔ ہندوستان کے کچھ ملا گھروں میں بغیر کسی خاص سبب کے چار چار بیویاں رکھنے پر مسجدوں سے نت نئے فتوے صادر کر رہے ہیں۔ مصر کے حکمراں کافروں کے ساتھ بیٹھ کر نئے نئے کمیشنوں کی تشکیل میں مصروف کار ہیں۔ لبنان کے مسلم پبلشروں کے شائع شدہ رسائل مغربی رسائل کی نقل میں عرب کی حسین عورتوں کی تصاویر کی ہر زاویہ نگاہ سے نمائش پر کمربستہ ہیں۔!

بتائیے کیا یہی شریعت محمدیہ ہے؟ کیا یہی اسلام کے نشر و اشاعت کے ذرائع ہیں؟ کیا یہی دین اسلام کی اخوت و مساوات کی تعلیمات ہیں؟

آج مسلمانوں نے مردوں اور عورتوں کی ترقی کے جو خود ساختہ اصول و حدود بنا رکھے ہیں کیا اسی کی تلقین ہادی برحق امام الانبیاء محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔

کیا اسلام کے مذہبی قوانین میں اسی چیز کا سبق دیا گیا تھا کہ جب دنیا بھر کی طاقت ور کافر اقوام صرف ایک اسلامی ملک کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپئے ہو جائیں تو تمام مسلمانان عالم ان کے خلاف اپنی تلواریں نکالنے کے بجائے اور ایک جھنڈے تلے صف آرا ہونے کے بجائے خود آپس میں زور آزمائی پر اتر آئیں؟

مثال سامنے ہے کہ اسرائیل کے ساتھ امریکہ جیسی بڑی طاقت نے فلسطینیوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں ان کے مارے کسکتے بے شمار اسلامی ممالک نے کیا کیا؟

آج جب مسلمانوں نے خود اپنے اوپر ہی اپنی شمشیریں سونت لی ہیں تو وہ خدائے عزوجل سے کس مدد کی توقع رکھتے ہیں ؟ وہ منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان تک کب پہنچے گی ؟ رب ذوالجلال کا مسلمانوں سے کیا ہوا وعدہ کب پورا ہوگا ؟ جب مسلمانوں کو خدا کے کیے ہوئے وعدوں کے ایفا ہونے کی فکر اس قدر دامن گیر ہے تو پھر ان کے وہ وعدے کیا ہوئے جو انھوں نے رب العالمین سے کیے تھے۔

خود مسلمانوں نے تو اپنی مدد آپ کرنے کی ہر تدبیر پس پشت ڈال دی ہے اور الٹے خدا سے شکوہ کناں ہیں کہ اس کی مدد ان تک کب پہنچے گی ؟ مسلمانوں کا پہلا سا ایمان، خدا پر مکمل بھروسہ، توکل واعتماد، اسلامی اعتقاد، اتحاد، محبت دبھائی چارے کا جذبہ کہاں ہے ؟

آج پورے عالم میں لوگوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کی خبریں گشت کر رہی ہیں مگر خود نسلاً بعد نسل مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کے ایمان واعتقاد کا کیا حال ہو رہا ہے ؟ نمازیوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے مگر نماز میں خشوع وخضوع سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے والے مفقود ہیں! زبان و بیان سے آج مسلمان بڑی بڑی ذمہ داریوں کا بیڑہ اُٹھانے کے دعویدار ہو رہے ہیں مگر خود اپنی عملی زندگی میں کیوں بے حد خود غرض، ودلپسند اور تنگ نظر بن گئے ہیں ؟ دیگر اقوام کو انسانیت کا سبق دینے والے کیوں خود اپنی زبوں حالی سے بے پرواہ جانوروں سے بھی بدتر عادات وخصائل کو اپنائے ہوئے ہیں ؟ شریعت محمدیہ اور آئین اسلامیہ کو از سر نو استوار کرنے والے کیوں ردِ بے عمل ثابت ہو رہے ہیں ؟

بتائیے ان سوالوں کا جواب کیا ہے ؟ کون مسلمان ان کے جوابات دینے کا ذمہ لیں گے ؟ ہر طرف مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کی خبریں گرم ہیں مگر خدا پر توکل اور ایمان کا جذبہ دن بہ دن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ کیا دور حاضرہ کے مسلمان اپنا وہ زریں عہد بالکل فراموش کر چکے ہیں جب مسلمانوں کی بے حد قلیل تعداد بھی کفر دل کے بحر بیکراں کو زیر کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی ؟

مسلمانو! اب بھی وقت ہے بیدار ہو جاؤ۔ اپنی عقلوں پر پڑے غفلت اور نادانی کے پردے کو مستقل مزاجی دایمان کی دھار دار قینچی سے چاک کر دو۔ اس رحیم وکریم مالک پر بھرپور توکل رکھو جو ہر حال میں اپنے نیک بندوں کا حامی ومددگار رہے !

اے غافل وناعاقبت اندیش مسلمانو! یاد کرو اپنے جری دبہادر اسلاف کے کارناموں کو! یاد کرو سپہ سالاروں کے تقویٰ وایمان اور عزم وولولے کو! یاد کرو مسلمان حکمرانوں کی انکساری وتواضع اور پرہیزگاری کو! کیا یاد ہیں تمہیں تاریخ کے وہ اوراق جن میں وہ ناقابل فراموش احکامات درج ہیں جو بنی امیہ کے بہترین حکمراں خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حبشہ میں اسلامی لشکر کے قائد اعظم منصور بن غالب کو صادر کیے تھے۔ وہی عمر ثانی جنھوں نے تقویٰ اور پرہیزگاری میں صحابۂ کرام ابوذر غفاری اور ابو ہریرہؓ کا قالب اختیار کر لیا تھا اور یہ مشہور تھا کہ اگر وہ خلفائے راشدین کے عہد میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان میں سے پانچویں ہوتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا یہ قرارنامہ ابو محمد عبداللہ بن عبدالحکم (متوفی ۲۱۴ھ) کی کتاب "سیرت عمر بن عبدالعزیز" میں درج ہے۔ یہ قرارنامہ اس طرح ہے کہ امیرالمومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز منصور بن غالب کو ہدایات دیتے ہوئے کہتے ہیں :-

" اے اسلامی لشکر کے سپہ سالار! اللہ سے ڈرو۔ اس سے ہر حال میں تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف تمہارے لیے سب سے بہتر جنگی ساز و سامان ہے۔ سب سے موثر تدبیر ہے۔ سب سے بھرپور قوت ہے اور دشمنانِ اسلام پر سب سے کاری ضرب ہے۔

اے ہمارے سپہ سالار اور سپاہیو! تمہارے لیے دشمن سے ڈرنے والی کوئی اور چیز اتنی اہم نہیں جتنی کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی خطرناک ہے۔ خود تمہارا نفس تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس سے بچنے کی تدابیر کرو۔ کیوں کہ گناہ میرے نزدیک دشمن کی مخالفانہ تدابیر اور سخت چالوں سے بھی زیادہ خوفناک اور ہیبت ناک ہے۔ یاد رکھو یہ جنگ قوت و بہادری کا مقابلہ نہیں بلکہ گناہ، عذاب اور معصیت کا مقابلہ ہے۔ تم دشمن کے خلاف مدد چاہو ان کی نافرمانیوں کے عوض۔ اگر تم نیک ہوئے تو فتح تمہاری ہوگی اور یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں بہترین کامیابی سے نوازے گا۔ کیوں کہ تمہاری نیکی اور خدا سے تقویٰ ہی ایک پاکیزہ معاشرے کا تصور ہے۔

جوانمردو! ذہن نشین کر لو اس بات کو کہ اگر تمہارے معصیت سے بچنے اور تقویٰ اختیار کرنے کا معاملہ نہ درپیش ہوتا تو ہم کو کبھی بھی کافروں پر غلبہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ کیوں کہ ہم مسلمانوں کی تعداد ان کی تعداد سے بہت قلیل ہے۔ ہمارے پاس جنگی ساز و سامان ان کے ساز و سامان کے مقابلے میں کمتر ہیں لیکن اگر ہم مسلمان اور دشمنانِ اسلام دونوں گناہ اور معصیت اور خدا کی نافرمانی میں برابر ہو گئے تو اُن کی طاقت و تعداد ہم پر غالب آ جائے گی۔ لیکن ہماری حق پرستی و فرمانبرداری توکل علی اللہ اور پختہ ایمان کے سبب حق تعالیٰ اگر ان کے مقابلے میں ہماری مدد نہ کرتا تو ہم اپنی قلیل طاقت و کمتر جنگی ساز و سامان کے ذریعے کبھی بھی ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے

میں پھر تلقین کرتا ہوں تمہیں اے مسلمان سپاہیو! اپنی ذات کی نگرانی کرنے میں تمہیں جس قدر طاقت و ہمت کی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ ضرورت اپنے گناہوں اور نفس کی نگرانی کی ہے۔ تاکہ تمہارا مواخذہ کیے گئے ان سے بچنا الذمہ ہو سکو۔ اور جان لو تم لوگ کہ بیشک تمہارے ساتھ چند محافظ فرشتے رب العزت نے مقرر کر رکھے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں جو تم اپنے سفر کے دوران کرتے یا پڑاؤ اور منزلوں پر اپنی قیام گاہوں میں کرتے ہو۔ تو اے مسلمانو! ان محافظین کا لحاظ کرو۔ ان سے شرم کا اہتمام کرو اور خدائے برتر کی نافرمانی سے انھیں آزار نہ پہنچاؤ۔ جب تم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کیے ہوتے ہو کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد میں مشغول ہو۔

اے سپاہیو! ہرگز ہرگز غرور نہ کرو اور اس بات کو نہ کہو کہ ہمارا دشمن ہم سے بدتر ہے اور یہ بھی کہنے سے گریز کرو کہ وہ ہمارے اوپر مسلط نہ کیے جائیں گے اگرچہ کہ ہم گناہ کے ہی مرتکب کیوں نہ ہوں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ خدا نے بہت سی ایسی قومیں ان قوموں پر مسلط کر دیں جو ان سے بدتر تھیں محض ان کی نافرمانیوں اور کوتاہیوں کے سبب تو اے مسلمانو! اپنے نفس کے خلاف نبرد آزما رہنے کی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ہر وقت مدد چاہتے رہو۔ میں بھی اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے مدد و رحمت کی درخواست کرتا ہوں "

پھر عمر بن عبدالعزیز نے قائدِ اعظم منصور بن غالب کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

" تمہارے ساتھ جو سپاہی اور افرادِ جنگ سفر کر رہے ہیں ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ انھیں تھکا دینے والی مسافت کا مکلف نہ بناؤ اور نہ ہی انھیں

منزل پر اُتارو جو انھیں آرام طلب اور کاہل بنا دے یعنی ایسے مناسب رفتار سے سفر کرو تاکہ جب دشمن کے مقابل پہنچو تو تمہاری طاقت و ہمت میں کمی واقع نہ ہوئی ہو کیوں کہ تم اور تمہارے ساتھ کے سپاہی ایسے دشمن کی طرف رواں دواں ہوں جو بھرپور ساز و سامان سے لیس ہے اور بڑی تعداد میں جنگی گھوڑوں کے ساتھ میدان میں مقیم ہے۔ اس لیے اپنے اصحاب اور گھوڑوں کو دورانِ سفر مناسب آرام پہنچاتے ہوئے چلو، تاکہ دشمن کا بے پناہ لشکر ان پر برتری حاصل نہ کر سکے۔ اللہ ہی سے مدد کے طالب رہو۔ وہی سب سے بہترین معاون و مددگار ہے۔

اے اسلامی لشکر کے قائد منصور بن غالب!

اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہر جمعہ کے روز ایک دن اور ایک رات قیام کرو۔ کیوں کہ یہ قیام تمہارے لیے راحت کا باعث ہوگا۔ اس لیے کہ اس دوران قیام میں تم اپنی منتشر طاقت کو یکجا کر سکو گے اور جنگی جانوروں اور جنگی ساز و سامان کی درستگی اور مرمت کر سکو گے۔ تم اپنا پڑاؤ صلح کیے ہوئے لوگوں کی بستیوں سے دور ہٹ کر ڈالو۔ ان کی بستیوں میں، ان کے میلوں ٹھیلوں میں اور بازاروں اور جماعت میں تم میں سے کوئی بھی شخص داخل نہ ہو۔ سوائے اس شخص کے جس کی امانت و دیانت پر تمہیں پورا بھروسہ ہو اور تم میں سے کوئی بھی شخص ان بستیوں والوں میں جا کر کسی قسم کے گناہ کا ارتکاب نہ کرے، ان بستی والوں پر ظلم نہ کرے اور نہ ہی انھیں کسی قسم کی تکلیف و ایذا پہنچائے کیوں کہ ہمارے اور تمہارے لیے یہ بڑی آزمائش ہے کہ ہم ان بستی والوں کے صلح کا معاہدہ کا بنا پر احترام کریں اور حفاظت کریں۔ جب تک وہ بستی والے صلح کے معاہدہ کا احترام کرتے رہیں۔ تم بھی صبر سے کام لو اور انھیں تکلیف پہنچانے سے رُکے رہو۔ تم صلح کرنے والوں کی مدد لے کر دشمنوں پر غلبہ حاصل نہ کرو۔

میں نے حتی المقدور تمہارے جنگی ساز و سامان کی تیاری میں کوئی کمی نہیں ہونے دی ہے اور نہ ہی تمہاری قوت کے سلسلے میں مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی۔ بلکہ میں نے تم سب کو متحد کر لیا ہے اور کافی تعداد میں تمام ذرائع اکٹھا کر لیے ہیں۔ تمہارے لشکر کا انتخاب کیا ہے اور تمہیں شرک کی زمین پر مقابلے کے لیے دیا ہے۔ تاکہ تم صلح کرنے والوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اور سب سے بہتر جو چیز کسی غازی کو دی جا سکتی ہے، اسے میں نے تمہاری نیت میں کشادہ کر دیا ہے۔ پس میں نے اللہ پر توکل کر کے قوت اور بھروسہ حاصل کیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

اور پھر اختتام میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ احکامات صادر کیے۔

"تمہارے جاسوس یا تو عربی النسل ہوں یا وہ لوگ ہوں جن کی خیرخواہی اور راست بازی پر تمہیں اطمینان ہو۔ کیوں کہ کاذب اور افترا پرداز کی خبر سود مند نہیں ہوتی۔ اگرچہ کہ وہ کسی موقع پر سچ ہی کیوں نہ بول دے۔ منافق شخص تمہاری موافقت میں کبھی جاسوسی نہیں کرے گا بلکہ تمہارے خلاف جال بچھانے کی پیش بینی کرے گا۔ والسلام علیک۔"

امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کے یہ جنگی احکامات محض جنگ کی صورت حال میں ہی کارآمد نہیں بلکہ آج معصیت و نفس پرستی کی عفریت کو زیر کرنے میں بھی سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ آج جب کہ مسلمان اپنی زبوں حالی اور اخلاقی پستی کا بری طرح شکار ہو چکے ہیں۔ انھیں ضرورت ہے اسلاف کے اس قول و فعل کی جس کے سبب تمام عالم میں قوم مسلم برسرِ اقتدار ہو چکی تھی۔ دوسری قوموں نے اپنی انسانیت، جرات مندی اور توقیر کا لوہا منوا چکی تھی۔ اے مسلمانانِ عالم! اپنے بزرگوں کی پیروی پر کمربستہ ہو جاؤ کہ تم دنیا اور آخرت میں سربلند و سرخرو رہو۔ ★

داخلہ نوٹس ۸۵-۱۹۸۴ء

امسال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسکولوں میں مندرجہ ذیل کلاسوں میں داخلے ہوں گے۔

۱- ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول۔ اے۔ ایم یو (منٹو سرکل) - پہلی کلاس (انگلش/اردو میڈیم) چھٹی اور نویں کلاس (صرف انگلش میڈیم)

۲- مسلم یونیورسٹی گرلز ہائی اسکول — پہلی کلاس (صرف اردو میڈیم) چھٹی اور نویں کلاسس (صرف انگلش میڈیم)

۳- مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول — چھٹی کلاس (اردو، ہندی اور انگلش میڈیم) ساتویں، آٹھویں اور نویں کلاسس (صرف انگلش میڈیم)

۴- سٹی برانچ اسکول۔ قاضی پاڑہ — پہلی کلاسس (صرف اردو میڈیم)

فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ ۲۷ جون ۸۴ء ہے۔ اسکول پراسپکٹس جس میں درخواست برائے ایڈمیشن ٹیسٹ منسلک ہے، اسکول متعلقہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مزید معلومات پرنسپل متعلقہ سے جوابی لفافہ بھیج کر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

المشتہر منیجر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسکولس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ —— ٹینڈر نوٹس

درج ذیل کاموں کے لیے سربمہر ٹینڈر دوبارہ آئٹم ریٹ کی بنیاد پر طلب کیے جاتے ہیں۔ ہفتہ میں جو کام کے دن مقرر ہیں، ان میں دفتری اوقات کے دوران یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے متعلقہ فارم اور کاغذات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ٹینڈرز ۲۲ جون ۸۴ء کو ۱۰ بجے صبح تک وصول کیے جائیں گے اور اسی روز دوپہر ۱۲ بجے کھول دیے جائیں گے۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	تخمینی رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	مدت
۱	تعمیر و توسیع پالی ٹکنیک (لائبریری) برائے طلباء	۱,۳۱,۸۱۳—۰۰	۲,۲۹۵—۰۰	۵/-	چار ماہ
۲	(الف) ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر اور ورکشاپ کا بیت الخلاء۔ یونیورسٹی پالی ٹکنیک برائے طلباء	۴۶,۸۷۰—۰۰	۱,۷۲۸—۰۰	۱۰	چار ماہ
	(ب) سینیٹری اور واٹر سپلائی فٹنگ ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں اور لیبوریٹری بلاک یونیورسٹی پالی ٹکنیک میں برائے طلباء	۲۲,۲۳۰—۰۰			
		۶۹,۱۰۰—۰۰			
	گرانڈ ٹوٹل	۲,۹۱۳—۰۰			

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر۔ یونیورسٹی انجینیر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۶/۸۴-۸۵ء

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱- سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ [چھٹی کی بنا پر خالی جگہ] - [ایک] ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی۔
شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۵۰۰-۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ معہ دیگر الاؤنس
قابلیت:- لازمی - بی۔ایس سی، ڈپلوما ان لیباٹری کلینیکل پیتھالوجی۔
پسندیدہ:- تدریسی اسپتال میں کام کرنے کا تجربہ [کیمیکل پیتھالوجی میں]

۲- پرسنل اسسٹنٹ برائے ڈین فیکلٹی آف انجینئرنگ [ایک] - [مستقل]
شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ مع دیگر الاؤنس
قابلیت:- آرٹس/سائنس یا کامرس میں بی۔اے کی ڈگری۔
کم ازکم پانچ سال کا تجربہ بحیثیت پرسنل اسسٹنٹ یا اسٹینوگرافر کے

۳- اسٹاف نرس [مستقل] [ایک] - یونیورسٹی ہیلتھ سروس اے ایم یو
شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۲۰-۶۴۰- معہ دیگر الاؤنس۔
قابلیت - لازمی ہائی اسکول۔
کسی منظور شدہ ادارے سے حاصل کیا ہوا جنرل نرسنگ کا اے گریڈ ڈپلوما- اور کسی ہسپتال میں تین سال کام کرنے کرنے کا تجربہ- کسی ایک ریاست میں رجسٹریشن۔
پسندیدہ - مرد اسٹاف نرس قابل ترجیح ہوں گے۔

نوٹ - مفت غیر آراستہ رہائش - پانی اور بجلی بھی مفت - قوانین کے مطابق

رہائش مکان کے عوض کرایہ مکان اور رہائش کا الاؤنس

۴- سینئر لیب اسسٹنٹ (عیبی کی وجہ سے خالی جگہ) (ایک) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن جواہر لال نہرو میڈیکل کالج -

شرح تنخواہ ۳۸۰ — ۱۲ — ۵۰۰ — ای بی ۱۵ — ۵۶۰ — مع دیگر الاؤنس

قابلیت:-

لازمی - سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری

کسی میڈیکل میں پیتھالوجی / بائیوکیمسٹری لیب میں کام کرنے کا تجربہ-

پسندیدہ:- میڈیکل لیب ٹیکنالوجی (پیتھالوجی) میں ڈپلوما رکھنے والے حضرات کو ترجیح دی جائے گی-

۵- فارمسسٹ (ڈوبگیس) (مستقل) یونیورسٹی ہیلتھ سروس

شرح تنخواہ:— ۳۳۰ — ۱۰ — ۳۸۰ — ای بی — ۱۲ — ۵۰۰ — ای بی — ۱۵ — ۵۶۰ — مع دیگر الاؤنس

قابلیت:- ڈپلوما / سرٹیفکٹ ان فارماسی

کسی ریاست میں رجسٹریشن-

فارماسسٹ کی حیثیت کام کرنے کا تین سالہ عملی تجربہ

۶- الیکٹریشن (ایک) (مستقل) - الیکٹریسٹی ڈپارٹمنٹ (ورکس اینڈ مینٹننس)

شرح تنخواہ:— ۲۶۰ — ۸ — ۳۰۰ — ای بی — ۸ — ۳۴۰ — ۱۰ — ۳۸۰ — ای بی — ۱۰ — ۴۳۰ مع الاؤنس

قابلیت:- آئی - ٹی - آئی کا الیکٹریشن میدان میں سرٹیفکٹ

بجلی کے موٹر اور بجلی کے دیگر سامان کی مرمت اور دیکھ بھال کا دو سالہ تجربہ-

۷- لائن مین (ایک) (مستقل) الیکٹریسٹی ڈپارٹمنٹ (سپلائی)

شرح تنخواہ:— ۲۶۰ — ۳ — ۲۹۰ — ای بی — ۶ — ۳۲۶ — ۸ — ۳۶۶ — ای بی ۸ — ۳۹۰ — ۱۰ — ۴۰۰ روپے

مع دیگر الاؤنس

قابلیت:- الیکٹریشن میں آئی - ٹی - آئی کا سرٹیفکٹ-

کرنٹ رکھنے والی بیرونی اور زیر زمین کیبل لائین میں کام کرنے کا دو سالہ تجربہ

کسی الیکٹرک سپلائی کی جگہ کام کا عملی تجربہ رکھنے والے قابل ترجیح ہوں گے-

[illegible] کے پاس کرنٹ رکھنے والی لائین بیرونی اور

زیر زمین کیبل میں کام کرتے رہنے کا دس سالہ تجربہ ہو، نوکری دی جا سکتی ہے
الیکٹرک سپلائی کی جگہ کام کرنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔
اعلیٰ تعلیمی لیاقت اور تجربے کے حامل افراد کو اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں
کو انٹرویو کیلئے طلب کیا جائے گا ان کو ایک طرف کا سکنڈ کلاس کا کرایہ بطور ٹی۔اے۔ دیا جائیگا
مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس اے ایم یو
علی گڑھ کے دفتر سے تین روپے نقد (مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین
پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا ۲۳x۱۵ cm
کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کیا جا سکتا ہے
درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ جون ۱۹۸۴ء شام ۴ بجے تک ہے
نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستوں کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تصحیح

برائے اشتہار نمبر ۶ اور ۷

نمبر ۶- آئیٹم نمبر ۵ (ii) (ا) کے تحت بی ایڈ کورس برائے [illegible] اشتہار دیا گیا تھا اس اشتہار میں جو اسکول مضامین
دیئے گئے ہیں ان کی فہرست میں ہوم سائنس کا اضافہ کیا گیا ہے۔
نمبر ۷- زیر حوالہ اشتہار میں مندرجہ ذیل کلاسوں میں داخلے کے لیے کم از کم علمی استعداد میں ترمیم کردی گئی ہے
۱- ایم ایس سی انجینئرنگ (سول، مکینیکل، الیکٹریکل) ۲- پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان پٹرولیم پروسیسنگ
سلسلہ نمبر ۱ و ۲ کے متعلق اطلاع دی جاتی ہے کہ امیدواروں کا داخلہ صلاحیت کی بنیاد پر ہوگا جس کا تعین مندرجہ
ذیل امور سے ہوگا۔ (ا) جی اے ٹی ای میں کارکردگی (ب) کوالیفائنگ امتحان میں کارکردگی (ج) زبانی امتحان
میں کارکردگی۔ صرف وہ امیدوار وظیفے کے مستحق قرار دیے جائیں گے جو جی۔اے۔ٹی۔ای میں کامیاب ہوں گے۔

این موئیدین
کنٹرولر آف ایڈمیشنز ٹیسٹ اینڈ ایگزامنیشنز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴/۷ - ۸۵ء

مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں [illegible] ہیں۔

۱۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (سنی تھیالوجی) - [ایک جگہ] - (مستقل) [illegible] سٹی ہائی اسکول

شرح تنخواہ:- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ مع [illegible] الاؤنس۔

استعداد:- سنی دینیات میں ایم۔ اے کی ڈگری یا کسی شہرت یافتہ مشرقی درس گاہ یا ادارے کی سند جو ایم۔ اے کے مساوی ہو اور عربی و انگریزی کی کافی استعداد

تجربہ:- کسی ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری اسکول یا کسی شہرت یافتہ مدرسے میں درس و تدریس کا تجربہ۔

ٹریننگ:- تعلیم یا تدریس کی ڈگری یا ڈپلوما

۲۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (انگریزی) (ایک جگہ) - [عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید] سٹی ہائی اسکول۔

شرح تنخواہ:- ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۵۰ مع الاؤنس

قابلیت:- لازمی:- متعلقہ مضمون میں بی۔ اے / بی ایس سی کی سند اور تعلیم و تدریس کا ڈپلوما یا ڈگری۔

پسندیدہ:- (۱) ابتدائی تعلیم انگریزی [illegible] حاصل کی ہو۔

(۲) متعلقہ مضمون/مضامین [illegible] کو کسی کالج یا ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری اسکول [illegible]

(۳) اردو، ہندی [illegible]

۳۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (فزکس) - (ایک جگہ) - (مستقل) - احمدی اسکول برائے نابینا
شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای بی-۳۰-۱۰۰۰-مع دیگر الاؤنس۔
استعداد۔ لازمی۔ فزکس میں ایم ایس سی کی ڈگری۔ اس طرح کہ بی ایس سی میں میتھ بحیثیت ایک مضمون کے رہا ہو۔
پسندیدہ:- تعلیم وتدریس میں ڈگری/ڈپلوما اور متعلقہ موضوع کو کسی ہائی اسکول/ہائر سکنڈری اسکول میں پڑھانے کا کافی تجربہ۔ انگریزی اردو اور ہندی کے ذریعہ پڑھانے کی قابلیت۔
نابینا لوگوں کو پڑھانے کی اہلیت

۴۔ لیڈی سپرنٹنڈنٹ (ریذیڈنٹ) - (ایک جگہ) - (مستقل) - احمدی اسکول برائے نابینا۔
شرح تنخواہ ۶۵۰-۳۰-۷۴۰-۳۵-۸۱۰-ای بی-۳۵-۸۸۰-۴۰-۱۰۰۰-ای بی-۴۰-۱۲۰۰ روپے معہ دیگر الاؤنس۔ اور مفت رہائش کا گرلز ہوسٹل میں انتظام
قابلیت۔ ایم اے کی ڈگری کے ساتھ درس و تدریس میں ڈگری یا ڈپلوما۔ نابینا اسکول میں تعلیم دینے اور انتظام کا تجربہ۔ سلائی، کڑھائی اور طباخی کا عملی تجربہ اور صلاحیت
نابینا حضرات کو تعلیم دینے کے فن کی اہلیت نابینا لڑکیوں کی دیکھ بھال کرنے کا تجربہ
غیر معمولی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔
انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور T.A ریلوے کے سکنڈ کلاس کا کرایہ ایک طرف کا ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سیلکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس اے ایم یو علی گڑھ کے دفتر سے پانچ روپے نقد (مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب ادا ہو، بذات خود 23x10cm کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔
درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ جون ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے
نامکمل اور تاخیر سے وصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸

سیشن ۸۵-۱۹۸۴

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل کورسوں کے واسطے ۸۴ - ۱۹۸۵ء کے تعلیمی میقات کے لیے اہل امیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ فارم مسلم یونیورسٹی میں جمع ہونے کی آخری تاریخ اور فیس داخلہ فارم ہر کورس کے سامنے تحریر کر دی گئی ہے۔

نمبر شمار	نام کورس	فارم جمع ہونے کی آخری تاریخ	قیمت داخلہ فارم
۱	بی۔اے/بی ایس سی/بی کام (آنرز) پارٹ ۲۔ تین سالہ ڈگری کورس کا۔ فیکلٹی آف آرٹس سوشل سائنس اور کامرس	۱۶ر جولائی ۸۴ء	۱۲ روپے مع رجسٹریشن فیس دو کمبینشن کی
۲	وومنس پولی ٹیکنک میں ڈپلوما۔ (I) الیکٹرونکس انجینئرنگ (II) کاسٹیوم ڈیزائنگ اینڈ ڈریس میکنگ۔ آفس اسسٹنٹ شپ اینڈ سکریٹریل پریکٹس	۶ر جولائی ۸۴ء	۳ روپے
۳	سرٹیفکٹ ان ڈرافٹس مین شپ (سول/میکینکل)	۶ر جولائی ۸۴ء	۳ روپے
۴	ڈپلوما ان ڈرافٹنگ اینڈ ڈرائنگ (سول میکینکل)	۶ر جولائی ۸۴ء	۳ روپے
۵	ڈپلوما آف ٹیچنگ ان اردو	۶ر جولائی ۸۴ء	۳ روپے
۶	سرٹیفکٹ ان اردو کیلگرافی۔	۶ر جولائی ۱۹۸۴ء	۳ ″
۷	ڈپلوما ان اسٹینو ٹائپنگ	–	۳ ″
۸	ایم۔اے/ایم ایس سی/ایم کام	۱۶ر اگست ۱۹۸۴ء	۱۲ روپے مع رجسٹریشن فیس دو کمبینشن تک
	ایل ایل بی/ایل ایل ایم	۱۶ر اگست ۸۴ء	
	بیچلر آف تھیالوجی (بی۔ٹی ایچ)/ماسٹر آف تھیالوجی (ایم ٹی۔ایچ)	۱۶ر اگست ۸۴ء	
	ڈپلوما ان بنک ایڈمنسٹریشن (ڈی۔بی۔اے)	۱۶ر اگست ۱۹۸۴ء	
	ڈپلوما ان سکریٹریل پریکٹس (ڈی۔ایس۔ڈبلیو)	۱۶ر اگست ۱۹۸۴ء	
۹	ڈپلوما ان پروفیشنل کورسیز	۱۶ر اگست ۱۹۸۴ء	

الف الیکٹرونکس ڈاٹا پروسسنگ مشین آپریشن

ب۔ موزیالوجی

ج۔ ہیلتھ مینیجمنٹ۔

د۔ کمپنی لا، بنکنگ اینڈ انشورنس

ہ۔ لیبر لا اینڈ لیبر ریلیشن

و۔ کریمنالوجی اینڈ کریمنل ایڈمنسٹریشن

ز۔ لیباریٹری ٹیکنالوجی (فزیکل اور کیمیکل)

ح۔ جیم ٹیسٹنگ اینڈ آرٹ آف لیپیڈری

ط۔ میڈیکل لیباریٹری ٹیکنالوجی (ریڈیالوجی)

ی۔ جرنلزم

ک۔ اپلائیڈ آرٹ

ل انسٹرومنٹ ٹیکنالوجی

م۔ میڈیکل لیب ٹیکنالوجی (کلینکل پیتھالوجی)

ن۔ کارٹوگرافی

س۔ آرتھوپیٹکس

ع فزیکلچر۔

کورسز، فیس، درخواست بھیجنے کے رولز گائڈ ایڈمیشن نمبر ۲ میں دے دیے گئے ہیں۔ داخلہ فارم اور ایڈمیشن گائڈ اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے درخواست بھیجنے پر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ہر کورس کے سامنے درج ہے۔ قیمت فارم و گائڈ کی ادائیگی نقد یا پھر فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر بھیجا جانا ضروری ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء اپنے ہالوں کے پرووسٹ سے داخلہ فارم لے سکتے ہیں۔ وہ امیدوار جو فارم بذریعہ ڈاک منگانا چاہتے ہوں ان کو چاہیے کہ 9x6 کا پتہ لکھا اور ٹکٹ (۱۰-۲ روپے دس پیسے) کا چسپاں شدہ لفافہ بھیج دیں۔ اگر درخواست فارم رجسٹرڈ ڈاک سے حاصل کرنا چاہیں تو خود کے پتہ لکھے لفافے پر 85-4 کے ٹکٹ لگائے جانا ضروری ہیں

طلباء و طالبات ایکسٹرنل امیدوار کے درخواست فارم جو ہر طرح مکمل ہوں اور مطلوبہ فیس کے ساتھ اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ اے ایم یو۔ علی گڑھ کے پاس آخری تاریخ کو شام پانچ بجے تک پہنچ جانا ضروری ہیں۔ یونیورسٹی کے طلباء اپنے فارم اپنے متعلقہ پرووسٹ کے یہاں آخری تاریخ سے کم از کم دو روز پہلے جمع کردیں۔ خواتین امیدواروں کے درخواست فارم برائے بی اے (آنرز) (آرٹس اور سوشل سائنس) اور بی ایس سی (آنرز) کورسوں میں داخلے کے واسطے پرنسپل ویمنس کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر براہ راست مطلوبہ فیس کے ساتھ بھیجے جائیں جو مقررہ تاریخ میں پرنسپل آفس میں پہنچ جانا چاہیں۔ ڈپلوما ان الکٹرونکس انجینئرنگ، ڈپلوما ان کاسٹیوم اینڈ ڈیزائننگ، ڈریس میکنگ اور ڈپلوما ان آفس اسسٹنٹ شپ اور سکریٹریل پریکٹس میں داخلے کے لیے درخواست فارم مع رجسٹریشن فیس پرنسپل یونیورسٹی ویمنس پولی ٹکنک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پاس متعلقہ تاریخ میں پہنچ جانا چاہیں۔ غیر مکمل یا دیر سے وصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں نہ اُن کے سلسلے میں کوئی خط و کتابت کی جائے گی۔

این۔ موئیدین۔ کنٹرولر آف اگزمینیشنز اینڈ ایڈمیشنز

فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ
یونیورسٹی پولیٹکنک کیمپس
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ایف سی آئی اے/۱/۸۵-۱۹۸۴

غیر مستقل مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے (جن کے چلتے رہنے کی امید ہے) درخواستیں مطلوب ہیں۔

عہدہ کا نام، تعداد اور شرح تنخواہ	تعلیمی لیاقت اور تجربہ
۱۔ سینئر انسٹرکٹر ۲ جگہیں۔ شرح تنخواہ ۷۰۰--۱۳۰۰ (ایک جگہ کیلیے کوکری، ریسٹورنٹ اور کاونٹر سروس کے لیے)	ہوٹل مینیجمنٹ میں تین سالہ ڈپلوما اور کیٹرنگ ٹکنالوجی میں ڈپلوما کم ازکم سکنڈ ڈویژن یا اس کے مساوی۔ تجربہ:- کم ازکم پانچ سالہ تجربہ کسی تعلیمی ادارے یا اس سے متعلقہ انڈسٹری کے دوران میں تعلیم دینے کا یا عملی تجربہ مرجح:- ہوٹل مینیجمنٹ میں خصوصی پوسٹ ڈپلوما
۱۔ سینیر انسٹرکٹر ایک جگہ شرح تنخواہ:- ۷۰۰--۱۳۰۰ ٹریول اور ٹورزم کے لیے	سکنڈ ڈویژن میں ایم کام اور ایم۔بی۔اے تجربہ:- کسی تعلیمی ادارے یا انڈسٹری میں تعلیم دینے یا عملی کام کا تجربہ

عہدہ	اہلیت
۳۔ انسٹرکٹر ۲ جگہیں (ایک ایک کوکری، ریسٹورنٹ اور کاؤنٹر سروس کے لیے) شرح تنخواہ:- ۶۵۰ ـ ۹۶۰	ہوٹل مینجمنٹ میں تین سالہ ڈپلوما اور کیٹرنگ ٹیکنالوجی میں یا اس کے مساوی میں ڈپلوما۔ (کم از کم سکنڈ ڈویژن پاس ہونا ضروری ہے) تجربہ:- متعلقہ شعبے کام یا میدان میں تین سالہ تجربہ۔ پسندیدہ:- ہوٹل مینجمنٹ میں خصوصی [illegible] ڈپلوما یا متعلقہ میدان میں کرافٹ [illegible]
۴۔ انسٹرکٹر ایک جگہ برائے ٹریول وٹورزم شرح تنخواہ:- ۶۵۰ — ۹۶۰	ایم۔ اے (آرکیالوجی) یا [illegible] (کم از کم سکنڈ ڈویژن) تجربہ:- متعلقہ شعبے یا کام یا میدان میں [illegible] تین سالہ تجربہ۔ پسندیدہ:- پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ٹریولنگ اور ٹورزم میں
۵۔ اسسٹنٹ انسٹرکٹر ایک شرح تنخواہ ۴۲۵ —	ہوٹل مینجمنٹ اور کیٹرنگ ٹیکنالوجی میں تین سالہ ڈپلوما یا اس کے مساوی۔ (کم از کم سکنڈ ڈویژن) تجربہ:- کوکری میں کم از کم ایک سالہ تجربہ۔ پسندیدہ:- متعلقہ میدان میں کرافٹ سرٹیفکیٹ
۶۔ اکاؤنٹس کلرک کم کیشیر۔ ایک جگہ۔ شرح تنخواہ۔ ۳۳۰ — ۵۶۰	کامرس میں گریجویشن اور کسی کاروباری یا کسی سرکاری دفتر میں پانچ سال کام کا تجربہ یا ایس۔ اے ایس اکاؤنٹنٹ کی حیثیت [illegible] اسٹیبلشمنٹ کا دو سالہ تجربہ
۷۔ کلرک گریڈ I ایک جگہ۔ شرح تنخواہ۔ ۳۰۰ - ۵۶۰	کسی دفتر میں پانچ سالہ کام کے تجربے کے ساتھ کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے گریجویشن۔ پسندیدہ۔ ٹائپ کے کام کا تجربہ
۸۔ کلرک کم ٹائپسٹ ایک جگہ شرح تنخواہ ۲۶۰ — ۴۰۰	میٹرکولیشن مع چالیس الفاظ فی منٹ ٹائپ اسپیڈ اور کم از کم ایک سالہ تجربہ

۹۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ ۲ جگہیں
شرح تنخواہ :۔ ۳۳۰-۵۶۰

پسندیدہ :۔ ہندی اور سندی میں ٹائپ کرنے کی صلاحیت
ہوٹل مینجمنٹ اور کیٹرنگ ٹکنالوجی کا تین سالہ تجربہ
یا
متعلقہ میدان میں کام کرنے کا سرٹیفکیٹ اور دس سال کا تجربہ

۱۰۔ لیبارٹری اسسٹنٹ ایک جگہ۔
شرح تنخواہ ۲۶۰- ۴۰۰

میٹرک کولیفیشن اور کیٹرنگ اسٹیبلشمنٹ میں پانچ سالہ تجربہ

اعلیٰ تعلیمی صلاحیت اور تجربے کے حامل افراد کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جاسکتی ہے۔

مطلوبہ فارم اور ہدایات ایڈمنسٹریٹو آفیسر، فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ یونیورسٹی پولی ٹکنک کیمپس۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے پانچ روپے نقد یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر بنام سکریٹری فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ادائیگی کے بعد بذات خود یا مع ۱۰x۵ انچ کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور اس پر مطلوبہ ٹکٹ بھی چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ جون ۱۹۸۴ دوپہر ایک بجکر تیس منٹ ہے۔

نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

ایکٹنگ پرنسپل / سکریٹری

فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ
یونیورسٹی پولی ٹکنک کیمپس
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پرنٹر پبلشر نورالحسن نقوی ... پریس علی گڑھ۔ مقام اشاعت۔ شعبہ اردو اے ایم یو۔ علی گڑھ

بہارِ نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت
نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے
پھنسی، خارش اور
داد وغیرہ کی
دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یو پی

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh. Phone . 4186

ایجوکیشنل بُک ہاؤس علی گڑھ کی خاص خاص مطبوعات

ادبیات

کتاب	مصنف	قیمت
کلیاتِ اقبال (اُردو)	صدی ایڈیشن	۲۰ -
اقبال معاصرین کی نظر میں	وقار عظیم	۵۰ -
اقبال بحیثیت شاعر	رفیع الدین ہاشمی	۴۵ -
اقبال کی اردو نثر	عبادت بریلوی	۲۰ -
اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم	۲۰/-
فکرِ اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۵۰/-
اقبال فن اور فلسفہ	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۷/۵۰
تصوراتِ اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۵/-
بانگِ درا عکسی	علامہ اقبال	۱۰/-
بالِ جبریل عکسی	"	۸/-
ضربِ کلیم عکسی	"	۸/-
ارمغانِ حجاز (اُردو) عکسی		۴/۵۰

غالبیات

کتاب	مصنف	قیمت
غالب تقلید اور اجتہاد	پروفیسر خورشید الاسلام	۳۰ -
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۱۵/-
دیوانِ غالب	نورالحسن نقوی	۱۳/-
خطوطِ غالب کا فنی تجزیہ	حامدہ مسعود	۲۰/-
فلسفیِ غالب	احمد رضا	۱۰/-

فیض

کتاب	مصنف	قیمت
کلامِ فیض عکسی	فیض احمد فیض	۲۰/-
نقشِ فریادی عکسی	"	۶/-
دستِ صبا عکسی	"	۶/-
زنداں نامہ عکسی	"	۷/۵۰
دستِ تہ سنگ عکسی	"	۶/-

سرسید

کتاب	مصنف	قیمت
سرسید ایک تعارف	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۲/۰
سرسید اور علی گڑھ تحریک	"	۴۵/-
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۲۰/-
انتخابِ مضامین سرسید	آلِ احمد سرور	۶/-
مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق	۱۵/-

لسانیات و جمالیات

کتاب	مصنف	قیمت
اردو زبان و ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۱۲/۵۰
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۱۲/-
جمالیاتِ شرق و غرب	پروفیسر نازش حسین	۲۰/-
ادب میں جمالیاتی اقدار	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۰/-

مثنوی

کتاب	مصنف	قیمت
اُردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری	۱۲/۵۰
انتخاب مثنویاتِ اردو	مغیث الدین فریدی	- -
مثنوی گلزارِ نسیم	ظہیر احمد صدیقی	۶/-
مثنوی سحر البیان	"	۶/-

ناول و افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
ہاؤسنگ سوسائٹی	قرۃ العین حیدر	۳/-
روشنی کی رفتار	قرۃ العین حیدر	۳۰/-
آخرِ شب کے ہمسفر (ناول)	"	۴۵/-
آنگن (ناول)	خدیجہ مستور	۳ -
خدا کی بستی (ناول)	شوکت صدیقی	۴۵/-
چوٹیں	عصمت چغتائی	۲/-
ضدی	"	۱۲/-
ہمارے پسندیدہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۱۵/-
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	"	۱۵/-
کرشن چندر اور کرشن چندر کے افسانے	"	۱۵/-
اُردو کے تیرہ افسانے	"	۱۲/-
منٹو کے نمائندہ افسانے	"	۱۲/-
پریم چند کے نمائندہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس	۱۲/-
نمائندہ مختصر افسانے	مرتبہ محمد طاہر فاروقی	۶/-

ڈرامے

کتاب	مصنف	قیمت
اُردو ڈراما کا ارتقا	عشرت رحمانی	۴۰/-
اُردو ڈراما: تاریخ و تنقید	"	۲۰/-
یونانی ڈراما	عتیق احمد صدیقی	۲۰ -
آغا حشر اور اردو ڈراما	انجمن آرا	۳۰ -
انارکلی	مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن	۹ -

ادب و تنقید

کتاب	مصنف	قیمت
مضامینِ نو	خلیل الرحمن اعظمی	۲۵/-
تنقیدیں	پروفیسر خورشید الاسلام	۳/-
شناسا چہرے	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵ -
ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ	رشید حسن خاں	۲۵ -
تنقیدی تناظر	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰ -
پریم چند تنقیدی اور کارنامے	"	۳۵/-
احساس و ادراک	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۲/-
انیس شناسی	ڈاکٹر فضل امام	۱۲ -
چہرہ پسِ چہرہ	ڈاکٹر ابنِ فرید	۲۵/-
میں ہم اور ادب	"	۲۰/-
غزل کا بیا منظر نامہ	شمیم حنفی	۱۰/-
ادب کا مطالعہ	ڈاکٹر اطہر پرویز	۲۵/-
ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	۲/-
اردو قصیدہ نگاری	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	۳۵/-
کلاسیکیت و رومانیت	"	۱۲/-
نثر، نظم اور شعر	منظر عباس نقوی	۷/۵۰
باغ و بہار	مقدمہ ممتاز حسین اختر	۱۲/-
ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	۱۵/-
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۹/-
موازنہ انیس و دبیر	مقدمہ ڈاکٹر فضل امام	۱۲ -
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی	۱۲ -
امراؤ جان ادا	مقدمہ شمس اعظمی	۱۲ -
ضمیمہ نظم حالی	مقدمہ ڈاکٹر ...	۵ ،
مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۳ ، ۵
آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۲/-
جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۴/-
غزل اور مطالعہ غزل	"	۳/-
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۲۰/-
نیا افسانہ	"	۲/-
شہرت کی خاطر	رشید احمد صدیقی	۱۵/-
تنقید اور احتساب	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۵/-
ستارہ یا بادبان	محمد حسن عسکری	۱۵/-
انسان اور آدمی	"	۱۰/-
اسلوب	سید عابد علی عابد	۲/-
قرۃ العین حیدر اور دھندلا دل	پروفیسر عبدالسلام	۱۲/-
تنقیدی دبستان	سلیم اختر	۱۵/-
تحقیقی و تنقیدی مطالعہ باغ و بہار	"	۱۵/-
منٹو کا فن	وقار عظیم	۵/-
آب حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ	سید سجاد	۱/-
مقدمہ آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	۶/۵۰
مقدمہ و تبصرہ امراؤ جان ادا	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۴ -
حسرت موہانی	طلعت سلطانہ	۱۵/-

سیاسیات و تاریخ

کتاب	مصنف	قیمت
دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن)	محمد ہاشم قدوائی	۲۰/-
تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پولیٹیکل تھاٹ)	"	۲/-
جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)	"	۱۵/-
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالٹکس)	"	۱۵/-
مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس)	"	۷/۵۰
تاریخ تہذیبِ عالم (ورلڈ ہسٹری)	اے۔ ایے۔ ہاشمی	۲/-

متفرق

کتاب	مصنف	قیمت
ایڈمنسٹریٹر کا ڈیسک	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۳۵/-
جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر مسار الدین علوی	۱۲/-
اصول تعلیم	"	۱۵/-
رہبرِ صحت	مسرت رحمانی	۷/-
تعلیمی نصاب کے نئے زاویے	"	۱۵ -
علم خانہ داری	"	۱۵/-
بچوں کی پرورش	"	۸/-
گلدستۂ مضامین و انشاء پردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۸/-
اُردو صرف	ڈاکٹر انصار اللہ	۳/۷۵
اردو نحو	"	۲/۷۵
نور اللغات (جیبی عکسی)		۷/۵۰
نور اللغات (اردو جدید ایڈیشن)		۲۶/-
اُردو سیکھئے (ہندی کے ذریعے اردو سیکھئے)		۲/-
انگلش کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم اے رشید	۸/-

ایجوکیشنل بُک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نور الحسن نقوی
استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

جلد ۳ ★ یکم تا ۱۵ر جولائی ۱۹۸۴ء ★ شمارہ ۱۳

مندرجات

سرورق کی تصویر: پروفیسر عبد السلام

اے ہمارے پروردگار! ہم کو وہ چیز بھی عطا کیجیے جس کا ہم سے آپ نے اپنے پیغمبروں کی معرفت وعدہ فرمایا ہے۔ (آل عمران، ۱۹۴)

کانووکیشن کی تقریب

ڈاکٹر آئی احمد اور ڈاکٹر رضا اللہ، پروفیسر عبدالسلام کے ساتھ

قرآن کریم میں صرف دو سو پچاس آیتیں ایسی ہیں جو قوانین سے متعلق ہیں۔ اس کے مقابلے میں ساڑھے سات سو آیتوں یعنی قرآن شریف کے تقریباً آٹھویں حصے میں ایمان لانے والوں سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ غور کریں، اپنی عقل کا بہترین استعمال کریں اور سائنس کے چرچے کو اپنی تہذیب کا لازمی حصہ بنالیں۔

ڈاکٹر محمد اعجاز الخطیب (دمشق یونیورسٹی)

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم تاریخ کے صفحات پلٹ دیں اور پھر اس قابل ہو جائیں کہ سائنس کے میدان میں دنیا کی رہبری کر سکیں؟ ہم یقیناً ایسا کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہمارے نوجوان اس کا بیڑا اٹھائیں۔ منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کی دشواریاں جھیلنا ہی پڑیں گی کہ اس کے بغیر منزل تک کوئی نہیں پہنچتا۔ پس یہ ضروری ہے کہ نوجوانانِ قوم کے دلوں میں منزل کو پالینے کا ولولہ پیدا کیا جائے اور پوری قوم کو جوش و خروش سے اس کام کے لیے تیار کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ہمیں نصف سے بھی زیادہ آبادی کو سائنسی تربیت دینی پڑے گی۔

پروفیسر عبدالسلام، نوبل انعام یافتہ

سائنس کے مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی تک دنیا کا کوئی علم ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کا شرمندۂ احسان نہ ہو۔ علوم میں کوئی اضافہ ایسا نہیں ہوا جس کا سہرا اس دور کے مسلمانوں یا عربوں کے سر نہ رہا ہو۔ اس کے بعد چار سو سال ایسے گزرے جنھیں ڈھلان کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد مکمل تاریکی ہے۔ جہالت، زوال اور بے حسی کی تاریکی! آج کا مسلمان سائنس اور ٹکنالوجی سے کوسوں دور ہے اور ان چیزوں پر غیر مسلموں کی حکمرانی ہے۔ یہ صورتِ حال تشویشناک ہے۔ ہم سب کو مل کر اس طرف توجہ کرنی چاہیے اور علم کی دنیا میں اپنا کھویا ہوا وقار پھر سے حاصل کرنا چاہیے۔

سید حامد (ایک تقریر سے)

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا ! ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا —— اقبال

سائنس اور ہم

سرسید کی دوراندیشی کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ آج سے سوا سو سال پہلے وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ اگر مسلمان سربلند ہوکر جینا چاہتے ہیں تو انہیں تعلیم کی طرف توجہ کرنی اور سائنس کو اہمیت دینی ہوگی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے انہوں نے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا لیکن وہ اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ صرف ایک کالج پورے ملک کے مسلمانوں کی ضرورت کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ہر جگہ اس کی شاخیں قائم ہوں جو اپنے اپنے علاقوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کی تدبیریں کریں۔ مختلف مقامات پر اس انجمن کے سالانہ اجلاس ہوئے۔ جہاں اجلاس ہوتا سرسید کئی دن پہلے وہاں پہنچ جاتے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے کوشاں رہتے سائنس کا ذوق عام کرنے اور سائنس کی تعلیم کو رواج دینے کے لیے انہوں نے سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی جس کے زیر اہتمام سائنس سے متعلق موضوعات پر لکچر دیے جانے تھے اور تجربے کرکے دکھائے جاتے تھے۔ سرسید کی ان تمام کوششوں کے باوجود ہم اس منزل تک نہ پہنچ سکے جس تک پہنچ جانا ایسا دشوار بھی نہ تھا۔ یہ نہیں کہ سرسید کا مشن ناکام ہوگیا ہو مگر عام تعلیمی بیداری کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ یقیناً شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور ہم آج بھی تعلیم بالخصوص سائنس کی تعلیم میں اوروں سے بہت پیچھے ہیں۔

یہ اس قوم کی تعلیمی پسماندگی کا ماتم ہے جسے حکم دیا گیا تھا کہ پیدائش سے لے کر موت تک علم حاصل کرو اور علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمھیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جدید عربی میں علم سے مراد ہے سائنس۔ یوں بھی سائنس کو اسلام نے کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ ایک بار کسی مملکت کا حکمراں حضرت امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ مسجد میں طلبا کو درس دے رہے تھے۔ جب فارغ ہوئے تو معزز مہمان نے کہا جو تعلیم آپ دے رہے تھے وہ دینی تعلیم تو نہیں تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ رموزِ کائنات کو سمجھنا اور سمجھانا بھی تعلیم ہے۔ حضرت علیؓ نے تو یہاں تک فرمایا تھا کہ "کارخانۂ قدرت پر غور و فکر عین عبادت ہے"۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ جس نے اس طرف سے غفلت برتی اس نے حکم خداوندی اور ارشادِ نبویؐ سے روگردانی کی اور نافرمانی کا مرتکب ہوا۔ جنھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا دنیا بھر کے علوم ان کے دامن میں تھے اور یورپ نے اپنے چراغ انہی کے چراغوں سے روشن کیے تھے۔ لیکن آج ہم ہر تحقیق اور ہر ایجاد کے لیے یورپ کے محتاج ہیں۔

یہ نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی بات ہے کہ سائنس کو فروغ دینے کا سہرا جس قوم کے سر تھا آخر وہ اس سے بیزار کیوں ہوگئی؟ اور وہ مضمون جس میں محض خیالی باتیں نہیں ہوتیں بلکہ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے کرکے دکھا دیا جاتا ہے، مسلم طلبا کے لیے اس میں کشش کیوں نہ باقی رہی پہلا سبب تو بالکل واضح ہے کہ یہ مضمون محنت اور استقلال کا متقاضی ہے۔ آرام کرسی پر دراز ہو کے پڑھنے والوں کا اس کوچے میں گزر نہیں۔ یہاں تو وہ قدم رکھے جو کمر کس کے گھنٹوں تجربہ گاہ میں کھڑا رہ سکے۔ چنانچہ دنیا کی ساری تن آسان قومیں سائنس میں پیچھے ہیں اور ہمیشہ پیچھے رہیں گی۔ ہمارے بچوں کی سائنس سے دوری کا ایک سبب اور بھی ہے جس کی طرف پروفیسر عبدالعلیم صاحب نے ایک گفتگو کے دوران اشارہ کیا تھا۔ وہ یہ کہ ہم نے کبھی اپنے بچوں کو ادھر مائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جو والدین خود تعلیم

اور اپنی تہذیب کے اعلیٰ ہونے کا عرفان بھی ہوا۔ وہ نیوٹن اور میکسویل کے دیس میں رہتے ہوئے بھی دن بدن بوعلی سینا اور ابن ہیثم کے قریب ہوتے گئے۔ ان کا جذبۂ حبِ وطن شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اپنے وطن پاکستان کی خدمت کے جذبے سے سرشار اور اسے عالمی برادری میں ایک اعلیٰ علمی مقام دلانے کی آرزو سینے میں دبائے ۱۹۵۱ء میں وہ واپس آئے جہاں گورنمنٹ کالج لاہور میں انھیں ریاضی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔

ایک سائنس داں غیر سائنسی مزاج کی سوسائٹی میں نکو بن جاتا ہے عبدالسلام جس دور میں واپس پاکستان لوٹے وہاں کی سوسائٹی نہ صرف غیر سائنسی تھی بلکہ سائنس کش بھی تھی۔ سائنس کی اہمیت کا زبانی اقرار تو کیا جاتا تھا، مگر عملاً اس کے فروغ کی راہ میں روڑے اٹکائے جاتے تھے۔ سائنس میں تحقیق کو فروغ دینے کی کوششوں کو تضیع اوقات سمجھا جاتا تھا اور کالج کے انتظامیہ اس عمل کو تحسین کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ اس ماحول میں سائنس داں عبدالسلام جلد ہی اپنے آپ کو ماہی بے آب محسوس کرنے لگے۔ اور جب بات یہاں تک پہنچی کہ ایک علمی مباحثے کے سلسلے میں گرمیوں کی تعطیل میں اُن کے بمبئی آنے پر تنخواہ کاٹ لی گئی تو انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بے موت مرنے سے بچانے کے لیے پھر انگلستان کی طرف رجوع کیا۔ وہاں امپریل کالج لندن میں ان کی تقرری بہ حیثیت لکچرر ہوئی۔ اس کے دو سال بعد رہیں پروفیسر کا عہدہ ملا جس پر وہ آج تک قایم ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام کی تحقیق کا میدان نظریاتی ذراتی طبیعیات ہے یہ وہ میدان ہے جس میں کام کرنے سے بڑے بڑے لائق سائنس داں بھی گھبراتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیقات میں ہمیشہ ہی بنیادی اہمیت کے مسائل کو اٹھایا ہے اور اس کا خوبصورت حل پیش کیا ہے۔ اب تک انھوں نے تقریباً دو سو پچاس بنیادی اہمیت کے بین الاقوامی ایوارڈ اور میڈل حاصل کیے ہیں۔

صرف تینتیس ۳۳ سال کی عمر میں ہی اُن کو فیلو آف رائل سوسائٹی چن لیا گیا اور دنیائے علم کا سب سے بڑا اعزاز نوبیل انعام ۱۹۷۹ء میں ان کو ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے علمی اور دیگر کارناموں پر دیے گئے اعزازات کی فہرست کافی لمبی ہے اور اس کا بیان اس تعارفی خاکے میں ممکن نہیں۔

انسان کی عظمت کا معیاری پیمانہ وسیع القلبی ہے۔ کوئی کتنا ہی قدآور کیوں نہ ہو اگر اس کا دل تنگ اور درد سے خالی ہو تو وہ بونا ہے بڑا وہ ہے جس کا دل بے در و دیوار ہو۔ تنہا آگے بڑھنا آسان ہے مگر اپنے ساتھ مظلوموں کی فوج لے کر آگے بڑھنا مشکل۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو عبدالسلام عظیم ترین ہیں۔ سائنس کی تاریخ میں کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کے دل میں اپنوں میں سائنس کو فروغ دینے کی تڑپ ہو جو عبدالسلام کے دل میں ہے۔ پاکستان کے جس سائنسی ماحول نے جنوری ۱۹۵۴ء میں ان کو اپنے وطن عزیز کو چھوڑنے پر مجبور کیا تھا وہ اسے بھولے نہیں۔ ذاتی کامیابیوں اور اعزازات کی بارشوں میں بھی انھوں نے تیسری دنیا خصوصاً عالمِ اسلام کے اس سائنسی ماحول کو یاد رکھا جس میں نہ جانے کتنے عبدالسلام پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ تیسری دنیا میں سائنس کو فروغ دینے اور وہاں ایک سائنسی ماحول پیدا کرنے کے لیے وہ مستقل بے قرار رہے۔ اس بے قراری کو بالآخر انٹرنیشنل سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس

کی شکل میں سکون ملا۔ یہ مرکز جو آئی سی ٹی پی کے نام سے مشہور ہے ۱۹۶۴ء میں اٹلی کے شہر ترئستی میں قایم ہوا۔ یہ عبدالسلام کا تیسری دنیا کی سائنس پر وہ عظیم احسان ہے جسے نسل در نسل یاد کیا جاتا رہے گا۔ اس مرکز کے قایم ہونے میں عبدالسلام کو کن کن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بڑی طاقتوں کے نمائندوں سے کیا کیا جنگ کرنی پڑی اس کے بیان کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ یہ مرکز عبدالسلام کے عزمِ محکم، جہدِ مسلسل اور جذبۂ صادق کا نادر نمونہ ہے۔ یہاں ہر سال تیسری دنیا کے ہزاروں سائنس داں مختصر قیام کے لیے آتے ہیں اور علوم جدیدہ کے ماہرین سے فیض یاب ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ ان سائنس دانوں کے سفر اور قیام کے اخراجات مرکز خود برداشت کرتا ہے۔ یہ مرکز کیا ہے وحدتِ انسانی کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ جہاں سیاست دانوں کی بنائی ہوئی ساری سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں مشرق و مغرب ہاتھ ملاتا ہے۔ گورا کالے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اشتراکیت سرمایہ داری کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے۔ تنہا اس مرکز کا قیام ہی عبدالسلام کا وہ کارنامہ ہے جس پر ایک اور نوبیل انعام ان پر نچھاور کیا جا سکتا ہے۔ عبدالسلام کی شخصیت بڑی ہی پیاری اور دلآویز ہے۔ سامنے ہوں تو بے اختیار عقیدت سے آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ مجھے ان سے پہلی ملاقات کا شرف ۱۹۷۱ء میں آئی سی ٹی پی ترئستی میں ہوا جس کے وہ ڈائرکٹر ہیں۔ اس وقت تک ان کو نوبیل انعام نہ ملا تھا مگر ان کے علمی اور دیگر کارناموں کو سن سن کر دل پر ایک رعب بیٹھ چکا تھا۔ ان سے ملنے میں ایک قسم کی جھجک مانع تھی اور ملاقات کو جی بھی بہت چاہ رہا تھا۔ بالآخر ایک روز ہمت کر کے ان کے پاس پہنچ ہی گیا۔ تعارف ہوا۔ پھر تو شفقت کی وہ بوچھار ہوئی کہ میں یکسر بھول گیا کہ ابھی چند منٹ قبل مجھے ان سے ملاقات کرنے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ گفتگو اردو میں ہوئی (وہ اردو جاننے والوں سے اسی زبان میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں) اور زیادہ تر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں۔ گو وہ اس یونیورسٹی سے کبھی منسلک نہیں رہے پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ اس ادارے سے ایک قسم کا قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ جب میں نے انھیں یہ بتایا کہ ہماری یونیورسٹی سائنسی تحقیق کے میدان میں کافی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے تو بہت خوش ہوئے اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ وہ اس کو کیمبرج اور آکسفورڈ کے ہم پلہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ پھر کسی ہندوستانی عبدالسلام کو حصولِ علم کے لیے اپنے وطن کو چھوڑ کر انگلستان نہ جانا پڑے۔ کاش! ہم ان کے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا سکیں۔

★ ★ ★

ڈاکٹر سید محمد ابوالہاشم رضوی

بُنیادی قوتوں کی تلاش

(پروفیسر عبدالسلام کی تحقیقات کا جائزہ)

پروفیسر عبدالسلام نے نظریاتی طبیعیات (Theoretical Physics) کے میدان میں بنیادی ذرات (Elementary Particles) پر بنیادی اور اہم تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلسل علم طبیعیات کی سرحدوں پر کام کرتے رہے ہیں اور نئی راہوں کی نشاندہی کرنے کے بعد اور بنیادی و دقیق سوالوں کے جوابات کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ یوں تو ان کی اور بھی تحقیقات اتنی اہم ہیں کہ نوبل انعام کے لائق سمجھی جا سکتی ہیں۔ مگر جس کام (برق مقناطیسی اور ضعیف نیوکلیر قوتوں کی وحدت کا نظریہ) پر ان کو وائنبرگ (Weinberg) اور گلیشاؤ (Glashow) کے ساتھ ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام دیا گیا وہ واقعی اعلیٰ ترین تحقیق کا ایک نمونہ ہے۔

انھوں نے بنیادی ذراتی طبیعیات پر تقریباً ۲۵۰ تحقیقی مقالے شائع کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کی سائنسی اور تعلیمی ترقی کے مسائل اور پالیسی پر بہت سے مضامین لکھے۔ ان کی زندگی پر اسلام کی تعلیمات خصوصاً اس کے تصورِ وحدت کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ فطرت کی بنیادی قوتوں کی وحدت اور تمام عالمِ انسانی کی وحدت پر ان کا یقین ہے۔ اسی وجہ سے فزکس میں ان کا کام دونوں نوعیت کا ہے۔ سائنس کی بین الاقوامیت پر عبدالسلام کا بڑا زور ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ "سائنس انسانیت کی مشترکہ میراث ہے" بڑی اہمیت کا حامل ہے اور قابلِ غور ہے۔ اس کا ایک نایاب اور درخشاں نمونہ اٹلی کے شہر تریستے (Trieste) میں بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعیات International Centre for Theoretical Physics کا قیام ہے۔ جس کی بدولت ترقی پذیر ممالک کے بے شمار نوجوان سائنس دانوں کو جدید معلومات حاصل کرنے اور تبادلۂ خیال کے مواقع میسر آتے ہیں جس کی سہولت خود ان ممالک میں ممکن نہیں ہے۔ یہ بین الاقوامی مرکز عبدالسلام کا ایک عظیم کارنامہ ہے جس کا فیض جاری اور ساری ہے۔ اس کی تکمیل سے لے کر قیام تک کے سارے مراحل اس مردِ مجاہد نے تنہا طے کیے ہیں۔

ذیل میں ہم ان کی چند اہم تحقیقات کو آسان الفاظ میں مختصراً بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس سے قبل مادے کے بنیادی ذرات، ان کے بین موجود قوتیں اور ان کی وحدت کے گیج فیلڈ نظریے (Gauge Field Theory) سے تعارف مفید ثابت ہوگا۔

ذرات، بنیادی قوتیں اور ان کی وحدت کا تصور

ماہرینِ طبیعیات کا موجودہ تصور یہ ہے کہ مادہ بنیادی ذرات سے مل کر بنا ہے۔ یہ بنیادی ذرات دو قسم کے ہیں۔ ہیڈران (Hadrons) اور لیپٹان (Leptons)۔ ہیڈران نسبتاً بھاری ذرات ہوتے ہیں۔ مثلاً پروٹان (Proton) نیوٹران (Neutron) مختلف قسم کے میسان (Mesons) اور دوسرے بھاری ذرات۔ اس کے برخلاف لیپٹان ہلکے ہوتے ہیں۔ مثلاً الیکٹران (Electron) میوآن (Muon) اور مختلف طرح کے نیوٹرینو (Neutrinos)۔ ان ذرات کے علاوہ ہر ذرے کا ایک ضد ذرہ (Anti particles) بھی پایا جاتا ہے۔ ہماری دنیا کے ایٹم (Atom) ذرات سے مل کر بنے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور ضد دنیا کے ایٹم کی تشکیل ضد ذرات سے ہوئی ہو۔

موجودہ تصور کے تحت کسی ذرے کے بیان کے لیے کوانٹم فیلڈ کی ضرورت ہوتی ہے جو کوانٹم میکانیات (Quantum Mechanics) اور نظریۂ اضافی (Quantum Mechanics) کے امتزاج کی شکل ہے۔ مختلف قسم کے فیلڈ ذرات کے تبادلوں کی وجہ سے دو ذرات کے درمیان قوت نمودار ہوتی ہے۔ اس لیے مذکورہ بالا مادی ذرات کے علاوہ کچھ فیلڈ ذرات بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً فوٹان (Photon) جس کو نور کا ذرہ کہا جا سکتا ہے اور جس کا تبادلہ برقی چارج رکھنے والے دو مادی ذرات کے مابین برق مقناطیسی قوت کا مظہر ہے۔ اسی طرح ایک فیلڈ ذرہ گریوٹان (Graviton) بھی ہے جس کے تبادلے سے ہر دو مادی ذرات کے درمیان قوتِ ثقل پیدا ہوتی ہے۔

فی الحال یہ خیال ہے کہ لیپٹان ذرات کو بنیادی تصور کیا جا سکتا ہے (10^{-16} cm کے فاصلے تک) جب کہ ہیڈران ذرات کی ساخت مرکب ہے۔ یعنی ہیڈران اور زیادہ بنیادی اجزاء سے مل کر بنے ہیں۔ مادے کے ان حتمی اجزاء (ultimate building blocks) کو کوارک (Quark) کا نام دیا گیا ہے۔

کوارک کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس خاصیت کو فلیور (Flavour) کہا جاتا ہے۔ مثلاً تازہ ترین نظریات کے تحت کوارک کے چھ فلیور ہیں۔ اپ (u)، ڈاؤن (d)، اسٹرینج (s)، چارم (c)، بیوٹی (b) اور ٹروتھ (t)۔ اس کے علاوہ ان میں سے ہر قسم کا کوارک ایک اور خاصیت کا حامل ہوتا ہے جسے رنگ (Colour) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح ہر فلیور (Flavour) کا کوارک تین مختلف رنگوں (Colours) میں پایا جاتا ہے۔ یہ رنگ ایک سائنسی تصور ہے اور ہماری روزمرہ کی زندگی میں پائے جانے والے رنگوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

گو کہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ کوارک بذاتِ خود کچھ اور "بنیادی" اجزاء سے مل کر بنے ہیں مگر سائنس دانوں کی اکثریت ابھی اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ مادہ بنیادی سطح پر "چھ عدد" لیپٹان یعنی e، μ اور τ اور ان سے وابستہ نیوٹرینو ذرات اور چھ طرح کے کوارک یعنی u، d، c، s اور t، b سے مل کر بنا ہے۔ یہ کوارک اور لیپٹان تین نسلوں میں عمل پذیر ہوتے ہیں

	کوارک	لیپٹان
پہلی نسل	u, d	ν_e, e
دوسری نسل	c, s	ν_μ, μ
تیسری نسل	t, b	ν_τ, τ

ان تمام ذرات (اور اس وجہ سے تمام مادے) کا عمل (Behaviour) ان قوتوں پر مبنی ہے جو ان ذرات کے مابین کام کرتی ہیں۔ فی زمانہ ان قوتوں کا بیان کوانٹم فیلڈ نظریے (Quantum Field Theory) کی زبان میں کیا جاتا ہے۔ کچھ سال پہلے تک اس طرح کی بنیادی قوتوں کو ہم چار قسموں میں بانٹ سکتے تھے۔

۱۔ مادی کشش یا کشش ثقل (Gravitational Force)
تمام مادی ذرات ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ قوت کشش ذرے کی کمیت (Mass) کے تناسب سے (Proportional) ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو کہ ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کا باعث ہوتی ہے۔ گویا تمام کائناتی صفات کی بنیادی وجہ یہی قوت ہے گریویٹان ذرے کا تبادلہ اس قوت کو دو ذرّوں کے درمیان پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

۲۔ برقی مقناطیسی قوت (Electromagnetic Force)
یہ قوت کشش اور دفع دونوں طرح کی ہو سکتی ہے۔ دو ذرات کے درمیان یہ قوت ان کے برقی چارج (Electrical charge) کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ اسی قوت کی وجہ سے ایٹم قائم اور دائم ہے اور یہی قوت زمین پر زندگی کے تمام عمل اور اثرات کی بنیادی طور پر ذمہ دار ہے۔ دو برقی ذرّات کے درمیان قوت کی ذمہ داری فوٹان ذرّے کے تبادلے پر ہے۔

۳۔ شدید نیوکلیر قوت (Strong Nuclear Force) ہیڈران ذرّات ایک اور طرح کے "چارج" یعنی (Strong Nuclear charge) کے بھی حامل ہوتے ہیں اور جب یہ ذرات بہت قریب تقریباً (10^{-13} سینٹی میٹر) ہوتے ہیں تو ایک دوسرے پر کشش انداز ہوتے ہیں۔ یہ قوت نیوکلیس (Nucleus) کو قائم اور مستحکم رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ فشن (Fission) اور فیوژن (Fusion) کے عمل اسی قوت کے مظہر ہیں۔ کوارک کے مابین گلوآن (Gluons) کا تبادلہ اسی قوت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ ضعیف نیوکلیر قوت (Weak Nuclear Force) ہیڈران اور لیپٹان کے درمیان ایک اور بہت کم (تقریباً 10^{-15} سینٹی میٹر) دائرۂ عمل (Range) رکھنے والی ضعیف (بہ نسبت شدید نیوکلیر) قوت ہوتی ہے جو کہ ذرّات کے ریڈیو ایکٹو (Radioactive) زوال کی وجہ ہے۔ اس کو ضعیف نیوکلیر قوت کہتے ہیں جو کہ ذرّات کے ضعیف چارج (Weak-charge) سے نسبت رکھتی ہے۔ زمین اور کائنات میں بھاری عناصر کے وجود کی خاص وجہ یہ قوت ہے۔ بوسان ذرّات $W^{\pm}$ اور Z^0 کے تبادلے اس قوت کا سبب بنتے ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ تمام ہیڈران ذرّات شدید نیوکلیر تفاعل (Interaction) میں ضرور حصّہ لیتے ہیں اور اس کے علاوہ اور متعدد تفاعل میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے لیپٹان ذرّات صرف ضعیف نیوکلیر تفاعل اور برق مقناطیسی تفاعل میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن شدید تفاعل کے کسی بھی عمل میں حصّہ نہیں لیتے۔

ان تمام بنیادی قوتوں کی وحدت کا تصوّر ماہرینِ طبیعات کا ایک بہت پرانا خواب ہے۔ تقریباً ایک سو بیس سال قبل میکسویل (Maxwell) نے برقی اور مقناطیسی قوتوں کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ یہاں سے ہی وحدت کے گیج نظریے (Gauge Theory of Unification) کی شروعات ہوئی۔ اس کے کافی عرصے بعد آئن سٹائن (Einstein) نے مادی کشش کی قوت اور برق مقناطیسی قوت کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور تمام قوتوں کے وحدت کے تصور کو کافی اجاگر کیا۔ مگر اس کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس نقطۂ نظر میں مادی کشش کے کوانٹم اثرات شامل نہیں تھے۔

اب اسی اتحاد کی کوشش ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے پچھلے پندرہ برسوں میں گیج فیلڈ نظریۂ وحدت کافی مقبولیت اختیار کر گیا ہے اور کامیابی کا ضامن معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس نظریے کی متعدد پیش گوئیاں پچھلے چند برسوں میں تجربہ گاہوں میں صحیح ثابت ہو چکی ہیں۔

اس طرح کی تحقیق کئی رخ اختیار کر چکی ہے۔ مثلاً ایک طرف مادّے کی بنیادی سی بنیادی ساخت کی تلاش ہے، دوسری طرف بنیادی قوتوں کے ربط کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ گیج نظریہ ان دونوں کاوشوں کو یکجا کرتا ہے۔ اس نظریے کی روح یہ ہے کہ بنیادی ذرات کی اضافیتی کوانٹم فیلڈ (Relativistic Quantum Fields) کچھ مخصوص چارج آپریٹر (Charge operators) کے گروپ خاکے (Group Representations) ہیں۔ اور پھر تمام بنیادی قوتیں ان چارجوں کے مابین کشش اور دفع کی قوتوں (جو کہ مختلف ذرات کے تبادلوں کی وجہ سے ہیں) کے طور سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ یہ چارج آیہ میٹر برقی چارج، کمیت، کوانٹم گھماؤ یا اسپن (Spin)، رنگ (colour) قسم کوارک (Flavour) وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد سب سے بنیادی تلاش اس "شے" (Entity) کی ہے جو ان (charges) کو وحدت کا جامہ پہنا دے۔ گویا یہ تمام قسم کے چارج صرف اس بنیادی شے (Entity) کے مختلف اجزاء یا اشکال اور رخ ہیں بلکہ ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ اس بنیادی چارج کی فطرت کو سمجھنا ہی غالباً ذرّاتی فزکس کا سب سے بنیادی اور اہم کام ہے۔

پروفیسر عبدالسلام کی اہم تحقیقات

ذیل میں پروفیسر عبدالسلام کے تحقیقی کاموں کا ایک تاریخ وار جائزہ آسان زبان میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا تعارف پر نظر ڈالنے کے بعد قارئین کو اس کوشش کی دقتوں کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہو گا۔ اس لیے امید ہے کہ وہ میری خامیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کریں گے۔

۱۔ رینارملائزیشن (Renormalization) ۔ پروفیسر عبدالسلام کا پہلا بڑا تحقیقی کام (۱۹۵۰–۵۱ء) کوانٹم فیلڈ تھیوری کے رینارملائزیشن نظریہ (Renormalization Theory) سے متعلق ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نظریے میں مختلف ناپی جا سکنے والی طبعی خاصیتوں کے تکمیلہ (Integrals) منتشر (diverge) ہو جاتے ہیں اور نتیجہ غیر طبعی لامتناہیہ (Unphysical infinities) کی شکل میں بار بار نمودار ہوتا ہے۔ اس دقت کو دور کرنے کے لیے رینارملائزیشن کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک کوانٹم فیلڈ تھیوری کے رینارملائزیشن ہونے کے قابل (Renormalizable) ہونے سے یہ مطلب ہے کہ اس نظریے میں جو بار بار بے ضابطہ لامتناہیات آتی ہیں ان سے بچا جا سکے۔ تاکہ اس نظریے کو کسی طبعی خاصیت کے حساب (calculations) میں استعمال کیا جا سکے اور محدود جوابات حاصل کیے جا سکیں اور تجربات کے نتائج سے ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔

۱۹۴۹ء میں فائن مین، شونگر، ٹوموناگا اور ڈائی سن (Feynman - Schwinger - Tomonaga - Dyson) نے کوانٹم برقی حرکیات (Quantum Electrodynamics) (جو کہ طبعی نظریات میں سب سے زیادہ کامیاب نظریہ کہا جا سکتا ہے) کی تشکیل مکمل کر لی تھی۔ اس نظریے کا رینارملائز ہونے کے قابل ہونے کا مکمل ریاضیاتی ثبوت عبدالسلام نے مہیا کر دیا۔

اس کے بعد عبدالسلام اور میتھیوز (Matthews) نے میسان نظریوں کے رینارملائز ہونے کی قابلیت کو پرکھا اور یہ پایا کہ صفر اسپن (Spin - 0) والے میسان ذرات کے لیے یہ نظریے رینارملائز ہونے کے قابل ہوتے ہیں۔ اُس وقت جو میسان ذرات معلوم تھے ان کی یہی خاصیت تھی۔

۲۔ دو اجزائی نیوٹرینو کا نظریہ اور پیریٹی (Parity) کی شرط

ان کے ایک اور اہم کام کا تعلق ذرّاتی فزکس میں پیریٹی (Parity) کے تصور سے ہے۔ پیریٹی سے مراد اس عمل سے ہے جو کسی واقعہ اور آئینہ میں اس کے عکس کی یکسانیت یا سیمٹری (Symmetry) کے تعلق کو بیان کرتا ہے۔ ۱۹۵۶ء تک یہ خیال تھا کہ فطرت نے داہنے اور بائیں میں کوئی بنیادی فرق نہ رکھا ہو گا اور تمام قوانین فطرت پیریٹی برقرار رکھنے کی شرط کے پابند ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مثلاً جب ایک ریڈیو ایکٹو (Radio active) نیوکلیس (Nucleus) بیٹا ذرہ (B Particle) یعنی الیکٹران کو خارج کر کے زوال پذیر ہوتا ہے اور ساتھ میں نیوٹرینو بھی نکلتے ہیں تو پیریٹی برقرار رکھنے والی شرط کے تحت اس بات کا احتمال کہ یہ ذرّات نکلتے وقت بائیں طرف یا دائیں طرف گھومیں (spin کریں) گے برابر ہو گا۔ ۱۹۵۶ء میں امریکی چینی ماہر طبیعات لی (Lee) اور یانگ (Yang) نے یہ کہا کہ ضعیف نیوکلیر قوتوں کے سبب پیریٹی کا قانون صحیح نہیں ہے۔ نتیجتاً اوپر والی مثال میں دائیں اور بائیں طرف spin کرنے والے الیکٹران کی تعداد برابر نہ ہو گی۔ ۱۹۵۷ء میں یہ بات تجربے سے بھی ثابت ہو گئی۔ اس بارے میں مشہور ماہر طبیعات پاؤلی (Pauli) نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ "خدا بائیں ہتھا ہے"۔

عبدالسلام کے نزدیک پیریٹی برقرار رکھنے کے اصول کے ٹوٹنے کی وجہ سے قانونِ فطرت جو بدشکلی پیدا ہوتی نظر آتی ہے اس کا کوئی نہایت خوبصورت بنیادی جواز ہونا چاہیے تاکہ یہ بدشکلی قابلِ قبول ہو سکے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ کسی نیوٹرینو کی صفر کمیت (Zero mass) کی کوئی وجہ نہیں سمجھائی ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۷ء میں نیوٹرینو کے متعلق یہ نیا نظریہ پیش کیا کہ یہ ذرّہ اس خصوصیت کا حامل ہے کہ اس کی ایک مخصوص صفت ہیلیسٹی (Helicity) ہے (یعنی چلتے وقت نیوٹرینو صرف ایک ہی مخصوص سمت spin کرتا ہے)۔ اس کے نتیجے کے طور پر نئی نیوٹرینو

کی کمیت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ پیرٹی کے اصول کو مانتا ہے۔ نیوٹرینو کا یہ تصور دو اجزائی نیوٹرینو نظریہ (The Compound Theory of Neutrino) یا کائرل یکسانیت (Chiral Symmetry) کہلاتا ہے۔ تقریباً یہی بات ۱۹۵۷ء میں ہی روسی سائنس داں لینڈاو (Landau) اور الگ سے یانگ اور لی (Yang and Lee) نے بھی کہی۔ اسی تصور کو بڑھانے کے بعد ضعیف تفاعل (Weak Interactions) کا موجودہ (V-A) کا نظریہ قیام میں آیا۔

۳۔ بنیادی ذرات کی یکسانیت کی صفات

(Symmetry)

اس کے بعد عبدالسلام نے اور بنیادی سوالات کی طرف توجہ کی مثلاً کیا یہ تمام (بنیادی) ذرات بنیادی کہلائے جا سکتے ہیں؟ یا ان میں سے کچھ دوسروں کی نسبت زیادہ بنیادی ہیں؟ ان سوالات کے جوابات کی تلاش کے سلسلے میں انھوں نے بنیادی ذرات کے خواص یکسانی (Symmetry) پر بڑا زور دیا اور خاندانی گروپ (Family Group) کی تلاش کی تاکہ اگر معلوم ہو کہ ایک ذرہ پایا جاتا ہے تو دوسرے ذرات جو سیمٹری اصول کے تحت اسی خاندان میں شریک ہوں، کے متعلق پیشین گوئی کی جا سکے۔

۴۔ یونٹری سیمٹری (Unitary Symmetry)

اسی سلسلے میں جاپانی سائنس داں اوہنوکی (Ohnuki) نے ۱۹۶۰ء میں ذرات کے مابین یونٹری سیمٹری کے نظریے کو اجاگر کیا۔ اس کے تحت اکثر ذرات تین بنیادی اجزا سے مل کر بنتے ہیں۔ عبدالسلام نے اس نظریے کی پرجوش حمایت کی اور وارڈ (Ward) کے ساتھ مل کر ۱۹۶۱ء میں آٹھ ذرات پر مشتمل ذرات کے ایک نئے خاندان (جن کی اسپن (spin) واحد ہے) کی پیشین گوئی کی۔ یہ ذرات کچھ ماہ کے بعد تجربات سے دریافت کیے گئے۔ اسی زمانے میں عبدالسلام کے ساتھ کام کرنے والے ایک اسرائیلی محقق یوال نے مان (Yuval Ne'eman) نے یہ ثابت کر دیا کہ اہم بنیادی ذرے پروٹان، نیوٹران بھی اسی طرح کے ایک ہشت پہلی (Eight Fold Way) سیمٹری کے ایک خاندان میں شامل ہیں۔ امریکہ میں گیل مان (Gell Mann) نے اسی طرح کے نظریے کو استعمال کر کے اومیگا مائنس (Ω^-) ذرے کی پیشین گوئی کی جو کہ ۱۹۶۴ء میں دریافت کر لیا گیا اور اس طرح سے یونٹری سیمٹری نظریے کی تجرباتی تصدیق ہو گئی اور بعد میں یہ اور ترقیوں کا ذریعہ بنا۔ مثلاً عبدالسلام نے رابرٹ ڈلبورگو (Robert Delbourgo) اور جان اسٹراتھڈی (John Strathdee) کے ساتھ مل کر زمان اور مکان کی ۴ بعدوں (Dimensions) کو استعمال کر کے اور بڑا یکسانی خاکہ (Symmetry Pattern) دریافت کیا

۵۔ برق مقناطیسی اور ضعیف نیوکلیر قوتوں کی گیج وحدت کا نظریہ

بعد میں عبدالسلام نے نیوٹرینو کے لیے اپنی کائی رل سیمٹری کے نظریے کو بڑھا کر اس کو الیکٹران اور میوآن کے لیے بھی لاگو کیا۔ چوں کہ الیکٹران اور میوآن کی کمیت صفر نہیں ہوتی اسی لیے شروع میں رینارملائزیشن برقرار رکھنے کے لیے (تو یہ ذرات صفر مقدار مادّے لیے جاتے ہیں) بعد میں سیمٹری کی حرکی از خود شکستگی (Dynamical Spontaneous Symmetry Breaking) کی مدد سے غیر صفر کمیت ظہور میں لائی جاتی ہے۔ ان ذرات کی کائی رل سیمٹری کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ضعیف قوت کے ماتحت زوالوں کے لیے اسپن واحد بوسان (وہ ذرات جن پر بوس آئن سٹائن شماریات لاگو ہوتی ہے اور جو کہ ($W^{\pm}$ Intermediate Vector Boson) کہلاتے ہیں) کے تبادلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان ذرات کی کمیت بہت زیادہ ہونی چاہیے کیوں کہ ضعیف تفاعل کا دائرۂ عمل (Range) بہت کم ہوتا ہے (اور قوت کے دائرہ عمل اور فیلڈ کے کوانٹم ذرے کی کمیت میں الٹا تناسب ہوتا ہے) اس کے برعکس برق مقناطیسی تفاعل کے لیے فوٹان کے تبادلے کی ضرورت ہوتی ہے (اور قوت کا دائرہ عمل دور تک ہے)۔ $W^{\pm}$ بوسان اور فوٹان کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوانٹم برق حرکیات (Q.E.D.) کا نظریہ تو مقامی گیج غیر تغیری (Locally gauge invariant) کی صفت رکھتا ہے اور رینارملائزیشن کے قابل ہوتا ہے مگر ضعیف تفاعل کے نظریے (میں) $W^{\pm}$ کی غیر صفر کمیت کی وجہ سے (یہ) صفت نہیں ہوتی۔

ضعیف تفاعل کے نظریے کو مقامی گیج غیر تغیری کی صفت عطا کرنے کے لیے ۱۹۵۴ء میں یانگ اور ملز (Yang & Mills) کی قسم کا غیر ایبلین گیج نظریہ (Non-Abelian Gauge Theory) سہارا دیتا ہے۔ اس نظریے میں میکسول نظریے کے گیج تصور کا امتزاج (SU(2)) گروپ کی داخلی سیمٹری سے کیا جاتا ہے (SU(2) کی داخلی سیمٹری پروٹان اور نیوٹران کی آئسو اسپن یکسانیت پر مبنی ہے)۔ عبدالسلام کے ایک شاگرد رونالڈ شا (Ronald Shaw) نے الگ سے ۱۹۵۵ء میں اپنی تھیسس (Thesis) میں خود اسی طرح کا تصور پیش کیا تھا۔ غرض کہ ۱۹۵۷ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک کی تحقیقات کے پیش نظر آخرکار ضعیف تفاعل کے لیے (Yang-Mills-Shaw) قسم کے غیر ایبلین گیج نظریے کا تصور مضبوط ہوتا گیا۔ انٹرمیڈیٹ ویکٹر بوسان (I.V.B.) کی کمیت کو ظہور میں لانے کے لیے از خود شکستہ سیمٹری کا عمل کارگر ثابت ہوا اور اس طرح سے نظریہ رینارملائزیشن کے قابل بھی رہا۔ یہ بذات خود بہت بڑی کامیابی تھی۔

اب اگر ضعیف تفاعل کے لیے یانگ ملز نظریہ درست ہے تو

(2) U وگروپ کی تہائی [Triplet] میں سے ۲ عدد برقی چارج رکھنے والے انٹرمیڈیٹ وکٹر بوسان (جو ±W کہلاتے ہیں) چارج شدہ ضعیف کرنٹ [Charged weak Current] سے منسلک ہوتے ہیں۔ SU(2) کے تیسرے ممبر کے لیے کئی امکانات ہیں مثلاً

۱۔ یہ برقی مقناطیسی کرنٹ [e.m. current] ہے (گویا اس طرح یہ ضعیف اور برق مقناطیسی قوتیں یکجا ہو جاتی ہیں)۔

۲۔ یہ ایک غیر برق مقناطیسی، ضعیف نیوٹرل کرنٹ۔ [weak neutral current] ہے۔ اور یا

۳۔ ان دونوں کی ملاوٹ ہے۔

۱۹۵۹ء میں عبدالسلام اور وارڈ اور الگ سے گلیشاؤ نے ان نظریات کو استعمال کرکے ضعیف نیوکلیر قوت اور برق مقناطیسی قوت کو یکجا کرنے کے تصور کو عملی جامہ پہنانے میں کافی ترقی کی۔ بعد میں ۱۹۶۱ء میں گلیشاؤ اور ۱۹۶۴ء میں عبدالسلام اور وارڈ نے دونوں برق مقناطیسی کرنٹ اور ضعیف نیوٹرل کرنٹ اور ان سے متعلق گیج ذرات [±W , Z°] کی اہمیت پر زور دیا۔ کیوں کہ اگر ضعیف نیوکلیر اور برق مقناطیسی قوت کو ایک ہی مصدر سے حاصل کرنا ہے تو نظریے میں ضعیف قوت کے لیے پیرٹی کے بقا کی شرط توڑنے اور برق مقناطیسی قوت کے لیے اس شرط کو برقرار رکھنے دونوں باتوں کی بیک وقت گنجائش ہونا چاہیے۔ اس لیے اوپر دیے ہوئے تیسرے امکان کو نظریے میں شامل کیا گیا۔

اسی دوران عبدالسلام نے سیٹون وائنبرگ [Steven Weinberg] کے ساتھ مل کر ان ہی مسائل سے متعلق ایک مشہور تھیورم [Goldstone] جو کہ گولڈاسٹون تھیورم کہلاتی ہے کا ثبوت مہیا کیا۔ اس تھیورم کے تحت از خود شکستہ سیمٹری (جس کی ضرورت وکٹر بوسان کی کمیت حاصل کرنے کے لیے ہے) کی وجہ سے صفر اسپن کے ذرات کا ظہور پذیر ہونا ضروری ہوتا ہے جب کہ ایسے ذرات کی تجرباتی تصدیق نہیں ہے۔ اس دشواری سے نکلنے کا راستہ امپیریل کالج لندن کے کئی لوگوں کی مشترکہ کاوش کے بعد ملا۔ یہ ہگس ترکیب [Higgs Mechanism] کہلاتی ہے۔

اس طرح سے آخرکار ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں عبدالسلام اور وائنبرگ نے الگ الگ کام کرکے از خود شکستہ $U(1) \times SU(2)$ گیج نظریے مکمل کر لیا۔ جو کہ دو بنیادی قوتوں (یعنی ضعیف نیوکلیر اور برق مقناطیسی) کو ایک ہی مصدر سے حاصل کرتا ہے۔ اس میں صرف ایک پیرامیٹر [Parameter] کی مدد سے ان دونوں قوتوں سے متعلق تمام طبعی واقعوں کو بیان کیا جا سکتا ہے اس طرح وحدت کا پرانا خواب جزوی طور سے پورا ہوتا ہے۔ ان ہی تحقیقی کاموں کی بنا پر عبدالسلام، وائنبرگ اور گلیشاؤ کو ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

شروع میں یہ وحدت صرف لپٹان ذرات کے درمیان دونوں طرح کی قوتوں کے درمیان قائم کی گئی تھی۔ بعد میں گلیشاؤ اور ان کے ساتھی محققوں کے کام سے ۱۹۷۰ء میں چار قسم کے کوارک کو استعمال کرکے ہیڈران ذرات کو بھی اس نظریے کے تحت لے آیا گیا۔ عبدالسلام اور وائنبرگ کا خیال تھا کہ یہ نظریہ غالباً رینارملائزیشن کی کسوٹی پر پورا اترے گا۔ اس کا ثبوت ۱۹۷۱ء میں ٹی ہوفٹ ['t Hooft] نے دے کر اس میدان کے تحقیقی کاموں میں جان ڈال دی اور ماہرین اس طرح کے نظریات پر گرم جوشی سے تحقیقات کرنے لگے۔

۶۔ ضعیف نیوٹرل کرنٹ، ڈبلیو پلس اور مائنس ذرات کے متعلق پیشن گوئیاں

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ عبدالسلام۔ وائنبرگ نظریے کے تحت فوٹان [γ] کے علاوہ ایک نیا نیوٹرل وکٹر بوسان ذرہ [Z°] بھی ہونا ضروری ہے جو کہ لپٹان ذرات اور کوارک ذرات سے منسلک ہوتا ہے اور ضعیف نیوٹرل کرنٹ کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح سے ضعیف چارج کرنٹ ±W ذرات کے تبادلے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ±W ذرات کا ہونا بہت پہلے سے سوچا جا رہا تھا مگر °Z ذرے کی پیشن گوئی عبدالسلام وائنبرگ نظریے کی دین ہے۔ اس کے علاوہ نظریے نے ان ذرات کی کمیتوں کے متعلق بھی پیشن گوئیاں کیں۔

۱۹۷۳ء میں جنیوا میں CERN کی تجربہ گاہ نے ضعیف نیوٹرل کرنٹ کی دریافت کر لی اور اس سے علم طبیعات کی دنیا میں بڑا تہلکا مچا اور وحدت کے اس انداز فکر میں بڑی جان پڑ گئی۔ بعد میں اس طرح سے نیوٹرل کرنٹ کی تجرباتی تصدیق مختلف تجربہ گاہوں (مثلاً Fermilab، Brookhaven، SLAC وغیرہ) میں ہوئی۔ اس طرح سے وحدت کے اس تصور میں کشش بڑھتی ہی گئی۔

پچھلے سال (۱۹۸۳ء میں) (جنیوا کی CERN تجربہ گاہ میں دو مختلف تجرباتی ٹیموں نے ۲۷۰ ارب الیکٹران وولٹ [270 GeV] کی طاقت والے پروٹان ذرات کو اتنی ہی طاقت رکھنے والے ضد پروٹان ذرات سے تصادم کرا کے ±W اور °Z ذرات کی تجرباتی تصدیق کی اور ان ذرات کے تعلق اور ان کی صفات کے متعلق پیشن گوئیوں کو صحیح ثابت کر دیا۔ اب یہ خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تحقیقات میں کتنی سرگرمی آئی ہوگی اور کتنا جوش و خروش بڑھ گیا ہوگا۔

۷۔ وحدت اعلیٰ [Grand Unification]

اس کے بعد عبدالسلام نے بنیادی قوتوں کی وحدت کی سیڑھی پر اگلا قدم رکھا یعنی ضعیف برقی $SU(2) \times U(1)$ نظریے (جو برق مقناطیسی اور ضعیف نیوکلیر قوت کو یکجا کرتا ہے) کو شدید نیوکلیر قوت سے

ملانے کی کوشش ۔ یہ عمل وحدت اولیٰ [Grand Unification] کہلاتا ہے اور ایسے نظریے وحدت اولیٰ کے نظریے یعنی G.U.T کہلاتے ہیں۔ شدید نیوکلیر قوت یا کوارکس کے درمیان قوت کا گیج نظریہ (3)SU گروپ کا حامل ہے کیوں کہ کوارکس تین قسم کے " رنگین چارج " رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ حوالہ انگلش "رنگوں" کو گیج نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کوانٹم رنگین حرکیات quantum Chromodynamics کہلاتا ہے۔ اس کے تحت ۸ طرح کے گیج بوسان ذرات (جو کہ گلوآن کہلاتے ہیں) کے تبادلے سے دو کوارک کے درمیان قوت کے باعث بنتے ہیں۔ ان گلوآن ذرات کی ایک خاص صفت یہ بھی ہے کہ یہ خود "رنگین چارج" رکھتے ہیں اور اس لیے ایک دوسرے سے منسلک بھی ہو سکتے ہیں (جب کہ فوٹان ذرات میں یہ صفت نہیں ہے)

اس وحدت اولیٰ کے سلسلے میں عبدالسلام اور جوگیش پتی نے ۱۹۷۳ء میں ایک بہت اہم قدم اٹھایا۔ انھوں نے لیپٹان ذرات کو کوارکس کے ساتھ ایک وحدانی گروپ G [Unifying group] کے ملٹیپلٹ (Multiplet) میں ساتھ ساتھ رکھا گویا لیپٹان ذرات کوارکس کے لیے "چوتھے رنگ" کی طرح ہیں۔ اس گروپ G کے لیے غیر ابیلین ہونا اور SU(2)XU(1)XSU(3) گروپ کا گروپ [Group] کا جز ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح کے کام کو جارجی [Georgi] گلیشاؤ [Glashow] کوئن [Quinn] اور وائنبرگ [Weinberg] نے بڑھاوا دیا۔ اس انداز فکر کے تحت یہ تخمینہ لگایا گیا کہ کائنات کے ارتقا کے شروع میں ایک بہت بڑی کمیت یا طاقت (تقریباً 10^{13}GeV) پر یہ تمام بنیادی قوتیں ایک ہی پیمانے کی ہوتی ہیں اور اس طرح سے وحدت کی لڑی میں جڑی ہوتی ہیں اور جیسے جیسے وقت کے ساتھ طاقت کم ہوتی جاتی ہے (یعنی کائنات کی عمر بڑھتی جاتی ہے) بنیادی قوتوں کے پیمانے مختلف نظر آنے لگتے ہیں اور عام حالت میں یہ تینوں قوتیں الگ الگ بھی جاتی ہیں۔

۸۔ پروٹان کے زوال پذیر ہونے کی پیشین گوئی

عبدالسلام اور پتی کے نظریے کے تحت اب بیریان نمبر [Baryon number] اور لیپٹان نمبر [Lepton no.] کا الگ الگ برقرار رہنا ضروری نہیں رہتا۔ بلکہ ان کا مجموعہ برقرار اور قائم رہتا ہے۔ یعنی اس نظریے کے تحت بیریان ذرات لیپٹان ذرات میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس بات کا ایک بہت اہم نتیجہ یہ ہے کہ پروٹان قائم اور دائم ذرہ نہیں ہے بلکہ زوال پذیر ہوگا گویا ہر مادہ خود ایک عرصے کے بعد زوال پذیر ہوگا۔

غنیمت ہے کہ پروٹان کی حیات کا وقفہ بہت لمبا (تقریباً 10^{30} سال) ہے۔ ورنہ قیامت شاید بالکل نزدیک ہوتی۔ نظریے کی اس اہم پیشین گوئی کو پرکھنے کے لیے دنیا میں کئی جگہ پروٹان کے زوال کا مشاہدہ کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی کولار سونے کی کان میں زمین دوز تجربات اس سلسلے میں جاری ہیں۔ امید ہے کہ جلدی آخری نتائج معلوم ہوں گے اور عبدالسلام کے اس نظریے کی ایک اہم پیشین گوئی کی تصدیق کی جا سکے گی۔ عبدالسلام کے علاوہ بھی کچھ ماہرین کے نظریات میں بھی پروٹان کے زوال پذیر ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے اس کا فیصلہ کہ کون سا نظریہ صحیح ہے، تجربات کے نتائج ہی کریں گے

۹۔ ذراتی طبیعات میں مادی کشش کی قوت کی اہمیت اور اتحاد اعلیٰ

بنیادی ذراتی طبیعات میں مادی کشش کی قوت کو عام طور سے نظرانداز کر دیا جاتا ہے کیوں کہ اس تعامل کی شدت بنیادی ذرات کے لیے بہت کم ہے لیکن عبدالسلام اور کچھ دوسرے ماہرین طبیعات کا خیال ہے کہ تمام بنیادی طبعی اعمال کو جامع اور مکمل طور سے سمجھنے کے لیے مادی کشش کی قوت کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ نہ صرف قدرت سے متعلق نظریاتی تصویر ادھوری رہ جائے گی۔ بلکہ نامکمل نظریے کے اندرونی تضاد کی بنیاد پر لامتناہیات سے چھٹکارا نہیں مل پائے گا۔

مذکورہ بالا اتحاد اولیٰ کے نقطۂ نظر میں یہی کمی ہے کہ وہ چوتھی بنیادی قوت یعنی مادی کشش [GRAVITY] کو شامل نہیں کرتا۔ جو نظریہ ان چاروں قسم کی بنیادی قوتوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اتحاد اعلیٰ (Super Unification) کہلاتا ہے

جیسا کہ معلوم ہے کہ زمان و مکان کی چار ابعاد [Dimension] کی جیومیٹری کی صفات سے مادی کشش کی قوت کا ادراک ہوتا ہے۔ اس قوت کے علاوہ بقیہ تین قوتوں کا جو گیج نظریہ ہے اس میں مقامی اور داخلی سیمیٹری کا دخل ہے۔ ان دونوں طرح کے نظریوں کو یکجا کرنے کا کام یقیناً آسان نہیں ہے اور موجودہ طبیعات کے بے حد بنیادی سوالات میں سے ایک ہے۔

چوں کہ اتحاد اولیٰ (GRAND Unification) ایک مقامی گیج غیر تغیری [Local Gauge Invariant] نقطۂ نظر ہے۔ اس لیے یہ گمان ہے کہ تمام قوتوں کی وحدت اعلیٰ (Super Unification) کا نظریہ بھی مقامی گیج یکسانیت رکھتا ہوگا۔ ایسا ایک نقطۂ نظر اعلیٰ قوت کشش (Super Gravity) کہلاتا ہے۔ سپر گریوٹی کا نظریہ آئن سٹائن کے عام نظریۂ اضافیت [General Theory of Relativity] کی ترقی شدہ شکل ہے جس میں کوانٹم اثرات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ گویا آئن سٹائن کا نظریہ اس کی غیر کوانٹم [Classical] شکل ہے۔ مادی کشش کے کوانٹم

اثرات کا حساب [Calculation] آئن سٹائن کے نظریے میں لامتناہیات دیتا ہے جب کہ سپر گریوٹی میں محدود جوابات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بذات خود ایک بڑی ترقی ہے۔

۱۰۔ یکسانیتِ اعلیٰ [Super Symmetry] :- اعلیٰ قوتِ کشش کے نظریے کی بنیاد ایک اور نئی اور بنیادی یکسانیت پر ہے جس کو یکسانیتِ اعلیٰ [Super Symmetry] کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی یکسانیت کا تصور ہے جس میں فرمی ذرات [Fermions] یعنی وہ ذرات جن کی "اسپن" نصف اکائی ہوتی ہے اور بوس ذرّات [Bosons] یعنی وہ ذرات جن کی اسپن صفر یا پوری اکائی ہوتی ہے، ساتھ ساتھ ایک ہی زمرے میں لیے جاتے ہیں اور اس طرح سے فرمی ذرات اور بوس ذرّات کا ایک دوسرے میں تبدیل ہونا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس یکسانیتِ اعلیٰ کی شرط اگر کائناتی [Global] سے بڑھا کر مقامی [Local] بنا دی جائے تو نئی گیج فیلڈ اور نئے ذرّات حاصل ہوتے ہیں۔ سپر سمیٹری کی بڑی خاص بات یہ ہے کہ بار بار سمیٹری کے عمل کو دوہرانے سے فرمی یا بوس ذرہ ایک نقطے سے دوسرے نقطے پر بآسانی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ایسی زمان اور مکان والی یکسانیت [جو کہ پواں کرے [Poincare] سمیٹری کہلاتی ہے] چوں کہ مادی کشش کی حامل ہوتی ہیں اس طرح سے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ مادی کشش [بصورت ایک گیج قوت] کو اور دوسری قوتوں سے ملایا جا سکے۔ یہی نظریہ سپر گریوٹی کہلاتا ہے۔ اس میدان میں ۱۹۰۵ء سے کئی ماہر طبیعات نے بڑا کام کیا ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

گوتعاں، والکوف، اکلوف، فریڈمین، زومینو، ییاند، عبدالسلام، اسٹرتھمڈی وغیرہ۔ اس نظریے میں اسپن ۲ رکھنے والے گریویٹان [Graviton] ذرّات کے ساتھ ساتھ اسپن ۳/۲ والے صفر کمیت کے گریوٹینو [Gravitino] ذرات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ اس نظریے کی ترقی یافتہ شکلوں [Extended - Super Gravity Theories] میں اور دوسرے ذرات بھی نظریے میں ظہور میں آتے ہیں۔

جس طرح پروٹان کا زوال وحدتِ اولیٰ کے نظریات کی تجرباتی کسوٹی ہے، اس طرح کی کسوٹی اعلیٰ قوتِ کشش کے نظریے کے لیے کیا ہے؟ یہ خیال ہے کہ ۳/۲ اسپن والے بھاری گریوٹینو [جس کا وزن یکسانیت کی شکستگی سے آتا ہے] کا پایا جانا اس نظریے کی سچائی کی طرف اشارہ ہوگا۔ تجربہ کرنے والوں کے لیے اس کا پتہ لگانا ناممکن نہیں مگر بے حد دشوار کام ہوگا۔

سپر گریوٹی کے نظریے میں مادی کشش کو انم فیلڈ کی زبان میں بیان کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ جیومٹری کی زبان میں [جس طرح سے آئن سٹائن نے ہی مادی کشش کا نظریہ پیش کیا تھا] بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے زائد سمتی اقدار [Coordinates] اور زائد بُعدوں [Dimension] کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سمتی اقدار [Coordinates] کی یہ خصوصیت ہے وہ کمیوٹ [Commute] نہیں کرتے [یعنی کسی بھی عمل میں ان کی ترتیب اہم ہوتی ہے]۔ ان نقطوں کے مکاں کو "اعلیٰ مکاں" [Super-Space] کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عبدالسلام اور جان اسٹرتھمڈی نے ۱۹۷۴ء میں اس طرح کے مکانِ اعلیٰ کو استعمال کر کے اعلیٰ قوتِ کشش کا نظریہ پیش کیا اور کئی تحقیقی مقالے لکھے۔

اس طرح کی تحقیق کے سلسلے میں دو نقطۂ نظر ہیں۔ ۱۔ کل ابعاد کو ۴ سے بڑھا کر زیادہ کیا جائے مثلاً ایک نظریے کے تحت ۱۱ ابعاد کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ۴ تو سمجھی بوجھی زماں و مکاں والی بعدیں ہیں [جن کا تعلق مادی کشش سے ہے] اور اس کے علاوہ ۷ زائد بُعدیں داخلی سمیٹری سے تعلق رکھتی ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ کائنات کے حیات کی بالکل ابتدا میں ان زائد سمتوں نے یکجا ہو کر پلینک لمبائی [Planck Length] یعنی تقریباً 10^{-33} سم کا سائز حاصل کر لیا ہوگا۔ ۲۔ دوسرا نقطۂ نظر وھیلر اور ہاکنگ وغیرہ کا ہے۔ اس میں زائد سمتوں کے استعمال کے بجائے مختلف قسم کے چارجوں کا تعلق زماں و مکاں کی ٹاپولوجی [Topology] سے پیدا کیا جاتا ہے جیسے کہ پنیر کی سطح پر چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں اسی طرح سے زمان و مکاں کی ٹاپولوجی میں تقریباً 10^{-33} سم سائز کے سوراخوں کا تعلق مختلف طرح کے چارجوں سے ہو سکتا ہے۔ اس طرح سے وہ بنیادی قوتیں جو ذراتی طبیعات کے بیان کے لیے ضروری ہوتی ہیں وہی کائناتی ارتقاء کو سمجھنے کے لیے بھی ضروری ثابت ہوتی ہیں۔

۱۱۔ بنیادیت کی تلاش جاری ہے [کیا Preons - یا Prequarks ہیں؟] کوارک ذرات بھی کم از کم ۳ عدد چارج رکھتے ہیں: قسم، رنگ اور نسلی نمبر۔ اس لیے یہ بھی بہت ممکن ہے کہ کوارک اور لیپٹان ذرات جن کو آج کل بنیادی سمجھا جاتا ہے، بنیادی نہ ہوں بلکہ اور زیادہ بنیادی اجزاء [Prequarks یا Preons] سے مل کر بنے ہوں جن کا صرف ایک بنیادی چارج ہو۔ اس طرح کا نظریہ عبدالسلام پتی اور اسٹرتھمڈی نے ۱۹۷۵ء میں پیش کیا اور ۱۹۸۰ء تک اس کی اور ترقی کی۔ اس نقطۂ نظر میں چار کرومان [Chromons] اور چار فلیوان [Flavons] ہیں جن کی وجہ سے بنیادی گروپ SU [8] اس گروپ کا جزوی گروپ SU(4) x SU(4) ہے۔ اسی خیال کے تحت یہ بھی تصور ہے کہ پریآن [Preons] مقناطیسی چارج کے حامل بھی ہوتے ہیں [اور بہت ہی کم دائرۂ عمل والی قوت کی وجہ سے قائم ہیں] لیپٹان اور کوارک ذرات ان سے مل کر کچھ اس طرح سے بنے ہیں کہ لیپٹان اور کوارک ذرات کی مقناطیسیت صفر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح

کے خیالات کر ٹرائٹ اور فرنڈ نے بھی ۱۹۷۹ء میں پیش کیے ان لوگوں کے (SU8) گروپ میں تین کرومان، دو فیلوران اور تین فیملیان [families] شامل ہیں۔

بنیادی قوتوں اور مادی کائنات کی کہانی بڑی طویل ہے اور اس کا اختتام نعلوم کب کہاں اور کیسے ہو؟ بہرحال اس کہانی کے بیان کو ختم کرنے کا اختیار ہم رکھتے ہیں۔ اس اختیار کو استعمال کرنے سے قبل اس قصہ کا ماحصل مختصراً بیان کرنا شاید نامناسب نہ ہو۔ ماہرین کے موجودہ تصور کے تحت کائنات کی ترویجات اور بنیادی قوتوں کے اتحاد میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ دراصل عظیم دھماکے -Big Bang- [ ] یا کائنات کی ابتدا کے وقت تمام بنیادی قوتیں متحد تھیں گویا صرف ایک بنیادی قوت تھی اور مکمل یکسانیت تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، کائنات اپنی ارتقائی منازل طے کرتی رہی اور یکسانیت کی شکستگی کی وجہ سے قوتوں کی شدت [Strength] کے مختلف ہونے لگی اور واحد قوت کے بجائے مختلف قوتیں نظر آنے لگیں۔ گویا وقت کے پردے کی وجہ سے وحدت کے بنیادی راز کے مختلف رخ نظر آنے کی بنا پر بنیادی وحدت چھپ گئی۔ مگر چشم بینا رکھنے والے ماہرین طبیعات نے اس بنیادی وحدت کو اجاگر کرنے کی کاوش جاری رکھی ہے۔

اختتام:- مندرجہ بالا صفحات سے معلوم ہوا کہ قدرت کے راز کو سمجھنے کے سلسلے میں نظریاتی طبیعات نے کتنی ترقی پچھلے چند برسوں میں کرلی ہے اور اس ترقی میں پروفیسر عبدالسلام کی تحقیقات کا کافی بڑا اثر رہا ہے۔ اس میدان میں عجیب مگر خوبصورت تصورات اور نظریات کی کمی نہیں ہے۔ اب تک جتنے تجربات ہوسکے ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان نظریات میں کچھ صداقت ضرور ہے اور کم از کم ترقی کی سمت تو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آنے والے برسوں کی تحقیقات اس کا فیصلہ کن جواب فراہم کریں گی۔ ★★

ڈاکٹر صابرہ خاتون

پروفیسر عبدالسلام کا دورۂ ہند

نوٹ :- پروفیسر عبدالسلام جنوری ۱۹۸۱ء میں بیس روز کے دورے پر ہندوستان تشریف لائے تھے۔ یہاں سے واپسی پر پاکستان میں، کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ طبعیات کے صدر پروفیسر محمد رفیع نے آپ سے اس دورے کے متعلق ایک انٹرویو لیا جو پاکستان کے ایک انگریزی جریدے میں شائع ہوا تھا۔ اسی انٹرویو کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

سوال :- پروفیسر عبدالسلام! میں آپ کا بیحد مشکور ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت مجھے مرحمت فرمایا۔ تاکہ میں آپ کے حالیہ دورۂ ہندوستان کے متعلق کچھ گفتگو کر سکوں۔ اس دورے کے کئی اہم پہلو ہیں جن کے متعلق میں آپ سے چند سوالات کرنے کا خواہاں ہوں۔ لیکن ان سوالات سے پیشتر میں ہندوستان میں آپ کے خیر مقدم کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی اخبارات و رسائل ـــــ ٹائمز آف انڈیا، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا وغیرہ نے آپ کی آمد پر خصوصی ضمیمے شائع کیے تھے۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک آپ کا جو استقبال ہوا، اسے ٹائمز آف انڈیا نے "رستم وقت کا خیر مقدم" بتایا، کیوں کہ آپ کے علمی کارناموں سے ہندوستانی بے حد متاثر ہوئے ہیں جس کو سراہنے کے لیے لوگ جوق در جوق آپ کا استقبال کے لیے چلے آرہے تھے۔ ہم یہ جاننے کے متمنی ہیں کہ اس دورے کے درمیان وہ کون سا ناقابلِ فراموش واقعہ تھا جس کی یاد آپ کے ذہن میں اب بھی تازہ ہے۔

جواب :- بیشک! یہ ایک یادگار دورہ تھا۔ میں اس دعوت نامے کے لیے انڈین فزکس ایسوسی ایشن (چیرمین۔ ڈیش پال) اور کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (چیرمین۔ ڈاکٹر نورالحسن) کا شکر گزار ہوں جن کے باعث یہ دورہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ کم و بیش ہر جگہ ہی میرا بڑے پُرجوش اور پرتپاک طریقے سے خیر مقدم ہوا، جو اس بات کا ثبوت تھا کہ سائنس میں برصغیر کا یہ ایک باعث فخر کارنامہ ہے۔ میں بمبئی، مدراس، بنگلور، کلکتہ، بھوونیشور، دہلی، علی گڑھ، امرتسر، قادیان اور حیدرآباد گیا۔ ہر جگہ ہی طلباء، اساتذہ، اور عوام خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے۔ سب سے زیادہ شاندار، پرجوش اور پُرخلوص استقبال میرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوا۔

جب میں دہلی سے علی گڑھ تقریباً دن کے دس بجے پہنچا تو سب سے پہلے یونیورسٹی کی جامع مسجد میں دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ پھر مسلم طلبا کے اصرار پر وہیں منبر پر بیٹھ کر انھیں خطاب کیا، اور ہدایت کی کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ و معیاری تعلیم حاصل کریں اور اس میں سبقت لے جانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ بعدازاں یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری دینے کی باضابطہ رسم ادا ہوئی۔ جس میں حوالہ (Citation) کا کچھ حصہ عربی میں سائنس کے ڈین نے پڑھا جو ایک ہندو پروفیسر تھے۔ یہ سلسلہ دوپہر تک چلتا رہا۔ طلبا کی یونین اس باضابطہ تقریب سے کچھ دل برداشتہ تھی۔ اس نے از خود اپنا ایک جلسہ منعقد کیا اور مجھے یونین کی تاعمر رکنیت سے نوازا گیا جس کی میرے دل میں بہت وقعت ہے۔ میں اس عزت و تکریم کے لیے اپنے خدائے رب العزت کا کسی طرح شکر ادا نہیں کر سکتا (اِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا) میری بس یہی تمنا اور نئی نسل کے لیے پیغام ہے کہ وہ سائنسی علوم پر دسترس حاصل کرے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

سوال :- کیا آپ نے دوسرے مسلم اداروں کا بھی دورہ کیا؟

جواب :- جی ہاں! اور ہر جگہ میرا استقبال مشفقانہ اور بڑی گرم جوشی سے ہوا۔ مثلاً جامعہ ملیہ میں جس کے بانی مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین تھے، مجھے لگاتار دو مرتبہ تقاریر کرنا پڑیں۔ کیوں کہ اوکھلا میں (دہلی کا وہ علاقہ جہاں جامعہ قائم ہے) بسنے والے مسلم عوام میری تقریر سننے کو بیقرار تھے۔ لہٰذا ایک گھنٹہ بعد ہم کو ہال خالی کروانا پڑا۔ تاکہ جو لوگ باہر منتظر کھڑے تھے، اندر آسکیں۔

اسی طرح حیدرآباد اور بنگلور میں مسلم ایسوسی ایشن مثلاً الامین فاونڈیشن اور اوقاف بورڈ وغیرہ نے باہم میری آمد کی خوشی میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا۔ بمبئی میں جب میں سیدنا برہان الدین صاحب سے ملنے گیا تو بوہرہ فرقے کے لوگوں نے نہایت جوش و خروش سے میرا خیر مقدم کیا۔

اسی قسم کی شفقت اور محبت کا اظہار ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے طلبا
کی جانب سے ہوا۔ چٹاگانگ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلا یادگار کانووکیشن مجھے
اعزازی ڈگری دینے کے لیے منعقد ہوا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں اور بنگلہ دیشی
طلبا کس طریقے سے باہم ایک دوسرے سے گھل مل گئے تھے۔ علاوہ ان مسلم
اداروں کے جن کا میں نے خصوصاً تذکرہ کیا، بمبئی، کلکتہ، امرتسر، مدراس
بھونیشور اور بنگلور میں ہر وقت اور ہر طبقے کے لوگوں نے میری آمد کی
خوشی میں اس طرح جشن منایا گویا یہ پورے برصغیر کا جشن ہو!

سوال:- ان باتوں کے پیش نظر، میں سمجھتا ہوں کہ ہر لحاظ سے
آپ اسے ایک ناقابل فراموش خیر مقدم کہیں گے۔ اب میں یہ جاننے
کا متمنی ہوں کہ جب آپ علی گڑھ یونیورسٹی تشریف لے گئے تو یونیورسٹی
کے چانسلر نواب چھتاری کا پیغام وہاں کے وائس چانسلر نے پڑھ کر
سنایا۔ آپ اس کو سن کر بے حد متاثر ہوئے۔ تو کیا آپ یہ بتانے کی تکلیف
گوارا فرمائیں گے کہ وہ پیغام کیا تھا؟

جواب:- وہ پیغام یہ تھا۔

" پروفیسر عبدالسلام کی آمد پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر
نواب چھتاری کا پیغام - ۲۲ جنوری ۱۹۸۱ء

آج کا دن ہمارے لیے بہت ہی مخصوص دن
ہے کیوں کہ آج دنیائے سائنس کی دانشمندی اور ذہانت
کا درخشندہ ستارہ علی گڑھ تشریف لا رہا ہے۔ میں بہت
افسردہ اور ملول ہوں کہ اپنے بڑھاپے اور علالت کے
باعث اس کا استقبال کرنے خود حاضر نہ ہو سکا۔

خواتین و حضرات! آج ہمارے درمیان وہ عظیم
شخصیت جلوہ گر ہے جو نہ صرف ہندوستان اور پاکستان
کے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے
باعث فخر و انبساط ہے۔ نوبل انعام کی تاریخ میں اس
شخصیت کا نام وہ واحد نام ہے جسے مسلم ہونے کا
شرف حاصل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مصر کے صدر عزت مآب
جناب انورالسادات نے بھی نوبل انعام حاصل کیا تھا، مگر
ان کا میدان سیاسی تھا، جب کہ پروفیسر عبدالسلام کو
ان کی عالمانہ قابلیت و لیاقت کے صلے میں نوبل انعام
سے نوازا گیا ہے۔

میرے پیارے بھائیو! پروفیسر سلام نے جو
مثال قائم کی ہے، اب اس کی تقلید آپ لوگوں کو کرنی
ہے۔ اسی پر ملک اور قوم کی بے پایاں ترقی اور خوشحالی
کا دار و مدار ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر
سلام کو طویل عمر، کامرانی اور صحت عطا فرمائے، اور
میں دعا کرتا ہوں کہ ہندوستان، پاکستان اور
سارا عالم اسلام علم اور دانشوری میں ان کی تقلید
کرے۔ آمین۔

احمد سعید، نواب آف چھتاری

سوال:- حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانا بہت مشکل ہے پھر
بھی علی گڑھ کے بعد کس جگہ کے خیر مقدم کو آپ دوسرے نمبر
پر رکھیں گے؟

جواب:- میری یادداشت کے مطابق دوسرے نمبر پر امرتسر
کی گرونانک دیو یونیورسٹی آتی ہے۔ یہاں کانووکیشن میں میں
نے اپنی افتتاحیہ تقریر پنجابی میں کی جسے چنڈی گڑھ کے اخبار ٹریبیون نے
"خالص مگر دیہاتی پنجابی" کہا۔ میں نے اس تقریر کے دوران بتایا کہ
ہرگوبند کھورانہ جنھیں علم وراثت (GENETICS) میں ۱۹۶۸ء میں نوبل
انعام ملا تھا، وہ ملتان کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح پنجاب اور
بالخصوص ضلع ملتان کے علاقہ جھنگ کو پورے برصغیر کے مقابلے میں سب سے
زیادہ اعزازات و انعامات حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے۔

جہاں کہیں بھی میں گیا میری بس یہی کوشش رہی کہ تینوں
ممالک ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے عوام میں باہم یک جہتی اور ربط ضبط پیدا
ہو۔ اور اس کے لیے میں نے پاکستانی عوام کی جانب سے ہر جگہ اپنے سامعین
کو مبارک باد کا پیغام دیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن میں خطاب کرتے
ہوئے آخر میں میں نے کہا۔ " جناب چانسلر صاحب! آپ لوگوں نے
میری جو عزت افزائی کی ہے اور جس خلوص سے مجھے نوازا ہے، وہ محض اس لیے
ہے کہ آپ سب کو برصغیر کے کارنامے پر فخر ہے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم
اپنے سارے مسائل اسی طرح مل جل کر حل کریں اور ہر قسم کے کارناموں
کی اسی طرح باہم خوشی منائیں ۔۔۔" میرے اس جملے پر چانسلر نے جو صوبے
کے گورنر ہیں اور ایک زبردست سیاسی شخصیت بھی ہیں کہا کہ وہ میری
اس بات سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ اب وہ اپنی لکھی ہوئی تقریر نہ پڑھ
کر اسی بات سے اپنے خطبے کا آغاز کریں گے اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔

سوال:- ہند کے اس دورے کے دوران ذاتی اعتبار
سے کون کون سے یادگار واقعات آپ کے ذہن میں
محفوظ ہیں؟

جواب:- پرانے ہم جماعت اور دوستوں سے ملاقات کے علاوہ
جو چیز میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی وہ میرے اساتذۂ کرام سے
ملاقات ہے۔ میں اپنے ان سب اساتذہ کا جنھوں نے مجھے کسی بھی جماعت میں

پڑھایا ہے بیحد عزت کرتا ہوں۔ والدین کے بعد یہی لوگ عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ اس دورے کے دوران مجھے ہند میں مقیم اپنے چار استادوں کو تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی۔ جناب انیشا کمار صاحب (جینڈی گڑھ) لالہ ہنس راج بھاٹلہ صاحب (دہلی)، پروفیسر اے۔این گنگولی صاحب (کلکتہ) اور جناب پی۔ ٹی۔ چنڈی صاحب (بنگلور)۔ جب میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرے اساتذہ صاحبان کی بھی عزت افزائی کی جائے تو میری خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا ہی کیا گیا۔ اسی طرح جب میں دسمبر ۱۹۷۹ء میں پاکستان آیا تو صدر پاکستان جنرل محمد ضیا الحق نے میرے استاد علامہ شیر افضل جعفری صاحب کو جو جھنگ میں رہتے ہیں۔ اسلام آباد میں منعقدہ سرکاری تقریب میں مدعو کیا

اب یہاں میں پروفیسر گنگولی کا خاص طور سے ذکر کروں گا جنہوں نے مجھے لاہور میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۶ء تک علم الحساب پڑھایا تھا۔ جب مجھے کلکتہ یونیورسٹی نے تمغہ دینا چاہا تو میں نے اسے اس شرط پر قبول کرنے کا وعدہ کیا کہ کلکتہ میں مقیم میرے استاد گنگولی صاحب کی بھی عزت افزائی کی جائے۔ کلکتہ یونیورسٹی نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ اٹھاسی سال کے عمر رسیدہ پروفیسر گنگولی جو ناسور جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں، اس قابل نہ تھے کہ تقریب میں شرکت کے لیے حاضر ہو سکتے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر آر۔ کے۔ پڈار میرے ہمراہ ان کے گھر تشریف لے گئے اور انھیں تین ہزار روپے کا چیک اور ایک سند بخشی کی جو ان کی درس و تدریس کی خدمات کے اعزاز میں تھی۔ میری رائے ہے کہ اسی قسم کے انعامات پاکستان میں بھی تقسیم کیے جائیں۔

سوال:۔ میرا خیال ہے کہ آپ نوبل انعام ملنے کے فوراً بعد پاکستان تشریف لائے تھے۔ تو کیا آپ دورۂ ہند کی روشنی میں پاکستان کے دورے کے بارے میں کچھ تذکرہ کرنا پسند کریں گے؟

جواب:۔ پاکستان میں عوام اور طلبا کی جانب سے سوائے تین جلسوں کے اور کوئی تقریب یا جشن نہیں منایا گیا۔ ان تینوں جلسوں میں سے دو کراچی میں منعقد ہوئے تھے۔ پہلا کراچی یونیورسٹی اور انجینئرنگ کالج کی جانب سے اور دوسرا پاکستانی ڈاکٹروں کی طرف سے تیسرے جلسے کا اہتمام میری جائے پیدائش جھنگ میں کیا گیا۔

سوال:۔ لیکن ایسا کیوں ہوا؟ جب کہ آپ فخر پاکستان ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے انعام سے بھی نوازے گئے ہیں۔

جواب:۔ اس کی وجہ آپ خود جانتے ہیں۔ انعام کے بعد صدر پاکستان نے مجھے سب سے بڑا قومی اعزاز "نشان امتیاز" عطا کیا۔ علاوہ ازیں اسلام آباد یونیورسٹی میں دو شاندار تقاریب منعقد کی گئیں جن میں مجھے اعزازی ڈگری دی گئی۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ بدقسمتی سے میری وہاں سائنس کے طلبا سے ملاقات نہ ہو سکی جس کا مجھے ازحد افسوس ہوا۔

سوال:۔ پاکستان میں آپ کی آمد ہند تشریف لے جانے سے پیشتر جنوری میں ہوئی تھی۔ اس سے قبل آپ دسمبر ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام کا جشن منانے پاکستان تشریف لائے تھے تو میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں سائنس کے متعلق آپ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

جواب:۔ دسمبر کے دورے کے بعد میں سمجھتا تھا کہ ملک کی بیداری میں سائنس کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور ملک میں اس کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں۔ مجھے امید تھی کہ سائنسی علوم کی ترقی کے لیے مالی ذرائع کا انتظام ہوگا اور ملک کی نئی نسل کو سائنس پڑھنے کی ترغیب دی جائے گی۔ مگر یہ سب کچھ نہ ہوا اور میں محض خوش فہمی کا شکار رہا۔ بہرحال اس سال ایک صنعت کار ڈاکٹر ظفر حسن نے پاکستان کے صنعتی حلقے کی ایما پر بنیادی سائنس کا ایک مرکز کھولنے کا تہیہ کیا ہے۔ اس سال جنوری میں اس کی ایک میٹنگ میں میں نے بھی شرکت کی اور اس پیش قدمی کو سراہا جسے ترقی کی منازل سر کرنے کے لیے فی الحال کافی وقت چاہیے۔

سوال:۔ ہندوستان میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے متعلق ایک مرتبہ سینٹر مونی ہن (Senator Monihan) نے کہا تھا کہ ۲۰۰۰ء تک ہندوستان ایک زبردست طاقت کا مالک بن جائے گا۔ آپ کو اُن کی رائے سے کہاں تک اتفاق ہے؟

جواب:۔ اس دورے کے دوران مجھے ہر چیز بڑے نار اوز سے دکھائی گئی جس میں خاص طور سے بھابھا تحقیق کا مرکز، حیدرآباد کا نیوکلیائی ایندھن تیار کرنے کا پلانٹ، بنگلور کا مصنوعی سیارہ تیار کرنے کا اسٹیشن اور 140 Mev کا تبدیل پذیر توانائی سائیکلوٹران Variable Energy Cyclotron شامل ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خصوصیت کا حامل مصنوعی سیارہ کا مرکز ہے۔ جہاں مجھے بتلایا کہ بیس سالہ جاپانی تجربے کو صرف چھ سال میں اپنا کر چار مصنوعی سیارے تیز تر برق رسانی اور مواصلاتی نظام کو کنٹرول کرنے اور موسم کی پیش گوئی کرنے کے لیے از خود تیار کیے ہیں۔ اس مرکز میں ۶۰۰ سائنس داں کام کر رہے ہیں۔ جس کا سالانہ بجٹ چودہ کروڑ روپیہ ہے۔ جو کچھ مجھے دکھلایا وہ بیشک ایک اونچے معیار اور اعلیٰ درجے کا تکنیکی کارنامہ ہے۔ جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو چیز بھی اس میں استعمال ہوئی ہے، اندرونِ ملک تیار کی گئی ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ مسلم سائنس داں ملک کے چیدہ اداروں میں سے کئی اداروں کے ڈائرکٹر، صدر اور اعلیٰ درجے

محقق ہیں جنھوں نے تحقیق کا نمایاں کام کیا ہے۔ لیکن مسلم سائنس دانوں کی مجموعی تعداد ۱/۵ سے ۱/۵ تک ہے، جو مسلم آبادی کے لحاظ سے کملنے میں نمکسکے برابر ہے۔ ان کے کام کا معیار تو اچھا ہے مگر تعداد بہت کم ہے۔ اس کی شاید وجہ یہ ہو کہ مسلمان سائنسی علوم کو پڑھنا نسبتاً کم پسند کرتے ہیں۔

بہرحال جہاں تک ہندوستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا تعلق ہے یہ کلمات دہاں میں نے بڑے فخر کے ساتھ سنے کہ اب ہندوستان کا شمار سائنسی نقطۂ نگاہ سے دنیا کی تین بڑی طاقتوں میں ہونے لگا ہے۔ اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے بلاتامل میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولی ہن نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ بالکل درست ثابت ہو رہی ہے۔

سوال:۔ سلام صاحب! آپ کے خیال میں وہ کون سے اسباب ہیں جن کے باعث ہندوستان سائنس اور ٹیکنالوجی میں بام عروج کو پہنچ سکا۔

جواب:۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہندوستانی حکومت کا خود پر کفالت کرنا ہے۔ ملک کی تیار کردہ اشیاء کے مقابلے میں حکومت نے برآمدات کو حتی الامکان نظرانداز کیا اور اس کا یہ رویہ پنڈت نہرو کے زمانے سے اب تک چلا آ رہا ہے۔

پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی تجارتی حلقے کا جتنا دباؤ ہے کم و بیش اتنا ہی دباؤ غیر ملکی درآمد کرنے والے تاجروں کا ہے۔ مگر حکومتِ ہند نے ان تمام اشیاء کی درآمد پر جو اپنے ملک میں تیار کی جاتی ہیں سخت پابندی عاید کر رکھی ہے، تاکہ مقامی تکنیکی معیار بلند ہو اور حکومت مقامی اشیاء کی برآمد میں نہ صرف یہ کہ خودکفیل ہو بلکہ ان پر فخر بھی کر سکے۔ مثلاً ہندوستان میں مقامی طور پر تیار کردہ ایمبیسڈر کاریں ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ چین کی طرح ہندوستان نے بھی یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ یا تو وہ خود اشیاء تیار کرے گا یا اُن کے بغیر ہی رہے گا اور اس بات کی تصدیق اس طرح ہو جاتی ہے کہ کمپیوٹر سے لے کر کوکا کولا تک اپنے ملک میں تیار کیے جاتے ہیں۔

دوسری وجہ جس کا خود مجھے تجربہ ہوا وہ حکومتِ ہند کا وہ رویہ ہے جو سائنس دانوں کو ملک میں ٹھہرنے کے لیے بڑا کارگر ثابت ہوا ہے۔ میں صرف ایک مثال آپ کے سامنے ڈاکٹر سوامی ناتھن کی پیش کروں گا جو رائل سوسائٹی کے رکن ہیں اور اعلیٰ درجے کے زراعتی محقق بھی۔ حکومت ہند نے ان کو پلاننگ کمیشن کا ممبر بھی منتخب کر لیا ہے۔

ہندوستان کے پلاننگ کمیشن میں شروع ہی سے ایک سائنس دان ممبر ہوتا آیا ہے۔ وہاں سائنس کے لیے بے پناہ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے ہندوستان کی کل آمدنی کا ۳/۴ حصہ صرف سائنسی تحقیق پر خرچ ہوتا ہے۔ ملک میں بہت سی قومی تجربہ گاہیں ہیں جن میں یہ روپیہ کسی نہ کسی مقصد کے تحت خرچ کیا جاتا ہے۔

سوال:۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہند کے مقابلے میں پاکستان کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:۔ میرے الفاظ ترش ضرور لگیں گے مگر ہمیں صداقت دیکھنا ہے۔ آپ دونوں ملکوں کے موازنے کی بات کر رہے ہیں، تو ہندوستان کے دورے کے بعد اور وہاں کی ترقی دیکھنے کے بعد میرا خیال ہے کہ سائنسی نقشہ پر ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کا وجود نہیں کے برابر ہے اور پھر بھی پاکستانی حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور یہ بات بڑی پریشان کن ہے کہ پاکستانی نوجوان سائنسی پیشہ اپنانے سے گریز کر رہے ہیں۔

پاکستان میں طبیعیات میں پی۔ایچ۔ ڈی کرنے والوں کی مجموعی تعداد سو سے کم ہی ہے جب کہ ہندوستان کے اعداد و شمار کے مطابق ان کی تعداد تقریباً سات ہزار ہے۔ ہندوستان نے عالمی سائنسی کلب میں شرکت کر لی ہے جب کہ پاکستان کا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ پاکستان سے سائنس داں اور سائنسی انتظامیہ کے کچھ عہدیداران کا ایک وفد ہندوستان جائے اور وہاں دیکھے کہ وہ کیسے اور کیا کر رہے ہیں۔ اس طرح انھیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس کے علاوہ میں یہ بات واضح کر دوں کہ تعلیم اور خصوصاً سائنسی تعلیم کی ترغیب دینا محض حکومت کی ہی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ تو ملک کے عوام کی ہے، اس کے دانش وروں کی ہے اور اتنی ہی کچھ والدین کی بھی۔ تو ہم سب کو اپنا اپنا فرض پورا کرنا چاہیے اور جتنا ممکن ہو سکے مقامی اسکولوں اور کالجوں کی امداد کرنی چاہیئے اور انھیں ہر ممکن تعاون دینا چاہیے۔

سوال:۔ ہمارے سامنے اس وقت سب سے سنگین مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے طلبا اور سائنس داں اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے غیر ممالک کا رخ کرتے ہیں اور واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔ اس کے علاوہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ہر وقت اسی فکر میں سرگرداں رہتا ہے کہ کب اسے مشرق وسطیٰ جانے کا موقع ملے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھیں ملک کی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ کوئی بھی شخص دوسرے ملک سے آ کر ہمارے ملک میں کیوں کام کرے گا؟ لہٰذا میری گذارش ہے کہ آپ اس مسئلے کا کچھ حل تجویز فرمائیں۔

جواب:۔ فرض کیا کہ ہمارے ملک میں ۱۲ سے ۱۷ سال کی عمر کے طلبا کی تعداد ۱۴ فی صد سے بڑھ کر ۲۸ فی صد ہو جاتی ہے، جو ترقی پذیر ممالک کا اوسط ہے تو ہم اپنے تربیت یافتہ لوگوں میں سے ۲۵ فیصد کو بآسانی غیر ممالک بھیج سکتے ہیں اور اس وقت ہمیں اس کمی کا قطعی احساس نہیں ہوگا جس سے ہم آج کل دوچار ہیں اور اگر ہم ۴۸ فیصد لوگوں کو تربیت

تربیت دیتے ہیں جو ترقی یافتہ ممالک کا اوسط ہے تو پھر یہ مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا۔

ہم فی الحال کافی کم لوگوں کو تربیت دے رہے ہیں جو ہماری آبادی کا بہت کم فیصد (کل ۱۲ فی صد) ہے، اور سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ اگر وہ تربیت یافتہ لوگ ملک میں ٹھہر بھی جاتے ہیں تو سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود کفیل ہونے کی بات بالکل نہیں سوچتے۔

سوال:- میں ایک بار پھر آپ سے درخواست کروں گا کہ ہندوستان کے دورے کے متعلق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔

جواب:- اوّل یہ کہ ہندوستانی سائنس داں، طلبا اور دوسرے تمام طبقے کے لوگوں نے تعلیم کی عزت و تکریم کا بے پناہ مظاہرہ کیا۔ ہندوستانیوں میں سائنس پڑھنے کی لگن بدرجہ اتم موجود ہے اور برصغیر کے کارنامے پر سب کو ناز ہے۔ ہر جگہ سیاست دانوں سے میں نے سوال کیا کہ کیا یہ فخر اور والہانہ محبت و شفقت ہمارے مسئلوں کو حل کرنے میں معاون ثابت نہیں ہو سکتے؟ تو لطف کی بات یہ ہے کہ کئی سیاست دانوں نے جواباً غیر ذمہ دارانہ صحافت کو نفرت کی آگ پھیلانے کا موجب قرار دیا۔

دوئم یہ کہ میں نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی اور انھیں اس بات سے آگاہ کیا کہ سائنس ان کا ورثہ ہے جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے انھیں جد و جہد کرنی چاہیے۔ اس طرف پیش قدمی ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید صاحب نے کی ہے جو ہمارے حکیم سعید صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کی زیر صدارت ایک میٹنگ میری موجودگی میں منعقد کی گئی جس میں سرسید سائنٹفک سوسائٹی کا قیام دوبارہ عمل میں آیا اور یہ طے پایا کہ شمالی علاقے کے سائنس پڑھنے والے مسلم طلبا کی امداد کے لیے ایک کروڑ روپیہ سالانہ دیا جائے گا۔ میری دعا ہے کہ انھیں اس کارِ خیر میں کامیابی ملے اور پاکستان میں بھی اسی قسم کا کام سرانجام ہو۔

میں آخر میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان کی سائنس کی ترقی سے ہمارے ملک کو سبق لینا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی سائنس میں ابھی کمزوریاں موجود ہیں۔ مثلاً یونیورسٹیوں میں سائنسی تحقیق نسبتاً کمزور ہے، حالاں کہ آپ جانتے ہیں کہ تریاست (ٹرائسٹ، اٹلی) کے مرکز نے ہندوستان کے اس طبقے کی اس طرح امداد کی ہے جس طرح پاکستان اور بنگلہ دیش کی۔

سوال:- کیا آپ اپنے سائنس دانوں اور ماہرین تعلیم کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے:

جواب:- میرا پیغام یہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے کام کا آغاز کریں۔ جس کے لیے سائنس فاؤنڈیشن قایم کرنے ہوں گے اور ہمارے شہری کو اس مقصد کو بروے کار لانے کے لیے قربانی دینا ہوگی۔

میری ناچیز رائے میں اسلام کی تعلیم کی اس وقت نہ صرف پاکستان بلکہ سارے عالمِ اسلام میں زور دینے کی ضرورت ہے۔ اگر حکومت اور ملک دونوں مل کر ہمت اور اولوالعزمی کے ساتھ کام کا آغاز کریں تو آج ہی سے کام شروع ہو سکتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ہماری محنتوں کو رائیگاں نہیں جانے دے گا۔

★ ★ ★

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
سیفیکس
لنک
کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
Link
CABLE 88 LOCK
تیار کردہ: سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون:
۳۶۰۹
۴۱۹۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸ / ۸۴ ــــــ ۸۵

مقررہ فارموں پر درج ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

پروفیسر سے

شرح تنخواہ ۱۵۰۰ ۔ ۶۰ ۔ ۱۸۰۰ ۔ ۱۰۰ ۔ ۲۰۰۰ ۔ ۱۲۵ / ۲ ۔ ۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

۱۔ پروفیسر شعبہ تھیالوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف شیعہ تھیالوجی ۔

قابلیت :۔ شیعہ تھیالوجی میں فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس ماسٹرس ڈگری یا عربی یا اسلامک اسٹڈیز میں فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری ۔

یا

کسی مستند اور معروف مدرسے سے فاضل کی ڈگری ساتھ میں انگریزی کی اچھی جانکاری پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھانے کا کم ازکم دس سالہ تجربہ یا اس پوسٹ گریجویٹ کلاسز کے مساوی کسی کالج / یونیورسٹی یا کسی مستند اور مشہور مدرسے میں درس و تدریس کا تجربہ

اور

پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری یا انتہائی اعلیٰ پایے کا مطبوعہ کام ۔

۲۔ پروفیسر آف اردو ۔ ڈپارٹمنٹ آف اردو ۔

۳۔ پروفیسر آف پولیٹیکل سائنس ۔ ڈپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس

۴۔ پروفیسر آف پولیٹیکل سائنس ۔ (انٹرنیشنل ریلیشن) ۔ ڈپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس ۔

۵۔ پروفیسر آف اسٹیٹکس ۔ ڈپارٹمنٹ آف اسٹیٹکس ۔

۶۔ پروفیسر آف ٹرانسپورٹ اکونامکس ۔ ڈپارٹمنٹ آف کامرس ۔

قابلیت :۔

۱۔ لازمی :۔ ۱۔ کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اسی کے مساوی کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں ڈگری ۔

۲۔ ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ درجے کا مطبوعہ کام ۔ اور ــــ

۳۔ کم ازکم دس سال کا پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھانے کا تجربہ اور تحقیق کے کام کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

II اپینڈیا۔ پوسٹ نمبر ۴۔ پروفیسر آف پولیٹیکل سائنس (انٹرنیشنل ریلیشنز) کے لیے
انٹرنیشنل ریلیشنز میں تخصص اور/یا درس وتدریس اور تحقیق کی رہنمائی کا انٹرنیشنل ریلیشنز میں تجربہ۔

ریڈرس:۔

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

۷۔ ریڈر ان زوولوجی ڈپارٹمنٹ آف زوولوجی۔
۸۔ ریڈر ان بوٹنی۔ ڈپارٹمنٹ آف بوٹنی۔
۹۔ ریڈر ان ایجوکیشن۔ ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن۔
۱۰۔ ریڈر ان عربک ڈپارٹمنٹ آف عربک۔

قابلیت:۔

۱۔ لازمی: (الف) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی غیر ملکی ڈگری۔
(ب) ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ درجے کا مطبوعہ کام۔
(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسسز کو درس دینے کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ اور تحقیق کی رہنمائی کا قدرے تجربہ
II اپینڈیا۔ پوسٹ نمبر ۱۰ ریڈر ان عربک کے لیے
(الف) عربی بولنے کی کافی صلاحیت
(ب) جدید تکنیک کے ساتھ مختلف کلاسسز کو جدید عربی میں درس دینے کی صلاحیت۔

لکچررس:۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰۔ ۴۰۔ ۱۱۰۰۔ ۵۰۔ ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

۱۱۔ لکچرر ان ایجوکیشن۔ ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن۔
۱۲۔ لکچرر ان پولیٹیکل سائنس۔ ویمنس کالج۔
۱۳۔ لکچرر ان کیمسٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف یونانی طب اور سرجری۔ اجمل خاں طبیہ کالج

قابلیت:۔

۱۔ لازمی۔ (الف) ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام
(ب) اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس (بی سیون پوائنٹ اسکیل میں) کے ساتھ متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔
II اپینڈیا۔ پوسٹ نمبر ۱۱۔ لکچرر ان ایجوکیشن کے لیے
I نرسری اور میتھوڈیکس میں تجربہ اور قابلیت
II ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن یا کسی ٹریننگ کالج میں درس وتدریس کا تجربہ
پوسٹ نمبر ۱۳۔ لکچرر ان کیمسٹری اجمل خاں طبیہ کالج کے لیے
اردو کی جانکاری۔

بین الموضوعی ترقیات کے پروگرام کی ضرورت کے تعلق ۳۹ سے مذکورہ بالا الف اور ب کے لیے مقررہ اسناد کافی سمجھی جائیں گی۔

اگر سیلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے اس صورت میں والف ع اور ب ع کے تحت مطلوبہ استعداد میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل امیدوار میسر نہ آئے یا بصورتِ دیگر وہ موزوں متصور نہ ہو، تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (اس صورت میں ایم فل ڈگری یا مطبوعہ معیاری کام کو وزن دیا جائے گا) کا تقرر کیا جائے گا بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیبارٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری کے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اسے مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہ دی جائے گی جب تک وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرے۔

فیکلٹی آف میڈیسن

پروفیسرس:

شرح تنخواہ ۱۵۰۰ - ۶۰ - ۱۸۰۰ - ۱۰۰ - ۲۰۰۰ - ۱۲۵/۲ - ۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاونس۔

۱۴- پروفیسر آف اناٹومی- ڈپارٹمنٹ آف اناٹومی۔

قابلیت:

ا- لازمی — ایم-ایس سی (اناٹومی)

ایم.بی.بی-ایس مع ایم ایس سی (اناٹومی)

پی ایچ-ڈی- (میڈیکل اناٹومی)

ڈی-ایس سی (میڈیکل اناٹومی)

درس و تدریس/اور تحقیق کرانے کا تجربہ۔

اور کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان اناٹومی چار سالہ تجربہ

۲- پسندیدہ بہتر ہو کہ امیدوار کے اس تخصیص سے متعلق اصلی تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہوں۔ اور امیدوار عملی طور تحقیقی کام میں مصروف ہو اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی راہنمائی کا تجربہ بھی رکھتا ہو

۱۵- پروفیسر آف اکولر پیتھالوجی - ڈپارٹمنٹ آف اوپتھلمولوجی

قابلیت

ا- لازمی:- ایم-ایس (اوپتھلمولوجی)

ایم-ڈی- (" ")

ایم-ڈی (پیتھالوجی)

ایم-ڈی، (پیتھالوجی اینڈ بکٹریالوجی) یا

میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ ان کے مساوی ڈگریاں۔

درس و تدریس/تحقیق کا تجربہ

میڈیکل کالج میں چار سال سے بحیثیت ریڈر پیتھالوجی/اوپتھلمولوجی کام کرنے کا تجربہ

ii پسندیدہ: کسی آپتھلک ڈپارٹمنٹ میں آپتھلک پیتھالوجی میں تجربہ کی بنا پر امیدوار قابل ترجیح ہوگا۔
بہتر ہو کہ اس تخصیص سے متعلق امیدوار کے اصلی اور تحقیقی مضامین ہندوستان اور بیرونی رسائل میں شائع ہوئے ہوں۔

ریڈرس:۔

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

۱۶۔ ریڈر ان پریوینٹیو اینڈ سوشل میڈیسن ۔ ڈپارٹمنٹ آف پریوینٹیو اینڈ سوشل میڈیسن

قابلیت:

i۔ لازمی:۔ ایم۔ڈی (سوشل اور پریوینٹیو میڈیسن)/(کمیونٹی میڈیسن) ۔
ایم۔ڈی (میڈیسن) مع ڈی۔پی۔ایچ
دوسری اس کے مساوی قابلیت کی ڈگریاں جو میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ ہوں۔
درس و تدریس اور تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں سوشل اینڈ پریوینٹیو میڈیسن کے لکچرر کی حیثیت سے پانچ سالہ تجربہ۔

ii پسندیدہ:۔ بہتر ہو کہ امیدوار کے اس تخصیص سے متعلق اصلی اور تحقیقی مضامین ہندوستان اور بیرون ہند رسائل میں شائع ہوئے ہوں۔

۱۷ ریڈر ان جنرل سرجری ۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری

قابلیت

i۔ لازمی:۔ ایم۔ایس (سرجری) یا/
ایم۔ایس (جنرل سرجری) یا
ایم۔ایس (پیڈیاٹرک سرجری) یا
اس کے مساوی دوسری ڈگریاں جو میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ ہوں۔
درس و تدریس / تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں سرجری، پیڈیاٹرک سرجری میں لکچرر کی حیثیت پانچ سالہ تجربہ۔

۱۸۔ ریڈر ان نیفرولوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

قابلیت

i) لازمی:۔ ایم۔ڈی (نیفرولوجی)
ایم ڈی ان میڈیسن مع دو سال کی نیفرولوجی میں خصوصی ٹریننگ
درس و تدریس / تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان نیفرولوجی پانچ سالہ کا تجربہ۔
خصوصی میدان میں مطبوعہ تحقیقی کام۔

۱۹۔ ریڈرس ان ای۔این۔ٹی ۔ ڈپارٹمنٹ آف آٹو رہینو لارینگالوجی۔

قابلیت: i) لازمی:۔ ایم۔ایس (آٹو۔ رہینو لارینگالوجی)/

اس کے مساوی دوسری ڈگریاں جو میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ ہوں۔

درس و تدریس / تحقیق کا تجربہ۔

کسی میڈیکل کالج میں اٹو رھینو لارینگالوجی میں لکچرر کی حیثیت سے پانچ سالہ تجربہ۔

iii پسندیدہ:۔ ۱۔ کسی تخصص میں اعلیٰ مطبوعہ تحقیقی کام جو کسی ہندوستانی یا غیر ملکی جرائد میں طبع ہوا ہو۔

۲۔ برانکو اوسوفیجولوجی / رائنالوجی اور لیرنیگالوجی کے لیے رجحان

۲۰۔ ریڈر ان فزیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی۔

قابلیت:۔

۱۔ لازمی:۔ ایم۔ڈی (فزیالوجی)

ایم۔بی۔بی۔ایس مع ایم۔ایس سی فزیالوجی

پی۔ایچ۔ڈی (میڈیکل فزیالوجی)

ڈی۔ایس سی۔ (" ")

اس کے مساوی دوسری ڈگری جو میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ ہوں

درس و تدریس / ریسرچ کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں فزیالوجی میں بحیثیت لکچرر پانچ سال کا تجربہ

iii پسندیدہ کسی تخصص میں اعلیٰ تحقیقی مطبوعہ کام جو ہندوستانی یا غیر ملکی جرائد میں طبع ہوا ہو۔

لکچررس

شرح تنخواہ۔ ۷۰۰ ۔ ۴۰ ۔ ۱۱۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاونس۔

۲۱۔ لکچرر کم پیڈیاٹرک سرجن۔ ڈپارٹمنٹ آف پیڈیاٹرکس۔

قابلیت

۱۔ لازمی۔ ایم۔سی ایچ۔ (پیڈیاٹرک سرجری)

iii پسندیدہ اس تخصیص سے متعلق تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہوں

۲۲۔ لکچرر ان بائیوکیمسٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف بائیوکیمسٹری

قابلیت:۔ ایم۔ڈی (بائیوکیمسٹری)

ایم۔بی۔بی۔ایس مع

ایم۔ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

پی ایچ۔ڈی (")

ڈی۔ایس سی (")

نوٹ:۔ منتخب شدہ امیدوار کلینکل بائیوکیمسٹری سیکشن کی تنظیم اور ایم۔بی۔بی۔ایس اور ایم۔ڈی کلاسوں کے لیے میڈیکل بائیوکیمسٹری کے نصابات کے ذمہ دار ہوں گے۔

فیکلٹی آف انجینئرنگ

پروفیسرس۔

۔ شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/۲۔ ۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاونس۔

۲۳ پروفیسر آف مکینیکل انجینرنگ ۔ ڈپارٹمنٹ آف مکینیکل انجینرنگ ۔

قابلیت:۔

۱۔ لازمی:۔ ایک ایسا ممتاز اسکالر جس کا انتہائی اعلیٰ درجے کا مطبوعہ کام ہو۔ اور جو عملی طور پر تحقیق میں معروف ہو۔ درس وتدریس اور/ یا تحقیق کا دس سال تجربہ رکھتا ہو۔ ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی راہنمائی کا تجربہ بھی ہو۔

یا

۱ انتہائی اعلیٰ درجے کا انجینر/ ٹیکنالوجسٹ ہو اور اپنے پیشے میں اسے تخصص حاصل ہو اور
۲ کیسٹنگ انجینرنگ میں اس خصوصی مہارت ہونا ضروری ہے۔

پسندیدہ پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کو پڑھانے کا تجربہ۔

۲۴۔ پروفیسر آف فزکس ۔ فزکس سیکشن۔ ذاکر حسین کالج آف انجینرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔

قابلیت:۔ فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فزکس میں ماسٹرس ڈگری یا اس ڈگری کے مساوی کوئی قابلیت کم از کم ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ درجے کا مطبوعہ کام۔ کم سے کم دس سال کا پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کو پڑھانے یا تحقیق کی راہنمائی کرنے یا انجینرنگ کے ڈگری کلاسیز کی درس وتدریس کا تجربہ۔

۲۵۔ پروفیسر آف کیمیکل انجینرنگ ۔ ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل انجینرنگ

قابلیت:۔

۱۔ لازمی:۔ انتہائی اعلیٰ درجے کا اسکالر جس کا انتہائی اعلیٰ پایے کا مطبوعہ کام ہو۔ اور جو عملی طور پر تحقیق میں مصروف ہو۔ درس وتدریس کا دس سالہ تجربہ یا تحقیق کا دس سالہ تجربہ۔ ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی راہنمائی کا تجربہ۔

یا

شہرت یافتہ غیر معمولی انجینر/ ٹکنالوجسٹ جس نے علم کے ارتقا میں معتدبہ خدمات انجام دی ہوں۔

پسندیدہ (۱) یونیورسٹی کے معیار کے کسی ادارے میں درس وتدریس کا تجربہ۔
(۲) ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی راہنمائی کا تجربہ۔

میدان میں خصوصی تخصص:۔
ٹرانسپورٹ فینومینا اور انالائسز/ میتھمیٹیکل موڈلنگ اور پلانٹ سمولیشن/ فلوئیڈ میکینکس/ ماس ٹرانسفر/ کیمیکل ری ایکشن انجینرنگ/ پٹرولیم پروسسنگ اینڈ ٹیکنالوجی/ کیمیکل انجینرنگ۔ تھرموڈائنمکس۔
درج بالا میں سے کسی دو میں کم از کم تخصص ہونا ضروری ہے۔

اسپیڈ ریس:۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

۲۶۔ ریڈرس ان کیمیکل انجینرنگ۔ ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل انجینرنگ

قابلیت:۔

۱۔ لازمی:۔ متعلقہ میدان میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔

درس وتدریس اور/یا تحقیق اور ترقیاتی میدان میں تقریباً پانچ سالہ کا تجربہ
اگر کوئی امیدوار پی ایچ۔ڈگری نہ رکھتا ہو لیکن اس کا مطبوعہ کام ریسرچ ڈگری کے معیار کا ہو یا ڈیزائن/ڈویلپمنٹ میں کسی ادارے یا انڈسٹری میں اس کا کام انتہائی اعلیٰ پایہ کا ہو تو اس امیدوار کو بھی تقرر کے لیے موزوں تصور کیا جائے گا۔

یا

ان اشخاص کے لیے جن کا تقرر صنعت یا پیشہ وارانہ حلقوں سے کیا جائے گا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے حامل ہوں اور اپنے میدان میں تقریباً سات سال کا تجربہ رکھتے ہوں، جس میں تحقیق/ایجادات اور ارتقاء بھی شامل ہے۔

پسندیدگی ا۔ ان چیزوں میں امیدوار کو تخصص حاصل ہونا چاہیے۔ فلوئیڈ میکینکس/ ہیٹ ٹرانفسر/ ماس ٹرانفسر/ ری ایکشن انجینرنگ/ ٹرانسپورٹ فینومینا/ پٹرولیم ٹیکنالوجی۔

لکچررس:

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

۲۷۔ لکچررس ان کیمیکل انجینرنگ۔ ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل انجینرنگ۔
۲۸۔ لکچرر ان سول انجینرنگ ڈپارٹمنٹ آف سول انجینرنگ (عارضی)

قابلیت:۔

ا۔ لازمی:۔ متعلقہ مضمون میں ماسٹر ڈگری ان انجینرنگ/ٹیکنالوجی۔
۲۔ انجینرنگ اور ٹیکنالوجی میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ بیچلرز ڈگری۔ بیچلر ڈگری میں فرسٹ کلاس ہو اور/یا ماسٹر ڈگری معیار کی قابلیت
کسی ریسرچ انسٹی ٹیوشن میں ایک سالہ تجربہ متعلقہ پروفیشنل فیلڈ میں علاوہ تعلیم کے تجربہ ہونا شرط ہے۔

★ اگر کسی امیدوار کے پاس پروفیشنل تجربہ نہ ہو، یا کوئی امیدوار یہ تجربہ تو رکھتا ہو لیکن اس کو تقرر کے لیے مناسب تصور نہ کیا جائے تو پروفیشنل تجربہ نہ رکھنے والے امیدوار کا اس شرط کے ساتھ تقرر کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر مندرجہ بالا تجربہ حاصل کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو اس وقت تک سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا جب تک کہ وہ اس شرط کو پورا نہ کر دے۔

★ اگر ایم۔ٹیک/ایم۔ای کی صلاحیت کا امیدوار میسر نہ آئے یا وہ تقرر کے لیے مناسب متصور نہ ہو تو اس صورت میں لازمی قابلیت میں چھوٹ دی جاسکتی ہے اور فرسٹ کلاس انجینرنگ گریجویٹ کو تقرر دیا جاسکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ امیدوار اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر ایم۔ٹیک/ایم۔ای کی ڈگری حاصل کرلے گا۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو اس وقت تک سالانہ ترقی سے محروم رکھا جائے گا جب تک وہ مطلوبہ استعداد حاصل نہ کرلے۔

پسندیدگی:۔ پوسٹ نمبر ۲۷ - لکچرر ان کیمیکل انجینرنگ کے لیے
تخصص کا میدان:۔ مندرجہ ذیل براڈ ایریاز میں سے کسی دو میں۔
ا۔ فیول ٹیکنالوجی
۲۔ کیمیکل ٹیکنالوجی
۳۔ ٹرانسپورٹ فینومینا/ ٹرانفسر آپریشنس۔

۴۔ کیمیکل انجینرنگ ڈایزائن۔

غیر معمولی تجربے اور استعداد کے حامل افراد کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو بطور راہی آمد (۳۔۸) ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا ایک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مجوزہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سیلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے پانچ روپیہ نقد ادائیگی یا فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے ذاتی طور پر یا ۱۰ + 23 سائز کا لفافہ بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ لفافہ پر مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہونا ضروری ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ر جولائی ۱۹۸۴ء (دفتر کے ٹائم تک) ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

موزوں امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۹ / ۸۴ ۔ ۸۵

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں ۔

۱۔ ڈائرکٹر آف فزیکل انسٹرکشن (ٹینیور) (مستقل) (ایک جگہ) یونیورسٹی گیمس کمیٹی ۔

شرح تنخواہ :۔ ۷۰۰ ۔ ۴۰ ۔ ۱۱۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۶۰۰ مع دیگر الاونس ۔

قابلیت :۔

۱۔ لازمی :۔ اسپورٹس میں ماسٹرز ڈگری کے ساتھ ٹیم کو نیشنل / اسٹیٹ / انٹر ورسٹی یا اس کے مساوی تربیت دینے اور تیاری کرانے کا تین سالہ تجربہ ۔

یا

پوسٹ گریجویٹ کا اسپورٹس میں ایک سالہ ڈپلوما جو کہ کسی مستند ادارے کا ہو اور ساتھ ہی پانچ سالہ تجربہ ٹیم کو نیشنل / اسٹیٹ / انٹر ورسٹیز یا اس کے مساوی معیار کے مطابق تربیت دینے اور تیاری کرانے کا ہو ۔

یا

گریجویٹ اور ایک سالہ ڈپلوما کسی مستند کوچنگ ادارے کا ہو اور ساتھ ہی ساتھ ٹیم کو نیشنل / اسٹیٹ / انٹر ورسٹیز / یا اس کے مساوی معیار کے مطابق تربیت دینے اور تیاری کرانے کا کم سے کم آٹھ سال کا تجربہ ہو ۔

نوٹ :۔ ۱۔ تربیت دینے کا تجربہ اپنے میدان میں اعلیٰ پایہ کا ہونا چاہیے ۔

۲۔ تجربہ و تعلیمی صلاحیت میں اس صورت میں چھوٹ بھی دی جا سکتی ہے اگر امیدوار اعلیٰ درجے کا ٹیم کو نیشنل / اسٹیٹ یا اس کے مساوی معیار کے کھیلوں کے لیے تربیت دینے کی لیاقت رکھتا ہو ۔

پسندیدہ :۔ کھیل کے میدان کو تیار کرانے / کھیل کی سہولت مہیا کرنے اور ساز و سامان سے متعلق تجربہ رکھتا ہو ۔

کام کی تفصیلات :۔ ۱۔ ٹیم اور کھلاڑیوں کو کوچنگ کرانا

۲۔ کھیل سے متعلق تمام سہولیات مہیا کرنا ۔

۳۔ ایڈمنسٹریٹیو کام کو پورا کرنا اور اپنے متعلقہ دوسری ایسی ڈیوٹی انجام دینا ۔

۲۔ اسسٹنٹ لائبریرین ۔ مولانا آزاد لائبریری ۔ اے ایم یو

شرح تنخواہ :۔ ۷۰۰ ۔ ۴۰ ۔ ۱۱۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۶۰۰ مع دیگر الاونس

قابلیت :۔ ۱۔ لازمی (۱) اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ کم از کم ہائی سکنڈ کلاس کے ساتھ کسی مضمون میں ماسٹر ڈگری

(۲) لائبریری سائنس میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس کے ساتھ ماسٹر ڈگری

پسندیدہ :۔ پروفیشنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کسی یونیورسٹی یا اعلیٰ ادارے میں کم از کم تین سالہ تجربہ

ڈاکومینٹیشن ورک / کمپیوٹر کی بنیاد پر معلومات بہم پہنچانے کا کام اور تجربہ
اعلیٰ قابلیت کے امیدوار کے لیے تجربے کی شرائط میں نرمی کی جا سکتی ہے

۳- سینیئر پرسنل اسسٹنٹ - اے ایم یو - علی گڑھ
شرح تنخواہ:- ۶۵۰ — ۳۰ — ۷۴۰ — ۳۵ — ۸۸۰ — ای بی — ۴۰ — ۱۰۴۰ روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت:- اسلازمی:- کم از کم آرٹس / سائنس یا کامرس میں گریجویشن کے ساتھ ساتھ پانچ سالہ تجربہ
پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے یا سینیئر اسٹینوگرافر کی حیثیت سے کسی یونیورسٹی یا ڈگری کالج یا
مشہور تنظیم میں کام کیا ہو۔ انگریزی کی اچھی جانکاری شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ میں ہونا ضروری ہے
پسندیدہ فائیلوں کی ترتیب کانفیڈینشل ریکارڈ کی تنظیم کا عملی تجربہ ایڈیشنل کوالیفیکشن میں شمار ہوگا۔

۴- پروفیشنل اسسٹنٹ۔ ایم - اے لائبریری اور ڈپارٹمنٹل لائبریریز کے لیے - اے ایم یو - علی گڑھ
شرح تنخواہ:- ۵۵۰ — ۲۵ — ۷۵۰ — ای بی — ۳۰ — ۹۰۰ — مع دیگر الاونس
قابلیت ا- لازمی:- بی - اے / بی - ایس سی / بی کام - ساتھ میں بی لب ایس سی یا لائبریری سائنس میں
ایک سالہ ڈپلومہ اور کسی یونیورسٹی لائبریری یا اعلیٰ تعلیمی ادارے کی لائبریری میں بحیثیت سیمی
پروفیشنل کی حیثیت سے کام کرنے کا چار سالہ تجربہ
یا
ایم - اے / ایم ایس سی / ایم کام کے ساتھ بی - لب یا لائبریری سائنس میں ایک سالہ ڈپلوما
پسندیدہ ا- (الف) ا- سیمی پروفیشنل کی حیثیت سے کام کرنے کا کسی یونیورسٹی لائبریری میں یا کسی ایسے تعلیمی ادارے کی
لائبریری میں جس میں پوسٹ گریجویٹ لڑکوں سے سابقہ رہتا ہو۔
(ب) کیٹلاگ کو ہندی / انگریزی / اردو / فارسی / عربی میں ٹائپ کرنے کا تجربہ
۵- سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) انسٹی ٹیوٹ آف آپتھلمولوجی
شرح تنخواہ:- ۵۵۰ — ۲۵ — ۷۵۰ — ای بی — ۳۰ — ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت ا- لازمی:- بی ایس سی کے ساتھ متعلقہ سبجیکٹ کی ٹکنیک کی لیباریٹری میں کام کا تجربہ
پسندیدہ:- متعلقہ ساز و سامان کے استعمال کا تجربہ اور ڈپارٹمنٹ آف اوپتھلمولوجی کے منظور شدہ
آئی ہوسپٹل میں عملی کام کا تجربہ۔
۶- سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ویٹرنیری) (ایک جگہ) (مستقل) - ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری
قابلیت ا- لازمی۔ کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے ویٹرنیری سائنس میں بیچلر ڈگری
اا پسندیدہ:- چھوٹے بڑے جانوروں کی دیکھ ریکھ کا تجربہ۔ کسی تجرباتی سرجیکل لیباریٹری میں کام کرنے
کا تجربہ اور انیستھیا دینے کا تجربہ

۷- سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (کلینکل پیتھالوجی) (لیوی ویکنسی) جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل۔
شرح تنخواہ:- ۵۵۰ — ۲۵ — ۷۵۰ — ای بی ۳۰ — ۹۰۰ — روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت:- بی - ایس سی کے ساتھ کسی منظور شدہ اسپتال میں کلینکل پیتھالوجی کا تین سالہ عملی تجربہ
۸- تھیٹر ٹیکنیشن (لیوی ویکنسی) میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵ — ۱۵ — ۵۰۰ — ای بی - ۱۵ — ۵۶۰ — ۲۰ — ۷۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت:۔ میٹریکولیشن یا اس کے مساوی۔ نرسنگ میں سرٹیفکیٹ۔ مع دوسالہ تجربہ کسی آپریشن تھیٹر میں کام کرنے کا
یا اسسٹنٹ یا ٹیکنیشن کی حیثیت سے کسی آپریشن تھیٹر میں عملی کام کا چار سالہ تجربہ۔

۹۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ [ایک جگہ] [مستقل] میتھ میٹکس سیکشن۔ ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
شرح تنخواہ:۔ ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت

۱۔ لازمی (۱) فزکس اور میتھ میٹکس سے گریجویٹ
(۲) ڈپلوما ان کمپیوٹر پروگرامنگ/الیکٹرانکس، ڈاٹا پروسسنگ کم از کم ایک سالہ میعاد کا کسی منظورہ شدہ یونیورسٹی سے

پسندیدہ:۔ (۱) کمپیوٹر لینگویج جیسا کہ فورٹران [Fortran] کوبل [Cobol] بیسک [Basic] وغیرہ کا تجربہ
(۲) انٹرایکٹیو کمپیوٹر ٹرمینل کی دیکھ بھال اور دوسرے کمپیوٹر کی دیکھ بھال کا تجربہ

۱۰۔ سینئر لیباریٹری اسسٹنٹ [دو جگہیں] [مستقل] ڈپارٹمنٹ آف بائیوکیمسٹری جے این میڈیکل کالج
شرح تنخواہ:۔ ۳۸۰-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت:۔

۱۔ لازمی:۔ (۱) ہائر سکنڈری سائنس کے مضامین کے ساتھ۔
(۲) کم از کم تین سال کا تجربہ بایوکیمسٹری لیباریٹری میں کام کرنے کا ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ لیباریٹری کسی میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کی ہو تو اس صورت میں امیدوار کو ترجیح دی جائے گی

پسندیدہ:۔ (۱) کلینکل ایسٹیشن میں مستعمل شدہ طریقوں سے گہری واقفیت
(۲) میڈیکل لیباریٹری ٹیکنالوجی میں ڈپلوما۔

۱۱۔ سینئر لیباریٹری اسسٹنٹ [ایک جگہ]۔ [مستقل]۔ ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔

شرح تنخواہ:۔ ۳۸۰-۱۲-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰ مع دیگر الاؤنس

قابلیت:۔ ہائر سیکنڈری سائنس کے مضامین کے ساتھ
مع
پہلے تجربے کے ساتھ۔

۱۲۔ سیمی پروفیشنل ایم اے لائبریری اور ڈپارٹمنٹل لائبریریز کے لیے۔ اے ایم یو علی گڑھ
شرح تنخواہ۔ ۳۸۰-۱۲-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت:-

۱- لازمی:- بی۔ اے/ بی۔ ایس سی/ بی۔ کام مع بی۔ لب ایس سی

یا

ایک سالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما لائبریری سائنس میں

(سب امتحانات میں فرسٹ کلاس یا سیکنڈ کلاس ہونا چاہیے)

پسندیدہ:- کیٹلاگ کارڈ تیار کرنے (انگریزی اردو ٹائپ رائٹنگ کے ذریعے) کا تجربہ اور مہارت۔

اعلیٰ قابلیت کے امیدواروں کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جا سکتی ہے۔

جو امیدوار انٹرویو کے لیے طلب کیے جائیں گے ان کو ایک طرف کا سکنڈ کلاس کا کرایہ بطور T.A دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے یکمشت پانچ روپے (اسامی نمبر ۱-۲-۳ کے لیے) اور باقی مانده کے لیے (۲) تین روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شده) یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کر سکتے ہیں ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۱۰ سم + 23 سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجنا ضروری ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۱ جولائی ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے
نامکمل اور دیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں
(رجسٹرار)

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh. Phone ; 4185

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

جلد ۳ ۱۶ تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء شمارہ ۱۴

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نورالحسن نقوی
استاد شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات

سرورق پر۔ وکٹوریہ گیٹ (ملاحظہ ہو : پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے) آرٹسٹ: سرفراز احمد

کنوں بہ چشم روشنی چو جلوہ زد سروجنی — فلک بہ سطحِ سوسنی بساطِ ماہتاب زد

تبسمش تکلمے، تکلمش ترنمے — سزد اگر تلاطمے بجانِ شیخ و شاب زد

شکستِ رنگِ ساحری چو زد نوائے شاعری

نمودہ سحر سامری اگر در خطاب زد — مولانا سہیل

آزاد ترجمہ:- سروجنی نے اپنی روشن نگاہوں سے جلوہ پاشی کی تو آسمان نے نیلگوں سطح پر چاندنی کا فرش بچھا دیا۔ اس کا تبسم سراپا تکلم ہے اور تکلم سراپا ترنم۔ اُس کی یہ ادا جوانوں اور بوڑھوں کے دلوں میں تلاطم برپا کر دے تو کیا عجب! اس کی شعر خوانی نے ساحری اور خطابت نے سحر سامری کو مات دے دی۔

اسٹریچی ہال میں مسز سروجنی نائیڈو کی تقریر ہوئی۔ بجلی کی روشنی کا انتظام بھی انہی دنوں ہال میں پہلے پہل ہوا تھا۔ کتنا جگمگاتا، پر رونق شایستہ مجمع تھا۔ مسز نائیڈو تقریر کرنے کھڑی ہوئیں۔ ذرا دیر مجمع اور ماحول کا جائزہ لیا ۔۔۔ ان تمام شیوہ ہائے بتاں کے ساتھ جن کو کوئی نام نہیں دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ بھی جن کو نام دیا گیا ہے! تھوڑی دیر میں تقریر کا یہ عالم تھا کہ جس طرف موصوفہ کی نگاہ اُٹھ جاتی تھی یا رخ پھر جاتا واقعی کچھ اس طرح کا رنگ نظر آنے لگتا جس کے بارے میں کہا گیا ہے ۔۔۔

الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

مولانا سہیل نے اس موقع کی تصویر جس نظم میں کھینچی ہے وہ علی گڑھ والوں میں سے بہتوں کو اب تک یاد ہوگی۔ اتنی مختصر لیکن ہر اعتبار سے مکمل اور دلکش نظم مولانا سہیل بھی پھر کبھی نہ لکھ پائے۔ مسز نائیڈو نے بھی اس نظم اور مولانا سہیل کو تادمِ آخر ہر موقع پر یاد رکھا۔

تقریر ختم ہوئی تو کالج کے پرنسپل ٹول صاحب جو صدارت فرما رہے تھے بڑے اعتماد و اخلاص کے ساتھ اُٹھے اور

Thank you very much indeed Mrs. Naidu!

کہہ کر بیٹھ گئے۔ مجلس برخاست ہوگئی! ہم سمجھتے تھے کہ اس تقریر کے جواب میں موصوف کچھ کہیں گے اور کچھ دیر تک کہتے رہیں گے لیکن اُن کی اس مختصر کلامی سے ہم سب متحیر رہ گئے۔ چنانچہ ایم۔ اے۔ او کالج میں جب کسی بات کو کاٹنا، یا بغیر کسی التفات کے طنزاً یا مزاحاً ختم کر دینا ہوتا تھا تو ٹول صاحب کا یہ فقرہ دہرایا جاتا، جو مدتوں کالج میں زبان زد رہا۔ صاحبانِ ذوق اس کا استعمال اس لطف اور برجستگی سے کرتے کہ جس پر یہ سر کیا جاتا۔ اس کے لیے خفیف اور خاموش ہو جانے کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ بڑے سے بڑے بور دوبالِ جان! کو اس فقرے سے پسپا کر دیتے تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ

تہذیب الاخلاق (شمارہ ۹/۳) میں ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر کچھ عرض کرکے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں متعدد مضامین و مراسلات موصو
ہوئے ہیں جن مکتوب نگاروں نے انگریزی ذریعۂ تعلیم کی حمایت کی ہے انھوں نے کوئی قابلِ ذکر دلیل پیش نہیں کی۔ بیشتر اصحاب نے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے بچوں
اردو زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تو آگے چل کر انھیں طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا ہوگا۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم کا بندوبست محال ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اردو کی محبت
اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔ بفرضِ محال اس کا بندوبست ہو بھی گیا تو تعلیم کے بعد ان کی کھپت کہاں ہوگی۔ ہندوستانی مسلمان اب بھی تعلیم میں بہت پیچھے ہیں اور اعلےٰ
ملازمتوں میں خال خال نظر آتے ہیں انھوں نے اردو کو نہ چھوڑا تو یہ خود تو ڈوب ہی رہی ہے، انھیں بھی لے ڈوبے گی۔

جس اداریے کے جواب میں یہ خطوط موصول ہوئے ہیں اس میں صرف اتنی بات عرض کی گئی تھی کہ ابتدائی تعلیم صرف اسی زبان میں دی جاسکتی ہے جسے طالبِ
آسانی سے سمجھ سکے۔ اسکول میں داخلے کے بعد مسلسل کوشش کی جائے تب بھی کئی سال تک اس میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی کہ وہ چھوٹے چھوٹے انگریزی جملوں ک
مطلب آسانی سے سمجھ لے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم کے دوران بچے کے کئی قیمتی سال برباد ہوجاتے ہیں۔ یہ وہ عمر ہے جب بچہ کتاب سے کہیں زیادہ بات چیت کے ذ
سیکھتا ہے۔ بشرطیکہ یہ بات چیت اُس زبان میں ہو جسے وہ بولتا اور سمجھتا ہے۔ یہ بات ممکن ہے کہ سیکنڈری اسکول تک پہنچتے پہنچتے طالب علم میں انگریزی کی اچھی استع
پیدا ہوجائے لیکن ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو تو یہاں بھی بچے کو دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے بلکہ جتنی محنت کسی مضمون کو سمجھنے پر صرف ہوتی ہے اس سے زیا
انگریزی کو سمجھنے کے لیے درکار ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ طالب علم لمبی لمبی عبارتوں کو پوری طرح سمجھے بغیر رٹ لیتا ہے۔

یہ تھیں وہ دلیلیں جن کی بنا پر ہم نے انگریزی ذریعۂ تعلیم کو ترک کرنے اور اپنی زبان کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جن مسلمان بچوں کی م
بنگالی، گجراتی، ملیالم وغیرہ ہے ان کے سامنے تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن شمالی ہندوستان کے مسلمان جنھیں سب سے زیادہ مطمئن ہونا چاہیے تھا وہی زبان کے معا
میں سب سے زیادہ پریشان نظر آتے ہیں۔ یہ علاقہ اردو ـــ ہندی کا علاقہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے لیکن اکثر مسلمان اس اندیشے
مبتلا ہیں کہ اردو زبان اور اردو ذریعۂ تعلیم ان کے بچوں کے حق میں مزید بربادی کا پیش خیمہ ہوگا وہ اعلیٰ تعلیم اور ملازمتوں سے محروم ہوجائیں گے کیونکہ
جس ملک میں اردو زبان کا کوئی علاقہ نہیں وہاں اردو پڑھنے والوں کی گنجائش کس علاقے میں نکل سکے گی۔ یہ وسوسے بے بنیاد ہیں۔ کسی ریاستی زبان می
تعلیم پانے والے کا یہ اندیشہ درست ہوسکتا ہے کہ اس ریاست سے باہر وہ کس مصرف کا ہے۔ پنجابی میں تعلیم پانے والا پنجاب سے باہر اور بنگالی میں تعلیم پا
والا بنگال سے باہر شاید کارآمد ثابت نہ ہو لیکن اردو کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنا ہندی کا بلکہ اس سے وسیع تر کیوں کہ یہ ہندی سے زیادہ عام
گویا اس کا علاقہ پنجاب سے آسام تک اور کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلا ہوا ہے۔

اردو اور ہندی اعلیٰ سطح پر یقیناً ذخیرۂ الفاظ کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ ہوجاتی ہیں لیکن ابتدائی درجے میں اور بول چال کی حد تک یہ دو
زبانیں ایک ہی ہیں۔ دیوناگری لپی میں لکھ کر جسے ہندی کہیے اسی کو فارسی رسم خط میں اردو کہہ لیجیے۔ اصل فرق زبان کا نہیں رسم خط کا ہے۔ اور ہندی رسم خط
آسان ہے۔ اردو جاننے والے کے لیے اس کی تحصیل ذرا بھی دشوار نہیں۔ گویا ذرا سی مزید محنت سے ہمارے بچے بیک وقت دو زبانیں سیکھ سکتے ہیں۔ آج کے ہند
اخبارات و رسائل اُٹھا کر دیکھیے ان میں اردو ہی نہیں بلکہ فارسی الفاظ و تراکیب کی بھرمار نظر آتی ہے۔ یہ رجحان روز افزوں ہے۔ اسی لیے تو ہندی رسائل کے
ایڈیٹر صاحبان فرماتے ہیں کہ اردو جاننے والے جب ہندی لکھتے ہیں تو اس میں زیادہ مٹھاس ہوتی ہے۔ اردو افسانوں کے متعدد ہندی تراجم ہم نے اس نو
کے ساتھ واپس آتے دیکھے ہیں کہ یہ بناوٹی اور مشکل زبان ہمارے ریڈر پسند نہیں کرتے۔ اصل زبان برقرار رہنے دیجیے صرف رسم خط تبدیل کر دیجیے۔

صورتِ حال یہ ہے تو ہم اردو والوں کو ہراساں ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اردو کے ساتھ اگر ہمارے بچے ہندی رسم خط سے واقف ہوں
اور ہندی کے محدود ذخیرۂ الفاظ تک بھی ان کی رسائی ہوجائے تو وہ ہندی والوں سے آگے نظر آئیں گے کیوں کہ ان کا دامن ہندی الفاظ کے علاوہ اردو فار
الفاظ سے بھی مالا مال ہوگا جن کا استعمال برابر بڑھ رہا ہے۔

اب ہم اپنی بات کو پھر دہرائیں گے کہ اگر ہم اپنے بچوں کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ کو دور کرنا چاہتے ہیں تو انگریزی ذریعۂ تعلیم کو ترک کر کے زبان کو اختیار کرنا چاہیے۔ اتنی دلیلوں کے باوجود اگر ہم اردو کے سلسلے میں اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہیں اور اس کے نام سے ہم شرمندہ ہوتے ہیں تو کہہ دیجیے کہ ابتدائی تعلیم آسان ہونی چاہیے اور زبان میں ہونی چاہیے۔ اسی آسان زبان میں کتابیں بھی دستیاب ہوں جو اردو رسم خط میں بھی موجود ہوں اور دوسرے رسم خط میں بھی۔ بچے کو آزادی ہونا چاہیے کہ وہ جس رسم خط کو آسان سمجھے اختیار کرے۔

کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ توجہ کا طالب ہے۔ آج ملک کا کوئی کالج اور کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں جہاں صرف وہی طالب علم داخلے کے خواہش مند ہوں جنھوں نے انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم پائی ہے۔ ہر جگہ بڑی تعداد ان طلبا کی ہوتی ہے جو ہندی میڈیم اور بعض جگہ اردو میڈیم اسکولوں سے آتے ہیں۔ ظاہر ہے انگریزی لکچر ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ بعض اساتذہ کا خیال ہے کہ یہ طلبا شروع میں ضرور پریشان نظر آتے ہیں لیکن دو ایک مہینے بعد ان کے چہروں سے اطمینان ظاہر ہونے لگتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انگلش میڈیم اب ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شروع میں جب طالب علم انگریزی لکچر سمجھنے سے قاصر ہو تو پریشانی اس کے چہرے سے نمایاں ہوتی ہو اور چند مہینے میں اس نکتے کو پا کے بعد وہ مطمئن ہو جاتا ہو کہ کلاس میں جانا ضروری ہے محض حاضری پوری کرنے کے لیے! اور امتحان میں جواب لکھنے کے لیے اپنی مادری زبان کی فلاں فلاں کتابوں سے نوٹس تیار کر لینا کافی ہوگا۔ اس خیال کی تائید میں یہ دلیل موجود ہے کہ آج بی۔ اے کی سطح پر طلبا کی بڑی تعداد سوالوں کے جواب ہندی میں دیتی ہے۔ بی۔ اے۔ آنرز سوشل سائنسز کے بعض مضامین میں یہ تعداد ستر فی صد کے قریب ہے۔ اردو میں جواب دینے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ کلاس میں طالب علم انگریزی میں لکچر سنے اور نوٹس ہندی یا اردو کتابوں سے تیار کرے تو اسے زیادہ فائدہ ہوگا۔ اس نے ایک مضمون کو دو زبانوں میں پڑھ لیا۔ اس رائے سے اتفاق کرنا دشوار ہے۔ کسی طرف ہاتھ پاؤں مارنے سے انسان کہیں کبھی نہیں رہتا۔ کلاس روم لکچر، مطالعہ، نوٹس اور امتحان اگر سب کی زبان ایک ہو تو طالب علم یکسوئی کے ساتھ برابر آگے بڑھتا جائے گا بصورت دیگر اس کا ذہن بٹ جائے گا۔ فرض کیجیے ایک طالب علم نے کلاس میں کسی موضوع پر انگریزی میں ایک گھنٹے لکچر سنا اور لائبریری میں اسی موضوع پر کسی اردو یا ہندی کتاب کا ایک گھنٹہ مطالعہ کیا۔ اس کی تحصیل علم کی مدت ایک گھنٹہ رہی اس کے برخلاف جس نے اپنی زبان میں ایک گھنٹہ کلاس روم لکچر اور اسی موضوع پر ایک گھنٹہ اسی زبان میں کتاب کا مطالعہ کیا اس نے دو گھنٹے اس مضمون کی تحصیل کی اور پہلے طالب علم کی بہ نسبت اس نے دو گنی مسافت طے کر لی۔

موجودہ صورت حال برقرار رہی تو ہمارے طالب علم دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا سے بہت پیچھے رہ جائیں گے اور جن مضامین کا انھوں نے انتخاب کیا ہے وہ ان کے ذہنوں میں پوری طرح واضح نہ ہو پائیں گے۔ انجینیرنگ کالج کے دو استادوں کا بیان ہے کہ چالیس منٹ انگریزی میں لکچر دینے کے بعد آخر کے دس منٹ میں وہ اپنے لکچر کا خلاصہ آسان اردو ہندی زبان میں بیان کر دیتے ہیں البتہ اصطلاحوں کا ترجمہ نہیں کرتے۔ دس منٹ کی اس مختصر مدت میں طلبا کے ذہن میں مضمون جتنا واضح ہو جاتا ہے وہ چالیس منٹ کے طویل لکچر میں نہیں ہو پاتا۔

لیکن آثار یہ ہیں کہ فی الحال ہم انگلش میڈیم کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔ اردو کے سلسلے میں ہم طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا ہیں۔ لیکن کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ ہر کلاس کا ایک سیکشن ایسا ہو جس میں لکچر کی زبان اردو/ہندی ہو اور طالب علم کو اختیار ہو کہ امتحان میں سوالوں کے جواب خواہ ہندی میں دے خواہ اردو میں۔ اور ڈگری پر یہ درج کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس طالب علم نے کون سا میڈیم اختیار کیا۔ بہر حال ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر ہمیں سنجیدگی سے غور کر کے جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہیے۔ ہم اس طرف سے غافل رہے تو وقت خود فیصلہ کر کے اسے ہم پر مسلط کر دے گا اور اس کا فیصلہ شاید ہماری پسند کے خلاف ہو!

نور الحسن نقوی

سید حامد

غرور اور فخر

غرور اور تکبّر بے شمار بُرائیوں کی جڑ ہے۔ مسیحی نظامِ اخلاق میں اس کی گنتی کبیرہ گناہوں میں ہوتی ہے۔ اسلام کو غرور ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ دُنیا کا کوئی مذہب کوئی ضابطۂ اخلاق غرور کو روا نہیں رکھتا۔ ابلیس کی خطا صرف یہی تھی کہ اس نے گھمنڈ کے نشے میں اللہ تعالےٰ کے اس حکم سے سرتابی کی کہ آدمؑ کو سجدہ کیا جائے۔ گھمنڈ اخلاق کو کھوکھلا کر دیتا ہے وہ حقیر ذرّہ جسے آدمی کا نام دیا گیا ہے، جس کے وجود کا انحصار سانس کے ڈورے، خون کی گردش اور دِل کی دھڑکن پر ہے اور جسے ایک لمحہ ثبات نہیں، اُسے تکبّر کیوں کر روا ہو سکتا ہے؟ وہ اِتراتا کس بات پر ہے، اسے زعم کا ہے کا ہے؟ تکبر کرنے والا خدا کی نہیں صرف اپنی پرستش کرتا ہے۔ وہ اشیا، حالات اور افراد اور مسائل کے متعلق صحیح رائے قایم ہی نہیں کر سکتا کہ ان سب پر خود اس کی شخصیت اور نخوت کا سایہ پڑنے لگتا ہے۔ اس کے سوچنے کے انداز میں کجی آجاتی ہے۔ وہ فیصلہ اپنی خوشی، آسایش، غرض اور رجحان کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ شے کی اچھائی اور بُرائی سے بے نیاز ہو کر انسان جیسے کمزور وجود کا اکڑ کر چلنا کتنا مضحکہ خیز ہے۔

گھمنڈ اتراہٹ، غرور، اکڑ، نخوت، انانیت، خود پرستی یہ سب تکبّر کی ہی شکلیں ہیں۔ ان کا نقصان حامل کو اس طرح پہنچتا ہے کہ وہ ہوش و گوش اور تناظر و تناسب اور بصیرت و شعور اور حسِ لطیف سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا افق سمٹ جاتا ہے۔ جو رائے ساری کائنات کے پس منظر میں قایم کرنا چاہیے تھی، متکبّر اور گھمنڈی انسان اسے اپنی شخصیت کے سکڑے ہوئے اور حقیر پس منظر میں قایم کرتا ہے۔ ایسی صورت میں رائے کے صائب اور فیصلے کے درست ہونے کا امکان بھی نہیں رہتا — چوں کہ اس کی ذات بیچ میں آجاتی ہے لہذا عقل پر جذبات کا کہرہ چھا جاتا ہے اور عقل کی آنکھوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ عقل کو جو صلاحیت پرکھنے کی دی گئی ہے وہ مفلوج ہو جاتی ہے۔

انسان تنہا رہ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا کام آگے جب ہی بڑھتا ہے جب دوسرے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ شرکت اور تعاون کے لیے باہمی ہمدردی اور انسیت درکار ہوتی ہے۔ گھمنڈی انسان سے لوگ کترانے لگتے ہیں۔ گھمنڈ کی تہ میں دوسروں کی تحقیر کا استر لگا ہوتا ہے۔ گھمنڈی کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے اور جب تک سخت غرض نہ پڑے اس سے دور رہتا ہے۔ مغرور آدمی نادانستہ دلوں کو توڑتا ہوا چلتا ہے۔

کبر اور غرور میں فرق ہے اور اس سے کہیں زیادہ فرق غرور اور فخر کے درمیان ملے گا۔ فخر اور ناز پھوٹتے ہیں اعتماد اور ولولے سے۔ فخر کا شمار اچھے خصائل میں ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں اتراہٹ کا پہلو اور دوسروں کی تحقیر پنہاں نہ ہو اور اپنی کم مائیگی کا احساس مضمر ہو۔ کوئی فرد، کوئی طبقہ کوئی قوم اور کوئی ادارہ صحت مند فخر سے محروم ہو کر پنپ ہی نہیں سکتا۔ فخر راست روی کے لیے محافظ، سخت کوشی کے لیے مہمیز، ذہن کے لیے افق اور بلند پروازی کے لیے پر و بال فراہم کرتا ہے۔

شاید ہی کوئی اِنسان اتنا بدقسمت، ایسا تیرہ روز ہوگا جو کسی بات پر فخر نہ کر سکتا ہو۔ ایسے آدمی کے لیے دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ زندگی میں اسے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ کوئی ولولہ اور کوئی امنگ اسے متحرک نہیں کر سکتی۔ اس میں اور مٹی کے ڈھیر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ وہ کڑھتا اور سلگتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں گنجائش نہیں رہتی، وسعت اور شگفتگی اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔

صحت مند فخر، اور عزتِ نفس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فخر کو گھمنڈ سے دور رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان یہ محسوس کرے کہ جن اوصاف پر وہ ناز کر رہا ہے وہ اس کے پیدا کرنے والے کی دین ہیں۔ وہ فخر جس میں شکر کا عنصر پنہاں نہ ہو، کھوکھلا اور کم وزن ہوتا ہے۔ اگر نگہداری نہ کی گئی تو وہ تکبّر میں بدل جائے گا۔ فخر کرنے والے شکر کرنے والے ہوتے ہیں۔ فخر محسوس ہوتا ہے، ملفوظ نہیں ہوتا۔ بلکہ آداب، اطوار، چال ڈھال اور بشرہ سے کبھی زیادہ نہیں جھلکتا تراوش ہوتی ہے تو صرف اعتماد تشکر عزتِ نفس اور رجائیت کے سرمایے میں۔ اللہ کے دیے ہوئے شمائل و خصائل پر فخر محسوس نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ فخر محسوس کرنے کی چیز ہے، اعلان کرنے کی نہیں۔ فخر وہ خوشنما جھاگ ہے جو زندگی کے سمندر میں شکر کی لہروں کی کلاہ بن کر سامنے آتا ہے۔ فخر اور گھمنڈ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا موتی اور خزف میں۔

★

خورشید حسین

کششِ ثقل

کہتے ہیں کششِ ثقل پر کائنات قایم ہے۔ یہ نہ ہو تو اجرامِ سماوی: سورج، سیارے، ستارے، ٹکرا کر چکنا چور ہو جائیں۔ کششِ ثقل کا عمل اس چھوٹی سی کائنات میں بھی نظر آتا ہے جسے گھر یا خاندان کہتے ہیں۔ عام دستور ہے کہ لڑکا یا لڑکے والے لڑکی یا لڑکی والوں کے سامنے رشتے کی تجویز رکھتے ہیں، پیام دیتے ہیں اور لڑکی یا لڑکی والوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اس تجویز کو منظور کریں یا رد کر دیں۔ اس دستور کے مضمرات پر غور کیجیے۔ لڑکا اپنی زندگی کے لیے رفیقِ سفر تلاش کرتا ہے جو خوشی اور غم میں ہمدرد، جلوت اور خلوت میں اس کی شریک رہے اس کے گھر کو چلائے اور اس کے بچوں کو جنم دے اور پروان چڑھائے۔

دنیا میں بالعموم دستور یہی ہے لیکن بعض ملکوں میں بعض گروہوں میں اس کا الٹا بھی ہوتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں ہمارے ہندو بھائیوں کے یہاں رشتے کی تجویز لڑکی کی طرف سے ہوتی ہے۔ لڑکی اپنا بر تلاش کرتی ہے۔ ہم اس وقت یہ فیصلہ کرنے نہیں بیٹھے کہ دونوں میں سے کون سا ڈھنگ بہتر ہے۔ ذاتی طور پر ہمیں بہتر یہ لگتا ہے کہ سوال یا خواستاری لڑکے کی طرف سے ہو۔ اس طرح صنفِ نازک کا وقار محفوظ رہتا ہے۔ منظور کرنے یا ٹھکرا دینے کا اختیار بھی لڑکی کو ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک انفرادی تاثر یا ردِ عمل ہے۔ علاوہ بریں اس دور میں جب کہ اقدار، روایات اور لطائفِ زندگی کی جگہ مانگ اور فراہمی کے بے درد قانون نے لی ہے، اچھے لڑکوں کی کمی کے باعث بعض اوقات ہندی مسلمانوں میں بھی تحریک لڑکی والوں کی جانب سے ہونے لگی ہے۔ ڈھکی چھپی تحریک، دلہن کی طرح ڈھکی چھپی۔ لیکن شادی ہو جائے تو ہندو لڑکی بھی اپنے شوہر کے گھر جاتی ہے وہ اس کے یہاں آکر نہیں رہ جاتا۔

ہمارے یہاں کیرالا ریاست کے "نایروں" میں اور شمال مشرقی ہندوستان آسام میگھالیہ وغیرہ کے اکثر طبقات میں وہ نظام رائج ہے جس کے تحت عورت صاحبِ اختیار اور مالک جایداد ہوتی ہے۔ وہ شادی کرتی ہے تو شوہر اس کے گھر آکر رہتا ہے۔ اس گھر میں اُس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے جیسے ملکہ کے شوہر کی جو بادشاہ نہیں کہلاتا بلکہ رفیق شاہزادہ کا منصب رکھتا ہے۔ بچے اپنی نسل اور ورثہ ماں سے اخذ کرتے ہیں۔ شوہر

یہاں سے ہم نفسِ مضمون پر آتے ہیں۔ الزامِ قدامت پسندی کے اندیشے کے باوجود ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ نظامِ قدرت کو دیکھتے ہوئے اور نر اور مادہ کی ساخت اور صلاحیت پر نظر رکھتے ہوئے یہ بات انوکھی لگتی ہے کہ شوہر اور بیوی کے رابطے میں عورت شریکِ غالب بن جائے اور مرد یا تو واقعی "گھر جائی" بن جائیں یا اپنی ذات کو اس طرح محو کر دیں، اس قدر نیازمند بن جائیں کہ اپنی بیوی کے شوہر کی حیثیت سے پکارے اور پہچانے جائیں۔ عورت محبت، احترام، عزت، تحفظ اور سپاس اور ستائش کی مستحق ہے۔ لیکن وہ کئی وجوہ سے، جن کا تذکرہ ہم اس وقت اٹھا رکھتے ہیں، گھر کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ شوہر کی موجودگی میں یہ بارِ گراں اس پر ڈالنا روا نہ ہوگا۔ بیوی کی محبت اور رکھ رکھاؤ داخت شوہر پر واجب ہے اس کا طواف یا پرستش واجب نہیں۔

یہ ایک کلیہ ہے کہ جینے، فروغ پانے اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی ذات، گھر خاندان، ادارہ یا قوم پر فخر کر سکتا ہو۔ ہمیں یہ بات انوکھی لگتی ہے کہ دادھیال پر فخر کرنے کے بجائے بچے صرف ننھیال پر فخر کریں۔ دادھیال کے بعد ننھیال کا نمبر آتا ہے۔ سوا اس شوہر کے جو زن مریدی کے منصب پر فائز ہو۔ کوئی یہ نہ چاہے گا کہ اس کی اولاد اپنا سلسلۂ نسب اُس کی سسرال سے جوڑے۔

جس زمانے میں لوگ اپنے خاندان پر فخر اور اس کی عزت کی پاس کرتے تھے، مائیں اس بات کی کوشش کرتی تھیں کہ بچے اپنے خاندان یعنی آبا و اجداد، باپ دادا کی روایات کے حامل، پاسبان اور ترجمان ہوں۔ اب کچھ عرصے سے بہت سی ماؤں نے دوسرا رُخ اختیار کیا ہے۔ وہ شوہر کے خاندان کی جگہ اپنے خاندان کے گن گاتی ہیں اور اس کی بالادستی کا بالقصد کرتی ہیں۔ ہماری نظر میں یہ اُن کی کوتاہ اندیشی اور تنگ نظری ہے۔ نسل باپ سے چلتی چلی آئی ہے اور چلتی رہے گی۔ باپ کا خاندان ہی اولاد کا خاندان ہے۔ کیا وہ چاہیں گی کہ اولاد اپنے خاندان کو حقارت کی نظر سے دیکھے یا اس کی عزت نہ کرے۔

رفتارِ زمانہ کے نقوش ایک نئے لیکن روز افزوں رجحان میں ہیں۔ لوگ اپنے فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہونے اور ملازمت کی مدت

ہیں۔ اس روش میں کوئی شرعی یا اخلاقی عیب نہیں ہے لیکن اس سے خاندان
ں اساس اور گھر کی بنیاد اور اقدار و روایات کمزور ہوتی ہیں۔ مرد کی عزتِ نفس
ر گھرانے کی ساکھ دونوں کا تقاضا ہے کہ شاخ شجر سے پیوستہ رہے۔ شجر'
ں پر لوگ فخر و مباہات کرتے چلے آئے ہیں' شجر سے ہی نکلا ہے۔ فصل بیج ہی
ے جانی جائے گی' اس زمین میں نہیں جس میں وہ بوئی گئی ہے۔

تہذیب کے ارتقا کی یہ ایک علامت ہے کہ مرد بالعموم ایک
ورت پر قناعت کرنے لگا۔ اس منزل کے حصول میں لاکھوں برس لگے۔
واج اور عدمِ استعمال نے صلاحیتوں کو متاثر کیا اور اس جسمانی غلبے میں جو
رد کو ودیعت ہوا تھا بہ تدریج کمی آگئی۔ اور اب سیکڑوں برسوں سے ایک
ج کا توازن زن و شوہر کے درمیان قایم ہوگیا ہے۔ لیکن اب یہ سلسلہ حدِ ب
بلیٹو تک پہنچ گیا ہے۔ اگر یہ رجحان اب نہ رکا اور آگے بڑھ گیا تو اس فتنہ و
ساد کا' جو تہذیب کے گوشوں میں زن کی بالادستی سے راہ پاگیا ہے' سدِّباب
مکن ہو جائے گا۔

یہ کہنے سے ہرگز مدعا یہ نہیں کہ عام عورتوں کو ان کے حقوق مل
ئے اور وہ مردوں کے مظالم اور تغافل سے محفوظ ہوگئیں۔ ان کی
ثریت اب بھی بے دردی کے ساتھ پامال کی جا رہی ہے۔ اس عالمگیر
لم کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہونا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ان "مہذب"

مردوں کی نیازمندی اور ناتوانائی اور غیرت باختگی کو شہ نہ ملنی چاہیے
جو اپنی شخصیت کی کمزوری سے قدرت کے توازن' خاندان کی تہذیبی اور
ثقافتی اہمیت اور گھر کی بنیاد کو کمزور کر رہے ہیں۔

قارئین نے زراعت کے اس طریقے کا نام سنا ہوگا جسے **"جھوم"**
کہتے ہیں۔ اس کے نمونے شمالی مشرقی ہندوستان میں اب بھی مل جاتے
ہیں۔ اوائل ایام میں جب انسان شبانی سے کسانی کی طرف آیا تو اس
نے کاشتکاری کا یہی طریق اختیار کیا۔ گھر سے نکلا' جنگل کاٹ کر زمین کے
ایک ٹکڑے کو صاف کیا' اس میں بیج ڈالا۔ زمین دوشیزہ تھی۔ بغیر محنت
کے اچھی فصل کے برگ و بار لائی۔ فصل کاٹی۔ اگلے سال اور آگے بڑھا'
جنگل کاٹا' نئی زمین میں بیج ڈالا' فصل کاٹی اور اسی طرح آگے بڑھ گیا۔
اس طرح کی آزادی' اور بے راہ روی اور تخم ریزی اب داستان
بن چکی ہے۔ جہاں باقی ہے وہاں بھی ختم ہو جائے گی۔ لیکن بیج بونے
اور فصل کاٹنے والے کے ہاتھ اور اُس کی ناک ہنوز نہیں کٹی کہ ہاتھ علامت
ہیں طاقت کی اور ناک عزت کی۔ اور ان دونوں کا امین اور محافظ ہے
خاندان کی عزت اور خاندان روایت کے تسلسل کا احساس گھر اور تہذیب
اس وقت تک قایم ہیں جب تک کہ کششِ ثقل کا مرکز مرد ہے۔

------*

بیش قیمت!

سب سے بڑا تحفہ جو مجھے ملا، وہ اتنے
لوگوں کی محبت ہے — یہ محبت اس افسوس
سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے جو میرے ہمدردوں
نے میری حالت پر محسوس کیا۔ کسی کی تکلیف
پر افسوس کیا جائے تو اس کی تکلیف میں کچھ
کمی ہو جاتی ہے۔ کسی کو محبت دی جائے
تو اس کے زخم بھرنے لگتے ہیں۔

ہیوبرٹ ہمفری

(کینسر کے باعث مرنے سے کچھ پہلے)

پرکھ

کسی شخص کے کردار کو جانچنے کے دو
طریقے ہیں:

(۱) ان لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے'
جو اس کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کر سکتے،

(۲) وہ ان لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا ہے'
جو اس کو جواب نہیں دے سکتے۔

(ارنگل فون میورین "شکاگو ٹری بون")

مختار مسعود

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کعبۂ دل میں ایک روز جھانکا تو دیکھا ایک صنم نے وہاں گھر کر لیا ہے۔ ہمیں گماں تھا کہ دورِ آذری ختم ہوئے مدت بیت چکی ہے اور اس عرصے میں دل اگر صحن مسجد نہیں بن سکا تو کیا غم کم از کم بت کدہ تو نہیں رہا۔ اب جو یہ گمان غلط نکلا تو اپنے ہی بارے میں لاعلمی پر تشویش ہوئی۔ یہ کس کا بت ہے جو اب تک سلامت ہے اور نہاں خانۂ دل میں کیسے آن چھپا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر نظر ڈالی تو یہ بت ایک دیوی کا نکلا۔ دبلی پتلی بوٹا قد، تنگ دہن، آنکھیں کشادہ اور روشن بالوں میں گھنگھر ہیں اور چھوٹا سا جوڑا گردن پر ڈھلکا ہوا ہے۔ جوڑے میں جڑاؤ پھول ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار۔ بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں بڑی سی انگوٹھی ہے، ساڑھی کا پلو کاندھے پر کلپ سے بندھا ہوا ہے۔ صورت من موہنی، پہلی نظر میں پُر اثر، دوسری میں پراسرار۔ میں نے جب اس بت کو دوسری بار نظر بھر کر دیکھا تو صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک بھاری سانولی اور معمر عورت نے سلک کی سلیٹی ساڑھی باندھی ہے۔ پلو سر پر ہے اور نصف چہرہ بھی اس میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ایک خوشنما قوس بنائی اور اسے ابرو کے سامنے لاکر سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے اراکین کو جو وکٹوریہ گیٹ میں صف بستہ کھڑے تھے، یوں آداب کیا گویا وہ مسلم تمدن کا مرقع ہے یا شائستگی کا مجسمہ۔ آداب کرتے ہوئے ساڑھی کا پلو چہرے سے ڈھلک گیا تو ہم نے پہچانا کہ یہ سروجنی نائیڈو ہے۔

نوجوان مسلمانوں کی ایسوسی ایشن کے نام سے مدراس میں ایک انجمن ہوا کرتی تھی۔ اس انجمن میں تقریر کرتے ہوئے سروجنی نے ۱۹۱۷ء میں کہا تھا کہ جب میں کسی نئے شہر میں جاتی ہوں تو ہمیشہ اس خصوصی استقبال کی منتظر رہتی ہوں جو مجھے وہاں کے مسلمانوں سے میسر آتا ہے۔ اس سلسلے میں نہ کبھی مجھے مایوسی ہوئی اور نہ کبھی میری حق تلفی ہوئی۔

اب جو سروجنی ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ آئیں تو ہم نے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے۔ یونیورسٹی گیٹ سے وکٹوریہ گیٹ تک ان کی موٹر کو طلبار کے گھڑ سوار دستے کی جلو میں لایا گیا۔ معزز مہمان کی موٹر آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور گھوڑے شاہگام چل رہے تھے۔ سوار زین سے لگے بیٹھے تھے۔ ان کی وردی بڑی خوشنما تھی، گہرے سبز رنگ کے ٹرکش کوٹ، سبز پگڑی، سنہری کلاہ، سنہری جھالر، سفید برجس، سفید دستانے، سیاہ جوتے اور پنڈلیوں پر اسی رنگ کی گرم پٹیاں، دوش اور کمر میں چمڑے کی پیٹی، جس کے ساتھ تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ سروجنی وکٹوریا گیٹ پر اتر گئیں اور سوار مسجد کے پاس جا اترے۔ تھوڑی دیر بعد جلوس شعبۂ تاریخ کی عمارت سے اسٹریچی ہال کی طرف روانہ ہوا۔ سرخ بانات بچھی ہوئی تھی۔ دستے کے دو لڑکے آگے آگے چل رہے تھے، ان کے بعد سروجنی اور نواب اسماعیل تھے۔ باقی دستہ دو دو کی صف بنائے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دستے کی سج دھج خوب تھی، سر اٹھائے، سینہ پھلائے قدم ملائے اور آبدار تلواریں بے نیام کیے ہوئے۔ میں اور گارڈ اس دستے کی اس صف میں تھے جو مہمان خصوصی اور وائس چانسلر کے بالکل پیچھے تھی۔ گارڈ ایم۔ اے اقتصادیات میں میرے ہم سبق اور گھڑ سوار دستے میں میرے ہم رکاب تھے۔ اب وہ ایک بنک چلاتے ہیں مگر گھوڑا چلانے کا شوق برقرار ہے۔ آج بھی ان کے اصطبل میں دو گھوڑے بندھے ہیں اور ان کی تنخواہ اور فرصت کا بیشتر حصّہ ان کی دیکھ بھال میں صرف ہو جاتا ہے۔ وہ چمکار کر گھوڑے پر چڑھتے ہیں، سواری کے دوران اس سے گفتگو بھی کرتے رہتے ہیں۔ جب تھپتھپا کر اترتے ہیں تو تولیے سے اس کی گردن کا پسینہ خشک کرتے ہیں اور جیب سے گڑ کی ڈلی نکال کر گھوڑے کے سامنے کر دیتے ہیں۔ ہم دونوں نے ان دنوں بھی گھوڑے کی دوبار اسی طرح اکٹھے سواری کی ہے جیسے ہم بیس برس پہلے کیا کرتے تھے۔ راستے میں وہ پوچھتے ہیں تم نے بھی تو گھوڑا رکھا ہوگا۔ میں جواب دیتا ہوں کہ ان دنوں میرے اصطبل کی خبر نہ پوچھو، بس اس کی خیر مانگتے رہو اور ہاں جو سلوک تم اپنے گھوڑے سے کرتے ہو وہ تو انسانوں کو بھی میسر نہیں۔

صبح یونیورسٹی کی طرف سے اسٹریچی ہال میں جلسہ تھا اور

ہر کو طلبا کی طرف سے یونین ہال میں ۔ اسٹریچی ہال میں تل دھرنے
کی جگہ نہ تھی ۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا۔ سال بھر پہلے اس بات
کا تصور بھی ناممکن تھا کہ مسلم یونیورسٹی میں کسی کانگریسی لیڈر کو خوش
آمدید کہا جا سکتا ہے ۔ چند ہی ماہ میں نقشہ بالکل بدل گیا۔ برٹش انڈیا کی
جگہ دو آزاد ملک وجود میں آگئے ۔ آزادی بڑی کافر صورت اور
سامان لیوا نکلی۔ بس غدر مچ گیا، سر کٹ گئے اور سامان لٹ گیا۔ لہذا
لوگ بے سرو سامان ہوگئے ۔ مرنے والوں کو کسی نے دفن نہ کیا مگر بچ
جانے والے زندہ درگور ہوگئے ۔ ہر شہر اور قریہ میں قتل و غارت کا
بازار گرم تھا ۔ مگر مسلم یونیورسٹی ابھی تک محفوظ تھی ۔ پھر بُری بُری خبریں
آنے لگیں ۔ یونیورسٹی پر حملے کی تیاری ہو رہی ہے ، قرب و جوار کے
دیہات میں باقاعدہ تربیت دی جا رہی ہے ۔ حملہ سخت اور کئی سمت
سے ہوگا ۔ ادھر یہ طے ہوا کہ حملے کی صورت میں عورتیں اور بچے
اسٹریچی ہال کی کشادہ اور محفوظ عمارت میں محصور ہو جائیں گے اور
جوان باہر نکل کر مقابلہ کریں گے ۔ کچھ ایسے انتظامات بھی کیے گئے
کہ حملے کی اطلاع اگر ممکن ہو تو پہلے ہی مل جائے ۔ یہ بات سب کو
معلوم تھی کہ حملے کی صورت میں یونیورسٹی کا سائرن بجایا جائے گا
تاکہ فوری طور پر ہر ایک کو خبر ہو جائے ۔ صبح شام مقررہ وقت پر
سائرن کا معمول تھا ۔ مگر دو ایک بار جب سائرن کو ناوقت بجایا
گیا تو وہ راتیں جو یوں ہی بڑا امتحان تھیں، لوگوں نے آنکھوں میں کاٹ
دیں ۔ ایک ایک رات بھاری تھی ۔ ایک ایک دن کٹھن تھا لیکن جسے اللہ
رکھے وہ اس ابتلا سے بھی بچ نکلتا ہے ۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی بالکل
محفوظ رہی ۔ اس کی حفاظت کے سامان پیدا ہوگئے اور اسے نئے
پاسبان میسر آگئے ۔ ان پاسبانوں میں سرفہرست سروجنی نائیڈو
کا نام آتا ہے ۔

سروجنی جب اسٹریچی ہال میں تقریر کے لیے کھڑی ہوئیں
لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی حفاظت کا رسمی اور مشروط
وعدہ کریں گی ۔ سروجنی کے دو چار معترف اس فکر میں تھے کہ نصف
صدی تک اسلامی تمدن کا دم بھرنے اور اسلام سے عشق کا دعوے
کرنے والی آج کیوں کر مسلم یونیورسٹی کی توقعات پر پوری اتر سکے گی
سروجنی کے ساتھ گاندھی کیپ پہنے کچھ کانگریسی بھی آئے تھے جو پہلی
صف میں بیٹھے تھے ۔ سروجنی نے تقریر شروع کی اور اُن کے پہلے
فقرے پر ہی سب لوگ چونک اُٹھے ۔ پہلی بات پوری ہوئی تو ہم لوگ
دنگ رہ گئے اور سروجنی کے ساتھ آنے والوں پر سکتہ طاری ہو گیا
نے لگیں ۔ "میں آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کئی لوگوں کے مشورے
کے خلاف اور چند لوگوں کی دھمکی کے باوجود حاضر ہوئی ہوں ۔ مجھے
علی گڑھ کی ضلعی اور یو۔پی کی صوبائی کانگریس نے پہلے مشورہ اور پھر حکم دیا
کہ تم مسلم یونیورسٹی کا دورہ منسوخ کر دو ۔ انھیں یہ بات بھول گئی کہ گورنر
کی حیثیت سے میں اب کانگریس کی ممبر نہیں رہی ۔ لہذا نہ اُن کی رائے کی
پابند ہوں نہ اُن کے ضابطے سے مجبور اور میں کسی کی دھمکیوں کو کب خاطر
میں لاتی ہوں ۔ میں حاضر ہوگئی ہوں ۔ بلبل کو چمن میں جانے سے کون روک
سکتا ہے ۔" ہم نے بلبلِ ہند کی یہ بات سنی تو خدا کا شکر بجا لائے ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

وحشت کا ایک دور آیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دور کے
ختم ہونے کے ساتھ علی گڑھ بھی ختم ہو جائے گا ۔ دس طویل مہینوں کے
بعد سروجنی کی تقریر ہوئی ۔ بے اعتباری کی فضا چھٹ گئی ۔ علی گڑھ کو اس
کا نیا مقام مل گیا ۔ اب یہ سر سیّد کے علاوہ سروجنی کا بھی علی گڑھ ہے
کل نہ جانے یہ اور کس کس کا علی گڑھ ہو جائے گا ۔ یہ تو دریا کی مانند ہے
بلند چوٹیوں سے چلا اور خشک صحرا کو سیراب کرتا ہوا سمندر کی جانب رواں
ہے ۔ بالآخر یہ بحرِ ہند میں جا گرے گا اور اس کا صاف اور میٹھا پانی اپنے
سے کہیں بڑے سمندری ذخیرے میں جا ملے گا

اسٹریچی ہال کے جلسے میں استقبالیہ پروفیسر ہادی حسن کو پیش
کرنا تھا ۔ پروفیسر صاحب خاص طور پر اس تقریر کے لیے منتخب کیے گئے تھے
کیوں کہ وہ اساتذہ میں انگریزی زبان کے سب سے اچھے مقرر تھے ۔ بلکہ
سچ تو یہ ہے کہ برصغیر کی تمام درس گاہوں کے اساتذہ میں بھی اس نہج کا
کوئی اور مقرر نہ تھا ۔ گورے چٹے ، دبلے پتلے ، سیاہ اچکن اور سمور کی
ٹوپی ، ریشمی ڈوری سے بندھا ہوا عینک کا شیشہ ، سراپا نزاکت سراسر
نفاست ۔ شخصیت کے سحر کے ساتھ وہ آواز کا جادو جگاتے تھے ۔ ان کی آواز
مترنم ، صاف اور بلند تھی اور اس کے زیر و بم پر انھیں غیر معمولی قدرت
حاصل تھی ۔ ان کی تقریر کے چار عناصر تھے ۔ روانی ، مبالغہ ، تکرار اور
مزاح ۔ اور اس کی ادائیگی کے دو اصول تھے ، کچھ انداز مدرسی کا اور
بہت کچھ تھیٹر کی اداکاری کا ۔ تقریر میں مبالغہ اسی قدر تھا جتنا ہماری
قصائد میں ملتا ہے ۔ وہ اسی زبان کے صدر شعبہ تھے [illegible] اس کا
اثر لازم تھا ۔ ان کے یہاں جو بلا کی روانی تھی وہ اُن کے حافظے کا کرشمہ
تھا ۔ اسٹیج پر کھڑے ہو کر شکسپیئر [illegible]
ڈرامے کے سارے مکالمے سنا سکتے [illegible] اور نہ اٹکتے
تھے ۔ سنا ہے کہ جب وہ انگلستان [illegible]
بچ کر چلتے تھے کہ مبادا اس پر نظر پڑ جائے اور کالج کے تمام اعلانات
خواہ مخواہ حفظ ہو جائیں ۔ والد محترم ایک بار ان کے ہم سفر تھے اور
ساری رات ریل گاڑی میں سو نہ سکے ۔ کیوں کہ اوپر والی برتھ پر پروفیسر
ہادی حسن کسی طویل تقریر کی ریہرسل کر رہے تھے ۔ [illegible]

، امتزاج کی وجہ سے ہادی حسن کی ہر تقریر لاجواب ہوا کرتی تھی اور اس کا اور لطف بہت دیر تک قایم رہتا۔ خیال تھا کہ سروجنی کے سامنے یہ علی گڑھ رجمانی کا حق بخوبی ادا کرسکیں گے اور وہ شہرہ آفاق مقررہ اُن کی تقریر محظوظ ہوگی۔

اسٹریچی ہال میں پروفیسر ہادی حسن کی تقریر بہت اچھی ہونے کے ود توقع سے کمتر نکلی۔ ان کی انگریزی تقریر اس جملے کی سطح سے بلند نہ ملی کہ بلبل ہند کو چمنستان علی گڑھ میں جس گلاب کی کشش کھینچ لائی ہے ، نواب اسماعیل کہنے ہیں۔ نواب اسماعیل ہمارے وائس چانسلر تھے ان کے ذاتی اثر و رسوخ کو سروجنی کے دورے میں بڑا دخل تھا [illegible] صاحب نے جس رعایتِ لفظی سے کام لیا وہ [illegible] کے لیے [illegible] [illegible] کہ وہ بچاس [illegible] سے بلبل ہند کہلاتی اور اپنے [illegible] استعمال [illegible] و بلبل کے افسانے سنا کرتی تھیں۔ ممکن ہے ہادی حسن پر سروجنی کا وجل گیا ہو۔ وہ سحر بیان بھی تھی اور عظیم الشان بھی [illegible] اس کا مرتبہ اونچا شہرہ بلند تھا۔ اُس کی آواز ملک کے ہر گوشے میں اور اس کا آوازہ دور تک پہنچ چکا تھا [illegible] پروفیسر ہادی حسن [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] معلوم ہوتی ہے [illegible] ہادی حسن کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اپنی نفاست اور رعالمیت کی وجہ سے سیاست کی طرف نہیں جاتا اور وہ کوشش بھی کرتے ہیں تو ناکام آورد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یک الگ تھلگ اور اپنی ذات ہی سے آباد ، آرام دہ ، مختصر اور کسی سادہ زندگی میں اس [illegible] ہجوم کو داخل ہی نہیں کرنے دینا چاہتے مجھے بغیر سیاسی شعور اور [illegible] چاہتے بغیر سیاسی [illegible] ناممکن ہے۔

سہ پہر کو طلبا کے یونین ہال میں سروجنی کے اعزاز میں جلسہ تھا نے اس جلسے میں شرکت کی [illegible] جذبات کی [illegible] دکھا [illegible] جلسہ یونین ہال میں [illegible] [illegible] کا آخری جلسہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] جوانی کے بیس برس [illegible] درسگاہ کی [illegible] میں صرف کیے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] لکھ رہے ہیں کہ جلد واپس آ جائیے [illegible] [illegible] کی یاد پاؤں پڑ گئی اور ایک اصول آڑے آ گیا۔ وہ جواب لکھتے ہیں ؎

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ او بیضہ آوردی [illegible]

چوں برکس رسخت ارو بے آشیاں بر داشتن ننگ است

[illegible] یونین ہال میں پہلی بار [illegible] [illegible] کی حیثیت سے والدہ [illegible] کے ساتھ داخل ہوا اور خواتین کی گیلری میں جن کے پیچھے بیٹھا۔ وہ ۱۹۳۵ء کی بات تھی۔ آج ۱۹۴۸ء ہے اور میں ایم اے کا امتحان دے چکا ہوں۔ وہ یونین ہال میں میرا پہلا جلسہ تھا اور آج طالب علم کی حیثیت سے آخری بار شامل ہو رہا ہوں۔ اس روز کسی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور آج لوگوں کو میں اپنی بات سمجھانے آیا ہوں۔ بھیڑ اس روز بھی تھی مگر والدہ محترمہ ہال میں بیٹھی تھیں ، بھیڑ آج بھی ہے اور والد محترم ہال کے باہر لان میں ٹہل رہے ہیں۔ اُس پہلے جلسے کی طرح اس آخری جلسے کی مہمانِ خصوصی بھی ایک عورت ہے۔ دونوں میں خوبیاں یکساں ہیں۔ صنف کی رعایت سے نازک اور صفت کی نسبت سے سخت کوشش اور سخت جان۔ وہ خاتون بھی انقلابی اور حریت پسند تھی اور یہ بھی وہ تحریر میں منفرد یہ تقریر میں یکتا۔ وہ کوہ قاف کی پری یہ گلشن ہند کی بلبل۔ اس کا نام خالدہ ادیب خانم تھا اور اس کا نام سروجنی نائیڈو ہے۔ ان دوناموں کے درمیان بزم آرائی کی جو مسافت ہے وہ میں نے مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین ہال میں طے کی تھی۔ آج جلسہ [illegible] ہوا تو ہمارے یہاں کوئی مجاز نہ تھا جو نذر خالدہ کی طرح ایک نظم نذر سروجنی " کے عنوان سے لکھتا اور لہک لہک کر سناتا۔ لیکن مجاز کی نظم کتنے ہی ایسے شعر تھے جو سروجنی پر بھی صادق آتے ہیں۔ مجاز نے خالدہ ادیب خانم کے نطق گوہر بار اور حضرت احرار کا ذکر کیا ، آزادی کے راز پوچھے ، بیداری کا ساز چھیڑنے کی فرمائش کی ، اس کی باتوں میں کوثر و تسنیم کا خمار دریافت کیا۔ خوبیوں کا ذکر اتنا بڑھا کہ بلبل خوش نوا کو بھی رشک آنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ نظم آج بھی اسی طرح تازہ اور حسب حال ہے جتنی اس موقع پر تھی جب کہ یہ لکھی گئی۔ یہی نہیں کہ مجاز نے جو کچھ خالدہ کے بارے میں کہا وہ چودہ برس بعد سروجنی پر بھی حرف بحرف پورا اترا۔ بلکہ اس نے اپنے بارے میں بھی اس موقع پر جو کچھ کہا [illegible] نے یہ جانا کہ گویا وہ میرے دل میں بھی ہے ؎

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ شمیم جانفزا
پھر میسر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اس انداز سے اے مطرب رنگیں نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا
ذکر جس کا زہرہ و پیروین کے کاشانے میں ہے
وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

یونیورسٹی کے طلبا کی طرف سے خیر مقدم کے لیے ایک لڑکے کا نام پکارا گیا۔ یہ دبلا پتلا لڑکا بھیڑ چیرتا ہوا صدر جلسہ کے سامنے رکھی ہوئی میز کے اس کنارے پر جا کھڑا ہوا جہاں مائکروفون رکھا تھا۔ وہ صدر اور سروجنی کے درمیان کھڑا تھا۔ اس نے ہال کی طرف دیکھا تو آواز آئی ٹوپی ، ٹوپی۔ کسی نے ایک ٹوپی بڑھائی اور اس لڑکے کے سر [illegible] گھنے بال

اس میں چھپ گئیں۔ ٹوپی کھلی تھی، کانوں تک ڈھلک آئی۔ اس سے پہلے
کہ صورت کے یوں بدل جانے پر کسی کو ہنسی آئے تقریریں شروع ہو گئیں اور
اس کے بعد کسی نے یہ نہ دیکھا کہ مانگے کی ٹوپی کب تک کانوں پر ڈھلکی
رہی اور کب مقرر نے اسے اتار کر میز پر رکھ دیا۔ یہ بڑی محنت سے
بار بار بڑے جوش سے ادا کی ہوئی تقریر تھی۔ ترشے ہوئے فقرے
چنے ہوئے الفاظ، خیال جس میں غور و فکر شامل تھا، جذبہ جو عمر کا تقاضا
تھا۔ بے باکی جو باتمیز تھی، اختلاف جو باادب تھا۔ جیسے ہوں کہ خاموشی
یہ دونوں کی ادائیگی سٹوڈنٹس یونین کی تربیت کا حاصل تھی۔
یہ تقریر انگریزی میں تھی، اس کے ابتدائی کلمات کا آزاد ترجمہ کچھ یوں
ہوگا

'اس خوش رنگ اور روشن شخصیت کے استقبال کے لیے حاضر
ہو گیا ہوں، مگر سوچتا ہوں، شروع کہاں سے کروں۔ اس خطابت
سے جس تک کوئی نہ پہنچ سکا یا اس نسبت سے جو ہر ایک کے حصے میں آئی۔
اس سیاست کے فلسفے جس میں آزردگی داخل ہے یا اس شاعری سے جس میں
سحر شامل ہے۔ اس نسبت سے جو اقلیت کو اکثریت سے ہوتی ہے
یا اس رعایت سے جو مساوات کہلاتی ہے۔ سارے رنگ شوخ اور
ساری کرنیں روشن ہیں، نقطہ آغاز ملے تو کہوں کر۔ میں کیوں نہ بات
ہمارے رشتے کے حوالے سے کروں جو علی گڑھ اور ہندوستان
کے درمیان قائم ہے یا اس ذاتی تعلق سے جو مہمانِ خصوصی نے مجھے
اپنا چھوٹا بھائی کہہ کر استوار کیا تھا۔ حالات ایسے بنے ہیں کہ
ہم یا تو چھوٹے بھائی ہیں یا بڑے دشمن، درمیانی صورت کوئی بھی
نظر نہیں آتی۔'

سروجنی جب یونین ہال میں تقریر کے لیے کھڑی ہوئیں تو
ان پر گل پاشی کی گئی۔ یونین ہال کی اس رسم کا جواب میں نے کہیں نہیں
دیکھا۔ بڑے ملکوں کے بڑے بڑے استقبال دیکھے، جاہ و حشم اور
شان و شوکت کی کہیں کمی نہ تھی، مگر پھر بھی جو حسن اور سادگی یونین
ہال کی گل پاشی میں ہے اس کی یکتائی کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ یونین
ہال میں ڈائس کے بالکل اوپر چھت میں ایک مستطیل شگاف ہے جس کے
چاروں طرف روشن دان ہیں اور اوپر لکڑی اور ٹین کی چھت پڑی
ہوئی ہے۔ اس چوکور سقفی روشن دان کے اردگرد چھت پر گیندے
اور نہ ہی پھولوں کی پتیاں منوں کے حساب سے ڈھیر کر لیتے ہیں
مہمانِ خصوصی جب تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ عین شگاف کے
نیچے ہوتا ہے۔ اس کی آمد پر تالیاں بجتی ہیں اور وہ خاموش کھڑا
رہتا ہے۔ جونہی تالیاں مدھم ہوئیں اور وہ تقریر کے لیے تیار ہوا
کہ اوپر سے پھولوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے تھوڑی تھوڑی

اور پھر بہت سی پتیاں نیچے دھکیل دیتے ہیں۔ اس اونچائی سے فرش کی
طرف اوپر تلے گرتے ہوئے پھولوں کی لرزش اور ریزش دیدنی ہوتی ہے
پہلے وہ مینہ کی بوندیں لگتی ہیں پھر آسمان سے زمین تک بہنے کی لڑیاں
پیدا ہو جاتی ہیں۔ کہتے ہیں اچھے لوگوں پر نور برستا ہے، برستا ہوگا۔
مگر میں نے تو چند اچھے لوگوں پر عرش سے فرش تک بہار کو برستے ہوئے
بھی دیکھا ہے۔ وہ سماں بندھتا ہے کہ جس نے ایک بار پھولوں کی برسات
دیکھی وہ تمام عمر اسے یاد رکھتا ہے اور جس پر ایک بار یوں گل پاشی ہو جائے
وہ ساری عمر ان پھولوں کے نیچے دبا رہتا ہے۔

خالدہ ادیب خانم پر جب گل پاشی ہوئی تو وہ حیران ہو کر بار
بار اوپر دیکھنے کی کوشش کرتیں کہ یہ پھول کہاں سے آ رہے ہیں۔ مگر ہر
بار پتیاں ان کی نظر اور ان کے چہرے کو ڈھک لیتیں۔ وہ اتنی متاثر ہوئیں
کہ اس رسم کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا جو برِ عظیم کے سفر کے بعد لکھی تھی
آج گل پاشی سروجنی پر ہوئی۔ دیکھنے والوں نے گل و بلبل کا یہ نیا رشتہ
بھی دیکھا۔ گل تھا کہ آج بلبل پر نثار ہو رہا تھا۔ بلبل کی باری آئی تو اس
نے کہا۔ میں آج ایک طویل مدت کے بعد یونین ہال میں آئی ہوں پھولوں
کی لڑیاں اور جوشیلے نوجوانوں کے جذبات کی کڑیاں ہی اس مدت کے
دونوں سروں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم نے پھول برسائے تھے سروجنی
نے جواب میں موتی لٹانے شروع کر دیے

یونین ہال کا جلسہ ختم ہوا تو صبح کے جلسے کی طرح ہجوم کا وہ عالم تھا
کہ جو لڑکے اپنی آٹوگراف البم ساتھ لائے تھے وہ سروجنی تک نہ پہنچ سکے۔ میں
ان لڑکوں کے گروہ میں شامل نہ تھا۔ میری آٹوگراف البم گھر پر تھی اور
اس کے بیسویں صفحے پر سروجنی نائیڈو نے دستخط کر رکھے تھے۔ اس صفحے کے
ایک کونے پر میں نے یادداشت کے طور پر کلکتہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۴ء لکھا ہوا
ہے۔ کلکتے میں ایک اردو کانفرنس تھی۔ میں اس میں طلبا کے نمائندے کی
حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ کمسنی کے دن تھے اور میرے لیے دو مشکلات
تھیں، ایک طوفان میل میں علی گڑھ سے کلکتے کا طویل سفر تنہا طے کرنا
اور پھر وہاں پہنچ کر سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر بی سی رائے اور شیرِ بنگال
اے کے فضل الحق کے سامنے تقریر کرنا۔ جوانی اور نادانی کے بہت سے
فائدے ہوتے ہیں اور اس موقع پر یہ دونوں جوہر بہت کام آئے
اب تو اس موقع کی نزاکت کو سوچ کر کانپ جاتا ہوں۔ کلکتے کے اسی
جلسے میں جب میرے بعد سروجنی نائیڈو نے تقریر کی تو میری دلجوئی کی
خاطر دو چار جملے میرے بارے میں کہے اور مجھے چھوٹا بھائی کہہ کر مخاطب
کیا۔ جلسے کے بعد میں نے آٹوگراف البم سروجنی کو پیش کی۔ وہ جہاں
کھڑی تھیں وہاں بلب کی روشنی بہت مدھم تھی۔ میں نے کہا دستخط بھی
کر دیں اور کچھ نصیحت بھی لکھ دیں۔ کہنے لگیں کہ روشنی اتنی کم ہے کہ محض

ازے سے دستخط کر دیتی ہوں تم اس کے اوپر خود ہی کوئی اچھی
بات لکھ لینا اور اسے میری جانب سے سمجھ لینا۔ سروجنی نے دستخط
تو انگریزی کے پہلے چار حروف روشن لکھے گئے اور باقی واضح مگر
بے مجھے سے۔ میں نے اجازت کے باوجود ان دستخطوں پر کوئی نصیحت
ہی کی البتہ ان پر ایک مضمون ضرور لکھا ہے۔

میں نے سروجنی کی صرف تین تقریریں سنی ہیں۔ ایک کلکتے
اور دو علی گڑھ میں۔ آج مجھے ان کے اقتباس یاد نہیں جتنے
تقریروں اور بیانوں کے جو میں نے اخبار یا کتاب میں پڑھے
ہیں۔ جب میں نے سروجنی کو آخری بار سنا تو ان کی بعض مشہور
تقریروں کو جو انھوں نے نوجوانی میں کی تھیں تقریباً پچاس برس
عرصہ ہو چکا تھا۔ اس نصف صدی میں نہ ان کا پیغام بدلا نہ
پیامبری کے انداز۔ پیغام میں وہی تازگی اور پیامبری میں وہی دلبری
شامل تھی، جس پر بیسویں صدی کی پہلی دو نسلیں فریفتہ ہو چکی تھیں
جوانی میں ان کی تقریروں میں پختہ کاری ملتی تھی۔ بڑھاپا آیا تو
ان میں جوانی کی سی جھلکنے لگی۔ ان کے موضوع میں عمر بھر یک رنگی
رہی مگر ان کے بیان کے سو رنگ تھے اور ہر رنگ ایک نیا شوخ
اور شاعرانہ رنگ تھا۔ پچاس برس کے بعد بھی ان کی سحر بیانی میں
وہی خیالی بدستور تھی اور رومانی رنگینی برقرار تھی۔ فرق صرف اتنا
تھا کہ دردمندی کی جگہ درد نے لے لی اور فکر کے ساتھ تفکرات
بھی نمایاں ہو گئے۔ وقت کے ساتھ مقرر کی دلکشی اور تقریر کی
دلاویزی بڑھتی چلی گئی۔

سروجنی کی تقریر ایک اچھی غزل کی طرح دلکش ہوتی تھی۔
جس طرح غزل میں صدیوں سے مضامین کی تکرار کے باوجود تازہ غزل بھی
ایک نوع ہے وہی کیفیت سروجنی کی تقریروں کی تھی۔ سروجنی نے جوانی
ہی میں یہ جتا دیا تھا کہ وہ خطابت کے ہنر کو جدوجہد آزادی کے لیے
وقف کر چکی ہیں اور کسی قیمت پر اس کے کسی دوسرے استعمال کو
جائز نہیں سمجھتیں۔ یہ بات وہ ۱۹۱۸ء میں ان الفاظ میں واضح کر چکی
تھیں "تم میں بہت سے ایسے ہوں گے جنھوں نے پچھلے چند دنوں
میں مجھے کئی بار سنا ہے، وہ کہتے ہوں گے یہ تو صرف ایک ہی راگ
الاپتی ہے لیکن قوموں کی تاریخ میں کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب
یہ لازم ہو جاتا ہے کہ آپ کا ساز سہ تار نہیں بلکہ محض اک تارہ
ہونا چاہیے۔" سروجنی کے ہاتھ میں جو ساز تھا وہ اس پر ساری عمر
مسلمانوں کا ترانہ بجاتی رہیں۔

سروجنی نے بارہا اپنی تقریروں میں اسلام اور مسلمانوں
سے اپنا رشتہ جوڑا۔ عورتوں سے خطاب ہو تو وہ پدمنی، ساوتری

اور سیتا کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس احسان کا بھی ذکر کرتیں جو
اس صنف پر اسلام نے اس کے حقوق تسلیم کرنے کے سلسلے میں کیا ہے
مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جب لکھنؤ سیشن میں جگہ ملی تو یوں اعتراف
کیا کہ اگر مجھے اس مقام پر کھڑا ہونے کا کوئی حق حاصل ہے تو اس کی
بنیاد یا تو وہ الفت ہے جو مجھے مسلم ہند کے نوجوانوں سے ہے یا وہ جدوجہد
جو میں مسلمان عورتوں کے ان حقوق کے لیے کرتی ہوں جو اسلام نے دیے
ہیں مگر آپ نے پورے نہیں کیے۔ یہ بات وہ اکثر دہراتی تھیں کہ ان کے
کانوں نے بچپن میں جو پہلی آوازیں سنیں وہ امیر خسرو کی زبان میں
تھیں اور جو پہلے دوست بنائے وہ بھی مسلمان گھرانوں سے تھے۔ مسلم
تمدن سے سروجنی کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمانوں کے شہر کی
آوازوں اور دوسرے شہروں کے شور و غل میں تمیز کرتی تھیں
کیوں کہ مسلمانوں کے شہر کی فضا میں اذان کی گونج ہوتی ہے جو سب
دوسری آوازوں سے مختلف اور اس پر غالب ہے۔ وہ حافظ اور رومی
کے ساتھ اقبال کا ذکر ان دنوں کیا کرتی تھیں جب اپنوں نے بھی
انھیں پوری طرح نہ اپنایا تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ سروجنی نے دین اسلام کا کتنا مطالعہ کیا تھا
مگر اس بارے میں جو رائے اس نے قایم کی وہ گہرے مشاہدے اور
وسیع مطالعے کے بغیر ممکن نہ تھی۔ تیرہ سو برس کے بعد اسلام کے نظام
کی تازگی اور روح اسلام کی توانائی نے سروجنی کو بہت متاثر کیا
... کے خواب کی تعبیر بھی اسے اسلام میں نظر آئی اور اس کے عملی
نمونے کو دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ ایسا واحد مذہب ہے جو
مساوات کو فلسفیانہ بحث سے نکال کر نماز کی صفوں میں لا کھڑا کرتا
ہے اور پھر اسے احرام کی چادر میں چھپا کر عالمگیر بنا دیتا ہے۔ اتنا عرصہ
گزرنے کے بعد بھی جو توانائی اسلام میں پائی جاتی ہے، اس کی وجہ
سروجنی کو یہ نظر آئی کہ اس کا بیج ایک تپتے صحرا میں سادہ اور غیور
لوگوں کے درمیان بویا گیا تھا کچھ سخت جانی ابتدائی ماحول نے پیدا
کی، کچھ بہادری نسل در نسل ورثہ میں تقسیم ہوتی۔ تمام مذاہب میں
اسلام کم عمر تو ہے مگر اس بات میں سب پر سبقت رکھتا ہے کہ وہ
روح اور بدن دونوں کے لیے نازل ہوا۔ دوسرے پیغامات اس
کے مقابلے میں نا تمام لگتے ہیں۔

سروجنی نے ایک بار مدراس کے نوجوان مسلمانوں سے
خطاب کرتے ہوئے قرآن مجید پڑھنے کا ذکر کیا تھا۔ معلوم نہیں
اس کی نگاہ "مولفۃ قلوبہم" اور وہ کہ ان کے دلوں میں
کلمہ حق کی الفت پیدا کرنی ہے ـــــ پر گئی کہ نہیں۔ دل کا حال
تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر سروجنی کی زبان پر کلمہ حق جاری تھا۔

ایک دن مسلمانوں سے خطاب کیا تو کہا ـــــ اگرچہ میں تمہارے دوش بدوش کھڑے ہونے کے باوجود تمہاری نظروں میں ایک کافرہ ہوں مگر میں تمہارے سارے خوابوں میں تمہاری شریک ہوں۔ میں تمہارے خوابوں اور بلند خیالوں میں بھی تمہارے دوش بدوش ہوں۔ کیوں کہ اسلام کے نظریات بنیادی اور حتمی طور پر اتنے ترقی پسند نظریات ہیں کہ کوئی انسان جو ترقی سے محبت کرتا ہو ان پر ایمان لانے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

ذات پات اور چھوت چھات کی گھٹی گھٹی فضا کے مقابلے میں اسے وہ کھلی اور کشادہ فضا بہت پسند آئی جس میں رنگ و نسل اور شرق و غرب کے جھگڑوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس برادری کے سب انسان برابر تھے اور افضل صرف وہ تھا جو دوسروں سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ پرہیزگاری کا فیصلہ بھی انسان پر نہیں چھوڑا یہ فیصلہ سب انسانوں کے سامنے ان کا خالق کرے گا۔ اس فضا میں سروجنی نے لمبے لمبے سانس لیے تو نفس مطلب اس پر عیاں ہو گیا اور اسے بہت سے ایسے اصول حقیر نظر آنے لگے جنہیں لوگ عزیز رکھتے ہیں اسے حیرت ہوئی کہ انسان اپنی مختصر زندگی کا بیشتر حصہ ایک تنگنائے میں بسر کر دیتا ہے حالاں کہ آفاق اور کائنات کی ساری فراخی اس کی منتظر ہے۔ سروجنی ہر تنگ نظری اور تنگ دلی سے نفرت کرنے لگی۔ وہ علاقائی وفاداریوں اور صوبہ پرستی سے بھی متنفر ہو گئی اس نے ۱۹۰۳ء میں ایک تقریر صوبائی عصبیت کے خلاف کی۔ اس نے اپنے سامعین سے کہا کہ تم تنگ نظری کا شکار ہو جس کی وجہ سے تمہارے افق کی ایک حد تمہارا صوبہ اور دوسری حد محض تمہاری اپنی ذات ہے۔ یہ محدود افق، یہ مختصر کائنات، یہ مفلس ذہن، یہ عاجز فکر نفرت کے قابل ہے اور تم ہو کہ اسی تنگ نظری سے محبت کرتے ہو۔ میں نے سفر کیا، میں نے سوچا، میں نے آس لگائی تو میری محبت کا دامن وسیع ہو گیا، میری ہمدردیوں میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ مختلف نسلوں، قوموں، مذاہب اور تہذیبوں سے ربط رکھنے کی وجہ سے دوستو مجھے بصیرت مل گئی ہے۔ سروجنی کی تربیت میں نہ جانے کون کون سے عوامل ہوں گے مگر اس کی بصیرت میں گنگا جل سے زیادہ آب زم زم کا اثر ملتا ہے۔

ایک بار گوکھلے نے سروجنی سے پوچھا کہ ہندو مسلم تعلقات کا کیا حال ہے تو سروجنی نے کہا شاید پانچ سال میں یہ مسئلہ طے ہو جائے گا۔ گوکھلے نے کہا، میری بچی تو محض ایک شاعرہ ہے۔ تیری توقعات کی سطح واقعات کی سطح سے ہمیشہ بلند رہتی ہے۔ اس بلند سطح پر وہ اپنے تخیل اور تمناؤں کے ساتھ تنہا زندگی بسر کرتی رہی۔

وہ رخصت ہوئی تو اس وقت بھی تنہا تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس کے ایک طویل و عریض کمرے میں وہ اکیلی سوئی ہوئی تھی۔ سوتے میں اس کی آنکھ لگ گئی اور پھر وہ جاگ نہ سکی۔ جب موت کا فرشتہ آیا ہو گا تو اس نے کہا ہو گا۔ تنہا کیوں آئے ہو۔ تمہاری تعداد تو لاکھوں میں بیان ہوتی ہے۔ آج سے تم میرے سامعین ہو۔ آؤ میں تمہیں اپنی نظم "الوداع" سناؤں ؎

کیا تمہیں اس کے سوا کوئی اور صلہ بھی چاہیے،
اے وہ جس نے مجھ سے میری متاعِ حیات چھین لی،
اچھا میں تمہیں الوداع کہے بغیر رخصت ہو جاؤں گی،
اے مردہ خوابوں کے معبد، اے میرے آنسوؤں کے مندر!

اب اس دنیا میں نہ سروجنی ہے اور نہ ہی والدہ محترمہ، جنہوں نے ایک بار مسکراتے ہوئے کہا تھا، یہ کافرہ کون ہے کہ جب جوان تھی تو باپ گرویدہ تھا اور بوڑھی ہوئی تو بیٹا شیدا ہے۔ بیٹے نے سوچا، بھارت سراب ہے اور مہا بھارت بیکار، بلبلِ ہند ایک پکار ہے اور سروجنی ایک خواب۔ خواب اچھا ہو تو اسے بیان کرنا چاہیے۔

★

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

سرسید کا ایک اہم کارنامہ

تحریکِ آزادیٔ ہند اور تحریکِ جہاد کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے
ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں قومی مرکزیت اور سیاسی اقتدار کی کمی نے جیرہ
نوں کو وہ قوت دے رکھی تھی کہ مسلمان قوم ہدفِ تنقید بھی بنی اور ہر منفی رو
اسے اپنی لپیٹ میں لینے کو تیار ہو گئی۔ ایسے عالم میں سرسید احمد خاں نے جذباتی
مانوں کے عوامل پر غور کیا اور ان کے واسطے ایک نسخہ کیمیا تجویز کیا کہ جدید علم
رسائنسی علوم کے حصول کے بعد ہی اس مردہ قوم کو نئی زندگی مل سکتی ہے۔
ن اُن کے خیال کے خلاف تیز و تند آندھیاں چلنے لگیں اور اکابرینِ ملت میں
غصے کا زور شور اس قدر بڑھا کہ سید کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ
و ادب کی دنیا میں بھی اس انقلابی بزرگ اور مجاہد بلکہ مجتہد کے خلاف
دیا گیا۔

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خریدار ہو، جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

سرسید سے اختلاف رکھنے والوں کی فہرست میں اوّل اوّل مولوی علی بخش
ذات تھی مگر آخری اور وہ بھی کاری ضرب لگانے والی ذات الہ آباد کے مولوی
رحسین کی تھی۔ جنھوں نے اپنے طنز و مزاح سے ایک جانب سرسید کے خلاف عوام
، جذبۂ تضحیک کو ابھارا۔ دوسری جانب علمی حلقے کو ادبی طور پر متاثر کرنا شروع
اور فرمان جاری کر دیا۔

علی گڑھ کا کالج ہے لندن کی مسجد
نہیں جب وہ سید احمد ہے سرسید نے تو کہا
سید بننا ہو تو بنو سرسید
ہونا ہو خاں، تو بنو انگریزی خواں

اکبر نے اسی پر اکتفا نہ کی۔ سید کے نظریات سے کے کر ان کے عقائد تک پر
آور ہوئے اور جب عوام و خواص کو اپنے آپ سے متاثر دیکھا، تو سید کی
ت کے بعد جو حشر رونما ہوتا، اس کی خیالی تصویر کشی بھی کی اور سچ یہ ہے
والے انداز سے کی، جس سے مولوی نذیر احمد اور مولوی سعد اللہ جیسے اشخاص
حد درجہ متاثر ہوئے اور دوسرے علماء نے بھی خوب حظ اُٹھایا۔ مگر اکبر
خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جو کہا، مزاح کے دائرے میں رہ کر کہا۔ جس سے
سود سب کی دلجوئی بھی تھی اور لطفِ عام کا حصول بھی:

جب مر کے چلے سوئے جنت سید لٹھ لے کے امام ابوحنیفہ دوڑے

اِس شعر سے گو مذہبی ذہن والے بہت خوش ہوئے مگر سرسید نے
ان ہفوات پر زیادہ توجہ نہ دی۔ انھوں نے جوابات دیے مگر سنجیدہ رہ کر
مقابلہ کیا مگر کالج کی رسوائی اور اس کے طلبا و اساتذہ پر حرف گیری کیے بغیر۔
یہی سبب ہے کہ اُن کی کسی تحریر یا تقریر سے ہمیں ان کے مرکزی خیال اور تصوّر
کی تکذیب نہیں ملتی۔ نہ کوئی اِس امر کی نشان دہی آج کر سکتا ہے کہ سرسید
کے قول و فعل اور عمل و کردار میں کوئی تضاد تھا۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ جب
سرسید احمد خاں اس دنیائے فانی میں نہ رہے تو اُن ہی اکبر نے، جو ان کی
تحریک کے سخت مخالف تھے اور تضحیک و تذلیل کو روا خیال کرتے تھے، کہا:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اس شعر میں اکبر کا نہ تو وہ طنز ہے جو اُن کا مزاج تھا، نہ اکراہ۔ نہ تضحیک
کا وہ پہلو، جس پر اُن کی شاعری کی اساس قایم تھی، بلکہ اِس شعر سے خود
انھوں نے اپنے آپ اور اپنے حواریوں پر طنز کے نشتر چلائے اور اپنی بے بسی
و مجبوری کو جس عمدگی سے نظم کیا ہے، اس کی مثال اکبر کے یہاں کم ملے گی۔ گویا
انھوں نے اپنی اور اپنے نظریے کی نفی خود کرنی مناسب خیال کی اور:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں

کہہ کر اہلِ علم اور اکابرینِ ملّت کو یہ باور کرانا چاہا کہ جو لوگ محض گفتار کے غازی
ہوتے ہیں، وہ عمل کی دنیا میں کسی محبِ صادق کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ گویا اپنے
کلام کو خود انھوں نے ہفوات قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فتنہ جس کی آبیاری ایک
نئے انداز سے اکبر کے ہاتھوں ہو رہی تھی، اس کا چشمہ از خود خشک ہو گیا۔
جہالتِ اولیٰ کا دور تمام ہوا اور مذہبی حقوق، بالغ نظری، حرکت و عمل، احکامِ
شرع اور اخلاقِ حسن کا دور شروع ہو گیا اور لوگ وقت کی پکار پر لبیک کہنے کے
لیے دوڑ پڑے۔ اپنے متعلقین، اپنے رشتہ داروں، اپنے کنبے والوں
اپنے معاشرے کے بدحالوں اور اپنے پاس پڑوس کے افراد کو علم کی
برکت کا نسخہ دینے لگے۔ جہل سے علم کی طرف، ظلمات سے نور کی
سمت، بے علمی سے علم کی جانب اور بے راہ روی سے رہبری کے
رُخ دکھانے لگے اور اس پر گامزن ہونے کے واسطے علی گڑھ کی طرف
نکل کھڑے ہوئے جہاں کی بساط پر جدید علوم کی شمع سرسید نے روشن
کر رکھی تھی۔ قرآن کا حکم ہے:

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کو بھلائی کا حکم
دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے ہوگے"

اس ارشادِ الٰہی کے مطابق، ایک خوددار، غیور اور آزاد انسان ہونے کے اعتبار سے ہم پر فرض ہے کہ خیر کی طرف قدم اٹھائیں اور بدی سے پرہیز کریں۔ لیکن اللہ کا منشا غالباً صرف یہی نہیں ہے، بلکہ اس کا حکم یہ بھی ہے کہ اقوام و ملل میں جہاں کہیں بھی خرابی نظر آئے، اُس کی درستی کی جائے، اُس پر توجہ دی جائے۔ اس کے لیے میدان اور روادی، آبادی اور سرحدی پابندیوں کی قید نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اچھی شے جہاں سے میسر آئے، اُسے سراپا یہ خیال کر کے حاصل کر لیا جائے یعنی کڑوے اور کسیلے پھل کو نظر انداز کر کے شیریں پھل کی اور ہاتھ بڑھاؤ جس سے زبان کو لذت اور روح کو بالیدگی میسر آئے۔ گویا علم ظاہری اور علم باطنی کے فرق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تعلیم کا حصول امر لازم ہے۔

سرسید اس امر سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لیے انھوں نے دونوں علوم کے حصول پر زور دیا۔ جس سے ان کے عہد کے دانا و بینا حضرات، اُن سے ناراض ہو گئے اور فتوے دے کر قہرمانی تک پر آمادہ ہوئے اور احکام شریعت سے کام لے کر سرسید کی تحریک کو کچلنا چاہا لیکن وہ اس بات کو فراموش کر بیٹھے کہ حرکت و عمل کی دنیا میں احکام شرع کو بھی اتنا ہی دخل ہے، جتنا سمت نما کو راہ کی سمت متعین کرنے میں۔ کہ اصل کام رہ نورد کو خود انجام دینا پڑتا ہے۔ محض سمت نما پر بھروسہ کر کے راہ کی مشکلات کو دور کرنا اور منزلِ مقصود پا لینا ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح مذہبی حقوق کی بات کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ بے دین حضرات کی طرف کچھ اس طور سے نظر ڈالیں، جس سے اس کی روح بیدار ہو اور وہ خود ذمہ دارانہ زندگی اپنانے اور حق کے محرکات کو سمجھنے پر آمادہ و تیار ہو جائے۔ اُس کا شعور از خود فرض کی جانب مائل ہو اور بے خبری میں بھی اجتہادی عمل کی طرف راغب ہونے پر اپنے آپ کو وہ مجبور کرے۔ یہی نہیں بلکہ یہ رول، مذہبی ذہن والوں کو کچھ اس خوبی سے ادا کرنا چاہیے کہ ہمارے قوانین اُن کے اپنے قانون بن جائیں ہماری تہذیب ان کی اپنی تہذیب اور ہمارا خیال اُن کی اپنی آواز ہو جائے سرسید کا بس یہی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اختلاف کرنے والوں سے بدظنی کو راہ نہ دے کر، اتفاق و اتحاد اور ملی روابط سے کام لینے پر خود بھی عمل کیا اور علی گڑھ تحریک والوں کے لیے اس کو درسِ آخر قرار دیا۔ دراصل ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم اپنے عمل سے بہترین امت کے فرائض کو انجام دیں اور تعمیر معاشرت میں اس انداز سے حصہ لیں کہ کسی فرقہ کو ناگواری کا احساس تک نہ ہونے پائے۔ اس بارے میں سرسید کا خیال تھا کہ

کسی بھی تعلیمی ادارے کو اگر ضرورت ہو تو اسے ایسے منصف مزاج شخص کے حوالے کر دینا چاہیے جو تدبر، دیانت، ذمہ داری اور عقل مندی سے و صلح پسندی سے کام کرے۔ جس سے کسی طبقے کو یہ سمجھنے کا موقع نہ ملے کہ اس کے عمل سے کسی ایک ملت کو فائدہ میسر آیا۔ دوسرے ادیان کو اس کا جائز حق نہ ملا۔ گویا تعصب سرسید کی نظر میں انسانی ضمیر کی سب سے بڑی کمی ا خلاقی کمزوری تھی۔ جس کی وجہ سے اسے انصاف پرور نہیں کہا جا سکتا اور ا شخص خدا کے نزدیک اور بندوں کی نظر میں بھی مقہور ہوگا۔ اس بات اگر خود سرسید کی زبان سے سنا جائے تو اصل حقیقت اس طرح سا آئے گی:

"درحقیقت میری رائے ہے کہ جیسا خدا
بے تعصب ہے، مشرک، بت پرست،
خدا پرست سب کی بلا پرورش کرتا
ہے، اسی طرح گورنمنٹ اور افسر کو بے
تعصب ہونا چاہیے۔"

ناانصافی، تعصب، بدخلقی اور بے مہری کو سرسید نے کبھی گوا کیا۔ نہ اپنے لیے، نہ دوسری اقوام و ملل کے واسطے۔ سرسید کی اسی تحریک دوسرا نام علی گڑھ تحریک ہے جس کی بقا اور دائمی حیات کے لیے، اق و ملل کی فلاح اور خیر کے لیے انھوں نے "رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعے انھوں نے قلمی جہاد کا کام لیا۔ اس و یقین کے بعد بھی ہم سرسید کے علمی و ثقافتی جہاد اور اس کے جائز مقا تعین نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ وہ جذبۂ ملی ہم میں ہے ہی نہیں جو سرسید نے ودیعت فرمایا تھا۔ چنانچہ تہذیب کے ذریعے بھی انھوں نے زبان کو فہم بنایا سادگی سے روشناس کر کے، آنے والی نسل کی رہنمائی بھی کی ا قدیم دانشوروں کی اصلاح کا موجب بنتے ہوئے نئے حوصلوں سے آ بھی کیا۔ اس ضمن میں حالی، شبلی، نذیر احمد اور عبدالحلیم شر تک کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے سرسید کی نثری اصلاح سے براہ را اثر قبول کیا۔ یہی نہیں بے لاگ سوانح نگاری کا طرز اور تاریخی طرز نگ کا انداز بھی ان کا رہین منت ہے۔ علامہ شبلی کا بیان ہمارے دعوے تصدیق کے لیے کافی ہے:

"...... جو چیز خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی
بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئی، اُن میں ایک اردو
لٹریچر بھی ہے۔ سرسید کی ہی بدولت اردو اس قابل
ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی،
سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس
زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی
سے ادا کر سکتی ہے......"

* * * * * * * * * * * * * * * * *

مجھ کو، میرے نفس کو، میرے وجود معین کو، میرے نفس خاص کو (خدا مل سکتا ہے یا پیار اور عشق) اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ اس راہ فنا بلکہ دعوت میں مضطربانہ، والہانہ دوڑوں، پھولوں کی سیج سے اٹھوں، اور کانٹوں کے اوپر لوٹوں، لعل و جواہر کو پھینکوں اور آگ کے انگاروں سے کھیلوں۔ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آسائش و راحت کے گھر کو جلا دوں، خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مال و متاع کو غارت گروں کے حوالے کر دوں۔ لینے سے بھاگوں اور کھونے سے عشق کروں۔ دست عطا سے دشمنی کروں اور دست سائل کے لیے پکاروں۔ اپنے آپ کو مٹا دوں۔ اپنے آپ کو کھو دوں۔ اپنی آنکھوں کو ہمیشہ خوں بار رکھوں اپنے جسم کو ہمیشہ زخموں سے چور دیکھوں۔ اپنے ایک ایک زخم سے خون کی ندیاں بہا دوں پھر اس پر بھی بس نہ کروں اور اگر اس محبوب حقیقی، اس شاہد یکتا کی ایک چشم لطف، ایک نگہ عشق پرور، ایک تبسم جاں نواز، ایک ادائے قبولیت بھی مل سکے تو سولی کے تختوں کا طواف کروں۔ جلاد کے ہاتھوں کو بوسہ دوں، آب شمشیر کو آب زلال سمجھوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد (البلاغ)

* * * * * * * *

مگر علامہ شبلی نعمانی کے سوا مہدی حسن افادی کا یہ کہنا:

"جدید نسل تمام تر تہذیب الاخلاق کی پروردہ ہے۔"

ایک تاریخی حقیقت ہے اور جامع بات۔ اس عبارت میں جملہ خدمات کا احاطہ موجود ہے، جن کا ہم سرسید کی ذات اور ان کی خدمات سے تصور کر سکتے ہیں۔ تقابلی مطالعہ اور حقائق کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو جدید تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی اور خوبی ان کی نثر میں ملی۔ اسی نے ہمیں دیگر ادب پاروں سے بھی قریب تر لانے کی رہنمائی کی۔ اس کے باوصف انھوں نے کسی موڑ پر بھی اپنی قوم یا زبان کا سودا کسی سے کرنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ سرسید جب انگلستان گئے اور ایک سال تک قیام کیا تو انھوں نے دوران قیام جو اثرات قبول کیے وہ یہ تھے کہ

مسلمان قوم کو علمی اعتبار سے مغرب کے خیالات و افکار کے قریب آ جانا چاہیے،

ساتھ ہی یہ خیال بھی کہ اپنے خیالات کو منظر عام پر کیسے لایا جائے؟ اس کے لیے انھوں نے نشر و اشاعت کا منصوبہ بنایا اور تہذیب الاخلاق کا اجراء عمل میں لائے۔ جس میں سب سے زیادہ مضامین انھوں نے خود مختلف موضوعات کو مدنظر رکھ کر لکھے۔ مذہب، اخلاق، معاشرت، ملکی سیاست، تعلیم و تربیت، فکر و تدبر اور علم مجلسی و تمدنی، اصلاح قوم اور ملک، جدید اذہان اور اجتماعی و انفرادی افکار کی ترویج و ترقی پر زور دیا۔ ان سب کے سوا اردو زبان کی ترقی و اصلاح پر نظر رکھنے کی طرف تاکید اکید کی۔ حالی نے ان کے اس ادبی و ملی ترجمان کے متعلق اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا اور سچ یہ ہے کہ اس سے بہتر بات اور کہی بھی نہیں جا سکتی ہے۔

"تہذیب الاخلاق سے تعجب انگیز نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ یہ رسالہ سب سے زیادہ افسردہ اور دل مردہ قوم کے لیے تھا۔ اس سے قوم میں زندہ دلی پیدا ہوئی۔ اس رسالے نے ثابت کر دیا کہ اس زبان میں ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی کے ساتھ اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں۔"

حالی کے اس بیان کی روشنی میں گویا تہذیب سے قبل اردو ادب مبالغہ، تصنع، بناوٹ، غیر فطری افکار، ظاہر داری کے گھروندے میں مقید تھا۔ اس رسالے سے سچائی، سادگی، صفائی ستھرائی کا تصور ہی نہیں عام ہوا بلکہ اردو ادب کو نمایاں خصوصیت بھی نصیب ہوئی۔ اور سرسید اور ان کے رفقا و ہم نواؤں نے ادب میں انقلاب برپا کر کے اور مصنوعی انداز بیان سے دامن بچا کر اردو کو ایک کارآمد اور فعال زبان بنانے کی سمت جو پہلا قدم اٹھایا، اس سے قومی اصلاح بھی ہوئی اور مذہب کی بنیادیں بھی مستحکم ہوئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس رسالے نے عبارت میں سادگی اور تاثیر کو پہلو بہ پہلو رکھنے پر اصرار کیا۔ جس سے دماغ کو مبالغے سے نجات نصیب ہونے کی راہ ملی۔ اور سچائی کو آگے بڑھنے کا موقع میسر آیا اور سادہ نگاری کا ایک عام رجحان پیدا ہوا۔ ایسا رجحان کہ بے تکلف و سادہ نثر کا اتنا بڑا ذخیرہ، اتنی کم مدت میں سامنے آ گیا کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں

کر سکتے مگر لطف کی بات یہ کہ سرسید کو اپنے اس قلمی جہاد کا خود اندازہ تھا جیسا کہ انھوں نے آخر بیان کے طور پر کہا تھا کہ:

"........ ہم نے بہ ذریعے اس پرچے کے اپنی قوم کی خدمت کی۔ مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی، اس سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات میں وہ مبتلا تھی، اس میں اس کو روشنی دکھائی

.... اردو زبان کا علم، ادب میں جو خیالات اور موٹے وبھدے الفاظ کا مجموعہ ہو رہا تھا، اس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا، ہم نے اصلاح چاہی۔

سیّد کے اس اعلان واقرار سے سرمو ہم اختلاف نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اردو زبان وادب کو ان کی ذات اور اُن کے رسالے کی نسبت سے علم لغت، علم فقہ، علم الاسماء، علم اصول، علم تطبیق، علم تاریخ، علم الآثار، علم جغرافیہ، علم قیاس، علم استدلال، علم قران، علم تفسیر، علم عمرانیات اور علم تاریخ قومی، علم السنہ اور علم تمدن وشائستگی، علم زبان وادب اور علم الانساب غرض تقریبًا سب ہی متعلقہ علوم کی آگاہی میسر آئی اور بقول شاعر:

جس سے شجر حجر میں اک روح دوڑ جائے

غرض یہ کہ سرسیّد نے اپنی ریاضت علمی اور فعال ومتحرک دعوتِ عمل سے ملت میں اسی رسالے کے ذریعے غور وفکر کے جذبے کو بیدار کرنے کا کام سرانجام دیا۔ اس کے باوصف وہ کسی ایک جگہ قیام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، نہ ٹھہرے۔ وہ دراصل اس نظریے کے قائل تھے کہ انسان کو رواں دواں اور ہر دم توانا وتندرست ذہن کا مالک رہنا چاہیے اور جمالیاتی طور پر ایسا مذاق پیدا ہونا چاہیے کہ وہ قدرت کا شاہکار معلوم ہو۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ اُن کے لہجے اور ان کے آہنگ، اُن کی تحریر اور تقریر میں ایسی دلآویزی، گھلاوٹ، ترقی وجذب کر لینے والی صلاحیت تھی کہ باطنی جوش وجذبے کی فراوانی دوسروں کو متاثر کیے بغیر نہ رہی یا پھر یہ وجہ بھی ہو کہ انھوں نے ملّت کے عشق کو اپنی ذات میں سمو لیا تھا اور اس کو آفاقی احساس دے کر نقطۂ کمال تک پہنچانا چاہتے تھے۔ یا پھر وہ اعلیٰ مقصدیت کی شمع میں امت کو ارفع واعلیٰ مقام سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ وجہ جو بھی ہو، اُن کی یہ بات وزن ووقار والی ہے اور لائقِ تقلید ہے اور بقول علامہ اقبال:

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیّت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

****

"ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایک وقت آتا ہے جب کہ انسانوں کے لیے زندگی کی خواہش معصیت ہو جاتی ہے اور زندہ رہنے سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں ہوتا جب کہ اونچی اونچی دیواروں اور آہنی دروازوں کی آبادی بڑھ جاتی ہے اور آہنگر کی صنعت کی سب سے زیادہ مانگ ہوتی ہے، جب کہ درختوں کی ٹہنیوں میں رسیاں لٹکائی جاتی ہیں اور جب کہ لکڑی کے تختے بنائے جاتے ہیں تاکہ ان پر فرزندانِ آدم کھڑے کیے جائیں۔ یہ وقت آتا ہے اور انقلابِ امم کے ایک قدرتی قانون کے تحت گذر جاتا ہے اور پھر بربادی ہلاکت کا ہر وہ بیج جو زمین میں ڈالا گیا تھا نئے موسم کے شروع ہوتے ہی زندگی اور حیاتِ قائم ودائم کا پھل پیدا کرتا ہے...."

مولانا ابوالکلام آزاد (الہلال)

****
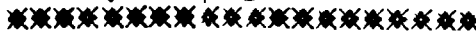
سرسیّد کی پوری حیات اور اُن کا اجتہادی عمل ان دو شعروں کے پوشیدہ ہے۔ شاید اقبال نے حیاتِ سرسیّد سے جو سبق لیا اور ان کی میں جو پایا، وہ شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ آگہی سے ہم خود کس حد تک سبق لے سکتے ہیں اور فیضان کی کس منزل پر پہنچ دم لینا چاہتے ہیں؟ خیالات پست اور ذوق اگر گرا ہوا نہ ہو اور اتنی ہمت باقی ہو کہ اصلاح ہو سکے، گمرہی وجہل کی حد سے پار ہو سکیں۔ جدید اصول ترقی نیز ضرورتِ زمانہ کے اعتبار سے تغیر وتبدّل کا حوصلہ ومذاق باقی ہو علم دین اور علم فروع سے یکساں کسب حاصل کیا جا سکتا ہے اور سرسیّد کا یہی بنیادی مقصد تھا کہ اسبابِ معیشت اور دینی ومذہبی تقشف آدمی خیال واحساس کا ایک حصہ ہونا چاہیے اور اپنے اخلاق سے نظامِ تمدن بقا میں اعانت کار فرما رہنا چاہیے اور خدمتِ قوم، دل جوئی، پاسِ عفت مآبی اور تعلقِ خاص کا جذبہ ہمیشہ بیدار رکھنا چاہیے۔

کمپیوٹر حضرات کی شاعری

کمپیوٹر دورِ حاضر کی اہم ترین ایجادات میں سے ایک ہے۔ اس مشین کا ڈیزائن ... سے ترقی کر رہا ہے۔ اور اس کے استعمال کے نئے نئے امکانات پیدا ہوتے ... ہیں۔

بڑے طویل حسابات برق رفتاری کے ساتھ کرنا، سائنس اور ٹیکنالوجی کے الجھے مسائل حل کرنا، زبردست صنعتی اداروں کو کنٹرول کرنا، ملکی اقتصادی پلان تیار کرنا، ... اور خلائی سیاروں کو کنٹرول کرنا اور طرح طرح کے بے شمار کام کمپیوٹر کی مدد ... جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ تخلیقی عمل کو سمجھنے (Heuristics) کے سلسلے میں ... کو استعمال کیا گیا ہے۔

ریاضیاتی لسانیات والوں نے بھی کمپیوٹر کی مدد سے بہت سے کام کئے ہیں۔ لسانیات ... سال پہلے تک ایک نیم ادبی اور غیر ریاضیاتی شاخِ علم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ریاضی کے ... ریاضیاتی امکانات کے اصول کی قبولیت سے یہ علم اب سائنس کا انداز اختیار ... اور اس نے زبان کے سلسلے میں بہت سی اہم باتوں کا پتہ لگایا ہے اور ہمارے علم کے ... کو بڑھایا ہے۔

ریاضیاتی لسانیات کے ماہرین نے زبان کی تجزیاتی شمار سے حاصل شدہ اصولوں کو ... کمپیوٹر صاحب کی فن کاری کا تماشہ بھی دیکھ ڈالا ہے۔ کمپیوٹر کو زبان کے یہ اصول ... لئے اور فقرے بنانے کا طریقہ اور الفاظ اور مطالب ان کی یادداشت میں محفوظ کر دئے ... اس کے بعد کہا گیا اب شعر کچھ تخلیق فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے انسان کی ودیعت کی ہوئی ... سمت اور اپنے حرارتِ علم سے کام لے کر شعر و ادب کے مندرجہ ذیل شاہکار تخلیق ... ملاحظہ کیجئے۔

امریکہ کی مشہور عالم کمپنی آر۔ سی۔ اے کے کمپیوٹر نمبر ۳۰۱ صاحب حزن و ملال کے شاعر ... صرف ۳۰ الفاظ کی لغت حفظ کئے بیٹھے ہیں اور ایک بحر پر عبور رکھتے ہیں۔ ملا کے برق رفتار ہیں اور اسی اندوختے سے تقریباً ڈیڑھ سو اشعار فی منٹ کہہ لیتے ہیں۔ نظموں کے عنوان نہیں۔ بس نمبر سے کہے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نظم نمبر ۲۷ ملاحظہ ہو۔

"زندگی خالی پرچھائیاں بناتی ہے
سست رفتار وقت اچھے کاموں کے برابر سے چپ گذر جاتا ہے
آسمان پر ستارے مایوس دل کے ساتھ گردش کر رہے ہیں
آہ انسان مسکرانا بھول گیا ... "

نظم نمبر ۹۲۹ میں فرماتے ہیں۔

جب ٹوٹی امید زندہ ہے
سبزہ کا ریلا چھا گیا
کائنات کا کام محبت کے درد سے بھر گئی
تیرا نور آدمی کے دل میں بجھ گیا

اور پھر آسمان نہیں سوئے ......"

اور اب انگلینڈ کے مانچسٹر یونیورسٹی کے کمپیوٹر ایم۔ یو۔ سی۔ صاحب کا ایک محبت نامہ ملاحظہ ہو۔ نثر میں طبع آزمائی کی ہے۔

"میری جان میری دولت
میری عقیدت تمہاری لطیف محبت کی تمنائی ہے۔
تم میری محبت ہو میرے سینے کو وسعت دینے والی محبت۔ میری محبت
تمہارے پیارے چھل پن کی منتظر ہے۔
تمہارا ادریس محبت
ایم یو سی

اور اب ایک فرانسیسی۔ مسٹر کالیوپے صاحب موصوف فرانسیسی کمپیوٹروں میں خاصے شہرت یافتہ ہیں۔ افسانہ نگاری سے شغف رکھتے ہیں اور جدیدیت کے رجحان سے تعلق ہے۔ علامتی اور تجریدی فن کاری فرماتے ہیں۔ ان کی ایک کہانی سے ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے۔

"میرا افق ایک سرخ پردہ ہے جس سے دم گھونٹ دینے والی گرمی کی لہریں اس اس کر آ رہی ہیں۔ ایک عورت کا غرور اور درشتی سے بھرا سایہ بہت مدھم پڑ رہا ہے وہ ایک اونچے خاندان کی عورت معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ خدا حافظ کہہ رہی ہو۔ میں اور کچھ نہیں دیکھ پاتا۔ اور پردے کی طرف بڑھتا ہوں اور کپکپاتے ہاتھوں سے پردہ ہٹاتا ہوں۔ پردے کے اس طرف ایک عجیب دردانگیز منظر ہے۔ سوکھی شاخوں والے درخت پر پرندے گر بیٹھ رہے ہیں۔ ایک کچھوا خاموش پڑا ہے۔ وہ میری موجودگی کا احساس کر لیتا ہے لیکن اس کے اوپر برف کیوں جمی ہوئی ہے۔
ایک لڑکا بھاگا آتا ہے۔ اس کے گدرائے ہوئے ہاتھ۔ اس کا سنجیدہ چہرہ — وہ ایک نوعمر ہیرو معلوم ہو رہا ہے —"

کچھ دنوں سے سوچا جا رہا ہے کہ ان حضرات کا کلام بلاغت نظام مجموعوں کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ ایک طرحی مشاعرے کا انتظام بھی زیرِ غور ہے جس میں ٹیلی کمیونیکیشن کے ذریعہ ایک دوسرے کو یہ حضرات کلام سنائیں گے اس لئے کہ قطب لوگ ہیں۔ اپنی اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔

ایک بات اور ذہن میں رکھئے کہ یہ فن کاری کا تجربہ سائنس والوں نے بعض تفننِ طبع کیلئے نہیں کیا ہے بلکہ یہ لسانیاتی اور تخلیقی عمل کے سلسلے کے بڑے معنی خیز تجربات ہیں جن سے زبان کی ساخت اور شعر و ادب کے بارے میں اہم انکشافات ہوئے ہیں۔

سید محمد کاظم نقوی

عقلِ عمومی کا یقینی اور منصفانہ فیصلہ

ارادی اور غیر ارادی

ہمیں دو طرح کے کام اپنی آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں جنہیں دیکھتے ہی بغیر غور کیے فوراً ہم فیصلہ کر دیتے ہیں کہ ان میں سے کون ارادے، اختیار اور عقل و شعور کا نتیجہ ہیں؟ کون غیر ارادی، غیر اختیاری اور عقل و شعور کی مدد کا رہیں ہے؟ اس فیصلے میں کسی سلیم الطبع اور عقل مند آدمی کو دشواری محسوس نہیں ہوتی ہے۔

دونوں قسم کے کاموں کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں

۱۔ آپ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ آپ نے دیکھا کہ دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے ہیں ان کے سامنے دو میزیں اور اُن پر ٹائپ کی دو مشینیں رکھی ہیں۔ دونوں چاہتے ہیں کہ اردو زبان کے مشہور شاعر غالبؔ کی اس شہرۂ آفاق غزل کو ٹائپ کریں جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا\
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ان دونوں میں سے ایک پڑھا لکھا اور آنکھوں والا، اس کے برخلاف دوسرا ان پڑھ اور اندھا ہے۔ پہلا تعلیم یافتہ شخص جس کی آنکھیں صحیح و سالم ہیں کام شروع کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے 'یہ'، پھر 'نہ'، پھر 'تھی' ٹائپ کرتا ہے جس سے مجموعاً "یہ نہ تھی" کا جملہ بنتا ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ پوری غزل بالکل صحیح طور پر ٹائپ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے۔

اس کے بعد جاہل اور نابینا شخص اپنی مشین چالو کرتا ہے، چوں کہ وہ حروف نہیں پہچانتا اور کچھ دیکھ نہیں سکتا ہے۔ لہٰذا بہت سے صفحے یا بہت سی سطریں خراب کرنے کے بعد کاغذ پر کچھ مہمل، بے معنی، بے ربط فقرے آپ کو دکھائی دیں گے۔ یہ دونوں طرح کے صفحے جس عقلمند آدمی کے سامنے رکھ کر دریافت کیجیے۔ وہ فوراً فیصلہ کر دے گا کہ پہلا کاغذ ایک پڑھے لکھے اور سمجھ دار آدمی کا ٹائپ کیا ہوا ہے اور دوسرے کاغذ کا ٹائپ کرنے والا ان پڑھ بیوقوف ہے۔ اگر ایک ہزار اندھے اور جاہل لاکھوں کاغذ سیاہ کرنا چاہیں کہ غالب کی غزل کا صرف ایک نسخہ بالکل صحیح صحیح ٹائپ کریں تو ہرگز ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے، کیوں کہ ان کے پاس علم اور آنکھوں میں روشنی نہیں ہے جہاں کہیں کسی عقل مند آدمی کے سامنے وہ پہلا کاغذ آئے جس پر غالبؔ کی غزل صحیح طور پر ٹائپ ہے وہ اسے دیکھ کر بغیر سوچ بچار کیے کہہ دے گا کہ اسے کسی پڑھے لکھے آدمی نے پورے عقل و شعور اور ارادہ و اختیار کے ساتھ ٹائپ کیا ہے۔ وہ ہرگز اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کرے گا کہ کسی جاہل اور اندھے شخص کے بغیر سوچے سمجھے ٹائپ رائٹر کے بٹنوں پر انگلیاں مارتے رہنے سے یہ غزل اس کاغذ پر چھپ گئی ہے۔ یہ بھی وہ تصور نہیں کر سکتا کہ کسی ناسمجھ کمسن بچے کو یہ مشین کمرے میں اکیلی مل گئی۔ اس نے اس سے کھیلنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں یہ غزل اس کاغذ پر ہمارے سامنے آ گئی ہے۔

۲۔ یہ تحقیق، ریسرچ اور کھوج کا زمانہ ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا مشغلہ زمین کی کھدائیاں کرنا، اونچے اونچے ٹیلوں کے دلوں میں اتر کر ان کی تہوں کا جائزہ لینا۔ ان کھدائیوں کے بعد زمین کے سینے میں جہاں انھیں کالے پتھر ملتے ہیں وہاں زنگ خوردہ، گھسے ہوئے ہتھیار اور طرح طرح کے برتن بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی دیواریں ان پر مٹے مٹے نقش و نگار، موٹے موٹے مضبوط کھمبے، مخصوص طرز کی محرابیں اور نہ جانے کیا کیا چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ غیر معمولی شوق اور انتہائی باریک بینی سے ان کے معائنے میں لگ جاتے ہیں۔ ان آثار کی پیشانی پر انھیں گذشتہ قوموں کا تمدن چمکتا نظر آتا ہے۔

۳۔ جب فلکیات کے ماہرین عظیم الشان دوربینوں کے ذریعے کرۂ مریخ کے مناظر اور اس کی سطح پر سفید سفید لہراتی ہوئی لکیریں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ اس کرے میں کوئی انتہائی مہذب اور متمدن قوم رہتی ہے جو ہماری طرح کھیتی باڑی کرتی ہے اس نے اپنی کھیتیاں سینچنے کے لیے باقاعدہ نہریں تیار کی ہیں۔

ان مذکورہ مثالوں کی روشنی میں ایک عمومی اور ہمہ گیر اصول بن پڑتا ہے، وہ یہی کہ جب کسی چیز کی شکل و صورت اور ساخت سے پتہ چلے کہ اس کے وجود کا کوئی مقصد ہے جس کے مطابق اس میں نظم و ترتیب ہے تو اسے بلاشبہ کسی ایسے شخص کی کارگزاری ماننا پڑے گا جو سوچ سمجھ کر ارادے و اختیار کے ساتھ اسے وجود میں لایا ہے۔ اس کے برخلاف ہر وہ چیز جس کے وجود کا کوئی مقصد نظر نہ آئے اس کے مطابق اس میں نظام اور ترتیب دکھائی نہ دے۔ اس کے بجائے اس میں بدنظمی اور بے ربطی نظر آئے وہ اتفاقات کا نتیجہ، یعنی اس کا کوئی ایسا سبب قرار دیا جائے گا جو عقل و شعور کی صفت سے محروم ہو۔

------*---*---*---*---*---*

کھلے ہوئے بٹوے میں اتنی دولت کبھی نہیں داخل ہوتی جتنی کھلے ہوئے ذہن میں۔

*

سب سے مفلس آدمی وہ ہے جو کسی مقصد کے لیے نہ جیے۔

(البرٹ شویٹزر۔ مشہور خادم خلق)

*

بیشتر مسکراہٹیں کسی دوسری مسکراہٹ سے شروع ہوتی ہیں۔

*

اچھی رائے حاصل کرنے کے لیے بہت سے افعال درکار ہوتے ہیں، اسے کھونے کے لیے صرف ایک۔

------*---*---*---*---*

عقل اور نظم کا واسطہ

نظم و ترتیب کسی مقصد اور غرض کے ماتحت کسی شے کا ہونا یہ کیوں بتاتا ہے کہ اسے کسی عقل و شعور اور ارادے کی مالک طاقت نے بنایا ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ بے شک ایسا ہی ہے کہ جہاں بھی کسی چیز کے وجود میں نظم و ترتیب، مقصد و غرض دکھائی دیا انسان فوراً بلا غور کیے فیصلہ کر دیتا ہے کہ اس کا موجد علم و شعور، ارادے و اختیار والا ہے۔ یہ اس کا ایک ایسا عقلی فیصلہ ہے جس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ دلیل سے بے نیازی کے باوجود اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اسے بے استدلال چھوڑ دیا جائے۔ براہِ مہربانی مندرجہ ذیل نکات کی طرف توجہ فرمایئے۔

۱۔ صاف سی سیدھی بات ہے کہ جس طرح کسی چیز کا نہ ہونے کے بعد ہونا یہ بتاتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے۔ اسی طرح اس کے صفات اور خصوصیات موثر کے اوصاف اور خصوصیات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ پہلے عرض کیا گیا کہ انسان کی بے آلائش فطرت کا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی چیز خود بخود بغیر کسی علت اور سبب کے عدم سے وجود میں نہیں آتی ہے۔ جب ہمیں کوئی موٹر کسی چوڑی، چکنی سڑک پہ دوڑتی نظر آتی تو وہ بزبانِ حال کہتی کہ مجھے کسی نے بنایا ہے، میں خود بخود وجود میں نہیں آگئی ہوں۔ یوں ہی اس موٹر کی خصوصیات بھی اس بات کی پرزور گواہی دیتے ہیں کہ ان کا موجد ان تمام فنون سے واقف ہے جن کا تعلق موٹر بنانے کی صنعت سے ہے۔

میر انیس کا مرثیہ سامنے آنے کے بعد جس طرح کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ادبی شاہکار اتفاقی طور پر خود بخود وجود میں آگیا ہے۔ اس طرح اس کی خصوصیات مثلاً گھوڑے اور تلوار کی تعریف یہ بتاتی ہے کہ میر انیس شہسواری اور سپہ گری کے فن سے واقف تھے۔ ان کے مرثیوں کے بیشتر حصے گواہی دیتے ہیں کہ وہ انسانی نفسیات سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ ہرگز کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ادبی شاہکار ایسے آدمی کے افکار کا نتیجہ ہے جسے اردو زبان کے خصوصیات کا بالکل پتہ نہ تھا، جسے واقعہ نگاری کے اصول رتی بھر معلوم نہ تھے یہ مرثیے اتفاقاً اس کے زبان و قلم سے نکل گئے ہیں۔

یقیناً ہر انشا پرداز کا مضمون، ہر خطیب کی تقریر بلکہ ہر انسان کا فعل اس کے معلومات کا درجہ، اس کے اوصاف، اس کے نفسیات اس کی صلاحتیں بتاتا ہے۔ کسی چیز کا حکیمانہ نظم و ترتیب انتہائی صریح اور واضح طور سے گواہی دیتا ہے کہ اس کو وجود میں لانے والا عقل و شعور، ارادے اور اختیار، طاقت اور اقتدار، فنی مہارت اور استادی کا مالک ہے۔

۲۔ یہ بات ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ انتخاب کرنا عقل و تدبر کی نشانی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی باقاعدہ عمارت بنانے کے لیے ہر قسم کے مسالے سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس کے واسطے خاص طرح کا ساز و سامان درکار ہے۔ مثلاً ایک شاندار کوٹھی کی تعمیر کے لیے لوہے، گٹے، سیمنٹ، مورنگ، بالو اور لکڑی کی ضرورت ہے کھال، اون، کاغذ، دفتی، کھانے پینے کی چیزوں سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ بھی یقینی ہے کہ عمارتی سامان کی ہر مقدار مقصد کے لیے مفید نہیں ہے۔ ہر چیز کی مخصوص اور معین مقدار ہونا چاہیے۔ اگر پانچ حصہ سیمنٹ اور ایک حصہ بالو ملا کر یا خالص سیمنٹ کا مسالہ تیار کیا جائے تو غالباً وہ کارآمد نہ ہوگا۔ یونہی لوہے کو سریوں کی صورت میں اور لکڑی کو دروازے کھڑکیوں کی صورت میں ہونا چاہیے۔ گٹے بھی خاص طرح سے رکھے جائیں گے تب جا کے عمارت تیار ہوگی۔ اگر ہزاروں ٹن لوہا کیلوں کی شکل میں اور لکڑی لٹھوں کی صورت میں، گٹوں کو ہر جگہ کھمبوں کی شکل میں جوڑ دیا جائے تو نہ سلیب لگ سکیں گے، نہ دیواریں کھڑی ہو سکیں گی، نہ کہیں ڈاٹیں بن سکیں گی، نہ دروازے اور کھڑکیاں وجود میں آئیں گی۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ لگ جانے کے بعد بھی عالی شان کوٹھی کا ذکر کیا، معمولی سا جھونپڑا بھی نہ بن سکے گا جس میں انسان اپنا سر چھپائے اور زندگی بسر کرے۔

کسی عمارت کے دیکھنے کے بعد یہی خاص طرح کا سامان، اس کی مخصوص مقدار، اس کی معینہ کیفیت اور شکل و صورت وہ ہے جس سے ہمیں پتہ چلتا

ہے کہ اس کے بنانے میں کسی صاحب عقل وشعور کاریگر اور انجینیر کا ہاتھ ہے۔ دنیا میں ہر طرح کا سامان موجود ہے وہ سب کو چھوڑ کر عمارتی سامان مہیا کرتا ہے، پورا گودام نہیں ڈھولاتا، بقدر ضرورت رفتہ رفتہ لاتا ہے، پھر اسے اسی صورت میں تبدیل اور مرتب کرتا ہے جس کے نتیجے میں ایک ایسی عمارت وجود میں آسکے جو ہر موسم میں رہنے کے قابل ہو، جس سے ہمارے تمام ضروریات پورے ہوں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ان چاروں مرحلوں میں سے کسی ایک مقام پر بھی عقل وشعور، فنی واقفیت اور کارگزاری کا دخل نہ ہو۔ بلکہ ہم بے اتفاقات کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں جو ہمارے مقصد سے میل کھاتے ہوں یا اپنا کام اناڑی لوگوں سے لینا چاہیں تو کبھی ہماری آرزو پوری نہیں ہوگی۔ تمام سامانوں کو چھوڑ کر عمارتی سامان کا انتخاب، اس کی مخصوص مقدار، مخصوص کیفیت، خاص طرح سے اسے مرتب اور منظم کرنا، ان میں سے ہر مرحلہ عقل وتدبر، ارادہ واختیار، علم وحکمت اور فنی مہارت کے سایے میں اٹھایا جاتا ہے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جنھیں دیکھ کر بغیر کسی غور وخوض کے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ہر منظم اور مرتب چیز جس کی شکل وصورت بتائے کہ اس کے وجود کا کوئی خاص مقصد ہے۔ ایسے سبب کی کارگزاری کا نتیجہ قرار پائے گی جس کے پاس عقل وشعور، علم وارادہ سب کچھ ہو۔

۳۔ فرانس کے مشہور ومعروف دانشور بلز پاسکال BLAISE PASCAL نے ۱۶۵۴ء میں 'حساب احتمالات' ایجاد کیا جس سے بہت سے علوم وفنون میں، خصوصیت سے فزکس کے مسائل میں بڑا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اس "حساب احتمالات" سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کوئی منظم اور مرتب چیز خود بخود وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اسے کسی صاحب عقل وشعور طاقت نے اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا کیا ہے۔

حساب احتمالات کی توضیح اور تفصیل یوں ہے:

فرض کیجیے کہ ایک بلند پایہ علمی کتاب ہمارے سامنے ہے جس کی ضخامت سو صفحے کی ہے۔ ہم نے اس کی جلد کو پھاڑ کر اس کے ترتیب دیے ہوئے ورق کو تتر بتر کر دیا، پھر اسی غیر مرتب صورت میں کسی اندھے، ان پڑھ شخص کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ دوبارہ انھیں ترتیب وار کتابی شکل میں قرار دے دے۔ چوں کہ وہ جاہل اور اندھا ہے، اس لیے وہ اُن میں سے ایک ورق اُٹھائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا پہلا ورق ہونا سو احتمالوں میں سے ایک احتمال ہے۔ وہ جاہل، اندھا یہ ورق جس نمبر کا بھی ہو اُسے اُٹھا کر الگ رکھ دیتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ ایک ورق اس امید سے اُٹھاتا ہے کہ وہ کتاب کا دوسرا ورق ہو اس کے دوسرے ورق ہونے کا احتمال ۹۹ احتمالوں میں سے ایک ہے۔ اس بنا پر یہ بات کہ ایک اور دو کے نمبر ترتیب کے ساتھ قرار دینے میں یہ جاہل اور اندھا شخص کامیاب ہوجائے، دس ہزار احتمالوں میں سے ایک ہے۔ یعنی $\frac{1}{100} \times \frac{1}{100} = \frac{1}{10000}$، ان دس ہزار احتمالوں میں سے ایک مطابق واقع ہے۔ یہ وہ صورت ہے جب کہ اس اندھے، جاہل شخص نے پہلی مرتبہ ورق نمبر ۱ اور دوسری دفعہ ورق نمبر ۲ اُٹھایا ہو۔ اسی طرح اگر پھر وہ آدمی کوئی ورق، ورق نمبر ۳ اٹھانے کی غرض سے اُٹھائے تو اس کی کامیابی کا احتمال ۹۸ احتمالوں میں سے ایک ہے۔ یعنی پہلے، دوسرے اور تیسرے ورق کا ترتیب وار نکل آنا دس لاکھ احتمالوں میں سے ایک احتمال ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اس بات کا احتمال کہ یہ بیچارہ جاہل، نابینا شخص اتفاقی طور پر اس سو صفحہ کی کتاب کو دوبارہ پہلے کی طرح ترتیب دے دے تقریبا غیر محدود احتمالوں میں سے ایک کمزور سا احتمال ہے۔

اگر کوئی شخص کسی مرتب اور منظم چیز کے متعلق یہ دعویٰ کرے اتفاقی طور پر ہے تو اس احتمال کو مذکورہ "حساب احتمالات" کے ذریعے انتہائی کمزور کیا جا سکتا ہے۔ غور فرمائیے اور منصف مزاجی، غیر جانبداری، آزاد خیالی سے غور فرمائیے۔

کچھ نہ کرنا پڑے، اس کے لیے بعض لوگ سب کچھ کر گزرتے ہیں۔

*

مصنف کا انتخاب اسی طرح کرو جیسے دوست کا۔

*

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کامل باہمی محبت پہلے پوتے یا پوتی کے آنے کے بعد آتی ہے
(ایک ویلش کہاوت)

*

لوگ ان لوگوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں جن کے سامنے انھیں جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔
وکٹر ہیوگو (فرانسیسی فلسفی)

ڈاکٹر فوق کریمی

ذریعۂ تعلیم کے بارے میں

۱۵ر مئی ۱۹۸۴ء کے تہذیب الاخلاق کے شمارے میں جناب
ترم ڈاکٹر نورالحسن نقوی کا ایک مضمون بعنوان "ایک اہم مسئلہ ذریعۂ
لیم" شایع ہوا ہے۔ اس مضمون میں نقوی صاحب نے ذریعۂ تعلیم کو مادری
بان میں رائج کرنے کی افادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور
پنے دلائل کو مستحکم بنانے کے لیے جو نکات موصوف نے پیش کیے ہیں وہ
می وزن رکھتے ہیں اور ارباب تعلیم کو متوجہ کرتے ہیں۔

نقوی صاحب اپنے دلائل میں فرماتے ہیں" اصل موضوع پر
نے سے پہلے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ اب تعلیم کا حجم بہت بڑھ گیا ہے۔
ی لیے ہر ملک میں پرائمری سے پہلے دو درجوں نرسری اور کے جی کا
نافذ کر دیا گیا ہے اور یہ تجربہ کامیاب ہے یعنی تعلیم پانچ برس کی عمر کے بجائے
ب تین برس کی عمر میں شروع ہو جاتی ہے۔ اس نظام کو اپنایا تو ہم نے
بھی مگر اس کی صورت بگاڑ دی۔ جوں ہی بچے نے نرسری کلاس میں قدم
رکھا ہم نے فوراً اس کے ہاتھ میں قلم تھما دیا اور اس سے لکھنے پڑھنے کی
توقع کرنے لگے۔ اگر نرسری کا استاد یہ جانتا ہے کہ اسے ان ننھے بچوں
کو کیا اور کس طرح سکھانا ہے تو وہ عمر کی اس منزل میں اور تعلیم کی اس
سطح پر بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ اس عمر میں بچہ جو کچھ سیکھ لیتا ہے اسے
وہ کوشش کرے تو بھی ساری عمر بھلا نہیں سکتا۔ گویا نرسری کی تعلیم
آئندہ تعلیم کی پہلی اینٹ ہے اور اسے بہت سلیقے سے رکھا جانا چاہیے۔

گویا تعلیم کی پہلی اور سب سے اہم منزل ہے۔ زبانی تعلیم اور
یہ نہ ہو تو بچے کی ذہنی نشو و نما رک جائے اور اس کا آغاز بلا تاخیر اسی
لمے ہو جانا چاہیے جب بچہ کچھ پوچھنے اور سمجھنے کے لائق ہو جائے۔ ماہرین
نے یہ عمر ڈھائی تین برس متعین کی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ نرسری
کا طالب علم یعنی ڈھائی تین برس کا بچہ سوال پوچھے گا تو وہ کس زبان میں
اور جواب سمجھے گا تو کس زبان میں۔ انگریزی میں؟ بے شک اگر آنکھ کھلتے
ہی اس نے گھر میں انگریزی کا ماحول دیکھا اور اگر اس کے کان میں
پڑنے والا پہلا لفظ انگریزی ہی کا تھا تو یہی زبان اس کے لیے مناسب
ہوگی۔ آپ مجبور رہیں کہ بچے سے بات کریں تو وہ زبان استعمال کریں
جس کو وہ سمجھتا ہے۔ اگر آپ یہ نہ کریں تو بچے کے ذہن و دل کے نزدیک
نہیں پہنچ سکتے اور وہاں تک رسائی نہ ہو تو اسے کچھ سکھانے کچھ بتلانے کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حیرت ہے اور حیرت سے زیادہ افسوس ہے کہ تعلیم یافتہ والدین ا
چھوٹے چھوٹے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں داخل کر کے مطمئن ہو جا
ہیں کہ وہ سرخرو ہو گئے اور یہ نہیں دیکھتے کہ انھوں نے ان معصوموں کے سا
کتنا بڑا ظلم کر دیا۔ آج کتنے گھرانے ہیں جہاں بے تکلف انگریزی بولی جاتی ہ
نتیجہ یہ کہ بچہ انگریزی سمجھ نہیں سکتا اور جو زبان بول سکتا اور سمجھ سکتا ہے
کا چلن نہیں۔ انگلش میڈیم اسکولوں میں پانچ چھ سال کی یہ مدت کس ط
گزرتی ہے؟ انگریزی حروف و اعداد لکھنے رٹنے اور ڈرل میں صرف
ہے۔ یہ نام نہاد انگلش میڈیم اسکول جو اسکول کم اور روپیہ بٹور
چمکتی دمکتی دوکانیں زیادہ ہیں۔ انھیں اپنی فیس سے غرض ہے، ہمار
بچوں کے مستقبل سے انھیں کیا سروکار!

نتیجہ صرف یہ نہیں کہ ہمارے بچے کی زندگی کے کم از کم چار
برس برباد ہو جاتے ہیں بلکہ زیادہ غم اس بات کا ہے کہ یہ چار پانچ بر
اس کی ذہنی صلاحیتوں کو پامال کرنے میں صرف ہوتے ہیں۔

پھر نقوی صاحب اپنے مضمون میں انگلش کی اہمیت کا اعتراف د
کی زبان میں اس طرح کرتے ہیں

"انگریزی کی حمایت میں تین باتیں خاص طور پر کہی جاتی ہ
پہلی تو یہ کہ انگریزی ایک عالمگیر زبان ہے اس سے واقف نہ ہوں تو سا
دنیا سے ہمارا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ کتابوں کا جتنا ذخیر
انگریزی زبان میں ہے خاص طور پر سائنسی علوم کا وہ کسی اور زبا
موجود نہیں ہے۔ اور تیسرے یہ کہ کچھ تو بات ہے کہ ہر میدان میں ا
اسکولوں سے نکلے ہوئے بچے ہی آگے نظر آتے ہیں۔ یہ محض غلط فہم
کہ انگریزی سے ناواقف ہوں تو دنیا سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا
سائنس اور ٹکنالوجی میں جو ترقی ہو رہی ہے اس سے ہم بے خبر رہ جا
گے۔ جاپان میں انگریزی جاننے والے نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن صنعت میں
نے بڑے بڑے ملکوں کو پچھاڑ دیا ہے"۔

اس طرح مختلف ملکوں کی ترقیاتی ذرائع کا ذکر نقوی صا
نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ جنھوں نے اپنی مادری زبان کے ذریعے ا
سے صرف نظر کرتے ہوئے ترقی کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انسان ص

اپنی مادری زبان کے ذریعے ہی ترقی کر سکتا ہے بلکہ جدید علوم بھی حاصل کرنے میں اسے کسی قسم کی کوئی دشواری بھی نہیں ہوگی۔

تمام دنیا کے دانشور اور ہر قوم کے ماہر تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی اپنی مادری زبان ہی کے ذریعے دی جائے اور اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ ہر قوم اور ہر ملک کے باشندوں کی ان کی اپنی مادری زبان ایک فطری عطیے کا درجہ رکھتی ہے جو انسان کو ہر شعبۂ حیات میں قدم بہ قدم ارتقاء کی طرف لے جاتی ہے۔ دوسرے دنیا کی مہذب اور ترقی یافتہ قومیں اپنی زبان اپنی تہذیب اور اپنے کلچر ہی کی بدولت دوسروں کی نگاہوں میں مفتخر سمجھی جاتی ہیں۔ جو قومیں اپنی زبان اور اپنی تہذیب اور اپنے کلچر ہی کی بدولت دوسروں کی نگاہوں اور تہذیب و کلچر کو اپناتی ہیں وہ دنیا میں کبھی سرفرو نہیں ہو سکتیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی نے پولینڈ پر بمباری کی اور جرمنوں کو پولینڈ پر تسلط حاصل ہو گیا تو جرمن فاتح قوم نے پولینڈ کے باشندوں کو پولی زبان پڑھنے کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اس کے باوجود پولینڈ کی عورتیں تہہ خانوں میں چھپ چھپ کر اپنے بچوں کو اپنی زبان میں تعلیم دیتی تھیں۔ آج بھی دنیا کی ہر ترقی یافتہ قوم اور ملک اپنی اپنی زبان کے ذریعے ہی متمدن بنا ہے۔ جرمنی جاپانی، امریکی، چینی، فرانسیسی، روسی، اطالوی۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی زبان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ہندوستانی ہیں کہ وہ آج بھی مغربی تہذیب و زبان کو اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ احساس کمتری غلامی کے دور کی نشاندہی کرتا ہے۔

جب ہمارے ملک کے حکمراں ہمارے آقا انگریز تھے تو اس وقت ہندو اور مسلمانوں میں وہ خاندان لائق احترام اور مہذب سمجھے جاتے جن کے یہاں انگریزی زبان، انگلش کلچر ان کے لباس اور وضع قطع سے ظاہر ہوتا تھا اور وہ لوگ زندگی کے ہر شعبے میں اپنے آقا انگریزوں کی تقلید کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے اور ہندوستانی طرز معاشرت کو حقارت سے دیکھتے تھے۔

بابائے ملت سرسید نے انگریزوں سے دوستی بھی کی اور ان کی بڑائی بھی کی۔ ان کے علوم کو اپنی قوم کی ترقی کے لیے ضروری بھی قرار دیا اور انگریزوں کی بہت سی باتوں کو اپنی عملی زندگی میں شامل بھی کیا لیکن اپنی تہذیب اپنی زبان اپنے کلچر کی انفرادیت برقرار رکھی۔ انھوں نے اپنی قوم کو مغربی قوموں کے علوم کو اپنانے کا مشورہ تو دیا مگر مشروط دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مغربی علوم کو اس طرح اپنایا جائے کہ دائیں ہاتھ میں قرآن کریم اور بائیں ہاتھ میں سائنس ہو اور سر پہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہو۔ یہ تھی سرسید کی شرط۔ مغربی علوم کو اپنانے کی، دوسرے مادری

زبان کے سلسلے میں تو ان کی رائے بڑی واضح تھی۔ انھوں نے متعدد موقعوں پر اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کا ایک اقتباس ہم ذیل میں دیتے ہیں۔

"جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنا تک ان ہی کی زبان میں ان کو دیے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھود دی جائے۔ اگر تمام علوم ہندوستان کو اس کی زبان میں نہ دیے جاویں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی کا درجہ نصیب نہ ہوگا۔" سرسید

سرسید نے مسلمانوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنے کے لیے جب ایم۔ اے۔ او۔ کالج کھولا تو اس کالج میں جدید علوم کے ساتھ مادری زبان اردو اور ہندی کو حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا۔

ان کے زمانے میں کالج کی انتظامیہ میں سارے کام اردو ہی میں انجام دیے جاتے تھے اور جب کالج یونیورسٹی بنا اور اس کے وائس چانسلر شاہ سلیمان مقرر ہوئے تو آپ نے یونیورسٹی کے ہر دفتر میں اردو ٹائپ رائٹرز کا انتظام ایسے ہی کیا جیسے آج دفاتر میں انگلش ٹائپ رائٹر نظر آتے ہیں۔

سرسید کے ذہن میں ہندوستانی زبانوں اور خاص طور پر اپنی مادری زبان کو ترقی دینے کے لیے ایک اور تجویز ورناکیولر یونیورسٹی کی تھی۔ وہ ایک ایسی یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے جس میں جدید علوم بھی مادری زبانوں کے ذریعے ہی پڑھائے جائیں مگر افسوس کہ ان کی یہ تجویز پوری نہ ہو سکی۔ اس تجویز ہی کی ایک عملی شکل ہمیں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے قیام سے ملتی ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جدید علوم سائنس، ٹیکنالوجی یا میڈیکل بغیر انگلش پڑھے یا بغیر انگلش کتابوں کے نہیں حاصل ہو سکتے۔ اس دعوے کو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے ختم کر دیا تھا۔ اس یونیورسٹی میں تمام جدید علوم اردو زبان کے ذریعے ہی پڑھائے جاتے تھے اور اس کا کیا معیار تھا۔ اس سلسلہ میں ہم دو واقعے بیان کرتے ہیں پہلا واقعہ تو ڈاکٹر چنا ریڈی سابق گورنر اترپردیش سابق وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش کا ہے۔ راقم الحروف نے حیدرآباد میں ڈاکٹر چنا ریڈی سے دوران گفتگو یہ سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے ایم بی بی ایس کیسے کیا اس وقت ایم۔بی۔بی۔ایس میں میڈیم کیا تھا۔ تو ڈاکٹر صاحب

نے فرمایا کہ میں نے تمام مضامین ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے اردو زبان ہی
یں پڑھے تھے اور مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا واقعہ ابھی
چند روز پہلے کا ہے اور وہ اس طرح اخبار میں آیا ہے کہ ایک صاحب
ڈاکٹر محمد شفقت حسین صدیقی ستارہ امتیاز پاکستان سے حیدرآباد آئے
نھوں نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ ان کی ابتدائی اور جامعاتی تعلیم ان کی
مادری زبان اردو میں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے انھوں نے بی۔ ایس سی
ایم۔ ایس سی میں امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۶ء
وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا (Chemistry) کے تدریسی فرائض
تر انجام دینے کے بعد شکاگو یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے گئے۔ وہاں
تلیم سے ایم۔ ایس سی اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور کچھ عرصے
شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر صاحب شکاگو
سے پاکستان چلے گئے اور وہاں پشاور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ کیمیا کی حیثیت
سے تقرر ہو گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے پشاور کے انجینئرنگ کالج کے پہلے
پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ موصوف نے انجینئرنگ کالج اور
نے شعبہ کیمیا پشاور یونیورسٹی کو اس طرح منظم کیا کہ یہ دونوں ادارے پاکستان
میں اعلیٰ تعلیم کا سرچشمہ بن گئے۔ خصوصاً پشاور یونیورسٹی کا شعبۂ کیمیا اس
ماوقت ایشیا کا سب سے بہترین ادارہ تصور کیا جانے لگا۔ ۱۹۷۵ء میں توانائی
بے کے بحران کے پیش نظر حکومت پاکستان نے توانائی کے میدان میں تحقیق
اور ترقی کے لیے ایک نیا ادارہ ہائڈروکاربن ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ
قائم کیا اور ڈاکٹر صاحب کو اس ادارے کا پہلا چیرمین مقرر کیا۔ ڈاکٹر
صاحب کی سائنس اور تعلیمی میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں
۱۹۸۰ء میں صدر پاکستان نے ستارہ امتیاز کا اعزاز عطا کیا اور
مغربی جرمنی کی حکومت نے ڈاکٹر صاحب کی سائنس اور تعلیمی خدمات کو
تسلیم کرتے ہوئے اپنے صدر - Theodore Heuss کا میڈل
عطا کیا۔ ۱۹۸۲ء میں انرجی سوسائٹی آف پاکستان نے ڈاکٹر صاحب کو
توانائی کے میدان میں کامیاب تحقیق کے اعتراف کے طور پر گولڈ میڈل
عطا کیا۔ ڈاکٹر صدیقی اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ تاہم وہ اب بھی پاکستان
اور بیرون پاکستان کے مختلف ممالک کے سائنسی اداروں سے بحیثیت اعزازی
رکن اور فیلو وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد شفقت حسین صدیقی ہمارے لیے ایک درخشاں مثال
ہیں۔ انھوں نے اور ڈاکٹر جینا ریڈی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر مادری
زبان میں سائنس کی تعلیم دی جائے تو وہ کسی بھی طالب علم کی ترقی کے لیے
رکاوٹ نہیں بنتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مادری زبان کی تعلیم اس کی علمی بنیادیں
مستحکم بنا دیتی ہے اور مادری زبان میں تعلیم بڑی آسان ہوتی ہے اور
اپنی زبان میں بچہ کسی بھی پیچیدہ سے پیچیدہ بات کو سمجھنے اور یاد رکھنے میں
کسی قسم کی پریشانی محسوس نہیں کرتا۔ جیسے کسی بچے کو انگریزی اص
میں بتایا جائے کہ Entropy اس کا مطلب ہے کہ زمیں
سے پرانی اور استعمال کے ناقابل ہو جاتی ہے۔ اسے اردو کی اصطلا
سہل تر اس طرح بنا دیا گیا کہ "ناکارگی" کہا جائے تو اس کا
واضح ہو جاتا ہے اور بچے کے ذہن میں ENTROPY جیسے ثق
کے تلفظ کے مقابلے میں ناکارگی آسانی سے سما سکتا ہے۔

پاکستان میں عام طور پر جدید علوم کالجوں اور یونیور
میں اردو ہی کے ذریعے پڑھائے جاتے ہیں اور یہ آسانیاں ا
عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعے سے حاصل ہو گئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی
متحدہ ہندوستان میں واحد یونیورسٹی تھی جس کا ذریعۂ تعلیم ارد
اردو کے ذریعے اس یونیورسٹی میں تمام جدید علوم پڑھائے جات
بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ترا
نگراں اور سربراہ تھے۔ آپ نے اپنی نگرانی میں ایک ماہرین زبا
ایسا بورڈ بنایا تھا جس میں ملک کے بڑے بڑے لائق ماہرین
جمع ہو گئے تھے۔ اس ادارے کی نگرانی ہی میں لاکھوں سائنس
انگلش کی اصطلاحوں کو اردو کا قالب دیا گیا تھا۔ افسوس ہے
کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔ اب زبان ارد
نہ اردو ذریعہ تعلیم ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے اپنے مضمون میں مادری ز
اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے زور دیا ہے کہ ہمارے نرسری
اسکولوں میں بچوں کو مادری زبان کے ذریعے تعلیم دی جائے
کالجوں اور یونیورسٹی کے معیار پر بھی اگر ہم ذریعۂ تعلیم کو اپنی
زبان اردو، ہندی (یا جو بھی آپ کی زبان ہے) میں اپنا لیں تو
بچے آج کے سائنس کے ترقی یافتہ دور میں پیچھے نہیں رہیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی بات اپنی جگہ وزن رکھتی ہے اور ہمیں اپ
زبان کو ضرور اپنانا چاہیے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مادری ز
اردو ہے اور یہاں ہم اپنی حیثیت سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس
ہمیں پہلے یہ سوچنا ہوگا کہ ہمیں کن کن دشواریوں سے گزرنا پڑے
پہلی بات تو یہ ہے کہ آزادی کے ۴۰ سال کے درمیان جو دو نسلیں
ماؤں کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہیں وہ اردو کے نام پر گونگی
بہری پیدا ہوئی ہیں۔ ۴۰ سال کے درمیان جن بچوں نے مدرسوں
کالجوں میں تعلیم حاصل کی ہے وہ ہندی میڈیم کے ذریعے حاصل کی
جب یہ بچے کالجوں سے نکل کر یونیورسٹیوں میں پہنچتے ہیں تو یہ اپنی
زبان کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال مسلم یونیورسٹی ہے۔
ملک کے مختلف کالجوں سے جو لڑکے آتے ہیں، وہ مادری زبان

ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ دینیات جیسے مضمون کے ...ن میں کاپیاں اسّی فی صدی ہندی میں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کے ...ہ ڈاکٹر نورالحسن صاحب جیسے خیالات کے لوگوں نے پرائمری اسکولوں ذریعہ تعلیم اردو رکھا تو اُن کے لیے دشواری یہ ہے کہ انھیں کورس ...تابیں اردو میں نہیں ملتی ہیں۔ اِدھر اُدھر کوشش اور درد ملت درد ...کے اظہار کے بعد دو چار کتابوں کا انتظام ہو بھی گیا تو پھر معاملہ آگے بڑھنے ...ک جاتا ہے۔ دور کیوں جایئے یونیورسٹی ہی کو دیکھ لیجیے کہ اسکول میں ...تابیں اردو کی کورس میں ضروری ہیں وہ بھی طلباء کو وقت پر نہیں ...ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز نے جو مضامین ہائی اسکول ...ی یونیورسٹی اور بی۔ اے میں پڑھانے کے لیے منظور کیے ہیں ان پر ...کی اردو کی کتاب دستیاب نہیں ہوتی۔ اس بات کو اسلامک اسٹڈیز ...اساتذہ اچھی طرح جانتے ہیں مگر دس سال سے آج تک کوئی انتظام نہیں ...ہوسکا۔

پرائمری اسکولوں نرسری اسکولوں اور انگلش اسکولوں کی ...م ہر حید نافص ہے اور یہ مسلمان بچوں کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ...۔ پھر بھی مسلمان اِن اسکولوں کو اہمیت دے رہے ہیں اور اپنے ...وں کو اِن اسکولوں میں داخلے کے لیے ہزار ہزار روپے بھی خرچ کرتے ہیں ...لائن میں بھی لگتے ہیں۔ ان اسکولوں میں چاہے ہندی میڈیم ہو یا انگلش ...کی کتابوں کی سیریز بڑی آسانی سے بازار میں مل جاتی ہے۔ نرسری ...لوں اور پرائمری اسکولوں کے شہروں اور قصبوں میں جال بچھا ہوا ہے ...ر اسکول کاروباری طور پر کامیاب ہیں۔ ان سے زیادہ وہ اسکول جو ...ہمارے ہٹ کر مشن کے طور پر پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ...پھیلتے جارہے ہیں وہ ہیں راشٹریہ سیوک سنگھ کے ششو مندر پرائمری ...نرسری اسکول۔ ان اسکولوں کا تمام ملک میں جال پھیلایا جارہا ہے۔ ...ان میں صرف ایک ہی آئیڈیالوجی کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہ ہے ...ملک کے دوسرے فرقوں کے درمیان نفرت۔

نقوی صاحب نے جس بات کا اظہار اپنے مضمون میں کیا ہے اس ...بڑی سنجیدگی کے ساتھ ارباب دانش اور ماہرین تعلیم کو فوراً توجہ کرنے ...کی ضرورت ہے۔ ۳۰ سال میں جو کچھ کھویا تھا وہ کھو دیا اس پر ماتم کرنے ...اور حکومت کو شکوہ شکایت کا نشانہ بنانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اب ...یہ وقت ہے کہ مادری زبان میں جو حکمت کارفرما ہے اسے لوگ سمجھیں ...تو بڑا کام ہوسکتا ہے۔

حکومت اترپردیش نے ازراہ سیاست یا ہمدردی اردو ...والوں کے آنسو پونچھتے ہوئے اترپردیش میں سیکڑوں اردو ٹیچرس ...مقرر کر دیے۔ ان اردو ٹیچرس میں بہت کم ایسے ہیں جو اردو ٹیچنگ سے

> مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آئی کہ سرکاری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کو جوش پیدا نہیں ہوا۔ ان کو غیرت نہیں آئی۔ [illegible]

واقف ہیں۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اردو برائے نام ہی جانتے ہیں مگر حکومت کو ایسے ہی ٹیچروں کی ضرورت تھی۔ عام طور پر اسکولوں میں دیکھا گیا ہے کہ اردو ٹیچرس کے نام پر تقرر ہوا اور ان سے یا تو ہندی پڑھوائی جاتی ہے یا ایلیمنٹری حساب اور اگر ٹیچرس یہ نہیں جانتے تو انھیں کہا جاتا ہے کہ تم صرف حاضری دے جایا کرو اور اپنی تنخواہ لے جاؤ۔ یہ تو ہماری سرکار کی اردو دوستی ہے کہ بلا پڑھائے کچھ ٹیچرس کو تنخواہ بھی مل جاتی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے بقول غالب ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس وقت جو ہمارے اردگرد حلقۂ صد کام نہنگ ہے اس سے بچ کر ہم کس طرح قطرۂ نیساں کو گہر بنائیں۔ اس کے لیے ہمارے خیال میں پہلے یہ ضروری ہے کہ ایک ماہرین تعلیم کا بورڈ تشکیل دیا جائے وہ ہمارے پرائمری اور نرسری اسکولوں کا نصاب مادری زبان میں ترتیب دے اس نصاب کی روشنی میں ہم ایک ایسا مکتبہ بھی قائم کریں یا کسی ادارے کو اس پر رضامند کریں کہ وہ ہمارے نصاب کی اردو کتابیں ترتیب دلا کر انھیں شائع کرے۔ جب یہ کتابیں تیار ہو جائیں تو پھر پہلے یو۔پی اور دہلی کے کچھ علاقوں میں اس قسم کے اسکول قائم کیے جائیں۔ جہاں نرسری اور پرائمری درجات میں صرف مادری زبان ذریعہ تعلیم ہو۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ جیسے جیسے درجات بڑھائے جائیں ان میں ہندی اور انگریزی کو بھی ضروری مضامین میں شامل کیا جائے۔ بغیر ہندی اور انگریزی کے ہماری ترقی ناکام رہے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کے ساتھ ہندی اور انگریزی کو بھی چھٹے درجات میں اپنائیں۔

نرسری اور پرائمری اسکولوں میں تعلیم سے زیادہ بچوں کو تربیت کی ضرورت ہے۔ آج ہمارے ملک میں بلاشبہ یہ تعلیم پہلے ہماری حکومت نے اربوں روپے کا بجٹ بنایا ہے۔ شہر تو شہر قصبوں اور دیہاتوں تک میں کالج کھول دیے ہیں مگر جو نسل ان کالجوں سے پڑھ کر نکل رہی ہے وہ انسانیت سے دور اس لیے ہوتی جارہی ہے کہ اس کے پس منظر میں اسے تربیت نہیں ملی۔ اس لیے ضروری ہے کہ جو نرسری یا پرائمری اسکول مادری زبان کے نام پر قائم کیے جائیں ان میں ایسے اساتذہ کا انتظام بھی کیا جائے جو بچوں کو صرف تربیت دے اور تربیت میں اخلاق، رہن سہن اور آداب زندگی سب کچھ ہو تو امید ہے کہ ہمارے ایسے نرسری اور پرائمری اسکول نہ صرف ہمارے بلکہ پورے ملک اور پوری انسانیت کے لیے لائق فخر ہوں گے۔ ★

مہر الٰہی

اسٹاف سلیکشن کمیشن

یہ کمیشن نومبر ۱۹۷۵ء میں تشکیل دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں تشکیل نو کے تحت اس کا سابق نام جو سب آرڈی نٹ سروس کمیشن تھا، بدل کر اسٹاف سلیکشن کمیشن رکھا گیا۔ اس کے سپرد (Technical group 'c' (Class III کے سرکار شعبوں نیز دہلی شعبوں کی اسامیوں کے لیے بھرتی کرنا ہے۔

کمیشن کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں واقع ہے۔ ریجنل دفاتر الہ آباد، کلکتہ، گوہاٹی، مدراس اور بمبئی میں واقع ہیں۔ جو شمالی، مرکزی، مشرقی، شمالی مشرقی، جنوبی اور مغربی مراکز کہلاتے ہیں۔ دہلی علاقائی دفتر کے علاوہ ہیڈ کوارٹر کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ ہر علاقائی دفتر ایک علاقائی ڈائرکٹر اور ریجنل ڈائرکٹر کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔

اسٹاف سلیکشن کمیشن کے امتحان کے مراکز ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں ہیں جہاں تمام سال امتحانات کا سلسلہ جاری رہتا ہے

کمیشن کے مقاصد میں ایک شق یہ بھی ہے کہ ملک کے ہر حصے سے امیدواروں کا انتخاب عمل میں آسکے اور ممکنہ طور پر امیدوار اپنے ہی صوبے یا منطقے میں کھپ سکے۔ جولائی ۷۶ء میں جب کمیشن نے یہ کام سنبھالا تھا اس وقت سے اب تک نہ صرف اس کے دائرۂ کار میں بلکہ طریقۂ کار میں بڑے پیمانے پر تبدیلی آئی ہے بلکہ بہت ساری اصلاحات بھی ہوئی ہیں۔ سرکاری دفاتر کے مختلف النوع حیثیت کے اسٹاف کی بھرتی کے لیے اصول وضوابط بھرتی کرنا نیز امیدواروں کی صلاحیتوں اور بھرتی کے امتحان کے طریقوں میں قابل عمل یکساں اصولوں کو نافذ کرنے کی جامع اسکیم مرتب کرنے کا فریضہ اس کمیشن نے انجام دیا وہ یقیناً ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ کمیشن نے انکم ٹیکس انسپکٹرز سینٹرل ایکسائز انسپکٹرز، پری وینٹو آفیسرز آف کسٹمز، سالٹ اینڈ نارکوٹک انسپکٹرز اور اسسٹنٹ انفورسمنٹ آفیسرز کی بھرتی کے لیے یکساں امتحان کی اسکیم مرتب کرکے اسے کامیابی کے ساتھ نافذ کیا۔

اسی طرح مختلف وزارتوں کے شعبوں کے لیے اکونامک/اسٹیٹسٹکل انوسٹی گیٹرز کی جگہوں کے لیے مشترک امتحانی اسکیم مرتب کی۔ نیز ہندی محکموں اور ہندی اساتذہ کی بھرتی کے لیے یکساں اصولوں پر مبنی اسکیم مرتب کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

اسٹاف سلیکشن کمیشن مندرجہ ذیل طریقوں سے امتحان لیتا ہے

۱۔ براہ راست بھرتی کے لیے امتحانات [Open examinations]

۲۔ شعبہ جاتی ترقی کے لیے

۳۔ اسٹینوگرافر، وٹائپ رائٹنگ ٹیسٹ جو Periodically ترقی کے لیے منعقد ہوتے ہیں۔

اسٹاف سلیکشن کمیشن کا اپنا ایک ___ Research and analytical cell بھی ہے اس cell کا مقصد ملک اور امتحانات کے طریقوں میں تبدیلیوں سے مطابقت رکھنا ہوا امتحانات انتخابات کے طریقہ کار کا استعمال ہے۔ یہ کمیشن ملک کی سرکاری نو امیدواروں کی لاکھوں کی تعداد میں سے بہتر امیدواروں کے انتخا فریضہ انجام دیتا ہے۔

کمیشن تمام سال براہ راست امتحانات اور شعبہ جاتی ترقی امتحانات منعقد کراتا ہے ان میں کئی لاکھ امیدوار فارم بھرتے ہیں وصول کرنا، ان کو چھانٹنا، امیدواروں کو اطلاع دینا، پرچہ ممتحنوں سے رابطہ قایم کرنا، نتائج نکالنا، انٹرویو لینا بہت طے کرنی پڑتی ہیں جو آسان کام نہیں ہے۔

اس cell کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ کمیشن کو وقتاً طریقہ امتحان میں ممکنہ نظر ثانی کے لیے مشورے بھی دے۔ کمیشن امتحان میں آسانی اور سائنٹفک طریقۂ کار کے پیش نظر ۱۹۷۷ء مضامین میں Objective type test شروع کیا۔ کے لیے یہ جواز دیا جاتا ہے کہ یہ سسٹم Evaluation کے مع Disparity سے مبرا ہے۔ کاپیاں جانچنے میں کم وقت لگ نتائج کے لیے امیدواروں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن ابھی سارے مضامین میں یہ طریقہ نہیں اپنایا ہے بلکہ جنرل اسٹ انگلش و جنرل ... تک ہی اس طریقے کو محدود رکھا ہے۔

اسٹاف سلیکشن کمیشن کے تحت ملک کے جن مختلف سر اداروں اور وزارتوں کے دفاتر کے لیے کارکنوں کی بھرتی کے لیے کرانا اور انتخاب کرنا ہوتا ہے، ان کی محتاط فہرست یہ ہے۔

انڈین فارن سروس (بی) گریڈ IV

ریلوے بورڈ سکریٹریٹ سروس گریڈ II

سینٹرل سکریٹریٹ کلیریکل سروس۔ لوور ڈویژن گریڈ۔

ڈپارٹمنٹ آف پارلیامنٹری افیرز۔ لوور ڈویژن کلرک

کلرک۔ آرمی/ایر فورس/نیوی وغیرہ

دہلی ایڈمنسٹریشن، میونسپل کارپوریشن آف دہلی اور دہلی بجلی

سپلائی انڈرٹیکنگ۔

انکم ٹیکس کمشنروں کے دفاتر

کسٹم ہاوس

سالٹ کمشنروں کے دفاتر

دہلی ایڈمنسٹریشن۔ دہلی پولس اور

سرکاری و ذیلی سرکاری اداروں کے تمام ہندوستان میں پھیلے

ہوئے دفاتر۔

اس طرح یونین پبلک سروس کمیشن کے بعد یہ دوسرا بڑا ادارہ ہے جو تمام سال ملک کے مختلف حصوں کے مراکز میں اسٹاف کی بھرتی کے امتحانات منعقد کراتا ہے اور ہائی اسکول تا گریجویشن کی سطح تک اسٹاف سلیکشن کمیشن بھی یونین پبلک سروس کمیشن کی طرح سرکاری نوکریوں کے متلاشی امیدواروں کے لیے اہم ادارہ ہے جس کے امتحان کے مراکز ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو مختلف صلاحیتوں (Qualifications) رکھنے والے امیدواروں کے لیے کامیابی کا ذریعہ ہے۔ وہ گریجویٹ جن کی عمر ۱۸ تا ۲۵ سال ہے ان کے لیے یہ کمیشن نوکری کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کمیشن کے مختلف امتحانات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر ایک امتحان کے لیے تیاری اور محنت کی جائے تو اس کے دوسرے امتحانات میں بھی امیدوار بیٹھ سکتا ہے۔ مضامین و معیار میں زیادہ فرق نہیں ہے بلکہ بعض امتحانات کے مضامین مشترک ہیں۔ جیسے انگلش و جنرل نالج یا جنرل اسٹڈیز اور میتھس وغیرہ۔ (دیکھیے امتحانات نقشہ ۲)۔

اس کمیشن کے سارے امتحانات کے اشتہارات امپلائمنٹ نیوز دہلی (نیز انگریزی، ہندی اور اردو کے اہم اخبارات میں شایع ہوتے ہیں) پورے سال کے امتحانات کا پلان مرکزی دفتر یا ریجنل دفاتر سے درخواست کرنے پر حاصل ہو سکتا ہے۔

مفصل ہدایات و شرائط ہر اشتہار کے ساتھ دی جاتی ہیں۔ نیز (Application) کا نمونہ بھی اشتہار کے ساتھ دیا جاتا ہے جو شہر کے ہیڈ پوسٹ آفس سے دستیاب ہو جاتا ہے۔

پرچہ جات، نیز گائیڈ بکس، بک سیلروں کے یہاں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

اشتہار نکلنے سے پہلے ہی امیدوار کو امتحان کی تیاری شروع کر دینی چاہیے۔ کمیشن کے دفتر سے درخواست کی منظوری کی اطلاع کا

انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

★ بینکوں، بیمہ کمپنیوں اور ریلوے سروس کمیشن وغیرہ کے امتحانات بھی تقریباً اسی معیار کے ہوتے ہیں۔ اس طرح بیک وقت امیدوار صرف ایک امتحان کی تیاری کر کے کئی امتحانات میں بیٹھ سکتا ہے۔ شرط ہے کڑی محنت اور مطالعے کی!

اسٹاف سلیکشن کمیشن کے اہم امتحانات کے بارے

میں ضروری معلومات

مضامین امتحان	امتحان	اشتہار کا مہینہ	تعلیمی صلاحیت	عمر کی حد	امتحان کا نام
انگلش جنرل نالج ٹائپ رائٹنگ ٹیسٹ ۱۔ انگلش یا ۲۔ ہندی	اگست	جنوری	ہائی اسکول یا اس کے متوازی	۱۸ تا ۲۵	کلرک گریڈ
۱۔ جنرل اسٹڈیز II جنرل انگلش III ارتھمیٹک انٹرویو/پرسنلٹی ٹیسٹ	اکتوبر	اپریل (Objective type)	گریجویشن	۱۸ تا ۲۵	انسپکٹر آف سینٹرل ایکسائز۔ انکم ٹیکس وغیرہ
صرف ان امیدواروں کے لیے جو تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کریں گے					
۱۔ جنرل انگلش II جنرل اسٹڈیز مع جغرافیہ III فزکس IV میتھس	اکتوبر/نومبر	جون/جولائی [Objective and Multiple choice type]	بی۔ایس سی فزکس کے ساتھ	۱۸ تا ۲۵	سینئر آبزرور
I جنرل اسٹڈیز II جنرل انگلش III ارتھمیٹکس	دسمبر	ستمبر	ایضاً	۲۰ تا ۲۵	آڈیٹر/جونیر اکاؤنٹنٹ/یو، ڈی، سی
I جنرل انگلش II جنرل نالج III جنرل ہندی و مضمون نگاری IV جسمانی ٹیسٹ۔ انٹرویو	جنوری	ستمبر	گریجویشن	۲۰ تا ۲۵	سب انسپکٹر آف دہلی پولیس ایگزیکیٹو گریڈ II و منسٹریل دہلی ایڈمنسٹریشن

i Proficiency ٹیسٹ معاشیات یا شماریات اور میتھس میں۔ ii انٹرویو	خالی جگہ ہونے پر اشتہار دیا جائے گا	گریجویشن ۲۰ تا ۲۶ معاشیات یا میتھمیٹکس کے ساتھ	اکانومکس اینڈ اسٹیٹسٹیکل انوسٹی گیٹر
i جنرل انگلش ii جنرل نالج iii انٹرویو	جگہیں خالی ہونے پر اشتہار دیا جائے گا	گریجویشن ۱۹ تا ۲۵	سب انسپکٹرز سی بی آئی دلی سینٹرل فنگر پرنٹ بیورو کلکتہ
i تحریری ٹیسٹ (تقریباً ۳۰ تا ۶۰ منٹ کا) انٹرویو سے قبل ii انٹرویو	ایضاً	گریجویشن ۱۹ تا ۲۵ ڈگری و ڈپلومہ ۲۱ ۲۵ لائبریری سائنس	لائبریرین / جونیئر لائبریرین / اسسٹنٹ لائبریرین

ان امتحانات کے علاوہ کمیشن وقتاً فوقتاً جن جگہوں کے لیے امتحانات لیتا ہے ان کے نام یہ ہیں۔

- ★ سینئر ٹرانسلیٹرز۔ ہندی
- ★ سب ایڈیٹرز۔ ڈائرکٹوریٹ آف اکانومکس اینڈ اسٹیٹسٹکس
- ★ اسسٹنٹ (عربی فارسی) آل انڈیا ریڈیو۔ دلی۔
- ★ ٹیکنیکل اسسٹنٹ۔ فشریز پروجیکٹ
- ★ (آرکیالوجی) نیشنل میوزیم دلی۔
- ★ لائننگ اسسٹنٹ۔ ڈیپارٹمنٹ آف امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ
- ★ ٹیچرز، کارٹوگرافرز [illegible]

پبلک سروس کمیشن، اتر پردیش

FOREST RANGERS' COURSE 1985-86/
85-87 - COMPETETIVE EXAMINATION 1984

ٹریننگ کی میعاد : ۲ سال (۱) انٹرمیڈیٹ پاس شدہ امیدواروں کے لیے
۱ سال (۲) بی ایس سی پاس امیدواروں کے لیے

کل سیٹوں کی تعداد:۔ ۳۵۔ عمر کی حد: ۱۰ تا ۳۰ سال (یکم مارچ ۸۵)

تعلیمی استعداد:۔ انٹرمیڈیٹ یا مساوی۔ میتھس، فزکس، کیمسٹری، [illegible] یا باٹنی کے ساتھ

جسمانی صحت کا معیار۔ قد ۱۶۳ سینٹی میٹر

امتحان کے مراکز:۔ الہ آباد شہر۔ فیس:۔ چالیس روپے
مندرجہ فہرست / قبائل وغیرہ کے ممبران کے لیے پندرہ روپیہ صرف بذریعہ ٹریژری چالان

آخری تاریخ (درخواست وصول ہونے کی) ۶ اگست ۸۴ء

امتحان۔ اکتوبر ۸۴ء

(A) امتحان کے مضامین۔ انگریزی مضمون، معلومات عامہ، ابتدائی ریاضی اور ہندی ہر ایک سو نمبر

(B) اختیاری مضامین (کوئی ایک مضمون) سو نمبر کا
فزکس، کیمسٹری، زولوجی، بوٹنی، انڈین ہسٹری، اکونامکس

(C) زبانی امتحان (پرسنالیٹی ٹیسٹ)۔ دو سو پچاس نمبر کا

داخلہ فارم اشتہار کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اشتہار نارورن انڈیا پتریکا ۲۴ نیز روزگار ڈائجسٹ (ہندی) جولائی ۸۴ء میں شائع ہوا ہے۔

فیروز پروین

کتابیں بولتی ہیں

کیا کتابیں بولتی ہیں؟ جی ہاں! کتابیں بولتی ہیں۔ چاہے وہ آپ کے ہاتھ میں ہوں یا یوں ہی پڑی ہوں یا الماری میں سجا کر رکھی ہوئی ہوں۔ وہ خاموش نہیں رہتیں۔ وہ اپنی ہی نہیں بلکہ ساتھ میں آپ کے چال چلن، آپ کی عادت اور آپ کے گھر کے ماحول کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہیں۔

جس کتاب کی جلد ڈھیلی ہو چکی ہو یا پہلے کے دو صفحے اور آخر کا صفحہ غائب ہو وہ چلا چلا کر آپ کی لاپرواہی کا اعلان کرے گی۔

اگر کسی آدمی کا چال چلن، رہن سہن معلوم کرنا ہو تو اُس کے ہاتھ سے وہ کتاب لے لیجیے جو وہ پڑھ رہا ہو۔ آپ کو اس کے بارے میں خود ہی اندازہ ہو جائے گا، یا پھر اسے کوئی کتاب اُدھار دے دیجیے اول تو وہ کتاب واپس ہی نہیں آئے گی اور اگر واپس آ بھی جائے گی تو وہ اس شخص کی داستان آپ کے سامنے تفصیل سے بیان کرے گی۔ جا بجا آپ کے دوست نے بہت ہی بے تکے انداز میں اپنا نام لکھ دیا ہوگا۔ کتاب کا آخری صفحہ غائب ہوگا۔ پہلے صفحے پر دھوبی کا حساب، درمیان میں سامان کا فون نمبر۔ ایک صفحے پر چائے کے کپ رکھنے کا نشان ہوگا۔ بیچ میں سے خوبصورت تصویر غائب اور دو پہلے صفحے ہوں گے جن پر بہت سی ... نمک مرچ وغیرہ کا حساب ہوگا۔

یہ سب کیا ہے؟ پڑھنے والوں کی عادت ہی تو ہے!

کتابیں طریقے اور سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں یا نہیں یہ سب باتیں خود کتابیں اپنی زبان سے بتا دیں گی۔ یہ بات سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ کتابیں بولتی ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔

آج کل تعلیم یافتہ گھروں میں کتابوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے گھر کا بناؤ سنگھار اور سجاوٹ کتابوں کی ایک الماری کے بغیر نامکمل ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر شخص سے ایسی امید وابستہ نہیں کی جا سکتی لیکن ہر شخص اپنی آمدنی کا لحاظ سے کچھ کتابیں ضرور خرید سکتا ہے۔ جس تعلیم یافتہ گھر میں کتابوں کی ایک الماری اور اخبار دکھائی نہ دے تو آپ اسے تعلیم یافتہ کیسے تسلیم کریں گے۔

اگر آپ کسی کا مزاج جاننا چاہتے ہوں تو اس کے گھر میں چلے جائیے۔ اس کی کتابوں کو اُٹھائیے کہ وہ کیسی ہیں۔ کس موضوع پر ہیں۔ شاعری کی کتابیں ہیں، ناول ہیں، کہانیاں ہیں یا سنجیدہ مسائل پر ہیں۔ اگر ناول ہیں تو کس قسم کے ہیں۔ شاعری کس موضوع پر ہے۔ جیسی کی پسند ہوگی ویسی ہی آپ کی ما... ہوں گی۔ عظیم ہستیوں کی زندگی کی کہانیاں پڑھنے والا نوجوان خود بھی ... کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ بلند خواہش رکھتا ہے اور زندگی میں کچھ کر دکھانے کی آرزو رکھتا ہے۔ گھٹیا رسالے اور سنسنی خیز ناول وہی پڑھتا ہے جس کا مذاق پست ہو اور جسے دنیا کا کوئی اور کام نہ ہو۔

آپ کسی کی بھی الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کا جائزہ لے کر اس شخص کے مزاج اور شخصیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔ اس کی کسی کتاب کو کھول کر دیکھیے کہ کہیں وہ صرف سجاوٹ کے لیے تو نہیں رکھی گئی ہیں یا کسی پر رعب گانٹھنے کے لیے تو نہیں سجائی گئی ہیں۔ ایسی کتابیں ہاتھ میں لیتے ہی خود بخود بول اُٹھتی ہیں کہ انہیں پڑھا نہیں گیا۔

جو سلیقہ شعار ہوتے ہیں وہ اپنی کتابیں الماری میں سجا کر طریقے اور قرینے سے رکھتے ہیں۔ کتاب کے پہلے یا آخری صفحے کے ایک کونے پر چھوٹا سا اپنا نام لکھتے ہیں۔ پڑھتے وقت صفحہ یاد رکھنے کے لیے کونے نہیں موڑتے بلکہ کاغذ یا کارڈ کا نشان بنا کر رکھتے ہیں۔ اور اس پر خوبصورت پھول بیل میں یا پھر کوئی شعر لکھ دیتے ہیں۔

بے پرواہ لوگوں کی کتابوں سے ہی ان کی لاپرواہی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی کتابیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہوں گی اور کتابوں کی حالت خستہ ہوگی۔ دو کتابیں الماری میں سیدھی رکھی ہوئی ہوں گی تو تین کتابیں ترچھی اور چار کتابیں میز پر کھلی ہوئی پڑی ہوں گی۔ جلد اکھڑی ہوئی ہوگی۔ کور بھی چپکا ہوگا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے لوگ انھیں فلسفی، فن کار ادیب تسلیم کریں گے۔ یہ لوگ اتنے ہی نمائش پسند ہوتے ہیں جتنے کہ وہ لوگ جو رعب گانٹھنے کے لیے کتابیں خرید کر الماری میں سجا کر رکھتے ہیں۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کسی کے گھر میں کتابیں ہونے یا نہ ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ کتابیں کسی دوسرے شخص کے ہاتھ میں جاتے ہی نہ جانے کتنے راز ظاہر کر دیتی ہیں۔ لہٰذا کتابوں کی عزت کیجیے۔ کتابیں احسان فراموش نہیں ہوا کرتیں۔ وہ معاوضے میں دوسروں سے آپ کا احترام کراتی ہیں۔

★ ★ ★ ★

بھاپ یا گیس کبھی کسی چیز کو اس
وقت تک حرکت نہیں دیتے جب تک کہ
وہ مقید نہ کر لیے جائیں۔ "نیاگرا" اس وقت
تک روشنی اور توانائی پیدا نہیں کرتا جب تک
کہ اُسے سرنگوں کی تنگنائے سے نہ گزارا جائے
کوئی زندگی اس وقت تک فروغ اور بالیدگی
نہیں پاتی جب تک کہ وہ ہمہ تن وقف نہیں ہو
جاتی، نظم و ضبط کے دائرہ میں نہیں آتی اور
اس کو فوکس نہیں ملتا۔

ہنری ایمرسن فوس ڈک (عملِ تخلیق پر)

دو انڈے توڑ کر پھینٹ کر ایک برتن میں دو چمچے شہد ملا کر اور پھینٹ لیں پھر ڈبل روٹی کے توس اس مرکب میں ملا کر بہت کم گھی میں سینک کر ناشتہ کریں عمدہ اور مفید ناشتہ ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ گھی یا مکھن کے ساتھ اس کا استعمال نقصان دہ ہے یورپ میں تو اس کا استعمال مکھن کے ساتھ ہی زیادہ تر کیا جاتا ہے۔

شہد بحیثیت دوا۔ شہد ہی وہ مٹھاس ہے جس کے اثرات مُضر نہیں ہوتے۔ چینی یعنی گنے کی شکر کو ڈاکٹر صحیح طور سے سفید زہر کہتے ہیں کیونکہ اس کے زیادہ استعمال سے خون کی نالیاں پراگندہ ہوتی ہیں۔ دل کمزور ہوتا ہے مگر شہد وہ مٹھاس ہے جو خون کی نالیوں کو صاف، خون کو پتلا اور صحیح رکھتا ہے۔ اس کا استعمال امراضِ چشم میں فائدہ مند اور ڈاکٹروں نے زخموں کی مرہم پٹی میں اس کو بے حد مفید پایا ہے کیونکہ جراثیم مارنے کی طاقت شہد میں ہونے کے علاوہ کیمیاوی دوا سے جو زخموں میں خرابی آتی ہے وہ شہد کے استعمال سے نہیں ہوتی ہے۔ بچوں کو تو شہد کا استعمال ہر طرح فائدے مند ہے۔ دانت نکلنے میں اس کے استعمال سے آسانی ہوتی ہے اور بدن میں طاقت و چستی آتی ہے۔ اسی طرح بوڑھوں کے لیے بھی فائدے مند ہے۔ ذیل میں چند نسخے عام استعمال کے لیے درج ہیں۔

۱۔ منقے پانچ عدد۔ بادام گری پانچ عدد کالی مرچ پانچ عدد مکھن ایک تولہ شہد تین تولہ سب کو صبح سویرے استعمال کریں۔ بدن کی طاقت، ہر قسم کی کمزوری اور درد میں بے حد فائدے مند نسخہ ہے۔ معمولی امراض بہت جلد چلتے رہتے ہیں۔ معدے کے مریض اگر پپیتے کو دہی میں اور ملا کر استعمال کریں تو بے حد مفید ہے۔

۲۔ پنچ امرت۔ شہد تین تولہ مکھن یا گھی ۲ تولہ گنگا کا پانی یا بارش کا یا بھاپ سے کشیدہ پانی دس تولہ۔ دہی دس تولہ ایک پیمانے میں سب کو ملا کر صبح سویرے استعمال کریں یا کھانے کے بعد برابر استعمال کریں کمزوروں اور بوڑھوں کے لیے بہترین دوا ہے۔

۳۔ ناریل کا پانی چار تولہ رس انگور چار تولہ۔ لیموں کا رس، شہد دو تولہ سب کو ملا کر استعمال معدہ و دماغ وغیرہ کی کمزوری کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔

شہد کی پہچان۔ شہد کی پہچان کی کوئی بھی صورت یہی بہتر ہے جب یہ یقین کر لیا جائے کہ شہد اصلی ہے۔ مکھی ڈوبنے اور کتے کے کھانے کے سب غلط طریقے پہچان کے ہیں۔ خانہ بدوش لوگ اکثر شہد مکھی کے چھتوں میں بھرا ہوا بیچ جاتے ہیں اور اکثر اس میں غلط یا ملاوٹ والا شہد ہوتا ہے۔ اصلی شہد کی دستیابی کے لیے ذیل کی چند صورتیں ہی ہیں۔

۱۔ اپنے سامنے کھلوانا ۲۔ شہد کے وہ چھتے جو منہ بند ہوں انکو اپنے سامنے خانوں کو کھول کر نکلوانا ۳۔ اعتبار والی جگہ سے حاصل کرنا ۴۔ کیمیاوی جانچ کرانا ۵۔ جاڑوں میں جما ہوا شہد لے کر گرم پانی کے برتن میں رکھ کر دیکھنا اگر پگھل جائے کل کا کل تو اصلی ہے۔

شہد کو ذخیرہ کرنا۔ شہد میں وہ خاصیت ہے جو کم ہی چیزوں میں ہوتی ہے یہ مٹھاس کی وجہ سے تقریباً ہر قسم کے جراثیم (جو ہوا میں ہر وقت موجود رہتے ہیں) کو داخل ہونے کے تھوڑی ہی عرصے میں ختم کر دیتا ہے۔ زہریلے مادہ کو ختم کر دیتا ہے مصر میں قریب دو ہزار سال قبل کی جو ممیاں نکلی ہیں ان کے ساتھ کچھ برتن شہد کے منہ بند ملے جنھیں شہد باوجود اتنی مدت کے صحیح حالت میں پایا گیا صرف گاڑھا ہو گیا تھا اور رنگ گہرا تھا۔ یہ خوبی شہد کی مٹھاس کی وجہ سے ہے مگر شہد میں پانی ملا کر ۲۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہے تو وہ پتلا ہوتا ہے جیسے عام طور سے تازہ شہد پتلے شہد میں جراثیم اثر کر کے اسکو کھٹا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ شہد کو خریدنے کے بعد اچھی طرح چھانا جائے۔ جمے شہد کو پگھلا کر چھاننا ضروری ہے تاکہ موم اور دیگر ملاوٹیں مثلاً پر، مکھی کے بدن کے ٹکڑے گرد۔ یہ سب دور ہو جائیں۔ چھان کر گرم کیا جائے (۶۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک) گاڑھا کیا جائے اور پھر برتن میں بھر کر رکھ دیا جائے۔ اس طرح سے رکھا ہوا شہد خراب نہ ہوگا۔

شہد میں وہ خوبیاں ہیں جو کسی ایک چیز میں یکجا نہیں کی بچے، بوڑھے سب کے لیے فائدے مند ہے اور ان کے مریضوں کے لیے بھی امرت اور شربت حیات ہے اور کلام پاک میں صحیح شفاء للناس کہا گیا ہے مگر مریضوں کو صحیح استعمال کے لیے تجربہ کار ڈاکٹر یا حکیم سے مشورہ کے بعد استعمال کرنا بہتر ہوگا۔

★

تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ

فون : ۳۶۰۹
۴۱۹۹

سے

بال سیاہ ، گھنے ، لمبے اور چمکیلے ہوجاتے ہیں
آپ بھی اپنی شخصیت کو
جاذب نظر بنانے کے لیے

روبی
شیمپو پاؤڈر

کا استعمال کریں

روبی شیمپو پاؤڈر بالوں کو سیاہ ، گھنا ، لمبا اور چمکیلا ہی نہیں بناتا بلکہ بالوں کی دوسری بیماریوں، جیسے بالوں کا وقت سے پہلے سفید ہونا ، کمزور ہوکر گرنا ، بالوں میں خشکی اور خارش کو ختم کردیتا ہے

آج ہی اپنے قریبی اسٹور سے طلب فرمائیں۔

مشرقی بہنیں اپنی پوشیدہ بیماریوں کا حال کسی ڈاکٹر یا حکیم کو بتلاتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں عورتوں کی یہ پوشیدہ بیماری ان کو اندر ہی اندر گھلا دیتی ہے اور وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جاتی ہیں۔

اکسیر خواتین

اس دردی بیماری کو جڑ سے ختم کردیتی ہے چند روز کے استعمال سے آپ فرق محسوس کرنا شروع کردیں گی قیمت فی شیشی ۱۵/= روپے ڈاک خرچ الگ
غیر ممالک میں دو شیشی کا مکمل کورس مع ہوائی ڈاک خرچ ۱۲۵/= روپے

آج نوجوان جس ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے اس کا نتیجہ ہے
* پچکے ہوئے گال * گھبراہٹ * بدخوابی

اکسیر شباب

کے استعمال سے بدخوابی دور ہوجائے گی۔ آپ کے پچکے ہوئے گال ٹھیک ہوجائیں گے۔ اور آپ اپنے آپ کو چاق و چوبند پائیں گے۔
ایک شیشی قیمت ۱۵/= روپے (ڈاک خرچ الگ)
غیر ممالک سے دو شیشی کا مکمل کورس مع ہوائی ڈاک خرچ ۱۲۵/=

ہاضمی کی مفید اثر گولیاں پیٹ کی جملہ تکلیفوں کا خاتمہ کرتی ہیں۔
ہاضمی بچوں سے چھپا کر رکھیے۔
اس کے اچھے ذائقے کی وجہ سے بچے اسے پسند کرتے ہیں اور پوری شیشی چٹ کر جاتے ہیں
قیمت پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

رانی تیل

چوٹ، موچ، جلے کٹے کا کامیاب علاج
۸۰ ملی لیٹر قیمت دس روپے

اسٹاکسٹ

بمبئی • ایلن اینڈ کینٹ ۳۸ الیف۔ محمد علی روڈ بمبئی
• میڈلین اینڈ پرفیومری اسٹورس ۳۱۔ سی محمد علی روڈ متصل چونا بھٹی مسجد بمبئی
• فرینڈس اسٹورس ۱۵۹ ہاردن منزل۔ بھنڈی بازار جنکشن بمبئی • سیما میڈیکل اسٹور ۵۱۲ سر جے جے روڈ بمبئی **کلکتہ** • این اینڈ سنز ۸ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ
نیفی دواخانہ ۲۱ رفیع احمد قدوائی روڈ کلکتہ **حیدرآباد** • مون اینڈ کمپنی چار مینار حیدرآباد
بھوپال • مختار حسین غلام عباس جمعراتی بازار بھوپال **اورنگ آباد** • ابوالحسنات مقام و ڈاک خانہ سملہ رفیع گنج۔ ضلع اورنگ آباد **دہلی** • دفاتر بیسویں صدی دریا گنج نئی دہلی

بنانے والے **ریڈیم کیمیکل ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲**

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۰/۸۴-۸۵

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱- پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (فزکس) - (ایک جگہ) - (مستقل) - (ایس ٹی ہائی اسکول)۔
شرح تنخواہ:- ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی- ۳۰- ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔
قابلیت: ا- لازمی:- متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری یا دلی یونیورسٹی کا متعلقہ مضمون میں پوسٹ گریجویٹ ڈ
ii پسندیدہ:- ۱- کسی کالج، ہائی اسکول یا ہائر سیکنڈری اسکول میں انگلش/اردو میڈیم سے متعلقہ مضو
کی درس و تدریس کا تجربہ اور مہارت تامہ۔
۲ ایجوکیشن یا ٹیچنگ میں ڈگری یا ڈپلوما۔

۲- ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر: (سوشل اسٹڈیز) (ایک جگہ) (مستقل) ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول۔
شرح تنخواہ:- ۴۴۰- ۲۰- ۵۰۰- ای بی- ۲۵- ۷۰۰- ای بی- ۲۵- ۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت: ا- لازمی:- وہ شخص جس نے گریجویشن میں ان مضامین سے دو مضمون لیے ہوں۔
ہسٹری- پولیٹیکل سائنس، اکونامکس- جغرافیہ اور کامرس
اور مزید یہ کہ اس کے پاس ایجوکیشن میں مستند اور منظور شدہ ڈگری یا ڈپلوما ہو۔
ii پسندیدہ:- متعلقہ مضمون میں بی۔ اے (آنرز) کے ساتھ ساتھ ایجوکیشن میں منظور شدہ ڈگری یا ڈپلوما ہو۔
۲- کسی کالج یا ہائی اسکول یا ہائر سیکنڈری میں اردو/ ہندی/ انگریزی میڈیم میں متعلقہ مضمون
کی درس و تدریس کا تجربہ اور مہارت تامہ۔

۳- پرائمری ٹیچر - (بنائی) - (ایک جگہ) (مستقل) احمدی اسکول برائے نابینا۔
شرح تنخواہ:- ۳۳۰- ۱۰- ۳۵۰- ای بی- ۱۰- ۳۸۰- ۱۵- ۵۰۰- ای بی ۱۵- ۵۶۰ روپے
مع دیگر الاؤنس۔
قابلیت:- ا- لازمی:- میٹرک ٹرینڈ ٹیچر مع ہاتھ سے کپڑا بننے کا طویل عملی تجربہ۔ مضمون کو پڑھانے کی عمدہ
صلاحیت۔
ii پسندیدہ:- نابینا حضرات کو تعلیم دینے کی جانکاری
ہلکے پھلکے انجینیرنگ/ کرافٹ کے کام کی مزید جانکاری۔

۴۔ لیکچرر ان میکینیکل انجینرنگ ۔ ڈیپارٹمنٹ آف میکینیکل انجینرنگ

۵۔ لیکچرر ان الیکٹرونکس انجینرنگ سیکشن ۔ ڈیفنس پولی ٹیکنک

قابلیت (الف) انجینرنگ/ٹیکنالوجی میں ماسٹرس ڈگری

(ب) اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ مع انجینرنگ یا ٹیکنالوجی میں بیچلرس ڈگری ہونا چاہیے۔ بیچلرس ڈگری/ ماسٹرس ڈگری میں فرسٹ ڈویزن ہو۔

(ج) تعلیمی/تحقیقی ادارے کے علاوہ ایک سال کا پیشہ ورانہ تجربہ

★ انجینرنگ اور ٹیکنالوجی کے موضوعات میں نا میاتی بین الموضوعی پروگراموں میں ملازمتوں کے لیے دیگر حیثیتوں سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل امیدواروں کے حق میں انجینرنگ اور ٹیکنالوجی میں ڈگریوں کی شرائط کو نرم کیا جا سکتا ہے۔

★ ایسے امیدواروں کے لیے جو پیشہ ورانہ تجربہ نہیں رکھتے ہوں یا ایسے امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربے کے حامل ہوں لیکن وہ تقرر کے لیے موزوں متصور نہ کیے جائیں تو اس صورت میں جس شخص کا تقرر کیا جائے گا اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر مطلوبہ پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تا وقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کرے۔

★ اگر ایم ٹیک یا ایم۔ای کی ڈگری کے حامل امیدوار دستیاب نہ ہوں یا تقرر کے لیے مناسب متصور نہ ہوں تو اس صورت میں تعلیمی صلاحیت کی شرائط کو نرم کیا جا سکتا ہے اور فرسٹ ڈویزن میں پاس شدہ انجینرنگ گریجویٹ کا تقرر کیا جا سکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ امیدوار تقرر کے پانچ سال کی مدت میں ماسٹر ان ٹیکنالوجی یا ماسٹر ان انجینرنگ کی سند حاصل کرے ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تا وقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کر دے۔

۶۔ لیکچررز ان کاسٹیوم ڈیزائن اینڈ ڈریس میکنگ ۔ ڈیفنس پولی ٹیکنک

قابلیت لازمی :۔

ٹیکسٹائلس اور کلاتھنگ میں فرسٹ کلاس یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری

یا

فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں بیچلرز ڈگری ہوم سائنس کے ساتھ

مع فرسٹ کلاس ڈپلوما اِن کاسٹیوم ڈیزائن اینڈ ڈریس میکنگ

اا پسندیدہ :- دو سالہ پروفیشنل / ٹیچنگ کا تجربہ

غیر معمولی لیاقت اور تجربہ کے حامل افراد کو ابتداء سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔

انٹرویو کے لیے بلائے جانے والے امیدواروں کو سیکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپے نقد مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا سے 23x10 کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو، بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ رجولائی ۱۹۸۴ء آفس ٹائم تک ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

نوٹ :- موزوں امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۱/۸۴ – ۸۵

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں

فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی

ریڈرس

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ – ۵۰ – ۱۳۰۰ – ۶۰ – ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

۱۔ ریڈرز ان میکینکل انجینئرنگ۔ ڈپارٹمنٹ آف میکینکل انجینئرنگ

۲۔ ریڈر ان الیکٹریکل انجینئرنگ سیکشن۔ یونیورسٹی پولی ٹیکنک۔

۳۔ ریڈر ان سول انجینئرنگ سیکشن۔ یونیورسٹی پولی ٹیکنک

قابلیت ۱۔ لازمی۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ درس وتدریس یا تحقیق اور ترقیات کے میدان میں ۵ سالہ تجربہ۔

ان امیدواروں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جاسکتا ہے جن کے پاس اگرچہ کہ ڈاکٹریٹ کی سند نہیں ہے، لیکن اس ڈاکٹریٹ کی سند کے معیار کا مطبوعہ کام ہے یا انتہائی اعلیٰ معیار کا کسی تعلیمی ادارے یا انڈسٹری میں ترقیاتی کام ہو۔

یا

ایسے اشخاص کی صورت میں جنھیں کسی صنعت یا پیشہ ورانہ میدان سے بھرتی کیا جائے گا، ان کے لیے ضروری ہوگا کہ امیدوار کے پاس اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ ہو اور تقریبًا سات سال کا پیشہ ورانہ تجربہ رکھتے ہوں جس میں نئی ایجادات / تحقیقات اور ترقیات بھی شامل ہوں۔

پسندیدہ:۔ پوسٹ نمبر ۱ ریڈرز ان میکینکل انجینئرنگ، ڈپارٹمنٹ آف میکینکل انجینئرنگ

مطبوعہ تحقیقی کام جو معروف رسائل میں چھپ چکا ہو، درس وتدریس برائے پوسٹ گریجویٹ کلاسس کا تجربہ۔

لکچررس:۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ – ۴۰ – ۱۱۰۰ – ۵۰ – ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

غیر معمولی لیاقت یا تجربے کے حامل افراد کو ابتداء سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے
انٹرویو کے لیے بلائے جانے والے امیدواروں کو سیکنڈ کلاس ریلوے کا ایک طرف کا کرایہ
ادا کیا جائے گا۔
درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے
پانچ روپے نقد مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر
جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا ۲۳x۱۰ سینٹی میٹر کا ایسا
لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو، بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ جولائی ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تصحیح

سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ ڈپارٹمنٹ آف اوپتھلمولوجی کی جو پوسٹ مشتہر کی گئی تھی
مورخہ ۱۸ جون ۱۹۸۴ء کو مشتہر کی گئی تھی اس کے لیے مطلوبہ استعداد کو
اس طرح پڑھا جائے۔

قابلیتیں:۔ لازمی بی ایس سی اور آرتھوپٹکس میں ڈپلوما اور ساتھ میں تین سال کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج یا معروف آئی ہاسپٹل کے ڈپارٹمنٹ آف اوپتھلمولوجی میں
پسندیدہ:۔ متعلقہ ساز و سامان کے استعمال کا تجربہ اور کسی منظور شدہ آئی ہاسپٹل یا
ڈپارٹمنٹ آف اوپتھلمولوجی میں کام کا عملی تجربہ۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

پرنٹر پبلشر نورالحسن نقوی۔ مقام اشاعت: شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ پریس برائے لیتھو کلر پرنٹرس۔

Tahzibul Akhlaq Fortnightly 16th to 31st July. 84. Regd. No L/ALG 247

تہذیب الاخلاق

جلد ۳ یکم تا ۱۵ اگست ۱۹۸۴ء شمارہ ۱۵

منـــدرجات

سرورق پر ۔۔۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق ۔۔۔۔۔ آرٹسٹ: سرفراز احمد

جس طرح پچھلوں کے کام اگلوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں اسی طرح ان کی غلطیاں بھی کچھ کم مفید نہیں ہوتیں تاکہ آنے والے ان سے بچیں اور ان کا اعادہ نہ کریں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

My naked soul may naked here be seen
Both what I was and what I should have been
Dissected thus, I stand a living martyr grown
Come read my errors and reform your own.

John Dunton

ان صفحات میں میری روح بے نقاب نظر آتی ہے
کہ میں کیا تھا اور مجھے ہونا کیا چاہیے تھا۔
اپنا تجزیہ آپ کر کے میں زندہ شہیدوں کی صف
میں شامل ہو گیا
آؤ میری لغزشوں پر نظر ڈالو اور خود کو ان سے
محفوظ کر لو۔

..... جان ڈنٹن

Lives of great men remind us
We can make our lives sublime
And, departing, leave behind us
Foot prints on the sand of time

Longfellow

وہ جو ہماری دنیائے تخیل میں تہلکہ مچا دیتے ہیں
وہ جن کے ہاتھوں میں قوموں کے فکر و ذہن کی
لگامیں ہوتی ہیں
کہ جدھر چاہیں انھیں موڑ دیں
ان کے حالات زندگی کو جاننے کی خواہش ہمارے
دلوں میں کتنی شدید ہوتی ہے۔

..... لیزلی اسٹیفن

عظیم انسانوں کی زندگی سے سبق ملتا ہے
کہ ہم بھی اپنی زندگی کو عظیم بنا سکتے ہیں
ایسا عظیم کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے
وقت کے ریگ زار پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جائیں

..... لانگ فیلو

اخلاق سکھانے کے دو ہی موثر طریقے ہیں ۔۔۔ ایک تو اچھی صحبت اور ماحول کے ذریعے، دوسرے ان برگزیدہ ہستیوں کے سوانح زندگی کے ذریعے جنھوں نے دنیا کی مخالفتیں اور سختیاں جھیل کر اپنے نفس کو مار کر تن من دھن سے اپنے ملک یا قوم کی خدمت کی اور اس کی خاطر اپنی ہر چیز کو قربان کر دیا اور ایسے کام کر گئے جو کبھی مٹنے والے نہیں۔ یہ لوگ مرے نہیں زندہ ہیں اور ہمیشہ اپنے بعد آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

استحصال

استحصال یا کمزوروں کا ناروا استعمال اس قدر عام ہے کہ
ت ایسا کرنے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ فطرت میں
دپنجے اور دانت کا قانون رائج ہے۔ بات "جس کی لاٹھی اس کی
"سے بڑھ کر" میرا چاقو تیری گردن "تک پہنچ گئی ہے۔
نگریزی میں اس کے مقابل EXPLOITATION کا لفظ استعمال
ہے۔ حصول مقصد کے لیے جائز استعمال کو بھی 'اکسپلوائیٹیشن' کہہ سکتے
گرشم کے قانون کے مطابق جس طرح کھوٹے سکے تبدریج اصلی یا خالص
ستعمال باہر کرتے ہیں اسی طرح اکثر ایک لفظ کے بُرے معانی اس کے
کو بے دخل کر دیتے ہیں۔ رائج اگرچہ دونوں معانی ہیں تاہم
یشن سنتے ہی ذہن بُرے معانی یا ناروا استعمال کی طرف جاتا ہے
۔ یہ نتیجہ نکالنا ضروری نہیں کہ انسان کی فطرت اچھائی کے مقابلے میں
رف زیادہ جھکی رہتی ہے

اردو میں استحصال بُرے مفہوم میں ہی استعمال ہوتا ہے۔
حصول' حاصل کرنا' استحصال ایک ہی مادے سے نکلے ہیں۔ گویا
حصال" حاصل کرنے کا وہ ڈھنگ ہے جو کسی دوسرے کو محروم کردے
پہنچائے۔ یعنی کسی کی قبر پر قصر تعمیر کرنا، کسی کے گھر کو جلا کر ہاتھ سیکنا
دوسری قوم' ایک نسل دوسری نسل' ایک فرقہ دوسرے فرقے'
ت دوسری جماعت' ایک گروہ دوسرے گروہ کا استحصال کرتا ہے
ے ناروا اجتماعی استعمال کی بات بعد میں آئے گی۔
شروع میں ہم بتائیں گے کہ ایک فرد دوسرے فرد کو کس کس طرح اپنی
کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو استحصال دو
ں بٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک استحصال بالجبر (اگر یہ اختراع جائز
ا) استحصال بالمکر۔ آخرالذکر کی بابت تجربہ کار لوگ کہہ گئے

ہرانش در جہاں با قیمت کس مفلس نمی ماند
صاحب تک بیوقوف بستے ہیں، کوئی غریب نہ رہے گا
سادہ لوح انسان وہ زمین ہیں جس میں چالاک انسان کھیتی کرتا ہے

یا سونے اور چاندی کی وہ کان ہیں جنھیں "اہل دانش" کھود کر تحصیلِ زر
کرتے رہتے ہیں۔ "سادہ لوح کی ترکیب پر غور کیجیے انسان اپنی بات کو
کس طرح ادا کرتا ہے' اس پر منحصر ہے کہ اس کی بات قبول کی جائے گی یا
رد کر دی جائے گی۔ کسی کو آپ برملا احمق کہہ دیجیے آپ کی جان کا دشمن
ہو جائے گا اور اگر بازو اسی قدر مضبوط ہیں جتنی عقل ناتواں ہے تو وہیں
آپ سے حساب چکالے گا۔ بے وقوف کہہ دیجیے تو بھی آپ کو معاف نہیں کرے
گا۔ سادہ لوح کہیے تو انگیز کرے گا۔ بہ شرطیکہ خود کو افلاطون نہ سمجھتا ہو۔
اور اگر "نیک نہاد" یا "بھلا مانس" یا "بہت ہی شریف" کہہ دیجیے تو بُرا سرے سے
مانے گا ہی نہیں۔ کیا عجب کہ خوش ہو جائے۔ حالاں کہ "احمق" سے "بہت
ہی شریف" تک آپ نے جتنی لغات صرف کیں انھیں آپ متبادل اور مترادف
سمجھتے ہیں۔ بُری بات کو اچھے پیرائے میں کہنا ایک ضروری ہنر ہے۔ انگریزی
نے تو اسے ایک اچھا سا نام دے دیا ہے: (EUPHEMISM)
یوفے مزم۔ "سادہ لوح" کے اجزائے ترکیبی پر غور کیجیے۔ سادہ یا بے لکھی
ہوئی تختی۔ ایسی تختی جس پر آپ جو چاہیں لکھ دیں' صاف پڑھا جائے گا'
ایسا معلوم ہوگا کہ وہ تختی بنی ہی اس تحریر کے لیے تھی۔ وہ لوگ جن کے دل و
دماغ کی تختی پر تجربہ اور سوجھ بوجھ کی تحریریں ہیں' سادہ لوح نہیں کہلاتے
اُس پر کوئی چابکدست لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو عبارت جمنے نہیں پاتی
حرفِ غلط کی طرح یوں مٹ جاتی ہے جیسے پانی کی سطح پر لکھے ہوئے حروف۔

استحصال بالمکر کا نشانہ سادہ لوح بنتے ہیں۔ آئے دن خبریں سننے
میں آتی ہیں کہ ایک شعبدہ باز سادھو یا فقیر کا روپ دھار کر آیا' دروازہ پر
دستک دی۔ اور کہا سائیں بابا آگئے۔ گھر میں جتنا زیور ہے لے آؤ۔ اپنی
چمتکار سے دوگنا کر دیں گے۔ چمتکار میں شبہ نہیں لیکن اس کا فائدہ سائیں بابا
کو ہی پہنچا۔

عطائی دوا فروشوں کا جادو سادہ لوحوں پر اور زیادہ چلتا ہے۔ مہلک
سے مہلک مرض سے چھٹکارا دلانے کے وعدوں کو باور کر لیا جاتا ہے۔ یہ نہیں
سوچتے کہ اس کی دوا میں اگر یہ تاثیر ہے تو یہ شخص بجائے جوتیاں چٹخانے اور
دربدر کی خاک چھاننے لکھ پتی بن کر محل بنا کر بیٹھا ہوتا۔

ادا کار اور طرب کار (کامیڈین)

مشغول رہنا چاہتے ہیں۔ باب ہوپ ڈاکٹر کے مشورے پر ایک ماہ کے واسطے جہاز پر تفریحی سفر کے لیے نکلا۔ ایک ہفتہ میں واپس آگیا۔ ڈاکٹر کی حیرت نے سوال کی شکل اختیار کی۔ جواب ملا "مچھلیاں داد نہیں دیتیں"۔

جان ملس

* * *

یہاں یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سادہ لوحی مطلق نہیں، اضافی اصطلاح ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہوگا کہ ضرورت کتنی شدید ہے اور ترغیب کتنی زبردست۔ ضرورت کی آنچ میں تجربہ اور فراست کے سارے حروف پگھل جاتے ہیں، تختی صاف ہو جاتی ہے۔ تاکہ فن کار اس پر جو کچھ لکھنا چاہے لکھ دے۔ وہ لوگ جو اپنی رجولیت کو کسرِ نفسی کے انداز سے دیکھتے ہیں، عطائیوں کے طلسم ہوشربا میں بہت جلد گرفتار ہو جاتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں صدیوں تک لوگ اس نسخۂ کیمیا کی تلاش میں سرگرداں رہے جو مٹی یا تانبے کو سونا بنا دے۔ کچھ خود بے وقوف بنے کچھ نے دوسروں کو بے وقوف بنایا۔ ترغیب نے انھیں بیوقوف بننے کے لیے اس قدر آمادہ اور مستعد کر دیا تھا جس قدر تیار گرمیوں میں چیڑ کی گوندار پتیاں (یا سوئیاں) آگ پکڑنے کے لیے رہتی ہیں۔

افراد کا استحصال زر کی ہوس کے تحت ہی نہیں ہوتا طاقت (اپنے زیادہ مفہوم میں) اختیار، اقتدار، نوکری، روزگار۔ ان سب کی طلب اچھے خاصے ہوشمندوں کو بے وقوف بنا دیتی ہے۔ نوکری دلانے کے بہانے لوگ گھروں کا صفایا کر دیتے ہیں۔ زرنفت کو جب سے فروغ ہوا ہے، ہندوستان میں دھوکہ بازوں کی بن آئی ہے۔ شرح بندھ گئی ہے۔ دس ہزار، پندرہ ہزار، بیس ہزار روپے داخل کر دیجیے، مشرقِ وسطیٰ میں کام کرنے کے لیے پروانہ مل جائے گا۔ ہزاروں سادہ لوح اس منظم فریب دہی، اس ریکٹ کا شکار ہو گئے۔ بیویوں کا زیور، گھر کے برتن بھانڈے بیچے، مہاجن سے قرض لیا تب کہیں اتنا روپیہ جڑا کہ "ہنرمندوں" کی فیس ادا ہو سکے۔ جو پروانہ پاگئے انھوں نے بھی بساط اور حوائج سے کہیں زیادہ روپے ادا کیے اور جو غریب پروانے سے محروم رہے وہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گئے۔

خیر ان غریبوں کی تو کوئی غرض بھی تھی، ان دانشمندوں کو کہیے جو صرف مستقبل میں جھانکنے کے لیے بے وقوف بننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ہاتھ دیکھنے والوں، جوتشیوں اور نجومیوں کا بازار جیسا آج گرم ہے، کبھی نہ رہا ہوگا۔ وزیر سے لے کر فقیر تک سب اسی حماقت کے اسیر ہیں۔ ستارے یا ہاتھ دیکھنے والے نے باہر پوچھ گچھ کر کے اور آپ کو اور آپ کے گرد و پیش کو دیکھ کر کچھ محکم قیاس آرائیاں کیں، اور کچھ معتبر معلومات حاصل کریں۔ آپ کے ماضی کے کچھ صفحات آپ کے سامنے الٹ دیے اور آپ نے ہتھیار ڈال دیے۔ آپ سمجھ بیٹھے کہ جو شخص گزری ہوئی باتیں بتا سکتا ہے، وہ آنے والی باتیں بتاتے ہوئے بھی نہ چوکے گا۔ آپ کے یقین کو اور پختہ کرنے کے لیے جوتشی جی آپ کے مزاج اور آپ کی ذہنی افتاد کے متعلق کچھ تبصرہ کر دیں گے جو ہر ہوش و گوش والا تھوڑی سی ملاقات کے بعد کر سکتا ہے۔ مستقبل کے متعلق اس کے پاس ابہام اور تعمیم کا ایسا لچک دار ذخیرہ ہے کہ اس کی پیش گوئی کو آپ کبھی غلط بتا ہی نہ سکیں گے۔ اور اگر واقعات کو آپ نے پیش گوئی سے صریحاً مختلف پایا تو آپ غریب حافظے کو الزام دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ جوتشی جی نے ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ قصور آپ سے بات سننے میں سرزد ہوا یا یاد رکھنے میں۔

جوتشی، سادھو، پیر فقیر، پنڈت، مولوی، ان میں سے بہت سے جہالت اور حماقت کا دل کھول کر استحصال کرتے ہیں۔ عقیدت اور مال دونوں کی شکل میں چونھ وصول کرتے ہیں۔ اس گروہ کا نشانِ امتیاز یہ ہے کہ یہ دھوکا اپنی شبیہ کو اصل سے مختلف دکھا کر دیتا ہے۔ لوگ اُن کا فریب یوں کھاتے ہیں کہ انھیں خداشناس یا مستقبل شناس سمجھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن فریب وہ لوگ بھی دیتے ہیں جو ایک عام انسان کی حیثیت سے آپ کی ہمدردی اور اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک بار اعتماد حاصل کر لیا، پھر تو میدان ہاتھ آگیا۔ انسان ذہنی طور پر اسی طرح کاہل اور آرام طلب ہے جیسے شیر ببر جسمانی طور پر۔ کسی شخص نے کسی انسان پر ایک بار اعتماد کر لیا تو اس کی ہر بات کو مانتا چلا جائے گا اور ذرا دیر کے لیے بھی یہ نہ سوچے گا کہ وہ بات ماننے کے لائق ہے بھی۔ ذہن کو وہ طاق پر بٹھا دیتا ہے کہ آرام کرو۔ کسی دوسرے کا دماغ تمہاری خاطر جانفشانی اور ریاضت کر رہا ہے۔ پکی پکائی کھانے کو مل رہی ہے تو ہم کیوں محنت کریں۔ شیر ببر شکار کے لیے شاذ ہی جاتا ہے۔ گوشۂ عافیت میں آرام کرتا ہے۔ شیرنی کو بھیج دیتا ہے کہ شکار کر کے لائے اور دستر خوان اس کے سامنے سجائے اور جب جنگل کے بادشاہ شکم سیر ہو جائیں تو شیرنی اور بچوں کی باری آئے۔ کھا کر ببر شیر پھر سو جاتا ہے۔ گویا آئینی

بادشاہ کی طرح اس کے پاس بھی کوئی کام نہیں ہے، سوائے موقع موقع سے بڑے سر، فراخ شانے، شاندار ایال، پتلی کمر اور درخشاں آنکھوں کی نمائش کے۔ ہاں ایک کا ذہن اور دوسرے کا جسم جب حرکت میں آتا ہے تو باقی مخلوق کو اس کی گرد بھی نہیں ملتی۔

اجتماعی استحصال کی مثالوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ راجہ، مہاراجہ، بادشاہ، امیر، صوبیدار، والیِ ریاست، تعلقدار، زمیندار، مل مالک، ٹھیکیدار، مہاجن، سود خوار۔ غرضیکہ ہر شخص جس کے پاس طاقت، اختیار یا دولت ہوتی ہے، انصاف سے آنکھیں بند کرکے، ان انسانوں کو جن کے پاس ان تینوں میں سے کچھ نہیں ہوتا، اور جو اس کے چنگل میں آجاتے ہیں، آلۂ کار بنالیتا ہے۔ یہ بات آسانی سے بھول جاتا ہے کہ وہ بھی انسان ہیں۔ اس کی طرح وہ بھی دل، احساس اور خواہشیں رکھتے ہیں۔ ان کا ضمیر ایک کونے میں پڑا ہوا چین کی نیند سوتا ہے۔ کیوں کہ سماج، روایت، رسم و رواج اور عادت نے اسے سلادیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ظالم خود کو محکن، خوں آشام اور جاں بخش سمجھنے لگتا ہے۔

اکثریت والے اقلیت کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اقلیت کا تحفظ کر رہے ہیں۔ مذہب رنگ اور نسل کے نام پر استحصال ہوتا ہے۔ اونچی ذات والے نیچی ذات والوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتے چلے آئے ہیں۔ ان کا ضمیر مطمئن رہتا ہے کہ وہ پیدا ہی بالا دستی کے لیے ہوئے ہیں۔ بالادستی دیکھتے ہی دیکھتے زبردستی میں بدل جاتی ہے۔ مظلوم انصاف طلب کرتا ہے، حقوق مانگتا ہے، داد چاہتا ہے تو باغی اور سرکش، احسان فراموش اور محسن کش کہلاتا ہے۔ سماج اور سماج کی پروردہ عقل ہر ظلم اور ناانصافی کو جائز ٹھہراتی ہے، اس کے لیے دلیلیں لے آتی ہے۔

بین الاقوامی استحصال کو استعمار کا نام دیا گیا ہے۔ انگریز تجارت کرنے ہندوستان میں آئے، ہندوستان پر قابض ہوگئے۔ اسے کنگال کردیا۔ اس کی صنعتیں تباہ ہوگئیں، اس کی خوشحالی کہانی بن گئی۔ وہ سوچتے رہے اور کہتے رہے کہ ہندوستانیوں کو مہذب بنانے آئے ہیں اور مہذب بنا کر چھوڑیں گے۔ انھیں اور ان کے ملک کو۔ استحصال اور استعمار، ظلم اور ناانصافی کے حمام میں سب ہی ننگے ہیں خواہ وہ سرمایہ دار ملک ہوں یا اشتراکی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے روس نے افغانستان پر قبضہ کرلیا اور وہاں کے بہادر اور غیور مجاہدین کو ہولناک جنگی ہتھیاروں کا نشانہ بنا ڈالا۔ اس ننگے حملے کا کوئی جواز نہیں مگر شاطر عقل نے جواز ڈھونڈھ نکالا۔ بھیڑیے نے میمنے پر حملہ کرنے سے پہلے یہی کیا تھا۔

افراد ہوں یا اقوام اپنے سے کمزور فرد یا قوم کا استحصال کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ نظر آتی ہیں۔ خود غرضی طغیانی پر آتی ہے تو نہ ضمیر اس کو روک پاتا ہے، نہ عقل، نہ روشن رائے عامہ، نہ سماج۔ اس کو اگر کوئی روک سکتا ہے تو وہ دین ہے جس کے آگے شاطر عقل کی پیش نہیں جاتی اور جس کے چھونے سے مردہ ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ دین انصاف کا دوسرا نام ہے اس کے بغیر **انصاف** کا لیبل ظلم پر چسپاں ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔

استحصال داخلی ہوتا ہے یا خارجی۔ داخلی استحصال کی ایک مثال دے کر ہم ان سطور کو پایان تک پہنچا رہے ہیں — ہندوستانی مسلمانوں کو قسمت، حکومت، اکثریت سے شکایت ہے۔ ظلم اور ناانصافی کی شکایت میں کچھ حقیقت ہے، کچھ مبالغہ۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ انھیں گلہ اپنوں سے زیادہ ہونا چاہیے، غیروں سے کم۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں سے ہی پہنچا ہے۔ یہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا خوشحال، تعلیم یافتہ، صاحبِ اقتدار طبقہ، باقی اَن پڑھ، جاہل، مفلس۔ پہلا طبقہ دوسرے طبقے کے استحصال پر کمربستہ ہے۔ اس کا نمائندہ بن کر مراعات، امتیاز اور اثر حاصل کرتا ہے اور اس کے حقوق کو نظر انداز کرکے اپنی ذاتی اغراض پوری کرتا ہے۔ انحطاط آمادہ قوموں میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے اگر ہندوستانی مسلمانوں میں ایسا ہو رہا ہے تو یہ عبرت اور افسوس کا مقام ہے، حیرت کا نہیں۔

— سید حامد

* * * * * *

خوش قسمت ہے وہ انسان جسے خود پر ہنسنا آتا ہو۔ اس کے لیے حظ اندوزی کے سامان کی کبھی کمی نہ ہوگی۔

حبیب بورغبا

جتنی زیادہ سدد اپنے باغیچہ میں تم لگاؤ گے، اتنا ہی کم وہ باغیچہ تمہارا ہوگا۔

واہیم ڈیوس

* * * * * *

ایک اہم شخصیت

تقسیم ملک سے بہت پہلے کی بات ہے کہ ریاست حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم کا مختصر ساعملہ دورہ کرتا ہوا کسی گاؤں کے نزدیک پہنچا۔ ملازمین نے کیولٹی یعنی چھوٹا خیمہ لگاکے اپنے افسر کو تو اس میں بٹھا دیا لیکن بڑا خیمہ نصب کرنے کے لیے مزید آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ملازمین میں سے دو چار نے گاؤں میں جاکے کہا۔ بھائیو زندہ شیر دیکھنا ہو تو ہمارے ساتھ چلے آؤ۔ شیر دیکھنے کے شوق میں دسیوں آدمی ساتھ ہو لیے۔ ان کی مدد سے ذرا دیر میں خیمہ کھڑا ہو گیا اور اس کی طنابیں کس دی گئیں۔ گاؤں کے لوگوں نے کہا لاؤ اب شیر دکھاؤ۔ ایک ملازم انھیں چھوٹے خیمے کے سامنے لے گیا اور اشارہ کرکے بولا۔ دیکھو وہ بیٹھا ہے شیر اور اس میں شک نہیں کہ وہاں سچ مچ کا شیر موجود تھا یعنی مولوی عبدالحق۔ غیور، جری، بے باک!

اپنے مقصد سے والہانہ عشق، اسے حاصل کرنے کے لیے مسلسل جد و جہد اور اس کے راستے میں جو دشواریاں حائل ہوں ان کا مردانہ وار مقابلہ۔ یہ وہ قابلِ تقلید خوبیاں ہیں جن سے مولوی صاحب کی زندگی عبارت تھی۔ انھیں اپنی زبان سے عشق تھا، دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا عشق۔ انھوں نے ساری زندگی اس کی ترقی کے لیے وقف کردی اور اپنا سارا اثاثہ اس پر نچھاور کر دیا۔

انھوں نے نادر قلمی کتابوں کا سراغ لگایا اور انھیں سلیقے سے مرتب کرکے شائع کیا، لغت نویسی اور اصطلاح سازی کی طرف توجہ کی، اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے ہزاروں میل کا سفر کیا، انجمن ترقی اردو کے مردہ جسم میں جان ڈالی، حیدرآباد میں اردو زبان کو اعلیٰ سطح تک تعلیم کا ذریعہ بنانے کا کامیاب تجربہ کیا اور ثابت کر دیا کہ اردو ایک علمی زبان ہے اور ذریعۂ تعلیم بننے کی اس میں پوری صلاحیت موجود ہے۔

اردو زبان سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور اس کے لیے وہ بلا خوف و خطر بڑی سے بڑی شخصیت سے ٹکرا جاتے تھے۔ گاندھی جی پہلے تو ہندوستانی یعنی ملی جلی اردو ہندی کو آزاد ہندوستان کی زبان بنانے کے حق میں تھے لیکن آگے چل کر ان کی رائے بدل گئی اور انھوں نے "ہندی اتھوا ہندوستانی" کا نعرہ بلند کیا تو مولوی صاحب ان سے بدگمان ہو گئے۔ ایک جلسے میں جب گاندھی جی نے ہندی اتھوا ہندوستانی کی وکالت میں تقریر کی تو مولوی صاحب پیچھے اسٹیج پر موجود تھے، بولے ہم آپ کے اس 'اتھوا' کے چکر میں آنے والے نہیں۔ اس پر گاندھی جی نے کہا:

"مجھے اردو سے پریم ہے"

"مجھے ہندی سے عشق ہے" مولوی صاحب نے پیچھے سے جواب دیا۔

"مگر میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا" گاندھی جی نے فرمایا۔

"تو پھر ہم اردو کو کیسے چھوڑ دیں؟" مولوی صاحب کا برجستہ جواب تھا۔

ہندوستان کے مردِ آہن سردار پٹیل سے انھوں نے کہا تھا کہ ریڈیو پر جو زبان آپ نے چلائی ہے اسے بس آپ ہی سمجھتے ہیں بلکہ آپ بھی کیا سمجھتے ہوں گے۔

اردو کی حمایت میں وہ ہمیشہ سینہ سپر رہے لیکن آزادی کے بعد انھیں احساس ہوا کہ اس ملک میں اردو کی ترقی کے لیے ماحول سازگار نہیں تو انھوں نے مولانا آزاد کے مشورے کے خلاف پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر وہاں انھیں اور بھی زیادہ مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا سب سے بڑا خواب تھا اردو یونیورسٹی کا قیام اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہ آتا تھا لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا میں ابھی مرنے کو تیار نہیں ہوں اور اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک اردو یونیورسٹی قایم نہ ہو جائے۔

مولوی صاحب آج اس دنیا میں موجود نہیں مگر ان کی جواں ہمتی، ان کا جذبۂ ایثار اور ان کا استقلال ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ بڑے آدمی ہمیں رستہ دکھانے کے لیے سدا اس دنیا میں بیٹھے نہیں رہتے مگر آنے والوں کی راہبری کے لیے وقت کے ریگ زار پر اپنے قدموں کے جگمگاتے نشان چھوڑ جاتے ہیں!

مدیر مسئول

بابائے اُردو

مختار الدین احمد

پروفیسر و صدر شعبۂ عربی
مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

سفید گھنیری داڑھی، آنکھوں پر پُرانی وضع کی عینک اور اس پر جھکی ہوئی گھنی پلکیں، کُھلتا ہوا رنگ، میانہ قد، دوہرا بدن جس میں بڑھتی ہوئی عمر نے ذرا سا خم پیدا کر دیا تھا سر پر عنابی رنگ کی ترکی ٹوپی کچھ ٹیڑھی رکھی ہوئی، بدن میں ڈھیلی ڈھالی کھدر کی شیروانی علی گڑھ تراش کا پاجامہ، پاؤں میں پمپ ـــــ یہ تھے عمل، خلوص اور لگن کے پُتلے اور اُردو کے عاشق مولوی عبدالحق جنھیں اردو دنیا بابائے اردو کہہ کر پکارتی تھی. کون جانے وہ جوانی میں کیسے رہے ہوں گے! ہمیں ان کی جوانی سے لینا بھی کیا، ہمیں تو اس بوڑھے سے عشق ہے جس کی زندگی کا ہر لمحہ اپنی زبان کی خدمت کے لیے وقف تھا، جو عمر کی آخری حدوں کو چھو لینے کے باوجود نامساعد حالات کے سامنے چٹان کی طرح جما رہا. ایسے جواں ہمت انسان کو بوڑھا کون کہہ سکتا ہے؟ وہ نوّے برس کی عمر میں بھی جوان تھے. ایک بار نوجوان طالب علموں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

”میں آپ کے لیے ایک دعا کرتا ہوں. دعا یہ ہے کہ آپ ہمیشہ جوان رہیں. میری طرح کبھی بوڑھے نہ ہوں. اس دعا کو کوئی معمولی یا ناممکن بات نہ سمجھیں. ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے. بے شک، جوانی لوٹ کر نہیں آتی، لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے. جوانی کو قائم رکھنے کے لیے زندگی میں کوئی بلند مقصد ہونا چاہیے. مقصد سے زندگی بنتی بھی ہے، بڑھتی بھی ہے اور قائم بھی رہتی ہے. آپ بار بار مجھے بڈھا کہتے ہیں. میں ابھی دو سال پہلے تک بڈھا نہیں تھا. جوانی چوڑے چکلے سینے، کسے ہوئے ڈنڈ اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی. اور بڑھاپا سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں آتا. جوانی ہمت اور عزم سے ہوتی ہے. جوان وہ ہے جس کا عزم جواں ہو. میں دو سال پہلے جوان تھا. لوگ مجھے تیس سال سے بڈھا بڈھا کہتے آ رہے تھے. میں نے اپنے کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دیا. لیکن اس دو سال کے عرصے میں بعض ساتھیوں نے مجھ پر ایسے ایسے مظالم کیے کہ میں بڈھا ہو گیا. انھوں نے انجمن کو تباہ کرنے کی، میرے رفیقوں اور ہمدردوں کو مجھ سے الگ کرنے کی کوشش کی تاکہ مجھے ختم کر دیں، لیکن مجھے پھر بھی ختم نہ کر سکے. انھوں نے سوچا کہ اس کا کام اس سے چھین لیا جائے، تو یہ مر جائے گا. میں پھر بھی نہ مرا. میں اپنی جوانی کو پھر واپس لاؤں گا. میں مرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور اس وقت تک نہیں مروں گا، جب تک اردو یونی ورسٹی قائم نہ کر لوں. آپ اگر چاہتے ہیں کہ اس کام کی تکمیل ہو، تو آپ کو میری مدد کرنی چاہیے. پھر آپ دیکھیں گے کہ میں دوبارہ جوان اور آپ ہی جیسا گبرو جوان ہو جاؤں گا.“

تو یہ تھے مولوی عبدالحق، جنھوں نے حالات سے سمجھوتا کرنا اور دشواریوں کے آگے ہتھیار ڈالنا سیکھا ہی نہ تھا. شدید مخالفت بھی ان کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکی. آخر وقت تک وہ اردو کی خدمت اس لگن کے ساتھ کرتے رہے کہ اردو اور مولوی عبدالحق ایک ہی چیز کے دو نام ہو گئے تھے. تعلیم یافتہ لوگ انھیں بابائے اردو کہتے تھے؛ مگر ادنیٰ درجے کے بے علم ملازم بھی اتنی بات تو جانتے ہی تھے کہ یہ بڑے میاں اردو کے ہیں اور اردو ان کی ہے. اس لیے وہ انھیں ”اردو کا بڈھا“ کہتے تھے تو کیا غلط تھا

مولوی صاحب نے شادی کی تو تھی لیکن انھوں جلد ہی اس پابندی سے نجات حاصل کر لی اور پھر ساری زندگی ان کی توجہ کا مرکز رہی اردو اور اردو کے ادارے، جیسے حیدرآباد کا دارالترجمہ اور انجمن ترقی اردو جس کا جال انھوں نے سارے ملک میں پھیلا دیا تھا. اس انجمن نے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے. مولوی صاحب کو اس انجمن سے ویسا ہی پیار تھا جیسا کسی کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے. جب انھوں نے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا اور وارث کے خانے میں کسی کا نام لکھنے کی ضرورت پیش آئی، تو انھوں نے بلا تامل انجمن ترقی اردو کا نام لکھ دیا. بیمے کی رقم مولوی صاحب کی زندگی ہی میں مل گئی اور انھوں نے سارا روپیہ انجمن کی نذر کر دیا.

آئیے، اردو کے اس جاں نثار کی کتابِ زندگی کا شروع سے مطالعہ کریں.

خاندان اور ابتدائی زندگی

اتر پردیش کے ضلع میرٹھ میں ہاپوڑ ایک پُرانا قصبہ ہے. یہاں زمانۂ قدیم سے ایک کایستھ خاندان آباد ہے اس کے بیشتر افراد مغلیہ سلطنت میں محکمۂ مال سے وابستہ رہے. شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں اس خاندان نے اسلام قبول کر لیا. سرکاری اعزاز اور ملازمتیں اس کے بعد بھی قائم رہیں. شیخ علی حسین اسی خاندان کے ایک دیندار بزرگ تھے. ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو ان کے یہاں دوسرا بیٹا پیدا ہوا. ان کے خاندان میں لڑکوں کے نام کے آخر میں حسن یا حسین ہوتا تھا مگر شیخ صاحب کے مرشد نے کہا تھا کہ اپنے بیٹوں کے نام کے ساتھ ”حق“ لگانا. اس لیے شیخ صاحب نے اپنے بڑے بیٹے کا نام ضیاء الحق رکھا تھا. اور اب جو دوسرا بیٹا پیدا ہوا، تو اس کا نام انھوں نے عبدالحق رکھ دیا. یہی عبدالحق آگے چل کر مولوی عبدالحق کے نام سے اور پھر بابائے اردو کے لقب سے مشہور ہوئے.

ہاپوڑ سے لگی ہوئی ایک چھوٹی سی بستی سراوہ ہے. شیخ علی حسین کی سسرال اسی بستی میں تھی ان کی بیوی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی اور اپنے بھائیوں کی اکیلی بہن تھیں. اس لیے وہ بہت چہیتی تھیں اور زیادہ تر اپنے میکے میں رہتی تھیں. عبدالحق سراوہ ہی میں پیدا ہوئے بلکہ ان کے بچپن کا ابتدائی زمانہ بھی زیادہ تر سراوے ہی میں گزرا. لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ کم عمری ہی میں انھیں پنجاب چلے جانا پڑا.

پنجاب انگریزوں کے زیرِ نگیں آ گیا تو نئے سرے سے اس کا بندوبست ہوا. بڑی

بڑائی

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چک پر دستخط کر دینے سے دنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں. بہت سے ہیں جنھیں اتفاقات زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے. بہت سے ہیں جو محض نام و نمود کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے. لیکن کم ہیں جو اپنی لیاقت اور محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں. یہ بڑائی پائدار ہوتی ہے.

بابائے اردو

تعداد میں باصلاحیت اور تجربہ کار ملازموں کا تقرر کیا گیا. بعض صوبوں کے ملازم تبادلہ کر کے پنجاب بھیجے گئے عبدالحق کے تین ماموں یو پی کے محکمۂ مال سے وابستہ تھے. اتفاق سے یہ تینوں پنجاب کے لیے منتخب ہو گئے. امتیاز علی، کمشنر کے پیش کار مقرر ہوئے، نیاز علی تحصیل داری پر تعینات ہوئے، اور امداد علی نے محکمۂ پرمٹ (نمک) میں جگہ پائی. یہ تینوں مدتوں فیروز پور اور اس کے گرد و نواح میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے. کچھ دنوں بعد ان کے چھوٹے بھائی محمد صدیق بھی وہیں پہنچ گئے. جب خاندان کے سب افراد یکجا ہو گئے تو انھوں نے اپنے بہن بہنوئی (یعنی عبدالحق کے والد اور والدہ) کو بھی بچوں سمیت وہیں بلا لیا. امتیاز علی بارسوخ آدمی تھے ان کی کوشش سے عبدالحق کے والد شیخ علی حسین انسپکٹر مال مقرر ہو گئے چنانچہ عبدالحق کی تعلیم پنجاب کے اضلاع فیروز پور میں ہوئی اور بالآخر پنجاب ہی سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا.

بچپن کی عادتیں

انسانی شخصیت کی داغ بیل بچپن ہی میں پڑ جاتی ہے اور اسی وقت طے ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص آگے چل کر کیسا انسان بنے گا. اس وقت جو عادتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں، آگے چل کر اُنھی کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے جن عادتوں نے مولوی عبدالحق کو ہر دل عزیز بنا دیا تھا، وہ ان میں بہت کم عمری ہی میں ظاہر ہونے لگی تھیں.

عبدالحق کا گھرانا ایک متوسط، خوش حال اور دیندار گھرانا تھا. ان کے والد ایسی سرکاری ملازمت میں تھے، جہاں رشوت ستانی کا زور تھا لیکن انھوں نے ساری زندگی اپنے پیر و مرشد کے ارشادات کو اپنے لیے مشعل راہ بنائے رکھا. عبدالحق کی والدہ بہت نیک اور عبادت گزار خاتون تھیں. گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ ان کے وقت کا بیشتر حصہ عبادت میں گزرتا تھا. عبدالحق کے بھائی احمد حسن نے لکھا ہے: "بھائی کے بچپن کی عادتوں کا تذکرہ والدہ مرحومہ بڑی خوشی اور فخر سے کیا کرتی تھیں" شوخی، شرارت اور لڑائی جھگڑا جو اکثر بچوں کی عادت ہوتی ہے، کم عمر عبدالحق اس سے بہت دُور تھے. جب وہ بہت چھوٹے سے تھے تو ماں کے برابر نماز کی چوکی پر کھڑے ہو کے اُن کی نقل کرنا ان کا سب سے دل چسپ مشغلہ تھا. ذرا بڑے ہوئے، تو کھیل کود کے بجائے لکھنے پڑھنے میں دل لگنے لگا. مطالعے کا جو شوق طالب علمی کے زمانے میں پیدا ہو گیا تھا وہ مرتے دم تک برقرار رہا اور اسی کی بدولت انھوں نے وہ علمی کارنامے انجام دیے، جن سے وہ امر ہو گئے.

علی گڑھ میں تعلیم

دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد پنجاب میں عبدالحق کی تعلیم کا سلسلہ ختم
کیونکہ ان کے والد ملازمت سے سبکدوش ہو کر ہاپوڑ چلے آتے تھے. عبدالحق ا
کے دوسرے افراد بھی ان کے ساتھ ہی واپس آگئے. مزید تعلیم دلانے کے لیے ا
ایک ہی صورت تھی کہ انھیں علی گڑھ بھیج دیا جائے. مگر اس زمانے میں یہ قدم خاصی
کا کام تھا کیونکہ اس وقت تک ان کے وطن سے کوئی لڑکا تعلیم پانے کے لیے ع
نہیں گیا تھا. آخر بڑی رد و کد کے بعد انھیں علی گڑھ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا. یہ ۱۸۸
بات ہے. عبدالحق کی عمر اس وقت اٹھارہ برس کی تھی. علی گڑھ میں ان کا قیام چھ
سے کچھ زیادہ رہا اور ۱۸۹۵ء میں وہ بی. اے. کرنے کے بعد یہاں سے رخصت

اگر یہ کہا جائے کہ عبدالحق، مولوی عبدالحق اور بابائے اردو علی گڑھ کے طفیل
تو اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا. عبدالحق ہی پر کیا موقوف ہے، اس زمانے کی
عہد ساز ہستیوں نے محمڈن کالج علی گڑھ اور اس کے بانی کے دامنِ تربیت میں
پائی. حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، وحید الدین سلیم جو اردو
کی دنیا میں آفتاب و ماہتاب بن کے چمکے، ان میں سے ہر ایک نے اسی ادارے
اس کے رہنما سے کسبِ نور کیا تھا. عبدالحق کو ان بزرگوں اور ان کے علاوہ کئی
اہم لوگوں کی صحبتوں سے فیض اٹھانے کا موقع ملا. سرسید کے بیٹے سید محمود
خاص طور پر مہربان تھے. خود سرسید کی شفقتیں بھی ان کے حال پر کچھ کم نہ تھیں.

کالج کا لباس

مولوی عبدالحق بہت کم گو انسان تھے. خود نمائی تو انھیں چھو بھی نہیں
تھی. اس کے باوجود وہ ایک واقعہ سپردِ قلم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں. بات یہ
ہے کہ اس پر وہ جتنا بھی ناز کرتے، کم تھا. قیامِ کالج کے بعد ہی سے سرسید کو یہ
تھا کہ کالج کا قومی لباس ہونا ضروری ہے. بہت غور کرنے کے بعد انھوں نے
طے کیا کہ ترکی ٹوپی، ترکی وضع کا کوٹ، پتلون اور پمپ شو کالج کا یونی فارم ہو. انھوں
نے کانپور کی کسی کمپنی سے گہرے نیلے رنگ کی سرج کا ایک تھان منگایا اور اس
تین کوٹ سلوائے ـــ ایک اپنے لیے، ایک اپنے چھوٹے پوتے راس مسعود کے
لیے اور ایک عبدالحق کے لیے. سید محمود نے شکایت کی کہ "آپ ہمیں بھول گئے
تو انھوں نے جواب دیا کہ "چوتھے کوٹ کی گنجائش نہ تھی."

کالے کپڑے کے ٹکڑوں پر کلابتوں سے "مدرسۃ العلوم" وہ دہلی سے کڑھوا کر لائے
تھے. بند گلے کے کوٹ پر یہ اس طرح ٹانکا گیا تھا کہ "مدرسۃ" ایک کالر پر اور "العلوم" دو
کالر پر تھا. کالر کا ہک لگتے ہی "مدرسۃ العلوم" پیش نظر ہو جاتا تھا. جب کوٹ تیار ہو کے
آیا تو عبدالحق اس وقت سید محمود کے کمرے میں تھے. انھیں بلایا گیا. درزی انھیں کوٹ پہنا
چکا، تو سید صاحب جھٹ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے، عبدالحق کو سلام کیا اور بولے "تم
میری ہو" جس کے نصیب ایسے ہوں، وہ اس پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے. یہ سلام
دراصل کالج کے یونی فارم کو تھا. عبدالحق صاحب کا کوٹ خواہ مخواہ نہیں تیار ہوا تھا. ا
کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ لباس پہن کر کالج کے طالب علموں کو دکھائیں اور پوچھیں کہ کالج کے

لیے۔ قومی لباس انھیں پسند ہے کہ نہیں! دو ایک کے سوا کالج کے سب لڑکوں نے اسے پسند کیا اور آخر کار یہ کالج کا یونی فارم طے پاگیا۔

قومی حمیّت

اس یونی فارم سے متعلق ایک واقعہ ایسا ہے جس سے سر سید اور عبدالحق دونوں کی قومی حمیت کا پتا چلتا ہے؛ اور ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ سید صاحب نے جب کالج یونی فارم طے کیا ہے تو اس زمانے میں کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک رخصت پر لندن گئے ہوئے تھے۔ واپس آکر انھوں نے مدرستہ العلوم کا یونی فارم دیکھا تو غالباً اسے پسند نہیں کیا۔ لیکن سید صاحب کی رائے سے اختلاف کرنا اور ان کے آگے زبان کھولنا بھی بڑا مشکل کام تھا۔ آخر ان کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ انھوں نے طالب علموں کے لیے ورزش کا گھنٹہ لازم کر دیا اور اس کے لیے رنگین ریشمی ململ کا لباس ضروری قرار پایا۔ ہر کلاس کے لباس کا رنگ الگ تھا۔ اب، یہ کہاں ممکن تھا کہ لڑکے کالج یونی فارم تو پہن کر آئیں اور پی ٹی کے لباس کی گٹھری بھی ساتھ لائیں کہ جونہی ورزش کا گھنٹہ شروع ہو، وہ رنگ برنگی تتلیاں بن کر قطاروں میں کھڑے ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کا قومی لباس تو کھونٹیوں پر ٹنگ گیا اور لڑکے رنگین ململ کے لباس میں کالج آنے لگے۔ عبدالحق سمجھ گئے کہ یہ سر سید کے خواب کو خاک میں ملانے کے منصوبے ہیں۔ بہت سوچا، پرنسپل صاحب کا خوف بھی مانع آیا، لیکن چپ رہنے اور مصلحت سے کام لینے پر دل کسی طرح راضی نہ ہوا۔ سچی اور کھری بات کہنے کی انھیں شروع سے ہدایت کی گئی تھی۔

آخر ایک دن عبدالحق ہمت کر کے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ سید صاحب اس وقت کھانے کی میز پر تھے۔ یہ سُن کر ایسا جلال آیا کہ چھری کانٹا پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے بعد اسٹریچی ہال میں سر سید کی تقریر پہلے سے طے تھی۔ سید صاحب کے آنے سے پہلے ہال بھر چکا تھا اور تخت پر ایک کرسی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ عبدالحق لکھتے ہیں کہ سید صاحب طیش میں بھرے ہوئے ہال میں اس طرح سے داخل ہوتے جیسے کوئی ہوائی جہاز داخل ہو رہا ہو۔ اپنے پاس ایک کرسی اور بچھوائی۔ پھر پوچھا بیک صاحب کہاں ہیں؟" ایک طرف سے آواز آئی: "اِدھر ہیں۔" ارشاد ہو: "یہاں آجائیے" کوئی اور تو خیر کیا سمجھتا، عبدالحق صاحب کا ماتھا ٹھنکا کہ اب ضرور کوئی آفت آنے والی ہے

سید صاحب نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ کالج کی زندگی کے دوران میں یونی فارم کی کیا اہمیت ہے پھر ترکوں کی شجاعت اور غیرت کی تعریف کی۔ پھر فرمایا کہ ہم نے سوچ سمجھ کر اس عالی حوصلہ قوم کے لباس کو اپنے کالج کا لباس قرار دیا ہے مگر کچھ کوتاہ نظر اور تنگ دل انگریز جو ہندوستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں، وہ اس لباس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس پر ایسے زور کی تالیاں بجیں کہ سارا ہال گونج اٹھا۔ ادھر بیک صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ انھیں ضرور ندامت ہوئی ہوگی کہ سید صاحب نے ان کے بارے میں ایسی رائے قائم کی۔ اس میں شک نہیں کہ مسٹر بیک اس لباس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ہماری رائے میں اس کا سبب یہ ہوگا کہ وہ دل سے کالج کے خیر خواہ تھے۔ اس زمانے میں حکومتِ برطانیہ ترکوں سے برسرِ پیکار تھی۔ شاید بیک صاحب کے دل میں اندیشہ گزرا کہ کہیں حکومت کالج سے بدگماں نہ ہو جائے۔

ان دو واقعات سے جو بیان ہوتے پتا چلتا ہے کہ سید صاحب، عبدالحق کو کتنا عزیز

اخلاق کی تعلیم

اخلاق سکھانے کے دو ہی موثر طریقے ہیں۔ ایک تو اچھی صحبت اور ماحول کے ذریعے۔ دوسرے ان برگزیدہ ہستیوں کے سوانحِ زندگی کے ذریعے سے جنھوں نے دنیا کی مخالفتیں اور سختیاں جھیل کر، اپنے نفس کو مار کر تن من دھن سے اپنے ملک یا قوم کی خدمت کی اور اس کی خاطر اپنی ہر عزیز چیز کو قربان کر دیا، اور ایسے کام کر گئے جو کبھی مٹنے والے نہیں۔ یہ لوگ مرے نہیں زندہ ہیں، اور ہمیشہ اپنے بعد آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

بابائے اُردو

رکھتے تھے حالانکہ اس وقت اُن کی حیثیت محض ایک طالب علم کی تھی۔ عبدالحق، سید صاحب کے سامنے خاصے بیباک تھے اور دل کی بات زبان پر لانے سے نہ چوکتے تھے حالانکہ سید صاحب کے سامنے اچھے اچھوں کی زبان ہکلانے لگتی تھی۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحق کو سید صاحب کے خواب کتنے عزیز تھے۔

سید صاحب کی شخصیت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ جو ان کے نزدیک آیا ان کا گرویدہ ہو کے رہ گیا۔ عبدالحق تو سید صاحب کے بہت نزدیک تھے۔ اگر وہ ان کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اور ساری زندگی ان کے نظریات کو متاعِ عزیز کی طرح سینے سے لگائے رہے، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! کبھی کبھی سر سید پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بری طرح پرنسپل بیک کے اثر میں آ گئے تھے۔ شبلی نے جب یہ کہا تھا" ان کی ہر بات میں آورد تھی، آمد تو نہ تھی"، تو روئے سخن بیک صاحب ہی کی طرف تھا۔ اس واقع سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ الزام بے بنیاد تھا۔

جہدِ مسلسل کا پہلا سبق

مولوی عبدالحق کی زندگی جہدِ مسلسل کی ایک طویل کہانی ہے، انھیں عمر بھر ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا، مگر وہ کبھی ہمت نہیں ہارے آخر ان کے عزم کے آگے یہ بھاری پتھر پگھل گئے۔ اس کی داستان آگے آتی ہے۔ یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ عبدالحق نے جہد و عمل کا پہلا سبق علی گڑھ میں اسی مردِ بزرگ سے سیکھا تھا جس کے فولادی اعصاب مایوسی اور شکست کے نام سے واقف ہی نہ تھے۔ عبدالحق کو کام کرنے کی جو دھن تھی، وہ بھی انھوں نے سر سید ہی سے سیکھی تھی۔ انھوں نے سر سید کی مصروفیت اور کام کرنے کا انداز دیکھا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی ایک کتاب میں کیا بھی ہے۔

قیامِ علی گڑھ کی ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ بہترین مضمون لکھنے پر یہاں ان کو تمغۂ لارڈ لینس ڈاؤن عطا کیا گیا تھا۔ سر سید ان کی اس صلاحیت سے باخبر تھے؛ انھوں نے مولوی صاحب سے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کے لیے کئی مضامین لکھوائے۔

تلاشِ روزگار

مولوی عبدالحق نے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا، تو اب ملازمت کی تلاش ہوئی۔ اسی سلسلے میں وہ بمبئی پہنچے۔ ان دنوں سر سید کے

علم وعقل

علم بعد عقل کے کارآمد نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات نقصان رساں ہوتا ہے عقل بغیر علم کے اکثر غلط راستے پر لے جاتی ہے۔ علم اور عقل دونوں کے تعاون پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے۔ لیکن ایک چیز اور ہے، جو ان سے بھی برتر اور افضل ہے، وہ انسان کی سیرت یعنی کیرکٹر ہے۔ اس میں کچھ فطرت کا عطیہ ہوتا ہے، جو پیدائشی ہے اور کچھ ماحول اور تعلیم و تربیت کا اثر۔ جہاں یہ نہیں، وہاں علم و عقل دونوں بیکار ہیں۔

دوست اور رفیق نواب محسن الملک مولوی مہدی علی ریاست حیدرآباد میں معتمدِ مال یعنی فنانس سکریٹری تھے۔ ان کا قیام اکثر بمبئی میں رہتا تھا۔ اس کے دو مقصد تھے۔ ایک تو علاج اور بحالیِ صحت، دوسرے علی گڑھ تحریک کو بمبئی کے متموّل طبقے میں مقبول بنانا۔ مولوی صاحب، نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نواب صاحب نے عارضی طور پر انھیں اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر کر لیا۔ اسی دوران میں ظفر علی خان اور محمد امین زبیری بھی بمبئی پہنچے۔ نواب صاحب ان سے بھی بہت شفقت سے پیش آئے۔ یہ دونوں بھی مولوی عبدالحق کے ساتھ رہنے لگے۔ تینوں اکثر محسن الملک کی خدمت میں حاضر رہتے۔ نواب صاحب کو ان تینوں نوجوانوں کی لیاقت کا اندازہ ہوا تو ان کی مہربانیاں اور بھی بڑھ گئیں۔

حیدرآباد اور مدرسۂ آصفیہ

۱۸۹۵ء میں وہ نواب محسن الملک سے تعارفی خط لے کر حیدرآباد گئے۔ مولوی عزیز مرزا اس وقت ریاست کے ہوم سکریٹری تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب کو بحیثیت مترجم اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیا۔ حیدرآباد میں اس وقت نواب وقار الملک کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ وہ ریاست کے وزیرِ مال تھے۔ علی گڑھ کے رشتے سے مولوی عبدالحق اکثر وقار الملک کی خدمت میں بھی حاضر ہونے لگے۔ ایک دن مولوی صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے کہ افسر الملک نواب افسر جنگ ان سے ملاقات کو آئے۔ یہ میر محبوب علی خان نظامِ ششم کے اےڈی کانگ اور افواجِ آصفیہ کے سپہ سالار تھے۔ خود سپاہی زادے تھے اور فوجیوں سے خاص تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ انھوں نے فوجیوں کے بچوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا تھا اور اس کا نام مدرسۂ آصفیہ رکھا تھا۔ اس مدرسے کی نگرانی ممتاز یار الدولہ کے سپرد تھی، جو نواب افسر الملک کے داماد تھے اور اپنی علم دوستی اور فلاحی کاموں کے لیے حیدرآباد میں خاص شہرت رکھتے تھے۔

افسر الملک اس اسکول کے لیے ایک باصلاحیت ہیڈ ماسٹر کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے وقار الملک کے پاس ایک نوجوان کو بیٹھے دیکھا تو ان کے بارے میں دریافت کیا پتا چلا یہ عبدالحق ہیں، علی گڑھ سے بی۔ اے کر چکے ہیں، سنجیدہ نوجوان اور اچھے ادیب ہیں، ملازمت کی تلاش میں ہیں اور محسن الملک کا تعارفی خط لے کر حیدرآباد آئے ہیں۔ افسر الملک نے اسے تائیدِ غیبی جانا اور مولوی صاحب کو صدر مدرس کی جگہ کے لیے ہر طرح موزوں پایا۔ ان دنوں عبدالحق مترجم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے لیکن اچھی ملازمت کی تلاش میں تھے۔ مدرسۂ آصفیہ کی صدر مدرسی کو انھوں نے اپنے لیے بسا غنیمت خیال کیا اور افسر الملک کی پیش کش قبول کر لی۔

محکمۂ تعلیم سے وابستگی

۱۹۱۱ء میں مولوی صاحب کو محکمۂ تعلیم سے منسلک ہونے کا موقع فراہم ہو گیا۔ ... کا ایک صوبہ میدک تھا، جس کا صدر مقام حیدرآباد تھا۔ گوبند راؤ کالے اس صوبے کے تعلیمات تھے۔ وہ جانب داری کے الزام میں معطل کر دیے گئے اور ان کی جگہ مولوی صاحب کا عارضی تقرر ہو گیا۔ مولوی صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا، تو وہ کالے صاحب کو برطرف کرانے اور خود مستقل ہونے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ ایک عالی ظرف انسان تھے ... نے بار بار اس کا اظہار کیا کہ کالے صاحب پر لگایا ہوا الزام بے بنیاد ہے۔ چنانچہ کالے صاحب پھر بحال ہو گئے۔ گویا ان کی بحالی کا سہرا مولوی صاحب کے سر ہے۔ اس کام سے ان کی بے غرضی اور دیانت داری کا پتا چلتا ہے۔ اس اثنا میں سراج یار جنگ ڈاکٹر سراج الحسن محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے۔ وہ مولوی صاحب کے دوست تھے اور مولوی صاحب کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب کو صدر مہتمم تعلیمات بنا کر اورنگ آباد بھیج دیا۔

قیامِ اورنگ آباد

اورنگ آباد کا قیام مولوی صاحب کو بہت راس آیا۔ انھوں نے یہاں رہ کر دل جمعی سے کام کیا۔ وہ کھلی فضا، مناظرِ فطرت اور خوش گوار آب و ہوا کے بڑے دل دادہ تھے اور اورنگ آباد کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے ایک دوست نے کہا۔ اورنگ آباد کو دو ہی قدر دان میسر آئے، ایک شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور دوسرے مولوی عبدالحق۔

ڈاکٹر سراج الحسن کے مشورے پر مولوی صاحب نے اپنی رہائش کے لیے بنگلے کو پسند کیا جو مقبرۂ رابعہ دورانی کے پہلو میں واقع ہے۔ اورنگ زیب نے ... کا مقبرہ تاج محل کے نمونے پر سنگِ مرمر کے بجائے اینٹ اور گچ سے تعمیر کرایا۔ اسی لیے یہ دکن کا تاج کہلاتا ہے۔ کسی سیاح نے لکھا ہے کہ چاندنی رات کی طلعت مقبرے میں جان ڈال دیتی ہے؛ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بے جان عمارت نہیں بلکہ ملکہ نورانی لباس پہنے کھڑی ہے۔ مقبرے کے پیچھے دور تک پہاڑی سلسلہ چلا گیا ہے؛ سامنے کے رُخ ایک خوبصورت باغ ہے۔ پہلو میں وہ بنگلہ ہے جس میں مقیم رہ کر مولوی صاحب برسوں ادبی اور علمی کاموں میں منہمک رہے۔

ایک لافانی کردار

مولوی صاحب بڑے حُسن پرست تھے، مناظرِ قدرت کے سچے عاشق اور پھول پودوں کے دلدادہ۔ انھوں نے بنگلے کے سامنے ایک چمن لگوایا۔ اس کی دیکھ بھال ایک مالی کے ذمے تھی۔ مولوی صاحب اندر کمرے میں تصنیفی کاموں میں مصروف رہتے۔ ان کی میز کے سامنے ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ مولوی صاحب دیکھتے کہ نام دیو ہر وقت جی جان سے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ وہ ذات کا ڈھیڑ تھا جو بہت نیچ ذات خیال کی جاتی ہے مگر مولوی صاحب نے سچ لکھا ہے کہ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ مولوی صاحب نام دیو کی محنت اور فرض شناسی سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے ایک مضمون میں اس

فلمی تصویر کھینچ کے اسے ابدی زندگی بخش دی ہے۔ بڑے لوگوں پر مضمون لکھنے والے بہت ہوتے ہیں مگر مولوی صاحب نے اس معمولی سے آدمی پر قلم اٹھایا اور اسے امر کر دیا۔ بڑا دلکش مضمون ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے کچھ حصے یہاں پیش کر دیے جائیں۔ لکھتے ہیں:-

"لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا۔ پھر اُلٹے پانو پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں، بے گار ہے۔

* * *

... وہ پیڑوں اور پودوں کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا، جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے...

* * *

"ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنووں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے، وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے، جیسے دق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا؛ وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا مگر یہ خدا کا بندہ، کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھونڈ ڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا، یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔ میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔

* * *

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کے چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا، اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی۔"

بڑا آدمی

ہم جسے بڑا شخص مانتے اور سمجھتے ہیں، وہ وہ ہے جو اپنے افکار اور اپنی زندگی سے دلوں میں ولولہ، دماغوں میں جلا اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دے، اور ان کے طرزِ فکر ہی کو نہیں بلکہ ان کے دماغوں کی ساخت کو بھی بدل دے، اور زندگی کا نیا تصور عطا کرے، قوم کو تاریکی سے نکال کر اُجالے میں لے آئے، اور پستی و ضلالت کی راہ سے موڑ کر اس رستے پر لے آئے، جسے ہم صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔

انجمن کی ذمہ داری

انجمن ترقیِ اردو ۱۹۰۳ء میں وجود میں آ گئی تھی مگر شروع میں اس کی حیثیت ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ کی تھی۔ اپنے اشاعتی کاموں کے لیے بھی وہ کانفرنس کی مالی امانت کی دست نگر تھی۔ سات آٹھ سال یہی صورتِ حال رہی۔ اس دوران میں کئی بار اس کے سکریٹری بدلے مگر حالت بہتر نہ ہوئی۔ عزیز مرزا بڑے فعّال آدمی تھے۔ وہ سکریٹری مقرر ہوئے تو امید بندھی کہ اب کچھ ہو جائے گا مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ آخر کار سب کی نظریں مولوی عبدالحق کی طرف اٹھیں اور ۱۹۱۱ء میں وہ انجمن کے سکریٹری منتخب ہو گئے۔

مولوی عبدالحق کو اردو سے عشق تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں،

"میری زندگی کا مقصد دنیا میں صرف ایک ہی ہے کہ اردو کو ترقی ہو اور وہ ایک علمی زبان بن جائے۔" طالب علمی کے زمانے سے وہ اردو زبان کی خدمت کرتے آتے تھے۔ اب بڑے پیمانے پر اردو کی خدمت کا موقع ملا تو دشواریوں سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ اس وقت انجمن کے پاس نہ سرمایہ تھا، نہ عملہ؛ اراکین کی تعداد بھی چند اشخاص تک محدود تھی۔ غرض انجمن کا دفتر بھی مولوی صاحب کے مسکن یعنی مقبرۂ دورانی سے ملحق ایک کمرے میں منتقل ہو گیا اور یہ جگہ "اردو باغ" کہلانے لگی۔

اُردو یونی ورسٹی کی اسکیم

مولوی عبدالحق تعلیم کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھیں کامل یقین تھا کہ جب تک سارے علوم ابتدائی جماعتوں سے اعلیٰ درجوں تک مادری زبان میں نہ پڑھائے جائیں گے صحیح معنی میں تعلیم کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اس وقت سرکاری زبان انگریزی تھی لیکن ہر جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے عبدالحق اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے زبردست حامی تھے۔ اس وقت لوگوں کو مولوی صاحب کی یہ رائے بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ اس تجویز کے خلاف ایک معقول عذر تو یہ موجود تھا کہ اردو میں درسی اور امدادی کتابیں دستیاب نہیں۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ ایسے اساتذہ ہی موجود نہیں، جو تمام علوم کو اردو زبان کے ذریعے پڑھانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

اس وقت ریاست حیدر آباد کے ناظمِ تعلیمات تھے۔ وہ ماہرِ تعلیم بھی تھے لیکن مولوی صاحب انھیں اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔ ... صاحب اس تحریک کے مخالف تھے اور انگریزی کے بجائے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے خیال کو ناقابلِ عمل سمجھتے تھے۔ نیت نیک ہو اور لگن سچی ہو، تو غیب سے امداد ملتی ہے۔ آخر کار سر اکبر

اچھی صحبت

ماحول کا انسانی تربیت اور نشوونما میں بڑا دخل ہے۔ ادنیٰ، ناسازگار ماحول اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی صفات کو زائل کر دیتا اور اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے، اور ایک صالح ماحول یا صحبت انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ میں نے بعض ایسے ان پڑھ لوگ دیکھے ہیں، جو اچھی صحبت کی بدولت اپنی گفتگو اور برتاو میں ایسے شائستہ اور مہذب معلوم ہوتے تھے کہ کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ وہ ان پڑھ یا جاہل ہیں۔

حیدری جو ریاست حیدرآباد کے ہوم سکریٹری تھے اس تحریک کے حامی ہو گئے۔ اکبر حیدری بڑے بارسوخ انسان تھے اور ریاست میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ وہ روشن خیال انسان تھے، اور قوم کے سچے ہمدرد۔ اکبر حیدری ایک بار اورنگ آباد آئے۔ مولوی عبدالحق نے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا اور اس میں جو تقریر کی اس کا موضوع تھا: "مروجہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم"۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں دلیلوں سے ثابت کیا کہ اردو ہی واحد ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہے اور اسی اقدام میں قوم کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ اکبر حیدری نے ان کی دلیلوں کو غور سے سنا اور آخرکار قائل ہو کے مولوی صاحب کے موئید ہو گئے لیکن وہ اپنی طرف سے اس معاملے میں پہل کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ البتہ انھوں نے اس کا یقین دلایا کہ معاملہ ان کے سامنے پیش ہوگا تو وہ اس کی حمایت کریں گے۔ قاعدے کے مطابق یہ تجویز الماطیفی ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) کی طرف سے پیش ہونی چاہیے تھی مگر وہ اس کے مخالف تھے۔ آخر عبدالحق نے دارالعلوم کے پرنسپل مولوی حمیدالدین کو راضی کر لیا۔ عبدالحق نے خود ہوم سکریٹری کے نام ایک عرضداشت تیار کی اور حمیدالدین صاحب کے دستخط سے اسے پیش کر دیا۔ اس طرح سلسلہ جنبانی ہوئی۔

مولوی صاحب دُھن کے پکے تو تھے ہی وہ فوراً کام میں لگ گئے۔ انھوں نے بہت سی یونی ورسٹیوں کے قواعد و ضوابط اور نصابات حاصل کیے اور اردو یونی ورسٹی کی ایک جامع اسکیم تیار کر لی۔ اس اثنا میں ڈائرکٹر تعلیمات راس مسعود بھی اس تجویز کے حامی ہو گئے۔ آخر یہ تجویز سر اکبر حیدری کی سفارش کے ساتھ والیِ ریاست نواب میر عثمان علی خان نظام ہفتم کے سامنے پیش ہو کر منظور ہوئی اور فوراً کام شروع ہو گیا۔

اس وقت ایک حلقے کی طرف سے یہ کہا گیا کہ اسکیم پر عمل درآمد سے پہلے ضروری تیاریاں کر لی جائیں یعنی پہلے کتابیں تیار ہو جائیں۔ مگر مولوی صاحب عملی آدمی تھے وہ جانتے تھے کہ تاخیر سے اس اسکیم کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ کتابوں کی کمی کا علاج یہ تجویز ہوا کہ جب تک کتابیں تیار نہ ہوں اس وقت تک استاد کے لکچر ہی کو کافی سمجھا جائے اور طلبہ لکچر نوٹ کر لیا کریں۔ کالج کے لیے پروفیسروں کا انتخاب ہوا تو فلسفے کے لیے خلیفہ عبدالحکیم، تاریخ کے لیے ہارون خاں شیروانی ریاضی کے لیے محمد حسین ریگلر اردو کے لیے مولوی وحیدالدین سلیم جیسے لائق اور ماہرینِ فن اصحاب کا تقرر عمل میں آیا۔

اردو یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ مدارس میں اردو ذریعۂ تعلیم قرار پائی۔ اسکولوں کے لیے درسی کتابیں تیار ہوئیں۔ جب پہلا گروہ اسکولی تعلیم سے فارغ ہو کے نکلا تو کالج میں پہلی جماعت قائم ہوئی۔ جو طالب علم فارغ ہو کر چلے گئے تھے انھیں مولوی صاحب نے اپنے خرچ سے واپس بلایا اور کالج کی سطح پر تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولوی صاحب اورنگ آباد کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے

اورنگ آباد پہلے ہی علم و ادب کا مرکز بن چکا تھا۔ کالج کے قیام کے بعد اس علمی اور تہذیبی فضا میں اور بھی جان پڑ گئی۔ یہاں بڑے بڑے علمی اجتماعات اور کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔ ہر سال کالج ڈے بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا۔ اس موقع پر نہایت دل چسپ پروگرام پیش کیے جاتے، جن کی تیاری میں مولوی صاحب دن رات ایک کر دیتے تھے اور اس تقریب پر اپنی جیب سے بھی بہت کچھ صرف کرتے تھے۔ اس پروگرام میں صرف طالب علم ہی نہیں، بلکہ سن رسیدہ، زندہ دل حضرات بھی حصہ لیتے تھے۔ ایک سال مہاراجا کشن پرشاد نے یہ خواہش ظاہر کی کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا "دلّی کا آخری یادگار مشاعرہ" اسٹیج کیا جائے۔ مولوی صاحب نے فوراً تیاریاں شروع کر دیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ یہ مشاعرہ اسٹیج کیا گیا۔ انھوں نے فرحت اللہ بیگ کو حیدرآباد سے کھینچ بلایا کہ وہ مشاعرہ اپنی نگرانی میں کرائیں۔ اس دن "اردو باغ" کی شان دیکھنے کے لائق تھی۔ چمن، حوض، فوارے، بارہ دری سب برقی قمقموں سے جگمگا رہے تھے اورنگ آباد کی یہ رونق ہر سال کا معمول تھا اور اس کا سہرا مولوی عبدالحق کے سر تھا۔ پھر اردو کے

دارالترجمہ کی سربراہی

جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے بھی پہلے سب کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ اردو میں کتابوں کی کمی ہے۔ اصحابِ مجاز کو احساس تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بہت سی کتابوں کے ترجمے اور اصطلاحات وضع کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ دارالترجمہ کا قیام اسی مقصد کے لیے عمل میں آیا۔ جب مولوی صاحب کو اس ادارے کا ناظم مقرر کیا گیا تو وہ یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے؛ دراصل وہ اورنگ آباد چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن جب حیدر نواز جنگ سر اکبر حیدری، صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی اور دوسرے دوستوں نے اصرار کیا اور کہا کہ آپ کی نگرانی کے بغیر اس اسکیم کی کامیابی محال ہے تو انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔

جامعہ عثمانیہ

مولوی صاحب کو اورنگ آباد سے بے حد لگاؤ تھا۔ یہاں کا پُرسکون ماحول، خوشگوار آب و ہوا، دل کش مناظر ان کا دامن نہ چھوڑتے تھے۔ یہاں مولوی صاحب کو وہ سکون اور اطمینان نصیب ہوا جو شاید زندگی میں کہیں اور میسر نہ آ سکا۔ یہی وہ مقدس مقام ہے جہاں رہ کر انھوں نے وہ کارنامے انجام دیے جنھوں نے اردو کو اردو اور مولوی عبدالحق کو بابائے اردو بنا دیا۔ دارالترجمہ کے قیام سے مولوی صاحب کا ایک دیرینہ خواب پورا ہوا تھا مگر اس کی نظامت سنبھالنے میں انھیں یہ ہچکچاہٹ تھی کہ اس سے ان کا اورنگ آباد اور اورنگ آباد کالج چھوٹ جائے گا۔ اور جب اپنے دوستوں اور اردو کے ہمدردوں کے اصرار پر انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی تو اس شرط پر کہ ہر مہینے دس دن وہ کالج کی دیکھ بھال میں گزارا کریں گے

انجمن کا دہلی منتقل ہونا

۱۹۳۶ء میں انجمن کا سالانہ اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ اس میں یہ تجویز منظور کر لی گئی کہ اس کے صدر دفاتر جلد دلّی منتقل کر دیے جائیں۔ نیز یہ بھی طے پایا کہ اس کے دائرۂ کار کو وسعت دی جائے۔

ضروری انتظامات مکمل کر کے آخر ۱۹۳۸ء میں انجمن کے دفاتر دلی آ گئے۔ اس کے بعد بھی مولوی صاحب کچھ عرصے تک عثمانیہ یونی ورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے جس کا وہ معقول مشاہرہ پاتے تھے مگر انھوں نے محسوس کیا کہ انجمن کے کاموں کو فروغ دینا ہے تو انھیں ہر طرف سے یکسو ہو کر اس کام میں لگنا ہوگا۔ اس پر وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقلاً دلی چلے آئے اور انجمن کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

ابھی انجمن کا کام پوری طرح دلی میں جم بھی نہیں سکا تھا کہ ملک کی سیاست کا رُخ بدل گیا۔ اردو کی مخالفت میں بھی شدت پیدا ہوتی گئی۔ مولوی صاحب اس کے تحفظ کے لیے سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے ہر محاذ پر اس کے لیے جنگ لڑی۔ مگر حالات روز بروز ناسازگار ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ دلی میں انجمن کا دفتر تباہ کر دیا گیا۔ جس میں کتنی قیمتی کتابیں اور کاغذات ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گئے۔

ترکِ وطن

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا۔ مولوی صاحب نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے خیال میں ہندستان کی بہ نسبت پاکستان میں اردو کا مستقبل زیادہ تابناک تھا۔ وہ ساری زندگی ایک نکاتی پروگرام — ترقیِ اردو — پر عمل پیرا رہے۔ ان کے نزدیک ان کا وطن وہ تھا جہاں ان کی زبان محفوظ ہو۔ پاکستان پہنچ کر وہ اردو کی ترویج و ترقی میں لگ گئے اور بڑی کوششوں کے بعد انھوں نے کراچی میں اردو کالج قائم کر دیا لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بنگال کی زبان بنگالی ہے، پنجاب کی پنجابی، سندھ کی سندھی، اور سرحد کی پشتو۔ اردو کا علاقہ صرف کراچی تک محدود تھا کیونکہ یہیں ہندستان سے جانے والے مہاجرین کا مسکن تھا۔ ہر علاقے کے رہنے والے اپنی اپنی زبان کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ خود حکومتِ پاکستان کا رویہ اردو کے موافق نہیں تھا۔ جس ملک میں اردو کے لیے گنجایش نہ ہو، وہ مولوی صاحب کو اپنے لیے تنگ معلوم ہوتا تھا۔

پاکستان میں انھیں کس مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران میں مولوی صاحب حیدر آباد سے دلی لوٹ رہے تھے۔ حیدر آباد سے انجمن ترقیِ اردو کی امداد بند ہو گئی تھی اور وہ اسی سلسلے میں وہاں گئے تھے۔ ایسی پر شعیب قریشی نے بھوپال کے اسٹیشن پر پہنچ کر انھیں روکنا چاہا کہ دلی کے حالات بہت خراب ہیں وہاں جانا خلافِ مصلحت ہے۔ مولوی صاحب کو انجمن اور اس کے علمی ذخیرے کے بارے میں تشویش تھی اور وہ رکنا نہیں چاہتے تھے۔ اس پر شعیب قریشی نے کہا کہ اگر یوں نہ مانے تو میں نواب بھوپال سے کہہ کر گرفتاری کے وارنٹ جاری کرا دوں گا اور پولیس کے ذریعے روک لوں گا۔ مولوی صاحب ان کے اصرار سے مجبور ہو گئے۔ پاکستان میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ کاش کہ میں اس دن بھوپال میں نہ رکا ہوتا اور راستے میں مارا جاتا۔ اس سے اس ذلت سے تو بچ جاتا جو مجھے یہاں پاکستان آ کر اٹھانی پڑی۔

غفلتُ

جو یہ سمجھے کہ رات کو سویا اور صبح ہوتے ہوتے اٹھ کھڑا ہو" اسے کوئی کیونکر سمجھا سکتا ہے کہ اس اثنا میں کئی صدیوں کا پھیر پڑ گیا ہے، اور زمانے میں ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

کامیابی کا راز

کامیابی آسمان سے نہیں اُترتی۔ یہ سب محنت، صبر، استقلال کی کرامات ہے۔ جانیں کھپانی پڑتی ہیں، تب کچھ ہاتھ آتا ہے۔ بابائے اردو

وفات

مولوی صاحب نے ۹۲ سال کی طویل عمر پائی مگر وہ ابھی مرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے نہیں کہ جینے کی خواہش ایک فطری بات ہے، بلکہ اس لیے کہ اردو یونی ورسٹی کا جو خواب انھوں نے دیکھا تھا، وہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ اردو کی ترویج و ترقی کے جو منصوبے انھوں نے بنائے تھے، انھیں اپنی زندگی میں پورا ہوتے دیکھیں۔ نوّے برس کی عمر میں انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا:۔

"میں مرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک اردو یونی ورسٹی قائم نہ کر لوں"

مگر یہ تو بات کہنے کا ایک انداز ہے۔ دراصل موت اور زندگی تو انسانی اختیار سے باہر ہے انسان صرف اتنا کر سکتا ہے کہ جس کام کو اپنا مقصدِ حیات بنا لے اس کی تکمیل کے لیے حتی المقدور کوشش کرے۔ اور مولوی صاحب نے یہی کیا۔ ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتے تو یہ ان ناعاقبت اندیشوں کا قصور ہے جنھوں نے مولوی صاحب کی بات پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔

زندگی کے آخری ایام میں مولوی صاحب خاصے علیل رہنے لگے تھے جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو انھیں کراچی کے جناح ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو علاج کے لیے مری بھیج دیا گیا۔

مولوی صاحب بڑے ظریف اور زندہ دل انسان تھے۔ ظرافت نے بسترِ مرگ پر بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا ایک دن لیٹے لیٹے کہنے لگے:۔

"میرا جی چاہتا ہے کسی ایسے مہینے میں مروں جس میں کوئی بڑا آدمی نہ مرا ہو مگر سارے مہینے تو گھرے ہوئے ہیں۔ جنوری میں محمد علی جوہر سدھارے، فروری میں غالب رخصت ہوئے، مارچ سر سید احمد خاں کے حصے میں آیا، اپریل میں علامہ اقبال نے کوچ کیا، جون بہادر یار جنگ کے حصے میں آیا، ستمبر میں محمد علی جناح نے وفات پائی، اکتوبر میں لیاقت علی خاں نے رختِ سفر باندھا، نومبر میں ظفر علی خاں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور دسمبر میں حالی چل بسے۔ اب لے دے کے تین مہینے رہ گئے — مئی جولائی اور اگست۔ مئی اور جولائی سخت گرمی کے مہینے ہیں۔ ان میں کون صاحب ذوق مرنا پسند کرے گا ہمارے خیال سے اگست کا مہینہ ٹھیک رہے گا"

اتفاق دیکھیے کہ ۱۹۶۱ء کے اسی مہینے میں انھوں نے وفات پائی۔ ہر سال ۱۶ اگست کو ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

بچت کی ایک سرکاری اسکیم جو چھوٹے
بچت کاروں کو 5.5 فیصد ٹیکس سے مستثنیٰ
سُود کے علاوہ 50 روپے تا ایک لاکھ روپے
کے کسی لکی انعام کا مفاد بھی پیش کرتی ہے۔

انعامی اسکیم

ڈاک گھر بچت بنک کھاتے میں کم از کم 200 روپے جمع رکھنے سے آپ پبلک ڈرار کے ذریعے نکالے گئے انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ڈرار ہر سال جنوری اور جولائی میں نکالے جاتے ہیں۔ ہر ڈرار کے تقریباً 22 ہزار انعاموں کی کُل مالیت لگ بھگ 30 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

ڈاک گھر بچت بنک کے تین لاکھ سے بھی زائد کھاتے دار ایسے انعام حاصل کر چکے ہیں۔
آپ اپنے خاندان کے ہر فرد کے نام کھاتا کھلوا کر اپنے انعام جیتنے کے مواقع میں اضافہ کر سکتے ہیں یا آپ مختلف ڈاک گھروں میں اپنے نام سے جتنے جی چاہے کھاتے کھول سکتے ہیں

ڈاک گھر بچت بنک میں 10 اکتوبر تک کھاتہ کھول لیجئے تاکہ آپ
جولائی 85ء میں نکالے جانے والے ڈرار میں شامل ہو سکیں۔

قومی بچت ادارہ — بھارت سرکار

84/49

سائنس اور ہم

آئی۔ احمد
ڈپارٹمنٹ آف فزکس
مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

بات تلخ ہے لیکن سچ۔ ہم مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بہ مقابلہ دوسری قوموں کے کافی پیچھے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس میدان میں ہمارا دور دور تک پتہ نہیں تو مبالغہ نہ ہوگا یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جسے ثابت کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کی ضرورت نہیں۔ سائنس کے موقر جریدے میں چھپنے والوں کی فہرست یا کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکاء کی لسٹ پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا۔ سنو میں اگر ایک دو مسلمانوں کا نام نظر آجائے تو شکر کا مقام جانیے۔

یہ المیہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ ہمیں اپنی اس کم مائیگی کا احساس تک نہیں۔ سائنس میں تحقیق و تخلیق کرنے کی بات تو ذرا اونچی ہے ہم تو اس بات کے بھی روادار نہیں کہ دوسروں کی تحقیقات کو سمجھیں اور انھیں اپنی زبان میں منتقل کریں۔

کیا ہمیشہ سے ہمارا یہ حال رہا ہے؟ نہیں۔ ایک زمانہ گذرا ہے جب سائنس کے میدان میں صرف ہم تھے۔ کسی دوسرے کا دور دور تک پتہ بھی نہ تھا اور سائنس ہی کیا علم کی ایسی کوئی بھی شاخ نہ تھی جس کی زندگی ہماری مرہون منت نہ رہی ہو۔ ہم سنہ ۷۵۰ء تا ۱۱۰۰ء یعنی مسلسل ساڑھے تین سو سال تک بلا شرکت غیرے دنیائے علم کے امام رہے۔ یہ زمانہ جابر، خوارزمی، رازی، مسعودی، ابوالوفا، البیرونی اور ابن ھیثم کا ہے۔ آج دنیا جسے فرما FERMATE اصول اور نیوٹن کے قوانین حرکت کے پہلے اصول کے نام سے جانتی ہے وہ فی الحقیقت ابن ھیثم کی ایجاد ہیں۔ ابن ھیثم کتنا عظیم تھا کہ اس نے فرما اور نیوٹن سے پانچ سو سال قبل یہ قوانین دیے۔

۱۱۰۰ء کے بعد دیگر اقوام نے بھی سائنس کے میدان میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا لیکن ۱۳۵۰ء تک امامت ہمارے ہی ہاتھ رہی۔ اس کے بعد سے جو ہم نے اس میدان کو چھوڑنا شروع کیا تو سولھویں صدی تک آتے آتے ہمارا نام و نشان بھی باقی نہ بچا۔ پچھلے لگ بھگ چار سو سال سے امامت کا منصب حاصل کرنے کی بات تو دور کی ہے ہم نے سنجیدگی سے مقتدی بھی بننے کی کوشش نہ کی۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک تحقیق طلب بات ہے۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

البتہ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس درگت میں ہمارا اپنا ہاتھ زیادہ ہے۔ ہم بری طرح جمود کا شکار ہو گئے، تو ہم و روایت پرستی ہمارا شیوہ بن گئی۔ ہم تن آسان ہو گئے جس نے اندھی تقلید کو پروان چڑھایا۔ اسلاف کے کارناموں کو آگے بڑھانے کے بجائے ہم نے ان پر فخر کرنے کو کافی سمجھا۔ ہم تکبر کے شکار ہو گئے۔ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ جو علم ہمیں اسلاف سے ملا ہے وہی سب کچھ ہے۔ ہم نے علم کے تصور کو محدود کر دیا۔ صرف دین کی جانکاری کو علم سمجھا۔ مختصراً ہم نے اپنے آپ کو ایک خول میں بند کر لیا۔ وہ ملت جسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ علم حاصل کرو چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اس نے یہ جاننے کی بھی زحمت نہ گوارا کی کہ دوسری قومیں کیا کر رہی ہیں۔ وہ ملت جس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہو جس میں بار بار غور و فکر و تسخیر کائنات کی دعوت دی گئی ہے اس نے پچھلے چار سو سال میں اسلامیات اور ادبیات کے علاوہ شاید ہی کسی اور علمی میدان میں کوئی گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہو۔ خود اسلامیات میں چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر نے اسلاف کے کارناموں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے یا ان پر حاشیہ آرائی کرنے کو ہی اعلیٰ درجے کا علمی کارنامہ سمجھا۔ ادبیات میں بھی ہمارا حال ایسا ہی کچھ رہا ہے۔ مستثنیات ضرور ہیں مگر اس میدان کی بھی بڑی اکثریت نے یا تو رگ گل سے بلبل کے پر کو باندھا ہے یا "حیات اور کارنامے" لکھے ہیں۔

دراصل ہماری بیشتر ذہنی توانائی خرافات کی نذر ہو گئی۔ الفاظ کے کھیل کو ہم نے علمی کارنامے کا درجہ دیا۔ غور و فکر ہم نے کیا ضرور مگر پیغام محمدؐ پر نہیں بلکہ لفظ محمدؐ پر۔ مناظرہ بازی اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کو ہم نے علمی بحث کا مقام دیا۔ ہم گروہوں میں بٹ گئے اور مخالف گروہوں کی تحریروں کو نت نئی تعبیر دینے کو ہم نے تحقیق کہا۔ ایسا نہیں کہ قدرت نے ہم کو ذہنی صلاحیتوں سے محروم کر رکھا ہو۔ ہماری ذہنی صلاحیتیں کسی طور بھی دیگر اقوام کے مقابلے میں کم نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ان صلاحیتوں کو بیشتر ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور ایک، دوسرے کو کافر، مرتد، زندیق اور دہریہ ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ ہر گروہ اپنے کو بہتر اور دوسرے کو کمتر درجے کا مسلمان ثابت کرنے کو عین علمی کارنامہ سمجھ رہا ہے۔ ہم ایک ایسے بھنور میں پھنس گئے ہیں جس میں سے نکلنے کے لیے زبردست کوشش کی ضرورت ہے ماضی میں اس سلسلے میں کئی کوششیں ہوئیں بھی۔ مگر وہ پرانی شراب کو نئی

اگر بچے بڑے ہو کر ویسے نکلتے جیسی ان سے امیدیں تھیں، تو دنیا میں ہر شخص نابغۂ روزگار ہوتا۔

گوئٹے

آواز سے زیادہ تیز رفتار طیاروں کے لاکھ چرچے ہوا کریں۔ ابھی تک ایسی کوئی شے ایجاد نہیں ہوئی جو چھینک سے زیادہ تیز اڑ سکے۔

آر۔ اے۔

چوروں کے پاس آرام کے لیے وقت ہے، چوکیداروں کے پاس نہیں۔

جاپانی کہاوت

تو ہو مگر اس میں شریک ہونے کی کوشش نہ کرے۔ دوسرے ہماری اور بے حسی کا مذاق کس طرح اُڑاتے ہیں، اس کا اندازہ اس چٹکلے سے ہو جسے میں نے چند سال پہلے فرانس کے ایک ریستوراں میں سنا تھا۔

"کسی خیالی بازار میں ایک صاحب انسان کا دماغ خریدنے گئے۔ دوکان پر ہر ملک و مذہب کے دماغ رکھے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر دوکان دار نے انھیں بتایا کہ ایک یہودی دماغ کی قیمت ایک فرانک، عیسائی دماغ کی چار فرانک اور مسلمان دماغ کی ١٦ فرانک ہے۔ خریدار حیرت سے بولا۔ عجیب بات ہے۔ یہودی جو اس وقت دنیا میں اپنی ذہانت کے لیے مشہور ہیں، ان کا دماغ سب سے سستا اور مسلمانوں کا اتنا مہنگا۔ دوکاندار نے جواب دیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ مسلمانوں نے الجبرا کی ایجاد کے بعد سے اپنے دماغ کو خرچ ہی کب کیا۔ ان کے دماغ کا سارا مغز محفوظ ہے۔"

ضرب کاری ہے لیکن حقیقت سے قریب۔

ملی عزت اور حمیت کی بات ذرا اونچی ہے۔ خالص کاروباری نقطۂ نگاہ سے دیکھیے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہمارے دیوالیے پن نے ہمارا کیا حال کر رکھا ہے۔ ہماری زمینیں مختلف النوع معدنیات کے ذخائر سے بھری پڑی ہیں۔ مگر ہمارے پاس وہ ٹیکنالوجی نہیں جس سے انھیں تلاش کر سکیں اور نکال کر استعمال میں لائیں۔ مجبوراً ہمیں ان ممالک کا سہارا لینا پڑتا ہے جو کسی طور بھی ہمارے بہی خواہ نہیں۔ وہ اپنی من مانی شرائط پر ہمیں لوٹتے ہیں اور ہمارے پاس جان بوجھ کر لٹ جانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں۔ ہمارے پاس زراعتی زمینوں کی کثرت ہے۔ مگر وہ جدید وسائل نہیں جن کو بروئے کار لاکر ان زمینوں کی پیداوار کو کئی گنا بڑھایا جا سکے۔ اس کے لیے بھی ہمیں انھیں ممالک کا منھ تکنا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس آدمیوں کی طاقت (MAN POWER) ہے مگر وہ انڈسٹری نہیں جہاں ان کی کھپت کر سکیں۔ لاچار وہ دوسروں کی صنعتوں کے کل پرزے بنتے ہیں۔ یورپ کے بڑے شہروں سے گزریے۔ یہ دیکھ کر کلیجہ منھ کو آتا ہے کہ ریستوران میں بیراگیری سے لے کر کوڑا کرکٹ پھینکنے جیسے چھوٹا کام کرنے والوں میں اکثریت محمدؐ کے نام لیواؤں کی ہے۔ ترکی، یوگوسلاویہ، مراکش، الجیریا، انڈونیشیا، پاکستان، ہندوستان وغیرہ جیسے ممالک کے مسلمانوں سے ارزاں لیبر [illegible] مغربی ممالک کو کہاں ملے گا۔ یقین نہیں آتا یہ اس ملت کے فرزندوں کی حالت بوتل میں انڈیلنے کے مصداق تھیں۔ اس سے ہم میں اور گروہ پیدا ہو گئے اور ہم اس گرداب سے نکلنے کے بجائے اس میں اور تیزی سے گردش کرنے لگے۔

بغور دیکھیے تو ہماری مذہبیت بھی عجیب قسم کی ہے۔ ایک طرف ہماری اکثریت دنیاوی تگ و دو کو مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں سمجھتی اور وہ چند مسلمان جو اپنے کام، روزگار یا پروفیشن کو بخوبی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان پر دنیا لپیٹ لینے کا الزام رکھتی ہے۔ دوسری طرف یہی اکثریت ہر اس دنیاوی آلائشات سے مستفید ہونے میں فخر محسوس کرتی ہے جو بغیر محنت یا تھوڑی بہت محنت کر کے حاصل ہو سکے۔ دراصل یہ ہماری محنت، جانفشانی اور عرق ریزی سے فراریت ہے جو ہمیں مذہب کے غلط تصور کی آڑ لینے اور دین و دنیا کی تفریق کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔ سائنسی دور کی وہ کونسی ایجاد ہے جس سے ہم مستفید نہیں ہوتے یا اگر وہ ہماری دسترس سے باہر ہوں تو ہم ان سے استفادہ کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ لیکن کیا کبھی ہم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ ان ایجادات کے پیچھے جو عرق ریزی ہے اس میں ہمارا اپنا کتنا ہاتھ ہے۔ یہ ایجادات جدید طب سے متعلق ہوں، یا انجینئرنگ سے، طبعیات سے متعلق ہوں یا علم کیمیا سے کہیں بھی تو ہمارا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ ایک حساس اور غیور قوم کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ دوسروں کی عرق ریزی سے فیضیاب

جن سے کبھی یورپ کی مائیں اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔

سائنسی علوم کی ناپیدگی نے ہم کو دنیا کی سب سے زیادہ جذباتی اور روایت پرست قوم بنا دیا ہے۔ سائنس وقوعات پر ٹھنڈے دماغ مختلف پہلوؤں سے غور کرنے کی تربیت دیتی ہے اور ظاہر باطن کشید کر لینے کی ٹریننگ بھی۔ یہ حالات کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرنا سکھاتی ہے اور تجربات مشاہدات پر مبنی قوتِ استدلال پیدا کرتی ہے۔ سائنس سنتِ ابراہیمی ہے جو بت کے جمود اور چاند اور سورج کے عروج و زوال کی راہ سے حق تک پہنچتی ہے۔ یہ روایتوں پر سختی سے عمل بھی کرتی ہے اور جب تجربات ان کے فرسودہ ہونے کا حتمی ثبوت فراہم کر دیں تو اُن کے توڑنے میں دریغ بھی نہیں کرتی۔ یہ اپنے اکابرین سے گہری عقیدت بھی رکھتی ہے اور وقت پر کھل کر ان کی تنقید بھی کرتی ہے۔ یہاں کوئی بات حق ہے اس لیے نہیں کہ اسے آئن سٹائن یا عبدالسلام جیسے عظیم سائنس دانوں نے کہا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ تجربات، مشاہدات اور تجزیے اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ یہاں اندھی تقلید، شخصیت پرستی، نری روایت پرستی اور کج بحثی کا کوئی دخل نہیں۔ کھلے ہوئے اذہان اور روشن دماغوں کا کوچہ ہے۔ یہ وہ بستی ہے جہاں سنت ابراہیمؑ اور آنحضرتؐ کی عقل و دانش کو بروئے کار لانے اور بے جا پرستی، گروہی عصبیتوں، فرسودہ روایتوں اور اندھی عقیدتوں کو توڑنے کی سنتوں پر عمل ہوتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ وہ ملت جو ان پیغمبروں پر رات دن پانچ بار درود بھیجتی ہے، اس نے پچھلی چار صدیوں سے اس بستی میں قدم بھی نہیں رکھا۔

سائنس کی تربیت کی کمی نے ہم کو کس حد تک جذباتی بنا دیا ہے، اس کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔ کسی نے نعرۂ تکبیر بلند کر دیا۔ اللہ اکبر کہہ کر اس کے پیچھے ہو لیے۔ یہ جاننے تک کی زحمت گوارا نہ کی کہ نعرہ بلند کرنے والا مسلمان ہے یا نہیں، یا کل تک وہ قبلہ رُخ بھی ہوا تھا۔ یا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کوئی کارنامہ اس کے اعمال میں ہے۔ اس اندھی جذباتیت کے ہاتھوں ماضی میں ہم نے کافی نقصان اُٹھایا ہے اور آج تک اُٹھاتے چلے آ رہے ہیں۔ اپنی صفوں کے شاطر اور دوسری قوموں کے شرپسند ہماری اس کمزوری سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جب اور جس وقت چاہتے ہیں ہماری اس جذباتیت سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔

یقین کیجیے، اوپر جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے خود میرا اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ لکھتے ہوئے قلم رک رک گیا ہے۔ اپنی خامیوں کو اجاگر کر کے کون خوش ہوگا۔ اپنے زخموں کو کریدنے میں کسے مزا آئے گا۔ لیکن کیا کیجیے جب چہرہ داغدار ہو جائے تو آئینہ سامنے ہی رکھنا پڑتا ہے۔ سائنس کے تئیں

یہ قصہ ہے ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور کا
بہت دیر سے ایک نک چڑھی گاہک کاؤنٹر پر ایک
بیچنے والی لڑکی کے ساتھ الجھ رہی تھی۔ کوئی چیز اس
کو پسند ہی نہیں آتی تھی۔ آخر میں وہ جھنجھلا کر بولی
"تمہارے یہاں کوئی زیادہ سمجھ دار لڑکی نہیں ہے جو
میری طرف دھیان دے سکے؟"
"جی نہیں، جیسے ہی آپ کو آتے دیکھا، زیادہ سمجھدار لڑکیاں غائب ہو گئیں"
ڈان لنڈل

ہماری جاہلیت کی جڑیں کافی دور تک گئی ہیں۔ ہمارا مرض پرانا بھی ہے اور شدید بھی۔ جہاں سنجیدگی سے ان عوامل کو ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت ہے جس سے ہم اس مرض کے شکار ہوئے ہیں، اس فوری توجہ کی بھی ضرورت ہے جس سے مرض کی شدت پر قابو پایا جا سکے اور اس میں کمی کی جا سکے۔ سائنس دانوں کی فہرست میں چند ایک مسلم ناموں کو دیکھ کر ہمیں اس غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہیے کہ ہم اس میدان میں اتر چکے ہیں اور بہت جلد دیگر اقوام کے ہم پلّہ ہو جائیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وسیع میدان میں ابھی ہماری حیثیت ایک نقطے سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ہمارے اور دیگر اقوام کے درمیان ویسے ہی کافی فاصلہ ہے۔ مزید وہ اس میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ پہلے ہمیں ان فاصلوں کو طے کرنا ہے اور پھر کم سے کم ان کے برابر آنا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان سے بہت زیادہ تیزی سے آگے بڑھیں۔ یہ چند 'دیوانوں' کے بس کی بات نہیں بلکہ اس طرف پوری ملتِ اسلامیہ کی توجہ کی ضرورت ہے۔

اب یہ ملتِ اسلامیہ کے اکابرین، دانشوروں اور نوجوانوں کے طے کرنے کا مسئلہ ہے کہ کیا وہ تن من دھن سے اس اہم فریضے کو انجام دینے کے لیے تیار ہیں یا وہ ہمیشہ کے لیے علم و دانش کی امامت کے منصب سے دستبردار ہو چکے ہیں۔

علم کی پانچ منزلیں

سعید الظفر چغتائی
ڈپارٹمنٹ آف فزکس
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

انسانی تاریخ میں آج سے پہلے علم کا اتنا چرچا کبھی نہ تھا۔ علم کا شرف اپنی جگہ ہے لیکن آج اسے وسیلۂ رزق بھی سمجھا جا رہا ہے۔ یہ بات جزوی طور پر صحیح ہے، کیوں کہ علم کے اطلاق سے رزق کے وسیلے پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ ایک حد تک اسی کو سعدی نے "علم بر تن زنی" کہا تھا لیکن اب انسان ایسا سیانا ہو گیا ہے جس نے اس سانپ کو پوری طرح یا کم از کم بڑی حد تک سادھ لیا ہے۔

بات علم اطلاق ہی سے شروع کرنی چاہیے کیوں کہ عملاً ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو بنیادی تعلیم دی جاتی ہے اس کا مقصد یہی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے کہ وہ پڑھنے والے کو اچھا شہری اور کام کا آدمی (مرد یا عورت) بنا دے۔ اس نہج پر تعلیم کی پہلی منزل اسکول (انٹر کالج) پر ختم ہو جاتی ہے جس کی بنیاد پر طالب علم کسی فنی درس گاہ (ٹیکنیکل کالج یا ادارہ) میں داخل ہوتا ہے اور وہاں دوسری منزل طے کر کے انجینیر ڈاکٹر وغیرہ بن کر عملی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔

لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ اگر صرف دولت کمانا مدنظر ہو تو بھی یہ بات صاف ہے کہ تجارت (Trade) صنعت (Industry) اور حرفت ([illegible]) علم کی پیداوار ہی استعمال کرتی ہے۔ اگر کسی کو منبع استعمال تک پہنچنا ہے تو صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنا ہوگا۔ ورنہ تجارت محدود اور دوسروں کے رحم و کرم پر منحصر رہ جائے گی۔ صنعت و حرفت فروغ پاتی ہیں علم جدید (سائنس) کی روز افزوں ترقی سے، جسے کم فہمی میں "علم برائے علم" سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور اسی لیے معاشرہ اور اس کی نمائندگی کرنے والے حکام اس کی اتنی سرپرستی نہیں کرتے جتنی ان کے لیے باعث عزت ہوتی —

دوسری طرف یہ بات بھی خاص طور پر توجہ چاہتی ہے کہ سائنس کے منتہی طالب علم خود علم برائے علم کے مغالطے سے بچیں اور اس کا استعمال کریں چاہے دل پر اور چاہے تن پر۔

علم کے دل پر استعمال کو آج میں کوئی صوفیانہ اصطلاح نہیں سمجھتا۔ یہ علم کا بلند تر تصور ہے جو دور رس نتائج برآمد کرتا ہے اور جس کے لیے روایتی طالب علمی نہیں، نگاہِ دوربیں درکار ہے جو علوم آج خالص (فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور معالجہ وغیرہ) یا سماجی سائنس (معاشیات، نفسیات وغیرہ) کہلاتے ہیں، اپنے طور پر سب کے سب صنعت و حرفت کو خام مال مہیا کرتے اور ان کے مستقبل و حال کے مسائل کا حل تلاش کرتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تحقیق وہ ہوتی ہے جسے جلد یا بدیر صنعت و حرفت (انڈسٹری) اپنا لے گی۔ لیکن آج اسے اس میں اپنی منفعت مشکل سے نظر آتی ہے۔ اسی نکتہ دیریا کو پا جانے سے امریکہ وغیرہ کی اعلیٰ صنعتی کمپنیاں بل (Bell) وغیرہ خالص سائنس کی تحقیقوں پر اپنے مستقبل کی ضرورتوں کے پیش نظر خاصہ سرمایہ لگانے لگی ہیں ——— اس بلندی پر پہنچ کر علم کی بات اس علم برائے علم تک آ جاتی ہے جسے "علم را بر دل زنی" کہا گیا ہے اور اسی کی پانچ منزلیں بیان کرنے کا ارادہ ہے۔

اگر کوئی طالب علم ترقی پذیر ممالک کے کسی ایسے خاندان سے اٹھ کر، جس میں علم کا قابل ذکر چرچا روایتاً نہیں، اچھے نمبروں گریجویشن یا آنرس کر لیتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ اس نے علمی زندگی کے ۲۰ فیصد تقاضے پورے کر دیے اور ایک منزل طے کر لی۔

دوسری منزل تحقیق (ریسرچ) کی ہے اور اس وقت طے سمجھنی چاہیے جب نہ صرف طالب علم پی ایچ۔ ڈی (یا اس کے مساوی) ہو بلکہ از خود موجودہ علمی معلومات اور مسائل پر غور کرنے اور ان کے حسن و قبح سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ ایسے شخص کو پڑھاتے وقت مذاکروں میں شرکت سے کتابیں یا مقالے پڑھ کے اور علماء کی گفتگو سن کر تحقیقی مسائل ہاتھ آ جاتے ہیں اور اس کے ذہن میں ان کے حل کی صورتیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ یہ دوسری منزل پہلی سے لمبی نہیں لیکن مشکل ضرور ہوتی ہے۔ اطمینان کا موقع ہے کہ ہمارے ملک و ملت کے بہت سے افراد اس سے آگے نکلنے لگے ہیں۔

تیسری منزل کا آغاز دوسری منزل پر پہنچ کر خود بخود ہو جاتا ہے، لیکن یہ سفر اور بھی مشکل ہے، اور اس کی مدت بالکل متعین نہیں۔ عام طور پر ایک عرصے کی کوششوں کے بعد علمی دنیا میں، یعنی بین الاقوامی طور پر، محقق سراہا جانے لگتا ہے اور اس کے علمی کارناموں کی مقدار سے بڑھ کر کیفیت کی بنا پر قدر ہونے لگتی ہے۔ جب بات یہاں تک پہنچے کہ محقق کسی عالمی طور پر ممتاز یونیورسٹی مثلاً کولمبیا، آکسفورڈ، پیرس میں مستقل یا مدعو استاد (پروفیسر) ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ تیسری منزل سر ہو گئی۔ اور اب اعلیٰ اعزازوں اور سرفرازیوں کی آرزو کی جا سکتی ہے جن میں سب سے مشہور اور قابل احترام نوبل انعام سمجھا جا رہا ہے

شوق کے ہاتھ بھلا چاند کو چھو سکتے ہیں ؟
چاندنی دل میں رہے یہ بھی شرف کیا کم ہے !!

اور جسے برصغیر ہندوستان اور پاکستان میں پیدا ہونے والے پانچ سپوت ہی اب تک حاصل کر سکے ہیں (ٹیگور۔ رامن۔ کھورانہ، عبدالسلام اور چندر شیکھر)

نوبل انعام یافتہ علمی زندگی کی ۸۰ فیصدی دوڑ جیت چکتا ہے، مگر فاصلے ہنوز اس کے آگے باقی ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ۱۹۰۰ء سے آج تک فزکس، کیمیا، معالجہ اور ادبیات میں سے ہر ایک میں سو دو سو نوبل انعام یافتہ موجود ہیں۔ اگر ہمیں تاریخ علوم پر ایک مختصر کتابچہ لکھنا ہو جو ناموں کی ڈائری نہ ہو بلکہ کارناموں کا مختصر اور عام فہم تعارف کرائے تو ان میں بھی بڑی کانٹ چھانٹ کر کے انتخاب کرنا ہوگا۔ کیوں کہ ہر کہانی کئی سو یا کئی ہزار سال پہلے شروع ہو چکی ہے۔ وہ کون کون سے نوبل انعام یافتہ یا غیر انعام یافتہ ہیں جو آئن شائن اور نیوٹن کی صف میں یا سینور، ڈاردن، مارکس، فرائڈ اور سندلیف کے ساتھ جگہ پائیں گے؟ اس کا جواب بتائے گا کہ دنیا کی تاریخ میں کتنوں نے علم کی پانچویں منزل سر کرلی اور زبانِ حال سے کہا کہ بہر حال اور بہر کیف: ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما !

مطالعہ

"پڑھنے کی عادت بہت اچھی ہے۔ مطالعہ ایک شریفانہ فعل ہی نہیں، حکیمانہ فعل ہے۔ لیکن پڑھنے پڑھنے میں فرق ہے اور کتاب کتاب میں فرق ہے۔ میں ایک بدمعاش اور پاجی آدمی سے باتیں یا بے تکلفی کرتے ہوئے جھجکتا ہوں اور آپ بھی میرے اس فعل کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں لیکن میں اس سے زیادہ بدمعاش اور پاجی کتاب پڑھتا ہوں، نہ آپ کو ناگوار گزرتا ہے اور نہ مجھے ہی کچھ ایسی شرم آتی ہے، بلکہ اس کی ہر بات شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اترتی چلی جاتی ہے۔ پاجی آدمی کی تو شاید کوئی حرکت ناگوار ہوتی اور میں اُس سے بیزار ہو جاتا مگر یہ چپکے چپکے دل میں گھر کر رہی ہے اور اس کی ہر بات دلربا معلوم ہوتی ہے۔

• اگر میں کسی روز بازار جاؤں اور چوک میں سے کسی محض اجنبی شخص کو ساتھ لے آؤں اور اس سے بے تکلفی اور دوستی کی باتیں شروع کردوں اور پہلے ہی روز اس پر اس طرح سے اعتبار کرنے لگوں جیسے کسی پرانے دوست پر، تو آپ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر ریل کسی اسٹیشن پر ٹھہرے، اور میں اپنی گاڑی سے اُتر کر سیدھا بک اسٹال پر پہنچوں اور پہلی کتاب جو میرے ہاتھ لگے، خرید لاؤں اور کھول کے شوق سے پڑھنے لگوں، تو شاید آپ کچھ نہ کہیں گے۔ حالانکہ یہ فعل پچھلے فعل سے زیادہ مجنونانہ ہے۔ اُس کے لیے تو کوئی عذر ہو بھی سکتا ہے مگر اس کے لیے کوئی عذر ممکن نہیں۔

" میں ایک بڑے آباد شہر یا مجمع میں جاتا ہوں، کبھی ایک طرف نکل جاتا ہوں، کبھی دوسری طرف جا پہنچتا ہوں، اور بغیر کسی مقصد کے اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہوں۔ افسوس کہ باوجود آدمیوں کی کثرت کے میں وہاں اپنے تئیں اکیلا اور تنہا پاتا ہوں اور اس ہجوم میں تنہائی کا بار اور بھی گراں معلوم ہوتا ہے۔ میرے کتب خانے میں بیسیوں الماریاں کتابوں کی ہیں۔ میں کبھی ایک الماری کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں اور کوئی کتاب نکال کے پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی دوسری الماری میں سے کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگتا ہوں میں اس طرح سیکڑوں کتابیں پڑھ جاتا ہوں۔ لیکن اگر میں غور کروں تو دیکھوں گا کہ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اس وقت میری آوارہ خوانی مجھے ستائے گی، اور جس طرح ایک بھرے ہُوئے شہر میں میری تنہائی میرے لیے وبال تھی، اسی طرح اس مجمع شرفا و علما و ادبا و شعرا میں، مَیں یکہ و تنہا اور حیران رہوں گا بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ہی نہیں مضر بھی ہے۔ جس قدر ہم بغیر کسی مقصد کے پڑھتے ہیں اسی قدر ہم ایک بامعنی مطالعے سے دور ہو جاتے ہیں۔"

باباۓ اُردو ۔

اِس [illegible]ـیرے نجی علم میں اس سے بھی بڑھ کر سرپرست صاحبان ایسے بھی ہیں جو بچے کے سرپرست بھی ہیں اور اتفاق سے خود بھی اسی مدرسے میں معلمی فرماتے ہیں لیکن یاد رکھیے یہ سرپرست صاحب بھی اوپر بیان کیے ہوئے سرپرست صاحبان سے کسی طرح کم نہیں ہوتے' ان سے سبقت ہی لے جانا چاہتے ہیں۔ "یہ پرچے مشکل بنائے گئے۔ بچے سے یہ سوالات کیوں کیے گئے اور کیوں نہیں کیے گئے۔ معمولی دیر سے آنے پر زیادہ پوچھنا مناسب نہیں۔ بڑے بچے پر سختی نہیں کرنا چاہیئے"۔ وغیرہ وغیرہ اس طرح کی نہ جانے کتنی اور بے مانگی رائے ملتی رہتی ہیں اور بیچارے ماسٹر صاحب متعلقہ پھر بھی لحاظ و مروت میں خاموش رہتے ہیں۔ اب بتائیے کیا ہماری مسلم قیادت کی نظر سرپرستوں کے اس رویے کی طرف کبھی بھی جاتی ہے جو یقیناً مسلم تعلیم کا اہم مسئلہ ہے۔ اب خود ہی غور فرمائیے کہ جہاں مسلم سرپرستوں کا یہ حال ہو تو اس قوم کے بچے کس طرح تعلیمی پسماندگی سے باہر آسکتے ہیں۔ جب کسی قوم کے تعلیمی اداروں کا حال کچھ اس درجے بگڑ چکا ہو اور اس میں کسی تبدیلی اور ترقی کی خواہش بھی نہ ہو تو میرے نزدیک صرف کوئی معجزہ ہی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا صحیح حل نکال سکتا ہے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو۔ اسی طرح اساتذہ کرام کی توجہ اپنے نجی معاملات پر زیادہ اور ادارے وطلباء کی فلاح وبہبود پر کم، تقریباً مسلم اسکول میں پائی جائے گی۔ آئے دن گرانی الاؤنس اور تنخواہوں کے اضافے پر نظر لگی رہتی ہے۔ وقت پر پہنچنے کی نہ پابندی ہے نہ درجے میں صحیح وقت پر پہنچنا اور ٹھیک طرح سے پڑھانے سے کوئی سروکار۔ نہ پرانے دقیانوسی علم کی کوئی تجدید کرنا اور نہ ہی نئی کتب کا مطالعہ کرنا۔ پھر بھی قوم چاہتی ہے کہ دلی کے پبلک اسکول۔ ماڈرن اسکول۔ سالون اسکول۔ دہرہ دون کا ویلہم اور دون اسکول۔ نینی تال کا سینٹ جوزف اور آگرہ کا سینٹ پیٹرس ہمارے اسکول اور ان سے نکلے ہوئے طلباء کا موازنہ ان اعلیٰ اسکولوں سے ہو۔ کیسے ممکن ہے تاوقتیکہ آپ اپنے میں بنیادی تبدیلی نہ لائیں۔ نتیجتاً مندرجہ بالا اسکولوں کے بچے ظاہر ہے ہمارے مسلم اسکولوں کے بچوں سے ہمیشہ ہی موجودہ صورت حال میں تو آگے ہی رہیں گے۔ کیوں کہ "دوسرے" اسکولوں میں کام کرنے والے اساتذہ میں لگن' قوم پرستی' اپنے علم کو تازہ رکھنے کا شوق اور اس سب کے اوپر ہمیشہ سے ایمانداری کہیں زیادہ واضح طور پر پائی جاتی ہے۔

کچھ معترض حضرات کا فرمانا ہے کہ ملک کے مشہور اسکولوں میں اساتذہ کی تنخواہیں مسلم اسکولوں سے کہیں زیادہ ہیں اور مراعات وسہولتیں بھی۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ کچھ مسلم ادارے بھی ایسے ہیں جن میں بہت معقول تنخواہیں ہیں پھر بھی کارکردگی میں فرق ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ مسلم اداروں میں مراعات ودیگر سہولتوں کو اب بھی نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فرض شناسی کا منظر ماسٹر صاحب کی طرف سے یوں بھی دیکھنے کو آیا کہ سال بھر کے پورے کام پر جوان کو سشنل مارکس دینے تھے' ماسٹر صاحب اپنے درجے کے طالب علموں کو سالانہ امتحان کے کمرے کمرے تلاش کرتے پھر رہے ہیں کیوں کہ آج سشنل مارکس دینے کا آخری دن ہے' لڑکے کا منہ دیکھا اور کھٹا کھٹ سشنل مارکس دے دیے۔ نہ کوئی ریکارڈ اور نہ کوئی لڑکے کے اچھے بُرے ہونے کا ثبوت بس جناب ماسٹر صاحب کے کرم پر یکمشت نمبر مل گئے۔ اس طرح امتحان گاہ میں ۲½ گھنٹے کا پرچہ ہے لیکن ماسٹر صاحب جہاں ایک گھنٹہ گزرا بے چین ہوئے۔ تقاضے پر تقاضے کہ میاں پرچہ پورا کرو۔ جلدی کرو۔ اتنی دیر ہوگئی۔ کیوں کہ بچوں کے ایک سال کی قیمت سے زیادہ ماسٹر صاحب کے چند وہ منٹ جو فرصت سے ان کو مل جائیں گے' زیادہ قیمتی ہیں اور پھر ہم مسلم اسکول میں جو پڑھاتے ہیں' قومی ادارہ ہے ہم جانیں اور قوم۔ فرمائیے کہ کیا ان مسائل کی طرف بھی قوم کی قیادت کی نظر جارہی ہے جو میرے نزدیک مسلم تعلیمی مسائل کی ایک اہم کڑی ہے۔

ہمارے مسلم اسکولوں کے مسلم طلباء کے مزاج' ان کی کارکردگی اور امتحان وتعلیم سے متعلق ان کا رویہ کیا اس پر بھی طائرانہ نظر ڈالیں۔ روزمرہ ہمارے اسکولوں میں کیا ہوتا ہے یہ تو موخر ہے ذرا "اردو، قوم اور مسلمان" کا مطلب سمجھتے چلیے۔ علی گڑھ کے جامعہ اردو کو کون نہیں جانتا۔ تمام ملک میں فروغ اردو کے لیے کام کر رہا ہے۔ پچھلے متعدد سالوں سے مختلف مراکز پر تقریباً ملک کے ہر صوبے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ چاہے وہ بنگال ہو اور چاہے ملحق صوبہ بہار۔ چاہے وہ اترپردیش ہو اور چاہے راجستھان وغیرہ کیفیت ہر جگہ ایک سی ہی ملتی ہے۔

ان مراکز کے نگراں حضرات کو نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امتحان کب سے شروع ہے اور نہ یہ چیز کہ جامعہ اردو سے آئے پرچے کہاں اور کس کے پاس ہیں۔ طلباء جہاں اور جس طرح چاہتے ہیں جامعہ کے امتحانات اپنی مرضی اور نگراں حضرات کے ایماء سے دیتے ہیں اور اگر میرے جیسے سرپھرے انسپکٹر مرکز کی رپورٹ پر مرکز کو ختم کر دیا جائے تو پھر "صاحب مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ اردو کے فروغ کا مسئلہ ہے۔ قوم کی ترقی کا مسئلہ ہے۔ چلنے دیجیے صاحب اسی دھرے پر" بولیے کیا آپ اب بھی ایسے معاملے کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل میں شریک کرنے کو تیار ہیں کہ کہیں نونہالان قوم اس درجہ علمی صلاحیت ولیاقت نہ کھو بیٹھیں کہ پھر صدیوں سنبھالا نہ لیا جاسکے۔

مزید یہ کہ ہمارے مسلم طلبا عدم نظم ونسق کے ماہر ہوتے ہیں ـــــ
اور اس درجے کہ برادرانہ قوم کے بچے ایسی کبھی ہمت نہیں کرتے۔ نہ درجے میں سال
بھر آئیں اور نہ استاد وسبق کی طرف توجہ دیں۔ البتہ امتحان کے قریب ضرور
ماسٹر صاحب کی خدمت یاد آئی۔ گو نہ صرف ان کے گرد طواف کریں گے اور ہر
خدمت کو تیار رہیں گے بلکہ اگر کبھی کبھی موقع لگ گیا تو ماسٹر صاحب کے گھر بھی حاضر
خدمت ہوں گے۔ منشاء صرف یہ کہ درجہ کی ۷۵ فیصدی حاضری جو امتحان میں
شریک ہونے کے لیے اب بہر حال لازم ہو گئی ہیں پوری ہو جائیں۔ دوم ماسٹر صاحب
"امپارٹینٹ" بتادیں کہ کس طرح پاس ہو جائیں۔

"امپارٹینٹ" کا ذکر آیا تو ایک لطیفہ بھی سنتے چلیے۔ تقریباً پچھلے دس
سال سے کم سے کم یہاں علی گڑھ میں "امپارٹینٹ" کی بیماری زور پکڑ چکی ہے
نہ صرف طالب علم بلکہ سرپرست صاحبان جنھوں نے اب تک اسکول کا منھ نہیں
دیکھا وہ بھی ماسٹر صاحب کے گھر وقت اور بے وقت دونوں اوقات میں تشریف
لائیں گے۔ مصر ہوں گے کہ کچھ تو امپارٹینٹ بتا دیجیے۔ آپ سے تعلقات دیرینہ
ہیں۔ لطیفہ یہ کہ اگر ماسٹر صاحب صرف اپنی جان بچانے کی خاطر سے سرسری اور
بالکل لاعلمی کے ساتھ قطعی اٹکل سے کچھ نشان لگا دیں تو بھی سرپرست صاحب
خوش خوش چلے جاتے ہیں۔ اب ایسی صورتِ حال میں اگر ہم مسلم تعلیمی مسائل
میں اس اندازِ فکر کو بھی شامل نہ کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے تعلیمی
مسائل پر پوری نظر نہ پڑ سکے گی۔

پورا انصاف نہ ہوگا اگر مسلم اسکولوں کی انتظامیہ کا آئینہ بھی آپ
کے سامنے نہ رکھوں۔ انتظامیہ اس کی بالکل فکر نہیں کرتی کہ ماسٹر صاحب نے جو
کچھ محنت سے پڑھایا ہے، اس کی جزا کیا ہونا چاہیے۔ کون سے اساتذہ پرانے
ہیں اور کون نئے۔ کس کو کس مقام پر حفظ مراتب کے تحت رکھا جائے۔ یہ
نہ کرے کہ سب دہاں بائیں ہاتھ پھیری چلتے ہیں بلکہ بات یہاں تک ہے کہ
نئے اساتذہ کو پرانوں پر نہ صرف فوقیت دی جاتی ہے بلکہ یہ ترجیح اس
انداز سے عوام کی موجودگی میں شعوری طور پر نمایاں کی جاتی ہے کہ پرانے
اساتذہ کھل کر عوام کے سامنے بے عزت ہوں۔ ان کے جائز بلکہ قانونی حقوق
تک نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ پرنسپل صاحب محترم صرف یہ جتانے کے لیے کہ دیکھو
ہم پرانے سے پرانے اساتذہ کو بھی کچھ نہیں سمجھتے ہیں اور یہ کہ ہم اپنی ریاست
کے مطلق العنان حکمراں ہیں۔ ایک طرف تو ان کے نزدیک ان کا یہ عمل نئے
اساتذہ پر ہیبت طاری کرتا ہے۔ دوسری طرف پرانے اساتذہ یا تو بزدل
ہو کر اپنی آبرو بچانے کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں یا شاید کبھی کوئی ایک آدھ
سرپھرا معاملے کو "ضابطے" کے سپرد کر کے رجوع کرتا ہے۔ لیکن افسوس
کہ "ضابطہ" بھی عام طور پر تو کوئی خاص خاطر خواہ توجہ ماسٹر صاحب
کی اس تکلیف پر کرتا ہے نہیں اگر کبھی کبھار دے بھی دی تو اتنی تاخیر سے
کہ یہ توجہ اپنا اثر زائل کر کے بے توجہی کے مصداق ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری جانب نئے اساتذہ اپنے مستقبل کو روشن بنانے کی امید
میں اور خود کرسی کی ہمت افزائی بلکہ ایما پر جناب پرنسپل کی مداح خوانی
کرنے لگتے ہیں اور یہ مسلسل "منظورِ نظر" بنے رہتے ہیں اور جو پرانے
اساتذہ محض تعمیلِ حکم کرتے ہیں۔ وہ اس قابل بھی نہیں سمجھے جاتے کہ
چار آدمی کھڑے ہوں تو ان بیچارے پرانے اساتذہ کو تخاطب میں بھی
لے آیا جائے۔ شاید قارئین کو یقین نہ آئے لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ
پرنسپل صاحبان کا یہ انداز نہ صرف دیہات کے مسلم اسکولوں و کالجوں
میں ہے۔ بلکہ یہ انداز پرنسپلانہ شہروں کے "اعلیٰ اسکولوں" کے جو
بڑی بڑی تعلیمی تنظیموں کے تحت چل رہے ہیں' میں پایا جاتا ہے۔ اگر
یہ کہہ دوں کہ جتنا بڑا اسکول اور جتنی زیادہ بڑی تعلیمی تنظیم اتنا ہی
زیادہ اندازِ حاکمانہ جناب پرنسپل کا ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

کبھی کبھی تو پرنسپل صاحبان اپنے زورِ افسری میں ایسے احکامات
بھی صادر فرما دیتے ہیں جو "اصولِ تعلیم" سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔
نیز محترم موصوف خود بھی اس مضمون سے غیر متعلق ہوتے ہیں لیکن زور
پرنسپلی ان کو ماہر مضامین بھی بنا دیتا ہے۔

ان باتوں کا اثر یقیناً اسکول کی کارکردگی پر اور نتیجتاً طلباء
کی تعلیم پر ضرور پڑتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ جس وقت ہم مسلمانوں کے
تعلیمی مسائل کا جائزہ لیں اور ان کا حل تلاش کریں تو متذکرہ بالا پرنسپل
صاحبان پر بھی ہم کڑی نظر رکھیں۔ مبادیٰ ان کی تقرری قوم اور
ملت کے اسکولوں کو نقصان پہنچا دے اور مسلم بچے تعلیم کے حصول سے
بے وجہ محروم رہ جائیں۔

وقت اور جگہ دونوں کی قلت کی وجہ سے اب اخیر میں یہ عرض
کروں گا کہ

۱- مسلم اسکولوں کو اپنی انتظامیہ کو درست کرنا ہوگا۔
۲- مسلم اسکولوں کو اپنے پرنسپل صاحبان کا تقرر بہت دیکھ بھال کر کرنا ہوگا۔
۳- مسلم اسکولوں کو اپنا اقلیتی کردار قایم رکھنا ہوگا۔
۴- مسلم اسکولوں کو انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی مذہبی تعلیم بھی دینا ہوگی۔ اور یہ تعلیم ابتدائی سے نہ صرف ثانوی منزل تک بلکہ بی۔ اے تک ہوگی۔
۵- چوں کہ ہمارے اسکول اقلیتی ادارے ہوں گے اس لیے اس کا

بجا طور پر خیال رکھنا ہوگا کہ داخلے صرف ان طلباء کو ہی ترجیحاً دیے جائیں جو صرف اردو ذریعۂ تعلیم کو اپنانے کو تیار ہوں۔

۶۔ مسلم اسکولوں کے ہر درجے میں کم سے کم ایک حصہ (سیکشن) میں ذریعۂ تعلیم انگریزی کرنا ہوگی تاکہ یہاں کے نکلے ہوئے مسلم بچے ملک کے بہترین پبلک اسکولوں کے بچوں سے انگریزی کی استعداد میں کم نہ ہوں۔

۷۔ مسلم اسکولوں میں اردو و انگریزی دونوں زبانیں لازمی پڑھائی جائیں لیکن ہندی کو بھی اختیاری مضامین سے کچھ اس طرح ہم رشتہ کیا جائے کہ طالب علم کو ہندی بھی لینا پڑے نتیجتاً مسلم اسکولوں میں بچے کو تین زبانیں (اردو۔ انگریزی وہندی) پڑھنا ہوں گی۔ جو تھوڑا سا زیادہ بوجھ ہے لیکن اگر قوم کے بچوں کو مقابلے کی دنیا میں سرخرو ہونا ہے تو ان کو ابتدا میں کچھ تھوڑا زیادہ بوجھ اٹھانا ہی ہوگا۔

۸۔ اردو و عربی مدارس پر مزید مخصوص توجہ کی ضرورت ہے اور ان مدارس میں دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی مضامین جیسے انگریزی حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ بھی پڑھانی ہوگی۔

۹۔ میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ "مسلم آواز کو" ریزرویشن کے نقطے کو چھوڑنا ہوگا اور مسلم بچوں کو اپنے پیروں پر از خود مضبوطی سے کھڑا ہونے کی تربیت و تعلیم دینا ہوگی۔

آج کی دنیا میں یہ "دست نگر" انداز فکر، مجھ کو یقین ہے کہ مسلم بچوں میں کم ہمتی پیدا کرتا ہے۔ ولولہ اور جولانی کی قوت کو کمزور کرتا ہے اور مقابلہ کے جذبے کو زائل کرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آج کی دنیا مقابلے کی دنیا ہے، مقابلے کا زمانہ ہے مقابلے کی زندگی ہے۔ ہر قدم اور ہر نفس پر مقابلہ ہی مقابلہ ہے۔ لہٰذا مسلم نوجوان بھی کیوں نہ بغیر غیر کے سہارے کے مقابلے کے بل پر برادران وطن کے بچوں سے آگے نکلیں۔

۱۰۔ مسلم اسکولوں میں ہم کو دیکھنا ہوگا بلکہ سعی مکمل کرنی ہوگی کہ کم سے کم ان اداروں میں تو مسلم بچے بہتر کارکردگی دکھائیں لیکن افسوس صورتِ حال قطعی مختلف ہے۔ حد ہے ہمارے اپنے مسلم اسکولوں میں دیگر اقوام کے بچے ہمارے بچوں سے بہتر نتیجہ دیتے ہیں (یہ بات جناب رشید نیر دانی صاحب کے متعدد مضامین سے ثابت شدہ ہے)

۱۱۔ صوبہ جاتی اور ضلع تعلیمی و ملی کمیٹیاں بنائی جائیں جو ملک کے تمام مسلم اسکولوں میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ اور ایک مربوط و طے شدہ خطوط اور راہ عمل پر مسلم اسکولوں کے کام کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہیں۔ ان کمیٹیوں کا کام یہ بھی ہو کہ مسلم بچے باوجود اپنی معاشی بدحالی کے تعلیم کی طرف ضرور متوجہ ہوں۔ بالخصوص صنعتی [illegible] شاخ کی جانب جو درحقیقت اس وقت کی مروجہ تعلیم کی اسکیم (۱۰+۲+۳) کی بنیاد ہے۔

۱۲۔ مسلم اسکولوں میں بچوں کی انگریزی میں بھی استعداد بڑھانا ہوگی عام طور پر صرف وہ مسلم بچے ہی "کام کے لائق" انگریزی جانتے ہیں جو پبلک اسکولوں میں پڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔

۱۳۔ مسلم اسکولوں کے اساتذہ کرام کو بھی اپنے رویے میں تبدیلی یقینی طور پر لانا ہوگی۔ جذبہ خدمت ملی و قومی کے تحت ان کو کام کرنا ہی ہوگا اور پیشے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انصاف بھی۔

میرے عرض کرنے کا منشا خدانخواستہ ہرگز یہ نہیں کہ مخلص اور اعلیٰ کارکردگی کے اساتذہ مسلم اسکولوں میں سرے سے کہیں نہیں۔ لیکن ان کی تعداد بے شک اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہو جاتی ہے اور وہ بھی حد درجہ بددل رہتے ہیں کیوں کہ اُن کا طریقہ کارکردگی اساتذہ کرام کی اکثریت سے مختلف ہوگا اور یہ بات مجموعی طور پر ظاہر ہے اسکول کے بچوں کی تعلیم پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔

اخیر میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ طلباء اور اساتذہ دونوں کے جائز مطالبات بالخصوص اساتذہ کے صحیح حقوق، مراعات، سہولتیں اور ترقی کے مواقع ـ ان سب پر ضرور ایماندارانہ طور پر توجہ دینا ہوگی میں سمجھتا ہوں کہ اگر مندرجہ بالا امور پر مسلم قیادت نے صحیح اور بجا طور پر توجہ دے دی تو مجھ کو یقین ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی حالات روز بروز بہتر سے بہتر ہی ہوتے چلے جائیں گے۔

سب سے اخیر میں یہ بھی عرض کر ہی دوں کہ چوں کہ میں خود بھی بنیادی طور پر پچھلے تیس سال سے بہم ایک معمولی ٹیچر ہی ہوں۔ اس لیے جو عرضداشت میں نے پیش کی ہے وہ نہ صرف اصولِ تعلیم اور نفسیاتِ طلباء، مسلمانوں کے موجودہ تعلیمی حالات کے تقاضوں اور وقت کی اہم ضرورت ہیں بلکہ سب کا سب احقر کے وسیع تجربے، عمیق مشاہدے اور مطالعے پر مبنی ہے۔ اس لیے "تلخ نوائی" کے لیے توقع کرتا ہوں وہ حضرات جن کو اپنی تصویر میری اس ناچیز تحریر میں نظر آئے درگزر اور نظر انداز فرمائیں گے۔ کیوں کہ بڑے مفاد (قومی) کے لیے چھوٹے فائدہ کو رد کرنا ہی ہوتا ہے۔

فیکلٹی آف انجینئرنگ کی مختصر تاریخ

ایس اے عباس
سابق پرنسپل
ذاکر حسین انجینئرنگ کالج
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک اولڈ بوائے، اور بعد ازاں بنارس ہندو یونیورسٹی سے وابستگی ختم کر کے نقل مکانی کرنے والا شخص، اوائل چوتھی دہائی میں اپنی مادر درس گاہ میں اس لیے لوٹ آیا تھا کہ یہاں وہ ٹکنولوجی کی تعلیم و تربیت کا آغاز کر سکے۔ اس شخص کا نام حبیب اللہ درانی تھا۔ وہ ایک ایسی بصیرت اور غیر متزلزل جرأت سے لیس تھا جو اس درسگاہ کے بانی کی یاد تازہ کرتی تھی۔

آغاز میں، علم کی جو شمع انہوں نے روشن کی، تمام ابتدائی کاوشوں کی طرح بہ مشکل سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ شہر کے تجارتی مرکز سے، انہوں نے چند آوارہ گرد لڑکے اکٹھا کیے اور ان سب کو اپنی ذاتی خراد مشین پر کام میں لگا دیا۔ انہوں نے یہ مشین یونیورسٹی کے قدیم بازار کے ایک کنارے واقع ایک دکان میں لگائی تھی

وہ دن کیسا مقدس تھا اور وہ ہاتھ کتنے مبارک تھے جن ہاتھوں نے اس خراد مشین کی تنصیب کی تھی ؟ یونیورسٹی کا وہ قدیم بازار ترقی کر کے موجودہ انجینئرنگ کالج میں تبدیل ہو چکا ہے۔

کچھ عرصے بعد درانی ان لڑکوں کی تربیت کی خاطر اپنی نجی موٹر کار بھی وہاں لے آئے۔ یہ کار کسی بھی آٹو موبائل کو شرمندہ کرتی تھی۔ یہ ہر وقت دھواں اڑاتی، گرم کرتی، درانی کے ابھرتے ہوئے دست کاروں کی تحویل میں، سڑک پر دوڑا کرتی اس کی آواز اور اس کا نظارہ عام لوگوں کے لیے پرکشش تھا۔ جس کے سبب یونیورسٹی کی سڑکوں پر لطف اندوز ہونے والوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی۔

غور کیجیے تو درانی کی وہی نجی خراد مشین آج کے ورکشاپ کی علامت تھی اور ان کی موٹر کار، موجودہ الیکٹریکل اور مکینیکل انجینئرنگ لیبارٹریوں کی علامت تھی۔ غرض اس کمزور اور موہوم سے مرکز کے گرد، درانی نے الیکٹریکل انجینئرنگ میں سرٹیفکٹ کورس کا آغاز کیا۔ مسٹر رشید الدین، خدا ان کی عمر دراز کرے۔ جو اس سرٹیفکٹ کورس کے تربیتی نگراں تھے، اسی تاسیسی مہم جوئی کی یادگار ہیں جس میں موجودہ انجینئرنگ فیکلٹی کا پودا پروان چڑھا۔

سرٹیفکٹ کورس کے فوراً بعد سنہ ۱۹۳۸ء میں ڈپلوما کورس کا آغاز ہوا۔ یہ سب کچھ آٹھ سال کے ناقابلِ یقین مختصر عرصے میں مرکزی یا صوبائی حکومت کے مالی تعاون کے بغیر ہوا۔

موجودہ انجینئرنگ فیکلٹی کا یہ بانی، جو اس یونیورسٹی میں تکنیکی تعلیم کے اس اتفاقی حادثے کا موجب بنا۔ ڈپلوما کورسز پر کیوں اکتفا کر سکتا تھا۔ اس نے یونیورسٹی کو ڈگری کورسز کے لیے آمادہ کرنے کا تہیہ کیا۔

دوسری جنگِ عظیم پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ جرمن کے مدمقابل فرانس مغلوب ہو چکا تھا۔ برطانوی مکمل تباہی کے دہانے پر کھڑے تھے۔ ان کے سارے وسائل، بشمول ہندوستان سے حاصل کردہ، جنگ پر صرف ہو رہے تھے ــــ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ کے اس انتہائی تشویشناک مرحلے پر، کسی ہندوستانی یونیورسٹی کے لیے انجینئرنگ کالج کے قیام کی آرزو کرنا بھی حماقت کی بات تھی۔

لیکن درانی کو اپنے عزم سے باز رکھنے اور انکی حوصلہ شکنی میں اس نازک صورتِ حال کو ناکامیابی ہوئی۔ انہوں نے کہیں زیادہ پر اعتماد ڈھنگ سے یونیورسٹی پر اپنا دباؤ قائم رکھا۔

وائس چانسلر آڑے آتے رہے۔ رجسٹرار چیختا چلاتا رہا، خزانچی نے وارننگ دی لیکن درانی نے اپنی حیرت انگیز بات منوا لینے والی صلاحیت کے سبب، انجام کار وائس چانسلر ضیا الدین احمد کو آمادہ کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی ــــ

اور اس طرح سنہ ۱۹۴۲ء کے موسم گرما کی ایک صبح، رجسٹرار عظمت الٰہی زبیری کی میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی جس کے مطابق رجسٹرار کو وائس چانسلر کی قیام گاہ، ذکا منزل، پہونچنا تھا۔ یہ عظیم رجسٹرار اپنے "چوڑیدار" اور "شیروانی" میں، جس کی ایک جیب میں ہمیشہ پان کی ڈبیا ہوا کرتی تھی، قدیم اور حسین علی گڑھ تہذیب کی علامت رہا۔ یہ عظیم وائس چانسلر سے ملنے فوراً اپنے کمرے سے نکل پڑا۔

وائس چانسلر نے حسب عادت، رجسٹرار کے سلام پر کوئی توجہ نہیں دی اور تند لہجے میں اپنے اس اٹل فیصلے کا اعلان کیا کہ اگلے تعلیمی سیشن سے، جو تین چار ماہ بعد شروع ہونے والا تھا، الیکٹریکل اور میکینیکل انجینئرنگ میں ڈگری کورس شروع ہوں گے۔ رجسٹرار کو وائس چانسلر نے ہدایت دی کہ ان کورسز میں داخلے کے لیے درخواستیں طلب کی جائیں۔

رجسٹرار یہ سن کر ششدر و حیران رہ گئے لیکن پورے وثوق کے ساتھ یہ بات سامنے رکھی کہ اس تجویز پر عمل پیرا ہونا مالی مشکلات کے سبب ناممکن ہے۔ عظیم وائس چانسلر نے رجسٹرار کی بات بیچ سے کاٹی اور اپنی ہدایت کو "حکم" کا درجہ دیا۔

تقریباً تین ماہ بعد، پھر رجسٹرار کی میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ان وائس چانسلر نے انجینئرنگ کورسز کے لیے مطلوبہ درخواستوں کی فائل پیش

کرنے کو کہا۔

رجسٹرار خالی ہاتھ ضیا منزل پہنچے، اس توقع کے ساتھ کہ چونکہ اب تک کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں ڈگری کورسز کا معاملہ کم از کم ایک سال تک کے لیے موقوف کر دیا جائے گا اور اس طرح ان کی جان بچ جائے گی۔

وائس چانسلر کو جب یہ بتلایا گیا کہ اب تک کوئی درخواست نہیں آئی تو انہوں نے اپنے خصوصی معاون لطیف سے پراکٹر شفیع کو فوراً بلانے کو کہا۔

چند منٹ میں پراکٹر شفیع پہنچ گئے۔ وائس چانسلر نے ان سے ایسے لڑکوں کے نام مانگے جو شورش پسند تھے۔ اور جنہوں نے انٹرمیڈیٹ سائنس کا امتحان فزکس، کیمسٹری اور میتھ سے پاس کیا تھا۔ وائس چانسلر کو ایسے ۱۶ نام دیے گئے۔ ان سولہ لڑکوں کو دوسرے دن وائس چانسلر کے سامنے حاضری کے لیے بلایا گیا۔ سبھی ڈرے، سہمے اور کانپتے ہوئے پہنچے کہ شاید پراکٹر کی رپورٹ پر سزا ان کے انتظار میں ہے۔

وائس چانسلر نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ یونیورسٹی میں ان کی شورش پسندانہ سرگرمیوں کی اطلاع پراکٹر انہیں دیتے رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ڈسپلن کمیٹی سے ان سب کے جلد از جلد اخراج کی سفارش کریں گے۔ لڑکوں نے وائس چانسلر سے دست بدستہ معافی مانگی اور مستقبل میں بہتر چال چلن کا وعدہ کیا۔ وائس چانسلر ان کی کہاں سننے والے تھے۔ انہوں نے اپنے پی اے کو حکم دیا کہ وہ ان سب کے نام رجسٹرار کو بھیج دے اور ہدایت دی کہ ان پر ایکشن کے لیے رجسٹرار ڈسپلن کمیٹی کی ایک میٹنگ جلد بلائیں۔

یہ سنتے ہی سبھی لڑکے مکمل جذباتی ہو گئے۔ اور معافی مانگتے ہوئے وائس چانسلر کے قدموں پر گر گئے۔

وائس چانسلر نے رحم و کرم کا بناوٹی اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ان سب کو صرف ایک بار معافی دے سکتے ہیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ سبھی انجینئرنگ کے مجوزہ ڈگری کورس میں داخلہ لیں جو آئندہ جولائی میں شروع ہوگا۔ ان لڑکوں نے وائس چانسلر کی بات تسلیم کر لینے کا وعدہ کر لیا۔

اس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انجینئرنگ فیکلٹی کا سنگ بنیاد جولائی ۱۹۴۰ء میں رکھا گیا جس کے ابتدائی طالب علم یہ ۱۶ "شام پراڈکٹس" تھے۔

یہ ایک ایسا وقت تھا کہ جب ہائڈرو الیکٹرک انجینئر دہلی کے بقول (جو فروری مارچ ۱۹۴۴ء میں کالج کے پہلے سالانہ جلسے میں انجینئرنگ نمائش کے موقع پر مہمانِ خصوصی تھے) جنگِ عظیم چھڑ جانے کے نتیجے میں کبھی کبھی حکومت کے لیے 'کوپج اسکریو' حاصل کرنا مشکل ہوتا تھا۔ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ "میں آپ کے وائس چانسلر کی قدر کرتا ہوں کہ آج کل جیسے ہنگامہ خیز دنوں میں ان کے پاس ایک بھرپور انجینئرنگ کالج قائم کرنے کی جرأت تھی۔"

اس نئے انجینئرنگ کالج کے لیے جس کے تمام اطراف و جوانب تاریکیاں تھیں، مناسب طور پر ایک تاریک اور گندگی سے اٹی ہوئی عمارت منتخب کی گئی۔ اس عمارت میں آج کل یونیورسٹی ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا دفتر ہے۔ اس کے ایک کمرے میں چند ٹوٹی ہوئی کرسیاں ڈال دی گئی تھیں جن پر بیٹھ کر یہ ۱۶ لڑکوں کا گروہ کھیل کود میں وقت گذارتا تھا۔

باہمت عبید اللہ درانی وہ شخص تھے جنہوں نے اس جرأت مندانہ اقدام کے لیے وائس چانسلر کو آمادہ کیا تھا ــــ وہ اس کالج کے صدر مقرر ہوئے۔ ایک ایسے کالج کے جس کی موت، بشمول رجسٹرار ہر ایک کے نزدیک یقینی تھی۔

درانی کی معاونت، واحد ساتھی، ایس سی بھٹاچاریہ کر رہے تھے۔ کالج فیکلٹی ان دو افراد پر مشتمل تھی۔ علاوہ بریں، آرٹس گیلری کے سید افضل علی اور سائنس فیکلٹی کے دو ایک اساتذہ کی خدمات مستعار لی گئی تھیں جن کے ذمے بالترتیب ڈرائنگ اور بنیادی سائنس کی تدریس تھی۔ اس وقت ورکشاپ اور لیبارٹریز میں سے کوئی چیز نہیں تھی۔ مارچ، اپریل ۱۹۴۱ء میں بالآخر فائنل امتحان ہوا جس کا پہلا پرچہ میتھ کا تھا۔

پرچہ ملتے ہی سارے ۱۶ لڑکے احتجاجاً اٹھ کھڑے ہوئے ان میں ایک نے چیختے ہوئے کہا کہ پرچہ کا مواد ان کے لیے "یونانی اور لاطینی" کی مانند ہے۔ یہ سب امتحان کے کمرے سے نکل جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ امتحان کا یہ کمرہ بابِ اسحٰق کے نزدیک ایس، ایم، ایسٹ ہوسٹل کے مشرقی بازو میں واقع تھا۔ مردانہ نائب شیخ الجامعہ، پروفیسر اے بی، اے حلیم اپنے روشن چہرے اور مشہور اسٹاف کے ساتھ اس وقت جائے وقوع پر پہنچ گئے اور لڑکوں سے نظم و ضبط اختیار کرنے، خاموشی کے ساتھ امتحان کا پرچہ حل کرنے کی ہدایت کی اور یہ بھی کہا کہ اگر کسی طرح کی "نمائندگی" ضروری ہے تو پھر بعد میں ہمدردانہ طور کے لیے کی جا سکتی ہے۔ اگر آپ نے نظم و ضبط اختیار نہ کیا تو وہ اگزامینیشن کمیٹی کو سفارش کریں گے کہ یہ لڑکے امتحان میں ناکامیاب قرار دیے جائیں۔ ان سخت اور مختصر الفاظ کے بعد نائب شیخ الجامعہ امتحان گاہ سے چلے گئے اور ان کے پیچھے پیچھے ان ۱۶ لڑکوں کا گروہ بھی نکل گیا۔

نائب شیخ الجامعہ کی دھمکی نے عملی صورت یہ اختیار کی کہ سبھی ۱۶ لڑکے ناکام ہو گئے۔ ان میں سوائے تین لڑکوں کے، جن میں ایک حیدرآباد کے "ستار" تھے سب نے اپنی اس ناکامیابی کا جشن کچھ اس طرح منایا جیسے یہ سب کچھ خدا کی مہربانی ہو۔

سنہ ۱۹۴۱ء بہتر دنوں کے ساتھ آیا۔ تقریباً ۱۵۰ امیدواروں نے داخلے کی درخواستیں دیں اور مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے ان میں سے میرٹ (Merit) کی بنیاد پر ۵۰ امیدوار منتخب کیے جاتے تھے۔ ۲۵ الیکٹریکل اور ۲۵ میکینیکل کورس کے لیے۔ ۱۹۴۰ء کے ۱۶ طالب علموں میں سے تین نے دوبارہ داخلہ لیا۔

ضرورت کے مطابق مزید استاد مقرر کیے گئے۔ جن میں جناب شوکت علم

سٹ پرنسپل کی حیثیت سے اور جناب (این سی) دوبے میکینیکل میں لکچرر کی
تیت سے شامل تھے۔

کچھ ساز و سامان، خاص طور پر فوجی ذرائع سے تول سے خرید لیا گیا۔
اس کی مدد سے دو لیبارٹریاں قائم کی گئیں۔ وہاں ابھی تک، کسی ورکشاپ کا وجود
ں تھا۔

۴۲ - ۱۹۴۱ء میں وائس چانسلر نے نہایت خوبصورتی سے، ایک اسکیم
ت دفاع سے منظور کرائی جو جنگی تکنیکی ماہرین کی تربیت کے لیے تھی۔ اس
ح ورکشاپ میں کام آنے والے ضروری ساز و سامان کی خرید اور تکنیکی ماہرین
تربیت کے لیے ایک چھوٹے سے ورکشاپ کی تعمیر کے لیے حکومت کا مالی تعاون
ل ہوگیا۔ چنانچہ حکومت کے مالی تعاون سے موجودہ مشین شاپ کے کچھ حصے اور ہیٹ
ت (H. E. L.) انجن لیبارٹری قائم کی گئی جس کا مقصد جنگی تکنیکی ماہرین کی تربیت
یہ نئی تنصیبات انجینئرنگ کے طلباء کی تربیت کے لیے مخصوص کردی گئیں اور
یرانی سو جہ دلبی بارک جس میں آج کل ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ کا دفتر واقع
اور حکومت کے گرانٹ سے خریدے گئے ساز و سامان سے آراستہ آٹو موبائل
جنگی تکنیکی ماہرین کی تربیت کے لیے مہیا کی گئیں۔

آغاز میں جدید تعمیر شدہ "مشین ورکشاپ" کے پاس صرف ایک سامان
ں کی خراد مشین تھی۔ اسی طرح نئے "ہیٹ انجن لیب" میں صرف انجن تھا اور وہ
ں کی موٹر کار تھی جو بس ایک ڈھانچہ تھی۔ جناب خلیل (خدا ان کی عمر دراز
ے) جو آج بھی یونیورسٹی پالی ٹیکنک میں فورمین کے عہدے پر کام کرتے ہیں
دنوں کی یادگار ہیں۔ وہ بلا شرکت غیرے کسی اور کے تعاون کے بنا درانی کے
موبائل انجن پر بی، ایس سی انجینئرنگ کے طالب علموں کو تربیت دیتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوچکی اور نتیجہ میں جنگ کے لیے تکنیکی ماہرین کی
اسکیم بھی ختم کردی گئی تو اس وقت اس مقصد سے خریدے گئے سبھی تربیتی
سامان یونیورسٹی نے تحفتاً حاصل کر لیے۔ اس کا ایک بڑا حصہ نئے تعمیر شدہ
شاپ میں دوبارہ نصب کردیا گیا۔ اور باقی چوں کا توں پرانی بارک میں رہنے
۔ گویا اس طرح انجینئرنگ کالج کے لیے اعلیٰ درجے کے ورکشاپ کی نشو و نما
۔ اس کی نوعیت مہم جوئی کے آغاز کی تھی۔

۱۹۴۲ء میں سول انجینئرنگ ڈگری کورس کا آغاز کیا گیا اور اسی سال
مارت کے پیشِ نظر ڈگری کورس کی مدت کم کر کے ۲۱ مہینے کردی گئی جو ۱۹۴۶ء
جنگ ختم ہو جانے پر دوبارہ بحال کردی گئی۔

اس یونیورسٹی میں انجینئرنگ کالج کا قیام ایک ایسی آگ تھی جو درانی کے
من قلب میں بھڑک رہی تھی۔ یہاں چند باتوں کا ذکر مناسب اور برمحل
م ہوتا ہے۔ اس آگ کے آغاز میں مالی مشکلات کا جو ہوّا کھڑا کیا گیا تھا۔
ملا کر راکھ کا ڈھیر کردیا گیا۔ درانی نے اس قلیل سرمائے سے جو یونیورسٹی
نے محدود وسائل سے مہیا کیا تھا، اپنا راستہ بنایا اور اس کو روشن رکھا۔

انھوں نے اخراجات کم کرنے کے لیے ایسے طریقے استعمال کیے جو آج ہمارے لیے
حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین معلوم پڑتے ہیں۔ یہاں اسی کی چند مثالیں دی جا
سکتی ہیں۔ مشینری اور دوسرے سامان کی تنصیب کے لیے وہ مزدوروں کا خرچ
اس طرح بچالے جاتے کہ خود بھی اپنے اسٹاف کے ساتھ مل کر سمنٹ، کنکر کوٹا کرتے
وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ندیوں اور نہروں میں ریت اور مٹی اکٹھا کرتے اور
اپنے ٹرک سے کالج لاتے۔ وہ تقریباً ٹوٹی ہوئی ریڑھ کی ہڈیاں لیے ہوئے
جس نے بہت حد تک انہیں حرکت کے ناقابل کردیا تھا ایک برہنہ کھاٹ پر
لیٹے رہتے۔ اور مشینوں کی تنصیب کی نگرانی کرتے۔ محض گیتوں کے بدلے
میں وہ، جیسی اور جہاں ہے کی بنیاد پر، تمام قسم کے فوجی ساز و سامان وزن
کے اعتبار سے خریدتے، گھر لاتے اور چونکہ وہ ایک ماہر ٹکنولوجسٹ تھے، اس
لیے اپنی زیرِ نگرانی دوسرے ہم پیشہ ساتھیوں کے تعاون سے ان سامانوں
کو لیبارٹریوں اور ورکشاپ میں نصب کرتے۔ وہ اور ان کا عملہ مہینے کے تیس
دنوں میں تیس دن، صبح سے رات گئے دیر تک کام میں مصروف رہتا۔ آج
کل کے مزاج سے الگ نہ تو اوور ٹائم مزدوری کا تقاضا کیا جاتا تھا اور نہ ہی
دیا جاتا تھا درانی کا اوور ٹائم بس چنے کا پیکٹ ہوتا تھا جسے وہ خود لیتے اور اپنے
لڑکوں کو بھی پیش کرتے۔

۴۵ - ۱۹۴۴ء انجینئرنگ کالج کی تاریخ میں ایک جشن کا سال تھا۔ موجودہ
عمارت میں کالج منتقل کیا گیا۔ گورنمنٹ سے امداد ملنی شروع ہوگئی۔ جناب ٹی ایم
میتھیومن جو پنجاب سے وابستہ ایک سینیر ماہر تعلیم تھے اور جنہوں نے سارے ملک میں
خاصی شہرت حاصل کی تھی، کا تقرر الیکٹریکل انجینئرنگ کے شعبہ میں پروفیسر اور کالج
کے پرنسپل کی حیثیت سے کیا گیا۔ یہ وہ سال تھا جب میں نے بھی جونیر استاذ
کی حیثیت سے ڈپلومہ کے طلبا کو فزکس اور کیمسٹری پڑھانے کے لیے سائنس کے
استاذ ضیا الاسلام کی جگہ کے بالمقابل ۱۲۵ روپیے بنیادی تنخواہ پر کام کرنا شروع
کیا۔

جناب میتھیومن سے قبل جناب درانی الیکٹریکل کے اور جناب این سی
دوبے میکینیکل کے صدر شعبہ تھے۔

کالج کی ایک انتظامیہ کمیٹی تھی جس کے ذمے بجٹ ڈیولپمنٹ پلان اور
تقرر وغیرہ کا مسئلہ تھا۔

جناب ایف، ایم، پی آر بٹ لوٹ (ایک برٹش سول انجینئرنگ) سول
انجینئرنگ کے پروفیسر اور صدرِ شعبہ مقرر ہوئے۔

ہر شعبہ میں عملہ ضرورت سے کم تھا اور ایک استاذ پر اوسط تدریسی بار
بہت زیادہ تھا کہ اگر اس مقدار میں آج کے استاذ کو سونپ دیا جائے تو وہ ضرور
بدمزاج ہو جائے گا۔ مثلاً الیکٹریکل کے ایس سی بھٹاچاریہ ہر وقت بھانت
بھانت کی کلاسیں پڑھانے میں مصروف رہتے اور جب ۱۹۴۷ء میں انھوں نے
اس شعبے کو خیرباد کہا، تو میں ۲۶ میں ۲۶ پیریڈ لے رہا تھا۔

اتر پردیش حکومت کے الیکٹریکل انسپکٹوریٹ کی سفارش پر ۱۹۴۶ء میں الیکٹریکل سپروائزر کا کورس شروع ہوا۔

کالج کا پہلا فائنل امتحان مارچ ۱۹۴۴ء میں الیکٹریکل اور میکینیکل انجینئرنگ کی ڈگری کے لیے ہوا۔ تقریباً ۵۰ طالب علم جن میں ایک میں بھی تھا، امتحان میں بیٹھے ان میں پچیس لڑکے الیکٹریکل کے تھے اور پچیس میکینکل کے تھے۔

امتحان کا معیار کافی تسلی بخش تھا جیسا کہ اس بات سے پتہ چلے گا کہ میں نے ۱۹۴۱ء میں داخلے کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ لیکن ۱۹۴۴ء کے فائنل امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ یہ معیار مسلسل باقی رہا۔ جس کا ثبوت یہ امر ہے کہ کہیں ۱۹۴۸ء میں جاکر الیکٹریکل کے سید شاہد حسین رضوی کو [illegible] ڈگری مل سکی۔

اسٹاف نے اپنے غیر معمولی جوش و ولولہ اور محنت و ریاضت سے [illegible] کمی کی تلافی کردی تھی۔ جو مادی وسائل کی قلت نے پیدا کر رکھی تھی۔ نتیجہ میں ایک بہتر تعلیمی معیار پایا جاتا تھا۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ آغاز کے کچھ سالوں تک محض اوسط یا اوسط سے بھی کم ذہن رکھنے والے طلبا اس کالج میں داخلہ پاتے تھے۔ خاص طور پر وہ لڑکے جو کہیں اور داخلہ حاصل کرنے کی استعداد بہم پہنچانے میں ناکام رہتے تھے تاہم وہی لڑکے فیکلٹی کی پرخلوص سرپرستی میں یہاں پروان چڑھتے تھے۔ اس حد تک کہ غالباً ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں سول انجینئرنگ کے ایک طالب علم یوسف نے انڈین انجینئرنگ میں ــــــ انٹرویو کے مرحلے تک پہونچتے ہی کامیابی حاصل کی۔ یہ انڈین سول سروس کی طرح انجینئروں کی ایک اعلیٰ آل انڈیا سروس تھی۔ لیکن یوسف کی صحت اور شخصیت چونکہ غیر مؤثر اور کمزور تھی۔ انہیں انٹرویو بورڈ نے ناموزوں قرار دیدیا۔

وہ زمانہ ایسا تھا جب یونیورسٹی پروفیسروں اور صدر شعبہ کے تقرر، اور انتخاب میں انتہائی محتاط تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۴۸ء میں پروفیسر میتھیومین نے جمیں چھوڑا تو غیر ملکی سند اور تاسیسی خدمات کا امتیازی ریکارڈ رکھنے کے باوجود ان کی جگہ پر درانی کا تقرر نہیں ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر این، سی، ساہا اس جگہ پر مقرر ہوئے جن کے پاس، مانچسٹر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تھی۔ اور ان دنوں یہ ایک قابلِ تعداد، انوکھی بات تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر کے سی چکو کالج کے پرنسپل اور سول انجینئرنگ کے پروفیسر مقرر ہوئے جو غالباً سول میں کسی برٹش یونیورسٹی سے پہلے ہندوستانی ڈی ایس، سی تھے۔ پروفیسر کا مدبرانہ انتخاب کافی نفع بخش ثابت ہوا۔ کم مدت میں ڈاکٹر ساہا اور ڈاکٹر چکو نے اس کالج کو انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کی تعلیم میں ہندوستان کے نقشے پر نمایاں جگہ دلادی۔ یہاں کے گریجویٹ خاص طور پر الیکٹریکل انجینئرنگ کے، شمالی ہندوستان میں سب سے بہتر سمجھے جاتے تھے۔

ہرچند کہ مرکزی حکومت ہماری بی ایس سی انجینئرنگ کی ڈگری کو آغاز سے ہی تسلیم کرتی تھی۔ لیکن صوبائی حکومت نے تسلیم کرنا، اس وقت تک کے لیے معرضِ التوا میں ڈال دیا تھا جب تک کہ انسٹی ٹیوشن آف انجینئرنگ آف انڈیا، تسلیم نہ کرلے جو کافی تاخیر سے ۱۹۵۱ء میں ممکن ہوسکا اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ جو ڈگریاں ۲۱ ماہ کے تیز رفتار تعلیمی نصاب کے مقابل دی گئی تھیں، تسلیم نہیں کی جائے گی۔ بعد میں چل کر یہ شرط بھی ختم کردی گئی۔

بعد کی تاریخ سے، عام طور پر لوگ واقف ہیں اس لیے اس کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں نیچے تاریخی ترتیب کے ساتھ ان شخصیتوں کے نام دیے جاتے ہیں جو ۱۹۴۰ء تک کالج کے پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔

۱۔ جناب شوکت عمر
۲۔ خان بہادر عبدالرحمٰن۔ آئی ای ایس (ریٹائرڈ)
۳۔ پروفیسر ٹی ایچ میتھیومین۔ ایم، ایس، سی (لندن)
۴۔ پروفیسر الیف، ایم، پی آربتھ نوٹ۔ بی ایس سی (آنرز) (ایڈن)
۵۔ پروفیسر حیدر خاں (صدر شعبۂ کیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)
۶۔ ڈاکٹر کے سی، چکو، ڈی، ایس، سی (انجینئرنگ لندن)
۷۔ پروفیسر حمید اللہ خاں۔ سپرنٹنڈنٹ انجینئر شعبۂ آبپاشی، یوپی۔ (ریٹائرڈ)
۸۔ بریگیڈیر منگت رائے۔
۹۔ پروفیسر ضیاءالدین انصاری
۱۰۔ ڈاکٹر این، سی، ساہا، بی ایس سی (آنرز) (ایڈن) ایم ایس، سی پی ایچ ڈی۔ (مانچسٹر)

آخر میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ تاریخ کی ایک بڑی ناانصافی ہے کہ اس نے عبید اللہ درانی کو کسی بھی نشانِ عظمت سے سرفراز نہیں کیا جو اس یونیورسٹی میں انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کی تعلیم کا بلاشک و شبہ حقیقی بانی تھا

⁂

قارئین کرام سے ضروری التماس

بعض ممبران نے شکایت کی ہے کہ "تہذیب الاخلاق" انھیں پابندی سے نہیں مل رہا۔ ہتوں کی ... اور رسالے کی باقاعدہ روانگی کی طرف اب بطور خاص توجہ کی جارہی ہے۔ اس بار تمام رسالے "انڈر پوسٹل سارٹیفکٹ" بھیجے جارہے ہیں۔ الحمدللہ تہذیب الاخلاق نہایت پابندی سے مقررہ تاریخوں پر روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر مقررہ تاریخ کے ایک ہفتہ بعد تک رسالہ نہ ملے تو دفتر کو خط لکھ کر دوبارہ طلب فرمالیں۔ پرچہ گم ہونے کی صورت میں ضروری ہے کہ اپنے علاقے کے ڈاکیہ کو تنبیہ فرمادیں۔ بلکہ ضروری ہو تو پوسٹ ماسٹر سے اس کی شکایت کریں۔

منیجر

شہد - اکسیرِ حیات

حافظ ڈاکٹر نسیم احمد شکیل
کیمسٹری سیکشن
ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

شہد [ہنی۔ Honey] کے لغوی معنی "بہت میٹھا" کے ہیں۔ یہ سب سے قدیم اور اہم ترین غذا ہے۔ یہ سائنس کے لیے بہت زیادہ خوشگوار معمہ ہے اور ابھی بھی ہماری سب سے مکمل اور بآسانی جذب ہونے والی غذا ہے۔ ذریعۂ توانائی کی حیثیت سے زمانہ کا صرف یہی ایک دوسرا رقیق سونا ہے۔ یہ چھ گنا مقوی ہے بمقابلہ اس دودھ کے جس سے فی کیلو ۳۲۰۰ کیلوری توانائی حاصل ہوتی ہے اس کی لطافت ایسی ہوتی ہے کہ یہ انتہائی قیمتی اور کثیر مقدار میں صحت کو شکر دینے والی شئے ہے۔ باقاعدہ تیار شدہ شہد کو جب نجاست اور آلودگی میں ڈال دیا جاتا ہے تو یہ ان تمام مضر جراثیم [Bacteria] کو جو اس نجاست میں موجود رہتے ہیں، محض چند گھنٹوں میں ختم کر دیتا ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ انسان مویشی رکھنے یا خمیر اٹھانے [Fermentation] کے فن سے بہت قبل ہی سے "انتہائی شیرینی" کے متعلق جانتا تھا، جو اسے جنگلی مکھیوں سے حاصل ہوتا تھا۔

زمانۂ قدیم ہی سے ساری دنیا میں شہد کی اہمیت اور قوتِ حیات کو بنی بنائی [Ready-made] غذا کی حیثیت سے تمام انسانیت کے لیے ایک عطیہ اور نعمت کے طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ مغرب میں اس کا ذکر سب سے قدیم طبی نصاب "میٹیریا میڈیکا" [Materia Medica] میں ہے اور ایک یونانی باشندہ ہپوکریٹس [Hippocrates] (تقریباً ۴۰۰ قبل مسیح) اور بابائے اطباء نے کٹے ہیں، پھوڑے پھنسیوں میں اور گلے میں بھی اس کی سفارش کی ہے۔ گیلن [Galen]، اوڈ [Ovid] اور شیخ نفذال [Nefzawi] پرفیومڈ گارڈن [Perfumed—Garden] — کے مصنف نے یہ مانا ہے کہ شہد کے اندر نمایاں طور پر شہوت انگیز قوتیں ہوتی ہیں: دراصل لفظ "ہنی مون" [Honeymoon] کا صحیح مفہوم شہد سے بنائی گئی ایک شراب شادی کے بعد تیس دنوں تک پینے کے لیے ہے۔

انجیل میں شہد کی مکھیوں اور شہد کی جانب بہت کثرت سے اشارہ کیا گیا ہے۔ قدیم یونان میں پہلوان [لوگ] قدرت کے اس بیش بہا شیریں شربتی غذا کو کھیلوں میں توانائی، قوت اور مردانگی حاصل کرنے کے لیے وسیع مقدار میں استعمال کیا کرتے تھے۔ یونانی فلسفی ڈیموکرائٹس [Democritus] اور الگزنڈر عظیم [Alexander The Great] شہد کی اہمیت سے اتنے زیادہ باخبر اور واقف تھے کہ انھوں نے یہ وصیت کی تھی کہ انھیں مرنے کے بعد اسی [شہد] میں دفنا دیا جائے۔ ایک قدیم شاہی مصری گنبد جو زمانۂ جدید میں کھولا گیا تو اس کے اندر مرتبانوں میں بھرے ۳۳۰۰ سال پرانے شہد پائے گئے۔ یہ پرانے ہونے کے باعث تاریک اور دھندلے ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود یہ خالص اور کھانے کے قابل تھے۔

شہد نمک کی طرح ایک عالمگیر سطح پر تسلیم شدہ مزہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کی خوشبوئیں اور رنگ مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں اور اس کا انحصار پودوں اور درختوں کی تقریباً دس ہزار اقسام [Species] پر ہے جن کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں۔ شہد سب سے زیادہ پہاڑی خطے سے دستیاب ہوتا ہے۔ نیم اور جامن کے درختوں سے حاصل شدہ شہد کے اندر تندرست کرنے والی خاصیت ہوتی ہے۔

کائنات میں یا مہذب دنیا میں شہد کی مکھیاں [جو سرخ رنگ کی اندھی ہوتی ہیں] سب سے پہلے پھولوں کی خوشبو سے اور پھر ان کے رنگوں سے راغب ہو کر اپنے شہد تیار کرنے کے کام کا آغاز کرتی ہیں۔ ہر کام کرنے والی شہد کی مکھی روزانہ رات ہونے سے قبل تک اپنے وزن کا تقریباً پانچ سو گنا میٹھا رس [Nectar] اپنے چھتے تک ڈھوتی ہے۔ ایک کھانے کا چمچہ [Table-Spoon] شہد تیار کرنے کے لیے ایک شہد کی مکھی کو تقریباً دو ہزار پھولوں کے پاس جانا ہوگا جب کہ چھتے میں ایک پونڈ شہد شہد کی مکھیوں کی پھولوں کے پاس کم از کم ۳۷۰۰۰ آمد و رفت سے تیار ہوتا ہے۔

شہد عموماً سب سے زیادہ کلوور بلوزمز [Clover Blossoms] [ایک خاص قسم کے پھول] سے تیار ہوتا ہے۔ میٹھا رس دینے والے پودوں کے اقسام تقریباً دس ہزار ہیں جن میں زیادہ تر پودے لوگوں کو معلوم ہیں۔ میٹھی خوشبو والے پھول زیادہ خوشبو دار شہد بنا سکتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ سب سے اچھا شہد ہو۔ دراصل گکروندا [Dandelion]

کرکم [Crocuses] اور مصر و شام کے انجیر [Sycamore] درختوں کے ناپسندیدہ پھول شہد کے چند اہم ذرائع میں سے ہیں۔ جنگلی رس بھری کا پودا [Raspberries] الفلفا [Alfalfa]، نیلا کروندہ [Blue berries]، پوسی بید کا درخت [Pussy-willow]، بک وہیٹ [Buck-wheat]، ببول [Acacia] اور صنوبر کا درخت [Pine woods] کچھ دوسرے اعلیٰ اقسام کے ذرائع ہیں۔ سب سے نایاب شہد وہ کہلاتا ہے جو دیوتاؤں کی خوراک کی سفید گھنٹیاں [White Bells of ambrosia] یا ایک قسم کی تلخ بوٹی [Worm wood] سے تیار ہوتا ہے اور سب سے زیادہ زہریلا اور خطرناک شہد وہ ہے جو مشرقی نیپال کی جنگلی شہد کی مکھیوں سے موسم بہار میں حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ پہاڑیوں میں بعض سدابہار جھاڑی [Rhododendron] کے پھولوں سے نکلتا ہے۔

غالباً بہت سے لوگ یہ نہ جانتے ہوں کہ دو نمایاں قسم کے شہد ہوتے ہیں:

۱۔ ناموزوں یعنی خراب ذائقہ اور خوشبو کا صنعتی شہد اور
۲۔ عمدہ، نازک، ضیافتی بوقلمونی [Table Variety] شہد

شہد کے ماہرین اسے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ چند ہی پھولوں سے ایسے میٹھے رس حاصل ہوتے ہیں جو کہ صاف بوقلمونی شہد [Table Honey] بناتے ہیں۔ دوسرے بہت سے ایسے شہد بناتے ہیں جو کہ سیاہی مائل اور خراب ذائقہ والا ہوتا ہے۔ حالانکہ اسے نانبائی [Bakers] حلوائی اور تمباکو کمپنی والے اچھا استعمال کے لیے رکھتے ہیں۔ ایسے شہد کو نان بائی کیک وغیرہ میں بھی ڈالتے ہیں بقیہ ادنیٰ درجے کے زیادہ تر شہد کا استعمال صحت یابی میں، نم کرنے میں نرم و ملائم کرنے میں اور تمباکو میں خوشبو پیدا کرنے میں استعمال ہوتا ہے کھانسی کے مکسچر [Cough Mixtures] اور ہاتھ لوشن [Hand-lotions] میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

کافی تعجب کی بات تو یہ ہے کہ شہد کی اتنی اہمیت اور خصوصیات کے باوجود کیمیادان [Chemists] اسے اس طرح اپنی تجربہ گاہ میں نہیں بنا سکتے جس طرح کہ وہ دودھ بنا سکتے ہیں۔ حیاتی معدنیات مثلاً لوہا، پوٹاشیم، تانبا، مینگنیز اور فاسفورس، لحمیہ [Protein] حیاتین [Vitamins] خامرہ [Enzymes] اور قدرتی شکر خالص شہد کے اجزاء ہیں اور یہ تمام چیزیں ایک ساتھ مل کر خام غذا تیار کرتی ہیں جو براہ راست خون کی شریانوں میں بہت اعلیٰ ممکنہ رفتار کے ساتھ جذب ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک عظیم کارنامہ انجام پاتا ہے جو کہ کسی دوسرے انسانی خوراک سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

کائنات میں شہد سب سے عمدہ کاربوہائیڈریٹ غذا ہے اور اس کے اندر مٹھاس پیدا کرنے کی صلاحیت چینی سے دوگنی ہوتی ہے۔ یہ قوت تحمل میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ انسان کی مختلف صلاحیتوں کو بہتر اور کرتا ہے اور یہ بہت سی بیماریوں کے لیے ایک اکسیر اعظم ہے۔ شہد بالعموم دو مفرد شکر کا مرکب ہوتا ہے۔

۱۔ "ڈکسٹروز" [Alpha-glucose or grape sugar-Dextrose]
۲۔ لیوولوز۔ "[Levulose] Fructose or fruit sugar."

کچھ شکروز [Sucrose] اور ڈکسٹرنس [Dextrins] بھی موجود ہوتے ہیں۔ شہد کے مختلف اجزاء کی فی صد آمیزش مندرجہ ذیل ہے:

لیوولوز ۳۸٫۱۹، ڈکسٹروز ۳۱٫۲۸، مالٹوز [Maltose] اور دوسرے شکر ۸٫۸۱، خامرہ، رنگ [Pigments] وغیرہ ۲٫۲۱، سکروز ۱٫۳۱، تیزاب [Acids] لحمیہ اور راکھ [Ash] ۱٫۰۰ اور پانی ۱۷٫۲۰۔

شہد کو بحفاظت رکھ کر کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دینے پر دانہ دار [Granulated] بن جاتے ہیں جو اس کے خالص ہونے کی اچھی علامت ہے۔

غذائی سائنس دانوں [Nutritional Scientists] نے محفوظ غذا کے طور پر شہد کی بڑی تعریف کی ہے۔ "سوئز بی" نامی ایک رسالے نے تین بیمار بچوں پر ایک تجربے کے نتائج کو بیان کیا۔ ایک بچے کو جب شہد کھلایا گیا تو وہ بقیہ دونوں بچوں کے مقابلے میں بہت جلد صحت یاب ہونے لگا۔ اس کی شکل نسبتاً زیادہ چمکیلی ہونے لگی۔ اس کے وزن اور بشاشت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دو سو گرام یا دس کھانے کے چمچے شہد سے جو قوت ملتی ہے وہ ۱٫۱۵ لیٹر دودھ، یا ۱٫۶۰ کیلو گرام ملائی پنیر، یا ۳۳۰ گرام گوشت، یا آٹھ عدد سنترے یا دس عدد انڈوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ایک کھانے کا چمچہ [۲۱ گرام] شہد سے ۶۰ کیلوری توانائی ملتی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں امریکہ کے ایک ڈاکٹر ایم۔ ایچ۔ ہیڈک [Dr. M. H. Haydak] نے شہد کی قوت غذائیت پر ایک عملی تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ شہد اور دودھ پر [کبھی کبھی ایک گلاس سنترے کے رس پر بھی] بارہ ہفتے تک حسب معمول بغیر کسی خراب اثر کے گزر کرتے رہے۔

شہد کی عظیم ترین اہمیت غذائی حیثیت سے اس کی وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے یہ خالص شکر کی جگہ لے لیتا ہے۔ تمام سائنس داں اس بات پر متفق ہیں کہ "سفید شکر" یعنی چینی جسے "سفید زہر" کہنا زیادہ موزوں ہے، انسانی جسم کے لیے اس کے اندر کوئی قوت بخش صفت نہیں ہوتی ہے۔

یا بیلس (Diabetes) اس کی تاک اور گھات میں لگا رہتا ہے۔

ایک بڑا انگریز ماہر خوراک ڈاکٹر جان یڈکن (John Yudkin)

نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ چینی دل کے دورے (Heart-attack)

لیے ایک نئی اور موذی شے ہے۔ وہ کہتے ہیں "یہ چینی ہی ہے جو جسم کو

یک قسم کا کولیسٹرول (Cholestrol) بنانے کی ہدایت کرتا ہے۔ جو خون

ں شریانوں میں تہ نشیں مادہ (Deposits) تیار کرتا ہے اور اس کے

استے میں مزاحم ہوتا ہے جس کی کوئی معقول وجہ ابھی تک نہیں معلوم ہو سکی

ہے۔ چینی (جو حیاتین اور معدنیات سے خالی ہوتی ہے) کو موزوں

ریقے پر "غذائی موت کا پھندا" کہا جاتا ہے۔ یہ بقیہ معدنی مواد کو

سم سے کھینچتا ہے اور مقوی اجزاء کو ان سے چھین لیتا ہے۔ اسی وجہ سے

یادہ چینی کھانے والے لوگ دائمی تھکان سے دوچار رہتے ہیں۔

شہد چینی کے لیے ایک حیرت انگیز بدل ہے۔ اسے ہر عمر کے لوگ

ں میں کسی وقت اور سال کے کسی بھی موسم میں صحت اور بیماری دونوں

ںے سکتے ہیں۔ بیماری میں اس کو دودھ پر بھی ترجیح دی جاتی ہے۔ اس

رتی غذا کی ایک مقررہ مقدار کو ذیابیطس میں بھی لینے کی اجازت ہے۔

ہد کی صفت طلسمی کا راز اس کے خاص جزو ڈکسٹروز میں پوشیدہ ہے

نائی پیدا کرنے کے لیے ڈکسٹروز جسم کے تمام نسیج (Tissues) کے ذریعے

سیجن سے مرکب (Oxidised) ہو جاتا ہے۔ عموماً جسم کی نصف سے زیادہ

نائی ڈکسٹروز کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈکسٹروز کی زیادتی بہت آسانی

روغن (Fat) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عضلات (Muscles)

ردوسرے نسیج گلائیکوجن (Glycogen) تیار کرنے کے لیے خون سے

سٹروز کو خارج کرتے ہیں۔ جس سے مختلف پیچیدہ کیمیاوی عمل ہونے کے باعث

اری نسیجی مشینری کو عمل میں لانے کے لیے توانائی پیدا ہوتی ہے۔

شکر کو جسم میں صرف ڈکسٹروز ہی کی شکل میں جمع کر سکتے ہیں۔ اسے

ر (Liver) غدودی خلیے (Gland cells) اور عضلات میں اکٹھا

اجا سکتا ہے۔ جب جسم کو توانائی کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ استعمال کے

بآسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔

شہد بچوں کے اندر کیلشیم کو قایم رکھنے میں مدد کرتا ہے اور اس

رح اُن کے دانتوں اور سخت اعضاء کو صحت مند بناتا ہے۔ یہ تھکان کو روکتا

اور فوری طور پر دستیاب توانائی بہم پہنچاتا ہے۔ ماں بننے والی عورتوں

لیے اس کی اہمیت بڑی مشکل ہی سے واضح کی جا سکتی ہے۔ یہ خطۂ شکمی

ت (Gastro-intestinal Tract) میں خمیر بننے (Fermentation) سے

رکتا ہے اور اسے بڑی تیزی سے جذب کر لیتا ہے۔ اس کے معدنیات جسم

ر بنانے کے کام انجام دیتے ہیں۔ مزید برآں یہ ایک بہت معقول ذریعۂ

حیاتین ہے۔ یہ معدنیات اور حیاتین غذا میں موجود دوسرے عناصر کو بھی

جو ان کے اندر موجود ہوتے ہیں، مقوی بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی اور شہد کا مخلوط خالی معدے میں لیا جانا عضلات کو ہم آہنگ بنانے میں مدد کرتا ہے۔ اسے اگر دودھ کے ساتھ لیا جائے تو یہ خطۂ ہاضم (Digestive tract) کو ہم آہنگ (Tones up) کرتا ہے۔

شہد ایک بہت ہی اچھا دافع قبض، سکون بخش اور جراثیم کش (Antiseptic) ہے۔ جس طرح لیکٹوز ہومیوپیتھی کی تقریباً ساری دواؤں میں باربردار کی حیثیت سے (Lactose) استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یونانی اور آیورویدک دواؤں میں شہد بڑی کثرت اور فراوانی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

شہد خون کے اندر اس کے خلیوں کا رنگین مادہ (Haemoglobin) بنانے میں مدد کرتا ہے۔ ایک اچھا دافع قبض ہونے کے باعث یہ تعفنیت کو روکتا ہے۔ اس کو زخم کی صفائی (Dressing) میں بھی ایک مثالی شے تصور کیا جاتا ہے۔ نارویچ (Norwich) ہوسپٹل کے ڈاکٹر مائیکل ڈبلو، بلمین (Michael W. Bulman) نے تو شہد کو بڑے بڑے عمل جراحی (Surgical operations) کی صفائی میں بھی استعمال کیا ہے۔ انھوں نے زخم کی صفائی میں شہد کے جو فوائد بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں:

"— اس سے سوزش نہیں ہوتی ہے۔ یہ غیر سمی (Non-Toxic) خود زندہ جراثیموں سے آزاد (Self-Sterile) جراثیم کش، مقوی، سستا، بآسانی دستیاب، بآسانی استعمال کیا جانے والا اور سب سے زیادہ موثر ہوتا ہے —"

شہد سردی، کھانسی، بخار کی روک تھام اور خون کی صفائی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ آنکھوں کی تکالیف، زبان اور غذا کی نالی کے ناسور، حلق کے ناسور اور جلنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کمزور دل کے لوگوں کی توقع اور امید کے لیے ایک قاصد کا کام کرتا ہے۔ ایک مشہور جرمن ماہر قلب ڈاکٹر ای، کوچ (E. Koch) کا کہنا ہے۔ "شہد پا جانے کے بعد دل کا مقابلہ اس گھوڑے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جس کو جئی (Oat) کھلایا گیا ہو۔ یہ قوت سے بھرپور ہوتا ہے۔ بہرحال شہد صحت مند دل کے لیے ایک قوتِ رسد (Power Supply) ہے اور بیمار دل کو قوت بہم پہنچاتا ہے۔

ہالینڈ کے ایک اعلیٰ عہدہ دارِ الکحلیت (Alcoholism) ڈاکٹر اولف مارٹینسن (Olaf Martenson) نے یہ پایا ہے کہ شہد الکحل کے لیے ایک عمدہ اور موثر تریاق (Antidote) کا کام کرتا ہے۔ شہد کی مناسب مقدار شرابیوں کی تپِ رق (Scourge) کو فوری طور پر کم کر دیتا ہے۔

ایک مشہور خاتون ناول نگار باربارا کارٹلینڈ (Barbara Cartland)

یہ سُرخ نشان آپ کا زرِ سالانہ ختم ہونے کی علامت ہے۔ ازراہِ کرم بیس روپے بذریعہ منی آرڈر منیجر تہذیب الاخلاق، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے نام جلد ارسال فرمادیں۔

اپنی کتاب "شہد کا جادو" The Magic of Honey میں کہتی ہیں:

"شہد اکسیرِ حیات ہے۔ ایک عظیم ترین اور سب سے زیادہ تعجب خیز محافظِ نوجوانی ہے۔ کیوں کہ شہد خود کبھی بھی پرانا نہیں ہوتا ہے۔"

ایک نادر جنسی محرک، اعلیٰ طرز کا سببِ مردانگی اور قوتِ باہ کی حیثیت سے وہ اس کی تعریف کرتی ہیں۔ حسن و خوبصورتی کی اعانت اور مدد کی حیثیت سے خاتون کارٹلینڈ کہتی ہیں:

"شہد رنگ و روپ کی صفائی کے لیے بہت عمدہ ہے اور یہ اسے تابندہ دمک [Radiant Glow] بخشتا ہے۔"

وہ کھوپڑی کے علاج کے لیے بھی اس کی سفارش کرتی ہیں جس سے کہ بالوں کے قدرتی رنگ اور چمک کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

حالیہ تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ چھتہ سے براہِ راست حاصل شدہ صرف خام شہد ہی لازمی طور پر شفا بخشنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تندرستی اور خوشحالی کے لیے شہد ایک اصلی پروانہ [Passport] ہے۔ ہم لوگ توانائی پیدا کرنے والی اس نادر شے [Energizer] "اکسیرِ حیات" کے ذریعہ اپنی بیکار بیٹری [Battery] کو پھر سے کارآمد بنا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ایک دن میں ایک چمچہ شہد ڈاکٹر کو دور رکھتا ہے۔

شہد کی ان تمام خوبیوں اور صفات کے علاوہ دنیا کی عظیم ترین آسمانی کتاب قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

" اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور اونچی اونچی چھتریوں میں، جو لوگ بناتے ہیں، گھر بنا، اور ہر قسم کے میوے کھا، اور اپنے پروردگار کے صاف رستوں پر چلی جا۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں [کے کئی امراض] کی شفا ہے۔"

[سورہ النحل پارہ ۱۴ - رکوع ۱۵]

پھر دوسری جگہ ارشاد پاک ہے:

" اور شہدِ مصفّٰی کی نہریں ہیں [جو حلاوت ہی حلاوت یعنی شیرینی ہی شیرینی ہے]۔"

[سورہ محمد پارہ ۲۶ - رکوع ۶]

غرض یہ کہ شہد کے اندر مختلف امراض کے لیے "قدرتی شفا" ہے۔

تصحیح

تہذیب الاخلاق میں دو مضامین "انسان کی حقیقت" اور "اسلام میں مساوات کی حقیقت" شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مصنف ہیں جناب ظہیرالدین احمد معلم دینیات ایس۔ٹی۔ ہائی اسکول، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۲ / ۸۴ — ۸۵

مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ وہ لوگ جو ایک سے زائد جگہ کے لیے امیدوار ہوں اُن کو چاہیے کہ ہر جگہ کے لیے علیحدہ علیحدہ درخواستیں دیں۔

پروفیسرس:- شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰ - ۶۰ - ۱۸۰۰ - ۱۰۰ - ۲۰۰۰ - ۲/۱۲۵ - ۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

۱۔ پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز۔ ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔

۲۔ پروفیسر آف بزنس ایڈمنسٹریشن۔ ڈپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن

۳۔ پروفیسر آف لینگوئیسٹکس۔ ڈپارٹمنٹ آف لینگوئیسٹکس

۴۔ پروفیسر آف لا۔ ڈپارٹمنٹ آف لا۔

۵ پروفیسر آف ہسٹری (ہسٹری آف راجستھان / ہسٹری آف دکن / مراٹھا ہسٹری / سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف میڈیویل انڈیا / پولیٹکل ہسٹری آف مغل ایمپائر)۔ ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری۔

قابلیت:- لازمی الف۔ متعلقہ مضامین میں فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے ماسٹرز ڈگری یا اس کے مساوی غیر ملکی قابلیت۔

(ب) ڈاکٹریٹ معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ درجے کا مطبوعہ کام

(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھانے کا کم از کم دس سالہ تجربہ اور ریسرچ کی رہنمائی کرنے کا قدرے تجربہ۔

نوٹ:- پوسٹ نمبر ۵ کے لیے پروفیسر آف ہسٹری مطبوعہ کام اوپر دیئے ہوئے اندرجات میں سے اعلیٰ پایہ کا ہونا چاہیے۔

آپسندیدہ:- پوسٹ نمبر ایک پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز کے لیے عربی زبان کی اچھی جانکاری ہونا چاہیے۔ فارسی یا ترکی زبان کا علم اضافی قابلیت میں شمار ہوگا۔

ریڈرس:-

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ مع دیگر الاؤنس

ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز (اکونامکس) سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔

۷ ریڈر ان سائیکلوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف سائیکلوجی
۸۔ ریڈر ان لائبریری سائنس ۔ ڈپارٹمنٹ آف لائبریری سائنس
۹ ریڈر ان ہسٹری (موڈرن انڈین ہسٹری) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری
۱۰ ریڈر ان ہسٹری (اکونومک ہسٹری آف میڈیویل انڈین بیسڈ آن اسٹیٹسٹیکل اینڈ کواٹی ٹیٹو انالائسز/ہسٹری آف میڈیویل انڈین آرٹ) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری
۱۱۔ ریڈر ان جنرل ایجوکیشن سینٹر
۱۲ ریڈرز ان جغرافیہ ۔ ڈپارٹمنٹ آف جغرافیہ
۱۳ ریڈرز ان زولوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف زولوجی ۔
۱۴ ریڈر ان بوٹنی ڈپارٹمنٹ آف بوٹنی
۱۵ ریڈر ان فلاسفی ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی ۔
۱۶۔ ریڈرز ان انگلش ڈپارٹمنٹ آف انگلش۔
۱۷۔ ریڈر ان اردو ڈپارٹمنٹ آف اردو
۱۸۔ ریڈر ان اردو ویمنس کالج

قابلیت ۱۔ لازمی (الف) متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرز ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد۔

(ب) ڈاکٹریٹ معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ درجے کا مطبوعہ کام

اور

(ج) کم سے کم پانچ سال کا پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھانے کا تجربہ اور تحقیق کی رہنمائی کا قدرے تجربہ۔
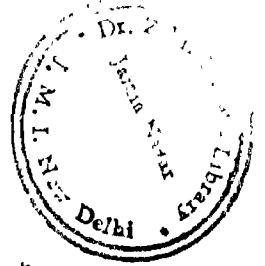
نوٹ :۔ پوسٹ نمبر ۱۰ ریڈر ان ہسٹری کے لیے
امیدوار کا تحقیقی کام مندرجہ سبجکٹس میں سے کسی دو میدان میں ہونا ضروری ہے

نوٹ : پوسٹ نمبر ۱۳ ' ریڈرز ان زولوجی کے لیے
درس و تدریس کا تجربہ ایپلائڈ اینٹامالوجی میں ہونا ضروری ہے (صرف ایک جگہ کے لیے)

۲۔ پسندیدہ۔ پوسٹ نمبر ۶ ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز (اکونومکس) کے لیے۔
کرنٹ ویسٹ ایشین اکونومکس ٹرینڈ میں اچھی اور جدید ترین معلومات۔ عربی یا کسی دوسری ویسٹ ایشین زبان میں کام کرنے کی صلاحیت۔

۲۔ پسندیدہ:۔ پوسٹ نمبر ۱ ریڈر ان ہسٹری کے لیے
اسٹیٹسٹکس میں یا میتھمیٹکس میں ماسٹرس ڈگری۔ سرٹیفکٹ یا ڈپلومہ ان اسٹیٹسٹکس کی بنا پر قابل ترجیح / ماسٹرس ڈگری یا ڈپلوما فائن آرٹ میں۔
پوسٹ نمبر ۱۱ ریڈر ان جنرل ایجوکیشن سینٹر کے لیے

کم از کم پانچ سالہ درس و تدریس کا جنرل ایجوکیشن کورسنز کا تجربہ

پوسٹ نمبر ۱۵ ریڈر ان فلاسفی کے لیے

مسلم فلاسفی میں تخصص یا اس کی اعلیٰ درجے کی معلومات / کنٹمپوریری ویسٹرن موریل اور ریلیجس فلاسفی / سیمبالک لاجک میں تخصص یا انتہائی اعلیٰ درجے کی معلومات۔

پوسٹ نمبر ۱۷ ریڈر ان اردو ڈپارٹمنٹ آف اردو کے لیے

۱۔ ورلڈ لٹریچر کی معلومات
۲۔ ویسٹرن تنقید کا علم
۳۔ فارسی / عربی / سنسکرت کی جانکاری

لکچررس :۔

شرح تنخواہ :۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس ۔

۱۹۔ لکچرر ان ہسٹری (ویسٹ ایشین ہسٹری) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری۔
۲۰۔ لکچرر ان ہسٹری (اینشینٹ ہسٹری اینڈ آرکیالوجی) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری۔
۲۱۔ لکچررز ان ہسٹری (سندی سورسیز آف میڈیویل انڈین ہسٹری / مسلم سوشل ہسٹری / ہسٹوریکل جغرافیہ / میڈیویل آرکیالوجی / اکونامکس ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا / سینٹرل ایشین ہسٹری) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری
۲۲۔ لکچررز ان لائبریری سائنس ۔ ڈپارٹمنٹ آف لائبریری سائنس
۲۳۔ لکچررز ان بزنس ایڈمنسٹریشن ۔ ڈپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن۔
۲۴ لکچررز ان میتھ میٹکس ۔ ڈپارٹمنٹ آف میتھ میٹکس
۲۵۔ لکچرر ان اپلائڈ میتھ میٹکس ۔ ڈپارٹمنٹ آف میتھ میٹکس۔
۲۶۔ لکچررز ان فزکس ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔
۲۷۔ لکچررز ان کیمسٹری ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری
۲۸۔ لکچرر ان بوٹنی ڈپارٹمنٹ آف بوٹنی
۲۹۔ لکچرر ان زولوجی (ایکولوجی) ڈپارٹمنٹ آف زولوجی
۳۰. لکچررز ان زولوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف زولوجی
۳۱ لکچرر ان جیولوجی ڈپارٹمنٹ آف جیولوجی
۳۲ لکچرر ان جیولوجی ، جیولوجی سیکشن ۔ ذاکرحسین کالج آف انجینرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
۳۳۔ لکچرر ان کامرس۔ ڈپارٹمنٹ آف کامرس
۳۴۔ لکچررز ان انگلش ڈپارٹمنٹ آف انگلش
۳۵ لکچرر۔ ان انگلش (عارضی) یونیورسٹی پولی ٹیکنک۔
۳۶۔ لکچرر ان انگلش ویمنس کالج

۳۷۔ لکچرر ان ہوم سائنس ۔ ڈیفنس کالج۔

قابلیت: لازمی (الف) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام

(ب) اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس (بی
سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹرس ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے
اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

نوٹ:۔ پوسٹ نمبر ۱۹ لکچرر ان ہسٹری (ویسٹ ایشین ہسٹری) کے لیے
ویسٹ ایشین ہسٹری میں ماسٹرس لیول کے مطابق تخصص ہونا چاہیے یا ویسٹ ایشیا
کی ہسٹری میں تحقیقی کام اور ساتھ ہی ساتھ عربی زبان کا علم

پوسٹ نمبر ۲۰ لکچرر ان ہسٹری (اینشینٹ انڈین ہسٹری اینڈ آرکیالوجی) کے لیے
ماسٹرس لیول کی اینشینٹ انڈین ہسٹری اور آرکیالوجی میں تخصص اور سنسکرت/پراکرت
زبان کا علم۔

نوٹ:۔ پوسٹ نمبر ۲۱ لکچرر ان ہسٹری (ہندی سورسز آف میڈیویل انڈین ہسٹری/مسلم
سوشل ہسٹری/ہسٹوریکل جغرافیہ/جغرافیہ میڈیویل آرکیالوجی/اکونامکس ہسٹری آف ساؤتھ
انڈیا/سینٹرل ایشین ہسٹری) کے لیے۔

امیدواروں کے لیے لازمی ہوگا کہ پوسٹوں میں دیے گئے ٹائیٹلس میں سے کسی فیلڈز
میں تحقیقی کام کا ثبوت پیش کریں،

ہسٹوریکل جغرافیہ کے لیے، ماسٹرس ڈگری ان جغرافیہ کی ڈگری، ماسٹرس ڈگری
ان ہسٹری کے مساوی تسلیم کی جائے گی

میڈیویل آرکیالوجی کے لیے امیدوار کے واسطے ضروری ہوگا کہ اس کے پاس آرکیالوجی
میں ماسٹرس ڈگری ہونا چاہیے۔ یا
اگر ہسٹری میں ماسٹرس ڈگری ہو تو اس کے ساتھ آرکیالوجی میں ڈپلوما ہونا ضروری ہے

بین الموضوعی ترقیات کے پروگرام کی ضرورت کے تعلق سے مذکورہ بالا الف اور
ب کے لیے متعلقہ مضامین میں ڈگری ہونا ضروری ہے۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا
مطبوعہ کام سے ظاہر ہے، اعلیٰ درجے کا ہے، اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ
استعداد میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل امیدوار میسر نہ
آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں تصور نہ ہو، تو اس صورت میں اچھے تعلیمی
ریکارڈ کے حامل امیدوار (اس صورت میں ایم۔فل ڈگری یا مطبوعہ معیاری کام کو
وزن دیا جائے گا) کا تقرر کیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ
ہو، یا اس نے کسی ریسرچ لیبارٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال تک کام کیا ہو۔
ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری کے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ
کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو
مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہ دی جائے گی جب تک وہ ان
ضروریات کو پورا نہ کرلے۔

پینسٹھ:- پوسٹ نمبر ۳۰ لکچررز ان زولوجی کے لیے
جینٹکس / اگریکلچر نیماٹولوجی میں تخصص (ایک جگہ کے لیے)

غیر معمولی تجربہ/اعلیٰ قابلیت کے امیدواروں کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا، ان کو ایک طرف کا
سیکنڈ کلاس کا کرایہ بطور T.A. دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ کے دفتر سے یکمشت پانچ روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش
سیکشن میں جمع شدہ) یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کے
کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کر سکتے ہیں۔
ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں 23×10 سم سائز کا ایسا لفافہ جس پر
خود کا پتہ تحریر ہو اور ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجنا ضروری ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۱ اگست ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے
نامکمل اور دیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔ علی گڑھ سے باہر سے بھیجی جانے والی
درخواستیں رجسٹرڈ پوسٹ سے بنام ڈاکٹر ایس۔اے۔ایس۔ جعفری سکریٹری برائے وائس چانسلر علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ بھیجی جائیں۔
نوٹ:- موزوں امیدواروں کو آئندہ جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

نوٹس

تمام متعلقہ طلبا کو مطلع کیا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کا ۸۵-۱۹۸۴ء کا تعلیمی میقات یکم اگست ۱۹۸۴ء سے شروع ہو جائے گا۔ مندرجہ کورسیز کی ریگولر کلاسیز اپنی مقررہ تاریخ سے، جو ان کے سامنے دی گئی ہیں، شروع کر دی جائیں گی۔

نمبر	کورس		تاریخ
۱۔	کلاس XII (سینئر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کورس انڈر 10+2 سسٹم)		یکم اگست ۱۹۸۴ء
۲۔	بی۔اے/بی۔ایس سی/بی۔کام پارٹ II (II ایر)		۱۶ر اگست ۱۹۸۴ء
۳۔	بی۔اے/بی۔ایس سی/بی۔کام پارٹ III (فائنل ایر)		" " "
۴۔	ایم۔اے/ایم۔ایس سی/ایم۔کام۔	(فائنل ایر)	" " "
۵۔	ڈپلوما انجینئرنگ	(II ایر)	" " "
۶۔	ڈپلوما انجینئرنگ	(III ایر)	" " "
۷۔	ڈپلوما ان ڈینٹل ہائی جینک (ڈینس ہائی میکنک)	(II ایر)	" " "
۸۔	ڈپلوما ان ڈینٹل ہائی جینک (ڈینس ہائی میکنک)	(III ایر)	" " "
۹۔	بی ایس سی انجینئرنگ	(V ایر۔کورس)	" " "
۱۰۔	ایم۔بی۔بی۔ایس	(فائنل پروفیشنل)	" " "
۱۱۔	بی۔یو۔ایم۔ایس	(I ایر/II ایر/III ایر/IV ایر/V ایر)	یکم اگست ۱۹۸۴ء
۱۲۔	ایل ایل۔بی۔ III اینڈ V سمسٹر		۲۰ر اگست ۱۹۸۴ء

باقی ماندہ کورسوں کے شروع ہونے کی تاریخ علیحدہ سے آئندہ مشتہر کی جائے گی۔

این۔ موئید الدین کنٹرولر آف اگزامینیشنز اینڈ ایڈمیشنز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

تصحیح

لازمی تعلیمی صلاحیت برائے پرائمری ٹیچر جو اشتہار نمبر ۱۰/۸۵-۱۹۸۴ء نمبر شمار ۳ کے تحت مشتہر کی گئی تھی اس میں مندرجہ ذیل جملہ میٹرک ٹرینڈ کے الفاظ کے بعد پڑھا جائے

"یا ہائی اسکول" اس جملہ کے اضافے کے بعد پہلی لائن اس طرح پڑھی جائے

"میٹرک ٹرینڈ یا ہائی اسکول مع طویل عملی ....

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

Tahzibul Akhlaq Fortnightly 1st to 15th August, 84. Regd. No. L/ALG 247

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh. Phone 41

تہذیب الاخلاق

جلد ۳ — ۱۵ر اگست تا ۳۱ر اگست ۸۴ء — شمارہ ۱۶

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسؤل:
نورالحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات

سرورق پر: مولانا حسرت موہانی — آرٹسٹ: سرفراز احمد

Speak Gently

Speak gently; it is better far
To rule by love than fear
Speak gently; let no harsh word mar
The good we may do here

Speak gently, tis a little thing
Dropped in the hearts deep well
The good, the joy that it may bring
Eternity shall tell

نرم کلامی — Anon.

کلام نرم و نازک
ایک جادو ہے
لوگوں کے دلوں کو محبت سے جیتو نہ کہ خوف سے
کلام نرم و نازک
ایک معجزہ ہے!
الفاظ سخت و سست سے زبان کو آلودہ نہ کرو
وہ حسن عمل کو خاک میں ملا دیتے ہیں
کلام نرم و نازک
ایک رحمت الٰہی ہے
جو انسانی دل کی گہرائیوں میں ملتی ہے
اور بنی آدم کو اس نیکی اور مسرت سے ہمکنار کر دیتی ہے
جو لازوال بھی ہے اور دائمی بھی!

ترجمہ: پروفیسر منظر عباس نقوی

مسلمانانِ ہند کے تعلیمی سماجی اور تہذیبی مسائل

(ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل لکچر، غالب اکاڈمی، نئی دہلی)

موضوع کی جامعیت اور وسعت کو اپنی صفائی کے بطور پیش کر رہا ہوں۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا آسان کام نہیں اور میرے لیے تو ناممکن ہے۔ اس اہم اور مشکل موضوع پر تقریر کرنے کی دعوت مجھے دی گئی۔ اس کی باز پرس آپ ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ سے کر سکتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس انتخاب کا بڑا محرک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میرا تعلق ہے۔ سر سید کے حُسنِ نیت اور دور اندیش بصیرت کی بدولت، جہاں تک ہندی مسلمانوں کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کا تعلق ہے، اس ادارے کو ابھی تک مرکزی حیثیت دی جاتی ہے۔ دوسری بات جو سمجھ میں آتی ہے اسی کا شاخسانہ ہے۔ سر سید نے ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ فکر اور اطوار و اخلاق کی اصلاح کے لیے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس رسالے کا احیاء اس سال کے اوایل میں ہوا۔ میں اس رسالے سے، جو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے غرض رکھتا ہے، متعلق ہوں۔ اور میں نے ان رسائل سے اثر لیا ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی استحقاق اس موضوع پر گفتگو کرنے کا نہیں ہے۔ میں نے اس موضوع پر کتابوں کی ورق گردانی بھی کی، لیکن مسلمانان ہند کے تعلیمی، سماجی اور تہذیبی مسائل پر کوئی ایسا تجزیہ نظر سے نہیں گزرا جو اعداد و شمار پر مبنی ہو۔ اس موضوع پر جو کچھ مواد موجود ہے وہ بیشتر تاثراتی ہے اور یہی انداز مجھے اختیار کرنا پڑ رہا ہے۔

آغازِ داستان میں دو باتیں عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا ایک تو یہ کہ ہماری مردم شماری کا پھیلاؤ فرقہ وارانہ اعداد و شمار فراہم نہیں کرتا۔ لہٰذا بڑی ضرورت سامپل سروے کے طریق کو اختیار کرنے کی ہے۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق احمد رشید صاحب شیروانی نے سالہا سال کی کاوش کے بعد کچھ اطلاعات حاصل اور جمع کی ہیں ان کا تعلق مسلم اسکولوں اور کالجوں سے ہے۔ ان سے کچھ امید افزا نتائج بھی نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکیم عبدالحمید صاحب نے ہندوستان بھر کے مسلم تعلیمی اداروں کا ایک سروے شروع کرایا ہے، جس کے کچھ نتائج منظرِ عام پر آ چکے ہیں، بیشتر باقی ہیں۔

دوسری بات جسے کہہ کر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں یہ ہے کہ ہندوستان کے مسایل کو ہم ہندوستان کے سارے باشندوں کے مسایل سے بالکل الگ نہیں کر سکتے۔ اوّل الذکر کو آخر الذکر کے فریم میں رکھ کر ہی دیکھنا ہوگا۔ یہ مسایل خواہ ثقافتی ہوں، خواہ تعلیمی، خواہ اقتصادی۔ ایک حد تک اہلِ ہند کے لیے مشترک ہیں۔

ایک تیسری بات اور قابلِ لحاظ ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی اور سماجی صورتِ حالات تمام ملک میں یکساں نہیں، مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔ شہر اور دیہات، شمال اور جنوب، مغرب اور مشرق میں بڑا فرق نظر آئے گا۔ ابھی تک ہم ان مسائل کو شہر کے آئینے میں دیکھتے چلے آئے ہیں۔ حالاں کہ تقریباً ،، فیصد ہندوستانی مسلمان گاؤں میں رہتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت کا کوئی جائزہ اور ان کی ترقی کا کوئی منصوبہ اس اکثریت کا احاطہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ آبادی کا یہ جزوِ غالب یقیناً درخورِ اعتناء ہے۔ علاوہ بریں ہم نے اکثر مسلمانوں کے مسائل کو یو۔پی کے مسلمانوں کے مسائل کے مساوی سمجھا ہے۔ وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو گیا جب ہندوستان سے مراد تھی شمالی ہندوستان۔ اب ملک کے دوسرے حصے اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے اگر ان کے کسی طبقے میں مسائلِ حاضرہ سے عہدہ برآ ہونے کی تھوڑی بہت صلاحیت نظر آتی ہے تو وہ جنوب کے مسلمان ہیں، شمال کے ہرگز نہیں۔ مسلمانانِ ہند کی قیادت جنوب کو منتقل ہو جانی چاہیے۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جو ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کی ذمہ دار اور ایک مدت تک سیاسی اتحاد و اقتدار کی بانی تھی، ایک عرصہ

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

سوا اس کے کہ سرسید نے جو ابتدائے اخیر دم تک سکریٹری
رہے اپنے فرائض کا پورا پورا حق ادا کیا اور انھیں کی توجہ اور
کوشش سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس برابر گیارہ برس
تک ترقیِ روزافزوں کے ساتھ ہوتے رہے، اس کی تجویزوں پر
بہت کم عمل درآمد ہوا۔ جہاں کانفرنس کا جلسہ ختم ہوا پھر سال
بھر تک کسی کو اس کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی

ہوا دم توڑ چکی۔ اس کے برعکس کیرالا میں جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل
سوسائٹی ہے وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑھتے ہوئے تعلیمی نظام کا مرکز اور منبع بن
گئی۔ اس کے علاوہ کیرالا کی مسلم سروس سوسائٹی نے بھی تعلیمی کام
بڑے پیمانے پر شروع کر دیا۔ یہی حال کرناٹکا کی الامین سوسائٹی
تامل ناڈو کی S.I.E.T اور سیتا کتھی ٹرسٹ اور آندھرا پردیش
کی متعدد انجمنوں کا ہے۔ کلام کا ماحصل امر یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں
میں جذبۂ اصلاح اور تعلیمی و ثقافتی پیش رفت کا تعلق ہے۔ مرکز ثقل اب
شمال سے ہٹ کر جنوب پہنچ گیا۔ یہ کہنے سے مدعا تاہم یہ نہیں کہ وہاں جو کام ہو رہا
ہے وہ کسی اعتبار سے بھی کافی ہے۔ یا دوسرے فرقوں کے کارناموں کے
آگے ذرا دیر بھی ٹھہر سکتا ہے۔

ایک آخری بات اعتذار کے طور پر اس گفتگو کے دوران میں مسائل
کا ذکر کرتے کرتے نقطۂ نگاہ اور نفسیاتی کیفیت اور صلاحیتوں اور میلانات
کی بات کرنے لگوں گا۔ یہ طریقہ نہ مربوط ہے نہ محمود لیکن میں جو کچھ کہنا
چاہتا ہوں اس کے لیے شاید غیر موزوں نہیں۔ مسائل کے ساتھ ساتھ کہیں
کہیں ان کے حل کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔

یہاں یہ دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ مسلمان ایک صدی کے اندر
معلوم دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے تھے۔ وہ جہاں
گئے علم کا چراغ لے کر گئے۔ چار سو سال تک نوعِ انسانی کے علمی اور تہذیبی
کارناموں کی داستان ان کے ذہن رسا اور دلِ زندہ کے ساتھ جڑی
رہی۔ علم اور سائنس کے سارے اکتسابات اور انکشافات ان ہی کے
مرہونِ منت رہے۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک مذہب نے عبادات سے
زیادہ زور مشاہدے، غور و فکر اور تحصیلِ علم پر دیا۔ نتائج نے ایک عالم
کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ چار صدیاں گزرنے کے بعد ۸۰۰ تا ۱۱۰۰

عیسوی] انحطاط کا سلسلہ شروع ہو گیا جس پر مہر پندرھویں صدی
کے اواخر میں لگ گئی۔ اختراع کی جگہ اقتدا، ایجاد کی جگہ تقلید نے لے لی
اور یہ سلسلہ زور پکڑتا چلا گیا۔ چنانچہ جو لوگ علم و تہذیب کے قافلہ سالار
تھے، جہالت اور قدامت کے اجارہ دار بن بیٹھے۔ اقتدار اور اقبال کے
دور میں یہ عنوان ڈھکا چھپا رہا۔ لیکن جب حکومت اور اختیار ہاتھوں
سے نکل گئے تو زوال طشت از بام ہو گیا اور اس کی رفتار تیز تر ہوتی
چلی گئی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا زوال اٹھارویں صدی کی ابتدا
سے شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں کے تسلط کے بعد
ہندوستانی مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ زندگی سے عہدہ برآ ہونے اور
مصائب و مراحل سے نبرد آزما ہونے کا ولولہ باقی نہ رہا۔ ایک چراغ
تھا جو گل ہو گیا۔ ایک آگ تھی جو سرد ہو گئی۔ انیسویں صدی کے آخری ربع
میں سید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو جہالت اور
مایوسی کے شکنجے سے چھڑایا اور ان میں جینے کی لگن پیدا کی۔ انھیں زمانے
سے ہم آہنگ اور ہم قدم ہونے کے آداب سکھائے۔ تعمیر کے عادیوں کو تعمیر
کا سبق دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا جو بدقسمتی سے ادھورا
رہ گیا، سید احمد خاں اور اُن کی تحریک کے سر ہے۔ لیکن قدامت پرستی
اور جہالت اور جمود نے اس تحریک کو زیادہ آگے بڑھنے نہ دیا۔ اور
۱۸۵۷ء کے زبردست جھٹکے پر ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستانی
مسلمانوں کو ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد ایک اور جھٹکا لگا۔ ملک دو
ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی پاکستان کے
حصے میں آئی یا وہاں چلی گئی۔ جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے، انھیں
ایک عرصے تک شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ بہت دنوں تک مسلمان بٹوارے
کے زخم چاٹتے رہے۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک مدت تک ہراس
چھائی رہی۔ وہ ایک بار پھر اپنے خول میں چلے گئے۔ انھیں کچھ ایسا محسوس
ہوا کہ وہ آزاد ہوتے ہی اسیر ہو گئے ہیں۔ پہلے بدیسیوں کے محکوم ہوئے
تھے اب اپنوں کے۔ یہ احساس رفتہ رفتہ زائل ہوا۔ لیکن وہ اعتماد جو مجروح
ہو گیا تھا ابھی تک پوری طرح بحال نہ ہو پایا۔ فرقہ وارانہ فسادات اس کی
بازیابی میں سدِ راہ ہوتے رہے۔ افسوس ہے کہ ان کا سلسلہ ابھی تک ختم
نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں یہ احساس عام طور پر پایا جاتا ہے کہ جہاں وہ یکجا
اور یکسو ہوئے سراسیمگی اور انتشار کے سامان فراہم کر دیے گئے۔ یہ
احساس بالکل حق بجانب نہ سہی حقیقت سے قطعاً بے تعلق بھی نہیں ہے۔
فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق جو کمیشن حکومت کی جانب سے بٹھائے گئے
اُن میں کمی ایک نے ان فسادات کے پیچھے سازش کا ہاتھ دیکھا ہے۔ یہ احساس

ٹ ساؤتھ انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ (جنوبی ہند کا تعلیمی ٹرسٹ)

بھی نہ محدود ہے نہ بے بنیاد کہ کبھی کبھی ان میں پولیس اور پی۔اے۔سی کا رخ مسلمانوں کے خلاف معاندانہ ہوجاتا ہے۔ فرقہ دارانہ بلووں نے ہندوستانی مسلمانوں کو نہ صرف دلجمی سے محروم کیاہے بلکہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب میں شیر و شکر ہونے سے بھی روکا ہے۔ وہ ہندوستان پر اپنا اتنا حق نہیں سمجھتے جتنا کہ وہ دراصل ہے اور جتنا کسی طبقے کے بلوغ، ترقی اور فروغ کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان کے منصوبہ بند وکاس میں وہ شریک نہیں ہو پاتے نہ اس سے کما حقہٗ بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ تعلیم، تمنّا اور ترقی کی کرنیں ان کے پہلو کو مستنیر نہیں کر پاتیں۔ بد دل ہو کر وہ علم سے جی چرانے لگتے اور محنت سے دامن بچانے لگے ہیں۔ طبیعت کی گلہ مندی، محرومی کا احساس، مظلومی کا انتشار، یہ سب نقطۂ نگاہ کی صحت اور ارادہ کی صلابت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ ایسی صورت میں افتادِ طبع مریضانہ ہوجاتی ہے۔ اختیارِ عمل کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے، عناں جذبات کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ بھلے برے کو پرکھنا دشوار ہوجاتا ہے۔ اور اپنے مسایل اور مشکلات کو کھلے دل سے سامنے رکھنا دشوار تر۔ اپنے گوشے میں بیٹھ کر سلگتے رہیے، دھواں حصّے میں آ جائے گا۔ لیکن نہ حرارت ہاتھ آئے گی نہ روشنی۔ محرومی کے فشار کو پدرم سلطان بود کے خیالِ دامن گیر نے اور بڑھا دیا ہے۔ اسی تباہ کن خیال نے انھیں گھمنڈ اور اسراف کے گرداب میں ڈال دیا اور محنت اور پامردی اور قدامیت سے محروم کر دیا۔

علیحدگی اور بے چینی اور بے اطمینانی کی آنچ کو بے روزگاری نے ہوا دی ہے۔ شمالی ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ایک معتد بہ حصّے نے زمینداری پر تکیہ کیا تھا یا نوکری کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔ زمینداری ختم ہوگئی، نوکری ملتی نہیں۔ اب کریں تو کیا کریں؟ چوں کہ بازار گرم رہا تھا، اس لیے کساد بازاری اور کھٹکتی ہے۔ پہلے ملازمت میں رعایت برتی جاتی تھی اب کئی سطحوں پر مراعات کے برعکس کچھ ہوتا ہے۔ پھر مقابلہ مشکل۔ اکثریت نے جدید تعلیم کا آغاز مسلمانوں سے پہلے کیا تھا۔ وہ اس دوڑ میں ان سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ خوشحالی اس کی ہمرکاب ہے۔ اس کے بچّے علمی ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اور پڑھے لکھے والدین کے زیرِ سایہ اور زیرِ ہدایت جلا یافتہ ذہن اور پُرحوصلہ دل کے ساتھ تعلیم کے مراحل طے کرتے ہیں۔ وہ تعداد میں بھی کم گنے ہیں۔ لہٰذا اُن کے مقابلے میں پست شکستہ، افلاس زدہ اور بیزار مسلمان شاذ و نادر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک ناکامی مزید ناکامیوں کو جنم دیتی ہے۔ مسلمان جب مسلمانوں کو سرکاری دفاتر اور محکموں میں نہیں پاتے تو اُن کا دِل اور کھٹّا ہوجاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی حکومت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں۔ محرومی کا احساس اور علیحدگی کا رجحان

اپنی مدد آپ

بڑا سچا اور نہایت مضبوط مسئلہ جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی مدد آپ کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لائیں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جائیں گے۔ اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔

اس طرح اور بڑھ جاتا ہے۔ بڑی صنعت اور بڑی تجارت میں بھی ان کا کوئی معقول حصّہ نہیں۔ جب تک حکومت کے محکموں میں حکومت کی پالیسی کے باوجود ان کی شرکت برائے نام ہے تو پبلک سیکٹر یا منظّم پرائیوٹ سیکٹر میں انھیں کون نوکری دے گا۔ وہاں اکثر عزیزوں یا ہم ذاتوں یا ہم مذہبوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں سوال اُٹھتا ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمان روزی کمانے کے محدود مواقع کے لیے اکثریت سے مقابلہ نہیں کر سکتے تو کیا انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا ملک کے اور خود ان کے حق میں اچھا ہوگا۔ ہندوستان خود بحیثیت ایک ترقی پذیر ملک کے ترقی یافتہ ممالک سے مطالبہ کرتا رہا ہے کہ وہ ترقی کی راہ میں اس کی اور دیگر ترقی پذیر ملکوں کی مدد کریں۔ کیا خود ہندوستان کی اتنی بڑی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی حکومت سے اور اپنے ملک کی اکثریت سے یہ مطالبہ کرے کہ اس کو سہارا دے کر آگے بڑھائے، بعض سطحوں پر اس کے لیے ملازمتوں کا تحفظ کرے اور اسے ملک کی ہمہ جہت ترقی میں شریک ہونے کا موقع بھی آنا چاہیے۔ ایک سیکولر، جمہوری اور ارتقا پرداختہ ملک کو خود اس کا انتظام کرنا چاہیے کہ اس کا بڑا طبقہ پس ماندہ اور غیر مطمئن نہ رہے۔ کیوں کہ اگر وہ پسماندہ رہا تو ملک کی ترقی میں اس کا عناں گیر ہوگا۔ ترقی اور خوشحالی دونوں ناقابلِ تقسیم ہیں۔

یہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا ذکر تاریخی اور وطنی پس منظر میں کیا گیا تھا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی زبوں حالی کی ذمہ داری دوسروں پر ہے۔ شکوہ دراصل خود سے کرنا چاہیے

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم[۵۲]
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

---

۵۲ مجھے غیروں سے ہرگز کوئی شکایت نہیں کیوں کہ مجھ پر جو کچھ گزری ہے، اپنوں کی وجہ سے ہے۔

کرنے کا کام

اے ہندوستان کی بھلائی چاہنے والو! تم کسی سے توقع مت رکھو اور خود اپنے بھروسے اور آپس کے چندے سے اپنے ملک میں تمام علوم اعلیٰ درجے سے ادنیٰ درجے تک اپنی زبان میں پھیلاؤ۔ پھر تم شائستگی کے درجے کو پہنچ جاؤ گے، سرکاری نوکریاں تمہارے قدموں تلے ہوں گی حالانکہ پھر تمہیں ان کی پروا بھی نہ ہوگی، ترقی کی راہیں تم پر کھلی ہوں گی۔

— سرسید

اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف مسلمان والدین بالعموم توجہ نہیں دیتے۔ تعلیم کی فیس داخل کر دی اور مطمئن ہو بیٹھے۔ یہ ذکر ان کا ہے جو استطاعت رکھتے ہیں کثیر تعداد ایسی ہے جن کی مالی حیثیت انھیں اس کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ بچوں کو اسکول بھیج کر ان کی قبل از وقت کمائی سے گھر کو محروم کر دیں۔ یہاں پیٹ کاٹنا ہوگا۔ ورنہ اس بچے کا مستقبل، اس کی نشو ونما کیا جو مزدوری میں لگا دیا گیا۔ تعلیم اگر گھر گھر نہ پہنچی تو فلاح کے دروازے ہمیشہ بند رہیں گے۔ ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم تعلیم کو عام کر دیں۔ جہالت میں نہ دنیا کی فلاح ہے نہ دین کی۔ جو لوگ پڑھ لکھ گئے ہیں اگر انھوں نے علم دوسروں تک نہیں پہنچایا تو وہ بہ یک وقت بے حسی اور کفرانِ نعمت کا ارتکاب کریں گے۔ ہمارا بنیادی اور اہم ترین مسئلہ ہے تعلیم کی اشاعت۔ اسی سے دوسرے امراض کا مداوا ہوگا اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھلیں گی۔ مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دیکھتے ہیں تو دل میں یہ ہوک اٹھتی ہے کہ یا الٰہی مسلمانوں میں کوئی دوسرا رہنما سید احمد خاں کے قد و قامت اور بصیرت کا کیوں پیدا نہ ہوا۔ سیاسی رہنماؤں کی ہمارے یہاں کثرت رہی ہے لیکن سماجی رہنما اور رفاہ کار ناپید ہیں۔ تعلیم کی اشاعت بڑی خشک چیز ہے۔ اس میں نہ اقتدار نہ شہرت نہ زبان کا چٹخارہ۔ اس میں ریاضت درکار ہے، پِتّہ مارنا پڑتا ہے اور اس کے ہم عادی نہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ اسلاف کی مہم جوئی، خطر طلبی اور ریاضت اور ذوقِ علم کے ردِ عمل کے طور پر ہم نے تن آسانی اور عشرت کوشی، کاہلی اور جہالت کے اندھیرے میں بسیرا لیا ہے۔ ہم میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ کسی بڑے اور دیر طلب کام کو منصوبہ بنا کر انجام دے سکیں۔ دل لگا کر یکسوئی کے ساتھ کوئی کام کر سکیں۔ ہمارا طریق یہ ہے کہ سوتے سوتے بیدار ہوئے تھوڑی دور دوڑے پھر سو گئے۔ دیر تک دوڑنے کا ہم میں دم نہیں۔ جم کر محنت کرنے، لگاتار ریاضت کرنے کا ہمیں یارا نہیں۔

غزل ہمارے مزاج کی آئینہ دار ہے۔ بلکہ اس کی تشکیل میں بھی اس کا حصّہ ہے۔ خاکہ، منصوبہ یا نقشہ، پلاٹ ہم تیار نہیں کر سکتے۔ تسلسل ہم دیر تک قایم نہیں رکھ سکتے۔ نصاب میں سائنس اور ریاضی سے ہمارے بچے ایک مدت تک دامن بچاتے رہے کہ ان میں یکسوئی اور لگاتار محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اس رجحان میں کمی آ رہی ہے۔

مسلمانوں نے مختلف شہروں میں اسکول قایم کیے لیکن کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر، اور ان مستثنیات میں اب اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کا معیار اچھا نہیں۔ ان اسکولوں کی اصلاح کے علاوہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان بچے بڑی تعداد میں اچھے عام اسکولوں میں داخل ہوں جو افرادی اور آلاتی وسایل ان اسکولوں اور کالجوں کو حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ممتاز اور با اثر شہریوں کو اس کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیے۔ وہ عام اداروں کے سربراہوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ان سے اپیل کر سکتے ہیں۔

تعلیم ہی نہیں ترقی کی دوسری مدوں میں پلان کے تحت جو سرمایہ کاری ہوتی ہے، مسلمانوں نے کچھ تو لاعلمی، کچھ بے حسی اور کچھ کاہلی کی بدولت اس سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ آبادی میں تناسب کے بقدر فائدہ اٹھایا ہوتا تو کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے۔ عام اسکولوں کے نصاب میں بعض ایسے سبق داخل کر لیے گئے تھے جن سے مسلمانوں کی تصویر بگڑ کر سامنے آتی تھی۔ ایسا نفاق انگیز مواد نصاب کی کتابوں سے نکالا گیا ہے اور نکالا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک طرف سے نکالا گیا، دوسری طرف سے پھر داخل ہو گیا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہمارے خلاف غلط باتیں پھیلائی جائیں اور ہم خاموش رہیں یا یہ کہہ کر کہ "ہماری بلا سے"، دم سادھ لیں۔ ضرورت چوکس اور چوکنا رہنے کی ہے، ورنہ وہ دن دور نہیں جب اہلِ وطن کے علاوہ خود ہمارے بچے ہمیں حقارت سے دیکھنے لگیں گے۔ کاش کہ مرحوم ظفر احمد صدیقی صاحب کی طرح ہر ریاست میں ایک جری، حق پسند اور بیدار انسان پیدا ہو جائے جو اس فتنے کا سدِّ باب کر سکے۔ صریح الزام تراشی اور دشنام طرازی سے بھی زیادہ خطرناک زاویہ نگاہ اور افتادِ طبع ہے جو سطروں کے درمیان چھپی رہتی ہے، جس پر کوئی انگلی رکھ ہی نہیں سکتا۔ اس طرح کی اسلام دشمن کتابوں نے بھی مسلمان بچوں کو بعض اوقات عام تعلیمی اداروں سے دور رکھا ہے نگران اداروں

سے دور رہنا نہ مسلمانوں کے لیے اچھا ہے نہ ملک کے لیے۔ گھر کے علاوہ اسکول میں ہی بچے، اپنے گرد و پیش، اپنے ہمسایوں اور اپنے ہم وطنوں کے متعلق رائیں قائم کرتے ہیں۔ بڑی بدقسمتی ہوگی اگر کتابیں نقطۂ نظر کی صحت میں حایل ہوجائیں۔ یا ان کی وجہ سے محبت اور صلح و آشتی کے بجائے کدورت اور عداوت دلوں میں راہ پائے۔ جن لوگوں نے نفاق انگیز مواد نصاب میں داخل کیا وہ ملک کے دشمن ہیں۔ انھوں نے عداوت اور نفرت کا بیج بویا ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں امتیاز کے لیے عام تعلیم کی چوڑی اساس درکار ہے۔ زیادہ تعداد میں اگر بچے تعلیم کے حلقے میں داخل ہوجائیں تو ان میں ممتاز، لائق اور عہد آفریں لوگ بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ اگر اساس تنگ ہے تو معیار بلند نہ ہو پائے گا اور وہ باجبر رائے عامہ بن پائے گی جو ایک صالح اور ترقی پذیر سماج کو جنم دیتی ہے۔ اور جو ظلم اور ناانصافی کا راستہ روک سکتی ہے ہم کچھ تو جہالت اور کچھ نفاق کی وجہ سے رائے عامہ کے فیوض سے محروم ہیں۔ جب ہی تو برائیاں سینہ تانے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں اور اچھائیاں سر چھپائے ہوئے ہیں۔ نہ ہم اپنوں کی اصلاح کر سکتے ہیں نہ دوسروں کو انصاف پر مجبور کر سکتے ہیں۔ رائے عامہ تعلیم کی توسیع سے بنتی ہے۔

تعلیم کی ناہمواری نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ انھیں دو گروہ میں بانٹ دیا ہے۔ پہلا طبقہ تو وہ ہے جس نے مدارس میں دینی تعلیم حاصل کی ہے۔ دوسرے طبقے نے عام اسکولوں میں جدید علوم حاصل کیے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک خلیج حایل ہے۔ ایک نے دین کا دامن پکڑ لیا دوسرے نے دنیا سے ناتہ جوڑ لیا۔ ایک دوسرے سے بیگانہ، بے نیاز، بے خبر، نتیجے میں ملت دو نیم ہوگئی، اس کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ جماعت کے لیے دو نیم ہونا اتنا ہی مہلک ہے جتنا فرد کے لیے۔ شخصیت کی سالمیت اس طرح تباہ ہوجاتی ہے۔ شخصیت پراگندہ ہو تو نہ افعال میں توازن ہوگا، نہ حرکات میں ٹھہراؤ۔ نہ نیک و بد کا شعور، نہ گرد و پیش کا ادراک، نہ متحد ہوکر قدم اٹھانے کی صلاحیت۔ ہمارا اس وقت یہی حال ہے۔

دین کو ہم نہیں چھوڑ سکتے کہ اگر دین نہیں تو ہم کہاں؟ ہماری انفرادیت ختم، دنیاوی تعلیم سے ہم منہ نہیں موڑ سکتے کہ ترقی اور خوش حالی اور انسانی ذہن کی تسخیرات سے بہرہ یابی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ چارۂ کار صرف یہ ہے کہ ان دونوں تعلیمی دھاروں کو باہم قریب تر لایا جائے۔ دینی مدارس کا ڈھانچہ کس اس طرح کا ہو کہ ایک تو اس میں جدید تعلیم کو کچھ نہ کچھ شامل کیا جاسکے۔ دوسرے دینی تعلیم پائے ہوئے طلبا کے لیے جدید

حاتم کی سخاوت

زہد و ریاضت ایک بخیل نیکی ہے جو صرف اپنی ذات کے لیے کی جاتی ہے اور اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو ایک کوٹھری میں بیٹھ کر کھانا کھاوے اور صرف اپنا پیٹ بھرے لیکن عام فلاح چاہنے والا جو اس کام میں زہد و ریاضت کرتا ہے اس کی مثال حاتم کی سخاوت کی سی ہے جو ہزاروں آدمیوں کو کھانا کھلا کر کھاتا ہے۔

— سرسید

تعلیمی اداروں میں داخل ہونے کی راہیں کھلی رہیں۔ اسی طرح عام یا جدید اسکولوں کے طلبا کے لیے دین اور اردو زبان کی جز وقتی تعلیم کا انتظام محلہ محلہ، مسجد مسجد کیا جائے۔ کام بہت بڑا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے پیمانے پر شہر شہر بستی بستی کیا جاسکتا ہے۔ مذہبی مدارس کے درسی نظام میں تبدیلی کی طرف توجہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ مشیر الحق نے اپنی کتاب Islam in Secular India؎ میں دکھایا ہے کہ درس نظامی میں دیوبند نے جو تبدیلی کی وہ اس لحاظ سے زمانے کے تقاضوں کے برعکس تھی کہ نصاب کا دنیاوی اور عملی اور کاروباری عنصر نکال دیا گیا اور نصاب کو مبلغین اور علما کی ضروریات کے مطابق ڈھال دیا گیا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہندوستانی مسلمانوں کے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے ادارے کھولنے چاہییں۔ جنوبی ریاستوں نے اس بارے میں پہل کی ہے۔ شمالی ریاستوں کے مسلمان سبق لیں۔ دراصل ادارے کھولنے سے بھی زیادہ اہم ان کا ڈھنگ سے چلانا ہے۔

تعلیم کا اصل مقصد تہذیب نفس ہے۔ تعلیم سے انسان میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق و اطوار کی صفائی ہوتی ہے۔ وہ ماحول اور گرد و پیش سے باخبر ہوتا ہے۔ علاوہ بریں تعلیم کا رشتہ روزگار سے جڑا ہوا ہے۔ جو طالب علم ڈھنگ سے محنت کرتے ہیں ان پر کسب معاش کی راہ کھل جاتی ہے۔ سرکاری اور بہت سی غیر سرکاری ملازمتوں میں داخلے کے لیے مقابلے کے امتحانات اور انٹرویو ہوتے ہیں۔ اس کام کے لیے مرکز اور ریاستوں، ریلوے اور بنکوں وغیرہ نے کمیشن قائم کر رکھے ہیں۔ مسلمان جو تعلیم میں یوں ہی پیچھے ہیں اور سرکاری محکموں میں جن کی نمائندگی بہت کم ہے، ان کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ ملک میں ہونے والے بے شمار مقابلوں کے امتحانوں کے لیے رہبری کے تحت ان تھک محنت کے ساتھ تیاری کریں۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے

؎ سیکولر ہندوستان میں اسلام

پہلا قدم اٹھایا تھا۔ جنوبی ریاستوں میں کہیں کہیں یہ کام شروع ہوگیا ہے، لیکن یہ ساری کوششیں ضرورت کو دیکھتے ہوئے ابھی تک بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر۔

روزگار کا ذکر آگیا ہے تو اہلِ حرفہ کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ مسلمان اہلِ حرفہ ہنرمند ہیں۔ لیکن ان کے دستِ دولت آفریں کو تخلیقِ جمال کے لیے مزدوری اس طرح ملتی ہے جیسے اہلِ ثروت غریبوں کو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ انھیں وسائل، تعلیم اور سامان اور ان کے ہنر کو صیقل درکار ہے۔ ان کی شیرازہ بندی کرنا، انھیں مہاجن کے چنگل سے اور تقلید کے شکنجے سے نکالنا، ان کے لیے نئے ڈیزائن اور اچھا خام مواد اور بازار کے امکانات فراہم کرنا، ایک ٹھوس قدم اصلاح اور بیش رفت کا ہوگا۔

جہالت بہت سی سماجی برائیوں کو جنم دیتی ہے اور معاشرتی اصلاح میں سدِ راہ ہوتی ہے۔ جہالت اور انحطاط کے زیرِ اثر خوبیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی رسائی براہِ راست اور بلا واسطہ اپنے خالق تک ہے۔ روایت کے دور میں انسان کی خود اعتمادی اور عزتِ نفس نخوت اور انانیت میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ ہم لوگ انا و لا غیری کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہماری انا کو ذرا سی ٹھیس پہنچ جائے تو ہم بڑے سے بڑے مقصد، اہم سے اہم ادارے، قریبی سے قریبی دوست کو تباہ و برباد کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہی انا ہے جو ہمیں کسرِ نفسی سے روکتی ہے جو ہمیں ادارے چلانے اور مل کر کام کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔ ہم ساری اہمیت اپنی ذات کو دینے لگے ہیں۔ سماج کی بھلائی کی ہمیں مطلق پرواہ نہیں رہتی۔ اسی کارن ہمارا معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا۔ نہ برائیوں سے دامن جھاڑ سکتا ہے۔

حسد کی جہاں سوز کونپل بھی انانیت کی ٹہنی سے ہی پھوٹتی ہے۔ حاسد کسی دوسرے کو پنپتے نہیں دیکھ سکتا۔ پھلنے پھولنے والا اگر حاسد سے اگر رشتہ یا ہمسائیگی کی قرابت رکھتا ہے تو حسد کی لو اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ حاسد دوسروں کے درپئے آزار رہتا ہے اور خود کو بھی جلاتا ہے۔ حسد اتحاد کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں یہ بیماری بہ نسبت دوسری ہندوستانی قوموں کے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ہمارے سماج کو یہ روگ گھن کی طرح لگ گیا ہے۔ ہم ملک کی دوسری قوموں کو دیکھتے ہیں، کس طرح وہ اپنے عزیزوں اپنے محلے یا ذات برادری والوں یا اپنے ہم مذہبوں کو تعلیم و تربیت اور روزگار دلا دیتے ہیں اور مسلمان، وہ اقتدار پاتے ہی، اختیار کو پہنچتے ہی ارڈ کے آٹے کی طرح اینٹھنے لگتے ہیں۔ ان کے خاندان کا مفہوم اتنا ہی محدود اور حقیر ہوتا ہے جیسا اہلِ مغرب کا یعنی میاں بیوی اور بچے۔ یہ سب انفرادیت کا تاریک پہلو، حسد کا ثمرہ اور نا اتفاقی اور غیر ذمہ داری کا نتیجہ ہے۔

ایمان کی شکل بگڑی تو وہ غور و فکر کے لیے سمِ قاتل بن گیا۔ نشیب و فراز پر غور کرنا معیوب ٹھہرا، متروک ہوا۔ حکومت ہاتھوں سے گئی تو شکایت زبان پر آگئی۔ لیل و نہار اور ابنائے روزگار کا شکوہ عادت بن گیا۔ نبرد آزمائی اور جہانگیری کا یارا نہ رہا تو خانہ جنگی اختیار کرلی۔ قناعت اور توکل سے حوصلہ کی یاوری ہوتی تھی۔ استقامت کو پشتہ ملتا تھا اور ارادے میں بے خوفی آتی تھی۔ اب ان ہی نے قویٰ کو مفلوج اور عزم کو معطل کر دیا۔ بزرگانِ دین کے احترام نے قبروں کی پرستش کا روپ دھارا۔ صحت مند اور بیدار مغز اطاعت شعاری اندھی تقلید بن کر رہ گئی۔ سچ ہے بُرے دن آتے ہیں تو اچھائیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس نقلِ ہیئت کا باعث روایت کا عمل ہوتا ہے۔

اسلام صحرا نشینوں کے عزائم کے جلو میں دنیا میں پھیلا تھا۔ وہ صحرا نشیں جو سادہ مزاج، پُر حوصلہ، تازہ دم اور روئیں تن تھے۔ انھوں نے اسلام کو سادہ، پاکیزہ، بے میل، انقلاب آفریں پایا۔ اس دستورِ حیات، اس منشورِ عمل کو سینے سے لگایا اور اسے ساتھ لے کر چار دانگ عالم میں کلمۂ حق بلند کیا۔ ایران کے راستے سے جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو وہ تکلفات، توہمات، آسائش طلبی، خانہ نشینی، عیش کوشی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ رنگ یہاں گہرا ہوتا چلا گیا۔ مطلق العنان حکومت اور جاگیردارانہ نظام نے اور چمکا دیا۔ اخوت اور مساوات کے رشتے کمزور ہو گئے اور حریت نے غلامی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ قوموں میں داد و ستد کے طریقے بھی نرالے ہوتے ہیں۔ وہ باتیں بلا تامل اختیار کر لی جاتی ہیں جن میں آسائش یا کشش ہو۔ مسلمانوں نے یہاں کے دیرینہ باشندوں سے وہی باتیں سیکھیں جو طبیعتوں کو بھاتی تھیں، دیدہ زیب تھیں یا آسائش آفریں۔ لیکن ہندوؤں کی سادگی اور محنت اور فکر کی پرداز کی طرف توجہ نہ کی۔ گرم خون کو ٹھنڈا ہوتے ہوتے آہنی عزم کو کمزور ہوتے ہوتے وقت لگا اور جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اخلاقی انحطاط اور عیش کوشی کے دروازے کھل گئے۔ مسلم معاشرے کو گھن لگنا شروع ہوگیا۔ یہ سماج تن آسانی اور کاہلی، نکتہ چینی، حسد اور بدگوئی، لفاظی، خود غرضی اور بے عملی کی رسیوں میں جکڑ گیا۔ مذہبی اصلاح کی تحریکوں نے گراوٹ کو روکا، اعلیٰ انسانی اقدار کی اشاعت کی، مگر اس کا اثر دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا سماج ہنوز رو بہ زوال ہے۔ عام ہندوستانی سماج کو بھی روگ لگا ہوا ہے، لیکن مسلمانوں کا معاشرہ زیادہ سرعت کے ساتھ زوال کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ بے ایمانی دونوں جگہ مشترک ہے لیکن انفرادی خود غرضی اور ریاضت فراموشی میں مسلمان ہندوستان کی دوسری قوموں سے کہیں آگے ہیں۔ سماجی خدمت اور اجتماعی کوشش کی روایت مسلمانوں کے یہاں بہت ضعیف

ہو چکی ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ یہاں وصل کی فکر کسی کو نہیں سے
لوگ فصل کے نغمہ سرا ہیں
تن آسانی اور عیش کوشی کے زیر سایہ ذہنوں کو زنگ لگ گیا ہے
اور ان ہی کے زیرِ سایہ زندگی سے متعلق ایک سرسری طرز نگاہ مسلمانوں کا
طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ وہ محنت اور سادگی اور صفائی اور صبر و ضبط کو
دے چکے ہیں۔ صبح کو دن چڑھے اُٹھنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد سب سے
زیادہ ہے۔ ان کے گھر عام طور پر گندے رہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے گفتگو میں مبالغہ
اور غلو سے کام لیتے ہیں۔ وفا کرنے کے ارادے کے بغیر وعدے کرتے ہیں فضول
خرچی پر فخر کرتے ہیں' جہالت پر نادم نہیں ہوتے۔ باہم کج بحثی پر اصرار کرتے
ہیں۔ چھوٹے سے اختلاف پر آستین چڑھا لیتے ہیں۔ جھگڑنے کے لیے ہمہ وقت مستعد
رہتے ہیں۔ اوقات کی تضیع میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔ مذہب کو ذاتی اغراض
کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ باتوں کو کہیے تو رات دن کیے جائیں۔ کام کو کہیے
تو دامن بچا جائیں۔ نام خدا کا لیتے ہیں پوجا لکشمی کی کرتے ہیں۔ دولتوں کی
جھلک دیکھی اور فرائض منصبی کو چھوڑ چھاڑ اس کے تعاقب میں رواں ہو گئے
وعدہ اور وقت دونوں کی پابندی سے بے نیاز ہیں۔ سنجیدگی اور ذمہ
داری سے روگرداں ہیں۔ نفس مارنے کے بجائے ڈینگ مارتے ہیں۔
بیگانے ترقی کریں تو یہ مسرور و مطمئن' لیکن اپنے آگے نہ بڑھنے پائیں۔ ان
کی ٹانگ کھینچ کر گرا دیں گے۔ ان کی خدمت کے لیے کوئی سر پھرا نکل پڑے
تو طعن و تشنیع اور زبان درازی سے اس کے کلیجے کو چھلنی کر دیں گے۔

ان کے یہاں ایسے لوگوں کی بہت کمی ہے جو پڑھے لکھے اور
باخبر اور باشعور ہوں' اس پر مزید بدقسمتی کہ ایسے لوگ عوام سے اولین فرصت
میں ناتہ توڑ لیتے ہیں۔ یہ انوکھا **Brain Drain** (برین ڈرین)* ہے
جس سے ہندوستانی مسلمان دوچار ہیں۔ یہ لوگ ملک سے باہر نہیں جاتے بلکہ
ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسری اقلیم میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کو اپنے
بھائیوں کی خبر بھی نہیں آتی۔ یہ بے غیرت اور حمیت باختہ لوگ اس پر فخر
کرتے ہیں کہ ان کا نقطۂ نگاہ عام مسلمانوں سے بالاتر ہے۔ مسلمان عوام کو
یہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ گویا اگر ان کی طرف ملتفت ہوئے تو ان کے حب
وطن' ان کی قوم پرستی پر حرف آئے گا۔ یہ اُن نو دولتوں کی طرح ہیں جو
غریب باپ کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی اصلاح کے لیے بیسویں صدی
عیسوی میں اگر کسی نے قدم اُٹھایا ہے تو وہ مذہبی جماعتیں ہیں۔ سیاسی
جماعتوں سے اس کی امید عبث ہے۔ بہرحال ہندوستانی مسلمانوں کا شیرازہ
بکھرا ہوا ہے۔ ان کے زوال کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔ چوں کہ اہل حرفہ
اور مزارعین پہلے کی بہ نسبت خوش حال ہیں اور زر نقد سے بھی کشائش
ہو گئی ہے۔ اس لیے ہندوستانی مسلمان سمجھنے لگے ہیں کہ اُن کا حال اچھا ہے'
حالاں کہ حالت دگرگوں ہے۔ ہندوستان کی زندگی کے ہر شعبے میں ان کا حصّہ
کم ہوتا جا رہا ہے۔ کسی علمی جلسے کے لیے کوئی مقرر تلاش کیجیے تو نتیجہ ہمت شکن۔
حکومت کے شعبوں اور دفاتر میں مسلمانوں کو ڈھونڈھیے تو مشکل سے کوئی نام نظر
آئے گا۔ وکلا' اطبا' صنعت کاروں اور فن کاروں میں بھی ان میں سے
کم ایسے ہیں جو نشانِ امتیاز تک پہنچے ہوں۔ مفکروں اور صحافیوں اور
دانش وروں اور مصنفوں کی صف اول میں مسلمانوں میں سے آپ کسے ٹھہرایے
گا۔ یہ قحط یہ فقدان حکومت کی بے اعتنائی یا اغیار کی مخالفت کی وجہ سے نہیں
بلکہ خود ہماری غفلت' کوتاہی اور شامتِ اعمال کی بنا پر ہے۔ ایک جمہوری
اور سیکولر ملک میں ہم حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں ہمیں کرنا
چاہیے جستہ جستہ قلم برداشتہ اور ذہن کشادہ نہیں بلکہ متحد ہو کر پیوستہ متواتر
مسلسل۔ لیکن اپنی بربادی کا الزام ہم حکومت کو نہیں دے سکتے۔ یہ ہمارے اپنے
کرتوت ہیں جو صورتِ انحطاط بن کر سامنے آئے ہیں۔ ہماری قیادت پارہ
پارہ ہے۔ اس میں ملک گیر قیادت کا ذکر کیا۔ اب سوائے ایک استثنا کے کوئی
ایسا بھی نہیں جو ریاستی سطح کی قیادت پر پورا اترتا ہو۔ ہماری نمائندگی
کا جو لوگ دعوی کرتے ہیں وہ اپنی یا آقایان ولی نعمت کی نمائندگی کرتے ہیں اقلیت کی
صورتِ حالات میں یہ دشواری بھی ہوئی ہے کہ اس کی قیادت کو اُبھرنے کیلیے حالات
مساعد نہیں ملتے۔ اگر صاف صاف جرأت کے ساتھ ترجمانی کرے تو حکومت
کی نظر میں مشتبہ ہو جائے۔ اگر عقل سے مسائل کو پرکھے اور جذبات سے
اپیل نہ کرے' انتہا پسندی کے عوض میانہ روی' جوش کی جگہ ہوش سے
کام لے تو ملت اس کو شمار میں نہ لائے اور اسے سوءِ ظن کا ہدف بنا لے۔
اور قیادت نہ اُبھرے تو اصلاح اور ترقی کے منصوبے کون بنائے ان کو قوت
سے فعل تک کون پہنچائے۔ یہاں باخبر اور صحت مند رائے عامہ کی کمی شدت
سے محسوس ہوتی ہے۔

ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں صحت مند
قیادت کے ابھرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی قیادت جو متوازن اور معتدل ہو
نہ کاسہ لیس نہ انتہا پسند۔ مسلمانوں میں تعلیم کو عام کیے بغیر گاڑی آگے نہیں
بڑھے گی۔ تعلیم کے دونوں مکاتب کو ایک دوسرے سے قریب لانا ہو گا۔
ایک سے دوسرے کو استفادہ کرنا ہو گا۔ مسلمانوں کے اندر سماجی خدمت کی
روایات کو عدم سے وجود میں لانا چاہیے۔ حکومت پر لازم آتا ہے کہ مسلمانوں

---

* ارباب ذہن و شعور کی ہجرت یا کنارہ کشی

[illegible] بحال دلا دے۔ اس لیے انتظامیہ کی مضبوطی، پیرا ملٹری فورس اور پی۔ اے۔ سی میں مسلمانوں کی ضروری قدم (جس کا حکومت کئی بار اعلان کر چکی ہے) پولیس اور پیرا ملٹری فورس اور پی۔ اے۔ سی میں مسلمانوں کو معتدبہ تعداد میں داخل کرنا ہے آئین جہاں سدِ راہ نہ ہوگا کیوں کہ ایسا کرنا ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور ایک بڑی اقلیت کو اندیشہ اور بے اطمینانی اور خطرے سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ملازمتوں کی کئی سطحوں میں مسلمانوں کے لیے تحفظ اور اعلیٰ ملازمتوں میں مقابلے کے امتحانات کے لیے تیاری کے انتظامات بھی حکومت پر واجب ہیں۔ اگر یہ دو قدم اُٹھائے گئے تو مسلمانوں کے حوصلے اور اعتماد اور وطن عزیز سے ان کی وابستگی اور اس کی ترقی کے لیے ان کی مساعی میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

تہذیبی مسایل کا ذکر جستہ جستہ آچکا ہے۔ اس ضمن میں زبان اور ادب کی اہمیت کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اردو کے متعلق بھی ایک قسم کا جھوٹا سکون اہلِ زبان کے شامل حال ہے۔ اردو نوازی بظاہر جاری ہے اس کے بولنے اور اس کی قدر کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کے لکھنے اور پڑھنے والوں اور اس کے نکتہ سنجوں کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے اور بظاہر وہ دن دور نہیں جب اردو زبان کے منصب سے ہٹ کر ایک بولی رہ جائے گی۔ اردو کے سلسلہ میں بعض ریاستوں نے کچھ اعلانات اور اقدامات کیے ہیں۔ ہمیں ان کی پذیرائی کرنی چاہیے لیکن اردو کا مسئلہ جب تک حل نہیں ہوگا جب تک اس کا ناتہ روزگار سے نہیں جڑتا اور جب تک کچھ ریاستوں میں اسے لازمی زبان کا درجہ نہیں ملتا۔ لیکن حکومت کے گوشۂ خاطر سے کہیں زیادہ اہم خود اردو والوں کی کوششیں ہوں گی۔ اگر گھر گھر، محلے محلے اردو کو بیرونِ وقت پڑھانے کا انتظام نہ کیا گیا تو یہ غیر معمولی زبان اپنے متمول اور پُر وزن ادب کو آغوش میں لے کر ڈوب جائے گی۔ یہ زبان ہندوستان کی بے مثال مشترک تہذیب کی سب سے دل کش علامت ہے۔ اگر یہ ختم ہوگئی تو ہندوستانی تہذیب کے تمول اور وقار کو سخت جراحت پہنچے گی اور مسلمان تو اپنے آپ کو اور زیادہ تہی دامن محسوس کریں گے کہ یہ اُن کے مذہب، تہذیب اور تمدن کی ترجمان بھی ہے۔

زبان سے قطع نظر، ہندوستانی تہذیب کو مسلمانوں نے مالا مال کیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب ہی ہے جو ایک طرف مقامی اور دوسری طرف ایک عالمگیر تہذیب کے ارتباط کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی تہذیب کو ان دونوں ہی کا اعتراف کرنا اور ان سے طاقت اخذ کرنا چاہیے۔ حبِّ وطن برحق لیکن اس کا یہ مطلب یہ نہیں کہ اخلاقی اقدار آب و گل کی اسیر ہو جائیں۔

ایک مقامی تہذیب کا ایک عالمگیر تہذیب کے ساتھ ارتباط نہ صرف فنونِ لطیفہ بلکہ فکر و فلسفہ کے اشجار میں برگ و بار لاتا ہے۔ ہمیں انسان دوستی کا مسلک اختیار کرنا ہے۔ وطن سے والہانہ محبت نوعِ انسان سے محبت کا راستہ نہیں روک سکتی۔

پرانی تہذیبیں اور اخلاقی قدریں، سائنس اور ٹکنولوجی کے انقلابات اور خود غرضی و ہوس کے سیلاب کی زد میں ہیں۔ ان کو بچانے کے لیے ہمیں اپنی ملی جلی تہذیب کو توہمات اور الحاقات اور تعصبات سے پاک کرنا ہے تاکہ دونوں تہذیبوں کا جوہر یعنی اُن کی خدا پرستی اور انسان دوستی آلائشوں سے منزہ ہو کر نکھر کر سامنے آجائے۔ اخلاقی قدروں اور انسانیت کے تحفظ کی شکل صرف یہی ہے اگر ہم باہم کدورت لے کر بیٹھے رہے تو ہمارا آئینہ زمانے کے تقاضوں کے انعکاس میں ناکامیاب رہے گا

الغرض ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے طرزِ فکر اور زاویۂ نگاہ کو بدلنا ہوگا۔ انھیں کسبِ فخر کے لیے ماضی کے بجائے حال پر تکیہ کرنا ہوگا ہمیں اپنے وطن عزیز اور اہل وطن کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرنا ہوگا ہمیں ہندوستان کے سیکولر آئین، اس کی ترقی پسند، مساوات پرور اور ترقی آمادہ جمہوریت کے لیے ہم وطنوں میں امتیاز حاصل کرنا ہے۔ انسان دوستی، اسلام دوستی اور حبِ وطن میں باہم کوئی مغایرت نہیں۔ ہمارے مسلک کے اجزائے ترکیبی یہ تینوں ہونے چاہییں۔ رواداری، حلم اور دور اندیشی کو ہمیں اختیار کرنا ہوگا۔ تعصب، زود برہمی اور لمحاتی رد عمل اور خامکارانہ جوش و خروش سے پرہیز، ہم پر بالخصوص واجب ہے۔ تعلیم سے غفلت کا خمیازہ ہم ابھی تک اُٹھا رہے ہیں۔ ہمیں اس گناہ کبیرہ کو ترک، اور اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ اقتصادی زبوں حالی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں ایک ایسا نظام قایم کرنا ہے جو ذہین طلبہ کو پہچان سکے اور ان کے تعلیمی مصارف کی کفالت کر سکے۔ علاوہ بریں ٹیکنیکل اور پروفیشنل (تیکنکی، مشغلہ پیوست اور ہنر آموز) تعلیم کی طرف توجہ کو موڑنا ہوگا۔ سماجی معائب میں اسراف، حسد اور نفاق، توہمات، گھمنڈ اور عیش کوشی سے حذر کرنا ہوگا۔ جاگیردارانہ نظام کی باقیات صالحات سے ہمیں اپنے دامن دل کو چھڑانا پڑے گا۔ جمہوریت کے ہمارا رشتہ ناز و نیاز اور داد و ستد کا رشتہ ہونا چاہیے۔

میں نے اس مقالے میں ہندوستانی مسلمانوں پر بے دریغ تنقید کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صاف گوئی کا، کھری کھری سنانے کا وقت آگیا ہے۔ یہ سارے اعتراضات ہم سب پر عاید ہوتے ہیں۔ میں خود کو ان سے مستثنیٰ کرنے کا گمان بھی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کے دوسرے

ذاتوں میں بھی کمزوریاں ہیں۔ جن میں سے کئی ایک مسلمانوں کی کمزوریوں سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن میرا روئے سخن ان کی طرف نہیں ہے۔ میں اگر انھیں کچھ کہوں گا تو چھوٹتے ہی بدگمانی کا شکار ہو جاؤں گا اور پھر مجھے اپنوں سے کہاں فرصت کہ بے گانوں کے قدم لوں۔ میری نیت پہ شبہ کیا جائے گا۔ شکایت عداوت پر محمول ہوگی۔ نکتہ چینی کو دشمنی تصور کیا جائے گا۔ میں نے مسلمانوں کی خوبیاں بھی نہیں گنائیں کہ میرا مقصد برائیوں اور کمزوریوں کی طرف دھیان اور ان سے چھٹکارا دلانا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ پوری ملّت ان برائیوں میں شریک ہو یا برابر کی شریک ہو۔ ہم میں ایسے بھی لوگ ہیں جو ان برائیوں سے بری ہیں۔ لیکن بڑی تعداد میں گہرا رنگ ان ہی کا ہے جن کا نقشہ کھینچنے کی کوشش میں نے ابھی ابھی کی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب عورتوں کی زبوں حالی ہے۔ ہماری عورتیں بالکل گھٹی ہوئی رہتی ہیں۔ اِس پردے نے جسے مذہب سے کوئی سروکار نہیں، ان کی صحت کو گھایل کر دیا ہے۔ جسمانی اور ذہنی صحت کو۔ اسیرانہ کم ہمتی ان کی عناں گیر ہو گئی ہے۔ نہ وہ صحت اعتماد اور وسعتِ نظر کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی ہیں اور نہ نئی نسل کو سلیقے سے پروان چڑھا سکتی ہیں۔ جو خود کھو گیا ہو، دوسروں کی رہبری کیوں کر کرے گا۔ ہم نے اپنی آدھی آبادی کو مفلوج کر رکھا ہے اور اس کے باوجود فلاح اور ترقی کے خواہاں ہیں۔

مسلمانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی سے تعلق قائم نہیں کیا اور نہ ہی ان سے مفاہمت گوارا کی۔ ان کا نقطۂ نظر ہنوز رومانی اور غیر سائنسی ہے۔ جذبات پر مبنی۔ عقل سے نفور۔

اقلیتوں کی صورتِ حال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تین شرطوں کو پورا کیے بغیر کوئی اقلیت پنپ نہیں سکتی۔

۱۔ وہ اپنے مسلک، مذہب اور روایات پر سختی سے قایم رہے

۲۔ انتھک ریاضت کی بدولت خود کو اکثریت سے زیادہ لایق کارگزار اور بہتر ثابت کرے۔

۳۔ اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات کو شگفتہ رکھے۔

ان میں سے ایک شرط بھی اگر پوری نہ ہوئی تو خوش حالی اور ترقی حاصل کرنا محال ہوگا۔ بلکہ جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔ ہمیں اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھنا ہوگا کہ ہم کس شرط کو پورا کر پائے ہیں۔

شرم کی بات ہے کہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی لڑکیاں والدین پر بوجھ بننے لگی ہیں۔ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات نہ سہی، توقعات ہونے لگی ہیں اور جنوبی ہندوستان میں تو کتخدائی کی قیمت لڑکی والوں سے مانگنے لگے ہیں۔ ہندوؤں میں بہت سی دلھنیں جن کے والدین سسرال والوں کے لالچ کو پورا نہیں کر سکے، خود کو آگ میں جلا کر خاکستر ہو گئی ہیں۔ مسلمان ابھی یہاں تک تو نہیں پہنچے لیکن اس راہ میں ان کے قدم پڑنے لگے ہیں۔ شمالی ہند کے مسلمان کھل کے روپیہ ہنوز نہیں مانگتے لیکن زیرِ لب تو دستِ سوال دراز کرتے ہی ہیں۔ ہونے والے سمدھیانے کی عقل مندی کی تشفی اشارہ سے کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں کو تو یہ لعنت پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ ایک عنوان سے لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ مسلمانوں کے یہاں زیادہ سنگین ہے کیوں کہ ان میں تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار لڑکوں کی تعداد تعلیم یافتہ لڑکیوں کے تناسب سے دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ کسی شہر یا قصبے پر نظر ڈالیے بہت سے مسلمان گھروں میں ایسی لڑکیاں ملیں گی جو بن بیاہے بیٹھی ہوئی ہیں۔ ایسے بر جو اُن کے لیے موزوں ہوں، نہیں ملتے۔ معاشرہ عبوری دور میں ہے بچّوں کی شادیاں ابھی تک ماں باپ کرتے ہیں۔ لڑکیاں سنجیدگی اور محنت کے ساتھ پڑھتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں۔ ہمارے لڑکے اتنی محنت نہیں کر پاتے۔ اگرچہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ نہ کریں۔ علاوہ بریں وہ محنت بھی کریں تو کیا۔ گھر کا اور محلے کا ماحول تعلیمی پیش رفت میں سدِّ راہ ہوتا ہے۔ تعلیم پوری کرتے ہیں تو روزگار کے بیشتر دروازوں کو بند پاتے ہیں۔ وہ لڑکیاں جنھوں نے ماں باپ کے گھر اخلاق اور تہذیب کے لحاظ سے خاصی معیاری زندگی گزاری ہے۔ کس طرح نکھٹو اور نکمے اور ناقص العمل لڑکوں کے گلے باندھ دی جائیں۔ ہمارے نوجوانوں میں اگر وہ "شے" "جیتے نام سے جس کا" ذرا بھی باقی ہے تو انہیں مسلمان لڑکیوں اور ان کے ماں باپ کو اس تشویش اور پریشانی سے بچانا چاہیے، جو اچھے لڑکوں کے قحط نے پیدا کر دی ہے اس کا طریقہ صرف ایک ہے، باقاعدہ محنت۔ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں ملازمتیں ہیں، خواہ سرکاری، خواہ غیر سرکاری، اگر ہمارے نوجوانوں کی طرف سے یوں مطمئن ہو جائیں کہ وہ زیادہ دیانت دار اور محنتی اور کارگزار ہیں تو وہ انھیں لینے پر بالآخر مجبور ہو جائیں گے۔

مذکورہ صورتِ حال نے دو انوکھی مشکلات ہمارے لیے پیدا کر دی ہیں۔ چوں کہ ہمارے لڑکوں کو دفاتر میں ملازمتیں بہت کم ملتی ہیں اور پڑھ لکھ کر وہ اکثر مدتوں بے روزگار رہتے ہیں۔ اس لیے مسلمان والدین اپنے بچوں کو جدید تعلیم ذوق و شوق کے ساتھ نہیں دے پاتے۔ بنا بریں تعلیم کی توسیع کی رفتار ہمارے یہاں اطمینان بخش نہیں ہے اور وہ طبقہ جس کے ہاتھ میں ہنر ہے یا جو محنت کش ہے وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ پڑھ لکھ کر لڑکے کسی کام کے نہیں رہتے، اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے سے گریز

کرتا ہے کیا یہ بہتر نہیں کہ بچے اوائل عمر سے کمانے لگیں اور پڑھ جائیں تو پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ کمائیں؟ جتنی بار وہ طبقہ یہ سوال خود سے کرتا ہے جواب اثبات میں پاتا ہے۔ اس جواب کے آگے تعلیم کے فوائد پر تقریر سننے کے لیے کون تیار ہوگا۔ تعلیم کے سہارے پر روزگار صرف اس لیے اہم نہیں کہ وہ نہ ملا تو کھائیں گے کیا؟ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اگر ہمارے بچے تعلیم پاکر بڑی تعداد میں ملازمتوں سے محروم رہے تو پھر انھیں پڑھوانے کا شوق ان کے والدین میں کیوں کر پیدا ہوگا۔ لاکھ جتن کیجیے۔ اس چکر سے کیسے نکلے گا؟ تعلیم کا رواج گھر گھر نہ ہوگا تو دوسرے طبقوں سے ملازمتوں اور کاروبار کے لیے مقابلہ کیسے کیجیے گا؟ اور جب تک ملازمتیں نہیں ملتیں والدین کو اس بات کے لیے کیسے راضی کیجیے گا کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر بے مصرف اور بے روزگار بنا دیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے رُبع سے مسلمان والدین نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف قدرے توجہ کی۔ مستثنیات کو چھوڑ کر یہ توجہ اس بنا پر تھی کہ لڑکے چاہنے لگے تھے کہ بیوی پڑھی لکھی آئے۔ اب یہ عالم ہوگیا ہے کہ زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں کو اچھے برسرِ روزگار لڑکے نہیں ملتے۔ اگر حالت یہی رہی تو لڑکیوں کی پڑھائی کو پھر دھکّہ پہنچے گا۔ پہلے تعلیم کی کمی لڑکیوں کی شادی میں سدِّ راہ تھی اور اب، ایک حد تک، تعلیم کی زیادتی۔ کیوں کہ مسلمان لڑکیاں کیریر کی طرف بہت کم جاتی ہیں۔ غریب ماں باپ کا روپیہ صرف کرا کر پڑھ لکھ گئیں اور پڑھا لکھا برسرِ روزگار بر بھی نہیں ملا تو کیا حاصل ہوا؟ روایت انھیں نوکری کرنے کی اجازت نہیں دیتی، ورنہ ملازمت کے دروازے پر دستک دیتیں۔ قطع نظر اس سے کہ دروازہ کھلتا بھی ہے کہ نہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے حالات سے مجبور ہوکر خود کو گروہوں میں باندھ لیا ہے۔ اور ابنائے وطن بے نیازی سے انھیں دیکھ رہے ہیں کہ انھیں اپنی آگ میں جلنے دو۔ نہ مسلمانوں کو بے حسی اور بے عملی زیب دیتی ہے اور نہ ابنائے وطن کو بے نیازی اور بے تعلقی۔ مسلمانوں کے مسایل جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کچھ تو دوسرے اہل وطن کے ساتھ مشترک ہیں، کچھ ان کے مخصوص مسایل ہیں۔ لیکن ان کے مسایل چاہے مخصوص ہوں، چاہے مشترک، ہیں سارے ہندوستان کے مسائل۔ ان مسایل کو حل کرنے کے لیے ہندوستان کے سارے باشندوں کو مل کر جتن کرنے چاہییں کہ سب کی عافیت اور فلاح اسی میں ہے۔ ہندوستان کے جسم میں مسلمانوں کی حیثیت ہاتھ یا ٹانگ کی سی نہیں کہ ٹوٹ جائے یا کٹ جائے پھر بھی جسم اپنا کام کرتا رہے گا۔ ان کی حیثیت اعضائے رئیسہ میں سے ایک عضو کی ہے کہ اس کے خلل پذیر ہونے کے بعد جسم صحت مند نہیں رہ سکتا۔

مسلمانوں کی پس ماندگی کی بیشتر ذمہ داری خود مسلمانوں پر ہے لیکن باقی اہل وطن خصوصًا ہمارے ہندو بھائی اس ذمہ داری سے بالاتر نہیں۔ جمہوریت جو ذمہ داریاں عاید کرتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی کہ سب شہریوں کی خوشحالی اور بیش رفت کے لیے کوشش کی جائے کیوں کہ اگر کوئی ایک فرقہ یا طبقہ پس ماندہ رہتا ہے تو جمہوریت کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ اکثریت کے لیے تو یہ لازم ہے کہ اقلیتوں کو ترقی اور خوش حالی کی دوڑ میں اپنے ساتھ لے کر چلے۔ حکومت سے مطالبہ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے یہ ہر فرد اور ہر طبقے کا حق ہے۔ اقلیت کے مطالبات پر حکومت کو کان دھرنا چاہیے کہ جمہوری طرزِ حکومت کی آزمائش یہیں ہوتی ہے۔ لیکن حکومت کی توجہ سے کہیں زیادہ اہم اکثریت کا التفات اور اس کی ہمدردی ہے بغیر اس کے حکومت کے فرامین واحکام زیبِ قرطاس ہوکر رہ جاتے ہیں۔

اکثریت کو چاہیے کہ اپنے افراد میں ایک فضا، ایک رجحان، ایک نقطۂ نظر اقلیت کے ساتھ کشادہ دلی، ہمدردی اور اعانت کا پیدا کرے۔ یہ فرض اکثریت کا ہے اور اُسی کو اسے نبھانا ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اکثریت کے ساتھ خیر سگالی، خوش دلی اور شگفتگی کے روابط استوار کریں۔ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ مسلمان جذباتی ہیں۔ جوش کی رَو میں بہہ جاتے ہیں اور جوش میں ان کے اکثر رہنما، ان کے دیرپا مفاد کو بھول جاتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ایسا موڑ آگیا ہے جہاں انھیں صورتِ حالات پر ٹھنڈے دِل سے غور کرنا اور بدلے ہوئے حالات سے خود کو ہم آہنگ کرنا چاہیے۔ نئی دنیا اور اس دنیا میں اپنی نئی حیثیت کے مضمرات اور عواقب کو سمجھنا اور اپنے رویے اور زاویۂ نگاہ اور اندازِ مزاج کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا بہت ضروری ہے۔ ماضی کے طواف، تن آسانی، خوش خرامی، انتہا پسندی، جذبات پرستی اور انا کو چھوڑ کر مستقبل کی تشکیل، جفاکشی، میانہ روی، عقلیت پسندی کو شعار بنالینا چاہیے۔ جہالت کی جگہ علم، طغیانی کی جگہ حلم، انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کو دینی ہوگی۔ مل کر کام کرنے، ایک دوسرے پر اعتبار کرنے، ڈھنگ سے ادارے چلانے، اور انسانیت کی خدمت پر خود کو آمادہ کرنے میں ہی بقا ہے۔ یہ دور سخت مقابلے اور اجتماعی کوشش کا دور ہے۔ جو قومیں قدم ملا کر اور سر جوڑ کر چلتی ہیں، وہی آگے بڑھتی ہیں۔ ترقی کے لیے کوئی چھوٹا راستہ آج تک نہیں نکلا۔ عیش کوشی کو انحطاط سے کوئی جدا نہ کرسکا۔ نفاق سے زوال کا ناتہ نہ ٹوٹا ہے، نہ ٹوٹے گا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اگر عزت کے ساتھ رہنا ہے تو تحصیلِ علم، اتحاد اور انتھک کوشش کے بغیر کام نہ چلے گا۔

سید حامد

حسرت ۔ جنگِ آزادی کا ایک جانباز سپاہی

احمد آباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی، ابو الکلام نظر بند تھے۔ باقی حضرات شریک تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں میں بھی تھا۔ اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیام گاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا۔ حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے۔ گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے، بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا کہ جلدی چلئے، کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیشن پیش کر دیا ہے اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں کوئی غیبی گولہ آکر پڑا ہے۔ گاندھی جی گھبرائے ہوئے جلسے سے اٹھ کر سبجکٹ کمیٹی کی طرف روانہ ہو گئے مگر حسرت ـــ

بہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

حسرت بدستور اپنی بات پر جمے رہے اور نوٹس دیا کہ وہ اسے کھلے اجلاس میں پیش کریں گے۔ چنانچہ وہ وقت آیا جب کھلے اجلاس میں حسرت نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کی اور آنکھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے مجمع میں ایک آواز بھی اس کی تائید میں نہ اٹھی۔

ـــــ مولانا سید سلیمان ندوی

اس مہینے ہمارے ملک کو آزاد ہوئے سینتیس برس ہو جائیں گے سینتیس برس کی مدت کسی قوم کی تاریخ میں ایک پل سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس مختصر مدت میں ہم نے جنگ آزادی کے ایسے بہت سے جانباز سپاہیوں کو بھلا دیا جنھوں نے ملک کو غلامی کے پنجے سے چھڑانے کے لیے ہر طرح کی سختیاں جھیلیں اور اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔ ان سرفروشوں میں ایک نام حسرت موہانی کا بھی ہے۔ حسرت کا شمار ان جیالے مسلمانوں میں ہے جنھوں نے محاذِ جنگ پر دوگنے زخم کھائے کچھ غیروں کے ہاتھ سے، کچھ اپنوں کے ہاتھ سے۔

اسی علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے کہ تحریک آزادی سے وابستہ ہو گئے۔ اس جرم میں تین بار کالج سے نکالے گئے، کئی بار قیدِ بامشقت کی سزا بھگتی اور ایک ایک دن میں من من بھر آٹا پیسا، تحریک کی حمایت میں ایک رسالہ اردوے معلیٰ جاری کیا تھا، بیباکی اور صاف گوئی کی پاداش میں اسے بند کرنا پڑا، پریس اور کتاب خانہ ضبط ہوا، مضامین کے مسودات ان کی آنکھوں کے آگے نذرِ آتش کیے گئے۔ کالج کے حدود میں داخلہ ممنوع ہو گیا تو شہر میں کرایے کا مکان لے لیا اور سودیشی تحریک کو فروغ دینے کے لیے ایک سودیشی اسٹور کھول لیا جس کا کالج کے اسٹاف اور طلبا کی طرف سے بائیکاٹ کیا گیا۔ جیل گئے تو گزر اوقات کے لیے پردہ نشین بیوی نے دکان پر بیٹھ کے کپڑا بیچا اور کسی ہمدرد نے مالی مدد کرنی چاہی تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ حسرت صاحب نے کسی کا سہارا لینا گوارا نہیں کیا تو میں یہ مدد کیسے قبول کر لوں۔ جیل ہی میں تھے کہ بیٹا بیمار پڑا، حالت بگڑی اور دنیا سے رخصت بھی ہو گیا مگر حکام نے باپ کو مطلع کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ بہت دن بعد جب اس جانکاہ حادثے کی اطلاع ملی تو حسرت صرف آہ بھر کے رہ گئے، حرفِ شکایت تک زبان پر نہ لائے۔

تحریک آزادی کا درخت برگ و بار لایا تو اس کی فصل کا لوگوں میں بٹوارا ہوا کسی کے حصے میں دھن دولت آئی کسی نے شہرت پائی، کسی کو صرف عزت ملی۔ مگر حسرت کو کچھ بھی تو نہ ملا۔ وہ کسی صلہ و ستائش کے طلبگار بھی نہ تھے۔ انھیں انعام ملا تو یہ کہ ان کے اپنوں نے کہا بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں، فہم و فراست سے محروم ہیں، سیاسی شعور سے بے بہرہ ہیں؛ انھوں نے خود تو کچھ بھی نہ

حسرت صاحب ہم کو ایسے پانی میں لے جانا چاہتے ہیں جس کی گہرائی
کا ہم کو اندازہ نہیں ——— مہاتما گاندھی

پایا، نہ یگانوں سے نہ بیگانوں سے مگر یہ حسرت ہی تو تھے جو ہمیں سرافرازی کی یہ لازوال دولت عطا کر گئے کہ ہم ہمیشہ سر اٹھا کے کہہ سکیں گے کہ جب ملک کے بڑے بڑے سورما آزادیِ کامل کا نام لیتے گھبراتے تھے تو ایک مردِ مسلماں، اردو کا ایک شاعر و ادیب، اس درسگاہ کا ایک فرزند ایسا تھا جس نے ہزار مخالفت کے باوجود ہزاروں کے مجمع میں فوری اور مکمل آزادی کی تجویز پیش کی۔ یہ اور بات کہ کوئی جوانمرد اس کی آواز میں آواز نہ ملا سکا۔

علما و مفکرین کی یہ رائے تہذیب الاخلاق کے پچھلے شمارے میں آپ کی نظر سے گزر چکی ہے کہ عظیم ہستیوں کے حالاتِ زندگی آنے والی نسلوں کے لیے رہنما مینار کا کام دیتے ہیں۔ ایک انگریزی شاعر نے کہا ہے کہ ـــ

عظیم انسانوں کی زندگی سے سبق ملتا ہے
کہ ہم بھی اپنی زندگی کو عظیم بنا سکتے ہیں
ایسا عظیم کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے
وقت کے ریگ زار پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جائیں

یہی نہیں بلکہ ان کی غلطیاں بھی آنے والوں کو جتاتی رہتی ہیں کہ خبردار تم ان کا اعادہ نہ کرنا۔ اس نقطۂ نظر سے بھی حسرت کی زندگی کا مطالعہ کچھ کم سودمند نہیں۔ ان کی شخصیت میں آپ بے شمار ایسی خوبیاں پائیں گے جنھیں اپنانے کی آرزو ہر دل میں پیدا ہو اور عبرت کا سامان بھی یہاں اور جگہوں سے کم نہیں ملے گا۔

حسرت کی شخصیت کے جس پہلو پر سب سے پہلے نظر جاتی ہے اور جم کے رہ جاتی ہے وہ ان کا فقر و استغنا ہے ساری زندگی ان کا ہاتھ تنگ رہا۔ ایسوں کے دل میں دولت کی حرص کچھ زیادہ ہی گھر کر لیتی ہے مگر حسرت کا معاملہ برعکس تھا۔ کبھی دولت کی دیوی ان پر مہربان ہوئی بھی تو مولانا فوراً گھبرا کے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ مہاتما گاندھی نے ایک بار پنڈت نہرو سے سوال کیا تھا کہ ـــ

" جواہر لال یہ بتاؤ کہ دیش آزاد ہوا اور تم پردھان منتری بنائے گئے تو کیا تنخواہ لوگے؟"

"سو روپے ماہوار" انھوں نے ازرہِ انکسار جواب دیا۔

اس پر مہاتما چیخ پڑے: جواہر لال، تم اس ننگے بھوکے دیش سے سو روپے تنخواہ لوگے، سو روپے! جب دیش آزاد ہوا تو حسرت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ پارلیمنٹ کے ممبر خود اپنی سرکار سے اتنی بڑی بڑی رقمیں سفر خرچ کے طور پر کیوں وصول کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک مشاعرے کے منتظمین سے یہ کہہ کر سفر خرچ تک لینے سے انکار کر دیا تھا کہ میں گرفتاری کے ڈر سے بلا ٹکٹ انجن میں بیٹھ کر آیا ہوں کرایہ کیسے لے لوں۔ ایک بار پی ایچ ڈی کا زبانی امتحان لینے علی گڑھ آئے۔ رشید صاحب نے دستخط کے لیے ٹی۔ اے۔ بل پیش کیا۔ میزان پر نظر پڑی تو دیر تک کہتے رہے کہ اتنے بہت سے روپوں کا کام کریں گے کیا؟ پھر تفصیل پر نظر پڑی تو چونکے۔ بولے ہم تو تھرڈ کلاس میں آئے ہیں فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسے لے لیں، پھر ارشاد ہوا ہم تو آپ کے گھر ٹھہرے ہیں یہ قیام و طعام کا خرچ کیا معنی؟ پھر کچھ اور خیال آیا بولے ہم تو دہلی جا رہے تھے، راستے میں ذرا دیر کو یہاں اتر گئے، ہم تو کچھ لے ہی نہیں سکتے۔

جو شخص درویشانہ زندگی بسر کرتا ہو اسے روپے پیسے کی ضرورت بھی کیا۔ ایک دوست کو کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کا وقت آیا تو مہمان عزیز کے لیے ڈیوڑھی میں چٹائی بچھادی۔ پھر اندر سے ایک رکابی میں چنے کی دال کا سالن اور طباق میں روٹیاں لے آئے۔ اسے محبت سے بٹھایا اور میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ لباس کی طرف سے وہ ہمیشہ لاپرواہ رہے۔ بیگم نے جو کپڑے دیدیے انھوں نے بلا تامل پہن لیے۔ وہ ان کے کپڑے خود ہی سیتی تھیں خود ہی دھوتی تھیں۔ مولانا کو افسوس تھا کہ شیروانی درزی سے سلوانی پڑتی ہے۔ بیگم سے ذکر کیا تو انھوں نے کسی درزی سے شیروانی کی تراش سیکھ لی اور درزی کا قصہ ہی پاک ہو گیا۔ جب کالج کے اساتذہ اور طلبا نے حسرت کے سودیشی سٹور کا بائیکاٹ کر دیا تو وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ بولے ہمارا خرچ ہی کتنا ہے جو فکرمند ہوں۔ ملازم رکھنے کی تو حالات نے کبھی اجازت ہی نہ دی۔ کرایے کے جس مکان میں رہتے تھے اس میں نل نہیں تھا۔ مکان کے سامنے سڑک کے اس پار پانی کا نلکا تھا۔ حسرت پائنچے چڑھا کر بالٹیاں بھر بھر کے لاتے اور دن بھر کی ضرورت کے لیے گھڑوں میں پانی بھر لیتے۔ کوئی اس کام میں مدد کرنا چاہتا تو سختی سے انکار کر دیتے۔ آزادی کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے تو اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی کے اسٹیشن پر تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے اس شان سے اترتے کہ ایک میلا سا

تکیہ پھٹی ہوئی دری میں لپٹا، رسّی سے بندھا داہنی بغل میں ہے اور بائیں ہاتھ میں لوٹا اسٹیشن سے نکل کے پا پیادہ نئی دہلی کی مسجد میں جا پہنچتے کہ یہی ان کی قیام گاہ تھی۔ جس غریب ممبر پارلیمنٹ کو بھتے کے نام پر ایک پیسہ وصول نہ کرنا ہو وہ یہ نہ کرتا اور کیا کرتا۔

حسرت شاعر تھے، حسن پرست تھے اور سرتا پا پیکر اخلاص۔ جس سے ایک بار ملاقات ہوگئی اسے ہمیشہ محبت سے یاد کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں ایک رفیق سید محمد ہاشم رسوا سے تعلق خاطر ہوگیا تھا جو ہاشم کے حیدرآباد چلے جانے کے بعد برابر انھیں تڑپاتا رہا۔ کئی شعروں میں اس عزیز کا بڑی محبت سے ذکر کیا ہے۔

تھا علی گڑھ کو جو یہ فخر کہ حسرت ہے یہاں
حیدرآباد کو ہے ناز کہ واں تو آیا

٭

اس جانِ آرزو نے کیا ہے جو واں مقام
گلزار بن گئی ہے زمین دکن تمام

٭

ایک ہمدردِ رسوا تھی انیسِ حسرت
سو وہ رسوا بھی اسے جا کے دکن بھول گئے

حسرت ایک زندہ دل عاشق مزاج انسان تھے اور ان کا لڑکپن خاصی رنگینی میں گزرا تھا۔ قرص کی حسینہ اور اٹلی کی ثریا کے قصوں اور عہد ہوس کے فسانوں کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے مگر یہ سب عہد شباب کی باتیں ہیں۔ انھوں نے جسے ٹوٹ کر چاہا، جس سے دائمی عشق کیا وہ تھیں ان کی بیگم نشاط النساء۔ کہا کرتے تھے کہ زلیخا، کملا اور نشاط نہ ہوتیں تو ابوالکلام، جواہر لال اور حسرت بھی نہ ہوتے۔ بیگم نشاط کی موت کا ماتم حسرت نے یہ کہہ کر کیا۔

غیر ممکن ہے ترے بعد ہوس   دل کسی اور سے لگانے کی
مٹ گئیں آپ ہی مٹا کے تجھے   سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ وہ دل نہ وہ ذخیرۂ شوق   توڑ دوں کنجیاں خزانے کی

ان کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرت
دل فریبی ترے فسانے کی؟

حسرت کو اپنے وطن سے جو عشق تھا اور اس کی آزادی کے لیے ان کے دل میں جو بے پناہ تڑپ تھی اس کی طرف کچھ اشارے اوپر کیے جا چکے ہیں۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ملک کی خاطر جیل تو ہزاروں لوگ گئے لیکن وہاں لوگوں نے جس طرح کی زندگی گزاری اس سے ہم ناواقف نہیں۔ مثلاً

حسرت کو دیکھ کر قرون اولیٰ کے مسلمان یاد آتے تھے۔
—— مولانا ابوالکلام آزاد

جیل میں مولانا آزاد اور ان کے رفقا کے شب و روز کیا تھے، غبار خاطر کے خطوط سے اس کا ہمیں علم ہو چکا ہے۔ اب سنیے حسرت کا حال خود ان کی زبانی: جیل پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا، کرتا، ایک ٹوپی پہننے کے لیے، ٹاٹ کا ٹکڑا بچھانے کے لیے، ایک کمبل اوڑھنے کے لیے ملا۔ ایک قدح آہنی بڑا ایک چھوٹا ضروریات کو رفع کرنے کے واسطے مرحمت ہوا۔ پھر مجھے الٰہ آباد جیل منتقل کیا گیا جہاں قید کی ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنا پڑا۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کا تعلق گرم دل سے تھا۔ احباب کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ حکومت سے شدید عداوت کا رویہ ترک نہ کر سکے اور ساری زندگی اس کا خمیازہ بھگتا۔ سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور جیل جانے کا وقت آیا تو گاندھی جی اور دوسرے رہنما چپ چاپ پولیس کے ساتھ ہو لیے۔ حسرت نے سنا تو حیران ہوئے کہ یہ کیا نافرمانی ہوئی۔ جب پولیس انھیں گرفتار کرنے پہنچی تو دل میں جیل جانے کی خواہش تھی مگر اظہار نافرمانی کے لیے زمین پر اوندھے لیٹ گئے کہ میں تو نہیں جاتا۔ مار پڑ رہی ہے مگر نہیں اٹھے سپاہیوں نے گھسیٹا تو گھاس پکڑ لی۔ آخر بہ ہزار دقت زبردستی لاری پر لاد کر لے جائے گئے۔ گاندھی جی اور ان کے فلسفۂ عدم تشدد کے وہ قائل نہ تھے۔ جب انھوں نے فوری اور مکمل آزادی کی تجویز پیش کی تو گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں نے سمجھایا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا مگر وہ نہ مانے۔ افسوس انھیں اس ریزولیشن کی تائید کرنے والا بھی کوئی میسر نہ آیا۔ حسرت کی تجویز کے خلاف تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا "حسرت صاحب ہمیں اس پانی میں لے جانا چاہتے ہیں جس کی گہرائی کا بھی ہمیں اندازہ نہیں۔"

ایۂ عشرتِ بے حد ہے غمِ قیدِ وفا
میں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

رہنا تھا ان کے ہو کے رہے جو عزیزِ خلق
ہم کیا رہے کہ طبع جہاں پر گراں رہے

حسرت بڑے بے باک اور بلا کے صاف گو تھے، دل کی بات زبان پر لانے میں انھیں کبھی تامل نہ ہوتا تھا۔ اس میں کبھی کبھی ناگفتی بات بھی زبان سے نکل جاتی تھی جس کا تاوان بہرحال انھیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ کانپور میں مسلمانوں کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر حکومت آپ کے ساتھ انصاف نہ کرسکی تو میں آپ کو گوریلا جنگ شروع کرنے کا مشورہ دوں گا۔ آزادی کے بعد ملک کے استحکام کے لیے سردار پٹیل نے بعض ریاستوں کو حسنِ تدبیر سے رام کیا، بعض کو زور زبردستی سے قابو میں لائے۔ یہ بات مولانا کو ناگوار گزری۔ پارلیمنٹ میں ہندوستان کے مردِ آہن سردار پٹیل کو مخاطب کرکے انھوں نے کہا "تم نے وہی کام کیا ہے جو ہسٹنگز، ولزلی اور کلائیو نے کیا تھا۔ تم نے اپنی طاقتور فوجوں کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادیاں چھینی ہیں۔ تمھارے محکمے پر خدا کی لعنت ہو!"

اس طرح کی تقاریر اور ایسے بیانات سے مولانا کے بارے میں اکثر غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی جذباتیت اور شدت پسندی سے خود ان کی ذات کو بھی نقصان پہنچا اور ملکی سیاست خصوصاً مسلم سیاست کو بھی۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ غور وفکر کے عادی نہ تھے یا ان میں تدبر کی کمی تھی۔ ان کے مزاج میں ایک طرح کی جلد بازی ضرور تھی۔ وہ ہر کام جلدی کرتے تھے۔ ان کا دماغ بھی اسی طرح تیز رفتاری سے سوچتا تھا اور جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے تھے تو چونکہ مصلحت کا ان کے مزاج میں گزر نہ تھا۔ موقع محل دیکھے بغیر دل کی بات زبان پر لے آتے تھے ورنہ ان کی دور اندیشی اور فہم وفراست کے ثبوت میں بہت سی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہم بہت دنوں مکمل غیر جانب داری کی پالیسی پر عمل نہیں کرسکتے۔ لامحالہ کسی ایک بلاک سے ہمیں اپنا رشتہ استوار کرنا ہوگا اور وہ بلاک امریکی نہیں روسی بلاک ہونا چاہیے، دولت مشترکہ کے زیرِ سایہ رہنے کو وہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ مرکز کے بجائے ریاستوں کو زیادہ اختیارات دینے کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مرکز کے پاس صرف دفاع، رسل و رسائل اور مالیات جیسے چند محکمے ہی رہنے چاہئیں۔ مضبوط مرکز کے خلاف اب آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ چند برس بعد اس معاملے میں عوام کا انداز فکر کیا ہوگا اس پر بھی صرف قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے۔ اردو رسم خط کو وہ مشکل بتاتے تھے اور آزادی سے پہلے انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ ہمیں رومن (انگریزی) رسم خط اپنا لینا چاہیے۔ اس کے کئی فائدے ہیں۔ انگریزی اعداد اور نام بالکل اسی طرح باقی رہیں گے، ٹائپ اور چھاپے کی آسانی ہوجائے گی، بولنے کی حد تک اردو زبان سارے ملک میں سمجھی جاتی ہے معاملہ صرف رسم خط کا ہے۔ رومن رسم خط سے اس کے حدود بہت وسیع ہوجائیں گے اور یہ زبان بہ آسانی انتہائے جنوب تک پہنچ جائے گی اور پھر ملک کی کوئی زبان اردو کی ہم سری کا دعویٰ نہ کرسکے گی۔ اس وقت لوگ مولانا کے مشورے کو ایک دیوانے کی بات سمجھ کر ہنس دیے اور خود مولانا بھی چپ ہو رہے لیکن آج یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اس وقت اس مشورے پر عمل کیا گیا ہوتا تو شاید اردو کی صورتِ حال کچھ مختلف ہوتی۔ یہ ہے مولانا حسرت موہانی کی شخصیت و افکار کی ایک دھندلی سی جھلک۔

*

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی   مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اور

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے   بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

جیسے شعروں کے خالق، اردوئے معلیٰ کے ایڈیٹر، پارلیمنٹ کے ممبر مولانا حسرت موہانی کو پہلی بار نئی دہلی کی ایک مسجد کے پاس الجھی ہوئی بے ہنگم داڑھی، جھکی ہوئی ترکی ٹوپی، ٹوٹی ہوئی کمانی کی عینک، ملی دلی شیروانی کے ساتھ ایک ہاتھ میں لوٹا اٹھائے دوسرے میں رسی سے بندھا دری تکیہ سنبھالے پھٹی پھٹی باریک آواز میں بولتے دیکھا تو ایک عظیم الشان دیوار ڈھیتی ہوئی نظر آئی مگر جب ان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے شناسائی حاصل ہوئی تو اسی شکستہ دیوار کے ملبے سے ایک منارۂ نور بلند ہوتا دکھائی دیا ایسا بلند کہ آج تک اس کا ہم سر کوئی دوسرا مینار نظر آیا نہیں۔

نورالحسن نقوی

مولانا حسرت موہانی

ہر سماج اور ہر دور میں ایسے انسان ضرور ہوتے ہیں جو اپنے کارہائے نمایاں سے ہمیشہ زندہ و پائندہ رہتے ہیں۔ ان کی کاوشوں اور ایثار سے سماج یا قوموں کی سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی مزاج کی تربیت ہی نہیں بلکہ از سرِ نو تشکیل بھی ہوتی رہی ہے۔ ایسے اوصاف کی حامل شخصیتوں میں مولانا حسرت موہانی کی شخصیت نہایت اہم ہے۔

مولانا کا نام سید فضل الحسن تھا مگر مشہور و معروف مولانا حسرت موہانی سے ہوئے۔ ان کا نام بہت کم اور ان کے قریبی ہی کے لوگ جانتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا ہے ؎

عشق نے جب سے کیا حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

مولانا قصبہ موہان ضلع اناؤ یو۔پی میں ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ ابتدائی تعلیم قصبہ موہان ہی میں ہوئی۔ ۱۸۹۴ء میں اردو مڈل کا امتحان اس اعزاز کے ساتھ پاس کیا کہ پورے صوبے میں اوّل آئے۔ ۱۸۹۵ء میں انٹرنس کا امتحان گورنمنٹ اسکول فتح پور سے اوّل درجے میں پاس کرکے علی گڑھ آگئے جہاں سے ۱۹۰۲ء میں بی۔اے پاس کیا۔ سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا شوکت علی ان کے ساتھیوں میں تھے۔

علی گڑھ کے دورانِ طالب علمی میں مولانا کا ادب سے تعلق کے ساتھ سیاست سے دلچسپی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مولانا نے ان دونوں میدانوں میں انتہائی اعلیٰ و امتیازی مقام حاصل کیا۔ علی گڑھ میں اردوئے معلیٰ کے مولانا بانی تھے جو تقریباً چالیس سال تک جاری رہا۔ اس رسالے کے ذریعے اردو ادب کی خدمت ہی نہیں ہوئی بلکہ مسلمانوں میں انگریزی تہذیب کے اثرات کمزور ہوئے اور رجحان میں توازن قائم ہوا۔ اردوئے معلیٰ آج بھی شعبۂ اردو کا ایک اہم ادبی فورم ہے۔ اس کی سالانہ تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں اکثر مولانا کی شخصیت پر تقریریں ہوتی ہیں اور شعری نشست کا بھی اہتمام ہوا ہے۔ اردوئے معلیٰ مولانا کی ادبی خدمات میں ایک اہم یادگار ہے جو یقیناً اس درس گاہ کے لیے باعث فخر ہے۔

مولانا کی شخصیت مختلف صلاحیتوں کا امتزاج تھی۔ ایک شاعر اور سیاست داں کی حیثیت سے ان کو اس دور کی شخصیات میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ہندوستان کی سیاست جو جہادِ آزادی کی سیاست تھی اس میں مولانا انتہائی دلیری اور مضبوط عزم اور اعتماد کے ساتھ شامل ہوتے اور اپنے خیالات کو بے خطر اور بے باکانہ واضح کرنے میں کبھی تامل نہ کرتے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے مولانا کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی اپنی کتابیں یا تو کسی ضرورت مند طالب علم کو دے دیتے یا فروخت کر دیتے اور اگر کوئی ساتھی طالب علم کہتا بھی کہ نتیجہ نکلنے کے بعد فروخت کیجیے گا تو کہتے کہ میرا کامیاب ہونا یقینی ہے لہٰذا ان کتابوں کی اب کیا ضرورت۔ مولانا کے انتقال کے بعد علامہ نیاز فتحپوری نے اپنے مضمون میں خاص طور سے یہ بات واضح کی جو انھوں نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ اسٹیشن پر پڑھا۔ خوش قسمتی سے یہ مضمون میں نے بھی سنا۔ نیاز صاحب نے مولانا کی طالب علمی کے واقعات، ان کے جداگانہ مزاج اور خود اعتمادی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا جو مجھے آج بھی یاد ہے کہ مولانا کو اپنی کامیابی کا اتنا یقین ہوتا تھا کہ جس روز وہ امتحان دے کر لوٹتے اُسی روز اپنی کتابیں فروخت کر دیتے۔ مولانا کی زندگی میں شروع سے آخر تک خود اعتمادی پورے طور پر کارفرما رہی۔

مولانا کے واقعات سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کس قدر انقلابی، دلیر، بے خطر اور مجاہدانہ خیالات کے انسان تھے۔ میرے ایک دوست مولانا سے ۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور میں اچانک ملاقات کا ایک واقعہ بتلاتے ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم کے اثرات انتہائی تباہ کن اور جان لیوا ہو رہے تھے۔ ہندو مسلم کشت و خون سے سارا ہندوستان نہا رہا تھا اسی پر آشوب دور میں میرا علی گڑھ جانا ہو گیا۔ اپنے وطن رودولی سے جب کانپور اسٹیشن پہنچا تو ایک بزرگ کو ایک بنچ پر نماز پڑھتے دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں لرز سا گیا اور خیال ہوا کہ یہ کون مرد مجاہد

اگلے روز ہمارا کارواں پھر روانہ ہوا۔ جیفہ سے نکلے تو ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کو بڑھے۔ پہلے تیس چالیس میل یہودیوں کے باغیچوں کے تھے جن کے شاداب مالٹے آب و رنگ میں ان یہودی دوشیزاؤں کو شرماتے تھے جو ہاتھ ہلا ہلا کر بے شرمائے ہمیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ پاس ہی یہودی کاشتکار مشینوں سے صحرا کو گلزار بنا رہے تھے اور ہم فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار۔

پھر دفعتہً باغیچوں کا سلسلہ ختم ہوا اور کیا دیکھتے ہیں کہ مختلف قطعات زمین میں اونٹوں اور گدھوں کے ناہموار تعاون سے ہل چلایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا یہ عرب کاشتکار ہیں۔ کھیتوں کے قریب سے گزرے تو عرب بچے بھاگے بھاگے آئے اور ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر "سگارہ رفیق" کی صدا لگانے لگے۔ صدا کا ترجمہ کرایا تو معلوم ہوا سگریٹ کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہم مسافروں کو پہلے تو دہشت دیکھ کے گھر یاد آیا اور پھر سوچا کہ ہمارے عرب بھائیوں کا کیا بنے گا اور بنا یہ کہ چند ہی سال بعد فلسطین جغرافیے سے نکل کر تاریخ میں چلا گیا اور اس کی جگہ اسرائیل نے لے لی۔

محمد خان

اس میں شدت و جوش کی روح ڈال دی۔ ورنہ سیاسی تاریخ ان حالات کی شاہد ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کے لیڈر حکومت برطانیہ کی ڈومنین اسٹیٹس Dominian Status کی پیش کش کو ہی غنیمت سمجھ لیتے۔ مولانا نے سیاسی مطالبات کو حاصل کرنے میں خوف، احتیاط اور بے بسی کی جگہ پختگی، دلیری اور حوصلے کا جذبہ پیدا کیا۔ مولانا سیاسی میدان عمل میں بغاوت اور سرفروشی شدت سے اختیار کرتے جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے ان کو پانچ مرتبہ قید کیا جس کا سلسلہ ۱۹۰۸ء سے شروع ہوا اس سال مولانا نے مصر میں انگریزی پالیسی کے خلاف ایک مضمون اپنے رسالے اردوئے معلیٰ میں شایع کیا جس کے بعد مولانا کو بغاوت کے جرم میں دو سال کی قید سخت کی سزا دی گئی۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا پھر اسی جرم میں قید کیے گیے اور ۱۹۲۱ء میں حکومت بمبئی نے بغاوت کا مقدمہ قائم کیا اور مولانا کو دو سال کے لیے یرودا سنٹرل جیل میں مقید رکھا۔ مولانا نے دو سال کی قید میں جو سزائیں اور تکلیفیں جھیلی ہوں گی اس کا اندازہ آج کے دور میں کیا لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا نے حکومت کی سزا میں کوڑے کھائے، چکی کی مشقت برداشت کی اور ہے جو اس فرقہ وارانہ فسادات کے ماحول میں علی الاعلان نماز پڑھ رہا ہے۔ میں انھیں کا ہمسفر بھی ہوا۔ پورے راستے وہ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں پر نام بنام تنقید و تبصرہ کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے میں خائف ہو رہا تھا مگر وہ انتہائی بے خطر انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ اور جب علی گڑھ قریب ہوا تو مجھ سے پوچھا۔ تم نے مجھے پہچانا؟ میرا نام حسرت موہانی ہے۔ دہلی جا رہا ہوں۔ یہ اخبار ہے اس میں چند سیاسی لیڈروں کے بیانات شایع ہوئے ہیں ان کا جواب دینے جا رہا ہوں۔ میں نے پہلی مرتبہ مولانا کو دیکھا تھا۔ ان کی گفتگو میں جو خود اعتمادی اور بے باکی تھی۔ اس کا تاثر آج بھی تازہ ہے۔

مولانا کی زندگی کا بیشتر وقت کانپور میں گزرا جہاں جناب مبارک علی صاحب خواجہ عبدالسلام صاحب اور خواجہ عبدالرشید صاحب سے حد درجہ سلسیمہ رہے۔ مولانا کا زیادہ وقت انھیں حضرات میں گزرتا جو کانپور کی انتہائی برگزیدہ شخصیت نواب محمد ابراہیم صاحب کے خاندان کے افراد ہیں۔ اس خاندان کی ہندوستان کی جنگ آزادی کی سیاست، کانپور کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں نمایاں خدمات رہی ہیں۔ پنڈت موتی لال نہرو کانپور میں نواب ابراہیم صاحب کے مہمان رہتے۔ ان کا قیام پارک میں رہتا جہاں سیاسی گفتگو اور تبادلۂ خیال ہوتا۔ جس میں نواب ابراہیم صاحب نے کٹورہ اٹھایا اور کہا دیکھیے۔ مولانا کٹورے میں سوکھی روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھا رہے تھے۔ میں دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ خواجہ صاحب کچھ جذباتی ہو کر کہنے لگے۔ جناب یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جن کی قربانیوں، ایثار، اور جانفشانیوں سے ہندوستان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

مولانا اپنے سیاسی عقائد کے اعتبار سے انقلابی اور کمیونسٹ تھے۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی سیاست میں جب شریک ہوئے تو مولانا نے سیاسی لیڈروں میں اپنے مطالبات پیش کرنے اور حاصل کرنے میں احتیاط، بے بسی اور خوف کا عنصر موجود پایا۔ پوری سیاسی فضا سہمی ہوئی اور حکومت برطانیہ کے طریقہ کار سے خوف زدہ تھی اس خوف و ہراس کے ساتھ اپنے مقاصد کی طلب تھی جس میں نہ پختگی تھی نہ حوصلہ۔ ایسے ماحول میں دو شخصیتیں بال گنگا دھر تلک اور اروبندو گھوش انتہائی شدت پسند اور انقلابی تھیں۔ جن کے سیاسی نظریات سے مولانا متاثر ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا کانگریس میں شامل ہوئے اور ۱۹۲۱ء کے احمد آباد کانگریس سیشن میں مولانا نے پہلی بار مکمل اور غیر مشروط آزادی کی تجویز رکھی۔ مولانا کی اس تجویز نے ہندوستان کے لیڈروں کے رجحانات کو ایک دلیرانہ حوصلہ دیا اور

بارک علی صاحب خواجہ عبدالسلام صاحب اور خواجہ عبدالرشید صاحب
نریک ہوا کرتے۔

مبارک علی صاحب اگرچہ آنریری مجسٹریٹ تاحیات رہے مگر سیاسی
عاملات میں دخیل رہتے۔ خواجہ عبدالسلام صاحب، صداقت اخبار
ے ایڈیٹر رہے اور صداقت پریس جو آج بھی قایم ہے اس کے بانی و مالک
ھے۔ یہ دونوں اس دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں، خواجہ عبدالرشید صاحب
و بفضلہ بقید حیات ہیں مولانا کے بہت سے سیاسی واقعات کے راوی ہیں
واجہ صاحب موصوف نے مولانا کے جو واقعات سنائے اُن سے مولانا
ی عظمت، ایثار اور جنگ آزادی میں ان کے جوش و شدت کا اندازہ
وتا ہے۔ مولانا کی احمد آباد کی تقریر کے بعد کا واقعہ جو خواجہ صاحب موصوف
ے دیکھا، سنایا کہ مولانا تقریر کرکے کانپور آگئے تھے اور اپنی سودیشی
پڑے کی دکان پر بیٹھے تھے کہ ایک پولس کی گاڑی سامنے آکر رکی
س میں سے چند پولیس افسران نکل کر مولانا کے قریب آئے اور پوچھا
پ مولانا حسرت موہانی ہیں۔ مولانا انتہائی اطمینان سے بیٹھے رہے اور
ڑے سختی سے جواب دیا۔ ہاں ہوں تم کون ہو۔ پولس افسر نے جواب
یا۔ جی آپ نے احمد آباد میں جو تقریر کی ہے، اس سلسلے میں آپ کی
گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی نے برطانوی
حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک Civil Disobedience Movement شروع کر رکھی تھی۔ مولانا نے اس کے
پیش نظر فوراً جواب دیا میں نہ یہ وارنٹ مانتا ہوں اور نہ تم کو افسر۔
پولس افسر نے کہا۔ آپ کی گرفتاری کے احکام ہیں لہٰذا مجھے آپ کو گرفتار
کرنا ہے۔ مولانا نے جھڑکنے کے انداز میں کہا۔ تو گرفتار کر لو۔ مگر
میں اپنے پیروں پر نہ جاؤں گا، نہ اٹھوں گا۔ تم اگر مجھے اٹھا کر لے
جا سکتے ہو تو اٹھا کر لے جاؤ۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا۔ مولانا خود سے نہ گئے۔
لے جاتے میں اگر کوئی قابل گرفت چیز مثلاً کھمبا، آجاتا تو اس سے لپٹ
جاتے۔ اسی طرح وہ احمد آباد لے جائے گئے اور جب عدالت کے سامنے
لائے گئے تو عدالت سے بھی سختی سے بولے کہ میں تم کو جج وج نہیں مانتا
مولانا کا یہ طریق عمل درحقیقت سول نافرمانی تھی۔ اگر وہ آسانی سے گرفتار
ہو جاتے اور اپنے پیروں پر چلے جاتے تو سول نافرمانی کا مقصد ہی ختم ہو جاتا
بلکہ مولانا کو حیرت تھی کہ گاندھی جی جو سول نافرمانی تحریک کے موجد تھے
وہ حکومت برطانیہ کے احکام کو تسلیم کرتے ہوئے خود سے اپنے پیروں
پر چل کر جیل گئے۔ مولانا برملا کہتے کہ جو حکومت برطانیہ کہے گی اس کے
خلاف کریں گے۔ نہ قانون مانیں گے نہ عدالت، نہ عدالتوں کے فیصلے اور
نہ کسی حاکم کو حاکم۔ خواجہ صاحب مولانا کے واقعات بیان کرتے جاتے اور
بار بار یہ کہتے جاتے۔ 'مولانا بڑے بہادر اور دبنگ انسان تھے۔ ایک
مرتبہ خواجہ صاحب کی آواز بھاری ہو گئی اور کچھ نم دیدہ ہو کر کہنے
لگے۔ مولانا بڑے صابر و شاکر آدمی تھے۔ حساس اور انتہائی غیور تھے۔
بے پناہ سادہ زندگی تھی۔ چٹائی پر بیٹھتے۔ چاروں طرف اخبار پھیلے رہتے
انھیں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ گھر میں یا آس پاس جاتے تو انگوٹھے دار
کھڑاؤں پہنے رہتے۔ کانپور سے باہر جاتے تو شیروانی پہن لیتے اور
ایک جھولا جس میں مختصر سامان مثلاً جانماز، لوٹا اور اخبار ہوتے، ساتھ
لے لیتے۔ کانپور سے باہر جانے کی ضرورت اکثر پیش آتی، اس پر
لڑائی ہوتی رہتی۔ جب خفا ہو جاتے تو گھر چھوڑ کر خواجہ عبدالسلام مرحوم
کے گھر کے باہری کمرے میں آکر رہنے لگتے۔ ان کے پاس آنا جانا میرا
روز کا معمول تھا۔ حسب معمول جب میں ایک روز ان کے یہاں گیا تو
دیکھا مولانا ہاتھ میں کٹورہ لیے کچھ کھا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر مولانا نے کٹورہ
فرش پر رکھ دیا اور چٹائی کے پنکھے سے ڈھانپ دیا۔ میں نے پوچھا مولانا
آپ کیا کھا رہے تھے؟ دکھائیے۔ میں بھی کھاؤں گا۔ اس پر مولانا نے
جواب دیا۔ خواجہ صاحب! آپ نہ کھا سکیں گے۔ میرے اصرار پر مولانا
سخت سے سخت سزائیں جھیلنے کے بعد جب مولانا قید سے آزاد ہوتے
تو پھر پوری قوت سے سیاسی تحریکوں میں شامل ہو جاتے۔

دارا کو شکست دینے میں تو سکندر کامیاب ہو گیا لیکن جب وہ
سائرس کی قبر پر پہنچا تو نامرادی نے گھیر لیا۔ اسے خیال آیا کہ اس جنگ و
جدل کے بدلے ایک بڑی سلطنت تو مل سکتی ہے مگر اس کا انجام محض قبر
کی تاریکی اور تنہائی ہوگا۔

جولیس سیزر نے سکندر کا حال پڑھا تو رونے لگا کہ میری عمر تک
سکندر کتنے ہی ملک فتح کر چکا تھا اور میرے اعمال نامے میں ابھی تک ایک
درخشاں ستارہ بھی نہیں ہے۔

جولیس سیزر کا یہ جملہ میں نے پڑھا اور میں بھی آزردہ ہوا۔ سکندر
اعظم کی سوانح کا ایک استعمال جولیس سیزر نے کیا تھا اور دوسرا ہمارے
فقیروں نے جو خیرات مانگتے ہوئے صرف اتنا یاد دلاتے ہیں کہ —

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ جن ہاتھوں نے دنیا
بھر سے خراج وصول کیا ان کے حوالے سے یہ لوگ خیرات مانگتے ہیں لیونلہ افراد
اور اقوام واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں۔

— مختار مسعود

پرواز

کہا درخت نے اک روز مرغِ صحرا سے
ستم پہ غم کدۂ رنگ و بو کی ہے بنیاد
خدا مجھے بھی اگر بال و پر عطا کرتا
شگفتہ اور بھی ہوتا یہ عالمِ ایجاد
دیا جواب اسے خوب مرغِ صحرا نے
غضب ہے داد کو سمجھا ہوا ہے تو بیداد
جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

علامہ اقبال

بحیثیت انسان مولانا ایک انتہائی قلیل مال و متاع کے وضع دار انسان تھے۔ انتہائی مذہبی تھے مگر دوسرے مذاہب کی برائی یا ہجو ان کو گوارا نہ تھی۔ ہر مذہب اور فرقے کے لوگوں کی عزت کرتے۔ انتہائی سادہ بلکہ افلاس کی زندگی تھی۔ ہر حال میں خوش رہتے۔ زندگی کی واجبی ضرورتوں کے علاوہ وہ کوئی چیز نہ رکھتے۔ قیمتی سامان رکھنا وہ کبھی پسند نہ کرتے۔ سودیشی کپڑے پہنتے۔ لہذا کانپور میں انھوں نے سودیشی کپڑے کی دوکان قایم کی جس کی مختصر آمدنی ان کا ذریعۂ معاش تھی۔ ریل کے سفر کے علاوہ وہ پیدل ہی چلنا پسند کرتے۔ دورانِ ممبری پارلیمنٹ جب دہلی جاتے تو مسجد میں قیام کرتے اور چٹائی پر رات بسر کرتے۔ پارلیمنٹ پیدل ہی جاتے اور اگر راستے میں کوئی اپنی موٹر میں بیٹھنے کی درخواست کرتا تو شکریے کے ساتھ انکار کر دیتے۔

پارلیمنٹ کی کارروائی میں پوری دلچسپی سے حصہ لیتے اور اگر کوئی بات اصول اور ملکی مفاد کے خلاف سمجھتے تو بے جھجھک ایسی تقریر کرتے کہ پورا ایوان دم بخود ہو جاتا۔ بڑے سے بڑے سیاست داں یا لیڈر سے مرعوب نہ ہوتے۔ ان کی قربت میں ہر بڑا چھوٹا سیاست داں عزت محسوس کرتا اور جب ملنے ان کی رہائش گاہ پر آتا تو اسی چٹائی، جس پر وہ خود بیٹھے ہوتے بیٹھ کر فخر محسوس کرتا۔

ہندوستان نے آزادی سے پہلے اور بعد کو بہت سے لیڈروں کو جنم دیا مگر مولانا جیسی صفات کے لیڈر چند ہی تھے۔ ان کی سیاسی نمایاں سرگرمیاں، دلیری اور بے باک اور بے خطر بات کہنے کی خصوصیت کے پیش نظر مولانا کا ہندوستان کے بلند مقام سیاسی لیڈر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کی اخلاقی و انسانی بلندی، ادبی خدمات، ان کا شاعرانہ مزاج و سخن گوئی ایسی خصوصیات ہیں جن کا سیاسی رجحان کے ساتھ ایک جا ہونا امکان سے بعید ہے۔ مولانا میں یہ ساری صفات انتہائی معیار کے ساتھ موجود تھیں اور اس طرح وابستہ تھیں کہ مولانا کو ان سے الگ کر کے نہ موجودہ ادب و شاعری مکمل ہے اور نہ جنگِ آزادی کی تاریخ۔ مولانا کی خدمات ان کا اخلاق و انسان دوستی کا جذبہ آج کے سیاسی نظام اور معاشرے کے لیے سہارا و مشعلِ راہ ہیں۔

آزادی کے بعد مولانا نے اپنا مشن کامیاب و مکمل کر لیا تھا۔ چالیس سال کی جدوجہد کا سلسلہ ۱۹۴۷ء میں ختم ہوا۔ زندگی زنت کی چادر میں لپٹتی ہوئی ضعیفی کو جا پہنچی۔ لہذا زندگی محدود ہو گئی کانپور ہی میں وقت گزارنے لگے۔ زندگی میں کوئی تمنا نہ تھی نہ مایوسیوں کا شکوہ نہ کامیابیوں کی خودستائی، نہ حکومت سے کوئی آرزو۔ نہ دوستوں کے محتاج ہوتے۔ بیوی نے پہلے ہی ساتھ چھوڑ دیا اور اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ایک بیٹی جو تسکین نظر رہیں ان کا قیام بھی کانپور ہی میں رہا۔ ایک بھتیجے نجم الحسن انتہائی ذہین تھے وہ ساتھ ہی رہتے جو مولانا کے انتقال کے بعد کچھ عرصے حیدرآباد میں رہے۔ مولانا کو اسہال کبدی کی شکایت ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ان کی صحت دن بدن گرتی گئی۔ انتقال سے قبل لکھنؤ چلے گئے جہاں کچھ وقت علالت کے بعد فرنگی محل میں ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو رحلت فرمائی۔ آج ہندوستان کا یہ لیڈر، ادب کا خادم اور انسان دوستی کا علمبردار لکھنؤ باغ مولوی انوار صاحب میں زیرِ خاک ہے۔ آج مولانا سے ہم محروم ضرور ہیں مگر چشمِ بینا کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی سیاسی زندگی میں پختگی و مضبوطی، شاعری میں کیف و نشاط، ان کا کردار، مزاج کی سادگی نفاست و پاکیزگی، تصوف، ہمدردی، انسان دوستی ایسی صفات ہیں جن کی اثر انگیزی سے دلوں کا مولانا کی طرف کھچا جانا لازمی ہے۔

سید مشرف علی، ریڈر، شعبۂ قانون، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

نِکمّاپَن

نکمّا پن اور ناکارکردگی ہماری قومی زندگی کا ناسور بن گئی ہے دفتروں میں، کھیتوں اور کھلیانوں میں، کارخانوں میں، مدرسوں اور کالجوں میں غرض کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں جائیے ناکارکردگی کا احساس فوراً ہوگا۔ کوئی بھی تنخواہ دار ملازم اپنے فرائضِ منصبی کو پوری طرح انجام دینا نہیں چاہتا۔ اس کو اس سے تو ضرور دلچسپی ہے کہ اس کے مشاہرے میں اضافہ ہو، لیکن وہ اپنی کارکردگی کو بھی بہتر بنائے اس کا اسے بھول کر بھی کبھی خیال نہیں آتا۔ دفتروں میں جائیے تو اکثر لوگ تو غائب ہی ملیں گے، جو موجود ہوں گے، وہ بھی کام سے زیادہ گپ بازی میں مصروف نظر آئیں گے۔ ٹال مٹول شیوہ بن گیا ہے۔ گھنٹوں کا کام دنوں میں دنوں کا کام ہفتوں میں ہوتا ہے۔ اسی لیے دفتری عملہ روز افزوں ہے جس کام کی انجام دہی کے لیے ایک فرد کافی ہوتا، وہاں تین تین آدمی کام کر رہے ہیں۔ لیکن کام کی رفتار پھر بھی سست ہے۔

صحت عامّہ کے لیے سرکار نے قریہ قریہ مراکز قائم کیے۔ بستی بستی کے لیے صحت کے نگراں مقرر کیے کہ وہ گھوم پھر کر امراض خاص طور پر متعدی امراض پر نظر رکھیں، ان کے اسباب کا پتہ چلائیں اور ان کی بیخ کنی کریں مالی وسائل سارے صرف ہوگئے، کاغذ پر سب کچھ عملدرآمد ہوگیا۔ ان اسکیموں کا جو فائدہ ہونا چاہیے تھا، اس کا شاید دسواں حصّہ ہی حاصل ہو سکا کیوں کہ نگراں صاحب کبھی گھر سے نکل کر گئے ہی نہیں، یا وہ اپنے کھیتوں میں کام کرتے رہے، یا اپنا کاروبار دیکھتے رہے، یا چوپال میں لمبی تان کر حقہ گڑگڑاتے رہے، سرکار سے تنخواہ لیتے رہے اور ضمنی طور پر کبھی کبھار فرائض منصبی بھی انجام دیے، مگر کاغذات مکمل رکھے۔ اتنے لوگوں کا معائنہ ہوا، اتنے لوگوں کو ٹیکہ لگایا، اتنے لوگوں کو دوائیں دیں وغیرہ

تعلیم ملک کی اہم ضرورت تھی۔ حکومت نے اس کے فروغ کے لیے بڑے بڑے منصوبے بنائے۔ ہر گاؤں میں ایک اسکول قائم کر دیا گیا۔ استاد مقرر کر دیے گئے۔ اسکول چلتے رہے۔ کاغذوں پر سب کام ٹھیک ہوتا رہا۔ مگر اسکول سے استاد و بچے دونوں ہی غائب رہے۔ یا استاد کرسی پر بیٹھے اونگھتے رہے اور بچے میدان میں کھیلتے رہے۔ تعلیم غائب رہی۔

زندگی کے ہر شعبے میں یہی ابتری نظر آئے گی۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ ہمارے قومی مزاج کی خرابی ہے یا نظام کا نقص ہے جس کی وجہ سے یہ صورتِ حال پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان ٹائمز کی حالیہ اشاعت میں سینٹ ویر سنگھ کا ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ فورڈ فاؤنڈیشن، عالمی صحت کے ادارہ، کسی غیر ملکی سفارت خانے کے چمنوں اور سبزہ زاروں کی شادابی کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ ان کی صفائی ستھرائی، چمن بندی، ہر موسم کے تر و تازہ پھولوں کی کثرت دل کو لبھاتی ہے اور بڑی طمانیت یہ حاصل ہوتی ہے کہ یہ سب ہندوستانی عملے کی کارگزاری ہے اور یہ یقین تازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی مالی بہترین کارکردگی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن اسی مالی کی کارگزاری کا مظاہرہ جب سرکاری دفتروں کے باغیچوں اور تعمیراتِ عامہ کے سبزہ زاروں میں نظر آتا ہے تو مایوسی ہوتی ہے۔ یہ مالی صرف اسی وقت مستعد نظر آتا ہے جب کوئی افسر معائنے کے لیے آنے والا ہو۔

آخر یہ فرق کیوں ہے؟ غیر ملکی اداروں میں کام کرنے والے دربان سے لے کر اعلیٰ عہدے تک کے افراد میں قلب ماہیت ہو جاتی ہے عالمی بنک کے اس کلرک کی مستعدی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جو کھلے کمرے میں بیٹھا اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ نہ اپنی جگہ سے غائب ہوتا ہے، نہ گپ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تن دہی سے اپنے کام میں مصروف اور کاغذوں کو ان کی مناسب جگہ پر رکھتا چلا جاتا ہے۔

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ اس کی ایک وجہ تو وہ لمبی لمبی تنخواہیں ہیں جو ان غیر ملکی اداروں میں ملتی ہیں۔ لیکن دراصل یہ اچھی تنخواہوں اور برخاستگی کے خوف کا امتزاج ہے جو ان لوگوں کو مستعد و چوکس رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ کی غلطی تقاضائے بشریت ہو سکتی ہے لیکن تیسری غلطی ناقابلِ معافی ہے۔ اگر چوکیدار دو مرتبہ سے تیسری مرتبہ اونگھتا ہو

پایا گیا تو اس کی برخاستگی یقینی ہے۔ پھر کوئی عذر قابل سماعت نہیں ہو سکتا۔ مالی کو پندرہ سو روپے ماہوار ملتے ہیں لیکن اگر گلاب پوری طراوت کے ساتھ نہ کھلے تو بوریا بستر گول ہے۔ جمعدار کو دو ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ ملتا ہے لیکن اگر کھڑکی کے شیشے پر دو چار دھبے نظر آگئے تو اس کا رخصت ہونا لازمی ہے۔

اونچے عہدوں کے لوگ بھی بڑی تنخواہوں اور دیگر مراعات سے متمتع ہوتے ہیں، لیکن اگر فرائض کی انجام دہی میں ذرا کوتاہی ہوئی تو معاہدہ ختم۔ ان اداروں میں ذات پات، اونچ نیچ کا امتیاز محسوس نہیں ہوتا۔ امریکی اور یورپی افسران ماتحت عملے سے برابری اور بے تکلفی کا برتاؤ کرتے ہیں اور ماتحتوں کو حکم دینے کے بجائے ان سے درخواست کرتے ہیں۔ اس فضا میں قدرتی طور پر مستعدی سے کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔

مضمون نگار نے سوال اٹھایا ہے کہ آیا انھیں عوامل کی وجہ سے کارکردگی میں اتنا بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں اس نے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ کہا جاتا ہے کہ مشرقی اور مغربی مزاجوں میں بڑا فرق ہے۔ ہندوستانی مزاج پر افلاکی تصور غالب رہتا ہے۔ وہ قومی آمدنی میں اضافے سے زیادہ نردان و نجات اخروی کے حصول پر متوجہ رہتا ہے۔ لیکن اگر یہ بات درست ہوتی تو غیر ملکی اداروں میں کام کرنے والے ہندوستانی اسی طرح کام کرتے جیسے ملکی اداروں میں۔ غور کیجیے تو اس کا راز صرف ایک نقطہ میں مضمر ہے۔ وہ ہے تنظیم۔ مغربی سوسائٹی میں بھی کوئی بات اتفاقی، سرسری یا رواروی میں نہیں ہوتی۔ ہر بات کی آخری تفصیل تک طے ہوتی ہے۔ اور اگر کام کرنے کا کوئی نظم متعین ہوا اور ہر شخص اس کی پابندی کرے تو مجموعی کارکردگی کا بہتر ہو جانا لازمی ہے۔ وہاں خلائی راکٹ داغنے میں جس اہتمام اور تنظیم کو مد نظر رکھا جاتا ہے، وہی تنظیم کوڑا کرکٹ جمع کرنے میں بھی نظر آئے گی۔ نتیجے میں کوڑا جمع کرنے والے کی کارکردگی میں بھی اسی مستعدی کا مظاہرہ ہوگا جو خلائی پرواز کو کنٹرول کرنے والے ٹیکنیکل ماہر کی کارکردگی میں موجود ہے۔ ایک بین الاقوامی ادارے کی ہندوستانی شاخ میں صرف تین ہندوستانی خواتین چالیس کروڑ روپے سالانہ کا حساب کتاب رکھتی ہیں۔ کسی ہندوستانی دفتر میں اس رقم کے حساب کتاب کے لیے درجن بھر سے زیادہ افراد موجود ہوں گے اور شاید پھر بھی کام میں اتنی صفائی ستھرائی نہ ہو۔ یہ بھی نہیں کہ یہ تین خواتین کچھ حد سے زیادہ کام کرتی ہیں۔ یہ صرف طریق کار اور تنظیم کا کمال ہے۔

یہاں آپ کسی بھی دفتر میں چلے جائیے۔ اوّل تو متعلقہ کارکن سیدھے منہ بات ہی نہیں کرے گا، ٹالنے کی کوشش کرے گا اور اگر مہربان ہوا تو کاغذ تلاش کرے گا۔ پھر بھی کسی بات کا صحیح جواب ملنا مشکل ہوگا۔ کاغذ اپنی صحیح جگہ پر نہیں ملے گا۔ بار بار آپ سے آپ کی درخواست کی نقل طلب کی جائے گی نتیجہ شاید پھر بھی کچھ نہ نکلے۔ کاغذات کا صحیح جگہ پر فائل ہونا، مناسب اشارہیے، ضابطے کی پابندی، درست طریق کار، عملدرآمد کا باقاعدہ اطلاعاتی نظام وغیرہ عمدہ کارگزاری کی بنیادیں ہیں۔

مضمون نگار نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ہندوستانی مزاج تنظیم کے تصور سے میل نہیں کھاتا۔ صدیوں سے ہمارا معاشرہ مہنتوں اور ملاؤں سادھوؤں اور سوروماؤں، تاجروں اور نیچ کام کرنے والوں پر مشتمل رہا ہے۔ ایسی کوئی ذات یا جماعت نہیں رہی جو نظم، ضابطہ اور تنظیم کے لیے وقف رہی ہو۔ اگر آج ہم نظم و ضبط کو اپنی زندگی کا شعار بنالیں تو ہمارے باغیچوں میں بھی اسی طرح گلاب کھل سکتے ہیں۔

پروفیسر عتیق احمد صدیقی، صدر، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی

ایرفورس میں ملازمت کے مواقع

ہندوستان کی بڑی اور بحری افواج کے مختلف شعبوں میں ہر سال بڑی تعداد میں بھرتی ہوتی ہے، صرف میدان جنگ کے لیے نہیں بلکہ مختلف کاموں کے لیے۔ یہاں ڈرائیور، انجینیر اور ڈاکٹر وغیرہ کی اسامیاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض جگہوں کے لیے انتخاب یونین پبلک سروس کمیشن اور اسٹاف سلیکشن کمیشن کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ بعض کے لیے انڈین ایرفورس اور انڈین نیوی براہ راست انتخاب کرتی ہیں۔ جو طلبا ہائی اسکول، انٹر، یا ۱۰+۲ کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے، ان کے لیے یہاں ملازمتوں کی گنجائش موجود ہے۔ ان طلبا کے لیے روزگار دفتروں سے رابطہ قائم رکھنا اور معلومات حاصل کرتے رہنا ضروری ہے۔ ہم تہذیب الاخلاق کے صفحات میں ملازمتوں اور مقابلے کے امتحانوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتے رہیں گے۔

ہائی اسکول/انٹرمیڈیٹ/۱۰+۲ پاس شدہ طلبا کے لیے ایرفورس کی تکنیکی اور غیر تکنیکی اسامیوں کے جو مواقع دستیاب ہیں یہاں ان کی نشان دہی کی جارہی ہے۔

ملازمت کی نوعیت	مطلوبہ تعلیمی صلاحیت	اضافی یا پسندیدہ صلاحیت	عمر کی حد
۱۔ ٹکنیکل [اے۔ بی]	انٹر/مساوی/۱۰+۲ سائنس و ریاضی کے ساتھ یا ڈپلوما انجینئرنگ	ٹکنیکی رجحان، ڈپلوما [الکٹرانکس/الکٹریکل/میکنکل انجینئرنگ]	۱-۹-۶۳ اور ۳۰-۶-۶۹ کے درمیان پیدائش
۲۔ ٹکنیکل [بی]	ہائی اسکول یا مساوی یا ۱۰+۲ سائنس کے ساتھ [کم سے کم ۶۰ فی صد نمبروں کے ساتھ]	——	۱-۹-۶۵ اور ۲-۶-۶۹ کے درمیان پیدائش
۳۔ غیر تکنیکی [سی و ڈی]	ایضاً کم سے کم ۴۵ فی صد نمبروں کے ساتھ	فزکس، کیمسٹری، بایولوجی کی تعلیم	" "
۔ میڈیکل اسسٹنٹ [سی آئی] کمپاؤنڈر	" "	سائنس کا علم	" "
۔ ریڈیو، ٹی وی آپریٹر۔ سی آئی	" "	سائنس کا علم، صاف آواز، درست تلفظ	" "
۔ اکاؤنٹنٹ کلرک	" "	ٹائپ، شارٹ ہینڈ، کامرس کا علم	" "
۴۔ غیر تکنیکی [ای۔ ایف]			
۔ ۱۰۸۰۶ پولس ای آئی	" "	صحت مند، قد آور	" "
۔ فزیکل انسٹرکٹر ای آئی	" "	کھیل کود کا شوق	" "
۔ موٹر ڈرائیور ایف آئی	" "	ڈرائیونگ کا شوق	" "
۔ کیٹرنگ (باورچی خانہ) ایف آئی	" "	کھانا پکانے کے فن سے لگاؤ	" "
صحت، آتش زنی کا مقابلہ	" "	صفائی ستھرائی	" "
۵ کیٹیگری جی			
۔ موسیقار	انگریزی حساب جاننے کے علاوہ موسیقی کا شوق	موسیقی کا عملی تجربہ	" "

نوٹ:۔ ۱ تا ۳ کے لیے قد ۵ء۱۵۲ سینٹی میٹر نمبر ۴ کے لیے ۱۷۵، ۱۶۷، ۱۶۵، ۵ء۱۵۲، ۵ء۱۵۲، ۱۶۷ بالترتیب سینہ ۸۰ سینٹی میٹر (پھولا ہوا) وزن ۵ء۱۵۲ قد کے لیے ۴۴ کلوگرام ۱۸۳ قد کے لیے ۶۰ کلوگرام

تنخواہ:- ۵۰۰ روپے ماہوار، رہائش، خوراک، لباس، طبی سہولتیں، رخصت، انشورنس۔ ترقی کے مواقع:- باصلاحیت امیدواروں کو کمیشنڈ افسر ہونے کے مواقع [تنخواہ پندرہ سو سے دو ہزار تک] مضامین امتحان: ابتدائی امتحان Ist Initial Screening Test ۲۲۱۰ کے معیار کی آسان انگریزی، حساب، ذہانت کا امتحان جو معروضی، Objective Type ہوگا۔ امتحان کے مراکز۔ نئی دہلی، پالم، گوڑ گاؤں، بریلی، غازی آباد، میرٹھ، کانپور، انبالہ، جودھپور، بمبئی، کلکتہ، پٹنہ، بھونیشور، گوہاٹی، کوچین وغیرہ

نوٹ:- جو امیدوار ابتدائی امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کو انتخاب کے امتحان میں بلایا جاتا ہے جو عموماً اپریل اور نومبر میں ہوتا ہے، میرٹ لسٹ کے مطابق انتخاب ہوتا ہے، درخواست کا نمونہ اخباروں میں اشتہار کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔ درخواست رجسٹری سے اس پتے پر بھیجی جاتی ہے۔

Central Airmen Selection Board, Air Force Station, Race Cource. N. Delhi

مندرجہ بالا پتے سے مزید معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ نیز روزگار دفتر سے رابطہ قایم کیا جاسکتا ہے۔

ایم-ایم-الہی (جنرل ایجوکیشن)

الکٹریسٹی سروس کمیشن - اتر پردیش

کلرک کی جگہیں: ۱۱۰؛ تنخواہ -/644 - -/465

عمر کی حد - ۱۸ اور ۲۸ سال کے درمیان [یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو]

تعلیمی صلاحیت: ہائی اسکول/انٹر یا مساوی۔ کم سے کم ۴۵ فی صد نمبروں کے ساتھ

اضافی صلاحیت: ہندی سے واقفیت، ہندی یا انگریزی ٹائپ

آخری تاریخ: ۱۳ اگست ۱۹۸۴ء

انگریزی یا ہندی میں ٹائپ کی ہوئی یا ہاتھ سے صاف لکھی ہوئی درخواستیں مندرجہ ذیل پتے پر بھیجی جائیں

Secratary,
Electricity Service Commission
B-17. J. Road Sector. G
Mahanagar Extension
Lucknow. U.P.

اتر پردیش پبلک سروس کمیشن

U.P. Nyayak (Munsif ship) exam. 84.

کل جگہیں ۵۰۔ مطلوبہ تعلیمی صلاحیت: گریجویشن و قانون]

عمر کی حد: ۲۱ تا ۳۰ سال [یکم جولائی ۱۹۸۴ء کو]

کمیشن کے دفتر میں درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۴ء

امتحان کی تاریخ:- دسمبر ۱۹۸۴ء

تفصیل کے لیے دیکھیے ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۵ جولائی اور انڈین ایکسپریس ۲۹ جولائی ۱۹۸۴ء

مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہونے والے طلبا کے لئے

ضروری اطلاع

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی گزشتہ دس سال سے آئی۔ اے۔ ایس اور مقابلے کے دیگر امتحانوں میں شریک ہونے والے طلبا کی کوچنگ وغیرہ کا قابل قدر اہتمام کر رہی ہے۔ اس سال مسلم یونیورسٹی سے جو طلبا (تقریباً ایک سو) ابتدائی امتحان میں شرکت کے لئے دہلی گئے ان کے قیام کا بند و بست اسی ادارے نے کیا

۱۹۸۲ء سے انڈیا اسلامک کلچر سینٹر بھی اس کام میں برابر کا شریک ہے۔ اس ادارے نے مقابلے کے امتحانوں کے تمام ضروری کتابیں فراہم کر لی ہیں اور تجربہ کار افسران کے لکچروں کا بند و بست بھی کیا ہے۔ جو طلبا تیاری کے لئے دہلی جاتے ہیں ان کے قیام کا متذکرہ بالا دونوں ادارے مفت انتظام کرتے ہیں، البتہ کھانے کے مصارف امیدواروں کو خود برداشت کرنے ہوتے ہیں۔

چودھری محمد عارف صاحب مسلم امیدواروں کے قیام اور کوچنگ کی نگرانی خود فرماتے ہیں۔ وہ ملک و قوم کی ایسی خدمت انجام دے رہے ہیں جس کے مثبت نتائج الحمد للہ ظاہر ہونے لگے ہیں۔ امید ہے کہ ان کا مشن انشاء اللہ ضرور پورا ہوگا۔ بہتر ملازمتوں کے خواہشمند طلبا کو چاہیے کہ وہ مندرجہ ذیل پتے پر چودھری صاحب سے رابطہ قائم کریں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
نمبر ۱، بلونت رائے مہتا لین کرزن روڈ نئی دہلی
اور انڈیا اسلامک کلچر سینٹر ۸۷-۸۸، لودھی اسٹیٹ نئی دہلی

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبات

سرسید نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کو تیز تر کرنے اور اسے وسعت دینے کی متعدد تدابیر اختیار کیں۔ ان میں سے ایک محمڈن ایجوکیشنل کانگریس، جو آج کل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے مشہور ہے، کا قیام ہے۔ یہ ۱۸۸۶ء میں عمل میں آیا۔ اس کا بنیادی مقصد مسلمانانِ ہند کی تعلیمی معاملات میں رہنمائی کرنا اور جدید تعلیم کی طرف انھیں رغبت دلانا تھا۔ اس مقصد میں کانگریس بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس ہوتے تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ ملک کے مختلف شہروں میں منعقد ہوتے اور ان میں عمائدِ ملت شرکت کرتے تھے۔ ہر سال جلسے کا ایک نیا صدر منتخب ہوتا، جو پوری قوم کے جذبات، خیالات اور افکار کی ترجمانی کرتا۔ صدر کی حیثیت سے جو خطبہ وہ دیتا وہ بڑا وقیع اور کئی لحاظ سے اہم ہوتا۔ اس میں مسلمانوں کے عصری مسائل سے بحث ہوتی اور ان سے نبرد آزما ہونے کی تدبیریں بتائی جاتیں۔ اسی کے ساتھ اس میں ادبی شان بھی ہوتی اور وہ اپنے عہد کے نثری اسلوب کا بہترین نمونہ بھی ہوتا۔ ۱۹۴۷ء تک یہ جلسے ہر سال بڑی پابندی سے ہوتے رہے۔ لوگ ان میں جوق در جوق شرکت کرتے اور اپنے خیالات سے دوسروں کو مستفید کرتے رہے۔ خود سرسید کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جس شہر میں اجلاس ہوتا، وہاں وہ کافی پہلے پہنچ جاتے اور تمام انتظامات خود اپنی نگرانی میں کراتے۔ ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے جانشینوں نے ان کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھا اور اسی شان سے جلسے منعقد کرتے رہے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا، مسائل بھی پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہو گئے۔ ہندوستان کے افق پر سیاسی تبدیلیاں تیزی سے نمودار ہونے لگیں۔ ملکی تحریکوں نے فضا کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ان سب باتوں کے اثر سے عوام کے مسایل بھی گوناگوں ہوتے گئے۔ مسلمان بھی ان حالات سے متاثر ہوئے جو ایک بالکل قدرتی امر تھا۔ اب ان کے مسایل معاشی اور تعلیمی دائرے سے باہر نکل کر سیاسی اور سماجی حدود میں بھی داخل ہوتے گئے۔ انھیں تیزی سے بدلتے ہوئے ہندوستانی معاشرے میں اپنے صحیح مقام کی بازیافت کرنا تھی۔ ظاہر ہے ان روز افزوں تقاضوں سے ایجوکیشنل کانگریس بے نیاز نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس طرف بھی اس نے اپنی توجہ مبذول کی اور اس طرح اس نے اپنے دائرۂ کار کو وسیع کیا۔ لہٰذا سالانہ جلسوں میں جو خطبے دیے جاتے، تقاریر ہوتیں اور تجاویز منظور کی جاتیں، اُن میں عصری تقاضوں کی بھرپور ترجمانی ہوتی۔ اس کے ابتدائی اجلاسوں میں جو خطبے دیے گئے وہ نسبتاً مختصر ہیں اور ان کا کینوس بھی محدود ہے لیکن جیسے جیسے حالات بدلتے گئے ان خطبات کا کینوس بھی پھیلتا گیا، ان کے حجم میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور یہ ضخیم تر ہوتے گئے۔

ان خطبات میں جو نکات بیان کیے گئے ان میں سے بیشتر آج بھی اہم ہیں اور حالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ تقریباً ایک صدی گزر جانے پر بھی یہ ایک عنوان ہماری رہنمائی کرتے ہیں — ان کی اس اہمیت کے پیش نظر تہذیب الاخلاق کے مدیر محترم نے خواہش ظاہر کی کہ ان خطبات کی تلخیص شایع کی جائے اور ان نکات کو خصوصیت سے اجاگر کیا جائے جو موجودہ دور میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ ہمارے بزرگوں کی کوششوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ موصوف کے حسب الارشاد پہلے خطبۂ صدارت کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض مولوی سمیع اللہ رئیس دہلی نے انجام دیے۔ ان کا صدارتی خطبہ مختصر اور جامع تھا۔

مولوی سمیع اللہ [۱۸۳۴ء – ۱۹۰۸ء] رؤسائے دہلی میں تھے ان کے اور سرسید کے خاندان کے قریبی مراسم تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں آپ نے دہلی کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ آپ کے دل میں شروع ہی سے قوم کی خدمت کا جذبہ تھا اور ہمہ وقت اس کی پسماندگی دور کرنے کی فکر لاحق رہتی تھی۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے وابستہ ہو گئے، بلکہ صحیح معنی میں اس کے روح و رواں تھے۔ سرسید کو دہلی کے طبقۂ اشراف میں متعارف کرانے میں

آپ نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ کالج کے قیام اور بعد میں اس کے استحکام کے لیے آپ نے جو خدمات انجام دیں، وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ سرسید بھی آپ کی خدمات کے بڑے معترف تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں کالج کی سالانہ رپورٹ میں سرسید نے آپ کی خدمات کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

> جس کالج کی رپورٹ آپ حضرات کو پڑھ کر سنائی گئی ہے یہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے ارادے اور صحیح رائے کی بدولت قایم ہوا ہے۔ کالج فنڈ کمیٹی جس کے ممبر مولوی سمیع اللہ خاں بھی تھے اور جس نے مدرسۃ العلوم قایم کرنے کا منصوبہ باندھا تھا، اس کی رائے تھی کہ جب تک پندرہ لاکھ روپیہ جمع نہ ہو جائے تو اس وقت تک مدرسہ یا کالج جاری نہیں ہو سکتا۔ اس رائے سے مولوی صاحب نے اختلاف کیا اور جب کسی نے اس اختلاف کی پروا نہ کی تو انھوں نے مخصوص فیاضی سے کام لے کر ایک فہرستِ چندہ کھولی اور اپنے پہلے چندے کے علاوہ اس میں بھی ایک ہزار روپے سے چندہ میں شرکت کی اور اس طرح جب روپیہ جمع ہو گیا تو انھوں نے مدرسہ قایم کر دیا۔"

لیکن اس کے کچھ ہی عرصے بعد انھیں سرسید کی بعض حکمت عملیوں سے اختلاف ہو گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے اس تحریک سے دست کش ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد ضیاالدین انصاری
مولانا آزاد لائبریری۔ مسلم یونیورسٹی

تلخیصِ خطبۂ صدارت

حضرات! آج کا جلسہ مسلمانوں کی ملّی تاریخ میں عظیم الشان حیثیت کا حامل ہے۔ ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ دنیا میں جو شے سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، وہ ہے سولیزیشن [Civilization] جسے عام فہم لفظ میں ہم "شائستگی" کہہ سکتے ہیں۔ یہ دو چیزوں سے مرکب ہے، ایک تعلیم اور دوسری تربیت۔ اور جو قوم جیسے جیسے ترقی کرتی ہے، اس ہی کے ساتھ تربیت بھی ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔

انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے جس کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ علم کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، جب کہ دوسری مخلوقات اس نعمت سے محروم ہوتی ہیں۔ دراصل تعلیم اور تربیت ہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کو انسان بناتی ہیں اور اسے دیگر مخلوقات سے میز و ممتاز کرتی ہیں۔

دنیا میں تعلیم دینے کے مختلف طریقے ہیں۔ اسی طرح تربیت کے بھی مختلف انداز ہوتے ہیں۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ تعلیم فیضانِ الٰہی ہے، بعض کا خیال ہے کہ یہ اشراق کے طریقے سے حاصل ہوتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اکتسابی طریقے سے۔

مجھے اوّل الذکر دو طریقوں سے کوئی سروکار نہیں، مجھے تو صرف اکتسابی تعلیم کے طریقے سے بحث ہے۔ گزشتہ زمانے میں ہماری قوم اکتسابی تعلیم میں بہت آگے تھی، لیکن آج کل بہت پیچھے ہے۔ اس کا سنبھالنا ہم مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کے طریقۂ کار پر غور کرنے کے لیے یہ ایجوکیشنل کانفرنس کا پلیٹ فارم مناسب ترین جگہ ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف لوگوں نے اس طرف توجہ کی ہے اور اپنے اپنے نظریات خیالات اور وسایل کے مطابق قوم کی اصلاح کی کوششیں کی ہیں۔ اور سب اسی نتیجے پر پہنچے کہ تعلیم کے ذریعے ہی ہم مسلم قوم کو اونچا اُٹھا سکتے ہیں۔ لیکن طریقۂ تعلیم کی نسبت سب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم آپس میں مل بیٹھیں اور بحث و مبحث کے بعد کسی ایسے طریقۂ تعلیم پر متفق ہو جائیں جو قوم کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو۔

اس کام کے لیے میرے خیال میں آج کے اجلاس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہاں وہ تمام حضرات جمع ہیں جو قوم کا درد رکھتے ہیں اور اس کی اصلاح و ترقی کے دل سے خواہاں ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ اس مقصد کی کارروائی شروع کرنے کے لیے مجھ کو عزت دی گئی ہے۔ اگرچہ آج کا جلسہ کچھ بہت بڑا جلسہ نہیں ہے، مگر مجھے قوی امید ہے کہ آئندہ اس پر لوگوں کو بہت توجہ ہوگی اور ہر سال اس جلسہ کو ترقی ہوتی جائے گی

آزادی — ایک نعمت — ایک موقعہ

37 سال قبل ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں اور ہم آزاد ممالک کی صف میں شامل ہوگئے تھے
تب سے ہم نے زندگی کے تمام میدانوں میں بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی

- آج ہمارے کسان قوم کی ضرورت کے لئے کافی اناج پیدا کرتے ہیں۔
- صنعتی پیداوار میں ہم نے دنیا کے تمام ملکوں میں ایک قابل فخر مقام حاصل کرلیا ہے۔

نیا بیس نکاتی پروگرام ہماری مسلسل عملی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے تاکہ سب کو سماجی اور اقتصادی انصاف مل سکے
صرف اسی نشانے پر کاربند رہ کر ہم اندرونی اور بیرونی خطرات کے خلاف اپنی آزادی اور ملکی سالمیت کا تحفظ اور دفاع کرسکتے ہیں۔

آئیے۔ آزادی کے 38 ویں سال میں داخل ہوتے ہوئے ہم کڑی محنت اور مل جل کر کام کرنے کا عہد کریں۔ تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں

ترقّی اُردو بیورو کی سرگرمیاں

چند اہم منصوبے

اردو انسائیکلو پیڈیا اور مختلف لُغات کی تیاری اور اشاعت، ترقی اُردو بیورو کے اہم منصوبوں میں سے ہے۔

۱. اردو انسائیکلوپیڈیا	(۱۲ جلدیں تیار)	۴ جلدیں زیر نظرِ ثانی
۲. انگریزی اردو لغت	(۵ جلدیں تیار)	پہلی جلد زیر اشاعت
۳. اردو اردو لغت	(۱۵ جلدیں تیار)	زیر نظرِ ثانی
۴. اردو اردو لغت برائے طلبا	(ایک جلد تیار)	کتابت زیرِ تصحیح
۵. فرہنگ سیاسیات	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے
۶. فرہنگ ادبی اصطلاحات	(ایک جلد)	پریس میں ہے

اصلاحات سازی

۱۸ شعبوں میں تقریباً ۱۲۲۰۰۰ اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں۔

۱. فرہنگ اصطلاحات کیمیا	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے
۲. فرہنگ اصطلاحات انسانیات	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے
۳. فرہنگ اصطلاحات معاشیات	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے
۴. فرہنگ اصطلاحات حیوانیات	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے

لسانیات، جغرافیہ، نباتیات اور تاریخ و سیاسیات کی فرہنگوں کا کام مکمل ہو گیا ہے۔

چند نئے منصوبے

۱۔ اُردو کتابوں کی ببلیوگرافی

(چھاپہ خانے کی ایجاد سے لیکر ۱۹۴۷ء تک)

ملک کی اہم لائبریریوں میں کام کیا جائیگا۔ فی الحال
مولانا آزاد لائبریری
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کام جاری ہے۔
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام عنقریب شروع کیا جائے گا۔

۲۔ اُردو اداروں کی ڈائرکٹری

ترقی اردو بیورو اور ملک کی تمام اردو اکیڈمیوں کی ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی ہے اور باہمی تعاون سے یہ ڈائرکیٹری مرتب کیجارہی ہے۔ اسی طرح کئی اور اہم کام کیے جارہے ہیں۔

کتابت اور خطاطی کے تربیتی مراکز

اب تک ۲۰ تربیتی مراکز ملک کے مختلف حصوں میں قائم کیے گیے ہیں۔ ان میں دو مراکز اعلا فنِ خطّاطی کی تربیت اور تین مراکز بطور خاص خواتین کے لیے ہیں۔ جلد ہی ایسے اور مراکز بھی قائم کیے جائیں گے

ردو ٹائپ رائٹر اور طباعتی کمپیوٹر

ترقی اردو بیورو نے ملک میں مقامی طور پر اردو ٹائپ رائٹر
تیاری کے سلسلے میں بھی کام کیا ہے۔ چنانچہ اب اردو ٹائپ
ئر ہندستان ہی میں تیار ہو رہے ہیں اور آسانی سے دستیاب ہیں۔
ی طرح طباعتی کمپیوٹر کی تیاری کے سلسلے میں بھی کوششیں جاری ہیں۔

پچھ اور نئے پروگرام

مراسلتی کورس :۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو
یکھنے کے خواہشمندوں کے لیے انگریزی اور ہندی ذریعہ تعلیم
ے اُردو سکھانے کا مراسلتی کورس جلد ہی شروع کر دیا جائے گا۔
ندائی کام مکمل کیا جا رہا ہے۔

تحقیقی رسالہ کی اشاعت :۔ ترقی اردو بیورو کی سرگرمیوں
کے سہ ماہی ترجمان " اردو دنیا " کے علاوہ ایک شش ماہی
یاری تحقیقی رسالہ بھی جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ ابتدائی
یاریاں جاری ہیں۔

مطبوعات کی نمائش اور فروخت

ترقی اردو بیورو ملک کے مختلف اردو مراکز میں ہر سال اپنی
ابوں کی نمائش اور فروخت کا انتظام بھی کرتا ہے۔ پچھلے سال
رو نے دہلی، بھوپال، مدراس اور کلکتہ جیسے اہم مقامات پر
ی کتابوں کی نمائش لگائی تھی۔ گذشتہ مالی سال کے دوران
٣١١٤٥ روپے کی مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس
طرح اب تک کل ١٠٠٦٥٦، ا روپے مالیت کی کتابیں
فروخت ہوئی ہیں۔

بچوں کا ادب

ترقی اردو بیورو اردو میں بچوں کی اچھی اور معیاری کتابوں
کی تیاری اور اشاعت کے سلسلے میں بھی کوشاں ہے۔ اب
تک اس طرح کی اڑسٹھ (٦٨) کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

طبّی کتابیں

طب یونانی کی عام ضرورتوں کے علاوہ نصابی ضروریات کو
پیش نظر رکھتے ہوئے کئی کتابیں لکھائی جا رہی ہیں۔ اب تک
دس (١٠) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

علمی، ادبی، سائنسی اور تکنیکی کتابیں

مختلف علوم و فنون سے متعلق اب تک ٤٥٥ کتابیں شائع
کی ہیں ان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جو اپنے موضوع پر اوّلین تصنیف
ہیں اور کئی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں
گزشتہ مالی سال کے دوران مختلف علوم و فنون سے متعلق ٩٤ کتابیں
شائع ہوئی ہیں جو از خود ایک ریکارڈ اشاعت ہے۔

یہ کتابیں مختلف ریاستوں میں کسی بھی بک سیلر سے خریدی
جا سکتی ہیں براہ راست بیورو سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں

تفصیلات کے لیے ذیل کے پتہ پر لکھیں

بچت کی ایک سرکاری اسکیم جو چھوٹے
بچت کاروں کو 5.5 فیصد ٹیکس سے مستثنیٰ
سُود کے علاوہ 50 روپے تا ایک لاکھ روپے
کے کسی لکی انعام کا مفاد بھی پیش کرتی ہے۔

انعامی اسکیم

ڈاک گھر بچت بنک کھاتے میں کم از کم 200 روپے جمع رکھنے سے آپ پبلک ڈرار کے ذریعے نکالے گئے انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ڈرار ہر سال جنوری اور جولائی میں نکالے جاتے ہیں۔ ہر ڈرار کے تقریباً 22 ہزار انعاموں کی کُل مالیت لگ بھگ 30 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

ڈاک گھر بچت بنک کے تین لاکھ سے بھی زائد کھاتے دار ایسے انعام حاصل کر چکے ہیں۔
آپ اپنے خاندان کے ہر فرد کے نام کھاتا کھلوا کر اپنے انعام جیتنے کے مواقع میں اضافہ کر سکتے ہیں یا آپ مختلف ڈاک گھروں میں اپنے نام سے جتنے جی چاہے کھاتے کھول سکتے ہیں

DAVP 84/49

ڈاک گھر بچت بنک میں 10 اکتوبر تک کھاتہ کھول لیجئے تاکہ آپ
جولائی 85ء میں نکالے جانے والے ڈرار میں شامل ہو سکیں۔

قومی بچت ادارہ بھارت سرکار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۲ / ۸۴-۸۵

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ لکچرر اِن فلاسفی (دو جگہیں) (ایک مستقل اور دوسری عارضی)۔ ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت

۱۔ لازمی (الف) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام جو اعلیٰ درجے کا ہو؛ اور

(ب) اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ فرسٹ یا سکنڈ کلاس میں (بی سیون پوائنٹ اسکیل میں) ماسٹرس ڈگری جو کہ متعلقہ مضمون میں ہو۔ یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الموضوعی ترقیات کے پروگرام کی ضرورت کے تعلق سے مذکورہ بالا الف اور ب کے لیے متعلقہ مضمون میں ڈگری ہونا چاہیے۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے وہ انتہائی اعلیٰ معیار کا ہے تو اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ کسی بھی قابلیت کے سلسلے میں چھوٹ دی جاسکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل امیدوار میسر نہ آئے یا بصورتِ دیگر وہ موزوں متصور نہ ہو تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (اس صورت میں ایم۔فل ڈگری یا مطبوعہ معیاری کام کو وزن دیا جائے گا) کا تقرر کیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیبارٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال کام کیا ہو اس شرط کے ساتھ کہ وہ پانچ سال کے اندر (اپنی تقرری سے) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی کام کا ثبوت پیش کر دے گا۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہ دی جائے گی جب تک وہ ان ضروریات کو پورا نہ کر دے۔

پسندیدہ:- ایک جگہ کے لیے مسلم فلاسفی میں تخصص۔

دوسری جگہ کے لیے   انالاٹیکل ویسٹرن فلاسفی میں تخصص۔

غیر معمولی تجربے اور استعداد کے حامل افراد کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو بطور ٹی۔ اے ریلوے کے سکنڈ
کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔
درخواست دینے کے لیے مجوزہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سلیکشن کمیٹی]
رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی یا
فائنس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر
کے ذریعے ذاتی طور پر یا 23×10 cm سائز کا لفافہ بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔
لفافے پر مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہونا ضروری ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۳ اگست ۱۹۸۴ء [دفتر کے ٹائم تک] ہے
نامکمل اور دیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل غور نہیں ہوں گی

علی گڑھ سے باہر کے تمام امیدوار اپنی درخواستیں رجسٹرڈ پوسٹ سے ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ ایس
جعفری سکریٹری ٹو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام براہ راست بھیجیں

موزوں امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۴/ ۸۴ — ۸۵

مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ منیجر۔ اے۔ ایم۔ یو۔ پریس [مستقل]
شرح تنخواہ ۱۱۰۰ — ۵۰ — ۱۶۰۰ مع دیگر الاؤنس

قابلیت:-

۱۔ لازمی: (الف) کم از کم گریجویٹ ہونا چاہیے۔

(ب) کسی تسلیم شدہ ادارے سے پرنٹنگ ٹکنالوجی میں ڈپلوما کیا ہو۔

(ج) ٹیکنیکل اور سپروائزری کاموں کا دس سالہ تجربہ جس میں کم سے کم تین سال کسی مشہور پریس میں ذمہ دارانہ صلاحیت کے ساتھ کام کیا ہو۔

(د) بشمول قاعدے و قانون، ای ایس آئی، پی ایف وغیرہ انتظامی قاعدوں اور جابوں کی لاگت کا علم ہونا چاہیے۔

(ہ) ہندی اور انگریزی زبانوں سے واقفیت۔

ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جنھیں اردو سے واقفیت ہے اور جنھوں نے سرکاری/ نیم سرکاری پریس یا کسی دیگر مشہور پریس میں کام کیا ہو۔

پسندیدہ:- اردو جاننے والے اور اردو طباعت کا تجربہ رکھنے والے، خاص طور سے موجودہ آفسیٹ شیٹ فیڈ اور روٹری پریس کا تجربہ رکھنے والے قابل ترجیح ہوں گے۔

عمر:- درخواست جمع کرنے کی آخری تاریخ تک ۳۰ سال سے کم نہیں اور ۵۰ سال سے زائد نہیں ہو۔

نوٹ:- اسامی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کا ملازم ہوگا نہ کہ اے۔ ایم۔ یو کا

۲۔ میڈیکل ریکارڈ آفیسر:- (ایک اسامی) (مستقل) جے این میڈیکل کالج ہسپتال

شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای-بی-۳۰-۹۰۰ معہ دیگر الاؤنس۔

قابلیت:- کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے گریجویٹ۔ کسی تسلیم شدہ ادارے سے میڈیکل ریکارڈ سائنس میں ڈپلوما۔ کسی تسلیم شدہ ادارے سے میڈیکل ریکارڈس میں ٹریننگ کا ایک سالہ کورس کیا ہو۔

۳۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ: (نیفرولوجی) (ایک اسامی) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای-بی-۳۰-۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت:- لازمی I بی۔ایس سی

II کسی میڈیکل کالج کی بائیوکیمیکل لیباریٹری میں کام کرنے کا کم سے کم ۳ سالہ تجربہ

پسندیدہ:- I میڈیکل لیباریٹری ٹیکنالوجی میں ڈپلوما

II نیفرلوجی یونٹ میں کام کرنے کا تجربہ۔

۴۔ آرتھوٹسٹ: (ایک اسامی) (مستقل) جے۔این۔میڈیکل کالج ہسپتال۔

شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت:- میٹرکولیٹ یا اس کے مساوی۔ کسی تسلیم شدہ ہاسپٹل میں اسپلنٹ روم میں کام کرنے کا کم سے کم تین سال کا عملی تجربہ۔ آرتھوٹکس یا پروستھیٹکس میں ڈپلوما۔

انسٹرکٹر:- (ایک اسامی) (مستقل) ورکس شاپ یونیورسٹی پالی ٹکنک۔

شرح تنخواہ:- ۴۴۰-۱۵-۵۱۵-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰-ای بی-۲۵-۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت:- (i) لازمی- مکینکل انجینرنگ میں ڈپلوما۔
شیٹ میٹل اور پینٹنگ میں دو سال کا تجربہ۔

مولڈر:- (ایک اسامی) (مستقل) یونیورسٹی پالی ٹکنک

شرح تنخواہ- ۲۶۰-۶-۲۹۰-ای بی-۶-۳۲۶-۸-۳۶۶-ای بی-۸-۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت- پانچ سالہ تجربے کے ساتھ ٹریڈ سرٹیفکیٹ
یا
۱۱ سالہ تجربے کے ساتھ فاؤنڈری ٹریڈ میں تربیت یافتہ۔

پلمبر- (ایک اسامی) (مستقل) بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۸-۳۰۰-ای بی-۸-۳۴۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۰-۴۴۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت ۱- لازمی- کسی آئی-ٹی-آئی/تسلیم شدہ ٹکنیکل ادارے سے پلمبر کے ٹریڈ میں سرٹیفکیٹ ساتھ میں بحیثیت فٹر عملی تجربہ۔
(ii) پسندیدہ- ٹریڈ میں اعلیٰ درجے کی مہارت
عمر:- ۲۵ سال سے کم نہ ہو۔

غیر معمولی اہلیت اور تجربہ کار امیدواروں کو زیادہ ابتدائی دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے بلائے گئے امیدواروں کو بطور ٹی-اے ایک طرف کا سنگل سیکنڈ کلاس ریل کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مجوزہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (انتخاب کمیٹی)، رجسٹرار آفس- اے ایم یو علی گڑھ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ فارم کی قیمت اسامی نمبر ۱ منیجر اے-ایم-یو پریس کے لیے-/5 روپے اور دیگر اسامیوں کے لیے-/3 روپے بذریعے انڈین پوسٹل آرڈر (فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے نام) ادا کرکے یا نقد (فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) ادا کرکے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ فارم بذات خود یا ۱۰ سه × 23 سائز کا پتا لکھا اور ٹکٹ چسپاں شدہ لفافہ روانہ کرکے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواست فارم وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ اگست ۱۹۸۴ء (دفتری اوقات میں) ہے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں زیرِ غور نہیں ہوں گی۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۵/ ۸۴-۸۵

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مجوزہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو افراد ایک سے زیادہ اسامیوں کے لیے امیدوار ہوں وہ ہر ایک کے لیے علاحدہ درخواست روانہ کریں۔

۱۔ ٹکنیکل اسسٹنٹ (اسٹورز) ڈپارٹمنٹ آف باٹنی۔ (ایک) (مستقل)

شرح تنخواہ۔ ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-ای بی-۲۰-۷۰۰ روپے مع الاؤنس

قابلیت ۱۔ لازمی۔ بی۔اے/ بی۔ایس سی/ بی۔کام۔

کسی سرکاری/ نیم سرکاری یا تجارتی ادارے میں سائنٹفک اشیا کی خرید، رکھ رکھاؤ اور حساب کتاب کا ۵ سالہ عملی تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ۔ پورٹ سے نکاسی کے طور طریقوں اور درآمدات کے دستوروں سے واقفیت۔

۲۔ سینیر لیبارٹری اسسٹنٹ (چار اسامیاں) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف باٹنی۔

شرح تنخواہ:۔ ۳۸۰-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت:۔ سابقہ تجربے کے ساتھ سائنس میں ہائر سکنڈری

نوٹ:۔ درج بالا اسامیوں (ٹکنیکل اسسٹنٹ اسٹورز اور سینیر لیب اسسٹنٹ) کے کام کی نوعیت اور تنخواہ اسکیل نظر ثانی کے تابع ہے۔

غیر معمولی تجربے اور تعلیم کے اہل امیدواروں کو زیادہ سے زیادہ ابتدائی تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں بطور ٹی۔اے ایک طرف کا سکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مجوزہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (انتخاب کمیٹی) رجسٹرار آفس اے ایم یو علی گڑھ سے ۳/- روپے نقد (جو کیش سیکشن، فنانس آفس اے ایم یو علی گڑھ میں جمع ہوں گے) یا فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے نام انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے ادا کر کے بذاتِ خود یا ۲۳×۱۰ سم سائز کا پتا لکھا ٹکٹ لگا لفافہ روانہ کر کے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اگست ۱۹۸۴ء (دفتری اوقات کے دوران) ہے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

(رجسٹرار)

فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ

[یونیورسٹی پالی ٹکنک کیمپس]

اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

استہارنمبر ایف سی آئی اے۔ ۲/ ۱۹۸۴ ۔ ۱۹۸۵ء

عہدہ	تعداد پوسٹ	شرح تنخواہ	تعلیمی قابلیت وغیرہ
پرنسپل ۔	ایک	۱۱۰۰ ۔ ۱۶۰۰ روپے	گریجویشن کے ساتھ ہوٹل منیجمنٹ اور کیٹرنگ ٹکنالوجی میں ڈگری یا ڈپلوما (تین سال) کم ازکم سکنڈ ڈویژن یا پوسٹ گریجویٹ ڈگری ۔ انسٹی ٹیوشنل منیجمنٹ میں (کم ازکم سیکنڈ ڈویژن) یا ایم بی اے (کم ازکم سکنڈ ڈویژن) یا ان کے مساوی تعلیمی قابلیت ۔ تجربہ :۔ ہوٹل منیجمنٹ اور کیٹرنگ ٹکنالوجی انسٹی ٹیوٹ میں کم ازکم ۱۰ سالہ تجربہ یا ہوٹل میں یا اس سے متعلقہ پروفیشن جس میں سے پانچ تک ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ یا اس جیسی جگہ اس کا تقرر ہونا چاہیے ۔ پسندیدہ :۔ پوسٹ ڈپلوما، ہوٹل منیجمنٹ ٹیچرس ٹریننگ ڈگری یا ڈپلوما اور اس میں تخصص۔ فرانسیسی زبان کی جانکاری ۔ ہوٹل اور کیٹرنگ انڈسٹری میں تجربہ ۔ ایڈمنسٹریشن، فنانس کا کسی تجارتی یا تعلیمی ادارے میں تجربہ ۔
ایڈمنسٹریٹو آفیسر	ایک	۵۵۰ ۔ ۹۰۰ روپے	منظور شدہ یونیورسٹی کا گریجویٹ ۔ کم ازکم ۸ سال کا ایڈمنسٹریشن میں تجربہ ۔ کسی تعلیمی ادارے کا تجربہ قابل ترجیح ہوگا۔ پسندیدہ :۔ قانون میں ڈگری ۔ اعلیٰ قابلیت کے امیدواروں کو جو تجربہ کار بھی ہوں ابتدا سے اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے۔

مجوزہ فارم پانچ روپے نقد یا سکریٹری فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کے نام انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے ادا کرکے قائم مقام ایڈمنسٹریشن آفیسر فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۲ یونیورسٹی پالی ٹیکنک کیمپس ۶ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔
فارم بذات خود یا ۲۳×۱۰ سینٹی میٹر سائز کا لفافہ جو پتا لکھا اور ٹکٹ لگا ہو روانہ کرکے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اگست ۱۹۸۴ء دوپہر ۳۰-۱ بجے تک ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل غور متصور نہیں ہونگی۔

پروفیسر ضیاء الحسن
قائم مقام پرنسپل/سکریٹری
فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۶/ ۸۵-۱۹۸۴ء

مقررہ فارموں پر درج ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔
پرنسپل جے۔این میڈیکل کالج۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔
شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰- ۶۰- ۱۸۰۰- ۱۰۰- ۲۰۰۰- ۱۲۵/۲- ۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاونسز جو قانون کے تحت آتے ہوں۔ اور نان پریکٹسنگ الاونسز بھی دیے جائیں گے۔ وہ اپنے متعلقہ موضوع تخصص کے تحت پروفیسر بھی ہوگا۔ اور کلینکل ڈیوٹیز بھی اس کے تحت رہیں گے۔
امیدوار کے پاس میڈیکل کوالی فیکیشن ہونا چاہیے۔ مع فرسٹ یا سکنڈ شیڈولڈ کے یا پھر پارٹ سکنڈ شیڈولڈ تھرڈ ۲ لائسینیٹ کوالی فیکیشن کے علاوہ ۶ انڈین کونسل آف میڈیکل ایکٹ ۱۹۵۶ کے تحت۔ ایجوکیشنل کوالی فیکیشن کے حامل امیدوار پارٹ II تھرڈ شیڈولڈ کے تحت دی گئی شرائط پوری کرتے ہوں جو میڈیکل کونسل آف انڈیا سیکشن ۱۳ (۳) ۶ میں دی گئی ہیں۔ ابتدائی یونیورسٹی کی تعلیم یا اس کے مساوی تعلیم ہونا ضروری ہے جو اسٹیٹ/سنٹرل میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کے شیڈول کے تحت دی گئی ہیں۔
قابلیت I لازمی ایم۔ ڈی/ایم۔ ایس/ ایم۔ آر۔ سی۔ پی/ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس۔ یا اس کے مساوی قابلیت میڈیکل سائنس کی کسی برانچ میں ہو۔ کم از کم پانچ سالہ تجربہ ہونا چاہیے کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت پروفیسر کے۔

ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جن کے پاس بحیثیت پروفیسر/ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ یا کسی میڈیکل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے طویل تجربہ ہو۔ اور خصوصی طور پر ایسے اشخاص جو کہ (انتہائی ذمہ دارانہ حیثیت سے کسی تدریسی میڈیکل میں رہے ہوں۔

میڈیکل کالج کے پرنسپل کو چیف سپرنٹنڈنٹ آف میڈیکل کالج ہاسپٹل کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہوگا۔

اا پسندیدہ:۔ ابتدائی یونیورسٹی میڈیکل کوالی فیکیشن اور دوسری تعلیمی قابلیت وصلاحیت ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ بحیثیت پروفیسر/ایسوسیئٹ پروفیسر/ریڈر میڈیکل کالج میں ۱۰ سالہ تجربہ تدریسی تجربہ ہونا چاہیے جس میں سے پانچ سالہ تجربہ بحیثیت پروفیسر کسی ڈپارٹمنٹ میں کم از کم ہونا ضروری ہے۔

پرنسپل۔ ذاکر حسین کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰ - ۶۰ - ۱۸۰۰ - ۱۰۰ - ۲۰۰۰ - ۱۲۵/۲ - ۲۵۰۰ روپیے مع دیگر الاؤنس

قابلیت:۔ امیدوار کو انجینیرنگ کی کسی برانچ میں انتہائی اعلیٰ درجے کی قابلیت ہونا چاہیے اور ساتھ میں بحیثیت ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف انجینیرنگ کالج کی حیثیت سے اضافی تجربہ ہونا چاہیے۔ جو کم از کم پانچ سالہ تجربہ ہو۔
ایک تجربہ کار انجینیر جس کا تعلیمی ریکارڈ اچھا رہا ہو اور طویل عملی تجربہ ہو اور انتظامی تجربہ بھی ہو۔
اور ایسے امیدوار جن کا اپنے انجینیرنگ کے میدان میں قابل قدر کام رہا ہو وہ بھی اس جگہ کے لیے مناسب خیال کیے جائیں گے۔

عمر:۔ عمر کی حد ۵۰ سال کے قریب تک ہونا چاہیے۔

اعلیٰ تعلیمی صلاحیت اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ مطلوبہ فارم اور ہدایات انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے افراد کو بطور ٹی۔ اے ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا سنگل ٹکٹ کا ایک طرف کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔ مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس اے ایم یو علی گڑھ کے دفتر سے پانچ روپے نقد (مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بذات خود یا ۲۳×۱۰ سم کا پتا لکھا اور ٹکٹ چسپاں لفافہ بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳ ستمبر ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل غور متصور نہ ہوں گی

علی گڑھ سے باہر کے امیدوار اپنی درخواست رجسٹرڈ پوسٹ سے بنام ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ ایس۔ جعفری سکریٹری ٹو وائس چانسلر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیج دیں۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

مندرجہ ذیل کاموں کے لیے آئٹم ریٹ کی بنیاد پر سر بمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ اس ڈپارٹمنٹ کے درجہ اول کے ٹھیکیدار یا سی۔پی۔ڈبلو۔ڈی؛ ایم۔ای۔ایس؛ پی۔ڈبلو۔ڈی یا دیگر سرکاری غیر سرکاری تنظیموں کے درجہ اول کے ٹھیکیدار جنھوں نے کم سے کم پچیس لاکھ کی مالیت کا سول ورک کیا ہو وہ ٹینڈر دینے کے مجاز ہیں۔ ٹینڈر کے ساتھ اس طرح کے کام انجام دینے کا سرٹیفکٹ منسلک ہونا ضروری ہے۔ کاموں کی فہرست اور کارکردگی کی سند بھی سر رشتہ کی جائے۔

مالی حیثیت کے تعین کی غرض سے ضروری ہے کہ ٹھیکیدار صاحبان کسی منظور شدہ [scheduled] بنک سے ذاتی طور پر منیجر بنک کا دستخط شدہ سرٹیفکٹ بھی منسلک کریں کہ انھیں بنک سے کتنی رقم حاصل ہو سکتی ہے یعنی:-

Credit worthiness certificate in the form of Solvency certificate

ٹینڈر کے ساتھ ٹھیکیدار صاحبان اپنی فرم سے متعلق تفصیلات یعنی یہ کہ ان کے اسٹاف میں کتنا ٹکنیکی عملہ ہے، کیسا پلانٹ ہے اور تعمیری کام سے متعلق کتنا ساز و سامان ہے۔ ان ٹھیکیداروں کو ترجیح دی جائے گی جنھوں نے ایسی عمارت کی تعمیر کا کام کیا ہو جس میں سینٹرل ایر کنڈیشننگ، ڈسٹ پروف اور آتش زنی کی روک تھام کا بندوبست ہو۔

یونیورسٹی کے انجینئر کے دفتر سے تعطیلات کے علاوہ دفتر کے اوقات میں ٹینڈر فارم وغیرہ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ٹینڈروں کی وصولیابی کے لیے جو وقت مقرر ہے، اس سے دو روز پہلے ٹینڈر فارموں کی فروخت بند کر دی جائے گی ٹینڈر کھلنے کی تاریخ تک ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک ٹینڈر وصول کیے جائیں گے۔

نمبر سلسلہ	کام کا نام	ٹینڈر کی رقم تخمینہ ۱۹۸۱ء کے ریٹ شیڈول کی بنیاد پر
۱۔	کمپیوٹر سینٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بلڈنگ کی تعمیر۔	
I	سول ورک	9,85,075-00 روپے
II	انٹرواٹر سپلائی۔ سینٹری۔ ڈرینج۔ وغیرہ	41,409-00 "
III	اندرونی کام کی قیمت	2,35,363-00 "
2 -	زر ضمانت۔	20,000-00
3 -	ٹینڈر کی قیمت۔	15-00
4 -	تکمیل کی مدت	ایک سال
5 -	ٹینڈر کھلنے کی تاریخ	۲۸ر اگست ۱۹۸۴ء۔ [۳ بجے شام]

لفٹننٹ کرنل۔ حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر۔

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری غذا اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟
سنکارا

Rs. 1-00

161

جلد ۳ — یکم تا ۱۵ ستمبر ۸۴ء — شمارہ ۱۷

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول: نور الحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات

سرورق پر: یونی ورسٹی جامع مسجد — آرٹسٹ: سرفراز

کچھ اپنے بزرگوں سے

سُرخ و سفید رنگ، دراز قد، بھرے بھرے چہرے پر سفید براق گھنیری داڑھی، ہونٹوں پر دلنواز مسکراہٹ، چال میں ایک خاص طرح کا وقار! میں پہلی بار سرِ راہ انھیں دیکھا تو معاً خیال آیا کہ سر سید کا بڑھاپا بھی کچھ اسی شان کا رہا ہوگا۔ جبھی تو ہمارا شاعر ایک فارسی شعر میں یہ خیال ادا کرنے پر مجبور ہوگیا:

وہ دل جو خوب رو جوانوں سے رم کرتا رہا
ایک پیر مرد نے پہلی ہی نظر میں اسے تسخیر کرلیا

پھر دیکھا کہ ان کی کوٹھی کے آگے صبح و شام ضلع کے اعلیٰ افسروں کی کاریں قطار اندر قطار کھڑی رہتی ہیں۔ مجال نہیں کہ ضلع کا بڑے سے بڑا افسر تبادلے کے و[قت] رخصتی سلام کو حاضر نہ ہو یا اس کی جگہ لینے والا نیا حاکم آشیرواد لینے میں ذرا تاخیر کرے۔ میں اس محلّے میں نو وارد تھا۔ جستجو کی تو معلوم ہوا ایک بہت بڑ[ے] عہدے پر تھے، نہایت نیک نامی کے ساتھ مدّتِ ملازمت پوری کی، سبکدوش ہوئے تو سر سید نگر علی گڑھ میں کوٹھی بناکر آباد ہوگئے۔ دن میں پانچ د[فعہ] مسجد تک جانا تو روز کا معمول ہے ویسے گھر سے کم ہی نکلتے ہیں۔ اس کا موقع بھی کہاں کہ صبح سویرے سے رات گئے تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ شو[قِ] ملاقات ایک شام ان کے گھر لے گیا۔ اس دن سرِ راہ انھیں دیکھا تھا تو سر سید یاد آئے تھے آج انھیں رنگا رنگ گلابوں کے تختے میں مصروف پایا تو مرحوم پر[وفیسر] رشید احمد صدیقی کی یاد تازہ ہوگئی کہ ان کا بھی یہی شوق تھا مگر علمی مشاغل کے سوا۔ لیکن خود ان صاحب کی زبان سے سنا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی کُل کائنات اس پائیں باغ میں سمٹ آئی ہے۔ یہی ان کا کارگہِ عمل ہے اور یہی ان کا کل مایۂ نشاط تو ملاقات کی مسرت کچھ ماندسی پڑگئی!

اپنے ایک رفیق سے یہ داستان سنی تو ذہن کی رَو بھٹک کر میر تقی میر تک جا پہنچی۔ ان کے میزبان نے گلہ کیا کہ میر صاحب میں نے تو آپ کے قیام کے لیے ا[س] کمرے کا انتخاب یہ سوچ کر کیا تھا کہ آپ شاعر ہیں، حسن پرست ہیں۔ اس دریچے سے پائیں باغ کا نظارہ کرکے مسرور ہوں گے مگر آپ نے تو اس کے پٹ ہی نہ کھولے۔ میر صاحب نے اپنے گرد بکھرے ہوئے اوراقِ اشعار کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس باغ کی آبیاری سے فرصت کہاں کہ کسی اور باغ کی طرف توجہ کرتا۔ ان کا فیصلہ درست تھا۔ جو پھول ان کی توجہ کا مرکز تھے ان کے رنگ روپ اور بوباس کو کبھی زوال نہیں لیکن جس باغیچے میں ہمارے یہ بزرگوار گم ہیں اس کی بہار دو [دن کی] ہے۔ بے شک یہ شغل بھی خوب ہے مگر کچھ اور کام بھی ہیں جو ان دلچسپ مشاغل سے کہیں زیادہ ضروری ہیں اور اپنی طرف توجہ کرنے والے کو بقائے دوام کی ضمانت دیتے ہیں۔

نہ جانے کیوں یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ مشغولی عمر کے بعد کا زمانہ آرام اور تفریحی مشاغل کے لیے ہے یا پھر یادِ خدا کے لیے۔ دور نہ جاتے ہوئے ہم صرف اتنا یا[د] دلائیں گے کہ سر سید نے ریٹائر ہونے کے بعد جو کارنامے انجام دیے، انھیں حیاتِ جاوید عطا کرنے کے لیے صرف وہی کافی ہیں۔ سر سٹھ برس کی عمر میں انھوں[نے] یہ گلہ کیا تھا کہ —

"وقت کم اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں!"

[ا]ن کی یہ مستعدی آخر وقت تک برقرار رہی اور وہ مرتے دم تک دس آدمیوں کے برابر کام کرتے رہے۔ سر سید کے زمانے سے مقابلہ کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ صحت کا گراف بتدریج اوپر اٹھ رہا ہے اور آج ہمیں اپنے گرد اسّی، نوے بلکہ سو برس کی عمر کے ایسے اشخاص نظر آجاتے ہیں جو ہر لحاظ سے چاق چوبند ہیں اور ا[ہم] سے اہم کام انجام دینے کی جسمانی اور ذہنی صلاحیت رکھتے ہیں بس ارادہ و عمل کی ضرورت ہے۔

بہت سے لوگ تو یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ بڑھاپا بھی کوئی چیز ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے شاید نوے برس کی عمر میں فرمایا تھا —
"ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے۔ بے شک جوانی لوٹ کر نہیں آتی لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی کو قائم رکھنے کے لیے زندگی میں کوئی بلند مقصد ہونا چاہیے۔ مقصد سے زندگی بنتی بھی ہے، بڑھتی بھی ہے، قائم بھی رہتی ہے۔ جوانی چوڑے چکلے سینے، کسے ہوئے ڈنڈ اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڑھاپا سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں آتا۔ جوانی ہمت اور عزم سے ہوتی ہے۔ جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہو!"

ہمیں بزرگوں سے اسی عزمِ جواں کے خواستگار ہیں۔ ہم ان سے کسی جسمانی مشقت کی توقع نہیں رکھتے لیکن ذہنی قیادت کی امید رکھنے میں ضرور حق بجانب ہیں۔ اللہ نے انھیں کم سے کم تین ایسی نعمتوں سے نوازا ہے جو نوجوانوں کے حصے میں عموماً کم آتی ہیں یعنی وسیع تجربہ، راہبری کی صلاحیت اور فرصت کے زیادہ لمحات۔ اگر اس فرصت کا ایک حصہ قومی خدمت اور رفاہی کاموں میں صرف ہو جائے تو اس سے ملک و قوم کا بھلا ہوگا۔ کتنے قومی ادارے ہیں جو ان بزرگوں کی ذرا سی کوشش اور ذرا سی توجہ سے سدھر اور سنور سکتے ہیں۔ رہا یہ خیال کہ عمرِ اخیر تو یادِ خدا کے لیے وقف ہونی چاہیے تو عبادت وہ چیز ہے جو زندگی کے ہر حصے میں ضروری ہے لیکن یہی کافی نہیں۔ سرسید نے محض عبادت کو بخیل نیکی کہا ہے جس سے صرف ہماری عاقبت سدھرتی ہے لیکن اس کے ساتھ خدمتِ خلق بھی شامل ہو جائے تو اس کے ساتھ دنیا بھی سدھر جاتی ہے / خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ خدا کے بندوں کی بہتری کے لیے کوشش کی جائے تو اس سے اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی۔

تہذیب الاخلاق کے کسی شمارے میں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کی یہ دعا آپ کی نظر سے گزری ہوگی کہ خدا بڑھاپا دے تو خوشگوار دے۔ جو چیزیں بڑھاپے کو خوشگوار بناتی ہیں ان میں کچھ تو عطیۂ الٰہی ہیں لیکن انسانی کوشش کو بہرحال ان میں دخل ہے یعنی ذہنی و جسمانی صحت اور آسودہ حالی و فارغ البالی۔ پہلی کا رشتہ زندگی کے ضبط و نظم سے جڑا ہوا ہے اور دوسری کا انسانی محنت سے۔ لیکن ایک تیسری چیز بھی ہے جو اس خوشگواری میں اضافہ کرتی ہے اور وہ ہے ذہنی و جسمانی مصروفیت۔ یہ مصروفیت ہزار برائیوں اور ہزار الجھنوں سے نجات دلاتی ہے۔ خالی دماغ شیطان کا گھر تو ایک انگریزی کہاوت کا ترجمہ ہے لیکن ہمارے ایک بزرگ حسن نے یہ بات بہ اندازِ دگر کہی ہے۔ فرماتے ہیں: جو دل ایک دن بھی بیکار پڑا رہتا ہے اس میں بے شمار عیب جڑ پکڑ جاتے ہیں جن کے ریشے بہت مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم خود کو قومی کام میں مصروف رکھ کر اوروں پر ہی نہیں خود پر بھی احسان کرتے ہیں۔ زندگی کے لمحات یوں بھی ایک بیش بہا دولت ہیں جن کا رائیگاں کرنا ایک عطیۂ قدرت کا برباد کرنا ہے۔ زندگی کی کامیابی کا راز منصوبہ بندی میں پوشیدہ ہے۔ اگر ہم اپنی ملازمت کے بعد کی زندگی کو زیادہ خوشگوار، زیادہ مفید اور زیادہ بامعنی بنانا چاہیں تو کافی پہلے سے اور خوب غور کر کے اس کا نظام مرتب کرنا ضروری ہے۔

یہ گفتگو تو ان حضرات کے بارے میں تھی جو زندگی کی ایک طویل مسافت طے کر چکے اور جو ہر دلیل کے جواب میں یہ عذر تو بہرحال پیش کر ہی سکتے ہیں کہ ہم اپنے منصبی فرائض ادا کر کے تھک چکے لیکن وہ احباب جو اپنی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہیں انھیں بھی اپنی فرصت کے اوقات کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور تعمیری کاموں پر صرف کرنا چاہیے۔

سماج کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جسے خدا نے فکرِ معاش سے آزاد پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس نہ دولت کی کمی ہے اور نہ وقت کی بلکہ ساری خرابی ان دونوں چیزوں کی کثرت کی ہے۔ ان لوگوں کا حال توبۃ النصوح کے میاں کلیم کا سا ہے کہ فہم و فراست سے محروم اور خود غرضوں کے نرغے میں گرفتار ہیں۔ اگر خدا ان لوگوں کو توفیق دے اور ان کے وسائل کا ایک حقیر سا حصہ بھی قوم کے تعمیری کاموں پر صرف ہونے لگے تو ایک عظیم انقلاب کی توقع ہو سکتی ہے۔ مگر ان کے بارے میں تو صرف دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ کچھ عرض کرنا تو یوں فضول ہے کہ ہماری آواز ان کے محلوں تک کیسے پہنچے گی کیونکہ تہذیب الاخلاق جیسے رسالوں کی ان درباروں میں رسائی کہاں!

نورالحسن نقوی

زبان کی اہمیت

اُس زبان سے دُور یا محروم ہو جانا جس کا تعلق آپ کے تمدن، تاریخ اور تہذیب سے ہو، بہت بڑا ذہنی، جذباتی اور روحانی اِفلاس ہے۔ اگر یہ دوری ایک جیتی جاگتی زبان سے ہو تو اس سے زیادہ کربناک محرومی اور مُفلسی تصوّر میں نہیں آسکتی۔ بلکہ ایسی زبان سے بھی جو بظاہر زندہ نہیں ہے، جو اب کہیں بولی نہیں جاتی، دُور ہو جانا ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

امریکہ کے شہر "کنعانِ نو" میں لاطینی زبان کی ایک معلّمہ نے جن کا نام "کیتھلین کالڈران" ہے، اپنے شاگردوں سے کہا کہ عالمی شخصیتوں کو خط لکھ کر یہ دریافت کریں کہ آیا اس زمانہ میں لاطینی زبان پڑھنے سے کچھ حاصل ہوگا۔

ساتویں جماعت کے طالبعلم "کیمسٹن ڈن" کو ڈاکٹر "بارٹلیٹ گیامائی" کی طرف سے یہ جواب موصول ہوا:

" عزیزم، مسٹر ڈن

آپ ہم سے یہ نہ پوچھئے کہ ہم "ایک مردہ زبان کیوں پڑھتے ہیں"

لاطینی زبان مُردہ نہیں ہے۔ یہ جنوبی یورپ کی کئی زبانوں (اطالوی، ہسپانوی، فرانسیسی) کے روپ میں زندہ ہے، خود انگریزی زبان بھی ایک حد تک اسی پر مبنی ہے۔ یہ کلیسا کی زندگی میں جاری وساری ہے اور مغربی دنیا کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ یہ ان اکابر کی تصانیف میں سانس لے رہی ہے جنھوں نے قدیم زمانہ سے "بادلیر" تک اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار اس میں کیا ہے۔ یہ زبان ہمارے دو ہزار سالہ تمدن کا ر[illegible] سے اہم کا[illegible] ہم اپنی تاریخ اور اپنے ورثہ سے آگاہ نہیں ہوسکتے۔

اور اسے جانے بغیر ہم خود کو بھی نہیں پہچان سکتے۔ ہم لاطینی زبان اس لئے بھی پڑھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ اپنی زبان کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ لاطینی پڑھ کر ہم انگریزی سیکھتے ہیں۔ جب ہم انگریزی الفاظ کے لاطینی مادّوں کو کھوجتے ہیں تو ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کے معنی کیا تھے اور کیا ہیں۔ لاطینی زبان کے ذریعہ ہم قواعد بھی سیکھتے ہیں قواعد بیک وقت وہ دیرینہ فن اور سائنس ہے جو ہمیں اپنے خیالات کو اور اس کے نتیجہ میں اپنی حیات کو صفائی، وقار اور سنجیدگی کے ساتھ ترتیب دینا سکھاتی ہے۔

اپنے والدین سے میرا اسلام کہیے اور مسز کیلڈران سے، اور خود آپ کو دُعائیں ہی دُعائیں ——— ظاہر ہے کہ مسز کیلڈران بہت اچھی اُستانی ہیں۔ اس پر تعجب ہونا بھی نہیں چاہیے۔ آخر ان کا نام لاطینی ہے جیساکہ آپ سے خطاب اور آپ کی قدر کرنے والے اس نامہ نگار کا۔

خیر اندیش

الف بارٹلیٹ گیامائی "

انگریزی کے سابق پروفیسر حال وائس چانسلر ییل یونیورسٹی، مندرجہ بالا خط زبان کی اہمیت کے بارے میں ایک قابل قدر دستاویز ہے۔ زبان ہمیں سوچنے اور بولنے، سمجھنے اور اظہار کرنے کے ڈھنگ سکھاتی ہے۔ بلکہ محسوس کرنے کے آداب بھی۔ لہو کی طرح یہ ہمارے رگ و پے میں جاری وساری ہے۔ نہاں خانۂ دل سے لے کر طلسم خانۂ دماغ تک اسی کا سکّہ چلتا ہے۔ حواس خمسہ کائنات سے جو کچھ جذب کرتے ہیں [illegible] زندگی [illegible] سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں انسانی وجود [illegible] سیکھتا ہے وہ سب زبان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انسان [illegible] ساری اجتماعی ترقی، تمام ذہنی تسخیرات، ایک حد تک زبان

ے شدید ترین جذبات اور لطیف ترین احساسات زبان کے ساتھ
ہوئے نظ آتے ہیں۔ دماغ نے جہاں کام کرنا شروع کیا، زبان
ہیں ہوگئی کہ ترجمانی، تعبیر اور توضیح پر وہ مامور ہے۔ ٹیلی کمیونکیشن
ر ذرایع ابلاغ) کا سارا کاروبار دھرا رہ جائے اگر دوسرے گرے
کو ھولنے اور سمجھنے کا سادھن نہ ہو۔ انسانی وجود کے نظام میں
ی اہمیت ایسے ہی سادھن کی ہے۔ انسان کے حواس کچھ اطلاعات
ہیں ان کے کوڈ کو زبان ہی کھولتی اور ان کے منشا و مفہوم کو زبان
نی ہے۔ نطق (گویائی) اور منطق کا مادہ ایک ہی ہے۔ زبان نہ
ـ ف فکر بلکہ زندگی، ترتیب، تنظیم، تعدیل، سلیقہ اور استواری
ر رہ جاتی۔ زبان انسان کی کائنات میں اس طرح پھیلی ہوئی
بدن میں نسیں۔ کروڑوں، اربوں افراد کے درمیان یہ رشتہ
ے۔ فرد اس سے فروغ پاتا ہے، جماعت اس سے شکل پذیر ہوتی
وگ بے غیرت ہیں اور فنا آمادہ، جو اپنی زبان کو بھلا دیتے
ت طمع یا ناعاقبت اندیشی یا کاہلی کی بنا پر اپنی زبان کو مٹنے
ا انسانی جسم کا خاصہ ہے کہ خارجی مادہ کو رد کر دیتا ہے،
انی ذہن بھی اسی طرح خارجی زبان کو اپنے میں پیوست نہیں
ا۔ وہ خارجی زبان سیکھتا ہے لیکن اس کی پذیرائی مہمان کی
ہے، اسے غور و فکر، اور رد و قبول اور داخلی پیغام رسانی کے
یں لاتا۔ ذہن اگر ایسا کرنے لگے تو وہ بے غیرت اور بیسوا ہے۔
بر وباقی رہے گی نہ ساکھ۔ گوشت کا ناخن سے جدا ہونا تصور
لیکن انسان کا اپنی زبان سے جدا ہو کر زندہ رہنا اور اپنے
ار رہنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ جو زبان کو ٹھکرا سکتا
اپنی ماں کو دھتکارنے میں بھی کوئی تامل نہ ہوگا۔

یس چانسلر کے مذکورہ خطاب سے زبان کی وسیع اور دلنواز
ے بارہ میں بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ داد و ستد، اشتقاق،
خودداری، خودشکنی اور افزائش نسل کا وہ سلسلہ جن سے
بقہ رہنا ہے حیرت خیز اور جستجو انگیز ہے۔ الفاظ اپنی صورت
شکل اور معنی صحبت اور سنگت کس طرح بدلتے ہیں، یہ
لکش داستان ہے۔

ملہ اس غیر معروف معلمہ کے بارہ میں جسے وہ
داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اچھے استاد سبق
پنے شاگردوں کے ذہن میں جستجو کو مہمیز دیتے
مع کرتے ہیں اور انھیں استفہام، تجسس، تحقیق،
اور تجزیے کے آداب سکھاتے ہیں۔

سید حامد

کدآشیاں کسی شاخ شجر پہ بار نہ ہو

یہ بات کچھ زیادہ پرانی نہیں کہ ہم ہندوستانی مسلمان مطمئن تھے۔ اپنے ماضی پر نازاں، حال سے بے فکر اور مستقبل سے غافل تھے۔ کسی کو احساس تک نہ تھا کہ ہم نے کیا کھویا ہے اور ہم ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ خدا کا شکر کہ آج ہمیں احساسِ زیاں تو ہے، ہمارے رفیق میداں میں اترے تو ہیں اُنھوں نے کسی شہرت کی خاطر نہیں، کچھ کر گزرنے کے خیال سے اس میداں میں قدم رکھا ہے۔ یہ احساس ہوا تو ہے کہ سائنس اور ریاضی کی تعلیم ضروری ہے اور اس تعلیم میں جو خامیاں ہیں ان کو دور کرنا ہے۔ آج ہم اس حقیقت سے واقف تو ہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کا معیار اچھا نہیں۔ ان میں جن اداروں کی حالت نسبتاً بہتر ہے ان میں ہمارے طلبا اقلیت میں اور جن کی حالت سقیم ہے وہاں ہمارے طالب علم اکثریت میں ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں غیر مسلم بھائیوں کی شرکت ایک اچھی علامت اور اتحاد کی نشانی ہے مگر اس شرکت کا تناسب قابل غور ہے۔

اس پر غور کرنا چاہیے کہ امریکہ پر یہودیوں کا تسلط کیسے ہوا۔ وہ اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر تمام بڑے اداروں پر چھا گئے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو تربیت دی، ان میں مقابلے کا شوق پیدا کیا، اوروں پر سبقت لے جانے کا جذبہ بیدار کیا۔ یہ سب ہمیں بھی کرنا ہوگا اور فلک ناہنجار کا شکوہ ترک کرکے میدانِ عمل میں اترنا ہوگا۔

ہمیں کسی سے عداوت نہیں، برادرانِ وطن آگے بڑھتے ہیں تو اس کی شکایت نہیں بلکہ ہمیں ان کی ترقی سے خوشی ہے کہ یہ ملک کے آگے بڑھنے کی نشانی ہے۔ اس پر ہمارا ردِ عمل مثبت ہے اور ہونا چاہیے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کہیں ہم پسماندہ رہ جائیں، کہیں ہماری پسماندگی ملک کی ترقی کے راستے میں حائل نہ ہو جائے۔ ہم اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور جس ملک کی اتنی بڑی تعداد پسماندہ ہو وہ ترقی یافتہ کیسے کہلا سکتا ہے۔ اگر ہم نے اپنی پسماندگی کو دور نہ کیا تو ہم پر یہ الزام عائد ہوگا کہ ہم اپنے ملک کی خوشحالی کے راستے میں رکاوٹ اور اس کی معیشت پر بوجھ بن گئے۔

سید حامد

(منیجرز اینڈ پرنسپلز کانفرنس کے خطبۂ صدارت سے)

ایک ترکی نظم

محمد ضیاء گوک آلپ ترکی کے عظیم مفکر، سیاسی رہنما اور قومی معلم تھے۔ لیکن ان کا شمار ترکوں کے بلند پایہ شاعروں، نامور ادیبوں اور صاحب طرز انشا پردازوں میں بھی ہوتا ہے۔ ان کو علوم اسلامیہ سے بھی لگاؤ تھا اور تصوف کے ذوق سے بھی آشنا تھے۔ ان کا مصطفیٰ کمال اتاترک اور جدید ترکی جمہوریہ کی تعمیر کے ساتھ وہی رشتہ تھا جو علامہ اقبال کا ہندوستان اور پاکستان کی آزاد مملکت کے قیام کے ساتھ رہا ہے۔ ان کی تخلیقات کی تعداد بہت زیادہ ہے جو علامہ اقبال ہی کی طرح نظم اور نثر دونوں میں ہیں اور ان کا اثر بھی ترکوں کے غور و فکر کی تشکیل پر بہت گہرا پڑا ہے۔ اِس وقت ان کی دو ترکی نظموں کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے پہلی کا اصل ترکی عنوان " دین الی علم" ہے جس کے معنی " دین اور علم" کے ہوتے ہیں یہ نظم ان کے دوسرے مجموعۂ کلام " ینی حیات" کے سب ہی مطبوعہ نسخوں میں ملتی ہے۔ اس ترکی نظم کا ترجمہ اس طرح کیا جا سکتا ہے ؎

انسانوں کے اولین مرشد کون تھے ؟
بلاشبہ پیغمبران اور اولیا
اُس دور میں دین نے عقل و حکمت کی رہبری کی
اخلاق، صنعت، سب اسی دین ہی کے نور سے فروزاں رہے
لیکن اس کے بعد دین کی جگہ خام زہد نے لے لی۔
پس جوشیلا وجدان کم ہو گیا
ولیوں کی برکتیں صرف کتابوں میں رہ گئیں
مرشد کا لقب فقہا کو وراثت میں ملا
ان فقہا کی رہبر صرف روایات ہیں
وہ زبردستی دین کو روایات کی اس راہ پر گھسیٹتے ہیں۔
مگر حکمت کا کہنا ہے کہ عقلیات رہبر ہیں (نہ کہ روایات)
اس صورت میں تم دائیں طرف جاؤ اور میں بائیں طرف

دینا مربیّ بن جاتا ہے اور حکمت معلّم
دونوں روح کو اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں
اُن کی آپس کی جنگ کے دوران
تجربے سے ایک مثبت علم جنم لیتا ہے
یہ آخری استاد (مثبت علم) کہتا ہے کہ روایات تاریخ ہیں
عقل کی راہ پر چلنا تاریخ کا اصول ہے
دونوں ایک ہی بات ثابت کرتے ہیں
مطلوب یہ ہے کہ روح کو اس کا وصال ہو
(لیکن) وہ شے کیا ہے ؟ کیا وہ وجد میں آیا ہوا ایک دل ہے ؟
کیا ہر قدسی شے اس کی زبان ہے ؟
اگر ایسا ہے تو میرے آخری الفاظ پر یقین کرو
دین ہی قلب کے وجدان کا مثبت علم ہے۔

ترجمہ : ———— ڈاکٹر اکمل ایوبی

طنز کے زہر میں ڈوبے

شاعر نے کہا تھا:

وہی الفاظ جو لاتے تھے محبت کا پیام
طنز کے زہر میں ڈوبے تو وہ پیکاں بھی ہوئے

... کو بُرے میں بدل دینا طنز کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ کسی کے ہوش دگوش ... ز ہوتے ہیں تو اسے دانش مند کہتے ہیں۔ الفاظ کو استعمال کرنے کا یہ شریفانہ ... ہے آپ جو کچھ محسوس کر رہے تھے اور کہنا چاہتے تھے وہ آپ نے کہہ دیا۔ ... ھے سادے ڈھنگ سے، خلوص کے پیرایہ میں۔ لیکن اگر آپ کی رائے میں ... سے غلطی یا بے وقوفی سرزد ہوئی ہے اور آپ اس سے کہتے ہیں کہ "آپ بڑے ... ش مند ہیں" تو آپ ایک اچھے لفظ کو بُرے معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔ ایک ... ئے کو جو اچھائی کے لیے وضع ہوئی ہے آپ برائی کے لیے استعمال کر رہے ... بُرے کو اچھا بنا دینا محمود ہے، اچھے کو بُرا بنا دینا مذموم ہے۔ یہ گویا صحبت ... رح ہے۔ اچھے اور نیک اور شریف لوگوں کی سنگت بُروں کے دل سے ... کا زنگ چھڑا دیتی ہے اور بُروں کی صحبت اچھوں کو برائی کے رنگ میں ... دیتی ہے۔ جن لوگوں کے دِلوں میں کجی ہوتی ہے اور زبان میں ترشی، ان ... ذہن و زبان کی صحبت اچھے الفاظ کو بدی کی طرف مائل کر دیتی ہے۔

دل آزاری سے زیادہ بُرا کوئی کام نہیں اور دل آزاری کے لئے طنز سے ... وہ کارگر کوئی وسیلہ بھی نہیں۔ طنز میں غضب کی کاٹ ہوتی ہے۔ نیزے کی ... کی طرح سینہ کو چھید ڈالتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ "تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے ... ن کا گھاؤ کبھی نہیں بھرتا۔" اور زبان کا وہ گھاؤ جسے طنز کی کمک حاصل ... قاتل ہوتا ہے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح وہ نہ صرف اعضا وجوارح کو ... ت ہو چلا جاتا ہے کہ زہر سارے جسم میں پھیل جائے۔ ہدف وقتی طور پر ... لا اُٹھتا ہے اور یہ زخم عرصہ تک رِستا رہتا ہے۔

کوئی پوچھے کہ یہ کون سی انسانیت ہے کہ دائیں بائیں گھاؤ لگاتے ... ے چلیے۔ زخم اور گھاؤ کے ان تاجروں کو ملتا کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ ... سروں کی زندگی کو تلخ کرتے ہیں اور شاید ان کو طنز کے پیچھے تڑپتے ... کر حظ اندوز ہوتے ہیں۔ دوسروں کو ایذا دے کر لطف اٹھانا ایک ... سفلی جذبہ کی تشفی کرنا ہے۔

طنز میں کوئی پہلو اچھائی کا نہیں ہوتا۔ اس کا سرچشمہ گھمنڈ ہے، اس ... محرک اپنی برتری کا احساس اور اس کا مقصود ایذا رسانی۔ دل آزاری سب سے بڑا گناہ ہے اور طنز کرنے والا دل دکھانے والوں میں سرفہرست۔ غور کیجیے یہ حقیر انسان جس کا وجود پانی کے بلبلے سے زیادہ بے ثبات ہے اکڑتا کس بات پر ہے، اور دوسروں کی تحقیر کیوں کرتا ہے۔

ہم نے کہا تھا کہ طنز کا مقصود ایذا رسانی ہے۔ یہ بات پورے طور پر صحیح نہیں۔ بعض اوقات محض تفنّنِ طبع کے طور پر، یا عادت سے مجبور ہو کر یا بہ سبیلِ فقرہ طرازی لوگ طنز کرتے ہیں، لیکن اس وقت بھی طنز میں اپنی برتری کا پہلو چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح طنز کے دونوں سرے برائیوں یعنی تکبّر اور دل آزاری سے جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جیسے کسی کا گھر جلا کر تاپنا۔

طنز کرنے کی عادت چھڑائے نہیں چھوٹتی، بالکل اسی طرح جیسے تکیۂ کلام سے مفر باقی نہیں رہتا۔ ایک صاحب کا تکیۂ کلام تھا "خدا جھوٹ نہ بلائے" حالانکہ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی یہ دعا ہر بار درِ اجابت سے نامراد واپس آئی۔ غالباً اس لئے کہ جو دعا دل سے نہیں نکلتی اثر نہیں رکھتی! یا شاید یہ بات بار بار ان کی زبان سے اس لیے صادر ہوئی تھی کہ انھیں اپنی صداقت سے متعلق گوناگوں شبہات تھے۔

بہرکیف ایک کلمہ کا بار بار دہرایا جانا سامعین کے لیے بارِ خاطر بن جاتا ہے۔ دہرانے والا، یا (دوسرے لفظوں میں) تکیۂ کلام کا ماہر جانتا ہے کہ گفتگو میں ایسے لفظوں کی بار بار تکرار جس سے معنی اور مفہوم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، ناروا ہے کہ اس میں وقت، سانس اور توانائی کا غیر ضروری استعمال ہوتا ہے لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور ہے اس حد تک مجبور کہ اگر وہ تکیۂ کلام کو ترک کر دے تو گونگے پن یا لکنت میں مبتلا ہو جائے۔ یہی حال بعض طنز کرنے والوں کا ہے کہ طنز نہ کریں تو بات نہ بنے، کھانا ہضم نہ ہو۔ ان کا مرض لاعلاج ہے۔

طنز کرنے والا ان سانپوں کی طرح ہے جنھوں نے ضحاک کے شانوں کو مسکن بنایا تھا اور جو روز انسانوں کا مغز کھایا کرتے تھے طنز کرنے والا دوسرے انسانوں کا مغز کھاتا ہے، ان کا خون چوستا ہے، ان کے گھاؤ لگاتا ہے اور ان میں زہر بھرتا ہے۔

یہ باتیں اس طنز طراز پر صادق آتی ہیں جو افراد پر طنز کرتا ہے۔ وہ طنز نگار جو افراد پر نہیں بلکہ انسانیت کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں وہ مختلف سطح پر ہوتے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا طنز نگار اٹھارویں صدی عیسوی کے

انسان کا سارا دین کو بعث ہے۔ اس نے ہی نوع انسان پر جو طنز کیا وہ
کاری، بے درد، نفرت آگیں اور مہلک ہے (اس وقت سے اب تک جو
زمانہ گزرا ہے اس نے سویفٹ کے طنز کے لیے مزید جواز فراہم کر دیا ہے) لیکن
اسے پڑھ کر کسی فرد کو جراحت نہیں پہونچتی، کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔
مرگِ انبوہ جشن می دارد۔ ساری انسانیت پر الزام آئے تو کسی انسان کا کچھ
نہیں جاتا۔ تکلیف وہیں ہوتی ہے جہاں اپنے پر بات آتی ہے، جب برائی
اپنے گرد منڈلاتی ہے، جب کروڑوں انسانوں میں سے طنز یا تحقیر کا
نشانہ ہم ہی کو بنایا جاتا ہے۔

طنز کرنے والا انسان ایک بیمار ہے جو اپنا دفاع دوسروں پر ناخواندہ
حملہ کر کے کرتا ہے۔ جو دوسروں کو تکلیف پہنچا کر مزا لیتا ہے۔ جو شخص
بے دردی کے ساتھ اور اکثر طنز کرے اس کے لیے اپنے دل میں خوش فہمی
کا کوئی گوشہ نہ رکھیے۔ طنز کی تلخی اور اس میں حقارت کی لہر اعلان کرتی
ہے کہ طنز کرنے والے کے دل میں کجی ہے۔ طنز کا علاج دو طریقوں سے کر سکتے
ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا حساب اسی سکّے میں چکایا جائے۔ طنز کا بدلہ سوا طنز
سے دیا جائے۔ اس طریقِ علاج میں اندیشہ یہ ہے کہ مرض متعدی نہ ہو جائے
اور داخلی جراحت خارجی جراحت کا روپ اختیار نہ کرے۔ آستینیں نہ چڑھ
جائیں اور غصّہ کی صفیانی طنز بازوں کو کفت بدہن نہ کر دے۔ دوسرا طریقہ
یہ ہے طنز کرنے والا تبدیلِ ذائقہ اور اصلاحِ نفس کے لیے کبھی کبھی خود پر
طنز کر کے دیکھیے۔ کتنا لطف آتا ہے۔

یہیں ایک بڑا فرق جو طنز اور ظرافت میں ہے، دکھائی دیتا ہے۔
انگریزوں نے "حسِ ظرافت" کی ترکیب میں اس بات کو واضح طور پر شامل
کر لیا ہے کہ انسان خود اپنا مذاق اڑانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کے
لیے بڑے دل کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس طنز کرنے والے کے پاس
جو دل ہوتا ہے وہ حاسد کی آنکھ سے بھی زیادہ تنگ ہوتا ہے۔ طنز کے اجزائے
ترکیبی میں حسد بھی کبھی کبھی داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن بالعموم نہیں۔

لیکن ایک قسم طنز کا ایسی ہوتی ہے جو خود پر کیا جاتا ہے۔ یہ طنز
جائز ہے۔ آپ کو اختیار ہے کہ خود اپنے ساتھ جس قسم کا برتاؤ چاہے
روا رکھیے۔ جو اپنا مذاق اڑانے کی ر... یت رکھتا ہو اس کی بات کا دوسرے بھی
بُرا نہیں مانتے۔

طنز ہر صورت میں ناروا نہیں ہوتا۔ طنز خوش دلی اور شگفتگی، رافت،
اور محبت کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی انسان ان لوگوں پر بھی طنز کرتا
ہے جنھیں وہ چاہتا ہے۔ ایسے طنز میں حقارت نہیں ہوتی، اس کی تہ میں شفقت
اور محبت کا استر لگا ہوتا ہے اور تبسم کے نگمے ٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ باپ جب
مسکراتے ہوئے اپنے نوعمر بیٹے کے لیے جسے عبادت سے غیر معمولی
ہے "مولینا" اور دوسرے خورد سال بیٹے کے لیے جو بحث او
خوگر ہے "بقراط" کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کی بات میں
یا غصّہ نہیں ہوتا بلکہ ملی جلی خوشی اور فہمایش ہوتی ہے۔ جا
طنز وہی ہے جس میں تحقیر اور تذلیل کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو، جو
اپنی برتری کا اعلان نہ کرتا ہو، جس میں عام انسانیت کے ساتھ ا
ہمدردی پرفشاں ہو، اور اس کی ہیئت کذائی پر ایک دلفریب مسکر
دنیا جانتی ہے کہ "کیا کہا گیا ہے"۔ اس سے کم اہم یہ بات
کہ "کس طرح کہا گیا ہے"۔ لب و لہجہ اور اندازِ گفتگو کے تغیر
کے معنی بدل جاتے ہیں اور کبھی کبھی الٹ جاتے ہیں۔ طنز میں تو
اکثر ہوتا ہے۔ طنز کی بات لطیف مسکراہٹ اور خوش دلی سے
گوارا بلکہ خوشگوار ہو جائے گی۔ وہی بات سختی اور درشتی سے
اد کیجیے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔

برائیاں تو بہت ہو گئیں، طنز کی ایک اچھائی بھی بیان کر دی
طنز غیبت کے ساتھ جڑا ہوا کم ہی ملتا ہے، یہ پیٹھ میں چھرا نہیں ...
سامنے سے حملہ کرتا ہے۔ اس میں بے حسی اور بے دردی مل جائے گی
شاید نہ ملے گی۔ غیبت چور ہے اور طنز ڈاکو۔ غیبت ڈر پوک ہے
جری۔ کسی کے پیٹھ پیچھے برائی کرنے سے بہتر ہے اسی کے منھ پر برا
اس لیے یہ عیب چغلی کھانے سے بہتر ہے۔ غیبت کے مقابلہ میں طنز
ہے لیکن بزدلی ایک حد تک اس میں بھی چھپی ہوئی ہے۔ طنز کرنے وا
کمزوروں اور زیردستوں کو نشانہ بناتا ہے۔ جن سے نرکی بہ ترکی
ان سے کتراتا ہوا نکل جاتا ہے۔ انسانیت کے پھوڑوں کے لیے طنز نشتر
کر سکتا ہے، افراد کے لیے خنجر کا۔

لہٰذا ماحصل ساری گفتگو کا یہ ہے کہ بس چلے تو زبان اور قلم
کو طنز سے آلودہ نہ ہونے دیجیے۔ طنز کرنے کا حق اسی کو ہے جو خود
بخشتا ہو جو انسانوں کو محبت اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتا ہو، جو
دیکھ کر دانت نہ پیستا ہو، مسکراتا ہو۔ جسے اپنے متعلق حسن ظن نہ ہو
طنز کی دھار کو لب و لہجہ کی ملائمت سے کند کر سکتا ہو۔ جو دنیا کو
اطفال سمجھتا ہو لیکن خود کو اطفال کے زمرہ سے خارج نہ کرتا ہو، جس
طنز کا انداز چھیڑ چھاڑ کا سا ہو، قطع و برید کا سا نہیں۔ جس کی زبان سے
کے الفاظ اس طرح نکلیں جیسے مزاج کو نوک پلک سے درست کر دیا گیا ہو
کے طنز سے دل کھل جائیں، گھایل نہ ہوں۔ اگر یہ شرطیں پوری کرتے ہوں اور
پابندیوں کو برداشت کر سکتے ہوں تو بسم اللہ، طنز کے میدان میں اتر آئیے۔

سید حامد

بابائے اردو کے عادات و خصائل

مولوی عبدالحق کے عادات و خصائل کو ان کی کامیابی میں بڑا دخل ہے۔ انھوں نے کم عمری سے اچھی عادتوں کو اپنایا اور آخر تک ان پر کاربند رہے۔ اسی میں ان کی لمبی عمر کا راز پوشیدہ ہے۔ مثلاً صبح سویرے اٹھنا ابتدائے عمر سے ان کا معمول تھا۔ اسی طرح کھلی ہوا میں چہل قدمی کرنا انھیں بہت مرغوب تھا۔ انھوں نے رہائش کے لیے ہمیشہ پُر فضا مقامات کو پسند کیا۔ مثلاً جب اورنگ آباد پہنچے تو مقبرۂ رابعہ دورانی سے بالکل ملے ہوئے اس بنگلے کو پسند کیا، جس کے پیچھے پہاڑی سلسلہ اور سامنے کشادہ باغ ہے۔ اورنگ آباد میں قیام کے دوران ہمیشہ صبح شام ٹہلنے کا معمول رہا۔ مولوی صاحب گپتی لے کر نکل جاتے اور ناہموار پہاڑی راستوں پر سیر کرتے حالانکہ یہاں وحشی جانوروں کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس کے بعد جب حیدر آباد گئے تو وہاں بنجارہ ہل پر بنے ہوئے ایک بنگلے کا رہائش کے لیے انتخاب کیا۔ مولوی صاحب کے ایک دوست کا مکان زیادہ روشن نہ تھا۔ مولوی صاحب اسے ہمیشہ 'مکھوہ' کہا کرتے تھے۔ جب وہ وحیدالدین سلیم کی جگہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے تو کمرے میں لکچر دینے کے بجائے اپنے طالب علموں کو لے کر باغِ عام پہنچ جاتے اور وہاں درختوں کے نیچے قدرتی فرشِ زمردیں پر کلاس جماتے تھے۔

مولوی صاحب ورزش بھی کیا کرتے تھے۔ صبح شام اکثر تو پہاڑی پر چڑھ کر یوگ کی ورزشیں کرتے۔ مختلف انداز سے ہاتھوں، ٹانگوں اور جسم کو اِدھر اُدھر موڑتے، آہستہ آہستہ جھک کر دونوں ہاتھوں سے پیروں کے انگوٹھے چھوتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کافی بوڑھے ہوجانے کے باوجود مولوی صاحب خاصے پھُرتیلے تھے۔ انھیں صبح سویرے تازہ پانی سے غسل کرنے کی عادت تھی۔ کوئی موسم ہو اس میں ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ سرد لہر چلتی، تو لوگ گرم پانی سے نہانے کی بھی ہمت نہ کرتے؛ مگر مولوی صاحب کے پروگرام میں فرق نہ آتا۔ دریا کا کنارہ میسر ہو، تو وہ ٹہلنے کے لیے اسے بہت موزوں خیال کرتے اور موقع پاکر دریا میں غسل بھی کرلیتے تھے۔

مہمان نوازی

مولوی صاحب بہت مہمان نواز تھے۔ وہ جہاں بھی رہے ان کا مکان مہمان خانہ بنا رہا۔ جن دنوں مقبرۂ رابعہ دورانی کے قریب قیام تھا، لوگ اورنگ آباد کی سیر کو آتے اور بے تکلف مولوی صاحب کی قیام گاہ پر فروکش ہوتے۔ مولوی صاحب انھیں ٹھہرنے کی سہولت بہم پہنچاتے، ان کے لیے لذیذ کھانے تیار کراتے، ان کی سیر کا انتظام کرتے اور کبھی کبھی خود انھیں سیر کرانے لے جاتے۔ اس دوران میں اصطلاح سازی، فرہنگ نویسی یا کسی اور ادبی کمیٹی کی نشست ہوتی تو مہمانوں کو بھی اس میں شریک کرلیتے اور ان سے بھی رائے لیتے۔ یہ مہمانوں کی عزت افزائی کا ایک طریقہ تھا۔

مولوی صاحب مہمانوں کی خاطر تواضع کرکے اور انھیں اچھے اچھے کھانے کھلاکے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک بار شاگردوں کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد مہمانوں کو وافر مقدار میں خشک میوے بھی فراہم کیے۔ لوگوں نے خوب کھائے اور بہتوں نے جیبیں بھی بھرلیں۔ مہمان رخصت ہونے لگے تو مولوی صاحب دروازے کے پاس کھڑے ہوگئے اور بولے: جن کی جیبیں خالی ہیں، وہ ایک طرف ہوجائیں اور جن کی جیبیں میووں سے بھری ہوئی ہیں، وہ دوسری طرف کھڑے ہوجائیں۔ جن کی جیبیں خالی تھیں، وہ اکڑتے ہوئے ایک طرف کھڑے ہوگئے اور جن کی جیبوں میں میوے بھرے ہوئے تھے، وہ سر جھکائے دوسری طرف کھڑے ہوگئے۔ مولوی صاحب نے خالی جیب والوں کو مخاطب کرکے کہا "تم لوگ نرے نکمے اور ناکارہ ہو۔ اپنے ان ساتھیوں سے سبق لو کہ کھانے کی چیز کھائی اور اس کی قدر کرکے جیبوں میں بھی بھرلیا۔ تم لوگوں نے یہ تو سوچا ہوتا کہ میرے گھر میں تمھارے سوا کون کھانے والا ہے۔ باقی بچے ہوئے میوے برباد نہ ہوں گے؟ — چلو، تم بھی جیبیں بھرو۔" یہ تھا مولوی صاحب کا مدارات کا انداز! ایک بار شاگردوں کی دعوت کی تو قیمہ مہاراجہ کشن پرشاد کے باورچی سے تیار کرایا کیونکہ وہ اس کا ماہر تھا۔ وہ دعوت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ تجربہ کار باورچیوں کو بلواکر ان سے عمدہ کھانے پکواتے اور کھانے سے زیادہ کھلاکے خوش ہوتے تھے۔

کھانے کا شوق

مولوی صاحب کھانے کے بہت شوقین تھے۔ ان کی اپنی خوراک بہت کم تھی، مگر سادہ، نفیس اور لذیذ کھانا پسند کرتے تھے۔ دوست ان کی اس عادت سے خوب واقف تھے۔ ایک مرتبہ نواب وقارالملک نے ان کی دعوت کی اور لطف لینے کے لیے دسترخوان پر صرف دال روٹی لگوادی۔ مولوی صاحب نے کھانا دیکھا، تو سمجھ گئے کہ یہ محض مذاق ہے لیکن اسے اداکاری کہیے یا کچھ اور کہ وہ طنطنے میں فوراً جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہمیں دال ہی کھانی ہے تو اپنے گھر نہ کھالیں گے۔ اس پر سب ہنس دیے اور مولوی صاحب کی پسند کے کھانے چن دیے گئے۔

مولوی صاحب گوشت کم کھاتے تھے، سبزیاں زیادہ۔ میٹھے کے بہت شوقین تھے۔ کھانے کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور کھاتے مگر بہت تھوڑی سی۔ لوگ کہا کرتے تھے مولوی صاحب میٹھا کھاتے کیا ہیں، سونگھتے ہیں۔ ان کے ذخیرے میں ہر طرح کا گڑ موجود رہتا تھا۔ ان کے ایک دوست ربانی صاحب کو گڑ کی ضرورت پڑی۔ مولوی صاحب سے گڑ مانگا، تو انھوں نے پوچھا: "کہاں کا گڑ چاہیے — بیدر کا؟ تلنگانہ کا؟

زوال کی نشانی

زوال یافتہ قوموں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اٹھتے ہوئے کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کا ... کیکڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کیکڑا دیکھنے سے ان کا ... ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں شاید یہی مساوات کا تقاضا ہے۔

کارزارِ دنیا

کارزارِ دنیا میں ... کام نہیں چلتا۔ یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں، ... کھانے پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے۔ جو اس کے لیے تیار نہیں اس کے لیے ... ہو جانا ہی بہتر ہے، بلکہ سرے سے اُسے میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے

شوق اور محنت

شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں۔ جسے ہم کمال کہتے ہیں، وہ انہی دونوں کا خانہ زاد ہے۔

...کا ہے؟ لیکن پھلوں کی مٹھاس انھیں سب سے زیادہ پسند تھی۔ کہا کرتے تھے: ...وں کی مٹھاس کسی میٹھے میں پیدا کرنا ممکن نہیں۔ میووں کے تیار کرنے میں قدرت ...ں صرف کرتی ہے۔ میٹھا کیسے ہی اہتمام کے ساتھ کیوں نہ پکایا جائے، میووں ...ں نہیں ہو سکتا۔" اسی لیے ان کا دسترخوان کبھی موسمی پھلوں سے خالی نہ ہوتا تھا ...ے تو وہ عاشق تھے۔ مگر دہلی کے آم چھوڑ کے اورنگ آباد جانا پڑا تو لکھتے ہیں: ...ں برسات میں اورنگ آباد جاؤں گا۔ صرف ایک مشکل ہے۔ وہ آموں کا موسم ہوتا ... ایسے آم وہاں نہیں ملتے۔ برسات میں اورنگ آباد جنت ہوتا ہے، اور دلی دوزخ ... ایسی جنت کس کام کی، جس میں آم نہ ہوں۔ اس سے تو وہ دوزخ اچھا جس میں ...ے کو آم تو ملیں"۔ موسمی پھلوں کے ساتھ خشک میوے بھی ان کے دسترخوان پر موجود رہتے تھے۔ اچھا چاول کہاں کہاں ملتا ہے، اس سے بھی وہ اچھی طرح ...ف تھے اور اکثر دوسرے مقامات سے منگاتے رہتے تھے۔

مولوی صاحب حقّے کے شوقین تھے اور اسے رفیقِ تنہائی کہا کرتے تھے۔ کہتے جب میں اکیلا ہوتا ہوں، تو یہ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ حقّہ نوشوں کی زبان سے ...سنا گیا کہ حقّے کی گڑگڑاہٹ احساسِ تنہائی کو مٹاتی ہے، طبیعت میں امنگ پیدا ...ہے، اور خیالات کو رفعت بخشتی ہے۔ یہ بات سچ ہو یا محض شاعری، مگر اتنا ضرور ... مولوی صاحب نے حقّے کی رفاقت میں بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیے۔ ...تمباکو بھی وہ دُور دُور سے منگاتے تھے اور ہر علاقے کے تمباکو کی خصوصیت ...واقف تھے۔ اسی شان سے چائے نوشی کا بھی اہتمام کرتے تھے۔

...ت پسندی

مولوی صاحب بہت نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ کھانا ہو، کھانے کے برتن ہوں، لباس ہو، کمرے کی سجاوٹ ہو، کتاب کی طباعت ہو — ہر معاملے میں انھیں صفائی، ستھرائی اور نفاست کا خیال رہتا تھا۔ سلیقہ مندوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں اور خردوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے۔ نشست و برخاست کے آداب، خورد و نوش کے آداب، ان کے نزدیک بہت اہمیت رکھتے تھے۔

ایک صاحب ان کی ملاقات کو آئے۔ یہ صاحب ولایت سے تازہ وارد ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے چائے سے تواضع کی۔ ان کی شامت جو آئی، انھوں نے چائے میں بسکٹ ڈبو لیا۔ مولوی صاحب بے مزہ ہو کے چائے کی میز سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بہت غصّے سے ان صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا: "تم نے چائے کا سارا مزہ خراب کر دیا۔ چائے میں بسکٹ ملا کے پینا انتہائی گھناؤنی حرکت ہے۔ اس طرح نہ چائے کا مزہ آتا ہے، اور نہ بسکٹ کا۔" پھر اُن کے ساتھی سے بولے: "ان کے لیے ایک اور چائے کی پیالی بناؤ اور اس میں سموسہ، پاپڑ اور دال سیو ڈال دو تاکہ ان کا پیٹ بھر جائے۔ یہ لوگ پیٹ بھرنے کے لیے چائے پیتے ہیں۔ بلکہ یہ چائے پیتے نہیں، چائے کھاتے ہیں"۔

مولوی صاحب بے ہنگم اور بد لباس آدمیوں سے ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ ایک بار اردو کے سلسلے میں وفد لے کر ایک اعلیٰ افسر کی کوٹھی پر گئے، لیکن اس سے ملاقات کیے بغیر لوٹ آئے۔ بولے "یہ تو صورت سے بیہر الگتا ہے۔ اس سے ہرگز توقع نہیں کہ یہ اردو کے معاملے پر ہمدردی کے ساتھ غور کر سکے"۔

شاگردوں سے محبّت

ایک استاد میں اپنے شاگردوں کے لیے جتنی ہمدردی اور شفقت ہونی چاہیے، مولوی صاحب میں اس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ ان کے اپنے بیوی بچے تو تھے نہیں، جتنی آمدنی تھی وہ اردو کے لیے وقف تھی، یا پھر شاگردوں کے لیے۔ انھیں اپنے ہر شاگرد کی ضرورت کا خیال رہتا تھا اور اسے کسی نہ کسی طرح پورا کرتے رہتے تھے۔ کسی کو سائیکل کی ضرورت ہے، مولوی صاحب اپنے پاس سے دلا دیں گے، کسی کے پاس کپڑوں کی کمی ہے، مولوی صاحب اس کی کو ضرور پورا کر دیں گے۔

مولوی صاحب جس زمانے میں اورنگ آباد کالج سے وابستہ تھے، ان کی تنخواہ کالج کے منتظم مولوی محمد علی کے پاس رہتی تھی۔ کالج کے جس طالب علم کو روپے کی ضرورت ہوتی، وہ سیدھا مولوی صاحب کے پاس پہنچتا۔ وہ فوراً محمد علی صاحب کے نام رقعہ لکھ دیتے کہ انھیں اتنے روپے دے دیجیے۔ محمد علی صاحب روپے دے دیتے اور حساب میں لکھ لیتے کہ فلاں طالب علم کو اتنے روپے قرض دیے۔ اب طالب علم کو چاہیے تو یہ تھا کہ روپے محمد علی صاحب کو ادا کرتا، اور بہت کرتا تو مولوی صاحب کو اس کی اطلاع کر دیتا۔ لیکن یہ تو جب ہوتا کہ کوئی روپیہ ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس لیے طالب علم روپے لے کر مولوی صاحب کے پاس جاتے اور وہ ڈانٹ کر بھگا دیتے کہ اچھا اب تم اس قابل ہو گئے کہ مجھے روپے لوٹاؤ گے۔ محمد علی صاحب ایسی باتوں سے بہت جھنجلاتے تھے، مگر وہ بیچارے کر کیا سکتے تھے۔

مہمان نوازی تو مولوی صاحب کی فطرت میں داخل تھی مگر اپنے رفقائے کار اور اس سے زیادہ اپنے شاگردوں کی خاطر تواضع کر کے انھیں خوشی ہوتی تھی۔ وہ دعوت کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکال لیتے تھے۔ ہاسٹل کے لڑکوں کا کوئی خاص چیز کھانے کو جی چاہتا

تو وہ کوئی بہانہ بنا کے بھوک ہڑتال کر دیتے۔ مولوی صاحب فوراً بلواتے اور طرح طرح کی چیزوں سے تواضع کرتے۔ کبھی شاگرد صرف ملاقات کو پہنچ جاتے تب بھی اسی طرح خاطر تواضع کرتے۔ کہتے: "اچھا تمھیں خوشبو پہنچ گئی کہ میرے پاس پشاور سے مردے آتے ہیں۔" کبھی کہتے: "اچھا صاحب نے جاسوسی کر دی کہ حلوہ سوہن آیا رکھا ہے۔ لاؤ بھئی، فینسی صاحب، حلوہ لاؤ۔" فینسی صاحب ان فضول خرچیوں پر کڑھتے، مگر حکم کی تعمیل کرتے۔ فینسی صاحب کا نام عبدالرحیم تھا اور یہ کالج میں کھیل کے انچارج تھے۔ خوش لباس آدمی تھے اس لیے ایک انگریز پروفیسر نے انھیں خطاب دے دیا۔ لوگ ان کا نام بھول گئے اور فینسی صاحب کہنے لگے۔

مولوی صاحب ہمیشہ اپنے شاگردوں کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی بہتری اور بھلائی کے لیے وہ جو کچھ کر سکتے تھے، اس کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ تعلیم کے دوران وہ ہمہ وقت اپنے شاگردوں کی لیاقت میں اضافہ کرنے، ان کی صلاحیتوں کو چمکانے اور ان کے کردار کے بلند کرنے کی تدبیروں میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد شرف الحق ایک مرتبہ کلاس میں عمدہ سوٹ پہن کر آئے۔ اس موقعے پر مولوی صاحب نے یہ پُر لطف تقریر فرمائی:۔

"دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے پہچانے جاتے ہیں اور پہچانے جاتے رہیں گے۔ مگر کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو پہچانے جاتے ہیں جولاہے، درزی، موچی، حجام اور دھوبی کی وجہ سے، جن میں ہمارے ایک دوست جناب شرف الحق صاحب بھی ہیں۔ اگر ان کا یہ سُوٹ بُوٹ اُتار لیا جائے تو بتاؤ پھر یہ کیا رہ جاتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میرے کالج کے جو بچے نکلیں، وہ اپنی صلاحیتوں سے پہچانے جائیں۔"

مولوی صاحب خود نفاست پسند انسان تھے، اور خوش لباسی کو پسند کرتے تھے۔ اُوپر نقل کیے گئے الفاظ میں عمدہ لباس پر چوٹ نہیں، بلکہ ظریفانہ انداز میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اصل چیز انسان کے ذاتی اوصاف ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کو زندگی میں کامیاب اور سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے جب بھی موقع ملتا، وہ انھیں کام کی باتیں سمجھایا کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں سے انھیں بہت محبت تھی۔ اورنگ آباد کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوتے وقت انھوں نے جو تقریر کی تھی اور جس کا اقتباس اُوپر گزرا اس نے سامعین کو رلا دیا تھا۔

استاد شاگرد کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ شفیق استاد ہمیشہ اپنے شاگردوں کو محبت سے یاد رکھتا ہے، اور سعادت مند شاگرد کے دل میں استاد کا احترام ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ مولوی صاحب کے شاگرد ہمیشہ ان کی شاگردی پر فخر کرتے رہے اور مولوی صاحب ہمیشہ ان کے بہی خواہ رہے اور جب بھی اور جس طرح بھی کسی شاگرد کے کام آ سکے، ضرور کام آئے۔

دوسروں کی مدد

حاجت روائی کرنا اور دوسروں کے کام آنا مولوی صاحب کے مزاج کا خاصّہ تھا۔ جو مدد ان کے امکان میں تھی، اس سے وہ دریغ نہ کرتے تھے۔ اس معاملے میں قرابت داری، ہم وطنی کوئی چیز ضروری نہ تھی۔ کوئی شخص کہیں کا رہنے والا ہو، کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو، ان کا لطف سب پر یکساں تھا۔ کسی تعلیم یافتہ شخص کو مولوی صاحب نے

اخلاقی قوّت

جو لوگ علم پر قدرت حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں بڑی کڑی تیاری اور محنت جفاکش کی ضرورت ہے۔ یہ زاہد کا سا زہد اور صوفی کی سی توجہ چاہتی ہے۔ اصل مقصد تک پہنچنے کے لیے اخلاقی قوت لازم ہے۔ اسی قوت سے فرض شناسی اور ذمہ داری عطا ہوتی ہے۔

خام خیالی

بیرونی امداد بڑی کارآمد اور مفید چیز ہے بشرطیکہ دلوں میں شوق اور جوش اور ہمت ہو۔ لیکن اگر کوئی چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لیے سب کچھ ہوتا جائے تو یہ محض خیالِ خام ہے۔

غلطی کیوں

غلطی وہی کرتا ہے، جو کچھ کرتا بھی ہے۔ جو کچھ کرتا ہی نہیں وہ غلطی کیا کرے گا۔

مالی دشواری میں پایا تو اس کا حل یہ نکالا کہ انجمن کا کوئی علمی کام اس کے سپرد کر دیا اور پھر اس کا معقول معاوضہ دیا۔ اس طرح بعض لوگوں کی تعلیم منقطع ہونے سے بچ گئی۔

جب سفارش کی ضرورت ہوتی تو مولوی صاحب کبھی سفارش کرنے میں پس و پیش نہ کرتے۔ ایک لکچرار صاحب کی سفارش کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"ابراہیم کے لیے خط لکھنے یا سفارش کرنے کو جی بالکل نہیں چاہتا۔ اس شخص نے بمبئی کے معاملے میں کچھ نہیں کیا اور دو سال سے برابر سبز باغ دکھا رہا ہے۔ دوسرے حیدر آباد جا کر بہت پچھتائے گا۔ جو اورنگ آباد سے گیا پچھتایا، اور یہ ٹھیرا دیوانہ۔ اس سے کیسے نبھے گی۔ اب تمھارا اصرار ہے تو لکھتا ہوں اور امید ہے کہ پروفیسر صاحب جلد ہی لیبر آفیسر ہو جائیں گے۔ دانت تو پہلے ہی نکلوا چکے ہیں، اب تھوڑی بہت عقل جو باقی رہ گئی ہے، وہ بھی نذرِ لیبر ہو جائے گی۔"

ایک نوجوان کی سفارش کے سلسلے میں تو مولوی صاحب کو بہت عجیب تجربہ ہوا۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ اسے اپنے ساتھ لے کر ایک اعلیٰ عہدیدار کے پاس گئے۔ جس ملازمت کے وہ صاحب امیدوار تھے، اس سے کم درجے کی ایک جگہ مولوی صاحب کی سفارش پر ان کو دے دی گئی۔ تقرری کا پروانہ دیتے وقت متعلقہ کلرک نے ان سے کہا کہ لیجیے، یہ نوکری تو آپ کو مل گئی، اب ترقی خود آپ کے اختیار میں ہے، جب چاہے کیجیے۔ ان کی سمجھ میں ان کی بات کا مطلب نہ آیا۔ وضاحت چاہی تو معلوم ہوا کہ جس جگہ کے لیے آپ امیدوار ہیں، اس پر تقرر کرنے کی رشوت صاحب بہادر چار ہزار روپے لیتے ہیں۔ آپ مولوی صاحب کے آدمی ہیں اس لیے آپ سے وہ صرف دو ہزار لیں گے اور موجودہ ملازمت تو اس سفارش پر آپ کو مفت دے دی گئی حالانکہ اس کے بھی دو ہزار مقرر ہیں۔ اس واقعے کا ان صاحب پر ایسا بُرا اثر پڑا کہ انھوں نے ملازمت کا ارادہ ہی

نیک برتاؤ

بُرے اتنے بُرے نہیں ہوتے اور نہ اچھے اتنے اچھے جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ اکثر یہ
وتا ہے کہ سوسائٹی اپنے برتاؤ سے بعض خوددار شخصوں کو بُرا بنا دیتی ہے، جیسے پولس
بعض شریفوں کو باغی اور ڈاکو بنا دیتی ہے۔ نیک برتاؤ کرنے سے وہ بھی اچھے ہو جاتے
یں، اور بعض اوقات اچھوں سے بھی اچھے کیونکہ انھیں بدی کا بھی تجربہ ہوتا ہے، جو
یکوں کو نہیں ہوتا۔

درجۂ کمال

درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی
کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔

مخالفت امتحان ہے

مخالفت بیدار کرتی ہے، عملی قوت کو اُبھارتی ہے اور انسان کے ان جوہروں کو
جلا دیتی ہے، جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت در پردہ امتحان ہے۔

ک کر دیا۔ مولوی صاحب کو بھی ان کے اس فیصلے پر مسرت ہوئی۔

غرض مولوی صاحب ان لوگوں میں نہ تھے جو اپنا کام تو ہر طرح نکال لیتے ہیں
اور دوسرے کے لیے کچھ کرنا پڑے تو ان کے اصول آڑے آتے ہیں۔ مولوی صاحب کا
قول یہی تھا کہ جس کے کام آسکو ضرور آؤ اور جو مدد کر سکو، ضرور کرو۔ ان کی سعی و سفارش
سے نہ جانے کتنوں کو ملازمت ملی اور نہ جانے کتنوں نے ترقی پائی۔ مولوی صاحب
سفارش میں ایک شان اور ان کی مدد میں ایک سلیقہ تھا۔ ایک مثال سے اندازہ ہوگا کہ
اپنا مدعا کس خوبصورتی سے بیان کرتے تھے۔

مہاراجا کشن پرشاد جو حیدرآباد کے بے تاج بادشاہ تھے، مولوی صاحب سے
بہت محبت کرتے تھے۔ جب بھی وہ اورنگ آباد جاتے، مولوی صاحب سے ضرور ملتے۔
ایک بار انھوں نے مولوی صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا
پہلی مشاعرہ اسٹیج کیا جائے۔ مولوی صاحب نے فوراً تعمیل کی۔ لوگ دور دور سے اس
سے کو دیکھنے آئے اورنگ آباد کی تاریخ میں یہ ایک یادگار جلسہ ثابت ہوا۔ مہاراجا بہت
خوش ہوئے اور انھوں نے مولوی صاحب کو بہت مبارک باد دی۔ اس پر مولوی صاحب
نے کہا کہ اس جلسے کی کامیابی کا سہرا رضا نواز جنگ صوبے دار اورنگ آباد کے سر ہے، مگر
افسوس ہے کہ یہ اگلے سال اورنگ آباد میں نہیں ہوں گے۔ مہاراجا مولوی صاحب کے
مطلب کو سمجھ گئے۔ انھوں نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار اتار کے رضا نواز جنگ
کے گلے میں ڈال دیا اور ان کی ملازمت میں ایک سال کی توسیع کر دی۔

ادرسی

مولوی صاحب بہت انصاف پسند انسان تھے۔ کہیں ظلم اور ناانصافی دیکھتے
تو ان کا غصہ قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ مظلوم کے حامی اور مددگار رہے۔ اپنے ماتحتوں
کے ساتھ انھوں نے ہمیشہ نرمی اور محبت کا سلوک کیا لیکن کسی نے اپنے ماتحت کے ساتھ
کوئی زیادتی کی، تو انھوں نے فوراً اس کا تدارک کیا اور ظالم کو سزا دی۔

ایک مرتبہ مہاراجا کشن پرشاد مولوی صاحب کی ملاقات کو ان کی رہائش گاہ پر تشریف
لائے۔ ان کے اردلی اور خدمت گار چاروں طرف نگرانی پر مامور ہو گئے۔ مقبرۂ رابعہ درانی
کے نزدیک ایک مختصر سے کمرے میں مولوی صاحب کی رہائش تھی۔ ظاہر ہے باہر ہونے
والی ہر بات اندر سنی جا سکتی تھی۔ ذرا دیر میں اندازہ ہوا کہ کوئی شخص اندر آنا چاہتا ہے
اور لوگ اسے روک رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے پوچھا "کیا بات ہے؟" پتہ چلا کہ کسی
اسکول کا چپراسی ہے، جو اپنے ہیڈ ماسٹر کے خلاف شکایتی عرضی لایا ہے۔ مولوی صاحب
نے کہا "عرضی لے لو اور اس سے کہو کل صبح آئے"۔ منشی محمد علی نے جواب میں عرض کیا کہ
"درخواست کے ساتھ ایک جوتا بھی ہے، جس سے ہیڈ ماسٹر نے اسے مارا ہے"۔ کہا:
"وہ بھی لے لو"۔ اگلے دن صبح کو وہ چپراسی آیا۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے ساتھ بٹھا کے
ناشتہ کرایا اور ساری شکایت سنی۔ پھر پوچھا "تم کیا چاہتے ہو۔ تمھارا کہیں تبادلہ کر دوں
یا ہیڈ ماسٹر کا؟" اس نے جواب دیا: "سرکار، میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ چار
روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ کہیں اور چار روپے میں کیسے گزر کروں گا؟" مولوی صاحب نے
اسی وقت سزا کے طور پر ہیڈ ماسٹر کا تبادلہ کر دیا۔

خودداری

مولوی صاحب بہت غیور اور خوددار واقع ہوتے تھے؛ خوشامد اور چاپلوسی سے
بالکل ناآشنا تھے۔ جس کسی سے ملتے، برابری سے ملتے۔ انھیں دوسروں کی عزت
کا بھی خیال رہتا اور خود اپنی عزت کا بھی۔ وہ حیدرآباد جیسی جگہ میں رہے۔ جو سازشوں کا
گڑھ تھا اور اسی لیے وہاں جھوٹ اور خوشامد کے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ وہاں بھی
مولوی صاحب اس طرح رہے کہ انھوں نے اپنے دامن کو غلاظتوں سے آلودہ نہ ہونے
دیا۔ صاف ستھری اور عزت کی زندگی گزاری۔

اپنی عزت کا خیال وہی رکھ سکتا ہے جو دوسروں کی عزت کا خیال رکھنا بھی جانتا
ہو۔ وہ ایک دورے سے اس لیے خفا ہو کے لوٹ آئے کہ محکمۂ تعلیم کے ایک اعلیٰ افسر
نے استاد کو طالب علموں کے سامنے ڈانٹ دیا تھا۔ ایک استاد کے کام سے خوش ہو کر مولوی
صاحب نے معائنے کی کتاب میں لکھا تھا کہ ایسے لائق استاد کی ماتحتی میں مجھے کام کرنے
کا موقع ملے تو میں اسے اپنی خوش نصیبی جانوں گا۔

نواب وقارالملک بڑے اصول کے آدمی تھے۔ ایک بار انھوں نے انجمن ترقی اردو
کی مدد میں کچھ دیر لگا دی اس لیے کہ ان کے سامنے جو فائل پیش ہوئی، وہ مکمل نہ تھی۔ نواب
صاحب جب نماز کے لیے کھڑے ہونے لگے تو مولوی صاحب نے ایک چبھتا ہوا جملہ کہہ دیا
کہ روزہ نماز انہی لوگوں کو زیب دیتا ہے، جو قومی خدمت میں دریغ نہ کرتے ہوں۔

مولوی صاحب نے سرسید کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی اور علمی
زندگی کے بہت سے سبق انہی سے سیکھے تھے۔ انھوں نے سرسید کا ایک پُرلطف
واقعہ لکھا ہے۔ ایک بار اسٹریچی ہال میں ایک جلسہ ہوا۔ تقریب ختم ہونے کے بعد
سب لوگ جلسہ گاہ سے باہر چلے گئے۔ آخر میں سرسید میز سے کاغذ سمیٹتے ہوئے
رہ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ باہر سے لڑکے آ آکر سیٹوں پر بیٹھتے جاتے ہیں۔ انھوں نے
معلوم کیا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ پتہ چلا کہ بمبئی سے آتے ہوتے ایک سیٹھ صاحب لڑکوں کو

مٹھائی تقسیم کریں گے۔ سید صاحب کا غیظ و غضب تو مشہور ہے۔ وہ آگ بگولہ ہو گئے اور بولے: "کم بختو، تمھیں غیرت نہیں آتی کہ مٹھائی لینے کے لیے یوں محتاجوں کی طرح قطاروں میں آ کے بیٹھ رہے ہو۔ کچھ تو شرم ہونی چاہیے۔" مولوی صاحب جب محکمۂ تعلیم سے متعلق تھے جب بھی بالکل ایسا ہی ایک واقعہ خود ان کے ساتھ پیش آیا۔ مولوی صاحب نے ایک اسٹیشن پر اسکول کے لڑکوں کا ہجوم دیکھا۔ پوچھا، یہ کس لیے آئے ہیں؟ معلوم ہوا ریاست کے ایک رئیس جو محکمۂ تعلیم کے افسر تھے اور مولوی صاحب تو دراصل انھی کے استقبال کے لیے اسٹیشن آئے تھے، وہ ان بچوں کو مٹھائی تقسیم کریں گے۔ مولوی صاحب کو یہ بات اتنی ناگوار گزری کہ ٹرین آنے سے پہلے ہی وہ واپس چلے گئے۔

بے نیازی

مولوی صاحب دنیوی فائدوں سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کے مزاج میں پیسے پیسے کی طمع کبھی داخل ہو ہی نہ سکی۔ بلکہ انھوں نے تن من دھن سے قومی خدمت کی۔ جو کچھ کمایا وہ یا تو اردو پر نچھاور کر دیا یا دوستوں اور شاگردوں پر صرف کر دیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا تھا جو ان کی زندگی میں انھیں وصول ہو گیا تھا۔ یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ انھوں نے یہ خطیر رقم انجمن ترقیِ اردو کے کاموں پر صرف کر دی۔

مولوی صاحب نے درسی کتابیں تیار کی تھیں جو حیدر آباد میں داخلِ نصاب تھیں۔ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں شایع ہوئیں اور اس سے خوب منافع ہوا لیکن مولوی صاحب نے منافع میں حصّہ لیا نہ حقِ تصنیف (رائلٹی) وصول کیا۔ وہ اردو کی ہر خدمت بے غرض کرتے تھے۔ جو شخص اپنا روپیہ اردو کے کاموں پر صرف کر دیتا ہو وہ بھلا معاوضہ لینا کیونکر پسند کرے گا۔ مولوی صاحب نے اردو کی ترقی کے لیے بے حساب دورے کیے، جگہ جگہ انجمن کی شاخیں قائم کیں اور شہر شہر اردو کا پرچار کیا۔ ایک اندازے کے مطابق مولوی صاحب نے پانچ لاکھ میل سفر کیا۔ یہ سفر فرسٹ یا سکنڈ کلاس میں ہوتا تھا بعض مواقع پر ان کا باورچی بھی ساتھ ہوتا تھا جو تھرڈ کلاس میں سفر کرتا تھا۔ سفر کے اخراجات کہا جاتا ہے مولوی صاحب اپنی جیب خاص سے صرف کرتے تھے۔

لکھنؤ یونی ورسٹی میں "حلقۂ احباب" کے نام سے ایک ادبی مجلس قائم تھی۔ ایک بار اس کے جلسے میں مولوی صاحب کو مدعو کیا گیا۔ وہ ہمیشہ اردو دوستوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، تشریف لائے، جلسے کو کامیاب بنایا اور نوجوانوں میں جوشِ عمل کی روح پھونک دی۔ آخر میں جب مجلس کے سکریٹری نے انھیں سفرخرچ پیش کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر لفافہ واپس کر دیا کہ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے بچّوں سے پیسے نہیں لیا کرتا۔"

مولوی صاحب ساری زندگی منصب، مشاہرہ، معاوضہ — ان ساری چیزوں سے بے نیاز رہے۔ کبھی کوئی کام ذاتی غرض سے نہیں کیا۔ ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مشن تھا کہ کسی طرح اردو کو فروغ ہو، اردو کا بول بالا ہو۔ اس مشن کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔ ان کی زندگی بے نیازی، بے غرضی اور ایثار و قربانی کی ہمیشہ زندہ رہنے والی مثال ہے۔

پابندیِ اوقات

مولوی صاحب کی زندگی میں بڑا نظم و ضبط تھا، اور وہ وقت کے بہت پابند تھے۔ بچپن سے ان کی یہ عادت بہت پختہ ہو گئی تھی۔ اپنی زندگی میں انھوں نے جو بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ وقت کی پابندی کرتے تھے اور ہر کام کو پروگرام کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ پابندیِ وقت کا جس طرح وہ خود خیال رکھتے تھے اسی طرح دوسروں سے بھی توقع رکھتے تھے۔ اگر کوئی بڑا آدمی بھی وقت اور وعدے کی پابندی نہ کرتا تو وہ اس پر بہت جھنجھلاتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ بہت دل چسپ ہے۔

مولوی صاحب کی کوششوں سے انجمن ترقیِ اردو نے کافی ترقی کی۔ اورنگ آباد میں کتابوں کی طباعت کے لیے ایک پریس قائم کیا گیا۔ اس کے لیے ایک کشادہ مکان کی ضرورت پیش آئی جو حاصل کر کے "اردو باغ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس موقع پر ایک شاندار تقریب ہوئی جس میں سو سے زیادہ مہمانوں کو مدعو کیا گیا۔ ریاست حیدر آباد کے صدرِ اعظم سر اکبر حیدری مہمانِ خصوصی تھے۔ کسی وجہ سے وہ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ مولوی صاحب نے وقت پر کھانا چنوا دیا۔ اور لوگوں سے کہا "بسم اللہ"! مہمان دم بخود تھے۔ دو ایک نے دبی زبان سے کہا بھی کہ تھوڑی دیر اور انتظار کر لینا چاہیے مگر وہ کسی طرح نہ مانے۔ کچھ دیر بعد حیدری صاحب تشریف لائے۔ لوگوں کے اصرار کے باوجود نہ مولوی صاحب ان کے استقبال کو بڑھے، نہ انھوں نے کسی اور کو جانے دیا۔ اکبر حیدری مولوی صاحب کے مزاج سے واقف تھے؛ دور ہی سے بولے "مولوی صاحب، میں جانتا ہوں آج آپ مجھے توپ سے اڑا دیں گے۔" انھوں نے بڑی معذرت کی مگر دیر تک مولوی صاحب کی خفگی کم نہ ہوئی۔

قوّتِ برداشت

مولوی صاحب میں قوّتِ برداشت بلا کی تھی۔ انھوں نے بڑی بڑی تکلیفیں چپ چاپ سہ لیں اور بڑے بڑے مصائب اس طرح برداشت کر لیے کہ منہ سے اُف تک نہ

بے عملی

سوچنا اور غور کرنا، بے شک ایک مبارک فعل ہے، اور اہلِ دانش کا شیوہ ہے لیکن سوچتے ہی رہ جانا اور عمل کی طرف قدم نہ اٹھانا کاہلوں اور شیخ چلیوں کا کام ہے۔ شیخ چلی کوئی بُرا آدمی نہ تھا۔ اس میں تخیل بھی تھا اور سُوجھ بُوجھ بھی۔ اس کے منصوبوں میں کہیں منطقی ضعف نہیں پایا جاتا۔ صرف ایک کسر تھی کہ بے عمل تھا۔ اسی لیے ناکام رہا اور بدنام ہوا۔

انسانی اعمال

دلوں کا حال جاننے والا خدا ہے لیکن جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے۔

لازمۂ حیات

دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح انسان بے عیب نہ ہوا ہے، نہ ہوگا۔

کی. کراچی میں ان کی زندگی کے آخری ایام بڑی آزمایش میں گزرے. لوگ ان کے قائم کیے ہوئے اداروں سے ان کو بے دخل کر دینا چاہتے تھے. ان لوگوں نے مولوی صاحب کی دل چسپی کے کام ان سے چھین لینا چاہے تاکہ وہ بے مصرف ہو کے رہ جائیں مگر انھوں نے بڑی پامردی سے کام لیا اور کبرسنی اور کمزوری کے باوجود ہمت کا دامن نہ چھوڑا.

مولوی صاحب اپنی خوشی میں تو لوگوں کو شریک کر لیتے تھے لیکن اپنے غم کو تنہا برداشت کرنا چاہتے تھے. اپنی تکلیف میں دوسروں کو شریک کرنا انھیں پسند نہ تھا. اپنی بیماری کو بھی وہ اکثر چھپا جاتے تھے. درد قولنج کے مریض تھے. اس کے دورے پڑتے رہتے تھے مگر کوشش کرتے تھے کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو. ایک مرتبہ دورہ کر رہے تھے. دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کمرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا. شام کو ساتھی فکرمند ہوتے. دروازہ کھٹکھٹایا تو جواب نہ ملا. آخر ایک لڑکے کو کھڑکی سے اندر داخل کرایا دروازہ کھلا تو دیکھا کہ مولوی صاحب بیہوش پڑے ہیں. دور سے ڈاکٹر کو بلایا گیا. بڑی کوشش کے بعد وہ انھیں ہوش میں لا سکا. ہوش میں آنے کے بعد مولوی صاحب نے سب سے پہلے یہی کہا کہ "میں نے تو ہر طرف سے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں. آپ لوگ کدھر سے اندر آ گئے."

مولوی صاحب کو اپنے دوستوں سے جو تکلیفیں پہنچیں ان کو بھی مولوی صاحب نے برداشت کرنے کی کوشش کی اور زبان کھولی بھی تو تکلیف کے حد سے بڑھ جانے کے بعد.

شدّت پسندی

مولوی صاحب کے مزاج میں شدّت پائی جاتی تھی. جو لوگ بہت حسّاس اور غور و فکر کے زیادہ عادی ہوتے ہیں، وہ اکثر اس کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں. مولوی صاحب کی پسند اور ناپسند دونوں انتہا درجے کی تھیں. وہ اپنے شاگردوں، رفیقوں اور دوستوں سے بہت محبت کرتے تھے لیکن کسی سے تکلیف پہنچتی تھی تو ایک حد تک تو اسے برداشت کرتے تھے لیکن زیادتی حد سے بڑھ جانے پر وہ اس سے نفرت کرنے لگتے تھے. لیکن ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی. جن لوگوں کو مولوی صاحب پسند نہیں کرتے تھے، ان سے مولوی صاحب کو کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی، بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مولوی صاحب کی زندگی کے مشن یعنی اردو کی مخالفت کی تھی. وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن اردو اور انجمن ترقی اردو کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے تھے. حکومت حیدر آباد کے ان پر بڑے احسانات تھے. لیکن حیدر آباد نے انجمن کی امداد بند کر دی، تو مولوی صاحب اس سے بے حد خفا ہو گئے.

وہ ہر اس شخص سے ناراض ہوتے، جس نے کسی طریقے سے یا کسی موقع پر کوئی ایسا کام کیا جو اردو کی ترقی یا مفاد کے خلاف ہو اور اس میں بعض ایسے نام بھی تھے جو اور لوگوں کے نزدیک حد درجہ قابلِ احترام تھے.

مولوی صاحب کھلی کتاب تھے. ریاکاری اور مصلحت اندیشی سے بہت دور. جس کے دوست ہیں [illegible] اور جس کے دشمن ہیں اس سے [illegible]

محنت اور لگن

مولوی صاحب کی طویل زندگی محنت، لگن اور جوشِ عمل کی ایک لمبی داستان ہے. وہ خود ہمیشہ مصروفِ عمل رہے، اور دوسروں کو جہدِ مسلسل پر آمادہ کرتے رہنے کا اور بے عملی سے انھیں ہمیشہ نفرت رہی. کاہلی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ سب انسان نیک ہیں، سوائے کاہل کے. کاہلی جرم ہے، گناہ ہے عطیۂ الٰہی سے انحراف اور کفرانِ نعمت ہے. یاد رکھیے کہ جو اقوام یا افراد کام کرنے سے ہچکچاتے اور محنت سے جی چراتے ہیں انھیں کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی. کام سے انسانیت آتی ہے، سیرت اور اخلاق بنتے ہیں، ظاہر و باطن کی اصلاح ہوتی ہے ہم جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، مگر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے. اس میں تپّا مارنا پڑتا ہے، عزیز اشغال اور محبوب عادتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے."

مولوی صاحب ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے تھے اور پروگرام کے مطابق کام کرتے تھے. ان کے مختلف کاموں کے اوقات مقرر تھے اور جہاں تک ہو سکتا وہ ان کی پابندی کرتے. یہی ان کی کامیابی کا راز تھا. انھوں نے آخری دن تک مصروفیت کی زندگی گزاری. وہ ہمیشہ دوسروں میں بھی کام کی لگن پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے. وہ محنتی آدمی کی قدر کرتے تھے اور اس سے محبت کرتے تھے، چاہے وہ ذات کا ڈھیڑ اور پیشے کا مالی کیوں نہ ہو. ان کی رائے میں نیکی اور شرافت کسی کی میراث نہیں بلکہ جس شخص میں فرض شناسی کا جذبہ اور اپنے کام سے لگن موجود ہے وہ عزّت اور ستایش کا حقدار ہے. مولوی صاحب نے جن لوگوں کو محنتی، دیانت دار اور شریف النفس پایا، انھیں اپنے قلم سے زندۂ جاوید کر دیا. نام دیو مالی اور نور خاں اس کی زندۂ جاوید مثالیں ہیں.

مولوی صاحب نے کیسی سچی بات کہی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، ان سے بہترین کام لینا اس کا فرض ہے، ورنہ حشر کے دن خدا کے سامنے اس کو اپنی کوتاہی کے لیے جواب دینا پڑے گا. فرماتے ہیں:-

"ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے ہی میں ساری نیکی اور بڑائی ہے. درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے، نہ پہنچ سکتا ہے. لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے! یہ سمجھو، کندن ہو جاتا ہے. حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی. وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں. وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا [illegible]"

پروفیسر مختار الدین احمد، شعبۂ عربی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

بابائے اردو کے اقوال

گوہرِ نایاب

انسان کو انسان بنانے والی جو شے ہے وہ شوق و سعی اور ریاضت و محنت ہے اور یہ صرف انہی لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کے دلوں میں کسی اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے کی لولگی ہوتی ہے اور جو اس دُھن میں دن کو دن سمجھتے ہیں اور نہ رات کو رات، مصیبت کو مصیبت خیال کرتے ہیں، نہ راحت کو راحت۔ مگر راہِ طلب میں برابر قدم بڑھائے چلے جاتے ہیں۔ اور آخر میں گوہرِ مقصد ہاتھ آئے یا نہ آئے، مگر ایک ایسی چیز ہاتھ لگ جاتی ہے جو اس سے زیادہ نایاب اور اس سے کہیں بیش بہا ہے یعنی انسانیت!

اکسیر

بُرے لوگوں کی صحبت بھی اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے۔ جو ان سے چھوا کندن بن گیا۔

رہنمائی

پچھلوں کی غلطیاں آئندہ آنے والوں کی ہدایت اور رہنمائی کا کام دیتی ہیں اور پکار پکار کے کہتی ہیں کہ خبردار اس طرف نہ آنا۔ اسی طرح ہماری غلطیوں سے آئندہ نسلوں کو فائدہ پہنچے گا۔

میراث

سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں، جیسی اونچی ذات والوں میں۔

مذہب آخری پناہ

انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے، تو مذہب میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔

ایک زبان

جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں، جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔

قوم کا ادبار

جب کسی قوم کے اخلاق گر جاتے ہیں، تو کوئی قوت، کوئی تدبیر اسے زوال کی گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ عقل و حکمت، ذہانت و ذکاوت، فن کا کمال کچھ کام نہیں آتا، جب تک اخلاقی قوت ان کے ساتھ نہ ہو۔ اخلاق تمدن کی بنیاد ہے۔ اخلاق سے مراد صداقت، جرأت، ارادی قوت اور ایثار ہے۔ اخلاق میں ایثار کا درجہ سب سے اوّل ہے انسانی ترقی کے لیے ایثار لازمی شرط ہے۔ اولوالعزم قوموں کی تاریخ میں آپ کو ایسی ہستیوں کے نام ملیں گے، جنھوں نے اپنی ہر چیز کو قربان کر دیا ہے، سچی عزت اور عظمت انہی کا حق ہے۔

لذتِ کار

کام اس وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام کام نہیں، بیگار ہے۔

شریفانہ فعل

پڑھنے کی عادت بہت اچھی ہے۔ مطالعہ ایک شریفانہ فعل ہی نہیں، حکیمانہ فعل ہے

علم کی خصوصیّت

علم ہی ایک ایسی چیز ہے جو نہ کسی کی وارث ہو سکتی ہے، اور نہ کسی خاص فرقے کا حق ہو سکتا ہے۔

بزرگوں کی غلطیاں

جس طرح پچھلوں کے کام اگلوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں، اسی طرح ان کی غلطیاں بھی کچھ کم مفید نہیں ہوتیں، تاکہ آنے والے ان سے بچیں اور ان کا اعادہ نہ کریں۔

لگن

لگن اور محنت سے کام عبادت بن جاتا ہے۔

وقت۔ایک نعمت

انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ اس چندروزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ تکمیل کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنھیں بقائے دوام بھی حاصل ہو اور خلقِ خدا کو ان سے فائدہ پہنچے۔ وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی بھی قدر نہیں کرتا؛ اور قدر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

بہترین نعمت

اچھا استاد دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔

کام کی اہمیت

کام سے انسانیت آتی ہے، سیرت اور اخلاق بنتے ہیں، ظاہر و باطن کی اصلاح ہوتی ہے۔ مگر اس میں پتّا مارنا پڑتا ہے، عزیز اشغال اور محبوب عادتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔

علم بے عمل

علم و فضل کا غرور بغیر عمل کے خالی ڈھول پیٹنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

تعلیم کا مقصد

تعلیم یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے، اسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرے۔

اندرونی آفات

زوال ہمیشہ اندر سے پیدا ہوتا ہے، باہر سے نہیں آتا۔ جب بداعمالی کی وجہ سے اندرونی حالت میں ضعف، انتشار، نفاق اور اقتصادی زبوں حالی پیدا ہو جاتی ہے تو ملک بیرونی آفات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ معمولی سا حملہ بھی اسے مغلوب اور پامال کر دیتا ہے۔ بعینہٖ جیسے کسی انسان کے قویٰ مضمحل اور ضعیف ہو گئے ہوں اور اعصاب کارِ رفتہ ہوں، معدہ ٹھیک کام نہ کر رہا ہو، تو مرض کی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اور معمولی سی بیماری بھی اسے ختم کر سکتی ہے۔

اصلی نیکی

نیکی اسی وقت تک نیکی ہے، جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

پیرایۂ بیان

جب کوئی بات اکھڑ پنے سے دوسرے کے مزاج یا جذبات کا خیال کیے بغیر پھٹ سے کہہ دی جاتی ہے، تو اکثر اوقات باوجودیکہ بات سچی ہوتی ہے، سننے والے کے دل میں بغاوت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن جب وہی بات اچھے پیرائے میں کہی جاتی ہے، تو دل آزاری کی تلخی خوشگواری میں بدل جاتی ہے اور بات دل میں اُتر جاتی ہے۔

حال اور مستقبل

حال سے غفلت کرنا اپنے مستقبل سے غفلت کرنا ہے۔

منصف مزاج

بے تعصبی کا وصف اُنہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

اخلاق

مذہب ہو یا دنیوی معاشرت، سیاست ہو یا دینیات، بغیر اخلاق کے چارہ نہیں جب تک ان کی تہ میں اخلاق نہ ہو، کامیابی ممکن نہیں۔

سبق آموز

غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے، اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔

ضیاعِ وقت

انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جن کے لیے وہ رات دن سرگرداں و حیران رہا، وہ آرزوئیں جن کی خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا اور وہ کوششیں جن کے لیے اس نے اپنی جان تک کھپا دی، پانی کے بلبلے سے زیادہ ناپائدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں اور کچھ اُنہی کاموں کو بقا حاصل ہے جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور شاید ضمنی طور پر کیے گئے تھے۔

لازوال دولت

انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے۔

ذکرِ علیگڑھ

جناب عبدالمجید قریشی صاحب نے "ذکرِ علی گڑھ" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے جو مکتبہ اردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں فرزندانِ علی گڑھ کے بیس مضامین شامل ہیں جو مرتبِ موصوف نے برسوں کی محنت اور کاوش کے بعد یکجا کیے ہیں۔ ابنائے علی گڑھ کی یہ دلکش اور بیش بہا یادداشتیں نہایت دلچسپ اور پُرخلوص انداز میں قلم بند کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند اہم اقتباسات قارئین تہذیب الاخلاق کی نذر ہیں۔

ڈاکٹر اشفاق علی خان

میر ولایت حسین

ماہ فروری ۱۸۸۹ء میں سرسیّد نے علی گڑھ کے میلہ و نمائش
یں بینی ریڈنگ تھیٹر کیا...... آخر کار سرسید ایک چوغہ پہن کر اسٹیج پر
ئے اور ایک پر اثر تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا کہ اس کالج کے واسطے
یں نے کیا نہیں کیا۔ لاٹری کے ذریعے جوا کھیلا، گلے میں جھولی ڈالی دُکان
دُکان بھیک مانگی اور اب ایکٹر بن کر اسٹیج پر آیا ہوں۔ مقصد یہی ہے کہ
الج کے واسطے کسی طرح روپیہ ملے۔

یں علی گڑھ کالجیئٹ اسکول میں بحیثیت سکنڈ ہیڈ ماسٹر پورے
نچ گھنٹے روز تعلیم کا کام کیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں اسکول اور کالج دونوں
سم کے بورڈنگ ہاؤسوں کی نگرانی میرے ذمہ تھی۔ گیمس فنڈ کا آنریری
یزرر، علی گڑھ منتھلی کا آنریری منیجر، اس کے حصہ اردو کا آنریری ایڈیٹر
یونی شنلب بعد ازاں کالج بک ڈپو کا آنریری منیجر ہونے کی وجہ سے اپنے
ل میں سمجھتا تھا کہ علی گڑھ میں کام کی مصیبت سب سے زیادہ مجھ پر ہے، مگر
ب مسٹر ماریسن پرنسپل کالج کو دیکھتا تھا کہ مئی اور جون کی سخت گرمی
ں سات بجے صبح سے بارہ بجے دوپہر تک پورے پانچ گھنٹے پڑھانے اور
ر کا کام کرنے کے بعد سہ پہر تین بجے سے پانچ بجے تک کالج کے دفتر میں
ر کام کرتے ہیں اور پھر بیسیوں خط اپنے قلم سے لکھتے ہیں، تو میری
نی ہو جاتی تھی۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

میں نے جب ہوش سنبھالا تو مسلمانوں میں کچھ ہلچل نظر آئی۔ مسلمان شرفا خصوصًا بڑے بوڑھے اپنے دیوان خانوں میں بیٹھتے تو کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کالج یا سید احمد خاں کا ذکر نکل آتا۔ سید احمد خاں اس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوع بحث تھے۔ ان کی نسبت کفر و الحاد کا فتویٰ تو عام تھا۔ مولوی صاحبان اس ذکرِ عزیز کو اپنے وعظوں، بحثوں، تحریروں اور تقریروں میں طرح طرح سے مزے لے لے کر بیان کرتے اور تخیل کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ سننے والے اور معتقدین ان باتوں پر اپنی طرف سے خوب خوب حاشیے چڑھاتے۔ کوئی کہتا اس نے اپنا سر بیچ دیا ہے۔ مرنے کے بعد انگریز اس کا سر لے جائیں گے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ اُن کی دانش مندی کے سب قائل تھے۔ سر بکنے کا قصہ اسی بنا پر مشہور رہا۔

میں یہ واہی تباہی سنتا رہتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز میرے ایک ہم جماعت مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں میں نے "تہذیب الاخلاق" دیکھے اور پڑھنے شروع کیے۔ اس میں ایسا دل لگا کہ اس کے بعد میں ان سے پرچے مانگ لاتا اور پڑھتا رہتا۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق کا مطالعہ کھینچ کر علی گڑھ لے گیا اور میں کالج کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ پہلے سالوں پہ

تکیہ تھا، اب آنکھوں نے جلوہ دکھایا، لیکن دور کے دیکھنے اور قریب کے دیکھنے میں فرق ہے۔ جب میں کالج پہنچا تو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخری دو سال میں زیادہ قربت نصیب ہوئی اور سرسید علیہ الرحمۃ کو کام کرتے، ہم کلام ہوتے، اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے، بورڈنگ ہاؤس کی پیمائش کرتے، مسجد میں نماز پڑھتے، جلسوں میں تقریر کرتے اور گرجتے دیکھا۔ ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

ایک خاص بات جو مجھے یہاں نظر آئی، وہ قومیت کی مہک تھی جو کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ کالج کے بانی سرسید احمد خاں کا طفیل اور ہمہ وقتی توجہ تھی جو طلباء کے دل میں ایک طرف اُن کا رعب اور دوسری طرف ان کی محبت اور عزت کا جذبہ پیدا کرتی تھی۔

...... گو اب ایسی یونینیں و اسٹوڈنٹس یونین ہر درسگاہ میں قائم ہو گئی ہیں لیکن ان کی ابتدا کا سہرا ہماری مادر علمی ہی کے سر ہے اور جس وقار، متانت اور تنظیم کے ساتھ یہ ادارہ علی گڑھ میں کامیاب رہا۔ ویسی حسن و خوبی اور ضبط و عمل سالہا سال کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے۔ علی گڑھ میں ہر منسٹری کی کامیابی کا اندازہ تین چیزوں سے لگایا جاتا تھا۔ اول منسٹری نے اپنے ایک سال کے عرصے میں کتنے مقرر پیدا کیے۔ دوم۔ مشاہیر ہند کے مقرروں میں سے کتنے حضرات یونین میں تقریر کرنے آئے اور یونین کے اعزازی رکن بنے۔ سوم کتنے کامیاب مباحثے سال میں ہوئے۔

چودھری خلیق الزماں

علی گڑھ کہنے کو یو۔ پی کے ایک شہر کا نام ہے مگر مسلمانوں میں عرف عام میں وہ بغداد اور قرطبہ کی یادگار ہے۔ جہاں کے طلباء حسنِ عمل سے سرشار اپنی قوم کو دعوتِ علم و فکر دینے میں مصروف پیکار، جہاں کے طلباء انسانی حریت اور مسلم اخوت کے اصولوں کی کھوئی ہوئی نعمت کو دوبارہ زندہ کرنے کی جدوجہد میں غلطاں، جہاں کے طلباء اپنی قوم کی افسردہ مجہول اور مضمحل ذہنیت جو صدیوں کی غیر اسلامی معاشرت کا دلسوز نتیجہ تھی دولت خود اعتمادی و خودداری سے مالا مال کرانے میں ہمہ وقت ساعی، وہ اسلام میں طبقاتی تقسیم کے خلاف، فرقہ بندی سے متنفر، وراثت میں غیر اسلامی روایات سے باغی، کلچر اور معاشرت میں آفاقی اثرات سے نالاں۔ غرض کہ وہ اپنے محدود وسائل اور ذرائع سے وہ سب کچھ حاصل کرنے کے متمنی جوان کی قوم میں نئی روح پھونک سکے، تاکہ وہ اپنی گم گشتہ عظمت کو جمہوری دور میں حاصل کرلیں۔ تیس برس کے عرصے میں جب کالج کی بنیاد ڈالی گئی اور جب

بلند پروازی

چیونٹی: میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند
عقاب: تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

علامہ اقبال

۱۹۰۷ء میں کالج میں داخل ہوا علی گڑھ کے اثرات نے مسلمانوں کی ذہنیت حد تک بدل دی تھی کہ فرقہ پرستی پر اوس پڑ چکی تھی۔ ناچ اور رنگ کی محفلیں بٹیر بازی، پتنگ بازی اور عیاشی کی منڈیاں سسک رہی تھیں اور جو کچھ ان معاشرتی خباثت کا وجود باقی رہ گیا تھا وہ بھی چند روزہ مہمان تھا۔

علی گڑھ والے محدث نہ تھے، صوفی نہ تھے، فقیہ بھی نہ تھے لیکن کٹر قسم کے مسلمان ضرور تھے جس کا سب سے بڑا ثبوت آج یہ ملتا ہے کہ کوئی بھی تحریک مسلمانوں کی ایسی نہ ہوئی جو علی گڑھ کے حامیوں یا کالج کے طلباء نے نہ اُٹھائی ہو۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۹۴۰ء تک صرف بہتّر سال ہوتے ہیں۔ پوری ایک صدی بھی نہیں اور اس کل عرصے میں علی گڑھ کے طلباء نے ہر صنف ڈاکٹری، قانون اور انتظامیہ میں...... اپنا سکہ جمائے رکھا۔

علی گڑھ کالج کے سند یافتہ طلباء ۱۸۷۵ء سے ہزارہا کی تعداد میں ہندوستان بھر میں تمام شعبوں میں پھیل گئے تھے۔ چند مخصوص ہستیوں کو چھوڑ کر پڑھے لکھوں میں جو معروف نام سامنے آتے ہیں وہ علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں...... ہزاروں اس قسم کے لڑکے علی گڑھ نے پیدا کیے جو نسبتاً نام و نمود سے محروم رہے۔ مگر اپنی زندگی انھوں نے ملت کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

خان بہادر حکیم احمد شجاع ساحر

علی گڑھ کالج کی زندگی کا وہ لطیف پہلو جس کا تعلق طلباء کے باہمی ارتباط سے ہے وہ حسین اور دلفریب منظر ہے جس کی یاد بادۂ دوشینہ کا خمار ہے اور بہار رفتہ کا سرور ہے۔

محنتِ پرواز

پھول: شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا
اے قاصدِ افلاک! نہیں، دور نہیں ہے

شبنم: ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن
یہ نکتہ کہ گردوں سے فلک دور نہیں ہے

علامہ اقبال

پروفیسر رشید احمد صدیقی

..... ایک درماندہ اجنبی کے ساتھ علی گڑھ کے ہمسفر طالب علموں کی بے ساختہ دوستی اور دردمندی آج ساٹھ سال بعد بھی میرے دل کو اسی طرح شاداب اور شادماں کر لیتی ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔

اس دور میں کالج کی شہرت پورے عروج پر تھی۔ کمرس میں کھیلتے میں، یونین کی سرگرمیوں میں، یورپین وضع قطع، رئیسانہ طور طریق، تعلیم و تربیت، رکھ رکھاؤ، چھوٹے بڑوں کے آپس کے سلوک میں، غرض اس وقت کے معیار سے زندگی کا ہر پہلو بابرکت اور بارونق نظر آتا تھا اور ایک طرح کی آسودگی، احترام اور آرزومندی کی فضا چپے چپے پر چھائی ہوئی تھی۔

ہندوستان میں جتنے اچھے بولنے والے تھے ان میں بیشتر کی تقریر سننے کا علی گڑھ میں اتفاق ہوا، لیکن آج شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ یونین کے وائس پریذیڈنٹ، سکریٹری یا کالج کے بعض طالب علم مقرروں کی جو تقریر ان مواقع پر کسی نہ کسی حیثیت سے ہوتی وہ ایسی اچھی ہوتی کہ مہمان بے اختیار داد دیتا اور یقیناً اس لیے نہیں کہ ایک طالب علم نے تقریر کا اچھا نمونہ پیش کیا، بلکہ جو تقریر کی گئی تھی وہ فنی اعتبار سے مکمل ہونے کے علاوہ سنجیدہ اور پُرمغز ہوتی تھی۔

غلام حسین بسکٹ فروش ہمارا ایک مصرف اور کھلی تھا۔ آج کل جلسے جلوس کی رونق کا مدار اس پر ہے کہ ہائے ہائے یا زندہ باد، مردہ باد کے نعرے کس بے جگری اور بے غیرتی سے لگائے جاتے ہیں —

غلام حسین کے عہد میں یہ تقریب اس طرح منائی جاتی۔ رات کے وقت کھانے کے بعد ایک بورڈنگ ہاؤس سے آواز بلند ہوتی: "غلام حسین!" پاس کے بورڈنگ ہاؤس سے جواب دیا جاتا "بسکٹ والا!" پندرہ بیس منٹ تک یہ سوال جواب طرح طرح کے اونچے نیچے سروں میں ہوتے رہتے اور پھر بند ہو جاتے۔ دوسرے دن معلوم ہوتا کہ وجۂ احتجاج کیا تھی۔ جس کو دور کرنے کے لیے فوری کارروائی عمل میں آتی۔ لیکن نہ کہیں احتجاج ہوتا، نہ جلوس نکلتا، نہ اس کارِ خیر میں شرکت کرنے کے لیے اسکول کے بچوں کو دعوت دی جاتی اور نہ شہر کی آبرو یا عافیت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا۔

نواب مشتاق احمد خاں

علی گڑھ میں چار سالہ قیام کی خوشگوار یادیں میری زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اتفاق سے وہاں طالب علم کی ماند قوم کے نونہال کشاں کشاں آتے تھے اور وہاں کے ماحول میں گھل مل کر ایک ہو جاتے تھے۔ بنگالی ہوں یا پنجابی، حیدرآباد ہوں یا مدراسی، بمبئی کے سیٹھ ہوں یا سرحدی پٹھان، سب ایک ہی لباس میں جو ترکی ٹوپی، کالی اچکن اور سفید پاجامے پر مشتمل ہوتا تھا، ایک ہی ثقافت اور معاشرت کے علمبردار بن جاتے تھے۔ ایک ہی زبان بولتے تھے اور ایک ہی جذبے سے سرشار ہوکر واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا کی عملی تفسیر بن جاتے تھے۔ وہاں کے در و دیوار سے محبت ہو جاتی تھی اور وہ محبت دل و دماغ پر انمٹ نقش چھوڑ جاتی تھی اور انھیں بار بار دیکھنے کو جی ترستا تھا۔

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی

حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم قومی درسگاہ کو محض اینٹ اور چونے کی عمارت تصور کرنا بڑی غلطی ہوگی۔ یہ سرسید اور ان کے نامور رفقائے کار نواب محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، زین العابدین اور مولوی سمیع اللہ کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ یہ وہ درسگاہ ہے جس نے ہر زمانے میں بڑے بڑے مردانِ کار پیدا کیے۔

علی گڑھ کی فضا تعصبی میں اور اس کے طلباء امن پسندی میں مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ آج کل یہ نگری نوجوانوں کی قانون شکنی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ علی گڑھ والوں کی شائستگی ضرب المثل ہو گیا تھا۔

پروفیسر آل احمد سرور

سرسید کی تحریک کا میرے دل میں بڑا احترام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا اور انھیں اس قابل بنایا کہ وہ دورِ جدید کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔

جناب شجاعت علی خاں

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ڈائننگ ہال کی دیوار پر جلی حروف میں لکھ دیا ۔

کوئی موتی کے صدقے ہو کوئی ہوٹل کے صدقے
ہم اپنی خشک روٹی بن بگھاری دال کے صدقے

سرسید علیہ الرحمۃ کی اس شعر پر نظر پڑی تو بڑے محظوظ ہوئے۔ اسی روز سے کھانے میں گوشت ضروری کر دیا گیا۔ مگر جنگ بلقان میں ترکی کی امداد کے لیے ہر شخص نے یہی دال کھا کر گزر بسر کی اور اس طرح ایثار و قربانی کا ثبوت پیش کیا۔

سرسید رضا علی

علی گڑھ کا لطف علی گڑھ کے ساتھ گیا۔ اور باتوں کو جانے دیجیے ہاں ایک بات کو لیجیے۔ علی گڑھ میں دوستی اور محبت کے اندر کوئی ذاتی غرض پنہاں نہ تھی۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد دوست بہت ملے، مگر دوستی اچھے بہت کم ملا۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی

علی گڑھ کالج ایک اقامتی درس گاہ تھی جہاں اساتذہ اور طلباء ایک بڑے خاندان کی طرح ایک ماحول اور ایک ہی سرزمین پر قیام پذیر تھے۔ یہاں اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے اساتذہ کی نگاہ طالب علم پر رہتی تھی اور طالب علم کی نظر اساتذہ پر ________ ' اپنی طرزِ رہائش کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ اس خاندان کے ارکان میں اسلامی اخوت کا عملی جذبہ پرورش پائے اور مخصوص روایات خاندانی پیدا ہوں۔ یہ ہے راز اس محبت اور یگانگت کا جو اس مادرِ علمی کے سپوتوں میں پائی جاتی تھی اور جسے دیکھ کر اغیار حیرت اور رشک کرتے تھے۔

جو آدمی کبھی اپنی رائے نہیں بدلتا وہ
بند پانی کی طرح ہے جس میں دماغی
کیڑے جنم لیتے ہیں۔

ولیم بلیک

محفوظ الحق حقی۔

(اس وقت) اِس شاندار مسجد کی جگہ صرف ایک چبوترہ تھا جس پر نماز ہوا کرتی تھی۔ مولانا حالی نے بھی یہاں نماز ادا کی تو اس کی کیفیت انھوں نے ان الفاظ میں بیان فرمائی،

" اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا، مگر اسے دیکھ کر ہمارے دِل پر جو اثر ہوا اس کو ہم فراموش نہیں کر سکتے ہم بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالس میں حاضر ہوئے ہیں، ہم نے اونچے اونچے منبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں، ہم حال و قال کی محفلوں میں بھی شریک ہوئے ہیں، ہم نے پیرانِ طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور اُن کے دل ہلا دینے والے نعرے بھی سنے ہیں، مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسہ کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے، وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی۔"

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

جو حضرات علی گڑھ کی زندگی کا صحیح نمونہ ہیں ان کو آپ ہر شعبۂ زندگی میں کامیاب پائیں گے۔ وہ ایک طرف قوم و ملت کے عاشق ہوں گے، تو دوسری طرف ملک و وطن کے شیدائی۔ ایک علیگیرین نے درست کہا تھا کہ علی گڑھ کا امتیازی نشان یہ ہے کہ علی گڑھ والوں کو کیسے ہی حالات میں رکھ دو، وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق اور ہو سکا تو حالات کو اپنے مطابق بنا لیں گے۔

عبدالمجید قریشی

سائنسی ترقیات میں مسلمانوں کا حصّہ

سنجار کا اور کوفہ کا میداں! فراہم ہوئے جس میں مساح دوراں
ے کی مسافت کے پھیلائے ساماں ہوئی جزو سے قدر کل کی نمایاں
زمانہ وہاں آج تک نوحہ گر ہے
کہ عباسیوں کی سبھا وہ کدھر ہے؟ حالیؔ

لانا حالیؔ اس بند کی تشریح میں لکھتے ہیں:- سنجار اور کوفے کے
میں خلیفہ مامون الرشید کے حکم سے مہندس جمع ہوئے تھے اور کرہ ارضی
درجہ دائرہ عظیمہ کی پیمائش کی اور محیط کرہ کو ۲۴ ہزار میل مشخص کیا۔
ن حالی میں اس سے آگے سمرقند اور اندلس کی رصدگاہوں کے
روں کا تذکرہ ہے۔ مراغہ (آذربائیجان) میں مروان بن محمد
رکیے ہوئے شہر میں سب سے پہلے رصدگاہ کے قیام کی تفصیل ہے۔
ہ میں بغداد میں خالد بن عبدالملک کی رصدگاہوں کی تعمیر کا بیان
ر یہ سب ان ذی شان خلفائے راشدین کے دور کی ترقیات اور
ی دریافتوں کا احوال بیان ہو رہا ہے جن کے متعلق تاریخی روایات
ب " خلیفۂ وقت جس کا کمبل کھجور کے تنکوں سے سلا ہوتا تھا،
نٹوں کی مالش اپنے ہاتھ سے کیا کرتا تھا، مشک کاندھے پر رکھ کر
کے گھروں پر جاکر پانی بھرتا تھا، میدانِ جنگ سے آئے ہوئے خطوط
مکان پر خود جاکر دے آتا تھا اور پھر ان کے جواب لے کر لشکر کو
رتا تھا۔" اندلس کے ضیاء الدین ابن بیطار جس نے ۱۲۴۸ء میں
پائی اپنے دور کا علم نباتات میں ماہر تصور کیا جاتا تھا، بعد کی اکثر
ی تحقیق ضیاء الدین کی تصانیف سے ماخوذ ہے۔

اٹلی میں سلرنو (پنسلز) میں مسلمانوں کے مدرسے میں طب کی
دی تھی اور یورپ کے طبیب یہاں آکر اپنے ہنر کو فروغ دیتے
شیخ الرئیس بوعلی سینا کی طب کے مختلف علوم میں ۴۰ تصانیف ہیں
ف "شفا" کے موضوع پر ۱۸ جلدیں ہیں۔ اس کے علاوہ بوعلی سینا
علوم میں جو دستگاہ حاصل تھی اس کا اندازہ ان تصانیف سے ہوتا
قانون" کی ۱۴، "کتاب الانصاف" کی ۲۰ اور "لسان العرب"
کی دس جلدوں میں موجود ہے۔

۱۹۴۰ء میں حیدرآباد کے ایک بزرگ عالم علامہ رشید ترابی مرحوم نے قرآن مجید کی آیات کریمہ کے تجزیے سے یہ ثابت کیا تھا کہ بہت سی بعد کی سائنسی دریافتوں کا کلامِ پاک میں تذکرہ موجود ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ کی تخلیق کا تذکرہ کلام مجید کی سورۂ آل عمران ع ۶ میں، حضرت عیسیٰؑ کے بے باپ پیدا ہونے کے سلسلے میں کہا گیا کہ:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ

(اللہ کی جناب میں عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے کی مثال آدم کی پیدائش سے ہے جس کو اس نے مٹی سے بنایا اور حکم دیا کہ ہو جا۔ اور وہ ہو گیا)

اس آیت کریمہ میں انسان کے مٹی سے بنائے جانے کا بلیغ تذکرہ بہت سی بعد کی میڈیکل تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ پھر Geo-Physics کے دائرے میں کلامِ پاک میں سورۂ یونس ع ۳ میں انما

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا .... الخ
کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ (دنیاوی زندگی کی مثال یہ ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس سے زمین کی پیداوار خوب گھنی نکل آئی جس کو انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔ جب زمین نے اپنی پوری زینت اور سرسبزی حاصل کر لی اور مالک نے یہ خیال کیا کہ اب تو اس پیداوار پر قابض ہیں تو یکایک ہمارے حکم سے ایک حادثہ رات یا دن میں آپڑا اور ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا جیسا کل کچھ تھا ہی نہیں۔" (القرآن، سورۂ یونس ع ۳) یا سورہ رعد کا تیسرا رکوع جس میں ASTRAL ELECTRONICS کی تفصیل ہے یا BOTANY کی کرشمہ کاریوں کا ذکر قرآن پاک میں سورۂ ابراہیم کے رکوع ۴ میں اور صحرا میں سراب کا ذکر سورۂ "نور" کے رکوع ۵ میں موجود ہے۔ مسلمان قرآن مجید کی ان آیات کریمہ کو اپنے لیے چراغِ راہ

بناکر آگے بڑھے اور اس طرح اسلام کو وسعت عطا ہوئی کہ بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ (غزوات نبوی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مقدس سے خلفائے راشدین کے دور تک اسلام بحساب چھ سو مربع میل یومیہ پھیلتا رہا تھا جیسا اقبال جزیرۂ سسلی (صقلیہ) کے متعلق نوحہ خواں ہیں:

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا — اقبال

اپریل ۱۹۶۷ء میں جناب نظام الدین حسن مرحوم نے اپنے ایک تحقیقی مضمون بعنوان "Kaba, A Mosque At Mecca" میں کعبۃ اللہ کے محلِ وقوع پر تفصیلی تذکرے میں لکھا ہے۔

The Globe of the Earth having been divided into hemispheres by the Meridian passing through Mecca.

اور علم حساب، Nautical Almanac اور ارضی و سماوی علوم کے ذریعے کعبۃ اللہ کے مرکزی مقام پر موجودگی کا [illegible] کیا گیا ہے۔ اسلام کے اس مقدس مرکز کی بنا حضرت ابراہیمؑ نے رکھی تھی، "واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت الخ (سورہ بقرہ)" اور پھر اسی مرکزِ اسلام سے علم و عرفان کی جو ضیا باری بعثتِ نبوی کے بعد چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوئی، اس نے عظیم سلطنت روما کی ترقیات کو ماند کر دیا۔ جیسا ڈاکٹر فیلے اپنی تصنیف "فتوحاتِ اسلامی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"خسرو ہرقل کے ماتحت ایران و روما کی سلطنتوں میں جو حیرت انگیز انقلابات ہوئے وہ سب کے سب اس عظیم الشان اثر کے آگے ماند ہو جاتے ہیں جو اُن کے معاصر محمد صلعم پیغمبر عرب نے ان ممالک کی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی زندگیوں پر ڈالنا شروع کر دیا جس پر تسلط جمانے کی ان سلاطین کو آرزو رہا کرتی تھی۔"

مصطفیٰ شیروانی، حیدرآباد

* * * * *

مسلم اداروں کے سربراہوں کی کانفرنس

۱۸ اور ۱۹ اگست کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام مسلم تعلیمی اداروں کے پرنسپل اور منیجر صاحبان کی دو روزہ کانفرنس ہوئی جس کے انعقاد کا سہرا پروفیسر مسعود الحسن کے سر ہے۔ کانفرنس کا افتتاح فرماتے ہوئے یونیورسٹی کے پرو چانسلر الحاج عبیدالرحمن خاں صاحب شیروانی نے فرمایا کہ ہمارے اداروں کے منتظمین کو اپنے ذاتی اختلاف کو بھلا دینا چاہیے ورنہ ان اداروں کی حالت کبھی سدھر نہیں سکے گی۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے جناب شمیم شاہ نے ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی جس میں اعداد و شمار کی بنیاد پر مسلم اداروں کی اصل صورتِ حال کو واضح کیا گیا۔

افتتاحی جلسے میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد نے موجودہ تعلیمی اداروں کو بہتر بنانے، نئے تعلیمی ادارے قایم کرنے، سائنس اور ریاضی کی تعلیم کو اہمیت دینے پر زور دیا۔ اور امید ظاہر کی کہ مندوبین واپس جاکر یہاں کی گفتگو کو فراموش نہیں کریں گے بلکہ جگہ جگہ اس کا چرچا کریں گے تاکہ یہاں کیے گئے فیصلوں پر ہر جگہ عمل درآمد ہو اور چراغ سے چراغ جلے۔ انھوں نے اتر پردیش کے وزیر نرائن دت تیواری سے اپنی حالیہ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اگر مسلم یونیورسٹی ریاست کی صنعتی ترقی کے لیے کوئی قدم اُٹھاتی ہے تو حکومت اس میں دل کھول کر مدد کرے گی۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے

پروفیسر مسعود الحسن نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور واضح کیا کہ اس اقدام سے ہمارے ادارے بہتر ہوں گے اور تبادلۂ خیال کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

افتتاحی جلسے کے بعد علیحدہ علیحدہ مسائل پر غور کرنے کے لیے تین اجلاس ہوئے۔ ۱۹ اگست کی شام کو اختتامی جلسہ ہوا جس میں تجاویز کو آخری شکل دے کر منظور کر لیا گیا۔ اس کانفرنس کی تفصیلی روئداد راقم نے مرتب کر لی ہے جسے آئندہ کسی اشاعت میں قارئین تہذیب الاخلاق کی نذر کیا جائے گا۔

راحت ابرار

ہم اور ہمارے تعلیمی ادارے

بنارس میں ایک تقریر کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس …سلر اور تہذیب الاخلاق کے مدیر جناب سید حامد نے بڑے پتے کی … کہی تھی کہ جب قوم کے بُرے دن آتے ہیں خدا اس سے ادارے چلانے کی …یت چھین لیتا ہے۔ جب قومی اداروں کی پیش رفت رک جاتی ہے تو قومی … کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور قوم ادبار کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہماری … کا ان دنوں یہی حال ہے اور ہمارے بیشتر ادارے آج بد نظمی اور ابتری کا …ار ہیں۔ اس کا تجزیہ کیا جائے تو ایک عجیب صورت حال سامنے آتی ہے …ر صورتوں میں ان اداروں کی زبوں حالی کے ذمہ دار وہ لوگ نہیں جو …روں کو چلا رہے ہیں بلکہ وہ لوگ ذمہ دار ہیں جو باہر سے ان پر کیچڑ …تے ہیں اور انھیں بدنام کرتے ہیں۔

…اب احمد رشید شروانی کو مسلمانان ہند کے تعلیمی مسائل سے گہرا …ف ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ شروانی صاحب نے اپنے ایک سرکلر میں الزام …ی اور عیب جوئی کو تعلیمی اداروں کے لیے مہلک بتایا ہے اور اس میں … نہیں کہ یہی وہ حرکتیں ہیں جو اداروں کو لے ڈوبتی ہیں۔ مجھے یہ دعویٰ …ں کہ جو ادارے چلاتے ہیں وہ ساری غلطیوں سے مبرا ہیں اور اُن سے … نہیں ہوتی۔ ان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور ضرور ہوتی … عبدالحق کا ایک قول جو سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے قابل … تہذیب الاخلاق کے صفحات میں نظر سے گزرا تھا کہ جو کام کرے گا …یاں بھی ضرور کرے گا جو کچھ نہ کرے اس سے غلطیاں کیسے سرزد …ں گی۔ ان غلطیوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے اور ضرور کی جانی چاہیے … ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے اور شائستگی کا دامن چھوڑے …۔ اس سے زیادہ یہ ضروری بات ہے کہ تنقید کے پیچھے تعمیری جذبہ کارفرما …ر ہمدردی اس تنقید کی محرک ہو۔ لیکن آج صحت مند تنقید کی جگہ … عیب جوئی اور الزام تراشی کا دور دورہ ہے۔ مزید افسوس …ات کہ یہ کام ان لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے جنھیں نہ ادارے … کا تجربہ ہے اور نہ ہمدردانہ ان مسائل پر غور فرماتے ہیں۔ ان … تنقید کے انداز سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اصلاح نہیں …۔ کسی ادارے کے سربراہ نے کسی موقع پر ہمیں نظر انداز کر دیا یا ہمارے مشورے کو قابل قبول نہ سمجھا تو ہمارا قلم اور ہماری زبان دونوں فی الفور حرکت میں آ جائیں گے اور ہم بھول جائیں گے کہ لفظوں کا انمول خزانہ یوں برباد کرنے اور لٹانے کے لیے نہیں۔ ان کا برمحل استعمال بہر حال ضروری ہے۔

تہذیب الاخلاق ایک سنجیدہ علمی رسالہ ہے۔ اس کے صفحات میں جناب بدر الاسلام صاحب کا ایک تلخ سا مضمون نظر سے گزرا تو حیرت ہوئی۔ فاضل مضمون نگار سے بعض صریح غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون کی بنیاد معلومات پر نہیں بلکہ مفروضات پر رکھی ہے۔ جس سے ساری عمارت ہی ٹیڑھی ہو گئی جن تعلیمی اداروں کا انھوں نے ذکر فرمایا ہے، ان کے متعلق فراہم کی گئی معلومات اصلیت سے بہت دور ہیں۔ مثلاً ہردوئی اُن کا وطن ہے لیکن ہردوئی کے جس مسلم اسکول کے وہ شاکی ہیں وہ مسلم اسکول ہے ہی نہیں۔ اسی سے باقی معلومات کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ جامعہ اردو کی بعض خامیوں پر تو مضمون نگار کی نظر پہنچی لیکن یہ خیال نہ آیا کہ اردو کے فروغ میں اس ادارے نے کیسی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

ہمیں کسی کی دل شکنی مقصود نہیں لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ جو ادارے ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں، ان کی حوصلہ افزائی ضروری ہے اور جو اصحاب ان اداروں کو خون پسینے سے سینچ رہے ہیں ان کی خدمت کا کھلے دل سے اعتراف ہمارا قومی فریضہ ہے اور ان کے بارے میں بدگمانی گناہ ہے۔

سرور علی قریشی

---

* پڑھنا اور غور نہ کرنا ایسا ہے جیسے کھانا اور ہضم نہ کرنا۔
ایڈمنڈ برک (مشہور انگریز مقرر اور پارلیمنٹرین)

* میں بول کر اکثر پچھتایا ہوں، خاموش رہ کر کبھی نہیں
پبلیس سائرس

اردو تعلیم کے مسائل

یو۔پی کی سرزمین جس کا اردو کی ترقی و ترویج میں بڑا حصہ ہے جس نے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور صحافی پیدا کیے آج وہیں اردو کی جڑیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ یو۔پی کا علاقہ وہ علاقہ ہے جس میں سب سے زیادہ اردو بولنے والوں کی تعداد ہمیشہ سے پائی جاتی ہے۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ اردو پڑھنا اور لکھنا تو درکنار اس کی شدبد بھی نوجوانوں میں کم ہو رہی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچیں اور حالات کا جائزہ لیں تو یہ ذمہ داری سرکار پر بھی جاتی ہے، سرپرستوں پر بھی ہے۔ اساتذہ بھی اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور اسکولوں کے ارباب حل و عقد کو بھی اس سے بری نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک سرکار کا تعلق ہے، سب سے بڑی ذمہ داری اسی پر ہے۔ نصاب بنانا اس کا کام۔ کتابوں کا انتخاب اور ان کو شامل نصاب کرنا بھی اسی کی ذمہ داری۔ جو لوگ تدریس سے تعلق رکھتے ہیں وہ نصاب کی پیچیدگیوں سے واقف ہیں۔ کسی مضمون کی جب اہمیت کم کرنی ہو تو نصاب میں اسے ایسا مقام دیا جاتا ہے جس سے کم سے کم طلبا اس کو پڑھ سکیں۔ اردو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یو۔پی گزٹ مورخہ ۱۴ر نومبر ۸۱ء کے اعلان کے مطابق جولائی ۸۲ء سے ریاستی ہائر سکنڈری اسکولوں میں ایک نیا نصاب جاری ہے اس کا پہلا ہائی اسکول کا امتحان مارچ ۸۴ء میں ہوا۔ یہ ایک سائنس زدہ نصاب ہے جس میں ہر لڑکے کو کسی نہ کسی سطح پر سائنس ضرور پڑھنا ہو گی۔ چاہے اپنی مادری زبان کو خیرباد کہنا پڑے۔ یہ نصاب عین اس وقت سامنے آیا جب حکومت اردو کو ریاست اتر پردیش کی دوسری زبان تسلیم کرنے کا اعلان کر چکی تھی۔ نصاب اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ کاغذ پر زبانیں سب ہی نظر آئیں گی۔ مگر طالب علم ہندی اور انگریزی کے علاوہ کچھ نہ لے سکے۔ پورا نصاب دو شعبے حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ لازمی ۲۔ اختیاری۔ لازمی میں دو زبانیں ایک ہندی (لازمی ۲) اور دوسری انگریزی عملاً لازمی۔ کیوں کہ اعلیٰ تعلیم بغیر انگریزی کے حاصل نہیں ہو سکتی اور ایڈوانس سائنس بغیر انگریزی کے چل نہیں سکتی۔ باقی زبانوں کی جو فہرست دی گئی ہے وہ صرف ذوقِ نظر اور زیبائش کا درجہ رکھتی ہیں۔ انھیں کوئی طالب علم چھو بھی نہیں سکتا ان کے علاوہ دو قسم کی سائنس ہے۔ ایلیمنٹری اور ایڈوانس۔ ان میں سے ایک لینا ہے ۲ اور مضامین لازمی ہیں۔ اس طرح کل چھ لازمی مضامین ہیں۔

اختیاری مضامین کے کئی گروپ ہیں ان میں لٹریری گروپ ایسا ہے کہ اس میں طالب علم اردو، فارسی، عربی وغیرہ میں سے ایک مضمون لے سکتا ہے۔ اس فہرست میں جنوبی ہند کی زبانیں اور سنسکرت بھی ہے۔ سنسکرت کا حل یہ نکل آیا کہ اس کا ایک پرچہ لازمی ہندی میں شامل ہو گیا۔ سائنس گروپ میں پہلے بیالوجی لازم نہیں تھی تو سائنس پڑھنے والے لڑکے اردو لے لیا کرتے تھے مگر اب بیالوجی لازمی کر دی گئی۔ اس طرح سائنس کا کوئی لڑکا اردو نہیں پڑھ سکتا۔ یہ ایک ایسا نصاب تیار کیا گیا ہے کہ کم سے کم طلبا اردو پڑھ سکیں۔

دوسرا مسئلہ کتابوں کے انتخاب کا ہے۔ نصاب میں جو کتابیں شامل ہیں وہ تقریباً تیس سال سے یوں ہی چلی آ رہی ہیں۔ کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ انتخاب اس وقت کیا گیا تھا جب طلبا کا ایک معیار تھا۔ نثر اور نظم میں ایسے ادب پارے شامل ہیں جنہیں سمجھنے سے آج کے طالب علم کا ذہن قاصر ہے۔ وہ ابتدائی چیزوں سے واقف نہیں اعلیٰ تخلیقات کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ نثر اور نظم کی دو الگ الگ کتابیں ہیں۔ ہفتے میں چھ پیریڈ ٹیچر کو پڑھانے کو ملتے ہیں۔ اس میں پڑھانا بھی لکھانا بھی اور کاپیاں جانچنی بھی۔ اس طرح کورس ختم نہیں ہو گا۔ نتیجہ یہ کہ استاد کو بہت سی چیزیں چھوڑ دینی پڑتی ہیں۔ اگر نثر اردو نظم کو انتخاب کر کے ایک ہی کتاب ہوتی تو کورس وقت معینہ پر ختم ہو سکتا تھا۔ سرکار نے چھٹے ساتویں اور آٹھویں کی کتاب "ہماری زبان" تیار کرائی ہے اور وہ ان جماعتوں

نصاب میں داخل ہے۔ اسی طرح نویں اور دسویں اور انٹر میں بھی
ئی ایسی کتاب تیار کرائی جائے جو آج کے طلبا کے معیار کے مطابق ہو۔ ہندی
انگریزی میں عمدہ سے عمدہ کتابیں داخل نصاب ہوتی رہیں اور اب ساری
یں میں ایک ہی کتاب الہ آباد بورڈ سے منظور شدہ پڑھائی جاتی ہے۔

اردو کتابوں کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب جولائی
اسکول کالج کھلتے ہیں تو بازار میں اردو کی کتاب نہیں ملتی۔ جب دو دکان
بھی جائیے تو یہ معلوم ہوگا کہ اردو کی کتاب ابھی نہیں آئی۔ اس طرح
کئی مہینے گزر جاتے ہیں اور مارکیٹ میں کتاب نہیں آتی۔ اس صورت
ں ٹیچر کیسے پڑھائے۔ اگر دو چار لڑکوں کو پرانی کتابیں مل بھی گئیں
اس سے کام نہیں چلتا۔ نہ پڑھائی ڈھنگ سے ہو سکتی ہے، نہ کورس
م ہو سکتا ہے۔

امتحان آتا ہے تو اسکیم ایسی بنائی جاتی ہے کہ لڑکے کو اردو پڑھنے
موقع ہی نہ مل سکے۔ دوسرے مضامین کی تیاری کے لیے چھٹیاں مل
تی ہیں مگر اردو کے لیے ایک دن بھی نہیں۔ مثلاً صبح کو کیمسٹری کا یا
یاضی کا پرچہ ہے تو شام کو اردو کا۔ ایسی صورت میں لڑکے کی عام توجہ
سٹری یا ریاضی پر رہتی ہے۔ اردو پڑھنے کے لیے صرف دو تین گھنٹے کا
قفہ ملتا ہے اس میں کیا تیاری ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی
یں کمزور ہی رہتی ہیں اور وہ اردو میں لیاقت پیدا نہیں کر سکتا۔

جس طرح سرکار کی طرف سے اردو عدم توجہ کا شکار ہے۔ اسی
رح خود نام نہاد اردو پرستوں کے ذریعے بھی اس کا خون ہو رہا ہے۔
نوی درجات میں جو طلبا پڑھتے ہیں ان کی بنیادی کمزوری کی وجہ یہ ہے
وہ جن اسکولوں سے آتے ہیں وہاں اردو مناسب طریقے پر نہیں پڑھائی
اتی۔ چند سال قبل حکومت نے کئی ہزار اردو ٹیچرس کا تقرر کیا تھا۔ مگر ان
ساتذہ کو اردو پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کے بجائے وہ ہندی
دوسرے مضامین پڑھاتے ہیں اور تنخواہ اردو پڑھانے کی لیتے ہیں۔ دیہات
کے اسکولوں میں تو مکمل آزادی ہے کوئی دیکھنے والا نہیں کہ پڑھائی ہو بھی
رہی ہے یا نہیں۔ ماسٹر صاحب اپنے فارم پر کام کر رہے ہیں۔
ہیڈ ماسٹر صاحب اس لیے کچھ نہیں کہتے کہ اُن کے گھر اناج، گھی، دہی،
دودھ سب کچھ پہنچتا رہتا ہے۔ شہر کے پرائمری اسکولوں کی حالت بھی
کچھ کم افسوسناک نہیں ہے۔ وہاں بھی اردو کو اس دلچسپی اور انہماک
سے نہیں پڑھایا جاتا کہ یہ ہماری زبان ہے۔ جو بچے پانچواں پاس کر کے
ٹے میں آتے ہیں وہ صحیح طور پر اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے۔ میونسپل بورڈ
اسکولوں کے علاوہ جگہ جگہ جونیئر سری اسکول کھلے ہوئے ہیں، وہاں کا تو

باوا آدم ہی نرالا ہے۔ وہاں کے مالکان اور منیجر صاحبان چاہے کتنے ہی اردو
دوست کیوں نہ ہوں، کتنی ہی اردو کے لیے دھواں دھار تقریریں کرتے
ہوں مگر خود اپنے اسکول میں اردو کو وہ مقام نہیں دیتے جو دینا چاہیے
زیادہ توجہ نمائشی کاموں پر دی جاتی ہے۔ ایسے اسکولوں میں جن لیڈی
ٹیچرز کا تقرر ہوتا ہے، وہ خود اردو سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتیں۔ وہ
بچوں کو کیا پڑھائیں گی۔ ثانوی درجات میں جو طلبا جاتے ہیں وہ ان ہی
اسکول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جب جڑ کمزور ہوگی تو پورا درخت
کمزور ہوگا۔ جب عمارت کی بنیاد ہی کھوکھلی ہوں گی تو عمارت کیسے بن سکتی
ہے۔ ثانوی درجات میں اردو اساتذہ کا بھی اپنے مضمون کے ساتھ یہی طرز عمل
ہے۔ ان میں سہل پسندی کا مادّہ پیدا ہو گیا ہے۔ ایک عام طرز فکر یہ ہے
کہ ہر لڑکے کو اردو میں پاس کر دو۔ جب پاس کرنا ہی ٹھہرا تو پڑھائیں
کیوں؟ امتحان کا پرچہ آتا ہے تو وہ اتنا آسان کہ لڑکا کوئی بھی ایک
دو سوال رٹ لے پاس ہو جائے گا۔ مثلاً اپنی پڑھی ہوئی کتاب میں سے
کسی ایک سبق کا خلاصہ لکھو یا کسی بھی شاعر کی سوانح حیات لکھو۔ اس سال
ہائی اسکول کے پرچے میں سوال آیا کہ اپنے پرنسپل کو ایک دن کی چھٹی کی
درخواست لکھیے۔ جب اردو کا یہ معیار ہوگا تو یہ کیسے زندہ رہ سکتی ہے
پرچے کو انتہائی آسان بنانا یا زیادہ سے زیادہ پاس کرنا اردو دوستی
نہیں اردو دشمنی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی ماں ممتا کے جوش
میں اپنے بیمار بچے کو اس کی ضد کی وجہ سے وہ غذا دے دے جو اس کے
لیے مہلک ثابت ہو۔ بظاہر بچہ کھا کر خوش ہو جائے گا مگر اس کے جو خطرناک
نتائج برآمد ہوں گے وہ ماں کو بھگتنے پڑیں گے۔ اردو ٹیچرس اس بات
پر خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا نتیجہ سو فیصد رہا۔ یہ بات دیانت داری کے
منافی ہے۔ اگر زبان سے محبت ہے تو ٹیچر کا فرض ہے کہ وہ طالب علم میں
اردو کا ذوق پیدا کرے۔ اگر اردو اساتذہ خود اردو کو دلچسپی اور
محنت سے پڑھائیں تو اردو تعلیم کے مسائل بہت حد تک ختم ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی

لکچرار، امام المدارس انٹر کالج، امروہہ

عید قرباں

آج عید الاضحیٰ ہے۔ آج کا دن اس عظیم واقعے کی یادگار ہے جو اب سے ہزاروں برس پہلے عرب کی سرزمین پر پیش آیا۔ جب کہ ایک باپ (حضرت ابراہیمؑ) نے اپنے بیٹے (حضرت اسمٰعیلؑ) کے گلے پر خدا کی رضا اور خوشنودی کے لیے چھری چلادی تھی۔ اسی لیے آج کے دن کو عید قرباں بھی کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں نہایت موثر الفاظ میں اس کا ذکر ہے۔ یہ واقعہ دراصل یوں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تین روز تک مسلسل یہ خواب دیکھتے رہے کہ وہ اپنے چہیتے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ ہر روز بیدار ہوتے ہی اونٹوں کی قربانی دیتے رہے۔ لیکن آخر میں خدا کا حکم ہوا "اے ابراہیمؑ! ہم تیرے بیٹے کی قربانی چاہتے ہیں۔" اور حضرت ابراہیمؑ حکم ربی کی تعمیل کے لیے تیار ہوگئے۔ بیٹے سے خواب بیان کیا تو بیٹے نے وہ جواب دیا جو رہتی دنیا تک کے لیے یادگار ہوگیا " یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْشَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ۔ " "ابا جان! آپ کو خدا نے جو حکم دیا ہے اسے پورا کیجیے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صابر ہی پائیں گے۔"

اللہ اللہ یہ ایثار، یہ ضبط، یہ اطاعت وصبر، یہ سعادت مندی و فرماں برداری۔ ہمارے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟

جب باپ ذبح کرنے پر اور بیٹا ذبح ہونے پر تیار ہوگئے اور باپ نے بیٹے کو زمین پر ذبح کرنے کے لیے لٹا دیا تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی، مبادا خدا کی محبت پر اولاد کی محبت غالب نہ آجائے اور پھر چشم فلک نے حیرت سے یہ نظارہ دیکھا کہ بیٹے کے حلقوم پر باپ نے چھری چلادی۔ زمین تھرا گئی۔ آسمان کانپ اٹھا۔ خدا سے محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا تھا؟ یہی جذبہ دراصل عشق حقیقی کہلاتا ہے جو اپنی صداقت کا ثبوت دینے کے لیے ہر سخت راہ سے بے خوف وخطر اس طرح گزر جاتا ہے کہ عقل بھی محو حیرت رہ جاتی ہے۔ عشق تو بہر حال عشق ہے۔ یہی وہ جذبۂ عشق تھا جس نے نمرود کی آگ کو گلزار میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہی وہ عشق تھا جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی اور معصوم بچے کو بے آب وگیاہ میدان میں خدا کے حکم پر تنہا چھوڑ دیا تھا اور اب اسی جذبۂ عشقِ حقیقی نے بیٹے کی گردن پر چھری چلوادی تھی۔

غیب سے ندا آئی "ابراہیمؑ! تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔" یہ سخت امتحان آزمائش کی گھڑی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ خدا نے بیکرا تیا حضرت اسمٰعیلؑ کو بچالیا اور ان کی جگہ جنت سے دنبہ بھیج دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی خوشنو[دی] حاصل کی۔ خدا نے خوش ہوکر انھیں متقیوں کا امام بنایا۔ اس کے بعد خدا کے حکم پر باپ اور بیٹے نے مل کر خانۂ کعبہ تعمیر کیا، جو دنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر تھا۔ یہ گھر بن کر تیار ہوگیا تو فرمانِ خداوندی ہوا " اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ "۔ لوگوں کو حج کے لیے پکارو"۔ خلیل اللہؑ نے عرض کیا۔ "رب کریم! میری نحیف آواز کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔" فرمایا "تم پکارو، ہم پہنچادیں گے نہ صرف اس نسل تک بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والی روحوں تک۔"

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے پکارا " اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد " اور ہر جانب سے ان کی آواز کا جواب دیا گیا " لبیک اللّٰھم لبیک۔" یہ اسی آواز کا اثر ہے کہ آج بھی لاکھوں مسلمان پوری دنیا سے خدا کے گھر کی زیارت کے لیے ماہِ ذی الحجہ میں خانۂ کعبہ کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ ایک ہی جیسے لباس میں ایک ہی جیسی تڑپ قلوب میں لیے، ایک ہی جیسے الفاظ لب پر لیے دیوانہ وار دوڑے آتے ہیں۔ زمین سے آسمان تک ایک ہی صدا سنائی دیتی ہے " لبیک اللّٰھم لبیک"۔ یہی حج ہے جس میں وحدت ومساوات کا وہ منظر دیکھنے کو ملتا ہے جو کسی اور مذہب کو نصیب نہیں۔ حج کے اگلے روز جانوروں کی قربانی کرکے سنت ابراہیمی پر عمل کیا جاتا ہے۔

حج اور قربانی ہمیں اطاعت ربانی، ایثار وقربانی، یقین کامل، تسلیم ورضا، صبر و استقلال، شجاعت وہمت، قوت برداشت اور بندگی وسپردگی کا درس دیتے ہیں۔ یہ دن ہمیں سکھاتا ہے کہ خدا کی محبت اتنی مقدس اور اتنی عظیم ہے کہ دنیا کی کوئی بھی شے اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ آج تقریباً سب مسلمان قربانی کرتے ہیں لیکن اصل چیز ہمارا تقویٰ ہمارا جذبۂ ایثار ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ تک ہمارے جانوروں کی قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ خدائے تعالیٰ تو ہماری نیت کو دیکھتا ہے۔

کاش آج بھی مسلمانوں میں حضرت ابراہیمؑ جیسا اطاعت وقربانی کا جذبہ پیدا ہوسکے جو مسلمان ہونے کے لیے بنیادی شرط ہے۔

عارفہ کمال
قصبہ رامپور ضلع مہاراجگنج

سیاہ رات نے اپنا مکروہ آنچل ہر سو پھیلا رکھا ہے۔ رات کے تین بجے ہیں۔ گھنٹے کی ٹن ٹن نے بھیانک خواب سے مجھے پھر بیدار کر دیا ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ ماحول سوگوار ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد پُراسرار بھی ہے۔ میری دونوں روم پارٹنر گہری نیند کے مزے لے رہی ہیں اور ایک میں بدنصیب ہوں کہ بارہ بجے سے نیند کی باہوں میں پناہ لینے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ آنکھ لگتی ہے تو سامنے بچھی نماز کی چوکی پر کوئی خاتون بیٹھی نظر آتی ہے۔ بے حد اداس چہرہ، بکھرے بال، ویران آنکھیں۔ گھٹنوں پر رکھے ہوئے سر کو وہ بار بار اُٹھاتی ہے۔ پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہے، میری محوِ خواب ساتھیوں کی طرف دیکھتی ہے اور پھر اسی طرح گھٹنوں پر سر ٹکا لیتی ہے اور اس کی دبی دبی سسکیاں مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کے جگا دیتی ہیں۔

بارہ بجے سے اب تک تین بار میں یہ دلدوز سپنا دیکھ دیکھ کے جاگی ہوں۔ کون ہے یہ دکھی عورت؟ کس کا ہے یہ مقدس، پرنور مگر سوگوار چہرہ؟ مریم؟ نہیں۔ سیتا؟ نہیں۔ فاطمہ زہرا؟ نہیں۔ اس عورت کی کھوج میں میری سوچ دور تک نکل جاتی ہے اور آخر دل اس پر ٹھہر جاتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ ہماری اعلیٰ بی ہیں — بیگم عبداللہ۔ صنفِ نسواں کی بہت بڑی ہمدرد۔ ان کی بھلائی کے لیے اپنے خاوند کے شانہ بشانہ چٹان کی طرح کھڑی ہو جانے والی اور اُن کے ساتھ مخالفتوں کے ایک زبردست سیلاب کا مقابلہ کرنے والی۔ خود بھوکی رہ کر غریب بچیوں کو اپنے حصے کا کھانا کھلانے والی۔ رسل گنج سے روز بالائے قلعہ پہنچ کر بلامعاوضہ قوم کی بچیوں کو پڑھانے والی۔ آج کی رات ان سے زیادہ پریشان اور سرگرداں اور کس کی روح ہو سکتی ہے۔

آج کا دن قیامت کا دن تھا۔ وہ زندہ ہوتیں تو آج مرجاتیں

گیارہ بجے جب میری ساتھیوں نے شب بخیر کہہ کے بتی گل کر دی تو میں دیر تک آج صبح کے حادثے پر غور کرتی رہی۔ ہم امتحان کے کمرے میں بیٹھے کاپیوں پر اپنے رول نمبر لکھنے کے بعد پرچے کا انتظار کر رہے تھے گھنٹہ بجا تو مستعد استانیوں نے دو منٹ میں پرچہ تقسیم کر دیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے بسم اللہ کہہ کے پرچہ لیا اور اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ پہلی نظر میں پرچہ ذرا مشکل نظر آیا، لیکن دوبارہ دیکھا تو اندازہ ہوا کہ ایسا مشکل بھی نہیں۔ پانچ سوال تو مل ہی سکتے ہیں۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کئی چہروں پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ محنت سے بھاگنے والیوں کی بدحواسی بھی نظر آئی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ امتحان کا کمرہ کیا تھا چھوٹا سا میدانِ حشر تھا جہاں ہماری سال بھر کی محنت کا آج حساب ہو رہا تھا۔

ذرا دیر بعد شور ہوا اور دسیوں لڑکے احاطے میں گھس آئے۔ یہ امتحان سے واک آؤٹ کر کے آئے تھے اور چاہتے تھے کہ لڑکیاں بھی واک آؤٹ کر دیں۔ امتحان کی نگراں نے ہال کے دروازے بند کرا دیے مگر انھوں نے اینٹیں مار مار کے کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور چٹخنی کھول کے آخر اندر گھس آئے۔ وہ ناکارہ لڑکیاں جو سارے سال نہ پڑھتی تھیں ان کے دل کی تو مراد بر آئی۔ یہ فوراً کاپیاں پھینک کے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور باقی سب کو بھی واک آوٹ کے لیے آمادہ کرنے لگیں۔ جنھوں نے محنت کی تھی وہ اس کے لیے کسی طرح راضی نہ تھیں مگر دنیا کا عجب دستور ہے۔ آخری فتح خواہ سچ ہی کی ہوتی ہو لیکن ذرا دیر کے لیے تو بھلائی پر بُرائی غالب آ ہی جاتی ہے۔ آج فتح بدی کی ہی ہوئی تھی۔ شر پسندوں نے ہم سے کاپیاں چھین کے پھاڑ دیں اور ہم بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکے۔

میں بستر پر لیٹی تو کسی طرح چین نہیں آتا تھا۔ رہ رہ کے وہ ساری مصیبتیں یاد آتی تھیں جو ہمیں تعلیم یافتہ دیکھنے کے لیے قوم کے بزرگوں نے برداشت کی تھیں۔ مجھے یاد آیا۔ اپنی بیگم کے حالاتِ زندگی لکھتے ہوئے شیخ عبداللہ نے لکھا ہے کہ علی گڑھ میں جب پہلی بار لڑکیوں کا مدرسہ بالائے قلعہ پر کھولا گیا تو لڑکیاں ڈولیوں میں سوار ہو کر اسکول جایا کرتی تھیں۔ ان ڈولیوں پر پردے بندھے ہوتے تھے اور شریر نامعقول لڑکے سڑک پر ڈولیوں کے پردے کھینچ کھینچ کر ان لڑکیوں کو بے پردہ کرتے اور ان کی توہین کرتے تھے۔ یہ نکمّے اور ناکارہ لڑکے لکھنے پڑھنے سے

بہت دور تھے اور گلی کوچوں میں گلی ڈنڈا اور گولیاں کھیلتے پھرتے تھے یہ جو حرکتیں کرتے تھے وہ یقیناً ان انسان نما شیطانوں کے اشاروں پر کرتے تھے جن کے دلوں میں طبقۂ نسواں کا کوئی احترام نہ تھا اور جو لڑکیوں کی ترقی کے دشمن تھے۔ آج ہمارے جن بھائیوں نے ہماری سال بھر کی محنت اکارت کی وہ پڑھنے والے تو ہیں لیکن کیا عجب وہ بھی ہمارے دشمنوں کا آلۂ کار بن گئے ہوں۔

بابا میاں دشیخ عبداللہ ؒ نے ان شریر لڑکوں کو اچھی سزا دی تھی۔ ایک دن وہ چھپ کے کھڑے ہو گئے۔ جب لڑکوں نے روزانہ کی طرح پردہ کھینچنے کی حرکت کی تو انھوں نے ایک ڈنڈے سے سب کی خوب پٹائی کی۔ اس کے بعد کسی کو ایسی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ زندہ ہوتے تو شاید ان کا ڈنڈا آج پھر حرکت میں آتا مگر وہ تو اپنی بیٹیوں سے بہت دور ہیں۔ کاش کوئی ان کا سا محبت بھرا اور درد مند دل لیے ہوئے اٹھے اور ان کی جگہ لے لے۔

میں سوچتی رہی کہ میری بے چینی اور بے خوابی کا سبب شاید وہ شر پسندی نہیں جس کا آج مظاہرہ ہوا بلکہ وہ بے حسی اور بے عملی ہے جس کا میری ساتھیوں نے اور خود میں نے آج ثبوت دیا۔ خدا جانے اکثریت میں ہونے کے باوجود ہنگامہ پسندوں اور امن دشمنوں کے آگے ہم اتنے بے بس کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ملال تھا تو اس پر کہ ہم سب اپنے حق کی حفاظت کے لیے سینہ سپر کیوں نہ ہو گئے؟ بزدلی کیوں ہمارے آڑے آ گئی۔ یہ خیال کیوں ہمارے قدموں میں زنجیر ڈال دیتا ہے کہ ہمارا تعلق صنف نازک سے ہے۔ مجھے اس دلیر خاتون کا خیال آیا جو قبول اسلام کے بعد اذیتوں کا شکار ہوئی اور اللہ کے راستے میں جان دے کر پہلی شہید کہلائی اور یوں مردوں پر سبقت لے گئی۔ پھر میرا ذہن اس مجاہد خاتون کی طرف پہنچا جو جنگ احد میں رسول اکرم ؐ کی حفاظت میں سینہ سپر ہو گئی اور اس کے چہرے پر تلوار کی ایک ایسی ضرب پڑی جس کا نشان مرتے دم تک باقی رہا۔ مجھے اس باہمت خاتون کی یاد آئی جس نے دلیرانہ باہر نکل کے ایک یہودی جاسوس کا سر تن سے جدا کر دیا تھا۔ مجھے فاطمہ کی یاد آئی جو میدانِ جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتی اور ان کی مرہم پٹی کرتی تھی ان عرب عورتوں کا خیال آیا جو میدان جنگ میں رجز گا گا کر اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتی تھیں۔ پھر چشم خیال کو برہنہ شمشیریں لیے گھوڑے دوڑاتی خاتونوں کے پرے کے پرے نظر آئے۔ یہ رضیہ سلطانہ ہے، یہ چاند بی بی ہے، یہ رانی جھانسی ہے، یہ ....
ان بہادروں کی یاد آئی تو میری ندامت میں کچھ اضافہ ہو گیا اور

ہمارا تمھارا خدا بادشاہ

—: طنز و مزاح

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ۔ بڑا دانش مند، مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمۂ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے، بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جمجاہ کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دور دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور اخبار آزاد تھے کہ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لیے مشہور رہے۔ ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی تھی، کہیں تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جو لوگ لکھ پتی تھے دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے۔ حسن انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اچھالتے اچھالتے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک بلکہ بعض اوقات بیرونِ ملک بھی چلے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لے جا رہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش اسے ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے یا اس کی کامرانی کے لیے چلّے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں عفو اور درگزر کا مادہ ازحد تھا۔ اگر کوئی شکایت کرتا تھا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائیداد ہتھیالی ہے یا فلاں کارخانے پر قبضہ کر لیا ہے تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو وہ کمال سیرچشمی سے اسے معاف کر دیتے تھے۔ بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چک بکیں لے کر تارکِ دنیا ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

—— ابن انشا ——

* * * * * * * * * * * * * * *

خواب میں یکھی ہوئی سوگوار شبیہ پھر سے تصور میں ابھری۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا ماں! میں وعدہ کرتی ہوں جو آج ہوا، اسے پھر دہرا نہ جا سکے گا۔ تمہاری لگائی ہوئی پھلواری کو کوئی پامال کر دے یہ ہم کبھی نہ ہونے دیں گے۔ ہماری ترقی کا جو خواب تم نے دیکھا تھا، اسے ہم شرمندۂ تعبیر کر کے رہیں گے..... مادر مہربان! ایک بار پھر خواب میں آنا مگر مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتے ہوئے!

عفت مفتی (مسلم یونیورسٹی)

بچت کی ایک سرکاری اسکیم جو چھوٹے
بچت کاروں کو 5.5 فیصد ٹیکس سے مستثنیٰ
سُود کے علاوہ 50 روپے تا ایک لاکھ روپے
کے کسی بکّی انعام کا مفاد بھی پیش کرتی ہے۔

انعامی اسکیم

ڈاک گھر بچت بنک کھاتے میں کم از کم 200 روپے جمع
رکھنے سے آپ پبلک ڈرار کے ذریعے نکالے گئے انعام
کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ڈرار ہر سال جنوری اور جولائی میں
نکالے جاتے ہیں۔ ہر ڈرار کے تقریباً 22 ہزار انعاموں کی
کُل مالیت لگ بھگ 30 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

ڈاک گھر بچت بنک کے تین لاکھ سے بھی زائد کھاتے دار
ایسے انعام حاصل کر چکے ہیں۔
آپ اپنے خاندان کے ہر فرد کے نام کھاتا کُھلوا کر اپنے
انعام جیتنے کے مواقع میں اضافہ کر سکتے ہیں یا آپ مختلف ڈاک
گھروں میں اپنے نام سے جتنے جی چاہے کھاتے کھول سکتے ہیں

ڈاک گھر بچت بنک میں 10 اکتوبر تک کھاتہ کھول لیجئے تا کہ آپ
جولائی 85ء میں نکالے جانے والے ڈرار میں شامل ہو سکیں۔

قومی بچت ادارہ — بھارت سرکار

ترقّی اُردو بیورو کی سرگرمیاں

چند اہم منصوبے

اردو انسائیکلو پیڈیا اور مختلف لغات کی تیاری اور اشاعت، ترقی اردو بیورو کے اہم منصوبوں میں سے ہے۔

۱. اردو انسائیکلوپیڈیا	(۱۲ جلدیں تیار)	۴ جلدیں زیر نظر ثانی
۲. انگریزی اردو لغت	(۵ جلدیں تیار)	پہلی جلد زیر اشاعت
۳. اردو اردو لغت	(۵ جلدیں تیار)	زیر نظر ثانی
۴. اردو اردو لغت برائے طلبا	(ایک جلد تیار)	کتابت زیر تصحیح
۵. فرہنگ سیاسیات	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے
۶. فرہنگ ادبی اصطلاحات	(ایک جلد)	پریس میں ہے

اصلاحات سازی

۱۸ شعبوں میں تقریباً ۱۲۲۰۰۰ اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں۔

۱. فرہنگ اصطلاحات کیمیا	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے
۲. فرہنگ اصطلاحات انسانیات	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے
۳. فرہنگ اصطلاحات معاشیات	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے
۴. فرہنگ اصطلاحات حیوانیات	(ایک جلد)	شائع ہو چکی ہے

لسانیات، جغرافیہ، نباتات اور تاریخ و سیاسیات کی فرہنگوں کا کام مکمل ہو گیا ہے۔

چند نئے منصوبے

۱. اُردو کتابوں کی ببلیوگرافی

(چھاپہ خانے کی ایجاد سے لیکر ۱۹۴۷ تک)

ملک کی اہم لائبریریوں میں کام کیا جائیگا۔ فی الحال

مولانا آزاد لائبریری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کام جاری ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام عنقریب شروع کیا جائے گا۔

۲. اُردو اداروں کی ڈائریکٹری

ترقی اردو بیورو اور ملک کی تمام اردو اکیڈیمیوں کی ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی ہے اور باہمی تعاون سے یہ ڈائریکٹری مرتب کی جا رہی ہے۔ اسی طرح کئی اور اہم کام کیے جا رہے ہیں۔

کتابت اور خطاطی کے تربیتی مراکز

اب تک ۲۷ تربیتی مراکز ملک کے مختلف حصوں میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں دو مراکز اعلا فنِ خطاطی کی تربیت اور تین مراکز بطور خاص خواتین کے لیے ہیں۔ جلد ہی ایسے اور مراکز بھی قائم کیے جائیں گے

اردو ٹائپ رائٹر اور طباعتی کمپیوٹر

ترقی اردو بیورو نے ملک میں مقامی طور پر اردو ٹائپ رائٹر کی تیاری کے سلسلے میں بھی کام کیا ہے۔ چنانچہ اب اردو ٹائپ رائٹر ہندستان ہی میں تیار ہو رہے ہیں اور آسانی سے دستیاب ہیں۔ اسی طرح طباعتی کمپیوٹر کی تیاری کے سلسلے میں بھی کوششیں جاری ہیں۔

کچھ اور نئے پروگرام

۱۔ مراسلتی کورس :۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو سیکھنے کے خواہشمندوں کے لیے انگریزی اور ہندی ذریعہ تعلیم سے اُردو سکھانے کا مراسلتی کورس جلد ہی شروع کر دیا جائے گا۔ ابتدائی کام مکمل کیا جا رہا ہے۔

۲۔ تحقیقی رسالہ کی اشاعت :۔ ترقی اردو بیورو کی سرگرمیوں کے سہ ماہی ترجمان "اردو دنیا" کے علاوہ ایک شش ماہی معیاری تحقیقی رسالہ بھی جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ ابتدائی تیاریاں جاری ہیں۔

مطبوعات کی نمائش اور فروخت

ترقی اردو بیورو، ملک کے مختلف اردو مراکز میں ہر سال اپنی کتابوں کی نمائش اور فروخت کا انتظام بھی کرتا ہے۔ پچھلے سال بیورو نے دہلی، بھوپال، مدراس اور کلکتہ جیسے اہم مقامات پر اپنی کتابوں کی نمائش لگائی تھی۔ گذشتہ مالی سال کے دوران ۳۱۱۴۵ روپے کی مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس طرح اب تک کل ۱،۱۰،۶۵۶ روپے مالیت کی کتابیں فروخت ہوئی ہیں۔

بچوں کا ادب

ترقی اردو بیورو اردو میں بچوں کی اچھی اور معیاری کتابوں کی تیاری اور اشاعت کے سلسلے میں بھی کوشاں ہے اب تک اس طرح کی اڑسٹھ (۶۸) کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

طبّی کتابیں

طب یونانی کی عام ضرورتوں کے علاوہ نصابی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کئی کتابیں لکھائی جا رہی ہیں۔ اب تک دس (۱۰) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

علمی، ادبی، سائنسی اور تکنیکی کتابیں

مختلف علوم و فنون سے متعلق اب تک ۴۵۵ کتابیں شائع کی ہیں ان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جو اپنے موضوع پر اولین تصانیف ہیں اور کئی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں گزشتہ مالی سال کے دوران مختلف علوم و فنون سے متعلق ۴، کتابیں شائع ہوئی ہیں جو از خود ایک ریکارڈ اشاعت ہے۔

یہ کتابیں مختلف ریاستوں میں کسی بھی بک سیلر سے خریدی جا سکتی ہیں براہ راست بیورو سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں

تفصیلات کے لیے ذیل کے پتہ پر لکھیں

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.

روبی شمپو پاؤڈر

سے

بال سیاہ ، گھنے ، لمبے اور چمکیلے ہوجاتے ہیں

آپ بھی اپنی شخصیت کو

جاذب نظر بنانے کے لیے

روبی شمپو پاؤڈر

کا استعمال کریں

روبی شمپو پاؤڈر بالوں کو سیاہ ، گھنا ، لمبا اور چمکیلا ہی نہیں بناتا بلکہ بالوں کی دوسری بیماریوں جیسے بالوں کا وقت سے پہلے سفید ہونا ، کمزور ہوکر گرنا ، بالوں میں خشکی اور خارش کو ختم کردیتا ہے

آج ہی اپنے قریبی اسٹور سے طلب فرمائیں۔

مشرقی بہنیں اپنی پوشیدہ بیماریوں کا حال کسی ڈاکٹر یا حکیم کو بتلاتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں عورتوں کی یہ پوشیدہ بیماری ان کو اندر ہی اندر گھلا دیتی ہے اور وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جاتی ہیں۔

اکسیر خواتین

اس موذی بیماری کو جڑ سے ختم کردیتی ہے چند روز کے استعمال سے آپ فرق محسوس کرنا شروع کردیں گی قیمت فی شیشی ۱۵/- روپے ڈاک خرچ الگ

غیر ممالک میں دو شیشی کا مکمل کورس مع ہوائی ڈاک خرچ ۱۲۵/- روپے

آج نوجوان جس ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے اس کا نتیجہ ہے

* پچکے ہوئے گال * گھبراہٹ * بدخوابی

کے استعمال سے بدخوابی دور ہوجائے گی۔ آپ کے پچکے ہوئے گال ٹھیک ہوجائیں گے۔ اور آپ اپنے آپ کو چاق وچوبند پائیں گے۔

ایک شیشی قیمت ۱۵/- روپے (ڈاک خرچ الگ)

غیر ممالک سے دو شیشی کا مکمل کورس مع ہوائی ڈاک خرچ ۱۲۵/-

ہاضمی

ہاضمی کی مفید اثر گولیاں پیٹ کی جملہ تکلیفوں کا خاتمہ کرتی ہیں۔

ہاضمی بچوں سے چھپا کر رکھئے۔

اس کے اچھے ذائقے کی وجہ سے بچے اسے پسند کرتے ہیں اور پوری شیشی چٹ کرجاتے ہیں

قیمت پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

چوٹ ، موچ ، جلے کٹے کا کامیاب علاج

۸۰ ملی لیٹر قیمت دس روپے

اسٹاکسٹ

بمبئی • ایلن اینڈ کینٹ ۳۸ الف۔ محمد علی روڈ بمبئی • میڈلین اینڈ پرفیومری اسٹورس ۱۳۱۔ سی محمد علی روڈ متصل چونا بھٹی مسجد بمبئی • فرینڈس اسٹورس ۱۵۹ ہارون منزل۔ بھنڈی بازار جنکشن بمبئی • سیما میڈیکل اسٹور ۵۱۲ سر جے جے روڈ بمبئی **کلکتہ** • امین اینڈ سنس ۸ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ نیفی دواخانہ ۲۱ رفیع احمد قدوائی روڈ کلکتہ **حیدرآباد** • مون اینڈ کمپنی چار مینار حیدرآباد **بھوپال** • مختار حسین غلام عباس جمعراتی بازار بھوپال **اورنگ آباد** • ابو انجنات مقام وڈاک خانہ سیلہ رفیع گنج۔ ضلع اورنگ آباد **دہلی** • دفاتر بیسویں صدی دریا گنج نئی دہلی

بنانے والے **ریڈیم کیمیکل ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲**

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۹/ ۸۴-۸۵

منتہیہ فارموں پر درج ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

فوٹوگرافر (ایک جگہ) (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف زولوجی

شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۸۵۰ ای بی ۳۰-۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت:-

i. لازمی ۱. بی ایس سی ڈگری۔ زولوجی اور باٹنی بحیثیت اوپشنل مضامین کے ساتھ
۲. فوٹوگرافی میں ڈگری یا ڈپلوما۔

ii. اپینڈیا- ماڈرن فوٹوگرافی اور اس کی تکنیک کے بارے میں جانکاری۔ اور ساتھ ہی ساتھ ڈارک روم کی جانکاری بھی ہونا چاہیے۔

۲۔ اسٹاف نرسز (۱۱ جگہیں) (مستقل) جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل

شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۶۰-ای بی-۲۰-۶۴۰ روپے مع دیگر الاونس

قابلیت:- میٹروکولیشن یا اس کے مساوی۔ کسی منظور شدہ ادارے سے جنرل نرسنگ اور مڈوائفری میں ڈپلوما اور کسی صوبے میں رجسٹریشن بھی ہو۔ کم ازکم ایک سالہ تجربہ بحیثیت جنرل ڈیوٹی نرس ہونا چاہیے۔

۳۔ سینیر لیباریٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ)۔ (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف اناٹومی۔

شرح تنخواہ:- ۳۸۰-۱۲-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰- مع دیگر الاونس۔

قابلیت:

i- لازمی۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری پاس شدہ اور ساتھ میں سابقہ تجربہ بھی ہو۔

ii پینڈیا:- ہسٹالوجی لیباریٹری میں کام کے تجربے کے ساتھ ایمبرائی سیکشن کی تیاری کا تجربہ بھی ہو۔

۴۔ سینیر لیباریٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ)۔ (مستقل)۔ ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری۔

شرح تنخواہ:- ۳۸۰-۱۲-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰- روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت:-

ا۔ لازمی۔ انٹرمیڈیٹ/ ہائر سکنڈری سائنسی مضامین کے ساتھ پاس شدہ۔ آرکیالوجی کے مضامین میں کچھ تجربہ۔

یا

انٹرمیڈیٹ و آرٹس) پاس شدہ امیدوار کے پاس آرکیالوجیکل لیباریٹری کے میدان میں کم از کم پانچ سالہ تجربہ

II پسندیدہ۔ اچھا ٹائپسٹ جس کی ٹائپ اسپیڈ چالیس الفاظ فی منٹ ہو۔

۵۔ اسسٹنٹ حکیم (ایک جگہ) (مستقل) ۔ اجمل خاں طبیہ کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ:۔ ۳۳۰ – ۱۰ – ۳۸۰ – ای بی ۱۲ – ۵۰۰ – ای بی ۱۵ – ۵۶۰ – روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت:۔

I لازمی:۔ ۱۔ بی۔یو۔ایم۔ایس یا اس کے مساوی پاس شدہ۔

۲۔ یونانی پریکٹس میں کم از کم چھ ماہ کا تجربہ۔

۳۔ عربی/فارسی اور انگریزی زبان کا علم۔

II پسندیدہ:۔ ۱۔ ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن کا تجربہ۔

۲۔ پوسٹ گریجویٹ ڈگری۔

اعلیٰ تعلیمی صلاحیت اور تجربہ کے حامل افراد کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا اُن کو بطور ٹی۔ اے ایک طرف کا سکنڈ کلاس کا سنگل کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس اے ایم یو علی گڑھ کے دفتر سے تین روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا 23x10 سم کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل قبول نہیں ہوں گی۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۲/ ۸۴ – ۸۵

مندرجہ ذیل جگہ کے لیے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ یونیورسٹی رجسٹرار۔

شرح تنخواہ :- ۱۵۰۰- ۶۰ - ۱۸۰۰- ۱۰۰- ۲۰۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت :- امیدوار کا تعلیمی ریکارڈ بہترین ہو اور کم سے کم دس سالہ تجربہ ایڈمنسٹریشن میں ہونا چاہیے اور اگر یہ تجربہ کسی یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریشن کے میدان میں ہو تو قابل ترجیح شمار ہوگا۔

اعلیٰ تعلیمی صلاحیت اور تجربے کے حامل امیدواروں کو ابتدا سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا تو ان کو سنگل ٹکٹ کا کرایہ بطور ٹی اے سکنڈ کلاس صرف ایک طرف کا دیا جائے گا۔
مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس، اے ایم یو علی گڑھ کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا سمـ ۲۳x۱۰ کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔
درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

علی گڑھ سے باہر کے امیدوار اپنی درخواستیں رجسٹرڈ پوسٹ سے بنام ڈاکٹر ایچ۔اے۔ایس۔جعفری سکریٹری وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجدیں۔

ضمیر احمد خاں
(رجسٹرار)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۷/ ۸۴- ۸۵

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

فیکلٹی آف میڈیسن

پروفیسرس :-

شرح تنخواہ :- ۱۵۰۰- ۶۰- ۱۸۰۰- ۱۰۰- ۲۰۰۰- ۱۲۵/۲- ۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

۱- پروفیسر آف آپتھلمالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی۔

قابلیت :- ایم۔ایس (آپتھلمالوجی)
ایم۔ڈی (" ")
تحقیق کی رہنمائی اور درس وتدریس کا تجربہ۔
کسی میڈیکل کالج کے آپتھلمالوجی ڈپارٹمنٹ میں چار سال تک بحیثیت ریڈر کام کرنے کا تجربہ

۲۔ پروفیسر آف فارینسک میڈیسن۔ ڈپارٹمنٹ آف فارینسک میڈیسن۔
قابلیت۔
۱۔ لازمی :- ایم۔ڈی (فارینسک میڈیسن)
کسی میڈیکل میں فارینسک میڈیسن میں بحیثیت ریڈر چار سالہ تجربہ۔
نوٹ :- اگر مطلوبہ استعداد کا امیدوار میسر نہ آسکے تو اس صورت میں متعلقہ مضامین مثلاً میڈیسن، پیتھالوجی، اناٹومی سرجری میں پوسٹ گریجویٹ استعداد کا امیدوار جس کو پانچ سے دس سال تک فارینسک میڈیسن میں درس تدریس کا تجربہ ہو، موزوں متصور کیا جائے گا۔
پسندیدہ :- امیدوار اعلیٰ تحقیقی کام میں مصروف ہو۔

ریڈرس

شرح تنخواہ :- ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ - روپے مع دیگر الاؤنس

۳۔ ریڈر ان آپتھلمالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی۔
قابلیت :- ایم۔ایس (آپتھلمالوجی)
ایم۔ڈی (" ")
درس وتدریس اور تحقیق کا تجربہ۔
میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر آپتھلمالوجی پانچ سالہ تجربہ۔

۴۔ ریڈر ان آبسٹیٹرک اینڈ گائناکالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف گائناکالوجی اینڈ آبسٹیٹرک۔
قابلیت :- ایم۔ڈی (آبسٹیٹرک اینڈ گائناکالوجی)
ایم۔ایس (" ")
ایم۔ڈی (میڈ اینڈ گائناکالوجی)
ایم۔ایس (میڈ اینڈ " ")
ایم۔او۔
تحقیق اور درس وتدریس کا تجربہ۔
میڈیکل کالج میں آبسٹیٹرک اینڈ گائناکالوجی میں بحیثیت لکچرر پانچ سالہ تجربہ۔

۵۔ ریڈر ان پیتھالوجی (ہیماٹولوجی اینڈ بلڈ بینکنگ) ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی۔
قابلیت:
۱۔ لازمی ایم۔ڈی۔ (پیتھالوجی)
ایم۔ڈی (پیتھالوجی اینڈ بکٹریالوجی)

ایم۔ڈی (پیتھالوجی مع بکٹریالوجی)
پی۔ایچ۔ڈی (پیتھالوجی)
ڈی۔ایس سی (")
درس و تدریس اور تحقیق کا تجربہ۔
میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرار پیتھالوجی (ہیماٹالوجی اینڈ بلڈ بینکنگ) پانچ سال تجربہ۔
ii پسندیدہ:۔ ہندوستانی یا غیر ملکی رسائل میں اصلی تحقیقی مطبوعہ کام۔

لیکچررس:

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰۔۴۰۔۱۱۰۰۔۵۰۔۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

۶۔ لکچرر ان اناٹومی (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف اناٹومی۔

قابلیت

ا۔ لازمی۔ ایم۔ایس (اناٹومی)
ایم۔بی۔بی۔ایس مع ایم۔ایس سی (اناٹومی)
پی۔ایچ۔ڈی (میڈیکل اناٹومی)
ڈی۔ایس سی (" ")

ii پسندیدہ:۔ مطبوعہ کام/تحقیق کا تجربہ اناٹومی کے میدان میں۔

۷۔ لکچرر ان اناٹومی (ہسٹالوجی) ڈپارٹمنٹ آف اناٹومی۔

قابلیت

ا۔ لازمی ایم۔ایس (اناٹومی)
ایم۔بی۔بی۔ایس مع ایم ایس سی (اناٹومی)
پی۔ایچ۔ڈی (میڈیکل اناٹومی)
ڈی۔ایس سی (" ")

ii پسندیدہ:۔ مطبوعہ کام/ ہسٹالوجی کے میدان میں تحقیق کا تجربہ

۸۔ لکچرر ان پیتھالوجی (عارضی)۔ ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی۔

قابلیت:۔ ایم۔ڈی (پیتھالوجی)
ایم۔ڈی (پیتھالوجی اینڈ بکٹریالوجی)
ایم۔ڈی (پیتھالوجی مع بکٹریالوجی)
پی ایچ۔ڈی (پیتھالوجی)
ڈی۔ایس سی (" ")

۹۔ لکچرر ان اوکولر پیتھالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی۔

قابلیت:

i لازمی ایم۔ایس (آپتھلمالوجی)

ایم۔ڈی (آپتھلمالوجی)
ایم۔ڈی (پتھالوجی)
ایم۔ڈی (پتھالوجی اینڈ بکٹریالوجی)

ii۔ پسندیدہ:۔ ۱۔ آپتھلمک ڈپارٹمنٹ میں آپتھلمک پتھالوجی میں تجربہ ہونے کی بنا پر قابل ترجیح سمجھے جائیں گے۔
۲۔ ہندوستانی اور غیر ملکی رسائل میں تخصص میں اصلی تحقیق کا کام طبع ہونا چاہیے

۱۰۔ لکچرر کم ایپڈیمیالوجسٹ۔ ڈپارٹمنٹ آف پرینونٹیو اینڈ سوشل میڈیسن۔
قابلیت۔
۱۔ لازمی:۔ ایم۔ڈی (سوشل اینڈ پریوینٹو میڈیسن) /
ایم۔ڈی (کمیونٹیو میڈیسن)
ایم۔ڈی۔ (میڈیسن) مع ڈی۔پی۔ایچ۔
تخصص میں مطبوعہ تحقیقی کام

۱۱۔ لکچرر ان کارڈیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔
قابلیت:۔
۱۔ لازمی۔ ڈی۔ ایم۔ (کارڈیالوجی)
ii۔ پسندیدہ:۔ تخصص میں مطبوعہ تحقیقی کام۔

۱۲۔ لکچرر ان نیرو سائیکیٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔
قابلیت:۔ ایم۔ڈی (سائیکیٹری)
ایم۔ڈی (سائیکالوجیکل میڈیسن)
ایم۔ڈی ان میڈیسن مع ڈپلوما ان سائیکلوجیکل میڈیسن)

۱۳۔ لکچرر ان آبسٹیٹرکس اینڈ گائناکالوجی (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف آبسٹیٹرکس اینڈ گائناکالوجی
قابلیت:۔ ایم۔ڈی۔ (آبسٹیٹرکس اینڈ گائناکالوجی)
ایم۔ایس (" " ")
ایم۔ڈی (مڈ اینڈ گائناکالوجی)
ایم۔ایس۔ (مڈ " ")
ایم۔او۔

۱۴۔ لکچرر ان پیڈیاٹرکس (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف پیڈیاٹرکس۔
قابلیت:۔
۱۔ لازمی۔ ایم۔ڈی۔(پیڈیاٹرکس)

اا پسندیدہ:- تخصص میں مطبوعہ تحقیق کا کام

۱۵- لکچرر ان منافع الاعضا (فزیالوجی) ڈپارٹمنٹ آف یونانی طب اینڈ سرجری۔

قابلیت:-

ا- لازمی۔ ا- بی۔یو۔ایم۔ایس۔/ بی۔یو۔ایم۔ایم۔ایس یا کسی مستند ادارے سے (جسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تسلیم کرتی ہو) اس کے مساوی امتحانات۔

۲- کسی مستند ادارے میں درس و تدریس کا کم از کم تین سالہ تجربہ۔

اا پسندیدہ:- ا- اردو زبان کا مکمل علم اور انگریزی میں کام کرنے کی صلاحیت۔

۲- مطبوعہ کام۔

غیر معمولی تجربے اور استعداد کے حامل افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو بطور ٹی۔اے (T. A.) ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ دیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مجوزہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی (فنانس آفس کے کیش سکشن میں جمع شدہ) یا فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے ذاتی طور پر یا پھر 23x10 سنٹی میٹر سائز کا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

علی گڑھ سے باہر کے امیدوار اپنی درخواستیں بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ڈاکٹر ایچ۔اے۔ایس جعفری سکریٹری وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام براہ راست ارسال کریں۔

موزوں امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

(رجسٹرار)

پرنٹر پبلشر: نورالحسن نقوی۔ مقام اشاعت: شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبع: شیروانی پرنٹرس دہلی برائے مجلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔

Litho Colour Printers, Ach 1 Fai, G. T Road Aligarh Phone ;418…

Rs.
1-00

مدیر: سید حامد — مدیر مسؤل: نور الحسن نقوی

جلد ۳ — ۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء — شمارہ ۱۸

مندرجات

فی شمارہ : ایک روپیہ
زرِ سالانہ : بیس روپے
تاحیات : دو سو روپے

ترسیلِ زر کا پتہ :
پروفیسر منظر عباس نقوی ۔ ٹریزرار
تہذیب الاخلاق ٹرسٹ
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

اُولُوالعَزمی

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن — دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن

نہریں ادھر ادھر ہیں امیدوں کی موجزن — اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن

کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

— محمد حسین آزاد

(ٹینی سن کی نظم: ایکسلسیر، سے ماخوذ)

The heights by great men reached and kept
Were not attained by sudden flight
But they, while their companions slept
Were toiling upward in the night

Longfellow

عظیم انسانوں نے جو عظمتیں حاصل کیں
وہ کسی یکلخت پرواز کا نتیجہ نہیں تھیں
بلکہ جب ان کے ساتھی نیند کے مزے لے رہے تھے
تو وہ بلندیوں تک پہنچنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

نئے دور کا آغاز

۱۱ اور ۱۲ اگست ۱۹۸۴ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ ہوئی جس میں ایکٹ کی دفعہ ۱۷، ۱۸، ۲۰ الف اور اسٹیٹوٹ ۱۲ (نہم) کے تحت چانسلر، پرو چانسلر، ٹریزرار اور ممبران ایگزیکیٹو کونسل کا انتخاب عمل میں آیا۔ ان عہدیداران کا تعارف پیش خدمت ہے۔ ممبران ایگزیکیٹو کونسل کا تعارف آئندہ اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

چانسلر

جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی بہ اتفاق رائے یونیورسٹی کے چانسلر منتخب ہوئے۔ یونیورسٹی سے ان کا دیرینہ تعلق ہے اور اس کے ایک اہم شعبے کی تعمیر کلیتاً قدوائی صاحب کی محنت و تدبیر کی رہین منت ہے۔ اس طرح یونیورسٹی کے معماروں میں ان کا شمار ہے۔

بڑا گاؤں، ضلع بارہ بنکی قدوائی صاحب کا وطن ہے۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ جامعہ ملیہ دہلی سے بی۔ ایس۔ سی کیا۔ یہی جامعہ کے پہلے سائنس گریجویٹ ہیں۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ تشریف لے گئے اور کارنل یونیورسٹی سے ایم۔ ایس اور الینوائس سے ڈاکٹوریٹ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی صف میں شامل ہوئے۔ قدوائی صاحب کی کوشش سے ۱۹۵۱ء میں بایوکیمسٹری کی تعلیم ایم۔ ایس۔ سی کی سطح پر شروع ہوئی۔ ۱۹۵۵ء سے بایوکیمسٹری بی۔ ایس۔ سی کا ایک اختیاری مضمون قرار پایا۔

۱۹۶۱ء میں قدوائی صاحب بایوکیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے صدر مقرر ہوئے۔ ان کی صدارت میں شعبہ مستحکم ہوا اور متعدد اہم موضوعات پر تحقیقات کا آغاز ہوا۔ طبیہ کالج میں ادویہ پر جو تحقیقی کام ابھی تک جاری ہے اس کی شروعات انہی کی کوشش سے ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں انھوں نے وقت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے شعبے کی تحقیقات کا رخ نیچرل پراڈکٹس کی طرف موڑ دیا۔

قدوائی صاحب نے یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بھی حصّہ لیا۔ وہ یونیورسٹی کے پراکٹر اور ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیر بھی رہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب یونین پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے تو انھوں نے یونیورسٹی سے رخصت لے لی۔ پھر کمیشن کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے اہم خدمات انجام دیں اور کمیشن کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے ضابطۂ امتحان کو درست کیا۔ انہی کے زمانے میں کوٹھاری کمیشن کی تشکیل ہوئی۔ اور اس کی سفارشات پر عمل درآمد ہوا۔ اس کے بعد کشمیر سے متعلق جب ایک کمیشن کی تشکیل ہوئی تو اس کے رکن رہے۔ آجکل قدوائی صاحب بہار میں گورنر ہیں اور اہل بہار ان کی شرافت اور انسان دوستی کے معترف ہیں۔

قدوائی صاحب نے جو بھی منصب سنبھالا اس کا حق ادا کر دیا۔ اس میں اپنے آرام کو تجنا پڑا، طرح طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑا مگر انھوں نے جس کام کی ذمہ داری اپنے سر لی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیا۔ ان کے کردار کا ایک اور وصف قابل ذکر ہے۔ وہ کہیں بھی رہے ہوں اور کتنے بھی مصروف رہے ہوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بالخصوص اس کے شعبہ بایوکیمسٹری کی ترقی کی تدبیروں سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ علی گڑھ کا معمولی سے معمولی کارکن بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو نہ صرف یہ کہ ان تک رسائی مشکل نہ ہوئی بلکہ انھوں نے اس کی پذیرائی کی اور اس کے مسائل میں دلچسپی لی۔

مسلم یونیورسٹی کے لیے یہ باعث افتخار ہے کہ قدوائی صاحب بہ اتفاق رائے چانسلر مقرر ہوئے اور انھوں نے اس منصب کو قبول فرمالیا۔ یقین ہے کہ ان کی سربراہی میں یہ قومی ادارہ ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔

پرو چانسلر

الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی صاحب یونیورسٹی کے پرو چانسلر منتخب ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی سے آپ کی وابستگی کی داستان بہت طویل ہے۔ شروانی صاحب جناب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے فرزند ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے احمد نگر کی جیل میں جو خطوط تحریر کیے ان میں تخاطب انہی سے ہے۔ یہ وہ خطوط ہیں جو غبارِ خاطر کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں سر سید نے حبیب الرحمٰن خاں صاحب کو کالج کا ٹرسٹی نامزد کیا تھا بعد کو یہ سنڈیکیٹ کے ممبر اور دینیات کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد دینیات کی فیکلٹی وجود میں آئی تو اس کے ڈین منتخب

پرو چانسلر

الحاج عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی

ہوئے۔ بڑے ذی علم اور علم دوست بزرگ تھے، نادر و کمیاب قیمتی کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا جسے ان کے صاحبزادے نے ہدیۂ مسلم یونیورسٹی کو عنایت فرمادیا۔

جناب عبیدالرحمٰن خاں شروانی کی ولادت حبیب گنج میں اگست ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ خاندانی روایت کے مطابق لائق استادوں کی خدمات حاصل کرکے ابتدائی تعلیم مکان پر ہی دی گئی۔ اس میں دینی تعلیم کے علاوہ اردو، فارسی، عربی کی تعلیم شامل تھی۔ انگریزی کا اضافہ بعد کو ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں کالیجیٹ اسکول کی چھٹی کلاس میں داخل ہوئے اور تعلیم کا یہ سلسلہ ۱۹۱۸ء تک جاری رہا۔ درمیان میں دو سال کے لیے دہلی جاکر اینگلو عربک اسکول میں تعلیم پائی اور لاہور سے ہائی اسکول کا امتحان دیا۔ ۱۹۱۸ء میں جب والدِ محترم صدرالصدور ہوکر حیدرآباد تشریف لے گئے تو جائیداد کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔

شروانی صاحب ۱۹۱۹ء میں فاؤنڈیشن کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے تو یونیورسٹی کی انتظامیہ سے پہلا تعلق قائم ہوا جو بحمداللہ اب تک جاری ہے۔ ۱۹۲۳ء میں یونیورسٹی کورٹ اور اس کے ساتھ ہی اکزیکیٹو کونسل کے ممبر چنے گئے اور اس کی مختلف کمیٹیوں میں شامل رہ کر یونیورسٹی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں ٹریزرار منتخب ہوئے اور ۱۹۴۷ء تک اس ذمہ داری کو سنبھالے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں دوبارہ ٹریزرار مقرر ہوئے اور ۱۹۶۵ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ یونیورسٹی سے لگاؤ اور ذمہ داری کے احساس کا یہ حال تھا کہ اس زمانے میں صبح سے لے کر رات کو دیر تک دفتر میں موجود رہتے اور بذاتِ خود ایک ایک کاغذ اور ایک ایک فائل پر توجہ فرماتے تھے۔ کورٹ کی ممبری کا سلسلہ ۱۹۶۷ء تک جاری رہا اور اس وقت ختم ہوا جب ایک آرڈیننس کے ذریعے کورٹ کو معطل کر دیا گیا۔ اس دوران امتحان کمیٹی، فنانس کمیٹی اور ڈائننگ ہال کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

شروانی صاحب نے چار دفعہ یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ کا بار بھی سنبھالا پہلی بار اس وقت جب سرشاہ سلیمان ولایت گئے، دوسری بار ان کی علالت کے زمانے میں اور تیسری بار جب کوئٹہ سے وائس چانسلر جناب زاہد حسین نے لکھا کہ مجھے مصروفیت ادھر توجہ کا موقع نہیں دیتی، یہ کام آپ سنبھالیے۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ شروانی صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسٹریچی ہال پر آزاد ہندوستان کا پرچم پہلی بار ان ہی کے ہاتھوں بلند ہوا۔ اتفاق یہ کہ ہر بار جب یہ ذمہ داری سنبھالنی پڑی تو یونیورسٹی میں کسی نہ کسی طرح کی شورش موجود تھی جسے انھوں نے حسن تدبیر سے رفع کیا۔ اسی دوران انھوں نے نواب زادہ لیاقت علی خاں کو جو اس وقت ملک کے وزیر مالیات تھے کانووکیشن کی تقریب میں مدعو کیا اور ان سے اسناد تقسیم کرائیں۔

شروانی صاحب کے حالات زندگی میں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ ایک طویل مدت تک یوپی کی آئین ساز کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے اہم خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۳ء میں پہلی بار وہ بلا مقابلہ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ۱۹۴۵ء میں پہلی بار انھیں الکشن لڑنا پڑا۔ اس مقابلے میں اس شان سے کامیابی حاصل ہوئی کہ مخالف امیدوار کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ رکنیت کے دوران وہ فنانس کمیٹی اور پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے ممبر اور چیرمین رہے۔

شروانی صاحب کی قومی خدمات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ یو.پی کے بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیجیٹ کے دو بار رکن رہے۔ سنٹرل کورٹ آف وارڈز کے ممبر رہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری رہے، لطفیہ اسکول کے صدر و مینیجر رہے اور اب بھی اس سے وابستہ ہیں۔ جامعہ اردو کے آنریری ٹریزرار، مسلم مسافرخانے کے ایڈمنسٹریٹر، اسلامیہ کالج اٹاوہ اور اسلامیہ کالج سکندرراؤ کے صدر، ندوۃ العلما، دارالمصنفین اعظم گڑھ دارالعلوم دیوبند کی مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔

امید ہے ان کی رہنمائی سے یونیورسٹی مستفید ہوگی۔

رژیزرار

کنور عمار احمد خاں صاحب یونیورسٹی کے ٹریزرار منتخب ہوئے ہیں۔ کنور صاحب لال خانی راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے ں اور مرحوم نواب صاحب آف چھتاری کے ہم جد ہیں۔ یہ خاندان ہمیشہ سرسید ریک کا ہمنوا اور علی گڑھ میں محمڈن کالج کے قیام میں شروع سے معاون رہا جس ا ثبوت یہ ہے کہ اسٹریچی ہال کی دیوار پر کالج کو مالی امداد دینے والے محسن الخیر ے نام کندہ ہیں ان میں اس خاندان کے کئی بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں۔

کنور صاحب کے اجداد دان پور ضلع بلند شہر میں آباد تھے۔ یہ قصبہ ی گڑھ سے بتیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہیں ۱۹۱۸ء میں کنور صاحب ی ولادت ہوئی۔ اسی سال وبائی انفلوئنزا پھیلا جس میں ان کے دادا، والد ر تین بھائیوں کا ایک ہفتے کے اندر انتقال ہو گیا۔ دادی نے ان کی پرورش ی اور ایک اسلامی مدرسے میں ابتدائی تعلیم دلائی۔ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ کی دگی کا آغاز ہوا۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے اسکول میں داخلہ لیا ر ۱۹۴۰ء تک ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے ۔ اے آنرز کیا اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے ر انھوں نے بیک وقت تین کاموں کی طرف توجہ کی۔ اپنی زمینداری کی یکھ بھال، ملکی سیاست اور ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل۔ ادی سے پہلے وہ یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور آزادی کے کافی تک ممبر رہے۔ اس دوران اسمبلی کی کئی اہم کمیٹیوں مثلاً فنانس کمیٹی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے قابل قدر خدمات ام دیں۔ لیکن سیاسی مصروفیات کے باوجود ان کی توجہ کا سب سے اہم ز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی رہی۔ ان کا جدت پسند ذہن اس کے استحکام اور وغ کے لیے نئی نئی اسکیمیں تیار کرنے اور پھر انھیں خواب سے حقیقت میں لنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس میدان میں انھوں نے ایسے کارنامے انجام یے ہیں کہ اس تعارفی مضمون میں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ تاہم ضروری علوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا مختصراً ذکر کر دیا جائے۔

★ ۱۹۵۹ء میں یونیورسٹی پریس قائم کیا اور ۱۹۷۷ء تک ممبر انچارج حیثیت سے اس کو ترقی دینے میں مصروف رہے۔

★ ۱۹۶۰ء میں اسٹوڈنٹ اسٹیشنری مارٹ قائم کیا جو آج بھی پوری نیورسٹی کو اسٹیشنری مہیا کرتا ہے۔ اس کے منافع سے نادار طلبا کی مدد ی جاتی ہے۔

★ اسٹور پرچیز ڈپارٹمنٹ قائم کیا اور یونیورسٹی کی اقامت گاہوں کو ان دکانداروں سے نجات دلائی جو خراب اشیا من مانی قیمت پر سپلائی کرتے تھے کیونکہ قیمت کی نقد ادائیگی ممکن نہ تھی۔ افسوس یہ مفید شعبہ باقی نہ رہ سکا۔

ٹریزرار

جناب کنور عمار احمد خاں صاحب

★ یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی منانے کا فیصلہ ہوا تو اس کی فنڈ کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے اور جوبلی کے لیے فنڈ جمع کیا۔ افسوس ہے کہ شاندار جوبلی منانے کا خیال شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

★ تیس پینتیس سال یعنی جب تک مسلم یونیورسٹی کورٹ برقرار رہی اس کے ممبر رہے۔

★ کئی برس ایگزیکٹو کونسل کے رکن رہے۔

★ بارہ سال سے زیادہ مدت تک یونیورسٹی فنانس کمیٹی کے ممبر رہے۔

★ طبیہ کالج دواخانہ کمیٹی کے ممبر رہے۔

★ اسکول مینجنگ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے اسکولوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔

★ ہال کونسلوں کے مسلسل ممبر رہے۔

★ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری رہے اور اس حیثیت سے کئی مفید کام انجام دیئے۔

★ دس برس تک اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری رہے اور اس عرصے میں کئی اہم کارنامے انجام دیے جن میں غالباً سب سے زیادہ اہم حبیب اللہ ہاسٹل کا قیام تھا۔ یہ ہاسٹل یونیورسٹی کے ایک محسن کے نام پر قائم کیا گیا تھا۔ اس میں ان طلبا کی رہائش کا انتظام تھا جن کا تعلیمی ریکارڈ شاندار ہو لیکن مالی حالت تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہ دیتی ہو ان طلبا کو خوراک سمیت تمام سہولیات میسر تھیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ یونیورسٹی کے لائق استاد شام کو ان طلبا کو علاحدہ سے تعلیم دیتے اور ان کی تعلیمی مشکلات بلامعاوضہ حل کرتے تھے۔ ہر طالب علم سے کل تیس روپے مہینہ لیا جاتا تھا۔ ابتداءً یہ ہاسٹل نمائش گراؤنڈ کے قریب کرایے کی عمارت میں تھا۔ بعد کو کوٹہ کے ایک رئیس کے مالی تعاون سے اس کی اپنی عمارت تعمیر کی۔ اس ہاسٹل میں جن طلبا کا قیام رہا ایک کے علاوہ باقی سب نے اپنے اپنے میدان میں بڑا نام پیدا کیا۔

کنور صاحب کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ملک میں مسلمانوں کے معیاری تعلیمی ادارے ہونے چاہئیں جن سے ہونہار طالب علم نکلیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیں اور آخر کار قوم کو سربلندی کا موقع فراہم کریں۔ علی گڑھ پبلک اسکول اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور کنور صاحب اس کے فاؤنڈر ممبر ہیں۔

★ کرنل بشیر حسین زیدی کا ایک بڑا کارنامہ سیفی ٹرسٹ کا قیام ہے۔ یہ ٹرسٹ سیدنا طاہر سیف الدین کے گراں قدر عطیے اور یونیورسٹی اسٹاف کے مالی تعاون سے قائم ہوا۔ سیدنا اس کے سرپرست تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے پہلے اور نواب صاحب آف چھتاری دوسرے صدر تھے۔ موجودہ صدر کرنل بشیر حسین زیدی ہیں ..... اس ٹرسٹ کے پاس اس وقت کئی لاکھ روپیہ موجود ہے۔ ضرورت مند طلبا کی اس سے مدد کی جاتی ہے لیکن اب ٹرسٹ کے دائرہ کار کو وسیع کیا جا رہا ہے جس سے اس کی افادیت میں نمایاں اضافہ ہوگا۔ کنور صاحب اس کے ٹرسٹی بھی ہیں اور سکریٹری بھی بلکہ اس کا پورا بوجھ انھی کے کاندھوں پر ہے۔

★ ان اداروں کے علاوہ کنور صاحب بہت سے رفاہی اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ یوپی سنٹرل وقف کمیٹی نے ضلع وقف کمیٹیاں قائم کیں تو انھیں علی گڑھ کی ــــــــ ضلع کمیٹی کا صدر مقرر کیا، نیشنل رائفل ایسوسی ایشن کے بھی نائب صدر رہے۔ اور آج بھی اس سے وابستہ ہیں۔ ضلع سے باہر بھی انھوں نے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی رہنمائی کی۔ دان پور ضلع بلند شہر میں انھوں نے جنتا انٹر کالج قائم کیا جس کے وہ صدر بھی ہیں۔ خورجہ کے سعید انٹر کالج کو بھی کنور صاحب کا عملی تعاون حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ کنور صاحب نے اپنی مصروفیات کے باوجود متعدد تعلیمی اور فلاحی ادارے قائم کیے، اپنی ان تھک کوشش سے قدیم اداروں کو مستحکم کیا اور ان کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ آج یہاں جو گرد جو تعمیری کام نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر کنور صاحب کے مشہور احسان ہیں۔ جو بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ ان کے عزائم آج بھی جوان ہیں۔ میرس روڈ (علی گڑھ) پر واقع عمار منزل کے مقابل کنور صاحب کی ایک بڑی آراضی ـــــ عن قریب اس پر ایک سہ منزلہ عمارت تعمیر ہوگی۔ جس کی دکانوں اور کمروں کے کرایے سے جو آمدنی ہوگی وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے تعلیمی اداروں پر صرف ہوگی۔ دان پور میں ان کا جو وسیع آبائی مکان ہے اس میں بھی وہ کوئی تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک گفتگو کے دوران کنور صاحب نے فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمان اگر باوقار انداز سے رہنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے وجود کی افادیت کو ثابت کرنا ہوگا اور اہل وطن کو بتا دینا ہوگا کہ ہم نکمّے اور ناکارہ نہیں۔ ہم اسی وقت کامیاب ہوں گے جب ہمارے ہم وطن یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم مسلمانوں کو ساتھ لیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے اور ان کے بغیر جی نہیں سکتے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم دوسروں سے بڑھ کر محنت کریں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ تعلیم کے بغیر یہ ترقی ممکن نہیں۔ ضروری ہے کہ ہم جگہ جگہ تعلیمی ادارے بالخصوص پرائمری اسکول قائم کریں یہ محض زبانی باتیں نہیں بلکہ ہم اس کا منصوبہ تیار کرنے میں مصروف ہیں اور جلد اس کو عملی جامہ پہنائیں گے۔"

ادارۂ تہذیب الاخلاق ان نیک ارادوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔

مندرجہ ذیل اصحاب ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے:

۱۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی۔ ایم۔ پی۔ نئی دہلی۔
۲۔ جناب محمد شفیع قریشی ایڈوکیٹ سپریم کورٹ۔ نئی دہلی
۳۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر
۴۔ جناب ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ لکھنؤ
۵۔ ڈاکٹر سید ظہور قاسم سکریٹری حکومت ہند۔ نئی دہلی۔

اے گرفتارِ عذاب

اغیار ایک فرد کو بگاڑ سکتے ہیں، چند افراد کو تباہ و برباد
ر سکتے ہیں لیکن ایک پوری کی پوری قوم کی تباہی و بربادی، اس کی
راہی و ضلالت خود اس کی اپنی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں دوسروں
ا ہاتھ نہیں ہوتا۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ اس تباہی و بربادی کے
ل کو تیز تر کر دیتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے، جب کوئی قوم راہ عمل سے ہٹ جاتی ہے، علم و ہنر
ے تہی دست ہو جاتی ہے اور محنت و جانفشانی سے گریز کرنے لگتی ہے
رے بلندیوں سے اٹھا کر پستیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ تاریخ
اہد ہے جب کوئی قوم عقل و خرد کی روش چھوڑ دیتی ہے، فہم و فراست
ے منہ موڑ لیتی ہے اور ذکاوت و زیرکی سے ناطہ توڑ لیتی ہے تو اسے
نش عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے جب کسی قوم کے افراد گروہوں
ں بٹ کر آپس ہی میں دست و گریباں ہونے لگتے ہیں، فتنہ و فساد اور
بغض و حسد کے آزار میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس قوم پر ذلتوں کا کہر
سلط کر دیا جاتا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ اس میں کوئی رعایت
ہیں کوئی لچک نہیں۔ کرۂ ارض کا مالک اس سلسلے میں یہ نہیں دیکھتا
کون قوم موسیٰؑ کا نام لیتی ہے اور کون عیسیٰؑ کا۔ کون قوم حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتی ہے اور کون مارکس اور لینن کا۔ وہ
مین کا اقتدار، اس کی امامت اسی قوم کے سپرد کرتا ہے جو اس کی
ل ہوتی ہے۔

دنیا کا نقشہ اٹھا کر دیکھیے مراکش سے فلپائن تک ایک وسیع
علاقہ ہے جس پر مسلمان پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا کی آبادی کا لگ بھگ
ہائی حصہ ہیں۔ ان کی اپنی بیسیوں حکومتیں ہیں جن میں انھیں خود مختاری
ا دعویٰ ہے۔ اس علاقہ میں زرخیز زمینیں ہیں، قدرتی وسائل کی بھرمار
ہے اور معدنی ذخائر کی کثرت ہے۔ آہ! لیکن یہی وہ علاقہ بھی ہے جو
مدتوں سے آتش فشاں بنا ہوا ہے اور یہی وہ خطۂ زمین بھی ہے، جو
مسلمانوں کے خون سے سرخ تر ہوتی جا رہی ہے۔ کبھی فلسطینیوں اور
شاہ حسین کی خانہ جنگی ہے تو کبھی پنجابی اور بنگالی مسلمانوں کی۔ کبھی آسام کا
سانحۂ عظیم ہے تو کبھی بمبئی اور بھیونڈی کے مسلم کش فسادات۔ کبھی اریٹریا کا
ظلم و ستم ہے تو کبھی فلپائن کی بربریت، کبھی افغانستان میں روس کی درندگی
کا رقص ہے تو کبھی مشرق وسطیٰ میں اسرائیلی حیوانیت کا ننگا ناچ۔ کبھی عربوں
کی آپسی جھڑپیں ہیں تو کبھی ایران و عراق کی طویل جنگ۔ غرض کہ ہر جگہ، ہر
شکل میں، یہ مسلمان کا خون ہے جو پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ کبھی اغیار
کے ہاتھوں کبھی خود اپنے۔

آج دنیا کی بڑی قوموں میں سے مسلمان ہی ہیں جنھیں جب کوئی چاہے
آ دبوچتا ہے۔ جسے جب کوئی چاہے بڑھ کر روند ڈالتا ہے۔ اسرائیل جیسا
چھوٹا ملک جس کی کل آبادی چالیس لاکھ سے زیادہ نہیں ساڑھے چار کروڑ
عرب مسلمانوں کے بیچ بدمست ہاتھی بنا ہوا ہے۔ وہ جب اور جس بھی یہ
ملک میں چاہتا ہے دندناتا ہوا گھس جاتا ہے۔ وہ مقبوضہ فلسطین میں
مسلمانوں کی بستیاں اجاڑ کر یہودی بستیاں بسا رہا ہے لیکن کسی کی کیا مجال
جو اسے روک سکے۔ اس نے لبنان کے قلب میں گھس کر درندگی کا ننگا رقص
کیا، سب بت بنے دیکھتے رہے۔ اس کے ہوائی جہازوں نے عراق کی راجدھانی
میں نیوکلیر ریئکٹر کو پیوست زمین کر ڈالا۔ مگر کوئی عرب توپ ان جہازوں
کے خلاف نہ داغی جا سکی۔ سب بے غیرتی کی چادر اوڑھے دبائے دیتے رہے۔
آج وہ خطۂ زمین جسے عالم اسلام کہا جاتا ہے، قتل و غارت گری کی
آماجگاہ ہے، تباہی و بربادی کا شہر ہے، نالہ و فریاد کی بستی ہے اور
بے بسی اور لاچاری کا ڈھیر ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے قدرت نے مسلمانوں کو
ایک مستقل عذاب میں گرفتار کر دیا ہے اور یہ بات ایک حامل قرآن قوم سے
زیادہ اور کون جانے گا کہ قومیں عذاب الٰہی کا شکار کب ہوتی ہیں۔

عذاب ہمیشہ ایک ہی شکل میں نہیں آتا۔ اس کی شکل، اس کی ہیبت ناکی
اس کا پھیلاؤ، قوموں کی نافرمانی، بے عملی اور گناہوں پر منحصر ہوتی ہے۔
کبھی مہیب آندھی آتی ہے، کبھی سیلاب آتا ہے، کبھی کوہ آتش فشاں پھوٹ
پڑتا ہے اور کبھی شدید زلزلہ۔ بغور دیکھیے تو دنیاوی عذاب کی یہ سب

ہلکی شکلیں ہیں۔ محدود علاقے میں، چند گھنٹے یا چند روز، چیخ و پکار، آہ و بکا سب کچھ ختم۔ لیکن آج کا مسلمان جس شکل کے عذاب میں گرفتار ہے وہ اپنی وسعت و مدت کے لحاظ سے بھیانک ترین ہے۔ یہ عذاب ایک مدت سے مسلط ہے اور نہ جانے کب تک رہے گا۔ جدھر دیکھیے مسلمان ہی قتل و غارت گری کا شکار ہے۔ ایک سانحے پر بہے ہوئے آنسو خشک بھی نہیں ہو پاتے کہ دوسرا اس سے بڑا سانحہ ہو جاتا ہے۔ ایک ظلم پر چیخ و پکار کی آواز مدھم بھی نہیں ہونے پاتی کہ اس سے بڑے کسی دوسرے ظلم کا شکار کر دیا جاتا ہے۔ بستیوں پر بستیاں جلا ڈالی جاتی ہیں، دن دہاڑے بہو بیٹیوں کی آبروئیں لوٹ لی جاتی ہیں، معصوم بچوں کو سنگینوں پہ چڑھا دیا جاتا ہے اور غریب مسلمان لاچاری اور بے بسی سے دیکھتا رہتا ہے۔

کسی قوم پر اس سے زیادہ مہلک عذاب اور کیا ہوگا کہ اس قوم کے افراد گروہوں میں بٹ کر آپس ہی میں دست و گریباں ہو جائیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی بوٹیاں نوچے اور دوسرے تفریح لیں۔ وہ قوم اپنے ہی وسائل کو اپنی ہی بربادی کے لیے استعمال کرے۔ دوسرے کے سامنے سرنگوں ہو کر ہتھیار خریدے اور اُن سے اپنوں ہی میں تباہی مچائی جائے۔ اخوت، رواداری، بھائی چارگی و بربادی کو خیرباد کہہ کر آپس ہی میں موت کا کھیل کھیلا جائے۔

کسی قوم پر عذاب کی اس سے زیادہ بھیانک شکل اور کیا ہوگی کہ اس کے لیڈر اغیار کے اشاروں کے غلام اور اس کے اکابر زمانے کے تقاضوں سے ناآشنا ہوں۔ اس قوم میں ایسے شاطر ہوں جو اپنی چھوٹے چھوٹے سیاسی اغراض کے لیے اداروں پہ ادارے برباد کرتے چلے جائیں اور اپنی جذباتی تقریروں سے عوام کے جذبات کو برانگیختہ کر کے انھیں تباہی کے غار میں جھونک دیں۔

اور پھر ستم یہ کہ مسلمانوں کو احساس تک نہیں کہ انھیں کسی عذاب میں مبتلا کر دیا گیا ہے اور ہو بھی کیسے جب ذہنوں پر یہ نقش ہو کہ وہ 'خیر امت' ہیں۔ ایک لمحہ ٹھہر کر سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ کیا خیر امت کا یہی حال ہوتا ہے جو اُن کا ہے۔ خیر امت آبا و اجداد تھے جنھوں نے بلاشرکت غیرے صدیوں تک دنیا کی امامت کی۔ نوحؑ کے گھر پیدا ہو جانے سے کنعان صالح نہیں بن گیا۔ آج مسلمانوں کا حال تو یہ ہے کہ ہر جگہ پٹتے ہیں، روندے جاتے ہیں مگر 'پدرم سلطان بود' کا نشہ ایسا طاری ہے کہ ہوش نہیں آتا۔ ایک ایسی لمبی غنودگی ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ ہر تاراجی کے بعد چند لمحے کے لیے چونک پڑتے ہیں، جھگڑا ہوتا ہے، گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں، الزام رکھے جاتے ہیں، قرار دادیں پاس ہوتی ہیں، آقاؤں کی آستانہ بوسی کی جاتی ہے۔ دوچار طفل تسلیوں کے بول سن کر، بیانات دے کر پھر لمبی غنودگی۔ ذرا دیر کو رک کر یہ نہیں سوچتے کہ وہ امت جس کے ذمے مظلوموں اور بے کسوں کی غمخواری تھی، اس کی غمخواری کرنے کو کون آئے گا؟ ٹھوکروں پہ ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی ذہن کی گرہیں نہیں کھلتیں۔ یہ سمجھ سکیں کہ جو اپنی مدد آپ نہیں کرتا خدا بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔

مسلمانوں پر جتنی جلد یہ حقیقت آشکار ہو جائے اتنا ہی بہتر ہوگا کہ اپنی موجودہ تباہی کے ذمہ دار وہ خود ہیں کوئی دوسرا نہیں۔ کمزوروں کی کمزوری، مجبوروں کی مجبوری و معذوروں کی معذوری سے فائدہ اٹھانا سدا سے دنیا والوں کا مشغلہ رہا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس وہ قانون ہے جو بھیس بدل بدل کر ہمیشہ سے رہا ہے اور ابد تک رہے گا۔ گدلا پانی بذات خود شکار ماہی کی دعوت ہے۔ متحد، عقل و خرد سے بہرہ ور، علم و ہنر سے آراستہ و عرق ریز اور جفاکش قوموں سے اغیار آنکھ ملاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ منتشر، عقل و خرد سے کوری، علم و ہنر سے تہی دست، کاہل و سست اقوام کی بستیاں ہمیشہ سے ہی دوسروں کی شکارگاہیں بنی ہیں، ویسے ہی آج مسلمانوں کی بستیاں ہیں۔

آج کا مسلمان پستی کے جس گرداب میں پھنس گیا ہے اس سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ یہ راستہ آہ و بکا، نالہ و فریاد، گریہ و زاری و سینہ کوبی کا نہیں۔ یہ راستہ دربدر کی بندگی "مدد مدد" کی پکار اور رحم کی بھیک مانگنے کا نہیں۔ نہ ہی یہ راستہ ابن الوقت لیڈروں اور اغیار کے فریب میں آنے کا ہے اور نہ ہی جذبات سے لبریز تقاریر کے زیر اثر آ کر خودکشی کر لینے کا۔ یہ راستہ ہے گروہی عصبیتوں سے بالاتر ہونے کا، اخوت و رواداری کا، بھائی چارگی اور خاموش ملّی خدمات کا۔ یہ راستہ ہے ایمان و یقین کا، فکر و عمل کا، حصول علم و ہنر کا و جفاکشی و عرق ریزی کا۔ یہی وہ راستہ ہے جسے قرآن صراط مستقیم کہتا ہے اور جس پر چلنے کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تلقین کی ہے۔ جب تک مسلمان اس راہ پر گامزن رہا وہ مسندِ امامت پر فائز رہا۔ دنیا اس کی ٹھوکروں پہ رہی۔ جب سے اس نے یہ راہ چھوڑی، دنیا کی ٹھوکریں اس کا مقدر بن گئیں۔

آئی۔ احمد

پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف فزکس

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی میں

ڈپلوما کورسز کا آغاز

سول، الیکٹریکل اور میکنیکل انجینئرنگ میں تین سالہ پوسٹ یٹرک ڈپلوما کورسز ۱۹۴۸ء میں شروع کیے گئے۔ اس کے آغاز کی یک رنگارنگ تاریخ تھی۔ کچھ عرصے تک یہ یونیورسٹی کے سوتیلے بچے کی مانند نظر آتا تھا۔ ڈپلوما کو ڈگری کورسز کے ساتھ ملحق رکھا گیا تھا اور اس کے تظام کی ذمہ داری انجینئرنگ کالج کے مختلف صدور شعبہ کے ذمے تھی جن کی پی شدید مصروفیات تھیں، جس کی وجہ سے ان کے لیے مشکل تھا کہ وہ ود کو ڈپلوما کورسز کے روزمرہ مسائل سے صحیح طور پر وابستہ کرسکیں و ان کی ترقی اور بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کرسکیں۔ نتیجے میں ان لو رسز نے اپنی صحیح سمت کھو دی اور ایک لمبے عرصے تک پیر پٹخنے میں سدارف رہے۔ ڈپلوما کی لکچر کلاسیں کبھی یہاں ہوتیں، کبھی وہاں اور بھی کہیں بھی نہیں۔ پریکٹیکل ورک متفرق اوقات میں انجینئرنگ کالج لی لیباریٹریوں اور ورکشاپ میں انجام پاتا اور شرط عائد تھی کہ اوقات گری کورسز سے خالی ہوں۔ اس سلسلے کا ایک دردناک واقعہ نقل رتا ہوں۔ ایک مرتبہ ڈپلوما کے طلبا اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق، کالج رکشاپ میں کام کر رہے تھے کہ ایک غیر مقررہ وقت میں ڈگری کلاس پہنچا اور ورکشاپ خالی کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ جب ایسا نہیں کیا گیا معاملے کی اطلاع ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ کو دی گئی جو پرنسپل سے ملے ور سب نے مل کر ڈپلوما کے طلبا کو وہاں سے دھکے دے کر نکال باہر ردیا۔

ڈپلوما کے لیے الگ سے کوئی اسٹاف نہیں تھا۔ کالج کے کچھ بہت ہی جونیر اساتذہ کو کلاسیں دی جاتی تھیں۔

کالج کے ایک مشہور پروفیسر ڈپلوما کے خون کے پیاسے ھے اور ان کی دلی تمنا تھی کہ اسے ختم کردیا جائے

وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کی دانشمندی نے ڈپلوما کورسز کی ماہیت محسوس کی اور ۱۹۵۰ء میں ایک الگ یونٹ کی حیثیت دے کر اسے الگ کر دیا۔ اس کا نام انھوں نے پالی ٹکنک رکھا۔ انھوں نے اس پالی ٹکنک کو انگلش ہاؤس کی عمارت میں جگہ مہیا کی۔ یہ عمارت آج کل ایم۔ ایم۔ ہال کا ایک حصہ ہے۔ انھوں نے اساتذہ کا ایک مخصوص عملہ مقرر کیا جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔

۱۔ الیکٹریکل انجینئرنگ۔ جناب ایچ، اے الہاشمی،
" ایم۔ یو۔ صدیقی۔
۲۔ میکینکل انجینئرنگ " ایس۔ نظر حسن۔
" غفران بیگ۔
۳۔ سول انجینئرنگ " اے۔ ضیاء الحسن۔
" کے۔ ایم بہاء الدین۔

جناب نور الہدیٰ پالی ٹکنک کے پہلے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے جن کی جگہ ۱۹۵۲ء میں ایچ، اے الہاشمی نے لی۔ سپرنٹنڈنٹ کے ذمے انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کی ماتحتی میں پالی ٹکنک کے روزمرہ انتظامی امور کی دیکھ بھال تھی۔ یہاں طلبا کے داخلے کی تعداد ۹۰ مقرر تھی۔

پالی ٹکنک کے اخراجات یونیورسٹی اپنے بلاک گرانٹس سے مہیا کرتی تھی۔

انجینئرنگ کالج منیجنگ کمیٹی کے خطوط پر ایک پالی ٹکنک منیجنگ کمیٹی بنائی گئی۔ ۱۹۵۰ء سے پالی ٹکنک کی کلاسیں انگلش ہاؤس میں ہونے لگیں اور وہیں سپرنٹنڈنٹ کا دفتر بھی واقع تھا۔ پریکٹیکل کلاسیں، پھر بھی کالج کے ورکشاپ اور لیباریٹریوں میں ہی ہوتی رہیں جو طلبا اور اساتذہ کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

۱۹۵۴ء میں اے۔ آئی، سی، ٹی، ای کی پہلی وزیٹنگ کمیٹی یونیورسٹی پہونچی اور اس نے ورکشاپ لیباریٹریوں، ساز و سامان اور فرنیچر کے لیے ایک بڑی رقم منظور کی، ساتھ ہی اسٹاف کے تقرر کے لیے بھی گرانٹ دی۔ اس کمیٹی نے طلبا کے داخلے کی تعداد ۱۲۰ مقرر کی۔

عمارت اور دوسرے ساز و سامان کے لیے دی جانے والی رقم کالج کے
کی گئی تاکہ ڈپلوما کے طلبا کی عملی تربیت کے لیے کالج اپنے ورکشاپ اور
یٹریوں کی موجودہ سہولتوں میں مزید اضافہ کرے۔

۱۹۵۷ء میں حیدر کانت گھوش توسیعی اسکیم کے تحت پالی ٹکنک
داخلے کی تعداد دوبارہ مقرر کی گئی جو بڑھ کر ۲۴۰ ہو گئی اور ۲۴۰ کی
کے پالی ٹکنک کے لیے، اے۔ آئی۔ سی۔ ٹی۔ ای کے ضابطے کے مطابق،
ت کی تعمیر، ساز و سامان کی خرید، فرنیچر، کتابیں، ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ عملے
ر وغیرہ کاموں کے لیے ایک بڑی رقم بھی منظور کی گئی۔ ایک پرنسپل کا عہدہ
منظور کیا گیا۔ میں اسی سال سپرنٹنڈنٹ ہاشمی کی جگہ، پالی ٹکنک کا پہلا
ل بنایا گیا اور ۱۹۸۱ء تک اسی عہدے پر کام کرتا رہا۔

۱۹۶۱ء میں پالی ٹکنک انجینئرنگ کالج سے تعلیمی اور انتظامی ہر دو امور
لگ کر دیا گیا۔ نئے آرڈیننس کے تحت اکیڈمک امور بورڈ آف
ٹڈیز کو دے دیے گئے جو ہر شعبے میں الگ الگ تھا۔ انتظامیہ کا مکمل
رنئے تفریباً پرنسپل کے ہاتھ میں تھا جو تمام بورڈ آف اسٹڈیز
مین بھی تھا۔ ہر بورڈ آف اسٹڈیز اپنے شعبے کے سب سے سینیئر ریڈر
تحت تھا۔ پرنسپل تمام شعبہ جات کے تعلیم کی عمومی نگرانی کرتا تھا۔

جناب اے۔ اے ضیاء، اا اسلام اے ــــ الہاشمی اور الیس
سن بالترتیب الیکٹریکل اور میکینکل شعبوں کے ریڈر
ج مقرر ہوئے۔ پرنسپل اور تین ریڈر انجینئرنگ فیکلٹی کے مستقل
نامزد ہوئے۔

ان باتوں کے باوجود پالی ٹکنک کے طلبا کی عملی تربیت اب بھی
کے ورکشاپ اور لیباریٹریوں میں انجام پاتی رہی اور ۱۹۵۷ء میں
ر کی گئی گرانٹ کالج کو دے دی گئی کہ وہ اپنے ورکشاپ
لیباریٹریوں میں ڈپلوما کے طلبا کے لیے سہولتوں کا انتظام کرے۔
۱۹۶۲ء میں تیسرے پانچ سالہ پلان کے تحت یو۔ جی۔ سی نے
یس۔ سی۔ انجینئرنگ میں داخلے کی تعداد ۱۲۰ سے ۲۴۰ کر دی اور
کو ایک بڑی گرانٹ بھی دی۔

اسی سال یہ بھی منظور کیا گیا کہ پالی ٹکنک کا اپنا ورکشاپ اور
یٹری ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد انجینئرنگ کالج کو ہدایت کی گئی
ہ پالی ٹکنک کے لیے وقتاً فوقتاً دی جانے والی گرانٹ پالی ٹکنک کو
کر دے۔ یہ واپسی جزوی طور پر بعض سامان کی منتقلی کے ذریعے
کچھ کالج کو مہیا کیے گیے ۱۹۶۲ء کے گرانٹ سے روپے کی صورت میں
میں لائی گئی۔

گویا ۱۹۶۲ء پالی ٹکنک کے لیے ایک جشن کا سال تھا۔ فیکلٹی کے
اندر رہتے ہوئے انجینئرنگ کالج سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی اور اس طرح
مکمل آزادی حاصل کر لی تاکہ خود اپنی رہنمائی میں اور اپنی ضرورت کے
پیش نظر ترقی کی طرف گامزن ہو۔

خواتین کے لیے ڈپلوما کورسز

انجینئرنگ کالج اور پالی ٹکنک کی طرح ویمنس پالی ٹکنک کی
بھی ایک دلچسپ تاریخ ہے۔ اس کے قیام کو خدا کا فضل ہی کہا جا سکتا ہے
کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ ۱۹۶۳ء ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ
بجی، اس وقت کہیں اور نہیں بلکہ یونیورسٹی پالی ٹکنک کے پرنسپل جناب
ایس۔ اے۔ عباس کے کمرے میں۔ انھیں دوسری صبح وائس چانسلر
طیب جی سے ملنا تھا۔

ملاقات کے دوران وائس چانسلر نے پرنسپل کو ہدایت دی
کہ وہ یونیورسٹی کی ترقی کے لیے تجاویز سوچیں اور یونیورسٹی کو پیش
کریں۔ پرنسپل نے کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل دو ترقیاتی
اسکیمیں پیش کیں۔

۱۔ مرکزی حکومت سینئر سول اور انجینئرنگ ملازمتوں کے لیے
کوچنگ اسکیم۔

۲۔ ویمنس پالی ٹکنک کا قیام

وائس چانسلر نے مذکورہ تجاویز پورے جوش و خروش کے ساتھ
منظور کر لیں اور پہلی تجویز کا ڈائرکٹر مقرر کیا اور دوسری تجویز کو آگے
بڑھانے کی ہدایت کی۔

وائس چانسلر کے ایک خط کے ساتھ، جس میں وزارت تعلیم سے
ویمنس پالی ٹکنک کے قیام کی اجازت مانگی گئی تھی، پرنسپل نے کانپور
میں اے۔ آئی۔ سی۔ ٹی۔ ای منسٹری آف ایجوکیشن کے سکریٹری، ناردرن
ریجنل کمیٹی (این۔ آر۔ سی) سے ملاقات کی۔ سکریٹری نے یونیورسٹی
کو احسان مند بنانے کی اپنی عدم صلاحیت پر اظہار افسوس کیا اور وجہ بیان
کی کہ آل انڈیا ٹکنیکل ایجوکیشن (اے۔ آئی۔ سی۔ ٹی۔ ای) کے
ضابطوں کے مطابق پورے صوبے میں صرف ایک ویمنس پالی ٹکنک کام کر سکتی
تھی اور چوں کہ اتر پردیش میں ایک لکھنؤ میں پہلے ہی سے موجود ہے دوسرے
کی منظوری ناقابل قبول تھی۔ سکریٹری نے اس پر یہ اضافہ بھی کیا کہ
علی گڑھ ٹیکارام ٹرسٹ کی جانب سے دی گئی ایک ایسی ہی درخواست
اسی بنیاد پر رد کی جا چکی ہے۔

طویل مذاکرے کے بعد اور پرنسپل کی اس تجویز پر کہ خواتین کے لیے مجوزہ تعلیمی پروگرام کے بدل کے طور پر یونیورسٹی پالی ٹکنک کی موجودہ سہولتوں کی توسیع زیر غور آسکتی ہے، سکریٹری نرم پڑ گئے اور انھوں نے تعاون کا وعدہ کیا۔

اس طرح اے۔آئی۔سی۔ٹی۔آئی کی ایک وزٹنگ کمیٹی وائس چانسلر کی درخواست پر غور و خوض کے لیے علی گڑھ آئی اور ایک "ملحقہ" ویمنس پالی ٹکنک کے قیام کی سفارش کی۔ اسی دوران ازراہِ عنایت یو۔جی۔سی کے ایک ممبر کی حیثیت سے پرنسپل کا تقرر عمل میں آیا اور جو ۱۹۶۵ء میں ہوئی کمیٹی کی اس میٹنگ میں موجود تھا جس میں وزٹنگ کمیٹی کی رپورٹ غور و خوض کے لیے پیش کی گئی۔

کمیٹی کے ایک انتہائی باعزت ممبر نے خطرناک اصولی نکتہ اٹھایا اور کمیٹی کو اس کی سابقہ تجویز یاد دلائی جس کی رو سے تمام ایسے پالی ٹکنک کو سٹیٹ بورڈس آف ٹکنیکل ایجوکیشن سے ملحق کیے جانے کی ہدایت دی تھی۔ بالخصوص جو اس کی ماتحتی میں کام نہیں کر رہے تھے۔ ممبر نے پُر زور مطالبہ کیا کہ جب علاقے کے تمام پالی ٹکنک، بشمول رڑکی یونیورسٹی کمیشن کی تجویز پر عمل پیرا ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے باغی علی گڑھ "کو مزید پالی ٹکنک کے قیام کی اجازت دینا خلاف منشا ہوگا۔ اس نے زور دیا کہ کمیٹی ایک تجویز پاس کرے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو کمیٹی کے سابقہ تجویز یاد دلائے اور پالی ٹکنک کو یو۔پی سٹیٹ بورڈس آف ٹکنیکل ایجوکیشن کے حوالے کیے جانے کی درخواست کرے۔

مخالفت کے باوجود، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ کمیٹی نے پرنسپل سے تسلی بخش جواب سن کر کمیٹی کی رپورٹ منظور کرلی اور یونیورسٹی میں ایک "ملحقہ" ویمنس پالی ٹکنک کے قیام کی۔ اے آئی سی ٹی ای سے سفارش کی۔

مخالف ممبر نے ایک اختلافی نوٹ لکھا جس کا وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ نے بعد میں خیال رکھا۔

اس طرح انجینئرنگ فیکلٹی کی تاریخ میں ۱۹۶۶ء ایک دوسرا جشن کا سال بنا جب، نہ صرف یہ کہ تعلیم نسواں کی پگڈنڈی پر یونیورسٹی میں ایک انتہائی مفید سنگ میل لگایا گیا بلکہ انجینئرنگ فیکلٹی کے تعلیمی پروگراموں کا افتتاحی باب بھی لکھا گیا۔

اسی سال، ۱۷ اکتوبر کو، یوم تاسیس ہونے کے سبب یونیورسٹی پالی ٹکنک کے آڈیٹوریم میں ہز ہولی نس ڈاکٹر بدرالدین، صدر بوہرہ کمیٹی کے ہاتھوں ویمنس پالی ٹکنک کا افتتاح عمل میں آیا اور تین سال بعد ۵ ستمبر ۱۹۶۹ء کو، پرنسپل کی رہنمائی میں اس کے اسٹاف اور طالبات ادارے کی شاندار عمارت میں منتقل ہوئے جو ایک تدریسی اور انتظامیہ بلاک اور ۱۸۰ طالبات کے ایک ہوسٹل پر مشتمل تھی۔ ویمنس پالی ٹکنک یونیورسٹی پالی ٹکنک کے ملحقہ یا اس کی توسیعی سروس کے طور پر قائم کیا گیا اور یہ طالبات کی ڈپلوما تعلیم کے لیے مخصوص تھا۔

ابتدا میں تین سالہ مدت کے تین پوسٹ میٹرک ڈپلوما کورس کاسٹیوم ڈیزائننگ اور ڈریس میکنگ، الیکٹرانکس انجینئرنگ اور آرکی ٹکچرل اسسٹنٹ شپ کے نام سے شروع کیے گئے اور کچھ عرصے بعد آخرالذکر کی جگہ آفس اسسٹنٹ شپ اور سکریٹریل پریکٹس میں دو سالہ ڈپلوما کورس شروع کیا گیا۔

طالبات کے داخلے کی تعداد ۹۰ مقرر کی گئی۔ اسٹاف کے تقرر، عمارت کی تعمیر، ضروری ساز و سامان، فرنیچر اور کتابوں کے لیے گرانٹ دیئے گئے اور شرط رکھی گئی کہ یونیورسٹی پالی ٹکنک کا پرنسپل ہی ویمنس پالی ٹکنک کا پرنسپل ہوگا۔

افتتاح کے سال میں ان چند لڑکیوں کی تدریس کے لیے جنہیں برضا و رغبت داخلہ دیا گیا تھا کوئی عمارت، فرنیچر، اسٹوڈیو یا لیباریٹری نہیں تھی۔ اسٹاف بھی کم تھا۔ اس لیے تقریباً تین سال تک یونیورسٹی پالی ٹکنک کی عمارت میں ہی ۲ بجے سے ۵ بجے شام تک مسلسل حاضر رہنا پڑتا۔ ان کی تدریس پالی ٹکنک کے کچھ اساتذہ کے سپرد تھیں۔

بالآخر یونیورسٹی پالی ٹکنک کے خطوط پر ویمنس پالی ٹکنک کے لیے ایک علیحدہ نیا آرڈیننس تیار ہوا۔ جناب اے۔اے انصاری صدر الیکٹرونکس انجینئرنگ سیکشن اس کے پہلے ریڈر انچارج مقرر ہوئے۔

ڈرافٹس مین شپ میں سرٹیفکیٹ کورس

۱۹۵۷ء میں پالی ٹکنک مینجنگ کمیٹی نے، وائس چانسلر بشیر حسین زیدی صاحب کی سربراہی میں پوسٹ میٹرک آرٹی سن کورسز شروع کرنے اور سرٹیفکیٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ اسی سال سول، میکینکل ڈرافٹ مین شپ میں سرٹیفکیٹ کورس شروع کیا گیا۔ اس کی کلاسیں شام میں ہوتیں۔ جن افراد نے داخلہ لیا ان میں اکثر یو۔پی شعبۂ آبپاشی سے وابستہ غیر سند یافتہ ڈرافٹ مین تھے۔ داخلے کی تعداد ۸۰ مقرر تھی۔

مرکزی اور صوبائی سرکار نے ان کورسز کو تسلیم کیا اور ۱۹۶۲ء میں یو۔جی۔سی نے ضروری تدریسی عملے کی تقرری اور عمارت کی تعمیر کے لیے گرانٹ دینا منظور کیا۔ یو۔پی سرکار ہمارے ڈرافٹ مین کو گریڈ I دیتی تھی جس طرح کہ رڑکی یونیورسٹی کے ڈرافٹ مین کو دیا جاتا تھا۔

وہ طلبا جنھوں نے یہاں سے ان کورسز میں سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے،

اچھی ترقی کی ہے، ان میں ایک ارشاد احمد خاں، آئی آئی ٹی دہلی میں ریسرچ بھی کر رہے ہیں۔

ڈرافٹنگ اور ڈزائننگ میں ڈپلوما کورسز

انڈسٹری کی ضرورتوں اور دن بدن زور پکڑتے ہوئے مطالبے کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ مختلف اشتہارات سے ظاہر ہوتا تھا، یونیورسٹی نے سول اور مکینیکل میں ڈرافٹنگ اور ڈزائننگ میں ڈپلوما کورسز شروع کیے۔ وہی طلبا اس میں داخلے کے حق دار تھے جو پوسٹ میٹرک ڈرافٹ مین شپ یا اس کے مساوی سرٹیفکٹ رکھتے تھے۔ یہاں بھی داخلے کی تعداد ۳۰ مقرر تھی۔

یہ کورسز مرکزی سرکار نے تسلیم کر لیے ہیں اور یو۔جی۔سی نے اسٹاف کے تقرر کے لیے گرانٹ بھی منظور کی ہے۔

مندرجہ ذیل اشخاص جولائی ۱۹۸۰ء تک پالی ٹکنک کے سربراہ رہے ہیں۔

۱۔ نورالہدیٰ فرسٹ سپرنٹنڈنٹ ۱۹[illegible] تا ۱۹۵۳ء

۲۔ ایچ۔ اے۔ الہاشمی سپرنٹنڈنٹ

۳۔ ایم۔ یو۔ صدیقی 〃

۴۔ ایچ۔ اے۔ الہاشمی 〃

۵۔ ایس۔ اے۔ عباس فرسٹ پرنسپل ۱۹۵۷ء تا ۱۹۸۱

اختتامیہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انجینئرنگ فیکلٹی کا تعلیمی کلچر

ملک کی عام سماجی اور معاشی صورت حال اور تعلیمی معیار کی گراوٹ کے پیش نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانیوں نے جو تعلیم کی نچلی سطح پر ملک کو ایک معیار اور ضابطہ فراہم کرنے کے لیے کوشاں تھے، یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے ایک نیا تصور دیا۔ اور نئے تعلیمی کلچر کی بنیاد ڈالی جسے دوسری یونیورسٹیوں نے بھی، جزوی طور پر، قبول کیا ہے۔

مغرب میں مروجہ یک موضوعی گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ پیٹرن کے برخلاف ان حضرات نے نرسری سے پوسٹ ڈاکٹریٹ تک ایک کثیر الجہت تعلیمی پروگرام پر غور و فکر کیا۔ تعلیم کے اس فلسفے نے یونیورسٹی کو ایک اور اہم فریضہ سونپا جس کی رو سے اسے گریجویٹ سے پہلے کی تعلیم کے لیے ایک معیار فراہم کرنا تھا جسے وہ بالخصوص پرائمری، سکنڈری اور ہائر سکنڈری ایجوکیشن کی سطح پر مختلف انواع کی پلاننگ اور ضابطہ بندی اور تجربات کے ذریعے مثال فراہم کر کے کر سکتی تھی۔ بالخصوص نرسری، سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کی سطح پر۔

ہماری یونیورسٹیوں کے اس نئے قومی رول کو یو۔جی۔سی نے تسلیم کیا ہے اور وہ مرکزی یونیورسٹیوں میں ڈپلوما اور سرٹیفکٹ کورسز کی سرپرستی اور نگرانی بھی کر رہا ہے۔ ملک کی اس انوکھی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس طرح، لفظ "یونیورسٹی" کے تصور کو صرف گریجویٹ تک محصور کر[illegible] ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر یو۔جی۔سی صرف ان ہی مرکزی یونیورسٹیوں کو سرپرستی اور تعاون دینا جوان تک اپنے تعلیمی پروگراموں کو محدود[illegible]

یونیورسٹی کے اس تعلیمی کلچر نے انجینئرنگ فیکلٹی کو مختلف [illegible] پروگراموں کے اجرا کے لیے آمادہ کیا ہے جس کے نتیجے میں مختلف سط[illegible] پر سرٹیفکٹ، ڈپلوما اور ڈگری پروگرام متعارف کرائے گئے۔ اور [illegible] بات اطمینان بخش ہے کہ فیکلٹی ایک مثالی پالی ٹکنک کے قیام میں کام[illegible] رہی جسے کچھ عرصے پہلے اے۔ آئی۔ سی۔ ٹی۔ آئی کی وزٹنگ کمیٹی نے "[illegible] میں سب سے بہتر" قرار دیا۔

صرف یہی نہیں کہ فیکلٹی نے ملک کے ہر شہری کے اس استحقاق [illegible] کیا ہے کہ اسے اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کا حق حاصل ہے بلکہ ایسے تر[illegible] کورسز بھی شروع کیے جن سے اچھے طلبا اپنی صلاحیت میں اضافہ کر[illegible] ہیں۔ اس لیے، جو لڑکے ڈرافٹ مین شپ میں سرٹیفکٹ کورس کر [illegible] ہوں، ان کے لیے نہ صرف یہ کہ سول، الیکٹریکل اور مکینکل انجینئرنگ میں [illegible] کے لیے جگہیں محفوظ کی گئی ہیں۔ یہ ڈرافٹنگ اور ڈزائننگ میں ایک سا[illegible] کل وقتی ڈپلوما کورس بھی مہیا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈپلوما کے [illegible] کے لیے صرف یہی نہیں کہ بی۔ ایس سی انجینئرنگ میں داخلے کی جگہیں محفوظ بلکہ ایک ایسے الگ کورس کا بھی انتظام ہے جس سے بی۔ ای کی ڈگر[illegible] دی جاتی ہے۔

یقیناً یہ بدقسمتی ہے کہ فیکلٹی کی ان گراں قدر کوششوں کو سرا[illegible] جانا اور آج بھی "ڈپلوما کورس ختم کرو"، "سرٹیفکیٹ کورس ختم کرو" صدائیں سنائی دیتی ہیں۔

آخر میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کا یہ تعلیمی کل[illegible] یونیورسٹی یا اس کے مساوی ادارے کے لیے نیا اور اجنبی نہیں ہے۔ [illegible] کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ صدی کے آغاز میں ہی، ملک[illegible] سد اعظیم انجینئرنگ کالج، تھومسن کالج آف سول انجینئرنگ، رڑکی میں ڈگر[illegible] اور اور سیر کورس پڑھائے جا رہے تھے۔ پھر یہ کہ ابھی حال تک رڑ[illegible] یونیورسٹی ہماری طرح ڈرافٹ مین شپ میں سرٹیفکٹ کورس اور س[illegible] الیکٹریکل اور مکینکل میں ڈپلوما کورسز جاری رکھے ہوئے تھی۔

پرنسپل ایس اے عباس

ترجمہ ڈاکٹر عقیل احمد
استاد شعبۂ اردو
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خلفائے عباسیہ کا شاہی کتب خانہ

بیت الحکمۃ

خلیفہ ہارون الرشید کا شمار دنیا کے عظیم ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اُس کے زمانے میں اس عظمت اور شان و شوکت کی کوئی سلطنت نہ تھی۔ خلافتِ عباسیہ کا عہد نہ صرف ممالکِ اسلامیہ بلکہ عالمی تاریخ میں منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بنیاد خلیفہ ابوالعباس عبداللہ سفاح نے ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء میں رکھی۔ اور ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں ۳۷ ویں خلیفہ مستعصم باللہ کے عہد میں ہلاکو خاں کے حملے سے اس کا سورج غروب ہو گیا۔ اس طرح دودمان عباس ؓ نے بغداد میں پانچ صدیوں تک حکومت کی۔ اس دور میں بغداد کا شمار دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں کیا جاتا تھا۔ اس دوران وہاں ہمہ جہتی ترقی ہوئی اور سلطنت کی شان و شوکت سارے عالم کو خیرہ کرتی رہی۔ ملک میں معاشی، معاشرتی، اخلاقی، تمدنی اور ادبی ترقیاں ہوئیں اور اس اعلیٰ سطح پر ہوئیں کہ اس کی نظیر دنیا کے دوسرے ممالک پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

خلافتِ عباسیہ کو ہم بآسانی تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور اس کے قیام اور استحکام کا ہے۔ اس سلسلے میں خلیفہ ابوالعباس عبداللہ سفاح [۷۵۰ء — ۷۵۴ء] اور اس کے بھائی خلیفہ ابو جعفر عبداللہ المنصور [۷۵۴ء — ۷۷۵ء] نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ سفاح نہایت وجیہ، خوش خُلق اور فیاض حکمراں تھا لیکن سخت گیر اور سفاک بھی تھا اور اپنے مخالفین کو کسی طرح بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اسی لیے وہ 'سفاح' کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی خلیفہ ابو جعفر عبداللہ المنصور تخت نشین ہوا۔ اس کو اکیس سال کے قریب حکمرانی کا موقع ملا۔ مورخین اس کو انتہائی عاقبت اندیش، دوربین، مدبر اور منتظم حکمراں بتلاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کے عہد میں عباسی خاندان کو اتنا استحکام اور اقتدار حاصل ہوا کہ اس کی حکمرانی مزید پانچ سو سال تک برقرار رہی۔ اس نے عوام کے ذہن میں مذہب کا ایسا تصور قایم کیا جس سے ان کے دل میں منصبِ خلافت کا ادب و احترام اور عزت و توقیر پختہ ہوگی، ان کے دل اور دماغ پر بادشاہ کی ایسی عظمت قایم ہوئی کہ وہ اس کو 'ظل اللہ فی الارض' سمجھنے لگے۔ اس کے ادب و احترام کو اللہ کا ادب و احترام اور اس کی توہین کو اللہ کی توہین تصور کرنے لگے۔ اس طرح منصور نے ایوانِ خلافت کو اتنا مضبوط اور مستحکم بنا دیا کہ بعد کے چند خلفاء کی ناعاقبت اندیشیوں اور نااہلیوں کے باوجود صدیوں تک اس کا وجود کسی نہ کسی طرح برقرار رہا۔

دوسرا دور خلیفہ ابو عبداللہ محمد المہدی بن منصور [۷۷۵ء — ۷۸۵ء] کے عہد سے نویں خلیفہ ابو جعفر ہارون الواثق باللہ [۸۴۲ء — ۸۴۷ء] کے دورِ خلافت کو محیط ہے۔ اس دور کو خلافتِ عباسیہٗ بغداد کا عہدِ شباب کہا جاتا ہے۔ اس دوران سب سے زیادہ فروغ خلیفہ ہارون الرشید [۷۸۶ء — ۸۰۸ء] اور اس کے بیٹے ابوالعباس المامون بن ہارون [۸۱۴ء — ۸۳۳ء] کے زمانے میں نصیب ہوا۔ اس کو عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ یہی وہ دو نامور خلفاء ہیں جن کے طفیل خلافت عباسیہ کو تمام عالم اسلامی میں ایک اعلیٰ اور امتیازی شان نصیب ہوئی جس کی تابانی اور شان و شوکت کے نقوش آج بھی علمی، ادبی اور ثقافتی افق پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

تیسرا دور ابوالفضل جعفر متوکل علی اللہ [۸۴۷ء — ۸۶۱ء] سے اختتامِ سلطنت تک ہے۔ اسے دورِ انحطاط و عہدِ زوال کہا جاتا ہے۔ المامون کے انتقال کے بعد عباسی خلفاء کی وہ شان و شوکت اور سلطنتِ بغداد کا وہ زور اور استحکام باقی نہ رہ سکا جو اب تک دیکھنے میں آ رہا تھا۔ ابو جعفر ہارون الواثق باللہ کے زمانے سے عباسیہ سلطنت کا آفتاب ڈھال پر آ گیا تھا۔ تا آنکہ ابو احمد عبداللہ المستعصم باللہ کے عہد میں تاتاریوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خاں

نے بغداد پر حملہ کر کے خلیفہ کو قتل کر دیا اور بغداد سے عباسیوں کے تسلط کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور 'عروس البلاد' بغداد کا سہاگ اجاڑ دیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہارون الرشید کے عہد میں سلطنتِ عباسیہ اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اس میں وہ تمام اوصاف مجتمع ہوگئے تھے جو ایک مدبّر اور قابل ترین سربراہ کے لیے لازم ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی زیرک، دانشمند، دور اندیش اور عالم و فاضل انسان تھا۔ اس کے مزاج میں استقلال تھا۔ اس نے محض اپنی ذاتی صلاحیتوں، اولوالعزمی اور فہم و فراست سے سلطنت کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ پروفیسر پامر (PALMER) کا بیان ہے:

"خلیفہ ہارون الرشید میں وہ تمام لیاقتیں جمع تھیں جو ایک قابل فرمانروا میں ہونی چاہییں۔ وہ بڑا ہوشیار، عقلمند، تیز فہم اور جامع جمیع صفات تھا۔ اس کا ارادہ مضبوط اور اس کا عزم بڑا مستقل ہوتا..... اس کے مزاج میں خلق اور تواضع تھی۔ اس وقت کی تمام مہذب دنیا اس کے زیرِ نگیں اور اس کی سلطنت میں داخل تھی۔ وہ زمین پر خدا کے نائب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رشتہ دار اور مذہبِ اسلام کا پیشوا تھا۔ تمام دنیا میں کوئی شخص اس سے زیادہ صاحبِ عظمت و اقتدار، صاحبِ شان و شوکت، قابلِ تعظیم اور رعایا کا خیرخواہ نہ تھا۔ وہ بہت مضبوط، مستقل مزاج اور اولوالعزم شہنشاہ تھا[1]"

مولانا اسلم جیراجپوری فرماتے ہیں:

"ہارون الرشید کا عہد خلافتِ عباسیہ کا بہترین زمانہ شمار ہوتا ہے۔ اس عہد میں رفاہیت، ثروت، علم، ادب، طاقت اور شوکت میں دولتِ عباسیہ انتہائی بلند اور ارفع درجے تک پہنچ گئی تھی۔ ہر قسم کے بڑے بڑے لوگ فراہم ہوگئے تھے جن کی بدولت ملک کی زینت میں زیادتی اور اس کے ہر شعبے میں ترقی ہوئی۔

علمی لحاظ سے بغداد اس وقت قبلۂ علوم تھا۔ عالمِ اسلام کے تمام ممتاز علماء اور فضلاء وہاں آکر جمع ہوگئے تھے۔ محدث، قاری، حافظ، مفسر، ادیب، مصنف، امامانِ نحو، فاضلانِ صرف، مورخ، متکلم، عروضی۔ غرض ہر قسم کے اہلِ کمال تدریس، تعلیم، تصنیف و تالیف میں مشغول تھے اور ان کے دارالتدریس مساجد کے صحن تھے۔ اس زمانے میں دنیائے اسلام کا کوئی شخص اس وقت تک کسی فن میں کامل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک اس نے دارالسلام بغداد کے دارالعلوم میں تحصیلِ علم نہ کی ہو"[2]

ہارون کو علمی ذوق اپنے دادا منصور سے ورثے میں ملا تھا۔ وہ خود بھی عالم تھا اور علم و ہنر کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس نے دوسری زبانوں کے شاہکار تصانیف کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ اسی کے عہد میں بغداد اور ہندوستان میں ادبی روابط قائم ہوئے۔ اسی کے زمانے میں ہندوستان کا ایک مشہور اسکالر بغداد پہنچا اور منصور کی خدمت میں اپنی تصنیف "سدھانتا" پیش کی۔ منصور نے اس کا عربی میں ترجمہ مشہور عالم محمد بن ابراہیم فزاری سے کرایا۔ اس کے علاوہ بہت سے فضلا، پنڈت اور ویدک عالم بھی اس عہد میں بغداد پہنچے۔ منصور نے علومِ عقلی کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اس کا صحت مند نتیجہ نکلا کہ مسلمان جو اب تک صرف مذہبیات اور ادبیات کے ہی دلدادہ تھے، اب ان علوم کو بھی قابلِ اعتنا سمجھنے لگے۔ آج مسلمانوں میں ان علوم کی طرف جتنی توجہ ہے، وہ بڑی حد تک منصور ہی کی کوششوں کی رہینِ منت ہے۔ اس ہی کی ایما پر عبداللہ بن المقفع نے کلیلہ و دمنہ کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا۔ جو تقریباً ایک ہزار سال گزر جانے پر آج بھی زبان کی لطافت اور بیان کی چاشنی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ منصور نے عربی اور عجمی دونوں علماء و فضلاء کو اپنے دربار میں جگہ دی اور علم کی خدمت کرنے کے بہترین مواقع فراہم کیے۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں:

"منصور کے ذوقِ علمی کا یہ حال تھا کہ یونان کے علوم و فنون کا جو سرمایہ خود اس کے ملک میں بہم پہنچ سکتا تھا اس پر اکتفا نہ کر کے قیصرِ روم کو خط لکھا۔ چنانچہ اس کی درخواست کے موافق قیصر نے فلسفہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں منصور کے پاس روانہ کیں۔

منصور کے ذوق کا چرچا یہاں تک پھیلا کہ دور دراز ملکوں سے ہر قوم و ملت کے اہلِ کمال نے اس کے

---

[1] خلیفہ ہارون الرشید۔ ص ۲۲۵۔ ۲۲۶۔

[2] اسلم جیراجپوری، تاریخ الامت۔ ج ۵ ص ۱۰۲

دربار کا رُخ کیا۔ ۱۵۶ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا
ریاضی داں عالم بغداد میں آیا اور سنسکرت کی مشہور زیچ
جس کا نام "سدھانتا" ہے ..... منصور کی خدمت میں پیش
کی۔ محمد ابن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے اس کا ترجمہ
کیا۔ مامون الرشید کے زمانے تک اعمال کواکب میں
اسی زیچ پر اعتماد کیا جاتا تھا۔" [1]

ہارون الرشید کو علمی ذوق اور علماء و فضلاء کی سرپرستی کی یہ
شاندار روایات ورثے میں ملی —— اس نے ان روایات کو آگے بڑھایا
اور اس میدان میں ایسے شاندار نقوش چھوڑے جو صدیاں گزر جانے پر
آج بھی مشعلِ راہ کا کام کرتے ہیں۔ اس نے علوم و فنون کی ترویج و
ترقی کے لیے ایک ادارہ قایم کیا جو "بیت الحکمۃ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی
حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی جس میں دن رات علم و حکمت کے چشمے جاری
رہتے تھے۔ اس طرح بغداد عالمِ اسلام میں پہلا شہر ہے جہاں علمی سرگرمیوں
کو شاہی سرپرستی میں جدید طرز پر منظم کیا گیا۔

بیت الحکمہ بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ
دار المطالعہ تھا اور دوسرا دار الترجمہ۔ دار المطالعہ کی حیثیت باقاعدہ
کتاب خانہ [Research Library] کی تھی۔ موجودہ اصطلاح میں ہم اسے عوامی کتاب خانہ
[Public Library] کہہ سکتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
کے مطابق:

"دنیائے اسلام میں بغداد وہ اوّلین مرکز ہے جہاں
پہلا عظیم الشان کتاب خانہ بیت الحکمہ خلیفہ ہارون الرشید
[م ۱۹۳ھ/ ۸۰۸ء] نے قایم کیا تھا جس کا فیض
ھلاکو کے حملۂ بغداد [۱۲۵۸ء] تک جاری رہا۔
کتاب خانوں کی تاریخ میں بیت الحکمہ ایک سنگ میل کی
حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ
تھی کہ وہ محض کتاب گھر نہ تھا بلکہ پہلا عوامی کتاب خانہ
تھا جو اعلیٰ پیمانے پر قایم کیا گیا تھا۔" [2]

معاصر شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس بے نظیر کتاب خانے میں
عربی کے علاوہ سنسکرت، فارسی، یونانی، سریانی، قبطی اور کالڈی
زبانوں میں کتابیں تھیں جن کی مجموعی تعداد دس لاکھ سے اوپر پہنچتی ہے
بیت الحکمۃ سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ خلافت اور شہنشاہیت
کے عروج کے زمانے میں بھی عالمِ اسلام میں سربراہانِ مملکت کا علم کا تصور
انتہائی جمہوری تھا اور ہر کہ و مہ کو اکتسابِ علم کی نہ صرف عام اجازت
تھی بلکہ اس کو ہر قسم کی سہولت بھی فراہم کی جاتی تھی۔ بغداد کے کتاب خانے
اس جمہوری تصور کی درخشاں مثالیں ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہم اس
عہد کے ہندوستان پر نظر ڈالیں تو تصویر کا دوسرا رُخ ہی نظر آئے گا
یہاں عہدِ قدیم سے کتاب خانوں کا رواج تو ملتا ہے لیکن عوام تک ان کی
رسائی نہیں تھی۔ ان کا وجود بہت ہی مخصوص طبقے کے لیے تھا اور صرف
اسی ہی طبقے کے افراد ان سے استفادے کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح
محض معدودے چند افراد ہی ان سے فیض یاب ہو سکتے تھے۔ باقی دنیا
کا حال بھی ہندوستان سے کچھ مختلف نہ تھا اور وہ ممالک جو آج جدید
تہذیب و تمدن کا سرچشمہ سمجھے جاتے ہیں، وہاں بھی علم کی روشنی عام
نہیں تھی۔ بقول ڈاکٹر سی۔ پی۔ رائے:

"جب یورپ کی دنیا بربریوں کے حملوں سے زوال
پذیر ہو کر ناگفتنی تاریکی کے گڑھے میں جا پڑی تھی، اگر
اُس وقت اسلام کمک نہ پہنچاتا اور اعلیٰ علوم کی تخم
ریزی کر کے اس کی پوری پرداخت نہ کرتا اور حق و
حریت کی جاں بخش آب و ہوا میں ان کی تربیت کر کے
انھیں پھلنے پھولنے نہ دیتا تو میں پوچھتا ہوں کہ آج
دنیا کہاں ہوتی اور تہذیبِ جدید کا نشان کہاں
ملتا۔" [1]

ہارون الرشید نے بڑی محنت و جانفشانی سے کتابوں کو جمع کیا۔
اس نے مختلف ممالک سے محض کتابوں کی خاطر روابط قایم کیے۔ ان میں
ہندوستان، یونان، روم، چین وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں
ان ممالک سے اس نے مختلف علوم و فنون کی کتابیں حاصل کیں اور
انھیں 'بیت الحکمۃ' کی زینت بنایا۔ ان میں زبان، موضوع، مذہب اور
مسلک کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب پر بھی
کتابیں حاصل کی گئیں۔ اس طرح اسلامیات کے علاوہ دیگر علوم پر بھی
کتابیں حاصل کیں جن میں علوم نقلیہ اور عقلیہ دونوں ہی شامل تھے۔
ہارون الرشید خود زبردست عالم تھا اور علم کا بڑا سرپرست۔ اس نے علم
کے معاملے میں ہمیشہ بے تعصبی اور وسیع القلبی سے کام لیا۔ اُس نے ایسے
مصنفین کی کتابیں بھی حاصل کیں جن کے اسلام دشمن نظریات مسلّم تھے

[1] شبلی نعمانی: تراجم [مقالات شبلی - ج ۶. ع ۲] ص ۱۱۔
[2] Encyclopedia of Islam: Vol II. P. 1045

[1] سر پی سی رائے: اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم [خطبہ]

اور ایسے حضرات کو کتاب خانے کی خدمت پر مامور کیا جو زبردست قسم کے عرب دشمن خیالات رکھتے تھے۔ ہارون نے محض ان کی لیاقت اور علمی استعداد کی بنا پر ان کو اپنایا اور نظریات سے صرفِ نظر کرکے ان سے بہترین علمی خدمات لیں۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں:

> "ہارون الرشید نے کتابوں کی فراہمی اور تدوین میں نہایت بے تعصبی سے کام لیا جس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ "علان شعوبی" کو بیت الحکمۃ میں ترجمہ و کتابت کی خدمت پر مقرر کیا۔ حالاں کہ یہ شخص ہمیشہ عرب کی ہجوگوئی میں مصروف رہتا تھا اور قبائل عرب میں سے ہر قبیلے کے عیوب میں الگ الگ کتاب لکھی تھی۔" [1]

شعوبی ایک عجمی فرقہ تھا۔ عربوں سے بغض رکھتا تھا اور ان کی تحقیر و تذلیل کرنا اپنا فرضِ اولین تصور کرتا تھا۔ علان اسی فرقے کا ایک اہم رکن تھا۔ اس کی خدمات حاصل کرنا یقیناً اعلیٰ ظرفی کا کام تھا۔

بیت الحکمۃ کا دوسرا حصّہ دارالترجمہ تھا۔ جس میں دوسری زبانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوتا رہتا تھا۔ ہارون کو جو کتابیں دستیاب ہوتیں وہ انھیں اس کتاب خانے میں داخل کر دیتا تھا اور عربی میں ان کے ترجمے کا اہتمام کرتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ کوئی علاقہ فتح کرتا تو اپنی فوج کو سختی سے ہدایت کر دیتا کہ مفتوح علاقے کے کتاب خانوں کو کسی طرح بھی نقصان نہ پہنچایا جائے بلکہ ان کو حاصل کرکے بحفاظت بغداد منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ جب ۹۹ء میں اس نے انقرہ (انگورہ) اور پھر عموریہ کو فتح کیا تو وہاں اسے یونانی کتابوں کا ذخیرہ ہاتھ آیا جسے بڑی حفاظت سے وہ بغداد لایا اور بیت الحکمۃ میں داخل کرکے عربی میں ترجمہ کرایا۔

بیت الحکمۃ کا عملہ: اس کے انتظام و انصرام اور نگہداشت وغیرہ کے لیے جو حضرات متعین تھے وہ سب یگانۂ روزگار اور ماہرین فن تھے۔ ان میں ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی اور پارسی سب ہی شامل تھے۔ جلد بندی کے کام کی نگرانی کے لیے 'ابن ابی الحریش' متعین تھا جو اپنے عہد کا مشہور ماہر فن جلد سازی تھا۔ اسی طرح کتابوں کی نقل کے لیے بہترین خطاط مقرر تھے۔ کتاب خانے کے قیّم کے منصب پر محمد بن موسیٰ خوارزمی فائز تھا۔ یہ علم جبر (الجبرا) کا موجد تھا۔ اس کی کتاب "الجبر و مقابلہ" عالم اسلام میں اس علم پر اولین تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ اسی نے علم جبر کو علم حساب سے اخذ کرکے ایک علیحدہ علم کی شکل میں پیش کیا۔

دارالترجمہ سے متعلق جو علماء، فضلاء اور ماہرین السنہ تھے ان کی تفصیلی فہرست علامہ ابن ندیم نے "الفہرست" میں پیش کی ہے۔ ان میں حجاج بن یوسف کوفی، ابوحسان سلما، ابوجعفر، یحییٰ بن عدی، محمد بن موسیٰ منجم، محمد بن موسیٰ، حسن بن موسیٰ، احمد بن موسیٰ، علی بن العباس احمد الجوہری، یحییٰ بن ابی المنصور، عبداللہ بن سہل بن نوبخت اور سہل بن ہارون خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عیسائی علماء میں حنین بن اسحاق، قسطا بن لوقا، یوحنا بن ماسویہ، یعقوب کندی، ہندوؤں میں نامور پنڈت سالی، مشہور حکیم منکا اور مشہور فاضل ابن دھن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ عیسائی علماء کو تنخواہیں بھی اس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ دی جاتی تھیں جس کی وجہ سے وہ فکرِ معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر یکسوئی سے بہترین خدمات انجام دیتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور شخصیت یعقوب کندی کی تھی۔ یہ اپنے زمانے کا زبردست فلسفی تھا اور پوری عرب دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

بقول علامہ شبلی:

> "یعقوب کندی کی بدولت عرب پر سے یہ اعتراض اٹھ گیا کہ اب تک نسل عرب سے کوئی شخص غیر زبانوں کا ماہر یا حکیم و فلاسفر نہیں پیدا ہوا۔ مامون الرشید کے زمانے سے چوتھی صدی (ہجری) کے آغاز تک تمام مسلمانوں میں اس کی تصنیفات رائج تھیں اور ارسطو کی تصنیفات کے ہم پلّہ خیال کی جاتی تھیں۔ وہ یونانی زبان کا بہت ماہر تھا اور یونانی، فارسی، سنسکرت کے علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا اس نے فلسفے کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں اور بڑا کام یہ کیا کہ اصل کتاب میں جو مشکلات اور پیچیدگیاں تھیں ان کے عقدے حل کر دیے۔ مامون نے اس کو خاص ارسطو کی کتابوں کے ترجمے پر مامور کیا۔ کیوں کہ ارسطو کے فلسفے کا سمجھنے والا اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا" [2]

یگانۂ روزگار شخصیات میں تھے۔ اول الذکر علم رصد میں ماہر تھا اور موخرالذکر علم نجوم میں مہارتِ تامّہ رکھتا تھا۔ حسن بن موسیٰ، محمد بن موسیٰ

---

[1] شبلی نعمانی: اسلامی کتب خانے (مضامین شبلی ج ۶۔ جلد ۲) ص ۱۵۶

[2] شبلی نعمانی: تراجم (مقالات شبلی ج ۶۔ ج ۲۔ ح) ص ۱۸

احمد بن موسیٰ تینوں بھائی تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت خلیفہ کے حکم سے اسحٰق بن ابراہیم مصعبی کے زیر نگرانی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کو بیت الحکمۃ سے متعلق کر دیا گیا۔ یہاں انھیں یحییٰ بن ابی المنصور کے تحت کام کرنے کا موقع ملا۔ ان دونوں کے فیضان سے وہ جلد ہی فلسفہ و ہیئت میں ماہر ہو گئے اور بڑی شہرت حاصل کی، حسن کو علم ھندسہ سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے اس میں بھی ید طولیٰ حاصل کر کے اپنی ناموری کو چار چاند لگائے۔ یوحنا بن ماسویہ اپنے زمانے کا مشہور عالم اور ماہر لسانیات تھا۔ ہارون نے اسے دارالترجمے کا افسر مقرر کیا تھا وہ یونانی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ انقرہ، انگورا اور عموریہ سے جو کتابیں دستیاب ہوئی تھیں، ان کے عربی ترجمے کے لئے مامور کیا گیا تھا۔ اسی زمرے میں قسطا بن لوقا، سہل بن ہارون اور سعید بن ہارون کے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ قسطا بن لوقا فلسفہ کا زبردست ماہر تھا، سہل بن ہارون ایک مجوسی عالم تھا جس کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل تھی۔ اس کی یادگار تصانیف میں "ثعلہ و عفراء" ہے جیسے اس نے کلیلہ و دمنہ کے طرز پر لکھا تھا۔ اس کا بھائی سعید بھی دارالترجمہ سے متعلق تھا۔ وہ بھی علم میں سہل کے ہم پلہ تھا اور اس کا شمار بھی اس عہد کے بے مثال فصیح و بلیغ لوگوں میں ہوتا تھا۔

ہارون الرشید نے خصوصی توجہ اور دلچسپی سے کتاب خانے میں بے بہا علمی ذخیرہ جمع کیا اور اس سے متعلق فقید المثال عملہ کا تقرر کیا۔ ان کی حیثیت محض ملازمین کی نہ تھی بلکہ یہ تمام حضرات اپنے اپنے میدان میں یکتائے روزگار تھے اور ہمہ وقت علم کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ یہ دراصل ایک وسیلہ تھا علماء و فضلا کو مجتمع کرنے اور ان کی سرپرستی کرنے کا۔ اس کے طفیل بغداد علمی دنیا کا اہم ترین مرکز بن گیا تھا۔ اور اسے صحیح معنیٰ میں 'مدینۃ العلم' کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ یہاں سے 'آفتاب علم' کی شعاعیں تمام مہذب دنیا پر پھیلنے لگیں۔ یہاں کے علمی سرچشمے سندھ سے لے کر مراکش تک اور بصرہ سے ترکستان اور ایشیائے کوچک تک تشنگان علم کو سیراب کر رہے تھے۔

مامون الرشید (۸۱۳ء – ۸۳۳ء) بھی اپنے باپ ہارون کی طرح علم کا دلدادہ اور علماء و فضلا کا قدردان اور ان کا سرپرست تھا۔ اس کے زمانے میں بیت الحکمۃ کے ذخیرے میں مزید اضافے ہوئے اور ایک عام خیال یہ ہے کہ اس عہد میں اسلامی دنیا میں تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو اس عظیم الشان کتاب خانے میں نہ آگئی ہو۔ ان کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں کی بھی بیش بہا مصنفات یہاں موجود تھیں۔ اس طرح عرب و عجم کی بہترین کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس میں عرب کے عہد جاہلیت کے نوادر بھی شامل تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی فرماتے ہیں۔

"مامون نے اس عظیم الشان کتب خانہ میں عرب جاہلیۃ کے زمانے کا بھی بہت کچھ سرمایہ جمع کیا تھا۔ جاہلیوں کے قصاید اور اشعار کے علاوہ اس زمانے کے خطوط، دستاویزات، معاہدے جہاں تک مل سکے نہایت کوشش سے فراہم کیے تھے اس کتب خانہ میں عبدالمطلب بن ہاشم کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرضے کا ایک رقعہ موجود تھا جو چمڑے پر لکھا ہوا تھا۔"[1]

مامون ارسطو کا بڑا معتقد تھا۔ ایک بار عالم خواب میں اس کی ارسطو سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ جس کا اس پر بڑا گہرا اثر ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے بڑی کاوش سے ارسطو کی تمام تصنیفات حاصل کیں اور ان کے عربی میں ترجمے کرائے۔

"مامونی کتب خانہ کی وسعت اور کتابوں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کے کہ بغداد پر اکثر تباہیاں آئیں اور انقراض زمانہ سے اس کے علمی خزانے ہمیشہ برباد ہوتے رہے۔ تاہم اس کتاب خانے کی بچی کھچی بہت سی کتابیں ساتویں صدی ہجری تک موجود تھیں جو خوش قسمتی سے علامہ ابن ابی اصیبعہ کو ہاتھ آئیں۔ علامہ موصوف نے ان کتابوں کا ذکر حنین بن اسحٰق کے ترجمے میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان پر حنین کے ہاتھ کی تحریریں تھیں اور مامون کا طغرا بنا ہوا تھا۔"[2]

مامون کے بعد اس عظیم الشان کتاب خانے کی شان و شوکت میں کمی واقع ہونے لگی۔ اس کا جانشین معتصم (۸۳۳ء – ۸۴۲ء) علمی مذاق کا حکمراں نہ تھا۔ وہ صرف عسکری شان و شوکت کا دلدادہ تھا۔ اسی لیے اس کے عہد میں اگرچہ فوجی کامیابیاں بہت ہوئیں تاہم علمی سرگرمیوں میں کوئی بیش رفت نہ ہو سکی۔ اس کے بعد واثق (۸۴۲ء – ۸۴۷ء) اور متوکل (۸۴۷ء – ۸۶۱ء) کے عہد میں کچھ علمی خدمات ضرور انجام دی گئیں اور کتابوں کے تراجم بھی ہوئے لیکن ہارون و مامون کا سا ذوق و شوق کسی میں نہ تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ فقید المثال کتاب خانہ مایل بہ تنزل ہوتا گیا اور ۱۲۵۸ء میں خلافت عباسیہ کے خاتمے کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح علم و حکمت کی وہ شمع جو تقریباً ساڑھے چار صدیوں تک دنیا میں علم کی روشنی پھیلاتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

---

[1] شبلی نعمانی: مقالات شبلی ج ۶۔ ص ۱۵۷

[2] شبلی نعمانی: اسلامی کتب خانے، مقالات شبلی۔ ج ۶۔ ص ۱۵۷ – ۱۵۸

سائنٹی فک سوسائٹی کے لیے دو اہم تجاویز

سرسید احمد خاں نے سائنٹی فک سوسائٹی کی بنیاد غازی پور میں ۹ر جنوری ۱۸۶۴ء کو قایم کی اور جب اُن کا تبادلہ ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ میں صدر الصدور کے عہدے پر علی گڑھ میں ہوا تو انھوں نے سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ میں قایم کیا اور سائنٹیفک سوسائٹی کی عمارت کا سنگ بنیاد ۳۰ر نومبر ۱۸۶۴ء کو آنریبل ایڈورڈ ڈرینڈ صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا۔ یہ عمارت وہ ہے جس میں دوا خانہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ قایم ہے۔ اس عمارت میں سائنٹیفک سوسائٹی کے بنیادی کتبات نصب ہیں اور اس طرح یہ عمارت آج بھی امراضِ انسانی کی دوا دارو کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

جسٹس مولانا سید کرامت حسین کے والد بزرگوار مولانا سید سراج حسین دیوان ریاست چرکھاری ضلع ہمیرپور، سائنٹیفک سوسائٹی کے ایک نامور رکن تھے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے لیے آپ نے چند گرانقدر تجاویز بذریعہ خط بزبان انگریزی سرسید احمد کی خدمت میں پیش فرمائیں۔ ان میں دو تجاویز نہایت اہم ہیں اور یادگار وہ اہم تجاویز ہیں کہ جن کے مطابق سرسید احمد نے مسلم یونیورسٹی اور اس کے کتب خانے کا بنیادی نظریہ قایم فرمایا۔

مولانا سید سراج حسین کی مذکورہ تجاویز کو سرسید احمد خاں نے حسبِ طلب قبول فرمایا اور اس قبولیت کو سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کی روداد نمبر ۵ مورخہ ۶ر جون ۱۸۶۴ء بصدارت ڈبلیو جے بریلی صاحب ڈسٹرکٹ جج علی گڑھ میں مولانا سید سراج حسین صاحب کے مکتوب گرامی کے ساتھ شایع فرما دیا۔ جس کا انتخاب ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

مولانا سید سراج حسین صاحب کی تجویز برائے قیام کتب خانہ کے متعلق سرسید احمد ارقام فرماتے ہیں۔ "بلحاظ دوسرے فقرے کے میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بات بہت ضروری ہے کہ سوسائٹی ایسی ایسی کتابوں کا جن کی اس خط میں سفارش ہے، ایک معقول کتب خانہ جمع کرے۔ لیکن مجھ کو افسوس ہے کہ ہماری سوسائٹی کی موجودہ مسکین حالت میں یہ مطلب نہیں بر آسکتا لیکن میں تحریک کرتا ہوں کہ کونسل کے کارپرداز اس معاملے پر خوب غور فرمائیں گے۔"

مذکورہ جلسہ سرسید احمد نے مولانا سید سراج حسین کی تجویز برائے قیام کتب خانہ کو تسلیم فرماتے ہوئے کتب خانے کی تحریک کے لیے کونسل کو متوجہ فرمایا اور اس بابرکت تجویز کا یہ اثر ہوا کہ کتب خانہ قایم ہوا اور عروج پا کر مولانا آزاد لائبریری کی صورت میں دنیا میں مشہور ہوا۔

مولانا سید سراج حسین کی تجویز دیگر برائے قیام مدرسہ کے متعلق سرسید احمد تحریر فرماتے ہیں۔ "بلحاظ تیسرے فقرے کے مجھ کو امید ہے کہ سوسائٹی کا علمی مدرسہ قایم ہونے کی جو اچھی تدبیر دکھائی گئی ہے وہ تھوڑے عرصے میں عمل میں آوے۔"

جلسۂ مذکورۂ بالا میں سرسید احمد نے مولانا سید سراج حسین کی تجویز برائے قیامِ مدرسہ کو تسلیم فرماتے ہوئے مدرسے کے اجرا کے لیے پوری جد و جہد فرمائی حتیٰ کہ ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسہ یعنی مدرسۃ العلوم علی گڑھ کھولا گیا اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ قایم ہوا جیسا کہ "حیات جاوید" میں مولانا الطاف حسین حالی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کالج کا سنگ بنیاد ۸ر جنوری ۱۸۷۸ء کو وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے ہاتھوں رکھا گیا اور اس کالج کا کتب خانہ لٹن لائبریری کے نام سے موسوم ہوا۔ ساتھ ہی سرسید احمد نے ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قایم کی جس نے اپنے اجلاس منعقدہ ناگپور ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کی تجویز منظور کی اور بالآخر ۱۹۲۰ء میں یہ کالج یونیورسٹی کی حیثیت سے ترقی پا گیا اور بحمد اللہ یہ یونیورسٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے دنیا بھر میں مشہور ہوئی۔

مختصر یہ کہ مولانا سید سراج حسین کی مذکورہ تجاویز وہ یادگار اور بابرکت تجاویز ہیں جن کی بنیادوں پر مولانا آزاد لائبریری اور مسلم یونیورسٹی کی عظیم الشان عمارتیں قایم ہیں۔ اور اس بنا پر یہ تجاویز مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان تجاویز کو سرسید احمد کی تصدیق و توثیق کے ساتھ کتبہ کندہ کرا کے سرسید ہاؤس میں نصب کرا دیا جائے۔

ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی
ریڈر اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

احسان

ذیل کی کہانی فرانس کے مشہور ناول نگار وکٹر ہیوگو Victor Hugo نے اپنے ناول "لے میزریبل" Le Miserable میں بیان کی ہے۔ یہ ناول اس نے ۱۸۶۲ء میں پورا کیا۔ اس ناول میں اس نے جین والجین نامی ایک کسان کی روداد حیات بیان کی ہے اور اس کے توسط سے ہیوگو نے اس دور کے فرانسیسی معاشرے ہی نہیں بلکہ اس نے انسانی مسئلوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہیوگو کا یہ ناول بہت مشہور ہوا اور یہ کہانی تو اتنی مقبول ہوئی کہ صرف انگریزی میں اس پر کم از کم چار ڈرامے لکھے گئے۔ ان میں جون ڈرنک واٹر [John Drink water] نے "In Safety" میں، مارگریٹ میکنامارا [Margaret Macnamara] نے In safety میں، ایل ہاؤز مین [L. Houseman] نے "Brother wolf" میں اس موضوع کو اختیار کیا۔ نورمن میکنل [Norman McKennel] نے تو Bishop's Candlesticks کے نام سے ہی ڈراما لکھا۔ اگرچہ اس کا اعتراف کہیں نظر نہیں آتا، لیکن خود ہیوگو نے اس کہانی کا مضمون مشرق سے مستعار لیا ہے۔

حسّان عتیق صدیقی
سر سید نگر، علی گڑھ

جین والجین ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس کی پرورش اس کی بہن نے کی۔ ابھی اس کی عمر ۲۵ سال کی ہی تھی کہ اس کے بہنوئی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب گھر کا سارا بوجھ جین والجین کے کندھوں پر تھا۔ وہ معمولی محنت مزدوری کر کے پیٹ بھر کھانے کا انتظام کر لیتا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ زبردست سردی ہو رہی تھی۔ جین والجین کو کوئی کام نہ ملا۔ گھر میں بھی کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا۔ بچے بھوک سے رو رہے تھے۔ جین والجین سے جب ان کا رونا اور بلبلانا نہ دیکھا گیا۔ تو مجبور ہو کر اس نے برابر کے ہوٹل سے روٹی چرانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ پکڑا گیا۔ اس کو بطور سزا جیل بھیج دیا گیا۔ جین والجین کا جیل ہی میں دل گھبرایا۔ گھر والے یاد آئے تو اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی اس میں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جس کی وجہ سے اس کی سزا میں توسیع کر دی گئی۔ اس طرح ایک معمولی کی کوشش کی اور پھر سزا اور بڑھا دی گئی۔ اس طرح ایک معمولی سے جرم۔ روٹی چرانے کی سزا کی مدت بڑھتے بڑھتے انیس سال ہوگئی۔

خدا خدا کر کے کسی طرح انیس سال گزرے اور جین والجین کے رہا ہونے کا وقت آیا۔ جین والجین بہت خوش تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے اب پھر مل سکے گا۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جیل شہر سے دور بہت دور تھی، راستہ پیدل چلنے کا تھا۔ جین والجین رہا ہوا اور خوشی خوشی اپنے شہر کی جانب لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ وہ چلتے چلتے تھک گیا تھا اور بھوک

صبح

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

علامہ اقبال

بھی زوروں پر تھی۔ راستے میں سرائے کا نام ونشان تک نہ تھا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور چلتا ہی رہا آخرکار ایک سرائے نظر آئی۔ وہاں پہنچ کر جین والجین نے کچھ کھانے اور رات بسر کرنے کے لیے جگہ مانگی۔ سرائے کے مالک نے اس کے بارے میں پوچھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک سزا یافتہ مجرم ہے تو اس کو دھتکار دیا اور کہا یہاں چوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ قسمت کا مارا اپنا سا منھ لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ چلتے چلتے رات ہوگئی۔ ایک اور سرائے نظر آئی۔ وہاں پہنچ کر جین والجین نے دیکھا کہ کچھ آدمی آگ کے کنارے بیٹھے ہاتھ تاپ رہے ہیں۔ جین والجین نے کھانا اور سونے کے لیے جگہ مانگی۔ وہ اس کی قیمت چکانے کو تیار تھا۔ مگر جیسے ہی ان کو معلوم ہوا کہ اسے چوری کے جرم میں سزا ہو چکی ہے تو اسے وہاں سے بھی دھتکار دیا گیا۔ اب تو جین والجین بہت مایوس ہوا اور سوچنے لگا کہ کیا صرف جیل ہی میرا ٹھکانا ہے؟ اس زندگی سے تو کتّے کی زندگی بہتر ہے۔ جہاں جاتا ہوں دھتکار دیا جاتا ہوں۔ انھیں خیالوں میں ڈوبا ہوا جین والجین چلا جا رہا تھا کہ ایک کٹیا نظر آئی۔ وہ ایک فقیر کی کٹی تھی۔ جین والجین بے حد تھک چکا تھا۔ اس کو خیال ہوا یہاں مجھے کھانا مل جائے گا۔ لیکن وہاں بھی اسے بےعزتی کا سامنا کرنا پڑا۔ مایوس اور پریشان جین والجین چلا جا رہا تھا کہ اس کو راستہ میں ایک بڑھیا ملی۔ اس نے بھوک سے بے تاب ہوکر بڑھیا سے پوچھا "کیا ایک بھوکے چور کو کہیں کھانا مل سکتا ہے؟" بڑھیا نے کہا۔ "دیکھو بیٹا وہ سامنے جو گھر نظر آ رہا ہے' پادری صاحب کا ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ وہ تم کو ضرور کھانا اور رات کو ٹھہرنے کے لیے جگہ دیں گے۔"

پادری بہت ہی نیک انسان تھا۔ ہر کسی کے دکھ تکلیف میں کام آنے والا' ضرورت مندوں کی مدد کرنے والا۔ وہ کسی کو ذرا بھی پریشان حال نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کو خدا پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ بغیر اللہ کے حکم کے کوئی کسی کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اس لیے نہ وہ اپنے گھر کے دروازے بند کرتا اور نہ کوئی حفاظتی تدابیر اختیار کرتا۔ جو دروازہ کھٹکھٹاتا اسے بلا جھجک اندر بلا لیتا۔

پادری کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کی خادمہ کہہ رہی تھی۔ "حضور ہم کو رات میں چوکنّا رہنا چاہیے کیوں کہ سنا ہے آج کل شہر میں کوئی بہت خطرناک آدمی آیا ہوا ہے جو ابھی حال ہی میں جیل سے چھوٹا ہے۔"

پادری نے کہا۔ "تو تم فکر کیوں کرتی ہو۔"

"نہیں حضور! میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ آپ کے دروازوں میں نہ تو کوئی تالا لگانے کی جگہ ہے اور نہ کوئی رکاوٹ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آپ ہر کسی کو اندر بلا لیتے ہیں۔" پادری کی خادمہ نے کہا۔

اتنے میں جین والجین نے دروازے پر دستک دی اور پادری نے اس کو فوراً اندر بلا لیا۔ خادمہ دیکھتے ہی کہنے لگی۔ "حضور! ہو نہ ہو یہ تو وہی آدمی ہے! خدا خیر کرے۔" جین والجین اندر داخل ہوا اور اس نے پادری سے کہا۔ "کیا مجھ کو کھانے کو کچھ مل سکتا ہے اور کیا میں رات یہاں گزار سکتا ہوں۔"

پادری نے کہا "ضرور آئیے! اندر آئیے۔"

جین والجین نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ میں اندر آؤں میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں۔"

پادری نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم بھوکے ہو اور رات گزارنے

کے لیے جگہ درکار ہے۔ بس یہی کافی ہے"۔ مگر جین والجین
نے پھر بھی سب کچھ بتادیا۔ کہ وہ کون ہے اور کہاں
سے آرہا ہے۔ پادری نے کہا۔" یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ آؤ
بیٹھو"۔ اس کے بعد پادری نے خادمہ سے کہا۔ "دیکھو جلدی
سے کھانا تیار کرو۔ تمہارے مہمان آئے ہیں"۔

جین والجین اور پادری کھانے کی میز پر آمنے سامنے
بیٹھ گئے۔ وہ کھانا کھاتے جاتے اور باتیں کرتے جاتے۔
اسی دوران اس نے پادری کو اپنی ساری کہانی سنا ڈالی
کھانے کے بعد اس کو پادری نے اپنے کمرے کے برابر والے
کمرے میں سونے کے لیے جگہ دی۔ جین والجین بہت تھک
گیا تھا۔ اس قدر کہ نرم گرم بستر پر بھی اس کو نیند نہیں
آرہی تھی۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ جین والجین اپنے
ماضی کی پرانی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ کہ اچانک اس
کے دل میں شیطانی وسوسہ آیا۔ اس نے کھانے کے دوران
ہی دیکھ لیا تھا کہ میز پر چاندی کے چمچے اور کانٹے رکھے
ہیں۔ ان کو بیچ کر کافی روپے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔
لیکن ساتھ ہی اس کو پادری کی ہمدردی کا بھی خیال
آتا تھا۔ مگر اس نے اس خیال کو دماغ سے نکال دیا۔
وہ خاموشی سے اُٹھا۔ اس نے چمچوں کی ٹوکری اُٹھائی
اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور صحن کی
دیوار پھاند کر بھاگ گیا۔ صبح کو خادمہ کی نظر پڑی،
اور ٹوکری غائب پائی تو اس نے شور مچایا۔ لیکن پادری
نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا اور کہا وہ اس کے مقدر
کے تھے، لے گیا۔ خادمہ نے کہا۔" میں پہلے ہی کہتی تھی کہ
وہ چور ہے"۔

پادری نے جواب دیا " تو کیا ہوا؟ کیا آدمی کبھی
بدل نہیں سکتا؟ آج وہ چور ہے ہو سکتا ہے کل اس کا
دل بدل جائے اور وہ بھی نیک ہو جائے"۔ ابھی یہ
گفتگو جاری ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔
پادری نے کہا " تشریف لائیے"۔ دروازہ کھلا تو پادری
نے دیکھا کہ ایک داروغہ اور اس کے پیچھے تین سپاہی اور
جین والجین کھڑا ہے۔ داروغہ نے پوچھا کہ "کیا آپ

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

علامہ اقبال

کا کچھ سامان چوری ہوگیا ہے۔ پادری نے صاف انکار
کردیا اور کہا کہ میرا کچھ چوری نہیں ہوا۔ داروغہ نے کہا
" ہم نے اس آدمی کو یہ چاندی کے چمچے لے کر بھاگتے
ہوئے پکڑا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ آپ کے ہی ہوں گے
" لیکن یہ تو میں نے اس کو دیے تھے"۔ پادری نے
بات بناتے ہوئے کہا۔

داروغہ بولا " لیکن ہم نے اس سے ہزار پوچھا لیکن
یہ کوئی تسلّی بخش جواب نہ دے سکا"۔ پادری نے داروغہ
کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور جین والجین سے
مخاطب ہو کر کہا۔ " اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں تو تم کو چاندی
کی یہ شمع دان تو دینا بھول ہی گیا تھا"۔ اور داروغہ
سے کہا۔ " آپ جا سکتے ہیں یہ تو ہمارا دوست ہے"۔
داروغہ اور سپاہی واپس چلے گئے۔ پادری نے
جین والجین سے کہا کہ تم کو اس طرح دیوار پھاند کر
جانے کی کیا ضرورت تھی۔ آرام سے دروازے سے
جاتے۔ دروازہ تو کھلا ہی ہے لو یہ شمع دان بھی لے لو
اور ان کو کام میں لاؤ۔

جین والجین کا سر شرم سے جھک گیا۔ اور اس کے
کپکپاتے ہوئے ہاتھوں نے شمع دان لے لیا۔ اور تھراتی
ہوئی زبان سے پادری کا شکریہ ادا کیا۔ اور پادری
سے کہنے لگا۔ " میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں
بھول سکتا۔ کیوں کہ آپ نے میری جان تو بچائی ہی
مگر مجھ کو آئندہ بھی گناہوں سے روک دیا"۔

سُقراط

یونانی فلسفی سقراط ۴۶۹ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ وہ سوفرونکس نامی سنگتراش کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں کا نام فیناریٹ تھا۔ زین تھپے سے اس کی شادی ہوئی جس کی اصل خوبیوں کو اس کے شوہر نے پہچانا۔ وہ گنوار و اور بے ڈول وضع قطع کا انسان تھا۔ شہرت اور دولت کی خواہش سے عاری یہ شخص عوامی عہدوں سے احتراز کرتا تھا لیکن دو بار اسے زبردستی عہدے دیے گئے جن پر فائز ہو کر اس نے اربابِ وقت کی کڑی نکتہ چینی اور مخالفت کی اور یوں اپنی ہمت اور اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ ۴۰۹ میں اس نے آرجی نو سے کی جنگ کے بعد اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے ایک ایسے شخص کو گرفتار کرنے سے انکار کیا جس کو سزائے موت دی گئی تھی۔

۳۳۹ قبل مسیح میں ایک عدالتی تحقیقات کے بعد، جس کا ذکر افلاطون کی کتاب "معذرت نامہ" میں ہے۔ سقراط کو سزائے موت کا حکم ملا۔ ملی ٹس اور لائیکون وغیرہ نے اس پر یہ الزامات لگائے کہ وہ نئے دیوتاؤں کو متعارف کرا رہا ہے اور نوجوانوں کو برباد کر رہا ہے سوالات کر کر کے وہ ان کو خود اپنا دشمن بنا رہا تھا جو کہ عقل و خرد کے لئے مشہور تھے (یا یوں کہہ لیجئے کہ جو عقل کے ٹھیکے دار تھے) ساتھ ہی وہ ان کی تردید بھی کر رہا تھا۔ اس کے تازہ اور طبعزاد، تخلیقی خیالات و افکار اور جمہوری حکومت کے کمزور پہلوؤں پر اس کی نظر نے ایتھنز کے باشندوں میں اسے غیر معمولی کر دیا۔ اپنے نظریات اور عقاید کی سزا کے طور پر اسے زہر کا پیالہ دیا گیا۔

اس کے نظریات کو صحیح طور سے سمجھنے میں دو باتیں مانع ہیں۔ اس نے اپنے نظریات کو ان میں شامل کیا۔ اور زینوفون جو اس کا دوسرا شارح تھا، چونکہ خود فلسفی نہیں تھا اس لئے اس کے نظریات کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا تھا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس کے نزدیک سب سے مفید سائنس وہ ہے جو نیکی، راست بازی، حسن سیرت اور اخلاقی وصف کے دائرہ علم کو کچھ عطا کر سکے، جو ایک اچھے شہری کو تخلیق کر سکے ـــ یہی وسیع معنوں میں اخلاقی سائنس ہے۔ اس نے ایک سراغ رساں کی مانند، انتہائی ذہانت سے روایتی نظریات میں خامیاں اور عیوب تلاش کرنے کی کوشش کی ساتھ ہی ایک نئے طریقہ سے کسی موضوع پر سچے خیالات کی

سبھی کی۔ مختلف الفاظ کی اس نے ازسرِ نو تعریف کی جیسے نیکی، دیانت وغیرہ جس میں اس نے مختلف مثالیں دیں۔ اس حد اور فرسودہ ذہنوں سے اس کے اختلاف کی ابتدا کی۔ یہ تجزیہ کے طریقہ کے ذریعہ عمل میں لایا گیا یوں وہ ایک خاص نتیجہ پر سقراط ان کو لانا چاہتا تھا۔ وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ گویا خود اسے معلوم۔ وہ سچ جو خود ان کے اپنے ذہنوں میں مستور و خوابیدہ اسے ابھار کر ایک مخصوص سلیقہ اور حسن و خوبی سے باہر لاتا تھا اس کے لئے وہ کبھی کنایہ اور اساطیر وغیرہ کا استعمال کرتا تھا وہ کسی نظریے کی وضاحت اور تشریح کرتا تھا۔ اس نے بہت پر مباحثہ کیا جو کہ زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں سے متعلق اور زینوفون دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ سقراط کے مطا راست بازی علم ہے، کوئی بھی اپنی خوشی سے برا نہیں ہوا کرتا اور مسرت کا سرچشمہ نیکی اور حسن سیرت ہے۔ اچھائی اور نیکی کی طرف اس نے خصوصی طور سے رجوع کیا اسکا خیال تھا کہ شخص بد ہے تو یہ اس کی جہالت کی وجہ سے ہے، لاعلمی کی وجہ ذہنی تاریکی کی وجہ سے ہے۔ سقراط نے (افلاطون کے قول کائنات کے توازن اور نظم سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کسی ملکو کے ذریعہ منظم کی گئی ہے اسی ربوبی یا ربانی جوہر کے ذریعہ ا قوتِ حیات پیدا کی گئی ہے، اسے زندگی بخشی گئی ہے۔ بالکل جیسے کسی شخص کے ذہن کا اندازہ ہم کو اس کے عمل سے لگتا

سقراط کی خاص اہمیت اس حقیقت میں مضمر تھی کہ وہ پہلا فلسفی جس نے نیکی اور دیانت کے نظریہ اور علم میں باہمی رشتہ قائم کیا۔

اس کی عجیب و غریب شخصیت اور یہ حقیقت کہ اس نے اپنے کی خاطر زہر کا پیالہ پیا اور موت کو ہنسی خوشی گلے لگایا، اس بات کا ہے کہ وہ حقیقی معنی میں ایک استاد تھا ایسا استاد جو اپنی بات کا اہل ہے اور آزادیٔ روح کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا یہاں تک کہ موت کو بھی لبیک کہہ سکتا ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

مترجمہ: نجمہ شہریار

حضرت یوسفؑ اور عزیزِ مصر

شاہ مصر کو مصری عوام فرعون کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ جیسا کہ
سورۃ 'الاعراف' کی ۱۰۴ آیت پر ہے۔ "وقال موسیٰ یٰفرعون
رسول من رب العالمین" اس سورت کی اگلی آیتوں میں بھی شاہ
فرعون کہا گیا ہے[1] برخلاف اس کے سورہ 'یوسف' میں شاہِ مصر
یوسفؑ کو فرعون کے بجائے 'مَلِک' کہا گیا ہے[2]۔ تاریخوں سے
ہوتا ہے کہ یوسفؑ کے زمانے میں سلاطین ھیکسس حکومت کرتے تھے
حکومتِ فراعنہ معطل ہو چکی تھی۔ سلاطین ھیکسس غیر ملکی تھے۔ اور
انہوں نے مصری بتوں کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ شام سے وہ اپنے بتوں کو
لائے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذھب رائج ہو جائے
قرآن میں حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو فرعون نہیں کہا۔
فرعون مصر کی مذھبی اصطلاح تھی اور یہ[3] بادشاہ ان کے مذہب
کے پابند نہ تھے۔ لیکن بعض مفسرین قرآن نے شاہ مصر معاصر یوسفؑ کو
فرعون لکھا ہے۔ درحقیقت مفسرین نے توراۃ کو بھی اپنے سامنے رکھا ہے
جس میں شاہِ مصر معاصر یوسفؑ کو بھی فرعون ہی کہا گیا ہے[4] اور یہ صریحاً
غلطی ہے۔ شاید توراۃ کے مرتبین مصر کے تمام بادشاہوں کو فرعون ہی
سمجھتے تھے۔ توراۃ میں یوسفؑ کے واقعات کے بیان میں ہے کہ جس نے
یوسفؑ کو خریدا پوطیفار تھا اور وہ خواجہ سرا اور خاص لشکریوں کا
سردار تھا[5]۔ یہیں سے مفسرینِ قرآن غلطی میں پڑ گئے ہیں۔ اور انھوں
نے 'شاہ مصر اور عزیز' جس نے یوسفؑ کو مصر میں خریدا، دو علیحدہ
شخصیتیں قرار دی ہیں۔ عبداللہ بن عباس رقم طراز ہیں:-

"وقال الذی اشتراہ ای اشتری یوسف من مصر
فی مصر وھو العزیز خازن الملک وھو صاحب
جنودہ وکان یسمی قطفیر" [6]

تفسیر ابن کثیر میں ہے: "این وزیرِ مصر بودہ و نامش قطفیر کس
میگوید اطفیر بود نام پدرش روحیب بود۔ او داروغہ خزانۂ مصر بود
و سلطنتِ مصر در آں گاہ در دست ریان بن ولید بود"[7]

تفسیر ماجدی میں ہے:- "خریدار یوسف عزیز مصر تھا۔ آئندہ
بادشاہ نے یوسف کو عزیز مصر مقرر فرمایا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
عزیز کا منصب نظامِ ملک میں سب سے اعلیٰ منصب تھا۔ وہ خزانہ کا محافظ
اور بادشاہ کے نزدیک "مکین امین" ہوتا تھا۔"[8]

الغرض تمام مفسرین قرآن نے عزیز اور ملک کو دو شخصیتیں قرار
دیا ہے لیکن اگر واقعاتِ قرآن کو غور سے دیکھا جائے تو یہ صاف پتہ
چلتا ہے کہ عزیز اور ملک ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ یہ قرآن کی بلاغت
کا بہترین نمونہ ہے کہ بادشاہ مصر کو واقعات کے بیان میں جس مقام پر وہ
جو حیثیت رکھتا تھا اس کو اسی حیثیت سے مخاطب کیا ہے جیسے الذی
اشتراہ، امراۃ العزیز، سید رب، ملک۔ قرآن کی جن آیتوں
میں یہ الفاظ آئے ہیں وہ سب واقعات کے تسلسل کے ساتھ حسب ذیل ہیں

"وقال الذی اشتراہ من مصر لامراتہ الخ"[9]......

اس جگہ قرآن کریم میں خریدار کا نام نہیں ہے اس لیے کہ یہاں عزیز
یعنی بادشاہ کی حیثیت خریدار کی تھی اسی لیے اس کا ذکر بھی خریدار کی حیثیت

---

[1] ۱۱۳،۱۰۹، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۴۱۔ [2] آیت ۴۳ [3] "القرآن الکریم" از عبداللہ یوسف علی جلد اول ص ۴۰۵
[4] سفر تکوین باب ۴۱ آیت از ۱ تا ۸ [5] کتاب پیدائش" فصل ۳۹ آیت ۱ [6] "تنویر المقباس"
از عبداللہ ابن عباس۔ الطبعۃ الاولی بالمطبعۃ الازھریۃ مصریہ ۱۳۱۶ھ [7] تفسیر ابن کثیر طابع و ناشر نور محمد اصح المطابع و
کارخانہ تجارت کتب۔ کراچی جلد دوم ص ۳ [8] تفسیر ماجدی۔ از عبدالماجد دریا بادی۔ جمال پرنٹنگ پریس
دہلی۔ ص ۵۵۳۔
[9] آیت ۲۱۔

نفسہٖ[1]" یہاں پر بھی نام نہیں لیا گیا۔ حالاں کہ آئندہ واقعات سے ظاہر ہے کہ عزیز نے یوسفؑ کو خرید کر اپنی بیوی کے سپرد کیا تھا اور یوسفؑ اس کے گھر میں رہتے تھے۔ "وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ[2]" الفیا صیغۂ تثنیہ ہے یعنی یوسفؑ اور زلیخا۔ دونوں نے دروازے پر عورت کے شوہر کو پایا۔ چوں کہ یہاں عزیز اپنی بیوی کی موجودگی میں شوہر کی حیثیت رکھتا تھا، اسی لیے سیّد لایا گیا۔ وقال نسوۃ فی المدینۃ امراۃ العزیز تراود فتٰھا عن نفسہٖ[3] مصر کی عورتوں نے 'امراۃ العزیز' کہا۔ کیوں کہ زلیخا کی حیثیت یہی تھی کہ وہ عزیزِ مصر کی بیوی تھی اور اس حیثیت سے وہ عوام میں معروف تھی۔ اس آیت سے قبل مذکورہ بالا تینوں آیتوں میں اگرچہ کسی کا نام نہیں ہے لیکن یہاں "امراۃ العزیز" سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ان میں عزیز اور اس کی بیوی کا ہی ذکر ہوا تھا۔

جب ملکِ مصر میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ زلیخا اپنے غلام سے عشق کرتی ہے اور اسے گناہ پر آمادہ کرتی ہے تو زلیخا سے کسی نے باز پرس نہ کی اور عزیز کو کسی نے جواب طلبی کے لیے نہیں بلایا۔ کوئی بات جو پورے ملک میں مشہور ہو جائے اور وہاں کے بادشاہ کو اس کا علم نہ ہو ایسا ممکن نہیں۔ معلوم ہو جانے کے بعد بادشاہ واقعہ کی تحقیق نہ کرے اور گناہگار کو سزا نہ دلوائے یہ بھی ممکن نہیں۔ چنانچہ اگر بادشاہ کوئی اور ہوتا تو اسے یقیناً معلوم ہوتا کہ میرے ایک ماتحت کے گھر میں کیا ہو رہا ہے تو وہ اسے سرزنش کرتا اور اس کی بیوی کو سزا دیتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ زلیخا کا جو دل چاہتا ہے وہ بے خوف و خطر کر گزرتی ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ ملکِ مصر کی عورتیں اسے مطعون کرنے لگی ہیں تو وہ ایک بڑی محفل کا انتظام کرواتی ہے اور اس میں عورتوں کو جمع کر کے یوسفؑ کو ان کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ پھر وہ سب عورتوں کو متحیر کرنے کے بعد تسلیم کرتی ہے " ولقد راودتہٗ عن نفسہٖ فاستعصم۔ ولئن لم یفعل ما آمرہٗ لیسجنن ولیکونا من الصٰغرین[4]" اور یہ بھی دھمکی محض ڈرانے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس نے واقعی حضرت یوسفؑ کو بے قصور قید بھی کروا دیا۔ زلیخا کے ان تمام ناجائز حرکات سے ظاہر ہے کہ وہ مصر کے بادشاہ عزیز کی بیوی تھی اور اسے کسی کی باز پرسی کا خوف نہ تھا۔

قید خانے میں یوسفؑ کے ساتھ ایک ساقی اور ایک نانبائی بھی قید تھے۔ ان دونوں نے خواب دیکھا اور یوسفؑ سے تعبیر پوچھی۔ آپ نے کہا۔" اما احدکما فیسقی ربہٗ خمرا[5]" یہاں صاف ظاہر ہے کہ رب سے

...بادشاہِ مصر ہے۔ قرآن میں اس مقام پر نہ تو لفظ 'ملک' آیا ہے اور عزیز۔ اس لیے کہ وہ دونوں جن سے یوسفؑ مخاطب تھے بادشاہ کے نوکر اور بادشاہ ہی سے تنخواہ پاتے تھے جس سے ان کے اور ان کے اہل خانہ کی گزر ہوتی تھی۔ نوکروں کے لیے بادشاہ 'رب' یعنی خداوندی رکھتا تھا۔ اسی طرح آگے دو اور مقاموں پر جہاں یوسفؑ بادشاہ کے نوکر سے مخاطب تھے 'رب' آیا ہے۔

(۱) اذکرنی عند ربک الخ[6]

(۲) ارجع الی ربک الخ[7]

وقال الملک انی اریٰ الخ[8] ..... یہاں عزیز کے لفظ 'ملک' آیا ہے۔ اس لیے کہ وہ دربارِ عام میں موجود ہے اور عوام درباریوں کے لیے وہ بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مفسرینِ قرآن کے نزدیک اب بادشاہِ مصر کا ذکر آیا ہے اور اس سے قبل عزیز کا ذکر تھا جو نظام میں مدار المہام تھا۔ اگر اس ناممکن بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ بادشاہ کے علاوہ کوئی اور تھا جسے زلیخا اور یوسفؑ کے واقعات کا علم نہ تھا۔ یا اس کی حکمرانی کے دوران اس کے ماتحتوں کو اپنی من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ تھی تو اب جب کہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتانے سے سب درباری اور معبر عاجز رہ گئے اور یوسفؑ نے فوراً بتا دیا تو بادشاہ نے کسی حیرت و استعجاب کا اظہار نہیں کیا کہ اتنا بڑا عالم قید خانے میں کیوں پڑا ہے؟ کس نے اسے وہاں قید کیا ہے؟ کیا قصور اس سے سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں اس نے یہ سزا پائی؟ وہ محض یہ حکم دیتا ہے۔ "ائتونی بہٖ[9]" اس بات سے ظاہر ہے کہ بادشاہ عزیز ہی تھا جس نے اپنی بیوی کی خواہش پر اور اسے بدنامی سے بچانے کے لیے یوسفؑ کو قید کروایا تھا۔

جب بادشاہ نے آزادی کا پروانہ بھیجا تو یوسف علیہ السلام نے اپنے جرم کی تحقیق سے قبل قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ کو مجبوراً سب کے سامنے اپنی بیوی "امراۃ العزیز[10]" اور عورتوں کو بلوا کر واقعے کی تحقیق کروانی پڑی۔ جب ان عورتوں نے اقبالِ جرم کر لیا تو یوسفؑ بادشاہ کے پاس آئے اور اس سے ملک کے خزائن پر مامور کرنے کے لیے کہا۔ بادشاہ نے بغیر تامل اتنا بڑا عہدہ ان کے سپرد کر دیا۔ اگر بادشاہ عزیز نہ ہوتا تو وہ اتنا بڑا عہدہ کسی اجنبی کو بغیر کسی صلاحیت و لیاقت سے باخبر ہوئے ہرگز نہ دیتا۔ لیکن یوسفؑ کی خوبیاں بادشاہ

باقی ص ۳۸

---

1 آیت ۲۳۔ 2 آیت ۲۵ 3 آیت ۳۰۔
4 آیت ۳۲ 5 ۴۱ 6 آیت ۴۲ 7 آیت ۵۰
8 آیت ۴۳ 9 آیت ۵۰۔ 10 آیت ۵۱۔

عورتیں مردوں کا ضمیمہ نہیں

آج کل شعوری یا غیر شعوری طور پر عورتیں جس طرح اپنے معاشی
ضروریاتِ زندگی کا ذمہ دار مردوں کو سمجھتی ہیں، اسی طرح اپنے
عمال کی ذمہ داری بھی مردوں ہی کے اوپر ڈالتی ہیں اور یہ رجحان
ی عام ہو چکا ہے۔ گویا مرد ایک کامل انسان ہے اور عورت اس
ر ضمیمہ ہے۔ اپنی حیثیت کے اس غلط تصور کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ
ی خود اعتمادی مردوں کے آگے دب کر رہ گئی ہے اور دوسری
رابی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ عورتوں میں از خود دین کا علم حاصل کرنے
ین پر چلنے کا جذبہ متاثر ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی ان کی دین داری بھی
کے تابع ہو کر رہ گئی ہے۔ حالاں کہ دین کے معاملے میں مرد اپنا ذمہ دار
عورتوں کی ذمہ داری ان کے اپنے سر ہے۔ جس طرح کے مردوں
لینے سے عورتوں کی بھوک اور پیاس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی
ردوں کے نیک اعمال سے عورتوں کو ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، ان
لیے خود ہی عمل کرنا پڑے گا اور خود ہی اپنی نجات کی فکر کرنی پڑے
ں کہ اللہ تعالٰی نے دونوں کو الگ الگ بندگی کا مکلف بنایا ہے اور
سے مستقل عبادت کا مطالبہ کیا ہے۔ چنانچہ نہ مرد مطلوبہ ذمہ داریوں
لیے بغیر کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ عورتیں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ فرق
تو صرف اس قدر کہ بعض فطری اور ناگزیر حالات کے پیش نظر اللہ تعالٰی
ن کی کفالت کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی ہے اور مرد عورت کا قیم اور
رار پایا ہے۔ اس سے عورت کی صرف وہ ذمہ داری ختم ہوتی ہے جو روزی
ور دیگر اجتماعی فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں ہے، مگر دینی اور انفرادی
ریاں تو عورت کو بہر حال خود ہی نبھانی پڑیں گی۔ قرآن میں بڑی صراحت
ۃ مذکور ہے۔

ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثٰی وھو
ن فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرا

اور جو نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے
ے جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔

ایک حدیث میں ہے

عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچے کی نگراں ہے اور تم سب کو اپنے ماتحت
کے بارے میں جواب دہی کرنا ہوگی۔

اسلام ایک مسلمان عورت سے یہ امید رکھتا ہے کہ وہ اس احساس ذمہ
داری کے ساتھ ہر حال میں اللہ کی بندگی کرے گی اور اس کی رضا جو رہے
گی خواہ اس کے حالات سازگار رہیں یا ناسازگار خواہ اس کا گھریلو ماحول
اس کا ساتھ دے رہا ہو یا نہ دے رہا ہو، خواہ اسے اپنے پرائے کی ناراضگی
مول لینی پڑے، قیامت کے دن اس کو یہ کہنے کا کوئی حق نہ ہوگا کہ حالات کی ناسازگاری
اقارب کی ناراضگی کی بنا پر اس کی دین داری متاثر ہوئی۔ وہ اپنی شبانہ روز کی
مصروفیات کا حوالہ دے کر بھی اپنی کمی کی تلافی نہ کر پائے گی، اس کو ہر حالت میں
اپنے ایک ایک قول و عمل کا جواب دینا پڑے گا۔ اس دن وہ خدائی عدالت میں تنہا
ہوگی، اس کے ساتھ دوسرا کوئی نہ ہوگا۔ قرآن کریم کی ۶۶ ویں سورہ تحریم کی
آخری آیات میں چار عورتوں کی نہایت موثر مثالیں دی گئی ہیں، ارشاد ہے۔

"اللہ کافروں کے معاملے میں نوح اور لوط (علیہما السلام) کی بیویوں کو
بطور مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں، مگر
انھوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ
کام نہ آ سکے، دونوں سے کہہ دیا گیا جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی
جاؤ۔ اور اہل ایمان کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے
جب کہ اس نے دعا کی۔ اے میرے رب! میرے لیے اپنے یہاں جنت میں ایک
گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات
دے! اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال دیتا ہے۔ جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت
کی تھی پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونک دی اور اس نے اپنے
رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں
سے تھی۔

یہ آیتیں ہر دور کی عورتوں کے لیے نمونہ عبرت ہیں۔ اللہ تعالٰی ان کے سامنے

ایک آئینہ پیش کرتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے دین وایمان اور سیرت کا جائزہ لیں۔ ان آیات میں پہلی مثال دو ایسی عورتوں کی دی گئی ہے جن کے شوہر انتہائی برگزیدہ انسان اور اللہ کے نبی تھے، وہ لوگوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دیتے تھے جو کوئی ان کی صحبت اختیار کرتا اس کی دنیا اور آخرت سنور جاتی تھی۔ مگر یہ بدنصیب عورتیں ان کی زوجیت میں رہتے ہوئے بھی اجنبی بنی رہیں۔ ان پیغمبروں کی تعلیم وتلقین کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور ان کی محنت کا صلہ انھوں نے انکار اور خیانت کی شکل میں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غضب خداوندی کی لپیٹ میں آگئیں۔ اور جہنم کا ایندھن بنادی گئیں۔ ان کے شوہروں کی نبوت ان کے کچھ کام نہ آسکی۔

دوسری مثال اس عظیم خاتون کی ہے جس کا شوہر وقت کا مشہور بادشاہ فرعون تھا، جس نے انسانوں کو ان کی مرضی کے خلاف غلام بنا رکھا تھا، وہ خود اللہ کی بندگی کیا کرتا، دوسروں کو بھی اللہ کی بندگی سے روکتا تھا اور اپنی بندگی کی دعوت دیتا تھا اور اس کی قوم اس کا حکم ماننے پر مجبور تھی۔ مگر اس کی بیوی اس کی طاقت ودولت اور عہدہ واقتدار کے رعب میں قطعی نہیں آئی۔ وہ ایسے ظالم کی زوجیت میں رہتے ہوئے بھی اس کی غلامی سے آزاد اور اس کی اطاعت سے بے نیاز رہی۔ وہ اپنے رب پر ایمان رکھتی تھی، اس کی عبادت گزار تھیں اور فرعون سے ذرا بھی نہیں ڈرتی تھی۔ چنانچہ اللہ نے بھی اس کی پوری مدد کی اور فرعون اس کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکا۔

تیسری مثال ایک مقدس خاتون حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کی ہے۔ جن کی خداترسی، پاکدامنی اور عفت مآبی کی تعریف قرآن میں کئی مواقع پر کی گئی ہے۔ مگر اللہ نے ان کو کنوارپن کی حالت میں جس شدید آزمائش میں ڈالا تھا وہ اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری واقعہ تھا اور انھوں نے بھی جس عزیمت اور صبر واستقلال کا ثبوت دیا۔ اس کو بھی اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ ایک شریف اور پاکباز لڑکی کا بغیر نکاح کے ماں بن جانا اگرچہ معجزہ تھا تاہم قوم کے ردّعمل کا سامنا کرنا ہرگز آسان کام نہ تھا۔ مگر خدا کی مرضی یہی تھی کہ انھوں نے بھی خدا کے لیے سب کچھ گوارا کیا۔

ان مثالوں کے ذریعے زبردست حکمت ودانائی کی باتیں بتائی گئی ہیں ایک تو یہ کہ اگر کوئی اپنی ذات میں بے عمل اور بے کردار ہو تو خواہ اس کا گھرانہ کتنا ہی دین دار کیوں نہ ہو، اس کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ دوسروں کی دین داری اس کی بے دینی کا کفارہ نہیں بن سکتی۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چہیتی بیٹی فاطمہ زہراؓ کو جتا دیا تھا کہ یہ نہ سمجھو کہ تمہارا باپ نبی ہے تو قیامت میں تم سے مواخذہ نہ ہوگا بلکہ اپنے اعمال کا تمہیں خود جواب دینا پڑے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ماحول انتہائی مخالف ہو مگر انسان خداترسی کا فیصلہ کرے تو کوئی اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ اگر اپنے دین کی حفاظت کرے تو خدا اس کی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیتا ہے۔ بشرطیکہ انسان ہمت اور جرأت سے کام لے۔

تیسری بات یہ ہے کہ خدا کسی بندی کو کسی بھی قسم کی آزمائش سے دوچار کرے تو اس پر اسے صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اللہ کی طرف بڑھنا چاہیے۔ کیوں کہ عزت وذلت اور نفع ونقصان کا سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ دراصل یہی ایک آئیڈیل اسلامی زندگی ہے اور اسی میں راہِ نجات ہے۔ اللہ نے جس دین کو انسانوں کے لیے پسند کیا ہے اور جس کا نفاذ پورے طور پر محمدؐ نے کر دیا ہے۔ کوئی اگر اپنے آپ کو مسلمان کہنا چاہے اور پسند کرے تو اس کے لیے لازم ہے کہ صرف اور صرف اسی دین کی پیروی کرے، اسی کو نظامِ زندگی سمجھے اور اسی کے مطابق اپنے افکار وکردار کی تہذیب وتربیت کرے۔ ایسی کسی بھی قول وعمل سے پرہیز کرے جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت لازم آئے۔ کیوں کہ یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ قرآن میں صاف مذکور ہے۔

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے
کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے میں فیصلہ کر دیں
تو پھر اسے اپنے اسی معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار
حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی
کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔ [الاحزاب-٣٦]

محمد مسعود عالم القاسمی
ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

ستارے کا پیغام

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب! خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

علامہ اقبال

پیغمبر اسلام کا
اخلاق و سیرت

جب سے انسان اس دنیا میں آباد ہوا ہے اُس وقت سے آج تک ہر دور
ں نہ کسی خطّے میں کوئی نہ کوئی انسان ایسا ضرور پیدا ہوتا رہا ہے جس نے
ں کو سیرت و کردار کی تعمیر کی دعوت دی اور اخلاق و اعمال کی درستگی
ں دیا۔ معلمین اخلاق کی ایک لمبی فہرست ہمارے سامنے آتی ہے انسانیت
ممنون و مشکور رہے۔ ان اخلاقی رہنماؤں نے ہمیں بنیادی انسانی صفات
ر رہنے، حیوانوں سے ممتاز زندگی گزارنے اور بلند ترین اخلاقی صفات
ر پیدا کرنے کی تعلیم دی۔ ان ہی معلموں میں ایک مقدس نام حضرت محمد
ﷲ علیہ وسلم کا بھی ہے۔ آپ جزیرہ نمائے عرب میں اس وقت پیدا ہوئے
پورا عرب شدید اخلاقی بحران کا شکار تھا اور دنیائے انسانیت میں ایک
ہیجان سا برپا تھا، اخلاقی اصول بے محابا توڑے جا رہے تھے اور انسانیت
سرعام تذلیل کی جا رہی تھی۔ انسان سیرت و کردار کی تعمیر سے غافل اور
و ناموس کی تخریب کاری میں مشغول تھا۔ وہ بنیادی انسانی صفات سے
راہ اور بلند اخلاقی اصولوں سے نابلد تھا، کھلے عام بدکاریاں کرنا دوسروں
رق غصب کرنا، دوسروں کی عزت و جان پر حملہ آور ہونا، یہ عام سی بات
ایسے میں اخلاق و کردار کی بات کرنا کچھ ایسا ہی تھا جیسے صحرا میں صدا لگانا
ہان جائیے اس نبی امّی پر جس نے مدت العمر اخلاقی اصولوں کی تبلیغ اور
قوانین کی اشاعت میں گزار دی اور ایک دن کے لیے بھی وہ اپنے ماحول
برگی سے مایوس نہ ہوئے، بالآخر وہ دنیائے انسانیت سے اخلاقی باختگی
سانیت سوز فضا کو ختم کرنے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے۔

عام طور پر دنیا کے دوسرے معلمین اخلاق کے ساتھ یہ المیہ رہا ہے
جن اخلاقی اصولوں کی تبلیغ کرتے ہیں اور جن ملکوتی صفات کو جذب کرنے
ور دیتے ہیں خود ان کی اپنی زندگی میں ان تعلیمات کا اثر بہت کم ہوتا ہے
منکرات سے وہ دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں، قریب سے دیکھا جائے تو
ر داس کے شکار ہوتے ہیں جن معروفات کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے
ہ کر دینے پر پتہ چلتا ہے کہ ان کی عملی زندگی ان سے یکسر محروم ہے۔ گویا
ان کے کردار اور گفتار میں ایک گہرا تضاد ملتا ہے جس کو دور کرنے سے وہ عاجز
ہوتے ہیں۔ یونان کے معلمین اخلاق ہوں یا ہندوستان کے حکماء اور فلاسفہ
بلا لحاظ سب کے سب اس میں مشترک ہیں، یہی وجہ ہے کہ دُور سے ان کی باتیں
سنیں تو سر دھننے کو جی چاہے گا اور قریب سے قریب تر جائیں تو سر پیٹنے پر
مجبور ہو جائیں گے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں آپ
کو کہیں بھی یہ نقص نظر نہیں آئے گا۔ جو شخص سیرت پاک کی جتنی زیادہ گہرائی
میں جائے گا وہ اسی قدر آپ کے بلند اخلاق اور پاکیزہ کردار کا مدح سرا نظر
آئے گا۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا اصول یہ تھا، نیکی کا کوئی کام اور
ثواب کا کوئی عمل ہو آپ سب سے پہلے اس پر عمل کرتے تھے۔ آپ جب کسی بات
کا حکم دیتے تو پہلے آپ اس کو کرنے والے ہوتے۔

حضرت انس بن مالکؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی صحابی
اور وفادار خادم تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انھوں نے بہت قریب
سے دیکھا تھا اور آپ کی سیرتِ مبارکہ کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا، ان کا
بیان ہے کہ میں نے پورے دس سال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
کی۔ آنحضرت نے کبھی مجھے اُف تک نہیں کہا اور میرے کسی کام پر یہ نہیں
فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا اور
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ محاسن اخلاق کے
حامل تھے (ترمذی)

غور کیجیے ایک شخص پورے دس سال رسول اکرمؐ کی خدمت کرتا
ہے مگر اس عرصے میں وہ کبھی آنحضرت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ قول یا عمل کی
نشاندہی نہیں کرتا، جس کو اخلاقی معیار سے فروتر قرار دیا جا سکے۔ بلکہ وہ
اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انسانوں میں سب سے زیادہ بلند اخلاق کے
حامل آنحضرتؐ تھے۔

حضرت انسؓ سے زیادہ قریب آنحضورؐ کی سیرت و کردار اور اخلاق و
اعمال کے مشاہدے کا موقع ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

کو میسر آیا تھا کیوں کہ وہ آنحضورؐ کی رفیقہ حیات تھیں اور آپ کی ہر ظاہری اور خانگی معمولات و عادات سے واقف تھیں۔ حضرت انسؓ نے آنحضرتؐ کو جلوتوں میں دیکھا تھا، جب کہ حضرت عائشہؓ نے حضور اکرمؐ کو جلوتوں اور خلوتوں ہر دو میں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے پاس کچھ حضرات آنحضورؐ کی سیرت و اخلاق کے بارے میں دریافت کرنے آئے تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی شخصیت کی تشکیل کر سکیں۔ انھوں نے پوچھا ام المومنینؓ کچھ حضور اکرمؐ کے اخلاق کے بارے میں بتلایئے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جواب دیا کہ کیا تم لوگوں نے قرآن نہیں پڑھا، کان خلقہ القرآن۔ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن تھا، یعنی قرآنی تعلیمات آنحضورؐ کے اخلاق و کردار میں رچی اور بسی ہوئی تھیں اور حضور مکرمؐ ان سے ذرا بھی منحرف نہ تھے۔ خود قرآن کریم میں آپ کے بلند اخلاق کی شہادت بایں الفاظ دی گئی ہے، انک لعلیٰ خلق عظیم۔ رسالت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بنیادی ذمہ داری قرآن کی تلاوت اور اس کی تعلیم تھی، اور خود حضورؐ کی زندگی اس کا عملی نمونہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ قرآن کو راہ راست کی ضمانت قرار دیتا ہے۔ ان ھٰذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم (بنی اسرائیل) بیشک یہ قرآن سیدھے راستے پر گامزن کرتا ہے اور دوسری طرف آنحضورؐ کی سیرت مبارکہ کو نمونہ زندگی بنا لینے کی تلقین کرتا ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیراً (احزاب) تمہارے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے مگر اس کے لیے جو اللہ اور قیامت پر یقین رکھتا ہے اور کثرت سے ذکر خدا کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ آپ جس قرآن کی تعلیم فرماتے، اپنی عملی زندگی [illegible] تقلید بنا کر پیش کرتے۔ بقول مولانا غلام رسول مہر۔ قرآن کے [illegible] ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے۔ دراصل قرآن اور سیرت [illegible] قرآن متن ہے اور سیرت اس کی تشریح ہے، قرآن علم ہے تو سیرت [illegible] نقشہ ہے۔

واقعہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی سیرت و اخلاق کی عظمت کے [illegible] حکماء اور معلمین سرنگوں نظر آتے ہیں اور ان کے قول و عمل کی [illegible] حاصل کیے بغیر دنیا کا کوئی انسان اخلاقی اعتبار سے بڑا نہیں [illegible] تقلید ہے تو صرف اخلاق محمدی۔ اور قابل عمل ہے تو صرف اخلا[illegible] بقول علامہ اقبالؒ ؎

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

عذرا اسلام انصاری
ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بقیہ: حضرت یوسف اور عزیز مصر

اس سے قبل جب وہ اس کے گھر میں رہتے تھے، دیکھ چکا تھا، اسی لیے اس نے نہ صرف انھیں خزائن پر مامور کیا بلکہ بادشاہ مصر مقرر کر دیا تھا۔ جیسا کہ قرآن کی اگلی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قحط کے زمانے میں یوسفؑ کے پاس ان کے بھائی غلہ لینے آئے تھے تو یوسفؑ نے اپنے سگے بھائی کے سامان میں پیالہ رکھ کر انھیں بہانے سے روک لیا تھا۔ قرآن میں اس پیالے کے لیے صواع الملک آیا ہے[1] اور دو مقاموں پر یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے عزیز کہہ کر مخاطب کیا ہے[2] اس سے میری بات کی مزید توثیق ہوتی ہے کہ عزیز اور ملک ایک ہی شخصیت ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عزیز کوئی عہدہ تھا جس پر یوسفؑ فائز تھے اور بادشاہ مصر کا پیالہ یوسفؑ نے بھائی کے سامان میں رکھا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بھائیوں نے یوسفؑ [illegible] ہی درخواست کرنے پر کیوں اکتفا کی کہ اس بھائی کو چھوڑ دیا جا[ئے] اور پیالے کی چوری کے جرم میں ہم میں سے کسی ایک کو اس کے [illegible] روک لیا جائے۔ یوسفؑ کے اس درخواست کو رد کرنے پر انھو[ں نے] بادشاہ کا دروازہ کیوں نہیں کھٹکھٹایا؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے [کہ] خود یوسفؑ ہی بادشاہ تھے۔ ان کو بادشاہت کے تخت پر ہی [illegible] دیکھ کر ان کے تمام خاندان کے افراد نے ان کو سجدۂ تکریمی کیا [illegible] الغرض واقعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر سورۂ یوسفؑ کا مطا[لعہ] کیا جائے تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ 'عزیز' کا لقب [اس] وقت مصر کے بادشاہ کے لیے مخصوص تھا۔

ڈاکٹر مسز صفیہ جاریہ انیس
شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

[1] آیت ۷۲، [2] آیت ۷۸ اور آیت ۸۸

مسلم تعلیمی اداروں کے سربراہوں کی کانفرنس

روئیداد

علمی وسائنسی ترقیات کے ساتھ ساتھ ملک میں تعلیم کا معیار بالعموم
...ل ہے انحطاط ہے۔ مسلم تعلیمی اداروں میں حالت اور بھی زیادہ خراب ہے۔ اس صورت
...تی حلقوں میں بے اطمینانی ایک عرصے سے موجود ہے۔ بعض اداروں نے
...س بارے میں تحقیق وتفتیش اور پھر نقائص کے دور کرنے کی تدبیروں کو اختیار
...تعلیمی ... نشر کر رہا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ماضی میں بھی ایک قائدانہ کردار
...ہے۔ اقلیتی کردار کی منظوری کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کی خصوصی
...د ... س کے شانوں پر رکھی گئی ہے۔ یہاں کے ارباب حل وعقد نے اس
...ہ دی کو محسوس کرتے ہوئے مسلم اسکولوں اور کالجوں کے منیجر صاحبان اور
...پرنسپل صاحبان کو مدعو کیا کہ وہ یہاں آکر ان مسائل پر غور وخوض کریں اور
...تدابیر سوچیں جن سے ہم اپنے ان اداروں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنا سکیں۔ تاکہ
...یہاں سے نکلنے والے طلبا ملک میں ہونے والی ہمہ جہتی ترقیات میں اپنا رول ادا
...کر سکیں۔ آغاز کار کے لیے اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور
...ہریانہ کی ریاستوں کو منتخب کیا گیا تھا۔ تقریباً ہر ریاست کی نمائندگی ہوئی۔

اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہریانہ کے مسلم
تعلیمی اداروں کے منتظمین اور پرنسپل صاحبان کے نمائندوں کا دو روزہ جلسہ
...اگست ۱۹۸۴ء کو ساڑھے دس بجے صبح انجینئرنگ کالج کے آڈیٹوریم میں منعقد
ہوا۔ یونیورسٹی اسکولوں کے منیجر جناب پروفیسر مسعود الحسن صاحب نے مہمانوں کا
خیر مقدم کیا اور جلسے کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اداروں کے
تعلیمی مسائل اور ان کے مالی وسائل کی طرف بھی اشارے کیے اور اس بات پر
غور کرنے کی دعوت دی کہ باہمی تعاون کے کون کون سے میدان تلاش کیے جا سکتے
ہیں اور کس طرح اداری معلومات کی فراہمی کے مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر جناب عبیدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی
نے افتتاحی تقریر میں یونیورسٹی کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اگر گذشتہ صدی
کے حوصلہ شکن حالات میں سرسیّد اپنے مشن کو جاری رکھنے میں کامیاب ہو سکتے تھے
تو کوئی وجہ نہیں کہ آج ہم ہمت سے کام نہ لیں۔ آپ نے یاد دلایا کہ یونیورسٹی کے
قیام کے وقت ہی یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ یونیورسٹی کو ہندوستان کے مسلم اداروں کے الحاق
کا اختیار دیا جائے۔ اس وقت یہ تسلیم نہیں کیا گیا لیکن الحاق کے بغیر بھی یونیورسٹی
تعلیمی رہنمائی کا کام انجام دے سکتی ہے۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری شمیم شاہ صاحب نے ایک
پُر از معلومات مضمون پیش کیا جس میں گذشتہ چار سال کے اعداد وشمار کی بنیاد
پر تجربے کیے گئے تھے۔ مسلم اداروں کو جو مسائل درپیش ہیں، اس مضمون میں اُن
کی واضح نشان دہی کی گئی۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے مشیر کوکب دری صاحب نے تجزیوں کی
بنیاد پر بتایا کہ مسلمان طالب علم ریاضی اور سائنس کے مضامین میں خاص طور پر
دوسرے طالب علموں سے بہت پیچھے ہیں۔ اس نقص کو دور کیا جانا چاہیئے۔

وائس چانسلر صاحب نے اس بات کو فال نیک قرار دیا کہ کم ازکم
مسائل کے سلسلے میں احساس زیاں بیدار ہوا ہے۔ آپ نے اس بات پر زور
دیا کہ مسائل کو حل کرنے کے لیے صرف نظریاتی بحثیں کافی نہیں ہوں گی، بلکہ
جو فیصلے کیے جائیں، ان پر عمل درآمد ہو۔ موجودہ اداروں کو بہتر بنانے اور اپنا
احتساب کرتے رہنے کے ساتھ نئے اداروں کے قیام کی ضرورت ہے تاکہ شہر شہر
اور قریہ قریہ تعلیمی نظام قایم ہو جائے۔ ... ہمیں ملی وسائل سے تو کام
لینا ہی چاہیے۔ لیکن حکومت کی طرف سے جو سہولتیں مہیا ہیں، اُن سے بھی پورا
فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد تعلیمی مسائل اور انتظامی امور سے متعلق اجلاس
ہوئے۔ مختلف اداروں کے نمائندوں نے اُن مسایل کی نشاندہی کی جن سے
وہ دوچار ہیں۔ اساتذہ اور والدین کے تعاون، طلبا کو ترغیب دلانے،
تحریری کام پر زیادہ توجہ دینے، باصلاحیت اور ایثار پیشہ اساتذہ کا تقرر کیے
جانے، تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ صرف کرنے، انتظامیہ اور اساتذہ کے مناقشات
کو ختم کرنے سے متعلق بہت سے مسایل زیر بحث آئے۔

شمالی ہند (اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان،
ہریانہ) کے مسلم اداروں کے منیجر صاحبان اور پرنسپل صاحبان کی کانفرنس
کے دوسرے روز (۱۹ اگست ۱۹۸۴ء) تین اجلاس ہوئے۔ پہلا اجلاس

سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم سے متعلق، دوسرا اجلاس منصوبوں پر عمل درآمد سے متعلق اور تیسرا اجلاس تجاویزوں اور سفارشات سے متعلق تھا۔

پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر معین فاروقی نے فرمائی۔ سائنس کی تعلیم کے سلسلے میں مقررین نے مندرجہ امور پر زور دیا۔

سائنس مسلسل ترقی پذیر ہے اور ہمارا جامد نظامِ تعلیم اس کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کا ذہن پیدا کیا جائے اور اس کے فلسفے کو عام کیا جائے۔ طالب علموں میں وہ تجسس پیدا کیا جائے جو ان کو سوالات پوچھنے پر مائل کرے اور پھر مشاہدے اور تجربے کی مدد سے اپنے علم میں اضافہ کرے۔ اچھے اساتذہ کے علاوہ اچھی تجربہ گاہوں کی بھی ضرورت ہے خود اساتذہ کے علم کو تازہ رکھنے کے لیے تجدیدی و ریفریشر کورسوں کی ضرورت ہے۔ نباتات کے لیے بالخصوص فیلڈ اسٹڈی ضروری ہے۔ بعض تجربوں کے لیے اگر سلائڈیں اور فلمیں تیار کی جاسکیں تو یہ بہت مفید ہوگا۔ ہائی اسکول تک تمام نصابی تجربات پر مشتمل فلم تیار کی جائے اور اسے گشتی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ جو علاقہ وار مختلف اسکولوں میں جائے اور دو یا تین روز میں طلبا کے سامنے تمام تجربات پیش کرے۔ سائنس کی جو کتابیں شامل نصاب ہیں، ان پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کی جائے تاکہ نئی معلومات طلبا کو مہیا ہوتی رہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وقتی تجدیدی تعلیم اور ورکشاپوں کا انعقاد کرے۔ تاکہ خود اساتذہ کا علم تازہ ہوتا رہے۔ جو ادارے ایسے ہیں کہ ان میں اقامتی طلبا موجود ہیں وہاں شام میں صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ تجربہ گاہ وغیرہ کی سہولت کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اساتذہ کیا اور کس طرح پڑھاتے ہیں۔ اگر سائنس کو بھی علم تاریخ یا تمدن کی طرح پڑھایا جائے گا تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ بہتر ہوگا کہ ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو اسکولوں کی لیبارٹریوں کو دیکھے اور ان کمیوں کی طرف توجہ دلائے۔

صاحب صدر نے اپنے ارشادات میں اس طرف توجہ دلائی کہ جب تک سائنسی رویہ پیدا نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک سائنس کی تعلیم بے معنیٰ رہے گی۔ مسلمانوں کے لیے تو یہ اور بھی ضروری ہے۔ ان کو تو مذہباً جستجو، تفکر اور تعقل کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے سات سو سے زیادہ بار موجوداتِ عالم پر غور کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ کیسے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان ہی ان امور میں سب سے پسماندہ ہیں۔ اس صورتِ حال کو تبدیل ہونا چاہیے۔

دوسرا اجلاس پروفیسر بہاء الدین، پرو وائس چانسلر صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔

صاحبِ صدر نے تمہیدی کلمات میں مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے فرمایا یہ امر ہمت افزا ہے کہ گذشتہ پانچ سال میں اول درجے میں پاس ہونے والے مسلم طلبا کی تعداد میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے منظم کوشش کی ضرورت ہے۔ تعلیمی معیار پست ہونے سے روزگار کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے آپسی اور فرقہ وارانہ تصادم کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ معاملہ صرف مسلمانوں کا نہیں ہے، بلکہ قومی مسئلہ ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پورے ملک کے مسلمانوں کی ضرورت کی کفالت نہیں کر سکتی۔ جگہ جگہ اچھے اسکول قایم کرنے اور موجود اسکولوں کی حالت بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ مشترکہ مسائل کو حل کرنے کے لیے باہمی رابطہ کی ضرورت ہے اور جب تک مدد آپ نہیں کریں گے تو کوئی بھی ہماری مدد نہیں کرے گا۔

شرکائے مجلس نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بہت سے طلبا اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ صلاحیت کے نقصان سے دوچار ہو کر اسکول چھوڑ دیں، ان کو کسی نہ کسی پیشہ ورانہ تربیت سے منسلک کر دیا جائے۔ ہندی اور انگریزی ٹائپ، صنعت و حرفت کے بہت سے کام ایسے ہیں جن میں ہائی اسکول بلکہ بعض میں اس سے بھی کم تعلیم کے ساتھ طلبا مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ آفس منیجمنٹ کی تربیت کی ضرورت ہے۔ تربیت یافتہ لوگوں کی کمی ہے اور ان کی ہر جگہ مانگ ہے۔ ہائی اسکول کے بعد بہت سی سرکاری ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان ہوتے ہیں، ان میں شرکت کے لیے ترغیب دی جائے۔ اس کے لیے اسکول/کالج طلبا کو مناسب اور ضروری اطلاعات فراہم کریں۔ علی گڑھ میں ایک ایسا تحقیقاتی مرکز قایم کیا جائے جو تعلیمی مسائل کا تجزیہ کرتا رہے اور ان کے حل کی تجاویز پیش کرتا رہے۔ مسلم تعلیمی مسائل سے متعلق ایک مجلّہ کا اجرا کیا جائے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سابقہ طریقے پر تعلیمی جلسے ہر سال ملک کے مختلف مقامات پر منعقد کیے جائیں۔ علی گڑھ میں ایک ایسا تعلیمی بورڈ قایم کیا جائے جس سے یہ سب ادارے منسلک ہوں اور اس کے امتحانی مرکز مختلف مقامات پر قایم ہوں۔ ایک مرکزی مالیاتی تنظیم قایم ہو جو ضرورت مند اداروں کو مدد دے سکے۔ ہر اسکول اور کالج کے ساتھ نچلے درجے (پرائمری یا ہائی اسکول) کے اسکول قایم ہوں۔ تاکہ وہ اعلیٰ جماعتوں کے لیے طلبا مہیا کرتے رہیں۔ خاص طور پر پرائمری اسکول ضروری قایم کیے جائیں۔ اس بات کی گنجائش پیدا کی جائے کہ ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں اساتذہ کی خدمات مستعار لی جاسکیں تاکہ اگر کوئی اسکول کسی مضمون میں کمزور ہے تو اچھے اساتذہ کی خدمات سے وہ اس کمی کو دور کر سکے۔ لڑکیوں کی تعلیم پر خاص طور سے توجہ کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ مخلوط تعلیم والے اسکولوں میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ ضرورت ہو تو زنانہ اسکول قایم کیے جائیں۔

تیسرا اجلاس سیّد حامد صاحب وائس چانسلر کی صدارت میں
صاحب صدر نے تمہیداً ارشاد فرمایا کہ یہ اجتماع اور تبادلۂ خیالات وقتی
... بلکہ اسے ایک تحریک کا نقطۂ آغاز تصور کیا جانا چاہیے۔ یہاں ایسی
... منظور کی جائیں جو آگے کے لیے نشانِ منزل ثابت ہوں۔ یونیورسٹی ایک
... قائم کرے گی جو ان کے نفاذ میں مدد دے۔ اگر ہر شہر میں چند مخلص
... آگے آئیں اور اپنے عمل سے عوام کا اعتماد حاصل کر سکیں تو
... کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اپنی ضرورتوں کے لیے دوسروں کی طرف
... جائے خود پر اعتماد کرنا چاہیے۔ طلبا کے معیار کو بلند کرنے کی ہر ممکن
... جائے تاکہ وہ دوسرے اداروں میں اپنی صلاحیت کی بنیاد پر
... سکیں۔

... کانفرنس کے شرکا یہاں سے واپسی پر صرف اپنے اسکولوں /
... میں ... ان امور کا آغاز کریں بلکہ ان تصورات کی اشاعت
... دوسروں کو بھی ترغیب ہو اور پوری قوم میں بیداری ہو۔

کانفرنس کے کنوینر پروفیسر مسعود الحسن صاحب نے ان دو روزہ
... کا احاطہ کرتے ہوئے مسائل کا تجزیہ کیا۔

* * *

... یوپی، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں واقع مسلم تعلیمی
... کے منیجروں، پرنسپلوں اور ہیڈ ماسٹروں کی یہ کانفرنس منعقدہ
... اگست ۱۹۸۴ء حسبِ ذیل تجاویز منظور کرتی ہے۔

چوں کہ تعلیمی معیاروں کی بہتری اور ترقی ایک ناگزیر قومی ضرورت ہے
... یونیورسٹی کے ۱۹۸۱ء کے ترمیم شدہ ایکٹ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
... مسلمانانِ ہند کی تعلیمی اور تہذیبی ترقی کو فروغ دینے کی ذمہ داری بطور
... خصوصی کی گئی ہے۔ یہ بات بے حد ضروری ہے کہ مسلمانوں کے زیرِ انتظام
... جانے والے تعلیمی اداروں کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے موثر اقدامات
... جائیں تاکہ مندرجہ ذیل مقاصد کو بروئے کار لایا جا سکے۔

(الف) علی گڑھ میں اور دیگر علاقائی مرکزوں پر دوران
... تربیتی نصاب، تازہ کار نصابات
... تربیتی کارگاہوں Training Centre کے وسیلے سے معلمین کی پیشہ ورانہ
... صلاحیتوں کو جلا دینا اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانا۔

(ب) مسلمان طلبا کی تعلیمی اور روزگار سے متعلق امور
... رہنمائی و تربیت کے کام میں اداروں کا ہاتھ بٹانا۔

یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ ایک مسلسل اور دیرپا انداز میں مذکورہ بالا
مقاصد کے حصول کی سعی کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک خصوصی شعبہ
قائم کیا جائے۔ نیز یہ کہ اس شعبے کی معاونت کے لیے ایک ایسی مشاورتی کمیٹی
تشکیل دی جائے جو یونیورسٹی کے کل ہند کردار کی آئینہ دار ہو۔

یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا شعبے کے قیام اور کاموں کے
لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بجٹ میں ضروری بندوبست کی درخواست
کی جائے۔

۲۔ یہ کانفرنس سفارش
کرتی ہے کہ تعلیمی کاموں میں سرپرستوں کے تعاون اور دلچسپی کو یقینی بنانے
کے لیے ہر اسکول اور کالج میں سرپرست استاد انجمنیں
قائم کی جائیں۔

۳۔ یہ کانفرنس مسلم اسکولوں اور کالجوں سے سفارش کرتی
ہے کہ اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ ابتدائی تعلیم ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی منازل
کے لیے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر مسلم اسکول اور کالج کے پاس حتی الامکان
اپنا ذاتی پرائمری اسکول ہونا چاہیے۔ تاکہ یہ پرائمری اسکول اُن کے لیے سرچشمے
[Feeder] کا کام انجام دے سکے

۴۔ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں ایک
کمیٹی سائنس کی تعلیم کے لیے اور دوسری روزگاری نصابات
کے لیے تشکیل دی جائے تاکہ مندرجہ ذیل مقاصد حاصل ہو سکیں۔

(الف) مسلم تعلیمی اداروں میں سائنس کی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانا

(ب) تدریسی عمل میں معاونت کرنے والے سمعی و بصری ساز و سامان

ج روزگاری اور پیشہ ورانہ نصابات کے سلسلے میں ان اداروں
کی رہنمائی کرنا۔

یہ بھی سفارش کی جاتی ہے کہ وائس چانسلر صاحب براہ کرم ان کمیٹیوں
کی تشکیل کے لیے ضروری اقدامات فرمائیں۔

۵۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے مسلمانوں میں
باصلاحیت طلبا کی تلاش اور ان کی امداد کے سلسلے میں جو منصوبہ حکومت ہند
کی وزارت داخلہ کو پیش کیا ہے۔ یہ کانفرنس اس کے مقاصد سے اتفاق کرتی
ہے۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں سے درخواست کی
جاتی ہے کہ مذکورہ بالا اسکیم کے تحت قبل میٹرک اور بعد میٹرک سطحوں کے لیے
جو وظائف تجویز کیے گیے ہیں ان کو منظوری دے کر ہونہار مسلم طلبا کے تعلیمی
مصارف کی کفالت کی جائے۔ اس طرح مسلمان طلبا کو مقابلے کے مختلف امتحانات
کے لیے تیار کرنے کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔

۶۔ یہ کانفرنس متعلقہ ریاستی سرکاروں سے مطالبہ کرتی ہے

کہ وہ تمام ادارے جن کے انتظام و انصرام میں مسلمان غالب طور پر دخیل ہیں "اقلیتی ادارے" قرار دیے جائیں۔

اس سلسلے میں ان اداروں کے حق میں بالخصوص جلد از جلد منظوری کا اعلان کیا جائے جن کی درخواستیں کئی سالوں سے ریاستی حکومت کے زیرِ غور ہیں۔

۷۔ یہ کانفرنس پرزور سفارش کرتی ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم نسواں کے فروغ پر خصوصی توجہ دی جائے۔ مسلمانوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ گرلز اسکولوں اور کالجوں کے منصوبے مرتب کریں اور انھیں عملی جامہ پہنائیں۔

۸۔ یہ کانفرنس تمام متعلقہ افراد سے اپیل کرتی ہے کہ مسلم تعلیمی اداروں کے خصوصی مذہبی، لسانی اور تہذیبی کردار کو استحکام بخشنے کے لیے ضروری اقدامات کریں جن میں فطری طور پر اردو زبان کی تدریس اور اخلاقی و مذہبی تعلیم بطور خاص شامل ہے۔

یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ مختلف تعلیمی سطحوں پر مثلاً پرائمری، جونیئر ہائی اسکول اور ہائی اسکول کی جماعتوں میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے ممکنہ کوشش اور اقدامات کیے جائیں۔ بالخصوص اترپردیش میں اس کے لیے زمین ہموار کی جائے

۹۔ یہ کانفرنس تمام مسلم اداروں سے سفارش کرتی ہے کہ وہ اپنے تمام مسلمان طلبا کے لیے دینیات کی تعلیم اور امتحان کا بندوبست کریں۔ غیر مسلم طلبا بہر طور دینیات کی تعلیم سے مستثنیٰ ہوں گے۔ البتہ ان کے لیے ہندوستان کی تہذیب کا مطالعہ یا کوئی دوسرا متبادل نصاب تجویز کیا جا سکتا ہے

۱۰۔ پری پرائمری اور پرائمری تعلیم کی دور رس اہمیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس سطح پر تربیت یافتہ استادوں اور استانیوں کی شدید قلت ہے۔ یہ کانفرنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے درخواست کرتی ہے کہ نرسری ٹیچرز ٹریننگ کے لیے جتنی جلد ممکن ہو سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسوں کا آغاز کیا جائے۔

۱۱۔ کانفرنس کا خیال ہے کہ ملک بھر میں مسلمانوں کے زیرِ انتظام تمام تعلیمی اداروں کے بامقصد ارتقاء کے لیے یہ بات بہت مناسب ہوگی کہ مسلمانوں کی ہائی اسکول اور ہائر سیکنڈری تعلیم کا کام ایک آزادانہ مرکزی بورڈ کی نگرانی میں دے دیا جائے جس کی اس مقصد کے لیے بطورِ خاص تشکیل کی گئی ہو۔

یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مجوزہ بورڈ کے فرائض ادا کرنے کے سلسلے میں کانفرنس کی درخواست پر ہمدردانہ غور کرے۔

۱۲۔ یہ کانفرنس کنوینر صاحب کو کانفرنس کی رپورٹ کو ترتیب دینے اور مذکورہ بالا تجاویز کے سلسلے میں ضروری اقدامات کرنے کے لیے پوری طرح مجاز قرار دیتی ہے۔

خود فریبی

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی؟
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

علامہ اقبال

—x—x—x—x—x—x—x—

کیوں

مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک

علامہ اقبال

ترقّی اُردو بیورو کی سرگرمیاں

چند اہم منصوبے

اردو انسائیکلو پیڈیا اور مختلف لُغات کی تیاری اور اشاعت، ترقی اُردو بیورو کے اہم منصوبوں میں سے ہے۔

۱۔ **اردو انسائیکلوپیڈیا** (۱۲ جلدیں تیار) ۴ جلدیں زیرِ نظرِ ثانی

۲۔ **انگریزی اردو لغت** (۵ جلدیں تیار) پہلی جلد زیرِ اشاعت

۳۔ **اردو اردو لغت** (۵ جلدیں تیار) زیرِ نظرِ ثانی

۴۔ **اردو اردو لغت برائے طلبا** (ایک جلد تیار) کتابت زیرِ تصحیح

۵۔ **فرہنگ سیاسیات** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

۶۔ **فرہنگ ادبی اصطلاحات** (ایک جلد) پریس میں ہے

اصطلاحات سازی

۱۸ شعبوں میں تقریباً ۱۲۲۰۰۰ اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں۔

۱۔ **فرہنگ اصطلاحات کیمیا** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

۲۔ **فرہنگ اصطلاحات انسانیات** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

۳۔ **فرہنگ اصطلاحات معاشیات** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

۴۔ **فرہنگ اصطلاحات حیوانیات** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

لسانیات، جغرافیہ، نباتات اور تاریخ و سیاسیات کی فرہنگوں کا کام مکمل ہو گیا ہے۔

چند نئے منصوبے

۱۔ اُردو کتابوں کی ببلیوگرافی

(چھاپہ خانے کی ایجاد سے لیکر ۱۹۴۷ء تک)

ملک کی اہم لائبریریوں میں کام کیا جائیگا۔ فی الحال
مولانا آزاد لائبریری
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کام جاری ہے۔
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام عنقریب شروع کیا جائے گا۔

۲۔ اُردو اداروں کی ڈائریکٹری

ترقی اردو بیورو اور ملک کی تمام اردو اکیڈمیوں کی ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی ہے اور باہمی تعاون سے یہ ڈائریکٹری مرتب کی جا رہی ہے۔ اسی طرح کئی اور اہم کام کیے جا رہے ہیں۔

کتابت اور خطاطی کے تربیتی مراکز

اب تک ۲۰ تربیتی مراکز ملک کے مختلف حصوں میں قائم کیے گیے ہیں۔ ان میں دو مراکز اعلا فنِ خطاطی کی تربیت اور تین مراکز بطور خاص خواتین کے لیے ہیں۔ جلد ہی ایسے اور مراکز بھی قائم کیے جائیں گے

اردو ٹائپ رائٹر اور طباعتی کمپیوٹر

ترقی اردو بیورو نے ملک میں مقامی طور پر اردو ٹائپ رائٹر کی تیاری کے سلسلے میں بھی کام کیا ہے۔ چنانچہ اب اردو ٹائپ رائٹر ہندستان ہی میں تیار ہو رہے ہیں اور آسانی سے دستیاب ہیں۔ اسی طرح طباعتی کمپیوٹر کی تیاری کے سلسلے میں بھی کوششیں جاری ہیں۔

کچھ اور نئے پروگرام

۱۔ مراسلتی کورس :۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو سیکھنے کے خواہشمندوں کے لیے انگریزی اور ہندی ذریعہ تعلیم سے اُردو سکھانے کا مراسلتی کورس جلد ہی شروع کر دیا جائے گا۔ ابتدائی کام مکمل کیا جا رہا ہے۔

۲۔ تحقیقی رسالہ کی اشاعت :۔ ترقی اردو بیورو کی سرگرمیوں کے سہ ماہی ترجمان "اردو دنیا" کے علاوہ ایک ششماہی معیاری تحقیقی رسالہ بھی جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ ابتدائی تیاریاں جاری ہیں۔

مطبوعات کی نمائش اور فروخت

ترقی اردو بیورو، ملک کے مختلف اردو مراکز میں ہر سال اپنی کتابوں کی نمائش اور فروخت کا انتظام بھی کرتا ہے۔ پچھلے سال بیورو نے دہلی، بھوپال، مدراس اور کلکتہ جیسے اہم مقامات پر اپنی کتابوں کی نمائش لگائی تھی۔ گذشتہ مالی سال کے دوران ۳۱۱۴۵ روپے کی مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس طرح اب تک کل ۱۰٬۰۶۵۶ روپے مالیت کی کتابیں فروخت ہوئی ہیں۔

بچوں کا ادب

ترقی اردو بیورو اردو میں بچوں کی اچھی اور معیاری کتابوں کی تیاری اور اشاعت کے سلسلے میں بھی کوشاں ہے اب تک اس طرح کی اڑسٹھ (۶۸) کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

طبّی کتابیں

طب یونانی کی عام ضرورتوں کے علاوہ نصابی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کئی کتابیں لکھائی جا رہی ہیں۔ اب تک دس (۱۰) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

علمی، ادبی، سائنسی اور تکنیکی کتابیں

مختلف علوم و فنون سے متعلق اب تک ۴۵۵ کتابیں شائع کی ہیں ان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جو اپنے موضوع پر اوّلین تصانیف ہیں اور کئی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں گزشتہ مالی سال کے دوران مختلف علوم و فنون سے متعلق ۴۰ کتابیں شائع ہوئی ہیں جو از خود ایک ریکارڈ اشاعت ہے۔

یہ کتابیں مختلف ریاستوں میں کسی بھی بک سیلر سے خریدی جاسکتی ہیں براہ راست بیورو سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں

تفصیلات کے لیے ذیل کے پتہ پر لکھیں

شعبۂ فروخت و نمائش
ترقی اُردو بیورو
ویسٹ بلاک ۸، آر، کے۔ پورم، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۶

DAVP [illegible]

تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ

فون :
۳۶۰۹
۴۱۹۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۳۰ - ۸۴/ ۸۵ -

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱- فورمین۔ (ایک) (مستقل)۔ ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینرنگ (ورکشاپ)
شرح تنخواہ:- ۶۵۰- ۳۰- ۷۴۰- ۳۵- ۸۸۰- ای بی ۴۰- ۹۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز
قابلیت:- مکینکل انجینرنگ میں ڈپلوما اور موزوں میدان میں دس سالہ تجربہ

۲- انسٹرکٹر: (تین) (مستقل)۔ ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینرنگ (ورکشاپ)
شرح تنخواہ:- ۴۴۰- ۱۵- ۵۱۵- ای بی- ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ۷۰۰- ای بی- ۲۵- ۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنسز
قابلیت:- مکینکل انجینرنگ میں ڈپلوما اور موزوں میدان میں آٹھ سالہ تجربہ۔

۳- جونیئر انسٹرومنٹ مکینک (فٹر) (ایک)۔ (مستقل)۔ ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینرنگ (ورکشاپ)
شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۶۰- ای بی ۲۰- ۶۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:- ٹریڈ سرٹیفکٹ اور موزوں میدان میں کم از کم پانچ سالہ تجربہ

یا

خواندہ اور موزوں میدان میں دس سالہ تجربہ

۴- جونیئر انسٹرومنٹ مکینک (مولڈر)۔ (ایک)۔ (مستقل)۔ ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینرنگ (ورکشاپ)
شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۶۰- ای بی- ۲۰- ۶۴۰- روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:- ٹریڈ سرٹیفکٹ اور موزوں میدان میں کم از کم پانچ سالہ تجربہ۔

یا

خواندہ اور موزوں میدان میں دس سالہ تجربہ۔

۵- جونیئر انسٹرومنٹ مکینک (کارپینٹر)۔ (ایک) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینرنگ (ورکشاپ)
شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۶۰- ای بی ۲۰- ۶۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

لیاقت:- ٹریڈ سرٹیفکٹ اور موزوں میدان میں کم از کم پانچ سال تجربہ

یا

خواندہ اور موزوں میدان میں دس سال تجربہ

۲- جونیر انسٹرومنٹ مکینک (ہیڈ مکینک) (ایک) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینئرنگ (ورکشاپ)
شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۶۰-ای بی-۲۰-۶۴۰-روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:- ٹریڈ سرٹیفکٹ اور موزوں میدان میں کم از کم پانچ سال تجربہ

یا

خواندہ اور موزوں میدان میں دس سال تجربہ

۳- جونیر انسٹرومنٹ مکینک (مل رائٹ فٹر)-(ایک)-(مستقل) ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینئرنگ (ورکشاپ)
شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۶۰-ای بی ۲۰-۶۴۰روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:- ٹریڈ سرٹیفکٹ اور موزوں میدان میں کم از کم پانچ سال تجربہ

یا

خواندہ اور موزوں میدان میں دس سال تجربہ

غیر معمولی لیاقت اور تجربہ رکھنے والے امیدواروں کو زیادہ ابتدائی تنخواہ دی جا سکتی ہے
انٹرویو میں شریک ہونے والے امیدواروں کو صرف ایک طرف کے دوسرے درجے کے ریلوے کرایے
کے مساوی ان کے سفری بھتے کے طور پر (ٹی-اے) دیا جائے گا

مقررہ فارم درخواست بمع ہدایات ۵/ روپے برائے اسامی نمبر ۱ اور ۳ روپے بقیہ اسامیوں
کے لیے نقد (جو فنانس آفس کے کیش سیکشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جمع شدہ ہو)
ادا کرکے یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے نام
واجب الادا کے نام واجب الادا ہو، اسسٹنٹ رجسٹرار سلیکشن کمیٹی (رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی، علی گڑھ سے بذات خود یا ۲۳ × ۱۰ سینٹی میٹر کا اپنا پتہ لکھا اور ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ
بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۴ء ہے (دفتری اوقات میں)
نامکمل اور دیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل غور تصور نہ کی جائیں گی۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈر ریسنٹیج کی بنیاد پر طلب کیے جاتے ہیں جو کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۴ء کو ایک بجے دوپہر تک وصول ہو جانا چاہیں۔ ٹینڈرز اسی روز شام ساڑھے تین بجے تک کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر سے متعلق تمام کاغذات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے کسی بھی روز آفس ٹائم میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ٹینڈرز کے فارموں کی فروخت ٹینڈر جمع کیے جانے کی مجوزہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے پیشتر بند کر دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	ایس۔ایس ہال کی باونڈری کی دیوار کو اونچا اٹھانا	۲۳,۳۰۰/ روپے	۵۸۵ روپے	۵/- روپے	تین ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈر ریسنٹیج کی بنیاد پر طلب کیے جاتے ہیں جو کہ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۴ء ایک بجے دوپہر تک وصول ہو جانا چاہئیں۔ ٹینڈرز اسی روز ساڑھے تین بجے شام تک کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر سے متعلق تمام کاغذات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے کسی بھی روز آفس ٹائم میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ٹینڈر فارموں کی فروخت ٹینڈر وصول ہونے کی مجوزہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کر دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱۔	پی/ایف روڈ سائنس اور نیم بورڈز ۱۰۰ عدد یونیورسٹی کے احاطے میں بنانا	۳۸,۰۰۰/- روپے	۹۵۰/- روپے	۵/- روپے	تین ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

[یونیورسٹی انجینئر]

کیا

آپ کی روزانہ کی خوراک سے آپ کے بدن کو پوری قوت اور پورا فائدہ ملتا ہے؟

اپنی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزاء کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ[14] جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اس مرکب سے آپ کے نظامِ ہاضمہ کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔

سنکارا

ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک

ہمدرد

تہذیب الاخلاق

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

مدیر: سید حامد　　مدیر مسئول: نورالحسن نقوی

جلد: ۳　　یکم تا ۱۵- اکتوبر ۱۹۸۴ء　　شمارہ: ۱۹

مندرجات

سرورق پر: روضۂ امام حسین علیہ السلام

۱۶ر اکتوبر ۱۹۸۴ء سے
فی شمارہ: ڈیڑھ روپیہ
زرسالانہ: تیس روپے

ترسیل زر کا پتہ:
پروفیسر منظر عباس نقوی - ٹرزرار
تہذیب الاخلاق ٹرسٹ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

معرکۂ حق و باطل

موسیٰ و فرعون و شبّیرؑ و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوتِ شبّیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم، — چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطعِ استبداد کرد — موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد
بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
سرِّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود — یعنی آں اجمال را تفصیل بود
ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد — ملّتِ خوابیدہ را بیدار کرد
تیغِ لا چوں از میاں بیروں کشید — از رگِ اربابِ باطل خوں کشید

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

— علّامہ اقبال: رموزِ بے خودی

موسیٰ و فرعون اور شبیر و یزید حق و باطل کی دو قوتیں ہیں۔ حسینؑ کی قوتِ بازو سے حق کی فتح اور باطل کی شکست ہوئی۔ جب خلافت نے قرآن سے رشتہ توڑ لیا اور حریت خاک میں مل گئی تو حسینؑ بادل کی طرح اٹھا اور میدانِ کربلا پر برس کے اسے گلزار بنا گیا۔ اس نے قیامت تک کے لیے استبداد ملوکیت کا خاتمہ کر دیا اور اپنے خون سے ایک چمن کھلا دیا۔ اس نے حق و صداقت کی راہ میں سر کٹا کے واضح کر دیا کہ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی قربانی ایک اجمال تھی جس کی تفصیل حسینؑ نے میدانِ کربلا میں پیش کر دی اور ثابت کر دیا کہ مسلمان اللہ کے سوا کسی کا غلام نہیں اور کسی فرعون کے آگے اس کا سر نہیں جھک سکتا۔ اس پیغام نے ملّتِ خوابیدہ کو بیدار کر دیا۔ جب اس نے اپنی نیام سے 'لا' کی تلوار نکالی تو اربابِ باطل کی رگوں سے خون نچوڑ لیا اور ریگ زار پر الا اللہ تحریر کر دیا کہ یہی ہماری نجات کا کلمہ ہے۔

میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

سانحۂ کربلا انسانی تاریخ کا ایک ایسا دردانگیز واقعہ ہے جس کی یاد ماہ محرم کے عشرۂ اول میں دنیا کے ہر گوشے میں ان گنت آنکھوں کو اشکبار کر دیتی ہے۔ مسلمان چاہے کسی بھی مسلک اور فرقے سے تعلق رکھتے ہوں شہادت امام حسینؑ پر سوگوار ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعہ اسلامی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اور اس کا مستحق ہے کہ ہم محض کچھ رسوم کی ادائیگی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس کے اخلاقی مضمرات پر غور کریں اور اس کی روشنی میں اپنے عمل و کردار کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

جوش ملیح آبادی نے کہا تھا کہ "ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ" اس کا مطلب یہی ہے کہ امام حسین نے میدان کربلا میں ۱۰ محرم ۶۱ھ کو جو عظیم قربانی پیش کی وہ تمام دنیائے انسانیت کے لیے کتنے ہی اخلاقی سبق اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ حسین اور یزید آج نیکی اور بدی کی دو علامتیں قرار پاتے ہیں۔ یہ جنگ صرف دو افراد کی جنگ نہیں تھی بلکہ حق و باطل کا معرکہ تھا، مادیت اور روحانیت کی آویزش تھی۔ ایک طرف حسین تھے جو روحانیت کے علمبردار تھے دوسری طرف فوج یزید تھی جس کے پیش نظر صرف مادی فوائد تھے۔ حسین نے مادی فوائد کو پس پشت ڈال کر بیعتِ یزید سے انکار کر دیا اور اس انکار پر اس استقلال، اور ثابت قدمی سے قائم رہے کہ اپنے پورے خاندان کی تباہی منظور کر لی لیکن ایک باطل قوت کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ حق کی یہ پاسداری اور باطل سے انکار، حسینؑ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسی استقامت بالحق کو اصطلاحی زبان میں ایمان اور یقین کہا جاتا ہے جو روحِ اسلام ہے شاید اسی بنا پر مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا :

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کوئی فرد ہو یا کوئی جماعت اس کے کردار کی عظمت اس میں ہے کہ وہ حق کی راہ میں ثابت قدم رہے اور آلام و مصائب کے ہجوم میں اپنے اصول سے انحراف نہ کرے حسینؑ نے یہ سبق اپنے نانا سے سیکھا تھا جنھوں نے کفار مکہ کے تمام تر شدائد اور ترغیبات کے مقابلے میں یہ اعلان فرما دیا تھا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ دیا جائے تو بھی مجھے اعلانِ کلمۃ الحق سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔

علامہ اقبال نے امام حسینؑ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "اہل حق حریت آموز از حسینؑ" حریت کے معنی ہیں کہ انسان اپنے ضمیر کے فیصلے پر قائم رہے۔ اس راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ بڑی رکاوٹ خود انسانی زندگی ہے جس کے تحفظ و بقا کے لیے انسان اپنے ضمیر کی آواز کو اکثر پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اور پھر اگر اولاد اور اعزہ کی جان کو خطرہ بھی درپیش ہو تو عام حالات میں ثابت قدم رہنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ میدان کربلا میں امام حسین کے سامنے یہ سب رکاوٹیں تھیں۔ خیموں میں بیبیاں تھیں، ساتھ میں بچے تھے، بھائی تھے، بھانجے تھے بھتیجے تھے، بچپن کے دوست تھے۔ اگر حسینؑ کے پائے استقلال میں ذرا بھی جنبش آجاتی تو وہ بیعتِ یزید کر کے ان سب کی جان بچا سکتے تھے۔ شب عاشور انھیں غور و فکر اور فیصلہ کرنے کی مہلت بھی ملی لیکن وہ اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہے۔ اور ان تمام شدائد کو برداشت کرنا قبول کیا جن کے تصور سے بھی انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ اس طرح حسینؑ نے یہ بتلا دیا۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ (اقبال)

واقعۂ کربلا سے ایک زبردست اخلاقی سبق ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ کسی جماعت کے پاس چاہے کتنا بھی بلند مقصد کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ جماعتی تنظیم سے محروم ہے یعنی اس میں وحدتِ خیال اور وحدتِ عمل نہیں تو اسے کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک خیال پر قائم بھی ہو

تو ضروری نہیں کہ اسے سب ساتھی بھی ایسے مل جائیں جو ہر منزل تک اس کا ساتھ دے سکیں۔ کربلا کے میدان میں امام حسینؑ کے ساتھ ہر عمر کے افراد تھے۔ بوڑھے بھی تھے جن میں بالعموم مصلحت اندیشی کی فراوانی اور جوش کی کمی ہوتی ہے۔ نوجوان بھی تھے جو بہت جلد جذباتی ہو جاتے ہیں۔ بچے بھی تھے جو اکثر مشکل بنتے پر پریشانی کا باعث بنتے ہیں، عورتیں بھی تھیں جن کا اضطراب اکثر و بیشتر مردوں کے قوت عمل کو متزلزل کر دیتا ہے۔ لیکن کربلا کے میدان میں یہ سب امام حسین سے ایسے وابستہ اور متفق الخیال تھے کہ اختلاف رائے یا عدول حکمی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ جماعتی تنظیم اور یہ ڈسپلن ہمارے لیے ایک سبق ہے۔

اس واقعے کا ایک بڑا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ امام حسین آخر وقت تک امن پسندی کی راہ پر گامزن رہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم یہی ہے کہ تم بلاوجہ کسی سے برسرپیکار نہ ہو، کبھی فتنہ و فساد کا باعث نہ بنو مگر ہاں یہ ضروری ہے کہ تمھارے عمل سے باطل کی حمایت نہ ہو اور حق پامال نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے کبھی قیام ضروری ہوتا ہے اور کبھی اقدام۔ حسین نے یہ سبق بھی اپنے نانا ہی سے سیکھا تھا جنھوں نے صرف امن پسندی کی خاطر ایک موقعے پر کفارِ مکہ سے ایسی شرائط پر صلح کر لی تھی جو خود ان کی جماعت کے لیے ناپسندیدہ تھیں۔ امام حسینؑ سے پہلے ان کے بھائی امام حسنؑ نے بھی اسی صلح پسندی کا مظاہرہ کیا تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے ایک جگہ کہا ہے ۔۔

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم　　حافظِ جمعیتِ خیر الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں　　پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں

یہ سمجھنا درست نہیں کہ امام حسین کا طرزِ عمل اپنے برادرِ بزرگ کے عمل سے کسی طرح مختلف تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ امام حسینؑ بھی آخر دم تک فوجِ یزید کے سردار سے صلح کی گفتگو فرماتے رہے۔ آپ نے چھٹی یا ساتویں محرم کو عمرو بن قرظہ بن کعب انصاری کو عمر بن سعد کے پاس بھیجا کہ آج شب مجھ سے دونوں لشکروں کے درمیان مل لینا۔ چنانچہ تاریکیٔ شب میں اس ملاقات کا انتظام کیا گیا جس کی تفاصیل صیغۂ راز میں رہیں البتہ تاریخ میں وہ شرائط موجود ہیں جو امام حسین نے بنیاد صلح کے لیے پیش کیں۔ امام حسینؑ اس پر آمادہ تھے کہ وہ عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دیں گے اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو ملک عرب کو چھوڑ کر کسی دور دراز مقام پر چلے جائیں گے۔ (طبری)۔ یہ پیش کش ظاہر کر رہی ہے کہ وہ پوری طرح اس بات کے کوشاں تھے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ اسی طرح صبح عاشور جو خطبہ امام حسین نے فوجِ یزید کے سامنے دیا اس میں اس کی پوری کوشش کی کہ خوں ریزی نہ ہو اور عملاً بھی اپنے ساتھیوں کو ہر منزل پر جنگ میں پہل کرنے سے باز رکھا۔ منزل شرافِ پر امام حسین کا فوجِ دشمن کو جو حر کی سربراہی میں مزاحم راہ ہوئی تھی سیراب کرنا ان کی انسان دوستی اور امن پسندی کا ثبوت ہے۔

امام حسین کے کردار کی سب سے اہم صفت صبر ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق

مصیبت کا ہنگامی طور پر سامنا ہو جائے تو انسان کو وہ مصیبت بہر طور برداشت کرنی ہی پڑتی ہے لیکن یہ حقیقی صبر نہیں۔ البتہ مصیبتوں کا ہنستے ہوئے استقبال کرنا اور "موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا" ایسی صورت میں یقیناً صبر ہے۔ اس صبر کا مظاہرہ میدان کربلا میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ حسینؑ تو پھر حسینؑ تھے۔ پروردۂ آغوشِ رسول اور جگر گوشۂ علیؑ و بتولؑ ہیں کربلا کے میدان میں ایسے افراد بھی دکھائی دیتے ہیں جنھیں دینی تعلق کے سوا خاندانِ رسالت سے کوئی نسبی تعلق نہیں تھا لیکن انھوں نے صبر کا وہ مظاہرہ کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ شہدائے کربلا میں ایک جنادہ بن کعب خزرجی تھے۔ جب وہ جامِ شہادت نوش کر چکے تو ان کا بیٹا عمر بن جنادہ خدمتِ امام میں حاضر ہو کر طالبِ اذن ہوا۔ امام نے اپنے اصحاب کی طرف رخ کر کے فرمایا ابھی تو اس کا باپ قتل ہو چکا ہے اگر یہ بھی قتل ہو گیا تو اس کی ماں کے دل پر کیا گزرے گی (یہ پیشِ نظر رہے کہ اس کی ماں اہل بیت اطہار کے ساتھ خیمے میں موجود تھی) نو برس کے اس بچے نے امام کو جواب دیا "آقا، میری ماں نے ہی تو مجھے بھیجا ہے اور یہ لباسِ جنگ میری ماں نے ہی تو پہنایا ہے۔" غرض بچہ میدانِ جنگ میں گیا، لڑا اور قتل ہو گیا۔ کسی بے رحم نے اس کا سر کاٹ کے حسینی خیموں کی طرف پھینک دیا۔ شیر دل ماں نے بچے کا سر اٹھا لیا اور کہا شاباش بیٹا شاباش۔ تو نے امام پر نثار ہو کر میرا دل خوش کر دیا اور آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی۔ پھر بیٹے کے سر کو فوجِ دشمن کی طرف یہ کہہ کر پھینک دیا کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جائے وہ واپس نہیں لیا جاتا۔ یہ ہے صبر!

حق و باطل کی آویزش آج بھی جاری ہے اور جاری رہے گی لیکن حسین نے میدان کربلا میں حق کی پاسداری کا جو مظاہرہ کیا وہ بنی نوع انسان کے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنا رہے گا۔ بقول علامہ اقبال ؎ حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

نور الحسن نقوی

خوشہ چیں

آرڈی اسٹیٹ

چیڑ کے دیودار کے پیڑ اور بادل اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں، دیودار ہر گھڑی، بادل کبھی کبھی۔ سورج نیزے تانے ہوئے آتا ہے، بادل پھٹ جاتے ہیں۔ لیکن فاتح کے سامنے نہ پیڑوں کا سر جھکتا نہ شکست سرنگوں ہوتی ہے۔ چیڑ کے پیڑ دھوپ میں مسکراتے ہیں، ایک پُروقار مسکراہٹ۔ سورج سے کہتے ہیں کہ "تم خود کو فاتح سمجھو، ہم تمھیں خادم جانتے ہیں۔ تم اس کے لیے مامور ہو کہ ہمیں غذا پہنچاؤ، ہماری سرسبزی اور شادابی کا سامان کرو۔ روز دس بارہ گھنٹے یہ خدمت انجام دو۔ وہ بھی اگر بادل راستہ نہ روکیں، اور پھر غائب ہو جاؤ۔ اب چاندنی ہے وہ لوری دے کر ہمیں سُلاتی ہے۔ تم ہو یا نہ ہو۔ دن نکلے یا نہ نکلے۔ ہم اسی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں۔ ہم ہوا میں نہیں ہیں ہماری جڑیں زمین میں ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تمھیں ہمیں کھلا رہے ہو۔ ہماری رونق تمھارے ہی دم سے ہے۔ جڑوں کو بھول گئے کہ بغیر کچھ کہے، بغیر احسان جتائے بنا نہ صرف ہمیں غذا دیتی ہیں بلکہ قد و قامت استواری بھی۔ انھیں کی وجہ سے ہم سرو قد کھڑے ہوئے ہیں۔"

سورج کے مزاج میں گرمی ہے۔ بھلا وہ گستاخی کیوں برداشت کر لیتا۔ تلملا کر بولا کہ "تم کیا اور تمھاری بساط کیا۔ جس زمین پر تمھاری جڑیں ہیں، جس ارض پر تمھیں اتنا ناز ہے، وہ خود مجھ پر فدا ہے۔ دن رات میرا طواف کرتی ہے۔ طواف کرتے ہوئے کہتی ہے 'میں بھکارن ہوں اور داتا ہو۔ میں پجارن ہوں تم دیوتا ہو۔ خدا کے واسطے مجھے گرمی اور روشنی کی بھیک دے دو۔ یہ بھیک نہ ملی تو میں بانجھ ہو جاؤں گی، زمہریر مت ٹھنڈی اور تاریک'، اور میں جب ترس کھا کر اس کی جھولی میں گرمی اور روشنی ڈال دیتا ہوں تو وہ خوشی اور اتراہٹ میں تھرک تھرک کر اپنی دھری پر ناچنے لگتی ہے، لیکن اس وقت بھی میرا طواف کرنا نہیں بھولتی۔ سمجھ لو، چیڑ کے گھمنڈی اور سرکش پیڑو کہ جس دھرتی کی کوکھ سے تم نکلے ہو، تمھیں ہر گھڑی سنبھالے رکھتی ہے، جس پر تم اتنا اتراتے ہو وہ تمھارے در کی سوالی ہے۔ اربوں سال ہو گئے، جب تمھارا کہیں وجود نہ تھا، میں نے تمھاری مایۂ ناز دھرتی کو اپنے بدن سے اس طرح جدا کر دیا تھا جیسے سانپ کینچلی کو اتار پھینکتا ہے۔ کینچلی سانپ کے زہر کو پیچھے چھوڑ آتی ہے۔ اپنی زمین کو دیکھو کہ ہم سے الگ ہو کر۔ جانے کہاں سے زہر لے آئی اور اسے اپنے جگر میں پیوست کر لیا۔ تم تو خیر اس کے زہر سے بچے رہے لیکن یہ زہر اس کے لختِ جگر انسان کی رگ رگ میں سما گیا۔ تم سر اٹھا کر آسمان سے باتیں کرتے رہتے ہو، تمھیں کیا خبر کہ اس بونے آدمی کے افکار و اقوال کتنے رس بھرے ہوتے ہیں۔ وہی بونا جو تمھاری جڑ پر کلہاڑی اور تمھارے سینہ پر آرا چلاتا ہے۔" چیڑ کے پیڑ نے کہا "بس بس، تم بھی فتنہ اٹھانے لگے۔ ہم میں اور انسان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔"

چیڑ کے ساتھ سورج کی بحث، دیودار، ترائی اور باغیچہ اوک کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ ایک آواز ہو کر بولے "مباہات و مباحثات بند کیجیے۔ اختلافات ختم کیجیے اور اگر لڑنا جھگڑنا اتنا ہی ضروری ہے تو میدانوں میں اتر جائیے۔ پہاڑوں کو آلودہ مت کیجیے کہ پہاڑ سکون، یکسوئی، عافیت امن، سلامتی اور صلح آشتی کے لیے ہیں۔ شہروں اور میدانوں کی آلودگی اور زہر، نفرت، بغض اور عداوت کو یہاں نہ آنے دیجیے۔ آلودگی اگر یہاں تک پہنچ گئی تو چرند، شجر، حیوان، بشر سب کے جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔"

یہ گوشۂ عافیت، یہ خطۂ حسن، یہ پیکرِ انبساط، یہ دارالامان، جسے "آرڈی اسٹیٹ" کہتے ہیں، رانی کھیت کے ایک گوشہ میں آرمیدہ ہے۔ یوں ہے کہ ایک انگریز کی نظرِ انتخاب جس کا نام "آرڈی" تھا اس پر پڑی۔ اس کے حسین چہرہ کے خد و خال، اس کے ہوشربا جسم کے نشیب و فراز اسے بھا گئے۔ وہ حسنِ فطرت کی جستجو میں نکلا تھا۔ اسی تلاش میں سرگرداں تھا۔ یہاں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ زمین نے قدم پکڑ لیے۔ پیڑوں نے اسیر کر لیا۔ سبزۂ خوابیدہ نے بیدار ہو کر آنکھیں بچھا دیں۔ "آرڈی" کی زباں سے بے ساختہ نکلا:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

محبت اور وہ بھی پہلی نظر میں۔ رختِ سفر کھول دیا۔ اور یہیں کا ہو گیا۔ حسنِ فطرت کی نوک پلک درست کرنے میں لگ گیا۔ اور ایک دن وہ آیا کہ اس نے تہذیب و تخلیق کی طغیانی میں بیابان و کہسار و راغ کے خالق سے اس طرح خطاب کر ڈالا

کارے کہ حسینؑ اختیارے کردی
در گلشنِ مصطفیؐ بہارے کردی

از ہیچ پیمبراں نیامد ایں کار
واللہ حسینؑ کارے کردی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

"خیابان و گلزار و باغ آفریدم
نقشِ اول تیرا، نقشِ ثانی میرا"۔ ظالم اور جاہل، ناداں اور مغرور انسان حسن شناس اور حسن آفریں بھی ہے۔ چنانچہ آرڈی صاحب نے قدرتی اُتار چڑھاؤ کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے، مختلف سطحوں پر دو بنگلے اور باورچی خانے اور شاگرد پیشے بنا ڈالے۔ وہ بنگلے جو میدان کے مکانوں کی طرح سپاٹ نہیں ہوتے۔ جن کی سرخ رنگ ٹینوں کی ڈھلان، ماحول کے اتار چڑھاؤ میں گھل مل جاتی ہے اور جن کے نظر نواز مثلث ان بنگلوں کو ایک ادائے کجکلاہی عطا کرتے ہیں جن پر آتشدان کی عمارت سفید چمپئی طرۂ دستار کا سماں دکھاتی ہے۔ گملے، پھول، کیاریاں، خیابان، قدرت کے خاکے میں حسن کار انسان کے مُوقلم کی گلکاریاں حیرت زا، ہوش رُبا، ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔

شاید یہ بھی قدرت کا قانون ہے کہ تسخیر کائنات کرنے والے تخلیقِ جمال بھی کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے جب ایمان کی طاقت اور جستجو کے بل پر ساری دنیا کو تسخیر کر لیا تھا تو ان کی فتوحات کے جلو میں تعمیر، تحسین اور تزئین چلتی تھیں۔ وہ جس جگہ پہنچے اسے گلزار بنا دیا۔ قصر ایسے تعمیر کیے جنھیں فطرت نے آبشاروں، نہروں، سبزہ زاروں، کا خراج ادا کیا۔ مذہب نے دین و دنیا کا ارتباط و انضباط سکھایا اس کے پیروؤں نے فطرت اور صنعت اسی طرح، قدرت اور فنکاری کو شیر و شکر کر کے دم لیا۔

انگریزوں کے عروج کا جب زمانہ آیا تو ان کی تسخیرات کے ... تخلیقاتِ جمال بھی رہیں۔ وہ جہاں گئے پھول کھل گئے۔ انھوں نے گھر کو اور ماحول کو سنوارا، نکھارا، حسین بنایا اور سلیقہ اور قرینے سے زندگی گزاری۔ ہمالیہ کے حسن کو مغلوں کے بعد انھوں نے فن کی ... سے چار چاند لگائے۔

کہتے ہیں کہ آرڈی صاحب نے اپنے حسنِ نظر، ظرف، نفاست ... کے بقدر اپنی اسٹیٹ کو سجایا۔ اس انداز سے کہ اپنی منظورِ نظر کو جسے ... میں چھوڑ آئے تھے لبھا سکیں۔ اسے شریکِ حیات بنا سکیں۔ ... کے متعلق سنا ہے کہ جب تک کہ نر آشیاں بنا اور سجا نہیں ... اس کی طرف التفات نہیں کرتیں۔ بنی نوعِ انسان میں بھی ... داوِ کشش اترا رہا ہے۔ لیکن فی زمانہ ہندوستان اور پاکستان ... پڑوسی ملکوں کا ہمیں علم نہیں) میں ریت بدل گئی ہے، الٹی ... ہے اور لڑکا امید کرنے لگا ہے کہ گھر کے لیے سارا ساز و سامان ... لے کر آئے، اور اس کے علاوہ بھی کچھ۔ رشتہ دولت مند گھر ... سے لڑکے آبا و اجداد سے رشتہ توڑ کر خانہ داماد بننے کے لیے تیار ... بغیر لجائے یا بلک جھپکائے۔

یہ جملۂ معترضہ تھا۔ آرڈی کے دل کی دھڑکن مادہ جبیں ... کی تجویز منظور کر لی۔ اور اس کہستانی قصر میں ملکہ بن کر نزولِ اجلال ...

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن، اتنی تیزی کے ساتھ گزرنے ... کتاب کے ورق الٹے جاتے ہیں۔ محبت کی عادت ہے کہ بدگمانی ... آزردگی، خفگی کے قافلے کو ساتھ لے کر چلتی ہے جیسے ملکہ کے ... کو تھامے ہوئے اطفال چلا کرتے تھے۔ ایک روز ماہ لقا خفا ہوگئی ... منائے نہ منی۔ "ہم تمھارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ تمھیں ہماری ... محبت کے دعوے سب جھوٹے۔ ہمارا تمھارا نباہ نہ ہوگا۔ محبت کے دعوے کرتے ہو اور ہو نرے بوالہوس۔"

چنانچہ دالیس نے شوہر سے علاحدگی اختیار کر لی۔ ... یہاں نہ عداوت تھی نہ نفرت۔ وہ اختلاف تھا جسے اردو زبان ... نے شکر رنجی کا نام دیا ہے۔ دالیس نے عملہ کو حکم دیا کہ ہمارے ... کے اندر لکڑی کا چھوٹا سا کاشانہ بنا دو جس میں صرف ہمارے ... چیڑ کے دو پیڑ کاٹے گئے اور کاٹیج، بے حد خوشنما کاٹیج بنا کر ... کاشانہ ان لاگ کیبنوں (لکڑی کے نشیمنوں) سے کہیں زیادہ ...

تع ہ جہ من کام (کشمیر) میں ڈھلوانوں پر سیاحوں کو دعوت قیام
ے ہیں آرڈی اس کارروائی کو نیم مبتسم نیم تشویش کے ساتھ دیکھتا
ر جب واپس ان کے شبستان کو خالی کر کے کاٹیج میں پہونچ گئی تو
ی م ح ، حریزوں کی طرح وہ اس کاٹیج کو " والیس کی حماقت " کہہ کر
بہ بوں اور اخبار دیکھنے لگا۔ وہ دن اور آج کا دن ، یہ خوشنما نشیمن
WALLIS' FOLLY (والیسز فولی) کہلاتا ہے ۔ یہ حماقتیں اتنی حسین ہیں
یہ سوچا جا رہا ہے کہ اس قسم کے سات آٹھ حماقت کدے اور
نا دیے جائیں ۔

آرڈی اسٹیٹ تک پہونچنے کے لیے ہفتخواں طے کرنا پڑتا ہے ۔
فتوں ہ اس رعایت لفظی ہے شاہراہ سے یہاں تک پہونچنے کے لیے
ت موڑوں سے گزرتے ہیں ۔ جیسا دلچسپ نام کاٹیج کو ملا ہے ، ایسے
ت ہم اور مل جائیں تو ان میں سے ہر موڑ کو ایک نام دے دیا جائے ۔

رے جل کرنل ونہار نے اس ریاست کی ملکیت کانپور کے ایک
ہ ملک منتقل کر دی ۔ انھوں نے اسے ہوٹل کی طرح چلایا ۔ بالآخر ہوٹل
سوں دیکھ کر اسے بیچ ڈالنے کی ٹھانی ۔ اس کی اطلاع کرنل بشیر حسین زیدی
ی جن کو صاحبقران ثالث کہنا چاہیے کیونکہ علی گڑھ نے انھیں شاہجہاں
ثانی دیا ہے ۔ اور کیوں نہ ہو انھوں نے یونیورسٹی کو مولانا آزاد لائبریری
اور کینیڈی ہال کمپلکس جیسی خوبصورت عمارتوں سے سجایا ۔ عروس علی گڑھ
ا لیے زیدی میں انھیں ید طولی رہا ہے ۔ اس وقت سے یہ ریاست
یونیورسٹی کے اساتذہ اور دوسرے مامورین کے لیے گرمیوں میں
ا ندہ کا کام دیتی ہے ۔ کچھ سالوں سے یہ تغافل کا شکار ہے ۔

وادی اور پہاڑیاں ، حد نظر تک گنگا جمنی دھوپ چھاؤں میں
نہائی ہوئی ہیں ۔ فلک شگاف پیڑوں کے درمیان سے پہاڑوں کی چوٹیاں
جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ اترتے ، اترتے ہی چلے جائیے ، ہر طرف
جنگل ہی جنگل ، ہو ، کا عالم ۔ گرمیوں کی سطحی ہما ہمی ختم ہو جاتی ہے تو گلدار
تیندوے اسے اپنی آرام گاہ بنا لیتا ہے ۔ گرمیوں میں جب چیڑ کی نوکیلی
پتیاں یا سوئیاں سوکھ جاتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ٹکرائیں گی تو
جنگل میں آگ لگ جائے گی ۔ اسٹیٹ کے نگران سری لکشمن دت جوشی
نے بتایا کہ اس گرمی میں جنگل میں جا بجا آگ لگ گئی تھی ۔ پانی ، اور
ان افراط سے پانی کہاں کہ آگ بجھائی جائے ۔ آگ بنگلے کی طرف بڑھ
رہی تھی انھوں نے اور ان کے بیوی بچوں نے رات دن ایک کر دیا اور
ڈالی ، پتوں ٹہنیوں کے ستالوں پر آگ آگے بڑھ رہی تھی راہ سے
ہٹا دیں تب آگ کا سلسلہ ٹوٹا اور بڑی مشکلوں سے بنگلہ بچ سکا ۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ ،
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

معلوم ہوتا ہے کہ چیڑ کے سر بہ فلک پیڑ انسان ، بر خود غلط انسان ، سے
ناراض ہو گئے تھے ۔ جبھی تو اپنی سوکھی اور گری ہوئی پتیوں کو حکم دیا
تھا کہ آدمیوں کی اس بستی کو جلا کر راکھ کر دو ۔

جس وقت یہ سطور لکھی جا رہی ہیں چاند ماری کی آوازیں آرہی ہیں ۔
یہاں بادل گرجنے کی آواز آتی تو اسے گت نہ سمجھی جاتی ۔ چاند ماری قدرت
کے سکون کو برہم کرتی ہے ۔ لیکن صرف کبھی کبھی ۔ اور پھر یہ سوچنا بھی ناروا
ہوگا کہ رانی کھیت کی چھاؤنی آرڈی اسٹیٹ کی خاطر اپنی مشقوں اور ورزشوں
کو ترک کر دے ۔

ریاست کا استعمال آج کل کم ہو رہا ہے اور کم سلیقہ کے ساتھ ۔
سوچا جا رہا ہے کہ اس کی افادیت کو بڑھایا جائے اور اس کے فائدہ کو
عام کیا جائے ۔ اس وقت یونیورسٹی کی APPLIED ARTS کی طالبات
بڑی تعداد میں یہاں ٹھہری ہوئی ہیں بہت خوش ہیں ۔ ساری ریاست
ان کے زیر قدم ہے اور سارا رانی کھیت اور اس کے کہسار اور مرغزار ان
کے زیر موقلم مناظر کی تصویریں بنا رہی ہیں ۔ یونیورسٹی میں ان کی نمائش
کی جائے گی ۔ یہاں انھوں نے تکلیف بھی اٹھائی لطف بھی اٹھایا ، دوسرے
کا شکر نہیں کیا ، پہلی کا گلہ کر رہی تھیں ، کہ یہ انسانی فطرت ہے ۔ دراصل

خدا کے خزانے میں خوشی کی کمی نہیں۔ وہ وہاں کثرت سے موجود ہے اور ہمیں کثرت سے مل سکتی ہے مگر خرابی یہ ہے کہ ہم میں کے اکثر لوگ اپنی ناسمجھی اور غلط خیالی سے اسے ٹھیک جگہ جا کے نہیں ڈھونڈھتے۔ (عبدالحلیم شرر: شادی و غم)

*

خزاں اور بہار میں کتنا کم فرق ہوتا ہے۔ خزاں اپنے اندر بہار کو چھپائے رکھتی ہے اور بہار میں جب اس کا وجود پوشیدہ ہے وہی درد اور کدار جو بہار کی خواہشات اور رنگ و بو میں ہوتے ہیں۔ خزاں کے موسم میں ایک یاد اور رنج بن کر یہاں رہتے ہیں۔ (احمد علی: اس کے بعد)

*

زندگی ایک تلخ شراب ہے، اس کو صرف وہی پی سکتا ہے جس کے منہ میں تلخی کا مزہ بس چکا ہو، یہ کوئی شربت نہیں جس کو ہر شخص پی سکے۔

(احمد علی: اس کے بعد)

حق لطف اٹھانے کا اسی کو ہے جو تکلیف اٹھا سکے، محنت کر سکے۔ جھرنے سے پانی بھر کر لانا، خود چولہا جلانا، کھانا پکانا، برتن مانجھنا۔ ان ساری دشواریوں کو ایک دن حافظہ سنہرے رنگ میں رنگ دے گا۔ اس طرح تربیت بھی ہوتی ہے، آنکھیں کھلتی ہیں، اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ یہ لڑکیاں خوش پوش، خوش اخلاق و خوش اطوار ہیں۔ لیکن ایک سہو ان سے ہو رہا ہے۔ جن کمروں میں ان کا قیام ہے، ان کو سلیقہ سے رکھنے اور قرینہ سے استعمال کرنے کی طرف انھوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ یہ ریاست ان کی ہے۔ انھیں اسے سجا کر سنوار کر رکھنا چاہیے۔ یہ تو بے چاریاں نوعمر طالبات ہیں جنھیں چھٹی کی خوشی اور پہاڑ آنے کے جوش میں ان ذمہ داریوں کا احساس نہیں رہا۔ سنا ہے کہ یہ سہو بعض اوقات بڑی عمر والے اساتذہ سے بھی سرزد ہو جاتا ہے۔

ان لڑکیوں میں صبوحی، صبیحہ اور سلمیٰ بھی ہیں اور نیرجا، پارجا اور نشی بھی۔ ان کو اس طرح گھلا ملا دیکھ کر خوشی ہوئی۔ علی گڑھ میں یکجہتی، اتحاد، آشتی، امن اور باہمی ہم آہنگی کی جو تربیت ملتی ہے اسے بھونڈی کی سفاکیاں اور خوں آشامیاں مٹا نہیں سکتیں۔ غضب آلود سمندر جزیرے کا کچھ بگاڑ نہیں پاتا۔

اسٹیٹ جو کبھی "آرڈی" اور والیس کی خلوت گاہ تھی ... ناز و نیاز اور آزردگی و التفات کے دور چلتے تھے اب شاہراہ عام کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ چیڑ کے پیڑوں اور بادلوں کا حصار ناکافی ثابت ہو ... اب اسے خاردار تاروں کی ضرورت ہے تاکہ اسے گلزار و باغ بنایا جائے۔ سیب اور ناسپاتی کے چھدرے پیڑ تغافل کے شاکی ہیں اور ... بانڈر بیچیا کے دلنواز پھول فکرمند ہیں کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ حسن التفات کا خوگر ہوتا ہے۔ التفات نہ ملے تو مرجھا جاتا ہے۔ پھل اور پھول اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اور خود انسان جو ... کا ہدف ہے اپنی جگہ شکوہ کناں ہے۔ اسے کیا شکایت ہے ... جس نے البرٹ کو بھی پورسیلری چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پانی کی کمی جس ... اور جھرنوں سے ملنے والا پانی پہلے کافی تھا، آبادی اس طرح بڑھی کہ ... بعایت ناکافی ہو گیا۔ شکر ہے کہ ناشکرے انسان کو پانی کی ... اس پانی کی جو زندگی کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑتا ہے۔ افراط میں ... سماں آج کل سارے ہندوستان میں نظر آ رہا ہے۔ خوشحالی ... اخلاق و اطوار، شہر و دیار، احساس و اقدار، بڑھتی ہوئی ... ہوئی آبادی کی نذر ہو گئے ہیں۔ یہاں "جویا" جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے، بول اٹھے "میاں خوشہ چیں تمھیں شکوہ لکھنے پر کس نے مامور کیا تھا۔ تم تو آبادی کے ازدحام اور شہروں کے طوفان بے تمیزی سے پناہ لینے کے لیے اس دارالامان، اس ارضی بہشت میں آئے ہو۔ خوشی کے اس لمحہ کو سمیٹ لو۔ فکروں اور شکایتوں کو شہروں اور میدانوں کے لیے چھوڑ رکھو۔ تمھیں لوٹ کر وہیں جانا ہے۔ آج کی خوشی کو ... کی بے مصرف فکر سے مکدر نہ کرو۔

والیس نے خفگی دکھائی، حماقت کی، تو اس کے ہمرکاب حسن تھا۔

دلبرِ خوباں کا دیکھا سبھاؤ +

کہ بگڑے سے دونا ہو ان کا بناؤ۔

اس کے آگے "آرڈی" کی بلغمی اور بناوٹی سرد مہری زیادہ دیر تک ... میاں خوشہ چیں تم ٹھہرے بدقوارہ۔ اس بھونڈی شکل اور چیچک کے ان داغوں کے ساتھ تمھارے بڑھے نخرے کیسے گوارہ ہوں گے۔ اپنے ... کی طرح تم بھی جنت سے کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ گے۔ ایاز قدر خود بشناس" (ایاز اپنی اوقات پہچان)۔

حفیظ عباسی

تین رومی جاں باز

زندگی ایک طوفان ہے جس کا لطف صرف ان ہی کو آسکتا ہے جو اس سمندر کے اندر ہیں، کنارے پر چلنے والے اس کو کیا جان سکتے ہیں

(احمد علی۔ اس کے بغیر)

دنیا کی تاریخ ایسے کتنے ہی بہادروں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے جو اپنی جان پر کھیل گئے، مگر اپنے وطن پر آنچ نہ آنے دی۔ ان کے بہادرانہ کارنامے رہتی دنیا تک ان کی یاد دلاتے رہیں گے اور ان کے نام ہمیشہ محبت اور عزت کے ساتھ لیے جائیں گے۔ آج ہم آپ کو ایسے ہی تین بہادر رومیوں کے قصے سنائیں گے جنھوں نے اپنے ملک کی عزت کے لیے جان کی بازی لگادی اور دنیا کی تاریخ میں امر ہو گئے۔

روم پرانے زمانے کا ایک ایسا شہر ہے جو سیکڑوں برس تک یورپ پر چھایا رہا اور جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحات صدیوں تک جگمگاتے رہے۔ کسی نے اسے شہروں کی ملکہ کہا تو کسی نے اسے لافانی شہر کا نام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی آٹھ سو برس پہلے یعنی اب سے تقریباً اٹھائیس سو سال پہلے آباد ہوا۔ اس شہر کے بسانے والے کا نام رومولس بتایا جاتا ہے جسے بھیڑیے نے پالا تھا۔

شروع میں یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا مگر دھیرے دھیرے اس کی طاقت بڑھتی رہی اور سرحدیں پھیلتی گئیں یہاں تک کہ اٹلی کا بڑا حصہ اس میں شامل ہوگیا پھر بھی حکومت کا مرکز شہر روم ہی رہا۔

طیبر کا بیٹا

شہر روم کے نزدیک ایک چھوٹی سی سلطنت تھی۔ پورسنا اس کا حکمراں تھا۔ ایک بار اس نے اچانک روم پر حملہ کردیا۔ اس کی فوجیں بڑھتے بڑھتے شہر کے سامنے آپہنچیں اور رومیوں کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔

جس میدان تک پورسنا کا لشکر آپہنچا تھا اُس کے اور شہر روم کے دروازے کے درمیان دریائے طیبر بہتا تھا۔ اس دریا پر لکڑی کا ایک پُل بنا ہوا تھا جو رومی دروازے اور میدان کو جوڑتا تھا۔ پورسنا پُل کو پار کرلیتا تو پھر شہر اس کا تھا کیونکہ رومی اس ناگہانی حملے کو روک نہ سکتے تھے۔ اس لشکر کو سب سے پہلے

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بہ گل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

۔ اقبال

ان لوگوں نے دیکھا جو شہر کے باہر آباد تھے۔ وہ شہر میں پناہ لینے لیے بھاگے چلے آتے تھے۔

ہوری شس روم کا ایک معمولی سا سپاہی تھا جو اس وقت شہر کے دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ لشکر پر اس کی نظر پڑی تو تھوڑی سی دیر کے لیے وہ الجھن میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے۔ اتنی مہلت نہیں کہ شہر میں جا کے حملے کی خبر کرے۔ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کرے یہ اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ جو لوگ پناہ لینے کے لیے شہر کے اندر بھاگے جا رہے تھے انھیں روک کر ہورشیس نے کہا کہ شہر کو بچانے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ کسی طرح پُل توڑ دیا جائے۔ میں پُل کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ذرا دیر کے لیے دشمن کو روکتا ہوں، اسی دوران تم پُل توڑ ڈالو۔

"مگر پُل ٹوٹ جانے کے بعد تم کس طرح لوٹو گے"، کسی نے سوال کیا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ اگر ایک جان چلی جاتی ہے اور شہر بچ جاتا ہے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں"۔ اس بہادر نے جواب دیا اور تلوار نکال کے پُل کے دوسرے سرے پر جا پہنچا۔ دو اور جوانوں نے بھی ہورشیس کا ساتھ دیا۔

ان تینوں نے تو دشمن کو وہاں روکے رکھا اور اِدھر باقی لوگ پُل پر زبردست چوٹیں لگاتے رہے۔ پُل گرنے کو ہوا تو انھوں نے پکار کے کہا "دوستو، اب لوٹ آؤ، پُل گرنے والا ہے"۔ یہ سن کر دونوں نوجوان لوٹ گئے۔ ہورشیس رُکا رہا کہ یہ دونوں نکل جائیں اور دشمن پیچھے سے ان پر وار نہ کر سکے۔

اتنے میں زور کی آواز ہوئی اور پُل اڑا اڑا دھم کرکے دریا میں گر پڑا۔ اب ہورشیس کے سامنے دشمن کا زبردست لشکر تھا اور پیچھے موجیں مارتا ہوا دریائے طیبر مگر اس سرفروش کی ننگی تلوار اب بھی اٹھی ہوئی تھی۔ دشمن کا لشکر لڑنا بھول کے سناٹے میں آگیا۔ اس کے مقابل ایک اکیلا جیالا تھا جو روم کو بچانے کے لیے جان پر کھیل گیا تھا۔ گویا سرفروشی اور قربانی کی ایک جیتی جاگتی مثال ان کے سامنے تھی۔

ہورشیس نے تلوار نیام میں رکھ لی اور دریا کی طرف منہ کرکے دونوں ہاتھ اٹھا دیے "بابا طیبر! تیرا سپاہی تیرا محافظ تیری گود میں آرہا ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پل توڑنے والے رومی بڑی مایوسی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انھیں اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ فولادی لباس پہنے ہوئے سپاہی کا دریا میں تیر جانا ممکن نہ تھا۔ پورسنا کے سپاہی بھی جرأت مندی کے اس کارنامے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اور شاید دوست دشمن سب اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

آخر ہورشیس ڈوبتا ابھرتا کنارے جا لگا۔ اس بہادر نے جان پر کھیل کے اپنے شہر کو بچالیا۔ شہر کے لوگوں نے اس کی دلیری کی قدر کی اور اسے کندھوں پر اٹھا کے شہر میں اس کا شاندار جلوس نکالا۔
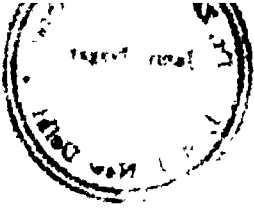
بائیں ہاتھ والا

پُل ٹوٹ جانے سے پورسنا کا، شہر روم میں اچانک گھس جانے کا خواب، پورا نہ ہوسکا۔ آخر اس نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ مطلب یہ کہ اس کے چاروں طرف فوجی گھیرا ڈال دیا کہ رومی تنگ آکر ہتھیار ڈال دیں۔ اب ایک اور بہادر جوان قیوس روم کو بچانے کے لیے ہتھیلی پر اپنا سر لے کے نکلا۔ وہ کسی طرح چھپ چھپا کے دشمن کے لشکر میں جا گھسا۔ اس کی نیت یہ تھی کہ وہ پورسنا کو مار ڈالے۔ اس کے مرجانے سے دشمن کی کمر ٹوٹ جائیگی اور وہ محاصرہ اٹھا کے واپس چلا جائے گا۔

قیوس کسی بہانے سے پورسنا کے خیمے میں بھی داخل ہوگیا۔ اس وقت خیمے میں کئی لوگ موجود تھے۔ وہ پورسنا کو پہچان نہ سکا اور اس کے دھوکے میں کسی اور کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ اس نے وہیں تڑپ کے جان دے دی۔ قیوس کو گھیر کے پکڑ لیا گیا اور اس قتل کا سبب پوچھا گیا۔ جوان نے کہا "کیا بتاؤں مجھ سے چوک ہوگئی۔ میں تو خود پورسنا کو مارنے آیا تھا کہ اس سے روم کو نجات دلادوں مگر اسے پہچان نہ سکا"

تمنّا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے
انھی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منت کشِ شبنم نگوں جام و سبو کر لے

— اقبال

پورسنا کو معلوم ہوا کہ یہ رومی ہے تو اس نے فوراً حکم دیا کہ "اس سے شہر کا حال پوچھو۔ رومیوں کے ارادوں کا پتہ لگاؤ اور یہ سیدھی طرح زبان نہ کھولے تو سخت تکلیفیں دو۔"

وہیں ایک طرف آگ روشن تھی۔ قیوس نے دوڑ کے اس میں ہاتھ ڈال دیا اور ہاتھ کو اس میں ڈالے ڈالے فخر کے ساتھ سر گھما کے پورسنا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے درد اور تکلیف کے آثار ذرا بھی ظاہر نہ تھے۔ اس سے مطلب یہ تھا کہ تم مجھے تکلیفوں سے ڈراتے ہو۔ ملک کی عزت کے آگے یہ جسم کچھ بھی تو نہیں۔ دیکھو ہاتھ کے جھلسنے کا مجھ پر ذرا بھی اثر نہیں۔ تم مجھے تکلیفیں پہنچا کے میرے شہر کا کوئی راز مجھ سے اگلوا نہیں سکتے۔

جوان کی اس دلیری کا پورسنا پر بہت اثر ہوا۔ اس نے فوراً قیوس کو چھوڑ دیا اور کہا "جوان، تم آزاد ہو، اپنے شہر واپس جاسکتے ہو۔" قیوس نے جواب میں کہا "تم نے میری جان بخشی ہے۔ اس کے بدلے میں تمھیں رومیوں کے ارادوں سے خبردار کیے دیتا ہوں۔ سنو، ہم سو نوجوانوں نے ایک ساتھ قسم کھائی ہے کہ جس طرح بن پڑے گا جان پر کھیل کے پورسنا کا سر اتار کے رہیں گے۔"

یہ کہہ کر قیوس تو اپنے شہر کو لوٹ گیا مگر پورسنا پر رومیوں کی ایسی دہشت چھائی کہ وہ فوراً محاصرہ اٹھا کے واپس چلا گیا۔

قیوس نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے ملک پر قربان کردیا۔ رومیوں نے اس کی بہت عزت افزائی کی اور اسے 'بائیں ہاتھ والا' کا خطاب دیا۔

سرفروش ریگولس

جس زمانے میں روم آباد ہوا اسی زمانے میں افریقہ کے شمالی ساحل پر ایک اور شہر کارتھیج بھی آباد ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ بہت بڑی بحری طاقت بن گیا۔ اس کے اور رومیوں کے درمیان برابر جنگیں ہوتی رہیں۔ کارتھیج کا مقابلہ کرنے کے لیے رومیوں نے ایک بحری بیڑہ تیار کیا اور ایک زبردست رومی سپہ سالار ریگولس اس بیڑے کو لے کر کارتھیج کے ساحل پر پہنچا۔ اس نے اپنی بہادری اور ہوشیاری سے کارتھیج کی فوجوں کو شکستوں پر شکستیں دیں۔

کارتھیج کے لوگوں نے پریشان ہو کر ایک یونانی سالار کی خدمات حاصل کیں۔ یہ جنگ کے فن میں بڑا ماہر تھا۔ اس کے آنے سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ رومی اب تک برابر جیت رہے تھے۔ اس کے آنے سے وہ ہارنے لگے اور ایک دن ایسا آیا کہ ریگولس دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہو گیا۔

جنگ جاری رہی۔ اب رومی فوجیں ہر جگہ پسپا ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ رومی اب اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لائق نہ رہیں گے۔ اس میں کافی عرصہ گزر گیا اور ریگولس برابر قید میں رہا۔ قید خانے کے محافظوں سے اب اس کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ان کی زبانی اسے شہر کے قصے معلوم ہوتے، جنگ کے واقعات کا پتہ چلتا۔ ایک دن ریگولس نے سنا کہ یونانی سالار ناراض ہو کے چلا گیا کیونکہ یہاں کے لوگ اس کی قدر نہ کر سکے۔ پھر اسے پتہ چلا کہ کارتھیج کے پاس سامان جنگ کی کمی ہو چلی ہے

ایک دن قید خانے کا دروازہ کھلا معلوم ہوا کہ کارتھیج کے ارباب حکومت ریگولس کو یاد کرتے ہیں۔ ریگولس سپاہیوں کے پہرے میں ان کی خدمت میں لے جایا گیا۔

"ہمارے تمھارے درمیان برسوں سے جنگ چل رہی ہے ___ بے نتیجہ جنگ جس سے بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ لوگوں کی جانیں بیکار ضایع ہو رہی ہیں۔ کیوں نہ ہم تم دوستوں کی طرح رہیں،" ریگولس سے کہا گیا۔

ریگولس سمجھ گیا کہ یونانی سالار کے لوٹ جانے اور سامان جنگ ختم ہو جانے کی وجہ سے یہ لوگ اب جنگ جاری نہیں رکھ سکتے۔ اگر رومی کچھ دنوں اور ان کے مقابلے میں ڈٹے رہے تو آخری فتح روم ہی کی ہو گی۔

"میں تو آپ کا قیدی ہوں۔ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں" ریگولس نے جواب دیا۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا
— اقبال

"ہم چاہتے ہیں تم صلح کی شرطیں لے کر اپنے وطن جاؤ اور انھیں صلح پر آمادہ کرو۔" انھوں نے کہا۔

"میں آپ کی شرطیں ان کے سامنے پیش کرنے کو حاضر ہوں لیکن وہ صلح کے لیے راضی نہ ہوئے تو؟"

"اگر وہ راضی نہ ہوئے تو تمھیں لوٹ کر یہاں آنا ہوگا۔ روانہ ہونے سے پہلے تمھیں اس کا وعدہ کرنا ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے۔"

رگولس نے یہ جواب دیا اور صلح کی شرطیں لے کر روم کی طرف روانہ ہوگیا۔

رومیوں کو اس کے آنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے استقبال کی تیاریاں کیں مگر اس نے شہر پناہ کے اندر داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس زمانے میں روم کا انتظام ایک مجلس چلاتی تھی۔ رگولس نے کہا کہ میں مجلس کے ممبروں سے شہر کے باہر ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ سب ممبر شہر سے باہر آگئے۔ رگولس نے انھیں مخاطب کر کے کہا۔

"دوستو! تمھارے دشمنوں نے صلح کی شرطیں دے کر مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے کہ جنگ کو بہت دن ہو گئے۔ اب صلح کر لینی چاہیے مگر ساتھیو! میرا مشورہ یہ ہے کہ جنگ جاری رکھو۔ ہماری فتح یقینی ہے۔ میں انھیں یہ زبان دے کر آیا ہوں کہ میرے وطن نے صلح منظور نہ کی تو میں پھر ان کی قید میں لوٹ جاؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے شہر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے اسی وقت واپس ہونا ہے۔"

رومی مجلس کے ممبر صلح کرنے کو تیار تھے کہ اسی طرح رگولس کی جان بچ جائے مگر رگولس نے انھیں اپنا مشورہ ماننے پر مجبور کر دیا۔ رومیوں نے اس سے کہا کہ جنگ میں دعاے پورے نہیں کیے جاتے۔ تم لوٹ کر نہ جاؤ مگر وہ نہ مانا۔

رگولس لوٹ کر کارتھیج پہنچا تو لوگ اس کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گئے کہ رومیوں کا جواب کیا ہے۔

"انھیں صلح منظور نہیں؟" انھوں نے پوچھا۔ "نہیں" اس کا مختصر جواب تھا۔

"اور وہ اس لیے کہ تم نے انھیں ہماری کمزوریوں سے واقف کر دیا۔ جانتے ہو اس کی سزا کیا ہے؟"

"موت ـــ دردناک موت" اس نے جواب دیا مگر اس کے چہرے پر نہ پریشانی کے آثار تھے نہ خوف کے بلکہ اطمنان کی روشنی پھیلی تھی۔ کارتھیج والوں نے اُسے تڑپا تڑپا کے مار ڈالا مگر آخری فتح روم کی ہوئی۔

دیکھا آپ نے، ان رومی جانبازوں کے نام آج بھی زندہ ہیں حالانکہ انھیں مرے ہوئے مدتیں گزر گئیں مگر نہیں، یہ لوگ مرے کہاں۔ وطن پر جان دینے والے بھلا کہیں مر سکتے ہیں!

اگر ہم انسان کا تصور بغیر زبان کے کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں جانور اور انسان میں امتیاز کرنا مشکل ہوگا۔

سید احتشام حسین

زبان اور تہذیب

✳

جو لوگ قسمت کی شکایت کرتے ہیں جو لوگ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور استقلال اور ہمت دکھانے سے گھبراتے ہیں، وہ بزدل ہیں۔

وحید الدین سلیم

صحیفۂ قدرت کا ایک صفحہ

ڈاکٹر جمال آرا نظامی

نواب سُلطان جہاں بیگم

عُلیاحضرت سلطان جہاں بیگم والی بھوپال نہ صرف ایک قدیم اسلامی ریاست کی تاجدار و حکمراں تھیں بلکہ اس سے بھی بڑی سعادت جو خدا نے ان کو عطا کی تھی وہ ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کے طبقۂ نسواں کے دلوں کی ملکہ تھیں۔ ریاست تو انھوں نے اپنے آبا و اجداد سے پائی لیکن دلوں کی محبت خود تسخیر کی۔ اگر ہم ان کی زندگی کے واقعات کا بغور مطالعہ کریں تو اس حقیقت میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آئے گا۔

عورتوں کی طرح مرد بھی علیاحضرت کے ابرِ کرم سے فیض یاب ہوتے تھے علی گڑھ کالج، تحریکِ تبلیغ اسلام لندن، انجمن ترقی اردو، مدرسہ صولتیہ مکۂ معظمہ، حالی میموریل فنڈ، دار المصنفین اور ہزاروں اسلامی مکاتیب و مدارس اس منبع الطاف و اکرام سے اپنا اپنا حصہ پاتے تھے۔ لیکن ان کی توجہاتِ شاہانہ کا قدرتی رجحان خود اپنی صنف کی جانب تھا۔ جس کی قومی زندگی میں بلا شبہ وہ اصلاحات اور ترقیاں ان کی توجہ اور نوازشوں کی بدولت ہوئیں جو پہلے کبھی ممکن نہ ہوئی تھیں

ایک جگہ بانیِ ویمنس کالج علی گڑھ شیخ عبداللہ نے لکھا ہے کہ ــــ

"سنہ ۱۹۱۴ء میں مجھ کو علی گڑھ میں مدرسۂ نسواں کے قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن اس وقت یہ آسان امر نہ تھا۔ چاروں طرف سے سخت مخالفت تھی۔ ایسی حالت میں ایک عرض داشت بیگم بھوپال کی خدمت میں بھی بھیجی جس میں لوگوں کی مخالفت اور اسکول کھولنے کا تذکرہ کیا کہ اگر آپ سرپرستی فرمائیں تو مخالفت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں پندرہ ہی روز کے اندر ایک پروانہ آیا کہ مدرسہ ضرور جاری کرو اور سرِ دست سَو روپے ماہوار کی امداد مقرر کی جاتی ہے۔"

اِس امداد اور سرپرستی کو مسلم گرلز انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ کے لیے سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد مدرسہ قایم ہو گیا اور مخالفت کم ہو گئی۔ بعد میں بیگم صاحبہ نے اس وظیفے کو بڑھا کر دو ہزار کر دیا۔

نواب سلطان جہاں نے مسائلِ نسواں پر اپنی زندگی کا بیشتر وقت صرف کیا۔ خود ریاست کے اندر سلطانیہ اسکول، مدرسۂ وکٹوریہ، مدرسۂ بلقیسی، برجیس کنیا پاٹ شالا، مدرسۂ سکندری، صنعتی مدرسہ، نرسنگ اسکول اور ایسی کتنی ہی یادگاریں قایم کیں جو ان کے نام کو روشن کرتی ہیں۔

ریاست کے باہر تمام ملک میں صنفِ نازک کی کوئی ایک تحریک ایسی نہ تھی جس تک ان کا دستِ کرم نہ پہنچا ہو۔

تعلیم کے علاوہ بھی سلطان جہاں بیگم تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کی طرف خاص توجہ دیتی تھیں۔ بے جا رسوم اور فضول خرچیوں کے انسداد کے لیے خود انھوں نے اپنی ذات کو ایک نمونہ بنا کر پیش کر دیا تھا۔ اپنی ریاست کے اندر مہر، نکاح اور ازدواجی زندگی کے معاملات نہ صرف ذاتی اثرات سے بلکہ قانونی صورت میں بھی سلجھا دیے تھے۔ لیکن مصارف خیر اور اوقاف کے ذریعے سے انھوں نے اپنی اِس قسم کی اصلاحی تحریکوں کو اور زیادہ تقویت پہنچائی تھی۔

قبائے شاہی کے اندر وہ ایک باخدا فقیر اور درد مند خادم ملت کا دل رکھتی تھیں۔ تعلیم اور اصلاح نسواں کے متعلق ان کی نکتہ نواز نظر نے ایک خاص نکتے کو محفوظ کر لیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مغربی و مشرقی تہذیب و تمدن کے تصادم میں مشرق کی اخلاقی خوبیاں مغرب کی بے اعتدالیوں سے متاثر و مرعوب نہ ہو جائیں۔ اسی نکتے کو انھوں نے تحریکِ تعلیم و اصلاح نسواں کی شرطِ اوّل بنا دیا تھا۔ ان کی نظر اس حقیقت تک پہنچ چکی تھی کہ مغربی تمدن کی ظاہری چمک دمک نئی نسلوں کو خیرہ نہ کرنے پائے اور ایسا نہ ہو کر تعلیم کی آزادیاں مشرقی اخلاق کے ضابطے کو کمزور کر دیں۔ انھوں نے شروع ہی سے اصلاح و ترقی کا ہر قدم اصول کے تحت اٹھایا۔ اُن کا خیال تھا کہ اسلام نے عورتوں کو ان کے تمام جائز حقوق عطا کیے ہیں اور شریعت اسلامی کی کوئی پابندی ایسی نہیں ہے جو ان کی قومی اور معاشرتی ترقی کی راہ میں حایل ہو سکے۔ اس لیے ان حدود کو قایم رکھ کر بھی مغربی تہذیب کی تمام خوبیوں سے بہرہ اندوز ہونا ممکن ہے۔

محکوم قوموں کے لیے وہ زمانہ بہت نازک ہوتا ہے جب اُن کی قومی تہذیب حاکم اور فاتح کی قوی تر تہذیب سے ٹکراتی ہے۔ اگر مفتوح قوموں کی ذہنیت اور قومی تہذیب مفتوح ہو جائے تو پھر ان قوموں کے لیے عزت کی زندگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ نواب صاحبہ کی دور بین نظر زندگی کے ان حقائق سے ناآشنا نہ تھی اور اسی لیے جب انھوں نے تہذیب اور اصلاح نسواں کا کام شروع کیا تو اس خطرے کو ہمہ وقت پیش نظر رکھا۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ مسلمان خواتین تعلیم و تہذیب جدیدہ کے زیور سے

آراستہ ہوکر مغربی تہذیب کے ظاہری نقوش پر فریفتہ ہوتی جارہی ہیں اوران کا مطمح
نظر یہ ہوگیا ہے کہ مغربی معاشرت کی نقالی تعلیم کا معیار سمجھی جانے لگی ہے اورعلم وعمل کی
دنیا میں مقلدوں کے کھوٹے سکے چل رہے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو سمجھ کر علیا حضرت
نے ایک درمیانی راستہ پیدا کیا اوراپنی تمام جدوجہد میں وہ کبھی اس راستے سے تجاوز
نہیں ہوئیں۔ ایک جگہ سفر یورپ پر تقریر کرتے ہوئے اس اصول کار کو انھوں نے صاف
صاف بیان کردیا۔

"میں اس تعلیم کے ساتھ اس آزادی کو پسند نہیں کرتی جو اعتدال
سے تجاوز ہوچکی ہے اورہمارے یہاں کی پردہ نشین ناخواندہ بلکہ
خواندہ عورتوں کو بھی اس کا خیال نہیں گزرسکتا۔ ممکن ہے کہ یہ
آزادی جو سرزمین یورپ میں ہے وہاں کے لیے مناسب ہو یا یہ
آزادی مذہب عیسوی کی تلقین وہدایت کے مطابق ہو مگر ہندوستان
اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے کسی طرح اور کسی زمانے میں میرے
خیال میں موزوں نہ ہوگی اور خدائے تعالیٰ کے احکام کبھی غیر مفید
نہیں ہوسکتے ہیں۔ بس ہم کو اس مقولے پر عمل کرنا چاہیے۔ اچھی
چیزوں کو لے لو اور بری چیزوں کو چھوڑ دو۔ مسلمان عورتوں کو
کو کبھی اس آزادی سے زیادہ کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ جو
مذہب اسلام نے ان کو عطا کی ہے اور وہ آزادی ایسی آزادی
ہے جو عورت کو اپنے حقوق سے مستفید ہونے اور تمام خرابیوں
سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہے۔"

ایک اورجگہ انھوں نے کہا کہ

"خواتین اسلام کو زمانۂ حال کی تعلیم اور بہتر تمدن ومعاشرت
سے بہرہ یاب دیکھنے کا یقیناً مجھ سے زیادہ کوئی شخص آرزومند نہ ہوگا
اوراس مقصد کے لیے میں ہر امکانی کوشش خواہ اس میں مجھ کو تکلیف
ہی برداشت کرنی پڑے عمل میں لاتی رہتی ہوں۔ لیکن اس
مقصد سے ایک اور بھی اعلیٰ مقصد میرے پیش نظر ہے اور وہ یہ
کہ اُن میں مذہبی روح مذہبی پابندی اور مذہبی محبت بھی بدرجہ
اولیٰ ہو۔"

مولوی محمد امین صاحب مارہروی اپنی تصنیف "بیگمات بھوپال" میں ایک
واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ

"ایک مرتبہ ہز ہائی نس کے روبرو امہات المومنین کا کچھ
تذکرہ تھا۔ اتفاق سے اس وقت تین آدمی موجود تھے۔ ایک رکن
مولوی سعیدالدین صاحب بہادر بھی تھے۔ انھوں نے دارالعلوم
دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کی تھی۔ ان کا علم بھی تازہ تھا۔
اس تذکرے میں امہات المومنین کے ناموں کا شمار ہوا۔ تین
چار ناموں پر جاکر سب رک گئے۔ قبل اس کے کہ سرکار عالیہ
کچھ فرمائیں۔ میں نے عرض کیا۔ حضور! اب ہماری یہ نوبت پہنچ
گئی ہے کہ ہم کو اپنی ماؤں کے نام تک یاد نہیں۔ ہر ہائی نس نے
دو تین سکنڈ کے وقفے کے بعد فرمایا کہ ہاں بیٹے بھول جائیں،
لیکن بیٹیاں نہیں بھولتیں۔ اور یہ فرماکر پورے نام گنوا دیئے"

کام کی یہ کیفیت تھی کہ دن کا بیشتر حصہ تو افسران ریاست سے ملاقات اور
گفتگو میں گزر جاتا تھا۔ چار بجے شام تک تمام دفاتر سکریٹریٹ سے احکام طلب
کاغذات کے پانچ چھ صندوق محل میں آجاتے تھے اور نواب صاحبہ بغیر کسی مدد
کے ہر ایک کاغذ کو خود ملاحظہ فرماکر اس پر خود حکم تحریر فرماتی تھیں۔ اس میں کسی
سکریٹری یا میر منشی کی شرکت نہیں ہوتی تھی۔ احکام نہایت مفصل اور
مدلل ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بلاشبہ ریاست کو امانت ہی تصور
کرتی تھیں اوراس کے تمام کام کو ایک فریضہ سمجھ کر انجام دیتی تھیں۔ ان کا خیال
یہ تھا کہ

"میں اگر اس خدمت کو فرض خداوندی نہ سمجھتی تو کب کا اس کو
چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلیتی۔ مگر جب تک اس کا کوئی بہتر
انتظام نہ ہو تب تک میں اس کو اپنی سب سے بڑی عبادت
سمجھتی ہوں۔"

واقعات نے ثابت کردیا ہے کہ ان کا یہ قول کس قدر صداقت اور خلوص پر
مبنی تھا اور جب وقت آیا تو انھوں نے کیسے بے تامل اس پر عمل کیا۔

بیگم صاحبہ بھوپال کو خداوند کریم نے تین فرزند عطا کیے۔ تینوں کو اچھی تعلیم
دلائی۔ سب سے چھوٹے فرزند کو علی گڑھ کالج میں بی۔ اے تک پڑھایا اور اپنا سکریٹری
بنایا۔ مگر عین عالم جوانی میں دو بڑے بیٹوں نے ضعیف ماں کو داغ مفارقت دے
دیا۔ اور پھر پوتے کے مقابلے میں اپنے فرزند نواب حمید اللہ خاں کو ریاست کی حکمرانی
دلانے کے لیے انگلستان کا سفر کیا اور اپنے بیٹے کو کاروبار ریاست بخوشی ورغبت
سپرد کردیا اور خود یاد الٰہی کا کام اپنے ذمے لیا۔

اگر ان کی زندگی پر سرسری نظر ڈالی جائے تو کئی حیثیتوں سے نمایاں
اور ممتاز نظر آئیں گی۔ سب سے پہلی حیثیت ایک فرماں روا کی ہے۔ اس حیثیت
سے آپ نہایت کامیاب اور بیدار مغز، منصف اور اپنی رعایا پر شفیق فرماں روا
ثابت ہوئیں۔ جس وقت اپنی پچیس سالہ دور حکومت کے بعد ریاست سے دست
کش ہوئیں تو اپنی رعایا کو مطمئن، خوشحال، ریاست کو آباد اور خزانے کو معمور چھوڑا

دوسری حیثیت ایک بلند پایہ مصنف اور مؤلف کی ہے۔ متعدد کتابیں
نہایت کارآمد اور مفید موضوع پر تصنیف وتالیف فرمائیں۔

زندگی میں سب سے زیادہ مقدم سمجھتی تھیں۔

پانچویں حیثیت بہترین منتظم صاحبِ خانہ کی ہے۔ آپ نے اپنے محلات کا انتظام تمام تر اپنے ہاتھ میں رکھا۔ کمروں کی ترتیب، محل کی آرائش و زینت، کھانے کا انتظام، بچوں کی تربیت و تعلیم، شوہر کی خدمت۔ غرض وہ تمام صفات و محاسن جو ایک باسلیقہ اور منتظم خاتون میں ہونے چاہئیں، وہ سب آپ میں موجود تھے۔ ان تمام حیثیتوں کے علاوہ آپ کی عظمت کا سبب محاسنِ اخلاق تھے۔ طبعاً نہایت رحم دل، فیاض، دردمند اور ملنسار واقع ہوئی تھیں۔

علی گڑھ میں ۱۹۱۴ء میں جب لڑکیوں کا بورڈنگ ہاؤس تعمیر ہو گیا، تو علیا حضرت خاص طور پر تشریف لائیں اور اپنے دستِ مبارک سے اس کا افتتاح فرمایا۔ مرحومہ مسلم یونیورسٹی کی چانسلر یونیورسٹی کے قیام ہونے کی تاریخ سے مقرر ہوئیں اور آخر وقت تک چانسلر رہیں۔ تین مرتبہ کورٹ نے ان کا انتخاب کیا۔ کیونکہ کورٹ کی اور کل قوم کی یہ خواہش تھی کہ جب تک علیا حضرت بقید حیات رہیں، اس وقت تک وہی یونیورسٹی کی چانسلر منتخب ہوا کریں۔ انھوں نے علاوہ مسلم یونیورسٹی اور مسلم گرلز کالج علی گڑھ کے اور بیسیوں اسلامی درسگاہوں کی سرپرستی فرمائی۔ اور جو مالی امداد وہ دیتی تھیں وہ اُن کے بعد بھی جاری رہی۔

سیرت النبی کے تمام مصارف بیگم بھوپال نے اپنے ذمے لے لیے تو مولانا شبلی نے ان کی فیاضی پر یہ قطعہ کہا ؎

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابرِ فیضِ سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیرِ بےنوا ہے ایک سلطاں ہے

دلخراش خاندانی حادثوں نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ دونوں صاحبزادوں کی جدائی کے بعد سے بےحد نڈھال اور خاموش ہو گئی تھیں۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۰ء کو ایک آپریشن کے بعد آپ نے انتقال کیا۔ مولانا شوکت علی صاحب نے لکھا ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم کی دلی تمنا یہ تھی کہ مرنے کے بعد "خادمۂ اسلام" کے لقب سے یاد کیا جائے ؎

تمہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کی زندہ ہو
تمہاری نیکیاں زندہ، تمہاری خوبیاں باقی

علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ مغفورہ سابق فرمانروائے بھوپال

ہزارہا روپیہ صرف کر کے ایک بےبہا لٹریچر صنفِ نسواں کے لیے فراہم کیا جو ان کے نام کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔

تیسری حیثیت اپنی صنف کی سب سے بڑی محسن اور رہبر کی ہے۔ ہندوستان کی صدہا تعلیم گاہیں اُن کے فیض و کرم سے بہرہ یاب ہوئیں۔ جس طرح سر سید احمد خاں کو مسلمان مردوں میں تعلیم کے احیاء اور اشاعت کا فخر حاصل ہے۔ اس طرح نواب سلطان جہاں بیگم کو عورتوں میں ہے۔

چوتھی حیثیت ایک زبردست پابند مذہب کی ہے۔ آپ مذہب کو

ڈاکٹر عالم حسین

سائنس دوستی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کے لئے بیدار ہوتے تھے
تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے اور یہ آیتیں تلاوت فرماتے،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

بے شک آسمانوں اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے آنے جانے

لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا

میں نشانیاں ہیں عقل والوں کیلئے وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے

وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

اور کروٹ پر لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

(کہتے ہیں) اے رب ہمارے تو نے یہ عبث نہیں بنایا تو پاک ہے (سب عیبوں سے) سو ہم کو

بچا دوزخ کے عذاب سے (سورۃ ۳، آیت ۱۹۰، ۱۹۱)

اور آپ یہ فرماتے کہ،

وَيْلٌ لِّمَنْ لَاكَهَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَلَمْ يَتَفَكَّرْ فِيْهَا

تباہی و بربادی ہے اس شخص کیلئے جو ان آیتوں کو اپنی دونوں داڑھوں کے درمیان
چباتا ہے مگر ان میں غور و فکر نہیں کرتا

سائنس کے متعلق گفتگو آج کل فیشن میں ہے اور کیوں نہ ہو روز سائنس کے کرشمے ہم کو چونکاتے رہتے ہیں۔ ہم لوگ سائنس کے حیرتناک کارناموں سے اس لیے بھی بے حد مرعوب ہوتے ہیں کیوں کہ ہم عموماً ان کارناموں کو تماش بین کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ کوئی دوسرا سائنس کا مظاہرہ پیش کرتا ہے اور ہم کچھ نہ جاننے اور نہ سمجھنے کی بنا پر صرف آہ اور واہ کر سکتے ہیں۔ بظاہر پڑھنے لکھنے میں ہم ایشیائی بھی کچھ کم نہیں لیکن غور کریں تو پتا چلے کہ ہم شعر و ادب کے نشے میں گم رہے ہیں اور سائنس کی تعلیم کو ہم نے ہمیشہ دوسرے تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔ اب جب کہ پانی گلے تک آ چکا ہے تو کچھ احساس ہو رہا ہے لیکن بچاؤ کی صورت کیا ہو؟ ہماری روزمرہ کی زندگی میں

سائنس اور ٹکنالوجی غیر معمولی انقلاب لا چکی ہے۔ بدلی ہوئی صورتِ حال پر قابو پانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے سائنس دوستی۔ سائنس سے دوستی کی راہ استوار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور اس کو بڑھاوا دیا جائے بلکہ اس کو چاہا جائے۔ سائنس دوستی کی بعد کی منزلیں تو ظاہر ہے آخر میں ہی آئیں گی، پہلے تو سائنس کو سمجھا جائے اور اس کی اصلی اہمیت کا احساس کیا جائے۔

سائنس کا مطلب کیا ہے؟ سائنس کی بہت سی کتابیں آپ کی نظر سے گزری ہوں گی۔ سائنس کے ان گنت قوانین سے یہ کتابیں بھری ہوئی ہیں جیسے مشہور و معروف نیوٹن اور آئن سٹائن وغیرہ کے قوانین۔ یہ قوانین

واقعی بہت اہم ہیں کیوں کہ اپنے گرد و پیش کو سمجھنے میں یہ قوانین بہت مدد
کرتے ہیں۔ لیکن محض ان قوانین کی طویل فہرست کو ہم سائنس نہیں کہہ سکتے۔
اسی طرح فطرت میں بے حساب حقائق ملتے ہیں مگر ان کو بھی سائنس کا نام
نہیں دیا جا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ سائنس انسانی دماغ کی صلاحیتوں کا
مظہر ہے۔

خیالات اور تصورات کے بے حساب سلسلوں نے سائنس کو جنم دیا ہے
مادہ کیا ہے اور مختلف حالات میں اس کا برتاؤ کیا ہے؟ اس بارے میں
خیالات اور تصورات کے سبب جو علم وجود میں آیا وہی سائنس ہے۔ اس علم
میں قوانین بھی ہیں اور حقائق کے ذخیرے بھی ہیں۔ سائنس میں حقائق کی
اصلیت کو سمجھنے کے لیے دانشوروں کے پیش کیے ہوئے نظریات کو تجربات کی
کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اس طرح پرکھ کے، کسوٹی پر کس کے، تجربہ کر کے
سچ کو جھوٹ سے الگ کرنا سائنس کا کام ہے۔ اس طرح دانہ دانہ کر کے علم کا
خزانہ جمع کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ صدیوں سے جاری تحقیق و جستجو کی یہ دلچسپ تحریک
علم کو اکٹھا کرنے میں منہمک ہے، پھر بھی اپنی کارگزاری پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا
ہے کہ ابھی ہماری جھولی آدھی سے زیادہ خالی ہے۔ یعنی کائنات کے اسرار و رموز
کے صرف ایک حصے تک ہی ہماری رسائی ہو سکی ہے۔

سائنس کیوں پڑھیں؟

شہری رونق اور ملبے سے دور سائنس کے مجاہد اپنی تجربہ گاہوں
میں سر جوڑ کر تجربے کرتے رہیں اور نت نئے نظریات کو شکل دیتے رہیں،
ہم کو اس سے کیا سروکار کہ وہ کیا کرتے رہتے ہیں۔ ہم کو تو صرف ان کی
ایجادات سے دلچسپی ہے جو روز بروز ہماری زندگی کو زیادہ خوشگوار
بناتی رہتی ہیں، ہمارے عیش و آرام میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ اگر ہم ایسا
سوچتے ہیں تو بہت بڑی غلطی پر ہی نہیں بلکہ گمراہی اور تباہی کی طرف
گامزن ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں سائنس کا عمل دخل اتنا بڑھ چکا ہے
کہ اب اس علم کو نظر انداز کرنا خودکشی کے برابر ہوگا۔ سوتے ہیں اور جاگتے ہیں
ہر وقت ہم سائنس سے فیض اٹھاتے ہیں۔ گرمی سے نجات پانے کے لیے بجلی کے
پنکھے، کولر، فرج وغیرہ، ٹھنڈک پر قابو پانے کے لیے ہیٹر، گرم پانی، اونی کپڑے
سیل وغیرہ، پینے کے لیے صاف پانی و مشروبات، کھانے کے لیے انواع و اقسام
کی نعمتیں، بیماری کو دور کرنے کے لیے دوائیں، نقل و رسائل اور تفریحات
کے لیے کاریں، ریل، جہاز، راکٹ، وائرلیس، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ وغیرہ
ذرا سوچ کر دیکھیے جو بھی چیز اس وقت آپ استعمال کر رہے ہیں وہ اسی علم
کا دین ہے جو انگنت سائنس دانوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اگر
آپ اچھے ڈھنگ سے جینا چاہتے ہیں تو اس علم کو حاصل کیجیے جس کو آپ عملاً
استعمال کر رہے ہیں۔

سائنس، خوف اور توہم پرستی: کیا آپ آندھی، طوفان،
چاند گرہن، اور سورج گرہن سے ڈرتے ہیں؟ مینا کے جوڑے کو
دیکھنا خوش قسمتی کی نشانی مانتے ہیں؟ بلی راستہ کاٹ گئی تو گھر واپس
آ جاتے ہیں؟ اپنے پرانے آئینے کے ٹوٹ جانے کو منحوس تصور کرتے
ہیں؟ رات میں شمشان گھاٹ کے قریب اس لیے نہیں جاتے کہ بھوت
پریت آپ کو لپٹ جائیں گے؟ کیا آپ جادو ٹونے میں یقین کرتے ہیں؟
حقیقت تو یہ ہے آپ ہی نہیں دنیا کے بہت سے لوگ سچائی سے ہٹ
کر جھوٹ اور فریب کے ان پردوں سے خائف رہتے ہیں۔ تعویذ دن
اور گنڈوں کے ذریعے علاج کروانے والے آپ کو ہزاروں لوگ مل جائیں
گے اور کتنی ہی معصوم زندگیاں صحیح علاج نہ ہونے کی وجہ سے اور ضعیف الاعتقاد
کے سبب ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہ افسوس ناک صورت حال اس لیے ہے کہ
لوگوں کو سچائی کا علم نہیں ہے۔ اگر عوام سائنس کو اپنائیں تو ان کے
خوف اور توہمات اس طرح غائب ہو جائیں گے جیسے روشنی سے اندھیرا
فنا ہو جاتا ہے

شہری زندگی، تندرستی اور سائنس: اچھی غذا کا کیا
مطلب ہے؟ وہ غذا جو ہم کو صحت مند رکھے یعنی بیماری سے ہم کو دور
رکھے۔ اچھی غذا کے بارے میں سائنس ہم کو تعلیم دیتی ہے۔ وٹامن
دھاتیں، نمک، شکر وغیرہ کس چیز میں کتنی مقدار میں ہیں؟ کس غذا
میں کتنی کیلوری انرجی ہے؟ جسم کو کتنی کیلوریز کی ضرورت ہے؟
یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے سوالات کے جواب سائنس ہم کو
دیتی ہے۔

اپنے شہر کی زندگی کو کیسے بہتر بنایا جائے؟ اچھی سڑکیں، اسکول
غلاظت کی صفائی، صاف پانی وغیرہ کی سہولتیں اچھے شہر میں ہونا چاہئیں
ظاہر ہے کہ یہ سب جب ہی کیا جا سکتا ہے کہ جب سائنس کا علم عام ہو۔

وسیع النظری اور سائنس: قدیم زمانے میں انسان
کو صرف اپنے قرب و جوار سے واقفیت تھی۔ اپنے گھر اور وطن عزیز سے
دور چند لوگ ہی سفر کرتے تھے۔ لیکن آج سائنس نے ہم کو نقل و رسائل
کے ایسے طریقے مہیا کر دیے ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم دنیا کے ہر کونے سے
آشنا ہیں۔ بلکہ یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ دنیا چھوٹی پڑ گئی ہے۔ زمین کو چھوڑ کر
آسمان میں انسان نئے ٹھکانے تلاش کر رہا ہے۔ تنگ نظری سائنس کی نذر
ہو گئی ہے اور اب وسیع النظری کی انتہا معلوم نہیں۔

سائنس علم کے خزانے کی کنجی ہے :۔

کیا، کیوں، کیسے اور کس طرح کے جوابات سائنس دیتی ہے۔ محکمۂ موسمیات یہ کیسے بتاتا ہے کہ کل شام کو بارش ہوسکتی ہے؟ ہوائی جہاز کس طرح پرواز کرتا ہے، راکٹ کیوں کر اڑان بھرتا ہے؟ دن رات کیسے بنتے ہیں؟ چاند و سورج گہن کا کیا مطلب ہے؟ سورج اور دیگر ستاروں کو توانائی کہاں سے ملتی ہے؟ بجلی کیا ہے اور کیسے بنائی جاتی ہے؟ ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹی وی اور کمپیوٹر کس طرح کام کرتے ہیں؟ ایٹم بم کس طرح تیار کیے جاتے ہیں، نیوکلیر توانائی کس طرح قابو میں کی جاتی ہے؟ وغیرہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے سوالوں کے جوابات فراہم کرنا سائنس کا ہی کام ہے۔ اس کے علاوہ سائنس داں علمی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے بہت سے قیاسات پیش کرتے ہیں جو کہ عموماً بہت بعد میں تجربات کے ذریعہ صحیح ثابت ہونے کے بعد سائنس کا جزو بن پاتے ہیں۔ اس طرح کی ایک مثال ستاروں کے بارے میں چندر شیکھر کا نظریہ ہے جس کو مناسب مقام ملنے میں پچاس سال لگے۔ بہت سے نظریات آج بھی ایسے ہیں جن کو صحیح ثابت ہونے کے لیے بنیاد نہیں ملی ہے۔ مثلاً کائنات کیسے بنی؟ اس بارے میں عرصۂ دراز سے نظریات موجود ہیں لیکن ناکافی ثبوت ہونے کی وجہ سے یہ نظریات یقین کی منزل سے آج بھی پرے ہیں۔

سائنس کا طریقۂ عمل : نت نئی ایجادات وجود پذیر ہوتی رہتی ہیں اور اکثر یہ ہمارے گھر میں بھی پہنچ جاتی ہیں۔ عموماً یہ پتہ نہیں لگتا کہ یہ کب اور کیسے وجود میں آئیں۔ اس بات سے آپ یہ نہ سمجھیے کہ سائنس دانوں کا کام بہت آسان ہوتا ہے۔ یا یہ کہ ایجادات اتفاقی طور پر وجود میں آجاتی ہوں گی۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی جس نے ہماری دنیا کی رنگا رنگ زیبائش کی ہے، وہ سائنس دانوں کی مدتوں کی سخت ترین کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مشہور سائنس دانوں کے حالات زندگی پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ علم کے ان رہبروں نے عام طور پر دکھ اور مصیبت کی زندگیاں گزاری ہیں۔ خود ان کی زندگیاں جہنم کی زندگی کا نمونہ کیوں نہ رہی ہوں مگر انھوں نے جو کچھ دریافت کیا اور جو کچھ ایجاد کیا، اس نے یقیناً دنیاوی شب و روز کو جنت میں بدلنے کی کوشش کر ڈالی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے کہ عام طور پر ایجادات اتفاقی نہیں ہوتیں بلکہ سائنس داں کام کرنے کا ایک خاص ڈھنگ اپناتے ہیں اور اس طرح کسی دریافت تک ان کی رسائی ہو جاتی ہے۔ اس خاص سائنسی طریقۂ عمل کے سات درجے ہیں جو مختصر خاکہ میں ہم اس طرح بیان کرسکتے ہیں۔

۱۔ کام کرنے کے لیے دلچسپ مسئلے کی تلاش کی جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ مسئلہ کیا ہے۔
۲۔ مسئلے کو حل کرنے کے لیے ضروری اطلاعات و اعداد و شمار حاصل کیے جائیں۔
۳۔ ممکن حل سوچے جائیں۔
۴۔ ممکن حلوں کو تجربات اور حقائق کی روشنی میں جانچا جائے اور نامناسب حلوں کو خارج از امکان کیا جائے۔
۵۔ اپنے مشاہدات کا اندراج کیا جائے۔
۶۔ اپنے مشاہدات کی روشنی میں نتائج اخذ کیے جائیں۔
۷۔ اخذ کیے گیے نتائج کو نئے یا ملتے جلتے مسائل کو حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔

اگر آپ اوپر بیان کیے گئے طریقے پر عمل پیرا ہیں تو یقیناً آپ سائنس کے راستے پر جا رہے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جو علم کا راستہ ہے یعنی سچائی کا راستہ ہے۔ اس راستے پر قدم جمانا کسی بھی عبادت سے کم نہیں۔ یہ سائنس کا راستہ ہے۔ اس راستے پر صرف روشنی ہی ہے۔ کیوں کہ سائنس جہالت کی ظلمتوں کو کھا جاتی ہے۔ وہ لوگ عقل اور ایمان کے دشمن ہیں، جو سائنس پر جہالت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے حال اور مستقبل دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ اس علم کو سمجھیں اور اپنائیں جو کہ ہماری زندگی میں گھر کر چکا ہے۔ سائنس کو اس لیے بھی پڑھنا چاہیے تاکہ اس پر حاوی ہو کر ہم اس کو بہتر طریقے سے کام میں لا سکیں۔ اگر ہم سائنس نہ پڑھیں گے تو ظلمتوں میں گرفتار رہیں گے اور سائنس ہم کو اپنا غلام بنا کر رکھے گی۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ چاہے سائنس کی غلامی قبول فرمائیں یا پھر اس کو اپنا خدمت گزار بنائیں۔

فزکس سیکشن، ذاکر حسین انجینئرنگ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قدرت کے کھیل نرالے ہیں جب دانت دیئے ہے تو چنے نہیں ہوتے اور جب چنے دینے پر آتی ہے تو دانت ندارد۔ (۱ مشتاق احمد یوسفی، آب گم)

کچھ وہ ہیں جو دیتے ہیں اور دے کر خوش ہوتے ہیں، ان کی مسرت ان کی فیاضی کا انعام ہے۔ کچھ وہ ہیں جو دیتے ہیں اور دے کر ملول ہوتے ہیں، وہ ملال ان کی سزا ہے۔ مانگنے کو دینا کار نیک ہے، مگر نیک تر کام یہ ہے کہ بغیر مانگے سمجھ کر دیا جائے۔ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ سب ہی کسی دن تقسیم ہو جائے گا بس آج دو کہ دینے کا لطف تم کو حاصل ہو، نہ کہ تمھارے وارث کو۔ (۲ قاضی عبدالغفار، اس نے کہا)

عہدِ مغلیہ کے ہندو اطبّا

ڈاکٹر عبداللطیف ایم۔ڈی

طب یونانی ملک یونان میں پیدا ہوئی جس کی ابتدا ابوالطب اسقلیوس نے کی۔ لیکن بقراط ۴۶۰ ق م نے سب سے پہلے طب کو فنی حیثیت دی اور تصانیف کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ بقراط کی آواز کو جالینوس نے بڑھاوا دیا اور اس کے بعد طب یونانی یونان سے باہر نکل کر روم و مصر ہوتی ہوئی عرب کی حدود میں داخل ہوئی۔ عربوں نے طب کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے اور مذہبی تقاضوں اور اصولوں کی غرض سے طب کو عام بنانے کے لیے یونانی طب کی تمام تصانیف کو عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ طب یونانی کا سرچشمہ اپنے مرکز یونان سے نکل کر عرب کی سرزمین میں شامل ہوا۔ وہاں کی آب و ہوا اور ماحول سے اثرانداز ہو کر بغداد پہنچا اور دمشق و اسپین ہوتے ہوئے یورپ بھی پہنچ گیا۔ وہاں شیخ الرئیس ابوعلی سینا کی "قانون" اور زہراوی کی "التصریف" کو طبی تعلیم کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ "قانون" کا ترجمہ تیرہ[13] زبانوں میں کیا گیا۔

ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں شفاخانوں کی بنیاد پڑ چکی تھی ۔۹۸ھ میں سب سے پہلا شفاخانہ قائم ہوا جس میں طبیب اور جرّاح کا تقرر کیا گیا۔

ہندوستان اور عرب میں تجارتی تعلقات بہت وسیع تھے جس کے اچھے اثرات کی بنا پر ایک دوسرے کے علوم و فنون کے اثرات قبول کیے گئے۔ ہارون رشید کے دورِ سلطنت میں ہندوستان کا ایک وفد بغداد بھی پہنچا۔ خلیفہ ہارون الرشید بیمار ہوا۔ بغداد کے حکماء اس کا علاج نہ کر سکے۔ تب اس کے وزیر نے منکہ نام کے وید کو ہندوستان سے بغداد بلایا اور اس کے علاج سے ہارون رشید صحت یاب ہو گیا جس کی وجہ سے اب ویدک سے بھی فائدہ اٹھایا جانے لگا اور ہارون رشید نے خوش ہو کر منکہ وید کو شفاخانہ کا افسر مقرر کیا اور اس سے سنسکرت کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کروایا۔ اس طرح ہندوستان سے وید بغداد پہنچے اور اپنے ساتھ کتابوں کے علاوہ ہندوستانی جڑی بوٹیوں کو بھی لے گئے۔ مثلاً صندل، کافور، ترپھلا، جائفل، زعفران، زنجبیل وغیرہ۔ ویدک کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا۔ اس طرح تقریباً سولہ[16] کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ طب اس کے بعد ایران پہنچ گئی۔

گیارھویں صدی ہجری میں ایران طبی تعلیم کا بہترین گہوارہ تھا۔ ایران اور ہندوستان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اور اکبر بادشاہ کی علمی دلچسپیوں اور اس کے ذریعے کیے جانے والے مختلف میدانوں میں ترقی کے اقدامات کی وجہ سے مشہور و ممتاز طبیب ہندوستان پہنچ گئے۔ عہدِ مغلیہ طب کی ترقی کا سب سے سنہرا زمانہ تھا۔ مغلیہ دور میں تقریباً ڈھائی سو (۲۵۰) سے زائد مشہور و معروف طبیب گزرے ہیں جن میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی بھی تھے۔ لیکن یہاں صرف چند ہندو طبیبوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو کہ عہدِ مغلیہ میں بڑی مقبولیت رکھتے تھے۔ مشہور اطبّاء حکیم مہادیو، بھیم ناتھ، شیواجی، جرّاح بندرابن، بہارجیو جراح، بھیرون، درگامل، سکھانند، رگناتھ، کنول نین، مترسین ناگر، نین سکھ، وید نرائن، وید آلی، چندرسین وید وغیرہ تھے۔ ان اطبّاء کے بارے میں مختصر تذکرہ درج ذیل ہے۔

وید آلی:۔ عہدِ اکبری کا مشہور وید تھا جس کا تذکرہ طبقاتِ اکبری میں ہے۔ بندرابن جراح شاہجہاں کے دور کا ماہر جراح تھا شاہجہاں جرّاح کو بہت مانتا تھا۔ ایک واقعہ ہے کہ ۱۰۷۶ھ میں ایک دن بادشاہ کو تیل ملنے سے حرارت کی شکایت ہو گئی اور ساتھ میں پیشاب بند ہو گیا جس کے ساتھ پیچش کی شکایت بھی تھی۔ بندرابن کے علاج سے فائدہ ہوا لیکن کمزوری بے حد ہو گئی اور اسی کے بعد بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ بہارجیو اکبری دور کا مشہور اور ماہر جرّاح تھا جس کا تذکرہ طبقاتِ اکبری میں ملتا ہے۔ بھیم ناتھ بھی اکبر کے زمانے کا وید تھا۔ اس کا نام آئینِ اکبری میں موجود ہے۔ چندرسین وید دورِ اکبری میں گزرا ہے جو کہ جرّاحی میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ طبقاتِ اکبری میں اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز طبی کتابوں میں اس کے چند نسخے بھی درج ہیں۔ حکیم محمد اکبر ارزانی نے مجرباتِ اکبری میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ درگامل طبیب شہنشاہ اکبر کے دور میں طبیب تھا۔ طبقاتِ اکبری کے مطابق یہ بہت بڑا کحّال اور ماہر جرّاح خیال کیا جاتا تھا۔ بعض جگہ اس کا نام درگ مل بھی لکھا ہے۔ حکیم رگناتھ جہانگیر عہدِ حکومت میں گزرا ہے۔ سکھانند دورِ اورنگ زیب کا مشہور طبیب تھا۔ شیواجی بادشاہ اکبر کے درباری طبیبوں میں سرِ فہرست تھے۔ اس کا تذکرہ آئینِ اکبری میں بھی ہے۔ مہادیو دورِ اکبر کا طبیب تھا۔ مترسین ناگر ۱۰۸۹ھ میں زخموں کا علاج کیا کرتا تھا اور عقلمند سیاست داں ہونے کی بنا پر اپنے دور میں کافی مشہور تھا۔

اس مختصر تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان طبِ یونانی کی خدمات میں ہندو حضرات بھی پیش پیش رہے۔ یہ فن کسی ایک مذہب یا فرقے کی میراث نہیں رہا بلکہ انسان کی فلاح و بہبود اور علاج معالجہ میں جسے بھی دلچسپی ہوئی، اس نے اس کی ترقی میں حصّہ لیا۔

اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

عیاذ انصاری

مادرِ درسگاہ کا جوہرِ قابل

محمّد علی جوہر

برصغیر کی جنگ آزادی میں مادر درس گاہ علی گڑھ کے دو فرزند آفتاب و ماہتاب
بن کر چمکے لیکن اہلِ زمانہ سے زیادہ اس دور کی سیاسی غلط نگاہی سے دونوں ہی کچلا کر
رکھ دیئے گئے۔ جنگِ آزادی کی تاریخ میں دونوں بے مقام اپنے ہم سفروں میں ناکام
ثابت کر دیے گئے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ اور مولانا حسرتؔ موہانی سف
سے فرزندِ سپاہی مگر دونوں ہی گردشِ روزگار کی تاریکیوں میں گم۔ دونوں
کے ... کی بازآفرینی کا امکان کم سے کم ہوتا جا رہا ہے کہ ان کے ہمسفران سے روگرداں
ہیں ... کبھی روادار نہیں اور ان کے ہم جوار "ابنائے علی گڑھ" ان کی تخصیص
... ملم۔ بھارت میں اقلیت کا المیہ یہی ہے کہ حال کی بدحالیوں میں ان
... سے چھوٹتا جا رہا ہے۔ مستقبل کی راہوں کو وہ ہموار کرنا بھی چاہے تو
... اس کا کوئی نصب العین نہیں ہے وہ خلا میں معلق ہے۔

سیاست کی اس بوالعجبی کو کسی مردِ قلندر نے شطرنج کا گندہ کھیل بھی کہا ہے
... ارسطو کی بصیرت افروزی نے سیاست کو علم کے درجے سے اونچا اٹھا
کر ... منصب پر فائز کیا ہے۔

POLITICS IS NOT KNOWLEDGE BUT ACTION

دنیائے اسلام کی بڑی دین یہی ہے کہ اس نے سیاست کو شریعت
... کے درمیان ... عمل کو ایمان کے ساتھ مشروط کر دیا ہے کہ اس لزوم سے
... نظر کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور عمل کے زندہ نتائج سے حوصلوں کی بلندی
... کی استواری کا ظہور ہوتا ہے۔ محاسن کی ترغیب اور معایب سے اجتناب
... کی زندگی میں چاہے ناقدری محسوس ہو لیکن اچھائی کو ہر جگہ اچھائی اور برائی
... برائی سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہی عملِ صالح ہے۔ انسانی فلاح و سعادت
... فالِ نیک ہے۔ صالح عمل اور اس کے لیے محمد علی کا جہد ان کی شخصیت کا
... امتیاز ہے!

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تہذیبی زندگی میں، اس ایک سہ حرفی لفظ جہد
... تہذیبی ہے وہ محتاجِ تفصیل نہیں کہ اسلامی تاریخ کا ہر طاقتور عمل
... سہ حرفی لفظ سے متمسک ہے۔ عسکری سطح پر، اعلائے کلمۃ الحق کے لیے سینہ سپر
... جاں سپری کی نذر پیش کر دی۔ بلاشبہ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانیت کی

انگوٹھی کا نگینہ وہ مجاہد ہے، جس مصدر کا مشتق مجاہد ہے۔ مجاہدہ اور جہاد بھی
اسی جاہدہ کے مشتقات ہیں۔ جہاد بالسیف سے گزر کر بالنفس یہی جاہدہ بالقلم
باللسان، بالفعل اور بالعمل ہے۔ پوری زندگی پر حاوی اس جہد سے مسلمان کے
شب و روز کا کوئی گوشہ خالی نہیں۔ مصاف زندگی میں وہ ہمہ وقت مجاہد ہے
تو مقصدِ توحید پورا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے سماجی عمل کو علامہ اقبالؔ نے بڑی
بصیرت افروزی سے تشکیلِ جدید میں پیش کیا ہے۔

"اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ سیاست؛ اصول توحید کو انسان کی
جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے،
اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لیے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لیے اور
چوں کہ ذاتِ باری زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے
اس کی طاعت کا در اصل مطلب یہی ہے کہ انسان خود اپنی معیاری
فطرت کی اطاعت کرتا ہے۔"

اصولِ توحید کو زندہ عنصر بنانے کا تقاضا پھر یہی جہدِ عمل ہے کہ زندگی کا رزم
قول و فعل، قلب و نظر حتیٰ کہ سماعت و لمس بھی طاعت کے لیے مصروفِ عمل ہے۔
تو انسانی زندگی میں اس عبدیت کا ظہور ہوتا ہے۔ علامہ نے جسے معیاری
فطرت کہا ہے۔ اسی بنیاد پر عشق کا قصرِ مشید تیار ہوا اور مومن کے خد و خال
علامہ پر روشن ہوئے۔

مولانا محمد علی کی زندگی کا جائزہ اگر استنتاجی زاویے سے لیا جائے تو
علامہ کے فکری محور سے ان کا جہد بہت قریب نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علیؒ اور
مولانا حسرتؔ موہانیؒ کی فرزانگی کو دیوانگی کہنے والے پھر وہی ہیں، خرد کو جنوں
اور جنوں کو خرد کے ابہام میں، جو آنکھ محمد علی اور حسرت کے عشق کے ملاحظے سے
معذور رہی ہے ؎

عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

ابن قیمؒ کا یہ قول بڑا ساکت جواب ہے کہ جو شخص شریعت اسلامیہ کو مخلوق
کی سیاست سے قاصر سمجھے اور اس کو جمیع دینی و دنیوی پر حاوی نہ جانے وہ
نرا جاہل ہے۔ ان کے نزدیک اس جہل ہی کی وجہ سے اربابِ سیاست کو شریعت

...مخالفت بہ جرأت ہوئی ہے۔

مولانا محمد علی کو ابن السبیل کا مقامِ عشق حاصل رہا یا نہیں رہا اس پر دو رائے کا امکان ہے، لیکن اس شخصیت کے گوشے ان کی ہزار مقامی سے روشن ہیں۔ مولانا کی زندگی جہدِ مسلسل ہے۔ ان کے سفرِ زندگی میں مقامِ عشق وہ ہے جب ہمسفروں کی شماتت سے اپنے عمل کی ہزیمتوں اور شکستوں کے ہجوم میں، مایوسیوں اور دل برداشتگیوں کو راستے سے ہٹاتے ان کی خودی تجسس کی راہیں بدلتی، جہد کی راہوں کی سمت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ سیرت کی یہ مضبوطی ان کا عشق و ایمان ہے اور عمل کا ظہور ان کا جہد ہے۔ ان کی سیرت ہمیشہ اس کی مقتضی رہی کہ سخت وقت کا صبر کے ساتھ مقابلہ اور پوری ہمت و جرأت کے ساتھ، جہد کی استقامت کا ظہور ہو۔ ان کا قدم کبھی بھی ڈگمگاتا نظر نہیں آتا۔

فاتح مصر حضرت ابوالعاص، اسلامی عسکریت کے ماہ دفتری ہیں۔ ان کا ارشاد ہے۔ "ایک قدم کی پسپائی کے بعد دوسرے قدم کو آگے بڑھا دینے کی ہمت اور جرأت ہی اسلامی سیرت ہے۔" دائم المریض محمد علی رح طبعی عوارض کی حوصلہ شکن معذوریوں میں بھی ان کی وہ سربلندی، آواز کی وہ گھن گرج، وہی اعتماد و وقار، وہی بے لاگ تنقید، آخری سانسوں میں بھی جہد کے تقاضوں کو اس ہزار مقامی ابن السبیل نے پورا ہی کیا ہے۔ برطانوی جبروت سے ٹکر لینے والا، دنیا کی عظیم ترین شہنشاہیت کو جھنجھوڑ کر متزلزل کر دینے والا زندگی کی آخری ہچکیوں میں وہی ایک جاہد تھا کوئی مردِ بیمار محمد علی نظر نہیں آتا۔ ان کے آخری بیان سے ان کی شخصیت کی قامت کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوالعاص کا فرمودہ وہ دوسرا قدم ہی تھا، جو سکراتِ موت میں بھی آگے بڑھنے سے رک نہ سکا۔ سیرت کی مضبوطی، عمل کا خلوص، ایمان و ایقان کی استقامت اسے نہ کہیے تو اور کیا کہیے!!

مولانا عبدالماجد دریابادی اور معروف صحافی رئیس احمد جعفری مولانا محمد علی کے مشہور و مستند سوانح نگار ہیں۔ ان دونوں نگارشات میں محمد علی کے دموں کی الٹ پھیر کی کھتونی تو تیار ہوئی لیکن ان کے جہد کی وہ موج جو عمل کی سان پر چڑھ کر تلوار کی دھار بنتی تھی، ان سوانح عمریوں میں جزئیات سے کلیات کا استنباط کا وہ آہنگ نہیں ابھرتا۔ "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" دوسری طرف وہ ہجوم بے خبراں ہے جس نے محمد علی کی شخصیت سے زیادہ، ان کی ذات کو ہدف بنا کر صحافتی انداز کے منفی تاثرات کا کیچڑ اچھالا۔ ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر مہودے اس گروہ کے سرخیل تھے۔ اخبار کے کالم محمد علی کے خلاف وقف رہے اور کوئی گھات اور داؤں انھوں نے ایسا نہیں چھوڑا۔ محمد علی کو معطون کرنے اور الزام لگانے کی جس پر موصوف کو دسترس تھی۔ مسلم اکثریت کے صوبے پنجاب میں وہاں کی غیر مسلم اقلیت کی ہنگامی بالادستی اس صوبے کے آریہ سماجیوں کو ہر قیمت پر عزیز رہی ہے اور یہ اخبار ان مفاد پرستوں کی سرپرستی اور ہمنوائی میں محمد علی پر الزامات کی بوچھار کرتا رہا ہے کہ ہندوستان میں محمد علی شریعت کی بازیابی چاہتے ہیں کہ اس ملک کی اکثریت پر وہ اقلیت کی بالادستی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہندوستان پر افغانستان کے حملہ کا تراشیدہ الزام سے کانگریس میں محمد علی مخالف ہجوم کے ذہن کی کدورت کبھی صاف نہ رہ سکی۔ انھوں نے اس الزام کو بالآخر انگریز کی مدد سے محمد علی کے خلاف سازش بنا لیا۔ اس سازش سے جن دوررس نتائج کا ظہور ہوا، اس سے وہ لاعلم ہی رہے کہ اس سازش کے اسباب میں برصغیر کی تقسیم کے ساتھ، عظمت برطانیہ کے زوال کا سبب بھی شامل ہے لیکن موقتی طور پر انگریز اور اس کے حلیف سازش ہندوستان کے ابھرتے سرمایہ کار اپنی من مانی کرنے میں کامیاب ہی رہے۔ کانگریس کا محمد علی مخالف گروہ اس تعلق کو مجروح کرنا چاہتا تھا جو خلافت کانگریس اتحاد سے گاندھی جی اور محمد علی کے درمیان مضبوط ہو کر ایک جان ہو گیا تھا اور اکثریت اقلیت کے متنازعہ مسائل ایک بے لوث یک ذہنی میں ختم ہوتے جا رہے تھے۔ یہ یک جہتی مفاد پرستی کے مزاج کے موافق نہیں تھی اور اس لیے محمد علی کے خلاف سازش میں وہ کامیاب بھی رہے کہ ترکِ موالات میں مشترک قومیت کی ابھرتی ننھی کونپل مفاد پرستی کے ہاتھوں بار آور شاخ بننے سے پہلے ہی مسل دی گئی۔

محمد علی دین اور عقیدے کے مضبوطی کے ساتھ، اپنے تہذیبی ورثہ کی استواری کو برصغیر کی آزادی کا لازمہ قرار دیتے تھے۔ مادہ اور روح کی ہم آہنگی کے ساتھ، معاد و معاش کے اعتدال کے لیے قوم و ملت کی ہم آہنگی مولانا کو عزیز تھی۔ وطن کی خاک کو سونا، کانٹوں کو پھول اور پانی کو آبِ حیات کہتے محمد علی بھی تھکتے تھے۔ اپنے ہمسفروں کے اس مطلب کو وہ حرف بہ حرف قبول کرنے والے محبِ وطن اور جنگِ آزادی کے سورما ثابت ہوئے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ملت کے لیے وہ سینہ سپر اتنے ہی جوشیلے مسلمان تھے جس قدر وطن پر نثار ہو جانے والے وہ سپاہی تھے۔ سرسید کے بیت الفکر کا یہ علم بردار گلے میں قرآن حمائل کیے، باللسان و بالقلم و بالعمل جہد سے آراستہ معاف زندگی میں سرگرمِ عمل نظر آتا ہے۔ ملت اور قوم کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ امرتسر اتحاد کے شریک ہوئے تھے۔ ان کا بنیادی تصور یہی تھا کہ وہ کسی ایسے فکر کے شریک نہیں ہو سکتے جس سے ان کے عرفان پر آنچ آتی ہو یا برصغیر میں ملت کی وحدت مجروح ہوتی ہو۔ آزاد ہندوستان پر ان کا تبصرہ صاف اور سادہ تھا۔ وہ کھول کھول کر تکرار کے ساتھ یہ بات کہتے رہے کہ ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت عوام کا مستقبل ایک ہے۔ غربت، جہالت اور بیماری سے نبرد آزما، رام اور رحیم میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے۔ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت ہے تو پورے ہندوستان میں وہ اقلیت میں ہیں۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کی اقلیت کے اقتصادی، تہذیبی اور ثقافتی تحفظات کی ہم پوری ذمہ داری

دیتے ہیں۔ یہ ہمارا وعدہ ہے اور ایفائے عہد مسلمان کا ایمان ہے۔ جس اعتماد
کے ساتھ ہم یہ ذمہ داری لے رہے ہیں، اسی خوش دلی کی امید کے ساتھ ہم
مسلم قومیت کی حفظ و بقا کے خواہش مند ہیں اور اسی بنیاد پر سندھ اور بلوچستان
کی آزادی چاہتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تصنیف باز آفرینی ہند میں کانگریس
کے صدر محمد علی کے سکریٹری کی حیثیت سے جو تاثر محمد علی کی شخصیت کا دیا ہے،
پنڈت جی کا ذہن مولانا کی حب الوطنی پر بالکلیہ صاف ہے۔ وہ برصغیر کے کسی
بھی محب وطن سے محمد علی کو دوسرے درجے پر نہیں رکھتے لیکن اعتذار
کے ساتھ مولانا کے مذہبی حاشیہ پر شبہ بھی ہے کہ ہندوستان کی ابھرتی قومیت
سے وہ متصادم ہے۔ پنڈت جی کے تاثر پر کوئی تنقید یہاں مقصود نہیں ہے
لیکن اس کو کیا کہیے کہ خود پنڈت جی خود اسی قومیت کے پرستار تھے۔ انقلاب
فرانس کے بعد جو ابھر کر یورپ میں عام ہوئی اور اس نے یورپ کے کائناتی تصور
کو ڈھیر کیا۔ یورپ میں کلیسا کی مرکزیت کا خاتمہ اسی مبہم تصور کا نتیجہ ہے۔ عبد و معبود
کے درمیان جو رشتہ اٹھارویں صدی تک مضبوط تھا، انیسویں صدی کی اس قومی
عصبیت نے اس تعلق کو خود ساختہ وطن کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ پچھلی دو صدیوں
میں یورپ کی قومیتوں کی باہمی رقابتوں کا وہ طوفان اٹھا کہ آج مغرب کی تہذیب
اس کی زد سے باہر نہیں ہے۔ وہ متزلزل ہو چکی ہے۔ زوال کا مادہ یہ تہذیب بربادی
کی سمت جھکی چلی جا رہی ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مغربی تہذیب کا یہ قصر مشید
[illegible]

امریکہ کے مشہور سیاح مسٹر وِنڈل ویکی نے پوری دنیا کے گرد گھوم کر اپنے
ملک کو باخبر کیا ہے کہ اگر اس نے محدود قومیت کے انحصار کو نہ توڑا تو وہ دن
دور نہیں جب اسے اپنی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ انھوں نے بین قومیت اور ایک
دنیا کے تصور کی مضبوطی کا مشورہ بھی دیا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے امریکن
سیاست سے پہلے اسی نئی دنیا اور اس کے رہنے کے لیے نئے آدم کی پیش گوئی
کر دی تھی۔ "فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے
ایک نئی دنیا کی تعمیر کر رہی ہے"۔ (دیباچہ پیام مشرق ۱۴)

دنیا کے عظیم مفکروں نے متعدد بار نئے آدم اور اس کی نئی دنیا
کی تعمیر کے نقشے بنائے، تصورات کو جنم دیا اور نظریات قایم کیے۔ انقلاب فرانس
اس کی واضح مثال ہے۔ اٹھارویں صدی میں خود مختاریت کے خلاف ردّ عمل سے
انسانیت پر ایک انسان کی مستبد حاکمیت کو معزول کر کے انقلاب فرانس نے انسانی
مسائل کا جو راستہ ڈھونڈا تھا، افسوس ناک حد تک عمل کی کسوٹی پر وہ کھرا سونا ثابت
نہیں ہوا۔ کوئی عقلی استدلال انقلاب کے فکری تصور کا ثابت نہیں تھا۔ لیکن قوت
نے عمل کی راہوں کو روک کر جمہور کے ابھرتے اس حق کو اپنی مرضی اور منشا کے
مطابق ڈھال لیا۔

۱۷۸۹ء کے انقلاب میں ایسا کوئی خطرہ چھپا نہیں تھا جو قومیت، جمہوریت
اور نووارد اس اشتراکیت کی تاریخی قوتوں کے منفی نتائج میں ظاہر ہوا۔ انقلاب فرانس
کا فکر اس کے عمل کے تصور کی وجہ سے غلط راہوں پر جا پڑا اور نیا انسان ہونے کے
باوجود وہ بہیمانہ خصائل سے باز نہیں رہا۔ اور اس کی فریدہ نئی دنیا ظاہری طمطراق
کے باوصف جنگل کا قانون ہی نہیں رہی کہ جس کی قوت زیادہ، اسی کو جینے کا حق زیادہ
ہے۔ انسانی بہیمیت پورے شباب پر ہے۔ آج بھی وہی الجھے الجھے بالوں والا، تیز تر
دانتوں والا، وحشی صفت انسان اپنی ہی جنس پر ناخن ہوس تیز کرتا نظر آتا ہے
مسٹر البرٹ شوزر ALBERT SCHNATZAR نے کیا خوب کہا تھا کہ انقلاب
فرانس کی فکری نوخیزی کو برف باری نے برباد کر دیا۔ اٹھارویں صدی کی لگائی
یہ پود، انیسویں صدی میں ٹھٹھر کر بے ثمر ہو گئی۔ مارکس نے انقلاب فرانس کو
اس دایہ سے تشبیہ دی جس نے سماج کے پیٹ سے وہ بچہ جنوایا جو ستاروں کی گردش
کا مارا آسیب زدہ تھا۔ عارف ہندی (غالبؔ) نے کسی ایسی ہی نیم پخت
تولید کی بڑی خوبصورت نشاندہی کی ہے ؎

تو پست فطرت اور خیال بسا بلند
اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند

روس میں اشتراکیت کا دورِ حاکمیت طفل خود معاملگی کی بڑی واضح مثال ہے
کہ بہ زورِ عصا سماج کو دھکیلتے چلتے اور ہنکاتے وہ اپنی ہی سمت موڑتے نظر آئے
انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کے سبب کی یہ تولید بھی قومیت کی عصبیتوں
اور رقابتوں کے اعصابی تناؤ کی حریف ہی ثابت ہوئی۔

مفکرِ اعظم مارکس کے فکر کا نیا آدم اور اس کے رہنے کی نئی دنیا کا خواب
بھی شرمندۂ تعبیر ہی رہا۔ انگلینڈ، فرانس، جرمنی اور پرتگال کے متوازی روس
اشتراکیت کی طفل خود معاملگی اسی افتراق و انتشار میں ظاہر ہوتی جا رہی ہے۔
جس عصا بلندیوں نے یورپ کی عظیم شہنشاہیوں کو جنم دے کر خاک آلودہ کر دیا
ہے۔ اشتراکیت بھی چین، پولینڈ اور جرمنی کے منطقوں میں بٹ کر ایک دوسرے
سے مبارز طلب ہے۔

پچھلی دو بڑی جنگوں کا سانحہ اور اُن کا درمیانی وقفہ تاریخ عالم کا
ایک عبرتناک صفحہ ہے جس پر مغرب کی تقدیر کندہ ہے (واذا قیل لھم لا
تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون الا انھم ھم المفسدون
ولکن لا یشعرون) (جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد نہ کرو
تو کہتے ہیں ہم تو صلح قایم کرنے والے ہیں۔ حالاں کہ وہی ہیں جو فساد کرنے
والے ہیں، لیکن اس سے وہ بے خبر ہیں)۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب
بھی فتنہ و فساد کا سیلِ رواں انسانیت کے سر سے گزرنے لگا ہے تو

خدا کی وسیع رحمت، اس کا لطفِ عام، قدرت کاملہ اور علم محیط اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ وہ ان قوتوں کو ڈھیلا کر دے اور ایسے ذرایع اور وساط پیدا کر دے کہ معاشرے کی بدنگامی اور بے زمامی معتدل رہے۔ یہی ربوبیت ہے کہ اگر ایسے حالات میں وہ مائل بہ کرم نہیں ہے تو تاریخ کے وہ حادثات بھی محفوظ ہیں کہ جہاں مفسدین فی الارض قانون مکافات کی زد میں شئی مذکورہ بن کر رہ گئے ہیں تاریخ تہذیبِ عالم کے مقتدر مولف۔ اے۔ بری۔ فالٹ (A BRIFAULT) نے زوال روم کی جو توجیہ کی ہے وہ قرآنی فرمودات سے بہت قریب ہے "ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل پر ہے کبھی قایم نہیں رہ سکتا۔ اس باطل کو چاہے انسانوں کی طاقتور سے طاقتور جماعت پورے تدبر و دانشمندی سے چلانے کا دعوی کرے اس کا خارجی نظم جزئی مرمت سے باطل کی بنیادی کمزوری کو کبھی رفع نہیں کر سکتا، جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لیے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص طبقے کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انھوں نے حکومت کو بڑی قابلیت اور محنت سے آگے بڑھایا لیکن حسنِ انتظام کی تمام خوبیاں بنیاد کے باطل کو اس کے غلط نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا روک ٹوک نتیجہ خیز ہو کر رہے۔"

اس صدی کی دو بڑی جنگوں کے درمیانی وقفہ کی باطل بنیادوں اور اس کے ردعمل کو علامہ اقبال نے بڑی چابکدستی سے یوں کہا ہے ؎

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

زوال مغرب پر کوئی پیشنگوئی مقصود نہیں ہے ہاں مجھے پچاس سالہ اس طغیان کا تاثر پیش کرنا ضروری ہے۔ جو سینما کے پردے کی طرح ان آنکھوں کے سامنے سے گزرا ہے۔ مغرب کی غلط نگاہی سے جب یہ طوفان انسانیت کے سروں سے گزرنے ہی لگا تو باری تعالےٰ کی قہاری و غفاری کائنات میں تخریب و تعمیر کے لئے جاری و ساری رہی اور نئے آدم اور نئی دنیا کی تخلیق میں اس کی مشیت الذی خلق فسوی والذی قدر فھدی کے تخلیقی عمل میں ظاہر ہوتی رہی۔ پروفیسر C. LOYD MORGAN نے ارتقاء نفس کو خدا کی تخلیق و تہدیہ قوت (CREATIVE & DIRECTIVE POWER OF GOD) کیلئے

ارتقاء نفس ہی نہیں کائنات کے ذرہ ذرہ میں، خلق فسوی قدر فھدی کی منزلوں سے گزرتی ہوئی اس کی مشیت پوری ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے سرمایہ داری نظام کی سفاکی کا ردعمل اشتراکیت کا ظہور تھا جو خود ایک منزل تھی مگر موقتی طور پر جزا کی تعمیری شکل میں پورے طمطراق کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ برطانوی سامراج کا زوال مقدر تھا۔ اس عظمت کے زوال کے ساتھ اشتراکیت کو آزاد چھوڑنا بھی حکمت خداوندی کے مطابق نہ ہوگا کہ

تخریب و تعمیر کے اس تخلیقی عمل میں، امریکہ کی تعمیر کو اشتراکیت کا محیط بنا دیا کہ اشتراکیت کی تشدد پسندی اپنی حدود سے آگے نہ بڑھ پائے۔ یہ باری تعالےٰ کی غفاری ہے کہ دونوں ان قوتوں کو فی الوقت متوازن رکھا ہے۔ معاذاللہ مشیت کا تقاضا قہاری جب بروئے کار ہوگا تو ایک لمحہ بھی نہ گزرے گا کہ دونوں یا اُن میں سے کوئی ایک قانون مکافات کی زد میں "شئی مذکورہ" بن کر رہ جائے گی۔ برطانوی عظمت کی طرح یہ تو صاف نظر آ رہا ہے کہ فطری تعزیران میں سے کسی ایک کا مقدر ہو چکی ہے۔ اس طوفان کی بربادیوں میں زندگی کی فرسودگی اور بوسیدگی، مگر صاف ہو کر ڈھل کر، نکھر کر نکلے گی کہ ایسا ہمیشہ ہوتا رہتا اور ایسا کئی مرتبہ ہوتا رہے گا۔ مسرتوں اور مسکراہٹوں کی زندگی بڑے بڑے طوفانوں کے گنج باد آورد ہی سے انسانیت کو میسر ہوئی ہے۔ یہ بات تو آنکھوں دیکھی ہے کہ برطانوی عظمت کا زوال ہی برصغیر کی قسمت کا جمال بن کر چمکا ہے۔

ہندوستان میں نئی دنیا اور نئے آدم کے تخلیقی عمل کی پیداوار ادارا دن محمد علی ہیں۔ اس صدی کی پہلی دہائی برطانوی حکومت کے طمطراق کا دور تھا۔ اس دور کے ایک صحافی کی جرأت کو داد دیجیے کہ انسانیت کے خدمت کے جذبے میں اس کا قدم آگے بڑھا، وہ جہد بالقلم سے آگے جہد بالعمل کے میدان میں اتر پڑے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں یہ حوصلہ محمد علی کا تھا کہ وہ یورپ کے مردِ بیمار ترکی کی مدد کو دوڑ پڑے۔ ہلالِ احمر کی تشکیل محمد علی کے ملی شخص کی پہلی منزل تھی۔ دوسری منزل بھی دور نہ تھی۔ ترکوں کے سیاق و سباق میں کامریڈ کے ذریعے ہندوستان کی قومی زندگی میں ملی وحدت کی ہم آہنگی کا آغاز میں انھوں نے ہندوستان کی پریشان بداحوال اقلیت میں تہذیبی قدروں کے تحفظ کا رجحان پیدا کیا۔ مولانا آزاد کا "الہلال" اور محمد علی کا اخبار کامریڈ برصغیر کی مسلم اقلیت میں خود آگاہی کے سنگ میل ہیں۔ ہندوستان کے کسی اخبار کا یہ دم خم نہیں تھا کہ وہ حکومت کے اقتدار کو للکار دے۔ کامریڈ نے حکومتِ وقت پر تنقیدوں اور تبصروں میں آزادی کا جو معیار اس وقت قایم کیا وہ ہماری قومی صحافت میں غیر ملکی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے کا پہلا قدم تھا۔ الہلال اور کامریڈ دونوں کی اولیت ان کی افضلیت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا چرچا ہوا تو مولانا محمد علی بیتول میں نظر بند تھے۔ رولٹ ایکٹ کا نفاذ ہو رہا تھا۔ گاندھی جی کا ردعمل، ترکوں کی شکست کا اضمحلال اور جلیانوالہ باغ کے ملال کے تاثر لیے وہ سیدھے امرت سر پہنچے کہ یہاں کانگرس اور خلافت کمیٹی دونوں کے اجلاس ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ جلیانوالہ باغ کا المیہ ہندوستان کی ابھرتی سیاست میں جنگ آزادی کی تاریخ کا نقطۂ آغاز ہے۔ فکر و عمل کے اتحاد کی بنیاد جلیانوالہ باغ ہے۔ ہندوستان کے عوام کی قوت کی وہ علامت بھی جلیانوالہ باغ ہی سے ابھر کر اتنی سربلند ہوئی جس نے ہندوستان

نلوت ہی کو بلند کر دیا۔ اس صدی کی دو عظیم جنگوں کی فاتح قوت جس کی حریف
ن کا وہ نحیف و ناتواں، مشتِ پر انسان موہن داس کرم چند گاندھی برطانوی
سامراج کے مقابلے تہی دست، بے سر و ساماں، یکہ و تنہا کھڑا تھا۔ یہ جنگ بھی
[illegible] بھی [illegible] بے جوڑ، مقابلہ و محاربت کا کوئی پیمانہ تھا نہ مبارز طلبی کا
[illegible] رولٹ ایکٹ کے خلاف وہ نحیف سی آواز کیا ابھری کہ حریف نے طبلِ
[illegible] بجا دیا اور پھر فوج کے گرجے بادل، کوہ تھرائے، زمین ہل گئی، گویا
[illegible] مغرب و مشرق کی کشمکش میں جنرل ڈائر کی جلادیت کتنی عریاں اور برطانوی
[illegible] قدر پست نظر آتی ہے۔ ورڈز ورتھ نے کسی ایسی ہی سفاکی کی علامتی
[illegible] تھی جو جلیانوالہ باغ کے حادثے پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔

A degrading thrusti a[illegible]
An outrageous stimulation

بھائی پنڈت مدن موہن مالویہ جیسے ثقہ بزرگ محمد علی کو اپنی آغوش میں
[illegible] سیاست کے میدان میں لائے اور خود ہی انھوں نے کانگریس کی ممبری کے لیے
[illegible] نامزد کیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ جاگا، مشترک قومیت کا تصور بیدار
[illegible]، کانگریس خلافت اتحاد ہوا تو اسی آسمان تلے۔ اقلیت میں ملت
[illegible] کی ہم آہنگی کے شعور کا وہ پہلا دن تھا۔ قومی تحریک کے [illegible] روح
[illegible] زندگی کی [illegible] دوڑی تو اسی دن اور وہ دن وہی سعید دن تھا جب محمد علی
[illegible] میدان میں پہلا قدم رکھا۔ خلافت کی طرف سے قومی تحریک کی امانت
[illegible] ہوا تو قومی تحریک کے روحِ رواں موہن داس کرم چند گاندھی نے
[illegible] آزادی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اتحاد کا یہ کوئی نوشتہ میثاق تو تھا نہیں
[illegible] رواداری، ایثار و قربانی، اعتبار و اعتماد کی بنا پر محبت و مودت کا
[illegible] ماحول تھا جس میں مغربی طرز کے افکار سے زیادہ انسانی نصب العین کے
[illegible] نقوش ابھر آئے تھے۔ افریقہ سے واپسی کے بعد چھ برس تک گاندھی جی
[illegible] کے جذبہ آزادی کی صداقت پر مشتبہ رہے۔ کانگریس خلافت اتحاد کا
[illegible] پہلا دن بھی تھا جب وہ عدم تشدد کے تجربے کو عمل کی جوت دینے پر مائل
ہے۔ انھیں اپنے تجربے کے لیے ایسے خام مسالے کی ضرورت تھی کہ ان کے
[illegible] کو قوت ملتی رہے۔ خلافت کی ہاری ہوئی بازی پر داؤں لگنے سے
[illegible] تکلف اس لیے نہیں تھا کہ اس کھیل میں جذبے کی فراوانی موجود تھی۔
[illegible] کے سامنے حفظِ ناموس کے سوا دوسرا کوئی مسئلہ اہم نہ رہا تھا۔

[illegible] جنگ عظیم کے نتیجے میں جرمنی کی شکست کے ساتھ، ترکی نے بھی
[illegible] کے سامنے ہتھیار رکھ دیے تھے۔ جنگ کی فتح مندی کے نشے میں چور
[illegible] قوتوں سے متجاوز ترکی سلطنت کو بے مقام کر دینے کی سازش مکمل تھی
[illegible] تین سو سال سے عالم اسلام کے تمام مقدس مقامات کی حفاظت سے
زیادہ خدمت کی ذمہ داری بالکلیہ ترکی سلاطین پر رہی تھی۔ اب یہ خوف نگاہوں
میں منڈلانے لگا تھا کہ مقاماتِ مقدسہ کے ساتھ ارضِ حرم و کعبہ بھی بلاواسطہ
انگریزوں کے قبضے و تصرف میں رہے گا۔ سارے مسلمان ترکی کی شکست سے ملول
و محزون تھے۔ ترکی کی بحالی کے لیے مولانا عبدالباری کی زیرِ قیادت ایک جماعت
لکھنؤ میں قائم کی گئی کہ خلافت کی بحالی کے لیے ہندوستان کی رائے عامہ کو ہموار
کیا جائے۔

ہندوستان کی سیاست ان دنوں الگ الگ جماعتوں میں بٹی تھی۔ کانگریس کا
مسلم لیگ کے ساتھ برائے نام تعاون ضرور تھا لیکن حقوق طلبی کی کاغذی کارروائیوں
سے آگے بڑھ کر کسی بھی جماعت نے کوئی ایسا عملی اقدام نہیں کیا تھا کہ حکومتِ وقت
پر رائے عامہ کا قرار واقعی دباؤ ڈالا جائے۔ گاندھی جی کی اولیت کی یہی افضلیت
ہے کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف ان کی وہ پہلی آواز تھی جس نے بحرِ سیاست کی ساکت
موجوں میں قوت و حرکت کا تلاطم پیدا کر دیا۔

گاندھی جی نے ترکِ موالات کی کشمکش کو اس خوبصورتی کے ساتھ مربوط کیا کہ
خلافت کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بھی بہ قول مولانا آزاد، دنیا کے لیے بین
قومی بنتا چلا گیا۔ ہندوستان کی یہی وہ عظیم خدمت تھی جو تاریخِ ہند کی اس عظیم
شخصیت مہاتما گاندھی نے انجام دی۔

ترکِ موالات میں وہ اقلیت کے جذبے سے اس قدر قریب ہے کہ
شبہ ہونے لگتا ہے کہ عملی سطح پر وہ محمد علی کے کندھے کے سہارے آگے بڑھ رہے ہیں کہ
جبہ و دستار والے ان مولویوں کی ذہنی کشادگی سے استفادہ کر رہے ہیں
جو ان کے گرد، آگے اور پیچھے ان کے ہر دم کے ساتھی بن چکے تھے۔ فرنگی محل اور
دیوبند کے علماء اور علی گڑھ کے احرار ترکِ موالات میں بس وہی تھے جو گاندھی
جی کے عدم تعاون کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ ادھر اقلیت کے جذبۂ ملی کو تسلیم کر کے
ہی انھوں نے خلافت کی عملی قوت حاصل کی تھی وہ پوری طرح مطمئن تھے کہ ملت
کی وحدت ہندوستان کی قومیت کی راہ میں سنگِ گراں نہیں ہے۔ اس دور
کے گاندھی جی کے بیانات، ان کی تقریروں اور تحریروں سے ان کے موقف کی
پوری پوری نشاندہی ہوتی ہے کہ اقلیت کے ملی مزاج سے وہ پوری طرح ہم آہنگ
تھے۔ یہ ان کی فکر کی پاکیزگی کا ثبوت بھی ہے اور مقصد میں خلوص کی مثبت
دلیل بھی ہے۔

امرت سر اتحاد سے مولانا محمد علی نے یہی تاثر لیا تھا کہ جس طرف گاندھی
جی چل رہے ہیں وہی راستہ عافیت کنار ہے۔ ہندو اور مسلمان مل کر نیکی کو بڑھاوا
دیں گے۔ انگریز سے گلو خلاصی ان کے نزدیک وقت کی سب سے بڑی نیکی تھی۔
اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف سودیشی تحریک، کھدر کی ترویج، شراب خانوں
پر دھرنا، انگریز کے نظامِ اخلاق اور اس کی تعلیم کا مقاطعہ، مفاد پرستی سے گریز،

مفاہمت کوشی سے روگردانی، باہمی رواداری، مساوات، محبت ومودت کی اجتماعی زندگی قایم رہے تو اس سے بڑی انسانی زندگی کی فضیلت اور کیا ہوسکتی ہے۔ گاندھی جی کے تصور کا یہی جنت نشاں ہندوستان تھا جس کے حصول کے لیے انھوں نے مغربی طرزِ فکر سے الگ خالص مشرقی بنیاد پر عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا۔ ان کے تصور کے ہندوستان کا کاشتکار، مزدور، صناع، ادیب، شاعر، محنت کش، دستکار عورت اور مرد، صبر وشکر کے ساتھ اپنی اپنی روزی کماتے، اپنے اپنے عرفان کی مضبوطی کے ساتھ، اپنے وطن کی حفاظت کے لیے سیسے کی پگھلائی ہوئی دیوار بنے، ترکِ موالات کی اخلاقی قدروں کو سینے سے لگائے سودیشی ان کا مزاج، تو کھدر ان کی معاش، اتحاد واتفاق ان کا عمل، ستیہ اور شانتی ان کا مسلک، سادہ معاش، صاف باطن، خود کفیل، بڑی طاقتوں کی رقابتوں سے محفوظ، زمکومت کو افراطِ زر کے مصنوعی دائرے بنانے کی ضرورت نہ ہتھیاروں کی دوڑ کے شریک، امن وشانتی کے گیت گاتے، قدر کفایت کے نغمے سناتے، خوش حالی کے ترانوں اور خود کفا کی سرخوشی وسربلندی کے ساتھ دنیا کی برادری میں ہم سرفرازی کی زندگی گزارتے ہوتے۔

ترکِ موالات کے ذکر وفکر میں اخلاقی قدروں کی قوت ہی کام کر رہی تھی۔ جو لوگ تحریک چلا رہے تھے، سب قابلِ اعتماد بزرگ تھے۔ اُس دور کے دلیش بھگتوں کا طائفہ فرشتوں کا جھرمٹ تھا۔ گاندھی جی اس کے سربراہ تو محمد علی قوتِ بازو، وہ قوت جس نے تحریک کو جبروت کا بل دے دیا۔ فرض کی ادائیگی میں جس قدر دور وہ جاسکتے تھے وہ اس منزل کی انتہائی بلندیوں تک پرواز کر گئے۔ ان کے عمل کے پھیلاؤ سے قطع نظر، کراچی کا مقدمہ اس عمل کا عروج، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام، مغرب کی دانش ورانہ بالادستی کے خلاف اور جدیدیت کے زہر آگیں نشتر کے بالمقابل، مشرقی اندازِ فکر کا طرفہ اظہار تھا کر علمی محاذ پر، معاد ومعاش کی ہم آہنگی کے ساتھ، برصغیر کی زندگی میں مشترک قومیت کا احساس بیدار رہے۔ جامعہ کے نصب العین پر اس میں ذرا شک نہیں کہ جس بے پایاں صبر واستقلال پر اربابِ جامعہ مصروفِ عمل رہے وہ اقلیت کے اجتماعی عہد بالعمل کی ایک روشن مثال ہی ہے۔ بیس برس کے اس مجاہدہ کے بعد، ملک کے سیاسی احوال کی بے ربطی اور باہمی بے اعتباری بد اعتمادی کی بیچارگی میں ترکِ موالات کی یہ باقیات الصالحات بھی انتشاری رجحانات کی شکار، عوامی فلاح کا یہ معمل بھی اقلیت کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

ترکِ موالات کی ناکامی میں جب بنیادی تحریک ہی ہم گنوا بیٹھے تو فروعات کے سود وزیاں کا ماتم بھی کیوں ہو۔ گاندھی جی۔ محمد علی کے فکر وعمل کے اتحاد نے جب افتراق وانتشار کا رخ اختیار کر لیا تو نظریات وتصورات کو نتائج کے حادثات کے ساتھ مطابق رکھنا ہی ممکن نہ تھا۔ محمد علی کو ناکام سیاست قرار دینے والے تحریکوں، اداروں اور جماعتوں کے تخلیقی عمل سے بے خبر ہیں کہ محمد علی کے عمل کے ساتھ گاندھی جی کے فکر کی گردن جڑی ہے۔ قوت کا بازو معطل ہوا تو فکر کا حسین تاج محل نگاہوں کے سامنے رہتا تو کیوں اور کس طرح، وہ بھی وقت کے ساتھ دھند بالآخر تاج نگاہوں سے مستور ہے۔ ترکِ موالات کے التواء کے بعد وہ ہندوستان تو خود گاندھی جی کی نظروں میں دھندلا چکا تھا۔

ترکِ موالات کے التواء اور ۱۹۳۰ء کی انفرادی ستیہ گرہ کے درمیانی وقفہ کو سیوا آگرام میں گاندھی جی کی خوش زندگی کہا جاتا ہے یہی وہ دور بھی ہے جب برصغیر کی سالمیت کی تقدیر گاندھی جی کی تدبیر سے متصادم رہی۔ وہ خود چرخہ چلاتے رہے، سوت کی انیٹوں میں وہ اپنی ذہنی الجھنوں کو سلجھاتے اور کبھی اور الجھاتے رہے۔ اپنے فکر کو عمل کی جوت دینے کے لیے محمد علی کی متبادل قوت کے لیے وہ اس وقت تک کامیاب نہ ہوئے جب تک ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ پر نوجوان جواہر لال کی کامرانی اُن کے سامنے متشکل نہ ہوئی۔ جواہر لال کی اہمیت کا احساس سب کو تھا۔ گاندھی جی کا احساس مگر موہوم نہ رہتا اگر جواہر لال کی کامیابی پر گرد دیو رابندر ناتھ ٹھاکر آنجہانی کی گفتار تبریک کا وثیقہ جواہر لال کی مٹھی میں دبا نہ ہوتا، گرودیو نے جواہر لال کی پیشانی کو مستقبل کے ہندوستان کی قسمت کا چمکتا ہوا ستارہ کہا تو گاندھی جی نے علی سرور میں اپنی آغوش جواہر لال کے لیے وقف کر دی۔ محمد علی قوت بازو تھے جواہر لال جگر گوشہ بن کر آئے۔ محمد علی تو کانگریسی حلقوں میں شانہ بریدہ تھے گاندھی جی کی آنکھ کا تارہ مگر ان کے تصورات ونظریات کے لیے بڑھاپے کی لاٹھی ثابت نہ ہوا اور یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں تھی۔ یورپ کی تعلیم سے ہندوستان کا ایک نوجوان، پنڈت نہرو سے زیادہ اور استفادہ بھی کیا کر سکتا تھا۔ ان کی علمی ذہانت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ ان کا اخلاص، وطن دوستی، حتی کہ اقلیت سے ہمدردی ہر شک وشبہ سے بلند ہے لیکن جس ماحول کی وہ پیداوار تھے وہ ماحول تو مغربی جدید اور مادی تھا، ان کا علم ان کا ذہن اور عمل اور فکر سب مغرب کا تحفہ تھا اور اکتسابی تھا۔ یورپ کے طویل قیام میں نوجوان جواہر لال نہرو نے ہندوستانی زندگی کے بالمقابل مغربی زندگی کے جن زاویوں کو دیکھا اور جن لذتوں اور راحتوں کا انہیں تجربہ ہوا وہ برطانوی تغلب وتسلط کا اگرچہ زوال آمادہ دور ہی تھا لیکن برطانوی شہنشاہیت کا پورا طمطراق ابھی موجود تھا۔ اس کی چکا چوند ان کی آنکھوں میں اور اسی کی تمنائیں اور آرزوئیں ان کے قلب میں سمائی رہیں۔ حب الوطنی کا یہ نرالا انداز ضرور تھا مگر اس میں نہ فکر کی گہرائی تھی نہ عمل کی گیرائی کا حوصلہ، سیاسی مفروضات کی لکیر کے فقیر، زندگی کے اس طمطراق کی باز آفرینی کی سعی میں انھوں نے اپنی پوری سیاسی زندگی گزار دی ہے۔ گاندھی جی کے فکر سے پنڈت جی کے عمل کے توافق کا کوئی منطقی جوڑ نہ

...ابھرتا۔ گاندھی جی کی مشرقیت، پنڈت جی کی مغربیت سے، ان کی قدامت
...ہرلال نہرو کی جدیدیت سے اور ان کی روحانیت نہرو جی کی مادیت سے
...ہونے کے لیے کسی بھی حدِ اتصال کی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد
...ھی جی کی فکر کو عمل کے اتحاد سے زیادہ افتراق کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس
...گیا کہیے کہ قوت کا سرچشمہ محمد علی کے لیے بھی گاندھی جی تھے۔ جواہر لال بھی
...قوں سے بے نیاز نہیں رہے۔ ترکِ موالات میں گاندھی جی کا فکری ہیولا برِ صغیر
...وم کے ذہنوں میں اتر گیا تھا۔ ان کا جذبہ عوام کے اجتماعی جذبے میں تحلیل
...ان کا شعور پورے ملک کا شعور بن گیا تھا۔ دنیا کے کسی بھی مصلح
...کو عوام کی وہ عقیدت نصیب نہیں ہوئی جو ترکِ موالات میں گاندھی جی
...نصیب ہوئی۔ سیوا گرام کی خموش زندگی میں مگر جواہر لال کے ساتھ جو
...بڑے بڑے نام آور قوم پرست اور انقلاب پسند اور آزادی کے
...گاندھی جی کے ساتھ شریکِ فکر و عمل ہوئے ——— لیکن وہ
...تھے جنھوں نے فکرِ گاندھی کو اُن کے تصور کے ہندوستان کے مقابل
...ہندوستان کو قایم کرنے کی کوشش کی جو ابھر کر پھر ۱۹۴۷ء کے آزاد
...رت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ برِ صغیر کی سالمیت کے اس جزوی ہندوستان
...کرنے والوں میں بلاشبہ گاندھی جی کو بھی اپنا آشیرواد دینا پڑا لیکن
...ہند کی ہولناکیوں میں تقسیم کی غیر منطقی عمل پر ان کا خاموش ردِ عمل بھی
...تھا۔ ان کی سیرت کی پختگی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ ہمالیہ برابر
...یوں کے اعتراف سے جھجکتے نہیں تھے۔ ترکِ موالات کے التوا پر ان کا ردِ
...دیر سے ہوا مگر وہ اسے بنیادی غلطی اور برِ صغیر کے عوام سے ناانصافی
...در فرماتے رہے۔ تقسیم کے خارجی احوال میں فلاح کی معکوس صورت ہی
...نگاہوں کے سامنے تھی۔ دلی کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں عوام کے
...کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ دیواروں پر بھی خون تھا۔ سڑکوں پر
...اور کالی کالی خون کی پیڑیاں جمی تھیں۔ لوگ خوف سے راستہ کاٹ
...تھے۔ جوانی کی چوٹ جس طرح بڑھاپے میں ابھر کر دردمند ہو جاتی ہے
...جذبے کا تحت الشعوری احساس تقسیم کے خارجی احوال سے متصادم
...شعور میں دردناک ہو کر ابھرتا تھا۔ مادہ اور روح، عقل و وجدان، شعور
...تحت الشعور کا عمل دو طرفہ ہے وہ مثبت بھی ہے اور اظہار میں منفی بھی
...قلب کے اتھاہ ساگر میں ڈوبی وجدانی موجیں جب عقل و شعور کے خارجی
...سے متصادم ہوتی ہیں تو یادوں کے چراغ ذہن میں جھلملانے لگتے ہیں
...واقعات، حادثات اور سانحات زندہ اور حقیقت بن بن کر نگاہوں
...متشکل ہو جاتے ہیں۔ خود شعوری وجود کا یہی وہ ذوقِ خراش ہے
...کی کسک بن کر وجود کو خود نمودی کے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔

"آرٹ اور فن ایک ایسا قدم ہے جو فطرت ابدیت
کی طرف اٹھاتی ہے"

"محبت ایک نورانی نغمہ ہے جسے نورانی ہاتھوں
نے نورانی کاغذ پر لکھا ہے"

"لوگ دنیاوی چیزوں میں غرق رہتے ہیں لیکن میں
ہمیشہ محبت کی قندیل لو لگانا چاہتا ہوں تاکہ
وہ اپنی آگ اور تپش سے مجھ پاکیزہ کر دے"

آزادی کے بعد گاندھی جی کے خود شعوری وجود میں ساتھ ساتھ چلنے والوں
کی بے اعتنائیوں اور بے وفائیوں کے متوازی پرانی وفاؤں کا اعتبار
واعتماد جاگ اٹھا تھا۔ تقسیمِ ہند کے آزاد بھارت کے قابو یافتہ افراد کی مفاد
پرستی، دولت اندوزی اور وجاہت طلبی کا پردہ ان کی نگاہوں کے سامنے
چاک تھا۔ اختیار کی ناسوری میں اخلاقی قدروں سے روگردانی، ہندو اور
مسلمانوں کی بے مقصد تفریق کا فریب، ان کے اپنے تصورات اور نظریات
کی پامالی اور پھر ان کی وہ اپنی بے بسی اور مجبوری کہ بقول ان کے اب
کوئی ان کی سنتا ہی نہیں تھا۔ تقسیم کی الجھن اور تاریک فضا میں ترکِ
موالات کی روشن یادوں کو اب بالکل کسی طرح چھپا نہیں سکتے تھے۔ ایک خلش
تھی جو انھیں کھا رہی تھی ایک ٹیس تھی جو ہر لمحے ان کے قلب میں اٹھتی تھی

بہ یادِ گرمیِ صحبت بہ رنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیوں کہ غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

وہ سمت مند دوراں کی نگاہوں کے سامنے ابھرتا تھا، جذبے سے بھرپور
وہ یک جہتی کہ ہندو اور مسلمان کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں، ارادے
کی مضبوطی اور عمل کی وہ صداقت کہ بہ شوق ایک جھنڈے تلے آزادی کے نغمے
ان کے کانوں میں گونجتے تھے کہ عوام کا ایک سیلِ رواں تھا جو دار و رسن تک پہنچ رہا تھا
مفاہمت کوشی سے دست بردار، مفاد پرستی سے تائب، وہ بے لوث قربانیاں
جو ترکِ موالات کی شرکت کے بعد، دورِ ناکامی میں جو زندگی کی کساد میں بے ننگ
و نام رہ گئیں، تحریک کی اخلاقی قدروں پر جنھوں نے بازی لگا کر گھل گھل کر جان
دی ہے

جلا ہے کس کا لہو رات بھر چراغوں میں
غرورِ حسنِ سحر اب یہ دیکھتا ہی نہیں

"میں محبت کی شانِ کبریائی، اوج اور حسن کی روشنی میں زندگی بسر کرنے آیا ہوں۔ حسن اور محبت دونوں چیزیں خدا کے عکس ہیں۔ میں یہاں زندہ ہوں اور لوگ مجھے جلاوطن نہیں کر سکتے اس سلطنت سے جسے زندگی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ یوں میں موت کے بعد بھی زندہ رہوں گا۔ اگر وہ میری آنکھیں بھی نکال لیں تو بھی میں محبت کی سرگوشیوں اور حسن کے گیتوں کو توجہ سے سنوں گا۔"

باپو کا اعتقاد مگر اب اعتراف پر مائل تھا جو قبول نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے عمل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ تقسیم کے خارجی احوال کی ہولناکیوں کا دھارا بھی انھوں نے پلٹ دیا۔ مفاد پرست ان کے ساتھیوں نے بہت زور مارا، اختیار پرستوں نے طرح طرح کے خطروں سے انھیں خوف زدہ بھی کیا، عمر کے تقاضے کا واسطہ دیا، بھارت کی نئی نویلی آزادی کی بدنامی، ہندو جاتی کی سبکی اور حکومت کی ہواخیزی کو مگر خطرے میں نہ لاتے ہوئے فلاطوں خم میں بیٹھ ہی گیا۔ شرابِ مرگ کی پروا کیے بغیر انھوں نے وہ اقدام کیا کہ ہوا کا رُخ ہی بدل گیا۔ طوفان کا زور ہی گھٹ گیا۔ ان کے مشہور ورت کی شانِ نزول تھی جس کی انتہا بھی ان کی شہادت سے ہوئی۔ گاندھی جی کے فکر کی پردہ پوشی کرنے والے کاغذی دستاویزوں کی بنیاد پر، قتل مہاتما کو تقسیم کے خارجی احوال سے الگ کر کے ایک فرد کے پاگل پن کا ایک تلخ سانحہ کہتے ہیں۔ ٹارٹ کے بنیادی قانون نے حقیقت کی موتی پر پردہ پوشی تو کر دی لیکن جو حقیقت قتل سے بھی تلخ تر ہے اس کی پردہ پوشی ممکن نہیں تھی وہ سامنے ہے کہ باپو نے اپنے فکر کی پامالی کے ردِعمل پر اپنی جان کی قربانی دی ہے جو ہندوستان ان کی نگاہوں میں ابھر رہا تھا اس کے دیکھتے رہنے کے لیے ان کا ذہن تیار تھا نہ آنکھ اس پر ٹھہر سکتی تھی۔

تقسیم ہند کا جو بھارت ان کی آنکھوں کے سامنے ابھر رہا تھا، وہ کسی طرح بھی اپنے تصور کے ہندوستان کے متبادل اس کو قبول کرنا گوارا نہ کر سکتے تھے جسے اس ملک کے مفاد پرستوں نے خون اور آنسوؤں کا بھارت اور پاکستان بنا کر رکھ دیا تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ترک موالات کے فکر و عمل کی صداقت سے کسی کو انکار نہیں اور اہمیت جب ہم اس ابتدا کی انتہا تک پہونچتے ہیں تو فکر و عمل کے دونوں دردناک منظر نگاہوں کے سامنے ہیں۔

محمد علی جوہر کی طرف مڑ کر دیکھیے تو، فکر سے الگ ہو کر ان کے عمل پر عقدہ کشائیوں کی صحرا نوردی کا احساس ہوتا ہے کہ آبلہ پائیوں کو خطرہ میں نہ لاتے ہوئے جس نے عالمِ تنہائی میں جانِ عزیز کی نذر پیش کر دی۔ اس کا ذہن نہ اس کی فکر سے ہٹا نہ قدم اس جہد سے رکا جس کی ابتدا تو گاندھی و محمد علی کی ایک تھی تو ان دونوں بزرگوں کو یہ قدر برگزیدگی انتہا بھی ایک ہی نصیب ہوئی برصغیر کی اجتماعی زندگی گاندھی جی کو عزیز تھی۔ ترک موالات کے یکجہت سماج کی تشکیل کا عمل محمد علی کے مضبوط ہاتھوں سے پورا ہو رہا تھا کہ ہوا کا رخ ہی ہونے نہ رہا۔ وفاقی دستور کا ڈھانچہ ابھی زیرِ غور تھا کہ عوامی فلاح کا دعویدار اس دھرتی کا فدائی، آزادی کا وہ سورما سپاہی، بلند بانگ، جادو بیان محمد علی اپنے وطن کی عظمت کے گیت گنگناتا ابدی نیند سو گیا ؎

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا
ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

ملک و وطن سے زیادہ دنیائے اسلام کا یہ عظیم حادثہ تھا۔ قضا و قدر نے مگر اسے وہ برگزیدگی عطا کی جو اس صدی کے خادمانِ ملت میں کسی کو نصیب نہ تھی۔ آغوشِ اقصیٰ میں مادرِ درسگاہ کا یہ جوہر قابل آج مسجدِ حرم کے ایک گوشے میں محوِ خواب ہے۔ زہے اوج و زہے بلندی ؎

ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ

قدرت کی طرف سے یہ فال نیک ہے کہ ہندوستان کے اس عزیز فرزند کو آغوشِ اقصیٰ نصیب ہے۔ مغربی سیاست کی روباہی میں محمد علی کی گیانہ شخصیت ابھی گرد آلود ہے اور اس کے ابھرنے میں ابھی شاید کچھ دیر لگے کہ عالمی مسائل کا الجھاؤ ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ نگاہوں میں ابھر رہا ہے قوم اور ملت کی ہم آہنگی مگر صرف ہندوستان کے لیے مخصوص نہیں تھی یہ ایک عزیز ہے ایک سیاسی اصول کی طرح ہندوستان میں انھوں نے پوری طرح مکمل کر کے دکھایا ہے۔ جدید و قدیم کی ہم پیوندی کو اس مجاہد نے اپنی زندگی میں سمو کر محفوظ کیا تھا۔ وہی مستقبل قریب کی مشرقی زندگی کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ مغرب و مشرق کی کشمکش میں محمد علی کی ہم آہنگ زندگی کے سوا کوئی دوسرا زاویہ نگاہ نہیں ہے۔ ایشیا اور افریقہ کی عوامی فلاح کا وہی آخری مورچہ ہے۔ مادہ اور روح کی ثنویت کو جس نے توڑ کر نئی اور پرانی دنیا میں وحدت کے اسلامی نقطۂ نظر کو عمل کی جوت دی ہے۔ و نور اللہ مرقدہٗ

سر سید نگر، سول لائنز، علی گڑھ

سلیمان سہیل

اردو زبان کی اہمیت

جب کسی انقلاب کی بات کی جاتی ہے تو اردو زبان میں کی جاتی ہے۔ اردو زبان انتہائی اہم زبان ہے۔ موجودہ انسانی معاشرہ میں جو سیاسی، اقتصادی اور سماجی انحطاط دیکھنے کو مل رہا ہے اس کا ایک باعث اردو زبان کو سیاسی طور پر ناقابلِ استعمال بنا دینا ہے تاکہ اردو زبان علم و ادب کے ذریعہ کوئی انقلاب نہ برپا کر دے۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ پرانی نہیں ہے۔ اردو زبان صدیوں پرانی ہے لیکن اس نے سارے انقلابیوں، حریت پسندوں اور آزادی کے متوالوں سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ کبھی وہ پورب میں شیر دل بنگالہ سبھاش چندر بوس کی تحریک "آزاد ہند" کا نام بن گئی تو پچھم میں خلافت کی تحریک کا محرک "انقلاب" کبھی اُتر میں بھگت سنگھ کی اور کبھی دکھن میں تلنگانہ تحریک کا بازو بھی۔

سوال یہ ہیں کہ اردو زبان صرف برٹش سامراج کے خلاف جہاد پر آمادہ لوگوں کا ساتھ دیتی ہے۔ اردو زبان تو ہر اس شخص کی ہے جس نے اسے قبول کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی اساس بھی اردو زبان پر ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنی اہم زبان کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی انقلاب ناگزیر ہے۔ اس کی رفتار کم ہو سکتی ہے لیکن یکلخت ختم نہیں کی جا سکتی۔ اقتصادی حکیموں کا کہنا ہے کہ سماج میں معاشی پریشانی پیدا ہونے پر سیاسی انقلاب برپا ہوتا ہے۔ اس انقلاب میں جس جذبے اور حوصلے کی ضرورت ہے وہ اردو زبان کی رہین منت ہے۔ اس کے باوجود اردو زبان کو مٹانے کے لیے تحریکیں چلائی جاتی ہیں۔ اردو زبان میں لکھے ہوئے پوسٹرس اور ہورڈنگس کو سیاہی سے پوت دینے اور چند بینرس کو پھاڑ ڈالنے سے اردو زبان کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان اتنی FLEXIBLE ہے کہ اس کے دامن میں دنیا کی بیشتر اہم زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ اس کی لغت کے نصف لاکھ الفاظ میں ہندوستان کی بقیہ تیرہ زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ پھر دنیا کے دوسرے حصوں کی زبانوں عربی، فارسی، ترکی، عبرانی، یونانی، انگریزی، فرانسیسی، لاطینی زبانوں کے الفاظ بھی بھرے ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے اگر دنیا میں رابطہ کی کوئی زبان بنائی جائے تو یہی اردو زبان اس کی مستحق ہے۔ یہ ہماری پرانی عادت ہے کہ ہم احسان کرنے والوں کو بھول جاتے ہیں۔ اردو زبان ہمارے ملک کی سبھی زبانوں سے ربطے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ پشتو، پنجابی، سندھی، بنگالی، بہاری، اودھی اور بھوجپوری ایسی درجن بھر زبانوں کے الفاظ سنسکرت، مراٹھی، گجراتی، دکنی، ملیالم، تلگو اور کنڑ زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی لغت کی اکثریت بن گئے ہیں۔

آج جو زبان ملک کی تجارت، ملازمت اور علوم و فنون میں استعمال کی جاری ہے وہ سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اردو زبان میں کی جاری ہے خواہ اس کا ہندی ہی نام کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ تحقیق کے مطابق اردو لغت میں تقریباً ساٹھ فیصد الفاظ ہندی کے ہیں جبکہ ہندی زبان کی لغت میں ساٹھ فیصد الفاظ معدوم سنسکرت زبان کے ہیں اور صرف چالیس فی صد الفاظ خود ہندی کے ہیں۔ اس کے برعکس اردو زبان میں چالیس فی صد الفاظ دنیا کے دوسرے ملکوں کی زبان سے لیے گئے ہیں۔ دراصل یہ ایک ایسا لسانی گلدستہ بن گئی ہے جو اپنے اندر بین الاقوامی زبانوں کے پھول بھی سجائے ہوئے ہے۔ جس کی مہک ہم سارے عالم میں محسوس کر رہے ہیں۔ گارساں دتاسی نے بھی اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر اپنے ایک خطبے میں اس بات کی نشاندہی کی تھی:

> "انگلستان کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں نیز لندن میں اردو زبان کی تعلیم کو ناگزیر سمجھ کر رائج کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈبلن یونیورسٹی، اسکاچستان کی یونیورسٹیوں اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی طرف جلد توجہ کی جائے گی۔"

اردو زبان بین الاقوامی زبان ہے۔ اس کے ذریعہ ہم دنیا کے ہر ملک کے بولنے والے سے بات کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے باہر جو لوگ جاتے ہیں اور رہتے ہیں ان ہندوستانیوں کی بولی "ہندوستانی" یہی "اردو زبان" کہلاتی ہے۔ جس نے ممالکِ غیر میں ہندوستان کی جو دو مختلف زبان بولنے والے ہندوستانیوں کو ایک زبان دے کر ان کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم و ادب بھی اردو زبان سے ہے۔ آج ہم ادب کو بھلا بیٹھے ہیں اور شکوہ گو ہیں کہ ہماری اولادوں کو ادب نہیں آتا۔ درس گاہوں میں معلّم پریشان ہیں کہ ان کا ادب نہیں کیا جاتا۔ سیاسی اور سماجی ادب کا بھی فقدان ہے۔ قانون ساز خود قانون توڑتے ہیں۔ ایڈمنسٹریشن میں خرابی آگئی ہے۔ نسلی امتیاز، ذات، برادری اور اسی قسم کی دوسری سماجی الجھنوں کا مداوا کرنے کے لیے جس لٹریچر کی ضرورت ہے وہ دوسری زبانوں میں موجود نہیں سماجی شعور کہاں سے آئے جب ہمارا سیاسی شعور ہی بیدار نہیں ہے۔ سماج میں فرد کی طاقت ایک اکائی کی سی رہ گئی ہے لیکن گھوڑے کی پشت پر چڑھ کر ایک آدمی نے دنیا پر حکومت بھی کی ہے اور ایک شخص نے اپنے اقتصادی فلسفے سے دنیا کی تاریخ بھی بدلی ہے۔ ہم دوسروں کے حالات سے ناواقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کا انحطاط ہم کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ ہمارے سیاسی شعور کا یہ عالم ہے کہ ہم کو خود اپنا پتہ نہیں ہے۔ ہم کو وہ ادب پڑھنے کو نہیں ملتا جو ہم کو تنگ نظری سے دور رکھے۔ مشاعروں کی محفلوں میں لفظی ہم آہنگی سے ہم امیر و غریب، چھوٹا بڑا اور اپنا پرایا سب کو مخاطب کر لیتے ہیں اور دوستی کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ ... کے مشاعرے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں کسی بادشاہ، حاکم اور وزیر کی پرواہ کئے بغیر ہر شخص ... ہوئے داد دے سکتا ہے۔ واقعی مشاعرے مساوات کی ... اردو جب اتنی اچھی زبان ہے تو اس کو ختم کرنے کی بات کیوں کی جاتی ہے جبکہ خود ختم کرنے والے اردو زبان کی ضرورت کو محسوس ... کہ جنوب میں اردو کے ذریعہ ہندی سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ وہ اسے ... کرنے کے لیے بھی تیار نہیں کیونکہ وہ ہندی مخالف تحریک ... اور ہندی کا انقطاع کرتے ہیں۔ اس سچائی کو تسلیم کرتے ... اردو کی اہمیت کو محسوس نہ کیا جائے تو اس سے زیادہ ... اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم جس شاخ پر بیٹھے ہیں اس کو ... کی آری سے کاٹ رہے ہیں۔ لیکن اردو ایسی سخت جان زبان ہے ... کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے اور اپنی نئی شاخوں کو پیدا کرتی رہتی ہے۔

ـــــــــــ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی

عذرا سلام انصاری

یومِ عاشورہ

مسلمانوں کے سال کا آغاز محرم سے ہوتا ہے اور ذی الحجہ پر ختم ہوتا ہے۔ ذی الحجہ کا مہینہ اپنے محاسن اور خوبیوں کے لحاظ سے عوام اور خواص میں خوب ہے۔ اسی طرح محرم الحرام کا مہینہ اپنی شان میں ممتاز ہے۔ ماہ محرم کی روایات ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے محترم رہا ہے۔ اس کی حرمت اور وقعت کے قائل صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ ہر فرزند آدم ہے۔ عرب کے کفار اور مشرکین بھی اس کی عظمت اور بزرگی کے قائل تھے۔ کوئی عرب مشرک و کافر اس مہینے میں لڑائی کو نہ چھیڑتا اور نہ دشمن پر حملہ کرتا۔ غرض یہ کہ قتل اور خونریزی اس ماہ میں نہ ہوتی۔ درحقیقت محرم امن و امان کا مہینہ رہا ہے۔ اس پورے ماہ میں ہر شخص کو پوری آزادی حاصل رہتی کہ جس جگہ دل چاہے جائے اور جہاں چاہے رہے۔ کسی دشمن کے آزار و انتقام کا خوف نہ ہوتا۔ اس مہینے کی دسویں تاریخ کو رحمتوں کے نزول کا خاص دن ہے۔

دسویں محرم کے دن کو یوم عاشورہ کہتے ہیں۔ ان دنوں نو اور دس کے روزے رمضان کے بعد سب سے افضل ہوتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے۔

اَفضَلُ الصِّیَامِ بَعدَ شَھرِ رَمَضَانَ شَھرُ اللّٰہِ المُحَرَّمُ

"ماہ رمضان کے بعد سب سے بہتر روزے اللہ کے محرم مہینے کے ہوتے ہیں۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ "محرم کے روزے رکھو۔ اللہ تعالیٰ ایک قوم کے گزشتہ گناہ اس مہینے میں معاف فرما چکا ہے اور آئندہ بھی وہ قوموں پر توجہ فرمائے گا اور ان کے گناہ بخشے گا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو جس کی تعداد چھ لاکھ تھی، اسی مبارک مہینے کی دسویں تاریخ کو فرعون کی غلامی سے نجات ملی تھی۔ فرعون اور اس کا لشکر دریائے مصر میں اسی روز غرق کر کے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اسی عظیم احسان کے شکریے میں اس تاریخ کو روزہ رکھا کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ تفصیل معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا ہم بھی حضرت موسیٰؑ کی اقتداء میں یہ روزہ رکھیں گے۔

ایک اور روایت میں ہے:

"نو محرم کا بھی روزہ رکھو اور دس کا بھی، تاکہ یہودیوں سے مشابہت باقی نہ رہے جو کہ صرف دس محرم کا روزہ رکھتے ہیں۔"

دسویں محرم کے روزے کو عاشورہ کا روزہ کہتے ہیں۔ اس روزے کا ثواب اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی وجہ سے ایک سال کے گناہ معاف کیے جاتے ہیں، بشرطیکہ اسے صحیح طور سے رکھا جائے۔

اس دن کی اہمیت اور فضیلت کے متعلق بہت سے تاریخی واقعات مذکور ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کیا۔ اسی دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بہشت سے نکالے جانے کے بعد کی توبہ قبول کی۔ اسی دن اللہ تعالیٰ نے ادریس علیہ السلام کو بلند مقام پر اٹھایا۔ اسی دن اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو گلزار کیا۔ اسی دن اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول کی۔ اسی دن اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے نکالا۔ اسی دن عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے اور اسی دن آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔ اسی دن نوح علیہ السلام کی کشتی طوفان ختم ہونے کے بعد جودی پہاڑ پر آکر ٹھہری تھی۔ اسی دن اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو مہلک بیماری سے شفا بخشی۔ اسی دن حضرت یوسف علیہ السلام اس کنویں سے نکلے تھے جس میں ان کے بھائیوں نے انھیں ڈال دیا تھا۔ اسی دن یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کی روشنی از سر نو آئی تھی۔ پھر یہی وہ مبارک دن تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام سے ملایا۔ اسی دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسینؓ نے میدان کربلا میں شہید ہو کر اسلام کو زندہ فرمایا۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دن انبیاء علیہ السلام کے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ایک خاص اور یادگار دن ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ اسے روزے کی حالت میں گزارا جائے۔ کیونکہ روزہ احسان کے شکرانے کی بہترین شکل ہے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

آپ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔
۵ شعبان ۴ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ مصعب الزبیری سے روایت ہے کہ امام حسینؓ نے ۲۵ حج پیادہ پا کیے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے بہت محبت کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ
" یہ دونوں میری دنیا کی آرائش ہیں۔"

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ بچے ہی تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دونوں کلائیوں کو پکڑا۔ اس وقت حسینؓ کے قدم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت قدم پر تھے۔ پھر فرمایا چڑھو، چڑھو، حسینؓ اوپر کو چڑھتے جاتے تھے حتیٰ کہ ان کے پاؤں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے پر تھے اور منھ کے برابر منھ تھا۔ پھر فرمایا منھ کھولو۔ انھوں نے منھ کھولا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا منھ چوم چوم لیا اور زبان سے فرمایا:-

" اللّٰھم احبہ فانی احبہ "

اللہ! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما۔

امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہت کم احادیث مروی ہیں۔ امام زہری نے امام حسینؓ سے یہ حدیث نبوی روایت کی ہے۔

" من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ "

" اسلام کی خوبی یہ ہے کہ ناکارہ چیز کو ترک کر دے۔"

مسند احمد وسنن ابوداؤد میں ایک اور حدیث مرفوعاً حسینؓ سے مروی ہے:-

ان للسائل حقاً وان جاء علی فرس

سائل کا حق قائم ہو جاتا ہے خواہ وہ گھوڑے پر ہی سوار آئے۔

حضرت امام حسینؓ شاعر بھی تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار اپنی بیوی رباب بنت امرء القیس الکلبی اور اپنی بیٹی سکینہ کے لیے جو رباب کے بطن سے ہیں، انشاء فرمائے تھے۔

لعمرک اننی لاحب ارضاً ــــ تحل بہا سکینۃ والرباب

ترجمہ " سچ تو یہ ہے کہ میں اس جگہ سے الفت رکھتا ہوں جہاں سکینہ و رباب ٹھہری ہوئی ہیں۔"

احبہما وابذل جل مالی ــــ ولیس لعاتب عندی عتاب

مجھے ان دونوں سے محبت ہے۔ ان دونوں پر دولت کثیر خرچ کرتا ہوں اور عاتب کے عتاب کی پروا نہیں کرتا۔

فلست لہم وان غابوا مضیعاً ــــ حیاتی او یغیبنی التراب

گو وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔ مگر میں ان کی غور و پرداخت سے بے خبر نہ رہوں گا جب تک زندہ رہوں اور جب تک مٹی مجھے چھپا نہ دے گی۔

کان اللیل موصول بلیل ــــ اذا زارت سکینۃ والرباب

جب سکینہ اور رباب اپنے اقارب سے ملنے گئی ہوں تو رات ایسی لمبی نظر آتی ہے گویا رات کے ساتھ دوسری رات مل گئی ہے۔

بی بی رباب جن کی محبت میں اشعار ارشاد فرمائے وہ بھی [illegible] تھیں۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد بہت سے لوگوں نے ان کے پاس نکاح کے پیغام بھجوائے۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ ذیل میں ان کے اشعار کا ترجمہ پیش ہے جو شہادت حسینؓ کے بعد کہے گئے تھے۔

" وہ نور جو روشنی پھیلاتا تھا، کربلا میں مقتول پڑا ہے۔ اسے کسی نے دفن بھی نہیں کیا۔ اے سبط رسول! تجھے اللہ ہماری جانب سے بہترین جزا عطا فرمائے۔ آپ میدان عمل کے خسران سے بچائے گئے۔ تم میرے لیے بلند پہاڑ کی چوٹی تھے۔ جس کی پناہ لیا کرتی تھی۔ آپ کا برتاؤ ہمارے ساتھ رحم اور دین کا تھا۔ اب یتیموں کا کون ہے؟ اب فقیروں کا کون ہے؟ اب کون رہ گیا ہے جس کے پاس ہر مسکین کو پناہ مل سکے۔ اب میں اس قرابت کے بعد کوئی خویشی پسند نہ کروں گی۔ حتیٰ کہ ریت اور مٹی کے تودہ میں جا چھپوں۔"

حضرت امام حسینؓ کی شہادت بروز جمعہ عشرہ محرم ۶۱ھ کو میدان کربلا میں جسے طف بھی کہتے ہیں، آغاز وقت زوال میں ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا ... واتقوا اجر عظیم۔ (سورہ آل عمران ۳ ـ ۱۶۹ تا ۱۷۲)

ترجمہ " جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضایع نہیں کرتا۔ جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار پر لبیک کہا ان میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔"

وقار خون شہیدان کربلا کی قسم
یزید مورچہ جیتا ہے، جنگ ہارا ہے

(ریسرچ اسکالر، شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

مسعود احمد برکاتی

کم اور سادہ غذا

بعض مقامات پر غلّہ اور میوے اور دوسری خوردنی اشیا بہ کثرت اور عمدہ ہیں اور ان مقامات کے باشندے عیش و آرام سے گزر کرتے ہیں۔ بعض مقامات جیسے یمن، صحرائے عرب، بربر، سوڈان مغرب اور حجاز میں گھاس تک پیدا نہیں ہوتی، غلّہ اور میووں کا تو ذکر ہی کیا۔ ان مقامات کے باشندے تنگ حال ہوتے ہیں اور ان کو غلہ ملتا ہے اور نہ رہنے کو اچھا مکان۔ ان کی غذا دودھ اور گوشت ہوتی ہے۔ [illegible] کی وجہ سے وہ دوسرے مقامات سے بھی درآمد کم ہی مقدار میں کر سکتے ہیں [illegible] ضرورت نہیں ہوتا۔ اس لیے کبھی کبھی تو صرف دودھ ہی پر اکتفا کرنی ہوتی ہے۔ [illegible] خشک اور بنجر مقامات کے باشندے نہ صرف اخلاق و عادات میں بلکہ صحت و تو[illegible] سرسبز و شاداب مقامات کے باشندوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ بدن سجیلے، [illegible] کھلتے ہوئے رنگ، خوش نما چہرے اور عادات و اطوار پسندیدہ ہوتے ہیں۔

[illegible]ن کا سبب یہ ہے کہ کثرت غذا اور اس کی رطوبات جسم میں فضلات ردّیہ پیدا کرتی ہے اور متعفن و فاسد اخلاط بڑھ جاتی ہیں۔ جن سے رنگ میلا اور صورتیں [illegible] کی زیادتی سے بے ڈھنگی سی ہو جاتی ہیں اور دماغ کی جانب ابخرات ردیہ کے [illegible] رطوبتیں قوائے ذہن و فکر کو داب لیتی ہیں اور بلادت و غباوت طبیعت پر [illegible] جاتی ہے۔

خشک جنگلوں اور بیابانوں کے جانوروں، ہرن، شتر مرغ، زرافہ، گدھے وغیرہ کا [illegible] شاداب مقامات اور مرغزاروں کے حیوانات سے کر کے دیکھیے کہ رنگ و روپ، صورت و تناسب اعضا اور حدت مدارک و حواس میں باہم کتنا نمایاں فرق ہے۔ حالانکہ ہرن اور بکرا ایک [illegible] خاندان کے جانور ہیں۔ اسی طرح گورخر اور گدھا نیل گائے اور بیل ہیں۔ مگر سرسبز [illegible] کی پرخوری نے وہاں کے حیوانات و بکرے، بیل، گدھے کے بدن میں فضلات ردیہ اور اخلاط [illegible] پیدا کر کے انھیں بد ہیئت، بھدّا اور سست کر دیا ہے۔ ان کے برعکس بیابانوں کے حیوانات [illegible] کم خوری کی وجہ سے چستی و چالاکی اور تناسب اعضا ہوتا ہے۔ یہی حال انسانوں کا ہے غلّوں [illegible] میووں کی کثرت جن مقامات پر ہوتی ہے وہاں کے انسان بلید الطبع اور بے ڈول ہوتے [illegible] مصامدہ، غمارہ اور سوس کے رہنے والے اور جو، جوار سے پیٹ بھرنے والے عقلاً اور جسماً [illegible] خوراک بربروں سے بہتر اور برتر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اندلس کے رہنے والے لوگوں کا [illegible] ہے جہاں گھی اور دودھ تقریباً مفقود ہے اور جو لوگ زیادہ تر جوار کھاتے ہیں، ان کے [illegible] چہرے اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ ذکاوت و ادراک کا مادّہ بھی ان میں زیادہ ہوتا ہے ان کے برعکس اہل مغرب میں جوں کہ وہ خوش خوراک اور خوش حال ہوتے ہیں۔

غلے کی افراط اور ارزانی کا اثر فقط جسم پر ہی نہیں ہوتا بلکہ خاص و مذہبیت پر بھی اس کے نمایاں اثرات ہوتے ہیں۔ جو لوگ تنگ حال اور کھانوں کی زیادت سے بچتے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ عیش و عشرت کے خوگر لوگوں سے زیادہ دین دار، عبادت گزار ہوتے ہیں۔ شہروں میں مذہب کے پابند لوگ کم ہی ہوتے ہیں کیوں کہ گوناگوں نعمتیں کھا کھا کر ان کے دلوں پر قساوت و غفلت چھا جاتی ہے اور دیہات کے کم خور مسکینوں میں و عابد زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ شہر و دیہات کی تفریق میں اصل سبب دولت و افلاس ہے۔ ایک ہی شہر کے خوش حال و تنگ دست باشندوں میں یہ اخلاقی، جسمانی اور روحانی تفاوت پایا جاتا ہے۔

خشک سالی اور قحط و گرانی میں یہ غربا کے مقابلے میں آرام طلب و عشرت پسند، بسیار خور لوگ زیادہ تعداد میں اور جلد تر لقمۂ اجل بنتے ہیں۔ اس لیے کہ خوش حال و خوش خوراک لوگوں میں تر نوالے کھانے کی وجہ سے آنتوں میں رطوبت اعتدال سے زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور جب دفعتاً کھانے کو نہیں ملتا اور روکھی سوکھی غذا وقت بے وقت ملتی ہے تو یک بارگی یبوست بڑھ جانے سے ان کی آنتیں سکڑ جاتی ہیں اور آنتیں نازک عضو ہیں۔ اس تغیر عظیم کو آنتیں برداشت نہیں کر سکتیں اور فوراً کوئی مرض لاحق ہو جاتا ہے اور انجام مرگِ مفاجات ہوتا ہے کیوں کہ امراض امعا اکثر مہلک ہوتے ہیں گویا قحط میں جو لوگ مرتے ہیں وہ اپنی سابقہ پرخوری کا شکار ہوتے ہیں نہ کہ اس بھوک کا۔

جو لوگ چرب غذا کے عادی ہوتے ہیں ان کی رطوبتِ امعا علیٰ حالہٖ قائم رہتی ہے اور وہ ہر طرح کی طبعی غذا برداشت کر سکتی ہے۔ اس لیے ان کے پیٹ میں غذا کے بدلنے میں یبس و انحراف نہیں ہونے پاتا۔

ہمارے زمانے میں قحطوں میں بربر، مغرب، مصر اور فارس کے باشندے زیادہ لقمۂ اجل بنتے ہیں۔ مگر چھواروں پر گزر کرنے والے اہل عرب، جو اور زیتون کھانے والے اہل اندلس اس ہلاکت سے محفوظ رہتے ہیں۔

ندائے ملت، لکھنؤ

*

روبی شمپو پاؤڈر

سے

بال سیاہ ، گھنے ، لمبے اور چمکیلے ہوجاتے ہیں

آپ بھی اپنی شخصیت کو

جاذب نظر بنانے کے لیے

روبی شمپو پاؤڈر

کا استعمال کریں

روبی شمپو پاؤڈر بالوں کو سیاہ ، گھنا ، لمبا اور چمکیلا ہی نہیں بناتا بلکہ بالوں کی دوسری بیماریوں ، جیسے بالوں کا وقت سے پہلے سفید ہونا ، کمزور ہوکر گرنا ، بالوں میں خشکی اور خارش کو ختم کردیتا ہے

آج ہی اپنے قریبی اسٹور سے طلب فرمائیں ۔

مشرقی بہنیں اپنی پوشیدہ بیماریوں کا حال کسی ڈاکٹر یا حکیم کو بتاتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں عورتوں کی یہ پوشیدہ بیماری ان کو اندر ہی اندر گھلا دیتی ہے اور وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جاتی ہیں۔

اکسیر خواتین

اس موذی بیماری کو جڑ سے ختم کردیتی ہے چند روز کے استعمال سے آپ فرق محسوس کرنا شروع کردیں گی قیمت فی شیشی ۱۵/ روپے ڈاک خرچ الگ
غیر ممالک میں دو شیشی کا مکمل کورس مع ہوائی ڈاک خرچ ۱۲۵/ روپے

آج نوجوان جس ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے اس کا نتیجہ ہے
* پچکے ہوئے گال * گھبراہٹ * بدخوابی

اکسیر شباب

کے استعمال سے بدخوابی دور ہوجائے گی۔ آپ کے پچکے ہوئے گال ٹھیک ہوجائیں گے۔ اور آپ اپنے آپ کو چاق و چوبند پائیں گے ۔
ایک شیشی قیمت : ۱۵/ روپے (ڈاک خرچ الگ)
غیر ممالک سے دو شیشی کا مکمل کورس مع ہوائی ڈاک خرچ ۱۲۵/

ہاضمی

ہاضمی کی مفید اثر گولیاں پیٹ کی جملہ تکلیفوں کا خاتمہ کرتی ہیں۔
ہاضمی بچوں سے چھپا کر رکھئے۔
اس کے اچھے ذائقے کی وجہ سے بچے اسے پسند کرتے ہیں اور پوری شیشی چٹ کرجاتے ہیں
قیمت پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

چوٹ ، موچ ، جلے کٹے
کا کامیاب علاج
۸۰ ملی لیٹر قیمت دس روپے

اسٹاکسٹ بمبئی • ایلن اینڈ کینٹ ۳۸ الف ۔ محمد علی روڈ بمبئی
• میڈلیس اینڈ پرفیومری اسٹورس ۳۱ ۔ سی محمد علی روڈ متصل جونا بھٹی مسجد بمبئی
• فرینڈس اسٹورس ۱۵۹ باردن منزل ۔ بھنڈی بازار جنکشن بمبئی • سیما میڈیکل اسٹور ۵۱۲ سردار جے روڈ بمبئی **کلکتہ** • امین اینڈ سنس ۸ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ
فیضی دواخانہ ۲۱ رفیع احمد قدوائی روڈ کلکتہ **حیدرآباد** • مون اینڈ کمپنی چار مینار حیدرآباد
بھوپال • مختار حسین غلام عباس جمعراتی بازار بھوپال **اورنگ آباد** • ابوالحسنات مقام و ڈاک خانہ سیلہ رفیع گنج ۔ ضلع اورنگ آباد **دہلی** • دفاتر بیسویں صدی دریا گنج نئی دہلی
بنانے والے **ریڈیم کیمیکل ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲**

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون :
۳۶۰۹
۴۱۹۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۱۲ سیشن ۸۴-۱۹۸۵ء

موزوں امیدواروں سے ایم اے (فائن آرٹس) ایم۔ اے (ملیالم) اور ڈپلوما آف ٹیچنگ ان اردو سیشن ۸۴-۱۹۸۵ء میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

فائن آرٹس کورس صرف طالبات کے لیے ہے

کم سے کم تعلیمی استعداد برائے داخلہ

ایم۔اے۔ فائن آرٹس ۲ سالہ کورس	بی۔اے یا اُس کے مساوی امتحان جس میں فائن آرٹس بحیثیت ایک مضمون کے رہا ہو اور اس پر کم سے کم ۵۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔
ایم اے ملیالم ۲ سالہ کورس	بی۔اے، بی ایس سی یا اس کے مساوی امتحان جس میں ملیالم بحیثیت مین سبجیکٹ یا بطور ایک مضمون کے رہا ہو اور اس میں کم سے کم ۴۵ فی صد نمبر حاصل کیے ہوں۔
ڈپلومہ آف ٹیچنگ اِن اُردو ۲ سالہ کورس	سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ امتحان اس یونیورسٹی سے کم از کم سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ہو یا ایسا امتحان جو ایس ایس سی کے مساوی ہو اور یونیورسٹی کے نزدیک تسلیم شدہ ہو اور اس میں اردو بطور ایک مضمون رہی ہو۔ یا جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر کا امتحان یا اس کے مساوی کوئی مشرقی امتحان پاس کیا ہو اور وہ امتحان یونیورسٹی کے نزدیک تسلیم شدہ ہو یا ایس ایس سی امتحان (صرف انگریزی میں) اس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو، ایسے تمام امیدوار داخلے کے مجاز ہیں۔

نوٹ:- ایسے طلباء جو تعلیم کا اعلیٰ معیار رکھتے ہوں اور انھوں نے کم از کم ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری کے معیار کی اردو پڑھی ہو وہ بھی اس کورس میں شریک ہونے کے مجاز ہیں

ایسے طلباء جو درج بالا کورسز میں داخلے کے خواہش مند ہوں اُن کو چاہیے کہ وہ سادے کاغذ پر درج ذیل پروفارما کے مطابق درخواست دیں

پروفارما درخواست برائے داخلہ ایم اے/ان فائن آرٹس/ملیالم/ڈپلوما آف ٹیچنگ اِن اردو

۱۔ جس کورس میں داخلہ چاہتے ہیں، اس کا نام :-

۲۔ امیدوار کا نام :

۳۔ تاریخ پیدائش اور عمر :-

۴۔ والد کا نام :-

۵:۔ جنس :-

تصدیق شدہ فوٹو
یہاں چسپاں کریں

۶۔ مذہب :۔

۷۔ قومیت :۔

۸:۔ ریاست :۔

۹۔ داخلے کے لیے مطلوبہ امتحان پاس کرنے کی تفصیل (مارکس شیٹ کی تصدیق شدہ کاپیاں ارسال کریں)

ان کا نام	رول نمبر	پاس کرنے کا سال	یونیورسٹی کا نام	مقررہ نمبر	حاصل شدہ نمبر	امتحان کے مضامین	متعلقہ مضمون میں حاصل نمبروں کا فیصد
	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸

اس بات کا تصدیق نامہ کہ امیدوار نے جس مدت میں تعلیم حاصل نہیں کیا مشغلہ رہا (اس کے لیے مصدقہ ثبوت)

امیدوار کا خط وکتابت کے لیے مکمل پتہ :۔

پوسٹل آرڈر کی تفصیلات :۔ نمبر :۔ تاریخ :۔ رقم :۔

اگر امیدوار درج ذیل زمرے میں آتا ہے تو مع ثبوت کے تصدیق نامہ

(الف) شیڈول کاسٹ / شیڈول ٹرائبس / بیک ورڈ کلاس :۔

(ب) ان ملازمین کے بچے جو دوران ملازمت انتقال کر گئے ہیں :۔ ہاں / نہیں

(ج) وارڈ لوائنز کے بچے ہاں / نہیں

(د) گورنمنٹ ملازمین کے بچے ہاں / نہیں

(ہ) یوپی سے دور کے صوبے کے رہنے والے ہاں / نہیں

(و) اعلیٰ کھلاڑی :۔ ہاں / نہیں

(ز) اعلیٰ مقرر : ہاں / نہیں

(ح) جسمانی طور پر معذور

کاغذات منسلکہ کی تعداد

امیدوار کے دستخط مع تاریخ

مکمل درخواستیں جن کے ساتھ تاریخ پیدائش اور امتحان پاس کرنے کے سرٹیفکٹ کی مصدقہ کاپیاں ہوں اور ۸/- روپے کا پوسٹل آرڈر (جو فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو) کے ساتھ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس ۲۵ اے ایم یو علی گڑھ کے یہاں ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء بوقت شام ۵ بجے شام سے پہلے پہنچ جانی چاہیں۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں نہ تو قبول کی جائیں گی اور نہ ان پر غور کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے متعلق خط وکتابت کی جائے گی

این۔ موئیدین

(کنٹرولر امتحانات و داخلہ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۱ / ۸۴ - ۸۵

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ گرلز ہائی اسکول میں پوسٹ گریجویٹ ٹیچر [ریاضی] [ایک جگہ] [مستقل]
تنخواہ کی شرح : ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت :- ۱- لازمی :- ریاضی میں ایم ایس سی -
یا ایجوکیشن میں ڈگری یا تسلیم شدہ ڈپلوما
یا انٹرمیڈیٹ یا ہائر کلاس کو پڑھانے کا تین سالہ تجربہ
ii ترجیح انگریزی، اردو اور ہندی میں کالج یا ہائی اسکول میں ہائر کلاسز یا ہائر سکنڈری کلاسز کو پڑھانے کا خاطر خواہ تجربہ۔

۲۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر [فزکس] [ایک جگہ] [مستقل] احمدی اسکول برائے نابینا۔
شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت :- ۱- لازمی :- فزکس میں ماسٹر ڈگری اور بی ایس سی میں ریاضی بطور ایک مضمون کے رہی ہو
ii ترجیح :- ۱- یونیورسٹی ڈگری / ٹیچنگ میں ڈپلوما / اردو، ہندی اور انگریزی میڈیم میں ہائی / ہائی سکنڈری اسکول میں مضمون پڑھانے کا خاطر خواہ تجربہ
۲- اندھوں کو پڑھانے کا علم۔

۳۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر [لائف سائنس] [ایک جگہ] [مستقل] ایس - ٹی - ہائی اسکول
شرح تنخواہ ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاونس
قابلیت :- ۱- لازمی - مندرجہ ذیل میں سے کوئی بھی
۱- میڈیسن میں گریجویٹ
۲- زولوجی یا باٹنی میں ایم - ایس سی - بی - ایس سی امتحان میں باٹنی یا زولوجی بطور ایک مضمون لیا ہو۔
۳- دہلی یونیورسٹی سے زولوجی یا باٹنی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما
ii ترجیح :- تعلیم یا پڑھانے میں ڈگری یا ڈپلوما - انگریزی / ہندی اور اردو میڈیم میں کالج یا ہائی اسکول میں ہائر کلاسز کو پڑھانے / ہائر سکنڈری اسکول میں پڑھانے کا خاطر خواہ تجربہ۔

۴۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر [فزیکل ٹریننگ انسٹرکٹر] [ایک جگہ]۔ [مستقل] ایس۔ٹی۔ ہائی اسکول
شرح تنخواہ:- ۴۴۰-۲۰-۵۰۰- ای بی- ۲۵- ۷۰۰- ای بی ۲۵- ۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت:- ۱۔ لازمی۔ کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی میں ۳ سالہ کورس والے فزیکل ایجوکیشن میں بیچلر ڈگری۔

یا

۲۔ کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے بی۔پی ایڈ کی ڈگری

یا

کم سے کم ایک اکیڈمک سیکشن میں ٹریننگ کے بعد کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ سے ڈی۔ پی۔ ایڈ کی ڈگری بشرطیکہ ڈپلوما کے لیے داخلہ قابلیت کم سے کم یونیورسٹی ڈگری ہو۔
۲۔ ترجیح:- بچوں کو ہاکی، کرکٹ، فٹ بال اور والی بال سکھانے کی قابلیت ہو اور اس طرح کی سرگرمیوں کو منظم کرنے کا تجربہ ہو۔

۵۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچرس [فزکس] [پانچ جگہیں] [مستقل] جس میں سے دو عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔
تنخواہ کی شرح:- ۴۴۰- ۲۰- ۵۰۰- ای بی- ۲۵- ۷۰۰- ای بی ۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔
قابلیت:- ۱۔ ضروری۔ مذکورہ مضمون میں گریجویٹ اور تعلیم میں تسلیم شدہ ڈگری یا ڈپلوما یا ازی
این سی ای آر ٹی ریجنل کالج آف ایجوکیشن سے بی ایس سی۔ بی ایڈ۔ یا
این سی ای آر ٹی ریجنل کالج آف ایجوکیشن سے بی ٹیکنیکل، بی ایڈ۔

اُن امیدواروں کو جن کی غیر معمولی قابلیت یا تجربہ ہو، ہائر تنخواہ دی جا سکتی ہے۔
جن امیدواروں کا انٹرویو لیا جائے گا، ان کو ریلوے سکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا
وضع کردہ درخواستوں کے فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سیلکشن کمیٹی] رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ۵/- روپے [جو کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کیے جا سکتے ہیں] دستیاب ہو سکتے ہیں۔ یا
سمت ۱۰ × 23 کے لفافے جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاک سے فارم منگانے کی صورت میں ۵/- روپے کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بھیجا جانا چاہیے۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۸ اکتوبر ۱۹۸۴ء [آفس ٹائم تک] ہے
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں
[رجسٹرار]

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

پرسنٹیج کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر طلب کیے جاتے ہیں ۔ ٹینڈر ۸/۱۰/۸۴ء دوپہر ایک بجے تک قبول کیے جائیں گے اور اسی روز یعنی ۸/۱۰/۱۹۸۴ء کو تین بج کر تیس منٹ پر کھول دیے جائیں گے ۔

ٹینڈر سے متعلق کاغذات اور دیگر ضروریات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے آفس ٹایم میں کسی بھی روز حاصل کیے جاسکتے ہیں ۔

ٹینڈر فارموں کی فروخت ٹینڈر موصول ہونے کی آخری تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی ۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کیلئے مختص رقم	زرِ ضمانت	ٹینڈر فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱ -	میڈیکل کالونی کے لکچررز کواٹرز کی باونڈری دیوار کو اٹھانے اور اس پر تار لگانے کا کام	۲۲,۹۱۵/-	۵۰۵/-	۵/-	تین ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

[یونیورسٹی انجنیر]

پرنٹر، پبلشر نورالحسن نقوی - مطبوعہ: ولی آفسیٹ پرنٹرز، دہلی - مقامِ اشاعت: شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone 4153

پندرہ روزہ
تہذیب الاخلاق
علی گڑھ
22/10/84
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

Rs 1-50

جلد-۳۰ ۱۶ر تا ۳۱ر اکتوبر ۸۴ء شمارہ ۲۰

مدیر: سید حامد

مدیر مسئول: نور الحسن نقوی

مندرجات

۱۶ر اکتوبر ۱۹۸۴ء سے
فی شمارہ : ڈیڑھ روپیہ
زر سالانہ : تیس روپے

سرورق کی تصویر: سرسید احمد خان
آرٹسٹ —— : سرفراز احمد

ترسیل زر کا پتہ
پروفیسر منظر عباس نقوی - ٹرزرار
تہذیب الاخلاق ٹرسٹ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

خدا کے بندوں سے محبت

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ (سورۂ دہر)

اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارا یہ کھلانا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لیے ہے؛ ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکر گذاری۔

يَا ابْنَ آدَمَ! مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي قَالَ كَيْفَ أَعُودُكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ عَبْدِي فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ؟ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ عُدْتَهُ، لَوَجَدْتَنِي عِنْدَهُ!

يَا ابْنَ آدَمَ! اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي۔ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ أُطْعِمُكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ أَطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَٰلِكَ عِنْدِي۔

يَا ابْنَ آدَمَ! اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِي۔ قَالَ: كَيْفَ أَسْقِيكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِي فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهِ۔ أَمَا إِنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَٰلِكَ عِنْدِي

(حدیثِ قدسی: مسلم بروایت ابی ہریرہ)

قیامت کے دن خدا ایک انسان سے کہے گا کہ اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی بندہ متعجب ہو کر کہے گا۔ بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ تو تو رب العالمین ہے۔ خدا فرمائے گا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

اسی طرح خدا فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا۔ کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا؟ اگر تو اسے کھلاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

ایسے ہی خدا فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ عرض کرے گا: بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے۔ تو تو خود پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا، لیکن تو نے اسے پانی نہ پلایا۔ اگر پانی پلا دیتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

سید کو خراجِ عقیدت

۱۷ اکتوبر سرسید کا یوم ولادت ہے۔ اس تاریخ کو ملک کے اکثر مقامات پر یوم سرسید منعقد کرکے قوم کے اس عظیم محسن کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے لیکن بات جلسوں اور تقریروں سے آگے نہیں بڑھتی۔ کردار کے اس غازی کی خدمت میں محض گفتار کا نذرانہ کچھ بے وقعت سا لگتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی کے جو منصوبے تیار کیے تھے جلسوں اور تقریروں کے ذریعے ان کی اہمیت کو واضح کیا جائے اور انھیں پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کی جائے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی جو حالت آج ہے کم و بیش وہی سرسید کے زمانے میں تھی خود سرسید کے الفاظ میں "پوری قوم۔ کیا دنیا کی باتوں میں اور کیا دین کے کاموں میں ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ اِدھر اُدھر کی چیزیں تو درکنار وہ خود اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی جس میں پڑی تھی"۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت نے مسلمانوں کو مکمل طور پر برباد کر دیا تھا۔ ہزاروں بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھائے گئے ان گنت مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ بے شمار مسلمان سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو گئے۔ نتیجہ یہ کہ کل تک جو لوگ صاحبِ ثروت تھے آج بھیک مانگتے نظر آتے تھے۔ سرسید نے لکھا ہے کہ انھوں نے محمد بن تغلق کی اولاد کو ہل چلاتے اور خلیل اللہ شاہجہانی کے پوتوں کو بیر بانٹتے دیکھا تھا۔ سرسید ایک دردمند دل اور حساس طبیعت رکھتے تھے۔ اس صورت حال نے انھیں بیقرار کر دیا لیکن ایک زمانے تک یہ طے نہ کر پائے کہ آخر کریں کیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ایک مدت اسی غم میں بڑا سوچ بچار رہا کہ کیا کیجیے۔ جو خیالی تدبیریں کرتا تھا کوئی بن پڑتی معلوم نہ ہوتی تھیں۔ جتنی امیدیں باندھتا تھا، سب ٹوٹ جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچتے رہنے سے کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کر سکو۔ ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل ٹھہرا، ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔"

ایک ماہر طبیب کی طرح پہلے انھوں نے قوم کے مرض کی تشخیص کرنی چاہی مگر واسطہ ایسے مردِ بیمار سے تھا جس کا عضو عضو بیماری سے متاثر تھا۔

رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہیے کہاں کہاں کی

اُس زمانے کا مسلمان بے حسی، بے عملی، بے حوصلگی، توہم پرستی اور احساس کمتری کا شکار تھا۔ ایسی حالت میں انسانی قویٰ شل ہو جاتے ہیں، قوتِ عمل سلب ہو جاتی ہے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور اسے انتظار ہوتا ہے اس مردِ کار کا جو غیب سے نمودار ہو اور اس کی بگڑی بنا دے۔ مگر بگڑی تو اپنے بنائے ہی بنتی ہے اور تائیدِ الٰہی بھی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان خود کچھ کرنے کے لیے کمر کس لے۔ بہر حال سرسید دن رات اسی فکر میں لگے رہے کہ قوم کا کھویا ہوا وقار کس طرح بحال ہو۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اُن کی ساری خرابیوں کا علاج جدید تعلیم ہے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد انھوں نے انگلستان جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں کے تعلیمی نظام سے براہ راست واقفیت حاصل کر سکیں۔

قیام انگلستان کے دوران انھیں ایک اور نسخۂ کیمیا ہاتھ آیا۔ وہاں انھیں پتہ چلا کہ جو حالت اس وقت ہندوستان کی ہے، وہی کبھی انگلستان کی بھی رہ چکی ہے۔ وہاں لندن کے پیغمبروں اور سویلیزیشن کے دیوتاؤں "ڈایڈیسن اور اسٹیل" نے ایک رسالہ جاری کیا تھا تاکہ اس زمانے کی عام برائیوں سے عوام کو خبردار کیا جائے اور ان کو دور کرنے کی تدبیریں کی جائیں۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "ان پرچوں (ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر) کے جاری ہونے سے انگریزوں کے اخلاق اور عادات اور دینداری کو نہایت فائدہ پہنچا اور ہر ایک دل پر اُن کا اثر ہوا۔ جس زمانے میں پہلے پہل ٹیٹلر نکلا ہے، انگلستان کے لوگوں کی جہالت اور بد اخلاقی اور ناشائستگی نفرت کے قابل تھی وضع دار لوگ کیا مرد کیا عورت تحصیل علم سے نفرت رکھتے تھے، علم حاصل کرنے کو خود فروشی کہتے تھے اور کمینوں کا کام سمجھتے تھے۔ جہالت کی شرم کسی کو نہ تھی۔ عورت کا پڑھا لکھا ہونا اس کی بدنامی کا باعث ہوتا تھا۔ عورتیں آپس میں بدگوئی کیا کرتی تھیں۔ خلاف تہذیب باتیں کرنا بڑی وضعداری گنی جاتی تھی۔ اسپیکٹیٹر میں ایک دفعہ لکھا تھا کہ میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں گا اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملاؤں گا تاکہ جہاں تک ممکن ہو اس کے پڑھنے والے دونوں باتوں میں نصیحت پاویں اور تا وقتیکہ لوگ ان تمام خرابیوں سے جن میں اس زمانے کے لوگ پڑے ہیں سنبھل جاویں، ہر روز ان کو نصیحت کی باتیں یاد دلاتا رہوں گا کیوں کہ جو دل ایک دن بھی بیکار پڑا رہتا ہے اس میں بے شمار عیب جڑ پکڑ جاتے ہیں جن کے نہایت مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں بسایا مگر میں اپنی نسبت صرف اتنا ہی کہلانا چاہتا ہوں کہ میں نے فلسفے کو مدرسوں، مکتبوں اور کتاب خانوں کی کوٹھریوں سے نکالا اور جلسوں، چائے خانوں، قہوہ خانوں تک پھیلایا اور ہر ایک دل میں بسایا۔"

ایڈیسن اور اسٹیل نے اپنے رسالوں سے جو کام انگلستان میں لیا تھا، سرسید نے وہی کام تہذیب الاخلاق سے لیا۔ انھوں نے اس رسالے کا خاکہ انگلستان ہی میں مرتب کر لیا تھا اور وہیں اس کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ہندوستان واپس آکر انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کر دیا۔ اس کا نکلنا تھا کہ چاروں

طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ایڈیسن اور اسٹیل نے مذہبی معاملات میں دخل دینے سے احتراز کیا تھا اور اس میں کامیاب رہے تھے لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ یہاں یہ تھا کہ کسی کام کے کرنے کی نہائش کی جاتی تو جواب ملتا کہ شرعاً گناہ ہے اور کسی کام سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی تو کہا جاتا کہ اس کا کرنا ثواب ہے۔ آخر مجبور ہوکر سرسید کو کہنا پڑا کہ جن باتوں کو تم نے مذہب کا نام دے رکھا ہے ان کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ جن کے ذہنوں میں کھلی ہوا کا گزر نہیں۔ انھوں نے یہ سنا تو برافروختہ ہوگئے اور سرسید پر ہر طرف سے لعنت ملامت ہونے لگی۔ کافر، مرتد، ملحد، زندیق، اسلام کا دشمن، مسلمانوں کا ہاجی، قوم کا عیب جو جیسے بے شمار خطابات سے انھیں نوازا گیا۔ کئی بار دل ٹوٹا، بار بار مایوسیوں نے گھیرا، ہر بار اللہ پر بھروسا کرکے انھوں نے تن تنہا اس سیلاب کا مقابلہ کیا اور اپنے موقف پر جمے رہے۔ ایک جگہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں ـــ

"وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈھتا ہے۔ ان کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے، یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈھتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے، انہی کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند عزیز واقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں ـــ

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سیّد تو کچھ دوانے ہیں"

لیکن سرسید کی یہ دیوانگی کام آئی۔ ان کے رسالے نے جادو کا اثر دکھلایا اور ان کی بات لاکھوں دلوں میں گھر کرگئی۔ یہ تہذیب الاخلاق کا ہی کرشمہ تھا کہ مسلمانوں کے کان قومی ہمدردی اور قومی خیرخواہی جیسے الفاظ سے پہلی بار آشنا ہوئے۔ ان میں اپنی مدد آپ کا جذبہ بیدار ہوا، انھوں نے خود احترامی کا سبق سیکھا، جدید علوم کی طرف توجہ کی اور ان میں قومیت کا احساس پیدا ہوا۔ مذہبی امور اور رواج و رسوم میں تمیز کرنا بھی تہذیب الاخلاق ہی نے سکھایا۔ مولوی نذیر احمد نے کہا تھا "یہ تہذیب الاخلاق ہی کا تصرف تھا کہ مسلمان جو پھیے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے تھے انھوں نے نعل جڑوا لیے اور کان تک نہیں ہلایا۔" آگے چل کر الہلال کے مدیر (مولانا ابوالکلام آزاد) نے اعتراف کیا کہ "ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالہ نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ تہذیب الاخلاق سے مرتب ہوئے۔" چنانچہ اگلی نسل کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا کہ وہ کلیتاً تہذیب الاخلاق کی پروردہ تھی۔

تہذیب الاخلاق کے اجرا کے وقت ہندوستانی مسلمانوں کی جو حالت تھی آج بھی تقریباً وہی صورتِ حال ہے۔ سرسید کے زمانے میں پریس کی دل بیل پڑ رہی تھی۔ انھیں اپنا چھاپہ خانہ آپ قایم کرنا پڑا تھا۔ آج نشر و اشاعت کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں بہت سے چھوٹے بڑے اخبار اور رسالے ہیں مگر کم ہیں جو مسلمانوں کے جذبات سے نہ کھیلتے ہوں اور جن کا مقصد قوم کو بیدار کرنا ہو۔ بلاشبہ اردو کے معیاری اخبار و رسائل کی مالی حالت نازک اور تعداد اشاعت کم ہے لیکن سرسید کو آج خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے تو اس مشعل کو اٹھانا ہوگا جو سرسید نے روشن کی تھی۔ ٹیگور کی ایک چھوٹی سی نظم ہے۔

رات نے کہا ـــ
مجھے اندھیرے سے نجات کون دلائے گا
ننھے سے مٹی کے دیے نے
جس کی بتی میں ابھی کچھ تیل باقی تھا
جواب دیا ـــ
میں کوشش کروں گا۔

اگر بہت سے ننھے ننھے دیے ایک ساتھ جل اٹھے تو اجالا پھیلے گا، ضرور پھیلے گا!

نورالحسن نقوی

سید حامد

کاروانِ زندگی

اسلام کے متعلق کبھی کبھی یہ خیال دل میں گزرتا ہے کہ

خوش درخشید ولی شعلۂ مستعجل بود [1]

آٹھویں اور نویں عیسوی کے درمیان تقریباً سو سال کے اندر اس مذہب کے نام لیوا اپنی علمی، اخلاقی اور عسکری فتوحات کی بدولت تقریباً اس وقت کی ساری دنیا پر چھا گئے۔ چار سو سال تک وہ علم کے کارواں سالار رہے صدق و کردار کی پاکیزگی کی ایسی مثالیں انسانیت کے سامنے لے آئے جن کی نظیر پیش کرنے سے دنیا ہر دور میں قاصر رہی ہے۔ لیکن جلد ہی مسلم معاشرے میں فساد در آیا۔ جس دین کے بازوؤں پر انھوں نے علوم کی تسخیر کی تخلیق کی تھی اس دین کی روح کو انھوں نے اپنی گرفت سے نکل جانے دیا۔ جستجو، حرکت، ولولہ، تازہ دمی، انبساط، اتحاد اور تقویٰ کی جگہ بے حسی، کاہلی، تن آسانی، تقلید، جمود اور عیش پرستی اور سپر اندازی نے لے لی۔ اپنے دین کی نسبت مسلمانوں کا وہی حال ہوا جو آئینے کے سامنے لائی ہوئی عبارت کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دین کا عکسِ معکوس بن گئے۔ چنانچہ اغیار کے لیے اسلام کو سمجھنے کا آسان مگر عبرت ناک طریقہ اب یہ رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کے دین کو ان کے اطوار و احوال کے برعکس قیاس کریں۔ مگر وہ ایسا کیوں کرنے لگے۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ جتنے بُرے مسلمان ہیں ان کا مذہب بھی اتنا ہی بُرا ہوگا۔ انھیں ایسا سمجھنے، حتیٰ کہ ایسا کہنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ کس کو ایسی جستجو ہوتی ہے کہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرے اور پھر ان کی بابت رائے قایم کرے؟ لوگ مذہب کے متعلق رائے اس مذہب کو ماننے والوں کو برتنے اور ان کے اطوار و اخلاق کو دیکھنے کے بعد قایم کرتے ہیں۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر اسلام خدا کا آخری پیغام ہے، اگر اسلام سے ہدایتِ خداوندی کا زریں سلسلہ پایاں کو پہنچتا ہے تو پھر کیا وجہ کہ اسلام کو بنیاد اس قدر جلد جراحت پہنچ گئی، اس کی ساکھ اتنے کم عرصے میں گر گئی، اس کے ماننے والوں کا شیرازہ اتنی جلدی برہم ہو گیا اور ان کے اخلاق اتنی تیزی کے ساتھ کیوں بگڑ گئے؟ یہاں ہمیں اسلام اور مسلمانوں کے درمیان فرق کرنا پڑے گا۔ آیئے خود کو بدر کے میدان میں لے جائیے۔ کل کفارِ مکہ کا لشکرِ جرار سے مٹھی بھر مسلمانوں کا مقابلہ بدر کے میدان میں ہوگا۔ دونوں فوجیں صف آرا ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن لشکر کو ترتیب دینے، خندق کھودنے اور کھدوانے اور صفِ جنگ کی ترتیب کو آخری شکل دینے میں صرف کیا۔ رات کو جب سب ساتھی سو گئے تو آپ نے پروردگار سے رجوع کیا۔ گڑگڑاتے رہے اور فتح و نصرت کی دعا مانگتے رہے کہ یا رب کل کی جنگ میں مسلمان ہار گئے تو پھر دنیا میں تیری عبادت کرنے والا، تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔ اللہ تعالےٰ اپنے رسولؐ کی دعائیں سن لیں، رن مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اسلام قیامت تک کے لیے محفوظ ہو گیا۔ محفوظ نہ صرف اس طرح کہ ترتیب و حفظ قرآن کا مکمل انتظام ہو گیا بلکہ اس طرح بھی کہ اسلام کی مکمل تشریح احادیث کی روشنی میں، مکمل ترجمانی سیرتِ رسولؐ کے ذریعہ؛ اور اس کی وضاحت صحابۂ کرامؓ کے اطوار و کردار کی شکل میں اور اسلام کی سچائی کا اثبات اس کی اخلاقی اور ذہنی تسخیرات کے ذریعے کر دیا گیا۔

لہٰذا اس خلش انگیز خیال کا جواب، جس کا ذکر آغازِ داستان میں آیا تھا، کچھ اس طرح بن پڑتا ہے کہ اس پیغامِ ہدایت میں تحریف و ترمیم کی گنجائش نہیں رہی۔ مسلمان کتنے ہی زبوں حال، گمراہ اور بدکردار کیوں نہ ہو جائیں ان کے دین کی سالمیت پاکیزگی اور ابدیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو دین خلقِ خدا کے لیے رحمت بن کر آیا تھا، وہ اب بھی رحمت بنا ہوا ہے اور رحمت بن کر رہے گا۔ ابد تک۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام اپنے نام لیواؤں تک محدود نہیں رہا، ساری انسانیت اس سے متاثر ہوئی۔ کوئی مذہب اب ایسا نہیں ہے جس کے ماننے والوں پر اسلام کی انقلاب آفریں تعلیمات کا اثر نہ پڑا ہو۔ خورشید جب کرنوں کے بھالے تانے ہوئے جب اپنے خیمے سے نکل آتا ہے تو لوگ رات کے گھور اندھیرے کو بھول جاتے ہیں۔ خورشید کی کرنیں اس کی بصارت افروز روشنی، اس کی حیات انگیز حرارت، ساری دنیا اور اس پر رہنے والی ساری مخلوق کے لیے

گئے ہوں گی۔ ڈاکٹر کٹر میں انتظامی صلاحیت او

[1] خوب چمکا لیکن جلد بجھ گیا۔

ہے۔ کوئی ایک طبقہ یا گروہ اس کو سمیٹ نہیں سکتا، محدود نہیں کر سکتا، نہ اوٹ بن کر دوسروں کو محروم کر سکتا ہے۔ اسلام کیا آیا سارے مذاہب کے ماننے والوں نے ایک خدا کو کسی نہ کسی عنوان تسلیم کر لیا۔ خدا کا تصور جو بعض ادیان میں دب گیا تھا، قرنوں کی گرد اپنے دامن سے جھاڑ کر پھر اُبھر آیا۔ توحید، غیر مخلوط توحید کو ساری انسانیت نے بطرزِ مستقیم یا بالواسطہ تسلیم کر لیا۔ ایک خالق کو ماننے کے بعد عقاید اور اعمال کی صفائی اور پاکی کے لیے بہت سی راہیں نکل آئیں خود ہندوؤں نے اسلام کے زیر اثر ویدک دور کی خدا شناسی کو دوبارہ حاصل کر لیا اور چمکا دیا۔

توحید ہی نے اخوت کو جنم دیا۔ اخوت ۔ بے آمیزش اخوت ـــ کا اعلان جیسا اسلام نے کیا ہے، پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب جب کہ اخوت کا اصول انسانیت کے لیے جزو ذہن بن چکا ہے، یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایک زمانہ میں یہ تصور کتنا غریب اور بعید تھا اور اس کو ذہنوں میں داخل اور زمانے میں رائج کرنا کتنا بڑا انقلاب تھا۔

اس سے بھی زیادہ اہم کردار اسلام نے مساوات کے تصور کو دلنشیں اور مساوات کے تقاضوں اور مضمرات کو منوا کر ادا کیا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی عالمِ اسلام میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو وسایل کی کمی کی بنا پر تحقیر سے نہیں دیکھ سکتا۔ ہندوستان میں کیفیت البتہ مختلف ہے کہ یہاں جاتی واد کا زور رہا ہے۔

اس عالمگیر انقلاب کے اجزائے ثلاثہ کا جو اسلام نے برپا کیا، تیسرا جزو حریت ہے۔ اسلام نے غلامی کو بند نہیں کیا، لیکن پہلے قدم کے طور پر اس کو گوارا بلکہ خوش گوار اور تحقیر، ظلم وستم اور نا انصافی سے محفوظ کر دیا۔ مساوات نے شہ دی اور حریت نے جراتِ حق گوئی کو اسلامی خصائل کی صف میں بٹھا دیا۔

انسان کو مندرجہ بالا اصولوں کے تحت، اسلام نے انسان کو عزتِ نفس دی، اسے اس کے افعال و اعمال کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا۔ اسلام نے انسان کو عذر معذرت، وسیلۂ سفارش، حیلہ، بہانہ، ابہام و اشکال کے دلدل سے نکال کر مسئولیت کی مضبوط دھرتی پر کھڑا کر دیا۔ اب فرد کو یہ اختیار نہیں رہا کہ اپنی غلطیوں اور تباہ حالیوں کے لیے دوسرے انسانوں یا اپنے مقدر کو موردِ الزام ٹھہرائے یا معذوری اور مجبوری کا عذر کر کے اپنی ذمہ داریوں سے گریز کرے۔

ان جاں بخش اصولوں کی روشنی نے توہمات، ضعیف الاعتقادی، دایرہ بانی، گریز اور غیر ذمہ داری کے اندھیرے کو دور کر دیا۔ اسلام نے بونے اور کاٹنے کے سادہ اصول پر اخلاق کی بنیاد رکھی۔

ان بڑے بڑے عیبوں کے خلاف جنھوں نے ابتدائے آفرینش سے انسان کو خوار و زبوں رکھا ہے اور جنھوں نے بے شمار دوسری برائیوں کو رواج دیا ہے، جنھوں نے امّ الخبائث بن کر لاکھوں گھر برباد کیے ہیں ان کے خلاف سب سے موثر جہاد اسلام نے کیا، یعنی شراب نوشی، جوا اور زنا۔ اسلا[م نے] پہلی بار عورت کو تحقیر، ظلم، استحصال اور نا انصافی کا ہدف بننے سے بچ[ایا] اس کے انسانی مرتبے اور حقوق کو تسلیم کیا۔

• اسلام کے ان اوصاف کو دنیا نے عام طور پر تسلیم کیا ہے۔ ا[س کے] علاوہ ایک اور وصف ہے جس کی طرف نظر کم گئی ہے وہ ہے ہر دور اور ہر گوشے میں ایسے انسانوں کا پیدا کرنا جو انسانیت کے معیار پر پو[رے] اترتے ہوں، جو پانی میں رہتے ہوئے اپنا دامن تر نہ ہونے دیں، دل میں خدا کا خوف ہو اور جو دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرتے ہوں کوئی طاقت کلمۂ حق کہنے سے نہ روک سکے۔ بُرائی کے باوجود جن کے دل برائی کے احساس سے آلودہ نہ ہو، جنھیں سیدھے راستے سے نہ کوئی ڈر سکے، نہ کوئی لالچ، تواضع جن کا مزاج ہو، انصاف جن کا شیوہ، فروتنی خو ہو، انسان دوستی اور ہمدردی جن کا مسلک، اور بے لوث خد[مت] جن کا مقصدِ زندگی۔ یہ لوگ نرم خو اور آہستہ رَو اور سراپا سکون ہوتے لیکن حق کی حمایت میں چٹان کی طرح سخت اور باطل کے مقابلے میں شمشیر [کی] طرح قاطع۔ یہ لوگ برائیوں سے بچنے کے لیے دنیا سے گریز نہیں کرتے دو[سروں] کو برائیوں سے بچانے کے لیے دنیا میں رہتے ہیں۔ اس وقت جب کہ فضا، مٹی اور پانی سب آلودہ نظر آتے ہوں۔ نمی اُن کی آنکھوں میں ہو دامن پر نہ آلودگی ہوتی ہے نہ نمی۔ مزدور جب ٹھیکے پر کھدائی کرتے ہیں تو زمین کے ایک چھوٹے سے حصّے کو تیشہ کی ضرب سے بچا کر چھوڑ دیتے ہیں پیمایش کا وقت آئے کہ کتنی مٹی کھودی گئی تو وہ حصّہ جو تیشہ سے مس نہیں اس کی نشان دہی کرے کہ کس سطح سے کھدائی شروع ہوئی تھی۔ مذکورہ اسی بچے ہوئے تودے کی طرح ہیں جس سے موازنہ کر کے یہ معلوم کیا جا سکے کہ ہم کس حد تک نیچے گئے ہیں۔ یہ لوگ اس لائٹ ہاؤس یا منارۂ نور [کی طرح] ہیں جو اپنی جگہ سے نہیں ہلتا لیکن دور دور تک جہازوں کو پر خطر چٹانوں [سے] دور رکھتا ہے۔ جن سے اگر وہ ٹکرا گئے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔

پس ہماری دانست میں اسلام کا بڑا کارنامہ نہ صرف یہ ہے کہ [اس] نے ایک قلیل عرصے میں ایک زبردست انقلاب اسلام کی اخلاقی اور ذہنی [دنیا] میں برپا کر دیا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے فیوض کو ان لوگوں تک محدود [نہیں رکھا] جو اس پر ایمان لے آئے اور اپنی قدروں اور لازوال اصولوں سے سا[ری] انسانیت کو متاثر کیا۔ بلکہ یہ بھی کہ اس نے قیامت تک ایسی مکمل اور شخصیتوں کو متواتر وجود میں لانے کا اہتمام کیا جو دنیا کی ترغیبات اور خباثت و مکروہات سے سر مو اثر پذیر نہیں ہوتیں۔ یہ لوگ ان

ہیں کہ جب کہ بدی حاوی نظر آتی ہے اور موج در موج بڑھتی چلی جاتی ہے' اِس
... ور پر سکون زندگی گزارتے ہیں جیسے کہ ماحول اور موسم ان پر اثرانداز
ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سورج پورب سے نکلے گا'
سی طرح ہم ان کے متعلق پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے پائے ثبات
کبھی لغزش نہ ہوگی اور کوئی دنیاوی طاقت انھیں حق طرازی' حق بیانی اور حق
گوئی سے باز نہیں رکھ سکے گی۔ یہ بظاہر سیدھے سادھے' کمزور اور نرم گو انسان
بڑے سے بڑے طوفان کے مقابلے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان ہی کے لیے کہا گیا ہے
کہ

مردانِ خدا خدا نہ باشند
لیکن زخدا جُدا نہ باشند

[خدا رسید لوگ خدا نہیں ہیں لیکن خدا سے جُدا بھی نہیں ہیں]

...یسا محسوس ہوتا ہے کہ قادر مطلق نے جب دین کے اتمام وتکمیل کا فیصلہ
کیا اور انبیائے کرام کے زریں سلسلہ پر خاتمہ کا مہر لگا دی تو یہ بھی مقدر ہوا کہ
...ن کی ترجمانی کے لیے خدا کے نیک بزرگوں کا ایک سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا
جن پر موسم اور لیل ونہار کے تغیّرات کا کوئی اثر نہ ہوگا اور جو بگڑی ہوئی
قدروں کی پرچھائیں بھی دامن دل پر نہ پڑنے دیں گے۔ جن کی ذاتِ گرامی تاریکی
... دی اور بدچلنی کے بحرِ ذخار میں مینارہ نور کی حیثیت رکھے گی۔ ان ہی لوگوں کی
برکت ہے کہ دنیا باوجود گناہوں اور بداعمالیوں کے ابھی تک تباہ نہیں ہوئی۔
خدا کا فضل ہے کہ یہ لوگ کتاب وسنت کے حامل اور پابند ہیں' ایک دور میں
یہ دو نہیں سیکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ آپ اپنے جوار میں دور تک دیکھیے
کم از کم بزرگ ایسے ضرور نظر آجائیں گے' جن کا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' مرنا جینا صرف
خدا کے لیے ہوگا۔ انسانیت کو اگر جسم تصور کیا جائے تو یہ لوگ اس میں آکسیجن کا
... رکھتے ہیں۔ طمع اور خوف کے علاوہ یہ نام ونمود سے بھی بالاتر ہوتے ہیں۔
... یہ اسلام کا کرشمہ ہے کہ ایسے نفوس کا سلسلہ اِس کثرت کے ساتھ جاری
ہے۔ یہ مختلف بستیوں میں بکھرے ہوئے ہیں جنھیں یہ تباہ ہونے سے بچائے ہیں۔

ہمیں "کاروانِ زندگی" میں ایک ایسے ہی شخص کے قدموں کی آہٹ ملی۔ انھیں
لوگ فرطِ محبت سے "علی میاں" کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالاں کہ ان کا پورا نام مولانا
سیّد ابوالحسن علی ندوی ہے۔ کاروانِ زندگی ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے
فروتنی کا یہ عالم کہ سالہا سال کے تامل اور فراواں اعتذار کے بعد سوانح عمری لکھنا
شروع کی " سیاست' قیادت' شہرت ومقبولیت' مشیخت' کمالِ علمی' ان میں سے
کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس تجویز کے لیے وجہِ جواز فراہم کرتی..... اس [راہ] میں
قدم قدم پر لغزش اور اپنے بارے میں خود فریبی وخودستائی' دوستوں اور
ساتھیوں کے بارے میں حق تلفی یا مبالغہ آرائی کے الزام کا اندیشہ ہے"۔ ہم

اس مضمون میں اس کتاب کے اقتباسات جابجا دیں گے تاکہ قارئین کو نہ صرف
... سوانح نگار کی شخصیت بلکہ اور بہت سی درخشاں شخصیتوں اور روایتوں کی
جھلک دیکھنے کو مل جائے۔

مولانا علی میاں کا تعلق رائے بریلی کے حسنی قطبی سادات سے ہے'
جن میں سے "تیرھویں صدی کے آغاز پر حضرت سیّد احمد شہید کی جیسی تاریخ ساز
اور عہد آفریں شخصیت پیدا ہوئی"۔ اس خاندان میں نسل اور اقدار وروایات
کی حفاظت کے لیے خاندان میں شادیاں کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ فاضل مصنف
نے اس انصاف پسندی سے کام لیتے ہوئے' جو اس کا شعار ہے' ایسی شادیوں
کی اچھائی اور بُرائی بے کم وکاست بیان کر دی' اور اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا
کہ خاندانی خصایص وروایات کا تسلسل بڑی حد تک قایم رہا اور خاص طور
پر عقاید میں کوئی فرق نہیں آیا اور مشرکانہ اعمال وبدعات داخل نہیں ہونے
پائے' بعد میں اس میں اتنا غلو اور ہوا کہ دائرہ سمٹتے سمٹتے بہت محدود ہو گیا
اور اس کا بڑا اثر اولاد کی صحتِ جسمانی' قوِیٰ اور ذہنی ملکات پر پڑا اور بعض
امراض متوارث ہو گئے"۔ یہاں اِس ہدایت کا ذکر کیا ہے جو حضرت عمرؓ نے ایک
قبیلے کو کی تھی' جس میں قریبی شادیوں کا بہت رواج تھا جس کا اثر صحتوں اور
قامتوں پر پڑا۔ انھوں نے فرمایا تھا۔ " ذرا باہر نکل کر شادی کرو' اولاد
قوی اور ہونہار پیدا ہوگی"۔ اپنے خاندان کے ضمن میں ان کا یہ لکھنا بھی انصاف
پسندی پر مبنی ہے کہ " کبھی مردم خیزی اور مرد آفرینی کا دور آتا ہے اور
کبھی قحط الرجال کا"۔ بات یہیں پر ختم نہیں کی' نفس کے محاسبے نے سوانح نگار
کو مجبور کیا کہ اپنے خاندان کی صالح روایات پر چھپے ہوئے اور جائز افتخار کو اُڑ
دبا دے۔ اس مقصد کے لیے اس حدیث کو نقل کیا گیا جس کا مطلب ہے کہ جس کو
اس کے عمل نے پیچھے ڈال دیا' اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔ مَنْ
اَبْطَأَتْ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔

اس تعدیل کے بعد لکھتے ہیں "میرے علم کی حد تک اس خاندان میں ان اللہ نظرِ
بد سے بچائے] کتنی ہی عملی کوتاہیاں اور اخلاقی کمزوریاں ہوں' شرک وبدعت
سے خاندان محفوظ ہے۔ والعلمُ عندَ اللہِ تعالیٰ"

" اس خاندان کی تاریخ میں بار بار ان اولوالعزم قایدین اور مجاہدین کے
نام آتے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں جہاد میں حصّہ لیا اور شہادت سے
سُرخ رو ہوئے"۔ خواہ یہ سیّد صاحب کی تحریکِ جہاد ہو خواہ ۱۸۵۷ء کا
ہنگامۂ رستخیز۔

اس خاندان میں " ایک طرف علمائے ربانی پیدا ہوتے رہے تو دوسری
طرف مشایخ روحانی..... اس کے افراد نے ... اپنے زمانے کے صحیح العقیدہ داعیٔ
سنت اور صاحبِ کمال مشایخ کی طرف بلا تکلف رجوع کیا اور ان سے علمی فیض

اور باطنی نعمت حاصل کی۔"

ابھی ہم اس اقتباسات کے سلسلے کو جاری رکھیں گے، تاکہ قارئین کو سوانح نگار کے خاندان اور اس کی روایات اور ان کے ارتقا کے متعلق دلکش اور معنی خیز اطلاعات براہ راست مل جائیں۔ دائرہ شاہ علم اللہ (رائے بریلی) کی مسجد کے نیچے سئی ندی بہتی ہے جو دیکھنے میں ایک حقیر، بے ضرر اور بے آزار ندی معلوم ہوتی ہے لیکن سخت بارش اور سیلاب کے زمانے میں اس کی طغیانی وفتنہ سامانی کا یہ حال ہوتا ہے

"تنگی ترشی کا زمانہ، کبھی فراغت، کبھی فاقہ .... والدہ صاحبہ نے کئی بار سنایا کہ جب ہیں کسی کو اپنے میکے سے آتے دیکھتی تو چولہے پر ہانڈی رکھ دیتی اور آگ جلا دیتی تاکہ معلوم ہو کہ کھانا پک رہا ہے، حالانکہ اس میں پانی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔"

والد ماجد حکیم سید عبدالحی صاحب مصنف "گل رعنا" بازار جھاؤلال میں رہتے اور مطب کرتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے بڑے مصنفوں میں تھے..... ہم بھائی بہنوں کو جو تھوڑے سے پیسے دست خرچ کے لیے ملتے ..... اس کا ایک ہی محبوب مصرف تھا کہ اس سے کوئی کتاب خرید لی جائے۔"

یہ منظر دیدنی ہے:

" جب عمر چھ سات سال کی تھی "کوئی مجھ سے وعظ کہنے کی فرمائش کرتا، کوئی نبض دکھاتا اور نسخہ پوچھتا.... وعظ کی فرمائش پر میں قرآن شریف کی آیت یا ایہا الذین آمنو قوا انفسکم واھلیکم نارا (اے ایمان والو بچاؤ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو دوزخ سے)

.... پھر کوئی نبض دکھاتا اور کہتا کہ حکیم جی نسخہ بتائیے۔ میں نسخہ بولتا، گل بنفشہ، گاؤ زباں، عناب ولایتی، تخم خباری، تخم خطمی۔ پرہیز پوچھنے پر شوربہ، پھلکا بتاتا۔"

آگے چل کر سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ان کا بچپن بالکل غیر درخشاں بلکہ مایوس کن تھا۔ مصنف کی صداقت اس بات کا تحمل کیوں کر کر سکتی تھی کہ پوری زندگی کو سنہری روشنی میں دکھایا جائے۔ ان اقتباسات سے قارئین کو اس خاندان کی ان روایات کا اندازہ ہوا ہو گا جو علم وفضل اور تقوی اور سادگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ سوانح نگار نے علم کی دنیا اور تصنیف و تالیف اور شریعت اور طریقت میں جو امتیازات حاصل کیے وہ انھیں دادھیال اور ننھیال دونوں سے ورثہ میں ملے تھے، اس پر مستزاد فاضل باپ (جن کا سایہ بہت جلد سر سے اٹھ گیا) ہوشمند ماں اور شفیق بھائی کی خصوصی توجہات

بچپن کے حالات میں کہیں اس کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے کہ خود کو غیر معمولی ثابت کیا جائے۔ سارے انداز عام بچوں کے سے، مثلاً یہ کہ اگر کوئی مہمان آگیا تو بچوں کی موج ہو جاتی، یا یہ کہ بوڑھی انّا کے ساتھ کہیں جا رہے تھے، میں صدقے کا کھانا کھانے کے لیے جو غریبوں کو بانٹا جا رہا تھا، رک گئیں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لیکن انّا نے روک دیا۔ شعر و شاعری کی طرف ہوئی ہی تھی، شفیق اور دور اندیش بھائی نے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ شغف ہوا۔ دو سال تک کھیلے، ہاکی بھی دوسرے اصنام کی طرح مشترک گوارا نہیں کرتی۔ اس لت سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ آگے چل کر یہ کہ ایک قریبی عزیز حافظ سید اسحٰق حسنی آئی۔سی۔ایس میں کامیاب ہو "انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا" لیکن ماں عنانگیر ہوئیں، وہ چاہتی تھیں کی راہ اور دینی زبان اور خدمت خلق غرضیکہ خاندانی روایات کو زندہ طبیعت شروع سے اصلاح پذیر تھی۔ ایک عزیز کے ساتھ ہیت رہنا ہوا تو دنیا کی بے ثباتی نے دل پر نقش بٹھا دیا" اس قیام نے جو کا مجاہدہ بھی تھا، ایک خانقاہی ماحول اور بزرگوں کی صحبت کا کام دیا۔ تحصیل علم کی خاطر دیوبند اور لاہور میں قیام کیا اور مولانا حسـ اور مولانا احمد علی صاحب سے درس کی تکمیل کی۔ کچھ تو جوہر قابل کچھ دین کی جستجو، سوانح نگار نے علم اور دین اور شریعت و طریقت سے متعلق کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس تصنیف کا محرک یہ خیال بھی تھا کہ شعور، ذہنی ارتقا، تحریر و تصنیف کی تاریخ اور اپنے زمانے کے اہم و حوادث اور دعوتوں اور تحریکوں کا ذکر کرنے کے سلسلے میں اپنے ان افکار، مشاہدات و تاثرات اور دعوت و تحریک کو اجمالاً و اختصاراً بیش اپنی تحریروں اور کتابوں کے مرکزی نقطۂ خیال اور ان کے اہم اقتباس کرنے کا بھی موقع ملے گا۔"

تواضع کند ہوشمند گزیں
نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں

(ہوشمند اور لائق آدمی لوگوں سے جھک کر ملتا ہے۔ پھلدار شاخ زمین پر جھکی جاتی ہے)۔

علم وفضل اور تقویٰ سے روایتاً جلال منسوب کیا جاتا لوگ اللہ سے لو لگا لیتے ہیں، وہ دنیا داروں کی مداخلتوں، حماقتوں او پر اکثر برہم یا چیں بہ جبیں ہوتے ہیں کہ سگان جیفۂ دنیا آکر ہمارا د خراب کرتے ہیں۔ عالموں، فاضلوں، مصنفوں اور دانشوروں کے لیے دشوار ہو جاتی ہے کہ جاہلوں اور ان پڑھوں یا ادھ پڑھوں کی تواضع انگیز کر سکیں۔ اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کے علاوہ تقویٰ اور پرہیز گاری اور اس بز بصیرت اور وسعت افق اور باخبری بھی عطا کی ہے اور جس کی دین دار

...کو سارے عالم اسلام نے تسلیم کیا' اس کو اپنی بڑائی کا احساس چھو تک
... نہیں پر دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت یا طاقت اثر انداز نہیں ہو سکتی
... سے انتہائی تواضع اور سچے انکسار کے ساتھ ملتا ہے۔ ہم نے انکساری
... کا مشاہدہ کیا ہے۔ ایک انکساری وہ ہوتی ہے جو زبان سے
... یہ گویا ایک بے جان رسم ہے جسے برتا جا رہا ہے۔ انکسار کی دوسری
... کوئی شخص اپنے متعلق بغایت حسن ظن رکھتا ہے لیکن کہنا خود کو
... اس لیے کہ مخاطب فوراً احتجاج کرے اور کہے کہ یہ آپ کیا
... تو خلق کی زبان پر ہے۔ ایک صاحب خود کو عاصی پُر معاصی
... اپنا شمار اقطاب وقت میں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب
... اور علامہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے دل میں ایسے مواقع پر یہ خیال آیا
... ہاں میں ہاں ملائی جائے' جو کچھ وہ اپنی قدح میں کہہ رہے ہیں'
... و خروش کے ساتھ کی جائے تاکہ ان کی فطری برہمی بناوٹی انکسار
... کردے۔ لیکن اسی لمحے ہمیں اپنے دامن او رشبیہ کا خیال عنان گیر ہوا۔
... صاحبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔" والد صاحب کے انتقال کی
... دل ... قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں لیکن دو
... تھیں ..... ایک تو نماز کے بارے میں کبھی تساہل نہیں برتتی
... نماز کے بغیر کبھی سو گیا تو اٹھا کر نماز پڑھواتیں۔ اس طرح فجر کی
... جگاتیں اور مسجد بھیجتیں اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لیے
... دوسری بات اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج والے غریب بچوں
... زیادتی ناانصافی کرتا یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ
... معافی منگواتیں' بلکہ ہاتھ تک جڑواتیں۔ اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلّت
... ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں۔ اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت
... ظلم و تکبّر و غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں
... کبیرہ گناہ سمجھنے لگا۔ اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کرنا ہمیشہ آسان

... والدہ صاحبہ کی تربیت کے اس انداز کا ذکر کرتے ہوئے ایک تجربہ اور
... اس کا بھی ذکر کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ بچوں کی مذہبی و اخلاقی
... کے اس قابل ہونے میں کہ اللہ تعالےٰ ان سے اپنے دین کی کوئی خدمت
... عطا فرمائے' دو چیزوں کا بڑا دخل ہے' ایک یہ کہ [وہ اپنی عمر کے مطابق]
... آزاری سے محفوظ رہیں اور کسی دکھے ہوئے دل کی آہ یا مظلوم کی کراہ ان
... پر اثر نہ ڈالے۔ دوسرے یہ کہ ان کی غذا غصب و حرام اور مشتبہ مال سے

سوانح نگار کا گہرا تعلق ندوۃ العلما کی تحریک اور ایک حد تک اس کی تشکیل
...ہے تھا:

" دین و عقاید کے معاملے میں ندوۃ العلما کے مسلک کی بنیاد دینِ خالص
پر ہے .....

دین کے فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین
اور صاف و شفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال و اخلاق کے شعبے میں دین کے جوہر و مغز کو اختیار کرے' اس پر
مضبوطی سے قائم رہے ... اور تقوی و صلاحِ باطن پر ہے۔

تصوّر تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا
دورِ اول سب سے بہتر اور قابلِ احترام دور' اور وہ نسل جس نے آغوش نبوت اور
درس گاہ رسالت میں تربیت پائی' اور قرآنی اور ایمان کے مدرسے سے تیار ہو کر
نکلی' سب سے زیادہ مثالی اور قابل تقلید نسل ہے ....

نظریۂ علم و فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذات خود ایک
اکائی ہے' جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی
...... ترک و قبول کے شعبے میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ " حکمت
مومن کا گمشدہ مال ہے' جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق
ہے۔ نیز خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ [یعنی جو صاف ہو اس کو لے لو اور جو
کثیف ہو اس کو چھوڑ دو] ...... عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلے میں اس
کی اساس اس ارشاد ربانی پر ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ [ان کے مقابلے کے لیے
جتنی قوت تم سے ہو سکے تیار کرو]

...... حتیّ الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرز عمل سے
احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے ......"

" علاوہ بریں پورے دارالعلوم پر عربی زبان اور اردو ادبیات و تاریخ
کے مطالعے کی فضا چھائی ہوئی تھی"! عربی کا رسالہ "الضیا" بڑے اہتمام سے ندوہ
سے نکلتا تھا۔ اس کے تبادلے میں عرب ممالک کے معیاری رسایل " المنار"
"الفتح" " العرفان" " الصفا" " الرسالہ" اور " الثقافہ"
آتے تھے۔

سوانح نگار کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اس نے ندوہ کا رخ دعوت
و عزیمت کی طرف موڑ دیا۔ یہ گویا مولانا سید محمد علی مونگیری کے مسلک کی بازیابی
تھی۔ دعوت کے لیے سوانح نگار کے دل میں کتنا ولولہ تھا اس کا اندازہ اس بات
سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں وہ بے یار و مددگار رہبی کے لیے اجنبی دیار
کی طرف اس لیے روانہ ہوا کہ ڈاکٹر ایبیدکر کو اور ان کے ذریعے ہریجنوں کو
اسلام کی دعوت دے۔ " جب میں کسی سے اس مہم کا ذکر کرتا تو اس کو ہنسی

آجاتی اور مجھ کو سر سے پاؤں تک دیکھتا کہ

اس حوصلہ کو دیکھیے، اور اِن کو دیکھیے

میں نے بڑی احتیاط اور راز داری کے ساتھ ڈاکٹر امبیدکر کے مکان کا پتہ پوچھا معلوم ہوا دادر میں ان کا بنگلہ ہے،.... میں نے انگریزی دعوتی رسائل کو جو لکھنؤ سے لایا تھا ساتھ لے کر ٹرام پر سوار ہوگیا۔ دادر اتر کر اُن کے بنگلہ پہنچا.... میں نے سوچا ان اہم ملاقاتیوں اور آنے والوں میں میں ان کی نظر میں کیا جچوں گا، اور وہ میری طرف کیا توجہ کریں گے، لیکن اللہ کا نام لے کر میں بیٹھ گیا.....

میں نے دیکھا کہ میز پر جو کتابیں تھیں، ان میں پکتھال صاحب کا 'ترجمۃ القرآن' بھی تھا، جس میں نشانی رکھی ہوئی تھی....

داعی نے چھوٹتے ہی کہا " اگر آپ کو اپنی اور اپنی برادری کی نجات کی فکر ہے اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے تو میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں .... انگریزی کا لٹریچر پیش کیا اور درخواست کی کہ اس کا مطالعہ ضرور کرلیں"۔ انھوں نے بالآخر بدھ مت اختیار کرلیا"۔

علّامہ اقبال سے دو بار ملاقات ہوئی سب سے بڑی چیز جو مجھے اُن کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے .... میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر انفس و آفاق کے لیے ابھارتا ہے، جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے.....

میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لیے ہیں کہ وہ بلند نظری محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں، اور مغرب کی مادّی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں، وہ اسلام کی عظمتِ رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گذشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے عظیم داعی ہیں"۔

" ۱۹۴۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے دینیات کا نصاب مُرتب کیا۔ ڈیڑھ دو ماہ علی گڑھ میں قیام رہا۔ " شام کو مولانا سلیمان اشرف صاحب کی مجلس میں حاضر ہونا اور بعض مضامین پر تبادلۂ خیال کرتا.... وہ غیر معمولی طور پر ذہین اور خوددار واقع ہوئے تھے۔ یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے ذمہ دار .... اُن کی خدمت میں نیازمندانہ وشاگردانہ حاضر ہوتے، مؤدب بیٹھتے اور ان کی ان اداؤں کو نہ صرف برداشت کرتے بلکہ ان کا لطف لیتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مولانا سارے علمائے دین کی طرف سے جدید تعلیم کے سب سے بڑے مرکز میں علماء کے وقار و احترام کا نقش قایم کرنے اور جدید طبقے سے بعض اوقات جو طنز و استہزاء دیکھنے میں آتا ہے، اس کا جواب دینے کا فرض کفایہ ادا کرنے کے لیے یہاں تشریف رکھتے ہیں"۔

مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی کے متعلق رقمطراز ہیں "میں نے اُن کی جیسی دل آویز اور جامع شخصیت کم دیکھی ہے۔ وہ اس تہذیب اور اس قدیم وتربیت کا دلکش نمونہ تھے، جس کی خصوصیت علم و عمل کی جامعیت، ثقافت کی وسعت و تنوع، خوش ذوقی اور سبک روحی تھی، وہ تمام علوم قدیمہ میں قدم راسخ رکھتے تھے۔ وہ نظر فقیہ تھے، اعلیٰ درجے کے ہیئت و ریاضی داں تھے (یونیورسٹی کی دعوت گری تقویم کا تیار کرنا انھیں کا کام تھا) فارسی اور اردو شاعری کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے بکثرت اشعار ان کو یاد تھے۔ "مغز و نغز" کے نام سے مثنوی مولانا روم کا انھوں نے انتخاب شایع کیا ہے۔ علم مجلسی اور واقفیتِ عام میں ایسے امتیاز خاص کے مالک تھے یونیورسٹی کے اعلیٰ پروفیسر ان کی مجلس میں شریک ہونا نہ صرف باعث سعادت بلکہ ذریعہ اضافۂ معلومات سمجھتے۔ اس سب کے ساتھ اپنے خاندانی مسلک و روایات (سید شہید کے مسلک توحید، اتباعِ سنت اور ردِ بدعت) میں بے لچک تھے اور اس میں مداہنت یا مروّت گوارہ نہ تھی۔ خودداری، مہمان نوازی.... میں انھوں نے علمائے سلف اور قدمائے ماضی کی یاد تازہ کردی تھی۔ ان یگانہ خصوصیات و متضاد صفات کی وجہ سے وہ یونیورسٹی کے حلقہ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس میں مولانا اشرف بھی ان کے شریک تھے (لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مولانا ابوبکر صاحب سب کے ساتھ محبوب و ہر دل عزیز تھے) میرا قیام بھی بالکل مرکزی حصّے میں سید ہال میں تھا۔ مولانا ابوبکر صاحب کے یہاں کھانے کے وقت جاتا تو یونیورسٹی کا حلقہ کرکے باب اسحٰق سے نکل کر ذکاء اللہ روڈ جاتا...' اس وقت کا احساس ہے کہ طلبا میں تہذیب اور علماء کا احترام تھا۔ ایسا کم اتفاق ہوا ہوگا کہ مجھے سلام میں سبقت کا موقع ملا ہو۔ طلباء دیکھتے ہی السلام علیکم کہتے۔ میں نے اپنی اس آمد و رفت میں دن میں کم سے کم تین مرتبہ ہوتی، کوئی طنزیہ فقرہ یا کوئی پھبتی نہیں سنی بخلاف کو یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے .... کہ وہاں سے ہم جیسے لوگوں کا گزرنا دعوتِ مذاق تھا"۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ندوہ کے عربی زبان و ادب کے نصاب کی تیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ہندوستان میں صدیوں سے مدارس کا اوڑھنا بچھونا درسِ نظامی تھا اس نصاب کے غیر دینی مضامین میں بہت سے نظریات ایسے تھے جنھیں جدید تحقیق نے فرسودہ قرار دے دیا تھا۔ لیکن ہمارے مدارس اسی پُرانی لکیر پیٹ رہے تھے۔ جہاں تک عربی نثر و ادب کا تعلق ہے نصاب سجع و قافیہ، تصنع و تکلف کا شکار تھا۔ اس کی نمایاں مثال مقاماتِ حریری ہے جو امیر خسرو کے عہد سے آج تک داخل نصاب ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایسے پرتصنع اسلوب کو منسوخ کیا اور قرن اول سے لے کر عصرِ حاضر تک" کا مجموعہ مرتب کیا جسے "مختارات" کا نام دیا گیا۔ اس کے مقدمہ میں "منثورات" آ گئے۔ اصلاح نصاب کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی (۱۹۸۱ء)۔ مختارات کے مقدمہ کی مذکورہ ذیل سطور سے مدوّن کے نقطۂ نظر

...رق کا ... پر روشنی پڑتی ہے۔

... ادب کی آزمائش اور ابتلا یہ ہے کہ اس پر ایسے لوگ حاوی ہوجائیں ... فن اور پیشے کے اپنا تے ہیں... اور اس کو بنانے سنوارنے اور ... میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں... اور ایک ایسا وقت ... کا ... ان ہی کی نگارشات قلم تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے، جو محض صنعت و ... تقلیدی ادب کا مجموعہ ہوتا ہے، اس کے اندر نہ زور ہوتا ہے نہ رُوح، جدّت ... ہوتی ہے نہ دل آویزی کا کوئی سامان"۔

"... کو دمشق یونیورسٹی نے ادبِ عربی کے نصاب میں داخل کرلیا۔ قصص النبیین ... بقول مولانا مسعود عالم "زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے ... جیسے گوشت اور ناخن"۔ مصر کے مشہور عالم سیّد قطب نے تبصرہ ... ہمارے وضع کیے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے، اس ... میں ... لطیف رہنمائیاں، قصہ کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات ... ایسے اشارات آگئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی ...

... علوم کی تدریس کے آغاز (۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک) تک میری سب سے ... طلباء کے پڑھانے، ان میں قرآن مجید اور عربی زبان وادب ... پیدا کرنے میں تھی۔" جب یہ دیکھا کہ طلباء پر خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ... بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب ماحول کا فساد ہے۔ یہ زہر صالح ... نہیں دیتا۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ موثر ہونے کے لیے تحریک و دعوت کی ضرورت ہے ... ذہنی پرداخت اسلام کے اولین داعیوں اور مبلغوں کے واقعات کے ... ہوئی تھی"۔ ۱۹۴۶ء میں جب کہ دارالعلوم سے قطع تعلق کرچکا تھا۔" اس ... کا کوئی ذریعہ نہ تھا، نہ کتابوں کے معاوضے اور نفع کا کوئی سلسلہ۔ ... طور پر سخت پریشانی کا گزرا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ امین آباد ... نظیر آباد جانے والی سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر میں نے جیب سے گھڑی ... کہ اس کو کسی گھڑی کی دوکان پر آدھے پونے دام پر بیچ دوں اس ... لیے، لیکن پھر اس خیال سے ہمت نہیں ہوئی کہ دوکان دار کہیں چوری ... سمجھے..."

... مولانا الیاسؒ کو تمنا تھی کہ اسلام کے اصل مرکز میں جاکر اس کام کی ... ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر سمپورنانند اور پرشوتم داس ٹنڈن کے اعتراضات ... ہندی وانگریزی لٹریچر تیار کرنے کے لیے جگر صاحب نے ایک ہزار ... کی طرف سے پیش کیے۔

حجاز کے قیام کے دوران اس کا بہ شدت احساس ہوا کہ مغربی تہذیب عرب ... طور پر متاثر بلکہ مفلوج کرچکی تھی، بھائی صاحب کو حجاز سے خط لکھا

"۱۹۴۷ء میں ہم پہلی بار یہاں آئے تھے اب ۱۹۵۰ء میں آئے ہیں تین برسوں میں کھلا ہوا تغیّر محسوس ہوتا ہے۔ بازار سے لے کر دماغوں تک مغربی تمدن، تجارت، معاشرت اور افکار وخیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں... معاش کا انہماک، دولت آفرینی کی عادت بحرانی حد تک پہنچ چکی ہے... عالم اسلام کا قبلہ مکۂ معظمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکز اسلام کا قبضہ سر دست امریکہ ہے۔ وبائے عام کی طرح اس کا اثر فضا اور ہوا میں ہے۔ اس کے مقابلے میں ہماری حقیر کوشش بالکل بے حیثیت رکھتی ہے جو کسی سمندر میں ٹھیکریاں پھینکنے سے لگے تموج کی حیثیت ہوتی ہے"۔

"صورت اور حقیقت میں بڑا فرق ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی حقیقت نے بڑی سے بڑی صورت پر فتح پائی ہے"۔

"حجاز سے ۱۹۴۹ء میں واپس ہوا تو عربوں کو اُن کی زبان میں اسلام کی طرف بازگشت کی دعوت اور عالم اسلام ہی نہیں انسانی دنیا میں داعیانہ و قائدانہ کردار ادا کرنے اور اپنا قدیم منصب سنبھالنے کی دعوت دل ودماغ پر چھا گئی"۔

"حجاز کے اس دوبارہ قیام سے جس کی مدت چار مہینے کے قریب تھی اور جس میں تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہل قلم واہل فکر سے ملنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔ عالم عربی میں مصر کی ادبی اور علمی قیادت کا اندازہ ہوا اور معلوم ہوا کہ مریض وسقیم فکر وادب انتشار انگیز لٹریچر اور اس کے مقابلے میں صحت مند خیالات، صالح علمی وفکری قیادت دونوں کا مرکز اور سرچشمہ (عالم عربی کی حد تک) مصر ہی ہے۔ اگر عالم عربی میں کسی چیز کو پھیلانا اور وسیع بنانا ہو اور اس میں کوئی تغیّر وانقلاب لانا ہو تو وہ مصر ہی کے راستے سے ممکن ہے"۔

۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں تقریباً چھ مہینے قیام رہا۔ "اس وقت تک دور ناصری کی وہ باد خزاں نہیں چلی تھی جس سے علم وادب، فکر اسلامی، آزاد سیاست اور اخلاقی جرأت وتنقید کے سرسبز وشاداب درخت برگ وبار سے محروم ہوئے اور پورے ملک پر انقلاب کی ایسی جھاڑ دبھری کہ گرد وغبار کے سوا کہیں زندگی اور زندہ دلی کے آثار نہیں نظر آتے تھے..."

"میں تاریخ اسلام، خدمت دین اور خدمت اسلام کا وہ باب آپ کے سامنے کھولتا ہوں جس پر ابھی تک آپ کی نظر نہیں پڑی ہوگی"۔

مصر میں اخوان المسلمین کے ساتھ روابط اور تعلق پیدا کیا۔ اس جماعت کے بانی شیخ حسن البنا (جو ۱۹۴۹ء میں شہید ہوچکے تھے) کی شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے۔ "وسیع وروشن دماغ گرم وپرمحبت ودرد مند دل، فصیح وبلیغ زبان، تسخیر کرنے والے اخلاق، دلآویز شخصیت"۔

"اسمعی یا مصر" کے نام سے مولانا نے اہل مصر سے خطاب کیا اور انھیں بتایا کہ وہ عالم عربی اور عالم اسلامی کی رہنمائی کرسکتے ہیں مصر کے بعد سوڈان گئے جہاں

حقیقی مسرت

تمھیں ذلیل کرنے والی اور زیادہ پریشان و سرگرداں بنانے والی عموماً وہی خواہشیں ہیں جن کو تم نے اپنی ہوس پرستیوں کے لیے خود ہی تصنیف کر لیا ہے۔ ان سے پیچھا چھڑاؤ ان کو دل سے بھلاؤ اور دیکھو کہ سچی مسرت اور بے غل و غش خوشی تمھارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ (عبدالحلیم شرر : شادی و غم)

افریقہ میں اشاعتِ اسلام کے روشن امکانات کا ذکر کیا اور کہا کہ براعظم افریقہ کی باری ہے کہ دعوت کے لیے کمر کس لے۔

دمشق کے علمی حلقوں میں کئی تقریریں کیں۔ ایک تقریر میں المیۂ فلسطین کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "عرب حکومتوں اور قوموں میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس کے دل و دماغ پر فلسطین کا مسئلہ چھا جائے اور اس کی صلاح الدین ایوبی کی طرح وہ کیفیت ہو جائے جس کو ان کے سکریٹری ابن شداد نے اس طرح بیان کیا ہے۔ "معلوم ہوتا تھا کہ ماں کی گود میں اس کے اکلوتے بچے کو کسی نے حلال کرکے ڈال دیا ہے"۔

دمشق کی ایک تقریر میں کہا کہ "جس طبقے کے ہاتھ میں ملکوں کی زمامِ کار ہے، اسلام پورے طور پر ان کے حلق سے نہیں اترا۔ ان کا اسلام پر ایک دین اور ضابطۂ حیات کی حیثیت سے ایسا ایمان نہیں ہے، جیسا مغربی تہذیب کے اصولوں اور اس کی افادیت پر ہے.... دوست دشمن کے فرق کی تمیز نہیں، قوم کا اجتماعی ضمیر بیدار نہیں ہوا ہے"۔

ایک اور تقریر میں فرمایا "عرب نعرۂ قومیت کے ساتھ روحانی قیادت اور عالمی مرکزیت کی توقع نہیں کر سکتے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان قوموں کو بھی اپنی پرانی قومیتیں یاد آئیں گی جن کو ترک کرکے وہ وحدتِ اسلامی اور اخوتِ انسانی کے دائرے میں داخل ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۵۱ء میں تقریباً ۱۴ مہینے کے بعد حجاز و مشرق کے سفر سے واپسی ہوئی۔

۱۹۵۱ء سے ۵۶ء تک مخلوط اجتماعات کے سامنے انسانیت اور اخلاق پر تقریریں کیں۔ "یہ اقدام اس خیال پر مبنی تھا کہ ہندوستان میں رہ کر اس کی (غیر مسلم) اکثریت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو بہرحال اس ملک پر اور اثر انداز رہے گی اور جو... اسلام کے عقائد و حقائق و دعوت سے ہے۔ پاکستان کے قیام اور کوتاہ اندیش مقررین کی اشتعال انگیزی نے مسلمانوں سے متنفر اور بدگمان بنا دیا... جب مسلمانوں کی سلطنت و اقتدار گیا تو سب کچھ گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ مسلمان اس ملک میں خلا میں ہیں

"غیر مسلم اکثریت کے ان افراد... کے ذہن و ضمیر تک پہنچنے کا اس وقت زندگی کے مشترک مسائل، انسانیت اور اخلاق اور ملک کے تذکرے اور تمام مسائل و مصائب کے حل کی نشان دہی کے سوا نہیں ان کو اسلام کے مطالعہ .... پر آمادہ کر سکتا ہے"۔

اس سلسلہ کی تقریریں لکھنؤ کے بعد تبلیغی دورے کے دوران جون پور، غازی پور، مئو اور گورکھپور میں کی گئیں .... "اسی تجربہ اور ۱۹۷۴ء میں "پیام انسانیت" کی تحریک اختیار کر لی۔

دیوبند کے طلبا کی دعوت پر ایک مقالہ "طالبانِ علومِ نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے لکھا۔ "اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون و وقوف ہو تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے، لیکن جب زندگی رواں ہے تو مدرسہ میں جمود و تعطل کی گنجائش کہاں، اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے مقابلہ کرنا ہے... وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے تو کی رفاقت اور قیادت کون کرے..."

لیکن ... ہمارے ان ہی اسلاف نے ہر دور اور ہر عہد میں اس (دین و علوم اسلامیہ) کو زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی انھوں نے اس کی ایسی ترجمانی اور تشریح کی کہ اُن کی معاصر نسلوں کے دماغوں نے اس کو بآسانی قبول اور ہضم کر لیا اور ان کو اپنے زمانے، اپنی عقلی سطح اور اس دین کے درمیان کوئی تفاوت اور فاصلہ محسوس نہیں ہوا... ان میں اصل مقاصد دین اور منصوصات کے بارے میں پہاڑوں کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت تھی لیکن اس کی تعبیر و تشریح میں اس کی توضیح و تفہیم میں شاخ گل کی سی لچک اور ریشم کی سی نرمی تھی"۔

مندرجہ بالا سطور خود سوانح نگار کے موقف اور زاویۂ فکر کی آئینہ دار ہیں۔

۱۹۵۴ء میں پاکستان کے سفر پر تشریف لے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں شام کا دوسرا سفر در پیش ہوا۔

تاریخ دعوت وعزیمت چار حصّوں میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۸۰ء تک مکمل ہوگئی۔
قارئین نے دیکھا ہوگا کہ اس مضمون کا بیشتر حصّہ "کاروانِ زندگی" سے
مشتمل ہے۔ یہ مضمون صحیح معنوں میں نہ تلخیص ہے نہ تبصرہ بلکہ ایک پاکیزہ
بصیرت شخصیت کو قارئین کے روبرو لانے کی کوشش ہے۔ اقتباسات
دیے ہیں جس کے اندر جھانک کر نہ صرف سوانح نگار کی شخصیت کو ڈھلتے ہوئے
دیکھ سکتے ہیں بلکہ ان ساری روایات اور تحریکات سے روشناس ہوسکتے
... کا سرچشمہ کتاب وسنت ہے۔ ہمارے سامنے کسی نہ کسی عنوان وہ سارے
... جاتے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی عیسوی میں مثال، وعظ، تلقین
... دعوت و ہدایت کے تابناک سلسلہ کو جاری رکھا۔ ان کی ذاتِ گرامی
... کی طرح ہیں جو ناظر کی نگاہ کو منبعِ نور کی طرف لے جاتی ہیں۔ قارئین نے
دیکھا ہوگا کہ سوانح نگار نے جب سے ہوش سنبھالا اپنی ذات کو تزکیہ اور
دعوت اور عزیمت کے لیے وقف کردیا۔ اپنے ذوق، صلاحیتوں اور اکتسابات
... کے تابع کردیا۔ ندوۃ العلما کے نصاب کی تشکیلِ نو سے جس سلسلہ
... ہوا تھا اس نے بالآخر عرب ممالک کے نصاب کا احاطہ کرلیا
... علی ندوی نے مذکورہ نصابوں میں نئی جان ڈال دی اور انھیں
... سے ہم آہنگ کردیا اور جامد اجزا کے بوجھ سے انھیں نجات دے دی۔
... بات ہے کہ عربوں نے جنھیں اپنی زبان دانی پر اتنا ناز ہے کہ ایک زمانہ
... باقی دنیا کو گونگا قرار دیا تھا۔ مولانا علی میاں کی زبان اور اسلوب کو بے چون
و چرا تسلیم کرلیا۔ یہی نہیں، دین کی بابت ان کی تعبیر کو احترام کی نگاہ سے
... یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لیے بلائیں۔ ان کی تقریروں کو ریڈیو پر
... عرب ممالک میں جہاں کہیں بھی گئے، ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ اس پذیرائی میں
... بصیرت اور ادراکِ دین کے علاوہ عربی زبان وادب پر عبور اور تحریر وتقریر
... کو بھی دخل تھا۔

عالمِ اسلام نے جو فوق العادۃ پذیرائی کی اور جو غیر معمولی امتیازات ان کے لیے
... انھوں نے ایک لمحہ کے لیے علی میاں کو ہندوستان کے مسائل سے غافل نہیں
... مسلمان ہمیشہ ان کی توجہ کو جذب اور ان سے رجوع کرتے رہے اور
... کرتے ہیں۔ ان کی پاکیزہ شخصیت اپنوں اور بیگانوں کی نظر میں یکساں
... دینی تعلیم اور پیامِ انسانیت وہ اہم تحریکات ہیں جنھیں مولانا
نے خونِ جگر سے پروان چڑھایا ہے۔

... مضمون کے آغاز میں اسلام کی اس خصوصیت کا ذکر کیا تھا کہ اس
... دور میں ایسے لوگ نظر آجاتے ہیں جو تقویٰ اور پرہیزگاری میں قرونِ
... اخیار کی یاد دلاتے ہیں۔ مولانا علی میاں کے یہاں پرہیزگاری اس
... علم وفضل، بصیرت اور دور اندیشی عصری آگہی اور وسعتِ افق، اور و
ہمدردی جو ساری انسانیت کا احاطہ کرلیتی ہے۔ پیامِ انسانیت کے سلسلہ میں اور
یوں بھی مولانا نے بارہا ان مشترک محفلوں کو خطاب کیا ہے جن میں غیر مسلم معقول تعداد
میں تھے۔ انھی میں یہ صلاحیت ہے کہ دین کو اس اس عنوان غیر مسلموں کے سامنے
رکھیں کہ وہ اس کی طرف کھنچنے لگیں یا کم از کم اس سے کھنچنا چھوڑ دیں۔ علی میاں کی
تقریروں میں نہ زورِ بیان ہوتا ہے، نہ عبارت آرائی، نہ مبالغہ، نہ زیبِ داستان۔ ہاں
ان کی سادگی اور خلوص اور بے ساختگی اور تازگی اور پردہ براندازی دلوں کو موہ لیتی
ہے، زنگ چھڑا دیتی ہے اور سامعین کو حقیقت کے روبرو کھڑا کر دیتی ہے
وہ ایک ایسے عالمِ باعمل کی شبیہ پیش کرتے ہیں جس کا شیوہ غور وفکر، جس
کا آئین عدل وانصاف، جس کا رخ ترحّم اور امداد، جس کا رجحان انسان دوستی، جس
کا شعار رافت اور ہمدردی ہے جس کی خو انکسار اور فروتنی ہے۔
مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اتھاہ سکون کے نیچے اضطراب کا ایک بحرِ ذخار موجزن
ہے۔ اضطراب، نیش زن اور جگر دوز اضطراب انسانیت کے اخلاقی انحطاط اور
عصرِ حاضر کی خود غرضی، ہوس رانی گمراہی اور زر پرستی پر۔ وہ انسانیت کو خانوں میں
بانٹ ہی نہیں سکتے۔ ان کے نزدیک اسلام کی افادیت کا دائرہ مسلمانوں تک محدود
نہیں رہ سکتا۔ اسلام انسانیت کی اصلاح اور فلاح کے لیے آیا ہے۔ مسلمانوں کی بے راہ
روی سے وہ کبیدہ خاطر ہیں، مایوس نہیں۔
کاروانِ زندگی سے متاعِ کارواں ہمارے ہاتھ آئی۔ ہم نے قارئین تک
پہنچادی۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

سید حامد
رانی کھیت - ۲۶ جون ۸۴ء

نادانی

حقیقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کا بوجھ اٹھا کر اتنی تکلیف محسوس نہیں
کرتے جس قدر اپنا بوجھ اٹھاتے ہوئے ہماری جان جاتی ہے۔
بہت سے لوگ دوسروں کا بوجھ اٹھانے ہی اس لیے ہیں
تاکہ انھیں اپنا بوجھ نہ اٹھانا پڑے (مشکور حسین یاد: تنہائی)

سید مشرف علی

سرسید کا کارنامۂ خاص

سرسید کے مقاصد اور ایم۔اے۔او کالج۔ایک جائزہ

انیسویں صدی کا وسط بالخصوص ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کا زمانہ ہندوستان میں تحریکی و تعمیری دور کے آغاز کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کو باضابطہ حکومت کرتے تقریباً سو سال سے زائد ہو چکے تھے اور انگریزی تہذیب کے اثرات بھی واضح ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان اثرات سے ہندی اقوام کے اندر تقریباً سبھی فرقوں میں قدامت پسند عناصر فکر مند تھے کہ ان کے مذہبی رجحانات معاشرت اور رسم و رواج جو تمام تر مذہبی اعتقادات کے تابع تھے، کمزور ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ دوسرا پہلو انگریزوں کی حکومت کا یہ بھی بہت اہم تھا کہ ہندی اقوام کو انگریزی اثرات سے کیا مکمل طور پر محفوظ کیا جائے یا انگریزی تعلیم و تربیت ان کی ترقی اور سائنسی علم و فن کو حاصل کرنے کے لیے قبول کرنا ضروری ہے۔ حالات کے ان تقاضوں کے پیشِ نظر ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں اپنی اپنی سماج اور مذہبی اعتقادات کے تحفظ و تنظیم کے لیے قیادت کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ مسلمانوں میں دو شخصیتیں دو مختلف نظریات کے ساتھ مسلمانوں کی قیادت کے مقاصد کو لے کر سامنے آئیں۔ یہ دو شخصیتیں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دوسری سرسید احمد خاں تھیں۔ مولانا قاسم نانوتوی کے خیالات کے اعتبار سے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم و تربیت سے بالکل محفوظ رکھنے کے لیے ان کو خالص دینی تعلیم دینا انتہائی ضروری تھا۔ سرسید نے ان کے خیالات کی مخالفت تو نہیں کی مگر دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم و تربیت کو بھی مسلمانوں کے کامیاب مستقبل کے لیے ضروری سمجھا۔ مولانا کا ذہن اس امتزاج پر راضی نہ ہوا اور نتیجے میں دونوں نے دو علیحدہ علیحدہ اداروں کی بنیادیں ڈالیں۔ مولانا قاسم نانوتوی نے دیوبند میں ۱۸۶۶ء میں خالص دینی ادارہ مدرسہ اسلامی عربی کے نام سے قایم کیا اور سرسید نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے اپنے ادارے کی ۱۸۷۶ء میں شروعات کی۔

سرسید کا یہ قدم قدامت پسندی اور مذہبی ماحول کے اعتبار سے ایک انتہائی نازک قدم تھا۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں نے سرسید کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ ان کی اس مخلوط تعلیمی تحریک کے خلاف احتجاج کیے۔ بیرونِ ہند مسلم ممالک سے فتوے حاصل کیے۔ سرسید کے ارادوں کو کمزور اور تعلیمی پالیسی کو پامال کرنے کی زبردست کوششیں کیں۔ سرسید پر علماء کا الزام تھا [illegible] کو اپنے مذہب سے ہٹا کر عیسائی بنا دینا چاہتے ہیں۔ مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت [illegible] ماحول اور انگریزوں کی سرپرستی میں ہو یہ کیوں کر گوارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ [illegible] کی یہ تحریک مسلمان دشمنی اور مذہب شکنی کی تحریک تصور کی گئی۔ اسلامی ممالک سے رابطے قایم کیے گئے تاکہ ان ممالک کے دباؤ سے سرسید کے ارادوں میں [illegible] پیدا ہو۔ مخالفت کا یہ سلسلہ سرسید کی زندگی ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ان کی [illegible] کے بعد عرصے تک مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے میں اس ادارے کے مقصد [illegible] بے چینی کا احساس غالب رہا۔ لہٰذا ترکی جس کو مسلم ممالک میں بیسویں صدی کے اوّل چہار صد میں نام نہاد ہی سہی، خلافتِ اسلامیہ کی مرکزیت حاصل تھی۔ [illegible] کے حکمراں سلطان عبدالحمید سے رجوع کیا گیا۔ مسلمانوں کے اس [illegible] کے نتیجے میں سلطان موصوف ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ تشریف لائے۔ نواب محسن الملک اس وقت بورڈ آف ٹرسٹیز [Board of Trustees] [illegible] تھے، ان سے سلطان عبدالحمید نے طلباء سے ملنے کی خواہش ظاہر کی [illegible] ظاہر کیا کہ مجھے برابر اطلاع ملتی رہی ہے کہ اس ادارے کی تعلیم سے مسلمان [illegible] دینی رجحانات بدل رہے ہیں اور مسلمانوں کو یہ خطرہ ہے کہ ان کے بچے [illegible] اپنے دین و ایمان سے ہٹ کر کہیں عیسائیت نہ اختیار کر لیں۔ نواب محسن الملک [illegible] ہوئے مگر سلطان ترکی کی تکمیل خواہش کے خاطر طلبا کو آسمان منزل میں [illegible] گیا۔ سلطان ترکی لڑکوں سے ملنے تشریف لائے۔ انھوں نے ایک لڑکے [illegible] ایک دینی مسئلہ پر سوال کیا۔ اس لڑکے نے اپنے دینی مسلک کے اعتبار سے صحیح [illegible] جس سے سلطان مطمئن ہو گئے۔ پھر ایک دوسرے طالب علم سے قرآن شریف کی [illegible] سورہ پڑھنے کو کہا۔ اتفاق سے وہ لڑکا حافظِ قرآن تھا۔ لہٰذا اس نے وہ سورہ انتہائی اطمینان سے سنا دی۔ سلطانِ ترکی نے یہ دیکھ کر کہا کہ یہاں تو خالص [illegible] ماحول ہے اور جو اطلاعات مجھے ملتی رہی ہیں وہ ساری بے بنیاد ہیں۔ ان الفاظ [illegible] سن کر نواب محسن الملک کی جان میں جان آئی۔

سرسید کو پورا یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے مغربی علوم اور انگریزی [illegible] سے وابستہ رہنا اُن کے سماج میں باوقار مقام اور ترقی کے لیے ضروری ہے۔

سرسید کا تعلیمی مشن یا علی گڑھ تحریک اس اعتبار سے انتہائی حیرت انگیز اور نادر ہے کہ اس میں دو متضاد تہذیبوں اور خیالات کا امتزاج ہے۔ سرسید نے اپنے قائم کردہ ادارے کو دو تہذیبوں کے سایے میں گہوارۂ تعلیم و تربیت بنایا۔ سرسید نے اس توازن کو قائم رکھنے میں انتہائی عزم و ہمت سے کام لیا جس پر وہ باوجود عالمی مخالفت کے مضبوطی سے قائم رہے۔ بابائے اردو جناب مولوی عبدالحق نے سرسید کے عزم و استقلال کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ "سرسید اپنے مشن کے لیے مخالف فضا میں بڑی تندہی اور جوش کے ساتھ مصروف تھے۔ جیسے ایک جہاز طوفانی لہروں کو چیرتا ہوا بے خطر گھستا چلا جا رہا ہو"۔

سرسید کا مقصد مسلمانوں کو اُن کے مذہب سے بے گانہ بنانا قطعی نہ تھا بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ مسلم اگر ضعیف الاعتقادی، رسم و رواج اور قدامت پسندی میں مبتلا رہے تو آئندہ آنے والے سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے سے قاصر رہے گا۔ ان کے نزدیک دینی مذہب کے ساتھ سائنسی ایجادات کا علم ہونا ضروری ہے۔ انگریزی اور دوسرے مضامین کی تعلیم اور تحقیق اردو، عربی اور فارسی کے ساتھ ضروری ہے۔ ان کے نظریات اور تعلیمی مشن میں وسعتِ خیالی ہے۔ ان کے مقاصد میں مسلمانوں کی تعلیم، راسخ عقائد اور غیر مسلموں سے خوش گوار تعلقات کا امتزاج پوری طرح موجود ہے۔

سرسید نے اپنے ادارے کو ایک متوازن تعلیم و تربیت کا گہوارہ بنایا، جس میں دین اور دنیا کے حاصل کرنے میں توازن رہے اور دونوں کی تعلیم فراہم رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ توازن یقیناً ایک طرف مسلمان کو دین سے وابستہ رکھے گا اور دوسری طرف مسلمانوں کو جدید تعلیم و تحقیق سے روشناس کراتا رہے گا۔ اس طرح مسلمان دین دار رہ کر بنیادی مقاصد کے لیے کشمکش کرے اور ترقی کی راہوں پر گامزن رہے۔ اگر یہ توازن برقرار نہیں رہتا ہے اور کسی ایک جانب پلّہ بھاری ہو جاتا ہے تو سرسید کا بنیادی نظریہ اور اس ادارے کا اصل مقصد متاثر ہوگا۔ ایسی حالت میں مسلمان یا تو کٹّر مسلمان ہوگا یا متشدد ترقی پسند سماج کی قدروں سے متاثر ہو کر اپنے مذہب سے دور ہوتا جائے گا۔ اس اعتبار سے وہ ادارہ جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی صورت شروع ہوا اور جسے ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا مقام حاصل ہوا ایک انتہائی اہم اور تاریخی کردار کا حامل ہے۔ اس توازن کو مضبوطی سے قائم رکھنے کی ذمہ داری اعلیٰ مقام عہدے داروں اور انتظامیہ پر ہر زمانے میں رہے گی۔ تاکہ مسلمانوں کے دینی معاملات و وابستگی اور سماجی مفادات کا تحفظ ہوتا رہے۔ ماضی میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ جب کبھی اس توازن کو ضرب لگی ہے، مسلمانوں کو کسی نہ کسی اعتبار سے نقصان ہوئی ہے اور خسارے کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس صورت حال کے باوجود اس ادارے کو اکثر و بیشتر ضربیں لگتی رہی ہیں۔ ایک حلقہ اس کا حامی رہا ہے کہ یہ ادارہ تمام جدید ترقی پسندانہ رجحانات سے متاثر و مغلوب رہے۔ اس قسم کی تحریکیں

اِس ادارے کے بنیادی مقاصد اور تاریخی کردار کو ختم کرنے ہی میں کامیاب نہیں ہوں گی بلکہ مسلمان اپنے دین اور اپنے معاشرتی قدروں کو اپنی دنیادی ترقی اور کامیابی کے حاصل کرنے میں حائل سمجھے گا اور بتدریج اپنے معاشرے اور مذہب سے دور ہوتا جائے گا، جس سے مسلمانوں کا ذاتی قانون "مسلم پرسنل لا" معاشرہ، تہذیب، زبان کا بتدریج کمزور ہونا لازمی نتیجہ ہوگا۔ اس پورے سلسلۂ عمل میں ایک مقام یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمان اپنی انفرادیت بھی کھو دے اور اس کی ساری دولت لٹ چکی ہو اور وہ خدانخواستہ محتاج بن کر سہاروں کا متلاشی ہو جائے۔

سرسیّد کے اس تعلیمی ادارے کے اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر اس ادارے کا تاریخی کردار، روایات کا تحفظ اور متوازن ماحول کا قایم رکھنا انتہائی اہم فریضہ ہے۔ اس کو ایسے عناصر سے محفوظ رکھنا ہے جو اس کے بنیادی مقاصد کو بتدریج پامال کر ڈالیں۔ ترقی پسند رجحانات کا خیر مقدم ہمارے لیے اس حد تک لازم ہے جب تک ان کے اثرات شدید ہو کر اس ادارے کے مذہبی پہلو کے لیے نقصان دہ نہ ہوں۔ ادارے کے اس بنیادی تصور و مقاصد کو ہمیشہ قایم رکھنا ہمارا فرض ہے۔ فرض کی اس ادائیگی میں ہی اس ادارے کی مخلصانہ خدمت ہے۔ اور ادارے کے کردار تعلیمی و دینی ماحول و مسلمانوں کی انفرادیت کے تحفظ کے ساتھ ملک و قوم اور اتحادِ باہمی کی بھی ضرورت ہے۔

شعبۂ قانون
مسلم یونی ورسٹی،
علی گڑھ

تمیزِ خار و گل سے آشکارا
نسیمِ صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

علامہ اقبال

ڈاکٹر عنایت علی

سرسید کا سیاسی مسلک

سرسید احمد خاں کی سیاسی زندگی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ انگریزی سرکار کی ملازمت کے باوجود اُن کے دل میں اپنے ملک سے ہمدردی کا جذبہ شدت سے موجود تھا۔ جس کا اظہار جنگ آزادی کے بعد ان کی انگریزی حکومت پر شدید نکتہ چینیوں سے ہوتا ہے، جو انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں کیا، جن میں انگریز حکام کی کوتاہیوں، تفریق پسند پالیسیوں پر سخت تنقیدیں کی گئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کا واقعہ برطانوی حکومت کی اس تفریق و بے اعتباری کا نتیجہ تھا جو اس نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ برتا۔ جس کا عملی نمونہ "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ ایسوسی ایشن لندن میں چند انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مفاد کی پاسداری کے لیے قایم کی گئی تھی۔ جس کی شاخیں ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی قایم ہوئیں۔ اس جماعت کے قیام کا خاص مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے ہندوستانیوں خاص کر زمینداروں کی عام پریشانیوں اور مطالبات کو پارلی منٹ میں پیش کیا جاسکے۔ چنانچہ اس کی ایک شاخ سرسید نے ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ میں قایم کی، جب کہ وہ یہاں سب جج تھے۔ اس کے افتتاحی جلسے میں انگریزاور دیگر روساء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے، ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان عدم مساوات کو ختم کرنے پر زور دیا:

> "مجھ کو یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے قانون میں دخل ہوگا، اس وقت تک دونوں قوموں (انگریز و ہندوستانی) کے درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی میں مزاحمتیں قایم رہیں گی۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے جب کہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، یورپین ہوں یا ریورشین اس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور اُن کے پولیٹکل حقوق یا کانسٹی ٹیوشنل رتبہ میں، قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔"

اس مثال کا ایک عملی نمونہ اس وقت مشاہدے میں آیا جب سرسید ۱۸۸۲ء میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ اس زمانے میں ایک بل لارڈ رپن نے پیش کیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ کو انگریزوں کے مقدمات پر بھی فیصلہ صادر کرنے کا مجاز قرار دیا جائے۔ جس کی انگریزوں نے سخت مخالفت کی تھی

اسی طرح ایک بار آگرہ دربار میں جب انھوں نے انگریزوں کی کرسیاں چبوترے پر اور ہندوستانیوں کی کرسیاں زمین پر رکھی ہوئی دیکھیں تو ان سے اپنے ہندو[...] بھائیوں کی ذلت برداشت نہ ہوسکی اور وہ دربار سے اُٹھ کر چلے آئے۔ [...] دلی مقصد یہ تھا کہ کسی طرح ہندوستانی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے انگریزوں [کے] برابر ہوجائیں:

> "یہ بات گورنمنٹ پر لازمی ہوگئی ہے کہ ہندوستانیوں کو اس قسم کی تعلیم دے کہ ان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی ہمت ہوجا[ئے] یا یوں کہیے کہ وہ اپنے تئیں ایسا لایق کرنے کی کوشش کریں کہ جو عہدے انگریزوں کو ملتے ہیں، وہ بھی پائیں۔ اگر گورنمنٹ ہندوستانیوں کو اس درجے تک تعلیم نہ دے گی تو اس نے اپنے اقرار کو پورا نہیں [کیا]۔"

دیسی اور بدیسی کی تفریق مٹانے اور حکومت وعوام کے درمیان [...] اتحاد اور مساوات قایم کرنے کی غرض سے سرسید نے ۱۸۶۳ء میں علی گڑھ [...] سوسائٹی" کی عمارت تعمیر کرائی، جس میں ہر فرقے کے ہندوستانی اور غیر ہندو[ستانی] (انگریز) شریک ہوتے تھے اور قومی ونسلی یک جہتی پر مضامین پڑھے جاتے [تھے]۔

سرسید احمد خاں عام انتخابات کے ذریعے لوکل بورڈوں اور ضلع کو[نسلوں] میں عوامی نمائندوں کی شرکت کو پسند فرماتے تھے۔ ان کے خیال میں عوام اور [حکومت] کے درمیان اس سے بہتر طریقۂ رابطہ نہیں ہوسکتا ہے۔ جب لوکل سیلف گورنمنٹ قایم کرنے کا قانون، وائسرے کی کونسل میں پیش ہوا تو سرسید احمد خاں نے [کہا] کو بحیثیت نامزدگی سے بھی پوری کرے، کیوں کہ اگر سب ہی نشستیں مخلوط انتخاب کے ذریعے پوری کردی جائیں گی تو اس سے بلند پایہ تعلیم یافتہ [لوگ] کونسل میں نہ آسکیں گے، جس کی وجہ سے ملک اور حکومت دونوں کو نقصان [ہوگا]۔ اس لیے سرسید چاہتے تھے کہ قابل، صاحب بصیرت اور صاحب تدبر لوگ، جو [ملک] کے مفاد و مطالبات کی نمائندگی کرنے کا صحیح حق رکھتے ہوں اگر انتخاب کے [ذریعے] نہ آسکیں تو اُن کو کونسل کے لیے نامزد کرلیا جائے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ انھوں نے دوسرے مسلمان لیڈروں کی طرح جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کبھی نہیں [کیا] کیوں کہ ان کا سیاسی مسلک کسی فرقہ وارانہ نظریے پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ ان [کی نظر] میں پورا ملک ایک قوم تھا۔

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ
ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ ہندو، مسلمان اور
عیسائی سب ایک قوم ہیں، تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان
سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ صرف
مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں۔"

ایک دوسرے موقع پر اس سے بھی زیادہ وسیع النظر موقف کا اعلان کیا:

"جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں، اسی طرح
مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلاتے ہیں۔"

سفر پنجاب میں ہندوؤں کو خطاب کرتے وقت فرمایا:

"آپ نے جو لفظ اپنے لیے "ہندو" کا استعمال کیا ہے، وہ
میری رائے میں درست نہیں کیوں کہ "ہندو" میری رائے میں
کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا
رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس
ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا
ہوں، ہندو نہیں سمجھتے۔"

سرسید کے انھیں خیالات نے ہندو اور مسلمان دونوں میں اتحاد دیکھنے کے
جذبے کو ابھرنے کا موقع دیا۔ گورنمنٹ اسکول جالندھر کے طلباء کے ایڈریس میں
جو رنگت رام نے پڑھا تھا، انھوں نے کہا:

"سید صاحب صرف ایک قوم یا ایک خاص فرقے کے مددگار نہیں
ہیں بلکہ وہ کل ملک کے جاں نثار ہیں۔"

اسی طرح برہمو سماج اور آریہ سماج کے وفد نے اپنے سپاس نامہ میں لکھا:

"ہم تمام ہندوؤں کی طرف سے آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا
کرتے ہیں جو آپ نے قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات
میں ہندوستان کے لیے کی ہیں۔ ہندو راجہ مہاراجہ جن سے بہت
کچھ امید کی جاتی تھی، ملک کے خیر خواہ ثابت نہ ہوئے لیکن آپ
نے حب الوطنی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اور البرٹ بل اور
دیگر تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی...."

سول سروس کے امتحان کے داخلے کے لیے جو اس وقت صرف انگلستان میں
ہوتا تھا ۲۱ سال کی عمر کی شرط تھی، مگر حکومت نے اسے کم کر کے انیس سال کر دیا
جس سے ہندوستانی امیدواروں کو کامیابی کے مواقع کم ہو گئے تھے، سرسید نے
سریندر ناتھ بنرجی کے احتجاجی جلسوں میں شرکت کی اور اس بل کے خلاف آواز
بلند کی۔

اسلامی خلافت کے بارے میں سرسید کے خیالات عام مسلمانوں سے بہت
مختلف تھے۔ ایک مسلمان کے لیے خواہ وہ رعایا ہو یا حاکم خلیفۂ اسلام کا حکم ماننا
ضروری ہے۔ ورنہ عدم اطاعت کی وجہ سے وہ حکومت مسلم حکومت نہیں کہی جا سکتی
تھی۔ نذر ارسال سے یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت سے چلتا رہا اور ہندوستان میں بھی
اس کا رواج رہا۔ جب خلافت ترکی کے ہاتھ آئی تو جمعہ میں خلفائے ترکی کا نام خطبے
میں پڑھا جانے لگا۔ مسلمانوں کے اس عقیدے سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے
ٹیپو سلطان کو ۱۷۹۹ء کی جنگ میں فرانسیسیوں کی امداد کرنے سے روک دیا۔ اس
طرح ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے سلطان عبدالحمید سے ہندوستانی مسلمانوں کے نام
ایک خط لکھایا:

"چوں کہ انگریز ہمارے دوست ہیں اس لیے تم لوگ ان سے
صلح رکھو۔"

چنانچہ اس کا بھی کافی اثر ہوا۔

۱۸۹۲ء میں جب انگریزوں اور ترکوں کے درمیان مصر کے بارے میں
بدمزگی ہوئی تو سرسید نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے مولوی سمیع اللہ خاں
(جو علی گڑھ کالج کے قیام میں سرسید کے دست راست تھے) کو مصر بھیجا۔ اس زمانے
میں جمال الدین افغانی مصر سے نکالے جانے پر ہندوستان میں رہ رہے تھے۔ اُن
کو سرسید اور اُن کے موقف سے شدید اختلاف تھا جس کا اظہار افغانی عربی رسالوں
میں اپنے مضامین کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ مگر سرسید نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں
کیا بلکہ اپنے سیاسی مسلک اور موقف پر جمے رہے۔

ملکی سیاست سے اس قدر تعلق رکھنے کے باوجود سرسید کی نظر میں مسلمانوں
میں تعلیمی ترقی کا مسئلہ بھی اولیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل
کانگریس علی گڑھ میں قائم کی گئی جس کا نام بعد میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کر دیا گیا
تھا۔ اس جماعت کو قائم کرتے وقت سیاسی امور کے بارے میں سرسید کے خیالات
کچھ اس طرح کے تھے:

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری
ترقی ہو گی، اس سے میں اتفاق نہیں کرتا، بلکہ تعلیم میں ترقی اور
صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔"

کانگریس کی مخالفت۔

۱۸۸۶ء میں کانگریس کا دوسرا اجلاس مسٹر دادابھائی نوروجی کی صدارت
میں کلکتہ میں ہوا۔ اس میں جو تجاویز پاس ہوئیں ان میں تین اہم شقیں یہ تھیں:

۱۔ جوری کے ذریعے مقدمات طے کیے جایا کریں۔
۲۔ عدالتی اور عاملانہ اختیارات رکھنے والے افسران جدا جدا مقرر کیے
جائیں۔
۳۔ ملک کی حفاظت کے لیے ہندوستانیوں کو والنٹیر بنانے کا سلسلہ

جاری کیا جائے۔

اِن تجویزوں میں بظاہر کوئی تجویز ایسی نہ تھی جو مخصوص مسلمانوں کے خلاف ہو۔ سول سروس کے امتحانات کے مسئلہ میں سرسید ہمیشہ سے حامی تھے، جب کہ ان کا مشن یہ تھا کہ تعداد میں اگرچہ کتنے ہی کم مسلمان تعلیم پائیں مگر جتنے بھی تعلیم یافتہ ہوں وہ اعلیٰ پایے کے ہوں۔ اصولاً یہ تحریک ان کی مرضی کے خلاف نہ تھی۔ جوری کی تجویز ہندوستانیوں کو اس ذلت سے نکالنے والی تھی جس کے لیے سرسید نے ہمہ وقت کوشش کی تھی۔

عدالتی اور عاملانہ اختیارات مسلمانوں کی عملداری میں جدا جدا تھے، مگر کمپنی نے انھیں یکجا کر دیا تھا اور بمشکل ۱۸۳۳ء میں علیحدہ علیحدہ کیا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۱۸۵۸ء میں پھر یکجا کر دیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے ساتھ حد درجہ ناانصافی ہو رہی تھی۔ ملک کی حفاظت کے لیے والینٹروں کا بھرتی ہونا مسلمانوں کی طبیعت کے عین موافق تھا اور اس قومی امتیاز کے مٹانے میں سرسید نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان سب سے بڑھ کر کانگریس کی تجویز کونسلوں میں ممبروں کی توسیع کے متعلق تھی اور جن صوبوں میں قانونی کونسلیں نہ تھیں ان میں قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ جو سرسید کا عین مقصد رہا تھا۔ اب کانگریس سے سرسید کے اختلافات کی بظاہر یہ وجہ ہوئی کہ حکام وقت سے بعض لوگوں نے کانگریس کو ایک انقلابی تحریک ٹھہرایا، اخبار پانیر الہ آباد نے جو نیم سرکاری اخبار تھا، لکھا کہ اس تحریک کو دبانے کے لیے نصف درجن پولس والے کافی ہوں گے۔

سرسید کو یقین تھا کہ مسلمان آئینی جد و جہد سے ناآشنا ہیں۔ کیوں کہ ہندوؤں کی تعلیمی تحریک ۱۸۱۶ء میں شروع ہوئی تھی۔ جب کہ انھوں نے ہندو کالج قائم کیا تھا۔ اس لیے ہندو انگلستان کے حالات پڑھ کر آئینی جد و جہد کی نوعیت سے خوب واقف ہو چکے تھے۔ برخلاف اس کے سرسید کی تعلیمی تحریک کی عمر اس وقت بارہ سال کی بھی نہ ہو پائی تھی، اس لیے مسلمان زمانۂ جدید کی جدّ و جہد سے بالکل نابلد تھے۔ اس بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا:

> "سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے، بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے، جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔"

مسلمانوں سے اندیشہ:

سب سے بڑھ کر سرسید کو مسلمانوں سے اندیشہ تھا کہ وہ قدیم طریقے کے مطابق سلطنت سے اپنی ناراضی کا اظہار بغاوت کے ذریعے کریں گے۔ سرسید نے چوں کہ ۱۸۵۷ء کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اس لیے وہ ہر قسم کی شورش کو ملک کی ترقی میں مانع اور ہارج سمجھتے تھے۔ ایک بار انھوں نے فرمایا:

> "اگر وہ [۱۸۵۷ء] واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سیکڑوں والینٹر ہوتے۔ ایکٹ اسلحہ وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فوج کے کپتان اور کرنیل و جرنیل ہوتے۔۔۔"

انھیں خیالات کی وجہ سے انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت سے روکا۔ اس وقت سرسید کی حالت بجنسہٖ مہاتما گاندھی کے مانند تھی۔ جب کہ ۱۹۲۲ء میں ثانی الذکر نے چورا چوری کے بلوے کی وجہ سے ملک کو سول نافرمانی کا اہل نہ پاکر فوراً اس کے بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔

سرسید کے سیاسی مسلک کا نیا رخ:

بہرحال سرسید نے اس وقت جو کچھ بھی کیا نہایت صداقت اور نیک نیتی کے ساتھ قوم کے حق میں مفید سمجھ کر کیا تھا۔ البتہ اس کا ایک مضر پہلو ہو گیا۔ یہی پہلو سرسید کے مسلک کو نیا رُخ دینے کا ذمہ دار بھی بنا۔ وہ یہ کہ سرسید کے انھیں سیاسی میلانات سے مسٹر بک نے فائدہ اٹھا کر ان سے اور دوسرے آزاد خیال انگریزوں کی پارٹی چھوڑوا دی اور انھیں کنزرویٹو پارٹی کا پرجوش حامی بنا دیا۔ جو ہندوستانیوں کو حکومت کا نااہل قرار دے کر ان کی ترقی میں روڑے اٹکایا کرتی تھی۔ اس کا قلق سرسید کے پرانے دوستوں اور قدر دانوں کو بہت زیادہ ہوا۔ جس میں سے ایک مسٹر ہیوم "پدر کانگریس" تھے۔ انھوں نے سرسید کو ۱۸۸۹ء میں ایک خط لکھا، پھر چند سال بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مسٹر ہیوم سے انگلستان میں ملے تو اُن سے مسٹر ہیوم نے کہا:-

> "سب سے پہلی چیز جس نے نیشنل کانگریس کی قسم کی کسی تحریک جاری کرنے کا خیال میرے دماغ میں پیدا کیا وہ خود سرسید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" تھی۔ لیکن اب وہی کانگریس کی مخالفت کر رہے ہیں۔"

جس زمانے [۱۸۸۷ء] میں مدراس میں نیشنل کانگریس کا اجلاس بدرالدین طیب جی کی صدارت میں ہو رہا تھا، جس میں مسلمانوں کی طرف سے میر ہمایوں، محمد عبدالشکور، حامد علی خاں علیگ اور علی گڑھ کے حافظ عبدالرحیم وکیل شریک تھے۔ ٹھیک ان ہی تاریخوں میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس [کانفرنس] کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔ اس کے اختتام پر سرسید نے ایک عام سیاسی جلسہ میں اپنی پہلی مشہور تقریر کانگریس کے خلاف کی۔

مسلمان کدھر جائیں:

ایسے سیاسی ماحول میں مسلمان عجیب کشمکش

[illegible] وہ کس پارٹی کو منتخب کریں۔ کیوں کہ اسی سال الہ آباد میں باوجود [illegible] لئے کی زبر دست مخالفت اور ممانعت کے کانگریس کا اجلاس [illegible] میں اور تجاویز کے ساتھ گاؤکشی کو روکنے کی بھی تجویز پاس ہوئی۔ [illegible] مسلمانوں نے کانگریس میں شرکت کے عدم جواز کے فتوے شایع کردیے [illegible] موافقین کانگریس پارٹی نے شرکت کے جواز کا فتویٰ جاری کردیا۔ [illegible] بدرالدین طیب جی اور صوبہ بمبئی اور مدراس کے مسلمان کانگریس کے [illegible] موافق بنے ہوئے تھے۔ پھر سرسید نے ان صوبائی جماعتوں کے [illegible] شروع کردی جو مسلمانوں کے مطالبات اور تکالیف کو حکومت برطانیہ [illegible] میں نمائندگی کا کام انجام دینے کے لیے قایم کی جانے والی تھیں۔ چنانچہ جب [illegible] نے کانگریس کی مانند ایک جماعت محمڈن نیشنل کانفرنس کے [illegible] چاہی اور پنجاب کے مسلمانوں نے بھی ایسی ایک پارٹی بنانی چاہی تو [illegible] قیام پر سخت تنقید کی [illegible] کانگریس پارٹی؛

۱۸۸۸ء میں علی گڑھ میں "یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" [illegible] کے مقاصد یہ قرار پائے:

[illegible] پارلیمنٹ اور انگلستان کو مطلع کرنا کہ ہندوستان کی کل [illegible] اور رؤسا و والیان ملک کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔

مسلمان اور ہندوؤں کی پارٹیوں کے خیالات سے جو کانگریس کے خلاف ہیں، ممبران پارلیمنٹ اور انگلستان کو مطلع کرنا

[illegible] گورنمنٹ کے استحکام کی کوشش کرنا، اور کانگریس کی مخالفت کرنا۔

[illegible] یہ جماعت "اینٹی کانگریس" کے نام سے معروف ہوئی۔ یہ پارٹی [illegible] نے قایم کی تھی۔ اس کی ایک شاخ انگلستان میں بھی قایم ہوئی تھی۔ [illegible] تمام بڑے بڑے نوابین، ہندو راجہ اور رئیسوں نیز انگریز دولت [illegible] تھے۔ راجہ شیو پرشاد بنارسی نے "انڈین لائل ایسوسی ایشن" کے نام [illegible] پارٹی قایم کرنے کی تجویز سرسید اور مسٹر بیک کے سامنے پیش کی تھی جو [illegible] یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" کی ایک شاخ سمجھی جائے۔

[illegible] وقت وہ تھا جب سرسید کونسل میں بلاتفریق مذہب و ملت ایک [illegible] کا ہونا لازمی سمجھتے تھے۔ لیکن جب میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ [illegible] انتخاب کا دروازہ کھلا تو سرسید نے مسٹر بیک کے ساتھ مل کر اس کی [illegible] مخالفت کی، اور مسٹر بیک دہلی کی جامع مسجد پر علی گڑھ کالج کے مسلمان طلبا [illegible] ایک عرض داشت کے بیٹھ گئے، جس پر ہر مسلمان سے دستخط کرائے [illegible] گاؤکشی بند کیے جانے کے خلاف پارلیمنٹ میں پیش کی جاسکے۔ مسٹر بیک کی ذات سے مسلمانوں کو بڑا نقصان ہوا۔ "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" کے نام سے جو پارٹی انھوں نے قایم کی تھی، جس کا واحد مقصد کانگریس کی مخالفت کرنا تھا۔ چوں کہ اس پارٹی میں کچھ آزاد خیال اور برطانوی حکومت کے زرخرید ہندو بھی شامل تھے اس لیے مسٹر بیک نے ۱۸۹۳ء میں ایک نئی پارٹی "محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" کے نام سے جاری کی۔ اس پارٹی کا خاص الخاص مقصد حکومت برطانیہ کی وفاداری کے لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کرنا اور ان کو کانگریس سے علیحدہ رکھنا تھا۔

مسٹر بیک نے یہ کوشش بھی کی کہ مسلمان [illegible] حکومت سے مراعات طلب کرنے کی دوڑ میں الگ [illegible] جائیں۔ درآں حالیکہ سرسید احمد خاں ہمیشہ اس کے مخالف تھے حتیٰ کہ وہ اپنے کالج کے پاس شدہ طلبا کی بھی سفارش ملازمتوں کے لیے نہیں کرتے تھے چنانچہ ۱۸۸۶ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں کہا:

"ہمارا اصول سلف ہیلپ پر مبنی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان خود اپنی ترقی کے لیے آپ کوشش کریں..... گورنمنٹ سے مراعات کی درخواست نہ کریں۔"

سرسید نے چاہا تھا کہ سول سروس اور جملہ امتحانات مقابلہ برائے سرکاری ملازمت میں شرکت کے لیے مسلمان طلبا کو کالج ہی میں تیار کیا جائے اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ ایک عمارت تعمیر کی جائے اور اعلیٰ تنخواہ کے بہترین معلمین کا تقرر کیا جائے مگر اس وقت کالج کے پرنسپل مسٹر بیک کے ہاتھوں میں لڑکوں کی باگ تھی۔ انھوں نے "ڈیفنس ایسوسی ایشن" کے ایک اجلاس میں کہا:

"پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنروں اور منصفوں کے تقررات کے لیے امتحانات مقابلے کی مخالفت کی جائے۔"

جب کانگریس نے ہندوستان میں سول سروس کے امتحانات کے انعقاد پر حکومت برطانیہ پر زور ڈالا تو حکومت نے کچھ ہندوستانیوں کو بغیر مقابلے کے امتحان سول سروس میں لینے کا سلسلہ شروع کیا تو اس میں کچھ مسلمان بھی آگئے۔ اس عارضی اور خفیف سی رعایت پر مسٹر بیک نے ان کے والدین اور تمام مسلمانوں کو یہ یقین دلانا شروع کردیا کہ اگر وہ حکومت کے وفادار رہے تو ان کو ملازمتوں کی کمی نہ ہوگی۔ اس وفاداری کے گھمنڈ میں نہ صرف مسلمانوں سے امتحانات مقابلہ کی مخالفت کرائی جاتی تھی بلکہ طلبا کے سامنے پڑھنے لکھنے والوں کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء کے کالج میگزین میں ایک کلکٹر کی چٹھی بنام کپتان کرکٹ کلب علی گڑھ شایع کی گئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

"تمھارے نام بی۔ اے کے حروف سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میرے نزدیک درس کے کمرے کے مقابلے میں کرکٹ فیلڈ ایک بہترین تعلیم گاہ ہے۔"

چوں کہ اس کلکٹر کے ہاتھ میں کچھ ملازمتیں تھیں جو وہ اپنے متوسلین کو دے سکتا تھا اس لیے کلکٹر کا خط شل صحیفۂ آسمانی کے علی گڑھ کالج کے کھیلنے والے طلبا کی حوصلہ افزائی کے لیے شایع کیا گیا اور امتحانات مقابلہ کی مخالفت کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم جسے تعلیم و تعلّم سے صدیوں سے مناسبت تھی اب اس کے نوجوان لکھنے پڑھنے سے بھاگ نکلے ان نصائح سے متاثر ہو کر طلباء نے حصولِ معاش کے لیے محض اس امر کو کافی سمجھا کہ وہ انگریزوں کی سی شکل بنا کر اور اُن کے ساتھ میدانوں میں کھیل کر اپنے کرتبوں سے انھیں خوش کر لیا کریں۔ مگر مسٹر بیک اپنے زبردست اثرات کے باوجود حکومت سے مقابلے کے امتحانات بند نہ کرا سکے۔ البتہ مسلمان لڑکوں کو ان امتحانات سے ڈرا ڈرا کر انھیں بزدل اور اپنی نظروں میں آپ حقیر بنا کر حقیقی معنوں میں انھیں دفتری حکومت کا غلام بنا دیا۔ لیکن جب مسلمانوں نے ایک بار سول سروس کے امتحانات میں شرکت کا مطالبہ کیا تو مسٹر بیک نے بتایا کہ اگر امتحانات ہندوستان میں جاری کر دیے جائیں تو مسلمانوں کو صرف چار یا پانچ آسامیوں سے زیادہ حصّہ نہ ملے گا۔ اس کے برعکس نقصان اُن کا پانچ گنا ہو جائے گا وہ اس طرح کہ گورنمنٹ مسلمانوں سے ناراض ہو کر پراونشل سروس کی ترانوے آسامیوں سے جو بطور انعام کے دی جاتی ہیں مسلمانوں کو ان کا حصہ نہ دے گی۔

ایک وقت وہ آیا کہ سر سیّد اسی ڈیفنس ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے سرحد پر فوجی اضافے کی تائید کی

"اس انجمن کی رائے میں یہ امر ازبس ضروری ہے کہ ہندوستان میں ایک قومی فوج ہو۔ بدیں وجہ یہ انجمن اس رائے کی سخت مخالف ہے کہ فوج یا اس کے موجودہ اخراجات میں تخفیف کی جائے۔"

ایسا اس لیے ہوا کہ کانگریس سرحد کی فوج اور فوجی اخراجات گھٹائے جانے پر حکومت برطانیہ سے مطالبہ کر رہی تھی۔ کیوں کہ اس کی نظر میں:

"سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنتِ برطانیہ کے لیے اور بالخصوص ہندوستان کے مفاد کے لیے مضرت رساں ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کے حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں جس سے قیمتی جانیں جاتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضایع ہوتا ہے۔"

اس سلسلہ میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک انجمن کے جلسے میں اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کیا جاتا ہے کہ سرحد پر فوج بڑھائی جائے، تعجب خیز ہے! کیوں کہ زیادہ تر سرحد پر جو قیمتی جانیں تلف ہوتی تھیں وہ کن لوگوں کی تھیں؟ وہ صرف مسلمانوں کی تھیں۔

ڈاکٹر ہنٹر نے وہابیوں پر حملہ کیا تو سر سیّد نے ان کی حمایت میں مضامین لکھے۔ اب وہی سر سید تھے جو کانگریس پارٹی کے علاوہ خود مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ مولانا شبلی نعمانی سر سیّد کے اس بدلے ہوئے سیاسی مسلک کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"وہ پُرزور دست و قلم جس نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی، لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اُڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تینوں آرٹیکلوں میں لکھا تھا کانگریس کا لٹریچر حقوق ملکی کے متعلق اس سے زیادہ پر زور لٹریچر نہیں پیدا کر سکا۔ وہ جانباز جو آگرہ کے دربار سے اس لیے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجے پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہے جس پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں صرف انھیں کی بدولت علم و آزادی اور حب الوطنی کو ترقی ہوئی میں صحیح طور سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں۔ حالات اور گرد و پیش کے واقعات نے ان کو (سر سید) اس پر مجبور کر دیا کہ انھوں نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے دفعتًا یہ انقلاب پیدا کر دیا.....؟"

اندازہ ہوتا ہے کہ آگے چل کر سر سیّد کے سیاسی نظریات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہ کچھ تو حالات کا نتیجہ تھیں اور کچھ پرنسپل بیک کے بڑھتے ہوئے اثرات کا۔

پروفیسر آئی۔ احمد

مسلمانوں کے لیے ایک سائنسی مرکز کی تجویز

مسلمانوں میں سائنسی علوم کا فقدان اور اس کے مضر اثرات کا ایک سرسری جائزہ کچھ عرصے پہلے ایک مضمون "سائنس اور ہم" میں لیا جا چکا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ سائنس میں ہماری جہالت کی جڑیں کافی گہرائی تک گئی ہیں اور دیگر اقوام کے مقابلے ہم اس میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ ان اقوام کی سائنسی علوم میں آگے بڑھنے کی رفتار اور ہمارے اور ان کے درمیان موجودہ فاصلہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اگر ہم وقت کے ساتھ جینا چاہتے ہیں تو ان سے بھی زیادہ محنت اور تیز رفتاری سے آگے بڑھیں۔ اس مقصد کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب پوری قوم تن من دھن سے اس اہم ملی مقصد کو انجام دینے کے لیے تیار ہو اور ایسے جیالے نوجوان مل سکیں یا تیار کیے جا سکیں جو فنافی الذات ماحول میں فنافی الملّت ہونے کے لیے آمادہ ہوں۔

سائنسی علوم کے تئیں بے رغبتی صرف ہندوستانی مسلمانوں کا نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کا مسئلہ ہے لیکن یہاں ہماری گفتگو کا محور صرف ہندوستانی مسلمان رہیں گے۔ ہم ان اولین قدم کا ذکر کریں گے جس سے مسلمانان ہند میں سائنس سے بے رغبتی ختم کیا جا سکے۔ مذہب کے حدود میں رہتے ہوئے ایک سائنسی مزاج پیدا کیا جا سکے اور نوجوانوں کو سائنس میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے لیے ابھارا جا سکے۔

ایک مرکز سائنس کی ضرورت

ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کا چرچا عام کرنے کے لیے اور اس کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ماضی میں بھی چند کوششیں ہوئی ہیں اور کچھ آج بھی جاری ہیں۔ لیکن یہ کوششیں نہ صرف انتہائی ناکافی ہیں بلکہ جس ڈھانچے میں رہ کر کی جا رہی ہیں اس سے مسلم عوام کے دلوں میں سائنسی علوم کے حصول کی ضرورت اور اہمیت کو پیدا کرنا شاید جلد ممکن نہ ہو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ۔ اس وقت ضرورت ہے۔ ایک ایسے طریقۂ کار کی جس سے مسلمانوں میں ہر سطح پر سائنسی تعلیم کو فروغ ہو اور مسلم نوجوانوں میں اعلیٰ سائنسی تعلیم کے حصول اور اس میں تحقیق کا حوصلہ پیدا ہو۔ بالفاظ دیگر اس وقت ضرورت ہے ایک مستقل مرکز کی جو مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد کی تکمیل کا کام کرے۔

[ا] دینی درس گاہوں میں سائنس کی تعلیم کا فروغ۔

[ب] سائنس کے مسلمان استادوں کے لیے ریفریشر کورس کا انتظام۔

[ج] باصلاحیت مسلم طلبا کی تلاش اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں ان کی مدد

[د] نظریاتی سائنس میں اعلیٰ تحقیق کے لیے ایک گوشے کا قیام۔

اب ہم ان اغراض و مقاصد پر ایک ایک کرکے تفصیلی گفتگو کریں گے۔

ا۔ دینی درس گاہوں کا مسلم سوسائٹی میں ایک اہم رول ہے اور جہاں کہیں بھی کچھ مسلم آبادی ہے، اعلیٰ درس گاہ نہ سہی ایک دینی مکتب ضرور مل جائے گا۔ ان چھوٹے بڑے دینی تعلیمی اداروں کا ملت مسلمہ پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے کسمپرسی کے عالم میں بھی مسلمانوں کو مذہب سے قریب رکھا اور ان کو اپنی تہذیب و تمدن پر قائم رہنے میں مدد دی۔ یہ انھیں چھوٹے چھوٹے مکتبوں اور چند اعلیٰ دینی اداروں کا فیض ہے کہ آج مسلمان اپنے دین سے واقف ہے اور وہ صحیح طور پر اپنی عبادت اور دیگر فرائض ادا کر سکتا ہے۔ ملت مسلمہ کے تشخص پر جب بھی کوئی یلغار ہوئی یا اسے مٹانے کی کوشش کی گئی تو یہ انھیں اداروں سے فارغ علما تھے جنھوں نے ہر طرح کی قربانی دے کر اس یلغار کو روکا اور اسے مٹانے کے ہر ارادے سے ٹکر لی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو ہم تو ہوتے مگر وہ نہ ہوتے جو بحمد اللہ آج ہیں۔

دینی مکتبوں میں عموماً پرائمری سطح سے کچھ نیچے کی پڑھائی ہوتی ہے۔ یہاں قرآن شریف کا ناظرہ اور حافظ کرایا جاتا ہے اور اردو زبان و عبادات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ریاضی، جوڑ، گھٹانا اور ضرب تقسیم تک سکھائی جاتی ہے اور کہیں کہیں جغرافیہ اور ہسٹری سے واجبی واقفیت کرائی جاتی ہے۔ زیادہ زور قرآن شریف کے ناظرہ، اردو زبان اور عبادات کی تعلیم پر رہتا ہے۔

اعلیٰ دینی درس گاہوں کے نصاب میں عربی زبان و ادب، اردو و فارسی تفسیر قرآن، حدیث و فقہ، قدیم فلسفہ و منطق و علم کلام وغیرہ داخل ہیں۔ یہ نصاب تھوڑے سے رد و بدل سے نہ جانے کب سے ایسا ہی چلا آ رہا ہے۔ اس طرح دینی مکتب سے لے کر اعلیٰ دینی درس گاہوں تک میں کسی بھی سطح پر سائنس کی مبادیات تک کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ قدرتی طور پر ہماری اعلیٰ دینی درس گاہوں کو انہیں خطوط پر کام کرنا چاہیے تھا جن پر خلافت عباسیہ یا اس کے آس پاس کے دور میں درس گاہیں چلائی جاتی

تھیں۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ دنیا کے سارے علوم ان درس گاہوں میں پڑھائے جاتے تھے اور علم کے ناطے سے دین و دنیا میں کوئی تفریق نہ تھی۔ لیکن لگ بھگ سولہویں صدی کے بعد سے ہماری درس گاہوں کا رویہ اس معاملے میں یکسر بدل گیا۔ انھوں نے مغرب میں ایجاد ہوئے علوم جدید سے مکمل بے اعتنائی برتی اور انہیں مکمل طور پر یا اُن کے کسی بھی جز کو نصاب میں داخل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے عوامل چاہے کچھ بھی رہے ہوں، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم علم کے معاملے میں کچھ تعصب کا شکار ہو گئے۔ مغرب کے علوم جدیدہ کو ہم نے نہ صرف علم کی صف سے خارج سمجھا بلکہ اسے اپنے مذہب کے خلاف بھی تصور کیا چودھویں پندرھویں صدی عیسوی تک ہمارے اسلاف نے علوم کی جن جن شاخوں کو فروغ دیا تھا یا جن جن علوم کو اہمیت دی تھی بس انھیں کو ہم نے ہمیشہ کے لیے کافی سمجھ لیا۔ ہماری دینی درس گاہیں کم و بیش اسی پرانے ڈھانچے میں کام کر رہی ہیں جو صدیوں پہلے بنایا گیا تھا۔

جہاں ہماری ان دینی درس گاہوں کا ہم پر یہ احسان عظیم ہے کہ انھوں نے ہمارے ملّی تشخص کو برقرار رکھا وہیں وہ اس الزام سے بَری نہیں ہو سکتیں کہ انھوں نے ہمیں ایک خول میں بند کر دیا اور علم کے میدان میں ملّت کی رہبری ہوشمندانہ طور سے نہ کی وہ مغرب میں آنے والے سائنسی انقلاب کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہیں اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے معاشی، سیاسی اور معاشرتی انقلاب کو بھانپ نہ سکیں۔ صرف اتنا ہی نہیں اگر کسی روشن دماغ نے اس طرف ان کی توجہ مبذول بھی کرانی چاہی تو اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا۔ ان درس گاہوں سے فارغ ہونے والے بیشتر طلبا نے مغرب کی ہر ایجاد کو شیطانی فعل اور اُن کے ہر علم کو اسلام کا دشمن سمجھا۔ بجائے اس کے کہ وہ ان علوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے، ان میں مہارت حاصل کرتے اور حسب ضرورت اسے مسلمان کرتے، انھوں نے ان کے خلاف ایک ایسی جنگ چھیڑ دی جس میں فتحیاب ہونا اصولِ قدرت کے خلاف ہوتا۔

اگرچہ فکر معاش نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے جدید تعلیمی اداروں کی طرف رجوع کریں پھر بھی مسلمان بچوں کی اکثریت پرائمری سطح پر دینی مکتبوں میں ہی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد بیشتر روزی روٹی کی جستجو میں لگ جاتے ہیں، کچھ سرکاری اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں اور باقی اعلیٰ دینی درس گاہوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ طالب علم جو ان دینی مکاتب سے نکلنے کے بعد جدید تعلیم کے اسکولوں میں جاتے ہیں وہ ریاضی اور سائنس میں عموماً زیادہ کمزور ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ آگے چل کر آرٹس اور سوشل سائنس کے مضامین کے لینے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں اس طرح ہمارے ذہین طلبا کی کثیر تعداد سائنسی علوم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی ہے۔

جہاں تک اعلیٰ دینی درس گاہوں کا تعلق ہے وہاں سرے سے سائنس کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی جب کہ ان درس گاہوں میں آج بھی نوجوان طلبا کی اچھی خاصی تعداد زیر تعلیم رہتی ہے۔ یہ انتہائی تشویش ناک صورتِ حال ہے کیوں عموماً ملّت مسلمہ اپنے مذہبی، معاشی، سماجی، معاشرتی اور کچھ حد تک سیاسی امور میں انہیں درس گاہوں سے فارغ [علماء] کی رہبری پر اعتماد کرتی ہے۔ سائنس اور علوم جدیدہ سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ علماء ذہنی، فکری، معاشی و معاشرتی تبدیلیوں کی ہیئت کو سمجھنے سے قاصر ہیں جو [روز] سائنس کے نت نئے انکشافات کی وجہ سے تیزی سے عمل میں آ رہی ہیں اور ابھی [اس] صدی کے اواخر تک سائنسی انکشافات کی بدولت ایسے ایسے سماجی و معاشرتی مسائل [کا] سامنا کرنا پڑے گا کہ عقل دنگ رہ جائے گی۔ ایسی صورت میں اگر ہمارے دینی درس[گاہیں] سائنس کے تئیں اپنے جمود کو نہیں توڑتیں تو اُن سے دانش مندانہ رہبری کی امید فضول ہے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چوں کہ آج بھی مسلم طلباء کی [بڑی] تعداد دینی اداروں میں تعلیم حاصل کرتی ہے اور چوں کہ ان اداروں سے فارغ طلباء [کا] سماج میں ایک اہم مقام ہے، اس لیے مسلم سماج میں ایک سائنسی انقلاب لانے کے لیے ضروری ہے کہ ان دینی اداروں میں سائنس کی تعلیم کو داخل کیا جائے اور [اسے] فروغ دیا جائے۔ ان اداروں پر یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ اگر اب بھی انھوں نے سائنس اور علوم جدیدہ سے بے اعتنائی برتی تو زمانہ رفتہ رفتہ انھیں مسلم [سماج کی] قیادت سے ہٹا دے گا اور یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہوگا۔

مجوزہ سائنسی مرکز کا یہ اولین فریضہ ہوگا کہ وہ اپنے دینی اداروں کو سائنسی تعلیم کی طرف راغب کرے، ان کے لیے مناسب نصاب اور کتابیں تیار کرے۔ [ان کے] اساتذہ کو سائنس کی مبادیات سے واقف کرائے اور سائنسی تعلیم کے سلسلے [میں مدد] فراہم کرے۔

ب۔ دینی اداروں کے بعد مسلم اقلیت کے قائم کیے ہوئے اسکولوں اور کالجوں کا نمبر آتا ہے جہاں جدید تعلیم دی جاتی ہے۔ جدید تعلیم حاصل کرنے والے [طلبا] کی اکثریت یہیں سے آتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے بیشتر اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں اور نہ ہی ان میں سائنس کے ایسے اساتذہ [ہیں] جو سائنس میں ہونے والی روز افزوں ترقیوں سے واقف ہوں۔ اس کی ایک وجہ [وسائل] کی کمی بھی ہے۔ سائنسی علوم آج کل جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں اس [کا] تقاضا ہے کہ ان اسکولوں اور کالجوں کو تازہ سائنسی لٹریچر فراہم کیا جائے اور [ان] کے اساتذہ کے لیے وقتاً فوقتاً سائنس کے رفریشر کورس Refresher Course کا انتظام کیا جائے۔

ج۔ مسلم آبادی کی اکثریت معاشی اعتبار سے کمزور ہے۔ خواہش [کے] باوجود اکثر مسلم خاندان اپنے ہونہار بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا پاتے۔ مجوزہ سائنسی [مرکز] کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہوگی کہ وہ سائنس میں دلچسپی رکھنے والے ہونہار طلبا کو تلاش کرے، انھیں سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرے، مناسب مشوروں سے نوازے اور ضرورت پر مالی امداد بھی فراہم کرے۔

د) مجوزہ مرکز کے اغراض ومقاصد میں سے ایک یہ بھی ہوگا کہ وہ مسلم
سائنس دانوں کے لیے اعلیٰ پیمانے کی ریسرچ کے وسائل مہیا کرے۔ بدقسمتی سے تجرباتی
سائنس کی تحقیقات فی زمانہ اتنی مہنگی ہوگئی ہیں کہ اس میدان میں اس قسم کی کوشش محال
ہوگی۔ نظریاتی سائنس میں بہت تھوڑے صرفے سے اعلیٰ پیمانے کی ریسرچ کا انتظام ہوسکتا
ہے۔ مجوزہ مرکز میں ایک گوشہ قائم کیا جائے۔ اس گوشے کے لیے مستقل ریسرچ
اسٹاف کی ضرورت نہیں۔ وہ مسلم سائنس داں جو ایسے کالجوں اور اداروں میں کام کرتے ہیں
جہاں ریسرچ کے وسائل میسر نہیں اور ان مسلم یا غیر مسلم سائنس دانوں کو جو بڑے
اداروں میں کام کرتے ہیں اور رضاکارانہ طور پر تیار ہوں اس مرکز کا رفیق ممبر
Associate Member بنالیا جائے اور ان کو یہ سہولت دی جائے کہ وہ
سال دو سال میں چند ماہ آکر یہاں ریسرچ کریں۔ ان کے سفر اور رہنے سہنے کے
اخراجات مرکز خود برداشت کرے گا۔ اس گوشے کے ذمے یہ کام بھی ہوگا کہ چھوٹی چھوٹی
کانفرنسیں وغیرہ بھی منعقد کرے جس سے مسلم سائنس دانوں کو روزافزوں
تحقیق کی بابت باخبری ہوتی رہے۔ مجوزہ مرکز کے نظامِ رفیق ممبر کا ایک فائدہ
یہ بھی ہوگا کہ رفیق ممبر ہونہار مسلم طلبا کو تلاش کرنے میں معاون ثابت ہوں گے
اور وہ مرکز کے کام کو لوکل سطح پر بھی پھیلائیں گے۔

مجوزہ مرکز کے خدوخال

مجوزہ نام: نام میں کچھ نہیں پھر بھی نام بہت ضروری ہے۔ یوں تو
مجوزہ مرکز کے کئی نام سوچے جاسکتے ہیں مگر میرے نزدیک "مسلم سینٹر فار سائنس"
Muslim Centre for Science بہتر رہے گا۔

مقام: مجوزہ مرکز کے لیے سب سے مناسب جگہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
ہوگی بشرطیکہ یونیورسٹی اسے قائم کرنے کی اجازت دے اور تعاون کرے۔

مجلسِ منتظمہ: اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تیار ہو تو مجوزہ مرکز اس کی سرپرستی
میں ہوگا مگر کافی حد تک خودمختار ہوگا۔ اس کی اپنی الگ مجلس منتظمہ ہوگی جو ملت کے
نامور دانشوروں اور یونیورسٹی اور مرکز کے اعلیٰ عہدے داروں پر مشتمل ہوگی۔
مجلس منتظمہ اس مرکز کے عہدے داروں کی تقرری اور مرکز کے کام کی نگرانی کرے گی
اور مرکز کے کام کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں مشورہ دے گی اور وسائل کی فراہمی میں
مدد بھی کرے گی۔

اس مرکز کو چلانے کے لیے زیادہ عملے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس مد پر زیادہ
خرچ آئے گا۔ شروع شروع مندرجہ ذیل عملہ کافی ہوگا۔

ڈائرکٹر: مجوزہ مرکز کا ایک ڈائرکٹر ہوگا جو اس مرکز کو چلانے کا ذمہ دار
ہوگا۔ وہ مرکز کے روزمرہ کے علمی اور انتظامی امور کا نگرانِ اعلیٰ ہوگا اور وہ مسلم یونیورسٹی
کے طبیعیاتی سائنس کے سینئر اساتذہ میں سے چنا جائے گا۔ اس کی تقرری پانچ سال
کے لیے ہوگی۔ ڈائرکٹر میں انتظامی صلاحیت اور مشنری اسپرٹ کا ہونا ضروری ہے
اسے اس مرکز کے اغراض ومقاصد سے اتفاق ہو اور نظریاتی سائنس سے دلچسپی ہو۔ اس
کو تقریباً پانچ سو روپیہ ماہانہ اعزازیہ دیا جائے گا۔

ناظم سائنس داں: مجوزہ مرکز کے روزمرہ کے انتظامی امور کا ذمہ دار
ہوگا اور مرکز کی فل ٹائم سروس میں رہے گا۔ اس کی تنخواہ کا گریڈ ریڈر کے مساوی
ہوگا۔ اسے اردو زبان پر عبور ہونا چاہیے۔ مرکز کے حسابات کی نگرانی بھی اسی کے
ذمہ ہوگی۔

اس کے علاوہ ایک اکاؤنٹنٹ مرکز کے آمد وخرچ کا حساب رکھنے کے لیے ایک
کلرک آفس ورک کے لیے اور چند چوتھے درجے کے ملازموں کی بھی ضرورت ہوگی۔

تعلیمی اور ریسرچ اسٹاف

معاون اساتذہ: فیکلٹی آف سائنس کے ہر شعبے سے اردو میں استعداد
رکھنے والا ایک استاد منتخب کیا جائے گا جس کے ذمے اپنے مضمون سے متعلق مندرجہ
ذیل کام ہوں گے

ا۔ دینی تعلیمی اداروں کے لیے نصاب اور کتابوں کو تیار کرنا
ب دینی درس گاہوں سے بلائے گئے اساتذہ کو اپنے مضمون کی بنیادی باتوں
کی تعلیم دیتے رہنا۔
ج دینی درس گاہوں سے مستقل تعلق قائم رکھنا اور اپنے مضمون سے متعلق
مشورے دیتے رہنا۔
د اپنے مضمون میں ہوئی اہم ترقیوں پر ہر سال ایک نوٹ تیار کرنا اور
اسے دینی اور دیگر تعلیمی اداروں کو بھیجنا۔

معاون اساتذہ سے امید کی جائے گی کہ وہ اوسطاً ۴۔۵ گھنٹے فی ہفتہ
مرکز کے لیے کام کریں گے انھیں لگ بھگ چار سو روپیہ ماہانہ اعزازیہ دیا جائے گا

رفیقِ مرکز: مجوزہ مرکز کے گوشۂ تحقیقات کے لیے نظریاتی سائنس
میں کام کرنے والے بیس سائنس داں پانچ سال کے لیے اس مرکز کے رفیق
Associate منتخب کیے جائیں گے۔ بہ حیثیت رفیق ان کو یہ حق ہوگا کہ وہ
سال کے کسی حصے میں مرکز پر کم سے کم پچاس دن اور زیادہ سے زیادہ نوے دن کے
لیے آئیں اور تحقیق کریں۔ مرکز انھیں سفرخرچ کے علاوہ پچاس روپے روزانہ
بھتہ بھی دے گا رفیق ممبر سے یہ امید کی جائے گی کہ وہ اپنے قیام کے دوران
مرکز میں ہونے والے پروگراموں میں دلچسپی لے اور واپس جاکر اپنے ادارہ
میں بھی اس مرکز کے اغراض ومقاصد کے تحت کام کرے۔

مہمان سائنس داں: مجوزہ مرکز پر وقتاً فوقتاً ملک کے چوٹی کے سائنس داں
چند روز کے لیے عام فہم لکچر دینے کے لیے بلائے جائیں گے۔ سال میں ایسے تقریباً
پندرہ بیس لکچر کا پروگرام رہے گا۔ کوشش یہ ہوگی کہ بیشتر یونیورسٹی میں کسی
اور پروگرام کے تحت آنے والے سائنس دانوں میں سے ہی اس قسم کے لکچر کے لیے

مدعو کیا جائے۔ اس طرح مرکز مہمان سائنس دانوں کے سفر کے اخراجات سے بری رہے گا۔ اندازاً اس مد میں چھ سات ہزار روپیہ سالانہ کا خرچ آئے گا۔

تعلیمی پروگرام

سہ ماہی اسکول: دینی تعلیمی اداروں کے اساتذہ کو سائنسی تعلیم کے لیے تیار کرنے اور انھیں سائنس کی مختلف شاخوں کی مبادیات سے واقف کرانے کے لیے مجوزہ مرکز ہر سال دو بار سہ ماہی اسکول چلائے گا جس میں شرکاء کی تعداد لگ بھگ پچاس ہوگی۔ مجوزہ مرکز اس اسکول میں شریک ہونے والے اساتذہ کا سفر خرچ برداشت کرے گا۔ اور انھیں لگ بھگ چالیس روپیہ روزانہ بھتہ دے گا۔ تخمیناً شرکاء پر چار ہزار روپیہ فی کس کا خرچ آئے گا۔ مرکز دینی اداروں کے منتظمین سے اپیل کرے گا کہ وہ ہر سال اپنے ایک یا دو استادوں کو سائنس کی تعلیمی تربیت کے لیے بھیجیں اور انھیں اس دوران تنخواہ بھی دیتے رہیں۔

ماہانہ کالج: اقلیتی کالجوں اور دوسرے اداروں کے طبیعاتی سائنس کے مسلم اساتذہ کے لیے مرکز ہر سال ایک ماہ کے لیے کالج یا ورکشاپ منعقد کیا کرے گا۔ اس کا مقصد شرکاء کو ان مضامین میں ہونے والی ترقیوں سے واقف کرانا اور مناسب ٹریننگ دینا ہوگا تاکہ وہ واپس جا کر کچھ ریسرچ کا کام کر سکیں۔ شرکاء کو مرکز سفر خرچ اور چالیس روپیہ روزانہ بھتہ دے گا۔ شروع شروع شرکاء کی تعداد لگ بھگ پچیس (۲۵) رکھی جائے گی۔ ایک فرد پر لگ بھگ پندرہ (۱۵) سو روپیہ کا خرچ آئے گا۔

ریسرچ: مرکز کے تحقیقاتی گوشہ میں مستقل ریسرچ کا کام ہوتا رہے گا۔ یہ پروگرام رفیقِ مرکز اور مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی مدد سے چلایا جائے گا۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کا کمپیوٹر سینٹر اس سلسلہ میں بھرپور تعاون دے گا۔

عمارت اور دیگر لوازمات

مجوزہ مرکز کے لیے ایک اپنی عمارت کا ہونا ضروری ہے جس میں کم سے کم ایک اوسط درجے کا لکچر ہال، ایک لکچر روم، ایک بڑا کمرہ لائبریری کے لیے اور تقریباً آٹھ اوسط درجے کے کمرے ہونے چاہییں۔ عمارت میں اندازاً مع فرنشنگ کے ۲۰ لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا۔

اس کے غیر مستقل خرچ کی مد میں مزید چند لاکھ روپیوں کی ضرورت ہوگی جس سے آفس کا سامان، ٹیچنگ ایڈ میٹریل
کمپیوٹر ٹرمنل، زیراکس مشین، فلم پروجیکٹر وغیرہ وغیرہ خریدا جا سکے۔

کل اخراجات کا تخمینہ

اوپر دی ہوئی تفصیلات سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ ہونا چاہیے کہ مجوزہ مرکز کے قیام کے لیے غیر مستقل اخراجات کی مد میں لگ بھگ پچیس لاکھ روپیہ اور اس کے مستقل اخراجات کے لیے لگ بھگ دس لاکھ روپیہ سالانہ کی ضرورت ہے

مستقل خرچ کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ ایک کروڑ روپیہ اکٹھا کر کے ایک ٹرسٹ قا[ئم کیا] جائے اور اس کی سالانہ آمدنی استعمال میں لائی جائے

اس طرح اس مرکز کو قایم کرنے اور اسے مستقل طور پر چلانے کے لیے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ درکار ہے۔

آخری بات

ہوسکتا ہے ہم میں سے چند کو جو سائنسی تعلیم کے اخراجات اور اس[…] سے ناآشنا ہیں یہ رقم زیادہ لگے۔ ان پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ ترقی یافتہ [اقوام] اپنی آمدنی کا اچھا خاصا حصہ تعلیم اور تحقیق پر صرف کرتی ہیں۔ اور یہی [ان] کا راز ہے۔ جیسے اقوام کی لگ بھگ چالیس فیصد آبادی سائنس اور ٹکنالوجی سے آراستہ ہے۔ اسرائیل جیسے ملک کا یہ حال ہے کہ اس کی ستر فی صد آبادی سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم سے مرصع ہے۔ ساڑھے چار کروڑ عربوں پر چالیس لاکھ اسرائیلیوں کی بالادستی کا بھی یہی راز ہے۔

اور پھر سوا کروڑ روپے کی رقم کچھ بڑی بھی نہیں۔ ہندوستان [کے مسلمانوں] کی آبادی ۱۲-۱۳ کروڑ کے درمیان ہے۔ یہ آبادی اگر فی کس دس [پیسے] [اس] مقصد کے لیے دے تو یہ رقم اکٹھا ہو جائے گی۔ لیکن شاید اس حد تک جانے کی [ضرورت] نہیں۔ صرف پانچ سو صاحب خیر پچیس پچیس ہزار روپے دے کر مطلوبہ [رقم فراہم] کر سکتے ہیں۔

ایک اتنی بڑی، غیرت مند اور اپنے ماضی پہ نازاں قوم میں د[نیا] میں اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی اور اپنی قوم کی صحیح معنوں میں تر[قی] کے لیے کیا چند صد بھی ایسے صاحب خیر افراد نہ ملیں گے؟

(شعبۂ طبیعیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ڈاکٹر اسیم احمد شکیل

سگریٹ نوشی کے مضر اثرات

سگریٹ نوشی (Smoking) نہ صرف سگریٹ نوش (Smoker) کے لیے ہر طرح سے مضر اور نقصان دہ ہے بلکہ یہ فضا کو بھی آلودہ اور پراگندہ کرتی ہے اور اس کے علاوہ یہ دوسری چیزوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔ سگریٹ نوش کے ذریعہ [illegible] دھواں (Smoke) بذریعہ ہوا سگریٹ نوش کے قریبی گرد و نواح [illegible] کے جسم کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور اس طرح انہیں انفعالی سگریٹ [illegible] (Passive Smoker) بنا دیتا ہے۔ سگریٹ نوشی انفرادی اور [illegible] نقصان صحت (Hygiene) کو بھی گندی سانس کے ذریعہ دانتوں [illegible] کرنے اور سگریٹ کی راکھ کے ذریعہ متاثر کرتی ہے۔ جلتی ہوئی [illegible] بیڑی بعض اوقات ناگہانی آگ لگنے کا بھی باعث ہوا کرتی ہے۔

لوگ سگریٹ کیوں پیتے ہیں:

[illegible] کچھ لوگ محض دکھاوے (Show off) اور دوسروں کو اپنی [illegible] رعب و دبدبہ قائم کرنے کے لیے سگریٹ پیتے ہیں۔ ویسے بعض لوگ اس کے [illegible] اور آرزومند بھی ہوا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ سگریٹ اس وقت پیتے ہیں [illegible] مکمل طور پر آسودہ (Relaxed) اور مطمئن بخش (Comfortable) [illegible] ہیں۔ حالاں کہ بعض دوسرے لوگ ذہنی الجھن، پریشانی اور کشیدگی (Tension) [illegible] میں اسے استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے [illegible] نوشی ایک غیر شعوری (Automatic Process) بن جاتی ہے۔ غالباً سگریٹ نوش اس حقیقت سے ناآشنا اور ناواقف ہوتے ہیں کہ [illegible] کا جھونکا (Puff) خود کو اونچا اور بلند مرتبہ ظاہر کرنے کے لیے [illegible] جو سگریٹ نوشی سماجی رتبہ (Social Status) کی [illegible] حیثیت اور یا محض تفریح و فیشن کے لیے کرتے ہیں، ان کو موت [illegible] سبب ثابت رہا ہے۔

سگریٹ نوشی کے ان عام نقصانات کے علاوہ کچھ دوسرے نقصانات بھی ہیں۔ مثلاً [illegible] ناکامیاب حمل، بچوں کے لیے خطرات، معدے کا ناسور (Peptic Ulcer) اور سگریٹ نوش کے لیے کھانسی وغیرہ کا بھی باعث و موجب ہوا کرتی ہے۔

ملک کے بعض علاقوں میں تو لوگ بیڑی کے جلے ہوئے حصے کو منہ کے اندر رکھ لیتے ہیں جو کہ تالو کے کینسر (Cancer of palate) کا ذمہ دار ہوا کرتا ہے۔

خطرات اور نقصان دہ و مضر اثرات

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سگریٹ کے ہر ڈبہ پر تنبیہی جملہ "Cigarette Smoking is injurious to health" سگریٹ نوشی صحت کے لیے نقصان دہ ہے، لکھا ہونے کے باوجود بھی لوگ سگریٹ نہیں چھوڑتے ہیں۔

تمباکو نوشی نکوٹین (Nicotine) اور کاربن مونو آکسائڈ گیس (Carbon monoxide gas) کی موجودگی کے سبب کافی خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ نکوٹین خون کی شریانوں arteries کو موٹا کر کے خون کے دباؤ (Blood pressure) کو بڑھا دیتا ہے اور خون کی نالی میں کولسٹرول (Cholesterol) کی نسبت (Percentage) میں اضافہ کر دیتا ہے۔ کاربن مونو آکسائڈ گیس آکسیجن گیس کی موجودگی کو، جو کہ جسم، دل اور دماغ کے لیے ضروری ہے، کم کر دیتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ایک جلتی ہوئی سگریٹ تقریباً چار ہزار مرکبات پیدا کرتی ہے۔ سگریٹ میں موجود ٹار (Tar) کے اندر کینسر پیدا کرنے والے کم از کم ۱۶ عناصر پائے جاتے ہیں۔

سگریٹ نوشی سے کچھ عام خطرات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پھیپھڑے کا کینسر Lung cancer
۲۔ منہ اور حلق کا کینسر Cancer of mouth & throat
۳۔ گلے کی نلی کا کینسر Cancer of Oesophagus
۴۔ تالو کا کینسر Cancer of palate
۵۔ مثانے کا کینسر Cancer of bladder
۶۔ مزمن قصبی ورم Chronic Bronchitis

۷۔ دل کے امراض Heart Diseases

۸۔ محیطی عروقی امراض Peripheral Vascular Diseases

سگریٹ نوشی بازو اور ٹانگوں Arms کے درد اور جسم کے سڑنے گلنے (فسادِ نسیج) وغیرہ کا بھی باعث ہو سکتی ہے۔

سگریٹ نوشی کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔

چونکہ سگریٹ نوشی انسان کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا یہ تمام بیماریاں بھی اختیاری ہیں اور یقیناً روکی جاسکتی ہیں۔ کچھ نہیں بلکہ محض قوت ارادی will power ہی ایک انسان کو اس بُری عادت سے نجات دلا سکتی ہے۔ جتنا زیادہ سے زیادہ اس کو یہ یقین ہوگا کہ وہ موت کے قریب کھنچ رہا ہے محسوس کرے گا اور جتنا زیادہ سے زیادہ اس کو یہ یقین ہوگا کہ موت کے قریب کھنچ رہا ہے۔ غالباً وہ سگریٹ نوشی سے اتنا زیادہ پرہیز کرے گا۔ قوت ارادی اور عزم مصمم ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لہٰذا اسے سگریٹ نوشی چھوڑنے کا مصمم ارادہ کرنا چاہیے۔ اور اس طرح وہ اسے ضرور چھوڑ سکتا ہے۔ اگر ایک بار وہ سگریٹ نوشی کے خطرات سے باخبر ہو جاتا ہے اور اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی صحت کے لیے یہ نقصان دہ ہے تو اس کو اسے چھوڑنے میں آسانی ہو جاتی ہے ما گرچہ سگریٹ نوشی کا یکایک خاتمہ مضبوط قوتِ ارادی کے ذریعہ ایک مثالی اور معیاری ideal ہے۔

سگریٹ نوشی کا مرحلہ وار خاتمہ

سگریٹ نوشی کا مرحلہ وار (منزل بمنزل) خاتمہ بھی ایک کامیاب طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مطابق آپ اپنی اس بُری عادت HABIT کو مرحلہ وار مندرجہ ذیل ایک آسان کھیل کے ذریعہ چھوڑ سکتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں آپ اپنی روزانہ کی سگریٹ و بیڑی کی تعداد گھٹا کر نصف کر دیجیے۔ لفظ کے پہلے حرف "H" کو چھوڑ دیجیے۔ "ABIT" باقی رہ جاتا ہے۔ ایک سگریٹ کا نصف حصہ پیجیے۔ اس کے ساتھ ہی لفظ کے دوسرے حصے "A" کو چھوڑ دیجیے۔ تب بھی "BIT" باقی رہ جاتا ہے۔ تیسرے مرحلے میں دھوئیں کو اندر داخل مت کیجیے۔ بلکہ اس کو یوں ہی باہر چھوڑ دیجیے۔ اب حرف "BIT" بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اس طرح صرف "IT" باقی بچ جاتا ہے۔ "IT" وہ مرحلہ ہے، جہاں کہ رکا جا سکتا ہے۔ دیاسلائی کی ڈبیہ مت لیجیے، سگریٹ مت سلگائیے۔ سگریٹ مت پیجیے۔ اب حرف "I" کو بھی چھوڑ دیجیے اور کہیے کہ "میں" "میرے اندر سگریٹ نوشی کی خواہش پر غلبہ پا سکے گا"۔ اب صرف "T" حرف باقی بچ جاتا ہے۔ "TEA" آپ کی مزید مدد کر سکتی ہے۔ جب بھی آپ کو سگریٹ پینے کی خواہش ہو تو چائے (TEA) پی لیجیے۔

امریکہ کے نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ نے ان لوگوں کے لیے جو واقعی سگریٹ

"حُسن وہ ہے جو تمہاری روح کو اپنی طرف کھینچے جس کو فقط دیکھنے سے غرض ہو لینے سے نہیں۔"

نوشی چھوڑنا چاہتے ہیں ایک ممکنہ اور آسان مندرجہ ذیل تجربہ پیش کیا ہے۔

• سب سے پہلے یہ کہ یہ کبھی مت سوچیے کہ اپنی بقیہ زندگی بغیر سگریٹ کے ہے، بلکہ ایک وقت میں ایک ہی دن پر پوری توجہ مرکوز کیجیے۔

دوسرے یہ کہ روزانہ ایک گھنٹے کے لیے اپنے پہلے سگریٹ کو ملتوی رکھیے یا جفت گھنٹے Even Hours یا طاق گھنٹے (Odd Hours) میں سگریٹ پینا طے کیجیے۔

تیسرے یہ کہ آپ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ایسی جگہوں پر جہاں کہ سگریٹ نوشی منع ہے۔ مثلاً: عجائب خانہ، تماشہ گاہ اور عبادت گاہ

بالآخر پانی یا پھلوں کے رس پیجیے لیکن الکحل (Alcohol) ایسی دوسری تمام اشیاء سے جو سگریٹ سے متعلق ہوں، مکمل پرہیز کیجیے

ایسے تمام لوگوں کو جن کو دل کے دورے (Heart Attacks) پڑ چکے ہیں یا جو سوزش گلو Angina میں مبتلا رہ چکے ہیں، انہیں بیماریوں کے خلاف احتیاط کے طور پر سگریٹ نوشی فوراً چھوڑ دینا چاہیے۔ اور مریض سگریٹ نوشی کا سلسلہ جاری رکھتا ہے تو پھر دل کے دورے امکان بہت زیادہ ہیں۔

بُری عادت کو چھوڑنا۔

ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سگریٹ نوش اپنے منہ میں لونگ وغیرہ رکھ کر اپنے منہ کو مشغول رکھ سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے مشورہ دیا جا کہ جب بھی سگریٹ پینے کی خواہش ہو جائے پی لیا کریں۔ اگر کچھ نہیں تو گلاس پانی تو پی ہی سکتے ہیں۔

سگریٹ نوش مختلف قسم کی ہابی Hobbies مثلاً باغبانی پینٹنگ اور کھیل وغیرہ کو اپنا کر خود کو ان میں مشغول رکھ سکتا ہے۔ ہابی بہتر بدل اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے جو کہ اسے مشغول رکھ کر سگریٹ کے لیے سوچنے کا اس کے لیے کوئی موقع بھی چھوڑ سکتی ہے۔

ایک اچھی مثال پیش کرنے کے لیے والدین کو سگریٹ نہیں پینا کیوں کہ اس سے نوجوان طبقوں کے اندر نقل اتارنے کو نظر انداز کرنے مدد ملتی ہے۔ خصوصاً دیہاتی علاقوں میں بڑے بزرگ لوگ اپنے چھوٹے عزیزوں سے چلم بھرنے کو اور حقوں کے پانی بدلنے کو کہتے ہیں۔ دستور کو ختم کرنا چاہیے کیوں کہ اس سے سگریٹ نوشی کی بہت حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ (ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری، انجینئرنگ کالج)

شاداں اطہر پرویز

فضائی آلودگی کے اثرات

ہمارے چاروں طرف فضا ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ اس فضا میں ہوا، پانی اور خشکی تینوں ہی شامل ہیں۔ ہوا ناک کے ذریعے ہمارے پھیپھڑوں تک جاتی ہے اور جب ہمیں پیاس لگتی ہے تو ہم پانی پیتے ہیں یہ پانی منہ سے ہمارے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں چاہیے کہ صاف ہوا میں سانس لیں اور صاف ہی پانی کو پینے کے استعمال میں لائیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہوا اور پانی کیوں گندے ہوتے ہیں؟

کچھ چیزیں کم مقدار میں جسم کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں مگر ان کی مقدار بڑھ جائے تو وہی چیزیں جسم میں بیماریاں پیدا کرنے لگتی ہیں۔ ان چیزوں کے ہوا یا پانی میں زیادہ ہونے سے ہوا اور پانی دونوں گندے ہوتے ہیں اور ان کے گندے ہونے سے انسان کی صحت پر، پودوں اور جانوروں یہاں تک کہ عمارتوں پر بھی خراب اثر پڑتا ہے۔

موٹر کاروں، بسوں، اسکوٹر، موٹر سائیکل اور ہوائی جہاز سے پٹرول یا ڈیزل کے جلنے سے جو دھواں خارج ہوتا ہے وہ فضا کو گندا کرتا ہے اور یہ تمام جانداروں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ دھواں کاربن کہلاتا ہے گو کاربن تھوڑی سی مقدار میں ہمارے بدن میں پایا جاتا ہے۔ مگر اس کی ایک حد سے زیادہ مقدار نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ کاربن سگریٹ کے دھوئیں میں بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کارخانے اور گھروں میں جلنے والے لکڑی اور کوئلے کے چولہے اس کا ذریعہ ہیں۔ یہ کاربن صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ انسان کو سست اور کاہل بنا دیتا ہے، اس سے سر میں درد بھی ہونے لگتا ہے، جلدی تھکن ہونے لگتی ہے، آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں اس کے علاوہ دل کی بیماریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کی فضا میں اگر انسان زیادہ دنوں تک رہے تو اکثر موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ کاربن عمارتوں کو بھی خراب کرتا ہے مثلاً آگرہ میں تاج محل کے چاروں طرف کارخانے ہیں۔ ان کارخانوں سے جو دھواں نکلتا ہے، اس سے تاج محل میں لگا سنگ مرمر خراب ہو رہا ہے۔ اس کی سفیدی دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔

جیٹ ہوائی جہاز کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اور یہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اپنے پیچھے ایک دھواں جو کہرے کی طرح ہوتا ہے چھوڑتا جاتا ہے۔ یہ دھواں دراصل کیمیکل (Chemical) ہوتا ہے جسے ایروسول (Aerosol) کہتے ہیں۔ یہ ایروسول چند سالوں سے سائنس دانوں کے لیے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ فضا میں ہوا کے اوپر ایک گیس زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، اسے اوزون (Ozone) کہتے ہیں۔ اوزون کی ایک موٹی سی تہہ غلاف کی طرح زمین کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے۔ اوزون سورج کی کچھ ایسی شعاعوں کو روکتی ہے جو کہ انسان اور جانور دونوں ہی کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایروسول اوزون کی تہہ کو پتلا کرتا ہے۔ اس کے پتلا ہونے سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ سورج کی وہ شعاعیں زمین کی سطح تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت تیز رفتار جہاز بھی اوزون کی اس تہہ کو پتلا کرتے ہیں۔

یہی اوزون جو ایک طرف ہماری حفاظت کرتی ہے دوسری طرف ہوا میں زیادہ مقدار میں شامل ہو جائے تو یہ ربر کی بنی ہوئی چیزوں کو خراب کرتی ہے اوزون کے علاوہ ہوا میں کچھ ایسی چیزیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جو سانس کی بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔

اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ مکھیوں اور مچھروں کو مارنے کے لیے ڈی۔ڈی۔ٹی (D D T) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر کچھ دنوں بعد مکھیاں اور مچھر اس سے مرنے بند ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ڈی۔ڈی۔ٹی کے اندر جو زہریلی چیزیں ہیں وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ کانوں کے پاس کے پیڑ اور پودے ان زہریلی دھاتوں کے عادی ہو جاتے ہیں جو اس کان سے نکالی جاتی ہیں۔ پودے جو کانوں سے دور ہیں ان کی مٹی میں اگر یہ دھاتیں ملا دی جائیں تو وہ پودے مر جائیں گے۔

پہلے بھی یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ پانی کی گندگی بھی جانداروں کے لیے نقصان دہ ہے۔ پانی گندا ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زہریلی چیزیں پانی میں مل جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ شہر شہر کا فضلہ ندی یا دریا کے پانی میں بہا دیا جاتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ گرمیوں میں ندی یا دریا کا پانی حد سے زیادہ گرم ہو جاتا ہے جو مچھلیوں کو مارتا ہے۔

اگر آپ غور کریں تو آپ کو دکھائی دے گا کہ شہر شہر کے نالے اور

نالیوں کا رُخ کسی بھی مقامی ندی، دریا، جھیل یا چشمے کی طرف ہے۔ شہر بھر کی گندگی ان نالوں میں جاکر گرتی ہے جو بہت زبردست مقدار میں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے ہندوستان کی مقدس ندی گنگا تک میں شہر بھر کی غلاظت پھینکی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کارخانوں کا فضلہ بھی ان ہی ندیوں میں بہادیا جاتا ہے۔ جس کے اثرات بہت خراب ہوتے ہیں۔ شکر کے کارخانوں سے اکثر شیرا بہہ کر ندی کے پانی میں مل جاتا ہے۔ اس شیرے سے مچھلیاں اور گھونگے مرجاتے ہیں اس وجہ سے آبی پرندے ان ندیوں میں نہیں اترتے ہیں۔ اور ان ندیوں کے پانی میں طرح طرح کے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں۔ اکثر قدرتی طور پر بھی ندیاں گندی ہوجاتی ہیں۔ شروع گرمیوں میں جب آندھیاں آتی ہیں تو دھول اُڑ اُڑ کر ندی میں جاتی ہے۔ پیڑوں سے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر پانی میں گرتے ہیں اور اسی میں گل سڑ جاتے ہیں۔ اس سے بھی پانی گندا ہوتا ہے۔ مگر بہتے پانی میں کچھ عرصے بعد یہ چیزیں تہہ میں چلی جاتی ہیں اور اوپری سطح کا پانی صاف ہوجاتا ہے۔

آج کل ہماری اس ترقی یافتہ دنیا میں سب سے خطرناک کام جو ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے ممالک جو آئے دن طرح طرح کے بم بناتے رہتے ہیں، وہ ایٹمی ٹیسٹ کے فضلہ کو سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ یہ فضلہ سمندر کی مچھلیوں کے جسم میں براہ راست پانی کے ذریعے پہنچ جاتا ہے اور جب جاندار اُن مچھلیوں کا استعمال کرتے ہیں تو وہ زبردست زہر انسان کے جسم میں داخل ہوجاتا ہے جس کے اثرات بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ اس سے دماغی بیماریاں ہوتی ہیں اور جسم کے مختلف اعضا ٹیڑھے ہونے شروع ہوجاتے ہیں اور جان کا خطرہ تو ہوتا ہی ہے۔ اس قسم کا زہر اگر بدن میں داخل ہو جائے تو جان بچنی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔

کیڑوں کو مارنے کے لیے جن دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ دوائیں بھی بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ مگر قوم کی ترقی کے لیے کھانا کپڑا اور بیماریوں کا علاج بہت ضروری ہے۔ اس وجہ سے کیڑے مارنے کی دوائیں ایک طرف ہماری مدد بھی کرتی ہیں۔ کیوں کہ کیڑے اناج کی بڑی تباہی مچاتے ہیں۔ دراصل ان دواؤں کو بڑی احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے

مئی کے مہینے میں جب گرمی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو ندیوں اور دریاؤں کا پانی بہت گرم ہوجاتا ہے اس کی گرمی سے اکثر مچھلیاں مرجاتی ہیں۔ کیوں کہ وہ اس گرمی کو برداشت نہیں کرپاتی ہیں۔

فضا میں شور وغل بھی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ سڑکوں پر چلنے والی موٹروں میں سائیلنسر (Silencer) ضرور لگے ہوں، جس سے وہ زیادہ شور برپا نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ شادی بیاہ میں، اونچی آوازوں میں ریکارڈ بجانے پر بھی پابندی ہو جانی چاہیے اور

اصل خوشی ایک دلچسپ خیال سے عبارت ہے جو اگر اس دل میں ہوتا ہے جس میں خواہشیں کم ہیں جس قدر تم اپنی ضرورتوں کو کم کرتے جاؤگے اسی قدر تمھاری مسرت بڑھتی جائے گی

(عبدالحلیم شرر : ...)

لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ ایسے کام نہیں کرنے چاہئیں جس سے عام آدمی کو تکلیف ہو۔ دراصل شور وغل دماغ اور کانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ لوگوں کے رہنے کے علاقے جتنے پرسکون ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ سکون ذہن کو تندرست رکھتا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیئے کہ ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ اپنی خوشی میں دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچانی چاہیے۔

ہم نے دیکھا کہ ہماری فضا کن کن چیزوں سے گندی ہوتی ہے یہ بھی دیکھا کہ ان چیزوں کے بُرے اثرات ہمارے اوپر براہ راست پڑتے ہیں۔ اب ہم کو یہ بات توجہ کے ساتھ سوچنی چاہیئے کہ اس سلسلے میں ہم کیا کرسکتے ہیں۔ مثلاً ہوا کو دھویں کی گندگی سے بچانے کے لیے یہ کیا جاتا ہے کہ کارخانوں کی چھتوں پر بڑی بڑی چمنیاں لگادی جاتی ہیں جن کے ذریعے دھواں باہر نکلتا ہے۔ یہ دھواں جو چمنیوں سے گزر کر آتا ہے اس میں کاربن کی مقدار کچھ کم ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں جو احتیاط برتی جاسکتی ہے۔ اس پر کم خرچ ہوگا بہ نسبت اس خرچ کے جو اس سے نقصان کو ٹھیک کرنے میں ہوگا۔ اس کے علاوہ ... کی بہ نسبت ہوا کو کم گندا کرتا ہے۔ کارخانے اگر آباد علاقے میں نہ ہوں ... ہے۔ کاروں میں بھی ایسے فلٹر [Filter] لگانے چاہئیں جس سے وہ کم دھواں خارج کریں۔

عام لوگوں کو سگریٹ پینے سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بتانا چاہیئے کہ سگریٹ پینے سے کتنی بڑی بڑی کینسر جیسی بیماریاں ہوتی ہیں۔ سگریٹ پینے والوں کو نوے فیصدی پھیپھڑے کا کینسر ہونے کا امکان ہوتا ہے اور جو دوسرے لوگ اس فضا میں سانس لیتے ہیں جو سگریٹ پیتے ان کو تیس فی صدی کینسر ہونے کا امکان ہوتا ہے۔

پانی کو صاف کرنے کے لیے یہ کرنا چاہیے کہ کارخانوں کے فضلے کو کسی حد تک پہلے سے صاف کرکے دریا میں بہانا چاہیے جس سے مچھلیاں نہ مریں۔ ایٹمی فضلے کو سمندر میں پھینکنے کے بجائے کوئی اور حل نکالنا چاہیے۔ فضا میں گندی کا مسئلہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہر ایک کو چاہیئے کہ اس پر توجہ دے۔ گو وہ بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب یہ مسئلہ ہم سب کا ہے۔ اور ہم سب کو چاہیے کہ صفائی کی طرف توجہ دیں۔ اسی میں قوم کی

سجاع الدین فاروقی

انتقام یا درگزر
اسلام کی نظر میں

انتقام انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اگر مقدور ہو تو انسان ... بدلہ لینے پر اکتفا نہیں کرتا جتنا اسے ستایا گیا ہے، بلکہ اس سے دس ... اس کے انتقام کی آگ نہیں بجھتی اور اسے صبر و قرار حاصل ...

... سے قبل مختلف ادیان و مذاہب نے اس فطرت پر روک ... کی مگر تاریخ شاہد ہے کہ جذبۂ انتقام کو روکنا تو کجا کبھی ... نہیں کیا جا سکا۔ اقصائے عالم میں ہر طرف انتقام در انتقام کا ایک ... جاری تھا اور عفو و درگزر کا تصور بھی نہ تھا۔ قبائل عرب ... کے بدلے میں پورے پورے خاندانوں اور قبیلوں کو تہِ تیغ ... تھے۔ خود ہندوستان میں، جو اہنسا کا پجاری ... بار چھتری قوم کا قتل عام کر کے بھی پرسرام کے انتقام کی ... ہی ... راجپوتوں میں انتقام کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ... تھا۔

... تعلیمات قرآنی اور اسوۂ محمدیؐ سے قبل دنیا کے سامنے دو جلیل ... کی تعلیمات تھیں۔ ایک طرف تورات تھی جو انتقام میں ہاتھ ... آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان لینے کا حکم دیتی ... طرف انجیل کی تعلیمات تھیں جو اس فطری جذبے کے برخلاف ... عفو و درگزر چاہتی تھیں۔ اول الذکر کی بنیاد عدل و قانون پر ... الذکر تمام تر احسان و اخلاق پر مبنی تھی۔ ایک میں بے پناہ ... تھی، تو دوسرا اصول ناقابل عمل تھا۔ کیونکہ یہ کہنا تو بہت آسان ہے ... کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے ... کر دو، لیکن درحقیقت ایسا کرنے والے اس دنیا میں کتنے لوگ ... اسی لیے دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔ اسلام ... دین فطرت اور عالمگیر شریعت کا حامل ہے، ان دونوں اصولوں کا حسین ... امتزاج پیش کرتا ہے۔ وہ اتنا ہی انتقام لینے کی اجازت بھی دیتا ہے ... ساتھ ہی عفو و درگزر کی ترغیب بھی دیتا ہے اور اس کے لیے اجرِ عظیم کی بشارت بھی۔ سورہ نحل میں ارشاد باری ہے

"وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔"

یعنی سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کر لو تو صابروں کے لیے یہ بہت ہی اچھا ہے۔

سورۂ شوریٰ میں عفو کی ترغیب اس طرح دی گئی ہے۔

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۔

"اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے۔ بیشک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔"

اسی طرح سورۂ نور میں ارشاد خداوندی ہے

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

"معاف کرنا اور درگزر کرنا چاہیے کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے"

یہی نہیں، سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ، سورۂ شوریٰ، سورۂ انعام، سورۂ اعراف، سورۂ آل عمران میں جگہ جگہ عفو و درگزر، رحم و کرم، ضبطِ نفس اور تحمل و برداشت کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ زبان رسالت مآبؐ نے بھی بارہا عفو و درگزر اور تحمل و برداشت کی تلقین کی ہے۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا

"لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ"

"جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا"

ایک اور حدیث شریف ہے۔

"اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ"

"تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا یعنی اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا۔"

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے اگر یہ نہ ہو تو گناہوں سے بھری ہوئی یہ دنیا چشم زدن میں نیست و نابود ہو جائے۔ اللہ کے ناموں میں عفو، غافر، غفور اور غفار اسمائے خاص ہیں اور وہ اپنی صفت خاص کا بارہا ذکر بھی کرتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ نے اپنے آپ کو دو بار غافر (چھپانے والا، گناہ بخشنے والا) پانچ بار غفار (بڑا چھپانے والا، بڑا بخشنے والا) پانچ بار عفو (بڑا معاف کرنے والا) اور ستر سے زائد آیات میں غفور (بڑا بخشنے والا) قرار دیا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں ضبط و تحمل اور حلم کس قدر وافر مقدار میں ہے اور اس کے عفو و درگذر کا سمندر کس زور و شور سے ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو معاف کرنے اور بخشنے کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔

خدا اپنی یہ صفت خاص اپنے بندوں میں بھی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا تحکم آمیز مشورہ ہے۔ "تخلقوا باخلاق اللہ" یعنی اللہ جیسے اخلاق پیدا کرو اور اس کے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ وہ اُن لوگوں کی بھی پرورش کرتا ہے جو اس کو نہیں مانتے بلکہ بُرا کہتے ہیں قدرتی عطیات سے سب کو یکساں فائدہ حاصل ہوتا ہے اور کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔ اسی لیے اکثر آیات میں مومن کی پہچان بھی یہی بتائی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ غلطیوں کو معاف کرنے والا اور کوتاہیوں سے درگذر کرنے والا ہوتا ہے۔

ان آیات بیّنات اور احادیث مبارکہ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام انتقام کے بجائے عفو و درگذر پر کس قدر زور دیتا ہے اور اس کے لیے بہت بڑے اجر و ثواب کی بشارت بھی دیتا ہے۔

لیکن ہمیں یہاں یہ دیکھنا ہوگا کہ صبر و ضبط، تحمل و برداشت اور عفو و درگذر واقعی قابل عمل ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ خوش آئند و خلوص اور عمدہ عمدہ نصیحتوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے، کمی جس چیز کی ہے وہ 'عمل' ہے۔ اہنسا کا وعظ دنیا نے بارہا سنا ہے۔ لیکن مہاویر اور گوتم بدھ سے لے کر گاندھی جی تک کی کوششیں کیا ہندوستان میں اہنسا کا ماحول قائم کر سکیں؟ انجیل مقدس کی عفو و درگذر کی تعلیمات کیا یورپ کی درندگی دور کر سکیں؟ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مذاہب کے بانیوں اور شارعوں کی سیرت و کردار میں ہم ان خوبصورت و دلآویز تعلیمات اور مفید نصیحتوں کا عملی مظاہرہ نہیں پاتے مگر رسول عربی بانگ دہل اعلان کرتے ہیں "لِمَ تقولون ما لا تفعلون" (تم وہ بات کیوں کہتے جو کر نہیں سکتے") اور اس اعلان کا انھیں حق حاصل تھا کیوں کہ وہ کچھ فرماتے تھے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھاتے تھے اور یہی وہ بیّن فرق ہے جو آپ کو کوہ زیتون کے واعظ اور کوہ صفا کے مبلغ اعظم کی سیرت میں نمایاں نظر آئے گا۔ ایک کی سیرت اس سے یکسر خالی ہے تو دوسرے کی سرتاپا معمور۔ آپ کے ان عملی اقدامات نے ہی آپ کے پیروں کو عمل کا پیکر بنا دیا تھا۔

کسی مجبور و معذور اور کمزور کی خاموشی یا صبر کو درگذر نہیں کہا جا سکتا البتہ قوت پا کر عفو و درگذر کرنا اور حلم و بردباری کا مظاہرہ کرنا بلند ترین اخلاق کا مظہر ہے۔ عفو و درگذر کے معنی یہی ہیں کہ انتقام کے باوجود ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصور وار سے اس کا کوئی بدلہ نہ لیا جائے ؎

موسیٰ نے کی یہ عرض کہ اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

اب اگر ہم اسی اصول کی روشنی میں سیرت رسول عربی کا مطالعہ کریں تو صدہا ایسے واقعات نظر آ جائیں گے جب آپ نے باوجود تمام تر قوت و قدرت عفو و درگذر کو اپنا شعار بنایا اور اس کی ایسی زندہ مثالیں پیش کیں جو بنی نوع انسانی میں سے کوئی دوسرا پیش نہ کر سکا اس کی شہادت اپنوں ہی نے نہیں بلکہ غیروں نے بھی دی ہے۔ عظیم روسی مفکر و مصنف ٹالسٹائی لکھتا ہے۔

"حضرت محمدؐ بے انتہا منکسر المزاج، رحم دل، راست باز، خلیق، متحمل، انصاف پسند اور جلیل القدر مصلح تھے۔ .... دنیا کے تمام انصاف پسند اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ کا طرزِ عمل اخلاقِ انسانی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے"

مشہور مورخ ولیم ٹاڈ نے آپؐ کے اخلاقِ حسنہ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"....... محمدؐ اپنے دائرۂ حکومت میں پورے اختیارات رکھتے تھے لیکن پھر بھی مقابلۂ اعدا میں آپؐ ہمیشہ نرمی اور انصاف سے کام لیتے تھے۔ آپؐ کے ابنائے وطن نے جس طرح آپؐ کے حقوق کے خلاف سرکشی کی وہ ایک ظالم حکمراں

کے لیے کافی وجہ ہوسکتی تھی کہ وہ ان سب کو تباہ کر دیتا لیکن انھوں نے سوائے چند مجرموں کے سب کو عام معافی دے دی اور تمام واقعات استہزا اور اہانت پر خاک ڈال دی۔ آپؐ کا وہ کمال جو آپؐ نے فتح کے بعد بنانقوش موقع میں ظاہر کیا، اخلاقِ انسانی کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔"

مکی زندگی کو تو جانے دیجیے کیوں کہ اس وقت بظاہر آپؐ کو قوت حاصل نہ تھی البتہ مدنی زندگی پر نظر ڈالیے جب کہ آپ کا جاہ و جلال اپنے کمال پر تھا ایسے وقت میں آپؐ کس طرح اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگذر سے پیش آتے ہیں۔

آپ پر کئی بار قاتلانہ حملے کی سازشیں کی گئیں، زہر دیا گیا، اور پر جادو کرانے کی ترکیبیں کی گئیں، حد یہ ہے کہ آپ کی عزت و ناموس پر بھی بدترین حملہ کیا گیا۔ غرض وہ مکہ جس میں ہر طرح سے آپؐ پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے تھے جب فتح ہوتا ہے تو وہ سارے اہلِ مکہ مجرم و قیدی کی صورت میں آپ کے سامنے پیش ہوتے ہیں، جنھوں نے آپؐ کو گالیاں دی تھیں، آپؐ کی توہین کی تھی، آپؐ پر نجاستیں پھینکی تھیں، آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھائے تھے، آپؐ اور آپؐ کے اہلِ خاندان کا سماجی بائیکاٹ کیا تھا، آپؐ کے اعزا و اصحاب کا خون ناحق کیا تھا۔ آپؐ کے قتل کی سازشیں کی تھیں، مختصر یہ کہ آپؐ اور آپؐ کی تحریک کو مٹانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ آج آپ کو ان سے انتقام لینے کا پورا پورا موقع تھا یوں کہ آپؐ کے ساتھ آج دس ہزار تلواریں ان ظالم و جابر اور درندہ صفت انسانوں سے بدلہ لینے کے لیے بے چین و بے قرار ہیں اور دنیا کا کوئی قانون اور ضابطہ اخلاق آپ کو ان سے بدلہ لینے سے نہیں روکتا بلکہ تقاضہ یہ ہے کہ ان کو قرار واقعی سزا دی جائے اور ان سے انتقام لیا جائے چنانچہ آپ کے ساتھی پکار اٹھتے ہیں۔ "الیوم یوم الملحمۃ" (آج تو قتل و خونریزی کا دن ہے) لیکن رحمۃ اللعالمین اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ "نہیں نہیں۔ الیوم یوم المرحمۃ" (آج تو رحمتِ عام کا دن ہے) اور اس طرح دنیا کے تمام فاتحوں کے برعکس انتقام کے بجائے عفو و درگذر کو ترجیح دیتے ہیں اور ان سب کو معاف کر دیتے ہیں اور نہ صرف معاف فرماتے ہیں بلکہ انھیں اپنی بے چارگی اور معذوری کا احساس بھی نہیں ہونے دیتے اور حسنِ سلوک فرماتے ہیں۔

یہ ہے عفو و درگذر کا عملی نمونہ اور روشن مثال۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور شارعِ اسلام کی نظر میں انتقام کے بجائے عفو و درگذر، تحمل و برداشت اور صبر و ضبط کی کس قدر اہمیت ہے اور وہ ان پر کس قدر زور دیتے ہیں بلکہ خدا و رسولؐ خود کس قدر ان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بے شک اسلام انتقام کی اجازت دیتا ہے مگر اس کی نظر میں پسندیدہ عفو و درگذر ہی ہے۔ وہ تو یہی چاہتا ہے کہ

"بخش دو گر خطا کرے کوئی"

مذہبی احکام سے قطع نظر مندرجہ بالا خصوصیات ایک مہذب و شریف اور شائستہ و متین انسان کی بھی خصوصیات ہیں۔ علم اخلاق بھی ہر انسان میں یہی خصوصیات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن افسوس رسولِ عربی کے شیدائی ہوں یا اخلاقیات کے نام لیوا، سب ہی ان انسانی خصوصیات سے تہی دامن نظر آتے ہیں۔ آج انتقام تیر و تلوار سے نہیں تو زبان و قلم سے لیا جا رہا ہے۔ آج ہر شخص بغض و حسد اور نفرت و عداوت کی شدید آگ میں جل رہا ہے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، کمزور کرنے اور نقصان پہنچانے کے لیے کمربستہ ہے۔ مردم بیزاری اور دل آزاری کا ہر طرف بازار گرم ہے۔ عفو و درگذر، تحمل و برداشت اور صبر و ضبط کی قوتیں کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہیں۔ صاحبانِ اقتدار نشۂ جاہ میں سرمست اور مزہ چکھانے کا عزم مصمم کیے ہوئے ہیں تو زیردست افراد موقع کی تلاش کے متمنی و جویا۔ تخریبات نے تقریبات کا روپ دھار لیا ہے، بڑے بڑے سفید پوش انتقامی سیاہی کے دھبوں سے مالامال نظر آتے ہیں اور اسی چیز کو ذرا امریکہ اور روس کی اسلحہ پرستی سے معمور فضا میں لے جا کر دیکھیں تو مستقبل کا جام تھرکتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس لیے آج سب سے بڑی ضرورت حلم و عفو کی قوتوں اور قدروں کو پھر سے توانا اور تندرست کرنے کی ہے۔ اگر یہ جذبات اور اقدار ایک بار پھر پوری قوت و توانائی سے زندہ و تابندہ ہو جائیں تو یقیناً ہمارے سماج کی بہت سی برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مذہبی مبلغین اور اساتذہ ان اقدار اور اخلاقی جواہر کو درخشاں کرنے کے سب سے زیادہ اہل ہیں لیکن اگر ہم میں سے ہر شخص اپنے اندر ان صفات کو پیدا کرنے کی کوشش کرے تو بھی ایک انقلاب عظیم رونما ہوسکتا ہے۔

* محبت اپنی گویائی سے بے جور رہتی ہے تا آنکہ فراق کی ساعت آ جائے۔
* یاد رکھو کہ محبت تمہارے سر پر تاج رکھتی ہے تو ساتھ ہی تمہیں سولی پر بھی چڑھا دیتی ہے۔

قاضی عبدالغفار: اس نے کہا

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
Link
CABLE 88 LOCK
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ علی گڑھ
فون :
۳۲۰۹
۴۱۹۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

استہار نمبر ۲۲/ ۸۴۔ ۸۵۔

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ۔ جواہرلال نہرو میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰ روپے مع دیگر الاونسز
قابلیت: لازمی:۔ کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے ایم۔بی۔بی۔ایس اور کسی کلینکل مضمون میں پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم
کسی مرکزی یا ریاستی اور بہتر ہو کہ کسی تدریسی ہسپتال میں نگراں کی حیثیت سے ہسپتال کے انتظام کا تجربہ
پسندیدہ:۔ ہسپتال کے انتظام سے متعلق کوئی ڈگری یا ڈپلوما۔

۲۔ ریڈر ان فارماکولوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف فارماکولوجی
شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت:

۱۔ لازمی۔ ایم۔ڈی۔ (فارماکولوجی)
ایم۔ڈی (فارماکولوجی اینڈ تھریپوٹکس)
ایم۔بی۔بی۔ایس مع ایم ایس سی (فارماکولوجی)
پی۔ایچ۔ڈی (میڈیکل فارماکولوجی)
ڈی۔ایس سی (" ")
ٹیچنگ/ریسرچ کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر پانچ سالہ تدریس کا تجربہ۔
پسندیدہ:۔ نیورو فارماکولوجی میں تجربہ۔ مطبوعہ تحقیقی کام

۳۔ ریڈر ان نیفرولوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن
شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس
قابلیت:۔

لازمی۔ ایم۔ڈی (نیفرولوجی)
ایم ڈی ان میڈیسن مع دوسالہ خصوصی ٹریننگ ان نیفرولوجی۔

ٹیچنگ/ ریسرچ کا تجربہ

پسندیدہ:- تخصص (اسپشلائزیشن) کے میدان میں تحقیق کا [illegible] وعہ کام

جو امیدوار اشتہار نمبر ۱۸/۸۴ - ۸۵ کے تحت درخواست بھیج چکے ہیں انھیں دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ وہ لوگ اگر ملازمت کے مجاز ہوں گے تو اُن کی امیدواری پر پچھلی درخواست کی روشنی میں غور کیا جائے گا۔

۴- ریڈر ان جنرل سرجری (بائیوکیمسٹری) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت:

لازمی:- ایم ڈی (بائیوکیمسٹری)

ایم۔بی۔بی۔ایس مع

ایم ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

پی ایچ۔ڈی (" ")

ڈی۔ایس سی (" ")

ٹیچنگ/ ریسرچ کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر بائیوکیمسٹری پانچ سال کا تدریسی تجربہ

پسندیدہ:- جن مریضوں کا مخصوص قسم کا آپریشن ہوا ہو اُن کا بائیوکیمیکلس کے ذریعے علاج کرنے کا تجربہ۔

۵- لکچرر ان فزیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی

شرح تنخواہ:- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت

۱- لازمی:- ایم۔ڈی (فزیالوجی)

ایم۔بی۔بی۔ایس مع

ایم۔ایس سی (فزیالوجی)

پی۔ایچ ڈی (میڈیکل فزیالوجی)

ڈی۔ایس سی (" ")

پسندیدہ:- تخصص (اسپشلائزیشن) کے میدان میں تحقیق کا مطبوعہ کام۔

۶- لکچرر ان کارڈیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

قابلیت:۱-لازمی - ایم۔ڈی (کارڈیالوجی)

۱۱- پسندیدہ:- تخصص (اسپشلائزیشن) کے میدان میں تحقیق کا مطبوعہ کام۔

۷۔ لیکچرر ان آپتھلمالوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۷۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت:

۱۔ لازمی ایم ایس سی [آپتھلمالوجی]

ایم۔ڈی [" "]

پسندیدہ:۔ تدریس کی طرف خاص رجحان اور ریٹینالوجی، کالا پانی، بھینگاپن سے متعلق تحقیق کا تجربہ

نوٹ:۔ وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۶/ ۸۳-۸۴ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۸۳ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں انھیں دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ۔ وہ لوگ اگر ملازمت کے مجاز ہوں گے تو اُن کی امیدواری پر پچھلی درخواست کی روشنی میں غور کیا جائے گا۔

۸۔ میڈیکل آفیسر [فیمل] [دو جگہیں] [پوسٹ پارٹم پروگرام] ڈپارٹمنٹ آف آبسٹیٹرکس اینڈ گائنا کالوجی۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۹۰۰ - ای بی ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس۔

قابلیت ۱۔ لازمی۔ ایم۔بی۔بی۔ایس کسی مستند یونیورسٹی سے

ایک سالہ ہاؤس جاب کا تجربہ جس میں سے چھ ماہ آبسٹیٹرکس اور گائناکالوجی میں ہونا ضروری ہے

پسندیدہ:۔ فیملی پلاننگ اور ایجوکیشن میتھڈ میں خصوصی ٹریننگ۔

اعلیٰ قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا ان کو ایک طرف کا سکنڈ کلاس ریل کا کرایہ سنگل ادا کیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سلیکشن کمیٹی] رجسٹرار آفس، اے ایم یو علی گڑھ سے پانچ روپے نقد [جو فنانس آفس، اے ایم یو کے کیش سکیشن میں جمع کیے گئے ہوں] ادا کر کے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاک سے منگانے کی صورت میں ۱۰ × 23 سم کا ایسا لفافہ جس پر ڈاک ٹکٹ چسپاں ہو اور خود کا پتہ تحریر ہو بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱ رنومبر ۱۹۸۴ء ہے۔ [آفس ٹائم تک]

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

علی گڑھ سے باہر کی بھیجی جانی والی درخواستیں رجسٹرڈ پوسٹ سے براہ راست ڈاکٹر ایچ۔اے۔ایس جعفری سکریٹری وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام بھیجی جانی چاہیں۔

مناسب امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

[رجسٹرار]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۳/۸۴-۸۵

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

پروفیسرس

تنخواہ کا اسکیل:- ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

۱۔ پروفیسر آف کمپیوٹر سائنس ۔ کمپیوٹر سینٹر۔

۲۔ پروفیسر آف پرشین ۔ ڈپارٹمنٹ آف پرشین

قابلیت

۱۔ لازمی [الف] کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی ڈگری۔

[ب] ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام۔ اور

[ج] کم از کم دس سال کا پوسٹ گریجویٹ کلاسسز کو پڑھانے کا تجربہ اور تحقیق کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

پسندیدہ -پوسٹ نمبر ۱، پروفیسر آف کمپیوٹر سائنس ۔ کمپیوٹر سینٹر کے لیے

تدریس اور تحقیق کا درج ذیل شاخوں میں سے کسی کا تجربہ

تھیوریٹیکل کمپیوٹر سائنس، آپریٹنگ سسٹم، انفارمیشن سسٹمس، کمپیوٹر آرکی ٹیکچر، کمپیوٹر گرافکس اور کمیونیکیشن نیٹ ورکس۔

ریڈرس:-

تنخواہ کا اسکیل: ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

۳۔ ریڈرس ان کمپیوٹر سائنس، کمپیوٹر سینٹر

۴۔ ریڈر ان جنرل ایجوکیشن ۔ جنرل ایجوکیشن سینٹر۔

۵۔ ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز [پولیٹکل سائنس] سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔

۶۔ ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز [جغرافیہ] سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔

۷۔ ریڈر ان اردو [کمپریٹیو لٹریچر] ویمنس کالج۔

قابلیت

۱۔ لازمی ۱-[الف] متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے

مساوی کوئی غیر ملکی استعداد

(ب) ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام اور
پوسٹ گریجویٹ کلاسسز کو پڑھانے کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ اور کچھ تحقیق کی رہنمائی کا تجربہ

پسندیدہ:- پوسٹ نمبر ۳ "ریڈرس ان کمپیوٹر سائنس" کے لیے

درس و تدریس اور تحقیق کی رہنمائی کا مندرجہ ذیل میں سے کسی میں تجربہ
تھیوریٹیکل کمپیوٹر سائنس، آپریٹنگ سسٹم، انفارمیشن سسٹمس، کمپیوٹر آرکیٹکچر، کمپیوٹر گرافکس اور کمیونی کیشن نیٹ ورکس۔

پوسٹ نمبر ۴ "ریڈر ان جنرل ایجوکیشن" کے لیے۔
جنرل ایجوکیشن کورسسز کو پڑھانے کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ

پوسٹ نمبر ۵ "ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز (پولیٹیکل سائنس)"
پولیٹیکل سائنس ٹرینڈز آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں اعلیٰ درجے کی مہارت۔
ویسٹ ایشین زبانوں یا جدید یورپین زبانوں میں کام کرنے کی صلاحیت

پوسٹ نمبر ۶ "ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز (جغرافیہ)" کے لیے۔
موجودہ ویسٹ ایشین جغرافیہ ٹرینڈ میں اعلیٰ درجے کی مہارت
عربی یا کسی دوسری ویسٹ ایشیائی زبان میں کام کرنے کی صلاحیت

نوٹ پوسٹ نمبر ۷ "ریڈر ان اردو" (کمپیریٹیو لٹریچر) وینس کالج۔
وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱۲/۸۴-۸۵ مورخہ ۱۲/۷/۸۴ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں اُن کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں سمجھے گئے تو پہلی درخواست کی روشنی میں ان کو طلب کیا جائے گا

نوٹ:- پوسٹ نمبر ۵ اور ۶ "ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز (پولیٹیکل سائنس) اور ریڈر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز (جغرافیہ)" کے لیے۔
وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۳۷/۸۳-۸۴ بتاریخ ۹ مارچ ۱۹۸۴ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں سمجھے گئے تو پہلی درخواست کی روشنی میں ان کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا۔

لکچررس:

شرح تنخواہ:- ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپیے مع دیگر الاؤنس۔

۸۔ لکچررس اِن کمپوٹر سائنس - کمپوٹر سینٹر۔
۹۔ لکچرر اِن زولوجی (ایکولوجی) ڈپارٹمنٹ آف زولوجی)
۱۰۔ لکچرر اِن ویسٹ ایشین اسٹڈیز (اکونامکس) سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔
۱۱۔ لکچررس اِن سوشیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی
۱۲۔ لکچرر اِن عربک ویمنس کالج۔
۱۳۔ لکچرر اِن سنسکرت ویمنس کالج
۱۴۔ لکچرر اِن پالی ڈپارٹمنٹ آف سنسکرت
۱۵۔ لکچرر اِن بنگالی ڈپارٹمنٹ آف ہندی۔

قابلیت:۔ ا۔ لازمی (الف) ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام اور
(ب) اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس (بی سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹرس ڈگری یا کوئی غیر ملکی ڈگری جو اسی معیار کی ہو۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام' جیسا کہ اس کی تھیسس سے ظاہر ہے' اعلیٰ پایہ کا ہے یا اس کا مطبوعہ کام معیاری درجہ کا ہے تو اس صورت میں وہ قابلیت جو اوپر (ب) میں دی گئی ہے اس میں نرمی برتی جا سکتی ہے۔

مزید یہ کہ اگر کوئی ایسا امیدوار دستیاب نہ ہو جس کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری ہو یا اس کے مساوی تحقیقی کام ہو۔ یا ایسا امیدوار تقرری کے لیے موزوں متصور نہ ہو تو اس صورت میں ایسے شخص کو جس کا تعلیمی ریکارڈ اچھا رہا ہو اور اس کے پاس ایم فل یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اچھا معیاری تحقیقی کام ہونے تو اس کو وزن دیا جائے گا اور اس کا تقرر کیا جا سکتا ہے اس صورت میں کہ وہ ثابت کرے کہ اس نے دو سال تک تحقیقی کام کیا ہے یا اس کو ریسرچ لیباریٹری/آرگنائزیشن میں کام کرنے کا عملی تجربہ ہے۔
ایسے امیدوار کا تقرر اس شرط پر ہوگا کہ وہ اپنے مقرر کیے جانے کی تاریخ سے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اعلیٰ تحقیقی کام یونیورسٹی کو پیش کرے گا۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو آئندہ کسی سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تا وقتیکہ وہ مقررہ شرائط کو پورا نہ کر دے۔

پسندیدہ :۔ پوسٹ نمبر ۸ "لکچرر اِن کمپوٹر سائنس" کے لیے۔
تدریس اور تحقیق کی رہنمائی کا درج ذیل ایریاز میں سے کسی میں تجربہ
تھیوریٹیکل کمپوٹر سائنس، آپریٹنگ سسٹمس، انفارمیشن سسٹمس، کمپوٹر آرکیٹیکچر، کمپوٹر گرافکس اور کمیونیکیشن نیٹ ورکس

پوسٹ نمبر ۹ "لکچرر ان زولوجی (ایکولوجی)
وائلڈ لائف منیجمنٹ/اربن ایکولوجی میں کچھ تجربہ۔

پوسٹ نمبر ۱۰ "لکچرر ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز" (اکونامکس) کے لیے
عربی یا کسی دوسری ویسٹ ایشین زبان میں کام کرنے کی صلاحیت

پوسٹ نمبر ۱۲ "لکچرر ان عربک" کے لیے
۱۔ تدریس اور ریسیرچ کا تجربہ
۲۔ اعلیٰ درجے کا مطبوعہ کام

پوسٹ نمبر ۱۴ "لکچرر ان پالی" کے لیے
۱۔ ہندی اور انگریزی میڈیم سے پڑھانے کا تجربہ
۲۔ سنسکرت زبان اور اس کے لٹریچر کی جانکاری قابل ترجیح

پوسٹ نمبر ۱۵ "لکچرر ان بنگالی" کے لیے۔
ہندی زبان کی جانکاری اور تدریس اور/یا تحقیق کا تجربہ

نوٹ:۔ پوسٹ نمبر ۹ "لکچرر ان زولوجی (ایکولوجی) کے لیے
وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱۲/۸۴-۸۵ بتاریخ ۱۲ جولائی ۸۴ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں تصور کیے گئے تو ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا

موزوں اور اعلیٰ قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے۔
وہ امیدوار جن کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو بطور ٹی اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا ایک طرف کا کرایہ دیا جائے گا
مقررہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نام کیے ہوئے کسی دفتر سے پانچ روپیہ نقد (مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا ۱۰ x ۲۳ سم کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔
درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ نومبر ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا
علی گڑھ سے باہر کے امیدوار اپنی درخواستیں بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک براہ راست بنام ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ ایس جعفری سکریٹری، وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ یوپی کو روانہ کریں۔
نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں
(رجسٹرار)

بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
وغیرہ کی دوا
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

Litho Colour Printers Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone 4185

Rs 1-50

مدیر: سیّد حامد — مدیر مسئول: نور الحسن نقوی

جلد ۳ ★ یکم تا ۱۵۔ نومبر ۸۴ء ★ شمارہ ۲۱

مندرجات

سرورق پر: ٹیپو سلطان
آرٹسٹ: سرفراز احمد

ترسیلِ زر کا پتہ:
پروفیسر منظر عباس نقوی
ٹریزرار — تہذیب الاخلاق ٹرسٹ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

قیمت فی شمارہ: ڈیڑھ روپیہ
زرِ سالانہ: تیس روپے۔
دوامی رکنیت: تین سو روپے۔

سلطان شہید

ٹیپو سلطان کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب! بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دُوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

——— علامہ اقبال

اردو کی تدریس کے مسائل

(یونیورسٹیوں میں)

کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اساتذۂ اردو کا اب عام تجربہ ہے کہ اردو کی تدریس کے سلسلے میں ان کی محنت بار آور نہیں ہوتی۔ امتحانات میں بیشتر طلبہ کی کارکردگی ناقص ہوتی ہے۔ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں یا تو ہمارے طریقِ تدریس میں کوئی خرابی ہے کہ ہماری کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا یا پھر جن طلبا سے ہمارا واسطہ ہے ان کی تعلیمی بنیاد ایسی ناقص ہے کہ اس پر تعلیم کی کوئی قابلِ ذکر عمارت اٹھ ہی نہیں سکتی۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ دونوں وجوہ مل کر اردو کی تعلیم کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔

آزادی کے بعد ملک میں اردو دشمنی کا جو مظاہرہ ہوا اس سے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاید یہاں یہ زبان زندہ نہ رہ سکے گی۔ لیکن یہ گرد دبی اور اردو سے مخالفت میں کمی آئی تو ایک اور تکلیف دہ حقیقت سے دوچار ہونا پڑا وہ یہ کہ ہماری زبان کو اصل خطرہ خود اپنوں سے ہے۔ کسی ریاست میں کم کہیں زیادہ لیکن سارے ملک میں خوش حال گھرانے اپنے بچوں کو اردو زبان کی تعلیم دلانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور اردو ذریعۂ تعلیم کے بارے میں تو یہ اندیشہ عام ہے کہ یہ آئندہ نسل کو برباد کرنے کی باتیں ہیں۔ یہ سوال بار بار دہرایا جاتا ہے کہ اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والوں کی ملک کے کس گوشے میں کھپت ہو سکے گی۔ نتیجہ یہ کہ ابتدائی تعلیم کی سطح پر اردو ملک کے ایک بڑے حصے سے خارج ہو گئی۔ ثانوی سطح پر بھی یہی صورتِ حال ہے۔ لیکن بعض جگہ داخلے کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کچھ ایسے طلبا بھی اردو لے لیتے ہیں جنھوں نے پہلے اردو نہیں پڑھی یا اس پر عبور نہیں رکھتے۔ اس بات سے تو سب کو اتفاق ہوگا کہ جو زبان ذریعۂ تعلیم ہوتی ہے اس پر آخرکار طالب علم کی زیادہ گرفت ہو جاتی ہے کیوں کہ ہر مضمون کے ساتھ اس زبان کی تعلیم آپ سے آپ ہوتی رہتی ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم نہ رہی تو اس فائدے سے وہ خود بخود محروم ہو گئی۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اردو لینے والوں کی بڑی تعداد وہ ہوتی ہے جنھوں نے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ کہیں کہیں ایسے طلبا بھی ہوتے ہیں جنھوں نے اردو کم پڑھی ہے یا نہیں پڑھی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اردو شعبوں کو باقی رکھنے کے لیے مختلف تدبیروں سے طلبا کو اس طرف مائل کیا جاتا تھا۔ کیا عجب بعض جگہ اب بھی یہی صورت ہو۔ بہر حال کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں بڑی تعداد ان طلبا کی آتی ہے جنھوں نے دوسرے مضامین میں داخلے سے مایوس ہو کر ادھر رخ کیا ہے اور جو درست املا لکھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ ان کی کارگزاری تسلی بخش کیسے ہو سکتی ہے۔

بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحان کی کاپیاں جانچتے وقت صحیح صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ کبھی کبھی تو بیسیوں کاپیوں میں ایک بھی ایسی نہیں ملتی جو املا اور زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک ہو۔ مواد و معلومات کے اعتبار سے بھی طلبا کا معیار بہت پست نظر آتا ہے۔ جو طالب علم زبان پر قدرت نہیں رکھتا اس سے وسیع مطالعے کی توقع بھی کیسے کی جا سکتی ہے۔

افسوس کہ یہ مرض لاعلاج معلوم ہوتا ہے یوں کہ نہ تو داخلوں پر ہمارا اختیار ہے اور اگر ہو بھی تو مصلحت ہمیں رعایتوں پر مجبور کرتی ہے اور نہ پرائمری یا سیکنڈری ایجوکیشن کی اصلاح ہمارے دائرۂ اختیار میں آتی ہے۔ ہم تو صرف اس پر غور کر سکتے ہیں کہ جو طلبا ہمارے حصے میں آتے ہیں، انھیں ہم کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں۔

اردو کا معاملہ دوسری زبانوں اور دوسرے مضمونوں سے مختلف ہے، ہماری دشواریاں اور سب سے علیحدہ ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے طور پر بلکہ فنِ تعلیم کے مسلمہ ضابطوں سے کہیں کہیں انحراف کرکے اردو زبان و ادب کی تدریس کا ایک جامع منصوبہ بنانا ہوگا۔ اساتذۂ اردو سر جوڑ کے بیٹھیں تو کوئی ایسا طریق کار طے کیا جا سکتا ہے جس سے اس دشواری پر قابو پایا جا سکے۔

پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پرانا طریقِ تدریس یعنی صرف لکچر دے دینا کافی ہے یا نہیں۔ اگر صرف لکچر کافی ہے تو بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ وہ ذہین طالب علم جس نے ابھی ایم۔اے کیا ہے اور جس کے پاس ضروری معلومات کا ذخیرہ موجود ہے وہ کلاس میں جائے اور اپنے لکچر کے ذریعے سارا مواد طلبا کے سامنے رکھ دے خواہ پیش کش کا انداز کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اس سطح کے طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ لکچر سے بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں اور ایسے نوٹس تیار کر سکتے ہیں جنھیں آئندہ انفرادی مطالعے سے مکمل کیا جا سکے۔ لیکن اردو کے مخصوص حالات اور اردو پڑھنے والے طلبا کے موجودہ معیار کے پیش نظر اگر لکچر کا طریقہ ناکافی ہے تو ہمیں تدریس کی ان تدابیر یعنی ان techniques سے کام لینا پڑے گا جو اب تک اسکولوں کے لیے مخصوص رہی ہیں جن کا استعمال تعلیم کی اعلیٰ سطح پر ناپسندیدہ رہا ہے اور جن کے استعمال کرنے کے لیے باقاعدہ تربیت یعنی ٹریننگ حاصل کرنی ضروری ہے یہ تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ طلبا کی عمروں کا لحاظ کر کے طریقِ تعلیم میں فرق کیا جانا چاہیے لیکن یہ خیال محل نظر ہے کہ اعلیٰ سطح پر تدریس کے فن سے واقفیت سرے سے غیر ضروری ہے اور یہ فن صرف تربیت یعنی ٹریننگ ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ایک عرصے سے تدریس میں مشغول ہیں انھیں تو تجربے نے سب کچھ سکھا دیا ہوگا لیکن نوجوان اساتذہ کے لیے کوئی نہ کوئی تربیتی نصاب خواہ قلیل مدتی ہی کیوں نہ ہو، بہرحال ضروری ہے اردو اساتذہ کو بلا تاخیر اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔

عام خیال یہ ہے کہ تحریری کام کی اصل جگہ اسکول ہے اور تعلیم کی اعلیٰ سطح پر یہ تضییع اوقات ہے۔ ماہرین تعلیم یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ ہائی اسکول تک بچے کو لکھنے کی خوب مشق کرا دینی چاہیے لیکن آئندہ کے لیے اسے غیر ضروری کوئی نہیں بتاتا۔ اردو کا معاملہ یوں بھی مختلف ہے۔ اردو رسمِ خط دشوار ہے اور جب تک ادب لکھنے کی لگاتار مشق نہ کی جائے اس پر قدرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ افسوس ہے کہ یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ تحریری مشق کرانے اور اسے جانچنے کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ طالب علم بی۔اے یا ایم۔اے میں داخلہ لینے سے پہلے جو غلطیاں کرتا تھا، سند حاصل کرنے کے بعد بھی وہی غلطیاں کرتا رہتا ہے جس سے اردو کے شعبوں کی بہت رسوائی ہوتی ہے۔

دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں لفظوں کی جس طرح درجہ بندی ہوئی ہے اس سے اردو ابھی تک محروم ہے۔ میری مراد اس تعین سے ہے کہ کس عمر کا بچہ کون کون سے الفاظ استعمال کرتا ہے اور کون کون سے صرف سمجھ لیتا ہے۔ امید ہے کہ مستقبل قریب میں ہم یہ کام انجام دے سکیں لیکن ذرا سی محنت سے ان الفاظ کی فہرست بہ آسانی تیار ہو سکتی ہے جن کے املا میں طلبا عموماً غلطی کرتے ہیں۔ یہ فہرست اردو کے ہر استاد کے پاس ہونی چاہیے تاکہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر طلبا کو یہ الفاظ سکھا دیے جائیں ممکن ہے یہ کام ہمیں اپنے مرتبے سے فروتر معلوم ہو مگر اس کے بغیر چارہ نہیں۔

معروضی امتحان objective type test کا ان دنوں بہت چرچا ہے اور اس کی افادیت بھی مسلّم ہے۔ نصاب کے ایک مختصر حصے کو از بر کر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کی جو وبا عام ہو گئی تھی اس سے نجات اسی طرز امتحان کی بدولت ملی ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ طلبا کو پورا نصاب پڑھنے پر مجبور کیا جا سکے۔ اگر مختلف یونیورسٹیاں ایک ایک صنف سے متعلق سوالات تیار کرنے کی ذمہ داری لے لیں تو اردو ادب سے متعلق سوالات کا ایک مکمل ذخیرہ تیار ہو سکتا ہے اور طلبا میں جو معلومات کی کمی ہے اسے دور کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس راستے کے خطروں سے آگہی بھی ضروری ہے۔ زبان اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے اور اس پر قدرت حاصل کرنے کے لیے مختصر اور طویل جواب دینے کی مشق ضروری ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اردو زبان کا رسم خط مشکل ہے اس لیے بے سوچے سمجھے معروضی امتحان کو اپنا لینا مضر ہو سکتا ہے۔ سوالناموں میں صرف ۲۵ فی صد سوال معروضی ہو سکتے ہیں۔ نمبروں میں سے بچھتر نمبر مختصر اور طویل جوابات کے لیے مخصوص ہونے چاہییں۔

ایک بات اور — اردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم چونکہ تسلی بخش نہیں ہے اس لیے مبادیات کے اعادے کی گنجائش ہمارے نصاب میں ضرور رہنی چاہیے یعنی وہ ضروری چیزیں جو طالب علم کو کالج اور یونیورسٹی میں قدم رکھنے سے پہلے جان لینی چاہییں انھیں دہرانے کی گنجائش ہمیں اپنے پروگرام میں ضرور رکھنی چاہیے کیونکہ اندیشہ ہے کہ طالب علم ان سے ناواقف ہوگا یا اُن کا واضح تصور نہ رکھتا ہوگا یہ تجویزیں مناسب اور قابلِ عمل ہوں تو اساتذۂ اردو کو ادھر توجہ کرنی چاہیے۔

نورالحسن نقوی

اُداس چہرے

"چہروں پر اُداسی کس نے نہیں دیکھی۔ زندگی اکثر بے رحمی کو برباد کرتی ہے۔ سیل و نہار کا ظلم سہتے سہتے، بوڑھے ہوتے ہوتے بہت سے لوگ اداس، بے کیف اور بے ذوق رہ جاتے ہیں، ایک بوسیدہ عمارت کے کھنڈر کی طرح۔ زمانے نے انھیں ستایا ہے اور سالوں سے شادابی کے آخری قطروں کو چوس لیا ہے۔ جوانوں کے چہروں پر بھی کبھی کبھی اداسی کی لکیریں نظر آتی ہیں۔ البتہ اس وقت ہوتا ہے جب ان کے شانوں پر زیادہ بوجھ پڑ جائے، ہوتے سے ... یا مصیبتیں اور فکریں یا ناکامیاں ہر طرف سے آکر گھیر لیں یا محبت محرومی میں بدل جائے۔"

"جویا" سے نہ رہا گیا۔ بات کاٹتے ہوئے بولا "بھائی خوشہ چیں اس طویل تقریر سے تمھارا مقصد کیا ہے۔ ہر عمر کا موسم کی طرح ایک جامعہ ہوتا ہے۔ بچپن کی صفت معصومیت، سادگی، بے فکری، شادابی اور شگفتگی ہے، لڑکپن میں معصومیت، سادگی اور بے فکری کملانے لگتی ہیں لیکن شادابی اور شگفتگی اور نکھر آتی ہیں اور اعتماد و توانائی اس پر مستزاد۔

جوانی میں فکریں اپنا سایہ ڈالنے لگتی ہیں، اور معصومیت اور سادگی پر تجربہ تیر برسانا شروع کرتا ہے لیکن اس کی تلافی ذوقِ زندگی کی طغیانی، جوش، سرمستی، پرامیدی اور فرطِ اعتماد سے ہو جاتی ہے۔

بڑھاپا آتا ہے تو پہلے معصومیت اور سادگی کو گھر سے نکال دیتا ہے، جوش، سرمستی، فرطِ اعتماد کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ ذوقِ زندگی کی جگہ شک اور اندیشہ لے لیتا ہے۔ لیکن کون ہے جو یہ نہیں جانتا، بھائی خوشہ چیں تمھیں تو یہ زعم تھا کہ:

جب سنائی نئی سنائی بات

ایک جانی بوجھی بات کو فلسفیانے کیوں بیٹھ گئے"

خوشہ چیں نے کسی قدر ترشی کے ساتھ کہا "میاں جویا، مانا کہ تم میدانِ جستجو کے مرد ہو اور تحصیلِ اطلاعات میں فرد ہو لیکن ایسی بھی کیا بے تابی کہ بات پوری سنی بھی نہیں اور تبصرہ آرائی شروع کر دی"

"نادم ہوں بھائی، تم اپنی بات پوری کرو، ضرور تمھیں کوئی دکھ پہنچا ہے۔ خود تمھارے چہرے پر اداسی کے آثار نظر آ رہے ہیں"

"تو سنو" خوشہ چیں نے سلسلۂ سخن جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کسی بچے کے چہرے پر اداسی کس نے نہ دیکھی ہوگی۔ تکلیف یا اضطراب کی لہریں نظر آ بھی جائیں، یاس اور اداسی بچوں کے پھول جیسے چہروں کو جچتی نہیں ہے۔ لیکن میں نے کل شام ہی محلہ صابن گراں میں ایک بچے کو دیکھا جس کے چہرے پر اداسی کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اداسی جس کے سبب آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ان میں امید کی ہلکی سی رمق باقی نہ رہی تھی جسم بکھرا گیا تھا۔ یہ چہرہ چھ سال کے جسم پر ٹکا ہوا تھا لیکن زمانے کے ہاتھوں ستائے ہوئے کسی پیرِ نود سالہ کا چہرہ بھی اتنا بے آب، بے رونق اور مایوس اور بے حس نہ ہوگا۔ گویا اس گلِ نادمیدہ کو صبا کی نازک انگلیوں کا مسکراہٹیں لانے والا لمس کبھی نصیب نہ ہوگا۔ اس نے سنِ شعور کو پہنچنے سے پہلے زندگی کی محرومیاں اور ناانصافیاں دیکھ لیں اور وہ مجسمے کی طرح منجمد ہو کر رہ گیا۔

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، ڈھونڈو تو رگوں میں خون کی بوندیں، چہرے پر تابانی کی شعاعیں، لبوں پر مسکراہٹیں دور دور نہ ملیں گی۔ اس غریب بچے کے چہرے پر دل کو چھیدنے والی خشکی اور پژمردگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ نہ خوشی نہ امید نہ خواب، نہ حیرت، نہ ولولہ، نہ امنگ، یہ چہرہ ایک لق و دق بیاباں کی طرح ہے جہاں آب و گیاہ کا گزر نہیں۔ قدرت سب کے لیے حسبِ تقدیر انتظامات کر دیتی ہے۔ غموں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے [illegible] نے خدا سے کئی دل مانگے تھے۔ یہاں اسی کام کے لیے اس بچے کو بے حسی، بے تعلقی

روشنی

پرانے لباس میں دسیوں پیوند لگے ہوئے تھے اور کندھے پر لاٹھی رکھی تھی جس سے ایک پوٹلی لٹکی ہوئی تھی۔ اکہرے بدن کا یہ سادہ، غریب اور سنجیدہ عرب مسجد نبوی میں داخل ہوا اور بہ آواز بلند سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گیا۔ سامنے بیٹھے ہوئے بارعب شخص نے اپنا کام مکمل کیا، حساب کے رجسٹر ایک طرف رکھے اور نو وارد سے مخاطب ہوا۔

خط ملتے ہی چل پڑے تھے؟

جی ہاں۔

پھر اتنی دیر کہاں ہوئی؟

پیدل آیا ہوں۔

تمھارے پاس کوئی سواری نہیں؟

جی نہیں

تمھارا سامان کہاں ہے؟

سب اس پوٹلی میں ہے

سوال کرنے والے امیر المومنین حضرت عمرؓ تھے اور جواب دینے والے حمص کے گورنر حضرت سعید بن عامر۔ امیر المومنین کو اطلاع ملی تھی کہ حضرت سعید عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے لگے ہیں اور اسی لیے انھیں طلب کیا گیا تھا۔ حکم ملا تو انھوں نے ایک جوڑی پھٹے ہوئے کپڑے، پانی پینے کا پیالہ، خود رے سے سوکھے ٹکڑے پوٹلی میں لپیٹے اور فوراً چل کھڑے ہوئے۔ حضرت سعید کا سارا اثاثہ بس یہی پوٹلی تھی۔

بے امیدی کی ڈھال دے دی گئی۔

"اللہ رحم کرے!" جویا نے جو ہمہ تن گوش ہوکر اداسی کی یہ داستان سن رہے تھے، آبدیدہ ہوکر کہا۔ "ننھی سی جان، اس پر یہ بپتا کہ بچپن کی کوئی بات اس میں باقی ہی نہیں رہی!"

خوشہ چیں بولے" اس بچے کو تم دیکھ لیتے تو غالب کا یہ شعر سمجھ میں آ جاتا۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

شاعر مشکلوں کے اس ہجوم کا ذکر کر رہا ہے جو انسان کو صبر کا سبق سکھا دیتا ہے۔ یہ سانحہ صبر اور برداشت کی حدود سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اس کو نہ برداشت کرنا پڑتی ہے نہ اسے خوشی اور غم کا شعور ہی نہیں رہا۔ غالب نے کہا تھا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

شاعر کے یہاں ایک قسم کی امید تھی جس نے ناامیدی کی کوکھ سے جنم لیا۔ لیکن یہ بچہ جس نے امید کا چہرہ آج تک نہیں دیکھا، جسے خوشی اور آرام کا ایک لمحہ کبھی میسر نہیں ہوا، اس کے یہاں امید اور ناامیدی کا وہ مد و جزر ہے ہی نہیں جو انسانی زندگی کا تانا بانا ہے۔"

"آخر اس بے غمی، بے حسی، بے کیفی بے تعلقی اور اداسی کا سبب کیا تھی جو ہر مصیبت اور غم سے بدتر ہے؟" جویا نے پوچھا۔

"وجہ پوچھنا چاہتے ہو؟ سچائی کی تاب لا سکو گے؟ مجھے اپنی طمانیت اور طاقت برداشت پر بڑا زعم تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ اس مرجھائے ہوئے بچے، اس پیر خورد سال، اس سنگ ملامت کا چہرہ اتھاہ مایوسی اور اداسی کے ساتھ، آنکھوں کے سامنے ہے۔ مرتے دم تک میں اس چہرہ کو نہیں بھولوں گا۔ وہ چہرہ سنگ ملامت ہے دلوں کے آئینہ کے لیے۔ لیکن پہلوؤں میں اب دل کہاں، پتھر ہیں۔ دل ہوتے تو ایسے چہروں کو دیکھ کر شق ہو جاتے۔ کسی نے کہا تھا۔

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

یہ شعر طفل کی موت پر پڑھتے ہیں۔ لیکن یہاں سامنا طفلی کی موت سے تھا۔ بچپن کی موت، امید کی موت، شگفتگی کی موت، زندگی کی موت، معصومیت کی موت۔ یہ کلی کھلنے نہ پائی تھی کہ مرجھا گئی۔ کاش کسی نے اسے توڑ کے پھینک دیا ہوتا تو بہتر تھا۔ اسے ٹہنی سے لگا چھوڑ دیا مرجھانے اور کملانے کے لیے۔

جویا نے پھر جستجو کی۔ "بتاؤ تو بھائی کون بچہ تھا۔ اس پر کیا گزری تھی!"

بھائی جویا" خوشہ چیں نے جواب دیا۔ وہ بچہ ان ہزاروں بچوں میں سے ایک تھا جو گہوارہ سے پاؤں نکالتے ہی قینچی بنانے میں لگا دیے جاتے ہیں۔ والدین پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ان بچوں کو مقراض سازی کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں۔ چھوٹا سا گھر ہے، گھر کیا ہے، کوٹھری، اس میں قینچی بنانے کا کارخانہ لگا ہوا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ بچے کارخانے میں لگ جاتے ہیں۔ وہ نہ کھیلتے ہیں نہ پڑھتے ہیں، نہ ہنستے ہیں، نہ بولتے ہیں۔ صبح سے شام تک قینچی بناتے ہیں۔ یہ قینچی شادمانی، بے فکری، ذوق شوق کی قبا کو چاک کر دیتی ہے۔ ایک تاریک بے ہوا کوٹھری میں قینچیاں بناتے ان کی زندگی گزر جاتی ہے۔ جہاں ان کے دل کی طرح روشنی اور ہونٹوں کی طرح مسکراہٹ اور چھیپھڑوں کی طرح تازہ ہوا کا گزر نہیں"

ان کا بچپن بیوہ کی جوانی اور مفلس کے شباب سے کہیں بدتر ہے۔ دبا ہوا، گھٹا ہوا۔ جوان ہوتے ہیں تو خود ساختہ سان چلاتے ہیں یعنی پرسان رکھتے ہیں۔ چنگاریاں نکلتی ہیں جو آنکھوں کو اندھیا دیتی ہیں اور ریت اور لوہے اور پیتل کے ذرات ہوا کو بوجھل اور کثیف بنا دیتے ہیں۔ یہ رات دن اس میں سانس لیتے ہیں۔ پھیپھڑے کٹ جاتے ہیں دق ہو جاتی ہے۔ سخت جان ہیں۔ تیس سال کی منزل کو پار کر لیتے ہیں۔ چالیس تک پہونچتے پہونچتے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ چالیس سال کی عمر میں خوش حال انسان اپنے عنفوان پر ہوتا ہے۔

جو یا میاں بچے کے چہرے کی شبیہ جیسی بن آئی تمھارے سامنے رکھ دی۔ اب ایک دوسرے چہرے کو دیکھو۔ یہ تیس سال کا جوان ہے جو دیکھنے میں ساٹھ سال کا لگتا ہے۔ دق زدہ، زبوں حال۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھا ہے۔ موت آئے تو پاپ کٹے۔ بے رحم اور بے لطف اور پُرکرب زندگی سے چھٹکارا ملے۔

شیخ سعدی نے چہل سالہ جوان کی طفلانہ افتادِ طبع پر ماتم کیا تھا۔ یہاں جو سماں دیکھنے میں آیا اس کے برعکس تھا۔ یہاں بچے بوڑھوں سے بدتر، جوان کمزور اور بیمار، اور بوڑھے بے حال بے سُدھ، در گور"

جویا" بھائی خوشہ چیں تم نے دنیا کی سیاحت کی اور جہاں گئے وہاں کی جھلکیاں ہمیں بھی دکھائیں۔ کبھی مصر کا بازار ہے جاکر دکھایا، کبھی کسی شبستان میں جھانکا، کبھی کسی چمن کی سیر کی۔ تم جہاں گئے باغ کے خوشے یا گلستاں کے پھول چن کر لائے۔ اس بار کیسی بستی میں گئے کہ اندھیرا، گھٹن، ریت اور دھاتوں کے ذرّے لے کر آئے"

میں تو اس جگہ پر جو گھر بھی تھا اور کوٹھری اور کارخانہ بھی ایک منٹ بھی نہ ٹھیر سکا۔ دیدہ سوز چنگاریاں اور سینہ دوز ذرات۔

روشنی

دیس کو آزاد ہوئے ابھی چند مہینے بھی نہ گزرے تھے۔ ہر طرف آگ اور خون کا ہنگامہ گرم تھا۔ تارکینِ وطن کے ان گنت قافلے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر رواں تھے۔ ریل گاڑیوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ ایسے میں درجوں کی تفریق بھی مٹ گئی تھی جس کو جس درجہ میں جگہ ملی گھس گیا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں ایک لُٹی پٹی بے سہارا بڑھیا بھی چھوٹی سی گٹھری اٹھائے گھس آئی۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو ٹکٹ چیکر ہاتھ میں کاپی لیے ہوئے ڈبے میں داخل ہوا ممتاز احمد صاحب اپنی آپ بیتی 'کاروانِ حیات' میں لکھتے ہیں کہ ٹکٹ چیکر اس بڑھیا کی طرف بڑھا تو مجھے خیال آیا کہ اس کے پاس تو کسی درجے کا بھی ٹکٹ نہ ہوگا۔ ذرا دیکھوں تو یہ کیا کرتا ہے۔ واقعی اس کے پاس تو ٹکٹ تھا ہی نہیں اور گٹھری سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس میں پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ چیکر نے بڑھیا کی بات سنی، اسے کرایے اور جرمانے کا حساب بنایا اور رسید کاٹنے لگا۔ بڑھیا روتی اور فریاد کرتی رہی کہ بیٹا رحم کر۔ یہ کیا کرتا ہے میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ مگر اس نے جیب جاب رسید کاٹی اور بڑھیا کے حوالے کرتا ہوا بولا "ماں، تم سچ کہتی ہو، تمھارے پاس کیا رکھا ہے، مگر بنا ٹکٹ سفر کرنا جرم ہے اور اس سے ملک کی بیماریں کھوکھلی ہوتی ہیں۔ اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ تمھارا کرایہ اور جرمانہ میں ادا کر دوں گا" میں خود برسوں تک ریلوے میں افسر رہا تھا اور طرح طرح کے مقدمے سن چکا تھا مگر اس دن حب وطن، فرض شناسی اور انسان دوستی کا ایسا منظر دیکھا جو ساری زندگی یاد رہے گا۔ میں نہیں جانتا وہ چیکر کون تھا اور آج کہاں ہے مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ تھا بہت بڑا آدمی!

★ ★

"محبت اپنی گہرائی سے بے خبر رہتی ہے تا آنکہ
فراق کی ساعت آجائے۔
یاد رکھو کہ محبت تمہارے سر پر تاج رکھتی ہے
تو ساتھ ہی تمہیں سولی پر بھی چڑھا دیتی ہے"

قاضی عبدالغفار نے اس کہا

* · * · * · * · * · *

[ـ]ہیں جلنے لگیں، کلیجہ پھٹنے لگا۔ اور وہ غریب اسی فضا میں آنکھیں
[ک]ھولتے ہیں اور بالآخر موند لیتے ہیں۔ لیکن "جویا" میری بات سن کر اس
[بس]تی سے بدگمان نہ ہو جانا اس سے بدتر آبادیاں بھی ہیں جہاں اسی طرح
[ان]سانوں کی زندگی جانوروں سے بدتر ہے"۔

"وہ کون سی جگہ ہے آخر؟"

مراد آباد کو بھول گئے جہاں پیتل کے خوشنما ظروف بنائے
[ج]اتے ہیں۔ وہاں تو کارخانہ داروں کے گھر گھر میں بھٹیاں ہیں جو آگ اور
[ہ]وا اور گرد اور دھواں اگلتی رہتی ہیں۔ سانسوں کے ساتھ دھول اور
[د]ھواں اور دھات کے ذرات پھیپھڑوں میں جاتے ہیں۔ چنانچہ مغربی
[یو]پی کے اس شہر میں جس کی آب و ہوا یوں تو بہت اچھی ہے، تپ
[د]ق کا بول بالا ہے۔ ہندوستان میں کانپور کے بعد دق کے روگی
[ی]ہاں سب سے زیادہ ہیں۔ یہاں بھی بچے تعلیم سے محروم ہیں اور جہالت
[م]یں اسیر اور محنت پر مجبور۔

علی گڑھ میں جو لوگ تالے بناتے ہیں اور عمارتی سامان۔ ان
کی حالت بھی اسی طرح زبوں ہے۔ وہاں بھی والدین غریبی سے
مجبور ہو کر اپنے بچوں کی زندگیاں اسی طرح برباد کرتے ہیں جس طرح
میرٹھ اور مراد آباد میں۔ ان تینوں شہروں میں سرمایہ داروں
نے مزدوروں کے پیروں میں قرض کی زنجیر ڈال رکھی ہے اور ان
کے کندھوں پر اپنے دئے ہوئے کچے مال کا بوجھ۔ وہاں بھی دستِ
دولت آفریں کو مزدوری خیرات کی طرح دی جاتی ہے اور خیرات بھی
بخیلوں کی سی خیرات۔ کچے مال سے لے کر ہنر کی اجرت پانے تک
سارے مراحل میں کاریگر کارخانہ داروں کے دست نگر رہتے ہیں۔
مہینے میں کے روز کام اور اس کی اجرت کیا ملتی ہے اس کا انحصار
سرمایہ دار کے رحم و کرم پر ہے، پر رحم و کرم کا پونجی پتی کے دل میں
گزر کہاں۔

جویا سے نہیں رہا گیا۔ حیرت سے کہنے لگا کہ یہ کاریگر تو بیشتر
مسلمان ہیں۔ تو مسلمانوں کے رہنما اور دانشور ان غریبوں کی
رہبری کیوں نہیں کرتے۔ ان کو ان کے حال پر کیوں چھوڑ رکھا ہے۔

"میاں جویا تم بڑے سادہ لوح ہو۔ آج کا مسلمان
ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ
کی تمثیل و تعبیر ہے۔ چونکہ مسلمان پسماندہ ہیں اس لیے ان میں
گنتی کے جو لوگ پڑھے لکھے، خوشحال اور صاحبِ اقتدار ہیں خ[واہ]
وہ تاجر ہوں یا صنعت کار، سرکاری ملازم ہوں، عالم یا مولوی یا
سیاست داں وہ اس مشغلہ میں لگے ہیں کہ عام مسلمانوں کی
پسماندگی اور افلاس کا فائدہ اٹھائیں، ان کا گھر جلے تو ہاتھ سینکی[ں]
کسی قوم کے زوال کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کے افراد ا[پنے]
اغراض کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دینے لگیں۔ ہمارے یہاں خود غر[ضی]
کا بازار گرم ہے۔ ایسے میں ان غریبوں کو کیا ملے گا۔ ہمارے رہنما
دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں لیکن آج تک انھیں توفیق نہیں
ہوئی کہ معاشرہ کی اصلاح کا کام شروع کریں۔ سماج کی خدمت
کریں۔ مایوسوں کو آس دلائیں۔ ان کے طریق کار کو بہتر بنائیں۔ ان[ھیں]
کچا مال اور مشینیں فراہم کریں۔ ان کے بنائے ہوئے مال کے بکنے کا
انتظام کریں۔ ان کو تعلیم کی اہمیت کا احساس دلائیں، ان کے بچوں
کو زہر آلود اور حیات سوز ماحول سے نکال کر کھلی ہوا میں سانس
لینے کا موقع دیں۔ اداس چہروں پر امید کی لہریں دوڑا دیں۔
بچوں کی صحت اور تعلیم کا بندوبست کریں۔ کہ فرد کی شخصیت
انھی سے بنتی، بڑھتی اور زور پکڑتی ہے۔ یہاں ڈھنگ یہ رہا ہے کہ
بچپن میں ان کے ساتھ غفلت برتو اور جوان ہو جائیں تو انھیں
جذبات کی بھٹی میں جھونک دو۔ جہالت اور جذبات کا جوڑ خطرناک
ہوتا ہے اتنا ہی خطرناک جتنا بیکاری اور زر کا ساتھ۔ ہمارا طریق یہ رہا ہے
کہ اس رشتہ کو ٹوٹنے نہ دیں۔ یہ ٹوٹ گیا تو ہماری بات کون سنے گا۔
ہمارے بھڑکانے پر مشتعل کون ہوگا۔

"کہیں رکو گے بھی، ایسا بھی کیا طیش کہ اداسی سے اشتعال
تک کی طویل مسافت ایک سانس میں طے کر گئے"۔

جویا نے احتجاج کیا۔

خوشہ چیں نے کہا "اداس چہروں کا علاج اداسی سے کبھی
ہوا ہے؟"

★★

نفیس بانو

سلطان شہید

ہندوستان میں شاہی سطوت وعظمت کی کشتی ڈانوا ڈول ہو رہی تھی۔ مغربی اقوام ہندوستان کو للچائی نظروں سے دیکھ ہی نہیں رہی تھیں بلکہ طرح طرح کی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھیں۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں مغربی تسلّط بڑھنے لگا۔ مغربی اقوام کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کے لیے نواب حیدر علی سینہ سپر ہو کر ان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے نبرد آزما رہا۔ وہ کسی قیمت پر نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان پر مغربی اقوام برسرِ اقتدار ہوں۔ نواب حیدر علی تادمِ مرگ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے ہی خواب دیکھتا رہا۔ حیدر علی کے اس خواب کی تعبیر ڈھونڈنے کے لیے اس کا بہادر اور شیر دل بیٹا ٹیپو زندگی بھر انگریزوں سے برسرِ پیکار رہا۔

ٹیپو سلطان نے آنکھیں کھولتے ہی بہادر باپ کی بے نیام تلوار دیکھی۔ وہ تلوار کے سایہ میں پل کر جوان ہوا اور تلوار کے ہی سایہ میں جانِ عزیز جانِ آفریں کے سپرد کی۔ اس کے رگ و پے میں ملک و قوم کی حمیت کا خون دوڑ رہا تھا۔ وہ کمسنی سے ہی دلیر اور ہوشیار تھا۔ حیدر علی بذاتِ خود تعلیم سے بے بہرہ تھا لیکن اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی۔ وہ اپنے بیٹے سے اکثر کہا کرتا تھا کہ یاد رکھو تلوار سے زیادہ علم کی ضرورت ہے۔

حیدر علی اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ اس کی پہلی بیوی علیل رہتی تھی۔ اس نے حیدر علی سے دوسری شادی کر لینے پر اصرار کیا۔ حیدر علی نے بادلِ ناخواستہ حصولِ اولاد کی آرزو میں دوسری شادی کی۔ لیکن شومیٔ تقدیر سے دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی۔ حیدر علی کو درویشوں اور بزرگوں سے بے حد عقیدت تھی۔ اسی حدِ عقیدت میں وہ حضرت ٹیپو مستان کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ حضرت ٹیپو مستان کی دعا دربارِ ایزدی میں باریاب ہوئی اور حیدر علی کی مراد بر آئی۔

حیدر علی نے اپنے بیٹے کا نام حضرت ٹیپو مستانؒ کے نام پر ٹیپو سلطان رکھا۔ کنیت ابو الفتح قرار پائی۔ ٹیپو کے سنہ پیدائش کے سلسلے میں مورخین کی رائے میں اختلاف ہے۔ مسلم ضیائی نے ابجد کے قاعدے سے ٹیپو کا سنہ پیدائش سنہ ۱۱۶۲ھ لکھا ہے۔ کچھ نے سنہ ۱۷۵۰ء کسی نے سنہ ۱۷۵۱ء کسی نے سنہ ۱۷۵۲ء اور لورنگ نے سنہ ۱۷۵۳ء مطابق سنہ ۱۱۶۶ھ لکھا ہے۔

ٹیپو سلطان کے دادا مہاراجہ میسور کی فوجی ملازمت سے منسلک ہو کر مع اہل و عیال ریاست میں ہی قیام پذیر ہو گئے تھے۔ ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی نے ایک معمولی مگر بہادر سپاہی کی حیثیت سے شہرت پائی اور اپنی خداداد ذہانت و قابلیت اور اپنی محنت سے سپہ سالار بن کر ابھرے۔ خوش قسمتی سے انھیں ایسا اقتدار حاصل ہوا کہ خود راجہ میسور ان کے زیرِ اثر آ گیا۔ میسور میں رفتہ رفتہ ان کے اقتدار میں اضافہ ہونے لگا اور وہ خوبیٔ قسمت سے میسور کی ریاست کے حکمراں بن گئے۔ مولانا محمد علی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "سلطان حیدر علی کی پوزیشن فی زمانہ مسولینی کی پوزیشن سے ملتی جلتی تھی اور اس نے ریاستِ میسور کے لیے وہی کام کیا جو مسولینی نے موجودہ اطالیہ کے لیے کیا ہے یعنی اسے ایک مردہ اور منتشر ریاست سے ایک منظم، زندہ اور مضبوط سلطنت بنا دیا۔"
>
> (ٹیپو سلطان - مرتبہ عبد الله بٹ صفحہ ۵۹، ۶۰)

سلطان ٹیپو حیدر علی کے زمانۂ عروج میں پیدا ہوا۔ حیدر علی کی سلطنت ہندوستان کے نواحِ جنوب میں ایک طاقت ور سلطنت تھی۔ اوائل عمری ہی سے اس نے میدانِ کارزار میں اپنے باپ کے شانہ بہ شانہ کئی جنگیں لڑیں۔ اور کئی مہمات سر کیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۶ سال کی عمر سے ہی وہ میدانِ جنگ میں اپنے باپ کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔

ٹیپو سلطان اپنے حلیہ سے ہی میدانِ جنگ کا دلاور سپاہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا۔ جسم دبلا مگر فولاد کی مانند مضبوط و توانا۔ چہرے پر گوشت کی تہیں۔ آنکھ سیاہ و روشن، ناک آگے کو جھکی ہوئی خم دار۔ چہرے کے خدوخال سے شاہی رعب و دبدبہ ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے سراپا سے سطوتِ شاہی اور شکوہِ سلطانی کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ سپاہیانہ آن بان کا مجسمہ تھا۔ لباس نہایت سادہ اور شرعی پہنتا تھا۔ دستار پر سفید رومال اور کمر کی پیٹی میں ایک پیش قبض اور تلوار ہوتی تھی جس سے شاہانہ وقار ترادش کرتا تھا۔ ٹیپو اپنے والدین کا نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار بیٹا تھا۔ ۱۷۷۴ء میں اس کی شادی بیک وقت دو لڑکیوں سے ایک ہی دن میں ہوئی تھی۔ ایک شادی تو والدہ کی حسبِ خواہش

خاندان کے ایک بزرگ لالہ میاں شہید کی دختر رقیہ بانو سے اور دوسری شادی والد کی مرضی کے مطابق امام بخش نائطہ کی لڑکی سے۔ ٹیپو نے ماں اور باپ دونوں کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ایک ہی دن میں دو شادیاں کیں۔

سلطان اپنی زندگی میں نظم و ضبط کا بے حد پابند تھا۔ اُسے پابندیٔ اوقات کا بہت خیال رہتا تھا۔ علی الصبح بیدار ہونا نماز کی ادائیگی پابندی سے کرنا اس کا معمول تھا۔ مسجدِ اعلیٰ کی تعمیر کے بعد جب پہلی نماز کی امامت کا سوال آیا تو سلطان نے کہا کہ جو صاحب ترتیب ہو وہ امامت کرے۔ بڑے بڑے علما اور مولوی ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے اور آخر سلطان یہ کہتے ہوئے کہ الحمدللہ! میں صاحب ترتیب ہوں، مسندِ امامت پر ایستادہ ہوا۔ نمازِ فجر کے بعد ایک گھنٹہ قرآن کی تلاوت کے لیے وقف کرتا اس کے بعد توشک خانہ میں جواہرات کا معائنہ کرتا پھر ناشتہ کرتا۔ ناشتے کے وقت اس کے ہمراہ تین شاہزادے اور ایک منشی ہوتے تھے۔ خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ دیتا۔ کچھ خطوط وہ خود لکھتا اور کچھ خطوط املا کرایا کرتا تھا۔

سلطان کی خوراک نہایت سادہ تھی۔ پھل اور دودھ اس کی پسندیدہ غذائیں تھیں۔ عادتاً وہ نہایت شریف، نیک خصلت، شیریں زبان اور نرم گفتار تھا۔ بدکلامی اور بدگوئی سے سخت متنفر تھا۔ اسے عفو و درگزر کی بہت عادت تھی۔ وہ اپنے عہدہ داروں نیز افسروں کی بڑی سے بڑی غلطیاں بھی معاف کر دیتا تھا۔ بشرطیکہ ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ اکثر کو تو وہ ترقیاں بھی دے دیتا تھا۔ عہدہ داروں سے عفو و درگزر کی اس عادت کا اسے ایسا خمیازہ بھگتنا پڑا کہ تاج و تخت بلکہ جانِ عزیز سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

ٹیپو شیر کی بہادرانہ زندگی کا تہِ دل سے قدرداں تھا۔ شیر کی خصلت سے اس کی طبیعت کو مناسبت تھی۔ اُسے شیر کی بے باک اور بے خوف زندگی سے جس قدر پیار تھا گیدڑ کی بزدلانہ زندگی سے اتنی ہی نفرت تھی۔ آج بھی اس کا کہا ہوا یہ جملہ ہزاروں دلوں پر نقش ہے اور اب تک میسور کے در و دیوار سے اس کی گونج سنائی دیتی ہے کہ "گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بدرجہا بہتر ہے"۔

شیر کا شکار کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ شیر کا رنگ اس کا پسندیدہ رنگ تھا۔ قدرت نے اسے شیر کی طرح نڈر، بلند حوصلہ اور جری بنایا تھا اور اس کے سینے میں شیر جیسا بہادر دل رکھا تھا۔ حد یہ کہ ٹیپو اپنی ایجادات و اختراعات جن کا تعلق محض تفریحی مشاغل سے تھا ان میں بھی اس نے شیر کی بہادرانہ صفات کو مدِنظر رکھا۔ شیر کی صورت پر اس نے 'ارغنون' بنوایا جس میں شیر ایک فرنگی کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے اور فرنگی سہما ہوا خوف زدہ نظر آتا ہے۔ ارغنون کا شیر پوری جسامت کا اور فرنگی قد آدم بنایا تھا۔ چنانچہ اس کی آواز وسیع و عریض شاہی ایوانوں میں گونج جاتی تھی۔ دیگر آلاتِ موسیقی کے ساتھ انگریزوں نے اپنی فتح کے بعد یہ ارغنون بھی محل سے حاصل کر کے ولایت بھیج دیا تھا۔ ... میں مدہوش کن اور خمار آگیں کیفیات تھیں۔ اس کی صدا میں ر... اور مردانہ جلال کا احساس پایا جاتا تھا۔ ٹیپو کے شاہی تخت پر ... تصویریں تھیں۔ گویا اس نے اپنی زندگی کو شیر کی زندگی کے قالب میں ... دانستہ کوشش کی تھی۔ سید حامد حسین جیلانی معتبر تاریخی حوالوں ... واقعہ بیان کرتے ہیں: "سلطان محل کے ایک وسیع کمرے میں ... بڑا ہوا تھا۔ قالین پر ایک نہایت خوشنما جھاڑی بنی ہوئی تھی ج... کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جھاڑی کے کنارے ایک زبردست ش... بیٹھا ہوا تھا۔ جھاڑی کے پیچھے پتوں میں چھپا ہوا ایک شکاری ... لیے شیر کو تاک رہا تھا۔ شکاری کے سر پر فرنگی ٹوپی تھی مگر شیر اس ... تھا۔ ایک فقیر سلطان کی طلب پر اسی کمرہ میں آیا اور اس نے قالین ... سلطان سے اس کی بہت سی باتیں ہوئیں۔ جن کو سن کر سلطان ... گیا۔ ابھی اس کی حیرت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فقیر اٹھ کر چلنے ... کچھ میری قسمت بھی بنا دیجیے۔" فقیر پلٹا اور کہنے لگا "شہنشاہ ... قالین پر نقش ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ شیر سے اس فطری لگاؤ نے اس کو ... ہمت کا پیکر بنا دیا اور اسے موت سے کھیلنا سکھا دیا۔ اس د... وقت جب اس سے تصویر کھنچوانے کے لیے کہا گیا تو اس نے ... اس کی بہادری اور شجاعت پر دلالت کرتا ہے۔ اس نے کہا ... تصویر ان کی حوالہ مردی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنا سر د... اپنا ہاتھ انگریزوں کے ہاتھ میں نہیں دیا۔

ٹیپو سلطان کی زندگی میں تکلفات بے جا کو دخل نہ تھا۔ ... سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق ... فرشی سلام کرنا اور ہاتھ باندھ کر احتراماً کھڑے ہونا لازمی تھا ... مساجد میں بھی امیروں کی تعظیم و تکریم کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ... خدائے ذوالجلال کے علاوہ دیگر انسانوں کی اس بے جا تعظیم و احترام کو روکنے کے لیے سلطان مسجد میں علیحدہ دروازہ سے د... کی صف میں شریک ہو جایا کرتا تھا۔ عام دروازے سے مسجد میں ... وجہ یہ تھی کہ کہیں لوگوں کی توجہ بارگاہِ الٰہی سے ہٹ کر سلطان کی ... ہو جائے اور اس طرح اس کی ذات اللہ اور اس کے بندوں کے در... ہو کر ان کے خشوع و خضوع میں کمی کا باعث نہ ہو جائے۔

ٹیپو سلطان پر انگریزوں نے طرح طرح کے الزامات لگائے ... نے اسے ناکارہ اور نکما سلطان ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ...

...حسوں میں مصروف رہتا تھا۔ لہذا ملک کی اصلاحات کی طرف سے لاپرواہ رہا
...ت دیہ ہے کہ جنگوں میں مصروف رہتے ہوئے بھی وہ اپنے ملک سے غافل ہوا
...سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کسانوں اور مزدوروں کو سرمایہ داروں کے
...ظالم سے چھٹکارا دلانے کے لیے تخت نشین ہوتے ہی قدم جاگیرداری کا
...ور کسانوں کو جو زمینیں دی گئیں وہ ان کی ہی ملکیت قرار پائیں۔ اس
...ے ملک کا چپہ چپہ آباد کردیا اور بہت بڑا علاقہ زیر کاشت آگیا۔ میسور
...قوں میں اس نے زمینداری و جاگیرداری کے نام و نشان مٹا کر رکھ دیے۔
...دھتر زمیندار اور جاگیردار بری طرح پیچ و تاب کھانے لگے اور
...کے طور پر امرا کے ساتھ وہ بھی سازشوں میں شریک اور سلطان کی
...وابستہ ہوگئے۔

...ٹیپو نے میسور میں مذہبی اصلاحات کے لیے عملی اقدامات کیے۔ طرز معاشر
...ی رسوم رائج ہوگئی تھیں۔ سلطان نے ان کا انسداد کیا۔ اس نے
...منشیات پر پابندی لگائی۔ خواہ ہندو ہو یا مسلمان سب کو اس نے
...پینے کے دیدار سے محروم کردیا۔ تمام ملک سے مہوہ اور کھجوروں کے درخت
...یے گئے اگرچہ اس سے سلطان کو ایک کروڑ روپیہ سالانہ آمدنی کا نقصان
...قومی بھلائی کے لیے اس نے یہ نقصان برداشت کیا۔ مسلمانوں کے
...دینی کے لیے ہر شہر اور ہر گاؤں میں قاضی مقرر کیے گئے۔ مسلمانوں کے
...مذہب اور جہاد کی حقیقت بتانے کے لیے کتاب "فتح المجاہدین" لکھی اور
...کی ہزار ہا نقلیں ملک میں تقسیم کرائیں۔ جو لوگ پیری مریدی کو محض
...بنائے ہوئے تھے ان پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔ اہلِ سادات کو پیری
...پابندیاں بہت ناگوار گزریں کیوں کہ دکن کی اسلامی سلطنتوں میں اور
...سرکاٹ اور سرا میں ان کی بے حد تعظیم و توقیر تھی حد یہ کہ ان کے محض
...سادات ہونے کے ناطے انھیں وظائف و جاگیریں دی جاتی تھیں۔ سلطان نے
...دل وظیفوں کو بند کر کے ان کو تجارت کی طرف راغب کیا اور سلطان
...لوگوں کی بذاتِ خود بھی مدد کی۔ وہ انسانی مساوات کا قائل تھا۔ ذات
...ونسل و حسب و نسب کے امتیاز سے دور تھا اور عوام کو بھی چاہتا تھا کہ وہ
...ذات انسان پر عمل کریں۔ اس برائی کے انسداد کی خاطر اس نے برہان الدین
...شادی قمرالزماں نائطہ کی لڑکی سے کردی جس پر نائطہ مخالف ہوگیا۔

کسی نے صحیح کہا تھا کہ سلطان اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہوا تھا
...مصلح قوم بلاشبہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے اور بعد میں ہی اس
...کارناموں کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ جس قدر مذموم اور قابلِ ننگ
...تھیں سلطان نے ان سب کو ختم کرنے کی عملی کوشش کی۔ دکن میں عورتیں
...کے مطابق صرف ایک تہ بند پہنتی تھیں ان کے سر اور سینے کھلے ہوتے
تھے۔ ٹیپو نے اس رسم کے خلاف سخت احکامات جاری کیے۔ مالابار کے علاقوں میں
جہاں سلطان کا اثر نہیں پہنچا تھا وہاں یہ حال تھا کہ کسی ہندو عورت کو قمیص
پہنا دینا ان کے نزدیک اسے بالجبر مسلمان بنا لینے کے برابر تھا۔ اس نے عورتوں
پر شوہروں کے ظلم و تشدد کا انسداد کیا۔ تمام وحشیانہ رسوم و عادات کے
خلاف آواز اٹھائی اور ختم کرنے کی کوشش کی۔ ٹیپو کے زمانے میں ہندوستان
کے بعض حصوں میں انسانی قربانی کا رواج تھا۔ سلطنت میسور میں جہاں
اس نے یہ مذموم رسم دیکھی فوراً سختی سے پابندی لگائی۔ یتیم و نادار بچوں
کی پرورش کے لیے یتیم خانے کھلوائے۔ غلامی اور بردہ فروشی کی رسموں
کی سختی سے ممانعت کردی۔

سلطان کے دل میں عورتوں کی تعظیم و تکریم کا بے حد خیال تھا۔
وہ میدانِ جنگ میں بھی اپنے دشمنوں کی مستورات کا احترام کرتا تھا۔
نظام کا داماد مہابت جنگ ٹیپو کے خوف سے میدان جنگ سے اکیلا اپنی
جان لے کر بھاگ نکلا اور اس کی مستورات قلعہ ہی میں رہ گئی تھیں
ٹیپو نے مستورات کی موجودگی میں قلعہ پر گولہ باری اور فوج کو آگے بڑھنے
سے اس وقت تک روک رکھا جب تک قلعہ مستورات سے خالی نہ ہوگیا
اور وہ باعزت مہابت خاں کے کیمپ میں پہنچا نہ دی گئیں۔

سلطان کو فنون حرب کے ساتھ ساتھ دیگر علوم و فنون سے بھی
دلچسپی تھی۔ اس نے ۱۷۹۱ء میں 'جامع امور' کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم
کی۔ اسے کتب بینی کا بہت شوق تھا۔ اس کی لائبریری میں بے شمار کتابیں
موجود تھیں جو کتابیں وہ پڑھ لیتا تھا ان پر اپنی مہر ثبت کر دیتا تھا۔ اس کی
لائبریری میں زیادہ تر کتابیں مجلد تھیں اور ان جلدوں پر سنہری کام تھا۔ حیدر علی
جیسے جری، دلیر سپاہی اور مدبرانہ صلاحیتوں کے مالک باپ کے سایۂ
عاطفت میں ٹیپو کی تربیت ہوئی۔ وہ نہ صرف میدانِ جنگ کا شہسوار تھا بلکہ
قلم کا بھی شہسوار تھا۔ خطاطی، حکمت اور دیگر علوم و فنون میں بھی اسے
مہارت حاصل تھی۔ فنونِ حرب پر اس کی کتاب "فتح المجاہدین" اپنی
نوعیت کی عمدہ کتاب ہے۔ وہ ایک اچھا مقرر اور خطیب بھی تھا۔ فرانسیسی
افسروں کی زیرِ نگرانی اس نے فوجی تعلیم حاصل کی۔ وہ ہر قسم کے علوم و فنون
میں ماہر تھا۔ وہ امیر البحر تھا اور جنگی بیڑے کی طرف اس کی خاص توجہ
رہتی تھی۔

انگریز سلطنتِ حیدری کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اس کی
وجہ یہ تھی کہ حیدری سلطنت ان کی فریب کاریوں سے بخوبی واقف تھی۔
انگریزوں نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی یہاں کی ہر ریاست اور ہر صوبہ
کے سربراہ و حکمراں کو کچھ ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ انگریزوں کی چال میں

آگئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ اور ریذیڈنٹ ان حکمرانوں، نوابوں نیز امراء کی خدمت میں ایسی خوشامدانہ و عاجزانہ انداز میں لکھی ہوئی عرضیاں پیش کرتے کہ دل کیا پتھر پگھل جائیں۔ حقیقت ہے کہ "ٹیپو سلطان کی تلوار نے ہر موقع پر دشمنوں کو شکستیں دیں لیکن دشمن نے اس کی تلوار کے ٹکڑے کر دیے۔" (مسلم ضیائی۔ ٹیپو سلطان ص۲۹۲) خوشامد چاپلوسی اور ادب و احترام سے بھری ہوئی عرضیوں اور درخواستوں نے انھیں ہندوستانی حکمرانوں سے خصوصی مراعات حاصل کرنے میں بڑی مدد کی۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی جب یہاں کے حکمرانوں کے روبرو حاضر ہوتے تو حد درجہ خاکساری اور منکسر المزاجی دکھاتے اور ان کے روبرو اپنے تئیں اطاعت گزار [اپنے آپ کو] غلام سمجھتے۔ جس کے نتیجے میں وہ رئیسوں اور نوابوں سے کمپنی کی وفاداری اور خیر خواہی کا عہد نامہ حاصل کر لیتے۔ اس طرح اپنی طاقت کو بڑھانے کی تدابیر میں لگ جاتے۔

سلطنتِ حیدری انگریزوں کی رگ رگ سے واقف تھی۔ صرف سلطنت میسور ہی اپنی دور اندیشی سے محفوظ تھی۔ جہاں انگریز اپنا ریذیڈنٹ متعین کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب کہ شمال اور دکن کے ہر حکمراں کے دربار میں انگریزوں کا وکیل یا ریذیڈنٹ متعین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے میسور کی سلطنت کو مقامی حکمرانوں سے یعنی نظام اور پیشوا سے لڑا کر کمزور کرنے اور اس کے بعد ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے لیے انھوں نے جائز اور ناجائز حربے استعمال کیے۔

۱۷۶۷ء میں میسور کی پہلی جنگ کے دوران حیدر علی کرناٹک کے مقام پر دشمنوں سے نبرد آزما تھا۔ اسی دوران معلوم ہوا کہ بنگلور میں انگریزوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ حیدر علی کا کرناٹک کے محاذِ جنگ سے ہٹنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لہٰذا بنگلور کی حفاظت کے لیے نوعمر شہزادہ ٹیپو کو دشمن کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ اس ۱۶ سالہ نوعمر شہزادے نے شاندار فتح حاصل کی اور دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ انگریزی فوج کو شرمناک شکست ہوئی۔

میسور کی دوسری جنگ میں سلطان نے کرنل بیلی کو شکستِ فاش دی۔ حیدر نگر کے قلعے پر سلطانی نصرت کا علم لہرانے لگا اور انگریزی فوج کو بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ انگریزوں کا سپہ سالار میتھوز قید کر لیا گیا۔ انگریزوں میں عجیب بدحواسی اور سراسیمگی کا عالم تھا۔ اب انھیں سلطان سے صلح کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ سلطان نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا اور ان کی درخواست قبول کر لی۔

اقتدار کی ہوس میں انگریز خاموش بیٹھنے والے تو تھے نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ ۱۷۸۲ء میں ٹیپو میدانِ کارزار میں انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا کہ ۷ دسمبر ۱۷۸۲ء کو حیدر علی [کا انتقال] ہو گیا۔ امراء کی غداری کے خیال سے حیدر علی کی تجہیز و تکفین نہایت [خاموشی] سے کر دی گئی اور اس کے وفاداروں نے مصلحتاً اس کے چھوٹے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔ بعد ازاں خفیہ طور سے یہ افسوسناک خبر سلطان [تک پہنچائی] گئی۔ دل پہ باپ کے غم کا بوجھ لیے سلطان سرنگا پٹم کی جانب روانہ ہوا۔ چھوٹے بھائی نے بڑھ کر استقبال کیا۔ سلطان نے چھوٹے بھائی کو شفقت سے گلے لگایا۔ حالات کچھ ایسے نازک تھے کہ دونوں بھائی [باپ] کی موت پر اظہارِ غم بھی نہ کر سکتے تھے۔

۲۰ محرم الحرام ۱۱۹۷ھ کو سلطنت کی باگ ٹیپو سلطان [کے ہاتھ] میں آئی۔ سلطان نے اس سلطنت کا نام 'سلطنتِ خداداد' رکھا۔ [تخت] نشینی کے بعد وہ پھر جنگ پر واپس ہو گیا۔ فرانسیسی بھی جنگ [میں ٹیپو] کا ساتھ دے رہے تھے لیکن بعد میں اپنے مفاد کی خاطر [انگریزوں] سے مل گئے۔ ۱۷۸۳ء میں فرانسیسی مالابار میں اپنی تجارت بڑھا[نا چاہتے] تھے اور ضرورت سے زیادہ تجارتی مراعات نہ ملنے پر ان فرانسیسیوں نے مالابار کے بعض سرداروں کو سلطان کے خلاف بھڑکا نا شروع کیا اور بغاوت پر آمادہ کیا۔ مغربی اقوام کی پالیسی ہی یہی تھی کہ لڑاؤ اور حکومت کرو۔

غرض ٹیپو کو اس جنگ میں بھی نہایت شاندار کامیابی [ملی]۔ ۱۷۸۴ء میں عہد نامہ منگلور کے نام سے صلح ہو گئی۔ ۱۷۸۴ء میں کورگ کی بغاوت ہوئی اس بغاوت کی سرکوبی میں بھی سلطان [کو کامیابی] ملی۔ باغیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے [اب] مرہٹے اور نظام سراسیمہ تھے اور اندر ہی اندر اس کی جڑیں کا[ٹنے کی] تدابیر میں لگے رہے۔ شاہور کے میدان پر بھی سلطان فتح [و] ظفر [کا] پرچم نصب ہو گیا۔ نواب حکیم خاں باغی ہو کر مرہٹوں اور نظام [سے مل] گیا۔ لیکن سلطان کی آمد پر اپنے بیٹے کو میدان میں ہی چھوڑ [کر] بھاگ نکلا۔ اس کا بیٹا گرفتار ہو گیا۔ بعد میں ہری پنڈت کی [سفارش] پر سلطان نے نواب کلیم کو محض معاف ہی نہیں کیا بلکہ ریاست واپس کر دی۔

ٹیپو سلطان ۱۷۸۷ء میں نہایت تزک و احتشام کے [ساتھ] فتح و نصرت کی خوشی میں سرشار سرنگا پٹم کی جانب روانہ ہوا [۔ اگرچہ] انگریزوں کو شکست فاش ہوئی لیکن ابھی ان کے ترکش [میں] سازشوں کے زہر میں بجھے ہوئے زبردست تیر باقی تھے اور سلطنت

جواب میں انھوں نے تیر چلانے شروع کیے۔ جس کی زد میں تمام افسران
، داران سلطنت آ گئے۔ سلطان کے خلاف عوام کو بہکانے اور بھڑکانے
یغ حربے بھی استعمال کیے گئے۔ مثلاً سلطنت خداداد میں ایک
ی وضع قطع اختیار کرکے داخل ہوا اور لوگوں کو سلطان کے خلاف
ادر پروپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ یہ ہندوستانی عوام کی بدقسمتی ہے
سی معاملات میں اتنے تقلید پرست ہوتے ہیں اکثر پیر، درویش یا
ھیس بنا کر انھیں دھوکا دیا گیا اور وہ دھوکے میں آ گئے۔ یہی اس
صفت پیر نما مکار نے کیا۔ اس پیر نے کرنل لارنس کی پوری پیروی
ل لارنس نے بھیس بدل کر اور عربی بود و باش اختیار کرکے نام
ے میں عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا اور خوب جی کھول کر
لایا گیا۔ یہی کام اسی پیر نے میسور میں کیا۔ جہاں مالی امداد کی ضرورت
اں بے دریغ روپیہ بھی خرچ کیا اور مفاد پرستوں کے دلوں کو جیت کر
ں میں شریک کرلیا۔ انگریز اپنی پیہم شکستوں پر پیچ و تاب کھا رہے
۱۷۹۱ء میں آخر بلا کسی اعلانِ جنگ کے ہی میسور پر حملہ کر دیا۔
ان کے عہدہ دار انگریزوں سے مل گئے۔ کشن راؤ نے قلعہ انگریزوں
الے کر دیا۔ سلطان کو اس کی غداری کی اطلاع اس وقت ملی جب
سے گزر چکا تھا۔ کشن راؤ کی غداری کا علم جلد ہی ہو گیا تھا اور
س غداری کی سزا قتل کی صورت میں ملی۔ مرتے وقت اس نے
قدر صحیح کہا تھا "میں نے جو آگ لگائی ہے وہ سلطان کے بجھائے
گی۔ حقیقت ہے کہ اس کی لگائی ہوئی سازشوں کی آگ کچھ اس
ھڑکی جس کا بجھانا ایک اکیلے سلطان کے بس میں نہ تھا اور نتیجہ
تھا۔ میسور کی یہ تیسری لڑائی جون ۱۷۹۲ء میں ہوئی اس لڑائی میں
وسوں اور غداروں کی غداری و سازش سلطان کی شکست کا سبب
دل ناخواستہ سلطان کو صلح کرنی پڑی۔ تین کروڑ روپیہ بطور
ن جنگ اور آدھا ملک انگریزوں کو دینا پڑا۔ تاوان جنگ کی بقیہ
لی کے اپنے دو بیٹوں عبدالخالق اور معزالدین کو بطور یرغمال
وں کے سپرد کرنا پڑا۔ اس صلح پر غیور سلطان نے قسم کھائی تھی
ب تک اس شکست کا انتقام نہ لے لوں پلنگ پر سونا حرام ہے
۱۷۹۲ء سے ۱۷۹۹ء تک وہ زمین پر ہی ٹاٹ کے ٹکڑوں پر سوتا رہا۔
۴ مئی ۱۷۹۹ء کی آخری لڑائی میں سلطان اور اس کے جانباز
اہی بہادری سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے اور قریب
انگریزی فوج ہتھیار ڈال دے۔ اس اثنا میں غداروں نے قلعہ کی
ا میں شگاف ڈال دیا۔ اس موقعے پر اس مذکورہ بالا پیر نے جو
کارگزاری کی وہ یہ تھی کہ اس نے حکم دیا کہ دیوار کے ایک خاص مقام پر گولہ رکھ کر
اُڑا دیا جائے اور اس نے اپنے آدمیوں کو بہکاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اس مقام
پر خزانہ مدفون ہے اور گولے سے اڑانے والے کو یہ خزانہ ملے گا۔

ٹیپو سلطان نے ہر چند مرہٹوں اور نظام کو سمجھایا کہ وہ انگریزوں
کے مکر و فریب میں نہ آئیں۔ اس نے یقین دلایا کہ یاد رکھو تمھارا سب سے بڑا
دشمن انگریز ہے مگر ناعاقبت اندیش مرہٹے اور نظام اپنے ذاتی مفاد
اور اپنے اقتدار کے سنہرے خواب میں اس قدر سرمست تھے کہ انھیں
ہوش ہی نہ تھا کہ ان کی ناعاقبت اندیشی پورے ہندوستان کو غلامی
کی آہنی زنجیروں میں جکڑ دے گی۔ مرہٹے اور نظام سلطان سے کسی
تعاون کے بجائے مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ ٹیپو نے آخر سلطان روم
اور نپولین سے تعاون مانگا۔ مولانا محمد علی (مُنیب) رئیس التجار
مدراس لکھتے ہیں: "سلطان روم نے تو خاموشی اختیار کرلی۔ نپولین
اعظم بھی اس وقت مصر میں سکندر اعظم کی سلطنت کے خواب دیکھ رہا تھا۔
اس نے سلطان کے ساتھ اتحاد کو اپنی ایشیائی سلطنت کی پہلی کڑی
سمجھ کر پیغام بھیجا کہ میں مصر سے، روم اور ایران اور افغانستان ہوتا
ہوا ہندوستان پہنچ کر انگریزوں کا سر کچلنے میں تمھاری مدد کروں گا۔
مگر تقدیر کھڑی ہنس رہی تھی کہ ہونے والا تو کچھ اور ہی ہے۔ چنانچہ
سلطان کی تمام اسکیمیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ خائن عہدہ داروں
کی غداری نے وہ کام کیا جو مضبوط اور قوی دشمن تلوار سے کرسکتا تھا۔
سلطان کا اپنا ماموں محمد صادق اور دیوان اس پیر کی کرامت سے
انگریزوں کے ہاتھوں بک چکے تھے۔" (ٹیپو سلطان۔ مرتبہ عبداللہ ص ۲۵)

حیدرآباد میں میر عالم، بنگال میں سراج الدولہ کے ساتھ میر جعفر کی
غداری، دکن میں غلام علی لنگڑا، میر قمرالدین، میر معین الدین، پورنیا،
میر قاسم، کشن راؤ، بدر الزماں نائطہ کی غداریوں کو ہندوستان کی تاریخ
کبھی نہ بھلا سکے گی۔ ٹیپو کے غداروں میں سرِ فہرست پورنیا نامی برہمن اور
میر صادق۔ یہ وہ غدارانِ ملک و ملت ہیں جن پر ہندوستان کا ذرّہ
ذرّہ تا حشر لعنتیں بھیجتا رہے گا۔ اقبال نے غداروں کے نمائندہ جعفر اور
صادق کے بارے میں خوب کہا ہے:

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

میر غلام علی لنگڑا وہ غدار نمک حرام تھا جس نے سلطان کے
شہزادے کو تخت نشین کرنے کی تجویز پر کمیشن کے سامنے یہ کہنے میں
ذرا بھی عار نہ محسوس کی: "افعی کشتن و بچہ اش را نگہہ داشتن کار خردمندا

نیست۔ پورنیا جیسا غدار جس نے نواب حیدر علی کے ہی ٹکڑوں پر پرورش پائی اور حیدر علی کے ہی زمانے سے ملازمت میں تھا ایک مرتبہ اپنے عہدہ سے معزول کر دیا گیا تھا لیکن ہندوستان کی بدنصیبی اور سلطان کی رحم دلی نے دوبارہ اسے اپنے عہدہ پر بحال کر دیا۔ یہ تمام خفیہ خبریں اور قلعہ کے سربستہ راز انگریزوں تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ یہ ہر سازش میں پیش پیش تھا۔ عین لڑائی کے وقت تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے اسنے فوج کو محاذ سے واپس بلا لیا تھا۔ سرنگاپٹم کے قلعے کا افسر میر قاسم علی انگریزی فوجوں کو قلعے میں داخل کروانے میں سب سے آگے تھا۔ فصیل سے چڑھنے والا سب سے پہلا شخص جنرل بیرڈ تھا اور اس کی رہنمائی کے لیے آگے آگے جو شخص تھا وہ بھی دغا باز میر قاسم تھا جس نے گھر کو گھر کے ہی چراغ سے آگ لگا دی۔

بدر الزماں نائطہ اپنی ذاتی رنجشوں کے سبب سلطان کا مخالف ہو گیا اور انتقام لینے کے در پے ہو گیا۔ ذاتی رنجش کی وجہ یہ تھی کہ سلطان نے اپنے نسبتی بھائی برہان الدین کے لیے اس کی لڑکی کا رشتہ مانگا۔ نائطہ انکار نہ کر سکا۔ نائطہ لوگ چونکہ اپنے کو بہت عالی نسب سمجھتے تھے اور سلطان کے خاندان میں شادی کا رشتہ کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے چنانچہ بدر الزماں نے اس رشتہ کو اپنی اعلیٰ نسبی پر داغ سمجھا اور لڑکی نے شادی کی پہلی شب میں کنویں میں گر کر خودکشی کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اسے قصداً کنویں میں گرا کر مارا گیا تھا۔ ایک مرتبہ میر صادق کی شکایت پر کہ نائطہ سلطنت کا وفادار نہیں ہے اسے نظر بند کر دیا گیا مگر بعد میں اسے معاف کر کے وزیر بھی بنا دیا گیا مگر وہ سلطان کی طرف سے رنجش اور خلش اپنے سینے میں چھپائے رہا۔ اس نے اپنی ذاتی رنجشوں کا انتقام کچھ اس طرح سے لیا جس کے نتائج محض ٹیپو کی اپنی ذات کے لیے مخصوص نہ تھے بلکہ پورے ہندوستان کے ایوانِ سلطنت کی جڑوں کو کھوکھلی کر دینے کے لیے کافی تھے۔

نواب حیدر علی نے ان غداروں کو خوب اچھی طرح پہچان لیا تھا لیکن ٹیپو نے اپنی رحم دلی اور جذبۂ عفو درگذر سے کام لے کر ان کے

افسوس کہ ٹیپو سلطان کی رحم دلی اور سادہ لوح فطرت نے ان کی گہرائیوں کو نہ سمجھا۔

ولکس نے اپنی کتاب Historical Sketches of South India میں ہندوؤں سے متعلق ٹیپو کی زیادتی لکھا ہے۔ بقول ڈاڈویل ڈاکٹر سریندر ناتھ سین نے ٹیپو کو عزیز کہتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے ہمیشہ ہندوؤں کی حمایت کی اور جب اس نے سختی و بربادی کا سلوک کیا اس کی وجہ سیاسی تھی نہ کہ مذہبی۔ مہاتما گاندھی ٹیپو کو "ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ" کہتے ہوئے ہیں۔ "ٹیپو نے ہندو مندروں کے لیے نہایت فیاضی سے جائداد وقف کیں اور خود ٹیپو سلطان کے محلات کے قریب سری امتا سر نیواس اور سری رنگناتھ کے مندروں کی موجودگی اس کی وسیع النظری اور رواداری کا ثبوت ہیں۔" اعداللہ ٹیپو سلطان مرہٹہ سپہ سالار ہری پنڈت شاہنور کی جنگ میں سلطان کا مدمقابل تھا۔ صلح کے بعد اس کی جواں مردی کے صلہ میں سلطان نے اس سپہ سالار کو کنچن گڑھ کا علاقہ بطور انعام دیا مگر اس نے بے وفائی کی۔

انگریزوں نے اس پر اس طرح ایسے بے بنیاد الزام لگائے تاکہ ٹیپو کی تاریخ پڑھنے والے کے سامنے ٹیپو کی اصل تصویر نہ آئے۔ انگریز ٹیپو پر ہزار الزامات لگانے کے بعد بھی سلطان کی موت کو سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ ٹیپو کا سب سے زبردست مخالف لیون بی۔ بورنگ اس پر غاصب اور ظالم ہونے کا الزام لگاتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"مقبرہ سلطانی کے گنبد میں جس میں ذرا سی بھی آواز سے آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص جا کر کھڑا ہوتا ہے تو لا محالہ ایک لمحے کے لئے تو اس خیال سے تشفی ہو ہی جاتی ہے کہ سلطان اگرچہ غاصب اور ظالم تھا تاہم سپاہیانہ موت مرا ہے۔"
(امین علی اشہدی، سوانح ٹیپو سلطان ص۔)

ں کے لیے پیامِ غلامی لے کر آئی۔ جد و جہد آزادی کی جنگ
رں تھا۔ سلطان کو اپنے عہدہ داروں کی غداری کا علم میدان
ں ہوا۔ سلطان دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ایک درخت کے
یں بیٹھا تھا اور ابھی پہلا ہی لقمہ منہ میں رکھا تھا کہ ایک
ں سہادت کی خبر ملی۔ چند غدار افسروں نے آکر سلطان
ے کہ دشمنوں نے دیوار میں شگاف ڈال دیا ہے اور
ں فوج اندر داخل ہو جائے گی۔ یہ سنتے ہی سلطان
ہ کا دوسرا لقمہ ویسے ہی رکھ دیا اور تلوار سنبھالتا ہوا
ں سے فورا اٹھ گیا۔ سلطان نے اپنے غدار عہدہ داروں
ے کہا:

ں عاری کا نتیجہ نہیں اس وقت معلوم ہوگا جب کہ
ں ملک میں تمہاری آئندہ نسلیں ایک ایک دانہ
ں دوں اور ساز کی ایک گٹھلی کو ترسیں گی۔

سلطان کی ان باتوں سے اقتدار اور زر و جواہرات کی ہوس
ست مہ جو غدار رسوائی اور ناعاقبت اندیشوں کے کانوں پر جوں نہ
ں غداروں میں سے کسی نے انگریزوں کی سرافت کے کن گانے
ے سلطان کو انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی رائے دی۔
ں کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا اور اس کی حمیت نے للکار کر
ے گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔
ے دمے ی بہ از صد سالہ میش!

جس جانب قلعہ کی فصیل میں غداروں کی مدد سے دشمنوں نے
ڈال دیا تھا وہاں سلطان اپنے دونوں گھٹنے ٹیکے سپر سے سر
سینہ سپر ہو کر دشمنوں کی گولیوں کو متواتر روکتا رہا۔ اس کے
ں عاقبت دشمن تھے۔ غدار عہدہ داروں نے قلعہ کا دروازہ
ں اس کے اپنے ہی معتمدانِ خاص نے اس کے چاروں طرف
ں کے جال پھیلا رکھے تھے۔ ہندوستان کا گورنر جنرل لارڈ
ں کی طاقت کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی
ے جو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔ اس کی طاقت کو کمزور کرنے کے
سں سے بہتر اور کوئی صورت نہیں تھی کہ تمام ملک میں سازشوں
یے جائیں۔

میر صادق نے قلعہ کا دروازہ مقفل کر رکھا تھا۔ تاکہ سلطان
لیے پناہ گزیں نہ ہو سکے۔ یہ میر صادق ہی تھا جس نے
کی اطلاع انگریزوں کو دی اور انگریز افسروں کو اشارہ

کیا کہ سلطان ہی ہے۔ انگریزی فوج نے اس طرف سے گولیاں برسانی
شروع کیں اور وہ محسن عالم تذبذب میں دشمن کے مدمقابل
کھڑا اس تنہا تلواروں سے کھیلتا رہا۔ اور وہ رت کے تماشے دیکھتا
رہا کہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دے رہے تھے۔

غداروں کی مدد سے قلعہ کی دیوار کئی دن سے توڑی جا رہی تھی۔
اور آخر کار دشمنوں نے اپنا راستہ بنا لیا تھا تاکہ قلعہ کے اندر داخل
ہونے میں آسانی ہو۔ سلطان مدافعانہ انداز میں ٹوٹی ہوئی دیوار کو
گھیرے ہوئے کھڑا دشمنوں کی گولیوں کا ... دیتا رہا۔ اس کے
اپنے وفادار آدمی داد شجاعت دیتے ہوئے مارے گئے۔ وہ
گھوڑے پر سوار قلعہ سے ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک گولی اس
کے گھوڑے کے پیٹ میں آکر لگی اور گھوڑا زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔
سلطان پیدل ہی دشمنوں کی صفوں کے سینے چیرتا ہوا آگے بڑھا
کہ ایک گولی اس کی پنڈلی کو چھیدتی ہوئی نکل گئی مگر وہ تکلیف سے
بے نیاز ہو کر سپاہیانہ وقار کے ساتھ دشمنوں سے مقابلہ کرتا ہی
رہا۔ اسی اثنا میں دشمنوں کی ایک گولی اس کے سینے کے بائیں
جانب آکر لگی مگر ٹیپو سرکار اس شیر جیں دشمنوں پر جھپٹنے کی ابھی
طاقت باقی تھی کہ دوسری گولی اس کے بازو میں پیوست ہو گئی اس
کے علاوہ وہ بھی نہ جانے کتنی گولیاں اس کے سینے میں اتریں۔ آزادی کی
حفاظت وطن کی آبرو کی خاطر وہ اپنے جسم کا خون اس وقت تک بہاتا رہا
جب تک کہ جسم میں سانس تھی۔ ان کاری زخموں سے نڈھال ہو کر دشمن
خاک پر گر پڑا لیکن ابھی اس کی رگوں میں جسم کا لہو باقی تھا اور ابھی
تک اس کے فولادی ہاتھ میں اس کی بے نیام اور خون آلود تلوار
دشمنوں کا خون پینے کے لیے بے تاب تھی۔ دشمنوں کے ایک سپاہی
نے اسے اس طرح نڈھال پڑے ہوئے دیکھ کر اس کی پیٹی قیمت میں ...
مارنی چاہی لیکن اس حالت میں بھی جب کہ اس میں اٹھنے کی تاب
نہ تھی۔ موت کا فرشتہ سر پر کھڑا مسکرا رہا تھا اور سینے میں
سانس چند لمحوں کی مہمان تھی ایسے وقت میں بھی اس کی جنون سے
سپاہیانہ بانکپن نمودار تھا۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے ایسی تلوار ماری کہ
اس کے گھٹنے کی ہڈی کٹ گئی۔ بعد ازاں دشمن کی ایک گولی سلطان
کی پیشانی کو چیرتی ہوئی اس طرح آر پار نکل گئی کہ زندگی سے اس کا رشتہ
ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا اور ہندوستان کی حفاظت میں چمکنے والی خون
آشام تلوار آخر ٹوٹ گئی۔

سلطان بے یار و مددگار بھوکا و پیاسا آخری وقت تک جان بازی

روشنی

دیوجانس کلبی درویشوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا اور وہ تھا بھی درویش ہی۔ دولت دنیا کو پائے حقارت سے ٹھکرانے والا! اس کی کل پونجی صرف لکڑی کا ایک پیالہ تھا جسے سر پر رکھ کے وہ خود کو دھوپ اور بارش سے محفوظ کر لیتا۔ یہی اس کے کھانا کھانے کی رکابی اور پانی پینے کا پیالہ تھا لیکن ایک دن جب اس نے ایک چھوٹے سے بچے کو دریا کے کنارے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کے چلو سے پانی پیتے دیکھا تو رو پڑا کہ مجھ سے زیادہ دانشمند تو یہ ننھا سا بچہ ہے جو ایک پیالے کا بھی محتاج نہیں۔ دیوجانس نے اپنا پیالہ اسی وقت توڑ پھینکا۔

یہ سکندر اعظم کا زمانہ تھا۔ اس نے دیوجانس کی بے نیازی کے قصے سنے تو ملاقات کا مشتاق ہوا۔ ایک دن خود ہی اس کی ملاقات کو جا پہنچا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اس وقت دیوجانس دھوپ میں لیٹا تھا۔ سکندر اعظم کا خیال تھا کہ اس کے قدموں کی زمین کو دہلا دینے والی چاپ سے دیوجانس اچھل کھڑا ہوگا مگر ایسا کچھ بھی تو نہ ہوا۔ یہاں تک کہ سکندر اعظم اپنے عہد کا جلیل القدر شہنشاہ اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

"دیوجانس! دیوجانس!! میں سکندر اعظم ہوں" اس نے رعب دار آواز میں کہا "سکندر! سکندر!! میں دیوجانس ہوں" اس نے اسی طرح لیٹے لیٹے اور آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا ـــــ "دیوجانس، تم مجھ سے ڈرتے نہیں؟" سکندر نے سوال کیا۔ "پہلے یہ بتاؤ تم اچھے آدمی ہو یا برے؟" اس نے پوچھا۔ سکندر نے کہا "میں تو خود کو اچھا آدمی ہی سمجھتا ہوں" "پھر میں تم سے کیوں ڈروں؟" سکندر جو اس کے قصے سن کر متاثر ہوا تھا یہ جواب سن کر تو بالکل ہی مرعوب ہو گیا، بولا ـــــ

"دیوجانس! میرا جی چاہتا ہے تم مجھے کوئی حکم دو اور میں بجا لاؤں"
"ہاں۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم نے میری دھوپ روک لی ہے"
دیوجانس کا جواب تھا۔ جو کسی سے غرض نہیں رکھتے ان کے جواب ایسے ہی ہوتے ہیں۔

* * * * * * *

کا ثبوت دیتا رہا۔ سلطان نے ایک بار بذات خود نصف شب میں اٹھ کر

پیاس کی شدت میں کراہتے ہوئے اپنے ایک انگریز قیدی کو پانی پلایا تھا۔ اس مظلوم سلطان کا یہ انجام ہوا کہ خود اپنے غلام راجہ خاں سے وہ پانی طلب کرتا رہ گیا لیکن پانی کا چھاگل ہوتے ہوئے بھی اس نے سلطان شہید کو ایک قطرہ پانی نہ دیا جیسے ہی اس شہید نے شہادت کے جام سے اپنی پیاس بجھائی، یہ نمک حرام غلام راجہ خاں آگے بڑھا اور سلطان کے گلے سے نہایت بیش قیمت ہار اتار کر بھاگ نکلا۔

سلطان شہید ہو چکا تھا۔ مقتولین کے درمیان اس کی لاش کا پتہ نہ چل سکا۔ انگریزی فوجوں نے سمجھا کہ ٹیپو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا ہے۔ دوسرے دن سلطان کے شاہزادوں اور خدام کے ساتھ جنرل بیرڈ نے سلطان کی لاش کی شناخت کی۔ یہ وہی جنرل بیرڈ تھا جو کافی عرصہ تک سلطان کی حراست میں تھا۔ سلطان کی لاش دیکھ کر انگریزوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ لارڈ ہارس تو خوشی سے چلا اٹھا "آج ہندستان ہمارا ہے"۔

سلطان کی لاش کو پالکی میں رکھ کر حرم سرا میں لے جایا گیا جہاں رات بھر لاش رکھی رہی دوسرے دن نہایت تعظیم و احترام کے ساتھ اس کی تجہیز و تکفین ہوئی شہر کے قاضی نے تجہیز و تکفین کا سامان کیا۔ ۵ مئی ۱۷۹۹ء کو ظہر کے وقت نہایت ادب و احترام اور تزک و احتشام کے ساتھ بینڈ باجوں کی دھنوں کے درمیان حرم سرا سے جنازہ اٹھایا گیا۔ تمام عہدہ داران سلطنت جنازہ کے ساتھ تھے۔ فرزند دوم شہزادہ عبدالخالق جنازے کے پیچھے برہنہ پا چل رہے تھے۔ انگریزوں کی چار کمپنیاں بھی جنازہ میں شریک تھیں۔ قلعہ سے جنازہ کی روانگی کے وقت سے تدفین کے مرحلے تک قلعہ سے ماتمی توپیں برابر چھوٹی رہیں راستے میں پانچ ہزار روپے فقیروں کو خیرات کیے گئے۔

جنازہ نواب حیدر علی کے مقبرہ پر ٹھہرایا گیا۔ تمام سپاہیوں نے دو رویہ صف بستہ ہو کر اپنے ہتھیاروں کو خم کر کے رسم تعظیم ادا کی۔ بعد ازاں بہادر باپ کے پہلو میں بہادر بیٹے کو دفن کر دیا گیا۔

جن جن راستوں سے ہو کر سلطان شہید کا جنازہ گزرا سلطان کے آخری دیدار کے لیے سیکڑوں مرد و عورت اور بچوں کا ایک جم غفیر تھا۔ ہر آنکھ نم اور ہر دل سوگوار تھا۔ پورے میسور میں صف ماتم بچھی تھی۔ کسی نے تاریخ وفات نکالی "شمشیر گم شد"

شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا طفیل احمد منگلوری

ایک یادگار تحریر

یہ دیباچہ مولانا سید طفیل احمد مرحوم نے ۲۰ر نومبر ۱۹۳۷ء میں اپنی مشہور تصنیف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے پہلے ایڈیشن میں شامل ہونے کے لیے میرے دادا مولانا نظامی بدایونی کے پاس بھیجا تھا۔ مگر اس وقت کی کچھ مصلحت کی بنا پر اس دیباچے کو شامل کتاب نہ کیا گیا اور مولانا کو دوسرا دیباچہ لکھنا پڑا جو کتاب میں شامل ہے۔ یہ غیر مطبوعہ دیباچہ یا "آپ بیتی" مولانا کے اپنے قلم سے تحریر شدہ مسودہ کی شکل میں محفوظ رہی۔ اتفاق سے مجھے پرانے کاغذات میں یہ دستیاب ہوا۔ میں نے اس کو پڑھا اور مناسب سمجھا کہ اس کی اشاعت ضروری ہے۔ کہیں آگے چل کر مسودہ بھی ضائع نہ ہو جائے۔ اس لیے ضروری خیال کیا کہ یہ ایک قومی سرمایہ ہے جسے پبلک کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ ساتھ ہی علی گڑھ تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ضرور کارآمد ہوگا۔

منعیم الدین بدایونی

بچپن میں مسلمانوں کے متعلق سب سے پہلی کان میں پڑی ہوئی جو بات یاد ہے وہ یہ ہے کہ مولویوں کی مخالفت کی وجہ سے انھوں نے انگریزی نہیں پڑھی اس لیے وہ علوم جدیدہ پڑھنے میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے اور روز بروز ملازمتوں سے خارج ہو رہے ہیں۔ اب سر سید احمد خاں صاحب نے انھیں انگریزی پڑھانے پر کمر باندھی ہے اور علی گڑھ میں ایک مدرسہ کھولا ہے۔ چند روز بعد خدا نے مجھے اس مدرسے میں پہنچا دیا۔ یہ ۱۸۷۹ء کا واقعہ ہے جب کہ میری عمر گیارہ سال کی تھی اور مدرسہ قایم ہوئے چار سال ہوئے تھے اور اسکول کالج اور بورڈنگ ہاؤس سب پرانی چھاؤنی کے بنگلوں اور کچے مکانات میں تھے۔ اس وقت سر سید کو دیکھا کہ وہ ایک غیر معمولی شکل و شباہت کے انسان ہیں اور ان سے بڑا کوئی آدمی نہیں ہے۔ ان دنوں کالج میں کبھی کبھی جلسے ہوتے تھے تو اُن میں کہا جاتا تھا کہ مسلمان تباہ ہو گئے۔ جاہل اور غریب ہو گئے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کیوں کہ نہ کالج میں کوئی غریب اور جاہل معلوم ہوتا تھا اور نہ اپنے گھر پر اپنے عزیزوں قریبوں میں یہ بات نظر آتی تھی۔

پھر سولہ سال کی عمر سے کرکٹ کھیلنے کے لیے دوسرے شہروں میں جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کالج کے انگریز پرنسپل اور کبھی کوئی اور انگریز پروفیسر ساتھ ہوتے تھے جہاں پہنچتے خوب آؤ بھگت ہوتی جن کالجوں اسکولوں سے میچ ہوتا تو ان کے لڑکے دیسی کپڑے یا کرتہ پاجامہ پہنے کھیلتے ہم علی گڑھ والے قمیص پتلون پہنے فیلڈ میں جاتے اور ہر موقعے پر دوسروں سے زیادہ خرچ کرتے۔ اس حالت میں کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم لوگ دوسری قوموں کے مقابلے میں کس طرح غریب اور مرتبے میں کم ہیں۔ جب انگریزوں کے مقابلے میں کھیلنا ہوتا تو دوپہر کے وقت ان کے ساتھ لنچ کھاتے کھیلتے وقت کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا تو انگریز استاد ہماری طرف سے ان سے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ تب اپنی برتری کا اور بھی زیادہ احساس ہوتا اور خیال ہوتا کہ ہم سے زیادہ معزز کوئی نہیں ہے۔ اس خود فراموشی کی حالت میں دس گیارہ سال گزر گئے۔

طالب علمی کے آخری زمانے میں حسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے اپنے ایک ہم جماعت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے زیادہ ملاقاتیں رہیں جو لینے سے زیادہ خوش حال اور صورت شکل میں بالکل انگریز تھے۔ سر سید کے پاس بہت جاتے آتے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ مسلمان فی الواقع بہت غریب ہیں۔ کالج میں مستقل سرمایہ نہیں۔ طلبا کے وظائف کے لیے روپیہ نہیں اور ضرورت ہے کہ طلبا خود اپنی جماعت بنا کر سرمایہ جمع کرنے کا تہیہ کریں اور اسے ڈیوٹی یا الفرض سے موسوم کریں اور اپنی اس سوسائٹی کو خفیہ رکھیں اور تعطیلوں میں علی گڑھ سے باہر جا کر چندہ کیا کریں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ بالآخر صاحبزادہ صاحب کے اصرار پر میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ صاحبزادہ صاحب کو ایک نواب کے بیٹے ہو کر دن رات مسلمانوں کی بدبختی، جہالت اور افلاس کا رونا رہتا ہے۔ خدا کی بارگاہ میں مسلمانوں کے لیے دعائیں مانگتے ہیں اور مسلمانوں کی ترقی کی اسکیمیں بناتے ہیں۔ بالآخر دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔

ان کی صحبت سے بدقسمتی سے مسلمانوں کی قسمت کو رونے کا مرض مجھے بھی لاحق ہو گیا اور جس کام پر صاحبزادہ صاحب نے لگایا اس میں بھی لگ گیا۔ اب کالج سے باہر نکل کر جب دنیا میں باہر جانا ہوا اس وقت جو باتیں سر سید کی اسپیچوں اور صاحبزادہ صاحب کی باتوں میں سنی تھیں وہ صحیح معلوم ہونے لگیں مسلمان ہر جگہ جاہل اور غریب نظر آئے۔

اس زمانے کا مسلّم علاج یہ تھا کہ لڑکوں کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا جائے اور جو وہاں جانے کے قابل نہیں ہیں انھیں مقامی اسکولوں میں داخل کرایا جائے۔ پھر آگے چل کر یہ بھی اضافہ ہو گیا کہ مسلمانوں کے مقامی اسکول بھی قایم کرائے جائیں۔ غرض کہ ان کاموں کو حسب ہدایت آنریری سکریٹری صاحب انگریز استادوں اور صاحبزادہ صاحب کرنے کی کوشش کی گئی اور اس طرح اس زمانے کے سابق طلبا علی گڑھ کالج کیا کرتے تھے۔ ان کاموں میں انگریز استاد حد درجہ مددگار تھے، وہ انسانی ہمدردی اور اخلاق کا بہترین نمونہ تھے اور ہم لوگوں کو رحمت کے فرشتے معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جو کچھ کریں گے وہ علی گڑھ کالج کے سابق طلبا کریں گے۔ اس لیے ان کی مکمل فہرستیں مع مشاغل کے مرتب کی گئیں۔ کتابوں کی شکل میں شائع کی گئیں اور اس میں عمر کا ایک بڑا حصّہ صرف ہوا۔

کچھ عرصے بعد یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا مرض جہالت سے بڑھ کر یہ ہے کہ افلاس اور سود دینے کی وجہ سے جاہل اور عالم، امیر و غریب، تاجر و کاریگر، زمیندار اور کاشتکار سب کے سب سرمایہ داروں کے غلام ہیں اور اپنی اپنی جائدادیں ضایع کرتے ہیں اس کی بابت یہ سمجھ میں آیا کہ اس کا علاج بالمثل مفید ہوگا۔ اس لیے کوشش کی گئی کہ مسلمان بھی مثل دیگر اقوام کے بینکوں میں اپنا روپیہ جمع کریں اس کے منافع سے مستفید ہوں۔ تجارتی کاروبار میں سود سے پرہیز نہ کریں جو اسلامی ممالک میں اور بعض علماء کے نزدیک جائز ہے اس کی تبلیغ میں عمر کا ایک بڑا حصّہ صرف ہوا۔

غرض کہ مسلمانوں کی زندگی کے لیے دو تدبیریں پیش نظر ہیں۔ ایک تعلیمی ترقی دوسرے مالی حالت کی درستی۔ ان کے علاوہ اگر کسی اور طرف کوئی شخص مسلمانوں کو متوجہ کرتا تھا تو یہ خیال ہوتا تھا کہ ان چیزوں کے مکمل ہونے سے قبل کسی اور کام کو اختیار کرنے سے قوم کے نشوونما میں کمی رہ جائے گی اور اس سے نقصان پہنچے گا۔

صاحبزادہ صاحب ابتدا سے کانگریس کے حامی تھے اور اسے ایک مفید جماعت سمجھتے تھے اور علی گڑھ کی سرزمین سے اس کی جو مخالفت ہوتی تھی اس کے وہ قائل نہ تھے۔ تاہم مسلمانوں کے لیے حصول تعلیم کو زیادہ مقدم سمجھتے تھے۔ اسی لیے کالج اور کانفرنس کے کاموں میں منہمک رہتے تھے اور اپنی بڑی قوت کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر پہنچانے میں صرف کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسی سے مسلمانوں کے مصائب کا خاتمہ ہوگا۔ مگر ان کاموں کی خصوصیت یہ تھی کہ باوجود حد درجے کے انہماک اور محنت کے ہر روز اپنی قوم کی تعلیمی اور مالی و اخلاقی حالت دیگر اقوام کے مقابلے میں بد سے بدتر ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ اور جس عینک سے قوم کو دیکھا جاتا ہے اس کا رنگ روز بروز گہرا تاریک ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے قلب پر مستقل طور پر مایوسی طاری رہتی تھی۔ مسلمانوں کی زندگی کو ہر پہلو اسی سیاہ رنگ کی عینک سے دیکھا جاتا تھا اور اس میں وہ کالا ہی کالا دکھائی دیتا تھا۔

بہرحال اتفاق یا سوءِ اتفاق سے صاحبزادہ صاحب کا تقرر وزیر ہند کونسل میں ہو گیا اور وہ انگلستان چلے گئے۔ ان کے پیچھے ہندوستان میں ترک موالات کا گولا اٹھا اور اس نے علی گڑھ کالج کو تہ و بالا کر دیا۔ ہماری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ ہر طرف سے سابق طلبا اسے بچانے دوڑ پڑے۔ مگر ایسی کشاکش میں علی گڑھ کالج یونیورسٹی بن گیا اور قوم کی دیرینہ امید بر آئی۔ اس دوران میں صاحبزادہ صاحب انگلستان سے آئے اور آتے ہی مہاتما گاندھی کی خدمت میں گئے۔ وہ دن ان کی خاموشی کا تھا۔ تاہم صاحبزادہ صاحب مہاتما جی کے سامنے گئے اور سلام کر کے کہا کہ کوئی غرض بجز سلام کے نہیں ہے اور صرف سلام کر کے علی گڑھ واپس آ گئے۔ صاحبزادہ صاحب کے ہم معتقدین کو سخت حیرت ہوئی کہ وہ علی گڑھ کالج پر حملہ کرنے والے کو سلام کرنے کیوں گئے۔ فرمایا کہ جس شخص نے بڑے مغرور لوگوں کی گردنیں نیچی کی ہیں اس کی زیارت اور اس کے سلام کو گیا تھا۔ وہ مغرور لوگ کون تھے۔ انڈیا کونسل کے انگریز ممبر۔ پوچھا گیا کیا انگریز غریب انسانوں کے ہمدرد نہیں رہے۔ کیا ان کے اخلاق گر گئے۔ جواب ملا کہ ان میں سب خوبیاں اب بھی موجود ہیں بلکہ جتنی خوبیاں میں پہلے جانتا تھا اس سے زیادہ پائیں۔ مگر جس نظام اور جس آئین کے تحت میں یہ نیک دل لوگ کام کرتے ہیں وہ بے رحمانہ اور ظالمانہ اور ہماری بربادی کا موجب ہے۔

معلوم ہوا کہ صاحبزادہ صاحب وہاں بڑی کشاکش میں رہتے ہیں۔ پہلے سنا کرتے تھے کہ انڈیا کونسل کی ممبری بڑے آرام کی جگہ ہے۔ جتنا کام چاہا کر دیا اور باقی دستخط کر دیے۔ اب معلوم ہوا کہ صاحبزادہ صاحب دن کے علاوہ بعض وقت دفتر میں جا کر رات کو اور تعطیلوں میں کام کرتے ہیں اور ہندوستان کے مسائل میں بعض اوقات پچاسوں صفحات کے نوٹ دیتے ہیں اور اسی میں گھلے جاتے ہیں حتی کہ اپنی صحت کھو بیٹھے۔ ان کا کام بالکل خاموش تھا۔ تاہم مسٹر چنتامنی انگلستان گئے تو انھیں صاحبزادہ صاحب کے کام کا پتہ چلا اور انھوں نے ان کی تعریف میں ایک طویل نوٹ اخبار لیڈر الہ آباد میں دیا۔

اب جب کہ پیر کی "قلب ماہیت" ہوئی تو مرید بھی اپنی جگہ سے ہل گیا اور سوچنا شروع کیا۔ پھر اتفاق سے صوبہ متحدہ کی کونسل میں جانا ہوا اور اس کی وجہ سے ایکٹروں کو اسٹیج کے اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور وہاں دیکھا جو دیکھا اور سنا جو سنا۔ اب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی بربادی کے اسباب ان سے مختلف ہیں جنھیں ہم حقیقی تنزل سمجھتے تھے اور ان کی واقعی حالت اس سے مختلف ہے جس کا رونا ہم روزانہ روتے ہیں اور ان کا علاج ناکافی ہے جسے ہم واحد علاج سمجھتے رہے ہیں۔

ان انکشافات سے خیالات کا ہجوم ہوا جس کا اظہار ۱۹۲۸ء میں کتاب "حکومت خود اختیاری" کے ذریعے کیا گیا۔

مگر خیالات کی تبدیلی سے پیر اور مرید دونوں کا عمل وہی رہا جس کی عادت پینتیس ۳۵ سال سے ہوگئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب اسی خالص تعلیمی کاموں کے چکر میں رہے۔ حتی کہ وہ اس دنیا سے چل بسے اور ان کا یہ مرید بھی حسب عادت قدیم تعلیمی کانفرنسوں اور حکام کی خدمت عرضداشتوں کے مشاغل میں لگا رہا۔ اور مسلمانوں کی حالت سے مایوس تھا اور سمجھتا تھا کہ اس مایوسی کی حالت میں مر جاؤں گا مگر یکایک معلوم ہوا کہ جس اندھیرے میں مسلمان گھرے ہوئے تھے، اس میں کمی اور ایک طرف سے روشنی کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور اب یقین ہوگیا کہ مسلمان جس دورِ تنزل میں تھے وہ بمنزلہ ایک کسوف کے تھا جو ختم ہو رہا ہے اور قریب وقت ہے کہ مسلمانوں پر بھی زندگی پیدا کرنے والی کرنیں پڑ رہی ہیں۔

اس انکشاف نے مادی شکل اختیار کرلی اور ہر چیز بدیہی معلوم ہونے لگی اب پھر ہجوم افکار اور خیالات ہوا اور یہ ارادہ کیا کہ مرنے سے قبل وہ ستاون سالہ تجربہ جو علی گڑھ تحریک سے وابستہ رہنے سے حاصل ہوا ہے مسلمانوں کے سامنے پیش کردوں اور انھیں خوش خبری دوں کہ ان کا دورِ انحطاط عرصہ ہوا ختم ہوچکا اور ان کا ہر قدم اب بلندی کی طرف اٹھ رہا ہے اور قریب وقت ہے کہ وہ اپنی اصلی جگہ جس کے وہ اسلام کے نام لیوا ہونے کی وجہ سے اہل ہیں حاصل کریں۔

طفیل احمد منگلور

۲۰ر نومبر ۱۹۳ء

اخلاق احمد

عربی زبان و ادب کا یورپ پر اثر

عربی ادب کے سلسلے میں یورپ کی مشرق پرستی سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مغربی ادب میں لاطینی ادب کے اثرات صدیوں سے چلے آرہے تھے اور نشاۃ ثانیہ کے بعد یونانی ادب حاوی ہوگیا۔ لیکن آٹھویں صدی سے لے کر تیرھویں صدی تک عربی ادب یا اسلامی ادب کا دور دورہ رہا۔ یورپ کے اندر ادبی فقدان تو نہیں تھا لیکن اس کے اندر ادبی شعور، نشوونما، عروج، نئے رجحانات، ادبی تحریک، معاشرتی اور اخلاقی نظریات کی نشاندہی نہیں ہو رہی تھی۔ جس سرزمین پر صدہا برس مسلمانوں کے ثقافتی اثرات باقی رہے۔ مشرق و مغرب کے خونی رشتے بھی قائم ہوگئے۔ ہسپانوی اور صقلوی خون کی آمیزش کی وجہ سے عربی نسل خالص نہیں رہ گئی تھی۔ معاشرہ ایک ہوگیا تو زبان اور ادب کی ہم آہنگی سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔ عربی سرکاری زبان تھی۔ اپنی افادیت کی کشش سے ہر دل عزیز ہوئی۔ لیکن پھر بھی علاقائی زبانوں کا وجود اپنی جگہ پر باقی رہا مسلمانوں کے عہد میں اسپین کے اندر مختلف زبانیں استعمال ہوتی تھیں۔

۱۔ کلاسیکی عربی یعنی ادبی زبان۔

۲۔ عام عربی جو انتظامیہ وغیرہ میں استعمال ہوتی تھیں۔

۳۔ پادریوں کی مذہبی لاطینی زبان

۔ رومانسی بولی

یہ رومانسی زبان چوں کہ وہاں کے عوام کی زبان تھی۔ اس لیے ادنیٰ سے اعلیٰ تک ہر ایک اس کو بولنے اور سمجھنے کے لیے مجبور تھا۔ اسپین کے عیسائی اور مسلمان دونوں نمایاں طور پر عربی سے واقف تھے۔ لیکن روزمرہ کی زندگی میں دونوں رومانسی زبان استعمال کرتے تھے جس میں کچھ عربی کے الفاظ بھی مل ہوتے تھے۔ لیکن ہسپانوی مسلمانوں نے اور وہاں کے عوام نے عربی زبان و ادب کو ترقی دی۔ دوسری طرف عرب ادیبوں نے رومانسی زبان کی طرف سے بے توجہی کا رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی جڑیں زیادہ مضبوط نہ ہوسکیں۔ مسلمانوں کے زوال کے بعد علاقائی زبان اور ادب کی ترقی لازمی تھی اور دھیرے دھیرے عربی زبان اور ادب کے نقوش مٹنے شروع ہوگئے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ نہ صرف جنوبی یورپ بلکہ پورا یورپ مسلمانوں کی زبان اور ادب سے متاثر ہوا۔ نویں دسویں صدی عباسی دور میں مسلمانوں کی ثقافت کے شباب کا زمانہ تھا۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں مسلمانوں کی ثقافت لاطینی دنیا یعنی یورپ میں منتقل ہوگئی۔ اور عہدِ وسطیٰ میں عیسائی ثقافت کا جز بن گئی۔ پھر پندرھویں اور سولھویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بن گئی۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے رات ہونے کو آئی مگر
بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ شہر کے گلی کوچے ندی نالے
بن گئے اور سارا کاروبار معطل ہو کے رہ گیا۔ آج بڑی حویلی میں بھی
سناٹا تھا۔ نوکر چاکر سب غائب تھے۔ آج ہر ایک اپنی مصیبت
میں گرفتار تھا۔ کسی کی دیوار ڈھ گئی تھی کسی کا گھر ٹپک رہا تھا
کھانا کھی بیگم صاحبہ خود ہی پکا رہی تھیں۔ صاحبِ خانہ کسی ذہنی
الجھن میں گرفتار ہو اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اتنے میں
عشا کی اذان سنائی دی۔ اب تو وہ بالکل ہی بیقرار ہو گئے۔ بیگم
سے کچھ کہا۔ پہلے تو انھوں نے حیرت سے اپنے بوڑھے باوقار شوہر کو
دیکھا پھر حکم کی تعمیل میں کھانے کی ایک پوٹلی میں تیار کر دی تو
یہ اسے چڑھا کے اس ہاتھ میں کھانے کی پوٹلی اور اس میں چھاتا
سنبھالے گھر سے نکلے اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جما جما کے قدم رکھتے
اپنے بھاری تن و توش کو سنبھالتے کوئی آدھ گھنٹے میں منزلِ مقصود تک
پہنچے۔ ایک کوٹھری کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ دروازہ کھولنے والے نے گھور کے
دیکھا۔ شاید اسے کم دکھائی دیتا تھا۔ رات کی تاریکی بھی کچھ کم نہ تھی۔ آ
نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا "اب آیا ہے کھانا لے کے؟ جا۔
لے جا۔ میں نہیں کھاتا"۔ یہ گڑگڑائے۔ "بارش ہو رہی ہے۔ دیر ہو گئی
معاف کر دو" اس نے نئی آواز سن کے کہا " اور غفور آج کہاں مر گیا؟
اس کی چھت گر پڑی۔ اس لیے نہیں آسکا " یہ کہہ کے پھر خوشامد کرنے
لگے " اب تو کھا لو۔ آئندہ دیر نہ ہو گی"۔ بڑے میاں نے بہت خوشامد
کی تب اس نے لقمہ توڑا۔ ان بزرگ کو وہ بیچارہ نہ پہچان سکا
تو آپ کیا پہچانے ہوں گے۔ سنیے، یہ تھے دولتِ آصفیہ (حیدرآباد)
کے بے تاج بادشاہ، سرسید کے دستِ راست، آل انڈیا مسلم لیگ کے
بانی یعنی وقار الدولہ وقار الملک نواب انتصار جنگ بہادر جن کے گھر سے
کسی محتاج کا کھانا مقرر تھا۔ بارش کی وجہ سے ملازم غیر حاضر تھا
تو علالت اور ضعیفی کے باوجود موسلا دھار بارش اور گھٹنوں گھٹنوں
پانی میں اس کا کھانا خود لے کر گئے۔ اس کی زبان سے برا بھلا سنا اور
خوشامد کر کے کھانا کھلایا۔ بڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں۔

* * * * * *

سسلی کے نارمن بادشاہ فریڈرک دوم کے زمانے میں خاص طور سے عربی
زبان، ادب اور شاعری کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یورپ کی مختلف
زبانوں میں عربی ادب کے خیالات اور طرز کا گہرا اثر پڑا۔ خاص طور سے فرانس
ادب پر عربی ادب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ رومی حکومت کے عہد وسطیٰ
شروع میں بیانیہ اور ناصحانہ نظم کا رواج تھا۔ موضوع یہ ہوتا تھا کہ عاشق
غیر معلوم محبوبہ کے لیے آہ و فغاں کرتا تھا۔ جنوبی فرانس کا غزل گو شاعر اسپین
کے تغزل کی تقلید کرتا تھا۔ عربی ادب کی وجہ سے عیسائی ادیبوں پر مبالغہ
آمیزی اور تخیل پرستی کا اثر ہوا۔

عربی زبان کے الفاظ یورپ کی مختلف زبانوں میں شامل ہو گئے
تھے اور ان کا استعمال عام ہو چکا تھا۔ جہاز رانی، بحری انتظام، لڑائی کے
نعرے، ہتھیاروں کے نام، جگہوں کے نام، علم و فن کے الفاظ، شکار
گیت، کھیل، تفریح اور سائنس کے لیے عربی الفاظ استعمال ہوتے تھے۔
یورپ کی نئی شاعری اور عربی شاعری کے روابط سے انکار نہیں کیا جا سکتا
عربی نثر کا اثر علمی اور فلسفیانہ کتابوں، اخلاقی تمثیلوں اور قصے کہانیوں
ذریعے ہوا۔ مشرق کی کہانیاں یورپ میں رائج ہوئیں۔ عربی سفرنامے شوق
پڑھے جاتے تھے۔ کیوں کہ پڑھنے والوں کو دور دور کے احوال، معلومات
دلچسپی حاصل ہوتی تھی۔ عربی سے ترجمہ ہونے والی چند کتابیں خاص طور سے
اثر انداز ہوئیں۔

کتاب سند باد، کلیلہ و دمنہ، مقاماتِ حریری، الف لیلہ
گلستاں، بوستاں وغیرہ۔ ان ترجموں کے اثر سے رابنسن کروسو
جیسی کتاب یورپ کے اندر وجود میں آئی۔ سند باد، کلیلہ و دمنہ اور
الف لیلہ سنسکرت اور پہلوی زبان سے ماخوذ ثابت کی جاتی ہیں لیکن
پھر ان کی اہمیت کسی طرح سے کم نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح شیکسپیر کی حیثیت
یہ ثابت کرنے کے بعد کم نہیں کی جا سکتی ہے کہ اس کے ڈراموں کا انحصار تو
نوادرات پر ہے۔ دانتے، چوسر، بیکن، گوئٹے وغیرہ عربی ادب کے اچھوتے تخیل
اور ادبیات سے اثر انداز ہوئے۔

علم انساب بھی عربی زبان کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کا بہت کچھ تعلق عرب
کی قبائلی زندگی سے تھا۔ لیکن وہ سب سینوں میں محفوظ رہتا تھا۔ اس
کی بنیاد پر فن رجال کی تشکیل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات
زندگی اور اقوال و اعمال کو مسلمانوں نے جس طرح محفوظ اور مدون کیا۔
کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ روایات کے ذریعے حالاتِ زندگی
اقوال اور اعمال اس طرح پیش کیے گئے کہ ایک پاک اور عظیم ہستی کا پیکر مجسم
سامنے نظر آنے لگا۔

شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انجمن اساتذۂ اردو کی کانفرنس

کیرالا کی سرسبز و شاداب سرزمین پر ۳۰ ستمبر اور یکم اکتوبر ۸۴ء کو کل ہند انجمن اساتذۂ اردو کی دسویں کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ نے شرکت کی اور تدریس کے مسائل پر غور کیا۔ کانفرنس کے آغاز پر کیرالا یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے تالیوں کی گونج کے درمیان یہ یقین دہانی کی کہ کیرالا میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کیرالا میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اور یہاں اردو ٹیچرز کی تعداد دوسری تمام ریاستوں سے زیادہ ہے۔ اس موقع پر انجمن کے صدر پروفیسر محمد حسن نے جو خطبہ پیش فرمایا اس سے اردو کی تدریس کے اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے اور اُن کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے جو انجمن نے اردو کی تعلیم کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ اس لیے یہ خطبہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

خطبۂ صدارت :-

[یہ خطبہ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی دسویں کل ہند سالانہ کانفرنس بمقام ملاپرم (کیرالا) منعقدہ ۳۰ ستمبر و یکم اکتوبر ۸۴ء میں پڑھا گیا تھا۔]

دوستو اور رفیقو!

کیرالا میں اردو اساتذہ کی یہ محفل اردو کی دلربائی اور کیرالا کے رہنے بسنے والوں کی دلنوازی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ شکریے کے بہت سے لفظ موجود ہیں لیکن کوئی بھی ہمارے جذبات کو پوری طرح ادا کرنے پر قادر نہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی لمحہ ہے جب ہم اور آپ کیرالا کے جیالے میزبانوں کی دعوت پر ہندوستان کی آخری نکار پر یکجا ہو رہے ہیں اور یہ یکجائی کسی سرکاری ادارے کی نہیں ہے۔ اپنے خرچ سے یا اپنی یونیورسٹی کے خرچ سے آئے ہوئے ان اساتذہ کی یکجائی ہے جو ملک کی لگ بھگ ساٹھ یونیورسٹیوں میں اردو پڑھاتے ہیں اور کیرالا ایسے مقام پر ہے جہاں سے اس تہذیبی سنگم کا عمل شروع ہوا تھا جس نے اردو کی رنگارنگی کو جنم دیا۔ یہیں سے شنکر اچاریہ کی [illegible] جس نے تت توام اسی اور وحدت الوجود کے رشتے استوار کرائے۔ یہیں وہ [illegible] تاجر پہلی بار آئے جنھوں نے عرب اور مغربی ایشیا کی تہذیبی قدروں کو ہندوستانی آب و ہوا سے روشناس کرایا ہے۔ بے شک کیرالا میں اردو اس طرح پروان نہیں چڑھی جس طرح کرناٹک اور آندھرا میں پلی بڑھی۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ملیالم اور اردو کے رشتے تہذیبوں اور قدیم زبانوں کی وراثت میں دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ کیرالا میں اردو سے دلچسپی دن بدن بڑھ رہی ہے اور ہزاروں طلبا اردو پڑھ رہے ہیں۔ کیرالا فراخ دلی اور روشن خیالی کی سرزمین ہے اور اردو ادب محبت اور آزادی کی امانت۔ اس اعتبار سے یہ لمحہ بڑا تاریخی ہے کہ مدتوں بعد اردو کیرالا میں اس انداز سے پہنچی ہے۔ یہ بات اس کا ثبوت ہے کہ اردو جسے ہمیں [illegible] پھیلی و پنپی ہے۔ سب ہی اردو اساتذہ کی طرف سے کیرالا کے میزبانوں کا شکریہ اور اپنی طرف سے اپنے رفیقوں کا شکریہ جنھوں نے اس یادگار موقع پر صدارت کی عزت بخشی۔ امید ہے کہ کیرالا کے رشتے اب اور زیادہ گہرے، وسیع اور مستحکم ہوں گے اور اردو کے گلدستے میں کیرالا کے دلکش رنگ بھی جلد شامل ہوں گے۔

رفیقو! ہم سال بھر سے زیادہ مدت کے بعد مل رہے ہیں۔ مدراس کانفرنس میں جو کچھ تجاویز منظور ہوئی تھیں اور جو ارادے کیے تھے ان پر عمل درآمد کی رپورٹ آفس سکریٹری سے معلوم ہو گئی ہے جن کی کارکردگی کا اعتراف واجب ہے۔ مختصراً اس مدت میں ۲۱ مارچ کو ہر سال ہندوستان گیر پیمانے پر یوم اردو منانے کی روایت قائم ہوئی اور ہر علاقے کے اردو اساتذہ نے اردو تعلیم کی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ تجاویز منظور کیں اور عملی اقدام کیے۔ کرناٹک، بہار اور راجستھان میں انجمن اساتذہ اردو کی علاقائی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ انجمن کا وفد وزیر تعلیم سے ملا جس کے نتیجے کے طور پر لکھنؤ میں مرکزی حکومت کے ادارے سینٹر آف انڈین لنگویجز کے زیر اہتمام اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا مرکز قائم ہوا۔ اردو کو اس کا آئینی حق دلانے کے سوال پر مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندہ ممبران پارلیمنٹ کا مشاورتی جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ ہندوستان گیر سطح پر اردو کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے انجمن نے جناب اندر کمار گجرال، جناب کلدیپ نائر، جناب خوشونت سنگھ اور صدر انجمن پر مشتمل ایک غیر سرکاری کمیٹی مقرر کیا جس نے کام [illegible]

کر دیا ہے۔ کل ہند پیمانے پر ثانوی اور ابتدائی درجوں کو اردو پڑھانے والے اساتذہ کی تنظیموں سے انجمن نے رابطہ قایم کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے ایک رابطہ کمیٹی بھی بنائی گئی۔ ملک گیر سطح پر اردو تعلیمی ٹرسٹ کی تشکیل کے لیے ایک مشاورتی جلسہ طلب کیا گیا۔ مگر بعض وجوہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا۔ صدر انجمن کو اس دوران برطانیہ میں اردو تعلیم کے انتظامات سے باخبر ہونے اور برطانیہ کے اردو فاداروں کی سرگرمیوں سے واقفیت بہم پہنچانے اور رابطہ قایم کرنے کا بھی موقع ملا ——— قاعدے کے مطابق تو انجمن کو صرف تعلیم و تدریس اور تحقیق ہی تک اپنے کاموں کو محدود رکھنا چاہیے تھا۔ مگر اردو زبان و ادب کو ہندوستان میں اور خاص طور پر شمالی ہند میں جو خطرات درپیش ہیں، ان کی وجہ سے استاد کو اردو کے محافظ اور مجاہد کے فرائض بھی ادا کرنے ہوتے ہیں۔ آج بھی اتر پردیش میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ نہیں ملا ہے اور معاملہ سپریم کورٹ کی آئینی بنچ کے سامنے ہے۔ کرناٹک میں اردو ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں اور اردو پڑھانے والے اساتذہ کا مستقبل خطرے میں ہے۔ ظاہر ہے کہ انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند اس صورت حال کی خاموش تماشائی نہیں رہ سکتی۔ اگر ابتدائی اور ثانوی سطحوں پر اردو نہ پڑھائی گئی تو یونیورسٹیوں میں اردو کون پڑھے گا۔ ہماری پوری کوشش ہے کہ اردو محض کلاسیکی زبان یا لائبریری کی زبان بن کر نہ رہ جائے۔ بلکہ ایک ایسے دور میں جب ۱۸ ملکوں میں اردو کی تعلیمی اور تدریسی سرگرمیاں جاری ہیں، اپنے وطن ہندوستان میں بھی اسے ایک زندہ کارآمد اور روزانہ کاروبار کی زبان وادب کا درجہ حاصل ہو۔ اس ضمن میں تعلیم و تدریس کی سطح پر ہماری بنیادی ضرورت ہے جدید تقاضوں کی مطابقت اور تحقیق کی سطح پر ہماری بنیادی ضرورت ہے Problem Oriented Research جایزیاتی کے بجائے مسایل حل کرنے والی تحقیق ——— جدید تقاضوں سے تعلیم کی مطابقت آج ایک اہم موضوع ہے اردو تعلیم کو روٹی روزی سے جوڑنے کی بات ضروری سہی مگر خاصی سطحی ہے اور تعلیم محض روٹی روزی کی بدلتی ہوئی مصلحتوں کی بیساکھیوں پر نہیں چل سکتی۔ تعلیم انسان کے وسیع تر اور اہم تر مقصد کو پورا کرتی ہے۔ اس کے حواس کی تربیت کرتی ہے اسے سوچنے اور محسوس کرنے کا بہتر طریقہ سکھاتی ہے۔ احساس جذبے اور شعور میں توازن اور ترتیب و ربط پیدا کرتی ہے۔ اعلیٰ تر شخصیت کی تشکیل ادب کا مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد جتنا اور جس قدر کامیابی کے ساتھ مادری زبان میں حاصل ہو سکتا ہے، اتنا کسی اور وسیلے سے ممکن نہیں۔ روٹی روزی اس بہتر شخصیت کی تعمیر کا محض ایک ضمنی پہلو ہے۔ بہتر شخصیت کی تشکیل و تعمیر کے اس کام میں پوری انسانیت کی قیمتی وراثت کا عرفان اور اظہار کی قدرت اور صلاحیت مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اپنی وراثت سے دن بدن بے خبر ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو ادب کے گرتے ہوئے معیاروں کا یہی سبب ہے ضرورت ہے کہ کلاسیکی اسالیب سے ہماری واقفیت زیادہ مستحکم بنیادوں پر قایم ہو جس کے معنیٰ ہیں منتخب متون کی لفظاً لفظاً تعلیم اور دوسری طرف ادبی ماخذوں اور سرچشموں سے ہمارے طالب علم بہتر طور پر واقف ہوں۔ خاص طور پر قدیم فارسی اور اس کی ادبی روایات سے اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ادب سے اور بالخصوص اردو تراجم میں مہیا ہونے والے مختلف علاقائی زبانوں کے ادب سے بھی ہماری سرسری واقفیت ضروری ہے۔ پھر عالمی ادب کے شہ پاروں اور ادبی میلانات سے بھی تھوڑی بہت شناسائی مناسب بلکہ ناگزیر ہے۔ اظہار زبان پر قدرت چاہتا ہے۔ اظہار کے لیے مشق اور شوق شرط ہے۔ اردو کا طالب علم اگر محض گونگا اور بہرہ ہو تو تعلیم کا مقصد پورا نہ ہوگا۔ خواہ سائنس اور ٹکنالوجی کتنی ہی ترقی کیوں نہ کریں، اظہار کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور اظہار ادب سکھاتا ہے جو بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب سے وجود پاتا ہے۔ بات کہنے کے بہت سے ڈھنگ ہیں اسی لیے بات کا ڈھب پانا بھی اظہار شناسی کے بغیر ممکن نہیں۔ الفاظ محض ادب کا کاروبار نہیں ہیں۔ بلکہ زندگی اظہار اور ربط کی بنیاد ہے۔ انسان ٹکنالوجی کے ذریعے دنیا بدل ڈالے۔ مگر ٹکنالوجی کو سنبھالنے اور برتنے کے لیے انسان کے اندر جو اندرونی تبدیلیاں لانا ضروری ہوں گی وہ اظہار اور آہنگ کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ اندرونی تبدیلی کا عمل جس قدر مادری زبان پڑھانے والا استاد متاثر کر سکتا ہے، اتنا کسی دوسرے مضمون کا استاد نہیں کر سکتا۔ دوسرے اساتذہ اور ماہرین معلومات فراہم کر سکتے ہیں مادری زبان اور ادب کا استاد یہی سب ہم کیوں کر کر سکتے ہیں اور کیوں کر زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں یہی اس کانفرنس کا موضوع ہے۔ ظاہر ہے بہتر نصاب اور بہتر طریقہ تعلیم پر غور کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ دنیا کے اٹھارہ ملکوں میں اردو زبان وادب کی تعلیم ہو رہی ہے۔ ان ملکوں کی الگ نصابی ضرورتوں کے باوجود عالمگیر سطح پر نصاب کی فراہمی اور تدوین کے سلسلے میں رابطے قایم کیے جانے چاہییں۔ اردو ہندوستان کی زبان کی ہے اور یہ بات ہماری حکومت اور وزارت خارجہ کو سمجھنی اور سمجھانی چاہیے۔ اس لیے اردو کی تعلیم و تدریس اور نصاب کی تدوین اور تعلیمی ساز و سامان تیار کرنے کے سلسلے میں ہندوستانی اردو اساتذہ کو مرکزی حیثیت ہونی چاہیے اور اس نصاب اور تعلیمی ساز و سامان سے ہمیں خود بھی ہندوستانی یونیورسٹیوں میں فیض پہنچانا چاہیے۔ وسیلۂ اظہار کے ساتھ ساتھ تحقیق کی بھی مرکزی اہمیت ہے۔ ابھی تک ہماری تحقیق بڑی حد تک جایزے کی رہی ہے۔ یہ کام بھی کسی حد تک ضروری تھا اور اب بھی اس کی گنجائش ہے مگر اب وہ مرحلہ آگیا ہے جب تحقیق کو جایزیاتی سے زیادہ مسایلی ہونا چاہیے۔ تاکہ زبان وادب اور سماج کے باہمی ربط و تعلق سے ابھرنے والے سوالات کے جوابات تلاش کیے جا سکیں۔ اس سلسلہ میں ہر یونیورسٹی کو اپنے طور پر تحقیق دائرہ کار طے کرنا ہوگا۔

رفیقو! انجمن اساتذۂ اردو کی یہ کانفرنس نئے سفر کے لیے نئے عزم و حوصلے فراہم کرتی ہے۔ ہم اس موقع پر اپنی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کو دور کر کے نئی منزلوں تک پہنچنے کا عہد کرتے ہیں۔ اردو کی تعلیم و تدریس ملک میں مسایل سے دوچار ہے، اس کے پیش نظر ہمیں اس عہد کی تجدید کی ضرورت ہے کہ اردو کا استاد ملک کی تہذیبی رنگارنگی اور یک جہتی کا شاید سب سے اہم محافظ اور مجاہد

کیوں کہ اس کی زبان اور ادب کشمیر سے کنیا کماری تک قومی یگانگت کا نشان ہے اور وہ علاقے، رنگ، نسل اور مذہب کی تفرقہ بندیوں میں محدود نہیں ہے۔ اردو کے استاد کو کسی معذرت کی ضرورت ہے نہ مصلحت پرستی کی کیوں کہ اس کے لیے قومی یگانگت مصلحت نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ رنگارنگی میں یک جہتی اور تنوع میں وحدت اور ہم آہنگی اس کا مزاج ہے۔ نظامی بیدری سے وحشت کلکتوی تک سب اس کے اپنے ہیں جن کے نغمے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سننے والوں کے دلوں کو مسحور کرتے ہیں۔ آج سے پہلے اس کی ضرورت شاید کبھی اتنی شدید نہیں تھی کہ تمام خاکساری اور انکساری کے باوجود اردو کا استاد افتخار و اعتماد کے ساتھ سربلندی کا شعور رکھے، عبوری دور کی دشواریوں کے باوجود کسی دوسرے علم و فن کے استاد سے اپنے کو کمتر نہ سمجھے، پوری ہوشمندی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ اپنے تعلیمی مسایل حل کرے اور باہمی اتحاد و اتفاق میل ملاپ، خوش دلی اور محنت کی وہ فضا پیدا کرے کہ ناموافق حالات اس کے لیے اور اس کی زبان و ادب کے لیے حوصلہ اور امید کی بشارت بن جائیں۔ علم کا صحیح منصب بھی یہی ہے کہ جہالت، کم ہمتی اور زبوں حالی میں حوصلے، امید اور عرفان کا چراغ جلائے اور جب وقتی طور پر سماج کے کچھ حصے، خواہ وہ کتنے ہی بااثر اور باحیثیت کیوں نہ ہوں، تفرقہ بازی اور تعصب میں مبتلا ہو جائیں، خواہ وہ تعصب لسانی ہو، نسلی ہو، علاقائی ہو یا مذہبی، گھٹا ٹوپ اندھیرے کے ان لمحوں میں بھی وہ روشنی کی ننھی سی کرن کی حفاظت کرے اور اپنے خون جگر سے ان چراغوں کو صبح ہونے تک روشن رکھے۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخون دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

پروفیسر محمد حسن
صدر شعبۂ اردو، جے این یو، دہلی

یونیورسٹی کے ایک مخلص سابق طالب علم کا مکتوب

محترم سید حامد صاحب

آپ کا ۲۵ ستمبر کا خط پاکر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ شری نرملیش جی نے آپ کو میرے متعلق جو کچھ اطلاع دی وہ مبالغہ اور جانبداری پر مبنی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ یکم دسمبر ۱۹۲۰ء کو ہوا اور یونیورسٹی کا پہلا امتحان ۱۹۲۱ء میں اور میں اس امتحان میں شریک ہوا تھا۔ ہائی اسکول کے امتحان میں صرف انیس لڑکے بیٹھے، میں اُن میں سے ایک تھا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان میں نے ۱۹۲۳ء میں دیا۔ اس وقت تک یونیورسٹی تسلیم کر لی گئی تھی۔

میں نے قانون کی پریکٹس ۱۹۲۷ء میں شروع کر دی۔ گزشتہ سال ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے مجھے بہ حیثیت اپنے سب سے بزرگ ممبر کے عزت بخشی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین، سر ضیاء الدین کی شادی میرے سامنے ہوئی تھی اور مجھے راس مسعود صاحب کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔

چوں کہ آپ میری مادر درس گاہ کے سربراہ ہیں اس لیے میں آپ کو اپنا وائس چانسلر سمجھتا ہوں۔ میں آپ سے ملاقات کا بے چشم براہ رہوں گا اور آپ سے اسی احترام سے ملوں گا جو میں آپ کے پیش رو ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کے ساتھ روا رکھتا تھا۔

آپ کا مخلص
گیا دھر پرشاد بھارگوا

تنہائی ان لوگوں کو محرومیوں اور ناکامیوں کا احساس دلاتی ہے جو اس سے گریز کرتے ہیں۔ تنہائی سے پیار کے صلہ میں خود اعتمادی حاصل ہوا کرتی ہے۔

مشکور حسین یاد: تنہائی

"تم میرے ہاتھوں کو زنجیروں سے باندھ سکتے ہو اور میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال سکتے ہو لیکن تم میری روح کو غلام نہیں بنا سکتے کیوں کہ یہ آزاد ہے باد صبا کی طرح جو آسمان کی لامحدود وسعتوں میں منڈلاتی پھرتی ہو"

خلیل جبران

عقلِ عمومی کا
یقینی اور منصفانہ فیصلہ

سید کاظم نقوی

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو

کہیں یہ نظم و نسق غلطی یا بدنظمیوں کا نتیجہ نہ ہو!

مادہ پرست اور وجودِ خدا کے منکرین کا طبقہ کہہ سکتا ہے:

" سب سے مضبوط اور بنیادی دلیل وجودِ خدا کو ثابت کرنے کے لیے یہی پیش کی جاتی ہے کہ ہمیں پوری کائنات میں اغراض و مقاصد کے لحاظ سے خاص توازن اور نظم و ضبط دکھائی دیتا ہے۔ ایسا اتفاقی طور پر نہیں ہو سکتا، اس " اتفاق " کے جو بھی معنی قرار دیے جائیں۔

یہ دلیل مذکورہ دعوے کو اس صورت میں ثابت کرتی ہے جب کہ ہر چیز شروع سے ہی ایسی متوازن اور منظم صورت سے وجود میں آئی ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ پیدائشِ عالم کی ابتدا میں ہزاروں ناموزوں، غیر منظم، ناقص، معیوب موجودات ہوں، کروڑوں برس کی مدت میں رفتہ رفتہ عیوب اور نقائص دور ہوئے اور بے شمار تبدیلیوں کے بعد تدریجی طور سے وہ اس ارتقاء اور کمال کے نقطے تک پہنچے ہوں؟

اس لیے موجودہ ارتقا، توازن، تناسب اور نظم و ضبط تدریجی ترقیوں کی ایک لمبی زنجیر کی آخری کڑی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ عقل و شعور کے بجائے اتفاقات کی پیداوار ہو۔

زیادہ کھلے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ خدا پرستوں کا کہنا ہے کہ یہ عالم خود بخود اتفاقاً موجود نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اس میں ہمیں نظم و ضبط دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ہم مادّہ پرستوں کا طبقہ اس بات کے مقابلے میں کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ شروع شروع میں خود بخود ہزاروں غیر منظم، بے فائدہ موجودات، ہزاروں معیوب، ناقص جاندار اور درخت پیدا ہوئے ہوں، چوں کہ وہ مکمل طور پر باقی رہنے کی شرطوں سے محروم تھے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ فنا ہو گئے۔ ان کے صرف وہ موزوں حصے باقی رہ گئے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ یہ صورتیں خود بخود حاصل کر لیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔"

اٹھارویں صدی کے فلاسفہ میں سے ڈینس ڈائیڈیروٹ DANIS DIDEROT کا غالباً یہی نظریہ تھا، وہ کہتے ہیں:

" ہم اس دور میں موجودات کو دیکھتے اور انھیں مکمل پاتے ہیں۔ ہمیں اس کی خبر نہیں کہ نیچر کے آغوش میں کتنے ناقص موجودات نے آنکھیں کھولیں ... رفتہ وجودِ زندگی کے اس نقطے تک پہنچا ہے۔" (قصۃ الفلسفۃ الحدیثۃ)

بہرکیف مادہ پرستوں کی ایک جماعت بڑے شد و مد سے یہ اعتراض کرتی ... درحقیقت یہ اعتراض ڈارون کے " انتخابِ طبیعی " کے نظریے میں وسعت پیدا کر... ہے۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار صرف جانداروں کے متعلق کیا ہے ... مادیین نے اس خیال کی چار دیواری میں تمام موجودات کو داخل کر لیا ہے ... بعید نہیں کہ ڈارون کے نظریے کی بنیاد اس ہمہ گیر اصول کے اوپر ہو۔

مذکورہ نقطۂ نظر کئی وجہوں سے صحیح نہیں ہے:

پہلی " حسابِ احتمالات اس کے منافی ہے

آپ کی نظر میں ہے کہ ہم نے عرض کیا کہ اس دنیا میں جب کوئی چیز ... آنکھوں کے سامنے آئے تو اس کے مختلف طرح سے وجود میں آنے کے احتمالات ہمیں حساب لگانا چاہیے۔ اس کے بعد یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس طرح کے ... اور منظم وجود کے احتمال کی نسبت دوسرے احتمالات سے کیا ہے؟ مثلاً جس ... ہم آنکھیں بند کر کے قلم کو صفحۂ کاغذ پر رکھ کر حرکت دیں تو چند احتمال ہیں ... کہ اس جنبش کے نتیجے میں ایک خطِ مستقیم بصورت الف صفحۂ کاغذ پر ابھرے، ممکن ہے کہ ایک خطِ منحنی کھنچ جائے۔ اس کی بھی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ خلاصہ ایک حرف کی پیدائش کے سلسلے میں بہت سے احتمالات ہیں جن میں سے ایک صحیح اور بقیہ غلط ہیں۔ جب ایک حرف کے سلسلے میں سے وجود میں آنے کے لیے بیسیوں احتمال ہیں تو ایک مکمل جملے، ایک منظم قصیدے، ایک علمی مضمون، ایک بلند پایہ کتاب کے اتفاقی طور سے، قلم کی غیر شعوری حرکت کے نتیجے میں موجود ہونے کے لیے احتمالات کی تعداد لاکھوں بلکہ کروڑوں تک پہنچ جائے گی۔

اس بنا پر ہمارا دعویٰ ہے کہ موجودہ نظمِ کائنات جس طرح بھی پیدا ہوا ہو، دفعتاً یا تدریجاً اس دلیل احتمالات کی روشنی میں خود بخود نہیں ہو سکتا، یعنی یہ احتمال اتنا کمزور ہے جو صفر کے برابر ہے۔

بالفرض اگر ہم سے میں سے کوئی شخص " کولمبس " کے ساتھ پہلے پہل ... گیا ہوتا، وہاں کے لوگوں میں سے کوئی اسے اتفاق سے دکھائی نہ دیتا، صرف

ایک عظیم انسان شہر کے آثار آنکھوں کے سامنے آتے جہاں رہنے والا کوئی نظر نہ آتا
نقشہ منظم طور سے، چوڑی چوڑی سڑکیں، گوناگوں خوبصورت عمارتیں، سبز و شاداب
پارک شہر کے مختلف حصوں میں بلندیوں پر حسین مجسمے سلیقے سے نصب دکھائی دکھاتے
تو اگر تمام دنیا کے لوگ مل کر اسے یقین دلاتے کہ یہ سب مناظر نیچرل اسباب کا نتیجہ
ہیں۔ کروڑوں سال کی طویل مدت میں دھیمی اور تیز ہواؤں، ہلکی اور موسلا دھار
بارشوں، سورج کی دھوپ اور چاند کی چاندنی سے مختلف ناقص اور غیر ناقص
نقوش ابھارے۔ ان میں سے یہ آثار اپنے کو باقی رکھ سکے ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ
خود بخود نیست و نابود ہوگئے۔ ان موجودات کو کوئی باشعور طاقت معرضِ شہود
پر نہیں لائی ہے۔ تو کیا وہ شخص ان یقین دہانیوں سے رتی بھر متاثر ہوتا؟ کیا
اس کے برعکس ہر صاحب عقل اس قسم کی چیزوں کو دیکھ کر یقینی طور سے یہ فیصلہ
نہ کرتا کہ انھیں کوئی باشعور طاقت اپنے ارادے سے وجود میں لائی ہے؟

یوں ہی اگر بوعلی سینا کا قانون، ملّا صدرا کی اسفار، عفرانساب کی
عماد الاسلام یا کوئی دوسری کتاب ہمارے ہاتھ میں دے دی جائے تو کیا ہمیں
اس کے متعلق یہ شبہ ہوگا کہ یہ کتاب بے سواد، ان پڑھ لوگوں کے قلم کی لاکھوں
جنبشوں کے نتیجے میں اتفاق سے مرتب ہوگئی ہے؟ یہ بے شمار نسخوں میں سے ایک
عمدہ نسخہ ہے، ناقص کتابیں تدریجاً فنا ہوگئیں اور یہ کامل نسخہ باقی رہ گیا۔

شرائط بقا اور شرائط ارتقا۔

اگر محترم مادہ پرست طبقے کا یہ خیال صحیح ہو کہ شروع میں کروڑوں غیر منظم
ناقص موجودات تھے۔ رفتہ رفتہ وہ باقی رہنے کی صلاحیت سے محروم ہونے کی
بنا پر وہ فنا ہوگئے، صرف ایسے موجودات باقی رہ گئے جو باقی رہنے کی صلاحیت
کے مالک تھے تو یہ ماننا پڑے گا کہ تدریجی ارتقاء صرف اس طرح کے نظام اور
توازن کو پیدا کر سکتا ہے جو موجودات کے باقی رہنے کی شرط اولین ہو، لیکن
وہ ہرگز ان کے دوسرے کمالات اور خصوصیات کے وجود میں آنے کا ذمہ دار
نہیں ہو سکتا جن کا ان کی زندگی میں رتی بھر دخل نہیں ہے۔

اس مجمل اور مبہم چھوٹی سی بات کو کھول کر تفصیل سے یوں عرض کیا جا سکتا
ہے کہ اس وقت موجودات میں ہمیں دو طرح کا نظام اور تناسب دکھائی دے رہا
ہے۔ ایک وہ نظم جو ان کے باقی رہنے کی شرط ہے۔ یہ نظام اور توازن اگر نہ
رہے تو وہ موجودات نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دوسرا نظام
و توازن وہ ہے جس کا ان موجودات کو باقی رکھنے میں کوئی دخل نہیں ہے۔
اس کے سایے میں یہ صرف ترقی کے منازل طے کرتے، پھلتے پھولتے اور
پروان چڑھتے ہیں۔ اس نظم کے نہ ہونے کی وجہ سے موجودات فنا نہیں ہو
جائیں گے۔ اس کا نہ ہونا صرف ان کی راحت و آسائش میں خلل پیدا کرے
گا۔ انھیں زحمتوں اور دشواریوں سے دوچار کر کے ان کی زندگی دوبھر

کر دے گا۔ ظاہر ہے کہ تدریجی ارتقا کو صرف نظام و توازن کی پہلی قسم کا سہرا
دیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس نظریے کے مطابق ناقص موجودات صلاحیت سے
محروم ہونے کی بنا پر فنا ہوگئے اور بقیہ استعداد بقا کے مالک ہونے کی
باقی رہ گئے ہیں، لیکن مادہ پرست طبقے کے خیال کی روشنی میں نظام موجودات کی
دوسری قسم کا کیا سبب قرار دیا جائے گا جس کا ان کے زندہ اور باقی رہنے سے
کوئی تعلق نہیں ہے؟!

اس بات کے مزید صاف ہونے کی غرض سے ہزاروں مثالوں میں سے
چند مثالیں بطور نمونہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

ا۔ انسان کے جسم میں بیسیوں ایسی خصوصیتیں دکھائی دیتی
ہیں جن کے نہ ہونے سے اس کی زندگی ہرگز خطرے میں نہیں پڑے گی۔
اگر بالوں کی جڑوں کے ارد گرد چکنائی کے غدود نرم کرنے کی غرض سے
اگر آواز کی لہروں کو اکٹھا کرنے کے لیے کانوں کی لویں اور ان کے زاویے
اگر روشنی کی موجوں کو جمع کرنے کے واسطے آنکھوں کی پتلیوں میں اندر
اگر آنکھوں کو گرد و غبار سے بچانے کی خاطر پلکوں کی چلمنیں نہ ہوتیں
اگر دانتوں کی تین قسمیں نہ ہوتیں۔ سامنے کے دانت کاٹنے کی غرض سے، بیچ کے دانت
کی غرض سے، داڑھیں چبانے اور پیسنے کی غرض سے۔ اگر ہمارے ہاتھوں اور
ہتھیلیوں میں یہ لکیریں نہ ہوتیں جو چیزوں کو پھسل جانے سے روکتی ہیں،
اگر ہاتھوں اور پیروں کی ہڈیوں کے موجودہ جوڑ نہ ہوتے جو انتہائی سہولت و
آسانی کا باعث ہیں تو ہرگز انسان مر نہ جاتا، صرف زحمتوں میں مبتلا ہو کر
اس کی زندگی میں تلخی پیدا ہو جاتی۔ وہ راحت و آرام کے ساتھ زندہ نہ رہتا۔
آیا تدریجی ترقی کا اصول انسانی جسم کے اس طرح کے نظم و توازن کی وجہ
بتا سکتا ہے؟

ب۔ اگر ہماری زمین کے سینے میں طرح طرح کے معدنیات
نہ ہوتے، اگر بجلی کی طاقت نہ ہوتی، اگر موجودات عالم کے دل میں ایٹمی طاقت
نہ موجود ہوتی، اگر تمام خشکیاں زمین کے نصف حصے کرۂ جنوبی میں ہوتیں
تمام سمندر اس کے دوسرے نصف حصے کرۂ شمالی میں واقع ہوتے، اگر
میں غیر معمولی نشیب و فراز ہوتا، اگر تمام دریا اور سمندر ایسے کھارے
سے بھرے ہوتے جس کا پینا کسی جاندار کے لیے خوشگوار نہ ہوتا، اگر پرند
جسم پروں سے ڈھکا ہوا نہ ہوتا، اگر ان کی موجودہ ساخت کے بجائے کوئی
ساخت ہوتی، اگر ان کا وزن دوسرے زمین کے جانوروں سے کم نہ ہوتا
وہ سب بڑے بڑے چمگادڑوں کی طرح وزنی نہ ہوتے، اگر وہ انڈوں کے
بچے دیتے اور ایسے ہی دوسرے صفات سے متصف ہوتے تو کیا ہم اور
ہو جاتے؟ ہرگز نہیں آرام سے زندگی نہ بسر کر سکتے تھے، اپنی زندگی سے بیزار

"والدین اور اولاد کے خیالات میں کتنا فرق ہوتا ہے؟ اتنا ہی جتنا کہ ماضی اور حال میں۔ موجودہ نسل اور متقدمین میں"

احمد علی: شادی: شعلے

آگر ہمارا علم معدوم ہوجائے اور عقل و ادراک کے واپس آنے کی امید نہ رہے تو وقت بھی معدوم ہوجائے گا

وحید الدین سلیم۔
مضامین سلیم

فائدہ نہ اٹھا سکتے۔

خلاصہ یہ کہ عالم ہستی کا دائرۂ نظام و تناسب ارتقاء ندریجی کا دائرۂ کار سے بہت زیادہ وسیع ہے، کیوں کہ یہ گفتگو "انتخاب طبیعی" "بقاء اصلح"، ماحول کے غیر مطابق، ناقص موجودات کی فنا کے مسائل کے گرد چکر لگاتی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ رخ نظم و ترتیب کی صرف ایک قسم کی توجیہ کرسکتا ہے، لیکن اس کی تطبیق ان کمالات، ان دقیق وعمیق باریکیوں کے اوپر نہیں ہوسکتی جن کا دخل موجودات کی اصل زندگی میں بالکل نہیں ہے۔

مذکورۂ بالا دقیق مطلب ایک دوسری مثال سے زیادہ واضح ہوجاتا ہے: فرض کیجیے کہ کسی پہاڑ میں متعدد غاروں کے نشانات ہمیں دکھائی دیتے ہیں ان میں سے صرف ایک بہت بڑا غار باقی رہ گیا اور بقیہ فنا ہوگئے۔ انھیں دیکھ کر آپ یہی کہیں گے کہ وہ کچھ نیچرل اسباب کی وجہ سے رفتہ رفتہ مٹ گئے۔ یہ ایک بڑا غار "انتخاب طبیعی" اور "بقاء اصلح" کے اصول کے ماتحت باقی رہ گیا۔ کیوں کہ اس کا دہانہ بہت وسیع، اس کی گہرائی بہت زیادہ، اس کے پتھر بہت زائد مضبوط تھے، لیکن اگر اس غار کی دیواروں پر ابھرے ہوئے خوبصورت، تاریخی نقش و نگار دکھائی دیں تو انھیں ہرگز کوئی صاحب عقل "انتخاب طبیعی" اور "بقاء اصلح" کے اصول کا نتیجہ نہیں قرار دے گا، کیوں کہ جو چیز اس اصول کا نتیجہ ہوسکتی ہے، وہ فقط اس غار کی بقا ہے۔ یہ مزید خصوصیات جن کے ہونے اور نہ ہونے کی نسبت اس غار کی بقا کے لحاظ سے یکساں ہے۔ "انتخاب طبیعی" اور "بقاء اصلح" کا اصول ان کا سبب نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ جس چیز کا تعلق اس اصول سے ہے وہ فقط اس غار کا مضبوط اور مستحکم ہونا ہے۔ اس سے ان

مزید خصوصیات کا کوئی تعلق نہیں ہے جن کے وجود اور عدم دونوں کی حیثیت ان کے باقی رہنے کے لحاظ سے یکساں ہے۔ اس بنا پر موجودات عالم کی یہ نزاکت و لطافت ان کے بارے میں جس باریک بینی سے کام لیا گیا ہے وہ واضح طور پر بتا رہی ہے کہ زندگی ابتدائی شرائط کے تقاضے سے بہت بلند نقطہ پر آشیانۂ کمال بنایا گیا ہے۔ ان موجودات کو دیکھ کر بآسانی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے وجود کا ایک مقصد ہے، انھیں گویا کسی منصوبے اور پروگرام کے ماتحت وجود میں لایا گیا ہے۔

براہِ مہربانی تدریجی ارتقاء کا قائل دکھلائیے!

گذشتہ دو باتوں سے چشم پوشی کرنے کے بعد مادہ پرستوں کے مذکورہ اقوال میں یہ کمزوری نظر آتی ہے کہ اگر وہ صحیح ہے تو اس ہماری زمین کی جو کھدائیاں برابر ہوا کرتی ہیں، ان کے اندر سے ان ناقص اور ناموزوں موجودات کے ڈھانچے نکلا چاہئیں جو ان کے نقطۂ نظر کی پرزور تائید کریں، جو ہمیں صاف صاف لفظوں میں یہ بتائیں کہ جو مرتب، موزوں اور منظم چیزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں، انھیں ہزاروں ناموزوں اور غیر منظم موجودات کے درمیان سے چنا گیا ہے۔ لاکھوں برس کی تبدیلیوں کے بعد انھوں نے یہ دیدہ زیب، خوشنما، تمام ضروریات زندگی کے مطابق شکل و صورت پائی ہے، لیکن اسے کس کی خوش قسمتی یا بدقسمتی سمجھا جائے کہ آثار قدیمہ کا زندہ اور جیتا جاگتا علم اس کے خلاف فیصلہ کر رہا ہے۔ ہم جتنا جتنا اپنے پیروں پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں اور گذشتہ موجودات کے باقی ماندہ گھسے ہوئے ڈھانچوں کا معائنہ کرۂ زمین کے مختلف طبقات کے سینے میں کرتے ہیں، اتنا اتنا ہمارا یہ عقیدہ مستحکم اور پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب اپنی جگہ انتہائی مرتب و منظم ہیں ان میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اگرچہ وہ ہو بہو اس زمانے کے موجودات کے مانند نہیں ہیں، لیکن ان سے ملتے جلتے ضرور ہیں۔ زندگی کے باقی رہنے کے لیے اس دور کے موجودات کے پاس جو کچھ ہے وہی سب ان کے پاس بھی ہے

کیوں جناب والا! اگر اندھے اور آرٹ سے ناواقف شخص کے ہاتھ میں پنسل اور قلم دے دیں اور اس سے فرمائش کی جائے کہ اس کاغذ پر طوطے کی تصویر بنا دو تو شاید سیکڑوں کاغذ خراب کرنے کے بعد بھی وہ آپ کی فرمائش پوری نہ کرسکے گا۔ یہ ہزاروں کاغذ ردی کی ٹوکری میں جھونک دینے یا دیا سلائی دکھانے کے قابل ہوں گے۔ اگر یہ موجودات عالم، انسان اور جانور گونگے، بہرے اندھے بے بس، بے عقل نیچرل اسباب کی غیر اختیاری کارگزاری کا نتیجہ ہیں تو ان کو وجود میں لانے کی خاطر جو لاکھوں یا کروڑوں صاف ستھرے کاغذوں پر کھینچی گئی بے ڈھنگی ناموزوں، غیر منظم لکیروں کو بنا کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا وہ کہاں ہیں؟ زمین کی کس تہہ میں دبے ہوئے ہیں؟

ہمارے معزز مادہ پرست مفکرین کیوں خاموش ہیں؟ کس لیے وہ ہمارے سوال کا جواب نہیں دیتے؟

شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی

اُمِّ ہانی

النِّسَاءُ حِبَالَةُ الشَّیطَان

مذکورہ بالا حدیث شریف دیکھ کر میں چونک پڑی۔ النساء حبالۃ الشیطان یعنی عورتیں شیطان کی رسیاں ہیں۔ کیا یہ حدیث حقیقتاً مجسم ہو کر آج ہمارے روبرو نہیں ہے؟ وہی عورت جس کی تعظیم و توقیر کی خاطر اسلام نے بہترین قوانین بنائے، جس کی عزت و عظمت کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلائی۔ پھر انہیں عورتوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ "عورتیں شیطان کی رسیاں ہیں"۔

پہلے ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ رسی کس کام میں لائی جاتی ہے، اس کی کیا خصوصیت ہے؟ رسی ایک طرح کا جال اور پھندا ہے جس سے کسی کو پھانسنے کا کام لیا جاتا ہے۔ رسی گویا پھنسانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں اس حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ شیطان کسی کو پھانسنے کے لیے عورتوں کو ذریعہ بناتا ہے۔ ان کو جال بنا کر کسی کو دام میں پھنساتا ہے۔ شیطان تو موقع کا منتظر رہتا ہے۔ وہ ہر طریقے سے انسانوں کو گمراہ کرنے کے درپے رہتا ہے اور بہکانے کے لیے اسے عورتوں کو استعمال کرنا سب سے کارآمد لگتا ہے۔ اور اسے عورتیں سب سے بہترین ذریعہ نظر آتی ہیں۔

لیکن کبھی ہم عورتوں نے یہ سوچنے کی کوشش بھی کی ہے کہ آخر شیطان کا داؤ ہم پر کیونکر چل جاتا ہے؟ کیوں وہ ہمیں گناہ کروانے کا ذریعہ بنا رہا ہے؟ آخر اس کی ہمت کیسے ہوئی؟ وہ ہم پر اس قدر حاوی کیسے ہو گیا؟ ضرور ہم میں لغزشیں ہوں گی، خود ہم میں ہی کھوٹ ہوگا۔ تبھی شیطان کی اس قدر جرأت ہوئی کہ وہ ہمیں یوں زیر کر رہا ہے!

عصر حاضر میں جو چلن عورتوں نے اپنایا ہے اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ شیطان بھی اپنی مکاریوں اور عیاریوں میں مات کھا گیا ہے۔ آج عورتوں کی بے حیائی اور عریانی سے شیطان کے بھی تمام داؤ پیچ ماند پڑ گئے ہیں اور شاید ان کی ان بے ہودہ لغویات کو دیکھ کر شیطان بھی اپنی شیطنت کی بے وقعتی پر دنگ رہ جاتا ہو۔ اس نے تو ایک شوشہ چھوڑا بالکل اس رائی کو پربت بنانے والی، اس کو جلا دینے والی اور اس پر بالکل دل صاد کہنے والی یہی عورتیں ہیں۔

آزادی نسواں کی حامی عورتیں آئے دن احتجاجی جلوس نکالتی پھرتی ہیں، جگہ جگہ جلسے منعقد کرتی ہیں کہ ان کے ساتھ سڑکوں پر، سینما ہالوں، تفریح گاہوں اور بازاروں وغیرہ میں چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے اور چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں مگر وہ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ان مردوں اور لڑکوں کو برافروختہ کرنے کے پورے سامان سے لیس ہو کر وہ کیوں گھروں سے باہر نکلتی ہیں؟ کیوں ایسے عریاں ملبوسات زیب تن کیے رہتی ہیں کہ دیکھنے والوں کے ذہن آلودہ ہوں اور بری فطرت کے مرد اور لڑکے ان کے ساتھ فحاشی پر اتر آئیں؟ کیوں وہ اس قدر میک اپ سے لیس ہو کر نکلتی ہیں کہ خواہ مخواہ ان پر بری نظریں اٹھیں، ان سے فحش کلامی کی نوبت آ جائے اور لوگ عندیہ ظاہر کر کے اپنی حسی نفس کو تسکین دیں۔ جب عورتیں خود ہی اپنی طرف اس ڈھنگ سے راغب کرنے میں پیش پیش ہیں اور صرف مردوں کو دعوت نظارہ دینے کی غرض ہی سے وہ باہر نکلتی ہیں تو پھر سماج میں پھیلنے والے برے عناصر سے کیا شکوہ؟ ان کو اتنا موقع ہی کیوں فراہم کیا جائے کہ وہ ان سے چھیڑ چھاڑ کریں؟ یہ نوبت ہی کیوں آئے کہ وہ عفت و عصمت کے زندہ مجسمے ان کی فحاشیوں کا شکار بنیں؟ اور شرم و حیا کی سوداگری اس طرح ہوتی رہے!

مجھے تعجب ہوتا ہے ان عورتوں پر جو جلسے اور جلوس کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہیں، مگر جو عورتیں آج فحاشی کو اپنا وطیرہ بنا چکی ہیں ان کے خلاف یا عورتوں کے عریاں پوسٹرس اور اشتہارات کے خلاف کوئی نعرۂ احتجاج بلند نہیں کرتی ہیں! بلکہ انھیں کی تقلید کر کے بستہ رہتی ہیں سینما میں مردوں کے شانہ بشانہ بیٹھی ہوتی اور گردنوں کو فخر سے اکڑائے، اسمارٹ بننے کے اسٹائل میں بیٹھی ہوئی زنا بالجبر کے مناظر دیکھا کرتی ہیں۔ ان مکروہ حرکتوں کو دیکھ کر انھیں کراہت نہیں آتی، یہ بے ہودگیاں ان کی طبع نازک پر گراں بار نہیں ہوتیں۔

آہ! کیا ہو گیا ہے عورتوں کی غیرت و حمیت کو؟ خود اپنا ہی ننگا ناچ بڑے فخر سے دیکھ رہی ہیں۔ خود اپنی عزت کی دھجیاں اڑتے

ہوئے دیکھتی ہیں اور مسکراتی ہیں، خوش ہوتی ہیں کہ یہ تو محض تفریح ہے۔ اپنی ہی جیسی نازک آبگینہ سی عورتوں کو سربازار عریاں دیکھتی ہیں اور ہزاروں ناظرین کو اس منظر سے حظ اٹھاتے دیکھتی ہیں اور اسے صرف تفریح کا نام دیتی ہیں۔ تف ہے اسی تفریح پر جو شرم وحیا کو ریزہ ریزہ کر دے، جو عفت وعصمت کا جنازہ نکال دے۔

آزادئ نسواں کی حامی عورتیں تو بڑی بے باکی سے مختلف مسائل کے لیے احتجاجی جلوس نکالتی پھرتی ہیں۔ مخالف مضامین چھپواتی ہیں۔ بڑی بڑی عدالتوں میں مختلف مقدمات پیش کرتی ہیں لیکن کیا وہ ان فحاشیوں کے لیے احتجاج نہیں کر سکتیں؟ کہ عورتوں کو اس طرح سرعام بے عزت نہ کیا جائے۔ عورتیں گھروں کی زینت ہیں، مائیں ہیں، بہنیں ہیں، بیٹیاں ہیں، بیویاں ہیں، مردوں کے لیے سکون کا ذریعہ ہیں اور آئندہ نسلوں کی معمار ہیں۔ تو پھر تصویروں اور اشتہاروں کے ذریعہ ان کا اس طرح استحصال کرنا کہاں تک تہذیب و اخلاق کی تائید کرتا ہے مگر نہیں۔ عورتیں بڑے ذوق وشوق سے ان بے ہودگیوں کو سراہتی ہیں۔ اور پھر انھیں کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہو جاتی ہیں۔ اور پوری قوت وصلاحیت کے ساتھ ان کی نقالی میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ وہ خود شیطان کی رسیاں بن بیٹھی ہیں۔ پھر ایسی حالت میں شیطان سے یا شیطان نما آدمیوں سے شکوہ کناں ہونا عبث ہے۔

اس وقت ندامت سے سر جھک جاتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں جب شرم کا آنچل ڈالنے اور عفت کا زیور پہننے کی مستحق خواتین کا عکس بے جان صفحوں پر عریانی کا اشتہار بنی ہاتھوں ہاتھ بکتی نظر آتی ہیں۔ ہر طرح کی گندی نظروں کا شکار بنتی ہیں۔ اور زہر آلودہ ذہنوں کے لیے بدکاری اور بدمعاشی کا ذریعہ بنتی ہیں، انھیں بے ہودہ عوامل پر اکساتی ہیں اور پورے سماج کو گندہ کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں

میری مسلمان بہنو! آج آپ کو یہ بدنہاد تہذیب پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہمیں اس طرح تباہ ہونے سے بچالو! باطل نظام کو بدل ڈالو اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کرو!

کیا اب بھی وقت نہیں آگیا ہے کہ ہم خود میں ایمان کی قوت اور نیکیوں کی عصا لے کر اٹھ کھڑے ہوں تاکہ اس لادینیت اور شیطنت کا خاتمہ ہو سکے اور خدا اور اس کے سچے رسول مقبول سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بنائے ہوئے نظام کو قائم کرنے میں معاون بن سکیں اور خود شیطان کی رسیاں بن جانے جیسے ہتک آمیز فعل سے بری الذمہ ہو جائیں۔

اقبال منزل، اسٹیشن روڈ، لکھنؤ

ع۔ س۔ انصاری

قومی یک جہتی

اس وقت جب کہ ملک میں علاقائی خودمختاری کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں اور علیحدگی پسند طاقتیں سر اُٹھا رہی ہیں، لسانی اور مذہبی جھگڑے ہو رہے ہیں، قومی یک جہتی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ملک کے طول وعرض میں جو یک جہتی آزادی سے قبل دکھائی دیتی تھی وہ یکسر مفقود ہے۔ اب جب کہ ملک انتشار کی کگار پر کھڑا ہے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد آرہا ہے، جس کی طاقت کے بل پر ہم نے برٹش راج سے آزادی حاصل کی تھی، کاش اگر ہم آزادی کے بعد بھی اس سبق کو دوہراتے رہتے تو ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ابھی ملک کی ایک ہی تقسیم کے زخم مندمل نہیں ہو پائے ہیں کہ ہم ایک دوسرے انتشار سے دوچار ہیں۔

بہرحال رہنمایانِ قوم اور حکومت وقت نے اب ملک کی توجہ اس طرف مبذول کی ہے۔ ایک قومی یک جہتی کاؤنسل کا قیام بھی عمل میں آیا ہے وقتاً فوقتاً اس کے جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سب اقدامات جو اس وقت کیے جا رہے ہیں سطحی ہیں اور اُن کا کوئی دیرپا اثر نہیں ہے۔ سب پروگرام شہروں اور پڑھے لکھے طبقوں ہی تک محدود ہیں۔ دیہی عوام ان سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ جب تک یہ کام وسیع پیمانے پر اور ٹھوس بنیادوں پر قائم نہیں کیے جاتے سودمند ثابت نہیں ہو سکتے۔

قومی یک جہتی کے تصور کی ابتداء بچے کے گہوارے سے شروع ہونی چاہیے۔ بچوں کو سلانے اور بہلانے کے لیے ایسی لوریاں اور گیت لکھے جائیں

کہ جس سے ان کے کانوں میں یک جہتی کا رس گھل جائے ۔

بچے جب تھوڑے سمجھ دار ہو جائیں تو ان کو ایسی کہانیاں اور قصے سنائے جائیں کہ جن میں قومی یک جہتی کی جھلک ملتی ہو اور جب وہ تعلیم حاصل کرنے لگیں تو اُن کے تعلیمی نصاب میں ایسے اسباق شامل کیے جائیں جن میں ہر بڑے مذہب کے بانیوں کی زندگی کے وہ روشن پہلو اجاگر کیے جائیں کہ جن میں محبت اخوت اور انسانی برادری کے بھائی چارے کا سبق ملتا ہو۔ تعلیم گاہوں میں طلبہ کو ایسے دلکش گیت اور نظمیں سکھائی اور یاد کرائی جائیں جو قومی یکجہتی کی آئینہ دار ہوں۔

ابتدائی مدارس کے اساتذہ کا انتخاب اس امر کو مدِ نظر رکھ کر کیا جائے کہ وہ حب الوطنی اور قومی اتحاد کے علم بردار ہوں۔ تاکہ بچوں کو صحیح طریقے پر تعلیم دے سکیں۔

قومی یک جہتی کے مسئلے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مذہبی، لسانی اور علاقائی۔

مذہبی اعتبار سے ہندوستان دنیا کے سب ہی بڑے مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کی تہذیب گنگا جمنی تہذیب ہے جس کو سنوارنے اور نکھارنے میں مختلف مذاہب نے حصہ لیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ملک کے ہر باشندے کو تمام بڑے مذاہب کی معلومات ہوں تاکہ لاعلمی کی بنا پر وہ غلط فہمیوں کا شکار نہ ہو۔ ہر فرد اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا بھی احترام کرنا سیکھے۔ ہر مذہب کے بڑے بڑے تیوہار قومی تیوہاروں کے طریقے پر منائے جائیں۔ جس سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان محبت اور یگانگت بڑھے۔ اس میں ارباب حکومت اور سماجی انجمنیں بہت کچھ کام کر سکتی ہیں۔ مختلف مذاہب کے بنیادی اصولوں کی تعلیم کو تعلیمی نصاب میں شامل کیا جائے۔ حکومت کے حکام کو بھی جو ٹریننگ دی جائے اس میں بھی مختلف مذاہب کی تعلیم کا اچھا خاصہ عنصر شامل ہو۔

لسانی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک کے ہر خطے اور ہر ریاست کی اپنی ایک الگ زبان ہے۔ ان زبانوں کا اچھا خاصہ ادب ہے جس پر ان کو بجا طور پر ناز ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کو بڑھنے اور پنپنے کا موقع دیا جائے۔ کسی خطے پر دوسرے خطے کی زبان تھوپنے کی کوشش نہ کی جائے اور کسی بھی خطے کی زبان کو کمتر نہ سمجھا جائے۔ شمال کی زبانیں جنوبی ہند میں اور جنوب کی زبانیں شمالی ہند میں پڑھائی جائیں۔ زبان کو سیکھنے کے لیے ایک خطے کے طلبا اور اساتذہ دوسرے خطے میں جائیں۔ ایسے طلبا اور اساتذہ کی حکومت کی جانب سے حوصلہ افزائی کی جائے۔

علاقائی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ ایک برِ صغیر ہے جس کی مختلف ریاستیں جغرافیائی، لسانی، ثقافتی اور معاشرتی اعتبار سے خود ایک ملک ہیں۔ علاقائی خود مختاری کی آوازیں جنوبی ہند سے بلند ہونا شروع ہوئیں اور اس کے کئی وجوہات ہیں۔

تاریخی اعتبار سے جنوبی ہند کے باشندوں کا یہ کہنا ہے کہ ہندوستان کے اصلی باشندے وہی ہیں۔ شمالی ہند کے آرین غیر ملکی ہیں۔ جنھوں نے وسط ایشیا سے آکر ان کے ملک پر قبضہ کیا اور انھیں غلام بنایا۔ ان کو غیر مہذب قرار دے کر ان پر اپنی زبان اور تہذیب تھوپی۔ اسی خیال کی بنا پر جنوبی ہند کے باشندے شمالی ہند کی مقدس کتاب "رامائن" اور اس کے کرداروں سے نفرت کرتے ہیں۔ بقول ان کے یہ صحیفہ اس کی نشان دہی کرتا ہے کہ شمال کے باشندے کس حد تک جنوب میں گھس آئے تھے اور یہاں آکر انھوں نے ان کے ہر دل عزیز حکمراں راون کو ہرا کر اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے باشندوں کو اپنا غلام بنا لیا۔

جنوبی ہند کے لوگوں کے اس زخم کو مندمل کرنے کی کوشش آج تک نہیں کی گئی۔ شمالی ہند کے ہندی داں طبقے نے ان پر زبردستی جو اپنی زبان تھوپنے کی کوشش کی اس سے اُن کا پرانا زخم ہرا ہو گیا اور وہاں لسانی جھگڑے شروع ہو گئے۔ جنوبی ہند کے لوگوں کو ان کی تہذیب اور ثقافت کو خطرہ نظر آنے لگا۔ یہی وجوہات ہیں جن کے باعث علاقائی خود مختاری کی تحریک کا آغاز دکن سے ہوا۔

شمال اور جنوب کے لوگوں میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ہم ایک خطے کو دوسرے خطے کی زبان و ثقافت کا احترام کرنا ہوگا۔ ایک دوسرے کے درمیان قریبی رابطے قائم کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔

ایک خطے کے لوگوں کو دوسرے خطے کے لوگوں کے درمیان تجارتی تعلیمی ہی نہیں بلکہ ازدواجی رشتے بھی قائم کرنے ہوں گے۔

قومی یک جہتی کے پودے کی آبیاری آپسی محبت، بھائی چارہ، رواداری اور ایک دوسرے کے جذبات کے احترام کے بغیر ہونا ممکن نہیں ہے۔

آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

* "حسن وہ ہے جو تمہاری روح کو اپنی طرف
کھینچے جس کو فقط دینے سے غرض ہو لینے سے نہیں" *

روبی شمپو پاؤڈر

سے

بال سیاہ ، گھنے ، لمبے اور چمکیلے ہوجاتے ہیں
آپ بھی اپنی شخصیت کو
دلنظر بنانے کے لیے

روبی
شمپو پاؤڈر

کا استعمال کریں

روبی شمپو پاؤڈر بالوں کو سیاہ ، گھنا ، لمبا اور چمکیلا ہی نہیں بناتا بلکہ بالوں کی دوسری بیماریوں، جیسے بالوں کا وقت سے پہلے سفید ہونا ، کمزور ہوکر گرنا ، بالوں میں خشکی اور خارش کو ختم کردیتا ہے
آج ہی اپنے قریبی اسٹور سے طلب فرمائیں۔

مشرقی بہنیں اپنی پوشیدہ بیماریوں کا حال کسی ڈاکٹر یا حکیم کو بتلاتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں عورتوں کی یہ پوشیدہ بیماری ان کو اندر ہی اندر گھلا دیتی ہے اور وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جاتی ہیں۔

اکسیر خواتین

اس موذی بیماری کو جڑ سے ختم کردیتی ہے چند روز کے استعمال سے آپ فرق محسوس کرنا شروع کردیں گی قیمت فی شیشی ۱۵/- روپے ڈاک خرچ الگ
غیر ممالک میں دو شیشی کا مکمل کورس مع ہوائی ڈاک خرچ ۱۲۵/- روپے

آج نوجوان جس ماحول میں زندگی بسر کررہا ہے اس کا نتیجہ
* پچکے ہوئے گال * گھبراہٹ * بدخوابی

اکسیر شباب

کے استعمال سے بدخوابی دور ہوجائے گی۔ آپ کے پچکے ہوئے گال ٹھیک ہوجائیں گے۔ اور آپ اپنے آپ کو چاق وچوبند پائیں گے۔
ایک شیشی قیمت ۱۵/- روپے (ڈاک خرچ الگ)
غیر ممالک سے دو شیشی کا مکمل کورس مع ہوائی ڈاک خرچ ۱۲۵/-

ہاضمی

ہاضمی کی مفید اثر گولیاں پیٹ کی جملہ تکلیفوں کا خاتمہ کرتی ہیں۔
ہاضمی بچوں سے چھپا کر رکھیے۔
اس کے اچھے ذائقے کی وجہ سے بچے اسے پسند کرتے ہیں اور پوری شیشی چٹ کر جاتے ہیں
قیمت پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

چوٹ ، موچ ، جلے کٹے
کا کامیاب علاج
۸۰ ملی لیٹر قیمت دس روپے

اسٹاکسٹ

بمبئی • ایلن اینڈ کینٹ ۳۸ الف. محمد علی روڈ بمبئی
• میڈلین اینڈ پرفیومری اسٹورس ۳۱. سی محمد علی روڈ متصل جونا بھٹی مسجد بمبئی
• فرینڈس اسٹورس ۱۵۹ ہارون منزل. بھنڈی بازار جنکشن بمبئی • سیما میڈیکل اسٹور ۵۱۲ سرجے جے روڈ بمبئی کلکتہ • امین اینڈ سنز ۸ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ
فیضی دواخانہ ۲۱ رفیع احمد قدوائی روڈ کلکتہ حیدرآباد • مون اینڈ کمپنی چارمینار حیدرآباد
بھوپال • مختار حسین غلام عباس جمعراتی بازار بھوپال اورنگ آباد • ابوالحسنات معتمد وڈاک خانہ سیلہ رفیع گنج. ضلع اورنگ آباد دہلی • دفاتر بیسویں صدی دریا گنج نئی دہلی
بنانے والے ریڈیم کیمیکل ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون :
۳۶۰۹
۴۱۹۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۴/۸۴-۸۵

درج ذیل پوسٹوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ وہ حضرات جو ایک سے زائد پوسٹوں کے لیے امیدوار ہوں، اُن کو چاہیے کہ ہر پوسٹ کے لیے علیحدہ درخواست دیں۔

۱۔ پبلک ریلیشنز آفیسر:

تنخواہ کا اسکیل:۔ ۷۰۰-۴۰-۹۰۰-ای بی-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۳۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز [۷۰۰-۱۶۰۰ روپے ہونے کا امکان]

قابلیت:۔ کسی یونیورسٹی سے کم از کم سکنڈ کلاس میں بیچلرز ڈگری۔ انگریزی اور اردو زبان بولنے اور لکھنے کی اچھی صلاحیت۔ صحافت اور رابطۂ عامہ کے کام میں کم از کم دو سالہ تجربہ۔

۲۔ سینیر ٹیکنکل اسسٹنٹ [لیوی ویکنسی] - [ایک جگہ] ڈپارٹمنٹ آف علم الادویہ۔ اجمل خاں طبیہ کالج۔

تنخواہ کا اسکیل:۔ ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:۔

i۔ لازمی:۔ بی۔ ایس سی ڈگری کے ساتھ اردو زبان کا علم

ii۔ پسندیدہ:۔ کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی/ادارے کی فارماکولوجی لیباریٹری میں کام کرنے کا تجربہ۔

۳۔ سینئر ٹیکنکل اسسٹنٹ [لیوی ویکنسی] [ایک جگہ] ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی

تنخواہ کا اسکیل:۔ ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:۔

i۔ لازمی:۔ بی ایس سی، ڈپلومہ ان میڈیکل لیباریٹری ٹیکنالوجی [کلینیکل پیتھالوجی]

ii۔ پسندیدہ:۔ کسی تدریسی ہاسپٹل کیمیکل پیتھالوجی میں کام کرنے کا تجربہ۔

۴۔ ریڈیو تھیراپسٹ [ایک جگہ] [مستقل]۔ جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل۔

تنخواہ کا اسکیل:- ۴۵۵- ۱۵- ۵۶۰- ای بی- ۲۰- ...، روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱- لازمی:- بی۔ایس سی یا اس کے مساوی۔ کسی مستند ادارے سے ایکس رے ٹیکنیشن ٹریننگ کورس پاس کیا ہو۔

۱۱- پسندیدہ:- ریڈیوتھراپی کے ورکشاپ میں کام کا تجربہ

۵- اوورسیر [ایک جگہ] [مستقل] ڈپارٹمنٹ آف الیکٹریسٹی [سپلائی]

تنخواہ کا اسکیل:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۰۰- ای بی- ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ...، روپے مع الاؤنسز

قابلیت:- ۱- الیکٹریکل انجینیرنگ میں ڈپلوما۔

۲- کنسٹرکشن اور/یا الیکٹریکل تنصیبات کے جائزے کا دو سال کا تجربہ۔

۶- تھیٹر ٹیکنیشن [لیوی ویکنسی] [ایک جگہ] میڈیکل کالج ہاسپٹل۔

شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۰۰ ای بی- ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ...، روپے مع الاؤنسز

قابلیت:- میٹریکولیٹ یا اس کے مساوی- نرسنگ میں سرٹیفکٹ کے ساتھ کسی آپریشن تھیٹر میں کام کرنے کا دو سالہ تجربہ

یا کسی آپریشن تھیٹر میں بحیثیت اسسٹنٹ ٹیکنیشن عملی کام کرنے کا چار سال تجربہ۔

۷- اوورسیر [ایک جگہ] [مستقل] بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۰۰- ای بی ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ...، روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- کسی مستند ادارے سے سول انجینیرنگ میں ڈپلوما بلڈنگ کی تعمیر اور رکھ رکھاؤ کا کم از کم پانچ سال تجربہ

۸- ڈرائنگ اسسٹنٹ [ایک جگہ] [عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید ہے] ڈپارٹمنٹ آف جغرافیہ۔

شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۰۰- ای بی- ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ...، روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- ۱- کسی مستند تعلیمی ادارے سے ہائی اسکول پاس کیا ہو۔

۲- کسی مستند ادارے سے سرٹیفکٹ/ڈپلوما ڈرائنگ یا ڈرافٹ مینس شپ میں ہونا چاہیے۔

۳- جغرافیائی نقشے، چارٹس اور ڈائی گرامس تیار کرنے کی صلاحیت۔

۹- سائنٹیفک انسٹرومنٹ مکینک [انجن فٹر] [ایک جگہ] [مستقل] ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینیرنگ۔

شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۶۰- ای بی- ۲۰- ۶۴۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱- لازمی- انجینیرنگ کی خاص برانچ میں عام پوسٹ میٹرک ڈپلوما، ساتھ میں دو سالہ موزوں اور مناسب تجربہ

یا

مخصوص ٹریڈ میں ٹریڈ سرٹیفکٹ کے ساتھ سات سالہ مناسب و موزوں تجربہ

پسندیدہ:- ڈیزل اور پٹرول انجن کو چلانے اور ان کی دیکھ ریکھ کرنے اور فٹنگ کرنے کا تجربہ۔

۱۰- سینیر لیباریٹری اسسٹنٹ [لیو ویکنسی] ڈپارٹمنٹ آف بیٹالوجی۔

شرح تنخواہ:- ۳۸۰-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱- لازمی:- ہائر سکنڈری/پری یونیورسٹی [سائنس]

۲- پسندیدہ:- کسی تدریسی اسپتال میں کام کرنے کا تجربہ۔ ہیماٹولوجی/کلینکل پیتھالوجی لیباریٹری میں کام کرنے کی بنا پر قابل ترجیح

۱۱- پیش نماز:- [شیعہ] [ایک جگہ] [مستقل] وی-ایم ہال-

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۶-۲۹۰-ای بی-۶-۳۲۶-۸-۳۶۶-ای بی ۸-۳۹۰-۱۰-۴۰۰-روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- کسی معتبر دینی مدرسہ کی سند، جیسے فاضل، سندالافاضل یا اس کے برابر کوئی دوسری سند۔ نیز اس کے ساتھ کسی معتبر عالم دین کا اجازۂ پیش نمازی اور احکام شرعیہ کی ایسی پابندی جس سے عدالت کا پتہ چلے۔

۱۲- میسن [ایک جگہ] [مستقل] بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۶-۳۲۶ ای بی-۸-۳۵۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- خواندہ [اردو/ہندی/انگریزی]۔ اپنے پیشے میں کسی مستند ادارے سے سرٹیفکٹ اور تین سالہ عملی تجربہ

یا

کسی مشہور فرم یا تنظیم میں اپنے پیشے میں کام کرنے کا چھ سالہ تجربہ۔

عمر:- ۲۵ سال سے کم نہ ہو۔

اعلیٰ تعلیمی صلاحیت اور قابلیت کے حامل افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا، اُن کو بطور ٹی۔ اے یک طرفہ سکنڈ کلاس کا سنگل کرایہ ادا کیا جائے گا

مقررہ فارم اور ہدایات رجسٹرار اسسٹنٹ رجسٹرار [سلیکشن کمیٹی] رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے ۵ روپے نقد ادائیگی [پوسٹ نمبر ایک کے لیے] اور باقی جگہوں کے لیے تین روپے نقد ادائیگی [مسلم یونیورسٹی کے کیش سکشن میں جمع شدہ] یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا ۱۰سم x ۲۳ سم کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور اس پر مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۹ر نومبر ۱۹۸۴ء [آفس ٹائم تک] ہے۔

نامکمل اور دیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

[رجسٹرار]

شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۵-۱۴/۲۵

مقررہ فارموں پر درج ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر [ٹیلرنگ] [ایک جگہ] [مستقل] سٹی ہائی اسکول

شرح تنخواہ:- ۴۴۰-۲۰-۵۰۰- ای بی ۲۵-۷۰۰ ای بی ۲۵-۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- گریجویشن کے ساتھ

الف۔ ٹیلرنگ میں ڈپلوما، نیڈل ورک اور ایمبرائیڈری کا کام درج ذیل کسی انسٹی ٹیوشن سے سیکھا ہو۔

[i] لیڈی اِرون کالج۔ نئی دہلی۔

[ii] گورنمنٹ انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی۔

[iii] پنجاب گورنمنٹ ٹیکنیکل ٹریننگ سینٹر تملہ۔

یا

ب۔ لیڈیز اور بچوں کے ملبوسات کی سلائی میں سرٹیفکٹ جو کہ ڈپارٹمنٹ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن مہاراشٹر کا ہو۔

یا

ج۔ سوشل ویلفیر ریہیبیلیٹیشن ڈائرکٹوریٹ، نئی دہلی سے کرافٹ ہینڈلنگ [ٹیلرنگ] میں ڈپلوما حاصل کیا ہو۔

یا

[د] برائے ویمنس انسٹرکٹر نوماہ / ایک سال کا کٹائی سلائی میں ٹریننگ کورس کا سرٹیفکٹ ہو جو کہ سینٹرل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ برائے ویمنس انسٹرکٹر نئی دہلی سے حاصل کیا ہو۔

یا

[ہ] نیڈل کرافٹ میں ٹیچرس ٹریننگ کورس اور ایمبرائیڈری اور فینسی میں سرٹیفکٹ ہونا چاہیے جو کہ بورڈ آف ٹیکنیکل اگزامینیشن، مہاراشٹرا سے حاصل کیا ہو۔

یا

و۔ گروپ سرٹیفکٹ اور نیڈل ورکس اور ڈریس میکنگ کا لوور امتحان ٹیلرنگ اور ٹیک میں ہونا چاہیے ٹیچرز سرٹیفکٹ گورنمنٹ آف مدراس کا ہو

۲۔ بی۔ایس سی [ہوم سائنس میں] اور بی۔ایڈ

یا

۳ لیڈی اروِن کالج سے ہوم سائنس میں تین سالہ ڈپلوما کورس کیا ہو مزید کسی مستند یونیورسٹی/بورڈ سے میٹرکولیٹ ہونا چاہیے۔

یا

۴۔ انسٹی ٹیوٹ آف ہوم اکونامکس نئی دہلی سے ہوم سائنس میں ڈپلوما حاصل کیا ہو۔

۲ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچرز [فزیکل ایجوکیشن] [دو جگہیں] [مستقل] گرلز ہائی اسکول

شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰-۲۰-۵۰۰-ای بی-۲۵-۶۰۰-ای بی ۲۵-۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:۔

۱۔ لازمی کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے فزیکل ایجوکیشن میں تین سالہ مدت کی بیچلرز ڈگری۔

یا

ڈپلوما اِن فزیکل ایجوکیشن جو کم از کم ایک اکیڈمک سیشن کی ٹریننگ کے بعد کسی منظور شدہ یونیورسٹی ادارے سے دیا گیا ہو اور جس میں داخلہ کی شرط کم از کم یونیورسٹی کی ڈگری ہو

پسندیدہ:۔ وہ امیدوار جن کے پاس بی۔ایس سی [ہوم سائنس] یا بی۔ایس سی بائیالوجی کے ساتھ ہو قابل ترجیح ہوں گے۔

۳۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچرز [میتھمیٹکس] [دو جگہیں]۔[مستقل] گرلز ہائی اسکول۔

۴۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر [میتھمیٹکس] [ایک جگہ] [مستقل] ایس۔ٹی۔ ہائی اسکول

شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰-۲۰-۵۰۰-ای بی-۲۵-۶۰۰-ای بی ۲۵-۷۵۰ روپے مع دیگر الاونسز

قابلیت:۔

۱۔ لازمی۔ متعلقہ مضمون میں گریجویشن کے ساتھ ایجوکیشن میں منظور شدہ ڈگری یا ڈپلوما۔

۲ پسندیدہ:۔ متعلقہ مضمون کی تدریس کا اردو/سندھی/انگریزی میڈیم سے کسی کالج یا ہائی/ہائر سکنڈری اسکول میں مناسب تجربہ ہونا چاہیے۔

۵۔ پرائمری ٹیچرس [جنرل] [تین جگہیں] [مستقل] گرلز ہائی اسکول۔

شرح تنخواہ:۔ ۳۳۰-۱۰-۳۵۰-ای بی-۱۰-۳۸۰-۱۵-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:

۱۔ لازمی۔ میٹرک/ہایر سکنڈری ٹرینڈ [سائنس اور میتھ کے ساتھ] یا اس کے مساوی قابلیت۔

۲۔ پسندیدہ:۔ متعلقہ مضمون کا انگریزی میڈیم سے کسی ہائی/ہایر سکنڈری اسکول یا کالج میں تدریس کا مناسب تجربہ

اعلیٰ قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو شروع سے ہی اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے۔

وہ امیدوار جن کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا اُن کو ایک طرف کا ریلوے کے سکنڈ کلاس کا

سنگل کرایہ بطور ٹی۔ اے دیا جائے گا۔

مجوزہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سلیکشن کمیٹی] رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پانچ روپیہ نقد [رقم کیش سیکشن، فنانس آفس، اے ایم یو علی گڑھ میں جمع ہوگی] ادا کرکے یا فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے نام انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ادا کرکے بذات خود یا ۱۰x23 سائز کا پتا لکھا اور ٹکٹ چسپاں لفافہ روانہ کرکے حاصل کیے جاسکتے ہیں

درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۲ نومبر ۸۴ء [دفتری اوقات کے دوران] ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۶/۸۴-۸۵

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

پروفیسرس

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰- ۶۰ - ۱۹۰۰ - ۱۰۰ - ۲۰۰۰ - ۲/۱۲۵ - ۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

۱۔ پروفیسر آف سوشیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی

۲۔ پروفیسر آف لا۔ ڈپارٹمنٹ آف لا۔

قابلیت:- [الف] کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی قابلیت۔

[ب] ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام۔

[ج] پوسٹ گریجویٹ کلاسز کی تدریس کا کم از کم دس سالہ تجربہ اور ساتھ میں ریسرچ کی رہنمائی کا قدرے تجربہ۔

نوٹ:- پوسٹ نمبر ۱، پروفیسر آف سوشیالوجی کے لیے

وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۲۴/۸۳-۸۵ مورخہ ۱۵ نومبر ۸۳ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں

اُن کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں سمجھے گئے تو اُن کی پہلی درخواست کی بنیاد پر طلب کیا جائے گا۔

پوسٹ نمبر ۲ پروفیسر آف لا کے لیے

وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱۲/۸۴-۸۵ مورخہ ۱۲ جولائی ۸۴ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں اُن کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ موزوں سمجھے گئے تو اُن کی پہلی درخواست کی بنیاد پر اُن کو طلب کیا جائے گا۔

لکچررس

شرح تنخواہ :- ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

۳- لکچرر اِن مراٹھی- ڈپارٹمنٹ آف ماڈرن انڈین لینگویجز۔

۴- لکچرر اِن فزکس [عارضی] ویمنس پالیٹکنک۔

۵- لکچرر اِن جرنلزم [تین جگہیں] [انگریزی، اردو اور ہندی صحافت میں ایک ایک]

۶- لکچرر اِن بزنس ایڈمنسٹریشن [عارضی لیکن مستقل ہونے کا امکان] ڈپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن۔

قابلیت :-

۱- لازمی [الف] ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اعلیٰ درجے کا اس کے مساوی تحقیقی کام۔ اور

[ب] اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس [بی سیون پوائنٹ اسکیل میں] کے ساتھ متعلقہ مضمون میں ماسٹر ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الموضوعی ترقیات کے پروگرام کی ضرورت کے تعلق سے مذکورہ بالا الف اور ب کے لیے متعلقہ اسناد ہونا چاہیں

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا اس کے مطبوعہ کام سے ظاہر ہے اعلیٰ درجے کا ہے تو اس صورت میں [ب] کے تحت مطلوبہ استعداد میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل امیدوار میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں متصور نہ ہو، تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار [اس صورت میں ایم فل ڈگری یا مطبوعہ معیاری کام کو وزن دیا جائے گا] کا تقرر کیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس کو کسی ریسرچ لیبارٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال کا عملی تجربہ ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری کے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہ دی جائے گی جب تک وہ اُن ضروریات کو پورا نہ کرے۔

[ا] پسندیدہ :- اسامی نمبر ۵ ، لکچرر اِن جرنلزم کے لیے۔

- ڈگری کلاسز یا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کلاسز کی تدریس کا کم از کم تین سال کا تجربہ

اردو، ہندی اور انگریزی صحافت کی اچھی واقفکاری اور ان زبانوں میں لکچر دینے اور تحقیقی کام کرانے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔
سروے کے دوران رہنمائی کی لیاقت اور مختلف عوامی رابطوں کا کچھ تجربہ۔

اعلیٰ قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو ابتداءً سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں بطور ٹی اے ایک سنگل دوسرے درجے کا ریلوے کرایہ دیا جائے گا۔

مجوزہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ۵/ روپے نقد (رقم کیش سیکشن، فنانس آفس، اے ایم یو، علی گڑھ میں جمع ہوگی) ادا کرکے یا فنانس آفیسر، اے ایم یو علی گڑھ کے نام انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے ادا کرکے بذات خود یا cm ۱۰ x 23 سائز کا پتہ لکھا اور ٹکٹ لگا لفافہ روانہ کرکے حاصل کیے جاسکتے ہیں
درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۴ نومبر ۱۹۸۴ء (دفتری اوقات کے دوران) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۷/۸۴-۸۵

درج ذیل اسامی کے لیے مجوزہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

یونیورسٹی رجسٹرار

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- (الف) بحیثیت لکچرر اور ریڈر کے کم از کم پندرہ سالہ تجربہ مع تعلیمی انتظامیہ کا تجربہ۔
(ب) تحقیقی اداروں اور اعلیٰ تعلیم کے دیگر اداروں میں کام کرنے والے اصحاب جو اس کے مساوی علمی لیاقت رکھتے ہوں اس جگہ کے لیے درخواست دینے کے مجاز ہیں۔

[ج] وہ امیدوار جن کا تعلیمی ریکارڈ اور سروس ریکارڈ اچھا ہو اور دس سال کا انتظامیہ کا تجربہ ہونے کے ساتھ ساتھ پوسٹ گریجویٹ ڈگری بھی ہو۔

اعلیٰ قابلیت اور تجربے کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں بطور ٹی۔اے ایک سنگل دوسرے درجے کا ریلوے کرایہ دیا جائے گا۔

مجوزہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سلیکشن کمیٹی] رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے -/5 روپے نقد [رقم کیش سیکشن، فنانس آفس، اے ایم یو علی گڑھ میں جمع ہوگی] ادا کرکے یا فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے نام انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے ادا کرکے بذات خود یا سم 15 × 23 سائز کا پتہ لکھا لفافہ جس پر مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں روانہ کرکے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ 24 نومبر 84ء [آفس ٹائم کے دوران] ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

ایسی تمام درخواستیں جو علی گڑھ سے باہر کی ہوں وہ رجسٹرڈ پوسٹ سے بنام ڈاکٹر ایچ۔اے۔ایس جعفری، سکریٹری برائے وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجی جائیں۔

نوٹ:۔ اشتہار نمبر 18/84-85 مورخہ 6 اگست 84ء کو مندرجہ بالا اشتہار کے مطابق منسوخ کیا جائے۔

ضمیر احمد خاں

[رجسٹرار]

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آئیٹم ریٹ کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈرز مطلوب ہیں۔ جو کہ 10 نومبر 1984ء ایک بجے دوپہر تک وصول ہوجانے چاہئیں۔ ٹینڈرز اسی روز 3-30 شام کو کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈرز سے متعلق کاغذات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے آفس ٹائم کے دوران کسی روز بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ٹینڈرز فارم کی فروخت دستیابی کی آخری تاریخ سے 24 گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کے لیے مختص رقم	زرِ ضمانت	ٹینڈر فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
1۔	رورل ہیلتھ سینٹر جواں میں ڈورمیٹری قسم کی بلڈنگ کی تعمیر کا کام	-/1,95,350	-/4885	-/10	آٹھ ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

[یونیورسٹی انجینئر]

Rs
1-50
1917- 1984

مدیر: سیّد حامد ✶ مدیر مسئول: نور الحسن نقوی

جلد ۳ ✶ ۱۶ تا ۳۰ نومبر ۱۹۸۴ء ✶ شمارہ ۲۲

مندرجات

ترسیل زر کا پتہ:
پروفیسر منظر عباس نقوی (ٹریژرار تہذیب الاخلاق ٹرسٹ)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

فی پرچہ: ڈیڑھ روپیہ
زر سالانہ: تیس روپے
دوامی رکنیت: تین سو روپے

خداوند ہمارے دیس کو جنّت بنا دینا

Where the mind is without fear

Where the mind is without fear and the
head is held high,
Where knowledge is free
Where the world has not been
broken up
Into fragments by narrow domestic
walls.
Where words come out from the
depth of truth,
Where tireless striving stretches its
arms towards perfection
Where the clear stream of reason
has not lost its way
Into the dreary desert sand of
death habit.
Where the mind is led forward by thee
Into ever-widening thought and action
Into that heaven of freedom, my
Father, let my country awake!

Rabindranath Tagore
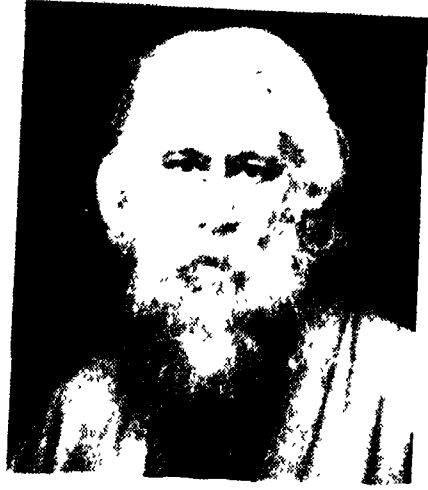
جہاں پہرے نہ ہوں ذہنوں پہ جہل اور خوفِ باطل کے۔
جہاں علم و ہنر آزاد ہوں، بیباک ہوں انساں،
جہاں دنیائے رنگ و بو کی اس پر کیف پہنائی میں
خود بینی کی دیواریں نہ راہوں کو جدا کر دیں،
جہاں سچّائیوں کے بیکراں سینے سے پھوٹیں
تند چشمے لفظ و معنی کے،
جہاں پر سعیِ پیہم، فکرِ جولاں کے حسیں پیکر
پئے تکمیل رقصاں ہوں،
جہاں عزمِ جواں، ذہنِ رسا کی جوئے بے پروا،
جمود و بے حسی کے سخت، سنگیں ریگزاروں میں نہ کھو جائے،
جہاں پر ذہن کو مل جائے وسعت حدِ امکاں کی،
جہاں فکر و عمل کے ساز میں لَے تیری ہو یا ربِ
جہاں آزادیِ قلب و نظر کی حکمرانی ہو،
تو میرے دیس کو اس جنّتِ امکاں میں پہنچا دے۔

منظوم ترجمہ: ساجدہ زیدی

المناک سانحہ

ہندوستان کی تاریخ میں ۳۱ اکتوبر کو ہمیشہ روزِ سیاہ کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ مہاتما گاندھی کے ظالمانہ قتل کے بعد یہ دوسرا المناک سانحہ ہے اور ایک معنی میں اس سے سنگین تر۔ یہ ایک معمر خاتون کا قتل ہے اور وہ بھی اس بے دردی کے ساتھ کہ ایک دو نہیں بلکہ ایک درجن گولیاں ان کے کمزور جسم میں پیوست کر دی گئیں۔ قتل ان ہتھیاروں سے ہوا جو وزیر اعظم کے تحفظ کے لیے فراہم کیے گئے تھے اور ان لوگوں کے ذریعے ہوا جو ان کی حفاظت پر مامور تھے۔ گویا وزیر اعظم کے ساتھ ایک قتل اور بھی ہوا — اعتماد کا قتل!

قتل، غارت گری، ظلم کی تاریخ بہت پرانی ہے اور گھروں کو آگ بھی سدا سے لگتی آئی ہے لیکن گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگے تو اس کا غم دس گنا ہوتا ہے اور ندامت مستزاد! مہاتما گاندھی کی زندگی کا چراغ بھی اپنوں نے ہی بجھایا تھا، آج ملک کو اندرا جی کی سرپرستی سے محروم کرنے والے بھی اسی دیس کے باسی ہیں!

ملک اور قوم پر اندرا جی کے احسانات بے شمار ہیں۔ انھوں نے بڑے نازک دور میں ملک کی قیادت سنبھالی اور اس کا حق ادا کر دیا۔ ان کی سربراہی میں ملک نے کئی بار بدترین حالات کا مقابلہ کیا اور سرخ رو ہوا۔ انھوں نے اپنے دیس کے لیے بہت کچھ کیا لیکن بہت کچھ کرنے کو ابھی باقی تھا۔ ملک کی سالمیت کو اس وقت جو خطرہ درپیش ہے اس سے نجات پانے کے لیے ہمیشہ سے زیادہ آج ان کے آہنی عزم، بے مثال قوتِ فیصلہ اور پختہ سیاسی شعور کی ضرورت تھی۔ موت مہلت دیتی تو یقین تھا کہ درپیش مسائل کا حل وہ جلد ہی ڈھونڈ نکالتیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی جو استعداد قدرت نے انھیں عطا کی تھی، دشمن بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہیں۔ انھیں سیاسی تربیت بھی وہ میسر آئی جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ انھوں نے جد و جہدِ آزادی کے زمانے میں جنم لیا اور پرورش پائی۔ ان کا گھر اس جد و جہد کا اہم مرکز تھا جہاں ملک کے سیاسی رہنما اور اس عہد کے نامور مدبر جمع ہوتے اور تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ اور اس تحریک کے رہنما خود ان کے بزرگ تھے۔ اس ماحول میں اندرا جی کی ذہنی نشو و نما ہوئی۔ باپ اور دادا دونوں نے ان کی تعلیم اور تعلیم سے زیادہ تربیت کی طرف توجہ کی۔ کملا نہرو کی موت اور پنڈت نہرو کی قید و بند کی زندگی دونوں سے ان کی تعلیم میں خلل واقع ہوا لیکن پنڈت جی کی توجہ نے جلد ہی اس کمی کا ازالہ کر دیا۔ وہ بیٹی سے دور جیل میں ہوتے تب بھی مسلسل اور طویل خطوط لکھ کر انھیں تعلیم دیتے رہتے۔ آگے چل کر اندرا جی کو پنڈت نہرو کے ساتھ رہنے، بیرونی ممالک کا دورہ کرنے اور اہم شخصیتوں سے تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع میسر آئے تو گویا اعلیٰ درجے کی عملی تعلیم کا آپ سے آپ اہتمام ہو گیا۔ اس طرح دنیا کے نشیب و فراز اور سیاست کے پیچ و خم سے انھیں مکمل آگاہی حاصل ہو گئی۔ جو ان کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہی۔

اندرا جی نے اپنے دادا کی نصیحتوں کو ساری زندگی پیشِ نظر رکھا اور ان پر عمل کیا۔ حقیقت پسندی، تحمل اور گہرا سیاسی شعور یہ وہ خصوصیات تھیں جو انھوں نے اپنے دادا پنڈت موتی لال نہرو سے ورثے میں پائی تھیں۔ اصول پسندی، آئیڈیل ازم اور اعلیٰ اخلاقی اقدار انھیں اپنے والد سے ملی تھیں لیکن ذہنی طور پر باپ کی بہ نسبت وہ اپنے دادا کے زیادہ نزدیک تھیں۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا "میرے باپ سنت تھے، میں سیاست داں ہوں"۔ اور سچ بات یہ ہے کہ جس دور میں انھوں نے وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری سنبھالی اور جن شخصیتوں کے درمیان رہ کر انھیں کام کرنا پڑا اس میں سادھو سنت سے زیادہ ایک دانشمند سیاست داں اور مضبوط رہنما کی ملک کو ضرورت تھی۔ اندرا جی میں یہ اوصاف موجود تھے اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ انھوں نے ملک کی رہنمائی کا حق ادا کر دیا اور آج جب کہ پہلے سے بھی زیادہ ان کی ضرورت تھی، ملک ان کی سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ ان کا آخری کارنامہ یہ ہے کہ جب ایک خاص فرقے کے اشخاص کو ان کے حفاظتی عملے سے ہٹانے کا مشورہ دیا گیا تو اسے انھوں نے سیکولرازم کے منافی قرار دیتے ہوئے رد کر دیا۔ گویا انھیں سیکولرازم جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اندرا جی کی یاد کو اس سے بہتر کوئی خراجِ عقیدت نہیں ہو سکتا کہ ہم سب ان کے اس آخری سبق کو یاد رکھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔

نورالحسن نقوی

مسز اندرا گاندھی

چند بکھرے ہوئے تاثرات

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کے مشاہرے اور شرائطِ خدمت کی چھان بین کرنے اور اس کے بعد کمیشن کو اپنی سفارشات پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ اس کمیٹی نے مسئلہ پر غور وفکر کیا اور اساتذۂ جامعات اور ماہرینِ تعلیم سے مشورہ کرنے کے لیے اپنے اراکین کو مامور کیا۔ میرے سپرد وہ سب کمیٹی کی گئی جو جنوبی ریاستوں کا دورہ کرے گی۔ کرناٹک کے دورے کے بعد ہم لوگ کیرالا آئے۔ ماہرینِ تعلیم کے ساتھ ٹری وانڈرم میں ہمارے مذاکرات کا آج دوسرا دن تھا۔ کیرالا یونیورسٹی میں اس ریاست کے تعلیمی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے آکر میرے کان میں یہ روح فرسا خبر پھونکی کہ مسز گاندھی پر آج صبح ان کے مکان میں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور وہ نازک حالت میں انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں لے جائی گئی ہیں۔

پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ مسز گاندھی باوجود ان نکتہ چینیوں کے جو وقتاً فوقتاً ان پر کی جاتی رہی ہیں، اس وقت ہندوستان کی سب سے قد آور اور اہم ترین شخصیت تھیں۔ ہندوستان کے پھوٹ ڈالنے والے اور فتنہ برپا کرنے والے عناصر اور رجحانات کو قابو میں رکھنا، ان ہی کا کام تھا۔ انھیں خدا نے وہ قامت اور بصیرت عطا کی تھی جو اتنے بڑے اور پُرپیچ ملک کی رہنمائی کے لیے ضروری ہے۔ انہوں نے بڑی حد تک بحیثیت وزیر اعظم اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا جس کی بنیاد اس کے عہدآفریں باپ نے ڈالی تھی۔ ذاتی دیانت اور اعلیٰ ظرفی اور بلندیٔ معیار کی بدولت وہ سارے ہندوستان کے لیے موجب احترام تھیں۔ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی ترجمانی، اس ملی جلی تہذیب کی ترجمانی جس میں ہندوستان کی رواداری اور اس کا وسیع ظرف شامل تھے اور جو جدید مغربی تہذیب کی شائستگیوں، رعنائیوں اور علم طرازیوں سے بھی مستنیر تھی، جس قرینہ اور جمال کے ساتھ اندرا گاندھی نے کی، وہ آپ اپنی مثال ہے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ماضی اس کے عبوری حال اور تابناک مستقبل کے لیے اس کے منصوبوں اور عزائم کی پیکر تھیں۔

نہرو خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ سونے کے نوالے اور سنہری شہرت کے ساتھ پیدا ہوئیں۔ ہر چند کہ بچپن میں ہی سانس انھوں نے سیاست کے ماحول میں ہی لی، لیکن منظرِ عام پر وہ کانگریس کے صدر (۱۹۵۹) کی حیثیت سے آئیں۔ بہ حیثیت صدر کے ان کی کارگزاری نے جمنا کی لہروں کو شعلہ بار نہیں کیا۔ اور بہ حیثیت وزیر اطلاعات (۱۹۶۴) بھی انہوں نے کارگزاری اور کارسازی کے کوئی ہوشربا نقوش محکمہ کے اوراق پر ثبت نہیں کئے۔ بظاہر ایک نازک سی کمزور سی، کم گو، کم آمیز، کم آواز جس خاتون سے زیادہ توقعات کی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ جب یہ سنا گیا کہ وہ جواہر لال نہرو کی جانشین ہوں گی تو خیر خواہوں کے دلوں میں بھی شکوک پیدا ہوئے۔

لال بہادر شاستری جی کے تاشقند میں اچانک انتقال کے بعد جب اندرا گاندھی کو وزارت عظمیٰ کے لیے چنا گیا تو دلوں میں طرح طرح کے اندیشوں نے سر اٹھایا۔ "اس برصغیر کی مہار ایک نازک سی خاتون کے ہاتھ میں دے دینا کہاں کی دانشمندی ہے، حد ہو گئی خاندان پرستی کی" بعض نکتہ چینوں نے کہا۔ اور شروع شروع میں ایوان میں نئی وزیر اعظم کی کارگزاری اور گفتگو پر عدم اعتماد، ہچکچاہٹ اور لکنت کے انداز ہمدردوں کی حوصلہ شکنی اور عام ہندوستانیوں کی تشویش کے لیے کافی تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہوتا گیا، نقشہ بدلتا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ بظاہر نحیف و نازک خاتون خوش پوش خوش اطوار، خوش رو، نفاست پسند خاتون، دل بھی رکھتی تھی اور دماغ بھی اور آہنی گرفت بھی، وہ دل جس میں جرأت تھی اور وہ دماغ جو روشن تھا اور جس میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت تھی اور وہ ہاتھ جن کی پکڑ کبھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس کا سکہ بیٹھتا گیا، اس کی آواز اور انداز میں اعتماد اور گفتگو میں روانی آ گئی، اور پھر سیاست کی ڈوریاں سمٹ کر اس کے ہاتھوں میں آ گئیں اور ان کے سروں پر جو رہنما اور وزرا اور بااثر اور مقتدر انسان تھے، ان کی حیثیت دیکھتے ہی دیکھتے کٹھ پتلیوں کی سی ہو گئی۔ اس

بساط سیاست کے گُر سیکھ لیے اور کہنہ مشق شاطروں کو پے در پے مات دی۔
اور وہ دن بھی آگیا جب اس کا قد اس پارٹی سے بھی اونچا ہو گیا جس نے
اُسے اعلیٰ وزارت کے لیے چنا تھا۔ وہ پارٹی اس کی ذات سے کسب اقتدار و اعتبار
کرنے لگی۔ ۱۹۶۷ اور ۱۹۷۲ میں اس کے شانوں پر کانگریس پارٹی نے عام چناؤ
جیتے۔ ۱۹۷۰ سے تین سال پہلے اس نے بینکوں کو سرمایہ داروں کے شکنجہ سے
نکال کر قوم کے تصرف میں دے دیا تاکہ وہ خلق کی خدمت بھی کر سکیں۔
کانگریس کے فرسودہ اصنام کو توڑ کر اس نے نئی کانگریس کی بنا ڈالی۔ اس
شکست سے پرانی کانگریس میں جان ہی نہ رہی اور بڑے بڑے بُت سر کے
بل گرے۔ اور ایسا ایک بار سے زیادہ ہوا۔

جو دِ زباں کی نرمی اور لہجہ کی شیرینی کے اس نے سب سے مناسب
سمجھا۔ جہاں کسی نے قریب آنے کی کوشش کی یا یہ ظاہر کیا کہ وہ وزیر اعظم کے
من دخیل ہے، وہیں اس کو اس کی جگہ پر پہونچا دیا گیا۔ کسی کی مجال
اس کی نگاہ میں اپنی اہمیت کے پُل باندھ سکے۔ کانگریس کے بڑے بڑے
دررِیاستوں کے وزرائے اعلیٰ اس کے دستِ نگر اور اس کی نگاہِ کرم کے
محتاج ہو گئے جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا۔ کیا مجال کہ دوسرے اف بھی کر سکیں۔
ایک انگریزی میگزین نے اسے ہندوستان کی ملکہ (ایمپریس آف انڈیا)
کہا۔ اس کے بظاہر نازک ہاتھوں میں غیر معمولی طاقت تھی۔ کہا جاتا تھا
کابینہ میں صرف ایک مرد ہے، اندرا گاندھی۔ (اور وہ بھی مردِ آہن)۔

مسز گاندھی کے شانے اتنے فراخ نہ تھے جتنے ان کے عظیم باپ کے
دل اتنا وسیع، نہ دماغ اتنا باخبر لیکن انتظامی امور میں وہ ان سے زیادہ
تھیں۔ فیصلہ اور کام کی راہ میں وہ تکلّف، مروّت اور مراعات کو
حائل ہونے دیتی تھیں۔ فیصلہ کا نفاذ بے دریغ کراتیں اور چالاکی اور
غداری اور سازش کرنے والوں یا وزارتِ عظمیٰ کے خواب دیکھنے والوں
کی انتہائی شائستہ چابکدستی کے ساتھ کرتیں۔ زبان پر کوئی سخت
نہ آتا۔ ملنے کی نوبت بھی نہ آتی اور سرکش اور سازشی کو پتہ چل جاتا
آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا ہے۔ باریابی کے دعویدار کو اچانک پتہ
کہ دروازہ اس پر بند کر دیا گیا ہے۔ سر ٹکرائے گا تو بھی نہ کھلے گا۔ جو
یا مشتبہ ہوا وہ خواہ کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو، ہفتوں
انتظار کرے تب بھی حاضری سے محروم رہے گا۔ اپنا سا منھ لے کر واپس
جائے گا۔ اس طرح لوگوں میں احساسِ تناسب بنا رہا اور مرکزی
حکومت کے وزن و وقار کی بالاتری پر آنچ نہ آئی۔

خفگی یا اختلاف کا اظہار براہ راست شاذ ہی ہوتا۔ آنکھ میں آنکھ
ڈال کر بات کم ہی کی جاتی۔ آپ باتیں کر رہے ہیں کوئی بات اہم یا التفات کی

مستحق سمجھی گئی تو سر اٹھا کر دیکھ لیا۔ یہ آپ کی فراست پر منحصر ہوتا کہ اس اٹھتی
ہوئی نگاہ سے کیا نتائج اخذ کرتے ہیں اور ردّ عمل کی بابت کس قیاس کو راہ
دیتے ہیں۔

اس نازک اور خوش اندام و خوش قطع عورت کے اعصاب فولاد کے
بنے ہوئے تھے۔ دنیا میں کسی حکمراں کو رات دن اتنے بڑے بڑے گونا گوں
حوصلہ شکن سکون آشوب مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جتنے کہ ہندوستان
کے وزیر اعظم کے حصے میں آتے ہیں لیکن اندرا گاندھی ان مسایل و مصائب
سے ہمیشہ تازہ دم نکلیں۔ ایسے مسایل کے بوجھ کے نیچے مضبوط سے مضبوط کمر
ٹوٹ جاتی لیکن یہاں جبیں پر شکن تک نہ آئی۔ وہی تازہ دمی، وہی تبسم نما سکون،
وہی نفاست، وہی شادابی، وہی شگفتگی۔ گویا ایک نازوں کی پلی ہوئی خوشحال
خاتون ہے جس کے چمن کو بادِ سموم اور جس کے دامنِ دل کو فکروں نے چھوا تک
نہ ہو۔ جس کا منتہائے آرزو، خوش باشی اور خوش پوشی ہو، جس نے ڈرائنگ
روم سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ جو شخص بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ کون ہیں ان سے ملے
اسے گمان بھی نہ ہو کہ اس خاتون نے زمانہ کے سنگیں سے سنگیں، پُر آشوب سے
پر آشوب، جگر دوز سے جگر دوز مسائل سے لوہا لیا ہے۔ اور کسی ایسے ہی مسئلہ
سے نبرد آزمائی کر کے ابھی ابھی آ رہی ہے۔ ریشم کی ڈوری مضبوط ہوتی ہے،
سُن رکھا تھا لیکن نہ اتنی مضبوط کہ فولاد شرمائے نہ اتنی قاطع کہ سیوف کو
رشک آئے۔

اس خوبصورت چہرے کی پاکیزہ کشش کو ہزاروں دلوں نے محسوس کیا
ہے۔ نہ معلوم کتنے دل اس انتہائی دلاویز مسکراہٹ سے کھل اٹھے ہیں۔ وہ
مسکراہٹ جو مونالیزا کے تبسم کی طرح پُراسرار نہیں لیکن اس سے زیادہ دلکش
ہے۔ اور اسے سادہ نہ سمجھیے، پُرکار بھی ہے اور رمز آلود بھی۔ کبھی اس میں
پایانِ گفتگو کی آہٹ ملتی ہے، کبھی یہ دانستہ کوشش کہ جانے والا بے التفاتی کا گلہ
کرتا ہوا نہ جائے۔ کبھی بے محل بات کو ٹالنے کی تدبیر، کبھی دل موہ لینے کا حربہ،
کبھی یہ فہمایش کہ ان چند لمحات سے زیادہ معصوم نہیں ہیں تشریف لے جائیے۔

ایمرجنسی کے دوران اہل نفاذ نے زیادتیاں کیں جس کا خمیازہ مسز گاندھی
کو بھگتنا پڑا۔ لیکن وہ سپر انداز نہیں ہوئیں۔ اس وقت سب یہ سمجھے تھے ان
کا سیاسی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اس وقت بھی ان کے حوصلے پر آنچ
نہیں آئی، نہ سکون نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ ان کی شخصیت کا یہ جادو تھا کہ ویرانہ
میں رہتے ہوئے بے منصب وجاہ بھی اگر وہ کسی سفارتی جلسے میں چلی جاتیں تو
سب لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے، بر سرِ اقتدار وزیر خارجہ کو چھوڑ کر۔

مصیبت اور معزولی کے ان ایام میں کچھ لوگوں نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔
ان کی خدمت میں برابر جاتے رہے۔ ایک روز بڑے امتنان کے ساتھ ایسے

ایک فیشن ایبل خاتون اپنی دوست کی بیٹی کے لیے بدیسی کپڑے کا ایک خوبصورت فراک لائیں۔ انھوں نے شکریے کے ساتھ فراک واپس کر دیا کہ ہم لوگ اب صرف کھدر پہنتے ہیں اور اسے قبول کرنے سے معذور ہیں۔ لیکن ان صاحبہ نے اصرار کیا کہ اپنی جان پر جو ظلم چاہو کرو مگر اس معصوم بچی کے ساتھ تو اتنی زیادتی نہ کرو۔ ماں نے بیٹی کو آواز دی۔ اس وقت وہ اپنی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ اس کو لیے ہوئے وہ ماں کے پاس آئی تو انہوں نے پیار سے کہا "دیکھو بیٹی، تمہاری آنٹی تمہارے لیے یہ فراک لائی ہیں۔ ہم تو اب بدیسی کپڑا استعمال کرتے نہیں، تم چاہو تو یہ فراک لے لو۔" ننھی منی بچی کا دل بہت للچایا مگر اس نے فراک کو چھوئے بغیر فیصلہ کن انداز میں جواب دیا "ہمارے ماں باپ بدیسی کپڑا نہیں پہنتے تو ہم کیوں پہنیں؟"

ان خاتون نے طنز کیا" بیٹا، یہ جو گڑیا تمہارے سینے سے چمٹی ہوئی ہے یہ بھی تو ولایتی ہے۔" بات ہنسی میں کہی گئی تھی لیکن اس بات نے ایک چھوٹی سی حساس بچی کی نیند اڑا دی۔ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہ سکی۔ آنٹی کی بات بھی درست تھی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ یہ گڑیا اسے بہت عزیز تھی اور اس کا جدا کرنا آسان نہ تھا دن نکلنے سے پہلے وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ اٹھتے ہی اپنی گڑیا کو لے کر چھت پر گئی اور اسے آگ لگا دی۔ بھیگی ہوئی آنکھوں سے وہ جلتی ہوئی گڑیا کو دیکھتی رہی۔ آگ کے شعلوں نے اس کے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ گڑیا جل بھی مگر اس کے چہرے پر اب بھی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ عزم محکم کی روشنی! یہ ننھی بچی اپنے ماں باپ کی چہیتی بیٹی اندو تھی یعنی ہماری آپ کی اندرا جی۔

لوگوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شبنم کی بوندیں آہن کے حصار میں ہیں۔

راقم نے پہلی بار قریب سے انھیں اس وقت دیکھا جب وہ اسی طیارہ سے جس میں وہ سفر کر رہا تھا بمبئی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد کئی ایک بار ان مجلسوں میں شریک ہوا جن کی وہ صدر تھیں۔ ان میں سے ایک مجلس قومی یکجہتی کونسل کی تھی۔ ذکر مسلم اقلیت کے اعتماد اور خوشحالی کو بحال کرنے کا تھا۔ اس مجلس میں غفور صاحب (اس وقت بہار کے وزیر اعلیٰ) نے مذاکرہ میں شرکت کرتے ہوئے کہا تھا کہ محترمہ آپ کسی مسلمان کو صدر یا چیف جسٹس بنائیں یا نہ بنائیں مسلمانوں کو تھانوں میں مامور ضرور کر دیجیے کیوں کہ اس کا بڑا اثر مسلمانوں

کے احساس سلامتی و احساس اختیار پر پڑے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری جب میں نے قبول وزیر اعظم سے ملنے گیا۔ رخصت کے وقت کہنے لگیں کہ آپ جب چاہیں مل سکتے ہیں۔ حوصلہ بڑھانے کا یہ ایک طریقہ تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی با اہمیت رکھتی ہیں۔

آساں روی اور طوائف الملوکی کے بعد نظم و ضبط اور قواعد و کا نفاذ متاثرہ عناصر کو گراں گزرا۔ ہنگامہ برپا کیا کہ شیخ جامعہ کے جائیں یا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ طلبہ کے گمراہ سربراہوں نے کسی اشار خاک دخون کی تیاریاں کیں۔ خود قلعہ نشین ہو گئے اور معصوم لڑکوں میں جھونک دیا۔ پولیس کو دفاع میں گولی چلانا پڑی اور ایک معصوم جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہی ہو گیا جس کو بچانے کے لیے میں بے جتن کرتا اور خطرے اٹھاتا چلا آیا تھا۔ میں نے شدت غم میں استعف کی ٹھان لی۔ یہ بات دلی پہونچی اور وہاں سے چشم زدن میں دُبائی جہاں ذ دورے پر گئی ہوئی تھیں۔ ابھی دلی سے بات ہوئے آدھا گھنٹہ بھی نہ کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وزیر اعظم کا پیغام پہونچا کہ استعفیٰ دینے نہیں ہونا۔ ثابت قدم رہیے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے د امور میں گھرے ہونے کے باوجود مسز گاندھی نے میری ڈھارس بن اور سبکدوشی سے باز رکھنے کا یہ اہتمام کیا۔ یہی نہیں دوسرے رو اندھیرے اس وقت کے وزیر داخلہ (حالیہ صدر جمہوریہ) وائس چ کے مکان پر تشریف لائے، بہ ظاہر بچشم خود حالات کو دیکھنے کے لیے اسی پیغام کو دہرانے کے لیے۔ چند ماہ بعد مسز گاندھی سے ملاقات ہ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی اس خصوصی توجہ نے اس وقت میں میرے دل کے تاروں کو چھو دیا تھا۔ اس سانحہ کے بعد ط آزماؤں نے یونیورسٹی کو اپنے ذاتی یا سیاسی مقاصد کے لیے تسخ چاہا۔ میں سدّراہ بنا ہوا تھا چنانچہ تین سال تک لگاتار ایک گروہ مر وزیر اعظم کے کان بھرتا رہا لیکن مسز گاندھی نے نہ رائے بدلی نہ رُخ نے البتہ ان سے معذرت کی کہ میری وجہ سے ان کو الجھن میں ڈالا جا راقم سطور کے متعلق ان کی جو کچھ رائے رہی ہو اس سے قطع نظر ا انتظامی شعور نے اس کی اجازت نہیں دی کہ احتجاج کی رو میں ک وائس چانسلر کو سبکدوشی پر مجبور کر دیا جائے۔

اس دردناک سانحے کے بعد یونیورسٹی کو بند کرنا پڑا تھا، ج کھولنے کا ارادہ کیا تو انتظامیہ نے ہامی نہیں بھری۔ ریاستی حکومت یقین دلایا گیا تھا کہ اگر یونیورسٹی کھلی تو بہت بڑا تصادم ہوگا؛ ک

ے لینے تک جائیں گے ۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرتے ہوئے
ہتاج کر رہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا ۔ لیکن کون سنتا تھا جن حضرات
، یونیورسٹی بند کرانے کے ڈول ڈالے تھے ان کی ان تھک کوشش تھی
ونی ورسٹی کھلنے نہ پائے ، لڑکوں کا ایک سال تو ضائع ہو ہی جائے ۔
رد کھیں وائس چانسلر کیسے رکتا ہے ۔ یہ گتھی بھی مسز گاندھی کے خاموش
نارے نے سلجھائی ۔ وزارتِ داخلہ میں مجلسیں ہوئیں اور یونیورسٹی
ملی ادر سکون اور امن کے ساتھ پڑھائی ہوئی اور ضائع ہوتا ہوا سال
ت کے جبڑے سے نکال لیا گیا ۔

یونیورسٹی کی اقامت گاہوں میں بڑا ہجوم تھا ۔ ضرورت تھی ان میں اضافہ
، ایک عرصۂ دراز سے کوئی ہوسٹل نہیں بنا تھا ۔ کمیشن اور وزارت میں کون
ما یہاں بھی وزیر اعظم کی ذاتی دلچسپی نے دروازے وا کر دیے ۔ اور اس
ِ خطر سے جو منظور ہوا تھا ایک نئے ہال کی خوبصورت عمارت کھڑی کردی گئی
علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہے ۔ اور جس میں سات سو طالبعلموں کے
جگہ ہے ۔

یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لیے ۱۹۶۶ء سے ہندوستان
مسلمانوں نے جدوجہد شروع کی ، قربانیاں دیں ، یہاں کی تعلیمی فضا
ہوگئی ۔ احتجاج کرکر کے لوگ تھک کر بیٹھ گئے ۔ مراد آباد میں فسادات
ے ، پھر علی گڑھ شہر میں ، اور بازیابیٔ کردار کی مانگ دب گئی ۔ اس
ت جب یہ مطالبہ ایک عرصہ سے فضا میں نہ تھا ، اچانک یہ منظور کرلیا
ایسا کیوں ہوا ، یہ بات ابھی تک صیغۂ راز میں ہے اور رہے گی لیکن
کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے بعد بہت دیر تک یونیورسٹی میں
ہ آرائی کا حوصلہ کسی کو نہ ہوسکا ۔ حالات کا یہ بھی ایک طنز ہے کہ
کے ترمیمی ایکٹ نے جس کے ذریعہ مسلمانوں کا مطالبہ منظور ہوا اور
ہی کردار بحال کیا گیا بالآخر ہدف اسی کو بنایا گیا جس کے لیے یہ
ل جدوجہد کی گئی تھی ۔ نکتہ چین خندہ زن ہیں کہ اقلیتی کردار کیا
لو کہتے ہیں ،

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد
وائے گر درپسِ امروز بود فردائے

پھر ایک وقت آیا کہ ساری مرکزی یونیورسٹیوں کے لیے ایک مشترک
ـ کی تجویز کی گئی ۔ یونیورسٹیوں کی خود اختیاری معرضِ خطر میں پڑگئی ۔
لی گڑھ یونیورسٹی کے احاطہ میں تو کہرام مچ گیا کہ ایک ہاتھ سے
یتی کردار دیا گیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے واپس لیا جارہا ہے ۔
بڑی ریلی ہوئی ۔ راقم نے اس ریلی کی صدارت کی اور اس کا رخ
آئینی مانگ کی طرف موڑا ، اور کہا کہ ایک نمائندہ گروہ وزیر اعظم سے ملے ،
میں اس کی سیادت کو تیار ہوں ۔ دوسری یونیورسٹیوں کی نگاہ بھی
ہم پر تھی ۔ چنانچہ بھان متی کے کنبہ کو لے کر راقم سطور مسز گاندھی کی
خدمت میں حاضر ہوا ۔ وہاں تو یہ عالم تھا کہ تار باجا اور راگ بوجھا ۔
میں نے اس اقدام کے مضمرات کا ذکر چھیڑا ہی تھا کہ انھوں نے انتہائی
شگفتگی کے ساتھ بات کی تہ تک پہونچنے کی خبر دے دی ۔ حامی تو نہ بھری لیکن
ہم مطمئن واپس آئے ۔ وہ دن ہے اور آج کا دن اس مشترک بل کا سراغ
بھی کسی کو نہیں ملا ۔ مسز گاندھی کے کام کرنے کا یہی انداز تھا ۔ انھیں بات
کی تہ تک پہونچنے اور فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگتی تھی لیکن اس کا اعلان دورانِ
گفتگو کرنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا ۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں ، ایک
تو یہ کہ جب تک ان کا دفتر جس میں انھوں نے لائق ترین افسروں کو جمع کر رکھا تھا ،
تجویز کو چھان پھٹک کر دیکھ نہ لے ، کوئی حتمی وعدہ کرنا بعد میں دشواریاں پیدا

روشنی

چینی سیاح ہیون سانگ نے اپنے سفرِ ہندوستان کے جو حالات لکھے
ہیں ان میں شاید سب سے دلچسپ قصہ اس نادان کا ہے جسے اپنے علم پر بڑا ناز
تھا ۔ اسے گمان تھا کہ علم کا یہ بے پناہ ذخیرہ اس کے پیٹ میں محفوظ ہے اور
روز افزوں ہے ۔ چنانچہ پیٹ پھٹ جانے کے خوف سے اس نے لوہے
کی پٹیوں سے پیٹ کو کس رکھا تھا ۔ دن میں بھی گھر سے نکلتا تو اس شان
سے کہ ایک روشن شمع اس کے سر پہ دھری ہوتی ۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا
تھا کہ اس کے سوا باقی تمام لوگ جہالت کی تاریکی میں گھرے ہوئے ہیں جس
سے نجات دلانا اس کا فرض ہے ۔

پیاری بیٹی ، نہ تو مجھے اس نادان کی طرح یہ خوش فہمی ہے کہ میں علم کی دولت
سے مالامال ہوں ، نہ یہ سمجھتا ہوں کہ علم میری توند میں محفوظ ہے اور نہ کبھی میرے
دل میں یہ خیال گزرا کہ میں دانشمند ہوں اور دوسرے گروہ ، کم علم ، بے عقل ؛
اس لیے میں نصیحت کرنے اور وعظ کہنے کو ایک مہمل بات سمجھتا ہوں ۔ تم
خوب جانتی ہو کہ میں نے کبھی تمہیں کچھ نہیں دیا ۔ ہاں یہ میں ضروری سمجھتا ہوں
کہ اپنے تجربات تمہارے سامنے رکھ دوں ، اپنی معلومات تم تک پہنچا دوں ،
زندگی میں جو لغزشیں ہوئیں اور ان کے جو نتیجے نکلے وہ تمہارے سامنے رکھ
دوں ، تم ہوشیار ہو ، اس میں سے کام کی باتیں خود ہی نکال لوگی ۔

— پنڈت جواہر لال نہرو کا خط اپنی بیٹی کے نام ۔

کرسکتا تھا۔ دوسرے اس طرح وہ ملنے والوں کو ان کی جگہ پر رکھ سکتی تھیں تاکہ
مزدوری فاصلہ درمیان میں رہے۔ اور گفتگو سوال و جواب یا برابری کی سطح پر
بات چیت کی شکل، اختیار نہ کرلے۔ ان کا طور ڈالفن کا سا تھا جس کی پشت
بقول شیکسپیر پانی میں رہنے کے باوجود تر نہیں ہوتی۔ اس بات پر اب اتفاق
ہے کہ مسز گاندھی مشورہ بہتوں سے کرتی تھیں لیکن فیصلہ ان کا اپنا ہوتا
تھا۔ ابتدا میں لوگ سوچتے تھے کہ ان کے مشیران کے لیے فیصلہ کرتے ہیں
لیکن بعد میں یہ بات واضح ہوگئی کہ نہیں، فیصلہ کیا ہو اور کب ہو، یہ سب
کچھ وہ خود طے کرتی تھیں۔ فیصلوں کی ضمن میں ایک عالم ان کے انتخاب
ساعت کا قائل تھا۔ صحیح وقت پر فیصلہ کرنے کے لیے ان کے پاس گویا ایک
چھٹی حِس تھی۔ بینکوں کو قومی تصرّف میں لانے کا فیصلہ اتنا برمحل اور بروقت
نکلا کہ اس نے ہندوستان کی سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا اور اس وقت
سے ان کی سیادت کا سکّہ چلنے لگا۔ بہت سی مثالوں میں سے یہ صرف
ایک مثال ہے۔

ہر وہ شخص جو آگے بڑھنے اور لے چلنے کے لیے بے تاب ہو، وہ
جمہوریت اور اہل کاروں کی آہستہ خرامی سے گھبرا جاتا ہے۔ کام اگر کرنا
ہے تو ان تکلّفات اور ضوابط اور لایعنی اور پُرتاخیر موشگافیوں کو
بالائے طاق رکھنا ہوگا۔ اندرا گاندھی نے بھی یہی کیا۔

لیکن سارا اختیار جب ہاتھ میں آجاتا ہے تو وہ اپنے خطرات بھی ساتھ
لاتا ہے۔ پھر انسان دوسروں کی رائے کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا اور رائے
دینے والے بھی اپنی رائے کو صاحبِ اختیار کی رائے یا رجحان اور افتاد کے
مطابق ڈھالنے لگتے ہیں، گویا صاحب اختیار آزاد اور پرخلوص رائے
سے خود کو محروم کرلیتا ہے۔ اسے جو مشورہ ملتا ہے وہ خود اس کے
رجحان کی پھیکی سی نقل ہوتا ہے۔ اپنی ہی آواز کی گونج اس کے
کانوں میں آتی ہے اور وہی بھلی لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک خطرہ
اور پیش آتا ہے، صاحب اختیار جو دراصل عوام سے طاقت اخذ
کرتا ہے، ان سے کٹنے لگتا ہے، دُور ہوجاتا ہے۔ محصور ہوجاتا
ہے۔ ہرچند کہ اندرا گاندھی کا ہاتھ عوام کی نبض پر تھا پھر بھی ان سے
ان کا رابطہ وہ زندہ اور پیوستہ رابطہ نہیں رہا تھا جس کی بنا گاندھی
اور نہرو نے ڈالی تھی۔ ان کو سلامتی اور تحفظ کے لیے ایک حد تک
دامن کش اور رُوپوش رہنا پڑا۔

شروع میں کانگریس کے جن مکھیاؤں نے اندرا گاندھی کو وزیر اعظم
کی گدّی پر اس امید کے ساتھ بٹھایا تھا کہ حکومت اندرا گاندھی کی ہوگی
اور راج وہ کریں گے، انھیں مایوس ہونے میں دیر نہیں لگی۔ یہ "اتالیق"
اسی سرعت کے ساتھ ہٹا دیے گئے جس سے نوخیز اکبر نے بیر
اختیار اور راستہ سے ہٹا دیا تھا۔ اوّل تو وہ کام کرنے نہ دیتے
نہرو کی بیٹی دوسروں کی تابع فرمان کب ہونے والی تھی، تیسرے د
جو غریبوں اور کمزوروں کے حق میں تھیں کہنہ دماغوں کو راس کہ

اشوک مترا نے جو ایک سبکدوش سول سرونٹ ہیں اور جنھ
اطلاعات میں اندرا گاندھی کے ساتھ کام کرنے کا اور ان کی
اور مشوروں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے اسٹیٹسمین
مضمون میں اندرا گاندھی کے بیکراں اختیارات کے مضر اثرا
ذکر اس طور کیا ہے:

o ۱۹۶۹ء میں کانگریس پارٹی کے جس وقت دو ٹکڑے
جس سے سول سروینٹ کے اس حق پر جو آزاد رائے دینے سے
تھا، بندشیں لگنا شروع ہوگئیں۔ کلّی اتفاق یا کمٹ منٹ کی
نے معاملہ کو اور سنگین بنا دیا... اندرا گاندھی یہ سمجھنے لگیں ک
کرنا ان ہی کا فرض اور حق تھا۔ اور اسی اعتماد کے مطابق ہند
کے وفاقی نظام کے ڈھانچے کو توڑا مروڑا گیا۔ مسز گاندھی کا ک
زبردست اور ہیبت آفریں ہے۔

اندرا گاندھی نے بہ حیثیت وزیر اعظم ۱۶ سال کے عرصے میں کا
نمایاں انجام دیے۔ انھوں نے ملک کے اتحاد پر جراحت نہ آنے دی
اور کمزوروں کے لیے ان کا دل ہمیشہ پگھلتا رہا اور ان کا نصب العین
پسماندوں، مظلوموں کو علم اور خوشحالی سے روشناس کرانے
انھیں اپنے عظیم باپ کی طرح جو گرم جوشی تائید ملی، ان کی شخص
جو کہربائی طاقت تھی اس کا راز نہ صرف اس روحانی عقیدت میں
ہندوستانیوں کو نہرو خاندان سے تھی، وہ خاندان جو اپنے
قامت، جمال اور خدوخال کے لیے مشہور تھا، بلکہ اس احسا
بھی کہ اتنے خوشحال اور آسائش خو افراد نے وطن کی آزاد
لیے ساری آسائشیں اپنے اوپر حرام کرلیں اور ساری تکالیف
بنا لیا؛ اندرا گاندھی کی پرستش اس لیے بھی کی گئی کہ وہ عورت
وہ عورتوں کے شعور اور امکانات کی علامت بھی تھیں
سب سے زیادہ جس چیز نے جواہر لال اور اندرا گاندھی کی شخ
میں وہ کہربائی سحر بھر دیا جسے کیرزما کہتے ہیں وہ اہلِ ہند
میں یہ احساس تھا کہ وہ ایک روشن مستقبل کا تصور رکھتے ہیں ا
رائے ہیں۔ وہ دیانت، ذہانت، لیاقت اور بصیرت سے
وہ ریاستی، لسانی، مذہبی اختلافات اور تنگ نظریوں سے

... کے شانہ بہ شانہ چلانے کے خواب دیکھتے ہیں اور خواب کو ... پر قادر ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کو وسائل اور سائنسی ... کلچر سے مضبوط کیا۔ وہ ایسی زبان بولتے ہیں جو ہندوستان ... سمجھی جاتی ہے۔ وہ اتنے خوشحال اور نفاست پسند ہونے کے ... جان دیتے ہیں۔ اندرا گاندھی نے ناوابستہ ممالک کی سربراہی ... اور ذہانت اور قرینہ کے ساتھ کی۔ اشوک متا نے ۱۹۶۰ء میں ... سے اس ... پہلی ملاقات کا ذکر اس ڈھنگ سے کیا ہے " وہ ... ہوئی ... تھیں۔ حیا نے ان کے چہرے پر سرخی کی لہریں ... تھیں۔ اور بولنے میں انہیں تامل تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی ... تنہائی در حفاظت میں گزری ہو"۔

میں نے ملاقاتوں کے دوران ان سے بات چیت کا آغاز بالعموم ... میں کیا۔ اس خیال سے کہ فاصلہ رکھنے اور ضابطہ کو نباہنے کے ... زبان کارآمد ہے اور مادری زبان میں قرب اور بے تکلفی کا پہلو ... ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھے اردو کی طرف لے آتیں۔ شاید وہ ایک ... والے کی غیر مخلوط اردو سننا چاہتی تھیں جو شائستگی کے آداب ... کی بندش اور لطافت کی نہیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ انہوں ... ساڑھے چار سال کے دوران یونیورسٹی میں کبھی مداخلت نہیں کی لیکن اس کے وائس چانسلر کی مدد اور پشت پناہی میں کبھی ... نہیں کیا۔ اگر کوئی صلاح دینی ہوئی تھی تو براہ راست کبھی کچھ نہیں کہا۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

... گاندھی کی عظمت کو ان کی زندگی میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ موت نے ... میں اضافہ کر دیا۔

... میں کام کی لگن اور ریاضت کی صلاحیت لامحدود تھی۔ ٹیلی وژن ... نے معالج، (معالج نہیں طبیب کہ ان کو علاج کی نوبت ہی نہ آئی تھی) ... کہ وہ روز سولہ سترہ گھنٹے کام کرتی تھیں۔ مشکلات کا وہ خیر مقدم ... چیلنج کو دوڑ کر قبول کرتیں۔ میری اندرا گاندھی سے آخری ملاقات ... اکتوبر ۸۴ء کو ہوئی تھی۔ ذاکر حسین کالج ٹرسٹ کی میٹنگ میں۔ بات ... سے شائستہ اور دلنواز شگفتگی اور خندہ جبینی مترشح ہو رہی تھی۔ ... نومبر کے دوسرے ہفتے میں علی گڑھ آ رہی تھیں۔ شاید اس روز ... یہ سطور لکھی جا رہی ہیں وہ یہاں ہوتیں لیکن ایسا ہونے کو نہ تھا۔ ... کے ظالم ہاتھوں نے انہیں ہم سے چھین لیا۔

بحیثیت وزیر اعظم کے انہوں نے یونیورسٹی میں قدم نہیں رکھا۔ ... اعظموں میں وہی ایسی تھیں جنہیں یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار انہیں علی گڑھ آنے کی دعوت بھی دی۔ انہوں نے متبسم ہو کر ہامی بھر بھی لی لیکن ہر بار آنا ٹل گیا کہ ایک گروہ کی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ نہ آئیں۔ وہ یہاں آتیں تو ... ان زبردست خیر مقدم سے نوازا جاتا۔ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائی جاتیں۔ علی گڑھ کی روایتی مہمان نوازی کو ان کی صنف اور دلپذیر شخصیت اور ان کے حسن و جمال سے اپنی نسبت ... اور وہ آتیں تو یونیورسٹی کو کچھ دے کر جاتیں۔ میں نے آخر میں انہیں لکھ دیا تھا کہ میں نے طے کر لیا ہے جب تک وزیر اعظم نہیں آئیں میں تقسیم اسناد کا جلسہ (کونووکیشن) نہیں کروں گا۔ انہوں نے سوچا کہ جانا چاہیے مگر نہ آ سکیں۔ اور جو امید بندھی تھی وہ مایوسی میں بدل گئی۔

اندرا گاندھی اپنے باپ کی طرح نڈر تھیں۔ ذاتی خطرہ کا انہیں احساس تک نہ تھا۔ اور محنت سے دامن چرانا ان کے تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ چیلنج کو بنا آنکھ جھپکائے قبول کرتیں۔ خطرہ میں کود پڑنا ان کی ادا تھی۔ ٹیلی وژن پر ہی مسز سبھدرا جوشی نے بتایا کہ تقسیم کے ایام میں گھرے ہوئے اور ستائے ... مسلمانوں کی خدمت کے لیے ان کے ساتھ نکلتیں اور بے دھڑک ان محلوں میں چلی جاتیں جہاں ہر لمحہ ان کی جان کا جوکھوں تھا۔ ڈاکٹر ماتھر نے یہ بھی بتایا کہ ان کی نگاہ جزئیات پر تھی اور وہ ان لوگوں کا جو ان کے ساتھ مامور تھے خاص خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار دورے پر ڈاکٹر ماتھر کی سال گرہ پڑی۔ اندرا گاندھی نے ایک خوبصورت سی نظم اس موقع کے لیے لکھی اور تبریک کے ہدیہ اور دلدہی کے وسیلہ کے طور پر انہیں بھیج دی۔

... کی روایت کے مطابق انہیں اقلیتوں اور پچھڑی ہوئی ... اور ... اور بچھڑے ہوئے طبقوں کی فلاح سے گہری دلچسپی تھی۔ لیکن باوجود ان کی کوششوں کے یہ لوگ ... کا نشانہ بنتے رہے ... مسلمانوں نے اکثر ان کا ساتھ دیا لیکن کہا جاتا ہے کہ ... کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے کچھ بے نیازی برتنا شروع کر دی۔ فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو کلمند کر دیا تھا۔ تاہم بحیثیت مجموعی انہیں مسلمانوں کی زبان، تمدن اور اطوار سے دلچسپی تھی جس کا ... کے بچپن کا ماحول اور ان کا سیکولر اور جمہوری مزاج کر رہا تھا۔

مسز گاندھی کے قتل کی خبر ... سکھوں ... نہیں تو اور کیا ہے۔ جو لوگ مارے گئے یا لوٹے گئے ان کا ... کے قصور کی سزا انہیں یوں ملی ... انصاف ... ہے۔

اندرا گاندھی کے ہمیشہ تازہ دم رہنے کے ... کام میں انہاک اور کام کرنے کا حوصلہ اور اپنے اوپر ... اور ایک مرتب نظام زندگی۔ ہر چیز سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ ہر چیز نپی تلی ہوئی۔ مسلسل کام قاعدہ سے کیا

جائے تو سہل ہوجاتا ہے، آسان کام بے قاعدگی سے کیا جائے تو زندگی خلش اور خلفشار میں گزرتی ہے۔ ان کی زندگی بہت مرتب اور منضبط تھی۔ اسی وجہ سے وہ مصروف رہتیں لیکن مصروف نظر نہ آتیں۔

۲ر نومبر کی شب میں تین مورتی اندرا گاندھی کے آخری دیدار کے لیے گیا۔ سارا جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ خوبصورت چہرا موت کے سایہ میں بھی خوبصورت نظر آرہا تھا اور وہ تراشے ہوئے خدوخال اپنے یونانی زاویوں کو لیے ہوئے اس آہنی قوتِ ارادی کا اعلان کر رہے تھے جو ۱۶ سال تک ہندوستان کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دیا اور جس نے اقوامِ انجمن میں ہندوستان کو مقام امتیاز عطا کیا۔ ذہن سینتیس سال پہلے طرف گیا جب ہم اسی طرح جواہرلال نہرو کو آخری خراجِ عقیدت ادا کرنے کے لیے تین مورتی میں آئے تھے۔

ہر کمال کو زوال ہے۔ لازوال صرف خدا کی ذات ہے۔ ★★

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں :

تعزیتی جلسے

ملک کی محبوب رہنما اور ہر دل عزیز وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی پر حملہ کی اطلاع کو مسلم یونیورسٹی میں پہلے محض افواہ خیال کیا گیا لیکن جب اس کی تصدیق ہوگئی تو ہر طرف سوگواری چھاگئی۔ سارا کاروبار معطل ہوگیا اور لوگ ان کی سلامتی وصحت کی دعائیں مانگنے لگے لیکن دوپہر کے وقت اطلاع ملی کہ ڈاکٹروں کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں اور انہوں نے اس دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی ہر طرف غم واندوہ کے بادل چھاگئے۔ اگلے دن تعزیتی جلسے ہوئے اور تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں۔ یونیورسٹی انتظامیہ اور اسٹاف ایسوسی ایشن کی طرف سے قراردادیں پیش کی گئیں۔

پروفیسر ایم بہاء الدین پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر نعمت اللہ چودھری سکریٹری اسٹاف ایسوسی ایشن کی تقاریر کے اقتباسات یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔ (راحت ابرار)

بڑے رنج وغم کے ساتھ میں آپ کے سامنے محبوب وزیرِ اعظم کی وفات کا ماتم کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ سبھی حضرات کو معلوم ہے کہ ان کی موت ناوقت، چند قاتلوں کے ہاتھوں ہوئی۔ آنجہانی مسز گاندھی نے اپنے عہدِ حیات میں تشدد اور فرقہ واریت کے خلاف انتھک جدوجہد کی اور اپنی جان ملک کے اتحاد اور سالمیت کی بقا کی راہ میں جان آفریں کے سپرد کردی۔

مسز اندرا گاندھی دنیا کی سب سے عظیم جمہوریت کی وزیرِ اعظم تھیں۔ مختلف سماجی ڈھانچوں پر مشتمل، مختلف ثقافتی پس منظر والے ملک اور مذہبی، لسانی و اقتصادی معاملات میں مختلف الخیال قوم کے اتحاد کو برقرار رکھنا کوئی سہل کام نہیں۔ ان کی قد آور شخصیت نے ہر عوام کی زندگی کے ہر پہلو پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں انھوں کے اتحاد اور سالمیت کو باقی رکھا۔ وزیرِ اعظم کی حیثیت سے گاندھی نے بڑے بحرانی دور میں ملک کی قیادت کی۔ اور ایک جدید ہندوستان کی تعمیر کی۔

آنجہانی وزیرِ اعظم صرف ہندوستانی عوام کی قائد نہیں وہ تمام ناوابستہ ممالک کے لیے امید کی ایک روشن کرن کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ ظلم وستم کے شکار تمام لوگوں کی حامی تھیں، نئے اقتصادی نظام کی وکیل تھیں جس کے اندر بین اقوامی سطح پر پذیر ممالک کو زیادہ انصاف مل سکے۔ خود ہمارے ملک میں اور باہر وہ پسماندہ عوام کے لیے روشنی کی علامت تھیں۔ وہ دنیا آزادی کی تحریکات کی مشعل بردار اور غیر جانب دار اقوام کی قائد وہ اس درسگاہ کی بہی خواہ تھیں۔ ہمیں اپنی محبوب وزیرِ اعظم کی حمایت و تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔ ہمارے ادارے کے ترقیاتی پروگراموں کا ان کی مدد کے بغیر ممکن بھی نہ تھی۔

مسز گاندھی کی موت سے انسانیت ایک دوست، قوم اپنے قائد اور سیاست داں سے محروم ہوگئی ہے۔ ایسے لمحات میں ہم اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں اور ہمارے اختیار میں بس یہی ہے کہ ہم اس غم میں برابر کے شریک ہو

پروفیسر ایم بہاء الدین
پرو وائس چانسلر اے ایم یو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعزیتی قرارداد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہم جملہ ممبران اسٹاف اور طلبا محترمہ اندرا گاندھی کی بے وقت اور المناک وفات پر اپنے انتہائی رنج و غم کا اظہار کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس افسوس ناک سانحے نے ساری دنیا کو صرف جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ روحانی طور پر بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہ صرف ایک معمولی انسان کا نہیں بلکہ پوری دنیا کی عظیم رہنما کا ماتم ہے۔

محترمہ اندرا گاندھی اس عہد کی ایک عظیم شخصیت، ایک غیر معمولی مدبر تھیں۔ انھوں نے ملک کی جو خدمت کی اسے آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جدید ہندوستان کی تعمیر میں ان کا رول لاثانی تھا۔ ان کی زندگی اور کارنامے ہمارے ذہن و افکار اور پورے سماجی نظام کو متاثر کرتے رہیں گے۔

یہ تصور کرنا محال ہے کہ آج ہمارا ملک محترمہ اندرا گاندھی کی فعّال اور ہمہ گیر شخصیت سے محروم ہو چکا ہے۔ ان کی وفات کے ساتھ ملک کی تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہو گیا۔ ان کی وزارتِ عظمیٰ کا عہد ایک دہائی سے زیادہ ہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے ملک میں سائنسی رجحان، سیکولرازم کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کی جرأت مندی، ذہانت اور شخصیت نے ملک کے اتحاد و سالمیت میں مدد کی۔ ہمیں متحد رہنا ہے تو ان کی تعلیمات کو اپنانا ہوگا۔ ہم سب لوگ جو آج ان کے غم میں سوگوار ہیں ان کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ جو مقاصد مسز اندرا گاندھی کے پیشِ نظر تھے ان کے حصول کے لیے کوشاں رہیں۔

خدا ان کی روح کو سکون عطا فرمائے اور ان کے اہلِ خاندان کو ہمت دے کہ اس غم کو برداشت کر سکیں۔

★ ★

جامعہ اردو کی تعزیتی قرارداد: جامعہ اردو، علی گڑھ کے عہدہ داروں اور کارکنوں کا یہ جلسہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے المناک و بے وقت انتقال پر اپنے گہرے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مرحومہ کی محبوب شخصیت میں ہم نے صرف تاریخ ساز رہنما کو کھو دیا بلکہ ایک ایسی اردو نواز دخترِ وطن سے بھی محروم ہو گئے جس نے جامعہ اردو کی اعزازی سند دکتورِ ادب قبول کر کے اسے سرفراز کیا تھا۔ انھوں نے مرتے دم تک مادرِ وطن کی خدمت کی اور بالآخر اس کی سالمیت برقرار رکھنے کی خاطر گاندھی جی کی طرح جامِ شہادت نوش کیا۔ خدا انھیں اجرِ عظیم دے۔

محمد جمیل خاں
رجسٹرار جامعہ اردو، علی گڑھ

اسٹاف ایسوسی ایشن کی تعزیتی قرارداد

ملک کی رہنما اور ملک کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بے رحمانہ قتل پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹاف ایسوسی ایشن کا یہ جلسہ دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ یہ جلسہ مسز گاندھی پر وحشیانہ حملے کی پرزور مذمت کرتا ہے۔

مسز گاندھی کا شمار ملک کی عظیم ترین ہستیوں میں تھا۔ اعلیٰ انسانی اقدار اور صحت مند رجحانات ان کی شخصیت میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ سیکولرازم کی علم بردار تھیں اور تمام مذاہب کا احترام کرتی تھیں اسی لیے انھوں نے اپنے حفاظتی دستے کے ان ملازمین کو ہٹانے کی تجویز مسترد کر دی جو ایک خاص فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ عالمی سطح کی رہنما، امنِ عالم کی علمبردار تھیں جس کا ثبوت غیر جانب دار ملکوں کی وہ کانفرنس ہے جس کی انھوں نے صدارت فرمائی۔ ان کے دور میں ملک خلائی عہد میں داخل ہوا اور سائنس کے میدان میں آگے بڑھا۔ سیکولرازم اور سوشلزم کی بقا اور ترقی کے لیے وہ ساری زندگی کوشاں رہیں۔ بلاشبہ عہدِ حاضر کے عظیم رہنماؤں میں ان کا شمار تھا۔

انھوں نے اپنی زندگی ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ انھوں نے ملک و قوم کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا۔ یقین ہے کہ ان کی شہادت رائیگاں نہ جائے گی۔ اور ملک جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کی راہ پر گامزن رہے گا۔

مسز گاندھی نے اس یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ خیال رکھا۔ ان کے زمانۂ حکومت میں یونیورسٹی کے اکثر ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل ہوئی۔ انھی کے زمانے میں اس کا اقلیتی کردار بحال ہوا۔ ان کی توجہ سے یہاں مقابلے کے امتحانات کی تیاری کے لیے مرکز قائم ہوا۔

اس بے مثال رہنما کی ناوقت موت کے غم میں یونیورسٹی کا تمام اسٹاف ان کے ورثا کا شریک ہے۔ خدا ان کی روح کو سکون عطا فرمائے۔

ڈاکٹر رفعت اللہ چودھری
سکریٹری
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹاف ایسوسی ایشن

ڈاکٹر شہریار

چیخوف کی ایک کہانی

۱۸۶۰ء میں اس نے جنم لیا ۱۹۰۴ء میں پیوندِ زمین ہوگیا گویا اس سرائے فانی میں کل چوالیس برس مہمان رہا۔ یہ مختصر مدت بھی چین سے نہ گزری۔ بیماری، بے روز تنگ دستی، کوئی نہ کوئی بلا اس کے پیچھے لگی رہی۔ وہ ایک غریب کیرے (SERF) کا پوتا، ایک معمولی دکاندار کا بیٹا اور ایک مقروض و مفلوک الحال گھرانے تھا۔ ابھی کھیل کود کے دن تھے مگر گھنٹوں دکان کے کام میں لگا رہتا۔ مول تول میں کہیں چوک ہو جاتی تو بے رحم چڑچڑا باپ قمچیوں سے کھال ادھیڑ دیتا۔ دکان سے وقت بچتا تو اس میں چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا، گرمی کی چھٹیوں میں محنت مزدوری کرتا، باپ سے موسیقی کی تعلیم لیتا، گرجا میں بھجن گاتا اور سے بچے پر جس کی صحت بھی اچھی نہ تھی کاموں کا کتنا بوجھ تھا! ذرا بڑا ہوا اور کچھ پڑھنا لکھنا آگیا تو مزاحیہ خاکے، کہانیاں، ڈرامے لکھ کر پادری، پروفیسر، ڈاکٹر، ضلع دار کا مذاق اڑایا۔ ایک کم عمر ذہین بچے کی ان کوششوں کو کیا نام دیں؟ ٹھیک ہے ادبی شرارتیں کہہ لیں۔ چھوٹا سا گھر اسٹیج بن گیا اور گھر کے افراد میں اپنے بہن بھائیوں کو ملا کے چھوٹی سی منڈلی بنائی جو طرح طرح کی نقلیں اور کھیل تماشے پیش کرتی۔ اس سے تنگ و تاریک گھر کی اداس فضا میں ذرا دیر کو آجاتی اور قرض کے بوجھ میں دبے گھر کے لوگ اپنے خالی پیٹ پکڑے دیر تک ہنستے رہتے۔

یہ تھا ننھا انتوشا (انتون پاولوچ چیخوف) جس کی ساری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح گھر والوں کو خوشی کے چند لمحے میسر آجائیں۔ اور جب وہ جوان ہوکر مشہور افسانہ نگار، ڈراما نویس اور ڈاکٹر انتون چیخوف بنا تو اس کی آرزو صرف یہ تھی کہ اپنے شہر، اپنے ملک اور ساری دنیا کو خوشیوں کی بے حساب دولت سے مالا مال ہر نیک انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ساری دنیا میں نہ سہی تو کم سے کم اس کے شہر میں کوئی ننگا بھوکا نظر نہ آئے لیکن چیخوف نے اپنی پوری زندگی عملاً اس مقصد کرنے میں صرف کر دی اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اس نے ہزارہا بیماروں کا مفت علاج کیا اور ان کی تیمار داری کی، ہیضے کی وبا پھیلی تو وہ گاؤں گاؤں دو کرتا پھرا۔ اس نے جگہ جگہ اسکول کھولے اور کھلوائے، ہسپتال قائم کیے، سڑکیں بنوائیں، جگہ جگہ باغات لگوائے، پارک بنوائے، سفر کی تکلیفیں برداشت اس سرزمین علاقے میں پہنچا۔ جہاں مجرموں کو جلاوطن کرکے بھیجا جاتا تھا۔ واپس آکر ان کی تکلیف دہ حالت پر ہزاروں صفحات لکھ ڈالے اور حکومت کو ا مجبور کر دیا۔ اس کی بہن ماریا کا بیان ہے کہ نوجوان اپنے مسودے، بیمار اپنے مرض اور کسان اپنے مسائل لیے ہر وقت اس کے دروازے پر کھڑے رہتے۔ وہ مدد کرتا اور اس میں روز اپنی جیب خالی کر لیتا۔ جب اس پر دو لاکھ کا قرض تھا تب بھی وہ ہر ایک کو قرض دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کا مکان زیر تعمیر تھا کہ کچھ کچھ اجنبیوں، کچھ قومی اداروں کو روپے کی ضرورت پیش آگئی۔ اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے بے دریغ دے ڈالا اور کام روک دیا۔ بیمار تو وہ سدا کا تھا کام یورش نے اسے تپِ دق کے موذی مرض میں مبتلا کر دیا لیکن وہ کام سے باز آیا نہ لوگوں کی مدد سے۔ بستر مرگ پر تھا کہ اطلاع ملی مشرق میں جاپان سے روس کی جنگ چھڑ گئی ہے اس نے بلا تاخیر اپنی طبی خدمات پیش کر دیں اور سفر کی تیاری کرنے لگا اتنے میں سفر آخرت پیش آگیا۔ سیر و سفر کا اسے بچپن سے بہت شوق لمبے سفر پر بھی ہنسی خوشی روانہ ہوگیا۔ کہتے ہیں آخر وقت تک وہ ہنستا، بولتا اور کہانیوں کے لیے موضوع تلاش کرتا رہا۔

شروع شروع میں اس نے جو لکھا وہ ایک بھولے بھالے بچے کا شوقِ فضول تھا، پھر رسالوں سے معاوضہ لے کر گھر کا بوجھ ہلکا کرنے کو لکھا جو کچھ لکھا تیز رفتاری سے اور قلم برداشتہ۔ جب اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ ہوگیا تو جی لگا کے اور قلم روک کے لکھا اور لکھنے میں اپنی جان کھپا دی۔ وہ تخلیقات کو دشمن کی نظر سے دیکھتا تھا اس لیے اپنی تحریروں سے کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ ایک دن کہنے لگا "مرنے کے بعد مجھے کون یاد رکھے گا۔ سات سال بعد سب بھول جائیں گے"۔ سننے والے نے احتجاج کیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بولا "چلو ساڑھے سات سال سہی"۔ آج کون ہے جو اس بات سے انکار کرے کہ اس کی مقبولیت سات سو سال بعد بھی کم ہونے والی نہیں۔

وہ جو کچھ اور جیسا کچھ دیکھتا تھا اس کی ہوبہو تصویر کھینچ دیتا تھا۔ اس کے زمانے کے تنقید نگار اس سے مطمئن نہ تھے۔ وہاں مدت کئی صدی سے بیدار ہو رہے تھے اور فنکار سے مکمل حمایت اور جانبداری کا تقاضا کرتے تھے۔ چیخوف نے ایک بار جھنجھلا کے کہا "میں گھوڑوں کی چوری پر کوئی کہانی لکھوں تو کیا یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ گھوڑے چرانا بری بات ہے؟ کیا بتائے بغیر لوگ اتنی سی بات سمجھ نہیں سکتے؟" تنقید نگار اس سے ناخوش ہی رہے اور اس کے قلم سے وہ مشہور جملہ نکلا جو آج تک زبان زدِ خلائق ہے کہ "تنقید نگار گاڑی کے پہیے پر بیٹھی اس مکھی کے مانند ہے جس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پہیے کو گھومنے سے روک دے۔"
مگر پہیہ گھومتا رہا اور اس کی شہرت پھیلتی رہی۔ مرنے سے پہلے بائیس زبانوں میں اس کی تخلیقات کے ترجمے ہو چکے تھے اور آج! آج تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دنیا کی کسی بڑی باصلاحیت زبان کا افسانوی ادب اس کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں۔

اس کے شہرۂ آفاق ڈرامے ہیں: مرغابی، چیری باغ، ایوانوف، چچا وانیا، تین بہنیں اور سیکڑوں افسانوں میں سے چند زندۂ جاوید افسانے: گھاٹی میں، اسٹیپی، ... کا سپاہی، کلرک کی موت، انجان آدمی کی کہانی، شکاری، گرگٹ، غم، دشمن، شرط، وانکا، ... بدگمان، خوف، گرگٹ، وارڈ نمبر ۶، بھونرا، بے لطف کہانی۔
یہاں اس کی ایک کہانی "انوکھی شرط" پیش کی جا رہی ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر شہریار نے کیا ہے۔

نور الحسن نقوی

انتون چیخوف

انوکھی شرط

چیخوف

آدھی رات گزر چکی تھی مگر کمرے میں ابھی تک روشنی تھی۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ تیسری بار جھک کر میں نے کنجی کے سوراخ میں سے اندر جھانکا۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا اور میز پر سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔

"شاید آج اس کا سونے کا ارادہ نہیں ہے۔" میں نے دل میں سوچا "ممکن ہے اس نے خطرے کی بو سونگھ لی ہو اسی لیے ساری رات جاگنا چاہتا ہو۔ اگر میں نے اسی طرح سوچ بچار میں تھوڑا وقت اور گنوا دیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ سورج نے مشرق سے سر نکالا اور میں شرط ہارا۔ اس کا مطلب ہوگا ساری دولت سے ہاتھ دھو بیٹھنا اور باقی زندگی فقیروں کی طرح
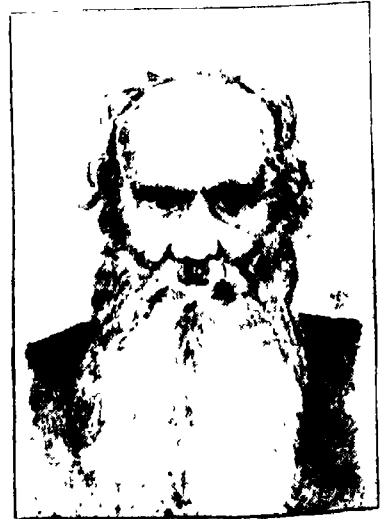
بسر کرنا "۔ غریبی کے خیال سے میرا سارا بدن کانپ اٹھا اور کھلے ہوئے چاقو پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔

بایاں ہاتھ جیب میں ڈال کے میں نے کنجی نکالی اور اسے سوراخ میں ڈال کے آہستہ سے گھمایا۔ ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ میں نے آہٹ پر کان لگا دیے۔ اگر وہ چوکنا ہے اور خطرہ محسوس کر چکا ہے تو اس نے کنجی کی آواز پر ضرور دھیان دیا ہوگا اور سمجھ گیا ہوگا کہ تالا کھولا جا رہا ہے۔ مگر کئی منٹ گزر گئے اور اُدھر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ دیر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے چابی سوراخ میں لگی رہنے دی اور بائیں ہاتھ سے ہینڈل گھما کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ آدھا کھل گیا مگر وہ اسی طرح میز پر سر جھکائے کچھ لکھتا رہا۔ ساری دنیا سے بے خبر اور اپنے سر پہ منڈلانے والی موت سے بے پرواہ!

احتیاط سے قدم اٹھا کے میں اندر داخل ہوگیا۔ دائیں ہاتھ کو اس کا بستر تھا جس پر کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ وائلن، گٹار اور وہ سارے ساز جو بہت دنوں اس کی تنہائی کے ساتھی رہے تھے ایک کونے میں نیچے اوپر دھرے تھے۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا مگر چہرے کا تین چوتھائی حصہ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بال جو کبھی سیاہ اور چمک دار تھے اب آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ جسم سوکھ کے رہ گیا تھا۔ کندھوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ چہرے کی جھریاں پیچھے سے بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔

بیس برس پہلے وہ کتنا تندرست، کتنا خوبصورت اور کیسا شاندار نوجوان تھا۔ اس لمبی قید اور تنہائی نے اسے کتنا بوڑھا اور کیسا کمزور کر دیا۔ وہ اپنی اصل عمر سے بیس برس بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دھکا سا لگا۔ "یہ ہنسی ہنسی میں کیا ہوگیا۔ اس نے اپنی جوانی کے بیس قیمتی برس گنوا دیے اور میرے ہاتھ سے ساری دولت نکل جانے کو ہے "۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری ہمت نے جواب دے دیا اور چاقو پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

بیس برس پہلے کی ایک خوشگوار شام میری نظروں میں گھوم گئی۔ اسی بنگلے کے لان میں اس دن بہت سے دوست جمع تھے۔ میں نے دوستوں کو ایک شاندار پارٹی دی تھی۔ کھانے کے بعد لوگ دیر تک ٹولیوں میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ زوردار بحث ہوتی رہی۔ ہر ایک کی کوشش یہی تھی کہ اسی کی بات اونچی رہے اور اسی کی رائے ٹھیک مانی جائے۔

باتوں باتوں میں جانے کس طرح یہ ذکر چل نکلا کہ تنہائی بری بلا ہے۔ ایک وکیل صاحب کا خیال تھا کہ تنہائی کا ایک دن ایک سال کے برابر لمبا ہو جاتا ہے اور کاٹے نہیں کٹتا۔ ایک اور دوست کہتے تھے کہ کتابیں موجود ہوں تو میں مہینوں تنہا رہ سکتا ہوں۔ کسی صاحب نے کہا کہ ضرورت کی ساری چیزیں ملتی رہیں تو تنہائی سے زیادہ مزہ کسی چیز میں نہیں۔ اچانک یہ نوجوان بول اٹھا "مجھے ضرورت کی ساری چیزیں پہنچائی جاتی رہیں اور بعد میں انعام میں کوئی بھاری رقم ملے تو میں بیس برس تک اکیلا قید میں رہنے کو تیار ہوں "۔ یہ سن کر سب اس طرح ہنس پڑے جیسے نوجوان

تخلیق

"... یہ، سال میں پانچ ڈرامے لکھ ڈالیے۔ تندرست آدمی ہیں آپ۔ پانچ میں ایک تو غالباً اچھا نکلے گا ہی۔ لکھ چکنے کے بعد فوراً باہر مت نکالیے۔ پڑا رہنے دیجیے کچھ عرصے۔ لکھیے، مسودہ تیار کر کے کئی کئی مہینے بھول جایا کیجیے! اتنے اور کوئی نئی چیز اٹھا لیجیے۔ بعد میں جب پہلے کے مسودے کا رُخ کریں گے تو اس میں ترمیم کے قابل بہت کچھ ملے گا۔ اتنے عرصے میں کتنے ہی نئے خیال، اور کام کے الفاظ و تراکیب دماغ میں آ جائیں گے۔ وہ اس میں بڑھا کر پھر تھوڑے دن یونہی چھوڑ دیجیے۔ تب جا کر ایک مکمل اور خوب سوچی سمجھی چیز تیار ہوگی "

چیخوف، ترجمہ ظ۔ انصاری

نے بڑی بیوقوفی کی بات کہہ دی ہو۔ اس پر وہ جھنجلا گیا۔ بولا میں ابھی شرط لگانے کو تیار ہوں۔ میرے جی میں جانے کیا آئی کہ فوراً شرط کے لیے ہاتھ بڑھا دیا کہ اگر وہ بیس برس کی قید پوری کرے تو اسے دس لاکھ انعام میں دوں گا۔ میری کل پونجی شاید اتنی ہی ہوگی

یا تو ہنسی مذاق ہو رہا تھا یا سب سنجیدہ ہو گئے۔ شرطیں طے ہونے لگیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ نوجوان اسی بنگلے کے ایک کمرے میں قید رہے گا۔ اس کمرے کا تالا اندر اور باہر دونوں طرف سے کھولا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک چابی نوجوان کو دے دی گئی اور دوسری میرے پاس رہی۔ یہ بھی طے ہوا کہ نوجوان کو جن چیزوں کی ضرورت ہوگی ان کی فہرست بنا کے وہ کھڑکی میں رکھ دیا کرے گا۔ اگلے دن وہ ساری چیزیں اس کھڑکی میں رکھ دی جایا کریں گی اگر درمیان میں وہ شرط توڑنا چاہے تو اپنی کنجی سے دروازہ کھول کے نکل جائے ورنہ بیس برس گزرنے پر دن نکلتے ہی میں کمرہ کھولوں گا اور شرط کے دس لاکھ روپے اسی وقت گن دوں گا۔

شرطیں طے ہو گئیں اور اگلی صبح سے اس کی قید شروع ہو گئی۔ پہلے برس تو اس نے خوب آرام کیا، زیادہ سے زیادہ وقت سونے میں گزارا اور طرح طرح کے کھانوں کی فرمائشیں کیں جنھیں شرط کے مطابق پورا کیا گیا۔ پھر اسے گانے اور ساز بجانے کا شوق ہوا۔ کبھی ایک ساز منگا، کبھی دوسرا۔ مہینوں بانسری بجائی پھر وائلن کا شوق ہوا۔ اس کے بعد گٹار کا نمبر آیا۔ اسی طرح ساز بدلتے رہے اور پانچ چھ برس کی مشق نے اسے ہر ساز کا ماہر بنا دیا۔

پھر ایک دن ایسا آیا کہ ان سب چیزوں سے اسے نفرت ہو گئی اور کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا۔ اب وہ ناول اور افسانے مانگنے لگا۔ دو برس میں اس نے سیکڑوں ناول اور ہزاروں افسانے پڑھ ڈالے۔ دوسری زبانیں سیکھنے کا شوق بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کے بعد شاعری کا نمبر آیا۔ اس سے اکتایا تو سیر و سفر کے قصوں اور زندگی کے حالات کی طرف توجہ ہوئی۔ پھر کئی برس وہ فلسفہ اور تاریخ کی کتابیں شوق سے پڑھتا رہا۔ کوئی دس برس وہ ان کتابوں کی دنیا میں کھویا رہا۔

پانچ برس کی قید باقی رہ گئی تو اس کی توجہ مذہب کی طرف ہو گئی۔ پہلے اس نے اپنے مذہب کا مطالعہ کیا۔ پھر دوسرے مذہبوں کا۔ اس سلسلے کی جتنی اچھی کتابیں ہو سکتی تھیں وہ اس کی نظر سے گزرتی رہیں۔ یہاں تک کہ قید کا زمانہ ختم ہونے کو آ گیا۔ آج اس کی قید کی آخری رات تھی۔ چند گھنٹوں کے بعد سورج کی پہلی کرن اس کے لیے آزادی کا پیام لانے والی تھی اور وہ بے حساب دولت کا مالک بننے والا تھا۔

مجھے اس بات کا بڑا غم تھا کہ اس نوجوان کی زندگی کے بہترین سال اس کوٹھری میں بیت گئے۔ بیس برس پہلے یہ اس کوٹھری میں داخل ہوا تو جوان، تندرست اور خوبصورت تھا، کل صبح یہاں سے بوڑھا، کمزور اور بدصورت ہو کے نکلے گا۔ اس کی زندگی برباد ہوئی تو ہوئی مگر اس سے زیادہ غم مجھے اس کا تھا کہ میں کہیں کا نہ رہا۔ ساری زندگی چین سے گزری کل صبح سے غریبی میرے گلے کا ہار ہوگی۔ اب جسم میں اتنی جان بھی نہیں کہ محنت مزدوری کر کے گزر کر لوں۔ بڑھاپا کیسی مصیبت سے کٹے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میرا ارادہ پھر مضبوط ہو گیا — اب ایک ہی راستہ ہے۔ اس لمبے دھار دار چاقو کا ایک بھرپور وار! کل صبح نہ یہ قیدی زندہ ہوگا نہ مجھ سے شرط کی رقم مانگ سکے گا۔

باغ کے ایک کونے میں کھدا ہوا گڑھا اس کے مردہ بدن کا انتظار کر رہا ہے۔ لوگ سمجھیں گے مدت پوری ہونے سے پہلے کہیں بھاگ نکلا۔

میں دبے پاؤں میز کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا داہنا ہاتھ اونچا ہوگیا۔ اب چاقو کی نوک ٹھیک اس کی گردن کے سامنے تھی۔ اسے اب بھی خبر نہ ہوئی کہ اس کی موت کرسی کے پیچھے کھڑی ہے وہ ابھی تک کچھ لکھ رہا تھا اور لیمپ کی روشنی میں اس کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ روشن تھا۔ میں پڑھنے لگا:

دوست! یہ قید کی آخری رات ہے ذرا دیر بعد سورج نکلنے کے ساتھ ہی میں شرط جیت جاؤں گا تم ہار جاؤ گے اور تمہاری دولت میری ہوگی مگر اتنے برس یہاں رہنے، تنہائی میں سوچنے، فلسفہ اور مذہب کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی کو برباد کرکے کسی کا مال چھین کے اور بہت سی دولت حاصل کرکے انسان کو سچی خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔ سچی خوشی اس میں ہے کہ دوسروں کے لیے قربانی دی جائے۔

اس لیے میں شرط ہار رہا ہوں اور وقت ختم ہونے سے ذرا دیر پہلے تمہارا کمرہ چھوڑ کر...

شرم سے میرا سر جھک گیا، چاقو والا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا اور سارا بدن پسینے میں بھیگ گیا۔ وہ لکھتا رہا۔ اور میں دبے پاؤں باہر چلا آیا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ بند کرکے پھر تالا لگا دیا۔ اتنے میں دروازے کے پیچھے آہٹ ہوئی۔ میں ایک درخت کی آڑ میں ہوگیا۔

پہلے تالا کھولنے کی آہٹ ہوئی۔ پھر کواڑ کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ ایک بوڑھا کمزور سا آدمی کمرے سے نکلا اور تھکے تھکے قدموں سے ایک طرف کو چل دیا۔

کیے جاؤ کوشش....

ایک دن شام کے وقت چے خف سے ملنے گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ لکھنے کی میز پر صرف آدھا لکھا ورق پڑا ہے۔ اور چے خف جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنے کمرے میں گھوم رہا ہے۔

"یہاں پھنس گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ طوفان کی تصویر کشی کیسے کروں!"

ہفتہ بھر بعد پھر پہنچا تو دیکھا وہی ورق، اتنا ہی لکھا ہوا میز پر دھرا ہے۔

"طوفان کا بیان لکھ لیا آپ نے؟"

"کہاں لکھ لیا۔ دیکھیے، ابھی تک اٹکا ہوا ہوں۔ مناسب رنگ نہیں مل رہے ہیں تصویر کشی کے لیے۔"

شرط اول یہ ہے کہ آدمی بہت سا لکھے۔ کچھ نہ کچھ نکل آئے گا لکھے جاؤ، لکھے جاؤ، بس لکھے جاؤ۔ ایک کہانی نہیں چھپتی، دوسری لکھو۔ تیسری لکھو۔ کوئی نہ کوئی تو چھپے گی ہی۔ شروع میں التفات نہیں کرتے۔ پھر نظر پڑنے لگتی ہے۔ بس کام کرنا، جم کر، ڈٹ کر کام کرنا چاہیے۔"

"اور اگر کسی میں فطری جوہر نہ ہو تو؟"

"بغیر کام کیے کیسے پتہ چلے گا کہ جوہر ہے یا نہیں؟ محنت اور فطری جوہر کے بغیر مقصد حل نہیں ہوتا۔ اگر آپ نے ایک خاص لائن چن لی ہے تو اسی لائن پر اپنی قوت لگاتے رہیے۔ فیصلہ تو دوسرے کریں گے۔"

ترجمہ — ظ۔ انصاری

ڈاکٹر سید ابوالہاشم رضوی
شعبۂ طبیعیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فزکس میں ۱۹۸۴ کا نوبیل انعام

ڈبلیو پلس مائنس $W^{\pm}$ اور زیڈ Z^{0} ذرات کی دریافت

ذراتی فزکس کے موجودہ تصور کے تحت بنیادی قوتوں کے برسرِ پیکار ہونے کے لیے مخصوص ذرات کا تبادلہ ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً دو برقی چارج رکھنے والے ذرات کے مابین برق مقناطیسی قوت نور کا ذرہ یعنی فوٹان [Photon] کے تبادلے کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ فوٹان ذرہ عرصہ دراز سے معلوم ہے۔ اور اس کی تجرباتی تصدیق بہت آسان ہے۔

اسی مناسبت سے بہت پہلے ۱۹۳۲ء میں مشہور سائنس داں فرمی (Fermi) نے نظریہ پیش کیا تھا کہ ضعیف نیوکلیہ قوت کے پیدا ہونے کے لیے وزنی ذرات [جن کو اب W کہا جاتا ہے] کا تبادلہ ضروری ہوگا۔ یہ کافی کمیت رکھنے والے اس لیے ہوں گے کیونکہ ضعیف قوت کا دائرہ عمل بہت کم ہوتا ہے [دائرہ عمل اور کمیت کا الٹا تناسب ہے]۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تصور مضبوط تر ہوتا گیا۔ مگر چونکہ اتنی بڑی مشینیں (accelerators) موجود نہ تھیں جن کی قوت اتنی زیادہ ہوتی کہ یہ بھاری ذرات پیدا کیے جاسکتے اور اس طرح سے اس نظریے کی تصدیق کی جاسکتی۔

ادھر پچھلے دس برسوں میں سلام۔ وائنبرگ اور گلیشاؤ (Salam - Glashow - Weinberg) کے نظریے نے ضعیف نیوکلیر اور برق مقناطیسی قوتوں کو یکجا کردیا۔ اور اس کے تحت $W^{\pm}$ ذرات کے علاوہ غیر برقی چارج رکھنے والے ذرے [Z^{0}] کی موجودگی بھی ضروری قرار دی گئی۔ [ملاحظہ ہو تہذیب الاخلاق یکم تا ۱۵ جولائی ۸۲ء صفحات ۲۲ — ۳۰]۔ ۱۹۷۳ء میں ایسے "نیوٹرل کرنٹ" کے ذریعے ہونے والے عوامل (Processes) جن کے لیے Z^{0} ضروری ہے، کی تجرباتی دریافت ہوگئی۔ نتیجتاً نہ صرف $W^{\pm}$ بلکہ Z^{0} ذرات کی خود اپنی تجرباتی دریافت نظریے کی کامیابی کے تحت اشد ضروری سمجھی جانے لگی اور برابر اس کی کوشش جاری رہی۔ ان ذرات کی دریافت ہی ضعیف اور برق مقناطیسی قوتوں کے جدید نظریات کی تجرباتی کسوٹی کا ماثل بنی اسی وجہ سے ان تجربات کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی۔

غرض کہ ۱۹۸۳ء میں مغربی جرمنی کے شہر ہیمبرگ (Hamburg) میں DESY نام کی مشہور تجربہ گاہ میں کام کرنے والے دو گروہوں [جو کہ UA1 اور UA2 کے ناموں سے جانے جاتے ہیں] نے W^{+}، W^{-} اور Z^{0} ذرات کی دریافت کا اعلان کرکے عالمِ طبیعیات میں تہلکہ مچادیا۔

[UA1 (Underground Area 1) اور UA2 (Underground area 2)]

کے نام سے زمین دوز تجربہ گاہ کے دو حصوں "۱" اور "۲" کام کرنے والے گروہوں کی وجہ سے پڑے۔ UA1 تجربہ میں یورپ اور امریکہ کے ۱۳۵ سائنس داں اور UA2 میں ۵۱ سائنس داں شامل تھے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ تجربے کس پیمانے کے ہیں۔

ان تجربات میں 270 GeV [یعنی ۲۷۰ ارب الیکٹران وولٹ] کے پروٹان (Protons) اور اتنی ہی توانائی کے ضد پروٹان (Anti Protons) کا سیدھا تصادم کرایا جاتا ہے اور اتنی زیادہ طاقت ہونے کی وجہ سے بے شمار ذرات پیدا کیے جاسکتے ہیں تجربات کرنے والوں نے اس طرح کے تقریباً ایک ارب [یعنی 10^{9} یا ایک بلین] تصادموں کو جانچا اور پرکھا۔ اتنی طاقت والے تصادم میں پروٹان اور ضد پروٹان کے کوارک اور ضد کوارک ذرات کے درمیان تصادم ہوتا ہے۔ مثلاً پروٹان کا ایک d کوارک اور ضد پروٹان کا ایک $\bar{u}$ [$\bar{u}$] کا ضد کوارک ٹکرا کر W^{-} پیدا کرتے ہیں:

$$d \text{ کوارک} + \bar{u} \text{ کوارک} \xrightarrow{\text{تصادم}} W^{-}$$

اسی طرح سے

$$u \text{ کوارک} + \bar{d} \text{ کوارک} \xrightarrow{\text{تصادم}} W^{+}$$

یہ W ذرات اس طرح سے زوال پذیر ہوتے ہیں:

$$W^{\pm} \longrightarrow e^{\pm} + \nu \quad \text{یا} \quad W^{\pm} \longrightarrow \mu^{\pm} + \nu$$

اور اس بنا پر پہچانے جاتے ہیں۔

پروٹان اور ضد پروٹان کے تصادم میں اگر ایک ہی قسم کے کوارک اور ضد کوارک کا تصادم ہو تو Z^{0} ذرہ نمودار ہوتا ہے۔ مثلاً

$$u \text{ کوارک} + \bar{u} \text{ کوارک} \xrightarrow{\text{تصادم}} Z^{0}$$

یہ Z ذرات الیکٹران [e^{-}] اور پوزیٹران [e^{+}] یا میوآن [μ^{-}] اور ضد میوآن [μ^{+}] کے جوڑوں میں زوال کے بعد تبدیل ہوجاتے ہیں:

$$Z \longrightarrow e^{+} + e^{-} \quad \text{یا} \quad Z \longrightarrow \mu^{+} + \mu^{-}$$

گویا برقی چارج رکھنے والے لیپٹان (lepton) اور نیوٹرینو (neutrino) ذرات اگر آخر میں پائے جائیں تو $W^{\pm}$ کی نشاندہی ہوتی ہے اور اگر چارج رکھنے والے لیپٹان اور اُن کے ضد ذرات پائے جائیں تو یہ Z کی پیدائش کے ضامن ہوتے ہیں۔ اربوں تصادموں کی چھان بین کے بعد تقریباً ۳۰ $W^{\pm}$ ذرات اور صرف

حکیم محمد مختار اصلاحی

بُری عادتیں۔ نقصانات، تدارک

شراب نوشی

مذکورہ بالا مستقل عنوان کے تحت قارئین تہذیب الاخلاق کیلئے مضامین کا ایک سلسلہ میں نے شروع کیا ہے۔ ارادہ ہے کہ جب بھی مقررہ مضامین قلم بند ہو جائیں گے تو بعد میں انھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس وقت جو موضوع بھی ذہن میں آتا جا رہا ہے اس پر لکھتا جا رہا ہوں۔ کتاب میں اس کی مناسب ترتیب بھی قائم کر دی جائیگی۔ امید ہے کہ قارئین اس سلسلہ کو پسند فرمائیں گے۔ (مختار)

دنیا میں آج تک جتنی بھی چھوٹی بڑی جنگیں لڑی گئی ہیں اور ان کی وجہ سے جو ہلاکت و بربادی ہوئی ہے وہ یقیناً شراب کی لائی ہوئی تباہی بربادی کے مقابل میں بہت کم ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب کسی بڑی جنگ کا نام لیا جاتا ہے تو ہر شخص اس کے ہولناک تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہے۔ مگر جب ذکر شراب کا ہو یا وہ سامنے ہو تو اس کے متوالوں کی والہانہ عقیدت کا حال نہ پوچھئے۔ کہتے ہیں ؎

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

دراصل شراب کا یہی چسکا اور چسکا ہی تو ہے جو اتنی بڑی تباہی و بربادی کا باعث ہے۔ ایکبار منہ سے لگ جائے تو پھر یہ آسانی سے جدا نہیں ہوتی ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

شراب اپنی ہلاکت خیزی کے باوجود اتنی مقبول کیوں ہے؟

ماہرین کی رائیں اس بارے میں مختلف ہیں۔ بعض ماہرین نفسیات کا یہ خیال ہے کہ بچپن کی بے جا سخت گیری حد سے زیادہ لاڈ و پیار اور ماں باپ کے ناخوشگوار تعلقات یہ سب آگے چل کر اس عادت کو اختیار کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

جوانی کے زمانے میں معاشی دشواریاں، خانگی جھگڑے اور جنسی کمزوریاں بڑھاپے میں نہ حل ہونے والے مسائل، شریک زندگی کی غیر موجودگی اور سہارے کی تلاش یہ سب ایسے وجوہات و محرکات ہیں جو اس عادت بد کی طرف مائل کرتے ہیں۔ غالبؔ نے بھی اس خیال کی تائید فرمائی ہے۔ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یکگونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سوسائٹی میں اس عادت کو جو ایک اونچا مقام دیدیا گیا ہے اور ادیبوں و شاعروں نے اس کی جو حد سے زیادہ سرائی کی ہے وہ اس عادت کو پھیلانے کا ایک اہم سبب ہے کیونکہ اپنے کو سوسائٹی میں بلند و ممتاز دیکھنا چاہتا ہے۔ بعض لوگوں کے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود حکومت اپنی کثیر آمدنی کی خاطر اس کی پشت کرتی ہے۔ اگر ان میں کسی ایک ہی سبب کو حقیق نہ کہئے تو بھی یہ کہا ہے کہ یہ سارے ہی وجوہات و محرکات مل کر شراب نوشی کو زیادہ فروغ دے رہے ہیں۔

قرآن مجید میں شراب نوشی کو بہت بڑا گناہ کہا گیا ہے اور دنیا بھی ایسا مذہب نہیں ہے جس نے شراب نوشی کی مذمت نہ کی ہو۔ شراب ایک انسان کے لئے ہر حیثیت سے مضر اور تباہ کن ہے۔ جسمانی، اخلاقی، اقتصادی اور سماجی کسی حیثیت سے بھی غور کیجئے تو اس کے واضح ہیں۔

جسمانی طور پر شراب کے اثرات کے بارے میں جو جدید تحقیقات ہیں، تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ شراب دماغ اور اعصاب کو بُری متاثر کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے دماغی کام کرنے کی صلاحیت گھٹ ہے دردسر، لقوہ فالج، مرگی اور بے خوابی جیسی بیماریوں کے امکانات جاتے ہیں۔ زبان میں لکنت، بینائی میں فرق، پاؤں میں لغزش اور توازن بگڑ جاتا ہے۔

ماہرین قلب کی تازہ رپورٹ بتاتی ہے کہ شراب نوشی کے دل پر بھی بڑا خراب اثر پڑتا ہے۔ فشار خون بلند ہو جاتا ہے، رفتار قلب بڑھ جاتی۔ دل کے عضلات کمزور اور حجم میں اضافہ ہو کر اچانک حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔ جسم میں جگر جیسی بیمار عضو سب سے زیادہ متاثر ہے۔ جس کی وجہ ورم جگر، یرقان اور فقر الدم جیسی خطرناک

ریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ معدہ اور آنتوں میں سوزش اور زخم کے
ت، جسم بہت زیادہ خراب ہو جاتا ہے۔ گردہ و مثانہ کمزور ہو جانے
وجہ سے پیشاب پر کنٹرول نہیں رہتا۔ غرض تمام اعضائے رئیسہ کے مبتلائے
ں ہونے سے بالآخر طرح طرح کی مہلک اور لاعلاج بیماریاں پیدا
جاتی ہیں۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو ایک شرابی احساس
وری میں مبتلا رہتا ہے کیونکہ شراب قوت ارادی کو متزلزل کر کے رکھ
ی ہے۔ شرابی والدین کے بچے عموماً کمزور، لاغر اور بزدل ہوتے ہیں
مختلف قسم کے غلط احساسات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس میں احساس
ی سب سے اہم ہے۔ ظاہر ہے جو بچے احساس کمتری کے ساتھ اپنی
ی کا آغاز کریں گے وہ زندگی کی دوڑ اور راہ ہی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اخلاقی قدروں پر شراب نوشی نے جو گہرے گھاؤ لگائے ہیں
کا بھرنا ممکن نہیں۔ ماں باپ، بھائی بہن، بڑے چھوٹے کا ادب و
ظ نشہ و بدمستی کی حالت میں کیونکر باقی رہ سکتا ہے؟ گالی گلوج، اُلٹ
ی، دھینگا مشتی، مارپیٹ اور ہنگامہ و فساد کے ماحول میں تہذیب و اخلاق
واج کیونکر ہو سکے گا؟ ایک مفکر نے بالکل سچ کہا ہے کہ "شراب اور فلموں
اخلاقی قدروں کو جس طرح پامال کیا ہے تمام برائیوں کو بھی اکٹھا
جائے تو ان کی خرابی کا پلہ بھاری ہوگا۔"

اقتصادی زاویۂ نگاہ سے بھی اگر سوچئے تو شراب سے عوام کا
نقصان ہے۔ لاکھوں افراد اور ہزاروں گھر اس بری عادت کے نتیجہ میں مفلس
بھکاری بن گئے۔ شراب بندی کے مخالفین کہتے ہیں کہ کروڑوں روپے کی
سالانہ ایکسائز آمدنی کا خسارا ہوگا لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ شراب بندی
عوام کے جو اربوں روپے کی بچت ہوگی اسی بچت سے نئے نئے روزگار
واقع پیدا کئے جائیں گے اور یہ نئے روزگار حکومت کی آمدنی میں زبردست
کریں گے۔

سماجی اعتبار سے دیکھئے تو شراب نے ہمارے معاشرے میں
ہر گھول دیئے ہیں اس کے المناک اثرات سے آج پورا سماج کراہ رہا ہے۔
بھولے عوام کو تو چھوڑ دیجئے، تھوڑی کیلئے اوسط درجہ کے لوگوں کو بھی
ں جائیے، اپنے سب سے اونچے طبقے کے لیڈروں اور وزیروں پر نظر ڈالئے
اب سے لت پت اور بدمست ہو کر وہ کیا کیا گل کھلا رہے ہیں اور اپنے ملک
ر کس طرح سے روشن کر رہے ہیں؟

آئے دن کے واقعات و حادثات کا بھی جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم
جائے گا کہ شرابی ڈرائیوروں کی غفلت و خرمستی سے روزانہ کتنے جانی و
مالی نقصانات ہو جاتے ہیں۔ صنعتی اور گھریلو حادثات میں بھی شراب کی
تباہ کاریاں کچھ کم نہیں، اسی طرح خودکشی کی وارادات میں بھی شراب کو بہت
بڑا دخل حاصل ہے۔

کچھ لوگ فوجی لحاظ سے شراب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اس کو ایک
فوجی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر ولینس (DR-WALLANCE)
جو ایک عرصہ تک فوج میں طبی خدمات انجام دیتے رہے۔ اپنا تجربہ بیان
کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وہ فوجی زیادہ بہتر طریقے سے جنگی فرائض ادا کرتے
ہیں جو شراب نہیں پیتے۔ شرابی فوجی ثابت قدم نہیں ہوتے۔ جلد ہی دم توڑ دیتے
ہیں یا راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔"

شراب کی لعنت سے نجات اور رہائی کی کیا صورت اختیار کی جائے؟
ایسا لگتا ہے کہ اس سوال کے سامنے دنیا کے سارے ہی با اختیار
و صاحب اقتدار بے بس و مجبور نظر آتے ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی ایسا ملک نظر نہیں
آتا کہ جو آج سینہ تان کر یہ کہہ سکے کہ ہم نے اس لعنت کا پورے طور سے
انسداد کر لیا ہے۔ جن ملکوں کو ہم پاک و صاف سمجھتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ پاک
و صاف وہ بھی نہیں۔

شراب بندی کا مسئلہ آج ساری دنیا کیلئے ایک بڑا چیلنج ہے۔
۱۹۲۰ء میں گاندھی جی اور ان کی انڈین نیشنل کانگریس نے شراب
بندی کو اپنے پروگرام میں شامل کیا تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے اب تک
یہ تجویز کارروائی سے خارج نہیں کی گئی، لیکن عملی طور پر اس تجویز کا جو افسوسناک
انجام ہوا ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے۔ مرکز سے لیکر ریاستوں نے شراب
نوشی کے خلاف زبردست چیخ و پکار کے ساتھ ہر طرح کا زور لگایا لیکن ع
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

۱۹۷۵ء میں عالمی ادارۂ صحت نے شراب کے پھیلاؤ پر تشویش کا
اظہار کرتے ہوئے اس کی روک تھام کیلئے کچھ تجاویز منظور کی تھیں لیکن
نو۹ سال گذر جانے کے باوجود اس تجویز کا ابتک کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا، حالانکہ
یہی ایک ایسا ادارہ تھا جو اس وبا کے روکنے میں موثر قدم اٹھا سکتا تھا۔

شراب کی روک تھام کی دو ہی صورت ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنی
جگہ ہر شخص یہ عہد کر لے اور اپنے ضمیر کو گواہ بنا لے کہ وہ آج سے کبھی زندگی بھر
اس تباہ کن، خانہ برباد اور برائیوں سے بھرپور عادت کو اختیار نہیں کرے
گا۔ تو آج ہی سے دفعتاً سارے میخانے بند اور تمام ساغر و مینا بیکار ہو سکتے
ہیں اور اگر یہ انقلاب ممکن نہیں تو پھر جماعتیں اور حکومتیں دیانت داری کے
ساتھ فیصلہ کر کے اس تباہی و بربادی کو روک سکتی ہیں۔

(اصلاحی دواخانہ ۔ بمبئی)

پروفیسر حمیدہ سعید الظفر

وہ ہستیاں جو ہمارے اس ادارے، یعنی مسلم یونیورسٹی کے لیے مایۂ ناز ثابت ہوئیں ان میں حمیدہ سعید الظفر کا نام بھی شامل کیا جانا چاہیے جن کو کچھ عرصہ قبل "پروفیسر ایمریٹس" کا اعزاز ملا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وہ پہلی خاتون استاد ہیں جن کو یہ اعزاز ملا۔ ہندوستانی مسلمانوں اور خصوصاً مسلم خواتین کے لیے سر اونچا کرنے کا مقام ہے۔

میری خصوصی دلچسپی ڈاکٹر حمیدہ کی شخصیت میں تب پیدا ہوئی تھی جب انھوں نے ایک تقریب میں مختلف چڑیوں پر مشتمل، یورپ میں اپنی تیار کی ہوئی سلائیڈز دکھائی تھیں۔ تب مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ ان میں ایک فن کار کی روح پوشیدہ ہے۔ ایک شاعر اور مصوّر کی روح۔ سائنس اور آرٹ کا یہ امتزاج اُن کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے کہ دونوں کی بنیاد تخیل پر ہے اور یہیں آکر دونوں کے بیچ کی دیوار گر جاتی ہے۔ ان دونوں کا بہت گہرا تعلق آنکھ سے ہے آنکھ جو کچھ دیکھتی اور تصور کرتی ہے وہ سائنس میں بھی ہے اور آرٹس میں بھی ہے۔ یوں دونوں کا آپسی منفی اختلاف ختم ہوتا ہے۔

بچپن میں ڈاکٹر حمیدہ کو انجینئرنگ میں گہری دلچسپی تھی۔ کھلونے توڑنا اور جوڑنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا وہ اپنے فطری تجسس کی وجہ سے کھلونے توڑتی تھیں تاکہ ان کی ساخت اور بناوٹ کو جان سکیں۔ پھر از سر نو تعمیر میں مصروف ہو جاتیں یعنی ٹوٹے کھلونوں کو جوڑتیں۔ اس عمل سے ان کے اس تجسس اور جستجو کا پتہ چلتا ہے جو انسان کی اہم جبلت ہے، جو کہ سارے علم کی بنیاد ہے، ساری ریسرچ اور تحقیق کا سرچشمہ ہے۔ یوں وہ کچھ کرنے، کوئی کارہائے نمایاں انجام دینے کی خواہاں اور متمنی تھیں.... جستجو، مہم جوئی، ایڈونچر..... مسائل کا حل کرنا۔ یہ اُن کی فطرت ہے۔ اپنے میدان میں انھوں نے اس کا بخوبی ثبوت دیا۔

ڈاکٹر حمیدہ کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے والد سعید الظفر صاحب لکھنؤ میڈیکل کالج کے پرنسپل تھے۔ ان دنوں لڑکیوں کو انجینئرنگ میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ جنوبی ہند میں بنگلور میں ان کو داخلہ مل سکتا تھا۔ لیکن والدہ اتنی دور بھیجنے کو تیار نہیں ہوئیں۔ ہائی اسکول وڈ اسٹاک مسوری سے کیا۔ حالات کے تحت اپنے پسندیدہ میدان یعنی انجینئرنگ کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ چنانچہ بیالوجی گروپ میں داخلہ لیا۔ اس وقت بھی فزکس، یا کیمسٹری میں ایم۔ ایس سی کا ارادہ تھا۔ ان کی بھاوج ڈاکٹر رشید جہاں نے ان کو مشورہ دیا کہ کوئی پروفیشنل فیلڈ ہونا چاہیے۔ میڈیسن، قانون یا انجینئرنگ۔ چنانچہ حالات کے پیش نظر میڈیسن کا انتخاب کیا۔ پری میڈیکل کے امتحان میں لکھنؤ میڈیکل کالج سے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ لکھنؤ سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا پھر مہارت خصوصی Specialization کا طے کرنا تھا۔ چوں کہ علم العین Opthamology ان کو انجینئرنگ سے قریب تر محسوس ہوئی۔ طبیعیات، بصریات اور روشنی سے متعلق ہونے کی وجہ سے اور بینائی روشنی پر منحصر ہے اور اس علاوہ علم چشم میں زیادہ تر آلات بھی علم طبیعیات سے قریب تر تھے۔ چنانچہ یہ میدان سب سے زیادہ پرکشش معلوم ہوا اور اس کا انتخاب کیا۔

اس میدان میں ان کو خاصی جدّ وجہد اور کشمکش سے دوچار ہونا پڑا کہ مرد حضرات اسے بھی اپنا ہی میدان سمجھتے تھے (یہ صورت باعثِ تکلیف اور باعثِ شرمساری رہی ہے اور اکثر آج بھی ہے) اور اس میں عورت ذات کی مداخلت ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ بہر حال ایک مجاہد کی طرح ڈاکٹر حمیدہ نے جد وجہد کی، خود کے لیے مسدود راہوں کو ہموار کیا، اپنے کو اہل ثابت کیا اور اس میں کامیابی اور سرخروئی حاصل کی۔ کسی سوچنے والے ذہن نے یقیناً صحیح سوچا تھا کہ۔ "عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے تب کہیں جاکر وہ مردوں سے آدھی قابل تسلیم کی جاتی ہیں۔" خوشی کا مقام ہے کہ ڈاکٹر حمیدہ کی اہلیت کا پورا اعتراف کیا گیا۔ ایک دلچسپ بات یہ کہ مرد کی دنیا ہوتے ہوئے بھی ان کی ہمت افزائی اور قدر دانی بیشتر مرد حضرات نے ہی کی کہ مردوں کی اس دنیا میں فقط باہمت مرد ہی کسی ذہین، قابل اور اہل خاتون کی طرف داری کر سکتے ہیں عام مردوں اور عام عورتوں کے قبضۂ قدرت سے یہ چیز باہر

ملینڈ سے ۱۹۵۳ء میں **Opthalmic medicine** میں
ڈپلوما حاصل کیا۔ اس سلسلے میں والد نے کافی ہمت افزائی کی۔
ان کا خیال ہے کہ اپنے میدان میں وہ بہت کم کچھ کر سکی ہیں۔ ملن
ہے پسندیدہ مضمون میں وہ کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیتیں۔ مرد
دنیا ہے، عورت کے لیے ترقی کے راستے مسدود کیے جاتے رہے ہیں
اس کی وجہ بہت پرانی ہے ...... پھر بھی ڈاکٹر حمیدہ کا اپنے بارے میں یہ
خیال محض ان کا انکسار اور عجز ہے جو بڑی شخصیت کی پہچان ہے۔ ... کا
اپنے اس میدان میں کارنامہ بہرحال بہت بڑا ہے جس کی وجہ سے ان کو
نا ہم اعزاز ملا اور بالکل صحیح ملا۔
گاندھی آئی ہاسپٹل میں تقرر کے بعد ان کو نئی سمتیں اور نئی
منزلیں ملیں۔ اس اسپتال کی عمارت پر سامنے کی طرف لکھے ہوئے الفاظ

Service is its own reward.

(خدمت بذات خود انعام ہے)

نے ان کو بے حد متاثر کیا۔ ان میں ایک تخلیقی تحریک اور روحانی تاثیر پیدا کی۔
ان کو نیا عرفان حاصل ہوا ... اس جملے کے زیر اثر انھوں نے خود کو پہچانا ...
ریاضت کیا اور ان میں خدمت خلق کا وہ عظیم جذبہ پیدا ہوا جس کی مثالیں
مدر ٹریسا اور فلورنس نائٹنگل وغیرہ کی شخصیات ہیں۔ تب ہی ان میں
نرسی بننے کی خواہش کے، خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا ہوا جو ایک سچے اور
انسان دوست معالج کا نصب العین ہونا چاہیے۔ انھوں نے انسانیت کی
رہی خدمت کی اس کے پیچھے شہرت، پیسہ یا پوزیشن حاصل کرنے کا جذبہ
نہیں تھا فقط لگن، خدمت، ریاضت، انسانیت کی فلاح و بہبود ہے کہ
کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس کا استعمال انسانیت کی بھلائی کے لیے
کیا جائے۔

۵۸-۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر کو اپنے میدان میں ریسرچ
کا موقع ملا۔ ۱۹۵۷ء میں **Glaucoma** اور **Squint**
جس کا تعلق بھینگے پن کے عارضے سے ہے ... کا انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا ۔
پروفیسر راجرس جو ایکسچینج پروگرام کے تحت لندن سے یہاں آئے تھے
... ان کی بہت ہمت افزائی کی، ان کا حوصلہ بڑھایا۔ ان کی کوششوں سے
حکومت ہند کی جانب سے ڈاکٹر حمیدہ کو کولمبو پلان اسکالرشپ ملی۔ تحقیق
لندن میں کی اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
مواقع ان کو ڈھیرے ڈھیرے ملتے گئے اور جہاں جہاں عورت ہونے
کی وجہ سے حوصلہ شکنی کی گئی وہاں وہاں پر وہ پُرعزم اور اٹل رہیں۔ حوصلہ
شکنی کی کبھی بھی پروا نہ کی۔ خود اعتمادی سے اپنی راہ پر گامزن رہیں اور
... منزل پائی ہے۔ یہ اعزاز ان کی منزل ہے شاید ... یا یہ بھی ممکن ہے
کہ وہ اور اونچی اڑان بھریں ... کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور کوئی دوسرا بڑا اعزاز ان کا انتظار کر رہا ہو۔ ابھی بھی وہ
پرعزم ہیں اور خدمت خلق کا جذبہ، جستجو اور لگن بھی ان کو اور بلندیوں
پر لے جائے گا۔

تری جستجو کی منزل ابھی فلک پار ہی ہے
کہ فلک کے ماہ و انجم ترے ساتھ چل رہے ہیں

بچپن میں اپنی جستجو کے تحت چیزوں کی حقیقت کو جاننے کی خواہش ذہین
بچی جو توڑ توڑ کر جوڑنے کی شدت تھی وہی شدت ... سرگرمی ابھی اور
میدان میں کارگر رہی ہے

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

یہ سب تو ان کے کارنامے ہوئے۔ بہ حیثیت سائنس داں کے جو
موجود گرت ہیں، میری خصوصی دلچسپی ان کی ایک خاص وجہ ان میں پوشیدہ
ایک فن کار کی شخصیت ہے۔ مختلف النوع طور کے خوبصورت تصاویر
Slides دیکھ کر ان کی قوت تخیلہ اور شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ
مجھے ہوا۔ انگریزی کے تقریباً سبھی رومانی شعرا نے چڑیوں سے تخلیقی
تحریک درنعمان حاصل کیا تھا۔ بلبل، فاختہ، کوئل اور اسکائی لارک
وغیرہ موضوع تھیں۔ ورڈز ورتھ، شیلی اور کیٹس کی نظموں میں
شاعر کی نظر رکھنے والی ہماری سائنس داں مصور کو انسانی چہروں اور
مختلف اعضائے انسانی مثلاً آنکھوں، ہونٹوں اور خصوصاً آنکھوں کی
خاکہ کشی کے ذریعے اندرون میں پوشیدہ جذبات و احساسات کے اظہار
پر ملکہ ہے۔ جیسے کا زندگی سے بھرپور تصویر خاکہ وہ منٹوں میں تیار
کر سکتی ہیں۔ یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ان خاکوں کو بڑے مصوروں
کے خاکوں کے مدمقابل رکھا جا سکتا ہے۔
ڈاکٹر حمیدہ کو شاعری اور ادب سے گہری دلچسپی ہے ...
کا جتنا خلوص اور عدم مصلحت پسند ذوق ان میں نظر آتا ہے ...
استادوں میں ہوتا ہے اس کا فقدان ...
ان کی طبیعت میں بچوں کی سی معصومیت اور سادگی ہے خلوص
ان کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔ اعلیٰ ظرفی، بلند ہمتی ان میں بدرجہ اتم
موجود ہیں۔ ہم کو ان کی ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں

ویمنز کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید کاظم نقوی

فکرِ انسانی کی نئی تشکیل

انسانی فطرت اور ذاتِ خدا سے لگاؤ

دل یا دماغ؟

کبھی ہماری عقل کسی بات کے متعلق بڑی آسانی سے فیصلہ کر دیتی ہے۔ اسے اس بارے میں کوئی زحمت اور کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی ہے، ایسے مقامات پر درحقیقت ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات خود بخود انسان کے سامنے واضح اور آشکار ہوتی ہے۔ اس کی یہی خصوصیت ہمارے اس کے متعلق آسانی فیصلہ کرنے کا ذریعہ بن جایا کرتی ہے۔ مثلاً ہم یقینی طور پر کہتے ہیں کہ "چار کا عدد جفت ہے" لیکن اس فیصلے کی کنجی یہ ہے کہ وہ دو برابر کے حصوں پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہ خصوصیت خود بخود ہر شخص کے دماغ میں موجود ہے۔ عقل انسانی کے فیصلوں کو "فطریات" کہا جاتا ہے۔

آیا وجود خدا کے عقیدے کے فطری ہونے سے یہی مراد ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے مراد عقل کی فطرت نہیں بلکہ دل کی فطرت ہے۔ انسان کی روحانی ساخت کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ خداخواہ پیدا کیا گیا ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جستجوئے خدا کا جذبہ ایک طرح کی روحانی کشش ہے۔ گویا ایک طرف انسان کا دل ہے اور دوسری طرف وہ ذات خدا ہے جو تمام موجودات کا سرچشمہ اور سراکمال ہی کمال ہے۔ جس طرح سورج تمام سیارات کو اپنی طرف کھینچتا ہے، جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے، اسی طرح خالق کائنات لوگوں کے دلوں کو اپنی ذات کی طرف جذب کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انسان کے سراپائے وجود کے اندر اس آشکارا اور نمایاں "میں" کے علاوہ ایک دوسرا "میں" بھی ہے جو پوشیدہ اور پُراسرار ہے۔ اس بیسویں صدی میں علم النفس کے بعض ماہرین اس حقیقت تک پہنچ گئے ہیں کہ انسان کے پاس دو قسم کے شعور ہیں، ایک ظاہری اور دوسرا باطنی اس واضح اور کھلی ہوئی انسان کی شخصیت کے علاوہ اس کی ایک دوسری شخصیت بھی ہے جو پردہ راز کے پیچھے ہے۔ علم النفس کے کچھ ماہرین کہتے ہیں کہ انسان کی ایک برتر شخصیت کے تمام عناصر ظاہری شعور کی حدود سے بھاگ کر باطنی شعور کی سرحد میں پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے اپنا بھیس بالکل تبدیل کر لیا ہے، لیکن ان لوگوں کے برخلاف بعض مفکرین باطنی شعور اور باطنی شخصیت کے علیحدہ مستقل وجود کے قائل ہیں، ان کا خیال ہے کہ اخلاقی شعور، علمی شعور اور مذہبی شعور کا انسان کی روح سے تعلق ہے ان شعوروں کا سرچشمہ اس کی فطرت ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہی وہ نقطہ ہے کہ جہاں سے اولیاء کا راستہ فلاسفہ کے راستے سے الگ ہو جاتا ہے۔ اولیاء خدا پر ایمان اور اس کے وجود کے عقیدے کو انسان کے جذب فطری اور عشق طبیعی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ اسی صلاحیت کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے نزدیک انسان کا فریضہ ہے کہ وہ ان رکاوٹوں کو دور کر دے جو اسے پھلنے پھولنے نہیں دیتی ہیں۔ انسان کو اپنا دل صاف کرنا چاہیے پھر وہ خود بخود عشق الٰہی کے تیز رفتار اور طاقتور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے معبود کی بارگاہ میں پہنچ جائے گا۔ لیکن اولیاء کے اس راستے سے الگ فلاسفہ اور عقائد و مذاہب کے ماہرین "جنھیں "متکلمین" کہا جاتا ہے" غور و خوض کر کے عقلی استدلال کی مدد سے چاہتے ہیں کہ اپنے مطلوب اور مقصود تک پہنچ جائیں اولیاء کا مقصد ہے کہ ان کی روح پرواز کر کے خدا کی بارگاہ سے نزدیک ہو جائے اور فلاسفہ کا مقصد ہے کہ غور و خوض کر کے دلائل و براہین کے سہارے ان کا دماغ وجودِ خدا کے سلسلے میں کوئی مثبت یا منفی فیصلہ کرے اسلام میں عبادت کا مقصد اسی باطنی عشق اور میلان کو پروان چڑھانا ہے یا کم از کم ان کے مختلف اور گوناگوں مقاصد میں سے ایک اہم اور بنیادی مقصد یہ بھی ہے۔

علم النفس کے جدید ماہرین کا فیصلہ

اس زمانے کے بہت سے ماہرین علم النفس اس بات کے قائل ہیں کہ روح انسانی کی گہرائیوں میں اس طرح کی ایک کیفیت موجود ہے جسے عشق ہی کہا جا سکتا ہے، وہ اس کا خدا کی ذات سے رابطہ قائم کر سکتی ہے۔

آیا اس قسم کی کوئی کیفیت وجود انسانی کے اندر موجود ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب ملنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہم خود تجربہ

کریں، خواہ اپنے اوپر اور خواہ اپنے جیسے دوسرے اشخاص کے اوپر۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ ایسے لوگ کہ جنھوں نے سالہا سال انسان کی روح اور روحانی مسائل کے بارے میں ریسرچ کی ہے وہ اس مسئلے کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ اگلے زمانے کے بعض مفکرین کا خیال تھا کہ فقط انسان نہیں بلکہ تمام موجودات کے اندر اس طرح کا عشقِ الٰہی موجود ہے۔

آج کل کے جدید ماہرین علم النفس بھی ان کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ ان کے نفسیاتی تجربات نے انھیں اسی نتیجے تک پہنچایا ہے۔ ان ہی میں سے ایک مشہور شخصیت ڈاکٹر الکسیس کیرل Dr. Alexis Carol کی ہے انھوں نے دعا کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ خدا کی طرف روح کی پرواز کا نام ہے"۔ (کتاب "دین و رواں")

ولیم جیمس کے الفاظ یہ ہیں۔

"میں پورے طور پر اس بات کو مانتا ہوں کہ مذہبی زندگی کا سرچشمہ دل ہے، میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ فلسفیانہ فارمولے اور دستور العمل ان مضامین کی طرح ہیں جو کسی دوسری زبان میں ہوں۔"

یہی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں نے اپنے ایمان کی عمارت کو فلسفیانہ ستونوں پر بلند کیا ہے۔ حالاں کہ اس کی بنیاد دماغ پر نہیں دل کے اوپر قائم ہوئی ہے۔ وجود خدا کی گواہی دل دیتا ہے، نہ کہ عقل، ایمان اسی راستے سے دستیاب ہوتا ہے۔ دل کے پاس ایسی ایسی اطمینان بخش دلیلیں ہیں جہاں تک عقل نہیں پہنچ سکتی" (کتاب "دین و رواں")

برگسان کا نظریہ ملاحظہ فرمایئے:

"عالم بالا علم و اطلاع کا وہ سرچشمہ ہے جس نے جانوروں میں سرشت اور انسانوں میں عقل قرار دی ہے۔ اسی نے انسان میں کشف و اشراق کی قوت ودیعت کی ہے جو عام معمولی حالات میں کمزور اور مبہم بلکہ نیست و نابود ہو جانے کے قابل خیال کی جاتی ہے، لیکن درحقیقت وہ مکمل اور طاقتور ہے، خود انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ اس پر اسی طرح اثر ڈالتی ہے جس طرح آگ لوہے پر اثر کرتی اور اس کو سرخ کر دیتی ہے۔ آدمی اپنے اصلی سرچشمۂ وجود سے وابستہ ہے۔ عشقِ الٰہی کی آگ اس کے دل میں سلگ رہی ہے۔ وہ بے اطمینانی جو عقل کی وجہ سے انسان میں پیدا ہوتی ہے، اسے دل اطمینان و سکون سے تبدیل کر دیتا ہے۔ جو شخص ذات خدا سے وابستہ ہو جاتا ہے اُسے دنیا کی چیزوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا ہے، میں تمام کائنات کا عاشق ہوں، کیوں کہ وہ ساری کی ساری خدا کی ہے" (سیر حکمت در اروپا)

قرآن اور حدیث کا نقطۂ نظر

قرآن مجید اور عظیم المرتبت راہنمایان اسلام کے ارشادات میں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وجود خدا کا عقیدہ فطری ہے۔ غالباً قرآن مجید وہ پہلی کتاب ہے جس میں اس مسئلے کو چھیڑا گیا ہے۔ یہ اس کے کلام الٰہی اور معجزہ ہونے کا ثبوت ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ چودہ سو برس گزرنے کے بعد انسانی علم و دانش اس کی ہم نوائی کر رہا ہے۔

چند آیتیں اور حدیثیں قارئین کرام کی بصیرت میں اضافہ کرنے کی غرض سے پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ فاقم وجهک للدین حنیفا فطرة الله التی فطر الناس علیها

۲۔ افغیر دین الله یبغون وله اسلم من فی السموات والارض

۳۔ واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربکم قالوا بلی

۴۔ فبعث فیهم رسله وواتر الیهم انبیائه لیستادوهم میثاق فطرته ویذکروهم منسی نعمته ویحتجوا علیهم بالتبلیغ و یثیروا لهم دفائن العقول (نہج البلاغہ)

۵۔ ابتدع بقدرته ابتداعا واخترعهم علی مشیته اختراعا ثم سلک بهم فی طریق ارادته وبعثهم فی سبیل محبته (صحیفۂ سجادیہ)

کیا تم نے بحری سفر کیا ہے؟

ایک شخص نے امام (ع) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ اسے خدا کے سلسلے میں ہدایت فرمائیں کیونکہ وہ عقل کی مغالطہ انگیزیوں سے تھک گیا اور الجھ گیا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق (ع) نے ایک مثال دے کر جس کا سرچشمہ بھی قرآن مجید ہے اس کو اس کے فطری پیغام کی طرف متوجہ کیا، آپ نے پوچھا آیا اب تک تم نے بحری سفر کیا ہے اور کبھی کشتی پر بیٹھے ہو؟

کیوں نہیں؟

ایسا ہوا ہے کہ کشتی ٹوٹ جائے اور تم تیرنا بھی نہ جانتے ہو؟

اے فرزند رسول، ایسا ہوا ہے۔

آیا اس عالم میں تمہارے دماغ میں یہ خیال موجود تھا کہ اب بھی ایک طاقت ہے جو مجھے اس مہلکہ سے نجات دے سکتی ہے؟

کیوں نہیں ؟ اس طرح کا خیال میرے دماغ میں گھوم رہا تھا۔
معلوم ہونا چاہیے کہ وہی طاقت خدا کی ذات ہے، جب تمام مادی وسائل ساتھ چھوڑ دیں، ہر طرف مایوسی کا اندھیرا چھایا ہو، نجات کا کوئی راستہ نظر نہ آ رہا ہو، خدا نجات دے سکتا اور فریاد رسی کر سکتا ہے۔

ان بیانات اور توضیحات سے پتہ چلا کہ روح انسانی کی گہرائیوں میں مذہب اور خدا پرستی کا احساس موجود ہے۔ تمام افراد انسانی اپنی فطرت کی تحریک سے اس کی جانب خود بخود کھنچتے ہیں۔ خدا اور ما بعد الطبیعہ امور کی طرف یہ توجہ طبیعی ہے۔ لہٰذا اس کا سرچشمہ انسانی فطرت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ توجہ علمی اصول اور فلسفی دلائل کی مرہون منت نہیں ہے فطری معرفت خدا استدلالی معرفت سے علیحدہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بہت سے علماء اور متکلمین نے ان دونوں کے درمیان فرق نہیں قرار دیا ہے!

پھر ہر شخص دلچسپی کیوں نہیں لیتا ؟

اس مقام پر یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ اگر خدا اور دوسرے مذہبی مسائل کی بابت غور و خوض اور بحث و گفتگو کرنا فطری ہے تو تمام اشخاص اس سلسلے میں دلچسپی کیوں نہیں لیتے ؟ کیوں صرف بیکار لوگ اور طرح طرح کی محرومیوں میں بسر کرنے والے افراد ان مسائل کے بارے میں بحث اور گفتگو کرنے سے دلچسپی لیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ الٰہیات انسان کی دلچسپی کا مرکز تھے۔ لیکن آج اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسان اپنے مقام پر جن کاموں کے کرنے میں اپنا وقت صرف کرتا ہے، ان کے درمیان مذہبی مسائل کی بابت غور و خوض کرنا دکھائی نہیں دیتا ہے۔
ڈیکارٹ کا شمار اگرچہ جدید علوم کے ان ماہرین میں ہے جو وجود خدا کے معترف تھے لیکن اس کے باوجود وہ تصریح کرتے ہیں کہ "میں بہت تھوڑا سا وقت الٰہیات میں صرف کرتا ہوں، اس کا بیشتر حصّہ ریاضیات اور طبیعیات میں خرچ ہوتا ہے۔"

ڈیکارٹ کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، الٰہیات سے دلچسپی میں کمی پیدا ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بعض قوموں کو اس مسئلے سے بالکل دلچسپی نہیں رہ گئی ہے، ظاہر ہے کہ اگر اس کے متعلق بحث اور گفتگو فطری ہوتی تو سائنس اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ بھی آگے بڑھتی، اس میں کمی نہیں پیدا ہونا چاہیے تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب اور وجود خدا کی طرف توجہ کا سبب انسان کی ذاتی فطرت کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے۔

فطری ہونے کا یہ تقاضا کب ہے ؟

کسی چیز کے فطری ہونے کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ہر شخص کے تمام اوقات کو گھیر لے۔ وہ دن رات، اٹھتے بیٹھتے اسی میں جٹا رہے۔ ۔۔۔ کا ذکر کیا کوئی ایسا مسئلہ دستیاب نہیں ہو سکتا جس سے دلچسپی ۔۔۔ کے نزدیک مانی ہوئی چیز ہو اور اس نے انسان کی توجہ کو سو فیصد ۔۔۔ جذب کر لیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ آرٹ سے آدمی کو فطری طور پر دلچسپی ہے ۔۔۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کام میں وہ وقت ہی ۔۔۔ کرتا ہو، ہاں ایسا ضرور نظر آتا ہے کہ جن چیزوں سے دلچسپی عمومی ۔۔۔ ہے، ان کے سلسلے میں عملی طور پر ہر جگہ اور ہر دور میں ایک خاص طبقہ ۔۔۔ اشخاص کی بہ نسبت زیادہ اپنا وقت صرف کرتا ہے۔

مذہبیات اور الٰہیات کے بارے میں بھی ہر زمانے میں ۔۔۔ افراد ملیں گے جو ان کے علاوہ دوسرے مسائل سے ان کے برابر ۔۔۔ نہیں لیتے ہوں گے۔ وہ اپنے اوقات کا بیشتر حصّہ ان ہی کی بابت غور و خوض اور بحث و گفتگو میں صرف کرتے دکھائی دیں گے۔ جس طرح دوسرے اشخاص ایسے نظر آئیں گے جو اسی طرح اپنا وقت آرٹ کے ۔۔۔ میں خوشی خوشی صرف کر رہے ہوں گے۔

یہی ایک تھوڑی سا ہے :

وہ باتیں کہ جن سے انسان کو فطری طور پر لگاؤ ہے، ۔۔۔ نہیں بہت سی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آدمی جب ان میں سے کسی ایک ۔۔۔ انہماک سے مشغول ہو جائے گا تو دوسری چیز چھوٹی رہے گی، بلکہ ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ عارضی طور سے انسان اس کو بھول جائے، اس کا تصور ۔۔۔ دماغ میں نہ ہو۔ ہم لوگ برابر دیکھتے ہیں کہ ایک طالب علم جب تک علم ۔۔۔ کرنے میں مشغول اور علمی ماحول میں انتہائی شوق سے ریسرچ کر ۔۔۔ نہ تھکتا ہے، نہ اکتاتا ہے، لیکن ادھر اس نے یونیورسٹی چھوڑی، ۔۔۔ گیا، سن و سال دوستوں اور اپنے خاندان کے لوگوں سے ملاقات ۔۔۔ ہوئی ادھر اس کی ویسی علمی مصروفیت نہ رہی۔ اب زیادہ وقت ۔۔۔ کے پاس اٹھنے بیٹھنے، ان سے ہنسنے بولنے میں صرف ہونے لگا، وہ خود محسوس کرتا ہے کہ اس کا پڑھائی میں زیادہ وقت صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا، حالاں کہ فطری طور پر انسان کو تحقیق، ریسرچ اور ۔۔۔ کرنے سے لگاؤ ہے۔

مذہبیات سے دلچسپی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی زیادتی ۔۔۔ کا تعلق ماحول کے سازگار اور ناسازگار ہونے سے ہے۔ مادی ۔۔۔ طرف متوجہ ہونے کے اسباب کی موجودگی اور عدم موجودگی اس ۔۔۔ طاقتور اور کمزور بناتی ہے۔

یاد دہانی بھی ضروری ہے ۔ کسی چیز سے دلچسپی ۔۔۔

لگاؤ کے فطری ہونے کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ اس کے زندہ رکھنے کے بھی کوئی ضرورت اس کے سلسلے میں انسان کا بازو ہلانے کی کبھی حاجت نہ ہو۔ مذہب اور خداپرستی کی طرف اس کو توجہ دلانے والی چیزیں اگر موجود ہیں تو اُن سے ان کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اور اگر اس قسم کی چیزیں نہیں ہیں تو وہ ظاہر نہیں ہوتی ہیں۔ اسی مخصوص دلچسپی اور لگاؤ کی کیا خصوصیت کسی ایسی چیز کا نام لیجیے جس سے انسان کو فطری طور پر لگاؤ ہو، لیکن اسے اپنے زندہ رہنے کے لیے کسی سہارے کی احتیاج نہ ہو۔ کیا اولاد سے انسان کو فطری طور پر دلچسپی نہیں ہے۔ انسان کا کیا ذکر جانور تک ہمیشہ نہ سہی، لیکن کچھ عرصے تک اپنے بچوں سے محبت کرتے، خود بھوکے رہتے مگر ان کا پیٹ بھرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود تاریخ عرب میں ایک ایسا دور نظر آتا ہے کہ گوناگوں اسباب نے مل کر اسلام کے آنے سے پہلے جیسے لوگوں کے دل سے اولاد کی محبت کو چھین لیا تھا، ان کے درمیان عام طور سے لڑکیوں کو مار ڈالنے کا رواج ہوگیا تھا، ہم نے اپنی ضخیم کتاب "عورت اور اسلام" میں تفصیل سے ان اسباب کا ذکر کیا ہے۔ یہی حال غذائی اور جنسی رغبت کا ہے۔

اس دور کا انسان جس طرح مادیت پر جان دے رہا ہے، عیاشی اور ہوس رانی میں ڈوبا ہوا ہے، وہ ہر شخص کے پیش نظر ہے۔ ایسے مادی ماحول میں اگر لوگ مذہبی مسائل کی بابت نہ سوچیں، ان کے متعلق تحقیق اور ریسرچ میں اپنا وقت صرف نہ کریں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وجود خدا کے مسئلے سے انسان کو فطری طور پر دلچسپی نہیں ہے یا یہ لگاؤ اب بالکل مُردہ ہو چکا ہے۔ آج بھی ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ انسان جب موقع پاتا ہے، جب اسے عیاشی اور ہوس رانی سے چھٹی ملتی ہے، جب کوئی عبرتناک حادثہ اسے جھنجوڑ دیتا اور اس کا بازو پکڑ کر ہلا دیتا ہے تو وہ خدا اور مذہب کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اس قسم کے مسائل سے دلچسپی لینے لگتا ہے۔

پورے طور سے مادی ماحول کے چھا جانے کے باوجود آج بھی فضاؤں میں مذہبی مقررین کی آوازیں گونج رہی ہیں، آج بھی کتاب فروشوں کی دوکانوں پر مذہبیات سے متعلق بہتر سے بہتر معیاری لٹریچر نظر آتا ہے۔ آج بھی سیکڑوں دماغ صرف خدا کی ہستی اور دیگر مذہبی مسائل کی بابت بڑی لگن اور اخلاص سے دن رات لگاتار سوچتے رہتے ہیں، آج بھی ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان مذہبی کتب اور مضامین کے پڑھنے میں اپنے قیمتی وقت کا بڑا حصہ صرف کرتے ہیں۔

شعبۂ دینیات شیعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

امراضِ صدر کے چند مجرّب نسخے

علامہ حکیم سید غلام حسنین کنتوری ہندوستان کے ماہرین طب میں شامل تھے۔ آپ نے اولاً "القانون فی الطب" مصنفہ شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ ابن سینا اور اس کے بعد کامل الصناعت مصنفہ ابو الحسن علی بن العباس المجوسی کا ترجمہ و شرح بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک مکمل زبان اردو میں فرمایا۔ اور دونوں کتابوں کے معالجات کے ضمن میں اپنے تجربات بھی درج فرمائے۔ نیز مجربات جداگانہ بھی مرتب فرمائے جو متعدد کتب و رسائل میں شایع ہوئے۔ شفیق بسیار علامہ کنتوری کے جو مجربات احقر کو حاصل ہوئے۔ انہیں احقر نے کتاب موسومہ بہ "علامہ کنتوری اور طب" میں مرتب و مدون کیا ہے جو زیر طباعت ہے۔ عنوان مذکورہ کے تحت علامہ کنتوری کے وہ مجربات پیش کرتا ہوں جو آپ نے امراض صدر کے معالجات کے سلسلے میں پیش فرمائے ہیں۔

دمہ :- علامہ کنتوری نے دمہ کی تین قسموں دمہ بارد، دمہ حار اور دمہ ضعف دماغ سے مجربات ذیل تحریر فرمائے ہیں۔

دمہ بارد :- علامہ کنتوری فرماتے ہیں کہ جو دمہ سردی سے ہو یعنی سرد اشیا کے کھانے پینے سے اور دمہ کا دورہ جاڑوں میں ہو تو اس کا علاج مجرب ہمارا یہ ہے اور بالکل بے خطا ہے۔ درخت جٹ جٹہ بابیخ و برگ بسوزاند و نیم آثار ایں خاکستر در دہ آثار آب جوشیش دہد کہ بایک آثار بماندہ بعدہ فلفل دراز۔ بار۔ سائیدہ آمیختہ بذر شہد بقدر نخود حب بندد یکے صبح و یکے شام بخورد۔ یہ دوا بھروسے کی ہے مگر حکیم کو اپنی نگرانی میں تیار کرا کے

دیناضروری ہے

دمہ حار :۔ اسبغول کے پھانکنے سے ہمارا تجربہ ہے کہ زایل ہوتا ہے مگر دیر میں۔

دمہ ضعفِ دماغ :۔ جو سرما گرما دونوں میں ہوتا ہے۔ اس کا نسخہ یہ ہے۔

رشیہ برگد ۶ ماشہ، تخم کتان ۶ ماشہ، ریشہ خطمی ۶ ماشہ، کوکنار ۴ ماشہ، سریشم ماہی ۶ ماشہ، مویز منقیٰ ۷ دانہ

درآب خیسانیدہ نبات ۱ تولہ حل کردہ بنوشند۔

دق اور سل کی کھانسی کے معالجہ کے سلسلے میں علامہ کنتوری ارقام فرماتے ہیں۔ ابھی دو مریضوں پر تجربہ ہوا

بزر البنج سفید ۱ تولہ، مغز چلغوزہ ۶ ماشہ، مرمکی ۵ ماشہ، کوفتہ بیختہ با شہد مقوم ساختہ

بقدر کنار دشتی۔ حب بندد۔ اس گولی سے کسی قدر خشکی حلق میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے تدارک کے لیے روغن بنفشہ میں کپڑا تر کے حلق پر باندھیں۔

چونکہ اخراج بلغم رک جاتا ہے تو یہ بلغم اسہال کے ذریعے دفع ہوتا ہے اس قسم کے بلغمی اسہال کے تدارک کے لیے مندرجہ ذیل دوا استعمال کرائیں جو اسہال ذوبانی کے لیے مفید ہیں اور بارہا تجربہ ہوا ہے۔

پوست انار ترش ۲ تولہ، مازو سبز ۲ تولہ، دو سرکہ تند پختہ ہمراہ سازند وافیون ۱۰ ماشہ

امیختہ بقدر فلفل حب بندند خوراک از سہ حب تا پنج ہمراہ جوشاندہ پوست کہ آب سرخ میباشد۔ مجرب المجرب باذن اللہ۔ مقدار دو تولہ ہمراہ کسی مناسب عرق کے یہ تدبیر مخصوص ہماری ہے جن کا علاج کیا ابھی تک زندہ ہیں۔

ذات الجنب اور ذات الصدور کے جملہ اقسام میں ایک تولہ برگ سبلاب یعنی عشق پیچاں پانی میں پیس کر پلانے سے شفاء کلی ہوتی ہے۔ اگر بارد ہو تو ضماد مغز کر بخوہ ورنہ سپیدی بیضہ کاغذ پر جس میں سوزن سے بہت سے سوراخ کیے گئے ہوں، لگا کر مقام درد پر چسپاں کیا جائے فوراً درد ٹھہر جاتا ہے۔ یہ دونوں دوائیں بھی بھروسہ کی ہیں۔

علاج مذکورہ بالا کے حاشیے پر والد بزرگوار حاذق الحکما حکیم سید محمد ریاض الدین حسین صاحب جنہوں نے پچاس سال تک امام باڑہ سید خیرات علی واقع قصبہ جلالی میں کامیابی کے ساتھ مطب فرمایا، تحریر فرماتے ہیں ذات الجنب کا علاج عشق پیچاں سے۔ یہ علاج ذات الجنب بھی یادگار ہے کہ منھ سے مریض کے خون آچکا تھا اور پھوڑا پھوٹ کر منھ کی راہ اس کا مادہ نکل رہا تھا اور معالجین نے حکم قطعی اس کی موت کا لگا دیا تھا۔ مگر نے برگ سبلاب (عشق پیچاں) کا عصارہ چند ادویہ مناسبہ میں داخل کر کے پلایا ا خدا نے مردہ کو زندہ کر دیا المجرب من امر اللہ طبیبوں کو یاد رہے کہ یتی خدا نے عجیب پیدا کی ہے۔

امراض قلب

علامہ کنتوری تحریر فرماتے ہیں۔ امراض قلب کا علاج ادویۂ مفرحہ ومعدنیہ سے کرتا ہوں۔ یہ نسخہ اکثر امراض قلبیہ کو نافع ہے۔

گاؤزباں ۲ ماشہ، گل گاؤزباں ۲ ماشہ، زرنب ۲ ماشہ، زرنباد ۲ ماشہ، گل سرخ ۲ ماشہ، فرنجمشک ۲ ماشہ

دانۂ ہیل ۲ ماشہ، برادۂ صندل ۴ ماشہ، نبات سفید ۲ تولہ، شب درآب گرم خیسانند

صباح صاف نمودہ بنوشند۔ اگر نزلہ زکام ہو تو بجائے صندل برادۂ عود خام استعمال کرایا جائے۔

نسخۂ دیگر برائے امراض قلب۔

گل چاندنی ۶ ماشہ۔ گل سیوتی ۶ ماشہ، گل گڑہل ۹ ماشہ، گل گاؤزباں ۶ ماشہ، گل نیلوفر ۶ ماشہ، درآب خیسانند ۱۵ تولہ

شربت صندل ۱ تولہ یا شربت کیوڑہ ۱ تولہ آمیختہ بنوشند

بطور نمونہ از خروارے علامہ حکیم سید غلام حسنین کنتوری نے چند اہم مجربات امراض صدر وقلب کے لیے بغرض استفادہ اطبائے نوآموز پیش کیے ہیں۔ ورنہ علامہ کنتوری جملہ امراض صدریہ کے علاج میں مہارت کامل رکھتے تھے اور سیکڑوں مجربات آپ کے خزانہ طب میں محفوظ تھے۔ آپ کے مجربات پیسہ اخبار لاہور، الحکیم، معالج، مفتاح الاسرار وغیرہ رسائل میں شایع ہوئے ہیں۔ اور راقم نے کتاب "علامۂ کنتوری اور طب" میں مرتب کیے ہیں جو عنقریب شایع ہونے والی ہے۔

دور حاضر کے اطباء کرام بھی اگر رسائل میں اپنے مجربات شایع کراتے رہیں تو ان سے طلبا اور نوآموز اطباء کو فائدہ حاصل ہوگا اور اس طرح فن طب بھی ترقی کرے گا اور اس کو فروغ حاصل ہوگا۔ مجربات کو مخفی رکھنے سے بھی فن طب کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ مجربات طبیہ کو زیادہ سے زیادہ شایع کیا جائے اور میدان طب میں تجربات کی رفتار تیز کی جائے۔

(ریڈر طبیہ کالج - مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ)

سید محمد ہاشم
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سیرۃ النبی جلد اوّل و دوم کا مؤلف؟
علامہ شبلی یا سید سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی ایک نادرہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے استاد علامہ شبلی کی تحریک و تربیت کے نتیجے میں سیرۃ النبی کے زبردست علمی منصوبے کو بے مثل طریقے پر درجۂ اتمام کو پہنچایا اور بسا اوقات تو یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس میں استاد کا تعاون کس قدر ہے۔ یہی اس تحریر کا منشا و موضوع بھی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی تعلیم و تربیت کا آغاز اُن کے والد مولانا شاہ سید ابوالحسن اور مولانا ابوحبیب جیسے صاحبان معرفت کے سایہ عاطفت میں ہوا تو نوعمری کے استاد کے طور پر انھیں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی جیسا جیّد عالم اور فقید المثال استاد ادب ملا اور پایۂ کمال کو پہنچانے کے لیے بالآخر علامہ شبلی جیسا مخدوم، نگراں اور مربی نصیب ہوا۔ والد مرحوم اور برادر معظم کے فیضانِ صحبت سے سید صاحب کے اندر دینی روح کا سا جوہر پیدا ہو گیا تھا جس نے ان کی زندگی کو مجلّی کر دیا تھا اور اس کے اندر بڑی سے بڑی آندھی اور طوفان کا مقابلہ کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی تھی۔ عربی زبان و ادب کو مولانا چریاکوٹی کے دورِ تربیت میں جلا و کمال نصیب ہوا اور وہ صلاحیت رنگ لائی جو آگے چل کر سید صاحب کا طرّۂ امتیاز سمجھی گئی۔ یہ حسنِ اتفاق ہی تو ہے کہ علامہ شبلی، جنھوں نے خود مولانا چریاکوٹی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تھا، سید صاحب کے آخری استاد اور سرپرست قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ اس سعادت سے بہرہ ور ہونے کے بعد جہاں مولانا مرحوم کا سلسلۂ تربیت تکمیل کے مرحلے کو پہنچا وہیں علامہ شبلی کی پارس صفت معیت سے اکتسابِ فیض کے نتیجے میں سید صاحب کا انفرادی تشخص بھی قائم ہو سکا اور ان خصائص کے ساتھ وہ علامہ شبلی کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات کا شافی جواب دینے کے سلسلے میں سیرتِ رسول لکھنے کا خیال سب سے پہلے سرسید علیہ الرحمہ کو آیا تھا۔ بعد کی کوششیں سرسید کے اس احسانِ عظیم سے گراں بار ہیں۔ علامہ شبلی ایک زبردست مؤرخ تھے اور اس میدان میں ان کا تبحر علمی سرسید سے مضاعف تھا۔ "خطبات احمدیہ" کے تقریباً تیس برس بعد اسی شدت سے انھیں بھی سیرت لکھنے کی ضرورت کا احساس ہوا اور بقدر ظرف و ذوق انھوں نے اس منصوبے کی بنا ڈالی۔ لیکن انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس کارِ عظیم کے لیے سرسید کو انگلستان جانا پڑا تھا اور خود شبلی کو سیرت فاروق کا مواد حاصل کرنے کے لیے قسطنطنیہ کا سفر کرنا پڑا تھا۔ اس لیے سیرت رسول انام علیہ السلام کا جو منصوبہ علامہ شبلی نے تیار کیا تھا وہ غیر معمولی درک و بصیرت، جگر کاوی اور جد و جہد و جاں فشانی کا متقاضی تھا۔ ۱۹۰۲ء سے شبلی کو بار بار اس کا تقاضا محسوس ہوتا تھا۔ یوں تو ناموران اسلام پر کتابوں کا سلسلہ انھوں نے بہت پہلے شروع کر دیا تھا اور رسول اکرمؐ کی سوانح کے ضمن میں وہ پورے اسلامی نظام کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ اسی مقصد سے اس موضوع پر ۱۹۰۳ء میں انھوں نے کچھ لکھا بھی تھا لیکن اسے خود ہی کالعدم قرار دے دیا تھا۔ مارگولیتھ کی انگریزی کتاب "محمد" کی اشاعت کے بعد مولانا محمد علی جوہر کی توجہ دلانے پر سیرت لکھنے کے جذبے میں پھر شدت آ گئی لیکن اپنے ذہن و جذبے کی شدت احساس کے باوجود اس کی تکمیل کے مراحل کا خیال انھیں بار بار عرق ریز کر دیتا تھا۔ ارادہ کرتے اور ہمت ہار جاتے۔ منصوبے کے لیے جو خطوط متعین کیے تھے اس سے کم پر ان کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ وقت ہی انھیں مہمیز کرتا اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس ارادہ کی عدم تکمیل کے سلسلے میں احساس شکست اور دوسری مصروفیات ان کے اس خیال کو قدرے سرد کر دیتی تھیں۔ سید سلیمان ندوی ۱۹۰۵ء تک مولانا محمد فاروق صاحب سے کسب فیض کرتے رہے اور اسی سال جب علامہ شبلی ندوہ کے معتمد بن کر آئے تو موصوف علامہ شبلی کے سایۂ تربیت سے منوّر اور دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۰۷ء میں تعلیم سے فراغت کے ساتھ ہی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان "الندوۃ" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور بڑی مستعدی کے ساتھ کئی برس تک اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ اس میں انھیں مضامین کے علاوہ کبھی کبھی اداریہ بھی لکھنا ہوتا تھا۔ اسی عہد میں ان کا اسلوب اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ ان کے بعض اداریوں پر اصل ایڈیٹر یعنی علامہ شبلی کے اداریوں کا گمان کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں بحیثیت استاد سید صاحب کا ندوہ میں تقرر ہوا۔ اسی زمانے میں "دروس الادب" کے نام سے عربی کے مبتدیوں کے لیے کتابچے لکھے۔ "وکیل" امرتسر اور "مخزن" لاہور وغیرہ میں وہ پہلے سے ہی مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۱ء

ہیں انھوں نے ایک عربی اردو لغت تیار کر کے شایع کی۔ اس کے علاوہ بعض اور اہم علمی کام بھی اس وقت تک منصۂ شہود پر آچکے تھے۔ سابقہ تربیت اور ان سات برسوں میں علامہ شبلی کی معیت نے سید صاحب کو ایک گوہر آبدار کی حیثیت میں نمایاں کر دیا تھا اور علامہ شبلی کو جب یہ احساس ہو گیا کہ سیرت کے منصوبے کی تکمیل کے سلسلے میں یہ ذی استعداد اور باصلاحیت نوجوان ان کی کما حقہٗ معاونت کر سکتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اور دیگر مسائل یعنی فکر معاش اور ندوہ کی طرف سے بھی انھیں اطمینان ہو گیا تو ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اس عظیم اور غیر معمولی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلے میں جتنی کتابیں درکار تھیں انھیں فراہم کر کے یکسوئی سے کام کرنے کے لیے بمبئی چلے گئے۔ وہاں خود بھی مطالعہ میں مشغول رہے اور سید صاحب کو بنیادی ماخذ سے تحقیق و تفحص اور اخذ و انتخاب کے کام پر مامور کیا۔ انھوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ اہم ترین کام ہے اور اسے سید سلیمان انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کو اپنے ایک خط میں علامہ نے لکھا کہ

"کام ہو رہا ہے۔ سیرت کی اصل ماخذ صرف تین کتابیں ہیں۔ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری۔ ان کے تمام رواۃ استقصاء کر کے ان کا اسماء الرجال تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا ہوں کہ رواۃ کے انتقاد میں آسانی ہو۔ سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں اور یہیں ہیں۔ خود الگ سیرت میں مشغول ہوں۔ انگریزی کتابوں کا بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔" [۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء]

سید صاحب نے اپنے کام کی نوعیت کو کچھ اس نہج پر چلایا کہ اسے بتدریج زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ دیگر ممکنہ ماخذ سے ایک ایک کر کے تمام روایتوں کو نکال کر جمع کر لیا پھر اسے تنقید حدیث کے سخت اصول پر پرکھ کر ان میں سے معتبر اور موثر روایتوں کا انتخاب کیا اور ان پر بحث کر کے بڑے مستحکم استدلال کے ساتھ اپنے نتائج کا استخراج بھی کیا۔ علامہ شبلی اس پورے کام کی نگرانی کر رہے تھے اور مطمئن تھے۔ بمبئی سے واپسی کے بعد سید صاحب الہلال کلکتہ اور پونا میں بھی رہے لیکن اس خدمت کو پوری جانفشانی اور ارتکاز سے انجام دیتے رہے۔ اگر سید صاحب کسی موضوع پر سہواً یا مصلحتاً بحث نہیں کر پاتے تھے تو علامہ شبلی اس کی نشاندہی کر دیتے اور نازک سے نازک سوالات کر کے اس پر سید صاحب کی عالمانہ اور ناقدانہ رائے معلوم کرتے تھے۔ اس سلسلے میں متعدد خطوط شبلی کے مجموعۂ مکاتیب میں شامل ہیں، ایک خط کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"تم نے کعبہ کی تعمیر اور ذبح کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ قرآن مجید میں فبشرنٰہ بغلٰمٍ حلیم جہاں ہے اس سے ہر شخص نے حضرت اسحاقؑ کو مراد لیا ہے۔ کیوں کہ بشارت کا لفظ انہی کے متعلق دوسرے موقع میں آیا ہے اور اسی آیت کے بعد یہ آیت ہے۔ فلما بلغ معہ السعی الخ اس لیے اس سے بھی حضرت اسحاقؑ مراد ہو سکتے ہیں، اس کا کیا جواب ہے۔"

اس کے بعد اس موضوع پر سید صاحب نے اپنے انداز پر گل افشانی گفتار کا مظاہرہ کیا، دوسری جلد کا ابتدائی حصہ اس کا مظہر ہے، اسی طرح کے اور بہت خطوط علامہ نے لکھے۔

جب سیرۃ کا مواد مرتب ہو گیا تو جلد اول کے مقدمے کے طور پر عہد جاہ کی تاریخ کی ضرورت تھی۔ یہ کام بھی سید صاحب کے سپرد ہوا لیکن اہل تحقیق پر راز مخفی نہیں کہ محقق اپنی تحقیق کے دوران خود کو بہت زیادہ محدود نہیں کر پاتا اور جس قدر بھی ضروری مواد مل سکے، اسے کھوج نکالنے کے درپے ہوتا ہے۔ اتنا ہی اسے بہت سے ضمنی موضوعات ملتے رہتے ہیں جن پر الگ سے متعدد مقالات کے لیے مواد ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ اپنی فطرت سے مجبور رہے۔ چنانچہ عہد جاہلیت کی [illegible] تحقیق کے دوران سید صاحب بہت گہرائی تک پہنچ گئے اور اس موضوع میں اتنی گنجائش نکلتی گئی کہ عرب قدیم کا جغرافیہ، وہاں کے علاقے، مآثر، مقابر اور مختلف پیغمبروں کے معجزات، ان کی قوموں کے احوال اور اُن پر واقعات کے صدور کے مقامات، ان کی کیفیات اور اُن کے باقی ماندہ آثار، مختلف سلطنتوں، قبیلوں اور قوموں کی فنی اور وسیع تحقیق، اور اس تحقیق کے سلسلے میں وہاں کے ماخذ بالخصوص کتبوں وغیرہ کا مطالعہ، سید صاحب کی کاوش فکر کا تختۂ مشق بنے۔ اور اس موضوع پر اتنا وافر اور وقیع مواد فراہم ہو گیا کہ بعد میں اسے ارض القرآن کے نام سے دو جلدوں میں شایع کرنا پڑا۔ علامہ شبلی اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ سید صاحب موضوع کی تہہ تک پہنچے بغیر واپس نہیں آتے ہیں۔ کئی روز تک انتظار کرنے کے بعد انھوں نے اس خیال سے کہ نہ جانے ان کا اشہب تحقیق انھیں کہاں لے جائے، اس کو لگام دینے کے لیے سید صاحب کو ایک خط میں لکھا کہ

"تم عرب بائدہ یا عرب کی ان مہذب سلطنتوں کے پیچھے نہ پڑو جو یمن شام وغیرہ میں قایم تھیں، ان کے متعلق چند صفحات میں اجمالی بحث کافی ہوگی۔ تمام کوشش نجد و حجاز و یثرب کے متعلق معلومات جمع کرنے میں صرف کرنی چاہیے۔ تم انہی مقامات کے متعلق معلومات بہم پہنچاؤ۔ آبادی کعبہ اور حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے واقعات میں جس قدر تفصیلات مل سکیں، محقق، وہ تلاش کرو۔"

چنانچہ سید صاحب نے یہ بھی کیا اور دوسری جلد کا آغاز بھی اسی بحث سے ہوا ہے۔ لیکن مقدمے کے طور پر علامہ شبلی نے اس مواد کا اجمالی انتخاب ہی شامل کیا اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے "الندوہ" کی ادارت کے زمانے میں ہی سید صاحب کا اسلوب علامہ شبلی سے اس درجہ مماثل ہو گیا تھا کہ کبھی کبھی تو اداریے میں [illegible] نگار کی تمیز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایسی صورت حال میں پہلی جلد کو جس کا سواد ہی ہم

بڑی مدت تک ترتیب اور مقدمہ تک بھی سید صاحب کی سعی بلیغ کا کرشمہ ہے۔ اسے اپنا اسلوب
عطا کرنے میں علامہ شبلی کو خاصی سہولت ہوگئی تھی۔ سر ولیم میور اور مارگیولتھ کی انگریزی
تحریروں کے ترجمے کے لیے دوسرے لوگ مقرر تھے۔ انگریزی کے اس مترجمہ مواد سے گاہ بگاہ
استفادہ، زبان کی تراش خراش اور آخر وقت تک اسے آراستن و پیراستن کی منزل سے گزار
کر بنا پر تلو، منفرد اسلوب بخشنا، یہی پہلی جلد میں اور دوسری جلد کے چند ابواب میں علامہ
شبلی کا کارنامہ ہے، جس کی اہمیت مسلم ہے۔ چنانچہ جلد اول کا جو کتابت شدہ مسودہ
دار المصنفین اعظم گڑھ میں اس وقت تک محفوظ ہے، وہ علامہ شبلی کی اسی نظافت کا مظہر ہے
جس مواد کی فراہمی، تحقیق و تفتیش، بحث و استدلال، نقد و انتخاب اور نتائج کے استخراج
کے علاوہ قدر تک بھی سید صاحب نے ترتیب دیا۔ ان سب کے پیش نظر ظاہر ہے کتاب
کی تصنیف کا سہرا سید صاحب کے سر ہے اور خود علامہ شبلی کو بھی اس سے انکار نہیں۔
جب وہ پہلی جلد کے تمام کام سے تقریباً مطمئن ہوگئے تو دوسری جلد کا کام آگے بڑھانے
کی فکر سوار ہوئی اور انھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ

"تم اب کیا کر رہے ہو، اگر کوئی اور کام نہ ہو تو اب دوسرے حصے کے
اجزا کو لے لو۔"

مذکورہ بالا سے قطع نظر علامہ شبلی نے تو عام اور معمولی مسائل پر غور و خوض کے سلسلے
میں بھی سید صاحب کو زحمت فکر دی اور بار بار اُن سے یہ معلوم کرتے تھے کہ کون سی
باتیں کم اہم ہیں اور کن پر مزید تفصیل کی گنجائش یا ضرورت ہے، وہ سب لکھ بھیجا
کرو۔ علامہ نے اپنے شاگرد رشید کی صلاحیت و استعداد کو بروئے کار لانے
میں ہی بس نہیں کی، بلکہ ان کی خواہش تھی کہ ان کے اسلوب میں ڈھلنے کے بعد
بھی سید صاحب اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کریں۔ یہ بات نہ مبالغے پر مبنی
ہے اور نہ ہی علامہ شبلی کے کسی علمی عجز اور کم مائیگی کی دلیل ہے بلکہ بڑے
عالم کی شان ہی یہی ہے کہ وہ اپنے خیال کو حرف آخر اور مکمل نہیں سمجھتا بلکہ ہر
لفظ اس کی بہتری اور عمدگی کے لیے آمادہ و کوشاں رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ
سید سلیمان ندوی معتقدات، حدیث اور دینیات کے میدان اور طرز فکر
میں منتخب روزگار شخصیات میں تھے اور علامہ شبلی کا تخصص عربی ادب اور
اسلامی تاریخ میں تھا۔ لیکن سید صاحب کی مذکورہ بالا صلاحیتوں اور صفات
کے علاوہ ان کی محنت شاقہ اور بصیرت و آگہی پر علامہ کو غیر معمولی اعتبار تھا اور ان
کی خواہش تھی کہ جس مسودے کو وہ آخری شکل دے چکے ہیں، سید صاحب ایک
بار اسے بھی ضرور دیکھ لیں۔ اس کے لیے وہ انھیں مختلف انداز سے مدعو
کرتے اور نظر ثانی کے لیے کہتے تھے:

"اس وقت تمہاری ضرورت اس لیے ہے کہ مبیضہ پر نظر
ثانی کرو، کوئی بات غلط درج ہوگئی ہو یا فرو گذاشت ہوگئی
ہو، ان کو نوٹ کرتے جاؤ۔ بعض امور میں مشورے کی بھی
حاجت ہے۔ چند مہینے کے بعد تم بالکل آزاد ہو، جو تمہاری اسکیم
ہو اس کے موافق کام کرو، میں ہر کام میں مدد کے لیے
تیار ہوں۔"

۲؍ دسمبر ۱۹۱۳ء

"تم کو ایک محدود مدت تک، جو ۴-۵ مہینے سے متجاوز نہ
ہوگی، سیرت کے کام میں رہنا چاہیے کہ پہلی جلد تیار ہو جائے۔
ضعف حافظ و دماغ کی وجہ سے اپنی نظر ثانی پر اطمینان نہیں
مسائل ذیل پر نہایت تحقیق و تدقیق سے نظر ڈالو۔ کعب اشرف
یہودی اور ابو رافع کا قتل باذن آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم جس طرح بخاری میں منقول ہے، اس کو کیوں کر اخلاق
کے موافق تسلیم کیا جائے۔"

راوی اول جابر بن عبد اللہ ہیں۔ کیا وہ اس دفعہ
میں شریک تھے یا شرکاء سے سنا تھا، آیت تخییر سے کیا مراد
ہے۔ کیا آنحضرت پر عدل بین الازدواج باقی نہیں رہا۔ حضرت
عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیثیں جو ترجی من تشاء
کے متعلق کہاں تک صحیح ہیں۔"

۱۷؍ دسمبر ۱۹۱۳ء

سید صاحب نے ان خطوط میں دیے گئے حکم کی تعمیل بھی کر دی تھی۔ ملاحظہ ہو
سیرۃ النبی (جلد اول)۔ یہ معاملات ابتدائی دو جلدوں اور بالخصوص اولین
جلد سے متعلق ہیں۔ جن پر مولف کی حیثیت سے علامہ شبلی کا نام لکھا ہوا ہے
اگرچہ ان میں سے کوئی بھی علامہ کے سامنے زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی تھی۔ اپنے
آخری وقت میں علامہ شبلی نے سید صاحب اور مولانا حمید الدین؛ انہی کے ہاتھ
میں ہاتھ لے کر سیرت کی تکمیل کی تاکید کی تھی۔ چنانچہ اسے حرز جاں بنا لیا گیا اور علامہ
کی وفات کے چار سال بعد سعادت مند شاگرد نے جب اسے شائع کیا و اشاعت
کے وقت بھی چند اضافوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور اکرام کا یہ حال تھا کہ
ان اضافوں کے لیے بھی ہلالین کو ناگزیر سمجھا گیا۔ جب کہ مجموعی طور پر یہ سارا سرمایہ شاگرد
رشید ہی کا تھا۔ ان معروضات کا مدعا استاد مکرم علامہ شبلی کی اہمیت کی تخفیف
نہیں، نہ یہ بات ممکن ہے اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ اولین جلدوں میں علامہ کا نام غلط
درج ہے۔ بلکہ اصلاً یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ یہ دو جلدیں جن پر سید صاحب نے
ہی استاد کا نام لکھا ہے، نیز حیات شبلی اور دوسری تحریروں میں انھوں نے کئی بار
بار مصنف یا مولف کا لفظ استعمال کیا ہے، اپنے سیاق و سباق کے پیش نظر
دراصل سید سلیمان ندوی صاحب کی محنت شاقہ اور علامہ کی شرف نگاہی کا نتیجہ
ہیں اور داخلی و خارجی شواہد نیز مبینہ حقائق سے صرف نظر کر کے صرف رسمی

ادب واحترام پر اصرار کرتے ہوئے اصل حقیقت کا اعتراف نہ کرنا تحقیق کی راہوں کو مسدود کرنے کے مترادف ہوگا۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے اگر سرسید کے لیے کام کیا تو یہ سرسید کی نااہلی کا ثبوت نہیں بلکہ سرسید کی مصروفیت اور وقت کا تقاضا تھا۔ علامہ شبلی سیرت پاک پر کام کرنا چاہتے تھے۔ بار بار ارادہ کرتے لیکن اپنے اندر ہمت نہیں پاتے تھے۔ مل جل کر جو کام کیا اس پر اپنی نظر ثانی میں بھی تامل تھا اور شاگرد کی حیثیت میں ہی سہی سید صاحب کی مدد لینے پر مجبور تھے۔ یہاں مولوی عبدالسلام ندوی کا ذکر بھی ناگزیر ہے جو آخر میں کچھ دن علامہ کے معاون رہے لیکن اصل کام اس وقت تک ختم ہو چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ سید صاحب علامہ شبلی کے پروردہ تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ خاکہ اور منصوبہ بھی انہی کا تھا جس کی تکمیل کا بیڑا سید صاحب کے سبب ہی اٹھایا تھا اور ہر لحظ سید صاحب کی نگرانی کرتے رہتے تھے لیکن یہ امور بھی اسی پر دال ہیں کہ علمی طور پر یہ کارنامہ بہرحال سید سلیمان ندوی کا ہی ہے۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ دوسری جلد کے بعد کی بقیہ پانچ جلدیں سید صاحب کی تالیف ہیں، دوسری جلد میں بھی ہلالین کے اضافوں کے علاوہ متعدد ابواب سید صاحب کا اضافہ ہیں۔ گویا وہ جلد بھی برائے نام ہی علامہ شبلی کی ہے ان میں جلد کے پہلے ایڈیشن میں علامہ شبلی کا منفرد اسلوب اپنی پوری کت ش کا حامل ہے اور اس کے ہلالین میں سید صاحب کے اضافے اور حواشی ضمنی حیثیت رکھتے ہیں کتاب کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں یہ ہلالین برقرار رہے لیکن متعلقہ مواد حاصل ہوتا گیا اور چوتھے ایڈیشن میں کافی اضافوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب وہ نادر مخطوطات بھی طبع ہو کر شائع ہو چکے تھے جو شبلی کے زمانے میں دستیاب نہ ہو سکے تھے اور ان سے استفادہ ناگزیر سمجھا جا رہا تھا، سید صاحب نے ان کتابوں کا ضروری مواد اس میں شامل کر لیا اور غیر معمولی اضافوں نیز عبارت کی روانی کی خاطر ہلالین بھی ختم کر دیے۔ نئی تحقیقات کی روشنی میں سابقہ مواد پر جہاں تنقید کی ضرورت محسوس ہوئی اس کا اظہار بھی کیا گیا، اور ان تمام امور کی تفصیل چوتھی اشاعت کے دیباچے میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی اس نئی ترتیب کے لیے جن اصولوں کو اختیار کیا انھیں بھی مختصراً بیان کر دیا۔ اور اس طرح کتاب کی وقعت میں مزید اضافہ ہو گیا

بقول سید صاحب

" پوری کتاب کے واقعات کو از سر نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور اس میں جہاں کہیں نقص نظر آیا، دور کیا گیا۔

تصحیح بیان، دفع شبہ، رفع ابہام اور تشریح کے لیے بہت سے توضیحی حوالے بڑھا دیے گئے ہیں۔ طبع اول کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں ان سے استفادہ کر کے اگر کوئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کر دیا گیا ہے "

ہماری بحث کتاب کے پہلے ایڈیشن سے متعلق تھی اور ان غیر معمولی تبدیلیوں و اضافوں کے ساتھ اس چوتھی طباعت و اشاعت کے بعد تو اس موضوع پر گفتگو کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا علمی دلائل پر مبنی بحث طلب مسئلہ یہ نہیں کہ سید سلیمان ندوی صاحب نے شبلی کی سیرۃ النبی میں کیا اضافے کیے۔ ا داخلی اور خارجی قرائن سے یہ نشاندہی کرنا باقی ہے کہ ان دو جلدوں میں شبلی کی زبان و اسلوب کا رنگ اور آراستگی و پیراستگی کا منفرد انداز کہاں کس حد تک موجود ہے۔

[باقی]

لقیہ : نوبل انعام

۵ عدد حیح ذرات شروع میں ملے تھے [ابھی یہ چھان بین جاری ہے اور امید ہے ان ذرات کی تعداد میں اضافہ ہوگا] ۔

ان تجربات سے ± ڈبلیو اور حیح کی کمیت بالترتیب ۸۱ اور ۹۳ G ی و پائی گئی جو کہ عبدالسلام - وائنبرگ نظریے کی پیش گوئی سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس طرح سے ان تجربات نے نہ صرف ضعیف نیوکلیر قوت کی تجرباتی تصدیق کی بلکہ اس اہم تصور کو بڑھاوا دیا جس کے تحت بنیادی قوتوں کے سبب کچھ مخصوص ذرات کا تبادلہ ہوتا ہے۔

حوالے :- ا- فزکس ٹوڈے [Physics Today] اپریل ۱۹۸۳ء اور نومبر ۱۹۸۳ء۔

۲- فزکس نیوز [Physics News] ستمبر ۱۹۸۳ء

اکتوبر ۱۹۸۴ء میں فزکس میں نوبل انعام مذکورہ بالا دریافت کے کارلو روبیا (Carlo Rubbia) اور وان ڈر میر [Van der Meer] کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۴ء کا یہ انعام دسمبر میں دیا جائے گا

ہمارا خراجِ عقیدت ——— اتحاد

"ہم سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں۔ جس کی بندگی ہم مختلف ناموں سے ادا کرتے ہیں۔ اس لئے، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے لازمی اتحاد کو محسوس کریں، اور انسانوں کے درمیان چھوت چھات، برتری اور کمتری کے احساس کو ترک کر دیں۔"

ایسا کہا تھا مہاتما گاندھی نے جنہوں نے اپنی ہستی کمزوروں کے لئے مکمل طور پر وقف کر دی تھی۔ باپو پورے سماج کی فلاح کے علمبردار تھے۔ سماجی انصاف ہمارا اولین نصب العین ہے، جس کے حصول کے لئے ہم کئی بنیادی پروگراموں پر عمل کر رہے ہیں۔ خاص طور سے 20 نکاتی پروگرام پر۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے الفاظ میں: "ملک کی ترقی کے تمام منصوبوں کا مقصد اقتصادی بنیاد کو مستحکم بنانا ہے۔ تاکہ ہم لوگ بتدریج، اور اگر ممکن ہو تو بتعجیل، اپنے ملک سے غربت کا خاتمہ کر دیں، اور اپنے سماج سے اقتصادی پسماندگی کو اکھاڑ پھینکیں۔"

ہمارا عزم ——— پسماندگی کا خاتمہ

Link
LOCKS
Link
Link
CABLE 88 LOCK
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون :
۳۶۰۹
۴۱۹۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۸/۸۴-۸۵

مقررہ فارموں پر درج ذیل اسامیوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ ریڈر ان مکینکل انجینئرنگ۔ مکینکل انجینئرنگ سیکشن۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ — ۵۰ — ۱۳۰۰ — ۶۰ — ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ تقریباً پانچ سال کا درس وتدرس کا تجربہ اور/یا تحقیقی یا ترقیاتی تجربہ۔

ان امیدواروں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جا سکتا ہے جن کے پاس اگرچہ کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں ہے، لیکن ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے معیار کا مطبوعہ کام ہے یا ڈزائن/ڈیویلپمنٹ میں کسی تعلیمی ادارے یا انڈسٹری میں انتہائی اعلیٰ معیار کا ترقیاتی کام ہو۔

یا

ایسے اشخاص کی صورت میں جنھیں کسی صنعت یا پیشہ ورانہ میدان سے بھرتی کیا جائے گا، ان کے لیے ضروری ہوگا کہ امیدوار کے پاس اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ ہو، اور تقریباً سات سال کا پیشہ ورانہ تجربہ رکھتے ہوں جن میں نئی ایجادات/تحقیقات اور ترقیات بھی شامل ہوں۔

۲۔ لکچرر ان سول انجینئرنگ۔ [عارضی] سول انجینئرنگ سیکشن، یونیورسٹی پولی ٹکنک۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ — ۴۰ — ۱۱۰۰ — ۵۰ — ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:۔ [ا] متعلقہ میدان میں انجینئرنگ/ٹیکنالوجی میں ماسٹرس ڈگری

[ب] اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ انجینئرنگ/ٹیکنالوجی میں بیچلرس ڈگری۔ بیچلرس ڈگری میں فرسٹ کلاس اور/یا پھر ماسٹرس ڈگری ہو۔

[ج] تعلیمی/تحقیقی ادارے کے علاوہ ایک سال کا پیشہ ورانہ تجربہ۔

- انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے موضوعات مابین نامیاتی بین الموضوعی پروگراموں میں ملازمتوں کے لیے دیگر حیثیتوں سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل امیدواروں کے حق میں انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی میں ڈگریوں کی شرائط کو نرم کیا جا سکتا ہے۔

- ایسے امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربہ نہیں رکھتے ہوں یا ایسے امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربے کے حامل ہوں، لیکن

وہ تقرر کے لیے موزوں متصور نہ کیے جائیں تو اس صورت میں جس شخص کا تقرر کیا جائے گا، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر مطلوبہ پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو سالانہ ترقی سے محروم کردیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کرے۔

اگر ایم ٹیک یا ایم ای کی ڈگری کے حامل امیدوار دستیاب نہ ہوں یا تقرر کے لیے مناسب خیال نہ کیے جائیں تو اس صورت میں تعلیمی صلاحیت کی شرائط کو نرم کیا جاسکتا ہے اور فرسٹ ڈویژن میں پاس شدہ انجنیئرنگ گریجویٹ کا تقرر کیا جاسکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ امیدوار تقرر کے پانچ سال کے اندر ایم ٹیک یا ایم ای کی سند حاصل کرلے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے محروم کردیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کردے

غیر معمولی لیاقت اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے
انٹرویو کے لیے بلائے جانے والے امیدواروں کو سکنڈ کلاس کا یکطرفہ سنگل کرایا ادا کیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پانچ روپے نقد، (علیگڑھ مسلم یونیورسٹی فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر، اے ایم یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو)، بذات خود یا سم ۱۰ x 23 سائز کا ایسا لفافہ جس پر مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں اور خود کا پتہ تحریر ہو بھیج کر حاصل کیا جاسکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۶ نومبر ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔
علی گڑھ سے باہر کے امیدوار اپنی درخواستیں رجسٹرڈ پوسٹ سے بنام ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ اس۔ جعفری سکریٹری وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، بھیجیں۔

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے بنائے گئے پینل میں رکھا جاسکتا ہے

رجسٹرار

۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

ی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۹/۸۴—۸۵

مقررہ فارموں پر درج ذیل اسامیوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ پروفیسر آف اناٹومی ۔ ڈپارٹمنٹ آف اناٹومی۔

شرح تنخواہ ۔ ۱۵۰۰—۶۰—۱۸۰۰—۱۰۰—۲۰۰۰—۱۲۵/۲—۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت

۱۔ لازمی:۔ ایم۔ایس۔ [اناٹومی]

ایم۔بی۔بی۔ایس مع ایم۔ایس سی [اناٹومی]

پی۔ایچ۔ڈی [میڈیکل اناٹومی]

ڈی۔ایس سی۔ [" "]

تدریس/ تحقیق کی رہنمائی کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان اناٹومی چار سالہ تجربہ

پسندیدہ:۔ بہتر ہو کہ امیدوار کے اس تخصیص سے متعلق اصلی تحقیقی مضامین شایع ہوئے ہوں اور امیدوار عملی طور پر تحقیقی کام میں مصروف ہو اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی رہنمائی کا تجربہ بھی ہو۔

نوٹ:۔ وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۸/۸۴—۸۵ مورخہ ۴ جون ۱۹۸۴ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں، اُن کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ موزوں تصور کیے گئے تو اُن کو پہلی درخواست کی بنیاد پر انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا۔

۲۔ ریڈر ان آپتھلمالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف اپتھلمالوجی

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰—۵۰—۱۳۰۰—۶۰—۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:۔ ایم۔ایس [آپتھلمالوجی]

ایم۔ڈی [آپتھلمالوجی]

تدریسی/تحقیقی تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان آپتھلمالوجی پانچ سالہ تجربہ

۳. ریڈر ان پیتھالوجی (ہیماٹولوجی اور بلڈ بینکنگ) ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰–۵۰–۱۳۰۰–۶۰–۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱. لازمی - ایم ڈی (پیتھالوجی)

ایم ڈی (پیتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی)

ایم۔ڈی (پیتھالوجی مع بیکٹریالوجی)

پی ایچ۔ڈی (پیتھالوجی)

ڈی۔ ایس سی (پیتھالوجی)

تدریس/تحقیق کا تجربہ

میڈیکل کالج میں بحیثیت لیکچرر ان پیتھالوجی (ہیماٹولوجی اینڈ بلڈ بینکنگ) میں پانچ سال تجربہ۔

۲. پسندیدہ:- ہندوستانی یا غیر ملکی رسائل میں اس تخصیص سے متعلق اصلی تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہوں۔

۴. لیکچرر ان اناٹومی (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف اناٹومی۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰–۴۰–۱۱۰۰–۵۰–۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:-

۱. لازمی ایم۔ایس۔ (اناٹومی)

ایم۔بی۔بی۔ایس مع ایم۔ایس سی (اناٹومی)

پی۔ایچ۔ڈی (میڈیکل اناٹومی)

ڈی۔ایس سی (" ")

۲. پسندیدہ اناٹومی کے میدان میں مطبوعہ کام/تحقیقی تجربہ ہونا چاہیے۔

۵. لیکچرر ان ریڈیو-تھراپی۔ (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف ریڈیالوجی۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰–۴۰–۱۱۰۰–۵۰–۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- ایم۔ڈی/ایم ایس۔ (ریڈیالوجی)

ایم۔ ڈی (ریڈیو-تھراپی)

۶. لیکچرر ان اینستھیسیالوجی (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف اینستھیسیالوجی

شرح تنخواہ:- ۷۰۰–۴۰–۱۱۰۰–۵۰–۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- ایم۔ڈی (اینستھیسیالوجی)

ایم۔ایس (")

۷. لیکچرر ان ٹیوبرکلوسس اینڈ چیسٹ ڈیسیز (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰–۴۰–۱۱۰۰–۵۰–۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت ایم۔ڈی ڈٹوبرکلوسس ع

ایم۔ڈی ان میڈیسن مع

ٹی۔ڈی۔ڈی۔ ر ڈی۔ ٹی۔ ڈی یا ڈی۔ٹی۔سی۔ڈی

اعلیٰ قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو زیادہ ابتدائی تنخواہ دی جاسکتی ہے۔
انٹرویو میں طلب کیے جانے والے حضرات کو صرف ایک طرف کے دوسرے درجے کا سنگل کرایہ بطور ٹی۔اے دیا جائے گا۔

مقررہ درخواست فارم و ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی فنانس آفس مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا 23x10 سم کا ٹکٹ چسپاں اور پتہ لکھا ہوا لفافہ بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۹ر نومبر ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل غور نہیں ہوں گی۔

علی گڑھ سے باہر کی تمام درخواستیں رجسٹرڈ پوسٹ سے ڈاکٹر ایچ۔اے۔ایس جعفری اسکریٹری وائس چانسلر اے ایم یو علی گڑھ کے نام بھیجی جانی چاہییں۔

موزوں امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے بنائے گئے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۳۰/۸۴-۸۵

درج ذیل جگہ کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔
ڈائریکٹر (کنٹینونگ اینڈ ایڈلٹ ایجوکیشن سینٹر) اے ایم یو۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۲۰۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت :- (ا) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ یا سکنڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری ایڈلٹ ایجوکیشن / اسپیشل سائنس / سوشل ورک میں یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی قابلیت۔

(ب) سوشل سائنس، ایجوکیشن ایڈلٹ ایجوکیشن میں ریسرچ ڈگری جو ڈاکٹریٹ کے معیار کی ہو یا مطبوعہ تحقیقی کارناموں پر جو تنقید و تبصرہ ہوا ہے اس کی بنیاد پر صلاحیت کا اندازہ

(ج) تدریس، پروگرام پلاننگ ایڈمنسٹریشن میں تقریبًا دس سالہ تجربہ

(د) وہ امیدوار جن کو کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروجیکٹ میں تجربہ ہو اور خصوصًا بالغان کی تعلیم میں مہارت ہو ان کو ترجیح دی جائے گی۔

نوٹ ۱۔ اگر کوئی پروفیسر / ریڈر / لکچر مندرج اسامی ڈائرکٹر کے لیے منتخب کیا جائے تو منتخب شخص کو موجودہ اس کی تنخواہ اور اسکیل برقرار رکھا جائے گا

۲۔ تجربے کی شرائط اور / یا قابلیت جو کہ مندرج اسامی کے لیے مخصوص صورت میں انتہائی تجربہ کار آدمی کے سلسلے میں نرم کی جاسکتی ہیں جب کہ موزوں قابلیت کا امیدوار میسر نہ آئے

(۳) اگر کوئی پروفیسر ڈائرکٹر کی جگہ پر منتخب کر لیا جاتا ہے تو اس یونیورسٹی کے پروفیسر کو اس کی موجودہ تنخواہ، اسکیل اور دیگر مراعات برقرار رکھی جائیں گی۔

اعلیٰ قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا، اُن کو ایک طرف کا ریل کے سکنڈ کلاس کا سنگل کرایہ بطور ٹی۔اے دیا جائے گا۔

مقررہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی (جو کہ فنانس آفس مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے کیش سیکشن میں جمع کیے گئے ہوں) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نام واجب الادا ہو، بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں
فارم بذات خود یا سے ۵ × 23 سائز کا لفافہ جس پر مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں اور اپنا پتا لکھا ہوا ہو ارسال کر کے طلب کیے جاسکتے ہیں۔
درخواست فارم موصول ہونے کی آخری تاریخ یکم دسمبر ۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔
علی گڑھ سے باہر کی تمام درخواستیں رجسٹرڈ پوسٹ سے ڈاکٹر ایچ۔اے۔ایس جعفری، سکریٹری وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام بھیجی جائیں۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ
ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈرز ایٹم ریٹ کی بنیاد پر طلب کیے جاتے ہیں۔ ٹینڈر فارم اور دیگر ہدایات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے [چھٹی کے علاوہ] کسی بھی روز حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

- ٹینڈرز ۲۹ر نومبر ۱۹۸۴ء بارہ بج کر تیس منٹ (دوپہر) تک قبول کیے جائیں گے۔
- ٹینڈرز ۲۹ر نومبر ۱۹۸۴ء تین بج کر تیس منٹ (شام) پر کھول دیے جائیں گے۔
- ٹینڈرز ٹھیکیداروں کی موجودگی میں کھول دیے جائیں گے۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کیلئے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
	علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں کلاس ہاؤس کی تعمیر کا کام۔	-/۱,۴۸,۲۷۰	-/۳,۷۱۰	-/۱۰	چھ ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

[یونیورسٹی انجینیر]

مالک تہذیب الاخلاق ٹرسٹ علی گڑھ۔ پبلشر نورالحسن نقوی طابع عمران آفسیٹ پریس دہلی۔ مقام اشاعت شعبۂ اردو اے ایم یو علی گڑھ

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh. Phone ;4185

Rs.1-50

مُدیر: سیّد حامد — مُدیر مسئول: نورالحسن نقوی

جلد ۳ ★ یکم تا ۱۶؍ دسمبر ۸۴ء ★ شمارہ ۲۳

سرورق کی تصویر
سر ضیاء الدین (مولانا آزاد لائبریری)

ترسیل زر نامہ
پروفیسر منظر عباس نقوی
ٹریژرار تہذیب الاخلاق ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
علی گڑھ

★
قیمت فی شمارہ: ڈیڑھ روپیہ
زرسالانہ: تیس روپے
تاحیات رکنیت: تین سو روپے
★

میرے بعد

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اجالا ہوگا
بجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو قافلۂ درد کا اب کیا ہوگا

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لیے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد" — فیض

دو عظیم فن کاروں کی رحلت

اس مہینے اردو ادب دو عظیم فن کاروں سے محروم ہوگیا۔ پہلے ہمارے نامور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کی موت کی خبر آئی اور پھر مایۂ ناز شاعر فیض احمد فیض کی۔ بیدی اردو افسانے کی آبرو اور درجنوں لازوال کہانیوں کے خالق تھے۔ وہ زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کے رمز آشنا اور انسانی نفسیات کے نبض شناس تھے۔ بڑی سے بڑی بات کو کم سے کم لفظوں میں بیان کردینے اور مشکل سے مشکل مسئلے کو سیدھی سادی زبان میں ادا کردینے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا۔ ان کے افسانے گرم کوٹ، لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو، صرف ایک سگریٹ ہمارے ادب کے لافانی شاہکار ہیں۔

فیض ہمارے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری اقبال کی شعری روایت کی توسیع ہے۔ گو یا وہ پیامی شاعر تھے لیکن پیغام کس طرح شعر میں ڈھل جاتا ہے ان کی ساری شاعری اس کا زندۂ جاوید ثبوت ہے۔ ان کا ایمان تھا کہ "حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا تقاضا بھی ہے" اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اس جدوجہد میں گزرا۔ انھوں نے سختیاں اٹھائیں مصیبتیں جھیلیں مگر حوصلہ کبھی نہ ہارا اور ہمیشہ یہ یقین برقرار رہا کہ "لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے"۔ اسی لیے ان کے کلام کا مطالعہ عزم و حوصلہ عطا کرتا ہے اور عطا کرتا رہے گا۔

فسادات کو کیسے روکا جائے

وزیر اعظم پر وحشیانہ حملے اور ان کی موت کے بعد ملک کے بڑے حصے میں جو تشویش ناک صورت حال پیدا ہوگئی تھی، ایک خاص فرقہ لوگوں کے تعصب کا نشانہ بنایا گیا تھا اور اسے سخت جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ حالات کب کیا رخ اختیار کرلیں گے۔ اس وقت زمام حکومت کمزور ہاتھوں میں ہوتی یا ارباب حکومت نے دانش مندی سے کام نہ لیا ہوتا تو عجب نہیں کہ ملک ایک خوفناک بربادی سے دوچار ہوتا۔ لیکن نئی حکومت کا پہلا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سرعت کے ساتھ حالات پر قابو پالیا، ہر طرف امن و امان بحال ہوگیا اور انتشار پسندوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ساری دنیا اس وقت سانس روکے ہوئے یہ دیکھ رہی تھی کہ نو تشکیل شدہ قیادت ان نازک حالات سے کس طرح عہدہ برآ ہوتی ہے۔ اس وقت حکومت نے جس مضبوطی کا ثبوت دیا، انتظامی عملے نے جس مستعدی کا مظاہرہ کیا اور نئے وزیر اعظم نے جس خلوص و تدبر کی مثال پیش کی اسے ملک کے اندر اور ملک سے باہر ہر جگہ سراہا گیا اور ہندوستان کے خیرخواہوں نے آخر کار اطمینان کی سانس لی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حکومت چاہے تو بدترین فساد کو بھی بلا تاخیر روک سکتی ہے۔ بہرحال اس اقدام کے لیے حکومت مبارکباد کی مستحق ہے اور ہم یہ امید کرنے میں حق بجانب ہیں کہ خدانخواستہ آئندہ کبھی ملک کے کسی گوشے میں امن و امان کو خطرہ ہوا، کسی علاقے میں فساد کا اندیشہ ہوا تو حکومت کی مشنری اسی مضبوطی اور تیزی سے حرکت میں آجائے گی۔

آزادی کے بعد سے اب تک ملک جس مہلک وبا سے نجات نہ پا سکا تھا، وہ فسادات کی وبا تھی۔ (خدا کرے کہ 'تھی' کی بجائے 'ہے' کا لفظ اب بھی استعمال کرنا پڑے) اور اس میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ہمیشہ ہم ہی رہے۔ یہ فسادات جس باقاعدگی کے ساتھ ہوتے رہے۔ اسی باقاعدگی کے ساتھ حکومت کی طرف سے ان پر اظہار ندامت کیا جاتا رہا۔ کسی علاقے میں فساد قیامت بن کر نازل ہوا، سیکڑوں ہزاروں گھر جلے، کشتوں کے پشتے لگ گئے اور اس کی پردہ پوشی ممکن نہ ہوئی تو سربراہان حکومت نے ایک ہی بات بار بار دہرائی کہ اس واقعہ کی ندامت دنیا کے سامنے ہمارا سر شرم سے جھک گیا ہے۔ بے شک جھکتے رہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اس ظلم و زیادتی کو روکنے کے لیے ان کے ہاتھ جو قدم مضبوطی سے ایک بار بھی اس طرح نہ اٹھ سکے جس طرح اٹھنے چاہیے تھے۔

فساد کی نوعیت عام جرائم سے مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ ایک منظم اور اجتماعی جرم ہوتا ہے اور اسی لیے زیادہ مہلک بھی۔ چنانچہ جرائم کو روکنے میں جو تدابیر کارگر ہوسکتی ہیں وہی فسادات کو روکنے میں بھی مؤثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ان میں سب سے کارگر تدبیر ہے سخت سزا لیکن آج کی متمدن دنیا کا رجحان اس کے خلاف ہے۔ بہت سے ملکوں نے تو سزائے موت کا قانون ہی ختم کردیا۔ عہد حاضر کا قانون مجرم کو چھوڑ دینے کے حیلے تلاش کرتا ہے۔ مجرموں کی بڑی تعداد تو بے نقص گواہی موجود نہ ہونے کے سبب گرفت میں آہی نہیں پاتی لیکن جو مجرم گرفت میں آجاتے ہیں ان کی رسی دراز کرنے کو 'شک کا فائدہ' کافی ہے۔ پھر جو لوگ سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاتے ہیں وہ باہر سے زیادہ اندر آرام و آسائش کی زندگی گزارتے ہیں۔ سخت سزاؤں کی حمایت کرنے والے وحشت و بربریت کے حامی ٹھہرائے جاتے ہیں۔ آج کی مہذب دنیا کا یہی چلن ہے اور یہ بات کس سے چھپی ہے کہ جرائم روز افزوں ہیں اسی طرح فسادات بھی کم ہونے میں نہیں آتے۔ اگر ہمارا قانون فسادیوں کو عبرتناک سزائیں دے سکتا، اگر انتظامیہ ان شرپسندوں کے گریبانوں تک پہنچ سکتے تو فسادات کا سلسلہ ختم ہوچکا ہوتا۔ ایک ذمہ دار بزرگ نے رفیع احمد قدوائی کا یہ واقعہ سنایا کہ چند گھنٹوں کے لیے کسی شہر پہنچے۔ وہاں پتہ چلا کہ سخت فساد کے آثار ہیں۔ انھوں نے ضلع کے افسران کو طلب کرکے صرف اتنا کہا "اگر یہاں فساد ہوگیا تو اور تو میں کچھ نہیں جانتا، مگر اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ تم لوگوں کی خیر نہیں۔ اب تم جاسکتے ہو۔" راتوں رات ان افسروں نے ایسا کچھ کیا کہ دن نکلنے سے پہلے شہر کی فضا خوشگوار ہوگئی۔ ضلع کے حاکم ایک ایک شہر سے واقف ہوتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ کس سے کس طرح نمٹا جاسکتا ہے۔ اگر ان حاکموں کو صرف یہ معلوم ہوجائے کہ وہ امن برقرار رکھنے میں ناکام رہے تو انھیں سزا دی جاسکتی ہے، ملازمت سے برطرف کیا جاسکتا ہے، ان کی ترقی روکی جاسکتی ہے۔ یہ سب باتیں بھی جانے دیجیے، انھیں صرف یہ باور کرادیا جائے کہ اس جرم میں ان کا تبادلہ کیا جاسکتا ہے تو شرپسندوں کے لیے فساد برپا کرنا آسان نہ رہے۔ اسی طرح اگر حکومت یہ بات واضح کردے کہ امن کو مجروح کرنے والے قانون کی گرفت سے بچ نہ پائیں گے، جس علاقے میں قتل یا آتش زنی کی واردات ہوگی اس علاقے کے رہنے والوں سے باز پرس کی

... کی جائے

فساد کرنے والوں میں ایک بڑا طبقہ وہ ہوتا ہے جسے عادی مجرموں کا طبقہ کہنا چاہیے۔ ان لوگوں کے دلوں میں فرقہ وارانہ منافرت سے زیادہ لوٹ کے مال سے اپنا گھر بھرنے کی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔ اگر لوٹ کا مال اس طرح برآمد کیا جائے جس طرح اس بار دہلی اور دوسرے شہروں میں کیا گیا تو اس سے لٹیروں کے حوصلے پست ہوں گے اور اُن کے بھی جو قانون کے محافظ کہلانے کے باوجود مظلوموں کا مال لوٹنے میں اکثر پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جلوسوں پر پابندی لگانے سے بھی فساد کی روک تھام میں مدد ملے گی کہ اکثر خوں ریز فسادات کی شروعات اسی سے ہوئی ہے۔ کہیں جلوس نکل رہا ہو تو شرپسندوں کی بن آتی ہے اس وقت اگر صرف ایک شرپسند کا فساد کرنا چاہے تو جلوس پر دو چار کنکر پھینک کر فساد کرا سکتا ہے۔ بلکہ اس کی بھی ضرورت نہیں جھوٹ موٹ یہ غل مچا دینا کافی ہے کہ کسی نے اینٹ پھینکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی پابندیاں شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم کرتی ہیں۔ لیکن ارباب حکومت غور کرکے بتائیں کہ یہ حقوق زیادہ اہم ہیں یا بے گناہوں کی جانیں۔

اتنا لکھنے کے بعد یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں نے آپ کا وقت اور اپنا کاغذ خواہ نخواہ برباد کیا۔ یہ ساری باتیں آپ سے کہنے کی نہیں، حکومت کے گوش گزار کرنے کی ہیں اور ہمارے پاس کوئی ایسا سادھن نہیں جس کے ذریعے ہم اپنی بات حکومت یا اپنے ہم وطنوں تک پہنچا سکیں۔ ہمیں ناز ہے کہ ہم اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ مگر عالم یہ ہے کہ آج تک ہمارے ہاتھ میں انگریزی یا ہندی کا ایک روزنامہ تک نہیں جس کے سہارے ہماری آواز دور تک پہنچ سکے حکومت ہمارے مطالبات تسلیم کرے یا نہ کرے مگر اتنا تو ہو کہ ہم اپنی بات اس کے کانوں تک پہنچا سکیں۔ اور اپنا نقطۂ نظر اپنے ہم وطنوں کے سامنے رکھ سکیں۔ ہمارے پاس صرف اردو کے چند کم اشاعت اخبارات ہیں۔ گویا خود ہی لکھیے خود ہی پڑھ لیجیے۔ تو آیئے آج آپس ہی میں سر جوڑ کے بیٹھیں، اپنے درد کا درماں آپ ہی تلاش کریں اور سوچیں کہ فسادات کو روکنے کے سلسلے میں ہم خود کیا کر سکتے ہیں۔

فساد کو روکنے کی تدبیروں سے پہلے ہمیں فساد کی نفسیات پر غور کرنا ہوگا۔ یعنی یہ پتہ لگانا ہوگا کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو فساد کی ذمہ دار ہیں۔ غالباً یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ افواہیں فساد کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا میں افواہ بازوں کی بن آتی ہے۔ جھوٹی خبریں چشم دید واقعات کے طور پر سنائی جاتی ہیں۔ انسانی ذہن کا حال بھی عجب ہے کشیدگی کے ماحول میں بُری اور تشویش ناک خبریں توجہ سے سنی جاتی ہیں اور کوئی سنجیدہ آدمی ان کی تردید کرے تو اسے شک اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان افواہوں میں سب سے زیادہ زور اس پر ہوتا ہے کہ دوسرا فرقہ سخت حملے کی تیاری میں مصروف ہے۔ بالکل اسی طرح کی خبریں دوسرے فرقے میں عام ہوتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ مالدار اسی خوف میں بدمعاشوں کو اپنی حفاظت کے لیے مقرر کرتے ہیں۔ یہ اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے اکا دکا وارداتیں کرتے ہیں اور ایک دن فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ حالات قابو میں نہیں آتے تو پولیس سے بھی متعین ہوتی ہے۔ اس سے حالات اور بگڑتے ہیں۔ آخر کار شریفوں اور رہنماؤں کی کوشش سے امن کمیٹیاں قائم ہوتی ہیں اور ان کمیٹیوں کی کوشش سے امن وامان بحال ہوتا ہے۔

یہ امن کمیٹیاں جو مختلف فرقوں کی ملی جلی جماعتیں ہوتی ہیں دراصل ایسا موقع فراہم کر دیتی ہیں کہ جھوٹی خبروں کی تردید ہو جائے اور آپس کی بدگمانیاں رفع ہو جائیں۔ اگر اسی طرح کی مستقل انجمنیں ہر جگہ قائم ہوں اور سب کو ایک ساتھ مل بیٹھنے کے مواقع کبھی کبھی ملتے رہیں تو غلط فہمیاں پیدا ہی نہ ہوں۔ بے بنیاد افواہیں اُسی فضا میں پنپتی ہیں جب دو گروہوں، دو جماعتوں کا رابطہ ٹوٹ جائے اور اُن کی تردید کا کوئی موقع میسر نہ ہو۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ جگہ جگہ ایسی انجمنیں اور ایسے ادارے قائم کریں جن میں اکثریتی فرقے کے افراد کو شریک کیا جائے۔ اس سے تعمیری کام بھی ہو سکیں گے اور خوشگوار فضا کو برقرار رکھنے میں بھی مدد ملے گی۔ اکثریت کا اعتماد حاصل کیے بغیر اور اس کا دل جیتے بنا اور اُس سے دور رہ کر ہم اس ملک میں نہ پرسکون زندگی بسر کر سکتے ہیں نہ یکسوئی کے ساتھ تعلیم و ترقی کے کاموں میں لگ سکتے ہیں۔ شہریوں کے جان و مال کی حفاظت یقیناً حکومت کی ذمہ داری ہے اور دوستی کا ہاتھ ہمیشہ اقلیت کے بجائے اکثریت کی طرف سے بڑھایا جاتا ہے لیکن ہمیں اپنا کام آپ کرنا ہوگا اور اس دائمی دوستی کی پہل خود کرنی ہوگی قومیں افراد سے بنتی ہیں اور اجتماعی کاموں سے پہلے افراد کے کام ظہور میں آتے ہیں۔ اگر ہم میں سے ہر شخص یہ طے کرلے کہ وہ اپنے قریبی دوستوں کے حلقے کو وسعت دے گا اور دوسرے فرقے کے دو چار لوگوں کو بہرحال اس میں داخل کرلے گا تو اس سے امن کو برقرار رکھنے اور ملک کی فضا کو خوشگوار بنانے میں یقیناً مدد ملے گی۔

نور الحسن نقوی

سید حامد

مسز اندرا گاندھی

چند بکھرے ہوئے تاثرات

"تاریخ پڑھنا اچھا ہے، لیکن اس سے بھی اچھا ہے تاریخ بنانے میں
[حصہ] ادا کرنا۔"

جواہر لال نہرو نے اپنی چہیتی بیٹی اندرا کو یہ جملہ نینی جیل سے بھیجے
ے خط میں لکھا تھا۔ بیٹی کے نام باپ کے خطوط دو کتابوں کی شکل
[میں] شائع ہوئے۔ پہلی کتاب کا نام تھا "ایک باپ کے خط بیٹی کے نام"
[دوس]ری کتاب کا نام ہے "تاریخ عالم کی جھلکیاں"۔ یہ خطوط انگریزی میں لکھے
ے تھے۔ دوسری کتاب کے خاتمہ پر "پس نوشت" مکرر (پوسٹ اسکرپٹ)
ے عنوان سے جو خط چھپا ہے اس میں جواہر لال نہرو نے اس بات کو
[مض]حکہ خیز قرار دیا ہے کہ ایک ہندوستانی باپ اپنی ہندوستانی بیٹی کو خط لکھے
[ت]و انگریزی میں اور اس کی مادری زبان میں نہ لکھے۔

تاریخ پڑھنے کا جہاں تک تعلق ہے اندرا کو استاد ایسا ملا جس پر بڑے
[بڑ]ے مورخین کے شاگرد بھی رشک کریں۔ نہرو کے خطوں میں انسان کی
[تار]یخ ابتدائے آفرینش سے تا دم تحریر قلمبند ہے۔ کاتب نے مورخ ہونے
[کا د]عویٰ نہیں کیا بلکہ ایک طایرانہ نظر انسانی تاریخ کے نشیب و فراز اور اس کے
[پیچ]یدہ اور عہد ساز موڑوں اور رجحانات پر ڈالی ہے۔ بظاہر ان خطوں کے
[لکھ]نے سے جواہر لعل نہرو کا مقصد بیٹی کو تاریخ پڑھانا نہیں بلکہ اس کے اندر
[تہذ]یب کے ارتقا اور انسان کے اجتماعی محرکات و عوامل کا شعور پیدا کرنا تھا۔
[وہ] چاہتے تھے کہ اپنی دلاری دختر کی اٹھان کو ایک ایسی نہج پر ڈال دیں جو
[اس]ے چھوٹی باتوں، تنگ نظریوں، واہموں، تعصبوں، وسوسوں اور خلفشار
[س]ے اوپر اٹھا دے اور اس میں وہ جرات، بلندیٔ نگاہ، وسعت قلب، مہم
[جو]ئی، خطر جوئی، وطن پرستی، انسان دوستی، طالع آزمائی، حوصلہ، اعتماد
[و] رفتاری اور مستقبل شناسی پیدا کر دے جو نہرو خاندان کا طرۂ امتیاز تھا اور
[جو] خصوصیات خود جواہر لعل کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ ہم
[آ]گے چل کر ان خطوں سے کچھ اقتباسات قارئین کی نذر کریں گے۔ اس انوکھے سلسلۂ
[خط]وط کے متعلق یہاں اتنا کہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا دوسرا مجموعہ "تاریخ
[عال]م کی جھلکیاں" سات اوپر ایک ہزار صفحات پر حاوی ہے۔ طویل تاریخ نگاری
کے درمیان باوجود فنکارانہ ضبط کے بیٹی کی محبت پھوٹ نکلتی ہے، وہ
[بیٹی] جس سے باپ کو صیاد کے ظالم ہاتھوں نے دور کر دیا ہے۔ جواہر لعل نہرو

نے کبھی کہا نہیں لیکن انھوں نے یہ دیکھا ہوگا بارہا کہ نہرو خاندان کی چشم و
چراغ ہندوستان کی تاریخ بنانے میں کسی نہ کسی عنوان مدد ضرور دے
گی۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان کی بیوی سروپ رانی پوتے کے بجائے پوتی کی
کی آمد سے ملول و مایوس ہیں، پنڈت موتی لعل نہرو نے کہا تھا کیا عجب جواہر اور
کملا کی یہ بیٹی آگے چل کر ایک ہزار بیٹوں سے بڑھ کر نکلے۔

باپ کی نصیحت (بابت تاریخ سازی) جس سے ہم نے اس مضمون
کا آغاز کیا ہے اور دادا کی پیش گوئی دونوں پوری ہوئیں۔ اندرا نے بڑھ کر
عہد آفرینی اور تاریخ سازی کا حق ادا کر دیا اور مادر وطن نے اپنے ۲۵
کروڑ سپوتوں پر اپنی اور جواہر اور کملا کی اس بیٹی کو ترجیح دی۔ اور مادر وطن
کے جو فرزند اندرا کے قتل پر غم و غصہ کا ہدف بنے خود ان کی تعداد ایک
ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اندرا گاندھی نے جیسا کہ حزب مخالف کے ایک لیڈر
نے پارلیمنٹ میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کہا تھا نہ صرف تاریخ سازی
کی بلکہ جغرافیہ سازی بھی۔

جواہر لعل نہرو جدید ہندوستان کے معمار ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں
سے کہیں زیادہ حال شناس اور مستقبل اندیش تھے۔ اگر ان کی قد آور اور روشن
دماغ شخصیت ہندوستان میں طلوع نہ ہوتی تو کیا عجب کہ ہمارے وطن عزیز
کا رخ آگے کے بجائے پیچھے کی طرف ہوتا اور ہم واہمہ پسندی، رجعت
پرستی اور تنگ نظری کی تاریکیوں سے نکل ہی نہ سکتے۔ علوم او سعت اور
ٹکنولوجی سے ہمیں کوئی لگاؤ ہی نہ ہوتا۔ یہ اس ملک کی خوش قسمتی تھی
کہ اسے سترہ سال تک ایسے شخص کی رہنمائی ملی جسے تاریخ کا گہرا شعور،
ارتقا کا شدید احساس، نظر کی وسعت اور بیشہ فن کے لئے بے تابی
ودیعت ہوئی تھی۔ جواہر لعل کی خواہش تھی کہ ان کی لخت جگر کی شخصیت
بھی اسی سانچہ میں ڈھلے اور اس خواہش کو پورا کرنے کا یہی طریقہ انھیں
سجھائی دیا کہ جیل میں بیٹھے بیٹھے اپنی لڑکی کو خط لکھتے رہیں قلم برداشتہ نہیں
تیاری کر کے۔ ان خطوط میں تعلیم سے زیادہ تربیت ہے۔ ارتقا کے سفر میں
انسان نے کیا کیا ہفتخواں طے کئے ہیں۔ انسان اپنے راستہ سے کہاں کہاں
بھٹکا ہے۔ اس ظالم اور جاہل نے کیا جہالتیں کی ہیں، کون کون سے ظلم ڈھائے
ہیں۔ اور یہ مظلوم آفت زدہ و وقف جستجو انسان کس طرح فطرت کی طاقتوں پر غالب

ایک خود، دوسرا غلام، سواری کو ایک مریل سی اونٹنی اور سفر دور دراز درپیش۔ غلام کو حکم ہوا ایک منزل ہم سوار ہوں تم مہار پکڑ کے آگے چلو، اگلی منزل پر تم سوار ہو اور ہم مہار تھام کے چلیں۔ غلام نے تعمیل کی۔ سفر جاری رہا یہاں تک کہ ایک عظیم الشان قلعہ نظر آیا جس کے گرد فوجیں محاصرہ کیے پڑی تھیں۔ یہی اس مختصر قافلے کی منزل مقصود تھی۔ سفر کی اس آخری منزل میں غلام کی سوار ہونے اور آقا کی مہار تھامنے کی باری تھی۔ (۳۱) نے کئی بار آقا سے گزارش کی کہ اب وہ سوار ہو جائیں مگر یہ نافرمانی انھیں گوارا نہ تھی۔ سرداران لشکر نے بڑھ کے استقبال کیا تو فصیل پر سے کسی نے پکار کے پوچھا "یہ اونٹنی کی مہار تھامے کون شخص ہے جس سے لوگ مصافحہ کر رہے ہیں؟" جواب ملا "یہی ہمارا امیر ہے"

یہودیوں کی قلعہ بند فوجیں انگشت بدنداں تھیں کہ امیر ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ذرا دیر میں سب نے تسلیم کر لیا کہ ایسی قوم سے جنگ جیتنا ممکن نہیں۔ قلعہ کے دروازے کھول دیے گئے۔ امیر کے لیے شاہانہ پوشاک اور ایک شاندار گھوڑا بھیجا گیا کہ لباس زیب تن فرمائیں اور اس گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ میں تشریف لائیں۔ جب ان سے لباس تبدیل کرنے کی درخواست کی گئی تو سوال ہوا کہ اس میں کیا خرابی ہے؟ عرض کیا گیا "سفر میں میلا ہو گیا ہے" جواب ملا "ابھی دھو لوں گا" کہا گیا "جگہ جگہ سے پھٹ بھی گیا ہے" ارشاد فرمایا "سی لوں گا" مگر اس خیال سے کہ اونٹنی لمبے سفر سے نڈھال ہے گھوڑے پر سوار ہونا منظور فرما لیا۔ وہ سدھایا ہوا گھوڑا تھا ان کے بیٹھتے ہی اترا اترا کر چلنے لگا۔ پوچھا "یہ کیا کر رہا ہے" جواب ملا "اٹکھیل کر رہا ہے۔ آپ جو سوار ہیں" فوراً اتر آئے کہ اترانے کو خدا تعالیٰ نے ناپسند فرمایا ہے۔ آخر کار یہ فاتح اعظم اس شان سے قلعہ میں داخل ہوا کہ اپنی کمزور سی اونٹنی پر سوار تھا اور عاجزی سے خدا کے حضور سر جھکا ہوا تھا۔ سو دشمنوں کے بھی جھک گئے تھے۔
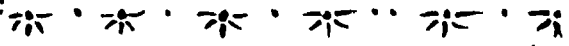
آیا ہے۔ یہ دلکش داستان سحر اور دلآویزی کے ساتھ ان صفحات میں سنائی گئی ہے۔ اندرا نے ارتقا کے سفر، دنیا کی وسعت، اقوام کے تنوع، دلیری، فراخ دلی، راست گوئی اور راست روی اور ثابت قدمی کے سبق ان خطوط میں پڑھے اور اس طور جذب کئے کہ وہ اس کی شخصیت کا جزو بن گئے۔ اس نے

ابھی آنکھیں پوری طرح کھولی بھی نہ تھیں کہ آنند بھون سیاست کی صدا
گونج اٹھا۔ بھارت ماتا کی جے اور انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نع
فضا بوجھل ہو گئی۔ وہ تین سال کی تھی کہ (گڑیوں کی تربیت، تلقین ادرا
کے لئے) دھواں دھار تقریریں کرنے لگی۔ ان تقریروں میں ربط اور م
جیسا ہوتا ہو گا، ظاہر ہے لیکن انقلاب کی فضا میں سانس لینا اور سیا
کی کشمکش میں آنکھیں کھولنا، شخصیت اور کردار کی تشکیل پر شروع
اثر ڈالنے لگا۔ آنند بھون میں کانگریس کے سارے بڑے رہنما
اور تدبیریں کرتے کہ جنگ آزادی اب کس ڈھنگ سے لڑی جائے
باپ جیل چلے جاتے تو اندرا دادو (دادا) کے سایۂ عاطفت میں
۱۲ سال کی ہوئی تو نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی بنائی جو با
(یعنی بندروں کی فوج) کہلائی۔ اس کا کام تھا سراغرسی کر کے ا
کا پتہ لگانا جو پولیس اور سیکورٹی گارڈس (حفاظتی دستوں) کو حکو
کی طرف سے مجاہدین آزادی کے خلاف کارروائی کے لئے دی جا
تاریخ کا یہ بھی ایک بڑا طنز ہے کہ یہ نوخیز لڑکی جب بڑی ہو کر دنیا کی
بڑی جمہوریت کی وزیراعظم ہوئی اور دنیا نے اس کی فراست اور انتظا
کا لوہا مان لیا۔ اس وقت خود اس کے سلامتی دستے (سیکورٹی گارڈس
دغا کر کے ان گولیوں کو جو اس کے تحفظ کے لئے تھیں اس کے ج
میں اتار دیا۔ اور اس بڑی غداری کا ارتکاب کرتے ہوئے ان
ذہن میں تھا کہ وہ ایک نیک کام کر رہے ہیں، ان کی اس خیانت
پر ایک نہ چھوٹنے والا دھبہ لگا دیا۔ ستم ہے کہ باہر حفاظت اور سلامتی
اتنے اعلیٰ، جدید اور مکمل اور گھر میں معمولی سی احتیاط سے اتنی غفلت
کی سب سے قیمتی زندگی غداری سے کہیں زیادہ نااہلی کی نذر ہوئی —
یہ تراشا گیا کہ خود شریمتی گاندھی نے سیکولرزم کے نام پر سکھ حفاظتی د
ہٹانے نہ دیا۔ ایک پولیس افسر نے ہی اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ یہ غفلت
چاپلوسی پر مبنی تھی۔ وزیراعظم سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا
ان کی حفاظت کی ذمہ داری ان پر تھی یا ان کی حفاظت کے لئے مامور
انتظامیہ پر۔

ذات سے باہر فیروز گاندھی سے شادی نے پہلی بار یہ بات پور
واضح کر دی کہ اندرا گاندھی کو ہاتھ پکڑ کر چلایا نہیں جا سکتا اور یہ کہ ا
رگوں میں نہرو خاندان کا لہو اسی روایتی تندی کے ساتھ گردش کر رہا
وہ اپنے ارادے پر چٹان کی طرح اٹل ہیں۔

زنداں کی تاریک زندگی میں ایک نقرئی لکیر بھی ہے۔ اس
اوقات اہل فکر اور اہل قلم کو یکسوئی فراہم کر کے تخلیق کے لئے راہ ہموار کر د

اور کبھی کبھی زنداں کے شدائد نے جذبہ کو دہکا کر اظہار پر مجبور کر دیا ہے۔
فارسی اور اردو ادب میں سے ایک ایک مثال خاقانی اور فیض احمد فیض کی
ہے ہسپانوی میں "ڈون کو یتوٹے"[1] اور انگریزی میں "پلگرمس پروگریس"[2]
محبس میں لکھی گئیں۔ جواہر لعل نہرو کا زنداں نامہ اس اعتبار سے ممتاز ہے
کہ یہ خطوں کا ایک مربوط سلسلہ ہے اور اس کے صفحات میں وہ تاریخ جو
بن چکی اور وہ تاریخ جو بن رہی ہے، باہم آنکھ مچولی کر رہے ہیں۔ اس شخص
کے خیالات اور واردات جو آگے چل کر عہد آفریں اور تاریخ ساز ثابت ہوا۔
زبان رواں، اسلوب دلکش، موضوع اہم، زمینہ وسیع۔ لیکن ہمیں یہاں اس کتاب
سے غرض ہے تو صرف اتنی کہ وہ اندرا گاندھی پر کس طرح اثر انداز ہوئی۔
کتاب کالب و لہجہ اور وقت کی چاشنی ان اقتباسات میں ملے گی۔

ایک دوسرے زاویے سے دیکھئے تو یہ خطوط کفارہ یا تلافیٔ مافات
کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ سیاست سے زیادہ سخت گیر اور ناصبہ طلب کوئی صنم
نہیں ہوتا۔ جنگ آزادی کے سالاروں کو اس کا وقت کیونکر ملتا کہ اپنے بچوں
کی طرف دھیان دے سکیں۔ تیسری دہائی کے اوائل میں (جس زمانہ میں یہ خط
لکھے گئے) کملا نہرو کی بیماری سنگین ہو چلی تھی (وہ دوسرے جیل میں تھیں) اور موتی
لعل نہرو اس بیماری میں مبتلا تھے جو مرض الموت کا بدرقہ ثابت ہوئی۔ اندرا کی تعلیم
کٹ بٹ گئی اور تربیت متاثر ہوئی۔ چاہنے والے اور مجبور باپ نے اس کمی
کو پورا کرنے کیلئے یہ خطوط لکھے۔ ان میں نہرو خاندان کی شبیہ دیکھی جا سکتی ہے اور
اس کے افراد کی وہ خصوصیات جھلک رہی ہیں جنھوں نے اندرا کو کردار دیا۔
اندرا نے سوئزرلینڈ، آکسفورڈ اور وشو بھارتی میں مختلف قسطوں میں تعلیم پائی۔

کملا نہرو کی علالت کی خبر اخبار "بھارت" میں دیکھ کر:

"اپنی تکلیف اور بے آرامی تو آسانی سے برداشت کی جا سکتی ہے۔
اس سے فائدہ ہی پہونچتا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان آسائش طلب اور
کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسروں کی تکلیف کو برداشت کرنا آسان نہیں ہے،
خصوصاً جب ہم ان کے لئے کچھ کر بھی نہ سکتے ہوں۔ . . . تمہاری ماں بہادر ہے
اور اس کے سینے میں شیرنی کا دل ہے، لیکن اس کا جسم کمزور ہے اور میں یہ
نہیں دیکھ سکتا کہ وہ جسم اور کمزور ہو جائے۔ ہمارا دل کتنا ہی مضبوط کیوں
نہ ہو، اگر ہمارا بدن ہمارا ساتھ نہیں دیتا تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم کوئی
کام اچھی طرح کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں صحت اور طاقت اور بہترین جسم درکار ہیں۔

روشنی

دُور تک پھیلے ہوئے ریتیلے میدان میں فوجیں
خیمہ زن تھیں۔ ان کا سالار جو بادشاہ بھی تھا اپنے
سرداروں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے چہرے سے
شاہانہ جاہ و جلال اور عزم و ہمت کے ساتھ آج تشویش
کے آثار بھی نمایاں تھے۔ اس وقت اس کا مقابلہ ایک ایسے
جنگجو اور بہادر راجا سے تھا جس کی ساری زندگی جنگ
کرنے میں بسر ہوئی تھی اور جس کے پاس آزمودہ کار سپاہی
اور بہترین سامان جنگ تھا۔ اسی اثنا میں سپاہیوں نے
ایک سادھو کو پیش کیا جو مدہوشی کی حالت میں خیموں کے
نزدیک گھوم رہا تھا۔ بادشاہ نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ بڑی
بے باکی سے بولا "سمراٹ تو گھمنڈ کیسا۔ آج سورج ڈوبنے
سے پہلے تیری ہار ہو جائے گی، یہ سردار مارے جائیں گے۔ یہ
خیمے لٹ جائیں گے" یہ سن کر سرداروں کے چہرے اُتر گئے۔
فوج کے حوصلے پست ہو جائیں تو پھر شکست ہی اس کا مقدر
ہوتی ہے۔ بادشاہ کیا یہ بات نہ جانتا ہوگا۔ وہ سادھو سے
مخاطب ہوا "مہاراج! بتا سکتے ہو تمہاری کتنی عمر باقی ہے؟"
مہاراج نے حساب لگا کے جواب دیا "پانچ برس، پانچ مہینے اور
پانچ......" جملہ مکمل ہونے سے بھی پہلے ایک تلوار بجلی کی طرح
فضا میں لہرائی اور سادھو کا بدن دو ٹکڑے ہو کر ریت پر تڑپنے
لگا۔ بادشاہ نے اپنے سرداروں کو مخاطب کر کے کہا "دیکھا تم نے
جسے اپنی خبر نہیں وہ ہماری قسمت کا حال بتانے آیا تھا ہم
وہ لوگ ہیں جو خدا کی مدد اور اپنی تلوار پر بھروسہ کرتے ہیں۔
اس لیے فتح ہماری ہوگی" اور سورج نے ڈوبتے ڈوبتے یہ دیکھ
لیا کہ فتح اسی کی ہوئی۔ یہ بادشاہ بابر تھا اور وہ شاعر
اقبال تھا جس نے کہا تھا ـــ

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

. . . . کل میرا ملاقات کا دن ہے۔ جیل میں ملاقات کا دن عید کا دن ہوتا ہے
. . . کل میں تمہارے دادو کو دیکھوں گا اور تمھیں بھی ایک بہت طویل پندرہ
روزہ کے بعد اور تم اپنے اور اپنی امی کے متعلق مجھے سب کچھ بتاؤ گی۔

$\frac{12}{1}$ . . . . دادو کو دیکھ کر مجھے دھکا لگا۔ وہ اتنے کمزور اور بیمار نظر آرہے
$\frac{31}{}$ ہیں۔ اُن کی ٹھیک سے دیکھ بھال کرو اور انھیں پھر سے مضبوط اور چاق و

1. DON QUIXOTE
2. PILGRIMS PROGRESS by John Bunyan

"میں یہاں سب کے لیے آیا، سب کے ساتھ رہنے
آیا اور جو کچھ آج میں تنہائی میں کرتا ہوں آنے والا کل
اسے گونج کی صورت میں لوگوں تک پہنچا دے گا"

. . .

"اگر تم اپنے اندر کچھ لکھنے کا جذبہ محسوس کرو
(کہ یہ جذبہ صرف پاک روحوں کو ہی میسّر ہوتا ہے) تو
تمہارے اندر تین جذبے ہونی چاہئیں :—
معرفت، فنکاری اور سحر آفرینی —
الفاظ کے ترنم کی معرفت
سادگی، بے ساختگی اور اثر آفرینی کا فن
اور قارئین کو اپنا گرویدہ بنا لینے کا جادو!"

خلیل جبران، مرسلہ نجمہ شہریار

چو بند بنا دو۔ تم سے تو کل میں بات ہی نہ کر سکا۔ ایک مختصر سے انٹرویو میں کوئی
کر بھی کیا سکتا ہے۔ ان باتوں کی جو ہم نہیں کر سکے میں ان خطوں کے ذریعہ تلافی
کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یہ نعم البدل نہیں ہیں اور خود کو بہلانے کی
یہ تدبیر زیادہ دیر تک کارگر نہیں ہوتی۔ پھر بھی دل کو اس طرح کبھی کبھی دھوکا دینا
بُرا نہیں ہوتا۔

۳۱/۱/۱۳ مغربی ایشیا کی سلطنتیں — کا عنوان دے کر جو خط لکھا ہے
اس میں قدما کا ذکر کرتے کرتے برف کے دور (آئیس ایج) کا ذکر آ گیا۔ اور ان کے
ساتھ گلیشیروں کا قدیم گلیشیروں کا ذکر کتابوں میں نہیں ہے کہ اس زمانہ میں کتابیں
تھیں ہی نہیں۔

"لیکن تم نے کتابِ فطرت کو بھلایا نہیں ہو گا۔ فطرت کا اپنا الگ
ڈھنگ ہے چٹانوں اور پتھروں میں اپنی تاریخ قلمبند کرنے کا۔ جو کوئی چاہے
پڑھ کر ان تحریروں کو پڑھ لے۔ یہ ایک قسم کی خود نوشت سوانح عمریاں ہیں۔

یعنی اپنی تاریخ۔ گلیشیر اپنے وجود کے بڑے انوکھے نشانات چھوڑ
... ہم سے سب سے زیادہ قریب پنڈاری گلیشر ہے جو الموڑہ
ہفتہ کی مسافت پر ہے.....

بجائے تاریخ اور ماضی کے میں گلیشیروں کی طرف مڑ گیا۔
سے بہلانے کا جو کھیل میں کھیل رہا ہوں اس کا انجام کچھ ایسا ہی
میں چاہتا ہوں کہ تم سے اس طرح بات کروں جیسے کہ تم میرے روبرو
میں ایسا کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ ہم دونوں کبھی کبھی ضرور گلیشیروں ا
دوسری موجودات کی سیر کو نکل جایا کریں گے۔ ہے نا؟"

"... اردو ہندی کی ایک شکل ہے۔ ہندوستانی سے مُراد
اُردو دونوں ہیں... پندرہ کروڑ انسان ہندوستانی بولتے ہیں، تھ
تبدیلیوں کے ساتھ.... اور جیسا کہ تم جانتی ہو ہندوستانی ا
بیشتر حصّوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اغلب یہ ہے کہ یہی ہندوستان
زبان بنے گی..... (ہندوستان کی دوسری زبانوں کا ذکر کرتے

اس کی کوشش ہرگز نہ کرنی چاہئے کہ ایک ترقی یافتہ زبا
لوگوں کو محروم کر دیا جائے۔

۳۱/۴/۲۱ موتی لال نہرو کے متعلق:
" وہ ہتھیار ڈالنا، یا ہار ماننا جانتے ہی نہ تھے۔ اس وقت
نے ہتھیار نہیں ڈالے جب غنیم موت تھی۔
..... اور اب آنند بھون کا کیا ہو گا۔ وہ بھی ہماری طرح
اولاد تھا، جسے انھوں نے محبت اور توجہ کے ساتھ بنایا تھا۔ یہ
ویران اور اس کی روح، ایسا لگتا ہے، پرواز کر گئی ہے۔"

۳۲/۳/۲۸
" تاریخ چند افراد کی کہانی نہیں ہے۔ اس کا موضوع
ہونے چاہئیں جو مل کر ایک قوم بنتے ہیں۔ جو محنت کرتے ہیں
سے زندگی کی ضرورتیں اور آسائشیں پیدا کرتے ہیں اور جو ہزا
طریقوں سے ایک دوسرے سے ملتے اور ٹکراتے ہیں اور باہم د
ہوتے ہیں۔ انسانوں کی اس قسم کی تاریخ کس قدر دلآویز ہو
ہو گی۔

۹/۸/۳۲

آخری خط

بہن ڈرزیلی!

میں نے جو کچھ ان خطوں میں لکھا ہے اُسے سند نہ سمجھا جائے۔ دل تو چاہتا ہی ہے کہ ہر موضوع پر رائے زنی کرے۔ اور جتنا وہ جانتا ہے اس سے کہیں زیادہ دکھاتا ہے۔ اُس پر نظر رکھنا ہوگی۔ میرے یہ خطوط سطحی خاکے ہیں جو ایک باریک کچے دھاگے سے جوڑ دیئے گئے ہیں۔

تاریخ ہمیں بڑھنے اور ترقی کرنے کی داستان سناتی ہے اور لامحدود پیش رفت کے امکان کو ہمارے سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔ زندگی بلند اور گوناگوں ہے۔ اور اگر چہ اس میں بہت سے قطعاتِ زمین جھاڑ جھنکاڑ اور دلدل سے بھرے ہوئے ہیں تاہم اس میں بڑے بڑے سمندر، اونچے اونچے پہاڑ اور برف اور گلیشیر بھی ہیں اور حیرتناک تاروں بھری راتیں (خصوصاً زنداں میں جھانکتی ہوئی)، اور عزیزوں اور دوستوں کی محبت اور ایک مشترک مقصد کے لئے کام کرنے والوں کا ساتھ، موسیقی اور کتابیں اور خیالات کی وسیع سلطنت ....

دنیا کے حسن و جمال پر فریفتہ ہونا اور افکار اور تخیل کی دنیا میں رہنا آسان ہے۔ لیکن اس طرح دوسروں کے غموں سے دور رہنا، ہمت اور ہمدردی کے خلاف ہے۔ خیالات اور افکار کا جواز عمل ہے اور صرف عمل۔ بقول ہمارے دوست رومیں رولاں کے "خیال کا انجام عمل ہے وہ خیال جس کا رُخ عمل کی طرف نہیں ہے اُسے اسقاط، زیاں یا دغا کہتے ہیں۔ لہذا اگر ہم خیال کی خدمت پر کمربستہ ہیں تو عمل کا خادم بھی بننا پڑے گا۔"

لوگ عمل سے اس لئے گریز کرتے ہیں کہ وہ نتائج سے ڈرتے ہیں کیونکہ عمل کے معنی ہیں کھٹکا اور خطرہ۔ دور سے عمل خطرناک نظر آتا ہے۔ قریب سے دیکھو تو وہ اتنا بُرا نہیں، وہ ایک اچھا ساتھی ہے، اس کی بدولت زندگی کی خوشی اور ذوق دوبالا ہو جاتا ہے.... بہت سے لوگ اونچے پہاڑوں کو سر کرتے ہیں، اپنی زندگی اور اعضا کو خطرے میں ڈال کر۔ صرف اس لئے کہ پہاڑ کی چڑھائی شادمانی لاتی ہے اور موانع کی تسخیر کے جلو میں انبساط آتی ہے! انقلاب زندہ باد

"پریا درشنی (نظر کو عزیز) پر اس وقت اور زیادہ عزیز جب تم نظر سے دور ہو، میں یہاں بیٹھا ہوا تمہیں خط لکھ رہا تھا کہ مدّھم سی آوازیں کانوں میں آئیں جیسے دور سے بجلی کے گرجنے کی آواز آ رہی ہو۔ شروع میں تو میری سمجھ میں نہیں آیا یہ آوازیں کیسی ہیں، لیکن ایسا لگا کہ یہ آوازیں سُنی ہوئی ہیں، اور دل ان کی بازگشت سے گونج رہا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ آوازیں قریب آتی گئیں اور اونچی ہوتی گئیں اور جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ وہ آوازیں کیا ہیں "انقلاب زندہ باد" "انقلاب زندہ باد" زنداں اس بھرپور جنونی آواز سے گونجنے لگا۔ اور اسے سُن کر ہمارے دل جگمگا اُٹھے۔ میں نہیں جانتا وہ لوگ کون تھے جو ہماری جیل کے باہر ہم سے اتنے نزدیک ہمارا نعرۂ جنگ بلند کر رہے تھے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ شہر کے مرد اور عورتیں تھیں یا دیہات سے آئے ہوئے کسان۔ نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ آج اس کا کیا موقع تھا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی رہے ہوں۔ انھوں نے ہمارے اندر خوشی کی لہر دوڑا دی، اور ہم نے ان کی نوید کا خاموشی سے جواب دیا اور وہ جواب اپنے ساتھ ہماری دلی آرزوئیں لے کر گیا

ہم "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ کیوں لگاتے ہیں؟ ہم انقلاب اور تبدیلی کیوں چاہتے ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ آج ہندوستان ایک بہت بڑی تبدیلی چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ بڑی تبدیلی حاصل ہو جائے گی اور ہندوستان کو آزادی مل جائے گی اس وقت بھی ہم سکون سے نہیں ہیں

"فقط ایک اقتدار ایسا ہے جس کی میں اطاعت کرتا ہوں اور وہ ہے انصاف کا فطری قانون"

• • •

"آج سے کل کا جنم ہوتا ہے خزاں کی گود سے بہار جنم لیتی ہے۔ سوکھے پتے دھرتی کی گود میں ہریالی اور پھولوں کو جنم دیتے ہیں آنسوؤں کی حدت سے مسکراہٹیں جنم لیتی ہیں"

• • •

"اگر تم اپنی قوم، ملک اور ذات کے نقصان سے ذرا بلند ہو جاؤ تو تم اپنے رب کے مثل ہو جاؤ"

خلیل جبران، ترجمہ شہریار

گے۔ دنیا میں کوئی جاندار شے ایسی نہیں ہے جس میں ہر آن تبدیلی نہ ہوتی ہو۔ قدرت دن بدن پل بہ پل بدلتی رہی ہے۔ بڑھنا وہی بند کر دیتے ہیں جو مر جاتے ہیں، وہی سکون اختیار کر لیتے ہیں۔ تازہ پانی بہتا رہتا ہے بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے۔ یہی حال ایک فرد اور ایک قوم کا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں ہماری عمر بڑھتی جاتی ہے۔ بچیاں بڑھ کر لڑکیاں بن جاتی ہیں، چھوٹی لڑکیاں بڑی لڑکیوں میں بدل جاتی ہیں، اور پھر جوان عورتوں اور بوڑھی عورتوں میں۔ ہمیں ان تبدیلیوں کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو سرے سے مانتے ہی نہیں کہ دنیا بدلتی رہتی ہے۔ وہ اپنے دماغوں کو بند رکھتے ہیں، ان پر تالا لگا دیتے ہیں اور ان میں کسی نئے خیال کو داخل ہونے ہی نہیں دیتے۔ سوچنے اور غور و فکر کرنے کے خیال سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ انجام ظاہر ہے۔ وہ آگے نہیں بڑھتے، نہ بڑھیں، دنیا تو رکنے سے رہی۔ اور چونکہ وہ اور اُن جیسے دوسرے لوگ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق خود کو نہیں ڈھالتے، اس لئے وقتاً فوقتاً زلزلے آتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے انقلاب رونما ہوتے ہیں، جیسے فرانس کا عظیم انقلاب جو ایک سو چالیس سال پہلے ہوا تھا اور روس کا انقلاب جسے ابھی تیرہ سال ہی ہوئے ہیں۔ اسی طرح اپنے ملک میں ہم ایک انقلاب کی گرفت میں ہیں۔ ہم آزادی چاہتے ہیں، بے شک۔ لیکن ہم کچھ اور بھی چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پانی جہاں جہاں مر رہا ہے، بہنے لگے رواں ہو جائے اور ہر طرف تازہ پانی موجزن ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ جھاڑو لگا کر اپنے وطن سے غبار اور غریبی اور نکبت کو دور کر دیں۔ یہی نہیں، ہمیں چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو، انسانوں کے ذہنوں سے جالے بھی صاف کر دیں، وہ جالے جو انھیں سوچنے سمجھنے اور بڑے کام میں مدد دینے سے روکتے ہیں جو ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ اس میں وقت لگے گا۔ لیکن ہمیں کندھے لگا کر اسے آگے ڈھکیلنا ہے۔ انقلاب زندہ باد۔

ہم اپنے انقلاب کی دہلیز پر ہیں۔ مستقبل کیا لائے گا، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن حال ہی نے ہماری محنتوں کو انعامات سے نوازا ہے۔ ہندوستان کی عورتوں کو دیکھو۔ کس افتخار کے ساتھ ہماری اس جدوجہد میں وہ سب سے آگے آگے ہیں۔ نازک لیکن بہادر اور شکست ناپذیر۔ دیکھو وہ دوسروں کے لئے کس طرح نقشِ پا چھوڑ رہی ہیں۔ اور پردہ جس نے ہماری بہادر اور خوبصورت عورتوں کو چھپا رکھا تھا اور جو اُن کے لئے اور ان کے وطن کے لئے ایک لعنت تھا، وہ پردہ کہاں گیا۔ کیا وہ پردہ تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف سمٹتا ہوا نہیں جا رہا ہے۔ وہ ان عجائب گھروں میں جا کر دم لے گا جہاں ہم ماضی کی یادگاروں کو سجا کر رکھتے ہیں۔

بچوں پر نظر ڈالو۔ لڑکوں اور لڑکیوں پر بانر سیناؤں اور بال اور بالکا سبھاؤں پر۔ ان بچوں میں سے بہت سوں کے ماں باپوں کا رویہ ماضی میں بزدلوں یا غلاموں کا سا رہا ہوگا۔ لیکن آج کون سوچ سکتا ہے کہ ہماری نئی پیڑھی کے بچے غلامی یا کایرتا کو گوارا کریں گے۔

تبدیلی کا پہیہ اسی طرح گردش میں ہے۔ جو اوپر تھے وہ نیچے آ جاتے ہیں؛ جو نیچے تھے اوپر پہونچ جاتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ پہیئے کی یہ گردش ہمارے ملک کو بھی اپنی زد میں لے لے۔ دراصل ہم نے اس کو اتنی زور سے ڈھکیلا ہے کہ اب کسی کا بوتا نہیں کہ اسے روک سکے۔

انقلاب زندہ باد

جواہر لعل نہرو نے اپنے خطوط میں بیٹی کو تلقین کی تھی کہ ڈر کو دل میں جگہ نہ دینا۔ بہادری اور ہمت اُسے ماں، باپ اور دادا سے ملی تھی چین اور پاکستانی محاذ پر وہ بے خطر گئی۔ جنوب میں وہ اس وقت گئی جب ہندی کا ایجی ٹیشن زوروں پر تھا۔ اس کی کار پر پتھر برسائے گئے، اسے چوٹ آئی بھی لیکن اس کا ارادہ گھائل نہیں ہوا۔ اس خطرے کی وجہ سے جو انکے گرد منڈلاتا ہے ان بہادر دلکے حواس اور ارتسامات تیز ہو جاتے ہیں اور زندگی کا ذوق اس وقت جبکہ زندگی ایک کچے دھاگے پر ٹنگی ہوتی ہے اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔

میں اختتام رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی کی ایک نظم یا دعا سے کروں گا:

" جہاں ذہن خوف سے آزاد ہوں اور انسانوں کا سر اونچا ہو۔
جہاں علم آزاد ہو؛
جہاں تنگ دیواروں نے دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا ہو،
جہاں الفاظ حقیقت کی گہرائیوں سے نکلتے ہوں،
جہاں ان تھک کوشش اپنے بازوؤں کو تحصیل کمال کے لئے پھیلا رہی ہو،
جہاں عقل کی شفاف ندی بھٹک کر مردہ عادت کے ویران صحرا میں نہ چلی گئی ہو
جہاں دماغ کو تیری رہنمائی مدام بڑھتے ہوئے خیال اور عمل کی طرف لے جا رہی ہو۔
پروردگار میرے وطن کی آنکھیں آزادی کے اُس فردوس میں کھلیں"

تمام شد

(جواہر لعل نہرو نے "تمام شد" ہی لکھا ہے)

سر ضیاء الدین

کچھ یادیں — کچھ باتیں

پروفیسر مختار الدین احمد

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو میں نے پہلی بار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس میں دیکھا تھا جو پٹنہ میں آج سے کوئی چالیس سال پہلے منعقد ہوا تھا نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی اور ملک کے بہت سے عمائد اس میں شریک تھے، مسلمانوں میں عام طور پر اور تعلیم گاہوں میں خاص طور پر اس اجلاس کی دھوم تھی۔ جلسہ پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ہو رہا تھا، صدارت ایک باوقار معمر بزرگ کر رہے تھے، معلوم ہوا یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ہیں۔ ذہانت کے آثار چہرے سے نمایاں تھے اور جسم اور دماغ دونوں میں بلا کی تیزی اور پھرتی تھی۔ علی گڑھ کے ایک طالب علم جو بعد کو بہت مشہور ہوئے، ایک ریزولیشن کی تائید میں بولنا چاہتے تھے لیکن وہ کانفرنس کے رکن نہ تھے اور ضابطہ انھیں بولنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً دس روپے رکنیت کی فیس داخل کرا کے انھیں باضابطہ رکن بنا دیا اور چند لمحوں میں نعمان زبیری صاحب ڈائس پر مائکروفون کے سامنے موجود تھے۔ یہ سب کچھ اس عجلت میں ہوا کہ جب تک سب کچھ ہو نہ گیا حاضرین میں بیشتر سمجھ بھی نہ سکے کہ مسئلہ کیا تھا اور یہ کس طرح طے ہوا۔ یہ طالب علم نعمان زبیری تھے جو بھوپال کے جناب امین زبیری صاحب کے صاحب زادے تھے یہ علی گڑھ کی تاریخ کے ماہروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ نعمان زبیری اپنی تقریروں کی وجہ سے بعد کو علی گڑھ میں بہت مشہور ہوئے اور پٹنہ کے اجلاس میں بھی حاضرین ان کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

میں ۱۹۴۳ء میں جب علی گڑھ پہنچا تو ڈاکٹر ضیاء الدین علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے اور متعدد منصوبوں کی تکمیل میں مصروف تھے۔ ایک طرف علی گڑھ میں زراعتی کالج قائم کر رہے تھے، دوسری طرف انجینئرنگ کالج کی ترقی و بقا پر خون پانی ایک کر رہے تھے۔ کامرس کے شعبہ اور ساتھ ہی ساتھ مجوزہ میڈیکل کالج کے لیے ہر جگہ دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ پہلی مرتبہ ہندی ڈیپارٹمنٹ کے سالانہ جلسے اور مشاعرے میں جس کا پنڈت رام سروپ شاستری بڑا اہتمام کرتے تھے، انھیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پہلی نگاہ میں میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب پہلے سے زیادہ مستعد ہیں اور جسم اور دماغ دونوں بدستور شاداب ہیں۔

ما صدر رشد ہند ○

موسم سرما میں بھی وہ علی الصباح وائس چانسلر آفس پہنچ جاتے تھے اور گرما کی سخت شدت میں دوپہر کو بھی وہ کام کرتے رہتے تھے۔ کام کرنے کے لیے صرف ان کی آمادگی کی دیر تھی، وہ جس طرح وقت، موسم، فضا کی قیود سے آزاد تھے اسی طرح انھوں نے کام کرنے کے لیے جگہ کی بھی قید اٹھا دی تھی۔ میں نے انھیں ایک مرتبہ دیکھا کہ وہ علی گڑھ کے اسٹیشن پر جہاں وہ کسی اہم مہمان کو لینے گئے ہوئے تھے، اپنی کار میں بیٹھے ہوئے فائلوں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ مرکزی اسمبلی کے رکن تھے وہاں کی تقریریں بعض مرتبہ وہ علی گڑھ اور دہلی کے سفر کے دوران مرتب کر لیتے تھے، اگر کچھ کام باقی رہ گیا اسٹیشن سے اسمبلی کی عمارت تک کے سفر میں تمام کر لیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی شہرت ویسے تو ایک ریاضی داں، ممتاز استاد اور ماہر تعلیمات کی حیثیت سے تھی، لیکن ان کی اسمبلی کی تقریروں نے ثابت کر دیا تھا کہ مالیات، ریلوے کی وزارت کے مسائل اور دوسرے امور پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی۔ مالیات میں ان کی رائے اور مشوروں کو مجلس مقننہ کے اراکین خاص اہمیت دیتے تھے۔ ان کی تقریروں میں معلومات ہی معلومات ہوتے تھے، زائد بات کہنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ ان کی تقریریں جب اخباروں میں شائع ہو کر آتی تھیں تو ان کی خاص اہمیت ہوتی ویسے ان کی زبان سے سنیے تو پھیکی اور بے جان معلوم ہوتی تھیں، بولنے کا انداز یہ ہوتا کہ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک اٹھ جاتے اور بولنا شروع کر دیتے، اور کبھی بولتے بولتے دفعتاً بیٹھ جاتے اور تقریر ختم کر دیتے۔ وہ تقریروں میں تمہید اور چہرہ باندھنے کے قائل تھے اور نہ اختتامیہ کے۔ میں اور مقامات کی بات نہیں جانتا کم از کم علی گڑھ اور مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں ان کی یہی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ اسمبلی کا ایک جلسہ مجھے یاد آتا ہے جہاں ریلوے کے بجٹ پر حزب مخالف کے کوئی رکن تقریر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ٹوپی اتارے، کاغذات پھیلائے جلد جلد کچھ نوٹس لے رہے تھے (مقرر کے بعد انھی کو تقریر کرنی تھی)، وہ بڑے غور سے نوٹس بنانے میں اور اس کے مطالعے میں مصروف تھے، رکن کی تقریر ختم ہوئی ڈاکٹر صاحب کھڑے ہو گئے۔ ٹوپی پہنی، ہاتھ میں نوٹس لیے، مائکروفون درست کیا اور انھوں نے تقریر شروع کر دی۔ جس طرح بغیر تمہید کے انھوں نے

اپنی تقریر شروع کی تھی، اسی طرح تکلفات کا سہارا لیے بغیر انھوں نے تقریر ختم کردی۔ پورا اسمبلی ہال تالیوں سے گونج اٹھا جس میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے حکمراں جماعت کے اصحاب تھے اس لیے کہ انھوں نے ریلوے کے محکمے کے وزیر کے دفاع میں تقریر کی تھی اور اعداد و شمار اور دلائل سے ان کے بجٹ کی پرزور تائید کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سے چار مختصر ملاقاتیں یاد آتی ہیں۔ ایک ملاقات مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی استاد شعبۂ دینیات کے ساتھ ہوئی تھی مولانا مرحوم، انھی کے زمانے میں علی گڑھ تشریف لائے تھے اور ہیئت و ریاضی کے مضامین سے دلچسپی میں دونوں کا اشتراک تھا۔ مجھے انھوں نے اس سلسلے میں بلایا تھا کہ میرے والد، مولانا ظفرالدین قادری رضوی مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ) کے تلامذۂ خاص میں سے تھے جنھوں نے ان علوم میں ریاضی و ہیئت کی بریلی میں ان سے تحصیل کی تھی اور متحدہ ہندوستان میں انھیں بڑی شہرت حاصل تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ تمھیں بھی ان علوم سے دلچسپی ہے؟ پھر بولے تم نے سنا ہے: "میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز" وہ والد رحمۃ اللہ علیہ کی ان تصانیف کے متعلق استفسار کرتے رہے جو ان علوم میں انھوں نے لکھی ہیں اور یہ کہ فاضل بریلوی کی تصانیف ہمارے لنا جانے میں کون کون سی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں البیرونی کی ایک غیر مطبوعہ عربی تصنیف میں بیحد دلچسپی لے رہے تھے۔ انھوں نے اس کا اردو ترجمہ کرایا تھا اور چاہتے تھے کہ علم ہیئت کا کوئی ماہر اس ترجمے پر نظر ثانی کردے۔

دوسری مختصر ملاقات ان کے آفس میں ہوئی۔ کسی ضرورت سے میں مسٹر محمد یونس ملک جو بہار کی انڈیپنڈنٹ پارٹی کے صدر تھے اور بعد کو وہاں کے وزیر اعلیٰ بھی مقرر ہوئے، میرے عزیزوں میں تھے اور ڈاکٹر صاحب کے دوستوں میں، انھوں نے میرے سلسلے میں بہت اچھا خط لکھ کر دیا تھا، میں حاضر ہوا، انھوں نے خط پڑھا، مجھے ایک نظر دیکھا، خط ایک طرف ڈال دیا اور دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوگئے، جسے میں نے اس بات کا اشارہ سمجھا کہ ملاقات ختم کرے ہر دل گرفتہ آیا اور انھیں تو نہیں ان کے بیٹے یعقوب یونس ملک کو خط لکھا کہ ڈاکٹر صاحب کام کیا کریں گے انھوں نے ٹھیک سے خط بھی نہیں پڑھا اور ایک طرف ڈال دیا۔ تیسرے دن مجھے اطلاع مل گئی کہ انھوں نے میرا کام کردیا۔ ان کے کام کا طریقہ یہی تھا۔ وہ بھی ہمارے سید حامد صاحب کی طرح نہ فاضل باتوں کے قائل تھے نہ ان کے پاس اس کا وقت تھا۔ مجھے بعد کو احساس ہوا کہ خط پڑھ کر جب وہ تقریباً آدھ منٹ مجھے دیکھتے رہے اس وقت انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد کسی گفتگو کی انھیں ضرورت ہی نہ تھی۔

بقیہ دو ملاقاتیں ان سے ٹرین میں ہوئیں۔ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ ٹرینیں بہت کم تھیں، جو تھیں وہ گورے اور کالے فوجیوں سے بھری رہتی تھیں۔ مجھے ایک صبح دہلی جانا تھا، تھرڈ کلاس میں جگہ تلاش کر رہا تھا کہ گاڑی پلیٹ فارم سے رینگنے لگی، میں سامنے کے ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہوگیا وہاں دیکھا کہ ایک فوجی آفیسر اور ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں، بہت گھبرایا، گاڑی چل چکی تھی اس لیے اب اترنے کا موقع بھی نہیں تھا، خیر انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی، کچھ کام کرتے رہے، کوئی ایک گھنٹے کے بعد انھوں نے گھڑی دیکھی کاغذات کا دفتر بند کیا، ناشتہ دان نکالا، اب انھوں نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی، بولے، سفر میں کھانا ضرور چاہیے (یا کہا تھا: کھاتے رہنا چاہیے) جس طرح انجن میں ہمیشہ ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انسانی جسم کو بھی۔ سفر کی حالت میں آدمی کی انرجی زیادہ ضائع ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہ کمی پوری ہوتی رہے۔

میں ان کی اس نصیحت پر ہمیشہ تو عمل نہیں کرسکا لیکن اب بھی جب ٹرین میں کھانے پینے کا اتفاق ہوتا ہے تو اکثر ڈاکٹر صاحب مرحوم یاد آجاتے ہیں میں نے ان کا ناشتہ دان سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا، تھرماس سے انھیں پانی پلایا (بالکل گرم پانی تھا، مئی جون کا زمانہ تھا غالباً تھرماس میں ٹھنڈا پانی بدلوانا وہ بھول گئے ہوں گے) اب انھوں نے شیروانی کی جیب سے ٹن کا ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا، چمچہ لانا انھیں تکلف محض معلوم ہوا ہوگا۔ شہادت کی انگلی سے انھوں نے سیاہ رنگ کی ایک کالی معجون کھائی، ڈبا جیب میں واپس رکھتے ہوئے مجھ سے بولے: یہ (لکڑی کے؟) کوئلے کی معجون ہے بہت مقوی اور بہت مفید، اب ٹرین خورجہ اسٹیشن پر پہنچ رہی تھی وہ اوپر کے برتھ پر دراز ہوگئے (یہ بھی اپنی انرجی کو محفوظ کرنے کا ان کا ایک طریقہ تھا) گھڑی دیکھ کر مجھ سے بولے، ٹرین لیٹ ہو رہی ہے (انھیں وقت پر اسمبلی ہال پہنچنا تھا) تم اسٹیشن پر اتر کر ذرا ڈرائیور سے کہہ دو کہ ٹرین کی رفتار ذرا تیز کردے۔ یہ کہہ کر وہ غافل ہوگئے میں اس عجیب و غریب فرمایش پر حیران کہ ان کا یہ پیغام اگر میں نے انجن کے ڈرائیور تک پہنچایا تو وہ انھیں کیا کہے گا اور مجھے کیا سمجھے گا۔ ٹرین جب اسٹیشن پر رکی تو بادل ناخواستہ حکم کی تعمیل میں میں ڈرائیور کے پاس پہنچا، اس تک ڈاکٹر صاحب کا نام لیکر ان کا پیغام پہنچایا اور پھر اپنے کمپارٹمنٹ میں آکر بیٹھ گیا۔ اس بیکار سی حرکت پر مسکراتا ہوا۔ ٹرین چلنے کے کوئی دس منٹ بعد میں نے محسوس کیا کہ ٹرین کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ میں نے اس وقت تو یہ سمجھا کہ ریلوے کے معمولات میں ہوگا کہ فلاں اسٹیشن سے ٹرین تیز چلے اگر اسٹیشنوں کی مسافت طویل ہو، اور ٹرین کی رفتار کی تیزی میں ڈاکٹر صاحب کے پیغام کو کوئی دخل نہیں۔ لیکن علی گڑھ پہنچ کر یہ بات جب میں نے حلیم صاحب (پروفیسر ابوبکر احمد حلیم) کو سنائی تو وہ مسکرائے اور بولے: ریلوے

کے مسلم ملازمین میں معلوم نہیں کتنوں کی ملازمت ڈاکٹر صاحب کی رہین منت ہے۔ انھوں نے معلوم نہیں کتنے غریب طالب علموں کی تعلیم کا انتظام کیا اور کتنوں کو اچھی ملازمتیں اور بڑے عہدے دلوائے۔

ٹرین میں کا ایک واقعہ اور یاد آتا ہے۔ اب میں بی۔ اے کے پہلے سال میں تھا دہلی سے شب کو واپس ہو رہا تھا، پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم، ٹرین میں کہیں پاؤں ٹکانے کو جگہ نہیں۔ ناچار اس زمانے کے معمول کے مطابق فرسٹ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ وہاں بھی جگہ نہ تھی ڈاکٹر صاحب نچلی برتھ پر لیٹے ہوئے تھے، میں کچھ دیر کھڑا رہا، انھوں نے مجھے دیکھا تو اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ اگر انھوں نے زیر لب کچھ جملے گفتنی یا ناگفتنی کہے ہوں تو ٹرین کی گڑگڑاہٹ کے شور میں میں سن نہ سکا۔ وہ دہلی میں سوئے تو علی گڑھ پہنچ کر جاگے۔

جاگنے پر بھی انھوں نے میرے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے متعلق کچھ نہ پوچھا یہ معاملہ اس سے مختلف نکلا جو مجھے حلیم صاحب کے ساتھ کچھ دن بعد پیش آیا۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے اثرات ہندوستان پر باقی تھے۔ ٹرینیں کم تھیں اور مسافر زیادہ (اب ٹرینیں بھی زیادہ ہیں اور مسافر بھی زیادہ) دہلی سے آ رہا تھا، تھرڈ کلاس کا ٹکٹ تھا، سوار فرسٹ کلاس میں ہوا۔ وہاں پہلے ایک نمایاں ترکی ٹوپی نظر آئی پھر مجسم پروفیسر ابوبکر احمد حلیم، وہ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے اور بڑے اصول اور ضابطے کے انسان، لیکن میں وہاں انھیں اچانک پاکر اس لیے سخت پریشان ہوا کہ وہ میرے قریبی رشتہ دار تھے اور وہی مجھے اپنے ساتھ تعلیم کے لیے علی گڑھ لائے تھے۔ کسی بات پر وہ مجھے سرزنش بھی کر سکتے تھے اور والد مرحوم کو خط بھی لکھ سکتے تھے۔ بہرحال اب تو ٹرین چل چکی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ بڑی شفقت سے فرمایا: یہاں آئیے۔ بیٹھ جائیے، کتابوں کا بنڈل اوپر رکھ دیجئے، میری شیروانی کے بٹن سارے بند تھے ورنہ وہ یہ بھی فرماتے: شیروانی کے بٹن بند کر لیجئے ان کی برتھ پر جیسے تیسے ایک کونے میں بیٹھ گیا، انھوں نے اخبار الگ رکھا، چشمہ اتارا اور وہ مجھ سے مخاطب ہوئے: ٹکٹ آپ کے پاس فرسٹ کلاس کا ہے؟ میں نے ندامت کے ساتھ نفی میں جواب دیا۔ خاموش رہے پھر چشمہ لگایا اور پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ جب اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکنے کو ہوئی تو بولے: جائیے ٹیکٹ چیکر کو بلا لائیے (مجھے ان کی یہ بات غیر ضروری نظر آئی، یہ تو بیل مجھے مار والا معاملہ ہوا) خیر صاحب ٹکٹ چیکر آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا، بولے: ان کا ٹکٹ علی گڑھ کا فرسٹ کلاس کا بنا دیجئے۔ میں نے جیب سے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ، انھوں نے اپنے بٹوے سے پیسے نکال کر

دے یہ بہت شرمندہ ہوا اسکے بعد زندگی میں یہ حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ غالباً فرسٹ کلاس کا ٹکٹ دہلی تک چار پانچ روپے میں ملتا تھا۔ (کیا زمانہ تھا ۱۹۵۲ میں زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے ٹی۔ اے وصول کرنے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خدا ان پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے، کی توجہ سے آکسفورڈ کی تعلیم اور شرف اوسط میں قیام کے لیے مجھے روکفیلر فاؤنڈیشن کی فیلوشپ تفویض ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عابد حسین اور احتشام حسین کے بعد میں تیسرا ہندوستانی مسلمان تھا جسے یہ اعزاز ملا تھا اور مجھے بہت کم عمری میں واشنگٹن سے فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر گلپیٹرک نے مجھے لکھا تھا کہ اس سلسلے میں نیو یارک جاکر ڈاکٹر واٹسن سے ملوں اور سفر کی تفصیلات بھی طے کروں، ملاقات کے بعد ان کی امریکن سیکریٹری نے نہایت ادب سے ایک لفافہ میرے سامنے پیش کیا، معلوم ہوا یہ میرا سفر خرچ ہے یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ فرسٹ کلاس کا کرایہ علی گڑھ سے دہلی کا ۸/- روپیہ تھا۔ آجکل ۵۱۱/- روپیہ ہے اور وہ آرام بھی نہیں جو اس زمانے کے سکنڈ کلاس میں تھا)

ذکر ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کا تھا، ان سے شاید آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب انھوں نے اپنی کوٹھی "ضیاء منزل" میں مجھے چند اور طلباء کے ساتھ چائے پر مدعو کیا تھا۔ موعودہ میڈیکل کالج کے لئے رقم کی فراہمی کے سلسلے میں وہ اس زمانے میں گویا مستغرق تھے، ڈاکٹر ہادی حسن اور دوسرے اساتذہ اس سلسلے میں برابر ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے طلباء کو بھی اس طرف متوجہ کیا تھا اور وہ وفود کی شکل میں پورے ہندوستان میں پھیل گئے تھے۔ بس وفدوں میں سے ایک تھا جس میں چار طلباء پر مشتمل تھا، وفد کے سربراہ شعبۂ فلسفہ کے ایک ذہین اور ہونہار طالب علم شہاب الدین محمد مغنی صاحب تھے، میرے عزیز تھے لیکن مجھ سے سینیئر، بعد کو وہ یہاں شعبۂ فلسفہ و نفسیات کے استاد ہوئے پھر پشاور یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر اور فیکلٹی کے ڈین ہوئے انٹرمیڈیٹ (سائنس) کے ایک طالب علم ضیاء الحق اور جمشید پور کے رہنے والے انجنئرنگ کالج کے ایک صاحب یاد آتے ہیں جو وفد کے ارکین میں تھے۔ ہمیں بہار کے چھوٹا ناگپور کا علاقہ ملا تھا۔ یہ چندہ وصول کرنے کے لحاظ سے بنجر علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ پٹنہ اور گیا کے ضلعوں کی بات اور تھی وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ علی گڑھ اور میڈیکل کالج کے قیام کی ضرورت کو سمجھ سکتا تھا۔ لیکن آفرین ہے مغنی صاحب پر کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے تجویز کردہ علاقے میں جانا منظور کر لیا اور اس بھاری پتھر کو چوم کر نہیں چھوڑا بلکہ اسے اٹھا لیا۔ گرمی کی تعطیلات میں ہم لوگ اس دورے پر روانہ ہوئے اور جب واپس آئے تو کوئی پچاس ہزار روپے کرنسی ڈرافٹ اور چیک کی شکل میں مغنی صاحب کے پورٹ فولیو میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع ملی تو بہت خوش ہوئے۔ پچاس ہزار کی رقم

اس زمانے میں حالت نہ سمجھی جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب چپ چاپ سفر اور اس مہم کی تفصیلات پوچھتے رہتے اور خوشی کا اظہار کرتے رہتے اور دوسرے روانہ ہونے والے دنوں کی ہمت افزائی اور تشجیع کرتے رہتے۔

اس مہم کے ساتھ ایک خوشگوار بات کی یاد اب بھی کبھی کبھی تازہ ہو جاتی ہے۔ علی گڑھ میں یہ طے ہوا تھا کہ معطی اگر پانچ ہزار یا دس ہزار رقم عطیہ دیں [illegible] تو میڈیکل کالج یا ہسپتال کے ایک کمرے پر ان کے نام کا پتھر نصب کیا جائے گا (جیسا کہ سرسید علیہ الرحمۃ نے اپنے زمانے میں کیا تھا)۔ [illegible] کے ایک صاحب کے گھر گیا۔ بظاہر کچھ ایسے متمول نہ تھے۔ [illegible] ان کی چیتی [illegible] اور بس [illegible] ہم لوگوں کے پاس [illegible] رسید چھپی ہوئی تھی اور چھوٹے موٹے چندہ دینے والوں [illegible] سے ہم لوگ یہی دس بیس روپیہ کی توقع رکھتے تھے لیکن ان کے پاس جاتے ضرور تھے کہ علی گڑھ اور میڈیکل کالج سے تو واقف ہو جائیں۔ اس دن اتفاق سے وفد کے قائد معنی صاحب نہ جانے کسی اور طرف نکل گئے تھے۔ میں تنہا ایک مقامی شخص کو لیکر اس مہم کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ خدا نے زبان میں اس دن کچھ ایسی تاثیر دے دی تھی کہ وہ گفتگو سے متاثر ہوئے اور ایک بڑی رقم بطور عطیہ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان سے میں نے یہی بات کہی جو ہم نے ہر جگہ کہی تھی کہ بہت بڑی رقم دینے پر نو تعمیر شدہ ایک کمرے پر ان کا نام پتھر پر نقش کرایا جائے گا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد افریقہ سے ان سے ملاقات ہوئی، انھوں نے علی گڑھ آنے اور اپنے [illegible] اس وقت میڈیکل کالج کی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی [illegible]۔ اب ان کا انتقال ہو گیا ہے، خدا ان کی مغفرت فرمائے [illegible]۔ لیکن جب تک وہ زندہ رہے مجھے یہ [illegible] کہ اگر وہ کسی دن آ گئے تو میڈیکل کالج لے جا کر انھیں کون سا [illegible] دکھاؤں گا۔ افسوس ہوا ہے کہ یونیورسٹی کی نظامت جن بزرگوں کے ہاتھ میں رہی وہ یونیورسٹی کے اس وعدے کو فراموش کر گئے اور خود ہماری یونیورسٹی نے تو خود اپنے محسن اور میڈیکل کالج کے قائم کرنے والے ڈاکٹر ضیاء الدین کو بالکل فراموش کر دیا۔ ان کے معاون ڈاکٹر ہادی حسن کو یاد کیا بھی تو بہت بعد کو ان کے نام پر ایک ہال کا نام ہادی حسن ہال رکھا گیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کو تو یہ سعادت بھی نہیں بخشی گئی حالانکہ میرا خیال ہے کہ یہ بات کہیں زیادہ مناسب ہوتی کہ موجودہ میڈیکل کالج کا نام ڈاکٹر ضیاء الدین میڈیکل کالج رکھا جاتا۔ اب بھی اس کا موقع ہے کہ کسی اور طرح یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اس کی تلافی کر دیں۔

ڈاکٹر صاحب کی وضع قطع اور طبیعت کے سادہ تھے۔ تکلف نام کو [illegible] رہتے تھے۔ عام طور پر شیروانی استعمال کرتے [illegible] کبھی کبھی [illegible] لباس بھی زیب تن کر لیتے تھے۔ جس دن ہندوستان کے کمانڈر ان چیف سر آکنلک علی گڑھ آئے تھے اس دن ڈاکٹر صاحب یونیفارم میں تھے کیونکہ وہ لفٹنٹ کرنل بھی تھے اور اسی یونیفارم میں [illegible] کے استقبال کے لیے علی گڑھ کے اس ایرپورٹ پر گئے تھے جہاں [illegible] جہاز یا ہیلی کوپٹر اترنے والا تھا۔ اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوا اور مہمان اور میزبان دونوں نے اس موقع پر بہت اچھی تقریریں کیں۔ اب اسٹریچی ہال کی اہمیت [illegible] ہو رہی ہے اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یونیورسٹی کو چاہیے کہ کبھی کبھی جلسوں کا اہتمام کیا کرے۔

ڈاکٹر صاحب کے لباس کا ذکر تھا۔ ان کی شیروانی اکثر ڈھیلی ڈھالی ہوتی تھی۔ بعض مرتبہ یہ کیفیت بھی دیکھنے میں آئی کہ پاجامہ کا ایک پائنچہ اونچا دوسرا نیچا ہے، لیکن انھیں نہ تو اس کی خبر ہوتی تھی اور نہ پروا تھی۔ پیدل چل رہے ہیں اور چلنے کے دوران اپنے کپڑے بھی سنبھالتے جاتے ہیں اور اپنے کسی رفیق سے محو کلام بھی ہیں۔ اس زمانے میں پروفیسر ظفر الحسن صدر شعبۂ فلسفہ موجودہ انگلش ہاؤس میں رہتے تھے، [illegible] اور دوسرے ہندوستان سے عمائد آئے ہوئے تھے، وہیں ڈنر تھا شرکت کے لیے میں نے ڈاکٹر صاحب کو پیدل آتے دیکھا، میرس روڈ کے چوراہے سے [illegible] روڈ تک وہ چل کر آئے اور انھوں نے کار کا بیکار تکلف نہیں کیا۔ ٹوپی ہمیشہ ترکی پہنتے رہے، شیروانی پر بھی اور کوٹ پر بھی۔ ایک آدھ بار ہی ایسا اتفاق ہوا جب انھوں نے اس قدیم عادت کی خلاف ورزی کی ہو اور یہ وہ موقع تھا جب مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلم لیگ کی مکمل فتح ہوئی تھی اور عبدالرحمن صدیقی کے استثناء کے ساتھ اسمبلی کے دوسرے مسلم اراکین جناح کیپ پہنا کرتے تھے۔

سیاسی معاملات میں یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کس نظریے کے حامی اور کس سیاسی جماعت کی طرف مائل تھے۔ بہت دنوں تک انھوں نے کسی سیاسی جماعت سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا، کچھ دنوں تک وہ خاکسار تحریک سے وابستہ رہے۔ پھر مسلم لیگ کے عروج کے زمانے میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ بنیادی طور پر سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن حالات اور فضا کی تبدیلی کا انھیں شعور بہت جلد ہوتا تھا اور ان میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ اس کے مطابق اپنے کو ڈھالیں، یہ ان کا بڑا وصف تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم ہندوستان کے مشہور ریاضی داں، ماہر تعلیمات اور مسلم الثبوت سیاست داں تھے۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی جہاں ان کی ذہنی تربیت ہوئی، کیمبرج جا کر انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ

اخلاریں بعد بین المشرقین۔ دونوں ایک زمانے میں سانس لیتے رہے، لیکن ریل کی پٹریوں کی طرح، ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے لیکن ملے کبھی نہیں۔ بایں ہمہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق انھوں نے اس خط میں صرف دو جملے لکھے ہیں ان سے ایک طرف ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے تو دوسری طرف خود مرحوم کی سیرت اور نیک دل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

خط کا آخری ٹکڑا انہایت دلچسپ معلومات کا حامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دو مشہور عادتوں سے کون ان کا جاننے والا واقف نہیں۔ جب چاہیں وہ کسی چیز کو بھول جائیں اور جب ان کا جی چاہے اور جتنی دیر کے لیے چاہے وہ سو رہیں۔ ان کا حافظہ بے پناہ تھا، لیکن اگر وہ کسی بات کو بھول جانا چاہتے ہوں تو کوئی انھیں عمر بھر یاد نہیں دلا سکتا تھا، اور اگر کسی بات کو وہ یاد رکھنا چاہیں تو ناممکن تھا کہ وہ اسے بھول جائیں۔ اسے صرف ڈاکٹر صاحب ہی جانتے تھے کہ کب کیا کیا بھلانا ہے اور کس موقع پر کیا کیا یاد رکھنا ہے۔ پروفیسر عبدالمجید قریشی مرحوم نے جب ایک بار ان سے کہا کہ میں ضروری کام، دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے بھول جاتا ہوں تو مرحوم نے کہا: بھولتا میں بھی ہوں، لیکن اسی کام کو جسے غیر ضروری سمجھتا ہوں، ضروری کام کو بھولنا ممکن ہی نہیں۔

ان کی تھوڑی دیر تک سو رہنے کی عادت بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ علی گڑھ میں ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ میٹنگ ہو رہی ہے، ایجنڈا کے بعض دفعات سے عدم دلچسپی یا ان کی اہمیت کی کمی کی بنا پر ایسا ہوا کہ قریب کے لوگوں سے اجازت لیکر میز پر سر رکھکر سو گئے۔ سوئے بھی ایسے کہ گہری نیند کے سارے آثار ظاہر ہونے لگے پانچ دس منٹ کے بعد اٹھے تو چاق و چوبند اور گفتگو کا دور انھوں نے وہیں سے اٹھائی جہاں سے چھوڑی تھی۔ ظاہر ہے اس دوران کونسل یا کمیٹی نے پیش نظر ریزولیشن پر کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور گفتگو جاری رہی تھی۔

ان کے ایک واقف کار جمیل امام صاحب کا بیان ہے کہ خوبی ان کے دماغ کی یہ تھی کہ جس وقت انھیں ضرورت ہوتی تھی، وہ کسی چیز کو یاد کر لیتے تھے اور جب چاہتے بھلا دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے ذہن کو اس طرح تربیت دی تھی جیسے ایک سپاہی یا ایک کھلاڑی تربیت پاتا ہے۔ ایک مثال اس کی یہ ہے کہ جب اور جتنی دیر چاہتے تھے سو لیتے تھے اور اس کے فوراً بعد اٹھ بیٹھتے اور تازہ دم ہو جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ انھوں نے کہا کہ میں پانچ منٹ سو لوں اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ سو گئے۔ پانچ منٹ کے بعد فوراً وہ بیدار ہو گئے اور بدستور کام میں مصروف ہو گئے۔

بقول پروفیسر عبدالمجید قریشی ان کے فیصلوں میں یہ کمال تھا کہ جتنے منٹ وہ چاہتے تھے اتنے ہی منٹ وہ قیلولہ کرتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مقررہ منٹوں سے تجاوز ہوا ہو۔ چند اصحاب کے ساتھ ایک مرتبہ وہ آگرہ سے اٹاوہ جا رہے تھے۔ اٹاوہ سے تین چار میل ادھر ایک فلیگ اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب نے کہا میں ذرا سو رہوں۔ یہ کہہ کر اوپر کے برتھ پر لیٹ گئے سب نے کہا کہ اٹاوہ قریب ہے سونے کا کیا موقع ہے۔ لیکن جواب میں خراٹوں کی آواز سنی۔ چند ہی منٹ میں ٹرین سگنل کے اندر داخل ہوئی اور ڈاکٹر صاحب برتھ سے کود کر نیچے آ بیٹھے

ان کے قصداً بھولنے بھلانے اور ہر وقت سو جانے اور اٹھ جانے کا ذکر آیا ہے۔ امین زبیری صاحب کی کتاب "ضیائے حیات" سے ان دونوں مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے:

علالت اور قوت خیال سے علاج کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں " (کیمبرج میں) امتحان سے قبل ڈاکٹر صاحب حسب معمول رات کے دو بجے تک پڑھا کرتے تھے اور جب سونے کا ارادہ کرتے تو زیر غور ریاضی کا مسئلہ ان کے دماغ میں گھوما کرتا۔ اس لیے نیند نہیں آتی تھی دو ہفتہ اس طرح گزر گئے تو اپنے ٹیوٹر سے انھوں نے شکایت کی۔ اس نے ماہر امراض کے پاس بھیج دیا جس نے خوف ظاہر کیا کہ خرابی دماغ کا اندیشہ ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب نے اپنا علاج قوت خیال کے ذریعہ اس طرح شروع کر دیا کہ کتاب بند کرتے ہی ریاضی کے تمام مسائل دماغ سے نکل جائیں، چنانچہ ایک ہفتہ کی مشق میں وہ کامیاب ہو گئے اور ان کو کامل قابو ہو گیا کہ کتاب بند کرتے ہی ریاضی کے مسائل سے دماغ خالی ہو جاتا اور دوبارہ کتاب کھولتے ہی تمام مسائل پوری طرح ذہن میں آ جاتے۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بھول جانے کے فن پر انھوں نے باضابطہ توجہ کی تھی اور شیکاگو میں انھوں نے اپنا ایک حلیف بھی تلاش کر لیا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ پچیس تیس سال پہلے کسی نے مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے اس بات کی بھی مشق کی تھی کہ کچھ دیر تک بالکل خالی الذہن ہو جائیں، یعنی دماغ میں اس وقت کوئی بات نہ رہے۔ یہ ایک مشکل امر ہے شاید اب تک ریکارڈ آدھ منٹ کا ہے، اب تک کوئی ایک منٹ تک خالی الذہن نہیں رہ سکا کوئی نہ کوئی خیال فوراً دماغ میں آ جاتا ہے اور آدمی یکسو نہیں رہتا

یہ طویل مکتوب امریکا کے رنگین ہوائی کاغذ پر بال پین سے لکھا ہوا ہے کاغذ آب رسیدہ ہے بیس فیصدی الفاظ مطموس ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا اردو خط پڑھنا، خط کوفی پڑھنے سے کچھ ہی کم دشوار ہے۔ بریکٹ کا مطلب ہے کہ یہاں الفاظ یا تو چھوٹ گئے ہیں یا قیاس سے میں نے الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ مطلب ادا ہو جائے۔ بریکٹ میں سوالیہ نشان (؟) بنا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ واضح نہیں۔ سیاق و سباق کا خیال کر کے یہ الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں۔

مکتوب الیہ یعنی خاں بہادر مولوی بشیر الدین صاحب کے پوتے

محمد امتیاز الدین صاحب بی ایس سی (علیگ) سے یہ خط مجھے ملا ہے ان کے
شکریے کے ساتھ اسے شائع کیا جاتا ہے۔

شکاگو، ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء

مخدوم و مکرم، اکثر آپ کی صحت اور آپ کے اسکول کا خیال رہتا ہے۔
خدا کرے دونوں اچھی حالت میں ہوں۔ میرا اس وقت امریکہ آنا بہت
مفید ہوا اور یہاں آکر آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے پروفیسر قریشی صاحب کو
دو خط لکھے ہیں۔ ان کی کاپیاں ٹائپ کرانے کے لیے کہا ہے۔ ان سے
منگوا کر ضرور پڑھیں۔ صرف تعلیم کے متعلق ان کو لکھا ہے۔ تمدن کے
متعلق کچھ ان کو نہیں لکھا ہیں ایک یا دو خط ان کو اور لکھوں گا۔ اس میں
تعلیم کے عام حالات معلوم ہوں گے۔ مختصر یہ ہے کہ تعلیم اور امتحان کا جو
طریقہ برٹش کے آنے سے پہلے ہندوستان میں جاری تھا وہی ٹھیک تھا۔ اور
اس پر ہم کو رجوع کرنا چاہیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی امریکن سے لینا چاہیے
مگر امریکن سے اسی قدر پیچھے ہیں جس قدر ہم انگلستان سے۔ امریکہ والے
ہندوستان پاکستان دونوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہاں سب سے
کہا ہے کہ روس اور امریکہ کی لڑائی میں ہندوستان پاکستان دونوں روس کا
ساتھ نہیں (دیں گے)۔ مسلمان ... میں خیال ہے کہ وہ خدا کے وجود کو نہیں
چھوڑ سکتے اور ہندو سرمایہ داروں، کے دباؤ (میں) روس کے حامی نہیں
ہوں گے۔ بہر حال امریکہ کی اس وقت کوشش ہے کہ وہ ہندوستان اور
پاکستان دونوں کو خوش رکھے اور ہم کو بھی ان سے علیحدگی (کی) کوئی
وجہ نہیں۔ ہز ہائی نس آغا خاں نے پچاس لاکھ روپیہ کراچی اور چٹاگاؤں
میں سائنس اور ٹکنالوجی بنانے کے لیے دیا ہے۔ میں ان سے ملنے گیا
تھا۔ خود انھوں (نے) مجھ سے ذکر کیا تھا امریکہ کے (؟) FULLBRIGHT ACT
کے ماتحت جو ستمبر ۱۹۴۶ء میں پاس ہوا تمام اپنے اسٹورز Surplus stores
اس ملک کی تعلیم کے لئے دے دیا گیا۔ ہندوستان کو غالباً پندرہ کروڑ ملے
اور اس کے خرچ کا طریقہ کمشنر تعلیم کے مشورے سے ہوگا۔ آج کل عوام
پاس (نے) جوش (؟) بہت ہے جو After کا Propaganda
ecr ... ہے مگر یہ جلد زائل ہو جائے گا۔ ہمارے سامنے (آئندہ)
زیادہ سخت وقت (ہے) اس وقت معاملہ گورنمنٹ سے تھا مگر اور اقوام
کی ہمدردی ہمارے ساتھ کم و بیش تھی۔ اس وقت ہم کو گورنمنٹ اور دیگر
اقوام سے غلط فہمی یا مقابلہ کرنا .... میں بہت غور کر رہا ہوں۔ پاکستان ہماری
مدد اگر کرنا بھی چاہے تو موثر طریقے سے نہیں کر سکتی۔ ہم کو اپنے معاملات کو خود
ہی حل کرنا ہوگا۔ اور ہر شہر ہر قصبہ اور ہر گاؤں کے سامنے علیحدہ علیحدہ
مسائل آئیں گے۔ ہم کو تمام امداد اور حقوق کو چھوڑ دینا چاہیے اور صرف
وہ ... کے جو حقوق ہیں ان کو مانگنا چاہیے اور ہمارے اصول
... Socialist ہونے چاہئیں کہ ہر چیز سے ہر شخص مستفید ہو۔ Socialist
میں اور Communist میں بڑا فرق ہے۔ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کو
Politics سے علیحدہ رکھنا چاہیے۔ اس وقت U.P. اور بہار کے
مسلمان لیڈ لینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ (دوسرے) صوبہ ان کی تقلید کریں گے۔
جامعہ ملیہ کے متعلق حالات سنے۔ عبرت کا مقام ہے۔ ذاکر حسین کی سچائی
اور خلوص کی وجہ سے وہ دونوں مرتبہ بچ گئی۔ نہایت خوشی کی بات ہے۔
امریکہ کے اخباروں (میں) ہندوستان کے متعلق بہت حالات چھپتے ہیں مگر
پاکستان کے متعلق کچھ نہیں چھپتا ہے۔ لوگوں کی توجہ اس طرف نہیں ہے
میں اپنے آپ کو Politics سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہتا ہوں۔
یہاں مجھ سے لکچر کی فرمائش کی اور Govt. ... کا وعدہ کیا۔ ڈالر
dollars نہایت اچھا معلوم ہوتا ہے، مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ
سوائے تعلیم کے میں اور کسی چیز پر پبلک گفتگو کے لیے تیار نہیں ہوں۔
اس وقت خلیق الزماں، نواب اسماعیل خاں، حسرت موہانی، رضوان اللہ
عزیز احمد، محمد یونس پالیسی بنانے کے اہل ہیں اور ان کو . . . . .
اس وقت لیڈ دینا چاہیے۔ امریکہ میں تین ہفتے کے لیے آیا تھا مگر
بارہ دنوں میں معلوم ہوا کہ صرف چار روز کام ہو سکا۔ کچھ وقت Spade
work میں گیا۔ کچھ تعطیلات کی وجہ سے ۱۵ تاریخ سے یونیورسٹیاں
اور کالج کھلیں گے مجھے اپنے پروگرام سے کچھ زیادہ ٹھہرنا پڑے گا۔ امریکہ
میں چیزیں اسی بہتات سے (ہیں) جیسی بڑی جنگ سے پہلے جرمنی اور
لندن (میں) ملتی تھیں مگر قیمت زیادہ ہے۔ فرانس کے سکے کی قیمت
یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ انگریزی سکے کی قیمت نصف ہے۔ ہندوستان
اور سوئٹزرلینڈ کا سکہ اپنی جگہ (پر) قائم ہے۔ ہندوستان کا کریڈٹ بجٹ
کی وجہ (سے) بہت ہے اور روپیہ اپنی جگہ پر قائم ہے (صفحہ ۲) امریکہ کی موجودہ
پالیسی کہ ہر ملک اکانومک economic دباؤ سے اپنے زیر رکھنا خود
امریکہ کے لیے اچھا نہیں۔ Palestine کے متعلق میں نے Truman
کو خط لکھا ہے کہ وہ اس مسئلے میں فوج کا استعمال نہ کریں۔ Palestine
کے مسئلے کے تین جز ہیں اور اس پر علیحدہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اوّل
بیت المقدس یہودی عیسائی اور مسلمانوں کے نزدیک متبرک جگہ ہے۔
بیت المقدس (کا) انتظام پرانے طریقے پر رہنا چاہیے۔ اس میں عیسائی
اور یہودی دونوں کے مشوروں کو کونسل لینا چاہیے۔ دوم Palestine
کا سول انتظام۔ اس میں ہر شخص کو دالکس دینا چاہیے۔ یہودیوں میں صرف
ان کو جو صرف ایک جنریشن generation سے رہتے آ چلے ہیں۔

سوم، یہودیوں کے لیے کسی گھر کا انتظام کہ جہاں دنیا کے Jews جاکر جمع ہوں بس جائیں۔ اس کے لیے Palestine کو کیوں چنا جائے امریکہ والے اپنی ... زمین سے کچھ حصہ دیدیں۔ انگلستان والے) اپنی colonies میں سے کچھ حصہ دیدیں۔ یہودی بہت مالدار ہیں۔ وہ South Americe یا ویسٹ افریقہ سے اپنے لیے کچھ زمین خریدیں Palestine کے عربوں کو مجبور کرنا کہ ہم سب لوگ تو اپنے ملک کی (زمین) یہودیوں کے دینے کے لیے تیار نہیں ہیں مگر عربوں کو فیاض دل سے کام لینا چاہیے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ چودھری ظفر اللہ خاں نے خوب کہا ہے کہ حلوائی کی دکان دادا جی کی فاتحہ ۔

ہندوستان اچھی حالت میں ہے۔ اگر Mount Betan کی حماقت نہیں ہوتی تو یہ جھگڑے پیش نہ ہوتے۔ علی گڑھ کے متعلق کچھ نہیں معلوم چونکہ No news is good news وہاں کی حالت اچھی ہوگی۔ اچھے اسٹاف کی ضرورت (ہے) اندرونی پروپیگنڈہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ اٹاوہ کے نام (کے) ساتھ امیر حسن، نفیس، وارثی یاد آتے ہیں۔ سوشل لائف اٹاوہ (کی) (۱۹۳۰ سے ۱۹۳۴ء میں اٹاوہ رہا) بہت اچھی تھی۔ ان سب کو سلام کہیے گا۔ امیر حسن صاحب کیا اب تک non-cooperation سے post office کا non کر رہے ہیں۔ جو میں خواہاں نہیں ہوں مگر قریشی صاحب (کے نام کے) خطوط سب پڑھیے گا۔

علی گڑھ میں سرسید کی پالیسی تو برٹش گورنمنٹ کے ساتھ ہو گئی۔ اب دوسری پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو اپنی ٹانگ پر کھڑا ہونا ہوگا۔ اقتصادی حالت درست کرنی پڑے گی اور ان کے کریکٹر اور تعلیم کو کم از کم پچیس فی صدی اونچا کرنا ہوگا۔ خطوط کا انتظار اگر کسی دن اور رات کو نیند نہیں آئی تو لکھوں گا۔

نیاز مند: ضیاء الدین احمد

یہاں چکاگو میں ایک (صفحہ ہ) Lasvre D'Cor جو یہاں Lawyer ہیں بہت خوشی ہوئی انھوں نے بھی آج سے تیس برس پہلے بالکل ان واقعات کے تحت میں جو مجھ کو کیمبرج (میں) پیش آئے بھول جانے کی مشق کی تھی اور مشق کرنے کا طریقہ ان کا اور میرا ایک ہے مجھے اس معاملے میں صرف انھی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس کے ساتھ جو اس کی Collary ہے وہ جب چاہیں اور جس قدر چاہیں سو سکتے ہیں۔ خط نہ لکھیے گا۔ اس وقت پرانے .... بہت سے سامنے:

لفافے کی نقل

Khan Bahadur
Moulvi Bashiruddin Sahib
Editor AL-BASHEER
ITAWA (U.P.) India

یہ خط امریکن ہوائی ڈاک دس سینٹ کے ہوائی لفافے پر لکھا گیا
مہر سے پتہ چلتا ہے کہ روانگی کی تاریخ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء ہے

فیروز پروین

سلطان ٹیپو کا علمی ذخیرہ

مسلمان حکمراں نہ صرف یہ کہ عالم اور صاحبِ فضیلت ہوا کرتے تھے بلکہ انھوں نے علم اور تعلیم کی اشاعت کا بھی بندوبست کیا۔ ان کے کتب خانے ان کے شوقِ علم، ان کی علمی قدردانی، ان کے کتب خانے کی آرائش کا اہتمام، ان کی جلد بندی کا طریقہ، یہ سب باتیں ان کے علم دوست اور حسنِ ذوق ہونے کا ثبوت ہیں آج بھی مسلمان بادشاہوں کے کتب خانوں کی بیش قیمتی کتابیں یورپ کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

شیرِ میسور فتح علی ٹیپو اور ان کے والد حیدر علی کا نام بھی علم پسند، علم پرور اور کتابوں سے محبت کرنے والے بادشاہوں کی صف میں آتا ہے۔ سلطان ٹیپو نے ۱۷۸۲ء میں اپنے والد حیدر علی کے انتقال کے بعد …ء تک بہادرانہ طور سے حکومت چلائی۔ ٹیپو کی شہادت کے بعد انگریزوں نے میسور کے ادب اور اس کے آثار بڑی حد تک مٹا دیئے۔ لیکن وہ ان آثارِ ادب کو پوری طرح نیست و نابود نہیں کر سکے۔ ایک طرف سرینگاپٹم کے کھنڈرات اس سلطنت کی شان و شوکت کی یاد دلاتے ہیں تو دوسری طرف اس دور کے بچے کھچے مخطوطات اپنے وقت کی علمی اور فنی فتوحات کا پتہ دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ دورِ سلطنت کل ۴۸ سال رہا لیکن حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے علوم و فنون کی اشاعت اور اہلِ علم کی ہمت افزائی میں غفلت نہیں برتی۔ یہی وجہ تھی کہ سرینگاپٹم اس زمانے میں علم و ہنر کا مرکز بنا رہا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کو اچھی اچھی کتابیں جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ انھیں جو بھی اچھی کتاب حاصل ہوتی اسے فوراً شاہی کتب خانے میں بھجوا دیتے۔

افسوس کہ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد انگریزوں نے انکا کتب خانہ بھی مالِ غنیمت میں شامل کر لیا۔ اس کتب خانے میں دو ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں۔ ان میں طب، تاریخ، شعر و ادب، لغات، فلسفہ، ریاضی، نجوم، موسیقی اور اسلامی علوم پر اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں کتابیں موجود تھیں۔ ان کتابوں کو بڑے اہتمام سے رکھا جاتا تھا۔ سب کی چرمی جلدیں تھیں۔ ان جلدوں پر محمدؐ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ" کے نام درمیان میں ہوتے تھے۔ چاروں کونوں پر خلفائے راشدین کے نام اور سب سے نیچے 'اللہ کافی' اور سب سے اوپر "سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحکیم" نقش ہوتے تھے۔

اسٹورٹ کے بیان کے مطابق سلطان ٹیپو کی نگرانی میں مختلف موضوعات پر ۴۵ کتابیں لکھی گئیں جو زیادہ تر قوانینِ سلطنت سے متعلق تھیں۔ لیکن افسوس کہ سلطنت میسور کی یہ علمی اور ادبی دولت کچھ تباہ ہو گئی تو کچھ انگریز لوٹ کر لے گئے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ریسرچ اسکالر کچھ اہم مخطوطات کو منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں جس سے اس دور کی علمی اور فنی فتوحات کا ہلکا سا نقشہ سامنے آتا ہے۔ سیرِ میسور کے کتب خانہ کی کتابیں آج مخطوطات کی شکل میں انگلستان، پاکستان اور ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی بہادرانہ موت کے بعد انگریزوں نے اس کتب خانہ کی قابلِ قدر قلمی کتب کچھ لندن منتقل کر دیں تو کچھ فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں اور کچھ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ کلکتہ میں۔

اسٹورٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانہ کی جو فہرست مرتب کر کے شائع کی اس کے مطابق اس کتب خانے میں تصوف پر ۱۵ کتابیں، فلسفہ پر ۲۶، فقہ پر ۵۴، حدیث پر ۴۶، دینیات پر ۹۵، قرآن کے نسخے ۴۴، دعائیں ۲۵، لغات ۲۹، اخلاقیات پر ۲۴، دکنی شاعری پر ۲۳، فنون شاعری اور سائنس پر ۱۹، نقشے ۱۸، دکنی نثر ۴ اور اردو اور ترکی نثر پر ۲ کتابیں شامل تھیں۔ اس کتب خانے میں قرآن شریف کا ایک ایسا نسخہ تھا جو پہلے اورنگ زیب کی ملکیت تھا اور آج ونڈسر کاسل کی لائبریری میں ہے۔ اس دور میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں فتح المجاہدین اور مفرح القلوب شائع ہو چکی ہیں۔

ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں قرآن شریف کا ایک ایسا نسخہ تھا جو ٹیپو کے علمی خزانے کا گوہر نایاب تھا۔ جو فن خطاطی اور جلد بندی کا نادر نمونہ تھا۔ اس قرآن کے پاکیزہ خط اور خوشنما جلد سے دربار شاہی

کی یادیں وابستہ تھیں۔ عالم گیر بادشاہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اس قرآن کی زیب و زینت پر ٹیپو سلطان نے ۹۰,۰۰۰ روپیہ خرچ کیا تھا۔

اسٹورٹ کے بیان کے مطابق یہ کتب خانہ دراصل شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے کتب خانوں اور نواب نصیر الدین اور عبدالوہاب خاں کے کتب خانوں کے آثار باقیہ پر مشتمل تھا۔

شیر میسور اور علم دوست ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں محمد قلی کتب شاہ (۱۵۸۰ - ۱۶۱۱) کی کلیات اور شعراء دکن کی کئی قابل قدر مثنویاں شامل تھیں۔ ان میں عادل شاہی عہد کے بلند پایہ شاعر محمد نصرت نصرتی کی سب سے مشہور مثنوی علی نامہ (۱۶۷۴ء)، ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" (۱۶۵۵ء)، غواصی کی نظم "طوطی نامہ" (۱۶۳۹ء) طبعی کی مثنوی "بہرام و گل اندام" (۱۶۷۰ء)، فائز کی مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" (۱۶۸۳)، عاجز دکنی کی مثنوی "لعل و گوہر" یہ سب مثنویاں ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں انعام اللہ یقین کا دیوان بھی شامل تھا۔

ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں ایک اور روح افزا کتاب "نشاط العشق" تھی جس کو شیخ عبدالقادر جیلانی نے لکھا تھا۔

ترجمہ: ڈاکٹر اکمل ایوبی

ایک ترکی نظم

گوک آلپ کی نظم جس کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے مساوات مرد و زن سے متعلق ہے۔ اس نظم کا اصل ترکی عنوان "عائلہ" یعنی خاندان یا کنبہ ہے اور یہ بھی ان کے "ینی حیات" نامی مجموعۂ کلام میں موجود ہے۔ اس کا اردو ترجمہ اس طرح ہے ؎

وہ ایک عورت ہے جو میری ماں یا میری بہن یا میری بیٹی ہے
وہ وہی ہے جس نے مجھ میں بہت ہی مقدس جذبات پیدا کیے ہیں۔
وہ بھی ایک عورت ہی ہے جو میری محبوبہ ہے، میرا دن ہے، میرا چاند ہے،
میرا ستارہ ہے۔
اسی نے مجھے میری حیات کی شاعری کا مفہوم سمجھایا ہے
ایسی مخلوق شریعت کی نظر میں کیسے حقیر ہو سکتی ہے ؟
یقیناً مفسر کی تعبیر غلط ہے !
اس ملت کی اساس، ملک کی اساس کنبہ ہے
اگر عورت کی تکمیل نہ ہوتی تو یہ زندگی نامکمل رہ جاتی
کنبے میں عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ بنیادی اصولوں
نکاح، طلاق، میراث؛ ان تینوں میں مساوات ہو
جب تک وراثت میں بیٹی کو بیٹے سے آدھا اور بیوی کو ایک چوتھائی ملے گا
نہ کنبے کی ترقی ہوگی نہ مملکت کا ارتفاع
دیگر حقوق کے لیے ہم نے ملی عدالتیں قایم کی ہیں
لیکن کنبے کے معاملات مدرسوں ہی کے ہاتھوں میں ہیں
نہ معلوم ہم کیوں عورت کے متعلقہ مسائل سے بھاگتے ہیں
کیا اس نے ترکوں کے وطن کے لیے کوئی محنت نہیں کی ؟
کیا ہم   کہ وہ اپنے ہاتھ کی سوئی کو خونی سنگین بنالے اور
اپنے حقوق کو ہمارے پنجوں سے بغاوت کے ذریعے حاصل کرے ؟

حکیم محمد مختار اصلاحی

تمباکو نوشی

آج کی اس دنیا میں تمباکو کے استعمال کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ سگریٹ، بیڑی، پان، حقہ، پائپ اور سگار کے علاوہ دیگر لوگ تمباکو اور اس کے مرکبات کو براہ راست استعمال کرتے ہیں اور بعض ناک اور دانت کے ذریعے بھی۔ کم و بیش یہ سارے ہی طریقے جسم کے لیے نقصان دہ ہیں، کیوں کہ ان سب ذریعوں سے تمباکو اور اس کے زہریلے اثرات جسم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان تمام طریقوں میں آج کل سگریٹ نوشی کا رواج سب سے زیادہ ہے۔ اس کا سبب، دساعٹی کا فیشن ہے جسے صنعتی اشتہارات، فلمیں اور ٹیلی ویژن تیزی سے پھیلا رہے ہیں۔ عالمی تنظیم کے جائزے کے مطابق صرف سگریٹ کے اشتہارات پر دو ارب ڈالر سالانہ خرچ کیے جاتے ہیں۔ تمباکو نوشی کے ہلاکت خیز نتائج کا اندازہ اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔ صرف برطانیہ میں سالانہ پچاس ہزار آدمی تمباکو نوشی سے پیدا شدہ امراض میں مرتے ہیں۔ امریکہ، کناڈا، ڈنمارک، ہالینڈ اور سویڈن وغیرہ کے ملک بھی تقریب قریب یہی ہیں۔ یہ حال تو ترقی یافتہ ملکوں کا ہے جہاں بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں کا حال تو ان کی غربت کی وجہ سے اور زیادہ خراب ہے۔ غریب طبقہ اور دیہات کے لوگ زیادہ تر بیڑی یا چونا تمباکو استعمال کرتے ہیں۔ پان کا شوق رکھنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں، اس شوق میں عورتیں بھی برابر کی شریک ہیں۔

تشویش اور فکر کی بات یہ ہے کہ ماحول کے بگاڑ کی وجہ سے اب چھوٹے چھوٹے بچے اور کم عمر کے طلباء بھی تمباکو نوشی کی اس خطرناک عادت کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں تمباکو نوشی کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ ماحول کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے جو والدین سگریٹ، بیڑی، حقہ اور پان وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اکثر اُن کے بچے بھی اُس کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ اسکول و کالج کے وہ طلبا جو تمباکو نوشی کی کسی عادت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اپنے ساتھیوں کو بھی متاثر کرتے ہیں اور ایسے اساتذہ بھی معاون بنتے ہیں۔ بعض لڑکے اپنی شخصیت کو نمایاں اور ممتاز کرنے کے لیے بھی سگریٹ نوشی اختیار کرتے ہیں اور کچھ تسکین کی جستجو اور غم غلط کرنے کے خیال سے بھی اس خراب عادت کے ہدف بنتے ہیں۔

حالیہ تحقیقات کی روشنی میں تمباکو میں بہت سے مضر اجزاء پائے جاتے ہیں، ان میں حسب ذیل خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ نکوٹین :۔ یہ ایک خطرناک قسم کا زہر ہے جو دل و دماغ اور گردوں کو بُری طرح متاثر کرتا ہے۔ بلڈ پریشر کو بڑھاتا ہے، دل کے پردہ شگاف اور خون کی رگیں بھی سخت کمزور ہو جاتی ہیں۔ صرف ۔۔ ملی گرام نکوٹین ایک جوان آدمی کا مکمل تنفس منقطع کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ زہر سانس اور بدن کی درجہ حرارت کو بھی گھٹا دیتا ہے۔ اس کی زیادتی اچانک موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

۲۔ پروسک ایسڈ :۔ یہ بھی ایک قوی زہر ہے۔ اس کی وجہ سے درد سر، چکر اور متلی وغیرہ کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ ایکرولین :۔ یہ عام طور سے گھٹیا قسم کے تمباکو میں پایا جاتا ہے۔ اس سے دماغ خلل اور بینائی میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ کولی ڈین :۔ جسم میں ڈھیلا پن پیدا کرتی ہے۔ تمباکو میں مخصوص بو اسی کی ہے۔

۵۔ نیوکلالین :۔ یہ بھی ایک مہلک زہر ہے اس کی معمولی مقدار بھی کتے کو ہلاک کر دیتی ہے۔

۶۔ بنزو پائرین :۔ کول تار کے مانند ایک مادّہ ہے جو سرطان پیدا کرنے میں معاون ہے۔

۷۔ پائرڈین :۔ یہ مادّہ بھی سرطان پیدا کرتا ہے۔

۸۔ فرفیورل :۔ یہ اعصاب کو کمزور کرتا ہے۔ دماغی اور اخلاقی کمزوریوں کا باعث بنتا ہے۔

۹۔ آرسنک ۔ تنہا بھی اور دوسرے اجزا سے مل کر معدہ، جگر اور اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔ اگزیما اور سرطان کے لیے بھی معاون ہے۔

۱۰۔ میتھائل الکوحل :۔ ذیابیطس کے مریضوں میں مستقل اور عام لوگوں میں عارضی اندھاپن پیدا کرتی ہے۔

۱۱۔ کاربن مانو آکسائڈ :۔ آکسیجن کی سپلائی کو بند کر کے غشی، فالج، رعشہ اور تشنج جیسے امراض پیدا کرتی ہے۔

۱۲۔ کاربالک ایسڈ :۔ گلے اور سانس کی نالیوں میں سوزش پیدا کرتا ہے اور منہ میں کینسر کا باعث ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایسے اجزا ہیں جو جسم کے لیے نقصان دہ ہیں۔

جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

...

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی نہیں ہے
فیض

تمباکو نوشی کے مجموعی نقصانات ایک نظر میں :۔

تمباکو نوشی سے بے خوابی، دماغی کمزوری، بدحواسی، مرگی، دمہ اور بلڈ پریشر جیسی شکایتیں عام ہیں۔ جرمن اور امریکہ کی تحقیقاتی رپورٹ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زبان، گلے، ہونٹ اور پھیپھڑے کے کینسر میں سب سے اہم سبب تمباکو نوشی ہے۔ بدہضمی، زخم معدہ، سل، دق، کمزوری، نامردی، ذیابیطس اور ہڈیوں کی خستگی میں بھی تمباکو نوشی کے اثرات نمایاں طور سے دیکھے گئے ہیں۔

بچوں میں تمباکو نوشی کے اثرات خاص طور سے بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ جسمانی اور ذہنی طور سے ناکارہ اور اخلاقی طور سے نہایت پست ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ دماغی خلیات اور اخلاقی حس بچپن ہی میں نمو پاتے ہیں اور نکوٹین اس کی نشو و نما کو روک دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بچوں کے اندر بہت سی خرابیاں و برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چڑچڑاپن، چھچھوراپن، جھوٹ، دھوکہ دہی اور چوری وغیرہ میں ملوث ہو کر آخر یہی بچے جیلوں میں جا کر اپنی زندگی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

عورتوں میں تمباکو کے نقصانات مردوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتے ہیں نکوٹین اور دوسرے مضر اجزا کے خراب اثرات کو عورتیں جلد قبول کر لیتی ہیں۔ ان کے چہروں کی رونق، آنکھوں کی چمک و کشش، لبوں کی نزاکت بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ عورتیں جلد اپنا نسوانی حسن کھو بیٹھتی ہیں اور وقت سے پہلے بوڑھی نظر آتی ہیں۔ بعض عورتوں میں تولید کی صلاحیت بھی کم ہو جاتی ہے اور جو بچے پیدا ہوتے ہیں، ان کی صحت اچھی نہیں رہتی۔

تمباکو نوشی سے چھٹکارا کیوں کر حاصل کیا جائے؟

اس کا جواب کچھ اتنا آسان نہیں۔ کیوں کہ جو لوگ ایک مرتبہ اس بُری عادت کی گرفت میں آ جاتے ہیں وہ جلد نکل نہیں پاتے۔ تمباکو نوشی اعصاب کو متاثر کر کے انسان کی قوتِ ارادی کو بھی کمزور کر دیتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنے حالات اور صحت کی خرابی سے مجبور ہو کر چھوڑنا بھی چاہتا ہے تو اس کی قوتِ ارادی اس کا ساتھ نہیں دیتی

پھر آج یہ ایک انفرادی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے ہر ملک کی بیشتر آبادی اس مضر و مہلک عادت کی شکار ہے۔ اس لیے اس کی روک تھام کے لیے اجتماعی طور پر ہی غور کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جب تک ہر جہتی کوشش اس کو ختم کرنے کے لیے اختیار نہ کی جائیں گی، اس وقت تک اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔

اس عادت کی روک تھام میں سب سے اہم رول حکومتِ وقت کا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اس کو اپنے منافع کا ذریعہ نہ بنائے۔ حکومت جب تک یہ سوچے گی کہ سگریٹ بیڑی اور پان وغیرہ پر بندش لگانے سے اس کی آمدنی کم ہو جائے گی، اس وقت تک وہ کوئی موثر قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ عوام کے بہلاوے کے لیے سگریٹ کے پیکٹوں پر صرف یہ لکھوا کر مطمئن ہو نا کہ "یہ نقصان دہ ہے" مضحکہ خیز بات ہے۔ تمباکو کی کمپنیاں اپنے وسیع اور زور دار اشتہاری ذرائع سے اس طرح کے نصیحت آمیز جملوں کو بآسانی بے اثر بنا دیتی ہیں حکومت جب تک تمباکو کی روک تھام کے لیے کوئی موثر اور ایماندارانہ قدم نہیں اُٹھائے گی، اس کا انسداد ممکن نہیں۔ سب سے پہلے تمباکو کی کاشت پر پابندی لگائی جائے اور اس کی جگہ کسانوں کو دوسری نفع بخش چیزوں کو اگانے کی ترغیب دی جائے۔

تمباکو سے بنی ہوئی ہر چیز پر سختی سے پابندی لگائی جائے اور اس کی تشہیر کے تمام ذرائع بند کیے جائیں۔ تمباکو نوشی کے نقصانات پر فلمیں بنائی جائیں اور اخبارات میں اس کے مہلک اثرات کو نمایاں طور سے شائع کیا جائے۔ اسکولوں میں ہر ماہ بچوں کے لیے ایسے پروگرام تیار کیے جائیں جس میں تمباکو کی ہلاکت خیزیاں بتائی جائیں۔ تمام اطباء و معالجین بھی اپنے مطب اور دواخانوں میں مریضوں کو تمباکو کے سخت ترین نقصانات سے آگاہ کر کے ان کو اس سے دور رہنے کی تلقین کریں اور گھر کے لوگ بھی اپنے بچوں پر اس بات کی نگرانی رکھیں کہ وہ تمباکو اور تمباکو نوشوں کے قریب نہ جائیں یہ تو ہوئی اجتماعی کوشش۔

انفرادی طور پر جو لوگ اس بُری عادت کو چھوڑنا چاہیں، اُن کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے۔ اگر ان کی صحت اچھی اور قویٰ مضبوط ہیں تو اُن سے کہا جائے کہ وہ اپنی قوتِ ارادی کو مضبوط کر کے ایک ہی بار چھوڑ دیں اور اگر صحت خراب یا قوتِ ارادی کمزور ہے تو اُنھیں بتدریج چھڑایا جائے۔ تمباکو کی جگہ ایسی دوائیں دی جائیں جو مضر اثرات کو کم کر کے تقویت کا باعث ہوں۔ خمیرہ گاؤ زبان عنبری جدوار عود صلیب والا، خمیرہ عنبری جواہر والا۔ دواء المسک جواہر والی، خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا۔ معجون اعضاء رئیسہ اور حب مقوی اعصاب اور حب جند وغیرہ اس کام کے لیے کامیاب و مجرب دوائیں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ طبیب کے مشورے سے اسے استعمال کیا جائے پیٹ صاف رکھنا، تازہ پھل اور سبزیوں کا استعمال کرنا، سورج نکلنے سے پہلے صاف ہوا اور کھلی فضا میں ٹہلنا، گہرے سانس لینا اور بلا ناغہ روزانہ غسل کرنا یہ سارے ہی عمل تمباکو چھوڑنے کے وقت نہایت ہی مفید و معاون ہوتے ہیں۔ ✱

رمضان علی ایڈوکیٹ، بنارس

یادوں کے جھروکے سے

آج پھر دوپہر کی خاموشی توڑتی ہوئی یہ آواز گونجی ـــ

"یا خدا مولانا پر پھر کوئی افتاد آئی" مارسین کورٹ کے کمرہ نمبر ۱۶ سے کمرہ ۱۲ کی طرف بھاگا۔ دیکھا مولانا غصہ سے ہانپ رہے ہیں۔ لحاف فرش پر پڑا ہوا ہے۔ اسلم تبسم زیر لب اپنی چارپائی پر بیٹھے ہیں اور کنور اسد کو مولانا خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اندر ہی اندر اسد بھی اس سے محظوظ ہو رہے ہیں۔

"آج پھر وہی حرکت کیوں!" میں نے دریافت کیا۔

"سارا کیا دھرا حضور کا ہے اور واہ رے معصومیت"۔ اسد بولے

"معموں میں باتیں نہ کریں" میں نے وضاحت چاہی۔

"حضرت آپ سے شاعری کرنے کو کس نے کہا تھا۔ اگر آپ شاعری نہ کرتے تو کون سا آسمان پھٹ پڑتا۔ شوق ہی تھا تو مولانا کو اپنی شاعری کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ کیوں بنایا۔ دن ہو رات یہاں تک کہ دوپہر کا گھڑی بھر کا آرام بھی حرام کر دیا ہے۔ وہی بے تکا الاپ وہی بے سری نغمہ سرائی۔ ہر وقت تصور ہے انکا دن رات کی کوئی قید نہیں۔ ان کے لئے رات کی قید نہ ہو مگر ہمیں تو رات دن کا بہتر مصرف کرنا ہے۔"

مولانا گرجے۔" خاموش" سر توڑ دونگا۔ تم شئے لطیف سے عاری ہو تو اس میں میرا کیا قصور!"

اسد "آخر آپ کو کس نے منع کیا ہے کہ یہ شعر مولانا کی نذر نہ کر دیں۔ اس شعر میں کوئی خاص صنعت بھی نہیں۔ نہ ندرت خیال، نہ شوکت الفاظ۔ محض جذبات کے اظہار کو تو شاعری نہیں کہتے ـــ پھر آپ کو شاعر کہتا کون ہے"

"بھائی اگر میں نے شاعر ہونے کا کبھی دعویٰ کیا ہو تو میں گنہگار اور آپ سب گواہ رہیں میں خدا کو حاضر ناظر جان کر، بہ ثبات عقل و بدستی ہوش و حواس بلا جبر و کراہ یہ ایک شعر کیا اپنی ساری اگلی پچھلی بکواس بحق مولانا محفوظ کرتا ہوں۔"

مولانا کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ ہنس پڑے۔ کمرہ میں ایک قہقہہ گونجا اور یہ کمرہ ۱۲ کے ہم نوالہ و ہم پیالہ عبدالعزیز صاحب تھے جو دروازے پر کھڑے ہوئے ان باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

مولانا سے میری ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ مجھے قطعی یاد نہیں نہ یہ یاد ہے کہ مولانا بذات خاص مجھسے ملنے آئے تھے یا میں ان سے ملنے گیا تھا کلاس میں دار المطالعہ میں، راستہ میں یا کمرہ میں بالارادہ یا بلا ارادہ ـــ یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے ـــ خود مولانا اس پہ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ مولانا کی کشش اور ان کی محبت ہی مجھے مارسین کورٹ لے گئی۔ اور یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ثابت ہوا کیونکہ علی گڑھ کی ساری دلچسپیوں اور اس مضمون کا سارا مواد اسی ایک ملاقات کی دین ہے۔

مارسین کورٹ کا گیٹ کمرہ نمبر ۱۰ و نمبر ۱۱ کے درمیان یونین ہال کی جانب کھلتا تھا۔ اسی راستے سے نکل کر باب العلم سے ہوتے ہوئے ہم لوگ اپنے کلاس جانے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ ـــ۔ مولانا اکثر و بیشتر ساتھ ہی ہوتے تھے۔

یہ مولانا کی قربت ہی کا حاصل تھا کہ محمد اسلم (بدایوں) کنور اسد (میرٹھ) اور عبدالعزیز (فتحپور) سے بھی قریب تر ہو گیا تھا۔ ہم سب سال آخر یعنی ایم۔ اے (فائینل) کے طالب علم تھے۔ مضامین مختلف درجے الگ الگ مگر دل ایک، سوچنے کا انداز ایک، سب کا غم ایک اور سب کی خوشی ایک تھی۔

آیئے میں آپ کی ملاقات مولانا سے کرادوں۔ نام نہ بتا سکونگا کیونکہ وہ وکیل ہیں اور ڈر ہے کہ ازالۂ حیثیت عرفی کا مجرم نہ قرار دیا جاؤں۔ ایک دبلا پتلا نوجوان، خوش شکل، خوش گفتار، نیک رو، داڑھی مونچھوں سے بے نیاز آنکھوں پر چشمہ، اپنے آپ میں ایک کشش لئے ہوئے۔ خود اپنے خیالوں میں گم۔ کبھی کوئی شعر یا مصرعہ زبان پر چڑھ گیا تو ہفتوں بلکہ مہینوں اٹھتے بیٹھتے تختۂ مشق بنا رہا۔ شیروانی، ترکی ٹوپی، علی گڑھ پائجامہ۔ کمر سے شانہ کے درمیان قدرے خم۔ جوتا موسم کے ساتھ رنگ بدلتا ہوا۔ صانع نے اس پر جو ایک بار پالش کر دی تو پھر ساری زندگی وہ دوسری پالش کا رہین منت نہ ہوا۔ جسم

ہی تاریخ اسلام کے کلاس میں جاتا اور وہ تواریخ یورپ کے۔ مگر شام کو قانون کے درس ساتھ ہی لیتے تھے۔ اسلم بھی ساتھ ہوتے۔ مولانا کو میری ذات سے خصوصی خلوص و محبت تھی۔ کسی ساتھی نے چھیڑ دیا تو اس کی شامت آجاتی میرے لئے نہ تو کوئی قید تھی نہ مجھسے کبھی خفا ہوتے تھے۔

مولانا کی چارپائی ان کی ساری کائنات تھی۔ اسی پر گندے و صاف کپڑے، اسی پر کتابیں، اسی پر مطالعہ، وہی لائبریری۔ موسم کی تبدیلیوں سے بے نیاز ہمیشہ، ہر موسم میں، خواہ مئی جون کی گرمی ہی کیوں نہ ہو یہاں تک کہ دوپہر میں بھی مولانا لحاف میں لپٹے ہوئے ملتے۔ اس زمانہ میں ہمارے کمروں میں نہ پنکھے تھے اور نہ ہم خود اپنا ذاتی انتظام کر سکتے تھے۔

ایک دوپہر کو آپ ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ آپ کے سلام علیکم کے جواب میں لحاف کا ایک ہاتھ نکلا جس میں ایک پرزہ ہوتا جس پر لکھا ہوتا "میں آج چپ کا روزہ ہوں"۔ یہ ان کا اکثر معمول تھا۔

ایک بار معلوم ہوا کہ مولانا جو روزے رکھ رہے ہیں وہ ایک سحری و ایک افطار سے تین دن گذارتے ہیں۔ مجھے ان کے اس غیر اسلامی فعل پر غصّہ آیا۔ پہلے تو سخت سست کہا۔ پھر کافی سمجھانے بجھانے پر وہ روزانہ کی سحری و افطار پر روزے رکھنے کے لئے راضی ہوئے۔ یہ ہفتوں روزے رکھتے۔ اور اب تو وہ سالوں روزہ رکھتے ہیں۔ اسی روزے کی حالت میں سخت گرمی کے موسم میں بھی اپنے پیشہ پر پوری توجہ دیتے ہیں۔

ایک روز یونیورسٹی اور ہاسٹل کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے پر ہم سب اس نتیجے پر پہنچے کہ ابتک ہم صرف طالب علمی کی زندگی کے حصول علم کے پہلو تک محدود رہے۔ یونیورسٹی اور ہاسٹل کی کسی ACTIVITY میں کوئی حصّہ نہیں لیا سوائے اس کے کہ اللہ میاں کی خوشنودی کے لئے مولانا کو داروغہ نماز مقرر کرایا گیا۔ اب یہ مولانا کا اپنا فعل تھا کہ طلباء کی حاضریاں وہ ایمانداری سے لگاتے تھے یا نہیں۔ اس کا مواخذہ تو ان پر تھا۔

ان دنوں سینیئر فوڈ ہال (یعنی داروغہ مطبخ کلاں) کا مسئلہ درپیش تھا طے پایا کہ ہم بھی میدان میں آئیں گے۔ اور اب آخری دور طالب علمی میں صرف روکھی سوکھی سے کام نہیں چلے گا۔ ابتک تو ہم چار روٹی اور دو بوٹی پر قانع تھے۔ اپنا دستر خوان بھی انواع و اقسام کے اکل و شرب سے مزین ہونا چاہئے تھا۔ مقابلہ آسان نہیں تھا۔ چار ہوسٹلوں کا مقابلہ تھا۔ بڑے بڑے پہلوان طلباء میدان میں تھے۔ پھر بھی ہر حال میں یہ معرکہ عبدالعزیز صاحب ایسے کمزور (جسمانی اعتبار سے) نمائندہ کو لے کر سر کرنا تھا۔ ہاسٹل کے کئی ساتھی پیروی میں لگ گئے۔ کنور سعید اللہ خاں (بڑے بھائی) نسیم خاں اور حافظ محمد صابر وغیرہ۔ مولانا سے دعائیں لی گئیں۔ راقم الحروف اور محمد اسلم غیر جانب دار ہو کر میدان میں آئے۔ یہیں سیاست کا پہلا سبق ملا۔ لوگوں نے وارڈن اور پرووسٹ کے یہاں چکر لگانے شروع کئے۔ ہم دونوں تو غیر جانب دار ممبر کی حیثیت سے تھے۔ آخر پرووسٹ صاحب نے فیصلہ ہم دونوں کی رائے پر ملتوی رکھا۔ ہم نے مہلت مانگی تاکہ مسئلہ کے ہر پہلو پر خوب غور کیا جا سکے؟ یہ تو ایک حیلہ تھا۔ مقصد تو سامنے تھا آخر وہی ہوا جو ہونا تھا، ہم نے عبدالعزیز صاحب کو ترجیح دیا اور وہ منتخب ہو گئے۔ اس طرح یہ معرکہ سر ہوا۔

اب ماربین کورٹ کی بن آئی۔ روزانہ دو چار ساتھی دستر خوان پر آجاتے تھے۔ یہ سلسلہ آخری دوران قیام تک جاری رہا۔ کمرہ ۴۱ جو ہم دونوں کا مستقل ڈائننگ روم تھا۔ مزید وسیع ہو گیا۔ کبھی کبھی دوسرے ہاسٹل سے بھی احباب آجاتے۔ ان سب باتوں کے باوجود عزیز صاحب اپنے فرض کو نہیں بھولے برابر کھانے کے معیار پر نظر رکھی۔ خود جاکر باورچی خانہ میں چیکنگ کرتے تھے سارے طلباء ان کی کارگذاری سے مطمئن تھے۔ ورائٹی کا معیار بھی بلند ہو گیا تھا۔

اس سے فرصت ملی تو یونیورسٹی کی دیگر تحریکات کا جائزہ لیا گیا۔ ان دنوں سال میں ایک بار اسلامی ہفتہ منایا جاتا تھا۔ جس میں ملک کی جانی مانی علمی و دینی ہستیاں مدعو کی جاتیں جو اپنے مقالات پڑھتی تھیں۔ مولانا مودودی، مولانا دریا بادی، قاری محمد طیب کے مقالے کتابچہ کی شکل میں شائع بھی ہوئے ان میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی۔ تاریخ اسلام کے طالبعلم کی حیثیت سے اس میں مجھے بھی ذمہ داریاں سپرد تھیں، خواجہ حسن نظامی مرحوم بھی آئے۔ خواجہ صاحب یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں بھی ضرور شریک ہوتے۔ وہ ایک منفرد طرز تحریر کے مالک تھے۔

یونین کا الکشن سر پر آرہا تھا۔ یاران طریقت نے اس میں حصّہ لینا طے کیا۔ مگر رکاوٹ یہ تھی کہ سال آخر کے طالب علم کا انتخاب بہت مشکل ہوتا تھا۔ کیونکہ چندماہ بعد وہ اپنی جگہ خالی چھوڑ کر کارزار حیات میں گم ہو جاتا تھا۔ یہ زبردست رکاوٹ کیسے دور کی جا سکتی تھی۔ پھر الکشن برائے الکشن لڑنا طے ہوا۔ مسئلہ امیدواروں کے انتخاب کا تھا۔ ان دنوں راقم کے افسانے تو کم مگر غزلیں اور نظمیں ہندوستان کے اکثر رسائل میں شائع ہوتی تھیں وہ بھی فرضی نام سے یا تخلص سے۔ اس راز کو صرف دو ایک حضرات جانتے تھے جن میں ہمارے دوست بھی تھے۔ اس لئے قرعہ فال بنام من دیوانہ زدن اور میں امیدوار ٹھہرا۔ اب اور مراحل طے ہونے تھے۔ اخراجات کی کفالت مشترکہ ٹھہری۔ ایک ساتھی نسیم فیض آبادی نے پوسٹر کی کتابت کی اور شایع کرایا۔ اوصاف و کارگردگی کی ایک فہرست اُردو و انگریزی میں ترتیب دی گئی۔ مونس رضا صاحب نے ان پر نظر ثانی کی اور اُردو کی فہرست پر اقبال کا یہ شعر تحریر کیا ؎

رہی مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

چھوٹے کارڈ چھپے — میری امیدواری کے کاغذات داخل ہوئے کمرہ نمبر ۲۴ میرا انتخابی دفتر بنا۔ ہونیاں کا ساری تفصیلات تو یاد ہیں مگر یہی بھول گیا ہوں کہ کس عہدہ کے لئے امیدوار تھا۔

یہاں ایک واقعہ کا ضمنی تذکرہ ضروری ہے۔ پوسٹر چسپاں ہوئے تو ایک دن ایک صاحبزادے مجھ سے ملنے آئے۔ فرمانے لگے کہ کافی دنوں سے تلاش کر رہا ہوں مگر ایک ہاسٹل میں رہنے کے باوجود ناکام رہا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سال دوئم کے طالب علم خلیل الرحمٰن صاحب ہیں۔ کمرہ ۱۸ میں رہائش پذیر ہیں۔ اعظم گڈھ کے اس گاؤں کے رہنے والے ہیں جہاں میرا ننیہال ہے۔ یہی حضرت آگے چلکر خلیل الرحمن اعظمی ہوئے جنھوں نے اردو زبان وادب میں اپنا مقام پیدا کیا مگر افسوس کہ شمع حیات وقت سے پہلے ہی گل ہو گئی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

ان کے کمرے میں رسالہ 'اضطراب' کا سرورق فریم کیا ہوا آویزاں تھا اس رسالہ کی ابتدا ابھی تھی۔ بنارس سے شروع ہو کر لکھنؤ میں ختم ہو گیا۔

خلیل صاحب اکثر و بیشتر میرے ساتھ رہتے اور انتخابات میں دل کھول کر میرا کام کیا — علی گڑھ میں ان کی کمی کا مجھے شدت سے احساس ہوا ہے۔ انتخابات سے چند دن قبل امیدوار اپنے کمرہ میں معتکف ہو جاتا تھا۔ اس کمرہ کے اندر یا باہر اس کی امیدواری کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا تھا۔ میں بستر پر پڑا مطالعہ میں مصروف رہتا یا کچھ لکھتا پڑھتا تھا۔ اس وقت بہت لطف آتا جبکہ میرے حریف امیدوار کے کارکن مجھے CONVESS کرتے اور یکے بعد دیگرے کئی گروپ آتا۔ اس وقت ووٹ کا تعلق امیدوار کی شخصیت سے نہیں ہوتا تھا بلکہ طلبا اس کے اوصاف و کارکردگی پر نگاہ رکھتے تھے۔

امیدواروں کے ووٹ کا علیحدہ انتظام ہوتا۔ شام کو امیدوار اپنے سینیر کارکن کے جلو میں ووٹ دینے جاتا۔ اور یونیورسٹی کی صحتمند روایات کے تحت اپنے کسی حریف کو ووٹ دیتا۔

نتیجہ نکلا تو امید کے مطابق میں ہار گیا۔ کسی کو کوئی افسوس نہ ہوا اس لئے کہ سبھی ذہنی طور پر اس خبر کے لئے تیار تھے۔

دوسری صبح کو معلوم ہوا کہ رات کو جنازہ ہاسٹل میں آیا۔ مرثیے پڑھے گئے مگر اس کا نشانہ صرف سنیر کارکن تھے۔ امیدوار سے کوئی مطلب نہ تھا صبح ہونے پر ساری تلخیاں طاق نسیاں پر رکھدی گئیں اور زندگی معمول پر آگئی۔

ماریسن کورٹ کے کمروں کی تعداد باب العلم سے شروع ہوتی! ابتدائی چند کمرے بطور مسجد استعمال ہوتے تھے۔ کمرہ ۸ میں خلیل الرحمٰن ۱۲ میں انیس، مونس، رضا، نبی رضا ۱۴ میں مولانا اسد اسلم اور ۲۲ میں عزیز صاحب تھے۔ ایک کڑی میں کچھ اس طرح مربوط تھے کہ ایک ہی کمرہ بن کر رہ گئے تھے۔

کنور اسد علی اس وقت امریکہ میں بحیثیت ڈاکٹر اسد نعیم ہی نہیں ہیں بلکہ شہری ہو گئے ہیں۔ بہ اصرار رہتے ہیں۔ عبدالعزیز صاحب کا ۳۰ سال کے بعد پتہ چلا۔ اس وقت ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب دلی میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں۔ ان کے خطوط محبت و خلوص کا گلدستہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد انس صاحب مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دوا سازی سے منسلک تھے اللہ کے پیارے ہو گئے۔ ڈاکٹر مونس رضا صاحب بر ... [illegible] یونیورسٹی میں ایک اہم حیثیت کے مالک ہیں۔ اور نبی رضا صاحب نے اعظم گڑھ میں وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔

دوستوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ مگر ذہن کے کسی کونے میں یادوں نے گھر کر رکھا ہے۔ مولانا سے مراسلت و مکاتبت کے علاوہ شرف نیاز بھی حاصل ہو جاتا ہے وہ بھی اگر کبھی میں ہمت کر کے ان کے پاس چلا جاؤں ورنہ حضرت تو میرا ڈاک کا پتہ کھو دیتے ہیں۔ بھول جاتے ہیں۔ بنارس آنے کا وعدہ ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ وکالت کے علاوہ کھیتی و آموں کے باغات کے مالک ہیں۔

ہاسٹل کی ایک ہستی کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو یہ داستان نامکمل رہ جائے گی۔ یہ تھے ہمارے اور سب کے نواب محمد الیاس صاحب۔ یہ آخر تک پتہ نہ چل سکا کہ وہ کب سے ہاسٹل میں تھے اور کب وہاں سے رخصت ہوئے۔ ہاں اتنا ضرور سنا تھا کہ ان کے صاحبزادے بھی ہاسٹل میں آگئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ دشمنوں نے اڑائی ہو۔

نواب صاحب ہر وقت نوک پلک سے درست رہتے۔ چوڑی دار پائجامہ جس کی شکنوں پر خصوصی توجہ صرف کرتے۔ جوتے کی پالش پر نا قدانہ نگاہ رہتی، اگر یادداشت ساتھ دے تو سر سے نیز دستار ... [illegible] کئے ہوئے۔

چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، انگلیوں میں انگوٹھیاں اور ہاتھ میں چھڑی ہوتی۔ نہ تو کبھی یہ معلوم کرنے کی ضرورت سمجھی کہ وہ کس کلاس میں ہیں۔ ان کے اوقات کس طرح صرف ہوتے تھے یہ بھی پتہ نہ چل سکا۔ حال میں ان کے ایک ہموطن کی زبانی معلوم ہوا کہ اندنوں اپنی ارضیات کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔

ایک اور واقعہ میرے ذہن میں ابھر رہا ہے۔ معلوم نہیں کس سن کی بات ہے۔ کسی صاحب کو 'بلنڈر بوائے' کا لقب دیدیا گیا۔ رات میں

سائرن کی آواز ختم ہوتے ہی ساری یونیورسٹی بلند ریوڑ کے نعرے سے لرز اٹھی۔ چند ماہ میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس سے کسی کی تضحیک مقصد نہیں تھا۔ بلکہ جہاں تک معلوم ہوا کہ وہ ذات شریف بھی اس نعرہ میں شریک ہوتے اور بہت محظوظ ہوتے۔

خالی پیریڈ یا وقفے دارالمطالعہ کی نذر ہوتے یا ہم لٹن لائبریری سے کتابیں اپنے نام جاری کراتے۔ میرے لئے تو لائبریری میں ایک خاص رعایت تھی کہ اندر جاکر کتابیں اپنی مرضی کی نکال لاتا۔ یہ اسسٹینٹ لائبریرین مولانا طفیل صاحب کی خصوصی مہربانی تھی۔ مولانا نیک طبیعت، سادہ اور پُرشفقت بزرگ تھے۔ ہموطن ہونے کی وجہ سے سخت نظر بھی رکھتے تھے۔ باب اسحٰق کے قریب رہائش رکھتے تھے۔ انھیں کی خصوصی مہربانی سے الہلال، ہمدرد، کامریڈ کی فائیلیں اور "تہذیب الاخلاق" کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اولذکر پرچوں سے ہندوستانی سیاست و تحریک آزادی کے خطوط و نظریات واضح ہوئے، تو آخرالذکر سے ہندوستانیوں، خاص طور مسلمانوں کی نثر نویسی کیلئے نئی راہیں نکالیں۔ مگر سرسید کو ہم بلاشبہ نئی نثر کے بانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ جہاں انھیں بچھڑے ہوئے مسلمانوں کی فکر کھا رہی تھی وہیں وہ ہندو مسلم اتحاد کے بھی زبردست علمبردار تھے اور ان کی تحریروں میں کئی جگہ یہ نظریات ملتے ہیں۔ سرسید کی نثر کو اگر ہم میدانی دریا کی تیز موجوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں کبھی کبھی آہستہ خرام پانی سے بھی تو مولانا آزاد کی زبان کو پہاڑی آبشار سے مشابہت دی جا سکتی ہے جو پہاڑوں کے دل توڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ آزاد کے پاس الفاظ کا بے بہا خزانہ ہے جس لفظ کو جہاں چاہے استعمال کر لیتے ہیں۔ گویا الفاظ اپنی پذیرائی کے لئے دست بستہ ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ مولانا نہ صرف جذبات میں شدت پیدا کرنے میں ماہر تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ پانی میں آگ لگا سکتے تھے تو بیجا نہ ہوگا۔ حسرت بجا فرماتے ہیں ؂

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزا نہ رہا

اب ایسی زبان لکھنا تو درکنار افسوس کہ خود "اردو قوم" اس کے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوتی جا رہی ہے۔

اس وقت لٹن لائبریری سے دو کتابیں جاری ہوا کرتی تھیں۔ مجھے تو اردو زبان و ادب اور تاریخ اسلام کی کتابوں سے استفادہ کا جو موقع وہاں نصیب ہوا اور جو کچھ حاصل ہو سکا وہ زندگی کا حاصل ہو کر رہ گیا۔ یونین کی لائبریری سے بھی ایک کتاب جاری ہوا کرتی تھی۔ ان کتابوں سے نہ صرف روشنی ملی بلکہ نصابی تعلیم کے لئے بھی کافی مددگار ثابت ہوئیں۔

یونیورسٹیوں کے اوقات سرموسم میں صبح سے دوپہر تک ہوتے تھے۔ اس سے پڑھنے کا اچھا موقع مل جاتا تھا۔ جمعہ کو ہفتہ واری تعطیل ہوا کرتی تھی۔

ہاسٹل میں ایک تعارفی شب ہوتی تھی۔ اس میں سینئر طلبا کے نام پر نوواردوں سے چندے بھی لئے جاتے اور تعارف کی دعوت [illegible] بھیا پارٹی کے نام سے منسوب تھی۔ وہاں نئے طلبہ کے دل سے خوف و [illegible] نکال دینے کی [illegible] بنا لیا جاتا۔ اور پھر کوئی تعارف کا مرحلہ پیش نہ آتا تھا۔ نئے طلبہ میں کچھ کمی رہ جاتی تو سینئر طلبا کی ذمہ داری تھی کہ ان کی [illegible] کر کے علیگ برادری کے معیار پر لائیں۔

سال کی پہلی بارش میں MUD RIOT ہوتا اس میں ہاسٹل میں [illegible] ہر صحتمند لڑکے کو حصہ لینا ہوتا۔ آپ جمنٹ میں سب [illegible] ہنسی مذاق کرتے اور لطف اندوز ہوتے۔ گویا یہ پہلی برسات کا جشن [illegible]

تفریحات کے تین مراکز تھے۔ سنیما وہ بھی صرف پہلا شو [illegible] اجازت نامہ کے ساتھ، دوسرا ریلوے اسٹیشن، مگر مجھ پر آج تک ریلوے اسٹیشن کے تفریحی پہلو کا راز سربستہ وا نہ ہو سکا۔ نہ مجھے وہاں کوئی دلچسپی نظر آئی ــــ ان دو کے علاوہ نقوی پارک تھا۔ جہاں دوپہر کو [illegible] زار پر درختوں کے سائے میں طلبا مطالعہ کرتے اور شام کو ٹہلنے [illegible] یہ ایک حسین پارک تھا جس کی درختوں کے سائے میں طلبا مطالعہ اور شام کو ٹہلتے تھے۔ یہ ایک حسین پارک تھا جس کی دیکھ بھال [illegible] نقوی خود اپنی نگرانی میں کرتے تھے۔ نقوی صاحب ان دنوں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔

ہم دوستوں کی شام کی چائے کا مسئلہ کیفے ڈی پھوس میں [illegible] ہوتا تھا۔

سب سے اہم سالانہ تفریحی مرکز نمائش تھی۔ یہ اپنے طرز کی [illegible] نمائش تھی۔ دیگر سامانوں کی خرید کے علاوہ پیشاوری پراٹھوں [illegible] دوکانوں پر سب سے زیادہ ہماہمی رہتی۔ ہاسٹلوں کے نذر ہوتے [illegible] طلبا اپنے جرنیس کو نوازتے۔ سیاہ شیروانیاں اور سیاہ برقعے نمائش کی جان ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ پوری یونیورسٹی نمائش میں پہنچ پڑی ہے۔ ایک کل ہند مشاعرہ کا انعقاد ہوتا۔ جس میں یونیورسٹی [illegible] شہر کے مشہور شعرا حصہ لیتے۔ اسکے علاوہ نمائش کے لاؤڈ اسپیکر [illegible] حضرت شکیل بدایونی سے ان کی نظم "نمائش" اور کئی غزلیں سننے کا موقع بھی ملا ــــ ان سے علی گڑھ کی ادبی زندگی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

رکٹوریل اسٹاف یونیورسٹی کے طلباء وطالبات نذر رکھتا کیونکہ سائرن کے ساتھ ہی انھیں نمائش گاہ سے واپس چلا جانا ضروری تھا۔ سائرن کی آواز آئی اور سیاہ بادل چھٹا، یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اب شہریوں کا دور شروع ہوتا۔ نمائش کے دنوں میں قرب وجوار کے سابق طلباء بھی علیگڑھ آجاتے تھے۔

میں نے نمائش کا نو بجے شب کے بعد کا دورہ بھی دو بار دیکھا۔ اس کے لیے مجھے اپنے کسی نہ کسی پراکٹر ساتھی کی مدد لینی پڑی تھی۔ اس سے پراکٹر بیج لے کر رخصت کر دیا اور خود بیج لگا کر پراکٹر بن گیا گویا نمائش رات گئے تک تھہ نے کا لائسنس ہاتھ آ گیا۔ اب اطمینان سے سینما دیکھئے سرکس دیکھئے، جادو کا پٹارہ دیکھئے یا دیگر عجائبات سے لطف اندوز ہوجیے کیونکہ پراکٹر بیج وی پاس کا بھی کام کرتا تھا۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ ماشل پہنچے تو دربان نے جھک کر اسکنل دیدیا۔

اس وقت پراکٹر انچارج شعبۂ اقتصادیات کے محمد شفیع صاحب تھے اور نائب پراکٹر شعبۂ جغرافیہ کے مختار احمد صاحب تھے۔ ذمہ داران اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے اور طلباء بھی پورا اشتراک کرتے تھے۔

شعبۂ اردو میں اساتذہ کے کمرے سے ملا ہوا جو کمرہ تھا اس پر ایک بورڈ "اردوئے معلیٰ" لگا ہوا تھا۔ اس کمرے میں مجاز کی زبانی ان کا کلام سننے کا موقع ملا۔ نشے میں مدہوش منھ سے پان کی رال بہتی ہوئی۔ مگر مجاز اس سے بے نیاز اپنے کلام کی دنیا میں کھوئے ہوئے۔ وہ جھوم جھوم کر پڑھتے اور ہم فرمائش کرتے ذرا "شہ نگاران بھی اور پھر پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا"۔ "آوارہ"، "ترانۂ علی گڑھ" سبھی سننے کا موقع ملا۔ مجروح صاحب تو کافی دن وہاں نظر آئے۔ اپنی مترنم آواز میں خوب خوب کلام سنائے۔ جذبی اور ذوقی صاحبان کو بھی سنا ——— علی گڑھ کا ایک اپنا منفرد مزاج ہے جو علیگ شعراء کے کلام میں جھلکتا ہے۔

یاد آیا کہ ایک بار اسٹریچی ہال میں چند شعراء مدعو تھے۔ انہیں اختر الایمان صاحب بھی تھے۔ اختر صاحب نے بھی یونیورسٹی سے اکتساب علم کیا ہے۔ وہ اردو شاعری میں ترقی پسندی کے علمبرداروں میں ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام کا پہلا مصرعہ پیش کیا۔ " دور مسجد کے منارے پہ پرانا چنڈول" حاضرین نے آوازے کسے "پرانا چنڈول" اور پھر وہ شور اٹھا کہ اختر صاحب کو بیٹھ جانا پڑا۔

اپنے علی گڑھ میں اس وقت سواری کے لئے یکے استعمال ہوتے تھے۔ اسٹیشن سے یونیورسٹی اور شہر سے یونیورسٹی کے کرائے مقرر تھے۔ سواری تنہا ہو یا پوری ہو۔ کرایہ طے شدہ تھا اور ایک ہی ہوتا تھا۔ عموماً طلبا ٹہلتے ہوئے جاتے تھے۔ سائکل بھی بمشکل چند ایک کے پاس تھی۔ شہر سے آنے والے طلباء سائکل سے آتے تھے بارش میں چھتری کا استعمال معیوب سمجھا جاتا تھا۔ عموماً طلباء پان سگریٹ سے گریز کرتے تھے۔

مولانا کی زندگی اپنے پسندیدہ اصولوں پر گامزن رہ کر مقررہ راہوں پر رواں دواں تھی، کلاس، مطالعہ، نماز روزے خاموشی کے روزے اور ہر موسم میں لحاف کا استعمال ـــــ گویا وہ صرف اپنے نفس ہی پر قابو نہیں حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ موسم کی نیرنگیوں سے بے نیاز ہونا چاہتے تھے۔

ایم اے۔ سال اول کے امتحانات چل رہے تھے۔ رات کو میں اور مولانا حسب معمول شعبۂ تواریخ کی لائبریری اسمینار میں مصروف مطالعہ تھے۔ نصف شب ہو چکی تھی کہ مولانا نے اچانک اپنی کتاب میز پر پٹک دی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں بھی پیچھے دوڑا۔ دیکھا کہ وہ جلدی جلدی آگے بڑھتے جارہے ہیں۔ میں نے آواز دی تو رک گئے۔ کہنے لگے" میں خودکشی کے طریقوں پر غور کر رہا ہوں ـــ اس وقت تک کسی خوشہ چیں نے اس کے طریقوں پر روشنی نہیں ڈالی تھی، سب سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ ٹرین کے نیچے لیٹ جاؤں مگر اس میں اعضائے جسمانی بکھر جائیں گے۔ دیکھنے والوں کو تکلیف ہوگی۔ چھت کی کڑی کی مدد لی جائے تو چہرہ خراب ہوجائے گا اور بچے ڈر جائیں گے۔ چھت سے کود جاؤں تو ایک امکان یہ ہے کہ بچ جاؤں اور لنگڑا لولا بن کر زندگی گذاردوں"۔

"تو آپ پوٹاشیم سائنائٹ کیوں نہ استعمال کریں۔ کسی طرح کی کوئی تکلیف بھی نہ ہو اور ایسا معلوم ہو کہ آپ آرام کر رہے ہیں"۔ میں نے مشورہ دیا۔

"واقعی اگر آپ لادیں تو دوستی کا حق ادا کریں گے"۔ مولانا ممد ہوگئے۔

"آپ کسی فوٹوگرافر یا صراف سے بات کرلیں مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ کوئی دقت بھی نہیں ہوگی"۔ میں نے سمجھایا۔

"مگر آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔ مولانا سنجیدگی سے بولے۔

میں کیوں خون ناحق اپنی گردن پر لوں۔ وہ بھی ایک عزیز دوست کا۔ میں نے انکار کیا۔

"تم میرے دوست ہو میرے سارے غموں کا خاتمہ کردو گے"۔ انھوں نے استدعا کی۔

مولانا کا یہ غم صرف خیالی تھا۔ محض ان کی قنوطی ذہن کی پیداوار تھا۔ انھوں نے فرمایا "مرنا ایک دن ضرور ہے۔ زندگی لاحاصل شئے ہے۔ درد وغم مصائب وپریشانی جھیل کر مرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جب اپنے ہاتھوں یہ سلسلہ ختم کیا جاسکتا ہے تو پھر مستقل موت کا انتظار کیوں کیا جائے۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
——— فیض

آپ ہی نے کہا ہے ؎

زندگی اک زہر ہے ایسا کہ جو با اپنی مرضی ہو نہ ہو پینا پڑے
موت کی اک آس پہ جینا پڑے'

"کبھی میری ذہنی رو ہوگی، کوئی وقتی جذبہ رہا ہو۔ اسے بھول جائیے"
میں نے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے زندگی کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر ایک مختصر لکچر دیدیا۔ احادیث کا حوالہ دیا، زندگی پر دوسروں کے حقوق و ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ میں نے حقائق سے فرار کو بزدلی قرار دیا۔ مولانا بزدلی کا لفظ نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ خاموش ہو گئے اور پھر ہم دونوں واپس جا کر مطالعہ میں صبح تک مصروف رہے۔ میرے سمینار اور جامع مسجد کے درمیان صرف ایک کمرہ حائل تھا۔

اس کے بعد مولانا پر یہ جذبہ ایک بار اور طاری ہوا مگر جلد ہی وہ معمول پر آ گئے۔

مارسین کورٹ کے احباب کے علاوہ ایم۔ اے میں میرے دوسرے دوست مختلف علاقوں کے رہنے والے تھے۔ محفوظ الرب و احمد شعیب یحیی بدایوں کے، عارف علی انصاری حیدر آباد کے، عبدالستار بنگلور کے، عبدالرزاق کیرل کے، ملک احمد سعید سری نگر کے، اور خواجہ شیر علی کراچی کے تھے اوروں کے نام یاد نہیں۔ (اگر کسی صاحب کو انمیں سے کسی کے بارے میں علم ہو تو مجھے تہذیب الاخلاق کے معرفت مطلع فرمائیں) ایک اور ہستی مجھسے بہت قریب اور آج بھی وہ پروفیسر مسعود الحسن صاحب صدر شعبۂ انگریزی ہیں۔ وہ بھی ۳۴ سال کی گم شدگی کے بعد دریافت ہو سکے۔ وہی اکہرا بدن، نرم گفتار، اور سراپا خلوص شخصیت۔ بنارس میں دو سال قبل ملاقات ہوئی تو ۳۵ سال کا فاصلہ ہم نے چند گھنٹوں میں طے کر ڈالا۔ وہی بے تکلفی اور کسر نفسی جو طالب علمی کے زمانہ میں تھی آج بھی ہے اور میرے لئے تو انکا دولتکدہ خانۂ بے تکلف ہے۔

فی الوقت مولانا اور مسعود صاحب یہی دو ایسی ہستیاں ہیں جنھیں دیکھکر جن سے مل کر میں کچھ دیر کے لئے پھر مسلم یونیورسٹی کے طالب علمی کے دور میں واپس چلا جاتا ہوں اور ساری دوریاں چشم زدن میں مٹ جاتی ہیں۔

ہاسٹل نے الوداعی تقریب منعقد کر دی۔ ایم۔ اے کے امتحان کے بعد کتنے دوست اور ساتھی ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ جنھیں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دینا تھا خواہ ان کا سال اوّل ہو یا دوئم رہ گئے۔ یہ امتحانات ایک ماہ بعد ہونے تھے۔ یہ خصوصیت صرف مسلم یونیورسٹی کو حاصل تھی دو سال میں ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی دونوں ہی ڈگریاں دیتی تھی۔ ایم۔ اے کے کلاس اور بعد نماز مغرب ایل۔ ایل۔ بی کے کلاس ہوتے تھے آخر الذکر امتحان کے وقت مئی جون کی گرمی ہوتی۔ اکثر شام کو آندھیاں آتیں۔ رات کو میں مولانا اور اسلم غسل خانہ کے سہارے ہاسٹل کی چھت پر چلے جاتے اور لیمپ کی روشنی میں دوسرے روز کے پرچے کی تیاری کرتے وہیں پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔ ہم سب کے پرچے کافی اچھے ہوئے

اسد اور عزیز صاحبان اس نصاب میں شامل نہیں تھے اس لئے پہلے ہی بادیدۂ نم گلے مل کر کبھی نہ ملنے کے لئے رخصت ہو چکے تھے

آخر کار ہم جب امتحانات سے فارغ ہو گئے تو ساری رات باتیں کرتے رہے۔ دوسرا دن "یوم مفارقت" تھا۔ وہ قہقہے، وہ مجلسیں وہ خفگی، وہ ہنسی مذاق سب خواب ہونے والے تھے۔ ہم سب کو اس چمنستان علم و ادب، اس دبستان تہذیب و تمدن کو خیر باد کہہ کے کارزار حیات میں شامل ہونا تھا۔ اسلم کو پہلے ہمیشہ کے لئے رخصت کیا۔ آنکھیں گہر بار تھیں۔ اب اس سے سخت مرحلہ درپیش تھا اپنے رفیق صادق، عزیز ترین دوست مولانا کو رخصت کرنا تھا۔ گلے ملے نگاہیں نیچی تھیں مبادا آنکھیں چار ہونے پر ہم خود پر قابو نہ رکھ سکیں۔ وہ اپنے وطن بس سے روانہ ہوئے۔ شام کو مجھے اس مادر درسگاہ سے جدا ہونا تھا اسٹیشن روانہ ہوا۔ اپنی الوداعی نظم کا یہ شعر زبان پر تھا ؎

اے علوم مشرق و مغرب کے مخزن الوداع
الوداع اے مرکز تہذیب روشن الوداع

الوداع

دل میں ایک حسرت تھی۔ کاش ہم جدا نہ ہوتے ہمیشہ سب اسی طرح ایک انجمن بنے رہتے۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔

آج جب یادوں کے جھروکے میں جھانکتا ہوں تو ایک نامعلوم جذبہ ذہن سے تقاضا کرتا ہے ؎

دوڑ پیچھے کی طرف اے ذہن ناپیدا کنار
زندگی مانگے ہے پھر اپنے وہی لیل و نہار

وہ محفلیں اجڑ گئیں۔ وہ دوست وہ احباب افق میں گم ہو گئے تلاش کرنے پر بھی نہ وہ علی گڑھ ملتا ہے نہ وہ دوست ——
کہیں سے آواز آتی ہے ؎

داغ فراق صحبت شب کی۔ ۔ ۔ ۔
کہیں یہ میری اپنی آواز تو نہیں ہے۔

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیئے
کوئی بھی طریقہ اپنایئے
نرودھ
کاپر ٹی
کھانے کی گولی
NIRODH
84/135

Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون :
۳۶۰۹
۴۱۹۹

اتر پردیش اردو اکیڈمی کی مطبوعات کی نئی شرح کمیشن

اتر پردیش اردو اکادمی نے اپنے تازہ ترین فیصلے کے مطابق اپنی مطبوعات کی شرح کمیشن پر نظر ثانی کی ہے۔ عام خریدار کو کم سے کم سَو روپے کی خریداری پر ۱۵٪ اور عوامی لائبریری کو ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ تاجرانِ کتب کو مندرجہ ذیل شرح کمیشن پر کتابیں سپلائی کی جائیں گی۔

۱۔ [الف] ۱۰۰ روپے تک کی خریداری پر 25٪ کمیشن دیا جائے گا۔

[ب] ۱۰۱ روپے سے ۱۰۰۰ روپے تک کی خریداری پر 33 1/3٪ کمیشن دیا جائے گا۔

[ت] ۱۰۰۱ روپے سے ۵۰۰۰ روپے کی خریداری پر 35٪ کمیشن دیا جائے گا۔

[ث] ۵۰۰۱ روپے سے زائد خریداری پر ۴۰٪ کمیشن دیا جائے گا۔

۲۔ سَو روپے سے زائد (کمیشن وضع کرنے کے بعد) کی کتابیں خریدنے پر ریلوے/ڈاک خرچ اکادمی برداشت کرے گی۔

۳۔ اسٹینڈنگ آرڈر [Standing Order] کے لیے خریدار کو اپنے بنک کے ذریعے =/۱۰۰۰ روپے کی تحریری ضمانت دینی ہوگی جس کے تحت اکادمی کی تازہ شائع ہونے والی کتاب کی کم سے کم پانچ جلدیں یا زیادہ سے زیادہ زرِضمانت کے برابر قیمت کی کتابیں ارسال کی جائیں گی۔ جن کے ڈسپیچ کے اخراجات اکادمی برداشت کرے گی۔

۴۔ آرڈر کی ایڈوانس رقم یا بلوں کی ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی کے نام قابل قبول ہوگی۔

اردو اکادمی اردو ادب کے مختلف اصناف پر اب تک تقریبًا پونے دو سو کتابیں شایع کر چکی ہے۔ تازہ کتابوں کی فہرست یہ ہے۔

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱	سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات۔	مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن	=/5
۲	عکس گل۔	شمیم کرہانی	=/14
۳	مقالات یوم پریم چند۔	اکادمی کے زیر اہتمام کل ہند پریم چند سیمنار کے موقع پر	=/6
۴	تذکرہ شورش (غلام حسین شورش)۔	محمود الٰہی	=/34
۵	انتخاب کربل کتھا۔	حنیف نقوی	=/4
۶	تذکرہ نکات الشعراء (میر)۔	محمود الہی	=/8
۷	انتخاب سب رس۔	نور الحق ہاشمی	3/50
۸	رسالہ منتہی العروض اور مثنوی تحفۃ الشعراء۔	میر محمود	=/5
۹	آئینہ بلاغت۔	مرزا محمد عسکری	=/12
۱۰	راماین فراقی (جلد دوم)	رائے سدھ ناتھ بلی فراقی	=/12
۱۱	مقالات صدیقی	مرتب مسلم صدیقی	=/15

فہرست کتب اور مزید تفصیلات کے لیے رجوع کریں۔

سکریٹری
اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۳۱/۸۴-۸۵

مقررہ فارموں پر درج ذیل اسامیوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ سسٹم منیجر [ایک جگہ] [مستقل] کمپیوٹر سینٹر

۲۔ سسٹم انلائسٹ [ایک جگہ] [مستقل] کمپیوٹر سینٹر۔

شرح تنخواہ:- ۱۱۰۰/- - ۵۰ - ۱۶۰۰/- روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:-

i لازمی:- کمپیوٹر سائنسز میں ماسٹرس ڈگری یا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اور ساتھ میں سسٹم منیجر کی حیثیت سے کم از کم پانچ سال کا تجربہ

ii پسندیدہ:- کمپیوٹر سائنس میں ریسرچ ڈگری یا اس کے مساوی کوئی قابلیت جس میں کمپیوٹر سائنس میں ترقیاتی پروجیکٹ میں کام کا تجربہ۔

کام کی تفصیل:- ۱۔ کمپیوٹر سسٹم کو مینٹین کرنا، اور ملٹی پروگرامنگ میں کمپیوٹنگ سسٹم کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ اس میں نت نئی ترقیات کے ساتھ چلانا

۲۔ تدریس اور تعلیمی پروگرام برائے کمپیوٹر سائنس میں حصہ لینا

۳۔ ترقیاتی پروگرام کے سہولت فراہم کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے استعمال کے طریقوں کو بتلانے میں سہولت مہیا کرنا

۴۔ اس کے چلانے کے طریقوں کی جانکاری میں مدد کے ساتھ ان امور کو انجام دینا جو وقتاً فوقتاً تفویض کیے جائیں۔

۳۔ ڈائرکٹر آف فزیکل انسٹرکشن ٹینس [ایک جگہ] [مستقل] یونیورسٹی گیمس کمیٹی۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰- ۴۰- ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱۔ لازمی:- اسپورٹس میں ماسٹرس ڈگری ساتھ میں نیشنل/اسٹیٹ/انٹر ورسٹیز یا اس کے مساوی معیار کے مطابق ٹیم کو تیار کرنے کا تین سالہ تجربہ

یا

کسی مستند اسپورٹس کے ادارے سے اسپورٹس میں ایک سالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اور ساتھ میں

ٹیم کو نیشنل/اسٹیٹ/انٹرورسٹیز یا اس کے مساوی معیار کے مطابق تیار کرنے کا پانچ سالہ تجربہ۔

یا

کسی مستند ادارے سے ایک سالہ کوچنگ ڈپلوما کے ساتھ ساتھ گریجویٹ بھی ہو۔ اور ساتھ میں ٹیم کو نیشنل/اسٹیٹ/انٹرورسٹیز/یا اس کے مساوی معیار کے مطابق تیار کرنے کا کم سے کم آٹھ سالہ تجربہ۔

نوٹ:- ۱۔ کوچنگ کا تجربہ اس مخصوص میدان ہونا چاہیے جس کے لیے ضرورت ہے۔

۲۔ تعلیمی قابلیت یا تجربہ کی ان شرائط میں نرمی برتی جا سکتی ہے اگر امیدوار انتہائی اعلیٰ لیاقت اور مہارت ٹیم کو نیشنل/اسٹیٹ یا اس کے مساوی معیار کے مطابق تیاری کرانے میں اور اُن کو ٹریننگ دینے میں رکھتا ہے۔

ii۔ پسندیدہ: کھیل کے میدان/کھیل کے سامان اور دیگر چیزوں کی جو کھیل سے تعلق ہیں اگر امیدوار کو ان کی دیکھ ریکھ کا تجربہ ہے تو قابل ترجیح ہوگا۔

کام کی نوعیت۔ ۱۔ ٹیم اور دوسرے کھلاڑیوں کو تربیت دینا۔

۲۔ اسپورٹس کی ضروریات کو مینٹین رکھنا

۳۔ انتظامی امور کو سرانجام دینا اور دوسرے فرائض جو تفویض کیے جائیں۔

وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۸۴-۸۵/۹ مورخہ ۲۱/۷/۸۴ کے تحت درخواست دے چکے ہیں وہ دوبارہ درخواست نہ دیں۔ اُن کو پہلی درخواست کی بنا پر ہی امیدوار تصور کیا جائے گا اگر وہ مناسب خیال کیے گئے۔

۴۔ الیکٹرونک انجینیر، ڈیپارٹمنٹ آف فزکس۔

شرح تنخواہ۔ ۷۰۰-۴۰-۹۰۰-ای بی-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۳۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت۔

۱۔ لازمی۔ ایم۔ایس سی [فزکس] یا ایم ٹیک [الیکٹرانک میں تخصص کے ساتھ]

یا

بی۔ای/بی۔ایس سی۔ [الیکٹرانک انجینیرنگ میں]

پسندیدہ:- الیکٹرانک کی مشنری اور لیبارٹری کی مرمت اور دیکھ ریکھ کا کچھ تجربہ۔

۵۔ سیکوریٹی آفیسر۔ [ایک جگہ] [مستقل] جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل۔

شرح تنخواہ:- ۶۵۰-۳۰-۷۴۰-۳۵-۸۱۰-ای بی-۳۵-۸۸۰-۴۰-۱۰۰۰-ای بی-۴۰-۱۲۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱۔ لازمی ۱۔ بیچلرز ڈگری۔

۲۔ سیکورٹی اور انتظامی فرائض کی انجام دہی کا ذمہ دارانہ حیثیت سے تقریباً دس سالہ تجربہ

۳۔ ساخت اور جسمانی اعتبار سے اچھی صحت

عمر:- ۴۵ سال سے کم [اگر امیدوار ہر طرح سے موزوں خیال کیا گیا تو خصوصی/اور غیر معمولی کیس میں

عمر کی حد میں چھوٹ دی جا سکتی ہے۔

فرائض: واچ اینڈ وارڈ سیکشن کی دیکھ بھال اور ایسی تمام ڈیوٹیز جو چیف سپرنٹنڈنٹ آف جے این میڈیکل کی جانب تفویض کی جائیں۔

نوٹ: ملٹری یا پولیس کے ایسے افسران جو گزیٹیڈ پوسٹ پر متمکن رہے ہوں وہ بھی اس جگہ کے لیے امیدوار ہو سکتے ہیں چاہے کہ وہ گریجویٹ نہ بھی ہوں۔
ریٹائرڈ گورنمنٹ آفیسر اگر انتہائی اعلیٰ صلاحیت کے مالک ہوں تو وہ بھی اس جگہ کے لیے درخواست دے سکتے ہیں اور اُن کے لیے عمر کی حد میں نرمی برتی جا سکتی ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اُن کا تقرر کنٹریکٹ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

۷۔ فیزیو تھراپسٹ:۔ (ایک جگہ) (مستقل) جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل۔
شرح تنخواہ:۔ ۴۵۵ - ۱۵ - ۵۶۰ - ای بی - ۲۰ - ۷۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:۔ ہائی اسکول یا مساوی۔ کسی مستند اور منظور شدہ میڈیکل ادارے سے فزیو تھراپی میں ڈپلوما یا مساوی اس مضمون میں تین سالہ تجربہ ری ہیبلیٹیشن کے فیلڈ میں ایک سالہ تجربہ۔

۸۔ کارڈیو تھوراسک لیب۔ ٹیکنیشین (۳ جگہیں) (مستقل) جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل۔
شرح تنخواہ:۔ ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ - ۲۰ - ۷۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:
آ۔ لازمی۔ بی۔ایس سی۔ (بائیولوجی گروپ)
ڈپلوما ان میڈیکل لیب۔ ٹیکنالوجی
آآ پسندیدہ پرفیوشنسٹ کی معاونت کا تجربہ۔ (اوپن ہارٹ سرجری کے دوران)

۱۔ سینیر لیب اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی)
شرح تنخواہ:۔ ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:۔
ا۔ لازمی۔ ہائر سکنڈری (سائنس) / پری یونیورسٹی (سائنس) کسی تدریسی ہاسپٹل کی ہسٹوپیتھالوجی اور ہیماٹولوجی لیبارٹری میں کام کا تجربہ۔
آآ پسندیدہ:۔ میڈیکل لیبارٹری ٹیکنالوجی میں ڈپلوما۔

۹۔ سینیر لیبارٹری اسسٹنٹ (مکینک) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف پری وینٹو اینڈ سوشل میڈیسن
شرح تنخواہ:۔ ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
ا۔ لازمی۔ سائنس مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری ساتھ میں پہلے کا تجربہ۔
آآ پسندیدہ:۔ پلمبنگ اور الیکٹریکل فٹنگ وغیرہ کا کم سے کم تین سالہ تجربہ۔

نوٹ:- منتخبہ شخص کو خاص طور پر دیہی ہیلتھ ٹریننگ سینٹر جواں پر کام کرنا ہوگا۔ اور جواں ہی میں
میں رہائش اختیار کرنی ہوگی۔

۱۰- اسٹینوگرافر (انگریزی)
شرح تنخواہ:- ۳۳۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۲-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:- گریجوئیشن کے ساتھ انگریزی کی اچھی جانکاری۔ شارٹ ہینڈ میں ۸۰ الفاظ فی منٹ اور ۴۰ الفاظ فی منٹ انگریزی کے ٹائپ میں۔

۱۱- ریسپشنسٹ:- (ایک جگہ) (مستقل) جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل
شرح تنخواہ- ۳۳۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۲-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰-روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
۱- لازمی- گریجویٹ- روانی کے ساتھ اردو/ہندی/انگریزی بولنے کی قابلیت۔
۲- پسندیدہ:- ریسپشنسٹ کی حیثیت سے کام کا تجربہ۔

۱۲ اسٹور کیپر (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف پریوینٹو اینڈ سوشل میڈیسن۔
شرح تنخواہ:- ۳۳۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت انٹرمیڈیٹ یا مساوی۔ دواؤں کی خریداری اُن کی دیکھ بھال رکھنے اور اسٹور کے بارے میں ایک سال کا عملی تجربہ اگر یہ جانکاری اور تجربہ کسی ہسپتال کا ہو تو قابل ترجیح ہوگا۔

۱۳ سپروائزر اسٹرلائزیشن (ایک جگہ) (مستقل) جے این میڈیکل کالج ہاسپٹل۔
شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۶-۲۹۰-ای بی-۶-۳۲۶-۸-۳۶۶-ای بی ۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز
قابلیت:- کسی منظور شدہ اسپتال میں اسٹرلائزیشن کی ٹریننگ۔ سرجیکل ایکوئپمنٹ اور لائمنن کے اسٹرلائزیشن پانچ سالہ عملی تجربہ۔ نرسنگ یا آئی۔ ایس۔ سی میں سرٹیفکٹ۔

غیر معمولی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتداء سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے افراد کو بطور ٹی۔ اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یکطرفہ سنگل کرایہ دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپے برائے اسامی نمبر ۱-تا-۵ اور ۳ روپے باقی ماندہ اسامیوں کے لیے نقد مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا سہ ۱۰ x 23 کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

درخواست وصولیابی کی آخری تاریخ ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۴ء (آفس ٹائم تک) ہے،
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

شمار نمبر ۱ تا ۵ کی ایسی درخواستیں جو علی گڑھ کے باہر کی ہوں وہ رجسٹرڈ پوسٹ سے ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ ایس جعفری سکریٹری وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو بھیجی جانی چاہیں۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۳۲/۱۴-۱۵

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

لیکچررس۔ شرح تنخواہ۔ ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنس

۱۔ لیکچرر ان زولوجی۔ ویمنس کالج۔

قابلیت۔ [الف] ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام۔

[ب] فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس کے ساتھ مسلسل بہترین تعلیمی ریکارڈ اور سیون پوائنٹ اسکیل میں متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری یا غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری

بین الموضوعی ترقیاتی پروگرام کے لیے مذکورہ بالا الف و ب کے متعلقہ موضوع میں ڈگری

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس سے ظاہر ہے یا اس کا مطبوعہ کام انتہائی اعلیٰ پایہ کا ہے تو وہ [ب] کے تحت دی ہوئی مطلوبہ استعداد کو ختم کر سکتی ہے۔

اور اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل کوئی امیدوار میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں نہ ہو تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (اس صورت میں ایم۔ فل ڈگری یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام کو وزن دیا جائے گا) کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیباریٹری میں یا آرگنائزیشن میں دو سال کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری سے پانچ سال کے اندر ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی جب تک کہ وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرے۔

پسندیدہ:- ۱۔ ٹریننگ یا کچھ تحقیقی تجربہ برائے میمیلین / ایوین ایکولوجی

۲۔ کسی مستند اور منظور شدہ ادارے میں تدریس کا تجربہ۔

۱. چیرمین ڈیپارٹمنٹ آف سنی تھیالوجی ۔

قابلیت :۔

۱. لازمی ۔ فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس کے ساتھ مسلسل بہترین تعلیمی ریکارڈ (۷ سیون پوائنٹ اسکیل میں) متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری سنی تھیالوجی میں یا عربی میں یا اسلامک اسٹڈیز میں یا فاضل درس نظامی کسی مستند مدرسہ سے پاس کیا ہو (ساتھ میں انگریزی کی اچھی جانکاری ہونا ضروری ہے) یا (کوئی غیر ملکی استعداد جو ماسٹرس ڈگری کے مساوی ہو۔)

۲. پسندیدہ ۱۔ راست بازی، دیانت امیدوار کا وصف ہونا چاہیے جس سے طلبا کے لیے اچھے اقدار کا نمونہ قایم ہوسکے

۲۔ اسلامی قوانین وضوابط کے بارے میں اچھی جانکاری ۔

۳۔ پی۔ایچ ڈی ڈگری یا مطبوعہ اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام

۴۔ یونیورسٹی یا مدرسہ میں تدریس کا کچھ تجربہ

۵۔ مسائل کے استنباط واستخراج کی صلاحیت ۔

غیر معمولی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا رہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے ۔

انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے اشخاص کو بطور ٹی ۔اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا کرایہ صرف ایک طرف کا ادا کیا جائے گا ۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بذات خود یا بذریعہ ڈاک مع 23×10 کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں ۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ر دسمبر ۸۴ ۱۹ء (آفس ٹائم تک) ہے نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا ۔

ایسی تمام درخواستیں جو علی گڑھ سے باہر کی ہوں وہ رجسٹرڈ پوسٹ سے ڈاکٹر ایچ ۔اے ۔ایس جعفری سکریٹری وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام ارسال کی جائیں ۔

نوٹ :۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں خالی ہونے والی جگہوں پر تقرری کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے ۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

اطلاع برائے جونیئر ریسرچ فیلوشپ اور سینیئر ریسرچ فیلوشپ اِن میڈیول انڈین ہسٹری، سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈی اِن ہسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

الف ۔ میڈیول انڈین ہسٹری کے میدان میں پانچ جونیئر ریسرچ فیلوشپ تحقیق کے لیے پی ایچ۔ ڈی ڈگری کے واسطے دیے جائیں گے پانچ فیلوشپ میں سے دو ان امیدواروں کے لیے محفوظ ہیں جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ کسی دوسری یونیورسٹی سے تاریخ میں ماسٹر ڈگری حاصل کی ہو۔

نیلوشپ کی رقم ۔

پہلے دو سال کے واسطے ۶۰۰ روپے ماہانہ اور اگلے دو سال کے لیے [توسیع کی منظوری کے بعد] ۱۰۰۰/- روپے ماہانہ متفرق اخراجات کے لیے ۳۰۰۰/- روپے سالانہ ۔ فیلوشپ ۶۰۰/- روپے سے ۱۰۰۰/- روپے ماہانہ اور متفرق اخراجات ۳۰۰۰/- روپے سالانہ سے بڑھ کر ۵۰۰۰/- روپے سالانہ تک بڑھائے جانے کی امید کی جاتی ہے ۔

مدت :- ۔

عمومی طور پر ۲ سال چار سال تک توسیع کے قابل [یو۔جی۔سی کے مجوزہ نو مدت سابقا]

قابلیت :-

۱۔ تاریخ میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری ۔

۲۔ اگست ۱۹۸۴ء میں منعقدہ جونیئر ریسرچ فیلوشپ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تحت کوالیفائنگ پوزیشن

ریکوائرمنٹ :-

یہ ضروری نہیں ہے کہ فیلوشپ کے لیے درخواست دیتے وقت اے ۔ ایم ۔ یو علی گڑھ میں ریسرچ میں رجسٹریشن ہو۔ اگر امیدوار منتخب کرلیے گئے تو ان کو پی ایچ۔ ڈی کے کسی مضمون کے لیے رجسٹریشن کرانا ہوگا ۔ اور ان کو اپنی پی ایچ۔ ڈی سے پہلے مقررہ فیلوشپ کی مدت میں ایم ۔ فل ڈگری کے لیے کام کرنا ہوگا

[ب] دو سینیئر ریسرچ فیلوشپ ۔

کسی بھی یونیورسٹی سے میڈیول انڈین ہسٹری میں پی ایچ۔ ڈی ڈگری کے حامل امیدواروں کو دیے جائیں گے

فیلوشپ کی رقم :-

۱۰۰۰/- روپے ماہانہ فیلوشپ اور متفرق اخراجات کے لیے ۵۰۰۰/- روپے سالانہ

فیلوشپ کی رقم اور سالانہ متفرق اخراجات کے لیے رقم وہی دی جائے گی جو سینیئر ریسرچ فیلوشپ کے لیے یو جی سی سے منظور ہوئی ہے

مدت :- ایک سال دو سال تک قابل اضافہ

قابلیت :- کسی بھی یونیورسٹی سے میڈیول انڈین ہسٹری کے کسی میدان میں پی ایچ۔ ڈی ڈگری

نوٹ :- امیدواروں کو انٹرویو کے وقت اپنی پی ایچ۔ ڈی کی تھیسس اپنے ساتھ لانا ہوگی

ریکوائرمنٹ :-

امیدواروں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی فیلوشپ کے دوران کسی مخصوص ترقی پانے پروجیکٹ میں تحقیقی کام

کام کرے۔

اس کو تدریس کے فرائض بھی تفویض کیے جائیں گے۔

دوسری اطلاعات

۱۔ جونیر اور سینیر ریسرچ فیلوشپ دیے جانے کے ضوابط وہی رہیں گی جیسی کہ یو۔جی۔سی فیلوشپ کے قواعد وضوابط کی ہوتی ہیں۔

۲۔ مقررہ درخواست فارم پر درخواست دی جانی چاہیے۔ یہ فارم سیکشن آفیسر [ایڈمنسٹریشن] ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

۳۔ درخواست وصولیابی کی آخری تاریخ ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۴ء ہے۔

۴۔ امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا۔ اور اگر ایسا ہوا تو اُن کو ایک طرف کا سکنڈ کلاس کا کرایہ بھی دیا جائے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

تصحیح

پیراگراف [۵] اشتہار نمبر ۸۵-۸۴/۲۰ برائے اسامی رجسٹرار اس طرح پڑھا جائے۔

[۵] کم از کم ۱۵ سالہ تجربہ بحیثیت لکچرار اور ریڈر کے جس میں سے پانچ سال کا تجربہ بحیثیت ریڈر کے ہونا چاہیے۔
ساتھ میں ایجوکیشنل ایڈمنسٹریشن میں تجربہ بھی ہو۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

مالک: تہذیب الاخلاق ٹرسٹ۔ علی گڑھ
مقامِ اشاعت: شعبہ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پرنٹر پبلشر: نور الحسن نقوی۔ پریس: شروانی آفسیٹ پریس مٹیا محل، دہلی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

داخلہ سیکشن

سیشن ۸۵-۱۹۸۴ء

داخلہ نوٹس نمبر ۱۴

اردو خطاطی سرٹیفکٹ کورس کے لیے سیشن ۸۵-۱۹۸۴ء میں داخلے کے خواہش مند طلباء سے درخواستیں طلوب ہیں

کم سے کم لیاقت۔ پری یونیورسٹی / ہائر سکنڈری اسکول یا اس کے مساوی یا جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر اور مسلم یونیورسٹی سے صرف انگریزی میں پری یونیورسٹی پاس شدہ امتحان۔

کورس کی تکمیل کی مدت دو سال ہے۔ منتخبہ امیدواروں کو ۱۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔

ہر طرح سے مکمل درخواستیں جن کے ساتھ تاریخ پیدائش سرٹیفکٹ ہو، امتحان کے سرٹیفکٹ اور آٹھ روپے کا انڈین پوسٹل جو کہ فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بنام اسسٹنٹ رجسٹرار داخلہ پوسٹ بکس نمبر ۵۲، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۴ء بوقت ۵ بجے شام تک پہنچ جانی چاہیں۔

نامکمل اور دیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی اور اس سلسلے میں کوئی خط و کتابت نہیں کی جائے گی۔

داخلے کے خواہش مند طلبا درج ذیل نمونے کے مطابق سادے کاغذ پر درخواست دیں۔

پرو فارما برائے داخلہ سرٹیفکٹ ان اردو کیلیگرافی۔

تصدیق شدہ فوٹو یہاں چسپاں کریں۔

انٹرنل / ایکسٹرنل

رجسٹرڈ نمبر ......

انرولمنٹ نمبر ....

امیدوار کا نام .. ..

تاریخ پیدائش اور عمر ....

والد کا نام ....

٥ مذہب ....

٦ قومیت ....

٧ اسٹیٹ ....

٨ داخلے کے لیے مطلوبہ امتحان کی تفصیل [مارکس شیٹ درخواست کے منسلک کریں]۔

امتحان کا نام	رول نمبر	پاس کرنے کا سال	یونیورسٹی کا نام	مقررہ نمبر	حاصل شدہ نمبر	امتحان کے مضامین	متعلقہ مضمون میں حاصل فیصد
١	٢	٣	٤	٥	٦	٧	٨

٩۔ کیا ہوسٹل میں رہنے کا خواہش مند ہے۔ [ہاں/نہیں ۔]

اگر پہلے سے ہوسٹل میں رہائش پذیر ہیں تو اس کی تفصیل

ہال	ہوسٹل	کمرہ نمبر

١٠۔ اگر تعلیمی سالوں میں تسلسل نہیں ہے تو جس سال خالی رہے ہوں اس کی تفصیلات [تصدیقی حوالے سے] دیں۔

١١۔ خط و کتابت کے لیے مکمل پتہ

١٢۔ منسلکہ پوسٹل آرڈر کی تفصیلات:- نمبر .... تاریخ .... قیمت ....

١٣ کیا درج ذیل کسی کیٹگری سے تعلق رکھتے ہیں

ا سیڈول کاسٹ/شیڈول ٹرائب/پسماندہ

ب یونیورسٹی ملازم کے بچے۔ ایسے ملازم جو دوران ملازمت انتقال کر گئے ہیں۔ ہاں/نہیں

ج قدیم طلبا کے لڑکے اور لڑکیاں۔ ہاں/نہیں

د ایسے گورنمنٹ ملازمین کے بچے جن کا حال میں ہی علی گڑھ تبادلہ ہوا ہے۔ ہاں/نہیں

ہ دور کی ریاستیں جن کی سرحد اتر پردیش سے نہیں ملتی۔ ہاں/نہیں

و غیر معمولی صلاحیت کا اسپورٹس مین ہاں/نہیں

ز غیر معمولی صلاحیت کا مقرر۔ ہاں/نہیں

ح جسمانی طور پر معذور ہاں/نہیں

ط منسلک کاغذات کی تعداد

ی امیدوار کے دستخط مع تاریخ۔

این مؤیدین
کنٹرولر امتحانات و داخلہ

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 418

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

Rs.1-50

مدیر: سید حامد　　　　مدیر مسئول: نور الحسن نقوی

جلد　　　　۱۶ - دسمبر تا ۳۱ - دسمبر ۱۹۸۴ء　　　　شمارہ ۲۴/۲

مندرجات

تزئین: سرفراز

سرورق کی تصویر: جسٹس کرامت حسین

فی شمارہ : ڈیڑھ روپیہ
سالانہ : تیس روپے
تاحیات : تین سو روپے

ترسیل زر کا پتہ
پروفیسر منظر عباس نقوی
تہذیب الاخلاق ٹرسٹ (رجسٹرڈ) علی گڑھ

لوگوں کے گھر کتنے بے رونق ہیں۔

ان میں محبت نہیں، دولت نہیں — پھول نہیں

(مگر شرط ہے ورنہ کوئی آدمی اتنا غریب اتنا مصروف نہیں ہوتا

کہ اپنے ہاں کسی کونے میں پھول بھی نہ اگا سکے)

اکثر لوگ بیج اس لیے نہیں بوتے کہ شام تک اس کا پھل نہ پا سکیں گے

میں کہتا ہوں ذرا صبر.........

چوبیس گھنٹے میں نہ تم محبت کا اجر پا سکتے ہو، نہ دولت کا شجر، نہ بیج کا ثمر

کسی نم زمین میں بیج بو دو اور بھول جاؤ.......

جب تم دوسرے کام کر رہے ہو گے بیج اپنے آپ پھوٹتا رہے گا

شجر و ثمر بنتا رہے گا

اس خوبصورت صبح کا تصوّر کرو

جب تم اس بدمعاملہ دنیا کے بدصورت خوابوں سے اٹھ کر اِدھر آ نکلو گے

تو ایک پھول تمہیں اپنی طرف ہمکتا ہوا نظر آئے گا

راجندر سنگھ بیدی

حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

جسٹس کرامت حسین

جسٹس مولانا سید کرامت حسین صاحب کنتوری ان معلمین قوم میں
جنھوں نے ہندوستان میں تعلیم کو فروغ دیا۔ خصوصاً تعلیم نسواں کے اولا
ین کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ آپ کی حیات ہندوستان کی تہذیبی و تعلیمی
یں یادگار ہے۔ آپ کے کچھ مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

آپ مولانا سید سراج حسین صاحب، ممبر سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ
زہ سرسید احمد خاں کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ یکم جولائی ۱۸۵۲ء کو جھانسی
یدا ہوئے۔ ابتداً آپ نے اپنے گھر پر بعض معلّموں سے فارسی، عربی پڑھی۔ پھر
لد صاحب سے میبذی، مقامات حریری، اقلیدس، جبر و مقابلہ اور اردو
ور اس کے بعد اصول علم طبیعات اور تفسیر صافی پڑھی۔ مولانا سید سراج حسین
کی وفات اگست ۱۸۶۵ء میں ہوگئی تو گھر پر آپ کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا
کے ہمراہ سفر حج اختیار فرمایا اور حج سے مشرف ہونے کے بعد آپ کو طلب علم
ن زیادہ ہوا۔ اس زمانے میں لکھنؤ ایک حوزہ علمیہ کی حیثیت سے مشہور تھا۔
پ لکھنؤ تشریف لے گئے اور جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب، جناب مولوی
احمد علی صاحب، جناب مفتی میر عباس شوستری صاحب اور جناب مولانا سید
ین صاحب کے دروس و امالی میں شریک رہے اور چند سبق تبرکاً سلطان
سید محمد صاحب سے بھی پڑھے۔ آپ روزانہ سولہ سترہ گھنٹے طلب علم میں مصروف
تھے۔ اس پر بھی فرطِ شوق کے باعث کسل ہوتا تھا۔ اس دور میں آپ نے
رب میں مہارت کامل حاصل کی اور علم اللسان میں آپ نے کتاب "فقہ اللسان"
ن فرمائی۔ فردوس مآب جناب مولانا سید حامد حسین صاحب نے آپ کے
تحریر فرمایا کہ ہندوستان میں مثل آپ کے عربی کوئی کم ہی لکھ سکتا ہے۔ آپ
یر، حدیث، اور فقہ استدلالی میں بھی تبحر حاصل فرمایا۔ شرح لمعہ آپ نے مولانا
احمد علی صاحب سے پڑھی۔

یس و تدریس :۔ تحصیل علم کے ساتھ ہی درس و تدریس کا
سلہ بھی اساتذہ کے حکم سے آپ نے شروع کیا اور طلبہ کو تفسیر مجمع البیان
البلاغہ، معلقات، حماسہ، متنبی، شمس بازغہ،
ا، شرح مغنی، مفتاح مکالی، قوانین الاصول، مستند الشیعہ
وغیرہ کتابیں پڑھاتے رہے۔ آپ کا طرز تعلیم نہایت بہتر تھا اور تقریر نہایت صاف
اور سلجھی ہوئی۔ ہر بات طالب علم کے ذہن نشین ہو جاتی تھی۔ اگر طالب علم کوئی اعتراض
کرتا تو بجائے غصے کے شفقت و نرمی سے جواب دیتے اور طالب علم کو مطمئن کیے بغیر
نہ چھوڑتے تھے۔ جناب مولانا سید حامد حسین صاحب نے ان کی نسبت ۱۱ رمضان
۱۲۹۲ھ کو سند میں ارقام فرمایا ــــــ "میں اطمینان رکھتا ہوں کہ وہ بہتر
اور اشخاص سے کتب درسیہ متعارفہ کا درس دے سکتے ہیں اور عبارت عربی و فارسی
خوب لکھ سکتے ہیں۔ خصوصاً اُن کی سی عربی عبارت کوئی کم لکھ سکتا ہے۔"

نواب عماد الملک سید حسین صاحب بلگرامی نے سند مرقومہ ۲۴ مارچ
۱۸۷۴ء میں یہ خلاصہ تحریر فرمایا ہے۔ آپ کا مبلغ علم عربی بہت اونچے درجے
کا ہے۔ علوم و زبان عربی میں آپ نے وہ ملکہ پیدا کیا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں
اور مولویوں میں اکثر نہیں پایا جاتا۔ آپ کا فارسی علم بھی ایسا ہی وسیع ہے۔ یہ
نہایت افسوس کی بات ہے کہ سید کرامت حسین تھوڑی انگریزی نہیں جانتے۔
سید کرامت حسین کی سیرت کی بابت میں خود کہہ سکتا ہوں کہ اب تک جتنے مسلمان
نوجوان میری نظر سے گزرے ہیں ان سب میں وہ سب سے نیک تامل مثال
نوجوان ہے۔

ملازمت

۱۲۹۱ھ میں انہیں بعض نامساعد حالات کی بنا پر
لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ چھوڑ کر آپ اپنے بڑے بھائی مولوی سید عنایت حسین کے
پاس چرکھاری ضلع ہمیرپور پہنچے اور وہاں ملازمت کا خیال آپ کو پیدا ہوا چنانچہ
آپ اپنے والد صاحب کے دوست ڈاکٹر اسٹراٹن صاحب سے ملے جن سے آپ کے
بھائی آپ کے علم و کمال کی تعریف کر چکے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے آپ کو مشورہ
دیا کہ انگریزی زیادہ پڑھیں۔ چنانچہ وہاں آپ نے انگریزی بھی پڑھی اور جب
قوت مطالعہ پیدا ہوگئی تو آپ نے طبیعات، کیمیا، علم نباتات و حیوانات حاصل کیا
اور ہربرٹ فلسفہ اسپنسر کو پڑھا جو دس جلدوں میں ہے اور اس کے بعد آپ
راجکمار کالج بندیل کھنڈ میں ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ تین برس مدرسی کرنے
کے بعد ۱۸۷۸ء میں میر منشی مقرر ہوئے اور کام اس خوبی سے کیا کہ پولیٹیکل ایجنٹ
صاحب بہادر بندیل کھنڈ آپ کے معتقد ہوگئے اور ایجنٹ صاحب کی سفارش پر

... اور جب ولی عہد ریاست بالغ ہوئے
تو ۱۸۸۲ء میں ریاست چھکاری کا چارج اُن کے حوالے کرکے سبکدوش ہوئے
اور پھر ایجنٹ صاحب کی سفارش سے نرسنگھ گڑھ کے دیوان مقرر ہوئے۔

سفر لندن اور بیرسٹری :- راجہ صاحب نرسنگھ گڑھ نے جب لندن جانے کا ارادہ کیا تو مولانا سید کرامت حسین کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ ایجنٹ صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ لندن میں بیرسٹری کی سند حاصل فرمائیں۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء میں آپ جب لندن پہنچے تو وہاں آپ نے انگریزی زبان اور تاریخ کا ایک ابتدائی امتحان پاس کیا اور پھر بیرسٹری کے امتحان کی تیاری کی اور ایک سال میں یہ امتحان بھی پاس کرلیا۔ اس امتحان کے بعد ٹرم پورا کرنے کے لیے ایک سال اور ان کو وہاں رکنا پڑا اور اس زمانے میں انھوں نے جرمنی زبان بھی حاصل کی اور اس کے لیے ہائیڈل برگ جاکر رہے۔ جولائی ۱۸۸۹ء میں ہندوستان واپس آئے۔ نومبر ۱۸۹۰ء میں سیّد کرامت حسین صاحب نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کردی۔ اس وقت سید محمود صاحب فرزند سر سید احمد خاں بہادر رح ہائی کورٹ میں جج تھے۔ آپ عید کے مبارک موقع پر ان سے عید ملنے گئے۔ سید محمود صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ مولانا سیّد حامد حسین صاحب کے بھتیجے اور شاگرد ہیں تو آپ کی بڑی عزت کی اور اپنے کتب خانے میں لے گئے اور پھر تعلقات زیادہ بڑھے۔ جسٹس محمود آپ کو اکثر ہائی کورٹ سے واپسی پر اپنے ساتھ اپنے مکان لے جاتے تھے اور فقہ' قانون' فلسفہ' ادب اور اخلاق وغیرہ موضوعات پر گفتگو فرماتے تھے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں قانون کی پروفیسری

جسٹس محمود کی سفارش پر سر سیّد احمد خاں بہادر نے آپ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں قانون کا پروفیسر مقرر فرمایا۔ اس وقت علی گڑھ میں ایل ایل بی کے لیے بی۔ اے کی شرط نہ تھی۔ آپ نے بی۔ اے کی شرط لگائی جس سے لاء کلاس میں آمدنی کم ہوئی جس کی بنا پر آپ کو کالج سے برطرف کیا گیا اور آپ کی جگہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کو قانون کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔

میور سینٹرل کالج الٰہ آباد میں لا ریڈری

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے کنارہ کش ہو کر میور سینٹرل کالج میں آپ لا ریڈر مقرر ہوئے۔ مگر کچھ عرصے کے بعد اس کو بھی چھوڑ دیا اور پھر مقدمات میں دلچسپی لینا شروع کردی

ججی ہائی کورٹ :- ۱۹۰۸ء میں لندن گزٹ میں آپ کا تقرر بحیثیت جج ہائی کورٹ مشتہر ہوا۔ اس خبر کے شایع ہوتے ہی ..۲ ٹیلی گرام اور ۵۰۰ خطوط مبارکباد کے ایکدم وصول ہوئے۔ اخبارات میں مبارکباد کے مضامین شایع ہوئے اور جا بجا جلسے ہوئے جنھیں اظہار تہنیت کے لیے تجاویز پاس ہوئیں۔ آپ ے زمانہ جی میں تنہا و دیگر جج صاحبان کے ساتھ بجاس طے فرمائے۔ آپ فیصلہ زبانی لکھاتے تھے۔ آپ کا مزاج اجلاس میں گرم نہ ہوتا تھا۔ اجلاس کی ابتدا سے انتہا تک وہی تہذیب وہی خندہ پیشانی ایک سی رہتی تھی۔ آپ فرماتے تھے کہ جس کی زبان قانون ہو اس کو غصہ کیوں۔ ۱۹۱۲ء میں آپ عہدۂ ججی سے سبکدوش ہوئے اور آپ کو ایڈیشنل اراکین قانون پیش کیا گیا۔

تعلیم نسواں

آپ کو تعلیم نسواں کا خیال لندن پہنچنے پر ہوا۔ ۱۸۸۶ء مولانا کرامت حسین صاحب وہاں پہنچے اور اعلیٰ صحبتوں میں شریک ہو میموں سے آپ کی گفت و شنید ہوئی اور مختلف موضوعات پر اظہار خیال کا موقع ملا تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے عورتوں کی تربیت نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں جب کہ آپ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں قانون کے پروفیسر تھے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس ششم منعقدہ علی گڑھ بتاریخ ۲۷ دسمبر میں سر سیّد احمد خاں بہادر کی موجودگی میں تعلیم نسواں کی ضرورت پر تجویز آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب پانی پتی نے پیش فرمائی جس نے پرزور تائید فرمائی۔ سر سیّد احمد خاں بہادر نے تعلیم نسواں کے بارے میں فرمایا کہ میں تعلیم نسواں کا مخالف نہیں ہوں۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے اور ان کو کیا علوم تعلیم کیے جائیں، یہ مسائل طے نہیں ہو پائے ہیں۔ لڑکوں کی تعلیم ہی کو ہم لڑکیوں کی تعلیم کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جہاں کے مرد تعلیم یافتہ ہوگئے ہیں وہاں کی عورتیں بھی تعلیم یافتہ ہیں۔ ان مسائل کا جواب بھی غلام الثقلین صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا اور بالآخر کثرت رائے سے یہ تجویز پاس ہوگئی۔ جناب لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ سر چارلس کو کراستھویٹ کی یہ تعلیمی تجویز بھی بہت پسند آئی اور انھوں نے الٰہ آباد میں کراستھویٹ گرلز اسکول کی بنیاد ڈالی جو اب کالج ہے۔

۱۹۱۱ء میں جناب سر راجہ محمد علی خاں صاحب تعلقہ دار محمود آباد الٰہ آباد تشریف لے گئے تو جسٹس سیّد کرامت حسین صاحب نے ان کو کراستھویٹ گرلز اسکول کے ملاحظہ کے لیے دعوت دی۔ جناب راجہ صاحب نے ملاحظہ کے بعد فرمایا کہ پہلے تو میں لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھا' مگر کلکتہ جانے اور تعلیم یافتہ عورتوں کو دیکھنے کے بعد میرا خیال تبدیل ہوگیا کہ اگر مسلمان لڑکیاں تعلیم نہ پائیں گی تو تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان برہمو عورتوں سے شادی کریں

فرقے عالموں کو باہم اختلاف ہے۔ حالاں کہ ہر شخص مدعی ہے کہ جو وہ کہتا ہے وہی حکم آلہی ہے۔ کیا حکم آلہی سرمدی کے یہی معنی ہیں کہ ہر شخص اس کو اپنی رائے کے مطابق گڑھ لے۔ حکم آلہی سرمدی کیا ہوا' پانی ہوا کہ جس ظرف میں اس کو رکھا اسی کی صورت میں متصور ہو گیا

مسلمانوں کے تنزل اور ادبار کے اسباب جسٹس مولانا سید کرامت حسین صاحب کی نظر میں ۔

مولانا رقام فرماتے ہیں:-

میری رائے میں مسلمانوں کے تنزل اور ادبار کی صحیح وجہ یہ ہے کہ وہ صحیح اور سود مند علوم حاصل نہ کرکے وہ مادہ اور قوت کے مرکبات سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور زصحت' دولت' عزت اور قوت حاصل کرنے میں بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ اس اعتقاد کا یہ اثر ہوا کہ انسان اپنی بہتری اور ترقی کی کوشش نہ کرے عین ضلالت ہے۔

میرے نزدیک ایسی تعلیم جس سے متعلم تندرست' متمول' بے آزار و سود مند بن جائے بہترین خیرات و بہترین اعمال حسنہ ہے۔

میری رائے میں ہر مرد و عورت پر فرض عین ہے کہ وہ پوری کوشش کرکے تندرست رہے' ضروری کسب معاش میں مشغول ہو۔ اپنا بوجھ اوروں پر ڈالنا قبیح جانے۔

وفات :- آپ نے ۱۹/ اپریل ۱۹۱۷ء کو سر راجہ محمد علی محمد خاں صاحب کے محل المعروف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ میں وفات پائی اور آپ کا دفن کربلائے تال کٹورہ لکھنؤ میں اندرون احاطہ امام باڑہ مرزا کیواں جاہ' مسجد کے جانب شمال واقع ہوا۔

محامد :- سید حامد علی صاحب مولف حیات مولانا سید کرامت حسین تحریر فرماتے ہیں:-

مولانا سید کرامت حسین صاحب کے علم و فضل' کمال فنون و اوصاف کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ مولانا ہر فن مولا تھے۔ تفسیر' حدیث' فقہ' ادب' قانون' منطق' فلسفہ' تاریخ' جغرافیہ' ہیئت و نجوم' علم جفر' علم طب و ڈاکٹری سائنس اور لسانیات' مثلاً فارسی' عربی' سریانی' فرانسیسی' لاطینی' جرمنی اور انگریزی کے ماہر تھے اور علم سیاست سے بھی خوب واقف تھے۔ فلسفہ اسپنسر کے خاص طور سے ماہر تھے۔ اس کو دس برس تک آپ نے پڑھا۔ فن میں آرٹ کے بھی ماہر تھے اور طباخی میں بھی کامل دستگاہ تھی۔

مولانا کا کردار نہایت بلند تھا۔ صداقت' راستبازی' صاف گوئی' آزادی' یک رنگی' پختہ مزاجی' بے تعصبی' ہمدردی وغیرہ آپ کے خصوصیات تھے۔ ہکسلے نے کیا خوب کہا ہے۔ ترجمہ " لائق آدمی روئے زمین پر بہت ہیں کیریکٹر (سیرت) کے آدمی بہت کم ہیں" ہمارے مولانا میں یہ دونوں باتیں جمع تھیں۔ لیاقت لاجواب کیریکٹر بے مثل۔

> اگر خدمت قومی کا کوئی کام نیک نیتی سے' خدا کا کام سمجھ کر کیا جائے تو ہرچند کہ دشواریوں اور آزمائشوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن جس کا کام ہوتا ہے وہ دست گیری فرماتا ہے اور منزل تک قدموں کو ثبات عطا کرتا ہے۔
> (ڈاکٹر ذاکر حسین)

تصانیف :- آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی اہم تصانیف فہرست حسب ذیل ہے۔

مذہبی تصانیف

۱- سچا عقیدہ۔ عقائد اصولیہ پر

۲- حالات جنابہ سیدہؑ۔ بشری پہلو سے بحث کی ہے۔ غیر مطبوعہ

۳- حالات حضرت امام حسین علیہ السلام بشری پہلو بیان فرمایا ہے۔ غیر مطبوعہ

۴- حالات امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام۔ بشری پہلو بیان فرمایا ہے۔ غیر مطبوعہ

۵- المرأۃ۔ صنف نسواں پر

۶- الدین والکون۔ مطبوعہ ۱۹۱۰ء۔ خدا کی ہستی کے ثبوت پر اسپنسر اولیوشن اینڈ سولیوشن کا خلاصہ

۷- مسلمانوں کی تعلیم پر ایڈریس۔ جو نواب سجاد علی خاں صاحب بنا ٹولہ ٹھاکر نواب علی خاں صاحب تعلقدار اکبر پور ضلع سیتاپور نے طبع کرایا۔

۸- تعلیم نسواں پر لکچر بزبان اردو۔

۹- مکاتیب عربیہ۔

۱۰- رسالہ علم اخلاق بزبان اردو و فارسی۔

۱۱- افراد کا سیر۔ مطبوعہ تصویر عالم پریس لکھنؤ

ادبی تصانیف

۱۲- فقہ اللسان۔ عربی فیلالوجی پر تین جلدوں میں مطبوعہ منشی نول کشور۔ لکھنؤ۔ ۱۹۱۶ء

۱۳- رسالہ فی امور العامہ

قانونی تصانیف۔

۱۴- سائنس آف لا۔ بزبان انگریزی

۱۵- اے اسکیم فار دی پروگریس آف محمڈن لا

۱۶- ڈرائینٹیو اور ٹیکن آف دی پرائمری عربک روٹس

۱۷- حقوق و فرائض اور ان کے ارتقاء بموجب اصول قانون فقہ۔ مطبوعہ انڈین پریس۔ الہ آباد۔

اشتیاق محمد خان، بمبئی

علی گڑھ کی ایک دلنواز شخصیت

جناب مُراری لال متل

فلم ڈائرکٹر تنویر احمد صاحب (علیگ) نے اپنی فلم "مسٹر عاشق" کے ایک
سیٹ پر مجھ سے کہا "اشتیاق صاحب. میں نے آج کے سیٹ پر یونیورسٹی
کے بہت ہی پرانے اولڈ بوائے متل صاحب کو بھی مدعو کیا ہے۔ آپ
ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

متل صاحب کی آمد کا میں بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ فلم کا شوٹ
ختم ہو گیا لیکن وہ کسی وجہ سے نہ آ سکے۔

بہرحال تنویر صاحب سے متل صاحب کے گھر کا فون نمبر حاصل کیا اور
دوسرے ہی دن صبح متل صاحب سے فون پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا
متل صاحب، میں آپ کو جانتا ہوں لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔
تعارف کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ میں علیگ ہوں اور ایک چھوٹے علیگ
کی کو اپنے بڑے علیگ بھائی سے ملنے کا اشتیاق ہے۔"

متل صاحب نے جواب دیتے ہوئے فرمایا "آپ بھی علیگ
ہیں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے بھائی، علیگ ہونے کا تعارف
سب تعارفوں پر بھاری ہے۔ ہم تو میخانۂ سرسید کے پرانے میخواروں
میں سے ہیں۔ ظہور وارڈ میں اے. بی. سی. ڈی کے ابتدائی درس سے لے کر
ایل ایل بی کی ڈگری تک ایم اے او کالج کے مرہونِ منت ہیں جب
آپ کو فرصت ملے بلا تکلف گھر (جوہو) پر تشریف لایئے۔ پھر تفصیل سے
گفتگو ہوگی۔"

چوتھے دن شام کے وقت اطلاع کیے بغیر میں متل صاحب
کے مکان پر پہنچ گیا۔ دروازے کی گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا۔ "میں
اشتیاق ہوں۔ علیگ۔" متل صاحب کی جیسے باچھیں کھل گئیں۔
تپاک طور پر مصافحہ کیا۔ ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ میرے سوالوں

کے جواب میں متل صاحب نے فرمایا "ہمارا خاندان تو علی گڑھ
شہر کے محلہ مانک چوک میں اب بھی ہے۔ میری پیدائش، نومبر ۱۸۹۳ء
کی ہے۔ میرے والد رائے صاحب لالہ لسوری لال علی گڑھ سول کورٹ
کے مشہور وکیل تھے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں مجھے سرسید احمد خاں کے مدرسہ
میں دوسری جماعت میں داخل کیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں میں نے انٹرنس
پاس کیا۔ پھر ایم اے او کالج سے سنہ ۱۹۱۴ء میں بی اے پاس کیا۔ دو سال
بیمار رہنے کے باعث تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا۔ جب صحت مند ہو گیا تو پھر
ایم اے او کالج میں داخلہ لیا۔ اور سنہ ۱۹۱۷ء میں ایل ایل بی پاس کیا۔
ایل ایل بی کرنے کے بعد ڈیڑھ سال تک والد صاحب کے ساتھ علی گڑھ
سول کورٹ میں پریکٹس کی۔ پھر اپریل سنہ ۱۹۲۱ء کو آگرہ میں حیثیت
ڈپٹی کلکٹر میری پوسٹنگ ہوئی۔ کافی عرصہ آگرہ میں رہا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں
اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے
وقت میں لکھنؤ میں تھا اور اس کے فوراً بعد ہی بمبئی منتقل ہو گیا۔
یہاں میرے لڑکے تھے۔"

میرے اس سوال کے جواب میں کہ آپ علی گڑھ کب سے نہیں
گئے، فرمایا "بھئی، سنہ ۱۹۲۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۶ء تک تو یوپی ہی میں
گورنمنٹ ملازم کی حیثیت سے ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی آگیا۔
اور ابھی تک علی گڑھ جانا نہ ہو سکا۔ سنا ہے علی گڑھ شہر بھی بہت
بڑھ گیا ہے۔ اور یونیورسٹی کے علاقہ میں تو میدان اور بنجر زمین تک
آبادیوں اور سبزہ زاروں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ جی بہت چاہتا ہے علی گڑھ
دیکھنے کو بالخصوص یونیورسٹی کو۔ اس لیے کہ صاحب باغ کے پاس ہماری
جائداد بھی ہے۔ والد صاحب کا قائم کیا ہوا دھرم شالہ اور ایک مندر بھی

[illegible]

سوال: آپ جب ایم اے او کالج کے طالب علم تھے تو اس وقت طلبا کی کتنی تعداد تھی۔ بورڈر کتنے تھے اور ڈے اسکالر کتنے؟ ہندو طلبا کتنے تھے۔ ماحول کیسا تھا؟

متل صاحب: میرے خیال میں یہی چار پانچ سو طلبا ہوں گے۔ زیادہ تعداد بورڈرز کی تھی۔ میں ڈے اسکالر تھا۔ ماحول بہت اچھا تھا۔ ہندو مسلم طلبا کے درمیان کوئی فرق یا امتیاز نہ تھا، بالکل بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔ ہندو طلبا اندازاً پانچ سے دس فیصد تک تھے۔ کالج کا یونیفارم ٹرکش کوٹ، ٹرکش ٹوپی اور پتلون تھا۔ گریجویٹ ہونے کے بعد ہر طالب علم اپنے نام کے آگے "علیگ" ضرور لکھتا تھا۔ اور "علیگ" ہونا گویا ایک بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ 'علیگ' برادری میں بھائی چارہ کا جذبہ بلا امتیاز مذہب و فرقہ اتنا زبردست تھا کہ دوسرے لوگ رشک کرتے تھے۔ پتہ نہیں وہ جذبہ ہے کہ نہیں!"

میں نے کہا' علیگ برادری کا وہ جذبہ ہے تو اب بھی لیکن کم کم۔ آپ کو علی گڑھ چھوڑے ہوئے باسٹھ سال ہو رہے ہیں۔ نصف صدی میں زمانہ نے جتنے انقلابات دیکھے ہیں اتنے تو صدیوں میں بھی کبھی نہیں ہوئے۔ ہر جگہ تبدیلی آئی ہے۔ علی گڑھ بھی اس سے مبرّا نہیں۔

میں رخصت ہونے سے پیشتر ایک ذاتی سوال اور پوچھ لیا متل صاحب آپ زندگی کے نوّے سال گزار کر اب آپ ماشاء اللہ اکیانوے سال میں داخل ہو رہے ہیں۔ آپ کی رفتار، گفتار اور جسمانی حالت سے عمر کم لگتی ہے۔ آپ کی صحت کا راز کیا ہے؟ متل صاحب نے فرمایا "علی الصبح جوہو بیچ پر (سمندر کے کنارے) ڈیڑھ کلومیٹر تک چہل قدمی۔ کھیلوں کی مشقیں، معتدل کھانا اور ذہن کو پرسکون رکھنا۔ بس یہی صحت کا راز ہے!"

سید افتخار احمد نقوی

ایم۔ ڈی۔ ڈاشنل،

شعبۂ علم الادویہ

عہدِ اموی کا ایک عظیم کیمیا داں

جابر بن حیان

خلفاءِ بنی امیہ کے دورِ خلافت میں عربی سلطنت انتہائی وسعت کو پہنچ چکی تھی۔ اموی دور میں یہ بتانا از حد دشوار کہ اس عہد میں فنِ طب نے کیا ترقی کی کیوں کہ اموی دور کے عربوں میں طب کا سراغ بہت کم ملتا ہے۔ صرف تین یا چار اطباء کے نام ملتے ہیں یہ بھی غیر عرب یا مسیحی تھے۔ گو کہ اس عہد میں حفظِ صحتِ عامہ پر خاص توجہ کی جاتی تھی۔ طبری کے مطابق ۸۸ھ میں خلیفہ ولید نے مریضانِ جذام کے لیے ایک جگہ بنائی تھی۔

" اموی شہزادہ خالد بن یزید بن معاویہ علم کیمیا کا بڑا دلدادہ تھا۔ اُسی نے عربوں میں یونانی علوم سے بہرہ ور ہونے کی تحریک کی۔"
[الفہرست - ابن ندیم]

اسی نے یونانی فلسفے کے علماء کو مصر میں جمع کیا اور کیمیا کے متعلق یونانی اور مصری کتب کو عربی میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔

"مسلمانوں میں طب فلسفہ اور دیگر علوم حکمیہ میں تالیف اور ترجے
کی تحریک اسی عہد میں شروع ہوئی" (تاریخ تمدن اسلامی۔ جلد سوم)

اس عہد میں جہاں دیگر علوم و فنون میں بے شمار ترقیاں ہوئیں وہاں علم کیمیاء میں اکثر اضافے ہوئے اور بہت سی نئی کیمیاوی اشیاء دریافت کی گئیں۔ ان اضافوں اور اختراعوں میں فضیلت اور برتری کا سہرا اُس دور کے عظیم کیمیا داں جابر بن حیان کے سر ہے۔

کیمیاء کا فن دنیا میں بڑے بڑے کام سرانجام دے چکا ہے گو کہ موجودہ دور میں تو اس کی ترقیوں کی رفتار نہایت حیرت انگیز ہے۔ حکماء عرب نے اس جہت میں جیسی ترقی کی ہے اور جیسے جیسے اکتشافات کیے ہیں، وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے ایسے تجربات کیے جن کی بدولت وہ دوسروں کے مقابلے میں بہت ممتاز ہو گئے۔

جابر بن حیان کا پورا نام ابوموسیٰ جابر بن حیان الازدی الطوسی بن عبداللہ ہے لیکن یہ الصوفی اور ابوموسیٰ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ یہ ۱۶۱ھ کے اکابرین میں سے ہیں۔ یہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ اس کی شخصیت کے بارے میں مورخین میں اختلاف ملتا ہے۔ شیعہ علماء کا خیال ہے کہ جابر بن حیان ان کے اکابرین میں سے تھے اور حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبوں میں شامل تھے۔ فلاسفہ کا خیال ہے کہ جابر کا تعلق ان کے گروہ سے تھا۔

مورخین کے ایک بہت بڑے گروہ کا خیال ہے کہ جابر بن حیان کو خالد بن یزید بن معاویہؓ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

"امیر معاویہؓ کے پوتے خالد بن یزید کو طب اور کیمیاء سے عمیق دلچسپی تھی۔ طب و کیمیاء میں خالد کے علم و فضل کا اندازہ اس امر سے لگ سکتا ہے کہ اسلامی فن کیمیاء کی مشہور زمانہ شخصیت جابر بن حیان الصوفی کو بھی اس سے نسبت تلمذ حاصل ہے"۔

طب اسلامی۔

جابر کو فن کیمیاء سے گہرا شغف تھا وہ درحقیقت اس علم کے جملہ اسرار و رموز سے واقف تھے۔ اس کی شہرت و ناموری اس کو اس ناواقفیت پر ہی منحصر نہیں بلکہ اس میں جابر کی مساعی جمیلہ کو بھی دخل ہے جو انھوں نے کیمیاء کے اوضاع تبدیل کرنے اور اس میں تجربہ، مشاہدہ، استنتاج کی صلاحیت پیدا کر دینے کی شکل میں سرانجام دی۔ یہی وہ عوامل ہیں جنہوں نے جابر کو تاریخ ارتقاء کیمیاء میں صف اول کے زندہ جاوید ماہرین فن کے درمیان جگہ دی۔

"جابر پہلا شخص تھا جس نے عمل تقطیر کے ذریعے گندھک کا تیزاب (H_2SO_4) تیار کیا اور اس کا نام "زیت الزاج" رکھا۔ اگر تیزاب گندھک ثقافتی اور معاشی ترقی کا نشان ہے تو ہمیں جابر کو نسل انسانی کو سب سے بڑا فائدہ پہنچانے والا تسلیم کرنا پڑے گا۔"

(آؤٹ لائن آف ہسٹری کیمسٹری ہیومنس ٹو دی میڈیسن ص۱۶۵)

جابر نے ہی تیزاب گندھک اور تیزاب شورہ کا ایک ایسا محلول تیار کیا جس میں سونا اور چاندی بھی تحلیل ہو جاتے اس کے متعلق مشہور مورخ متجر ہسٹری آف میڈیسن میں ص۲۲۳ پر رقمطراز ہے۔

"اس نے ایک محلول H_2SO_4 اور نائٹرک ایسڈ کا بنایا جس کو Aqua Ragia کہا تھا اس میں سونا تحلیل ہو جاتا تھا"

جابر نے سوڈیم کاربونیٹ کاسٹک سوڈا، پوٹیشیم کاربونیٹ سے بھی عالم انسانی کو روشناس کرایا۔ جابر نے پارے کو خصوصیت اور ... کا مطالعہ کیا نیز بنایا بھی۔ ... مترجم حکیم ... واسطی کہتے ہیں۔

"تمام منصف مزاج معاصر مورخین کو اعتراف ہے کہ جابر نے علم کیمیا کو سائنٹفک کو سائنٹفک طور پر مرتب کیا۔ جابر ہی نے کشتہ جات اور معدنی مرکبات بنائے تصعید، ترشیح، تبخیر اور تقطیر وغیرہ کے طریقے ایجاد کیے۔ تیزاب سے الکحل بنانے کا طریقہ دریافت کیا اور آرسینک (سنکھیا سیاہ) اور اینٹی منی وغیرہ کو ان کے مرکبات سے علیحدہ کر کے اصول معلوم کیے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی تحقیقات اور تجربات ہیں جن اضافوں اور طریقوں پر کاربند رہ چکا ہے ان کی بدولت اس نے علم کیمیا کی تاریخ میں ایک دوررس اثر پیدا کر دیا ہے وہ ان ہی خصوصیات کی بناپر عرب کے زندہ جاوید مشاہیر کی صف میں شامل ہے اور رہتی دنیا تک عالم انسانیت سے خراج تحسین حاصل کرتا رہے گا۔

جابر بن حیان کے علم و فضل اور فنی کمال کا اعتراف یورپ کے تمام بلند مرتبہ محققین نے کیا ہے مشہور مورخ جارج سارٹن کہتا ہے کہ

"جابر ایک بے نظیر شخص تھا۔ اسے جو مقام حاصل تھا اس میں کوئی عالم اس کی ہمسری کا دعوا نہ کر سکتا تھا اس نے اپنے مخلص اور جفاکش شاگردوں کا ایک ایسا گروہ تیار کیا تھا جو اُس کے بعد کئی صدی تک علمی تحقیقات کے کام کو آگے بڑھاتا رہا۔ اس طرح جدید سائنس کے عہد کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ اس کامیابی کا سہرا بھی جابر کے سر ہے۔"

تصانیف:۔ جابر بن حیان کی تصانیف کی مجموعی تعداد ۵۰۰ ہے۔ اس میں سے اکثر تلف ہو چکی ہیں جو باقی ہیں وہ اس حقیقت کا انکشاف کرنے میں قاصر نہیں ہیں کہ موجودہ تجربے اور تحلیلی کیمیاء کے بانی مسلم کیمیا داں ہیں۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی کو جابر بن حیان کی تالیفات اس قدر محبوب تھیں کہ اس نے جابر کی ایک کتاب کو نظم کر لیا تھا۔

ابوعلی، اعظم گڑھ

علامہ شبلی کی سیرۃ النبی

اب تک یہ متفق علیہ سمجھا جاتا تھا کہ سیرۃ النبی کی پہلی دو جلدیں تمام تر مولانا شبلی کے قلم سے ہیں اور ان ہی دونوں میں آپ کی سیرت ختم بھی ہوگئی ہے۔ بقیہ جلدیں اسی کی لوازم ہیں جن کا لکھا جانا بھی بہت ضروری تھا۔ اس لحاظ سے جیسا کہ مولانا شبلی کا بھی خیال تھا کہ یہ پورا سلسلہ دائرۃ المعارف النبویہ ہوگیا جس میں آپ کی پوری زندگی کی مرقع آرائی ہوگئی۔ اس اہم تصنیف پر اردو زبان کو جتنا بھی ناز ہو کم ہے کہ اس کی نظیر سے عربی جیسی وسیع و ہمہ گیر زبان کا دامن بھی خالی ہے، لیکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے ایک فاضل ریسرچ اسکالر نے جو مولانا شبلی کے عزیز شاگرد اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی پر ڈاکٹریٹ بھی کر رہے ہیں، یونیورسٹی کے پندرہ روزہ رسالہ تہذیب الاخلاق میں سیرۃ النبی جلد اول و دوم کا مولف؟ علامہ شبلی یا سید سلیمان ندوی" کے عنوان سے مضمون لکھ کر لوگوں کو حیرت اور استعجاب میں ڈال دیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس سلسلہ کی ابتدائی دو جلدیں بھی مولانا شبلی کی نہیں، مولانا سید سلیمان ندوی ہی کی ہیں۔ ان کے سارے مباحث ان ہی کے قلم کے ہیں۔ اگر یہ دونوں جلدیں بھی سید صاحب کے قلم سے ہوتیں تو وہ اس کا اظہار بڑے فخر و انبساط کے ساتھ ان دونوں جلدوں کے دیباچے میں کر سکتے تھے۔ مولانا شبلی نے ان دونوں جلدوں کے دوران تالیف میں اپنے اہل علم معاصر دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں، جو شایع ہوگئے ہیں ان سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ ان دونوں جلدوں کو اپنی زندگی ہی میں نہ صرف یہ کہ مرتب کر چکے تھے بلکہ اُن کا مبیضہ بھی کرا لیا تھا، بس اُن کے پریس میں جانے کی دیر تھی کہ وہ راہی عالم بقا ہوگئے انھوں نے اپنے مرض الموت میں بقیہ جلدوں کی جن کا خاکہ سیرت النبی جلد اول کے مسودہ اور پھر مبیضہ میں کر چکے تھے تکمیل کی وصیت کی تھی جس کو مولانا سید سلیمان نے مزید چار جلدیں لکھ کر پورا کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اُن کی عمر میں کچھ اور برکت دی ہوتی تو ساتویں جلد بھی مکمل ہو جاتی، جس کو انھوں نے چھٹی جلد کے طبع ہو جانے کے بعد ہی لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ابھی چند ہی مضامین لکھے تھے کہ ان کی عمر مستعار بھی ختم ہوگئی، اور اپنے استاد کی طرح وہ بھی اسی ناکامی کا داغ لے کر دنیا سے تشریف لے گئے

ان دونوں جلدوں میں سید صاحب کے قلم سے اتنا ہی ہے جتنا انھوں نے جا بجا قوسین کے اندر کر دیا ہے، تاکہ استاد اور شاگرد کی عبارت مختلط نہ ہونے پائے اور جتنا بھی قوسین کے اندر ہے، اس کے لکھے جانے کے لیے مسودہ میں مصنف کی طرف سے اشارہ بھی تھا اور جہاں اشارہ نہیں تھا، وہاں اس کی کمی خود محسوس کر کے، اپنے قلم سے اضافہ کر دیا ہے۔

سید صاحب پہلی جلد کے طبع اول کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا، اس میں اس حصہ تک مبیضہ تھا۔ اس میں چار مقامات پر اضافہ کی علامت نہیں تھی اور کہیں کہیں اور مطالب کے بڑھانے کی یادداشت تھا، جنھیں ان کو اپنی زندگی میں پورا کرنے کا موقع نہیں مل سکا، اور انتقال فرما گئے امانت میرے سپرد ہوئی تو میں نے ان ہی علامات و اشارات کی روشنی میں اضافہ کر دیا کہیں حوالے اور حواشی چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈ کر لکھے۔ لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی، متن یا حواشی و تعلیقات میں جامع کا کوئی لفظ کیا، کوئی حرف بھی مصنف کی عبارت میں نہ ملنے پائے، اس لیے ان تمام جزئی اضافوں، اور حواشی و تحقیقات کو جو مصنف کے قلم سے نہیں، قوسین کے اندر کر دیا گیا ہے کہ دیانت کا تقاضا یہی تھا، وہ بھی ہیں۔ اس طرح کے اضافے، سیرت جلد دوم میں پہلی جلد سے زیادہ ہیں، جو دراصل پہلی جلد کا دوسرا باب تھا، مگر حجم کے بڑھ جانے کے خیال سے قارئین کی آسانی کے لیے دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔"

سید صاحب اس دوسری جلد کے دیباچے میں لکھتے ہیں

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا مسودہ میں ہاتھ میں آیا اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی جن کے اضافے کے بغیر یہ جلد مکمل نہیں ہو سکتی مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر کار کچھ دن کے حیص بیص کے بعد طے کر لیا کہ ان کا لکھا جانا بہرحال ضروری ہے۔ اتفاق سے اسی دوران میں مولانا کی ایک یادداشت بھی دستیاب ہوگی، جو وفات سے چند ماہ پیشتر کی لکھی ہوئی تھی، جو یادداشت اخیر تھا، جن کا مطلب یہ تھا کہ پھر آئندہ اسی کے مطابق لکھا جائے گا لیکن بھی لکھنے کا مصنف کو موقع نہ مل سکا، اس یادداشت کو پڑھ کر بڑی مسرت کی انتہا نہ رہی کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا تھا، ان کا اضافہ اس یادداشت میں ضروری قرار دیا۔ بہرحال جیسا کہ جلد اول کے دیباچے میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس جلد کے بھی تمام اضافے خواہ ہوں یا خواہ کم تکملے اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں تاکہ اصل اور جامع کی عبارتیں باہم مخلط نہ ہونے پائیں،

سید صاحب نے اپنے کو ان دونوں کا ہر ایک کے دیباچے میں جامع ہی لکھا مرتب اور مصنف نہیں لکھا ہے۔

فاضل جامع کی اتنی وضاحت کے بعد کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ دونوں جلدیں بھی مولانا شبلی کی نہیں، سید صاحب کی لکھی ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر اصغر عباس،
شعبۂ اردو،
مسلم یونیورسٹی

اردو کی تدریس کے مسائل اور ان کا حل

[یہ تحریر اس مضمون کی تلخیص ہے جو میں نے آل انڈیا اردو ٹیچرس کانفرنس مالاپورم کیرالا کے پہلے اجلاس میں پیش کیا۔]

رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ اردو کا دوسرا نام علی گڑھ بھی ہے۔ حقیقت تو سب پر روشن ہے کہ علی گڑھ تحریک نے اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیا اس نے قدماء کی کوتاہیاں واضح کر کے نئے اردو ادب کی راہ ہموار کی۔ اس نے شاعری و نثر میں ابلاغ کی اہمیت پر زور دیا اور ایک ایسے اسلوب کی طرح ڈالی جس کے امکانات بڑے تابناک تھے۔ علی گڑھ کے طلبا نے شعر و ادب خطابت و صحافت کے ذریعے اردو کا حق ادا کیا۔ لیکن آزادی کے بعد دھیرے دھیرے علی گڑھ میں تبدیلی آتی گئی اب یہاں زیادہ تر ایسے طالب علم آ کر داخلہ لیتے ہیں جن کا ذریعۂ تعلیم ہندی ہے۔ اس کا اثر اردو کی اعلیٰ تعلیم پر پڑا ہے اور گزشتہ کئی برسوں سے یہ اثر ایک مسئلہ بن کر ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ اگر اس کا ہم نے کوئی حل نہ نکالا تو خود ہمارا وجود اور اردو کی تدریس و تحقیق کا دور دور تک پتہ نہیں ملے گا۔ اب اردو کی اعلیٰ تعلیم شمالی ہند کی تمام جامعات میں، جس میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی شامل ہے، اس منزل پر پہنچ گئی ہے جسے آسانی سے ہرچند کہیں کہ "ہے، نہیں ہے" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

میں اس بات کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ہمیں اعلیٰ درجات میں زیادہ تر ایسے طالب علم ملتے ہیں جو اردو کے مبادیات سے ناواقف ہوتے ہیں یہ طلبا زیادہ تر تحصیلی مدرسوں سے آتے ہیں جو اردو کو آسان مضمون سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اردو کے تہذیبی پس منظر سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے انھیں نہ تو اردو صرف و نحو کا علم ہوتا ہے اور نہ جملوں کی ساخت کا اور جب یہ باتیں مفقود ہوں تو شعر فہمی اور ادب دوستی کا وجود کہاں رہے گا۔ اور "ہر شام ہے شام مصر یہاں" اور "ہر شب ہے شب شیراز یہاں" کی معنویت کیسے سمجھ میں آئے گی۔

بات یہیں آ کر ختم نہیں ہوتی جسے ہم بطور محاورہ یہ کہتے ہیں کہ "شین قاف بھی درست نہیں" عملاً اس کی مثالیں کلاس میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ طالب علم اردو کے حروف کو صحیح مخرج کے ساتھ ادا نہیں کر پاتا، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ابتدا میں جب طالب علم اپنی تعلیم شروع کرتا ہے تو اسے ہندی کے مخارج سے سابقہ پڑتا ہے اور جب وہ اردو کی تعلیم شروع کرتا ہے تو ان مخارج سے اس کا ٹکراؤ ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اردو کے مخارج میں ہندی کے حروف کے مخارج کا امتزاج کر دیتا ہے اور وہ صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتا کہ اردو کا شین قاف کیسے ادا کیا جاتا ہے۔

اب اس صورت حال کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ طالب علم اسی قابلیت کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے وہ ابتدائی درجات سے ثانوی درجات میں ترقی پاتا ہے اور پھر یونیورسٹی میں آ کر ادبیات کے مطالعے میں مصروف ہو جاتا ہے جب کہ اسے اردو کے ادبی سرمایے اور ادبی مزاج سے کوئی مس نہیں ہوتا اور یونیورسٹی سے جب وہ استاد کے منصب پر پہنچ جاتا ہے تو کار طفلاں تمام خواہد شد کا نمونہ بن جاتا ہے۔

ہمیں اس مسئلے کی نزاکت محسوس کرنی چاہیے اور تعلیم و تدریس کا ایسا لائحۂ عمل مرتب کرنا چاہیے جو طلبا کو اس در پیش آفت سے محفوظ رکھ سکے۔

میرے نزدیک ادبیات کی تعلیم کے لیے نصاب مرتب کرتے وقت ہمیں طلبا کی اس بے مائیگی کو پیش نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ ہمیں چاہیے کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے میں ایک اور لازمی پرچہ داخل نصاب کریں جس کے ذریعے طالب علموں کو اردو کے مبادیات سے واقف کرایا جائے۔

بظاہر یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبا کو صرف و نحو کی تعلیم دی جائے یا انھیں خ ز ژ ش ف اور ق وغیرہ کے صوتیات سے واقف کرایا جائے یا انھیں عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کے تلفظ اور اُن کی لہجے سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نہ صرف علی گڑھ میں بلکہ شمالی ہند کی ساری جامعات میں اردو کے اساتذہ اس نازک مسئلے سے دوچار ہیں۔ اس مضحکہ خیزی سے زیادہ اہم اور تکلیف دہ وہ صورت حال ہے جب اردو میں فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد طالب علم کا نہ تو شین قاف درست ہوتا ہے اور نہ وہ جملوں کی ساخت اور اس کی ترکیبوں سے واقف ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں اعلیٰ تعلیم کے درجات

[illegible] ترجمہ کو بھی استعمال میں لانا چاہیے۔ تاکہ طلبا صحیح طور پر مخارج سے واقف ہو جائیں جب ہم قواعد کی تعلیم دیں تو بطور خاص فارسی اضافتوں سے بھی بحث کریں گویا اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے ہمیں طالب علموں کو بی۔ اے اور ایم۔ اے کے درجات میں ابتدائی اور ثانوی سطح کی بھی تعلیم دینا ہے۔

اس کے علاوہ اگر شمالی ہند کی تمام جامعات کے اردو شعبے اپنے اپنے حلقے کے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے استادوں کے لیے ہر سال ایک تربیتی کورس شروع کریں تو اس سے ابتدائی اور ثانوی درجات کے طالب علموں میں اردو زبان و ادب کی بنیادی استعداد قابل اطمینان ہو سکے گی۔ تربیتی کورس کے انعقاد کے لیے اردو اکیڈمی اور یو۔ جی۔ سی سے امداد بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

میں بطور خلاصہ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اب تک اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جو نصاب مرتب کیا گیا ہے وہ ان طلبا کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے جو ثانوی درجات میں اردو کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعات میں داخلہ لیتے ہیں۔ اب ہمیں نصاب کے اس ڈھانچے کو قطعی طور پر بدلنا چاہیے اور اس میں اتنی لچک پیدا کرنی ہوگی جو بیک وقت ان طلبا کے لیے بھی مفید ہو جنھوں نے ثانوی درجات میں اردو کا مطالعہ بس یوں ہی سا کیا ہے اور ان طلبا کے لیے بھی مشعل راہ بنے جو ابتدائی درجات سے اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے یونیورسٹیوں تک پہنچے ہیں۔

صفحہ ۲۵ کا بقیہ

د۔ کتاب المطالع [Hypsicles: On Ascendents]

ھ کتاب الکرہ والاسطوانہ۔ [Archimedes: On Sphere and Cylinder]

طبیب بخت یشوع بن جبرئیل اسی شان و شوکت سے زندگی بسر کرتا تھا جس طرح خود خلیفۂ وقت۔ اس نے گرمی کے موسم میں خلیفہ کو رائی مدبّر کر کے کھلائی تھی۔ اتنی سی بات پر دوسرے دن جب خلیفہ کو کوئی تکلیف نہ ہوئی تو اسے بیش بہا انعامات سے نوازا گیا۔

خلیفہ المعتضد باللہ باوجود شان خلافت کے ثابت بن قرہ کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا تھا۔ ایک دن باغ میں ٹہلتے ہوئے اس کے ہاتھ ثابت کے ہاتھ پر پڑ گیا۔ مگر اس نے فوراً یہ معذرت کرتے ہوئے ہٹا لیا کہ

"نہیں ابوالحسن ایسا نہیں ہو سکتا، علم ہی کا ہاتھ اوپر رہنا چاہیے، اس پر کسی اور کو سربلندی نہ ہونا چاہیے۔"

نمبر ۵: اسی کتاب کے مقالہ دوم کی شکل چہارم [جس کا مطالبہ ہے کہ کسی طرح ایسے دو حصوں میں تقسیم کیا جائے کہ دونوں حصے ایک دی ہوئی نسبت میں ہوں] کے حل کے سلسلے میں تیسرے درجے کی مساوات کے حل کا سلسلہ شروع ہوا۔

[د] کتاب الاکر

[Menelaus: Sphaerica]

اسی کتاب میں پہلی مرتبہ شکل قطاع کو بیان کیا گیا جو قدیم یونانی اور اولین مسلمان ہیئت دانوں کے یہاں معلوم قوسوں کی مدد سے مطلوبہ قوسیں دریافت کی جاتی تھیں اور جو کروی مثلثات کی اصل ہے۔ اس کی آخری ترقی یافتہ شکل وہ ہے جسے البیرونی کے استاد نے "شکل مغنی" کا نام دیا اور جس کی رو سے ہر کروی مثلث میں

جیب ضلع ا / جیب زاویہ ا = جیب ضلع ب / جیب زاویہ ب = جیب ضلع ج / جیب زاویہ ج

اور جو آج کل Napier's Analogy کہلاتی ہے [جیب = Sine]

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ
مری اسیری پہ شاخ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رلایا
کہ ایسے پرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

— اقبال

جب تک تم نے کوئی بات اپنی زبان سے نہیں
نکالی وہ تمہاری قید اور حراست میں ہے اور جب تم
نے اسے آزاد کردیا تو پھر تم خود اس کے پابند ہو گئے۔ لہٰذا
اپنی زبان کی اسی طرح حفاظت کرو جیسے درہم و دینار
کی حفاظت کرتے ہو، کیونکہ بہت سے کلمے (متکلم کی)
نعمت کو سلب کر لیتے ہیں۔

— نہج البلاغہ

ہے ہر ہندوستانی واقف ہے۔ ہمارے لیے یہ مشکلات ہی کیا کم تھیں کہ اندرا جی
ادت نے اُن میں اور بھی اضافہ کردیا ؎

ہمارے واسطے دورِ خزاں ہی کیا کم تھا
کہ آج اپنے ہی مالی نے خاک کر ڈالا

اندرا جی کو ہمیشہ دیش کی ترقی کی فکر رہتی تھی۔ ان کے دورِ حکومت میں ملک
نے ترقی کی ہے۔ جتنا وہ مضبوط ہوا ہے اور جتنے اہم کام ہوئے ہیں، وہ اس سے
پہلے نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے پہلے سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک ہندوستان
کے کام کیا۔ اموسٹ تین سال کے دوران جس بڑے نقصان قدم اٹھائے
وہ قدم بھی نہیں کے۔ وہ ہمیشہ چلتی رہتی اور اُن کے ساتھ ہمارے قدم آگے بڑھتا
یہاں تک کہ جب انھیں دشمن کی گولیاں لگیں تو وہ اس وقت بھی چل ہی رہی تھیں
وہ قدم بڑھاتی رہتے تھے۔

ہمالیہ کی طرح بلند، سمندر کی طرح گہری، پھول جیسا دل رکھنے والی، سورج کی
روشن، سیماب فطرت اس دخترِ ہند نے جتنا کام تنہا اپنے ملک کے لیے کیا، اتنا کام ہم
مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی اس بے لوث خدمت کی یاد ہمارے لیے مشعلِ راہ
جب آزاد بھارت کی تاریخ لکھی جائے گی تو اُن کا نام اور ان کے کارہائے نمایاں

سبھی حروف میں لکھے جائیں گے۔

اپنی زندگی کی آخری تقریر میں، جو انھوں نے اپنے قتل سے ایک روز پہلے
اُڑیسہ میں کی تھی، کہا تھا:

"ہو سکتا ہے کہ میں آج ہوں، کل نہیں رہوں، لیکن میرے خون کا
ایک ایک قطرہ، ایک ایک بوند، بھارت کو زندہ رکھے گی، اس کو
مضبوط کرے گی۔"

اور اگلے ہی روز یعنی ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو صبح نو بج کر اٹھارہ منٹ پر انھیں شہید
کر دیا گیا۔ ہندوستان کی وہ بیٹی کہ جس پر ہندوستان فخر کرتا تھا کہ اس کی سرزمین
پر اس کی ایک ایسی بیٹی موجود ہے کہ جس نے اس کا سر پوری دنیا میں اونچا کر دیا۔
اُسی نازشِ ہند کے خون کے قطرے سرزمینِ ہند پر گرے اور اسے امر کر گئے۔ وہ مادرِ
وطن پر قربان ہو گئیں اور اس کے خون کی ہر بوند زمین پر لفظ "امرت" نقش کر گئی۔
مجھے امید ہے کہ اُن کے خون کا ہر قطرہ سرزمینِ ہند پر ہزارہا گلاب کھلائے گا۔ محبت کے
گلاب، زندگی اور مسرتوں کے گلاب، بھائی چارے کے گلاب، انسان دوستی اور اہنسا
کے گلاب، جمہوریت کے گلاب اور امن کے گلاب!

آج ہم سے وہ ہستی جدا ہو گئی ہے کہ اب نرگس بھی ہزاروں سال اپنی بے نوری
پر روئے گی تب بھی گلستانِ ہند میں ایسا دیدہ ور پیدا نہیں ہو سکے گا۔

آج سارا بھارت ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ کہیں سے دھیمی سسکیوں اور کہیں
سے آہ و بکا کی دلخراش صدائیں مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ ہر ہندوستانی اور دنیا کے
ہر امن پسند کی آنکھ سے جو خون کے آنسو ٹپک رہے ہیں وہ بھی میں دیکھ رہی ہوں۔
اگرچہ یہاں ہر طرف اندھیرا ہے۔ گہرا اندھیرا.... یہاں کی روشنی تو اندرا جی کے
ساتھ ہی ختم ہو گئی ہے۔ آج فلکِ ہند کا وہ درخشاں آفتاب جو اسے ایک خاص زاویے سے مسلسل روشنی
بخش رہا تھا، ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا ہے۔ اندرا جی کے قتل کے ساتھ اس اجالے کا بھی قتل
ہو گیا ہے۔ لیکن نہیں..... روشنی کبھی بھلا کبھی مر سکتی ہے؟ اندرا جی نے حب الوطنی
اور امن کی جو مشعل روشن کی تھی وہ آج بھی اسی طرح روشن ہے۔ یہ مشعل اس دیش
کو ہمیشہ تابندگی بخشتی رہے گی۔

اور اب اس اندھیرے میں ماہِ کامل کی طرح جگمگاتا ایک حسین چہرہ دھیرے
دھیرے اُبھر کر میرے سامنے آرہا ہے۔ گہری آنکھوں والا چہرہ.... دیوی جیسا نور
اور ممتا بھری شفقت لیے ہوئے.... لبوں پر حسبِ معمول دلآویز مسکراہٹ ہے مگر
آج اس مسکراہٹ پر اُداسی غالب ہے۔ یہ چہرہ اب شیریں اور دھیمی آواز میں گویا
ہو گیا ہے۔ میرے کانوں میں آبشار کے خوبصورت ترنم کی طرح اس کے بول گونج
رہے ہیں ؎

ہم نے جس طرح گزری، زندگی گزاری ہے
نسلِ نو کے متوالو! اب تمہاری باری ہے

سلام علیکم ایک دعا ہے۔ السلام علیکم کا جواب وعلیکم السلام ہے جس نے سلام کیا اُس نے مخاطب کو دعا دی اور جواب میں بھی سلامتی کی دعا ملی۔ مگر ہماری یونیورسٹی میں سلام علیکم کا جواب سلام علیکم یا السلام علیکم ہوتا رہا ہے جو ایک روایت سی بن گئی۔ بہت کم سلام علیکم کا جواب وعلیکم السلام سننے میں آتا اور جب ایسا ہوتا تو یہ خیال ہوا کرتا کہ جواب دینے والا یا تو جونیئر ہے یا پھر بطور مہمان مقیم ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انتہائی محتاط پُرانے لڑکے یا اساتذہ جواب وعلیکم السلام دیتے۔ سلام علیکم کے جواب میں سلام علیکم کی وجہ غالباً یہ رہی کہ سلام کرنے والا اور مخاطب ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہوں یا یہ کہ جواب دینے والا سلام علیکم کہہ کر اپنی برتری یا سینیارٹی کے اظہار کے بجائے انکساری کے ساتھ سلام کی پہل کرنا چاہتا ہو۔ بہر کیف ہماری یونیورسٹی کے پورے ماحول میں سلام علیکم کثرت سے رہا۔

بعض اوقات سلام علیکم کے اصل مقصد کے علاوہ انہیں دو الفاظ کے ذریعے مختلف اوقات میں مختلف معنوں کے اظہار میں بھی ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر باب اسحاق سے تیزی کے ساتھ دو لڑکے آتے جاتے ہوئے ٹکرا جاتے یا سائیکلیں غیر متوازن ہو جاتیں تو دونوں ایک دوسرے کو جلدی سے سلام علیکم کرتے۔ یہاں سلام کا مقصد سلام کے بجائے "معاف کیجیے گا" یا Sorry ہوتا۔ اسی طرح کوئی لڑکا اپنی ہم جماعت لڑکی کے ساتھ یونیورسٹی پوسٹ آفس آتی دکھائی دیتی تو اُسی جانب ایس۔ ایس۔ ہال یا ممتاز ہاؤس کی جانب سے انتہائی بلند اور خوب کھینچ کر آواز آتی۔ "سلام علیکوم"

مقصد اس کا یہ ہوتا کہ "مبارک ہو"۔ بہن یا کسی بزرگ محترمہ کا ساتھ ہوتا پہچان لینے میں نظر دھوکا کبھی نہ کھاتی۔ لہٰذا اس موقع پر انتہائی ادب سے سلام ہوتا۔ سلام کا اتنی کثرت سے استعمال رہتا کہ ہر طرف ہر لمحہ سلام کے نعرے لگا کرتے۔ میرے ایک دوست اور اقامتی زندگی کے ہمعصر ہمیشہ اور ہر ملاقات پر سلام کیا کرتے۔ پانچ پانچ منٹ پر ملاقات ہوتی تو سلام کرتے۔ لڑکوں کے علاوہ اساتذہ میں بھی خود سے سلام کرنے کا شدت سے احساس رہا۔ میرا خود تجربہ ہے کہ ذاکر صاحب مرحوم جو اُس وقت ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے جب اپنی آسٹن گاڑی میں گزرتے اور دیکھتے لڑکے سلام نہیں کر رہے ہیں تو خود سے سلام کرنے اور گاڑی بھی آہستہ کرا لیتے۔ پروفیسر ہادی حسن صاحب سے اس یونیورسٹی میں کون واقف نہیں۔ شعبۂ فارسی کے صدر رہے۔ فارسی انگریزی اور دوسری زبانوں پر زبردست عبور تھا۔ فارسی و انگریزی ایسی بولتے کہ اہل زبان بھی لوہا مانتے اور بغیر تعریف کیے نہ رہتے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں ایک ایرانی وفد علی گڑھ آیا۔ ہادی حسن صاحب نے یونین ہال میں فارسی میں استقبالیہ تقریر کی۔ وفد کے سربراہ نے اپنی جوابی تقریر کی تو ہادی صاحب کی بے اختیار تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"ہادی حسن چشم و چراغ ادبیات است"

ایک دلچسپ بات ہادی صاحب میں یہ تھی کہ وہ بیرونی ممالک خاص طور پر ایران، مصر اور سعودی عرب سے آئے ہوئے وفد پر یہ ظاہر کر دیتے کہ ہماری یونیورسٹی کے لڑکے اُن کی زبان میں تقریر سمجھ لیتے ہیں۔ صاحب تقریر ہوتی تو خود ڈائس پر بالکل سامنے بیٹھتے اور دوران تقریر جب کوئی ایسی بات آتی جو قابل ستائش ہو تالیاں بجانا ہوتیں تو خود سر سے اوپر دونوں ہاتھ لے جا کر تالی بجاتے۔ سارے لڑکے انہیں کو دیکھتے رہتے جب ہی وہ تالی بجاتے پورا ہال تالی بجا دیتا۔ مقرر یہ سمجھتا کہ میری تقریر خوب سمجھی جا رہی ہے اور داد مل رہی ہے۔ ہادی صاحب کے لیے کوئی ایسا موضوع یا مضمون نہیں تھا جس پر پورے اعتماد سے نہ بول سکتے ہوں۔ علی گڑھ کے علاوہ دوسری یونیورسٹیوں میں اور دوسرے ملکوں میں ان کے عقیدتمند اور بے پناہ محبت کرنے والے رہے ہیں۔ موصوف زیادہ تر سائیکل پر چلتے اور لڑکوں کو دیکھ کر دور ہی سے سر سے اوپر ہاتھ لے جا کر سلام کرتے۔ لڑکوں کو سلام کرنے کے پہل کا موقع شاید ہی کبھی ملتا۔

علی گڑھ میں سلام کی اہمیت تہذیب کے ساتھ ہماری تربیت اور علی گڑھ برادری Aligarh Brotherhood کی ہے۔ اس ایک جملے میں محبت ایثار اور ایک دوسرے کو جاننے یا وجود کے تعلق کا جذبہ پنہاں ہے۔ میرے ایک شاگرد جب ایل۔ ایل بی کی تعلیم مکمل کر چکے تو علی گڑھ چھوڑنے کے بعد ایک ملاقات پر کہنے لگے کہ علی گڑھ سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ایل۔ ایل۔ بی ڈگری تو کہیں سے لے لیتا اور مل جاتی مگر علی گڑھ جا کر

روشنی

بادشاہ سلامت کی سواری بڑے کروفر کے ساتھ درویش
کے تکیا تک پہنچی لیکن اندر وہ تن تنہا ہی داخل ہوئے۔ نورانی چہرے
والے بزرگ نے بڑی خندہ پیشانی سے مگر بیٹھے بیٹھے سلام کا جواب
دیا اور اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ ٹاٹ کے فرش پر دو زانو
بیٹھ گئے اور اشرفیوں کی ایک تھیلی نہایت ادب سے یہ کہتے ہوئے نذر
کی "یہ حقیر تحفہ قبول فرما کر عزت افزائی کیجیے۔" انھوں نے تھیلی لی
اس کا منہ کھول کے ایک اشرفی نکالی اور دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھی
رہے۔ پھر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

بادشاہ نے سر جھکائے جھکائے عرض کیا کہ "یہ سونا ہے۔ سارا
کا کاروبار اسی سے چلتا ہے۔ حکومت کا سب کام اسی کے دم سے
ہے۔ جنگ و جدال اسی کے لیے ہے۔" بزرگ نے یہ گفتگو سنی اور تھیلی کا
منہ کھول کر دیر تک حیرت سے اشرفیوں کو دیکھتے رہے۔ پھر ارشاد
فرمایا کہ "ایسا ہے تب تو یہ بہت ہی بیش قیمت تحفہ ہے۔ حکم ہے کہ
جو تحفہ لایا کرے تو قبول کر لیا کرو۔ اس لیے سر آنکھوں پر" یہ کہا اور تھیلی
کا منہ بند کر کے اسے ٹاٹ کے نیچے رکھ لیا۔ پھر روٹی کے سوکھے ٹکڑے پانی
میں بھگوئے اور مٹی کا آبخورہ بادشاہ کے آگے رکھتے ہوئے فرمایا "اور
حکم ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق مہمان کی مدارات کیا کرو۔ اس لیے جو کچھ
حاضر ہے۔ نوش فرمائیے۔"

بادشاہ نے ایک چھوٹا سا لقمہ منہ میں رکھا مگر وہ حلق سے نیچے
اترنے سے پہلے پھندا لگ گیا۔ بزرگ نے فرمایا "اچھو لگ گیا۔ کھایا نہیں جا
رہا۔" بادشاہ نے جواب تو کچھ نہ دیا لیکن آنکھوں نے صاف بتا دیا
کہ جی ہاں یہ سوکھے ٹکڑے ہم بادشاہوں کے حلق سے کب اترتے
ہیں؟" انھوں نے ٹاٹ کے نیچے سے اشرفیوں کی تھیلی نکال کے بادشاہ
کے آگے رکھ دی کہ جب ہمارا تحفہ تمہارے حلق سے نہ اتر سکا تو تمہارا
ہمارے حلق سے کیسے اتر سکے گا؟"

*   *   *

جو حاصل کیا وہ کہیں نہ ملتا۔ میں نے پوچھا وہ کون سی خاص بات ہے جو
علی گڑھ سے حاصل کی کہنے لگے 'سلام کرنا سیکھا' یہ کہہ کر اپنے متعلق مجھے
بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے بلکہ تعجب بھی ہوگا کہ مجھ میں اتنی زبردست
Vanity تھی کہ میں کسی کو سلام نہیں کرتا تھا۔ علی گڑھ نے اس انا
کو توڑ دیا اور مجھے سلام کرنا سکھا دیا۔ اس کی اہمیت کا علی گڑھ چھوڑنے کے بعد احساس
ہوتا ہے۔ اور آج میں سمجھتا ہوں کہ میری تعلیمی صلاحیت کے ساتھ میری ترقی سلام کرنے
کی عادت کا فیض ہے۔

میرے ایل ایل ایم کے ایک ہم جماعت "پلے" صاحب ہوا کرتے تھے۔ ان کو
سب پلے ہی کہتے نام کوئی نہیں جانتا۔ کیرالا کے رہنے والے تھے۔ ایس۔ ایس ہال
میں ہم دونوں ہی رہتے تھے۔ لہذا کلاس کے علاوہ بھی ملاقات ہوا کرتی۔ ایل۔ ایل۔
ایم کا امتحان ختم ہو جانے کے بعد ملاقات ہوئی اور کہنے لگے کہ "میں کل علی گڑھ
چھوڑ رہا ہوں۔ وہ اپنی زبان ملیالم یا انگریزی کے علاوہ کچھ نہ بول پاتے۔ کم
پاتے۔ ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ میں نے پوچھا "مسٹر پلے! آپ نے ایل ایل ایم
تو کر ہی لیا۔ مگر یہ بتایئے کہ علی گڑھ دو سال رہ کر کیا سیکھا" تو ہنس کر کہنے لگے
دو باتیں Two Things۔ پہلا "سلام علیکم" اور دوسرا "کیا حال ہے"
"سلام علیکم اور کیا حال ہے" انھوں نے اپنے انداز سے تلفظ کیا۔ ہم دونوں
ہنسنے لگے۔ میں نے پوچھا "آپ اس کے معنیٰ جانتے ہیں" تو کہا "نہیں۔ مگر
میں نے دیکھا کہ عام طور سے جب لڑکے ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے یہی کہتے ہیں
تو میں نے اس کو ضروری سمجھا اور سیکھ لیا۔ آج کے ماحول میں افسوس ہے کہ اس پر
دولت کی کم مائیگی کا احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ سلام کرنا باعث شرم
یا کمتری کے معنیٰ میں سمجھا جانے لگا۔ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر تو سلام شروع کر دیا
اس کے بعد بے تعلق۔ ان طریقوں اور خیالات میں ہماری یونیورسٹی کی اہم روایت کی
پامالی ہے اور بھائی چارگی یا محبت کی فضا نہیں بنتی۔ علی گڑھ کا اپنا ایک مزاج ہے۔
جو یہاں کی روایت کو اپنانے میں تعمیر ہوتا ہے۔ یہی ہماری یونیورسٹی کا امتیاز ہے
اس مزاج میں جو ڈھل گیا وہ بغیر کسی تشخیص مذہب، ملت اور نظریے کے ایک
دوسرے کا بھائی ہو جاتا ہے۔ اسی کو ہم "علی گڑھ برادری" یا "علی گڑھ برادرہڈ"
کہتے ہیں۔ ہم کو اپنی روایات کو عزیز رکھنا ہے اور ان کو روزمرہ کی زندگی میں
قایم رکھنا اپنی علی گڑھ برادری کے جذبے کی حفاظت کرتے رہنا ہے۔ ہماری بہت
سی روایات ہیں۔ سلام کرنے کا کثرت سے استعمال ایک انتہائی اہم ضرورت ہے
یہ ضروری نہیں کہ نئے لڑکے پرانوں ہی کو سلام کریں بلکہ دونوں ایک دوسرے کو کریں
اور ہر ملاقات پر کریں۔ اس کے قایم اور ہمیشہ تازہ رکھنے سے ہمارے دیرینہ امتیاز کا
تحفظ ہے۔ وہ ادارے انتہائی مستحکم اور برتر اور اعلیٰ ہیں جن کے دامن روایات سے
مالا مال بھی۔ یہ انتہائی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہم کو روایات نہ قایم کرنا ہیں نہ تلاش
کرنا ہیں۔ بس جو سرمایہ ہم کو حاصل ہے، اس کی حفاظت کرتے رہنا ہے۔ اس کو روزمرہ
کی زندگی میں برتتے رہنا ہے۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہیں تو ہم یقیناً اس ادارے
کے ہمدرد ہی نہیں بلکہ ہم اپنی روایات کا سرمایہ آنے والی نسلوں کو دے سکیں گے
سلام علیکم خود کیجیے اور اپنے نئے ساتھیوں کو اس کی تربیت دیجیے۔

لوک سبھا کے انتخابات

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا الزام یو۔پی کے مسلمانوں پر برسوں تک لگایا جاتا رہا ہے۔ مگر ہندوستان کی آزاد فضا میں اس طبقہ کی ایک نسل جوان ہو چکی ہے جو کسی بھی حالت میں ملک کی تقسیم کی ذمہ دار نہیں ہے اور اپنے آپ کو دوسروں کی طرح اسی ملک کا ایک آزاد شہری تصور کرتی ہے۔

ملک کی تقسیم سے مسلمانوں کو جہاں بہت سے نقصانات اٹھانا پڑے وہیں سیاسی نقصانات بھی ہوئے مگر آزادی کے بعد کی اس نسل کے جوان ہونے کے بعد بھی اس صوبے کی ۸۵ پارلیمانی نشستوں میں سے ۳۲ سے زائد سیٹیں آج بھی ایسی ہیں جو مسلم ووٹروں سے لوک سبھا کے نتائج کو کسی نہ کسی حد تک متاثر کرتی ہیں۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اتر پردیش کی کل آبادی گیارہ کروڑ ۹ لاکھ ہے۔ اس میں مسلم آبادی ایک کروڑ ستر لاکھ یعنی کل آبادی کا ۱۵.۳۳ فی صد ہے۔ صوبے کے تقریباً ۴۸ اضلاع ایسے ہیں جہاں دس سے بارہ فیصد تک مسلم آبادی ہے۔
اتر پردیش میں بعض اضلاع کو چھوڑ کر پورے صوبے میں کم یا زیادہ مسلم آبادی ہے۔
لوک سبھا کے ان ۸۵ پارلیمانی حلقوں میں سے ۳۲ حلقے ایسے ہیں جہاں پندرہ فیصد یعنی ایک لاکھ سے زیادہ مسلم رائے دہندگان ہیں۔ ان حلقوں میں بجنور (محفوظ) امروہہ، مرادآباد، رام پور، سنبھل، بدایوں، بریلی، آنولہ، پیلی بھیت، شاہجہاں پور، سیتا پور، کھیری، لکھنؤ، بارہ بنکی (محفوظ)، بہرائچ، قیصر گنج، بلرام پور، گونڈہ، بستی (محفوظ)، ڈومریا گنج، خلیل آباد، جلیسر، ایٹہ، خورجہ (محفوظ)، بلند شہر، ہاپوڑ، میرٹھ، باغپت، مظفر نگر، کیرانہ، سہارنپور، وغیرہ اہم ہیں۔

صوبے کی پانچ بڑی میونسپل کارپوریشن آگرہ، کانپور، لکھنؤ، وارانسی، الٰہ آباد اور دیگر میونسپل حلقوں میں مسلم آبادی بیس سے ستر فیصد تک ہے۔ رام پور میونسپل ایریا میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ۷۰ فیصد ہے۔ علی گڑھ شہر میں مسلم آبادی صرف سترہ فیصد ہے۔

اس اعداد وشمار کی روشنی میں ملک کی تقسیم کے سلسلے میں تاریخ کے اوراق میں یہ الزام بھلے ہی زندہ ہو مگر ملک چھوڑ کر پاکستان نہ جانے والے مسلمانوں کو کانگریس پارٹی سمیت دیگر سیاسی جماعتوں نے اس الزام سے بری کر دیا اور ۱۹۶۲ء تک تین لوک سبھا انتخابات میں مسلم رائے دہندگان نے پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت کو تسلیم کرتے ہوئے کانگریس پارٹی کی بھرپور حمایت کی۔

۱۹۶۴ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد مسلمانوں نے کانگریس سے ہٹ کر اپنی طاقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اسی دوران ۱۹۶۶ء میں مسز گاندھی وزیر اعظم منتخب ہوئیں لیکن ملک کی بعض سیاسی پیچیدگیوں کی بنا پر ۱۹۶۷ء میں چوتھے عام پارلیمانی انتخابات اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں کانگریس کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ جب کہ اس سے قبل ۱۹۵۱ء میں ۸۱، ۱۹۵۷ء میں ۷۰ اور ۱۹۶۲ء میں ۶۲ سیٹیں کانگریس نے حاصل کی تھیں۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۴۸ رہ گئی۔ مسٹر چندر بھان گپتا کی چیف منسٹرشپ میں صوبائی سرکار کو ممبران اسمبلی کا اعتماد حاصل نہیں تھا اور کچھ دن بعد ہی اسمبلی میں ناکامی کے بعد مسٹر گپتا کی وزارت نے استعفیٰ دے دیا تھا اور چودھری چرن سنگھ کی قیادت میں ملی جلی حکومت قائم ہوئی۔

اسی دوران مسلمانوں کی جانی دشمن پارٹی جن سنگھ کانگریس کے [illegible]ے کی دوسری طاقتور پارٹی ابھر کر سامنے آگئی۔ جن سنگھ کو لوک سبھا میں ۱۲ اور اسمبلی کے انتخابات میں ۹۹ سیٹیں ملی تھیں۔ جن سنگھ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو صوبے کے مسلمانوں نے محسوس کیا جس کے نتیجے میں ۱۹۶۹ء کے اسمبلی انتخابات میں جن سنگھ کی طاقت گھٹ کر آدھی ہو گئی اور صوبے میں ایک مرتبہ پھر کانگریسی حکومت قائم ہو گئی۔
اسی دوران چودھری چرن سنگھ کی قیادت میں بھارتیہ کرانتی دل (بی۔کے۔ڈی) کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت صوبے میں ابھر کر سامنے آگئی لیکن ووٹوں کی تقسیم اور "اندرا لہر" کی وجہ سے ۱۹۷۱ء کے لوک سبھا چناؤ میں کانگریس ۸۵ سیٹوں میں سے ۷۳ سیٹیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جو لوک سبھا کے دوسرے عام انتخابات میں حاصل سیٹوں سے بھی تین گنا زیادہ تھیں۔

۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء کے دوران مسلم لیگ اور مسلم مجلس جیسی جماعتیں ابھر کر سامنے آگئیں اور مسلمانوں کی ان جماعتوں نے ملک کی دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مسلمانوں کے "تھوک" ووٹوں کا سودا کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں جماعتوں نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی، مسلم پرسنل لا اور اردو کو صوبے

تم اپنے اور اپنے غیر کے درمیان اپنے نفس کو ترازو بنا لو اور اپنے غیر کے لیے بھی اسی چیز کو اچھا سمجھو جسے اپنے نفس کے لیے اچھا سمجھتے ہو اور اس کے لیے بھی اس چیز کو مکروہ سمجھو جسے اپنے نفس کے لیے مکروہ خیال کرتے ہو۔ کسی پر ظلم نہ کرو جیسا کہ تم اپنے لیے مظلومیت کو پسند نہیں کرتے۔ احسان کرو جیسا کہ تم کو یہ مرغوب ہے کہ تمہارے ساتھ نیکی کی جائے۔ اپنے نفس کی عیب جوئی کرو جیسا کہ اپنے غیر کے عیوب تلاش کرتے ہو اور لوگوں کی طرف سے اسی بات پر راضی رہو جس پر ان لوگوں کے لیے اپنے نفس کی طرف سے رضامند رہتے ہو۔

— نہج البلاغہ

✳ ✳ ✳ ✳ ✳

کی دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے تعلیمی، مذہبی اور لسانی مسئلے کو سیاسی مسئلے کے طور پر پیش کیا۔ اسی دوران فرقہ وارانہ فسادات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا۔ دوران ایمرجنسی خاندانی منصوبہ بندی جیسے پروگرام پر سختی سے عمل کرنے پر مسلمانوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور ۱۹۷۷ء کے پارلیمانی انتخابات میں کانگریس پارٹی کو اقتدار سے محروم ہونے کا بھاری معاوضہ ادا کرنا پڑا۔ ایمرجنسی کے دوران افسر شاہی کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلم رائے دہندگان نے مسلم امیدواروں کو ہی ووٹ دینے کا فیصلہ کیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بہرائچ، بلرام پور اور علی گڑھ سے جن سنگھ کے مسلم امیدوار پہلی بار اسمبلی کے لیے جنتا پارٹی کے ٹکٹ پر چنے گئے۔

۱۹۶۷ء میں چوتھی لوک سبھا کے عام انتخابات میں پورے صوبے سے ۲۹ مسلم امیدوار کھڑے ہوئے تھے جن میں کانگریس پارٹی سے ۷، سوتنتر پارٹی سے نو، کمیونسٹ پارٹی سے ۴ اور آزاد ۲۰ امیدوار تھے جن میں پانچ مسلم امیدوار کامیاب ہوئے۔

۱۹۷۱ء کے لوک سبھا انتخابات میں ۵۹ مسلم امیدواروں میں سے صرف ۶ امیدوار ہی کامیاب ہوئے جن میں پانچ کانگریس کے اور ایک کانگریس کی حمایت میں کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر چنے گئے۔

۱۹۷۷ء کے لوک سبھا چناؤ میں کل ۵۹ مسلم امیدوار میدان میں تھے۔ جنتا پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے نو مسلم امیدوار کامیاب ہوئے (یاد رہے کہ اس انتخاب میں کانگریس کو ایک بھی سیٹ نہیں ملی تھی)۔ اسی برس صوبائی اسمبلی کے لیے کل ۳۵۸ مسلم امیدوار کھڑے ہوئے جن میں ۴۹ کامیاب ہوئے تھے۔

۱۹۸۰ء کے لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات میں مسلم امیدواروں کی تعداد بڑھ کر ۱۰۱ ہوگئی جن میں کانگریس اور لوک دل کے ٹکٹ پر پندرہ امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں نو کے مقابلے ۱۸ مسلم امیدوار کامیاب۔ اسی طرح ۱۹۸۰ء کے صوبائی اسمبلی کے وسط مدتی انتخابات میں مسلم امیدوار کی تعداد بڑھ کر ۳۰۰ ہوگئی جن میں پچاس امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس اسمبلی میں کانگریس (آئی) کے ۳۲ اور لوک دل کے ۱۸ امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔

صوبائی اسمبلی کے چناؤ میں ۱۹۵۲ء میں ۴۱، ۱۹۵۷ء میں ۳۷، ۱۹۶۲ء میں ۲۵، ۱۹۶۹ء میں ۲۸ اور ۱۹۷۴ء میں ۴۰ مسلم ایم۔ایل۔اے چنے گئے۔ ان مندرجہ بالا اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی بیدار جاری ہے اور ملک کی تمام سیاسی جماعتیں مسلم ووٹوں کو حاصل کرنے کے لیے مسلم امیدواروں کو ہی ترجیح دیتی ہیں۔

اسی ماہ ہونے والے آٹھویں لوک سبھا کے انتخابات میں کانگریس (آئی) سمیت دیگر سیاسی جماعتوں نے بھی اتر پردیش کی مسلم آبادی والے علاقوں سے امیدوار کھڑے کیے ہیں۔ مرکزی کابینہ میں مسلم وزیروں کی اکثریت اسی صوبے سے تعلق رکھتی ہے۔ جن میں مرکزی وزیر محسنہ قدوائی کا مقابلہ میرٹھ میں دلت مزدور کسان پارٹی کے امیدوار مسٹر منظور احمد ایم۔اے سے ہوگا۔ مرکزی نائب وزیر مسٹر عارف محمد خاں کانپور کی جگہ بہرائچ سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔ جہاں اُن کا مقابلہ ڈی۔ایم۔کے۔پی کے امیدوار مسٹر ارشاد احمد قدوائی سے ہوگا۔ مرکزی وزیر مملکت مسٹر خورشید عالم خاں پہلی مرتبہ اپنے آبائی وطن فرخ آباد سے انتخاب لڑ رہے جہاں اُن کا مقابلہ ڈی ایم۔کے۔پی کے امیدوار مسٹر انوار محمد خاں سے ہوگا۔ اتر کابینہ کے وزیر حافظ محمد صدیق مراد آباد سے چناؤ لڑ رہے ہیں۔ جہاں ان کا مقابلہ ڈی۔ایم۔کے۔پی کے امیدوار حاجی غلام محمد کے درمیان ہوگا۔ مرکزی وزیر مملکت مسٹر ضیاء الرحمٰن انصاری (اناؤ)، مرحوم صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کی بیوہ عابدہ احمد (بریلی)، اختر حسین (کیرانہ)، قاضی جلیل عباسی (ڈومریاگنج)، مشیر احمد خاں (ایٹہ)، سلیم شیروانی (بدایوں)، ذوالفقار علی خاں (رامپور) سے کانگریس آئی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہے ہیں۔

اس بار حزب اختلاف کی جماعتوں کے کچھ اہم مسلم لیڈر بھی اتر پردیش سے لڑ رہے ہیں۔ جن میں جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری سید شہاب الدین (کانپور) جنوادی پارٹی کے جنرل سکریٹری مولانا سید احمد ہاشمی (خلیل آباد)، سابق مرکزی وزیر یونس سلیم (لکھنؤ) لوک دل کے لیڈر رشید مسعود (سہارن پور) سے ڈی۔کے۔پی کے امیدوار ہیں۔ سنجے وچار منچ کے لیڈر اکبر احمد عرف ڈمپی بھی نینی تال سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کتنے امیدوار آٹھویں لوک سبھا کے لیے کامیاب ہوتے ہیں۔

رضاء اللہ انصاری
و
شبیر احمد خاں غوری
شعبۂ فزکس - اے ایم یو

اسلامی سائنس کا مختصر جائزہ

پروفیسر عبدالسلام نے جن کو ۱۹۷۹ء میں ان کی جدید طبیعیات کی تحقیق پر نوبل انعام ملا تھا، اپنی ایک تقریر میں ایک دوسرے نوبل انعام یافتہ ماہر طبیعیات کا مندرجہ ذیل سوال دہرایا تھا کہ

"سلام! کیا تمہارے خیال میں ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم اُن قوموں کو زندہ رکھنے کے لیے امداد دیں جنھوں نے انسانی علم کی ثروت میں حبہ برابر اضافہ نہیں کیا؟"

پروفیسر عبدالسلام کو اس سوال سے جو کوفت ہوئی، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے یہ "استفہام انکاری" اقوام مشرق بالخصوص مسلمانوں کی علمی و ثقافتی ماضی کی مبینہ پسماندگی و زبوں حالی پر ایک دل دوز طعن ہے جس کا فوری جواب تو یہ ہے۔

ہنسو نہ تم مرے حال پہ میں ہوں وہ ذلیل
کہ میری ذلت و خواری سے شان تم کو لگی

اس جواب کی تفصیل تو ایک مستقل بیش کش کی مقتضی ہے مگر تحقیقی جواب یہ ہے کہ یہ نکتہ چیں ماہر طبیعیات یقیناً غیر قوم کا فرد ہے جس کے لیے ضروری نہیں کہ ہماری علمی و ثقافتی تاریخ، اس کی عظمت و درخشانی اور سائنس میں ہمارے اسلاف کی شاندار خدمات کا علم ہو۔ اس کے پیش نظر اگر رہی ہوگی تو صرف جدید یورپ کی تاریخ۔ شاید وہ قرون وسطیٰ کے یورپ کی علمی و حکمی تاریخ سے بھی نابلد ہو جس کے بارے میں پروفیسر تھلی لکھتا ہے[1]

"ساتویں اور آٹھویں صدی غالباً ہماری مغربی یورپ کی تہذیبی تاریخ کا تاریک ترین زمانہ ہے۔ یہ لا انتہا جہالت اور بربریت کا عہد تھا، جس کی تباہ کاریوں اور غارت گریوں کے اندر کلاسیکی دور ماضی کے ادبیاتی اور جمالیاتی کارنامے گم ہو کر رہ گئے تھے۔"

اس سے زیادہ حقیقت پسندانہ تبصرہ ایم۔ ڈی۔ وولف نے دوسرے مورخین کی طرف منسوب کیا ہے[2]

"مثال کے طور پر ٹین [Taine] کا خیال ہے کہ تیرھویں صدی کے بڑے علمائے مغرب کا زمانہ محض نالائقوں کا زمانہ ہے جو نفرت و حقارت کے سوا کسی اور بات کا مستحق نہیں ہے۔ اس تاریک عرصہ کی تہہ میں جو تین صدیاں گزری ہیں، انھوں نے انسان کے عقلی ورثے میں ایک نئے تصور کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ قرون وسطیٰ کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔ یہ لوگ اس زمانے کو انسانیت کے لیے موجب ننگ و عار سمجھتے ہیں۔"

یہی مورخ آگے چل کر دوسرے مورخین کا حسب ذیل قول نقل کرتا ہے۔

"۵۲۹ء سے کہ جب قیصر جسٹینین نے یونانی مدارس کو بند کر دیا تھا، ۱۶۳۰ء تک جبکہ ڈیسکارٹ [Descartes] کی مقالات جو منا[illegible] شائع ہوئی نیند کی ماتی انسانیت نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا یا یوں کہیے کہ علم و حکمت کے اہم مسائل کو غور و فکر کی بارگاہ میں لانا ہی بند کر دیا تھا۔"

عبدالسلام سے سوال پوچھنے والا ماہر طبیعیات اور اس کے دوسرے ہم وطن مذکورہ بالا بیدردانہ تبصرہ کے لیے معذور ہیں۔ وہ اپنی تاریخ سے ہی بخوبی واقف نہیں ہیں تو انہیں ہماری تاریخ کی واقفیت کا سوال ہی کہاں ہے۔[3]

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

لیکن قابل افسوس تو ہمارے اُن اساتذہ اور طالب علموں کی ذہنیت ہے جو خواہ مخواہ ہی "زمرہ دانشوران" میں داخل ہونے کے لیے انھیں مغربی

> تم لوگوں کے ساتھ اس طرح کا طرزِ معاشرت اختیار کرو کہ تم
> مرجاؤ تو لوگ تم پر آنسو بہائیں اور اگر زندہ رہو تو تم سے میل جول
> کا اشتیاق رکھیں۔
>
> ـــ نہج البلاغہ

فضلاء کی "نکتہ چینیوں" کو وقت بے وقت دہراتے رہتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بالکل نابلد ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں ایشیائی دانشوروں' بالخصوص ان افاضل اسلام نے علم و حکمت کی ترقی میں جو خدمات شائستہ انجام دی تھیں' مغربی ممالک کی آج کی سائنس' اسی کا تسلسل ہے اور بنیادی طور پر اسی پر مبنی ہے۔

اسلامی ثقافت کی عظمت کا اعتراف

چنانچہ انصاف پسند اور منصف مزاج محققین یورپ نے علم اور حکمت کے ذخیرے میں مسلمان اہلِ کمال نے جو بیش بہا اضافے کیے ہیں' اس کی شہادت دی ہے۔ مثلاً فرانسیسی مستشرق کارا ڈی وو لکھتا ہے۔

> "عربوں (مسلمانوں) نے سائنس میں واقعی بڑے کمالات حاصل کیے۔ انھوں نے صفر کا استعمال سکھایا' اگرچہ انھوں نے اسے ایجاد نہیں کیا تھا اور اس طرح وہ روزانہ زندگی کے علم الحساب کے بانی بن گئے۔ انھوں نے الجبرا کو ایک تحقیقی علم بنا دیا اور اسے بہت زیادہ ترقی دی۔ انھوں نے تحلیلی ہندسے کی بنیاد ڈالی۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ علم المثلثات المستویہ اور علم المثلثات الکرویہ کے بانی تھے .... علم الہیئت میں انھوں نے قیمتی مشاہدات کیے۔"

آخر الذکر علوم یونان و ہندوستان میں وجود میں تو آگئے تھے لیکن ان کا منظم و مرتب مطالعہ ایک مکمل علم ([illegible]) کی حیثیت سے اسلامی مفکروں کی ہی دین ہے۔ جس میں نصیر الدین طوسی کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

اسلامی سائنس کی تاریخی اہمیت

یورپ کی موجودہ عظیم الشان سائنس اس کی عہدِ نشاۃ ثانیہ کی علمی سرگرمیوں پر مبنی ہے اور نشاۃ ثانیہ کی علمی سرگرمیاں' دنیائے اسلام کی خوشہ چینی کی رہینِ منت تھیں۔ چنانچہ پروفیسر ہٹی لکھتا ہے۔

> "ریاضیات' علم الہیئت اور طب میں یونانیوں کے شاہکار .... ارسطو اور اس کے بعض یونانی شارحین کی تصانیف .... اور مشاہیر عرب اور یہودی فلاسفہ اور ارسطو کے شارحین کی کتابیں ان لاطینی تراجم کے ذریعے متعارف ہو رہی تھیں' جو عربی متون سے کیے گئے تھے۔

بدیں وجہ اگر ہمیں جدید دور کی سائنس اور ٹیکنالوجی کو کما حقہ' سمجھنا ہے تو ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ سترھویں صدی (جب کہ جدید سائنس کا آغاز ہوتا ہے) سے ایک ہزار سال پہلے کی سائنسی سرگرمیوں سے خود کو روشناس کرائیں۔ پروفیسر عبدالسلام نے اپنی اس تقریر میں اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے تاکہ یہ سعی مشکور ہماری آئندہ نسلوں کی خود اعتمادی اور تحفظ خودی' نیز ان کی انفرادیت کی نشو و نما کی بھی ضامن ہو سکے۔

اسلامی سائنس کی مستقل تاریخ کی ضرورت

اس ضمن میں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ایشیائی بالخصوص اسلامی سائنس کے آغاز و ارتقا کی تاریخ مغربی مصنفوں کی کتابوں سے حاصل کرنا مشکل ہے اور خاص طور سے اسلامی سائنس کی وہ خصوصیات جو اسے مغربی سائنس سے ممتاز کرتی ہیں۔ یورپی اور امریکی مصنفوں نے سائنس جو تواریخ لکھی ہیں ان میں اسلامی اور دیگر ایشیائی ممالک کی سائنس کی تاریخ پر' اگر ایک باب بھی مل جائے تو بہت بڑی بات ہے' اور پھر یہ مختصر معلومات بھی بیشتر حالات میں حقیقت نگاری سے زیادہ مصلحت کوشی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لہٰذا اگر ہمیں اپنی علمی پیاس بجھانا ہے تو خود اپنا کنواں کھودنا ہوگا اور اس کے لیے اپنے اسلاف کی تصانیف کے مخطوطات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس طرح ہم یقیناً دوسروں کے مقابلے میں ایک زیادہ صحیح اور مفید تاریخی جائزہ مرتب کر سکیں گے کیوں کہ "صاحب البیت ادریٰ مافی البیت (گھر والا ہی گھر کا حال بہتر طور پر جانتا ہے) غیروں کے سہارے زندہ رہنا کوئی زندگی نہیں ہے۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو

مغربی مصنفین کی تواریخ پر نظرِ ثانی کی اہمیت

یوں بھی مغربی مصنفین کی تاریخِ سائنس کی کتابوں میں مندرج معلومات اب باسی ہو چکی ہیں بلکہ جارج سارٹن کی مشہور تصنیف "سائنس کی تاریخ کا تعارف" کو بھی اب اسی زمرہ میں شامل کرنا چاہیے۔ سائنس کی تاریخ کی یہ کتابیں دراصل اس زمانے کی ناکافی اطلاعات

پر مبنی ہیں۔ جب کہ مختلف اسلامی علوم بالخصوص ریاضی و ہیئت کے ضروری مآخذ و مراجع تک عام مصنفوں کی دسترس نہیں ہو سکتی تھی اور وہ ثانوی اطلاعات ہی پر اکتفا کر لیتے تھے۔ مگر آج اسلامی علوم کے بہت سے مخطوطات جرمنی اور فرانس کے علاوہ مصر، بیروت، ایران، حلب اور حیدرآباد (ہندوستان) میں طبع ہو چکے ہیں اور اب تک جو نہیں شائع ہوئے ہیں ان کی مائیکروفلم اور فوٹو اسٹیٹ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی لائبریریوں سے بآسانی حاصل کیے جا سکتے ہیں اور جن کی تفصیل مختلف لائبریریوں کے کیٹلاگ میں ملتی ہے۔ اس لیے علمی دیانت داری کا تقاضا ہے کہ نئی معلومات کی مدد سے پرانی معلومات پر نظر ثانی کر کے ان میں جو اغلاط [illegible] اور کوتاہیاں رہ گئی تھیں ان کی ہم اصلاح کریں اور جو مزید معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کا قدیم معلومات پر اضافہ کریں۔ یورپ میں تو دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک دفعہ پھر اس بات کا احساس ہو رہا ہے اور وہاں تقریباً از سر نو اسلامی سائنس پر کام ہو رہا ہے۔

اس ضمن میں یہاں ایک ترکی عالم و فاضل فواد سیزگن [Fuat Sezgin] کا نام لینا ضروری ہے۔ جنھوں نے بروکلمان کی نہج پر جو کام از سر نو شروع کیا بلکہ اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر کتابیاتی Biographical کام کرنے کی ٹھانی۔ پروفیسر سیزگن (فرانکفرٹ) نے پچھلے دس برسوں میں "عربی تصانیف کی تاریخ" کے نام سے جرمن زبان میں ایک سلسلہ لائیڈن (ہالینڈ) سے شائع کیا۔ جس کی اب تک سات جلدیں چھپ چکی ہیں۔ سیزگن کا یہ سلسلہ صرف فہرست کتب (مخطوطات) سائنس دانوں کی مختصر سوانح عمری پر ہی صرف مبنی نہیں بلکہ اس کی ہر جلد ایک مخصوص سائنس سے متعلق ہے۔ اس میں اس سائنس کی تاریخ کا مختصر جائزہ بھی ہے۔ اس طرح پروفیسر سیزگن کی یہ تصنیف بلا مبالغہ اس صدی کی معرکۃ الآرا تصنیف مانی گئی ہے۔ جب ہی ان کو شاہ فیصل انعام سعودی عرب کی طرف سے بھی ملا ہوا ہے۔ سیزگن کا یہ پہلا سلسلہ جو ۷-۸ جلدوں پر مشتمل ہے پانچویں صدی ہجری (یعنی گیارہویں صدی عیسوی) تک محدود ہے اور دوسرا عرب اسلامی سائنس کی تاریخ کو ۱۷-۱۸ ویں صدی عیسوی تک لے جائے گا۔

سیزگن کے علاوہ مشہور روسی سائنس داں بورس روزین فیلڈ [Boris Rosenfeld] نے بھی ۱۹۸۳ء میں "قرون وسطیٰ کے مسلم ریاضی و ہیئت داں" پر روسی زبان میں تین جلدوں میں کتابیاتی مواد شائع کیا ہے[۱۲] جس میں ان عالموں کی سوانح عمری، تصانیف اور ان پر لکھے ہوئے متعدد مقالات (ثانوی مراجع) کی بہت مکمل کتابیاتی فہرست ہے جس میں ریاضی و ہیئت کی تاریخ کا جائزہ بھی ہے۔

مندرجہ بالا حوالے سے ظاہر ہے کہ اسلامی سائنس کی تاریخ پر جو کام یورپ میں اب ہو رہا ہے وہ ہمارے یہاں شروع بھی نہیں ہوا اور یہ بہت افسوسناک حالت ہے۔ ع

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

"اسلامی سائنس" کے مفہوم کی تحقیقی توضیح

اصل موضوع پر آنے سے پہلے اسلامی سائنس کے مفہوم و مصداق کو واضح کر دینا ضروری ہے۔ کیوں کہ بجا طور پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ سائنس تو پوری کی پوری دنیائے انسانیت کا سرمایہ ہے۔ اس کا تعلق کسی مخصوص مذہب (مثلاً اسلام یا مسیحیت) سے کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ اسلام نے مبعوث ہو کر مذہب سے قطع نظر ایک مستقل ثقافت کی بھی بنیاد ڈالی اور اس تہذیب و ثقافت کے پروان چڑھانے میں مسلمانوں نے خصوصی حصہ لیا۔ بے شک اس نئی تہذیب و ثقافت کی ترقی میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا۔ مگر یہ غیر مسلم قلمروئے اسلام ہی میں مسلمان خلفاء و امراء کی سرپرستی میں کام کرتے تھے اور ان کی ہمت افزائی کے لیے یہ خلفا و امرا انھیں اسی فیاضی سے نوازتے تھے جس طرح مسلمان اہل علم کو (بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ)۔ اس لیے اس ثقافت کو اور اس میں پروان چڑھنے والے علوم کو "اسلامی" کہنے کے علاوہ اور کسی نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی سائنس کی اصطلاح میں صفت "اسلامی" کے ساتھ موصوف "سائنس" بھی ذرا سی توضیح چاہتا ہے کیوں کہ یورپ کا پندار قومی اس کا جذبہ "انا ولا غیری" اور دعوائے "ہمچو من دیگرے نیست" اپنے علاوہ دوسری اقوام کی علمی و حکمی سرگرمیوں کو سائنس کا نام دینا نہیں چاہتا۔ مگر یہ کھلا ہوا تعصب اور ہٹ دھرمی ہے۔ کیوں کہ سائنس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ فطرت کی پوشیدہ قوتوں کو جاننے اور اپنے حسب منشا استعمال کرنے کی ٹیکنیکس اور طریقۂ کار کو ایک منطقی وحدت میں منظم کرنے کا نام ہے۔ ذہن انسانی کا یہ شغل جہاں کہیں پایا جائے گا اسے "سائنس" ہی کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ خواہ انسان زمانہ ما قبل تاریخ میں اس شغل میں مشغول پایا جائے یا نیوٹن اور آئن سٹائن جیسے ماہر طبیعیات اپنے کمروں اور تجربہ گاہوں میں یا دوسرے سائنس دانوں کے چاند کے سفر کے لیے مخصوص راکٹ کی تیاری میں۔ پھر جدید سائنس کے علمبرداروں کو اپنے ہی طریقوں اور ٹیکنیکوں پر ناز ہے یعنی نظریہ اور کلیہ کا مشاہدہ اور تجربے کے ساتھ تال میل نہ رکھنے کی صورت میں نئے کلیات و قوانین کی دریافت اور

باره داری نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ طریقہ کار ایک حد تک قدیم مفکرین اسلام لرازی (۸۶۵ء – ۹۲۵ء) البوریحان البیرونی (۹۷۳ء – ۱۰۴۸ء) بوعلی سینا (۹۸۰ء – ۱۰۳۷ء) ابن الہیثم (۹۶۵ء – ۱۰۳۹ء) ور دوسرے افاضل کے یہاں بھی ملتا ہے۔ صرف اُن کی تصانیف کا بنظر غائر مطالعہ شرط ہے۔ کاش ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس مطالعے کی ہمت کر پاتا

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

مسلمانوں کی علمی خدمات کی عظمت

ان تمہیدی معروضات کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تاریخی حقیقت کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے جزیرہ نمائے عرب کے نیم متمدن بدوؤں نے مشرف با سلام ہونے کے بعد عرصۂ قلیل میں دنیا کی عظیم الشان سلطنت قائم کرلی جو کہ

نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

پھیلی ہوئی تھی (یعنی خلیج بنگال سے مغرب اقصیٰ تک) بیشک یہ تاریخ کا معجزہ ہے۔ لیکن اس سے بھی عظیم تر اہم بات یہ ہے کہ وہ قوم جس کا اسلام لانے سے پیشتر امتیازی وصف "جاہلیہ" تھا اسلام لانے کے بعد زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ دنیائے قدیم کے علمی ورثے کی وارث ہو گئی۔ اس اعجوبے کا راز مضمر ہے خود اسلام کے عقلیت پسندانہ مزاج اور اس سماج کے ترقی پسند تقاضوں میں جس کی اسلام نے بنیاد ڈالی تھی۔

اسلام کا عقلیت پسندانہ مزاج

اسلام کے اقدار حیات میں خیر اعلیٰ (Summum Bonum) حکمت ہی کو قرار دیا گیا ہے:

ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔ (سورۃ بقرہ)

"اور جس کو حکمت ملی اس کو "خیر کثیر" یا بہت بڑی نعمت ملی۔"

اسلامی آئیڈیالوجی کی رو سے خلاق کائنات نے انسان کو خلعت وجود عطا کرنے کے بعد جس نعمت سے نوازا وہ علم کی نعمت تھی اور یہ وہ دولت تھی جس سے فرشتے بھی تہی دامن تھے۔

وعلم آدم الاسماء کلھا " (سورۃ بقرہ)

" اور اس (اللہ) نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔ "

ابلیٹ نیسن نے لکھا ہے کہ " عیسائی خارجی فطرت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے"۔ لہذا وہ جب تک اپنے مذہب کی مزعومہ تعلیم پر کاربند رہے علم و حکمت میں کوئی ترقی نہ کر سکے۔ ان سے بدتر حال کا تھا۔ وہ مظاہر کائنات کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے جلتے اور جو کچھ مل جاتا اسے مزعومہ دیوتاؤں کی دین سمجھتے اور جو کچھ نہ ملتا قہر و غضب کا نتیجہ گردانتے۔ اس کے برعکس اسلام اپنے پیرووں کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ اللہ رب العزت نے کائنات کو ان کے لئے مسخر کر دیا ہے اب یہ دیکھنا ان کا کام ہے کہ اسے کس طرح اپنے حسب منشا

وسخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون

اور مسخر کر دیا تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین پر ہے سب کو اپنی طرف سے، اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ (سورۃ بقرہ)

لیکن کائنات کی جاندار اور بے جان قوتوں کی تسخیر اُن راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی۔ یہ فریضہ صرف کائنات کی پوشیدہ سے واقف ہو کر ہی انجام دیا جا سکتا ہے اور اسی کا نام "علم طبیعی" اور سائنس" ہے اور ہم جانتے ہیں جملہ علوم طبیعہ کا اصل الاصول "مطالعہ" ہے جس کے لیے قرآن اپنے متبعین کو ایجابی طور پر مامور کرتا ہے

قل انظروا ماذا فی السموات والارض وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یومنون۔

"آپ کہہ دیجیے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں اور جو لوگ (عناداً) ایمان نہیں لاتے ان کو دلائل اور دھمکیاں فائدہ نہیں پہنچاتیں"۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہوتا ہے۔

" اولم ینظروا فی ملکوت السموات والارض وما خلق اللہ من شیء

" اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور (نیز) دوسری چیزوں میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں"

اس تعلیم سے امت مسلمہ کے اجتماعی مزاج کی جو تشکیل ہوئی اس مختلف سائنسی علوم کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کے لیے ایک ولولہ اور نیا عزم و حوصلہ بخشا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اسلامی سماج کے ترقی پسندانہ تقاضے۔

اقوام سابقہ کے برخلاف اسلام اجتماعی زندگی اور متمدن معاشرہ قیام پر زور دیتا ہے۔ فرار عن الحیات (رہبانیت) اور ترک

کے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مبہم طور پر فرمایا ہے:-

لا رھبانیۃ فی الاسلام " اسلام میں رہبانیت یعنی ترکِ دنیا کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

متمدن زندگی کی تکمیل تعلیم سے ہوتی ہے جس کا سنگِ بنیاد "لکھنے پڑھنے" پر موقوف ہے۔ اسلام میں اس پڑھنے لکھنے کی اہمیت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود وحی الٰہی کا آغاز اس مقدس حکم سے ہوا کہ

اقراء باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقراء و ربک الاکرم۔ الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم [سورہ علق]

"پڑھیے [اے نبی] اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا جمے ہوئے لوتھڑے سے انسان کو پیدا کیا اور آپ کا رب سب سے زیادہ کریم ہے جس نے قلم سے لکھنا سکھایا اُس نے انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ عرب معاشرے میں جو پہلی کتاب مدون ہوئی وہ اللہ کی کتاب تھی جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مدون ہوئی۔ ورنہ اسلام سے پہلے عرب میں کتاب جیسی شے کا شاید تصور بھی نہ تھا۔

یقینی [...] سرگرمیوں کا آغاز عہدِ نبوی ہی میں ہو چکا تھا۔ سورج گھڑی کا استعمال نمازِ ظہر و عصر کے اوقات کے لیے اور مغرب کے اوقات کے لیے صبح صادق اور شفق کا مشاہدہ اور اس طرح سے اوقاتِ نماز کو ایک سائنٹفک طریقۂ کار پر مبنی کرنا۔

خلافتِ فاروقی میں بیت المال کی بنیاد پڑی۔ جس کی نگہداشت کے لیے علم الحساب کی واقفیت ناگزیر تھی۔ اس طرح حساب کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول ہوئی۔ ورنہ اس سے پہلے عرب ہزار سے بڑا عدد تک نہ جانتے تھے۔[۱۷] عہدِ فاروقی ہی میں سوادِ عراق کا علاقہ فتح ہوا جسے آپ نے خراج کے عوض میں مفتوحین ہی کے پاس رہنے دیا۔ تشخیصِ خراج کے لیے زمین کی پیمائش کرائی اور اس طرح علم ہندسہ [جیومیٹری] کی ضرورت لاحق ہوئی۔

لیکن اس باب میں سب سے اہم جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔

"کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن اینما وجدھا فھو احق بھا" [حدیث ترمذی]

"کلمۂ حکمت مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے، جہاں ملے وہ اسے لے لینے کا زیادہ حقدار ہے۔"

قدیم سائنس کا مسلمانوں میں داخلہ

اسلام کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا جس کی بنا پر مسلمانوں کو اُن لوگوں سے ملنے کا موقع ملا، جن کے اسلاف عہدِ قدیم سائنس و حکمت کے امین اور دانائے راز رہے تھے۔ انھوں نے ان کے ہاں سے اس سرمایۂ علم و دانش کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔[۱۸] اس کوشش کی ابتدا تو اموی خلافت [آٹھویں صدی عیسوی] میں ہو چکی تھی جب کہ یزید بن معاویہ کے بیٹے خالد [م ۸۱۷ء] نے کیمیا، طب اور نجوم کی کتابوں کے بھی عربی ترجمے کرائے مگر اس تحریک میں باقاعدگی عباسیوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پیدا ہوئی۔ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور [۷۵۴ء - ۷۷۵ء] نے جو خود علوم عقلیہ کا واقف کار اور ان علوم کے ماہرین کا قدر دان تھا، اپنے ہمعصر بازنطینی بادشاہ کو لکھا کہ اس کے ہاں ریاضیات و طبیعیات کی جو کتابیں ہوں انھیں ترجمہ کرا کے بھیج دے۔ قیصر نے ان کی مطلوبہ کتابوں کے تراجم بھیجے جن سے لوگوں کا شوقِ علم اور بڑھ گیا۔[۱۸] منصور کے ایما سے جن یونانی کتابوں کے ترجمے ہوئے اُن میں اقلیدس [...] کی "اصول الھندسہ"، بطلیموس [...] کی "المجسطی" اور علم نجوم کی مشہور کتاب "المقالات الاربعۃ" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔[۱۹]

منصور کے بعد بھی یہ تحریک چلتی رہی۔ اس کے پوتے ہارون الرشید [۷۶۳ء - ۸۰۹ء] کا برمکی وزیر یحییٰ بن خالد [۷۸۶ء - ۸۰۵ء] ان علوم کا بڑا شائق تھا۔ اس نے ایک جانب ہندوستان کے مشاہیر اطبا کو بلا کر اہم عہدوں پر مقرر کیا اور ہندوستانی طب کے شاہکاروں کا ترجمہ کرایا۔ دوسری جانب یونانی علوم کے جواہر پاروں کو عربی میں منتقل کرایا۔ اس نے "المجسطی" کا پھر باقاعدہ ترجمہ کرایا۔[۱۹] اسی کے واسطے حجاج بن یوسف بن مطر [۸۰۰ - ۹ ویں صدی] نے اصول "اقلیدس" کا ترجمہ کیا۔ بعد میں حجاج نے ہارون کے بیٹے المامون [عہدِ حکومت ۸۱۳ - ۸۳۳ء] کے واسطے اسی کتاب کا نیا ترجمہ کیا۔ اس لیے پہلا ترجمہ "نقل ہارونی" اور دوسرا "نقل مامونی" کہلاتا ہے۔[۲۰] سلام الابرش نے ارسطو کی "طبیعات" کا بھی ترجمہ کیا۔[۲۱] دراصل المامون کے عہد میں یہ تحریک بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ اس کام کے لیے ماہرین کی ایک جماعت بازنطینی شہنشاہوں کی مملکت میں بھیجی گئی جو اپنے ہمراہ علومِ قدیمہ کے ان ذخائر کو بغداد لائے[۲۲] بقول الطاف حسین حالی ؔ

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے روم و یوناں کے دفتر

ان کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے المامون نے "بیت الحکمہ" کے نام سے ایک مستقل ادارہ قایم کیا جو اسکندریہ کے میوزیم کے بعد دنیا کی سب سے پہلی سائنس "اکیڈمی" تھا۔ المامون نے ۲۱۸ھ مطابق ۸۳۳ء میں وفات پائی مگر علم و حکمت کی سرپرستی کی تحریک اس کی وفات کے بعد بھی برابر چلتی رہی۔ خلفا کی تقلید میں عمائدین ملک بھی اپنی دولت کا بڑا حصہ یونانی کتابوں کا ترجمہ کرانے پر صرف کرتے تھے۔ ان میں سب سے مشہور بنو موسیٰ کا خاندان تھا [۹ ویں صدی عیسوی] ان کے ایماء سے طب کے علاوہ ریاضی کی بھی بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ ان میں سب سے اہم البونیوس [Apollonius] [۲۶۱ – ۱۹۰ ق۔م] کی کتاب المخروطات تھی۔ پہلے اس کے صرف چار مقالے ملے جن کا ہلال بن ابی ہلال [متوفی ۸۲۳ء] نے ترجمہ کیا۔ باقی مقالوں کی تلاش کے لیے ثابت بن قرہ Conica [۸۲۶ء – ۹۰۱ء] کو روم بھیجا گیا۔ جہاں تلاش بسیار کے بعد اسے تین مقالے اور ملے اور اس نے ان کا ترجمہ کیا[23] آج اصل یونانی میں اس کے صرف ابتدائی چار مقالے ہی ملتے ہیں۔ لہٰذا جب ۱۷۱۰ء میں برٹش ہیئت داں [Halley] ہیلے نے اس کتاب کا معیاری ایڈیشن شائع کرنا چاہا تو بعد کے مقالوں کے لیے اسے اسی ثابت کے ترجمے کا سہارا لینا پڑا[24]

مخروطات [Conics] کے علاوہ جو اور کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں خصوصیت وہ کتب و رسائل قابل ذکر ہیں جو "المتوسطات" [Little Mathem] کہلاتے تھے۔ کیوں کہ یہ "اصول اقلیدس" اور "المجسطی" کے درمیان پڑھائے جاتے تھے ان میں مندرجہ ذیل خصوصی اہمیت کے حامل تھے، کیوں کہ ان کا موضوع کروی علم الھندسہ اور کروی علم المثلثات ہے جو ریاضیاتی علم الھیئت کی اصل بنیاد ہیں۔

(۱) اقلیدس نے علم ہیئت پر صرف ایک ہی کتاب PHENOMENA لکھی جس کا عربی میں ترجمہ "ظاھریات الفلک" کے نام سے ہوا۔ ترکی اسکالر فواد سیزگن کے مطابق اس کا ترجمہ ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے کیا جو ۹ ویں صدی کے آخری نصف میں زندہ تھا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے۔ نصیر الدین طوسی [۱۲۰۱ – ۱۲۷۴ء] جیسے عالم نے جو مراغہ کی رصدگاہ کا مہتمم بھی تھا اس کتاب کی توضیح کی ہے اس سے پہلے النیریزی [۹ – ۱۰ صدی] اور الکندی [۷ – ۸ صدی] نے بھی اس پر شرح لکھی تھیں۔

۲۔ اقلیدس کی کتاب المناظر [Optics] کے مترجم کا نام کتابیات میں نہیں ملتا۔ اسی کتاب سے متاثر ہو کر ابو یوسف یعقوب الکندی [متوفی ۸۷۰ء کے بعد] نے اپنی کتاب "اصلاح المناظر" تصنیف کی Optics پر سب سے عمدہ کام یا یوں کہیے کہ اس کے مطالعے اور تحقیق کا نقطہ عروج ابن الہیثم [۹۶۵ – ۱۰۳۹ء] کی کتاب المناظر اور کمال الدین فارسی کی "تنقیح المناظر" ہیں۔ ان کے بارے میں آئندہ تفصیل سے لکھا جائے گا۔

۳۔ ثاوذوسیوس [Theodosius] [پہلی صدی ق۔م] کی کتاب الاکر [Sphaerica] کرہ کی جیومٹری سے متعلق تھی۔ ثابت بن قرہ نے اس کے ترجمے کی اصلاح کی۔ نصیر الدین طوسی نے المتوسطات کے دیگر رسائل کے ساتھ اسے بھی اپنی توضیحات کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب الاکر کا سنسکرت میں ترجمہ مہاراجہ جے سنگھ کی سرپرستی میں محمد عابد دہلوی ہیئت داں کی مدد سے نارائن سنگھ اپادھیائے نے تقریباً ۱۷۳۰ء میں مکمل کیا۔ اس ترجمے کے مخطوطات کلکتہ کیمبرج [انگلینڈ] اور جے پور کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔

۴۔ اوطولوقیوس [Autolycos] [حیات ۳۱۰ ق۔م] کی کتاب الکرہ المتحرکہ کا بھی ترجمہ دو دفعہ عربی میں کیا گیا۔ ان ترجموں کی الکندی اور ثابت جیسے عالموں نے اصلاح کی۔ اوطولوقیوس جو اقلیدس کا ہم عصر تھا اس کی ایک اور تصنیف "کتاب الطلوع الغروب" کا ترجمہ قسطا بن لوقا [۹ – ۱۰ ویں صدی] نے عربی میں کیا اور اس کی بھی ثابت نے اصلاح کی۔

۵۔ ارسطرخس [Aristarchus] [حیات ۳۱۰ء – ۲۳۰ ق۔م] کی کتاب فی جرمی النیرین یعنی سورج اور چاند کی جسامت اور فاصلوں سے متعلقہ مسائل پر ہے۔ بدقسمتی سے اس تصنیف میں ارسطرخس نے شمس مرکزی [Heliocentric] نظریہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ بدیں وجہ عربوں کو اس بات کا شاید علم نہ ہو سکا کہ قدماء میں ارسطرخس خصوصیت سے اس کا قائل تھا۔

اس مختصر فہرست کو درج کرنے کا منشا یہ ہے کہ قارئین اس بات سے آگاہ ہو جائیں کہ خاص طور سے یونانی سائنس کے بیش بہا شاہکاروں کے ترجمے اسلامی معاشرے میں بڑی لگن کے ساتھ کیے گئے۔ یہ تحریک تیسری صدی ہجری کے خاتمے تک چلتی رہی۔ اس کے علمبرداروں میں ثابت بن قرہ، اسحاق بن حنین اور قسطا بن لوقا خصوصیت سے مشہور رہے۔ ان افاضل نے ریاضی و ہیئت کے علاوہ یونانی طب کی مشہور اور مستند کتابوں کا بھی ترجمہ کیا۔ اس طرح اس

صدی کے ختم ہوتے ہوتے یونانی سائنس کے تقریباً تمام یا کم از کم بیشتر شاہکار عربی میں منتقل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد مسلمان افاضل نے خود مختلف علوم حکمیہ میں مستقل تصانیف مرتب کرنا شروع کیں جن کا اجمالی خاکہ اگلی قسط میں انشاءاللہ پیش کیا جائے گا۔ اس میں یا تیسری قسط میں اسلامی سائنس کی تحقیقات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی اور خاص طور پر ان دریافتوں، ایجادوں اور طریقہ کار پر جن کی بنا پر ہم اسے "اِسلامی سائنس" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں [۲۶]

1- Abdul Salam. "On Scientific Creat--ivity in Arabic and Islamic countries"

Speech delivered at the United Nations University Symposium at Kuwait, March, 8.

2 Thilly, F.: History of Philosophy (Central Book Depot, Allahabad 1949), P. 142.

3 Dal Pio Bel Scholastic Philosophy, P. 5-6

4 Discourse on Method کی René Descartes پہلی دفعہ لائیڈن / ہالینڈ سے ۱۶۳۷ء میں شائع ہوئی اور جس کے تین رسالے ضمیمے کے طور پر لگے تھے جن کے عنوان مندرجہ ذیل ہیں۔

Dioptrics اور Meteorics, Geometry

5- Carra De Vaux. Mathematics and Astro--nomy in Arnold: Legacy of Islam, P. 37

6- Plane and spherical trigonometry.

7- Thilly, F.: History of Philosophy, P. 162

8 - History — C.B. Boyer کی ضخیم کتاب مثلاً ملاحظہ ہو of Mathematics (John Wiley, New York) ۷۱۷ صفحات — اس میں ایک باب بعنوان Arabic Hegemony میں اسلامی الجبرا، جیومٹری وغیرہ کا بیان ہے۔ لیکن اس باب کی ضخامت صرف ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے

9 Sarton, George: Introduction to the History of Science

۱۰ ...

1970 — 83.

۱۲ خلیفہ المامون اپنی جزرسی کے باوجود حنین بن اسحاق مترجم کو ان کاغذوں کے ہم وزن سونا انعام میں دیا کرتا تھا جن پر وہ یونانی سے عربی میں ترجمہ کرتا تھا۔

۱۳- ولیم نیل: مختصر تاریخ فلسفہ یونان (دارالطبع والتالیف حیدرآباد) صفحہ ۲۳۔

۱۴- چنانچہ عربی زبان میں اس کی ثروت و کثرت مترادفات کے باوجود "الف" (ہزار) سے زیادہ بڑے عدد کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔

۱۵- مقدمہ ابن خلدون: کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر، الجزء الاوّل مقدمہ (مکتبہ التجاریہ قاہرہ) صفحہ ۴۸

۱۶- ابن الندیم: کتاب الفہرست (مطبع الاستقامۃ قاہرہ) صفحہ ۲۵۲ نیز ۵۱۱۔

۱۷- مقدمہ ابن خلدون۔ صفحہ ۲۱۶

۱۸ المسعودی: مروج الذہب و معدن الجواہر (دارالرجاء للطبع والنشر مصر) الجزء الرابع صفحہ ۲۴۱۔

۱۹- ابن الندیم: کتاب الفہرست

۲۰ ... صفحہ ۳۵۵

۲۱

۲۲-

۲۳- ابن القفطی، جمال الدین ابوالمکارم: تاریخ الحکماء (لیپزگ ۱۹۰۳ء) صفحہ ۶۱

24 ... History of Greek Mathematics (Oxford, 1921) Vol. II

۲۵ التوسطات میں شامل دوسری اہم کتابیں حسب ذیل ہیں:

ا- کتاب المساکن

ب کتاب الایام واللیالی

ج کتاب الطلوع والغروب

پروفیسر عارف رضا

غاروں سے کتابوں تک

ذہنِ انسانی کے ارتقار کی داستان بھی اسی وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب سے نسل انسانی کسی نہ کسی شکل میں وجود میں آئی۔ یہ داستان ...پ بھی ہے اور طویل بھی۔ اس داستان کی ابتدائی کڑیاں ڈھونڈتے ...ونڈتے ہمیں ماضی کے ان دھندلکوں میں جانا پڑتا ہے جہاں سے انتہائی ...کاوش کے بعد ہمیں بہت پرانے انسان کے وجود کے ہلکے ہلکے نقش ...آتے ہیں۔ یہ نقش اتنے نامکمل ہیں کہ ان کے ذریعہ انسانی ذہن کی ...ندائی کارکردگی کے متعلق کوئی نتیجہ نکالنا ہمیشہ خطرے سے خالی نہیں ہوتا ...ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے غور و خوض اور عرق ریزی کے بعد کوئی نتیجہ ...لا گیا مگر چند دن بعد وہ اتنا ہی غلط ثابت ہوا جتنا مثال کے طور پر آج سے ...ند سو سال پہلے انسان کا یہ خیال کہ زمین گول نہیں چپٹی ہے یا زمین نہیں آج ...ں کے گرد گھومتا ہے۔ غرضیکہ انسانی ذہن کی ابتدائی کارکردگی کا جو تصور ...ج ہمارے ذہن میں ہے اس کے متعلق دو باتیں یقینی ہیں ایک تو یہ کہ ہم اس ...ستان کے بالکل نقطۂ آغاز تک نہیں پہنچ سکتے دوسرے یہ کہ ہماری بہت ...ی آرا آئندہ کبھی غلط ثابت ہو سکتی ہیں۔

ذہن انسانی کے ارتقار کی وہ منزل جہاں سے ہمیں قدیم ترین تحریر ...تی ہیں اتنی دشوار گذار نہیں اور ہم پرانی تحریروں کے ذریعہ منزل بہ منزل موجودہ ...مانہ تک انسانی ذہن کے ارتقائی سفر کی داستان قلم بند کر سکتے ہیں مگر دراصل ...قت ان منازل کا پتہ لگانے میں ہوتی ہے جو انسان کے ذہن نے اس وقت ...لے کیں جب وہ لکھنے کے فن سے ناواقف تھا اور کسی تحریر کی صورت میں اپنی ...ندگی یا ذہن کا کوئی عکس اپنے بعد کی نسلوں کی رہنمائی کے لئے نہیں چھوڑا۔

پرانی تاریخ سے اس درجہ ناواقفیت کے باوجود بھی اگر ہم عقل سلیم ...ی رہنمائی میں اور شواہد کی روشنی میں اس دور کی چھان بین کریں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ادب اور فن کی تاریخ اس زمانہ سے نہیں شروع ہوتی جب سے ...سان نے لکھنا یا پڑھنا سیکھا بلکہ ادب کا وجود تحریر کی ابتدا سے بہت پہلے

بھی تھا۔ اغلب ہے کہ فنون لطیفہ میں سب سے پہلے ناچ وجود میں آیا ہوگا ہزار ہا سال پہلے بھی جب انسان بالکل وحشی تھا اس وقت وہ اپنے دشمن کو ہرا کر یا اس کا قتل کرنے کے بعد جب اپنے غاروں میں واپس جاتا تو خوشی کے مارے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ناچنا شروع کر دیتا اور جب وہ خوشی سے بے آپے ہو کر تھرکتا تو کچھ آوازیں بھی نکالتا۔ رفتہ رفتہ ان آوازوں اور جسم کی حرکت میں ایک ربط پیدا ہوتا چلا گیا۔ جب یہی عمل بار بار دہرایا جانے لگا تو صوتی مناسبت کا تصور انسانی ذہن میں پیدا ہوا۔ یہ تصور پختہ ہوتا گیا یہاں تک کہ انسان شعوری طور پر ایسی آوازیں نکالنے لگا جو متوازن ہوں اور اس طرح دنیا کا سب سے پہلا رزمیہ گیت وجود میں آیا۔ جب انسان کا ذہن قدرے اور پختہ ہوا تو چند عناصر سے ڈر کر یا ان سے متاثر ہو کر کسی وجود برتر کا تصور بھی پیدا ہوا اس وجود برتر کے متعلق جب اس نیم وحشی انسان کا عقیدہ مضبوط ہوا تو اس نے مناجاتوں کے قسم کے گیت بھی گانا شروع کئے۔ یہ مناجاتیں سینہ بہ سینہ دوسری نسلوں تک پہنچتی رہیں ہر نسل کے لوگ ان مناجاتوں کو دھن سے پڑھتے اور ان میں کچھ اضافہ بھی کرتے۔

دنیا کی تاریخ میں شاعری کی ابتدار بھی یہیں سے ہوئی ہے۔ یہ بات تو پایۂ تحقیق تک نہیں پہنچ سکی کہ دنیا کی سب سے پہلی نظم یا تاریخ کا اولین کلام موزوں مذہبی رنگ کا تھا یا غیر مذہبی جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس نظم یا کلام موزوں کے محرک شدید ترین جذبات اور احساسات ہوں گے۔ انڈریو لینگ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ عوامی گیت جو اب بھی مختلف ملکوں کے دور دراز کے گاؤں میں گائے جاتے ہیں۔ بہت حد تک اس زمانہ کا ورثہ ہیں جب انسان بالکل غیر مہذب تھا وہ لکھتے ہیں کہ گو کہ موجودہ عوامی گیتوں کی" ہئیت یقیناً جدید طرز کی ہے کیونکہ صدیوں تک زبانی گائے جانے کے بعد ان کی زبان اور ڈھانچے میں تبدیلی آنا لازمی تھی مگر جدید رومانی چار بیتوں (BALLADS)

ہیں اب بھی بہت سے ایسے خیالات اور مخصوص رجحانات ملتے جو بہت قدیم ہیں جن کی اپیل آفاقی ہے' یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اگر مشرق و مغرب کے عوامی گیت یکجا کر کے ان کا موازنہ کیا جائے تو زبان تو جدا ہو گی مگر ان کے بنیادی خیال اور مخصوص جذبات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔ نہ صرف بلکہ مختلف ممالک کے عوامی گیتوں میں جو قصے موجود ہیں ان میں بھی بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے اور مشرقی ملک کے کسی دور دراز گاؤں میں جو داستانیں سینہ بسینہ چلی آ رہی ہیں ان میں اور مغربی ممالک کے گاؤں میں جو داستانیں مشہور ہیں بڑی مماثلت اور یکرنگی پائی جاتی ہے۔ ان داستانوں میں جو مماثلت ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ چونکہ یونانی، ہندوستانی، ایرانی، رومی، روسی، جرمنی، اور یورپائی اقوام ایریائی نسل سے ہیں اور ان کے آباؤ اجداد ہجرت سے قبل ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ لہذا جب وہ دنیا میں ادھر ادھر پھیلے تو اپنے ساتھ وہ داستانیں بھی لے گئے جو ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ کے طور پر ملی تھیں اور جو ان کے سینوں میں محفوظ تھیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ غیر آریائی نسلوں مثلاً چین یا امریکہ کے نیگرو اقوام میں جو قصے مشہور ہیں وہ بھی ان قصوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جو ایرانی نسل کی اقوام میں عوام کے ورد زبان ہیں۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد یہ مفروضہ غلط ہو جاتا ہے کہ یہی عوامی گیت یا عوامی قصے مشرقی اور مغربی اقوام میں ملتے جلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی اقوام ایک ہی سلسلہ کی بکھری ہوئی کڑیاں ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد ایک ہی تھے۔ اس مفروضہ کے غلط ثابت ہونے کے بعد یہ عقیدہ کہ دور دراز کی قوموں کے عوامی قصوں میں یکسانیت دل سے پھر حل نہیں ہوتا۔ اس موضوع پر بہت سے مغربی مصنفین نے بہت مقالے لکھے ہیں۔ اور مختلف نظریے پیش کئے ہیں۔ ان سب میں زیادہ قابل قبول نظریہ انڈریو لینگ ہی کا معلوم ہوتا ہے جن کا خیال ہے کہ قدیم قصوں میں یکسانیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسانی تجربات اور جذبات میں چاہے وہ جس زمانہ یا جس مقام سے تعلق رکھتے ہوں تو ہمیشہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بزرگوں اور [illegible] داروں کے گن گانا، خوف محبت، نفرت، خوشی، غم وغیرہ ایسے جذبات ہیں جو آفاقی ہیں اور کسی زمانہ کا انسان یا کسی مقام سے تعلق رکھنے والی نسل ان جذبات سے عاری نہیں رہی ہے اسی لئے عوامی قصے یا عوامی گیت زمان و مکان کے فرق کے باوجود بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔

تحریر کسی قوم یا کسی کے ذہن اور اس کی زندگی کی مکمل آئینہ دار ہوتی ہے اور تحریر ہی کے ذریعہ ہم پرانے زمانے کے انسان کے متعلق اندازے لگاتے ہیں جو اکثر صحیح ہوتے ہیں مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ انسانی تاریخ کا ایک طویل دور ایسا گزرا ہے جس کی کوئی تحریر ہماری رہنمائی نہیں کرتی۔ انسان نے غاروں میں معمولی تبدیلی کر کے دھوپ اور بارش سردی اور گرمی سے بچاؤ کی صورت پیدا کر لی تھی، درختوں کی چھالوں اور پتیوں سے اپنا تن ڈھانپنے کی ایجاد بھی کر لی تھی، دشمنوں اور جنگلی جانوروں کا مقابلہ کرنے اور خود کو ان سے محفوظ رکھنے کا فن بھی تجربے نے اسے سکھا دیا تھا۔ خوشی کے موقعوں پر تھرکنے اور پھر رفتہ رفتہ ناچنے اور اس کے ساتھ ساتھ متوازن آوازیں نکالنے کے فن سے بھی وہ آشنا ہو گیا تھا، خدا کا تصور بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کے ذہن میں موجود تھا سورماؤں کے قصے اور دعائیہ نظمیں بھی دہرانے لگا تھا۔ غرضیکہ نہ صرف زندہ رہنے کا طریقہ اسے آ گیا تھا بلکہ فنون لطیفہ میں سے کم از کم شاعری اور رقص میں بھی اسے کافی مہارت ہو گئی تھی مگر اتنی ترقی کے باوجود بھی وہ لکھنے کے فن سے ایک عرصہ تک ناواقف رہا۔

وقت گزرتا گیا۔ انسان کے ذہن نے ترقی کی کچھ اور منازل طے کیں اور رفتہ رفتہ اسے لکھنے کی حاجت کا احساس ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ انسان کو تحریر کی حاجت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہ ان گیتوں کو قلمبند کرنا چاہتا تھا جو اب تک سینہ بسینہ چلتے رہے تھے اس کا خیال اسے بعد میں آیا۔ جان ڈرنک واٹر لکھتے ہیں کہ ابتدائی تحریر کی تحریک تین وجوہات کی بنا پر ہوئی جو خالصتاً افادی تھیں نہ کہ ادبی۔ اوّل یہ کہ اس کے تجربے نے اسے چند ایسے حقائق سے روشناس کر دیا جن کو بھول جانا انتہائی خطرناک ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسی چیزیں ضبط تحریر میں لائی جائیں۔ دوم یہ کہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ جب بکھر گئے اور ایک دوسرے سے دور ہو گئے تو آپس میں ایک تعلق پیدا کرنے کیلئے تحریر کی ضرورت پیش آئی۔ سوم یہ کہ اس کے تصرف میں جو چیزیں یا مویشی تھے ان پر شناختی نشانات لگانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ایک انسان یا گروہ کی ملکیت کو دوسرے کی ملکیت سے علیحدہ رکھا جا سکے۔ اس طرح ان افادی ضروریات کی بنا پر انسان نے تحریر کی اولین کوششیں کیں۔ بعد میں اس نے تحریر کے اور فوائد دریافت کئے اور جنگ کے گیت اور دعائیہ نظمیں بھی تحریر میں لائی جانے لگیں۔ اس ترقی کے باوجود بھی ایک بہت ہی طویل عرصہ تک بہت کم لوگ لکھ سکتے تھے اور پڑھنے والوں کی تعداد اس سے بھی کم تھی۔

انسان نے رفتہ رفتہ چٹانوں پر بھدے کھدے نقوش کی شکل

پر چند نشانات بنا دیتا تھا اس کے بعد سنگ تراش نویسندہ کے بنائے ہوئے خاکہ کے مطابق چٹان کی اوپری سطح سے پتھر تراش دیتے تھے اور اس طویل عمل کے بعد تحریر وجود میں آتی تھی۔ مگر چونکہ لکھنے کا یہ طریقہ ایک تو بہت دشوار تھا دوسرے اس میں ایک کے بجائے دو آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی اس لیے انسان کے ذہن رسا نے جلد ہی چٹانوں کے بجائے پنڈول یا چکنی مٹی کی لوح پر لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ مٹی کی بڑی بڑی تختیاں بنا کر ان کو سکھایا جاتا تھا اور پھر نوک دار قلموں سے کھرچ کر لکھا جاتا تھا۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مٹی کی ان "کتابوں" پر چار ہزار سال قبل مسیح لکھا جانے لگا تھا۔ ایسی ایک "کتاب" برٹش میوزیم میں بھی موجود ہے اس میں اس طغیانی کا ذکر ہے جس کا حال یہودیوں نے توریت کے پہلے باب "کتاب تخلیق" (BOOK OF GENESIS) میں بیان کیا ہے۔ مٹی کی ان "کتابوں" کے چند نمونے سرہنری لیرڈ نے کلدان یا بابل سے مہیا کئے ہیں۔ یہ تحریریں زمانہ انجیل سے ہزاروں سال پہلے کی ہیں۔ گو کہ ان تحریروں سے مطالب اخذ کرنا ہر ایک کا کام نہیں پھر بھی بعض محققین نے کلدانی تحریروں کے خطوط (CHARACTERS) کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کے خطوط کا عام انداز خانہ نما یا مثلثی ہے جو اوپر سے تیر کی مانند نوکیلے ہوتے ہیں اور نیچے آتے آتے دو لائینیں مثلث کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ مختصراً یہ دیکھا جائے کہ باقاعدہ حروف تہجی کے وجود میں آنے سے پہلے انسان وہ کونسی شکلیں اور خطوط کھینچنا جانتا تھا جن کے ذریعہ وہ لکھ کر اپنے حالات کو دوسروں تک پہنچا سکے۔ دراصل حروف تہجی بھی ان خاص خطوط یا علامتوں کا ہی نام ہے جن سے کوئی خیالی یا صوتی وابستگی ہو آج جب ہم کوئی ایسا خط یا ایسے کئی خطوط کھینچتے ہیں جو حروف تہجی میں سے ہوں تو ہمارے ذہن میں فوراً وہ مطلب یا خیال آ جاتا ہے جن سے یہ علامتیں رسمی طور پر اور روزمرہ کے استعمال کی وجہ سے وابستہ ہو گئی ہیں اور چونکہ ہم روزمرہ ان حروف تہجی کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بناتے رہتے ہیں اس لیے ہمیں ان خطوط سے مطالب اخذ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ مگر حروف تہجی کا استعمال اپنے خیالات کو دوسروں تک تحریر کے ذریعہ پہنچانے کا انتہائی ترقی یافتہ طریقہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ باقاعدہ حروف تہجی بہت بعد میں وجود میں آئے اور ان کی عمر تحریر کی عمر سے بہت کم ہے کیونکہ اس وقت کا انسان بھی لکھا کرتا تھا۔ جس کے ذہن میں حروف تہجی کا تصور تک نہ تھا۔

ہیں اس سے کہ حروف تہجی وجود میں آئیں انسان نے لکھنے کے اور طریقے دریافت کر لئے تھے۔ یہ طریقے زیادہ واضح تھے اور ان میں لکھنے والے کے خیال کا براہِ راست اظہار رہتا تھا۔ کیونکہ تحریر کے اور خیال میں ہم آہنگی اور پیوستگی تھی۔ تحریر اور خیال میں ہم آہنگی و پیوستگی کی وجہ یہ تھی کہ ان تحریروں میں اظہار خیال تصاویر اور خاکوں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ لکھنے کے یہ طریقے تین قسم کے تھے (۱) تصویری تحریر (PILTAG ROPH) (۲) خیالی تحریر (IDEAG RAPH) اور خیالی حروف (HIEROGLYPH) تحریر کے ان تینوں طریقوں میں تصویری تحریریں اور خیالی تحریریں ایک ساتھ رائج تھیں مگر خیالی حرف ان دونوں قسم کی تحریروں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ تحریر کی تاریخ میں یہ تین منزلیں بہت اہم ہیں۔ خیالی تحریر یا تصاویر کے ذریعہ لکھنا پہلے اور دوسرے مرحلہ کی درمیانی کڑی ہے۔ تصاویر کے ذریعہ لکھنے والے جو خطوط استعمال کرتے تھے ان سے نہ کوئی صوتی تاثر ہوتا تھا جیسے ہمارے موجودہ حروف سے ہوتا ہے، اور نہ ہی کسی لفظ کی تشکیل ہوتی تھی بلکہ یہ خطوط اس شے کا بعینہ خاکہ ہوتے تھے کہ جس کا اظہار منظور ہو مثلاً اگر غم واندوہ کا اظہار مقصود ہو تو ایک آنکھ بنا کر اس میں سے آنسوؤں کو گرتا دکھاتے یا اگر ایسے آدمی کا خاکہ بناتے جس کی پسلیاں باہر نکلی ہوں تو اس سے قحط کال مراد ہوتی۔

تصویری حرف (HIEROGLYPH) اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے اب رفتہ رفتہ کسی خیال یا شئے کا بعینہ تصویر بنانے کا رواج بدل رہا تھا اور خطوط کے ساتھ خاص معنی وابستہ ہوتے جا رہے تھے۔ لکھنے والے تصویر کو احتیاط کے ساتھ بنا کر اس کی جزئیات کو زیادہ واضح نہیں کرتے تھے بلکہ لاپرواہی سے چند خطوط کھینچ دیتے مگر چونکہ ہر خط اور شکل سے ایک خیال وابستہ ہو گیا تھا اس لئے لکھنے والا اپنے خیال کے اظہار میں اور قاری اس خیال کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں محسوس کرتا تھا۔ تصویری حرف کا دور عبوری دور تھا جلد ہی انسان کے ذہن نے ہر تصویر حرف سے صوتی وابستگی پیدا کر لی اور خطوط کے مطالب صوتی تاثر کے ذریعہ سمجھے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ تصور کی جگہ اس تصویر کے بگڑے ہوئے خاکوں اور پھر ان خاکوں کی جگہ محض علامتوں نے لے لی اور اس طرح حروف کی بنیاد پڑی۔ موجودہ زمانہ کے بہت سے حروف تہجی کا سلسلہ بالواسطہ یا بلاواسطہ خیالی تحریر یا تصویری حرف سے جا ملتا ہے۔ تحریر کے قدیم طریقے اور اس کے بعد لسانی ارتقا بجائے خود ایک وسیع علم ہے چونکہ اس کی بحث ہمارے دائرہ سے باہر ہے اس لئے یہاں نہایت سطحی طور پر تحریر ـ

کے ایک کتابوں کا دیوتا بھی تھا جو اتنا ہی واجب الاحترام تھا جتنے اور دیوتا
مذکرہ بالا دو کتابوں کے علاوہ اس زمانہ کی دوسری مصری تصانیف کا کوئی
پتہ نہیں چلتا۔ مگر جان ڈرنک واٹر لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں مصری ادب نے
بہت ترقی کی۔ ایک طرف تو مصری مصنفین دربار سے وابستہ تھے جن کی وجہ
سے درباری ادب میں اضافہ ہو رہا تھا دوسری طرف عوامی ادب بھی ترقی پذیر
تھا یہ عوامی ادب زیادہ تر عوامی قصوں پر مشتمل تھا جو ہر خاص و عام میں
مقبول تھے اس کے علاوہ وقت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے علوم کی کتب
میں اضافہ ہوتا گیا" مذہب، اخلاقیات، قانون، خطابت، ریاضی، علم حساب،
علم ہندسہ، طب اور سیاسیات پر تصانیف کے علاوہ ناول بھی لکھے گئے جو بہت
مقبول ہوئے"۔ یہ سب کتابیں جن کی قدامت پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا
نیست و نابود ہو گئیں سوائے ان دو کتابوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

قدیم کتابوں کی سلسلہ وار تاریخ میں کلدانی اور مصری کتب کے بعد چینی
کتب کا ذکر آتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ چینی ادب بھی قریب قریب اسی زمانہ کی
پیداوار ہے جس زمانہ نے قدیم مصری ادب کو جنم دیا۔ سرزمین چین کی تہذیب
بھی بابل اور مصر کی تہذیبوں کی طرح ہزاروں برس پرانے انسان کی یاد دلاتی
ہے اس وقت جبکہ یورپ میں کسی کتاب یا کسی قسم کے مذہبی یا عوامی ادب
کا تصور نہ تھا چین میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ چین میں فن تحریر
کی ایجاد شہنشاہ فوہائے (FUHAI) نے تقریباً دو ہزار آٹھ سو سال قبل
مسیح کی۔ اس ترقی پسند اور روشن دماغ حکمران نے آب، آتش، زمین وغیرہ
کے لئے علامتیں مقرر کیں۔ انہیں علامتوں کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ چین
میں ایک وسیع تصویری تحریر وجود میں آئی ابتدا میں یہاں بھی مذہب نے
تحریر کی ترقی میں ہاتھ بٹایا اور کانسی، پتھر، اور ظروف پر مذہبی تحریریں کھودی
جانے لگیں۔ بعد میں قصے کہانیاں، سلاطین کی تاریخ، عوامی گیت اور نظمیں
بھی لکھی جانے لگیں۔ چین کے مشہور حکیم کنفیوشس نے انہیں تحریروں
سے حاصل شدہ مواد کو یکجا کر کے تشریحی حاشیوں کے ساتھ تقریباً پانچ
سو سال قبل مسیح شائع کیا۔ اس زمانہ میں چینی اپنی کتابوں کو بانس کے
ریشوں سے بنائی ہوئی سپاٹ تختیوں پر چھاپتے تھے۔ کبھی ان تختیوں پر تصویروں
کو کھودا جاتا تھا اور کبھی یہ تصویریں روشنائی سے بنا دی جاتی تھیں چین
تحریر کی تاریخ میں ایک اہم مرحلے کی نشان دہی کرتا ہے یہاں اولاً تحریر اور
اس کے بعد طباعت کا ارتقا بہت سرعت کے ساتھ ہوا۔ کانسی، پتھر، اور
ظروف کی "کتابوں" کے بعد بانس کے ریشوں سے بنی ہوئی تختیوں کو استعمال
کیا جانے لگا اور جلد ہی وہ لوگ اپنی کتابیں حریر یا ریشم سے بنے ہوئے کپڑے
پر لکھنے لگے۔ کتابیں لکھنے کا فن وہاں ترقی کی ابتدائی اور درمیانی منازل طے
کرتا ہوا آخر کار تقریباً سو سال قبل مسیح اپنی آخری منزل تک پہنچ گیا جب چینیوں
نے کاغذ بنانا شروع کر دیا۔ حضرت عیسٰی کی پیدائش کے فوراً بعد وہاں ٹھوس
سانچا ... چھپائی کی ایجاد ہوئی اور یورپ میں چھپائی کی ایجاد سے تقریباً تین
سو سال قبل چین میں متحرک ٹائپ کی مدد سے باقاعدہ طباعت کا کام شروع
ہو چکا تھا۔

ابتدائی چینی ادب اور اخلاقیات کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔
اس زمانہ میں چین میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں سے اکثر ایسی تھیں
جن میں مصنفین نے حکمت و دانائی کے زریں اصول سمیٹ کر یکجا کئے تھے۔
تاکہ ان سے استفادہ کر کے انسان اس دنیا میں ایسی زندگی گزارے جو
اخلاقی قدروں سے بھرپور ہو اور جس کے طفیل وہ اپنی عاقبت بھی سنوار
سکے۔ چینی قوم روایتی طور پر زمانہ قدیم سے ہی ملکی مصنفین کی عزت اور ان کی
قدر و منزلت کرنے کے سلسلہ میں مشہور ہے۔ کتابیں لکھنے اور ان کو ذریعہ
معاش بنانے کا رواج ابھی تک چین میں نہ تھا اس کے بجائے مصنفین
کو حکومت کی طرف سے مستقل تنخواہیں ملتی تھیں۔ قدیم زمانہ میں چینیوں نے
اہل علم حضرات، حکما، فلسفیوں اور طالب علموں کی جو قدر و منزلت کی اس کی
مثال اس زمانہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ قدیم چینی ادب اتنا وسیع ہے اور
اس میں اتنا تنوع تھا کہ گذشتہ اکتی انقلاب سے پیشتر چینی ادب سے مراد محض
کلاسیکی علوم کا ذخیرہ ہی تھا۔ انقلاب چین سے پہلے جو بھی نئی کتابیں لکھی
گئیں وہ محض کلاسیکی ادب پر تبصرہ یا اس کی تشریح کے زمرہ میں آتی ہیں۔
موجودہ زمانہ تک چینی اپنے کلاسیکی مصنفین کی اتنی عزت کرتے تھے اور ان
سے انہیں اتنی عقیدت تھی کہ وہ کوئی ایسی کتاب لکھنا گناہ تصور کرتے
تھے جو کلاسیکی ادب کا مقابلہ کرے۔ نہ صرف ادبی میدان میں بلکہ لسانی
میدان میں بھی چینی اتنے روایت پرست اور قدامت پسند تھے کہ انہوں نے
اپنے بزرگوں کی صدیوں پرانی زبان میں بھی کسی بڑی تبدیلی کو گوارا نہ کیا یہی وجہ
ہے کہ آج کی چینی زبان اور ایک ہزار سال پہلے کی چینی زبان میں اتنا فرق نہیں
ہے جتنا مثال کے طور پر موجودہ اور ایک ہزار سال پہلے کی فارسی میں یا چاسر
کی زبان اور آج کی انگریزی میں۔

ارتقائے ذہن انسانی کے اولیں مدارج میں وید بھی تصنیف ہوئے
چین کے مذہبی ادب کے ساتھ ہی ساتھ ویدوں کی سب سے پہلی کتاب بھی
وجود میں آئی۔ وید ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں قدیم ترین ہیں اور خاص طور
سے رگ وید کی مناجاتیں اور بھجن تقریباً تین ہزار سال پرانے ہیں۔ ان مجموعوں
کی تاریخ کا سراغ اس وقت سے ملتا ہے جب آریوں نے ہندوستان اور یورپ
کی طرف سے ہجرت بھی نہیں شروع کی تھی۔

اور خطوط اسے کہ جن سے تاریخ کی اولین "کتابوں" کی تشکیل ہوئی کچھ واقفیت ہو سکے۔

تحریر کے قدیم ترین طریقوں کی مختصر سی بحث کے بعد ہم پھر کلدانی تحریروں کی طرف آتے ہیں کیونکہ یہ تحریریں اب تک دریافت شدہ تحریروں میں اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ چونکہ یہ کلدانی "کتابیں"، جو مٹی کی تختیوں پر لکھی گئیں تعداد میں کافی ہیں اس لئے یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ لکھنے کا رواج قدرے عام ہو چلا تھا۔ لکھنے کے فن کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ بادشاہ نویسندوں کو باقاعدہ مشاہرہ پر زیادہ تر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ زمانہ امن میں یہ نویسندے دربار میں ہر وقت حاضر رہتے اور اگر بادشاہ کو جنگ پر جانا پڑے تو یہ نویسندے میدان کارزار میں بھی بادشاہ کے ساتھ جاتے تاکہ لڑائی کا حال، دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کی تفصیلات، لوٹ مار اور مال غنیمت کا حساب وغیرہ درج کرتے رہیں۔

لکھنے کا رواج نہ صرف یہ کہ دربار تک محدود تھا بلکہ جلد ہی انسان کی یہ نئی دریافت درباروں سے باہر بھی دوسرے مقاصد کی تکمیل کرنے لگی۔ مذہبی رہنماؤں اور پروہتوں نے پند و نصائح اور مناجاتیں مٹی کی لوحوں پر لکھنا شروع کیں۔ ایسے پروہت جو مذہبی لٹریچر ضبط تحریر میں لاتے تھے انکی تنخواہیں بھی دربار سے مقرر تھیں۔ بہت سی ایسی تختیاں بھی ملی ہیں جن پر جنگ کے حالات اور مناجاتوں کے علاوہ کاشتکاری، علم نجوم اور سیاحت سے متعلق مواد بھی ملتا ہے غرضیکہ عیسٰی کی پیدائش سے کئی ہزار سال پہلے لکھنے کا فن انسان کی تہذیب کا جزو بن چکا تھا۔ اگرچہ یہ فن عام نہ تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ بادشاہوں کی سرپرستی میں تحریر کے فن نے خاصی ترقی کی۔ کہا جاتا ہے کہ سیناچرب (SENNACHERIB) جس کی وفات ۶۸۱ قبل مسیح میں ہوئی اس کے کتب خانہ واقع نینوا میں مٹی کی "کتابیں" خاصی تعداد میں موجود تھیں۔

تحریر کی تاریخ میں باعتبار تقدم کلدانی ادب کے بعد مصری ادب کا درجہ ہے۔ کلدانی کتابیں مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی ہیں۔ پیپرس نرسل یا سرکنڈے کی قسم کا ایک پودا ہوتا ہے جو پانی میں اگتا ہے اور دریائے نیل کی وادی میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ سرکنڈے کے گودے سے پیپرس کے یہ اوراق تیار کئے جاتے تھے۔ اور ان پر سرکنڈوں ہی سے بنائے ہوئے قلم سے لکھا جاتا تھا۔ مصر کی قدیم ترین کتاب "کتاب الموتیٰ" (THE BOOK THE DEAD) کے نام سے مشہور ہے جس کی تصنیف کا سراغ اہرام مصری کی تعمیر کے زمانہ سے ملتا ہے۔ اس کتاب میں دعائیں اور مناجاتیں، مذہبی گیت اور دیوتاؤں کے متعلق نظمیں ہیں اس کے علاوہ اس میں ان ... و تجربات کا بھی بیان ہے۔ جو روح انسانی کو موت کے بعد دوسری د... پیش آئیں گے۔

"کتاب الموتیٰ"، زمانہ قدیم کے مصریوں کی مقدس کتاب جس میں مذہبی ارکان اور رسوم بھی درج تھے۔ اس کتاب سے ... کو اتنی عقیدت تھی کہ جب وہ مردہ کو سپرد خاک کرتے تو اس کی ایک ... و کاپی نعش کے ساتھ ضرور رکھ دیتے تاکہ اس کی برکت سے ... کی روح بہ آسانی قفس عنصری سے پرواز کرنے کے بعد دوسری د... منزل مقصود تک پہنچ سکے یہ رواج جتنا عام ہوتا گیا اتنی ہی کتابوں ... زیادہ سے زیادہ جلدوں کی مانگ بڑھتی گئی اور اس طرح سرزمین ... کتابوں کی ابتدا ہوئی۔ ایک اور نظریئے کے مطابق کتابوں کی تجارت ... میں شعرا اور خطیبوں کی وجہ سے فروغ ہوا۔ مصری خطیب اور شعر ... کلام کو مجمع عام میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے جب یہ شعرا اور خطیب مجمع ... خطاب کرتے تو نویسندے ان کے ارشادات کو اسی وقت قلم بند کر لیتے ... اس کی نقلیں امرا کے ہاتھ کثیر رقم کے عوض فروخت کرتے کتابوں ... اولین تاجر نویسندے تھے یا وہ کاتب جو کتاب الموتیٰ کی نقلیں ... کرتے تھے؟ یہ امر ثانوی حیثیت رکھتا ہے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ادب ک... میں کتب فروشی کس زمانہ اور کس ملک سے شروع ہوئی اور اس حیثیت ... کوئی انکار نہیں کرتا کہ یہ تجارت سب سے پہلے مصر میں شروع ہو... اہرام مصری زیر تعمیر تھے۔

"کتاب الموتیٰ" کے علاوہ اسی زمانہ کی ایک اور تصنیف "تھا... کے اقوال" (THE PRECEPTS) بھی دریافت ہوئی جس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں موجود ہے۔ تھاموتیپ ... تین ہزار سال قبل مسیح میمفس میں پیدا ہوا تھا۔ پیپرس کے ورق پر لکھ... پند و نصائح کی اس "کتاب" کا طول ۲۲ فٹ ۱۷ انچ اور عرض ۵ ... انچ ہے۔ اس کتاب کی قدامت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے ... کی تصنیف حضرت موسیٰ کے زمانہ سے اور ویدوں کے ترتیب دیئے جا... وقت سے دو ہزار سال قبل ہوئی۔ اسی طرح ہومر اور حضرت سلیمان کے ... سے بھی ڈھائی ہزار سال پہلے یہ کتاب وجود میں آ چکی تھی۔

کلدانی کتابوں کے مقابلہ میں مصری کتابیں زیادہ ترقی یافتہ شکل ... کر چکی تھیں کیونکہ مصری مٹی کی تختیوں کے بجائے اوراق پیپرس پر ... لگے تھے۔ اس زمانہ میں مصری ادب کی ترقی و ترویج مذہب کی مرہون ... رہی۔ مصری معبد وہاں کے ابتدائی ادب کا گہوارہ تھے مجلہ اور دی...

جب آریہ نسل کے لوگ شمالی ہند کے میدانوں میں ہجرت کر کے
ے تو اپنے ساتھ اپنی تہذیب اور اپنے مذہبی عقائد بھی لائے۔ یہ لوگ
مالی ہند میں پھیل گئے اور ہندوستان کے پرانے باشندے ان کے زیر اثر آ گئے۔
دارد نسل نے اپنی معاشرتی برتری کی بنا پر مقامی نسل کے افراد پر غلبہ حاصل
لیا۔ چونکہ آریہ اپنے کو مقامی نسل سے برتر سمجھتے تھے لہذا انہوں نے ہندوستان
ے ساتھ مدغم ہونا پسند نہ کیا۔ اپنی زبان سنسکرت کی تعلیم وہ مقامی باشندوں
ہیں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے وید اعلیٰ نسل کی زبان یعنی سنسکرت میں
ھے گئے۔ چین یا مصر میں مذہبی کتابوں کی نقل کر کے عام لوگوں تک پہنچانے
رواج عام ہو گیا تھا برخلاف اس کے ویدوں کے مطالعہ کا وہی مستحق
ا تو برہمن ہو اور اسی وجہ سے ویدوں کی نقل کرنے یا اس کو چھاپنے
رواج نہ ہوا۔ یہاں تک برہمنوں کا یہ عقیدہ تھا اور کسی حد تک اب بھی
، کہ جو انسان ویدوں کی نقل کر کے ان کی جلدیں فروخت کرے گا وہ
مقدس کتابوں کی بے حرمتی کے جرم کا مرتکب ہو گا اور ایسا شخص
م میں جائے گا۔

یہ ہے ان چند کتابوں کا مختصر سا تذکرہ جن کو اگر ذہن انسانی
ارتقاء کی درمیانی کڑیاں تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہو گا ویسے تو جس
انسانی ذہن وید یا کنفیوشس سے پہلے سوچ و فکر اور اختراع و ایجاد
ادی میں سرگرم عمل رہا اسی طرح کنفیوشس کے بعد سے آج تک
س وادی میں خوشہ چینی کر رہا ہے۔ جس دور کا سرسری جائزہ اس
دل میں لیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی انسان نے ایسی معرکتہ الآرا ذہنی
ں کا ثبوت دیا ہے کہ اگر اس کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو دفتر کے
سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی یہ تذکرہ نامکمل رہے۔ جو نیا دور یونانی تہذیب
ساتھ شروع ہوتا ہے اس میں افکار و تصنیفات کا ایک لا انتہائی سلسلہ
ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں علوم و فنون، فلسفہ و حکمت،
ادب، مذہب و عقیدت کے آڑے ترچھے دھارے ہمارے تجسس کے
کو کبھی مغربی ساحل سے ٹکراتے ہیں۔ اور کبھی مشرقی ساحل کی طرف
لے جاتے ہیں۔ اس بحر بیکراں میں جگہ جگہ روشنی کے مینار ہیں جن کی
شنی ہمیں ان دھاروں سے روشناس کراتی ہے۔ کہیں ہومر کی
ں شاعری ہے تو کہیں ارسطو و افلاطون کا فلسفہ، کہیں گوتم بدھ کا فلسفۂ
و ممات ہے کہیں انجیل کی طویل داستان اور کہیں قرآن پاک جیسی
، جامع اور آفاقی اقدار کی حامل کتاب۔ اور یہ تو صرف سرچشمے
ں میں سے ہر ایک نے علم و حکمت کے ہزاروں دھاروں کو جنم دیا۔
ان سرچشموں کا تذکرہ نہ تو اس مختصر سے مضمون میں ممکن ہے اور نہ ہی مقصود۔

زمانۂ قدیم کی ان کتابوں اور تحریروں کی مدد سے ہم چند مفید نتائج
بآسانی اخذ کر سکتے ہیں جن کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے تاکہ مغربی
اقوام کے مقابلہ میں وہ احساس کمتری جس کا ہم شکار ہیں اور جو ایک بڑی
غلط فہمی کا نتیجہ ہے ختم ہو سکے۔ ذہن انسانی کی مظہر کتابیں ہیں اور کتابوں
کی ارتقائی داستان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرزمین مشرق علم و فن،
فلسفہ و حکمت اور مذہب کا اولین گہوارہ رہی ہے۔ وادئ نیل اور وادئ
یانگ سی کی درمیانی سرزمین اتنی زرخیز ہے کہ قدیم علوم کے اکھوے
یہیں پھوٹے مگر افسوس ان اکھوؤں کے پھوٹتے ہی مغربی رہزنوں نے
ان پر قبضہ کر لیا اور چھوٹے چھوٹے پودوں کو جڑ سمیت اکھاڑ کر اپنے وطن
لے گئے جہاں ان کی نگہداشت کی ان پر ریاضت کی اور جب یہ مشرقی
پودے مغرب کی سرزمین میں بڑھ کر شجر بنے تو ان میں مغربی خوبو، مغربی مزاج
اتنا رچ گیا تھا کہ مشرق والے بھی انہیں دیکھ کر نہ پہچان سکے اور ایک طویل عرصہ
تک اسی دھوکہ میں رہے کہ یہ مغربی اشجار ہیں۔ ورنہ کون سا علم اور کون سا فن
ایسا ہے جس کی داغ بیل مشرق میں نہ پڑی ہو؟ بابل کی تہذیب اور وہاں
کا ادب، مصر کی کتابیں اور ان کا مذہبی فلسفہ، ویدوں کی بصیرت اور کنفیوشس
کی دانائی۔ یہ سب کچھ مشرق ہی کا سرمایہ تو ہے۔ یہ تو ہزاروں سال قبل مسیح
کی بات ہے۔ علم و حکمت کے سرچشمے سرزمین مشرق میں حضرت عیسیٰ کے بعد
بھی پھوٹتے رہے اور حد تو یہ ہے کہ عیسائیت جو سارے یورپ کا مذہب ہے
اور جس کی توصیف و تعریف کے گن یورپ کے چپہ چپہ میں گائے جاتے ہیں
اس مذہب کی مقدس انجیل بھی تو مشرق ہی سے مغرب لے جائی گئی۔ موجودہ
دور میں گوتم بدھ کی تعلیمات اور قرآن پاک کی بصیرت افروز ہدایات نے
ذہن انسانی میں جو انقلاب برپا کیا اس کی نظیر اس دور کی تاریخ میں عیسائیت
کے علاوہ اور کوئی تحریک نہیں پیش کر سکتی۔

اس کے علاوہ قدیم ادب اور تحریر کے ارتقاء کے اس جائزہ کے بعد
یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ تحریر کے وجود میں آنے کی وجوہات چاہے
جو کچھ بھی ہوں مگر انسانی زندگی کے ابتدائی ادوار میں تعلیم محض مذہب کے
سہارے پھیلی اور نہ صرف تعلیم بلکہ ادب نے بھی اوائل عمر میں مذہب کی
گود میں پرورش پائی ابتدائی مناجاتیں اور بھجن، خداؤں کی تعریف
میں نظمیں اور دیوتاؤں کی کہانیاں ہی وہ اجزاء ہیں جن سے قدیم ادب کی
تشکیل ہوئی اور آج بھی اگر دنیا کی ہر زبان اور ہر زمانہ کے ادب کا جائزہ لیا
جائے تو اس میں مذہب کا عنصر غالب نظر آئے گا۔

اور موت کا اندراج کرانا لازمی ہے

کیونکہ

یہ آپ کی مدد کرتا ہے

پیدائش کا سرٹیفکیٹ مختلف مقاصد کے لئے عمر کا ثبوت ہوتا ہے،

اسکول میں داخلے

ڈرائیونگ لائسنس

پاسپورٹ کے حصول

ملازمت کے حصول

ووٹ دینے کے حق

بیمہ پالیسی کے حصول

موت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے:

ترکے میں جائیداد کے حصول

بیمے کی رقم کی وصولیابی

جائیداد کے کلیم کے نپٹارے کے لیئے

قوم کی امداد کرتا ہے

پیدائش اور اموات کا اندراج مستقبل میں "بہتر صحت اور بہتر زندگی" کی پیش بینی اور منصوبہ بندی کرنے کے لئے بنیادی معلومات مہیا کرتا ہے۔

اندراج پیدائش واموات کے قانون 1969 کے بموجب پیدائش واموات کا اندراج کرانا لازمی ہے۔

پیدائش اور اموات کا اندراج بروقت کرانے کو یقینی بنائیے۔ اندراج قدرے تاخیر سے بھی کرایا جاسکتا ہے۔

رجسٹرار جنرل، بھارت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۴ ۲ / ۹۴-۹۵

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ **سینیر ریسرچ فیلو** [ایک] [عارضی] [ڈی۔ایس۔اے (فزکس) پروگرام کے تحت] فزکس ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ:۔ ۔/۰۰، [مقررہ] ماہانہ۔

۔ ۱۰۰۰ روپے ماہانہ [مقررہ] ان امیدوار کے واسطے جو اعلیٰ لیاقت کے حامل ہوں۔

قابلیت:۔

آ۔ لازمی:۔ ایم۔ایس سی (فزکس) یا بی۔ٹیک (الیکٹریکل انجینرنگ/الیکٹرونکس) یا ایم۔اے [لنگویسٹکس] سب ڈجیٹل سگنل پروسسنگ میں کم از کم دو سالہ تحقیقی تجربہ یا ایم۔ٹیک (الیکٹریکل انجینرنگ الیکٹرانکس) میں۔

II پسندیدہ:۔ ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی تھیسس جمع کی ہو۔

۲۔ **سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ** [پوٹری] [ایک] [مستقل] ہسٹری ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاونسز

قابلیت

۱۔ لازمی (۱) آرکیالوجی/آرکیالوجی کے ایک مضمون کے ساتھ تاریخ/تاریخ ہند قدیم، تمدن اور آثار قدیمہ میں ایم۔اے

(۲) کم از کم آثار قدیمہ کے میدان میں کچھ تجربہ۔

II پسندیدہ:۔ آثار قدیمہ میں ڈپلوما [جب کہ آثار قدیمہ میں ماسٹر ڈگری کے حامل افراد میسر نہ ہوں]۔

۳۔ **اسسٹنٹ آرکیالوجسٹ** [دو جگہیں] [مستقل] ہسٹری ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاونسز۔

قابلیت:

۱۔ لازمی ۔ آرکیالوجی/ہسٹری میں ہائی سکنڈ یا فرسٹ کلاس میں ماسٹرس ڈگری

آثار قدیمہ کی کھدائی کے میدان میں کچھ تجربہ۔

II پسندیدہ:۔ آثار قدیمہ میں ڈپلوما [جب کہ آثار قدیمہ میں ماسٹر ڈگری کے افراد میسر نہ آسکیں]۔

۴- اسسٹنٹ-کم-ڈرافٹسمین (ایک) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری

شرح تنخواہ- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:- ڈرائنگ اور پینٹنگ میں ماسٹرس ڈگری / سول انجینئرنگ میں ڈپلوما ڈرافٹسمین شپ میں ڈپلوما- آرکیالوجیکل ریکارڈنگ میں ممکن عملی تجربہ مثلاً ڈرائنگ آف انٹی کیوٹیز، پوٹری سیکشن، پلانس وغیرہ میں تجربہ اور ڈرائنگ [illegible] میں تجربہ

۵- ایگزیکیوٹو اسسٹنٹ (ایک) (مستقل) ہسٹری ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱- لازمی۔ (۱) کم از کم آرکیالوجی ہسٹری میں ایم اے۔ اور ساتھ میں تاریخ بشمول قدیم تمدن اور آثار قدیمہ کے ایک مضمون [illegible]

(۲) کم از کم کچھ تجربہ آثار قدیمہ کے میدان میں رہا ہو۔

۲- پسندیدہ:- آثار قدیمہ میں ڈپلوما (جب کہ آثار قدیمہ میں ماسٹرس ڈگری کے حامل امیدوار میسر نہ ہوں)

۶- گلاس بلوئر (ایک) (مستقل) فزکس ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۶۰-ای بی-۲۰-۶۴۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:- کسی مستند اور تسلیم شدہ ادارے سے گلاس بلوئنگ کورس میں خصوصی ٹریننگ حاصل کی ہو اور ساتھ میں گلاس بلوئنگ ٹیکنالوجی میں پانچ سالہ تجربہ ضروری ہے۔

۷- سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک) (مستقل) اینستھیسیالوجی ڈپارٹمنٹ، جے این میڈیکل کالج۔

شرح تنخواہ:- ۳۹۰-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- سائنس کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی۔ مع اینستھیسیا ریکارڈ میں تین سال تجربہ۔

۸- اسٹور کیپر (ایک) (مستقل) ہسٹری ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۳۳۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:

۱- لازمی- کم از کم گریجویشن اور ساتھ میں اسٹاک رجسٹر کو تیار کرنے کی قابلیت۔

۲- پسندیدہ:- حساب و کتاب رکھنے کا کچھ تجربہ ہونا چاہیئے۔

اور

اسٹور کی دیکھ بھال کرنے کا تجربہ۔

[illegible] (ایک) (مستقل) [illegible] ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ [illegible] ۳۵ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت :— آئی - ٹی - آئی یا سول انجینیرنگ میں ڈرا[illegible] مین شپ۔
پانچ سالہ عملی تجربہ یا
بلڈنگ تعمیرات کا کافی تجربہ
تعمیری اور بناوٹ کے عمارتی نقشوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی اہلیت
اور کام کرنے میں خود کی قابلیت اور کام لینے کی صلاحیت

عمر — ۲۵ سال سے کم نہ ہو۔

غیر معمولی تجربے کے اور استعداد کے حامل افراد کو ابتدا سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شر[illegible]ت دی جا سکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو بطور ٹی۔ اے۔ ریلوے سکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مجوزہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس اے ایم یو علی گڑھ کے دفتر سے تین روپے نقد ادائیگی فنانس آفس کے کیش سکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا بھیر سہ ۱۰ × 23 2 کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔
درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۵ جنوری ۱۹۸۵ء (آفس ٹائم تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائیگا۔

ضمیر احمد خان
رجسٹرار

۴ر دسمبر ۱۹۸۴ء

علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۱۵ سیشن ۸۴-۱۹۸۵ء

ایم ایس سی انزائم اور فرمنٹیشن بائیوٹکنالوجی میں ۸۵-۱۹۸۴ء سیشن کے لیے موزوں امیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

کم سے کم قابلیت برائے داخلہ۔
بی ایس سی کیمسٹری، زولوجی اور باٹنی۔
یا ۱۰+۲ امتحان میں میتھمیٹکس رہا ہو۔

ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جن کے پاس ایم ایڈیل

کورس کی مدت دو سال ہے۔ یہ کورس موڈرن بائیولوجی / بائیوٹیکنالوجی، جیسے اتوٹولوجی، ہربری ڈوماٹیکنالوجی، مولیکولر بائیولوجی، جینٹک انجینرنگ، انزائم / انزائم انجینرنگ / بائیوکیمیکل انجینرنگ، مائکرو بائیولوجی، بائیوکیمسٹری، کمپیوٹر پروگرامنگ وغیرہ پر احاطہ کرتا ہے۔

وہ امیدوار جو اس کورس میں داخلے کے خواہش مند ہوں وہ ایک سادے کاغذ پر دو پاسپورٹ سائز کے فوٹوز کے ساتھ درج ذیل معلومات تحریر کرکے درخواست دیں۔

۱- نام:- .... ۲- تاریخ پیدائش:- .... ۳- والد کا نام:- .... ۴- سیکس:- ....

۵- مذہب .... ۶- قومیت:- .... ۷- صوبہ .... ۸- پاس کیے ہوئے امتحانات کی تفصیل

امتحان کا نام:- .... رول نمبر .... پاس کرنے کا سال .... یونیورسٹی کا نام ....

مقررہ نمبر .... حاصل شدہ نمبر .... مضامین اور .... % فی صد نمبر.. (مصدقہ مارکس شیٹ ساتھ میں منسلک کریں)

۹- ہوسٹل میں رہائش چاہتے ہیں یا نہیں:- .... ۱۰- اگر تعلیم میں تسلسل نہ ہو تو خالی سال کے مصرف کی تفصیل (تحریری تصدیقی ثبوت کیساتھ)

۱۱- خط وکتابت کا مکمل پتا- .... ۱۲- منسلکہ انڈین پوسٹل آرڈر کی تفصیل:- ....

۱۳- کیا امیدوار مندرجہ کسی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ شیڈول کاسٹ:- ... درج قبائل:- ... پسماندہ طبقات:- ....

یونیورسٹی ملازمین کے بچے:- .... اولڈ بوائز کے بچے:- .... ایسے سرکاری ملازمین کے بچے جن کا حال ہی میں علی گڑھ تبادلہ ہوا ہے

ایسے صوبے کے طلبا جن کی سرحد اتر پردیش سے نہ ملتی ہو:- .... اچھے کھلاڑی / مقرر:- .... جسمانی طور پر معذور:- ....

۱۴- منسلکہ کاغذات کی تفصیل:- .... امیدوار کے دستخط اور تاریخ:- ....

ہر طرح سے مکمل درخواستیں، جس میں تعلیمی قابلیت کا مصدقہ نقول کے ساتھ ثبوت شامل ہو، ۸/- روپے کی قیمت کے انڈین پوسٹل آرڈر کے ساتھ جو کہ فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن سیکشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے یہاں ۲۹ دسمبر ۱۹۸۴ء شام پانچ بجے تک ہر حال میں پہنچ جانی چاہییں۔ نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا اور نہ ایسی درخواستوں کے سلسلے میں کوئی خط وکتابت ہی کی جائے گی۔

این۔ موئیدین

کنٹرولر آف اکزامیشن
اینڈ
ایڈمیشن

اسٹیٹ آفسر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

یونیورسٹی کے چوتھے درجے کے ملازمین کو گرم یونیفارموں کے لیے ذیل میں درج آئٹموں کی سپلائی کے لیے بتاریخ ۲۲ر دسمبر ۱۹۸۴ء تک سربمہر ٹینڈر طلب کیے جاتے ہیں۔

نمبر شمار	تفصیلات	تخمینہ مقدار
۱۔	ٹیری کلاتھ پلائی 7/2 × 5 : 2/33 کاؤنٹ خاکی رنگ چوڑائی 143 سینٹی میٹر	8,500.00 میٹر
۲۔	سفید ٹیری کاٹ کپڑا 2/80 : 2/20 زنانہ بلاوز اور پائجامہ برائے موزوں 90 سینٹی میٹر چوڑائی	2,500.00 میٹر
۳۔	لائننگ کلاتھ پولی سونک خاکی شیڈ	1,500.00 میٹر
۴	لائننگ کلاتھ پولی سونک سفید شیڈ	2,500.00 میٹر

شرائط:-

۱۔ اشیا کی فراہمی علی گڑھ کے لیے ہوگی

۲۔ آرڈر جاری ہونے کے بعد اشیا کی فراہمی ۱۵ دنوں کے اندر یکشت ہوگی۔

۳۔ ادائیگی ملوں اور باہری پارٹیوں کو ۹۰ فی صد رقم کی ادائیگی اسٹیٹ بینک آف انڈیا اے ایم یو برانچ علی گڑھ کی معرفت ہوگی اور بقیہ دس فی صد رقم کی ادائیگی بل کی بنا پر اس وقت ہوگی جب نمونے کے مطابق معائینہ کے بعد یونیورسٹی اشیاء کو منظوری دے دے گی۔

ii مقامی فرموں کو ۹۰٪ فی صد رقم کی ادائیگی بذریعہ چیک اسٹیٹ بینک آف انڈیا اے ایم یو برانچ علی گڑھ اشیاء فراہم ہونے پر ہوگی اور بقیہ ۱۵٪ فی صد ادائیگی معائنہ کے بعد یونیورسٹی کی منظوری پر ہوگی۔

دونوں صورتوں میں اگر اشیاء نمونے اور دی گئی خصوصیات کے مطابق نہیں پائی گئیں تو اشیا کو بدلنے کی ذمہ داری فرم کی ہوگی اور بقیہ رقم کی ادائیگی روک لی جائے گی اور سپلائی منسوخ ہونے پر یا اشیاء کو تبدیل نہ کرنے پر پہلے سے کی گئی ادائیگی بھی واپس کرنی ہوگی۔

۴۔ یونیورسٹی کو اختیار ہے کہ وہ بغیر کوئی وجہ بتلائے کسی بھی ٹینڈر منظور یا مسترد کرے۔

۵۔ ٹینڈر کے ہمراہ نمونہ، مینوفکچر پرائس لسٹ روانہ کریں اور جتنکر فریدر رویت جو خاص طور سے تعلیمی اداروں کو دی جاسکتی ہے، درج کی جائے۔

دستخط

[کے۔ آر۔ صدیقی]

اسٹیٹ آفیسر

مالک: تہذیب الاخلاق ٹرسٹ، علی گڑھ
مقام اشاعت: شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پرنٹر پبلشر: نورالحسن نقوی
پریس: شروانی آفسٹ پریس، شیش محل، دہلی

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185